سال اجرا موسم بہار سنہ ۱۹۳۰ء

عرصہ اشاعت ۱۱ سال

منظور شدہ محکمہ ہائے تعلیم برار و ریاست میسور

تعارف

جلد ۱۲ | ماہنامہ "شاعر" آگرہ جنوری سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر ۱

چندہ سالانہ عوام سے ۲ خواص سے ۵ محسنین سے ۵۰ معاونین سے ۲۴ ... ہمدردوں سے ... فی پرچہ ۴

سرپرست، محسنین، معاونین اور انیسان و ہمدردانِ شاعر

سرپرست

(۱) سرپرستِ ادب جناب محترم محمد حیات خانصاحب طالبؔ سیمابی لدیانوی یک صد روپیہ سالانہ

محسنینِ ادب

(۲) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشترؔ ہنگامی عہ۶ سالانہ

(۳) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نشترؔ خورجوی عہ۶ سالانہ

(۴) محسنۂ ادب ہائینس علیا حضرت کلثوم(؟) والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ عہ۶ سالانہ

(۵) محسنِ ادب جناب محترم خان تہری امام الدین خانصاحب بستانؔ دربار پاجود عہ۶ سالانہ

معاونینِ ادب

(۶) معاونِ ادب مسٹر اے۔ بی فلیس صاحب اکبرآبادی بی۔ اے ایل ایل بی عہ۲۴ سالانہ

انیسانِ ادب

(۷) انیسِ ادب جناب سید تفضل کریم صاحب جمشید پور عہ۱۵ سالانہ

ہمدردانِ ادب

(۸) ہمدردِ ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلیمان جالندہری عہ۱۲ سالانہ

(۹) ہمدردِ ادب جناب سید کرم علی صاحب نسیمؔ گوالیاری عہ۱۲ سالانہ

(۱۰) ہمدردِ ادب جناب ابو محمد عبدالعظیم صاحب رونقؔ دکنی عہ۱۲ سالانہ

(۱۱) ہمدردِ ادب جناب محفوظؔ مرادآبادی عہ۱۲ سالانہ

(۱۲) ہمدردِ ادب جناب مولوی محمد قاسم صاحب نامی علوی دربھنگوی عالم فاضل عہ۱۲ سالانہ

(۱۳) ہمدردِ ادب جناب نوابزادہ کنور شکور حسین خانصاحب قیسؔ آف منڈو عہ۱۲ سالانہ

(۱۴) ہمدردِ ادب جناب صاحبزادہ سید مظفر حسین صاحب گوہرؔ رئیس و زمیندار (ڈاکخانہ لوہارام) عہ۱۲ سالانہ

خاصانِ ادب

(۱۵) جناب صاحبزادہ سلطان حامد خانصاحب ثروتؔ گلشن آبادی صہ سالانہ

(۱۶) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمان خان صاحب شفقؔ ٹونکی صہ سالانہ

(۱۷) جناب عبدالحفیظ صاحب ثمرؔ صدیقی پھلواروی بی۔ اے صہ سالانہ

(۱۸) جناب محمد سعید خانصاحب ادیبؔ صہ سالانہ

(۱۹) جناب لالہ گنگارام صاحب آبدؔ سرہندی صہ سالانہ

(۲۰) جناب سید مسعود حسن صاحب مسعودؔ ڈپٹی کلکٹر صہ سالانہ

(۲۱) جناب سید مظفر حسین صاحب عرشیؔ دہلی صہ سالانہ

(۲۲) جناب دلیر زمن(؟) صاحب قمرؔ بی۔ سی۔ ڈی۔ فرنیچ صہ سالانہ

(۲۳) جناب سید علی حیدر صاحب عابدیؔ صہ سالانہ

(۲۴) جناب ایم۔ اے رشید صاحب توبہ صہ سالانہ

(۲۵) جناب صاحبزادہ عبدالحمید خانصاحب بہادر عباسیؔ بی۔ اے صہ سالانہ

(۲۶) جناب ماسٹر حسن خانصاحب اثرؔ صہ سالانہ

(۲۷) جناب نذیر احمد صاحب نذیرؔ سکیر کوٹی صہ سالانہ

(۲۸) جناب محمد صبغت اللہ صاحب ارشدؔ صدیقی امروہوی صہ سالانہ

(۲۹) جناب صاحبزادہ سیٹھ اکبر علی صاحب صہ سالانہ

(۳۰) جناب مخدوم سید علی اسدؔ نقوی البخاری احمدآباد (جھنگ) صہ سالانہ

(۳۱) جناب محبوب حسن صاحب آسیؔ متوطن ٹنکی۔ بمبئی صہ سالانہ

(۳۲) جناب طالقؔ ہمدانی لدھیانوی صہ سالانہ

(۳۳) جناب سبحان خان صاحب فاضلؔ بتول صہ سالانہ

(۳۴) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثرؔ نقوی سرگودھا صہ سالانہ

جرعات

سالِ نو یک لحظ عشرت بن کر آیا اور یہ وقتی مسرت ختم ہو گئی ——— کوئی آمر ہوا کوئی خان بہادر، ہر نوع عزائم و عوامل میں ایک جھرجھری سی ضرور پیدا ہوئی۔ حادثہ غیر محسوس اور سانحہ ناقابل محسوس ——— خادمانِ ادب نے بھی عزم و ارادہ کی کو کو تیز کیا اور اپنے رسائل و جرائد کو سامانِ نو سے آراستہ کرنے کے لئے اُن میں ترمیم و اضافہ کو ناگزیر سمجھا، اس لئے کہ دُنیا انقلاب در آغوش ہے۔ رسائل و جرائد پر بھی کیوں جمود طاری رہے۔

ناظرین "شاعر" بھی بڑی بےچینی سے نئے سال کے پہلے پرچہ کے منتظر ہونگے اور گوناگوں اضافے متوقع۔ خدا کرے زیرِ نظر اشاعت "شاعر" کے بلند ذوق ناظرین کے مذاق کے مطابق ہو، میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ شاعر کا افادی پہلو زیادہ سے زیادہ تابناک ہو جائے اور وہ عامیانہ مذاق کے رسائل سے کچھ اونچا رہے میں نے رسالہ کی ترتیب میں ناظرین کی دلچسپی اور وابستگی کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھا ہے اور ایک بڑی حد تک اس میں یکسانیت پیدا نہیں ہونے دی ہے **تحقیق و تصحیح** کے علاوہ **تجزیہ۔ اصلاح سخن۔ شخصیات۔ طرزِ نگارش۔ مذاکرِ علمیہ** اور **پردۂ قلم** جدید ابواب ہیں۔ ان میں سے بعض کے متعلق ناظرین کا مطالبہ تھا اور بعض ادارہ کے ذاتی غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ ان ابواب کی ترتیب بعض مضامین کے حذف و اضافہ کی وجہ سے کچھ ادھر ادھر ہو گئی ہے، فروری نمبر سے یہ ابواب اپنے مخصوص صفحات پر شائع کئے جائیں گے۔

حسبِ اعلان اس ماہ سے شاعر کا حجم بھی بڑھا دیا گیا ہے اور اُسے باتصویر بنا دیا گیا ہے۔ اس مرتبہ چوٹی کے ۲ دو اساتذہ کی تصاویر پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا۔

سرورق زیرِ نظر اشاعت کا سرورق جناب اسحٰق حیدر صاحب ٹیچر مسر عزیزالدین مڈل اسکول جالسی کی فن کارانہ جنبشِ قلم کا ایک دلنشین اور جاذب نظر شاہکار ہے۔ ہر چند اسحٰق صاحب کو اس ٹائٹل کی تیاری میں صرف چند گھنٹے مل سکے، لیکن پھر بھی اُنھوں نے اس میں اپنے کمالِ فن کا اظہار ضرور فرما دیا ہے۔ ہندوستان کے رسائل و اخبارات کو موصوف کی ذات سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

قلمی معاونین مجھے مسرت ہے کہ گزشتہ ماہ میری درخواست پر بیشتر ادبا اور شعرا نے توجہ فرمائی، مجھے اُمید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ اب "شاعر" مستقبل میں ادب و شعر کے ایسے شاہکار پیش کر سکے گا جو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتے، اس اشاعت میں بھی تین بلند مرتبت ادیب و شاعر شرکت فرما رہے ہیں، یعنی محترمی ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زور قادری ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) محترمی سید احتشام حسین ایم۔ اے اور حضرتِ امجد حیدر آبادی، جن ادبا اور شعرا نے ابھی تک توجہ نہیں فرمائی ہے اُن سے پھر ملتجی ہوں کہ وہ اپنے تازہ مضامینِ نظم و نثر سے شاعر کو نوازیں اور اُسے زبان و ادب کا فقید المثال ماہنامہ بنا دیں۔

ایک گذارش سالِ نو کا نقشِ تازہ آپکے سامنے ہے جو گذشتہ اشاعتوں سے کہیں بہتر درجہ ہے ۱۹۴۱ء میں "شاعر" نے ادب و شعر کی جو خدمت کی ہے کا اعتراف نہ صرف ناظرین بلکہ مستند ادبا اور شعرا کو بھی ہے۔ سیکڑوں خطوط میں سے صرف محترمی سید احتشام حسین ایم۔ اے لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی کے تازہ نگارش نامہ کا ایک جملہ پیش کر دینا ہوں جس سے "شاعر" کے معیار و خدمت کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ موصوف تحریر فرماتے ہیں

"شاعر" سال بھر سے آرہا ہے اور ہر دفعہ کوئی نہ کوئی چیز ایسی لاتا ہے کہ اردو کے دوسرے رسائل میں نہیں ملتی۔"

اب ۱۹۴۲ء میں مختلف عنوانوں کے علاوہ تعداد کی مسلسل اشاعت اور حجم میں صفحات کا اضافہ یقیناً کثیر اخراجات کا باعث ہوگا۔ اس لئے ناظرین اس کی اشاعت میں فراخدلی سے حصہ لیکر اُسے زبان و ادب کی خدمت کا زیادہ سے زیادہ موقع دیں جو حضرات "شاعر" کو اپنے مقامی انجمنوں، لائبریریوں، اسکولوں اور علم دوستوں کو دکھائیے اور اُنھیں خریداری پر آمادہ کیجئے۔

اعجاز صدیقی

تجزیہ —— زیرِ نظر اشاعت کے بعض مضامین

ہندوستان کی فارسی شاعری اور اسکے علمبردار یہ مولانا درد کاکوروی کا ایک گرانقدر مقالہ ہے جس میں آپ نے فارسی شاعری کی تاریخ پر ایک اجمالی تبصرہ فرمایا ہے نیز بعض فارسی ادبا اور شعرا کے مختصر حالات و نمونہ کلام بھی دیا ہے آخر میں آپ نے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو مولوی حامد حسن صاحب قادری نے شیخ محمد زماں اور احمد خاں صوفی کے بعض اشعار پر کئے تھے۔ قادری صاحب کے اعتراضات اور مولانا درد کاکوروی کے جواب پر اہل الرائے طبقہ خود غور کر سکتا ہے

اُردو قصیدہ گوئی اور مرزا سودا۔ سودا کو قصیدہ گوئی میں جو امتیازی درجہ حاصل ہے اس مقالہ میں اس پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، مولانا آلم مظفر نگری نے فارسی اور اردو کے دیگر قصیدہ گو شعراء سے سودا کے قصائد کی خصوصیات کا موازنہ کر کے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ سودا قصیدہ گوئی میں اپنا مثیل نہیں رکھتے۔ یہ مقالہ بڑی کاوش اور دقتِ نظر سے لکھا گیا ہے۔ اس کے ضمنی مباحث بھی اپنی جگہ بہت اہم ہیں۔

اُردو کی موجودہ شاعری یہ حضرت مولانا احسن مارہروی مرحوم و مغفور کا بالکل آخری مقالہ ہے جو انھوں نے اپنی وفات سے کچھ دن پہلے کل ہند اُردو کانفرنس بریلی کے لئے لکھا تھا اور وہاں بنفسِ نفیس جا کر پڑھا بھی تھا۔ مرحوم کے صاحبزادے جناب سید احسن مارہروی نے بطورِ خاص یہ مقالہ "شاعر" کے لئے مرحمت فرمایا ہے، جس کے لئے میں اُن کا ممنون ہوں اس مقالہ میں مرحوم نے قدیم اُردو شاعری کو پُر لطف طریقہ پر سراہا ہے اور بعض باتیں بڑی کام کی تحریر فرمائی ہیں۔ رہا جدید و قدیم رنگِ شاعری کا اختلاف تو یہ ہمیشہ قائم رہیگا۔ بہر طور دونوں کے سراہنے اور پسند کرنے والے موجود ہیں

مرزا عبدالقادر بیدل ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زور قادری ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) کسی تعارف کے محتاج نہیں، موصوف اُردو کے جلیل القدر نقاد اور ادیب ہیں۔ یہ مختصر مقالہ آپ نے اپنی ایک زیرِ ترتیب تصنیف میں سے مرحمت فرمایا ہے جس سے مرزا عبدالقادر بیدل کی ادبی اور شاعرانہ زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

خطبۂ صدارت عالیجناب میجر نواب حافظ حاجی محمد جمشید علی خاں صاحب آف باغپت نہ صرف ادب نواز اور سخن فہم ہی ہیں بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کے نقاد اور [illegible] بھی ہیں۔ زیرِ نظر خطبۂ صدارت آپ نے خاص طور پر شاعر میں اشاعت کے لئے مرحمت فرمایا ہے۔ اس میں آپ نے اُردو شاعری اور شعر کی ماہیت و اہمیت نیز تنظیم و اصلاح کے متعلق جو لائحۂ عمل پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ بہت وقیع اور قابلِ غور ہے۔

مطرب کا انجام۔ یہ جناب مفتی گوہر شادانی کے سحر کار قلم کا لکھا ہوا ایک ڈرامہ ہے چونکہ یہ بہت طویل ہے اس لئے شاعر کی تین اشاعتوں میں شائع ہو سکے گا۔ نغمہ کی سحرکاری، محبت و نفرت کی کشمکش اور جبر و اختیار کی قوتوں کا مظاہرہ اور ان سب علاوہ مطرب کا انجام پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ساحر، دلوں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے غالباً گوہر صاحب نے بنگال میں رہ کر یہ جادوگری سیکھی ہے۔

افسانے۔ اس اشاعت میں جناب بشیر احمد قریشی گوالیاری کا افسانہ "دیوی" اور جناب بہار کوٹی کا افسانہ "مقدس گناہ" شائع ہو رہا ہے، دونوں افسانے اپنی جگہ بہت خوب ہیں "دیوی" ہندوستانی عورت کی فطرتِ وفا کا آئینہ دار اور "مقدس گناہ" محبت کی کرشمہ سازیوں کا نقشِ دلپسند ہے۔

عرفانِ جمال اصنافِ سخن میں مسدس، مخمس، ترجیع بند، ترکیب بند، رباعی غرض سب ہی کچھ ہے۔ اب حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی نے اختراع سے کام لیتے ہوئے اصنافِ سخن میں "تربیع" کا اضافہ فرمایا ہے، امید کہ شعرا اس کی تقلید فرمائیں گے "تربیع" کے سوز و اثر کے متعلق کچھ لکھنا سورج کو آئینہ دکھانا ہے۔

جنگ کا دیوتا اور شاعر مستغنیٰ داد نظم ہے۔ جنگی خونخوار شاہیوں پر تبصرۂ ساغر نکف اور اسیرِ دام گیسو شعرا پر جنگ کے دیوتا کا طنز اور رموز آگاہِ فطرت شاعر کا جواب جنابِ صبا متھراوی کے زورِ قلم اور ندرتِ تخیل کا نقشِ جاوید ہے۔

حضرت ماہر القادری۔ جناب حاجی نبی احمد بریلوی اور جناب روشن دکنی کی نظمیں اپنی اپنی جگہ بہترین اور اردو شاعری کا بلند معیاری نمونہ ہیں۔

اساتذہ اور مشاہیر شعرا کی غزلیں بھی اس نمبر میں بہ کثرت کافی موجود ہیں جنکا بیک وقت دوسری جگہ ملنا مشکل ہے حضرت مولانا آثر بدایونی۔ حضرت مولانا احسن مارہروی مرحوم۔ حضرت دل شاہجہانپوری۔ خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی۔ حضرت شاہد احمد حیدرآبادی۔ حضرت حیدر جنگ آبادی جناب احتشام حسین صاحب لکھنوی۔ جناب بخاری شری امام الدین صاحب شاد وغیرہ کی غزلیں نوازِ ارباب ذوق ہیں۔

اعجاز صدیقی

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

پھر ایک نئے دور کا آغاز ہوا
پھر بابِ عزائم و عمل باز ہوا
دی بزمِ جہاں نے دعوتِ نقد و نظر
پھر ذہن مرا مائلِ پرواز ہوا

جاری وہی چنگیز تابی ہے ہنوز
موجود فضا میں شعلہ تابی ہی ہنوز
آئی نہ کمی جذبۂ خوں ریزی میں
اے خاک ترا رنگ گلابی ہے ہنوز

اندھیر یہ ہے خلافِ دنیا کیسا!
دنیا نہ رہی تو اس پہ قبضہ کیسا!
انجام پہ کیوں نہیں نظر انساں کی؟
یہ آگ کی بارش میں اندھیرا کیسا!

اسبابِ تمرد تہ و بالا کر دو
انجام سپردِ حق تعالیٰ کر دو
شاید کچھ روشنی پڑے ظلمت پر
"مینارۂ مسیح" میں اجالا کر دو

کوئی درمانِ سرکشی ڈھونڈ کے لا
قوت پھر رودِ نیل کی ڈھونڈ کے لا
ہے اوج پہ عوج ابنِ عنق کی اولاد
اے مصر عصائے موسوی ڈھونڈ کے لا

اس جنگ میں کوئی سود و بہبود نہیں
مقصود بجز کوششِ بے سود نہیں
دے قوتِ آہنی کو لعنت پر گداز
کیا آج جہاں میں کوئی داؤد نہیں؟

رزمِ حرص و خودی ہے یہ جنگ نہیں
ہنگامۂ خودسری ہے یہ جنگ نہیں
اپنے ہاتھوں سے اپنی بربادی ہے
اک قسم کی خودکشی ہے یہ جنگ نہیں

فطرت پہ نظر خاطرِ آزاد رہے
اس کا بھی خیال اے ستم ایجاد رہے
توپوں کی گرج کو قولِ فیصل نہ سمجھ
فطرت ابھی خاموش ہے، یہ یاد رہے

جو لوگ محبت کے منافی ہوں گے
فطرت کی نظر میں اختلافی ہوں گے
کام آئیں گے ہنگامۂ باطل میں وہی
جو محفلِ ہستی میں اضافی ہوں گے

صحرا، نہ سمندر، نہ جبل جائیں گے
دنیا سے یہ سب کہاں نکل جائیں گے؟
ترمیم یہ ہوگی صفحۂ ہستی میں
بدلے ہوئے کچھ نقش بدل جائیں گے

سیماب

تحقیق و تصحیح

استفسار :-

الف (۱) پلادے ساقیٔ رنگیں وہ آفتاب مجھے
ہر ایک ذرّہ نظر آئے آفتاب مجھے

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں ایطائے صریح ہے یا نہیں، اس لئے کہ دونوں جگہ آفتاب قافیہ ہے

انور ایولوی

ب (۱) نگاہوں سے کسی کی سیکھ لے اندازِ خونریزی
اگر طرزِ جفا او خنجرِ قاتل نہیں ملتا

کیا طرز مذکر ہے ؟

نیر لکھمی۔ کرنول (مدراس)

ج (۱) دسمبر کے شاعر میں جناب آذر سرحدی نے مطلع میں "سمجھاؤنگا" اور "کھاؤنگا" قافیہ نظم کیا ہے اور اس کے بعد جاؤنگا۔ لاؤنگا وغیرہ کیا یہ درست ہے؟

ہلال رائے پوری از پالن پور گجرات

د (۱) جناب جلیل قدوائی بی۔ اے (علیگ)
آزاد ہے ہر قید سے پروازِ محبت
بیکار جلیل مذہبِ بال و پری کا

اس شعر کے دوسرے مصرع میں مذہب کا رُخ تقطیع سے خارج ہے یا نہیں؟

سید قاسم ناشاد

ہ (۱) آمد اور آورد میں کیا فرق ہے۔ آمد کا شعر اچھا ہوتا ہے یا آورد کا، دونوں میں سے اوّلیت کا درجہ کسے حاصل ہے ؟

قدیر احمد خاں۔ چکسانہ

جواب :-

الف (۱) مصرع اولیٰ میں "آفتاب" کے معنی چمکدار شراب کے لئے گئے ہیں۔ اور مصرع ثانی میں "آفتاب" اپنے حقیقی معنی دے رہا ہے، یعنی سورج یہ جائز ہے جیسے "بار" (بمعنی رسائی) اور بار (بمعنی پھل) اگرچہ باعتبار لفظ ایک ہیں مگر باعتبار معنی مختلف ہیں۔

ب (۱) طرز مونث ہی ہے۔ بعض لوگ مذکر بھی لکھتے ہیں لیکن یہ ایک بیجا تجاوز ہے، متقدمین اور متاخرین شعرا نے زیادہ تر مونث ہی استعمال کیا ہے

یہ جیتے جی کے جھگڑے ہیں اجل ہے تاک میں اک دن
نہ رنگ دوستی ہوگا نہ طرزِ دشمنی ہوگی
(تسلیم لکھنوی)۔

ج (۱) مطلع کے دونوں مصرعوں میں جس قسم کا قافیہ لایا گیا ہو اسی قسم کا قافیہ

پوری غزل میں لانا چاہیے مثلاً اگر مطلع میں "افسانہ" اور "پیمانہ" قوافی نظم کیے گئے ہیں تو پوری غزل میں دیوانہ۔ پروانہ۔ بیگانہ وغیرہ قوافی لکھنا اولیٰ ہے۔ ایمانہ۔ اچانہ قوافی معمولہ ہیں۔ یہ بھی از روئے فن جائز ہیں۔ آذر صاحب کی غزل میں بھی "۔انہ" کی قید ہونی چاہیے تھی۔

---

(۱) "عذر" کا عین تقطیع سے گر رہا ہے۔

---

۲ (۱) اس ذیل میں شعرا مختلف الخیال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آمد کا شعر اچھا ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ آورد کا شعر زود اثر ہوتا ہے۔ آمد اور آورد میں کسے اوّلیت حاصل ہے، اس میں بھی اختلاف ہے بعض لوگ اس شعر کو جو بیاختہ نظم ہو جائے آمد تصور کرتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، آورد کے بعد آمد پیدا ہوتی ہے۔ جب دماغ میں خیالات سامنے کے آتے ہیں اور مضامین معمولی ہوتے ہیں تو اُسے آورد کہتے ہیں اگر سامنے کے خیالات کو شاعر چھوڑتا چلا جائے تو اس کے بعد جو خیال شعر کا جامہ اختیار کریگا وہ زیادہ سوچا سمجھا ہوا اور پُر اثر ہوگا، اور اسی کا نام آمد ہے۔ مولانا حالی مقدمۂ شعر و شاعری میں فرماتے ہیں:—

"اکثر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ جو شعر شاعر کی زبان یا قلم سے فوراً بے ساختہ ٹپک پڑتا ہے وہ اس شعر سے زیادہ لطیف اور بامزہ ہوتا ہے جو بہت دیر میں غور و فکر کے بعد مرتب کیا گیا ہو پہلی صورت کا نام انھوں نے آمد رکھا ہے اور دوسری کا آورد۔ بعضے اس موقع پر یہ مثال دیتے ہیں کہ جو شیرہ انگور سے خود بخود ٹپکتا ہے وہ اس شیرہ سے زیادہ لطیف و بامزہ ہوتا ہے جو انگور سے نچوڑ کر نکالا جائے۔ مگر ہم اس رائے کو تسلیم نہیں کرتے جو شیرہ انگور سے خود بخود اس کے پک جانے کے بعد ٹپکتا ہے وہ یقیناً اُس شیرہ کی نسبت بہت دیر میں تیار ہوتا ہے جو کچے یا ادھ کچرے انگور سے نچوڑ کر نکالا جاتا ہے۔ مستثنیٰ حالتوں کے سوا ہمیشہ وہی شعر زیادہ لطیف، زیادہ بامزہ زیادہ سنجیدہ اور زیادہ مؤثر ہوتا ہے جو کمال غور و فکر کے بعد مرتب کیا گیا ہو۔"

بعد مولانا حالی نے مختلف شعرا کی شعر گوئی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ شعر کہنے کے بعد کس طرح اُسے سنوارتے تھے اور ایک ایک شعر میں کئی کئی دن صرف کر دیتے تب کہیں وہ شعر ہوتا تھا۔

اعجاز صدیقی

استفسارات

اساتذۂ فن، مستند ادبا اور شعرا اپنے مختصر جوابات زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ ماہِ رواں تک مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔ جوابات میں سنجیدگی اور سادگی کا خیال رکھا جائے۔

ایڈیٹر

الف (۱) "پہونچ" اور "پہنچ" میں کون سا لفظ صحیح ہے اس لفظ کو تحریر میں کس طرح لکھنا چاہیے۔

(۲) "آبشار" مذکر ہے، یا مؤنث۔ شعرائے قدیم و جدید کی اسناد درکار ہیں

(۳) جنابِ علی منظور حیدرآبادی کے مندرجۂ ذیل شعر میں ؎

کیا یاد مجھے آئے وہ گنجینۂ پرویز
تھا اہلِ بصیرت کی نگاہوں میں جو ناچیز

کیا "پرویز" اور "ناچیز" قوافی صحیح ہیں۔

(۴) ذوق اور شوق میں بیّن فرق کیا ہے۔ لغوی اعتبار سے دونوں قریب قریب ہم معنیٰ ہیں۔ شعرا اکثر ذوق کی جگہ شوق اور شوق کی جگہ ذوق نظم کر جاتے ہیں، ان الفاظ کے استعمال میں کس قسم کی احتیاط ہونی چاہیے۔

(۵) جنابِ اثر چکوالی بی۔ اے کے یہ دو شعر نومبر کے رسالہ "داستان" لاہور میں شائع ہوئے ہیں ؎

افلاک سے بلند کر ذوقِ نگاہ کو — ارض و سما کی رفعتوں پر مسکرا کے چھوڑ

کیا چھوڑا ہے

فرسودگی کی تُند کلائی مروڑ دے — ذہنوں پہ فکرِ تازہ کی مُہریں لگا کے چھوڑ

بلند کر کی "ر" اور تازہ کی "ہ" کیا تقطیع سے گرتی ہیں۔ تُند کلائی سے کیا مقصد ہے؟

خواجہ دردؔ اکبرآبادی (جھانسی)

مشاعرۂ شاعر بابت مارچ ۱۹۴۱ء

مصرعِ طرح

"شمعِ ایوانِ تصور کو فروزاں کر دو"

فروزاں۔ نمایاں وغیرہ قوافی۔ کر دو ردیف

عرفانِ جمال

(تضمین بصورتِ ترجیع)

کیا نیا کوئی اثر کم نگہی کا دیکھا
یا دلِ خوں شدۂ یاس چھلکتا دیکھا
نہیں معلوم نگاہوں میں یہ کیا دیکھا
آج پھر اُس نے بہ اندازِ گوارا دیکھا

اسے بیگانۂ خال و خدِ معنی دیکھا
اس نے باطن کا نہ اک روز نظارا دیکھا
ماسوا کا تو بڑے شوق سے جلوا دیکھا
آئینے نے کبھی اپنا بھی تماشا دیکھا؟

کوئی مرکز نہ تری جلوہ گری کا دیکھا
کی نظر دل پہ، نہ سیمائے سویدا دیکھا
طور دیکھا نہ ابھی عرصۂ سینا دیکھا
کیا میں گھر بیٹھے ہی کہدوں ترا جلوا دیکھا؟

جلوتیں حسن کی جادہ پسِ جادہ نکلیں
خلوتیں راز کی پردہ پسِ پردہ نکلیں
وسعتیں دشت کی جلوہ پسِ جلوہ نکلیں
دامنِ تنگ ہر اک ذرہ نے پھیلا دیکھا

ای تری ناوکِ پنہاں کا یہ اندازِ خراش!
کفِ موسیٰؑ میں تھا صرف اک یہی لاضو پاش
میرے جب دل کے اندھیرے میں کیا تجھ کو تلاش
اپنے ہر داغ کی لو میں یدِ بیضا دیکھا

راہ ایسی کوئی پرخار نہ ہوگی شاید
منزل ایسی کوئی دشوار نہ ہوگی شاید
وہ قیامت کی بھی رفتار نہ ہوگی شاید
ہم نے جو حال گذرگاہِ وفا کا دیکھا

اب تمہارا بھی نہیں حدِ تماشا میں گذر
اپنے ہی جلوے ہیں اور آپ ہی ہم جلوہ نگر
اب ہمیں اپنی ہی صورت میں ہے تسکینِ نظر
تم نے جلوہ نہ دکھانے کا نتیجا دیکھا؟

پہلے خود جلووں کو چھپ جانے کی فطرت دیدی
تنگ آئے تو نمائش کی اجازت دیدی
اَرِنی کہنے کی انسان کو جراءت دے دی
جب کسی طرح نہ امکانِ تجلا دیکھا

بےخودی ترک کرے وہم ہے عرفانِ جمال
ہے فقط بےخودیٔ شوق میں امکانِ جمال
چشمِ خود بیں کو نہ دیکھا کبھی شایانِ جمال
دلِ خود کام کو مردودِ تمنّا دیکھا

صرف بجلی تھی کہ تھا رنگ میں حُسنِ ترمیم
عشوہ و غمزہ و انداز کی تھی کیا تقسیم؟
کہئے کچھ جلوہ گہِ طور کی روداد کلیم
دیکھنا آپ کا تسلیم، مگر کیا دیکھا؟

کر دیا قیدِ تعیّن کے بکھیڑے میں تو کیا
ہمیں خود ڈال دیا آپ نے دھوکے میں تو کیا
حرم و دیر کھڑے کر دیئے رستے میں تو کیا
آنکھ اُٹھا کر بھی کسی سمت نہ دیکھا دیکھا؟

حسرتِ دید کا آنکھوں پہ اثر ہی نہ رہے
کون ہے ناظر و منظور، خبر ہی نہ رہے
ہے یہ تکمیلِ نظارہ کہ نظر ہی نہ رہے
دیکھنے کی وہی حسرت ہے تو پھر کیا دیکھا؟

پہلے اک ہمّتِ طوفان کُشا یاد آئی
پھر جو طوفان نہ سمٹا تو قضا یاد آئی
جب قضا آ گئی سر پر تو دُعا یاد آئی
ناخدا نے بھی خدا ہی کا سہارا دیکھا

لی جہاں تو نے اک انگڑائی وہیں ڈوب گئے
جب تجھے دیکھ کے موج آئی وہیں ڈوب گئے
جس جگہ تیری جھلک پائی وہیں ڈوب گئے
ہم نے قطرے پہ کیا غور نہ دریا دیکھا

پسِ آئینہ رہے، جیسے تجلّی و حجاب
ہم سے وابستہ رہی انجمنِ حُسن کی تاب
تجھ سے ہیں تابش و تزئینِ نظر اے سیماب
آئینہ خانوں میں اپنا ہی کرشما دیکھا

سیماب اکبرآبادی

ہندوستان کی فارسی شاعری اور اسکے علمبردار

آگرہ کے قدیم شاعر سنہ ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء سے اس مضمون کا تعلق ہے اور رسالہ شاعر بھی آگرے سے نکلتا ہے۔ فارسی کی ایک مثل ہے "قضیۂ زمین برسر زمین" اس لحاظ سے بھی یہ رسالہ شاعر میں اس کی اشاعت دلچسپی سے خالی نہیں۔

مولوی حامد حسن صاحب قادری موجودہ دور کے ایک اچھے ادیب ہیں صاحب موصوف کا ایک مضمون رسالہ عالمگیر کے سالنامے سنہ ۱۹۴۰ء میں اس سُرخی سے شایع ہوا تھا "آگرے کا قدیم شاعرہ" اس میں مولوی صاحب موصوف نے شاعرۂ مذکورہ کا تذکرہ فرماتے ہوئے ہندوستانی فارسی شاعری کی ابتدائی تاریخ پر بھی طائرانہ نظر ڈالی ہے اور اس کا ابتدائی دور یوں ظاہر فرمایا ہے۔

۱۔ فارسی نظم و نثر کا آغاز سنہ ۱۸۰ھ م سنہ ۲۰۰ھ

۲۔ سبکتگین کے حملۂ پنجاب کے بعد ہندوستان میں فارسی زبان کی اشاعت

۳۔ فارسی کتابوں کی تصنیف کی ابتدا (پہلی کتاب) کشف المحجوب سنہ ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء

۴۔ (ہندوستان کے سب سے پہلے فارسی شاعر) حضرت امیر خسروؒ متوفی سنہ ۷۲۶ھ / ۱۳۲۵ء

اس کے بعد فیضی، بیدل، ناصر علی، غنی، غنیمت اور مرزا غالب کے نام گنائے ہیں جنکی شخصیت کو ایک عالم معترف ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک نہایت وسیع مضمون ہے، افسوس ہے کہ ہندوستانی فارسی شعرا کی ابتک تاریخ مدون نہ ہوئی۔ اس سے زیادہ ہندوستان کی بدقسمتی کیا ہوگی کہ بڑے بڑے فارسی ادیب اٹھ گئے اور اُٹھتے جارہے ہیں کس کس کو روئیے جناب احسن مارہروی، جناب اقبال، جناب آزاد، جناب حالی، مولوی شبلی نعمانی، سب ہی چل بسے اور جو جاتے ہیں اپنی نظیر نہیں چھوڑتے مگر پھر بھی ہمارا ہندوستان خالی نہیں۔

غرض ہندوستانی فارسی شعرا کے تذکرے کی شدید ضرورت ہے اور میرا ناچیز خیال ہے کہ حسب ذیل حضرات اس خدمت کو بہترین طریقے سے انجام دے سکتے ہیں۔

مولانا سلیمان ندوی، مولانا اسلم جیراج پوری، مولانا سیماب اکبرآبادی، مولوی امیر احمد علوی (یہ وہ صاحب ہیں جن کا طرز تحریر مولانا شبلی کو پسند تھا اور اکثر فرماتے کہ ہماری شعر العجم کا کچھ حصہ لکھدو) مولوی تحوی صدیقی۔ مولوی حامد حسن صاحب قادری

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کا فارسی ادب ایران کی برابری نہیں کر سکتا تاہم ہندوستان نے فارسی ادب کی کچھ کم خدمت نہیں کی اور وہ فارسی ادیب پیدا کئے جن پر اہل فارس کو بھی رشک ہے۔

شاہجہاں بادشاہ کہا کرتا کہ "میں اپنی مملکت میں پورب کے قصبات پر فخر کرتا ہوں جنھوں نے بڑے بڑے فضلا پیدا کئے اور جنکا ہر قصبہ مردم خیزی کے اعتبار سے شیراز کا ہم پلہ ہے"

ہمارے ہندوستانی شعرا کے کارنامے انکا بہترین ثبوت ہیں کہ ہندی نژاد جس میدان میں آئے تو اپنی خداداد شیریں زبانی سے کہیں سعدیؔ و انوری ہوئے تو کہیں نظامی و جامی بنکر چمکے۔

مولانا اسلم جیراج پوری حیات جامی میں لکھتے ہیں کہ قاضی رُوم کہا کرتے تھے "جب سے سمرقند آباد ہوا کوئی ایسا ذہین اور طباع آدمی آجتک دریائے آموں کے اس پار نہیں آیا"

میں عرض کروں گا کہ ہندوستان کے باہر کے شعرا میں حضرت مولانا جامیؔ کے بعد سے متقدمین کے رنگ کا سا شیریں زبان آجتک کوئی شاعر ہی پیدا نہیں ہوا۔ جس کے کلام میں وہ حلاوت و شیرینی ہو جو حضرت مولانا رومؔ، سعدیؔ، نظامی وغیرہ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

آج سے بہت پہلے ہندوستان نے فارسی ذوق کو اس قدر دلچسپ اور اتنا عام کردیا تھا کہ مسلمان تو مسلمان ہمارے ہندو بھائیوں نے بھی اسمیں کافی سے زیادہ حصہ لیا اور ایسی دستگاہ حاصل کی کہ فارسی ادب میں وہ تقریباً اہل اسلام کے دوش بدوش نظر آرہے ہیں انکی بیش بہا تصانیف اس کا قوی ثبوت ہیں،

سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے فارسی کا مذاق گھٹتا گیا اور اتنا گھٹا کہ خود اہل اسلام جو فارسی زبان کے حامل تھے انھیں میں اب ہم فارسی زبان کا وہ جوہر نہیں پاتے

جس کو حقیقتاً علمی ذوق و شوق سے تعبیر کیا جاسکے اسی وجہ سے اُردو شاعری کا عنصر بھی خام رہتا ہے۔

خیر جو کچھ بھی ہو، ہم اپنے ہندو بھائیوں کے ذوق کو ہرگز۔ گز فراموش نہیں کر سکتے اور ہم اسے آسانی سے کس طرح بھلا سکتے ہیں جبکہ انھوں نے نہ صرف فارسی بلکہ اُردو زبان میں بھی ہمارا ہاتھ بٹایا ہے۔

ہندوستان کے فارسی شعرا میں سب سے پہلے حضرت امیر خسرو ہندوستان کی فارسی شاعری کے وہ درخشندہ آفتاب ہیں جو رشک سعدی و انوری کہے جاسکتے ہیں جن کی شاعری کو فارس والوں نے بھی تسلیم کر لیا۔ بلکہ صاحب آتشکدہ نے اُن کو خواہ مخواہ اپنایا ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ یہ ہندی نژاد تھے۔ (واللہ اعلم) اور اسی حیثیت سے مولوی حامد حسن صاحب قادری نے ان کا تذکرہ فرمایا ہے

حضرت خسرو سے لیکر حضرت غالب تک اور غالب کے بعد سے آج تک یوں تو بہت فارسی کہنے والے ہوئے ہیں لیکن صرف اُن چوٹی کے چند شعرا کا ہم تذکرہ کریں گے، جن کے کلام میں کوئی خاص بات ہے اور صحیح معنوں میں اہلِ زبان کی شان پائی جاتی ہے۔

غدر کے بعد سے اُردو زبان کی شاعری کچھ ایسی مقبول ہوئی کہ بہت سے شعرا نے فارسی میں غزل کہنا ہی چھوڑ دی، اس کا سبب یہ تھا کہ بعض حضرات نے یہ اعتراض شروع کر دیا کہ غیر زبان پر عبور مشکل ہے۔ اس لئے فارسی زبان میں شاعری کرنے سے کیا فائدہ۔ یہاں تک کہ بعض لوگ فارسی شاعری کو نظر حقارت سے دیکھنے لگے۔ گر خدا رحمت کرے حضرت اقبال پر کہ جب انھوں نے توجہ کی تو سب کی زبانیں بند ہوگئیں۔

اب ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں۔ مولوی حامد حسن صاحب قادری نے حضرت خسرو کے بعد فیضی کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر ہم حضرت خسرو ہی کے دوست اور ہم عصر کا تذکرہ زیادہ مناسب سمجھتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ فارسی ادب میں باکمال شعرا نے اتنا حصہ نہیں لیا جتنا صوفی شعرا کے ذریعہ اس میں اضافہ ہوا ہے۔

ہندوستانی فارسی کے چند زرین ادیب و شعرا کی فہرست مع نمونہ کلام

۱۔ حضرت امیر حسن بدایونی یا دہلوی صاحب دیوان ولادت ۶۵۳ھ وفات ۷۳۸ھ مزار بمقام قصبہ خلدآباد (ضلع اورنگ آباد دکن) ۔

اے تو بحسن بادشاہ بندہ نوازِ کیستی پردہ ما ہمی دری محرم رازِ کیستی

دل کند سجدہ باین طرز خرامیدنِ تو دیدہ صد شکر بجا آرد ازیں دیدنِ تو

ما بجانان زندہ می باشیم از جاں فارغیم خاکِ کوئش یافتیم از آبِ حیواں فارغیم

۲۔ شاہ محمد افضل الہ آبادی ثابت۔ صاحب دیوان — ولادت ۱۰۴۸ھ وفات ۱۱۲۴ھ ۔

قسم بہ مصحف گل عندلیب باغ توام برگ شمع کہ پروانہ چراغ توام

ہم چو گردے کہ بلند از اثر قافلہ شد داد بر باد فنا رفتن یاراں ما را

شمع افروختہ را کس نہ فروشد ثابت داغم دگری بازار ندارم چہ کنم

۳۔ سید عبد الجلیل بلگرامی واسطی ولادت ۱۰۷۱ھ وفات ۱۱۳۸ھ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

مژدہ اے دوستاں کہ در عالم نقد شد نسیہ بہار ارم

نونہال طرب بہ بار آمد گل فشاں گشت خاطر خرم

باغ از بس شگفتگی پر کرد ساغر گل نہ بادہ شبنم

۴۔ حضرت درد دہلوی صاحب دیوان وغیرہ ولادت ۱۱۳۳ھ وفات ۱۱۹۹ھ

چناں کشتہ حیرت گیستم من کہ چوں آتش از سوختن زیستم من

نہ شادم نہ محزوں نہ خاکم نہ گردوں نہ لفظم نہ مضموں نہ معنیستم من

بہ بالِ توہم بنازِ تخیل کہ ہستی گماں دارد و نیستم من

۵۔ حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی صاحب دیوان ولادت ۱۱۵۵ھ وفات ۱۲۵۰ھ ۔

عاشق با خبرم من نہ منم نہ من منم عارف با ہنرم من نہ منم نہ من منم

سوز دل و جگرم و حشت بزہ درمنم دانش بخیہ گرم من نہ منم نہ من منم

حسن دیگری شود در ہر نگاہم جلوہ گر می کند ہر دم تماشائے رخِ یارے دگر

۶۔ حضرت شاہ تراب علی قلندر کاکوروی صاحب دیوان وغیرہ ولادت ۱۱۸۱ھ وفات ۱۲۷۵ھ ۔

جاں بلب آمدم ز درد کردم از و دوا طلب
گفت اگر تو عاشقی صبر کن و رضا طلب

بر دلم ایں چنیں جفا کرد کہ کرد یار کرد
با من دل شدہ دغا کرد کہ کرد یار کرد

عشق دردیست کہ ہرگز نہ دوائے دارد
ہر کہ دارد دلِ پُر درد بلائے دارد

۷- مولوی غلام مینا ساحر کاکوروی صاحب کلیات نثر و نظم۔ اس کے علاوہ ان کے نثر کا ایک مجموعہ مثل رقعات بیدل بھی ہے ولادت سنہ ۱۱۹۵ھ وفات سنہ ۱۲۵۰ھ ؎

به تیغِ ادائے تو سری فروشم   بنوکِ سنانت جگری فروشم
اسیری ز پرواز گلزار بہتر   بکنجِ قفس بال و پری فروشم
ندارد سخن روز بازار ساحر   بیک جو متاعِ ہنری فروشم

۸- حضرت شہید امیٹھوی ولادت سنہ ۱۱۸۰ھ وفات سنہ ۱۲۹۶ھ صاحبِ دیوان ؎

بے لبِ لعلِ آں پری نوش نہ کنم شراب را   بر سرِ سنگ بشکنم ساغرِ آفتاب را
از رخِ پُر عرق کش در حجیں نقاب را   شب ز گلاب تر کن چادرِ ماہتاب را
کاش بباغِ خلد ہم ہمچو تو حور داشتے   طرۂ مشکِ ناب را نرگسِ نیم خواب را

۹- مولوی محی الدین خاں ذوق کاکوروی صاحب کلیاتِ فارسی۔ ان کو تاریخ نکالنے میں خاص ملکہ تھا انتقال سے پہلے "برخاستم" تاریخ کہی اور رحلت فرمائی۔ ولادت سنہ ۱۲۲۱ھ وفات سنہ ۱۳۰۳ھ ؎

بہ ہر خاکے کہ خونِ گرمِ بہاری می شود پیدا   کشایم سینہ ہر جا نالہ زاری می شود پیدا
برلبِ بام بعد جلوۂ مستانہ بیا   خلق را مائلِ خود کن بتِ فرزانہ بیا
[۱] پے نظارۂ ات ہر شب سرِ بامِ گردوں را   ز ہر سیارہ چشمے انتظاری می شود پیدا

۱۰- مولوی عبد الصمد یوسفی کاکوروی ناثر و ناظم ولادت سنہ ۱۲۲۸ھ وفات سنہ ۱۲۷۲ھ ؎

بدوشِ صبا می رسد بوئے یارے   چہ مرکب سبک تر چہ نازک سوارے
بدورِ فلک ہر یکے راست کارے   تو و بزمِ دشمن من و انتظارے
مخور اے پسر غم اگر یوسفی مُرد   کہ زو نیست در دہر الا مزارے

۱۱- مولوی امیر حسن خاں بسمل کاکوروی شاگرد ساحر۔ جن کے نام غالب کے دو رقعے بھی ہیں۔ صاحب دیوان و مصنف پنج گلبن بجواب پنج آہنگ۔ ولادت سنہ ۱۲۳۰ھ وفات سنہ ۱۲۶۳ھ

آہے زدیم برق شد و بر سما رسید   ایں دودِ دل نگر ز کجا تا کجا رسید
بدستم دادہ دستے دادہ رفتے عدو دستے   بچاکِ سینہ با آورد دستے در رفو دستے
ساقی آں جا نشستِ من و تست   مے و میکش ہمہ ستِ من و تست

[۱] یہ مصرع صحیح نقل نہیں ہوا۔ ایڈیٹر

۱۲- مولوی امیر رضا حسن کاکوروی صاحب تصانیف کثیرہ۔ ولادت سنہ ۱۲۴۶ھ وفات سنہ ۱۲۶۲ھ در عالمِ شباب ؎

مرگ اگر مردست گو پیشِ من آئے   تا در آغوشم بگیرم تنگ تنگ
من ز وے عمرے ستانم جاوداں   او ز من دلقے ستاند رنگ رنگ

۱۳- مولوی جعفر علی شیون کاکوروی مصنف سہ نثر جعفری بجواب سہ نثر ظہوری ولادت سنہ ۱۲۷۳ھ وفات سنہ ۱۳۱۵ھ۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

دلا گر ہم چو من رندانہ باشی   برنگِ شیونم مستانہ باشی

۱۴- حضرت شاہ ابو الحسن فرد پھلواروی (پٹنہ) سنہ ولادت و وفات نامعلوم ؎

بہ نیم قبلہ جز رویش نہ باشد   حریم کعبہ جز کویش نہ باشد
از جاں خیالِ آں قدِ رعنا نمی رود   نقشِ جمالِ او ز دل و جاں نمی رود
چشم امید تا شود بینا   آرزومند خاک پائے توام

۱۵- حضرت علامہ آزاد بلگرامی صاحب تصانیف کثیرہ ولادت سنہ ۱۱۱۶ھ وفات سنہ ۱۲۰۰ھ مزار بمقام خلد آباد (ضلع اورنگ آباد دکن) سرو آزاد میں جہاں سلیم و صائب کے توارد کی بحث ہے وہاں فرماتے ہیں ؎

شاہدِ معنی کہ باشد جامۂ لفظش کہن   نکتہ دانے گر حریرِ تازہ پوشاند خوش ست

انھوں نے قدسی کی مشہور غزل "جاں در بغل" پر جو غزل لکھی ہے اس کا مشہور شعر ہے ؎

روزِ قیامت ہر کسے در دست گیرد نامۂ   من نیز حاضر می شوم تصویرِ جاناں در بغل
باشد گلِ بہارِ سخن یادگارِ ما   ایں لعلِ بے بہاست چراغِ مزارِ ما

۱۶- حضرت شاہ عزیز اللہ صفی پوری صاحب تصانیف۔ سنہ ولادت و وفات نامعلوم ؎

دو عالم بکاکل گرفتار داری   بہ ہر موئے ز احسان سیہ کار داری
تو سرتا بپا رحمتی یا محمدؐ   نظر جانبِ ہر گنہگار داری
عزیز اللہ عجب کفر عشقش   نہاں در زیرِ خرقہ زنار داری

۱۷- حضرت شاہ احمد حسین شاہجہانپوری آحمد ولادت سنہ ۱۲۴۶ھ وفات سنہ ۱۳۲۶ھ لطیف سنی اور سوز و گداز جو ان کے کلام میں ہے ان کے ہمعصروں

...و نہیں۔ کہنا قوال انھیں کا تربیت یافتہ تھا اور سماع کی محفلوں میں ان کا
...کرنا تھا نمونہ کلام یہ ہے ؎

...یم دلستاں سوئے من از کوئی کسے | شد پُر سر در دپُر طرب جانِ من از بوی کسے
...جانِ من بیمار شد بیمار تر بادا | دگر دل از محبت ز رگشتہ زار تر بادا
...ہائے زخت عشاق شید ایکطرف | جان باز حسنِ شور خ اوو از ند غوغا یکطرف

اب رہے ان فارسی زبان کے شعرا کے کلام میں عہد بہ عہد ترقی یا تنزل
...کے لحاظ سے زبان کے مدارج ۔ تو یہ خود ایک مستقل مضمون ہے۔ مرزا قتیل نے ہندوستانی
...ی سے متاثر ہو کر نہر الفصاحت ایک رسالہ لکھا تھا جس سے ہندوستان کی فارسی
پر کافی روشنی پڑتی ہے جس کی تفصیل وقت اور موقع چاہتی ہے۔
مولوی حامد حسن صاحب قادری نے مشاعرہ ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء کی فارسی غزلوں
پر تنقید فرمائی اور دوسروں کو بھی دعوت دی ہے ، اس کے متعلق کچھ عرض ہے۔
شیخ محمد زماں المتخلص زماںؔ اور احمد خاں صوفیؔ کے جن اشعار پر اعتراض
ہے وہ یہ ہیں۔

نخل آتش باز یم کاں اندریں عالم زماں
خویشتن را سوخت از بہر تماشائے دگر (زماںؔ)

دست در دست رقیب و چیں با بروآشکار
تیغ بر من می زند بہر تماشائے دگر (صوفیؔ)

اعتراض یہ ہے کہ " اس میں دگر کا لفظ دوسرے کی تمنا کے لئے استعمال
کیا ہے اس لئے غلط ہے دوسری تمنا مراد ہو سکتی ہے نہ کہ دوسرے کی تمنا،
...فرماتے ہیں جب دوسرے شخص کے لئے بولتے ہیں تو صرف (دیگر یا دگر)
...ہیں بلکہ دیگرے یا دگرے کہتے ہیں بغیر " ے " کے مستعمل نہیں ہے "!
اس کے متعلق عرض ہے کہ اس میں کوئی ہرج نہیں ہندوستان کے
...کے شعرا نے بھی لفظ دگر اس طرح استعمال فرمایا ہے جس طرح زماںؔ اور
صوفیؔ نے اپنے اشعار میں نظم کیا ہے ۔ مولانا جامیؔ علیہ الرحمۃ کا شعر ملاحظہ ہو ؎

عیدست و دار د ہر کسے عزم تماشائے دگر
ما را نہ باشد غیر تو در دل تمنائے دگر

زیرِ بحث طرح میں مولانا جامیؔ کی غزل ہے مگر قافیہ دوسرا ہے
وہ شعر بھی سن لیجئے ؎

تا سماعِ قول مطرب داد پند من حکیم
گوش نمی آید کہ دارم گوش در پندِ دگر

دونوں جگہ دوسرے کی تمنا کے لئے دگر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ہلالیؔ بھی
ہندوستان کے نہیں ہیں فرماتے ہیں ؎

با من او کرد بہ یک بار تماشائے رخت
کہ دگر بار نباید بہ تماشائے دگر

دگر کو دیگرے کے معنوں میں استعمال کرنا غلط نہیں ہے۔ ہلالیؔ کی ایک غزل
میں ردیف ہی دگراں ہے اس غزل کا صرف ایک شعر سنئے ؎

گنجِ حسنِ دگراں را چہ کنم بے رخِ تو
من برائے تو خرابم نہ برائے دگراں

اس کے علاوہ " با غمِ ہجراں " صوفیؔ شاعر نے صحیح لکھا ہے بجائے از غمِ ہجراں
فارسی محاورے کے خلاف ہے۔ مثلاً اگر کوئی کہے میں نے سیب کے مربے سے
روٹی کھائی اس کو فارسی زبان میں اس طرح کہنا غلط ہوگا کہ " نان از مربائے سیب "
خوردم بلکہ نان با مربائے سیب کہنا صحیح ہوگا۔ اس لئے با غمِ ہجراں صحیح ہے
کہا جاتا ہے کہ غالبؔ کے بعد فارسی تراکیب کا استعمال ڈاکٹر سر اقبال کی بدعتِ حسنہ
ہے مگر یہ صحیح نہیں سر اقبال ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے یہ بہت بعد کے ہیں ان سے
پہلے مولانا محسن کاکوروی جو ۱۲۴۲ھ میں پیدا ہوئے ان کا کلام دیکھئے غالبؔ کی
طرح فارسی ترکیبوں سے بھرا پڑا ہے ان کے کلیات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے
صرف پانچ شعر سند میں پیش ہیں ؎

بیضاوی صبح کا بیاں ہے | تفسیر کتاب آسماں ہے
ہے خاتمۂ شبِ دل افروز | دیباچہ نگار نسخۂ روز
عنوانِ فلک ہے دُرِ منثور | لوحِ زرینِ سورۂ نور
معمورۂ دہر تابیاباں | ہم طالعِ کشورِ بدخشاں
گردوں کے غلاف میں ہے پنہاں
مشکوٰۃ شریف مہرِ تاباں

کیفِ تغزّل

فریاد کہ چھٹتا ہے ہم سے درِ میخانہ
لبریز خدا کردے اب زیست کا پیمانہ

مانوس ابھی دل سے ہے جلوۂ جانانہ
باطن میں جو کعبہ ہو ظاہر میں ہو بتخانہ

تقدیر سے ملتا ہے کوشش سے نہیں ملتا
یہ خلد نہیں واعظ مے خانہ ہے میخانہ

اب کیوں انھیں وحشت ہی ذکرِ غمِ فرقت سے
اب تک تو وہ کہتے تھے فرضی ہے یہ افسانہ

سرشارِ مئے وحدت یہ راز سمجھتے ہیں
سجدوں ہی کے قابل ہے سنگِ درِ میخانہ

دُنیائے محبت میں وحشت کے تسلط سے
ویران ہے آبادی آباد ہے ویرانہ

کہتے ہیں کہ مرنا ہی جینا ہے محبّت میں
یہ خط مجھے بھیجا ہے یا موت کا پروانہ

پھول اس میں بھی ملتا ہی گل اس میں بھی کھلتے ہیں
مے خانہ بھی گلشن ہے گلشن بھی ہے میخانہ

دل پھیرنے کو اُن سے کہیے تو وہ کہتے ہیں
واپس کبھی ہوتا ہے گزرا ہوا نذرانہ

سر جھکنے کو سجدے سے تعبیر نہ کر واعظ
آنکھوں سے لگاتا ہوں سنگِ درِ جانانہ

پیتے ہیں قمر لیکن اس حال میں پیتے ہیں
ٹوٹی ہوئی توبہ ہے ٹوٹا ہوا پیمانہ

قمر بدایونی

موجِ زنگار رنگ

سخن میں حل ہے خیالاتِ خاص و عام کا رنگ
کسی سے نبھ نہ سکے گا مرے کلام کا رنگ

کمال سوز دروں سے چڑھا دیا میں نے
ہر ایک شعر پہ شمشیرِ بے نیام کا رنگ

نہ دانہ ہائے تہِ دام، اور نہ حلقۂ دام
ہماری قید کا باعث تھا صرف دام کا رنگ

کسی نے کوششِ اخفائے جوشِ عشق جو کی
جبیں سے پھوٹ بہا نورِ صبح و شام کا رنگ

عزیز اہلِ نظر ہے شراب کی رنگت
پسندِ خاطرِ اہلِ ہوس ہے جام کا رنگ

اب اپنے ذوق کی اوروں کو داد دے ساقی
بدل گیا تری محفل کے انتظام کا رنگ

کلامِ وجد کے سب نکتہ چیں خموش ہوئے
کہیں نظر نہ پڑا جوشِ انتقام کا رنگ

سکندر علی وجد

ڈرامہ :-

مُطرب کا انجام

(جس کا کچھ حصّہ "مطربہ" کے عنوان سے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا)

افراد :-

نعمان
شاہد
توقیر
منیر
لیلیٰ

پہلا منظر

(وائلن کا ایک لطیف و نازک نغمہ بتدریج بلند ہو کر ختم ہوتا ہے)

(اور اسکے بعد بے شمار تالیوں کا شور سنائی دیتا ہے)

توقیر- دیکھا آپ نے مس لیلیٰ! کیا جواب ہے اس فن کا۔ جادو کرتا ہے یہ نعمان کمبخت

لیلیٰ- آپ سچ کہہ رہے ہیں مسٹر توقیر میں نے ایسا دلکش اور مبہوت کر دینے والا نغمہ اپنی زندگی میں کبھی نہیں سُنا حالانکہ مجھے موسیقی سے خود بڑی دلچسپی ہے اور سینکڑوں اچھے اچھے ساز بجانے والوں کو سُن چکی ہوں۔

توقیر- خوب! مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کو موسیقی کا اس قدر شوق ہے، غالباً آپ خود بھی وائلن بجاتی ہیں۔

لیلیٰ- جی ہاں کچھ تھوڑا بہت بجا ہی لیتی ہوں۔

توقیر- نعمان آپ سے مل کر بڑا خوش ہوگا، اگر اجازت دیں تو میں آپ سے اس کا تعارف کرا دوں۔

لیلیٰ- ہیں، میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھونگی۔

توقیر- (پکار کر) نعمان — نعمان — ذرا اِدھر آنا بھی

نعمان- (دور سے) ابھی آیا۔

لیلیٰ یہ تو آپ کے بڑے گہرے دوست معلوم ہوتے ہیں۔

توقیر- جی ہاں پُرانا دوست ہے۔ دراصل ہم دونوں اسکول میں اکٹھا پڑھتے تھے کالج میں بھی عرصہ تک ساتھ رہا۔ اُس نے پڑھا لکھا خاک نہیں البتہ اپنے اس شوق میں ترقی کرتے کرتے ہندوستان کے گوشہ گوشہ پر چھا گیا اور بچے بچے کی زبان پر اُس کا نام سُنائی دینے لگا

لیلیٰ- خوب تو آپ سے بھی یہ ملاقات گویا عرصہ کے بعد ہوئی

توقیر- جی ہاں، عرصے کے بعد گرفتار ہوا ہے ظالم۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ میرے اس کے تعلقات کیا ہیں تو اس کے سننے کا تقاضا ہوا۔ آج کا جلسہ اسی تقاضے کا نتیجہ سمجھیے۔ میری بڑی خوش نصیبی تھی کہ آپ یہاں موجود تھیں اور شاہد آپ کو کھینچ لایا۔

لیلیٰ- (ہنس کر) دراصل سچ پوچھئے تو شاہد کو میں کھینچ لائی اس نے تذکرہ تو کیا تھا کہ آپ کے ہاں نعمان صاحب آج وائلن بجائیں گے۔ میں اُن کی شہرت سُن چکی تھی۔ اس لئے نہ رہا گیا۔ شاہد سے اصرار کیا، اس بیچارے کو مجبوراً آنا ہی پڑا۔

توقیر- مجبوراً آنا پڑا — یہ میں نہیں مان سکتا، شاہد کو دُنیا میں دو چیزوں سے بڑی محبت ہے، ایک کرکٹ اور دوسری آپ۔ جب وہ کرکٹ کی باتیں نہیں کرتا تو آپ ہی کی کرتا ہے۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ آپ آنا چاہیں اور وہ پس و پیش کرے۔

لیلیٰ- (ہنس کر) آپ اِسے اچھی طرح نہیں جانتے مسٹر توقیر۔ بعض اوقات

وہ کرکٹ کو مجھ پر بھی ترجیح دے دیتا ہے اور آجکل تو وہ اس میں بیحد
مصروف ہے کیونکہ اس کی ٹیم عنقریب باہر والوں سے میچ کھیلنے کی تیاری
کر رہی ہے، لیجئے نعمان صاحب آ رہے ہیں۔

نعمان۔ کیا حکم ہے —— معاف کرنا، چند منٹ کی دیر ہوئی ہیں......

توقیر۔ (بات کاٹ کر) ان سے ملو، مس لیلیٰ چودھری۔ کلکتہ کے مشہور و
معروف رئیس اور سوداگر مسٹر رفیق چودھری کی اکلوتی صاحبزادی اور
میرے عزیز ترین دوست اور کرم فرما مسٹر شاہد کرکٹ چمپین کی منگیتر۔

نعمان۔ مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی، مس لیلیٰ۔

لیلیٰ۔ اور یقین جانئے میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتی ہوں۔

توقیر۔ مس لیلیٰ کو موسیقی میں بڑا دخل ہے۔ خوب گاتی ہیں اور وائلن بھی
بجاتی ہیں، آپ میری ہم خیال ہیں کہ اس فن میں آج تمہارا ثانی
ہندوستان تو کیا شاید یورپ بھی پیش نہ کر سکے۔

نعمان۔ (ہنستے ہوئے) تمہاری تعریف تو خیر میں سمجھ سکتا ہوں، ایک پرانے
دوست کا یہی فرض ہے، لیکن مس لیلیٰ کو اگر میرا وائلن بجانا واقعی پسند
آیا ہے تو یہ میری خوش نصیبی ہے۔

لیلیٰ۔ آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ مسٹر نعمان۔ میں واقعی عرض کر رہی تھی۔

نعمان۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔

لیلیٰ۔ مسٹر نعمان! میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ ایک دن غریب خانہ
پر تشریف لائیں۔ میں اسے اپنی عزت افزائی سمجھونگی۔

نعمان۔ میں ضرور حاضر ہونگا۔ بشرطیکہ آپ سے وائلن سننے کا فخر حاصل ہو سکے۔

لیلیٰ۔ (ہنستے ہوئے) ارے صاحب۔ میں کیا۔ میں تو بہت ہی معمولی بجاتی
ہوں لیکن اگر آپ آنے کا وعدہ کریں تو میں آپ کی یہ خواہش بھی
پوری کر دونگی۔

نعمان۔ مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔

لیلیٰ۔ تو پھر آپ کب آئیں گے؟

نعمان۔ جب آپ بلائیں۔

لیلیٰ۔ آپ کو فرصت کب ہو گی؟

نعمان۔ آپ کے یہاں آنے کے لئے مجھے ہر وقت فرصت ہے۔

لیلیٰ۔ بہت بہت شکریہ، تو پھر کل تشریف لایئے، کھانا بھی میرے ساتھ
کھائیگا۔

نعمان۔ اس تکلیف کی چنداں ضرورت نہیں۔

لیلیٰ۔ یہ کوئی تکلیف نہیں مسٹر نعمان۔ ہاں شاید آپ کو معلوم ہو۔ میں ابا
چچا کے ہاں ٹھہری ہوئی ہوں۔ نمبر سات سول لائن۔ آپ کو پہنچنے پر
کوئی دشواری تو نہ ہو گی۔

نعمان۔ میں ضرور حاضر ہوں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔

شاہد۔ (دور سے) لیلیٰ —— لیلیٰ ——

نعمان۔ آپ کو کوئی صاحب پکار رہے ہیں۔

لیلیٰ۔ جی ہاں میرے چچازاد بھائی شاہد ہیں۔

توقیر۔ اور منگیتر بھی ——

لیلیٰ۔ اوہ ——

(شاہد آتا ہے)

شاہد۔ یعنی آپ یہاں ہیں، میں جانے کہاں کہاں ڈھونڈھ آیا۔

لیلیٰ۔ اچھا خیر۔ آپ سے ملو —— میں نعمان صاحب سے تمہارا غائبانہ تعارف
کرا چکی ہوں۔

نعمان۔ میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا مسٹر شاہد

شاہد۔ مجھے بھی بہت خوشی ہوئی، ہاں تو لیلیٰ اب ہمیں چلنا چاہیئے۔
توقیر بھئی، اب ہمیں اجازت دو۔ لیلیٰ کا شوق پورا ہو گیا۔ انھوں نے نعمان
صاحب کو وائلن بجاتے سن لیا۔ گو مجھ سے پوچھو تو سبھی ایک ایسا بجاتے
ہیں۔ مسٹر نعمان میں کوئی خاص خوبی ——

لیلیٰ۔ شاہد —— شاہد ——

شاہد۔ اوہ میں معافی چاہتا ہوں۔ دراصل بات یہ ہے نعمان صاحب کہ مجھے
موسیقی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اب اگر آپ کرکٹ کے متعلق ——

توقیر۔ "خدا خیر کرے۔ شاہد کرکٹ پر تمہارے خیالات سننے کے لئے ہمارے
پاس بالکل وقت نہیں۔ میں تمھیں شوق سے رخصت کرتا ہوں۔

شاہد- بڑے ——— بڑے بد ذوق آدمی ہو تم- نہ جانے تمہیں پلیس کی
نوکری کیسے مل گئی- آجکل کرکٹ کا فلسفہ انسانی زندگی میں خاص اہم ———

توقیر- کرکٹ کا فلسفہ، معاذاللہ یہ کیا بلا ہے- مس لیلیٰ میں آپ سے درخواست
کرتا ہوں خدارا ہمیں اس ناگہانی مصیبت سے بچائیے۔

لیلیٰ- شاہد- توقیر صاحب پر رحم کرو اور اب چلو- نعمان صاحب بھی کرکٹ کے
کھیل پر تمہارا فلسفیانہ لکچر پھر کبھی سنیں گے۔

شاہد- مگر سنو تو ——— میں کہنا چاہتا تھا کہ عنقریب ہم لوگ باہر جارہے
ہیں اور اس کی تیاری میں کل مشق کے طور پر آپس میں ایک میچ کھیل
رہے ہیں- شاید نعمان صاحب آنا پسند کریں گے- میچ کیٹس ہوگا اور

لیلیٰ- وہ نہیں آسکیں گے۔

شاہد- کیوں- آخر کیوں نہیں آسکیں گے؟

لیلیٰ- وہ کل دوپہر کو مجھ سے ملنے آرہے ہیں۔

شاہد- اوہ۔

لیلیٰ- ہاں اور ظاہر ہے کہ ایک وقت میں وہ دونوں جگہ موجود نہیں ہوسکتے
آداب عرض ہے نعمان صاحب میں کل آپ کی منتظر رہوں گی۔

نعمان- میں ضرور حاضر ہوں گا مس لیلیٰ- آداب ——— آداب
مسٹر شاہد-

شاہد- اوہ ——— ہاں ——— آ ——— آ ——— آداب۔

(دونوں جاتے ہیں)

نعمان- (قہقہہ لگا کر) بڑا دلچسپ انسان معلوم ہوتا ہے، مس لیلیٰ کا منگیتر-
کیوں؟

توقیر- ہاں- مگر بڑا سرپھرا بھی ہے- خاصکر مس لیلیٰ کے معاملہ میں۔

نعمان- (ہنستے ہوئے) اوہ تمہیں اس کا خوف نہ کرنا چاہئے- گو لڑکی بڑی خوبصورت
اور باذاق ہے۔

توقیر- یعنی؟

نعمان- (ہنس کر) میں معافی چاہتا ہوں- تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں اس
دور سے عرصہ ہوا گذر چکا

توقیر- محبت کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں نعمان صاحب۔

نعمان- شاید تم ٹھیک کہتے ہو- مگر اپنے کمزور پہلو کو انسان خود بہتر سمجھتا ہے،
چلو تمہارے دوسرے مہمان انتظار کر رہے ہیں- میرا خیال ہے کہ
مجھے ان سے ملنا بھی ضروری ہے- گو مس لیلیٰ کی تعریف سن لینے کے
بعد ———

توقیر- جی ہاں کسی اور سے کچھ سننے کو دل کیوں چاہے گا مگر کیا کیا جائے
اخلاق بھی دنیا میں کوئی چیز ہے۔

نعمان- بیشک- بیشک ——— چلئے میں اپنے عزیز ترین دوست
کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار ہوں۔

(دونوں جاتے ہیں)

دوسرا منظر

(لیلیٰ کا سنگھار خانہ- اس کے گنگنانے کی آواز)

{ کچھ دیر بعد- دروازہ بند کرنے کی آواز پھر سیڑھیوں
سے نیچے اترنے کی آواز آتی ہے }

شاہد- لیلیٰ-

لیلیٰ- کیوں شاہد

شاہد- کہاں جا رہی ہو؟

لیلیٰ- کہیں ——— کہیں بھی نہیں۔

شاہد- مگر تیار تو اس طرح ہو رہی ہو جیسے کہیں جانا ہے

لیلیٰ- ہاں، نعمان صاحب نے پارک میں ملنے کو کہا ہے- شاید سنیما جانا پڑے
اس لئے میں نے کپڑے تبدیل کر لئے ہیں۔

شاہد- مگر میں تم سے اس سلسلہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

لیلیٰ- کہو نا کیا کوئی خاص بات ہے؟

شاہد- آجکل نعمان سے تمہارا ملنا جلنا بہت بڑھ گیا ہے- ہر طرف چہ میگوئیاں
ہو رہی ہیں- اگر یہ بات ابا جان کے کان تک پہنچ گئی تو بہت برا ہوگا

لیلیٰ - کیا مطلب تمہارا۔

شاہد - اس میں ——— اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ——— وہ تمہاری طبیعت سے واقف ہیں۔ تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں لیکن پھر بھی احتیاط ———

لیلیٰ تم میرے اور نعمان کے متعلق کیا سمجھتے ہو۔

شاہد - میرا خیال ہے کہ وہ چونکہ ایک مشہور مطرب ہے اور تمہیں موسیقی سے بڑی دلچسپی ہے اس لئے تم اس سے ملتی ہو اور یہی اس دوستی کی بنا ہے ورنہ ———

لیلیٰ - میں تمہاری بے حد ممنون ہوں شاہد کہ تم میرے متعلق کوئی اور خیال نہیں رکھتے۔

شاہد - مجھے اس کا پورا یقین ہے لیلیٰ۔ لیکن تم دنیا والوں کی زبان بند تو نہیں کر سکتیں ... چند دیکھنے والے کیا کیا کہتے ہیں۔ اس لئے اگر مناسب سمجھو تو نعمان سے ملنا جلنا کسی قدر کم کردو۔ یہ ہر وقت کا ساتھ اچھا نہیں ہے۔

لیلیٰ میں آئندہ اس کا خیال رکھوں گی شاہد۔

(جاتی ہے)

(موٹر کے روانہ ہونے اور بازار کے شور و غل میں گم ہونے کی آواز پھر اس کے رکنے کی آواز)

نعمان - مس لیلیٰ آپ تشریف لے آئیں۔

لیلیٰ - جی ہاں، زیادہ دیر تو نہیں ہوئی، آپ کو انتظار کی زحمت تو نہیں اٹھانی پڑی۔

نعمان - آپ بیشک ٹھیک وقت پر پہنچی ہیں، مس لیلیٰ لیکن افسوس کہ اس پر بھی مجھے انتظار کی زحمت اٹھانی ہی پڑی۔

لیلیٰ یہ کس طرح؟

نعمان یہ جانتے ہوئے کہ آپ ٹھیک چھ بجے تشریف لائینگی میں ایک گھنٹہ قبل ہی آپ کا انتظار کر رہا تھا۔

لیلیٰ - میں بہت ممنون ہوں - در اصل اس کی کوئی ضرورت نہ تھی

نعمان جی ہاں، میں جانتا ہوں مس لیلیٰ کہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر میں باوجود کوشش کے اس غلط فہمی کو دور نہ کر سکا کہ کوئی غیبی طاقت کوئی نامعلوم جذبہ آپ کو وقت مقررہ سے ایک گھنٹہ پہلے یہاں کھینچ لائیگا۔

لیلیٰ - میں ——— میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

نعمان - مس لیلیٰ۔ میں اپنی اس مختصر، غیر دلچسپ زندگی میں بہت سی حسین، جوان، تعلیم یافتہ، باذوق عورتوں سے ملا ہوں۔ اُن سے میں نے دوستی بھی پیدا کی۔ مراسم بھی بڑھائے، لیکن اُن کی موجودگی میں ایسا لطف ایسا کیف اور ایسی تسکین نہیں پائی جو میں آپ کی موجودگی میں آپ کو سامنے پاکر محسوس کرتا ہوں۔ نہ جانے یہ کیا بات ہے۔ آپ میں ایسا کون سا جادو ہے، ایسی کونسی کشش ہے۔

لیلیٰ - مسٹر نعمان!

نعمان - مس لیلیٰ!

لیلیٰ - برائے مہربانی آپ مجھ سے ایسی باتیں نہ کریں۔

نعمان - کوئی خاص وجہ؟

لیلیٰ - میں انھیں پسند نہیں کرتی۔

نعمان - مگر یہ ایک حقیقت ہے لیلیٰ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں، تم میرے دل پر قابض ہو چکی ہو، میری روح میں سما گئی ہو، میں تمہیں نہیں بھول سکتا

لیلیٰ - مسٹر نعمان مجھے افسوس ہے کہ میں ایک غلط فہمی کا شکار ہو گئی اور یہ سمجھ بیٹھی کہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان صرف دوستی بھی قائم رہ سکتی ہے۔ بہر حال آج کی یہ ملاقات آخری سمجھئے۔ اس کے بعد میں آپ سے نہ مل سکوں گی۔

نعمان - تم ——— تم خفا ہو گئیں لیلیٰ۔

لیلیٰ - جی نہیں، مگر مجھے کچھ مایوسی ضرور ہوئی۔ بہر حال میں اسے جلد بھول جاؤنگی، خدا حافظ۔

(جانا چاہتی ہے)

نعمان - لیلیٰ سنو، ٹھہرو ——— مجھے معاف کردو لیلیٰ، مجھ سے قصور ہوا

لیلیٰ - (رک کر) قصور ہرگز نہیں، آپ اپنی مرضی کے مختار ہیں، جو دل میں آئے زبان پر لاسکتے ہیں۔ آپ کو مجھ سے محبت کرنے کا حق بھی حاصل ہے لیکن میں بھی آپ سے یہ کہنے کا اختیار رکھتی ہوں کہ مجھے آپ سے بالکل محبت نہیں۔ میں آپ سے صرف اس لئے ملتی تھی کہ آپ موسیقی کے استاد ہیں

اور میں اس فن کی دیوانی۔

ن- لیکن، لیلیٰ۔ شاید تم اس محبت کو نہیں سمجھ سکتیں۔ برسات کے زمانے میں دریا کی سیلابی کیفیت کو کبھی دیکھا ہے؟ میرے دل کی بھی یہی حالت ہے، عورت کے معاملہ میں میں اپنے کو جذبات سے خالی، ایک بے جان بے حس انسان سمجھتا تھا۔ میں نے اپنی تمام امیدیں اور تمام امنگیں، پورا ——— ہاں پورا احساسِ محبت لکڑی کے اس بے جان ٹکڑے کی نذر کر دیا تھا جسے تم وائلن کہتی ہو وہی میری محبوبہ تھی، وہی میری دیوی۔ میں اس کی پرستش کرتا تھا، اس کے تاروں کو چھیڑتے وقت مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی حسین عورت کی زلفوں سے کھیل رہا ہوں اس کے ہونٹوں سے ہوا میں اڑتے ہوئے نغموں کو سن کر یہ سمجھتا تھا کہ کوئی دوشیزہ فضا کی آغوش میں پھول بکھیر رہی ہے۔ لیکن تمھیں دیکھ کر تمہاری باتیں سن کر میں یہ سب کچھ بھول گیا۔ اس کی جھنکار سے ترنم اڑ گیا۔ اس کا جسم بے جان، سرد۔ بے روح معلوم ہونے لگا۔ اس کے نغمے تمہارے قہقہوں نے چرا لیے۔ اس کے گیت تمہاری باتوں میں سمٹ آئے ——— لیلیٰ میری جان موسیقی تھی اور اب میں اسے تم میں پاتا ہوں۔ میری روح شاعری تھی اور اسے اب میں تم میں دیکھتا ہوں، آہ! میں تمہارا بن گیا ہوں، میرا دل تمہارا ہو گیا ہے۔

لیلیٰ - افسوس ہے میں آپ کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی تسلیم۔

ن- لیلیٰ۔

ل- مس چودھری کہیے مسٹر نعمان

ن- اوہ میں اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔

ل- آداب!

(جاتی ہے)

ن- آداب ——— آداب، لیلیٰ تم ابھی تک مرد کی محبت اور اس محبت کی طوفان برپا کرنے والی شدت سے واقف نہیں ہو تمھیں واقف ہونا پڑیگا۔

(ایک مجنونانہ قہقہہ)

تیسرا منظر

(شاہد اور منیر کے دروازہ کھول کر داخل ہونے کی آواز آتی ہے)

شاہد- میں نہیں جا سکتا، آخر اس ضد سے کیا حاصل منیر۔

منیر- مگر سنو تو، ان لوگوں نے خاص طور پر تمہارے لئے لکھا ہے اگر تم نہ گئے تو ———

شاہد- وہ لوگ ——— وہ لوگ گئے جہنم میں اور ساتھ تم اور ——— اور تمہاری پوری ٹیم۔ سمجھے۔ میں نہیں جاؤنگا۔

منیر- مگر اس کی کوئی وجہ بھی؟

شاہد- وجہ؟ ——— میں ——— میری ——— طبیعت ٹھیک نہیں۔

منیر- کیا کہا؟۔

شاہد- میری ——— میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

منیر- بکتے ہو۔ تم سے زیادہ تندرست، صحت مند انسان پورے شہر بھر میں نظر نہیں پڑتا، آخر تمھیں بیماری کیا ہے؟

شاہد کھانسی کی شکایت ہے۔

منیر- ہیں، اتنی سی بات،

شاہد- بخار بھی رہتا ہے۔

منیر- دیکھوں نبض۔

شاہد- تم کیا جانو ——— نبض دیکھنا اور ——— اور پھر یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس وقت بھی ہو۔

منیر- میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو

شاہد- مجھے بالکل فرصت نہیں۔

منیر- شاہد تم بہانہ کر رہے ہو۔ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔

شاہد- منیر یقین جانو، میں تمھیں دھوکہ نہیں دے رہا ہوں، خدا جانتا ہے میں تمہارے ساتھ چلنے کو کسقدر بیتاب ہوں، لیکن ——— میں ——— میں نہیں جا سکتا منیر۔

(باقی - باقی)

گوہر شادانی

جنگ کا دیوتا اور شاعر

جنگ کا دیوتا

غیب کی آواز ہے در پردۂ الہام سن
اے محبت کے پیامی سن مرا پیغام سن

زندگی ابھری ہیں جس میں تیری شعری قوتیں
لے رہی ہے اب سہارے سے اجل کے کروٹیں
جلوہ گاہِ زیست میں تاریکیاں ہیں موت کی
گرمیٔ غم سے بھڑک اٹھی ہے نعشِ سرخوشی
رفعتوں پر عرش کی ہے خود پرستی کا دماغ
آندھیوں کی زد میں ہے عرفانِ ہستی کا چراغ
آدمیت رو رہی ہے آدمیت کے لئے
ہو رہے ہیں مشتعل تہذیبِ حاضر کے دئیے
بے کسوں کا بن رہا ہے ہر قدم پر اب مزار
بربریت اور عصبیت کی ہے دنیا شکار
وسعتیں ہوتے ہوئے بھی تنگ ہے ساری زمیں
زندگی کو پاؤں پھیلانے کی گنجائش نہیں
تجھ کو اب بھی کر رہی ہیں کیا خراب سرخوشی
شعریت کی دیویاں انگڑائیاں لیتی ہوئی؟
کیا نظر کے میکدے سے اب بھی پیتا ہے شراب
تیری فکرِ شعریت پرور کا دیوانہ شباب؟
ہو رہی ہے اب بھی کیا موجِ تبسم پر نثار
تیرے گلزارِ تخیل کی شباب افزا بہار
گیسوؤں کے دام میں اب بھی رہیگا کیا اسیر
طائرِ تخیل تیرا عرش سیر و عرش گیر
کیا رہے گی اب بھی محدودِ شبِ انجمن
تیری معراجِ تخیل سیرِ پروازِ سخن

بزمِ عشرت سے نکل اندیشۂ انجام کر
آمرے ہمراہ آ، اعلانِ جنگِ عام کر

لے کر آیا ہوں میں اپنے ساتھ خونی آندھیاں
گوشے گوشے میں چلینگی خون کی پچکاریاں
میری پھونکوں سے اڑینگے ظلم کے سنگیں پہاڑ
داب دیگی شورشیں میری گرج میری دھاڑ
ذرے ذرے کو بنا دوں گا میں سرگرمِ ستیز
میری آنکھیں ہو رہی ہیں شعلہ ریز و شعلہ خیز
میں ہواؤں میں اڑ رہا ہوں لیکے تختِ آتشیں
میں سمندر میں رواں ہوں شکلِ طشتِ آتشیں
میں ہوا کے دوش پر پرسوز شعلہ زار ہوں
آگ پانی میں لگاتا ہوں کرشمہ کار ہوں
میری نظروں سے عیاں ہیں انقلاباتِ حیات
میں پلٹ کر ہی یہ چھوڑوں گا اساسِ کائنات

میری آمد کشت و خوں ہے میری رخصت سرخوشی — آگے آگے موت میرے پیچھے پیچھے زندگی

محفلِ رنگینیٔ عالم کو پھر بے رنگ کر
آج شاعر تو بھی میری طرح عزمِ جنگ کر

شاعر:—

رحمتیں تیرے غضب پر تیرے غصہ کو سلام
اے جدل کے دیوتا میں نے سنا تیرا پیام

میں ہوں صرف سرخوشی یہ ہے غلط تیرا خیال — میری نظروں میں بھی ہے دنیا کا احساسِ زوال
جانتا ہوں جو مزاجِ دہر کے ہیں حادثات — دیکھتا رہتا ہوں میں بھی زیرِ نبضِ کائنات
انقلابِ عالمِ امکاں سے بیگانہ نہیں — میں سمجھتا ہوں رموزِ زیست دیوانہ نہیں
گردشِ دورِ زماں کا راز داں رہتا ہوں میں — حادثاتِ زندگی کا ترجماں رہتا ہوں میں
ایک خوش لہجہ مفسّر ہوں کتابِ زیست کا — ایک ندرت زا مصوّر ہوں شبابِ زیست کا
قہرمانی قوتوں کو میں بھی کرتا ہوں تباہ — بربریت کا عدو ہوں آشتی کا خیر خواہ
حجلۂ عشرت میں میں بھی چاہتا ہوں انقلاب — غمزدوں کو میں بھی کرنا چاہتا ہوں کامیاب
کشمکش ہائے وبالِ زیست سے میں بھی ہوں تنگ — رزم گاہِ زندگی میں میری بھی جاری ہے جنگ

ہے مگر میرے ترے ضبطِ عمل میں امتیاز
تو سراپا ہے تکبّر، میں مجسّم ہوں نیاز

کیش تیرا کشت و خوں، میرا عمل امن و اماں — جسم پر قابض ہے تو، میں ہوں دلوں پر حکمراں
پھونکتا ہے آگ تو آتش فشاں بارود سے — میں اڑاتا ہوں شررِ سوزِ دل کے دود سے
تجھ کو ہے جنگی جہازوں کی جہاں میں احتیاج — اور بساطِ گرمیٔ افکار پر ہے میرا راج
موجبِ تحلیلِ جسم و جاں ہیں گر گیسیں تری — مضطرب کرتی ہیں روح و قلب کو آہیں مری
ہے جہاں کی مادی چیزوں پہ تیرا اختیار — سر بسر روحانیت کا مجھ کو حاصل ہے وقار

تو گرج کر دے رہا ہے کیا پیامِ انقلاب — تجھ سے پہلے کر چکا ہوں اہتمامِ انقلاب

کچھ ہی دن میں تیرا زعمِ آتشیں مٹ جائیگا
میرا نغمہ حشر تک دنیا کے دل گرمائیگا

صبا متھراوی

اُردو قصیدہ گوئی اور مرزا سوداؔ

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ اُردو شاعری داخلاً اور خارجاً **فارسی شاعری** کا نقشِ ثانی ہے اس میں جو کچھ بھی ہے وہ سب فارسی کی تقلید سے وجود میں آیا، چنانچہ دیگر اصنافِ سخن کی طرح اُردو قصیدہ بھی سراسر فارسی قصیدے کی تقلیدِ بے جا کا نمونہ ہے، متقدمین شعرائے اُردو اوّل اوّل غزل گوئی کی طرف مائل ہوئے انھوں نے فارسی شعرا کی طرح اپنی شاعری کی ابتدا قصیدے سے نہیں کی جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سلاطین و امرا کے دربار سے علاقہ نہیں رکھتے تھے، ظاہر ہے کہ جو کام فطری ازواق و امیال کے تقاضے کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ اس میں انسان استغراق و فنائیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے، متقدمین شعرائے اُردو کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اشعار میں بے پناہ اثر کی بجلیاں پوشیدہ ہیں، اُن کے دلوں میں ایک دریائے آتش موجزن نظر آتا ہے جس کی موجیں زبان پر آکر شعر بن جاتی ہیں اور سننے والوں کے دلوں کو گرما دیتی ہیں۔

میرؔ و سوداؔ سے پہلے غزل گوئی کا عام رواج تھا، قصیدے کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی جس کی وجہ وہی امرا کے دربار سے بےتعلقی اور آزادروشی تھی اور کسی نے کچھ بطور قصیدہ کہا بھی تو گویا وہ نہ کہنے کے برابر تھا خود میرؔ تقی کا قصیدہ فارسی قصائد کی خصوصیات سے اتنا بعید ہے کہ وہ سراسر غزل معلوم ہوتا ہے۔ صرف مرزا سوداؔ ایک ایسے شخص ہیں جنھوں نے اُردو میں سب سے پہلے فارسی کی پوری پوری تقلید کرتے ہوئے قصائد کہے جو واقعی قابل اعتنا ہیں، انکے قصائد میں فارسی قصیدے کی خصوصیات داخلاً و خارجاً بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اور انھوں نے اس صنف کو اتنا بلند کیا ہے کہ اُردو شعرا میں سے کوئی ایک بھی ان کی پوری پوری تقلید نہ کر سکا اس لئے وہ اُردو شاعری میں قصیدہ گو کی حیثیت سے پہلے اور آخری شاعر ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ شیخ ابراہیم ذوقؔ سوداؔ کے بعد دوسرے درجہ کے قصیدہ گو ہیں اور اُن کے قصائد سوداؔ کی تقلید کا بہتر نمونہ ہیں بلکہ بعض جگہ وہ سوداؔ سے بھی بلند نظر آتے ہیں، یہ خیال دونوں شاعروں کے قصائد پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے پیدا ہو سکتا ہے، لیکن جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے کہا جا سکتا ہے کہ ذوقؔ نے سوداؔ کی پوری پوری تقلید نہیں کی، انکے قصائد میں ایک دوسرا عالم نظر آتا ہے وہ صحیح طور پر سوداؔ کے حریف نہیں؛

یہاں یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالبؔ نے جو اُردو میں دو تین[۲] قصیدے کہے ہیں وہ بھی مرزا سوداؔ کی یا فارسی شعرا کی تقلید میں نہیں کہے گئے بلکہ انھوں نے اپنی جدت آفریں ذہنیت اور قادر الکلامی کا مظاہرہ کرنے کے لئے ایک نئی راہ اختیار کی ہے، مرزا غالبؔ نظرتاً کسی کی تقلید گوارا نہیں کرتے تھے، انھوں نے مرزا سوداؔ کے قصائد کا مرتبہ دیکھکر اس طرف رُخ نہیں کیا بلکہ اُردو میں اور ایک نیا اسلوب بیان اختیار کیا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ چنانچہ اُن کے یہ قصائد

صبح دم دروازۂ خاور کھلا مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا

ہاں مہِ نو سُنیں ہم اُس کا نام جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

اُردو زبان کا تو ذکر ہی کیا فارسی میں بھی اپنے مخصوص انداز کی وجہ سے جواب نہیں رکھتے بہرحال مرزا سوداؔ کے طرز سے یہ چیز بالکل علیحدہ ہے۔

فارسی میں قصیدہ گوئی کے تین دور ہیں متقدمین، متوسطین اور متاخرین امیر معزی، انوری، ظہیر، سلمان ساوجی، خاقانی اور کمال اسماعیل قدما میں شمار ہوتے ہیں۔ ابوالفرج رونی، عبدالواسع جبلی، ازرقی اور رشید الدین وطواط وغیرہ متوسطین ہیں، سلاطین صفویہ کے زمانے سے متاخرین کا دور شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اس دور میں حسین ثنائی۔ محتشم کاشی۔ سنجر کاشانی، عرفی، طالب آملی اور محمد جان قدسی بہت مشہور ہیں۔ قدسی کو شاہجہان نے ایک قصیدے کے صلے میں چاندی میں تلوایا تھا اور ایک قصیدے پر سات مرتبہ جواہرات سے مُنہ بھر گیا تھا۔

دورِ متاخرین میں عرفی نے قصیدہ کو بڑی ترقی دی، چنانچہ اس کا زورِ کلام

خاقانی کو بھی دباتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مرزا سودا کا کلام بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے قصائد میں اگرچہ عام طور پر شعرائے متاخرین فارس کی تقلید کی ہے۔ لیکن زیادہ تر عرفی کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کی ہے ان کے تمام قصائد میں عرفی کا رنگ جھلکتا ہے، زور کلام عرفی کا عام جوہر ہے چنانچہ کہتا ہے:۔

آہنیں پنجۂ تیغش بہ جبل گفت کہ من	موج بر موج شکستم چو بہ عمان رفتم

چمن آید بہ چمن بہر تماشائے جمال	بلبل آید بر بلبل بہ تمنائے غزل

اگر بہ صحن چمن فی التل شجاعت او	دہد نہیب کہ ہیں یاسمن ہاں نرگس
چو عکس لالہ زند یاسمن در آب آتش	چو شاخ بید کشا خنجر از میاں نرگس

اس کے مقابلے میں مرزا سودا کے زور کلام کی مثالیں دیکھئے:۔

غضب کے پنجے سے جسکے بہ رنگ دانہ ٔ تنک	نہ آسمان کی ہو جائے تار تار گرہ
ثبات چرخ یہ اسکے نہیب کے آگے	کہ جوں حبوبیں کی نہیں رکھتی اعتبار گرہ
جو اسکے عدل میں خس سنہ موج کے آجائے	تو ہو سرٹ کے وہیں بحر بے کنار گرہ

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل	تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل
بخشتی ہے گل نورستہ کی رنگ آمیزی	پوشش جیت قلمکار بہر دشت و جبل
فیض تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے	شہد ٹپکے جو لگے نشتر زنبور عسل

جدت استعارات، ترکیب الفاظ، مضامین کا تسلسل اور نازک خیالی و مضمون آفرینی غرض کہ عرفی کی ہر خصوصیت کلام سودا کے یہاں پائی جاتی ہے اس لئے وہ صحیح معنی میں خصوصاً عرفی اور عموماً متاخرین شعرا کے مقلد ہیں۔

قصیدے میں تین چیزیں معیار کمال ہیں تشبیب، گریز، اور خاتمہ تشبیب میں شاعر کی قوت فکریہ اور اقتدار طبع کا اچھی طرح امتحان ہو جاتا ہے، شاعر کو اس میدان میں قوت تخیل کے مظاہرہ کا پورا موقع ملتا ہے وہ ہر قسم کے مضامین لکھنے میں آزاد ہوتا ہے۔ چنانچہ اہل نظر قصیدہ گو شعرا کی تشبیب کے مضامین دیکھکر ہی اُن کے مراتب شعری کا اندازہ کرتے ہیتے ہیں، "مدح" بالکل خارجی شے ہے شعرا بالطبع اس کی طرف مائل نہیں ہوتے بلکہ مقتضائے وقت کے لحاظ سے طوعاً و کرہاً اس صنف کو نباہتے ہیں۔ بعض شعرا کے قصائد دیکھنے سے یہ بات صاف معلوم ہو جاتی ہے، کہ وہ فطری تقاضے کی بنا پر "مدح" نہیں کر رہے ہیں بلکہ کوئی اور وجہ ہے جو مجبوراً انھیں اس طرف متوجہ کر رہی ہے۔

ایک لمحۂ فکریہ

اُردو کے دَورِ جدید میں نظم کہنے کی طرف ایک عام میلان طبع پایا جاتا ہے، اوّل اوّل مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے اس کی داغ بیل ڈالی تھی، چنانچہ ان حضرات کی تقلید میں بہت شعرا نے نظم کو رواج دیا اور مختلف اسلوب بیان کے ساتھ ساتھ مختلف عنوانات پر کامیاب نظمیں لکھیں ڈاکٹر اقبال مرحوم، مولانا سیماب اکبرآبادی اور جوش ملیح آبادی اس خصوص میں بہت مشہور ہیں لیکن ان تمام نظموں کو جب آپ غور سے دیکھیں گے اور اس صنف مخصوص کا تجزیہ کرینگے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ درحقیقت یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ وہی پرانی چیز ہے جسے قصائد میں تشبیب کے نام سے پکارا جاتا ہے دور جدید کے شعرا نے قصائد سے تشبیب کو علیحدہ کر لیا اور اس میں ہر قسم کے مضامین لکھنے لگے، پہلے قصیدہ گو شعرا یہ کام قصیدے میں تشبیب سے لیتے تھے اور وہ ہر قسم کے علمی، اخلاقی، فلسفیانہ، عاشقانہ اور بہاریہ وغیرہ مضامین اسی کے ذیل میں ادا کر جاتے تھے چنانچہ فارسی قصائد پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے۔

العود الی المقصود

سب سے پہلے مرزا سودا کے قصائد کی تشبیب پر نظر ڈالنا ضروری ہے کیونکہ یہی ایک چیز ہے جس سے اُن کے معیار کمال کا صحیح اندازہ ہو سکے گا اور یہ بھی فیصلہ آسانی سے کیا جا سکے گا کہ اس صنف میں کسی نے ان کی صحیح تقلید کی ہے یا نہیں، یہ بحث بالکل خارجاً اصول قصیدہ گوئی کے ماتحت ہوگی۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ شاعر نے قصیدے کی مخصوص بلند و متین اور پرشوکت زبان تشبیب میں اختیار کی یا نہیں کیونکہ قصیدے کی زبان غزل اور دیگر اصناف سخن سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں نرم و شیریں زبان کو بالکل دخل نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب مرزا سودا کے قصائد کی تشابیب پر نظر ڈالی جاتی ہے تو صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے

کہ ان کی زبان نہایت متین و پُرشوکت ہے، فرماتے ہیں:۔

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی　　نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہلِ دولت کی　　نہ جھاڑے آستینِ کہکشاں شاہوں کی پیشانی

عروج دستِ ہمت کو نہیں ہے قدر بیش و کم　　سدا خورشید کی جگ پر مساوی ہے زر افشانی

اکیلا ہو کے رہ دنیا میں گر چاہے بہت جینا　　ہوئی ہے فیضِ تنہائی سے عمرِ خضر طولانی

برنگ کوہ رہ خاموش حرف ناسزا سُن کر　　کہ تا بد گو صدائے غیب سے کھینچے پریشانی

---

[۱] اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل　　تیغِ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمر دار ہر ایک　　دیکھکر باغِ جہاں میں کرمِ عز و جل

قوّت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض　　ڈال سے پات تلک پھول سے لیکر تا پھل

واسطے خلعت نوروز کے ہر باغ کے بیچ　　آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

بخشتی ہے گلِ نورستہ کی رنگ آمیزی　　پوشش جیت قلمکار بہر دشت و جبل

تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ　　ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل

شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہنچی ہے　　شمع ساں گرمی نظارہ سے جاتی ہے پگھل

فیضِ تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے　　شہد ٹپکے جو لگے نشترِ زنبورِ عسل

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد اس حقیقت کے اعتراف میں ذرا بھی تامل نہیں ہو سکتا کہ ہماری اُردو زبان میں جو سکت اور جان پائی جاتی ہے وہ سوداؔ کی متین اور سنجیدہ گوئی کی بدولت پیدا ہوئی، ہر قسم کے ملکی، سیاسی، مذہبی اور فلسفیانہ مضامین ادا کرنے کے لئے یہ زبان بالکل موزوں ہے، شیخ ابراہیم ذوقؔ کے قصائد کی زبان اگرچہ بعض جگہ متین و سنجیدہ سہی لیکن وہ بلند خصوصیات جو سوداؔ کی زبان سے متعلق ہیں۔ ذوقؔ کے یہاں نہیں ہیں۔ یعنی اُن کی زبان قصیدے کی مخصوص زبان سے علیحدہ ہو کر اکثر عاشقانہ ہو جاتی ہے اور وہ وہاں بجائے قصیدہ گو کے غزل گو معلوم ہونے لگتے ہیں اس بنا پر ان کو سوداؔ کا صحیح مقلد نہیں کہا جا سکتا، فرماتے ہیں:۔

؎ سحر جو گھر میں بشکل آئینہ تھا میں بیٹھا، نزار و حیراں
تو اک پری چہرہ، حور طلعت بشکل بلقیس و ماہ کنعاں

پری کی صورت چمن کی رنگت، گر اسکا عشوہ تو اس کا جلوہ
زبان شیریں، بیان رنگیں، کلام رندان، خرام مستاں

حبیں بشکل مہ نو عرق کے قطرے ہیں اس میں اختر
ہلال ابرو، نگاہ جادو، خدنگ مژگان و چشم فتاں

بروئے رنگیں نگار بستاں، شگوفہ خنداں، نگر نہ خنداں
بوئے پیچاں ہے عشق پیچاں جو ہیں پریشاں تو دل پریشاں

نگاہ ساغر کش تماشا، بسا من گردن صراحی آسا
وہ گول بازو وہ گوری ساعد وہ پنجہ رنگیں بخونِ مرجان

---

[۱] یہ قصیدہ سوداؔ نے عرفیؔ کے جواب میں کہا ہے۔ عرفیؔ کا قصیدہ یہ ہے۔

چہرہ پرداز جہاں رخت کشد چو بجمل　　شب شود نیم رخ روز شود مستقبل
چشم شب تنگ شود دائرۂ مردمکش　　دیدۂ روز بستد ز برآید احول

بعض قوافی دونوں کے یہاں بڑی لطافت سے نظم ہوئے ہیں۔ موازنہ کیجئے۔

عرفیؔ ؎ بسکہ ہر خار گل کردہ عجب نیست اگر　　یاسمن شگفد از نشترِ زنبورِ عسل
سوداؔ ؎ فیضِ تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے　　شہد ٹپکے جو لگے نشترِ زنبورِ عسل

عرفیؔ ؎ نا بہ چوں چمن سبزہ دہد انامش　　ناقص از کار گہہ آمدندے باغ از مخمل
سوداؔ ؎ واسطے خلعت نوروز کے ہر باغ کے بیچ　　آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

عرفیؔ ؎ شاید ار قدر پرستاد بزیر ند بحشر　　بسکہ بردا شت صفا صحف عزی و ہبل
سوداؔ ؎ دم میں ہے فزوں فیض ہوا ہے یا کہ　　دیو میں قسم جادات سے شاید ہو خلل
فکر رہتی ہے مجھے یکہ زباں سوا اپنی　　کہیں ہوائے خدائی نہ کریں لات و ہبل

بعض مضامین بھی ایسے ہیں جن میں سوداؔ قطعاً عرفیؔ کے ہمسر نظر آتے ہیں۔ چونکہ یہ بحث ہمارے موضوع سخن سے خارج ہے اس لئے اسکی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

ابر دُر فشاں وہ چمن میں کمال کے — عاشق نہال کیوں نہوں عاشق نہال کے
بہ بیہ دو ستاروں میں خورشید و ماہ اگر — روشن ہیں دونوں نور سے اسکے جمال کے

قلقل کا سا ہے سمجھا بہ گلوئے مینا — ہچکیاں قلقلِ مینا جو ہے لیتی پیہم
جس ساز فدا ساز کو آغوش میں آج — تار چھیڑ دے گی کمر کا تو سنو گے پنچم
ان مزامیر کو ہم سنتے تھے واعظ سے حرام — وجد میں آئیں نہیں آج گر آپ سے حرم

دیکھ خورشید لقا طرفہ جوانِ ارشق — تاب رخسار فلق سرخیٔ رخسار شفق
وہ جبیں ماہ جبیں اس پہ خطِ مہ جبیں — تھی وہ انگشت بنی جس نے کیا ماہ کو شق
کئے دو ٹکڑے جگر کھینچ کے ابرو تلوار — باندھ کر کھینچ لے دل زلفِ مسلسل کی رسن
تیر انداز جو مژگاں تو ادا دشنہ گذار — چشم ابلق تو نگہ ترک سوار ابلق

یہ چند اشعار ان کے بعض قصائد سے نقل کیے گئے ہیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ قصیدہ نہیں بلکہ غزل کہہ رہے ہیں، بعض ترکیبیں چست بھی مگر قصیدے کی مخصوص زبان سے ان اشعار کی زبان واقعی مختلف ہے، سودا کے اشعار پر نظر ڈالو جہاں عشقیہ مضامین کا موقع آجاتا ہے وہاں بھی بین بین نکل جاتے ہیں اور مطلق غزل گو نہیں ہو جاتے۔ قصیدے میں تو زبان کی یہاں تک احتیاط کی جاتی ہے کہ جو غزل تشبیب کے سلسلے میں لکھی جاتی ہے اسکی زبان عام غزل سے مختلف ہونی چاہیے ورنہ قصیدے میں وہ انمل بے جوڑ معلوم ہونے لگتی ہے۔ مرزا غالب کا مشہور قصیدہ ہے

صبح دم دروازۂ خاور کھلا — مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

اس کی غزل کے اشعار دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ اور ہی چیز ہے۔ مطلع

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا — کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا
ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ — دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا
ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کماں — کب کمر سے غمزے کا خنجر کھلا

الی آخر

سودا کی غزل دیکھئے ؎

نہ پوچھ مجھ سے کدھر ہے خزاں کہاں ہے بہار — کہ بلبلِ قفسی کو ہے گل سے کیا سروکار
عجب نہیں ہے کہ بادِ سموم ہو جائے — نسیم گر کرے یکدم مرے چمن سے گزار
کہاں بہار کہاں ساقی اور کہاں ہے شراب — کہاں مغنی و مطرب کدھر ہے ناخن و تار
فلک کے ہاتھ سے اتنی بھی داد ہو نہ رہے — کہ خوب روئیے دل کھول کر پکار پکار
تنگنگی سے مجھے دل کی یوں ہوا معلوم — فلک نے گوشۂ خاطر کو بھی کیا مسمار
پڑا پھرے ہے اسی فکر میں سدا ظالم — کسو طرح سے کسو دل کو دیجئے آزار

یہ بہت مشکل مقام ہے اس کا طے کرنا آسان نہیں، سب سے پہلے یہ چیز عرفی نے پیدا کی ہے اس نے بعض قصائد میں ایسی زبان استعمال کی ہے کہ جو عام غزل سے بالکل علیحدہ معلوم ہوتی ہے اور قصیدہ گویوں میں سوائے سودا کے یہ خصوصیت اور کسی کے یہاں نظر نہیں آتی۔

نوعیت مضامین کے لحاظ سے فارسی قصائد میں اکثر مسلسل مضامین لکھے جاتے تھے جن میں واقعہ نگاری اور ہر قسم کے مربوط مضامین کی ترتیب کا لحاظ رکھا جاتا تھا، قاآنی کا یہ خاص انداز ہے چنانچہ اس نے جس واقعہ یا حالت کو بیان کیا ہے اس کے تمام جزئیات پر سیر حاصل دادِ سخن دی ہے، تشابیب میں تسلسل مضامین عرفی کے یہاں بھی بڑی خوبی کے ساتھ پایا جاتا ہے، کہتا ہے۔

صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم — گدا کلاہ نمد کج نہاد و شہ دیہیم
جمال جنیبہ خوش و من خوشترا بجنابہ شاق — نشستہ با خرد اندر تعلّم و تعلیم
کہ ناگہاں ز درم در رسید مژدہ دہے — چنانکہ از چمن طالعم ز مغز شمیم
چہ گفت؟ گفت کہ اے مخزن جواہر قدس — چہ گفت؟ گفت کہ اے مطلب شکست نعیم
بیا کہ از کرمت باد می کند دریا — بیا کہ تشنہ لبت را طلب کند تسنیم
زلال چشمۂ امید نقد اکبر شاہ — طراز دولت جاوید شاہزادہ سلیم
ازیں پیام دلم شد شگفتہ و شاداب — چنانکہ باغ ز شبنم چنانکہ گل ز نسیم
برہ فتادم و گشتم چناں شتاب زدہ — کہ دست اہل کرم در نثار گوہر و سیم
چو روزگار رسیدم بدرگہے کہ کند — زمانہ طوف حریمش بدیدۂ تعظیم

یہ قصیدہ شہزادہ سلیم کی مدح میں ہے اور اس وقت کہا گیا ہے جبکہ خود شہزادہ سلیم نے عرفی کو دربار میں بلا کر قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی ہے یہ قصیدہ فصاحت و بلاغت اور لطافت و ندرتِ مضامین کے لحاظ سے بہت بلند ہے،

اُردو میں سودا نے اس خصوصیت کو بہت خوبی کیساتھ نباہا ہے۔ امام موسیٰ رضا علیہ السلام کی تعریف میں قصیدہ لکھا ہے اس کے ابتدا میں بعض شعرا کی ہجو کرتا ہے۔

استاد کی ان کے ہے انھوں کو یہ نصیحت — لفظی نہ تناسب ہو تو کچھ مت کرو تحریر
اتنا تو تلازم رکھو الفاظ کا ملحوظ — بے پنجۂ ناخن نہ لکھو دودھ کو تم شیر
جب تک کہ نہ منظوم ہو یا سنگ و ترازو — باندھو نہ کبھی شعر میں تم لفظ کم سیر
تم شعر و سخن اپنے کی بندش میں کماں ابرو — بولو نگہ یار کو یارو نہ کبھو تیر
چہرے کو نہ معشوق کے دو شمع سے تشبیہ — تا زلفوں کو باندھو نہ کبھو شکل سے گلگیر
مضموں جو قد و زلف کا معشوق کی باندھو — لکھو الف و لام کے سیپارہ کی تفسیر
ملحوظ فقرا ان رکھو ہر آن نظا میں — مرجع ہو مونث تو ضمیر اس کی ہو تذکیر

ان اشعار میں علاوہ تسلسل مفہوم بڑی خوبی کے ساتھ ایک فنی مسئلے کو بیان کیا ہے رعایت لفظی کی وجہ سے جو خرابیاں کلام میں پیدا ہو جاتی ہیں ان کی طرف کامیاب اشارات پائے جاتے ہیں، چونکہ یہ بحث خارجی خصوصیات سے متعلق ہے اس لئے دخل گفتگو کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ایک قصیدہ امام عسکری علیہ السلام کی تعریف میں لکھتے ہوئے تشبیب کے سلسلے میں ایک امیر کی گفتگو کا جواب کس خوبی سے دیا ہے۔

ناگہ اس اثنا میں اک منعم نے یہ مجھ سے کہا — بندہ خانہ کیا تمھیں تشریف لانا ننگ ہے
ہر مکاں میں مسند و ہر ایک جا فرش سمور — ہر طرف مطرب بسیر ہر سو رباب و چنگ ہے
نوش کرنیکو کباب اور پینے کی خاطر شراب — دیکھنے کو رقص محبوبانِ خوش آہنگ ہے
یہ کہا سن کر جو ترغیب آپ کرتے ہیں مجھے — اسکو باور کیجئے گا یہ خیال بنگ ہے
ناز پروردہ جو استغنا کے ہیں انکے تئیں — یک قدم راہ طلب طے کرنے سو فرسنگ ہے
دیکھنا راہ اجل ان کو تماشا رقص کا — دردِ دل سننا کسی کا انکو عود و چنگ ہے
غم کسی دل سوختہ پر ان کو کھانا ہی کباب — نت انھیں خونِ جگر پینا مئے گلرنگ ہے

اسی سلسلے میں گریز کی خوبی قابلِ داد ہے۔

خاک در کی ایسی کے ہیں وہ تیری مسند ہے کیا — عرش کے دامن پہ گر بیٹھیں تو انکا ننگ ہے
قبلۂ دنیا و دیں یعنی امام عسکریؑ — جنکی میزانِ عدالت اتنی بے پاسنگ ہے
ایک پلے میں ہو کاہ اور دوسرے پلے میں کوہ — کاہ کو باور کرنا کوہ سے ہم سنگ ہے

امام حسین علیہ السلام کی تعریف میں قصیدہ ہے، جس کا مطلع ہے۔

سوائے خاک نہ کھینچوں گا منت دستار — کہ سرنوشت لکھی ہے مری بخطِ غبار

حُسنِ مطلع، سبحان اللہ۔

چمن زمانے کا شبنم سے بھی ہے محروم — اگر نہ رووے مرے روزگار پر شب تار

اسی انداز میں نہایت بلیغ اشعار کہتا ہوا زمینِ کربلا کی تعریف کرتا ہے اور وہاں کی ہوا کی تعریف میں ایک مسلسل غزل کہتا ہوا سلسلۂ بیان کو گریز تک لیجاتا ہے۔

زبس ہوا کی تراوت نے واں کیا ہے نثار — شرار سنگ میں ہے رنگ دانہ ہائے انار
گر اس طرف کو ہو جاوے صبا چمن کی طرف — نہو سوائے زمرد عقیق واں زنہار
جو نخل خشک کی تصویر کھینچے واں نقاش — ہر ایک شاخ و ہیں سبز ہو کے لاوے بار
عجب نہیں ہے کہ ہوں اس ہوا سے دانہ سبز — اگر زمیں پہ گرے ٹوٹ سبحۂ زنار
غرض میں کیا کہوں یارو چمن میں قدرت کے — عجب ہے لطف کی اس قطعۂ زمیں پہ بہار

دو تین شعر کے بعد اس طرح رُخ بدل دیا جاتا ہے۔

اُنھوں کی نظروں میں ہوگی بہشت کی کیا قدر — جنھیں ہے مسکن و ماویٰ کیواسطے وہ دیار
بہشت عرض کریں یہ جناب اقدس میں — عجب نہیں کہ شرم سے بروز شمار
جو کربلا کے ہیں ساکن انھوں کو ہو یہ امر — سوائے عرش نہ دیکھے کس طرف کو گزار
تری تو ذات پہ روشن ہی جزو کل کا خیال — بھلا ہی پردے ہی میں رکھے جنتوں کا وقار

اس کے بعد تخیل کے تصرف سے تسلسل کو یوں قائم رکھا ہے۔

غرض کہ دیکھکر اس جا کے مرتبے کے تئیں — لگا زمیں سے کرنے فلک یہ استفسار
خبر دے اسکی مجھے اے زمیں کہ تجھ میں سے — ہوا ہے کس لئے اس خاک کو یہ عز و وقار
دیا جواب زمیں نے کہ اے فلک ہیہات — نہ دیکھ تجھ کو سیر تناسب اسے تو دیگر بار
نہیں ہے خاک وہ ہے آبروئے آب حیات — نہیں وہ خاک ہے کحل الجواہر الابصار
اگر نہ چشم کواکب کو پہنچے اس میں سے — نظر سکے شب تاریک بیچ تو رفتار

گریز کا انداز دیکھئے:۔

مجھے ہی نسبت اس خاک سے کہاں جس میں — ابو تراب کے فرزند نے کیا ہو قرار

(مدح)

امام مشرق و مغرب شہ زمین و زمن   رموز داں خداوند لجۂ اسرار

یہ چند اقتباسات ہیں جن سے سوداؔ کے تسلسل مضامین، بلاغت مقام، فصاحت بیان، جزالت اسلوب اور روانیٔ کلام و برجستگی تراکیب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اگر زور بیان پر عرفی کا گمان ہوتا ہے تو تسلسل و روانی میں قاآنی کا، کسی اُردو شاعر کے کلام میں قصیدے کی یہ خصوصیات نہیں پائی جاتیں۔ ذوقؔ کے تمام قصائد کو پڑھ جایئے یہ خصوصیات کہیں نظر نہ آئیں گی، ہاں اُنکے یہاں زبان کی صفائی اور محاورت کی خوش اسلوبی ضرور پائی جاتی ہے لیکن یہ دونوں باتیں ایسی نہیں کہ جن کی وجہ سے اُن کو سوداؔ کا ہم پلہ قرار دیا جا سکے جس طرح وہ باوجود ان دونوں خوبیوں کے غزل میں میرؔ تقی سے کوئی نسبت نہیں رکھتے اسی طرح قصیدے میں سوداؔ سے بالکل علیحدہ ہیں حقیقت یہ ہے کہ ذوقؔ دہلی کے شعرا میں صرف تنہا ایسے شخص ہیں جنھوں نے لکھنؤ اسکول کی پیروی میں اپنا وقت صرف کیا اُن کی شاعری سراسر ناسخؔ لکھنوی کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے، اگر صفائیٔ زبان اور محاورہ کی خوش اسلوبی اِن کے یہاں ہوتی تو اُن کی شاعری اتنی بھی قابلِ اعتنا نہ سمجھی جاتی جتنی کہ اس وقت سمجھی جاتی ہے کیونکہ غزل میں وہ میرؔ کے مقلد اور قصیدے میں سوداؔ کے پیرو نہیں ہیں اِن کے یہاں غزل میں میرؔ کا سوز و گداز اور قصیدے میں سوداؔ کی جزالت بیان و تشبیب کی ہمہ گیری بالکل نہیں ہے۔

مدح کی طرف ہم نے اس مضمون میں اس لئے توجہ نہیں کی کہ قصیدہ کا یہ حصّہ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں شاعر کی فطری قابلیتوں اور اس کے کمال فن کا آئینہ دار نہیں ہوتا۔ جہاں تک گریز کا تعلق ہے، سوداؔ کا گریز کسی فارسی قصیدہ گو سے کسی طرح کم نہیں گریز کے لئے قاآنی بہت مشہور ہے، امام موسیٰ رضا علیہ السّلام کے مشہور قصیدے کی گریز جسکا مطلع یہ ہے ؎

بگردوں تیرہ ابرے بامداداں برشد از دریا
جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا

خاص طور پر قابلِ تحسین ہے۔ برسات اور بہار کی پرکیف حالت کا نقشہ کھینچتا ہوا دفعتاً کہتا ہے ؎

چمن از فرّ فرودیں چناں نازاں بہشت چیں
کہ طوس از فر شاہ دیں بریں گنبد خضرا

سوداؔ کے وہ گریز جن کا ہم نے سلسلۂ مضمون میں ذکر کیا ہے نہایت خوب ہیں، علاوہ ازیں ان کے تمام قصائد میں ہر جگہ گریز اپنے مقام پر موزوں و مناسب واقع ہوا ہے اگریز کے لئے بے تکلّفی اور بے ساختہ پن ضروری ہے۔ اس سے یہ نہ معلوم ہو کہ شاعر نے قصداً مدح کی طرف رُخ کیا ہے بلکہ دفعتہً اتفاق کے ساتھ بات میں سے بات پیدا ہو جائے۔ مثلاً سوداؔ کے اس قصیدے کی گریز

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیحِ سلیمانی

ایک طویل تمہید کے بعد کہتا ہے ؎

نکال اس کفر کو دل سے کہ اب وہ وقت آیا ہے
برہمن کو صنم کرتا ہے تکلیفِ مسلمانی

یا جیسے اس قصیدے میں :-

"اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل"   الی الآخر

بہاریہ تشبیب کے بعد دفعتہً کہتا ہے ؎

ہے مجھے فیضِ سخن اسکی ہی مداحی کا
ذات پر جس کی مبرہن کنہِ عزّ و جل

ایک طویل قصیدہ امام موسیٰ رضا علیہ السّلام کی تعریف میں لکھا ہے اس کی تشبیب نہایت شاندار اور بلحاظ مضامین عالمانہ اور اخلاقی اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ مطلع ہے ؎

اگر عدم سے نہ ہو ساتھ فکر روزی کا
تو آب و دانہ کو لیکر گہر نہ ہو پیدا

مختلف مضامین کی ایک بے پناہ تفصیل کے بعد خرد سے گفتگو کرتا ہوا اسکے جواب کے ساتھ اس طرح گریز کرتا ہے ؎

دیا جواب خرد نے مجھے کہ اے ناداں   خوشی ہے دہر میں یہ غم سو پوچھتا ہی کیا
نہیں ہے امن کہیں زیرِ آسماں ہرگز   بجز زمینِ خراساں کہ ہے وہ عرش آسا

دوسرے شعر کا دوسرا مصرع گریز پر مشتمل ہے۔

اب تک یہ گفتگو قصیدے کے خارجی پہلوؤں سے متعلق تھی تشبیب و گریز کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب خارجی خصوصیات سے متعلق ہے اور وہ بھی بہت مختصر، ہم اہلِ نظر سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قصیدے کی خصوصیات خواہ داخلی ہوں یا خارجی مرزا سودا ان میں یکہ و تنہا ہیں اِن کا کوئی حریف نہیں حتیٰ کہ اُردو شعرا میں کوئی ان کی پوری تقلید بھی نہیں کر سکا۔ فارسی قصائد کا صحیح مقلد ہونے کا حق صرف انھیں کو پہنچتا ہے، ذوق اور دیگر قصیدہ گو شعرا، کی راہ دوسری ہے ان کا انداز اپنی جگہ اچھا ہے یا بُرا ہمیں اس سے بحث نہیں بلکہ کہنا یہ ہے کہ وہ سودا اور فارسی قصیدہ کا رنگ نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں دَورِ جدید میں شعرائے اُردو نے قصیدہ گوئی بالکل ترک کر دی اور تشبیب کے حصے کو قصیدے سے نکال کر نظم گوئی کی بنیاد ڈالی، چنانچہ اس وقت تک بہتر سے بہتر نظمیں کہی گئی ہیں اور کہی جائینگی، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مرزا سودا کا ان شعرا پر عظیم احسان ہے اور یہ کہ وہ اُن کے لئے ایک ایسا نمونہ چھوڑ گئے جس کی روشنی میں انھوں نے اپنی شاعری کی بنیاد رکھی، بہرحال جدید نظم گوئی اپنی جگہ خواہ کتنی ہی مفید و اعلیٰ ہو مگر سودا کے قصیدے کا جواب نہیں، جس طرح آج بھی غزل میں میر کا ہمرنگ پیدا ہونا دشوار ہے۔ اس طرح قصیدے میں سودا کی ہمسری دشوار نظر آتی ہے۔

مرزا سودا کی قصیدہ گوئی کے بعض دیگر پہلوؤں پر ہم آئندہ کسی اشاعت میں روشنی ڈالیں گے۔

المُ مظفر نگری

حدیثِ شوق

(غزل)

اِسے کچھ لوگ سمجھے راز، کچھ دیوانگی سمجھے،
محبت کیا تماشہ ہے، کوئی دیکھے، کوئی سمجھے

وہ نقشِ بے ثباتِ دہر کو کیا دائمی سمجھے
جو خود مٹی ہوئی، اپنی بساطِ زندگی سمجھے

کرینگے طور کی سی اپنے دل میں بھی تڑپ پیدا
بہت دن میں تمہاری فطرتِ جلوہ گری سمجھے

وہ کیا آئیگا ہستی کے نظر افروز دھوکوں میں
جو اپنی زندگی کو اک فریبِ زندگی سمجھے

وہ ہی دل اصل میں شایانِ جذباتِ محبت ہے
سکوں کے بعد جو بےچین ہونا لازمی سمجھے

سمجھنا چاہتے ہیں جو حقیقت رات دن تیری
کوئی پوچھے کہ وہ اپنی حقیقت بھی کبھی سمجھے

جہاں ملتی ہیں راہیں نیستی کی اور ہستی کی
پہونچکر ہم وہاں اپنا مقامِ زندگی سمجھے

حقیقت میں وہ عرفانی ہے سرد و گرمِ ہستی کا
جو اپنے آپ کو بیگانۂ رنج و خوشی سمجھے

ستاروں نے وہ پوری داستانِ شوق دہرا دی
جسے ہم اک حدیثِ ناتمامِ عاشقی سمجھے

شکایت حُسن سے بیکار ہے تسکیں نہ دینے کی
جو خود تڑپا نہ ہو، وہ کیا کسی کی بیکلی سمجھے

نہ دی دیر و حرم میں بھی اجازت سر جھکانے کی
خدا اہلِ خرد کو اے جنونِ بندگی سمجھے

میں ہوں آزاد جب چاہوں اٹھا دوں پردۂ ہستی
مجھے بھی زندگی والے غلامِ زندگی سمجھے ؟

ذریعہ تھا یہی اعجازؔ تسکینِ طبیعت کا
ہم اپنا منتہائے شوق، ذوقِ شاعری سمجھے

اعجاز صدیقی

درسِ خودی

جب حریفِ محفل آرائی ترا کوئی نہیں
پھر جہاں تو ہے وہاں تیرے سوا کوئی نہیں!

تیرا غمزہ کس قدر بیگانگی آموز ہے
تیری محفل میں کسی کا آشنا کوئی نہیں

بیخودیٔ عشق نے مجھ کو دیا درسِ خودی
میں ہی میں ہوں ہر طرف میرے سوا کوئی نہیں

کیوں وسائل کا عدم ہو اسقدر ہمت شکن
کیا خدا نا خواستہ میرا خدا کوئی نہیں

تھیں بیاں کرنے کے قابل دردِ دل کی لذتیں
پر کہوں کس سے یہاں دردآشنا کوئی نہیں

راہ پیمائی سے مطلب ہے، نہ کر منزل کی فکر
تو چلا چل، کیا ہوا جو رہنما کوئی نہیں

حوصلہ افزا ابھی ہے حوصلہ فرسا ابھی
جو نہ آتی ہو تجھے ایسی ادا کوئی نہیں

تو کسی کا ہو کے دیکھ اے شکوہ سنجِ روزگار
کیوں یہ کہتا ہے کہ دنیا میں مرا کوئی نہیں

ہمصفیر اپنا طلب کرتا ہے ذوقِ شعر سے
کیوں حریفِ وحشتِ رنگیں نوا کوئی نہیں

(غزل) (خان بہادر) رضا علی وحشت کلکوی

فکر و عمل

جب تیرا اختیار ہے پابند غیر کا
قبضہ میں ترے مُلکِ سلیمانؑ ہوا تو کیا

جب تک کہ آندھیوں سے بغاوت کری نہ لَو
اُمید کا چراغ فروزاں ہوا تو کیا

جب تک ترا ضمیر نہ ہو واقفِ جنوں
پھولوں کی طرح چاک گریباں ہوا تو کیا

توبہ ہے نام دہر میں ترکِ گناہ کا
تو دل ہی دل میں اپنے پشیماں ہوا تو کیا

دل میں ترے اُمنگ ہی باقی نہیں رہی
تجھ پر طلوعِ صبحِ بہاراں ہوا تو کیا

شاہیں کے بازوؤں کی حرارت ہے اور چیز
زاغ و زغن کی طرح پرافشاں ہوا تو کیا

جب تک کہ تیرے دل میں نہ ہو دردِ کارواں
ماہر بھی کارواں میں حُدی خواں ہوا تو کیا

(نظم) ماہر القادری

دیوی

میں نے اُس سے پوچھا ——— "تمہارا نام؟"
اُس نے کہا" ——— رانی!"
پھر میں نے پوچھا ——— "تمہارا بیاہ ہوگیا رانی؟"
وہ شرما گئی ——— اور اُس کے منہ سے بغیر ارادہ "نہیں" نکل گیا

پھر .... ؟

"برسات بعد"!

اُس نے میرا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی جواب دیا اور وہ بھی نہایت لاپروائی کے ساتھ۔ گویا اُس کے نزدیک اِس قسم کی باتیں قابلِ اعتنا تھیں ہی نہیں۔ وہ گنگنا گنگنا کر اپنی گڑیا کو کپڑے پہنانے کے دلچسپ شغل میں مشغول تھی ——— بالکل معصومانہ انداز میں۔

وہ ابھی صرف سات آٹھ برس کی ایک بھولی بھالی لڑکی تھی اور ابھی اچھی طرح ہوش کی منزلوں میں قدم رکھنے بھی نہ پائی تھی کہ شفقتِ مادرانہ سے محروم کردی گئی، اُس کی پرورش کے بہلانے سے جو دوسری ماں لائی گئی وہ حقیقی معنوں میں سوتیلی ماں تھی، محلہ کی تمام عورتیں "رانی" کو سمجھاتیں کہ وہ تیری ماں ہے مگر اسے اُن کی باتوں پر یقین نہیں آتا تھا، وہ سوچا کرتی تھی کہ کیا ایسی ماں بھی ہوسکتی ہے، اُس کی عمر کا تو پہلا ہی گھونٹ کڑوا تھا۔ روتے ہنستے اُس کا بچپن گذر رہا تھا۔ بدقسمت کو اس چھوٹی سی عمر ہی میں دُکھ سُکھ سب کچھ دیکھنے پڑ رہے تھے، وہ نہایت خاموشی، صبر استقلال اور متانت کیساتھ ان مصائب کو برداشت کر رہی تھی ——— روح فرسا اور دلشکن،

"تم یہاں کہاں رانی؟" میں نے اسے خلافِ توقع دیکھ کر کہا۔
اُس نے چونک کر اپنا آنچل سنبھالا، اسی کے ساتھ اُس کی آنکھوں سے دو چمکتے ہوئے موتی اُس کے پژمردہ رخساروں پر ڈھلک آئے، اُس نے آہستہ مگر انکساری کے ساتھ کہا "اب میں شادی شدہ ہوں بابو"۔

میرے پیہم اصرار کے بعد اُس نے بتایا کہ اُس کے پتا نے اسے ایک شرابی کے ہاتھ بیچ دیا ہے، میرا سر چکرانے لگا اور بے اختیارانہ طور پر اس جملے کے ساتھ میرے منہ سے درد میں ڈوبی ہوئی ایک آہ نکل گئی۔ "انسان کتنا بے رحم اور لالچی ہے رانی؟"

"ایسا نہ کہو بابو" اُس نے اپنی ہچکی چھپاتے ہوئے کہا۔

میں نے اُس سے ڈرتے ڈرتے پوچھا "رانی کیا تم اس حال میں خوش ہو؟"

جواب میں اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور دل کی ترجمانی آنکھوں کے سپرد کردی۔

آنسو ——— ! اور ——— مسلسل آنسو!!

پہلے آنکھوں میں ڈبڈبائے ——— ڈبڈبا کر ٹپکے ——— اور ٹپک کر بہنے لگے۔ ایک دریا تھا جو اُمڈا چلا آرہا تھا ——— کس قدر جامع اور دردانگیز جواب تھا۔ وہ رانی تھی مگر نام کی۔ اُس کی زندگی بے کیف تھی۔ پہلے سے بہت زیادہ۔ اُس کو سکون و آرام میسر نہ تھا، ہاں اتنا ضرور تھا کہ برسات بعد اُس کی شادی ہوگئی تھی! لیکن غم کے بادل محیط اور اشکوں کی جھڑیاں جاری۔

وہ قیدی تھا ———!!

اور موٹے موٹے پتھروں کی ایک بدبودار بھیانک کوٹھری میں مقید، اُس کی تندرستی تباہ ہوچکی تھی ——— گال سوکھ گئے تھے۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے، اُس کا کام اب صرف یہ تھا کہ اپنی محدود دنیا میں ٹہلے اور جب ٹہلتے ٹہلتے تھک جائے تو عہدِ ماضی پر دو آنسو بہائے مگر آج خلافِ معمول اُس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے ——— نہ معلوم وہ کب سے رو رہا تھا ——— اور کیوں رو رہا تھا۔ ——— کبھی کبھی وہ بڑبڑانے بھی لگتا اور

باجوں میں "ر ۔ ا ۔ ن ۔ ی" کی مبہم آواز فضا میں گونج کر رہ جاتی۔ اس نے
وں میں سے جھانک کر دیکھا ——— دُنیا عیش و سرمستی میں غرق تھی اور
ی زبوں حالی و بے چارگی پر خندہ زن ——— وہ اِس نظارے کی تاب
سکا اور منہ پھیر کر اپنے گُھر درے دامن میں اشکوں کے سیلاب کو جذب کرنے لگا۔

رات اپنے سیاہ لبادے میں کائنات کے ذرّے ذرّے کو چھپائے
تھی۔ چاند کی مدہم روشنی درختوں میں سے چھن چھن کر آ رہی تھی اور دُنیا
راحت میں مست و سرشار تھی مگر قیدی تھا کہ ابد تک جاگتے رہنے کا ارادہ کرکے
ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ ایک طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے
رہا تھا۔ کبھی کبھی آنسوؤں کی جھالر اُس کے سامنے آجاتی تھی ———
ی قسمت پر آنسو بہا رہا تھا۔ یکایک اُس نے محسوس کیا کہ اسے کوئی بُلا رہا ہے۔
——— اور ——— بہت دور!! جہاں آسمان و زمین ملتے ہیں!!!
——— اُس نے دیکھا اور کئی بار دیکھا کہ ایک خوبصورت دیوی مجسمہ یاس
بنی کھڑی ہے ——— ہو بہو "رانی" کی طرح۔ وہی انداز وہ ہی بھولاپن
وہی بلوریں آنکھیں ——— دیوی نے آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھنا
کیا۔ بڑھتی رہی ——— یہاں تک کہ اُس کے بالکل قریب آگئی
——— اب وہ سلاخوں کے باہر چاندنی کی نورانی ردا اوڑھے ہوئے
تھی اور پُر ارمان نظروں سے جن میں یاس بھی تھی اور آس بھی اُسے
رہی تھی۔

کون؟ ——— رانی!
اُس کی زبان سے بے اختیارانہ طور پر نکلا اور قید خانے کی بھیانک
خاموشی میں کھو گیا وہ انتہائی شوق اور بیتابی کے عالم میں ہم آغوش ہونے کیلئے
بڑھا اور اپنے سوکھے ہوئے ہونٹ اُس کی طرف بڑھانے کی کوشش کی
——— مگر لوہے کی سرد سلاخوں نے اُس کی خشکیوں کو سیراب کرنے کے لئے
جوئے خوں بہا دی ——— اُس کا سفینۂ زندگی اب تیزی کے ساتھ بہہ رہا تھا
وہ قیدی تھا ——— اُس کے ارمان! ——— اُس کی حسرتیں!!
——— اور سب کچھ!!! تکمیل کو پہونچ چکی تھیں۔

چودھویں کا چاند ایک غمگین مسافر کی طرح آسمان کی نیلگوں منزلیں طے کر رہا تھا جنا کی
سیمیں موجیں ہچکولے کھا رہی تھیں ——— بلے یار و مددگار ——— بربطِ موج
سے الم انگیز نغمے برس رہے تھے، دور ——— بہت دور! دوسرے کنارے پر
دو چتائیں جل رہی تھیں جن کے شعلے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو رہے تھے۔
وہ بھڑکے، بڑھے وفورِ شوق کے ساتھ اور پھر ہمیشہ کے لئے سرد ہوگئے ———
کچھ ملی جلی آواز یں یہ کہتی ہوئی
"دیوی نے اپنے شرابی دیوتا کی لب تشنگی بجھادی"
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فضا میں منتشر ہوگئیں ———

(ہندی سے آزاد ترجمہ)

بشیر احمد قریشی گوالیاری

دُنیائے راز

یہ جب سمجھے ہوئے ہو تابِ نظارہ نہیں مجھکو — تو پھر کیوں بے تکلف سامنے آیا نہیں جاتا
ادا کرلے جبینِ شوق سجدہ زندگی بھر کے — مگر نقشِ قدم تیرا کہیں پایا نہیں جاتا
نہیں تم ہو نظر میں روح میں دل میں خیالوں میں — وہ گھر ہے کونسا جس میں تمہیں پایا نہیں جاتا
ہوا ہے اس پہ دل صدقے ہوا ہو اس پہ دل شیدا — تصور میں بھی جس بت کو کبھی لایا نہیں جاتا

سمجھنے پر بھی رازِ زندگی اے راز میں چُپ ہوں
یہ اک ایسا معمہ ہے کہ سمجھایا نہیں جاتا

(غزل) — راز جوناگڈھی

احسن الکلام

یہ ان کی محبت کا حاصل نظر آتا ہے
دل دے کے ہر اک عاشق بے دل نظر آتا ہے

جس راہ سے کتراتا قاتل نظر آتا ہے
اُس راہ کا ہر ذرہ بسمل نظر آتا ہے

اک غنچۂ لب بستہ جو دل نظر آتا ہے
کونین کے رازوں کا حامل نظر آتا ہے

اے مرحلۂ اُلفت منزل ہے کٹھن تیری!
آسان ترا ہونا مشکل نظر آتا ہے

سُن سُن کے مرے نالے خاموش ہوا ناصح
تاثیر محبت کا قائل نظر آتا ہے

دریائے قناعت میں کیا فکر سہارے کی
بہتا ہوا ہر تنکا ساحل نظر آتا ہے

شوریدہ و سودائی، آشفتہ و شیدائی
کل سر نظر آتا تھا اب دل نظر آتا ہے

تقدیر ہے اُس دل کی فرمائیں وہ جس دل سے
تو میری محبت کے قابل نظر آتا ہے

احسن ہی بُرا کیسا ہے اُلٹا ہی زمانہ بھی
اس عہد میں ہر حق گو باطل نظر آتا ہے

(غزل) احسن مارہروی مرحوم و مغفور

محسوسات

اُن کی جبیں پہ بھی عرقِ انفعال ہے
شاید یہی جنونِ وفا کا مآل ہے

سایہ میں بجلیوں کے ٹھہرنا محال ہے
ان سے نظر ملائے یہ کس کی مجال ہے

چاہے تو رشتۂ غم و اُمید توڑ دے
معصوم عشق آپ اسیر جمال ہے

سیرِ چمن کا ذکر کہاں اُن کے جاتے ہی
میرا تو اب اُدھر سے گذرنا محال ہے

تاریکیوں میں رات کی جیسے وہ آ گئے
کتنا سکوں نواز فریبِ خیال ہے

یہ حُسن ہی نہیں ہے جو تنہا سنور گیا
عشقِ نظارہ جو بھی شریکِ جمال ہے

کیوں پیش کر نہ دوں دلِ بے مدعا کو میں
اُن کی نگاہِ شوخ کا پہلا سوال ہے

ویسے ملا تو تیرے تغافل میں بھی مزا
کیفِ نگاہِ لطف مگر لازوال ہے

کہہ دے تو چاک کرکے گریباں نکل پڑوں
احساسِ ننگ میرے لئے اب وبال ہے

احتشام حسین ایم۔اے

اُردو کی موجودہ شاعری

اس مقالے کا عنوان "اُردو کی موجودہ شاعری" ہے۔ میں نے لفظِ موجودہ کو بلحاظِ معنی دو حصّوں میں منقسم کیا ہے، یعنی ایک وہ شاعری جس کے مصنف معدوم ہیں مگر اُن کے اشعار موجود ہیں، دوسری وہ شاعری جس کا وجود شعرائے حاضر کے ساتھ پایا جاتا ہے، اخلاقی مسائل بغیر موازنہ و مقابلہ طے نہیں ہو سکتے، اس لئے یہ معنی آفرینی ناموزوں نہ ہوگی، ہر چیز کے اچھے بُرے دو پہلو ہوتے ہیں اور تمام اشیا کے محاسن و معائب کا تعارف اضداد کے تقابل سے ہوا کرتا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مختصراً پُرانی یا قدیم شاعری کا تذکرہ کیا جائے پھر نئی یا جدید سخن آرائی کا مذکور ہو۔

شاعری کی ابتدا انسانی تمدن کے آغاز سے وابستہ ہے ہابیل و قابیل کے واقعے سے اس دعوے کا پتا چلتا ہے اور ابوالبشر حضرت آدم کے مرثیے سے اس کی دلیل ملتی ہے، یہیں سے شاعری یا نظم کی قدامت و رفعت کی سند ہاتھ آتی ہے۔ انسانی تمدن و معیشت کی جتنی مدّت گزرتی گئی، اتنی ہی اس کی دلکشی و دلچسپی میں افزائش ہوتی گئی، یہاں تک کہ شاعری ضروریاتِ زندگی کا ایک جزو بن گئی اور دوسری عادتوں کی طرح یہ مشغلہ بھی طبیعتِ ثانیہ بن گیا، پھر جیسے جیسے زمانہ کا رنگ بدلتا رہا شاعری کی رنگا رنگی بھی نئے نئے انداز دکھاتی رہی۔ شاعری کے جذبات و اثرات سے کوئی زمانہ اور کوئی زبان خالی نہیں، کہا جاتا ہے اور صحیح کہا جاتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی شاعری عہدِ ملیت سے زیادہ اچھی ہوتی تھی۔ ام الالسنہ کے قصائد "سبعہ معلقہ" اور عکاظ وغیرہ جیسے میلوں ٹھیلوں کی سخن سرائیاں اس کے شواہد ہیں۔ فارسی کا بھی قریب قریب یہی حال ہے جس کی عذوبت، اُس کی لطافت جیسی رودکی، دقیقی اور بالآخر شاہنامۂ فردوسی میں ملتی ہے، رفتہ رفتہ وہ روش مابعد کے شعرا میں نہیں ملتی۔ ان اشارات و خیالات کا مطلب یہ ہے کہ شاعری کے زمانۂ ابتدائی میں جو صداقت، بے تکلفی اور سادگی پائی جاتی ہے وہ تکلفاتِ علمی کے زمانے میں نہیں پائی جاتی۔ فنی خوبیاں بحدِ کمال بڑھ جاتی ہیں، مگر جذباتِ اصلی پر نقّالی کا رنگ چھا جاتا ہے۔ صنفِ مثنوی میں آپ پہلے شاہ نامے کو پڑھئے، پھر نظامی، خاقانی سے مُلّا جامی تک کی مثنویاں پڑھ جایئے، ذوقِ صحیح دونوں زمانوں کے مراتب و مطالب سمجھا دے گا۔ اسی طرح غزل میں شیخ سعدیؒ کی زبان اور طرزِ بیان کو سمجھئے پھر اُن کے متاخرین کا کلام دیکھئے، زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

اُردو شاعری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی ابتدائی سخن سنجیاں بہت سبک، گنجلک اور ناہموار ہیں، بخلاف دوسری زبانوں کے، کہ اُن کی پُرانی شاعریاں اپنی دل کشی، دلچسپی اور ہمواری کے لحاظ سے بعد کی مرصّع کاریوں پر فوقیت رکھتی ہیں، اس مقولے کو صحیح مانتے ہوئے میں اس وقت تمام موانع و عوارض اور اُن کے اسباب و علل پر نظر نہ ڈالوں گا، صرف ایک سطحی بات عرض کروں گا کہ اُردو کی ابتدا بازاری اور کاروباری ضرورتوں کی بدولت ہوئی۔ اس کی بنیاد علمی و ادبی سرزمین پر نہیں پڑی، مدتوں عوام الناس کی صحبتوں میں رہی صدیوں روزمرہ اور معمولی خیالات کی حامل رہی۔ جب ادبا و شعرا نے اُس کو منہ لگایا تو وہی پُرانی ترکیبیں، عامیانہ الفاظ، ڈھیلی ڈھیلی بندشیں موزوں ہوتی رہیں برخلاف دوسری زبانوں کے کہ اُن میں شاعری اس وقت شروع کی گئی جبکہ اُس کے ادبی سرمائے کا خزانہ بھرا پڑا تھا، اُردو کو ابتداءً صرف بازاری اور کاروباری اشخاص سے روشناسی حاصل تھی، حکومت اور خصوصاً دفترِ حکومت کو اس زبان سے کوئی واسطہ نہ تھا، کئی صدیوں کے بعد جب دو ایک قلعہ بند نام کے بادشاہوں نے اس کو نوازا اُس وقت اُردو زبانی بات چیت سے گزر کر کتابی صورت میں نظر آنے لگی اور صرف شعرا کی بدولت موزونیت کا جامہ پہننا شروع کیا۔ آپ نے تذکروں میں پڑھا ہوگا کہ اُردو کی جتنی پُرانی مثالیں پُرانے بزرگوں کے فقرات سے دی گئی ہیں وہ سب اسی قسم کی ہیں جیسے حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر متوفی ۶۶۴ھ ہجری نے کسی کے اس سوال

پر کہ جسم میں عقل کا کون سا مقام ہے یہ فرمایا کہ "بیچ سر کے" یا خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی متوفی ۷۵۷ھ نے اپنے مرید اخی سراج کو بنگالہ جانے کی ترغیب دی اور اُن کی اس گزارش پر کہ وہاں شیخ علاء الدین موجود ہیں اور خلائق کا رجحان ان کی طرف ہے، میرے جانے سے کیا نتیجہ ہوگا ارشاد فرمایا کہ "تم اوپر دے تلے" یا شاہ تعجب عالم (متوفی ۸۸۸ھ) کا اندھیرے میں کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر یہ فرمانا "لوہا ہے یا لکڑی۔ یا پتھر" یا شاہ ہاشم علی علوی برادر زادہ شیخ وجیہہ الدین گجراتی (متوفی ۱۰۵۹ھ) کے یہ فقرے "ہاشم جی کی سنئے بات جبنے رکھی ہاسی بھات۔ اس کا جادے ہاتے ہات"

ان مثالوں کو پڑھکر یہ کبھی بھی سمجھتی ہے کہ جب تک اُردو بازاری اور عامیانہ زبان رہی اُس وقت تک ہندوستان کی مروجہ پراکرتوں کے الفاظ ہی کا عمل دخل رہا اور یہ صرف اس لئے کہ اُردو کی بازار کے سوا دربار تک رسائی نہیں ہوئی تھی مگر جب لکھے پڑھے ہندوؤں اور مسلمانوں نے اُردو کو دفتر اور شاہی درباروں تک پہنچایا تو اس میں بھاشا اور دوسری ہندی زبانوں کے ساتھ فارسی، عربی اور ترکی الفاظ شامل ہونے لگے۔

ان مختصر تاریخی اشارات و اطلاعات کے بعد اُس شاعری کی کچھ تفصیل کیجاتی ہے جس کے شاعر معدوم ہیں لیکن اُن کی یادگار موجود ہے۔

شاعری کی قسموں کی تعداد بہت ہے۔ یہ مقالہ ان سب کی تفصیل کا متحمل بلحاظ وقت نہیں ہو سکتا اس لئے صرف ان دو تین اقسام کو پیش کیا جائے گا جو مشہور و معروف ہیں یعنی مسدس، مثنوی اور قصیدہ و غزل۔

اُردو شاعری میں سب سے پہلے برکت یا ضرورت کے لئے مذہبی مسئلے مسائل کی کتابیں لکھی گئیں، پھر دوسری زبانوں کے ترجمے شروع ہوئے جن کو اکثر مثنوی کی بحر میں موزوں کیا گیا پھر کہیں کہیں مرثیوں کی مثالیں ملتی ہیں، پھر غزل اور قصیدے کی باری آتی ہے، سودا سے پہلے قصیدے کی کوئی نمایاں حیثیت نہیں۔ البتہ موجودہ مقبول و مطبوع روش پر غزلوں کے دیوان کی ترتیب ولی دکنی سے شروع ہوئی اور اس صنف میں ہر زمانے کے شاعر نے خوب خوب طبع آزمائی کے جوہر دکھائے ہیں ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد مثنوی کو میر حسن نے قصیدے کو سودا نے اور مرثیے کو میر انیس نے اس طرح ختم کر دیا ہے کہ اس کے بعد ان اصناف میں خامہ فرسائی کی گنجائش نہیں رہی البتہ غزل کی وہ صنف ہے کہ اپنی دلچسپی، دل آویزی اور دلکشی کے ساتھ اب سے تیس برس پہلے تک بلا اختلاف عموماً مقبول رہی اور اب مخصوص مذاق کے اصحاب میں خصوصاً مطبوع ہے۔

بنابراں خیال کے کہ ہم کو یہ رنگ پسند ہے اور وہ رنگ ناپسند ہے اصولاً یہ دیکھنا چاہئے کہ غزل لفظاً اور معنیً جس انداز و پرواز کی حامل ہے اور جس غرض و غایت کے لئے موجدوں نے اسے ایجاد کیا ہے اور جس زبان و بیان کو اس کے لئے مخصوص کیا گیا ہے وہ سکہ رائج الوقت کی طرح ٹکسالی ہے یا کھوٹے سکوں کی طرح ٹکسال باہر۔ غزل اپنے ایجاد کے وقت سے انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک انھیں معنوں میں غزل سمجھی جاتی رہی جن میں ولی و حاتم سودا و میر، درد و مظہر، انشا و مصحفی، حسرت و جرأت، نصیر و ذوق، ناسخ و آتش، امیر و داغ، جلال و تسلیم دادِ سخن دیتے رہے، ان سب کی اور ان کے دیگر معاصرین کی غزلیں پڑھکر غزل کے صحیح مفہوم کا پتا چلتا ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہی انداز غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔ اگر غزل میں حسن و عشق اور اُن کے تمام متعلقات خصوصی کا لحاظ نہ ہوگا تو وہ غزل نہ ہوگی بلکہ ؏

وعظ ہوگا واعظ کا اور کچھ بیاں اپنا

عصر موجودہ کی شاعری جس کو جدید شاعری کہنا زیادہ موزوں ہے بلحاظ مضامین و خیالات نئی نہیں۔ البتہ اس کے مختلف عنوانات کی جداگانہ صورت اور مضامین کی مستقل اور مسلسل ترکیب ۴۰ - ۴۵ برس کی جدت آفرینی کا نتیجہ ہے۔ اس جدت خصوصی سے پہلے آپ جس پرانے شاعر کا کلام دیکھیں گے انفرادی حیثیت سے اُس کے کلام میں بہت سے اشعار ایسے ملیں گے جن کے مضامین و خیالات نئے عنوانات کے تحت میں آسکتے ہیں، شمس العلما پروفیسر آزاد اور شمس العلما مولانا حالی نے پرانی مخلوط شاعری میں یہ امتیازی شان پیدا کی کہ خاص خاص عنوان قائم کرکے ایک سلسلے میں ایک ہی مضمون پر نظمیں لکھیں، اور غزل کے وہ مضامین جو بمدت مدید سے گل و بلبل، وصل و ہجر، رقیب و مدعی، جور فلک جفائے زمانہ اور دہن موہوم و کمر معدوم کے نام سے عام ہو رہے تھے ان کو اس جدید بساطِ سخن آرائی سے نکال کر مناظر قدرت، مظاہر فطرت وغیرہ

ایسے مضامین پر اپنی نظموں کی بنیادیں رکھیں، یہ تاثرات انگریزی زبان کی تعلیم سے پیدا
ہوئے اور انھیں تاثرات نے استعارہ و تشبیہ اور مجازی و تمثیلی شاعری کو بھلانا شروع
کیا اور اکثر خیالات انگریزی شاعری سے ماخوذ ہونے لگے، اس ذہنیت اور ایسے اسالیب
بیان نے اتنی اذعانی ترقی کی کہ پرانے رکیک خیالات اور عریانی مضامین کے ساتھ ہر قسم
کی پرانی غزل گوئی بری سمجھی جانے لگی مثلاً ؎

لاہے اور دلِ راحت طلب کیا شادماں ہوکر — زمینِ کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہوکر
ہی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے — اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہوکر

ان اشعار کو بھی ناپسند کیا جانے لگا۔ حالانکہ بنظرِ انصاف دیکھا جائے
تو یہ وہ بہترین اشعار ہیں جن کی مثال جدید شاعری پیش نہیں کر سکتی۔ زیادہ
وضاحت کا موقع نہیں ورنہ دکھایا جاتا کہ ایسے اشعار پرانی شاعری میں اس
کثرت و افراط سے موجود ہیں جن سے اخلاقی، قومی، سیاسی اور نفسیاتی سبق
حاصل ہو سکتے ہیں۔

جدید شاعری کی اس نمایاں خصوصیت کا یہ عام نتیجہ ہوا کہ تغزل سے
اصل سوز و گداز اور عاشقانہ رنگ و انداز بالکل مفقود ہو گیا۔ جدید شاعری کے
موضوعی عنوانات بہت ہیں، مثلاً اخلاق و موعظت، تاریخی منظومات، مناظرِ قدرت،
…رف فطرت، مزدور و سرمایہ دار، دوشیزہ کسان اور خاتون مشرق و مغرب
وغیرہ، ان مضامین کے نظم کرنے کو ابتداءً زیادہ تر مسدس کی طرز اختیار کی گئی پھر
رفتہ رفتہ مثنوی، قطعہ اور مسمط وغیرہ میں بھی طبع آزمائیاں ہونے لگیں۔ جو
ارباب سخن جدید شاعری کے پابند ہیں وہ عموماً غزل گوئی سے دلچسپی نہیں رکھتے
چند شعرائے خاص نے صنفِ غزل کو اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے لیکن ان کے
خیالات جذبات اور حسیات پرانی غزل گوئی سے بہت دور ہیں۔ پرانے غزل گو
ان اسلوبِ بیان، ترکیبِ تخیل اور سحر اثر آفرینی سے غزل کو حقیقی معنی
میں غزل بنائے ہوئے تھے، اس وقت غزل کی تکمیل، جذباتِ عاشقانہ،
حسیاتِ معشوقانہ، حسیاتِ دلی اور نفسیاتی واقعات سے کی جاتی تھی
اب غزل کو حکمت و موعظت، فلسفہ و تصوف اور مظاہرات و مناظراتِ
سے پورا کیا جاتا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ قدیم شاعری میں بعض مضامین ایسے عام اور فرسودہ
ہو گئے تھے کہ ان کو پڑھتے پڑھتے بلحاظِ معنی شاعری میں کوئی جدت نہیں رہی
تھی اور اس میں غزل گوئی کی فرسودگی سب سے زیادہ تھی، جدید شاعری نے
اس یکسانیت کو مٹایا اور تنوعات کو بہت نمایاں کیا، کلُّ جدیدٌ لذیذٌ مسلّم و مشہور
ہے، فی زمانا مرزا غالب کے قبولِ عام میں بھی راز پوشیدہ ہے؛

زمانے کی رَو کسی کے روکے نہیں رک سکتی، اور اہلِ زمانہ کسی طرح اس کے
اثر سے بچ نہیں سکتے، تنہا شاعر کو اچھا یا برا کہنا انصاف سے بعید ہے، وہ
حقیقۃً زمانے کا ترجمان ہوتا ہے، جو دیکھتا ہے، جو سنتا ہے اور جن واقعات
کو اپنے ارد گرد پا کر متاثر ہوتا ہے وہ صرف اس کا پیدا کیا ہوا ماحول نہیں،
بلکہ سوسائٹی اور سماج کے ماحول سے اس کا احوال بھی منقلب اور متغیر ہوتا
رہتا ہے اس لئے کسی شاعر کی شاعری کو براہِ راست برا کہنا، اگر فنی اعتبار
سے صحیح ہے، قرینِ انصاف نہیں، اردو شعرائے قدیم کی عریانی مضامین،
پستی خیالات قابلِ گفتگو ضرور ہیں، مگر زمانے کا رنگ دیکھ کر گفتگو کرنی چاہئے
اس وقت کی خصوصیتیں جو فیشن، آزادی، بے پردگی، بے باکی وغیرہ کے نام
سے منظرِ عام پر ہو رہی ہیں وہ پرانی باتوں سے زیادہ قابلِ بحث و نظر ہیں۔
بات یہ ہے کہ دنیا میں سبھی زاہد و عابد نہیں۔ زاہد مناجاتی کے ساتھ رند
خراباتی بھی دنیا میں رہتے ہیں، ان کی بھی سوسائٹی ہوتی ہے زمانہ ان کو
بھی اپنے زیرِ اثر رکھتا ہے۔ اس صورت میں وہ شاعری جو سو برس پہلے پسند
کی جاتی تھی اس کو اسی زمانے کے چشمے سے دیکھنا چاہئے نہ کہ اس زمانے کی
دوربین سے۔ پرانی طرز کی شاعری کو نقالی، کورانہ تقلید اور سرقہ و اخذ سے
منسوب کر کے ٹھکرایا جاتا ہے اور موجودہ شاعری کو صحیح جذبات و تاثرات کی
تصویر کہہ کر اس لئے سراہا جاتا ہے کہ وہ ذاتی واردات ہیں، جن کو سچا موتی
کہنا چاہئے یہاں کہنے والوں کو اس کہنے کا حق ہے کہ جدید شاعر اپنے موجودہ
عنوانات کے تحت میں جو نظمیں موزوں کرتے ہیں ان میں چاند، سورج،
صبح، شام جیسے مضامین کے علاوہ کتنے عنوانات ایسے ہیں جن میں خود بعض
ذاتی تجارب شامل ہیں، اگر تفتیش کی جائے تو شاید ہی احسانِ دانش
کی طرح کوئی ایسا [illegible] مزدوروں کی محنت و زحمت کو اپنی آنکھوں
سے کماحقہ دیکھا ہو اور سرمایہ داروں کی خود سری اور راحت کو ایک کتاب

کی طرح جانچا ہو۔ یا بھیری اور تنگے کے پیچھے جگنوں جگنوں یا محلوں محلوں یا باغوں باغوں لٹے ا پھرا ہو۔ اس قسم کے اکثر عنوانات پر بھی سماعی وقیاسی تفکر و تخیل سے کام لیا جاتا ہے جو زیادہ تر از دماغی یا سماعی ہوا کرتے ہیں۔ اس صورت میں پُرانے اور نئے شعرا کی مفکرانہ سخن گوئی میں کیا فرق نظر آتا ہے بجز اس کے ایک شاعری منتشرانہ حالت میں ہے دوسری منتظمانہ صورت میں۔ انداز بیان اور اسالیب کلام جُدا جُدا ہیں مگر نتیجہ یکساں۔ یہ کہنا کہ غزل گوئی وہی کر سکتا ہے جو خود عاشق کا تجربہ رکھتا ہو یعنی اس کے لئے دلِ زخمی درکار ہے لیکن جب کہ عشق کی حد بندی نہیں ہو سکتی تو عشق صرف اس کو کیوں کہا جائے جو غزل کے معشوق سے کیا جاتا ہے

خدا و رسول، ماں باپ۔ اہل و عیال، علم و عمل وغیرہ سے بھی عشق ہوتا ہے تو بہر صورت عشق کا تجربہ حاصل ہو سکتا ہے اور مجازی عشق و محبت کی مہارت یقیناً حقیقت تک پہنچا سکتی ہے، ہجر و وصال صرف جنسی تعلقات تک محدود نہیں بلکہ ہر محبوب شے کا عدم و وجود انسانی قلوب پر یکساں اثر پذیر ہوتا ہے، خلاصہ یہ کہ شاعری کا کسی حُسنِ طبع پر انحصار نہیں بلکہ اُسے صرف ذوقِ صحیح درکار ہے۔

پُرانے زمانے کے شعرا علمی و ادبی درسیات کے بعد اور مذاقِ صحیح پیدا کرنے کے بعد شاعری کے میدان میں قدم رکھتے تھے، اور اب اسکولوں اور کالجوں کے لان پر آتے ہی ٹینس اور والی بال کی طرح شعر و شاعری سے کھیلنے لگتے ہیں۔ قاعدہ ہے اور لازمی قاعدہ ہے کہ جس کام کا شوق کیا جائے اُس کے تمام متعلقات اور اُس کی فنی معلومات کا حاصل کرنا مقدم رکھا جائے۔ شاعری کے لئے صرف موزونیٔ طبع کافی نہیں بلکہ ذوق کی تکمیل پہلے مشق و مزاولت سے کرنی چاہئے۔ جو ایک دو دن میں حاصل نہیں ہوتی اور نہ ایک آدھ دیوان کی ورق گردانی سے آتی ہے، بلکہ یہ دولت اہلِ کمال کی صحبتوں اور اربابِ ادب کی محفلوں میں شریک ہونے سے میسر آتی ہے، پُرانے زمانے کے اہلِ ذوق ایک دو سال نہیں بلکہ مدتہا اساتذۂ فن کی خدمتوں میں زانوئے ادب تہ کرتے اور اپنی قابلیت فنی بڑھایا کرتے تھے۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی ہمت کرتے تھے۔ اس زمانے میں یہ مواقع کہاں ملتے ہیں۔ ہماری اقتصادی اور معاشی تنگیوں نے ہمیں اس کہنے پر مجبور کر دیا ہے کہ

شاعری کیجیے تو روٹی جا کے کس گھر کھائیے

اس صورت میں جیسی ناکمل واقفیت و ناقص معلومات ہوگی اُسی قدر ہماری شاعری ساقط الاعتبار رہوگی۔ سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے عزیز نوجوان باوجود مذاق و قابلیتِ عمومی صرف موزونیٔ طبع کے بھروسے پر شاعری کا میدان مارنا چاہتے ہیں، حالانکہ شاعر جس کو بجا طور پر مصورِ کائنات کہا جاتا ہے اُس کا علم نامحدود ہونا چاہئے کیوں کہ کائنات کے ممکنات میں کوئی ایک ہی چیز نہیں ہے بلکہ بے شمار مناظرات و مظاہرات پیشِ نظر ہیں اور ان سب پر مصورِ کائنات اپنی وسعت معلومات سے قلم فرسا ہو سکتا ہے اور پھر اس افسوس میں اور اضافہ ہو جاتا ہے جب کہ ایسے نوجوان موزوں طبع اپنی ابتدائی مشق کو انتہائے کمال سمجھ لیتے ہیں۔

بول چال کے معمولی الفاظ۔ شَرَف۔ عَرَق۔ مَرَض۔ حتیّ الامکان، دائم المرض وغیرہ کو شَرْف۔ عَرْق۔ مَرْض۔ حتّٰی الامکان، دائم المریض کہتے ہوئے ایسے لوگوں کو علانیہ اور بے ساختہ سنا جاتا ہے جن کی استادانہ قابلیت مسلّم و مستند ہے، پھر طرّہ یہ کہ ایسی باتوں کی گرفت پر وہ قابو سے باہر ہو جاتے ہیں، مقولہ تو یہ ہے کہ "ازلغت غرشتہ عاری است" مگر مشاہدہ یہ ہے کہ "درلغت اصلاح بندہ جاری است"!

خود درایتوں کا یہ حال کہ اس وقت جب کہ سارا زمانہ ڈاکٹر سر اقبال کو کمل اور بہترین مفکر و شاعر مان رہا ہے بعض حضرات ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو اُن کی شاعری کو غلط اور مہمل بتا کر اس کا قافیہ بقافیہ جواب دے رہے ہیں ایسی صورت میں اُردو کی جدید شاعری کے متعلق کس کے منھ میں زبان ہے کہ وہ کچھ کہہ سکے!

چلتے چلتے اپنے عزیز نوجوانانِ قوم و ملک کی خدمت میں بطور مشورت یہ گزارش ہے کہ "ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد" کے ماتحت اس وقت نظم سے زیادہ نثر کی خدمت کرنی چاہئے اور اپنی علمی و ادبی قابلیت کو تراجم کے لئے وقف کر دینا چاہئے

اس مقالے میں گفتگو کی بہت گنجائش تھی مگر وقت کی قلت اور اپنی علالت نے اتنا موقع نہیں دیا کہ میں ان اشارات و کنایات سے زیادہ وضاحت کر سکتا اور اب اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں ؎

احسن وظیفۂ تو دُعا گفتن است و بس
در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

(غیر مطبوعہ)

احسن مارہروی (مرحوم و مغفور)

چلے گئے

وہ روح بنکر آئے اور آکر چلے گئے — پھر میرے دل کو درد بنا کر چلے گئے
گہرائیوں میں دل کی سما کر چلے گئے — تھے جس قدر حجاب اُٹھا کر چلے گئے
سینے میں بھر گئے مرے کچھ شعلۂ و شرار — صبر و سکوں میں آگ لگا کر چلے گئے
رونے پہ میرے رحم نہ آیا اُنھیں ذرا — طوفان حسرتوں کا اُٹھا کر چلے گئے
میری کنارِ شوق کو دے کر نئے فریب — تقدیر کو تھپک کے، سُلا کر چلے گئے
کانوں میں میرے بھر گئے رومانِ زندگی — اک نغمۂ حیات سُنا کر چلے گئے
بیچارگی نہ دیکھی مرے دستِ شوق کی — دامانِ ناز اپنا بچا کر چلے گئے
کوثر فروشِ نرگسِ گلنجانہ ساز سے — ہر رنگ کی بہار دکھا کر چلے گئے
اپنی ادا و ناز کے سکے بٹھائے لے — میرا ہر اک غرور مٹا کر چلے گئے
دل کو مرے تمام تصور بنا دیا — ذہن و دماغ پر مرے چھا کر چلے گئے
اک خاص نغمہ بربطِ دل پر کیا ادا — اک گیت سازِ روح پہ گا کر چلے گئے
یوں بے نیاز کر گئے دونوں جہان سے — وہ دولتِ جمال لٹا کر چلے گئے
اب میں ہوں اور خوابِ پریشانِ زندگی — جادو تمام رات جگا کر چلے گئے
وہ دل کو دے گئے ابدی بیقراریاں — اک عمر بھر کا روگ لگا کر چلے گئے

ابتک نہیں ہے ہوش مجھے اپنے حال کا
اتنا ہی یاد ہے کہ وہ آکر چلے گئے

(غزل)

حاجی نبی احمد بریلوی

مرزا عبدالقادر بیدل

سنہ ۱۶۴۴ء تا سنہ ۱۷۲۰ء

مرزا بیدل توم اولاس چغتائی سے تھے عظیم آباد میں سنہ ۱۰۵۴ ہجری مطابق سنہ ۱۶۴۴ عیسوی میں بعہد شاہجہاں پیدا ہوئے. سپہ گری پیشہ تھا. ان کے چچا مرزا قلندر نے (جو شیخ کمال کے خاص مرید تھے) انکی پرورش کی. سلسلۂ قادریہ سے ددھیالی اور ننھیالی تعلق تھا. پہلے رانی ساگر (بہار) میں چچا کے ساتھ قیام پذیر رہے پھر قصبہ آرہ میں اقامت اختیار کی اور وہاں ایک بزرگ شاہ یکہ آزاد سے فیض حاصل کیا۔

جب شاہجہاں کی بیماری کی خبر سُن کر شاہ شجاع نے بنگالہ کی طرف سے حملہ کیا تو مرزا بیدل اس کی فوج میں شامل تھے اسوقت اُن کی عمر چودہ پندرہ سال سے زیادہ نہ تھی سنہ ۱۰۷۱ھ میں جب وہ مرزا قلندر کے ساتھ اڑیسہ آئے تو شعر وسخن کا ذوق پیدا ہوچکا تھا اور وہ فی البدیہہ شعر کہنے لگے تھے سنہ ۱۰۷۶ھ میں انکے چچا مرزا قلندر کا انتقال ہوگیا تو خود مرزا بیدل نے حسب ذیل تاریخ نکالی تھی

بگوش ہوشم آخر ہاتفی گفت
قلندر یافت وصل جاودانی

۱۰۷۶ھ

—— (۲) ——

مرزا بیدل سنہ ۱۰۸۰ھ میں آگرہ میں قیام پذیر تھے اور اس وقت تک شعر و سخن اور تصنیف و تالیف کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کرلی تھی. سیر و سیاحت اُن کا دوسرا محبوب شغل تھا. چنانچہ شمالی ہند کے اکثر شہروں میں قیام کیا اور ہر جگہ کے صاحبان علم و فضل اور صوفیائے کرام سے ملاقاتیں کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انشا پردازی اور شاعری کے علاوہ فلسفہ اور تصوف میں بھی کمال پیدا کیا۔ ان کے کشف و کرامات اور خوارق عادات بھی مشہور ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ مرزا بیدل نے جہاں شاہجہاں کے بیٹوں کی لڑائیوں کے وقت اُس کے ایک فرزند شاہ شجاع کی طرف سے اس خانہ جنگی میں حصہ لیا وہاں اورنگ زیب کے فرزندوں کی لڑائیوں میں بھی شرکت کی۔ چنانچہ یہ شہزادہ محمد اعظم کی فوج میں شریک تھے اور غالباً اُس کی وفات اور شکست کے بعد چونسٹھ برس کی عمر میں ملازمت ترک کرکے گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی اور عرصہ تک درویشانہ زندگی بسر کرنے کے بعد محمد شاہ کے عہد میں سنہ ۱۱۳۳ء ہجری میں وفات پائی، اسوقت اُن کی عمر بحساب ہجری ۷۹ سال اور بحساب شمسی ۷۶ سال کی تھی۔

—— (۳) ——

فارسی نظم و نثر میں مرزا بیدل نے ایک اجتہادی شان پیدا کرلی تھی، چنانچہ ان کے تصرفات اور بعض لفظوں اور محاوروں کے استعمال میں بعد کو سراج الدین علی خاں آرزو نے ان سے اختلاف کیا ہے، فارسی شاعروں میں وہ صرف شیخ سعدیؒ کے مداح تھے اور اسلوب اور معانی کے لحاظ سے اپنے لئے ایک نئی راہ پیدا کرلی تھی، وہ پامال شدہ مضامین اور سیدھے سادے اسلوب بیان سے ہمیشہ کنارہ کش رہے. مشکل پسندی اور ندرت ان کے طرز بیان کی سب سے اہم خصوصیت ہے. چونکہ وہ صوفیا کے متبع تھے وحدت الوجود ان کا پسندیدہ مسلک تھا اور ان کے کلام میں اس سے متعلقہ مضامین کی کثرت ہے۔ مطالب و معانی اور اسلوب کی یہی وہ خصوصیتیں ہیں جن کی بعد میں مرزا غالب نے تقلید کرنے کی کوشش کی اور فارسی کے علاوہ اُردو میں بھی ان خصوصیتوں کو نبھانا چاہا، اگرچہ اسکی وجہ سے انھیں بڑی زحمت اُٹھانی پڑی اور آخر میں اعتراف بھی کرنا پڑا کہ

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے

—— (۴) ——

مرزا بیدل کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:—

نثر :- (۱) چار عناصر بیدل (۲) نکاتِ بیدل (۳) رقعات بیدل

نظم :- اشارات و حکایات ۔ معلقات و نکات ۔ عرفان و طور معرفت ۔ محیط اعظم ۔ اور طلسم حیرت مثنویاں ہیں ان کے علاوہ دیوان میں غزلیں ۔ رباعیاں قصیدے ۔ تاریخی قطعات ۔ ترکیب بند اور ترجیع بند بھی شامل ہیں

قصیدے زیادہ تر مذہبی موضوعوں پر لکھے گئے ہیں اور اگرچہ مرزا کی زندگی کا بیشتر حصہ شہزادوں کی ملازمت میں گذرا تھا لیکن ابتدائی زمانے میں صرف دو تین قصیدے ان کی مدح میں لکھے جن میں سے ایک ، ۴۴ شعر کا قصیدہ شہزادہ محمد اعظم کی مدح میں ہے ۔ بقیہ قصائد زیادہ تر حضرت علیؑ اور اولاد علیؑ کی منقبت میں ہیں ۔

مرزا کے قطعات تاریخی بھی بہت اہم ہیں ، مادّہ تاریخ نکالنے میں ان کو خاص ملکہ تھا ، ان کے دیوان میں چودہ ہزار تین سو سے زائد اشعار موجود ہیں ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اچھے شاعر ہونے کے علاوہ پُر گو بھی تھے ۔

(۵)

مرزا بیدل کی شاعری قلیل عرصہ میں اتنی مقبول ہوئی کہ ہر نوجوان اُنکے طرز کی تقلید میں کامیابی حاصل کرنے کو اپنا طرۂ امتیاز سمجھتا تھا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان میں فارسی کو زوال ہو رہا تھا اور گولکنڈہ اور بیجاپور کے کتب خانوں سے اورنگ زیب کے ساتھ اور اسکے بعد کی آئی ہوئی اُردو کتابوں کو دیکھکر اہلِ دہلی نے بھی اُردو میں لکھنا شروع کر دیا تھا اور خاصکر ولی اورنگ آبادی کے دیوان نے دہلی کی شعر و سخن کی محفلوں میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا ۔ اتفاق کی بات ہے کہ دیوان ولی کے دلی پہنچنے کے چند ماہ بعد ہی مرزا بیدل کا انتقال ہو گیا ۔ اگر وہ کچھ اور دن زندہ رہتے تو فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو کے بھی بہت بڑے شاعر ہوتے ۔ کیونکہ اس دیوان کو دیکھکر دلی کے اکثر فارسی گو شاعروں مثلاً سراج الدین علی خاں آرزو ۔ شاہ ظہور الدین حاتم ۔ میر مظہر خانخاناں وغیرہ نے فارسی گوئی ترک کرکے اُردو میں لکھنا شروع کر دیا تھا ۔ مرزا بیدل اس وقت اگرچہ بڈھے ہو گئے تھے مگر انھوں نے بھی ولی اورنگ آبادی کی تقلید میں چند شعر اُردو زبان میں لکھے ۔ جن میں سے حسب ذیل دو شعر بہت مشہور ہوئے اور اُردو شاعروں کے تذکرہ میں درج کرنے کے قابل سمجھے گئے ۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں — اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا — پردہ سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

(ڈاکٹر) سید محی الدین زور قادری
ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی (لندن)

(ختم)

لطفِ سخن

اک برقِ تجلّی نے ، میری تعمیر کے ٹکڑے کر ڈالے — تدبیر کے ٹکڑے کر ڈالے ، تقدیر کے ٹکڑے کر ڈالے
پایا نہ تھا جب تک اُس بت کو ، میں اپنی پرستش کرتا تھا — ہاتھ آ گئی جب اصلی صورت تصویر کے ٹکڑے کر ڈالے
بھولا ہوا جب تک تھا چپ تھا جب آ گئی اُس کو یادِ وطن — بس ایک ہی جست میں قیدی نے زنجیر کے ٹکڑے کر ڈالے
غم میں مرا غمخوار آ ہی گیا ، رونے پہ اُسے پیار آ ہی گیا — تدبیر نے میری قسمت سے تقدیر کے ٹکڑے کر ڈالے

افسانۂ غم کہنے کے لئے سوچے تو بہت کچھ تھے امجد
اک تیز نظر نے ظالم کی تقریر کے ٹکڑے کر ڈالے

(غزل) — امجد حیدر آبادی

مجبوریاں

(غزل)

سر بسجدہ سوئے بزم ناز جانا ہی پڑا
حسن کی تسخیر پر ایمان لانا ہی پڑا

کھیلتی تھی یوں چمن میں شوخیٔ موجِ نسیم
بے تکلف ہر کلی کو مسکرانا ہی پڑا

جلوہ گاہِ ناز میں ہر ناز تھا خنجر بکف
اضطرابِ عشق کا پہلو دبانا ہی پڑا

کیا کہا یہ خود سمجھتی تھی نگاہِ منفعل
آج حالِ سوزِ دل ان کو سنانا ہی پڑا

حسن محوِ ناز و تمکیں فطرتِ دل بندگی
جو کرشمہ ہم نے دیکھا سر جھکانا ہی پڑا

مدعا گو بے نشانی تھا مگر کچھ سوچ کر
خاک ہونے پر مزارِ دل بنانا ہی پڑا

بارگاہِ حسن میں نخوت تھی گو ہمت شکن
دل ہوا مجبور اس حد تک کہ جانا ہی پڑا

شدتِ غم میں جب آہیں بے اثر ثابت ہوئیں
چشمِ تر کو خون کا دریا بہانا ہی پڑا

مائلِ تمکیں رہیں گو حسن کی خودداریاں
عشق کے جذبات پر ایمان لانا ہی پڑا

ہو چکا آزاد جب ہر قید سے جوشِ جنوں
دل کے ہر گوشے کو اک صحرا بنانا ہی پڑا

سنگِ در گو التجائے عشق سے تھا بے نیاز
حضرتِ دل کو مقدر آزمانا ہی پڑا

دل شاہجہانپوری

جذباتِ مستان

(غزل)

مرا سر جذبِ سنگِ آستاں ہے
یہاں سجدے کی گنجائش کہاں ہے

لٹا بیٹھا ہوں جس پر اپنی دنیا
وہ میرا لوٹنے والا کہاں ہے

نگاہوں سے سمجھ لو - کچھ نہ پوچھو
خموشی ہی مری گویا زباں ہے

نہ پھولوں سے نہ شکوہ باغباں سے
چمن اپنا نہ اپنا آشیاں ہے

کسی دن رنگ یہ لا کر رہے گا
لہو جو میری آنکھوں سے رواں ہے

نشاں کیا پوچھتے ہو بے نشاں سے
نشاں کیا اپنا دے جو بے نشاں ہے

تری فرقت میں ہے یہ حالِ مستان
گریباں چاک دامن دھجیاں ہے

خانشری امام الدین خاں مستان
ذربار پاجود - (کاٹھیاواڑ)

مقدّس گناہ

محبت شاہ کو پہلی مرتبہ میں نے دربارِ خواجہ اجمیرؒ میں دیکھا۔ "یہ پیکرِ تمکین" شرقی دروازہ کے قریب والے مقبرہ پر متعدد متنوّع "پیشوایانِ دین" کے جھرمٹ میں آسودۂ تمکیں تھا۔ تبسّم گر حیا پاش نگاہوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ایک لطیف اشارہ کی تعمیل میں ہم دونوں مقبرہ پر فروکش ہوگئے۔ رسمی تعارف کے فوراً بعد ہی غزل کی فرمائش اور فرمائش کے ساتھ ہی غزل سرائی و غزل تابی شروع ہوگئی داد اور اُن شراب ریز ہونٹوں سے جن سے مس ہو کر دشنام بھی رنگیں بن جاتا ہے اُن سرمدی سُروں میں جنھیں سُن کر ناہید بھی پکار اُٹھے "شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو۔"

محبت شاہ شباب شعریت کی اس منزل میں تھی جہاں "کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست" سکر و موسیقیت کے اس مقام سے گزر رہی تھی، جہاں "حُسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے" زندگی کے اس موسم میں سانس لے رہی تھی جسے دنیا "شگفتن گلہائے ناز" سے تعبیر کیا کرتی ہے۔ اور جب ہر گام پر فتنے اُٹھ اُٹھ کر پکارا کرتے ہیں "بید مجنوں کی طرح ہر سرو تھرانے لگا" یہ تھا محبت شاہ کی مہلک جوانی کا عالم۔

مجھے کیا خبر تھی کہ خواجہؒ کے دربار میں مُغتنِ نظر جلووں کی فراوانی کا یہ عالم ہوتا ہے اور اِن دنوں یہ کوچہ "صد طور تماشا" بن جایا کرتا ہے۔

میں درگاہ بہت کم جاتا ہوں اور اپنے سیاہ خانے کے "زاویۂ حادثہ" میں پڑا ہوا اکثر سوچا کرتا ہوں کہ عرس میں آخر تمام دنیا اجمیر میں کیوں سمٹ آتی ہے، کیا اس لئے کہ "جو کچھ مجھے لینا ہے لیلوں گا میں خواجہ سے" یا اس لئے کہ "سرِ اخلاص سے دو پھول چڑھاتے جاؤ" ممکن ہے حضرت خواجہؒ وہ سب کچھ دے سکتے ہوں جو (نعوذ باللہ) اللہ نہیں دے سکتا۔ یا مزارِ خواجہؒ دو پھول اور فاتحہ کے دو بولوں کو ترستا ہو، آخر یہ لوگ اُن کس مپرس مزارات پر بغرضِ فاتحہ خوانی کیوں نہیں جاتے جو حقیقتاً سرِ اخلاص اور دو پھولوں کے محتاج ہیں اور جہاں "جز کثرت پروانہ" کوئی زیارت کرنے والا "نہیں۔

تو پھر کیا یہ لوگ یہاں اِس لئے آتے ہیں کہ فضائے دربارِ خواجہ کیف ریز ہوں، سبحان اللہ جہاں دن رات قوال "خواجہ پیا رنگ دے چندریا" الاپتے ہوں۔ جہاں زائرین ہر آن "کیا نور برستا ہے خواجہ ترے گنبد سے" کا وظیفہ ورد کرتے ہوں۔ جہاں رقیق القلب صوفیا ڈھولک کی ہر تھاپ پر "سپردم بتو مایۂ خویش را" کہہ کر رقص کرنے لگتے ہوں، جہاں ہر قت خانہ مست درویش ہر کسی کو دیکھکر "وہ آرہی ہے کٹے چڑھائے ہوئے پائنچے اٹھائے ہوئے" کا نعرہ لگاتے ہوں جہاں علمائے کرام "سنگِ درِ جانانہ" سمجھ کر سر رکھدیا کرتے ہوں، جہاں غنڈے کسی کو مہربان دیکھ کر دفعتاً چیخ اُٹھتے ہوں "کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں"۔ اور جہاں "ندیدہ نم سایۂ آفتاب" کی مدعی خواتین کا یہ عالم ہوتا ہو کہ "سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں" اس جگہ کی فضا کا کیا کہنا

لیکن اب میں بلاناغہ درگاہ جاتا ہوں، اور اُسی شرقی دروازہ کے پاس والے مقبرہ پر گھنٹوں سر بزانو بیٹھا رہتا ہوں۔ کاش محبت شاہ جن کے ... استغنائے روح کے بارہ میں اُن کے ارادتمند بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں، اپنے دیدۂ باطن کی روشنی میں اتنا ہی دیکھ سکیں کہ یہ زلف گرفتارِ قفسِ جذب کی کس منزل سے گزر رہا ہے اور یہ بتا سکیں کہ "دل کا کیا حال کروں خونِ جگر ہونے تک" مگر انھیں تو بقول کسے، اپنے حلوہ مانڈے سے کام، یعنی پیر صاحب کے مزار کی تعمیر کے لئے چندہ۔ ببتی کے سیٹھ، اور بس۔ آہ پیر اور ایسے تاثر کا جو "خدا کو بھی نہ سونپا جائے" صیاد ادراک آہوئے رمیدہ نما۔ الفساد کا جوا اور غرور الہی بنا کی گردن پر ۔۔۔۔۔۔۔۔

فلسفۂ حسن و محبت۔ میں آج تک اس چیز کا قائل نہ تھا اور نہ شاید ہوتا اگر محبت شاہ کی "نادر شاہی" سے سابقہ نہ پڑتا، میں کہا کرتا تھا کہ حسن نام ہے فریبِ نظر کھانے کا، اور حسین کہتے ہیں گوشت و پوست کے اُس مجسمہ کو جس پر جوانوں کی ملوث بہ گناہ نگاہیں جم کر رہ جائیں .... محبت کو میں نے پہلے کبھی "بازیٔ طفلانۂ دل" سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی۔ محبت میرے نزدیک حقیر قسم کے "خمار گندم" کا نام تھا لیکن ...... آہ آج میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ محبت شاہ کا حسن وہ حسن نہیں جسے میں فریبِ نظر کہکر دل کو دھوکا دے سکوں اور یہ مری خلش وہ خلش نہیں ہے جسے "چڑھی ہے یہ آندھی اُتر جائیگی" کہہ کر نظر انداز کیا جاسکے۔

خواجہ کا عرس ختم ہوگیا ہے۔ زائرین ایک ایک کرکے رخصت ہوچکے ہیں۔ محبت شاہ بھی جاچکی ہیں، مگر اُن کا خیال۔ وہ خیال جو مومن کے "جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا" والے کلیہ سے یکسر مستثنیٰ ہے، نہیں گیا۔ وہ وجود جو میں رگ رگ میں تیر رہا ہے میرے "لمحاتِ شعری" کی تمام تعلیاں کسی کے نازک قدموں پر سر ٹیک رہی ہیں۔

"الٰہی ایں چہ کافر ماجرائی است" وہ غنی میں فقیر۔ میں حریص وہ بے نیاز۔ محرومیٔ وصال کو سعادتِ عظمیٰ سمجھنا مجھ جیسے مغلوب الجذبات انسان کے بس کی بات نہیں۔ فراق کی گھڑیاں جھیلنا ناکامیٔ محبت کو نہایت محبت اور ماحصل عشق گردانناشیوۂ اہل اللہ اور دلیل پختہ کاری ہی سہی ....

"اس شیوۂ فرسودۂ ابنائے روزگار" کا تتبع مجھ جیسے خامکار سے ممکن نہیں یہ سنتِ عشق میں نہ ادا کرسکوں گا ... پھر ....

...... اس سینہ کاوی سے نجات پانے کا ایک اور صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ شادی ...... ترکِ تجرد ...... ازدواجی زندگی ...

شادی کس سے .... اس یتیم لڑکی سے ...... ہاں اُسی یتیم زینب سے جو جہیز میں کچھ لانا تو درکنار اپنے ساتھ اپنے دو یتیم بھائی لائیگی ....

اماں کہہ رہی تھیں زینب خوش رو ہے، ہوگی۔ تعلیم یافتہ ہے خیر یوں ہی سہی ...... میں کسی غریب لڑکی سے شادی نہ کروں گا۔ نہیں میں ایسا نہیں کرنا چاہتا مجھے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ میری موجودہ آمدنی میرے ہی مایحتاج کی متکفل نہیں۔ میں کہاں سے تین تین یتیموں کی کفالت کرونگا ......

نہیں میں اپنے گھر کو یتیم خانہ نہیں بنانا چاہتا .... میرا مجموعۂ کلام۔ میرا سرمایۂ حیات زیورِ طباعت سے کیونکر آراستہ ہوگا ...... ایک ہزار جلدیں۔ دو ہزار کی خطیر رقم ...... آخر کہاں سے لاؤں گا ....

میں تو کسی امیرزادی کو شریکِ حیات بناؤں گا .... اُف ... محبت شاہ کافر محبت شاہ ہاں محبت شاہ کے معاملہ میں میں اپنا نظریہ بدل سکتا ہوں، بدل دوں گا۔ اُس دُرِ یتیم کی خاطر افلاس کی لعنت کو گوارا کرلوں گا ... مگر وہ "تو" جو تو ہے وہی میں ہوں اسے "جلوۂ جانانہ" بن چکی ہے جس نے اللہ سے لو لگائی ہو اُسے مجھ جیسے گنہگار سے کیا سروکار۔

اُسے میں پا نہیں سکتا یہ جانتا ہوں۔ مگر
ہر ایک سانس میں بڑھتی ہے آرزو اُس کی

ایک روز میں انھیں خیالات میں غرق دفتر پہونچا۔ میز پر ایک خوش رنگ لفافہ پڑا ہوا تھا۔ پتہ نسوانی نقوش کا مرہونِ نظر آیا بسرعت تمام چاک کرکے پڑھنا شروع کیا:—

میرے شفیق

"زینب اب بھی یتیم ہے مگر غریب نہیں۔ اب وہ اتنے سرمایہ کی مالک ہے جس سے صرف اُس کے یتیم بھائیوں کی تعلیم و تربیت ہی بدرجۂ احسن نہیں ہوسکتی بلکہ کسی کا مجموعۂ کلام و مضامین بھی زیورِ طباعت سے آراستہ ہوسکتا ہے، کہئے اب کیا کسر باقی ہے۔ جلب زر کے سلسلہ میں زینب نے دُنیا کو دھوکا دیا۔ دھوکا کون نہیں دیتا۔ کیا آپکے ضمیر نے آپ کو کبھی دھوکا نہیں دیا۔ کیا آپ کی نگاہیں آپ کو دھوکا نہیں دیتیں۔ بیشک زینب نے گناہ کیا، لیکن کیا گناہ مقدس قسم کا فرمائیے یہ ترکیب کیسی رہی جبتک بیوقوف زندہ ہیں عقلمند بھوکا نہیں رہ سکتا"

طالب عفو زینب عرف محبت شاہ

میں دفتر جانیکی طیاری میں مصروف ہوں۔ زینب سامنے بیٹھی ہوئی میرے لئے پان بنا رہی ہیں ایک حسین بچہ انکی گود میں مچل رہا ہے وہ اُسے پیار کر رہی ہیں اور مجھ سے پوچھ رہی ہیں:—

"حسن کسے کہتے ہیں اور محبت کیا ہے"

بہار کوٹی

خطبۂ صدارت

جو عالیجناب میجر نواب حافظ حاجی محمد جمشید علیخاں صاحب ایم. بی. ای. ایم. ایل. اے نواب باغپت

نے ۲۶ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو دوسری کُل ہند اُردو کانفرنس کانپور کے مشاعرہ میں پڑھا

شکریہ و تعارف

معزز حضرات!

میں آپ حضرات کی اس ذرہ نوازی کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں کہ آپ نے مجھ ایسے ہیچداں کو اس علمی مجلس کی صدارت کا افتخار ارزاں فرمایا؟ ممکن ہے اس حُسنِ ظن میں آپ کی شاعری کارفرما ہو لیکن میرے لئے بصیغۂ مبالغہ بھی اس حقیقت کا باور کرنا ذرا دشوار ہی ہے کہ کاملینِ سخن اور مشاہیرِ فن کے اس شاندار اجتماع کا صدر بن سکنے کی کوئی اہلیت مجھ میں موجود ہے

بہر حال اپنی ہیچمدانی کے کامل احساس کے ساتھ میں تعمیلِ ارشاد کے لئے حاضر ہو گیا ہوں اور آپ کی نوازشات کا شکر گذار ہوں کہ اس جہت سے مجھے دورِ حاضر کے مشاہیر شعرا کے بلند پایہ کلام سے روحانی مسرت حاصل کرنے کا ایک نادر موقع مل گیا ؎

ما کہ باشیم کہ در بزمِ تو داخل باشیم
دولتِ ماست کہ در حسرتِ محفل باشیم

حضرات!

اُردو کانفرنس کی اہمیت اور اُس کے اغراض و مقاصد آپ سب صاحبان کو جو اس میں شرکت کر رہے ہیں پورے طور پر معلوم ہیں، یہ محل نہیں کہ میں بھی اُنکا اعادہ کروں البتہ اس کانفرنس کے سلسلہ میں ایک آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد جس غرض و غایت کا حامل ہے اُس پر اس نشست میں ایک اجمالی نگاہ ڈال لینا آپکا اور میرا یکساں فرض ہے۔

شعر و شاعری کی ماہیت

اس مسئلہ پر غور کرنے سے قبل کہ کسی زبان کے لٹریچر میں شعر و شاعری کی کیا اہمیت ہے اور انفرادی نقطۂ نظر سے وہ کس طرح ایک زبان کے احیا، و بقا کی ضامن ہے، سب سے پہلا سوال ہمارے ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ شعر کیا ہے؟ اور شاعری کسے کہتے ہیں؟

یہ ایک قدیم بحث ہے اور جس وقت سے الفاظ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنے ہیں تقریباً اُسی وقت سے اس بحث کا آغاز بھی ہوئیا ہے۔ لیکن آج تک شعر و شاعری کی کوئی جامع مطلق اور قطعی محیط تعریف مرتب نہ ہو سکی، یعنی ——

"ہے آئہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا"

اس ناکامی کے اسباب کئی ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ بھی ہے کہ شاعری کا تعلق ہمارے جذبات و محسوسات، وجدان و تخیل سے ہے اور یہ انسان کی وہ روحانی قوتیں ہیں جو تعینات کی قید سے ماورا رہیں، ظاہر ہے کہ ایسے لامحدود موضوع پر اگر میں بھی اپنی کوئی رائے پیش کرنے کی جرأت کروں تو وہ اس وسیع مجلس کا صدر ہونے کی حیثیت سے میری انفرادی رائے تو قرار دی جا سکتی ہے، لیکن کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی بھی وہی رائے ہوگی، اس لئے اپنی ذاتی رائے کو پیش کرنے کی بجائے میں یہ زیادہ مناسب سمجھتا ہوں کہ چند تمثیلات کی صورت میں آپکے سامنے وہی پیش کر دوں جو مجھ سے پہلے سمجھنے والوں نے اُسے سمجھا ہے ؎

ندارم تابِ ضبطِ رازِ می ترسم ز رسوائی
مگر جویم ز بہرِ ہم زبانی بے زبانی را

کہا گیا ہے کہ:-

(۱) شاعری ہماری ذہنیت کا سایہ اور ہمارے قوائے متاثرہ کا ایک

نقشِ مرقی ہے،

(۲) شاعری ہماری رُوح کی تاثر خیز آواز ہے،

(۳) شاعری ناطق مصوری ہے۔

(۴) شاعری ہمارے تاثر و وجدان کی موزونیت کا نام ہے۔

(۵) شاعری محبت ہے۔

(۶) صحیفۂ قدرت کے عمیق مطالعہ کا نام شاعری ہے،

(۷) شاعری کائنات کی وراثت ہے،

(۸) علم موسیقی کی وضع کا خیال شاعری ہے وغیرہ وغیرہ

شعر و شاعری کی ان چند تعریفوں کو آپ اپنے ذاتی نظریہ کی کسوٹی پر کس کر دیکھئے ممکن ہے کوئی نتیجہ خیز اصول مرتب ہو جائے۔

غالباً شاعری کی سب سے آسان تعریف "کلامِ موزوں" ہے مگر اس میں ایک بڑی نازک سی بحث یہ نکلتی ہے کہ شاعری کا کلام موزوں ہونا تو یقینی ہے، لیکن محض کلامِ موزوں کو شاعری کہہ دینا کس حد تک درست ہے؟ جبکہ ؎

دندانِ تو جملہ در دہان اند

چشمانِ تو زیرِ ابروانند

جیسی شاعری بھی کلامِ ناموزوں نہیں کہی جا سکتی،

بہر نوع شاعری کی ان مختلف توضیحات میں سے ہم کسی کو پسند کریں یا نہ کریں کم از کم ایک نتیجہ ضرور اخذ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ شعر و شاعری کی بنیاد کلام کی موزونیت، احساس کی ذکاوت، مشاہدہ کی قوت اور فطرت کے وجدان پر قایم ہے، اور انھیں ارکان کی مناسب ہم آہنگی یا امتزاج سے شعر و شاعری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے،

شعر و شاعری کی اہمیت اور افادیت

شعر و شاعری کا یہ بنیادی خاکہ پیش کرنے کے بعد اب میں آپ حضرات کی توجہ اصل موضوع کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، یعنی شعر و شاعری کی اہمیت۔

بعض ایسے حضرات جو دنیا کی ہر چیز کو تجارتی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں اور شعر و شاعری کو محض تفننِ طبع کا مشغلہ سمجھتے ہیں اُن کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ شعر و شاعری کا ہماری عملی زندگی میں کوئی مفید مصرف نہیں، یہ اعتراض جتنا سطحی ہے اُتنا ہی بے دلیل بھی ہے، دراصل شاعری کی طرح انسانی زندگی کے بھی دو رُخ ہیں، ایک عملی یا مادی دوسرا روحانی، روحانیت ہمارے عمل و کردار کی جان ہے، ہمارا کوئی کام بامعنی نہیں ہو سکتا، ہماری کوئی کوشش کامیاب نہیں کہی جا سکتی، ہمارا کوئی ارادہ حقیقت نہیں بن سکتا، اگر ہماری روحانیت اُس میں شریک نہیں۔ شاعری ہماری روح کی ہمراز ہے، وہ ہمارے احساس و ادراک کو بیدار کرتی ہے، اور ہماری انسانیت کو جلا دے کر ہمیں اپنی بے پناہ عملی و روحانی قوتوں سے آگاہ کرتی ہے، اس سے زیادہ ہماری عملی زندگی کا اور کیا مطالبہ ہو سکتا ہے۔

اُردو زبان کی ادبی ترقی میں شعرا کا ہاتھ

حضرات! اُردو زبان کی اصلاح و ترقی میں اُس کے نازک خیال اور نکتہ رس شعرا کا ہاتھ نمایاں طور پر نظر آتا ہے، اُس کے علم ادب کی ابتدائی تاریخ سے لیکر دورِ حاضرہ تک دیکھ جائیے ہر زمانے اور ہر دور میں آپ کو اس کی مثال ملے گی، بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ ہماری زبان کے لٹریچر میں جو حلاوت و شیرینی، جو سلاست و روانی، جو بلاغت و معنی آفرینی جو گنجائش و ہمہ گیری آج نظر آ رہی ہے وہ تمام تر اس زبان کے مفکر اور ذہین شعرا کی بدولت ہے، اُردو کو بازاری زبان کے پست مقام سے اُٹھا کر ادبی زبان کے بلند معیار پر لانے کی طرف سب سے پہلا عملی قدم جس شخص نے اُٹھایا وہ ہماری زبان کا مایۂ ناز اور زندۂ جاوید شاعر میرؔ تھا۔

میرؔ کی جذبات نگاری، واردات کی ترجمانی، سادگی و پُرکاری نے جن نازک حقیقتوں کو الفاظ کا جامہ پہنایا، اُس نے سب سے پہلی بار ہماری توجہ کو حیرت و سنجیدگی کے ساتھ اس طرف مبذول کیا کہ اس نئی کاروباری زبان میں دشوار فلسفیانہ مسائل، باریک ذہنی نکات، اور عمیق خیالی تاثرات نیز جذبات و احساسات کی برقرار واقعی ترجمانی کرنے کی کتنی صلاحیت موجود ہے۔

میرؔ کے بعد مرزا غالبؔ کی نکات آفرینی اور دقیقہ سنجی نے اگرچہ ایک طرف اُردو نظم کو عرفیؔ و خاقانیؔ کی شاعری کے ہمدوش کر دیا تو دوسری جانب

[illegible]نگاری میں وہ اسلوب ایجاد کیا جو کسی بڑی سے بڑی ترقی یافتہ زبان کے لئے باعثِ [illegible]شک ہو سکتا ہے،

غالب کے بعد انیس کی واقعہ نگاری، فطرت کی ترجمانی، اور مناظر کشی نہ صرف [illegible]دو زبان کی خارجی شاعری کا متاعِ بے بہا ہیں بلکہ خود مشرقی لٹریچر میں ایک مستقل [illegible]ضافہ ہیں۔

انیس کے بعد مرزا داغ کی محاورہ بندی اور شیریں بیانی نے زبان کو صاف [illegible]ستھرا اور عام فہم بنایا، پھر حالی، چکبست، اور اقبال آئے جنھوں نے اُردو کو اُس [illegible]راجِ کمال پر پہونچا دیا جہاں ؎

[illegible]نگی مضمر ہے اُس کی شوخیٔ تحریر میں تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

[illegible]ردو شعر و ادب میں [illegible]قی و اصلاح کی گنجائش

لیکن ان تمام تدریجی ترقیات کے باوجود اُردو شعر و شاعری میں ابھی کافی ترقی و اصلاح کی گنجائش موجود ہے [illegible]ہماری شاعری کا داخلی پہلو ابھی اتنا بلند نہیں جتنا بلند مشرقی روحانیت کا [illegible] اُسے دیکھنا چاہتا ہے، بقول علامہ اقبال ؎

[illegible] اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے شمع یہ سودائی دل سوزیٔ پروانہ ہے

دُنیا کی ترقی یافتہ زبانوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے [illegible]بان جتنی سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے اور جتنی آسانی کے ساتھ دقیق علمی نکات [illegible]فی الذہن مطالب اُس میں آشکار ہو سکتے ہیں اُتنی ہی ترقی یافتہ وہ سمجھی جاتی ہے [illegible]صول کے پیش نظر ہمیں اپنی شعر و شاعری کی زبان و بیان میں اصلاح کی ضرورت [illegible] آتی ہے، کوئی شک نہیں کہ نثر کی بہ نسبت نظم میں اس اصول کی پابندی زیادہ [illegible]وار ہے لیکن پھر اس مشکل کو آسان کرنے کی جتنی صلاحیت و اہلیت شاعر کو [illegible]یت کی گئی ہے اُتنی انشا پرداز کو نہیں ——— الفاظ خیالات کا لباس ہوتے [illegible] یہ مسلّم ہے کہ اس لباس کی جتنی بہتر تراش خراش ایک شاعر کو معلوم ہے اور اس [illegible]س کی صحیح قیمت کا جتنا سچا اندازہ اُسے ہو سکتا ہے کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا۔

نظر براں اگر یہ راہ نظم میں آسان ہو جاتی ہے تو پھر نثر میں کسی مزید کوشش [illegible] ضرورت ہی باقی نہیں رہتی،

[illegible]شاعروں کی تنظیم و اصلاح

اسی طرح ہمارے شاعرے بھی ہماری توجہ کے محتاج ہیں، ابتداءً مشاعرے کی حیثیت بڑے لوگوں کی تفریحی محفل سے زیادہ نہ تھی پھر رفتہ رفتہ مشاعرے اساتذۂ فن کی مقابلہ آرائی کے میدان بنے جن میں فریقین کے عقیدتمند، صاحبِ ذوق اور ذی علم لوگ عموماً شریک ہونے لگے، اس کے بعد طرحی دور چلا جس کا کم و بیش ابتک رواج ہے۔

شاعروں کی یہ خصوصیت کہ علمی خدمت کے ساتھ ہی ساتھ ان میں تفریحی رنگ بھی موجود ہے، عوام و خواص کی دلچسپی کا موجب ہوئی، چنانچہ آج بھی زندگی کی تجارتی مادہ پرستی اور دیگر کشمکشوں کے باوجود ہمارے شاعروں کے بین الاقوامی اجتماعات اُردو زبان کی مقبولیت، ہر دلعزیزی اور مشترک حیثیت کو روزِ روشن کی طرح آشکار کر رہے ہیں، اگر ہم چاہیں تو اہلِ ذوق و اہلِ فن کی ان مجالس کو اُردو علم و ادب کی خدمت کے لئے اور کار آمد بنا سکتے ہیں، غالباً اُردو شعر و شاعری کے لئے یہ زیادہ مفید ہوگا اگر اب شاعروں کو مناظروں کی صورت میں بدل دیا جائے اور مصرع طرح کی پابندیوں کو یکسر اُٹھا دیا جائے، اُس کے بجائے شاعروں کے انعقاد سے قبل کسی مخصوص موضوع پر شریک ہونے والے شعراء کی نظمیں فراہم کر کے کتابی صورت میں انھیں شائع کرا دیا جایا کرے، اور شاعرے کے موقع پر برائے فروخت یا تقسیم (جیسی صورت ہو) وہ شرکاءِ شاعرہ کے لئے مہیا کر دی جایا کریں، اس طرح اُردو نظمیات میں معتدبہ تصانیف کا اضافہ ہو سکے گا۔

اس کے علاوہ شاعروں کے موقع پر اساتذۂ فن اور مشاہیر سے بعض فنی موضوعات مثلاً الفاظ کے ترک و اختیار، زبان و محاورات کی اصلاح اور ادب و انشا کے دیگر مابہ النزاع مسائل پر تقریریں کرنے کی استدعا کی جائے اور ان تقریروں کی اشاعت و طباعت بھی تاکہ فلم کمپنیوں اور ریڈیو اسٹیشنوں سے جو ایک گمراہ کن پروپیگنڈہ اس بارے میں جاری ہو چکا ہے۔ اُس کی بروقت روک تھام ہو سکے۔

الفاظ کے ترک و اختیار کا مسئلہ

حضرات! مندرجۂ بالا اداروں کے ماسوا، اُردو زبان کے بعض جدید کرم فرما بھی اس زبان کے اکثر

اکثر الفاظ و محاورات کو قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں اور ضرورت وایجاد کے حیلے سے زبان میں بعض ایسے اہم تغیرات دیکھنے کے متمنی ہیں جو محلِ نظر ہیں۔

میں ذیل کی فہرست میں انگریزی، فارسی اور ہندی زبان کے بعض وہ عام فہم الفاظ پیش کرتا ہوں جو آجکل بعض خود ساختہ مصلحین زبان کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔

(انگریزی الفاظ)

اسکول، کالج، کونسل، کلاس، مشین، ٹکٹ، سکنڈ، منٹ، نمبر، پروپیگنڈہ، سکریٹری، اڈیٹر وغیرہ۔

(فارسی وعربی الفاظ)

خلیج، بحر، ساحل، تجویز، تائید، تقریر، مطالبات، دیہات، اضلاع، ترقی، نہایت، یقیناً، مدعی، مدعی علیہ، عرضی، درخواست، صدر، جلسہ، عوام، جمہوریت، ماہوار وغیرہ۔

(ہندی الفاظ)

بھلا، سہانا، رسیلا، سماں، اندھیرا، ادھورا، گاؤں، اچپن، کٹھن، سمجھ بوجھ، دھواں دھار، گھاٹوپ، کس بل، وغیرہ

ایسے اور اس قسم کے اور بہت سے الفاظ کو اردو سے خارج کر دینے اور ان کی بجائے دوسرے نامانوس الفاظ کی ریل پیل کے معنی سوائے اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ آپ زبان کو سرے سے بدل دینے پر آمادہ ہیں۔

اس اشارے سے میرا یہ مدعا ہرگز نہیں کہ زبان میں جدید اصطلاحات الفاظ کا اضافہ ہی نہ کیا جائے، مجھے کامل احساس ہے کہ بغیر اس کے زبان کی ترقی و اصلاح ممکن نہیں، گفتگو صرف اس میں ہے کہ جو الفاظ ہماری زبان میں شامل ہو کر رائج ہو چکے ہیں اور جن کے صحیح مفہوم سے عوام و خواص پورے طور پہ آگاہ ہیں۔ انھیں محض جدت پسندی یا دوسری اغراض کی بنا پر رد کر دینا کس حد تک قرینِ انصاف ہے؟

اردو کو ملکی سیاسیات سے علیحدہ رکھنے کی ضرورت

حضرات! زبانِ اردو آج کل جس نازک دور سے گذر رہی ہے وہ اس کی زندگی میں بڑا اہم اور سخت وقت ہے یا دش بخیر اس زبان کی دلکشی اور دلربائی کا ایک وہ زمانہ بھی تھا جب اپنے تو اپنے پرائے بھی اس کے میٹھے بول اور پیارے لفظوں کو سرہنے اس کے نثر کی طرح دلکش و دلنشیں اندازِ بیان پر وجد کرتے اور اس کے بانسری سے زیادہ نرم اور رسیلے لہجے پر جھوم جاتے یا اب یہ زمانہ ہے کہ اغیار تو ایک طرف بعض یگانے بھی اسے اپنی زبان کہنا عار سمجھتے ہیں اور اس کے الفاظ کو زہر کی طرح مسموم اور گناہ کی طرح بھیانک جانتے ہیں۔

حالات کی یہ صورت، ذہنیتوں کا یہ تغیر، فطرت کی یہ کایا پلٹ نتیجہ ہے ہماری سیاسی بے راہ روی، کورانہ خود غرضی، اور نفاق و جہالت کا، یہ حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ اردو ہندوستان کی مشترک زبان ہے، کسی خاص قوم یا فرقے کی ملکیت نہیں، اس مقدس ورثہ کو جو ہمیں اپنے آبا و اجداد سے پہونچا ہے۔ سیاسی مصلحتوں اور ذاتی شکر رنجیوں کی بھینٹ چڑھا دینا نہ صرف اپنی زبان کے ساتھ غداری ہے بلکہ ملک و قوم کے اتحاد و یکجہتی کے لئے بھی ناقابلِ تلافی نقصان ہے

ہمارا فرض ہے کہ ہم خود اس فریب سے خبردار رہیں اور دوسروں کو اس بے راہ روی سے باز رکھیں۔

اختتام و شکریہ

ان چند معروضات کے بعد میں پھر ایک بار آپ صاحبان کی اس نوازشِ بیکراں اور کرمِ بے پایاں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جس کی بدولت مجھے اپنے ناچیز خیالات کے اظہار کا موقع ملا، داستان دلچسپ تھی اس لئے اس کا طویل ہو جانا ناگزیر تھا، اُمید ہے کہ اب آپ حضرات اس خشک بحث کی تلافی اپنے روح پرور کلام سے فرما دیں گے ؎

حدِ من نیست کہ در پیشِ تو گویم سخنے
دوست داند کہ مرا قوتِ گفتار نماند

———— ۰ ————

دردِ دل

جانے کیا آیا خیالِ قادرِ قیوم میں
پڑگیا اک تفرقہ سرمایۂ معسوم میں

چاند کو سیمیں شعاعیں مہر کو سوزِ دروں
مل گئی تاروں کو ضوتابی بمقدارِ فزوں

خوئے تسلیم و رضا سے جو ہوا فائز مرام
ہوگیا سیلابِ رنج و غم کا اسیر اختتام

دیدیا حسن جفا پیشہ کسی بیدرد کو
بھر دیا دل میں کسی کے سیلِ آہِ سرد کو

کی گئیں نغمہ میں مضمر کیف کی سرمستیاں
بلبلِ یک مشتِ پر نے پائیں خوش الحانیاں

بخشدی پستی زمیں کو آسماں کو رفعتیں
کی عطا غلماں کو عصمت حور کو دیں عظمتیں

بخشدیں پھولوں کو آب و رنگ کی رعنائیاں
برگِ گل کو تازگی دی شاخ کو انگڑائیاں

نوعِ انساں میں کسی کو جاہ و حشمت مل گئی
اور کسی کو دولتِ صبر و قناعت مل گئی

کردیا اک دائمی احساس کا حامل مجھے
یعنی اُسنے بخشدی جاگیر دردِ دل مجھے

دردِ دل وہ دردِ دل جو ہے متاعِ کائنات
صبح جس کی صبحِ عید اور شام جنت جسکی رات

دردِ دل ہی پر ہے حسن و عشق کا دار و مدار
جس سے مستحکم ہے رفتارِ مدارِ روزگار

دردِ دل ہی زندگی ہے جذبۂ احساس کی
زیست کے دھوکوں سے کرتا ہی یہی دامن تہی

دردِ دل کی ہر تڑپ دیتی ہے پیغامِ حیات
لمحۂ رنگیں ہے اس کا حاملِ صد کائنات

دردِ دل ہے باعثِ افزائشِ نورِ بصر
رات دن رہتے ہیں انوارِ حقائق جلوہ گر

دردِ دل کی ٹیس سے پڑتی ہے جو رخ پر شکن
بنتی ہے آخر وہ فردوسِ نگاہِ اہلِ فن

دردِ دل عنوانِ حسن و عشق کی تمہید ہے
کاہشوں کے ہاتھ میں یا قسمتِ امید ہے

دردِ دل ہے وسطِ دریا، دامنِ ساحل بھی ہے
چل پڑے تو کارواں رک جائے تو منزل بھی ہے

دردِ دل خود رازِ ہستی ہی حجاب اندر حجاب
خواب ہے دنیائے فانی اور یہ تعبیرِ خواب

سازِ فطرت ہے حقیقت میں نوائے دردِ دل
دردِ دل سو جان سے خود ہے فدائے دردِ دل

(نظم) رونق دکنی

اصلاحِ سخن

سید دل محمد رضا صاحب فضا جالندھری کی غزل پر لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم کی اصلاح

شوخ
ہوا ہے جب سے دل شیدا کسی کی تیکھی چتون پر
نظر آتی ہے تیغِ خونفشاں ہر وقت گردن پر

کیا ہے خاک کیا حاصلِ کشتِ تمنا کو
~~مری کشت امید و بیم دم میں خاک کر ڈالی~~
نگاہِ یار نے بجلی گرا کر دل کے خرمن پر

اگر حکمِ رہائی مل نہیں سکتا اسیروں کو
~~نہ تڑپا فصلِ گل میں عندلیب زار کو اتنا~~
قفس ہی رکھدے اے صیاد تو دیوارِ گلشن پر

وہی اے دل ستمگر مقتل تری حسرت نکالے گا
~~اسی پر دم نکلتا ہے اسی پر جان جاتی ہے~~
قضا صدقے ہوا کرتی ہے ہر دم جس کی چتون پر

نمایاں یہ اثر دیکھا کسی کے حُسنِ دل کش میں
~~کوئی دیکھا کرے کب تک ادھر ہیں ٹکٹکی باندھے~~
نظر ہٹتی نہیں چلمن سے جب پڑتی ہے چلمن پر

توجیہ:

۱- "تیکھی" کی "ی" دب رہی تھی اس لئے شوخ بنا دیا گیا۔

۲- اصل شعر میں "امید و بیم" بیکار سے تھے، اس کے علاوہ "دم میں" کی بجائے اک دم میں یا دم بھر میں ہونا چاہیے تھا۔ قابل اُستاد نے فضا صاحب کے مفہوم کو ترقی دیکر "خرمن" کے اعتبار سے "حاصلِ کشتِ تمنا" بنا دیا۔ لفظ "کیا" نے مصرع میں جان ڈال دی ہے۔ بہت اچھی اصلاح ہے۔

۳- بظاہر مصرع اولیٰ میں کوئی سقم نہیں تھا لیکن دوسرے مصرع میں چونکہ "ہی" تھا اس لئے پہلے مصرع میں کسی تاکیدی لفظ کی ضرورت تھی "اگر" نے اس مقصد کو پورا کر دیا۔ اس کے علاوہ اب مصرع اولیٰ بہت صاف اور بلند ہو گیا۔

۴- دونوں مصرعے غیر مربوط تھے۔ مصرع اولیٰ کا مفہوم واضح نہیں تھا۔ نہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کس کا دم نکلتا ہے اور کس کی جان جاتی ہے۔ اصلاح سے مفہوم واضح ہو گیا۔ دوسرے مصرع میں ہر دم کی بجائے پیہم معنوی اعتبار سے بہت مناسب ہے۔

۵- فضا صاحب کے مصرع میں کوئی غلطی نہیں تھی۔ فاضل استاد نے مصرع بدل کر اس میں ترقی پیدا کی ہے۔ اب پورا شعر بہت اچھا ہو گیا۔

اعجاز صدیقی

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح :- "ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لے گی"

حضرتِ نوح ناروی

حُسن کا لطف غمِ عشق کی دُنیا لے گی
آہ نکلے گی نکلتے ہی کبھی جا لے گی

کیا کہا پھر تو کہو دل نہ تمھارا لیں گے
تم نہ لوگے تو نہ لوگے اِسے دُنیا لے گی

اس میں آزار بھی ہے قہر بھی ہے جور بھی ہے
عشق ہمارا روگ طبیعت نہ مری پالے گی

آٹھویں قسم بھی ملتی نہیں ظالم کی نگاہ
یہ تغافل ہے تو وہ میری خبر کیا لے گی

پھر سرِ طور چمک کر وہ ہیں آنے والے
لطف دیدار کا اب چشمِ تماشا لے گی

تم سلامت ہو تو میں مُت سے ڈرنے کا نہیں
جان لینے کو وہ آئیگی مگر کیا لے گی

پھر بلا آئے گی دُنیا میں محبت کی قسم
پہلے وہ جائزۂ اہلِ تمنا لے گی

تذکرہ اور کرے کوئی یہ اُمید نہیں
عشق کا نام مگر حُسن کی دُنیا لے گی

بحرِ آلام میں اک وہ بھی زمانہ ہوگا
نوح کشتی مری ساحل کا سہارا لے گی

حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی

گر انگڑائی مری چشمِ تماشا لے گی
حُسن کی شوخیوں سے طور کا بدلا لیگی

کاہشِ شوق کا کبتک یونہی چلا لیگی
نئی کروٹ بھی کوئی دلِ تمنا لیگی؟

فرصتِ امن و سکوں کشمکشِ عالم کو
پھر ترا نام مری روحِ شکیبا لیگی

نکہ یاس مری کاوشِ دل تیری سپرد
تو مرے عقدۂ دشوار کو سلجھا لیگی

انقلاب آئینگے عشرت کدہ عالم میں
انتقام اپنی تباہی کا یہ دُنیا لیگی

طور کا ذکر ہے پھر مصر کے بازاروں میں
پیرہن کوئی نیا حسرتِ موسیٰ لیگی

آشیاں میرا جو اسکو نہ ملا گلشن میں
میرے مدفن پہ بہار آ کے بسیرا لیگی

قوتیں تیری سلامت ہیں اگر بامِ حرم
پھر سہارا ترا دیوارِ کلیسا لیگی

جب سے تم کو ہے تقاضائے مداوا سیماب
وہ نظر جائزۂ دردِ تمنا لیگی

حضرتِ کمالی سینائی جمشید پور

کجروی کر کے تری تیغ مزا پا لیگی
داغ دیجائیگی خود مجھ کو مرا کیا لیگی

ناز بیجا ہے جوانی کی توانائی پر
زیست خود موت کا اک روز سہارا لیگی

سبزۂ گورِ غریباں سے جو گزری شبنم
چار آنسو مری تربت پہ بھی ٹپکا لیگی

چاکِ خود ساز کو تضحیک کا دیگی موقع
اور کیا دامنِ یوسف سے زلیخا لیگی

اے جوانی تری اس دیر شناسی کے نثار
اب جو مرنے کے دن آئے تو مصلّا لیگی

خاکِ مرقد مری میت کی سکوں پائی کو
بن پڑیگا تو ترا نقشِ کفِ پا لیگی

کھو گیا راہِ طلب میں جو کمالی تو مجھے
خود مری سعی بھی پھر ڈھونڈھ کے پا لیگی

حضرت راغب ہاشمی برہانپوری

لینے دو گردشِ ایام جو بدلا لے گی
جان لیگی مری وہ اسکے سوا کیا لیگی

خون رُلوائیگی پھر دل مجھے تڑپا لیگی
اور تو اے خلشِ درد مرا کیا لیگی

کانپ اُٹھیگی لرز جائیگی دُنیائے ستم
کروٹ اک دن جو مرے درد کی دُنیا لیگی

جب دمِ جوشِ جنوں ہوگا گذر صحرا میں
بڑھ کے خود میرے قدم وسعتِ صحرا لیگی

مرکزِ جلوہ گہہ ناز بنے گا مرا دل
وادیٔ دل میں جگہ برقِ تجلّا لیگی

کب ملیگی مجھے شامِ شبِ فرقت سے نجات
کس دن انگڑائی مری صبحِ تمنا لیگی

میری بخشش کی تمنا سرِ محشر راغب
دامنِ شافعِ محشر کا سہارا لے گی

حضرتِ کوکب شاہجہانپوری

بیکسی عشق کی جب ہو کے جو بدلا لیگی
جور کا نام نہ پھر حُسن کی دُنیا لے گی

کیا سمجھانے کے لئے کیجئے ترکِ اُلفت
اپنے قبضہ میں ہا کیا ہے وفا کیا لے گی

ہو سکے گی نہ کبھی میری محبت ممنون
میں بدل جاؤنگا تقدیر جو پلٹا لے گی

حرف آئیگا کسی طرح نہ خودداری پر
دل جو مچلے گا بھی اُمید اسے بہلا لیگی

غیر ممکن ہے کہ اب کوئی بھلائے اُن کو
دل میں وہ ہوں گے، ہاں نام کسی کا لیگی

عشق مایوس نہ ہوگا کبھی ناکامی سے
زندگی موت کا ہرگز نہ سہارا لیگی

ہے حقیقت میں محبت، جو محبت ہو کب
بھول کر وہ نہ کبھی نام تمنا لیگی

حضرت الم مظفر نگری

گردشیں تا بکجا [illegible] لیگی
کیا [illegible] کبھی گردش دُنیا لیگی

ڈوب کر کشتیِ دل بحر غم اُلفت میں
جائزہ شورش گرداب فنا کا لیگی

دھیان [illegible] ہے ساقی کہ مری تشنہ لبی
میکدے سے جو تری نام ترا لیگی

خود سمجھ لیگی کہ ساحل کی حقیقت کیا ہے
ناؤ جب ڈوب کے [illegible] دریا لیگی

مختصر کیوں ہوئی جاتی ہے خدا سے شب غم
کیا تو گزرا ہوا مرا خون تمنا لیگی

سعی ناکام کے پردے میں [illegible] حیات
جنبش قطرہ کبھی وسعت دریا لیگی

میں تو ہوں گرد [illegible] دامن اٹھائے دُنیا
ساتھ چلکر یہ ترا چار قدم کیا لیگی

اپنی ہی آگ میں جل [illegible] سوز تمام
انتہا کیا [illegible] آتش سینہ لیگی

تا رگ دل [illegible] خون [illegible] الم
[illegible] دل میں اگر [illegible] لیگی

جناب صبا متھراوی

[illegible]
ختم [illegible] تری اُمید سنبھالا لیگی

مجھ کو کیا تیری جوانی تو کبھی تڑپا لیگی
جب کبھی [illegible] عشق کا بدلا لیگی

تیرے اخلاص کے صدقے تری [illegible]
[illegible] دل کا سہارا لیگی

حسرت دید تمنائے جو [illegible] شباب
آپ [illegible] تعزیر حسن [illegible]

[illegible] کبھی ہوتا ہے [illegible]
ایک بار اور جوانی تری پلٹا لیگی

[illegible] معراج محبت تو ملے
[illegible] ذوق تماشا لیگی

حسن رنگیں کی نگاہ و غمزہ انداز صبا
[illegible] خون تمنا لیگی

جناب رضا قریشی گوالیاری

فطرت عشق نہ احسان قضا کا لیگی
تم نہ لوگے تو مری جان تمنا لیگی

خواہش غم کے مطابق مجھے غم بھی نہ ملا
میری افسردہ دلی لطف سکوں کیا لیگی

لے گیا ایک نظر میں جو اُسے لینا تھا
چشم نظارہ در و بام سے اب کیا لیگی

بچ کے طوفان سے نکل آئی مگر ڈوب گئی
تجھے کشتی سے تھی امید کنارا لیگی

درس عبرت ہی مرا قصہ انجام وفا
بھول کر نام وفا وں کا نہ دُنیا لیگی

بھولنے والا مرا لاکھ بھلائے مجھ کو
وہ جہاں ہوگا مرا نام بھی دُنیا لیگی

ہو نہ جنگ رضا آج یہ دنیا سے مگر
ایک دن تھک کے محبت کا سہارا لیگی

جناب برق صدیقی فتحپوری

راز اگر میری تباہی کا کبھی پا لیگی
پھر یہ دُنیا نہ کبھی نام وفا کا لیگی

دل میں کانٹا جو کھٹکتا ہے وہ کیسے نکلے گا
جان آخر خلش خار تمنا لیگی

ایک ہے قطرہ برباد کا آغاز و مآل
مجھ کو آغوش میں پھر وسعت دریا لیگی

ناخدا ساحل مقصود ملے گا کہ نہیں؟
کیا کبھی کشتی امید کنارا لیگی؟

بار خاطر ہے تو جلووں کی کوئی کر تدبیر
ورنہ انگڑائی بہر حال تمنا لیگی

ماسوا سے نہ رہا کچھ بھی علاقہ مجھ کو
اب طبیعت غم و عشرت سے اثر کیا لیگی!

رائیگاں ہوگی نہ برباد وفا کی ہستی
ہر زمانہ میں سبق برق سے دُنیا لیگی

ہمدرد ادب جناب رونق دکنی از جمشید پور

نگہ حسن محبت کی جو تصویر پا لیگی
جائزہ دل کا باندازِ تمنا لیگی

گیسوئے حسن میں اک اور گرہ ڈال بھی دو
دل کی آشفتہ مزاجی اثر اچھا لیگی

ہو بہانہ تو کوئی ترک علائق کے لئے
یوں قضا اپنے سر الزام نہ تنہا لیگی

آپ سے شکوہ بجا ہستیِ موہوم کا ہے
آپ کی ہوتی یہ کیوں نام کسی کا لیگی

چھٹ گیا ہاتھ سے گر یاس میں دامان اُمید
کس کا دار زندگی شوق سہارا لیگی

وضع داری میری ہستی کی نہیں تک حرص
دولت غم بھی باندازِ شکیبا لیگی

تابکے، گردش دُنیائے سکوں لے رونق
"ایکبار اور یہ دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

جناب طالب جبلی

دل میں انگڑائی اگر میری تمنا لیگی
حسن کے دامن رنگیں کو کبھی جا لیگی

خود بخود ہوگی پریشان تری زلف کی یاد
یہ بھلا مجھ سے اُلجھ کر شب غم کیا لیگی

آپ بھی مجھ سی چھڑا لیں گے جو دامن اپنا
تو پھر اُمید مری کس کا سہارا لیگی

کسی انجام پہ پہونچے گا تجسس میرا
اک نہ اک روز مری لوح تجھے پا لیگی

کب عیادت کے لئے آؤگے تم بالیں پر
کب سنبھالا مرے ارمان کی دُنیا لیگی

آگئی یاد تمہاری تو شب فرقت بھی
باتوں باتوں میں دل زار کو بہلا لیگی

میں اندھیری میں نہ تنہا رہوں گا طالب
ظلمت گور بنا رخ زیبا لیگی

ہمدرد ادب جناب نسیم گوالیاری

میری رگ رگ میں جو انگڑائی تمنا لیگی
میں تو کیا چیز ہوں انکو بھی یہ تڑپا لیگی

کنج عزلت میں تری یاد کئے جاتے ہیں
چھیڑ کر ہم کو زمانے کی فضا کیا لیگی

قلب مایوس نے یہ یاس سے کہہ رکھا ہے
تجھ سے بدلا میری ایک ایک تمنا لیگی

دفع الفت میں تمہیں آرزوئے جاں ہو تمہیں
جو تمہارے یہ تمنائے دلی کیا لیگی

دل میں ہے جذبۂ آزادی و حب الوطنی
"ایک بار اور یہ دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

تیرا ہی جاہے جولے بادِ مخالف کر لے
نقش ہستی کے مٹانے کے سوا کیا لیگی

عمرِ رفتہ کو منا لاؤ کسی طور نسیم
"ایک بار اور یہ دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

جناب انور ایولوی

ایک دن جان ہی یہ جان کی لیوا لیگی
اور کیا اس کے سوا موت ہمارا لیگی

یاد اس شوخ کی پہلے مجھے تڑپا لیگی
اور پھر میری ہی تسکیں کا سہارا لیگی

میں سمجھتا ہوں کہ جان آپ ہی لینگے میری
ساری مخلوق مگر نام قضا کا لیگی

دل بھی حاضر ہے جگر بھی ہے مری جاں بھی ہے
پوچھتا ہوں تری چتون سی بتا کیا لیگی؟

دورِ موجود کے آثار سے یہ روشن ہے
"ایک بار اور یہ دنیا ابھی پلٹا لیگی"

تو گرفتارِ قفس ہوں مرا بھی اے صیاد
کچھ دنوں بعد اسیری مجھے بہلا لیگی

دن گذاروں گا کسی شغل میں اپنے انور
کثرتِ رنج و الم دل مرا بہلا لیگی

جناب رعنا عشرتی

دفعتاً روح کی خلوت میں تمھیں پا لیگی
جب سنبھالا مری ناکام تمنا لیگی

کر کے بے پردا انھیں موجِ نظر کیا لیگی
اپنے سر اور نئی تہمتِ جلوا لیگی

یاد نے تیری اگر لو نہ بڑھائی اس کی
شمعِ اُمید ہوا دل کا سہارا لیگی

جس میں رقصاں ہوں تری سیکڑوں رنگین جمال
وہ نظر باغ میں کیا لطفِ نظارا لیگی

آپ بے پردا سرِ طور وہ آجائیں گے
جھکیاں ذوق میں جب نیتِ موسیٰ لیگی

بے حجاب آئے ذرا سامنے وہ برقِ جمال
امتحاں عشق کا کب تک پسِ پردا لیگی

چل رہا ہے ہمیں آثار و قرائن سے پتہ
کوئی کروٹ نئی رعنا ابھی دُنیا لیگی

جناب اجمل بنگلوری از بمبئی

دیر و کعبہ تو کجا، اُس کو یہیں پا لیگی
کبھی دُنیا جو نظر جانبِ دل ڈالیگی

سر نگوں ہونے سے ملجائیگا بامِ رفعت
خاکساری تری ہر دل میں جگہ پا لیگی

بحرِ اُلفت میں اُبھرنا تو رہا ایک طرف
ڈوبنے والے کا ہر موج کنارا لیگی

بعد میرے مری وحشت کا رہے گا چرچا
میری دیوانگی سے درس دُنیا لیگی

عشق سے واسطہ آسائشِ دُنیا کو نہیں
وہ شہیدانِ محبت کی خبر کیا لیگی

زندگی بھر تو ملی میری تباہی میں پناہ
بیکسی بعد مرے کس کا سہارا لیگی

میں ہوں اور عشق و محبت کی فضا ہے اجمل
ہوئی دُنیا جو مخالف تو مرا کیا لیگی

جناب انور گوالیاری

چین برباد ہی کر کے مجھے دُنیا لیگی
طیشِ رفتہ کا میری جان سے بدلا لیگی

درد خواہی کے لئے حشر میں ہونگے لاکھوں
ہم نہ لیں گے جو ترا نام تو دُنیا لیگی

کہکے منصور انا الحق بڑی زحمت میں پھنسے
یہ نہ سمجھے تھے کہ دُنیا اثر اُلٹا لیگی

آپ کے ظلم و ستم کا بھی سہارا نہ رہا
زندگانی مری اب کس کا سہارا لیگی

اُن کو ضد ہے تو شبِ ہجر مری غیرت بھی
جان دیدیگی نہ احسانِ مسیحا لیگی

اک نظر ڈالکے وہ رہ گئے میرے دل پر
میں تو سمجھا تھا کہ دُنیا ابھی پلٹا لیگی

دل سے بے جان لئے جا نہیں سکتی انور
جان ہی ایک نہ اک روز تمنا لیگی

جناب نیر لکھمی (مدراس)

رخ مرکز کی طرف اپنے کھنچی جاتی ہے
تنکا اب موجِ سرِ ساحلِ دریا لیگی

کر رہا ہوں میں بصد ناز چمن میں اعلان
میری بے بال و پری چرخ سے بدلا لیگی

دفعتاً پلٹے گا تغیرِ نظامِ عالم
جب اجل تیرے اشاروں کا سہارا لیگی

کھو دیں زلف گرہگیرِ عروسانِ جمال
تنگیٔ صحنِ چمن وسعتِ صحرا لیگی

ہوں وہ مشاق شناور کہ اگر ڈوب گیا
کشتیٔ جاں مری کروٹ تہِ دریا لیگی

اثر اندازِ پھر یادِ رخِ شاہدِ عشق
جو گڑی بھر کے نظر پھر رہِ صحرا لیگی

نظر اُٹھے گی اِدھر اور اُدھر اے نیر
نگہِ ناز مرا قلبِ شکیبا لیگی

جناب شفا گوالیاری

امتحاں اُنکی نظر جب کرے دل کا لیگی
کر ڈیں دل میں نئی درد کی دُنیا لیگی

کوئی حد بھی ہے، کہاں تک کوئی مشتاقِ نظر
آپ کے وعدۂ فردا کا سہارا لیگی

درسِ عبرت ہے مرا حال زمانے کیلئے
نام الفت کا نہ اب بھول کے دُنیا لیگی

کیا خبر تھی کہ قیامت ہے نگاہیں ملنا
امتحاں اُنکی نظر میری نظر کا لیگی

ایک دل تھا مری پہلو میں اُسے دے ہی چکا
اب خدا جانے وہ دزدیدہ نظر کیا لیگی

دلِ پُرشوق محبت میں یہ مایوسی کیوں
تیری تقدیر کسی روز تو پلٹا لیگی

مجھ کو مرنے کا نہیں رنج، خوشی یہ ہے شفا
نام تو ذکرِ وفا پر مرا دُنیا لیگی

جناب قمر نعمانی سہسرامی

داورِ حشر سے میرا گلۂ حسن غلط!
یہ محبت نہیں ایسی کہ جو بدلا لیگی

جن کو جنت کی تمنا ہو وہ جنت مانگیں
فطرتِ عشق فقط حسن کی دُنیا لیگی

کیا مرے پاس رہا ہے جو تری نذر کروں
اے نگاہِ غلط انداز بتا کیا لیگی

وہ کریں مجھ پہ عنایت تو یہ اُنکی مرضی
غیرتِ عشق تو احسان نہ کسی کا لیگی

میری محرومیٔ قسمت پہ ہنسا جائے گا
اور دلچسپی تو کیا مجھ سے یہ دُنیا لیگی؟

وہ کسی طرح مرے سامنے آجائیں قمر
نگہِ یاس جو چاہے گی وہ سمجھا لیگی

جناب مختار ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ لکھیم پور کھیری

مجھے ناکامیٔ تقدیر بتا کیا لے گی
غمِ امروز نہ لیگی غمِ فردا لیگی؟

تیری انگڑائی کا انداز بتاتا ہے ہمیں
"ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

دامنِ شوق میں وسعت تو بہت ہے لیکن
آپ جو دیں وہ سر آنکھوں پہ تمنّا لیگی

میں نے مانا ہے محبت کی نظر لا حاصل
آپ دیکھیں تو سہی آپ کا یہ کیا لیگی

کر چکے جان تو پہلے ہی محبت میں نثار
اب قضا آئی ہے پوچھو تو ذرا کیا لیگی

پڑ گئے منجدھار میں مایوس نہ ہونا مختار
ڈوبتی ناؤ بھی تنکے کا سہارا لیگی

جناب وحید نولوی۔ غازیپور

ظالموں سے وہ یہیں ظلم کا بدلا لیگی
"ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

بزمِ وحدت میں جہاں بارشِ کثرت ہوگی
ہمّتِ ذرّہ وہاں وسعتِ صحرا لیگی

جان جسکی ہے امانت میں اسے دیدونگا
موت آتی ہے تو آجائے مرا کیا لیگی

یا الٰہی جنھیں دُنیا میں نہیں چین نصیب
اُن غریبوں کی بھی قسمت کبھی پلٹا کیگی

خاکِ زریں مری ٹھوکر سے اُڑا کر دیکھو
گو ہے پامال مگر روح ثریّا لیگی

جو مقدر میں ہے ملجائیگا وہ خود ہی وحید
کیوں یہ غیرت مری احسان کسی کا لیگی

جناب عاصی ننگھتلہ (ضلع حصار)

فطرتِ عشق اگر حشر میں پلٹا لیگی
اپنے مجنوں کے قدم دوڑ کے لیلیٰ لیگی

کیوں قیامت کا گماں سانس کی رفتار پہ ہو
چلتے چلتے یہ فقط ایک ہی جھٹکا لیگی

حسرتِ سینہ کی جو کھاتی رہی یہی شب و روز
کونسے منھ سے زباں نام خدا کا لیگی

تجربہ درسِ محبت میں سبق دیتا ہے
اور بازار سے سودا نہ زلیخا لیگی

ہو چکی ہونے کو تنظیمِ جہاں کی لیکن
"ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

شیخ پر ہوگا یہ عاصی کو تفوّق حاصل
اُس کی رحمت طلبی خلد میں حصّا لیگی

جناب بزم امروہوی۔ گیان پور

زندگی کو ہوس زر ہے مگر کیا لیگی
پھول برباد کئے جائیگی کانٹا لیگی

وقت اظہارِ محبت کا تمنّا لیگی
اور اک بار یہ دُنیا ابھی پلٹا لیگی

پار ہو جائے گی دریا سے فنا کے کشتی
سانس اُکھڑی ہوئی جب نام تمہارا لیگی

شبِ غم اور اسے ہم سے کوئی کام نہیں
جان لیگی نہ ہماری تو قضا کیا لیگی

یہ تو ہے کام محبت کا کریگی وہی کام
دل نہ جس بات کو سمجھے گا وہ سمجھا لیگی

انقلاب آئیگا بدلے گا زمانہ اے بزم
ایک بار اور یہ دُنیا ابھی پلٹا لیگی

جناب اثر ذائقی بنگلوری

جو تری مشقِ جفا مجھ کو مٹا ڈالیگی
نامِ اُلفت نہ کبھی بھول کے دُنیا لیگی

تیرے دیوانوں کی ٹکّر ہی رہِ صحرا لیگی
موسمِ گُل کی خبر قید میں جب پا لیگی

دہشتِ مرگ سے ناداں نہ کر نقل مکاں
تو جہاں بھی ہو وہاں تجھ کو قضا جا لیگی

فتنہ سامانیٔ عالم یہ خبر دیتی ہے
"ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

میری قسمت میں ازل سے ہے لکھی محرومی
درِ تاثیر پہ پھر جا کے دُعا کیا لیگی

لے اثر حشر میں آئینگے وہ بن ٹھن کے ضرور
لذتِ دید مری چشمِ تمنّا لیگی

جناب شگفت سیتاپوری کلٹی

صبح چہرے سے ترے دن کا اُجالا لیگی
شام زلفوں سے تری شب کا اندھیرا لیگی

عطر و خوشبو سے ہوئے دشت و چمن پھر خالی
پھر صبا حُسن کے پھولوں کا پسینا لیگی

وہم بھی پہلے نہ تھا اب ہی قرینہ غالب
"ایک بار اور بھی دینا ابھی پلٹا لیگی"

آئیے اپنی کہانی تو مرتب کر دیں
نسلِ آئندہ بھی کیا نام ہمارا لیگی

اے شگفت تجھ کو عبث فکر درخشانی ہے
قسمتِ حسن تو خود عشق کو چمکا لیگی

جناب ایم۔ اے صابر بمبئی

لطف سجدوں کا جبیں کیا تنِ تنہا لیگی
دلِ ناکام کو ہمراہ نہ تو کیا لیگی

اور ہے کون سوا اسکے سزاوارِ کرم
معصیت ہی تری رحمت کا سہارا لیگی

رائیگاں ہو نہیں سکتی یہ مری سعیٔ وفا
سینکڑوں دردِ وفا سے مری دُنیا لیگی

چشمِ باطن ہی بہر طور ہم آغوشِ مراد
چشمِ ظاہر ترے جلوؤں کا مزہ کیا لیگی

پھر بہار آنے کو ہے پھر سے چمن میں صابر
پھر دوبارہ مری قسمت کوئی پلٹا لیگی

جناب کوثر نقوی۔ گڑھی کوٹاہہ

ہوش تو لے لیا اب قلب شکیبا لیگی
وہ نگاہِ مترنم ابھی کیا کیا لیگی

دل ہوسیٰ بھی لیا، تابِ نظر بھی لے لی
اور کیا اس کے سوا وادیٔ سینا لیگی

نگہِ شوق کہاں جلوۂ بے باک کہاں
جان اک روز مری حسرتِ بیجا لیگی

نہ رہیگا نگہِ شوق پھر ارماں کوئی
ایک انگڑائی اگر برقِ تجلا لیگی

انقلاباتِ دما دم سے ہے ثابت کوثر
"ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

جناب سیّد محمد ذاکر صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

جب کبھی آنکھ مری جائزہ دل کا لیگی
اسی کاشانے میں تجھ کو بھی کہیں پا لیگی

یاد میں قامتِ جاناں کی جو نکلی مری روح
شاخِ طوبیٰ پہ کسی روز بسیرا لیگی

آنکھ کو اپنے تصور کو اجازت دیدے
دل یہ اپنا تری تصویر سے بہلا لیگی

دولتِ عشق میں لے جاؤنگا اپنے ہمراہ
بجز اک خاک کے تودے کے اجل کیا لیگی

پھر کریگی کہیں آسودہ منزل ذاکر
پہلے وحشت مجھے ہر راہ میں بھٹکا لیگی

جناب وفا اکبر آبادی

آنکھ جب دل کے تصور کا سہارا لیگی
لاکھ پردوں میں بھی جلوؤں کو تری پا لیگی

فطرتِ منتقم انساں سے بدلا لے گی
"ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

ٹیس زخمِ دلِ مجروح کی خود ہے درماں
کیوں یہ بے فائدہ احسانِ مسیحا لیگی

خود نظر آئیگا تو، نزدِ رگِ جاں سب کو
کام جب دل کی نظر سے کبھی دُنیا لیگی

گر سلامت ہے وفا شانِ تصور میری
دل کے آئینے میں عکسِ رُخِ زیبا لیگی

جناب انجم احمد آبادی

یہ نہ کہئے کششِ ذوقِ نظر کیا لیگی
حُسن پر قطنے بھی پردے ہیں اُٹھا ڈالیگی

ہے ابھی گردشِ گرداب کے حلقے میں اسیر
جانے کب کشتیٔ اُمید کنارا لیگی

انقلاب آئے ہیں دنیا میں کئی بار مگر
"ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

فیض ہے سوزِ غمِ عشق کے دُنیائے سکوں
ابھی پلٹی نہیں کچھ دیر میں پلٹا لیگی

دہرِ فانی کی نہیں تجھکو خبر اے انجمؔ
ایک دن درسِ فنا ہستیٔ اشیا لیگی

جناب عباس انصاری دھولیوی

پھر بہار آئی جنوں خیز بہاریں لیکر
پھر مری وحشتِ اُلفت رہِ صحرا لیگی

تجھ سے اے دورِ فلک مجھ کو یہ امید نہ تھی
برق بھی میرے نشیمن کا سہارا لیگی

چاکِ دامن سے نکل آئی ہے خود راہِ نجات
نام کیا حضرتِ یوسفؑ کا زلیخا لیگی

کام یوں بھی جو نکلتا ہو تو کچھ عیب نہیں
بڑھ کے غیروں کے قدم میری تمنا لیگی

عشق میں ہے جو یہی سوز و گدازِ عباسؔ
درسِ عبرت مرے اشعار سے دنیا لیگی

جناب ہلال کوکشی۔ ریاست دھار

خونِ دل، خونِ جگر، خونِ تمنا لیگی
اور مجھ سے تری کافر نگہی کیا لیگی

ابھی زد میں نہیں معلوم وہ کیا کیا لیگی
ایک انگڑائی اگر برقِ تجلا لیگی

ہو لا سکوں سندِ محبت، تو تصور میں آ
یاد تیری مجھے کچھ دیر تو تڑپا لیگی

ناخدا خود ہو خدا بحر میں جس کشتی کا
پھر وہ کس موج کا طوفاں میں سہارا لیگی

نامۂ شوق ہی آیا، نہ وہ خود آئے ہلالؔ
نئی کروٹ کوئی جذبات کی دُنیا لیگی

جناب تنویر احمد آبادی

سعیٔ پیہم مری جب ہاتھ میں شانا لیگی
گتھیاں عقدۂ تقدیر کی سلجھا لیگی

انقلاب آئیگا اک روز قیامت بردوش
"ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

خاک ہونے دو رہِ عشق میں ان کے ورنہ
میں نہیں تو نہ سہی خاک میری جا لیگی

وصل ہو جائیگا دیوانۂ اُلفت کو نصیب
اپنی آغوش میں جب وسعتِ صحرا لیگی

بے نیازانہ طبیعت مری تنویرؔ نہ پوچھ
عیشِ امروز نہ فکرِ غمِ فردا لیگی

جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی

"ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی"
یہ اُتر جائے گا تو دوسرا چڑھا لیگی

توڑ کر شاخِ نشیمن کی نہ پھینکا ہو کہیں!
بلبلِ زار کہاں جاکے بسیرا لیگی؟

میرے عصیاں کا جو کر لیگا جہنم سودا!
رحمتِ حق کے لئے کیا ہے؟ وہ پھر کیا لیگی؟

طور پر جلنے ہی کیوں؟ دیکھنے اسکو موسیٰؑ
کیا خبر تھی کہ نظر حُسن کی یوں کھا لیگی

بے صلہ ہی سہی طرفہ یہ ادب کی خدمت!
بعد مرنے کے مرا نام تو دُنیا لیگی؟

جناب قیس ملوری

چٹکیاں دل میں اگر تیری تمنا لیگی
لہر ہر خواہشِ دل صورتِ دریا لے گی

ہے متاعِ دل و جاں پیشِ نگاہِ جاناں
جو پسند آئیگا اس کو وہی سودا لیگی

ہونگی نیرنگیاں اشعار کی پھر قابلِ دید
شاعری صورتِ دُنیا ابھی پلٹا لیگی

عشق کی گتھیاں سلجھائی اسے کیا مطلب
اپنے سر مفت کا جھگڑا نہ یہ دُنیا لیگی

نظمِ سیمابؔ ہی گنجینۂ معنیٰ اے قیسؔ
نام سرکار کا ہر حال میں دُنیا لیگی

جناب حفیظ ریوانی

غور سے کام اگر چشمِ تماشا لے گی
ذرّے ذرّے سے ترے حُسن کا جلوا لیگی

رنگ بدلیگی کسی شعبدہ بازی کے لئے
"ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لیگی"

چشمِ حق میں جو تعین کی حدوں سے گذری
بُت سے اللہ صنم خانے سے کعبا لیگی

گھر تو میدان کئے دیتی ہے وحشت میری
اور جو پاؤں نکالیگی تو صحرا لیگی

منتسب ہیں جو یونہی حضرتِ سیمابؔ حفیظؔ
خوف سے خلق نہ نام ان کا وہ دنیا لیگی

جنابِ اثر گلشن آبادی

جانتا ہوں مجھے اک دن یہ زمیں کھا لیگی
مجھ سے میری فلک آرائی کا بدلا لیگی

طور کچھ اور ہی کہتے ہیں تری چتون کے
"ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لیگی"

آکے بازارِ غمِ عشق میں میری فطرت
اور کیا لیگی ترے عشق کا سودا لیگی

کوئی ٹوکے نہ سرِ حشر مری حسرت کو
اپنی بگڑی ہوئی یہ آپ ہی بنوا لیگی

ہر تکمیلِ جنوں گھر سے میں نکلا ہوں اثرؔ
میری وحشت خبرِ وسعتِ صحرا لیگی

جناب قمر احمد آبادی

زندگی ہاتھ میں جب جامِ فنا لیگی
دیکھتے دیکھتے دُنیا مری پلٹا لیگی

طور کی طرح میں پُھک جاؤں گا اے چشمِ کلیم
امتحاں پھر جو مرا برقِ تجلّی لیگی

میری ہستی ہے حقیقت میں بیاضِ عبرت
دیکھنا درسِ فنا مجھ سے ہی دُنیا لیگی

ڈھونڈھ ہی لیگی رہِ ظلمتِ اُلفت میں تمہیں
جستجو ہاتھ میں جب شمعِ تمنا لیگی

لے قمرؔ کفرِ محبت سے بچا لیو دامن
ورنہ ایماں کششِ بادِ کلیسا لیگی

جناب غافل از بتول سی۔پی

وہ جو سمجھیں گے تو حسرت مری سمجھا لیگی ورنہ محشر میں خدا چاہے تو بدلا لیگی

تو مجھ جل جل کے فنا ہے یہی انجام جفا ہم سے تو شمع بھلا درسِ وفا کیا لیگی

کس کو معلوم ہے کیا ہو، مگر انداز یہ ہے "ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

جانتا ہوں کہ مری جان کے دو گاہک ہیں تم جو لے لوگے مری جان قضا کیا لیگی

لاکھ ہو جاؤ خفا عشق میں تم غافل سے اُس کی فطرت ہی کچھ ایسی تمھیں بہلا لیگی

جناب ارشاد مانیوملی۔ گیان پور

تیرِ سوختہ کو قلب میں بھڑکا لیگی جب کہیں چین مری چشم تمنا لیگی

جتنا جی چاہے ستا لے مجھے اے دورِ فلک ایکدن آہ مری ظلم کا بدلا لیگی

بے سبب گردشِ افلاک نہیں ہے قائم "ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

بیوفا ہے کہ وفادار ہے آخر کیا ہے؟ امتحاں یاد مری آپ کے دل کا لیگی

جناب رسوا مراد آبادی

اُس نے کیا کیا نہ لیا اور نہ کیا کیا لیگی زُلفِ پُرخم تری کونین کو اُلجھا لیگی

نذر تو کر چکا سب عالمِ رنگیں اپنا اور کیا مجھ سے تو اے گردشِ دُنیا لیگی

چھوڑتے چھوڑتے ہا مجھکو مری حالت پر ناامیدی تو کہاں تک مرا پیچھا لیگی

بیخودی عقل پہ غالب جو ہوئی اے رسوا گتھیاں رازِ خودی کی ابھی سلجھا لیگی

جناب احقر کا بٹوی از بھنڈارہ

جب تصور میں مال صورتِ زیبا لیگی ہم بھی دیکھیں گے حیا کون سا پردا لیگی

کی نظر حشر میں اے رحمتِ مولا مجھ پر معصیت تیرے سوا کس کا سہارا لیگی

صبحِ عشرت سے بدل جائیگی، شامِ غربت "ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

مجھ کو اُمید ہے احقر کہ تلطف کی نظر مری بگڑی ہوئی تقدیر بنا ڈالیگی

جناب سلیم علوی۔ بورنگ پلیٹھ

میری نظروں سے قیامت میں چھپیں گے کیونکر نگہِ شوق ہزاروں میں تمھیں پا لیگی

میں وہ مجنوں ہوں کہ مجنوں بھی ہے شاگرد مرا مجھ سے آ آکے سبق عشق کا دُنیا لیگی

یار کی حشر خرامی کا نیا عالم ہے "ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

میں وہ ناکام تمنا ہوں مری تربت پر درسِ عبرت کا سلیم آکے یہ دُنیا لیگی

جناب شاطر (عطا پیلور)

ساتھ اشکوں کے اگر بہہ گیا دل خوں ہوکر چشمِ خوددار تو پھر کس کا سہارا لیگی

اپنے دل ہی تو خود پوچھ ... یہ شالے کس کو معلوم ہے کیا چشمِ تمنا لیگی

... پیغام زمانہ کا عروج "ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

ہم اگر چاہیں تو پروازِ تمنا شاطر ایک ہی جست میں یہ عالمِ بالا لیگی

جناب بسمل بھنڈاروی

اپنی تقدیر کو اے شاکی تقدیر نہ رو تیری تدبیر ہی تقدیر کو چمکا لیگی

اس سے مطلب نہیں ناقوس ہو یا بانگِ اذاں لطفِ لبیک مرے شوق کی دُنیا لیگی

ہو گیا جلوۂ محبوب تصور کتنا ر اور کیا چیز مری چشمِ تمنا لیگی

خونِ بسمل کی ہر اک بوند سمجھ لے قاتل حشر کے روز تری تیغ سے بدلا لیگی

جناب وارث سہادوی

بعد موسیٰ ہی سہی آپ دکھائیں جلوہ لطفِ نظارہ میری چشمِ تماشا لیگی

رُخِ روشن پہ ہے بیکار یہ افشاں بازی چاندنی رات نہ تاروں کا سہارا لیگی

ضد نہ موسیٰ کبھی کرتے جو یہ ہوتا معلوم طور پر ہوش تری برقِ تجلی لیگی

ابھی یکسوئی کہاں اس کو میسر وارث "ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لیگی"

جناب ڈاکٹر بصیر از ملباگل

جنگِ یورپ سے بخوبی ہے یہ روشن ہم پر "ایک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

دیکھیں کب تک نگہِ ناز رہے گی غافل دیکھیں کب تک یونہی صبرِ دلِ شیدا لیگی

تیغ اُن کی نہ اُٹھے گی، یونہی مر جائیں گے ہم اپنی گردن پہ وہ کیوں خونِ تمنا لیگی

ہو گی دُنیا میں وہی قوم سرافراز بصیر جو مصیبت میں بھی ہمت کا سہارا لیگی

جناب بیتاب کالپوی

امتحاں صبر کا آخر مرے کتنا لے گی آرزوئے دلِ ناشاد بھی کیا کیا لیگی

صبر اور ہوش و خرد عشق میں کھو بیٹھا ہوں یونہی گھٹ گھٹ کے یہ اُمید بھی رسوا لیگی

ہلکا ہو جائیگا کچھ دردِ فراواں دل کا چشمِ گریاں مری کچھ اشک جو ٹپکا لیگی

لبِ خاموش کو تکلیفِ تکلم کیوں دیں چشمِ غماض ہی اسرار کی فرما لیگی

جناب آزاد جبلپوری

موت جس شخص کی آئی ہو تری قدموں میں کیوں نہ خوش ہو کے زمیں اُسکا جنازا لیگی

پھر نئے جذبۂ کامل کو لئے اُٹھوں گا نئی اُمید کا تقدیر سہارا لیگی

دھجیاں آپ ہی بنجائینگی سامانِ بہار تارِ دامن میں جو وحشت مجھے اُلجھا لیگی

جلوہ فرما جو وہ ہونگے مرے دل میں آزاد ظلمتِ قلب مری طور کا نقشا لیگی

جناب مذاق سنکھڑوی (ڈبھوئی)

نگہِ شوق تجلی سے تری کیا لیگی اپنے سرِ مفت میں الزامِ تماشا لیگی

ہیں دن رات کی گردش سے یہ معلوم ہوا "ایکبار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی"

عشق نے آہ کسی کام کا رکھا نہ مجھے اب یہ بیتابئ دل کس کا سہارا لیگی

شخصیات

حضرت آرزو لکھنوی اور اُن کا کلام

—— (۱) ——

سید انوار حسین صاحب آرزو لکھنوی میرزا ذاکر حسین صاحب یاس لکھنوی مرحوم کے منجھلے صاحبزادے ہیں آپ کے جد اعلیٰ نواب سید جان علیخاں صاحب المخاطب بہ نواب تہور خاں صاحب اپنے والد میر شہام علی خاں صاحب کے ہمراہ ہرات سے عہد شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ میں واردِ ہندوستان ہوئے اور اجمیر میں قیام کیا آپ سلطنتِ مغلیہ کے ایک رکن تھے، انھیں نواب تہور خاں صاحب کے پوتے نواب سیف الدین خاں صاحب المعروف بہ نواب میرزا گل بیگ صاحب اجمیر سے لکھنو آئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

غدر میں جہاں اوروں کے گھر لٹے وہاں آپ کے خاندان کو بھی شدید نقصان پہونچا۔ آپ کے والد میرزا ذاکر حسین صاحب سرکاری ملازمت ترک کرچکے تھے اور تلوار کی بجائے ہاتھ میں قلم اُٹھا چکے تھے۔ دلآرام کی بارہ دری میں رہتے تھے وہیں ۱۸ ذی الحجہ سنہ ۱۸۸۹ء کو حضرت آرزو پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حکیم میر قاسم علی صاحب سے حاصل کی اور اس کے بعد مولانا سید آقا حسن صاحب مجتہد العصر سے علوم متداولہ میں مہارت حاصل کی۔ ۱۲ سال کی عمر سے شعر و شاعری کا شوق ہوا اور ۱۳ سال کی عمر میں حکیم ضامن علی جلالؔ مرحوم و مغفور کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ شاعری کے ابتدائی دور میں حضرت آرزو نے بڑی جانفشانی اور محنت کے ساتھ مشقِ سخن کی اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸ سال کی عمر ہی میں استاد نے اپنے بعض تلامذہ کی غزلیں اُنھیں اصلاح کے لئے دینی شروع کردیں تاکہ اُن کی مشق میں اضافہ ہو اور فنی غلطیوں کا اندازہ کرسکیں۔

—— (۲) ——

آرزو صاحب نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور ہی سے اس بات کی کوشش کی کہ وہ اپنے کلام کو زیادہ سے زیادہ عام فہم، برجستہ اور سلیس بنائیں۔ میر کا رنگِ سخن اُنھیں پسند تھا، اُنھیں کا تتبع کیا چونکہ مرزا غالبؔ کے رنگِ سخن سے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے اس لئے باوجود کوشش آرزو صاحب بھی اس اثر سے نہ بچ سکے اور کچھ عرصہ تک اُن کے کلام میں وہ رنگ بھی کہیں کہیں جھلکتا رہا۔ یہ اشعار اُسی دور کی یادگار ہیں ؎

دوست نے دل کو توڑ کر نقشِ وفا مٹا دیا سمجھے تھے ہم جسے خلیل کعبہ اُسی نے ڈھا دیا
خوں شدہ دل اگر نہیں پھر یہ اشکِ سرخ کیا اب بھی نہ تم یقیں کرو، آنکھ سے تو دکھا دیا

آتشِ غم سے بن کے زباں بھی شعلۂ بے آواز تھے ہم
خاموشی میں مٹادی ہستی کیونکہ سراپا راز تھے ہم

اداؤں سے ولولے نمایاں کچھ اس طرح قتل عام کے ہیں
کہ اختیارات جیسے حاصل جفائے بے انتقام کے ہیں

چھوٹے گا نہ جادہ کہ ہوں وابستہ منزل ہے خطِ جبیں نقشِ قدم راہ نما کا
لب دوختۂ کشمکشِ بیم و رجا ہوں اقرار نہ لب پر ہے نہ انکار خطا کا
دریوزہ گرِ حرص نہ بن راہِ طلب میں دل عشق سے خالی ہو تو کاسہ ہے گدا کا

غرض فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ ساتھ مشکل تراکیب اُن کے کلام میں جگہ جگہ پائی جاتی تھیں۔

—— (۳) ——

چونکہ فطرتاً اُن کا میلانِ طبع اس قسم کی شاعری کی طرف نہیں تھا اور وہ

خالص اُردو الفاظ کو اپنی شاعری کا طرۂ امتیاز بنانا چاہتے تھے اس لئے آہستہ آہستہ اُنھوں نے اس رنگ کو ترک کر دیا اور اس کی جگہ آسان الفاظ، عام فہم خیالات اور روزمرہ لے لی ؎

بچنے کے طریقے یاد نہیں، بس دل کا کھونا آتا ہے
مشکل میں نہیں جب بن پڑتی منہ ڈھانک کر رونا آتا ہے

اے گریۂ غم یہ بے اثری بجھتی نہیں تجھ سے دل کی لگی
آنکھوں کا سُجانا آتا ہے۔ دامن کا بھگونا آتا ہے

دیتے ہیں جان تم پہ مرنے سے کیا ڈرینگے — اب تک یہی کیا ہے اب پھر یہی کرینگے
جو یہ سمجھ چکا ہے وہ کیوں نہ دل جلائے — نالے نہیں کریں گے آمیں نہیں کرینگے

اس دور کے بعد حضرت آرزو نے کچھ تو "ہندوستانی" کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر (جس کا مقصد اُردو ادب کی زبان کو تیلی اور تنبولی کی فہم و فراست کے مطابق بنانا ہے) اور کچھ اپنے ذاتی اور فطری عام فہم شعری رجحان سے مجبور ہو کر موجودہ دور کے کلام کو اور بھی زیادہ آسان بنا کر پیش کیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ عرصہ سے نیو تھیٹر میں مکالمے اور گانے وغیرہ لکھ رہے ہیں۔ فلمی زبان جس قسم کی ہوتی ہے اس سے سب واقف ہیں فلمی زبان کو ہندوستان کی ہر قوم کے لئے قابلِ فہم بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ حضرت آرزو نے بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے اسے بنا ہا ہے اور عام فہم چبھتی ہوئی زبان پیش کرنے میں انھوں نے بڑی محنت کی ہے، آپکا تازہ کلام "سُریلی بانسری" کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ موجودہ دور کے بعض اشعار بھی یہاں پیش کرتا ہوں ؎

یہ آنکھ اپنی ساون ہو وہ آنکھ بھادوں — ٹپاٹپ ہے آنسو کی، پانی کا جھالا
اس اندھیر نگری میں بتی نہ ڈھونڈو — جو کچھ ہے سو اپنی سمجھ کا اُجالا
اُلجھنے جو دیتے ہیں پہلے کہاں تھے — کسی نے نہ گرتے ہوئے کو سنبھالا

کہاں سمجھ سکا بن کے انجان جانا — جھجھکنا مرا اُن کا پہچان جانا

منہ بنا رہتا ہے گونگا چاہ میں — بول اُٹھتا ہے گلا کاٹا ہوا

سب کی متیں پلٹ گئیں سنکی بندھی ہوئی ہوائیں
جی ہی نہیں اُداس اُداس کرتا ہو من بھی بھائیں بھائیں

ہو گئیں کیاریاں ہری جیسے کرشمہ پلٹ چلی — کون یہ مسکرا دیا ہنسنے لگی کلی کلی

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی — جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

چاہت کا پھل ایسا ہے۔ جیسے جل جائے کھیتی بوئی ہوئی
کیا ہوتا ہے آنسو پونچھنے سے، چھپتی نہیں آنکھیں روئی ہوئی

کالی گھٹا میں کوندا لپکا اور کے جو کوئل کوک گئی
جتنی گہری سانس کھنچی تھی اتنی لمبی ہوک گئی

"سریلی بانسری" کے علاوہ حضرت آرزو کے دو دیوان اور بھی **فغانِ آرزو** اور **جہانِ آرزو** کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نے کئی مثنویاں بھی لکھی ہیں جن میں "عدلِ محمود" اور "صبحِ بنارس" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ قطعات۔ رباعیات اور سلام اس کے علاوہ ہیں، مراثی بھی آپ نے بہت زیادہ کہے ہیں "نظامِ اُردو" کے نام سے اُردو کے قواعد و ضوابط بھی مرتب فرمائے ہیں جن میں اسی قسم کی سادہ زبان پر زور دیا ہے۔ ڈرامہ نگاری میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل ہے اور آپ کے مکالمے ہندوستان میں بہت زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔

میں نے اس مختصر سے مضمون میں حضرت آرزو کے مختصر سوانح اور ہر دور کے کلام پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی ہے، میرا مضمون تنقیدی پہلو لئے ہوئے نہیں ہے۔ بابِ شخصیات میں تنقید سے میں حتی الوسع گریز کرونگا۔

اعجاز صدیقی

طرزِ نگارش

اُردو اخبارات و رسائل کی تحریری خامیاں اور اُنکی اصلاح

خامیاں	تصحیح	تصریح
اربابِ تعصب کی نگاہ کوتاہ بیں کو	اربابِ تعصب کی کوتاہ نظر کو	
قارئینِ خوش ذوق نے	خوش ذوق قارئین نے	
رسالہ کی ترتیب میں بڑے احتیاط سے کام لیا	رسالے کی ترتیب میں بڑی احتیاط سے کام لیا	احتیاط بالاتفاق مؤنث ہے۔
مضامین کی اشاعت کو روکنی پڑتی ہے۔	مضامین کی اشاعت روکنی پڑتی ہے	
وہ اس کا سرگرم استقبال کریں	وہ اس کا گرم جوشی سے استقبال کریں	
کسی نئی شیطان کی تخلیق کا راز	کسی نئے شیطان کی تخلیق کا راز	شیطان بالاتفاق مذکر ہے۔
مجھے صاف ظاہر ہوگیا	مجھ پر صاف ظاہر ہوگیا	
سوال اپنی نوعیت کا تشویشناک ضرور ہے	سوال اپنی نوعیت کے اعتبار سے تشویشناک ضرور ہے	
کسی انعام یا اکرام کی لالچ میں نہیں کر رہا ہوں	کسی انعام یا اکرام کے لالچ میں نہیں کر رہا ہوں	انعام واکرام بالاتفاق مذکر ہیں۔
آپنے بنگالی کیسی سیکھی	آپ نے بنگالی کیسے سیکھی	
پھر میں نے اور فیروز خاں نے اکٹھا کھانا کھایا	پھر میں نے اور فیروز خاں نے ساتھ ساتھ کھانا کھایا	
اپنی عمر کے منازل طے کر رہے تھے	اپنی عمر کی منازل طے کر رہے تھے	منزل مؤنث ہے
وہاں پانچ یا چھے نقاب پوش کھڑے تھے وہ ہم پر آن پڑے	وہاں پانچ یا چھ نقاب پوش کھڑے تھے وہ ہم پر ٹوٹ پڑے	
نقاب پوش نے اُن کے سر پر چوٹ لگائی	نقاب پوش نے اُن کے سر پر چوٹ کی	
خدا کی عبادت میں سر دھنے لگا	خدا کی عبادت میں سر گرم رہنے لگا (مشغول ہونے لگا)	
زلیخا کا دل ایکدم سے دھک ہوگیا	زلیخا کا دل یکایک دھک سے ہوگیا	
بھٹیارخوں کے یہاں	بھٹیارین کے یہاں	

تیسرے نے ٹونکدیا	تیسرے نے ٹوکدیا	
کیوں جناب معاف کیجئے گا ہم کو تمہارا نام نہیں معلوم	کیوں جناب معاف کیجئے ہمیں آپ کا نام نہیں معلوم۔	
یقین سے کہا جا سکتا ہے	یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے	
مذاحیہ شاہکار اپنے انتہائی تناول سے گذر رہا ہے	مذاحیہ شاہکار اپنے انتہائی مراحل سے گذر رہا ہے	تناول کے معنی ہیں کھانا۔ پکڑنا۔ اُٹھانا
اخلاقیت کا پرچار نہیں ہے	اخلاقیات کا پرچار نہیں ہے۔	
عورت اور مرد کی محبت کتنی ہی پُرخلوص ہو	عورت اور مرد کی محبت کتنی ہی پُرخلوص ہو	
گر اس میں جسمائیت ضرور موجود رہتی ہے	مگر اُس میں جسمانیت ضرور موجود رہتی ہے	
اس اشارے پر نظر ڈالنا ہے	اس اشارے پر نظر ڈالنی ہے	
جغرانی قوتیں	جغرافیائی قوتیں	
مصائسحانہ گفتگو میں	مصالحانہ گفتگو	
دھرتی ماتا کو تو ہی نے یہ طاقت عطا کی	دھرتی ماتا کو تو نے ہی یہ طاقت عطا کی	
کسی گہری سونچ میں	کسی گہرے سونچ میں	
آج جب کہ جنگ کے بادلوں نے تمام یورپ کو گھیرا ہوا ہے۔	آج جب کہ جنگ کے بادلوں نے تمام یورپ کو گھیر لیا ہے۔	
اسی شمارے میں مفصل اشتہار ملاحظہ فرمایئے گا	اسی شمارے میں مفصل اشتہار ملاحظہ فرمایئے	
اس سے ہر طرح کے سوتی اور اونی دھوئے جاتے ہیں	اس سے سوتی اور اونی کپڑے دھوئے جاتے ہیں	
ایک جھلتی ہوئی راگنی ہے	ایک مچلتی ہوئی راگنی ہے	
اُسے ذرا کی ذرا حال سے ہٹا کر ماضی کی طرف جھکا دیتی ہیں۔	اُسے فوراً (ذرا سی دیر میں) حال سے ہٹا کر ماضی کی طرف جھکا دیتی ہیں۔	
اور شاعر نے لکس صابن۔ الماری۔ شیشے کا گلاس اور سینٹ کی شیشی (ایسی) مادّی چیزوں سے تلازمِ خیال کے ذریعہ جو شعریت پیدا کی ہے وہ قابلِ غور ہے۔	اور شاعر نے لکس صابن۔ الماری۔ شیشے کا گلاس اور سینٹ کی شیشی جیسی مادّی چیزوں سے تلازمِ خیال کے ذریعہ جو شعریت پیدا کی ہے وہ قابلِ غور ہے۔	
دوسرا مصرع تیسرے کی جگہ پر اور تیسرا مصرع دوسرے کی جگہ لکھ کر بے ربط بنا دیا۔	دوسرا مصرع تیسرے کی جگہ اور تیسرا مصرع دوسرے کی جگہ لکھ کر بے ربط بنا دیا۔	
اب کی زیادہ کاوش سے کام لے کے	اس مرتبہ زیادہ کاوش سے کام لیکر	

ایڈیٹر

مذاکرِ علمیہ

اعلیحضرت نواب صاحب بھوپال خلد اللہ ملکہٗ کی سالگرہ کی تقریب میں ہر سال ایک مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ امسال اس مشاعرہ کو اور زیادہ وسیع پیمانہ پر منعقد کیا جا رہا ہے جس میں ہندوستان کے بیشتر مشاہیر شعرا اور اساتذہ شرکت فرمائیں گے۔ اس مشاعرہ کی دو نشستیں ہونگی، ۱۵ جنوری کو طرحی اور ۱۶ کو غیر طرحی۔ طرحی مشاعرہ تاریخِ مقررہ پر رات کے دس بجے سے نشر بھی ہوگا شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے ریڈیو پر اس مشاعرہ کو ضرور سنیں۔

مولانا انتظام اللہ شہابی صدیقی کے کتب خانہ میں چند بیش قیمت قلمی کتب موجود ہیں جو ہندوستان کے کسی دوسرے کتب خانہ میں نہیں مل سکتیں۔ ان میں سے چند کی تفصیل یہ ہے۔ (۱) **نو طرزِ مرصع** از تحسین یہ انہیں کے زمانہ میں اٹاوہ میں لکھی گئی تھی۔ (۲) **کلیاتِ سودا** (مکمل) نواب آصف الدولہ کے کتب خانہ کا نسخہ ہے (۳) **دریائے لطافت** (مکمل) میر انشاء اللہ خاں دہلوی۔

جو کتب خانے یا صاحبِ ذوق ہستیاں ان کتب کو خریدنا چاہیں وہ **مدیرِ شاعر** کے توسط سے خط و کتابت کریں۔

بمبئی کی کانگریسی حکومت نے ابتدائی اور ثانوی مدارس میں ہندی زبان لازمی قرار دیدی تھی مگر موجودہ حکومت نے اس قانون کو توڑ دیا ہے اور اب اردو مدارس سے ہندی کی قید اٹھا دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں حکومتِ بمبئی نے جو رپورٹ شائع کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی کو لازمی قرار دینے سے بعض ایسی کتابیں بھی نصاب میں شامل ہو گئی تھیں، جو مسلمان بچوں کے لئے مناسب تھیں۔ حکومتِ بمبئی کا یہ اقدام قابلِ تحسین ہے۔

سردار بدھ سنگھ پریزیڈنٹ جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس نے وزیرِ اعظم کشمیر کو ایک خط لکھا تھا جس میں فارسی رسم الخط کی تبدیلی کے متعلق بھی پُرزور مطالبہ کیا تھا، لیکن وزیرِ اعظم نے رسم الخط میں کسی قسم کی تبدیلی سے انکار کر دیا

صوبہ بہار کی ہندوستانی کمیٹی نے مختلف علوم و فنون کی اصطلاحوں کے تراجم کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس نے جغرافیہ، حساب، الجبرا وغیرہ کی اصطلاحات کا ترجمہ کر کے ملک کے اکثر اہلِ علم حضرات کے پاس بغرضِ حصولِ آرا بھیجی ہیں۔ ان اصطلاحوں کو دیکھنے کے بعد ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔ کمیٹی نے جو الفاظ وضع کئے ہیں اُن میں سے بیشتر بھدے اور نامانوس ہیں اور علمی و ادبی حیثیت سے کوئی درجہ نہیں رکھتے۔ ہماری رائے میں یہ کام صرف وہ ہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو زبان و ادب پر خلاقانہ دسترس ہے، بہتر یہ ہے کہ اس سلسلے میں ہندوستان کے ممتاز ادبا اور محققینِ زبان کو دعوتِ فکر دی جائے۔

حیدر آباد کے مشہور علم دوست اور ادب نواز رئیسِ اعظم نواب سر سالار جنگ بہادر کی سرپرستی میں "مجلسِ اشاعت دکنی مخطوطات" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے، جس کے صدر مولوی سید محمد اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج حیدر آباد ہیں۔ یہ ادارہ اب تک قدیم دکنی زبان کی چھ غیر مطبوعہ کتابیں جو نایاب تھیں مع فرہنگ تصاویر شائع کر چکا ہے۔ اب عنقریب ہی ۸ کتابیں اور شائع ہونگی۔ ان میں ملک الشعرا نصرتی کا "گلشنِ عشق" اور "علی نامہ"۔ "کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ" اور "کلیات شاہ سراج اورنگ آبادی" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ادارہ

نقد و نظر

یادِ اقبال حصہ اوّل

مرتبہ جناب غلام سرور فگار مدیر "پیغامِ حق" لاہور۔ تقطیع ۲۲×۱۷/۸ حجم ۱۲۰ صفحات کاغذ اور طباعت معیاری۔ لکھائی بہت خراب ہے۔ قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ۔ ملنے کا پتہ دفتر اقبال اکیڈیمی۔ ظفر منزل۔ تاج پورہ لاہور۔

اس مجموعہ میں مرتب نے وہ نظمیں جمع کی ہیں جو علامہ ڈاکٹر سر اقبال مرحوم کی وفات پر مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئی تھیں، نظموں کے انتخاب میں مرتب نے مذاق سلیم کا ثبوت دیا ہے، زیادہ نظمیں معیاری اور ملک کے بلند پایہ شعرا کی نتیجہ ہائے فکر ہیں، البعض نظمیں پست بھی ہیں، جو نہ ہونے کے برابر ہیں، خوشی کی بات تو یہ ہے کہ یہ یادگار نظمیں ایک جگہ آگئیں۔ شروع میں سر اقبال کی سوانح حیات بھی ہے۔

دھرتی ماتا

ترجمہ جناب ابوسعید قریشی بی۔اے۔ تقطیع ۲۲×۲۹/۱۶ حجم ۲۱۴ صفحات۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پر خوبصورت جلد پوش ہے قیمت عہ ملنے کا پتہ۔ ہاشمی بک ڈپو انارکلی لاہور۔

یہ مشہور مصنف پرل بک کی ایک حقیقت نما رسماجی داستان کا ترجمہ ہے۔ اس داستان کا خاص کردار وانگ لنگ ایک غریب کسان ہے جو عسرت میں اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی پرورش کرتا ہے، ایک قطعۂ زمین اُس کی کل کائنات ہے مفلوک الحالی اور قحط سالی سے تنگ آکر موشیوں کی پیٹ بھرنے کے بعد جب کچھ نہیں بچتا تو یہ چھوٹا سا خاندان مجبوراً اُس قطعۂ زمین کو چھوڑ دیتا ہے جسے اُس نے اپنے خون سے سینچا تھا۔ سیکڑوں ٹھوکریں کھانے کے بعد اور مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد اس خاندان کے دن پھرتے ہیں، مالا مال ہو جاتا ہے اور اس قطعۂ زمین پر پھر واپس آتا ہے لیکن بایں دولت وثروت اُسے سکون میسر نہیں ہوتا، پہلے مفلوک الحالی اور قحط سالی کا بھوت سوار تھا اور اب دولت کا جن، غرض اس داستان میں غربت کی بتیا اور امارت کے چونچلے دکھائے گئے ہیں۔ قصہ بہت دلچسپ ہے، لیکن جا بجا کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ترجمہ پر بھی میرے خیال میں نظرِ ثانی نہیں کی گئی ہے۔ اکثر مقامات پر محاورے اور انشا کی غلطیاں پائی جاتی ہیں، اُمید کہ ابوسعید صاحب دوسرے ایڈیشن میں ذرا دقّتِ نظر سے کام لیں گے۔

تحفۂ عید الاضحیٰ

مرتبہ الحاج مولانا شاہ قمر الہدیٰ فردوسی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۸۸ صفحات لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ ٹائٹل سنگین و خوبصورت۔ یہ کتاب مولانا موصوف مفت تقسیم فرما رہے ہیں، ضرورت مند حضرات ایک آنہ کا ٹکٹ برائے محصول ڈاک بھیجکر دفتر دار الہدایت جامع مسجد شکوہ آباد (یو۔پی) سے طلب فرمائیں۔

مولانا شاہ قمر الہدیٰ فردوسی ان خدمت گذارانِ ملتِ اسلام میں سے ہیں جو "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا" کو اپنا مطمحِ نظر قرار دیتے ہوئے سالہا سال سے تبلیغ دین اسلام فرما رہے ہیں۔ موصوف اسلام کے ارکان و عوامل پر اب تک متعدد کتابیں لکھ چکے ہیں۔ گذشتہ ماہ رمضان المبارک میں آپ نے رمضان کے متعلق ایک مفید رسالہ مرتب فرمایا تھا جو تمام ہندوستان میں پسند کیا گیا۔ اب آپ نے "تحفۂ عید الاضحیٰ" مرتب فرمایا ہے جس میں فضائل ذی الحجہ۔ قربانی۔ حج اور عید وغیرہ کی غرض وغایت پر نہایت محققانہ انداز میں۔ قرآن و حدیث اور تاریخ کی روشنی میں بحث کی ہے۔ یہ رسالہ عام مذہبی کتابوں سے مختلف ہے صرف اس لئے کہ اس میں کسی قسم کا اُلجھاؤ نہیں ہے۔ موصوف نے جو کچھ لکھا ہے وہ مدلل ہونے کے علاوہ عام فہم بھی ہے اور معلومات کا ایک بیش قیمت ذخیرہ۔

رگبی کی زندگی

تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۲۹ صفحات۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی۔

یہ ٹامس ہیوز کی مشہور و معروف تصنیف "ٹوم براونس سکول ڈیز" کا ترجمہ ہے۔ اس میں آرنلڈ کے اُن بنیادی تعلیمی اصول ہیں جن سے رگبی کا مدرسہ ایک مثالی مدرسہ بن گیا تھا اور آخر انگلستان کی ثانوی تعلیم انھیں سانچوں میں ڈھالی گئی۔ اس کتاب میں مدرسے کے اصلی واقعات کو افسانے کی صورت میں بڑی سادگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ سیرت سازی نظام و توسیع نصاب کی۔ اس میں زیادہ سے زیادہ وضاحت کی گئی ہے جس کے مطالعہ سے طالب علم، والدین سر پرست سب ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہ کتاب اُردو ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ ہمارے ثانوی مدارس یقیناً اس سے متاثر ہوں گے

پردۂ فلم

"ہندوستاں ہمارا"

تیار کردہ:— "کرشن مووی ٹون" کلکتہ

ہدایات کار:— رام دربانی

اداکاران:— جمنا۔ نندریکر، پدما۔ گوپی۔ ہری شوڈلیسائی وغیرہ

مسٹر رام دربانی اس سے پیشتر اپنی ایک تصویر "زمانہ" پیش کر چکے ہیں، جو ایک دلچسپ تمثیل پر تیار کی گئی تھی۔ "ہندوستان ہمارا" بھی انھیں کی پیشکش ہے یہ دونوں فلمیں دربانی صاحب کے ترقی پسند رجحانات کی مظہر ہیں لیکن رجحانات جن خطوط پر اور جن طریقوں کیساتھ صرف کئے جا رہے ہیں وہ اسد حد تک دور از فن ہیں کہ یہ دونوں فلمیں دلچسپ اور قابلِ تعریف موضوع رکھنے کے باوجود مجموعۂ نقائص بن کر رہ گئی ہیں ذیل میں ہم "ہندوستان ہمارا" پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

افسانہ "ہندوستان ہمارا" کے افسانے کا "مرکزی خیال" اور "پس منظر" جذبۂ حب الوطنی اور کسانوں کی اقتصادی تباہی و بدحالی سے متعلق ہے اور یہ اشتراکی نقطۂ نگاہ سے قابلِ قدر بھی ہے مگر اس پس منظر پر جو عمارت بنائی گئی ہے، اسکی بنیادوں میں افسانویت، تمثیلی عنصر اور فن کارانہ صداقت کو جس صورت میں پامال کیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ اس فلم کے افسانے کے مقصد تخلیق میں فلمائے جانے کا ہلکا سا تصور بھی شامل نہ تھا بے شبہ "واقعیت" آرٹ کی زندگی و بقا کے لئے لازمی ہے، لیکن اس کی آڑ لیکر خلاف حقیقت "ماجرا" اور اصلیت سے بعید کرداروں کی تخلیق کرنا، نہ صرف یہ کہ آرٹ کے گلے پر کند چھری چلانی ہے، بلکہ بجائے خود واقعیت کے دائرہ سے باہر نکل جانا بھی اسی کا نام ہے اور اسی لئے افسانہ نگار کا فرض ہوتا ہے کہ وہ واقعات اور کرداروں کے خطوطِ اتحاد میں اپنے موضوع کو اس طرح سادگی و سچائی کے ساتھ پیش کرے کہ افسانے میں پروپیگنڈا اور "وعظیت" ابھری ہوئی نہ ہو! افسانہ نویس جو کچھ چاہتا ہے، وہ ناظر کے دل دماغ میں افسانوی واقعات کے مطالعہ سے از خود پیدا ہونا چاہئے، اس نقطۂ نگاہ سے دور ہٹ کر جو چیز بھی لکھی جائیگی وہ افسانہ نہیں بلکہ ایک لیکچر یا ایک وعظ ہوگی۔

"ہندوستان ہمارا" کے افسانے میں یہی تین نقائص بہت نمایاں ہیں۔ اول خلاف حقیقت واقعات اور مہمل کرداروں کی بھرمار، دوسرے ان دونوں کی باہمی بے ربطی و دوری اور تیسرے "وعظیت" کی تلخی! ——— ان نقائص نے افسانے کے تمام اجزائے ترکیبی پر فنی کمزوریوں کا ایک بھاری بوجھ ڈالدیا ہے اندھا دھند واقعات کے ساتھ کرداروں کا جوڑ ملادینے کی شاید ہی اس سے بدتر مثال کسی اور مطالعہ فن رکھنے والے افسانہ نویس کے قلم سے نکلی ہو کہ ——— بینا (ہندوستان ہمارا کی ہیروئن) اور اس کا بھائی سراسر مغربی تہذیب و معاشرت کی آغوش میں پل کر جوان ہوئے ہیں، انکے ماحول اور ان کی تمام تر حرکات پر ایک گہری مغربیت مسلط ہے اور اس کے ساتھ ہی دولت کی فراوانی و کثرت نے انھیں سرمایہ دارانہ خو، بے فکری اور تعیشات سے دلدادگی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دئے ہیں، لیکن اچانک ایک قلیل ترین وقفہ کے ساتھ ان دونوں کی سیرت میں ایک انقلابِ عظیم رونما ہوتا ہے اور وہ دوسرے ہی لمحہ میں وہ عجز و انکسار کے پیکر، وطنی دردمندی کے مجسمے، محنت و جفاکشی کی تصویر اور خلق دوستی کے جذبات میں تر اور نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسانی فطرت میں اتنا زبردست انقلاب بغیر کسی اہم ترین سبب کے ظہور پذیر نہیں ہو سکتا لیکن "ہندوستان ہمارا" میں کوئی ایسی اہم علت نظر نہیں آتی۔ جس کی بنیاد پر اتنے بڑے تغیر کی تعمیر کو جائز اور نیچرل کہا جا سکے، ہاں، اگر یہ چیز "خوارق عادات" اور "معجزات" کی قسم سے ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں! ——— اس ذیل میں ایک اور عجیب تر بات سنئے! ——— جب **دینا** اور اس کا بھائی اس انقلاب کے بعد خدمتِ خلق پر کمر بستہ ہوتے ہیں تو سب سے پہلے وہ مفلس کسانوں کے ننگے اور بھوکے بچوں کے لئے بیش قیمت جاپانی کھلونے (موٹریں، ریلیں، چھتریاں وغیرہ) اور انگریزی مٹھائیاں (مثلاً چاکلیٹ وغیرہ) اپنی موٹر میں بھر کر گاؤں میں پہنچتے ہیں اور ان کھلونوں اور مٹھائیوں کو

چھواروں کی طرح بچوں میں تقسیم کرتے ہیں ——— ان بچوں میں جنھیں تن ڈھانپنے کو ایک چیتھڑا بھی میسر نہیں اور جن کی شدت گرسنگی کا یہ حال ہے کہ اگر ان سے سوال کیا جائے "دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟" تو وہ یہی جواب دیں گے کہ "چار روٹی"! ——— ایسے بچوں میں جاپانی کھلونے اور انگریزی مٹھائیاں تقسیم کرنا شاید ہی کسی صاحب فہم انسان اور صحیح الدماغ خادم خلق کا فعل ہو سکے!

افسانے کی ابتداء، ارتقاء، عروج، تقابل عروج اور اختتام میں بھی اسی طرح کے اہمال موجود ہیں جو بعض جگہ بہت بھدی شکل اختیار کئے ہوئے ہیں۔ مادھو (افسانہ کا ہیرو) کے بیشتر اعمال و حرکات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کمیونسٹ خیالات و جذبات رکھتا ہے مگر کبھی کبھی اس کی زبان سے خواہ مخواہ عقیدہ عدم تشدد کا بھی اظہار ہو جاتا ہے، اسکے کردار کے پیش نظر یہ چیز محض افسانہ نگار کا "جبر" معلوم ہوتی ہے۔ اس قسم کی چند اور کمزوریوں کے باعث افسانے میں "یکانگی اثر" قائم نہیں رہ سکا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مجموعی طور پر یہ افسانہ اپنے منازل کو سرعت تمام طے کرتا ہوا انتہا تک پہنچا ہے اور اس لئے اس کا دامن "اتحاد زمانی" سے خالی نظر نہیں آتا۔ اگرچہ یہ "اتحاد زماں" اپنی کمزوریوں کے سبب سے "وحدت مکاں" کی تخلیق سے قاصر ہی رہا ——— دینا اور مادھو، رائے بہادر ہیرا لال (دینا کے باپ) کی جائداد کے منیجر چونی لال کے ہاتھوں ہر طرح کے ظلم و ستم کا شکار ہوتے ہیں ——— چونی لال ان دونوں کو اپنے "پرائیویٹ قید خانے" کی کوٹھریوں میں بند کر دیتا ہے ——— تمام گاؤں میں اس کی شہرت بھی ہو جاتی ہے ——— اور آخر میں نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ دو تین آدمیوں کا خون کر کے خودکشی بھی کر لیتا ہے ——— لیکن عجیب بات ہے کہ تمام باتیں مشہور خاص و عام ہو جاتی ہیں اور پولیس کا ایک فرد بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ درانحالیکہ افسانوی واقعات کی زمین بتا رہی ہے کہ یہ سب کچھ اسی موجودہ دور میں ہو رہا ہے، جبکہ محکمہ پولیس ہر چھوٹی بڑی جگہ موجود بھی نظر آتا ہے اور اسے معمولی معمولی حادثات کی بھی رپورٹ پہنچتی ہے اور چونی لال کے یہ سنگین و مشہور جرائم "قابل دست اندازی پولیس" بھی ہیں۔

افسانے کے انجام کو قطعی خلاف فطرت اور سہل طریقے سے "طربیہ" بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ واقعات اور فنکارانہ صداقت کے پیش نظر اسے "حزنیہ" ہونا چاہئے تھا۔

فعالیت اس فلم کے اداکاروں میں صرف ایک جمنا کا وجود ہی ایسا ہے، جو صحیح المذاق فلم بینوں کی بہترین توقعات کا حامل بن سکتا ہے لیکن "ہندوستان ہمارا" کے فنی نقائص نے اس کی شہرت یافتہ Activism کو نمایاں نہیں ہونے دیا۔ ایک "سکوت بے کسی" اور "جمود بے چارگی" ہے جو شروع سے آخر تک اس کے عمل پر چھایا رہا، تاہم جہاں بھی موقعہ ملا، اس نے بقدر وسعت اپنے کام کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ پدما، ہری شو دیسائی اور گوپی کا کام بھی قابل تعریف ہے۔ دینا کے بھائی کا کردار افسانے میں قطعی غیر ضروری طور سے شامل کر دیا گیا ہے، اس لئے اس کے ادا کرنے والے کے عمل پر سراسر "مردنی و مجہولیت" طاری رہی ہے۔ کردار کی اہمیت کے پیش نظر سندر یکر کا کام بہت پست درجہ میں ہے، اس کی اداکاری کو "فعالیت" کی صحیح روح سے دور کا بھی علاقہ نظر نہیں آتا۔ اس کا لب و لہجہ، حرکات و سکنات، خندہ و گریہ اور اسلوب گفتگو ایک "جبریہ تصنع" کے مظہر ہیں جو ذوق سلیم کے لئے اپنے اندر ایک طرح کی تلخی، گرانی اور چبھن لئے ہوئے ہیں، جمنا جیسی صاحب طرز (Stylish) اداکارہ کے ساتھ اس کے جوڑ پر "زاغ کی چونچ میں انگور" کی مثال صادق آتی ہے۔

مکالمہ افسانے کے ابھار اور ماجرا آفرینی میں بے شبہ "عملیت" کا کافی سرمایہ موجود ہے لیکن کہیں کہیں مکالے کی غیر موزونیت نے اسے "بیانیہ انداز" سے قریب تر بنا دیا ہے۔ کسی تخیل کے بہترین مکالمے کی خوبی یہی ہے کہ اس میں ایک نقرہ دوسرے نقرے سے بولتا ہوا محسوس ہو، اور اپنے ادا کرنے والے کے کردار کی حدود کا پابند ہو۔ "ہندوستان ہمارا" کے مکالمے میں اس خوبی کا قطعی فقدان ہے، اور یہ عیب صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک کردار دوسرے کردار سے گفتگو نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ ایک تیسرا فرد (مکالمہ نگار یا افسانہ نویس) بول رہا ہے۔

گانے بجائے خود خوب ہیں، لیکن انکا استعمال تقریباً ہر جگہ غیر مناسب اور کہیں کہیں لغویت کی حد تک نظر آتا ہے۔

موسیقی گانوں کو جن سُروں اور آلات ساز کیساتھ پیش کیا گیا ہے وہ کافی دلکش اور جاذب توجہ ہیں اور انھوں نے ڈرامائی اثرات پیدا کرنے اور ابھارنے میں بہت مدد دی ہے۔ افسانوی وقت، موقعہ اور فضا کے اعتبار سے بھی وہ نہایت مناسب اور صحیح کیفیات کے ترجمان ہیں جمنا اپنی فلمی زندگی میں پہلی مرتبہ "پردہ سیمیں" پر دوسری بار گاتی ہوئی نظر آئی ہے "ہندوستان ہمارا" میں اس کا طرز ترنم بہت خوب ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اسے ایک مغنیہ کی حیثیت میں پیش کرنا اس کی فعالیت کے وقار سنجیدگی و متانت پر ایک مجروح کن ضرب لگاتی ہے۔

ڈائرکشن ڈائرکشن نے پوری فلم میں صرف دو، تین جگہ افسانہ و تصویر میں یکرنگی پیدا کی ہے۔ ورنہ فلم کے بیشتر حصے اس فنی اور فطری اتحاد سے محروم ہیں، کئی جگہ مزاحیہ اور غیر مزاحیہ ٹکڑے لگائے گئے ہیں، افسانے اور اداکاروں کے غلط انتخاب اور عکاسی اور سیٹنگس کی کمزوریوں نے مل جلکر ڈائرکشن پر برا اثر ڈالا ہے۔ لیکن فلم کے اتنے نقائص کے باوجود فاضل ڈائرکٹر کی ذہانت چھپی نہیں رہ سکی۔ اور ہم اس فلم کی مجموعی کیفیات کے پیش نظر توقع رکھتے ہیں کہ اگر مسٹر رام دریانی زیادہ توجہ دیں تو وہ ایک اچھی فلم بنا سکتے ہیں۔

سکرٹری کاسموپالٹین لٹریری سوسائٹی دیوبند

(دار الثقافت گولیان رجسٹرڈ ڈبالہ ضلع گورداسپور کا جدید اردو کلب)

(اعجاز حسین صدیقی پرنٹر و پبلشر نے رفاہِ عام پریس ہینگ کی منڈی میں چھپوا کر قصر الادب آگرہ سے شائع کیا)

عرق اکسیر اعظم
(رجسٹرڈ)

پیٹ کے بیماری کی دوا

مثلاً پیٹ درد کرنا۔ پیٹ پھولنا۔ پیٹ میں میٹھا میٹھا درد رہنا۔ پیٹ میں گڑگڑاہٹ بے چینی ہونا۔ قبض رہنا۔ پتلا دست آنا۔ کلیجہ میں درد اٹھنا معدہ کی کمزوری کیوجہ سے غذا ہضم نہ ہونا بھوک نہ لگنا۔ سینہ پر جلن معلوم ہونا ورم جگر ہونا۔ تلی کا بڑھ جانا۔ پیشاب زیادہ آنا۔ بار بار رہ کر آنا (جسکو ذیابیطس کہتے ہیں) دست اور متلی کیساتھ قے آنا (جسکو ہیضہ کالرا کہتے ہیں) موسمی بخار کا آنا یا معدہ کی خرابی سے کوئی دوسری بیماری ہوجانا۔ مرض نیا ہو یا پرانا خدا کے فضل سے عرق اکسیر اعظم استعمال کرنے سے بالکل اچھا ہوجاتا ہے

قیمت فی شیشی ایک روپیہ تین شیشی قیمت دو روپیہ بارہ آنہ (محصول علاوہ)

سرٹیفکٹ :۔ جناب حولدار محمد زماں خانصاحب میسور اسٹیٹ سے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ میری ایک دوست کو پیٹ کے درد اور دل کی دھڑکن کی شکایت تھی۔ چنانچہ اکسیر اعظم کے پلانے سے فائدہ ہوگیا دو شیشی اکسیر اعظم اور روانہ فرمایئے۔

نسوانی
(رجسٹرڈ)

عورتوں کے پرسوت کی بیماری کی مفید دوا

آجکل ہر گھر میں عورتوں کو سفید رطوبت مثل دھات یا ٹیالے رنگ کا گاڑھا لیس آتے رہنے کی شکایت ہوجاتی ہے جسکی وجہ سے بدن کمزور۔ رنگ پیلا۔ ہاتھ پیر میں جلن۔ دماغ میں چکر۔ آنکھ تلے اندھیرا آجایا کرتا ہے ٹانگ میں درد۔ کمر میں درد۔ بھوک بند طبیعت میں سستی رہتی ہے حمل گرجانے مردے گھرانے۔ کمزور اولاد پیدا ہونے کی شکایت رہتی ہے۔ نسوانی ان سب بیماریوں کے لئے تین شیشی استعمال کرانے سے عورتوں کی جملہ شکایت انشاء اللہ دور ہوجائیگی۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ۔ تین شیشی قیمت دو روپیہ بارہ آنہ

دہلی کے پیش امام صاحب نسوانی کی تعریف لکھتے ہیں

جناب مولوی محمد ریاض الدین صاحب، پیش امام۔ دہلی سے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ آپ کے کمپنی سے دوا نسوانی جس کسی کو بھی ہم نے منگا کر دیا۔ اس کو پورا فائدہ پہونچا۔ اس لئے پھر تین شیشی نسوانی اور روانہ فرما کر مشکور فرمایئے۔

فرمائش لکھتے وقت "شاعر" کا حوالہ دیجئے

ملنے کا پتہ ایس۔ بی۔ بخشی کمپنی گھڑی والی کوٹھی نمبر ۳۲ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

بخشی ڈائری سنہ ۱۹۲۲ء رنگین فوٹو والی چھپکر تیار ہوگئی ہے۔ قیمت فی جلد پانچ پیسہ کا ٹکٹ بھیجکر منگا لیجئے۔ بلا قیمت بھیجی جائیگی۔

باقیاتِ فانی کون نہیں جانتا کہ سوز و گداز حضرتِ فانی بدایونی کا حصہ ہے اگر آپ کو جذباتی شاعری کا لطف اٹھانا ہے اور ایک حقیقی شاعر کے واردات قلب سے آشنا ہونا ہے تو ایک جلد ضرور منگائیے۔ مع تصویر مصنف قیمت عہ

نشاطِ روح حضرتِ اصغر گونڈوی کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے کلام میں حقیقی واردات۔ ندرتِ بیان، شکوہِ الفاظ، لطافت، پاکیزگی اور رفعتِ تخیل سبھی کچھ ہے یہ دیوان آرٹ پیپر پر بڑے اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ قیمت صرف عہ

میکدہ جناب مولوی سید محمد علی شاہ میکش قادری نیازی اکبر آبادی کے جذبات حسن و عشق اور متصوفانہ کلام کا مجموعہ ہے۔ اردو شاعری کا ایک معیاری نمونہ ہے قیمت مع تصویر مصنف ایک روپیہ (عہ)

قصائدِ نجم اکبر آباد کے مشہور شاعر حضرت نجم آفندی کی لاجواب تصنیف ہے۔ مدح رسولؐ میں بلند پایہ نظمیں قصائد پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

نقوشِ مانی حضرت مانی جائسی کو کون نہیں جانتا، ایک ایک شعر جذبات و واردات کا صحیح نمونہ ہے قیمت دو روپیہ

ایاغِ بزم۔ اردو کے مایۂ ناز شاعر، مسلم الثبوت استاد حضرت بزم آفندی اکبر آبادی کا تازہ ترین دیوان جس میں محاکات و تاثرات کا دریا موجزن ہے۔ آپ کو زبان کا لطف آ جائیگا۔ قیمت صرف دو روپیہ۔

صبحِ مشرق۔ اگر آپ زندگی کے صحیح راز سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔ اگر آپ مناظرِ فطرت سے کیف اندوز ہونا چاہتے ہیں، اگر آپ واردات و جذبات کی حقیقی کیفیات سے سرخوش ہونا چاہتے ہیں تو محمد صادق صاحب ضیا بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کا کلیات نظم و غزل دیکھئے۔ قیمت دو روپیہ

نشترکدہ۔ مجموعۂ غزلیات محسنِ ادب جناب بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی جسے مکتبۂ قصر الادب "آگرہ" نے نہایت اہتمام کے ساتھ چھپوایا ہے۔ قدیم رنگِ تغزل کو جدید مذاقِ بلند کے ہم دوش دیکھنا ہو اور جذبات و احساساتِ انسانی کی حقیقت کھینی ہو تو یہ دیوان ضرور ملاحظہ فرمائیے مع تصویر مصنف دو روپے آٹھ آنہ

نورِ مشرق مجموعۂ نظمیات جناب مہر لال صاحب ضیا فتح آبادی ایم۔ اے۔ اس مجموعہ کی ہر نظم اپنی نوعیت کے لحاظ سے دلکش اور اثر آفریں ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی

اگر آپ کو
اردو شاعری کی معراج دیکھنی ہے تو
کلیمِ عجم

ملاحظہ فرمائیے جو شاعرِ تاج حضرت علامہ سیاب اکبر آبادی مدظلہ العالی کی غزلوں کا نادر ترین مجموعہ ہے جس کا ایک ایک شعر درس و پیام، عرفانِ ہستی اور واردات و مدرکات کا آئینہ دار ہے۔ **کلیمِ عجم** میں آپ کو تغزل کا وہ معیاری نمونہ ملے گا جو دوسری جگہ شاذ ہی نظر آ سکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مولانا کے چودہ خطبے بھی اس میں شریک ہیں جن سے اردو شاعری کے ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ مقدمۂ شعر و شاعری مصنفہ مولانا حالی کے بعد اردو نثر میں شاعری اور شاعروں پر اس سے بہتر مضامین آپ کو کہیں نہیں ملیں گے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ حجم ۴۰۰ صفحات کتاب مجلد ہے جلد پر سنہری ڈائی کندہ ہے، مولانا کی تین تصویریں بھی شریک ہیں۔

قیمت تین۳ روپے (سے)

حکیم آزاد انصاری اور منظر صدیقی کے تعارف مع تصویر شریکِ کتاب ہیں۔ قیمت عہ

اربعہ عناصر۔ یہ ایک جیبی سائز کا خوبصورت اور نظر فریب مجموعہ ہے جو حال میں شائع ہوا ہے۔ اس میں قائداجب حکیم محمود علیخاں ماہر اکبر آبادی کی رموز و نکات سے پُر رباعیوں کے مختلف ابواب ہیں۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

روحِ نظیر۔ میاں نظیر اکبر آبادی کے منتخب کلام کا مجموعہ جس کو حضرت مخمور اکبر آبادی نے ایک بسیط مقدمہ و تبصرہ کے ساتھ نہایت کاوش و تحقیق سے مرتب کیا ہے جس سے نظیر اکبر آبادی کے شاعرانہ کمال کا پتہ چلتا ہے۔ قیمت صرف عہ

فغانِ آرزو۔ جناب سید انوار حسین آرزو لکھنوی کی غزلیات کا مجموعہ۔ جس میں زبان و بیان کی خوبیوں نے مل کر عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔ قیمت عہ

گلکدہ۔ حضرت عزیز لکھنوی مرحوم عصرِ حاضر کے ان باکمال شعرا میں سے تھے جن پر حقیقی شاعری کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان کے اشعار سوز و گداز اور حقیقت و معارف کا ایک خزانہ ہیں۔ قیمت صرف دو روپیہ (عہ)

گلزارِ داغ۔ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کا مشہور دیوان جو صحت کے ساتھ از سر نو چھاپا گیا ہے اور جس کا ایک ایک شعر براہ راست دل پر اثر کرتا ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

جگر پارہ۔ یہ بیدم شاہ وارثی مرحوم کے متصوفانہ اور سوز و گداز سے پُر کلام کا مجموعہ ہے۔ مرحوم کی غزلیں حال و قال اور معیاری تغزل کا بہترین نمونہ ہیں۔ قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

مصحفِ بیدم۔ حضرت بیدم شاہ وارثی کا دوسرا دیوان جس میں اُن کا تمام کلام مع ٹھمری اور دادروں کے ہے جس کا مقدمہ حضرت خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے۔ یہ دیوان حضرتِ بیدم کا شاہکار ہے۔ اُن کی تصویر بھی اس میں ہے قیمت عہ

مثنوی عالمِ خیال۔ مصنفہ مرزا شوق قدوائی لکھنوی (مرحوم) شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جس نے اس مثنوی کا نام نہ سنا ہو۔ شوہر اور بیوی کے محبت آمیز منظوم خطوط۔ اس میں ہیں۔ جذبات اس میں ہیں۔ ایک نظم کے چار نسخ ہیں جو چار خوبصورت تصویروں سے مزین ہیں۔ قیمت مجلد مع رنگین تصاویر عہ سادہ بغیر تصاویر و غیر مجلد ۸

مثنوی مادرِ ہند۔ حضرتِ شاد عظیم آبادی کی وہ مثنوی ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نئی ہے، اس مثنوی کا تعلق حسن و عشق سے نہیں ہے بلکہ اس میں ہندوستان کی مکمل سیاسی تاریخ ہے۔ علامہ سیاب اکبرآبادی اور رشید احمد صدیقی کے مقدمے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قیمت ۱۲

مینائے سخن منشی امیر احمد امیر مینائی کی مقبول و مشہور تمام واسوختوں کا ایک مجموعہ بے نظیر کتاب ہے۔ قیمت عہ

رازِ عروض۔ حضرت علامہ سیاب اکبرآبادی کی وہ سہل ترین تصنیف جس نے ہر بندی کو فنِ عروض کا منتہی بنا دیا ہے جس کے مطالعہ سے عروض جیسا مشکل علم پانی نظر آتا ہے۔ دوسرا ایڈیشن بعد اضافہ و ترمیم چھپ کر تیار ہو گیا ہے قیمت صرف ۶

نکاتِ شاعری جن طلبائے فن شعر کو اولیات فن معلوم کرنے کے علاوہ ایک ایک قافیے کی کئی کئی قافیے دریافت کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ مثلاً آم بام۔ خام دام۔ رام۔ شام، سام۔ تمام نام بکام الف سے یا تک ختم ہونے والے اکثر قافیے درج ہیں نہ صرف یہی بلکہ بڑی بڑی نکات عروض سمجھائے گئے ہیں قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

عام فہم عروض۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ عام فہم عروض کو پڑھنے کے بعد آپ کو علم عروض میں پوری دستگاہ ہو جائیگی عام فہم عروض میں نہایت آسان الفاظ اور سلیس اردو میں علم عروض کی پوری وضاحت مع مثالوں کے کر دی گئی ہے قیمت ۸

چراغِ سخن۔ حضرت مرزا یاس عظیم آبادی کی وہ لاجواب تصنیف ہے جسے سالہا سال سے قبولیت کا درجہ حاصل ہے جس نے سینکڑوں حضرات کو صاحب فن بنا دیا۔ اس میں شعر اور فنِ عروض سے تعلق رکھنے والی تمام باتیں بہت ہی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ قیمت صرف عہ

فکرِ بلیغ۔ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم استادِ فن تھے انہوں نے اردو داں طبقہ کے لئے فکرِ بلیغ لکھکر واقعی احسانِ عظیم کیا ہے، جس کے ایک مرتبہ پڑھنے سے تمام فن شاعری کی پوری معلومات ہو جاتی ہے اور انسان شعر کہتے وقت غلطی سے بچتا ہے، ہر سخن فہم اور سخن گو اس کا مطالعہ ضرور کرے۔ قیمت عہ

کارِ امروز

مجموعۂ نظمیات حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی

اگر آپ اپنی زندگی میں انقلاب چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو وطنی، قومی، ملی اور سیاسی موضوعات سے دلچسپی ہے اگر آپ کو اخوت، محبت رواداری اور صداقت کا درس لینا ہے تو اپنے بین القومی شاعرِ اعظم کی شاہکار تصنیف دیکھئے۔

یہ علامہ سیماب کا وہ مجموعہ ہے جس نے اردو شاعری کی دنیا میں ایک ہیجان پیدا کر دیا ہے اور جس نے ناظمینِ اردو میں علامہ موصوف کو واقعی ہندوستان کا ناظمِ اعظم تسلیم کرا لیا ہے۔ اس مجموعہ کی ہر نظم موتیوں میں تولنے کے قابل ہے حجم ۲۶۵ صفحات۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی اعلیٰ۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پر سنہری ڈائی کندہ ہے۔

قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنہ

مشاطۂ سخن۔ ازجناب معتمد مرزا پوری۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے دنیائے ادب میں پہلی کتاب ہے جس میں مسلّم الثبوت اور ماہرینِ فن اساتذہ کی وہ اصلاحیں جمع کی گئیں ہیں جو انھوں نے اپنے ہونہار شاگردوں کو دیں قیمت عہ

جانِ سخن۔ اس کتاب میں فنِ عروض کے متعلق نہایت تشریحی مضامین لکھے گئے ہیں۔ متروکات کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے۔ بحور، صنائع و معائب۔ شاعری کے علاوہ تقطیع کے قاعدے اور علم قافیہ کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ قیمت عہ

ایشیائی شاعری۔ یہ کتاب اثہری صاحب کی تصنیف ہے جس میں تمام اصنافِ شاعری پر پوری وضاحت کے ساتھ بحث کی گئی ہے، تمام کتاب فنی نکات سے بھری پڑی ہے اور نہایت ہی آسان ہے قیمت ایک روپیہ (عہ)

ایضاح القوافی۔ ڈاکٹر سید سخاوت علی شوخ اکبرآبادی جانشین مرزا رئیس اکبرآبادی کی لاجواب تصنیف ہے، ہمارا دعویٰ ہے کہ اردو میں علم قافیہ میں آجتک کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی قیمت ۱۰

مغل اور اردو۔ ادیب الملک نواب نصیر حسین خیال مرحوم کی لاجواب تصنیف۔ اس میں اردو کے ابتدائی دور سے لیکر مغلوں کے ہر زمانہ کے تمدنی واقعات بڑے دلچسپ اور تحقیقی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ اردو کی تاریخ اس سے بہتر آجتک مرتب نہیں ہوئی، بڑا سائز حجم ۱۸۰ صفحات قیمت عہ

نگارستان۔ یہ مجموعہ ہندوستان کے فخید المثال فسانہ نگار حضرت نیاز فتحپوری کا ایک شاہکار ہے۔ حضرت نیاز کے افسانے رفعتِ تخیل حسین و پرشکوہ الفاظ کے اعتبار سے اپنا جواب آپ ہیں۔ قیمت صرف دو روپیہ (عہ)

گہوارۂ تمدن۔ مولانا نیاز فتحپوری کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ اسلام سے ثابت کر دیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیائے تمدن اس کی کس قدر ممنون ہے۔ قیمت عہ

شہاب کی سرگذشت۔ مولانا نیاز فتحپوری کا وہ عدیم النظیر فسانہ جو اردو لٹریچر میں بالکل نئی چیز تسلیم کیا گیا ہے۔ جذبات سیرت نگاری اور تحلیل جذبات کے ایسے نادر نمونے اس میں نظر آئیں گے جو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتے۔ قیمت عہ

شمیم۔ باتصویر مکمل مصنفہ فیاض علی بی۔اے (علیگ) زمانۂ حال کی اُردو افسانہ نگاری میں معرکۃ الآرا تصنیف فنِ ناول نویسی میں انقلاب پیدا کرنے والا مصلحِ اخلاق، سبق آموز، عبرت خیز اور بے انتہا دلچسپ ناول جس پر ہندوستان کے تمام مشہور اخبارات و رسائل نے بسیط تبصرے کئے ہیں۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ۔ متعدد رنگین و سادہ تصاویر۔ قیمت ہر دو حصہ مکمل مجلد للعہ

کیفستاں جناب قیسی رام پوری کو کون نہیں جانتا ہے۔ دنیائے افسانہ میں آپ کا درجہ بہت بلند ہے یہ جمیل و حسین کتاب آپ کے افسانوں کا جدید مجموعہ ہے جس میں آپ نے خوب رنگ آمیزی اور تخیل نگاری کی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

آتش پارے۔ دُنیائے افسانہ میں اپنی طرز کے قابلِ مطالعہ افسانے۔ جن کو مصنف کا شاہکار کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ "آتش پارے" جناب سعادت حسن منٹو کے آتشِ جذبات کے آئینہ دار ہیں، ہر افسانہ روحانی معاشرتی اور جذباتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

دُنیا کی حور۔ حضرت کوثر چاند پوری کے افسانے ہندوستان کے مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہے۔ یہ افسانہ اُن کے تمام افسانوں سے مشہور و معروف ہے۔ قیمت ۱۰/

شبِ چراغ۔ مصنفہ جناب محمد صادق ضیائی بی۔اے۔ایل۔بی۔ عورتیں کہتی ہیں یہ افسانے ہماری تہذیب و تسکین کے لئے لکھے گئے ہیں، لیکن مردوں کی زبان میں مرد کہتے ہیں کہ ان افسانوں میں ہماری اخلاقی، مجلسی، ازدواجی زندگی کی تصویر ہے۔ قیمت ۸/

قاتل اور دیگر افسانے۔ یہ ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار حضرت ایم۔اسلم کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ اس مجموعہ میں حضرت ایم۔اسلم کے تازہ ترین افسانے ہیں مسکراہٹ اور آنسو، یاس و اُمید ناکامی و کامرانی۔ محبت و نفرت آزادی و غلامی کے نہ مٹنے والے نقوش آپ کو ملیں گے۔ حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت صرف عہ/

بزمِ خیال۔ از جناب مقتدر مرزا ایدی۔ اس کتاب میں شعرائے اُردو اور فارسی کی مجالس کے لطائف و ظرائف کو جمع کیا گیا ہے۔ برجستہ گوئی اور حاضر جوابی کے بہترین نمونے دکھائے گئے ہیں حجم ۱۶۰ صفحات قیمت ایک روپیہ (عہ)

زادِ راہ۔ منشی پریم چند آنجہانی کے پایہ کا ادیب اور مصنف کسی ملک میں صدیوں ہی میں پیدا ہوتا ہے ... [illegible] ... آئینہ دار ہیں زادِ راہ میں فاضل مصنف کا آخری اور بہترین نمونہ ہے۔ قیمت عہ

کمالِ داغ۔ یہ مرزا داغ دہلوی کی غزلیات کا بہترین اور بہت مستند انتخاب ہے جس کو مولانا حامد حسن قادری لیکچرار سینٹ جانس کالج آگرہ نے نہایت کاوش سے مرتب کیا ہے۔ ایک بسیط فاضلانہ تنقیدی مقالہ بھی داغ کی شاعری پر اس میں موجود ہے۔ قیمت مجلد عہ

حُسنِ کار۔ فنونِ لطیفہ پر بہت پُر معلومات کتاب ہے۔ جناب محمد صادق صاحب ضیائی بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی کی یہ عجیب و غریب تصنیف ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے مع تصویر مصنف ۶/

ایوانِ تصور۔ بلبلِ ہند شریمتی سروجنی نائیڈو کے دلکش رنگین گیتوں کا آزاد ترجمہ ہے جسے مسٹر مظفر قریشی بی۔اے نے نہایت کاوش و قابلیت کے ساتھ تالیف کیا ہے یہ مشرقی تمدن کی خوبصورت تصویر رفعتِ خیال اور رنگین بیانی کا عدیم المثال مرقع ہے۔ قیمت ۸/

داستانِ عجم مصنفہ ادیبِ شہیر نواب نصیر حسین خیال مرحوم داستانِ عجم وہ گوہرِ نایاب ہے جس پر سینکڑوں کی تعداد میں ریویو ہو چکے ہیں شاہنامۂ فردوسی پر اُردو میں آج تک اس سے بہتر تبصرہ شائع نہیں ہوا۔ قیمت عہ

روحِ نظم۔ مولانا تاجور نجیب آبادی اور پنڈت میلا رام وفا نے اُردو شاعری کا یہ انتخاب دو جلدوں میں کیا ہے۔ میر سے لیکر آج تک کے اکثر شعرا کے کلام کا انتخاب دونوں حصوں میں موجود ہے۔ حصہ اوّل عہ/ حصہ دوم عہ

روحِ انتخاب۔ اُردو نثر اور اُردو لٹریچر کا ضروری تاریخی انتخاب مرتبہ مولانا تاجور نجیب آبادی اور پنڈت میلا رام وفا دو حصوں میں۔ حصہ اوّل حجم ۱۰ صفحات قیمت ۱۲/ حصہ دوم ۸/

محامد الخلفا رض۔ قرآن مجید اور احادیث شریف کی روشنی میں خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام رض کے مستند اور مکمل حالات، زندگی۔ خلفائے اربعہ رض کے متعلق یہ تحقیقی جمیل و جلیل اور نادر ترین تصنیف اس میں ہندوستان کے مشہور شعرا سے نظمیں اور قطعات لکھوائے گئے ہیں۔ تعارف حضرتِ محترم مفتیٔ اعظم علامہ کفایت اللہ صاحب مدظلہ نے تحریر فرمایا ہے سلیس اور عام فہم زبان، اعلیٰ درجہ کی لکھائی چھپائی۔ ٹائٹل قابلِ دید۔ قیمت مجلد ۱۲/ غیر مجلد ۸/ دونوں جلدوں کے خریداروں کے لئے خاص رعایت۔

ادبیاتِ اُردو میں ایک نیا اضافہ

حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی کی معرکۃ الآرا تازہ ترین تصنیف

دستور الاصلاح

اصولِ اصلاح پر یہ پہلی کتاب ہے۔ جس میں اصلاحِ زبان، اپنی اصلاح۔ اصلاحِ خیال مشاعروں کا جدید نظامِ عمل۔ ضرورتِ اصلاح۔ اصلاح لینے کا طریقہ۔ اصلاح دینے کا طریقہ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ نیز شعرائے متقدمین سے لیکر اس وقت تک کے تمام اساتذہ کی اصلاحات کے نمونے مع توجیہ اصلاح دیئے گئے ہیں۔

ہندوستان کے تمام مشہور اساتذہ نے اس کتاب کی تعریف کی ہے اور اسے استاد و شاگرد دونوں کے لئے مفید بتایا ہے

لکھائی چھپائی بہترین ہے۔

قیمت صرف عہ/

علم و ادب کی بہترین کتابوں کا ذخیرہ

افسانے

سرگذشت اسیر
سمندر کی خلا و ندہ
محمودہ
فسانہ
طوفان زندگی
دنیا
شیطان
عبرت کدہ
خانقاہ
جتوڑ کی دیوی
مغربی دلہن
ہیرو
دوست

تصانیف ل۔ احمد

انشائے لطیف
نغمات
محبت کا افسانہ
زندگی کے کھیل

تصانیف شوکت تھانوی

بحر تبسم
موج تبسم
سیلاب تبسم
طوفان تبسم
منشی جی

ناول مولانا شرر لکھنوی

ملک العزیز ورجنا
منصور موہنا
فردوس بریں
دلکش کا مل
دربار... کی مصیبت
فلورا فلورنڈا
حسن بن صباح

تاریخی

تاریخ کا روشن پہلو
حکایت کشمیر
کشمیر کی رانیاں
معارک کعبہ
عروج ترکی
کشمیر کا مستقبل
ترکان احرار
اشرف التواریخ کامل
خضر منزل
خلافت الہیہ
انقلاب فرانس

ادبی

ترکی زبان
انشائے محبت
ادبی موتی چار حصے

نہالستان شاعر
انشائے تبسم
مضمون نگار
عورتوں کے لئے
بہشتی جھومر
عقیلہ بیگم
معین الخواتین
... خطوط
کفایت شعاری
لونڈی نامہ

سوانح عمریاں

امت کی مائیں
بنت الرسول
سوانح خاتون جنت
سوانح امام حسن

تذکرہ صابر
سوانح خواجہ غریب نواز
سوانح غوث پاک
مناقب غوث گوالیاری
تحفہ درباروالایت
خمخانہ برکات
قصص الانبیا
حیات خواجہ
تذکرہ خواجگان چشت
سوانح اورنگزیب
سوانح زیب النساء
سوانح اکبر اعظم
سوانح نورجہاں بیگم
سوانح غازی محمد بن قاسم
حیات ابلیس
حیات سعدی
حیات حافظ
حیات جانی اکبر آبادی
خالدہ ادیب خانم
حیات خسرو
سوانح شاہجہاں
حیات فردوسی

مشہور شعرا کے دیوان

دیوان غالب (انتخاب)
غزلیات امیر مینائی
انتخاب کلام اکبر الہ آبادی
دیوان اکبر دانا پوری
دیوان کالیمان

کلام ذوق (انتخاب)
بہار معرفت
دیوان حافظ

تصانیف مولانا حالی

مسدس حالی (عکسی)
مسدس حالی (سادہ)
مرثیہ غالب
مناجات بیوہ
شکوۂ ہند
حب وطن
تصویر درد

تصانیف ڈاکٹر اقبال

شکوہ جواب شکوہ
شمع و شاعر
فریاد امت
اکبری اقبال
نالۂ یتیم

مذہبی

جواز تعزیہ
ارشاد احمد
قومی نظم
تقویم الاسلام
کمالات قرآنی

صنعتی

اسرار صنعت
دولت کا ڈھیر
چائے کی ...

سوانح امام حسین
ذاکرہ
سوانح حضرت صدیق اکبر
سوانح حضرت عمر فاروق
سوانح حضرت علی
سوانح امام اعظم
سہیلی نامہ
انشائے نسواں
اصلاح الرسوم
آفتاب زندگی
شباب زندگی
چاند تارے
گھر اور گھر والی
شوہر کی نصیحتیں
آداب نسواں
نورجہاں بیگم
صبر کی دیوی
ناصح مشفق

طالبان فن اور شائقین شعر و سخن کو نوید نو

اُردو زبان کا بے نظیر لغت

معین الشعرا

معنفہ غلام حسین خاں آفاق بنارسی مرحوم

یہ وہ عدیم المثال لغت ہے جس میں عربی۔ فارسی۔ اُردو۔ انگریزی اور ہندی زبان کے ہزاروں الفاظ کے معنی کے علاوہ ہر لفظ کے اعداد ملفوظی صحت کیساتھ درج کئے گئے ہیں جو تاریخ نکالنے میں معاون ہوتے ہیں ہر لفظ کے متعلق یہ بھی درج ہیں کہ وہ کس زبان کا ہے اور مذکر ہے یا مونث۔ نہ صرف یہی بلکہ اساتذہ ماضی و حال کے کلام سے ہر لفظ کی تذکیر و تانیث کا ثبوت بھی پیش کیا گیا ہے۔ حقیقتاً یہ لغت طالبان ادب تشنگی کے لئے خضر راہ ہے کتابت طباعت بہترین حجم ۳۸۶ صفحات مع تصویر مصنف ۱۸×۲۲/۴ سائز۔ جلد خوشنما اور مضبوط کاغذ دبیز اور چکنا۔ قیمت صرف چار روپیہ چار آنہ۔

محصول ذریعہ وی۔ پی ۱۲/

منظور شدہ محکمہ ہائے تعلیم برار و ریاست میسور

نگار

تصویر:- محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ایڈووکیٹ اٹاوی

جلد ۱۲ | ماہنامہ "شاعر" آگرہ فروری سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر ۲

چندہ سالانہ عوام سے ۳ خواص سے ۵ محسنین سے ۶۰ معاونین سے ۲۴ انیسان سے ۱۵ ہمدردوں سے ۱۲ فی پرچہ ۴

سرپرست، محسنین، معاونین اور انیسان و ہمدردانِ شاعر

سرپرست

(۱) سرپرستِ ادب جناب محترم محمد حیات خانصاحب طالب سیمابی لدیانوی یک صد روپیہ سالانہ ۱۰۰/

محسنینِ ادب

(۲) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ۶۰ سالانہ

(۳) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیر خورجوی ۶۰ سالانہ

(۴) محسنہ ادب ہر ہائینس علیہ حضرت کیتانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ سالانہ

(۵) محسنِ ادب جناب محترم حاتمی امام الدین خانصاحب ملتان دربار پاجود ۶۰ سالانہ

(۶) محسنہ ادب شہزادی تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ سالانہ

معاونینِ ادب

(۷) معاونِ ادب مسٹر ٹے۔ بی فلپس صابر اکبرآبادی بی۔ اے ۲۴ سالانہ

انیسانِ ادب

(۸) انیسِ ادب جناب سید تفضل کریم صاحب جمشید پور ۱۵ سالانہ

ہمدردانِ ادب

(۹) ہمدردِ ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلیمان جالندہر ۱۲ سالانہ

(۱۰) ہمدردِ ادب جناب سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری ۱۲ سالانہ

(۱۱) ہمدردِ ادب جناب ابو محمد عبدالعظیم صاحب رونق دکنی ۱۲ سالانہ

(۱۲) ہمدردِ ادب جناب محفوظ مرادآبادی ۱۲ سالانہ

(۱۳) ہمدردِ ادب جناب مولوی محمد قاسم صاحب نامی علوی دربھنگوی عالم بھنگوی ۱۲ سالانہ

(۱۴) ہمدردِ ادب جناب نوابزادہ کنور شکور حسین خانصاحب قیس آف بینڈدو ۱۲ سالانہ

(۱۵) ہمدردِ ادب جناب صاحبزادہ سید سلطنت حسین صاحب کیفؔ زمیندار (وان رادہارام) ۱۲ سالانہ

خاصانِ ادب

(۱۶) جناب صاحبزادہ سلطان حامد خانصاحب ثروت گلشن آبادی صہ سالانہ

(۱۷) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمان خان صاحب شفق ٹونکی صہ سالانہ

(۱۸) جناب عبدالحفیظ صاحب نمر صدیقی جہاددی بی۔ اے صہ سالانہ

(۱۹) جناب محمد سعید خانصاحب ادب صہ سالانہ

(۲۰) جناب لالہ گنگارام صاحب آبد سرہندی صہ سالانہ

(۲۱) جناب سید مسعود حسن صاحب مسعود ڈپٹی کلکٹر صہ سالانہ

(۲۲) جناب سید مظفر حسین صاحب عرشی دہلی صہ سالانہ

(۲۳) جناب دلیسراج صاحب شرما بی۔ سی۔ ٹی۔ ڈی۔ فرخنگ صہ سالانہ

(۲۴) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی صہ سالانہ

(۲۵) جناب ایم۔ اے رشید صاحبہ توبہ صہ سالانہ

(۲۶) جناب صاحبزادہ عبدالحمید خانصاحب بہادر عباسی بی۔ اے صہ سالانہ

(۲۷) جناب ماسٹر حسن خانصاحب اثر صہ سالانہ

(۲۸) جناب نذیر احمد صاحب نذیر شیرکوٹی صہ سالانہ

(۲۹) جناب محمد صبغتہ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی صہ سالانہ

(۳۰) جناب صاحبزادہ سیٹھ اکبر علی صاحب صہ سالانہ

(۳۱) جناب محبوب حسن صاحب آسی متوطن رڑکی۔ بمبئی صہ سالانہ

(۳۲) جناب مخدوم سید علی اسد نقوی البخاری احمدآباد (جھنگ) صہ سالانہ

(۳۳) جناب طالق سیدانی لدھیانوی صہ سالانہ

(۳۴) جناب سبحان خاں صاحب فاضل بھوپال صہ سالانہ

(۳۵) جناب سید اشفاق حسین صاحب حرفؔ نقوی سرکاباد صہ سالانہ

(۳۶) جناب حبیب حسن خانصاحب حبیب خانجہانپوری۔ ازکوئٹہ صہ سالانہ

(۳۷) جناب ابو نعیم محمد خان صاحب عارف سیالکوٹی۔ ازکوئٹہ صہ سالانہ

جرعات

ایراد و قبول

جنوری ۱۹۴۱ء کا "شاعر" سینکڑوں دقتوں کے بعد شائع کیا گیا تھا۔ کاغذ کی ناپیدی اور گرانی پریس کی معروفیتیں، نئے سرورق کی بہ سرعت تیاری اور ان سب کے باوصف میری دوسری معروفیتیں ان حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے امید نہیں تھی کہ میں نئے سال کی اشاعت اپنے ارادوں کے مطابق پیش کر سکوں گا۔ لیکن اُس منعمِ مطلق کا کرم تھا کہ ادارہ نے دن رات ایک کر کے "شاعر" کو اُس رنگ میں پیش کیا کہ دوست دشمن سبھی چیخ اُٹھے۔ ہندوستان کے کونے کونے سے سیکڑوں تعریفی خطوط آ چکے ہیں۔ جنوری نمبر کو جو قبولِ عام حاصل ہوا ہے، اُس کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ شاعر کی نئی ترتیب، معیار اور سرورق پر مستند ادبا اور شعرا نے دو دو تین تین صفحات کی تقاریظ ارسال فرمائی ہیں۔ کوئی خط آجتک ایسا وصول نہیں ہوا جس میں "شاعر" کے جنوری نمبر کا ذکر نہ ہو، میں چاہتا تھا کہ ان خطوط کے اقتباسات چند صفحات میں پیش کروں، لیکن بدیں خیال کہ ناظرین کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچیگا اور خواہ مخواہ مضامین کے کم از کم ۸ صفحات گھر جائیں گے، میں نے ان کی اشاعت مناسب نہیں سمجھی۔

زیرِ نظر اشاعت اپنے مضامین کے اعتبار سے گذشتہ نمبر سے بھی زیادہ وزنی ہے، مستند ادبا اور شعرا کے علاوہ تین شاعر خواتین بھی اس میں حصہ لے رہی ہیں۔ ادارہ کوشاں ہے کہ شاعر کا ہر نقشِ ثانی، نقشِ اول سے بہتر ہو۔ بعض حضرات کو شکایت تھی کہ "شاعر" میں نظمیں کم ہوتی ہیں اور غزلیں زیادہ۔ زیرِ نظر اشاعت میں اس کا بطورِ خاص خیال رکھا گیا ہے۔

ادارہ بصد مسرت و افتخار محترمہ **شہزادی تاج بخت صاحبہ** دام اقبالہ آف جوناگڑھ کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انھوں نے ازراہِ ادب پروری "شاعر" نوازی "محسنۂ شاعر" بننا قبول فرمایا۔ شہزادی جوناگڑھ کی یہ ادب پروری اُن کے علمی شغف کا ثبوتِ درخشاں ہے۔ شاہی خاندان میں "شاعر" کی قبولیت ادارہ کے لئے بہت حوصلہ افزا ہے۔ خدا اس علم دوست خاندان کو عظمتوں اور نعمتوں سے بہرہ ور فرمائے اور **اعلیٰحضرت نواب سر محمد مہابت خاں بابی صاحب بہادر ثالث** جی۔سی۔آئی۔اے۔ کے۔سی۔ایس۔آئی دام اقبالہ کے دورِ حکومت کی درخشانیوں کو اور زیادہ کرے۔

تبریکِ ازدواج

یہ اطلاعات ادارہ کے لئے بہت زیادہ مسرت خیز ہیں کہ ۲ جنوری کو "شاعر" کے ممتاز مضمون نگار و مترجم اور مدیرِ شاعر کے محبِ صادق جناب **توکل ڈبائیوی بی اے** ازدواجی مسرتوں سے ہمکنار ہوگئے۔ آپ کا ایک بہترین ترجمہ "کردار" کے عنوان سے آئندہ اشاعت میں نظر نواز ہوگا۔

۶ فروری ۱۹۴۱ء کو شاعر کے سب سے قدیم محسن جناب محترم بابو ہر **گوبند دیال** صاحب نشتر ہنگامی ایڈووکیٹ اورئی کے چھوٹے صاحبزادے مسٹر سلہ کی شادی ہے۔

ادارہ شاعر اپنے دونوں کرم فرماؤں کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہے۔

حدیثِ ناگفتنی

جنوری نمبر کی اشاعت کے بعد اس کی پسندیدگی کی اطلاعات سے جہاں ادارہ کو مسرت ہوئی وہاں مستقبل کے خطرات اور عام جمود و خمود کو دیکھ کر ہمتوں میں پسپائی بھی پیدا ہوئی۔ "شاعر" کو پسند تو سب کرتے ہیں لیکن اس کی ترقی و اشاعت کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ ہر رسالہ اور اخبار اپنی ذاتی جاذبیتوں کے علاوہ ناظرین کی توجہ اور کوشش سے عروج پاتا ہے۔ الحمد للہ "شاعر" کو یوں تو متعدد علم دوست حضرات کی ہمدردیاں حاصل ہیں لیکن عام طور پر اُس کی ترویج کے لئے کوشش نہیں ہو رہی ہے۔ دو چار کی کوشش دو چار کی ہے۔ جب تک تمام ہی خواہانِ شاعر اجتماعی حیثیت سے اُسے مدد نہیں پہونچائیں گے، اُس وقت تک اُن کا "شاعر" کشمکشِ روزگار میں مبتلا ہی رہے گا۔ کاغذ پر ہر ہفتہ دو چار آنے بڑھ رہے ہیں۔ اس اشاعت میں جو کاغذ لگایا جا رہا ہے وہ بمشکل حاصل کیا گیا ہے اور وہ بھی دگنی سے زیادہ قیمت پر۔ بازار میں یہ اطلاعات گرم ہیں کہ چھ ماہ تک اس سائز کا کاغذ کسی قیمت پر نہیں مل سکیگا۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری مشکلات میں دیگر رسائل و اخبارات کی طرح آپ کا "شاعر" بھی مبتلا ہے۔

میرا خیال تھا کہ جنوری میں جن خریداروں کا زرِ رسالہ ختم ہو رہا ہے وہ سب کے سب دوبارہ خریداری قبول فرما لیں گے اور چونکہ ایسے حضرات خاموش تھے اسی لئے اور بھی زیادہ توقع تھی لیکن افسوس کہ آدھے سے زیادہ خریداروں نے وی۔ پی واپس کر دیے اور تقریباً محصول ڈاک میں ایک سو روپیہ کا نقصان ہوا۔ جن حضرات نے وی۔ پی واپس کر دیے ہیں اُن سے تو اب کسی قسم کی توقع ہے ہی نہیں، البتہ اُن محترم خریداروں سے جن تک "شاعر" بار بار پہونچ رہا ہے میں یہ گذارش کرونگا کہ وہ شاعر کی اشاعت میں کوشش فرمائیں

تجزیہ — زیرِ نظر اشاعت کے بعض مضامین

بزرگوں کی شوخیاں، پروفیسر مولوی عبید اللہ قدسی کا ایک لطیف طنزیہ مقالہ ہے جس میں مولانا شبلی، حافظ شیرازی اور مرزا غالب وغیرہ کے کردار کو اُن کی شاعری کے آئینہ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پروفیسر صاحب نے خلوت کو جلوت میں منتقل کرنا چاہا ہے، ان کے جا بجا لطیف اشارات بہت پُر لطف ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ اس مقالہ سے کوئی غلط اثر لیں لیکن اثر گیر ہونے سے پہلے انھیں اصلاحی پہلوؤں پر غور کر لینا چاہیے۔ اُردو ادب میں اس قسم کے طنزیہ مضامین چونکہ کم لکھے جاتے ہیں اس لئے ابھی لوگ عادی نہیں ہوئے ہیں۔ پروفیسر مولوی رشید احمد صدیقی کے یہاں یہ چیز بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

ہماری مثنویاں منظوم افسانوں کی حیثیت سے، یہ مقالہ اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل نیا ہے، جہاں تک مجھے علم ہے ابھی تک اس پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا، مولانا سیماب اکبرآبادی نے اس مقالہ میں مثنوی اور منظوم افسانہ کا فنی ادبی اور افادی فرق دکھایا ہے اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ موجودہ دور کے منظوم افسانے قدیم صنفِ مثنوی کا ایک مفید اور ارتقائی ردِ عمل ہیں۔ یہ مقالہ موصوف نے ریڈیو اسٹیشن دہلی سے نشر فرمایا تھا۔

شعر العرب، عربی شاعری کا زیادہ حصہ اتفاقی ہے، عرب کے قدیم شعرا ہمارے ملک کے شعرا سے بہت مختلف تھے وہ زندگی کے حادثات و واقعات اور روح کی تشنگی کو محسوس کرنے کے بعد شعر کہتے تھے۔ اس مقالہ میں مولانا ماہر القادری نے چند دلچسپ شعری واقعات کو قلمبند فرمایا ہے جن سے عربی شعرا کی برجستہ گوئی اور قادر الکلامی مترشح ہے۔

ہندی فیلسوف، اکبرآباد کے محقق ادیب مولانا انتظام اللہ شہابی نے اپنی تمام زندگی تاریخی معلومات کے لئے وقف کر دی ہے، مولانا موصوف نے اپنی کاوشِ پیہم اور چھان بین سے سیکڑوں ادبا اور شعرا کو حیاتِ تازہ بخشی ہے۔" شاعر کے کسی گذشتہ نمبر میں آپ نے مرزا قتیل کے تفصیلی واقعات جن سے ہر شخص ناآشنا تھا بڑے شرح و بسط کے ساتھ پیش کئے تھے۔ اس نمبر میں آپ نے شمس العلما علامہ عبد الحق عمری خیرآبادی کے مفصل حالات بعد کاوش تلاش کر کے مرحمت فرمائے ہیں اور علامہ عبد الحق کی کتاب فلسفہ کے چند اقتباسات بھی جو آئندہ نمبر میں شائع ہونگے۔ علامہ عبد الحق کے متعلق میرا کچھ لکھنا لاحاصل ہے، ناظرین اس مقالہ کو پڑھنے کے بعد اُن کے تبحرِ علمی کا خود اندازہ لگا لیں گے۔

شکستِ رنجیت، یہ ملک کے نوجوان ادیب میاں محمد صادق حسین ضیائی۔ ایل ایل۔ بی کا تخلیقی مقالہ ہے، شعوری کیفیتوں کے پیدا ہونے کے بعد ذہنی قوتوں کا تدریجی ارتقا، انفرادیت کا وجود و عمل، شاہراہ زندگی کی تلاش، کامرانی کی سعی اور کامیابی کے خوش آئندہ خیالات جو انسانی زندگی کا لازمہ ہیں۔ اس مقالہ کے داخلی پہلو ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسین ضیائی صاحب نے بہ امعانِ نظر موجودہ دور کے نوجوانوں کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے یا خود وہ ان واقعات سے گذرے ہیں، مضمون اپنی جگہ نفسیات و حقائق کا آئینہ دار ہے۔

ایک بوند پانی، ہرچند بہت مختصر افسانہ ہے لیکن سوسائٹی کی مسموم ذہنیت کا صحیح آئینہ دار اور چھوت چھات کی سخت گیریوں کی ایک المناک ٹریجڈی ہے۔ جناب مخمور عثمانی اردو کے اچھے افسانہ نگاروں میں سے ہیں، موصوف نے شاعر کے افسانوی باب کو مستقلاً نوازنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

منظومات۔ اس اشاعت میں شائع ہونے والی غزلیں اور نظمیں بہت ہی زیادہ جاذبِ قلب و روح ہیں کس کس کی تعریف کی جائے۔ حضرت مولانا سیماب کے قطعاتِ جنگ ایسے چبھتے ہوئے نشتر ہیں کہ بیساختہ داد نکل جاتی ہے۔ حضرت مولانا قمر بدایونی کی غزل زبان، جذبات اور قادر الکلامی کا شاہکار ہے۔ حضرتِ جگر بریلوی پہلی بار شاعر کے صفحات پر رونق افروز ہو رہے ہیں، آپ کی پوری غزل لطیف جذبات کی حامل ہے۔ مولانا آلم مظفر نگری کی نظم **درد** کو عرفانِ درد کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ افسر الشعرا حضرتِ آغا شاعر قزلباش مرحوم و مغفور کی غزل دلّی کی ٹکسالی زبان اور تغزل کا بہترین نمونہ ہے۔ "روحِ سخن" حضرتِ وحشت کلکتوی کی تازہ ترین غیر مطبوعہ غزل ہے جس کا ایک ایک شعر روح میں نشتر زنی کرتا ہے۔ "**سنت تلسی داس**" حضرتِ آغاز برہانپوری کے شاعرانہ جذبات و احساسات کی کامیاب تصویر ہے۔ حضرتِ نیر فورجوی کی نظم "**تیری یاد**" واردات کا رنگین مرقع ہے۔ موصوف نے آئندہ بھی شاعر کو نوازنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ حضرتِ شفق فرنگی کی نظم **تیری** رنگ و بو کا ایک منظوم افسانہ ہے **جنگِ مغلوبہ**۔ حضرت حکیم آزاد انصاری کی قدرتِ شاعرانہ کا مظاہرہ کر رہی ہے کسی کسی بند میں جنگ کا منظر بالکل سامنے آجاتا ہے۔ جناب خان نشتری امام الدین خاں ملتانی۔ بہار کوٹی۔ نواب زادہ قیس آف مینڈو۔ حضرتِ نسیم گوالیاری۔ جناب مرزا عالم پوری جناب تخفیف کوٹی۔ جناب جاوید کوہستانی۔ آنسہ خورشید اقبال جالندھری اور جناب محمد تصدق بی۔ اے۔ بی۔ ٹی وغیرہ کی غزلیں اور نظمیں بھی چنیدہ پھول ہیں۔

اعجاز صدیقی

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

کچھ سوگ بتقریبِ محرم کرلیں
دل پر طاری حقیقتِ غم کرلیں
اسلام کے اس عشرۂ سالِ نو میں
آ سالِ گذشتہ ترا ماتم کرلیں

تخلیق کی غایت تو نہیں ہے یہ جنگ؟
دُنیا کی ہلاکت تو نہیں ہے یہ جنگ؟
معلوم نہیں کسیکو انجام اس کا
تمہیدِ قیامت تو نہیں ہے یہ جنگ؟

کچھ خاک میں زیرِ آسماں دفن ہوئے
کچھ لوگ تہِ آبِ رواں دفن ہوئے
پامال ہیں ٹھوکروں میں عبرت کی ہنوز
مارے گئے جتنے، سب کہاں دفن ہوئے

یورپ میں سکون و صلح کا رنگ نہیں
جذبات محبت سے ہم آہنگ نہیں
فطرت کا نظام توڑنے والوں سے
فطرت کا یہ انتقام ہے، جنگ نہیں

بیکار تدابیر ہوئی جاتی ہیں
سب کوششیں فتنوں سے دبی جاتی ہیں
آویزشیں جنگ کی نہیں ختم ابھی
کچھ کشمکشیں بڑھی چلی جاتی ہیں

وہ عیش کا کاروبار جاری نہ رہا
وہ سلسلۂ بادہ گساری نہ رہا
نادانی سے جس کو ابدی سمجھا تھا
یورپ پہ وہ خوابِ ناز طاری نہ رہا

یہ جنگ، جو ایک رنگ پر جاری ہے
بالواسطہ تنبیہِ زبوں کاری ہے
خوابِ غفلت میں ہیں جو قومیں اب تک
اُن کے لئے اک نفیرِ بیداری ہے

بیدار کُن اے ہند ترے ساز نہیں
معلوم تجھے حیات کا راز نہیں
بچوں کا ہیں کھیل ڈھول تاشے تیرے
اُن میں طبلِ جنگ کی آواز نہیں

کب جوش میں فطرت کا عتاب آجائے
کب عیش میں رنگِ اضطراب آجائے
اے غفلتیانِ بزمِ عالم ہشیار!
معلوم نہیں کب انقلاب آجائے

لاشوں کو قدم سے ناپنا خوب نہیں
فصلِ غم میں الاپنا خوب نہیں
کاشانۂ ہمسایہ میں جب آگ لگے
اُس آگ سے ہاتھ تاپنا خوب نہیں

سیماب

تحقیق و تصحیح

جوابِ استفسارات مطبوعہ "شاعر" جنوری ۱۹۴۱ء

گذشتہ اشاعت میں جناب خواجہ دِر دا کبرآبادی نے چند علمی و فنی استفسارات کئے تھے اور اساتذہ فن سے اُن کے جوابات چاہے تھے لیکن افسوس کہ اس طرف توجہ نہیں دی گئی، مجبوراً میں خود جواب لکھ رہا ہوں۔ میں خود بھی چاہتا تھا کہ بابِ تحقیق و تصحیح کو دوسروں کے سپرد کردوں اور ہر ماہ سوالات شائع کرکے ہر فن حضرات کو جوابات لکھنے کی دعوت دوں تاکہ میری ذمہ داریاں ہلکی ہوجائیں لیکن اس عام ادبی جمود کو کیا کیا جائے۔ میرے جوابات کی غلطیوں کی گرفت کے لئے تو ہر شاعر و ادیب چشم براہ رہتا ہے لیکن خود قلم فرسائی کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا۔

الف (۱) میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ "پہنچ" میں واو ضرور ہونا چاہئے۔ اگر ہم "پہونچا" کو "پہنچا" لکھتے ہیں تو اس میں اور "پہنچا" میں جس کے معنی کلائی ہیں کوئی امتیاز نہیں ہوسکتا۔ ہرچند یہ لفظ دونوں طرح لکھا جاتا ہے، لیکن میں "واو" کے اعلان کو اولیٰ سمجھتا ہوں۔

(۲) "آبشار" کو قدما نے مونث استعمال کیا ہے مثلاً ؎

باقی رہے نہ جنتِ گلشن کی تازگی جاری اگر نہ آپ کی ہو آبشارِ نبض
(امیر مینائی)

خیالِ قامتِ بالا میں ہیں رواں آنسو بڑی بلندی سے یہ آبشار گرتی ہے

اس کے باوجود کہ قدما نے "آبشار" کو مونث لکھا ہے موجودہ دور کے شعرا اسے قبول نہیں کرتے۔ چنانچہ عام طور پر "آبشار" مذکر استعمال ہوتا ہے۔ قدما میں بھی مرزا مہدی قبول نے "آبشار" کو مذکر لکھا ہے "اسی صورت سے اب جاری ہے گا آبشار اپنا"

موجودہ دور کے اساتذہ میں سے اس وقت میرے سامنے مولانا سیماب کا ایک شعر ہے

اِدھر ہے اک آبشارِ لرزاں اُدھر ہے زلفِ سیاہ پریشاں
وہ اپنی موجیں دکھا رہا ہے یہ اپنی موجیں دکھا رہی ہے
(سیماب)

اور یوں بھی جب "آبشار" کے معنی پانی کا جھرنا اور پہاڑ کا چشمہ ہیں تو اس کا مونث استعمال اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ "بڑی بلندی سے یہ آبشار گرتی ہے" کی اگر نثر کریں اور کسی کو آبشار کے معنی سمجھائیں تو یوں کہنا پڑیگا۔ "یہ پانی کا جھرنا بڑی بلندی سے گرتی ہے"۔ میرے خیال میں یہ کسی طرح درست نہیں۔

(۳) "پرویز" اور "ناچیز" قوافی قطعاً غلط ہیں۔ یہ عیوبِ قوافی میں سے ایک عیب ہے جسے "اقوا" کہتے ہیں

(۴) ذوق اور شوق میں بڑا فرق ہے، کوئی اس کے استعمال میں احتیاط نہ کرے یہ دوسری بات ہے۔ ذوق کے معنی ہیں چاشنی۔ مزہ لذت۔ نشاط۔ خوشی۔ چکھنا مزہ لینا۔ لطف۔ حظ اور شوق کے معنی ہیں بڑھی ہوئی خواہش۔ آرزو مندی۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ ذوق ایک خارجی چیز ہے اور شوق داخلی۔ ذوق بڑھتے بڑھتے شوق کی حد تک پہونچ سکتا ہے۔ ایک بین فرق یہ بھی ہے کہ ذوق پیدا کیا جاتا ہے اور شوق فطرتاً پیدا ہوتا ہے۔ شوق کے لئے کسی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی۔

کرتی ہیں دل کو خون ان آنکھوں کی پتلیاں ان مغبچوں کو ذوق ہے مے کی کشید کا

آمیز انتہا ہوا ثابت کشاکش ہے محبت کی مسافر کو لئے جاتا ہے کھینچے شوقِ منزل کا

(۵) "افلاک سے بلند کر ذوقِ نگاہ کو" میں بلند کر کی "ر" گرتی نہیں ہے بلکہ دب رہی ہے "ازمنۂ سما کی رفعتوں پر مسکرا کے چھوڑ" واقعی ایک مبہم خیال ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا چھوڑ "تند کلائی" سے مقصد تیز کلائی ہوگا۔ میرے خیال میں یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ "ذہنوں پہ فکرِ تازہ کی ضربیں لگاکے دیکھ" میں تازہ کی "ہ" یقینی طور پر تقطیع سے گر رہی ہے

استفسار :-

الف (۱) ہاں کیفِ بیخودی کی وہ ساعت بھی یاد ہے
محسوس ہو رہا تھا خدا ہو گیا ہوں میں (حفیظ جالندھری)

شاعر کا مطمعِ نظر کیا ہے ؟

محمد اسمٰعیل پوسٹ ماسٹر آگرہ

ب (۱) داستانِ عشق کی تکمیل کے اجزا نہ پوچھ ابتدا اُن کے لئے ہے انتہا میرے لئے

---

(۲) ہے
رحم اے داورِ محشر میں گنہگار نہیں مجھ پہ الزام ہے مجرم ہوں خطاوار نہیں

مندرجہ بالا اشعار میرے خیال میں کوئی معنی نہیں رکھتے۔ یا میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ ان کی تشریح فرمائیے۔

عبد العلی شرق۔ لال کرتی بازار میرٹھ

ج۔ شاعر ماہِ نومبر صفحہ ۲ پر جناب رمزی آبادی کی نظم "میری جنت" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے مندرجۂ ذیل اشعار پر مجھے اعتراض ہے۔

(۱) اک جھیل کے کنارے سر سبز باغچہ ہے اس باغچہ کے اندر دار المطالعہ ہے
(۲) گذری مصنفوں کی آواز آ رہی ہے مرحوم روح ان کی سطروں میں گا رہی ہے
(۳) انجیل اور گیتا، قرآن بھی یہیں ہے ایمان کی تو یہ ہے ایماں بھی یہیں ہیں

باغیچہ کی جگہ باغچہ لکھا گیا ہے، جو میرے خیال میں غلط ہے۔
مرحوم روح۔ روح مرحوم نہیں ہو سکتی، مرحوم کی روح ہونا چاہئے۔
ایمان کا استعمال بصیغۂ جمع ہوا ہے۔ میں ایمان کو واحد سمجھتا ہوں۔
ایمان ایک ہے بہت سے نہیں۔

ضیا سنکاؤلوی (سیٹھر)

جواب :-

الف (۱) بیخودی میں ایک ساعت ایسی بھی آتی ہے جب انسان اپنے آپ کو ماورائے عالمِ خیال کرنے لگتا ہے۔ اُس کی نظر میں ہر شے بے حقیقت ہو جاتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ ہر چیز کو بھول جاتا ہے اور خود اپنی ذات کو بھی۔ جب انسان اپنی ذات کو بھول جاتا ہے تو اُسے فنا کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ غالباً شاعر کا یہی مقصد ہے، لیکن مجھے ذرا سا اختلاف ہے اور وہ یہ کہ بیخودی میں تو حس کا مادہ بالکل فنا ہو جاتا ہے پھر خدا ہونے کا احساس کس طرح ہوا ؟

ب (۱) شعر بہت اچھا اور با معنی ہے، عشق جب مکمل ہو جاتا ہے تو وہ عاشق کے لئے بلائے بے درماں ثابت ہوتا ہے۔ ابتدا ً محبوب کو بھی محبت میں لطف آتا ہے لیکن انجامِ کار عاشق کا جنونِ عشق محبوب پر بار ہونے لگتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ محبوب پہلے تو شکارِ محبت بنا لیتا ہے اور پھر عاشق کو تڑپنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ بہرطور داستانِ عشق کی تکمیل کے اجزا کا ذکر کرنے کے بعد "ابتدا" محبوب کے لئے اور "انتہا" عاشق کے لئے بہت سچی سچی بات ہے۔ البتہ آخر مصرع میں "ہے" کی بجائے "تھی" ہونا چاہئے یعنی "ابتدا اُن کے لئے تھی انتہا میرے لئے"

(۲) شعر صحیح ہے مقصد یہ ہے کہ یوں تو میں گنہگار نہیں ہوں۔ الزامِ گناہ کا مجرم ضرور ہوں۔ مجھ پہ الزام ہے مجرم ہوں، کا انداز یہی ظاہر کرتا ہے

ج - (۱) باغیچہ کی جگہ باغچہ ضرورتِ شعری کی وجہ سے لکھا ہے جیسے تیرا کو ترا لکھ دیا جاتا ہے۔
(۲) جب جسم مرحوم ہو سکتا ہے تو روح کیوں مرحوم نہیں ہو سکتی ؟
(۳) ایمان واحد ہی ہے۔ لیکن اکثر جمع کے صیغہ میں استعمال ہوتا ہے "جیسے مومنوں کے ایمان"

اعجاز صدیقی

لمعات

یہ ہو یا اور کچھ مرنے کا مطلب ہم یہی سمجھے
کہ جو اب تک نہ سمجھا اب مآلِ زندگی سمجھے

خدا جس کو سمجھ دے وہ کبھی یہ بات بھی سمجھے
کمالِ زندگی یہ ہے مآلِ زندگی سمجھے

کہا دل پر نہیں قابو تو بولے جان بھی دیدو
کہا اس کا یہ مطلب تھا تو بولے ہم یہی سمجھے

کوئی غمخوار یا ہمدرد اس ڈھب کا نہیں ملتا
جو نیک و بد بھی سمجھائے مجھے مجبور بھی سمجھے

لحد کے بعد باقی ہے ابھی ہنگامۂ محشر
یہ منزل ابتدائی تھی جسے ہم آخری سمجھے

حریصِ نساں کیا جانے توکل کیا قناعت کیا
یہ اُس کا کام ہے جو زندگی کو عارضی سمجھے

ستم کی اُن کے شہرت بڑھکے گو رسوائی تک پہونچی
مگر وہ اپنی خود رائی سے اسکو رازہی سمجھے

مجھے اس سرگذشتِ غم کی اُن سے داد کیا ملتی
انھیں جب پر ہنسی آئی وہ جس کو دلگی سمجھے

قمر ہم زیست کا حاصل ہی مرنے کو سمجھتے ہیں
وہ مرنے سے ڈرے جو زندگی کو زندگی سمجھے

(غزل) **قمر بدایونی**

بھولی ہوئی کہانی

جو رات اتنی بھیانک تھی کیا سہانی ہے
بڑے مزے کی کہانی تری کہانی ہے

مری زباں پہ یہ کس رنگ کی کہانی ہے
نفس نفس میں جوانی ہے شادمانی ہے

چمک رہا ہے زمانے میں داغِ عشق مرا
سیاہی شب دیجور پانی پانی ہے

جگاکے خاک کے پتلوں میں درد بھر دیگا
ترا پیام ہے اور وہ مری زبانی ہے

یہ کس کے کوچے سے آکر نسیم نے چھیڑا
مری رگوں میں نئے خون کی روانی ہے

اُسی کی عمر گذرتی ہے تیری قربت میں
جسے ہراس یہ رہتا ہے موت آنی ہے

سناؤں گا کہیں روداد زیست سوچ تو لوں
پرانی بات ہے بھولی ہوئی کہانی ہے

جگر کا نام مٹائے سے مٹ نہیں سکتا
وہ اُس جگہ ہے جہاں عمرِ جاودانی ہے

(غزل) **جگر بریلوی**

بزرگوں کی شوخیاں

آب و گل کا پتلا کسی وقت اپنی ہستی کو فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ لوگ جو انتہائی سنجیدگی کا دعویٰ کرتے ہیں وہ بھی تنہائی میں خوب گُل کھلاتے ہیں، اور گُل کھلاتے نظر آتے ہیں اور حقیقت میں کون شخص ایسا ہے جو اپنی فطرت سے جنگ مول لے اور اپنی پوری زندگی کو "قانونی مشین" بنائے۔

خدا کے رسولوں کی زندگی بھی دنیاوی دلچسپیوں سے لبریز ہے وہ دلچسپیاں جنکو الفاظ کی صورت میں ہم عام محفلوں میں پیش نہیں کیا کرتے ——— کسی صورت بھی سہی لیکن کرشن جی کی زندگی ان دلچسپیوں کا مکمل ترین مرقع تھی اور اس قدر اہم کہ اس نے مذہبی حیثیت کی آخری شکل اختیار کر لی ——— حضرت یوسفؑ کو انتہائی معصوم ہونے کے باوجود اس وقت کا سامنا کرنا پڑا جس کے لئے ہم سنجیدگی کو چھوڑنے کے بعد بھی مشکل سے تیار ہوتے ہیں اور آخر یہی سلسلہ قید خانہ کی تاریک کوٹھری تک دراز رہا اور نتیجہ میں حضرت زلیخا کے ساتھ ازدواجی زندگی ایک لطیف نکتہ ہے جو صحیح طور پر ہمیں فرشتہ بن جانے کے بجائے انسان بننے کا درس دیتا ہے،

آنحضرت کی حیات طیبہ رنج و خوشی کے تمام جزئیات پر حاوی ہے اور ان تمام مسائل کا استنباط صرف حدیثوں ہی سے ہو جاتا ہے کہ جن کا ذکر اگر حدیثوں میں بیان ہوتا تو ان کی تشریح غالباً ڈاکٹر لوگ کرتے مولوی تو نہیں،

"حُسن موسیقی اور شعر" کسی فلسفی کے قول کے مطابق "انسان کی ہلاکت کے لئے کافی ہیں اگر ان کا اجتماع ہو جائے"۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان چیزوں کے سحر آگیں سایہ میں جذبات کی پرورش اس قدر جلد ہوتی ہے کہ انسان کی طرۂ امتیاز عقل یکسو ہو جاتی ہے اور اپنی کامل بیخودی ہی پر آدمی فخر کرنے لگتا ہے، غالباً اِن سے زیادہ وجد آفریں کوئی دنیاوی چیز ہے بھی نہیں ——— تو کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ پیغمبر داؤد جب اپنا مسحور کن نغمہ چھیڑتے ہونگے تو لوگوں کے ہوش و خرد اور تنقید کی قوتیں سلب ہو جاتی ہونگی۔

اِن تینوں قوتوں میں شعر سب سے قوی طاقت ہے۔ اس لئے کہ انسان کی تمام قوتیں "زبان" اور "دل" ہی کی تابع ہیں اور انھیں پر انحصار ہے بقیہ حصہ تو گوشت و پوست ہے اور بس ——— دل میں جذبات ہوتے ہیں اور جذبات زبان سے ادا کئے جاتے ہیں اور جو جذبات موزوں شکل میں زبان سے ادا ہوں حقیقت میں وہی اشعار ہیں، چنانچہ غزل نازک ترین اور لطیف ترین جذبات کا نام ہے، بقیہ جذبات عوارضات میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں جو اکثر رنج و غم کے تحت کسی بیرونی جذبہ سے متاثر ہو کر دلیں جاگزیں ہوتے ہیں اور اس کے بعد شعر کی شکل میں زبان سے نکلتے ہیں، غزل ہی صرف ایک ایسی چیز ہے جس کے جذبات دل میں پرورش پاتے ہیں اور براہِ راست دل سے زبان تک آتے ہیں۔

آپ خواہ شرمائیں یا تصنع سے کام لیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ جب انسانی جذبات کا تذکرہ نہایت لطیف پیرائے میں اسی نزاکت کا حامل ہوتا ہے جیسا کہ وہ لطیف ہے تو بدن میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے روح میں ایک خاص قسم کی گرمی اور جسم میں ایک عجیب برقی رو محسوس ہوتی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ بزمِ خاص میں جب جذبات کے موافق قریب ترین الفاظ کا استعمال ہم سنتے ہیں تو اُس وقت آپس میں بے تکلفی اور یگانگت محسوس کرتے ہیں اور جب کبھی جذبات و الفاظ میں بُعد اور تصنع برتا جاتا ہے تو ہم آپس میں بھی تکلف، ریا اور مصنوعی زندگی کی بے کیفی محسوس کرتے ہیں ایسے تجربات رات دن ہوتے رہتے ہیں اور ہمیں اُن سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔

میرے پیشِ نظر اس وقت جگر کا ایک کامیاب ترین شعر ہے جو انھیں جذبات کا حامل ہے۔ اس کے الفاظ اس کے نازک ترین خیال کی چغلی کھا رہے ہیں، حسن و عشق کے جذبات کے یکجا ہونیوالے لمحات اور ہر دو جانب کا اضطرابِ شوق بہت قریب ترین الفاظ سے ظاہر کیا گیا ہے ؎

درِ فردوس نظر آنے لگا باز مجھے
دیکھئے دیکئے ایک اور بھی آواز مجھے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم ہر چیز کو بہت دور سے دیکھنے کے عادی ہیں، ہر امر میں تصنع کا پردہ حائل پاتے ہیں، مصنوعی زندگی کو "مقدس" زندگی سے تعبیر کرتے ہیں اور "کیفیات" اور "معاملات" کو نواحش میں داخل سمجھتے ہیں

شبلی کے ایک شعر میں میرے ان تمام خیالات کا ثبوت آپ مجمل طور پر یکجا پائینگے ؎

شاعری از من مجو دور از سواد بمبئی
حالیا شبلی ست دم رند غزل خوان ستم

شبلی کا ربط عطیہ بیگم سے "حسن و عشق کا معاملہ" یہ سب چیزیں "چھپے ہوئے خطوط" نشان دیتے ہیں، اور پھر لکھنو کی "مقدس" زندگی جس کو شبلی خود ریا کا مرادف سمجھتے ہیں ؎

ہم نے بھی حضرتِ شبلی کی زیارت کی تھی
یوں تو ظاہر میں "مقدس" تھا "پہ شیدائی" تھا

لہذا یہاں شبلی نے "حالیا شبلی شدم" کہکر ظاہر "تقدس" اور مصنوعی زندگی کا گلا یلہ ہے اور "غزل خوانی" کا بالکل لغوی معنوں میں استعمال کیا ہے، نیز شاعری سے مراد وہی لطیف جذبات سے ہیں جن کو حقیقت میں شاعری کی جان "غزل" سے تعبیر کر چکا ہوں۔

یہی گلہ اور قریبی الفاظ اور واضح مفہوم سے شبلی ایک اور جگہ لکھنو میں بیٹھ کر بیان کرتے ہیں ؎

نے ذوق نگاہی و نہ ہنگامہ عشقے
اے وائے بشہرے کہ در و فتنہ گری نیست

شبلی کی زندگی منظرِ عام پر آچکی ہے کہ بمبئی میں کیسی گذرتی تھی اور ہندوستان میں کیسی، چنانچہ بہت سیدھے الفاظ میں نیچے کے شعر میں مرقع کھینچتے ہیں ؎

ز بمبئی چو بہندوستاں رسم شبلی
زیادہ بگزرم و باز پارسا گردم

لیکن بعض خوش عقیدہ حضرات اس میں بھی "مسائل تصوف" کا انکشاف کرلیں گے، ——— جانتے ہیں کہ غالب پیتے تھے لیکن جب اُن کے اشعار میں بادہ و ساغر کا ذکر آئیگا تو فوراً "مولینا روم" کی مثنوی کی سی تصریحات شروع کردی جائینگی، اسی چیز سے غالب نے متاثر ہو کر کہا تھا" بھائی اگرچہ مشاہدۂ حق کی ہی گفتگو کیوں نہ ہو لیکن بہرکیف ہم آب و گل کے بنے ہوئے ہیں اپنی ہستی کو فراموش نہیں کرسکتے وہاں بھی بادہ و ساغر کا ذکر کرنا فطرت کے مطابق اور جزوِ لازمی ہے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

شبلی کا ذیل کا شعر آپ اندازہ کے لئے کسی ندوی کے سامنے پیش کرکے تجربہ حاصل کرلیجئے کہ "غمزۂ پنہاں" سے کیا مراد ہے یقین کیجئے اس میں بھی کوئی مسئلہ تصوف نکل آئیگا حالانکہ "رنگینی" اور "بزمِ خاص" کے اندرونی جذبات کا حامل ہے ؎

بہ شکر خندۂ لطفِ تو تسلی نہ شوم
من کہ خو کردۂ آں غمزۂ پنہاں باشم

اسی قسم کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

خونِ دل میخورم از حسرتِ "ناکردہ" کنوں آں شدائی دوست کہ از کردہ پشیماں باشم
از جمالش ہم نہ بردم "بہرہ" آں قدر محوِ تماشہ بودہ ام

لطف یہ ہے کہ شبلی نے اپنے چند روزہ بمبئی کے قیام میں "دستۂ گل" مکمل کرڈالا۔ کوئی دن ایسا نہیں چھوڑا جس میں اپنے "معاملات" کا اظہار زبانِ غزل میں نہ کیا ہو، چنانچہ بار بار کھول کر اس بات کو کہنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ آپ نے پیرانہ سری میں زہد و تقویٰ کو خیرباد کہہ کر "عشق بازی" شروع کی ہے کوئی صاحب مغالطہ میں نہ پڑیں اور تاویلیں نہ کریں، ملاحظہ ہوں ذیل کے اشعار، ساتھ ہی ان کی برجستگی اور جوش سے بھی لطف اندوز ہوتے جائیگا ؎

پیرانہ سر ہوائے مے و جام کردہ ایم ما ابتدائے کار ز انجام کردہ ایم
با مے و بادہ بہ پیرانہ سرم کار افتاد آہ ازاں تقویٰ سی سالہ کہ نقصاں کردم
شبلی غم زدہ در داوری تو دیر رسد گرم اگر در رہِ عشق تو نہ تازد چہ کند
روزگاری ست کہ فرزانہ و دانا بودم حالیا مصلحت آن است کہ ناداں باشم

شبلی اچھی طرح جان گئے کہ یہی "نادانی" حقیقت میں زندگی کا بہترین حصہ ہے اور بغیر اس کے کتابِ زندگی خشک پنوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ؎

ناتمامی ہائے سحر سامری دانی زچیست کسب ایں فن از نگاہ یاری بایست کرد
ہست چل سال کہ بیہودہ نگہ داشتمش گر نہ بر سنگ زنم شیشۂ تقویٰ چہ کنم
دلِ افسردہ را آئینِ عشق آموختم شبلی بسے میداشتم با خویش رفتم کیمیا کردم

لیکن ساتھ ہی یہ بھی دھڑکا لگا ہوا ہے کہ میرے "تقدس" کیساتھ لوگوں کو اس زندگی کا یقین نہیں آئیگا کنایہ میں کہنے سے لوگ غلط تاویلیں کرلیں گے ؎

بارہا گفتہ ام و حاجت تکرار نماند — کہ مرا جز غمے و بادہ سروکار نماند
بہ یاراں آشکارا گفتہ ام این حرف پنہانے — کہ شوخ و نکتہ دانی بردہ از من عقل و ایمانے

ان سب سے بڑھ کر شبلی کی وہ غزل مسلسل ہے جس میں اس راز کو بالکل کھول کر رکھدیا ہے ؎

بمبئی بود مرا منزل مقصود عبث — پیش ازیں گام طلب در رہ حرماں زدہ ام
چند در پردہ تواں کرد سخن فاش بگو — سنگ بر شیشۂ تقویٰ زدہ ام ہاں زدہ ام
داستاں گردم ازیں پس کہ بہ این زہد و ورع — با بتاں جام طرب بانی و دستاں زدہ ام
جامۂ زہد بر قامت من راست نہ بود — شیشۂ تقویٰ سی سالہ بہ سنداں زدہ ام
ہاں ہاں دست بدارید زمن ای احباب — کہ بہ زیبا صنمے دست بہ پیماں زدہ ام
جائے آن ست کہ گلشن دمد از کنج لبم — بوسہ ہا بسکہ بر آں عارض خنداں زدہ ام

پایان مستی میں ضبط کی تاب نہ رہی تو آخر وہ سب کچھ فاش کہدیا جو آپ ہم "دنیا وی رسم" کے لحاظ سے کہتے ہوئے شرماتے ہیں ؎

صد چمن لالہ و گل پوشدم از جیب و بغل
ترمۂ فال ہم آغوشی جاناں زدہ ام

دوسری جگہ اس ہم آغوشی کو بہت لطیف اشارے کیساتھ بیان کیا ہے لیکن حقیقت میں وہ اشارہ اسقدر قریب ہے کہ مشارٌ الیہ میں کچھ فرق ہی نہیں رہتا،

خنک آں کس کہ بہ ذوق نظرے شد قانع — وائے برمن کہ صد اندیشۂ باطل دارم
از تو با بوسہ و آغوش تسلی نہ شوم — شب وصل ہست بہ سامان ازیں می باید

پھر اندیشۂ باطل سے جو شائبۂ غلط فہمی پیدا ہوتا ہے اس کا ازالہ کس خوبی سے کرتے ہیں کہ ناممکن ہے کہ انسان دریا کے کنارے ہو اور پیاسا رہے، دنیا میں صحیح و سالم زندہ ہو اور اس کی کیفیات میں حصہ نہ لے ؎

عاشق از بسکہ بہ پیش تو ز تو محروم است
دست اگر سوئے تو گستاخ نہ باز د چہ کند

شبلی اپنی "مقدس زندگی" سے تنگ آ کر سادہ زندگی بسر کرنیکا بہت کم وقت نکال سکتے تھے لیکن موقع ملتے ہی پہلی فرصت میں بمبئی پہنچنے کی ضرور کوشش کرتے تھے۔ کبھی ہر سال پہنچتے ہیں، اور انھیں ایام کو وہ اپنی زندگی تصور کرتے ہیں۔ باقی سب بے حاصل و بیلے خرد دی تھی۔

عمر است ایں کہ عاقل و فرزانہ بود ما یہ — ہم بہ بنا شد از دو سہ ماہے جنوں کنید
بسکہ بود از دۂ رندی و دنیا فزودم — شبلیا ہستی امسال من از پار گزشت

حضرت اقبال موجودہ دور کے شاعر پیغام گر جنکی تمام شاعری "فلسفہ" اور "تقدس" سے لبریز ہے، اور جنکی ہر شاعری لوح محفوظ کی سی ہوتی ہے، یہی حضرت ایک ایسی رنگین نظم کہتے ہیں کہ جہاں کسی سے کوئی بات بنائے نہیں بن سکتی، یہ نظم خالص جذباتی ہے نہ تو "پیغام" ہے اور نہ کسی پرانے شاعر کے "جواب" میں ہے اور نہ ہی کوئی "ترجمہ" ہے اور نہ ہی کسی کی "ترجمانی" ہے بلکہ شاعر تمام "مقدس" ماحول کو چھوڑ کر اپنے جذبات کی طرف متوجہ ہوتا ہے، کائنات اور اس کے تصنع کو بھول جاتا ہے۔ جو کہ دل سے براہ راست زبان پر راز آجاتا ہے، الفاظ بھی اپنے معنی سے بہت قریب مستعمل ہوئے ہیں۔ اس نظم کا عنوان ہی مستقل "غزل ہے"۔ . کی گود میں بلی دیکھکر (زور دینے کے لئے میں خاص الفاظ پر واوین کا نشان کئے دیتا ہوں)

"شوخ" "تو ہوگی تو" "گودی" سے اتار دینگے تجھے
گر گیا "پھول" "جو سینے" کا تو مار دینگے تجھے

یہ شعر کہتے ہی شاعر اس رنگین دنیا میں محو ہو جاتا ہے، "دل کی آرزوؤں" سے متاثر ہو کر اپنی دوری منزل سے حسرت کھا کے بیک لمحہ سینکڑوں خیالات سے دب جاتا ہے اور بچشم نم دوسرا شعر کہتا ہے، بغیر فصل کے نظم کا دوسرا شعر کہیں کہیں پہنچ جانا، رنگ بدل جانا، شاعر کے جذبات کی پوری ترجمانی کرتا ہے ؎

"کیا" "تجسس ہے تجھے" کس کی "تمنائی" ہے
آہ کیا تو بھی "اسی چیز" کی سودائی ہے

حقیقت یہ ہے کہ کوئی در پردہ کہے یا بالاعلان لیکن "انسان" ہے تو کہے بغیر رہ نہیں سکتا، اور نہ ایسا کہنا غلطی ہے، بہت سخت مغالطہ میں ہیں وہ لوگ جو ان باتوں پر دھیان نہیں دیتے، ورنہ اس قسم کا اظہار جزو لازمی ہے، خود اقبال کا اصلی شعر ملاحظہ ہو ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اب ذرا چھاتا غالب کے بھی دو شعر ملاحظہ ہوں لوگ بطور طعنہ غالب کے یہ دو شعر پیش کر دیا کرتے ہیں ؎

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے	کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے
بینس میں گذرتے ہیں جو کوچہ سے وہ میرے	کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان میں سوقیت آگئی ہے، نزاکت اور لطافتِ خیال کا شائبہ بھی نہیں میں اُس کی بجائے ذیل کے دو شعر پیش کرتا ہوں ؎

تھا خواب میں خیال کو اُن سے معاملہ	جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا
ابھی آتی ہے بُو بالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی	ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

اب لسان الغیب حضرت حافظ شیرازی کے بھی چند شعر ملاحظہ فرمالیجئے۔ جہاں نازک ترین مسائل نفسیات کا تذکرہ کرتے ہیں اور عجیب عجیب لطیف پیرایہ کیساتھ مختلف کیفیتوں کا اظہار کرتے ہیں، لیکن افسوس کہ ہمارے متصوفین نے اس اظہار کو گناہ خیال کرکے دور از کار عجیب مضحکہ خیز تاویلیں کی ہیں، کاش کہ وہ انسانی جذبات کا احترام کرتے ہوئے دُنیا کے رنگ و بُو کو فرشتہ خصائل سے تبدیل نہ کرتے، حضرت شیرازی کا تمام دیوان ہی ان جذبات سے لبریز ہے میں صرف چند شعروں پر اکتفا کرتا ہوں، فرماتے ہیں ؎

جاں بے جمالِ جاناں میلِ جہاں ندارد
ہر کس کہ ایں ندارد حقا کہ آں ندارد

ذوقِ چناں ندارد بے دوست زندگانی
بے دوست زندگانی ذوقے چناں ندارد

اگرچہ حافظ صاحب کے زمانہ میں اسقدر ڈھونگ رچانے والے متصوفین پیدا نہ ہوئے تھے کہ سیدھی سادھی بات میں ابدالآباد کی تاریخ مہیا کردیں، اور ہر دل سے نکلے ہوئے شعر کو تصوف اور تقشف کا بوجھل لباس پہنادیں (لیکن اس آرٹ کی بنیاد ضرور پڑ چکی تھی) کہ ان کے رد کے لئے شبلی کی طرح حافظ صاحب کو اسی جوش و خروش سے تردید کی ضرورت لاحق ہوتی لیکن خدا کے بندوں نے جبکہ متصوفین کا دور شباب پر تھا تو جان متغزلین کلام حافظ کو اس طرح بلند آہنگی کے ساتھ اپنایا کہ بڑے بڑے آزادوں کو لب کشائی کی ہمت نہ ہوئی اور انھوں نے بھی تردید کے لئے نثر کی زبان اختیار کرنے کے بجائے حجاب پسند کیا، اس لئے میں تنوع جذبات نگاری کی مثالوں کیساتھ اس ترتیب کا بھی خیال رکھتا ہوں کہ اس سے خود بخود اس بوسیدہ عقیدہ کی تردید ہوجائے

اگرچہ میں بذاتِ خود شارحین کے گمراہ کن پروپیگنڈے سے اسقدر گھبرا گیا ہوں کہ اس مضمون کے دوران تحریر میں ایک سادہ قلمی نسخہ کے سوائے کسی کتاب کو نظر سے نہیں گزارا لیکن آپ دلچسپی لیں تو یقیناً شارحین کو ایسے مقامات پر بدحواس اور بھٹکتے دیکھکر بڑا لطف لیں گے جہاں حافظ صاحب نے کسی بادشاہ وامیر کی مدح کی ہو، ایسے مقامات پر گل ولالہ و مئے ناب کی تشریح میں شارحین عاجز نظر آئیں گے اور قلم میں وہ جولانی نہیں رہیگی جو "بے سجادہ رنگین کن" میں نظر آتی ہے بہر کیف اس وقت آپ حافظ کی زبان سے جوانان کی صورت ملاحظہ فرمائیے ؎

ز وصلِ روئے جواناں تمتعے بردار	کہ در کمینگہ عمرست مکرِ عالمِ پیر
می دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ	ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر

پہلے جوانان کہا اور پھر محبوب چاردہ سالہ لیکن آپ مزید بیان کے خواہشمند ہونگے لہذا ملاحظہ ہو ؎

"یارِ گندم گونِ" ما گر میل کردے نیم جو
ہر دو عالم پیشِ چشمِ ما نمودے یکدرم
حسنِ "مہ رویان" مجلس گرچہ دل میبرد و دیں
عشقِ ما "بر لطفِ طبع" و "خوبیٔ اخلاق" بود
نغز گفت آں بُت ترسا بچہ بادہ فروش
شادیٔ روئے کسے خور کہ صفائی دارد

اور پھر بقیہ لوازمات بھی ملاحظہ ہوں ؎

کنارِ آب و پائے بید و طبعِ شعر و یارے خوش
معاشر دلبرِ شیریں و ساقی گلعذارے خوش

اس کے ساتھ ہی پوری غزل ملاحظہ فرمائیے ؏

زلف آشفتہ و خوی کردہ و خنداں لب مست

لیکن اس خوش دمی و خوش باشی کو سال میں چند ماہ کیساتھ وقف کرتے ہیں ؎

نہ گویمت کہ ہمہ سالہ مے پرستی کن	سہ ماہ مے خور و نہ ماہ پارسا می باش
کنوں کہ میدمد از بوستاں نسیمِ بہشت	من و شرابِ فرح بخش و یارِ حور سرشت

لیکن تمام مستی و رندی حافظ صاحب بھی ایام شباب ہی میں بہتر سمجھتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نوجوانی کا زمانہ ہی امنگوں کا زمانہ ہوتا ہے ؎

عشق و شباب و رندی مجموعۂ مراد ست   ساقی بیا کہ جامے دریں زماں تواں زد
دلاموں پر رندی حسن و ناز کی مفروشی   کہ ایں معاملہ با عالم شباب رود

ذیل کے شعر میں "خانۂ بے تشویش" جذبات کا انسانی پہلو ہی نمایاں کر سکتا ہے۔ تسبیح و مصلےٰ کا آخری درجہ مطلوب نہیں ہے ؎

خانۂ بے تشویش و ساقی یار و مطرب بذلہ گو   موسم عیش ست و دور ساغر و عہد شباب

اگرچہ یہ معاملہ شبلی کی طرح کبھی کبھی پیرانہ سری میں بھی پیش آجاتا ہے ؎

پیرانہ سرم عشق جوانے بسر افتاد   واں راز کہ در دل بنہفتم بدر افتاد

اور حقیقت یہ ہے کہ اسکے لئے وقت کا تعین کیا ہی نہیں جا سکتا اسکی نماز ہر وقت روا ہے

حافظ اگر سجدہ تو کرد مکن عیب   کافر عشق آں صنم گناہ ندارد
با یار شکر لب و خوش اندام   بے بوس و کنار خوش نباشد

ایسے ہنگام میں انسان سب کچھ کر بیٹھتا ہے چنانچہ مغرب کو نام کیوں رکھے ایسے موقع پر تو جوش ملیح آبادی بھی رقص میں آگئے ہیں، اور حافظ صاحب کا فتویٰ تو ہے ہی ؎

رقص بر شعر تر و نالہ نے خوش باشد   خاصہ رقصے کہ در دست نگارے گیرند

جس چیز کے لئے غالب نے "ایک گونہ بیخودی" کہہ کر اجازت طلب کی ہے اس فائدہ کو حافظ صاحب ثانی تر فائدہ قرار دیتے ہیں،

زیادہ ہیچت اگر نیست ایں نہ بس کہ ترا   دمے ز وسوسۂ عقل بیخبر دارد

اور اس جگہ پہنچکر حافظ صاحب عمر خیام سے بہت بلند نظر آتے ہیں، جس چیز کو خیام نے مقصود سمجھا اس کو یہ لوازمات میں قرار دیتے ہیں۔

اگر علامہ شبلی کے خطوط نہ چھپتے تو اُن کے بمبئی کی رنگین محفلوں کے حالات کیسے معلوم ہوتے ۔ افسوس کہ حافظ صاحب کی رنگین محفلوں کا پتہ دینے سے تاریخ ساکت ہے۔ تاریخ اُنکے زہد و ورع کا پتہ دیتی ہے لہذا اُن کی زندگی کو شبلی کی زندگی سے ملانے کے لئے ہیں یہ شعر کافی مدد دیتا ہے ؎

از قال و قیل مدرسہ حالی دلم گرفت   یک چند نیز خدمت معشوق و مے کنم

چونکہ ہم پیشہ تھے اس لئے عالموں اور زاہدوں کی پگڑی بھی خوب اچھالتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ دُکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھتے ہوئے کیا کیا مقابلے کئے ہیں ؎

تو و طوبیٰ و ما و قامت یار   فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

زاہد اگر بحور و قصور است امیدوار   ما را شرابخانہ قصور است و حور یار
باغ فطرت لطیف است و لیکن زنہار   تو غنیمت شمر ایں سایۂ بید و لب کشت

اور پھر اس پسندیدگی کا تاریخی ثبوت بھی ملاحظہ ہو، کس خوبی سے الزام دفع کیا ہے ؎

نہ من از خانۂ تقویٰ بدر افتادم و بس
پدرم نیز بہشت ابد از دست بہشت

ان سب کوششوں کے بعد تنگ آکر کہنا ہی پڑا ؏

ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

ز میوہائے بہشتی چہ ذوق دریابد   کسے کہ سیب زنخدان شاہدے نگزید
شرح مجموعۂ گل مرغ سحر داند و بس   کہ نہ ہر کو ورقے خواند معانی دانست

ان سب باتوں کے بعد حافظ صاحب کا ایک لطیف ترین شعر ملاحظہ ہو اس شعر کا مفہوم سمجھنے کے لئے شبلی کی "غمزۂ پنہاں" والی اصلاح ؎

ز شکر خندۂ لطف تو تسلی نہ شوم   من کہ خو کردۂ آں غمزۂ پنہاں باشم

ضرور ذہن میں رکھئے اور پھر حراغ کے مفہوم پر غور فرمایئے ؎

گر من از باغ تو یک میوہ بچینم چہ شود   پیش پائے بچراغ تو بہ بینم چہ شود

افسوس کہ مضمون کی طوالت کے خوف سے حافظ صاحب کے بہترین اشعار کافی پیش نہ کئے جا سکے اب بطور تبرک چند آیات قرآنی پیش کر کے مضمون ختم کرتا ہوں۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ قرآن حکیم نے بھی اپنی حکمت بالغہ کو اس نکتہ کے سمجھانے میں صرف کیا ہے۔ اگر اب بھی کوئی صاحب ضد سے کام لیں تو انھیں اختیار ہے، قرآن شریف میں اس نفسیاتی پہلو اور "ترغیب جنسی" کا تذکرہ خاص طور پر سورۂ رحمٰن میں ہے۔ آپ چند آیات کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

"ان باغوں میں جھکی ہوئی نظروں والی یعنی شرمیلی حوریں ہونگی جنھیں اس سے پہلے نہ کسی انسان نے چھوا ہوگا اور نہ کسی جن نے وہ ایسی اچھی ہونگی گویا کہ یاقوت و مرجان ہیں۔

ان دو باغوں کے علاوہ دو باغ اور ہونگے نہایت گھنے، جن میں دو چشمے اُبل رہے ہونگے اور ان میں میوے، کھجوریں اور انار ہونگے،

ان میں خوبصورت حوریں خیموں میں بیٹھی ہوئی ہونگی۔ جنکو اس سے پہلے نہ کسی انسان نے چھوا ہوگا اور نہ کسی جن نے ۔۔۔"

عبید اللہ قدسی

درد

درد کیا ہے بربطِ صبحِ طرب کا سوز و ساز
شام کے گیسوئے برہم کا سوادِ جاں فروز

خواب میں ہوتی ہیں جس دم صبح کی بیداریاں — مطلعِ خورشید آتا ہے نظر ظلمت نشاں
کند ہو جاتا ہے سورج کی کرن کا نیشتر — جم کے رہ جاتا ہے خونِ نبضِ شفق میں سربسر
گھیر لیتا ہے فضاؤں کو طلسمِ خامشی — ہر طرف چھایا ہوا ہوتا ہے ابرِ بیخودی
دفعتہً نجمِ سحر کو نیند آ جاتی ہے یوں — جیسے سو جاتی ہے چنگاری بآغوشِ سکوں
دور رہ جاتا ہے منزل سے سحر کا قافلہ — گم فضائے چرخ میں ہوتی ہے آوازِ درا

درد دل لیتا ہے آ کر جوش میں انگڑائیاں
ذرّے ذرّے کو بنا دیتا ہے مشرق آشیاں

ٹوٹ جاتا ہے یکایک خود طلسمِ خامشی — کھلنے لگتے ہیں جہاں میں سب یہ اسرارِ خودی
جنبشِ موجِ ہوا کرنے کے درسِ اضطراب — ناچتا ہے اوس کے قطروں میں حسنِ آفتاب
شوقِ بلبل میں لگا کر آگ سورج کی کرن — پھول کو دیتی ہے پھر ترغیبِ چاکِ پیرہن
میکدہ ہوتا ہے یا خمیازۂ ساحل کا جوش — مستیِ ساقی کہ حسنِ موجۂ بادہ فروش
پھیل جاتا ہے فضا میں نغمۂ دیرِ مغاں — گونج اٹھتی ہے حرم کے صحن میں بانگِ اذاں

بجنے لگتا ہے زمیں سے آسماں تک سازِ درد
گونجتی ہے عرصۂ کونین میں آوازِ درد

درد کی تصویرِ رنگیں ہے بہارِ گل فشاں — درد ہی کا اک نظارہ ہے نیرنگِ خزاں
درد بنتا ہے کبھی عالم میں آئینِ زوال — اور کبھی زینت فروزِ تابشِ حسنِ کمال
گاہ سازِ حسن گہ سوزِ محبت کی نمود — گاہ پروانہ گہے شمعِ فروزاں کا وجود
خود ہی قطرہ خود ہی دریا خود ہی طوفاں خود ہی موج — خود ہی ساحل خود ہی کشتی خود ہی پستی خود ہی اوج
درد کے دم سے ہے روشن شمعِ بزمِ کائنات — درد کی موجوں میں پوشیدہ ہیں اسرارِ حیات

درد سے رہتا ہے قائم سوز و سازِ زندگی
درد سمجھاتا ہے مردہ دل کو رازِ زندگی

کتنے جلوے ہیں ابھی ذرّوں میں جو روشن نہیں — کتنے لالے ہیں ابھی جو زینتِ گلشن نہیں
کتنے گوہر بطنِ قلزم میں ابھی پوشیدہ ہیں — کتنے قلزم ہیں جو قطروں میں ابھی خوابیدہ ہیں
طور ہیں لاکھوں ابھی خاموش، جلوہ گاہ میں — سینکڑوں موسیٰ عمراں گامزن ہیں راہ میں
بن رہا ہے یوسفستاں عرصۂ غیب وجود — ہیں بہت یعقوب ابھی بیگانۂ بزمِ شہود
حسن کے جلوے ہیں لاکھوں بے نیازِ دیدہ ابھی — داغ کی صورت نہفتہ ہیں بہت خورشید ابھی

درد اُن کو ایک دن پردے سے باہر لائیگا
گوشے گوشے میں جہاں کے انقلاب آ جائیگا

آلم مظفر نگری

افسانہ:-

ایک بوند پانی

"ماں! ایک بوند پانی!" ــــــ

اُس نے پینے کے لئے ٹھنڈا پانی مانگا۔ شدت تشنگی سے اُس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے اور اُس کی آواز بدقت تمام نیم مردہ سے الفاظ میں منتقل ہو رہی تھی۔ معصوم اور اکلوتے بیٹے کی اس طلب پر ماں کا کلیجہ نہ جانے کتنی قیامت انگیز چیخیں بلند ہونے سے پہلے ہی ایک نیم جاں سسکی میں دبا کر رہ گیا۔ ضبط و برداشت کی تمامتر کوششوں پر بھی اُس کی آنکھوں سے گرم گرم پانی کی دو بوندیں ٹپک ہی پڑیں ــــــ دو بیش قیمت موتی ــــــ جن کی قیمت تمام دُنیا کے خزانے مل کر بھی ادا نہیں کر سکتے ــــــ شاید ایسے ہی قطروں سے زمین اپنی خاک سے مصلحین اور اوتاروں کو پیدا کیا کرتی ہے۔ ایک ماہ سے بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے بیٹے کے پانی مانگنے پر ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو بوندوں کا ٹپکنا اور سینۂ زمین میں جذب ہو جانا ممکن ہے زمین کی کسی ایسی ہی فرزند کا انتظار رہا ــــــ تپ دلرزہ کی شدید تکلیف کے ساتھ آج اڑتالیس ۴۸ گھنٹے سے غذا کا ایک حقیر سا ریزہ بھی اُس کے پیٹ میں نہ گیا تھا۔ ماں اُس کی بھوک کے احساس سے اُسکے پاس بیٹھی چپکے چپکے رو رہی تھی۔ اور شاید اس غیر محسوس توقع پر کہ کل جب وہ بڑا ہوگا اور اُس میں سوجھ بوجھ پیدا ہوگی تو وہ بھی ماں کو بھوکا دیکھ کر اسی طرح آنسو بہائیگا۔

وہ اگر ایک اچھوت اور غریب بیوہ کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں پیدا ہونے کی بجائے اونچی ذات کے کسی رئیس گھرانے میں پیدا ہوا ہوتا تو آج غالباً اسے کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ بہتر سے بہتر اور بیش قیمت لباس زیب تن کئے ہوئے اپنے باپ سے وہ بھی جاپانی کھلونے لینے کی ضد کرتا ــــ اس کی معمولی تکلیف پر ڈاکٹروں، حکیموں، دواؤں اور تیمارداروں کی آمد و رفت کا تانتا بندھ جاتا ــــــ مگر آج اُس کی تمامتر تکلیف اور دُکھ کا باعث صرف اُس کا یہی جرم تھا کہ اُس کی پیدائش ایک بے یار و مددگار اور غریب مفلس اچھوت بیوہ کی جھونپڑی میں ہوئی تھی۔

کسی اسکول یا مدرسہ میں تعلیم نہ پانے پر بھی اُس کا ذہن حالات کا تنقیدی جائزہ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اُس نے یہ دیکھتے ہوئے کہ آج گھر میں اناج کا ایک دانہ بھی نہیں ہے، صرف پانی ہی مانگنے پر اکتفا کیا اور روٹی کا نام بھی لینا مناسب نہ سمجھا۔

"لیکن!" ــــــ ماں نے سوچا ــــــ "اب آدھی رات کو پانی کہاں سے ملیگا؟ آس پاس کوئی کنواں بھی نہیں۔ دو میل دور ایک برہمن کا مکان ہے، وہاں جانے پر برہمنی کو اگر رحم آگیا تو شاید پانی مل سکے!" ــــــ یہ غریب تو کنوئیں کو چھو بھی نہیں سکتی ــــــ اچھوت کے چھو لینے سے وہ ناپاک ہو جاتا ہے نا! ــــــ

"ماں! تھوڑا سا پانی!" ــــــ چھ سال کی عمر کے بچے نے اپنے خشک ہونٹوں سے یہ الفاظ پھر دُہرائے۔

قریب ہی دیوتاؤں کا ایک مندر تھا اور وہاں کنوئیں بھی بہت سے تھے لیکن اس بدنصیب کا داخلہ وہاں کیسے ہو ــــــ "دیوتا" بھی تو اپنی "قیام گاہ" کی حدود میں اچھوت انسان کو داخل نہیں ہونے دیتے۔

وہ ایک گنوار عورت ہے اور جاہل محض ہونے کے ساتھ نا سمجھ بھی ــــــ دُنیا کے بارے میں اُسے کوئی بھی علم نہیں ــــــ وہ صرف ایک بات جانتی ہے ــــــ محض ایک بات ــــــ اپنے بیٹے کو اپنی جان سے زیادہ چاہنا ــــــ اور بس!

اُس کا جسم آبنوس کی مانند سیاہ ہے ــــــ لیکن اس عمیق سیاہی کے اندر وہ ایک پاکیزہ اور سورج سے زیادہ شفاف و روشن چیز چھپی ہوئی رکھتی ہے ــــــ اور وہ ہے اُس کی روح ــــــ ایک ماں کی روح!

اُس نے سر اوپر اُٹھا کر آسمان کی طرف ایک نظر ڈالی۔ جھونپڑی کی چھت کے لاتعداد سوراخوں میں سے اُس نے بے شمار تارے جگمگاتے ہوئے دیکھے ــــــ ان چمکدار اور مسکراتے ہوئے تاروں نے روشنی کا ایک حقیر سا حصہ بھی اسکی اندھیری جھونپڑی کو نہ دیا تھا ــــــ بھلا، اونچی جگہوں پر رہنے والے اپنے سے نیچے رہنے والوں کی فکر کیوں کریں؟! ــــــ اُس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، مگر تاریکی

میں اُسے سوائے اپنی جھونپڑی کی تین فٹ اونچی دیواروں کے اور کچھ نظر نہ آسکا ——— دیواریں ——— جو اُس کے زخم خوردہ شکستہ دل کی طرح جگہ جگہ سے ٹوٹی پھوٹی تھیں! ———

"ماں! بہت پیاس لگی ہے، تھوڑا سا پانی دے!" ———

اس دفعہ وہ برداشت نہ کرسکی۔ مٹی کا ایک گھڑا لیکر وہ جھونپڑی سے باہر نکلی۔

دو میل چل کر برہمن کی عورت کو جگانا اب دشوار سمجھ کر وہ سیدھی مندر کی طرف بڑھی ——— جوں جوں وہ کنوئیں کے قریب پہنچتی گئی اُس کے پاؤں میں شدت کیساتھ لرزہ پیدا ہوتا گیا ——— اس لئے کہ وہ ایک پاپ کرنے جارہی تھی ——— برہمنوں کے کنوئیں سے پانی نکالنا ——— کسی اچھوت کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا؟! ———

بمشکل وہ کنوئیں تک پہنچی۔ مندر کے بالائی حصہ کی کھڑکیوں سے روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹکی، لیکن ممتا نے اُسے بے خوف کردیا اور وہ چُپ چاپ پانی نکالنے لگی۔

"کون ہے؟" ——— مندر سے کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز اُسے سُنائی دی۔ وہ ٹھیک اسی طرح گھبراگئی جیسے کوئی چور مسروقہ مال کے ساتھ گرفتار ہونے پر خوفزدہ ہوجاتا ہے۔

"کون ہے؟" ——— یہ ہیبت ناک الفاظ پھر اُس کے کانوں میں پہنچے اُس کی جسمانی طاقت سلب ہوگئی۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے، اور کنوئیں سے باہر آتا ہوا گھڑا ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

اندر سے "کون ہے؟" پوچھنے والے برہمن نے کوئی جواب نہ پاکر نوکر کو آواز دی۔ نوکر کچی نیند سے اُٹھکر غصہ کے مارے جھلاتا ہوا باہر آیا ———

بس پھر کیا تھا ——— بیچاری پر بے تحاشا لاٹھیوں کی مار پڑنے لگی۔ بدبختی نے پوری تکمیل سے یہاں بھی اُس کا ساتھ دیا ——— اس کے کلیجہ کا ٹکڑا ایک بوند پانی کے لئے ترس رہا ہے۔ وہ پانی لئے بغیر کیسے واپس ہوسکتی تھی ——— آخر اُس نے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا ——— "سرکار! میرا ننھا بیٹا بیمار ہے اور ایک بوند پانی کے لئے جان دے رہا ہے!"

لیکن یہاں اُس کی باتوں کو سننے والا کون تھا ——— ماں کے دل کی تڑپ کا احساس و اندازہ یہاں کون کرتا ——— وہ اس وقت صرف ایک مجرم تھی ——— اُس نے ایک برہمن کا کنواں ناپاک کیا تھا نا!" ———

انجام کار وہ لاٹھیوں اور جوتوں سے مار مار کر مندر کے احاطے سے باہر نکال دی گئی۔ ملتجیانہ نگاہوں سے اُس نے بار بار کنوئیں کی طرف دیکھا اور جب اس طرف سے قطعی مایوس ہوگئی تو اپنے جھونپڑے کی طرف چل پڑی۔

کچھ دور چلنے پر اسے کوئی بات یاد آئی، ٹھہر کر اُس نے اپنی پھٹی ہوئی چادر کے ایک حصہ کو دیکھا جو ابھی ابھی پانی سے بھرے ہوئے گھڑے کے گرجانے سے بھیگ گیا تھا۔ اُس کے تڑپتے ہوئے دل کو تسکین کا ہلکا سا سہارا محسوس ہوا وہ تیز رفتاری سے بھاگ کر جھونپڑی میں آپہنچی، ایک چھوٹا سا مٹی کا پیالہ لیکر اُس نے اپنی چادر کے اس بھیگے ہوئے حصہ کو نچوڑا۔ اس طرح چند قطرے پانی کے جمع کرکے وہ اپنے بیٹے کے قریب پہنچی۔

نزدیک تر ہوجانے پر بھی معمول کے خلاف نہ اُسکے بیٹے نے آواز دی اور نہ پانی مانگا۔ وہ اسی طرح خاموش لیٹا رہا، جیسے اب اُسے پیاس ہی باقی نہ رہی ہو ——— یا جیسے اب اُسے کوئی تکلیف نہ ہو! ———

ہاں اب وہ بہت سکھ سے لیٹا ہوا ہے ——— اب اُسے کوئی دُکھ نہیں ——— تکلیفوں کو شاید اس پر رحم آگیا ہے ——— پھٹی پرانی چٹائی کے بجائے اب موت نے اُسے اپنی سکون بخش آغوش میں لٹا لیا ہے! ———

"بیٹا!" ——— اُس نے محبت بھری آواز میں پکارا ——— مگر بے جان جسم سے جواب کیسے ملتا؟!

"بیٹا! کیوں کچھ نہیں بولتے؟" ——— اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُس نے دوبارہ آواز دی۔

"ارے، یہ کیا؟" ——— وہ یکایک چونک پڑی اور مردہ بیٹے کے جسم کو ہلا ہلا کر اُسے ہوشیار کرنے کی سعی کرنے لگی۔ لیکن سب بے سود ——— اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ——— اور اب وہ سب کچھ سمجھ گئی۔

اُسکے منہ سے صرف ایک ہی ہلکی سی آہ نکلی اور بس! ——— اُس نے سوچا، یہ میری ہی تقصیر ہے مجھے پانی لانے میں دیر ہوئی اور میرا لال مجھ سے ناراض ہوکر چل دیا ———

مُردہ بیٹے کا جسم اُس کے کاندھے پر تھا اور وہ ناچ رہی تھی ——— مہمل اور بے ربط الفاظ اُسکے ہونٹوں پر تھرتھرا رہے تھے۔

دُنیا کے پاس اب اُسکے لئے صرف ایک لفظ تھا ——— "پاگل" ——— "دیوانی"!

محمود عثمانی

تبرکات

جس نے تجھے خلوت میں بھی تنہا نہیں دیکھا
اُس دیکھنے والے کا کلیجا نہیں دیکھا

ہر بار نکھر جاتا ہے یہ اور ستم ہے
تیرا لبِ لعلیں کبھی جھوٹا نہیں دیکھا

جس گُل کو یہ سب ڈھونڈتی پھرتی ہیں ہوائیں
تو نے تو اُسے نرگسِ شہلا نہیں دیکھا؟

دم آنکھوں میں اٹکا ہے خدا کے لئے آؤ
پھر یہ نہ گلہ ہو، مرا رستا نہیں دیکھا

شاعر یہ غزل لکھی ہے یا جڑ دئے موتی
دنیا میں قلمکار بھی ایسا نہیں دیکھا

(غزل) آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم مغفور

روحِ سخن

رہِ محبت میں جز محبت مرا کوئی مدعا نہیں ہے
نظر چراتے ہو مجھ سے کیوں تم مری کوئی التجا نہیں ہے

ہوا میں زورِ کشش نہیں ہے گلوں میں بوئے وفا نہیں ہے
سبھی ہیں بیگانہ اس چمن میں کوئی یہاں آشنا نہیں ہے

طریقِ اُلفت میں اپنی منزل کدھر ہے اسکا پتا نہیں ہے
سوائے گم کردہ راہ دل کے کوئی مرا رہنما نہیں ہے

نہ زحمتِ فکرِ چارہ سازی نہ بارِ احسانِ چارہ سازاں
ملا ہے قسمت سے مجھ کو اے دل وہ درد جسکی دوا نہیں ہے

اِدھر وہی ہے نیازمندی اُدھر وہی شیوۂ تغافل
ہوئے ہیں وہ بے نیاز ایسے کہ جیسے میرا خدا نہیں ہے

کہوں جو اُن سے تو کیا کہوں میں مری خموشی پہ کہتے ہیں جب
یہ کیسی چپ لگ گئی ہے تجھ کو اگر کوئی مدعا نہیں ہے

حریفِ اندازِ بے نیازی بنا ہوں اُس شوخِ نازنیں کا
زباں پہ مدعا نہیں ہے نگاہ میں التجا نہیں ہے

وہی ہے بزمِ نیازمنداں جہاں کی ہے رسمِ جانفشانی
وہی ہے بازارِ دلستاناں جہاں متاعِ وفا نہیں ہے

کہاں سے ہو خواہشِ تکلم بجا ہے وحشت تری خموشی
کوئی ترا ہم نفس نہیں ہے کوئی ترا ہم نوا نہیں ہے

(غزل) خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی

ہماری مثنویاں منظوم افسانوں کی حیثیت سے

اس عنوان کا مقصد و مفہوم صرف اتنا ہے کہ "اب تک جو مثنویاں ہمارے سامنے ہیں وہ دراصل منظوم افسانے ہیں" مگر افسانے اور مثنوی میں صنفی نقطۂ نگاہ سے پھر بھی بہت فرق ہے، مثنوی کو داستانِ منظوم کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ افسانہ عموماً ایک مختصر واقعہ ہوتا ہے، اور داستان ایک لمبا قصہ مگر چونکہ داستان میں بھی ایک قسم کی افسانویت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اسے افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور داستان تو خیر کہتے ہی ہیں۔

افسانے اور مثنوی میں نمایاں فرق یہ ہے کہ افسانے میں پلاٹ ہوتا ہے۔ کردار ہوتے ہیں اور منظر ہوتے ہیں مگر مثنوی میں ان باتوں کے ساتھ ساتھ شاعرانہ اہتمام بھی کرنا پڑتا ہے۔ پرانی مثنویوں میں حمد و نعت اور منقبت کے بعد ساقی نامہ بھی ضروری چیز تھا۔ افسانے ان تکلف سے آزاد ہوتے ہیں۔ مثنوی میں جب تک بحر اور قافیوں کے اہتمام کے ساتھ صنائع بدائع۔ تشبیہات۔ کنایات اور محاکات نہ ہوں مثنوی کی خوبصورتی نمایاں نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف افسانے میں سادگی و قعیت اور نفسیاتی تحلیل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مثنوی اپنے فنی اور ادبی لوازم کے ساتھ طوالت چاہتی ہے۔ اور افسانہ اختصار۔ اختصار مثنوی کا بھی حسن ہے لیکن وہ کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ مثلاً مثنوی گلزار نسیم کے یہ دو شعر اختصار کا بہترین نمونہ ہیں ؎

خالق نے دئے تھے چار فرزند
دانا۔ عاقل۔ ذکی۔ خردمند

دوسرا شعر ؎

پتّے۔ پھل۔ پھول۔ چھال لکڑی
سب لیکے چمن سے راہ پکڑی

ایسے شاذ مواقع کے علاوہ۔ اکثر و بیشتر مثنویوں میں تفصیل ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ واقعہ چاہے کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ مگر فنی اور ادبی نقطۂ نگاہ اُسے طویل کردینے پر شاعر کو مجبور کردیتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پہلے مثنویاں صرف واقعات کے اظہار ہی کے لئے نہیں لکھی جاتی تھیں بلکہ مثنوی لکھنے والے اپنا زورِ طبیعت اور اپنی شاعرانہ قوتیں بھی مثنوی کے ذریعے بروئے کار لانا چاہتے تھے۔ مثالاً میں آپ کو میر حسن دہلوی کی مثنوی سحر البیان کے چند شعر سناتا ہوں۔ جن میں حمام میں نہانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے ؎

پلا آتشیں آب پیرِ مغاں | کہ بھولے مجھے سرد و گرمِ جہاں
اگر چاہتا ہے مرے دل کو چین | نہ دینا وہ ساغر جو ہو قلتین
کدورت مرے دل کی ہو دُھو ساقیا | ذرا شیشۂ مے کو دھو دھا کے لا

یہ تو ہوا ساقی نامہ جس میں حمام اور غسل کی مناسبت سے آب۔ سرد و گرم اور دھونا دھانا وغیرہ الفاظ دانستہ لائے گئے ہیں۔ اب اصل واقعہ بیان کرتے ہیں ؎

ہوا جبکہ داخل وہ حمام میں | عرق آگیا اس کے اندام میں
تنِ نازنیں نم ہوا اُس کا کُل | کہ جس طرح ڈوبے ہو شبنم میں گُل
پرستار باندھے ہوئے لُنگیاں | ہر اِدھر سے طاس لیکر وہاں
لگے ملنے اُس گلبدن کا بدن | ہوا اُڈھڈھا آب سے وہ چمن
نہانے میں یوں تھی بدن کی دمک | برسنے میں بجلی کی جیسے چمک
بدن پر جو پانی پڑا سر بسر | نظر آئے جیسے کہ گلبرگ تر

غرضکہ اسی طرح ۱۲۶ شعار میں غسل اور آراستگی وغیرہ کا ذکر ہے۔ ایک مثنوی سحر البیان ہی پر منحصر نہیں۔ فارسی اور اُردو کی اکثر مثنویاں جو واقعاتی ہیں ایسی ہی تفصیلات اور تشبیہات و استعارات سے بھری ہوئی ہیں۔ فارسی میں یوسف زلیخا اور سکندر نامہ دو بڑی مثنویاں ہیں جنھیں سب جانتے ہیں۔ ان مثنویوں میں چونکہ واقعات بہت ہیں۔ اس لئے تشبیہ و استعارہ کو زیادہ گنجائش نہیں، تاہم جہاں کوئی واقعہ اہم یا دلچسپ آگیا ہے، وہاں مولانا جامی اور مولانا نظامی نے شاعرانہ قوتوں کے اظہار میں بھی کوتاہی نہیں کی۔

لیکن اُردو مثنوی کی بیلے جا یا بجا طوالتیں، ہر عنوان کی تمہید میں ساقی نامہ اور تشبیہات و استعارات کی انبار آخری دور کے شعرا میں متروک ہوگئے تھے۔ صرف زبان

اور محاورات نظم کرنے تک اُن کا زورِ قلم محدود تھا۔ اسکی مثال میں مثنوی فریادِ داغ مثنوی عالمِ خیال۔ مثنوی زہرِ عشق اور مثنوی مادرِ ہند پیش کی جاسکتی ہے، فریادِ داغ ایک جذباتی مثنوی ہے جس میں سلیس زبان اور محاورات کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے اس کے دو شعر سنیئے فرماتے ہیں ؎

رل نے دو ہی دن میں پہونچایا   رمضاں ایک دن کے بعد آیا
لوگ سب سحریاں مناتے تھے   رمضاں مجھکو کھائے جاتے تھے

اسی طرح مثنوی عالم خیال میں حضرت شوق قدوائی لکھنوی نے جذبات کے ساتھ زبان کی لچک اور بیان کے بوتے کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھا ہے۔ دو شعر اس مثنوی کے بھی مثالاً سنئے ؎

میں اس خبر سے خوش ہوا کہ زندہ ہے چکورا بھی
تمہارے پاس ہے تمہارا وہ حسین مورا بھی

پپیہے خوش رہیں کہ روز وہ مجھے بلاتے ہیں
جواب کہیں ؤ ہی کہاں تو تم کہو کہ آتے ہیں

اسی طرح نواب مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی زہرِ عشق بھی جذبات اور نفسیاتِ حسن و محبت کے اعتبار سے دلچسپی اور اثر میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ میں اس کے اشعار پڑھ کر دانستہ آپ کا وقت لینا نہیں چاہتا۔ شاید ہی ہندوستان کا کوئی شخص ایسا ہوگا جس نے "زہرِ عشق" کا مطالعہ دو چار بار نہ کیا ہو۔

دَورِ آخر کے شعرا نے بھی مثنوی لکھنے کی طرف توجہ کی ہے اور ہندوستانی ادب میں نہ صرف اُردو بلکہ فارسی مثنویاں بھی منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ڈاکٹر سر اقبال کی مثنویاں اسرارِ خودی۔ رموزِ بیخودی اور جاوید نامہ وغیرہ اس کا زندہ جاوید ثبوت ہیں مگر یہ مثنویاں واقعاتی ہیں کرداری نہیں ہیں۔

البتہ دورِ موجود کے شعرا میں مثنوی لکھنے کا رجحان بالکل نہیں پایا جاتا، اور بظاہر یہ صنفِ کلام متروک سی ہوتی جاتی ہے مگر اس کا ترک آسان نظر نہیں آتا۔ اس لئے کہ اب منظوم افسانے لکھنے کا رواج عام طور پر ہوگیا ہے، صرف نام بدلا ہے کام وہ ہی ہے اُردو رسالوں کے جو افسانہ نمبر وقتاً فوقتاً شائع ہوتے ہیں، اُن میں دو چار منظوم افسانے بھی ضرور ہوتے ہیں۔

ان مثنوی نما منظوم افسانوں میں پرانی مثنویوں کے خلاف صرف جذبات و نفسیات کی ترجمانی میں فکر کی قوتیں صرف کی جاتی ہیں موجودہ دور کے منظوم افسانے ادبیات میں ایک قیمتی اضافہ ہیں، ان میں نگاہوں کو تھکا دینے والی طوالت اور ذہن کو اُلجھا دینے والے غیر ضروری حشو و زوائد نہیں ہوتے بلکہ صرف جذبات و نفسیات کی مناسب نمائش ہوتی ہے۔ خوبصورت تشبیہیں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن ایسی کہ وہ تشبیہیں نہیں معلوم ہوتیں اور ان سے ذوقِ سلیم متاثر ہوتا ہے۔

ان منظوم افسانوں میں منظر کشی بھی ہوتی ہے، مگر اثر و جذب میں ڈوبی ہوئی تشبیہ و استعارہ کی جگہ اب واقعیت سے کام لیا جاتا ہے۔ پہلے مثنویوں کا مقصد اعلیٰ اظہارِ کمال تھا۔ اب منظوم افسانوں کا منشا درس و پیام بھی ہے، اب اُن کا ایک مآل بھی ہوتا ہے۔ اب ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اگر گذشتہ دور کی مثنویاں افسانوں کی حیثیت رکھتی تھیں تو موجودہ دَور کے افسانے بھی "مثنوی" کے بلند ترین نمونے ہیں۔

اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ پرانی مثنویوں اور موجودہ افسانوں یا داستانوں میں پلاٹ اور کردار کے لحاظ سے کہاں تک یگانگی یا ربط پایا جاتا ہے جس طرح بعض افسانوں میں پلاٹ اور بعض میں کردار نمایاں خصوصیت رکھتا ہے، اسی طرح مثنویوں میں بھی بعض مثنویاں صرف اپنے پلاٹ کی وجہ سے اور بعض اپنے کردار کی وجہ سے ممتاز ہیں "مثنوی زہرِ عشق" اور "فریادِ داغ" میں مخصوص اور اہم کردار ہیں جو اوّل سے آخر تک نمایاں طور پر ہمارے احساسات پر اثر کرتے ہیں، اس کے برخلاف پرانی مثنویوں کی بنیاد زیادہ تر پلاٹ ہی پر رکھی جاتی تھی۔ مثنوی نل دمن۔ وامق و عذرا۔ لیلیٰ مجنوں۔ یوسف زلیخا۔ ان سب کا ایک مرتب پلاٹ تاریخ میں پہلے سے موجود تھا شعرا نے اسی کو مثنوی کا لباس پہنا دیا لیکن مثنوی غنیمت۔ گلزارِ نسیم۔ زہرِ عشق فریادِ داغ اور عالمِ خیال میں پلاٹ کے ساتھ کردار کشی بھی کی گئی ہے۔ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ کسی داستان کو مثنوی بنانے میں کردار کی خصوصیتیں نمایاں نہیں کی جاسکتیں مثلاً اگر داستانِ امیر حمزہ۔ یا طلسمِ ہوشربا کو ہم مثنوی کے پیرہن میں ڈھالنا چاہیں تو یقیناً ہمیں کردار کشی کی طرف سے مایوس ہونا پڑے گا اور کوشش کرنی پڑے گی کہ واقعات کو سمیٹا جائے، لیکن مختصر افسانوں کو اگر مثنوی کا اسلوب دیا جائے تو کردار کی نمائش نہایت خوبصورتی سے کی جاسکتی ہے، آجکل کے کرداری افسانوں میں سب سے بڑی چیز یہ سمجھی جاتی ہے کہ انسانی سوسائٹی اور نفسی کیفیات کا نقشہ کھینچا جائے۔ پرانی مثنویاں اس خصوصیت سے محروم نظر آتی ہیں۔ ان میں نفسی کیفیات

زیادہ ماحول کی تصویر کشی بہت زیادہ پائی جاتی ہے رزم و بزم کی تصویر کشی میں نقشہ رزم و بزم یا فطرتِ جنگ و امن یا کیفیات غم و عیش کا خیال بہت کم رکھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس ہتھیاروں کے نام، اُن کے کام، اُنکا اثر، اُن کی ہلاکت آفرینی، اُن کی تعریف یا اگر محفلِ عیش کی تصویر کھینچی جاتی تو شمع و آئینہ ساقی، جام و شراب، بنفشہ و نسرین و سرو کا ذکر زیادہ آتا تھا، یہی وہ باتیں تھیں جو مثنویوں کو تفصیل و طوالت پر مجبور کر دیتی تھیں مگر موجودہ افسانوں میں ایسا نہیں ہوتا۔

مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ مثنویاں حقیقت نگاری کا اور افسانے فن کاری کا نمونہ ہیں۔ اظہارِ حقیقت میں اگر فن شریک نہ ہو تو افسانہ پھیکا اور داستان خشک ہو کر رہ جاتی ہے۔ مثنویوں میں شاعرانہ خصوصیات نے ایک حد تک اس ضرورت کو ضرور پورا کیا لیکن شاعرانہ قوتیں ماحول کی آراستگی یا نمائش میں صرف ہو گئیں، حال پر انکا کچھ اثر نہ پڑ سکا اسی چیز نے مثنوی اور افسانے میں امتیاز قائم کر دیا۔

اب سے پہلے افسانہ لغوی حیثیت سے ایک ایسی ہی چیز تھا جس میں واقعیت کو زیادہ دخل نہ ہو۔ یہ مصرع آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ ع

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"

شاید آپ نے اس مصرع کے لفظ "افسانہ" پر غور بھی کیا ہو۔ یہاں بھی افسانے کے معنی کسی غیر حقیقی اور تخیلی چیز ہی کے ہیں، اس لئے اسے "خواب" کے مقابلے میں رکھا گیا ہے۔ "خواب" اور "افسانہ" دونوں چیزیں غیر حقیقی ہیں۔ لیکن موجودہ زمانے کی افسانہ نگاری نے اس لفظ کی ماہیت تبدیل کر دی ہے۔ اب "افسانہ" ہم اُن کہتے ہیں جس میں زیادہ سے زیادہ نفسیاتی اور حقیقی باتیں ہوں۔ جیسے انسان کی روزانہ زندگی سے گہرا تعلق ہو، جس میں مشاہدات اور تجربات کو سادہ بیانی کے ساتھ پیش کیا گیا ہو جس میں واقعیت ہو اور جو انسانی فطرت اور اپنے ماحول کے لحاظ سے صداقت پر مبنی ہو۔ پرانی مثنویاں اور داستانیں اس معیار پر پوری نہیں اترتیں اکثر مثنویاں اور داستانیں مافوق الفطرت حکایتوں اور روایتوں سے آپ کو لبریز ملیں گی۔ جن میں شعبدوں کی سی فطرتِ انسانی سے بالاتر باتیں پائی جاتی ہیں، مثنویوں کا رواج ختم ہو جانے کا ایک سبب انکا خلافِ فطرت ہونا بھی ہے۔ یہ آخری اعتراض تمام پرانی مثنویوں پر حاوی نہیں ہوتا مگر پھر بھی بہت زیادہ مثنویاں آپ کو ایسی ہی ملیں گی۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ افسانے کا پلاٹ اگر انسانی زندگی کی حدود کو پیش نظر رکھ کر سوچا اور تیار کیا جائے تو وہ کتنا ہی حیرت انگیز کیوں نہ ہو اسکے حقیقی کردار دنیا میں کہیں نہ کہیں ضرور مل جائینگے۔ خواہ مغربی افسانوں کے کردار مشرق میں اور مشرقی افسانوں کے کردار مغرب ہی میں کیوں نہ ملیں لیکن ملیں گے ضرور، اس لئے کہ انسان اگر نفسیات کا تجربہ کار ہے تو وہ انسانی حقائق سے الگ جا ہی نہیں سکتا وہ انسانی ماحول سے دور اپنی دنیا بنا ہی نہیں سکتا۔ اس کا تخیل صداقت اور حقیقت کی حدود سے باہر جست لگا ہی نہیں سکتا۔ اب ہمارے افسانہ نگار زندگی کی اصلی تصویر پیش کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہیں اور منظوم افسانوں میں بھی اس چیز کا خیال کافی حد تک رکھا جاتا ہے۔ جو صنفِ مثنوی کا نعم البدل ہیں ان حالات میں منظوم افسانوں کا مستقبل بہت تابناک نظر آتا ہے۔

سیماب اکبرآبادی

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی)

کامرانیٔ خیال

(نظم)

اے مری تخیل کی دنیا ذرا بیدار ہو — ترک کر دے یہ سکونِ بے خودی، ہشیار ہو!
رنج ناکامی و اضمحلال ہے قطعاً فضول — تو اگر چاہے تو کچھ مشکل نہیں "اس" کا حصول
یہ اُداسی اور جمود ایسا، نہیں شایانِ دل — آنکھ کھول اور دیکھ اُٹھا کر، پردۂ ایوانِ دل
غم کی تاریکی کے پیچھے مسکراتا ہے کوئی — آفتابِ حسن بنکر جگمگاتا ہے کوئی

تیرے دل میں ڈھل رہا ہے بادۂ عرفاں کا نور
آ گیا تیرے لبوں تک، دیکھ مینائے سرور

آنسہ حیا میرٹھی

سنت تلسی داس

(فلم تلسی داس دیکھکر)

اے رشی اے سنت تلسی داس روحِ سوز و ساز
تجھ پہ نازاں ہے حقیقت تجھ پہ نازاں ہے مجاز

کھیلتی ہے رام کی مورت سے تیری کمسنی
کمسنی میں تیرے چہرے پر رہے روحانی خوشی

تیری بنیاد محبت ہے شریکِ زندگی
جس نے بخشی تجھ کو تعمیرِ حیاتِ عاشقی

تو نے چھانی ہے اجودھیا اور بندرابن کی خاک
گوہرِ مقصود پایا بر بنائے عشقِ پاک

تیرے روحانی تصرف نے یہ ثابت کر دیا
ایک شاعر ہی رشی ہوتا ہے اپنے وقت کا

کھینچتا ہے جب تجھے اپنی طرف عورت کا دل
تیری روحِ عشق ہو جاتی ہے یکسر مضمحل

روح کی گہرائیاں تیری صدائے نغمہ زار
تیرے میٹھے بول پیاسوں کے لئے امرت کی دھار

برق و باراں کی تب و تاب اے رشی کچھ بھی نہیں
آندھیوں کا زور طوفانوں کی رو کچھ بھی نہیں

تیرا روحانی عمل اک درسِ عالمگیر ہے
تیرے دل کی جو صدا ہے عشق کی تفسیر ہے

اے رشی، اے شاعرِ ہندوستاں اے دیوتا
تیری روحِ عشق نے ہر زندہ ہستی سے کہا

"زندگی پر جب پڑے غفلت کا پردہ چاک کر
آتما سنسار کی آلائشوں سے پاک کر"

کیوں نہ دل سے رام ہی کی تو ثنا خوانی کرے
جب ترا ممدوح خود تیری نگہبانی کرے

عشق ہی شاعر کو دیدے منصبِ پیغمبری
عشق ہی رتناولی سے چھین لے اُس کا پتی

رام بھگتی کو بڑھا سکتا ہے تیرے من کا راگ
جس کے میٹھے بول دے سکتے ہیں بیوہ کو سہاگ

اے مجسم عاشقی اے بادیہ پیمائے عشق
تیرا رنگیں کارنامہ کیوں نہ ہو طغرائے عشق

تیرے دل کا گوشہ گوشہ رام کا مسکن بنا
عاشقی میں عشق اپنا کام آخر کر گیا

تیرا رنگیں کارنامہ زندگی ہے رام کی
عشق نے کی مہر جس پر رام ہی کے نام کی

رام ہی کو من کے مندر میں بسا لیتا ہے تو
رام ہی کی یاد میں سب کچھ بھلا دیتا ہے تو

تیرے دل میں جس کا تھا ارمان حاصل کر لیا
رام حاصل کیا کیا، بھگوان حاصل کر لیا

دلکشی نغموں کی ہے تیری نوائے ساز میں
روحِ حُسن و عشق ہے تیرے لبِ اعجاز میں

یادگارِ حسن تیرا عشق کال ہند میں
زندگی تیری پرستش کے ہے قابل ہند میں

جانتا ہوں زندگیٔ عشق کا محرم تجھے
مانتا ہوں اے سخنور شاعرِ اعظم تجھے

(نظم)

آغاز برہانپوری

ڈرامہ

مُطرب کا انجام

(گذشتہ سے پیوستہ)

منیر - اس کی کوئی معقول وجہ دکھائی نہیں دیتی۔

شاہد - سنو منیر تم میرے بڑے عزیز دوست ہو۔ میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ میں آجکل ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہوں۔ تم ــــ تم جانتے ہی ہو لیلیٰ کی خوشی میری خوشی ہے اور اس کا غم میرا غم ہے۔ خدا جانے کیوں آجکل وہ بڑی افسردہ اور غمگین رہتی ہے۔ اُس کے ہونٹوں پر وہ روز مرہ کی سی ہنسی دکھائی نہیں دیتی۔ کوئی نامعلوم غم اُسے دن بدن گھلا رہا ہے۔ اُسے کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہی۔ مجھ سے تو جیسے وہ دُور دُور بھاگتی ہے۔ بس یہی میری پریشانی کا سبب ہے۔ تم یقین جانو کسی بات میں میرا جی نہیں لگتا۔ کھانا پینا ہنسنا کھیلنا سب کچھ مجھے بھولا ہوا ہے۔ مجھے تمہارے ساتھ نہ چلنے کی کتنی تکلیف ہے اس کو خدا جانتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرا جانا بیکار ہوگا۔ میں تمہاری کچھ بھی مدد نہ کرسکوں گا۔

(خاموشی)

شاہد - کچھ کہو۔ آخر چپ کیوں ہوگئے۔

منیر - میں سوچ رہا تھا کہ لیلیٰ کی اس پریشانی اور افسردگی کا سبب کیا ہوسکتا ہے۔

شاہد - تمہارا خیال ہے ــــ

منیر - کہو

شاہد - کچھ نہیں۔ یونہی ایک وہم سا میرے دل میں آیا تھا۔ منیر خیر اس پر ہم لوگ پھر کبھی گفتگو کریں گے۔ تم کب جا رہے ہو؟

منیر - آج شام کو۔

شاہد - اچھا تو خدا حافظ۔ خدا کرے تم لوگ کامیاب واپس لوٹو۔

منیر - ہاں دُعا کرنا۔ گو تمہارے بغیر کھیل کا کچھ لطف نہ آئیگا۔ مگر چارہ ہی کیا ہے۔ خدا حافظ۔

(جاتا ہے)

(شاہد کے دروازہ بند کرنے کی آواز آتی ہے)

(اس کے بعد ایک سسکی)

شاہد - لیلیٰ لیلیٰ۔ کیوں خیریت تو ہے۔ یہ تم کیوں رو رہی ہو۔

لیلیٰ - نہیں تو

شاہد - تمہاری آنکھیں بھی سُرخ ہو رہی ہیں۔

لیلیٰ - تمہارا خیال ہے میں روئی کیوں آخر۔

شاہد - کیا تم ــــ تم نے میری اور ــــ اور منیر کی باتیں سنیں؟

لیلیٰ - ہاں سنیں۔

(رونے کی آواز آتی ہے)

شاہد - مگر ــــ میں ــــ دراصل ــــ وہ ــــ بات یہ ہے لیلیٰ کہ وہ ــــ میں ــــ میں باہر جانا نہیں چاہتا اور اس لئے کوئی نہ کوئی بہانہ تو کرنا ہی تھا ــــ دیکھو میں نے اُس سے نعمان کا نام تک نہیں لیا۔

لیلیٰ - نعمان ــــ نعمان کا نام تم سمجھتے ہو کہ میں نعمان سے نہ مل سکنے کی وجہ سے افسردہ رہتی ہوں۔ میں اُس سے ہرگز ملنا نہیں چاہتی۔ کبھی کسی وقت نہیں ــــ اوہ ــــ

(رونے لگتی ہے)

شاہد - یہ کیا ــــ یہ کیا لیلیٰ ــــ تم ــــ تم رونے کیوں لگیں؟

لیلیٰ - اُف

(بے اختیار ہو کر رونے لگتی ہے)

شاہد۔ لیلیٰ لیلیٰ کچھ کہو۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ۔ آخر رونے کا کیا سبب ہے۔ کیا کہا۔ تم۔ تم ——— نعمان کو چاہتی ہو؟

لیلیٰ۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں اس کی صورت سے نفرت کرتی ہوں۔ گر ——— گر ——— مگر

شاہد۔ مگر؟

لیلیٰ۔ میں اُس سے ملنا نہیں چاہتی، مگر اُسے بُھول بھی نہیں سکتی۔ اُس نے مجھ پر جادو کر رکھا ہے۔ میرا دل میرے قابو میں نہیں رہا۔ میری مرضی میرا ارادہ۔ میرا فیصلہ سب کے سب اُس کے اختیار میں ہو گئے ہیں۔ میں ——— میں اپنی خواہش کے خلاف۔ اپنے ارادے۔ اپنے فیصلے کے خلاف اس سے ملنا چاہتی ہوں۔

شاہد۔ تم ——— تم اس سے ملنا چاہتی ہو؟ مگر ابھی تو کہہ رہی تھیں ———

لیلیٰ۔ (بات کاٹ کر) ہاں ہاں میں کہہ رہی تھی کہ میں اس سے ہرگز ملنا نہیں چاہتی۔ شاہد تم نہیں سمجھ سکتے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں اس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔ لیکن جب ——— جب وہ وائلن بجاتا ہے۔ اُس کے بے جان۔ مردہ تاروں کو چھیڑ کر ان میں زندگی کی تڑپ پیدا کر دیتا ہے۔ جب اُس کی نازک سنہری لہروں سے نغموں کا طوفان پھوٹ نکلتا ہے تو میں اُس نفرت کو بُھول جاتی ہوں۔ اس ایک لمحے میں وہ میرے اندر جذب ہو جاتا ہے۔ میں اُس کی مرضی کی غلام۔ ارادے کی لونڈی بن جاتی ہوں۔

(ہچکیوں کی آواز آتی ہے)

شاہد۔ لیلیٰ لیلیٰ۔ خدا کے لئے تم روؤ نہیں۔ مجھے کچھ سوچنے تو دو۔ دماغ سے کام تو لینے دو۔

لیلیٰ۔ وہ ——— وہ ایک جادوگر ہے۔ شاہد۔ شاہد مجھے اس سے بچاؤ مجھے اس سے بچاؤ شاہد۔

شاہد۔ گھبراؤ نہیں، لیلیٰ۔ حوصلہ نہ ہارو۔ میرے جیتے جی میری موجودگی میں وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں اس مردود کا گلا گھونٹ دوں گا۔ اُسے ——— اُسے جان سے مار ڈالوں گا۔

لیلیٰ۔ نہیں نہیں۔ یہ نہ کہو۔ یہ نہ کہو شاہد۔ اگر تمہارے دشمنوں کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی۔

(تازہ ہچکیوں کی آواز آتی ہے)

شاہد۔ خدا کے لئے تم روؤ نہیں۔ لیلیٰ ذرا ہمت سے کام لو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔

لیلیٰ۔ لیکن وعدہ کرو شاہد کہ تم اس سے لڑو گے نہیں۔

شاہد۔ اچھا۔ میں وعدہ کرتا ہوں لیکن اس کے بدلے میں تم سے بھی ایک وعدہ لینا چاہتا ہوں۔

لیلیٰ۔ وہ ——— وہ کیا؟

شاہد۔ یہی کہ تم کبھی ——— کسی وقت نعمان سے نہیں ملو گی۔

لیلیٰ۔ میں وعدہ کرتی ہوں شاہد۔ مگر یہ وعدہ بیکار ثابت ہو گا۔ کئی دن سے میں اس خواہش کا مقابلہ کر رہی ہوں لیکن دن بدن یہ میرے ارادے پر حاوی ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ——— جیسے کوئی مقناطیسی قوت مجھے اس کی طرف کھینچ رہی ہے۔ میں اب کا اور مقابلہ نہیں کر سکوں گی شاہد۔ مجھے اس کے پاس جانا ہی ہو گا۔

. . . .

. . . .

{ لیلیٰ کی آواز بتدریج کم ہوتی ہے اور اُس کی جگہ وائلن کا ایک لطیف نغمہ بلند ہوتا ہے۔ }

(وقفہ)

نعمان۔ لیلیٰ ——— لیلیٰ ——— آؤ۔ میرے پاس آؤ لیلیٰ۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہارا دیوانہ ہوں۔ آؤ میری زندگی۔ میری روح۔ میرے پاس آؤ۔

(نغمہ پھر چھڑتا ہے)

(وقفہ)

نعمان (سخت لہجہ میں) لیلیٰ۔ لیلیٰ۔ تم میری ہو۔ تم میری ہو۔ دُنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے نہیں چھین سکتی

(نغمے سے غیظ و غضب ٹپکتا ہے)

نعمان- (جھنجھلا کر) لیلیٰ- میرے پاس آؤ- میری محبت تمہیں حکم دیتی ہے
آؤ میرے پاس ——— آؤ ——— لیلیٰ ——

(یکایک نغمہ سوگوار ہوجاتا ہے- اس سے انتہائی مایوسی ٹپکنے لگتی ہے-)

....

....

لیلیٰ- وہ - - وہ .. مجھے بلا رہا ہے- آہ کوئی غیبی طاقت مجھے کھینچے لئے جارہی ہے (بلند آواز سے) میں آرہی ہوں، میں آرہی ہوں- نعمان

شاہد- لیلیٰ لیلیٰ ——— تم کہاں چلیں- ٹھہرو سنو-

لیلیٰ- مجھے چھوڑ دو- مجھے نہ روکو- وہ مجھے بلا رہا ہے- مجھے جانا ہی ہوگا میں اس کا حکم نہیں ٹال سکتی- وہ ——— وہ دیکھو- وہ مجھے حکم دے رہا ہے- اس کی تعمیل مجھ پر فرض ہے ——— آہ ——— آہ ——— مجھے چھوڑ دو- مجھے چھوڑ دو-

شاہد- نہیں نہیں میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا- میں تمہیں ہرگز ہرگز نہیں جانے دوں گا- لیلیٰ- آنکھیں کھولو- ہوش سنبھالو- آہ یہ تمہیں کیا ہوگیا لیلیٰ-

لیلیٰ- (بگڑ کر) تم مجھے نہیں روک سکتے- دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی میں آرہی ہوں- میں آرہی ہوں نعمان-

شاہد- لیلیٰ- ٹھہرو- خدا کے لئے ——— اوہ- تم- تم بالکل دیوانی ہوگئی ہو- تمہارے ہوش و حواس بجا نہیں ہے- مجھے ——— مجھے دروازہ مقفل کرنا ہوگا-

(دروازہ بند کرنے کی آواز)

لیلیٰ- کھولو- دروازہ کھولو- مجھے جانے دو- آہ- میں کیا کروں نعمان یہ ظالم وحشی مجھے تمہارے پاس آنے نہیں دیتے- یہ دروازہ بند کرکے تالے ڈال کر مجھے تم سے جدا رکھنا چاہتے ہیں- لیکن- کیا ——— کیا یہ مجھے تم سے جدا رکھ سکیں گے- نہیں- کبھی نہیں- ہرگز نہیں ——

تم ——— تم مجھے بلا رہے ہو- میں جانتی ہوں- لیکن ——— لیکن ——— آؤں تو کس طرح ——— کھولو ——— کھولو ——— دروازہ کھولو-

شاہد- لیلیٰ- لیلیٰ

لیلیٰ- میں تم سے التجا کرتی ہوں- تمہارے پاؤں پڑتی ہوں- دروازہ کھول دو- تم ——— تم نہیں مانتے ——— اچھا ——— اچھا تو میں ——— میں ——— تمہیں جان سے مار ڈالوں گی- تمہارا گلا گھونٹ دونگی ——— ظالم ——— بے رحم ———

(ہاتھا پائی کی آوازیں)

شاہد- لیلیٰ!

(گرنے کی آواز)

شاہد- اوہ خدایا- یہ کیا ——— یہ کیا ہوا ——— لیلیٰ ——— لیلیٰ ——— ہیں یہ تو بیہوش ہوگئی ——— اوہ ——— خدایا - کوئی ڈاکٹر کو بلائے

(دوڑ کر جانے کی آواز)

....

....

(وائلن کا نغمہ اپنے پورے شباب پر)

(وقفہ)

(دروازہ کھلتا ہے)

نعمان- تم آگئیں
لیلیٰ- ہاں
نعمان- کیوں آئی ہو؟
لیلیٰ- تم ——— تم نے بلایا تھا
نعمان- ہاں- میں نے بلایا تھا- بیٹھ جاؤ-

(وائلن پھر چھڑتا ہے، کچھ بجاتا ہے، پھر بند کردیتا ہے)

نعمان - لیلیٰ۔

لیلیٰ - ہاں

نعمان - تمہیں مجھ سے محبت ہے۔

لیلیٰ - ہاں۔

نعمان - تم میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں۔

لیلیٰ - نہیں۔

نعمان - شاباش

(خاموشی)

نعمان - تم چپ کیوں ہو لیلیٰ؟

لیلیٰ - میں تمہارے حکم کا انتظار کر رہی ہوں۔

نعمان - ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ہنسو۔

(لیلیٰ ہنستی ہے)

نعمان - زور سے ——— اور ——— اور ——— زور سے۔

(لیلیٰ دیوانہ وار ہنستی جاتی ہے)

نعمان - اب ——— اب روؤ۔ لیلیٰ۔

(لیلیٰ رونے لگتی ہے)

نعمان - میرے اشارے کی غلام۔ میری مرضی کی لونڈی۔ لیکن اس کے باوجود کیا تم میری ہو، لیلیٰ۔ نہیں، نہیں آہ۔ یہ قسمت کی ستم ظریفی ہے۔ فطرت کا انتقام ہے ——— لیکن نہیں ——— میری محبت اس سر بستہ دل میں زندگی کی گرمی پیدا کر دے گی جس طرح میرے ہاتھوں کی جنبش ان بے جان تاروں میں نغموں کا سوز پیدا کر دیتی ہے ....

....

نعمان - لیلیٰ لیلیٰ - میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہارا غلام ہوں لیلیٰ۔ مجھ پہ رحم کرو۔ ترس کھاؤ ——— ہیں، یہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں، میں اور کسی کا غلام نہیں، ہرگز نہیں۔ میں تمہارا آقا ہوں تمہارا مالک ہوں۔ اِدھر آؤ۔ میرے قریب، اور قریب لیلیٰ ——— ہاں شاباش۔ تم اپنا جسم۔ اپنی روح۔ اپنا سب کچھ میرے حوالے کرنے کو تیار ہو؟

لیلیٰ - ہاں۔

نعمان - خوشی سے؟

لیلیٰ - ہاں۔

نعمان - (بگڑ کر) ہاں ——— ہونٹوں کی ایک جنبش۔ زندگی سے خالی ——— مُردے کی بھرّائی آواز ——— جیسے ٹوٹے ہوئے بربط کے تاروں کی جھنکار۔ جاؤ۔ جاؤ۔ دُور ہو جاؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ مجھے تمہاری محبت کی بھی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری صورت تک دیکھنی نہیں چاہتا ——— تم ——— میرے اور میرے فن کے درمیان حائل ہو گئی ہو، تم نے میری دلنواز محبوبہ مجھ سے چھین لی ہے، تم میری قوتِ ارادی پر بھی تدریجاً قابض ہو رہی ہو، جاؤ دُور ہو جاؤ۔ نکل جاؤ۔ ورنہ آج میں تمہارا آقا ہوں، کل بندہ بن جاؤں گا ———

(لیلیٰ کے جانے کی آواز)

(وقفہ)

نعمان - چلی گئی، سچ مچ چلی گئی۔ قوسِ قزح کی رنگین جھلک کی طرح آئی اور روپوش ہو گئی ——— دنیا۔ دنیا تسکین سے خالی نظر آتی ہے ——— لیلیٰ ——— میرے دل کی ملکہ۔ آ اس قدر ظالم نہ بن۔ میری تمناؤں پر رحم کھانا سیکھ ——— تو مجھ سے سب کچھ چھین رہی ہے ———

(ہچکیوں کی آواز)

اُف۔ میں ——— میں ——— دیوانہ ہو گیا ہوں۔ میرے ہوش و حواس رخصت ہو گئے ہیں ———

(چیخ کر) لیلیٰ ——— لیلیٰ ——— آ۔ واپس آ۔ میں نعمان خداوندِ موسیقی، تجھے حکم دیتا ہوں ابھی ——— اسی وقت

——— واپس آ ——— واپس آ ——— لیلیٰ

(جوش و خروش کے ساتھ وائلن کا نغمہ شروع کرتا ہے)

(جو بتدریج مدھم پڑتا جاتا ہے اور آخرکار خاموشی میں ڈوب جاتا ہے)

پانچواں منظر

(بازار کے شور و غل کی آواز)

ایک شخص - ایک مہینہ میں یہ انقلاب، نعمان کو کیا ہوگیا۔

دوسرا - سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ اس کے نغمے اب اس کیف سے خالی ہوگئے ہیں جن کے لئے وہ مشہور تھا۔

پہلا - ہاں۔ در اصل وہ آجکل کوئی گیت بھی پورا نہیں بجاتا۔ ایک راگ چھیڑتا ہے اور اُسے ختم کئے بغیر دوسرا شروع کر دیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے آجکل اُسے سکون حاصل نہیں۔

دوسرا - شاید

پہلا - لوگ بڑے برگشتہ خاطر ہو رہے ہیں

دوسرا - ہاں۔ اگر یہی حالت رہی تو اُس کی تمام شہرت خاک میں ملجائیگی۔

پہلا - شش شش ...... دیکھو وہ آرہا ہے۔

دوسرا - کسی گہری سوچ میں ہے

پہلا - آنکھوں کے اردگرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے متواتر کئی راتیں نہیں سویا۔

دوسرا - ٹھہرو۔ میں بلاتا ہوں۔ نعمان ——— نعمان صاحب

سُنا تک نہیں۔ آنکھ تک اُٹھا کر نہیں دیکھا۔

پہلا - خدا اس کی حالت پر رحم کرے۔

ایک تیسری آواز - ہاں بیشک خدا اُس کی حالت پر رحم کرے۔

پہلا - کون توقیر صاحب۔ آداب عرض ہے۔

توقیر - آداب، نعمان کے متعلق خیال آرائی ہو رہی تھی۔

پہلا - ہاں انسپکٹر صاحب۔ نعمان کے نغموں میں اب کوئی سوز نہیں رہا۔

اس کا وائلن اب زندگی کی تڑپ سے خالی ہوگیا ہے

توقیر - ساز مطرب کے دل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یوں کہئے کہ آجکل نعمان کا دل بجھا ہوا ہے اُس کی شمع مسرت جھلملا رہی ہے۔ (قہقہہ) اچھا تو رخصت چاہتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔ آداب۔

(جاتا ہے)

پہلا - انسپکٹر توقیر کی گفتگو کچھ سمجھ میں نہیں آئی

دوسرا - ہاں کچھ طنز کی جھلک موجود تھی۔

(شور و غل کی آواز بتدریج کم ہوتی جاتی ہے)

(وقفہ)

....

....

لیلیٰ - تم اس روز کے متعلق پوچھتے ہو شاہد۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایک خواب تھا جو میں نے دیکھا۔ لیکن ایسا خواب جس کے خیال سے میں ابھی تک کانپ جاتی ہوں۔

لیلیٰ - میں ایک وسیع تاریک کمرے میں کھڑی تھی۔ جس کی دیواروں پر سیاہ رنگ کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں ایک پرانے وضع کا شمعدان رکھا تھا جس کی مدھم لرزتی ہوئی روشنی کمرے پر ساحرانہ اثر ڈال رہی تھی۔ سب کھڑکیاں اور روشن دان بند تھے۔ میں وہاں کیونکر پہونچی، یہ میں نہیں جانتی اور وہ کمرہ کس مکان میں واقع ہے۔ یہ بھی نہیں بتا سکتی ———

نعمان میرے سامنے کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں وائلن تھا، اور اُس کی آنکھیں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ اف وہ آنکھیں جیسے ——— جیسے دہکتے ہوئے انگارے، میں ——— میں انھیں کبھی نہیں بھول سکوں گی ——— (رُکتی ہے)

(باقی - باقی)

گوہر شادانی

جنگ مغلوبہ

ابتلا خیز جنگ برپا ہے محشر انگیز جنگ برپا ہے
تیز سے تیز جنگ برپا ہے سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جتنے باہر سے تار آتے ہیں جنگ کی اطلاع لاتے ہیں
ریڈیو گھر میں غل مچاتے ہیں سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

برّی و بحری و ہوائی جنگ ابتدا سے ہے انتہائی جنگ
جنگ بھی اور کیمیائی جنگ سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

بحر خشکی سے ہٹ چکے ہیں تمام اپنے ساحل سے کٹ چکے ہیں تمام
کہ سرنگوں سے پٹ چکے ہیں تمام سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جس طرف رُخ سپاہ کرتی ہے حملہ بے پناہ کرتی ہے
امنِ عالم تباہ کرتی ہے سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جنگ دبابہ ہائے قہر افزا ہے نہایت ہی جنگ آفت زا
بالخصوص ان کی جنگ برق آسا سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

آبدوزیں ہیں اور تہ کاری تارپیڈو ہیں اور بلا باری
ہائے! خلق خدا کی ناچاری سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

روز طیارے لائے جاتے ہیں روز لشکر بڑھائے جاتے ہیں
قہر پہ قہر ڈھائے جاتے ہیں سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جب ہوائی جہاز آتے ہیں آتش افروز بم گراتے ہیں
خاک کے ڈھیر چھوڑ جاتے ہیں سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

سینکڑوں اسلحہ ہیں آتش بار لاکھوں آلات اگل رہے ہیں شرار
وقنا ربنا عذاب النار سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جس طرف جاؤ اُٹھ رہا ہے دھواں سقف و دیوار و در ہیں شعلہ فشاں
آتشیں غسل کر رہا ہے جہاں سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

ان خطرناک یورشوں کے سوا حملہ آور ہے ایک اور بلا
یعنی فتنہ پروپیگنڈے کا سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

اس وغا میں یہ ہے بلا بھی شریک یہ وبال اور یہ وبا بھی شریک
یہ بھی اور اس کا ارتقا بھی شریک سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

ہمتِ نشر مدح و ذم بھی شریک ناشر و کاتب و قلم بھی شریک
اور بدقسمتی سے ہم بھی شریک سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

حربہ ہائے زباں بھی شامل ہیں   حملہ ہائے بیاں بھی شامل ہیں
یاں بھی شامل ہیں واں بھی شامل ہیں   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

دم بھی، دھوکا بھی، افترا بھی ہے   جھوٹ بھی، مکر بھی، دغا بھی ہے
اور پھر سچ کا ادعا بھی ہے   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

سب و شتم بہم دگر بھی ہے   طعن و تشنیع تلخ تر بھی ہے
کوششِ از دیادِ شر بھی ہے   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

ریڈیو، ٹیلی فون، تار، اخبار   بن چکے ہیں وغا کے آلۂ کار
جنگ کا بھوت ہے سروں پہ سوار   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جس کو دیکھو وہ مدح خوانِ دغا   جس سے پوچھو، وہ قدر دانِ دغا
بارک اللہ اوجِ شانِ دغا   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

کاردانانِ مکر و فن بھی نئے   بم بھی، مردانِ بم فگن بھی نئے
تیغ بھی اور تیغ زن بھی نئے   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

نئے اندام ہیں نئی پیکار   نئے آلات ہیں نئے ہتھیار
بحر و بر ہیں نئی بلا سے دوچار   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

قوم پر قوم کھا رہی ہے مات   ملک کے ملک کھو رہے ہیں ثبات
سخت نازک ہے صورتِ حالات   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

اک طرف حکمِ عامِ بربادی   اک طرف اذنِ تامِ بربادی
ہر طرف اہتمامِ بربادی   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

ہر طرف قتلِ عام جاری ہے   ہر طرف نہب تام جاری ہے
اور بہ صد انتظام جاری ہے   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

نوعِ انساں ہے اور تباہی ہے   نظمِ دوراں ہے اور تباہی ہے
امنِ گیہاں ہے اور تباہی ہے   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

روز دو دو کروڑ سکۂ زر   مفت برباد ہو رہا ہے، مگر
پھر بھی اس بے پناہ نقصان پر   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جنگ وحشت میں بڑھتی جاتی ہے   زور و شدت میں بڑھتی جاتی ہے
اور وسعت میں بڑھتی جاتی ہے   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

کیا خبر؟ اب یہ کس طرف کو جھکے   کیا خبر؟ اب کہاں یہ جا کے رکے
کیا خبر؟ کیونکر اب یہ قصہ چکے   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

صلح کی کیا امید بر آئے   صلح کی کیا کوئی خبر آئے
کوئی دبتا بھی تو نظر آئے   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

سعیِ صلحِ بہم غلط ہے ہنوز   اس طرف ہر قدم غلط ہے ہنوز
لا صحیح اور نعم غلط ہے ہنوز   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

ہندوالو! کچھ اب تو ہوش میں آؤ   فرصتوں کو نفاق میں نہ گنواؤ
وقت ہے وقت، متحد ہو جاؤ   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

وقتِ فرصت کو مغتنم سمجھو   خدمتِ ملک کو اہم سمجھو
ورنہ اپنے کو کالعدم سمجھو   سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

حکیم آزاد انصاری

رقصِ بہار

کسی بھنوری کو جب کلیوں پہ رقصاں دیکھ لیتا ہوں
گھڑی بھر میں کئی خواب پریشاں دیکھ لیتا ہوں

محبت کی ہمہ گیری نمایاں دیکھ لیتا ہوں
میں گل کیا بتہ گل کا چاک داماں دیکھ لیتا ہوں

میں ہر انداز میں وحشت کا ساماں دیکھ لیتا ہوں
گلوں کے چاک میں اپنا گریباں دیکھ لیتا ہوں

تری کافر نگاہوں کا تبسم اے معاذ اللہ
ہجومِ غم میں امیدوں کا طوفاں دیکھ لیتا ہوں

کسی دم یک بیک کچھ اس ادا سے دل مچلتا ہے
نگاہِ حُسن کو بھی عشق ساماں دیکھ لیتا ہوں

کسی کی مرحمت پاس و حیا پرور نگاہوں میں
امید و یاس کو دست و گریباں دیکھ لیتا ہوں

نسیمِ صبح کے جھونکوں میں کلیوں کے تبسم میں
ہر آئینہ میں اُن کا روئے خنداں دیکھ لیتا ہوں

تری مشقِ ستم نے وہ بصیرت بخش دی دل کو
کہ ساکن موج کی تہ میں بھی طوفاں دیکھ لیتا ہوں

ترے جلووں نے وہ رنگینیاں بھر دیں نگاہوں میں
کہ ہر کانٹے کے دامن میں گلستاں دیکھ لیتا ہوں

بہارؔ اک حور وش کی عنبریں زُلفوں کے صدقے میں
میں گھر بیٹھے بہارِ سنبلستاں دیکھ لیتا ہوں

(غزل) **بہار کوٹی**

پروازِ فکر

آج پھر مجھ پر کرم فرما نگاہِ ناز ہے
اس میں کوئی مصلحت ہے، اس میں کوئی راز ہے

یہ ہوا آخر مآلِ کوششِ اخفائے راز
ساری دُنیا کی زباں پر آج اپنا راز ہے

دم اِدھر نکلا اُدھر انسان افسانہ ہوا
پھر تو اُس کی زندگی بگڑا ہوا اک ساز ہے

پڑھ رہا ہے فاتحہ یہ کون میری قبر پر
یہ تو اک بے مہر کی گوشِ آشنا آواز ہے

وقتِ آخر آخری ہچکی نے مجھ سے کہہ دیا
زندگی کا راز یہ تھا موت کا یہ راز ہے

دل کو قدموں سے نہ مسلو تم خدا کے واسطے
اس میں میری عمر بھر کی زندگی کا راز ہے

آخری منزل یہ ہے بیمارِ غم کی زندگی
اب نہ بالیں پر دُعا گو ہے نہ چارہ ساز ہے

لے اُڑوں گا اب تو میں شاخِ نشیمن تک قفس
ہمتِ پرواز کیسی، قدرتِ پرواز ہے

قیسؔ اُن کو کیا سناؤں داستانِ زندگی
اب تو میری ضعف سے ڈوبی ہوئی آواز ہے

(غزل) **نوابزادہ قیس** (مینڈو)

شعر العرب

بھولے ہوئے ادب کا ایک ورق

ابونواس کا معجزۂ شاعری

خلیفہ مہدی عباسی اپنی محبوب کنیز خیزران کے قصر میں اچانک جا پہونچا۔ خیزراں غسل کر رہی تھی، برہنہ جسم، مرد کی اچانک آمد، نسوانی غیرت غیر ارادی طور پر حرکت میں آگئی، خیزراں نے بڑی پھرتی کیساتھ اپنے لانبے اور گھنے بال برہنہ جسم پر چھوڑ دیئے اور اُس کا بدن، بالوں میں چھپ گیا مہدی کو کنیز کی یہ ادا بہت پسند آئی، کنیز کے حجرے سے واپس ہوکر وہ دربار میں آیا اور دربانوں سے دریافت کیا کہ دروازے پر کون کون شاعر ہیں؟ دربانوں نے عرض کیا کہ ابونواس اور بشار بن برد آستانۂ مبارک پر حاضر ہیں۔ خلیفہ نے اُن دونوں کو طلب فرمایا اور وہ دونوں حاضر دربار ہوگئے۔

خلیفہ نے اُن سے کہا کہ ایسے اشعار کہو، جو میری نفسی کیفیت اور قلبی واردات کے مطابق ہوں۔ اس پر بشار بن برد نے اسی وقت کھڑے کھڑے چار اشعار پڑھکر سنائے، اشعار بہت خوب تھے، مگر خلیفہ کے دل کی بات کی اس سے ترجمانی نہ ہو سکی۔ بشار کے بعد ابونواس کی باری آئی، اُس نے ارتجالاً اشعار پڑھنا شروع کئے:۔

پانی بہنے کے سبب اُس نے اپنی قمیص اُتار دی، اور شدتِ حیا نے
اُس کے رخساروں کو گلگوں بنا دیا۔
وہ برہنہ ہوگئی، اور اُس نے ہوا کا، اپنے اُس جسم سے، جو ہوا سے
زیادہ ہلکا پھلکا تھا، مقابلہ کیا۔
جب برتن میں پانی بھر گیا، تو اُس نے اپنی ہتھیلی جو پانی کی طرح
لطیف تھی پانی کی طرف بڑھائی۔
جب وہ نہا چکی تو اُس نے عجلت کے ساتھ چادر لینے کا
ارادہ کیا۔
اُس ہرنی کی طرح جو ہرنوں سے جدا ہوگئی ہو، اُس نے
گردن اٹھا کر دیکھا۔
اُس نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اُسے قریب سے گھور رہا
ہے تو اُس نے روشنی پر تاریکی ڈال دی۔
(یعنی اپنے سیاہ بال اپنے بدن پر چھوڑ دیئے)
پس صبح، رات کے نیچے چھپ گئی اور پانی، پانی کے اوپر
بہنے لگا۔

مہدی ابونواس کے اشعار سُن کر ششدر رہ گیا، وہ بے اختیار ہوکر بولا "تلوار لاؤ" ابونواس نے کہا امیرالمومنین! تلوار کا کیا ہوگا؟ خلیفہ نے کہا تو ہمارے ساتھ تھا؟ ابونواس نے جواب دیا، قسم خدا کی میں آپ کے ساتھ نہ تھا، یہ تو میں نے اپنے دل میں آئی ہوئی بات کو اشعار کی صورت میں پیش کردیا اس پر خلیفہ نے ابونواس کو چار ہزار درہم عطا کئے وہ خوش خوش اپنے گھر چلا گیا۔

ایک حسینہ کو دیکھکر

سراج الوراق اور ابوالحسین جزار ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے، ایک حسین وجمیل چھوکری اُن کے قریب سے گذری۔ سراج الوراق نے فوراً ہی کہا:—

اُس کے عادت واطوار، اُس کی نرمی کا پتہ دیتے ہیں، اور
اُس کا لعابِ دہن شراب انگور سے زیادہ لطیف ہے۔

ابوالحسین جزار بھی چھوکری کے حسن جمال سے متاثر ہو چکا تھا، اُس نے بھی

نہ رہا گیا، سراج کا شعر ختم ہوتے ہی بولا:۔

اُس کے رخساروں میں گلاب کے پھول کھلے ہوئے ہیں، لیکن
اُس کی زُلفوں کی ناگنیں پھول توڑنے سے روکتی ہیں۔

مذمتِ شراب

شراب شعر کا خاص موضوع ہے اور جاہلیت کی عربی شاعری میں تو شراب کو طرح طرح سے پیش کیا گیا ہے، لیکن خدا کے بعض بندوں نے اشعار میں شراب کی مذمت بھی کی ہے اور لطف یہ ہے کہ مذمت میں شعر کی لطافت باقی رہتی ہے۔ اصمعی نے سعد المجنوں کی زبان سے سُنا:۔

میں نے شراب، اہلِ شراب کے لئے چھوڑ دی، اور میں نے خالص پانی
پینا شروع کر دیا۔
میں نے دیکھا کہ شراب عزّت والے کو ذلیل بناتی اور سُرخ و سپید
چہروں کو کالا کرتی ہے۔

غمِ فراق

ایک عاشق مزاج شاعر نے اپنی محبوبہ کی موت پر کہا:۔

میرے ہاتھ سے میرا پھول چھین لیا گیا، اے میری آنکھو!
تمہارے آنسو دیکھو! خشک نہ ہونے پائیں۔
قرب و دوری کے عالم میں میرے دل کو جب وحشت ہوتی تھی،
تو وہی سراپا اُنس و تسکین بن جاتی تھی۔
وہ میرا ہاتھ تھی، جس سے میری قوت تھی، میرا ہاتھ،
میرے ہاتھ سے چھڑا لیا گیا۔

کنیز کی حاضر جوابی

ایک کنیز کو ہارون الرشید خریدنا چاہتا تھا، بیچنے والے سے اُس نے کہا کہ اگر کنیز کا چہرہ صاف ہوا تو میں اُسے خرید لوں گا اور اگر داغ اور جھائیاں ہوئیں تو میں اُسے نہ خریدوں گا۔ کنیز پردے کے پیچھے کھڑی تھی اُس نے شعر پڑھنا شروع کئے:۔

ہرن اپنے حُسن و جمال کے باوجود، اور چودھویں رات
جس کی سب لوگ تعریف کرتے ہیں بے عیب نہیں ہیں۔
ہرن کی تو ناک پست ہے اور چاند کے منہ پر جھائیاں
ہیں۔

ہارون الرشید نے کنیز کے اشعار کو حیرت کے ساتھ سنا اور اُس نے اُسے فوراً خرید لیا۔

ماہر القادری

صحرا نوردِ شب

یہ رات، یہ گھٹائیں، یہ دوریٔ منازل
ہر سانس اک مصیبت ہر گام ایک مشکل
تاریکیوں کے پردے ہر جنبشِ نظر پر
پُر ہول سی فضائیں بدلے ہوئے سے منظر
چھایا ہوا جہاں پر خاموشیوں کا عالم
ہر شخص کی زباں پر مُہرِ سکوتِ پیہم
ہر پیکرِ تصوّر مایوسیوں کا پیکر
کھائے قدم قدم پر تارِ نگاہ ٹھوکر
اِن مشکلوں سے لیکن مطلق نہیں ہراساں
بے خوف جا رہا ہے رہگیرِ کوئے جاناں
شمعِ اُمید اس کے پہلو میں ہے فروزاں
جس سے چمک اُٹھیگا ہر ذرّہ بیاباں

(نظم)

مرزا سیمابی عالمپوری

منزل بہ منزل

رہِ عشق میں خضر ہے عزمِ راسخ چلا جا رہا ہوں میں منزل بہ منزل
متاعِ محبت کا حاصل یہی ہے تجھے پا رہا ہوں میں منزل بہ منزل

غریقِ محبت ہوں افسردہ دل ہوں بہا جا رہا ہوں میں منزل بہ منزل
بنا ہی ہیں ساحل سرِ موجِ طوفاں چلا جا رہا ہوں میں منزل بہ منزل

کوئی حد بھی ہے ہستیِ بے بقا کی کہ صورت دکھائی بقا نے فنا کی
بقا کی حدیں ہیں فنا کی حدیں ہیں چلا جا رہا ہوں میں منزل بہ منزل

ثباتِ فنا مرگِ ہستی پہ قائم فنا میں ہے ہستی بہ ہر طور دائم
فنا و بقا سے نگاہیں بچاتا چلا جا رہا ہوں میں منزل بہ منزل

تصور کو میں تابِ پرواز دے کر تجھے شوق کی داستاں لکھ رہا ہوں
ہوا شعلۂ دل کو دے دے کے اپنی اڑا جا رہا ہوں میں منزل بہ منزل

خرابِ محبت خرابِ زمانہ ہوا ہوں تری جور کا میں نشانہ
جہاں میں اماں مجھ کو ملتی نہیں ہے چلا جا رہا ہوں میں منزل بہ منزل

اٹھا ہے وہ طوفانِ ارماں کا دل میں کہ کشتیِ دل تہ بہی جا رہی ہے
خدا کو کیا ناخدا میں نے اپنا چلا جا رہا ہوں میں منزل بہ منزل

مرا شوقِ پرواز دیکھے تو کوئی شرر تھا مگر برق سا بن گیا ہوں
خس و خار رہ کو جلاتا بجھاتا چلا جا رہا ہوں میں منزل بہ منزل

مرے اشکِ پیہم کی رنگینیاں ہیں کہ دامن پہ گلہائے رنگیں کھلے ہیں
ہر اک گام پر اشک افشاں و گریاں چلا جا رہا ہوں میں منزل بہ منزل

مری تیرہ بختی کی ہے کوئی حد بھی تبسم مرے لب پہ آکر فغاں ہے
زمانے کو ٹھکرا کے تیری طلب میں چلا جا رہا ہوں میں منزل بہ منزل

نسیم اپنے احساسِ نازک کے صدقے ستم کو کرم کر دیا ہے سراسر
رہِ شوق میں سرگراں پا بہ جولاں چلا جا رہا ہوں میں منزل بہ منزل

(غزل) نسیم گوالیاری

نوائے جاوید

تمیزِ دیر و حرم کو مٹا رہا ہوں میں
بتوں کو کعبۂ دل میں بسا رہا ہوں میں

کسی کو دیکھ کے نظریں چرا رہا ہوں میں
ہنوز رازِ محبت چھپا رہا ہوں میں

تڑپ رہی ہے نقابِ سحاب میں بجلی
پھر آشیانہ چمن میں بنا رہا ہوں میں

جگر میں داغ، جنوں سر میں آبلے دل پر
یہ نعمتیں تری محفل سے لا رہا ہوں میں

تجلیات کے پردے اٹھا رہا ہے تو
ہر ایک ذرّے کو موسیٰ بنا رہا ہوں میں

خمارِ بادہ جھلکتا ہے میری آنکھوں سے
کہ تیری آنکھ سے مستی چرا رہا ہوں میں

میں چن رہا ہوں نشیمن کے واسطے تنکے
چمن میں برق کو خود ہی بلا رہا ہوں میں

خیالِ زلفِ پریشاں سے اور بھی جاوید
درازیِ شبِ فرقت بڑھا رہا ہوں میں

(غزل) جاوید کوہستانی

ہندی فیلسوف

شمس العلما علامہ عبدالحق عمری خیرآبادی

نام ولقب علامہ عبدالحق خطاب شمس العلما تھا۔

نسب نامہ عبدالحق بن مولانا فضل حق بن مولانا فضل امام بن شیخ ارشد بن محمد صالح بن عبدالواجد بن عبدالماجد بن قاضی صدرالدین ہرگامی بن اسمٰعیل بن قاضی عمادالدین بدایونی بن شیخ ارزانی بن شیخ منور بن خضر الملک بن خضر الملک بن سالار شام بن وجیہ الملک بن بہارالدین بن شیر الملک بن محمد عطا بن ابوالفتح بن عمر الحاکم بن قاہرون بن جرجیس بن احمد نامدار بن محمد شہریار بن عثمان بن ہامان بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن محمد بن سیدنا عبداللہ بن حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ[1]

خاندانی حالات مولانا کے مورث عرب سے ایران آکر ایک عرصہ تک ایک قطعۂ ملک کی فرمانروائی کرتے رہے۔ دورِ حکومت ختم ہونے کے بعد علمی مشاغل کی طرف توجہ ہوئی اکثر حضرات عہدۂ جلیلہ قضاۃ پر فائز ہوئے ان میں نامور قاضی عمادالدین بدایونی تھے، جن کے پوتے قاضی صدرالدین تھے۔

قاضی صدرالدین ہرگامی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عالم متبحر فاضل متدین نواسہ شیخ سعدی کاکوروی کے تھے مفتی عبیداللہ الشہابی متوفی سنہ ۱۰۷۶ھ ان کے داماد تھے[2] اور ان کے پرپوتے مولانا فضل امام مشاہیر ہند سے تھے مولانا فضل امام مولانا سید عبدالواجد کرمانی خیرآبادی کے شاگرد رشید تھے۔ عالم محقق فاضل مدقق تھے منجانب گورنمنٹ انگریزی عہدۂ صدر الصدور دہلی پر فائز ہوئے۔ مولانا شاہ صلاح الدین صفوی گوپاموی کے مرید تھے۔ مرقات۔ بجتہ السیر۔ تلخیص الشفا میرزاہد ملا جلال میرزاہد کے رسالہ پر حواشی لکھے۔ آمدنامہ تصانیف سے ہے ۵ ذیقعدہ سنہ ۱۲۴۳ھ کو خیرآباد میں انتقال کیا۔[3]

مولانا فضل حق باپ کے شاگرد تھے، علم حدیث مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی سے حاصل کیا۔ بہت کم عمری میں فارغ التحصیل ہوئے باپ نے درس سپرد کیا کچھ عرصہ بعد عدالت ضلع میں سررشتہ دار ہوگئے۔ ناقدری حکام سے نوکری ترک کی مگر نواب جھجر نے بلالیا پھر رام پور چلے گئے، نواب نے بہت نوازا، پھر آپ لکھنؤ میں صدر الصدور کے عہدہ پر سرافراز ہوئے سنہ ۱۲۷۳ھ کے ہنگامہ کی لپیٹ میں یہ بھی آئے، کالاپانی ہوا۔ ۱۲ صفر سنہ ۱۲۷۸ھ کو وصال ہوا۔ کثیر التعداد کتب کے مصنف و مؤلف ہیں۔[4]

پیدائش مولوی عبدالحق سنہ ۱۲۴۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ باپ سے فاضل و یگانۂ روزگار علوم و عقلیات و نقلیات کی تحصیل کی کم عمری میں فارغ التحصیل ہوئے اور مشغلِ والد ماجد درس و تدریس میں لگ گئے۔

سوانح مہاراجہ الور نے بلابھیجا، آپ رئیس کی طلبی پہ گئے وہاں بڑی آؤبھگت ہوئی راجہ بے حد تواضع سے پیش آیا سنہ ۱۲۷۳ھ میں ہنگامہ رونما ہوا، باپ نے فتویٰ جہاد پر دستخط کئے تھے اس کی وجہ سے ان پر مقدمہ چلا، آخر میں کالاپانی ہوا، یہ الور سے وطن چلے آئے۔ نواب وزیرالدولہ نے ٹونک طلب کیا وہاں چلے گئے نواب نے توقع سے زیادہ قدردانی کی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ بڑے بڑے صاحبِ کمال حضرات ٹونک میں جمع ہوگئے تھے۔ مولانا کا شغل ٹونک میں بھی تعلیم و تعلم ہی تھا۔ زیادہ حصہ وقت کا نواب کی صحبت میں

---

[1] تذکرۂ انساب للمولوی مصطفیٰ امین خاں و تذکرہ علمائے گوپامو۔ مرتبہ انتظام اللہ شہابی

[2] سیر العلما ص ۱۵۔ مرتبہ حکیم بہارالدین صدیقی گوپاموی۔

[3] تذکرہ مولانا فضل امام خیرآبادی۔ مرتبہ انتظام اللہ شہابی

[4] حیات علامہ فضل حق خیرآبادی۔ "

گذرتا تھا۔ دوست محمد خاں شریکِ درس تھے، مولانا کا یہ طریقہ تھا کہ کوئی اہلِ علم مسائلِ علمیہ کے حل کرانے کے لئے حاضر آتا تو اُس کی طرف متوجہ ہو جاتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ طلبا کے اسباق پڑھنے کے کئی کئی دن تک ناغہ رہتے۔ دوست محمد خاں نے مولوی نقیر اللہ جو نواب صاحب کے منہ لگے تھے اُن سے جا کر شکایت کی وہ نواب کے پاس گئے اور مولانا کی عدمِ توجہ کا ذکر کیا نواب سے جب ملنا ہوا تو نواب صاحب بولے مولانا طلبا کا بھی پاس رکھئے کس لیا تھا۔ فوراً دوست محمد خاں کو حکم دیا کہ مرے درس میں شریک نہ ہو، دوست محمد خاں گھبرا گئے مولانا سے قصور معاف کرانا چاہا مگر مزاج میں برافروختگی بڑھتی ہی رہی، آخرش دوست محمد خاں نے پھر مولوی نقیر اللہ سے کہا کہ نواب سے التجا کیجئے کہ مری عمر تو برباد جا رہی ہے۔ نواب صاحب نے مولانا کو بلوایا اور خود معافی مانگی جب جا کے مولانا کا غصہ فرو ہوا مگر پھر زیادہ عرصہ ٹونک میں نہیں رہے وطن خیرآباد چلے گئے۔ نواب کلب علی خاں والی رام پور نے بُلا لیا اور مولانا سے بے حد خلوص اور آرام سے پیش آیا ۱۲۸۱ھ سے ۱۳۰۲ھ تک رام پور میں مقیم رہے نواب کلب علی خاں کا دربار اہلِ علم کا مرکز بنا ہوا تھا مولانا کی مجلس علمی روز نہ جمتی، ارباب علم جمع ہوتے۔

لطیفہ ایک دن ایک بنگالی طالب علم آیا اور مولانا کی مجلس میں حاضر ہوا۔ علما اور ارباب ریاست کا مجمع، مولانا گفتگو میں مشغول، کس کی مجال جو دخل در معقولات کر سکے۔ صبح سے دوپہر ہو گئی مجلس برخاست ہوئی۔ مولانا محل سرا میں تشریف لے گئے۔ طالب علم بڑبڑاتا ہوا جب باورچی خانہ کی طرف گذرا، میاں شبراتی کھانا پکا رہے تھے۔ طالب علم کی خفگی کو بھانپ لیا۔ پوچھا میاں تم کون ہو وہ کہنے لگے ہم طالب علم ہیں مولانا کا نام سن کر آئے تھے کہ بڑے عالم ہیں۔ بولا بھائی ایسا کیا مسئلہ ہے تم اس کے لئے اتنی دور دراز کا سفر کر کے آئے ہیں اور جلدی اس قدر ہے کہ مسائل آج ہی طے ہو جائیں۔ بھائی آج آرام کرو کل آنا اور ایسے وقت آنا کہ مولانا طلبا کو درس دے رہے ہوں، اور وہ وقت صبح کا ہے۔ اور بھائی یہ تو بتاؤ وہ سوال کیا ہے ہم بھی تمہاری زبان سے سنتے۔ طالب علم بولا بھائی تم روٹی پکاتے جاؤ تم سے میں کیا علمی مسئلہ بیان کروں۔ شبراتی بولا بھائی ہم جاہل تو ٹھہرے مگر عالم کی جوتیاں سیدھی کی ہیں، علمی باتیں سُنا کرتے ہیں جو کہو گے وہ میرے لئے نئی بات نہ ہوگی، طالب علم بولے، بھائی میں اپنے شہر بنگال کے علاقہ سے یہاں تک صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ ہیولیٰ کیا ہے اور جسم کیا ہے، کتاب میں تو تفصیل پڑھی ہے مگر عملی طور سے کسی نے نہیں بتایا استادوں نے مولانا کا نام لیا کہ وہ سمجھائیں گے مگر یہاں کا یہ عالم دیکھا کہ مولانا کو دوستوں کی گفتگو سے فرصت ہی نہیں کہ ہم سے غریبوں کی طرف توجہ ہو، شبراتی بولا ذراسی بات ہے اس کے لئے اس قدر طبیعت میں برہمی پیدا کر رکھی ہے، لو بھائی اپنی مرضی سے روٹی نکال کر طالب علم سے کہا کہ لیا یہ ہیولیٰ ہے اور اس روٹی کو ٹھیکر کہا یہ جسم ہے۔ دیکھو العباد ثلثہ اس میں ہے یا نہیں طالب علم اچھل پڑا اُس نے کہا جس بزرگ کے یہاں کے نوکر چاکر علمی مسئلہ کو باتوں باتوں میں سمجھا دیتے ہیں تو آقا و ولی نعمت کا کیا عالم ہوگا اور سیدھا اپنے گھر کا راستہ لیا

مولانا رام پور سے وطن چلے آئے ۱۸۷۶ء میں کلکتہ گئے حاکم مرافعہ اور مدرسہ عالیہ کے افسر مقرر ہوئے۔ گورنمنٹ نے شمس العلما کا خطاب دیا۔ ۱۸۹۶ء میں نواب حامد علی خاں نے باصرار رام پور بُلا لیا اور خود تلمذ اختیار کیا۔

نواب حامد علی خاں مولانا کی بے حد تعظیم و تکریم کرتے تھے، آخر عمر میں مولانا کی نازک مزاجی بہت بڑھ گئی تھی مگر نواب صاحب اُستاد کی ہر بات کو سراہا کرتے تھے۔

لطیفہ[۵] مفتی خلیل احمد صدیقی انسپکٹر پولیس بھوپال جو مولوی رکن الدین نبیرہ ملا قطب الدین گوپاموی کے نواسہ[۵۲] فرماتے تھے۔ مولانا عبد الحق کو ایسا عارضہ لاحق ہو گیا تھا جس کی اصلاح و ازالہ کے لئے بگلہ کا شوربہ ہفتہ میں چند مرتبہ کھانے کے ساتھ استعمال میں آیا کرتا اس وجہ سے گھر پر مثل بطوں و مرغوں کے مولانا کے یہاں بگلے پلے رہتے تھے۔ آپ کے دوست نے تحفہ میں بٹیریں بھیجیں وہ آئیں اور کچھ روز بعد شبراتی میاں نے دو دو ایک ایک کر کے نوش جان کیں۔ مولانا کو ایک دن خیال آیا کہ بٹیریں گھر میں ہیں اس کا پلاؤ پکایا جائے۔ میاں شبراتی بلائے گئے۔ اُن سے کہا کہ آج بٹیروں کا پلاؤ پکانا وہ کہنے لگے میاں اُن بٹیروں کو تو آپ کے بگلے ایک ایک کر کے نگل گئے، اُنھوں نے سن کر کہا اچھا بگلہ کھا گئے۔ اب جو آتا مولانا

---

[۵] سالنامہ مشور ونبرگرہ [۵۲] ماثر الکرام مولانا آزاد بلگرامی

اس واقعہ کو سناتے، مولوی اسد اسحق آپ کے خلف الرشید تھے وہ صبح کا سلام کرنے باپ کے سامنے آئے تو اُن سے بھی کہا میاں اسد ہمارے بگلے سب بٹیریں کھا گئے، شبراتی کہتا ہے مولوی صاحب نوعمر تیز طبیعت تھے کہنے لگے ابا جان شبراتی نے خود بٹیروں کو چٹ کیا ہے اور بگلوں کے سر تھوپتا ہے۔ کہیں ابا بگلے بھی بٹیریں نگل سکیں گے۔ مولانا نے ترش رو ہو کر اُن سے کہا "دُور ہو بے ادب ہمارے سامنے چڑ بڑ کرتا ہے گستاخ کہیں کا" یہ بسورتے ہوئے گھر میں گئے، دو چار دن تو یہ رہا صبح سلام کرنے آتے تو مولانا اُن سے منہ پھیر لیتے جب مولانا کا غصہ ٹھنڈا پڑا، مولوی اسد اسحق نے دست بستہ باپ سے معافی مانگی تو اُن سے مولانا بولے میاں اسد یہ ڈاڑھی دُھوپ میں تو سفید ہوئی نہیں، عمر کچھ تو گذری ہے کیا میں نہ اتنا ہوں اتنا بھی نہیں جانتا کہ بٹیریں کون کھا گیا، مگر شبراتی ابا میاں کا چھوکرا ہے، پُرانا خدمت گذار ہے اسکو جھوٹا کہنا اپنے طور و طریق کے تو خلاف ہے، یہ شہرت جو ہمہ و شما کے سامنے کی گئی وہ خود خجل نظر آتا ہے، آئندہ اسکو تنبیہ بھی ہو گئی اور لطیفہ کا لطیفہ رہا میاں اپنے آدمی کی عزت کی بھی پاسداری رکھا کرتے ہیں، دیکھتے ہو میاں شبراتی کیساتھ کیا برتاؤ کیا کرتا ہوں۔ آپ آئندہ سے ایسی کوئی بات منہ سے بے سوچے سمجھے نہ نکالنا جو بڑوں کے لئے حرف گیری اور توہین کی حد تک ہو۔

واقعہ سید محمد فاروق متخلص تیز نبیرہ مولانا ابو الواحد کرمانی خیرآبادی[۱] یہ واقعہ بیان کرتے تھے کہ شمس العلما خوش خوراک و خوش لباس امتیازی درجہ تک تھے، جس کی وجہ سے جو آمدنی تھی وہ عموماً ناکافی رہا کرتی۔ اگرہ سے تحصیل علم کے لئے نگلہ اروی کے زمیندار کے صاحبزادہ (حافظ محمد محسن شہید) خیرآباد مولانا کے پاس پہونچے حافظ صاحب موقع بے موقع فراخدلی سے استاد پر روپیہ صرف کیا کرتے۔ ایک عرصہ سے دستور چلا آرہا تھا کہ لکھنؤ کے بعض دوکاندار نیا مال آیا اور مولانا کے لئے خیرآباد پہونچے، اکثر دوکانداران لکھنؤ میں آپ کی دریادلی کی شہرت تھی۔ ایک پارچہ فروش جس کے یہاں نئی نئی اقسام کی الوانیں کشمیر سے آئی ہوئی تھیں وہ تعلقداران لکھنؤ کے دکھانے سے پہلے مولانا پاس لے گئے، مولانا درسگاہ میں رونق افروز تھے، پارچہ فروش نے شبراتی کی معرفت اطلاع کرائی، اجازت ملتے ہی حاضر آیا، ہر قسم کے پارچوں کیساتھ الوانیں پیش کیں اُن میں سے ایک الوان مولانا کی پسند خاطر ہوئی آپ نے پوچھا لالہ جی اس کے دام کیا ہیں، اُنہوں نے کہا دو سو کی ہے مگر آپ کے لئے صرف سوا سو کی ہے آپ نے خوش ہو کر کہا اچھا بھئی ہمارے لئے یہ رعایت ہے تو ہم لئے لیتے ہیں قلمدان طلب کیا، کنجیوں کا گچھا نکالا صندوقچہ کھولا دیکھتے ہیں کہ پچاس روپیہ مع دو اشرفیوں کے پس انداز ہیں، کہا بھائی کل آنا اس مال کو دوسرے کو نہ دیدینا ہمارے لئے ہی رکھنا، حافظ محمد محسن سبق پڑھ رہے تھے اور یہ سب کیفیت آنکھوں دیکھتے گذری، ادھر یہ محسوس بھی ہو رہا تھا کہ استاد کی نظر الوان پر ہے، سبق سے فارغ ہو کر سرائے پہونچے اور پارچہ فروش سے وہ الوان ۶۰ روپیہ میں طے کر کے خرید لائے اور شام کو جب سبق لینے حاضر ہوئے الوان استاد کے سامنے پیش کی کہ حضرت جو الوان پسند خاطر ہوئی تھی سوا سو کے بجائے میں اپنے حُسن تدبیر سے ۶۰ روپیہ میں خرید کر لایا ہوں۔ حافظ صاحب کو خیال یہ تھا کہ مولانا میری کفایت شعاری سے خوش ہوں گے، شاباشی دینگے، مگر مولانا نے الوان کو اُلٹا پلٹا اور کہا یہ وہ الوان ہی نہیں ہے اور وہ پارچہ فروش میری پسند چیز کو کبھی بھی زیادہ یا کم داموں میں بیچ ہی نہیں سکتا، یہ لیجاؤ اور اپنے کام میں لاؤ، حافظ صاحب سٹ پٹائے، استاد کی خوشنودی مزاج کے لئے یہ کیا تھا اور اُلٹا اثر یہ ہوا، مولانا اُن سے اس حرکت پر کبیدہ خاطر ہو گئے، درس سے اُٹھکر شبراتی خادم کے پاس آئے اور سب حال کہا اور بے حد غمگین ہو گئے۔ شبراتی بولا مجھے کیا دوگے جو میں پسند کرا دوں، حافظ صاحب نے اُسی وقت پانچ روپیہ نذر کئے، دوسرے دن پارچہ فروش آیا، شبراتی نے اندر آنے سے روکا اور کہا مولانا کی طبیعت ناساز ہے اور وہ الوان جو خریدنا چاہتے تھے وہ تو تم سے مولانا کے شاگرد کل ہی کم داموں میں خرید لائے اور مولانا کو دیدی بھی گئی، یہ سُن کر پارچہ فروش نے لکھنؤ کا راستہ لیا۔ ادھر اسی الوان کو لیکر مولانا پاس شبراتی پہونچے۔ حضور حافظ صاحب نے دھوکا کھایا تھا۔ فی الحقیقت جو الوان آپنے پسند کی تھی وہ تو آپ کے لئے اُس نے رکھ چھوڑی تھی، اس سے ملتی جلتی

---

[۱] آمدنامہ مولانا فضل امام خیرآبادی۔

حافظ صاحب کے سر منڈھی اور اُن سے کہا کہ مولانا کی یہ پسند کردہ ہے۔ میں نے وہ الوان پھروائی اور آپ کے پسند کی الوان نکلوائی، حافظ صاحب نے پورے دام ادا کر دیے میں اور حافظ صاحب لیکر حاضر خدمت ہوئے اور پارچہ فروش لکھنؤ چلا گیا، مولانا نے اس کو دیکھا بھالا اور کہا کہ بھائی یہ ہی تو میں کہتا تھا کہ وہ کیسے اتنے کم داموں میں دے دیگا۔ میاں محسن یہ تو دیکھو مجھ گدائے منکسر بوریہ نشین معلم پیشہ کی خاطر دوکاندار لکھنؤ سے بڑے بڑے تعلقداروں کے سامنے مال پیش کرنے سے پہلے آتے ہیں کوئی بات تو ہے میاں میں نادان نہیں ہوں یہ اپنی بات ہے جو دام کہے وہ منظور کئے اسی بات کی تو یہ بات ہے کہ مجھ بینوا کے پاس دوکاندار سالانہ آتے ہیں، اپنی بساط بھر اُن کی دلجوئی کر دیا کرتا ہوں۔ دو چار پیسے زیادہ جاتے ہیں مگر یہ دُور دُور چرچا ہے کہ ایک معلم بھی اس آن کو لے بیٹھا ہے جو اس سے دام مانگتا ہے پورے پاتا ہے۔ یہ بھی علم کا وقار ہے۔ ہمارے پیشوائے اعظم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ اور ہمارے مقتدا پیر دستگیر محی الدین عبد القادر جیلانی بھی لباس فاخرہ ہی زیب تن کیا کرتے تھے، اس لباس کے نیچے ٹاٹ کا کرتا ہوتا تھا تو دیکھو اُن کا غلام بھی کرتے کے نیچے موٹے گاڑھے کی نیم آستین پہنے ہوئے ہے، لباس پر تکلف تو علم کا وقار اور عظمت دکھانے کے لئے ہے ورنہ اپنی خلوت گاہ میں میاں گاڑھے کا تہبند اور نیم آستین ہی پہنے رہتا ہوں مگر قرآن اور حدیث اور معقول کے درس کے وقت لباس فاخرہ ہی پہنکر بیٹھتا ہوں جاؤ سبق یاد کرو یہ کہکر محل سرا میں تشریف لے گئے۔

بول چال

گفتگو بہت سلیس تھی اور ٹھیٹ اردو بولتے تھے، دلی کی ٹکسالی زبان آپ کی تھی آپ کے دادا مولانا فضل امام دلی میں صدر الصدور رہے، ان کی عمر کا بڑا حصہ وہیں گذرا، باپ مولانا فضل حق دلی میں پیدا ہوئے، دلی ہی میں رہے، آخر میں لکھنؤ چلے آئے۔ خود کی ابتدائی عمر دلی والوں میں بسر ہوئی۔ مولوی صدر الدین خاں آزردہ۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب، حکیم مومن خاں مومن سے ارباب علم و فضل کی بچپن میں صحبت اُٹھائی۔ دلی کے شہزادوں کے ساتھ بچپن میں کھیلے، یہی وجہ تھی کہ اردوئے معلٰی کی زبان بولتے تھے۔

مفتی فخر الحسن نبیرہ حاجی صفت اللہ محدث خیر آبادی کہتے تھے کہ مولانا کی گفتگو میں کبھی کوئی غیر مانوس لفظ نہیں آنے پاتا، عربی یا فارسی کا کوئی لفظ استعمال نہیں کرتے تھے، سادی بول چال تھی۔

مفتی اکرام اللہ شہابی گوپاموی قاضی صدر الدین ہرگامی کے پرنواسہ تھے اور مولانا عبد الحق پر پوتے مولانا مفتی صاحب سے عمر میں بڑے تھے الہ آباد میں مفتی صاحب مختاری کا شغل رکھتے تھے، مولانا بھی الہ آباد آئے انکے یہاں مقیم ہوئے۔ مفتی صاحب نے اثنائے صحبت میں پوچھا۔ بھیا دنیا میں حکیم کتنے گذرے ہیں جنکو فی الحقیقت حکیم کہا جا سکتا ہے۔ مولانا کہنے لگے میاں تبن (یہ مفتی صاحب کی عرفیت تھی) ساڑھے تین حکیم صرف اب تک عالم میں پیدا ہوئے۔ ایک معلم اوّل (ارسطو) معلم ثانی (ابو نصر فارابی) تیسرے والد ماجد (مولانا فضل حق) نصف بندہ۔

خُلق

مولانا خلیق متواضع بزرگ تھے، مولوی اخلاق الحسن خیر آبادی بیان کرتے تھے کہ مولانا کے اخلاق کی یہ ادنیٰ سی بات تھی کہ کوئی شخص صرف سلام کے لئے جاتا تو کم از کم مولانا کے پاس سے گھنٹہ دو گھنٹہ بعد آتا۔ آپ کے حسن مذاق اور شگفتگی مزاج کی شہرت عام تھی۔ ہنس مکھ تھے، مولوی اولاد حسین صاحب (جن کا قیام زیادہ تر جے پور میں رہتا تھا) کہتے تھے کہ مولانا میں انکسار بے حد تھا چھوٹے سے چھوٹے کو بھائی کہہ کر گفتگو کرتے اگر کسی سے گفتگو ہو رہی ہے تا وقتیکہ وہ خود مولانا کے پاس سے نہ جائے خود اس کو رخصت نہ کرتے تھے کہ کہیں اس کا دل میلا نہ ہو۔

حلیہ

کشیدہ قامت، گول چہرہ، ڈاڑھی بھری ہوئی۔ خوبصورت شان و شکوہ کے بزرگ تھے۔ لباس میں انگرکھا بہت پسند تھا۔ عرض کے پائینچے کا پاجامہ پہنتے۔ نیچی آستین کا کرتہ اور قبہ نما ٹوپی پہنتے گاہے گاہے عبا بھی پہنا کرتے تھے۔ عالمانہ وقار چہرہ سے عیاں رہتا تھا عمامہ بھی باندھتے تھے، پرانی دلی کی وضع کے پابند تھے۔

وفات

رام پور میں مولانا بیمار ہوئے وطن چلے آئے۔ ۲۳ شوال ۱۳۱۶ھ کو انتقال ہوا۔

حضرت شیخ سعد قدس سرہ کے درگاہ میں مسجد کے شمالی جانب دس قدم پر دفن ہوئے افسوس ہے کہ مزار پر کتبہ بھی نصب نہیں ہے۔

تصانیف | الجواہر العالیہ فی الحکمۃ المتعالیہ۔ شرح ہدایت الحکمت شرح المرقات للعبد الحق خیرآبادی۔ شرح عقائد نسفی زبدۃ الحکمت (اُردو) وغیرہ

تلامذہ | مولوی حکیم برکات احمد طبیب دربار ٹونک۔ مولوی فضل حق صدر مدرس مدرسۂ عالیہ رام پور۔ مولوی علی احمد خاں اسیر بدایونی پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ آپ کے تلامذہ سے ہیں۔

اردو میں فلسفہ | مولانا پہلے فرد ہیں جنھوں نے اُردو میں فلسفہ پر مستقل کتاب لکھی، ٹونک کے قیام کے زمانہ میں یہ رسالہ لکھا ہے۔ زبدۃ الحکمت نام رکھا؛ فضل المطابع دہلی میں ۱۳۳۲ھ میں طبع ہوا فلسفہ کے دقیق مسائل کو بہت ہی سہل صورت میں پیش کیا ہے۔ منطقیات و طبیعیات و الٰہیات پر یہ کتاب مشتمل ہے، عبارت میں دقت نہیں ہے مصطلحات قدیم قائم رکھے ہیں۔ زبان صاف اور شستہ ہے۔

(آئندہ اشاعت میں علامہ عبدالحق کی کتاب فلسفہ زبدۃ الحکمت سے کچھ اقتباس پیش کیا جائے گا۔)

(مولانا) **انتظام اللہ شہابی** اکبرآبادی

عشرتِ انجام

(غزل)

شگفتہ کلی دل کی مرجھا چکی ہے
بہارِ جوانی کو موت آچکی ہے

نقاب اُنکے چہرہ سے سرکا چکی ہے
نظر کو حقیقت نظر آچکی ہے

وہ اب ہم سے نظریں ملائیں تو کیسے
کہ پہلی نظر اُن کی شرما چکی ہے

تصوّر کی رنگیں طرازی کے صدقے
انھیں گل بداماں یہاں لا چکی ہے

یہ نالے ہی دھوکے کے ماری نہیں ہیں
دُعا بھی فریب اثر کھا چکی ہے

شبِ غم کے جاگے ہوئے اب تو سو جا
نثارؔ و تکی آنکھوں میں نیند آچکی ہے

نثارؔ اپنی ہے شاعری جاودانی
محبت سے یہ زندگی پا چکی ہے

نثار اٹاوی

ذوقِ مسلسل

(غزل)

اُن کی طرف نگاہ کئے جا رہا ہوں میں
پاکیزہ اک گناہ کئے جا رہا ہوں میں

اُس کی طرف بھی دیکھ رہا ہوں میں غور سے
دل پر بھی اک نگاہ کئے جا رہا ہوں میں

چُھپ چُھپ کے آسمان کی بدظن نگاہ سے
دلیس تمہارے راہ کئے جا رہا ہوں میں

میں ہوں وفا شعار وہ ہے خوگرِ جفا
بنتی نہیں نباہ کئے جا رہا ہوں میں

گو اُن کے آنے کا نہیں مجھ کو یقین مگر
آنکھوں کو فرشِ راہ کئے جا رہا ہوں میں

دُنیا کی اُلجھنوں سے تو فرصت نہیں مگر
یاد اُس کی گاہ گاہ کئے جا رہا ہوں میں

ہر ذرّہ کائنات کا ہے رہبرِ جمال
جلوؤں کو شمعِ راہ کئے جا رہا ہوں میں

شاید اسی کا نام محبت ہے اے شفیقؔ
دن رات آہ آہ کئے جا رہا ہوں میں

شفیق کوٹی

تیتری

(نظم)

پروانۂ حریمِ درخشانِ رنگ و بُو — نیرنگِ صبح زارِ گلستاں کہیں جسے
دیباچۂ سرور ہے سرنامۂ طرب — افسانۂ بہار کا عنواں کہیں جسے
اک نغمہ ہی حکایتِ فردوس برزباں — گل در نظر بہار بداماں کہیں جسے
شاید یہی مغنیۂ نو بہار ہے — فطرت کا اک سازِ غزلخواں کہیں جسے
پھر آئی مسکراتی ہوئی جانبِ چمن — جلووں کی ایک صبحِ درخشاں کہیں جسے
رنگوں کے ارتعاش میں گویا ہے موجزن — رعنائی شباب کا طوفاں کہیں جسے
موجِ ہوا سے ٹھوکریں کھاتی ہے بار بار — رنگین ایک موجِ پریشاں کہیں جسے
پیغمبرِ رسالتِ عرفانِ رنگ و بُو — اک پیکرِ تجلیٔ عریاں کہیں جسے
دوشِ فضا پہ ساقیۂ کیف جس کا نام — خاکِ چمن پہ ذرۂ پرّاں کہیں جسے
یک قطرۂ چکیدۂ موجِ شرابِ گل — بہتی ہوئی نشاطِ فراواں کہیں جسے
دیتی ہے گوشِ گل میں اذانِ طلوعِ کیف — صبحِ چمن کی طلعتِ رقصاں کہیں جسے
شاید یہی وہ آئینۂ رضو طراز ہے — قدرت کی اک حقیقتِ تاباں کہیں جسے

اک حسن ہے کہ رونقِ ہر انجمن بھی ہے
تزئینِ دشت بھی ہے فروغِ چمن بھی ہے

(صاحبزادہ) شفق ٹونکی

عرفانِ حیات

زمانے کی کچھ ٹھوکریں اور کھالوں — ذرا بختِ خوابیدہ اپنا جگالوں
ذرا اور بھی تیز اس درد کر دوں — خلش ہائے وحشت کی میں بھی مٹالوں
کبھی یہ تقاضا ہے دل کی تڑپ کا — کہ حلقے ترے دام کے توڑ ڈالوں
کبھی چاہتی ہوں کہ سو جاؤں ایسی — تری گود کو اپنا مرقد بنا لوں
ترا حسن ہٹ جائے گر درمیاں سے — تو دردِ محبت کی تقدیر پالوں
خدا کے لئے اور اتنا تو ٹھہرو — کہ میں عشق کا آخری گیت گا لوں

مسرت کو اے نجمہ فرصت ہی اتنی
کہ چاہوں تو دو چار آنسو بہالوں

نجمہ تصدق بی۔اے۔بی۔ٹی

شکست و ریخت

انسان کی ذہنی زندگی بھی کس قدر پُرکیف اور دلچسپ ہوتی ہے، ہر وقت نئے جذبات نیا عالم، نئے خیالات اور نئی کیفیات۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر انسان عملی زندگی سے آنکھ بند کرکے دُنیائے تصور کا ہی ہو رہے تو ایک نہ ایک دن اکملیت کے درجے تک پہونچ جائے۔ کون سی بات ہے جو انسان کو ذہنی طور پر محسوس نہیں ہوتی کون سا جذبہ ہے جو انسان کے خیال اور دماغ سے پوشیدہ رہتا ہے ؎

انگڑائی سے رہی ہے بہارِ تصورات　　جیسے رواں شمیم کی موجیں ہوں باغ میں

اک نغمہ آشنا ہے نیا میرے کان سے
جو سُن رہا ہوں کہہ نہیں سکتا زبان سے

یوں تو خیالات کا سمندر بے تھاہ ہے جس کے ساحل کا دُور دُور پتہ نہیں ملتا۔ لیکن میں ذہنی محسوسات کے حسبِ ذیل موضوعات کو ضابطہ تحریر میں لانا چاہتا ہوں۔

(۱) ذہنی قوتوں کا بتدریج ارتقا۔
(۲) ذہنی انفرادیت کا وجود اور اس کا عمل۔
(۳) انتہائی سرخوشی اور اُس کا ردِ عمل۔

شعوری کیفیات کے بیدار ہونے کے ساتھ ہی انسان کا ذہن اور دماغ اپنا عمل شروع کر دیتا ہے، اوائل عمر میں انسان اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں چند نظریات مرتب کرتا ہے یہ نظریات اس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہوتے ہیں۔ اور انسان انھیں نظریات کے اصول پر دنیا کے معاملات کو ترتیب دینا چاہتا ہے، جوں جوں عمر گزرتی جاتی ہے انسان کا خیال پختہ اور نظر پختہ تر ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ ایک دن دنیا اپنے حقیقی پیرہن میں اس کے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہے، اگر اس انسان کے نظریات اور اصول سچائی اور نیکی پر مبنی ہیں تو دُنیا ان کو تسلیم کر لینے پر مجبور ہو جاتی ہے، ورنہ انسان کی نگاہوں کے سامنے ہی اس کے نظریات کا ردِ عمل شروع ہو جاتا ہے۔

نظریات متعین کرنا انسان کی زندگی کا دلچسپ ترین مشغلہ ہے غالباً ہر انسان کو اس منزل سے گزرنا پڑتا ہے اور ہر شخص اپنے اس عہد کو اپنی زندگی کا زرّیں ترین دَور سمجھتا ہے۔ دُنیا انسان کی نگاہ کے سامنے تصویر کے کئی رُخ پیش کرتی ہے۔ نئی نئی باتیں اور نئے نئے خیالات انسان کے دماغ کو اپنی آماج گاہ بناتے رہتے ہیں۔ انسان ہر بات کو اپنے علم اور اپنے ادراک کی کسوٹی پر پرکھتا ہے، اور بالآخر ایک ایسا نظریہ مرتب کرتا ہے جو اُس کی زندگی میں ایک اہم حیثیت کا حامل ہو جاتا ہے۔

میں جب اپنی گزشتہ زندگی کے دور کی ڈائری پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اپنی گذشتہ زندگی کی اہمیت اور وقعت محسوس ہوتی ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں پھر اسی فضا میں سانس لینے لگوں جس فضا میں میرے نظریات مرتب اور متعین ہوئے تھے۔ اپنی زندگی کے اس دَور میں جو تعلیمی ماحول میں بسر ہوئی مجھے دُنیا کی ہر شے کو دیکھنے کا موقعہ ملا اور اپنی سمجھ کے مطابق میں نے ہر چیز کے متعلق ایک نظریہ اور ایک خیال قائم کیا۔ میری ڈائری میں میری عملی زندگی کے واقعات درج نہیں ہیں بلکہ دُنیائے تصوّر کی سیر ہے۔ اپنی زندگی کے موجودہ دَور میں، مَیں یہ نہیں بتا سکتا کہ طلبی زندگی کے دوران میں میری روزمرّہ زندگی کیا تھی، میں کس سے ملا اور میں نے کیا کیا۔ ہاں میں یہ بتا سکتا ہوں کہ میں نے کیا سوچا اور کیا خیال قائم کیا، میرے خیال میں حقیقی زندگی یہی تھی اور اس زندگی کو ختم کرنے کے بعد آج کل مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری حقیقی زندگی ختم ہو چکی ہے اور دُنیائے تصوّر میں میری ضرورت بھی نہیں ہی، اس لئے کہ اب میں کوئی نیا نظریہ قائم کر سکتا ہوں اور نہ کوئی نیا خیال میرے ذہن میں وارد ہوتا ہے۔

مجھے اپنی زندگی میں مختلف کیفیات سے ہمکنار ہونا پڑا ہے۔ مجھے وہ عالم بھی اچھی طرح یاد ہے جب یہ عالم اور دُنیا کے اُلجھے ہوئے معاملات میری

نگاہ میں کوئی وقعت نہ رکھتے تھے۔ زندگی کا تصور میرے لیے ایک ایسا تصور تھا جسے میں کسی قیمت پر بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ میں زندگی سے کھیلتا اور زندگی مجھے دل پسند اور دل خوش کن کھلونے عطا کرتی۔ میں اپنے قلب اور اپنی روح میں یک گونہ طمانیت اور سکون محسوس کرتا اور اپنے ان لمحاتِ زرّیں پر فخر کیا کرتا جب مجھے یہ کیفیات عطا ہوتیں تھیں

میرے نظریات میری انفرادیت کا انتہائے کمال تھے اور میں اس منزل پر پہونچ گیا تھا جہاں ابدیت اور سرمستی میرا استقبال کرنے کے لیے بیتاب تھیں۔ میں ان حالات کا حامل تھا اور دنیا کے تمام انسانوں کو اکملیت کے درجے تک پہونچا دینے کا مدعی۔ میرے نزدیک انسان کی زندگی کا صرف ایک مقصد تھا اور وہ تھا انفرادیت کی تعمیر، شخصیت کا عروج اور خودی کی انتہا۔

قاعدہ ہے کہ غور و فکر کی زندگی انسان میں ایک ایسی انفرادیت کا احساس پیدا کر دیتی ہے جو انسان کے جسمانی اور مادی وجود سے بالکل الگ ہو کر خود حاصل کرتی ہے اور اپنے لیے ایک ایسی فضا تعمیر کر لیتی ہے جہاں دنیا کی مشکلات اور الجھنیں قدم نہیں جما سکتیں

یہ انفرادیت یا دوسرے لفظوں میں یہ ہستی رفتہ رفتہ پروان چڑھتی ہے اور بالآخر اس قدر قوت حاصل کر لیتی ہے جو اُس کو جسمانی اور مادی وجود پر غالب کر دیتی ہے، انسان کام کرتا ہے اور یہ انفرادیت اُس کی رہنمائی کرتی ہے۔ انسان نیکی اور بدی میں امتیاز کرنا چاہتا ہے اور یہ وجود شمع ہدایت ثابت ہوتا ہے، اگر انسان غلط راہ چلتا ہے تو یہ ہستی انسان کے ارادوں اور اُس کی ذہنیت پر خندہ زن ہوتی ہے

میری ذہنی انفرادیت نے مجھ پر اور میری حرکات و سکنات پر اس قدر غلبہ حاصل کر لیا تھا کہ مجھے اپنے وجود سے ڈر محسوس ہونے لگا۔ میری غلط کاریوں اور میری لغزشوں پر میری ذہنی انفرادیت سختی سے تنقید کرتی اور میں اپنے آپ کو بالکل بے حس و حرکت پاتا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا کہ عملی زندگی کی اُلجھنیں اور دشواریاں بے حقیقت نظر آتیں۔ میں اپنے مسائل کو خاطر میں ہی نہ لاتا اس لیے کہ ذہنی طور پر جس نوعیت کی زندگی میں بسر کر رہا تھا، میری عملی مشکلات وہاں تک پہونچ ہی نہ سکتی تھیں۔

انسان کے لیے مشکل ترین دور اُس کی ذہنی زندگی اور جسمانی زندگی کا تصادم ہے۔ یہ ایک ایسا نازک دور ہے جس کی اہمیت کا اندازہ کرنا ایک حد تک ناممکن ہے، یہاں پہونچکر کھوٹے اور کھرے کی تمیز ہوتی ہے اور انسان اپنے لیے ایک ایسی راہ متعین کر لیتا ہے جو اُس کی زندگی کا نصب العین بن کر اس کے لیے میرِ کارواں ثابت ہوتی ہے۔

اس تصادم میں کامیاب ہونا انسان کی زندگی کا سب سے بڑا اور سب سے اہم مسلہ ہے۔

اِن دشواریوں سے ہر انسان کو اپنی زندگی میں دو چار ہونا پڑتا ہے اور ہمارے مشاہدے میں روزانہ ایسے سانحے آسکتے ہیں جو لغزش زدہ انسانوں کی زندگی کو قنوطیت تک پہونچانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جہاں چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی ہوتی ہے اور روشنی کا نام بھی نہیں ہوتا۔ نہ معلوم کتنے انسان ذرا سی بھول پر اس کشمکش کا شکار ہو گئے، نہ معلوم کتنی آرزوئیں پامال اور کتنے ارادے مجروح ہو گئے۔ تاریخ کو صرف وہی واقعات یاد ہیں جو عالم شہود میں وقوع پذیر ہوئے۔ کاش انسان کی ذہنی کیفیات کی روداد بھی منصۂ شہود پر آجاتی اور انسان فطرت کو دکھا سکتا کہ کتنے جوہر قابل اس کی بے رحمی کا شکار ہو گئے۔ کتنے انسان تخیل کی دنیا تعمیر کرتے ہوئے ظاہری مشکلات پر عبور نہ کر سکے اور گمنامی کے تاریک غار میں ڈھکیل دیے گئے کاش کوئی فطرت کو آئینہ دکھا سکتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ شہرت کے بلند مینار پر فائض ہونے کے بعد انسان انھیں مشکلات کا شکار ہو کر گمنامی اور تاریکی کے عمیق سمندر میں غرق بھی ہو جاتا ہے اور دنیا اپنی ہماہمی میں اس انسان کے کارناموں کی یاد اپنے دل سے فراموش کر دیتی ہے، کیا عروج کے بعد زوال اسی کو کہتے ہیں، کیا دنیا کا یہی قاعدہ ہے اور کیا دُنیا میں انسان اسی غرض سے پیدا ہوا ہے کہ ایک عمارت تعمیر کرنے میں اپنی عمر صرف کر دے اور زندگی کے آخری دور میں اس کو محسوس ہو کہ جو کچھ اُس نے اب تک کیا وہ سب بیکار اور فضول تھا اور دُنیا میں اس کے لئے کہیں بھی گنجائش نہیں ہے!

کیا یہی انسانیت اور کیا یہی زندگی ہے؟ —— زندگی!!

فرض کیجئے ایک معمار انتہائی محنت اور مشقت سے ایک محل تعمیر کرتا ہے

عمارت مکمل ہو جانے کے بعد معمار کے خیالات کا عکس اور مجسمہ بن جاتی ہے جب ہی معمار اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ سکتا ہے۔ اب خیال فرمائیے کہ عمارت کی تکمیل کے بعد اس سے کہا جائے کہ تم نے اب تک جو محنت و مشقت کی وہ سب اکارت گئی۔ تمہارے اصول غلط تھے اور تمہارا طریقہ کار صحیح نہ تھا۔ جس بنیاد پر تم نے عمارت کھڑی کی وہ سرتاپا لغو اور بے معنی تھا تو اس وقت اس معمار کے جذبات کی کیا کیفیت ہوگی۔

ہماری دنیا کا یہی اصول ہے اور ہماری زندگی اسی اصول کے شکنجے میں قطر بند ہے، ہم سے کہا جاتا ہے کہ تم ایک خوشنما باغ سجاؤ، اس میں رنگا رنگ پھول اور مختلف نوعیت کے پودے لگاؤ جب ہم دل جمعی اور سکونِ قلب کے ساتھ اپنے کام کی تکمیل کر چکتے ہیں، خزاں کا بے رحم ہاتھ پھولوں اور پودوں پر دراز کر دیا جاتا ہے۔ اور ہمیں مجبور کیا جاتا ہے کہ ہم اپنی نگاہوں کے سامنے یہ سب کچھ دیکھیں۔ برداشت کریں اور اپنی زبان پر ایک حرف بھی شکایت کا نہ لائیں، نہ ہماری دنیا اور واہ رے فطرت کے اصول!

جب ایک انسان بے روک ٹوک آگے بڑھا چلا جا رہا ہو اور اسی عالم میں کوئی پتھر اس کی راہ میں حائل ہو جائے اور سنگِ راہ بن کر اس کا راستہ روک دے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کے جذبات اور احساسات میں کس قدر بے پناہ انقلاب آ جائیگا، بڑھتے ہوئے طوفانوں کو آگے بڑھنے سے روک دینے کا مقصد یہ ہے کہ آپ اس طوفان کی ہلاکت آفرینیوں کو ہوا دینا چاہتے ہیں اور اس قدر ستم قاتل بنا دینا چاہتے ہیں کہ اس سے مس کرنے والی ہر چیز فنا کے خوفناک اژدھے کی غذا بن کر رہ جائے، اسے کہتے ہیں تمہیدِ انقلاب اور نظامِ زندگی بدل دینے کے اہتمام کی تدابیر۔

یہ میری ذہنی کیفیات کی روداد ہے اور میں خرمنِ ہستی کو بھڑکانے والے بلند شعلے فضا میں دیکھ رہا ہوں

محمد صادق ضیا

بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل

کیفِ خیال

(غزل)

کرم تیرا جو مجھ پر ساقیٔ میخانہ ہو جاتا
"جگر بنتا صراحی اور دل پیمانہ ہو جاتا"

اگر تیرا تصرف جلوۂ جانانہ ہو جاتا
ترے دیوانے کو جو دیکھتا دیوانہ ہو جاتا

میں جھکتا کسی عنوان سے اپنے مقدر کو
جبیں سائی کو گر حاصل درِ جانانہ ہو جاتا

مری اجڑے ہوئی دل میں کرم فرما جو تم ہوتے
تو فردوسِ بریں میرا دلِ ویرانہ ہو جاتا

نقاب افگن تم آئے بزم میں اچھا کیا تم نے
یہاں ورنہ تمہیں جو دیکھتا پروانہ ہو جاتا

خدا کا گھر تھا دل لیکن بتوں کی بھی سمائی تھی
ستم ہوتا اگر یہ کعبہ پھر بتخانہ ہو جاتا

چراغِ داغِ عشقِ مصطفٰے کے نور سے روشن
نہ کیوں مستان میری دل کا ظلمت خانہ ہو جاتا

خانصاحب امام الدین خاں مستان
دربار باجود (کاٹھیاواڑ)

تیری یاد

سکوں کا کسی طرح حامل نہیں ہوں
میں یک لمحہ عشرت کے قابل نہیں ہوں
ہوا خواہِ دنیائے باطل نہیں ہوں
میں شایانِ رومانِ محفل نہیں ہوں
مگر یاد سے تیری غافل نہیں ہوں

بُرائی بھلائی کو بھُولا ہوا ہوں
غمِ آشنائی کو بھُولا ہوا ہوں
وصالِ جدائی کو بھُولا ہوا ہوں
میں ساری خدائی کو بھولا ہوا ہوں
مگر یاد سے تیری غافل نہیں ہوں

مری طرح ناشاد کوئی نہیں ہے
گرانبارِ فریاد کوئی نہیں ہے
مرے دل میں آباد کوئی نہیں ہے
مجھے مطلقاً یاد کوئی نہیں ہے
مگر یاد سے تیری غافل نہیں ہوں

مرے دل کے جذبے ستائے ہوئے ہیں
مرے اشک طوفاں اُٹھائے ہوئے ہیں
مصیبت کے دن مجھ پر آئے ہوئے ہیں
مرے دل پہ آلام چھائے ہوئے ہیں
مگر یاد سے تیری غافل نہیں ہوں

بنایا محبت نے ناشاد مجھ کو
ہے صبر آزما تیری بیداد مجھ کو
کیا ہے تغافل نے برباد مجھ کو
تو بھُولے سے کرتا نہیں یاد مجھ کو
مگر یاد سے تیری غافل نہیں ہوں

از نیر زیدی

عشق و ہوس

تری امانتِ غم کا تو حق ادا کروں
خدا کرے شبِ فرقت ابھی دراز رہے

میری زلیخا! ـــــ سلامت رہو!

تمہارے خطوط ملے ـــــ اتنی تعداد میں کہ مجھے یاد بھی نہیں میں نے جواب دینا چاہا تھا مگر نہ دے سکی، اب بھی شاید نہ دیتی اگر تمہاری شادی کا معاملہ درپیش نہ ہوتا، تم نے لکھا ہے کہ "میری شادی اُس سے ہو رہی ہے جس سے مجھے محبت ہے"۔ آہ زلیخا تم عشق کی توہین کر رہی ہو! آخر تم نے محبت کا مطلب کیا سمجھا ہے، کیا یہی کہ "دو نوجوان مرد و عورت ایک دوسرے کو کہیں دیکھتے ہیں، کچھ دن بیقرار رہتے ہیں پھر شادی کر کے چھ سات بچوں کے والدین بن جاتے ہیں"! ابھی زلیخا تم نے ابھی "عشق و ہوس" کو سمجھا ہی نہیں! جو محبت کامیابی کے لئے شادی کی محتاج ہے وہ ہوس ہے زلیخا! محبت نہیں ہے، شادی تو ایک کاروبار ہے (کم از کم ہندوستان میں) جیسی قیمت ویسی چیز، امیروں کی شادی امیروں میں اور غریبوں کی غریبوں میں! اگر عورت کو شوہر ہم مذاق مل گیا تو کچھ دن مسرت سے کٹ جاتے ہیں۔ عورت شوہر کی ہر خدمت کر کے اُسے اپنا بنانا چاہتی ہے اس طرح وہ خود بھی شوہر کی ہو جاتی ہے مگر زلیخا یہ امیدیں غلط ہیں، شوہر صرف اس لئے ہوتا ہے کہ ایک عورت کو نان و نفقہ (جو اس زمانے کے لئے بیکار ہے) میں خریدے اُس کی آزادی - جوانی - رنگینی - صحت - علم - حُسن سب کچھ چھین لے تا دمِ زیست طرح طرح کے تشدد سے کام لے۔ شادی اک سودا ہے اس میں ہمسری کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اس میں دو ایسی ہستیاں تلاش کی جاتی ہیں جو نسلِ انسانی میں اضافہ کریں! میرے خیال سے تو شادی کا منشا یہی ہے

رہ گیا عشق! تو اس کے متعلق کیا کہوں یہ کہنے اور سمجھانے کی چیز ہی نہیں ہے، بجز اس کے کہ میں اپنی زندگی کے اوراق تمہارے سامنے رکھ دوں اور کچھ نہیں کر سکتی! جمیل سے مجھے جو عقیدت ہے اُسے میں الفاظ سے ظاہر نہیں کر سکتی، جمیل میرا خدا ہے! تم کہتی ہو یہ کفر ہے، نہیں زلیخا یہ وہ منزل ہے جہاں حق و باطل کا امتیاز رہتا ہی نہیں ـــــ عذاب و ثواب نظری ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ محبت "ہوش" سے کی ہی نہیں جاتی اس منزل میں عقل کی ضرورت ہی نہیں یہاں ہجر و وصل کا امتیاز ہی نہیں ہے ـــــ جب میں کسی کی ہو چکی پھر کسی کو اپنا بنانا کیا ضرور ہے ـــــ تمہیں یاد ہوگا کہ جمیل ایک بار میرے یہاں آئے تھے زندگی میں پہلی بار میں نے اسی وقت جمیل کو دیکھا تھا وہ میز کا ایک کونہ تھامے کچھ دیر کھڑے رہے میں دوسرے کمرے میں دریچی کے پردہ سے لگی کھڑی تھی وہ شاید مجھی سے ملنے آئے تھے وہ کچھ دیر تک مجھے دیکھتے رہے اس کے بعد یہ شعر گنگناتے ہوئے چلے گئے ؎

تم نہ دیکھو کہ میرے چہرے میں
اک تمنا سی پائی جاتی ہے

اُن کے جانے کے بعد مجھے اس کا احساس ہوا کہ وہ آئے تھے اور اس وقت میں نے میز کا وہ کونہ جو اُن کے ہاتھ سے مس ہوا چوم لیا، اُسی وقت تم آگئیں تھیں اور تم نے میری اس وارفتگی پر میرا مذاق اُڑایا تھا، اس کے بعد میں نے کبھی اُن کو نہیں دیکھا بلکہ اس وقت بھی میں نے نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا ـــــ مجھے دیکھنے کا ہوش تو تھا ہی نہیں ـــــ مجھے اس کا خیال نہ رہا کہ میرا اور اُن کا پردہ ہے، اگر کوئی مجھے اس طرح محوِ دید دیکھ لے تو میرے متعلق کیا خیال کرے! تمہیں وہ وقت بھی یاد ہوگا جب میں عروسی لباس میں تھی، شادی کے مہمانوں میں جمیل بھی تھے۔ رخصت کے وقت جب مجھے موٹر میں بٹھایا جا رہا تھا تو کسی نے کہا "جمیل بیہوش ہوگئے" میں نے جلدی سے سہرا اُلٹ کر پوچھا "کہاں ہیں جمیل" تم اس وقت بہت پریشان ہوگئی تھیں

تم نے زبردستی میرا سر جھکا دیا ———

اب تم یہ کہتی ہو کہ آخر میں نے شادی کی رسم کس طرح گوارا کر لی؟ زلیخا! میں سمجھتی ہوں کہ بحیثیت انسان میرا فرض تھا کہ دنیا میں میرا کچھ مصرف ہو جائے ——— کسی کی خدمت کر لوں، میرے والدین کی خواہش تھی کہ میں ازدواجی زندگی گذاروں، انھوں نے میرے لئے ایک شخص کو پسند کر لیا اور اس سے میرا عقد کر دیا۔ اس میں گوارائی اور ناگواری کا سوال ہی کیا؟ مگر میں سمجھتی ہوں کہ اس امتحان میں میں پوری نہ اُتری کیونکہ میری ازدواجی زندگی کامیاب نہیں ہے۔

کئی ماہ کا واقعہ ہے جب میں "بورگاؤں ناگپور" میں مقیم تھی وہاں سے "گوڑے وارا تالاب" بہت نزدیک ہے اک چاندنی رات میں ہم لوگ ٹہلنے کے لئے نکلے۔ اُس تالاب کے راستہ میں ایک بہت بڑا پختہ نالہ ملتا ہے اس پر پل بنا ہوا ہے، نالہ کے دونوں طرف کھجور کے درخت ہیں نالہ کے پیچ و خم میں کھجور کی قطار بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی، ہلکی ہلکی چاندنی میں کہیں کہیں ابر کے ٹکڑے حسن پیدا کر رہے تھے۔ میرے رفیق حیات نے کہا "اگر ایسی جگہ مکان ہو تو کتنا بہتر ہے"۔ مگر میں یہ سوچ رہی تھی کہ "اس جنت کی تکمیل میں جمیل کی کمی ہے"۔ اس وقت مجھے اختر کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

ہوگی کوئی جنت میری جنت تو یہی ہے
وہ ہوں لبِ گنگا ہو، بنارس کی سحر ہو

زلیخا! یہ واقعہ میں نے اس لئے لکھا ہے کہ میں سمجھتی ہوں کہ عشق کے لئے جس ضبط کی ضرورت ہے وہ ابھی مجھ میں نہیں ہے، ابھی تو میں اس دور سے گذر رہی ہوں کہ ؎

کہیں بیخودی میں لے دل نہ زباں پہ نام لینا
اگر ان کی یاد آئے تو جگر کو تھام لینا

محبت کی تکمیل اس وقت ہوگی جب کبھی مجھے جمیل کی کمی محسوس نہ ہوگی مجھے اس کا احساس ہی نہ ہوگا کہ وہ مجھ سے علیحدہ کوئی شے ہیں ——— تم کہتی ہو کہ "دنیا اسے گناہ کہتی ہے" نہیں زلیخا دنیا جسے گناہ کہتی ہے وہ محبت نہیں "ہوس" ہے۔ میں جمیل سے ملتی نہیں ہوں اُسے دیکھتی تک نہیں ہوں پھر کیا دلہن بھی کسی کی پرستش گناہ ہے؟ خدا تو خود کہتا ہے (میں تو مومن کے دل میں ہوں) پرماتما اور پریم آتما ایک ہی ہے کیا جمیل کی روح کو پوجنا خدا کی پرستش نہیں ——— ؟ میری زلیخا! محبت اور ہوس کو پہچانو، تشنگیٔ نفس کو محبت نہ کہو، اگر یہ ہوس نہیں تو اس کی تکمیل کے لئے شادی کی کیا ضرورت؟ محبت تو یہ ہے کہ ؎

مجھے دونوں عالم سے بیگانہ کر کے
مکمل محبت کا افسانہ کر دے

"جمیل تمھیں یاد کرتے ہیں"۔ تمہارے اس جملہ سے مجھے سخت تکلیف ہوئی، کیا میں نے ابھی تک اُن کے دل میں جگہ نہیں پائی ہے، اُنھیں اقبال کا یہ شعر سُنا دینا ؎

حُسن کا گنج گراں مایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

میری زلیخا! للہ اپنی محبت کو یوں پشیمان نہ کرو۔ جب محبت کر رہی ہو تو اسے نباہو ——— "شادی کر کے قانونِ محبت نہ توڑو۔"

حجاب بنارسی

مشاعرۂ شاعر ——— اپریل ۱۹۴۱ء

مصرع طرح :- "ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"

آفتاب۔ حجاب وغیرہ قوافی۔ کئے جا رہا ہوں میں ردیف

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح :- مفعولُ مفاعیلن مفعول مفاعیلن - ردیف "ہے"

اعلیحضرت قدر قدرت ہز اگزالٹیڈ ہائنس نواب سر میر عثمان علیخاں عثمانؔ شہریار دکن خلد اللہ ملکہ و حشمتہٗ

کیا محفلِ ہستی کا نقشہ متغیر ہے
ساقی ہے نہ مطرب ہے شیشہ ہے نہ ساغر ہے

غم سے نہ فراغ اس کو سودے سے نہ وہ خالی
دل ہے تو عجب دل ہے سر ہے تو عجب سر ہے

سوئے سے جب اُٹھے گا اک حشر بپا ہوگا
وہ فتنۂ خوابیدہ جو فتنۂ محشر ہے

تلوار جو کھینچی ہے حاضر ہے گلا میرا
دل میں ہے وہی تیر جو آپ کے لب پر ہے

انداز ترے قاتل سب جاں کے دشمن ہیں
چتون ہے کہ ناوک ہے غمزہ ہے کہ خنجر ہے

جو برق گراتی ہے وہ ہے نگہِ جاناں
جو دل کو پھنساتی ہے وہ زلفِ معنبر ہے

اب چشمِ عنایت سے پیاس اس کی بجھا دیجے
بیتاب بہت عثمانؔ یا ساقیِ کوثر ہے

(مرسلہ حضرت آغا زبیر برہانپوری)

حضرت نوحؔ ناروی

انسان تھا اک پردہ پردے میں چھپا کیا ہے
میں اُن کو بتا دوں گا پوچھیں وہ خدا کیا ہے

لے لیں وہ میرے دل کو اقرارِ وفا کیا ہے
یہ مُفت ہی ملتا ہے اچھا ہے بُرا کیا ہے

سو قسم کے ہنگامے آفاق میں جو دیکھیں
ہے شانِ خدا پوچھیں وہ شانِ خدا کیا ہے

وہ ظلم ہی ڈھائے گا میں ظلم ہی جھیلوں گا
ہر درد کا درماں ہے عادت کی دوا کیا ہے

بیداد بھی ہو مجھ پر آزار بھی ہو مجھ کو
اُلفت میں یہی تو ہے اور اس کے سوا کیا ہے

ظالم سے ہوئی اُلفت بے درد سے دل اٹکا
معلوم نہیں مجھ کو منظورِ خدا کیا ہے

اظہارِ محبت پر اقرارِ شکایت پر
نار ض وہ کیا کیا تھا بیزار وہ کیا کیا ہے

محشر میں خموشی پر حیرت ہے مجھے کیوں ہو
دُنیا میں تو وہ کافر کہتا تھا خدا کیا ہے

طوفان اُٹھے پیہم غرقاب ہوئی دُنیا
اے نوحؔ مگر اُس نے یہ بھی نہ کہا کیا ہے

حضرتِ وحشتؔ کلکتوی

لبریز حقیقت گو افسانۂ موسیٰ ہے
اے حُسن حجاب آرا کس نے تجھے دیکھا ہے

عاشق کے تخیل میں دُنیا ہے نہ عقبیٰ ہے
جو تجھ کو پسند آئے اُس کو وہی کرنا ہے

محفل سی سجائی ہے دیدار کی حسرت نے
ہر چند ترا جلوا محجوبِ تماشا ہے

مٹتا ہے کہیں دل سے نقش اُس کی محبت کا
ناکام تمنا بھی مجبورِ تمنا ہے

جذبات کی دُنیا میں برپا ہے قیامت سی
اس حال میں روپوشی کیا آپ کو زیبا ہے

ساقی تری محفل کو رنگین کیا جس نے
وہ خون ہے تقوی کا یا جوہرِ مینا ہے

اک شیوہ تغافل ہے اک عشوہ تجاہل ہے
غصہ ہے بجا تیرا شکوہ مرا بیجا ہے

تھی چشمِ کرم جس سے اُس نے بھی نظر بدلی
اے طاقتِ ضبطِ غم تیرا ہی سہارا ہے

یہ بیدلی اچھی ہے، دیوانہ نہ بن وحشتؔ
انجامِ تمنا کا حسرت کے سوا کیا ہے

حضرت مولانا سیمابؔ اکبرآبادی

نُستھرا ہو یہ فطرت کا پھر آئینہ خانا ہے
تقدیر کے گیسو میں تدبیر کا شانا ہے

یہ دورِ ترقی ہے، رفعت کا زمانہ ہے
ذرّوں کو اُٹھانا ہے، تاروں کو ملانا ہے

آغوشِ تصور ہے اور نقشِ جمیل اُن کا
دُوری ہے نہ مجبوری آنا ہے نہ جانا ہے

آوازِ درا باطل، فریادِ جرس ناقص
اب محفلِ خفتہ کو ٹھوکر سے جگانا ہے

نیرنگِ محبت ہے، ہر رازِ مرے دل کا
چُپ ہو تو حقیقت ہے کہہ دوں تو فسانا ہے

پایانِ طلب کچھ ہو لیکن مری ہمت نے
ہر قطرہ نچوڑا ہے، ہر ذرے کو چھانا ہے

ارمانِ تجلی کا، کوتاہ بھی کر قصہ
اے دوست تجھے آخر اک دن نظر آنا ہے

ہستی کے اندھیرے میں کھو آئے جو کچھ تھا
پھر چاندنی راتیں ہیں کچھ ڈھونڈ کے لانا ہے

کیا شعبدہ ساماں ہے سیمابؔ زمانہ بھی
ہر شخص سمجھتا ہے میرا ہی زمانہ ہے

حضرت مولانا شفق رضوی عمادپوری مینائی

ہاتھ اس کا تو اسکا الزام مری سر پر — جو لکھ کے چھپا رکھا تھا نام اس کا مقدر پر
ہر قطرہ ہی اک دریا۔ ہر ذرہ ہی اک صحرا — وسعت ہی مرے دل کی یا عرصۂ محشر ہے
جو تہ کو نہیں پہونچا اس راز کو کیا جانے — گوہر میں ہی آب اسکی۔ وہ آب ہی گوہر ہے
عصیاں کی گرانباری رحمت سے نہیں بھاری — تو لینگے فرشتے کیا پلّہ تو برابر ہے
خود اسکو مٹا دیگا نقش قلم فطرت — داغ ورق ہستی جو حرف مکرر ہے
سہتا ہے کڑی چوٹیں کیا کیا دل نازک بھی — شیشے کا یہ شیشہ ہے۔ پتھر کا یہ پتھر ہے
ہر آنکھ ہے اشکوں کا چھلکا ہوا پیمانہ — ہر آبلۂ دل اک اُٹّا ہوا ساغر ہے
دریائے محبت میں عاشق کا دل مضطر — ارمانوں کی کشتی کا ٹوٹا ہوا لنگر ہے
ہے محضر خوں کسکی تکمیل شہادت کا — عنوان شفق جسکا رنگین سرِ فتر ہے

حضرت الم مظفر نگری

اے دل ہے مرا خاموش مضطر ہے زہر جان — اب میرا سکوت غم تسکین کا ساماں ہے
ہر رنگ سے وہ صحن گلشن میں نمایاں ہے — ہر غنچے میں لب بستہ ہر پھول میں خنداں ہے
داغوں سے مرا سینہ صد رشک بہاراں ہے — گویا چمنستاں میں تقریب چراغاں ہے
زندلی ہے دلی کو تر میں دنیا کی گلستاں ہے — پھولوں کی ہر اک رگ میں یہ کون خراماں ہے
سوز غم الفت سے خود عشق ہراساں ہے — بے شمع بھی محفل میں پروانہ غزلخواں ہے
وحشت کے تصور سے کب حسن ہے مستغنی — یہ آپکا دامن بھی میرا ہی گریباں ہے
دل ڈوبتا جاتا ہے پھر درد کی لہریں ہیں — یہ کون خلش افزا نزدیک رگ جاں ہے
اس راز سے ناواقف ابتک ہیں چمن والے — ہر ذرۂ گلشن کے دامن میں بیاباں ہے
اک جام نگاہی دو ہونٹوں سے الم کے — بیگانۂ لطف مے یہ مردِ مسلماں ہے

حضرت آغاز برہانپوری۔

جو زندہ حقیقت ہے خود ایک کہانی ہے — یہ عالم فانی بھی کیا عالم فانی ہے
گردش ساعت ہو آسودہ چمن میں لے — کانٹوں کی زبانوں پر پھولوں کی کہانی ہے
اے کاش وہ آجائیں گلریز فضاؤں میں — ہر عالم رنگیں پر آشفتہ جوانی ہے
کیا بات سمجھئے کیا کہئے اب سبکی زبانوں پر — یا آن کا فسانہ ہے یا میری کہانی ہے
مدہوش محبت کو اے شوق نہ ہیں ملے — جس عالم مستی میں مخمور جوانی ہے
دنیا نے جسے سنکر افسانہ بنا ڈالا — کچھ میری زبانی ہے کچھ انکی زبانی ہے
یہ عالم مدہوشی مہتاب در آغوشی — واللہ جوانی کے پہلو میں جوانی ہے
ہم دونوں کی شکلوں کو ارباب نظر دیکھیں — اک آئینہ باقی ہے اک آئینہ فانی ہے
آغاز ابھی انجام ہستی سے نہ ہو غافل — آنے کو بڑھاپا ہے جانے کو جوانی ہے

حضرت نیر خورجوی

ہر رنگ تجلی میں وہ حسن سراپا ہے — صورت ہے تو صورت ہے جلوہ ہے تو جلوا ہے
ہر جلوہ مگر اس کا اک جلوۂ رعنا ہے — دیکھا نہیں جاتا وہ جس نے اسے دیکھا ہے
در پردہ و بے پردہ ہم نے تجھے دیکھا ہے — اے حسن ترا عالم پنہاں ہے نہ پیدا ہے
ہے سب سے الگ رہبر عرفان کی منزل کا — جو تیرا شناسا ہے بیگانۂ دنیا ہے
ارباب محبت نے ہستی ہی مٹا ڈالی — ابتک نہ ہوا معلوم منشائے وفا کیا ہے؟
جس پر یہ ہوس طاری جا اسکی نوازش کر — تو اس سے نہیں واقف جو میری تمنا ہے
گو حسن و محبت نے برپائے سر طوفاں — ہستی وہ ہی ہستی ہے دنیا وہ ہی دنیا ہے
میں اپنے تجارب سے دنیا کو یہ سمجھا ہوں — موہوم سا اک سپنا۔ رنگین سا دھوکا ہے
پھر مائل عرض غم ہے اس ستم آرا سے — دامن کش نیر پھر اک جذبہ رسوا ہے

گلستاں ہے

حضرت شفق ٹونکی

ہر ذرہ بیاباں ہے ہر پھول گلستاں ہے — جلووں کے تلاطم سے نظارہ پریشاں ہے
کیا عہد جوانی ہے کیا جوش بہاراں ہے — ہر صبح گلستاں ہے ہر شام چراغاں ہے
کرتی ہے جسے دنیا منسوب محبت سے — وہ میری جوانی کا اک خواب پریشاں ہے
ہر پھول کو دیتا ہوں ہنستا ہوا اک جوہر — میری ہی بہاروں کا اک نام گلستاں ہے
تم نے جسے خوش ہو کر آلدن مجھے بخشا تھا — وہ نشتر غم ابتک محفوظ رگ جاں ہے
یہ چاندنی راتوں کا فور ریز جواں منظر — ہنستا ہوا میرا ہی اک جلوۂ خنداں ہے
مستی کی طرح گم میں ہستی کے شبستاں میں — یا کس مسلسل ہے یا خواب پریشاں ہے
وہ کس لئے دنیا میں سرگشتۂ تسکیں ہو — جس کو غم ہستی کے انجام کا عرفاں ہے
یہ دل بھی کوئی دل ہے ہر لحظہ شفق جسمیں — اک سوز مسلسل ہے اک کاہش پنہاں ہے

حضرتِ صبا متھراوی

رُستے ہیں ہر اک کا فرغارتگر ایماں ہے
رہ گیرِ محبت کا اللہ نگہباں ہے

اک درس تحیّر ہے مشکل ہے نہ آساں ہے
ظالم کی محبت بھی نیرنگ بداماں ہے

سب کچھ ہے تصدق کہ یہ عشق کا احساں ہے
ہستی بھی نہیں مہنگی کونین بھی ارزاں ہے

جلووں کا تمہیں صدقہ تو دل کی نہ بجھ جائے
اس غم کے دئے سے ہی امید چراغاں ہے

پھر بھی گئیں وہ نظریں پروانہ مگر اب تک
ممنونِ نوازش ہے شرمندۂ احساں ہے

وارفتگیٔ الفت کچھ غور تو کرنے دے
ہاتھوں میں محبت کے یہ کس کا گریباں ہے

چمکا کریں جگنو بھی روشن ہیں نہ رہیں بھی
جو اشک فروزاں ہے وہ اشک فروزاں ہے

دنیا کی نگاہیں ہیں آغازِ گلستاں پر
اور میری نگاہوں میں انجامِ گلستاں ہے

نادانیاں برحق لیکن یہ سمجھ لینا
کہتے ہیں صبا جسکو بیفکر نہیں انساں ہے

جناب ایم۔ اے صابر۔ از بمبئی

تیرا ہی تصرف یہ ہے حسن فراواں ہے
ہر قطرۂ اشک غم اک شمع فروزاں ہے

محجوب نگاہوں سے وہ جلوۂ جاناں ہے
دنیا ہو کہ جنت ہو میرے لئے زنداں ہے

آرام میسر ہے راحت بھی فراواں ہے
اب میری نگاہوں میں صحرا بھی گلستاں ہے

وہ ہنستے ہوئے انکا کھولی ہوئی زلف آنا
ابتک میری آنکھوں میں وہ خواب پریشاں ہے

بیزار ہو دل کیوں اس دورِ کشاکش سے
ہر رنگ گلستاں کا نیرنگِ گلستاں ہے

بھلا سا نہیں باقی اب ذوقِ گنہ دل کو
اب اپنی خطاؤں پر یارب یہ پشیماں ہے

وہ دور نہیں اپنا وہ ذوق نہیں اپنا
اب یاد بھی ماضی کی اک خوابِ پریشاں ہے

دنیا کے جھمیلوں کی کچھ فکر نہیں مجھکو
گلشن سے کہیں بڑھکر دلچسپ بیاباں ہے

دو وصف کی حامل ہے اک انکی نظر صابر
گر جائے تو بجلی ہے اٹھ جائے تو طوفاں ہے

جناب صغیر اختر اکبرآبادی از الہ آباد

ذرّے سے نمایاں اک نیرنگیٔ دوراں ہے
یہ دورِ گلستاں بھی کیا دورِ گلستاں ہے

نقشہ ہے مرتب پھر عالم کی تباہی کا
تو پیں ہیں سواحل پر تخریب پہ انساں ہے

وہ دیکھ فضاؤں سے اک آگ برستی ہے
شعلہ ہے جہنم کا یا عالمِ امکاں ہے

بیکس کو مٹانے کا بے بس کو مٹانے کا
تہذیب کے دامن پر اک داغ نمایاں ہے

اک آگ لگا دی ہے پانی میں جہازوں نے
موجوں میں سمندر کی اک عالم طوفاں ہے

بھولا ہے خدا کو تو دعویٰ ہے خدائی کا
سائنس کا قائل ہے سائنس پہ نازاں ہے

دنیا کو دئے دھوکے سب تیری فراست نے
تو عقل کا دشمن ہے تو دشمنِ ایماں ہے

جب سے میں اختر داخل ہوں راہِ محبت میں
نظروں میں گلستاں ہے دامن میں بیاباں ہے

جنابِ طرفہ قریشی بھنڈاروی

ہر ذرہ مرے دل کا پھر نور بداماں ہے
پھر طور کے جلوؤں کا ہر ذرہ میں امکاں ہے

پھر خاطرِ محزوں کے تاروں کو ہوئی جنبش
پھر سازِ محبت پر شاید وہ غزلخواں ہے

تو ہے کہ تجھے دل کی ابتک بھی نہیں پروا
دل ہے کہ تری غم سے مضطر ہے پریشاں ہے

کیا بزمِ مسرت میں اس دل کی رسائی ہو
غم خوردۂ الفت ہے پژمردہ ہے حیراں ہے

پھینکا تھا جسے تیری نظروں نے ازل کے دن
وہ تیر ترا اب بھی پیوستِ رگِ جاں ہے

اے شیخ اِ برہمن سے ہے کد تجھے کیوں ناحق
جو کفر کے پہلو میں بیٹھے وہی ایماں ہے

دل لیکے دیا اس نے درد اپنی محبت کا
یہ کیسی نوازش ہے یہ کس قدر احساں ہے؟!

طرفہ کے تکلم میں طرفہ کے تغزل میں
احساس کی موجیں ہیں جذبات کا طوفاں ہے

جناب باقی اعظمی۔ از بمبئی

رقصاں میری آنکھوں میں عکسِ رخِ تاباں ہے
دنیائے تمنا میں ہر وقت چراغاں ہے

مجبور ہوں میں دل میں جذبات کا طوفاں ہے
تسکین کا مری باعث صحرا نہ گلستاں ہے

کس طرح رہوں خوش میں یہ عقدۂ ہستی
دل مجھ کو ملا لیکن وقفِ غمِ دوراں ہے

جذبات نے لی کروٹ اور اشک امنڈ آئے
چڑھتا ہوا دریا ہے بڑھتا ہوا طوفاں ہے

بعد اسکے خدا جانے کیا حالِ گلستاں ہو
بدلا ہوا پہلے سے کچھ رنگِ گلستاں ہے

مایوس مجھے کر کے دنیا نہ بدل دینا
امید مرے دل کی اک شمع فروزاں ہے

کیوں اسکی شکایت سے آلودہ ہیں لب میرے
جب میری نگاہوں میں ارزاں غمِ دوراں ہے

وحشی نے ترے ایسے کچھ راز کئے افشا
ہر صاحبِ دانش بھی انگشت بدنداں ہے

میں قوتِ باطل سے کیوں خوف کروں باقی
قوت ہے بڑی اسکی جو میرا نگہباں ہے

حضرت فیاض گوالیاری

حسرت کی ابھی حسرت ارماں کو تو ارماں ہے
جلدی تجھے کیا ایسی اے عمرِ گریزاں ہے!

مخصوص نوازش ہو، اتنا مجھے ارماں ہے
تم ظلم ہی کر دیکھو احساں تو ہے احساں ہے

نفرت کی نظر کیوں ہے تنکوں کی طرف گلچیں
جو شئے ہے گلستاں میں وہ جانِ گلستاں ہے

کیوں آپ کو الجھن ہے کیوں آپ ہیں امن کش
دیوانے کے ہاتھوں میں اپنا ہی گریباں ہے

اک جذبۂ وحشت نے دنیا ہی بدل ڈالی
جب بھی اپنی ناداں تھا اب بھی وہی ناداں ہے

طوفان کی لہروں میں لذت کشِ ساحل میں
یہ بھی کوئی جینا ہے ساحل ہے نہ طوفاں ہے

فیاضؔ مسلماں تو کہتے ہیں مجھے کافر
کافر یہ سمجھتے ہیں کمبخت مسلماں ہے

جنابِ ولیؔ گوالیاری

پابندِ ہوسناکی آزادیٔ انساں ہے
تعمیر کے پردے میں تخریب نمایاں ہے

حاصل ہے محبت میں یہ زندہ دلی مجھ کو
ہونٹوں پہ تبسم ہے دل میں غم پنہاں ہے

موقع ہے کہ لے لیجے طعنے اسے جی بھر کے
دل اپنی وفاؤں پر ایسے میں پشیماں ہے

ہیں پھول کبھی کانٹے بھی ابرِ ترے دامن میں
تجھ میں ہی گلستاں ہے تجھ میں ہی بیاباں ہے

لیجائیں جدھر لہریں پہنچائیں جدھر موجیں
کشتی مری قسمت کی وابستۂ طوفاں ہے

دشواری و آسانی اب عشق میں کیا دیکھیں
مشکل ہے تو مشکل ہے آساں ہے تو آساں ہے

جذباتِ غم و شادی مخلوط ہیں کچھ ایسے
الفت میں ولیؔ کا دل ہر حال میں یکساں ہے

جنابِ انورؔ گوالیاری

آخر ترا مطلب کیا اے ناصحِ ناداں ہے
میں بھی تو ہوں انساں تو بھی تو ہی انساں ہے

آنکھوں میں نشیمن ہے نظروں میں گلستاں ہے
چاہوں تو قفس میں بھی ہر تنکا اک امکاں ہے

تفریقِ مکاں ہستی تکمیلِ تصور سے
صحرا ہے گلستاں میں صحرا میں گلستاں ہے

چھپتا ہے چھپانے سے کب راز محبت کا
دل کی مری کیفیت چہرے سے نمایاں ہے

وحشت میں نہیں کوئی شے اپنے ٹھکانے پر
دامن ہے گریباں میں دامن میں گریباں ہے

کعبہ کے تقدس سے انکار نہیں زاہد
سنگِ درِ جاناں پھر سنگِ درِ جاناں ہے

دامن تو کہاں اُن کا قسمت میں مری انورؔ
خود اپنے ہی آنسو ہیں خود اپنا ہی داماں ہے

جنابِ خاورؔ شاہدوی

ضو بارِ تجلی یہ کس کا رخِ تاباں ہے
ہر تارِ نظر میرا صد طور بداماں ہے

کیا جوشِ جنوں میرا پھر سلسلہ جنباں ہے
اُلجھا ہوا کانٹوں میں ہر تارِ گریباں ہے

بربادیٔ الفت کا انجام کوئی دیکھے
دنیا میری حالت پر انگشت بدنداں ہے

داغِ غمِ الفت کی اللہ رے ارزانی
سینہ بھی مرا اب تو ہم رنگِ گلستاں ہے

وہ بزمِ تصور میں ہیں جلوہ نما ہمدم
یا شامِ تمنا کی یہ صبحِ درخشاں ہے

مضرابِ رگِ جاں ہے پھر یاد تری شاہد
ہر تارِ نفس میرا ہر دم جو غزل خواں ہے

اسبابِ عالم پنہاں ہیں دامنِ عشرت میں
خاورؔ جسے دنیا میں دیکھا وہ پریشاں ہے

جنابِ شہیدؔ از بمبئی

پھر عشق کی دنیا میں جذبات کا طوفاں ہے
پھر حسن کے ہاتھوں میں مضرابِ رگِ جاں ہے

اب خانۂ دل میرا ہر وقت فروزاں ہے
ہر داغ محبت کا اک نیرِ تاباں ہے

ممنونِ کرم دل سے ہوں اسکی نوازش کا
وہ میرے تصور میں ہر وقت خراماں ہے

دنیائے محبت میں پابندیٔ مذہب کیا
جو عشق کا بندہ ہے کافر نہ مسلماں ہے

انجام ہو کیا اسکا اب اسکو خدا جانے
میں دل سے پریشاں ہوں دل مجھ سے پریشاں ہے

ہر دل میں تمنا ہے آزارِ محبت کی
ہر چند شہیدؔ اسمیں تکلیف کا ساماں ہے

جنابِ نیرؔ لکھمی از مدراس

سینہ میں فروزاں دل ہم رنگِ بہاراں ہے
تو اشکِ محبت کی صد شعلہ بداماں ہے

اے شمع ترا جلوہ تسکینِ دلِ جاں ہے
خاکسترِ پروانہ شرمندۂ احساں ہے

کتنے رخِ کافر کے عریاں ہیں حسیں جلوے
ہر حیثیتِ نظارہ غارت گرِ ایماں ہے

اے جوشِ جنوں دیکھی معراج گریباں کی
ہر تارِ گریباں کا وابستۂ داماں ہے

اے دردِ محبت اٹھ مائل بہ کرم ہو جا
پھر آج ہزاروں سے خالی مرا داماں ہے

کیا دیکھیے ہوتا ہے انجامِ فلک نیرؔ
نالہ مرا بجلی ہے گریہ مرا طوفاں ہے

جنابِ شرقؔ کوندھوی از میرٹھ

ہیجانِ غمِ الفت پھر سلسلہ جنباں ہے
تصویر مری دل کی آنکھوں سے نمایاں ہے

سب ان کی نگاہوں کا یہ کار نمایاں ہے
اب میرے ہی ہاتھوں میں میرا ہی گریباں ہے

یا رب کوئی حد بھی ہے اس وسعتِ وحشت کی
اب میری نگاہوں میں ہر ذرہ بیاباں ہے

تو حیرت کے جلوے ہیں دنیائے محبت میں
ایماں کی پوچھو تو کافر بھی مسلماں ہے

کیا کام بنا میری بگڑی ہوئی قسمت سے
وہ اپنی جفاؤں پر اب خود ہی پشیماں ہے

اے شرقؔ نہ کر شکوہ اس گردشِ دوراں کا
یہ دور ہی ایسا ہے ہر شخص پریشاں ہے

جنابِ نیاںؔ نیازی

الفت مری وحشت کی پھر سلسلہ جنباں ہے
آنکھوں میں بیاباں ہے ہاتھوں میں گریباں ہے

شاید کہ مرا غم سے شیرازہ پریشاں ہے
تصویر مری مجھکو کیوں دیکھ کے حیراں ہے

ہے رنج و الم مضمر تخلیق میں انساں کی
جو غم سے گریزاں ہے کیا خاک وہ انساں ہے

ہر دم غمِ ہجراں کا اک کہر سا طاری ہے
گویا یہ مرا دل بھی اک صبحِ زمستاں ہے

جب چاہا ہوں جگا لو منت کی ہوئی قسمت
ہاتھوں میں مرے نیاںؔ اب جسکا داماں ہے

آئیں تو مصیبت ہے جائیں تو قیامت ہے
جب جور و ستم حاصل ہر حسرت و ارماں ہے

جناب اشرف اتقی بنگلوری

ارادۂ تغافل ہے خود عیسیٰ دوراں کو
بیمار محبت کا اللہ نگہباں ہے

ہر ذرہ سی ضو افشاں جب جلوۂ جاناں ہے
پھر طور کا ارماں کیوں اے موسیٰ عمرانی ہے

کیا جانے وہاں کیونکر زاہد کا گزارا ہو
سنتا ہوں کہ جنت بھی اک بزم حسیناں ہے

نیرنگیوں سے اسکی دل کیا متاثر ہو
دنیا جسے کہتے ہیں بازیچۂ طفلاں ہے

تزویر اشرف دیکھو دانستہ گنہ کر کے
دنیا کے دکھانے کو کمبخت پشیماں ہے

جناب منظر امنیروی

بدلے ہوئے تیور ہیں ارباب محبت کے
اے عالم ہستی کا اللہ نگہباں ہے

اللہ رے یہ تیری جلووں کی فراوانی
جو ذرہ زمیں پہ ہے خورشید درخشاں ہے

جذبات محبت کے لے آئے ہیں اس حد تک
میں ہوں مری وحشت ہے دامان بیاباں ہے

منظر وہ دکھایا ہے گلہائے محبت نے
ہر داغ مرے دل کا ہم رنگ گلستاں ہے

جناب ناداں ازٹروانی

آؤ تو میرے دل میں دیکھو تو میرے دل کو
وہ میری تمنا ہے جو آپ کا ارماں ہے

یہ بھی کوئی پردہ ہے او پردہ نشیں تیرا
تو دل میں نمایاں ہے اور آنکھوں سے پنہاں ہے

پھر لطف تڑپنے کا آئیگا مجھے ناداں
پھر میرے ستانے کا اس شوخ کو ارماں ہے

جناب رضا قریشی گوالیاری

دل مٹ ہی گیا ہوتا کیا حسن مداوا ہے
تسکین کی اک صورت خود یاس سے پیدا ہے

آنکھوں کی ضیا بنکر اک بار پھر آجاؤ
بے نور سی آنکھیں ہیں بے کیف نظارا ہے

ہر دیکھنے والے نے دیکھا ہی کہاں انکو
جس نے انہیں دیکھا ہے انکو انہیں دیکھا ہے

مے بنکے برستا ہے آنکھوں سے شباب انکا
جو سانس وہ لیتے ہیں گلشن سا مہکتا ہے

راز غم الفت پہ نظریں ہیں دو عالم کی
ہر سانس محبت کی گویا لب گویا ہے

کیا پوچھتے ہو میرے جذبات فراواں کو
چڑھتے ہوئے دریا کو تم نے کبھی دیکھا ہے؟

کچھ یوں وہ مٹاتے ہیں الفت میں رضا مجھکو
محسوس یہ ہوتا ہے میری ہی تمنا ہے

جناب آبد سرہندی

وجدان محبت میں ایسا نظر آتا ہے
ہر ذرے میں صحرا ہے ہر قطرے میں دریا ہے

کیونکر کہیں پوشیدہ وہ جلوۂ رعنا ہے
نکھری ہوئی راتوں میں ہمنے اسے دیکھا ہے

انسانکو دل بخشا اس کا یہ نتیجا ہے
دنیا کی تمنا ہے دنیا سے تمنا ہے

ناکامی کاوش پر ہوتا ہے گماں اکثر
قسمت کے دھندلکوں میں تدبیر کا مارا ہے

یہ شوق کا طوفاں ہے اس بزم تجلی میں
خود چشم تماشا بھی اک موج تماشا ہے

جلووں کی حقیقت کو کیا تنگ نظر جانے
لیلیٰ کے اشاروں کو مجنوں ہی سمجھتا ہے

تا چند گلستاں میں تمیز گل و لالہ
فطرت کا اے آبد تجھ سے کچھ اور تقاضا ہے

جناب نصیر مالیگانوی۔

آتا ہی مجھے کافی جینے کا سہارا ہے
یاد اس گل رعنا کی فردوس تمنا ہے

آنکھوں میں دم گریہ اک صورت زیبا ہے
ہر قطرۂ چشم تر اب عرش کا تارا ہے

الطاف کی نظروں سے کیا آپ نے دیکھا ہے
پھر دل میں مرے برپا ہیجان تمنا ہے

قربان دو عالم کی اس آنکھ پہ بینائی
اے پردہ نشیں تجھ کو جس آنکھ نے دیکھا ہے

پامال رہ الفت برباد وفا ہوں میں
جینا مرا جینا تھا مرنا مرا مرنا ہے

بربادئ الفت کا شاید یہی حاصل
عالم کی زبانوں پر اب میرا فسانا ہے

اک وجد میں پاتا ہوں عالم کو نصیر اب میں
کیا ساز محبت کو پھر عشق نے چھیڑا ہے

جناب وحید نولوی۔ غازیپوری۔

کیا بزم محبت کا دلچسپ نظارا ہے
وہ محو تغافل ہے دل محو تماشا ہے

آزاد طبیعت ہے کس بات کی پروا ہے
سر خوگر سودا ہے دل وقف تمنا ہے

دیکھا ہے

جناب برق صدیقی فتحپوری

تنگ دل انساں ہے جو داغ سویدا ہے
لیکن جو چمک جائے رشک ید بیضا ہے

آئینہ ترے دل کا روشن نہیں اندھا ہے
ہر ذرہ یہاں ورنہ اک برق تجلی ہے

تارے نہیں تارے ہیں غنچے نہیں غنچے
پردے پہ دو عالم کے جو نقش ہے دھوکا ہے

ہنگامۂ ہستی کا مقصد نہ کوئی سمجھا
حل ہی نہوا اب تک ایسا یہ معما ہے

سرگرم تماشائے جلوہ ہوں سر بستر
اے موت کوئی یہ بھی ہنگام تقاضا ہے

یاد آج پھر آیا اک بھولا ہوا افسانہ
آنکھوں میں پھر اشکوں کا امڈا ہوا دریا ہے

شام شب غربت ہے ظلمت کدۂ دلبر
برق انکے تصور کی شمعوں سے اجالا ہے

ہر ملک میں فتنہ ہے، ہر دیس میں جھگڑا ہے ۔۔۔ عالم کی سیاست کا، بگڑا ہوا نقشا ہے
تہذیب و تمدن کے، سیلاب میں بہہ جو گیا ۔۔۔ الحاد و تکبر کا اڈا ہوا دریا ہے
جب سامنے آتی ہے صورت کوئی رعنا سی ۔۔۔ آنکھیں مری کہتی ہیں اسکو کہیں دیکھا ہے
یہ انکی باتیں ہیں اسکو کوئی کیا سمجھے ۔۔۔ آنکھوں میں ہے جو قطرہ وسعت میں وہ دریا ہے
گم ہو کے دحید اسمیں مشکل ہے نکلنا پھر ۔۔۔ دنیا جسے کہتی ہیں اک دام تمنا ہے

جناب تنویر کولاری

کی جب سے نظر تو نے اک قطرہ بھی دریا ہے ۔۔۔ ذرہ مری مٹی کا، ذرہ نہیں صحرا ہے
اے شوق جبیں سائی سرگرم عمل ہو جا ۔۔۔ آزار محبت کا پہلا یہ مداوا ہے
مر مر کے تڑپتی ہے بجلی جو گھٹاؤں میں ۔۔۔ کاشانۂ بلبل میں شاید کوئی تنکا ہے
آغاز محبت ہے میرا دل دیوانہ ۔۔۔ مجبور تقاضا ہے بے تاب تمنا ہے
کیوں شمع محبت پر پروانہ ہیں دل والے ۔۔۔ مستور حقیقت ہے مجہول معما ہے
اک وجد کا عالم ہے اس محفل انجم میں ۔۔۔ تنویر شکستہ دل جب زمزمہ پیرا ہے

جناب لکشمی نرائن فائق اودیپوری

بنتے ہیں جسے قطرہ وہ اصل میں دریا ہے ۔۔۔ سمجھے ہیں جسے ذرہ، ذرہ نہیں دنیا ہے
سنتا ہے اگر مولا مجبور ہے کیوں بندہ ۔۔۔ مولا ہے اگر ہر جا پھر کون یہ بندا ہے
زنجیر علائق نے پابند کیا اسکو ۔۔۔ انسان حقیقت میں چلتا ہوا دریا ہے
حسرت کی فضاؤں میں امید کے جلوے ہیں ۔۔۔ بیمار غم فرقت مرتا ہے نہ جیتا ہے
معصوم تمنائیں الجھاتی ہیں دل فائق ۔۔۔ ہر غنچے کے دامن میں اک دام شگفتا ہے

جناب جوہر

جس نے اُسے پایا ہے کس نے اسے دیکھا ہے ۔۔۔ جب چشم تصور بھی محروم تماشا ہے
منزل کے مقدر میں کب حسن دل آرا ہے ۔۔۔ جس نے اُسے سمجھا ہے اُس نے اُسی پایا ہے
گھٹ گھٹ کے رہوں لب پر آئے نہ کبھی شکوہ ۔۔۔ مر مر کے جیئے جاؤں انکا یہی منشا ہے
واماندہ مسافر کا عالم تو ذرا دیکھو ۔۔۔ ہر نقش کف پا کو کس یاس سے تکتا ہے
اُمید کی کشتی کو جوہر یونہی بہنے دے ۔۔۔ دریائے محبت کا ساحل کہیں ملتا ہے

زمانہ ہے

ہمدرد ادب جناب سلیمان از جالندھر

ہر نقش قدم اپنا عبرت کا فسانہ ہے ۔۔۔ ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے
بلبل کا ترانہ کب، بلبل کا ترانہ ہے ۔۔۔ کچھ تیری کہانی ہے کچھ میرا فسانہ ہے
دریائے محبت کا دریا میں کرانہ ہے ۔۔۔ اے بندۂ ساحل تو بے عکس دوانہ ہے
زاہد تری مسجد ہے تنہا نوں کا تنہا خانہ ۔۔۔ دل جلوہ گہ رب ہے سچوں دیگانہ ہے
سجدے سے نہیں اٹھتے آج اپنی جبین دل ۔۔۔ مقبول در جاناں شاید یہ دوگانہ ہے
اللہ رے خودداری دیوانۂ الفت کی ۔۔۔ احوال فقیرانہ، انداز شہانہ ہے
اس دل کی جراحت کا کیا چارہ سلیماں ہو ۔۔۔ در دیدہ نگاہوں کے تیروں کا نشانہ ہے

جناب وزیرزادہ قہر جوناگڈھی

پھر انکی محبت میں خون دل کا بہانا ہے ۔۔۔ پھر ہستی سادہ کو رنگین بنانا ہے
کا ہیدۂ غم ہو کر جسم اپنا ..... گھلانا ہے ۔۔۔ اس پیکر خاکی کو مٹی میں ملانا ہے
جو اشک نکلتا ہے، آنکھوں سے محبت میں ۔۔۔ ظاہر میں وہ آنسو ہے باطن میں فسانہ ہے
او پردہ نشیں مجھ سے پھر کیوں یہ حجاب اتنا ۔۔۔ اک بار تجھے آخر جب سامنے آنا ہے
تو خاک نشیں ہو جا ملجائیگی رفعت بھی ۔۔۔ جو خاک میں ملجائے سرسبز وہ دانا ہے
وہ دل میں ہے لیکن پوشیدہ نگاہوں سے ۔۔۔ کچھ انکو اگر جانا حیرت ہی نے جانا ہے
دیتے ہو جگہ دل میں گر بت کو مگر یہ تو ۔۔۔ کعبہ کو صنم خانہ اے قہر بنانا ..... ہے

جناب عاصی تنکتھلوی

یہ بزم جہاں کیا ہے اک آئینہ خانہ ہے ۔۔۔ کیا کیا نظر آیا ہے کیا نظر آنا ہے
جو ہو ابدی یعنی تا حشر نہ ہو زائل ۔۔۔ احباب کی محفل پر وہ رنگ چڑھانا ہے
جو محفل عالم کو مسرور تپش کر دے ۔۔۔ وہ ساز محبت پر نغمہ مجھے گانا ہے
اخلاق کی تصویریں عریاں نظر آتی ہیں ۔۔۔ تہذیب و تمدن سے آزاد زمانہ ہے
ایثار و شفقت سے جو کینہ جواں ہمت ۔۔۔ یہ دور ترقی ہے رفعت کا زمانہ ہے
روداد ستم سنکر کس ناز سے بولے وہ ۔۔۔ پر لطف زبانی میں اک پر درد فسانہ ہے
عاصی یہ غزل میری اک گیت ہے عبرت کا ۔۔۔ یا ساز شکستہ پر پُر سوز ترانہ ہے

جناب ذکی اورنگ آبادی

حال اپنی مصیبت کا پھر آج سنانا ہے ۔۔۔ پانی کی طرح دل کا پردرد کے بہانا ہے
مجھ کو یہ مسرت ہے تم ہو تو میرے دل میں ۔۔۔ اس مانڈ سے شیشے کو آئینہ بنانا ہے
پندار کے بندوں کو اتنا کوئی سمجھا دے ۔۔۔ اللہ کے بندوں کو بیکار ستانا ہے
اک روز بھی بھولے سے آئے نہ مرا لیں ۔۔۔ سچ کہتی ہے یہ دنیا مطلب کا زمانہ ہے

وہ آئے تو زکی دیکھو دل تھامے ہوئے رہنا   بگڑی ہوئی قسمت کو پھر آج بنانا ہے

جناب ارشاد ازگیان پور

وہ اپنے ہیں بات اپنی، اور دل کا فسانہ ہو   ہر سانس ہے قابو میں قبضے میں زمانہ ہے
پوچھو تو محبت میں غایت مرے رونے کی   اک آگ لگائی تھی اب اسکو بجھانا ہے
ہمراز نہیں کوئی، دمساز نہیں کوئی   تقدیر مخالف ہے برگشتہ زمانہ ہے
ارشاد کسی سے کچھ امید نہ رکھ ہرگز   رونے کو نہیں کوئی ہنسنے کو زمانہ ہے

جناب بصیر از ملیا گل

اے رندِ خرابانی اب ہوش میں آنا ہے   ذکرِ مئے و مینا کو ہر دل سے بھلانا ہے
یہ عشق کی منزل ہے الفت کی یہ ہے وادی   ہر گام پہ لے وحشی سو ٹھوکریں کھانا ہے
کہنا ہے بصیر ان کا ملتا نہیں دل سے دل   کہنے کی یہ باتیں ہیں دلچسپ بہانا ہے

جناب تبسم کھنڈاردی

ہر وقت مری جانب اٹھتی ہے نظر ان کی   ہر وقت دلِ محزوں تیروں کا نشانہ ہے
اس دیدۂ پرنم کو تم غور سے دیکھو تو   اشکوں کی روانی میں الفت کا فسانہ ہے

جناب عاجز پلولی

ہر تارِ رگِ جاں سے اک سوز ہویدا ہے   ہر تارِ نفس گویا اک غم کا فسانہ ہے
سنگِ درِ جانانہ اور شوقِ جبیں سائی   کیا حسن و محبت کا پر کیف زمانہ ہے

(محبت ہے)

جناب رونق دکنی ۔ جمشید پور

وہ جلوۂ رعنا جو عنوانِ محبت ہے   پُر کیف اک افسانہ، رنگین حکایت ہے
وہ ترکِ تعلق پر، ہم صلح پر آمادہ   وہ اُن کا ارادہ ہے، یہ اپنی طبیعت ہے
آسودگی الفت ہے وجہِ سکونِ حسن   اور حسن کی دلجمعی، تسکینِ محبت ہے
یکرنگیٔ فطرت ہے، دریائے محبت میں   گنگا کی روانی ہے، زمزم کی حلاوت ہے
درماندۂ منزل کی دیکھے کوئی مایوسی   منزل ہے نگاہوں میں اور وادیٔ غربت ہے
آنکھ کا سحر زیبا ہے شام و سحرِ عاشق   کیا حسنِ صباحت ہے، کیا رنگِ ملاحت ہے
دنیائے محبت نے کچھ قدر نہ کی دل کی   کیا پوچھتے ہو دل کی مردودِ محبت ہے
معصوم ہے دل میرا، کچھ جرم نہیں اسکا   ایما ہے یہ فطرت کا جو تم سے محبت ہے
کچھ ذوقِ سخن رونق ممنون ہے مرشد کا   کچھ جذبۂ فطری ہے، کچھ فکر کی جدت ہے

جناب اوج حنیفی دھولپوری

آگاہ حقیقت سے میری بشریت ہے   سرمایہ جو ہے میرا وہ تیری امانت ہے
کیا جانے کوئی میرے دل کی جو حقیقت ہے   گلزارِ تمنا ہے فردوسِ محبت ہے
تاروں میں اُدھر تابش پھولوں میں اِدھر نکہت   اللہ رے وحدت کے جلووں کی یہ کثرت ہے
میں غیر کو کیا جانوں میں اور کو کیا جانوں   بندہ ہوں تمہارا ہی تم سے ہی عقیدت ہے
کیونکر نہ مری ہستی روشن ہو زمانے میں   پوشیدہ مرے دل میں اک چاند سی صورت ہے
اکبار ملوں تم سے اکبار تمہیں دیکھوں   دل کی یہ تمنا ہے آنکھوں کی یہ حسرت ہے
کیونکر نہ مجھے حاصل معراجِ محبت ہو   اے اوج نظر میری شہبازِ محبت ہے

جناب مجروح صدیقی امراؤتی ازبھنڈارہ

جس دن سے مرے دل میں اس بت کی محبت ہے   کعبہ کی اذاں میں بھی ناقوس کی لذت ہے
تم نازکے پروردہ، دل رنج و الم خوردہ   کیا اس سے تمہیں نسبت، کیوں اس سے محبت ہے
کلیوں کا چٹکنا ہے تمہید بہاروں کی   غنچوں کے تبسم میں اعلانِ مسرت ہے
اب میری جبیں اٹھے کیوں در سے ترے آخر   اب میری جبیں کو خود سجدوں کی ضرورت ہے
کلیوں میں کشش اتنی پہلے تھی کہاں ہمدم!   یہ ان کے تبسم کی رنگین کرامت ہے
اے دوست! محبت ہے آئینہ خدائی کا   دنیا کو مگر اس سے کیوں اتنی کدورت ہے
مجروح تغزل میں کر رنگ نیا پیدا   ہر چیز زمانے کی اب مائلِ جدت ہے

جناب خادم ہروچی

غیروں سے تجھے الفت اور ہم سے کدورت ہے   کیا یہ بھی کوئی ظالم قانونِ محبت ہے
ہے ذکر ترا لب پر دل میں تیری الفت ہے   اپنی یہ عبادت ہے اپنی یہی طاعت ہے
اب رہ گئے دنیا میں سب دوست نما دشمن   ظاہر میں محبت ہے باطن میں عداوت ہے
مایوس نہ ہو اے دل تو انکی جفاؤں سے   آباد تجھی سے تو دنیائے محبت ہے
تو سامنے اس کے ہو اے دوست دمِ آخر   بیمارِ محبت کی یہ آخری حسرت ہے

جناب سید ظہیر مدنی ایم اے ۔ سورت

میں عشق کا بندہ ہوں مذہب مرا الفت ہے   سجدہ درِ جاناں پر کرنا ہی عبادت ہے
یا طور بتائیگا یا بے خودیٔ موسیٰ   اس برقِ تجلی کی جو کچھ بھی حقیقت ہے
تکمیلِ نشیمن بھی تو نے تو نہ ہونے دی   اے برقِ ستم تجھ سے صرف اتنی شکایت ہے
اوّل بھی پریشانی آخر بھی پریشانی   آغازِ محبت ہی انجامِ محبت ہے
روداد ظہیر اپنی کہئے تو کسے کہئے   اس دور میں ہر انساں پامالِ مصیبت ہے

(جوانی ہے)

جناب بہار کوٹی

ہر لفظ میں پوشیدہ دنیائے معانی ہے ۔۔۔ شاید یہ شہیدانِ محبت کی کہانی ہے
انگارے برستے ہیں مہتاب کی کرنوں سے ۔۔۔ یہ صبح قیامت ہے یا شامِ جوانی ہے
تسکین اثر لذت ملتی ہے تڑپنے میں ۔۔۔ کیا چیز مرے مالک یہ دردِ نہانی ہے
فردوس بداماں ہے ہر خارِ گلستاں کا ۔۔۔ قربان جوانی کے کیا چیز جوانی ہے
ہر گام پہ سو فتنے ہر فتنہ قیامت زا ۔۔۔ اک تیری جوانی بھی تیری ہی جوانی ہے
قربان محبت کے صدقے میں محبت کے ۔۔۔ جذبات میں رنگینی شعروں میں روانی ہے

جناب ملک بشیر بیخود (از ٹونک)

کیا جوشِ مسرت ہے کیا کیفِ جوانی ہے ۔۔۔ ہر صبح درخشاں ہے ہر شام سہانی ہے
کشمیرِ طرب میرا ہر منظرِ فانی ہے ۔۔۔ کس درجہ حسیں کیفِ نیرنگ جوانی ہے
ہر پھول ہے اک سرخی تاریخِ محبت کی ۔۔۔ ہر غنچہ اک عنوانِ رودادِ جوانی ہے
آتی ہے شرر بن کر جاتی ہے ہوا ہو کر ۔۔۔ بہتے ہوئے پانی کی اک موج جوانی ہے
اک کیف نظر میں ہے اک جوش طبیعت میں ۔۔۔ ہر موجِ نفس میری فردوسِ جوانی ہے
اک روز ہے آنے کا اک روز ہے جانے کا ۔۔۔ لے دے کے فقط اتنی ہستی کی کہانی ہے
ہے موجِ تبسم کی ان کے لبِ لعلیں پر ۔۔۔ بیخود یہ مری شاید گم گشتہ جوانی ہے

جناب مظفر بھنڈاروی

نالے ہیں شبِ ہجراں اور اشک فشانی ہے ۔۔۔ لٹتے ہوئے شعلے ہیں بہتا ہوا پانی ہے
کس شوق سے سنتی ہے دنیا مرا افسانہ ۔۔۔ جیسے مرا افسانہ دنیا کی کہانی ہے
اے کاش وہ آ جائیں ہم پھر کو تصور میں ۔۔۔ اک درد بھرے دل کی روداد سنانی ہے
دو دن کی جوانی کی کیا قدر کرے کوئی ۔۔۔ دو دن کی جوانی بھی کیا کوئی جوانی ہے؟

جناب حسن ساگری — "محبت ہے"

تکئے پہ توکل کے رہنا مری عادت ہے ۔۔۔ قسمت سے جو ملتا ہے اُس پر ہی قناعت ہے
رہنے دو جو رہتے ہیں وہ دور نگاہوں سے ۔۔۔ آتے ہیں تصور میں کیا کم یہ عنایت ہے
مانا کہ نہیں اُس کو منظور یہ دل آزاری ۔۔۔ لیکن کوئی شے بھی تو مجبوریٔ عادت ہے
ہر رنگ ہو آئینہ تو خاک تماشا ہو ۔۔۔ دل صاف ہو جب تک بیکار عبادت ہے

(غم ہے)

جناب رعنا عشرتی

انسان حقیقت میں ہم صورتِ شبنم ہے ۔۔۔ اک لمحہ کی عشرت ہے اک لمحہ کا ماتم ہے
اک اُن کے سوا ہر شے تخئیل میں مبہم ہے ۔۔۔ میں آج جہاں پر ہوں وہ اور ہی عالم ہے
گو یاس پہ وہ اک آئینۂ عالم ہے ۔۔۔ خاموش ہے دل لیکن ہر راز سے محرم ہے
لے درسِ سبکساری اے عشق نگاہوں سے ۔۔۔ جو بارِ محبت ہے وہ بارِ دو عالم ہے
ہنسنے کی محبت میں کیا دل کو اجازت دوں ۔۔۔ احساس خوشی میں بھی پیدا خلشِ غم ہے
اللہ محبت کی راتیں بھی ہیں کیا راتیں ۔۔۔ شعلے ہیں نگاہوں میں سینے میں جہنم ہے
بھاتی نہیں گلشن میں کلیوں کی ہنسی اس کو ۔۔۔ وہ روح میں رعنا کی جب سے تبسم ہے

جناب حزیں احمد آبادی

اب میری بیاضِ غم شیرازہ بہ برہم ہے ۔۔۔ عنوانِ سکوں جس کا بیتابیٔ عالم ہے
کچھ آہ بھی افسردہ کچھ درد بھی کم کم ہے ۔۔۔ سازِ نفسِ دل کی آواز بھی مدھم ہے
کیا خاک میسر ہو محویت یکسوئی ۔۔۔ خلوت گہِ عالم میں ہنگامۂ عالم ہے
خورشید کی ہلکی سی رنگین شعاعوں پر ۔۔۔ اُڑنے کے لئے مائل ہر قطرۂ شبنم ہے
کیا پوچھ رہے ہو تم لطفِ شبِ تنہائی ۔۔۔ خاموش فضائیں ہیں میں ہوں دلِ پُر غم ہے
وہ بزمِ طرب گذری وہ دورِ طرب گذرا ۔۔۔ اب صرف نگاہوں میں اک یاس کا عالم ہے
ناسورِ محبت کو رس رس کے ٹپکنے دے ۔۔۔ یہ زخم حزیں دل کا بیگانۂ مرہم ہے

جناب عباس انصاری

دنیا کا فنا ہونا عباس مسلم ہے ۔۔۔ اس نقش نگاری کا ہر خط خطِ مبہم ہے
میخانۂ عرفاں کے رندوں کا یہ عالم ہے ۔۔۔ اک ہاتھ میں کوثر ہے اک ہاتھ میں زمزم ہے
بیتابیٔ خاطر کا اب میری یہ عالم ہے ۔۔۔ اک دردِ مسلسل ہے اک کاہشِ پیہم ہے
جو آپ کا بندہ ہے وہ غیر کو کیا جانے ۔۔۔ جو آپ کا شیدا ہے بیگانۂ عالم ہے
ایسے بھی زمانے میں ہیں لوگ ابھی جن کو ۔۔۔ فردوسِ محبت بھی ہم شکلِ جہنم ہے
قدرت نے تجھے اپنے ہاتھوں سے سنوارا ہے ۔۔۔ تو شاہدِ فطرت ہے تو حسنِ مجسم ہے
افشائے محبت کا خطرہ ہو تو کیوں اس کو ۔۔۔ کوئی کہیں دنیا میں عباس کا محرم ہے

جناب بیتاب کالپوری

آوازِ دلِ مجروح اس نگہ سے مرہم ہے — سازِ غم جان و دل پھر درہم و برہم ہے
میں نیکی بدولت ہی عالم سے ہوں بیگانہ — دل عشق کے باعث ہی رسوائے دو عالم ہے
ہر غنچہ میں گلکاری ہر پھول میں رعنائی — اک گوہر تابندہ ہر قطرۂ شبنم ہے
اب دور ہے سفاکی اور ظلم کا دنیا میں — انصاف کا رونا ہے اخلاق کا ماتم ہے
بیتاب دل و جاں ہیں سودائے محبت سے — دنیائے محبت میں اک یاس کا عالم ہے

کیا حسن تلون ہے ظالم تری نظروں میں — دشوار مرا جینا مرنا مرا مشکل ہے
سر اٹھتا نہیں یاور سنگِ درِ جاناں سے — شاید مرے سجدوں کی یہ آخری منزل ہے

جناب اظہر جعفری جبلپوری

صہبائے محبت سے لبریز مرا دل ہے — یہ جامِ حقیقت میں کونین کا حاصل ہے
آنکھوں میں ترا جلوہ اور دل میں ترا پرتو — یہ بھی ترا کاشانہ وہ بھی تری منزل ہے
آئینہ ہے اور وہ ہیں اللہ ری محویت — معلوم نہیں یہ بھی کون ان کے مقابل ہے
بیخود نہ ہوا تنا گستاخ نہ بن اتنا — اے ہوش کی اے اظہر عشق کی منزل ہے

(دل ہے)

جناب غنی جعفری جبلپوری

کیا ضبط محبت کا لے دل ہی حاصل ہے — وہ پوچھتے ہیں مجھ سے کیا کیفیت دل ہے
آسان ہوں ہر شئے پر قدرت مجھے حاصل ہے — آساں نہیں جو مجھکو وہ کونسی مشکل ہے
اب فکر محبت کے طوفاں کی نہیں پروا — اب موج ہی کشتی ہے اب موج ہی ساحل ہے
ہشیار ہوئے غافل یہ کارگہِ عالم — اک فتنۂ خوابیدہ اک جلوۂ باطل ہے
اسرار حقیقت کے ظاہر نہ کبھی ہوں گے — خود اپنا سمجھ لینا جب تک مجھے مشکل ہے
میں دیکھ لوں یوں بھی رگ رگ میں تجھے پنہاں — کیا خون کے ذروں میں جلوہ ترا شامل ہے
میں نے بھی غنی اسکو دیکھا ہے اکبر آبادی — اب تک مری نظروں میں وہ جلوہ کامل ہے

(مٹایا ہے)

جناب انور الوری

دل میں غم جاناں نے گھر اپنا بنایا ہے — جائے گا نہ یہ آکر کیا جانے کو آیا ہے
یہ حسن کے پرتو نے اعجاز دکھایا ہے — ذروں کو تجلی سے خورشید بنایا ہے
آنکھوں میں بھی رہتے ہو تم دل میں بھی رہتے ہو — یہ گھر بھی بسایا ہے وہ گھر بھی بسایا ہے
بھولے ہیں نہ بھولیں گے ہم اسکو قیامت تک — الفت کا سبق تونے کچھ ایسا پڑھایا ہے
اپنا کسے میں سمجھوں اپنا کسے میں جانوں — جب جان پرائی ہے جب دل بھی پرایا ہے
بیتاب ہوا کوئی بے ہوش ہوا کوئی — بے پردہ وہ اے انور جب بزم میں آیا ہے

جناب روحی۔ مقام سنگری ڈرگ

مژدہ کسی مدہوش کے آنے کا جو پایا ہے — پھولوں سے چمن سارا فطرت نے سجایا ہے
صیاد کے پھندے میں کیونکر نہ پھنسے کوئی — دام اپنا ستمگر نے پھولوں میں چھپایا ہے
مینا بھی ہے ساقی بھی مطرب بھی ہے نغمہ بھی — اے اہلِ چمن مژدہ ابا دل بھی گھر آیا ہے
اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو روحی — دریائے کرم اس کا اب جوش میں آیا ہے

جناب خلیل آلہ آبادی

آئینہ مرا دل ہے آئینہ ترا دل ہے — کب تجھ سے میں غافل ہوں کب تو مجھ سے غافل ہے
کام آئی کشش میرے جذبات محبت کی — میں تیرے مقابل ہوں تو میرے مقابل ہے
رونق دہ محفل ہو کون آج سوا خوبی — یہ تاروں بھری کیسی آراستہ محفل ہے
تو اک تصور میں نقشہ میں ترا کھینچوں — آئینۂ دل تیری تصویر کے قابل ہے
جو داغ محبت میں دل لیئے بہار اُن سے — پھولوں سے تر و تازہ میرا چمن دل ہے
منزل پہ یقیناً میں پہونچوں گا خلیل اک دن — ہمراہ اگر میرے خضرِ رہِ منزل ہے

جناب یاور رائے پوری

برباد نہ کر دل کو تو با خبر دل ہے — فطرت کی امانت کا ظالم ہی حاصل ہے
اللہ رکھے جذبِ ہمت کی جوانی کو — ہر گام ہے منزل پر ہر گام پہ منزل ہے
طوفان حوادث کی پروا نہیں عاشق کو — ہر موج محبت کی آغوش میں ساحل ہے

(مختلف قوافی)

جناب مخمور جالندھری

لبریز تباہی سے یوں جادۂ ہستی ہے — ہیں زندگیاں خاموش اور موت برستی ہے
اُن کے قدم بوسیں دوشِ فلک پر ہوں — دنیائے محبت کی یہ رفعت و پستی ہے
میری تری عظمت میں کچھ فرق نہیں لیکن — نظروں کی بلندی ہے نظروں ہی کی پستی ہے
میخوار تمنا ہوں صہبا کش الفت ہوں — دل میں غم و حسرت کی انگڑائی بھی مستی ہے
تفسیر حقیقت ہے ہلکی سی جھلک اس کی — کیا کفر حسینوں کی تصویر پرستی ہے
ہے تیرے تجسس میں یہ شوقِ طلب میرا — میں منزلوں آگے ہوں پیچھے مری ہستی ہے
تقدیر کی حائل ہے مخمور مری ہستی — میرے لئے خود ان کی نظروں سے برستی ہے

ہمدرد ادب جناب نسیم گوالیاری

تجھ کو بھی خبر ہے کچھ کیا حال ہمارا ہے
طوفان کی کشاکش ہے موجیں ہیں کنارا ہے

یہ زیست عبارت ہے اک جہد مسلسل سے
سمجھا بھی کبھی تو کیا تار و رگ اشارا ہے

تو جذب رگِ جاں ہے رگ رگ سے نمایاں ہے
پوشیدہ نظر سے پھر کیوں تیرا نظارا ہے

فرقت میں مری آہیں اک نذرِ رنگیں ہیں
ہر اشک سر مژگاں ٹوٹا ہوا تارا ہے

پیوست رگِ جاں ہے وہ قلب میں پنہاں ہے
پنہاں مری ظلمت میں تابندہ ستارا ہے

ذرات بیاباں تک دامن میں نہیں آتے
واللہ نسیم اپنی تقدیر کا مارا ہے

جناب اجمل بنگلوری از بمبئی

ہے داغ مرے دل میں اور آنکھ میں آنسو ہے
آسودہ الفت ہوں ہر رنگ پہ قابو ہے

دنیا اسے کیا جانے دنیا اسے کیا سمجھے
ہر غنچہ ترا لب ہے ہر گل میں تری بو ہے

کھو کر تری الفت میں یہ راز کھلا مجھ پر
آغاز میں بھی تو ہے انجام میں بھی تو ہے

فردوس بداماں ہے دیوانے کی دنیا بھی
کس درجہ کرم فرما اے حسن ازل تو ہے

قائم ہی نہیں رہتا پیمانِ وفا ان کا
چلتا ہوا بادل ہے اڑتی ہوئی خوشبو ہے

اب زیست کے جو نغمے کہاں اجمل
سب تار شکستہ ہیں کب ساز پہ قابو ہے

جناب انجم احمد آبادی

اس دیدۂ حیراں کا کیوں غم تجھے انجم ہے
ہر رنگ کے جلووں میں جب کسی کی نظر گم ہے

یہ نقش حسیں جتنے ابھرے ہیں مٹیں گے سب
اک خواب کی صورت میں دنیا کی توہم ہے

وہ نغمۂ سرمد ہو یا بانگ انا الحق ہو
ہر ساز کے پردے میں تیرا ہی ترنم ہے

جلووں میں کہ جلووں کی تابانی دلکش میں
معلوم نہیں تاب نظارہ کہاں گم ہے

پھر پرورش اشک غم ہے شعلۂ پنہاں پر
پھر آگ کا پانی کا آپس میں تصادم ہے

غواص محبت کچھ احساس بھی ہے اسکا
دریائے محبت کی ہر موج تلاطم ہے

گاتا ہے کوئی انجم کیا سازِ رگِ جاں پر
کانوں کے قریں جیسے آوازِ ترنم ہے

جناب نصیر چھاؤنی مہو

روداد غم دل پھر آج ان کو سنانا ہے
رو رو کے ہنسانا ہے ہنس ہنس کے رلانا ہے

ہم کو تو "من و تو" کا جھگڑا ہی مٹانا ہے
یا آپ ہی کھونا ہے یا آپ کو پانا ہے

جو عشق میں مٹ جانا اک کھیل سمجھتا ہے
جانا ہے تو کچھ اس نے اس راز کو جانا ہے

انجام محبت ہے جلووں کی فراوانی
آغاز محبت میں کھونا ہے نہ پانا ہے

کچھ حسن کا قصہ ہے کچھ عشق کی باتیں ہیں
لے دیکے محبت میں یہ اپنا فسانہ ہے

پہلو میں نصیر اپنے دل ہے بھی تو وہ دل ہے
جس نے کہ محبت کے ہر راز کو جانا ہے

جناب قمر نعمانی سہسرامی

شاعر کی طبیعت کو بیخود جو بناتی ہے
میخانۂ فطرت سے کھنچ کھنچ کے وہ آتی ہے

ان چاندنی راتوں میں آوارگی نکہت
کچھ اور مرے دل کو دیوانہ بناتی ہے

اے ساکن دنیا تم غافل ہو مگر اس سے
راتوں کی خموشی میں آواز کچھ آتی ہے

کیا کیا نہیں ہوتی ہے پھر حسن کی حیرانی
تاثیر محبت کی جب رنگ دکھاتی ہے

اس عقل کی عظمت کا میں کیوں ہوں قمر منکر
جو رازِ محبت سے بیگانہ بناتی ہے

جناب احقر کائیتھوی از بھنڈارہ

پھر آج مری جانب وہ چشم فسوں گر ہے
پھر بزم تمنا میں ہنگامۂ محشر ہے

مہمان مرے دل میں پھر آج وہ کافر ہے
ہر ایک نظر جس کی چلتا ہوا نشتر ہے

پھر ذوقِ عبودیت مغرور نہ ہو جائے
پھر نقش کف پائے دلبر پہ مرا سر ہے

ممکن ہے کہ درِ معنی ہاتھ آئے مرے احقر
دریائے سخن کی اب تخئیل شناور ہے

جناب ضیا سنگالوی

اک درد سا اٹھتا ہے دل میں بھی جگر میں بھی
کیا جان پہ الفت کی جذبے نے بنائی ہے

اس کو بھی فلک کو بھی قدموں پہ جھکا دے تو
اے آہ اگر تجھ کو دعوائے رسائی ہے

یارب یہ ضیا تیرا سائل ہے تری در کا
سر اس کا ترے در پہ کشکول گدائی ہے

جناب مذاق سنکھیڑوی

وہ ذات ہے مستغنی دل جذب سے خالی ہے
وہ مجھ سے ملے آکر یہ خام خیالی ہے

دل غنچۂ ہستی تھا برباد کیا تو نے
اے باغ کے رکھوالے تو باغ کا مالی ہے

سب موت سے ڈرتے ہیں اے رہروِ محبت میں
دل موت سے ملتا ہے کیا ہمت عالی ہے

اصلاح سخن

ابطرفہ قریشی بھنڈاروی کی غزل پر حضرت احسن مارہروی مرحوم و مغفور کی اصلاح

جب سے تم ہو دل نشیں قابو میں میرا دل نہیں
~~اب کوئی پہلو تفوق کا مجھے حاصل نہیں~~ ۱ اب مری منزل حقیقت میں مری منزل نہیں

اشتیاق رہ نوردی کا جنوں
توبہ توبہ! ~~اعتبار حسن منزل کا فریب~~ ۲ جا کے منزل پر بھی میں سمجھا کہ یہ منزل نہیں

اے جنون عشق قدرے صبر کرنا چاہیے
ڈھکیدن
~~ٹھہر کچھ دن اے جنون عشق کچھ دن اور ٹھہر~~ ۳ ~~لائق~~ درخور صحرا ابھی دیوانگی دل نہیں

کیا غریق بحر فرقت کو وہ پہونچائیگا فیض
~~کیا کبھی آوارۂ قسمت کو یہ پہونچائیگا فیض~~ ۴ خود دُرِ مقصد سے پُرجب دامنِ ساحل نہیں

اِس عنایت ~~میں~~ بھی ہے گنجائش شکوہ ابھی ۵ درد تو تم نے دیا لیکن بقدر دل نہیں

تھیں بزمِ یار کی آرائشیں
~~تھی مرے ہی دم سے انکی بزم کو رونق نصیب~~ ۶ دنیا ہے میں نہیں تو کوئی بھی رونقِ دہ محفل نہیں

خوگرِ غم مجھ سا ~~جویائے~~ محبت میں کہاں
۷
وصل کا پیغام بھی وجہ سکونِ دل نہیں

توجیہ:-

۱- مصرع اولیٰ سے مصرع ثانی کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اصلاح سے دونوں مصرعے مربوط ہوگئے اور اب شعر بامعنی ہوگیا۔

۲- "اعتبارِ حسنِ منزل کا فریب" بے معنی ٹکڑا تھا۔ اصلاح بہت اچھی دی گئی ہے۔ منزل پر پہونچکر یہ سمجھنا کہ یہ منزل نہیں ہے۔ ایک قسم کا جنوں ہی ہوسکتا ہے۔ جیسے اشتیاقِ رہ نوردی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۳- مصرع اولیٰ میں "ٹھہر" "ٹھیر" نظم ہوا ہے جو غلط ہے۔ اسی لئے مصرع بدلنا پڑا۔ "لائق صحرائی" "درخورِ صحرا" بہت اچھا ہے۔

۴- مصرع اولیٰ میں "آوارہ قسمت" کا تعلق دُرِ مقصد اور دامنِ ساحل سے بے جوڑ سا تھا۔ اسی لئے فاضل استاد نے "غریقِ بحرِ فرقت" بنا دیا۔ ضمیر حاضر بھی غلط تھی یہاں ضمیر غائب ہی کی ضرورت تھی۔ اسی لئے "وہ" بنا دیا۔

۵- اس مصرع میں "میں" صحیح تھا۔ اس لئے کہ گنجائش کسی چیز میں نکلتی ہے، کسی چیز پر نہیں نکلتی لیکن پر "سے" "باوجود" کا پہلو نکل آیا یعنی باوجود اس عنایت کے بھی الخ

۶- "بزم کو رونق نصیب تھی" اچھا اندازِ بیان نہیں تھا۔ اصلاح سے مصرع صاف اور چُست ہوگیا۔

۷- "جویائے محبت میں" ایک بے معنی سی بات تھی۔ "دنیا" بنا کر شعر صحیح کر دیا گیا۔

ایڈیٹر

شخصیات

محسنِ ادب بابو ہر گوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ایڈووکیٹ اورئی

آج میں اُردو کے ایک ایسے بُزرگو شاعر کو شخصیات کے ذیل میں پیش کر رہا ہوں جو موجودہ دَور کے ہندو شعرا میں ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے حضرتِ نشتر ہنگامی کا وطنِ مالوف ہنگام ہے۔ آپ کے والد منشی جگل کشور آنجہانی قصبہ اورئی میں سکونت پذیر تھے اور وہیں وکالت کرتے تھے۔

حضرت نشتر جولائی ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۶ سال کی عمر میں آپ کو مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ ابتدائی تعلیم کی منازل آپ نے اپنی ذہانت اور طباعی کی وجہ سے بہت جلد طے کر لیں۔ اس کے بعد انگریزی کی تعلیم شروع کی میٹرک کا امتحان پاس کر کے آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوگئے، لیکن اپنے والد کی ناگہانی وفات کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ تادیر قائم نہ رکھ سکے اور کالج کو خیرباد کہدیا۔ اس کے بعد وکالت کا امتحان پاس کیا اور اورئی ہی کو اپنا مستقر قرار دیا۔ کچھ عرصہ بعد آپ ہائیکورٹ کے وکیل ہوگئے۔ پیشہ وکالت میں آپ کو اتنا عروج حاصل ہوا کہ بڑے بڑے پیچیدہ مقدمات آپ کے پاس آنے لگے، نیز بار ایسوسی ایشن کے آپ صدر بھی بنائے گئے اور آخرکار گورنمنٹ نے ایڈووکیٹ کی سند بھی عطا کر دی۔

حضرتِ نشتر ہنگامی کی شاعرانہ زندگی کے حالات بڑے طویل اور دلچسپ ہیں۔ آپ نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام "زخمِ خنداں" میں بہت شرح و بسط کے ساتھ ان حالات کو قلمبند فرمایا ہے۔ "شاعر" کے محدود صفحات میں اس تفصیل کا تو امکان نہیں ہے، میں اجمالاً اُن کے کلام اور شاعرانہ زندگی کے واقعات پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

زمانۂ طالب علمی میں آپ کو موسیقی سے غایت درجہ محبت تھی اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ مطلقاً فنا فی الموسیقی ہو کر رہ گئے۔ تعلیمی اوقات میں بھی آپ اکثر اپنے اس محبوب شغل کو جاری رکھتے تھے۔ جہاں بھی محفلِ نغمہ گرم ہوتی آپ اپنے والد سے چھپ چھپا کر وہاں ضرور جاتے۔ صاحبِ اختیار ہونے کے بعد آپ نے اس فن کو ایک ماہر موسیقی سے باقاعدہ طور پر حاصل کیا اور اکثر اپنے گھر پر بڑے بڑے مشہور مطربوں کو بُلا کر لطف اندوز ہوتے رہے۔

ہر چند شاعری اور موسیقی فنونِ لطیفہ کے دو قریبی عناصر ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک ماہرِ فنِ موسیقی شاعر بھی ہو، موزونیٔ طبع ایک فطری چیز ہے۔ یہ خداداد نعمت سب کو نہیں ملتی لیکن حضرتِ نشتر ہنگامی کو خدا نے ان دونوں نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ اسکول کی ابتدائی جماعتوں ہی میں آپ کو اُردو نظم میں ایک خاص قسم کا لطف حاصل ہونے لگا اور آہستہ آہستہ یہ ذوق شاعرانہ رنگ اختیار کر گیا۔ چونکہ فارسی اور اُردو آپ کے محبوب مضامین تھے، اس لئے فطری موزونیٔ طبع پر اور جلا ہوگئی۔ ادھر آپ کے شفیق استاد مولوی ہدایت اللہ صاحب کی توجہ نے شعری ذوق کو اور بھی ابھارا اور عروض کی باقاعدہ تعلیم دی۔ کالج کے تعلیمی زمانہ میں آپ بلاتکلف شعر کہتے تھے اور اکثر مشاعروں میں بھی شرکت فرماتے تھے۔ پیشۂ وکالت اختیار کرنے کے بعد آپ کو کچھ ایسا ماحول ملا کہ بعض واقعات سے متاثر ہو کر سلسلہ شعرگوئی ترک کرنے کے بعد بھی آپ اُس پر قائم نہ رہ سکے اور پہلے سے زیادہ اُس پر توجہ دینی ناگزیر ہوگئی۔ "شاعر" کے ماہانہ مشاعروں کی شرکت، اربابِ ادب کی حکیم عبدالرب صاحب رئیس بارہ بنکوی، مولوی عبدالرزاق صاحب بیخود سہسرامی اور منشی عبدالسبحان صاحب ناظر وغیرہ کے اصرار نے نشتر صاحب

کو شعر و شاعری پر اپنی تمام توجہ صرف کر دینے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ آپ نے اپنا ایک دیوان بھی ۱۹۳۴ء میں طبع کرایا۔ اب یہ ذوق اپنے پورے شباب پر تھا۔ "قصر الادب" سے آپ کا دیرینہ تعلق قائم ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۵ء سے آپ نے اپنا کلام حضرت مولانا سیماب مدظلہ کو دکھانا شروع کیا اور ۱۹۳۷ء میں "قصر الادب" سے آپ کے جدید و قدیم کلام کا ایک ستھرا اور مبسوط مجموعہ جس میں تین سو غزلیں ہیں "نشترکدہ" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ آپ کے پاس بڑی کثیر تعداد میں کلام موجود ہے۔

حضرت نشتر شاعری کے ارتقائی مدارج طے کرنے کے بعد اب اس مقام پر پہونچ گئے ہیں۔ جہاں استادانہ شان پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ آپ فطرتاً شہرت و نمود پسند واقع نہیں ہوئے ہیں، اس لئے بجز "شاعر" کے اور کسی رسالہ یا اخبار کو اپنا کلام نہیں بھیجتے۔ آپ کی زود گوئی کا یہ عالم ہے کہ جس وقت آپ غزل لکھنے بیٹھتے ہیں تو جذبۂ شعر گوئی ایک طوفانی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کلام میں پرکاری اور پختگی بدرجۂ اتم ہوتی ہے۔ آپ کے کلام میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو ایک حقیقی شاعر کے کلام میں ہونی چاہئیں۔ شگفتگی، برجستگی اور بالیدگی نشتر صاحب کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ سیدھے سادھے عام فہم اور دلنشیں اشعار ان کے کلام میں بڑی کثرت سے مل جاتے ہیں جن سے ہر پڑھنے والے کا ذوق تسکین ہوتا ہے۔ آپ کے تغزل میں چھچھورا پن اور عمومیت و غیر شائستگی کہیں نام کو نہیں ملتی۔ حقائق و معارف کی بھی نشتر صاحب کے کلام میں کمی نہیں ہے، کمی صرف اس بات کی ہے کہ وہ اپنے کلام کی شہرت و اشاعت پسند نہیں فرماتے ورنہ اس پروپیگنڈے کے دور میں جبکہ سینکڑوں شاعر چیخ رہے ہیں، اُن کا تغزل انھیں صفِ اوّل کے شعرا میں لا کر کھڑا کر دیتا۔ یہاں میں اُن کے چند منتخب اشعار پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں، یوں تو اُن کے کلام پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے ؎

اس حسن کی محفل میں ایسے بھی قرن آئے ہیں ‎ ‎ ‎ جب شمع تو ہوتی ہے پروانہ نہیں ہوتا

کوئی ابھی ابھی ہمیں دیوانہ کر گیا ‎ ‎ ‎ یہ بھی نہ دیکھ پائے کہ ظالم کدھر گیا

ایک دن کی بات ہو تو شوق سے رہ بیقرار
پھر نہ رات آئیگی اے دل پھر نہ ہوگی شام کیا؟

کعبہ سے دوستی نہ کلیسا سے دشمنی ‎ ‎ ‎ ہم جس ڈگر پہ چلنے لگے کام چل گیا

کچھ رنگ اور ہی ہے دلِ بیقرار کا ‎ ‎ ‎ کیا پھر قریب آگیا موسم بہار کا؟

زندگی جسطرح بھی کٹ جائے نشتر ٹھیک ہے ‎ ‎ ‎ چار دن کی بات ہی تکلیف کیا، آرام کیا

اللہ محبت کے وہ دن رات کہاں ہیں ‎ ‎ ‎ تنہائی میں بھی میں کبھی تنہا نہ ہوا تھا

آخر مری قناعتِ طوفاں فریب نے ‎ ‎ ‎ ساحل کو بحر، بحر کو ساحل بنا دیا

جبتک تھی تری چشمِ کرم ظرف پہ میرے ‎ ‎ ‎ میں شاکیِ کوتاہیِ داماں نہ ہوا تھا
ذہنیتِ ناقص نے کیا مائلِ تخریب ‎ ‎ ‎ انسان مکمل ابھی انساں نہ ہوا تھا
اس وقت سے ہمرازِ گل و لالہ ہوں نشتر ‎ ‎ ‎ جس وقت گلستاں بھی گلستاں نہ ہوا تھا

تھی لذتِ دیدار میں محویتِ کامل ‎ ‎ ‎ بے ہوش میں ہنگامِ تماشا نہ ہوا تھا

جو کچھ گذر رہے ہیں زمانے میں واقعات ‎ ‎ ‎ دو چار روز میں اُنھیں افسانہ دیکھنا

چارہ گر جس درد کی تو نے ابھی کی تھی دوا ‎ ‎ ‎ وہ تو پھر ہونے لگا ظالم دمِ دل کے قریب

جن کو امراض ہے مجھ پر کہ دلا جان اپنی ‎ ‎ ‎ وہ ہی جینے کی بتا دیں کوئی تدبیر مجھ کو
مجھ سے دنیا کا کوئی ذکر نہ للہ کرے ‎ ‎ ‎ خوب معلوم ہے دنیا کی حقیقت مجھ کو

اعجاز صدیقی

طرزِ نگارش

اُردو اخبارات و رسائل کی تحریری خامیاں اور اُنکی اصلاح

خامیاں	تصحیح	تصریح
سازحیات کی سُریں۔	سازِ حیات کے سُر۔	
بیساکہ مجھے آپ سے اُمید تھی۔	جیسی کہ مجھے آپ سے اُمید تھی۔	
ں نے بہ سرعت بر لبط اُٹھائی۔	اُس نے بہ سرعت بر لبط اُٹھایا۔	لہ بربط مذکر ہے
اجہ نگاری میں طاق ہیں۔	مزاح نگاری میں طاق ہیں۔	
روپیہ پیسے کے احتیاج کی ضرورت ہیں	روپیہ پیسے کی احتیاج نہیں۔	
ب سے اُن کا رُخ دیکھا ہے۔	جب سے اُن کا چہرہ دیکھا ہے۔	
سمانی بلاؤں میں انسان کو ر نہیں، خواہ کوئی کتنا ہی قوت دار ں نہ ہو، مقابلہ کا حامل نہیں ہو سکتا۔ رت جسے منہ اُٹھانے کی طاقت دیتی ہے کبھی نہیں گرتا۔	آسمانی بلاؤں سے انسان کو مفر نہیں خواہ کوئی کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو مقابلہ نہیں کر سکتا۔ فطرت جسے سر اُٹھانے کی طاقت دیتی ہے وہ کبھی نہیں جھکتا۔	
ہیں دوسرے ملکوں کی زندگی پر ں رشک آئیں۔	اُنھیں دیگر ممالک کی زندگی پر کیوں رشک آئے۔	
بے ہوئے نغمے ایک دن ضرور	ڈوبے ہوئے نغمے ایک دن ضرور	

اُٹھتے ہیں۔
بند پانی خود منہ پیدا کر لیتا ہے۔
موسم برسات[1] کی سُہانی رات۔
ہوائیں سائیں سائیں ہو رہی تھیں
جمیل نے جواب کا انتظار نہ دیکھتے ہوئے دروازے سے قدم باہر کیا اور چلا گیا۔
روپیہ پیسہ آنا جانا چیز ہے۔
برطانیہ کا ہر جوابی حملہ بلا سے بے ساماں ثابت ہو رہا ہے۔
آپ کی خفگی بہت دُکھ دہ[2] ہے۔
دل ڈوب اُٹھا ہے
دل میں نئی ارمان[3] پیدا ہوئی
دیدہ دلیری سے کام لیا
رحمتی فرشتے صبح کے وقت رحمت کرتے ہیں۔
اُلٹی منہ کے بل آئے گا۔
آہ و بکا کی[4] شور و شین۔
آجکل بہت غمی ہوں۔
پجاری نے سنکھ کو منہ سے لگایا اور فضا میں کچھ آوازیں دل ہلا دینے والی اُٹھا دیں۔
آج روٹی کا سوال ساری دُنیا کو ہے۔
کامیابی ہونا ہو گی تو ہو جائے گی۔
جیسے کوئی ہرن چھلانگتا ہو۔
کاناں پھوسی کی۔
اُس کی آنکھیں ڈب ڈب کرنے لگیں
دُور سا ایک دریچہ دکھلائی دیا۔

اُبھرتے ہیں۔
بند پانی خود راستہ نکال لیتا ہے۔
موسم باراں کی سُہانی رات۔
ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔
جمیل جواب کا انتظار کئے بغیر دروازے سے باہر چلا گیا۔
روپیہ پیسہ آنی جانی چیز ہے۔
برطانیہ کا ہر جوابی حملہ بلائے بے درماں ثابت ہو رہا ہے۔
آپ کی خفگی بہت تکلیف دہ ہے۔
دل ڈوب چلا ہے
دل میں نیا ارمان پیدا ہوا
بہادری سے کام لیا
رحمت کے فرشتے صبح کے وقت رحمت بھیجتے ہیں۔
اُلٹی منہ کے بل گرے گا۔
آہ و بکا کا شور و شین۔
آجکل بہت غمگین ہوں۔
پجاری نے سنکھ منہ سے لگایا اور کچھ دل ہلا دینے والی آوازیں فضا میں پھیلا دیں۔
آج ساری دُنیا میں روٹی کا سوال ہے۔
کامیابی ہونی ہو گی تو ہو جائے گی۔
جیسے کوئی ہرن چھلانگیں مارتا ہو۔
کانا پھوسی کی۔
اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔
اور ایک دریچہ دکھائی دیا۔

[1] برسات ہندی ہے اور موسم فارسی اس لئے مضاف مضاف الیہ نہیں ہو سکتے
[2] دُکھ ہندی ہے اس لئے اُس کے ساتھ دہ استعمال نہیں کر سکتے۔
[3] ارمان مذکر ہے۔
[4] شور و شین مذکر ہے

ایڈیٹر

مذاکرِ علمیہ

اُردو ٹکٹ، ادارۂ اشاعتِ اُردو نے جدت طرازی سے کام لیتے ہوئے اُردو زبان کی ترویج و ترقی کے لئے اُردو ٹکٹ کی اشاعت کی ہے یہ ٹکٹ لفافوں اور پوسٹ کارڈوں پر استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ ان ٹکٹوں کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ اُردو کے جلیل القدر ادبا اور شعرا کی تصاویر کو عوام سے روشناس کیا جائے۔ جن کی گودوں میں پرورش پاکر اُردو آج دنیا کی سب سے زیادہ دلکش، آسان اور شیریں زبان بن گئی ہے۔ ان ٹکٹوں پر اُردو کی ترویج و اشاعت اور ترقی کے متعلق چھوٹے چھوٹے جملے بھی لکھے ہوئے ہیں۔ ٹکٹوں کے ڈزائن دیدہ زیب اور خوبصورت ہیں۔ ابھی ان ٹکٹوں کی پہلی قسط شائع ہوئی ہے جس میں ۴۸ ٹکٹ ہیں۔ جن پر ۱۶ مرحوم ادبا اور شعرا کی تصاویر ہیں گویا ایک شاعر کے ۳ ٹکٹ ہیں جو چار بار استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ اور کل ٹکٹ ۴۸ لفافوں یا کارڈوں پر لگ سکتے ہیں۔ ہر اُردو داں کو ان ٹکٹوں کا خیر مقدم کرنا چاہیے اور اُن کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں استعمال کرکے اُردو زبان کو فروغ دینا چاہیے۔ ٹکٹوں کی پشت پر باقاعدہ گوند لگا ہوا ہے۔ بعض تصاویر کچھ پھیکی اور مدھم ہیں، ہمارے خیال میں اگر یہ سفید کاغذ پر چھاپی جائیں تو زیادہ موزوں رہیں گی۔ ۴۸ ٹکٹوں کی ایک کاپی کی قیمت صرف ۴ر ہے، ادارہ اشاعتِ اُردو لاٹوش روڈ لکھنؤ سے یہ ٹکٹ طلب کئے جاسکتے ہیں۔

لائل پور (پنجاب) میں اُردو کانفرنس، اطلاع ہے کہ بزمِ ادب لائل پور کے زیرِ اہتمام ۲۲ر، ۲۳ر اور ۲۴ر فروری کو اُردو کانفرنس منعقد ہوگی۔ اسی سلسلے میں ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی منعقد ہوگا۔ ابھی پروگرام شائع نہیں ہوا ہے، خدا کرے یہ کانفرنس کسی کارآمد نتیجہ کی حامل ہو اور گذشتہ کانفرنسوں کی طرح ایک وقتی ہنگامہ بن کر نہ رہ جائے۔ دہلی۔ کانپور اور بریلی میں اب تک جو اُردو کانفرنسیں ہوئیں ہیں، اُن میں بجز روپیہ کے صرف کے اُردو زبان کے لئے کوئی سودمند بات نہ ہوسکی۔ کاش یہ روپیہ اُردو زبان کی ترویج پر کسی اچھے پہلو سے صرف کیا جاتا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اربابِ کانفرنس ایسا نظامِ عمل کیوں مرتب نہیں فرماتے جو کسی ٹھوس عمل کی طرف لیجائے۔ مختلف متنازع فیہ عنوانات پر دو چار مقالات پڑھوا دینا، رندمشرب اور گلے باز شعرائے شراب و شاہد۔ ہجر و وصال اور گل و بلبل کے فرسودہ اشعار سُن لینے سے اگر اس دَورِ ترقی میں اُردو کانفرنس کا مقصد پورا ہوسکتا ہے تو خیر، ورنہ ہماری رائے میں اگر غور و فکر کے ساتھ نظامِ عمل مرتب کیا جائے اور حظِ نفس کے پہلو کو ذرا کم کردیا جائے تو یقیناً کوئی مفید کارچیز پیدا ہوسکتی ہے۔ ابھی ماہِ دسمبر میں کل ہند اُردو کانفرنس کانپور کے آل انڈیا مشاعرے میں جو حشرِ بدتمیزی برپا ہوا تھا اُس کے خیال سے آجتک لوگ کانوں پر اُنگلیاں رکھتے ہیں۔ ہمارا مقصد ان چند سطور سے کسی اُردو کانفرنس کی مخالفت مقصود نہیں ہے بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہنگامہ آرائی سے ہٹ کر اپنی زبان اور اپنے ادب کے لئے کوئی اچھا کام کیا جائے۔ یوں بیکار روپیہ برباد کرنے سے کیا فائدہ۔ ہماری رائے ہے کہ لائل پور اُردو کانفرنس میں بجائے مشاعرہ کے مناظمہ کا اہتمام کیا جائے اور ہندوستان کے ممتاز نظم نگاروں کو دعوت دی جائے۔

ڈاکٹر سر اقبال کے مزار کا تعویذ، کابل سے اطلاع آئی ہے کہ سر اقبال مرحوم کے مزار کا تعویذ جو کابل کے کارخانہ سنگ تراشی میں وہاں کی انجمن ادبی کے زیرِ اہتمام افغانستان کے نفیس اور قیمتی پتھر و سے تیار کرایا جارہا تھا اب بالکل مکمل ہوگیا ہے۔ اس تعویذ کا ڈزائن بہت خوبصورت ہے اور عنقریب ہندوستان پہونچنے والا ہے۔ یہ تعویذ بطورِ اظہارِ عقیدت پیش کیا جارہا ہے۔

ادارہ

اطلاع ضروری۔ فروری اور مارچ میں حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ میرے خاگرد" کی ترتیب میں مصروف رہیں گے اس لئے ان مہینوں میں صرف ضروری خطوط اور غزلیں بھیجی جائیں۔ غیر ضروری خطوط اور معمولی غزلیں بغیر جواب و اصلاح پڑی رہینگی۔ مولانا مدظلہٗ کے تلامذہ نوٹ کرلیں۔

پردۂ فلم

سی فلم کے تیار ہوچکنے اور سنیماؤں میں آجانے کے بعد اُس پر تنقید کرنا بعد از وقت ہے
لیکن آنے والے فلموں کے لئے مفید ہے

"بندھن" پر آزاد تنقید

فلموں کے مراکز اس وقت صرف دو ہیں۔ کلکتہ اور بمبئی۔ کلکتہ میں نیو تھیٹرز نے اور بمبئی میں بمبئی ٹاکیز، پربھات، منروا اور رنجیت فلم کمپنیوں نے اپنی صنعت فہمی اور کاردانی کا بہت اچھا ثبوت دیا ہے، ہر نیا فلم پہلے کلکتہ اور بمبئی میں دکھایا جاتا ہے لیکن جب تک شمالی ہند کی لسانی اور ادبی فضاؤں میں کسی فلم کو ہر جہت سے نہ پرکھا جائے اُس کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی بمبئی اور کلکتہ کے اخبارات ہر فلم کی صرف تعریف کرسکتے ہیں۔ اس لئے کہ اُنھیں معاوضتاً اشتہارات مل جاتے ہیں لیکن اُن کی آواز مستند نہیں مانی جاتی، البتہ شمالی ہند میں جہاں مستند ادبا اور اہل زبان فلم دیکھتے ہیں ہر فلم کا حسن و قبح کھل جاتا ہے۔

"شاعر" میں یہ باب اسی ضرورت سے کھولا گیا ہے کہ فلموں کی حقیقی اور اصلی کیفیات واضح کی جائیں اور انھیں لسانی ادبی اور نفسیاتی پہلو سے پرکھا جائے تاکہ اس قسم کی تنقیدیں آنے والے فلموں کے لئے ایک صحیح راستہ قائم کرسکیں۔

ایڈیٹر

"بندھن" سالِ گذشتہ کا ایک رومانی فلم ہے۔ جسے بمبئی ٹاکیز نے تیار کیا ہے۔ یہ فلم ہر بڑے اور متمدن شہر میں ہفتوں چلا ہے۔ فلم کی سیٹنگ اور فوٹوگرافی میں کوئی غیر معمولی اختراع تو نہیں ہے، لیکن کوئی بات زیادہ قابلِ اعتراض بھی نہیں۔ ایکٹر سب اچھے ہیں، خصوصاً لیلا چٹنس اور سرلش نے بہترین کام کیا ہے۔ اشوک اور دوسرے ایکٹر بھی اداکاری کے ماہر ہیں۔ مگر سرلش اور لیلا چٹنس نے اپنی حرکات و سکنات اور جذبات سے اس فلم میں جان ڈالدی ہے۔

فلم کی زبان نہایت سادہ مگر صحیح ہے اور ذو معنی مکالمے بہت دلچسپ ہیں، ایک گانا "چل چل رے نوجوان" تمام فلم پر چھایا ہوا ہے، جو تین جگہ مختلف اسالیب سے گایا جاتا ہے۔ "بول پپیہے بول" بھی رومانی اور مؤثر گیت ہے۔ "من بھاون من بھاون لو ساون آیا رے"۔ لیلا چٹنس خوب گاتی ہے۔ مگر اس "میں میں ہاری" کے گیت "آئے شبھ دن آئے سجنی آئے"۔ اور "گنگا کے اُس پار" جیسی روح کش اور دل موہنے والی موسیقی نہیں ہے۔ تاہم گانا اچھا ہے۔ "بندھن" کے تمام

گاؤں میں سازوں نے غیر معمولی دلچسپیاں پیدا کردی ہیں۔ معلوم نہیں اس کی داد دو ساز نوازوں میں سے کس کو دی جائے اور کون اس کا مستحق ہے؟

گانوں کے بعض بول البتہ نامناسب ہیں۔ ہیڈ ماسٹر اور بینا جہاں مل کر گاتے ہیں وہاں ہیڈ ماسٹر پوچھتا ہے "یہ دُور کی منزل سے مجھے کس نے پکارا؟" تو بینا جواب دیتی ہے "ممتا نے پکارا" —— حالانکہ بینا ہیڈ ماسٹر کی ماں نہیں محبوبہ ہے۔ اور چند گانوں میں بھی ایسے ہی بے جوڑ اور جھول ٹکڑے ہیں۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس فلم میں کئی جھول ہیں۔

(۱) رام کا کریکٹر قابلِ اعتراض ہے کہ وہ اپنی سگی بہن کو ہیڈ ماسٹر سے ملنے ملانے کی برابر کوشش کرتا رہتا ہے اور اپنی کامیابی پر خوش ہوتا ہے۔

(۲) ہیڈ ماسٹر کی گاڑی بینا کا خط ملنے کے بعد گانوں کی طرف واپس نہیں سیدھی چلی جاتی ہے۔ مگر ہیڈ ماسٹر صاحب ۸ بجے رات کو گانوں کے مدرسے میں موجود ہوتے ہیں۔

(۳) جب زمیندار ہیڈ ماسٹر سے گاؤں واپس آنے کا سبب پوچھتا ہے تو ہیڈ ماسٹر کوئی سبب نہیں بتاتا اور نتیجتاً گرفتار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ کہہ سکتا تھا کہ میں اپنے کچھ ضروری کاغذات یا روپیہ بھول گیا تھا اُسے لینے کے لئے آیا ہوں۔ یہ بالکل سامنے کی بات تھی۔

(۴) سرلیش ولایت سے آتا ہے مگر اس کے ساتھ اسباب میں صرف دو سوٹ کیس ہوتے ہیں بستر تک اس کے ساتھ نہیں ہوتا اور وہ دونوں سوٹ کیس بھی ٹرین سے اُتر کر گاڑی میں بیٹھتے وقت اس کے ساتھ نہیں دکھائے جاتے۔

جہاں یہ فروگذاشتیں ہیں وہاں چند رومانی اشارے بھی ہیں۔ زمیندار کے پانوں سے بینا کے ہاتھ سے گرے ہوئے پھول کا نادانستہ طور پر کچل جانا بھنورں کا اڑا دینا۔ رات کے سناٹے میں جھینگروں کی آواز —— وغیرہ۔

بحیثیتِ مجموعی فلم بہت اچھا ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ شمالی ہندوستان میں ابھی اس کی شہرت و قبولیت اور زیادہ ہوگی۔

ادارہ

عرق اکسیر اعظم (رجسٹرڈ)

پیٹ کے بیماری کی دوا

مثلاً پیٹ درد کرنا۔ پیٹ پھولنا۔ پیٹ میں میٹھا میٹھا درد رہنا۔ پیٹ میں گڑگڑاہٹ بے چینی ہونا قبض رہنا پتلا دست آنا کلیجہ میں درد اٹھنا۔ معدہ کی کمزوری کی وجہ سے غذا ہضم نہ ہونا بھوک نہ لگنا سینہ پر جلن معلوم ہونا ورم جگر ہونا تلی کا بڑھ جانا پیشاب زیادہ آنا۔ بار بار رہ کر آنا (جسکو ذیابیطس کہتے ہیں) دست اور متلی کیساتھ قے آنا (جسکو ہیضہ کالرا کہتے ہیں) موسمی بخار کا آنا۔ یا معدہ کی خرابی سے کوئی دوسری بیماری ہوجانا۔ مرض نیا ہو یا پرانا۔ خدا کے فضل سے عرق اکسیر اعظم۔ استعمال کرنے سے بالکل اچھا ہوجاتا ہے۔

قیمت فی شیشی۔ ایک روپیہ۔ تین شیشی قیمت دو روپیہ بارہ آنہ علاوہ محصول

سرٹیفکٹ :- جناب حولدار محمد زماں خانصاحب .... میسور اسٹیٹ سے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ میرے ایک دوست کو پیٹ کے درد اور دل کی دھڑکن کی شکایت تھی چنانچہ "اکسیر اعظم" کے پلانے سے فائدہ ہوگیا۔ دو شیشی "اکسیر اعظم" اور روانہ فرمائیے۔

نسوانی (رجسٹرڈ)

عورتوں کے پوشیدہ بیماری کی مفید دوا

آجکل ہر گھر میں عورتوں کو سفید رطوبت مثل دھات یا ٹیالے رنگ کا گاڑھا لیس آتے رہنے کی شکایت ہوجاتی ہے۔ جس کی وجہ سے بدن کمزور۔ رنگ پیلا۔ ہاتھ پیر میں جلن، دماغ میں چکر۔ آنکھ تلے اندھیرا آجایا کرتا ہے۔ ٹانگ میں درد۔ کمر میں درد۔ بھوک بند طبیعت میں سستی رہتی ہے حمل گرجانے مرد سے گھبرانے۔ کمزور اولاد پیدا ہونے کی شکایت رہتی ہے۔ **نسوانی** ان سب بیماریوں کے لئے تین شیشی استعمال کرانے سے عورتوں کی جملہ شکایت انشاء اللہ دور ہوجائیگی۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ۔ تین شیشی قیمت دو روپیہ بارہ آنہ علاوہ محصول

دہلی کے امام صاحب نسوانی کی تعریف لکھتے ہیں

جناب مولوی محمد ریاض الدین صاحب، پیش امام۔ دہلی سے تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کی کمپنی سے دوا النسوانی جس کسی کو بھی ہم نے منگا کر دی۔ اس کو پورا فائدہ پہونچا۔ اس لئے پھر تین شیشی نسوانی اور روانہ فرماکر مشکور فرمائیے۔

فرمائش لکھتے وقت "شاعر" کا حوالہ دیجئے

ملنے کا پتہ ایس۔ اے۔ بی بخشی کمپنی گھڑی والی کوٹھی ۸ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

(اعجاز حسین صدیقی پرنٹر و پبلشر نے رفاہ عام پریس ہینگ، کی منڈی میں چھپواکر قصر الادب نائی آگرہ سے شائع کیا)

علم وادب کی بہترین کتابوں کا ذخیرہ

افسانے

- سرگذشتِ اسیر
- سمندر کی خداوندہ
- محمودہ
- فسانۂ سلطنتِ مغلیہ
- طوفانِ زندگی
- عروجِ زندگی
- دنیا
- شیطان کا پنجہ
- عبرت کدہ
- خانقاہِ اسرار
- چندر کی دیوی
- مغربی دلہن
- بدرِ کمال
- بالشوک شہزادی
- انارکلی
- جنات کی شہزادی
- پر پرواز
- شیطان زادہ
- شیطان کا چرخہ
- دوست

تصانیف ل۔ احمد

- انشائے لطیف
- نغمات
- محبت کا افسانہ
- زندگی کے کھیل

تصانیف شوکت تھانوی

- بحرِ تبسم
- موجِ تبسم
- سیلابِ تبسم
- طوفانِ تبسم
- منشی جی

ناول مولانا شرر لکھنوی

- ملک العزیز ورجنا
- منصور موہنا
- فردوسِ بریں
- دلکش کابل
- بدرالنسا کی مصیبت
- فلورا فلورنڈا
- حسن بن صباح

تاریخی

- تاریخ کا روشن پہلو
- حکایاتِ کشمیر
- کشمیر کی رانیاں
- معمارانِ کعبہ
- عروجِ ترکی
- کشمیر کا مستقبل
- ترکانِ احرار
- اشرف التواریخ مکمل
- خضرِ منزل
- خلافتِ الٰہیہ
- انقلابِ فرانس

ادبی

- ترکی زبان
- انشائے محبت
- ادبی موتی چار حصے
- نہالستانِ نثار
- انشائے تبجر
- مضمون نگار

عورتوں کے لئے

- بہشتی جھومر
- عقیلہ بیگم
- معین الخواتین
- زنانہ خطوط
- کفایت شعاری
- لوری نامہ
- گھر لکشمی گھر والی
- شوہر کی نصیحتیں
- آدابِ نسواں
- ثریا بیگم
- صبر کی دیوی
- ناصحِ مشفق
- سہیلی نامہ
- انشائے نسواں
- اصلاح الرسوم
- آفتابِ زندگی
- شبابِ زندگی
- چاند تارے

سوانح عمریاں

- امت کی مائیں
- بنت الرسولؐ
- سوانح خاتونِ جنت
- سوانح امام حسنؓ
- سوانح امام حسینؓ
- فاطمہ کا لال
- سوانح حضرت صدیق اکبرؓ
- سوانح حضرت عمر فاروقؓ
- سوانح حضرت علیؓ
- سوانح امام اعظمؒ
- تذکرہ صابرؒ
- سوانح خواجہ غریب نوازؒ
- سوانح غوث پاکؒ
- مناقب غوث گوالیاریؒ
- تحفہ دربار علائی صابرؒ
- خمخانۂ برکات
- قصص الانبیا
- حیاتِ خواجہ
- تذکرہ نوجوانانِ جنت
- سوانح اورنگ زیب
- سوانح زیب النساء
- سوانح اکبر اعظم
- سوانح نورجہاں بیگم
- سوانح غازی محمد بن قاسم
- حیاتِ انیس
- حیاتِ سعدیؒ
- حیاتِ حافظؒ
- حیاتِ حاتی اکبرآبادی
- خالدہ ادیب خانم
- حیاتِ خسرو
- سوانح خیامؒ
- حیاتِ فردوسی

مشہور شعرا کے دیوان

- دیوانِ غالب (انتخاب)
- غزلیاتِ امیر
- انتخاب کلام اکبر الہ آبادی
- دیوانِ اکبر داناپوری
- دیوان [illegible]
- کلام داغ (انتخاب)
- بہارِ معرفت
- دیوانِ حافظ

تصانیف مولانا حالی

- مسدس حالی (عکسی)
- مسدس حالی (سادہ)
- مرثیہ غالب
- مناجاتِ بیوہ
- شکوۂ ہند
- حبِ وطن
- تصویرِ درد

تصانیف ڈاکٹر اقبال

- شکوہ جواب شکوہ
- شمع و شاعر
- فریادِ امت
- اکبر و اقبال
- نالۂ یتیم

مذہبی

- جوازِ تعزیہ
- ارشادِ احمدؐ
- قومی نظم
- تقویم الاسلام
- کمالاتِ قرآنی

صنعتی

- اسرارِ صنعت
- دولت کا ڈھیر
- چائے کی حکایت

طالبانِ فن اور شائقین شعر و سخن کو نویدِ نَو

اُردو زبان کا بے نظیر لغت

معین الشعرا

مصنفہ غلام حسین خاں آفاق بنارسی مرحوم

یہ وہ عدیم المثال لغت ہے جس میں عربی۔ فارسی۔ اُردو۔ انگریزی اور ہندی زبان کے ہزاروں الفاظ کے معنی کے علاوہ ہر لفظ کے اعداد ملفوظی صحت کیساتھ درج کئے گئے ہیں جو تاریخ نکالنے میں معاون ہوتے ہیں ہر لفظ کے متعلق یہ بھی درج ہیں کہ وہ کس زبان کا ہے اور مذکر ہے یا مؤنث نہ صرف یہی بلکہ اساتذہ ماضی و حال کے کلام سے ہر لفظ کی تذکیر و تانیث کا ثبوت بھی پیش کیا گیا ہے حقیقتاً یہ لغت طالبانِ ادب و فن کے لئے خضرِ راہ ہے کتابت طباعت بہترین حجم ۳۸۶ صفحات مع تصویر مصنف $\frac{۲۲×۱۸}{۱۶}$ سائز جلد خوشنما اور مضبوط کاغذ دبیز اور چکنا۔ قیمت صرف چار روپیہ چار آنہ۔

محصول ذریعہ وی۔ پی ۱۲ر

منظور شدہ محکمہ ہائے تعلیم برار و ریاست میسور

نگارہ

تصاویر۔ افسر الشعرا حضرتِ آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم (شباب و شیب)

جلد ۱۲ ماہنامہ "شاعر" آگرہ اپریل سنہ ۱۹۴۱ء نمبر ۴

چندہ سالانہ عوام سے ۳ خواص سے ۶ محسنین سے ۱۲ معاونین سے ۲۴ زیبان سے ۵ ہمدردوں سے ۱۲ فی پرچہ ۴

محسنین معاونین، انیسان و ہمدردانِ شاعر

محسنین ادب

(۱) محسن ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ۶۰ عـہ سالانہ

(۲) محسن ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیتر خورجوی ۶۰ عـہ سالانہ

(۳) محسنہ ادب ہرہائینس علیہ حضرت کتیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ عـہ سالانہ

(۴) محسن ادب جناب محترم خان شبری امام الدین خانصاحب مستان ورسوا دربار پاجوڑ ۶۰ عـہ سالانہ

(۵) محسنہ ادب شہزادی تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ عـہ سالانہ

معاونین ادب

(۶) معاونِ ادب مسٹر اے۔ بی فلپس صابر اکبر آبادی بی۔اے ۲۴ عـہ سالانہ

(۷) معاونہ ادب محترمہ نجمہ تصدق بی۔اے۔بی۔ٹی ۲۴ عـہ سالانہ

(۸) معاونِ ادب جناب مولوی محمد احمد صاحب رسوا سہارنپوری ۲۴ عـہ سالانہ

انیسانِ ادب

(۹) انیسِ ادب جناب سید تفضل کریم صاحب جمشید پوری ۱۵ عـہ سالانہ

ہمدردانِ ادب

(۱۰) ہمدردِ ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلیمان جالندہری ۱۲ عـہ سالانہ

(۱۱) ہمدردِ ادب جناب سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری ۱۲ عـہ سالانہ

(۱۲) ہمدردِ ادب جناب بابو عبدالعظیم خانصاحب رونق دکنی ۱۲ عـہ سالانہ

(۱۳) ہمدردِ ادب جناب نوابزادہ کنور شکور حسین خانصاحب قیس آف ہنڈوہ ۱۲ عـہ سالانہ

(۱۴) ہمدردِ ادب جناب مولوی محمد قاسم صاحب نامی علوی دربھنگوی ۱۲ عـہ سالانہ

(۱۵) ہمدردِ ادب جناب صاحبزادہ سید مظفر حسین صاحب گوہر زمیندار (وان ادہام) ۱۲ عـہ سالانہ

خاصانِ ادب

(۱۶) جناب صاحبزادہ سلطان حامد خانصاحب ثروت گلشن آبادی صہ سالانہ

(۱۷) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمان خانصاحب شفق ٹونکی صہ سالانہ

(۱۸) جناب عبدالحفیظ صاحب ثمر صدیقی چھپراوی بی۔اے صہ سالانہ

۱۹ جناب محمد سعید خانصاحب ادب صہ سالانہ

(۲۰) جناب لالہ گنگارام صاحب آبد سرہندی صہ سالانہ

(۲۱) جناب سید مظفر حسین صاحب عرشی دہلی صہ سالانہ

(۲۲) جناب دلبراج صاحب شرما بی۔سی۔ڈی فرخ صہ سالانہ

(۲۳) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی صہ سالانہ

(۲۴) جناب صاحبزادہ عبدالحمید خانصاحب بہادر عباسی بی۔اے صہ سالانہ

(۲۵) جناب ماسٹر حسن خانصاحب اثر صہ سالانہ

(۲۶) جناب نذیر احمد صاحب نذیر شیرکوٹی صہ سالانہ

(۲۷) جناب محمد صبغتہ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی صہ سالانہ

(۲۸) جناب صاحبزادہ سیٹھ اکبر علی صاحب صہ سالانہ

(۲۹) جناب محبوب حسن صاحب آسی متوطن رڑکی۔ بمبئی صہ سالانہ

(۳۰) جناب مخدوم سید علی اسد نقوی البخاری احمد آبادی (جھنگ) صہ سالانہ

(۳۱) جناب طالق ہمدانی لدھیانوی صہ سالانہ

(۳۲) جناب سبحان خاں صاحب غافل جتول صہ سالانہ

(۳۳) جناب شیخ اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی۔ کوٹاہہ صہ سالانہ

(۳۴) جناب حبیب حسن خانصاحب حبیب شاہجہانپوری از کوئٹہ صہ سالانہ

(۳۵) جناب بابو فقیر محمد خانصاحب عارف سیالکوٹی از کوئٹہ صہ سالانہ

(۳۶) جناب فیض پرشاد صاحب برگ باندہ صہ سالانہ

(۳۷) جناب ہدایت اللہ خاں صاحب شجر کوٹی صہ سالانہ

جرعات

ماتمِ سلیمان

یوں تو ہندوستان سے آئے دن مشہور شخصیتیں اٹھتی جا رہی ہیں جن کا جواب پیدا ہونا مشکل ہے، ڈاکٹر اقبال کے بعد دوسری عظیم المرتبت شخصیت سر شاہ سلیمان جج فیڈرل کورٹ، وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی وفات ایک ایسا نقصانِ عظیم ہے جس کی تلافی اب صدیوں تک نہیں ہو سکتی۔ سر شاہ سلیمان مرحوم مسلمانوں میں غیر معمولی قابلیت اور عظمت کے حامل تھے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ کو بھی انھوں نے اپنی ذہنی قوتوں اور علمی بیداریوں سے جھنجوڑ دیا تھا۔ مرحوم کی خصوصیات اور علمی و ملی خدمات کو اگر قلمبند کیا جائے تو ایک مبسوط کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ اُن سے ملنے والے، اُن کے پاس بیٹھنے والے اور اُن سے مستفیض ہونے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہونچی ہوئی ہے، اُن میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو غیر معمولی طور پر اُن کے اخلاق سے متاثر نہ ہوا ہو، جہاں وہ ایک قابل ریاست داں اور ممتاز قانون داں تھے وہاں فلسفہ اور سائنس میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ادب سے بھی نہیں گہرا شغف تھا۔ سیکڑوں ادبی جلسوں اور مشاعروں کی صدارت فرما چکے تھے، الٰہ آباد میں جب بھی کوئی بڑا مشاعرہ ہوا اُس کے بعد مرحوم نے اپنے دولت کدہ پر ایک مخصوص صحبت کا ضرور انتظام کیا۔ شعر اتنا اچھا سمجھتے تھے کہ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور ہندوستان کی مردہ قوموں کو توفیق دے کہ وہ اِن کی یاد تازہ رکھ سکیں۔

یومِ شاعر

۲۹، ۳۰ مارچ کو دہلی میں افسر الشعرا حضرتِ آغا شاعر مرحوم و مغفور کی یاد میں "یومِ شاعر" منایا گیا۔ آغا شاعر مرحوم ہندوستان کے ممتاز اور مشاہیر شعرا میں سے تھے امید کہ اُن کی یہ یادگار ہر سال بڑے پیمانہ پر منائی جائیگی۔ "شاعر" کی اس اشاعت میں مرحوم کے مختصر حالات مع تصاویر شائع کئے جا رہے ہیں۔ مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام بھی اکثر "شاعر" میں شائع ہوتا رہتا ہے، آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا

مشاعرۂ "شاعر"

اپریل کے مشاعرہ کے لئے جو مصرع دیا گیا تھا وہ جنابِ شفیق کوٹی کا تھا۔ اُن کا پورا شعر یہ تھا ؎

جلوؤں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

شفیق صاحب اور دیگر شعرا مشاعرہ میں دیکھیں گے کہ بعض دوسری غزلوں میں بھی یہ شعر موجود ہے۔ چونکہ اس خیال میں بہت عمومیت ہے اس لئے توارد پر تعجب نہیں ہونا چاہئے اور نہ ایسے سرقے کے ذیل میں لانا چاہئے اس لئے کہ ہر شخص نے بغیر کسی دوسرے کی غزل دیکھے ہوئے غزل بھیجی ہے۔ مندرجہ بالا مطلع کے علاوہ اور بھی اشعار ملتے جلتے نظر آئیں گے اور مصرعے تو بہت سے لڑ گئے ہیں۔ یہ سب مصرعِ طرح کی وجہ ہے، شعرا نے مصرع کو آسان سمجھ کر سامنے کے خیالات نظم کر دئے ہیں۔ ہمیشہ آسان مصرع پر زیادہ سے زیادہ غور و فکر کے بعد غزل کہنی چاہئے اور سامنے کے خیال کو کبھی نظم نہ کرنا چاہئے۔

اس مرتبہ میں اپنی بے پناہ مصروفیتوں کی وجہ سے رسائل کا مطالعہ نہ کر سکا۔ اسی لئے "طرزِ نگارش" سے شاعر کے صفحات خالی ہیں۔ آئندہ اس کی تلافی کی کوشش کروں گا۔ ادبی خطوط اور ادبی لطائف جو گذشتہ اشاعت میں شائع ہوئے تھے وہ بھی دفتر میں آ چکے ہیں آئندہ اشاعت سے یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا۔

تبریکِ ازدواج

ادارہ نے بڑی مسرت کیساتھ یہ اطلاع سُنی کہ محترمہ ادب شہزادی بلند اقبال تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ دام اقبالہا کی شادی بڑی شان و شوکت کے ساتھ ۱۲ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء کو بھوپال کے شاہی خاندان کے ایک رکنِ اعلیٰ عالیجناب صاحبزادہ محمد امیر میاں باتقابہ کیساتھ ہو گئی۔ جسمیں راجہ اور نواب شریک تھے۔ تمام ریاست خوشیوں اور مسرتوں سے معمور تھی۔ اعلیٰحضرت نواب صاحب بہادر دام اقبالہٗ نے تمام شاہی روایات و خصوصیات کے ساتھ اس تقریبِ سعید کا اہتمام فرمایا۔ ادارہ اعلیٰحضرت نواب صاحب بہادر دام اقبالہٗ، تمام شاہی خاندان اور خصوصیت کے ساتھ محترمہ ادب شہزادی بلند اقبال تاج بخت صاحبہ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔ خدا شہزادی صاحبہ کو تمام عمر مسرتوں سے ہمکنار رکھے اور جاہ و اقبال میں بلندیاں عطا فرمائے، شہزادیٔ عالیہ کو علم و ادب اور شعر و سخن سے بیحد ذوق ہے۔ خود بھی شعر بہت اچھا کہتی ہیں، ادارہ عنقریب اُن کے کلام کی اشاعت کی مسرت حاصل کرے گا۔

اعجاز صدیقی

تجزیہ :-

زیرِ نظر اشاعت کے بعض مضامین پر ایک نظر

لسانی تبدیلیوں کے چند اصول - ہر چند یہ مضمون بہت مختصر ہے لیکن اپنی جگہ پر از معلومات ہے۔ مولوی محمد ابو اللیث صاحب صدیقی ایم-اے (علیگ) نے جہاں لسانی تبدیلیوں کے اصول پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی ہے، وہاں مثالاً مختلف زبانوں کے الفاظ بھی دیدیے ہیں جن میں کسی نہ کسی نہج سے تغیر و تبدل کیا گیا ہے۔ الفاظِ متذکرہ کے علاوہ سیکڑوں الفاظ ایسے مل سکتے ہیں جن کے تغیر کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ الفاظ کی تحقیق کے سلسلے میں محققین آئے دن معلوم شدہ الفاظ میں کچھ نہ کچھ اضافے ہی کرتے رہتے ہیں۔

ماہ مئی ۱۹۴۱ء کے لئے جناب ابو الاسرار رمزی آثادہ کا ایک مضمون "علم اللغت" کے عنوان سے وصول ہو چکا ہے۔ یہ مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ رمزی صاحب نے ایسے الفاظ کی ایک کثیر تعداد اپنے مضمون میں جمع کر دی ہے۔ جن میں تغیر و تبدل کیا گیا ہے اور وہ مختلف زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔

ولی پر ایک نظر - یہ مضمون بابائے ریختہ ولی دکنی کے تغزل پر سیر حاصل نہیں تو ایک بڑی حد تک نقد و فکر کا درجہ ضرور رکھتا ہے۔ ابو مسلم صاحب نے تغزل کی نمایاں خصوصیات کو سامنے رکھکر اس پر ولی کے اشعار کو پرکھا ہے۔ بطورِ ثبوت انھوں نے جو اشعار دئے ہیں، وہ اپنی جگہ واقعی ولی کی امتیازی شان ظاہر کرتے ہیں۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ ہمارے ادیب ریختے کے اس موجد کو تحقیق کی روشنی میں لاکر نئی زندگی عطا کر رہے ہیں۔ گذشتہ چند سالوں میں ولی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھے جانے کی امید ہے۔

مدیرِ شاہین اور دستور الاصلاح - صاحبانِ نقد و فکر کے لئے یہ مضمون بڑی جاذبیت رکھتا ہے۔ مولانا آلم مظفر نگری مستحقِ داد ہیں کہ انھوں نے گالی کا جواب گالی سے نہیں دیا جو آجکل تنقید کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ مضمون کی سنجیدگی نے مجھے اس کی اشاعت پر مجبور کیا ہے مولانا سیماب نے دستور الاصلاح ہرگز اس لئے تصنیف نہیں فرمائی کہ اس سے کسی کی کسرِ شان ہو بلکہ بھٹکے ہوئے مسافروں کو سیدھے راستے پر لگانا مقصود تھا۔ معدودے چند تنگ بیں اور حاسد طبیعتوں کے علاوہ، تمام اساتذۂ فن، ادبا، رسائل اور اخبارات نے اس کی افادیت کا اعتراف کیا ہے۔ مجھے تو افسوس اس بات کا ہے کہ خود تو اربابِ علم کو اس کی توفیق نہیں ہوئی کہ عام بے راہ روی دور کرنے کے لئے اور نوجوان شعرا کو صحیح راستہ دکھانے کے لئے کوئی بنیادی چیز پیش کرتے اب جبکہ مولانا سیماب اس اہم خدمت کو انجام دے چکے ہیں۔ تو اس پر خواہ مخواہ لے دے ہو رہی ہے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اگر دستور الاصلاح کی کسی چیز سے اربابِ علم کو اختلاف تھا تو وہ نیک نیتی کے ساتھ باہم مبادلۂ خیال کر لیتے اور اگر واقعی کوئی ایسی چیز ہوتی تو اس کا ازالہ آئندہ ایڈیشن میں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن حسد کی آگ اور طبیعت کے اوچھے پن کو کیا کیا جائے، چنانچہ "شاہین" کی تنقید کے پردے میں جو شخصیتیں نہاں ہیں ان کا علم میری طرح دوسروں کو بھی ہو چکا ہے، امید کہ وہ جوابِ تنقید پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔

دل کی گہرائیاں - پروفیسر عبید اللہ قدسی نہ صرف ایک بلند مرتبت ادیب ہی ہیں بلکہ ترقی یافتہ افسانہ نگار بھی ہیں۔ موصوف کا یہ افسانہ نفسیاتی حیثیت سے ایک ایسا شاہکار ہے جو واقعی دلوں کو چھوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ زبان و بیان کی ندرت نے مل جل کر اس افسانہ کو ایک بلند چیز بنا دیا ہے۔

دوسری دنیا - ایک بہت دلچسپ اور اثر انگیز داستانِ محبت ہے۔ واقعات کے اعتبار سے افسانہ پڑھنے میں جاذبیت ہے، نہ صرف یہی بلکہ فاضل مترجم کی تحریر نے بھی اس میں نقش آفرینی کی ہے۔

انعام - جاوید کوہستانی پہلی بار بزمِ شاعر میں شریک ہو رہے ہیں۔ اس افسانہ کا داخلی پہلو بیکاری ہے یہ غریبی، مفلسی اور بھوک پیاس کی کشمکش، عیش و عشرت کے خواب کی ڈراؤنی تعبیر، جذباتِ رحم کی شدت اور تعلیم یافتہ طبقہ کی بے بسی کی ایک المناک داستان ہے۔

حصۂ نظم - اس اشاعت میں جہاں اچھے علمی اور ادبی مضامین اور دلچسپ افسانے ہیں وہاں حصۂ نظم بھی متنوع، بلند اور معیاری ہے، مولانا سیماب کی نظم "خدا کہاں ہے"، ایک ایسی حقیقت آشکار نظم ہے جس کو تمام ہندوستان نے پسند کیا ہے، لوگوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر یہ نظم شائع کی جا رہی ہے دوسری خاص نظم "باغی تتلیاں" ہے۔ جناب رمزی آثادی نے اپنی نظم میں جس شعلہ کاری سے کام لیا ہے اور مخلوط تعلیم پر جو ناقدانہ نظر ڈالی ہے وہ اپنی جگہ بہت خوب ہے جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے اس میں مرد اور عورت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ مخلوط تعلیم میں بے انتہا نقصانات ہیں۔ رہا غیر ضروری پردہ کا سوال تو ماحول اور وقت اب ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا کہ زیادہ عرصہ تک ہم اپنی خواتین کو چار دیواریوں میں بند رکھیں اور نتیجتاً اپنی آئندہ نسلوں کو تندرستی، آزادی اور بلند حوصلگی سے محروم کر دیں۔ مسلمانوں میں جس پردہ کا حکم ہے اس کا منشا ہرگز گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر بیٹھنا نہیں ہے۔ ❋

صفحۂ جنگ سے

(نفسیاتی اشارات)

تغیر سر ایک حال و رُوداد میں ہے
تسکین کہاں عالمِ ایجاد میں ہے
ہر چیز فنا و نیست ہونے کے لئے
آمادہ اِس انقلاب آباد میں ہے

یہ گرم روئ جنگ گھٹ جائے گی
یہ ظلمتِ دار و گیر چھٹ جائے گی
جس پر چلتے ہیں سب سیاسی چالیں
اِک دن یہ بساط ہی اُلٹ جائے گی

اب اور فضا ہے مغربی محشر کی
مٹتی جاتی ہے خودسری خودسر کی
کی یو گوسلاویہ نے اطاعت نہ قبول
پہلی یہ شکستِ فاش ہے ہٹلر کی

گولوں سے جو احتراق پیدا ہوتا
دنیا کا مزاج اسیرِ سودا ہوتا
کرتے نہ سمندر اگر اس آگ کو جذب
کیا حال خدا جانے زمیں کا ہوتا!

معلوم ہے ہندیوں کی کوشش مجھکو
معلوم ہے اِن کی جہد و کاوش مجھکو
سنتا ہوں کبھی جو کارنامے ان کے
ہوتی ہے خوشی کے ساتھ نازش مجھکو

اُردو ہی زبان ہے پرانی اپنی
ہے اس سے مسلّم ہمہ دانی اپنی
اٹلی۔ جاپان۔ مصر۔ جرمن۔ ٹرکی
اُردو میں سُناتے ہیں کہانی اپنی

دیتی ہے عنا کو جوانی اُردو
لیتی ہے خراج خوش بیانی اُردو
یورپ اور ایشیا پہ ہے چھائی ہوئی
کرتی ہے جہاں پہ حکمرانی اُردو

پُر حوصلۂ و ثبات در بر نکلا
پا مرد توقع سے فزوں تر نکلا
یاجوج کی طرح اہرمن کا تھا خروج
یونان مگر سدِّ سکندر نکلا

جو قوم دغا باز و جفا پیشہ ہے
اُسکے لئے وقت دست بر تیشہ ہے
یہ ہے اثرِ شماتتِ ہمسایہ
اٹلی کے وجود کو بھی اندیشہ ہے

سب ہوں گے وہ کام ہیں جو ہونے والے
نقصان بھرینگے وقت کھونے والے
یہ جنگ ہے اک نہیبِ فطرت یعنی
بیدار ہوئے غفلت [illegible]

سیماب

شخصیات :- افسر الشعرا حضرتِ آغا شاعِر قزلباش دہلوی مرحوم و مغفور

آغا صاحب ۵ مارچ ۱۸۷۱ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا شجرۂ نسب ایران کے شاہی خاندان شہزادہ احمد سے ملتا ہے۔ آپ کے آبا و اجداد دہلی آکر مقیم ہوئے۔ یہیں آپ نے تعلیم و تربیت پائی۔ آپ بچپن ہی سے شوخ اور طبّاع واقع ہوئے تھے۔ نواب احمد سعید خاں صاحب طالب کے فیضِ صحبت اور مرزا شجاع الدین خاں تاباں کی حوصلہ افزائی نے اس میں اور بھی چار چاند لگا دیئے۔ چنانچہ آپ دہلی کے مشاعروں میں بڑی شان سے شرکت فرماتے تھے۔ ایک ایک دن میں پانچ پانچ سو اشعار کہہ کر شاگردوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد جہاں استاد بلبلِ ہند فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی کے شاگرد ہوگئے اور اُن کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوئے۔ اس وقت کے اساتذہ مثلاً مولانا حالی۔ ظہیر۔ مجروح۔ طالب۔ ثاقب۔ راسخ اور برتر وغیرہ اُن کی ذہانت۔ طبّاعی اور سلاستِ کلام کے معترف تھے۔

آپ نے سب سے پہلے اخبار "وکیل" امرتسر میں ایڈیٹری کے فرائض انجام دیئے۔ کچھ عرصہ آپ کلکتہ میں بیگم صاحبہ مرشدآباد کے داماد نواب نصیر الملک قونصل جنرل ایران کے پاس رہے۔ اسی زمانہ میں گورنمنٹ ایران کی طرف سے "افسر الشعرا" کا خطاب ملا۔ اس کے بعد آپ حیدرآباد دکن میں بھی رہے اور وہاں بھی اپنی زباں دانی کا سکہ بٹھایا۔

باعتبارِ سیرت آغا شاعر مرحوم بہت خوش اخلاق۔ بذلہ سنج۔ ملنسار اور منس مکھ انسان تھے جو ایک بار اُن سے مل لیتا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا وضع قطع کے اعتبار سے جوانی کے عالم میں کیا اور بڑھاپے میں کیا اُن کا ہمیشہ ایک ہی انداز رہا۔ بلند قامت۔ بھرا ہوا بدن۔ رعب دار چہرہ۔ بڑی بڑی مونچھیں۔ کشادہ دامن عبا اور اپنے قد سے اونچا عصا، غرض وہ کلاً اسلاف کا جیتا جاگتا نمونہ معلوم ہوتے تھے۔

ان کی شاعری دہلی کی ٹکسالی زبان کا نادر نمونہ ہے۔ فصاحت۔ سلاست۔ روزمرہ اور محاورات اُن کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ غزل سرائی میں اُن کا کوئی مثیل نہ تھا۔ جس وقت وہ غزل پڑھتے تھے تو سننے والے کانپ جاتے تھے۔ تمام اصنافِ سخن پر انہیں پوری قدرت حاصل تھی۔ قصیدہ۔ رباعی۔ مسدس۔ مخمس۔ غزل۔ نظم۔ مرثیہ اور نثر میں ڈرامہ۔ افسانہ وغیرہ سبھی میں انہوں نے اپنی جولانیِ طبع کے جوہر دکھائے۔ شوخی اور بانکپن اُن کے کلام کی جان ہیں۔ نثر بھی بے تکان لکھتے تھے۔ فارسی اور عربی میں کامل دستگاہ تھی۔ مرحوم کے احباب اور تلامذہ کی تعداد بہت کافی ہے۔ اُن کی مندرجہ ذیل تصانیف شائع ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکی ہیں۔

خمکدۂ خیام۔ تیر و نشتر۔ روحِ نغمہ۔ گلِ صد برگ۔ بلبلانِ فارس۔ شاعر کے تو شعر۔ ارمان۔ خاک کی کہانی۔ حورِ جنت۔ قتلِ نظیر۔ ہمارا آسمان۔ ہیرے کی کنی۔ آویزۂ گوش۔ دامنِ مریم۔ نگارستان۔ شعلۂ جوالہ۔ جہاں دار و تغلق۔ نقلی تاجدار۔ پر پرواز۔ لیلیٰ دمشق اور آپ کا ایک مکمل دیوان۔ ڈرامے۔ کہانیاں افسانے مرثیے ابھی بہت کچھ مسودہ کی صورت میں ہیں۔

بطورِ نمونۂ کلام چند شعر لکھتا ہوں۔

جو ترے سامنے ہو آتے ہیں ‏ ‏ دل و دیں جان کے کھو آتے ہیں

چار آنکھیں کبھی ہو جاتی ہیں آتے جاتے ‏ ‏ نظرِ لطف کہاں چشمِ مروّت کیسی؟

اک تم ہو کہ دل چھینا ہے دزدیدہ نظر سے ‏ ‏ اک ہم ہیں ہمیں آنکھ چُرانی نہیں آتی

حشر میں انصاف ہوگا بس یہی سنتے رہو ‏ ‏ کچھ یہاں ہوتا رہا ہے کچھ وہاں ہو جائیگا

کبھی ساون کی جھڑی ہو کبھی بھادوں برسے ‏ ‏ ایسا برسے مرے اللہ کہ چھاجوں برسے

جو وعدے کی شب تم نے ٹالی نہ ہوتی ‏ ‏ مری رات اس طرح کالی نہ ہوتی

آئے جاتی ہے پیاری پیاری یاد ‏ ‏ دل سے جاتی نہیں تمہاری یاد

اعجاز صدیقی

اصلاحِ سخن

سیّد محمد مبین صاحب ماہر بیتھوی کی غزل پر حضرت مولانا احسن مارہروی مرحوم کی اصلاح

ہے وہ شوخ دورِ شراب ہی ~~اور عدو کی محفلِ عام~~ [سرِ بزم گردشِ جام] ہے ۔ ۱ ۔ کوئی اس کے ہجر میں جان دے بھلا اس سے کیا اُسے کام ہے

اگر اس پہ تجھ کو دماغ ہے کہ ستمگری ترا کام ہے ۔ ۲ ۔ تو مجھے یہ باعثِ فخر ہے میرا ظلم سہنے میں نام ہے

جو کہا کہ مرتا ہوں تجھ پہ میں تو لگا یہ کہنے وہ طنز سے ۔ ۳ ۔ ارے باز آ نہ یوں جان دے کہ یہ خودکشی ہی حرام ہے

کسی بے وفا کے فراق میں کوئی دیکھے میری یہ جستجو ۔ ۴ ۔ کہ ~~لگانا گردشیں رات دن~~ [شبانہ روز کی گردشیں] مرا شغل ہے میرا کام ہے

~~تجھے~~ [تمہیں] ڈھونڈا ہم نے تو جا بجا یہ ~~پتہ مگر نہ مجھے ملا~~ [نہ چلا کہیں بھی مگر پتا] ۔ ۵ ۔ کہ وہ کون ایسا مقام ہے کہ جہاں ~~پہ تیرا~~ [تمہارا] قیام ہے

وہاں جا کے میری طرف ~~ان کو پیام دینا ہی~~ [سے تو ہی دے پیام انھیں] صبا
۶
ہے تباہ ماہرِ خستہ جاں تری یاد اسکو مدام ہے

توجیہ :-

(۱) اصلاح سے مصرع چست ہوگیا۔ حالانکہ دَورِ شراب اور گردشِ جام ایک ہی بات ہے۔

(۴) گردش کرنا محاورہ ہے، نہ کہ لگانا۔

(۵) اس شعر کے مصرع اولیٰ میں شتر گربہ تھا، ایک جگہ "ہم نے" لکھا گیا تھا اور دوسری جگہ "مجھے"۔ اصلاح سے مصرع اولیٰ چست ہوگیا۔ مصرع ثانی میں "کہ جہاں پہ تیرا" کی بجائے "کہ جہاں تمہارا" نے روانی پیدا کردی۔

(۶) مصرع اولیٰ کے پہلے ٹکڑے میں "کو" آنا چاہئے تھا لیکن وہ دوسرے ٹکڑے "پیام دینا ہی صبا" کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اس نقص کو دُور کرنے کے لئے اصلاح دی گئی ہے۔

اعجاز صدیقی

تحقیق و تصحیح

استفسار:-

الف (۱)- احساس و محسوس دو لفظ ہیں جن کے معنی بھی غالباً دو ہیں۔ لیکن آجکل شعرا احساس کی جگہ محسوس استعمال کرتے ہیں کیا احساسات کی جگہ محسوسات لکھنا درست ہے۔ لفظ ہمیشگی کے متعلق آپکا کیا خیال ہے۔ حجاب بنارسی ازسیونی

ب (۱) شاعر فروری ۱۹۴۲ء میں جناب ضیا سنکاڈوی (میرٹھ) نے اس شعر پر

گذرے مصنفوں کی آواز آرہی ہے مرحوم روح اُن کی سطروں میں گا رہی ہے

اعتراض کیا تھا کہ روح مرحوم نہیں ہوسکتی۔ جس کے جواب میں آپ نے جسم کی طرح روح کو بھی مرحوم بتایا ہے۔ مرحوم اسم مفعول کے لحاظ سے تو روح بھی مرحوم ہوسکتی ہے یعنی وہ روح جس پر رحمت کی گئی ہو۔ لیکن لفظ مرحوم فانی چیز کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ اور روح فانی چیز نہیں ہے۔ اس لئے روح کو مرحوم نہیں کہا جاسکتا۔ اور شعر میں مصنفوں (جمع) کے ساتھ روح (واحد) بھی قابل اعتراض ہے

(۲) مشاعرہ شاعر فروری ۱۹۴۲ء میں جناب نصیر چھاؤنی ہو کا یہ مطلع شائع ہوا ہے۔

روداد غم دل پھر آج اُن کو سنانا ہے رو رو کے ہنسانا ہے ہنس ہنس کے رُلانا ہے

روداد مؤنث ہے اس لئے میرے خیال میں "سنانی ہے" ہونا چاہیئے۔

(۳) شاعر فروری ۱۹۴۲ء صفحہ ۴۲ پر آل پور اردو کانفرنس کا اعلان کیا گیا ہے جس کی سطرہ ا میں حشر بدتمیزی لکھا گیا ہے۔ میرے خیال میں حشر بدتمیزی نہیں حشر بےتمیزی ہونا چاہیئے۔ چونکہ تمیز بذات خود اچھی چیز ہے اس لئے اس کے ساتھ "بد" لگانا اُس کی صفت کو کم کرتا ہے۔ عبدالکریم مجروح صدیقی۔ بھنڈارہ

ج (۱) شاعر ماہ فروری صفحہ ۴۰ پر جناب شفق ٹونکی کی نظم بعنوان "تیتری" شائع ہوئی ہے۔ اس کے ذیل کے شعر کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے۔

یک قطرۂ چکیدۂ موج شراب گل بہتی ہوئی نشاط فراواں کہیں جسے

(۲) اسی ماہ کے شاعر میں صفحہ ۱۶ پر جناب آلم مظفرنگری کی نظم "درد" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے

درد کیا ہے بربط صبح طرب کا سوز و ساز شام کے گیسوئے برہم کا سواد جاں فروز

کیا سوز و ساز اور جاں فروز قوافی صحیح ہیں۔ فقیر محمد خان عارف ارشدی کوئٹہ (بلوچستان)

جواب:-

الف (۱) احساس و محسوس دونوں مختلف المعنی ہیں البتہ دونوں ہم اصل ضرور ہیں۔ احساس کے معنی ہیں چھونا۔ حواس خمسہ کے ذریعہ کسی چیز کو معلوم کرنا۔ یا اثر لینا۔ محسوس کے معنی ہیں ظاہر۔ آشکار۔ دریافت شدہ۔ اور دانستہ۔ جس طرح تخئیل اور تخیّل کے استعمال میں لوگ احتیاط نہیں کرتے اسی طرح ان الفاظ میں چوک جاتے ہیں۔ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ احساس مصدر ہے اور محسوس اسم مفعول۔ اسلئے دونوں کے معنی جداگانہ ہیں۔

"ہمیشگی" صحیح ہے۔ ہمیشہ اور ہمیشگی میں بھی ایک نازک فرق ہے۔ ہمیشہ کے معنی ہیں سدا اور ہمیشگی کے معنی ہیں ہمیشہ ہونا۔ ہمیشہ پن۔

ب (۱) مرحوم کے معنی اگر فنا کے لئے جائیں تو واقعی "روح" مرحوم نہیں ہوسکتی۔ روح تو خدا کا حکم ہے اور اُس کے حکم کو کبھی فنا نہیں۔ البتہ اگر مرحوم کے لغوی معنی مراد ہوں تو روح کو مرحوم کہا جاسکتا ہے۔ اُن کی روح یا اُن کی روحیں دونوں طرح صحیح ہے۔

(۲) روداد مؤنث ہے اسلئے "سنانی ہے" ہونا چاہیئے۔ سنانا ہے غلط ہے۔ (۳) "بدتمیز" عام طور پر مستعمل ہے۔ بےتمیز بھی صحیح ہے۔ رہا یہ سوال کہ "بد" لگانے سے تمیز کی صفت کم ہوتی ہے مجھے اس سے اتفاق نہیں "بے" سے بھی کچھ نہ کچھ صفت میں کمی ہوجاتی ہے۔ دیانت۔ بددیانت۔ صورت بدصورت۔ طینت۔ بدطینت۔ کردار۔ بدکردار۔ کیش۔ بدکیش۔ گوہر۔ بدگوہر۔ مزہ۔ بدمزہ۔ نام۔ بدنام۔ نصیب۔ بدنصیب وغیرہ عام طور پر لکھا جاتا ہے۔ ج (۱) غالباً توالی اضافت کو آپ برا سمجھ رہے ہونگے۔ جہاں اضافتوں سے فصاحت میں کوئی نقص واقع نہ ہو وہاں اضافتیں جائز ہیں شفق صاحب کے مصرع میں تو تین ہی اضافتیں ہیں میں نے تو چار چار اور پانچ پانچ دیکھی ہیں۔ غالب کا ایک شعر ہے

گرد راہ یار ہے سامان ناز زخم دل ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

(۲) سوز و ساز اور جاں فروز قافیہ نہیں ہوسکتے۔ اس شعر میں کتابت کی غلطی ہے۔ اصل مصرع میں بجائے سوز و ساز کے ساز و سوز تھا۔ سوز کا قافیہ روز صحیح ہے۔ اعجاز صدیقی

خدا کہاں ہے؟

"خدا کو ڈھونڈنے والے خدا ضرور ملیگا"

وہ نظم جو حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی نے ۲۲ فروری ۱۹۴۱ء کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دھلی کے مشاعرہ میں پڑھی

خدا کو ڈھونڈنے والے نہ ہو نراس، اِدھر آ
حدودِ دیر و حرم میں نہ پھر اُداس، اِدھر آ
نہ ڈھونڈ گلشن و صحرا کے آس پاس، اِدھر آ
خدا کہاں!۔ نہ ملے گا خدا شناس، اِدھر آ

خدا کی فکر و طلب میں نہ ہو خراب، اِدھر آ
خدا کہاں ہے؟ تجھے اسکا دوں جواب، اِدھر آ

خدا تھکے ہوئے پیاسے مسافروں میں ملے گا
غریب خانہ بدوشوں کے جھونپڑوں میں ملے گا
رضا و صبر کی پُرخار منزلوں میں ——— ملے گا
رجا و بیم کے پُرہول راستوں میں ملے گا۔ بہ رنگِ راہرو و رہنما ضرور ملے گا

خدا کو ڈھونڈنے والے، خدا ضرور ملیگا

یہ مسجدیں یہ دُوارے، یہ بتکدے، یہ شوالے
سب اُسکے گھر ہیں، مگر خود پرستیوں کے ہیں آلے
بقیدِ سبحہ و زنار اِن کے پوجنے والے
خدا بنے ہوئے بیٹھے ہیں، فخر و ناز کے پالے

خدا کی فکر و طلب میں نہ ہو خراب، اِدھر آ
خدا کہاں ہے؟ تجھے اِسکا دوں جواب، اِدھر آ

ستم کشوں میں ملیگا، ستم زدوں میں ملے گا
دکھی کی جان کو گھیرے ہوئے دُکھوں میں ملے گا
علیل فاقہ زدوں کی تباہیوں میں ملے گا
غمِ آشناؤں کے ٹوٹے ہوئے دلوں میں ملے گا۔ شکست و ریخت میں اُس کا پتا ضرور ملیگا

خدا کو ڈھونڈنے والے، خدا ضرور ملیگا

خدا طویل قباؤں کی جنبشوں میں نہیں ہے
خدا سفید جٹاؤں کی بندشوں میں نہیں ہے

خدا تعیشِ فانی کی خواہشوں میں نہیں ہے
خدا وقار و عجب کی نمائشوں میں نہیں ہے
خدا کی فکر و طلب میں نہ ہو خراب، ادھر آ
خدا کہاں ہے؟ تجھے اس کا دوں جواب، ادھر آ

وہ نامرادوں کے مجروح آسروں میں ملیگا
گنہگاروں کی خالص ندامتوں میں ملیگا
وفا پرست کے خوں ریز دامنوں میں ملیگا
غبارِ راہ سے ملفوف گیسوؤں میں ملے گا۔ وہ خون و خاک میں جلوہ نما ضرور ملیگا
خدا کو ڈھونڈنے والے خدا ضرور ملیگا

خدا سرابِ خودیؔ و خمار میں نہ ملے گا
خدا خزانۂ سرمایہ دار میں نہ ملے گا
خدا سرورِ طلب کی بہار میں نہ ملے گا
خدا غرور و ریا کے دیار میں نہ ملے گا
خدا کی فکر و طلب میں نہ ہو خراب، ادھر آ
خدا کہاں ہے؟ تجھے اس کا دوں جواب، ادھر آ

شکستہ حال بھکاری کے چیتھڑوں میں ملے گا
فقیرِ مست کی پیوند کاریوں میں ملے گا
جو ہل چلاتے ہیں اُن کی کشاکشوں میں ملے گا
کبھی، دبی ہوئی مزدور کی رگوں میں ملے گا۔ اثر کے رنگ میں وقتِ دعا ضرور ملیگا
خدا کو ڈھونڈنے والے خدا ضرور ملیگا

ہجومِ حرص و ہوا میں، تلاش کر نہ خدا کو
نشاطِ رنج رُبا میں، تلاش کر نہ خدا کو
جہانِ جور و جفا میں تلاش کر نہ خدا کو
مسرتوں کی فضا میں تلاش کر نہ خدا کو
خدا کی فکر و طلب میں نہ ہو خراب، ادھر آ
خدا کہاں ہے؟ تجھے اس کا دوں جواب، ادھر آ

خدا یتیم کے مایوس تیوروں میں ملے گا
خدا تجھے کسی بیوہ کی سسکیوں میں ملے گا
اگر کہیں نہ وہ ان اپنی خلوتوں میں ملے گا
تو پھر خرابِ محبت کے آنسوؤں میں ملے گا۔ ان آنسوؤں میں وہ بھیگا ہوا ضرور ملیگا
خدا کو ڈھونڈنے والے خدا ضرور ملیگا

سیماب اکبرآبادی

(باجازت اسٹیشن ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو دہلی)

لسانی تبدیلیوں کے چند اُصول

زبان کا سیکھنا اور زبان کا سکھانا دو مختلف چیزیں ہیں۔ کسی زبان کا سیکھنے والا اپنے حدودِ معینہ سے بہت کم تجاوز کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور شاذ ہی اُس کی نظریں اس زبان سے دور کہیں اور پہونچتی ہیں جس کا اُسے مطالعہ کرنا ہے۔ لیکن سکھانے والے کی نظر اِس زبان یا اس خاندان کی دو ایک اور شاخوں کے محدود دائرے سے باہر نکل کر ہی مطمئن ہو سکتی ہے، اگر اُستاد کو زبان کا مطالعہ سلیقہ سے کرنا ہے تو اُسے زبانوں کے اس پورے خاندان کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ تاکہ ان زبانوں کے آپس کے ربط اور زبان کی صحیح روح پر قادر ہو سکے۔

زبانوں کا مطالعہ اِس ترتیب سے کرنا لسانیات کا موضوع ہے۔ یادش بخیر اب سے کئی برس پہلے لسانیات پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی اور جب سے اب تک مطالعہ برابر جاری رہا۔ اِس دَوران میں جو نتائج حاصل ہوئے اُن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں البتہ صرف ایک پہلو یعنی لسانی تبدیلیوں سے فی الحال بحث کی گئی ہے اور اِس خشک موضوع کا بھی صرف ایک حصہ عام دلچسپی کیلئے پیش کیا جا سکتا ہے۔

زبان ساکن اور جامد چیز نہیں۔ اسے انسان روزمرہ استعمال کرتے ہیں اور اِن کی زندگی کے ساتھ اِن کی زبان میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، بہت سے الفاظ آج ہمیں ایسے نظر آتے ہیں جو اپنی اصل سے بہت دُور جا پڑے ہیں لیکن تبدیلیوں کے خاص اصولوں کو پیشِ نظر رکھکر ہم اُن کی اصلیت تک پہونچ سکتے ہیں۔

اِن اصولوں میں سب سے اہم اصول تبادلہ ہے۔ یعنی بعض حروف آپس میں ایک دوسرے سے بدل سکتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی لفظ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے تو اس کا کوئی حرف نئی زبان میں بدل جاتا ہے۔ اسطرح لفظ کی صورت بدل جاتی ہے۔ مثلاً عربی صحنی کا ص ح اُردو میں س سے بدل گیا اور یہ لفظ سینی کی صورت میں موجود ہے۔ عربی میں صحن پیالی طشت یا رکابی کو کہتے ہیں، سینی ہمارے یہاں طشت کے معنوں میں مستعمل ہے۔ ہمارے یہاں ایک اور لفظ ہے جس میں اُس کی اصلی صورت کچھ باقی رہ گئی ہے۔ یہ لفظ صحنک ہے۔

دوسری مثال "موپلا" ہے اس کی اصل عربی "مفلاح" ہے بمعنی کاشتکار، ابن بطوطہ نے بھی ہندوستانی موپلوں کو عربی النسل لکھا ہے۔

"ل" اور "ر" کا بدل لسانیات میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، یہ دونوں قدیم سنسکرت में ल اور र SEMI - VOWELS کہلاتے ہیں اور آسانی سے ایک دوسرے سے بدل جاتے ہیں۔ ایسی مثالیں آپ نے بہت سنی ہوں گی۔ گاؤں والے "ہل" کو "ہر" اور "دیوار" کو "دوال" کہتے ہیں۔

اس کی ایک مستند مثال سنئے ہسپانوی زبان میں "اَلگزیل" AL - GUAZIL، بمعنی وزیر آتا ہے۔ یہ عربی لفظ ہے۔ جس میں "و" کی جگہ "گ"، اور "ر" کی جگہ "ل" آ گیا ہے، اور "الوزیر" کی جگہ "الگزیل" ہو گیا ہے۔

اسی کی ایک اور مثال اُردو کے لفظ "الماری" سے ملتی ہے۔ الماری کو آزاد نے پرتگالی لکھا ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ لفظ ہمارے یہاں پرتگالیوں کے ساتھ آیا، لیکن پرتگالی ڈکشنریوں میں دیکھئے تو اس کی وضاحت یوں کی ہے۔

Almirah - from arabic al - mal (refer Bait_ul mal) = safe cupboard

(یعنی) المیرہ عربی المال سے ہے (ملاحظہ ہو بیت المال، بمعنی محفوظ صندوق)

اس لفظ میں پہلے "المال" سے "المارا" اور پھر "المیرا" ہو گیا۔ الماری اسی کی ایک صورت ہے

"الگزیل" کی تشریح میں آپ نے دیکھا کہ "ل" اور "ر" کے تبادلے کے ساتھ ہی "و" "گ" کا تبادلہ بھی موجود ہے۔ ایک جغرافیائی نام سے اس کی تصدیق کر لیجئے مشہور شہر کا نام ہے۔

Gueadiquier گادل قودر یہ دراصل وادی الاصغر ہے۔

گا	د ی ل	قو	ور
وا	د ی اَل	اص	غر

اس لفظ سے شروع اور آخر میں "گ" اور "و" کے تبادلہ کی مثال موجود ہے۔

اسی طرح "ر — س" "و — ر" "ن — ل" "س — ک" اور "گ" کے تبادلہ کی مثالیں عام طور پر مل جاتی ہیں سنسکرت، پراکرت اور فارسی میں گاؤ ہے یہی لفظ انگریزی میں کاؤ (Cow) ہو جاتا ہے۔ سب زبانیں ایک ہی خاندان کی ہیں لیکن ماحول نے یہ فرق پیدا کر دیا۔

س اور ک یا س اور خ کے تبادلہ کی ایک دلچسپ مثال سنئے سنسکرت میں स्वदत्त سوداتّا (یعنی خود اپنا دیا ہوا) بمعنی رب کے ہیں، قدیم ژند میں یہی لفظ خداتا ہے یہاں "س" "خ" سے بدل گیا۔ خداتا سے خدا، کا سلسلہ بآسانی مل سکتا ہے۔ "خ" اور "گ" کے تبادلہ سے "خدا" نے انگریزی میں گوڈ (   ) کی صورت اختیار کر لی

س اور خ کے تبادلہ کی ایک اور مثال ہے سنسکرت میں سواپ स्वप بمعنی سونا ہے۔ اسی سے سپنا بمعنی خواب بنا، اسی سواپ کی صحت فارسی میں خواب ہے۔

"ک" اور "خ" کے تبادلہ کی ایک اور مثال سنئے، سنسکرت میں کرام क्रम بمعنی جانا۔ اسی سے فارسی میں خرام اور خرامیدن ہیں، اسی طرح گدھے کو سنسکرت میں کھرا اور فارسی میں خر کہتے ہیں۔

"ج" اور "ی" کے تبادلہ سے آپ آشنا ہوں گے۔ "جاترا" اور "یاترا" دونوں ایک معنوں میں مستعمل ہیں۔ اس سے ہمیں ایک دلچسپ لفظ کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے لاطینی میں "جوپیٹر" (Jupiter) بمعنی "آسمانوں کا مالک یا باپ" لفظ کے دو حصے ہیں جو اور پیٹر، یہ لفظ انگریزی میں عام ہے۔ اس کی اصل سنسکرت قدیم میں ملتی ہے جہاں اس کی اصلی صورت دیوپتر ہے دیو दिव بمعنی روشنی یا آسمان اور پتر بمعنی باپ یا مالک۔ ہندی میں پتا اور فارسی میں پدر، انگریزی میں فادر جرمن فاتر (Vater) اسی کی صورتیں ہیں۔ دیوپتر سے جوپیٹر اس طرح ہوا کہ قدیم سنسکرت کا "د" द اکثر "ج" ہو جاتا ہے، چنانچہ دیوپتر سے یوپتر ہوا، "ی" کی جگہ "ج" آکر جوپیٹر ہو گیا۔

اصول تبادلہ کے علاوہ لسانی تبدیلی میں چھ اور اصول خاص طور پر کارفرما ہیں۔
اصول تحریک[۱]، اصول ترتیب[۲]، اصول نکتہ[۳]، مقامی اثرات کا اصول، غلط[۵] فہمی کا اصول۔ (مثلاً ہسپانیوں نے ہر "ال" حرف کو جس کے شروع میں ال تھا عربی سمجھ لیا) اور تبدیلی[۶] حرکت اصول۔

ان کو تفصیل سے سلسلہ وار انشاء اللہ پھر پیش کروں گا۔

محمد ابواللیث صدیقی ایم۔اے (علیگ)

ترانۂ ارشد

ارشد صدیقی امروہوی

بہارِ چمن بن گئی گو فسانہ — ابھی تک تصوّر میں ہے آشیانہ
میں ہوں بلبلِ گلستانِ محبت — مرا شاخِ طوبیٰ پہ ہے آشیانہ
فضائے تخیل پہ اڑتے چلیں ہم — محبت کا گاتے ہوئے اک ترانہ
سرِ چرخ بیتاب تھی برقِ سوزاں — ابھی تھا تخیل ہی میں آشیانہ
زمانے پہ ہیں بار وہ چار تنکے — عبارت ہے جن سے مرا آشیانہ
سرِ چرخ دیکھی قفس پر جو بجلی — نگاہوں میں پھرنے لگا آشیانہ
تجھے مستِ پندار میں دیکھتا ہوں — کہاں تک ترا ساتھ دے گا زمانہ
مرے ایک آنسو میں ہے دل کی حالت — بہت مختصر کر دیا ہے فسانہ

سخن فہم ہی کچھ سمجھتے ہیں اس کو
ہر اک بات ارشدؔ کی ہے شاعرانہ

"احسن الکلام"

وفا کروگے تو خوش رہینگے جفا کروگے تو غم کرینگے
یہی ہے انجام وصل و فرقت وہ تم کروگے یہ ہم کرینگے

ابھی سے کیا چاک جیب و دامن ابھی تو ہے ابتدائے اُلفت
بڑھیگی جب جب سے وحشت دل تو ساز و ساماں بھی کم کرینگے

یہاں ہے دشمن وہاں ہے زاہد رقیب ہیں ہر جگہ مُسلّط
اگر ملیگا وہ ہم کو تنہا تو قصد دیر و حرم کرینگے

کرینگے بہزاد اور مانی نہ پھر تمنّا مصوّری کی
جو تیری تصویر کھینچ لیں گے تو ہاتھ اپنے قلم کرینگے

جہاں کی ناپائداریوں پر گمان کیسا یقین ہے احسنؔ
قریب آیا ہے وہ زمانہ کہ ہم بھی قصدِ عدم کرینگے

احسنؔ مارہروی مرحوم مغفور

جگر پارے

کٹا دیتے محبت میں قدم رکھنے سے سر پہلے
اگر انجام کی اپنے ہمیں ہوتی خبر پہلے

کہاں پیوست تھی رگ رگ میں نوکِ نیشتر پہلے
نہیں چبھتی تھی اس انداز سے تیری نظر پہلے

محبت کرکے اِک آزار کیوں ہم مول لے لیتے
پلا دیتیں نہ گھونٹ زہر کے وہ آنکھیں اگر پہلے

نہ جانے زخمِ دل کو آج تم نے کس طرح چھیڑا
نہیں رونی تھی یوں آٹھ آٹھ آنسو چشمِ تر پہلے

دلوں کا ذکر کیا ہے سنگ و آہن موم ہو جائیں
کوئی پیدا تو کرے آہ میں اپنی اثر پہلے

وہ منزل ہے کہ اب ہر ہر قدم پر دم اُکھڑتا ہے
بہت آساں نظر آتی تھی تیری رہگزر پہلے

کوئی ہو جائیگا اے دل شریکِ درد تیرا بھی
کسی کے ساتھ غم میں رو تو لے خوں چشمِ تر پہلے

جگرؔ اب بھی نہیں خالی ہے دنیا باکمالوں سے
کوئی پیدا تو کرے دیکھنے والی نظر پہلے

جگر بریلوی

دِل کی گہرائیاں

صاحبانِ ذوق میری کاوشوں کی داد دیں گے، پیرایۂ بیان یقیناً مشکل ہے۔ لیکن جو مجلسی ادبیات سے واقف ہیں۔ وہ علم النفس کے نکات سے صحیح طور پر حظ حاصل کرینگے: بزرگوں کی شوخیاں، سابق مضمون جن حضرات نے دیکھا ہے وہ مسائلِ محبّت اور وارداتِ حیات کو اِس طرح اِس افسانہ میں پاکر ایک مخصوص سایۂ جمال میں خود کو محسوس کریں گے۔ اکار گاہِ حیات کی شاہراہیں مختلف ہیں۔ اور ان میں سے میں نے یہ نفیس و لطیف موضوع آج کی گرمیٔ محفل کے لئے پسند کیا ہے۔ **قدسی**

نسیمہ!

جس قدر تمہیں علم ہے اس سے زیادہ اس کی اور میری دوستی ہو چکی ہے۔ ہم لوگ خود کو ایک ایسے نقطۂ اتصال پر محسوس کرتے ہیں۔ جس کے بعد سرحدِ ادراک ختم ہو جاتی ہو لیکن یہی نقطۂ اتصال ایک مضبوط قلعہ بھی اپنے درمیان میں پوشیدہ رکھتا ہے۔ کیا کہوں نسیمہ تجھ سے، میں اپنا دردِ دل۔ اس کمبخت کی تمام باتیں نرالی تھیں، دوستی میں اس نے عقل کو رہنما بنایا ہے اس کی میں بھی قائل ہوں۔ لیکن اس میں محبّت کی جنوں انگیز چاشنی اس نے ابھی اس طرح نہیں پائی جس میں انسان اپنی بے خودی پر ناز کرتا ہے۔ یا وہ کافر ابھی بچپن کی حقیقت کو نہ پا سکا یا میں ابھی شاہراہِ حقیقت پر نہیں ہوں۔

میں اُس کے دل کے راج محل میں گھومتی پھرتی ہوں تمام شہرِ دل میرے سامنے ہے اور تفریح کے لئے سب سامان مہیا لیکن ایک گوشہ میں ایک تاریک مقفل کمرہ بھی ہے جس کے دروازے پر "بت پندار" ہر وقت بھری ہوئی بندوق لئے اور سال سیدھی کئے بیٹھا رہتا ہے۔ میں چاروں طرف دل میں گھومتی ہوں اور جب کبھی اتفاقاً اس گوشہ میں گذر ہو جاتا ہے تو کسی ستون کی آڑ لیکر بہ مشکل کترا کر جان سلامت لے جاتی ہوں مجھے نہیں معلوم اِس تاریک کمرے میں اس نے کیا بند کر رکھا ہے جسکی اس قدر سنگینی سے حفاظت ہے بخدا جب میں اس گوشہ میں آتی ہوں میرے بدن کا رواں رواں کانپ جاتا ہے اور یہ غم مجھے اندر ہی اندر گھلائے جاتا ہے۔ غور تو کرو اس کے تمام شہر پر مجھے حکومت سی حاصل ہے، مالکانہ اقتدار حاصل ہے۔ ہر خزانے کی کنجی مجھے دے رکھی ہے لیکن ایک گوشہ اب بھی محفوظ رکھا ہے، جس میں میرے فرشتے بھی پر نہیں مار سکتے۔ جہاں ایک بت پتھر کا، ایک بت جو بے جان ہے کچھ نہیں سمجھتا پہرے پر مقرر ہے۔ اس کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق ہے اس کے سامنے آتے ہی کمانی چڑھ جائیگی اور بندوق چل جائیگی۔ اس نے وہاں میری اور غالباً صرف میری اطلاع کے لئے ایک بورڈ بھی لگا رکھا ہے (اُسکی میں شکر گذار ہوں) جس پر لکھا ہے کہ "اِس کمرے کے زینے پر چڑھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ سامنے پتھر کا بت ہے جس کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق ہے جو اُس کی زد میں آئیگا نشانہ بن جائے گا"

میری پیاری نسیمہ میں نے اِس سے ڈرتے ڈرتے ایک دفعہ کہا تھا کہ اِس کمرے میں ایک لمحہ کیلئے مجھے ساتھ لے چلو۔ اُس نے کہا بورڈ کی ہدایت کے سامنے میں مجبور ہوں۔ میں نے کہا اچھا یہ بتاؤ اِس کمرے میں کیا ہے۔ وہ سنکر چپ ہو گیا۔

تمہیں یہ سنکر تعجب ہوگا۔ کہ مجھے کبھی کبھی اِس بت کے سامنے سے مجبوراً گذرنا پڑتا ہے اِس لئے کہ مصحف خانہ اور شفاخانہ دونوں کا رستہ اسی طرف ہو کر ہے۔ کیونکہ انسان بغیر عبادت کے جیئے، روح کی تسکین اور دماغ کی جلا ایمانی تقویت کے بغیر ناممکن ہے۔ ہجومِ شوق آخر سجدوں پر مجبور کر ہی دیتا ہے۔ پاؤں والہانہ طور سے عبادت خانے کی طرف اُٹھتے ہیں، ہاتھ گستاخانہ مصحف تک جا پہونچتا ہے اور میں تلاوت میں مصروف نظر آتی ہوں مجھے خود اپنی خبر نہیں رہتی کہ میں کب شوق میں وہاں تک جا پہونچی۔ لیکن جب ذوق و شوق کی تسکین کے بعد واپس ہوتی ہوں اُس وقت اِس بت کا خیال اور بندوق کا خوف میری جان خشک کر دیتا ہے دبے دبے پاؤں ہزار ہا احتیاطوں کے ساتھ قدم اُٹھاتے ہوئے اس رستے واپس ہوتی ہوں جب اِس بت کے قریب سے گذرتی ہوں تو چہرہ زرد خون خشک اور آنکھوں میں جان سمٹ آتی ہے۔ کس قدر خوف طاری ہوتا ہے میری قدرت سے باہر ہے کہ بیان کر سکوں۔

تم جانتی ہو صحت و تندرستی کا قائم رکھنا بھی ایک سمجھ دار انسان کے لئے اسی قدر ضروری ہے جس قدر ایک بیمار کے لئے علاج لوگ سمجھتے ہیں بیمار ہونے پر شفاخانے

جانا چاہیئے۔ میرا خیال ہے بیماری سے پہلے محکمۂ حفظانِ صحت کی رہنمائی حاصل کرنا چاہیئے دماغی کام کرنے والوں کے لئے توازن بڑی چیز ہے ورنہ پارۂ حرارت دماغ کی طرف رجوع ہونے کے بعد اگر خلل نہیں آئیگا تو کاموں میں تیزی ضرور پیدا ہو جائے گی۔ اور یہ مسلم امر ہے کہ کام کی تکمیل کے بعد کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ کس قدر جلدی کام ہوا بلکہ یہ دیکھا جائیگا کہ کیسا ہوا۔ اس لئے اگر گرم مزاجی سے ہمارے کام جلد ہو بھی گئے تو وہ جمالی ذوق کی تکمیل کے لئے بیکار ہونگے۔ ان امور کے پیش نظر میں ایک ماہ میں شفاخانے ہو آنا ضروری سمجھتی ہوں اور اس طرح ڈاکٹری اصول کے موافق رفع فساد ہو جاتا ہے اور میں اطمینان سے پھر امورِ دنیا کی ہماہمی میں حصہ لینے کے قابل ہو جاتی ہوں۔

اُس نے مجھے منع کیا کہ تم اِس راہ سے شفاخانے نہ جایا کرو۔ اس نے یہ بھی کہا کہ بت پندار کے ہاتھ سے بھری ہوئی بندوق واپس لے لینا میرے قبضۂ قدرت سے باہر ہے ہاں میں تمہیں ہمراہ شفاخانے لیجا سکتا ہوں اور میری آڑ میں تم اس راہ سے گذر سکتی ہو لیکن اس طرح بندوق کا نشانہ کسی روز میں بن جاؤں گا —— میں اس کے اس جذبۂ ایثار کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکی۔ لیکن میرے لئے یہ امر سوہانِ روح کا سبب بنتا جا رہا ہے کہ وہ اِس بت کو راہ سے کیوں نہیں ہٹا دیتا۔

اور یہ کہ اِس "کنجِ تاریک" میں وہ کونسی دولت دفن ہے جس کی خاطر اِس نے آتنا سنگین پہرہ بٹھایا ہے۔ میں اسی فکر میں گھلی جا رہی ہوں اور کچھ حل نہ کر سکی ہوں۔ میرا بابی کو سلام کہو فقط

تمہاری بہن

روحہ

نسیمہ

اے جان روحہ تجھ پر نثار۔ کس قدر گہری نگاہ ہے تیری، لیکن میری گتھی پھر بھی اُلجھی ہوئی رہی، آ میں تجھے کچھ بتا دوں بلکہ سب کچھ بتا دوں جس کے بعد تیرے خیالات میں طوفان آ جائیگا اور میری پیہم سعی کو مشکور دیکھکر آب دیدہ ہو جائے گی۔ بڑی جانکاوی کے بعد یہ مہم انجام دی ہے میں نے،

کچھ دنوں کے بعد میں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ بت پندار کو ادراک اور حس سے کوئی واسطہ نہیں، بلکہ وہ ایک طلسمِ عقل ہے جس کی ایک مخصوص کمانی دبنے سے بندوق کا نشانہ لگتا ہے، میں اِس کے "دل محل" سے نکلکر دماغ کے کتبخانہ میں پہونچی تمام دفتر اُلٹ ڈالے ہر طرح کوشش کی کہ اِس کمانی کا مقام معلوم ہو جائے لیکن کوئی سُراغ نہ چلا۔

ابتک میں چند بار اِس راہ سے گذر چکی ہوں لیکن ہر دفعہ جان ہتھیلی پر رکھکر یہ بیم جان و امید نان میرے لئے بڑا مشکل مسئلہ بن گیا ہے، میں سوچتی تھی کب تک اِس طرح کام چلے گا'

ایکدن میں نے اُسکی جان کا واسطہ دیکر پوچھا کہ اِس مقفل گوشہ کا حال مجھے بتا دو ورنہ میں اِس شاہراہ سے گذرنے کے بجائے اِس قفل کے کھولنے میں اپنی جان دیدونگی۔ اُس نے پہلے تو اسی انداز تجاہل سے کام لیا پھر میرے اصرار پر آبدیدہ ہو کر کہا کہ اِس کمرے کو مقفل کر کے میں کنجی پھینک چکا ہوں اور اس کی حفاظت کے لئے یہ بت پندار میں نے ہی تراشا ہے جس کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق دینے کے بعد کمانی کا مقام خود بھول چکا ہوں اور اب میں نہیں کہہ سکتا کہ اِس کا نشانہ کون بنے گا دفترِ دماغ میں سے اِس کا نقشہ تلف کر دیا گیا ہے اور اب میں بھی اِس سرنگ سے ناواقف ہوں، یہ کہکر اُس نے آہ بھری اور منھ پھیر لیا۔ میں نے دریافت کیا کہ اِس کمرے میں کیا مقفل ہے۔ اُس نے حافظہ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس میں ہزاروں زہریلے سانپ بند ہیں۔ جن کے تریاق کا دنیا میں پتا نہیں۔ اِس کمرے کا دروازہ کھلتے ہی بدی کے سانپ رینگنا شروع ہو جائیں گے اور میرے دل محل کی لطیف فضا اُن کی سمیت سے متعفن ہو جائے گی پھر یا تو نہیں یہ کیڑے ڈس لیں گے یا اِس محل کو چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ میرے دل محل کا لہلہاتا ہوا باغ اُجڑی ہوئی بستی ہو جائیگا اور آہ پھر میں ان بدی کے زہریلے ناگوں کا مقابلہ نہ کر سکوں گا۔ اِس لئے میں نے حکیم عقل کے مشورہ سے ان سب کو اس کمرے میں مقفل کر دیا ہے اور بت پندار کا پہرہ بٹھا دیا ہے۔ جس روز یہ بت ٹوٹ جائیگا اُس روز اپنی خواہش کے مطابق میرے دل کا ہر سیاح اِس کا قفل آسانی سے توڑ سکے گا۔

مجھ پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ہم دونوں گہرے سکوت میں کھو گئے۔ لیکن میں ان زہر بھرے ناگوں کے تصور سے کانپ جاتی تھی —— میں نے ہمت کر کے کہا کہ اگرچہ حکیمِ عقل نے حد سے تجاوز کیا ہے اور جانبِ اعتدال کو ملحوظ نہیں رکھا لیکن میں اِس بت کی شکست کی خواہاں نہیں بلکہ یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھے مصحف خانے اور شفاخانے جانے کی سہولت پہونچا دو اِس بت کے قیام سے مجھے یہ بھی اطمینان رہیگا کہ کوئی اور سیاح اِس راہ سے گذر کر دوسرے حصۂ دل میں آ کر میرا حریف

نہیں بن سکے گا۔ لیکن میرے لئے اگر عمومیت سے بالا رعایت نہ کی گئی تو پھر امتیاز ہی کیا ہوا۔

تمہارے ایثار کے میں قربان کہ تم نشانہ بننے کے لئے تیار ہو لیکن ہم دونوں ملکوتی کے مقام کا ہی پتہ کیوں نہ چلا لیں کہ اس مقام سے احتیاط برتی جائے۔ آخر حساب نفس کے بعد بڑی کوشش سے یہ پتہ چلا کہ بالائی زینوں سے بچکر اس راہ کو اس طرح عبور کیا جائے کہ زینوں پر قدم نہ پڑنے پائے اور ہم پھلانگ کر اُس پار ہوں۔ اِن زینوں میں ہی بت پندار کی کمانی مخفی ہے پہلے زینے پر قدم رکھتے ہی کمانی چڑھ جاتی ہے اور دوسرے زینے پر پاؤں پڑتے ہی بندوق سامنے آجاتی ہے اور دروازہ میں داخل ہونے ہی گھوڑا گر پڑتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ارسطوئے عقل نے بت پندار کا بہت بہتر طلسم کھڑا کیا ہے لیکن اس حکیم کی ہی رہنمائی سے بدی کی شاہراہ کو انسان پھلانگ سکتا ہے۔ وہ وہ نفس و لطائف کے خلوت کدے جو یہیں قلب کے ایک مخصوص گوشے میں جلوہ گر ہیں اِن سے فیضیاب ہو سکتا ہے، لیکن ایک ذراسی بھول اور معمولی سی غفلت بندوق کا نشانہ بنا سکتی ہے۔

تاہم رنشیر حکمت اُٹھ نے کے بعد بھی یہ بات حاصل نہیں ہوتی کہ کوئی شخص بدی کے رستے کو اس طرح پار کرے کہ اُس سے گذرنا نہ گذرنے کے برابر ہو اور جس نے اس احتیاط کو پا لیا وہی اعلیٰ لطائف اور مدارج خلوت سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے۔

میں بہت مطمئن ہوں کہ میں نے ایک ایسا راز پا لیا ہے جو باعث سکون ہو سکتا ہے اور میری بندیاں مجھ پر ناز کر سکتی ہیں۔ تمہاری تسلی کے لئے یہ اطلاع کافی ہے۔ فقط

تمہاری

روحہ

عبیداللہ قدسی

نشترِ ساز

محبّت ایسی تو شئے نہیں ہے کہ جس میں کوئی اثر نہیں ہے
مری محبّت ہے وہ محبّت کہ تم پہ جس کا اثر نہیں ہے
خیال تھا یہ جواب دے گا خیال ہے یا نہیں ہے تیرا
نہ بات پوچھی نہ حال دیکھا کیا جو وعدہ کبھی تو جھوٹا
اُدھر وہ نازک مزاج ایسے کہ جی چراتے ہیں بات کرتے
جو دل میں ہوگا وہی کہیں گے جو کچھ کہیں گے۔ وہی کریں گے
اسے قناعت کہو کہ مستی یہ رند ہنگامے پرستی
کہا جفاؤں سے باز آؤ تو بولے اِس کا سبب بتاؤ
مجھے ہے وہ دعویٔ محبّت کہ حسن کو جس کی ہے ضرورت
زمانہ بھر ہے تمہارا شاکی کہ تم نے جس سے بھی کی دغا کی

خیال یہ ہے کہ میری حالت کی اُن کو اب تک خبر نہیں ہے
مجھے یہ احساس کیوں نہ ہوتا۔ ضرور ہوتا مگر نہیں ہے
یہ کیا خبر تھی وہ یہ کہے گا کہ فرض کر لو اگر نہیں ہے
کچھ اس کا الزام آپ پر ہے۔ نہیں۔ نہیں آپ پر نہیں ہے
اِدھر یہ شامت کہ حال میرا طویل ہے۔ مختصر نہیں ہے
وفا شعاروں کی گفتگو ہی اگر نہیں ہے۔ مگر نہیں ہے
جو حال ہے اُس کو دیکھتے ہیں مآل پیشِ نظر نہیں ہے
کہا کہ دنیا برا کہے گی تو بولے ہم پر اثر نہیں ہے
مرض بھی ہے یہ اگر تو ایسا کہ حاجت چارہ گر نہیں ہے
مجھی کو شکوہ نہیں ہے تم سے مجھی پہ کچھ منحصر نہیں ہے

اثر کچھ اے ارشدی نہ ہوگا۔ خدا کے بندے خموش ہو جا
وہ تیری آہوں سے کیا ڈرے گا جسے خدا کا بھی ڈر نہیں ہے

ارشدی بدایونی

باغی تتلیاں

(۱)

بے حجابی کا مرقع، کفر کی تصویر دیکھ! — شرم کی بگڑی ہوئی اس بزم میں تقدیر دیکھ!
اس طرف کرسی نشینوں کی صفوں پر غور کر! — انکی پوشش اور گلے کے کالروں پر غور کر!
غیر محرم جگمگاتے ہیں اور خواتینِ وطن — بجلیاں نظروں میں جنکی چتونوں میں بانکپن
یہ خواتیں کون ہیں؟ اور کون ہیں یہ بیبیاں؟ — نوجوان کالج کی دوشیزہ مہذب لڑکیاں!
سر سے پا تک مغربی پوشاک میں ملبوس ہیں — دُنیا زدیں، نئی تہذیب سے مانوس ہیں
جسم پر جمپر، فراکیں، جگمگاتی ساریاں — پاؤں میں رنگین چپل، فینسی گرگابیاں
ان پہ اظہارِ زینت خوبصورت عینکیں — ریشمیں فیتے، پروں کی کلغیاں، رخشاں نگیں
"دخترِ آدم" کی جلووں میں "دختِ رز" کی بوتلیں — سرخیٔ باطل لبوں پر انگلیوں میں سگرٹیں
اس طرح بل کھا رہا ہے اُٹھکے ہونٹوں سے دھواں — جیسے بوڑھے سود خوار کی جبیں پر جھریاں

جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے شرارت کا فسوں — کرچکا ہے جن کو پاگل دیوِ مغرب کا جنوں
روح میں محلول جنکی بادۂ طاغوتیت — جنکی گندی سانس سے آتی ہے بوئے معصیت
جنکے سینے بھی کھلے ہیں جنکے بازو بھی کھلے — بال بھی کترے ہوئے ہیں نصف زانو بھی کھلے
عالمِ جذبات و مستی کے بھیانک سلسلے — باعثِ ہیجانِ خاطر جنکے فاجر قہقہے
ساحرانہ گنگناہٹ، ہلکی ہلکی سیٹیاں — کر رہی ہیں سازشیں بہکی ہوئی رعنائیاں
دسبب سے تبسم بے محل انگڑائیاں — کوندتی جاتی ہیں پیہم معصیت کی بجلیاں
جرم آلودہ نگاہیں، ذہن مشغولِ خطا — قلب کی تاریکیوں میں اہرمن ہنستا ہوا
جنکے اندازِ خراماں سے تکبر ہے عیاں — گفتگو سے جنکی اندازِ تبختر ہے عیاں

بعض فقرے بول جاتی ہیں "زبانِ خاص" میں
آگ روشن کر رہی ہیں خرمنِ اخلاص میں

(۲)

سر برہنہ دیویاں، یہ نیم عریاں لڑکیاں — پھر وہیں آ پڑتی ہیں کیوں یہ نازک شیشیاں
آہ! گلزارِ تمدن کی یہ باغی تتلیاں — جنکی ہیبا کی سے لرزاں زاہدوں کی نیکیاں
عظمتِ اسلاف اور ناموس سے منہ موڑ کر — آ گئیں ہیں خارزاروں میں گلستاں چھوڑ کر

ماتم اے ناموس، یہ کیا پُرخطر نظارہ ہے!
حدِ فطری چھوڑ کر اب حُسن یوں آوارہ ہے!!

(۳)

کالجوں میں، پارکوں کے ست گہوارو نہیں دیکھ! — کھیل کے میدان تھیٹر اور گلزاروں میں دیکھ!
خوبصورت بیکدوں، ہوٹل کے میخواروں میں دیکھ! — ہونیوالی حور کو کوثر سے بیزاروں میں دیکھ!

حسن ہی بکھرا ہوا ہر سمت بازاروں میں دیکھ!
خلد سے نکلی ہوئی حوّا کو انگاروں میں دیکھ!

(۴)

روشنی ابتک وہی ہے عرش کے تاروں میں دیکھ! — ہیں وہی آثارِ عظمت سخت کہساروں میں دیکھ!
کورنش پیرا اُسی صورت سے ہے موجِ سراب — ہاں اسی انداز سے گرتا ہے سجدے میں حباب
ہاں اسی انداز سے قائم ہیں اجرامِ فلک — انقلاب آیا نہیں انکی روش میں آجتک
ایک ہی رفتار پر پابندِ قانونِ خدا — بندگی کرتے چلے جاتے ہیں بے چون و چرا

تتلیاں باغوں کی ابتک باغ کے پھولوں میں ہیں
اور گھر کی تتلیاں ظلمات کے جھولوں میں ہیں

ابوالاسرار رمزی اٹاوی

وَلی پر ایک نظر

اے وَلی لگتا ہے ہر دل کو عزیز
شعر تیرا بسکہ شوق انگیز ہے

وَلی کے سنہ وفات کی تحقیقات کا مسئلہ مدت سے نقادوں کی دلچسپی کا مرکز بن چکا ہے۔ موجودہ زمانہ میں بھی دو نہیں تو ڈیڑھ مضمون اس پر وقف کئے جاچکے ہیں جو ملک کے دو بہترین رسالوں میں شائع ہوچکے ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا وَلی کے سنہ وفات کے بارے میں اتنی چھان بین کیوں ہو رہی ہے یقیناً اور شاعروں کا سنہ وفات اور سنہ پیدائش بھی ہنوز تاریکی میں ہے لیکن اُن کے بارے میں یہ تحقیق جاری نہیں ہے۔ یہ یقیناً وَلی کے کلام کی تاثیر ہے کہ وہ اپنے پیش رووں اور ہمعصروں سے زیادہ مشہور ہیں۔ آزاد نے تو انھیں نظم اُردو کی نسل کا باوا آدم بتایا ہے۔ اگر آزاد کا یہ مطلب ہے کہ وَلی اُردو کے پہلے شاعر ہیں تو ہم اس کے ماننے کو تیار نہیں، کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے اردو نظم کی تدریجی ترقی پر غور نہیں فرمایا اور جن شاعروں نے وَلی سے پہلے اُردو کو ترقی دینے میں جانکاہیاں کی ہیں اُن کی کاوشوں اور کاہشوں پر خاک ڈالدی ہے۔ بہت سے مورخوں کی رائے ہے کہ ریختہ اس مرتبہ کو وَلی سے سو سوا سو برس پیشتر پہونچ گیا تھا کہ اس میں باقاعدہ دیوان مرتب ہونے لگے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ۔ محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ صاحب دیوان تھے۔

آزاد، وَلی کو گجرات کا باشندہ بتاتے ہیں۔ اور اُن کا سلسلۂ نسل علامہ وجیہ الدین علوی گجراتی سے ملاتے ہیں لیکن میر حسن اور میر تقی میر کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وَلی اورنگ آباد یعنی دکن کے باشندے تھے۔ ممکن ہے کہ وَلی اکتساب فن یا تعلیم کی غرض سے گجرات گئے ہوں یا اُن کے آباؤ اجداد گجرات سے دکن آئے ہوں اور آزاد نے اسی لئے قدرت اللہ خاں قاسم کے تذکرے کے حوالے سے ایسا لکھدیا ہو۔

لیکن آزاد کے اس بیان میں کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ وَلی کا ہندوستان کی نظم میں وہی رتبہ ہے جو انگریزی میں چاسر اور فارسی میں رودکی اور عربی میں لہلہل کا۔ کیونکہ وَلی کے یہاں غزل، قصیدہ، مثنوی مرثیہ قطعہ، رباعی ہر چیز کے نمونے بکثرت ملتے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اُردو شاعری میں وَلی کی شہرت اُن کے تغزل کی وجہ سے ہے، اُنکی غزلیں اُنکی ابدیت کا باعث ہوئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ وَلی نے اُردو شاعری میں مختلف طرح سے اضافہ بھی کئے۔ وَلی نے نہ صرف موضوعات کے ہی اضافے کئے بلکہ اصناف سخن کے بھی اضافہ کئے۔ اگر ہم اس مضمون پر مفصل بحث کرنا چاہیں تو سب سے پہلے ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ وَلی سے قبل اُردو شاعری کی حالت کیا تھی اور وَلی نے اس میں کس کس طرح کیا کیا اضافہ کرکے انگریزی کے چاسر، فارسی کے رودکی اور عربی کے لہلہل کا درجہ حاصل کرلیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ان کے زمانہ کی گرامر پر بھی غور کرنا پڑے گا۔ سو اسوقت نہ اس کا موقعہ ہے اور نہ گنجائش۔

وَلی کی یہ تمام اہمیت سمجھنے کے لئے ہم کو اُردو کے اِس نقاد کی رائے پر اکتفا کرنا پڑیگا جس کی رائے وَلی ہی کی جائے پیدائش اور اولیت کے بارے میں ہم غلط خیال کرچکے ہیں۔ آزاد نے وَلی کے بارے میں لکھا ہے: "اس زمانہ میں اُردو میں متفرق شعر ہوتے تھے۔ وَلی کی برکت نے اسے وہ زور بخشا کہ آج ہندی شاعری نظم فارسی سے ایک قدم پیچھے نہیں۔ تمام بحریں فارسی کی اُردو میں لائے۔ شعر کو غزل اور غزل کو قافیہ ردیف سے سجایا۔ ردیف وار دیوان بنایا۔ ساتھ اس کے رباعی، قطعہ، مخمس کا راستہ بھی نکالا۔ اُردو زبان اُس وقت سوائے ہندی دوہروں اور بھاشا کے مضامین کے اور کسی قابل نہ تھی۔ انھوں نے اس میں فارسی ترکیبیں اور فارسی خیالات کو رائج کیا..... ان کا دیوان اِس عہد کے شاعروں کی بولتی تصویر ہے۔ کیونکہ اگر آج دریافت کرنا چاہیں کہ وقت کے امراء و شرفا کی کیا زبان تھی تو اُس کی کیفیت سوائے دیوان وَلی کے اور کوئی نہیں بتاسکتا"

لیکن ہمارا موضوع اس وقت وَلی کے محض تغزل کو پرکھنا اور جانچنا ہے۔ اس کے ساتھ جو پہلا فطری سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ تغزل کسے کہتے ہیں اور آیا وَلی کے یہاں وہ چیز موجود ہے یا نہیں۔ تغزل کیا ہے۔ اسکی کوئی فلسفیانہ یا سائنٹفک تعریف کرنا ناممکن سا ہے کیونکہ اس کا مفہوم ہر شخص کے ذہن میں ہے مگر اس کا بیان کرنا ہمارے

بس کی بات نہیں، بہرحال ہمارے نزدیک تغزل سے آجکل کی شاعری میں یہ مفہوم مراد لیا جاتا ہے۔ "تغزل وہ ہے جس میں مضامین عشق و حسن اور خارجی و داخلی تعلقات حسن و عشق نیز جذبات و معاملات کا پُراثر بیان ہو" صوفیانہ مضامین کو بھی بشرطیکہ ان میں خالص مضامین تصوف و دقیق مسائل بالکل خشک طریقے سے نہ بیان کئے گئے ہوں بلکہ جذبات کی آمیزش اور زبان کی چاشنی بھی موجود ہو تغزل میں شامل کر سکتے ہیں۔ وؔلی کے عہد میں بلکہ اس کے بہت بعد تک غزل محض حسن و محبت کے بیان کے لئے مخصوص رہی۔ وؔلی کے یہاں اکثر اشعار ایسے موجود ہیں جو تغزل کی زندہ مثالیں ہیں۔ ادب کا مقصد خواہ تلاش حسن ہو خواہ اُسے نیکی کا آئینہ دار قرار دیا جائے۔ ادب برائے ادب تسلیم کر لیا جائے خواہ ادب برائے زندگی۔ لیکن شعری تاثیر سے ہم کبھی انکار نہیں کرینگے ادب کو خواہ ہم کسی حیثیت سے دیکھیں شعر ہمارے دل پر ضرور اثر کرے گا۔ وؔلی کے کلام میں اگر ادب کا کوئی مقصد تلاش کیا جائے تو وہ واقعی ایک حد تک مضحکہ انگیز ہو گا۔ لیکن یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ادب اُس وقت بھی زندگی کا آئینہ دار تھا لیکن یہ تو الگ بحث ہے۔ اس وقت تو اس مختصر مقالہ میں وؔلی کے کلام سے چند مثالیں دیکر اس وقت کی غزلوں کا اندازہ لگانا ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ آیا تغزل وؔلی کے یہاں موجود ہے یا نہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھنا ہے کہ وؔلی کی زبان کیا تھی۔ آیا اس وقت اُسے سمجھنے کے لئے کسی خاص لُغت کی ضرورت تو نہیں پیش آتی۔

وؔلی کا کلام تکلف سے یکسر پاک ہے جو کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے آیا ہے اور جو خیالات اُن کے دل میں گذرے ہیں، اُنھیں کو بیان کر دیا ہے، ان کے یہاں پُرپیچ خیالات، نازک ترین استعارات اور دور از کار تشبیہات کا قحط ہے، ان کے اشعار بالکل صاف ہیں۔ وؔلی فارسی و عربی بحروں اور عروض سے پوری واقفیت رکھتے تھے ان کے اشعار ان کی طبیعت کی بلند پروازی کا نمونہ ہیں۔ وؔلی نے ریختہ گوئی شروع کی اور ساتھ ہی اُس کی روش بھی بدلی۔ لہٰذا وؔلی ریختہ کے موجد بھی ہیں اور مصلح بھی۔ اُردو غزل کی بنیاد حسن و عشق پر ہے۔ وؔلی کے یہاں پاکیزگی اور متانت موجود ہے ابتذال اور رکاکت نہیں۔ غزل میں ہمارے خیال میں داخلی رنگ مناسب ہے۔ خارجی رنگ اس پر نہیں کھلتا غزل سے واردات قلبی اور اندرونی جذبات کا پتہ چلنا چاہیئے۔ ہاں غزل عشق و محبت کے ساتھ بے ثباتیٔ دنیا کے افسانے بھی دُہراتی رہتی ہے۔ وؔلی کے یہاں حسن و عشق پر بعض شعر ایسے ہیں جو آپ ہی اپنا جواب ہیں مگر وؔلی کے زمانے کی شاعری کو اُنھیں کے زمانے میں پہونچکر دیکھنا چاہیئے لکھتے ہیں:

حُسن تھا پردۂ تجرید میں سب سے آزاد طالب عشق ہوا صورتِ انسان میں آ

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ دو نہایت دقیق مسئلے حل کر دیئے۔ ایک تو یہ کہ عشق کا وجود انسان سے ہوا دوسرے یہ کہ ع عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا میشود۔

معشوق کی تعریف میں لکھتے ہیں ؎

جلوہ گر جب خوش جمال ہوا نور خورشید پائمال ہوا

معشوقِ حقیقی کا جلوہ ہر چیز میں دیکھتے ہیں ؎

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حُسن بے حجاب اسکا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں ہرگز نقاب اسکا

اُردو زبان میں میؔر اپنی سادگی کے لئے مشہور ہیں۔ وؔلی کے یہاں بھی اس کی قابلِ تحسین مثالیں ملتی ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

جسے عشق کا تیر کاری لگے اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

شرابِ شوق سے سرشار ہیں ہم کبھی بے خود کبھی ہشیار ہیں ہم

عشق و محبت جو اُس وقت غزل کا اصل موضوع تھا۔ اس میں سوائے اس کے کہ نتائج عشق کے مضامین باندھے جائیں یا عاشق اور معشوق کی خصوصیات بیان کی جائیں یا پھر ہجر و وصل کے جھگڑے روئے جائیں اور کیا ہو سکتا ہے۔ وؔلی کے کلام کو بھی اس معیار پر پرکھ لیا جائے۔ نتائج عشق کے مضامین دیکھئے ؎

وؔلی جو عشقبازی کی حقیقت سے نہیں واقف
سخن اُس کا قیامت میں گل باغ ندامت ہے

معرکہ میں عشق کے ہر بوالہوس کا کام کیا دیکھ کیا حالت ہوئی منصور سے سردار کی

کتنا اچھوتا شعر ہے ؎

لالہ و گل مجھے لیجاتے ہیں رنگ و بوئے درد
گلرخوں کے عشق نے جب سے کیا ہے خوں مجھے

وؔلی کے زمانہ میں ایہام گوئی اور رعایت لفظی کافی زوروں پر تھی۔ مگر بالکل ناسخ کے عہد کا سا گورکھ دھندا بھی نہ تھا۔ بعض بعض اشعار اساتذۂ قدیم کے رنگ کا بہترین نمونہ ہیں ؎

کیا مجھ عشق نے ظالم کو آب آہستہ آہستہ کہ آتش گل کو کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

گر ردیف کی استواری سونے پر سہاگہ ہے۔

عاشق کی خصوصیات کے بارے میں بھی دو ایک نمونے دیکھ لئے جائیں ؎

کیونکر چھپا سکوں میں تجھ درد کی حقیقت ہے کام آہ دل کا افشائے راز کرنا

زبان ملاحظہ ہو۔

گر نہیں ہے خنجر بیداد خوباں کا شہید دامن صد چاک گل کس واسطے پر خوں ہوا

عجب نہیں جو ساجن کہریا ہو مجھ کھینچے کہ مجکو کاہ من عشق نے کیا ہے نحیف

معشوق کی خصوصیات ولی کے زمانے میں کیا تھیں اس کا اظہار ان کے اشعار میں موجود ہے ؎

نسخۂ سبزۂ خط خوباں والی عالم خیال ہوا

باوجود اس شان تغزل اور واردات حسن و عشق کے ایہام گوئی اور زمانے کا اثر نمایاں ہے۔ مثلاً

تیرے لب کے حقوق ہیں مجھ پر کیا بھلا دوں میں دل سے حق نمک

ندہ بالی ندہ بالا بلا ہے ۔۔ بلائے عاشقاں ناز و ادا ہے

ان دو شعروں میں سے اوپر والے شعر میں رعایت لفظی اور دوسرے میں ضلع جگت کی کیسی مثالیں موجود ہیں، اور ملاحظہ ہو

دیکھ اسکی "کلاہ بارانی" چاند پر آج ابر آیا ہے

فارسی شاعری کے اثر سے امرد پرستی شروع ہو چکی ہے - "کلاہ بارانی" کا لفظ اس کا ثبوت ہے

تشبیہ کی مثال کتنی نادر ہے

ہر صبح تجھ مصحف دیدار کی آرسی کو تشنگئ صاف ہے

تشبیہ کی مثال اس سے بہتر ملنی مشکل ہے۔

لب پہ دلبر کے جلوہ گر ہے جو خال حوض کوثر پہ جیوں کھڑا ہے بلال

معشوق کی تعریف میں فرماتے ہیں

زندہ کرنا استخواں کا گرچہ تھا کار مسیح زندہ کرنا شوق کا تجھ ناز کا اعجاز ہے

یہ شاعری دو سو برس پیشتر کی ہے۔ اس سے زیادہ خیالات کی تازگی، مضامین کی رفعت، روزمرہ کی سلاست، ان سب کے ساتھ ساتھ نتیجۂ شاعری یعنی درد و اثر کیا نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اردو شاعری کا یہ بچپن تھا۔

زاہد اور شاعر کی نوک جھونک غالباً پیدائشی ہے۔ بلکہ ممکن ہے کہ یہ جھگڑا دونوں کے عالم وجود میں آنے سے پیشتر ہی "طاؤس و مار" کی دشمنی کی طرح شروع ہو چکا ہو۔ ولی کے زمانے میں کہ اردو شاعری عہد طفلی کی ہی بہار دیکھ رہی تھی، زاہد پر تنا پڑنا شروع ہو چکی تھی۔ ولی بھی اس سے آزاد نہیں۔ رعایت لفظی بھی قابل ستائش ہے۔ ؎

ترے ابرو کی پہنچے گر خبر مسجد میں زاہد کو تماشہ دیکھنے آوے ترا محراب سے اٹھکر

اردو شاعری میں آتش اخلاقی شاعری کے لئے مشہور ہیں، یعنی آتش کے اشعار میں اخلاقی سبق دیئے گئے ہیں، مگر ہمیں ولی کے یہاں بھی اس کی مثالیں مل سکتی ہیں ؎

طمع مال کی سر بسر عیب ہے خیالات گنج جہاں سر سے ٹال

ولی میری تواضع سے رقیب سنگدل دائم

پشیماں ہے، خجل ہے، منفعل ہے سخت رسوا ہے

ولی نے دو ایک جگہ اپنی شاعری پر خود بھی رائے دی ہے۔ ؎

ولی شعر میرا سراسر ہے درد خط و خال کی بات ہے خال خال

ولی کو اس بات کا احساس تھا کہ داخلی رنگ غزل میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

اب ولی کے زمانے کی زبان کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے یہاں بکثرت ترکیبیں اور الفاظ ایسے ملیں گے جنہیں دیکھکر بہت سے لوگ آجکل ہنسیں گے مثلاً سوں بجائے سے۔ کوں بجائے کو اور دوانی گھوڑا ہوڑا۔ گورا وغیرہ بھی استعمال کئے ہیں۔ ولی خود دکنی تھے اس لئے اُن کے یہاں دکنی الفاظ بھی ملتے ہیں۔

ولی کی شہرت ان کے زمانے میں بہت ہو چکی تھی۔ کیونکہ وہ خود دو مرتبہ دلی آئے۔ دہلی میں اُن کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ خود اُنھیں بھی دہلی والوں سے دلچسپی پیدا ہوئی جس کی مثال میں اُن کا یہ مشہور شعر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ؎

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ ولی کی شہرت اُن کی زندگی میں دوسرے ممالک میں بھی پہونچ گئی تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں ؎

ولی ایران و توران میں ہے مشہور اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

ولی کے زمانے کی اصل زبان یہ تھی۔ ؎

بیوفائی نہ کر خدا سوں ڈر | جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر
گر ہوا ہے طالبِ آزادگی | بندہ مت ہو سبحہ و زنّار کا

کدھی میری طرف ساجن تم آئے نہیں سو کیا باعث
چھبیلا مکھ اپنا تک اُٹھاتے نہیں سو کیا باعث

گر بڑا تعجب اُسوقت ہوتا ہے جب اُن کے یہاں بالکل آجکل کی سی زبان کے شعر بھی ملتے ہیں۔ ویسی ہی ترکیبیں اور بندشیں جیسی آجکل رائج ہیں ؎

مضطربِ عشق ہے ہوں مجھکو ملامت نہ کرو
تپشِ دل نے کیا رعشۂ سیماب مجھے

کیونکہ بیٹھوں گوشۂ آرام میں | کھینچتا ہے وہ کماں ابرو مجھے
صنم کے لعل پر "دقتِ تکلم" | رگِ یاقوت ہے "موجِ تبسم"
ہر ذرہ اُس کی چشم میں لبریز نور ہے | دیکھا ہے جس نے حسنِ تجلّی بہار کا
مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی | دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

اشک خوں آلود ہے سامانِ طغرائے نیاز
مہرِ فرمانِ وفاداری ہے داغِ عاشق

مندرجۂ بالا اشعار میں "تپشِ دل" "رعشۂ سیماب" "گوشۂ آرام" "دقتِ تکلم" "رگِ یاقوت" "موجِ تبسم" "لبریز نور" "حسنِ تجلّی" "مسندِ گل" "منزل شبنم" "اشک خوں آلود" "سامانِ طغرائے نیاز" "مہرِ فرمانِ وفاداری" "داغِ عاشق" کیا ایسی ترکیبیں نہیں ہیں جنھیں آجکل بھی جدید کہا جاتا ہے۔ پھر ان اشعار کی زبان سے کہیں بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ دو سو برس قبل لکھے گئے ہیں، بالکل متاخرین کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں۔ کہ ولی کے زمانے میں بھی زبان اُردو کافی منجھ گئی تھی۔ فانی کا شعر ہے ؎

اب آنکھ اُٹھتی ہے وہ جنبش ہوئی ہلکی سی مژگاں کو
وہ چھیڑا چاہتے ہیں نوکِ نشتر سے رگِ جاں کو

واقعی ولی کے کلام کی سب سے بڑی خوبی اُن کا تغزل ہے جس سے اُن کے کلام کی آب تاب ابتک قائم ہے۔ ولی کا شعر ملاحظہ ہو ؎

رگِ جاں سے ہوا ہے خوں جاری | یاد تیرے پلک کی نشتر ہے

ولی کا تغزل زمانے کے اثر سے ہمیشہ محفوظ رہیگا

ابومسلم صدیقی ایم اے ایل ایل بی (علیگ)

معراجِ محبت

ازل سے ڈھونڈتا ہوں اُس نگاہِ نشترِ جاں کو | کبھی جسنے سکھایا تھا تڑپنا قلبِ انساں کو
رخِ تاباں پہ رہنے دے یونہی زلفِ پریشاں کو | کہ دنیا ڈھونڈتی ہے اتحادِ کفر و ایماں کو
بنے گردوں پہ اختر اور شبنم صحنِ گلشن میں | جو آنسو میں نے سونپے تھے کبھی فطرت کے داماں کو
نکھرلے زخمِ دل کی لالہ کاری یوں شبِ فرقت | کہ عنواں کوئی مل جائے نیا صبحِ درخشاں کو
ہمارا حشر بھی صحرائے وحشت ہی میں ہو یارب | ازل سے ہم ترستے ہیں یہاں دیدارِ جاناں کو
نہ پوچھو عشق کی معراج اب خود سے بھی منکر ہوں | غمِ جاناں مبارک ہو کیا کافر مسلماں کو
بھڑک اُٹھے نہ برقِ حسن میری عرضِ سادہ پر | چھپاتا پھر رہا ہوں دل میں جذباتِ پشیماں کو
زمیں ہے رقص میں اور یہ تواجد آسماں کو بھی | یہ کسنے آج پھر چھیڑا مرے تارِ رگِ جاں کو
مثالِ گل نہیں کم ظرف ہم جو راز کھو بیٹھیں | ہوا جب چاک تو پھر سی لیا چاکِ گریباں کو
یہ اے شہ زور ہے سیماب کے فیضان کا صدقہ | ملا الہام میں حصہ مرے قلبِ غزلخواں کو

شہ زور کاشمیری

طوفانِ نوح

مدت ہوئی ترکِ الفت کو اب ذہن میں وہ روداد نہیں — کیا تم نے کہا کیا ہم نے سنا کیا دل نے کیا کچھ یاد نہیں

دنیا کے طلسموں سے بڑھکر دل چسپ کوئی روداد نہیں — آرام بھی ہے تکلیف بھی ہے آزاد ہوں اور آزاد نہیں

پابندِ قفس ہونے سے مرے مسرور ہوئے مرغانِ چمن — جب میں تھا وہاں صیاد بھی تھا اب میں نہیں تو صیاد نہیں

پہلے تری محفل میں ہم نے دوڑائیں نگاہیں جلووں پر — پھر دیکھ کر اُن کو یہ دیکھا پہلو میں دلِ ناشاد نہیں

کیوں روزِ جزا سے خوف اتنا اسمیں تو فقط ہے بات اتنی — بیداد و ستم کی پرسش پر کہہ دیجئے گا کچھ یاد نہیں

اے دیدۂ ظاہر بیں تجھکو معلوم کہاں رتبہ میرا — کانٹا ہوں مگر ہوں پھولوں میں ذرہ ہوں مگر برباد نہیں

جب ظلم بھی تھا آزار بھی تھا تو آہ بھی تھی فریاد بھی تھی — اب ظلم نہیں آزار نہیں تو آہ نہیں فریاد نہیں

معشوق ستائے عاشق کو تقدیر کہاں یہ عاشق کی — بیداد کئے جا تو مجھ پر بیداد تری بیداد نہیں

اے جذبِ محبت کھینچ اُنکو اے طالعِ خفتہ کروٹ لے — تاثیر دکھائے نالۂ دل سب شاد ہیں میں ہی شاد نہیں

ناشاد رہے برباد رہے مرجائے کوئی مٹ جائے کوئی — قاتل کی ستم گر نظروں میں بیداد مگر بیداد نہیں

میں عشق و وفا سے چھوٹ سکوں مشکل یہ نظر آتا ہے مجھے — اُس قید میں دل نے ڈال دیا جس قید کی کچھ میعاد نہیں

محصورِ مصائب ہوکر بھی جو آن تھی وہ قائم رکھی — اللہ سے ہے فریاد مگر بندوں سے مری فریاد نہیں

کیا شکوۂ غم کیا شکرِ ستم کیا ذکر دعا کیا عرضِ وفا — ہم دیکھکر اُن کے تیور کو سب بھول گئے کچھ یاد نہیں

ناوک جو کبھی تکلیف کرے تو خانۂ دل کا راز کھلے — وہ کہتے ہیں آباد ہے یہ میں کہتا ہوں آباد نہیں

یہ قہر کرے وہ ظلم کرے یہ خاک کرے وہ قید کرے — صیاد سے بڑھکر بجلی ہے بجلی سے سوا صیاد نہیں

ہم عشق میں گنوائیں کیوں کر گنتی سے ہماری باہر ہیں — اتنے دئے تم نے رنج و الم تعداد تمہیں بھی یاد نہیں

پامالِ ستم کچھ لوگ ہوئے محصورِ الم کچھ لوگ رہے — ان سب کا خلاصہ اتنا ہے دنیا میں کوئی دلشاد نہیں

پھر عشق و وفا کی دنیا میں طوفان اُٹھا دینا کیسا
اے نوح وہ جوشِ گریۂ غم ہے یاد اُسے کیا یاد نہیں

نوح ناروی

ہنگرین افسانہ:-

دوسری دنیا

مغرور بیرن ونسٹین اپنے قلعہ کی کھڑکی سے، سامنے جانیوالی سڑک پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ یہ سڑک ایک پہاڑی پر سے ہو کر گھنے جنگلوں کی طرف جاتی تھی۔ اس کے ایک جانب دریا بہتا تھا۔ وہ سڑک پر غور سے دیکھ رہا تھا۔ جب اُس نے اپنے قلعہ کے دروازہ سے ایک شخص کو گھوڑے پر سوار نکلتے دیکھا، جو آگے جاکر سرپٹ دوڑنے لگا، تو اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور چہرہ پر خوشی و مسرت کے جذبات طاری ہوگئے۔ اُس نے ایک تحقیر انگیز قہقہہ لگایا اور اپنے ملازم سے کہا کہ وہ اس کی لڑکی امیلکا کو بلالائے۔

شفاف آسمان میں —— شہاب ثاقب کی چمک کی طرح امیلکا اپنے باپ کے کمرے میں نمودار ہوئی، وہ اس کو سنگ مرمر کی جھنجری کی طرف لے گیا اور کہا۔ "دیکھو سڑک پر یہ کون جارہا ہے پہچانتی ہو اس کو؟"

اپنی حیرت و مسرت کو چھپاتے ہوئے امیلکا نے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں یہ آپ کا خدمتگار گوتلا ہے"

"اب تم اس کو کبھی نہیں دیکھ سکوگی" اُس نے سرد مہری سے کہا۔

امیلکا کی آنکھوں میں اندھیرا چھاگیا۔ جیسے سورج گہن میں آگیا ہو۔ وہ شدتِ غم سے چکرا کر گرنا ہی چاہتی تھی کہ اُس کے باپ کے قوی بازو نے اُس کو تھام لیا —— امیلکا کو اُس کے کمرے میں پہونچادیا گیا۔

گوتلا بلا کسی شک و شبہ کے اپنی منزلِ مقصود کی جانب چلا جارہا تھا۔ اسے پوسٹیزن میں راہب ہوسٹیم کے پاس پہونچنا تھا —— بیرن نے اس کو ایک خط اس ہدایت کے ساتھ دیا تھا کہ وہ نہایت رازدارانہ طور پر اس کو پہنچادے اور راہب کے علاوہ اسے کوئی نہ دیکھے

گوتلا نے کوشش کی تھی کہ وہ اپنے آقا کی رضا جوئی اور خوش اعتقادی حاصل کرے، اب جو اسے آقا نے یہ خفیہ کام سپرد کیا تو اسے اپنی کوششوں میں کامیابی کی جھلک نظر آنے لگی۔

کون سمجھ سکتا تھا کہ وہ اسوقت کیسے کیسے حسین خواب دیکھ رہا ہوگا؟ وہ امیلکا سے محبت کرتا تھا اور امیلکا اُس پر جان دیتی تھی۔

——(۲)——

وہ جنگل میں ایک خانقاہ کے پاس رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ تاکہ راہب کے پاس چپ چاپ پہونچ جائے۔ مئی کا مہینہ تھا۔ غروب آفتاب کا دلکش منظر عجب بہار دکھا رہا تھا۔ نیلے آسمان کی چمک، بلبلوں کی ترنگ اور پھولوں کی مہک سے اس کا دل مسرت و ابتہاج کے بحرِ ذخار میں غوطے کھانے لگا۔

اِس کا دل بے اختیار چاہ رہا تھا کہ وہ اس حسین دنیا کو —— اِس بہاروں کے خزانوں کو اپنے سینہ سے لگالے —— دُور سے گھنٹوں کے بجنے کی آواز نے اُسے چونکا دیا اور اُسے اپنا فرض یاد آگیا۔ آسمان پر بزمِ انجم کی تیاریاں شروع ہوچکی تھیں ستارے ایک ایک کرکے نمودار ہورہے تھے۔ جنگل کا بڑھتا ہوا سکون اُسے اپنے سفر پر روانہ ہونے کی تلقین کر رہا تھا، اُس نے کائنات عالم کے سنجیدہ پہلو کو محسوس کیا اور آہستہ آہستہ روانہ ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ خانقاہ کے دروازہ پر پہونچا، یہاں سکوت، متانت اور بے رونقی سی چھائی ہوئی تھی، بیرن کی ہدایت کے مطابق اُس نے اشارہ کیا دروازہ زور سے کھلا اور کسی نے کرخت آواز میں کہا

"کہاں سے آئے ہو اور کون ہو؟"

"بیرن وان ونسٹین کی طرف سے محترم راہب کی خدمت عالی میں حاضر ہوا ہوں۔"

"اچھا! میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ!"

وہ تنگ او نیچے راستے سے گذر کر سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے ایک دروازے کے سامنے جاکھڑے ہوئے۔ نوکر نے آہستہ سے دروازہ پر تین بار دستک دی۔ —— فوراً ہی ہلکی سی آواز آئی "میں تنہا ہوں"

ملازم نے دروازہ کی طرف اشارہ کیا اور خود نیچے چلا گیا۔ گونلا اندر داخل ہوا ایک اونچی اور منقش کرسی پر راہب بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا، چراغ سے ہلکی ہلکی روشنی کی کرنیں نکل رہی تھیں ـــ جیسے موسم خزاں کی پھیکی دھوپ، جیسے ہی گونلا روشنی میں آیا۔ راہب نے اُس کے چہرہ کو اچھی طرح دیکھ لیا، اور پھر اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگا، جیسے عہد رفتہ کا کوئی گم گشتہ واقعہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو ـــ راہب نے خط کی مہر توڑی اور خاموشی سے پڑھنا شروع کیا جوں جوں وہ خط پڑھتا جاتا تھا، اُس کی سنجیدگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی نظریں کاغذ پر ہی جم کر رہ گئی ہیں۔

"تمہارا نام؟" راہب نے اچانک پوچھا۔

"گونلا فرہیسگی"

"ـــ اور تمہارے والدین کا نام؟"

"گیبا فرہیسگی ـــ اور سوسے لورانڈی۔ دونوں کا انتقال ہو چکا ہے"

"یہ تمہاری انگلی میں انگشتری کس کی ہے؟"

"یہ میری پیاری ماں کا آخری تحفہ ہے"

راہب کے زرد چہرے پر سرخی دوڑ گئی،

"میرا پیشیں یہاں سے اس قدر جلد چلا گیا کہ بیرن کو بھی اطلاع نہ دے سکا، یہ خط اسی راہب کے نام تھا"

اُس نے گونلا کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا

"گونلا! اس خط میں لکھا ہے کہ لانے والے کو فوراً موت کے گھاٹ اُتار ـــ جانتے ہو کیوں؟ اس لئے کہ اس نے رمیکا سے محبت کرنے کی جرأت کی ہے ـــ ایک ادنیٰ خدمتگار اور اُس کا یہ حوصلہ ـــ اس کو موت کے آغوش میں سُلا دیا جائے چپ چاپ، کسی کو معلوم نہ ہو، میں اس کا چہرہ پھر نہ دیکھ سکوں۔"

"کیا محبت میں ادنیٰ و اعلیٰ کی بھی شرط ہے؟" نوجوان نے چیخ کر کہا

"خاموش!" راہب نے حکم دیا۔

"مجھے اپنے بڑوں کا حکم ماننا پڑتا ہے"

گونلا پر یہ سنکر بجلی گر پڑی۔

راہب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا

"لیکن بیرن نے تمہارے متعلق جو حکم دیا ہے، میں اُسے پورا نہیں کرونگا غور سے سنو! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں کسی اور سے نہ کہنا ـــ"

نوجوان کی جان میں جان آئی، اُس نے جذبۂ تشکر سے راہب کے دست متبرک کو بوسہ دیا۔

راہب نے کہنا شروع کیا "تمہیں یہاں سے فوراً چلا جانا چاہیئے ـــ میں تمہیں ایک خط دوں گا ـــ جسے تم ہمارے آقا کے پاس کورائیلے جانا، اگرچہ اسے کوئی اور لے جاتا مگر اب تمہیں لیکر جاؤ ـــ اُس کو پڑھ لو، آقا تمہیں ہماری فوج میں بھرتی کر لیں گے، خدا پر بھروسہ رکھو اپنے پر قابو پاؤ ـــ اگر ضرورت پڑے تو میرے پاس چلے آنا ـــ!"

"مگر محترم راہب! مجھ پر اس کرم کا سبب؟"

"تمہیں دیکھکر مجھے اپنا عہد رفتہ یاد آگیا۔ تمہاری طرف دل خود بخود کھنچ گیا ـــ میں اسوقت تم سے وہ کچھ کہہ رہا ہوں جو کبھی "آشنائے لب" نہیں ہوا، تمہیں اس زندگی کے لئے اپنی ماں کا رہین منت ہونا چاہیئے میں اُس سے محبت کرتا تھا ـــ" دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ! طوفان زدہ سمندر، راستہ دکھانے والے ستارے کی طرح میں ابتک اُس سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے تمہاری ماں کو جبکہ وہ نوجوان تھی، اُس کے باپ کے یہاں دیکھا تھا ـــ آہ! تمہارے باپ سے بھی اُس کی ملاقات ہوئی ـــ اور وہ بھی میری طرح اُس کو چاہنے لگا، ایسا کون سنگدل ہوگا جو اُس سے محبت کرنا پسند نہ کرتا ہو، میں تمہیں اپنے دل حزیں کی بے قراریاں کس طرح دکھاؤں، میں قنوطیت پسند نہیں اس لئے قسمت کی آزمائش کے لئے تمہاری ماں کے گھر گیا، تاکہ اُس کے باپ کو اپنی محبت سے مطلع کر دوں۔ وہاں تمہارے باپ کا ایک دوست ملا، اُس نے مجھ سے کہا "جلدی کیجئے! آپ سوتے کی منگنی میں ٹھیک وقت پر پہونچے ـــ"

میں اُسی وقت پچھلے پاؤں اُس شخص کو، جو گویا تمہاری ماں کے لئے دیکر چلا آیا ـــ اور بعد میں راہب بن گیا۔ کچھ عرصہ بعد اُن کی شادی ہو گئی۔ ایک دن ہماری خانقاہ میں ایک راہب آکر ٹھہرا، اُس کے ذریعہ تمہاری ماں کا نام میں نے پھر سنا، اُسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ شادی کی کسی بھی تقریب میں خوش

نہیں ہوتی ——— حتیٰ کہ اُس کے چہرہ پر مسرت کا شائبہ تک نہیں پایا گیا، ہر جگہ یہی کہا جا رہا ہے کہ اُسے کسی اور سے محبت تھی ——— اور یہ شادی جبراً اُس کی رضامندی کے بغیر کی گئی ہے۔ یہ سنکر میں پاگل سا ہوگیا اور رکزنڈار میں شامل ہوگیا۔ تاکہ مشرق بعید کی کسی لڑائی میں اپنا قصّہ ہی تمام کردوں ——— زندگی میرے لئے بے کیف تھی ——— تم چلے جاؤ ——— دیکھو گھنٹہ زیح چکا ہے۔ وقت قیمتی ہے، فوراً روانہ ہوجاؤ۔"

گوتلا، راہب سے بغلگیر ہوا۔ راہب نے نوکر کو بلایا اور نوجوان لڑکھڑاتا ہوا روانہ ہوگیا۔ اُس نے انتہائی افسوس اور ملال کے ساتھ نوسٹین جانے والے راستہ کی طرف سے اپنے گھوڑے کا منھ موڑا ——— اور ایک نئی زندگی کے سفر پر روانہ ہوگیا۔

—— (۳) ——

نوسٹین کیسل میں سکوت کی حکمرانی ہے، ریبکا ذرا ہوش میں آگئی ہے۔ اتنے میں ایک پیغامبر راہبر کی طرف سے یہ خبر لیکر آیا" نوسٹین کا خدمت گار دریائے واگ میں پھسل گیا اور پھر اُس کا کچھ پتہ نہ چلا ———"

امیلکا سخت بیمار ہوگئی، بیرن بھی رنجیدہ رہنے لگا، کیونکہ وہ اُس کی اکلوتی لڑکی تھی، ایک مشہور راہب کو بلایا گیا، اگرچہ وہ تشخیص مرض میں کامیاب ہوگیا، لیکن علاج بے سود رہا، لڑکی روز بروز نحیف سے نحیف تر ہوتی جا رہی تھی، بیرن شکار کھیلنے چلا جاتا اور دنوں باہر رہتا، وہ کئی بار ٹیمپی کیسل بھی گیا۔ جہاں وہ ایک نوبل سے بہت ہی گھُل ملکر باتیں کرتا تھا!

اس تنہائی سے امیلکا قدرے خوش رہتی، کیونکہ اُسکی بوڑھی دایہ گونڈر، اُسے جب وہ لیٹ بستر پر لیٹ جاتی تھی، پرانے زمانے کی کہانیاں سُنایا کرتی تھی، اور عشق و محبت، افراق و وصال، صبر و تحمل، مایوسی و ناکامی کا نقشہ کھینچا کرتی تھی، اُس نے امیلکا کو یہ بھی بتایا تھا کہ محبت میں صبر و سکون ہی کامرانی کا ذریعہ ہے، ——— اور اگر زندگی میں جدائی ہوجائے تو پھر ایک دوسری دنیا میں دائمی ملاقات ہوتی ہے، یہ دنیا محبت کرنے والوں کو اذیت پہونچاتی ہے مگر ——— یہاں سے بہت دُور، ایک نئی دنیا میں محبت کرنے والے جاتے ہیں اور محبت کا دیوتا خراج عقیدت پیش کرتا ہے، اور کیوپڈ پھول نچھاور کرتا ہے

امیلکا کو دلنی کی کہانی بہت پسند تھی جسے بوڑھی عورت نے اِس طرح بیان کیا تھا۔ "میری لڑکی دلنی کے متعلق لوگ کہتے تھے کہ وہ دلہن "بنکر مری" دنیا کی بے چینی کیساتھ زمین پر گھوما کرتی ہیں اور چوراہے پر ناچتی ہیں اگر کسی آدمی کو وہ مل جائیں تو اس کے گرد ناچنے لگتی ہیں، ناچتی رہتی ہیں یہاں تک کہ وہ چکرا کر مرجاتا ہے، اور وہ اُن میں سے سب سے کمسن کا دولہا بن جاتا ہے، وہ اپنا مقصد اِس طرح پالیتا ہے ——— یہی حال میری ایک بہن کا ہوا ——— اسے میں چاندنی کی روشنی میں اکثر دیکھتی ہوں، اس کے بعد بوڑھی عورت نے لڑکی کی محبت اُس کی پریشانیاں اور پھر اُس کا خاتمہ بیان کیا۔

—— (۴) ——

موسم سرما گذر گیا، بہار اپنی عطر بیزیوں اور رنگ ریلیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی، ——— ایک دن امیلکا سے اُس کے باپ نے کہا کہ ٹیمپی کے لارڈ سے اُس کی شادی ہونے والی ہے۔ ——— وہ بیرن کی ضدی طبیعت سے خوب واقف تھی اِس لئے چپ چاپ کمرے سے باہر چلی گئی ———"

مطمئن بیرن نے اپنی سرزمین پر نظر دوڑائی اور دل میں سوچا کہ اُس کا داماد اِس علاقہ میں آزادی کے ساتھ شکار کھیلا کرے گا۔

——— لیکن امیلکا خدا سے دعا مانگ رہی تھی کہ وہ اُسے جلد اِس دنیا سے اُٹھالے، وہ دن بدن زرد اور کمزور پڑتی گئی اور آخر ایک دن اِس کی روح اِن اذیتوں سے آزاد ہوگئی ———!!

"ابا جان! آپ نے گوتلا کو مجھ سے جدا کردیا ——— خیر ——— میں نے آپ کو معاف کیا!" یہ امیلکا کے آخری الفاظ تھے،

سنگدل بیرن کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوا، اُس وقت اُسکا خون منجمد ہوا جا رہا تھا، امیلکا کے تابوت کو ایک غار میں لیجا کر سپرد خاک کردیا گیا وہاں بیرن اکیلا رہتا تھا ——— مغموم دلول!! ——— اُس نے بات چیت کرنا بھی چھوڑ دیا۔

شدہ شدہ یہ خبر کورانیا میں گوتلا کے پاس پہونچی کہ نوسٹین میں کیا کیا انقلابات ہوچکے۔

وہ فوراً یہ کہکر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔" اگر بوڑھا بیرن اپنے ساتھ

مجھے امیلکا کی قبر کی پاسبانی نہیں کرنے دیگا تو کم از کم مجھے مار ہی ڈالے گا۔۔ اس طرح میں اُس زمین پر اپنی محبوبہ کے پاس پہونچ جاؤں گا! وہ مجھے بلا رہی ہے۔۔ آیا۔۔ میں آ رہا ہوں امیلکا ۔۔۔۔ !!! میں اب تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا ۔۔۔۔ پیاری امیلکا میں آ رہا ہوں ۔۔۔۔ !"

وسٹین کے جنگل میں جس وقت گوتلا پہونچا تو رات ہو چکی تھی۔۔ جگنو چمک رہے تھے ۔۔ ہوا درختوں سے کانا پھوسی کر رہی تھی، چاند اپنی نقرئی کرنیں بکھیر رہا تھا۔۔ بارہ بجتے ہی وہ چورلہے پر پہونچ گیا۔۔ وہ "ولیبوں" کے درمیان گھر گیا ۔۔۔۔ اُن کی آواز روحوں سے مشابہ تھی،

روحیں اب رقص کر رہی تھیں ۔۔ ان کے دراز گیسو چاندکی روپہلی روشنی میں چمک رہے تھے ۔۔۔ اچانک ان میں سے ایک گوتلا کے پاس آئی اور اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔۔

" امیلکا " اُس نے کہا

گوتلا نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں، اُس کی نظریں گڑی کی گڑی رہ گئیں۔

امیلکا نے اُس کو اپنے نازک سینے سے لگا لیا۔ وہ ساکت کھڑا تھا۔ جیسے ہی امیلکا نے اُسے پیار کیا اُس کا طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا ۔۔۔۔

صبح جب بیرن وادی میں اُترا تو اُسے ایک نعش پڑی ہوئی ملی، وہ پہچان گیا کہ یہ اُس کے پُرانے خدمتگار گوتلا کی نعش ہے

" او خدا ۔۔ میرا گناہ معاف کر "

اُس نے آسمان کی طرف منہ کرکے کہا۔

وہ نعش کو اپنے ساتھ غار میں لے گیا اور اپنی لڑکی امیلکا کے پہلو میں اُس کو دفن کر دیا ۔۔۔۔

۔۔ بیرن کو اکثر خواب میں امیلکا اور گوتلا ۔۔۔۔ "ستارۂ صبح" کی طرح ۔۔۔۔ چمکتے ہوئے ۔۔۔۔ شاداں و فرحاں نظر آتے ہیں!

رُشدی مدیر معاون "ندیم" بھوپال

سازِ راز

عشق میں جب وہ بندگی نہ رہی ۔۔۔ حسن میں بندہ پروری نہ رہی
بات انصاف کی اگر پوچھو ۔۔۔ اب زمانے میں منصفی نہ رہی
سُن چکا طور کا فسانہ میں ۔۔۔ اب تمنائے دید کی نہ رہی
اُسنے جو کچھ کہا رہا ہوکر ۔۔۔ بات اُس کی رہی مری نہ رہی
اتنا رویا ہوں اُنکی فرقت میں ۔۔۔ آنکھ میں اب کہیں نمی نہ رہی
عیش قربانِ عشق ہوکے رہا ۔۔۔ اپنی کوئی خوشی خوشی نہ رہی
اُسنے دُنیا مری بدل ڈالی ۔۔۔ زندگی اب وہ زندگی نہ رہی
آگ بھڑکی وہ عشق کی ہمدم ۔۔۔ لاکھ دابا مگر دبی نہ رہی

حُسن سے عشق کیا کریں اے راز
حسن میں عشق پروری نہ رہی

اسمٰعیل کھوکھر راز جوناگڑھی

رودادِ جوانی

آہوں کا دھواں تحلیل ہوا، اشکوں کی روانی ختم ہوئی
اب عشق کے ساتھ اے حسن تری پرکیف کہانی ختم ہوئی

تو فصدِ رگِ وحشت کی کھلی، رنگین فضائے حسن ہوئی
سیراب ہوئی کشتِ الفت، پانی کی گرانی ختم ہوئی

رنگینیِ حسن و محبت میں، اب جاذبیت باقی نہ رہی
آثار ہیں صبحِ قیامت کے، اور شامِ جوانی ختم ہوئی

دل ہی نہ رہا ہم کیوں جائیں، الفت نہ رہی وہ کیوں آئیں
وحشت کا زمانہ بیت گیا، اب خاک اڑانی ختم ہوئی

اندوہِ مآلِ گلشن پر، اک شبنم تھی جو روتی تھی
پوچھتے ہی رودادِ چمن، غنچوں کی زبانی ختم ہوئی

اب کون وہ گیت سنائیگا، دنیا کو کون جگائے گا
دیوانۂ الفت کی آخر، آشفتہ بیانی ختم ہوئی

وہ ہم نہ رہے، وہ تم نہ رہے، وہ دل نہ رہا وہ دن نہ رہے
احساسِ جوانی باقی ہے، رودادِ جوانی ختم ہوئی

پرسش پہ جو اشک نکل آئے، وہ آخری تھے پیغام مرے
آنسو بنکر رودادِ الم، آنکھوں کی زبانی ختم ہوئی

فرسودہ خیالی پھر بھی ہے، فرسودہ خیالی اے رونق
ہے مائلِ جدّتِ فکرِ سخن، وہ طرزِ پرانی ختم ہوئی

رونق دکنی

رباعیات

توبہ

رحمت منڈلا رہی ہے پیچھے پیچھے
اک بدلی سی چھا رہی ہے پیچھے پیچھے
اے میری بدی، تو کہاں جاتی ہے
توبہ بھی تو آ رہی ہے پیچھے پیچھے

إن الحكم إلا لله

کیوں خوفِ تعینات سے روتا ہے
ڈر کر غم الم سے جان کیوں کھوتا ہے
تنجیم، ارم، چند کانت ہے، لیکن
سب جبر کی کے ہاتھ میں ہوتا ہے

دنیا

پر ظاہر یہ نہیں کہ نکل آئے گی جب
مٹی ہی نہیں وقت پہ جائے گی جب
اک ریت حباب بن کے بن جائے گی جب
دنیا پہ نہیں ہے سر اٹھائے گی جب

بھرم

محفلِ عیش میں سبھی ہیں میرے
ہیں دیدۂ بے بسی بھی معدوم مرے
بے جفا کا اب سبب ہے میرے
سکینہ کے جھکے ہے سر مرے

امجد حیدرآبادی

"دستور الاصلاح اور مدیرِ شاہین"

"میں چاہتا تھا کہ زیرِ نظر مضمون "شاہین" ہی میں شائع ہو۔ تاکہ وہ حضرات جن کی نظر سے "شاہین" کی تنقید گذر چکی ہے اُس کا جواب بھی ملاحظہ فرمالیں اور اعتراض و جواب کی نوعیت اُن پر اچھی طرح واضح ہو جائے تقریباً چار ماہ ہوئے میں نے یہ مضمون پروفیسر مولوی رشید احمد صاحب صدیقی نگرانِ "شاہین" کی خدمت میں بغرضِ اشاعت ارسال کیا تھا اور مجھے قوی اُمید تھی کہ پروفیسر صاحب اصولاً میرا جوابی مضمون مدیرِ "شاہین" کو اشاعت کے لئے ضرور دیدیں گے جبکہ میرا مضمون قطعاً سنجیدہ ہے اور میں نے دانستہ اُن گالیوں کا جواب کہیں نہیں دیا ہے جو مدیرِ "شاہین" نے اپنے مضمون میں بکی ہیں، لیکن نہ معلوم کیوں اُنھوں نے جوابی مضمون کی اشاعت سے گریز فرمایا، کم از کم پروفیسر صاحب سے مجھے اس قسم کی توقع نہیں تھی، اس لئے کہ وہ اُردو کے ایک اچھے نقاد اور بالغ نظر ادیب ہیں۔ اُن کی زیرِ نگرانی "شاہین" میں شائع ہونے والی اس لچر تنقید سے جو ایک عام بدگمانی پیدا ہو گیا ہے اسکے ازالہ کے لئے بھی یہ ضروری تھا کہ وہ میرے جوابی مضمون کی اشاعت میں معاون ہوتے۔

"مدیرِ شاعر" بھی میرے جوابی مضمون کی اشاعت کے لئے تیار نہ تھے۔ اُن کا منشا بھی یہی تھا کہ جوابی مضمون "شاہین" ہی میں شائع ہو، لیکن اس صورت میں کہ "شاہین" والے بالکل خاموش ہیں، میرے مجبور کرنے پر مدیرِ "شاعر" میرا جوابی مضمون شائع کر رہے ہیں۔

آکم مظفر نگری

اکتوبر ۴۰ء کے "شاہین" (علی گڈھ) میں ایک مضمون مضطر صاحب مدیرِ رسالہ کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں مولانا سیماب اکبرآبادی کی تازہ تصنیف "دستور الاصلاح" پر ایک تنقیدی نظر ڈال کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے صرف تفاخرِ بیجا اور تعلّیوں کا مظاہرہ مقصود ہے، علاوہ ازیں بعض اصلاحوں کی توجیہات اور بعض جگہ اصلاحوں پر کچھ اعتراضات وارد کئے گئے ہیں۔

اختلاف و اعتراض بُری چیز نہیں بشرطیکہ وہ نیک نیتی پر مبنی ہو۔ اسوقت تک جتنے مصنف و شعرا گذرے ہیں سب کے کلام پر اعتراضات وارد کئے گئے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہیگا اور اعتراضات کئے جائینگے "من صنف فقد استہدف" لکھنے والا ضرور تیروں کا نشانہ بنتا ہے جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے کہا جاسکتا ہے کہ معترض سے بلا منتِ استاد فائدہ پہنچا ہے مگر یہ بات اس وقت تک ہے جب تک کہ تنقید نگار کا منشا صرف تعمیرِ فن ہو لیکن جب اُس کی نیت فاسد ہوتی ہے اور تنقید کے پردے میں دل کا بخار نکالنا اور بغض و حسد کا مظاہرہ منظور ہوتا ہے تو اُس کی تحریریں بجائے تعمیر تخریب کا باعث ہو جاتی ہیں، مجھے مدیرِ "شاہین" معاف فرمائیں میں اُنکی تحریر میں صداقت کا شائبہ بھی نہیں پاتا اور یہ سمجھتا ہوں کہ اُن کی تحریر کسی نیک نیتی پر مبنی نہیں ہے بلکہ مصنف "دستور الاصلاح" کی شہرت اور اُس کے کمالِ فن کی بلندیوں کے اعتراف سے دانستہ گریز مقصود ہے۔ یہ صرف میرا خیال ہی نہیں بلکہ خود معترض کی تحریر اِس حقیقت کی آئینہ دار ہے قارئین کرام دیکھیں گے کہ اعتراضات کے سلسلے میں ایک جگہ امیر مینائی کی اصلاح کو مصنف دستور الاصلاح کی اصلاح سمجھ کر اُس پر خوب لے دے کی گئی ہے، معترض جو خاندانِ امیر مینائی کا ملح ہے اس سے یہ اُمید نہیں ہوسکتی تھی مگر اسکو مخالف

کی تحریر سمجھکر جس انداز میں دادِ تہذیب دی گئی ہے وہ معترض کی نیّتِ فاسدہ کی اچھی طرح تشریح کردیتی ہے۔ علاوہ ازیں اعتراضات کی نوعیت دحقیقت صاف بتاتی ہے کہ تنقید کسی نیک نیتی سے نہیں بلکہ محض بغض وعناد کی بناپر کیگئی ہے۔ فنی اعتبار سے اعتراضات بالکل لچر ہیں سوائے اِس کے اور کچھ نہیں کہا گیا کہ لفظ غیر فصیح ہے فلاں ترکیب مبتذل ہے، ابتذال و غرابت اور غیر فصیح کی بحث نہایت اہم ہے اس کے لئے اصولِ فن سے واقفیت کی ضرورت ہے، بلادلیل محض کسی لفظ کو فصیح اور غیر فصیح کہدینا بہت آسان ہے مگر واقعی طور پر اس امر کی تحدید کردینا نہایت دشوار، مصنّفِ "دستورالاصلاح" نے کسی شاعری کے اسکول کو میدان میں خم ٹھوک کر نکل آنیکی ہرگز دعوت نہیں دی، بلکہ اپنے شاگردوں اور دیگر طالبانِ فن کی خدمت کا حق ادا کیا ہے، اگر کوئی اس کو اپنے حق میں چیلنج سمجھتا ہے تو سمجھے مگر مصنف کتاب کا یہ منشا نہیں ہے، جن کے دل میں کھوٹ ہے اور جو اپنی مفروضہ اُستادی کے ستون کو لرزاں دیکھتے ہیں وہی گھبرا رہے ہیں اور اعتراض کر رہے ہیں جو منصف مزاج ہیں وہ اس کی کماحقہٗ قدر کررہے ہیں، چنانچہ بہت سے اساتذۂ فن کی تحریریں کتاب کی تائید میں شائع ہوچکی ہیں، کمزوری سب میں ہوتی ہے اعتراض کس پر نہیں کیاجاسکتا؟ مصنّفِ دستورالاصلاح بھی انسان ہے اس سے بھی غلطی ہونا ممکن ہے — لیکن یہ کیسا انصاف ہے کہ اس کے کمال سے نظریں پھیرکر جا و بیجا طریقے سے جو اُلٹا سیدھا منہ میں آیا کہدیا، اگر اعتراض معقول ہو تو اس کے تسلیم کرنے سے کسکو انکار ہے، لیکن بلاوجہ بغض وعناد کا مظاہرہ تو اہلِ فن کی نظروں میں بہرطور قابلِ تعزیر ہی قرار دیا جاتا ہے۔ ابتدائے مضمون میں حضرت دلؔ شاہجہانپوری کی جو کچھ تعریف کی گئی وہ صحیح ہو یا غلط لیکن "دستورالاصلاح" پر تنقید کے سلسلے میں وہ اَمر بے جوڑ ضرور ہے۔ اعتراضات کتاب پر کئے جارہے ہیں اور ضمناً دل کھولکر دلؔ صاحب کی تعریف کی جارہی ہے گویا معترض کی تنقید کیا ہے دلؔ صاحب کی تعریف میں منثور قصیدہ ہے۔ بہرحال مجھے ان غیر ضروری باتوں پر جو ابتدائے مضمون میں لکھی گئی ہیں کوئی تفصیلی بحث منظور نہیں ہے، میں بیجا تطویل کو کام میں لاکر قارئینِ کرام کا قیمتی وقت لینا نہیں چاہتا۔ لہٰذا ان اعتراضات پر جو دستورالاصلاح پر کئے گئے ہیں ایک سرسری نظر ڈال کر یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اعتراضات اصولِ فن کے لحاظ سے کہاں تک قابلِ اعتنا ہیں؟،

اعتراض :-

لے سمجھے نہ سمجھے کوئی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ترکِ میکشی پر بھی رہی ہے میکشی اپنی

"اِس جگرؔ کے شعر کو آپ نے بیکار تختۂ مشق بنایا، آپنے جو اصلاح پیش کی ہے وہ یہ ہے

کہ ترکِ میکشی پر بھی ہے جاری میکشی اپنی

کوئی خاص ترقی آپکی اصلاح نے جگرؔ کے مصرع کو نہ بخشی بلکہ میری رائے میں تو آپ کی اصلاح خام ہے "رہی ہے" سے ایک محاورہ کی شان پیدا ہوگئی ہے جس کو آپ کے لفظ جاری نے زائل کردیا۔ "رہی ہے" میں ماضی قریب استمراری حیثیت لئے ہوئے ہے آپ نے محض ماضی قریب سے اِس لطفِ استمرار کو باطل کردیا —"

جواب :-

مولانا سیمابؔ کی اصلاح سے جگرؔ کے شعر میں یقیناً ترقی ہوئی، اگر معترض صاحب غور و فکر سے کام لیتے تو وہ آسانی سے سمجھ سکتے تھے کہ لطف استمرار "رہی ہے" سے زیادہ "جاری ہے" میں موجود ہے اور اسی لئے اصلاح کی گئی ہے "جاری ہے" میں تو حال و استقبال دونوں آگئے۔ "رہی ہے" میں یہ بات کہاں اس سے صاف ظاہر ہے کہ میکشی زمانۂ ماضی میں رہی ہے۔ اب نہیں، اِس کے علاوہ اصلاح شدہ مصرع میں روانی اور برجستگی پیدا ہوگئی، ترکِ میکشی پر بھی میکشی جاری ہے اور ہمیشہ رہے گی یہ لامحدود معنویت جگرؔ کے مصرع میں کہاں تھی!

اعتراض :-

صباؔ نہ جیب میں نہ گریباں میں تار باقی ہے یہ سُن رہا ہوں کہ فصلِ بہار باقی ہے

اصلاحِ آتشؔ

نہ جیب کا ہے نہ دامن کا تار باقی ہے جنوں کا جوش ہے فصلِ بہار باقی ہے

اصلاحِ سیمابؔ

نہ جیب میں نہ گریباں میں تار باقی ہے ہنوز شورشِ فصلِ بہار باقی ہے

"اگر میں حضرتِ سیمابؔ سے یہ کہوں تو غالباً بیجا نہ ہوگا کہ آپ کی اصلاح نے بوجہ توالیٔ اضافت اس زمانے کے ماحول ادب کو مدِ نظر نہ رکھا اس سے اچھا تو اصلاحِ آتشؔ کا دوسرا مصرع ہے جو توالیٔ اضافت کے سقم سے مبرا ہے نیز زبان کے اعتبار سے سلیس۔"

جواب :-

اعتراض ہوتا ہے کہ سیماب کی اصلاح میں توالیٔ اضافت کا سقم ہے آتش کی اصلاح میں یہ عیب نہیں ہے۔

معترض صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر جگہ توالیٔ اضافت مخلِ فصاحت نہیں ہوتی، میر انیس کا شعر ہے۔ ؎

میں ہوں سردارِ شبابِ چمنِ خلدِ بریں   میں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمدؐ کا مکیں

پہلے مصرع میں فارسی ترکیب کے علاوہ توالیٔ اضافت بھی موجود ہے لیکن ثقالت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی مصرع یا شعر کے تمام الفاظ جچے خود فصیح ہوتے ہیں تو وہ پورا مصرع یا شعر فصیح کہا جاتا ہے، جس کو بندش کی صفائی نشست کی خوبی برجستگی اور روانی سے تعبیر کرتے ہیں (موازنہ)

انیس کے شعر کی طرح سیماب کا اصلاح شدہ مصرع بھی یقیناً برجستگی اور بندش کی صفائی کے لحاظ سے قابل داد ہے۔ اس میں توالیٔ اضافت سے کوئی ثقالت پیدا نہیں ہوتی۔

معترض نے اس طرف توجہ نہیں کی کہ آتش کے دوسرے مصرع میں معنوی فروگذاشت تھی اور وہ یہ کہ جنوں کا جوش اور فصلِ بہار دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں اور پہلا مصرع اس کا متقاضی تھا کہ دوسرے مصرع میں صرف فصلِ بہار کی شورش بیان کی جائے۔ سیماب کی اصلاح سے یہ عیب دُور ہوگیا۔ رہا یہ کہنا کہ موجودہ ماحولِ ادب کو مدِ نظر نہ رکھا۔ یہ مطالبہ صرف اُن لوگوں کی نظروں میں وقعت رکھتا ہے جو اُردو زبان کی مخصوص بلندیوں کو ہندی کی پستیوں میں گم کردینا چاہتے ہیں اور جن کا سرمایۂ شعر صرف ٹوٹی پھوٹی ہندی کے چند بے تکے گیت ہیں۔

اعتراض :-

صفحہ ۴۰۔ خلق سے تھا وہ دل فروز مراد   صبح کے ہونے سے ہے روز مراد

اصلاحِ غالب

خلق سے تھا وہ دل افروز مراد   صبح کے ہونے سے ہے روز مراد

توجیہہ سیماب۔ پہلے مصرع میں دل فروز سے سکتہ پڑتا تھا۔ دل افروز نے اس کو پورا کردیا۔

سیماب صاحب نے سکتہ تحریر فرمایا ہے۔ سکتہ دوسری چیز ہے۔ یہاں بحر بدل رہی تھی۔ جس کو مرزا غالب نے صحیح کردیا۔ کیونکہ اشعار دیگر فاعلاتن فعلاتن فعلات بحر رمل مسدس مخبون محذوف میں تھے اور مصرع اولیٰ فاعلاتن مفاعلن فعلات میں، لہٰذا بحر رمل میں لانے کی خاطر یہ اصلاح کی گئی۔

میں نے آغاز مضمون میں کم علمی جیسا تلخ لفظ استعمال کیا ہے۔ اہلِ نظر سیماب صاحب کی عروض دانی کا تجزیہ کریں۔ فنِ عروض سے واقف ہونا نیز اُس میں مہارتِ کامل بہم پہونچانا انتہائی دیدہ ریزی کا کام ہے۔

جواب :-

سیماب نے توجیہہ مجمل کی ہے، سکتہ کوئی دوسری چیز نہیں۔ "در اصطلاح شعرا آنکہ در وزن اندکے توقف باشد کہ قبیح نماید"

مصرع معلومہ میں بھی صرف ایک "الف" کے نہ ہونے سے بحر رمل کے وزنِ معیّن میں سکتہ پڑتا تھا۔ اِسلئے مفصلاً نہ لکھا مجملاً اس کی تشریح کردی، اِس پر سیماب کو کم علمی کا طعن دینا خود اپنی کم علمی کا ثبوت دینا ہے۔ سیماب نے عروض کو پانی کی طرح حل کردیا ہے اور عروض پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اس لئے اُن سے کسی عروضی غلطی کی توقع لاحاصل ہے۔ یہ تو ایک مبتدی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اصل مصرع بحرِ خفیف میں اور تمام نظم بحرِ رمل میں ہے۔ سیماب کے ایجاز و اختصار سے غلط فائدہ اُٹھانا صرف بر خود غلط لوگوں کا کام ہے۔ جن میں سے ایک "دستور الاصلاح" کے نقاد صاحب بھی ہیں۔

اعتراض :-

صفحہ ۴۳۔ غضب داغ تو نے دئے اے فلک   کلیجہ گُلِ نیلوفر ہوگیا

اصلاحِ اسیر

غضب چٹکیاں ہیں تری اے فلک   کلیجہ گُلِ نیلوفر ہوگیا

توجیہہ سیماب۔ لیکن میرے خیال میں "ہیں" کی جگہ "لیتیں" ہونا چاہیئے۔ ردیف بھی یہی چاہتی ہے۔

گریہ بہت نازک بات ہے یہ مصرع یوں بھی ہوسکتا تھا۔

غضب چٹکیاں تو نے لیں اے فلک

اعتراض کیا جاتا ہے کہ

"میں عرض کروں گا کہ حضرت مجرد "چٹکیاں ہیں" محاورہ ہے جس کا بطور

کہ یہ فطرت فلک کے اعتبار سے اظہار کیا گیا ہے۔ سیماب صاحب نے "لیں" ٹھونس کر بے کیف کر دیا ہے۔

جواب: سیماب کی نظر میں "ہیں" کی جگہ بتقاضائے ردیف "تھیں" ہونا چاہیئے تھا۔ اِس پر اعتراض نہیں کیا گیا۔ گویا معترض کی نظر میں سیماب کا اعتراض صحیح ہے جب اعتراض صحیح ہے تو شعر کا عیب نکالنے کے لئے ضرورتِ اصلاح ہوئی۔ لہذا مصرع یوں بدل دیا گیا "غضب چٹکیاں تو نے لیں لے فلک"۔ "چٹکیاں ہیں تری" اور "چٹکیاں تو نے لیں" میں جو فرق ہے اُسے صرف فصحا سمجھ سکتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ چٹکیاں لینا محاورہ ہے یا نہیں۔ شعرا کے دواوین دیکھئے۔ یہ محاورہ اکثر جگہ ملے گا۔ عزیز لکھنوی کہتے ہیں۔ ؎

چٹکیاں لیکر نہ پوچھو دردِ دل کچھ کم ہوا جب ہٹایا ہاتھ تم نے پھر وہی عالم ہوا

راسخ دہلوی ؎

سوچتا ہوں میں ترے وصل کے پہلو دلیں چٹکیاں میں ترے زانو میں لوں یا در تو دلیں

اعتراض:-

جلیل رنگت یہ رخ کی اور یہ عالم نقاب کا دامن میں کوئی پھول لئے ہے گلاب کا

اصلاحِ امیر مینائی:- دامن میں تم تو پھول لئے ہو گلاب کا

توجیہہ سیماب: دوسرے مصرع میں اصلاح دینے سے شعر زیادہ قریب الفہم ہو گیا اور اسلوبِ بیان میں بھی ایک خاص حسن پیدا ہو گیا حالانکہ دوسرے مصرع میں دامن اب بھی بے جوڑ سا ہے۔ رنگ رُخ اور عالم نقاب دامن میں نظر نہیں آتا۔

ارشاد ہوتا ہے

"حضرت جلیل مانکپوری کے دیوان میں بجائے دامن کے آنچل ہے لہذا آنچل میں رنگ رخ اور عالم نقاب دیکھئے۔" مضطر۔

جواب: "دستور الاصلاح" میں جلیل مانکپوری کا یہ شعر مکاتیب امیر مینائی سے نقل کیا گیا ہے۔ احتیاطاً نیچے نوٹ بھی لکھ دیا گیا ہے۔ چونکہ مکاتیب میں لفظ دامن موجود ہے اس لئے اعتراض کیا گیا، یہ کہنا کہ دیوان میں بجائے "دامن" "آنچل" ہے اعتراض کی تغلیط نہیں کر سکتا، ہو سکتا ہے کہ بعد میں جلیل نے مصرع میں اس کمی کو محسوس کیا ہو اور بجائے "دامن" "آنچل" بنا دیا ہو۔ یہاں اعتراض امیر مینائی کی اصلاح پر ہے جو اُن کے مکاتیب میں موجود ہے، جلیل کی احتیاط پر نہیں جو بعد میں کی گئی ہے

اعتراض:-

صفحہ ۹۰ (کوثر) کہا جو اُن سے عنایت کبھی کبھی ہوگی بگڑ کے بولے اگر جان پر بنی ہوگی

اصلاحِ امیر مینائی:- تو ہنس کے بولے کہ جب جان پر بنی ہوگی۔

توجیہہ سیماب: یہ جو جواب دوسرے مصرع میں دیا گیا ہے ہنس کر ہی دیا جا سکتا ہے۔ بگڑنے کا یہاں کوئی محل نہیں اصلاح بہت اچھی دی گئی ہے مگر پہلے مصرع میں کبھی کی تکرار خلاف مفہوم ہے پوچھنا یوں چاہیئے تھا کہ مجھ پر کبھی عنایت ہوگی یا مجھ پر کب عنایت ہوگی؟ پہلا مصرع اس طرح بدل دیا جاتا تو یہ عیب بھی نکل جاتا۔

کہا جو اُن سے عنایت کب آپ کی ہوگی؟

اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے۔ "جناب سیماب حسنِ بیان کو کیا سمجھیں"

جواب: معترض کے خیال میں کبھی کی تکرار حسنِ بیان رکھتی ہے، سیماب کا اصلاح شدہ مصرع اس لئے حسنِ بیان سے خالی ہے کہ اُس میں کبھی کی تکرار کو دور کر دیا گیا سبحان اللہ حضرت حسنِ بیان اُسی گفتگو میں زیادہ ہوتا ہے کہ جو روزمرّہ کے موافق ہو۔ جس قدر اندازِ بیان روزمرّہ کے خلاف ہوتا جائیگا اتنا ہی غیر فصیح اور حسنِ بیان سے دُور ہوتا جائیگا۔ کوثر کا مصرع روزمرّہ کے موافق نہیں ایسے موقع پر یہ نہیں کہتے کہ عنایت کبھی کبھی ہوگی کیونکہ مفہوم کے اعتبار سے یہ اندازِ بیان تشنہ ہی نہیں رہتا بلکہ گنجلک پیدا کرتا ہے، دوسرے مصرع میں لفظ جب موجود ہے اس کی رعایت سے پہلے مصرع میں "کب" بہت قوی نشست رکھتا ہے، یہ سوال "کب عنایت ہوگی" روزمرّہ کے موافق یہی جواب چاہتا ہے۔ "جب جان پر بنی ہوگی" اہلِ نظر خود غور فرمائینگے کہ سیماب کی اصلاح بلحاظ حسنِ بیان و مفہوم کس قدر بلند ہے۔ شبلی کہتے ہیں شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام کے اجزا کی جو اصلی ترتیب ہے وہ بحال خود قائم رہے، فاعل، مفعول، مبتدا، خبر، متعلقاتِ فعل جس ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال میں آتے ہیں یہی ترتیب شعر میں بھی قائم رہے ..... جس قدر اس کا لحاظ رکھا جائیگا اُسی قدر شعر صاف، برجستہ، رواں اور ڈھلا ہوا ہوگا۔

اعتراض:-

صفحہ ۹۱ کوثر۔ خدنگِ ناز کے ٹھہرے دل و جگر طالب، جو تیر آئیگا کیا کیا کشاکشی ہوگی

اصلاحِ امیر مینائی

خدنگِ ناز کے طالب ہیں دل جگر دونوں بڑے مزے کی کشاکش میں دلگی ہوگی

توجیہہ سیمابؔ ۔ کشاکش بجائے کشاکشی غلط تھا اس لئے اُسے نکالدیا۔ پہلا مصرع بھی اصلاح کے بعد صاف ہو گیا۔ مگر دوسرا مصرع یہیں ختم ہو جاتاہے کہ "بڑے مزے کی کشاکش ہوگی" "کشاکش میں دلگی" اَن سنی بات ہے۔ قارئین کے لئے معترض کے جوشِ تعصب کا اِس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ دعفورالا صلاح میں کوثر کے شعر پر امیرؔ مینائی کی اصلاح پیش کرکے اُس کی توجیہہ کی جا رہی ہے مگر وہ اسقدر بدحواس ہے کہ امیرؔ مینائی کی اصلاح کو سیمابؔ کی اصلاح سمجھکر اس پر نہایت غیر معقول طریقے سے اعتراض کر رہاہے، کہتاہے۔

"کشاکش میں دل لگی اَن سنی بات ہے ممکن ہے سیمابؔ صاحب کا کوئی خاص تجربہ جذبات کی صورت میں اُچھلکر اس ایجاد کا باعث بنا ہو بہر حال ایک مضحکہ خیز اور بے معنی سی بات ہے۔"

سیمابؔ اپنی توجیہہ میں امیرؔ مینائی کے اس جملہ پر "کشاکش میں دلگی" خود اعتراض کرتے ہیں مگر معترض اسکو سیمابؔ کی اصلاح سمجھکر اُلٹا انھیں پر اعتراض کر رہاہے۔ یا للعجب! یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئیے کہ اگر معترض غلطی کا شکار نہ ہوتا تو امیرؔ مینائی کی اِس اصلاح کیلئے نہ معلوم کیا کیا لکھ جاتا مگر چونکہ وہ اصلاح اب اُس کے تعصب پرور دماغ میں سیمابؔ کی ہے اِس لئے جوشِ مخالفت میں دادِ تہذیب دے رہاہے۔۔

اعتراض:۔

صفحہ ۹۳۔ شوقؔ سندیلوی:۔

ہوائے سرد نے ٹھنڈا کیا اسیروں کو   پیامِ موت نہاں مژدۂ بہار میں ہے

اصلاحِ فانیؔ ۔   ہوائے باغ نے ٹھنڈا کیا اسیروں کو

توجیہہ سیمابؔ ۔ پہلے مصرع میں ہوائے سرد اور ٹھنڈا دونوں لفظ سُست پڑ گئے تھے اب سرد کو باغ بنا دینے سے ٹھنڈا کیا کے مفہوم میں گرمی پیدا ہو گئی لیکن فانیؔ صاحب اِس عیب کو نظر انداز کر گئے کہ "کیا" اور "ہے" میں مطابقت زمانہ نہیں "کیا" کے ساتھ "بہار میں تھا" ہونا چاہئیے۔

جواب:۔ اِس توجیہہ کے آخری حصے پر صرف "کیا خوب" فرما کر خاموشی اختیار کی گئی، گویا معترض کے خیال میں زمانے کی مطابقت ضروری نہیں حالانکہ شعر جس قدر روزمرہ کے مطابق ہوگا اور اُس میں جس قدر زمانوں کا تطابق اور افعال وغیرہ کی ترتیب درست ہوگی اُسی قدر فصیح سمجھا جائیگا۔ اسی بنا پر سیمابؔ نے اِس معمولی فروگذاشت کو بھی نظر انداز نہ کیا یہ اُن کی صحتِ نظر کا کرشمہ ہے لیکن معترض کے پاس نظرِ انصاف کہاں!۔

اعتراض:۔

صفحہ ۱۰۵ - کیفیؔ جام پوری

ہر موجۂ صبا میں ہے روحِ شگفتگی   ہر قطرہ ایک آذر بستاں ہے آجکل

اصلاحِ سیمابؔ:۔ ہر قطرہ ایک ابرِ زمستاں ہے آجکل

توجیہہ سیمابؔ: آذر کو بستان سے اور قطرہ کو آذر سے کوئی تشبیہ تھی نہ مناسبت نہ آذر سے شگفتگی کا کوئی مفہوم پیدا ہوتا تھا۔ اب قطرہ کو ابرِ زمستاں بنا کر ترقی دی تو اُس سے یک گونہ شگفت پیدا ہو گئی۔ اِس اصلاح پر یہ اعتراض کیا گیاہے

"ظاہر ہے کہ ابرِ زمستاں سے شگفتگی کا کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔ زمستاں بنا کر محض قافیہ گردانی کی گئی ہے۔ سیمابؔ صاحب یہ نہ سمجھے کہ زمستان کے ابر سے بجائے شگفتگی کے ہر چیز ٹھٹھر جاتی ہے اگر سیمابؔ صاحب پسند فرمائیں تو یوں ترمیم کریں

ع ہر قطرہ اک حیاتِ گلستاں ہے آجکل

روحِ شگفتگی اور حیاتِ گلستاں کی مناسبتِ الفاظ غور طلب ہے"

جواب:۔

قطرہ کو ابرِ زمستاں کہکر ضرور ترقی کی گئی۔ اور بطور ادعائے شاعرانہ ابرِ زمستان میں شگفتگی کا مفہوم تصور کیا گیا، شاعر کو اِس سے غرض نہیں کہ ابرِ زمستان سے ہر چیز ٹھٹھر جاتی ہے۔ اِس کے خیال میں تو بربنائے تخیل شاعرانہ شگفتگی موجود ہے، کیونکہ شاعر مسلمات عامہ کا پابند نہیں ہوتا وہ اگر چاہے تو آگ میں سردی اور سردی میں گرمی کا ادعا کر سکتاہے۔ رہی معترض کی ترمیم سو اُس کے متعلق عرض ہے کہ قطرہ کے ساتھ حیاتِ گلستاں تھا یے جوڑ چیز ہے اور سراسر بھرتی بخلاف ابرِ زمستاں کے۔ قطرہ کو ابر یا دریا کہنا اک نسبتِ واقعی رکھتاہے، ترمیم و تنسیخ تو ہر بہتر شعر میں کیجا سکتی ہے الفاظ تبدیل کئے جا سکتے ہیں لیکن اُس کا نام اصلاح و درستی نہیں بلکہ عمدہ کلام کا مسخ کر دیناہے۔

صفحہ ۱۰۶ - کیفیؔ جام پوری

جسکو دبا دیا تھا کبھی حادثات نے   بھڑکی ہوئی وہ آتشِ پنہاں ہے آجکل

اصلاحِ سیمابؔ:

جسکو دبادیا تھا کبھی امتدادنے   پھر مشتعل وہ آتشِ پنہاں ہے آجکل

توجیہہ سیماب ؛ حادثوں کا کام آگ لگانا ہے آگ دبانا نہیں ہے یہ کام امتدادِ ایام کا ہے اِس لئے حادثات کی جگہ امتداد بنادیا دوسرے مصرع میں پھر کی ضرورت تھی اسلئے ترمیم ضروری سمجھی گئی۔

اعتراض :-

عرض ہے کہ جب آپنے نثر میں امتداد کے ساتھ ایام کو ترکیب دیکر اس لفظ کی غرابت دور کردی تو نظم میں کیوں اسے معیوب جانا حضرت مجرد امتداد غیر فصیح ہے جسکو غریب کہنا چاہیئے ...... دوسری زبان کے الفاظ بغیر ترکیب استعمال نہ کرنا چاہیئے۔ اگر یوں ترمیم کی جاتی تو یہ سقم جاتا رہتا۔ ع

ـــــ جسکو بجھادیا تھا کبھی حادثات نے

جواب :-

اصول فصاحت کے مطابق کسی ایک لفظ کو فصیح یا غیر فصیح کہنا آسان نہیں کیونکہ کوئی بھی لفظ مجرداً اپنی جگہ فصیح یا غیر فصیح نہیں ہوتا بلکہ شاعر کا انداز بیان اُس کو فصیح یا غیر فصیح کردیتا ہے، پھر یہ کہ بعض الفاظ فصیح اور بعض فصیح تر ہوتے ہیں، ضرورت شعری بعض وقت مجبور کرتی ہے کہ شاعر فصیح تر کے بجائے فصیح الفاظ لے آتا ہے۔ چنانچہ سیماب کی اصلاح میں اسی اصول کے مطابق لفظ " امتداد " جو فصیح تر نہ سہی لیکن فصیح ضرور ہے استعمال کیا گیا ہے۔ ہاں امتدادِ ایام فصیح تر ہے۔ لیکن شاعر جب ایک ایسا لفظ لے آیا جو اپنی جگہ شعر کی معنوی حالت کو درست کرتا ہے اور غیر فصیح بھی نہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ جب سیماب کی توجیہہ کا یہ حصہ تسلیم ہے کہ " حادثوں کا کام آگ دبانا نہیں یہ کام امتدادِ ایام کا ہے " تو یہ سقیم ترمیم کیوں کی جاتی ہے۔ جسکو بجھادیا کبھی حادثات نے بجھانا اور دبانا قریب قریب ایک مفہوم رکھتے ہیں، جو اصل مصرع میں عیب تھا وہ معترض کی ترمیم میں بدستور موجود ہے پھر زحمتِ ترمیم کیوں کی گئی؟ — " موازنہ " کی جو تحریر نقل کی گئی ہے اُس کا صرف یہ مقصد ہے کہ بعض الفاظ بغیر اضافت فصیح نہیں معلوم ہوتے، یہ کہنا کہ " دوسری زبان کے الفاظ بغیر ترکیب استعمال نہ کرنے چاہئیں " کسیطرح صحیح نہیں۔ اُردو میں سینکڑوں ہزاروں الفاظ دوسری زبانوں کے بغیر ترکیب استعمال ہوتے ہیں اور وہ فصیح سمجھے جاتے ہیں۔

ع۱ سب بیٹے نے کہا شہ کی غلامی ہے سعادت — انیس

ع۲ کچھ آپ بولتی نہیں اسوقت میں نثار — انیس

ع۳ شوہر کے غم میں یوں کوئی ہوتا ہے بیقرار — "

معترض کا مصرع جسکو بجھادیا تھا کبھی حادثات نے

سعادت، نثار، بیقرار، اور حادثات دوسری زبان کے الفاظ ہیں مگر بغیر ترکیب استعمال ہوئے ہیں۔ خود معترض بھی اس جرم کا مرتکب ہے۔

کیفی۔ محسوس کررہا ہوں نئی لذتِ خلش   سینے میں کیفِ تازہ کا طوفان ہے آجکل

اصلاحِ سیماب

محسوس کررہا ہوں نیا جوش اور اُمنگ   برپا نشاطِ نو کا وہ طوفان ہے آجکل

اعتراض :-

- حضرت نشاط نو کا طوفان آپ ہی کی زبان سے سنا۔ طوفان میں نشاط کیا — '

جواب :-

یہ علم بیان سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے کہ نشاط نو کے طوفان پر اعتراض کیا جارہا ہے اور کوئی بلند کتاب نظر سے نہیں گزری تو معمولی اسکولوں اور کالجوں کی قواعد کی کتابیں دیکھلی جائیں ان میں اضافت کی معنوی قسموں میں اضافت استعاری موجود ہے۔ طوفان نشاط نو بالکل ایسی ہی ترکیب ہے جیسے طوفانِ بہار، طوفانِ غم، نشاط نو بترکیب توصیفی مضاف الیہ ہے۔ اور طوفان مضاف " کا " علامت اضافت — طوفان سے یہاں بطریق استعارہ جوش مراد ہے یعنی نشاطِ نو جوش پر ہے۔ طوفان اور جوش میں علاقہ تشبیہ موجود ہے۔

صفحہ ۱۰۸ - آلم مظفر نگری

کائنات حسن ذہن معجزہ پرور میں ہے   تو سمجھتا ہے کہ نقش آذری پتھر میں ہے

اصلاحِ سیماب ؛ کائنات حسن ذہنِ روشنِ بت گر میں ہے

اعتراض :-

" سبحان اللہ ذہن روشن بت گر کی ترکیبی فصاحت ملاحظہ ہو — "

اگر اس طرح ترمیم کردی جائے تو فصاحت ہاتھ سے نہ جائے گی ؛

حُسن کی تصویر دلکش ذہنِ صورت گر میں ہے - یا

حسن مقصد کا مرقع ذہن صورت گریں ہے

جواب:-

اصل مصرع میں کائنات حسن کی ترکیب کا قائم رہنا ضروری تھا۔ اس وجہ سے اُس کو بدستور رہنے دیا اور ذہن معجزہ پرور کو بدلا اُس کی جگہ ذہن روشن بت گر بنادیا۔ اس میں کوئی خرابی نہیں اگر معترض کو یہ ترکیب غیر فصیح معلوم ہوتی ہے تو ہو واقعاً ایسا نہیں ہے۔ معترض کی دونوں ترکیبیں یعنی "حسن کی تصویر دلکش" اور "حسن مقصد کا مرقع" معنوی لحاظ سے کمزور ہیں اور کائنات حسن کی طرح حاوی نہیں "کائنات حسن" اصل شعر کی جان ہے وہی معترض نے نکال دیا اور دو ایسی غیر متعلق ترکیبیں رکھدیں کہ جو اپنی جگہ معنویت میں محدود و تشنہ ہی نہیں بلکہ بالکل بے جوڑ ہیں

صفحہ ۱۰۹ - آلم مظفر نگری

لوٹنے گوشے کو چمن کے آشیاں کا ذکر کیا ے اُڑ و نگا ایک دن وہ زور زبال و پر میں ہے

اصلاح سیماب : آشیان و دام کا کیا ذکر سارے باغ کو

اعتراض:-

"سارے باغ کی فصاحت قابل داد ہے۔ سارے باغ کی جگہ "میں گلشن کو بھی" کیوں نہ بنادیا

یہ بھی بالکل ایسا ہی اعتراض ہے جیسا کہ پہلے شعر پر کیا گیا۔ سارے باغ کو غیر فصیح کہا گیا ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ میں کہتا ہوں سارے باغ میں کوئی بات مخل فصاحت نہیں۔ وہی ترمیم "میں گلشن کو بھی" اس میں کوئی خاص ترقی نہیں پھر ایسی ترمیم سے کیا فائدہ یوں تو ہر شعر میں کچھ نہ کچھ بدلا جاسکتا ہے۔

صفحہ ۱۱۰ - اعجاز — مجبور اُن کو جلوہ گری پر بناؤنگا

صحیح اس طرح ہے

مجبور اُنکو جلوہ گری پر بناؤں کیا اب یہ تعینات کے پردے اُٹھاؤں کیا

اصلاح سیماب

ہُوں دیدہ ور فریب تعین میں آؤں کیا پردے پڑے ہوئے ہی نہیں ہیں اُٹھاؤں کیا

اعتراض:-

"عرض ہے کہ دیدہ ور ثقیل ہے۔ اس کی جگہ اگر "ہوں باخبر" کردیا جائے تو ثقل جاتا رہے۔"

جواب:-

"ہوں دیدہ ور" کی ترکیب نہایت چست ہے، اس میں ہرگز ثقل نہیں البتہ "ہوں باخبر" سے شعر سُست ہوجاتا ہے۔ دیدہ ور میں جو زور و معنویت ہے وہ "ہوں باخبر" میں ہرگز نہیں۔ اسے اہل نظر خوب جانتے ہیں۔

صفحہ ۱۱۲ - اعجاز

کم ہو چلی ہے گرمی روح تمام شوق اب ساز دل پہ نغمۂ جاں سوز گاؤں کیا

اصلاح سیماب : پھر ساز دل پہ نغمۂ جاں سوز گاؤں کیا

اعتراض:-

"سیماب صاحب کی نظر "اب" کی طرف تو گئی جو آتنا تشنۂ اصلاح نہ تھا جتنی کہ "روح تمام شوق" کی ترکیب اگر اس کو "روح کمال شوق" بنادیا جائے۔ تو سیماب صاحب خود غور فرمائیں کہ مصرع کس درجہ فصیح ہوجاتا ہے۔

جواب:- معترض کو صرف یہ تین چار لفظ یاد ہیں، غیر فصیح، غریب اور ثقیل وغیرہ چنانچہ جتنے اعتراضات کئے گئے ہیں اُن سب میں یہی الفاظ قریب قریب بلا دلیل دہرائے گئے ہیں۔ اس شعر میں بھی حسب عادت "روح تمام شوق" کو غیر فصیح کہدیا گیا اور "روح کمال شوق" کو فصیح، یہاں تمام اور کمال پر محاکمہ بلحاظ معنویت کیا جاسکتا ہے، ظاہر ہے کہ جس قدر لفظ "تمام" میں حدِ انتہا ہے وہ "کمال" میں نہیں ہے۔ تمام کا درجہ بہرحال کمال سے آگے ہے۔ اس لئے "تمام شوق" "کمال شوق" سے زیادہ بلیغ ہے۔

صفحہ ۱۱۵ - لطیف انور

ہندوستاں نہیں ہے خلد بریں ہے گویا فطرت کی دلکشی کا حاصل یہیں ہے گویا

اصلاح سیماب : ہندوستاں ہمارا خلد بریں ہے گویا

توجیہہ : کلمۂ نفی کے بعد اثبات کچھ اچھا معلوم نہ ہوا۔

اعتراض:-

"جناب اس انداز بیان میں نفی کے بعد اثبات نہیں بلکہ تاکید تھی تمام اساتذہ کا کلام دور حاضر تک اس سے مستثنیٰ نہیں"

جواب:- جی ہاں نفی کے بعد اثبات تاکید پیدا کرتا ہے یہی منشا تو مصلح کا بھی ہے کہ یہ

نفی کے بعد اثبات سے جو تاکید پیدا کی گئی ہے وہ اتنی اچھی نہیں جتنا کہ اصلاح شدہ مصرع کی حالت جس میں خاص طور پر لفظ "ہمارا" نے لطف پیدا کیا ہے۔ چونکہ توجیہہ میں لفظ تاکید صراحتاً نہیں آیا تھا بلکہ وہ مقدر تھا۔ آپ اتنی معمولی بات بھی نہ سمجھ سکے۔ سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست۔

"دستور الاصلاح" قدامت، سطح نظری، اور نظر ثانی کی کمزوری کے خلاف ایک منضبط آواز ہے اس لئے قدامت پرست طبقوں میں اس کتاب کے خلاف ہیجان پیدا ہونا امر فطری ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب نے جہاں طالبانِ فن کی صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کی ہے وہاں اساتذۂ فنِ شعر کی بھی آنکھیں کھول دی ہیں کہ اصلاح سمجھ سوچ کر دی جائے اور تلامذہ کو محض استادنمائی سے مرعوب کر کے اُن کی ترقی کو نہ روکا جائے۔

خدا جانے "دستور الاصلاح" کے خلاف ابھی ایسی اور کتنی کمزور آوازیں اُٹھیں گی اور تنقید کے پردے میں اپنی یا اپنے اساتذہ کی خفت مٹائی جائیگی۔ لیکن "دستور الاصلاح" نے جو دستورِ اصلاح پیش کر دیا ہے۔ وہ اپنی جگہ ہمیشہ اٹل اور ناقابلِ تردید ثابت ہوگا۔

آلم مظفر نگری

سلکِ گوہر

آنکھوں کو تیری دید کا، رہتا ہے انتظار سا
سینہ بھی ہے فگار سا، دل بھی ہے بیقرار سا

لحظہ بہ لحظہ دم بدم شعلہ بجاں ہوں عشق میں
سینے میں میرے دل ہے اک دہکا ہوا شرار سا

ہے غمِ عشق جاں گسل، تم سے کہوں تو کیا کہوں
روح میں اک خلش سی ہے، دل میں ہے اضطرار سا

دل پہ نہیں ہے اختیار، تم پہ ہوا اختیار کیا
اب تو یہ ربط و ضبط بھی، مجھکو ہے ناگوار سا

غم سے ہوں تیرے شادماں، تیری جفا سے مطمئن
غم بھی ترا مرے لئے، آج ہے خوشگوار سا

بزم میں چاہتا تو ہوں، عشق کا راز کھول دوں
اُن کی نظر کو کیا کروں، مجھ پہ ہے اعتبار سا

گوہر نامراد ہوں، ذرۂ خاکِ راہ ہوں
میرا کہاں نصیب ہے، گوہر آبدار سا

(سیّد) مظفر حسین گوہر
(وان راد صادام)

محبِّ وطن کی دُعا

اے خدائے دو جہاں میری جوانی چھین لے
مجھ سے تو عہدِ محبت کی نشانی چھین لے

دل کے خوں سے جس کی برسوں پرورش کرتا رہا
تو وہی اب عشق کا سوزِ نہانی چھین لے

بے اثر کر دے مرے نالوں کو اے پروردگار
آنسوؤں سے دردِ دل کی ترجمانی چھین لے

میں غم و آلام میں بھی شاد ہوں، مسرور ہوں
چھین لے مجھ سے مذاقِ شادمانی چھین لے

فائدہ کیا مجھ کو، عمرِ خضر حاصل ہو اگر
چھین لے بیشک حیاتِ جاودانی چھین لے

تیری دنیا واقعی باغِ ارم سے کم نہیں
یہ بھی مجھ سے عیش و لطفِ کامرانی چھین لے

ہاں۔ مگر اک دولتِ حُبِّ وطن کر دے عطا
پھر اگر چاہے تو ساری زندگانی چھین لے

قتیل شفائی

خودداری

سجدے کروں سوال کروں، التجا کروں
یوں دیں تو کائنات مرے کام کی نہیں
وہ خود عطا کریں تو جہنم بھی ہے بہشت
مانگی ہوئی نجات مرے کام کی نہیں

سیماب اکبرآبادی

رنگین کہانی

اِک حسنِ مجسّم کی تمنّا ہے جوانی
ہر سانس محبّت کی ہے رنگین کہانی
عبرت کدۂ دہر کی ہے طرفہ کہانی
روتی ہے بڑھاپے کی مصیبت پہ جوانی
ٹپکا ہوا ہر اشک محبّت کا مرقع
اُبھری ہوئی ہر چوٹ محبّت کی نشانی
اب ملنے لگی ہیں مجھے انجام کی خبریں
کچھ درد کی کچھ آپ کی نظروں کی زبانی
آلودۂ آلام یہ تقدیر کا مارا
یہ دل ہے وہی جس نے مری ایک نہ مانی
دیوانگیٔ دل سے ہر اک طرح نبھایا
مٹ کر بھی بہت خاک ترے کوچے کی چھانی
وہ دل کہیں ملتے نظر آتے نہیں مجھکو
اس عہد میں صابر ہے محبّت کی گرانی

صابر اکبرآبادی بی۔اے

فکرِ لطیف

وہ تھے ہجومِ شوق تھا دورِ بہار تھا
میں دل کو روکتا میرا کیا اختیار تھا
ساقی کی بزمِ عیش میں جو سوگوار تھا
شاید وہی میرا دلِ ناکردہ کار تھا
تھی فطرتِ شباب ہی میں حسرتِ گناہ
میرا قصور کیا میرے پروردگار تھا
ہر ہر نفس تھا وقتِ نظارہ شرارہ بار
گویا نظر کے سامنے انجام کار تھا
محشر میں بازپُرس یہ کیوں ہو رہی ہے اب
کیا مجھ کو اپنی زیست پہ کچھ اختیار تھا
اُسوقت آکے تیرے تصوّر نے کی مدد
فرقت میں سانس لینا بھی جب مجھکو بار تھا
تکمیل کو پہونچ نہ سکی شانِ جستجو
آوارۂ ازل مرا مشتِ غبار تھا
ہر گل پہ مجھکو یار کا دھوکا ہوا لطیف
کتنا حسین فریب، فریبِ بہار تھا

لطیف قریشی

اِنعام

دیوالی کی نشاط آفریں اور عشرت در کنار شام تھی۔ بمبئی اور اس کے مضافات نور کی موجوں میں نہا رہے تھے۔ ہر طرف خوشی و مسرت کی دیوی حکومت کر رہی تھی۔ رنج و غم کسی تاریک گوشے میں اپنا منھ چھپائے بیٹھے تھے۔ عیش و نشاط کی محفلوں میں اُن کا گزر کہاں! ہر آدمی گھڑی دو گھڑی کے لئے زندگی کی تلخ کامیوں سے بے نیاز ہو کر کیف و انبساط کے گہوارے میں آرام و شادمانی کے جھولے جھول رہا تھا۔ شہر کے گلی کوچوں میں غیر معمولی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ بازاروں میں لوگوں کا بے پناہ ہجوم اُمنڈ آیا تھا موٹریں قطار اندر قطار چیونٹیوں کی طرح رینگتی چلی جا رہی تھیں اور ہجوم ایک شاندار جلوس کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

زندگی کی شورشوں اور ہنگاموں سے بے تعلق جمالی فٹ پاتھ پر ایک کھمبے کا سہارا لئے کھڑا تھا۔ بہت دیر سے وہ یہیں کھڑا تھا۔ اس وقت شاید وہ کسی ذہنی اُلجھن میں گرفتار تھا۔ اس کے صدمات سے خوگر دل میں مختلف النوع خیالات چکر لگا رہے تھے جن کی بنا پر وہ دنیائے رنگ و بو سے بے نیاز ہو کر اپنے تخیل کی حسین دنیا میں کھو گیا تھا۔

پوں پوں! پوں پوں!

ہارن کی آواز پر وہ اپنی خیالی دنیا سے بیدار ہو گیا۔ اُس کی نگاہیں اُٹھیں اور بیس بائیس برس کے ایک نوجوان پر جو صحت و تندرستی کا مکمل نمونہ تھا جا کر ٹھہر گئیں۔ وہ نہایت بے شرمی اور ڈھٹائی سے موٹر نشینوں کے آگے دستِ طلب دراز کر رہا تھا۔ موٹر میں بیٹھے ہوئے موٹی توند والے سیٹھ نے اُسے دیکھا اور نفرت و حقارت سے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ پچھلی موٹر کا ڈرائیور ہارن بجا رہا تھا کہ اُسے آگے بڑھنے کے لئے راستہ مل جائے۔ موٹر کی پچھلی نشست پر ایک حسین و جمیل دوشیزہ بیٹھی تھی جو سرتاپا ایک پیکرِ معصومیت تھی، اُس مجسمۂ حسن و رعنائی کے حسنِ جہاں سوز کے آگے شہر بھر کی روشنی ماند پڑ گئی تھی۔ آسمانی رنگ کی ساری اور کاسنی پھول جو وہ اپنے بالوں میں لگائے ہوئے تھی۔ اُس کی تو بہ شکن خوبصورتی میں اور بھی اضافہ کر رہے تھے۔

قریب سے ایک بڑھیا جریب ٹیکتی ہوئی آئی۔ پیرانہ سالی کے باعث اُس کی کمر خمیدہ ہو چکی تھی۔ اُس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور ایسی یاس آگیں نظروں سے لڑکی کو دیکھا۔ جن میں آرزوؤں اور تمناؤں کی اُجڑی ہوئی دنیا آباد تھی۔ لڑکی کی محبت و ہمدردی سے لبریز نگاہیں اُٹھیں۔ بڑھیا کے جھریوں دار چہرے کا جائزہ لیا۔ جیب سے ایک روپیہ نکالا اور بڑھیا کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

موٹر آگے بڑھ گئی۔ بڑھیا اپنی ہتھیلی میں چمکتے ہوئے گول گول سکے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سارا سارا دن بھیک مانگتی، تب کہیں مشکل سے چھ سات آنے جمع ہوتے۔ آج صرف ایک ہی دیوی نے اُسے ایک روپیہ دیدیا۔ وہ بے اختیار ہو کر چاہتی تھی کہ "دیوی" کے پاؤں چھوئے۔ لیکن موٹر نکل چکی تھی۔ ایک بار پھر اُس کے خیالات سمٹ کر اُس "روپے" میں جمع ہو گئے۔

"روپیہ" کتنا حسین لفظ تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اُس کی روح تک خوشی سے ناچ رہی ہے۔ آج گھر جاتے ہوئے وہ اپنے ننھے منے منو کے لئے نئی قمیص خرید کر لیجائیگی چار سال ہوئے اُس کا بیٹا رامو اپنے اکلوتے شیر خوار بچے منو کو اُس کے ہاتھ سونپ کر ہمیشہ کی میٹھی نیند سو گیا تھا۔ منو کی شکل اپنے باپ سے ملتی جلتی تھی۔ اپنے لال کی نشانی کو وہ بہت سکھ چین سے پال رہی تھی، سارا سارا دن بھیک مانگتی۔ خود بھوکی رہتی، لیکن اپنے منو کو اچھی اچھی چیزیں کھلاتی، منو بھی دادی کو "ماں" ہی کہکر پکارتا۔

نئی قمیص پاکر، کتنا خوش ہوگا؟ وہ دل ہی دل میں مسکرا اُٹھی۔ اچانک اُس کے دل میں ایک خیال اُٹھا۔ کہیں یہ روپیہ کھوٹا تو نہیں ہے؟.... اگر کھوٹا ہو، تو؟..... اس کے تصور ہی سے اُس کا بدن کانپ اُٹھا۔ روپیہ اُس کی ہتھیلی سے پھسل کر سڑک پر جا گرا۔ وہی نوجوان بھکاری لپکا۔ جھپٹا روپیہ اُٹھایا اور بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

بڑھیا حزن و ملال کی مجسم تصویر بنی کھڑی تھی، حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں ستائی ہوئی بے نور آنکھوں میں قطراتِ اشک چمک رہے تھے، جمالی کا ساغرِ دل ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہو کر چھلک اُٹھا۔ بڑھیا کی بے بسی پر اُسے رونا آ گیا۔ لیکن اُس نے ضبط سے کام لیا۔ یہ جاں گداز منظر دیکھنے کی تاب اُس میں نہ رہی بے اختیاری میں اُس کا

ہاتھ جیب کی طرف بڑھا، وہاں ایک چونی پڑی تھی.... صرف ایک چونی.... اُس کے سارے دن کی کمائی۔ اِس ایک چونی سے اُس کی بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ ابھی اُس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ خود بھوکا رہ سکتا ہے لیکن ایک بڑھیا اور اُس کے بچے کو بھوکا نہیں رکھا جا سکتا، اُس نے جیب سے چونی نکالی اور بڑھیا کی ہتھیلی پر رکھدی۔ بڑھیا دعائیں دینے لگی۔ جمالی مسکرا اُٹھا۔ بڑھیا اُسے امیر سمجھ رہی تھی لیکن اُسے کیا معلوم کہ کوئی اپنی ساری دولت اُس کی نذر کر رہا ہے۔

دورانِ تعلیم میں جمالی کالج کا جادو بیان مقرر مانا جاتا تھا۔ تقریر کرنے میں اُسے خاص ملکہ حاصل تھا۔ وہ لوگوں کے سوئے ہوئے جذبات و احساسات کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کرنا اچھی طرح جانتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تقریر میں اُسے بارہا انعامات مل چکے تھے، ہندوستان کی موجودہ اقتصادی بدحالی کا ذمہ دار وہ قوم و ملک کے کاہل افراد خصوصاً "بھیک منگوں" کو قرار دیا کرتا۔ وہ اور اُس کے دوسرے ہم خیال طلبا بھکاریوں سے ازحد نفرت کرتے تھے اور اُس کا اظہار وہ کھلے بندوں کر دیا کرتے تھے انھوں نے ملک کو پاک نہ جودے اِس "ناپاک پھوڑے" کو ہٹانے کی ہر ممکن سعی کی۔

جمالی کے والدین کافی آسودہ حال تھے۔ اُس کے دن آرام و سکون سے کٹ رہے تھے۔ وہ بچپن ہی سے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کا عادی ہو چکا تھا وہ اِس دکھ بھری دنیا کو مسرتوں کا گہوارہ سمجھ بیٹھا تھا۔ وہ زندگی کو چند ایک حسین قہقہوں کا مجموعہ خیال کرتا۔ اُس نے کبھی بھی زندگی کے تاریک پہلو پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اُسے کیا پڑی تھی کہ ان حسین قہقہوں میں چند ایک پُر درد آہوں کی آمیزش کر کے زندگی کا صحیح مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتا۔ اُس کے لئے تو زندگی "مسلسل لذت" اور "پیہم مسرت" تھی اور بس!

دن بے فکری میں کٹ رہے تھے جمالی آنیوالی مصیبتوں سے بے خبر۔ حیاتِ مستعار کی معدودے چند گھڑیاں بے فکری کی آغوش میں گذار رہا تھا۔ ابھی تک وہ درد و غم کی لذت سے ناآشنا تھا، لیکن تقدیر اُس کے سر پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ انسان کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں صرف اسی غرض سے لایا گیا ہے کہ دنیا کو تعمیر و تخریب کا تماشہ دکھایا جائے، خزاں بھی اسی انتظار میں تھی کہ اِس نوشگفتہ کلی کو کھل کر مرجھا جانے کا راز سمجھا دے، اُسے مصائب و آلام کی داستان سنا دے۔ اور اُسے زندگی کی تلخ کامیوں سے آشنا کر دے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں — ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ اقبالؔ

وقت کو کروٹ لیتے دیر نہیں لگتی۔ جہانِ آب و گِل کا ذرہ ذرہ تغیر پذیر ہے۔ مترنم قہقہوں کی جگہ دلسوز نالوں نے لے لی۔ ظالم گلچیں نے وہ شاخِ نازک ہی کاٹ ڈالی جس پر "عندلیبِ زار" کا آشیانہ تھا۔ شہر میں وبا پھیلی۔ جمالی کے والدین بھی اِس قضائے مبرم کے ہاتھوں نہ بچ سکے۔ اگرچہ جمالی کو اس روح فرسا و دلگداز سانحہ سے بہت دکھ پہونچا۔ تاہم کارکنانِ قضا و قدر کی یہ پہلی چوٹ اُس کی آنکھیں کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

اُس کی بے فکری میں کوئی خاص کمی نہ ہوئی، اُس کے بڑے بھائی راشد نے جو حد درجہ تلون کیش اور لاپروا تھا ساری جائداد کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا جمالی اپنے بڑے بھائی کے ارادوں میں قطعی مزاحم نہ ہوا، اُسے تو کالج کے ضروری و غیر ضروری اخراجات کے لئے روپیہ چاہیئے تھا۔ اُسے اِس امر کی کیا پروا کہ اُس کے بھائی کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے سب کاروبار تہیاناس ہو رہا ہے اور اگر اُسے اِس بات کا احساس ہوتا تب بھی وہ اپنے بڑے بھائی کے کاموں میں حارج ہونا یا اُس کے افعال پر نکتہ چینی کرنا نامناسب سمجھتا تھا۔

راشد کو چند ایسے "دوست نما" دشمن مل گئے جنھیں اُس کی دوستی سے زیادہ اُس کی دولت کی پروا تھی۔ وہ اِس سے یارانہ گانٹھ کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے تھے۔ راشد اپنی ناتجربہ کاری اور کم فہمی کی وجہ سے بآسانی اُن کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی ساری دولت رنگ رلیوں میں لٹا بیٹھا۔ "حسنِ آوارہ" اور دخترِ رز کی محبت نے اُسے ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیا۔ جمالی اپنے بھائی کی غلط کاریوں کو سنتا لیکن اُسے اتنی ہمت نہ ہوتی کہ وہ اُس کے افعال پر نکتہ چینی کر سکے۔ ایسے کاموں کا جو انجام ہوتا ہے وہی راشد کا بھی ہوا۔ ایک بازاری عورت کی "زلفِ گرہ گیر" کا اسیر ہو کر وہ اپنا آخری اساسہ یعنی مکانات وغیرہ بیچ بیٹھا۔ جب بارگاہِ حسن میں نذرانہ دینے کے لئے اُس کے پاس دولت نہ رہی تو دیوی جی کی نظریں بھی اُس پر سے ہٹ گئیں۔ اور "پجاری" کو مندر سے بیک بینی و دوگوش باہر کر دیا گیا۔ اب راشد کی آنکھیں کھلیں۔ لیکن اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا

اُن ہی دنوں جمالی بھی کالج سے "بی۔ اے" کی ڈگری لیکر گھر آیا۔ راشد فرطِ ندامت سے اپنے بھائی سے آنکھیں چار نہ کر سکا اپنی اور اپنے بھائی کی تباہی و بربادی کا ذمہ دار وہی تھا۔ اُس نے ریل کے نیچے کٹ کر جان دیدی۔ جمالی کے سر پر

مصائب و آلام کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ پے بہ پے صدمات سے اُس کے دل و دماغ ماؤف ہو گئے۔ رشتہ داروں نے بھی اِس آڑے وقت میں جمالؔی کی دل جوئی نہ کی۔ دوست احباب نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ لے دے کر جمالؔی کے قبضے میں صرف اپنا آبائی مکان رہ گیا تھا۔ جس میں وہ سکونت پذیر تھا۔ ابنائے زمانہ کی ناقدری نے اُس کے شیشۂ دل کو چور چور کر ڈالا۔ اُس نے اونے پونے داموں اپنا مکان فروخت کر دیا اور ملازمت کی غرض سے بمبئی آنے والی گاڑی میں سوار ہو گیا۔

ابھی اُس کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ قدرت اُس سے مذاق کر رہی تھی۔ ایک دلچسپ مگر خطرناک مذاق۔ جہاں کہیں بھی جمالؔی نے حصولِ ملازمت کی کوشش کی۔ اُسے "نو ویکینسی" کا مختصر مگر حوصلہ شکن لفظ سننا پڑا۔ رفتہ رفتہ جمالؔی کی ساری پونجی ختم ہو گئی۔ مایوسی کے سیاہ بادلوں میں اُسے امید کی ہلکی سی کرن بھی دکھائی نہ دی۔ پھر بھی وہ اسی امید پر بیٹھا رہا۔ کہ شاید خزانۂ غیب سے ہی کچھ ہاتھ آ جائے لیکن اُس کے شیریں خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے اب تو کئی کئی وقت فاقوں کی نوبت بھی آ جاتی۔ تین مہینے سے مکان کا کرایہ بھی نہیں دیا تھا۔ سب کچھ کھو کر بھی جمالؔی نے خودداری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کسی غیر کے آگے دستِ طلب دراز کرنا اس کے مسلک میں جرمِ عظیم تھا۔ تنورِ شکم کو پُر کرنے کے لئے قلی بننا بھی گوارا کر لیا لیکن بدقسمتی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ پھر بھی گاہے گاہے اُسے دو چار آنے مل ہی جایا کرتے اب اُسے معلوم ہوا کہ ایک خوددار انسان کے لئے یہ دنیا رہنے کی جگہ نہیں ہے یہاں تو وہ شخص کامیاب ہو سکتا ہے جس کے کانوں نے کبھی "خودداری" کا لفظ نہ سنا ہو۔

جمالؔی کی نظروں کے سامنے ماضی کے واقعات پردۂ سیمیں کی متحرک تصاویر کی طرح ایک ایک کرکے آ رہے تھے اب اُس کے دل میں بھکاریوں کے لئے ہمدردی کے جذبات تھے نفرت کے نہیں۔ ناگاہ اُس کے کانوں میں ایک آواز آئی

"جمالؔی بھائی اتنے دن کہاں غائب رہے"

وہ ٹھٹک گیا۔ اُس کے قدم خود بخود رُک گئے۔ اُس نے دیکھا سامنے سے جمیؔل آ رہا ہے۔ جمیؔل بھی اسی کی طرح بیکاری کا مارا ہوا گریجویٹ تھا۔ پورے ایک برس دردر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اب کہیں اُسے ایک دفتر میں بیس روپیہ ماہوار پر چپڑاسی رکھ لیا گیا تھا۔

"تمہارے ہی مکان سے واپس آ رہا ہوں، تم نے میرے پتہ پر جواب منگوایا تھا! لو دیکھو ریکروٹنگ آفس سے جواب آیا ہے۔ انٹرویو کے لئے کل گیارہ بجے بلایا ہے۔" جمیؔل کہنے لگا۔

جمالؔی حیرت سے اُس کا مُنہ تک رہا تھا۔ آخری چار آنے تو وہ بڑھیا کی نذر کر چکا تھا اب تو اُس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ جس سے وہ ریکروٹنگ آفس تک ہی جا سکتا۔

صبح ہوئی جہانِ رنگ و بُو کا ذرہ ذرہ انگڑائی لیکر بیدار ہوا۔ جمالؔی نے سوٹ زیبِ تن کیا جو اُس نے ایسے ہی موقعوں کے لئے سنبھال رکھا تھا، رات سے اُس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ لیکن وہ اتنے پیسے کہاں سے لاتا جن سے وہ ناشتہ کر سکتا ٹرام میں جانے کے لئے بھی ایک پیسہ پاس نہ تھا۔ وہ پیدل ہی چل نکلا۔ چونکہ وہ گھر سے کافی سویرے نکلا تھا اس لئے "ریکروٹنگ آفس" میں بھی وقت سے قبل پہونچ گیا۔ دیکھا تو پچاس ساٹھ کے قریب تعلیم یافتہ نوجوان سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ اتنے آدمیوں کے ہوتے ہوئے بھی وہاں کامل سکوت طاری تھا، ہر ایک اپنے تصوّرات کی دنیا میں گم تھا جمالؔی بھی ایک کونے میں خاموش ہو کر بیٹھ رہا۔

خدا خدا کرکے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ انٹرویو شروع ہوا۔ اور امیدوار ایک ایک کرکے اندر جانے لگے۔ آخر جمالؔی کی باری بھی آ ہی گئی جمالؔی امنگوں بھرے دل کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ افسر نے پہلا سوال اُس کی تعلیم کے بارے میں کیا۔ جس کا جواب مدہم آواز میں "گریجویٹ" تھا۔ یہ سنکر افسر ہنس دیا۔ اور کہنے لگا "کہ گریجویٹوں کو نواب ملازمتیں بھی بآسانی مل سکتی ہیں۔ ایسی معمولی نوکریاں تو معمولی تعلیم والے امیدواروں کو ملنی چاہئیں"۔ جمالؔی کے خرمنِ امید پر بجلی گر پڑی، وہ سمجھ گیا کہ اِس ذہنیت کے افسر سے ملازمت کی توقع کرنا بے سود ہے۔ اُس نے افسر مذکور کو سلام کیا اور باہر نکل آیا۔

وہ قدرت کی اِس ستم ظریفی پر مسکرا رہا تھا۔ جب وہ مسکراتا ہوا گیٹ سے گزرنے لگا تو اُسے مسکراتے ہوئے دیکھ کر چوکیدار یہ سمجھا کہ شاید اُسے ملازمت مل گئی ہے اسی لئے اتنا خوش خوش واپس جا رہا ہے۔

"بابوجی انعام" چوکیدار نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

جمالؔی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"انعام بابوجی" چوکیدار نے دہرایا۔

غیر ارادی طور پر جمالی کے ہاتھ پتلون کی خالی جیبوں میں داخل ہوئے۔

"انعام!.... ہا.... ہا.... ہا.... انعام!" وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ اور وہاں سے دوڑ پڑا۔ وہ زور زور سے ہنس رہا تھا۔ اور چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

"انعام!.... ہاہاہا.... انعام!"

چوکیدار اس کے اس فعل پر ازحد متعجب ہوا۔ وہ سمجھا شاید ملازمت ہاتھ آجانے کی خوشی میں اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔

جمالی کے زور زور سے ہنسنے کی آواز اب بھی اسے سنائی دے رہی تھی۔ اور وہ حیرت بھری نظروں سے "دُور، نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہوئے جمالی کو دیکھ رہا تھا۔

جاوید کوہستانی (کوہاٹ)

جذباتِ رسوا

فرقت میں گر زمانہ ستائے تو کیا کروں — اپنے جو ہوگئے ہیں پرائے تو کیا کروں

لیکر تو ساتھ جاؤں حسینوں کی بزم میں — دل ہی تو ہے جو ہاتھ سے جائے تو کیا کروں

علت سہی حرام سہی سب بجا درست — ساقی تماما ہوش جو پلائے تو کیا کروں

رکھتا ہوں شغل آہ و بکا میں رات دن — دل کو تمہاری یاد ستائے تو کیا کروں

سبزہ ہوا اور بادہ ہو چھٹکی ہو چاندنی — ایسے میں بن سنور کے وہ آئے تو کیا کروں

مجبور ہوں میں سامنے اُس چشمِ مست کے — ساتھ پئے ہی بنائے تو کیا کروں

کرتا نہیں میں بات پتے کی کبھی رقم — نامہ جو ہاتھ غیر کے آئے تو کیا کروں

دیتا نہیں پیام زبانی میں اس لئے — قاصد کچھ اور بات بنائے تو کیا کروں

کیونکر بھلاؤں بھولنے والی نہ ہو جو بات — دل سے تمہاری یاد نہ جائے تو کیا کروں

بدنامیاں تو عشق میں رسوا ہیں لازمی — انداز حسن کا مجھے بھائے تو کیا کروں

خان شری امام الدین خاں رسوا
والئی باجوہ (کاٹھیاواڑ)

مشاہدات

(۱)

جا رہا تھا ایک بوڑھا پیکرِ حزن و ملال
جھریاں گالوں پہ، چہرہ زرد، آنکھوں میں نمی
خشک ہونٹوں پر تھی اُس کے پھیکی پھیکی سی ہنسی
اک شکستہ قبر پہ چھٹکی ہو جیسے چاندنی

(۲)

نیلگوں آکاش پر ہے شوخ تاروں کا ہجوم
اُڑ رہے ہیں یاسمن کے ہر طرف تختے کئی
جھانکتا ہے چاند ہلکے بادلوں کی اوٹ سے
جیسے آنچل سے چھپالے اپنا منھ دلہن نئی

جاوید کوہستانی

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح:- "ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"

حضرتِ نوحؔ ناروی

اظہارِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں — جلووں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
نیرنگیٔ اثر سے ڈرے جا رہے ہیں وہ — فریادِ کامیاب کئے جا رہا ہوں میں
ناراضگی کا ڈر خفگی کا اثر نہیں — شکوہ دمِ عتاب کئے جا رہا ہوں میں
چمکیں گے داغ ہائے محبت ابھی کچھ اور — اِک اِک کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں
تعذیرِ بے شمار کا کھٹکا نہیں رہا — تقصیرِ بے حساب کئے جا رہا ہوں میں
آتے تھے وہ کبھی مرے خوابِ خیال میں — ذکرِ خیال و خواب کئے جا رہا ہوں میں
یہ صبح یوں ہے جیسے لاش نگاہوں کے سامنے — یوں ماتمِ شباب کئے جا رہا ہوں میں
پہلے بھی شرحِ دردسے تھا مجھکو احتراز — اور اب بھی اجتناب کئے جا رہا ہوں میں
اے نوحؔ میرے بعد کوئی کیا اُٹھائیگا — طوفاں کا سدِ باب کئے جا رہا ہوں میں

حضرتِ رعدؔ تلمیذ مرزا داغؔ دہلوی مرحوم

پھر ضبطِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں — پھر حالِ دل خراب کئے جا رہا ہوں میں
انجامِ عشق خوب ہوا ہے نہ خوب ہو — کیوں عمر کو خراب کئے جا رہا ہوں میں
اتنی نظر میں تاب کہاں ہے جو دیکھ لوں — کیوں اُنکو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
جنکی نگاہِ ناز سے دل تھامنا پڑے — ایسوں کو انتخاب کئے جا رہا ہوں میں
پہلے مٹا ہوا تھا جہانِ خراب پر — اب اُس سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں
رکھتا ہوں بار بار جبیں اُنکے پاؤں پر — قسمت کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں
یہ رعدؔ سے کہا اثرِ دردِ عشق نے — اب تجھکو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

حضرتِ المؔ مظفر نگری

دل کو ترا جواب کئے جا رہا ہوں میں — ذرّے کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں
قطرے کو دیکھتا ہوں کمالِ نگاہ سے — دریا کو بے حجاب کئے جا رہا ہوں میں
اِک بحرِ غم میں یہ جوش یہ طوفان سرکشی — نظّارۂ حباب کئے جا رہا ہوں میں
ہاں میں نے ہی کہا کہ بہار و خزاں ہو تم — ہاں تم کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
جلوے ترے ازل سے ہیں میری نگاہ میں — کب سے یہ احتساب کئے جا رہا ہوں میں
کرکے بیاں مآلِ جفا کی حقیقتیں — آج اُن کو لاجواب کئے جا رہا ہوں میں
فطرت کو دیکھتا ہوں نگاہِ مجاز سے — اپنی نظر خراب کئے جا رہا ہوں میں
ہر وعدۂ کرم ہے ترا مستقل فریب — کیوں اعتبارِ خواب کئے جا رہا ہوں میں
خونِ جگر سے دامنِ ہستی کو اے الم — آلودۂ شراب کئے جا رہا ہوں میں

محسنِ ادب حضرتِ نشترؔ تہنگامی ایڈوکیٹ اورئی

جلووں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں — "ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"
پیری کو بھی شباب کئے جا رہا ہوں میں — پانی کو بھی شراب کئے جا رہا ہوں میں
ممکن نہیں کہ اب وہ نہ ہوں مجھ پہ ملتفت — اب خود سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں
تسکیں کی جستجو میں ہوں سرگرم رات دن — توہینِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں
کیا جانے کر رہا ہوں میں تعمیرِ زندگی — یا زندگی خراب کئے جا رہا ہوں میں
دے کر نظر سے دعوتِ جلوہ جمال کو — پیدا نئے حجاب کئے جا رہا ہوں میں
بدلا ہے اور نہ بدلیگا نشترؔ شعارِ حسن — کیوں سعیٔ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

حضرتِ آغازؔ برہانپوری

آج اُنکو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں — کیا کارِ لاجواب کئے جا رہا ہوں میں
اے حسنِ دوست کون ہے اب کس کا آئینہ — یہ کسکو لاجواب کئے جا رہا ہوں میں
وہ یاس آشنا ہو کہ نا آشنا کوئی — اب سب سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں
کھائی ہیں میرے دل نے شکستیں کہاں کہاں — کب سے یہی حساب کئے جا رہا ہوں میں
یہ کون آج زیبِ شبستانِ شوق ہے — آنکھوں کو فرشِ خواب کئے جا رہا ہوں میں
اب میری زندگی ہو کہ دنیا کی زندگی — سب نذرِ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں
سیلِ سرشکِ دیدۂ گریاں کے جوش میں — عالم کو آب آب کئے جا رہا ہوں میں
ہو ختم جس پہ دعوتِ میخانۂ ازل — تقسیم وہ شراب کئے جا رہا ہوں میں
آغازؔ کیوں نہ داد ملے حسنِ دوست کی — لاکھوں میں انتخاب کئے جا رہا ہوں میں

حضرتِ جذبؔ عالم پوری

نظروں کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں — [illegible]

گو علم ہے مجھے کہ دوامی ہے اضطراب
درمانِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

یہ جانتا ہوں نیند نہ آئے گی شامِ غم
اور پھر بھی عزمِ خواب کئے جا رہا ہوں میں

ہاں دسترس نہیں ہے مری انقلاب پر
تدبیرِ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

دنیا نے گر خراب کیا ہے مجھے تو کیا
دنیا کو بھی خراب کئے جا رہا ہوں میں

خالی نہ تیری یاد سے کوئی نفس رہے
ہر لحظہ احتساب کئے جا رہا ہوں میں

دے کر مذاقِ عشق و وفا کی تجلیاں
"ذرّوں" کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

پھولوں کے لب سے کیوں نہیں پیتا بہار میں
اے جذب کیوں حجاب کئے جا رہا ہوں میں

حضرت صبا متھرادی

وہ چپ ہیں اور خطاب کئے جا رہا ہوں میں
یہ بات لاجواب کئے جا رہا ہوں میں

ہر ما سوا کو قسمتِ کونین کی قسم
نذرِ غمِ شباب کئے جا رہا ہوں میں

مخمور آنکھ کا ہوں سہارا لئے ہوئے
میخانوں کو خراب کئے جا رہا ہوں میں

خود ہی تو مٹ رہا ہوں مٹا کر ہر اک اُمید
دنیا کا کیا خراب کئے جا رہا ہوں میں

جلوے تمہارے ہوں کہ نہ ہوں جلوہ گاہ میں
نظروں کو باریاب کئے جا رہا ہوں میں

اللہ رے حجابِ نشیں کے تصرفات
اپنے سے خود حجاب کئے جا رہا ہوں میں

احساسِ زندگی ہیں مرے دل کی دھڑکنیں
تخلیقِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

خاموش وہ کھڑے ہیں صبا میرے سامنے
تصویر سے خطاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب جمیل سیوہاروی بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی

صرفِ غمِ شباب کئے جا رہا ہوں میں
یوں زندگی خراب کئے جا رہا ہوں میں

سجدہ نیہ کیوں ہو باریہ تخصیصِ آستاں
ہر در سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں

دل میں کبھی ہے درد کبھی ہے جگر میں ٹیس
تقسیمِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

مرکز پہ آ گیا ہے مرا جذبہ تلاش
تیرا ہی انتخاب کئے جا رہا ہوں میں

نظریں نثار ہا ہوں حریمِ جمال میں
آنکھوں کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

ہر شعر اک پیام ہے ہر لفظ اک صلا
اس طرح انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

آنکھوں میں سور موزِ تجلی لئے ہوئے
"ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"

اپنا ہی عکس سامنے ہے مثلِ آئینہ
یہ کس کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

اچھے نہیں ہیں دن یہ مسلّم مگر جمیل
راتوں کو کیوں خراب کئے جا رہا ہوں میں

جناب ارشد صدیقی امروہوی

[illegible] اضطراب کئے جا رہا ہوں میں
[illegible] سر سانس کو عذاب کئے جا رہا ہوں میں

سرگرمِ مشق ناز ہے اک شہسوارِ حسن
خاک اپنی ہم رکاب کئے جا رہا ہوں میں

وہ وارداتِ عہدِ جوانی نہ پوچھئے
جیسے کہ سیرِ خواب کئے جا رہا ہوں میں

خود ہی لٹا رہا ہوں متاعِ شبابِ زیست
خود ماتمِ شباب کئے جا رہا ہوں میں

سینے پہ زخمِ تیغِ محبت ہیں بے شمار
بیٹھا ہوا حساب کئے جا رہا ہوں میں

تکمیل کا جنوں ہے کہ ہر دل کے داغ کو
ہم سوزِ آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

مستور ہیں جو چشمِ حقیقت شناس سے
جلوے وہ بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

اللہ رے یہ لطفِ سزائے گناہِ عشق
دانستہ ارتکاب کئے جا رہا ہوں میں

ماضی کی یاد حال میں ارشد ہے دلشکن
سب کچھ خیال و خواب کئے جا رہا ہوں میں

جناب حزیں احمد آبادی

دنیا سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں
اک سعیٔ کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

یوں کہہ رہا ہوں عمرِ گذشتہ کے واقعات
جیسے کہ شرحِ خواب کئے جا رہا ہوں میں

دُہرا کے پھر حدیثِ آلِ کلیم و طور
اندازۂ عتاب کئے جا رہا ہوں میں

پھر ہر نفس کو شعلۂ سوزِ نہفتہ سے
معمورِ التہاب کئے جا رہا ہوں میں

اک جزوِ بندگی ہے میری زندگیٔ عشق
کس چیز کو خراب کئے جا رہا ہوں میں

رکھ رکھ کے ہاتھ نبضِ تباہیٔ دہر پر
تشخیصِ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

اُتنا ہی ہوں قریبِ مذاقِ گناہ سے
جتنا بھی اجتناب کئے جا رہا ہوں میں

کچھ مانگ کر ستاروں سے بیتابیوں کی بھیک
تکمیلِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

پردے اُٹھا کے روئے حقیقت سے اے حزیں
ہر شے کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب اثر ایم۔ اے جوناگڑھی

دل سرخوشِ شباب کئے جا رہا ہوں میں
خود کو یوں ہی خراب کئے جا رہا ہوں میں

دل میں سمیٹ کر نگہِ برق بار دست
تعمیرِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

حسنِ نظر فروز کے جلووں کی دید سے
"ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"

دل کی فغاں سے بارگہِ عیش و ناز میں
پیدا اک انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

اظہارِ شوقِ دید کی بیتابیاں نہ پوچھ
اب دُور ہر حجاب کئے جا رہا ہوں میں

جب شورشِ الم بھی ہے عنصر حیات کا
کیوں غم سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں

منظور ہے کہ دیکھ لوں پایانِ مغفرت
یوں جرم بے حساب کئے جا رہا ہوں میں

قیدِ تعیّنات مٹا کر نگاہ سے
جلووں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

اُمید مر رہا اثر نگہِ التفات کی
خود حسرتِ عتاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب سہا قریشی از بھنڈ

دل وقفِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں
رنگِ سکوں خراب کئے جا رہا ہوں میں

سرکا کے اُن کے چہرۂ پُرنور سے نقاب
فطرت کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

اسمیں نہیں ہے آپکی الفت کا کچھ قصور
خود زندگی خراب کئے جا رہا ہوں میں

کہہ کہہ کے داستانِ شبِ ہجر حسن کو
مجبورِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

قبلِ بہار داغِ جگر سے بنا کے پھول
گلشن میں انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

شرما رہا ہوں دیکھ کے دامن کو چاک چاک
وحشت کا سدِّباب کئے جا رہا ہوں میں

اسطرح رہ کے ہیں محبت سے ہم نشیں
جیسے کوئی عذاب کئے جا رہا ہوں میں

ہمت بڑھا رہا ہوں فتوحاتِ حسن کی
دلکو شکستیاب کئے جا رہا ہوں میں

ہے یہ جنوں کہ غیر تو پھر غیر ہیں سہا
اپنوں سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں

جناب نثار اٹاوی

فطرت کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
نظروں کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

جذبِ نظر شباب کئے جا رہا ہوں میں
سارا چمن خراب کئے جا رہا ہوں میں

وابستہ میرے درد سے ہیں حادثاتِ دہر
ہر لحظہ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

موجِ شباب صرف سرابِ خیال تھی
کیوں ماتمِ سراب کئے جا رہا ہوں میں

بیٹھے ہیں وہ مگر نہیں نظروں کو اعتبار
اب تک گمانِ خواب کئے جا رہا ہوں میں

گاتا ہوں جھوم جھوم کے عشق و وفا کے گیت
ہر سانس کو رباب کئے جا رہا ہوں میں

بالواسطہ ملا بھی جو ساحل تو کیا حصول
کشتی کو غرقِ آب کئے جا رہا ہوں میں

جو شعر کہہ رہا ہوں شبِ ہجر اے نثار
وہ ان سے انتساب کئے جا رہا ہوں میں

جنابِ شاعر نہٹوری وکیل سواسرا

نظروں کو باریاب کئے جا رہا ہوں میں
جلووں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

کچھ خود ہی بے نقاب ہوئے جا رہے ہیں وہ
کچھ اُنکو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

قیدِ تعینات سے ممکن نہیں مفر
برداشت ہر عذاب کئے جا رہا ہوں میں

جذبِ نگاہ کہہ کے تجلی حسنِ یار
نظارۂ بے حجاب سے کئے جا رہا ہوں میں

مانوسِ انقلاب ہوا جا رہا ہے دل
سامانِ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

صیاد کا خطر ہے نہ کچھ خوفِ باغباں
پھولوں کا انتخاب کئے جا رہا ہوں میں

تارِ نفس پہ چھیڑ کے نغماتِ انقلاب
ہر سانس کو رباب کئے جا رہا ہوں میں

فطرت کے نقش ڈھنگ میں اے شاعرِ حزیں
احساسِ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب برق صدیقی فتحپوری

بیزارِ کیفِ خواب کئے جا رہا ہوں میں
دنیا میں انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

دل کو جمال یاب کئے جا رہا ہوں میں
ذرّے کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

تحقیق واہمہ ہیں غم و عشرتِ جہاں
وہموں سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں

جسطرح راہ میں کوئی سوتا ہوا چلے
طے یوں رہِ شباب کئے جا رہا ہوں میں

ثابت نہیں ہنوز ثباتِ بہارِ دہر
تسلیم اسے سراب کئے جا رہا ہوں میں

تخویفِ احتسابِ قیامت نہیں مجھے
تقصیرِ بے حساب کئے جا رہا ہوں میں

جاں اُنکو جسمِ خاک کو دیکر دمِ اخیر
بیباق ہر حساب کئے جا رہا ہوں میں

اے برق مانگ کر کسی سے سکوں کی بھیک
دل نذرِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

جناب خواجہ بسمل اعظم گڈھی

نظارۂ شباب کئے جا رہا ہوں میں
یوں دلکو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

ضو دے کے تیرے جلوؤں کی ہر داغِ دلکو آج
مہتاب و آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

تیری طلب میں ہو گئے زمانہ سے بے نیاز
ہر شے سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں

کھا کر فریب شعبدۂ دہرِ بے ثبات
تم سے بھی اجتناب کئے جا رہا ہوں میں

داغِ دل و جگر کو محبت کے سوز سے
لبریزِ التہاب کئے جا رہا ہوں میں

کہکے ہر ایک موجۂ طوفاں سے ساز باز
ساحل کا جشن خواب کئے جا رہا ہوں میں

تاروں کو دے رہا ہوں ضیا دل کے داغ سے
"ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"

بسمل جمودِ منتقل دہر دیکھ کر
اعلانِ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب نصرت الانصاری بھوپالی

نظارۂ شباب کئے جا رہا ہوں میں
دلکو پُر التہاب سے کئے جا رہا ہوں میں

پھر اُن سے کچھ خطاب کئے جا رہا ہوں میں
پھر خود کو لاجواب کئے جا رہا ہوں میں

پھر میں ہوں اور سوزِ محبت کی لذتیں
پھر دلکو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

اے ضبطِ آہ دیکھ کہ اُنکو بھی شامِ غم
مجبورِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

یہ آبجو، یہ تکیۂ زانو، یہ نورِ ماہ
حاصل سکونِ خواب کئے جا رہا ہوں میں

پھر اک ضیائے نو دلِ تاریک کیلئے
جلووں سے اکتساب کئے جا رہا ہوں میں

ہے بیخودی حقیقتِ عالم کی پردہ در
کس کس کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

نصرت میں اس متاعِ محبت پہ ہوں نثار
جو اُنسے اکتساب کئے جا رہا ہوں میں

جناب خواجہ اختر اعظم گڑھی

نظارۂ شباب کئے جا رہا ہوں میں   نظروں کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں
تیری طلب میں آج ہوں بیزار کائنات   ہر شئے سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں
سوز دروں عشق سے ہر آرزوئے دل   خاکستر و خراب کئے جا رہا ہوں میں
تم سے نظر ملاکے دل و روح میں پھر آج   پیدا اک اضطراب کئے جا رہا ہوں میں
پردے اٹھا رہا ہوں میں اپنی نگاہ کے   یا انکو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
دلکو ترے تصور رنگیں سے شام غم   درپردہ فیضیاب کئے جا رہا ہوں میں
پیغام حریت سے مٹا کر جمود کو   برپا اک انقلاب کئے جا رہا ہوں میں
اختر کسی کے جلوۂ حسن و شباب کو   لاکھوں میں انتخاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب سراج احمد آبادی

کیا کم یہ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں   "ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"
اُس کے حریم ناز میں ذوق نگاہ سے   سجدوں کو باریاب کئے جا رہا ہوں میں
رنگیں جمال یار سے باغ خیال کو   جنت کا ہم جواب کئے جا رہا ہوں میں
سنکر زبان خلق سے تعریف حسن دوست   نادیدہ انتخاب کئے جا رہا ہوں میں
پھر ساز دل پہ چھیڑ کے نغمات بیخودی   عالم کو مست خواب کئے جا رہا ہوں میں
فکر سخن سے فطرت نیرنگ ساز کو   مجبور انقلاب کئے جا رہا ہوں میں
پھر سوئے بزم ناز کھچا جا رہا ہے دل   حالانکہ اجتناب کئے جا رہا ہوں میں
ہر ہر نفس کو عالم ہستی میں اے سراج   قربان بوتراب کئے جا رہا ہوں میں

معاون ادب جناب صابر اکبر آبادی (بی۔اے)

تسکین کو اضطراب کئے جا رہا ہوں میں   برپا اک انقلاب کئے جا رہا ہوں میں
یہ عشرت گناہ کہ توبہ نہیں پسند   جیسے بڑا ثواب کئے جا رہا ہوں میں
مجھکو یقین خواب نہیں بعد مرگ بھی   اندیشہ ہائے خواب کئے جا رہا ہوں میں
جلووں کی کائنات اُدھر ملتفت ادھر   جلووں سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں
تیرے حجاب نے مجھے یہ کیا سکھا دیا   اب خود سے بھی حجاب کئے جا رہا ہوں میں
احساس درد کی مجھے رکھنی ہے آبرو   اک ضبط کامیاب کئے جا رہا ہوں میں
صابر دل خراب ہے سرمایۂ سکوں   کیوں تذکرِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

جناب اظہر جعفری جبلپوری

منزل سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں   وحشت کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں
مد نظر ہے دیکھنا انجام حسن و عشق   برپا اک انقلاب کئے جا رہا ہوں میں
اللہ رے یہ جوشِ فراوانِ شوقِ دید   جلووں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
میری نظر ہے حسن حقیقت سے آشنا   "ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"
دنیا بھی ہے خراب محبت میں دین بھی   کیوں زندگی خراب کئے جا رہا ہوں میں
بزم جہاں میں راز فنا سے ہوں ہمکنار   ہستی کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں
اظہر ہوں اور واقف اسرار عشق ہوں   ہر راز بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب شفا گوالیاری

کیوں سعی انقلاب کئے جا رہا ہوں میں   کیوں فکر اضطراب کئے جا رہا ہوں میں
یہ جانتے ہوئے بھی کہ مشکل ہے اجتناب   دنیا سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں
دل ہے کہ آج بھی ہے سکوں کی تلاش میں   گو صرف اضطراب کئے جا رہا ہوں میں
فطرت میں شام غم کی نہیں راحت و سکوں   کیوں آرزوئے خواب کئے جا رہا ہوں میں
کیوں جی رہا ہوں اُن کے کرم کی امید پر   کیوں زندگی خراب کئے جا رہا ہوں میں
انجام اضطراب سکوں ہے یہ سوچ کر   تکمیل اضطراب کئے جا رہا ہوں میں
دلکو بنا رہا ہوں شفا مرکز جمال   ذرّے کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب مرزا عالم پوری

ترک شراب ناب کئے جا رہا ہوں میں   احساں علی الحساب کئے جا رہا ہوں میں
بنتی نہیں ہے اُن سے محبت کئے بغیر   ہر چند اجتناب کئے جا رہا ہوں میں
مہلت ملی تھی صرف دو روزہ حیات کی   اسکو بھی صرف خواب کئے جا رہا ہوں میں
وابستۂ جنوں کو خموشی روا نہیں   ہر شخص سے خطاب کئے جا رہا ہوں میں
رخصت حریم دل سے ہو، پھر سکون دل   پھر غم کو باریاب کئے جا رہا ہوں میں
آماجگاہ حسن بنا ہے سواد دل   جلووں کو باریاب کئے جا رہا ہوں میں
مرزا حریم دل میں ہے یہ کون پردہ دار   جو اسطرح حجاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب جری ہوشنگ آبادی از جبلپور

جلووں کا انتخاب کئے جا رہا ہوں میں   یہ کام لاجواب کئے جا رہا ہوں میں
محسوس ہو رہا ہے جہاں میں ترے بغیر   بربادی شباب کئے جا رہا ہوں میں
تجھسے برائے جفائے مسلسل نباہ کر   دنیائے دل خراب کئے جا رہا ہوں میں
لیتا ہوں درس بیخودی ہوکی بڑھا کے مشق   ہستی کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں
تم ساز زندگی پہ سُنا ہے کہ گاؤ گے   ہر سانس کو رباب کئے جا رہا ہوں میں

صرف اس خیال سے کہ میں ہو کر رہوں ترا — ہر شے سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں
امید کہہ رہی ہے وہ شاید ہوں مہرباں — اظہارِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں
مٹنے کا غم نہیں ہے جری عشق میں مجھے — الفت کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

جنابِ رعنا عشرتی

تو ہین اضطراب کئے جا رہا ہوں میں — کیوں آرزوئے خواب کئے جا رہا ہوں میں
مجبور ہوں اسی لئے خودداریٔ نظر — منت کشِ حجاب کئے جا رہا ہوں میں
دامن پہ اشک ہائے محبت بکھیر کر — تاروں کا ہم جواب کئے جا رہا ہوں میں
آزادیوں کا پھونک کے اپنے وطن میں صور — تمہیدِ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں
لیگا نہ میرے بعد کوئی نام عشق کا — بند آج یہ بھی باب کئے جا رہا ہوں میں
ہائے میں ہے جمالِ نظارے میں آنکھ ہے — یوں سیرِ ماہتاب کئے جا رہا ہوں میں
یہ جانتے ہوئے کہ نہ ہونگے وہ بے نقاب — رعنا نظر خراب کئے جا رہا ہوں میں

جنابِ موتی لال لکڑ ایم۔ بی۔ ایس۔ الہ آباد

"ذروں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں" — برپا اِک انقلاب کئے جا رہا ہوں میں
اِس ہم میں کہ آئیں نہ دل پر مصیبتیں — خود حسن سے حجاب کئے جا رہا ہوں میں
سب پھول چن رہے ہیں چمن میں اِدھر اُدھر — کانٹوں کو انتخاب کئے جا رہا ہوں میں
کیا حشر ہوگا حشر میں اسکی خبر نہیں — دنیا ابھی خراب کئے جا رہا ہوں میں
یہ زندگی کسی کی امانت ہے اِس لئے — ہر سانس کا حساب کئے جا رہا ہوں میں
نیرنگیٔ جہاں کی بھی کوئی لبا ملا ہے — آنکھوں کو صرفِ خواب کئے جا رہا ہوں میں
شایانِ شانِ عشق قرار و سکوں نہیں — یوں سعیٔ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

جنابِ وحید۔ نونوی۔ غازیپوری

الفت کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں — پیدا اِک انقلاب کئے جا رہا ہوں میں
تعبیر اس کی دورِ زمانہ بتائے گا — ہر واقعہ کو خواب کئے جا رہا ہوں میں
کہتا گیا وہ مہرِ نبوت دمِ غروب — "ذروں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"
بعدِ فنا نہ آسکے تعمیر کے بھی کام — مٹی کو یوں خراب کئے جا رہا ہوں میں
نقشِ شباب کیلئے موئے سپید کو — شرمندۂ خضاب کئے جا رہا ہوں میں
کیا دے سکیگی بعدِ فنا وہ مرا جواب — دنیا کو لاجواب کئے جا رہا ہوں میں

ہو کر سوار توسنِ انفاس پر وحید
طے منزلِ سراب کئے جا رہا ہوں میں

جنابِ بزم امروہوی

وا پردۂ نقاب کئے جا رہا ہوں میں — جلوؤں کا انتخاب کئے جا رہا ہوں میں
داغوں کو ماہتاب کئے جا رہا ہوں میں — "ذروں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"
اب دور ہر حجاب کئے جا رہا ہوں میں — اب خود کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
اتنی خبر نہیں کہ جہانِ مجاز میں — برباد کیوں شباب کئے جا رہا ہوں میں
غفلت میں کٹ رہی ہیں جوانی کی راتدن — یوں زندگی خراب کئے جا رہا ہوں میں
تجھ سا حسین عالمِ تخلیق میں نہیں — تیری طرف خطاب کئے جا رہا ہوں میں
مشقِ ستم میں کتنی جفائیں ہیں یادگار — اے بزم انتخاب کئے جا رہا ہوں میں

جنابِ عاصی ننگھلوی (حصار)

فریاد بے حساب کئے جا رہا ہوں میں — ثابت ترا عتاب کئے جا رہا ہوں میں
لطف و نشاط لوٹ رہا ہوں بہار میں — یا زندگی خراب کئے جا رہا ہوں میں
لاتا ہوں ڈھونڈ ڈھونڈ کے دلمیں نئے خیال — اچھوں کا انتخاب کئے جا رہا ہوں میں
آنسو بہا بہا کے سیہ کاریوں کے بعد — ہر عیب کو صواب کئے جا رہا ہوں میں
تصویر اُن کی اپنے تصور میں کھینچکر — جلوؤں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
کر کے بتوں کو رشتۂ کعبہ سے منسلک — "ذروں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"
عاصی نہ کیوں نڈر ہوں جہنم کی آگ سے — جب ذکرِ بوتراب کئے جا رہا ہوں میں

جنابِ طرفہ قریشی بھنڈاروی

نظروں کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں — جلوؤں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
ناقص ہر ایک شے ہے جہاں کی نگاہ میں — اپنا ہی انتخاب کئے جا رہا ہوں میں
یہ کون ہے سرابِ تصور میں میرے آج؟ — یہ کسکو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں؛
کیوں وقتِ نزع لب پہ تبسم نہ ہو مرے؛ — اب غم کا سدباب کئے جا رہا ہوں میں
فطرت بدل رہا ہوں جہانِ خراب کی — خود زندگی خراب کئے جا رہا ہوں میں
یہ سوچکر، کہیں سے تو دیگا کوئی جواب — ہر ایک سے خطاب کئے جا رہا ہوں میں
طرفہ نہیں ہے آنکھ سے آنسو مری رواں — درمانِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

جنابِ غنی جبلپوری

نظروں کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں — جلوؤں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
ذکرِ شرابِ ناب کئے جا رہا ہوں میں — ایمان کو خراب کئے جا رہا ہوں میں
دیتا ہوں تیری یاد میں خرم شہی کو اپنی جا — الفت کا فتح باب کئے جا رہا ہوں میں

پھر مائلِ عذاب ہوا ہے دلِ خراب
پھر خواہشِ شباب کئے جا رہا ہوں میں

پھر اُن سے کہہ رہا ہوں محبت کی داستاں
پھر اُنکو محوِ خواب کئے جا رہا ہوں میں

نظمِ جہانِ دل کے رہیگا جو ایک دن
برپا وہ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

کیا بات ہے کسی کی محبت میں اے غنیؔ
کیوں زندگی خراب کئے جا رہا ہوں میں

جناب منشی خلیل کولاری

ذکرِ ابو تراب کئے جا رہا ہوں میں
یہ کام بالصواب کئے جا رہا ہوں میں

بزمِ خیال میں تجھے اے شاہدِ جمال
ہر طرح باریاب کئے جا رہا ہوں میں

غیروں کا کیا سوال تمہارے خیال میں
اپنوں سے بھی حجاب کئے جا رہا ہوں میں

آدابِ عشق سے کبھی آدابِ حسن سے
دنیا کو فیضیاب کئے جا رہا ہوں میں

دل سوز اپنی آہوں سے دنیائے عشق کو
نا آشنائے خواب کئے جا رہا ہوں میں

مٹ کر ترے فراق میں اے جانِ زندگی
درمانِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

تعمیر کرنے کعبۂ دل آجکل خلیلؔ
سامانِ انتخاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب راحت از اندور

سر سے گذر چلی ہے مرے موجِ سیلِ اشک
ہستی کو غرقِ آب کئے جا رہا ہوں میں

جرأت دلا رہی ہے تری اک نگاہِ لطف
عصیاں جو بے حساب کئے جا رہا ہوں میں

غفلت میں دن گذار رہا ہوں شباب کے
ہستی کو وقفِ خواب کئے جا رہا ہوں میں

خود ہی تو جلوہ ریز ہوں ہر شے میں دہر کی
پھر سب سے خود حجاب کئے جا رہا ہوں میں

کرتا ہوں دلکو نذرِ ستم ہائے بے پناہ
حسرت کا سدِّ باب کئے جا رہا ہوں میں

حالِ فزورِ جوششِ گریہ سے مختصر
دریا کو آب آب کئے جا رہا ہوں میں

راحتؔ مجھی سے شورشِ ہستی کی ہے نمود
دنیا میں انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب صادق از بھنڈ ریاست گوالیار

یاد اُنکی بے حساب کئے جا رہا ہوں میں
الفت کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

پھر اُنکو جلوہ گاہ میں لانیکی فکر ہے
پھر فکرِ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

مجھ پر بقدرِ عشق ہے رعنائیِ شباب
اب حسن بے حجاب کئے جا رہا ہوں میں

سمجھا ہوں جب سے اپنی حقیقت کو عشق میں
دنیا سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں

یاد آ رہا ہے مجھکو ترا عہدِ التفات
یعنی خیالِ خواب کئے جا رہا ہوں میں

پھر کر رہا ہوں اپنی حقیقت کا انکشاف
پھر اُنکو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

[illegible]
اُنکو [illegible] کئے جا رہا ہوں میں

جناب بیتاب کالپوی

ہر عہد کامیاب کئے جا رہا ہوں میں
وا زندگی کے باب کئے جا رہا ہوں میں

جلووں سے اکتساب کئے جا رہا ہوں میں
یوں دلکو ماہتاب کئے جا رہا ہوں میں

تکمیلِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں
دل نذرِ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

ہر لحظہ انقلاب ہے دورِ حیات میں
کرنا جو ہے شتاب کئے جا رہا ہوں میں

دل جور آشنا ہے جگر جبر آشنا
اُنکا ہی انتخاب کئے جا رہا ہوں میں

مجرم ہوں میں گناہِ محبت کا اور پھر
ہر بار ارتکاب کئے جا رہا ہوں میں

وہ عفو کر رہے ہیں خطاؤں کو بار بار
اور جرم بے حساب کئے جا رہا ہوں میں

بیتابؔ اپنے دل کو جگر کو نگاہ کو
پابندِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

جناب رضا قریشی گوالیاری

پیدا ترا جواب کئے جا رہا ہوں میں
ہر شے کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

غالب ہیں شامِ ہجر کی تاریکیاں مگر
پیدا اک آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

دیکھا ہے میں نے خواب میں جب سے وہ آئے ہیں
اور اُنسے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں

اللہ رے بیکسی کہ شبِ انتظارِ دوست
اپنے سے خود خطاب کئے جا رہا ہوں میں

اب سوائے خود کوئی وابستگی نہیں
اب اُنسے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں

اُنکی خبر ملی ہے اُنھیں ڈھونڈنے رضاؔ
آنکھوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

ہمدردِ ادب جناب نسیم گوالیاری

وا رازِ دل کا باب کئے جا رہا ہوں میں
فطرت کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

عذرِ گناہ ہیں یہ مرے اشکِ انفعال
رحمت کو لاجواب کئے جا رہا ہوں میں

جمنے قدم ذرا نہیں دیتیں تجلیاں
نظروں کو باریاب کئے جا رہا ہوں میں

دشتِ جنوں میں دامنِ دل کرکے تار تار
سامانِ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

منزل پہ اپنی پہونچے گا اب کاروانِ شوق
اک عزم کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

دامانِ دل ہے داغِ خودی سے ہوا اے نسیمؔ
تزکیۂ شباب کئے جا رہا ہوں میں

جناب شفیق کوٹی (از سانبھر لیک)

جلووں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

عشق اُنسے بے حساب کئے جا رہا ہوں میں
رسوائیِ شباب کئے جا رہا ہوں میں

ہے زینتِ نگاہ تصورِ حریمِ دوست
آنکھوں کو باریاب کئے جا رہا ہوں میں

اے آپکا نقاب اُٹھنے کے شوق [illegible]
خود کو ہمہ تن نقاب کئے جا رہا ہوں میں

پھر کام کر رہی ہے کشش جذبِ شوق کی / افسوں کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں
وہ سامنے نہیں مری نظروں کے لئے شفیق / اُنکو گرخطاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب شہید جبلی از بمبئی

جلووں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں / "ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"
چمکا کے دل کے داغ کو شبہائے ہجر میں / ہمرنگ ماہتاب کئے جا رہا ہوں میں
دشواریٔ حیات سے بڑھتا ہے حوصلہ / ہستی کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں
سب کو سنا کے حسن کی رنگیں حکایتیں / اُلفت سے بہرہ یاب کئے جا رہا ہوں میں
مُردہ دلوں میں ڈال کے پھر روحِ زندگی / احسان بے حساب کئے جا رہا ہوں میں
کسبِ ضیائے نور سے اس دل کو لے شہید / ہمرنگِ ماہتاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب انجم احمد آبادی

اک سعیٔ کامیاب کئے جا رہا ہوں میں / جلووں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
جس نے چمک کے ذرّوں کو خورشید کر دیا / اس رُخ کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
سازِ نفس کو چھیڑ کے پھر اُنکی یاد میں / دل وقفِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں
دل تو خرابِ جستجوئے یار ہے مگر / نظروں کو بھی خراب کئے جا رہا ہوں میں
خود چھیڑ چھیڑ کر بتِ نخوت پسند کو / آمادۂ عتاب کئے جا رہا ہوں میں
انجم بہا کے شعلۂ سوزِ نہاں پہ اشک / تجدیدِ التہاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب بسمل بھنڈاردی

نظروں کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں / جلووں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
دل کے مکیں کو چھوڑ کے ہے جستجوئے غیر / کتنا بڑا عذاب کئے جا رہا ہوں میں
اتنا ہی ہو رہے ہیں وہ مجھ سے قریب تر / جتنا بھی اجتناب کئے جا رہا ہوں میں
رحمت سمجھ کے اپنے لئے جرمِ عشق کا / دانستہ ارتکاب کئے جا رہا ہوں میں
کس کو تمیزِ دیر و حرم فرطِ شوق میں / سجدے یونہی خراب کئے جا رہا ہوں میں
مر کے بھی انکی راہ میں مرتا نہیں ہوں میں / بسمل یہ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب فہمی جبلپوری

"ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں" / پیدا اک انقلاب کئے جا رہا ہوں میں
یہ جانتا ہوں زیست بڑی چیز ہے مگر / افسوس نذرِ خواب کئے جا رہا ہوں میں
پوشیدہ وہ نگاہوں سے رہتے ہیں جس قدر / اتنا ہی بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
غم سے الم سے رنج سے ارمان و یاس سے / ہستی کو [illegible] کئے جا رہا ہوں میں

تاریکیٔ فراق کی پروا نہیں مجھے / داغوں کو ماہتاب کئے جا رہا ہوں میں
آنکھوں میں اور خیالیں دلیں نگاہ میں / جلووں کو باریاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب صغیر اثر اکبر آبادی از الہ آباد

کچھ ذکرِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں / کچھ فکرِ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں
طے ظاہری حجاب کئے جا رہا ہوں میں / جلووں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
لے لے کے تیرا نام پلٹ دیں حکومتیں / دنیا میں انقلاب کئے جا رہا ہوں میں
اب عام کر کے داغِ محبت کی تابشیں / ذرّوں کو ماہتاب کئے جا رہا ہوں میں
گن گن کے لے رہا ہوں جو ہر سانس نزع میں / بیباق سب حساب کئے جا رہا ہوں میں
لے لیکے اسکا نام بصد عجز اے اثر / جذبوں کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب اسحاق ہلال از کوکشی ریاست دھار

جلووں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں / ذوقِ نظر خراب کئے جا رہا ہوں میں
ہو کر مکینِ سایۂ دامانِ نیستی / ہستی کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
دیکر فروغ حسن کی نظروں کو عشق سے / اک کارِ لاجواب کئے جا رہا ہوں میں
رودادِ سوزِ عشق سنا کر نگاہ سے / پتھر کو آب آب کئے جا رہا ہوں میں
وہ میرے بعد میرے لئے ہونگے بیقرار / ایسا اک انقلاب کئے جا رہا ہوں میں
شامِ فراق اُن کے تصور سے اے ہلال / تسکینِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

جناب شمیم نعمانی بیاوری

ہو کوئی گر حریفِ محبت تو دیکھ لے / جلووں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
حسرت گزارِ شوق ہوں مایوسیاں نہ پوچھ / منزل کو بھی سراب کئے جا رہا ہوں میں
بے ضبطِ غم تلافیٔ مافات کر چلا! / جاں نذرِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں
یہ التفاتِ حسنِ تغافل شعار کا ! / ہر شے سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں
گلشن فروز خونِ تمنا سے ہی شمیم / تعمیرِ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب ادب از ریواڑی

دل وقفِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں / عشق اپنا کامیاب کئے جا رہا ہوں میں
افشائے رازِ عشق کا اتنا خیال ہے / اب اُنسے خود حجاب کئے جا رہا ہوں میں
افسوس پھر بھی راہ مفر ناگزیر ہے / دنیا سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں
دل میں اُٹھا کے شورشیں امید و یاس کی / تجدیدِ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں
[illegible] محبت [illegible] / [illegible] کئے جا رہا ہوں میں

جناب فیروز سرکار از سورت

اُلفت میں دل خراب کئے جا رہا ہوں میں
کیا خوب انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

ملکر بھی اُن سے آج رہونگا میں ہم نشیں!
یوں چاک ہر حجاب کئے جا رہا ہوں میں

ابتک تو اُن کے عشق میں حاصل نہ کچھ ہوا
برباد کیوں شباب کئے جا رہا ہوں میں

رحمت خدا کی ہر گنہ گار رو قف ہے
پھر کیوں غمِ عذاب کئے جا رہا ہوں میں

فیروز روز و شب ہے فقط بیخودی سے کام
کیا کام لاجواب کئے جا رہا ہوں میں

جناب تنویر از کولار

داغوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں
پیدا اک انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

یہ بیخودی بھی صورت تسکیں ہے شوق میں
درمانِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

پھر کچھ شکستہ تنکے نشیمن کیواسطے
لے برق انتخاب کئے جا رہا ہوں میں

سوزاں تھا جس سے طور بھی وہ آتشِ جمال
ذرّوں میں بے حجاب کئے جا رہا ہوں میں

تنویر غم نصیب ہوں جوں بلبلِ قفس
نذرِ فغاں شباب کئے جا رہا ہوں میں

جناب منیر نقشبندی کولاری از ملباگل

جذبوں کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں
یوں دل میں انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

تھک کر نہ بیٹھ جائے کہیں راہِ شوق میں
دل کو پُر اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

اپنے وجود کا بھی مجھے احساس تک نہ تھا
دُور اب سب حجاب کئے جا رہا ہوں میں

دل کو جو بن گیا ہے سراپائے بیخودی
ہمرنگ آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

خود آپ کے ہیں سایۂ خورشید اے منیر
خود آپ سے حجاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب پریم چند پریم دھلوی

جلووں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
آنکھوں کو فیضیاب کئے جا رہا ہوں میں

نقصِ گناہ خود ہی ہوا۔ اُنکا کیا قصور
خود زندگی عذاب کئے جا رہا ہوں میں

محفل میں اُنکو اپنی دکھا کر نگاہِ شوق
آمادۂ حجاب کئے جا رہا ہوں میں

افکارِ غم فزا ہیں مری روح کے لئے
پیدا نئے عذاب کئے جا رہا ہوں میں

ہر رنگ میں دکھاتا ہوں میں رنگ پریم کا
پیدا نیا انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب سنتوکھ سنگھ کامل از جہلم

مل جائیگا کہیں تو مجھے ساحلِ مراد
کشتی کو نذرِ آب کئے جا رہا ہوں میں

سرزد ہوا تھا جرم جو منصور سے کبھی
پھر اُس کا ارتکاب کئے جا رہا ہوں میں

[illegible]

اپنا بہا کے خون وطن کی زمین پر
"ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"

اب اُنکی راہ و رسم ہے کامل براہِ راست
دنیا سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں

جناب سید ضمیر حسن اعجاز بجنوری

وحشت کا ارتکاب کئے جا رہا ہوں میں
دنیائے دل خراب کئے جا رہا ہوں میں

صورت گرِ تپِ عشق کے قربان جائیے
جلووں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

داغ جگر کو دیکے تجلّی جمال کی
صد رشکِ آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

آمیز کرکے خونِ تمنا کی سُرخیاں
اشکوں کو لاجواب کئے جا رہا ہوں میں

جناب کوکب از قصبہ کوٹ

دل خوگرِ عذاب کئے جا رہا ہوں میں
درمانِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

کچھ اسطرح مٹا ہوں کہ دنیائے عشق میں
برپا اک انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

دلکو اسیرِ گیسوئے جانانہ کرکے آج
تکمیلِ پیچ و تاب کئے جا رہا ہوں میں

کوکب وہ رشکِ مہر ہوا جب سے ضوفگن
"ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"

جناب نشتر جبلپوری از احمد آباد

یاد اُسکی بے حساب کئے جا رہا ہوں میں
اُلفت کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

اے برق اب چمن پہ تو للہ رحم کر
خود آشیاں خراب کئے جا رہا ہوں میں

رعبِ جمالِ یار سے اُٹھتی نہیں نظر
نظارے کو خراب کئے جا رہا ہوں میں

نشتر دیا ہے عشق نے مجھکو وہ سوز و ساز
ہر سانس کو رباب کئے جا رہا ہوں میں

جناب شو پرشاد برگ از باندہ

دل عشق میں خراب کئے جا رہا ہوں میں
یوں زندگی عذاب کئے جا رہا ہوں میں

ہستی پہ بھی اب اپنی نہیں ڈالتا نظر
اپنے سے بھی حجاب کئے جا رہا ہوں میں

خود باریاب ہوکے کسی کی جناب میں
دنیا کو باریاب کئے جا رہا ہوں میں

ناکامیٔ حیات سے اے برگ عشق میں
ہستی کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب سید ظہیر مدنی ایم۔ اے سورت

شغلِ شرابِ ناب کئے جا رہا ہوں میں
حسنِ خودی خراب کئے جا رہا ہوں میں

منت کشِ میری وہ بھی ہیں خوش اور غیر بھی
کیا کارِ لاجواب کئے جا رہا ہوں میں

وہ آئے بھی تو کب مری بالیں پہ بے نقاب
جب اُنسے خود حجاب کئے جا رہا ہوں میں

بس کر ظہیر قصۂ اُلفت کیا تمام
بس ہند اب یہ باب کئے جا رہا ہوں میں

جناب احقر کامٹھوی از بھنڈارہ

ہر شی سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں ‏ ‏ یہ کس کا انتخاب کئے جا رہا ہوں میں

کوسوں پڑا ہوں دور تری جلوہ گاہ سے ‏ ‏ خود کو ابھی خراب کئے جا رہا ہوں میں

یہ بھی ترا کرم ہے تری بارگاہ میں ‏ ‏ سجدوں کو باریاب کئے جا رہا ہوں میں

احقر ہی جب ہے اک بت کافر نگاہ میں ‏ ‏ اپنے سے خود حجاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب برق کلیمی جلال پوری

انکو جو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں ‏ ‏ روشن اک آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

چلمن پڑی ہے ہستی بے اعتبار کی ‏ ‏ تجھ سے بھی اب حجاب کئے جا رہا ہوں میں

دلکا وہ جام جسمیں جھلک لامکاں کی ہے ‏ ‏ دیکھ تجھے خراب کئے جا رہا ہوں میں

ہر شے میں پا رہا ہوں کسی کا ظہور برق ‏ ‏ موسیٰ کو لاجواب کئے جا رہا ہوں میں

جناب نشتر برہانپوری

دیکر فروغ حرص شہنشاہیت کو آج ‏ ‏ تائید انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

ہاتھوں کو اپنی بخش کے جرأت گناہ کی ‏ ‏ رحمت کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

پرتو جمال یار کا لے کر جہان میں ‏ ‏ "ذروں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"

نشتر تصورات سے محفل میں دوست کی ‏ ‏ پھر خود کو باریاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب قہر احمد آبادی

دل مائل شباب کئے جا رہا ہوں میں ‏ ‏ تکمیل اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

ہوکر اسیر نفس جہان خراب میں ‏ ‏ بربادیٔ شباب کئے جا رہا ہوں میں

لیکر امید و یاس کو ہمراہ عشق میں ‏ ‏ طے منزل شباب کئے جا رہا ہوں میں

کسکی نگاہ قہر کا یہ معجزہ ہے قہر ‏ ‏ "ذروں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"

جناب موجی رام موج دیوبندی

ذرہ کو ماہتاب کئے جا رہا ہوں میں ‏ ‏ پیدا ترا جواب کئے جا رہا ہوں میں

ہر منزل حیات مری صرف آہ ہے ‏ ‏ ہستی کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

افسانۂ حیات گذشتہ کو چھیڑ کر ‏ ‏ بیدار انکو خواب کئے جا رہا ہوں میں

فرما گئے کہ بحر محبت میں موج کو ‏ ‏ اشکوں سے فیضیاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب جمیل احمد آبادی

آج انکو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں ‏ ‏ سامان اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

یہ میری بیخودی یہ مرا ذوق بندگی ‏ ‏ سجدے بلا حساب کئے جا رہا ہوں میں

شورش ہو دور عالم خواب سکوں میں آج ‏ ‏ ہستی کو باریاب کئے جا رہا ہوں میں

نظریں جمال دوست سے پھر آشنا ہوئیں ‏ ‏ پھر سعیٔ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

جناب بصیر از ملبا گل

عصیاں سے ارتکاب کئے جا رہا ہوں میں ‏ ‏ اندازۂ عذاب کئے جا رہا ہوں میں

مجھ سے نگاہ ہوشربا! دیکھ ہوشیار ‏ ‏ دنیا میں انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

اب حدت وجود کا ہوتا ہے انکشاف ‏ ‏ "ذروں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"

دن ہو کہ رات اس کے تصور سے ای بصیر ‏ ‏ عصیاں کا سدباب کئے جا رہا ہوں میں

جناب محسن ساگری

تم کو ہی انتخاب کئے جا رہا ہوں میں ‏ ‏ یہ بات لاجواب کئے جا رہا ہوں میں

اللہ رے تصور تصویر روئے یار ‏ ‏ "ذروں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"

راز درون پردہ کے اظہار کے لئے ‏ ‏ دنیا میں انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

پروا نہیں کسی کو مرے اضطراب کی ‏ ‏ اظہار اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

جناب عاجز از پلول

تار نفس ہے نغمہ سرا ساز عشق پر ‏ ‏ منظوم اک کتاب کئے جا رہا ہوں میں

داغ جگر ہیں باغ تمنا میں گل فروز ‏ ‏ "ذروں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"

امیدوار سایۂ دامان فیض ہوں ‏ ‏ تقصیر بے حساب کئے جا رہا ہوں میں

عاجز شباب کا وہ زمانہ گذر گیا ‏ ‏ اب کیوں خیال خواب کئے جا رہا ہوں میں

جناب شاغل از جہلم

پھر قلب بیقرار کو دے کر تسلیاں ‏ ‏ تکمیل اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

یہ صرف اسکی شان کریمی کو ہے خبر ‏ ‏ کیوں جرم بے حساب کئے جا رہا ہوں میں

دے دے کے عکس صورت عالم فروز کا ‏ ‏ "ذروں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"

شاغل وہ میر قافلہ منزل شناس ہے ‏ ‏ دل جسکے ہمرکاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب زکی اورنگ آبادی (گیا)

ذروں کو دے رہا ہوں میں پیغام حریت ‏ ‏ خاموش انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

یہ ہے مرے مذاق تجسس کا اک ثبوت ‏ ‏ فطرت کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

ہوگی پھر آشکار جھلک حسن کی زکی ‏ ‏ پھر انکو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب مظہر از بھنڈ

مردہ دلوں میں پھونکنی ہے روح زندگی ‏ ‏ دنیا میں انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

تعبیر نکلے آتے ہیں جو روز میرے پاس
اُنکو شریکِ خواب کئے جا رہا ہوں میں

اُن کے حجاب نے کیا مایوس اس قدر
دنیا ہی سے حجاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب حبیب شاہجہانپوری از کوئٹہ

پوشیدہ ہے جو دل میں اُسی جذبِ عشق سے
ہر آہ کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

اہلِ وطن شراب سے برباد ہو گئے
اس غم میں دل کباب کئے جا رہا ہوں میں

جب سے سمجھ میں آگیا راز بقا حبیب
دنیائے دل خراب کئے جا رہا ہوں میں

جناب اثر ذائقی بنگلوری

پیدا اک انقلاب کئے جا رہا ہوں میں
ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

اک بار شوخ و شنگ کی دل کو دلا کے یاد
سرگرمِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

پیشِ نظر ہے مرحلۂ آخرت اثر
نیکی دمِ شباب کئے جا رہا ہوں میں

جناب وارث صدیقی شہادہ

آنکھوں کو محوِ خواب کئے جا رہا ہوں میں
تسکینِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

ہے کس قدر بلند مرا مطمحِ نظر
ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

وارث دہ صحیفۂ قرآن شاعری
جو منتخب انتخاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب ضیا بھنڈاروی

ناموں کو بار یاب کئے جا رہا ہوں میں
اک طرفہ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

پھر لب پہ آرہے ہیں جوانی کے زمزمے
پھر آج ذکرِ خواب کئے جا رہا ہوں میں

کیا جانے کس کے ہجر میں دل کو ضیا یہ آج
مجبورِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

جناب مظلوم کولاری

سنتا نہیں ہے کوئی محبت کی داستاں
ہر ایک سے خطاب کئے جا رہا ہوں میں

اپنی شکستہ رنگ کے پرتو سے مضمحل
دنیا کی آب و تاب کئے جا رہا ہوں میں

مظلوم اپنے زورِ تخیل سے دہر میں
پیدا اک انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب ارمان احمد آبادی

اے یادِ دوست میں بھی ناکامِ آرزو
تجھکو تو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

جلوؤں کے اژدحام میں گم ہو چلی نگاہ
ذوقِ نظر خراب کئے جا رہا ہوں میں

ارماں حریمِ حسن کے پردے اٹھا کے آج
نظروں کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب زار کاندھلوی

ہے عہدِ جان کا اللہ رے جنوں
دل ہی سے پھر خطاب کئے جا رہا ہوں میں

منزل کہاں ہو دیکھئے خانہ بدوش کی
دنیائے دل خراب کئے جا رہا ہوں میں

جناب غافل از بیتول

مر مر کے جی رہا ہوں کسی کے فراق میں
کیا کیا نہ انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

شعر و سخن سے اسکے سوا مدعا نہیں
ہستی کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب منظر کامٹوی

رنگینیٔ نگاہ کے قربان جائیے
جلوؤں کو کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

ہر عارضی نشاط ہر اک منظرِ بہار
کیوں ماتمِ شباب کئے جا رہا ہوں میں

جناب تبسم بھنڈاروی

ہر چند ہے تلاشِ سکوں کی مگر کہاں؟
دل وقفِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

دل ہو رہا ہے پرتوِ عارض سے فیضیاب
ذرّے کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب ناداں از بڑدانی۔ سی۔ آئی

اللہ رے معصیت کی مری شانِ ارتقاء
رحمت کو بے حجاب کئے جا رہا ہوں میں

اُنکی نگاہِ ناز کی کوئی خطا نہیں
خود اپنا دل خراب کئے جا رہا ہوں میں

جناب سریر بنگلوری

پھر کھینچ رہا ہے دل مرا کیوں اسطرف سریر
جس شے سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں

جناب مذاق ڈبھوئی

جلوے لٹا رہا ہوں فلک سے زمین پر
"ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں"

جناب شوق احمد آبادی

اے چشمِ شوق دیکھ جھپکنا نہ وقتِ دید
جلوؤں کو بے حجاب کئے جا رہا ہوں میں

جناب قیس ہلوری

اے قیس مہرِ لطف و عطائے کریم سے
جلوؤں کا اکتساب کئے جا رہا ہوں میں

باب فلم:-

"پُنر ملن" پر ایک طائرانہ نظر

مشہور فلم ایکٹرس دیوکا رانی نے بمبئی ٹاکیز سے اپنا پہلا فلم "پُنر ملن" ریلیز کیا ہے۔ اس وقت تک دیوکا رانی ہماری نگاہ میں ہندوستان کی بہترین فلم ایکٹرس کی حیثیت سے روشناس تھی۔ لیکن اپنے شوہر کی وفات کے بعد دیوکا رانی دنیائے فلم سے بہ حیثیت ایکٹرس علیحدہ ہو گئی اور اب ایک "پروڈیوسر" کی حیثیت سے دنیائے فلم میں نمودار ہوئی ہے۔

یوں تو بمبئی ٹاکیز کے ارباب حل و عقد میں فطری طور پر دیوکا رانی کو نمایاں درجہ حاصل ہے اور بمبئی ٹاکیز کے ہر فلم میں دیوکا رانی کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہوتا ہے۔ لیکن "پُنر ملن" کو خاص اپنی ذات سے منسوب کر کے دیوکا رانی نے اپنے مداحوں کو دعوت دی ہے کہ وہ اب دیوکا رانی کو ایک نئے پیرہن میں دیکھیں اور اندازہ کریں کہ ایک پروڈیوسر کی حیثیت سے دیوکا رانی دنیائے فلم میں کیا درجہ رکھتی ہے؟

"پُنر ملن" میں اپنا نام پروڈیوسر کی حیثیت سے پیش کرنے میں دیوکا رانی کا یقیناً یہی منشا ہو سکتا ہے۔ آئیے "پُنر ملن" پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ دیوکا رانی اپنے مشن میں کامیاب ہے یا ناکامیاب؟

ہمیں دیوکا رانی کے آرٹ کا اعتراف ہے اور بحیثیت ایکٹرس دیوکا رانی نے ہندوستانی فلموں کو کافی ترقی دی ہے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ پروڈیوسر کی حیثیت سے دیوکا رانی بہت حد تک ناکامیاب ثابت ہوئی ہے اور "پُنر ملن" ہمارے اس بیان کا روشن ثبوت ہے۔

"پُنر ملن" میں ہمیں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جسے دیوکا رانی کی خصوصیات سے منسوب کیا جا سکے۔ ایکٹرس سے پروڈیوسر بن جانا یقیناً ایک انسان کی زندگی کے لئے بہت بڑا انقلاب ہو سکتا ہے لیکن پروڈیوسر کی حیثیت میں رہ کر اپنی پہلی شہرت سے فائدہ اٹھانا اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ اس دوسری پوزیشن میں آرٹسٹ کسی نمایاں خصوصیت کا حامل نہیں ہے۔

ہمیں یقین تھا کہ جس فلم میں دیوکا رانی کا نام ہوگا وہ فلم اس کے اپنے فلموں کے مقابلہ میں افضل درجہ رکھتا ہوگا۔ اس لئے کہ دیوکا رانی کو اپنے تیار کردہ فلم میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کا کافی موقع ملے گا۔ بہ حیثیت ایکٹرس اس کی شخصیت ڈائرکٹر کی شخصیت کی ماتحت تھی۔ اور ممکن ہے کہ دیوکا رانی کو بعض اوقات ڈائرکٹر سے اختلاف بھی ہوا ہو لیکن موجودہ صورت میں اس قسم کی کوئی دشواری حائل راہ نہ تھی۔ "پُنر ملن" کو تو ہر نوعیت سے بلند ہونا چاہیے تھا مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔

"پُنر ملن" کی کہانی میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ کسی اعتبار سے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ "پُنر ملن" کی کہانی عام فلموں سے نمایاں یا افضل ہے۔ "پُنر ملن" کی بنیاد جرم پر رکھی گئی ہے۔ ایک شخص اپنے نوجوان لڑکے کی سالگرہ کی خوشی میں ایک جشن رقص و سرود منعقد کرتا ہے اور شراب نوشی کے دوران میں اپنے ایک دوست کو جان سے مار ڈالتا ہے۔ نوجوان اپنے والد کے جرم کو چھپانے کے لئے خود فرار ہو جاتا ہے تاکہ سب لوگوں کو اس پر شبہ ہو۔ قاتل کا دماغ صدمے اور شراب کے اثر سے ماؤف ہو جاتا ہے۔ اور اس کی زبان بھی بند ہو جاتی ہے۔ ایک طرف تو افسانہ نگار یہ دکھانا چاہتا ہے کہ پولیس نے مفروضہ قاتل کو کس طرح گرفتار کیا۔ دوسرا اصلی قاتل کے دماغ اور زبان کے معطل ہو جانے سے ایک طبی مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دونوں چیزیں یقینی طور پر کسی فلم یا ڈرامے کے لئے بہترین بنیاد ثابت ہو سکتی ہیں لیکن "پُنر ملن" میں اس قدر رعایت برتی گئی ہے کہ افسانہ کسی ندرت کا حامل نہیں رہتا۔

مفروضہ قاتل افسانہ میں بالکل سامنے اور قریب قریب رہتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ پولیس اسکو گرفتار نہیں کر سکتی۔ اسی سلسلے میں بعض مقامات پر جزوی لغزشیں اور بھی پائی جاتی ہیں۔ الغرض کسی پہلو سے "پُنر ملن" کو کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔ "آندھی" فلم میں بھی ایک طبی مسئلے کو سامنے رکھا گیا تھا۔ لیکن نیو تھیٹرز کا وہ فلم بھی کامیاب نہ ہو سکا اب "پُنر ملن" میں بھی یہی موضوع ہے اور ہمیں افسوس ہے کہ ہم کسی طرح اسے کامیاب نہیں کہہ سکتے۔ سنیہ پربھا نے ہیروئن کا پارٹ کیا ہے۔ اور اس کے رقص کافی دلآویز ہیں۔ اسٹریٹ سنگر میں کانن بالا نے جو روش قائم کر دی ہے اب ہر ایکٹرس اُسی روش پر چلنا چاہتی ہے۔ اسے جدت نہیں کہتے تقلید کہتے ہیں۔ "پُنر ملن" از اول تا آخر تقلید ہی تقلید کا حامل نظر آتا ہے جدت نام کو بھی نہیں پائی جاتی۔ (ص ض)

آئندہ اشاعت میں "خزانچی" پر ایک بصیرت افروز تبصرہ ملاحظہ فرمائیے

مذاکرِ علمیہ

محمد عبداللہ صاحب مضطرؔ گجراتی "امیرِ کارواں" کے نام سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ یہ کتاب شاعرِ مشرق مولانا سیماب اکبرآبادی سے متعلق ہوگی۔ اس ذیل میں وہ مولانا سیماب کے تلامذہ۔ احباب اور معاصر شعراء سے مندرجۂ ذیل امور کے متعلق مواد بہم پہونچانے کے متمنی ہیں۔

(۱) مولانا سیماب کے ادبی لطائف (۲) اصلاح کے قابلِ قدر نمونے (۳) مشاعروں کی شرکت کے دلچسپ حالات۔ معاصرین سے بذلہ سنجیاں (۴) مولانا سیماب کے خطوط جن کے ادبی حصے شریکِ کتاب کئے جا سکیں۔

پتہ:۔ محمد عبداللہ مضطرؔ گجراتی کلرک ورک شاپ۔ اکاؤنٹ آفس این۔ ڈبلیو ریلوے مغل پورہ لاہور

جناب صغیرؔ ابن نذیرؔ جلال آبادی حضرت مولانا احسنؔ مارہروی مرحوم مغفور کے خطوط جمع کر رہے ہیں اس کے بعد انھیں کتابی صورت میں شائع کریں گے۔ جن حضرات کے پاس مولانا احسنؔ مرحوم کے خطوط ہوں وہ صغیرؔ صاحب کو مندرجۂ ذیل پتہ پر روانہ کر دیں جس کے لئے وہ بے حد ممنون ہونگے۔ اصلی خطوط بعدِ نقل واپس کر دئے جائینگے اگر کوئی صاحب کسی وجہ کو اصل خطوط بھیجنا پسند نہ کریں تو نقل کر کے بھیجدیں۔

پتہ:۔ بر مکان داروغہ ولی محمد۔ کانجی ہاؤس۔ میرٹھ روڈ۔ مظفر نگر

---

۵ و ۶ اپریل ۱۹۴۱ء کو شاہجہانپور میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد کیا جا رہا ہے۔ سنا ہے کہ یہ مشاعرہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت شاندار عظیم ہوگا اراکین نے مشاعرہ کو نشر کرنے کا بھی انتظام کیا ہے۔ چنانچہ ۵ اپریل کی شب کو یہ مشاعرہ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے ریلے ہوگا۔ اہلِ ذوق حضرات کو یہ مشاعرہ ضرور سننا چاہیئے۔

---

۱۹ و ۲۰ اپریل ۱۹۴۱ء کو کانپور میں ایک آل انڈیا مشاعرہ بڑے اہتمام کے ساتھ منعقد ہو رہا ہے۔ اراکین مشاعرہ کے نام ہی اس مشاعرہ کی کامیابی کے ضامن معلوم ہوتے ہیں۔ دعوت نامہ کے ساتھ ساتھ شعراء کے ناموں کی ایک طویل فہرست بھی دی گئی ہے۔ اگر اراکین بیک وقت ان تمام شعرا کو جمع کرنے میں کامیاب ہوگئے اور مشاعرہ میں کسی قسم کی بدنظمی نہ ہوئی (جو ہر آل انڈیا مشاعرہ کا جزوِ ضروری بن کر رہ گئی ہے) تو یہ مشاعرہ اپنی نظیر آپ ہوگا۔

---

۲۶ اپریل کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے ایک مناظمہ براڈکاسٹ ہو رہا ہے جس میں صرف نظمیں پڑھی جائیں گی۔ یہ مناظمہ پونے دس بجے شب سے نشر کیا جائیگا۔ اور غالباً ۱۱ بجے تک ہوگا۔ خدا کرے اس میں آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی کی سی نظمیں نہ پڑھی جائیں اور جدید اردو شاعری کے نام کو بدنام نہ کیا جائے۔ ہم اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے درخواست کریں گے کہ وہ اس مناظمہ میں بھرتی کے شعرا کو جگہ نہ دیں جیسا کہ انھوں نے اپنے گذشتہ مشاعرہ میں کیا تھا۔

کلیمِ عجم مجموعۂ غزلیات مولانا سیماب اکبرآبادی کی اشاعت کے بعد سے آجتک اُسے شروع سے آخر تک پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ ایک خاص سلسلے میں اُس کی غزلوں کو از اوّل تا آخر پڑھا گیا تو معلوم ہوا کہ اُس میں چند کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں، جن حضرات کے پاس "کلیمِ عجم" موجود ہے وہ تصحیح فرمالیں۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۸۵	۳	نیاز	مذاق
۱۹۴	۹	پشیماں	پریشاں
۲۰۲	۲	ہوکے	ہوکر
۲۵۱	۱	کسی کی	کسی کے
۲۶۲	۱۷	آدابِ محفل	آدابِ محمل
۲۷۷	۴	بے نقابی	بے حجابی
″	″	جلوۂ مستور	ناظرِ مستور
۲۸۳		غزل کے آخر میں یہ شعر بڑھا لیا جائے۔	

جسے دیوانگی کہتے ہیں اُلفت کی نبوت ہے
غنیمت ہے جو صدیوں میں کوئی دیوانہ ہو جائے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۳۸	۱۵	ذہن وایماں	دین وایماں
۳۴۲	۴	تمہارے کوچے میں۔ الخ	یہ شعر کاٹ دیجئے
۳۸۶	۹	اُس کے	اُس کی

انتخابِ مشاعرۂ "حلقۂ خیال" کولار (میسور)

زیرِ صدارت:- عالیجناب فخرِ کولار مرزا قلندر بیگ صاحب غالبؔ کولاری

بزدولت اکرۂ عالی جناب فضیلت مآب جی غوث صاحب مالکِ کارخانۂ سورن بیڑی کولار

مصرعِ طرح:- مشہور ہے جہاں میں شجاعت حسینؑ کی

تاریخ ۱۵ فروری سنہ ۴۲ء — **نوٹ** — شب کے ٹھیک ۹ بجے

اِس مشاعرہ کی تمام نظمیں امین الملک نواب سر مرزا محمد اسمٰعیل صاحب دام اقبالہٗ وزیرِ اعظم ریاست میسور کے نام نامی سے اُنکی علم دوستی اور ادب نوازی کی بنا پر انتساب کی جا رہی ہیں۔ امید کہ یہ ارمغانِ عقیدت اُنکی ذاتِ گرامی سے شرفِ قبولیت حاصل کرے گا۔ سکریٹری

جنابِ سیّد عبد الغنی تنویرؔ بنگلوری

تابندہ آفتاب تھی قسمت حسینؑ کی — پھیلی ہوئی جہاں میں ہے طلعت حسینؑ کی
سیرت گرِ زمانہ ہے سیرت حسینؑ کی — قوموں کا ہے عروج شریعت حسینؑ کی
جو سرفروش ہے وہی زندہ ہے دہر میں — کیا زندگی نہیں ہے شہادت حسینؑ کی
ایثار کا سبق ہمیں دیتی ہے رات دن — اِک درسِ لا فنا ہے شہادت حسینؑ کی
دینِ نبی کیواسطے دُنیا اُجاڑ دی — کس درجہ تھی بلند طبیعت حسینؑ کی
سر دیکے دینِ حق کی حفاظت کری تمام — واللہ دیدنی تھی دیانت حسینؑ کی
گلزارِ مصطفٰےؐ کا گلِ صد مراد تھا — تھی عالم آشکار حقیقت حسینؑ کی
دولت جھانکی کر نہ سکی اُنکے دل میں گھر — خوددار و خودشناس تھی فطرت حسینؑ کی

سمجھا ہے کوئی اور نہ سمجھے گا اُس کی ذات
تنویرؔ کیا بتاؤں حقیقت حسینؑ کی

جنابِ خلیلؔ کولاری (ناظم حلقۂ خیال کولار)

جس دم ہوئی زمیں پہ شہادت حسینؑ کی — ہفت آسماں سے بڑھ گئی قیمت حسینؑ کی
کیا مرتبہ ملا ہے کیا ہے فضیلت حسینؑ کی — کہتے ہیں آج غیر بھی عزت حسینؑ کی
وہ سرفراز دونوں جہاں میں ہے واقعی — جسپر ہوئی ہے چشمِ عنایت حسینؑ کی
ہوتا نہ کوئی واقفِ اسرارِ حرّیت — ہوتی نہ گر جہاں میں شہادت حسینؑ کی
روتی ہے یاد کرکے زمینِ عرب اُسے — وہ پیاری پیاری صورت و سیرت حسینؑ کی
کیونکر نہ اُن کی یاد ہو مجھکو عزیز تر — اللہ سے ملاتی ہے اُلفت حسینؑ کی
مر کر بھی میرے دل سے نہ نکلیگی اے فلک — سینے میں دفن ہے جو محبت حسینؑ کی
دنیا میں سرفرازیٔ اسلام کے لئے — تھی کربلا کے بن میں مصیبت حسینؑ کی
اُمت پہ نانا جان کی آئے نہ کوئی حرف — حقا یہی تھی ایک وصیت حسینؑ کی
یارب ہیں جتنے تیرے پرستار سب کے پاس — دل ہو علیؑ کا اور طبیعت حسینؑ کی

ملتی ہے اُسکو دولتِ کونین اے خلیلؔ
رہتی ہے جس کے دل میں محبت حسینؑ کی

جنابِ ڈاکٹر بصیرؔ کولاری

ظاہر ہے سب پہ شوکت و حشمت حسینؑ کی — بالا ہے عرش و فرش سے عظمت حسینؑ کی
ہمسر ہوا نہ اُن کا خدائی میں کوئی بھی — اپنی مثال آپ تھی طاقت حسینؑ کی
شہ زور پہلواں بھی لرزتے تھے خوف سے — یہ دبدبہ تھا۔ یہ تھی شجاعت حسینؑ کی
دل کانپتا ہے آج بھی اُنکے خیال سے — جو جنگِ کربلا میں تھی حالت حسینؑ کی
دو سر دئے، نہ راہِ خدا سے وہ ہٹ سکے — اِک درسِ حریت ہے شہادت حسینؑ کی

حق کی رضا کا اُنکو ملا حق سے یہ صلہ — سارے جہاں میں ہوگئی شہرت حسینؑ کی
کیا تھی کسیکی تاب جو آتا وہ سامنے — منظور تھی خدا کو شہادت حسینؑ کی
ہے واقعی یہ سارے گناہوں کا سدِّ باب — فردوس کی کلید ہے مدحت حسینؑ کی
کیونکر نہ ہو بقیر شفاعت کا مستحق — پوشیدہ اسکے دل میں ہے اُلفت حسینؑ کی

جناب روشن خان جمیل ملباگلی

عظمت ہے اپنی عزت و عظمت حسینؑ کی — کیونکر نہ راس آئے محبت حسینؑ کی
دنیا کو اُن کے ظرف نے دیں سربلندیاں — ہے رازِ کائنات شہادت حسینؑ کی
امت پہ اپنے نانا کی قربان ہوگئے — سر دیدیا یہی تھی سخاوت حسینؑ کی
رن اک طرف تو چرخ کہن دوسری طرف — سب دیکھکر رہے دنگ شجاعت حسینؑ کی
راہ خدا میں سر کو دیا اور ہوا بلند — کس کو نصیب ہوگی یہ حرمت حسینؑ کی
اے چرخِ پیر تو تو حریفِ زمانہ تھا — کیوں تو نے کی پسند شہادت حسینؑ کی
بنتی نہ لالہ زار کبھی کربلا کی خاک — مانی نہ اشقیا نے نصیحت حسینؑ کی
راہ خدا میں سب کے چھوٹے بڑے شہید — دشتِ بلا میں لٹ گئی دولت حسینؑ کی
بے شبہ اُنکی یاد بُرے وقت میں تو کر — تجھ پہ جمیل ہوگی عنایت حسینؑ کی

جناب رونق خوندمیری چن پٹنی

کرتے تھے قدر ختمِ رسالت حسینؑ کی — بھائی تھی اسقدر انہیں عادت حسینؑ کی
ہر وقت اُنکی یاد میں رہتا ہوں مست میں — دی ہے خدا نے وہ مجھے اُلفت حسینؑ کی
آہ و بکا میں دونوں جہاں ہر بسر تھے غرق — دنیا سے جس گھڑی ہوئی رخصت حسینؑ کی
ہر شام خون روتا ہے صرف اسوجہ سے یہ — دیکھی ہے آسماں نے مصیبت حسینؑ کی
امت کی وہ کریں گے سفارش رسولؐ سے — ہے باعثِ نجات شہادت حسینؑ کی
مقبولِ کبریا نہ ہو کیوں کر مری دعا — کرتا ہوں میں زباں سے مدحت حسینؑ کی
رونق غمِ حسین علیہ السلام کر — ہے مقصدِ حیات محبت حسینؑ کی

جناب روشن حیدر آبادی مقیم حال کولار

کرتا رہوں گا دل سے زیارت حسینؑ کی — جبتک رہیگی دہر میں تربت حسینؑ کی
روتا ہوں خون گوشۂ خلوت میں بیٹھکر — جب بھی مجھے ستاتی ہے اُلفت حسینؑ کی
ارض و سما نے پھیر لیا اپنا اپنا منہ — دیکھی گئی نہ شام مصیبت حسینؑ کی
کرتے ہیں انکی قدر خدا اور رسول بھی — جس دل میں پائی جاتی ہے اُلفت حسینؑ کی

ابتک یہ حرام میں شہد کی سرزمیں — روتی ہے یاد کرکے مصیبت حسینؑ کی
روشن نہیں ہے دل میں مرے خواہشِ جہاں — میں جارہا ہوں لیکے محبت حسینؑ کی

جناب عبدالکریم عادل کولاری تلمیذ حضرت غالب کولاری

حُبِّ حبیبِ حق ہے محبت حسینؑ کی — جنت میں لیکے جائیگی الفت حسینؑ کی
بیشک وہ دو جہاں کا امام ہمام ہے — مانی نہیں ہے کس نے امامت حسینؑ کی
تشنہ رہا مگر نہ ہٹا حق کی راہ سے — یہ صبر اور یہ تھی قناعت حسینؑ کی
کرتا رہا مقابلہ تنہا ہزار کا — مشہور ہے جہاں میں شجاعت حسینؑ کی
یارب میں اُن کے روضۂ اقدس کو دیکھ لوں — رکھتی ہے بیقرار محبت حسینؑ کی
کہدو بہائے خامۂ عادل سر اشکِ خوں — لکھنی ہے داستانِ شہادت حسینؑ کی

جناب امیر بیگ مظلوم کولاری

سینے میں میرے دفن ہے دولت حسینؑ کی — پہلو میں دل ہے دل میں ہے اُلفت حسینؑ کی
جاری ہے دو جہاں میں امامت حسینؑ کی — ہر مومنوں کے دل پہ حکومت حسینؑ کی
اہلِ وفا تمہارے لئے باغِ دہر میں — نعمت ہے ایک خاص شہادت حسینؑ کی
ہر ذرہ کہہ رہا ہے زبانِ خموش سے — میدانِ کربلا میں مصیبت حسینؑ کی
ہر وقت ہے انھیں کا تصور بندھا ہوا — اسدرجہ جاں گزیں ہے محبت حسینؑ کی
خنجر چلا دیا سرِ اقدس پہ ہائے ہائے — ظالم نے کی نہ عزت و حرمت حسینؑ کی
یہ میری التجا ہے خدائے قدیر سے — میں خواب ہی میں دیکھ لوں صورت حسینؑ کی
مظلوم مجھکو اب بھی خراباتِ دہر میں — محسوس ہو رہی ہے ضرورت حسینؑ کی

جناب عاجز کولاری

ہو جائے گر نصیب زیارت حسینؑ کی — سمجھوں گا میں اسی کو عنایت حسینؑ کی
وہ لاڈلا نبیؐ کا ہے اور فاطمہؑ کا لال — کیوں ہو نہ سب کے دل میں محبت حسینؑ کی
ہنستا ہوا وہ جائیگا جنت کے باغ میں — رویا جو یاد کرکے شہادت حسینؑ کی
ظلم و ستم سے باز نہیں آئے اشقیا — اُنکی سمجھ میں آئی نہ حرمت حسینؑ کی
کیوں ڈھونڈتے ہو عرش پہ تم اُنکا مرتبہ — دوشِ نبیؐ سے پوچھو تو عظمت حسینؑ کی
اُسوقت آب بھی سوز میں جلتا ہے آفتاب — جسوقت ہو رہی تھی شہادت حسینؑ کی
عاجز نہ مضطرب ہو تجھے لیکے جائیگی — شہدا کی سمت حسرتِ روضہ حسینؑ کی

(اعجاز حسین صدیقی پرنٹر و پبلشر نے رفاہ عام پریس ہینگ کی منڈی آگرہ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ شاعر قصر الادب نائی کی منڈی آگرہ سے شائع کیا)

شمیم۔ باتصویر مکمل مصنفہ فیاض علی بی۔اے (علیگ) زمانۂ حال کی اردو افسانہ نگاری میں معرکۃ الآرا تصنیف فنِ ناول نویسی میں انقلاب پیدا کرنے والا مصلحِ اخلاق، سبق آموز، عبرت خیز اور بے انتہا دلچسپ ناول جس پر ہندوستان کے تمام مشہور اخبارات و رسائل نے بسیط تبصرے کئے ہیں۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ۔ متعدد رنگین و سادہ تصاویر۔ قیمت ہر دو حصہ مکمل مجلد للعہ

کیفستان جناب قیسی رام پوری کو کون نہیں جانتا ہے۔ دنیائے افسانہ میں آپ کا درجہ بہت بلند ہے یہ جمیل و حسین کتاب آپ کے افسانوں کا جدید مجموعہ ہے جس میں آپ نے خوب رنگ آمیزی اور تخیل نگاری کی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

آتش پارے۔ دنیائے افسانہ میں اپنی طرز کے قابلِ مطالعہ افسانے۔ جن کو مصنف کا شاہکار کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ "آتش پارے" جناب سعادت حسن منٹو کے آتشِ جذبات کے آئینہ دار ہیں، ہر افسانہ روحانی معاشرتی اور جذباتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

دنیا کی حور۔ حضرت کوثر چاند پوری کے افسانے ہندوستان کے مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر رہے ہیں یہ افسانہ اُن کے تمام افسانوں سے مشہور و معروف ہے۔ قیمت ۱۰/

شب چراغ۔ مصنفہ جناب محمد صادق ضیا بی۔اے۔ایل۔بی۔ عورتیں کہتی ہیں یہ افسانے ہماری تہذیب تسکین کے لئے لکھے گئے ہیں لیکن مردوں کی زبان میں مرد کہتے ہیں کہ ان افسانوں میں ہماری اخلاقی، مجلسی، ازدواجی زندگی کی تصویر ہے۔ قیمت ۸/

قاتل اور دیگر افسانے۔ یہ ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار حضرت ایم۔اسلم کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ اس مجموعہ میں حضرت ایم۔اسلم کے تازہ ترین افسانے ہیں مسکراہٹ اور آنسو، یاس و امید ناکامی و کامرانی۔ محبت و نفرت آزادی غلامی کے مٹنے والے نقوش آپ کو ملیں گے۔ حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت صرف عہ

بزمِ خیال۔ از جناب مقدر مرزا بیگ۔ اس کتاب میں شعرائے اردو اور فارسی کی مجالس کے لطائف و ظرائف کو جمع کیا گیا ہے۔ برجستہ گوئی اور حاضر جوابی کے بہترین نمونے دکھائے گئے ہیں حجم ۲۰۰ صفحات قیمت ایک روپیہ (عہ)

زادِ راہ۔ منشی پریم چند جہانی کے پایہ کا ادیب اور مصنف کسی ملک میں صدیوں ہی میں پیدا ہوتا ہے، پریم چند کی تصانیف گویا ملک کی ذہنی، سماجی اور اقتصادی حالت کی آئینہ دار ہیں "زادِ راہ" اس فاضل مصنف کا آخری اور بہترین نمونہ ہے۔ قیمت عہ

کمالِ داغ۔ یہ مرزا داغ دہلوی کی غزلیات کا بہترین اور بہت مشہور انتخاب ہے جس کو مولانا حامد حسن قادری لیکچرار سینٹ جانس کالج آگرہ نے نہایت کاوش سے مرتب کیا ہے۔ ایک بسیط فاضلانہ تنقیدی مقالہ بھی داغ کی شاعری پر اس میں موجود ہے۔ قیمت مجلد عہ

حسنِ کار۔ فنونِ لطیفہ پر بہت سیر حاصل کتاب ہے جناب محمد صادق صاحب ضیا بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی کی یہ عجیب و غریب تصنیف ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے مع تصویر مصنف ۶/

ایوانِ تصور۔ بلبلِ ہند شریمتی سروجنی نائیڈو کے دلکش رنگین گیتوں کا آزاد ترجمہ ہے جسے مسٹر ظفر قریشی بی۔اے نے نہایت کاوش و قابلیت کے ساتھ تالیف کیا ہے یہ مشرقی تمدن کی خوبصورت تصویر رفعتِ خیال اور رنگیں بیانی کا عدیم المثال مرقع ہے قیمت عہ

داستانِ عجم۔ مصنفہ ادیبِ شہیر نواب نصیر حسین خاں خیال مرحوم "داستانِ عجم" وہ دُرِ نایاب ہے جس پر سینکڑوں کی تعداد میں ریویو ہو چکے ہیں شاہنامۂ فردوسی پر اُردو میں آج تک اس سے بہتر تبصرہ شائع نہیں ہوا۔ قیمت عہ

روحِ نظم۔ مولانا تاجور نجیب آبادی اور پنڈت میلا رام وفا نے اُردو شاعری کا یہ انتخاب دو جلدوں میں کیا ہے۔ میر سے لیکر آج تک کے اکثر شعرا کے کلام کا انتخاب دونوں حصوں میں موجود ہے۔ حصہ اول عہ حصہ دوم عہ

روحِ انتخاب۔ اُردو نثر اور اُردو لٹریچر کا ضروری تاریخی انتخاب مرتبہ مولانا تاجور نجیب آبادی اور پنڈت میلا رام وفا دو حصوں میں۔ حصہ اول عمر، ۲ صفحات قیمت عہ حصہ دوم عہ

محامد الخلفا رضہ۔ قرآن مجید اور احادیث شریف کی روشنی میں خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام رضہ کے مستند اور مکمل حالات، زندگی، خلفائے اربعہ کے متعلق پہلی تحقیقی جمیل و جلیل اور نادر ترین تصنیف اس میں ہندوستان کے مشہور شعرا سے نظمیں اور قطعات لکھوائے گئے ہیں۔ تعارف حضرتِ محترم مفتی اعظم علامہ کفایت اللہ صاحب مدظلہ نے تحریر فرمایا ہے سلیس اور عام فہم زبان، اعلیٰ درجہ کی لکھائی چھپائی، ٹائٹل قابلِ دید۔ قیمت مجلد ۱۲/ غیر مجلد ۸/ دو جلدوں کے خریداروں کے لئے خاص رعایت۔

ادبیاتِ اُردو میں ایک نیا اضافہ

حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی کی معرکۃ الآرا تازہ ترین تصنیف

دستور الاصلاح

اصولِ اصلاح پر یہ پہلی کتاب ہے۔ جس میں اصلاحِ زبان، اپنی اصلاح۔ اصلاحِ خیال شاعروں کا جدید نظامِ عمل۔ ضرورتِ اصلاح۔ اصلاح لینے کا طریقہ۔ اصلاح دینے کا طریقہ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ نیز شعرائے متقدمین سے لیکر اس وقت تک کے تمام اساتذہ کی اصلاحات کے نمونے مع توجیہ اصلاح دئے گئے ہیں۔

ہندوستان کے تمام مشہور اساتذہ نے اس کتاب کی تعریف کی ہے اور اسے استاد و شاگرد دونوں کے لئے مفید بتایا ہے

لکھائی چھپائی بہترین ہے۔

قیمت صرف عہ

علم و ادب کی بہترین کتابوں کا ذخیرہ

افسانے

- سرگذشت اسیر
- سمندر کی خداوندہ
- محمودہ
- فسانہ سلطنت مغلیہ
- طوفانِ زندگی
- عروجِ زندگی
- دنیا
- شیطان کا پنجہ
- عبرت کدہ
- خانقاہِ اسرار
- چتوڑ کی دیوی
- مغربی دلہن
- بدر کمال
- بالنوک شہزادی
- نا سکل
- جنات کی شہزادی
- پری پرداز
- شیطان زادہ
- شیطان کا چرخہ
- دوست

تصانیف ل۔ احمد

- انشائے لطیف
- نغمات
- محبت کا افسانہ
- زندگی کے کھیل

تصانیف شوکت تھانوی

- بحرِ تبسم
- موجِ تبسم
- سیلابِ تبسم
- طوفانِ تبسم
- منشی جی

ناول مولانا اثر لکھنوی

- ملکۃ العزیز درجنا
- منصور موہنا
- فردوس بریں
- دلکش کول
- بدرالنسا کی مصیبت
- فلورا فلورنڈا
- حسن بن صباح

تاریخی

- تاریخ کا روشن پہلو
- حکایاتِ کشمیر
- کشمیر کی رانیاں
- معارفِ کعبہ
- عروجِ ٹرکی
- کشمیر کا مستقبل
- ترکانِ احرار
- اشرف التواریخ مکمل
- خضرِ منزل
- خلافتِ الٰہیہ
- انقلابِ فرانس

ادبی

- ترکی زبان
- انشائے محبت
- ادبی موتی چار حصے
- نہالستانِ نثار
- انشائے سنجر
- مضمون نگار
- عورتوں کے لئے
- بہشتی جھومر
- گھر اور گھر والی
- شوہر کی نصیحتیں
- آداب نسواں
- ثریا بیگم
- صبر کی دیوی
- ناصحِ مشفق
- عقیلہ بیگم
- معین الخواتین
- زنانہ خطوط
- کفایت شعاری
- لیڈی نامہ
- سہیلی نامہ
- انشائے نسواں
- اصلاح الرسوم
- آفتابِ زندگی
- شبابِ زندگی
- چاند تارے

سوانح عمریاں

- امت کی مائیں
- بنت الرسولؐ
- سوانح خاتونِ جنت
- سوانح امام حسنؓ
- سوانح امام حسینؓ
- فاطمہ کا لال
- سوانح حضرت صدیق اکبرؓ
- سوانح حضرت عمر فاروقؓ
- سوانح حضرت علیؓ
- سوانح امامِ اعظمؒ
- تذکرہ صابرؒ
- سوانح خواجہ غریب نوازؒ
- سوانح غوث پاکؒ
- مناقب غوث گوالیاریؒ
- تحفہ دربار ولایتؒ
- خمخانۂ برکات
- قصص الانبیا
- حیاتِ خواجہ
- تذکرۂ خواجگانِ چشت
- سوانح اورنگ زیبؒ
- سوانح زیب النسا
- سوانح اکبرِ اعظم
- سوانح نورجہاں بیگم
- سوانح غازی محمد بن قاسم
- حیاتِ انیس
- حیاتِ سعدیؒ
- حیاتِ حافظؒ
- حیاتِ جانی اکبرآبادی
- خالدہ ادیب خانم
- حیاتِ خسرو
- سوانح شاہجہانؒ
- حیاتِ فردوسی

مشہور شعرا کے دیوان

- دیوانِ غالب (انتخاب)
- غزلیاتِ امیر و نظیر
- انتخابِ کلام اکبر الٰہ آبادی
- دیوانِ اکبر داناپوری
- دیوانِ کالیداس بقلی
- کلامِ داغ (انتخاب)
- بہارِ معرفت
- دیوانِ حافظ

تصانیف مولانا حالی

- مسدسِ حالی (عکسی)
- مسدسِ حالی (سادہ)
- مرثیہ غالب
- مناجاتِ بیوہ
- شکوۂ ہند
- حبِ وطن
- تصویرِ درد

تصانیف ڈاکٹر اقبال

- شکوہ جوابِ شکوہ
- شمع و شاعر
- فریادِ امت
- اکبر و اقبال
- نالۂ یتیم

مذہبی

- جوازِ تعزیہ
- ارشادِ احمدؐ
- قومی نظم
- تقویم الاسلام
- کمالاتِ قرآنی

صنعتی

- اسرارِ صنعت
- دولت کا ڈھیر
- چائے کی معلومات

طالبانِ فن اور شائقین شعر و سخن کو نویدِ نو

اُردو زبان کا بے نظیر لغت

معین الشعرا

مصنفہ غلام حسین خاں آفاق بنارسی مرحوم

یہ وہ عدیم المثال لغت ہے جس میں عربی۔ فارسی۔ اُردو۔ انگریزی اور ہندی زبان کے ہزاروں الفاظ کے معنی کے علاوہ ہر لفظ کے اعداد ملفوظی صحت کیساتھ درج کئے گئے ہیں جو تاریخ نکالنے میں معاون ہوتے ہیں ہر لفظ کے متعلق یہ بھی درج ہیں کہ وہ کس زبان کا ہے اور مذکر ہے یا مؤنث، نہ صرف یہی بلکہ اساتذہ ماضی و حال کے کلام سے ہر لفظ کی تذکیر و تانیث کا ثبوت بھی پیش کیا گیا ہے حقیقتاً یہ لغت طالبان ادب و شعر کے لئے خضر راہ ہے کتابت و طباعت بہترین حجم ۳۸۲ صفحات مع تصویر مصنف $\frac{22 \times 18}{4}$ سائز جلد خوشنما اور مضبوط کاغذ دبیز اور چکنا۔ قیمت صرف چار روپیہ چار آنہ۔

محصول بذریعہ وی۔ پی ۱۲ر

باقیاتِ فانی کون نہیں جانتا کہ سوز وگداز حضرتِ فانی بدایونی کا حصہ ہے اگر آپ کو جذباتی شاعری کا لطف اُٹھانا ہے اور ایک حقیقی شاعر کے وارداتِ قلب سے آشنا ہونا ہے تو ایک جلد ضرور منگائیے۔ مع تصویر مصنف قیمت عہ

نشاطِ روح حضرتِ اصغر گونڈوی کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں ان کے کلام میں حقیقی واردات۔ ندرتِ بیان، شکوہِ الفاظ، لطافت، پاکیزگی اور رفعتِ تخیل سبھی کچھ ہے یہ دیوان آرٹ پیپر پر بڑے اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ قیمت صرف عہ

میکدہ جناب مولوی سید محمد علی شاہ میکش قادری نیازی اکبرآبادی کے جذبات حسن و عشق اور متصوفانہ کلام کا مجموعہ ہے جو اردو شاعری کا ایک معیاری نمونہ ہے قیمت مع تصویر مصنف ایک روپیہ (عہ)

قصائدِ نجم اکبرآباد کے مشہور شاعر حضرت نجم آفندی کی لاجواب تصنیف ہے۔ مدح رسولؐ میں بلند پایہ نظمیں و قصائد پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

نقوشِ مانی حضرت مانی جالسی کو کون نہیں جانتا، ایک ایک شعر جذبات و واردات کا صحیح نمونہ ہے قیمت دو روپیہ

ایاغِ بزم۔ اردو کے مایۂ ناز شاعر اسلم الثبوت استاد حضرت بزم آفندی اکبرآبادی کا تازہ ترین دیوان جس میں محاکات و تاثرات کا دریا موجزن ہے۔ آپ کو زبان کا لطف آجائیگا۔ قیمت صرف دو روپیہ۔

صبحِ مشرق۔ اگر آپ زندگی کے صحیح راز سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔ اگر آپ مناظرِ فطرت سے کیف اندوز ہونا چاہتے ہیں، اگر آپ واردات و جذبات کی حقیقی کیفیات سے سرخوش ہونا چاہتے ہیں تو محمد صادق صاحب ضیا بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کا کلیاتِ نظم و غزل دیکھئے۔ قیمت دو روپیہ

نشترکدہ۔ مجموعۂ غزلیات محسنِ ادب جناب بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی جسے مکتبہ قصر الادب "آگرہ" نے نہایت اہتمام کے ساتھ چھپوایا ہے۔ قدیم رنگِ تغزل کو جدید مذاقِ بلند کے ہم دوش دیکھنا ہو اور جذبات و احساساتِ انسانی کی حقیقت سمجھنی ہو تو یہ دیوان ضرور ملاحظہ فرمائیے مع تصویر مصنف دو روپے آٹھ آنہ

نورِ مشرق مجموعۂ نظمیات جناب مہر لال صاحب ضیا فتح آبادی ایم۔ اے۔ اس مجموعہ کی ہر نظم اپنی نوعیت کے لحاظ سے دلکش اور اثر آفریں ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی

حکیم آزاد انصاری اور منظر صدیقی کے تعارف مع تصویر شریک کتاب ہیں۔ قیمت عہ

اربعہ عناصر۔ یہ ایک جیبی سائز کا خوبصورت اور نظر فریب مجموعہ ہے جو حال میں شائع ہوا ہے۔ اس میں فاضل صاحب حکیم محمود علی خاں ماہر اکبرآبادی کی رموز و نکات سے پُر رباعیوں کے مختلف ابواب ہیں۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

روحِ نظیر۔ میاں نظیر اکبرآبادی کے منتخب کلام کا مجموعہ جس کو حضرت مخمور اکبرآبادی نے ایک بسیط مقدمہ و تبصرہ کے ساتھ نہایت کاوش و کفش سے مرتب کیا ہے جس سے نظیر اکبرآبادی کے شاعرانہ کمال کا پتہ چلتا ہے۔ قیمت صرف عہ

فغانِ آرزو۔ جناب سید انوار حسین آرزو لکھنوی کی غزلیات کا مجموعہ۔ جس میں زبان و بیان کی خوبیوں نے مل کر عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ قیمت عہ

گلکدہ۔ حضرت عزیز لکھنوی مرحوم عصرِ حاضر کے ان باکمال شعرا میں سے تھے جن پر حقیقی شاعری کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان کے اشعار سوز و گداز اور حقیقت و معارف کا ایک خزانہ ہیں۔ قیمت صرف دو روپیہ (ع۲)

گلزارِ داغ۔ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کا مشہور دیوان جو صحت کے ساتھ از سرِ نو چھاپا گیا ہے اور جس کا ایک ایک شعر براہِ راست دل پر اثر کرتا ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

جگر پارہ۔ یہ بیدم شاہ وارثی مرحوم کے متصوفانہ اور سوز و گداز سے پُر کلام کا مجموعہ ہے۔ مرحوم کی غزلیں حال و قال اور معیاری تغزل کا بہترین نمونہ ہیں۔ قیمت رعایتی ۱۲ در

مصحفِ بیدم۔ حضرتِ بیدم شاہ وارثی کا دوسرا دیوان جس میں اُن کا تمام کلام مع ٹھمری اور دادروں کے ہے جس کا مقدمہ حضرت خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے۔ یہ دیوان حضرتِ بیدم کا شاہکار ہے۔ اُن کی تصویر بھی اس میں ہے قیمت عہ

مثنوی عالمِ خیال۔ مصنفہ مرزا شوق قدوائی لکھنوی (مرحوم) شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جس نے اس مثنوی کا نام نہ سنا ہو۔ شوہر اور بیوی کے محبت آمیز منظوم خطوط اس میں ہیں۔ جذبات اس میں ہیں۔ ایک نظم کے چار رُخ ہیں جو چار خوبصورت تصویروں سے مزین ہیں قیمت مجلد مع رنگین تصاویر عہ۔ سادہ بلا تصاویر و غیر مجلد ۸

اگر آپ کو
اُردو شاعری کی معراج دیکھنی ہے تو
کلیمِ عجم

ملاحظہ فرمائیے جو شاعرِ تاج حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی مدظلہ العالی کی غزلوں کا نادر ترین مجموعہ ہے جس کا ایک ایک شعر درس و پیام، عرفانِ ہستی اور واردات و مدرکات کا آئینہ دار ہے۔ **کلیمِ عجم** میں آپ کو تغزل کا وہ معیاری نمونہ ملے گا جو دوسری جگہ شاذ ہی نظر آسکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مولانا کے چودہ خطبے بھی اس میں شریک ہیں جن سے اردو شاعری کے ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ مقدمۂ شعر و شاعری مصنفہ مولانا حالی کے بعد اردو نثر میں شاعری اور شاعروں پر اس سے بہتر مضامین آپ کو کہیں نہیں ملیں گے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ حجم ۴۰۰ صفحات کتاب مجلد ہے جلد پر سنہری ڈائی کندہ ہے، مولانا کی تین تصویریں بھی شریک ہیں۔

قیمت تین روپے (سہ)

مثنوی مادرِ ہند۔ حضرتِ شادؔ عظیم آبادی کی وہ مثنوی ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نئی ہے۔ اس مثنوی کا تعلق حُسن و عشق سے نہیں ہے بلکہ اس میں ہندوستان کی مکمل سیاسی تاریخ ہے۔ علّامہ سیمابؔ اکبر آبادی اور رشید احمد صدیقی کے مقدمے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قیمت ۱۲؍

مینائے سخن منشی امیر احمد امیرؔ مینائی کی مقبول و مشہور تمام واسوختوں کا ایک مجموعۂ بے نظیر کتاب ہے۔ قیمت عہ

رازِ عروض۔ حضرت علّامہ سیمابؔ اکبر آبادی کی وہ سہل ترین تصنیف جس نے ہر بتدی کو فنِ عروض کا منتہی بنا دیا ہے جس کے مطالعہ سے عروض جیسا مشکل علم پانی نظر آتا ہے۔ دوسرا ایڈیشن بعد اضافہ و ترمیم چھپ کر تیار ہو گیا ہے قیمت صرف ۶؍

نکاتِ شاعری جن طلبائے فنِ شعر کو ادلیاتِ فن معلوم کرنے کے علاوہ ایک ایک قافیہ کے کئی کئی قافیے دریافت کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ مثلاً آم۔ بام۔ خام دام۔ رام۔ شام۔ عام۔ تام۔ نام۔ کام الف سے یا تک ختم ہونے والے اکثر قافیے درج ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ بڑی بڑی نکاتِ عروض سمجھائے گئے ہیں قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

عام فہم عروض۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ عام فہم عروض کو پڑھنے کے بعد آپ کو علمِ عروض میں پوری دستگاہ ہو جائیگی۔ عام فہم عروض میں نہایت آسان الفاظ اور سلیس اُردو میں علمِ عروض کی پوری وضاحت مع مثالوں کے کر دی گئی ہے قیمت ۸؍

چراغِ سخن۔ حضرت مرزا یاسؔ عظیم آبادی کی وہ لاجواب تصنیف ہے جسے سالہا سال سے مقبولیت کا درجہ حاصل ہے جس نے سینکڑوں حضرات کو صاحبِ فن بنا دیا۔ اس میں شعر اور فنِ عروض سے تعلق رکھنے والی تمام باتیں بہت ہی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ قیمت صرف عہ

فکرِ بلیغ۔ حضرت شادؔ عظیم آبادی مرحوم استادِ فن تھے انھوں نے اُردو داں طبقہ کے لئے فکرِ بلیغ لکھکر واقعی احسانِ عظیم کیا ہے، جس کے ایک مرتبہ پڑھنے سے تمام فنِ شاعری کی پوری معلومات ہو جاتی ہے اور انسان شعر کہتے وقت غلطی سے بچتا ہے، ہر سخن فہم اور سخن گو اس کا مطالعہ ضرور کرے۔ قیمت عہ

مشاطۂ سخن۔ از جناب صفدرؔ مرزا پوری۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے دُنیائے ادب میں پہلی کتاب ہے جس میں مسلّم الثبوت اور ماہرینِ فن اساتذہ کی وہ اصلاحیں جمع کی گئیں ہیں جو انھوں نے اپنے ہونہار شاگردوں کو دیں قیمت عہ

جانِ سخن۔ اس کتاب میں فنِ عروض کے متعلق نہایت تفریحی مضامین لکھے گئے ہیں۔ متروکات کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے۔ بحور، صنائع و معائبِ شاعری کے علاوہ تقطیع کے قاعدے اور علمِ قافیہ کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ قیمت عہ

ایشیائی شاعری۔ یہ کتاب اثرؔ صہبائی صاحب کی تصنیف ہے جس میں تمام اصنافِ شاعری پر پوری وضاحت کے ساتھ بحث کی گئی ہے، تمام کتاب نئی نکات سے بھری پڑی ہے اور نہایت ہی آسان ہے قیمت ایک روپیہ (عہ)

ایضاح القوافی۔ ڈاکٹر سید سخاوت علی شوخؔ اکبر آبادی جانشین مرزا رئیسؔ اکبر آبادی کی لاجواب تصنیف ہے، ہمارا دعویٰ ہے کہ اردو میں علمِ قافیہ پر آجتک کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی قیمت ۱۰؍

مغل اور اُردو۔ ادیب الملک نواب نصیر حسین خیالؔ مرحوم کی لاجواب تصنیف۔ اس میں اُردو کے ابتدائی دور سے لیکر مغلوں کے ہر زمانہ کے تدریجی واقعات بڑے دلچسپ اور تحقیقی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ اُردو کی تاریخ اس سے بہتر آجتک مرتب نہیں ہوئی، بڑا سائز حجم ۱۸۰ صفحات قیمت عہ

نگارستان۔ یہ مجموعہ ہندوستان کے نقیدالمثال فسانہ نگار حضرت نیازؔ فتحپوری کا ایک شاہکار ہے۔ حضرت نیازؔ کے افسانے رفعتِ تخیل حسین و پرشکوہ الفاظ کے اعتبار سے اپنا جواب آپ ہیں۔ قیمت صرف دو روپیہ (عہ)

گہوارۂ تمدّن۔ مولانا نیازؔ فتحپوری کی وہ معرکۃ الآراء کتاب جس میں تاریخی اسلوب سے ثابت کر دیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دُنیائے شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے۔ قیمت عہ

شہاب کی سرگذشت۔ مولانا نیازؔ فتحپوری کا وہ عدیم النظیر فسانہ جو اُردو لٹریچر میں بالکل نئی چیز تسلیم کیا گیا ہے۔ جذباتِ سیرت نگاری اور تحلیل جذبات کے ایسے نادر نمونے اس میں نظر آئیں گے جو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتے۔ قیمت عہ

کارِ امروز

مجموعۂ نظمیات حضرت علّامہ سیمابؔ اکبر آبادی

اگر آپ اپنی زندگی میں انقلاب چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو وطنی، قومی، ملّی اور سیاسی موضوعات سے دلچسپی ہے اگر آپ کو اخوت، محبت، رواداری اور صداقت کا درس لینا ہے تو اپنے بین القومی شاعرِ اعظم کی شاہکار تصنیف دیکھئے۔

یہ علّامہ سیمابؔ کا وہ مجموعہ ہے جس نے اُردو شاعری کی دُنیا میں ایک ہیجان پیدا کر دیا ہے اور جس نے ناظمینِ اُردو میں علّامہ موصوف کو واقعی ہندوستان کا ناظمِ اعظم تسلیم کرا لیا ہے۔ اس مجموعہ کی ہر نظم موتیوں میں تولنے کے قابل ہے حجم ۲۶۵ صفحات۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی اعلیٰ۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پر سُنہری ڈائی کندہ ہے۔

قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنہ

منظور شدہ محکمہ ہائے تعلیم برار و ریاست بھوپال

نگار

تصویر:- ہمدردِ ادب جناب اسمٰعیل کھوکھر صاحب رآز جونا گڈھی

جلد ۱۲ — ماہنامہ "شاعر" آگرہ جولائی ۱۹۴۱ء — نمبر ۷

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
	مقالات مدیری		
۱	جرعات	اعجاز صدیقی	۵
۲	تجزیہ	" "	۶
۳	شخصیات	" "	۸
۴	تحقیق و تصحیح	" "	۹
۵	اصلاحِ سخن	" "	۵۱
۶	نقد و نظر	" "	۵۲
	علم و ادب		
۷	شبلی شاعر کی حیثیت سے	حضرت ماہر القادری	۱۳
۸	در جل	جناب شمیم نعمانی بیادری	۲۳
۹	ادبی خطوط	جناب رفیق مارہروی	۳۴
	افسانے		
۱۰	خون کی کھاد	جناب کیلاش نرائن شائق بی۔اے	۱۸
۱۱	تلون کیش	جناب جاوید کوہستانی	۲۸
۱۲	خوابِ تمنا	جناب حافظ اسحاق ہلال پریمی کرکشی	۳۸
	منظومات		
۱۳	صفوِ جنگ	حضرت مولانا سیاب اکبرآبادی	۷
۱۴	موحدِ علم	حضرت مولانا سیاب اکبرآبادی	۱۰
۱۵	گھٹا	جناب گنگا رام آبد سرہندی	۱۶
۱۶	جہانِ آرزو	حضرت آرزو لکھنوی	۱۷
۱۷	شعلۂ آواز	جناب ظہیر الدین حیدر اژ جگراؤں	۱۷
۱۸	دولتِ غم	جناب نذیر بشیر کوٹی	۲۱
۱۹	اپنے مجازی پروردگار وں سے؟	جناب فضل الدین اثر ایم۔اے	۲۲
۲۰	طلسمِ شب	جناب چودھری فتح محمد رفیق بی۔اے	۲۶
۲۱	ارشادات	حضرت وحشت کلکتوی	۲۷
۲۲	نمازِ تکبیر	جناب برق صدیقی فتح پوری	۲۷
۲۳	تماشائے عبرت	جناب (حاجی) نبی احمد بریلوی	۳۱
۲۴	مرحوم بیوی کی یاد میں	جناب ہیرالال سونی ضیا فتح آبادی ایم۔اے	۳۷
۲۵	نوائے راز	حضرت راز چاندپوری	۴۳
۲۶	شاعر اور حسنِ بازاری	جناب سہا قریشی گوالیاری	۴۴
۲۷	**مشاعرۂ شاعر** — خان بہادر حضرت وحشت کلکتوی۔ حضرت مولانا سیاب اکبرآبادی، حضرت نشتر ہنگامی، حضرت شاعر نظوری، حضرت اکمل مظفرنگری، حضرت آغاز برانپوری وغیرہ وغیرہ۔		۴۵
۲۸	پردۂ علم	ادارہ	۵۴

چندہ سالانہ عوام سے ۸ خواص سے ۱۰ محسنین سے ۲۵ معاونین سے ۲۴ للعہ انیسان سے ۱۵ ہمدردوں سے ۱۲ فی پرچہ ۳

محسنین، معاونین، انیسان و ہمدردانِ شاعر

محسنین ادب

(۱) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ؏ سالانہ

(۲) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیّر خورجوی ؏ سالانہ

(۳) محسنۂ ادب ہر ہائینیس علیا حضرت کیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ؏ سالانہ

(۴) محسنِ ادب جناب محترم خانشری امام الدین خانصاحب مسّان رسوا در بار پاجود ؏ سالانہ

(۵) محسنۂ ادب شہزادی تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ؏ سالانہ

معاونینِ ادب

(۶) معاونِ ادب سٹرلے۔ بی ظلیس صابر اکبر آبادی بی۔ اے۔ ۲۴ عہ سالانہ

(۷) معاونۂ ادب محترمہ تحمۂ تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ۲۴ عہ سالانہ

(۸) معاونِ ادب جناب مولوی محمد احمد صاحب رسوا سہارنپوری ۲۴ عہ سالانہ

انیسانِ ادب

(۹) انیسِ ادب جناب سید تفضل کریم صاحب جمشید پور ۵ عہ سالانہ

ہمدردانِ ادب

(۱۰) ہمدردِ ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلیمان جالندہری ۱۲ عہ سالانہ

(۱۱) محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری مرحوم ۱۲ عہ سالانہ

(۱۲) ہمدردِ ادب جناب بابو عبدالعظیم خانصاحب رونق دکنی ۱۲ عہ سالانہ

(۱۳) ہمدردِ ادب جناب نوابزادہ کنور مشکور حسین خانصاحب قیس آف بینڈو ۱۲ عہ سالانہ

(۱۴) ہمدردِ ادب جناب مولوی محمد قاسم صاحب نامی علوی در بھنگوی ۱۲ عہ سالانہ

(۱۵) ہمدردِ ادب جناب صاحبزادہ سید مظفر حسین صاحب رئیس زمیندار (دان ادھارم) ۱۲ عہ سالانہ

(۱۶) ہمدردِ ادب جناب اسمٰعیل کھوکھر دراز جوناگڈھی ۱۲ عہ سالانہ

خاصانِ ادب

(۱۷) جناب صاحبزادہ سلطان حامد خانصاحب ثروت گلشن آبادی صہ سالانہ

(۱۸) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمٰن خانصاحب شفق ٹونکی صہ سالانہ

(۱۹) جناب عبدالحفیظ صاحب ثمر صدیقی پھلواری بی۔ اے صہ سالانہ

(۲۰) جناب محمد سعد خانصاحب آدس صہ سالانہ

(۲۱) جناب لالہ گنگارام صاحب آبد سرہندی صہ سالانہ

(۲۲) جناب سید مظفر حسین صاحب عرشی دہلی صہ سالانہ

(۲۳) جناب دیسراج شہرما۔ بی۔ سی۔ ڈی فرنیچ صہ سالانہ

(۲۴) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی صہ سالانہ

(۲۵) جناب صاحبزادہ عبدالحمید خانصاحب بہادر عباسی بی۔ اے صہ سالانہ

(۲۶) جناب ماسٹر حسن خانصاحب اثر صہ سالانہ

(۲۷) جناب نذیر احمد صاحب نذیر شیرکوٹی صہ سالانہ

(۲۸) جناب محمد صبغتہ اللہ صاحب آرشد صدیقی امروہوی صہ سالانہ

(۲۹) جناب محبوب حسن صاحب آسی متوطن رڑکی صہ سالانہ

(۳۰) جناب صاحبزادہ سیٹھ اکبر علی صاحب صہ سالانہ

(۳۱) جناب مخدوم سید علی اسد نقوی البخاری احمد آبادی (جھنگ) صہ سالانہ

(۳۲) جناب طالق ہمدانی لدھیانوی صہ سالانہ

(۳۳) جناب سبحان خاں صاحب غافل بتول صہ سالانہ

(۳۴) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی۔ کوٹا ہہ صہ سالانہ

(۳۵) جناب حبیب حسن خانصاحب حبیب شاہجہانپوری از کوئٹہ صہ سالانہ

(۳۶) جناب بابو فقیر محمد خانصاحب عارف سیالکوٹی از کوئٹہ صہ سالانہ

(۳۷) جناب شیو پرشاد صاحب برگ باندوی صہ سالانہ

(۳۸) جناب ہدایت اللہ خاں صاحب تشنہ بھوپالی صہ سالانہ

(۳۹) جناب حکیم ڈاکٹر عبدالرحمان صاحب ناز کاندھلوی صہ سالانہ

جرعات

اُردو انسائیکلوپیڈیا

ہر جیتی علوم و فنون کو ہندوستانیوں تک پہونچانے کی اُردو زبان میں صلاحیت ہے یا نہیں۔ اس کا تجربہ سالہا سال ہو کیا جا رہا ہے اور اس وقت اُردو زبان میں تراجم کے ذریعہ وہ سب کچھ منظرِ عام پر لایا جاچکا ہے جس کے لئے غیر زبانوں کا جاننا ناگزیر سا تھا۔ دُنیا کے تمام علوم و فنون اُردو کے دامن میں سمٹ چکے ہیں اور اب اسے کوئی تہی دامن نہیں کہہ سکتا۔ اگر کچھ باقی بھی رہ گیا ہے تو وہ بھی ایک نہ ایک دن اُردو میں آجائیگا۔ اُردو زبان روز بروز جامع ہوتی چلی جا رہی ہے اور انشاء اللہ ایک دن وہ آنے والا ہے کہ دنیا کی دوسری مشہور زبانوں کی طرح دنیا والوں کو اس کا لوہا بھی ماننا پڑیگا۔ اُردو میں لچک اور انجذابی قوت اس قدر ہے کہ وہ ذرا سے ردّ و بدل کے ساتھ ہر زبان کے الفاظ کو اپنا لیتی ہے۔ اس لئے اُس کی جامعیت یقینی اور لازمی ہے۔ جدید و قدیم علوم و فنون کو اُردو کے سانچے میں ڈھالنے والے ضرور تا کچھ نئے الفاظ بھی پیدا کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر و بیشتر قبولِ عام حاصل کرکے "جانِ اُردو" بن جاتے ہیں۔ گویا تراجم اُردو زبان کے الفاظ کی پیداوار میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں اور نئی معلومات کے علاوہ ذخیرۂ الفاظ کو بھی وسعت دیتے ہیں۔

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا شعبۂ دارالترجمہ بلحاظ اسم اُردو کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ جس نے متعدد علوم و فنون کو اُردو کے قالب میں ڈھال دیا اور اُردو زبان کو دوسری زبانوں کے سامنے سرخرو ہونے کا موقع دیا۔ "اُردو انسائیکلوپیڈیا" کی ترتیب پچھلے کئی سالوں سے کئی جگہ یہ کام شروع ہوا، لیکن ابتدائی منازل ہی میں ختم ہوگیا۔ اب ادارہ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد دکن نے یہ بارِ عظیم اپنے سر لیا ہے۔ "اُردو انسائیکلوپیڈیا" کا ابتدائی نمونہ اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ہر جیتی علوم و فنون کا یہ خزینہ اگر شائع ہوگیا تو واقعی اُردو کو سربلند کردیگا۔ اس انسائیکلوپیڈیا کی تیاری میں حیدرآباد اور ہندوستان کے ماہرین علوم و فنون کا زیادہ سے زیادہ ہاتھ ہے۔ تمام شعبہ جات تقسیم کردئے گئے ہیں۔ اس تقسیم کار سے اُمید پائی جاتی ہے کہ ادارہ ادبیاتِ اُردو ضرور اس اہم خدمت کو انجام دے سکیگا۔ ابتدائی نمونہ بڑی حد تک قابلِ اطمینان ہے۔ میں دعاگو ہوں کہ اُردو انسائیکلوپیڈیا کو مرتب کرنے والے افراد کو خدا ہمت و استقلال عطا فرمائے اور ادارہ ادبیاتِ اُردو اس ٹھوس خدمت کے صلہ میں شہرتِ دوام حاصل کرے۔

چونکہ اس ذیل میں مجھ سے آزادانہ رائے طلب کی گئی ہے۔ اس لئے ایک خادم زبان و ادب کی حیثیت سے میں اربابِ ادارۂ ادبیاتِ اُردو سے اس کا متمنی ہوں کہ اُردو انسائیکلوپیڈیا میں الفاظ محاورات۔ تراکیب اور صحتِ زبان کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھا جائے تاکہ زبان کے اعتبار سے بھی یہ بلند ترین چیز ثابت ہو اور کسی نہج سے کوئی اسے ناکمل نہ کہہ سکے۔ تصریحات کی تحریر پر غور و خوض کرنے کے لئے اگر کسی ماہرِ زبان کی خدمات حاصل کرلی جائیں تو زیادہ مناسب ہو یوں تو تمام مقالہ نگار اُردو کے بہترین انشا پرداز ہیں۔ لیکن بسا اوقات بعض غلطیاں نظرِ ثانی سے رہ جاتی ہیں مثلاً صفحہ اول پر شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کے حالات میں تصانیف کو جگہ جگہ تصنیفات لکھا گیا ہے۔ محتاط حضرات کبھی تصنیفات نہیں لکھتے۔ یہ دو جملے بھی قابلِ ترمیم ہیں۔

(۱) "کتابی زبان کے علاوہ بول چال کی فارسی زبان کی بھی تحصیل کی۔"

(۲) "روزمرہ کے استعمال اور لفظی رعایتوں کے لحاظ کے قدیم اسالیب کے ساتھ ساتھ"

یہ چونکہ ایک علمی مقالہ ہے اس لئے اس میں تحریری خامیوں کی بہت کم گنجائش ہے دیگر علمی مضامین میں اس کا بہت زیادہ امکان ہے۔ دوسری چیز جو میں ضروری سمجھتا ہوں وہ نامانوس الفاظ کی تشریح ہے۔ اس کے لئے یا تو حاشیہ کو کام میں لایا جائے یا پھر آخر میں تشریح الفاظ کے عنوان سے ایک باب قائم کردیا جائے۔ ایسے حضرات جنھیں عربی فارسی وغیرہ پر زیادہ عبور نہیں ہے اُن کے لئے تشریح الفاظ ضروری ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ میری ان گذارشات پر توجہ فرمائی جائے گی۔

موت کی چیرہ دستی

آرزوؤں کی پامالی دیکھ کر سخت سے سخت دل انسان بھی آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ آرزوؤں کی پامالی اور موت کی سخت گیری نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ ۲۰ مئی کو میرے کرم فرما سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری کا خط آتا ہے جس میں شخصیات کے لئے وہ اپنا کلام بھیجتے ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ اپنی تصویر اور تذکرہ کو صفحۂ شاعر پر دیکھنے کے لئے بے چینی کا اظہار بھی فرماتے ہیں اور قبل اس کے کہ جون کا "شاعر" شائع ہو وہ ۲۳ جون کو سفر آخرت اختیار کر لیتے ہیں ——— آہ یہ کسے علم تھا کہ حضرت نسیم صرف دو تین دن کی معمولی علالت کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دینگے۔ میں تو منتظر تھا کہ وہ تصویر و تذکرہ کی اشاعت پر اظہار مسرت فرمائینگے لیکن بجائے ان کے خط کے ۹ جون کو اُن کے صاحبزادے کا غم انگیز خط آتا ہے۔ میں عرض نہیں کرسکتا کہ اس غیر متوقع سانحہ سے مجھ پر کیا اثر ہوا۔ کاش موت کی گھڑیاں کچھ قبل "شاعر" اُن کی نظر سے گذر جاتا۔ مرحوم کی خصوصیات "شخصیات" کے ذیل میں لکھ چکا ہوں۔ ناظرینِ شاعر دُعا فرمائیں کہ خدا اُن کی اہلیہ محترمہ اور صاحبزادگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

اعجاز صدیقی

تجزیہ

اس اشاعت کے بعض مضامین پر ایک نظر

علامہ شبلی شاعر کی حیثیت سے اتنے نہیں چمکے جتنا انھیں چمکنا چاہئے تھا ہاں اُن کی نثر جس انفرادیت کی حامل ہے اُس سے کسی کو انکار کی جرات نہیں ہو سکتی۔ حضرت ماہر القادری نے اپنے اس مضمون میں آپکے جستہ جستہ اشعار کے کیف و اثر کو پیش کیا ہے۔ شبلی کی فارسی شاعری کے متعلق حضرت ماہر کا خیال بڑی حد تک قابل تائید ہے۔ بات یہ ہے کہ اُن کے علمی اور تاریخی ذوق نے ان کی شاعری پر پردہ ڈال دیا اور انھوں نے خود کبھی بحیثیت شاعر دُنیا کے سامنے آنے کی کوشش نہ کی۔ ان کے فارسی اور اردو کلام کے دو کلیات شائع ہو چکے ہیں لیکن وہ قبول عام حاصل نہ کر سکے۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ دنیا تو انھیں دت عالم۔ مورخ۔ ناقد اور نقیہ سمجھتی ہے۔ اگر علامہ شبلی کی شاعری کے متعلق اسی طرح مضامین شائع ہوتے رہے تو اُن کی یہ خصوصیت بھی نمایاں ہو جائے گی۔

ورجل پر اُردو میں بہت کم مضامین لکھے گئے ہیں۔ انگریزی ادب میں بھی ورجل پر بہت کم مواد موجود ہے۔ اس لئے کہ وہ لاطینی شاعر تھا اور اس کا زمانہ بھی بہت قدیم ہے دنیا ورجل سے زیادہ ڈانٹے کو جانتی ہے۔ حالانکہ ڈانٹے کی شاعری بڑی حد تک ورجل کی خوشہ چیں ہے۔ جناب تسیم نعمانی کا یہ مضمون ورجل کی زندگی اُس کے کارناموں اور تصانیف کے متعلق کافی معلومات کا حامل ہے "شاعر" کے لئے آپ ڈانٹے پر بھی ایک مضمون لکھ رہے ہیں۔

افسانوں میں "**خون کی کھاد**" انسانیت اور رحم و کرم کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ خادم و مخدوم کے لئے یہ افسانہ ایک سبق ہے۔ "**تلون کیش**" عورت کی فطرت کے متعلق ایک طنز ہے۔ عورت اپنی رائے کو کتنی جلدی بدل دیتی ہے اور اُس کی قوتِ فیصلہ کتنی کمزور ہوتی ہے۔ ایک چیز سے مطمئن ہونے کے بعد بھی وہ اس سے زیادہ بہتر چیز سے کسقدر جلد متاثر ہو جاتی ہے۔ یہ ہیں "تلون کیش" کے داخلی خدوخال۔ اس افسانہ کا مغربی عورت پر تو اطلاق ہو سکتا ہے۔ لیکن مشرقی عورت کا جذبۂ پرستاری اس کے منافی ہے۔ مشرق میں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں لیکن کم۔ "**خونِ تمنا**" ہلال صاحب کا پہلا افسانہ ہے جو منظرِ عام پر آرہا ہے۔ افسانہ نہ صرف واقعتاً دلچسپ ہے بلکہ تمام افسانوی خصوصیات سے لبریز ہے۔ یہ ایک دل ہلا دینے والی ٹریجڈی ہے اور تمناؤں کی پامالی کا ایک دردناک واقعہ۔

نظمیں اور غزلیں "موحدِ اعظم" حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی کی ایسی نظم ہے جس کا جواب پیدا نہیں ہو سکتا۔ اردو شعرا میں آج تک کسی نے شیطان پر نظم نہیں لکھی۔ جس طرح عنوانِ نظم بالکل نیا ہے اُسی طرح خیالات بھی اچھوتے اور فلسفیانہ ہیں۔ درس و پیام جو مولانا سیماب کی شاعری کا مقصدِ وحید ہے، اس نظم میں بھی زیادہ سے زیادہ نمایاں ہے، یہ نظم ماہنامہ ادیب دہلی کے لئے لکھی گئی تھی۔ اُس میں شائع ہونے کے بعد چونکہ یہ بحد مقبول ہوئی ہے۔ اس لئے بطورِ خاص "شاعر" میں بھی شائع کر رہا ہوں تاکہ ناظرینِ "شاعر" بھی لطف اندوز ہو سکیں۔ "گھٹا" جناب آبد سرہندی کی بڑی دل آویز نظم ہے۔ اس نظم میں ردیف قافیہ نے بڑا لطف پیدا کر دیا ہے۔ "اپنے مجازی پروردگار سے" حضرت اخترؔ اکبر آبادی ایم۔ اے ایک عرصہ کے بعد صفحاتِ شاعر پر جلوہ گر ہو رہے ہیں۔ آپ کی یہ نظم جذباتِ خود اعتمادی کو کتنے دلنشین اور بلند عزائم کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ جذبۂ اثر کے اعتبار سے بھی یہ نظم لاجواب ہے۔ نظم کا ایک ایک شعر تیر و نشتر ہے، ہر قسم محکم اور ہر ارادہ مضبوط معلوم ہوتا ہے۔ "تماشائے عبرت" جناب حاجی نبی احمد بریلوی کی طویل نظم ہے جس میں زیادہ سے زیادہ شعری خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ "ہم بھی تڑپے ہیں، تم بھی تڑپو" اس نظم کا حقیقی مقصد ہے، انقلاباتِ ہستی کو انھوں نے جس پیرائے میں پیش کیا ہے اور جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ بہت خوب ہے "مرحوم بیوی کی یاد میں" حضرت ضیا فتح آبادی ایم۔ اے کی پُر اثر نفسیاتی اور سوز آفریں نظم ہے، جذباتِ وفا اس نظم میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں ماضی کی یاد اور مستقبل کے واقعات میں جن کنایات سے کام لیا گیا ہے اور مرحومہ کو یاد رکھنے کا جو عہد کیا گیا ہے وہ ضیا صاحب کے جذبۂ "یک گیری" کا روشن آئینہ ہے۔ "نمازِ تحیر" شاعر ادمحمود نادری (؟) ظلمِ شب بھی

نظموں کے علاوہ حضرتِ آرزو لکھنوی۔ خان بہادر حضرت رضا علی وحشت کلکتوی اور حضرت راز چاندپوری کا تازہ ترین کلام زینتِ صفحاتِ "شاعر" ہے۔ حضرتِ آرزو لکھنوی اور حضرتِ راز چاندپوری پہلی بار صفحاتِ "شاعر" پر جلوہ بار ہو رہے ہیں اور آئندہ بھی کرم فرمائی کا وعدہ فرمایا ہے۔ حضرتِ وحشت کلکتوی "شاعر" پر جو کرم فرماتے ہیں اُس کے شکریہ کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اساتذہ کے رنگِ سخن کے متعلق کسی قسم کا اظہارِ خیال میرے لئے بہت مشکل ہے۔ غزلوں کا ہر شعر جانِ تغزل ہے۔ جناب ظہیر الدین حیدر اور جناب نذیر بشیر کوٹلی کی غزلیں بھی معیاری اور وجد آفریں ہیں۔

اعجاز صدیقی

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

دُنیا کا یہ دَور حیرت انگیز ہے آج
چیونٹی بھی بزعم خویش "چنگیز" ہے آج
ہے ساری جہاں کو مرض جوع الارض
آتش کدۂ خودی بہت تیز ہے آج

"ڈکٹیٹری" ہے طبقۂ آزاد کی موت
گلزار کی زندگی ہے، صیّاد کی موت
مٹ جائے جو شخصیت، تو مل جائے اماں
ہے نتیجۂ شخصیت میں افراد کی موت

تجرید میں ہے دور و تسلسل کی فنا
ہے آتشِ گل ہی عالمِ گل کی فنا
سُن لے وہ جسے حرصِ جہاں گیری ہو
ہے کل کی طلب نتیجتاً کل کی فنا

یہ فتح و شکست حسبِ دلخواہ نہیں
جز موت حیات کے لئے راہ نہیں
شاید "نپولین" کا نقشِ تقلید
مرگِ "نپولین" سے آگاہ نہیں

خودبر النفس نہ برق ہو جائے کہیں
تو رالکھ نہ تابہ فرق ہو جائے کہیں
خوش ہو نہ ڈبو کے بے گناہوں کے جہاز
بیڑا تیرا بھی غرق ہو جائے کہیں

انسان ہے آمادہ فدائی کے لئے
ہے فرصتِ انقلاب ہستی کے لئے
یہ شورشِ بے پناہِ دورِ عالم
دعوت ہے مسیحؑ اور مہدیؑ کے لئے

دُنیا میں جو دورِ انقلاب آتا ہے
ساتھ اپنے بلائے شور و شر لاتا ہے
رہتی نہیں امن کی فضا بھی محفوظ
گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے

پوشیدہ نگاہوں سے ہیں کس جا دونوں؟
کیوں ننگے ہیں ہما و عنقا دونوں؟
روپوش ہیں "یونس" اور "امان اللہ خاں"
اس دور کے ہیں "خضر و مسیحا" دونوں

تجویزِ نیازِ عشق محمود ہے آج
تردیجِ غرور و ناز بے سود ہے آج
وہ کہتے ہیں حُسن ابھی ہے شائستۂ "ناز"
میں کہتا ہوں "نازی ازم" مردود ہے آج

اے بمبئی! اے حسین دروازۂ ہند
ہے تیری ہی عظمتوں سے اندازۂ ہند
اپنے بے جینوں کو دے رنگِ سکوں
تقلید بکھیر دے نہ شیرازۂ ہند

سیماب

شخصیات :-

جناب اسمٰعیل کھوکھر صاحب رازؔ جوناگڈھی

جوناگڈھ، کاٹھیاواڑ کی ایک ممتاز ریاست ہے جس میں بعض دیگر ریاستوں کی طرح بے حسی علمی جمود اور ادبی افلاس کے آثار نہیں پائے جاتے، بلکہ وہاں زندگی ہے اور زندگی میں ہیجان و ارتعاش۔ خسروِ جوناگڈھ کی بلند خیالی نے وہاں کے ہر شعبہ میں ترقی کی لہر دوڑا دی ہے۔ تعلیمی سرگرمی اور علمی مشاغل کی پھبنات وہاں اس قدر میں ملتی ہے اتنی کسی دور میں نہیں پائی گئی۔ چونکہ کاٹھیاواڑ کی عام زبان اردو نہیں ہے اور اردو مرا کز سے بھی وہ بہت دور ہے۔ اس لئے وہاں علمی و ادبی اور شعری دلچسپیوں کا پایا جانا کچھ کم باعثِ مسرت نہیں ہے۔ جوناگڈھ کے شعرا بڑی تیزی سے منزلِ ترقی پر گامزن ہیں۔ سیدؔ۔ اخترؔ۔ کاملؔ صدیقی۔ اثرؔ۔ قمرؔ۔ کوثرؔ۔ شرفؔ اور مقبولؔ وغیرہ وہاں کے ترقی یافتہ شعرا ہیں کاٹھیاواڑ کی سرزمین (منگرول) سے جنابِ خوشترؔ ایک عرصہ تک ماہنامہ "زبان" بھی نکال چکے ہیں۔ جو اردو زبان کا ایک معیاری ماہنامہ تھا۔ جوناگڈھ کا پورا شاہی خاندان اردو کو دل و جان سے چاہتا ہے۔

جناب رازؔ جوناگڈھی شاہی خاندان کے نہ صرف ایک ممتاز فرد ہیں بلکہ کاٹھیاواڑ کے ایک خوش فکر شاعر بھی ہیں۔ آپ قصبہ مظفر آباد عرف کوتیانہ (ریاست جوناگڈھ) کے خاندان "کھوکھر" (گکھر) کے ایک معزز و ممتاز گھرانے میں ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے آپ کا خاندان جوناگڈھ کے بڑے جاگیرداروں میں شمار ہوتا ہے۔ رازؔ صاحب کے آباؤ اجداد نے بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں اور بطور صلہ اُن کو بڑی بڑی جاگیریں عطا ہوئی ہیں اور وہ ریاست کے سر برآوردہ اور ممتاز اراکین میں شمار کئے جاتے ہیں۔

اعلیحضرت نواب صاحب جوناگڈھ کے قریبی عزیز ہونے کی وجہ سے آپ کا بچپن محلات میں گذرا اور انتہائی ناز و نعم کے ساتھ پرورش پائی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم بھی یہیں سے شروع ہوئی۔ گجراتی ورنیکلر کا امتحان پاس کر کے آپ مہابت خاں مدرسۃ العالی (مدرسہ جاگیرداران) میں داخل ہو گئے۔ جہاں کچھ عرصہ اُردو اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بعض خانگی امور نے آپ کو ترکِ تعلیم پر مجبور کر دیا۔ مدرسہ چھوڑنے کے بعد آپ نے مطالعہ کو اتنا وسیع کیا کہ اردو انگریزی اور گجراتی زبانوں میں خاص مہارت پیدا کر لی۔ اُردو ادب و شعر سے آپ کو فطرتاً لگاؤ ہے اور اس میں بیحد دلچسپی لیتے ہیں۔ اُردو میں شعر گوئی اسی دلچسپی اور فطری ذوق و شوق کا نتیجہ ہے۔ آپ کا کلام صاف۔ بندشیں چست اور زبان بامحاورہ ہوتی ہے۔ آپ اکثر مشاعروں میں بھی شرکت فرماتے ہیں۔ عام طور پر آپ کا کلام پسند کیا جاتا ہے۔ آپ کا مجموعہ کلام "جہانِ رازؔ" کے نام سے زیرِ طبع ہے۔ ریاستی مشاغل کے باوجود آپ فکرِ سخن کے لئے کسی نہ کسی طرح وقت نکال لیتے ہیں۔

رازؔ صاحب بیحد ذہین اور طباع واقع ہوئے ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ بااخلاق اور ملنسار بھی ہیں۔ آپ اعلیحضرت نواب صاحب جوناگڈھ کے عزیز اور ہمزلف ہیں اور فی الحال خاندانِ شاہی کے خانگی امور کے نگراں (CONTROLLER OF HOUSE HOLD) اور ہر ہائینس کوتیانہ بیگم صاحبہ و ہر ہائینس رانی صاحبہ کے پرائیوٹ سکریٹری ہیں۔ ان دونوں ممتاز عہدوں کے فرائض کو آپ بہ حسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

رازؔ صاحب کے کلام کی سادگی اور پُرکاری اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

میں پوچھنے لگوں تری کافر نگاہ کو ۔۔۔ دیدے وہ گر جواب لبِ بے سوال کا

جب ترا نقشِ پا نہیں ہوتا ۔۔۔ میرا سجدہ ادا نہیں ہوتا
روز مرتے ہیں روز جیتے ہیں ۔۔۔ تری الفت میں کیا نہیں ہوتا
میرا چاہا کبھی ہوا ہے نہ ہو ۔۔۔ آپ چاہیں تو کیا نہیں ہوتا

سادگی کے ساتھ بلند خیالی ان اشعار سے مترشح ہے ؎

یہ زندگی ہی عشق ہے اور عشق زندگی ۔۔۔ پھر زندگی ہی کیا جو محبت نہیں رہی

شوقِ نظارہ اگر ہو آنکھ کو ۔۔۔ ذرے ذرے میں جمالِ یار ہے
آرزو پر ہے مدارِ زندگی ۔۔۔ زندگی بے آرزو بیکار ہے

سنتے ہی وہ الاکرن تھا اس کی حدیثِ زندگی ۔۔۔ شمع تمام ہو گئی لذتِ سوز و ساز میں

اعجاز صدیقی

تحقیق و تصحیح

استفسار:-

۱۔ حسب ذیل سوالات کے جوابات بذریعہ شاعر مرحمت فرمائیں۔

(الف) حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہ نے "رازِ عروض" کے آخری صفحات میں متروکات کی جو فہرست دی ہے۔ اسکی تقلید شعرائے شاعرہ "شاعر" کے لئے فروری ہو یا نہیں؟ "شاعر و شاعرہ" میں، میں اکثر دیکھتا ہوں کہ شعرا متروکات کو برابر استعمال کرتے رہتے ہیں شامِ غم، ہمدم وغیرہ۔

سلیمان صاحب جالندہری کا مطلع ہے ؎

کیا کوئی رکھے ساغر و مینا مرے آگے — کم ظرف ہے جب وسعتِ دریا مرے آگے

"رکھے" کا کاف مشدد ہونا چاہئے تھا۔ غیر مشدد اب متروک ہے (شاعر جون ۱۹۴۱ء)

(ب) "شاعر" جون ۱۹۴۱ء میں نجمہ صاحبہ کا ایک شعر ہے:-

وہ ہیں جنکو درد کا احساس ہی نہیں — اک ہم ہیں درد و یاس کی دنیا لئے ہوئے

میرے خیال میں اگر "ہی" کی جگہ "تک" ہوتا تو شعر اور بلند ہو جاتا۔ اسکی معنوی خوبی بھی بڑھ جاتی۔

(ج) شاعر جون ۱۹۴۱ء صفحہ ۲ پہلا کالم گیارہویں سطر کا یہ فقرہ "تم نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی"۔ تم سنے کے ساتھ "فرمائی" کا استعمال کچھ بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے اگر طنزاً بولتے ہوں تو ثبوت چاہئے۔

(د) لفظ "تقّار" کا ماخذ کیا ہے؟ اسکے معنی کیا ہیں، فصحا اسے بولتے لکھتے ہیں یا نہیں؟

(ہ) "شاعر" جون ۱۹۴۱ء صفحہ ۲ "رازِ لا" کے چوتھے شعر میں "طلاطم" کے کیا معنی ہیں؟ کیا طلاطم کی املا طلاطم ہی صحیح ہے جبکہ بابِ تفاعل کا مصدر ہے۔

(و) صفحہ ۲۴ "یادِ ماضی" کے دوسرے کالم پندرھویں سطر کا یہ فقرہ "جو آگ دہک رہی ہے اسے ٹھنڈا کردو" میرے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ "ٹھنڈی کردو" ہونا چاہئے۔

(ز) "شاعر" جون ۱۹۴۱ء صفحہ ۴ میں اصلاحِ سخن کی توجیہ فرماتے ہوئے آپ نے لکھا ہے "وفا کے ساتھ اندوہ ہو تو وفا، وفا نہیں رہتی"، حالانکہ "اندوہِ وفا" کی ترکیب کو غالب نے بھی استعمال کیا ہے ؎

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

جواب:-

(۱) الف۔ مولانا نے جو متروکات کی فہرست دی ہے اُسکا اتباع صرف اُن کے تلامذہ کے لئے لازمی ہے۔ اگر دوسرے لوگ مانیں تو فبہا نہ مانیں تو اُن پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

(ب) "ہی" کی بجائے "تک" سے مفہوم میں کوئی بڑا فرق پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ "ہی" سے جو ایک قسم کا تعجب انگیز شکوہ استغنا مترشح ہوتا ہے وہ "تک" سے نہیں ہوتا۔ ایک لفظ کئی مترادف الفاظ سے بدلا جا سکتا ہے لیکن جب وہ لفظ سریع الفہم اور قریب المقصود ہو تو اُس کا بدلنا لاحاصل ہے۔

(ج) "فرمائی" کی جگہ "کی" ہونا چاہئے۔

(د) "تقّار" عربی میں میری نظر سے نہیں گذرا۔ جہلا اچھی تقریر کرنے والے کو عموماً "تقّار" کہتے ہیں مگر اہلِ زبان میں یہ لفظ تحریراً یا تقریراً کہیں مستعمل نہیں۔

(ہ) "تلاطم" کے معنی باہم تھپیڑے مارنا، اور تھپیڑے کھانا ہیں۔ دریا یا سمندر کی موجیں جب آپس میں تھپیڑے کھاتی ہیں تو اُسے "تلاطم" کہتے ہیں۔ میں "تلاطم" کا املا "ت" کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں۔

(و) یہاں ٹھنڈا ہی درست ہے۔ جب اظہارِ صفت مقصود ہوگا تو وہاں ٹھنڈی کہیں گے۔ "آگ تو بالکل ٹھنڈی پڑی ہے۔ آگ ٹھنڈی ہو گئی وغیرہ۔ اس جملے کو یوں کہہ سکتے تھے کہ "آگ ٹھنڈی کردو" لیکن اُسے یا اُس کو۔ کے ساتھ ٹھنڈا کرنا ہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔

(ز) میرا مقصد یہ تھا کہ اگر وفا کرنے میں اندوہ محسوس ہو تو ایسے وفا نہ کرنا اچھا۔ وفا کے ساتھ اندوہ نہیں بلکہ جذبۂ ایثار و محبت ہونا چاہئے۔ غالب کے یہاں "اندوہِ وفا" غم یا یاس کا مظہر ہے۔ یعنی وفا کرنے کے بعد جو مایوسی ہوئی اُسکے غم سے نجات پانا چاہتے تھے۔

اعجاز صدیقی

موحدِ اعظم

عزازیلؑ ۔۔۔ یا ۔۔۔ شیطان (علیہ ما علیہ)

وہ اک تنہا موحد، وحدت و کثرت کی محفل کا
وہ اک یکتا مبلغ، شعبۂ عرفانِ کامل کا

فرشتوں کا معلم، عالمِ ملکوت کا عالم
وہ عارف بشر جبروت کا، ناسوت کا عالم

بشر سمجھا نہ ابتک مرتبہ دنیا میں ٹھیک اُس کا
کہ ترکِ شرک و بدعت میں نہیں کوئی شریک اُس کا

وہ صرف اللہ کو ارض و سما میں پوجنے والا
علی الرغم ملائک جس نے حکمِ سجدہ کو ٹالا

وہ ناری جس کا سوزِ عشق میں کوئی نہیں ثانی
سراپا آگ جس کا جسم، لیکن روح نورانی

محبت کب پرستش غیر کی تسلیم کرتی ہے
محبت اقتضائے حسن میں ترمیم کرتی ہے

محبت میں روا غیروں کو سجدا ہو نہیں سکتا
سجودِ ماسوا ہرگز گوارا ہو نہیں سکتا

یہی جذبہ رہا ہے فطرتِ عشقِ مجاز اب تک
کہ عاشق غیر کی تحریم سے ہے بے نیاز ابتک

"تمھیں چاہوں، تمھارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں"
"مرا دل پھیر دو، مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا"

تو پھر عشقِ حقیقی میں کہاں گنجائشِ شرکت
حقیقت دوست کو زیبا نہیں آلائشِ شرکت

عزازیل اور خدا میں واسطہ تھا حسن و الفت کا
ہوا عدوان سرزد، یہ تقاضا تھا محبت کا

جبینِ حسن پر لاکھوں شکن آئیں ادا یہ ہے
مگر عاشق نہ اپنی وضع کو چھوڑے، وفا یہ ہے

سلیمہ مضطر خیرآبادی۔

خدا کے سامنے سجدہ بشر کو نقصِ غیرت تھا
یہی فرضِ عبودیت یہی حقِ محبت تھا

بہ ذہنِ عشق حنبطِ سجدۂ آدم نمی گنجد
میانِ طالب و مطلوب سایہ ہم نمی گنجد

کبھی یہ بات آئی تیری تخئیل کہن میں بھی
کہ جو قوت ہے یزداں میں وہی ہے اہرمن میں بھی

کبھی پہونچا ہے تو شیطان کی حدِ محبت تک
جو اپنی قوتوں کے ساتھ زندہ ہے قیامت تک

خدا کے ساتھ "اعوذ"[1] میں استحکام ہے اس کا
کلام اللہ میں سب سے زیادہ نام ہے اس کا

یقیناً "قادر و قدرت" کے ہے وہ رازداروں میں
کہ آدم تک پہونچ جاتا ہے جنت کے حصاروں میں

یہ بن کر آگ، پانی، خاک بنکر اور ہوا بنکر
حکومت کر رہا ہے نفس پر تیرے خدا بن کر

تجھے گمراہ کرنا بھی تقاضائے محبت ہے
کرے کیوں اس سے الفت کوئی جس سے اس کو الفت ہے

خلل انداز ہے وہ اس لئے تیری نمازوں میں
کہ شرکت تیری ہو جائے نہ اس کے خاص رازوں میں

خدا نے پیروی سے اس کی تجھ کو منع فرمایا
کہ تجھ پر سوزِ شیطاں کا نہ پڑ جائے کہیں سایا

کہیں تو بھی نہ دردِ عشق کی الجھن میں پڑ جائے
مبادا یہ شرر اڑ کر ترے ایندھن میں پڑ جائے

کہیں تو ہو نہ جائے مقصدِ ہستی سے بیگانہ
کہیں تو ہو نہ جائے عشق کی مستی میں دیوانہ

تجھے عشقِ مجازی کی گوارائی بھی مشکل ہے
کہاں تاب و تبِ عشقِ حقیقی تیرے قابل ہے

تو مشتِ خاک و سوزِ عشق از افلاک بالاتر
گدازِ عاشقی از ظرفِ مشتِ خاک بالاتر

سرشتاً تجھ کو ہونی چاہئے شیطان سے نفرت
کہ تیرے باپ کو سجدہ نہ کرنا اسکی تھی نیت

مگر یہ کفر تھا اس کا ترے اسلام سے بہتر
ادائے خاص تھی اس کی شعارِ عام سے بہتر

یہ تیرا سجدۂ رسمی ہے اک نوعِ ریاکاری
اور اس کا سجدے سے انکار تھا شرکت سے بیزاری

ہے سر سجدے میں اور "سبحان ربی" گن رہا ہے تو
یہ سجدہ کر رہا ہے تو، کہ گنتی گن رہا ہے تو؟

[1] اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔

جو ساری عمر یوں سجدا کرے تو فائدہ کیا ہے؟ ریاکاری میں سر مارا کرے تو فائدہ کیا ہے؟

"وہ سجدہ کیا ہے[۱] احساس جس میں سر اُٹھانے کا"
"عبادت اور بقیدِ ہوش، توہینِ عبادت ہے"

خدا کو کر دیا محدود تو نے بام اور در میں
کبھی سجدے ہیں مسجد میں کبھی سجدے ہیں مندر میں
مگر شیطان کا صبحِ ازل یہ صاف منشا تھا
اشارہ ہو تو ذرّاتِ دو عالم پر کرے سجدا
اُدھر یہ ضد کہ ہو مسجودِ خاکِ آدمؑ اولیٰ
اِدھر یہ پیچ کہ سجدہ ماسوا کو ہو نہیں سکتا
نیاز و ناز کا یہ راز سمجھا ہے کبھی تو نے؟
بغیرِ شمع پروانے کو دیکھا ہے کبھی تو نے؟
وہاں اک ترکِ سجدہ سے ہوئی یہ برہمی پیدا
قضا کتنے ہوئے ہیں تیرے سجدے۔ کر حساب اُن کا!

"گیا[۲] شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے"
"اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا"

ترے سجدے بہت ارزاں ہیں دُنیائے ریائی میں
میں واقف ہوں خدا تیرے ہیں لاکھوں اس خدائی میں
کبھی سجدے ہیں تیرے آستانے پر حکومت کے
کبھی ہیں کعبۂ مسجود دروازے قیادت کے
کبھی تو حُسن کے قدموں پہ سجدہ ریز ہوتا ہے
ترا ہر ایک سجدہ معصیت انگیز ہوتا ہے
درخت و سنگ اور ابر و ہوا مسجود ہیں تیرے
ہیں جتنے اہلِ سرمایہ یہ سب معبود ہیں تیرے
وہ ہی سجدا خدا کو اور وہ ہی سجدہ ہے انساں کو!
ترے نقصِ پرستش پر ہنسی آتی ہے شیطاں کو
حکایات و روایاتِ کہن میں مبتلا ہے تو
یہ تقلیداً فقط، شیطاں پہ لعنت بھیجتا ہے تو
کہ جب وہ یاد آ جاتا ہے، تو "لاحول" پڑھتا ہے
خدا کی یاد اُس کی یاد کا گویا نتیجا ہے
تو کہتا ہے کہ شیطاں باعثِ غفلت ہے یزداں سے
میں کہتا ہوں کہ ہے تمیزِ یزداں صرف شیطاں سے
سمجھ اُس کے مراتب اُس کا مشرب اور کام اُس کا
تری اس لعنت و نفرت سے اونچا ہے مقام اُس کا

تجھے انساں بننے کی ابھی توفیق حاصل ہے
مگر اے آدمی شیطان بننا سخت مشکل ہے

منظومہ ۱۲ مئی ۱۹۴۱ء — سیماب اکبرآبادی

---

[۱] میری غزل کا ایک شعر
[۲] ذوق دہلوی مرحوم

شبلی شاعر کی حیثیت سے

تصویر کا دوسرا رُخ

اردو زبان کے محسنوں اور مایۂ ناز انشا پردازوں کی اگر کوئی فہرست تیار کی جائے تو علامہ شبلی نعمانی مرحوم کا نام "سرِ فہرست" نظر آئیگا۔ جس طرح اُردو شاعروں میں غالب کو ہم کسی طرح بھول نہیں سکتے، بالکل اسی طرح شبلی نعمانی کو اُردو انشا پردازوں میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ شبلی کا اسلوبِ نگارش ہمارے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے، اور اُن کی تصانیف، ادب کی ہر منزل میں ہمارے لئے دلیلِ راہ ہیں۔ جہاں تک زبان کے چٹخاروں اور ٹکسالی زبان کے محاوروں کا تعلق ہے، دہلی کے بہت سے انشا پرداز اس منزل میں شبلی سے زیادہ تیز گام نکلیں گے۔ مگر جہاں تک علمی انداز میں مسائل کی تشریح، عنوانات کی تبویب اور مواد کے پھیلانے کا تعلق ہے، اُردو زبان کا کوئی ادیب، شبلی کا حریف نہیں۔ شبلی کا قلم سنگلاخ سے سنگلاخ وادی میں پھول برساتا ہے۔ تاریخ کا موضوع کتنا خشک ہے، مگر شبلی کے تاریخی مضامین کی دلکشی اور جاذبیت کا یہ عالم ہے کہ کتاب اُٹھا کر، رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ پوری کتاب ختم کر کے ہی دم لیجئے

شبلی تھوڑے سے مواد کو بہت سے صفحات پر پھیلانے کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس پھیلاؤ میں تکرار نہیں ہونے پاتی۔ شبلی کا شمار بھی دُنیا کے اُن مشاہیر میں ہوتا ہے۔ جن کی زندگی کا ایک رُخ اتنا نمایاں ہو جاتا ہے کہ دوسرے رُخ کی خصوصیات کی طرف لوگ متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ نیشاپور کے فلسفی اور حکیم عمر خیام کو عام طور پر لوگ شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں حالانکہ وہ اپنے دور کا مایۂ ناز فلسفی اور مہندس بھی تھا۔ اکبر الہ آبادی کو لوگ مزاحیہ نگار یا زیادہ سے زیادہ طنز کرنے والا شاعر سمجھتے ہیں حالانکہ اُن کا تغزل اُردو شاعری کی معراج کہا جا سکتا ہے۔ دُنیا کی یہ بڑی ناانصافی ہے کہ وہ اہلِ کمال کی صرف ایک ہی خصوصیت میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے اور دوسری خصوصیتوں کو قابلِ التفات نہیں سمجھتی۔ دنیا کی ناقدری کی انتہا ہے کہ ایک عالم، محدث اور فقیہہ کو وہ صرف ہارون الرشید کے دربار کے "گویّے" اور "بربط نواز" کی حیثیت سے جانتی اور پہچانتی ہے۔

شبلی کیساتھ بھی دُنیا نے یہی سلوک کیا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ شبلی بہت اچھے شاعر تھے۔ غالب کے بعد لوگ سمجھتے تھے کہ خالص ایرانی انداز میں فارسی شعر کہنے والا اب ہندوستان کی خاک سے پیدا نہ ہوگا۔ لیکن شبلی نے لوگوں کے اس اندازے کو غلط ثابت کر دیا۔ اُن کی غزلوں اور قصیدوں میں وہی ایرانی ٹھاٹ نظر آتا ہے۔ شبلی کی شاعری میں ترنم اور بیساختگی کیساتھ، شوخی اور چلبلاپن نظر آتا ہے۔ مجھے تو اُن کی فارسی غزلیں پڑھ کر ہمیشہ حیرت ہوتی ہے کہ سیرۃ النبیؐ الفاروق اور سیرۃ النعمان جیسی سنجیدہ اور ثقہ کتابوں کا مصنف اتنی شوخ اور رنگین باتیں شعر میں کس طرح بیان کر جاتا ہے۔ اُردو میں اُن کی تاریخی نظمیں بہت زیادہ قابلِ قدر ہیں، لیکن افسوس کہ ہم اُن کو بھولتے جا رہے ہیں۔ مشہور فلم "پکار" کا پس منظر شبلی کی مشہور نظم ہے، جس کا آخری مصرعہ ہے:-

"تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من"

شبلی کی صرف یہی نظم اُن کے کمالِ شاعری کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

میری نظر سے شبلی کے خطوط گذرے، ان میں شبلی کے اشعار دیکھ کر جی چاہا کہ اُن کے کمال کے اس رُخ کو تھوڑا بہت نمایاں کر دوں۔ یہ مضمون اسی نظریہ کے تحت لکھا جا رہا ہے۔ اُن کے کلام پر مفصل تبصرہ اگر حالات مساعد رہے تو کتابی صورت میں کروں گا۔ سرِ دست چند ناتمام نقوش حاضر ہیں۔

اصلاحِ سخن

اپنے کسی شناسا کو جو شاعر بھی ہیں (میرے پاس خطوطِ شبلی کا جو مجموعہ ہے اُس کے چند اوراق ضائع ہو گئے ہیں،

لہذا افسوس ہے کہ مکتوب الیہ کے نام کا پتہ نہیں چلتا) لکھتے ہیں:۔

"غزل دیکھی ماشاء اللہ اب تو آپ بہت پختہ کہنے لگے ہیں، اب کے بھی نکتہ چینیاں کرتا ہوں، لیکن زبردستی ڈھونڈ کر نکالی ہیں۔

ز رشکِ حُسنِ تو تلخ ست عیشِ شیریں را
ز تابِ زلف سیاہ ست روئے لیلیٰ را

ترصیع کا تو اذن چاہتا ہے کہ دوسرے مصرع میں بھی خطاب کا حرف ہو یعنی ز تابِ زلفِ تو ... الخ!

ز عکسِ روئے تو آئینہ روکشِ گلزار
بہ نطقِ شادکُنِ طوطیٔ شکر خارا

پہلے مصرع میں فعل نہیں اور دوسرے میں ہے، اس سے دونوں مصرعوں کا تناسب اور تقابل کم ہو جاتا ہے۔ ترصیع میں اس کا لحاظ رکھتے ہیں"۔

علامہ شبلی کے اس تنقیدی شورے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے شاعر دوستوں کو شعر و سخن میں مشورہ بھی دیتے تھے اور شاعری کے "اصولِ اصلاح" کی نزاکتوں سے باخبر تھے۔ اوپر لکھے ہوئے شعروں میں بظاہر کوئی سقم نظر نہیں آتا، لیکن شبلی کی تنقید پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ شعر کہنے والے سے چوک ہوگئی۔ شبلی چاہتے ہیں کہ شعر کو بلند سے بلند طریقہ پر، تمام ظاہری اور باطنی، لفظی اور معنوی خوبیوں کے ساتھ پیش کیا جائے، یہ بات اُن کے شاعر اور بلند شعر فہم ہونے کی دلیل ہے۔

شبلی کی یہ تنقید اُن بے راہ رو شاعروں کے لئے اپنے اندر عبرت و بصیرت کے اسباب رکھتی ہے جو بغیر سوچے سمجھے الفاظ جوڑ کر شعر "تصنیف" فرما دیتے ہیں۔ لوگوں نے "شاعری" کو "حلوائے بے دود" بلکہ اس سے بھی آسان اور سہل سمجھ رکھا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایک دنیا "شاعر" ہوئی جا رہی ہے، میں نے بہت سے نوجوانوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی جیبوں میں اپنی چھپی ہوئی غزلوں کے تراشے ڈکٹنگ ہا لئے پھرتے ہیں اور کسی نہ کسی عنوان سے بات نکال کر اُن تراشوں کو دکھاتے ہیں۔

میں کہاں سے کہاں نکل آیا، ہاں! تو میں شبلی کے ایک مکتوب کا ذکر کر رہا تھا، یہ خط شبلی نے اپنے قیام حیدرآباد دکن کے زمانہ میں لکھا ہے اور اپنی ایک نظم کا ذکر کرتے ہوئے دو شعر درج کئے ہیں۔ حیدرآباد دکن کی تعریف میں ہے ؎

ہندیاں نیز چو از حلقہ بگوشانِ تواند
ہر چہ ذیشاں بود آں نیز کنوں ہا از تست
ہاں! تو دعویٰ کن و ما نیز مسلّم داریم
شبلیِ سحر فن و داغِ غزلخواں از تست

دوسرا شعر کتنا بیساختہ اور رواں ہے آہ! وہ بھی کیا زمانہ تھا جب حیدرآباد میں شبلی اور داغ جیسے مشاہیر اور اساتذۂ فن جمع تھے۔ اُس انجمن کا تصور کیجئے جہاں شبلی اور داغ آپس میں معانقہ کرتے ہونگے، اُن کا معانقہ آفتاب اور ماہتاب کی "بغل گیری" تھی۔

اُردو کے چند شعر

مولانا ظفر علی خاں سابق ایڈیٹر "زمیندار" کے نام شبلی نے ایک خط لکھا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ ریاست ہائے بلقان، ترکی کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ تمام عالمِ اسلام میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ ہر مسلمان کا دل قسطنطنیہ کی طرف کھچا جاتا ہے۔ ہندوستان میں بہادر اور غیور ترکوں کی امداد کے لئے امدادی فنڈ کھولا گیا۔ عید الضحیٰ کا زمانہ تھا علامہ شبلی نے فتویٰ دیا کہ قربانی کی قیمت ترکوں کو دی جا سکتی ہے۔ علماء اس فتویٰ کے خلاف تھے۔ علامہ شبلی اپنے خط میں لکھتے ہیں:۔

مراکش جا چکا، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے ۔۔۔ کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ نیم جاں کب تک
بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی ۔۔۔ چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک

حریفوں کو گلہ ہے آسماں سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں گے ان کی کھیتیاں کب تک

بالکل وقتی اور ہنگامی نظم ہے، لیکن اس کو پڑھ کر آج بھی دل بیقرار ہو جاتے ہیں، شبلی کے جذبۂ اسلامی اور دردِ قومی پر بحث کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔ شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے ان شعروں کو دیکھو تو تمہیں ہر شعر اپنی جگہ مکمل نظر آئے گا۔

آج ژولیدہ بیانی اور شعروں میں دقیق اور ہمالیائی جیسے الفاظ کی بھرمار کا عام مرض ہو گیا ہے، شبلی مرحوم جو علومِ شرقیہ کا مستند عالم تھا کتنے سادہ اور عام فہم الفاظ میں جذبات کی ترجمانی کرتا ہے! تیسرے شعر میں تو شبلی نے اپنے خونِ جگر کو

حل کر دیا ہے۔

تشبیہ کا کمال

ایک دوسرے خط میں اپنے ایک شناسا کو علامہ شبلی اپنی غزل کے چند اشعار لکھ کر بھیجتے ہیں، دوسرا شعر ہے:-

بودہ ام در بزمِ مے با محتسب ہم ہمنشیں

گرچہ این صحبت مرا بسیار شاق افتادہ بود

پہلے مصرعہ میں "ہم" کی تکرار کیا بہار دے رہی ہے! شیخ و زاہد اور شحنہ و محتسب کی مذمت، شاعری کا خاص موضوع ہے، شبلی نے کسقدر نادر الفاظ میں محتسب پر طنز کی ہے کہ شعر کو بار بار پڑھئے اور لطف لیجئے! شعر میں ترنم اور روانی اس بلا کی ہے کہ گنگنانے کو جی چاہتا ہے ؎

از دلِ صد پارہ ات آگہ نیم شبلی ولے

شیشۂ دیدم کہ از بالائے طاق افتادہ بود

"دلِ صد پارہ" کو طاق سے گرے ہوئے شیشہ سے تشبیہ دے کر، شاعر نے شعر کو "سحرِ حلال" بنا دیا۔

آئینِ ہم آغوشی

شبلی بمبئی میں ہیں، وہی بمبئی جس کی تعریف کے لئے شبلی نے حافظ شیرازی کے مشہور شعر میں تصرف کر ڈالا ؎

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت

کنارِ آبِ چوپاٹی و گلگشتِ اپالو را

نگارِ حسن میں کس لئے بمبئی میں کس بات کی کمی ہے۔ اُن کا فرانہ مناظر نے علامہ شبلی سے بھی غزل کہلوا کر چھوڑی، اُن کے دو شعر ہیں ؎

بنگر دستگہ حُسن کہ آں نرگسِ مست

ہم آمیختہ ہشیاری و مدہوشی را

لکھتے ہیں کمالِ حُسن تو دیکھئے کہ اُن مست نرگسی آنکھوں نے ہشیاری اور مدہوشی کو ایک دوسرے میں سمو دیا۔ مضمون لطیف تھا اُس کی مناسبت سے اتنے لطیف اور حسین الفاظ کا استعمال کیا ہے کہ شعر پڑھتے وقت زبان حلاوت محسوس کرنے لگتی ہے۔

دوسرا شعر کس قیامت کا شعر کہا ہے ؎

من فدائے بتِ شوخیکہ بہ ہنگامِ وصال

بمن آموخت خود آئینِ ہم آغوشی را

"معاملہ بندی" کی صنف میں یہ شعر آپ اپنی نظیر ہے۔ شبلی کے اس شعر کو متقدمین فارسی شعراء کے بہترین اشعار کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے، تصور کیجئے کہ نشاط و سرخوشی کے وقت "وہ" جس کے لئے آپ بے تاب ہیں خود ہی ہم آغوشی کے طریقے آپ کو سکھاتے ہیں۔ جوان آدمی تو اس شعر کو برداشت ہی نہیں کر سکتا، بوڑھا آدمی بھی شعر پڑھکر ایک بار پھریری لینے پر مجبور ہو جائے گا۔

اس شعر کے متعلق مولانا شبلی خط میں لکھتے ہیں:-

"میں نے تو ایک خیالی بات کہہ دی، لکھنؤ کے ایک صاحب کے سامنے اخیر کا شعر پڑھا تو کہنے لگے اس کالج کے پروفیسر نہیں مل سکتے ہیں!"

شاعر کو جھٹلانے کا دوسرا آدمی حق نہیں رکھتے لیکن ہم تو اس شعر کو "عطیۂ فطرِ شاعر" سمجھتے ہیں۔

ایک رنگین غزل

۳ فروری ۱۹۰۸ء کو بمبئی سے شبلی نے ایک خط میں غزل کہہ کر بھیجی ہے بمبئی سے شبلی بہت زیادہ متاثر ہیں اور وہاں پہونچکر اُن کی شاعرانہ فطرت رنگ پر آجاتی ہے۔ چنانچہ اس غزل کے متعلق خود ہی لکھتے ہیں:-

ایں غزل اوّلِ فیضِ اثرِ بمبئی است

باش تا بادہ ایں میکدہ در جوش آید

اس غزل کا مطلع دیکھئے ؎

ساقیٔ مست چو سوئے منِ مدہوش آید

ساغر از کف بنہد میکدہ بردوش آید

پورا شعر کیف و مستی میں ڈوبا ہوا ہے ؎

من بدانم کہ کنار از ہمہ عالم گیرم

گر مرا ایک صنمے شوخ در آغوش آید

شعر تو حافظہ سے محو ہو گیا، لیکن اتنا یاد پڑتا ہے کہ قاآنی نے بھی اس مضمون کو ایک شعر میں باندھا ہے، مولانا کے اس شعر میں سارا لطف "ایک" کا ہے!

ناصحا! زحمتِ بے صرفہ بجانم مپسند
من نہ آنم کہ مرا پندِ تو در گوش آید

اس شعر میں ردیف کا (FORCE) نہیں بلکہ ردیف کے تیور دیکھئے!

مستی و عربدہ کارے چو منے نیست ولے
چشمِ ساقی ست کہ ناراج گرِ ہوش آید

پورا شعر "موجِ کوثر و سلسبیل" ہے۔ روانی، سادگی اور پرکاری کی معراج!

حالیا یک نگہِ ناز ازاں سادہ بس است
آں بود نیز کہ بے باک در آغوش آید

شاعر وصل سے پہلے ایک سادہ نگاہِ ناز ہی پر اکتفا کرنا چاہتا ہے اور یہ بالکل فطری تقاضہ ہے! "حالیا" اور "نیز" کا لطف اہلِ ذوق کا وجدان ہی لے سکتا ہے۔

مقطع کہا ہے، اور کس ٹھاٹ کے ساتھ کہا ہے ؎

باش تا شبلیِ آزاد بہ زیبا صنمے
از در صومعہ تا میکدہ ہمدوش آید

غزل لکھنے کے بعد، شبلی خط میں لکھتے ہیں:-

"افسوس یہ ہے کہ ہم نہ صرف پارسائی میں، بلکہ رندی میں بھی عالم بے عمل ہیں!"

یہ نثر کا ٹکڑا خود اپنی جگہ ایک مکمل شعر ہے!

رسالہ "شاعر" ہمارے شاعروں کا نقیب ہے، اس لئے میں نے یہ مضمون "شاعر" ہی میں چھپوانا مناسب سمجھا، شبلی کی شاعری کی طرف اشارہ کرکے میں ناظرین سے رخصت ہوتا ہوں، میں نے ایک ذرا سا گوشہ اُٹھا دیا ہے۔ آپ کو ذوق ہے تو پوری نقاب اُٹھا دیجئے!

(خاص)

ماہر القادری

گھٹا

کالی گھٹا ستار بجاتی ہوئی اُٹھی
ساون کے گیت جھوم کے گاتی ہوئی اُٹھی

آبِ رواں کا فرش بچھاتی ہوئی اُٹھی
پھولوں سے گل کدوں کو سجاتی ہوئی اُٹھی

آبادیوں میں دھوم مچاتی ہوئی اُٹھی
طوفان وادیوں میں اُٹھاتی ہوئی اُٹھی

سرمستیِ بہار کا رنگین آئینہ
خلوت گہِ اُفق سے دکھاتی ہوئی اُٹھی

دامانِ سرمگیں میں سمندر لئے ہوئے
لعل و گہر زمیں پہ لٹاتی ہوئی اُٹھی

کیفیتِ شباب میں رقصاں و نغمہ خواں
دُلہن کوئی جمال دکھاتی ہوئی اُٹھی

کوئل کی نے میں، سرد ہواؤں کے بھیس میں
پیغامِ برشگال سُناتی ہوئی اُٹھی

تنگ آ چکا تھا حدتِ خورشید سے جہاں
خورشید کی تپش کو مٹاتی ہوئی اُٹھی

دیتی ہوئی سموم کو خاصیتِ بہار
بے کیفیوں میں کیف بڑھاتی ہوئی اُٹھی

اندازِ بے تکلفِ رقص و سرود سے
چشم و دل و جگر کو لبھاتی ہوئی اُٹھی

آباد و شاد باش! کہ کالی گھٹا ابد
کیفیتوں کے جام لنڈھاتی ہوئی اُٹھی

آبد سرہندی

جہانِ آرزو

جفا کے واسطے بھی ہوں تو کیا بُرا ہوں میں — یہ کم نہیں کہ ترے دل کا مدعا ہوں میں

وہ لے رہے ہیں سہارا جھجک رہا ہوں میں — دُعا اُٹھا ہوئے دل کا حوصلا ہوں میں

ہنسی یہ برق کی سینے میں ہوک اُٹھتی ہے — وہ کر رہے ہیں اشارے سمجھ رہا ہوں میں

عزیز ہوگی بھلا کس کو اب حقیر سی جان — ذرا سمجھ کے کہو تیرا خونبہا ہوں میں

تلاشِ دوست کے سب راستے نکل آئے — جہاں یہ سوچنے بیٹھا کہ آپ کیا ہوں میں

وہ میرے منہ سے اُگلوا رہے ہیں راز مرا — یہ بے سُنے ہوئے کہکر کہ جانتا ہوں میں

فدائے لذتِ آزار کچھ نہیں کھلتا — کہ ہنس رہا ہوں تو پھر کیوں تڑپ رہا ہوں میں

کرم کا موجۂ ساحل نما تھا دامِ فریب — سمجھ کے عیش مصیبت میں پھنس گیا ہوں میں

قیامت آئیگی جس دن تڑپ کے لی کروٹ — ابھی تو رنگ زمانے کا دیکھتا ہوں میں

پہونچ کے بھی سرِ منزل تلاش باقی ہے — کہ وہ ملے ہیں تو اب آپ کھو گیا ہوں میں

غضب ہیں آرزو آدابِ عشق کی خلشیں

بچھے ہیں راہ میں کانٹے برہنہ پا ہوں میں

آرزو لکھنوی

شعلۂ آواز

التفاتِ ناز کی باتیں گئیں — عشق کے آغاز کی باتیں گئیں

اب قفس سے آشیاں نزدیک ہے — حسرتِ پرواز کی باتیں گئیں

میں نے خلوت میں جو اپنے دل سے کیں — عرش تک وہ راز کی باتیں گئیں

بے زبانی کی زبانی دور تک — نرگسِ غمّاز کی باتیں گئیں

غیرتِ ناہید اب کوئی نہیں — شعلۂ آواز کی باتیں گئیں

اُٹھ گیا وہ مطربِ آتش نفس — اب وہ سوز و ساز کی باتیں گئیں

نغمۂ اقبال کے آگے ظہیر

بلبلِ شیراز کی باتیں گئیں

ظہیر الدین حیدر

خون کی کھاد

"دیکھو بابوجی ابھی تک بدھوا نہیں آیا"

"آیا جاتا ہے بیٹی!"

"آخر کب تک آئے گا، سات تو بج گئے؟ پانی نہیں ہے۔ لکڑی بھی پھاڑنی ہے۔ یہ سب کب ہوگا؟ میں روٹی کب بناؤں گی؟"

"تھوڑا اور صبر کرو بیٹی! آدمی ہے کام لگ ہی جاتا ہے"

"بس، تم تو سب پر رحم ہی کرنا جانتے ہو، اسی سے تو نوکر سر چڑھ جاتے ہیں"

"ارے میرے سر پر تو ٹوپی بھی نہیں چڑھ پاتی، آدمی کیا چڑھے گا؟"

"بس تم تو میری بات اسی طرح ہنسی میں اڑا دیتے ہو" اتنا کہہ کر رجنی مصنوعی غصے کے ساتھ چلی گئی۔ میں لکھنے میں ہمہ تن مشغول ہوگیا۔ ایک گھنٹہ کے بعد وہ پھر آئی اور بولی "اب تو آٹھ بج گئے، بابوجی! وہ ابھی تک نہیں آیا"

اب تو مجھے بھی فکر ہوئی۔ میں اٹھا۔

رجنی بولی "اب ذرا اُسے سخت سست تو کہنا، بابوجی! کہنا کہ اگر ایسا کروگے تو نوکری سے برطرف کر دئے جاؤ گے۔"

رجنی کی بات سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ دل میں ایک درد سا اٹھا جیسے پرانا زخم عود کر آیا ہو، تاہم میں اپنے اس بڑھتے ہوئے درد کو دبا کر پھر کام کرنے میں مصروف ہوگیا۔ رجنی نے بھی میری سنجیدگی دیکھتے ہوئے بات کو زیادہ طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ میں پانی بھرنے لگا۔ لیکن رجنی نے رسی ہاتھ سے چھین لی۔ میں لکڑی چیرنے لگا۔ رجنی پانی بھر کر لائی۔ میں لکڑی چیر کر لایا اور روٹی پکنے لگی۔

روٹی پک گئی۔ ہم دونوں نے کھانا بھی کھالیا۔ لیکن بدھوا نہ آیا۔ رجنی برتن صاف کر رہی تھی اور بدھوا کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ اتنے میں بدھوا آگیا۔ رجنی کو امید تھی کہ میں بدھوا کو دیکھتے ہی اس پر برس پڑوں گا۔ لیکن اسکے برعکس میں نے محبت آمیز الفاظ میں دریافت کیا "کیوں بھائی آج تجھے اتنی دیر کیوں ہوگئی؟"

بدھوا سہم گیا بولا "میری لڑکی رات سے بیمار ہے، سرکار"

"ارے، رے تو پھر تو آیا کیوں؟ ہمارا کام تو ہو ہی جاتا۔ اب اسکی طبیعت کیسی ہے؟"

"ویسی ہی ہے سرکار!"

"اچھا تو جلدی واپس چلا جا"

"نہیں سرکار، جو کام رہ گیا ہے اُسے تو میں کر ہی لوں۔ میری وجہ سے بائی جی کو تو بہت ہی تکلیف ہوئی ہوگی؟"

"تو اس کی فکر نہ کر"

لیکن اس پر بھی بدھوا نے باقی کام پورا کیا اور اپنے قصور کی معافی مانگتا ہوا چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد رجنی بولی "اچھا ہوا بابوجی! تم نے اُسے پھٹکار نہ بتائی۔ بیچارے کی لڑکی بیمار ہے۔ آتے ہی اُسے پھٹکار دیتے تو اُسے کتنا صدمہ ہوتا۔ لیکن بابوجی یہ تو بتاؤ" تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اُس کی لڑکی بیمار ہے؟"

"مجھے کیسے معلوم ہوتا، بیٹی؟"

"تب بھی تمہیں غصہ کیوں نہیں آیا؟"

"بلا سمجھے بوجھے کسی پر غصہ کیوں کرتا؟ اگر غصہ کرنا ہی ہو تو پہلے بات پوری طور پر سمجھ لینی چاہئے"

"لیکن مجھے تو پہلے غصہ آتا ہے۔ بعد میں جب بات سمجھ میں آجاتی ہے تب تسکین ہوتی ہے"

"اک تو ہی کیا بڑے بڑے لوگ ایسی ہی نادانی کرتے ہیں۔ میں بھی پہلے ایسا ہی کرتا تھا۔ لیکن ایک ایسی بات ظہور میں آئی کہ میری یہ عادت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹ گئی"

"وہ کیا بات ہے بابوجی؟"

"پھر کبھی سناؤں گا۔"

"نہیں نہیں، ابھی سناؤ، ابھی۔"

مجھ سے وہ واقعہ سننے کے لئے مجھے اپنے دونوں ہاتھوں سے رجنی اس طرح جھنجھوڑنے لگی جیسے کوئی کھجور کے درخت کو ہلا کر کھجوریں توڑ رہا ہو۔ ضد دیکھکر میں وہ واقعہ اس وقت سنانے کے لئے مجبور ہوگیا۔ لیکن میں نے اُسے سمجھا دیا کہ اسے کہانی نہ سمجھنا بلکہ واقعہ سمجھنا۔

رجنی بولی "بھولی ہوئی۔ کہانی نہ سمجھوں گی۔ پوران سمجھونگی۔ تاریخ سمجھوں گی۔"

واقعہ کی یاد نے میرے چہرے پر غم اور تفکرات کے آثار نمایاں کردئے اور اتنے کہ رجنی کا تمسخر بھی مجھے نہ ہنسا سکا۔ خیر میں سنانے لگا۔

پندرہ سال پہلے کی بات ہے جب تو مٹی میں کھیلا کرتی تھی۔ اپنے یہاں ایک نوکر تھا جس کا نام مادھو سنگھ تھا۔ لیکن اُس کی زندگی میں کبھی کسی نے اتنا بڑا نام لینے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ لوگ اُسے مفلسی کیوجہ سے مادھو کہا کرتے تھے۔ کوئی کوئی تو مدو بھی کہدیتا تھا۔ پھر بھی وہ بلا کسی دل شکنی کے سب کو جواب دے دیتا تھا، میں اُسے مادھو کہتا تھا اور اتنی عزت سے کہ وہ شرمندہ ہو جاتا تھا۔

اُس کی بیوی کا نام تھا رادھیا یا رادھا۔ معلوم نہیں خدا کو ہی یہ منظور تھا کہ مادھو کو رادھا دی جائے یا مادھو نے جذبات شاعرانہ سے متاثر ہوکر اسکا نام رادھا رکھ لیا تھا۔ خیر جو کچھ بھی ہو نام سے کیا بحث؟

"ہاں تو اسی مُدّا کی طرح ایکدن وہ بھی صبح دیر سے آیا، ایسے کوئی قریب ۹ بجے، آتے ہی میں نے پاگل، اُلو، گدھا۔ پاجی۔ کام چور۔ کاہل، نکما۔ اور خدا جانے کیا کیا کہہ ڈالا اور پھر پوچھا "کیوں بے؟ آج اتنی دیر کیوں لگائی؟ کیا کچھ پیسے جمع کر لئے ہیں؟ مغرور ہوگیا ہے؟ نوکری نہیں کرنا چاہتا؟ اگر نہیں کرنی ہے نہ کر۔ مگر جب تک تو یہاں ہے تجھے ٹھیک وقت سے آنا پڑے گا۔ ورنہ میں تجھے علیحدہ کر دوں گا۔"

یہ تھا میرا سوال اب بیچارہ مادھو کیا جواب دیتا؟ ڈرتے ڈرتے بولا

"کل سے آپ کی رادھیا بیمار ہے۔"

مادھو نے سوچا کہ "آپ کی رادھیا" کہکر رادھیا کو میری پناہ میں چھوڑ دے لیکن میں اسوقت انسان نہ تھا۔ میں نے پھٹکارتے ہوئے جواب دیا "چل چل، بہانہ نہ بنا، آج تو بیمار ہے، کل سُرھیا بیمار ہے، پرسوں فلاں۔ نرسوں فلاں۔ اس طرح ہمیشہ بہانہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن اس طرح کام نہ چلے گا۔ نوکری سے علیحدہ کر دوں گا تو ساری بیماری دھری رہ جائے گی۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ کام کرتا ہے تو وقت پر آنا پڑے گا۔"

عموماً بڑے آدمیوں کی طرح میں بھی سمجھتا تھا کہ غریبوں کو بیمار ہونے کا کوئی حق نہیں ہے اور اگر وہ بیمار ہوں بھی تو انھیں آرام کرنے اور خدمت کرانے کی ضرورت نہیں۔ مادھو سے میں نے کیا کہا اور اس پر کیا گذر رہی ہے اسکا مجھے کچھ خیال نہیں رہا۔

مادھو کو رات کے ۹ بجے چھٹی ملتی تھی۔ لیکن کام پورا کرنے کے بعد وہ اکثر ۸ بجے ہی چلا جاتا تھا۔ میرا اس میں کچھ نقصان بھی نہیں تھا۔ اُس دن اُس نے کسی سے کچھ بات نہ کی۔ آنسو اُس نے بہائے یا پی لئے۔ مجھے اس کا علم نہیں۔ لیکن وہ اپنے پژمردہ چہرے سے رات کے ۹ بجے تک کام کرتا رہا۔ دوپہر کو اُس نے کھایا پیا بھی نہیں اور اس کی مجھے ذرا بھی فکر نہ ہوئی کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ غریب آدمی بھوک محسوس ہونے پر خود ہی کھا لیتا ہے۔ اُسے کھلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خیر، اُس دن جب گھڑی میں اس نے پورے نو بار ٹن ٹن سُن لئے جب گیا۔ میں نے سوچا میری پھٹکار کا اچھا اثر ہوا۔

مادھو دوسرے دن پھر دس بجے تک نہیں آیا۔ مجھے غصّہ تو آیا لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ شک بھی پیدا ہوا۔ کچھ رحم اور کچھ فکر بھی دامنگیر تھی سوچا کیا معلوم سچ مچ اس کی عورت بیمار ہو۔ کیوں نہ ایک بار اُسے دیکھ آؤں میری اس دلجوئی سے اسکی خدمت میں اضافہ ہوجائے گا یا اگر محض بہانہ بازی ہوگی تو پول کھل جائے گی۔

بس میں احسان جتانے کے لئے اُس کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستہ میں سوچتا چلا جا رہا تھا کہ آج سر پاؤں تک لادونگا اُسے احسان ۔ بار سے بوجھل کر دونگا میں اسکی جھونپڑی کے دروازے تک پہونچا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا

دیکھا کہ رَدھیا ایک چارپائی پر جس پر ایک چیتھڑا سا بچھا ہوا تھا پڑی ہوئی تھی۔ چارپائی کے ایک کونے سے سر لگائے ہوئے مادھو زمین پر بیٹھا تھا۔ شدتِ غم سے اسکی آنکھیں خشک ہو گئی تھیں، لیکن اُس کے رخسار شاہد تھے کہ اس سے پہلے روتے روتے ان پر گنگا جمنا کی دھاریں بہہ چکی ہیں۔

مجھے دیکھتے ہی مادھو چونکا اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ پر ایسی کوئی چیز دکھائی نہ دی جو میرے بیٹھنے کے لئے بچھا دیتا۔ میں نے کہا "میرے بیٹھنے کی فکر نہ کرو۔ اب رَدھیا کی طبیعت کیسی ہے"؟

رَدھیا کا نام سنتے ہی اُس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں اُس نے کہا "سرکار اب رَدھیا کہاں"؟

میں انگشت بدنداں رہ گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ کھڑا رہنا میرے امکان سے باہر تھا۔ ٹوٹی کھاٹ کے سہارے میں بھی بیٹھ گیا اور رَدھیا کو پکارنے لگا "رَدھیا بیٹی، رَدھیا بیٹی، تو بولتی کیوں نہیں؟" پر اب رَدھیا کہاں تھی؟ اب رَدھیا کی جگہ لاش تھی۔ میں چلا اُٹھا۔ میں انسان نہیں شیطان ہوں! ارے مادھو، تو نے اسے اتنی جلدی رخصت کر کے میرے سر پر خونِ ناحق کا الزام کیوں لگایا؟

مادھو اسکا کیا جواب دیتا۔ مجھے وہ شیطان کے علاوہ اور کیا سمجھ سکتا تھا مجھے اسوقت اپنے سے خود اتنی نفرت ہو رہی تھی کہ اگر مادھو میرا خون بھی بہا دیتا تو میں زبان سے اُف تک نہ کرتا۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ مادھو کا گھر لُٹ گیا تھا، لیکن وہ اپنا دکھ بھول کر مجھے سنبھالنے لگا۔ بولا "سرکار اس میں کوئی کیا کر سکتا ہے۔ میری قسمت ہی میں یہ لکھا تھا"۔

میں نے کہا "ہاں مادھو، تیری قسمت میں یہی لکھا تھا اور میری قسمت میں خون کا گناہ ـــــــ ارے پاگل، لکھا تھا تو لکھا رہنے دیتا لیکن کل تو میری یہاں کام کرنے گیا ہی کیوں؟ گیا تھا تو فوراً چلا آتا، نوکری چھوڑ کر چلا آتا، مجھ سے لڑ کر چلا آتا۔ آہ! رَدھیا نے میرے متعلق کیا خیال کیا ہوگا؟

مادھو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں اسے کیا سمجھاتا؟ اسوقت تو ضرورت تھی کہ مجھی کو کوئی سمجھاتا۔ تھوڑی دیر میں ہم دونوں کے آنسو تھم گئے۔ میں نے کہا "مادھو تو نے کل بھی تو کچھ نہیں کہا کہ وہ کب سے بیمار ہے۔ کیا بیمار ہے"؟

"سرکار مجھے کیا خبر تھی؟ پرسوں اسکی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہوئی۔ میں سمجھا کوئی معمولی بیماری ہوگی۔ وہ بولی سینہ میں درد ہے۔ اسی رات سے میں آگ پر توا رکھ کر گرم کپڑا کر کے سینکتا رہا۔ کسی نے کہا نمونیہ ہے۔ کسی نے کہا ڈبل نمونیہ ہے۔ اسے تو خوب سینکنا چاہئے۔ حسب امکان، رات کو سینکا، صبح بھی تھوڑی سینک دی۔ لیکن نوکری کی فکر تھی۔ میں نے رَدھیا سے کہا "کام کر کے میں جلدی آتا ہوں"۔

رَدھیا کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ آہستہ سے بولی "آج نہ جاؤ تو"؟

میں نے کہا "رَدھیا یہ نوکری ہے۔ کل ہی مالک دوسرا نوکر رکھ لیں گے تو تو جانتی ہے کہ نوکری کتنی مشکل سے ملتی ہے۔ نوکری چھوٹ جائیگی تو روکھی سوکھی بھی نہ ملے گی۔ یہ ٹوٹی کھاٹ بھی نہ رہے گی"۔

رَدھیا آہ کھینچ کر رہ گئی۔ موت کے گھاٹ پر پہونچ کر بھی اُس نے سوکھی روٹی اور ٹوٹی کھٹیا کے نام پر سر جھکا دیا۔ تھوڑی دیر بعد بولی تو جلدی آنا۔ ایسا نہ ہو کہ جاتے وقت تمھیں بھی نہ دیکھ پاؤں۔

"سرکار اُس کی بات سن کر میرے پاؤں بندھ گئے۔ میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک آنسو بہاتا رہا۔ رَدھیا پھر بولی "اس طرح کام کیونکر چلے گا جاؤ لیکن جہانتک ممکن ہو جلد لوٹ آنا"۔

جب میں نہ اُٹھا تو دو ایک بار اُس نے پھر کہا۔ آخر کار میں اُٹھا، اُسے ذرا سمجھایا۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور یہ کہکر چلا گیا کہ میں ابھی آتا ہوں۔ وہاں پہونچا تو آپ کی پھٹکار سن کر میری اُمید پر پانی پھر گیا۔ کچھ غم ہوا۔ کچھ ندامت محسوس ہوئی۔ میں نے اُس دن آخر وقت تک کام کیا۔ بیچ میں کئی بار دل تڑپا کہ چھٹی لیکر چلا جاؤں، یا ایک بار دیکھ ہی آؤں۔ لیکن آپ کے سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔

میں نے کہا "مادھو تو نے یہ کیا غضب کیا؟ تو نے مجھے اتنا بے رحم کیوں سمجھ لیا کم از کم ایک بار تو مجھ سے پوچھ ہی لیا ہوتا"۔

"سرکار آپ نے سویرے بہت کچھ کہا سنا تھا اور بھگوان کو یہی منظور تھا اس لئے مارے شرم کے میں سب سدھ بدھ بھول گیا۔

میری آنکھیں شرم سے نیچی ہو گئیں۔ اپنے غصے کو یاد کر کے میں دل ہی دل میں

خود پر لعنت ملامت کرنے لگا۔ خدا کو کیا منظور تھا۔ یہ کون جانے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ صبح میں نے اُسے بہت بُری طرح ڈانٹا تھا۔

مادھو کہہ رہا تھا "سرکار جب میں رات کو گھر آیا تو رادھیا بیہوش پڑی ہوئی تھی۔ میں نے پکارا لیکن اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اُس کے سینے کو سینکا لیکن وہ کچھ نہ بولی۔

میں نے دریافت کیا "اس نے یہ نہیں پوچھا کہ اتنی دیر کیوں لگائی ؟"

"نہیں سرکار! اسکے بغیر پوچھے ہوئے میں نے سب کچھ بتا دیا تھا"

پھر رادھیا نے کیا کہا ؟ کیا میرے متعلق کچھ نہیں کہا ؟"

"کچھ نہیں سرکار! صرف اُس نے کروٹ بدل لی۔ وہ بالکل غافل تھی۔ رات میں وہ بکنے لگی تھی، کبھی پھٹکارتی تھی، کبھی پچکارتی تھی وہ بالکل بے ہوش تھی"

"کیا میرے متعلق اس نے کچھ بھی نہیں کہا ——— ایک آدھ لفظ"

"اُس کا کیا ٹھکانہ تھا ؟ سبھی کے متعلق ؟" اُس نے کچھ نہ کچھ کہا۔ سُن کر کیا کریں گے آپ !"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ جانے دو"

سویرے اُس نے اتنا کہا کہ یہ اچھا کیا جو جاتے وقت آگئے اس کے بعد وہ کچھ نہ بولی اور تھوڑی دیر بعد "........" آہ !

اتنا کہہ کر مادھو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ میرے پیروں سے لپٹ گیا"

کہانی سناتے سناتے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور رجنی کے آنسو تو خدا جانے کب سے بہہ رہے تھے۔ میرا گلا خشک ہو گیا۔ میں کہتے کہتے رک گیا۔

تھوڑی دیر بعد رجنی نے دریافت کیا "پھر کیا ہوا بابوجی ؟"

میں نے کہا "پھر کیا ہوتا، بیٹی ! کچھ آدمیوں کو لے کر میں رادھیا کا کریا کرم کر آیا"

"اور مادھو ؟"

"مادھو دوسرے دن آیا۔ میں نے کہا جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ میں نے اس غلطی سے بہت کچھ سبق سیکھا ہے۔ اب تم جب تک زندہ رہو میرے گھر پر ہی رہو۔ اب کبھی ایسی تکلیف نہ دونگا۔ پھر میں نے سو روپے کے نوٹ اسکے سامنے رکھکر کہا "اب تم اپنی دوسری شادی کر لو اور جو کچھ خرچ ہو گا وہ میں دونگا"

مادھو نے سر جھکا لیا اور گہری سانس لی پھر بولا "سرکار جب میں رادھیا کی ہی رکھوالی نہ کر سکا اور اُس کو بے موت مار ڈالا تو اب دوسری شادی کر کے بھگوان کو کیا منہ دکھاؤں گا ؟" یہ کہکر وہ چلا گیا۔ نوٹ جہاں کے تہاں رہ گئے۔

دوسرے دن معلوم ہوا کہ مادھو گھر کا سامان پڑوسیوں میں تقسیم کر کے تیرتھ جاترا کے لئے چلا گیا۔

رجنی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "بابوجی رادھیا کی بات دل ہلا دینے والی ہے تبھی تو نوکروں کے لئے تمہارے دل میں رحم کا دریا موجزن ہے"

"ہاں بیٹی ! پر اس رحم کے پودے کو رادھیا کے خون کی کھاد دینی پڑی ہے۔

شایق ہنگامی۔ بی۔ اے

دولتِ غم

چند تارے جو انیسِ شبِ غم ہوتے ہیں — وہ بھی تاباں مری تقدیر سے کم ہوتے ہیں
دل شکارِ الم و یاس ہے اور تم غافل — سچ بتانا یہی اندازِ کرم ہوتے ہیں
فطرتِ عشق جنھیں دولتِ غم دیتی ہے — وہ کہاں شیفتۂ نازو نعم ہوتے ہیں
اُن کے آتے ہی بدل جاتی ہے دُنیا اپنی — جانے کس عالمِ پُرکیف میں ہم ہوتے ہیں

قربتِ دوست کو کیوں کھیل سمجھتے ہو نذیرؔ
ملنے والے بڑی مشکل سے بہم ہوتے ہیں

نذیر شیرکوٹی

اپنے مجازی پروردگاروں سے

آج اپنے ہاتھ میں ہے بہتے دریا کا نظام
موج کے دامن میں بھی ساحل بنا سکتے ہیں ہم

موجزن ہے اپنی رگ رگ میں جوانی کا لہو
موت میں بھی زندگی کے گیت گا سکتے ہیں ہم

ظلمتیں گو دائرہ در دائرہ بھی ہیں تو کیا
تارہ تارہ توڑ کر سورج بنا سکتے ہیں ہم

آپ اپنے لالۂ و نستر کو رہنے دیجئے
خون کے چھینٹوں سے بھی محفل سجا سکتے ہیں ہم

آپ کیا سمجھیں گے اک ٹوٹے ہوئے دل کی حیات
آنسوؤں کی آڑ سے بھی مسکرا سکتے ہیں ہم

دیکھئے چپ ہیں تو ہم کو چپ ہی رہنے دیجئے
آج روتے ہیں تو کل بجلی گرا سکتے ہیں ہم

اختیاراتِ خودی کو آزمانا چھوڑ دیئے
سجدہ کیسا، سجدہ گہ میں سر کٹا سکتے ہیں ہم

ہمتِ دارا و بازوئے سکندر کی قسم
اپنی انگلی پر زمانے کو نچا سکتے ہیں ہم

بے تکلف شوخیٔ دستِ زلیخا کی قسم
زندگی کو برق کے تیور سکھا سکتے ہیں ہم

احتیاطِ عصمت دامانِ یوسفؑ کی قسم
حسن بنکر حسن کو بھی آزما سکتے ہیں ہم

آتشِ نمرود سے لڑ جانے والے کی قسم
واقعاً آتشکدے جنت بنا سکتے ہیں ہم

ہمتِ موسیٰ کی حریت پسندی کی قسم
چیر کر امواجِ رودِ نیل جا سکتے ہیں ہم

ابنِ مریمؑ اور مریمؑ کے تقدس کی قسم
اپنی ہر ٹھوکر سے اب مُردے جلا سکتے ہیں ہم

زندگانی کو نیا رُخ دینے والے کی قسم
دیر اور کعبہ کو اک مرکز پہ لا سکتے ہیں ہم

کلکِ قسمت دے چکا ہے وقت پر قابو ہمیں
حسبِ منشا اب زمانہ کو بنا سکتے ہیں ہم

فضل الدین اثر
(ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ وڈپ)

ورجل

قدیم لاطینی کا سب سے بڑا پیامبر

لاطینی علم ادب میں ورجل (VIRGIL) کو "خدائے سخن" کا مرتبہ حاصل ہے. دو ہزار برس سے زیادہ گذر گئے مگر اُس کے نغمے اب بھی احساسِ مردہ میں روح پھونکتے ہیں. اس کے جذبات میں بنی نوع انسان کے لئے عام ہمدردی کا پیام موجود ہے اور وہ اپنے مذاق فطری سے سکون پذیری کے ساتھ فطرت اور مناظرِ فطرت کے جلوے عام کرتا ہوا چلا جاتا ہے، اسکے کلام کو محبت نے دوامی رنگینیاں عطا کر دی ہیں اور اس پر مستزاد اُسکا زبان و بیان پر پوری طرح حاوی ہونا ہے. تقدیسِ خیال نے اس کے کلام میں چار چاند لگا دئیے ہیں. اور حقیقتاً قدیم عظمتِ روما پر ورجل ہی کے کلام سے مہرِ تصدیق ثبت ہوتی ہے.

اس کا پورا نام پبلیس ورجلیس مارو (PUBLIUS VERGILUS MARO) ہے مگر تمام دنیا میں اُس کی شہرت ورجل ہی کے نام سے ہے. ہر چند وہ رومن لاطینی حدود کے باہر ہلا اکتوبر سنہ ق.م کو پیدا ہوا مگر رومن تہذیب اسکے خاندان اور ملک پر پوری طرح مسلط تھی. لمبارڈی کے میدان میں دریائے پو (PO) کے شمال کی جانب اس کا باپ زراعت کیا کرتا تھا، وہ بے حد روشن خیال آدمی تھا. اس نے عام رواج کے خلاف اپنے بچے (VIRGIL) ورجل کو شروع ہی سے تعلیم کی طرف مائل رکھا اور زراعت پر تحصیل علم کو ترجیح دی. ورجل کا ابتدائی زمانہ دیہات میں بڑے آرام سے گزرا اور حقیقت یہ ہے کہ یہیں اسکے دماغ میں وطن آفرین تموج پیدا ہوا. مناظر قدرت کی تصویر کشی میں اسکی تمام تر ساحرانہ اور ادبی قوتیں دراصل اسی زندگی کی مرہونِ منت ہیں جو اُس نے دیہات میں بسر کی اور اپنی بلند فطرت سے بیش از بیش فائدہ اُٹھایا. بارہ سال کی عمر میں تحصیل علم کے لئے ورجل کو کریمونا (CREMONA) بھیجدیا گیا اور وہاں سے وہ دو سال بعد اٹلی کے مشہور شہر میلان (MILAN) میں اکتسابِ علم کے لئے چلا گیا اور آخر کار دو سال بعد روم (ROME) میں فنِ کتابت اور فلسفے کی تعلیم کے لئے داخل ہوا. محققین کی انتہائی کوشش کے باوجود اُس کی روم کی زندگی کے حالات معلوم نہ ہو سکے. یوں تو متعدد افسانے اور قصے بنا لئے گئے ہیں مگر حقیقت کچھ اور ہے. سرزمین اطالیہ اسوقت ہنگامہ زار بنی ہوئی تھی اور ورجل کو معمولی شہرت بھی حاصل نہ تھی. چاروں طرف خانہ جنگی کے اثرات پائے جاتے تھے اور اسی وجہ سے بڑے بڑے سرکردہ افراد کی زندگی تاریکی میں رہی. یہ وہی زمانہ تھا جس میں مشہور عالم بادشاہ جولیس سیزر کا قتل ہوا تھا.

سنہ ۴۲ ق.م ورجل کی شہرتِ ایک متقل شاعر کی حیثیت سے امراء اور والیانِ ریاست کے کانوں تک پہنچ چکی تھی اور ان میں سے بعض اس پر مہربان بھی تھے. خانہ جنگی کے زمانہ میں ورجل کے باپ نے مفتوحین کی اعانت کی تھی. چنانچہ فاتح حکومت نے برسرِ اقتدار ہوتے ہی ایسے افراد کی گوشمالی بحدِ کافی کی جو مخالفین کے ممد و معاون تھے. ورجل کے باپ کی جاگیر بھی اسی سلسلے میں ضبط کر لی گئی. ورجل نے اوّل تو امراء سے سفارش حاصل کی اور پھر روم جا کر خود اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے کام لیا اور جاگیر واپس حاصل کر لی. چند روز بعد ہی ورجل کو محسنِ ادب وزیرِ اعظم میسینا (MOECANA) کی سرپرستی کا شرف حاصل ہو گیا اور وہ دارالخلافہ میں اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگا اور یہیں اُس کی دوستی ہوریس (HORACE) سے ہو گئی جو اس عہد کا مشہور شاعر تھا.

روم جانے سے پہلے ہی ورجل نے اپنی مشہور مثنوی (ECLOGUE) کو لکھنا شروع کر دیا تھا. اس نظم سے ورجل کی مراد اطالوی دیہات کے قدرتی

اور پرکیف مناظر کی دلکش تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتا تھی۔ قدیم یونانی شعرا کی شاہراہ پر گامزن ہو کر اُس نے اس نظم کو ۳۲ ق۔م میں ختم کرکے شائع کر دیا۔ آجکل کی سے مطابع اسوقت خواب میں بھی نہ تھے تاہم متعدد کتب فروش کتابیں لکھنے کے لئے غلام ملازم رکھتے تھے اور اس ضمن میں روم کو ایک خاص شہرت حاصل تھی۔ اچھی کتابوں کی بازار میں ہمیشہ مانگ رہتی تھی۔ نئی تصانیف کو مشتہر کیا جاتا تھا عوام کے لئے پبلک لائبریریوں کا قابل توصیف انتظام تھا۔ جہاں غربا اپنے ذوق کی تکمیل کرتے تھے۔ عوام کے لئے اس سے بھی مفید تر ایک اور طریقہ تھا وہ یہ کہ مصنفین اپنا کلام خود پڑھکر سناتے تھے۔ جس سے اُن کی شہرت ہوتی تھی۔ طبقۂ امرا میں عموماً کھانے کے وقت زور سے کتابیں پڑھکر سنانے کے لئے غلام ملازم تھے۔ غرضکہ اس عہد کے مطابق کتابوں کی نشر و اشاعت کافی ہوجاتی تھی۔

ورجل پہلے ہی کافی مشہور ہوچکا تھا (ECLOGUE) کی اشاعت نے اسکی شہرت میں اور بھی چار چاند لگا دئیے۔ اس کتاب کے پہلے باب میں اُس نے اپنی پریشان زندگی کا حوالہ دیا ہے اور خصوصاً اس عہد انتشار کا جس میں اُس کی جائداد ضبط کر لی گئی تھی۔ اسی طرح باب نہم میں اُس نے اپنی جائے پیدائش کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اسی کتاب کی چوتھی نظم مسیحی دنیا میں ایک خاص شہرت و اعتبار کی حامل ہے۔ مسیحی علما کے خیال کے مطابق اسی نظم میں ایک عہد جمیل کے ساتھ مستقبل قریب میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیدائش کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور اگر ہم قدرے آزادیٔ فکر و خیال سے کام لیں تو حقیقتاً یہ نظم ان خواہشات کی ترجمان ہے جو عوام کے دلوں میں خانہ جنگی کی بے پناہ تباہیوں اور انتشار قومی کے بعد پیدا ہوئی تھیں اور یکسر ایک عہد سکون و اطمینان کی توقعات پر مبنی تھیں۔ بہ ہر حال (ECLOGUE) کی نظمیں مجموعی حیثیت سے ان اعلیٰ اور توصیفی جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ جو انسانی محبت اور حقیقت عالم سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ ان نغموں کی رومان آفرینی نے روم میں زندگی کی نئی روح پھونکدی تھی اور عوام و خواص کی زبان پر ورجل ہی کا نام تھا اور وہ بجا طور پر فخر کرتے تھے کہ آخرکار لاطینی سرزمین پر کم ازکم ایک شاعر ایسا پیدا ہوگیا جو صفِ اوّل کے یونانی شعرا کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے اور حقیقت یہ کہ اس خدائے سخن کے کلام سے آئندہ کے تمام لاطینی اور اطالوی شعرا کا کلام مستند سمجھا گیا یہانتک کہ مشہور عالم اطالوی شاعر ڈانٹے (DANTE) نے بھی اپنی مشہور و معروف کتاب ڈیوائن کامیڈی (DIVINE COMEDY) میں ورجل کو رہنما بناکر عالم بالا کا تخیلی منظر پیش کیا اور حیاتِ جاوداں حاصل کی۔ ڈانٹے کے بعد بھی جو اطالوی شاعر" ورجل کا معتقد نہ ہوا وہ بے بہرہ رہا"

۳۷ ق۔م کے بعد سے ورجل کی زندگی کافی عیش و مسرت کے ساتھ بسر ہوئی۔ نیپلز (NAPLES) جیسے رومان آفریں شہر میں اُس نے ایک حویلی خرید لی اور نولا (NOLA) کے دیہات میں بھی ایک مکان بنوالیا اور ۳۰ قبل مسیح تک اُسی جگہ قیام پذیر رہا۔ اُسی زمانے میں اس نے اپنے مربی وزیرِاعظم سینا (MACENA) کے ایما سے (GEORGES) ختم کی یہ ساری کتاب فنِ زراعت کی منظوم تائید ہے۔ خانہ جنگی نے سب سے زیادہ تباہ کن اثر زراعت ہی پر ڈالا اور پیچیدگیٔ سیاست نے عوام کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا۔ وزیرِاعظم سینا جیسے مدبر کا اس کام کے لئے ورجل کو منتخب کرنا بذاتِ خود قابلِ داد ہے۔ اوّل تو ورجل ایک زراعت پیشہ باپ کا بیٹا تھا اور دیہی زندگی کا غائر مطالعہ کرچکا تھا۔ دوئم اقتضائے وقت کے ساتھ ساتھ اس کے زورِ قلم نے ایک ایسے خشک مضمون میں جان ڈالدی جس پر کسی لاطینی شاعر نے کبھی قلم نہیں اُٹھایا تھا۔ اس مضمون کو ورجل نے ایک ایسے شاعرانہ تخیل کے سانچے میں ڈھالکر پیش کیا کہ ہر کاشتکار نظارہ ہائے قدرت سے مالا مال نظر آنے لگا، شہری اور دیہی زندگانی کا موازنہ اُس نے کچھ اس انداز سے کیا کہ قدیم عظمتِ روما شہر سے نکلکر دیہات کی وسعتوں میں جاگزیں ہوگئی۔ یہ کتاب چار دلچسپ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں فنِ کاشت اور کاشتکار کے سالانہ لائحہ عمل کی وضاحت ہے۔ دوسرے باب میں انگور اور زیتون کی کاشت پر روشنی ڈالی گئی ہے جو اطالیہ کی خاص پیداوار میں سے ہیں۔ تیسرے باب میں گلہ بانی اور گھوڑے پالنے کا بیان ہے اور چوتھے باب میں شہد کی مکھیوں کو پرورش کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ چند لمحات کے لئے غور فرمائیے کہ آج سے دو ہزار سال پیشتر ایسے مضمون کو شاعرانہ کمالات کے ساتھ پیش کرنا ورجل کی عظمت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔

مذکورہ بالا دونوں کتابوں کی اشاعت ہی نے ورجل کو ایک بہترین شاعر قرار دیدیا تھا۔ ۲۹ سنہ ق۔م کے بعد سے آخری لمحات تک ورجل اپنی اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں مصروف رہا جو اسکی تصانیف میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے اور دنیائے ادب میں اینیڈ (AENEID) کے نام سے مشہور ہے۔ ورجل کی حقیقی عظمت اسی نظم سے قائم ہے۔ ابتدا ہی سے ورجل ایک قومی اور رزمیہ نظم کا خیال دماغ میں لئے ہوئے تھا اور اب وقت آگیا تھا کہ وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنادے اور تمام دنیا کے دل میں شہنشاہ آگسٹس (AUGUSTUS) اور روم کی عظمت قائم کردے۔ چنانچہ قدیم ترین تاریخ یونان کے ابواب سے اینیس (AENEAS) کی کہانی کو نظم کرنا شروع کردیا۔ اینیس معرکۂ ٹروجن (TROJAN) کا ایک کردار ہے اور ملتِ اطالیہ کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ اور بجائے بہادرانہ کارناموں کے پاکیزگیٔ خیال، استقلالِ عزائم اور مقاصدِ اعلیٰ کے لئے زیادہ تر مشہور ہے۔ دس سال کی متواتر دماغ سوزی کے بعد ورجل ۱۹ سنہ ق۔م میں عملی طور سے اس نظم کو ختم کرچکا تھا مگر اشاعت سے پہلے وہ اس پر نظرِ ثانی کرنا چاہتا تھا چنانچہ اسی خیال کے ماتحت اُس نے سہ سالہ پروگرام یونان اور ایشیا کی سیاحت کے لئے بنایا اور روانہ ہوگیا۔ یونان کے پایۂ تخت ایتھنز (ATHENS) میں وہ آگسٹس سے ملا اور مجبور کردیا گیا کہ واپس اٹلی چلا جائے۔ واپس جانے کے لئے کشتی پر سوار ہونے سے پہلے وہ بیمار ہوگیا۔ دورانِ سفر میں اسکی بیماری نے تشویشناک صورت اختیار کرلی اور منزل پر پہنچنے کے چند روز بعد ہی ۲۱ ستمبر ۱۹ سنہ ق۔م کو یہ آفتابِ سخن غروب ہوگیا۔

اُس نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ اس کی نامکمل تصانیف میں سے کوئی چیز شائع نہ کی جائے آخری لمحات تک اُس کو اینیڈ (AENEID) کا خیال تھا جو ہنوز نامکمل اور نظرِ ثانی کی محتاج تھی۔" (یاد رکھئے کہ یہ خیال صرف ورجل کا تھا، دنیا تو اس کو مکمل اور فارغ الاصلاح سمجھتی ہے) اسکی وصیت کا قطعی احترام کیا جاتا مگر ہماری خوش قسمتی کہئے کہ شہنشاہ آگسٹس نے کسی ایک کی شنوائی نہ کی اور اشاعت کے احکامات صادر فرمادئے۔ ورجل کو اس کی وصیت کے مطابق نیپلز میں پزدولی جانے والی سڑک کے کنارے دفن کیا گیا اور اب اسکا مقبرہ ایک مذہبی اور مقدس زیارت گاہ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ زندگی ہی میں وہ عوام کی آنکھوں کا تارہ تھا۔ اُس کے خلوصِ دل، خوش مزاجی شیریں بیانی، انسانی محبت اور جذباتِ ہمدردی نے ایک عالم کو گرویدہ کرلیا تھا۔ معاصر شعرا اسکا نام عظمت سے لیتے تھے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ مشاہیر حاسدانہ چشمکوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ مگر ورجل ہی ایک ایسی ہستی ہے جس پر کسی نے حسد نہیں کیا۔ اسکی پاکیزہ خیالی اور بلند نظری کا اس سے بہتر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اُس کی موت کے دن سے آجتک اسکی تمام تصانیف کو مہذب دنیا کی ادبیات (CLASSICS) میں بلند ترین مرتبہ حاصل ہے اور مدارس کے اعلیٰ ترین نصابِ تعلیم میں داخل ہیں اور رہیں گی۔ عیسائی ادبا کم ازکم تیسری صدی عیسوی ہی سے ذی فہم شعرا میں صرف ورجل کی عظمت کے قائل تھے۔ مذکورہ بالا چوتھے (ECLO UE) سے چونکہ ورجل نے عیسائی مبلغین کے خیال کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کی اطلاع دیدی تھی۔ اسی لئے آج تک دنیائے کلیسا میں اس کو ایک خاص درجہ حاصل ہے جو شاعر سے زیادہ وہ "ایک انسان" ہونے کی حیثیت سے یاد رکھا جائیگا ڈانٹے کا ورجل کو رہنما تسلیم کرنا اس امر کا مکمل ثبوت ہے۔ عہدِ وسطیٰ ہی سے عوام کی عقیدت حد سے گزر چکی تھی اور ہزارہا افسانے ورجل سے متعلق اب بھی پائے جاتے ہیں جن سے حقیقت کو دور کا رشتہ بھی نہیں یہانتک کہ یارانِ طریقت نے اسکی کرامات و معجزات کا ذکر بھی وضاحت سے کیا ہے۔ چنانچہ اسی ضمن میں ۱۵۲۰ء کی ایک انگریزی تصنیف سے ظاہر ہے کہ ورجل نے ابتدائی عمر ہی میں شیطان پر بالکل اسی طرح قابو پالیا تھا جس طرح داستان الف لیلہ میں ایک ماہی گیر نے ایک جن پر قابو پایا تھا اور لوٹے میں جن کو دوبارہ بند کرکے نذرِ دریا کردیا تھا —— مغرب میں ورجل کے کلام سے بالکل اسی طرح فال لی جاتی ہے۔ جس طرح مشرق میں کلامِ حافظ سے! یہ بدعت اسکی موت کے بعد ہی شروع ہوگئی تھی اور دورِ جدید تک پوری قوت کے ساتھ جاری رہی۔ مشہور ہے کہ انگلستان کا بادشاہ چارلس اوّل ورجل کے کلام سے فال لینے کے لئے باڈلین لائبریری، آکسفورڈ گیا تھا، اُس نے انتہائی ادب سے اینیڈ (AENEID) کا ایک صفحہ کھولا اور اس کی نظریں

بیک وقت ان سطور پر پڑیں جن میں اینیس (AENEAS) کو "بغاوت" شکست اور آخرکار شرمناک موت کی بددعا دی گئی تھی اور کون نہیں جانتا کہ چارلس اوّل کا کیا حشر ہوا۔ عام رعایا نے اُسکے خلاف بغاوت کرکے فوج کشی کی، اس کو شکست ہوئی اور وہ ملک و قوم کا مجرم قرار دیئے جانے کے بعد اپنے ہی محل کے سامنے سولی پر لٹکا دیا گیا۔

مصوّرانہ کمالات کے تخیّلی مناظر خود ورجل اور اس کے کلام میں بہت کچھ پائے جاتے ہیں مگر ورجل کی حقیقی تصویر دستیاب نہیں حالانکہ ورجل سے بھی بہت پہلے کی مصوّری اور نقاشی کے انمول نمونے اب تک موجود ہیں۔ ناممکن ہے کہ اطالیہ جیسی مصوّر گر سرزمین پر ورجل کی تصویر نہ کھینچی گئی ہو۔ ۱۸۶۰ء میں علاقہ ٹیونس سے ایک نقش برآمد کیا گیا تھا جو شاید اُس کی موت کے ایک سو سال بعد ایک تصویر سے لیا گیا تھا اور وہ بھی مشتبہ ہے تصویر کے نہ ہونے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ورجل نے عمر بھر شادی نہیں کی اور لاولد مرا۔ اس لئے اس مقدس ہستی کی صرف تصانیف یادگار ہیں جو دُنیا میں اسکا نام ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

(ماخوذ) **شمیم نعمانی بیاوری مقیم جبلپور**

طلسمِ شب

عمل ہے نیم شب کا خواب سے مدہوش ہے دُنیا
لباسِ تیرگی اوڑھے ہوئے خاموش ہے دُنیا

دلِ فطرت میں یادِ ردزِ روشن تک نہیں باقی
ہے مرہونِ سکوں ہر شورش و ہنگامۂ گیتی

خموشی چھا رہی ہے اس طرح بازارِ ہستی پر
گماں ہوتا ہے گورستاں کا ہر خوابیدہ بستی پر

گھنیرے بادلوں میں منہ چھپا رکھا ہے تاروں نے
کہ قندیلیں بُجھا دی ہیں فلک کے رہنے والوں نے

نوا سنجانِ گلشن دم بخود ہیں آشیانوں میں
خموشی نے لگا رکھا ہے پہرہ گلستانوں میں

ہوا کی ہے طبیعت شور سے ناساز گار ایسی
گراں ہے اسکی خاموشی پہ غنچوں کی چٹک تک بھی

تمنّا سو رہی ہے سرد ہیں دُنیا کے ہنگامے
شرابِ خواب سے لبریز ہیں آنکھوں کے پیمانے

ہے سنّاٹا سا طاری ہر طرف ایک ہُو کا عالم ہے
جہانِ کیف پر چھائی ہوئی کیفیتِ غم ہے

سیہ زلفیں بکھیرے رات کی دیوی ہے ماتم میں
جہاں کا ذرّہ ذرّہ کھو گیا ہے حسرت و غم میں

جہانِ رنگ و بو پر چھا رہا ہے عالمِ وحشت
غم و حسرت میں ہے ڈوبی ہوئی محبوبۂ فطرت

کچھ اس انداز سے محسوس ہوتا ہے ہر اک لمحا
فرشتہ وقت کا جس طرح روکے ہو قدم اپنا

اگرچہ نیستی سی چھا رہی ہے بزمِ ہستی پر
خموشی کی حکومت ہے بلندی اور پستی پر

مگر یہ خامشی ہنگامہ و شورش بداماں ہے
یہ آرام و سکوں اک شور پیدائی کا ساماں ہے

یہ مُہرِ خامشی اب صبح کی آمد سے ٹوٹیگی
حیاتِ مضمحل انگڑائیاں لے لے کے اٹھیگی

چودھری فتح محمد رفیق بی۔اے

ارشادات

تیری نظر ہے کافر کیا دقت آفریں بھی — کہتی نہیں ہے ہاں بھی کہتی نہیں نہیں بھی

کاش ایک دن رسائی ہو سکے آستاں تک — مشتاق ہے نظر بھی بیتاب ہے جبیں بھی

تم شیوۂ جفا کو اپنے عزیز رکھو — جنسِ وفا نہ ڈھونڈو ملتی نہیں کہیں بھی

بہتر ہے یہ کہ اُس سے کہیے نہ شوقِ دل کا — ہر چند نکتہ داں ہے لیکن ہے نکتہ چیں بھی

قتلِ نیازمنداں اور اہتمام اتنا — کھچتی ہے تیغ کیں بھی چڑھتی ہے آستیں بھی

اوروں کو دیکھتے ہو میری طرف بھی دیکھو — رکھتا ہے کچھ توقع میرا دلِ حزیں بھی

کس کی کروں شکایت دن ہی جو ہوں نہ اچھے — ہمطرزِ آسماں ہے میرے لئے زمیں بھی

سر میرا ڈھونڈتا ہے اُس پائے نازنیں کو — سجدے کی ہے طلب میں وہ پائے نازنیں بھی

وحشتؔ کے دل کی خاطر دونوں ہی مبتلا ہیں — وہ چشم سرمہ سا بھی وہ زلفِ عنبریں بھی

(خان بہادر) رضا علی وحشتؔ کلکتوی

نمازِ تحیّر

میں رات رہ نوردِ بیابانِ راز تھا — تھا سرگرانِ ضبط، پریشانِ راز تھا

اُلٹے ہوئے نقابِ رخِ جلوہ ہائے زیست — آئینۂ حیات میں نگرانِ راز تھا

ہستی کے تجزیہ کا ارادہ کیے ہوئے — عرفانِ نفس کیلئے کوشانِ راز تھا

صد شکر تشنہ لب نہ رہیں میری کاوشیں — میں کامیابِ چشمۂ حیوانِ راز تھا

راہِ تعینات کی طے سب تھیں منزلیں — پیشِ نگاہِ شوق چراغانِ راز تھا

پردے اُٹھے ہوئے تھے نگاہیں تھیں باریاب — نظارگیٔ جلوۂ عریانِ راز تھا

دیکھا کہ ہیں مرکب اجزائے کائنات — ہر جزو میں لئے ہوئے طوفانِ راز تھا

ہر راز کے حجاب میں جلوے تھے بے نقاب — ہر جلوہ کے نقاب میں یزدانِ راز تھا

بحرِ عبودیت میں سراپا تھا غرق میں — محوِ سرِ نمازِ تحیّر تھا برقؔ میں

برقؔ صدیقی فتحپوری

تلوّن کیش

چھک چھک ۔ چھک چھک

"بمبئی ایکسپرس" پوری رفتار سے اپنی منزل کی طرف بھاگا جا رہا تھا منورما انٹر کلاس کے زنانہ ڈبے کی کھڑکی سے سر نکالے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی ۔ آفتاب پردۂ مغرب میں اپنا منہ چھپا رہا تھا ۔ نیلگوں آسماں پر شفق کی ہلکی ہلکی سُرخی رزمگاہ حیات کی افسانہ خواں تھی ۔

منورما گورنمنٹ کالج لاہور کی ایک شوخ و شنگ تتلی تھی ۔ بہت شریر ——— بہت چنچل ——— اور بہت بے باک ——— فطرت نے اُس کی رگ رگ میں شوخی اور لطافت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی ۔ وہ فیشن پرست بلکہ "فیشن زدہ" تھی ۔ پرانی تہذیب اور رسم و رواج سے اُسے نفرت تھی ۔ وہ آزادی کی پرستار تھی ۔ اور ازدواجی زندگی کو صنف نازک کی ابدی غلامی کے نام سے تعبیر کرتی تھی ۔ وہ محبت کرنا چاہتی تھی ۔ لیکن آزاد رہ کر ۔ وہ کلی سے پھول بنا چاہتی تھی ۔ لیکن ہمیشہ شاداب رہنے کے لئے ——— وہ جذبات کی رَو میں بہنا چاہتی تھی لیکن آہستہ خرام ندی کی طرح ———

یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ تقدیر کے لکھے کو مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکی ۔

اس کے والدین نے اسے ایک ایسے نوجوان کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک کرنا چاہا جسے اُس نے اپنی ۱۵ سالہ شباب آفریں عمر میں ایک بار بھی نہ دیکھا تھا ۔ اگر تصویر سے کسی کے حُسن و قبح کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو منورما کی رائے میں اُس کا ہونے والا شوہر ہرگز اس قابل نہ تھا کہ کوئی حسین اور فیشن کی دلدادہ لڑکی اس سے محبت کر سکتی ۔ منورما نے لاکھو حیلے حوالے کئے ۔ لیکن اس کی ہر تدبیر پر تقدیر حاوی رہی ۔ آخر اُسے شکست ہوئی اور اس کی مرضی کے خلاف اسکی منگنی کر دی گئی ۔

کالج کی چھٹیاں تھیں منورما تعطیلات سے لطف اندوز ہونے کے لئے گھر جا رہی تھی ۔ اس کے ہمراہ اُس کے منگیتر کی بہن اور اُس کی سہیلی روپا بھی تھی ۔ روپا کے گھر والے گرمی سے پناہ لینے کے لئے پشاور سے کوہ مری چلے گئے تھے ۔ لیکن اس کا بھائی اُسے ساتھ لیجانے کی غرض سے راولپنڈی میں ٹھہر گیا تھا ۔

منورما کھڑکی سے سر نکالے باہر کے رنگین مناظر دلچسپی سے دیکھ رہی تھی اچانک اس کے کانوں میں کسی کے مدھم سروں میں گانے کی آواز آئی ۔ بیساختہ اُس کی نظریں اُٹھیں ۔ ملحقہ ڈبے کی کھڑکی سے سر نکالے ایک خوش پوش نوجوان منورما کو گھور رہا تھا ۔ وہ اپنے ہونٹوں پر بے معنی سی مسکراہٹ پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا ۔ منورما کو اس کا اس گستاخانہ طریقے پر گھورنا بہت ناگوار گزرا ۔ اُس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا سر اندر کر لیا ۔ اپنی دانست میں اس حرکت سے اُس نے نوجوان پر اپنی نفرت ظاہر کر دی ۔

وہ سوچنے لگی ۔ یہ مرد بھی کتنے بدتہذیب ہوتے ہیں ۔ لڑکیوں کو اس بُری طرح گھورتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی ۔ ان کی نگاہوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بےچاری لڑکیوں کو کھا ہی جائیں گے ۔ اس کے جوان سینے کا اُتار چڑھاؤ اُسکی قلبی کیفیات کا آئینہ دار تھا ۔ وہ اس وقت چاہتی تھی کہ صنف قوی کے ہر فرد کے خلاف علم جہاد بلند کر دے ۔ اگر اور کچھ نہیں تو اُن کی آنکھیں ہی نکلوا دے ۔ تاکہ اُنھیں دوبارا حسین مخلوق کو گھورنے کا موقع نصیب نہ ہو ۔

اپنے خیالات کی داد حاصل کرنے کے لئے اُس نے روپا کی طرف دیکھا ۔ لیکن وہ دُنیا و مافیہا سے بےخبر آرام کی نیند سو رہی تھی ۔ اُسے دیکھ کر منورما نے اپنی ناک سکیڑ لی ۔ کافی دیر تک وہ اپنی جگہ خاموش بیٹھی رہی ۔ لیکن اس طویل خاموشی سے گھبرا کر آخرکار اُس نے دوبارا اپنا سر کھڑکی سے نکالا ۔ خورشید عالمتاب پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا ۔ وہ سوچنے لگی ۔ اس وقت یہ چاند کروروں نگاہوں کا مرکز بنا ہوا ہوگا اور پھر بھی ان کے اس طرح گھورنے سے ماہِ تاباں کی درخشانی میں کوئی کمی نہیں ہوتی ۔ مجھے کسی کی نگاہوں سے اتنا خوف کیوں ہے ؟ اگر

صنفِ نازک کے نظارے سے مردوں کو ذوقِ محبت کی تسکین ہوتی ہے۔ تو اس میں اَدَل اللہ کر کا کیا حرج ہے، بلکہ اُن کے گھورنے ہی سے تو انھیں اپنی دلفریبیوں کا احساس ہوتا ہے۔ اُس نے ایک بار نگاہِ غلط انداز سے اُس نوجوان کو دیکھا وہ اب بھی ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہا تھا۔

ہوا کے لطیف جھونکے سے اس کی ساری کا آنچل اس کے سر سے ڈھلک گیا۔ اُس کی عطر بیز زلفیں پریشان ہو ہو کر ہوا میں لہرانے لگیں۔ اُس نے جز بز ہو کر ساری کا ڈھلکا ہوا پلو ٹھیک کیا۔ بے معنی نگاہوں سے نوجوان کو دیکھا اور سر گاڑی کے اندر کر لیا۔

وہ خود بخود گویا ہوئی۔ اتنا بدتہذیب تو نہیں ہے جتنا میں سمجھی تھی اور کوئی ایسا زیادہ بدصورت بھی نہیں۔ کیا ہوا جو اس کا رنگ قدرے سانولا ہے اور ہونٹ ذرا موٹے ہیں۔ اس کے خدوخال تو نہایت اچھے ہیں۔ اُس کی آنکھیں ...... اُف خدا کی پناہ۔ مجھے تو وہ کسی شریف خاندان کا چشم و چراغ معلوم ہوتا ہے۔ اظہارِ محبت تو جرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور پھر اُس نے اپنی بے قراری کا اظہار بھی تو نہیں کیا۔ اُس نے تو اپنی نرگسی آنکھوں سے اُسے محبت کا پیغام دیا ہے یہ محبت کے اظہار کا کتنا شریفانہ طریقہ ہے!

وہ اپنے خیالات کی رَو میں بہتی ہی چلی گئی۔ اُسے اس بات کا احساس ہی نہ ہوا۔ کہ گاڑی کتنی تیزی سے اُسے اپنی منزل کے قریب لے جا رہی ہے۔ اور نہ ہی اُسے یہ پتہ چلا کہ ہر اسٹیشن پر ایک نوجوان اُسی کے ڈبے کے پاس آکر اُسے محبت پاش نظروں سے تکا رہتا ہے۔ گاڑی کے جہلم پہونچنے پر وہ اپنی محویت سے چونکی۔ اُسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ وہ کھڑکی میں سے اس امید پر جھانکنے لگی کہ شاید اُسے پینے کے لئے کچھ مل جائے۔ ایک چھوٹا لڑکا "سوڈا لیمن" پکارتا ہوا اُس کے پاس سے بھاگتا ہوا نکل گیا۔ منورما نے اُسے آواز دی۔ لیکن وہ آواز نہ سُن سکا اور چلا گیا۔ منورما کی پریشانی دیکھکر نوجوان نے دریافت کیا۔ "کیا آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

منورما نے غیر ارادی طور پر اثبات میں سر ہلا دیا

"فرمایئے کیا لاؤں" نوجوان نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ پوچھا۔

منورما سخت تذبذب میں پڑ گئی۔ اُسے کیا حق حاصل ہے کہ وہ ایک اجنبی کو تکلیف دے۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس نوجوان کا احسان نہیں لے گی۔

"نہیں آپ تکلیف نہ کیجئے۔"

"اس میں تکلیف کیا ہے۔ شاید آپ کچھ پینا چاہتی ہیں؟"

منورما نے سر ہلا دیا، نوجوان دوڑا دوڑا گیا۔ اور "وِمٹو" کی دو بوتلیں لے آیا۔ منورما نے تشکر آمیز نگاہوں سے اُسے دیکھا اور بوتلیں لے لیں ہر چند منورما نے بوتلوں کی قیمت دینی چاہی لیکن اس لڑکے نے رقم لینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ نوجوان اُن کی قیمت پہلے ہی ادا کر چکا تھا۔

مغرب سے کالی گھٹا اُٹھی۔ رفتہ رفتہ آسمان ابر آلود ہو گیا۔ چاند تاریکیوں میں چھپ گیا۔ اور اُس کی روشنی ماند پڑ گئی۔ اگلے جنکشن پر جب نوجوان اُس کے ڈبے کے قریب آیا۔ تو وہ اسے دیکھ کر زیرِ لب مسکرا دی۔ نوجوان آگے بڑھ گیا جب وہ تیسرے درجہ کے زنانہ ڈبے کے قریب پہنچا۔ تو چند عورتوں نے اُسے دیکھ کر اپنے منہ چھپا لئے نوجوان سوچنے لگا۔

"یہ لوگ کس قدر جاہل ہیں۔ ان کی صورتیں کتنی مکروہ ہیں۔ اور اس پر نخرے تو دیکھو۔ مردوں کو اپنے آگے کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ ان میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ مردوں کی نگاہوں کا مقابلہ کر سکیں۔ غیر تعلیم یافتہ۔ بے وقوف عورتیں۔ مردوں کی غلامانہ ذہنیت سے عورتیں بھی اثر پذیر ہو رہی ہیں۔ وہ بھی غلام رہنا چاہتی ہیں۔ ایسی عورتیں ہندوستان کی آزادی کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہو رہی ہیں۔"

پھر اُسے منورما کا خیال آیا۔ "کتنی سیدھی سادی لڑکی ہے۔ یہ مغربی تعلیم کا اثر ہے کہ وہ آزادی کی دلدادہ ہے۔ اس میں اتنی ہمت ہے کہ وہ مردوں کا مقابلہ کر سکے۔ ایسی لڑکیوں کا وجود ملک و قوم کی بقا کے لئے از حد ضروری ہے آنیوالی نسلیں ان پر فخر و ناز کریں گی۔"

اُدھر منورما سوچ رہی تھی "کتنا نیک لڑکا ہے اگر وہ اس کی شریکِ حیات بن سکتی تو اپنے آپ کو بہت خوش قسمت تصور کرتی۔ سماج اور رسم و رواج نے اُسے ایک ایسے شخص کے پلے باندھ دیا ہے جو اُس نے زندگی بھر نہیں دیکھا۔ ہندوستانی لڑکیوں کو اکثر بے جوڑ شادیوں کی وجہ سے ساری عمر کانٹوں پر بسر کرنا پڑتی ہے۔ اگر مغربی لڑکیوں کی طرح انھیں بھی شادی کے معاملے

میں آزادی دیدی جائے اور وہ اپنی پسند سے شادی کریں۔ تو ان کی زندگی قابلِ رشک ہوجائے۔ وہ اس نوجوان کا مقابلہ اپنے منگیتر سے کرنے لگی۔ یہ کتنا ہنس مکھ۔ اطاعت گذار اور شریف ہے اور وہ چڑچڑے مزاج کا مالک۔ سخت گیر اور خدا جانے کیا کیا ہوگا!"

اس کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اُس نے روپا کی طرف دیکھا۔ وہ ذہنی و قلبی انتشار سے بے خبر آرام سے سو رہی تھی۔ ندامت کی وجہ سے منورما کی سیمیں پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ اگر روپا کو معلوم ہوجائے کہ وہ اُس کے بھائی کے بارے میں ایسے گندے خیالات رکھتی ہے تو وہ اُسے کتنا گرا ہوا سمجھے گی۔ اُسے کسی کے بارے میں بُری رائے قائم کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور پھر ایک ایسے آدمی کے بارے میں جسے اُس نے دیکھا تک نہیں۔

لیکن یہ نوجوان!..... اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اُس سے محبت کرتا ہے۔ وہ بھی تو اُسے پسند کرتی ہے.........

جب خاندان والوں نے اس کے جذبات کی قدر نہ کی۔ جب انھوں نے اس کے شیشۂ دل کو چور چور کر ڈالا۔ تو پھر وہ کیوں خاندان کی نیک نامی کا لحاظ کرکے اپنی زندگی کو تلخ بنالے... کیوں نہ وہ اس نوجوان سے صاف صاف کہدے کہ جہاں بھی وہ اسے لیجانا چاہے۔ وہ اُس کا ساتھ جانے کے لئے تیار ہے۔ وہ اس دُنیا سے دور..... بہت دور اپنی محبت کی رنگین دُنیا آباد کریں۔

روپا نے کروٹ بدلی منورما کے خیالات کا بڑھتا ہوا سیلاب دفعتاً رُک گیا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس نے کوئی بہت بُرا گناہ کیا ہے۔ جس کا کفارہ ادا کرنا مشکل ہے۔ وہ اپنے منگیتر کے ساتھ شدید بے انصافی کر رہی ہے۔ جب ایکبار اُس کی ہو چکی تو پھر ساری عمر اُسی کا ہو کر رہنا چاہئے۔ مزید برآں اس نوجوان نے کب اپنی محبت کا اظہار کیا ہے کیا اس کے اس طرح دیکھ لینے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے؟

روپا انگڑائی لیکر بیدار ہوئی۔ اُس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھکر کہا اف چار بج گئے۔ اسٹیشن آیا ہی چاہتا ہے"

سامنے اسٹیشن کی بتیاں نظر آرہی تھیں۔ اور منورما کی امیدکی شمعیں بجھتی جارہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مایوسی کا تاریک پردہ چھا رہا تھا۔ شبنم کے قطرے ننھی ننھی کلیوں کو ہنسنے پر مجبور کر رہے تھے۔ منورما کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اُس کی دراز پلکوں میں جذب ہوگئے۔ اور اُس کے دل کی مُرجھائی ہوئی کلی کو کھلانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ اسٹیشن پر رُکی۔ روپا منورما کا شانہ ہلاتے ہوئے کہنے لگی۔

"وہ رہے بھیا"

منورما کی نگاہوں نے روپا کے ہاتھ کا تعاقب کیا۔

پلیٹ فارم پر ایک خوشرو نوجوان کھڑا تھا۔ سفید پتلون۔ سفید قمیص اور چپل پہنے ہوئے وہ نہایت حسین نظر آرہا تھا۔ اُس کے گھونگر والے بالوں کی ایک لٹ اُس کی پیشانی کا سہارا لیتے ہوئے اُس کی کٹورا سی آنکھوں کو چوم رہی تھی۔

منورما خیال کر رہی تھی۔ یہ فوٹوگرافر بھی کتنے گدھے ہوتے ہیں۔ اچھی بھلی صورت کو بگاڑ دیتے ہیں۔

وہ سیدھا انٹر کلاس کی طرف آرہا تھا۔ منورما کو دیکھکر اُس کے قدم خود بخود رُک گئے۔ منورما نے شرما کر منہ کو آنچل سے چھپالیا۔ روپا نے معنی خیز و دلفریب تبسم کے ساتھ دونوں کی حالت کا جائزہ لیا۔

منورما دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ایک بار اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ اپنے منگیتر کی صورت پر تنقید کرتی ہوئی اُس کی نظریں نوجوان پر پڑیں جو ڈبے میں اپنی کہنی ٹیکے ہوئے یاس آگیں نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ان دونوں کا مقابلہ کرنے لگی۔ اس کا منگیتر خوبرو۔ شرمیلا اور نیک تھا۔ اس کے برعکس وہ نوجوان بدصورت۔ شریر اور چالاک تھا۔ پرائی لڑکی کو گھورتے ہوئے اُسے شرم بھی نہیں آتی۔

اُس نے نفرت سے تھوک دیا۔

نوجوان سوچنے لگا "عورت کتنی تلون کیش ہوتی ہے۔ ایک رنگین تیتری کی طرح ایک پھول سے اُڑکر دوسرے پر آبیٹھنے کو ہی مقصدِ حیات تصور کرتی ہے، کسی نے سچ کہا ہے۔ عورت ایک معمہ ہے جس کا حل ممکن نہیں"!

جاوید کوہستانی

تماشائے عبرت

اک نامرادِ بزمِ جہاں، مشعلہ درجگر — مست و خراب بادۂ غم، سب سے بے خبر
ہاتھوں میں اپنے چاکِ گریباں لئے ہوئے — مصروفِ گریہ، رسمِ محبت کا نوحہ گر
کچھ جسم و جاں کی فکر نہ اپنی نظر کا ہوش — جیسے چلا ہو کوئی خدائی سے روٹھکر
چہرہ تھا زرد اُسپہ اداسی محیط تھی — تھا ارتعاش جسم میں آنکھوں میں اشک تر
گھبرا کے دیکھتا تھا وہ ہر سمت بار بار — لیکن کسی طرف بھی توجہ نہ تھی نظر

وہ سوچتا تھا پوچھے کس سے مآلِ زیست؟
کس کو جہاں میں علم ہے، کیا ہے کمالِ زیست؟

یکبارگی وہ سوئے گلستاں جو آگیا — دیکھا حسین پھولوں کو ہر سُو کھلا ہوا
ہر پھول کی بہار پہ حیراں ہوئی نظر — ہر پھول تھا جہانِ تمنا بنا ہوا
ہر گل میں تھی نمود کسی کے جمال کی — گویا ہر ایک گل میں تھا کوئی بسا ہوا
ہر گل میں وہ مہک تھی کہ صدقے دل و جگر — اُس کا دماغ نکہتِ تازہ میں کھو گیا
دیکھا کہ ایک پھول پہ بلبل ہے نوحہ خواں — شیون سے اُس کے باغ میں ہے حشر سا بپا

پوچھا یہ اُس نے کچھ تو بتا بلبلِ چمن
کیا دکھ ہے تجھکو کس لئے رہتا ہے نالہ زن؟

بلبل نے دی صدا، تجھے اس کی خبر نہیں — اس آستاں سے اُٹھ نہیں سکتی مری جبیں
میری نگاہ وقفِ گلستاں ازل سے ہے — دنیا میں کوئی شے نہیں پھولوں سے بہتریں
میں وجد میں ہوں دیکھ کے پھولوں کا رنگ و بو — کلیوں کے بانکپن میں ہے اک جنتِ حسیں
روتا ہوں یوں کہ آج نگاہوں کے سامنے — لالہ بھی یاسمین بھی ہے اور نسرن و نسترن
لیکن یہاں کل آئیگا دورِ خزاں ضرور — منظر کہاں یہ پاؤنگا میں کیف آفریں

سُنکر یہ نامراد جو آگے ہوا رواں
دیکھا کہ اک چکور ہے نالوں سے نیم جاں

بولا یہ نامراد کہ اے طائرِ تباہ — ہے تیرے لب پہ کس لئے ہر وقت آہ آہ

رو کر کہا چکور نے ہی دردمندِ عشق دن میں مری نگاہ سے اوجھل ہے حسنِ ماہ
میں ہوں فدائے جلوۂ ماہ تمام حسن اُس کے بغیر میرے لئے ہے جہاں سیاہ
یہ روشنی بھی تیرگیوں سے نہیں ہے کم بے نور ہے بغیر تجلّی میری نگاہ
ہے میری زندگی ہمہ تن اضطرابِ عشق میرے لئے نہیں ہے تسلّی کی کوئی راہ

سُنکر بیاں چکور کا اک چوٹ سی لگی
اک آہ نامراد کے منہ سے نکل گئی

آگے بڑھا تو دیکھا پپیہے کو نوحہ خواں کہتا تھا بار بار بڑے دُکھ سے "پی کہاں"
گو نجا ہوا تھا نغموں سے اُس کے چمن تمام اس کی صدا میں سوز کا اک حشر تھا نہاں
آنکھیں تھیں بند اور تصوّر تھا دوست کا بس "پی کہاں" کے ورد سے تھی اُسکی تر زباں
پوچھا یہ نامراد نے اے مضطرب پرند ڈوبی ہوئی ہے سوزِ وفا میں تری فغاں
بولا پپیہا سچ سہی تیرا بیاں مگر روتا ہوں جسکی یاد میں اُسکا نہیں نشاں

گر ایک بار بھی مجھے ملتا وہ بے وفا
کیوں "پی کہاں" زبان پہ رہتا مری سدا

آگے بڑھا یہاں سے جو وہ بے نیازِ ہوش دیکھا کہ اک مقام پہ ساقی ہے مے فروش
بیٹھا ہے ایک سمت خصوصی ادا کے ساتھ آغوش میں لئے ہوئے سامانِ ناؤ نوش
اس کے چار سمت ہیں اربابِ میکدہ اور پی رہے ہیں بادۂ گلرنگ و گل بدوش
اک سمت ایک ٹوٹے ہوئے جام کے قریب بیٹھا ہے ایک شخص پریشاں اور خموش
پوچھا یہ نامراد نے افسردہ کیوں ہے تو کہنے لگا کہ پھر گئی ہے چشمِ میفروش

سب مستِ کیفِ بادہ ہیں میں ہوں اسیرِ غم
پیوست میرے دلمیں ہزاروں ہیں تیرِ غم

آگے بڑھا تو دیکھا کہ دوشیزۂ شباب بیٹھی ہے صحنِ باغ میں چہرے پہ ہے نقاب
رنگیں لباس اور بھی تھا وجہ دلکشی اور تھا نگاہِ ناز پہ چھایا ہوا حجاب
عشاق اک نگاہِ کرم کے تھے منتظر لیکن اسے تھا لطف و کرم ہی سے اجتناب
ہر سمت شور نالہ و فریاد تھا بلند چھایا ہوا تھا چرخ پہ آہوں کا اک سحاب
پوچھا یہ نامراد نے اے عاشقانِ حسن کیوں اپنی زندگی کو کیا وقفِ اضطراب

اک عاشقِ حزیں نے کہا تو ہے بے خبر
آنکھیں ہیں تیرے چہرے پہ لیکن نہیں نظر

آگے بڑھا تو دیکھا کہ اک پیرِ ناتواں — نالہ بلب پڑا ہے سرِ راہ خستہ جاں
بوسیدہ چیتھڑوں سے بدن ہے ڈھکا ہوا — آنکھوں سے سیلِ اشک ہے آٹھوں پہر رواں
پوچھا جو اُس سے کیوں ہے خراب اتنا تیرا حال — کیا تیرا غمگسار نہیں ہے کوئی یہاں؟
اک آہ بھر کے بولا وہ بیمار زیرِ لب — میں بھی کبھی تھا انجمنِ دہر میں جواں
اب ضعف ہے تو کوئی مجھے پوچھتا نہیں — دیتی نہیں زمین کی وسعت مجھے اماں

اب بیکسی میں پوچھنے والا کوئی نہیں
اب مجھکو ہے یقیں کہ میرا کوئی نہیں

آگے بڑھا تو دیکھا کہ اک قبرِ کہنہ پر — ہے بیکسی جھکائے ہوئے حسرتوں سے سر
پوچھا یہ کس کی قبر ہے کس کا مزار ہے — لوحِ مزار پر ہے تو کیوں اتنی نوحہ گر
بولی یہ خوابگاہ ہے اک شہریار کی — جو تھا جہاں میں صاحبِ اقبال و دادگر
دنیا میں اُس کے نام کے ڈنکے بجا کیے — سکہ رواں تھا اُسکا یہاں شام اور سحر
اور اب لحد پہ فاتحہ خواں بھی نہیں کوئی — جگنو بھی ضو فشاں کہیں آتا نہیں نظر

جو حکمرانِ دہر تھا اُسکا یہ حال ہے
دو دن کی زندگی کا یہ غمگیں مآل ہے

آگے بڑھا تو دیکھا کہ روتی ہے ایک شمع — جلتی ہے اور جان کو کھوتی ہے ایک شمع
پروانے ہو رہے ہیں نثار اُس کے حسن پر — اشکوں سے اُنکی لاش کو دھوتی ہے ایک شمع
حیران دیکھکر اُسے، یوں شمع نے کہا — تخمِ وفا کو دہر میں بوتی ہے ایک شمع
دیکھا ہے تُو نے حسن ہے بیزار عاشقی — لیکن برائے عشق ہی روتی ہے ایک شمع
عاشق ہے تو۔ تو جان بھی دے عشق کے لیے — جس طرح اپنی جان کو کھوتی ہے ایک شمع

اب نامراد پر کھلے اسرارِ زندگی
اک لفظ نے کیا اُسے سرشارِ زندگی

پیشِ نظر ہوا جو نیا رنگِ کائنات۔ — ذہنِ رسا پہ کھل گئے اسرارِ شش جہات
اس کی نگاہ ہو گئی یوں حسن آشنا — ذروں میں دیکھنے لگا لاکھوں تجلیات
وہ رازِ زندگی ہی سے واقف نہ تھا فقط — تھے ماورائے زیست بھی اُس کے تخیلات
حاصل ہوا عبور رموزِ حیات پر — اس کے لئے رہا نہ اہم قصۂ حیات
اب نامرادیوں کا نہ تھا کچھ اُسے گلہ — معروفِ انقلاب تھیں اُسکی توجہات

تھا اب وہ نامراد کہاں بامراد تھا
لیکن یہ واقعہ ہے نہ مضطر نہ شاد تھا

(حاجی) بنی احمد بریلوی

ادبی خطوط

حضرت احسن مارہروی مرحوم جہاں استاد حضرت داغ کے شاگرد تھے۔ ملک کے قدر شناس افراد نے ان کو داغ کے نورتنوں میں شمار کیا ہے۔ استاد اور شاگردوں میں کیسے تعلقات تھے اور استاد کے وصال کے بعد شاگرد کے دل میں آخر دم تک اپنے استاد سے کتنا گہرا خلوص اور حقیقی ارادت قائم رہی۔ اس کا اندازہ حضرت احسن مرحوم کی اُن تحریری و تقریری خدمات سے کیا جا سکتا ہے جن کا سلسلہ آخر دم تک مرحوم نے برابر جاری رکھا۔

حضرت امیر مینائی جناب داغ کے ہم عصر تھے ایک دوسرے سے آپس میں بڑی گہری محبانہ عقیدت بھی تھی مگر اسی کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی شاعرانہ رقابت کے فسانے بھی دہرائے گئے۔ عرصے تک امیر و داغ کے شاگردوں میں کاٹ چھانٹ بھی رہی ہے اور داغ کے شاگردوں نے امیر کے اور امیر کے بہی خواہوں نے داغ کے کمالات پر پردے ڈالنے کی کوششیں کی ہیں، ممکن ہے کہ اپنے استاد کی طرفداری میں حضرت احسن نے بھی کبھی زبان کھولی ہو مگر جہاں تک تعلق ہے امیر کے کمالات کے اعتراف کا حضرت احسن نے ہمیشہ اُن کے مدارج کو محسوس فرمایا اور حضرت امیر کی زندگی میں ان سے ہمیشہ عقیدت مندانہ مراسم قائم رکھے۔ اسی ثبوت میں امیر مینائی مرحوم کے بہت سے خط ہمارے پاس محفوظ ہیں، اس صحبت میں صرف احسن و امیر کے تعلقات کو واضح کرنے کے لئے کچھ خطوط پیش کرتا ہوں۔ ہر چند ان خطوط میں روزمرہ کے حالات اور خیروعافیت وغیرہ سے متعلق امور درج ہیں لیکن امیر جیسے بزرگ اور باکمال شاعر کی یہ بے تکلفانہ تحریریں بھی تبرکات سے کم نہیں۔ یہ خطوط جہانتک مجھے معلوم ہے کہیں شائع نہیں ہوئے ہیں، پہلی بار منظرِ عام پر لائے جاتے ہیں:-

(۸۵)

رام پور، یکم جنوری ۱۸۹۶ء

یادآورِ من محبی سید علی احسن صاحب احسن سلمکم اللہ ذوالمنن

سلام مسنون، اخلاص دُعا مشحون، محبت نامہ آیا۔ ریاض سخن ساتھ لایا، اس نے ممنون، اس نے مسرور کیا۔ عنایات کا شکر گزار ہوں۔ مگر اسی کے ساتھ امیدوار ہوں کہ میری رنجوری و معذوری کا عذر قبول ہو۔ پیرانہ سال ہوں، خستہ حال ہوں۔ باایں ہمہ جب طبیعت راہ دیگی کچھ کہوں گا۔ یہ نہیں لکھ سکتا کہ کب گلدستے میں غزل بھیجوں گا۔ میری افسردہ دلی نے جن شاگردوں کو مجھ سے دلی محبت ہے فکر سخن سے معطل کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص زمانے کی رفتار سے ایسا اپنے حال میں گرفتار ہے کہ اُس کو شاعری کا ہوش نہیں۔ جس کو جب فرصت ہوگی ضرور گلدستے کی شرکت کرے گا۔ امکان بھر دریغ نہ کیا جائیگا، آپ خاطر جمع رکھیں۔

امیر فقیر

---

(۸۶)

رام پور۔ ۷ر مئی ۹۶ء

گرامی شان، سعادت و اقبال نشان سلمکم اللہ المنان

سلام مسنون دُعا مشحون۔ حافظ کفایت اللہ خاں سے بعد ناچاقی طبیعت آپ کی صحت معلوم ہوئی۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ حافظ عبدالجلیل صاحب نے لکھا ہے کہ لغت کی قیمت حافظ کفایت اللہ خاں کے ہاتھ روانہ ہو گی، اُن سے معلوم ہوا کہ حافظ عبدالجلیل صاحب اُنکے چلتے وقت مارہرے میں نہ تھے لہذا آپ کو تکلیف دی جاتی ہے کہ زرِ قیمت بہ ذریعہ منی آرڈر اسی قیمت میں سے محصول دیکر بھیجدیجئے اس لئے کہ ان کتابوں کا تعلق سرکار سے ہے۔ حساب اُلجھا نہ رہے اور میں فارغ الذمہ ہو جاؤں۔ مدت سے آپ کا گلدستہ نہیں نکلا مانع بخیر ہو۔ حافظ عبدالجلیل صاحب اگر اس کارڈ کے پہونچنے تک آگئے ہوں تو سلام و دعا لیں۔ اخلاص کیش جلیل حسن تسلیم گزارش ہے فقط

امیر فقیر

رام پور۔ ۲۳ جون ۱۸۹۸ء ۷۸۶

دلنوازمن سید علی احسن صاحب۔ کارڈ آیا، ممنون یادآوری
کیا۔ گلدستے کی ترتیب اور طبع کو آپ میری غزل پر موقوف نہ رکھئے
میری طبیعت اچھی نہیں اور میرے گھر میں کئی عزیز بیمار ہیں۔ میں
غزل نہیں کہہ سکتا، آئندہ پھر کسی زمین میں موقع ملیگا تو کہوں گا
جلیل کی طرف سے سلام نیاز۔ فقط

امیر فقیر

۷۸۶

رام پور، دفتر امیر اللغات ۸ جولائی ۱۸۹۸ء

جناب من تسلیم

حسب الارشاد حضرت قبلہ و کعبہ جناب منشی امیر احمد صاحب امیر
مدظلہ العالی عرض کیا جاتا ہے کہ آپ کے یہاں سے جنوری ۹۸ء
کا پرچہ آیا تھا جس میں مختلف طرح پر غزلیں ہیں، درمیان کے پرچے
موصول نہیں ہوئے، اس قدر معلوم ہونا چاہتے کہ آپ نے بھیجے
ہی نہیں یا بھیجے تو کہیں تلف ہو گئے۔

نیازمند جلیل حسن سکریٹری دفتر

رام پور ۱۹ جولائی ۹۸ء ۷۸۶

محب دل نواز، سلام مسنون اخلاق مشحون
مہربانی نامہ مورخہ ۱۸ جولائی پہونچکر باعث منت پذیری ہوا
اس سے قبل ایک کارڈ بھی آچکا ہے۔ ریاض سخن کا پرچہ جس
میں والیٔ ٹونک کی شبیہ ہے اب تک نہیں آیا، معلوم نہیں
کیا بات ہے کہ آپ بھیجتے ہیں اور مجھ تک نہیں پہونچتا۔ آپ کی
کامیابی پر نہایت مسرت کے ساتھ مبارکباد دیتا ہوں اللہ تعالیٰ
روز بروز ترقی کرے، اس شہر میں کوئی مصور فوٹو اتارنے والا نہیں ہے
پچھلا ایک فوٹو میرا علاوہ صاحب جنرل علی خاں بہادر نے طلب کیا تھا
وہی کو بھیجا گیا۔ اب ان کو خط لکھکر منگواؤں گا اور آپ کو بھیجوں گا۔
باقی خیریت۔

امیر فقیر

رام پور یکم اگست ۹۸ء ۷۸۶

محبی و سیدی۔ سلام مسنون دعا مشحون
مہربانی نامے موصول ہوکر باعث شکر یادآوری ہوئے۔ ٹونک کے واسطے کان پور
تحریر بھیجی ہے ابھی وہاں سے کچھ جواب نہیں آیا۔ اس وقت پھر ایک تاکیدی خط
بھیجتا ہوں۔ پیچھے فارسی لگنا کوئی محاورہ نہیں ہے نہ میں نے کہیں سنا
آپ کے بار بار اصرار سے اور بوجہ ناچاقی طبیعت غزل نہ کہہ سکنے سے
سخت محجوب ہوتا ہوں۔ میں نے تحریر اسمی حافظ عبدالجلیل صاحب
میں بھی اپنی کردہات کا کچھ حال لکھکر معذرت کی ہے

امیر فقیر

رام پور یکم رجب ۱۳۰۵ھ ۷۸۶

محب من۔ سلام مسنون۔
گھائل کو قدما میں اکثر شعرا نے بہ فتح یا موزوں کیا ہے، شاہ ظفر دہلوی
وغیرہ نے انہیں کی تقلید کی مگر متوسط طبقۂ شعرا نے بہ کسر یا موزوں
کیا۔ البتہ اس طبقے میں بحر مرحوم نے بہ فتح یا کہا ہے اور مجھ سے بالمشافہ
یہ ذکر کیا کہ وزن سے لوگوں کو دھوکا ہوگیا ہے۔ در اصل ہندی لفظ
ہے بہ فتح یا۔ اس صحبت میں اسیر مرحوم بھی موجود تھے اُن کے نزدیک
بہ کسر یا ہی رہا اور انھوں نے فرمایا کہ طبقۂ متوسطین میں جمہور شعرا
نے بہ کسر یا کہا ہے تقلید انھیں کی مناسب ہے اور خود وہ اور اُن کے
اتباع سے میں بھی بہ کسر یا ہی استعمال کرنا بہتر اور راجح سمجھتا ہوں
مگر چونکہ بسمل ان معنوں میں شعرا کو مل گیا ہے تو اُس کا استعمال کرتے
ہاں جہاں کہیں مطلع میں بسمل کا قافیہ آگیا ہے اور ضرورت پڑی ہے
کردو۔ سرا قافیہ انھیں معنوں میں ہو تو گھائل کیا ہے، اشعار سند کے
اس وقت یاد نہیں اور میں عازم سفر ہوں لہذا تفصیل تجسس نہیں کرسکتا۔ فقط

امیر فقیر عفی عنہ (باقی۔ باقی)

(مرتبہ) سید رفیق مارہروی

مرحوم بیوی کی یاد میں

تجھے بھول جاؤں ممکن نہیں ہے   محبت میں ایسا ہوا بھی کہیں ہے
مجھے کیا یہ دنیا جو چیں بر جبیں ہے   تصور ترا مجھ کو ایمان و دیں ہے
تجھے بھول جاؤں یہ ممکن نہیں ہے

یہ ممکن نہیں ہے تجھے بھول جاؤں   کسی دوسرے سے دل اپنا لگاؤں
محبت کی برباد بستی بساؤں   میں ٹوٹے ہوئے ساز کو پھر بجاؤں
تجھے بھول جاؤں یہ ممکن نہیں ہے

مری زندگی میں اجالا تھا تجھ سے   یہ دنیا میں تقدیر والا تھا تجھ سے
ضیا گیر گھر کا شوالہ تھا تجھ سے   مرا سوز الفت دوبالا تھا تجھ سے
تجھے بھول جاؤں یہ ممکن نہیں ہے

نہیں ہے اگر تو تری یاد تو ہے   نہ ہوں لب پہ نغمات فریاد تو ہے
مرا دل ترے غم سے آباد تو ہے   ابھی نامکمل یہ روداد تو ہے
تجھے بھول جاؤں یہ ممکن نہیں ہے

تصور سے تیرے ہم آغوش ہوں میں   مئے تلخ فرقت سے مدہوش ہوں میں
مسرت کی محفل سے روپوش ہوں میں   ترے غم کو اپنا کے خاموش ہوں میں
تجھے بھول جاؤں یہ ممکن نہیں ہے

اکیلا ہی بحر حوادث میں چھوڑا   بلا کر مجھے پاس منہ مجھ سے موڑا
اسی دن کو کیا مجھ سے ناطہ تھا جوڑا   محبت بڑھا کر محبت کو توڑا
تجھے بھول جاؤں یہ ممکن نہیں ہے

مرے عشق کو تو نے ٹھکرا دیا ہے   مجھے راہِ منزل سے بھٹکا دیا ہے
یہ کیا اہل محفل سے فرما دیا ہے   مری آرزوؤں کو ٹھکرا دیا ہے
تجھے بھول جاؤں یہ ممکن نہیں ہے

نہیں غیر ممکن کرے سعیِ دنیا   کرے میرے دل کو فریب تمنا
کوئی اور ہو جائے ممکن ہے میرا   مگر میں نہیں ہو سکوں گا کسی کا
تجھے بھول جاؤں یہ ممکن نہیں ہے

یہ ممکن ہے بزم طرب گرم ہوگی   نیا ذوق و مستی نیا جام و ساقی
مگر اس میں بھی ہوگی تیری خوشی ہی   کرے گا مرا دل تجھے یاد جب بھی
تجھے بھول جاؤں یہ ممکن نہیں ہے

حسیں اور بھی خوش ادا اور بھی ہیں   جوانی کے نغمہ سرا اور بھی ہیں
دل و جاں ہوں جن پر فدا اور بھی ہیں   خدائی میں یوں تو خدا اور بھی ہیں
تجھے بھول جاؤں یہ ممکن نہیں ہے

بہاریں یہ گلشن میں آتی رہیں گی   نئے گل ہمیشہ کھلاتی رہیں گی
تبسم کے گوہر لٹاتی رہیں گی   ترنم سے دل کو لبھاتی رہیں گی
تجھے بھول جاؤں یہ ممکن نہیں ہے

کئی کروٹیں یوں تو لے گا زمانہ   بتدریج ماضی بنے گا فسانہ
نیا ہوگا تعمیر اک آشیانہ   یہی میرے جینے کا ہوگا بہانہ
تجھے بھول جاؤں یہ ممکن نہیں ہے

ضیا فتح آبادی ایم۔اے

خونِ تمنّا

میں بڑے کرّ و فر کے ساتھ اسٹیشن پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ چاند اپنی سنہری کرنیں کائنات کے ذرّے ذرّے پر پھیلائے ہوئے تھا۔ بادلوں کے ٹکڑے چاند کے گرد حلقہ ڈالے ہوئے تھے۔ تارے اپنی پوری تابانی کے ساتھ جھل مل جھل مل کر رہے تھے۔ پلیٹ فارم سے ملحقہ باغیچہ کی فضائیں مستی میں چور تھیں ہوا سنکی ہوئی تھی اور ماحول کیف و رنگ میں ڈوبا ہوا ـــــ

میں اپنے تصوّرات کی دُنیا میں مطلقاً ڈوبا ہوا تھا۔ کبھی کبھی انجن کی سیٹی ضرور مخل سماعت ہو جاتی تھی۔ میں پلیٹ فارم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتا اور پھر لوٹ آتا۔ اس وقت میرے سامنے ایک ہی سوال درپیش تھا اور وہ تھا نجمہ کا حسن ـــــ اماں جان جتنی اُسکی تعریف کرتی ہیں اگر وہ واقعی اتنی ہی حسین ہے تو مجھے اُس سے شادی کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ اماں جان غلط بیانی سے تو کام لے نہیں سکتیں، آخر انھیں مجھ سے بھی تو بے پایاں محبت ہے۔ نجمہ ـــــ خوبصورت نجمہ! میرے جذبات کے لئے کس قدر طمانیت بخش ہوگی۔ اُس کا گورا گورا رنگ۔ اُس کے گلابی رخسار۔ کتابی چہرہ۔ مخمور آنکھیں، قیامت خیز تبسم۔ بات بات میں شوخی یہ سب کچھ میرے خیالات میں رقص کر رہے تھے۔ میں خیالی سرمستی کی دُنیا میں ایسا کھویا کہ گارڈ کی سیٹی کی آواز تک میرے کانوں میں نہ آئی۔ جب انجن نے سیٹی دی اور ٹرین کافی تیز ہو گئی۔ اس وقت میں چونکا ـــــ ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگنا شروع کیا ـــــ اور بہ سرعت ایک ڈبے کے آہنی کنڈے کو پکڑ کر لٹک گیا۔ میرا سامان بسوہوں کا بکس، سوٹ کیس ـــــ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی ـــــ

گاڑی اپنی پوری رفتار کے ساتھ چھک چھک پھک پھک کرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ میں پسینوں میں نہایا ہوا تھا۔ میرا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر ہاتھ چھوٹ گیا یا پاؤں پھسل گیا تو پھر خیر نہیں، یا اندر سے کسی نے دروازے کو دھکا دیدیا تو سیدھا گاڑی کے پہیوں سے جا کر ٹکراؤں گا اور جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ دروازہ کھولکر اندر داخل ہو جاتا۔ خدا جانے سافر کیا سمجھیں اور دل کھولکر جوتوں سے مرمت کریں۔ اس قسم کے سینکڑوں خیالات، ٹرین کی رفتار سے زیادہ سرعت کیساتھ دماغ میں آ رہے تھے۔

یکایک ایک حور مجسّم جس کے لانبے لانبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے کھڑکی کے قریب آئی اور انتہائی غضب ناک تیوروں سے دیکھنے لگی۔ میں سہم کر رہ گیا، دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ میں نے ہمت کرکے عاجزانہ لہجہ میں کہا، "بوی مجھے معاف کیجئے ـــــ میں انتہائی مجبوری کے عالم میں اس جرم کا مرتکب ہوا ہوں۔ للّٰہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اندر آ جاؤں، ورنہ چند ساعتوں میں گرنے ہی والا ہوں۔"

"نہیں نہیں تم یہاں نہیں آ سکتے۔ یہ زنانہ ڈبہ ہے زنانہ ـــــ تم گاڑی سے فوراً اُتر جاؤ" اُس نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"میں اگلے اسٹیشن پر اُتر جاؤں گا۔ میں شریف ہوں، لُچّا لفنگا نہیں ہوں۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں آپ کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لوں گا۔ لیکن خدا کے واسطے اس وقت میری جان بچا لیجئے۔ میرے حال پر رحم کیجئے۔"

"بدتمیز۔ نالائق۔ بے وقوف، تمھیں شرم نہیں آتی کہ تم ایک زنانہ ڈبہ میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اُتر جاؤ۔ ابھی اور اسی وقت اُتر جاؤ ورنہ میں چلاتی ہوں۔ یاد رکھو اگر تم نہ اُترے تو میں زنجیر کھینچ لوں گی۔ گاڑی ٹھہر جائیگی اور تم گرفتار ہو جاؤ گے۔ نہیں اُترتے، ٹھہرو میں تمھیں ابھی دھکا دیتی ہوں تاکہ تم اپنی تمام بدمعاشیوں اور بدکرداریوں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم رسید ہو جاؤ۔"

"دیڑی ـــــ کیا مجھ پر آپ کو رحم نہیں آتا ـــــ آہ یہ قسمت

کی ستم ظریفی ہے کہ آج میری شرافت کو شبہ کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ یہ میری بدبختی ہے کہ آج میں اس طرح ٹھکرایا جا رہا ہوں۔ ایک مجبور پر یوں ظلم کرنا آپ جیسی شریف النفس لڑکی کو ہرگز زیب نہیں دیتا —— آپ کے ہاتھ غلطی نفسی کے لئے بنائے گئے ہیں، نہ کہ موت کے منہ میں ڈھکیلنے کے لئے۔ آئیے مجھے شوق سے گرا دیجئے —— آپ کے دستِ حنائی جسم سے مس ہوتے ہی روح قفسِ عنصری سے رخصت ہو جائیگی مگر —— جس کو حسن مارے اُس پر لاکھوں زندگیاں نثار ——

• جس کو ایک حورِ مجسم موت کے غار میں ڈھکیلے اُسکی قسمت پر جتنا ناز کیا جائے کم ہے۔ جس کے جمالِ جہاں آرا کو دیکھ کر ستارے ماند پڑ جائیں اُسے دیکھنے کے بعد میری آدھی زندگی تو ویسے ہی ختم ہو چکی ہے‘ اب آپ کیوں دیر کرتی ہیں آئیے اور جلد میرا کام تمام کر دیجئے۔“ وہ مجھے حیرت و استعجاب سے گھور رہی تھی —— جواباً وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ میں نے ہمت کر کے کھڑکی کھول لی اور اندر داخل ہو گیا۔

”تم چور ہو، تم ڈاکو ہو، تم بدمعاش ہو۔ زنانہ ڈبہ میں ایک تنہا عورت کو دیکھ کر اس طرح گھس آنا —— آخر تم کیا چاہتے ہو؟“ وہ خوف اور غصہ کی کشمکش میں مبتلا تھی اور بُری طرح کانپ رہی تھی اُس کے حسین و جمیل رخسار سُرخ ہو گئے تھے، موسم بہار کے گلاب کی طرح —— اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے سردی سے ٹھٹھرے ہوئے مزدور کی طرح، اس کا گلا خشک ہو گیا تھا آخری سانسیں لینے والے بیمار کی طرح۔ یکایک اُس کا ہاتھ تیزی کے ساتھ زنجیر کی طرف بڑھا۔ میں نے بہ سرعت ہاتھ تھام لیا اور فوراً اُس کے پیروں پر گر پڑا، خدا اور رسولؐ کے واسطے دیئے۔ اپنی شرافت اور نجابت کا رونا رویا میں نے اُسے بتایا کہ میں ایک اور ڈبے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرا تمام روپیہ اور سامان اسی میں ہے۔ میں سگریٹ لینے اترا تھا کہ ٹرین روانہ ہو گئی اور بہ مشکل میں اس ڈبہ کو پکڑ سکا۔ میرے انتہائی عجز و انکسار کے بعد اُس نے اپنے سوٹ کیس سے ایک پستول نکالا لیکن میرے جسم کے ہر حصے پر اپنی نظریں جمائے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے ایک طرف بیٹھ گئی کہ اگر تم نے ذرا بھی کسی قسم کی جرات کی تو اسی پستول کا نشانہ بنا دیئے جاؤ گے

”بڑی خوشی کے ساتھ“ میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا اور بہت دور جا کر بیٹھ گیا —— اس وقت شب کا ایک بجا تھا۔ چاندنی اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ کائنات کے ذرّہ ذرّہ منور کر رہی تھی۔ دور دراز کی چیزیں بھی آئینہ کی طرح چمک رہی تھیں۔ دُور بہت دُور آبشار کے قریب طاؤس کا ایک جوڑا جذبات کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو محبت کی آگ سے بجھا رہا تھا، پہاڑوں کے دامن میں سکوت کی حکمرانی تھی۔ گلاب کے سُرخ و شاداب پھولوں اور پودوں پر شبنم افشانی ہو رہی تھی —— کچھ خوف اور کچھ تکان کی وجہ سے میں لیٹ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

ایک شدید دھماکا۔ شور و غل اور آہ و فغاں سے میں یکایک چونک پڑا میں ہکا بکا سا رہ گیا۔ میرے منہ سے بیساختہ ایک چیخ نکل گئی —— یا اللہ میں کہاں ہوں اور یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں۔ کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ نہیں نہیں یہ خواب ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنے حواس درست کر کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں ایک غار میں پڑا ہوا تھا اور میرے سر اور ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔

چاند اب بھی اسی طرح چمک رہا تھا اور پہاڑوں کی چٹانوں کو شیشے کی طرح چمکا رہا تھا، چاروں طرف ایک بھیانک پن برس رہا تھا، میں اُٹھا رومال سے زخموں کا خون صاف کیا اور اُس طرف چل دیا جدھر سے شور و غل کی آوازیں آ رہی تھیں —— کوئی کہہ رہا تھا، ہائے میرا بیٹا، کوئی جگر خراش آواز میں ماں کو پکار رہا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا ارے میرے لال تو کہاں ہے۔ غرض ایک آہ و بکا کا حشر بپا تھا۔ قریب پہونچ کر معلوم ہوا کہ ٹرین گر گئی ہے چاروں طرف لوگ بھاگ دوڑ رہے تھے۔ ریلوے کے حکام۔ پولیس۔ مزدور غرض ایک ہجوم غفیر تھا ایسی حالت میں مجھے اپنے بے رحم ہم سفر کی خطرناک تلاش ہوئی۔ اُس کا برتاؤ کتنا ہی غیر شریفانہ سہی لیکن وہ مجرم نہیں ہے —— میں اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ ایک عورت بُری طرح چیخ رہی تھی، وہ گلوگیر آواز میں ابا جان۔ ابا جان کہہ رہی تھی۔ جب میں اس کے پاس پہونچا تو وہ کہنے لگی:—

"تم نے میرے ابا جان کو دیکھا ہے؟ خدا مجھے بتا دو، وہ خیریت سے تو ہیں۔"

"تمہارا نام" میں نے پوچھا۔

"مجھے سلطانہ کہتے ہیں۔ میرے ابا جان سے مجھے ملا دو، تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ اُن سے کہہ دینا کہ وہ تمہارے لئے بے چین ہے۔ اُس کے سر میں چوٹ آئی ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے تم اس وقت کس سے گفتگو کر رہی ہو؟" میں نے طنزاً کہا

"ہاں معلوم ہے —— اپنے ہم سفر سے۔" اُس نے انتہائی عاجزانہ لہجہ میں کہا۔

"کون کہتا ہے —— تمہیں کچھ مغالطہ ہو رہا ہے" میں نے ذرا بگڑ کر کہا۔

"میں کہتی ہوں تم مجھے اتنی جلدی بھول گئے —— کیا میں نے تمہیں موت کے منہ سے نہیں نکالا۔ کیا میں نے خلافِ قانون تمہیں پناہ نہیں دی۔ کیا عورت ذات ہوتے ہوئے میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کے تمہیں غیر مرد ہوتے ہوئے اپنی خلوت میں آنے کی اجازت نہیں دی۔ بولو۔ بولو —— کیا یہ غلط ہے صرف میرے اس گناہ ہی کی خاطر میرے ابا جان سے مجھے ملا دو —— جاؤ۔ جاؤ —— میں تمہارا احسان عمر بھر نہ بھولونگی" اُس نے روتے ہوئے کہا۔

"میرے دل میں رحم ہے لیکن بیکسوں کے لئے، تم جیسی رعونت پسند عورتوں کے لئے نہیں۔ غریبوں کے لئے میں اپنی زندگی بھی قربان کر سکتا ہوں لیکن تم جیسی بے رحم ہستی کے لئے نہیں۔ تم اپنی مصیبت میں رحم کی طالب ہو، لیکن دوسروں کی مصیبت میں رحم کا نام تک بھول جاتی ہو۔ بولو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں"

"میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ خدا کے واسطے مجھے معاف کر دو۔ میں تمہاری مجرم ہوں۔ میں نے گناہِ عظیم کیا ہے۔ جس طرح بھی ممکن ہو میرے ابا جان کی جان بچا لو۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں، تمہارے پیر دل پڑتی ہوں۔" وہ ڈکیں مار کر رونے لگی۔

"لیکن سلطانہ ایک ظالم۔ بدمعاش اور شاطر انسان سے تو تمہیں رحم کی امید نہیں رکھنی چاہئے۔ اُس کے پاس رحم ہوتا ہی کہاں ہے؟" —— میں نے کہا

"بھول جاؤ، خدا کے واسطے ان باتوں کو بھول جاؤ۔" اُس نے یہ کہتے ہوئے ایک آہ کھینچی اور زمین پر گر پڑی۔

سلطانہ، سلطانہ۔ میں نے اُسے جھنجوڑا۔ آوازیں دیں لیکن وہ بیہوش ہو چکی تھی۔ میں اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ ایک قلی چیختا ہوا آیا۔

"یہاں کوئی سلطانہ ہے؟"

"ہاں ہے، میں نے کہا، بولو کیا کہتے ہو؟"

"حضور ایک سید صاحب کے سر اور کمر میں بہت چوٹ آئی ہے۔ وہ ہسپتال میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بھیجا ہے کہ سلطانہ نام کی جو لڑکی ملے اُسے یہاں لے آؤ۔"

" —— اچھا تم جاؤ اور سید صاحب سے کہو کہ آپ کی لڑکی ابھی آتی ہے۔ وہ اچھی طرح ہے۔

"تم تو اب بالکل اچھی ہو گئی ہو سلطانہ —— کل ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ سید صاحب کو ابھی کم از کم ایک ہفتہ یہاں اور ٹھہرنا پڑیگا۔"

"ہاں آثار تو کچھ ایسے ہی نظر آرہے ہیں۔ ابا جان کے زخم بھرتے ہی نہیں ہیں۔"

"میں تو اب گھبرا گیا ہوں سلطانہ۔ دیکھو اس قفس سے کب آزادی ملتی ہے۔"

"اس عارضی قفس سے تو آزادی ممکن ہے مگر......"

"مگر کیا؟ کہو رُک کیوں گئیں، آؤ میرے قریب آجاؤ، ڈرتی کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں۔ بلا ارادہ میری زبان سے مگر نکل گیا تھا۔"

"تم جھوٹ کہہ رہی ہو سلطانہ —— مگر کا منہ بغیر ارادہ کھلتا ہی نہیں۔"

"تمہیں تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے نسیم، ذرا تو سنجیدگی اختیار کرو۔"

"سنجیدگی اور سلطانہ کے سامنے ایک شوخ و طرار دیوی کے سامنے —— ! تم نے بھی کمال کیا" دیوی ہار پھول چڑھائے اور دیوتا کی باچھیں نہ کھلیں۔"

واہ بی سلطانہ —— میں نے اُس کے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔"

"ہم تو جب جانیں کہ محبت کے قفس سے آزاد ہو جاؤ" —— وہ کہتی ہوئی بھاگی،

محبت کے قفس سے آزاد ہو جاؤ —— میں پہروں اس جملہ پر غور

کیا کرتا۔ اس پر جتنا غور کرتا مجھے اتنا ہی لطف محسوس ہوتا۔

آج دو بجے کے قریب کافی بارش ہو گئی تھی۔ فضا میں تازگی اور خنکی پیدا ہو چکی تھی۔ سلطانہ سید صاحب کے کام میں لگی ہوئی تھی اور میں کھڑکی میں سے سرسبز و شاداب مرغزاروں۔ جنگلی پھول اور پرندوں کے چہچہوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا ـــــ دل میں ایک عجیب ہیجانی کیفیت برپا تھی۔ معاً ایک سارس کا جوڑا سامنے والے تالاب پر آکر بیٹھا۔ اُس نے کچھ دیر پانی سے لطف اٹھایا اور پھر خشکی پر آکر ایک دوسرے کے پروں میں اپنی اپنی چونچیں دے کر محبت کے جذبات میں کھو گئے۔

"تم سچ کہتی ہو سلطانہ ـــــ محبت کے قفس سے آزادی ممکن نہیں۔ میں نے بے اختیارانہ طور پر کہا" "نہیں" کا "نون" ابھی زبان سے اچھی طرح ادا بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی کے نازک ہاتھ آنکھوں پر تھے۔ گھبرا کر مڑا تو سامنے سلطانہ مسکرا رہی تھی ـــــ

"ممکن بنانے کی ایک صورت ہے نسیم، اُس نے شرارت سے کہا"۔

"کس چیز کو سلطانہ؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"وہی م۔ب۔ح۔ت، ـــــ سمجھے جناب نسیم صاحب"۔ اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں نے بے اختیارانہ طور پر سلطانہ کو اپنے سینے اور ہاتھوں کی زد میں لیکر بھینچ دیا، اور پھر کسی خیال سے گھبرا کر فوراً چھوڑ دیا۔ سلطانہ کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ اُس کے سینے کا اُتار چڑھاؤ اُس کے محبت بھرے جذبات کا آئینہ دار تھا۔

"اچھا تو اب تم محبت کا وظیفہ کھینچا کرتی ہو"۔ بھلا ہم بھی تو سُنیں کہ وہ کون بزرگوار ہیں۔ جن سے سلطانہ دیوی کو محبت ہے"۔

"اپنے دیوتا سے ـــــ سمجھے نسیم صاحب"۔

"کون ہے تمہارا دیوتا؟"

"پتھر نہیں بلکہ انسان۔ دو آنکھوں والا۔ بیحد خوبصورت۔ بہترین موسیقار اور اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ"۔

"نام بتاؤ سلطانہ ـــــ یوں پہیلیاں بوجھنے سے کام نہیں چلے گا"۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے ذرا سوچ کر کہا ـــــ انجم تو نہیں ـــــ

"اوں ہوں"

"اسلم تو نہیں" ـــــ،

"اوں ہوں"

"شاہد تو نہیں ـــــ،

"اوں ہوں"۔

"ہر دفعہ اوں ہوں، غالباً کوئی اُلّو۔ پاگل یا گدھا ہوگا، میں نے چیں بجبیں ہو کر کہا"۔

"بس خاموش رہو نسیم ـــــ اُس نے برہم ہو کر کہا۔

تو پھر بتاتی کیوں نہیں ہو۔ خواہ مخواہ تعریفوں کے پل باندھ رہی ہو

"نہیں بتاتے! کوئی تمہارا جھگڑا ہے۔ یہ تو ہماری خوشی ہے، تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے اور بُرا بھلا کہنے والے۔ آئندہ ایسی جرأت کی تو اچھا نہیں ہوگا۔ میں صاف کہے دیتی ہوں نسیم ـــــ"

"اچھا صاحب اب کان پکڑے کبھی آپ کے دیوتا کو بُرا نہیں کہیں گے"۔

"اب تو بتا دو ـــــ،

"اس کا نام بڑا پیارا اور رس بھرا ہے، ـــــ اچھا تم اپنے کان بند کر لو اور آنکھیں بھی۔ میں ایک بار خوب زور سے اُس کا نام لونگی اور پھر چاک سے اس کالے پتھر پر لکھ دوں گی۔ دیکھو درمیان میں نہ کانوں سے ہاتھ ہٹانا، اور نہ آنکھیں کھولنا، ورنہ میں تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناراض ہو جاؤنگی"۔

میں نے کانوں پر جھوٹ موٹ ہاتھ رکھ لئے اور آنکھیں بھی بند کر لیں۔ پہلے سلطانہ نے اپنی ساری کی اوٹ کر کے کالے پتھر پر کچھ لکھا اور پھر زور سے چیخی "نسیم" ـــــ، ہنسی کے مارے وہ دیوانی ہو رہی تھی، وہ اس حرکت کے بعد بھاگنا ہی چاہتی تھی کہ میں نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"تم میرے ساتھ چلو گی سلطانہ" ـــــ میں نے اُس کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

"کہاں ـــــ میرے نسیم"۔

وہاں جہاں کوئی نہ ہو ـــــ جہاں شاہ بلوط پر بُلبل چہچہاتا ہو۔

جہاں کوئل ترانہ ہائے محبت الاپ رہی ہو۔ جہاں طاؤس آبشاروں کی اوٹ میں دُنیا و مافیہا سے بے خبر رنگین کھیل کھیل رہے ہوں۔ جہاں کے ذرّوں پر چاندنی سجدہ ریز ہو ——— اور جہاں فطرت اپنے معصومانہ انداز میں جلوہ گر ہو"۔

"چلونگی ——— نسیم تم مجھے جہاں لے چلوگے میں وہیں چلوں گی۔ تمہاری جُدائی میں کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی ———"

"جانا ہی پڑیگا سلطانہ۔ فرض مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ ماں کی محبت مجھے بُلا رہی ہے۔ تار کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ حالت بہت نازک ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل کو چوٹ لگے گی لیکن میں کیا کروں کہ میرا دل نکلا جا رہا ہے۔ میری پیاری امی جان کا میرے بغیر کیا حال ہوگا۔ غور تو کرو سلطانہ جس ماں نے باپ کا سایہ اُٹھ جانے کے بعد اس طرح پرورش کی ہو کہ باپ کا احساس تک نہ رہے کیا آخری وقت اُس کی ممتا کو تڑپانا مناسب ہے ——— میں تم سے محبت کرتا ہوں سلطانہ ——— لیکن ماں کی محبت میں فرض اور ممتا دونوں کو دخل ہے اور تمہاری محبت میں روح اور دل کو۔ دونوں کا وزن یکساں ہے سلطانہ۔ دونوں مجھے اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ میں اس وقت عجیب کشمکش میں مبتلا ہوں۔ مجھے خوشی سے اجازت دو سلطانہ میں بہت جلد ہیں لوٹ کر آؤنگا ——— میں تمہارا ہوں اور تمہارا ہی رہوں گا۔ میری محبت میں ماسوا کو دخل نہیں ——— تم رو رہی ہو سلطانہ ——— نہ روؤ، تمہارا نسیم اپنی ماں کو دیکھنے کے لئے بیچین ہے ——— اچھا خدا حافظ ———"

وطن پہونچنے کے صرف چند گھنٹے بعد امی جان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سدھار گئیں۔ اس صدمہ نے مجھے کئی دن تک خود اپنی ذات سے بے خبر رکھا جب کچھ غم کی بدلیاں چھٹیں تو میں نے فوراً سلطانہ کو خط میں لکھا لیکن پندرہ دن گذر گئے اور اس کا کوئی جواب نہ آیا۔ جوں جوں زمانہ طویل ہوتا جا رہا تھا، میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ خانگی حالات اور زمینداری کے کاروبار میں کسی وقت جی نہیں لگتا تھا جب سلطانہ کی جُدائی ناقابل برداشت حد تک پہونچ گئی تو میں

مردان پور کے لئے روانہ ہوگیا ——— جوں جوں مردان پور قریب ہوتا جا رہا تھا شوقِ دید و ملاقات تیز سے تیز تر ہوتا جاتا تھا۔ اسٹیشن پر اُتر کر میں نے اسپتال کا رُخ کیا، وہاں پہونچنے کے بعد یہ معلوم کرکے کہ وہ لوگ دو ہفتے ہوئے یہاں سے جاچکے ہیں۔ ساری امیدیں نقش بر آب ہوکر رہ گئیں۔

"ڈاکٹر صاحب کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ لوگ کہاں کے رہنے والے تھے؟"

"کیا خوب، خود ہی آپ نے نام اور پتہ لکھوایا اور اب اُلٹا مجھی سے پوچھ رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے ہنس کر جواب دیا۔

میں اپنے دل میں بیحد شرمندہ ہوا۔ جب ٹرین کا حادثہ ہوا تھا تو گھبراہٹ میں اس وقت میں نے اپنا اور اپنے گاؤں ہی کا پتہ لکھوا دیا تھا۔ چار و ناچار یاس و اندوہ کو جان گزیں کئے ہوئے اپنے مستقر پر واپس آگیا۔ نا اُمیدی اپنی انتہا پر پہونچ چکی تھی۔ کوئی لمحہ سلطانہ کی یاد سے خالی نہ تھا ——— دُنیا نظروں میں تاریک تھی۔ نہ کھانے کو جی چاہتا تھا نہ پینے کو۔ سلطانہ کی یاد ہی حاصلِ زندگی ہوکر رہ گئی تھی۔ میں جتنا اُسے بہلانے کی کوشش کرتا وہ اتنی ہی زیادہ یاد آتی۔ شامِ غم اور شبِ ہجر کے بعد ہر صبحِ فراق دل میں ایک نیا زخم پیدا کرتی ہوئی آتی ——— اس طرح ۶ ماہ گذر گئے ——— لیکن چھ سال کی طرح،

ایک دن خلافِ اُمید ڈاکیے نے ایک خاکی لفافہ لا کر دیا، دل نے گواہی دی کہ یہ مکتوب محبوب ہے، دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے چاک کیا۔ اُس میں لکھا تھا۔

میرے نسیم۔ سلامِ محبت

"تمھیں یہ سُن کر رنج ہوگا کہ اسپتال سے آنے کے دو ماہ بعد ابا جان کا انتقال ہوگیا، میں ان دنوں کچھ ایسی اُلجھن میں مبتلا رہی کہ تمھیں خط نہ لکھ سکی ——— ایک خیال یہ بھی تھا کہ تم مجھے بھول گئے ہوگے ——— اس عرصہ میں تم نے بھی کوئی خط نہ بھیجا ——— نسیم تم آخر محبت کی قدر نہ کرسکے اور مجھے اسپتال میں تنہا چھوڑ گئے ——— خیر ان گذری ہوئی باتوں کو جانے دو، میری تندرستی قدرے خراب ہوگئی ہے،

سینے میں ہر وقت شعلے سے اُٹھتے رہتے ہیں۔ کوئی تشویشناک بات تو ہے نہیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ یہ شعلے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیں۔ ایک تازہ خبر یہ ہے کہ ۲۰ ستمبر کو چچا جان میری شادی کر دیں گے۔ کس کے ساتھ اُس کے ساتھ جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ سُنا یہ ہے کہ بہت رئیس خاندان کا ہے۔ ہو گا! سلطانہ کے دل پر جس کا قبضہ ہے شادی کے بعد بھی رہے گا جسم مادی ہے —— اسے تو میں چیل اور کوؤں کے سپرد بھی کر سکتی ہوں، پھر کیا ہوا اگر ایک بھیڑیا اُسے اپنا لقمہ بنائے۔ ہاں روح میں جو چھپا ہوا ہے، روح اور دوسرے الفاظ میں سلطانہ اسی کی ہے۔ سلطانہ شادی سے پہلے اپنی زندگی ختم کر سکتی ہے۔ سلطانہ شادی سے انکار کر سکتی ہے لیکن صرف خاندان کے نام کا پاس ہے۔ سلطانہ ننگِ خاندان بننا نہیں چاہتی تم سلطانہ کو بے وفا کہتے ہو گے۔ نسیم یہ صرف تمہارا خیال ہے، سلطانہ ایک عورت ہے اور عورت کتنی مجبور و بے بس ہوتی ہے اسے تم بھی جانتے ہو۔ ان چند سطروں کو پڑھنے کے بعد تمہارا جو حال ہو گا وہ میرے علم میں ہے لیکن کیا کروں نسیم، مجبور ہوں گھوڑے سے گرنے والا انسان سنبھل سکتا ہے لیکن کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آ سکتا۔ اچھا اب تمہاری سلطانہ رخصت ہوتی ہے۔ ہاتھ کانپ رہے ہیں اور دل دھڑک رہا ہے"

تمہاری

نامراد۔ سلطانہ

خط کی ہر سطر آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی —— آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھایا ہوا تھا اور میرا سر چکرا رہا تھا۔ خط کو میں نے حفاظت سے جیب میں رکھا، چاہتا تھا کہ ڈرائنگ روم میں واپس جاؤں، —— ٹھوکر لگی اور میں گر گیا۔

"ہاں اب اچھا ہوں چچا میاں۔ صرف معمولی سی کمزوری باقی ہے وہ بھی انشاءاللہ دُور ہو جائے گی۔ آپ فکرمند نہ ہوں"

"ہاں ابھی دو ایک دن اور آرام کرو" چچا صاحب نے مشفقانہ لہجہ میں کہا۔

"بہتر ہے"

آج میں پہلے سے اچھا تھا، سلطانہ کو خط لکھنا چاہتا تھا لیکن آہ اُس نے اپنا پتہ نہیں لکھا تھا —— میں اپنی اس آخری حسرت کو پامال ہوتے ہوئے دیکھ کر ابھی آنسو بہا ہی رہا تھا کہ میری چچازاد بہن شمیم دوڑی ہوئی آئی اور شوخی سے کہنے لگی ——،

"مبارک ہو بھائی جان ۲۰ تاریخ کو بھابی جان آ جائیں گی۔ کل یہاں سے چڑھاوا جائے گا۔ اب مٹھائی کھلائیے —— مٹھائی"

"تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو شمیم —— یہ بھی کوئی مذاق ہے"

"مذاق —— لو اور سنو، ابھی آپ مذاق ہی سمجھ رہے ہیں آپ کو معلوم نہیں، سب باتیں بڑی اماں کی زندگی ہی میں طے ہو گئی تھیں اگر اُن کی عمر وفا کرتی تو اب تک یہ مسرت کی گھڑی کبھی کی آ جاتی ——"

اب میں سمجھا، وہ جو امی جان نجمہ کی تعریف کیا کرتی تھیں اور ابھی سلطانہ کے خیال نے میرے دل سے نکال دیا تھا، اُسی کے ساتھ چچا میاں نے شادی کا اہتمام کیا تھا۔ اب میں اُن سے کیا کہوں کہ میں نجمہ کے ساتھ شادی نہیں کروں گا۔ میں تو سلطانہ کو اپنا بنا چکا ہوں —— یا اللہ خاندان اور سوسائٹی کا یہ کیسا ظلم ہے!

سب خوش تھے اور میں مغموم —— باجے گاجے اور نقارخانہ کی آوازیں دل پر تیر و نشتر کا کام کر رہی تھیں —— بارات روانہ ہوئی اور دو دن کے بعد اپنے دامن میں مسرتوں کے طوفان لئے ہوئے واپس بھی آ گئی۔

آج شبِ عروسی تھی —— سارا کمرہ خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ پھولوں کی چھت گیری۔ پھولوں کا چھپرکھٹ۔ خوشرنگ گلدستے، غرض ہر چیز آراستہ و پیراستہ تھی —— میں سب کے کہنے سننے سے کمرہ میں داخل ہو گیا۔ حجلۂ عروسی کی رعنائیوں۔ دلفریبیوں اور عطر بیزیوں سے دل و دماغ دو گھڑی کے لئے اسقدر متکیف ہوئے کہ میں بیخود سا

ہوگیا۔ سامنے سُرخ ریشم میں لپٹی ہوئی نجمہ سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی ۔۔۔ اُس کے دل کی دھڑکن کا اندازہ میں اپنی جگہ سے اچھی طرح کر رہا تھا۔ میں نے گلوری منہ میں رکھی اور الائچی چباتا ہوا اُس کے قریب پہونچا۔ پلنگ پر قدم رکھنا ہی چاہتا تھا کہ نجمہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ جست بھر کر زمین پر آرہی ۔۔۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے، جلدی سے اُس کا منہ کھولا ۔۔۔،

"کون سلطانہ ۔۔۔ میری سلطانہ"

اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور "پیارے نسیم" کہنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کرلیں ۔۔۔، کمرہ میں چچا اور دیگر اعزا داخل ہوچکے تھے۔ ایک کالا سانپ جو قریب ہی لہرا رہا تھا، لکڑیوں سے کچلا جاچکا تھا ۔۔۔ تمام رات اور دوسرے دن ہر ممکن تدبیر کی گئی سپیرے آئے، بڑے بڑے مشہور ڈاکٹر اور حکیم آئے لیکن نجمہ ۔۔۔ یا سلطانہ جانبر نہ ہوسکی۔ ادہر گھر سے سلطانہ کا جنازہ نکل رہا تھا اُدہر سامنے دو دیا سمین کے پھول جو کچھ دیر پہلے شگفتہ تھے، مُرجھا کر زمین پر گر رہے تھے۔

حافظ اسحاق ہلال ازکوشی

نوائے راز

کیوں بے خبر ہے اتنا نیرنگِ آسماں سے
پوچھوں گا میں کسی دن برہم زنِ جہاں سے

یہ شانِ خود نمائی، یہ جوشِ خود پرستی!
شعلے نکل رہے ہیں کمبخت کی زباں سے

کیا اپنی گمرہی کا احساس ہوگیا ہے
بدظن ہیں کیوں مسافر اب میرِ کارواں سے

دُنیا کا ہر تغیّر ہے بر بنائے فطرت
اہلِ زمیں کو شکوہ بیجا ہے آسماں سے

تخریب میں نہاں ہے تعمیرِ نو کا جلوہ
حُسنِ نگاہ لیکن لائے کوئی کہاں سے

افسوس ہے تو اس کا، کیوں دل کی بات کہدی
شکوہ نہیں ہے مجھ کو کمظرف رازداں سے

سُنتا نہیں ہے کوئی اے رازؔ اہلِ دل کی
آئینِ حق پرستی کیا اُٹھ گیا جہاں سے

رازؔ چاندپوری

شاعر اور حُسنِ بازاری

اے کہ تو شاعر ہے اور فطرت کا ہے پیغامبر — یہ جہاں کیا دونوں عالم ہیں ترے زیرِ اثر
اے کہ تیرے دم سے ہے سرسبز باغِ زندگی — پھول کو تو نے چمک دی ذرّے کو تابندگی
اے کہ تو نغمہ سرا ہے زندگی کے ساز پر — جھومتی ہے محفلِ فطرت تری آواز پر
تیرے دم سے بزمِ عالم کی ہیں سب رنگینیاں — عشق میں اک سوز ہے اور حُسن میں سرمستیاں
تیری ہستی دو جہاں کی باعثِ تخلیق ہے — خود ترا پیغام دعوے کی مرے تصدیق ہے
تو نے دُنیا کے اندھیروں میں اُجالا کر دیا — سادگیِ حُسن کو تو نے دو بالا کر دیا

سچ تو یہ ہے عاشقوں کے دل کو گرماتا ہے تو
مُردہ جسموں میں عمل کی رُوح دوڑاتا ہے تو

لیکن اتنا عرض کرتا ہوں بصد عجز و نیاز — تیری ہستی وہ ہے جس پہ حُسن فطرت کو ہے ناز
اور تو بھولا ہوا ہے اپنے فرضِ عین کو — خود غرض ٹھکرا رہا ہے دولتِ کونین کو
چارہ سازیِ دلِ عشاق تو نے چھوڑ دی — سنتِ دیرینہ اسلاف بالکل توڑ دی
مکر و نخوت اور ریاکاری ہوا تیرا شعار — تو کبھی مخدوم تھا اب بن گیا خدمت گذار
تو کبھی شمعِ حقیقت کا حسیں پروانہ تھا — جلوہ گاہِ طور پہ تیرا دلِ دیوانہ تھا
چھوڑ کر حُسنِ حقیقت، حُسنِ فانی پہ مٹا — تیری منظورِ نظر ہے اک طوائف بے حیا

اُسکے کوٹھے کو حریمِ ناز ہے سمجھا ہوا — کرکٹ ناچیز کو شہباز ہے سمجھا ہوا
مل لیا ہے اپنے منہ پر اُس نے روغن قاز کا — تجھ پہ جادو چل گیا اُس کے لبِ اعجاز کا
نامۂ اعمال تیرا اُس نے کالا کر دیا — کالی ناگن نے ترے گھر میں اُجالا کر دیا
حُسنِ بازاری کو تو سمجھا ہے شہرت کی اساس — حُرمتِ اسلاف کا کچھ بھی نہیں ہے تجھ کو پاس
رات دن لہو و لعب میں اب گذرتی ہیں ترے — بے خبر شاعر ہے تو انجام کو بھولے ہوئے

حُسنِ بازاری مٹے گا، شاعری مٹ جائیگی
ایک دن آئیگا جب دُنیا تری مٹ جائیگی

تو سمجھتا ہے جسے اپنا، کبھی تیری نہیں — چلتی پھرتی چھاؤں دُنیا میں ٹھہرتی ہے کہیں
اُسکے کوٹھے سے بہت نزدیک ہے دوزخ کی راہ — کھینچ لیجائیگی تجھ کو ساتھ اپنے روسیاہ
یہ لبِ اعجاز کب ہیں ہر کی قاشیں ہیں دو — ہر ریاضِ آرزو کو خاک کر دیتی ہیں جو
سوچ اور اب بھی سنبھل ہو باخبر انجام سے — باز آ بہرِ خدا اپنے خیالِ خام سے
دیکھ قدرت لے رہی ہے آج تجھ سے انتقام — صفحۂ ہستی سے مٹتا جا رہا ہے تیرا نام

تیری اس حرکت سے دُنیا لرزہ بر اندام ہے
اور تو با ایں ہمہ ناکام تھا، ناکام ہے

شاعرِ فطرت ہے تو منتظر ہے تیرا انقلاب — تو اگر چاہے اُلٹ دے حُسنِ فطرت کا نقاب
قوتِ علم و عمل اک دن تجھے چمکائے گی — اس جہاں میں خود بخود شہرت تری چھا جائیگی

تازہ ہوگی پھر تری دم سے حدیثِ شاعری
پھر تجھے مل جائیگی کھوئی ہوئی پیغمبری

سہا قریشی وکیل بھنڈ

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح :- "یہ اہتمام سرِ آسماں گھٹا کے لئے"

حضرتِ خان بہادر رضا علی وحشتؔ کلکتوی

مصیبت آئی تو سہہ لے مگر خدا کے لئے ۔۔۔ مگر تو درد کو رسوا کبھی دوا کے لئے
جفا کے بعد وہ آمادہ ہیں وفا کے لئے ۔۔۔ اک اور ظلم سہی جانِ مبتلا کے لئے
امیدوارِ کرم ہو کے نامراد نہیں ۔۔۔ ہوا ہوں وقف ستمہائے ناروا کے لئے
خدا ہی جانے تری دل میں مدعا کیوں ہے ۔۔۔ مجال ہی نہیں جب عرضِ مدعا کے لئے
کرم بغیر ستم تیرا قاعدہ ہی نہیں ۔۔۔ جفا ادا ہے ترے شیوۂ وفا کے لئے
اُمید و بیم کی دنیا ہے دید کے قابل ۔۔۔ ہے آشنا کوئی بیتاب آشنا کے لئے
وہ بخش دیں گے خطائیں اگر بہت ہونگی ۔۔۔ سزا کہاں ہے ہو تجویز ہر خطا کے لئے
ہے خانۂ دلِ عشاق کا خدا حافظ ۔۔۔ کُھلا ہوا ہے یہ دروازہ ہر بلا کے لئے

عجب نہیں ہے جو کھل جائے درِ اجابت کا
تو ہاتھ اُٹھا بھی دے وحشتؔ ابھی دُعا کے لئے

محسنِ ادب حضرتِ نشترؔ ہنگامی ایڈوکیٹ اوریٔ

نہیں ملی ہے تجھے آنکھ ماسوا کے لئے ۔۔۔ خدا کو دیکھ نہ دیکھ اور کچھ خدا کے لئے
یہ باتیں اور بتِ دشمنِ وفا کے لئے ۔۔۔ زباں بند کرلے ہمنشیں خدا کے لئے
نہ ہوگا عشق میں مجھ سا بھی بدنصیب کوئی ۔۔۔ نہ میں وفا کیلئے ہوں نہ میں جفا کے لئے
نہ مبتلائے محبت ہو آدمی کیوں کر ۔۔۔ بہانا چاہئے آخر کوئی قضا کے لئے
دُعائیں مانگنی آتی ہوں آدمی کو اگر ۔۔۔ دُعا اثر کیلئے ہے اثر دُعا کے لئے
جلو میں برق، ہوا بند، آسماں پہ سکوت ۔۔۔ "یہ اہتمام سرِ آسماں گھٹا کے لئے"
دل اور دیر و حرم میں ہے دور کی نسبت ۔۔۔ یہ ابتدا کے لئے ہے وہ انتہا کے لئے
حقیقتاً مری ہستی پرے ہے دونوں سے ۔۔۔ نہ میں فنا کے لئے ہوں نہ میں بقا کے لئے

جو دل نہ ہو تو ٹھکانا کہیں نہ ہو نشترؔ
غمِ مفارقتِ صبر آزما کیلئے

حضرت مولانا سیمابؔ اکبرآبادی

سکوتِ بتکدہ ہے ترکِ ماسوا کے لئے ۔۔۔ بتوں کو پوج نہ اے برہمن خدا کے لئے
نہ راہرو کے لئے ہے نہ رہنما کے لئے ۔۔۔ سکونِ راہِ محبت ہے نقشِ پا کے لئے
اسیرِ جادۂ منزل ہے تیری ہمتِ پا ۔۔۔ روا نہ رکھ اسے تقلیدِ ناروا کے لئے
اگر ہے ذوق تجھے جلوہ آشنائی کا ۔۔۔ تو سعی کر نگہِ جلوہ آشنا کے لئے
مری اُٹھی ہوئی ہاتھوں کو کوئی کیا سمجھے ۔۔۔ دُعا سے ہاتھ اُٹھاتا ہوں یا دُعا کے لئے
جو تیری پائے شکستہ میں تابِ سیر نہیں ۔۔۔ تو سر کو پاؤں بنا جادۂ وفا کے لئے
ہنوز راز میں ہے ابتدا کی غایت بھی ۔۔۔ ابھی سے کون پریشاں ہو انتہا کے لئے
جو حسن عشق سے مٹنے کے بعد بھی نہ مٹے ۔۔۔ خلش وہ مانگ دلِ درد آشنا کے لئے

پڑا ہے دور حرم اور دیر سے سیمابؔ
کہیں جگہ نہیں اس بندۂ خدا کے لئے

حضرتِ شاعرؔ نہٹوری وکیل سواسرا

نگاہِ شوق ہے بیتاب التجا کے لئے ۔۔۔ اِدھر بھی ایک نگاہِ کرم خدا کے لئے
مجھے بھی کاہشِ درماں نے بے نیاز بنا ۔۔۔ وہ درد کیا جو مچلتا رہے دوا کے لئے
ازل سے نذرِ محبت ہوئے ہیں یہ دونوں ۔۔۔ دل ابتدا کے لئے جان انتہا کے لئے
مٹائی ہستی تو اسرارِ ہست و بود کھلے ۔۔۔ فنا نقاب تھی جلوہ گہِ بقا کے لئے
اِدھر ہلے لبِ مظلوم عرش اُدھر لرزا ۔۔۔ اثر نے بڑھ کے قدم لئے کر دعا کے لئے
جہانِ حسن و محبت کے مرنے والوں نے ۔۔۔ فنا سے کام لئے ہیں مگر بقا کے لئے
خبر نہ تھی کہ قیامت کا سامنا ہوگا ۔۔۔ نظر اٹھائی تھی اک بار التجا کے لئے
مجھے نہ دیر سے مطلب نہ کچھ حرم سے غرض ۔۔۔ جبیں ہے وقف مری تیرے نقشِ پا کے لئے

وہ بے نقاب سرِ بزم آئے شاعرؔ
نگاہِ شوق بڑھے نذرِ مدعا کے لئے

حضرتِ آلم مظفر نگری

نہ زندگی کیلئے ہیں نہ یار ساکے لئے — ہیں انکے جلوے فقط چشمِ آشنا کے لئے
بغیر نالہ نہیں دل کا اور کام کوئی — کہ وقف ہے جرس کاروانِ صدا کے لئے
بشر تو آپ ہی قسمت کا اپنی خالق ہے — قدم اُٹھائے تو تکمیلِ مدعا کے لئے
کہاں پناہ ملے گی اسے دو عالم میں — شبِ فراق ہے جو منتظر دوا کے لئے
ہر اک طرف سے قفس کو نہ بند کر صیاد — کوئی تو راہ رہے باغ کی ہوا کے لئے
سمجھ رہا ہے جنھیں جلوہ ہائے لالہ و گل — وہ بجلیاں ہیں یہ باغ کی فضا کے لئے
نہ تھا ہوس کا تصرف مرے گناہوں میں — گناہ میں نے کئے لذتِ سزا کے لئے
یہ فیصلہ تو ازل ہی میں ہو چکا ہے آلم — وفا ہے دل کیلئے اور دل وفا کے لئے

حضرت آغاز برہانپوری

تباہ عشق کو چھانتا ہے گر جفا کے لئے — سکوں نواز محبت نہ بن خدا کے لئے
وہ بزمِ ناز وہ رعبِ جمال کیا کہئے — کسی کے لب نہ کھلے عرضِ مدعا کے لئے
لگا نہ ٹھیس تو خودداریِ محبت کو — سکوں نہ مانگ دلِ دردآشنا کے لئے
جفا سے ہاتھ اُٹھاتا ہے کیوں، کہ باقی ہے — مری وفا کا سہارا تری جفا کے لئے
جمالِ حسن یہ بنا تھا جلال کی تصویر — مچل رہی ہے نظر پھر اُسی خطا کے لئے
جفائیں آپ کئے جائیے سمجھتا ہوں — یہ امتحاں ہے دلِ صبر آزما کے لئے
یہی صدا ہے اب آغاز سازِ محفل کی — ہے شرط نغمہ سرائی غزل سرا کے لئے

حضرت فضا جالندھری

اب اُنکا حکم یہ ہے اہلِ التجا کے لئے — نہ آئے کوئی یہاں عرضِ مدعا کے لئے
نظامِ عالمِ امکاں تو کر چکے برہم — اِدھر بھی دیکھ لو رُخ پھیر کر خدا کے لئے
حرم میں شکل وہ زاہد نظر نہیں آتی — صنمکدے ہی میں لے چل ہمیں خدا کے لئے
خدا کے ہاتھ ہے شرم اب شکستہ ہاتھوں کی — اُٹھے تو ہیں یہ لرزتے ہوئے دعا کے لئے
نشانِ نقشِ کفِ پا نظر نہیں آتا — طریقِ عشق میں حیراں ہوں رہنما کے لئے
پڑی ہے سیلِ حوادث میں اپنی کشتیِ دل — اسے بھی پار کرا اے ناخدا خدا کے لئے
وہ لے کے ہاتھ ہی دیتے ہیں اے فضا تقدیر — دعائیں کیوں نہ کروں لذتِ سزا کے لئے

حضرت مسلم مالیگانوی

ہیں لاکھ رحمتیں اُس مردِ باصفا کے لئے — جو روٹھ جائے دو عالم سے آشنا کے لئے
مذاقِ عشق کی محرومیاں معاذ اللہ — کہ اب تو درد بھی ملتا نہیں دوا کے لئے
مرے کریم نے پہلے ہی دیدیا سب کچھ — ابھی تو ہاتھ بھی اُٹھے نہ تھے دعا کے لئے
ادھر سوال کی مجھ کو نہ تھی کبھی عادت — اُدھر بہانے وہ ڈھونڈا کئے عطا کے لئے
امیدیں بادِ حوادث نے توڑ دیں ساری — بس اب خدا کا سہارا ہے ناخدا کے لئے
ترے ملنگ تراوحشی بتا کدھر جائے — زمین تنگ ہے اُس بندۂ خدا کے لئے
چلے ہو کعبے کو تم راہِ دیر سے مسلم! — بتوں کو چھیڑ نہ دینا کہیں خدا کے لئے

جناب برق صدیقی فتحپوری

تمام دولتِ کونین ماسوا کے لئے؟ — اور اے نگاہِ کرم! جانِ باوفا کے لئے؟
مری بہارِ نظر بھی وہ لے گئے ہمدم — کہاں سے لاؤں میں رنگینیاں فضا کے لئے
شرار و برق و گل و لالہ و مہ و انجم — یہ سب نقاب ہیں حسنِ کرشمہ زا کے لئے
مجھے تو سعیِ اطبا پہ رحم آتا ہے — دوائیں ڈھونڈتے ہیں دردِ لادوا کے لئے
قبول ہی نہیں مجھ کو شکستِ خودداری — اثر تو گوش بر آواز ہے دعا کے لئے
ملا ہے دل کہ کرے ہر تڑپ میں یاد اُسکی — یہ آرزو کے لئے ہے نہ مدعا کے لئے
خدا نے اتنی مجھے دردِ دل کی دولت دی — کہ ابتدا میں مزے ہیں نے انتہا کے لئے

جناب جمیل سیوہاروی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

سیاہ کاریِ کبر و خودی معاذ اللہ — ترس رہی ہے نظر جلوۂ خدا کے لئے
وہ کھینچ کر آ گیا ساحل قریبِ سیل گریہ — خدا ضرور تھا امدادِ ناخدا کے لئے
خدا گواہ کہ باوصف سعیِ ضبطِ الم — نگاہیں اُٹھ ہی گئیں عرضِ مدعا کے لئے
یہ کس نے ڈالدی چشمِ کرم دمِ آخر — قضا نے بڑھ کے قدم روک دیئے فنا کے لئے
نگاہِ عجز میں رکھتا ہے شانِ استغنا — کہ جھک رہے ہیں دو عالم ترے گدا کے لئے
ہنوز تشنۂ تکمیل تھا مذاقِ خلیل — حسین کی ہی ضرورت تھی کربلا کے لئے
خرابِ خلوت و جلوت جمیل کیا کرتا — کہیں نہیں ہیں حجاباتِ چشمِ وا کے لئے

جناب ذاکر بی۔ اے۔ بی۔ ٹی از مئو

جلائے جاتے مجھے لے سوزِ دل خدا کے لئے — تپش کے حوصلے درکار ہیں فنا کے لئے
وہ داغِ دل ہو کہ زخمِ جگر ہو یا کچھ اور — قبول ہے مجھے سب کچھ تری رضا کے لئے
میں اُن کے روبرو صد آرزو بلب یوں ہوں — زباں پہ لفظ نہیں عرضِ مدعا کے لئے
سفینہ ڈوب رہا ہے بغیر طوفاں بھی — بڑا سبق ہے یہی میرے ناخدا کے لئے

طبیب ہو سکے تجھ سے تو اک سکوں لا دے
اثر دوا میں کہاں دردِ لا دوا کے لئے

بقا کی انجمن آرائیوں کا کیا کہنا!
سجائی جاتی ہے بزمِ جہاں فنا کے لئے

مراد تجھ کو یقیناً ملے گی اے ذاکر
حضورِ قلب میں پھیلا کے تو کر دعا کے لئے

جناب صادق از بھنڈ (گوالیار اسٹیٹ)

فنا فنا نہیں الفت میں مبتلا کے لئے
شروع جادۂ منزل ہے یہ بقا کے لئے

وہ کہہ رہے ہیں جو ہونا نہیں نہیں ہوگا
ہزار ہاتھ اٹھائے کوئی دعا کے لئے

کبھی جو سیرِ چمن کو ہمارا دل چاہا
چمن کے لطف انہیں سامنے بٹھا کے لئے

مجھے تو عشق میں مر کر بقا نصیب ہوئی
بقا نہیں نہ سہی عالمِ فنا کے لئے

کسی پہ دل کو فدا کر کے عمر بھر ہم نے
ستم کے لطف مزے ظلمِ ناروا کے لئے

وہ میرے رنگ سے ہی میرا حال جان گئے
زباں جب نہ کھلی عرضِ مدعا کے لئے

یہ کہہ کے اس نے مجھے قتل کر دیا صادق
سزائے موت مناسب ہے مبتلا کے لئے

جناب قوی مالیگانوی

قبالہ دل کا لکھا ہے اک آشنا کے لئے
کوئی جگہ نہیں اس گھر میں ماسوا کے لئے

وبالِ جاں ہوئی بیگانگیِ دیر و حرم
کہیں جگہ نہ ملی عرضِ مدعا کے لئے

یہ سوچ کر تری دامن کو ہم نے تھام لیا
عبث خراب ہوں عمرِ گریزپا کے لئے

کچھ اس ادا سے جھکا آنکھ جھک پڑی رحمت
دعا وہ کیا ہے اگر ہاتھ اٹھیں دعا کے لئے

سنور رہا ہے مرا بخت کس کی ٹھوکر میں
جھکی ہوئی ہے جبیں کس کے نقشِ پا کے لئے

تڑپ رہی ہیں محبت کے ولولے دل میں
کہاں سے لاؤں اثر آہِ نارسا کے لئے

نہ پوچھ حالِ قوی کا صنم پرستوں میں
زمین تنگ ہے اس بندۂ خدا کے لئے

جناب رعنا عشرتی

تو کیوں فضول پریشاں ہے رہنما کے لئے
رہِ فنا سے گذر منزلِ بقا کے لئے

گناہِ عشق نہ اے دل چھپا خدا کے لئے
ضمیرِ حسن کو مجبور کر سزا کے لئے

ہر ایک ٹیس پہ تیری ہی یاد آئی مجھے
وہ درد و بخشش دلِ صبر آزما کے لئے

خموشیوں کو بنا راز دارِ دیدۂ دل
بھٹک کہیں نہ کسی رازِ آشنا کے لئے

بنے گا آپ ہی ہر کام وقت پر اپنے
تو لاکھ ہاتھ اٹھایا کرے دعا کے لئے

کسی نے کی تھی جو دار و رسن کے پردے میں
نہ جانے کب سے ہوں کوشاں اسی خطا کے لئے

گھٹا کے ساتھ وہ کیا آئے باغ میں رعنا
کچھ اور بڑھ گئیں رعنائیاں فضا کے لئے

جناب اثر انصاری دھولیوی

بلا سے وقفِ سفینہ ہوا بلا کے لئے
خدا پہ چھوڑ دے اے ناخدا خدا کے لئے

ابھی لبوں نے کھولے ہیں لب دعا کے لئے
اجل سے کہہ دو کہ دم لے ذرا خدا کے لئے

جنونِ شوق مرا ایک کھینچتا ہی گیا
وفا کی راہ میں اک دشمنِ وفا کے لئے

دلِ حزیں شبِ غم جب ہوا بہت بیتاب
اثر نے بڑھ کے قدم آہِ نارسا کے لئے

خوشا کہ گوہرِ مقصد سے بھر گیا دامن
کسی کے دستِ کرم جب بڑھے عطا کے لئے

حرام ہیں اب مجھے سرمستیاں جوانی کی
ترس رہا ہوں تری چشمِ کیف زا کے لئے

اثر کے عذرِ خطا پر اگر نگاہ نہیں
کوئی سزا ہو سزاوار ناسزا کے لئے

جناب ساز رامپوری از بمبئی

تمام عمر جنہیں احتراز مجھ سے رہا
وہ آئے ہیں مری تربت پہ فاتحہ کے لئے

اجڑ گیا وہ چمن جس میں آشیانہ تھا
رہا نہ کر مجھے صیاد اب خدا کے لئے

نہ پوچھ لوٹی گئی کس طرح متاعِ حیات
نہ یاد عہدِ گذشتہ دلا خدا کے لئے

ہے اعتراف مجھے جرمِ عشق کا لیکن
کیا تھا حسن نے مجبور اس خطا کے لئے

وہ وقتِ شام لبِ جو کسی سے راز و نیاز
تڑپ رہا ہے مرا دل اسی فضا کے لئے

زمانہ ہو گیا مثلِ کلیم ہوں بیتاب
نقاب رخ سے الٹ دے ذرا خدا کے لئے

ضعیف دردِ جگر سے ہوں اس قدر اے ساز
کہ ہاتھ بھی مرے اٹھتے نہیں دعا کے لئے

جناب باقی اعظمی

اب اور چاہیے کیا نازِ حسن و وفا کے لئے
شکستِ دل کی صدا بھی نہیں دعا کے لئے

نہ ڈھونڈو تم کوئی حیلہ مری سزا کے لئے
کہ وقف ہوں میں ستمہائے ناروا کے لئے

مرا قصور نہیں ہے جو شکوہ سنج ہوں میں
زباں ملی تھی مجھے عرضِ مدعا کے لئے

مرے کریم جو دینا ہے بے طلب دیدے
اٹھاؤں گا نہ کبھی ہاتھ میں دعا کے لئے

نفس نفس ہو مرا حاصلِ حیاتِ ابد
یہ اہتمام ہو عمرِ گریزپا کے لئے

اگر وہ چاہے بدل دے ابھی نظامِ جہاں
یہ ایک کھیل ہے اس چشمِ فتنہ زا کے لئے

غرض نمود ہے شعر سے نہیں باقی
مشاعرہ میں ہم آتے ہیں واہ وا کے لئے

جناب رفیق صدیقی اکبرآبادی

ہے تنگ وسعتِ دامن تری عطا کے لئے
میں خود ہی ہاتھ اٹھاتا نہیں دعا کے لئے

دہانِ زخمِ جگر سے بھی سانس چل رہی ہے
یہ راہ اور کھلی نالۂ رسا کے لئے

مآلِ فطرت طوفاں سے آشنا ہوں میں
مجھے فریب نہ دے ناخدا خدا کے لئے

ستم تو یہ ہے کہ میں خاک اڑا دوں صحرا کی
چمن میں بوندوں کے جھولے پڑیں صبا کے لئے

مریضِ ہجر پہنچتا ہے اپنی منزل پر
دوا کا وقت گیا اب اٹھو دعا کے لئے

دعا یہ کر کہ محبت میں موت آجائے
دوا نہ ڈھونڈ دلِ دردآشنا کے لئے

رفیقِ لطف بتوں میں اٹھا جوانی کا
ابھی تو عمر پڑی ہے خدا خدا کے لئے

جناب بزم امروہوی

ستم جہاں میں کسی پر نہ کر خدا کے لئے
کہ ایک دن ہے مقرر سزا جزا کے لئے

لگائے جاتے ہیں الزامِ نو خطا کے لئے
تلاش کرتے ہیں موقعے نئی جفا کے لئے

سنا گیا ہے ہوا گیسوئے دوتا کے لئے
"یہ اہتمام ہے سرِ آسماں گھٹا کے لئے"

خلاف ہوگئی دنیائے عاشقی کی ہوا
ستم سے ہاتھ اٹھاؤ بھی اب خدا کے لئے

یہ روز کہتے ہو، ہم تم کو قتل کر دینگے
ہے کوئی دن بھی مقرر مری قضا کے لئے

میں چاہتا ہوں ہوں گر دوستانِ خوباں
نہ کھول تو درِ خلدِ بریں خدا کے لئے

خموش رہنے سے چلتا نہیں ہے کام اے بزم
زبان کھولئے اظہارِ مدعا کے لئے

جناب زار کاندھلوی

ہے عام فیضِ نبوت شہ و گدا کے لئے
کہ ذات آپ کی رحمت ہے دوسرا کے لئے

زہے وہ دل جو ہو بیچین مصطفےٰ کے لئے
خوشا وہ سر کہ جو قربان ہو خدا کے لئے

قدم جو راہِ طلب میں رکھا تو سمجھے ہم
ہزار رنج و مصائب ہیں آشنا کے لئے

زہے نصیب کہ بخشا گیا مجھے دلِ زار
ہزار شکر ہیں چھانٹا گیا جفا کے لئے

اسیرِ کنجِ قفس ہوں مجھے رہائی دے
ترس گیا ہوں بہت باغ کی ہوا کے لئے

تو زار مایہ و اعزاز کی نہ کر حسرت
عروج و رفعتِ عالم تو ہے فنا کے لئے

جناب محمود یار خاں اثر ایم۔ اے۔ جوناگڈھ

ترا یہ عزم ہی منزل رسی کا ضامن ہے
رہِ طلب میں ہے کیوں فکر رہنما کے لئے

جگر کے چاک دکھا کر گلوں نے گلشن میں
اک انتشار سا پیدا کیا صبا کے لئے

یہ درد ہی تو سہارا ہے زندگانی کا
میں کیوں کروں کوئی تدبیر بھی دوا کے لئے

مٹوں تو کیسے کہوں دل پہ کیا گزرتی ہے
ہتک ہے یہ مری خودداری وفا کے لئے

ہزار بار میں مٹ مٹ کے بن چکا ہوں اثر
مری فنا ہے مقدر مری بقا کے لئے

جناب ظرفہ قریشی بھنڈاروی

یہ کیا کیا، کہ اسے چور چور کر ڈالا
دیا تھا آئینہ دل تمہیں جلا کے لئے

نگاہ میری اگر ترجمانِ شوق بنے!
لبوں کو وا نہ کروں عرضِ مدعا کے لئے

شبِ فراق کا جاگا ہوا ہوں سونے دے
نہ چھیڑ مجھکو نسیمِ سحر خدا کے لئے

فلک نے تان دی ابرِ سیاہ کی چادر
یہ اہتمام ہے کس رندِ پارسا کے لئے

کسی کے جور کا شکوہ فضول ہے ظرفہ
کہ ہم جہان میں پیدا ہوئے فنا کے لئے

جناب عباس انصاری دھولیوی

تڑپ رہا ہے دلِ زار مدعا کے لئے
ذرا مریض پہ کوئی نظر خدا کے لئے

یہ واقعہ ہے کہ اخفائے راز کے ڈر سے
زباں کھلی نہ مری عرضِ مدعا کے لئے

بہارِ باغِ جہاں ہم نفس ہے مثلِ سراب
نہ اس فریب میں آنا کہیں خدا کے لئے

نہ فکرِ درد رہا اور نہ کچھ خیالِ نشاط
بہار اپنی لٹادی اک آشنا کے لئے

کہاں مقامِ حبیب اور کہاں مکانِ رقیب
بھٹک گیا یہ کہاں ان کے نقشِ پا کے لئے

جناب حافظ اسحاق ہلال ازکوشی

کہاں سے لاؤں میں دل شکوۂ جفا کے لئے
زباں ملی ہی نہیں عرضِ مدعا کے لئے

یہ جانتا ہوں کہ مقسومِ زندگی، غم ہے
اٹھاؤں کس لئے ہاتھ اپنے پھر دعا کے لئے

خدا کو ورطۂ طوفاں میں سونپ دی کشتی
یہ فرصت اب بھی غنیمت ہے ناخدا کے لئے

الٰہی کوئی تو سمجھائے میرے دل کا سکوں
خرابِ عشق ہوں اک دردآشنا کے لئے

نصیبِ عشق ہی جب سوز مندیاں ہیں ہلال
تو پھر نہ حسن کو مجبور کر وفا کے لئے

جناب انجم احمد آبادی

خبر نہیں ہے مجھے آخر تھی کونسی منزل
نظر نے بوسے جہاں تیرے نقشِ پا کے لئے

یہ کون میرے تصور میں تھا تبسم ریز
یہ کس نے ہوش و خرد میرے مسکرا کے لئے

ہر ایک جلوۂ رنگیں حجابِ فطرت ہیں
نکھر رہا ہے مرا ذوق ارتقا کے لئے

نہیں ہیں راہ میں میری نہ ماہ و خورشید
جگر کے داغ بھی کچھ کم نہیں ضیا کے لئے

وہ مدعا طلبی کو نہیں سمجھ سکتے
جو ہاتھ اٹھے نہ کبھی ترکِ مدعا کے لئے

جناب شاد پونوی

تلاشِ گل ہے دلِ زار کو بیاباں میں
دیارِ غیر میں پھرتا ہے آشنا کے لئے

مرا مزار بھی ہوگا انہیں مزاروں میں
ادھر جو آؤ کبھی سیر یا دعا کے لئے

غرور و ناز نہ کر شیخ تو عبادت پر
خودی کو چھوڑ دے مردِ خدا لقا کے لئے

جگر کو دل کو تڑپنے کا لطف آجائے
اسی نگاہ سے پھر دیکھ لے خدا کے لئے

خلافِ شان ہے شاعر کے شاد یاد رہے
غزل سنائے جو محفل میں مرحبا کے لئے

جناب عنقا کاشمیری

فنا کی زندگی ہم کو ملی حباب آسا
مگر فلک کو ملیں وسعتیں بقا کے لئے

میں پوچھتا ہوں کہ مجھ پر کرم جو تھا ہر کا
وہ ابتدا کے لئے تھا۔ کہ انتہا کے لئے

اجل کے جور و ستم سے ہے ہر بشر خائف
بنائے نئے قانون کچھ قضا کے لئے

وہی ہیں قابلِ تقلید اس زمانے میں
جو کام کرکے دکھائیں کچھ ارتقا کے لئے

نہ چھیڑ بربطِ دل کو تو ہر سحر عنقا
طیور زمزمہ پیرا ہوں جنبشِ ہوا کے لئے

جناب ارمان برہانپوری

صنم کدے سے نہ نکلو نگا میں کبھی اے شیخ
مجھے بتوں کی دہائی نہ دے خدا کے لئے

جلالِ حسن نے کیا مجھ پہ کر دیا جادو
کہ میرے لب نہ کھلے عرضِ مدعا کے لئے

زہے نصیب ہوا انکی رہگذر میں گذر
مری نگاہ نے بوسے نقوشِ پا کے لئے

نمود و نام کی ارمان ہے عبث خواہش
یہ اہتمام نہ کر عمرِ بے وفا کے لئے

جناب اکرم دھولیوی

اٹھائے ہاتھ جو پھیلے پھر دعا کے لئے
اثر نے بڑھکے قدم میری التجا کے لئے

ہزار بار ہوا سامنا مرا اُن کا
کبھی زباں نہ کھلی عرضِ مدعا کے لئے

تمام عمر تمہیں مجھ سے اجتناب رہا
جھلک دکھا دو دمِ نزع تو خدا کے لئے

کبھی کوئی نہ رہا ایک حال میں اکرم
ہر ابتدا ہے حقیقت میں انتہا کے لئے

جناب برگ باندوی

کریں نہ فکرِ دوا چارہ گر خدا کے لئے
اٹھائیں ہاتھ مرے واسطے دعا کے لئے

نہ نزعِ عشق میں اتنے ستم نہ کر ظالم
کچھ ابتدا کے لئے ہوں کچھ انتہا کے لئے

وہ دیر ہو کہ حرم کوئی بھی چھڑا نہ سکا
مری جبیں میں جو سجدے تھے نقشِ پا کے لئے

صلہ ملا جو لٹے راہِ عشق میں اے برگ
فنا کے بعد مزے دائمی بقا کے لئے

جناب اثر ذائقی بنگلوری

بتو بتاؤ نہ اتنا مجھے خدا کے لئے
کہ میرا جرم محبت نہیں سزا کے لئے

طریقِ عشق کی دشواریاں معاذ اللہ
جنابِ خضر ترستے ہیں رہنما کے لئے

کبھی ہے رعد کی نوبت کبھی ہے بارشِ برق
"یہ اہتمام ہے سرِ آسماں گھٹا کے لئے"

غیور طبع ہوں ہے مانگنے سے عار اثر
اٹھاؤں ہاتھ نہ بھولے سے بھی دعا کے لئے

جناب صغیر اثر اکبرآبادی

نہیں ہے فرق محبت میں کفر و ایماں کا
روا ہے عشق میں سب بندۂ خدا کے لئے

کبھی ہو بتکدہ ساماں کبھی ہو زیبِ حرم
کہیں تو اپنا تعین کرو خدا کے لئے

تھکے ہیں پاؤں ہماری تری تجسس میں
جبیں ہے وقف فقط تیرے نقشِ پا کے لئے

جناب حسن ساگری

تھا ناتوانی کا عالم یہ ہجرِ جاناں میں
کہ ہاتھ تک نہ اٹھائے گئے دعا کے لئے

گلے پہ تیغِ ستم ہے جگر پہ ناوکِ غم
اٹھا رہا ہوں مصیبت تری رضا کے لئے

کہاں سمائیگی آکر کسی کی یاد اے حسن
کہ اب جگہ ہی نہیں دل میں ما سوا کے لئے

جناب درد نن درباری

زباں کھلی بھی نہ تھی عرضِ مدعا کے لئے
دراز ہو گئے دستِ کرم عطا کے لئے

حریمِ ناز سے آجاؤ بیقرار ہے پھر
سرِ نیاز مرا تیرے نقشِ پا کے لئے

وہ چشمِ مست یہ کہتی ہے درد فکر نہ کر
میں خود دوا ہوں دلِ درد آشنا کے لئے

جناب متین گلشن آبادی

وہ رہرو رہ منزل ہوں دور افتادہ
بھٹک رہا ہوں جو اپنے ہی نقشِ پا کے لئے

یہ میرا حسنِ طلب تھا کہ کفرِ عشق متین
اٹھایا ہاتھ نہ میں نے کبھی دعا کے لئے

جناب اطہر حنیفی دھولیوی

خجل ہوئی مری کم مائیگی پہ رحمتِ حق
حسابِ عرصۂ محشر میں جب خطا کے لئے

وظیفہ اشہد ان لا الٰہ کا اطہر
ہے خاص آئینۂ قلب کی جلا کے لئے

جناب افتح حنیفی دھولیوی

نگاہِ لطف ہے کافی مری شفا کے لئے
کرو نہ چارہ گرو فکر کچھ دوا کے لئے

فرشتے روتے ہیں اے افتح میری حالت پر
تڑپ رہا ہوں اک انسان بیوفا کے لئے

جناب منتظر کلیمی جام پوری

ستم سے ہاتھ اٹھاؤ نہ تم خدا کے لئے
دوا یہی تو ہے مجھ دردِ آشنا کے لئے

ادائے حسن پہ قربان جائے منتظر
دل اس نے سینکڑوں دل میں دکھا دکھا کے لئے

جناب منشی بڑودی

اٹھے ہیں ہاتھ بصد شوق التجا کے لئے
الٰہی کھول اجابت کے در دعا کے لئے

یہ اقتدار ہے لولاک کی خبر سے عیاں
ہیں دو جہان شہنشاہِ دوسرا کے لئے

جناب ضیا سنگا دلی۔ میرٹھ

عیاں ہے جب مرے چہرے سے آرزو دل کی
تو کیوں میں سعی کروں عرضِ مدعا کے لئے

خوشی سے برق گرے میرے آشیانے پر
جہاں میں ایک ہی گھر تو ہے ہر بلا کے لئے

جناب ساحر ایم۔ اے از بمبئی

ضمیر و قلب میں اک کشمکش ہوئی جاری
جو ہاتھ میں نے اٹھائے کبھی دعا کے لئے

یہ راز کھل نہ سکا چارہ گر یہ اے ساحر
کہ ہے علاج دعا درد یا دوا کے لئے

جناب غافل از بیتول

کسے بقا ہے یہاں ہیں سبھی فنا کے لئے
عبث ہے آرزو اے ہم نشیں بقا کے لئے

ابھی کنارے لگے نا خدا بغیر خطر
خدا پہ چھوڑ دے کشتی مری خدا کے لئے

جناب بیتاب سنسار پوری

مجھے جو درد دیا تم نے لا علاج دیا
تمھیں بتاؤ کہاں جاؤں میں دوا کے لئے

برس پڑیں نہ کہیں بجلیاں نشیمن پر
ہے اہتمام سرِ آسماں گھٹا کے لئے

جناب موج دیوبندی

کھڑا ہوں کب سے تری در پہ التجا کے لئے
مرا سوال تو سن لے ذرا خدا کے لئے

یہ موج بحر ہے ساحل سے بھی نہ آگے بڑھ
گذر نہ حدِ تعین سے تو خدا کے لئے

جناب بیتاب کالپوی

جفا و لطف سے یکساں تھا مطمئن بیتاب
کھلی زباں نہ کبھی عرضِ مدعا کے لئے

جناب شاغل جبلی

نہ انتہا ہو اگر میری ابتدا کے لئے
تو منتظر نہ رہوں رات دن فنا کے لئے

جناب جوہر حنیفی دھولپوری

تڑپ رہا ہے جو سینہ میں اپنا دل جوہر
یہ بیقرار ہے محبوب کبریا کے لئے

جناب پریم دہلوی

صدائے دوست ہی آتی ہے دل کی دھڑکن سے
یہاں جگہ ہی نہیں کوئی ماسوا کے لئے

جناب قیس بلوری

مری گناہوں کو جو بخش دے وہ روزِ جزا
یہ کوئی بات ہے مشکل بھلا خدا کے لئے

جناب بسمل علوی بھنڈاروی

نہ آسکے وہ عیادت کو بھی سرِ بالیں
صلہ یہ خوب رہا مجرمِ وفا کے لئے

جناب وارث صدیقی شہادوی

ابھی تو دردِ محبت ہے سازگارِ حیات
نہ مشورہ دے مجھے چارہ گر دوا کے لئے

اعجاز صدیقی (مدیر شاعر)

وہی تو وقت ہے مخصوص التجا کے لئے
یہ ہاتھ خود بخود اٹھ جائیں جب دعا کے لئے

شکستہ سازِ دل اور نغمۂ فضا خاموش
بھٹک رہا ہوں محبت میں ہمنوا کے لئے

ہوس کے پاؤں غلط کوش اور غلط رو ہیں
تو ان سے کام نہ لے جادۂ وفا کے لئے

کہو کہ وہ نہ کرے دل میں مدعا پیدا
جو بیقرار ہو تکمیلِ مدعا کے لئے

تمام عمر رہی کائناتِ دل خاموش
وہ نغمہ بن نہ سکے سازِ بے صدا کے لئے

پپیہے چپ ہیں پڑے ہیں نڈھال جھولے بھی
الٰہی کیا سر و ساماں کروں گھٹا کے لئے

ہے رسمِ کہنہ محبت میں ہاتھ پھیلانا
نگاہ و دل سے بھی کچھ کام لے دعا کے لئے

خودی کی موج نے طوفاں اٹھائے کچھ ایسے
خدا خدا نہ رہا ذہنِ نا خدا کے لئے

کیا فسردۂ غم ابتدا نے اے اعجاز
تڑپ رہا ہوں محبت کی انتہا کے لئے

مشاعرۂ شاعر

مصرعِ طرح برائے ماہِ ستمبر ۱۹۴۱ء

"بن سکے تو عشق میں ہم مشرب پروانہ بن"

پروانہ۔ افسانہ وغیرہ قوافی ۔ بن ردیف

نوٹ:۔ شعرائے کرام اپنی غزلیں ۸ اگست تک روانہ فرمادیں اسکے بعد جو غزلیں بصول ہونگی وہ شریکِ اشاعت نہ ہوسکینگی۔

ایڈیٹر

اصلاحِ سخن

جنابِ اثر انصاری دھولیوی کی غزل پر حضرت نوح ناروی کی اصلاح

۱ رہ گئی دید کی حسرت ترے گلزاروں کی (اصلاح: دید آپکے) — سیر ہم کو نہ میسر ہوئی گلزاروں کی

۲ گرمیِ الفتِ گیسو میں کہا وحشت نے (اصلاح: یہ کہا) — ~~کھائیے چل کے ہوا دشت کی~~ کہساروں کی (اصلاح: گھر سے اب چلیے ہوا کھائیے)

۳ نام تنہائی کا زندہ ہے مری غربت سے — راس آئی مجھے صحبت نہ کبھی یاروں کی ۳

۴ ~~قطرۂ اشک کے گرتے ہی زمیں پر افسوس~~ (اصلاح: آخر آنکھوں سے ٹپک ہی گئے دو چار آنسو) — مل گئی خاک میں عزت ~~ترے بیماروں~~ کی (اصلاح: جگر افگاروں)

۵ قابلِ دید تھی کیا زلفِ پریشاں کی بہار — سیر کو چھاؤں میں ~~نکلے تھے وہ گل~~ تاروں کی (اصلاح: نکلا تھا کوئی)

۶ ~~اپنے کشتوں کے لیے خلد میں پہنچا آئیں~~ (اصلاح: ہو گئے داخلِ فردوس شہیدانِ وفا) — رہبری ~~خضر سے بھی بڑھ گئی~~ تلواروں کی (اصلاح: عشق میں کام آ گئی)

۷ اے اثر ~~ایک فقط دردِ جدائی کے سوا~~ (اصلاح: اب نہیں آتا سرِ تربت کوئی) — ~~اور لیتا ہے خبر کون~~ عزاداروں کی (اصلاح: دیکھ لی ہم نے رفاقت بھی)

توجیہ:-

۱۔ پہلے مصرع میں ترتیب الفاظ اچھی نہیں تھی۔ دو جگہ "کی" کا آنا بارِ سماعت تھا اصلاح سے یہ عیب دور ہو گیا اور مصرع میں روانی پیدا ہو گئی۔

۲۔ پہلے مصرع میں حرفِ اشارہ کی ضرورت تھی وہ "یہ" نے پوری کر دی، دوسرے مصرع میں "ہی کی" کی تکرار تھی اصلاح سے یہ عیب دور ہو گیا، لفظ "گھر" بھی موقع کا اچھا ہے البتہ "گرمیِ الفتِ گیسو" میری سمجھ میں نہیں آیا۔ گیسو میں گرمی تو ہوتی نہیں ہے ممکن ہے الفت گیسو میں ہو، یا الفتِ گیسو سے مراد محبوب کی محبت ہو۔

۴۔ اس شعر پر بہت اچھی اصلاح دی گئی ہے۔ اثر صاحب کا شعر قطعاً بے اثر اور بیکار تھا۔ اصلاح سے شعر بیحد بلند ہو گیا۔ "جگر افگاروں" کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

(۵) "نکلے تھے وہ گل" پورا ٹکڑا بھرتی کا تھا۔ "نکلا تھا کوئی تاروں کی" زیادہ رواں اور برجستہ ہے۔

(۶) اثر صاحب کا شعر میرے نزدیک بے معنی تھا۔ اصلاح سے کچھ معنی ضرور پیدا ہو گئے لیکن یہ اشکال ہے کہ عشق میں تلوار سے شہید نہیں ہوا جاتا۔ اگر یہ شعر "سلام" کا ہو تو شہیدانِ کربلا سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ تغزل کا تو اس میں شائبہ بھی نہیں ہے۔

(۷) اثر صاحب کا مفہوم واضح نہیں تھا۔ اصلاح سے مطلب صاف ہو گیا۔ قافیہ کے اعتبار سے اسی قسم کے خیال کی ضرورت تھی جو اصلاح میں پیش کیا گیا ہے۔

اعجاز صدیقی

نقد و نظر

مقدمۂ تاریخ دکن از عبدالحمید صدیقی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی تقطیع ۲۶×۱۷/۸ حجم ۱۴۴ صفحات۔ قیمت عمر ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدر آباد (دکن)

تاریخ دکن کا یہ نقش اول ہے جس میں دکن کے تمام شاہی خاندانوں کو شجروں کے ذریعہ روشناس کرایا گیا ہے۔ دورِ قدیم سے لیکر زمانہ حال تک کے تمام ہندو مسلمان حکمراں اس میں بیک نظر نظر آجاتے ہیں۔ شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے جو بجائے خود دکن کی مختصر تاریخ ہے۔ اس میں دکن کے تمام شاہی خاندانوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ آخر میں ایک اشاریہ بھی ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ مقدمہ بہت مفید اور کار آمد ہے۔ شجرے کافی چھان بین کے بعد مرتب کئے گئے ہیں۔

تعلیمات اقبال از پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بریلوی بی۔ اے (آنرز) تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۲۵ صفحات۔ قیمت عمہ۔ ملنے کا پتہ دفتر اقبال اکیڈمی۔ ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور۔

اس کتاب میں حکیم مشرق علامہ اقبال مرحوم کے اشاریہ بیغامات جن کا تعلق ارکانِ اسلام۔ اصولِ اسلام۔ اصلاحِ عقائد و افکار۔ تنبیہہ۔ وطنیت۔ جمہوریت۔ ملوکیت۔ اشتراکیت۔ سرمایہ داری۔ تہذیبِ مغرب۔ ہدایات۔ مخاطبات۔ خطاب بہ فرزندانِ اسلام۔ خطاب بہ مخدراتِ اسلام۔ خطاب بہ مسلمانانِ عالم وغیرہ سے ہے تشریحی اور توضیحی نثری اشاروں کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ گویا علامہ مرحوم کے کلام کی توجیہہ پیش کی گئی ہے۔ شروع میں ایک مقدمہ اور ایک دیباچہ بھی ہے۔ یہ کتاب انسان اور انسانیت کے لئے کتنی مفید ہے۔ اس کے لئے علامہ اقبال کا نام کافی ہے۔ اقبال اکیڈیمی، علامہ اقبال کی تعلیمات کی اشاعت میں بڑے ستھرے مذاق اور بلند حوصلگی کا ثبوت دے رہی ہے۔

سیاسی معلومات مؤلفہ مولانا اسرار احمد آزاد۔ حجم ۴۳۰ صفحات مجلد سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت عمہ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ برہان نئی دہلی۔

موجودہ جنگِ یورپ نے مجبور کر دیا ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص دنیا کی بین الاقوامی سیاست سے باخبر رہے۔ اس موضوع پر اردو میں اچھی کتابوں کی بہت کمی ہے۔ کتابِ زیرِ تبصرہ ہر جہت سے بین الاقوامی سیاست کی توضیح کرتی ہے۔ تمام مشہور سیاسی افراد و اقوام کی مختصر سوانح حیات اُن کے رجحانات، اور کارنامے اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ تمام دنیا کے مشہور مقامات و ممالک کی جغرافیائی اور تاریخی حیثیت بھی اس کتاب میں واضح کر دی گئی ہے۔ اس کے بعد اصطلاحات اعلانات اور معاہدات پر بھی سیر حاصل مضامین ہیں۔ جو لوگ سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں یا سیاست کو بالکل نہیں سمجھتے اُن کے لئے یہ کتاب ایک انمول ذریعۂ معلومات ہے۔

شہنشاہیت ترجمہ جناب مظفر شاہ خاں صاحب ظفر یوسفی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۰۰ صفحات۔ مجلد قیمت عمہ۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ برہان نئی دہلی۔

یہ کتاب بھی بین الاقوامی سیاست ہی کی ایک کڑی ہے۔ جس میں شہنشاہیت کی تعریف کے ساتھ برطانوی، فرانسیسی، جرمنی، اطالوی، روسی، جاپانی، اور امریکن شہنشاہیت پر نہایت تفصیل کے ساتھ مباحث ہیں۔ موجودہ دور میں استعماریت اور شہنشاہیت وہ ایسے زہر ہیں جو دنیا کی رگوں میں سرایت کر کے اُس کا خون خشک کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کتاب میں عالمگیر جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) اُسکے مستقل اسباب۔ دورِ اشتراکیت اور بالشویک انقلاب۔ فاتحین کی فریب کاریاں فسطائیت اور نازیت کا دور اور بین الاقوامی واقعات سمجھ کر پڑھنے کے قابل ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ جنگِ یورپ کے سلسلے میں اردو لٹریچر کی ایسی کتابیں جہاں ہندوستانی اہلِ قلم کی ذہنی ہمہ گیری کا ثبوت پیش کرتی ہیں وہاں موجودہ بین الاقوامی سیاست کا بہترین مواد بھی ہم پہنچاتی ہیں۔ ایسے وقت میں ایسی ہی کتابوں کی ملک میں ضرورت ہے۔

پس پردہ | مصنفہ جناب اختر بریلوی۔ سائز $\frac{22 \times 29}{16}$ حجم ۴۸ صفحات قیمت ۱۲ؔ
ملنے کا پتہ۔ میزان الادب۔ ذخیرہ بازار شیخ بریلی۔

حضرت اختر بریلوی گو ایک رومانی شاعر ہیں مگر وہ اس کتاب "پس پردہ" میں اصلاحی شان سے بے پردہ ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں جتنی نظمیں ہیں وہ اُن کے وطن بریلی کے تمام مقامی اور ماحولی معاشرتی، تعلیمی اور اخلاقی رجحانات پر ایک آزادانہ تنقید ہیں۔ اختر صاحب کا یہ ایک ایسا کارنامہ جو شایانِ تقلید ہے۔ اگر اسی طرح ہر شاعر اپنے وطن کے معائب و محاسن پر فکر و غور سے کام لے تو عمرانیات اور مجلسی اصلاح کا مقصد بہ حسن الوجوہ پورا ہو سکتا ہے۔ نظموں میں اصلاح کی تلخی پر لطافتِ فکر کی چاشنی ایسی چڑھی ہوئی ہے کہ تنقید ناگوار معلوم نہیں ہوتی۔ بریلی کی مقامی فضا اگر نغماتِ اختر کی گونج سے متاثر ہو گئی تو یہ اس کتاب کا سب سے بڑا ماحصل ہے۔

نقشِ ناتمام | از جناب سحر رامپوری۔ حجم ۶۹ صفحات سائز $\frac{20 \times 26}{16}$ قیمت ۶ؔ
ملنے کا پتہ مرزا عباس علی بیگ باغیچہ نمازی مظفر خاں۔ ریاست رامپور۔

جناب سحر رامپوری ترقی پذیر ادب کے ایک جوان خیال مبلغ ہیں۔ اس چھوٹی سی کتاب میں آپ کی بعض نظمیں اور غزلیں ہیں سب اسلوب جدید اور نہج بلند خیالات کی حامل ہیں۔ یہ کتاب آپ کی پہلی کوشش ہے کامیاب کا نمونہ ہے اس لئے ہمیں سحر صاحب سے مزید امید ہوتی ہے۔

نسیمِ خیال | عام خیال یہ ہے کہ والیانِ ریاست اور اُن کے ہم نشینوں کی شاعری محض رسمی اور مہمل ہوتی ہے اور اُن کے حاشیہ نشین اُن کی تک بندی کو تملق اور خوشامد کا رنگ دیکر شاعری سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ یہی تملق اور جھوٹی خوشامد یا مصنوعی داد و تحسین اُمرا کو صحیح ذوقِ شعری سے محروم رکھتی ہے مگر نواب شہید یار جنگ (حیدرآباد دکن) کی یہ رباعیاں دیکھکر ہم اس فیصلے پر پہونچے ہیں کہ تمام اُمرا کے متعلق ایک ہی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کتاب میں جتنی رباعیاں ہیں حقائق و معارف سے لبریز ہیں۔ ہر رباعی میں ایک دلنشین پیغام موجود ہے اور ہر خیال میں پختگی اور ضمیر کی آزادی و بلندی پائی جاتی ہے۔ لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے جناب مصنف سے غالباً بغیر قیمت اس کی ایک جلد حاصل کی جا سکتی ہے۔

جوشِ وطن | یہ مالانوبہ جنفا آفتاب بسمل پانی پت کی وطنی و قومی نظموں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ نظموں میں کافی اثر ہے اور ہر نظم ایک خاص جذبے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے سائز $\frac{20 \times 29}{16}$ حجم ۱۱۲ صفحات مجلد قیمت صرف ۱۲ؔ

اعجاز صدیقی



پردۂ فلم :-

فلمی گانے ہماری نظر میں

فلمی گانوں کو علمی یا عروضی نگاہ سے دیکھنا تو اصولاً غلط ہے لیکن ادبی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے اِن پر ضرور تنقید کی جا سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بمبئی ٹاکیز، منروا، رنجیت اور بھارت کے گانا لکھنے والوں کو اس فن میں خاص مہارت ہے۔ وہ وقت اور منظر کو پیشِ نظر رکھ کر واقعات کی تحلیلِ نفسی کے ساتھ ایکٹروں اور ایکٹریسوں کے منہ سے ایسے میٹھے اور دلنشیں بول نکلواتے ہیں کہ سننے والوں کی روح پر اُن کا براہِ راست اثر ہوتا ہے۔ ان کمپنیوں کے میوزک ڈائرکٹر بھی اپنے فن میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں لیکن "بول" رکھنے میں تان اور سُر کی قیود کے ساتھ پھر بھی بعض اوقات ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں جو ادبی اور لسانی نقطۂ نظر سے ناقابلِ معافی اور بہ از روئے مفہوم ناقص اور بالکل غلط ہوتی ہیں۔

مثلاً "**بندھن**" میں ہیڈماسٹر (اشوک کمار) ایک گانے میں کہتا ہے:-

"یہ دُور کی منزل سے مجھے کس نے پکارا؟"

اس کے جواب میں بینا (لیلا چٹنس) گاتے ہوئے کہتی ہے: "ممتا" نے پکارا۔ بندھن نے پکارا۔ "ممتا" یا "ماتا" صرف ماں کی محبت کو کہتے ہیں جنسی محبت کو "ممتا" کوئی نہیں کہتا۔ "بینا" ہیڈماسٹر کی محبوبہ ہے "ماں" نہیں ہے۔ اس لئے یہ لفظ یہاں قطعاً خلافِ مفہوم ہے۔

"**میں ہاری**" میں راگنی ایک گیت گاتی ہے۔ جو بہت زیادہ مقبول ہو رہا ہے:

"گنگا کے اُس پار ساجن گنگا کے اُس پار"

اس میں آگے چل کر کہتی ہے: "کیا جانے کیا رسمیں ہونگی کیسے ہوں گے جوگ"

یہ جوگ پہلے مصرع کے لفظِ "لوگ" کا قافیہ ہے مگر یہاں اپنے اصلی معنی میں نہیں ہے۔

"**پردیسی**" کے گیتوں میں اس قسم کی خامیاں زیادہ ہیں۔

پوری غزل "پہلے جو محبت سے انکار کیا ہوتا" نہایت پھُسپھُسی ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس غزل کا ایک مصرع تو اس قدر مہمل ہے کہ آج تک اُس کے معنی ہی سمجھ میں نہ آسکے۔

"وہ روز تو پردوں میں گزار کیا ہوتا"

خدا جانے غزل کہنے والے کے ذہن میں اس مصرع کا مفہوم کیا ہوگا؟

اس کے علاوہ خورشید (میرا) ایک گانا گاتی ہے: "موری اٹریاں ہیں سُونی موہن نہیں آئے" اس انترے میں دلچسپ پن بہت نمایاں ہے۔ "اٹریوں" کی جگہ اگر "سیجریا" ہوتا تو انترے میں جان پڑ جاتی۔ یعنی

"موری سیجریا ہے سُونی موہن نہیں آئے"

ایک دوسرے گانے میں میرا (خورشید) ایک شعر گاتی ہے:-

"نہ آنکھ ہوتی نہ کوئی چُبھتا نہ رنج ہوتے نہ پیار ہوتے"

"رنج کے ساتھ "خوشی" ہونی چاہئے "پیار" کا یہاں کوئی محل نہیں ہے۔ مگر "خوار ہوتے" کا کوئی اور قافیہ سمجھ میں نہ آیا تو پنڈت جی نے "پیار ہوتے" ہی لکھ مارا۔

اسی طرح ایک گانا "مالا اور میرا" دونوں مل کر گاتی ہیں۔

"موری بھابی کے نخرے بڑے"

اس میں "میرا" کہتی ہے:-

میں جو منگاؤں گھوڑے کی گاڑی

ٹم ٹم پہ وہ جا چڑھے

حالانکہ "ٹم ٹم" بھی گھوڑے ہی کی گاڑی کو کہتے ہیں۔ پھر اس میں بانکپن کیا ہوئی؟ کیا "ٹم ٹم" کی جگہ "موٹر" نہیں آسکتا تھا؟ مگر سوچنے کی تکلیف کون گوارا کرتا؟

بظاہر یہ لفظی اور انفرادی غلطیاں ہیں۔ لیکن ان غلطیوں کا اثر صاحبِ ذوق سمجھنے والوں کی طبیعت پر کیا ہوتا ہے؟ اس کا اندازہ فلم نویس نہیں کر سکتے۔ سمجھنے والوں کی طبیعت میں ایسی فروگذاشتوں سے نہ صرف کراہت پیدا ہوتی ہے بلکہ فلم نویس یا گانا لکھنے والوں کی علمی، لسانی اور ادبی قوتوں کی طرف سے بے اعتباری بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ نیو تھیٹرز کلکتہ کی طرح اگر ہر ترقی یافتہ فلم کمپنی ایک زبان دان کہنہ مشق شاعر کی خدمات سے فائدہ اُٹھائے تو اس قسم کی فروگذاشتیں بیک نظر دور ہو سکتی ہیں۔

(ادارہ)

فلمی مختصرات

پنچولی آرٹ پکچرز کا نیا شاہکار "چودھری" عنقریب نمائش کے لئے بازار میں آنے والا ہے۔ خیال ہے کہ یہ فلم جولائی کے دوسرے ہفتہ میں ریلیز ہوگا۔ اس فلم کی تیاری پر ایک لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے اور فن کاری کے اعتبار سے یہ فلم پنچولی کی دوسری تصویروں سے بڑھ جائے گا۔

خاندان پنچولی کا دوسرا اردو فلم ہے جس کے مکالمے اور گانے مشہور ادیب امتیاز علی تاج نے لکھے ہیں۔ اس میں غلام محمد اور نور جہاں نئے رنگ میں پیش ہونگے۔

پربھات کی زیر تکمیل فلم "سنت سکھو" کے متعلق اطلاعات وصول ہوئی ہیں کہ یہ فلم دسمبر تک شمالی ہندوستان میں ریلیز ہو جائے گا۔ یہ ہندوستان کی پہلی فلم ہے جس میں ایک فدا رسیدہ خاتون کی داستان پیش کی گئی ہے۔

رنجیت فلم کمپنی کا نیا فلم "شادی" بعض شہروں میں بہت مقبول ہوا ہے۔

بمبئی ٹاکیز کی نئی تصویر "نیا سنسار" کی نمائش دہلی میں ہو رہی ہے۔ سنا ہے کہ نیا سنسار ہر لحاظ سے ایک نیا فلم ہے۔ اس کا افسانہ بالکل نئی طرز کا ہے اور اس کا ناچ بھی اس قسم کا ہے جو اس سے قبل کسی فلم میں نہیں دیکھا گیا۔

فلمی حلقوں میں یہ خبر بہت زور و شور کے ساتھ سنی جا رہی ہے کہ مسٹر مغنی بی۔اے سابق پبلسٹی آفسر منروا فلم کمپنی اور پرکاش پکچرز کے موجودہ پبلسٹی آفسر نے محمد احسان اور پکار والی نسیم کے اشتراک سے ایک فلم کمپنی کی بنیاد ڈالی ہے جس کا نام تاج محل پکچرز لمیٹیڈ ہے۔ پہلی فلم کو مغنی ڈائریکٹ کرینگے۔ مکالمے اور گانے جناب کمال امروہوی لکھ رہے ہیں۔ مغنی، نسیم اور کمال دیکھئے کیا کمال دکھاتے ہیں۔

منروا کا تازہ شاہکار "سکندر اعظم" بڑی تیزی کے ساتھ تکمیل کی منزلوں میں ہے۔ بیرونی مناظر کشی ختم ہو چکی ہے۔

مطبع ... میں چھپوا کر دفتر الادب آگرہ سے شائع کیا

صبحِ مشرق۔ محمد صادق صاحب ضیا بی۔اے ایل ایل بی
کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ مع تصویرِ مصنف۔ قیمت دو روپیہ (عہ)

نشترکدہ۔ بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ایڈووکیٹ کا دیوان
مع تصویرِ مصنف۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)

فغانِ آرزو۔ سید انوار حسین آرزو لکھنوی کا دیوان۔ قیمت دو روپیہ (عہ)

گلکدہ۔ حضرت عزیز لکھنوی (استاد جوش ملیح آبادی) کا دیوان۔ قیمت دو روپیہ

گلزارِ داغ۔ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی مرحوم و مغفور کا مشہور دیوان قیمت عہ

جگر پارہ۔ حضرت بیدم شاہ وارثی کا دیوان۔ قیمت ۱۲ار

مصحفِ بیدم۔ بیدم شاہ مرحوم کا دوسرا دیوان۔ مع مقدمہ حضرت
خواجہ حسن نظامی۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

کمالِ داغ۔ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے چاروں دیوانوں کا
انتخاب مع مقالۂ نقدی۔ قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ)

روحِ نظیر۔ از مخمور اکبرآبادی بی۔اے۔ انتخاب کلام مع مقدمہ و تبصرہ
قیمت دو روپیہ (عہ)

قصائدِ نجم۔ حضرت نجم آفندی اکبرآبادی خلف حضرت بزم اکبرآبادی
کے بلند پایہ قصائد۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ایوانِ تصور۔ شریمتی سروجنی نائیڈو کے رنگین اور دلکش گیتوں کا ترجمہ
قیمت ایک روپیہ (عہ)

مختلف دواوین

دیوانِ غالب۔ غزلیات امیر و نظیر۔ انتخاب کلام اکبر الہ آبادی۔ دیوانِ اکبر داناپوری
دیوان سوے خاں سقلی۔ کلامِ داغ۔ بہارِ معرفت۔ دیوانِ حافظ شیرازی

عروض کی منتخب معتبر اور عام فہم کتابیں

عام فہم عروض۔ آسان زبان میں عروض کے درس دئے گئے ہیں قیمت ۸ر

نکاتِ شاعری۔ عروضی معلومات کے علاوہ ہر لفظ کے کئی کئی قافیے
اس میں درج ہیں۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

چراغِ سخن۔ عروض، علم قافیہ اور بحر وغیرہ کی تصریح میں مرزا یاس
عظیم آبادی کی بہترین تصنیف۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

فکرِ بلیغ۔ مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم فنِ شاعری پر سیر حاصل
معلومات کے لئے نہایت بلیغ کتاب ہے۔ قیمت عہ

مشاطۂ سخن۔ مصنفہ صفدر مرزا پوری۔ مسلم الثبوت اور مشہور اساتذہ
کی اصلاحوں کے نمونے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

جانِ سخن۔ بحور، صنائع بدائع۔ تقطیع کرنے کے قاعدے اور علم قافیہ کی تشریح
متروک الفاظ کی فہرست بھی شریکِ کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ایشیائی شاعری۔ مصنفہ مولانا اثر مرحوم۔ اس کتاب میں تمام اصنافِ شاعری
پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ایضاح القوافی۔ علم قافیہ پر توضیحی اور تفصیلی کتاب۔ مصنفہ حضرت شوخ
اکبرآبادی۔ قیمت دس آنہ (۱۰ر)

مثنویاں

مثنوی عالمِ خیال۔ مصنفہ مرزا شوق قدوائی لکھنوی مرحوم مع تصاویر
قیمت عہ۔ سادہ ۸ر

مثنوی مادرِ ہند۔ مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم۔ قیمت ۱۲ار
مثنوی ظہورِ رحمت ۸ر مثنوی زہرِ عشق کامل عہ

مشہور افسانہ نگاروں کے مشہور افسانے

نگارستان۔ مصنفہ حضرت نیاز فتحپوری قیمت دو روپیہ (عہ)

گہوارۂ تمدن۔ مولانا نیاز فتحپوری کی معرکتہ الآرا کتاب جس میں تاریخ و
اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت کا کیا حصہ ہے قیمت عہ

شہاب کی سرگذشت۔ مصنفہ مولانا نیاز فتحپوری اُردو لٹریچر میں بہت
بلند اور بالکل نیا افسانہ۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

شمیم (باتصویر کمل) مصنفہ فیاض علی بی۔اے (علیگ) سبق آموز افسانہ
بطور داستان۔ فنِ ناول نویسی میں ایک معرکتہ الآرا انقلابی تصنیف۔
قیمت ہر دو حصہ مکمل چار روپیہ (للعہ)

کیفستان۔ از جناب قیسی رامپوری۔ اس میں کئی دلکش افسانے ہیں
قیمت ایک روپیہ (عہ)

آتش پارے۔ از جناب سعادت حسن منٹو۔ مصنف کا نام افسانوں کی اہمیت
کا خود ضامن ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

زندگی کے کھیل۔ ازل۔ احمد اکبرآبادی۔ قیمت عہ

تصانیف مولانا حالی پانی پتی

مسدس حالی (عکسی) عہ/ مسدس حالی (سادہ) ۸/ مرثیہ غالب ۲/ مناجات بیوہ ۲/ شکوۂ ہند ۲/ حب وطن ۲/ چپ کی داد ۲/

مختصر تصانیف علامہ ڈاکٹر سر اقبال مرحوم

شکوہ جواب شکوہ ۴/ شمع و شاعر ۴/ خضر راہ ۴/ فریاد امت ۴/ اکبری اقبال ۳/ نالۂ یتیم ۲/ تصویر درد ۳/

سوانح عمریاں

امت کی مائیں عہ/ بنت الرسول ۶/ سوانح خاتون جنت ۴/ سوانح ام حسین ۴/ فاطمہ کا لال عہ/ سوانح حضرت صدیق اکبر ۷/ سوانح حضرت عمر فاروق ۸/ سوانح حضرت علی کرم عہ/ سوانح امام اعظم ۱۲/ تذکرہ صابر ۱۲/ سوانح خواجہ غریب نواز عہ/ سوانح غوث پاک عہ/ مناقب حضرت غوث گوالیاری ۸/ تحفۂ دربار ولایت ۶/ خمخانہ برکات ۲/ قصص الانبیاء عہ/ حیات خواجہ ۶/ تذکرہ خواجگان چشت ۸/ سوانح اورنگ زیب ۸/ سوانح زیب النساء ۸/ سوانح اکبر اعظم ۸/ سوانح نورجہاں بیگم ۸/ سوانح غازی محمد بن قاسم ۴/ حیات انیس عہ/ حیات سعدی ۶/ حیات حافظ ۸/ حیات جانی اکبر آبادی ۶/ خالدہ ادیبہ خانم ۱۰/ حیات خسرو ۶/ سوانح شاہجہاں ۸/ حیات فردوسی ۶/

صنعتی کتابیں

اسرار صنعت عہ/ دولت کا ڈھیر ۸/ چائے کی معلومات ۴/

تاریخی کتابیں

تاریخ کا روشن پہلو ۸/ حکایات کشمیر/ کشمیر کی رانیاں ۴/ معارف کعبہ ۸/ عروج ترکی ۸/ کشمیر کا مستقبل ۲/ ترکان احرار عہ/ اشرف التواریخ کامل للعہ/ خضر منزل ۸/ خلافت الٰہیہ عہ/ انقلاب فرانس ۱۲/

مذہبی کتابیں

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق ۔ مؤلفہ حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی
اخلاق اور فلسفۂ اخلاق کے تمام گوشوں پر دلپذیر اور مکمل بحث اور اسلام کے ابواب اخلاق کی علمی تشریح جس سے اسلامی اخلاقیات کی برتری نہ صرف اعتقادی طور پر بلکہ علم و تحقیق کے معیار پر تمام ملتوں کے ضابطہائے اخلاق کے مقابلہ میں واضح ہو جاتی ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہترین حجم ۴۴۴ صفحات۔ قیمت للعہ (بڑا سائز)

غلامان اسلام ۔ مؤلفہ حضرت مولانا سید احمد ایم۔ اے اکبر آبادی فاضل دیوبند۔ جس میں ان مقدس ہستیوں کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و جستجو سے یکجا کئے گئے ہیں۔ جن کو غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود اسلامی سوسائٹی میں عظمت و اقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا ہے اور جن کے علمی، مذہبی تاریخی اور اصلاحی کارنامے نقش دوام بن کر سینۂ عالم پر ثبت ہو چکے ہیں۔ حجم ۵۲۲ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ بہترین قیمت للعہ (بڑا سائز)

اسلام کا اقتصادی نظام ۔ مؤلفہ حضرت مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی جس میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا نظام اقتصادی ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال کی راہ پیدا کی ہے کتابت و طباعت اور کاغذ بہترین حجم ۲۴۸ صفحات قیمت [illegible]

اسلام میں غلامی کی حقیقت ۔ مؤلفہ حضرت مولانا سید احمد ایم اے اکبر آبادی فاضل دیوبند۔ جس میں غلامی کی حقیقت، اس کے نفسیاتی، اخلاقی اور اقتصادی پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ غلامی کا آغاز کب سے ہوا۔ اسلام سے پہلے کن کن قوموں میں یہ رواج پایا جاتا تھا اور اس کی صورتیں کیا تھیں۔ اس کی کل تاریخ پھر اسلام نے اس رواج کو اس وقت کن مجبور کن حالات کی وجہ سے باقی رکھا اور اس میں کیا کیا اصلاحات کیں اور ان سب سے اسلام کا اصل منشا کیا ہے۔ اس کے بعد مشہور مصنفین یورپ کے بیانات اور یورپ کی اجتماعی غلامی پر مفصل بحث اور تبصرہ کیا گیا ہے۔ بڑا سائز کتابت و طباعت اور کاغذ بہترین حجم ۲۰۲ صفحات قیمت عہ

جواز تعزیہ ۸/ ارشاد احمد ۲/ قومی نظم ۴/ تقویم الاسلام عہ/ کمالات قرآنی ۴/

مولانا شرر لکھنوی کے ناول

حسن کا ڈاکو عہ/ قیس و لبنیٰ عہ/ یوسف و نجمہ عہ/ فلپانا عہ/ ملک العزیز ورجنا ۸/ منصور موہنا ۱۰/ فردوس بریں ۸/ دلکش کا ل عہ/ بدر النساء کی مصیبت ۳/ ظہور اطور نڈا ۱۲/ حسن بن صباح ۴/

منظور شدہ محکمہ ہائے تعلیم برار و ریاست میسور

تعارف

تصویر:- حضرت مولانا قمر بدایونی مرحوم

جلد ۱۲ | ماہنامہ ”شاعر“ آگرہ اگست سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر ۸

چندہ سالانہ عوام سے ۳ خواص سے ۵ محسنین سے ۶۰ معاونین سے ۲۴ انیسان سے ۱۵ ہمدردوں سے ۱۲ فی پرچہ ۴

محسنین، معاونین، انیسان و ہمدردانِ شاعر

محسنینِ ادب

(۱) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ننہ سالانہ
(۲) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیر خورجوی ننہ سالانہ
(۳) محسنۂ ادب ہر ہائنس علیہ حضرت کلیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ننہ سالانہ
(۴) محسنِ ادب جناب محترم خانشری امام الدین خانصاحب مستان فرنسوا دربار یاجود ننہ سالانہ
(۵) محسنۂ ادب شہزادی تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ننہ سالانہ

معاونینِ ادب

(۶) معاونِ ادب مسٹر ایلی فلپس صابر اکبرآبادی بی۔اے۔ للعہ ۲۴ سالانہ
(۷) معاونۂ ادب محترمہ نجمہ تصدق ایم۔اے۔ بی۔ٹی للعہ ۲۴ سالانہ
(۸) معاونِ ادب جناب مولوی محمد احمد صاحب رسوا سہارنپوری للعہ ۲۴ سالانہ

انیسانِ ادب

(۹) انیسِ ادب جناب سید تفضل کریم صاحب جمشید پور عہ ۱۵ سالانہ

ہمدردانِ ادب

(۱۰) ہمدردِ ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلیمان جالندہری عہ ۱۲ سالانہ
(۱۱) محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری مرحوم عہ ۱۲ سالانہ
(۱۲) ہمدردِ ادب جناب ابو عبدالعلیم خانصاحب رونق دکنی عہ ۱۲ سالانہ
(۱۳) ہمدردِ ادب جناب نواب زادہ کنور مشکور حسین خانصاحب قمر آف منڈو عہ ۱۲ سالانہ
(۱۴) ہمدردِ ادب جناب مولوی محمد قاسم صاحب نامی علوی دربھنگوی عہ ۱۲ سالانہ
(۱۵) ہمدردِ ادب جناب صاحبزادہ سید مظفر حسین صاحب بسمل زمیندار (وانی دھارام) عہ ۱۲ سالانہ
(۱۶) ہمدردِ ادب جناب اسمٰعیل کھوکھر راز جوناگڈھی عہ ۱۲ سالانہ

خاصانِ ادب

(۱۷) جناب صاحبزادہ سلطان حامد خانصاحب ثروت گلشن آبادی عہ سالانہ
(۱۸) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمٰن خانصاحب تخلص ٹونکی عہ سالانہ
(۱۹) جناب عبدالحفیظ صاحب ثمر صدیقی پھلرادی بی۔اے عہ سالانہ
(۲۰) جناب محمد سعید خانصاحب ادب عہ سالانہ
(۲۱) جناب لالہ گنگا رام صاحب آبد سرہندی عہ سالانہ
(۲۲) جناب سید مظفر حسین صاحب عرشی دہلی عہ سالانہ
(۲۳) جناب دیسراج ثمرا۔ بی۔سی۔ڈی فرنج عہ سالانہ
(۲۴) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی عہ سالانہ
(۲۵) جناب صاحبزادہ عبدالحمید خانصاحب بہادر عباسی بی۔اے عہ سالانہ
(۲۶) جناب ماسٹر حسن خانصاحب اثر عہ سالانہ
(۲۷) جناب نذیر احمد صاحب نذیر سشیر کوٹی عہ سالانہ
(۲۸) جناب محمد صبغۃ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی عہ سالانہ
(۲۹) جناب محبوب حسن صاحب آسی متوطن رڑکی عہ سالانہ
(۳۰) جناب صاحبزادہ سیٹھ اکبر علی صاحب عہ سالانہ
(۳۱) جناب مخدوم سید علی اسد نقوی البخاری احمدآبادی (جھنگ) عہ سالانہ
(۳۲) جناب طالق ہمدانی لدھیانوی عہ سالانہ
(۳۳) جناب سبحان خاں صاحب غافل بتول عہ سالانہ
(۳۴) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی۔کوٹاہہ عہ سالانہ
(۳۵) جناب حبیب حسن خانصاحب حبیب شاہجہانپوری از کوئٹہ عہ سالانہ
(۳۶) جناب بابو فقیر محمد خانصاحب عارف سیالکوٹی از کوئٹہ عہ سالانہ
(۳۷) جناب بشیو پرشاد صاحب برگ باندوی عہ سالانہ
(۳۸) جناب ہدایت اللہ خاں صاحب سحر کرلی عہ سالانہ
(۳۹) جناب حکیم ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب نار کاندھلوی عہ سالانہ
(۴۰) جناب علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی عہ سالانہ
(۴۱) جناب سید غلام مرتضٰی صاحب شاعر نہٹوری عہ سالانہ

جرعات

مولانا قمر بدایونی مرحوم

مولانا احسن مارہروی جیسے اُستادِ فن کی وفات کو ابھی پورا ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دوسرا شاعرِ جلیل اور استادِ فن ہم سے چھین لیا گیا۔ ۳ جولائی ۱۹۴۱ء کو جب کہ "شاعر" کی آخری کاپی پریس میں تھی مولانا قمر بدایونی کے ارتحال کی اندوہناک خبر ملی، میں عرض نہیں کر سکتا کہ اس اطلاع سے دل و دماغ پر کیا اثر ہوا۔ اُن کی وفات کے متعلق ایک سطر لکھنی مشکل ہو گئی۔ اس خبر سے میں کچھ اس قدر اثر گیر ہوا کہ بجائے ۳ جولائی کے ۳ جون لکھ گیا، یہ کلیہ ہے کہ جس سے جتنا قریبی تعلق ہوتا ہے اُس کی موت سے اتنا ہی زیادہ رنج و افسوس ہوتا ہے۔

مولانا قمر بدایونی اُن معدودے چند متغزلین میں سے تھے جن کے کلام پر صحیح تغزل کا اطلاق ہوتا ہے زبان میں شعر کہنے والوں میں میرے نزدیک اُن کا درجہ سب سے بلند تھا۔ سادہ سادہ الفاظ میں چبھتے ہوئے خیالات پیش کرنا اُنھیں کا حصہ تھا، وہ اپنے کلام میں محاورے اور روزمرہ کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ قدیم رنگِ تغزل اس دور میں آ کر بالکل بے اثر ہو چکا ہے لیکن مولانا قمر بدایونی مرحوم نے اس میں وہ اثر پیدا کیا کہ سننے والے پھڑک اُٹھے۔ اُن کی غزل کے زیادہ اشعار نشتر کا کام کرتے تھے۔ مرحوم مجھ سے اور "شاعر" سے غایت درجہ محبت فرماتے تھے، جہاں کہیں ملتے شفقتِ بزرگانہ سے نوازتے۔ اُن کا یہ جملہ "کیوں بھئی خلیفہ اچھے تو ہو؟" آج تک کانوں میں گونج رہا ہے۔ مرتے دم تک اُنھوں نے مجھے اعجاز نہیں کہا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "میرے خلیفہ" نے قابلِ رشک ترقی کی ہے"—

یہ اور اسی قسم کی میٹھی میٹھی باتیں خون کے آنسو بہانے پر مجبور کرتی ہیں۔ مرحوم کے مفصل حالات شخصیات کے تحت میں پیش کر رہا ہوں۔ حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ نے مرحوم کی لوحِ مزار کے لئے جو قطعہ تاریخ لکھا ہے وہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

هو الباقی

یکم ماہِ جولائی سہ شنبہ کے دن ... غم دہ ہم سے وقتِ فراغِ قمر ہے
یہ صحرائے ہستی ہے معمورِ ظلمت ... کہ فردوس اب عیشِ باغِ قمر ہے
کہاں ایسی خوش گو خوش اخلاق شاعر ... کسے اب میسر دماغِ قمر ہے
اگرچہ ہے کیفِ سخن جاودانی ... مگر ختم دورِ ایاغِ قمر ہے

قمر سے قمر کا پتہ پوچھنا کیا ... قمر خود ہی محوِ سُراغِ قمر ہے
ضیائے قمر کا ہے دشوار مٹنا ... کہ ہر شعر روشن چراغِ قمر ہے

ہے داغِ قمر دل میں سیماب پیدا
لکھو سالِ ترحیل "داغِ قمر ہے"

۱۳ھ ۶۰

شاعر نوازیاں

کچھ عرصہ ہوا میں نے "شاعر" کے لئے کاغذ کی خریداری کے سلسلے میں محبین اور معاونین شاعر کو متوجہ کیا تھا لیکن افسوس کہ بجز عالیجناب خان شری امام الدین خاں صاحب مستان رسولپوری دام اقبالہٗ العالی با وجود کے کسی علم دوست اور شاعر نواز ہستی نے توجہ نہیں فرمائی۔ ادارہ تعلیم قلب معصوف کا شکر گذار ہے کہ انھوں نے کاغذ کے خریداری کے سلسلے میں یکمشت رقم مرحمت فرمائی، خدا موصوف کے عز و جاہ میں ترقیاں عطا فرمائے۔

صوبۂ بہار میں دیگر صوبوں کی طرح "شاعر" کو قبولِ عام حاصل نہیں ہے۔ صرف مخصوص طبقہ تک اس کی اشاعت محدود ہے۔ اسے ادارہ کی خوش قسمتی سمجھئے یا "شاعر" کی جاذبیت کہ محترم شاہ فضل امام صاحب واقف "شاعر" کی توسیع اشاعت کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش فرما رہے ہیں۔ موصوف مسلم لیگ آرہ کے سکریٹری اور رئیس زمیندار ہیں حضرت مولانا تمنا عماد پوری سے آپ کو شرفِ تلمذ حاصل ہے اور بہار کے اچھے کہنے والوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ واقف صاحب کی توجہ فرمائی سے صوبۂ بہار میں "شاعر" کو زیادہ سے زیادہ قبولیت حاصل ہوگی۔

مدیرِ "کارواں" بمبئی سے

۱۹ جولائی کا "کارواں" "نظر سے گذرا" "تکلف برطرف" کے تحت میں بے تکلف صاحب نے اپنی خاندانی شرافت کا جو ثبوت دیا ہے اس کا شکریہ۔ اس سے پہلے بھی جناب سعادت حسن منٹو کے زمانہ میں بے تکلف صاحب کی رگ شرافت پھڑکی تھی، ہر چند شاعر کے باب تحقیق و تصحیح کے سلسلے میں انھوں نے اپنی کم علمی کا بہترین ثبوت دیا تھا لیکن چونکہ اُن کی طرزِ تحریر سنجیدگی پر مبنی تھی اس لئے میں نے دانستہ نظر انداز کر دیا۔ اس دفعہ انھوں نے دل کی بھڑاس نکال کر بھاگ جانا کر دیا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ معقولیت کے ساتھ ان کی بے تکلفی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں۔ آجکل میں اپنی اہلیہ کی علالت کے سلسلے میں بیحد پریشان ہوں اور

تجزیہ :- اس اشاعت کے بعض مضامین پر ایک نظر

کتابت کی غلطیاں :- باوجود کوشش رہ جاتی ہیں۔ جون کے شاعر میں صفحہ ۱۴ پر "رازِ لا" کے آخری شعر کے آخری مصرع میں "خوشا ذوقِ محبت کونسی منزل ہے یہ جسکی" "جسکی" کی جگہ "جس میں" بنالیا جائے۔ اسی نمبر میں صفحہ ۴۹ پر انیسویں سطر میں علاوہ "فرصت ذکر ہے" کو "وقت ذکر ہے" بنالیا جائے۔ "شاعر" بابت جولائی ۱۹۴۱ء صفحہ ۲۸ سطر ۲۰ میں "خورشید عالم تاب" کی جگہ "ماہتاب" بنالیا جائے۔

اس نمبر تمام مضامین طویل ہیں اس لئے اُن کی تعداد کم ہے۔ "شاعرہ شاعر" نے بھی کافی صفحات گھیر لیے ہیں اور بدرجہ مجبوری قلمی حصہ حذف کیا جا رہا ہے۔ **ادبی خطوط** اور **ادبی لطائف** بھی۔ شریکِ اشاعت نہ ہو سکے۔ آئندہ اشاعت میں دونوں دلچسپ مضامین ضرور شائع ہونگے۔

"انیسویں صدی کے بعض مشہور اخبار اور رسالے" اس اشاعت کا اہم ترین مضمون ہے جو ملک کے مشہور ادیب مولوی محمد ابواللیث صاحب صدیقی البدایونی ایم۔ اے کی نگاہِ تحقیق کا نتیجہ کامیاب ہے۔ موصوف نے انیسویں صدی کے ۲۷ اخبارات و رسائل کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اس مضمون میں تمہیداً جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی اضافہ معلومات کے لئے مفید ہے امید کہ فاضل مضمون نگار آئندہ اشاعت میں بعض اخبارات و رسائل کے اسلوب نگارش پر بھی تبصرہ فرمائیں گے۔

حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی فردوسی پر اُردو میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے ہمارے فاضل مضمون نگار کنور لیسین علیخاں شہاب نے فردوسی پر تحقیقی نقطۂ نظر سے قلم اٹھایا ہے اور غلط روایات سے بچنے کی کوشش کی ہے، فردوسی کی زندگی کے حالات کو موصوف نے کافی نئے رنگ میں پیش کیا ہے۔

آشکدۂ نوبہار بھی ایک تاریخی چیز ہے جو حضرت مولانا محمد اسحاق آلم مظفر نگری کی وسیع معلومات کی مظہر ہے، ہر چند مضمون مختصر ہے لیکن "نوبہار" کے کسی پہلو کو مولانا نے تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔

ایک خط اور اُسکا جواب ناظرین کے لئے بڑی دلچسپی کا حامل ہوگا۔ بنیر علم موصوف ڈاکٹر صاحب مولانا سیماب کی نظم کے متعلق جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ ہزاروں علماء، فضلاء اور فلاکار ان قوم کی نظر سے یہ نظم گذری لیکن کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا خود مولانا سید محمد آفتاب حسن صاحب امدادی مدیر ادیب و نظام المشائخ دہلی نے بڑے اہتمام سے یہ نظم شائع کی ہے۔ شاید صرف ڈاکٹر صاحب ہی مسلمان ہیں اور کسی بار میں ایمان کی روشنی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جس عام بالی نظم کا اپنے خط میں ذکر کیا ہے وہ بھی نظر میں ہو نچ گئی ہے، جو سطحی خیالات اور غلطیوں کی پوٹ کے علاوہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ڈاکٹر صاحب غالباً اس نظم کی اشاعت ہندوستان کے تمام اخبارات و رسائل میں کرانا چاہتے ہیں میرے خیال میں تو کوئی ہوشمند ایڈیٹر اُن کی اس نظم کو شائع نہیں کریگا۔ ڈاکٹر صاحب کا جذبۂ اسلامی اس وقت کیوں بیدار نہیں ہوتا جب ہندوستان کے بعض شعراء اور ادبار (نعوذ باللہ) خدا کو گالیاں دیتے ہیں، رسولِ پاک کو بُرا کہتے ہیں۔ لیکن جب شیطان کا منصب حقیقی اُن کے سامنے آیا تو وہ چراغ پا ہوگئے۔ کیا خوب!

افسانے اس نمبر صرف دو ہیں۔ پہلا افسانہ "خانہ بدوش" عورت کی فطری خودداری کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ خانہ بدوشوں کی زندگی سے زنگار رنگ واقعات بہت عجیب ہیں شنکری صاحب نے ترجمہ میں کسی قدر تو شگفتگی بھر دیا ہے۔ **رنگین دھوکا**۔ شاعر کے محسنِ اعلیٰ عالیجناب خانصاحب شری امام الدین خاں رشتان رسوا والئ باجوڑ کے حقیقت آشکار قلم کا نتیجہ ہے۔ چونکہ آپ خود ایک والئ ریاست ہیں اس لئے یہ افسانہ اور بھی جاذب توجہ ہوگیا ہے امید کہ موصوف آئندہ بھی اپنے افسانوں سے شاعر کے صفحات کی رونق بڑھائیں گے۔

نظمیں اس نمبر کم ہیں اور **غزلیں** زیادہ۔ نظموں میں حضرت صبا متھراوی کی نظم "کچھ دن شملے میں" اپنے اثر و مآل کے اعتبار سے بہت خوب ہے۔ صبا صاحب کو منظر کشی میں خاص ملکہ حاصل ہے لطیف کنایات اور رنگین تشبیہات کی اس نظم میں جگہ جگہ فراوانی ہے۔ "روح کی بازگشت بارگاہِ خداوندی میں" کامیاب ترین نظم ہے اس میں متفکرانہ انداز پائے جاتے ہیں، حضرت آغا زبیر بانوروی نے اپنی اس نظم میں "روح" کو گویا کرکے انسان کو ایک بلاواسطہ درس دیا ہے کہ انسان ہی کے غلط اقدام سے روح کو شرمندگی حاصل ہوتی ہے۔ "انتظارِ نسیم سحر" راجہ مہدی علیخاں کی ایک رومانی آفرین نظم ہے۔ اختصار کے باوجود نظم میں حلاوت موجود ہے۔ راجہ صاحب پہلی بار صفحاتِ شاعر پر جلوہ گر ہو رہے ہیں۔ خدا کرے کہ اُن کی جلوہ گری مستقل ہو جائے۔ موصوف اُردو کے بہترین افسانہ نگار بھی ہیں۔ "کرلی تجیا صاحب کی کیف آگیں نظم ہے اور اس موسم کو دیکھتے ہوئے تو اس کا مطالعہ رنگینیاں پیدا کرتا ہے۔

غزلوں کے علاوہ اس نمبر دو خمسے بھی ہیں حضرت رسوا عالی پلوری اور جناب ونق دکنی نے بڑی کامیابی کیساتھ اشعار کی تضمین کی ہے جناب سید ظہیر الدین جدید حضرت ماہر القادری۔ جناب حکیم عبد الکریم ثمر۔ جناب وزیر زادہ شجاعت خاں مہر جونا گڑھی۔ جناب نقا کراباری۔ حضرت نغا جالندھری۔ جناب اسمٰعیل گھوکر راز جونا گڑھی اور حضرت مولانا درد کاکوروی کی غزلیں معیاری تغزل کا بہترین نمونہ ہیں۔

اعجاز صدیقی

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

ہٹلر نے جو روس سے نئی ٹھانی ہے
اس طرزِ عمل سے سب کو حیرانی ہے
باطن کو تو دانا سے حقیقت سمجھے
ظاہر میں یہ ایک صاف نادانی ہے

"تحقیق" سے مقصد بجز "افواہ" نہیں
ادراکِ حقیقت کی کوئی راہ نہیں
کیا جانے وہ روس و جرمنی کے حالات
جو حالتِ ہمسایہ سے آگاہ نہیں

ہیں کشمکشیں خلوت و جلوت میں کچھ اور
اظہار ہے پردۂ صحافت میں کچھ اور
الفاظ میں کچھ اور ہے افسانۂ جنگ
ہے اصلیتِ جنگ حقیقت میں کچھ اور

فطرت ہے نمودار نئے ساماں سے
اسمیں حرکت ہے قوتِ یزداں سے
ہر رات نئی صبح کا اک پردہ ہے
کیا جانے نئی صبح ہو کس عنواں سے؟

ہر چند کہ رنگِ جنگ ہموار نہیں
ہر چند کہ خاتمے کے آثار نہیں
اک حال میں رہتی نہیں لیکن دنیا
اس حال میں انقلاب دشوار نہیں

شومیٔ قسمت کی، خوش نصیبی ہو جائے
باطن سے تعلق قریبی ہو جائے
مذہب سے ابھی اپنی علاقے نہ سمیٹ
ممکن ہے کہ یہ جنگ صلیبی ہو جائے

ذہنِ انساں پہ غفلتیں طاری ہیں
افراد شکارِ سہل انگاری ہیں
آغاز کی پیچیدگیاں ہیں لاحل
بحثیں مابعدِ جنگ پر جاری ہیں

دنیا مصروف، جنگِ اقوام میں ہے
ہر قوم کو محویت اسی کام میں ہے
لیکن چپ ہیں ممالکِ اسلامی
یعنی ہے سکوں تو صرف "اسلام" میں ہے

ہر روح شکارِ نامرادی ہوگی
شورشِ دنیا میں انفرادی ہوگی
اس جنگ کے انجام پہ مسرور نہ ہو
اک اور ابھی "جنگِ اقتصادی" ہوگی

ہر نفس پریشان ہے اور کچھ بھی نہیں
جھگڑے ہیں اور انسان ہے۔ اور کچھ بھی نہیں
تھی وسعتِ عالم کبھی جنت بکنار
اب "جنگ کا میدان" ہے اور کچھ بھی نہیں

سیماب

شخصیات :- حضرت مولانا قاضی قمر الحسن قمر بدایونی مرحوم

آپ ۲ صفر ۱۲۹۳ھ مطابق یکم مارچ ۱۸۷۶ء کو بمقام بدایوں محلہ قاضی ٹولہ پیدا ہوئے۔ خاندان "موحمید" بدایوں میں ہمیشہ سے عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، آپ اس خاندان کے چشم و چراغ تھے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت محمد بن حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ تک پہونچتا ہے آپ کے مورث اعلیٰ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں بسلسلۂ سیاحت "سبزوار" سے ہندوستان تشریف لائے تھے، آپ کے خاندان کے سب سے پہلے بزرگ جو وارد بدایوں ہوئے صدر العلما قاضی صدر الدین صاحب "صدر جہان وقت باقی" تھے۔ یہ بزرگ تاریخی عظمت و شہرت کے حامل تھے۔ دربار شاہی سے آپ کو قاضی القضات کا عہدہ عطا کیا گیا تھا۔ قاضی صدر الدین صاحب کی مستقل سکونت کے بعد آپ کے والد فخر العلما دیوان ارشاد عمدۃ الملک ملک حمید الدین گوری سبزواری رحمۃ اللہ علیہ بدایوں تشریف لائے۔ آپ شیخ مصلح الدین سعدی شیرازیؒ کے بھائی تھے۔ منصب قضاۃ عرصہ دراز تک اس خاندان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ دادا "حمید" الی سید احمد قاضی محلہ آج تک اس خاندان کی اقامت کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس خاندان کے بیشتر بزرگ مقربان سلطنت اور اعیان حکومت سے ہیں۔ اسلامی حکومت کے اختتام تک جاگیر و مناصب پر خاندان سرفراز رہا۔ علم و فضل کے اعتبار سے یہ خاندان اپنا جواب آپ تھا۔ شاعری بھی ہمیشہ اس خاندان کا طرۂ امتیاز رہی ہے چنانچہ طوطیٔ ہند نواب ظہور اللہ خاں نوا۔ مولوی شجاعت اللہ شفاعت (صاحب ترانۂ غریب) مولوی دلدار علی صاحب مذاق اور مولوی علی امجد حسین امجد اپنے وقت کے مشہور شاعر گذرے ہیں۔

جولائی ۱۸۸۰ء میں مولانا قمر بدایونی کا سلسلۂ تعلیم شروع ہوا۔ رسمی تعلیم کے بعد بدایوں کے مشہور اساتذہ شیخ محمود حسین جلیل، سید عرفان علی، مولوی التفات حسین، مولوی عبید المتعالی مولوی اعتقاد اللہ فاروقی مرحوم سے مولانا نے فارسی کی تکمیل کی اس کے بعد عربی میں کچھ دستگاہ حاصل کرکے گورنمنٹ اسکول بدایوں میں داخل ہوگئے ۱۸۹۵ء تک انگریزی تعلیم حاصل کرکے اسکول چھوڑ دیا اور مطالعہ کو اپنا معمول قرار دیا۔ ادبی اور شعری رجحانات فطری تھے اس لئے مضمون نگاری، ناول نویسی اور شاعری شروع کردی۔ ناداں دوست۔ نرالا۔ انوکھا فلاسفر وغیرہ اسی زمانہ کی یادگار ہیں ۱۹۰۲ء میں مولانا حافظ محمد عبد الرحمن راسخ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا ہندوستان کے مشہور رسائل میں آپ کے مضامین بڑی کثرت سے شائع ہوئے ہیں۔ مرحوم نے کبھی کسی رسالے کی فرمائش کو نہیں ٹالا مضمون نگاری، شعر و شاعری، مقامی اور غیر مقامی شاعروں کی شرکت اور تلامذہ کے کلام پر اصلاح، احباب اور شاگردوں سے ملاقاتیں، غرض صبح سے شام تک آپ انھیں مشاغل میں گھرے رہتے تھے۔

۱۹۱۰ء میں "انڈین پنچ" کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۹ء تک رسالہ "سودیش" اور "باتصویر اخبار" دہلی کے ادبی اور صحافتی شعبہ میں کام کرتے رہے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۹ء تک مستقل انتظامی پریس بدایوں سے متعلق رہے اور علمی و ادبی خدمات انجام دیں ۱۹۳۴ء میں آل انڈیا مشاعرہ الہ آباد سے جب آپ واپس ہوئے تو ضیق النفس کا مرض شروع ہوگیا جو وقت کے ساتھ ترقی کرتا رہا۔ علاج کے سلسلے میں ہر امکانی کوشش کی گئی اور مرض میں کمی بھی ہوگئی لیکن کامل فائدہ نہیں ہوا، اسی حالت میں آپ برابر احباب کے اصرار سے مشاعروں میں شرکت فرماتے رہے، چونکہ بیرونی مشاعروں کی شرکت سے آپ کو تکلیف ہوتی تھی اس لئے اکثر و بیشتر آپ اپنے ہمراہ اپنے صاحبزادے جناب ارشدی کو ساتھ رکھتے تھے۔ دو تین سال سے تو مرحوم خود غزل بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ یہ خدمت ارشدی صاحب کے سپرد تھی۔ ۱۹۳۹ء میں بیماری مرض کی وجہ سے ملازمت ترک کردی اور گوشہ نشین ہوگئے۔ لیکن تلامذہ کے کلام پر اصلاح فکر سخن۔ مشاعروں کی شرکت اور مضمون نگاری کا سلسلہ برابر جاری رہا — یہاں تک کہ اپنے انتقال سے ۲ روز پہلے تک آپ نے اصلاح دی ہے۔ اب سے تین ماہ قبل یعنی اپریل ۱۹۴۱ء میں پنڈت جگموہن ناتھ صاحب بینا شوق کے اصرار سے آپ شاہجہانپور کے آل انڈیا مشاعرہ میں تشریف لے گئے تھے۔ آخری بار مرحوم سے مجھے شرف نیاز حاصل ہوا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک سلسلۂ گفتگو جاری رہا۔ میں نے پان پیش کیا مرحوم نے بڑی خندہ پیشانی سے قبول فرمایا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مرض نے اُن میں بہت کافی اضمحلال پیدا کردیا ہے۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ خلیفہ ایک کام کرو بہت ہی اہم ہے اور دوسرے معنوں میں دلچسپ ہے۔ میں نے عرض کیا فرمائیے تو کہنے لگے کہ ہندوستان کے جتنے مشاہیر شعرا پر تنقیدی مضامین شائع ہوئے ہیں اُن سب کو جمع کرو اور ہر شاعر کی توصیف میں ناقد نے جو کچھ لکھا ہو اُسے نوٹ کرلو تم دیکھو گے کہ اس طرح کسی شاعر کو ایک دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں ہوگی اور سب ایک ہی ذیل میں آجائیں گے۔ یہ میں نے بہت مختصر طور پر اُن کے خیال کا اظہار کیا ہے، مرحوم نے

تو بہت وضاحت کے ساتھ فرمایا تھا، یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔ مشاعرہ کی دوسری نشست جو دن کی تھی اس میں بھی مجھے مرحوم کو سلام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی چونکہ وہ دور بیٹھے تھے اس لیے کوئی گفتگو نہ ہو سکی اور نہ میں ان کی غزل سن سکا۔ اس لیے کہ اختتام مشاعرہ سے قبل ہی میں چلا آیا تھا۔ یہ تھی آخری ملاقات۔ مرحوم نے شاہجہانپور کے مشاعرہ میں جو غزل پڑھی تھی وہ میرے سامنے ہے مطلع سے واضح ہوتا ہے کہ انھیں اپنی موت کا علم ہو چکا تھا۔ فرماتے ہیں ؎

چھوڑ کر بستی بسانے آئے ہیں ویرانہ ہم اب مرتب کر رہے ہیں دوسرا افسانہ ہم

یہ واقعی دوسرا افسانہ ہے جو میں ان کے متعلق لکھ رہا ہوں۔ شاہجہانپور کے مشاعرہ کے بعد جناب ساغر نظامی نے اپنے "ایشیا" میں اساتذہ سخن کو دل کھول کر برا بھلا کہا چنانچہ مرحوم نے اسی ذیل میں میرے ایک عریضہ کا جواب دیتے ہوئے اس کا بھی ذکر کیا، یہ ان کا آخری خط تھا جو انھوں نے مجھے لکھا۔ خط بہت طویل ہے کہیں کہیں سے اس کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

بدایوں ۲۲ مئی ۱۹۴۱ء

عزیز گرامی قدر۔ تسلیم

"یہ قصہ تو طویل ہے کہ میں شاہجہانپور میں موسم کی سختی سے متاثر ہو کر بدحال ہو گیا۔ ۸ کو بریلی آیا، یہاں آ کر تخمہ ہو گیا۔ ۷۔ ۸ وقت تک غذا ترک رہی بدقت تمام ۱۶ کو اس قابل ہوا کہ بدایوں آ سکوں بدایوں آ کر بھی دوا کا سلسلہ جاری رہا۔ جواب تک باقی ہے اور اب ضعف کا یہ عالم ہے کہ بیٹھ کر اٹھنا بھی آسان نہیں ہے۔

اسی حالت میں "ایشیا" کا مضمون پڑھا اور یہ طے کر لیا ....!

میں اپنی علالت اور کمزوری کی وجہ سے مضمون کو نہ خوشخط لکھ سکا ہوں اور نہ صاف کر سکا ہوں اس لیے احتیاط سے اس کی کاپی لکھوائیے اور غور سے دیکھ لیجیے۔"

والسلام قمر

بریلی میں مرض کی زیادتی کا علم مرحوم کے خط سے ہوتا ہے، اسی حالت میں آپ نے عرس قاسمی شریف کے مشاعرہ کی شرکت فرمائی اور اس کے لیے چند نعتیہ اشعار بھی لکھے، برادرم ارشدی تحریر فرماتے ہیں کہ انہوں نے جب نعت شریف کا یہ مقطع پڑھا ؎

دونوں میں کوئی صورت ہو جائے بس اب حضرت یا آپ تسلی دیں یا جان قمر دیدے

تو ان کی خرابی صحت دیکھتے ہوئے مجھ پر رقت طاری ہو گئی جس سے ساری محفل بیچین ہو گئی۔

بدایوں واپس آ کر روز بروز مرض بڑھتا ہی گیا اور کوئی دوا کارگر نہ ہوئی آخرکار ۷ جولائی ۱۹۴۱ء کو دن کے ۱۱ بجے اس شہنشاہ شاعری نے موت کا کالا نقاب اپنے چہرہ پر ڈال لیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

چونکہ آپ قادریہ خاندان میں بیعت تھے اس لیے آستانہ عالیہ قادریہ میں آپ کو ہمیشہ کے لیے سپرد خاک کر دیا

مرحوم کثیر التلامذہ اور صاحب تصانیف تھے۔ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ بہت سی تصانیف موجود ہیں وہ قدیم تغزل کے صحیح پیرو تھے اور مولانا راسخ دہلوی کے حقیقی جانشین تھے اپنے استاد کے رنگ کو جس طرح مولانا قمر بدایونی مرحوم نے نبھایا وہ انہیں کا حصہ تھا۔ اسلوب بیان، زبان اور محاورات کے بادشاہ تھے۔ متین شریف جذبات کی ترجمانی اور رموز و لسانیات کا لحاظ بدرجہ اتم کرتے تھے جو چٹخارہ اور لذت مرحوم کے کلام میں پائی جاتی ہے وہ دوسری جگہ بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ آپ تمام اصناف سخن پر قادر تھے۔

بریلی اور شاہجہانپور کی غزلیں جو آپ کی بالکل آخری فکر کا نتیجہ ہیں درج ذیل ہیں

نعت شریف بریلی

سرکار دو عالم کے آنے کی خبر دیدے رشتہ مجھے تسکیں کے باد سحر دیدے
میں اور ہے عرفاں یہ منزہ طلب، توبہ ساقی کی عنایت ہے اک جام اگر دیدے
اس کوچہ نوردی سے کیا فائدہ اے وحشی تو لے محبت کا دعویٰ ہے تو سر دیدے
اے خالق این آں تجھے جس سے عدو لرزاں اسلام کو وہ طاقت پھر بار دگر دیدے
آئے ہیں وہ بالیں پر میں دیکھ لوں جی بھر کے اتنی تو مجھے مہلت اے دیدۂ تر دیدے

دونوں میں کوئی صورت ہو جائے بس اب حضرت
یا آپ تسلی دیں یا جان قمر دیدے

غزل مشاعرہ شاہجہانپور

چھوڑ کر بستی بسانے آئے ہیں ویرانہ ہم اب مرتب کر رہے ہیں دوسرا افسانہ ہم
اک جفا پر اپنی قائم اک وفا پر کاربند اپنی کرنی سے نہ وہ بے مہر باز آیا نہ ہم
راز الفت فاش ہو یہ بات نازیبا سی ہے نظم کر دیں ورنہ ہر ہر شعر میں افسانہ ہم
عشق کی غیرت کو اب احساس رسوائی ہوا آج تجھ سے کام لیں گے ہمت مردانہ ہم
جلوۂ رخ سامنے ہو سر ہو پائے ناز پر بس یہی کر جانتے ہیں سجدۂ شکرانہ ہم
کل کہا تھا جس کو سنتے ہی غلط بالکل غلط آج کہتے ہیں سنیں گے پھر وہی افسانہ ہم
خواہ اب کچھ بھی اثر ہو عشق کی رفتار کا یہ نہ ہوگا چھوڑ دیں سنگ در جانانہ ہم
چار آنکھیں ہوتے ہی ساقی سے آنکھیں کھل گئیں دیکھتے ہیں ہر طرف میخانہ ہی میخانہ ہم

انقلاب دہر کو خاطر میں کیا لاتے قمر
گردش گردوں کو سمجھے گردش پیمانہ ہم

اعجاز صدیقی

انیسویں صدی کے بعض مشہور اخبار اور رسالے

(۱۸۳۵ء سے ۱۸۷۴ء تک)

ابتک اُردو صحافت کی کوئی تاریخ مرتب نہیں کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کم لوگ اُردو صحافت کی ابتدا، اور ارتقاء سے واقف ہیں، گذشتہ چند مہینوں میں مجھے سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے پُرانے اخباروں اور رسالوں کی کیفیت پڑھنے اور قلمبند کرنے کا موقع ملا، چنانچہ اُردو صحافت کی تاریخ کا پہلا باب یعنی انیسویں صدی کے اُردو اخباروں اور رسالوں کے حالات مرتب ہو چکے ہیں اور بشرط فرصت جلد شائع کئے جائیں گے۔ آج کی صحبت میں اسی مقالہ کے جستہ جستہ مقامات سے بعض مشہور اخباروں اور رسالوں کا حال پیش کیا جاتا ہے، اصل مقالہ میں انیسویں صدی کے چار سو اخباروں اور رسالوں کا حال شامل ہے ——— لیث

انیسویں صدی ہندوستان کی تاریخ میں بڑا پُر آشوب زمانہ ہے، یہ وہ وقت تھا کہ مغربیت اور مشرقیت کی ٹکر کا احساس لوگوں میں پہلی مرتبہ عام ہوا اور عوام کے ذہنی، تعلیمی، معاشرتی اور لسانی عقاید منقلب ہونے لگے، سیاست کا مواد ۱۸۵۷ء کی آگ میں نکل گیا جس نے اپنی لپیٹ میں آخری بیگناہ اور بوڑھے مغل شہنشاہ کو بھی لے لیا جس نے کبھی شہنشاہیت کا دعویٰ نہیں کیا تھا، بہرحال جو کچھ ہوا انقلاب ہوا اور ایک نئی سیاست کی ابتدا ہوئی

مسلمانوں میں اس سیاسی انقلاب سے بڑا انتشار پھیل گیا لیکن عام ہندوستانیوں کی زندگی سیاسی اعتبار سے بالکل نہ بدلی۔ ایک شہنشاہیت سے چھٹکارا ملا تو دوسری ملوکیت سے سابقہ پڑا لیکن ملک میں غیر سیاسی تحریکوں کو بڑی ترقی ہوئی۔ ان تحریکوں میں زبانوں کی ترویج و اشاعت کے لئے باقاعدہ اداروں کا قیام، شاعری اور نثر کے جدید دور کا آغاز، پریس کا قیام اور صحافت کی ابتدا، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، اُردو صحافت آج بھی کس مپرسی کے عالم میں ہے لیکن اس کی ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالیں تو حیرت ہوتی ہے کہ باوجود اس قدر کم عمر ہونے کے اُس نے صرف سو برس کی مختصر مدت میں بڑی ترقی کی ہے۔

پہلے کتابوں کے ہاتھ سے لکھے جانے کا رواج تھا اور فنِ خطاطی خالص آرٹ کے لحاظ سے بہت ترقی کر چکا تھا لیکن زبان کی اشاعت اور ترقی کے لئے لکھنے کا یہ طریقہ زیادہ مفید نہیں تھا اور اسی سبب سے اہلِ یورپ نے لکڑی کے چھاپوں کا خیال چین سے لیکر اُسے پریس کی صورت میں ترقی دی اور بہت جلد اس کا رواج ہو گیا لیکن ہندوستان میں یہ چیز بہت بعد میں آئی یہاں اُردو (یعنی فارسی رسم الخط) کے پریس کا پتہ سب سے پہلے "کلکتہ گزٹ" سے چلتا ہے جس میں علامہ عبداللہ یوسف علی کی تحقیق کے مطابق ۴ مارچ ۱۷۸۷ء کے ایک پرچہ کے ایک کالم میں فارسی میں "خلاصہ اخبار دربار معلی بہ دار الخلافہ شاہجہان آباد" چھپا تھا، گمانِ غالب ہے کہ اسی زمانہ سے ٹائپ پریس اُردو کے لئے استعمال کیا گیا ہوگا۔

ٹائپ پریس عرصہ تک مقبول رہا۔ چنانچہ مولانا شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا مشہور ترجمہ کلام پاک ۱۸۲۹ء میں اسی ٹائپ میں چھپا تھا، فورٹ ولیم اور ہیلی بری کالج کی تصانیف و تالیفات بھی ٹائپ میں شائع ہوتی تھیں۔ ۱۷۹۶ء میں گوشنبرگ ایک موجد سینی فلڈو سنے لیتھو یعنی پتھر کا چھاپہ بجائے لوہے کے چھاپہ کے استعمال کرنا شروع کیا اور ۱۸۳۶ء تک یہ ایجاد ہندوستان والوں نے بھی اختیار کرلی۔ ظاہر ہے کہ اسی زمانہ سے اخباروں اور رسالوں کی اشاعت شروع ہوئی ہوگی۔

اُردو کا پہلا اخبار "اردو اخبار" تھا جسے مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر صاحب نے ۱۸۳۵ء میں دہلی سے نکالنا شروع کیا، افسوس ہے کہ اس وقت تک اس اخبار کا کوئی پرچہ دستیاب نہیں ہوا جس سے اس کے متعلق مزید معلومات فراہم ہو سکیں، اتنا البتہ یقینی ہے کہ مولانا باقر کا پریس اپنا ذاتی تھا کیونکہ اس کا ذکر رسالہ خیر خواہ ہند کے سرورق پر ملتا ہے جو اسی پریس میں طبع ہوتا تھا۔

یہ اُردو کا پہلا رسالہ تھا جس کی تفصیل آگے آئیگی۔

اس کے بعد ہی سر سید احمد خاں اور اُن کے بڑے بھائی نے مل کر ایک اخبار **"سید الاخبار"** کے نام سے دہلی سے نکالنا شروع کیا، اس میں زیادہ تر مضامین سر سید کے قلم سے نکلتے تھے اور یہ اُن کی تصنیفی زندگی کی ابتدا تھی۔

یہ اخباروں کی ابتدا تھی۔ ترقی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۸۴۹ء میں صرف صوبہ مغربی شمالی میں ۲۳ مطابع تھے جن میں ۲۶ اخبار اور رسالے شائع ہوتے تھے ان میں سے ۲۳ اُردو زبان میں ۲ فارسی میں اور ایک بنگالی میں شائع ہوتا تھا، اگر اس سال کے اعداد میں وہ اخبار اور رسالے بھی شامل کر لئے جائیں جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے شائع ہوتے ہونگے تو یہ تعداد کم از کم پچاس تک ضرور پہنچ جائیگی، ۱۸۵۰ء میں مطبوں کی تعداد میں اور بھی اضافہ ہوا چنانچہ سات آگرہ میں، پانچ دہلی میں، دو میرٹھ میں، دو لاہور میں، چار بنارس میں، ایک بریلی میں، ایک کانپور میں، ایک شملہ میں اور ایک اندور میں تھا، صرف لکھنؤ میں ۱۳ مطابع ان کے علاوہ تھے۔

اس زمانہ کے رسالوں میں دو رسالے خاص طور پر اہم ہیں، ایک "محب ہند" اور دوسرا "خیر خواہ ہند" ان دونوں کے اڈیٹر دلی کالج کے مشہور اور فاضل پروفیسر ماسٹر رام چندر لال تھے جنھیں سر سید نے اپنے اخبار سینٹیفک سوسائٹی میں اکثر علّامہ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ ان کے متعلق مشہور فرانسیسی محقق گارساں دتاسی اپنے مقالات میں لکھتا ہے :-

"مذکورہ بالا اصحاب میں پہلے شخص ماسٹر رام چندر ہیں جن کے عیسائی مذہب قبول کر لینے پر (اور کہا جاتا ہے کہ دہلی کے وہ پہلے ہندو ہیں جنھوں نے یہ مذہب اختیار کیا۔) خاصی ہل چل مچ گئی تھی۔ اس پنڈت کی عمر اس وقت ۳۵ سال کی ہے یہ شخص دہلی کالج کا طالب علم تھا اور اس کالج میں اُس نے انگریزی ہندوستانی اور فارسی زبانوں کو حاصل کیا تھا لیکن علم ریاضی کی طرف اس کا خاص رجحان تھا وہ متعدد مفید کتابوں کا مصنف اور مترجم ہے۔ جن میں سے ایک الجبرا ہے برج اینڈ کیوب (BRIDGE & CUBE) کی تقلید میں لکھا گیا ہے۔ ایک کتاب علم مثلث پر ہے جس میں مخروطات بھی شامل ہیں۔ ایک کتاب علم ہندسہ پر ہے جو ہٹن اور بوشرلا (HUTTON & BOUCHARLAT) کے طریقہ پر مرتب کی گئی ہے، ایک کتاب علم حساب پر لکھی ہے اور اِن کے علاوہ کئی کتابیں علم ادب پر ہیں، یہ پروفیسر دو رسالوں کے اڈیٹر بھی ہیں، ان میں سے ایک خاص طور پر قابل ذکر ہے جس کا نام "محبوب[۱] ہند" ہے، یہ ایک ماہانہ پرچہ ہے جس میں اہم معاملات و مسائل وقت پر، اہل ہند کی تعلیمی حالت پر اور عام ادب یعنی ہندوستانی زبان کی ترقی پر مضامین لکھے جاتے ہیں"

گارساں دتاسی کے اس بیان سے اس فاضل اڈیٹر کی قابلیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ گارساں نے دو رسالوں کا ذکر کیا ہے لیکن نام صرف ایک کا بتایا ہے۔ دوسرا رسالہ "خیر خواہ ہند" ہے، جس کا ایک پُرانا پرچہ انعام الحق صاحب حقی دہلوی کو ملا تھا اور اس پر مخزن مئی ۱۹۰۹ء میں ایک مضمون بھی نکلا تھا، اس کے متعلق اُنھوں نے شمس العلما مولوی ذکاء اللہ صاحب کی یہ رائے لکھی ہے۔

"خیر خواہ ہند" پہلا رسالہ ہے جو اُردو زبان میں پروفیسر رام چندر نے نکالا تھا، وہی اس مضمون کے مصنف تھے، ان کی عادت تھی کہ وہ خود کوئی مضمون اپنے قلم سے نہیں لکھتے تھے، مگر اُن کے طلبا، جو عربی کی اوّل جماعت کے تھے وہ جو کہتے جاتے تھے، اس کو لکھ جاتے اس رسالہ میں اکثر مضامین ان کے اس طرح کے لکھوائے ہوئے ہیں، یہ مضمون انھیں کا ہے۔"

اسی رسالہ کا جو پرچہ اظہار الحسن صاحب کو ملا تھا اُس کی تفصیل رسالہ ہندوستانی جنوری ۱۹۳۲ء میں شائع ہو چکی ہے اس کے سرورق کی نقل یہ ہے :-

۱۸۴۸ء	جلد دوم	اوّل اکتوبر
قیمت سالانہ ایک روپیہ اور جاری ہوتا ہے ہر مہینہ میں ایک بار اور محصول ڈاک ذمہ خریدار		
خیر خواہ ہند		
رام چندر ماسٹر مدرسہ دہلی کے اہتمام سے مطبع دہلی اردو اخبار میں منطبع ہوا		
مکان مولوی محمد باقر	PRICE ONERUPEE	پنڈت موتی لال پرنٹر

[۱] گارساں کے مقالات میں "محبوب ہند" ہے لیکن اس کی جگہ "محب ہند" ہونا چاہیے۔

یہ رسالہ مصوّر شائع ہوتا تھا چنانچہ اس نمبر کے پہلے صفحہ ہی پر (نقشۂ شہر دہلی) از طرف دریائے جمن" دیا ہوا ہے، نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کی تصاویر بھی ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے رسالہ کا معیار خاصا بلند ہے۔ چنانچہ حصۂ نظم میں ذوق کا وہ مشہور قصیدہ موجود ہے جس کا مطلع ہے سہ

سر آرائی گردوں جب تلک سلطان خاور ہو تمر دستور اعظم صدر اعلیٰ سعد اکبر ہو

شروع میں کوئی فہرست مضامین نہیں ہے، نہ یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ تمام مضامین اڈیٹر نے خود لکھے ہیں یا دوسرے لکھنے والوں کا بھی کچھ حصہ ہے، مضامین میں کافی تنوع ہے، چنانچہ پہلا مضمون "تاریخ اودھ پر ہے" جو ۳ صفحات پر مشتمل ہے، دوسرا مضمون "تربیت اہل ہند" کے بیان میں ہے جو ۲ صفحوں پر ختم ہوا ہے، تیسرا مضمون "بیان سادھوؤں کے طریقوں کا" ۵ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے اس کے بعد ہیئت اور بیان ستاروں کا اور آخر میں ذوق کا قصیدہ ہے۔

اودھ والے مضمون سے آزادی رائے کا پتہ چلتا ہے، نواب سعادت علی خاں کے حالات میں انگریزی ریذیڈنٹ پر نکتہ چینی کی ہے، اس مضمون میں لڑائیوں کے حالات اور سیاسی واقعات تو ہیں لیکن تمدن و معاشرت تعلیم و زبان کے متعلق کچھ بھی نہیں ملتا

ذیل کے نقشہ سے خاص اخباروں اور رسالوں کے سنہ اشاعت اور مقام اشاعت کا حال معلوم ہوگا، ان میں نشان زدہ اخباروں اور رسالوں کی پوری تفصیلات موجود ہیں جنھیں کبھی پھر پیش کیا جائیگا

نمبر سلسلہ	نام اخبار یا رسالہ	مقام اشاعت	سنہ جس میں اسکا پتہ چلتا ہے	نمبر سلسلہ	نام اخبار یا رسالہ	مقام اشاعت	سنہ جس میں اسکا پتہ چلتا ہے	نمبر سلسلہ	نام اخبار یا رسالہ	مقام اشاعت	سنہ جس میں اسکا پتہ چلتا ہے
۱	اردو اخبار	دہلی	۱۸۳۵ء	۱۷	مفتاح الاخبار	میرٹھ	۱۸۵۱ء	۳۳	ریاض نور	ملتان	۱۸۵۱ء
۲	سید الاخبار	دہلی	۱۸۳۷ء	۱۸	جام جہاں نما	میرٹھ	۱۸۵۱ء	۳۴	مارتنڈ اخبار	کلکتہ	۱۸۵۱ء
۳	خیرخواہ ہند ※	دہلی	۱۸۴۸ء	۱۹	بنارس اخبار	بنارس	۱۸۵۱ء	۳۵	زنانہ اخبار	کلکتہ	۱۸۵۱ء
۴	محب ہند	دہلی	۱۸۴۸ء	۲۰	سدھاکر اخبار	بنارس	۱۸۵۱ء	۳۶	بمبئی ہرکارہ	بمبئی	۱۸۵۲ء
۵	مطلع الاخبار	آگرہ	۱۸۵۱ء	۲۱	باغ و بہار	بنارس	۱۸۵۱ء	۳۷	اخبار دفتر جزیرہ بمبئی	بمبئی	۱۸۵۲ء
۶	اخبار الحقائق	؟	۱۸۵۱ء	۲۲	زائرین ہند	بنارس	۱۸۵۱ء	۳۸	تازہ بہار	بمبئی	۱۸۵۲ء
۷	اسد الاخبار	؟	۱۸۵۱ء	۲۳	بنارس ہرکارہ	بنارس	۱۸۵۱ء	۳۹	نور الاخبار	آگرہ	۱۸۵۲ء
۸	قطب الاخبار	؟	۱۸۵۱ء	۲۴	عمدۃ الاخبار	بریلی	۱۸۵۱ء	۴۰	آفتاب ہند	بنارس	۱۸۵۲ء
۹	معیار الشعراء	آگرہ	۱۸۵۱ء	۲۵	خیرخواہ ہند	مرزاپور	۱۸۵۱ء	۴۱	فتح الاخبار	علی گڑھ	۱۸۵۲ء
۱۰	اخبار النواح	آگرہ	۱۸۵۱ء	۲۶	شملہ اخبار	شملہ	۱۸۵۱ء	۴۲	صادق الاخبار	دہلی	۱۸۵۲ء
۱۱	گورنمنٹ گزٹ	آگرہ	۱۸۵۱ء	۲۷	مالوہ اخبار	اندور	۱۸۵۱ء	۴۳	نور مشرقی	دہلی	۱۸۵۲ء
۱۲	سراج الاخبار	دہلی	۱۸۵۱ء	۲۸	مظہر السرور	بھرت پور	۱۸۵۱ء	۴۴	نور مغربی	دہلی	۱۸۵۳ء
۱۳	مظہر الحق	دہلی	۱۸۵ء	۲۹	دریائے نور	لاہور	۱۸۵۱ء	۴۵	سرکاری اخبار	گوالیار	۱۸۵۳ء
۱۴	قران السعدین	دہلی	۱۸۵۱ء	۳۰	کوہ نور ※	لاہور	۱۸۵۱ء	۴۶	شعاع الشمس	ملتان	۱۸۵۳ء
۱۵	فوائد الناظرین	دہلی	۱۸۵۱ء	۳۱	نور علیٰ نور	لدھیانہ	۱۸۵۱ء	۴۷	دہلی گزٹ	دہلی	۱۸۵۳ء
۱۶	دقیق الاخبار	دہلی	۱۸۵۱ء	۳۲	باغ نور	امرتسر	۱۸۵۱ء	۴۸	منظور الاخبار	سورت	۱۸۶۰ء

۴۹	خیرخواہ خلق	اجمیر	۱۸۶۰ء	۷۶	مظہر العجائب	رڑکی	۱۸۶۵ء	۱۰۳	مظہر الاخبار	مدراس	۱۸۶۵ء
۵۰	مفید خلائق	آگرہ	۱۸۶۰ھ	۷۷	لارنس گزٹ ※	میرٹھ	۱۸۶۵ء	۱۰۴	ریاض الاخبار	مدراس	۱۸۶۵ء
۵۱	اخبار طبابت	پشاور	۱۸۶۱ء	۷۸	اخبار عالم ※	میرٹھ	۱۸۶۵ء	۱۰۵	برق خاطف	بمبئی	۱۸۶۵ء
۵۲	نور الابصار ※	آگرہ	۱۸۶۲ء	۷۹	میرٹھ گزٹ	میرٹھ	۱۸۶۵ء	۱۰۶	مجمع البحرین	حیدرآباد	۱۸۶۵ء
۵۳	بغاوت ہند	آگرہ	۱۸۶۲ء	۸۰	قانونی رسالہ	آگرہ	۱۸۶۵ء	۱۰۷	اخبار انجمن ہند	لکھنؤ	۱۸۶۵ء
۵۴	اخبار حیدری	آگرہ	۱۸۶۲ء	۸۱	پنجابی ※	لاہور	۱۸۶۴ء	۱۰۸	اخبار سہیل	لاہور	۱۸۶۵ء
۵۵	اخبار حسینی	آگرہ	۱۸۶۲ء	۸۲	اودھ گزٹ ※	لکھنؤ	۱۸۶۴ء	۱۰۹	گنج شائگاں	لاہور	۱۸۶۵ء
۵۶	محب رعایا	اٹاوہ	۱۸۶۲ء	۸۳	روضۃ الاخبار	بمبئی	۱۸۶۴ء	۱۱۰	آئینۂ عالم	آگرہ	۱۸۶۶ء
۵۷	مجمع البحرین ※	لدھیانہ	۱۸۶۲ء	۸۴	مفرح القلوب	شکارپور سندھ	۱۸۶۴ء	۱۱۱	اردو اخبار	آگرہ	۱۸۶۶ء
۵۸	نسیم جونپور	جونپور	۱۸۶۳ء	۸۵	مطلع خورشید	کراچی	۱۸۶۴ء	۱۱۲	مفید الانام	فتح گڑھ	۱۸۶۶ء
۵۹	وکٹوریہ گزٹ	سہارنپور	۱۸۶۲ء	۸۶	صبح صادق	مدراس	۱۸۶۴ء	۱۱۳	طلسم حکمت	میرٹھ	۱۸۶۶ء
۶۰	امین الاخبار	الہ آباد	۱۸۶۲ء	۸۷	اخبار عالم ※	؟	۱۸۶۴ء	۱۱۴	بیوپاری	امرتسر	۱۸۶۶ء
۶۱	شعلۂ طور ※	کانپور	۱۸۶۲ء	۸۸	نجم الاخبار ※	میرٹھ	۱۸۶۴ء	۱۱۵	رتن پرکاش	رتلام	۱۸۶۶ء
۶۲	جام جہاں نما	کلکتہ	۱۸۶۲ء	۸۹	کانپور گزٹ	کانپور	۱۸۶۴ء	۱۱۶	اخبار سائنٹفک سوسائٹی ※	علی گڑھ	۱۸۶۶ء
۶۳	روہیلکھنڈ اخبار	بریلی	۱۸۶۱ء	۹۰	آب حیات	آگرہ	۱۸۶۶ء	۱۱۷	مخزن العلوم	گوجرانوالہ	۱۸۶۶ء
۶۴	کشف الاخبار	بمبئی	۱۸۶۱ء	۹۱	کارنامۂ ہند	سوہنہ (گوڑگانوہ)	۱۸۶۶ء	۱۱۸	فیضان عام	؟	۱۸۶۶ء
۶۵	سرکاری اخبار	لاہور	۱۸۶۱ء	۹۲	کارنامۂ ہند ※	لکھنؤ	۱۸۶۶ء	۱۱۹	انوار الشمس	لاہور	۱۸۶۸ء
۶۶	معلم العلم	پنجاب ؟	۱۸۶۱ء	۹۳	گیان پردینی پتریکا	لاہور	۱۸۶۵ء	۱۲۰	طلسم حیرت	مدراس	۱۸۶۸ء
۶۷	خیرخواہ خلق	آگرہ	۱۸۶۱ء	۹۴	بحر حکمت لاہور	لاہور	۱۸۶۵ء	۱۲۱	امیر الاخبار	مدراس	۱۸۶۸ء
۶۸	اودھ اخبار	لکھنؤ	۱۸۶۱ء	۹۵	خیرخواہ پنجاب ※	سیالکوٹ	۱۸۶۵ء	۱۲۲	اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ ※	لکھنؤ	۱۸۶۸ء
۶۹	نجم الاخبار ※	میرٹھ	۱۸۶۲ء	۹۶	چشمۂ فیض	"	"	۱۲۳	اکمل الاخبار	دہلی	۱۸۶۸ء
۷۰	جامع الاخبار	مدراس	۱۸۶۲ء	۹۷	خورشید عالم	"	"	۱۲۴	ضیاء الاخبار	؟	۱۸۶۸ء
۷۱	دلکشا	فتح گڑھ	۱۸۶۵ء	۹۸	اخبار پنجاب	"	"	۱۲۵	اخبار محتشم	؟	۱۸۶۸ء
۷۲	احسان الاخبار	بریلی	۱۸۶۵ء	۹۹	نیر راجستان	جے پور	۱۸۶۵ء	۱۲۶	حقائق عرفاں	لاہور	۱۸۶۸ء
۷۳	آئینۂ ہند	بریلی	۱۸۶۵ء	۱۰۰	اخبار کرنان	مدراس	۱۸۶۵ء	۱۲۷	مخزن مسیحی	دہلی	۱۸۶۸ء
۷۴	رفاہ خلائق	شاہجہانپور	۱۸۶۵ء	۱۰۱	شمس الاخبار	مدراس	۱۸۶۵ء	۱۲۸	ہندوستانی اخبار	گوالیار	۱۸۶۸ء
۷۵	نور نظر	بلند شہر	۱۸۶۵ء	۱۰۲	عمدۃ الاخبار	مدراس	۱۸۶۵ء	۱۲۹	مواعظ عقبیٰ	دہلی	۱۸۶۸ء

نمبر	نام	مقام	سنہ	نمبر	نام	مقام	سنہ	نمبر	نام	مقام	سنہ
۱۲۸	آئینۂ علم	میرٹھ	۱۸۶۸ء	۱۴۳	عمدۃ الاخبار	مدراس	۱۸۶۹ء	۱۵۸	وکیل ہندوستان *	؟	۱۸۷۳ء
۱۲۹	اخبار طبابت	؟	۱۸۶۸ء	۱۴۴	اعظم الاخبار	مدراس	۱۸۶۹ء	۱۵۹	آثار الابصار	لکھنؤ	۱۸۷۴ء
۱۳۰	اخبار الاخبار	مرزاپور (بہار)	۱۸۶۸ء	۱۴۵	دبدبۂ سکندری *	رامپور	۱۸۷۱ء	۱۶۰	جام جمشید	بمبئی	۱۸۷۴ء
۱۳۱	اتالیق پنجاب	لاہور	۱۸۶۸ء	۱۴۶	راقم بنارس *	بنارس	۱۸۷۱ء	۱۶۱	پٹیالہ اخبار *	پٹیالہ	۱۸۷۲ء
۱۳۲	چشمۂ علم	پٹنہ	۱۸۶۹ء	۱۴۷	محب ہند	میرٹھ	۱۸۷۲ء	۱۶۲	اُردو لا رپورٹ *	مرادآباد	۱۸۷۲ء
۱۳۳	دبدبۂ سکندری	سکندرہ	۱۸۶۹ء	۱۴۸	لوحِ محفوظ *	مرادآباد	۱۸۷۲ء	۱۶۳	اخبار انجمن لاہور *	لاہور	۱۸۷۲ء
۱۳۴	غالب الاخبار	سیتاپور	۱۸۶۹ء	۱۴۹	سانڈرس گزٹ	شاہجہانپور	۱۸۷۲ء	۱۶۴	جلوۂ تہذیب	لکھنؤ	۱۸۷۲ء
۱۳۵	گنجینۂ احکام *	مرادآباد	۱۸۶۹ء	۱۵۰	منظر العلوم	؟	۱۸۷۲ء	۱۶۵	الموڑہ اخبار	الموڑہ	۱۸۷۲ء
۱۳۶	جلوۂ طور *	میرٹھ	۱۸۶۹ء	۱۵۱	گلشنِ ریاضی *	آگرہ	۱۸۷۲ء	۱۶۶	آگرہ اخبار	آگرہ	۱۸۷۲ء
۱۳۷	خیر المواعظ	دہلی	۱۸۶۹ء	۱۵۲	رسالہ میرٹھ ڈبیٹنگ سوسائٹی	میرٹھ	۱۸۷۰ء	۱۶۷	اُردو گائڈ	کلکتہ	۱۸۶۷ء
۱۳۸	مخزن العلوم	بریلی	۱۸۶۹ء	۱۵۳	رسالہ مہا بھارت *	؟	۱۸۷۲ء	۱۶۸	رہنمائے پنجاب	لاہور	۱۸۶۷ء
۱۳۹	میور گزٹ	میرٹھ	۱۸۶۹ء	۱۵۴	بریلی ریویو *	بریلی	۱۸۷۳ء	۱۶۹	کارنامۂ ہند	؟	۱۸۶۷ء
۱۴۰	نیرِ اکبر	بجنور	۱۸۶۹ء	۱۵۵	اتالیق ہند *	لاہور	۱۸۷۳ء	۱۷۰	منظر الاخبار	لاہور	۱۸۶۷ء
۱۴۱	راجپوتانہ گزٹ	؟	۱۸۶۹ء	۱۵۶	میسور اخبار *	میسور	۱۸۷۳ء	۱۷۱	اخبار انجمن پنجاب	لاہور	۱۸۷۴ء
۱۴۲	روہیلکھنڈ اخبار	مرادآباد	۱۸۶۹ء	۱۵۷	مخزن الفواید *	حیدرآباد	۱۸۷۳ء	۱۷۲	ذخیرہ بال گوبند	آگرہ	۱۸۷۲ء

آئندہ اشاعتوں میں انشاء اللہ ان میں سے بعض اخبارات اور رسائل کے متعلق مزید تفصیلات پیش کی جائیں گی اور اُن کے مباحث وطرزِ بیاں کے نمونے دیکر اُردو صحافت کی تدریجی ترقی پر روشنی ڈالی جائیگی۔

محمد ابواللیث صدیقی بدایونی لکچرار شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

باتیں کریں

سید ظہیر الدین حیدر

چشم سحر آمیز کی باتیں کریں — ساغرِ لبریز کی باتیں کریں
مشک سے وارفتہ گیسو کو کیا — زُلفِ عنبر بیز کی باتیں کریں
دل سے جو گذرے جگر کے پار ہو — اُس نگاہِ تیز کی باتیں کریں
چاہتا ہے پھر دلِ ایذا طلب — دردِ غم انگیز کی باتیں کریں

آج پی کر ہم مئے کہنہ ظہیر
پھر کسی نوخیز کی باتیں کریں

سوز و ساز

جذبِ اُلفت کے یہ آثار نمایاں کیوں ہیں
آپ خاکم بدہن آج پریشاں کیوں ہیں

کیا اسی راہ سے گذرے گی سواری اُن کی
داغِ دل شمع کی مانند فروزاں کیوں ہیں

فصلِ گلشن کا تعلق تو ہے دیوانوں سے
میں یہ کہتا ہوں کہ گل چاک گریباں کیوں ہیں

مجھ کو ڈر ہے کہیں رحمت نہ پشیماں ہو جائے
لوگ اس درجہ گنہ ہوں پہ پشیمان کیوں ہیں

عکس کو خود ہے ضرورت کسی آئینہ کی
آئینے پرتوِ انوار سے حیراں کیوں ہیں

جبکہ دنیا میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
آدمی راہِ محبت سے گریزاں کیوں ہیں

وہ چلے بھی گئے پھولوں کی جوانی بن کر
اُن کے دیوانوں کے ہاتھوں میں گریباں کیوں ہیں

آپ کس فکر میں غلطاں ہیں جنابِ ماہر
کارواں جا بھی چکا آپ حُدی خواں کیوں ہیں

ماہر القادری

طلسمِ سومنات

عالمِ سوز و ساز میں کہنہ ہے بزمِ کائنات
دیر و حرم ہیں آجکل بتکدۂ تصورات

برقِ جمال نے دیا ہنس کے ثبوتِ زندگی
ابرِ بہار نے پڑھا رو کے صحیفۂ حیات

صبحِ ازل میں تیرا نور شامِ ابد میں تیری آب
عشق حضور و اضطراب حُسن فقط تجلیات

سدرہ ہے تیرا آشیاں جنت تری فلک بدوش
مُرغِ بلند بال تو تیری نظر میں شش جہات

توڑ بتانِ آذری پیرویٔ خلیل کر
آتے رہے ہیں انقلاب ہوتے رہے ہیں حادثات

جلوہ گہِ حجاز میں حُسنِ ایاز ہی نہ دیکھ
دیکھ جلالِ غزنوی توڑ طلسمِ سومنات

تیرے کرم سے بے گماں دونوں جہاں ہیں مستفیض
میں ہوں جمال کا کمال مبدۂ فیض تیری ذات

بن مرے تو ہی ناتمام میں ہوں ترے بغیر خام
تو ہے جو حُسنِ عینِ ذات میں بھی ہوں جلوۂ صفات

شانِ سکندری عیاں عزمِ قلندری نہاں
راز بہ راز ہیں ثمرؔ قلب و جگر کے واردات

عبد الکریم ثمر

خانہ بدوش

میکسیم گورکی کا ایک شاہکار

سمندر کی طرف سے سرد ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ سبزہ زار پر لہروں کی سرسراہٹ سے غمگین موسیقی طاری تھی، بے چین اور مضطرب لہریں کنارہ کی جھاڑیوں سے ٹکرا رہی تھیں، کبھی کبھی ہوا کے جھونکوں کیساتھ شدید سردی کی لہر بھی آجاتی اسی کے ساتھ ساتھ سوکھے ہوئے پتے بے ترتیبی سے اُڑ کر ہمارے الاؤ میں آگرتے اور تاریکی میں ایک چمک پیدا ہوجاتی، کبھی کبھی بائیں طرف وسیع میدان کی شادابی اپنی جھلک دکھا دیتی، اور دائیں طرف بحر ناپیدا کنار ٹھاٹیں مارتا ہوا نظر آنے لگتا۔

میرے قریب ہی ایک بڈھا خانہ بدوش میکار چُدرا بیٹھا ہوا اپنے کیمپ کے گھوڑوں کو دیکھ رہا تھا، یہ کیمپ ہم سے کوئی پچاس ساٹھ گز کے فاصلہ پر نصب تھا اسے سرد ہوا کے تھپیڑوں کی ذرا بھی پروانہ تھی وہ نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ نردکش تھا، ہوا سے اُس کے کوٹ کا کالر کھُل گیا تھا۔ بالوں دار سینہ صاف نظر آرہا تھا ——— اُس کے کھُلے ہوئے سینہ پر ہوا لوٹ رہی تھی

اس نے بے رحمی اور ایک شانِ استغنا کے ساتھ میری طرف دیکھا اور لمبے پائپ سے دھوئیں کے بادل اُڑانے لگا ——— اُس کے منہ اور ناک سے دھواں نکل رہا تھا جیسے کسی کارخانہ کی چمنی کا دہانہ کھُل گیا ہو! اس اندھیرے میدان میں اُس نے میرے چہرے پر اپنی نظریں جمادیں اور ہوا کی ستمرانی کو تغافل شعاری سے جواب دیتے ہوئے اُس نے مجھ سے بات چیت شروع کردی،

"اچھا! تم بھی صحرا نوردی کررہے ہو؟ بہت خوب! شاد باز! تم نے بہت اچھا رستہ اختیار کیا ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے، خوب گھومو اور خوب سیر کرو جب سب کچھ دیکھ چکو ——— طبیعت سیر ہوجائے تو لیٹ جاؤ اور ہمیشہ کے لئے جس محفل سے آئے تھے اُسی محفل میں چلے جاؤ!"

"زندگی ——— دوسرے لوگ؟" میرے فوری جواب کو مشتبہ انداز سے سُنکر اُس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "آدل! تم اس سے کیا کام لوگے؟ کیا تم بذاتِ خود زندگی نہیں ہو؟ دوسرے لوگ تمہارے بغیر رہ جاتے ہیں ——— اور تمہارے بغیر ہی زندگی گذار دیتے ہیں، کیا تم سمجھتے ہو کہ تم کسی کے کام آؤگے؟ نہ تو تم روٹی ہو اور نہ ایندھن ——— پھر کسی شخص کو تمہاری ضرورت نہیں، سیکھنے اور سکھانے کے لئے تم کہتے ہو؟ کیا تم یہ بتلاسکتے ہو کہ مسرت کا راز کیا ہے ———؟ تم لوگوں کو مسرور بنا سکتے ہو؟ ——— نہیں تم ایسا نہیں کرسکتے! پہلے سنجیدہ بنو، بڑھاپے کے تجربات حاصل کرو اور پھر یہ بتاؤ کہ یہ جاننا ضروری ہے! اور سکھاؤگے بھی کیا؟ ہر شخص اپنی ضرورتوں کو جانتا ہے، جو عقلمند ہیں وہ پالیتے ہیں اور جو بیوقوف ہیں وہ کچھ نہیں پاسکتے اور ہر شخص اپنے آپ کو خوب جانتا ہے! تمہارے لوگ بہت تیز ہیں وہ گروہوں میں تقسیم ہوگئے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنے پاؤں تلے روندھنا چاہتے ہیں جہاں یہ ہورہا ہے وہاں یہ بھی تو دیکھو کہ زمین پر کس قدر جگہ ہے؟"

اُس نے وسیع سبزہ زار کی طرف اشارہ کیا "وہ ہمیشہ کام کرتے رہتے ہیں کس کے لئے؟ کوئی نہیں جانتا ایک شخص کھیت جوتتا ہے، اپنی قوت وطاقت ضائع کرتا ہے، زمین پر ہل چلاتے چلاتے اُس کی پیشانی پر پسینہ آنے لگتا ہے ——— آخر وہ تھک کر چور چور ہوجائیگا۔ اور مرجائیگا ——— پھر اُس کا کوئی وجود نہیں رہیگا، اس کے بعد دُنیا میں کچھ نہیں بچے گا ——— وہ اپنے کھیت کی کوئی چیز نہیں دیکھ سکے گا وہ اس طرح چلا جائیگا جیسے وہ بیوقوف پیدا ہوا تھا اور پھر یہاں سے چُپ چاپ چلا جانا اس کا مقصد تھا اور اپنی قبر کھودنے سے قبل ہی وہ جانے کے لئے آیا تھا؟ کیا سمندر کی لہروں کی موسیقی اُس کا دل خوش کرسکتی ہے؟ آہ! وہ زندگی بھر غلام بنا رہتا ہے ——— اسی کو وہ سب کچھ سمجھتا ہے!

"میری طرف دیکھو! ۵۸ سال کی عمر میں اس قدر گھوما ہوں، اور اتنے مقامات دیکھے ہیں کہ تم لوگ ایک ہی چیز کو گھنے بیٹھو تو ایک فرد کا رہو۔

اچھا مجھے بتاؤ میں کہاں نہیں گیا؟ تم نہیں بتا سکتے میں نے بعض ایسے مقامات دیکھے ہیں جنکے متعلق تم نے کچھ سُنا تک نہ ہوگا، یہ ہے طرزِ زندگی! اس طرح رہنا چاہتے جہاں گردی کرو —— خوب پھرو —— ایک مقام پر زیادہ عرصہ تک نہ ٹھہرو، سمجھے اس بات کو؟ جس طرح دن رات دُنیا کے گرد ہمیشہ ایک دوسرے کا پیچھا کرتے رہتے ہیں اسی طرح زندگی کے متعلق تخیلات سے بھاگتے رہو تا کہ تمھیں کہیں زندگی سے نفرت نہ ہوجائے اگر تم اس میں مستغرق ہوگئے اور غور و فکر کرنے لگے تو پھر زندگی سے محبت نہ رہے گی اور یہ سچ ہے —— ایسا ایک حادثہ میرے ساتھ پیش آچکا ہے، شاہ باز! یہی راستہ ہے!

"میں گلے جن میں قید تھا —— میں دنیا میں کیوں رہتا ہوں؟ جیل میں قید و بند کی مشکلات سے اکتا کر اکثر یہ سوچا کرتا تھا، آہ کس قدر سخت اور کٹھن دن تھے! میں نے کھڑکی سے باہر کھیت کی طرف دیکھا تو دل پر ایک چوٹ سی لگی —— جیسے کسی لوہار کے چمٹے نے میرے دل کو کھینچ لیا ہو، کون کہہ سکتا ہے پہلے وہ کہاں تھا؟ میرے شاہ باز! کوئی نہیں بتا سکتا اس کے متعلق" تمھیں سوال کرنے کی ضرورت نہیں —— زندہ رہو یہی سب کچھ ہے، گھومتے پھرو، اپنے اوپر نظر رکھو —— اس وقت رنج و الم تمھیں کبھی نہیں پکڑ سکیں گے ——"

اُس نے جلتی ہوئی آگ سے ہاتھ تاپے اور اپنے پائپ کو بھر کر لیٹ گیا ہوا اور تیزی سے چیخ رہی تھی، گھوڑے اندھیرے میں ہنہنا رہے تھے اور کیمپ کی طرف سے درد بھرے اور اثر انگیز گانے کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی، میکار کی خوبصورت لڑکی نونکا گارہی تھی، میں اس کی آواز سے اچھی طرح واقف تھا، اُسکے گانے میں بےچینی اور اضطراب کی جھلک موجود تھی، اُسکا چہرہ ایک مغرور ملکہ سے مشابہ تھا، اسکی آنکھوں میں بیقراری اور تعشق کارفرما تھا، وہ اپنے حُسن پر نازاں بھی تھی اور متکبر بھی! وہ ہر شے سے استغنا برتتی تھی۔

میکار نے پائپ کے کش دیتے ہوئے کہا "سنو! کیا لڑکی اچھا گاتی ہے؟ ہاں وہ اچھا گاتی ہے —— کیا تم اسی لڑکی سے محبت کرنا پسند کروگے؟ نہیں؟ اچھا یہ ٹھیک ہے، لڑکیوں پر کبھی بھروسہ نہ کرنا اور ان سے دُور ہی رہنا —— لڑکی کے نزدیک پیار کرنا، میری پائپ نوشی سے بھی زیادہ خوشگوار ہے —— لیکن جب تم نے اس کو پیار کرلیا تو پھر سمجھ لو دل میں جذباتِ آزادی مردہ ہوجائیں گے —— وہ تم کو اپنی غیر مرئی زنجیروں میں باندھے گی اور تم انھیں کاٹ بھی نہ سکوگے —— تم اسے اپنی روح دیدوگے اور صرف تمہارے لئے "آرام" رہ جائیگا، یہ سچ ہے لڑکیوں کے تیرِ نیم کش سے ذرا بچتے رہنا وہ سراب آگیں راگ الاپتی ہیں۔

"میں تم سے محبت کرتی ہوں" وہ کہتی ہے دُنیا میں سب سے زیادہ تمھیں چاہتی ہوں"۔ تم نے اگر ذرا پن چھودی تو پھر تمہارے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈے گی، میں خوب جانتا ہوں، میں اچھی طرح واقف ہوں، اچھا شاہ باز! کیا تم ایک سچا واقعہ سنوگے۔ اسے خوب توجہ سے سُننا، اگر تم نے اسے یاد رکھا تو عمر بھر "آزاد پرند" رہوگے........

ٹوکو جبار ایک خانہ بدوش تھا، اسے سب جبار کہتے تھے۔ تمام ہنگری بوہیمیا، سلوانیا میں اور ساحل کے آس پاس وہ ایک دلیر اور جانباز جہاں گرد مشہور تھا۔ قرب و جوار کا کوئی گاؤں ایسا نہ تھا جہاں کے چند ایک آدمیوں نے اسے مار ڈالنے کی قسم نہ کھائی ہو —— مگر وہ زندہ تھا،

اگر جبار کو کوئی گھوڑا پسند آجاتا تو وہ اس پر بیٹھکر چکر کاٹتا، خواہ اُس کی حفاظت پوری ایک رجمنٹ ہی کیوں نہ کرتی —— آہ! وہ کسی سے نہیں ڈرتا تھا! اگر شیطان بھی آتا تو جبار اس سے لڑنے کے لئے تیار ہوجاتا اور اگر چاقو سے نہیں مار سکتا تو ٹھوکریں ضرور رسید کرتا، یہ میں بالکل سچ کہتا ہوں! —— خانہ بدوشوں کے تمام خیمے اس سے واقف تھے وہ گھوڑوں سے بلے انتہا محبت کرتا تھا، لیکن ان سے بھی زیادہ عرصہ تک محبت نہ کرسکتا تھا وہ ایک گھوڑے پر سواری کرتا اور پھر چند روز بعد اُس کو فروخت کردیتا، اگر کوئی روپیہ مانگتا تو بلا تکلف دیدیتا، اُس کے نزدیک کوئی شے مقدس نہیں تھی۔ اگر تم اس کا دل مانگو تو وہ اسی وقت سینہ چیر کر دیدیتا —— سمجھے میرے شاہ باز! اس قماش کا آدمی تھا وہ!

اس وقت ہمارا قافلہ بکووینا میں گھوم رہا تھا —— یہ کوئی اب سے دس سال پہلے کی بات ہے۔ موسم بہار کی ایک رات کو ——

مجھے اچھی طرح یاد ہے ——— ، ہم بیٹھے ہوئے تھے ——— میں تھا اور ونیلا
سپاہی جس نے کوستھ سے مقابلہ کیا تھا اور بوڑھا تور ،

دنیلا کی لڑکی رادھا بھی بیٹھی ہوئی تھی اور کئی اور لوگ بھی بیٹھے تھے ،
——— " تم میری ننکا کو جانتے ہو ، وہ کیسی " ملکہ نما لڑکی " ہے ! اچھا تم رادھا کا
اس سے مقابلہ نہیں کرسکتے ، ننکا اس قابل کہاں ؟ تم رادھا کے حسن کو الفاظ میں بھی
بیان نہیں کرسکتے ، شاید اُس کا حسن آئلن کی تانوں پر ہی جلوہ دکھا سکتا ہو ———
وہ بھی اس حالت میں کہ بجانے والا ——— وائلن کو اپنی روح سمجھتا ہو !

بہت سے بہادر دل اور جواں مردوں کے وہ دل توڑ چکی تھی مورادے
میں ایک امیر کبیر آدمی نے اُسے دیکھ لیا ، بس پھر کیا تھا دیوانہ ہو گیا ' ——— وہ اپنے
گھوڑے پر بیٹھکر ——— بخار کی شدت سے کانپتا ہوا ——— اس کے
پیچھے پیچھے گھر تک چلا آیا ' ——— وہ ایسا لال بھبھوکا معلوم ہو رہا تھا جیسے
شیطان ہو !

اُس کا کوٹ سونے سے سجا ہوا تھا اور ایک طرف شمشیر آبدار بجلی کی
طرح چمک رہی تھی ، جب گھوڑا قدم اُٹھاتا تو اُس کی تلوار عجب انداز سے لہراتی
اور اُس کی نیلی ٹوپی ——— آسمان کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتی ، وہ بہت مشہور
آدمی تھا ، وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا چلا جا رہا تھا ——— آخر کار اس سے
نہ رہا گیا تو چلا اُٹھا " رادھا مجھے ایک بار پیار کر لو ! میں تمھیں روپیوں کی
ایک تھیلی دونگا ! '

——— وہ ایک طرف مڑ گئی ——— '

" مجھے معاف کرنا ، اگر تمہاری کوئی ہتک ہوئی ہو ! آہ ایک نظر ادھر بھی !
بڈھے نے زر و جواہر سے بھری ہوئی ایک تھیلی اسکے قدموں میں گرا دی '
——— عزیزمن وہ ایک بڑی تھیلی تھی رادھا نے اُس کو
ایک ٹھوکر مار کر کیچڑ میں پھینک دیا ، آہ ! کتنی اچھی لڑکی ہے " اُس نے سرد آہ
بھر کر کہا اور گھوڑے کے چابک مار کر رفوچکر ہو گیا ' ——— صرف گرد و
غبار کا بادل اُڑتا ہوا رہ گیا ، دوسرے دن وہ پھر آیا ۔
" اس لڑکی کا باپ کون ہے ؟ " اُس نے کیمپ میں گرجکر کہا ،
ونیلا باہر نکل آیا ——— '

" اپنی لڑکی کو میرے حوالے کردو ——— جتنا چاہو روپیہ لیلو ——— !
ونیلا نے اس کا جواب دیا " آپ ہی جیسے شریف اپنی ہر شے ———
موٹر سے لیکر ضمیر تک بیچتے ہیں ' ——— میں کوستھ سے لڑ چکا ہوں '
——— مجھے کوئی پروا نہیں '

" بڈھا امیر آگ بگولا ہو گیا اور اپنی تلوار پہ ہاتھ ڈالا ، اگر ہم میں سے
کسی نے اسکے گھوڑے کے کان پہ ایک چنگاری رکھدی جس سے گھوڑا
تلملاتا ہوا ——— معہ اپنے سوار کے بھاگ گیا ۔

ہم فوراً وہاں سے روانہ ہو گئے ہم لوگ ایک ہی دن چلے ہونگے کہ
اُس نے پھر آلیا ——— !

" سنو تم " اُس نے کہا " میرا ضمیر بالکل پاک ہے ، اس لڑکی سے
میری شادی کردو ——— میں اس کے بدلہ میں تمھیں بہت کچھ دونگا '
جو کچھ تم مانگوگے ، میں بہت مالدار ہوں '

وہ جھلس رہا تھا اور ہوا میں اُڑتے ہوئے پر کی طرح گھوڑے پر کانپ
رہا تھا ' ——— ہم ذرا سنجیدہ ہو گئے ۔

" اچھا میری بیٹی بولو ——— ؟ " ونیلا نے چپکے سے کہا " اگر ایک
عقاب کا بچہ اپنی مرضی سے جنگلی کوے کے گھونسلے میں چلا جائے تو اُس کا
کیا ہوگا ؟ " رادھا نے ہم سے پوچھا ۔ ونیلا نے قہقہہ لگایا اور ہم نے بھی
اُس کا ساتھ دیا '

شاباش بیٹی ! سُنا آپ نے جناب ؟
کبوتروں پر ڈورے ڈالئے ، وہ زیادہ فرمانبردار ہوتے ہیں
——— یہ کہکر ونیلا چلا گیا '

بڈھے امیر نے اپنی ٹوپی اُٹھائی اور زمین پر دے ماری اور اتنی
تیزی سے گھوڑے کو دوڑایا کہ زمین لرز گئی ——— !
——— ایسی تھی رادھا میرے شاہ باز ——— سُنا تم نے
——— ہاں تو ایک رات ہم بیٹھے ہوئے دُور سے گانے کی آواز
سُن رہے تھے ——— یہ نغمہ سارے سبزہ زار پر چھایا ہوا تھا ، بڑا
دلکش و دل آویز گانا تھا ، ہماری رگوں میں تیزی سے خون دوڑنے لگا

اور اس مسحور کن نغمہ نے ہمیں کسی اور ہی دُنیا میں پہونچا دیا۔ ہم نے محسوس کیا کہ یہ نغمہ کسی اور ہی طرف بُلا رہا ہے۔ اب زندہ رہنا محال ہے، زندگی کی کوئی ضرورت نہیں ——— اگر رہنا ہی ہے تو دُنیا کے بادشاہوں کی طرح ——— ایسا مست و بیخود کرنے والا نغمہ تھا، شاہ باز! گانے کی آواز قریب قریب تر ہوتی جا رہی تھی جلد ہی اندھیرے میں ہم نے پہچان لیا کہ کوئی گھوڑے پر بیٹھا یہ دردبھرا گیت گا رہا ہے، وہ ہماری طرف بڑھا اور لکڑیوں کے الاؤ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اُس نے ساز بجانا ختم کر دیا اور ہماری طرف دیکھکر مسکرانے لگا۔

"ارے جبار تم! دنیلا نے چیخ کر کہا" لوٹکو جبار ہو تم ———"

اُس کی مونچھیں شانوں تک پہونچی ہوئی تھیں جہاں وہ اس کے بالوں کی لٹوں سے جا ملی تھیں، اُس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں اور اُس کا پُر رعب چہرہ بخدا سورج کی طرح دمک رہا تھا، وہ اپنے گھوڑے پر آگ کی طرح سُرخ روشنی میں فولادی انسان معلوم ہو رہا تھا ——— مسکراہٹ کی وجہ سے اُس کے دانت موتی کی طرح چمک رہے تھے، مجھے اس کی صورت سے ایک خاص اُنس ہو گیا، قبل اسکے کہ وہ مجھے دیکھے یا مجھ سے بات چیت کرے میرے دل میں اس کے لئے جگہ پیدا ہو چکی تھی، جانتے ہو شاہ باز ——— دُنیا میں کیسے کیسے آدمی ہیں ——— وہ تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر تمہاری روح کو قید کر سکتا تھا اور تم بھی اس میں جھجک محسوس نہیں کر سکتے، بلکہ تم فخر کا اظہار کروگے، تم ایسے آدمی سے ملکر خود بہتر ہو جاؤگے ———

دنیا میں ایسے چند ہی آدمی ہیں میرے دوست! اور یہ بھی اچھا ہے کہ اُنکی تعداد کم ہے اگر دنیا میں اچھائی زیادہ ہوتی تو پھر اچھے اور بُرے میں کس طرح تمیز ہوتی، یہی ٹھیک اصول ہے ——— اچھا سنو رادھا نے اُس سے کہا "لوٹکو! تم خوب بجاتے ہو ——— اس قدر شیریں آواز اور نازک وائلن کس نے تمہارے لئے بنایا ہے؟

اُس نے ہنستے ہوئے کہا "میں نے بنایا ہے، اس میں جو تار ہیں وہ میں نے ایک لڑکی کے دل سے نکالے ہیں، جس سے میں محبت کرتا تھا۔ وائلن ابھی تک قدرے بے وفا ہے ——— لیکن میں اُس کو ٹھیک کر لیتا ہوں! بھیں! لاریب ایک نوجوان، لڑکی کی نظر میں کھپ جانے کی ضرورکوشش کرے۔ اور جب وہ ناکام رہے تو پھر دل کی دُنیا میں تغیر ضرور ہو جاتا ہے ——— یہی لوٹکو کے ساتھ ہوا ——— وہ اس لڑکی کی نظر میں نہیں جچا، رادھا ایک طرف مڑ گئی، اور جمائی لیتے ہوئے کہا "لوگوں نے کہا تھا کہ جبار عقلمند اور ہوشیار ہے مگر اب معلوم ہوا کہ وہ جھوٹ بولتے تھے؟" یہ کہکر وہ چلی گئی۔

"حسین تیتری تمہارے پر بہت تیز ہیں؟"
لوٹکو نے گھوڑے سے اُترتے ہوئے کہا۔

"بھائیو! آداب بجالاتا ہوں، میں تمہارے پاس آیا ہوں؟"

"اے عقاب ہم اپنے مہمان کا خیر مقدم کرتے ہیں؟" دنیلا نے کہا۔ اس جگہ ہم ایک عرصہ تک رہے، حالات حسبِ معمول تھے۔ جبار ہمارے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا ——— وہ بہت مخلص اور رفیق تھا، وہ ایک بڈھے کی طرح تجربہ کار تھا، وہ ہر چیز کو جانتا تھا۔ وہ روسی اور ہنگروی زبان بھی لکھنا جانتا تھا۔ بعض اوقات وہ باتیں کیا کرتا تھا، میں اُس کی باتیں سُنا کرتا تھا ——— اور مجھے اُس کی باتوں میں نیند تک کی پروا نہ ہوتی تھی، باتیں کرتے کرتے وہ وائلن بجانے لگتا ——— شاید اتنا اچھا دُنیا میں کوئی نہیں بجا سکتا تھا ——— اگر میں جُھوٹ بولوں تو مجھ پر بجلی گر پڑے! جس وقت وہ تاروں پر کمان چلاتا تو دل لرزنے لگتا ——— جیسے ہی وہ وائلن پر کمان کو اوپر سے نیچے لاتا تو سننے والے کے دل میں ہوک سی اُٹھتی، وہ وائلن بجاتا تھا اور مسکراتا تھا، ایک ہی وقت میں رونے اور ہنسنے کا سماں پیدا ہو جاتا جب وہ گانا شروع کرتا تو فضا میں نغمے اُبلنے لگتے پھر ایسا معلوم ہوتا کہ وائلن کے تاروں پر جیسے کوئی رو رہا ہے اور التدعا کر رہا ہے ——— اور تمہارے دل کی جانتے ہو کیا حالت ہوتی ——— جیسے دل میں کوئی چھری گھونپ رہا ہو، کبھی یہ محسوس ہوتا کہ سبزہ زار آسمان کو پریوں کی کہانی سُنا رہا ہے ——— میٹھی اور دردبھری کہانی ——— پھر یہ منظر دکھائی دینے لگتا کہ ایک لڑکی اپنے جُدا ہونے والے محبوب سے التجا کر رہی ہے اور آنکھوں سے اشکوں کی لڑی جاری ہے!

اور پل کے پل میں معلوم ہونے لگتا کہ اُس کا محبوب لڑکی کو ———

ملاقات کے لئے سبزہ زار پر بلا رہا ہے۔ پھر اچانک ——— آہ! دلکش نغمہ ——— بجلی کی چمک کی طرح سُنائی دینے لگتا ——— اور ایسا معلوم ہوتا ——— کہ نغمہ کی دلکشی پر آفتاب رقص کرنا شروع کر دیگا۔

موسیقی رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی اور سننے والا اُس کا غلام بن جاتا اگر اس وقت لوٹکو جبار چلا اُٹھتا کہ "دوستو! چھریاں نکال لو" تو ہم فوراً اپنی چھریاں نکال لیتے اور جس کی طرف بھی وہ اشارہ کرتا ہم اس پر ٹوٹ پڑتے ——— وہ ہر شخص کے ساتھ بھلائی کا خواہاں تھا، اس لئے سب لوگ اس سے محبت کرتے تھے بلکہ اس پر اپنی جان نثار کرنے کے لئے تُلے رہتے تھے البتہ صرف راآدھا اُس کی طرف نظر نہیں کرتی تھی ——— وہ اکثر اُس کا مذاق اُڑایا کرتی تھی، بعض وقت وہ اس کو اپنی طراری، شوخی اور حُسن سے بیخود کر دیتی اور وہ دانت پیس کر رہ جاتا، اپنی مونچھوں کو بل دینے لگتا ——— اور اُس کی سیاہ آنکھوں میں کبھی کبھی خوفناک چمک پیدا ہو جاتی ——— جسے دیکھکر ہر شخص کانپ جاتا، لوٹکو اکثر راتوں کو سبزہ زار میں ——— دُور ایک طرف چلا جاتا اور رات بھر اُس کا دائلن اشکباری کرتا رہتا ——— جیسے اُس کی آزادی سلب ہوئی جا رہی ہو، ہم لیٹے لیٹے سُنا کرتے اور سوچا کرتے کہ اب کیا ہونے والا ہے، ہمیں خوب معلوم تھا کہ جب دو چٹانیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں تو اُن کے درمیان میں نہیں آنا چاہئے ورنہ وہ ہمیں بھی کچل ڈالیں گی۔

ایک دن ہم جمع ہو کر رفتار حالات پر بحث کر رہے تھے، موضوع بحث تلخ تر ہوتا جا رہا تھا کہ دنیلا نے لوٹکو سے کہا۔

"جبار کوئی دعد آفریں نغمہ چھیڑو! جو روح کو تڑپا دے ———"

جبار نے راآدھا پر ایک نظر ڈالی جو ذرا فاصلہ پر بیٹھی ہوئی آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی، ——— دردانگیز نغمہ چھڑا ——— دائلن اس طرح بج رہا تھا جیسے کسی دوشیزہ کا دل دھڑک رہا ہو ———؟

لوٹکو نے گانا شروع کیا

"آہ! ——— آہا ——— میرے دل میں آگ لگی ہوئی ہے

——— سبزہ زار وسیع ہے ہوا کی طرح میرا گھوڑا تیز رفتار ہے۔ اور میرا ہاتھ قوی ہے:

راآدھا نے سر ہلایا اور گانے والے کی طرف دیکھکر مسکرائی۔

وہ لہرایا جیسے پَو پھٹتی ہو ———،

"آہا ——— آہا! میرے دوستو آؤ ——— ہم دوڑ جائیں؟

——— سبزہ زار پر تاریکی چھا رہی ہے اور دیکھو طلوعِ آفتاب کی پہلی کرن ہمارا انتظار کر رہی ہے۔

——— ہمیں دن سے ملنے کے لئے اڑ چلنا چاہئے ——— چلے چلو

——— قدم بڑھائے ہوئے مگر دیکھو ——— کہیں نقرئی چاند سے گھوڑے کے نعل نہ ٹکرا جائیں؟"

——— آہا وہ کتنا اچھا گا رہا ہے کسی نے ایسا ولولہ خیز گیت نہیں گایا۔

مگر راآدھا نے کہا "جیسے پانی برس رہا ہو ——— یہ کوئی گانا ہے تم اتنے اونچے نہیں اڑ سکوگے لوٹکو! گر پڑوگے ——— سُنا تم نے منہ کے بل زمین پر آ رہوگے، اور تمہاری شاندار مونچھیں گرد آلود ہو جائیں گی"

لوٹکو نے اُس کی طرف ایک درندہ کی طرح دیکھا مگر کہا کچھ نہیں ———

جانباز لوٹکو نے پھر گانا شروع کیا:-

"جلد ہی وہ دن آئیگا ——— ہم سو رہے ہیں ———

——— اس وقت تم اور میں آتشِ شرم سے جل جائیں گے"

"کیا کہنا ہے ——— بھئی کمال کر دیا ——— یہ تمہارا ہی حصہ ہے ——— دنیلا نے کہا" اس سے پہلے میں نے کبھی ایسا گیت نہیں سُنا اگر میں جھوٹ بولوں تو شیطان میرے کان کاٹے ——— "

بوڑھے نور نے اپنی مونچھوں پر بل دیا اور شانوں کو مٹکایا ———،

ہم سب جبار کے گانے سے بے انتہا متاثر تھے۔

"ایک دن ایک مچھر بھی اسی طرح عقاب کی آواز میں بھنبھنایا تھا" راآدھا نے کہا جیسے وہ اُس کی بیحد توہین کر رہی ہو۔

"شاید راآدھا تم سزا چاہتی ہو؟" دنیلا نے اُسکی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

جبار تلملا رہا تھا، اُس نے اپنی ٹوپی زمین پر دے ماری اور کہا، "دنیلا اسے سمجھاؤ! وحشی گھوڑے کے لئے فولادی لگام کی ضرورت ہے"

تم تو اپنی لڑکی کو میری زوجیت میں دیدو!"

دنیلا مسکرایا اور کہا "اگر تمہاری یہی آرزو ہے اور تم لیجا سکتے ہو تو مجھے اس میں کوئی تامل نہیں ہے۔

"بہت اچھا" لوٹکو نے کہا اور راآدھا کی طرف مخاطب ہوا۔

"سنو لڑکی زیادہ مغرور نہ ہو! میں نے سینکڑوں لڑکیاں دیکھی ہیں، مگر کسی نے بھی میرے دل پہ اثر نہیں ڈالا لیکن تم نے میرے دل کو اُچک لیا ہے، آہ! راآدھا! تم نے میری روح کو قید کر لیا ہے، لیکن اب کیا ہوگا؟ کوئی ایسا گھوڑا بھی نہیں ہے کہ میں تنہا بھاگ سکوں۔ میں تمہیں اپنی بیوی بنا کر، خدا کے سامنے اپنی عظمت کے سامنے، تمہارے باپ کے سامنے اور ان سب آدمیوں کی موجودگی میں ۔۔۔۔ لے جاؤں گا۔ مگر دیکھو اس سے میری آزادی پر ضرب نہیں پڑے گی، میں آزاد رہونگا جس طرح میرا دل چاہے گا!"

وہ راآدھا کے پاس پہونچا، اُس نے زور سے دانت پیسے۔ اُسکی آنکھیں چمک رہی تھیں ۔۔۔۔ ہم دیکھ رہے تھے ۔۔۔۔ اُس نے اپنا ہاتھ کس طرح راآدھا کی طرف بڑھایا ہم نے خیال کیا کہ سبزہ زار کے گھوڑے پر راآدھا کاٹھی رکھدیگی ۔۔۔۔،

۔۔۔۔ اچانک ہم نے دیکھا کہ جبار ہاتھ بڑھاتے ہی زمین پر اوندھے منہ گر پڑا،

"ارے یہ کیا ہوا" ۔۔۔۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ نوجوان کے دل پہ گولی آکر لگی ہو ۔۔۔۔،

راآدھا نے جبار کے پاؤں کو کوڑا مار کر کھینچ لیا تھا ۔۔۔۔ اور اسی وجہ سے وہ گر پڑا ۔۔۔۔!

لڑکی بھی فوراً ہی چُپ چاپ، بے حس و حرکت زمین پر، مسکراتی ہوئی لیٹ گئی، ہم حیران تھے کہ اب کیا ہوگا؟ لوٹکو زمین پر بیٹھا اپنا سر کھجا رہا تھا وہ خاموشی سے کھڑا ہوا اور کسی کو دیکھے بغیر سبزہ زار پر ۔۔۔۔ دُور چلا گیا۔

نور نے مجھ سے کہا "ذرا اس کو دیکھو"!

میں رات کی تاریکی میں جبار کے پیچھے، دبے پاؤں ہو لیا، مجھے شاہ باز یہ بھی ایک تماشا تھا!"

میکار نے اپنے پائپ سے راکھ پھینکی اور اُسے پھر بھرا، میں نے اپنا گرم کوٹ اچھی طرح لپیٹ لیا اور لیٹے لیٹے اُس کے سیاہ جھرّیوں دار چہرہ کو دیکھنے لگا، اُس نے اپنا سر ہلایا اور آہستہ سے کچھ بڑبڑایا، اس کی گھنی بھوری مونچھیں ہل رہی تھیں اور ہوا میں بال لہرا رہے تھے، ۔۔۔۔ وہ بالکل پُرانے شاہ بلوط کے مانند تھا جس پر بجلی گر پڑی ہو اور پھر بھی طاقت پر نازاں ہو،

کنارہ پر سمندر پہلے کی طرح سرگوشیاں کر رہا تھا۔ شوخ ہوا لہروں کے راز و نیاز، ساحل سے اُڑا کر سبزہ زار میں پہونچا رہی تھی۔

ننکا نے گانا بند کر دیا تھا، آسمان پر سیاہ بادل گھر آئے تھے اور موسم خزاں کی رات اُداس اور بے کیف سی ہو گئی تھی۔

"لوٹکو آہستہ خرامی کیساتھ چلا جا رہا تھا" میکار نے سلسلہ داستان جاری رکھتے ہوئے کہا "اس کا سر ایک طرف جُھکا ہوا تھا۔ اور شانے کوڑوں کی طرح ہل رہے تھے جب وہ وادی میں چشمہ کے پاس پہونچا تو ایک چٹان پر دھم سے جا گرا اور ایک طویل سرد آہ بھری، میرا دل پگھلنے لگا ۔۔۔۔ مگر میں اُس کے پاس نہیں جا سکتا تھا تم مصیبت میں ایک لفظ سے کسی کی مدد نہیں کر سکتے، کیا ایسا نہیں ہے؟ وہ بیٹھا رہا، ایک گھنٹہ گذر گیا ۔۔۔۔ دو ۔۔۔۔ تین ۔۔۔۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا ۔۔۔۔ میں بھی ذرا اس سے دُور آڑ میں لیٹ گیا ۔۔۔۔ خسروِ انجم آسمان میں جلوہ گر تھا، تمام سبزہ زار روپہلی کرنوں سے چمک رہا تھا اور دُور، دور تک کے مناظر دکھائی دے رہے تھے؟

اچانک میں نے راآدھا کو کیمپ کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا، میں خوشی کے مارے پھولا نہیں سما رہا تھا، ساتھ ہی حیران بھی تھا۔ راآدھا کتنی اچھی لڑکی ہے میں نے خیال کیا، وہ جبار کے پاس پہونچ گئی لیکن جبار نے دیکھا نہیں ۔۔۔۔ اُس نے جبار کے شانوں پر ہاتھ رکھدیا ۔۔۔۔ لوٹکو لرز گیا، اُس نے اوپر سر اُٹھایا ۔۔۔۔ وہ اچھل پڑا، اور فوراً خنجر نکال لیا ۔۔۔۔ "آہ وہ لڑکی کو مار ڈالیگا" میں نے خیال کیا۔ میں کیمپ کی طرف آواز دیکر دونوں کی جانب دوڑنے ہی والا تھا کہ میں نے

رادھا کی آواز سنی۔

"خنجر پھینک دو! میں تمہارا سر توڑ ڈالوں گی" رادھا کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ جبار کی پیشانی کو نشانہ بنائے ہوئے تھی۔

کس قدر شیطان لڑکی ہے، میں نے خیال کیا خیر کچھ بھی ہو ——— دونوں برابر ہیں اب کیا ہوگا؟

"سنو" رادھا نے پستول کمر میں لگاتے ہوئے کہا "میں تمہیں مارنے نہیں آئی ہوں بلکہ تم سے صلح کرنا چاہتی ہوں ——— خنجر پھینک دو ——— !"

اُس نے خنجر پھینک دیا اور اُس کی نظروں میں نظریں ڈالدیں، یہ بڑا خوفناک منظر تھا دوست! دونوں ایک دوسرے کے مقابلہ میں وحشیوں کی طرح کھڑے تھے، دونوں بہادر تھے اور نڈر لیکن! صرف روشن چندا اُن کو دیکھ رہا تھا یا میں!

"سنو لوٹکو میں تم سے محبت کرتی ہوں" رادھا نے کہا

لوٹکو نے صرف شانے ہلائے جیسے اُس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہوں ——— رادھا نے دوبارہ کہا "میں نے بہت سے بہادر دیکھے ہیں لیکن کوئی بھی تمہارا ثانی نہیں ہو سکا ——— تم خوبصورت بھی ہو، اگر میں ان پر ایک نگاہ غلط انداز بھی ڈالدیتی تو وہ اپنی مونچھیں صاف کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کرتے ——— اگر میں چاہتی تو وہ میرے قدموں میں سر رکھدیتے لیکن اس سے فائدہ؟ وہ تمہاری طرح بہادر نہیں تھے ——— دنیا میں خانہ بدوش بہت ہیں لیکن بہت کم لوٹکو! میں نے لوٹکو آج تک کسی سے محبت نہیں کی مگر تم سے مجھے محبت ہے اور پھر آزادی سے محبت کرتی ہوں! ——— میں آزادی کو لوٹکو تم سے زیادہ چاہتی ہوں، میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی جس طرح تم میرے بغیر نہیں رہ سکتے، میں چاہتی ہوں تم میرے بن جاؤ ——— مجسم میرے ہو جاؤ ——— سُنا تم نے؟"

جبار نے مسکرا کر کہا "میں سُن رہا ہوں تمہارے الفاظ مجھ کو مسرور بخش رہے ہیں، کہے جاؤ ——— میں سُن رہا ہوں!"

"لیکن لوٹکو ایک چیز اور ہے۔ تمہیں اب کوئی شے نہیں بدل سکتی، تم میرے ہی رہو گے۔ وقت ضائع نہ کرو۔ میری محبت اور میرے پیار تمہارے منتظر ہیں لوٹکو! میں تمہیں خوب پیار کروں گی ——— میرا لطف اور شیریں سلوک تمہاری وحشیانہ زندگی کو بدل دے گا، تمہارے وہ گیت بھی سبزہ زار پر سُنائی نہ دیں گے۔ جو بہادر خانہ بدوشوں کو خوش کیا کرتے ہیں! ——— تم میرے لئے ——— اپنی رادھا کیلئے محبت کے لطیف گیت گاؤ گے وقت ضائع نہ کرو، میں نے کہدیا ہے، اسکا مطلب یہ ہے کہ کل تم بحیثیت ایک پُرانے رفیق کے مطیع ہو جاؤ گے، پورے کیمپ کے سامنے تمہیں میرے قدموں پر جھکنا ہوگا، اس وقت تم میرے ہاتھ پر بوسہ دو گے اور پھر میں تمہاری بیوی ہونگی!"

شریر لڑکی چاہتی کیا ہے، ہم نے آج تک ایسا واقعہ نہیں سُنا، بہت عرصہ ہوا مونٹنگرو میں ایسا رواج تھا لیکن خانہ بدوشوں میں کبھی نہیں ——— توبہ! ——— ایک لڑکی ایسا برتاؤ چاہتی ہے ——— رواداری و مساوات! اچھا دوست! اس سے زیادہ مضحکہ خیز چیز اختراع کرنے کی کوشش کرو! تم ایک سال تک سر مارو گے تو بھی نہ گھڑ سکو گے!

لوٹکو ایک طرف کو دگیا اور سبزہ زار پر اس طرح چیخا جیسے دل کا زخم دُکھا ہو۔

رادھا نے اپنے شانے مٹکائے مگر کوئی حرکت نہیں کی،

"اچھا کل تک کے لئے خدا حافظ! جیسا میں نے بتایا ہے، اُمید ہے کل ویسا ہی کرو گے؟

"لوٹکو! سُن رہے ہو؟"

"میں نے سب کچھ سن لیا، ایسا ہی ہوگا!"

جبار نے آہستہ سے کہا، اُس نے لڑکی کیطرف ہاتھ بڑھائے مگر اُس نے دیکھا تک نہیں، وہ لڑکھڑا کر زمین پر آ رہا، جیسے ہوا سے کوئی درخت گر پڑے وہ ہنس رہا تھا اور قہقہہ لگا رہا تھا،

اس طرح مغرور رادھا بہادر نوجوان پر ڈورے ڈالنے میں کامیاب ہوگئی۔ یہ کون جانتا ہے کہ مصیبت میں کیا گذرتی ہے؟ کون اسے پسند کرے گا کہ غم سے بے نیاز شخص کا دل کڑھے؟ ذرا سوچو تو!

میں کیمپ میں واپس آگیا اور سب کو یہ ماجرا سُنایا، انھوں نے اُس پر غور کیا اور کہا ہمیں دیکھنا چاہئے کہ انجام کیا ہوتا ہے اب سنو کیا پیش آیا ——— ؟

دوسرے دن ہم سب الاؤ کے گرد بیٹھے تھے کہ لوٹکو آیا، وہ کچھ مشتعل سا نظر آرہا تھا، رات کی بےچینیاں نمایاں تھیں آنکھوں سے خمار ٹپک رہا تھا، اُس نے اپنی آنکھیں زمین پر جھکا دیں اور کہا "دوستو! ایک عرض ہے، کل رات جب میں نے اپنے دل کا جائزہ لیا تو اُس میں مجھے اپنی پہلی سی آزاد زندگی کی جھلک نظر نہ آئی اس جگہ صرف رادھا جلوہ گر تھی ——— یہاں حسین رادھا ملکۂ حُسن کی طرح مسکرا رہی تھی، وہ مجھ سے کہیں زیادہ آزادی کی دلدادہ ہے اور میں اس سے کہیں زیادہ آزادی پسند ہوں! میں نے رادھا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جیسا کہ اُس نے حکم دیا تھا، اب ہر شخص دیکھے گا کہ کس طرح اُس کے حُسن نے بہادر لوٹکو کو جیت لیا اب وہ میری بیوی بن جائے گی، مجھے پیار کرے گی اور مجھے چاہے گی، پھر میں تمہارے واسطے نہیں گایا کروں گا، پھر مجھے اپنی آزادی کی بھی پروا نہ رہے گی، کیوں رادھا ہے نا ٹھیک؟"

رادھا نے آہستہ سے سر ہلایا اور درشتی سے اپنے پاؤں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا، ہم نے نظریں جما دیں، مگر کچھ نہ دیکھ سکے، ہم حیران تھے کہ جبار لوٹکو کس طرح ایک لڑکی کے سامنے جھکے گا جبکہ وہ لڑکی رادھا تھی!

ہمیں شرم کے ساتھ افسوس بھی ہو رہا تھا، "ہاں" رادھا نے زور سے کہا "جلدی نہ کرو! ابھی وقت ہے تاہم تم تھک گئی ہو!" اُس نے یہ کہکر قہقہہ لگایا، اُس کا قہقہہ ایسا تھا جیسے چٹان سے چٹان ٹکرائی ہو!

"دوستو! یہ ہے سب معاملہ! اب رہ کیا گیا ہے؟ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا میری رادھا کا دل ایسا ہی مضبوط ہے جیسا کہ مجھے دکھایا گیا ہے میں ذرا اسکا امتحان کرنا چاہتا ہوں! معاف کرنا بھائیو!"

ار! ——— ابھی ہم یہ سمجھنے بھی نہ پائے تھے کہ جبار کیا کرنے والا ہے کہ رادھا زمین پر گرتی نظر آئی، جبار کا خنجر مع دستے کے رادھا کے سینہ میں پیوست ہو چکا تھا ہمیں کچھ سجھائی نہ دیتا تھا ——— جیسے اندھے ہوگئے ہوں ——— !

رادھا نے فوراً خنجر نکال کر پھینک دیا اور زخم کو اپنے سیاہ بالوں کی لٹ سے چھپاتے ہوئے صاف آواز میں کہا،

"خدا حافظ لوٹکو! میں جانتی تھی کہ تم ایسا ہی کروگے ——— میں رخصت ہو رہی ہوں......"

کہو دوست پہچانا لڑکی کو کس قماش کی تھی؟

"آہا! مغرور ملکہ! میں تیرے قدموں پر جھکوں گا!" لوٹکو نے چیخ کر کہا اور اپنے آپ کو زمین پر گرا کر ——— اپنے ہونٹوں کو جان بار "رادھا کے پاؤں سے لگا دیا، ہم سکتہ میں رہ گئے ——— !

تم ایسے واقعہ کے متعلق دوست! کیا کہہ سکتے ہو، تور یہ کہنے والا ہی تھا کہ ہمیں اُس کو پکڑ لینا چاہئے" ——— مگر ہمارے ہاتھ لوٹکو جبار کو نہیں پکڑ سکتے تھے ——— اس حقیقت سے تور واقف تھا ——— !

اُس نے اپنا ہاتھ ہلایا اور ایک طرف قدم بڑھائے، دنیلا نے وہ خنجر اُٹھایا جو رادھا نے اپنے سینہ سے نکال کر پھینکا تھا ——— وہ بڑی دیر تک اُس کو دیکھتا رہا، رادھا کا خون ابھی تیز خنجر پر خشک نہیں ہوا تھا دنیلا جبار کے پاس پہنچا اور وہ خنجر اُس کی بائیں پسلی میں گھونپ دیا،

"ٹھیک ہے!" لوٹکو نے دنیلا کی طرف مُڑ کر کہا اور رادھا کو لینے کے لئے بڑھا ہم دیکھ رہے تھے، رادھا پڑی ہوئی تھی زخم میں سیاہ بالوں کی لٹ دبی ہوئی تھی، اُس کی کھلی ہوئی آنکھیں آسمان پر جمی ہوئی تھیں اور اُسی کے قدموں میں بہادر لوٹکو جبار کی نعش پڑی تھی، جبار کے بڑے بڑے بال اُس کے چہرہ پر آگئے تھے، جس سے وہ چھپ گیا تھا! ہم خاموش ہکا بکا کھڑے تھے، دنیلا کی بھوری مونچھیں کانپ رہی تھیں اور ابرو پر بل پڑ رہے تھے وہ عالمِ سکوت میں آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا ——— بوڑھا تور برف کی طرح سفید ——— زمین پر گر پڑا، اُسکا چہرہ لٹک گیا تھا اور شانے ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے کوئی انہیں کھینچ رہا ہو ——— دوست کیا رونے کی بھی کوئی بات تھی!

"تم پھر رہے ہو؟ اچھا اپنے راستے چلے جاؤ، ایک طرف مت جھکنا ——— سیدھے چلنا" ——— مکار خاموش ہو گیا، اُس نے پائپ ایک طرف رکھدیا، اور کوٹ سے اپنا سینہ چھپا لیا، سردی تیز ہوتی جا رہی تھی ہوا کے جھونکے زور زور سے چل رہے تھے، سمندر غیظ و غضب میں بڑے شور کیساتھ چلا رہا تھا، تمام گھوڑے ایک ایک کر کے الاؤ کی بجھتی ہوئی آگ کے گرد ایک

حلقہ کی شکل میں آ آ کر جمع ہو گئے تھے۔

"چلیش ۔۔۔ چلیش" مِیکا نے گھوڑوں کو پچکارتے ہوئے کہا اور پھر اپنے پسندیدہ سیاہ گھوڑے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھ سے بولا،

"اب سونے کا وقت آ گیا!"

اُس نے کوٹ سے سر چھپایا اور پاؤں پھیلا کر وہیں زمین پر پڑ رہا، میری نیند اُڑ چکی تھی میں نے سمندر کی طرف سبزہ زار کی تاریکی میں نظریں جما دیں، فضا میرے سامنے خوبصورت رادھا کی شکل پیش کر رہی تھی ۔۔۔ وہ اپنے سینہ کے زخم کو بالوں کی سیاہ لٹ سے دبائے ہوئے تھی، اُس کی نازک انگلیوں سے خون قطرات کی شکل میں ۔۔۔ زمین پر ننھے منے سُرخ ستاروں کی طرح گر رہا تھا، اُس کی پشت پر بہادر لوئکو جبار نظر آ رہا تھا اُس کا چہرہ بالوں سے چُھپا ہوا تھا اور ان میں سے آنسوؤں کے بڑے بڑے سرد قطرے ٹپک رہے تھے ۔۔۔ بارش بھی ہونے لگی تھی، سمندر خوبصورت ۔۔۔ آزادی پسند خانہ بدوشوں بین ۔۔۔

"جبار اور رادھا کے اعزاز میں ایک "متین نغمہ" الاپ رہا تھا۔

"رات کی تاریکی میں دونوں نے آسانی سے چکر لگایا ۔۔۔ اور حسین وائلن نواز لوئکو ۔۔۔ مغرور رادھا کو نہ پکڑ سکا؟

رُشدی بھوپالی

خمسہ

برغزل حضرت فانی بدایونی

مآلِ سوزِ دل ہے آتشِ خاموش ہو جانا
ہے تکمیلِ حجابِ ظاہری روپوش ہو جانا
خیالوں ہی خیالوں میں تحیّر کوش ہو جانا
"کمالِ ہوش ہے یوں بے نیازِ ہوش ہو جانا"
"ترے آغوش میں بیگانۂ آغوش ہو جانا"

بصیرت سازِ ہر سو جلوہ اسکا اب بھی ہے لیکن
مرقّعِ حُسنِ قدرت کا ہویدا اب بھی ہے لیکن
وداعِ ہوش کا باعث نظارہ اب بھی ہے لیکن
"وہی برقِ تجلّی کارفرما اب بھی ہے لیکن"
"نگاہوں کو میسّر ہی نہیں بیہوش ہو جانا"

ملطِ شامِ غم یوں صبحِ عشرت پر نہ ہو جائے
نہ یوں تقدیر برہم گیسوؤں کی طرح بل کھائے
نہ ہونٹوں پر بجائے نطق خونِ نطق لہرائے
"خدا دشمن کو بھی یہ خوفِ محرومی نہ دکھلائے"
"اِدھر ان کی پرسش اور اُدھر خاموش ہو جانا"

حقیقت پر جو پردہ تھا وہ بالآخر اُٹھا یعنی
سکوں میں رنگ آیا ابتلائے عشق کا یعنی
اب افسانہ محبت کا مکمل ہو گیا یعنی
"قیامت ہے یہ ٹکڑا داستانِ عشق کا یعنی"
"مرے راحت طلب دل کا اذیت کوش ہو جانا"

ریاضِ عشق کی قسمت میں ہے ہر طرح ویرانی
شواہد بھی ہیں رونقِ مصدرِ شوریدہ سامانی
مثالِ آئینہ کیوں ہو نہ جائے مجھ کو حیرانی
"مرقّع ہے کسی کی ہستیٔ موہوم کا فانیؔ"
"کسی کا دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہو جانا"

رونق دکنی

روح کی بازگشت بارگاہِ خداوندی میں

مجھے جو کالبدِ خاک میں ٹھکانہ ملا   قفس ملا مرے مالک کہ آشیانہ ملا
برائے عرصۂ ہستی سمجھ کے صید مجھے   کیا گیا قفسِ عنصری میں قید مجھے
مرے لئے وہ عناصر کی چار دیواری   جہاں ہوا و ہوس کی تھی گرم بازاری
قفس نصیب نے ہر منظرِ جہاں دیکھا   غرض کہ شادی و غم کا ہر اک سماں دیکھا
میں قید و بند میں بھی تجھ کو یاد کرتی رہی   جو واردات گزرنی تھی وہ گزرتی رہی
یہ کس کے حکمِ مشیت سے میں اسیر ہوئی   یہ کس کی ذات ہے جو میری دستگیری ہوئی

شکستہ حال کا جو کچھ بھی ہے بیاں سن لے
ستم رسیدہ ہستی کی داستاں سن لے

جہاں کی ہستیِ ناپائدار دیکھ چکی   فنا سرشت کا انجامِ کار دیکھ چکی
عروجِ زندگیِ مستعار دیکھ چکی   نفس نفس اثر و اقتدار دیکھ چکی
فضائے دشت و چمن بار بار دیکھ چکی   جہاں میں آئی ہوئی ہر بہار دیکھ چکی
قدم قدم پہ نرالی بہار دیکھ چکی   نمائشِ چمنِ روزگار دیکھ چکی
حسین مرقعِ لیل و نہار دیکھ چکی   وہ رخ بدلتا ہوا شاہکار دیکھ چکی
حیات کو ترا آئینہ دار دیکھ چکی   ترے عالمِ نقش و نگار دیکھ چکی
وہ آبشارِ صفت جوئبار دیکھ چکی   خرامِ ابر سرِ کوہسار دیکھ چکی
جہاں کو شادی و غم کا شکار دیکھ چکی   ہر ایک رسم و رہِ روزگار دیکھ چکی
ہر ایک آنکھ کو میں اشکبار دیکھ چکی   ہر ایک دل میں غمِ دلفگار دیکھ چکی
بشر کی فطرتِ آسودہ کار دیکھ چکی   کمالِ ہوش پہ غفلت شعار دیکھ چکی

کہاں کہاں نہ گئی میں کہیں سکوں نہ ملا!
اب اس سے کیا کہوں جو جانتا ہے کیوں نہ ملا!

اسیرِ تابعِ نفس اور غلام ہے دنیا   عجب ہوا و ہوس کا مقام ہے دنیا
سمجھتی خاک یہ منشائے فطرتِ آزاد   ہوس کی راہ میں دانہ بدام ہے دنیا
اب اس نتیجہ پہ پہنچی ہے قوتِ ادراک   کہ صرف عشرتِ فانی کا نام ہے دنیا
یہ بے نیازیِ عقلی یہ خبطِ گمراہی   فریب خوردۂ سودائے خام ہے دنیا
جمالِ حق مجھے پہلے ہی دے چکا فتویٰ   جو پاکباز ہے اس پر حرام ہے دنیا
ہزار قصۂ آدم کو یہ تمام کرے   مگر بزعمِ خودی ناتمام ہے دنیا
وہ زندگی نہیں جو زندگی ہے دنیا کی   تمام حاملِ مرگِ دوام ہے دنیا

مآلِ عشرتِ دنیائے دوں نگاہ میں ہے
بقدرِ ہوش وہ عہدِ زبوں نگاہ میں ہے

میں اپنا دورِ اسیری گزار آئی ہوں   ترے حضور مرے کردگار آئی ہوں
میں عمر بھر کا لئے انتشار آئی ہوں   سکوں نواز بہت بیقرار آئی ہوں
غمِ فراق نے مطلق گھلا دیا ہے مجھے   یہ ہے مآل کہ زار و نزار آئی ہوں
گناہ تیں مرے دامن سے دھو نہ سکیں   لطیف ہوتے ہوئے داغدار آئی ہوں
گناہِ نفسِ بشر سے جو آب آب ہوں میں   نگاہ نیچی کئے شرمسار آئی ہوں
جو مل گیا تھا لباسِ گناہ آلودہ   میں اس لباس کو اپنے اتار آئی ہوں
کہاں کہاں مجھے ذلت سے سابقہ نہ پڑا   کہاں کہاں سے یہاں ہو کے خوار آئی ہوں
جہانِ خواب سرا کی وہ مستیاں توبہ   چھپائے نشۂ کیف و خمار آئی ہوں
فریب کھائی ہوئی زندگی کا رنج نہیں   میں اپنے غم میں یہاں سوگوار آئی ہوں
گواہِ حال ہے انجامِ خارزارِ حیات   لباس اپنا کئے تار تار آئی ہوں
کہاں منازلِ ہستی کہاں وہ نقطۂ ے   زمانہ سیر و سفر کا گزار آئی ہوں
ہے تیری شمعِ حقیقت طواف کے قابل   اسی کی سمت میں پروانہ وار آئی ہوں
اداشناسِ عقیدت، نگاہِ لطف و کرم   فگار آئی ہوں میں اشکبار آئی ہوں
یہ قربِ خاص ترا میرا اصل مقصد تھا   اٹھا کے صدمۂ صد انتظار آئی ہوں
وہ مشتِ خاکِ بشر جس کی بدسلوکی سے   بہا لئے ہوئے دل میں غبار آئی ہوں
کسی کے جرم پہ مجرم سہی مری ہستی   ترے حضور اب آمرزگار آئی ہوں
نگاہِ لطف ہو سوئے نیاز مندِ قدیم   نگاہِ لطف کی امیدوار آئی ہوں

رہائی مل گئی زندانِ آب و گل سے مجھے
ہے اب لگاؤ تری بزمِ مستقل سے مجھے

حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

جس وقت فردوسی طوسی کا کلامِ معجز نظام آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے تو بے اختیار یہی کہنا پڑتا ہے کہ شعرائے فارس میں متقدمین سے لیکر تا ایندم کوئی شاعر اس کا ہم پلہ نہیں ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے زمانہ کا وحید العصر اور فرد زمانہ روزگار شاعر تھا اور معاصرین میں جو درجہ سے حاصل تھا وہ کسی کو نہ ملا

اکثر جلیل القدر شعراء اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں مثلاً فاضل لکھتا ہے ؎

سکۂ که در سخن فردوسی طوسی نشاند | کافرم گر، ہیچ کس از مردم فرسی نشاند
اوّل از بالائے کرسی بر زمیں آمد سخن | او سخن را باز بالا برد و بر کرسی نشاند

رباعی کا مصرع چہارم فردوسی کے کمالِ شاعری و سخنوری کے لئے کافی ثبوت ہے۔ مشہور رباعی ہے جس میں فردوسی کو پیغمبران سخن میں سے ایک مانا گیا ہے یعنی ؎

در شعر سہ تن پیمبر انند | ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را | فردوسی و انوری و سعدی

لیکن ملک الشعراء انوری جیسے شاعر کی انصاف پسند طبیعت اور حقیقت شناس نگاہیں فردوسی کی مدح میں یہ رباعی حوالہ قلم کئے بغیر نہ رہ سکیں ؎

آدیں بر ردانِ فردوسی | آں ہمایوں نژاد و فرخندہ
آں کہ اُستاد بود و ما شاگرد | آں خداوند بود و ما بندہ

وہ جہانِ شعر و سخن کا واقعی خداوند تھا۔

حضرت سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ جیسے محقق اور مصلح اخلاق بزرگ فردوسی کی تعریف دعائیہ مصرع کے ساتھ ختم کرتے ہیں ؎

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد (سعدی) | کہ رحمت بر آں تربت پاک باد
میازار مورے کہ دانہ کش است (فردوسی) | کہ جاں دارد و جان شیریں خوش است

یہ شاعر اعظم ۳۲۹ھ ہجری میں طوس یا اضلاع طوس میں پیدا ہوا، حسن بن اسحٰق بن شرف نام تھا کنیت ابوالقاسم اور تخلص فردوسی تھا کہتے ہیں کہ فردوسی کا باپ ایک دولتمند شخص کے باغ فردوس نامی کا داروغہ تھا۔ اسی لحاظ سے ابوالقاسم نے اپنا تخلص فردوسی اختیار کیا۔

شاہنامہ کے دیباچہ میں مرقوم ہے کہ جب فردوسی پیدا ہوا اسی رات کو باپ نے خواب دیکھا کہ اس نوزائیدہ بچے نے مکان کی چھت پر چڑھکر نعرہ لگایا اور جواب میں چاروں طرف سے لبیک لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اس زمانہ کے مشہور معبّر نے تعبیر دی کہ یہ لڑکا زبردست شاعر ہوگا اور اس کی شاعری کا شہرہ نزدیک و دور بلکہ تمام عالم میں پھیلے گا۔

سنِ رشد کو پہونچکر فردوسی نے تحصیل علم شروع کی اور تمام درسی علوم حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور شاعری کے جوہر کھلنے شروع ہوگئے۔

کتب اور تواریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہنامہ فردوسی نے خود اپنے شوق سے تصنیف کیا تھا نہ کہ سلطان محمود غزنوی کی فرمائش پر۔ اس کو شاہانِ عجم کی ایک مکمل تاریخ لکھنے کا شوق تھا اور چونکہ فطرتاً شاعر تھا لہذا نظم میں شاہانِ عجم کے واقعات منضبط کرنا شروع کئے اور شاہنامۂ ایران ۴۰۰ھ ہجری میں مکمل ہوا پینتیس ۳۵ برس تصنیف میں صرف ہوئے اس حساب سے تصنیف کا آغاز بقول شمس العلماء مولٰنا شبلی نعمانی مرحوم ۳۶۵ھ ہجری سمجھنا چاہئے جس کی تصریح خود فردوسی نے شاہنامہ میں کی ہے :-

سی و پنج سال از سرای سپنج | بسے رنج بُردم بہ اُمید گنج

اور اختتام شاہنامہ کے موقعہ پر لکھتا ہے ؎

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار | کہ گفتم من این نامۂ شہریار

پانچ کو اسّی میں ضرب دینے سے چار سو ہوتے ہیں یعنی ۴۰۰ھ ہجری اور سلطان محمود غزنوی کا سالِ تخت نشینی ۳۸۷ھ ہجری ہے اس حساب سے شاہنامہ کی تصنیف محمود سے کئی سال پیشتر شروع ہو چکی تھی، نیز شاہنامہ

کی تیسری جلد کے خاتمہ پر فردوسی سلطان محمود کی جانب اشارہ کر کے لکھتا ہے ؎

سخن را نگہداشتم سال بیست | بداں تا سزاوارِ ایں گنج کیست
جہاندار محمود با فر و جود | کہ اورا کند ماہ و کیواں سجود

یعنی سلطان محمود کے حضور میں حاضر ہونے سے بیس سال پیشتر شاہنامہ کی تصنیف شروع ہو گئی تھی۔

شوق دستگیری و معاونت شاہی کے خیال سے یا بقول بعض مورخین سلطان محمود کے طلب کرنے پر جب فردوسی غزنی پہونچا تو عرصہ دراز تک سلطان ذیشان کے دربار میں باریابی کا موقع نصیب نہ ہوسکا۔ آخرکار ایک روز سرگرداں ایک باغ میں جا نکلا جہاں دربارِ محمود کے ممتاز شعراء، عنصری، عسجدی، اور فرخی شغل جام و سبو اور کلرۂ کلام میں معروف تھے، تینوں نے اُس کو مخل صحبت سمجھا لیکن جب معلوم ہوا کہ وہ بھی ان کی طرح شاعر ہے تو یہ قرار پایا کہ ایک مصرع طرح پر سب طبع آزمائی کریں اور اگر اُس کا مصرع عمدہ ہوا تو اُس کو شریکِ مجلس کر لیا جائے گا۔

سب سے اوّل عنصری نے کہا ؏ چوں عارضِ تو ماہ نباشد روشن
پھر فرخی نے کہا ؏ مانندِ رخت گل نبود در گلشن
عسجدی بولا ؏ مژگانت ہمی گذر کند از جوشن
فردوسی فوراً کہہ اٹھا ؏ مانندِ سنانِ گیو در جنگِ پشن

گیو اور پشن کا نام سُن کر شعراء چونک پڑے اور کیفیت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ وہ شاہنامۂ ایران لکھ رہا ہے اور بعض داستانیں اُنھوں نے سُنیں تو عنصری نے اُس کی بہت قدر و منزلت کی اور سلطان کے دربار میں پیش کیا۔

کہتے ہیں کہ فردوسی نے دربارِ محمود میں پیش ہو کر سب سے اوّل جنگِ اشکبوس رستم کی داستان سنائی جس میں رستم کی تیراندازی ایسی خوبی اور شاعرانہ نزاکت نیز جرأت و دلیری کے ساتھ ظاہر کی گئی تھی جو اپنی نظیر آپ تھی۔

اشکبوس کشانی کے گھوڑے کو تیر سے بیجان کرنے کے بعد رستم اُس کی جانب متوجہ ہوتا ہے اُس موقعہ پر فردوسی کے قلم سے جو اشعار نکلے ہیں وہ دادطلب ہیں ؎

تہمتن بہ بندِ کمر بُرد چنگ | گزیں کرد یک چوبہ تیرِ خدنگ
خدنگے برآورد پیکاں چو آب | نہادہ برو چار پرِّ عقاب
بمالید چاچی کماں را بدست | بہ چرمِ گوزن اندر آورد شست
ستوں کرد چپ را و خم کرد راست | خروش از خمِ چرخِ چاچی بخاست
چو سوفارش آمد بہ پہنائے گوش | ز چرمِ گوزناں بر آمد خروش
چو پیکاں بوسید انگشتِ او | گزر کرد از مہرۂ پشتِ او
چو زد تیر بر سینۂ اشکبوس | سپہر آں زماں دستِ او داد بوس
قضا گفت گیر و قدر گفت دہ | ملک گفت احسن فلک گفت زہ

کشانی ہم اندر زماں جاں بداد
تو گفتی کہ او خود ز مادر نزاد

ان اشعار کو سُننے سے فردوسی کا زورِ تخیل شوکتِ الفاظ، سلاست زبان، نازک خیالی و قادر الکلامی کا پورا ثبوت مل گیا اور آخری شعر پر تو محمود پھڑک گیا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا خوب گفتی۔

غرض اُسے شاہنامہ کی تکمیل، کی، اجازت دیدی گئی اور اب فردوسی نے الطاف شاہانہ اور بذل خسروانہ کا امیدوار ہو کر اطمینان و جمعیتِ قلب کیساتھ شاہنامہ کی تکمیل شروع کی،

دربارِ شاہی سے فی شعر ایک اشرفی صلہ مقرر ہوا اور بہت محنت و جانفشانی کے ساتھ فردوسی نے ساٹھ ہزار اشعار اپنی ذہنی کدو کاوش سے جمع کئے کہ جنکا جواب آجتک کوئی شاعر پیش نہ کر سکا۔

مگر افسوس فردوسی کو اُس کی محنت کا صلہ حسبِ وعدۂ شاہی نہ مل سکا اور جب شاہنامہ تیار ہوا اور وہ انعام و اکرام کی اُمید میں، اس قدر طویل مدت کی محنت و معروفیت کے بعد اُن جواہر پاروں کو لئے ہوئے جنکی فراہمی میں اُس کی عمر کا معتدبہ حصہ صرف ہو چکا تھا، دربارِ محمود میں پیش ہوا تو بجائے اشرفیوں کے ساٹھ ہزار چاندی کے سکے دلوائے گئے۔ جس کی مختلف وجوہات بیان کی جاتی ہیں لیکن سب سے قطع نظر کرتے ہوئے ابن اثیر کا لکھا ہوا وجہ سبب صرف ایک تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ حسن میمندی نے جو اس زمانہ میں قلمدانِ وزارت سنبھالے ہوئے تھا، محمود کو فردوسی کی جانب سے بدگماں کیا کہ چونکہ فردوسی نے بجائے تاریخ لکھنے کے محیرالعقول افسانے اور مافوق الفطرت انسانی کارنامے درج کتاب کئے ہیں جن کی وجہ سے شاہنامہ بجائے تاریخ کے لغو اور جھوٹی داستانوں کا مجموعہ بنگیا

ہے اس لئے بجائے طلائی سکوں کے نقرئی سکے انعام میں دینے چاہئیں۔

یہی وہ سب سے بڑا سبب تھا جس سے بادشاہ وزیر کے فریب میں آگیا کیونکہ شاہنامہ میں کہیں سیمرغ کے ذریعہ زال کو پرورش کرانا، کہیں اکوان دیو کا رستم کے ہاتھ سے مارا جانا کہیں اسفندیار کا ہفتخواں طے کرنا، کہیں رستم کے تمام زخموں کا محض سیمرغ کے پر جسم پر پھیر دینے سے اندمال ہو جانا اور پھر سیمرغ کا انسانوں کی طرح گفتگو کرکے اسفندیار کو مارنے کی ترکیب بتانا وغیرہ وغیرہ ایسی باتیں درج ہیں جن کی بنا پر وزیر کا داؤں چل گیا اور وہ فردوسی کو نقصان پہونچانے میں کامیاب ہو گیا حسن میمندی اور فردوسی کے مابین دشمنی کے اسباب کچھ مذہبی اختلافات تھے اور کچھ فردوسی کی لاپروائی اور شان استغنا بھی تھی۔ حسن میمندی مذہباً خارجی تھا اور فردوسی شیعہ، علاوہ ازیں بادشاہ کو مہربان دیکھکر جملہ اعیان و امرائے سلطنت فردوسی کو تحفہ تحائف بھیجتے تھے اور بہت قدر و منزلت کرتے تھے اور یہ روز افزوں ترقی جاہ و منصب دیکھ کر حسن میمندی جلتا تھا لیکن فردوسی کچھ پروا نہ کرتا تھا وہ علانیہ کہتا تھا ؎

من بندہ کز مبادی فطرت بودہ ام — مائل بہ مال ہرگز و طامع بجاہ نیز
سوئے درِ وزیر چرا ملتفت شوم — چوں فارغم ز بارگہِ بادشاہ نیز

جب نقرئی سکے فردوسی کے پاس لیجائے گئے تو وہ حمام میں تھا خلافِ امید اس انعام کو دیکھکر اُس نے ایک حسرت بار آہ کھینچی اور اس روپیہ کو وہیں کھڑے کھڑے محتاجوں کو تقسیم کر دیا اور اپنی پینتیس سالہ محنت اور مغز پاشی کا یہ انجام دیکھکر اُس نے سلطان محمود کی ہجو لکھی اور غزنی سے روانہ ہو گیا، لیکن روانہ ہونے سے پیشتر ایاز کو سر بمہر لفافہ دیا کہ میرے جانے کے بیس روز بعد بادشاہ کو دینا اور خود ہرات چلا گیا، محمود نے لفافہ کھول کر دیکھا تو اُس کی ہجو لکھی ہوئی تھی اور چونکہ ہجو زبان زد خاص و عام ہے لہذا اسکا اعادہ ان صفحات پر بیکار ہے، آخری شعر جو لکھا ہے وہ بالکل درست ثابت ہوا ؎

کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا
بماند ہجا تا قیامت بجا

بہ نسبت اس تعریف کے جو فردوسی نے محمودؒ کے لئے شاہنامہ میں لکھی ہے ہجو زیادہ مشہور ہے۔

ہجو دیکھکر بادشاہ کو اپنی ناقدردانی کا احساس ہوا اور حسن میمندی کو بہت بُرا بھلا کہا جس کی ترغیب سے یہ سب کچھ عمل میں آیا تھا لیکن حسن میمندی نے پھر مخالفت کی اور عرض کیا کہ "خواہ کچھ بھی ہو جس منہ سے وہ شہنشاہ کی مدح و ستائش اور جس قلم سے توصیف و ثنا لکھ چکا تھا اُس سے کبھی ہجو اور بُرائی نہیں کرنی چاہیے تھی، علاوہ ازیں اُس نے عطیۂ شاہی کی بھی قدر نہ کی اور انعام شاہی کو محتاجوں میں تقسیم کرکے افضالِ شاہی کی تحقیر کی، اگر جہاں پناہ خاک کی ایک چٹکی بھی بھیجدیتے تو اُس کو سر پر رکھنی چاہیے تھی۔

یہ جملہ محمودؒ کے دل میں چبھ گیا اور اُس نے نہایت غضبناک ہو کر عامل ہرات کو لکھا کہ فردوسی کو فوراً دربار شاہی میں حاضر کیا جائے۔

فردوسی چونکہ معتوب بادشاہ تھا اور سلطان محمود کے دبدبہ و سطوت جلال کے روبرو کسی میں سر اُٹھانے کی طاقت نہ تھی اس لئے جا بجا پھرتا اور اپنی شخصیت کو پوشیدہ رکھتا ہاتھ میں عصا اور بدن پر ایک چادر لپیٹے ہوئے ہرات اور طوس ہوتا ہوا قہستان پہونچا اور ناصر لک کے خلوص سے متاثر ہو کر جو اُس جگہ کا حاکم تھا وہاں ٹھہر گیا اور ہجو کے علاوہ ایک مثنوی محمودؒ کی بدعہدی و ناقدردانی حاسدوں اور مخالفین کی ریشہ دوانی اور اپنی مظلومی کی حسرت انگیز داستان کے اظہار میں لکھنی شروع کی، لیکن ناصر لک نے اُس کو سمجھایا کہ کسی کو بُرا کہنا خصوصاً اُس زبان سے جس سے ایک مرتبہ اچھا کہا جا چکا ہو اہلِ کمال کا شیوہ نہیں بلکہ ناصر لک نے اس شرط پر، ایک لاکھ روپیہ دیکر مثنوی کے اشعار اُس سے خرید لئے کہ وہ کہیں ظاہر نہ ہونے پائیں، اس واقعہ کی طرف فردوسی اس مثنوی میں اشارہ کرتا ہے ؎

بہ غزنیں مرا گرچہ خوں شد جگر — ز بیدادِ آں شاہ بیدادگر
کز اں، ہیچ شد رنج سی سالہ ام — شنید از زمیں آسماں نالہ ام
ہمی خواستم تا فغانہا کنم — بہ گیتی ازو داستانہا کنم
بگویم ز مادرش و ہم از پدرش — نہ ترسم بغیر از خداوندِ عرش
چو دشمن نمی داند از دوست باز — بہ تیغ زبانش کنم پوست باز
ولیکن ز فرمودۂ محتشم — ندانم گزیں بیش چوں سر کشم
فرستادم از گفتۂ داشتم — بہ نزدیک خود ہیچ نگذاشتم

اگر باشد ایں گفتہا ناصواب | بسوزاں در آتش بشو آں در آب
گزشتم ابا سرو بنیک راے | ازیں داوری تا بدیگر سرائے

رسد لطفِ یزداں بفریادِ من
تا نہ بمحشر ازو دادِ من

ناصر لک نے قہستاں میں بھی فردوسی کو، محمود کے خوف کی وجہ سے ٹھہرنے نہ دیا اور وہاں سے وہ مازندراں پہونچا، لیکن وہاں بھی پناہ نہ مل سکی، بالآخر جب محمود غزنوی ایک مرتبہ ہندوستان کی مہم پر روانہ ہوا تو وہ اپنے وطن طوس میں آکر مقیم ہوگیا اور اپنی خانہ بدوشی اور سیاحت درد وپوشی سے تنگ آکر اس امر کے درپے ہوا کہ بادشاہ کی آتش غضب کو سرد کیا جائے۔

چہار مقالہ واقعات فردوسی میں درج ہے کہ رفتہ رفتہ بادشاہ کا غصہ بھی فرو ہوچکا تھا اور اُس کو اپنی بدعہدی اور ناقدردانی کا احساس ہوگیا تھا، وہ حسن میمندی کی شرارت کو سمجھ گیا تھا جس نے فردوسی کے حق میں کانٹے بوئے تھے اُدھر ناصر لک نے بھی قہستاں سے فردوسی کی تعریف و توصیف و ہمدردی و حمایت میں عریضہ لکھ کر عفو خطا کی درخواست کی تھی اور لکھا تھا کہ واقعی فردوسی کے ساتھ ظلم ہوا ہے، علاوہ ازیں دربار شاہی کے وزراء میں سے کوئی وزیر فردوسی کا دوست اور ہمدرد تھا لیکن موقع کا منتظر تھا کہ فردوسی کی ایسی پرزور سفارش کرسکے جو کارگر ہوجائے، ہندوستان سے واپس آتے وقت وہ موقع اُس کو مل گیا۔

بادشاہ نے کسی قلعہ دار کو اطاعت و فرمانبرداری کیواسطے تہدیدی خط لکھا تھا اور جواب کا منتظر تھا، قاصد کے واپس آنے پر اس سے پیشتر کہ جواب نامہ پیش ہو، محمودؔ نے کہا: "کیا جواب لایا؟" وزیر کی زبان سے بے اختیار نکل گیا؎

اگر جز بکامِ من آمد جواب
من و گرز و میدانِ افراسیاب

محمود نے خوش ہوکر دریافت کیا: "کس کا شعر ہے؟"

وزیر نے کہا: "بدبخت فردوسی کا جس نے اپنی عمر عزیز کا ایک حصہ خونِ جگر پینے میں صرف کیا اور کچھ حاصل نہ ہوا۔"

بادشاہ بہت متاسف و نادم ہوا اور مصمم ارادہ کرلیا کہ غزنین پہونچکر تلافی مافات کریگا۔ واقعات تذکرۃ الصدر کے علاوہ ایک اور قوی سبب بھی بادشاہ کے غصہ کو فرو کرنیکا یہ ہوا کہ وہ جب غزنین واپس آیا تو جمعہ کے روز فردوسی کی جانب سے یہ اشعار جامع مسجد کی دیوار پر لکھے ہوئے دیکھے جن کو یا تو فردوسی خود جاکر لکھ آیا تھا یا کسی کی معرفت لکھوا دئیے تھے؎

خجستہ درگہہ محمود غزنوی دریاست | چگونہ دریا کہ آں را کرانہ پیدا نیست
چو غوطہ ہا زدم واندرو ندیدم دُر | گناہ بخت من است ایں گناہ دریا نیست

غرض ہندوستان سے واپس آنے کے بعد محمودؔ نے حسب وعدہ ساٹھ ہزار سکہ طلائی طوس میں فردوسی کے پاس بھیجے گئے افسوس؎

ہائے کس وقت ہوئیں دونوں مرادیں حاصل
یار بالیں پہ جب آیا تو قضا بھی آئی

اِدہر شہر طوس کے ایک دروازے رودبار نامی سے خلعتِ شاہی اُس کی ذہنی کاوش اور تیس سال محنت کا صلہ لیکر داخل ہورہے تھے اُدہر دوسرے دروازے سے فردوسی کا جنازہ قبرستان کی طرف جارہا تھا۔

فردوسی نے اولاد میں صرف ایک بیٹی چھوڑی تھی جب اُس کی خدمت میں صلہ شاہی پیش کیا گیا تو اُس کی غیرت و حمیت اس کی متقاضی نہ ہوئی کہ جس دولت سے باپ متمتع نہ ہوسکا بیٹی فائدہ اُٹھائے لہذا اُس نے قبول کرنے سے انکار کردیا آخرکار سلطان کے حکم سے مرو اور نیشاپور کے راستہ میں اس رقم سے مسافروں کی آرام و آسائش کے لئے ایک کارواں سرائے تعمیر کردی گئی۔ جس کا نام "چاہ" رکھا گیا۔

شاہ نامہ کی تکمیل کے چند سال بعد یہ شاعرِ اعظم ۴۱۱ھ کے قریب دُنیا سے سفر کرگیا۔

کنور محمد یٰسین علیخاں شہاب

مشاعرہ شاعر: مصرع طرح برائے ماہِ اکتوبر ۱۹۴۱ء

"منزل نئی ہے، کوئی نیا کارواں بنا"

کارواں۔ داستاں وغیرہ قوافی۔ بنا ردیف

نوٹ:۔ شعرائے کرام اپنی غزلیں ۸ ستمبر تک روانہ فرمادیں اس کے بعد جو غزلیں وصول ہونگی وہ شریکِ اشاعت نہ ہوسکیں گی۔ ایڈیٹر

خمسہ

بر غزل جنابہ نجمہ تصدق ایم۔ اے۔ (بی۔ ٹی)

جب آہ کی تو عرش کے پردے ہلا دیئے   افلاک سے زمیں کے قلابے ملا دیئے
جب کی فغاں تو حشر ہزاروں اُٹھا دیئے   "ہم نے جو درد دل کے فسانے سُنا دیئے
"آنکھوں سے کائنات کی آنسو بہا دیئے"

اے حُسن لاجواب تیرا حُسن ہے عیاں   قاصر ہے یہ زبان میری کیا کروں بیاں
راتوں کی پُرسکون فضاؤں میں ناگہاں   "چھیڑی جو میں نے تیری جوانی کی داستاں"
"تارے، شراب، پھول، سبو، مُسکرا دیئے"

حق کس طرح ادا نگہہ مست کا کروں   کچھ ہوش ہو تو شکر کا سجدا ادا کروں
میں خاک پارسائی کا دعویٰ بھلا کروں   "توبہ کا پاس تھا مجھے لیکن میں کیا کروں"
"تیری نگاہِ مست نے ساغر پلا دیئے"

آ، دل میں میرے جھک کے کبھی نہاں تو دیکھ   یہ ناز اور نیاز کی مجبوریاں تو دیکھ
رُسوا کی اپنے عشق میں رُسوائیاں تو دیکھ   "اے دوست شوقِ دید کی سرمستیاں تو دیکھ
"نجمہ نے تیری راہ میں تارے بچھا دیئے"

خانشری امام الدین خاں رُسوا والیٔ بہود

افکارِ درخشاں

لازم ہے تفکّر بھی اگر ہے تمھیں جینا   پیچیدہ بہت اوج ترقی کا ہے زینہ
جو داغ محبت کا عطا تم نے کیا تھا   اب تک ہے مری خاتمِ دل میں وہ نگینہ
موجیں سی اُٹھاتے ہیں مرے قلب حزیں میں   "یہ ٹھنڈی ہوا اور یہ ساون کا مہینہ"
تم لاکھ کرو ضبط مرے قصۂ غم پر   چہرے سے نمایاں ہے ندامت کا پسینہ
ہے آئینہ بیکار جو داغوں سے بھرا ہو   وہ دل ہی نہیں جس میں اثر گیر ہو کینہ
پھر بحرِ محبت میں اُٹھا یاس کا طوفاں   کس طرح بچاؤں میں امیدوں کا سفینہ
کیوں خوف تجھے مرگِ محبت سے ہی غافل   مرنا ہی محبت میں حقیقت میں ہے جینا
ہم تو یہ سمجھتے ہیں جفا اور وفا کو   وہ حسن کا شیوہ ہے یہ اُلفت کا قرینہ
ساقی میں تری مست نگاہوں کے تصدق   سرشار ہوں مخمور ہوں بے ساغر و مینا
اے مہر وہی آدمی انساں ہے جہاں میں
جو بھولے نہ اخلاق و محبت کا قرینہ

وزیرزادہ شجاعت خاں مہر جونا گڈھی

رنگین دھوکا

آج مدھوکر کی سالگرہ کی تقریب ہے، وہ اپنی زندگی کے چوبیس سال پورے کرکے پچیسویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ اس جشن میں شرکت کے لئے مدھوکر نے اپنے تمام احباب کو مدعو کیا ہے۔ تقریب کو زیادہ پُرلطف بنانے کی غرض سے محفلِ رقص و سرود کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ جس دیوانخانے میں یہ محفل منعقد ہوگی وہ دُلہن کی طرح آراستہ ہے۔ ہر طرف رنگا رنگ پھولوں کی خوشبو مہمانوں کو بیخود بنانے میں پیش قدمی کر رہی ہے۔ روشنی بھی ایک نئے لباس میں ہے لیکن اس وقت کچھ ماند نظر آ رہی ہے کیونکہ آج اس دیوانخانے میں ایک ماہ پیکر جلوہ فرما ہے جس کا حُسنِ دلفریب حریفِ شمع بن کر پروانوں کو اپنی طرف مائل کر رہا ہے۔

یکایک مدھوکر اور رقاصہ مہ جبیں کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں نظروں ہی نظروں میں سرگوشیاں ہوئیں۔ چہروں پر مسکراہٹ کھیلی اور دونوں اپنی جگہ خاموش ہو گئے۔ اُن کی خاموشی محفل کی خاموشی تھی۔ لیکن دل پہلو میں مچل رہے تھے مسرور بھی اور مخمور بھی، مگر یہ عالم صرف دو دلوں تک ہی محدود تھا۔ ساری محفل اس سے بے خبر تھی۔

مدھوکر نے غزل ختم ہونے پر ایک دادرے کی فرمائش کی۔ سازندوں نے ساز ملایا۔ سارنگی نے دادرے کی زبان میں فریاد شروع کی اور کمل نے مسکرا کر موسیقی کے پر کھول دیئے۔ گانا شروع ہوا "سجن دوارے لاگے مورے نین" محفل جھومی، دادرے پر داد ملی، لوگوں نے اُس کے ہر لفظ اور کمل کی ہر ادا کو غور سے سُنا اور دیکھا لیکن مدھوکر صرف کمل کی آنکھوں سے گفتگو کرتا رہا، کمل کی بہن نے اس خموش گفتگو کو سنا، اور یہ سمجھنے کے بعد کہ اُس کی بہن نے ایک قیمتی پرند کو اپنے جال میں پھانسا ہے، وہ مسکرائی، لیکن اُس کو کیا خبر تھی کہ شکاری آج خود شکار ہو چکا ہے، شمع آج خود پروانے پر نثار ہونے کے لئے بیتاب ہے وہ جل رہی ہے لیکن پروانے کو جلانے کے لئے نہیں، کیونکہ اُس کے شعلے تو سرد ہو چکے ہیں۔ پروانہ بھی خوش ہے کیونکہ اُسکا سوز آج اتنا بھڑک اُٹھا ہے کہ جو شمع کو جلانے کیلئے کافی ہے۔

مدھوکر نے محفل برخاست کرنے کا حکم دیا، لوگ گھر جانے کے لئے اُٹھے، مدھوکر بھی اُٹھا مگر اُس کے پاؤں لڑکھڑائے اور وہ پھر بیٹھ گیا، یہ دیکھ کر کمل ہنسی اور بولی "کیوں سرکار اب آرام نہیں فرمائیں گے؟" "ہاں کیوں نہیں میں بھی جا رہا ہوں" مدھوکر نے بیتابانہ انداز میں کہا "لیکن میری ایک چیز یہاں کھو گئی ہے تم نے تو نہیں اُٹھائی؟" یہ کہہ کر مدھوکر نے کمل کو غور سے دیکھا، وہ شرما گئی، اُس کی نظریں جھکیں اور وہ اپنے پاؤں کے ناخن سے زمین کو کریدنے لگی، یہ دیکھکر مدھوکر نے کہا "کوئی ہرج نہیں، اگر تمہارے پاس ہو تو واپس کر دو" "واپسی کی شرط ضروری نہیں ہوتی" یہ سُنکر کمل مسکرائی۔

مدھوکر اور کمل کو یوں مصروفِ گفتگو دیکھکر اہلِ محفل اُٹھنے لگے اور کچھ دیر بعد وہاں مدھوکر اور کمل کے سوا کوئی نہ رہا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد مدھوکر نے کہا، ہاں کمل میں تم سے یہ کہنا تو بھول ہی گیا کہ آج تم نے خوب گایا طبیعت خوش ہو گئی "شکریہ سرکار لیکن یہ تو ہمارا کام ہے، آپ لوگوں کو خوش کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس میں میں نے کونسا شیر مار لیا جو آپ تعریف فرما رہے ہیں" وہ اتنا کہہ کر ہنسی اور خود ہی شرما گئی، "آہا تو کیا تم نے شیر مارنے کا بھی ارادہ کیا ہے، خدا خیر کرے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ شیر تمہارے نشانے سے بچکر نہیں جا سکتا" مدھوکر نے ہنستے ہوئے کہا "وہ کیسے سرکار" وہ بولی "اچھا ہمارے قریب آؤ تو ہم بتائیں" یہ کہکر مدھوکر نے کمل کو اپنے پاس بٹھا لیا، مدھوکر نے ایک بار اُس کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔ دیکھو کمل تم کتنی خوبصورت ہو، کتنی اچھی ہو کمل تم نے اپنا چہرہ کبھی خود بھی آئینہ میں غور سے دیکھا ہے، شاید کبھی نہیں دیکھا، ورنہ تم خود اپنا شکار ہو جاتیں۔ کمل تم بہترین تیر انداز ہو اور کمان کا تو کہنا ہی کیا" کمل شرما گئی، "نہیں میں سچ کہتا ہوں کمل تمہارا حسن حسنِ بے نظیر ہے، وہ چاہے جس کی دل کی دُنیا اُجاڑ سکتا ہے" "بجا فرمایا سرکار نے" "وہ چاہے جس کی دُنیا اُجاڑ سکتا ہے لیکن، آج اُس نے خود اپنی ہی دُنیا اُجاڑ لی ہے"!

سرکار آپ نے اپنی نشانی ہر ایک کو دے رکھی ہے، مجھے بھی کچھ مل جائے

یہ کہکر وہ مدھوکر کو بغور دیکھتی رہی۔ تم کیا چاہتی ہو کمل کہو، ہمارے بس کی بات ہوگی تو ہم ضرور دیں گے۔

ہاں ہاں سرکار کے بس کی بات کیوں نہیں، لیکن دیکھئے، اپنے وعدے کا خیال رہے بدل نہ جایئے گا۔

ہم کسی کو دھوکا نہیں دیتے کمل اچھا کہو تم کیا کہنا چاہتی ہو؟

"دل۔ سرکار میں آپ سے دل کی دولت مانگتی ہوں" یہ سُن کر مدھوکر کچھ خاموش سا ہوگیا۔

تو کیا سرکار کو یہ درخواست منظور نہیں، کیا سرکار کو اپنے وعدے کا خیال نہیں؟

نہیں کمل مدھوکر وعدہ کرکے بھُول نہیں سکتا، لیکن یہ تم نے مانگا کیا؟ دل ایسی چیز تو نہیں ہے کمل جو فوراً بغیر سوچے سمجھے دے دی جائے یا مانگا جائے، کیا کمل واقعی تم میرا دل چاہتی ہو؟ لیکن خوب سوچ لو کہ یہ نازوں کا پالا ہے۔ آج تک اسے سنبھال سنبھال کر رکھا ہے، لیکن اگر تمھیں چاہیے تو مجھے انکار نہیں ہاں اتنا ضرور ہے کہ یہ کھلونا نہیں ہے جو کھیلنے کے لئے تمہاری گود میں ڈال دیا جائے۔ یہ ایک انمول موتی ہے جس پر مدھوکر کی زندگی کا انحصار ہے۔ مجھے اگر ڈر ہے تو یہ کہ تم اس کو سنبھال نہ سکوگی۔

کیوں نہیں سرکار میں نے اس لئے تو طلب کیا ہے کہ وہ میرے پاس ہر وقت رہکر میری تاریک دُنیا کو درخشاں کرے۔ میرا سکون ختم ہوچکا ہے کسی کی نظروں نے اُسے چھین لیا ہے۔ میں بھنور سے نکلنا چاہتی ہوں اور اسی لئے سہارا تلاش کررہی ہوں کیا آپ میری کشتیِ اُلفت کے ناخدا نہ بنیں گے، ڈوبتے کو بچالینا بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔ ایک گم کردہ راہ کی رہبری بہت بڑی نیکی ہے۔

سچ کہتی ہو کمل مگر یہ کام بہت مشکل ہے۔ میں نے تمھیں دل دے دیا اب تم اس کو سنبھال سکو تو سنبھالو۔

لیکن دیکھو کمل یہ دنیوی کہاوت ہے کہ کمل، مدھوکر کو اپنے اندر بٹھاکر بند ہوجاتا ہے، مدھوکر اسی میں مرجاتا ہے اور ....

اور بھنورے کے مرنے کے بعد کمل پھر کھِل جاتا ہے۔ مردہ بھنورا اُس کی پتیوں پر سے پھسل کر نیچے گر پڑتا ہے اور وہیں اس کے قدموں میں اپنی قبر بنالیتا ہے کمل کا پھُول پھر کسی اور بھنورے کی تلاش کرتا ہے اور اُس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کمل کی جڑوں میں سینکڑوں بھنوروں کی قبریں بن جاتی ہیں۔ لیکن کمل اپنی عادت نہیں بدلتا، کمل مَیں بھی تو مدھوکر ہوں اور تم کمل تم وہی بے رحم کمل ہو، کیا تم میری قربانی چاہتی ہو؟ خیر تمھیں خوش کرنے کے لئے یہ بھی منظور ہے۔

سرکار میں برائے نام کمل ہوں، میری عادتیں نرگسی ہیں۔ لیکن آپ کا نام بھی مدھوکر ہے اور بھنورے کی یہ عادت دُنیا جانتی ہے کہ وہ ایک پھُول کو چوس کر دوسرے پھُول پر جا بیٹھتا ہے، کیا تمہاری عادت بھی ایسی ہی ہے مدھوکر، کیا تم بھی ایک پھُول کو برباد کرکے دوسرے کی تلاش کرتے ہو۔ نہیں مدھوکر مجھے تم سے یہ امید نہیں ہے اور ہاں آج تو کمل خود مدھوکر کے قدموں میں گرنے کو تیار ہے۔ کتنا عجب انقلاب ہے، مدھوکر تیرے گونجنے میں معلوم کیا جادو ہے کہ جس نے کمل کو بیخود کردیا ہے۔ اب کہو مدھوکر مجھے دل دینے میں کیا ہرج ہے؟

"کوئی ہرج نہیں کمل۔ مجھے اس کا خیال نہیں ہے" مدھوکر نے ہنستے ہوئے کہا، لیکن میں گناہ سے بچنا چاہتا ہوں، کمل میں تمھیں دولت کا لالچ دے کر ڈبونا نہیں چاہتا، ہاں دل کے عوض صرف دل چاہتا ہوں، کیا ایسا ہوسکتا ہے؟ کیا تمھیں یہ منظور ہے۔ کیا تم اتنی آزاد خیال ہو۔ نہیں کمل تم ابھی نادان ہو ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں، اگر تم مجھے چاہتی ہو تمھیں مجھ سے محبت ہے تو تم کو مجھ سے شادی کرنی ہوگی کیا تم اسے قبول کرلوگی، کیا تمہارے عزیز تم کو اس بات پر آمادہ ہونے دیں گے۔ کیا تمہارے گھر والے اس کام میں تمہارا ساتھ دیں گے؟ نہیں کمل ایسا نہ ہوسکے گا، تم سے اُن کی ہزاروں امیدیں وابستہ ہیں۔ تمہاری بدولت وہ عیش کررہے ہیں، وہ اپنے گھر کا چراغ دوسرے کے گھر میں کیوں جلنے دیں گے۔ کمل کوئی یہ پسند نہ کرے گا کہ دوسرے کے گھر میں روشنی کرکے خود اندھیرے میں بیٹھا رہے۔

لیکن سرکار روشنی خود ہی ختم ہوجائے گی تو بھی اُن کو اندھیرے میں بیٹھنا ہی پڑے گا اور سہارا؟ تو وہ ہر انسان کو چاہیئے میں بھی تو اپنا سہارا ہی ڈھونڈھ رہی ہوں اور مدھوکر میرا سہارا صرف تم ہو، میں خود گناہ سے نکلنا

چاہتی ہوں اور تم ایسے وقت میں مجھ سے کنارہ کر رہے ہو۔ مدھوکر، میرے مدھوکر مجھ سے وعدہ کر لو۔ میری تمناؤں کو یوں پامال نہ کرو۔ رہا گھر والوں کا سوال تو ان سے میں نبٹ لوں گی ــــــ کمل نے یہ کہہ کر ملتجی نظروں سے مدھوکر کی طرف دیکھا۔

مجھے منظور ہے کمل لیکن دیکھو جلدی نہ کرو، ہر کام سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے اور ایسے کام کا انجام اچھا ہی ہوتا ہے۔ مجھے اگر ڈر ہے تو صرف یہ کہ تمہارے عزیز و اقارب مجھ سے تمہیں چھین لیں گے۔

نہیں نہیں مدھوکر، اب کمل تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔ اگر ــــ کمل کو زبردستی مدھوکر سے جدا کیا گیا تو اس کا رنگ و بو ختم ہو جائیگا۔ تازگی جاتی رہے گی اور کیف و کم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیگا۔

اچھا کمل جب تم اپنے ارادہ میں اسقدر پختہ ہو تو میں بھی ہر طرح تیار ہوں لیکن ایک مرتبہ پھر کہتا ہوں کہ جلدی نہ کرو۔ ہر کام کا وقت مقرر ہوتا ہے، کمل پہلے تم اپنے رشتہ داروں کو راضی کر لو۔

"نہیں مدھوکر اب کمل کسی اور سے کچھ نہیں چاہتی۔ میں ان لوگوں سے ملنا بھی نہیں چاہتی۔ میں گناہ کی دلدل سے نکل کر پھر اس میں کودنا نہیں چاہتی تم ان لوگوں کو گھر واپس جانے کی اجازت دے دو، ان سے کہدو کہ آج کمل قطعی طور پر فروخت ہو چکی ہے اور اس کی ایسی قیمت لگ چکی ہے کہ اب اس کو بازار میں بیٹھ کر اپنی نمائش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"نہیں کمل جلدی نہ کرو، انہیں رات بھر تو سو لینے دو ما ندہاں مجھے بھی دنیا کا سامنا کرنا ہے۔ مجھ کو بھی کچھ غور کرنے کا موقع دو۔"

"کیوں مدھوکر ابھی سے تمہارے قدم ڈگمگانے لگے۔ کیا وہ قول و قرار سب بھول گئے۔ مدھوکر تم شاعر بھی تو ہو لیکن شاعر کو اتنا تنگ نظر نہیں ہونا چاہئے شاعر کو دنیا سے ڈرنا نہیں چاہئے، وہ اپنی شاعری کی نشر و اشاعت میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ مدھوکر تم شاعر ہو اور میں تمہاری شاعری۔"

"تم سمجھیں نہیں کمل۔ میں ڈرتا نہیں ہوں۔ لیکن بغیر سوچے مجھے کچھ کرنا بھی نہیں چاہتا۔ میں تم سے کچھ زیادہ دنیا کا تجربہ حاصل کر چکا ہوں، دنیا کو صرف دیکھنا ہی نہیں بلکہ برتنا بھی ہے، مجھے ڈر یہ ہے کہ تمہارے رشتہ دار تمہاری خیالی عمارت کو گرا دیں گے، وہ معصومیت اور پاکیزگی کے ملبوس پر گناہ کی ظاہری گلکاریوں کو ترجیح دیتے ہیں۔"

"تم اس کا خیال نہ کرو مدھوکر، دیکھو رات ختم ہو رہی ہے اب تم سو جاؤ۔"

"میں سو جاؤں کمل، کس طرح۔ جب تک تم نہ سوؤ گی مجھے نیند نہیں آئیگی اب تو دو دل ملکر ایک ہو چکے ہیں۔"

"میں سو جاؤں مدھوکر، مجھے اسوقت تک نیند نہیں آئے گی جب تک وہ لوگ میری نظروں کے سامنے ہیں، انہوں نے میرا سکونِ قلب چھین لیا ہے میں بھی انہیں غارت کرنا چاہتی ہوں۔"

"نہیں کمل ایسا نہ کہو، کیا اسی دن کے لئے ان لوگوں نے تمہیں پرورش کیا تھا، کمل عقل سے کام لو، اور ان سے صاف صاف یہ کہدو کہ محبت کرنا گناہ نہیں۔

"مدھوکر ہمارے مذہب میں محبت کرنا گناہ ہے وہ لوگ محبت کو کیا جانیں جو محبت کے نام سے روز کھیلتے ہیں۔ محبت صرف ایک "لفظ" کی صورت میں اُن کے ہونٹوں پر ہر وقت مسکراتی ہے اور دل پر اس کا مطلق اثر نہیں ہوتا ــــ مدھوکر ان کے پاس ایسا دل کہاں جو محبت جیسی امانت کو سنبھال سکے۔"

"سچ کہتی ہو کمل، مگر تم بھی تو انہیں میں سے ہو، کیا تمہارا دل اس امانت کو سنبھال سکے گا" مدھوکر یہ کہہ کر مسکرایا۔

"تم دھوکا کھا رہے ہو مدھوکر، دھوکا۔ اب میرے پاس میرا دل کہاں تمہارا دل ہے۔ میں تمہیں سے پوچھتی ہوں کیا تم محبت کا بار سنبھال سکو گے۔"

"کمل میں اپنی شکست منظور کرتا ہوں، اچھا اب سو جاؤ۔ دیکھو دن نکل آیا ہے، آؤ میرے ہمراہ آؤ، میرے بستر پر آرام کرو۔ میں تمہارے ہی پاس بیٹھا ہوں۔"

"نہیں مدھوکر تم نہ سوؤ گے تو میں بھی نہیں سو سکوں گی۔" "کمل تمہیں ہماری قسم سو جاؤ۔ اب ہم سونا نہیں چاہتے۔" "قسم نہ دو مدھوکر تمہارے حکم کے مطابق آنکھیں بند کئے لیتی ہوں" یہ کہہ کر وہ مدھوکر کے بستر پر دراز ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک

مدھوکر اس کو دیکھتا رہا پھر اٹھا گھڑی دیکھی تو ساڑھے سات بجے تھے، کمرے سے باہر نکلا، باہر اسکا ایک اڈی سی بیٹھا ہوا تھا، اس نے سلام کیا، مدھوکر مسکرایا اور کہا انیل آج میں تمہارا سہارا چاہتا ہوں۔

"سہارا! سرکار میں آپ کا خادم ہوں فرمایئے کیا ارشاد ہے"

"انیل اسوقت تم مجھے اپنا حاکم نہیں بلکہ دوست سمجھو اور جو کچھ میں پوچھوں اس کا دوستوں کی طرح بے تکلف جواب دو۔ یہ کہہ کر وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ انیل نے ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیا۔ سرکار دوستانہ طریقے سے ہر وقت سچی بات کہی جاتی ہے" ہاں ہاں انیل میں بھی تم سے صحیح مشورے کی درخواست کرتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ چلو، یہ تم نے دیکھا ہماری خوابگاہ میں کون سو رہا ہے"۔ جی ہاں یہ کمل ہے اور کمل مدھوکر کی آغوش میں بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے، نظر کی لگا تو ہے نا سرکار انیل تم نے بہت خوب کہا۔ اگر اب مدھوکر ہمیشہ کے لئے کمل کے ساتھ رہے تو کیا برائی ہے۔ بولو انیل جلدی جواب دو۔

سرکار برا تو نہیں مگر آج تک کمل نے مدھوکر کو تباہ و برباد ہی کیا ہے۔ ہم اپنے مدھوکر کو زندگی تباہ کرنے کے لئے کمل تک کیوں جانے دیں۔ ہم اُسکے محافظ ہیں لیکن ہماری کوشش اس جنون کو تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ سرکار ہمارے دل میں گلاب کی محبت ہے کیونکہ ہم نے اُس کو دوستی کے پانی سے سیراب کیا ہے ہم مدھوکر کو نہیں چھوڑ سکتے اور مدھوکر کو وہ کام نہیں کرنے دیں گے جس سے اُسکی تباہی یقینی ہو جائے۔ مانا کہ آپ کو کمل سے بے پایاں محبت ہے، لیکن دنیا کیا کہے گی، آپ اسے نوکر رکھ سکتے ہیں، مگر ہم اس کو مہارانی سمجھ کر سلام نہیں کرینگے۔

انیل مجھے ایسی زندگی منظور نہیں۔ مجھے ڈوب جانے دو، میں محبت کے دریا میں کودنے کے لئے تیار ہوں۔

سرکار قصور معاف یہ وہ دریا ہے جس میں ہزاروں بیڑے غرق ہو چکے ہیں جو اس میں گیا سلامت واپس نہ آیا۔ حضور آپ اپنے فرض کو بھول رہے ہیں، یاد رہے کہ آپ کا فرض ہے رعایا کی پرورش۔ آپ کو رعایا کی فریاد سن کر انصاف سے کام لینا ہوگا، اسوقت آپ مجھ کو اپنا اڈی سی نہ سمجھیں بلکہ میں آپ کی رعایا میں سے ایک ادنیٰ فرد کی حیثیت سے فریاد کر رہا ہوں، کیا داد ملیگی حضور؟

"ہاں ہاں کیوں نہیں ہم ضرور تمہاری فریاد سنیں گے کہو کیا چاہتے ہو؟

حضور اراکینِ حکومت میں سے ایک گناہ کی طرف راغب ہو رہا ہے، رعایا کو یہ منظور نہیں۔ کیا آپ اس کو گناہ سے باز نہیں رکھ سکتے۔ رعایا چاہتی ہے کہ سلطنت کی بنیاد نیکی اور فلاح پر قائم ہو، اس کے اراکین میں کسی کو گنہگار نہ ہونا چاہیے اور خصوصاً ایک رکنِ اعظم کو تو گناہ کا خیال بھی نہ کرنا چاہیئے۔

ٹھیک ہے انیل مجھے بدکار اراکین پسند نہیں نام بتاؤ وہ کون ہے؟

معاف فرمایئے گا حضور وہ آپ ہی ہیں۔ آپ گناہ کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں۔ کیا رعایا ایک ناچنے اور گانے والی کو اپنی ماں سمجھے گی اور کیا اس کی اولاد سعادتمند ہو سکتی ہے۔ نہیں مہاراج آپ خود گناہ کر کے تمام رعایا کو اس میں ملوث کر رہے ہیں۔

لیکن انیل وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور محبت کرنیوالے کو ٹھکرانا بھی ایک گناہ ہے۔

بجا ارشاد ہے سرکار محبت کرنیوالے کو ٹھکرانا یقیناً گناہ ہے۔ لیکن اس طوائف سے پہلے رعایا نے آپ سے محبت کی ہے کیا اس کی محبت کو ٹھکرا کر آپ گناہ کے مرتکب نہیں ہو رہے ہیں؟

خیر انیل مجھے الجھن میں نہ ڈالو۔ آج رات بھر جاگا ہوں، اب آرام کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو تم خیال رکھنا اس کی نیند میں خلل نہ آئے بیچاری ابھی سوئی ہے۔

اوہو مہاراج تو آج بد شہر معلوم ہوتے ہیں۔ خیر آپ تشریف لیجایئے میں پہرا دیتا ہوں۔ میں اپنا فرض بجا لاؤں گا، مگر اُس کو بھی یہاں سے ٹال کر رہوں گا۔ کچھ دیر یہ آرام سے سو لیں مگر اس کے بعد ان کو یہاں سے جانا ہی پڑے گا۔

مہاراج یہ سُن کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

صبح کے کوئی دس بجے ہونگے۔ کمل ابھی تک سو رہی تھی۔ مگر مدھوکر اور کمل کی شادی کی افواہ تمام راج محل میں پھیل چکی تھی، چھوٹے بڑے سب کی زبان پر یہی بات تھی اور تقریباً سب اس کام کو برا سمجھ رہے تھے۔ سمجھدار لوگ مہاراج سے کہہ رہے تھے، مہاراج ہم آپ کو ایسا نہ کرنے دیں گے۔ ہمارا تو خیال کیجئے ہم دنیا کے سامنے نظریں نیچی کرنا نہیں چاہتے۔ لوگ کہیں گے۔

کہ جاگیردار مدھوکر کے پاس تمام خوشامدی جمع ہوگئے ہیں، اس لئے جاگیردار کو اس گناہِ عظیم سے نہ روکا۔

کمل کی بہن کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ کمل آج جاگیردار سے شادی کرلیگی۔ اُس کی اُمیدوں کی دُنیا اُجڑ گئی، وہ دیوانہ وار جاگیردار کے کمرے میں داخل ہوئی جہاں کمل آرام سے سو رہی تھی۔ مدھوکر وہاں نہ تھے، کمل کی بہن نے کمل کو جگاتے ہوئے کہا۔ کمل اُٹھو دیکھو دن بہت نکل آیا ہے۔

"جاؤ بہن واپس جاؤ، کمل تمہارے لئے مر چکی، اب تم اس کو حاصل نہیں کرسکتیں وہ خود بھی آنا نہیں چاہتی وہ کسی کے ہاتھ فروخت ہوچکی ہے" کمل نے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

دوسری طرف جاگیردار کو سب سمجھا رہے تھے۔ مدھوکر تم خود سمجھدار ہو، غور تو کرو تم کیا کر رہے ہو۔ کیوں گناہ کو دعوت دے رہے ہو۔ ہم تمہیں ایسا نہ کرنے دیں گے۔

کمل کی بہن کمل سے کہہ رہی تھی "کمل تم ہرگز ایسا نہیں کرسکتیں۔ ہم تمہیں زبردستی اپنے ہمراہ لے جائیں گے، مہاراج بھی تم کو نہیں روک سکتے اور وہ تو سمجھدار آدمی ہیں ہم اُن کو سمجھا لیں گے

"تم مہاراج کو کیوں بدنام کرتی ہو اُنھوں نے مجھے نہیں روکا ہے بلکہ میں خود رُکنا چاہتی ہوں، بہن خدا کے لئے مہاراج کو بدنام نہ کرو" کمل نے بستر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

سامنے سے مہاراج اپنے چند دوستوں کے ہمراہ اس طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ اُن کی اور کمل کی نظریں چار ہوئیں۔ کمل کی نگاہیں کسی سہارے کی متلاشی تھیں لیکن مہاراج کی نظریں گناہ کش تھیں۔ مہاراج نے کمل کو تسلی دیتے ہوئے کہا نادان نہ بنو، ذرا صبر سے کام لو۔ مدھوکر تمہارا ہوچکا ہے مگر خیال تو کرو کہ تم کیا کر رہی ہو، مجھے دُنیا کے سامنے یوں بدنام نہ ہونے دو۔ مدھوکر کی سچائی اور نیک نیتی کا یقین اُن کے دلوں سے اُٹھ جائیگا۔ اگر تم ان لوگوں کو راضی کرسکو تو میں بھی تیار ہوں۔

کمل کی بہن نے مہاراج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو کیا ہم اپنی زندگی بھر کی کمائی آپ کے سپرد کردیں۔ کیا اسی امید پر ہم نے کمل کو پالا تھا۔

نہیں کمل تم ایسا نہیں کرسکتیں اور مہاراج آپ سے بھی ہمیں یہ اُمید نہیں ہے اگر آپ اجازت دیں تو ہم کمل کو اپنے ہمراہ لے جائیں، یہ ناممکن ہے کہ جانے سے انکار کیے۔ یہ کہہ کر وہ ملتجی نظروں سے مہاراج کو دیکھنے لگی

دیکھو کمل، مدھوکر نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ تم نے آج مجھے بہت شرمندہ کیا، میں کہتا تھا کہ جلدی نہ کرو اب یہ لوگ تم کو میرے پاس ہرگز نہ چھوڑیں گے اور میرے اعزا بھی اس بات کے لئے تیار نہیں، میرے خیال سے کچھ روز اور ان لوگوں کے ساتھ بسر کرلو۔

"سرکار مجھے پھر گناہ کی طرف ڈھکیل رہے ہیں آپ خدارا مجھے اپنی محبت کی آغوش میں پناہ دیجئے"

"نہیں کمل تمہیں ہماری قسم آج تو ان کے ساتھ چلی جاؤ" مدھوکر نے غمگین ہوکر کہا

"قسم نہ دو مدھوکر میں آج ان کے ہمراہ چلی جاؤنگی لیکن کل ضرور میں دوسرا راستہ اختیار کرلونگی اور ہاں تم بہت بہادر نکلے آج معلوم ہوا، اچھے شاعر ہو جو اپنی شاعری کو دوسروں کے حوالے کئے دیتے ہو" کمل نے محبت بھری نگاہ سے مدھوکر کی طرف دیکھا اور خاموش ہوگئی۔

موٹر آئی۔ کمل کو زبردستی اُس کے رشتہ داروں کے ساتھ اس میں سوار کیا گیا کمل نے ایکبار پھر مدھوکر کو دیکھا، اُسکی نظریں صاف کہہ رہی تھیں کہ بھنورا آخر بھنورا ہی ہوتا ہے۔ اسکو پھول کی کیا پروا خواہ مُرجھائے یا تروتازہ رہے۔ مدھوکر کا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ محبت کرنا گناہ ہے اور گناہ کا سامنا بہادر ہی کرتے ہیں۔ مدھوکر کے قدم ڈگمگا گئے، اُسے اپنی بہادری پر اعتماد تھا۔

موٹر چلنے لگی۔ موٹر میں سے کسی نے روتے ہوئے کہا:-

مری بہار چمن تھی فقط خزاں کے لئے — گری جو برق تو میری ہی آشیاں کے لئے

مدھوکر اس شعر کو دُہرا تا رہا حتیٰ کہ ایک دن اور ایک رات ختم ہوگئی۔ وہ بیچین تھا دوسرے دن صبح آٹھ بجے کے قریب اُسکو ایک تار ملا جس میں لکھا تھا کمل زہر کھاکر مرگئی" مدھوکر کو رنج ہوا اگر چند روز کیلئے مدھوکر آخر مدھوکر ہی تھا وہ اپنی فطرت کیسے بدلتا اس نے دوسرے پھول کی تلاش شروع کردی.... ایک پھول کی رنگینی ختم کرنے کے بعد

خانشری امام الدین خاں ستار نواز سوادربار (باجوڑ)

معلوماتِ نجمہ

خرابی اسکے پردوں میں نہاں معلوم ہوتی ہے
مری ہستی مجھی کو داستاں معلوم ہوتی ہے

وفورِ جوشِ سجدہ کی نہ پوچھو کارفرمائی
جبینِ شوق جزوِ آستاں معلوم ہوتی ہے

قوی ہوتا ہے جذبِ جستجو ہر نامرادی سے
بظاہر سعیِ پیہم رائیگاں معلوم ہوتی ہے

پیامِ دلبری دیتی ہے مجھ کو کس لگاوٹ سے
ادائے حسن دل کی رازداں معلوم ہوتی ہے

مری تربت پہ رکھا ہاتھ کس رشکِ مسیحا نے
رگِ سنگِ لحد نبضِ طپاں معلوم ہوتی ہے

نہاں ہیں حسن کی رعنائیاں پہنائے عالم میں
جبھی تو آجتک دنیا جواں معلوم ہوتی ہے

دماغ اپنا قدم رکھتے ہی پہونچا عرشِ اعلیٰ پر
زمیں کوئے جاناں آسماں معلوم ہوتی ہے

لگا رہتا ہے دہر کا رنج و غم کا عیش و عشرت میں
ہر اک راحت جہاں کی غم نشاں معلوم ہوتی ہے

مرادِ دردِ نہاں ہے آشکارا میری صورت سے
خموشی بھی مری نجمہ فغاں معلوم ہوتی ہے

آنسہ نجمہ تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

نوائے شفا

ہر اک دل میں ترا جذبہ اگر مستور ہو جائے
تو پھر ہر شخص اپنے وقت کا منصور ہو جائے

اگر انسان دنیائے خودی سے دور ہو جائے
خدا تو کیا ہے اہلِ خدا مشہور ہو جائے

ترے جلووں سے نظارہ اگر معمور ہو جائے
تو جس ذرّے پہ نظریں ڈالدیں وہ طور ہو جائے

اگر تیری نظر زینتِ فروزِ طور ہو جائے
تو ناظر تیرا ناظر کیوں نہ ہے منظور ہو جائے

اثر اتنا تو ہو یارب ہمارے جذبِ الفت کا
وہ خود پردہ اٹھانے کے لئے مجبور ہو جائے

یہ ممکن ہے بڑھا لوں وسعتِ ذوقِ نظر میں بھی
ترا جلوہ اگر حدِ نظر سے دور ہو جائے

حقیقت میں نظر ہو تو خدا کا پوجنے والا
بتوں کو سجدہ کرنے کے لئے مجبور ہو جائے

نہ ہوگا پاس رہکر امتحاں مشقِ تصور کا
وہ جتنا دور ہو سکتا ہو اتنا دور ہو جائے

شفا مجبوریاں ہیں یہ دنی ہیں تیرہ قسمت کی
کوئی مجبور جب تقدیر سے مجبور ہو جائے

شفا گوالیاری

طوفانِ تمنا

مہمان ہے وہ مہرِ درخشانِ تمنا
کیوں کر نہ چمک جائے شبستانِ تمنا

ہر اشک ہے اک سرخیِ عنوانِ تمنا
دیکھے تو کوئی گوشۂ دامانِ تمنا

اے جوشِ فغاں چھیڑ نہ افسردہ دلوں کو
پنہاں ہے ہر اک قطرہ میں طوفانِ تمنا

میں ذرۂ برباد ہوں دنیائے وفا میں
دل کیا ہے مرا سوختہ سامانِ تمنا

برسائے برسائے گل لالۂ تبسم
کر دیجئے رنگیں مرا دامانِ تمنا

کیوں شوق کی دنیا نہ ہو فردوسِ امن
آغوشِ محبت میں ہے وہ جانِ تمنا

اے کاش ہو پہلی سی تری چشمِ نوازش
دیکھوں میں ہی رنگینیِ ایوانِ تمنا

پھر دیکھ تو ہنس ہنس کے ذرا سوئے فضا بھی
ہلکا سا تبسم ہے ترا جانِ تمنا

فضا جالندہری منشی فاضل ادیب فاضل

آتش کدہ نوبہار

قدیم مجوسی اعتقاد رکھتے تھے کہ دنیا کی ابتدا آگ سے ہوئی ہے، عبد و معبود کے درمیان حقیقی اور معنوی علاقہ صرف آگ ہے۔ چنانچہ مجوسیوں کی مذہبی کتابوں میں اس عقیدہ کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جہاں تک ایران کی تاریخ مذہب کا تعلق ہے اس کی بنا پر آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ صرف آگ کی پرستش کا خیال اس اصول کے ماتحت وجود میں آیا اور اس کے بعد آتش کدوں کی تعمیر ضروری سمجھی گئی تاکہ اجتماعی طور پر اس فرض کی ادائیگی قوم کے لئے ضروری قرار دے دی جائے یہ وحدتِ قوم کا ایک بنیادی اصول ہے، جو کسی نہ کسی رنگ میں ہر نبی اور پیغمبر کے عہد میں اسکی مخصوص ہدایتوں کے ماتحت نشوونما پاتا رہا ہے

تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے پہلے فریدون کے عہد میں آتشکدہ تعمیر کیا گیا بعض کتب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فریدون نے یہ آتش کدہ خراسان میں بنوایا تھا مگر قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اول یہ آتش کدہ کہاں بنایا گیا، لیکن یہ خیال کہ اول فریدون نے بنوایا قطعی طور پر صداقت کے درجہ تک پہنچا ہوا ہے۔

زردشت بعقیدہ اعجام ایک اولوالعزم پیغمبر تھا اُس کے ظہور سے پہلے ایران میں دس آتش کدے موجود تھے لیکن اُس کے ظہور کے بعد ملک میں ہر طرف نہایت کثرت سے آتش کدے تعمیر کئے گئے چنانچہ **جوقل** نے تسلیم کیا ہے کہ ملک میں اس قدر آتشکدے تھے کہ ان کی صحیح تعداد معلوم کرنا آسان نہ تھا۔ البتہ سرکاری کاغذات کا استقصار کے ساتھ معائنہ کرنے کے بعد اُن کی تعداد معلوم کی جا سکتی

علامہ مسعودی نے لکھا ہے کہ جب مسلمان ترقی کی طرف متوجہ ہوئے اور فضائے عالم میں ان کا پرچم لہراتا ہوا نظر آیا تو ایرانیوں نے اس خوف سے کہ کہیں آتشکدوں کو کلیتہً برباد نہ کر دیا جائے، کثرت سے آتشکدے تعمیر کرنے شروع کر دیئے کہ کہیں تو ان کا نام و نشان کسی نہ کسی شہر میں باقی رہیگا۔ مگر مورخ موصوف کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ مسلمان مذہبی عبادت گاہوں کو برباد نہیں کرتے تھے اس سلسلے میں جتنے اعتراضات اسلام کی قوم پر کئے گئے ہیں وہ متعصب عیسائیوں کے کئے ہوئے ہیں، یہاں اس عنوان پر گفتگو کا موقع نہیں ہے بس اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس قسم کے اعتراضات سرتاپا غلط ہیں۔

نوبہار تمام عالم میں جس قدر مشہور و معروف آتشکدے تعمیر کئے گئے ان میں نوبہار جو بلخ میں تھا تاریخی حیثیت سے نہایت اہمیت رکھتا تھا، منوچہر بادشاہ نے ماہتاب کے نام پر اس کو تعمیر کیا تھا۔ دیگر قدیم اقوام کی طرح ایرانی بھی دیوتاؤں کے قائل تھے اور وہ اپنے آتشکدوں کو کسی نہ کسی دیوتا کے نام سے منسوب کرکے تعمیر کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم انسان زیادہ تر جو سیاروں کے نام سے دیوتاؤں کا وجود تسلیم کرتے تھے، یہ علم نجوم کی بگڑی ہوئی اصلاحات کے زیر اثر ضعیف عقائد کا مظاہرہ تھا۔ ورنہ ابتدا میں ماہرینِ علم نجوم نے صرف سیاروں کے اثرات کی بنا پر کچھ اصول ترتیب دئے تھے، جو اپنی جگہ نہایت مفید تھے، آنے والی نسلوں نے حقائق سے روگردانی کرکے بوجہ جہل اس کی صورت مسخ کر دی تھی اور اب وہ اصول دیوتاؤں کے فرضی نام سے قابل پرستش سمجھے جاتے تھے۔

نوبہار کی عمارت نہایت بلند اور مستحکم تھی اور خاص عمارت سو گز سے زیادہ اونچی اور اسی قدر اراضی کو محیط تھی، اُس کی چھت پر آہنی نیزے نصب کئے گئے تھے جنکی بلندی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب کوئی حریر کا پھریرا (جو نیزوں پر اڑا کرتا تھا) ہوا کی تیزی سے الگ ہو جاتا تھا تو کئی میل کے فاصلہ پر جاکر زمین پر گرتا تھا۔

تمام عمارت میں مختلف قسم کے جواہرات لگائے گئے تھے۔ دروازوں کی محرابوں میں بہت قیمتی پتھر تھے۔ عمارت کے مختلف حصوں کو ریشم کے مختلف رنگوں کے غلاف سے آراستہ کیا گیا تھا، پردوں پر سنہری کام اس صنعت کے ساتھ کیا گیا تھا کہ یہ پردے سالوں میں بھی اپنی چمک دمک نہ کھوتے تھے۔

عمارت کے چاروں طرف بہت سے حجرے بنائے گئے تھے جن کا طرز تعمیر ایشیا کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ تھا، ان حجروں میں مجاور رہتے تھے اور اکثر سفر کرنے والے مذہبی پیشوا انہیں میں قیام کرتے تھے۔ مسافروں کے لئے ہر قسم کا سامان آرام و آرائش ہر وقت موجود رہتا تھا، حکومت کی طرف سے ایک گلہ

خاص طور پر اسی کام کے لئے متعین رہتا تھا۔

مذہبی عمارتوں سے متعلق حجرے بنانے کا دستور ایشیا میں بہت قدیم ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں شاہجہانی عمارتوں میں آج بھی یہ چیز دیکھی جا سکتی ہے مسجد جامع اور تاج محل سے متصل حجروں کا وجود ثابت کر رہا ہے کہ کسی وقت یہ مسافروں کے آرام کے لئے اور اسلامی مدارس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تعمیر کئے گئے تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ بڑے بڑے علماء انھیں حجروں میں بیٹھ کر حدیث و فقہ کی تعلیم دیتے تھے۔

نوبہار پر چڑھاوے میں بڑی بڑی رقمیں چڑھائی جاتی تھیں اور سبز حریر کے پھریرے جو بطور چڑھاوے کے آتے تھے ان خادموں کو دیدیے جاتے تھے جو معمولی درجہ رکھتے تھے جن میں سے ہر ایک ان نذرانوں کی بدولت اپنے زمانے کا قارون تھا۔ تاریخ میں آپ نے جعفر برمکی کی دولت کا حال پڑھا ہوگا وہ سب اس نوبہار کا طفیل تھا کیونکہ جعفر برمکی اس آتشکدے کا متولی تھا۔

ایرانی اپنے عقیدے کے مطابق سال میں ایک مرتبہ نوبہار جا کر فریضہ حج ادا کرتے تھے، بالکل اسی طرح جیسے کہ مسلمان طواف کعبہ کرتے ہیں وہ بھی نوبہار کا طواف کرتے تھے گویا یہ عمارت ان کا کعبہ تھی۔ اس کا متولی خود مختار تھا۔ اس کے معاملات و اختیارات میں کوئی دخل نہیں دے سکتا، ایک بہت بڑی جائداد اس کے قبضے میں تھی جس کا وہ شخصی طور پر مالک تھا، اس کے اختیار شاہانہ تھے۔ **زردشت** جو ایرانیوں کا اولوالعزم پیغمبر بیان کیا جاتا ہے، نوبہار میں مدتوں تک گوشہ نشین رہا کہتے ہیں کہ وہ اپنی روحانی برکتوں سے نوبہار کی عظمت و وقعت میں اضافہ کرتا رہا اس واقعہ کی وجہ سے بھی ایرانیوں کی نظروں میں نوبہار کی بڑی قدر و عظمت تھی یہاں تک کہ **لہراسپ** جب ضعیف ہوگیا تو حکومت اپنے بیٹے گشتاسپ کو سپرد کرکے خود نوبہار کا مجاور بن گیا اس واقعہ کو دقیقی نے گشتاسپ نامہ میں لکھا ہے ؎

چوں گشتاسپ را داد لہراسپ تخت ۔۔۔ فرود آمد از تخت و بربست رخت
بہ بلخ گزیں شد دراں نوبہار ۔۔۔ کہ یزداں پرستان آں روزگار
مر آں خانہ را داشتندے چناں ۔۔۔ کہ مر کعبہ را تازیاں ایں زماں

تیسرے شعر کو دیکھئے دقیقی کہتا ہے کہ جس طرح آج اہل عرب کعبہ کی عظمت و حرمت کرتے ہیں بالکل اسی طرح اس زمانے میں یزداں پرست نوبہار کی کرتے تھے۔ لفظ یزداں پرست غور طلب ہے، یہ صحیح ترجمہ ہے حقیقی مسلمان کا، ملک و زمان کی وجہ سے حقائق تبدیل نہیں ہوتے۔ اسلام ہر ملک میں کسی نہ کسی خاص وقت پر اپنے زریں اصول پیش کرتا رہا ہے اور قوموں نے اس سے سیدھا راستہ سیکھا ہے۔ ہاں مفسدین نے اپنی طمع نفس کی وجہ سے اسکی صورتوں کو مسخ کر دیا جسکی وجہ سے حق و باطل میں تمیز کرنا دشوار ہو گیا ”لکل قوم ہاد“ سے اسی طرف اشارہ ہے فافہم۔

حکومت و آزادئ قوم کے ساتھ ساتھ نوبہار کی بہار قائم تھی کہ دفعتہً سرزمین عرب سے ایک نورانی سیلاب اٹھا جو تمام عالم کو مجلا کرنا چاہتا تھا، ایران؛ جو اسوقت بد اعتقادی اور جہالت کا مرکز بن رہا تھا، اس نورانی سیلاب کا مقابلہ کیا کرتا وہ تو جو چیز ایرانی قوم کھو چکی تھی اسے بخشنے آیا تھا یعنی تمدن و معاشرت انسانی کا بلند معیار مگر ایرانی اس حقیقت کو نہ سمجھے اور اس سے مقابلہ کرکے اپنی ہستی کو بھی فنا کر بیٹھے جب قوم ہی مٹ گئی تو نوبہار کو کون بچاتا چنانچہ ۳۱ ھ ۶۵۱ء میں اسلامیوں نے خراسان فتح کیا اور یہ آتشکدہ بھی سرد ہو گیا۔

الم مظفرنگری

رنگِ تغزل

سمجھ لیں گے حقیقت نقشِ باطل دیکھنے والے ۔۔۔ رخِ زیبا کو دیکھیں ماہِ کامل دیکھنے والے
نظر جو آ رہا ہے وہ طلسم راہِ الفت ہے ۔۔۔ ابھی منزل کہاں آثارِ منزل دیکھنے والے
کہیں ارماں کا مرقد ہے کہیں حسرت کا مدفن ہے ۔۔۔ خبر بھی ہے تجھے اے جانبِ دل دیکھنے والے
غبارِ کارواں بھی ہو گیا رخصت نگاہوں سے ۔۔۔ تو کب تک سوئیگا اے خوابِ منزل دیکھنے والے
کوئی ایسے میں آکر کھینچ لے تصویر مقتل کی ۔۔۔ ہوئے جاتے ہیں بسمل رقصِ بسمل دیکھنے والے
یہی قسمت کہ میں غرقابِ دریائے حوادث ہوں ۔۔۔ الٰہی خوش رہیں آغوشِ ساحل دیکھنے والے

کسی سے پوچھنے کی ہم کو اے اسلم ضرورت کیا
سمجھ لیتے ہیں سب کچھ رنگِ محفل دیکھنے والے

محمد اسلم خاں اسلم میرٹھی

انتظارِ نیم شبی

چاندنی آنکھ کھلی نور کا سیلاب آیا
سحر زا منظرِ خوابیدہ۔ نظر پر چھایا

آسماں یخ ہے زمیں یخ ہے فضائیں یخ ہیں
جم گئی ہیں مہ کامل کی شعاعیں، یخ ہیں

آہ، سوتے ہوئے غمناک نظاروں کا سماں
چمنستاں میں جدھر جاؤ ہواؤں کی فغاں

گوشۂ باغ میں اک بت کی طرح ہوں خاموش
روح ہے تیری محبت کے نشے میں مدہوش

قافلے تیرے خیالوں کے چلے آتے ہیں
دیے اُمید کے جلتے ہی بجھے جاتے ہیں

تجھ سے ملنے کی اُمیدیں نہیں سونے دیتیں
اور مایوس بھی مجھ کو نہیں ہونے دیتیں

راجہ مہدی علی خاں

سازِ راز

آیا خیال یار تو آتا چلا گیا
ہستی کی مستیوں کو بڑھاتا چلا گیا

جتنا میں دل سے اُس کو بھلاتا چلا گیا
اُتنا ہی اور یاد وہ آتا چلا گیا

آیا جو دل میں کوئی تو آتا چلا گیا
برباد بستیوں کو بساتا چلا گیا

تھامے جگر وہ سامنے بیٹھے رہے خموش
میں داستانِ درد سُناتا چلا گیا

سجدے جبینِ شوق میں تڑپا کئے مری
نقشِ قدم وہ اپنے مٹاتا چلا گیا

اے راز دہر میں ہوا اُتنا ہی تجربہ
دُنیا میں جتنی ٹھوکریں کھاتا چلا گیا

اسمٰعیل کھوکر راز جوناگڈھی

شورِ ہستی

ترے نغموں کی رنگینی گلستاں میں یہاں تک ہے
کہ ہر ذرہ درخشندہ زمیں سے آسماں تک ہے

جہاں میں اللہ اللہ یہ جمال آرائیاں تیری
بہارِ حسن سے رنگین دامانِ خزاں تک ہے

فضاؤں میں ہم آغوشِ تصور ہے وہ رنگینی
کہ دُنیا ہم کنارِ حسن و مستی کہکشاں تک ہے

جو بلبل چہچہاتی ہے تو غنچے مسکراتے ہیں
عجب خوشبو چمن سے لے کے پھیلی آشیاں تک ہے

ہماری زندگی کے ختم ہو جائیں گے سب قصے
یہ سارا شورِ ہستی ایک مرگِ ناگہاں تک ہے

ذرا پروردگارِ دین و ملت سے کوئی کہدے
کہ تیرے حُسن کا قصہ ہماری داستاں تک ہے

ہماری یہ کہانی دیکھ لینا رنگ لائے گی
بظاہر گرچہ شہرت دردِ دل کی داستاں تک ہے

درد کاکوروی

ایک خط اور اُسکا جواب

استاد محترم! تحفۂ سلام و نیاز!

قبلہ "موحدِ اعظم" پڑھنے کے قبل تک اپنے دل کی پہنائیوں میں جو احترام میں آپ کے تبحرِ علمی، پاکیزگیٔ خیالات اور صفائے قلب کا کرتا تھا اس کا اللہ تعالیٰ شاہد ہے۔ اتنی جرأت بھی نہ کرتا تھا کہ میں آپ کو بلا واسطہ حضرت اعجاز صدیقی کوئی خط بھی لکھوں۔ میری نظر میں آپ کے کلام کی از حد وقعت تھی لیکن افسوس اور صد افسوس کہ "موحدِ اعظم" لکھ کر آپ نے میرے اور ہر صحیح العقیدہ مسلمان کے جذباتِ مذہبی میں یک ہیجان پیدا کر دیا۔ نظم کے مطالعہ اور بغور مطالعہ کے بعد میں نے آپ کے متعلق یہ خیالات قائم کر لئے ہیں کہ آپ دماغی ذہنی اعتبار سے ایک زبردست زباں داں اور عروضی ہیں اور بس۔ آپ کے مذہبی عقائد بالکل کمزور ہیں اور قابلِ اصلاح ہیں۔ فلسفہ (فلسفہ کی املا غلط ہے) اور علم نفسیات سے آپ کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ گستاخی معاف! لیکن میں مجبور ہوں ؎

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے
(سعدیؔ)

جن خیالات کو آپ فلسفہ اور نفسیات گردانتے ہیں وہ میرے نزدیک محض وسواس شیطانی ہیں:—

خیال حوصلۂ بحر می پزم ہیہات
چہاست بر سر ایں قطرۂ محال اندیش
(حافظؔ)

آئیے بالاختصار ہیں پر میں آپ کے خیالات کی تردید کئے دیتا ہوں جو میرا ایک اہم اور اسلامی فرض ہے۔

(۱) شیطانِ رجیم مشرک تھا چونکہ اُس نے اللہ جل شانہٗ کا حکم ٹالا، نعوذ باللہ ان معنوں میں وہ اپنے آپ کو ربِ قدیم کا ہمسر اور حریف سمجھتا تھا (۲) سجدۂ آدم (استغفر اللہ) "خبط" نہیں تھا "شرک و بدعت" نہیں تھی یہ محض امرِ ربی تھا حُسنِ کامل کی ایک ادا۔ صدقِ دل اور عجز و انکساری کا ایک امتحان (۳) ابلیس عاشقِ خدا نہیں تھا، متکبر عاشقِ خودی تھا۔ وہ شبعہ (غالباً یہ لفظ شعبہ کی مٹی خراب کی گئی ہے) عرفانِ کامل کا عارف ہرگز نہیں تھا۔ محض رب عالم الغیب والشہادہ کے مقابلہ میں جاہلِ مطلق چونکہ وہ اللہ کی مخلوق اور اُس کا بندہ تھا اس کو اللہ ہی نے تا قیامت زندگی عطا فرمائی وہ اپنی قوتوں کے ساتھ نہیں زندہ ہے (یعنی زندہ نہیں ہے) (۴) شیطان ذریعۂ تمیز یزداں ہرگز نہیں ہے، بلکہ گمراہ کن نسلِ آدمؑ اور دشمن الٰہی ہے۔ تقلید شیطانی باعثِ گمراہی ہے۔ صرف انبیا علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور اولیائے کرام مبلغانِ توحید اور موحدانِ وحدت الٰہی تھے اور قسم اللہ کی حضور کریم رسولِ خدا محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم ہی موحدِ اعظم تھے۔ (صل علی صحیح ہے)

ان دلائل پر غور فرمائیے اور فوراً اپنے خیالات کی تردید خود کیجئے۔ اس نظم کو اپنے دفترِ کلام سے نکال دیجئے۔ خدا تعلیٰ (خدائے تعالیٰ) آپ کو توفیق عطا فرمائے آمین! بہر حال میں اس خط کے بعد سے آپ کا شاگرد نہیں ہوں۔ "ذکرِ شہادت" پر اصلاح نہ کیجئے واپس کر دیجئے۔ "میرے شاگرد" میں میرا تذکرہ نہ شائع کیجئے۔ وہ تذکرہ بھی واپس کیجئے۔ اللہ پاک کی تائید اور توفیق سے آپ کی نظم کے جواب میں میں نے بھی ایک نظم لکھی ہے۔ جس کو میں اخبارات اور کثیر الاشاعت رسائل میں محض ایک اسلامی فریضہ ادا کرنے کی خاطر ضرور چھپواؤں گا، جسکے آپ منتظر رہئے۔ جواب کا منتظر ہوں۔ آپ کو میرا آخری عقیدتمندانہ سلام اور شاگردانہ نیاز۔

نیازمند
ڈاکر بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

الجواب

مولوی صاحب، آپ کا عجیب و غریب خط میری نظر سے گذرا۔ جو باوجود آپکے بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ہونے کے املا اور زبان کی خامیوں سے خالی نہیں جس نظم پر آپ نے بخیالِ خود تنقید کی ہے اسے سمجھنے کے لئے بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ہونے کی نہیں بلکہ ماہرِ معقولات ہونے کی ضرورت ہے۔ حقائق و معارف سے آگاہی کی ضرورت ہے۔ آپ صرف روایت پرست مسلمان ہیں۔ جن کے متعلق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا ہے ؎

حقیقت روایات میں کھو گئی
یہ اُمت خرافات میں کھو گئی

جس طرح شیطان مصلحت و مشیتِ ایزدی کو نہ سمجھا اسی طرح آپ بھی میری نظم کا مقصد و منشا سمجھنے سے قاصر ہے۔ و ذالک خسران العظیم۔

تعجب ہے کہ آپ عزازیل کی حیات ماقبل واقعۂ آدمؑ سے بھی واقف نہیں ورنہ آپ کے جذباتِ اسلامی میں ہیجان پیدا نہ ہوتا۔ خیر، اپنے ایرادات کا جواب سنئے اور خاموش ہو جائیے۔

(۱) ابھی آپ کو "مشرک" کے صحیح معنی بھی معلوم نہیں، حکم ٹالنے والے کو "نافرمان" کہتے ہیں مشرک نہیں کہتے، مشرک اُسے کہتے ہیں جو خدا کی ذات و صفات میں ماسوا کو شریک کرے۔ ظاہر ہے کہ شیطان نے خدا کی ذات و صفات میں کسی کو شریک نہیں کیا بلکہ وہ سجدۂ آدم کو شرک سمجھا۔ جو اُس کے موحد ہونے کی تنہا دلیل ہے۔ وہ اگر خود کو خدا کا ہمسر و حریف سمجھتا تو یہ کہتا کہ "اے فرشتو مجھے سجدہ کرو، آدم کو سجدہ نہ کرو" لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے اُسے مشرک اور حریف الٰہی کہنا دونوں باتیں جاہلانہ اُپج ہیں۔

(۲) سجدۂ آدم چونکہ فرمانِ الٰہی کے تحت میں تھا اس لئے آپ اُسے شرک نہیں سمجھتے۔ ورنہ سجدہ جو صرف خدا کے لئے مخصوص ہے اگر ماسوا اللہ کو کیا جائے تو بہر حال شرک کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر آپ اس حکم کو حُسنِ کامل کی ایک ادا سمجھتے ہیں تو میں بھی سجدہ نہ کرنے کو "عشقِ کامل کی ایک ادا" سمجھتا ہوں۔ صدقِ دل اور عجز و انکسار کے امتحان میں شیطان سجدہ نہ کرنے ہی سے پورا اترا۔ اس لئے کہ وہ سچے دل سے صرف خدا کو شایانِ سجدہ سمجھتا تھا اور اُس نے عجز و انکسار کے ساتھ ہی اس سے اختلاف کیا تھا۔ آپ کی منطق بالکل اُلٹی ہے۔

(۳) اگر شیطان عاشقِ خدا نہ تھا بلکہ عاشقِ خودی تھا تو اُسکی یہ خودی بھی خدا ہی کی عطا کردہ تھی۔ "لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" پر ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اگر آپ کا ایمان ہے تو پھر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ متکبر بالذات اور خودی پرست تھا۔ عالم الغیب و الشہادۃ کے مقابلے میں مَیں اُسے جاہلِ مطلق بلکہ اجہل ماننے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے بھی اُسے عالم الغیب نہیں کہا لیکن یہ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اسرارِ الٰہی سے واقف اُس سے زیادہ کوئی اور فرشتہ بھی نہ تھا: تا بہ انساں چہ رسد۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر وہ آپ کے خیال کے مطابق (میرے خیال کے مطابق نہیں) مشرک، نافرمان، سرکش، جاہلِ مطلق، متکبر اور عاشقِ خودی تھا تو پھر خدا اُسے قیامت تک زندہ رکھنے کے لئے کیوں مجبور تھا۔ غضبِ الٰہی نے اُسے اُسی وقت کیوں نہ پھونک دیا۔ اُس کی آگ میں اُسی کو کیوں نہ جلادیا گیا۔ خدا ایک ایسے مغرور و متکبر کی گذارش قبول کرنے پر، جو آپ کی ہاتنی گالیوں کا مستحق ہے، مجبور کیوں ہو گیا؟ یہی ایک مصلحت اور یہی ایک راز ہے جسے آپ سمجھ گئے ہوتے تو اس عدوان کا صدور آپ سے کبھی نہ ہوتا۔

(۴) شاید آپ نے بی۔ اے کلاس تک یہ کہیں نہیں پڑھا کہ "ہر حقیقت اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے"۔ شیطان یزداں کی ضد ہے۔ اس لئے شیطان سے انسان یزداں کو پہچانتا ہے۔ رہا اُس کا "دشمنِ الٰہی ہونا" تو یہ بات آپ پر آج الہام ہوئی ہے۔ ورنہ خدا تو شیطان کو اپنا نہیں بلکہ انسان کا دشمن کہتا ہے "الم اعھد الیکم یا بنی آدم ان لا تعبدوا الشیطان، انہ لکم عدو مبین"۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ اُن مسلمانوں میں سے ہیں جنھیں ہنوز قرآنِ مبین کی آیات پر بھی عبور نہیں، مگر کہنے کو مسلمان ضرور ہیں۔ ہیہات ثم الہیہات بی۔ اے یا بی۔ ٹی ہونا دلیل آگہی نہیں ہے کسی مکتب میں ابھی چند سال درس لیجئے اس کے بعد میری نظم سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ آپ کیا جانیں کہ ذاتِ الٰہی عدوان و دشمنی کے اثرات سے بالاتر ہے۔

(۵) حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم "موحدِ اعظم" ضرور تھے لیکن انسانِ کامل کی حیثیت سے اور عزازیل "موحدِ اعظم" تھا ایک جلیل القدر فرشتہ ہونے کی حیثیت سے۔ اگر شیطان انسان ہوتا تو آپ کا ایراد قابلِ غور تھا۔ اس فرق و امتیاز پر آپ غور کرتے رہئے۔

آپ نے دیکھا آپ کے لاطائل دلائل کس قدر پوچ لچر اور کمزور ہیں؟

رہا آپ کا میری شاگردی سے استعفار دینا۔ تو میں خود ایسے جاہل اور سطحی علم رکھنے والے شخص کو وابستۂ تلمذ رکھنا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ میری پیشین گوئی ہے کہ آپ کبھی "شاعر" نہیں ہو سکتے۔ شاعری پیغمبری ہے اور آپ جہالت کے اعتبار سے بوجہل ہیں۔ فتدبر۔

سیماب اکبرآبادی

کوئل

رونما پھر ہو چلی ہے نکہتِ صبحِ بہار

آسماں پر ابر کے ٹکڑے ہوئے ہیں پھر رواں
کالے کالے بادلوں میں کوندتی ہیں بجلیاں
آ گئی برسات کی رت گلفشاں و گل چکاں

پھر سُنی جاتی ہے کوئل کی نوائے دلفگار
کر رہی ہے اسکی "کو کو" رازِ غم کو آشکار

اے مجسّم درد کوئل! سچ بتا کیا راز ہے

آج موسم کی ہوا ہے کیف بار و عطر بیز
لمحہ لمحہ پر ترنم، لحظہ لحظہ نغمہ ریز
یہ سُہانا وقت، یہ تیری صدائیں درد خیز

کیا سبب ہے غم میں کیوں ڈوبی ہوئی آواز ہے؟
کس قیامت کا اثر کس درجہ سوز و ساز ہے

ہے تری آواز کے شعلوں میں بجلی کی چمک

کر کے "کو کو" آگ سی دل میں لگا دیتی ہے تُو
سیلِ نغمہ میں فضاؤں کو بہا دیتی ہے تُو
ہر دلِ پژمردہ کو غم سے دکھا دیتی ہے تُو

تیری ہر آواز میں پوشیدہ ہے غم کی کسک
ہر نوا میں تیری گلہائے محبّت کی مہک

تجھکو خوش کرتی نہیں آموں کے باغوں کی بہار

یاد کس کی تجھ کو آتی ہے بھری برسات میں؟
تُو صدائیں دے رہی ہے کس کو بھیگی رات میں؟
آگ یہ کس نے لگا دی ہے ترے جذبات میں؟

کون ہے وہ جس نے لُوٹا ہے ترا صبر و قرار ہے؟
یہ تیری "کو کو" ہے کوئل! یا دکھی دل کی پکار ہے؟

آنسہ خورشید اقبال حیا میرٹھی

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح :- "اے مطرب بہار اُسی دھن میں گائے جا"

حضرت آلم مظفر نگری

اے مطرب بہار اُسی دھن میں گائے جا — صبح ازل جو گیت سُنے تھے سُنائے جا
رہ رہ کے برقِ حُسنِ تبسّم گرائے جا — ہستی کو میری طورِ محبت بنائے جا
دُنیا کو اپنی وسعتِ ہمت دکھائے جا — ذرّوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے سورج بنائے جا
پی پی کے اشک دیدۂ گریاں کی راہ سے — سوزِ غمِ فراق کے شعلے بجھائے جا
ناکامیوں سے نشو و نمائے حیات ہے — ان بجلیوں کو خرمنِ دل پر گرائے جا
تصویرِ یار آپ ہی بن جائے گی کبھی — نقشِ تصوّرات بنا کر مٹائے جا
خاموش سازِ ہستیٔ پروانہ ہو چکا — اے شمع تو ہی نغمۂ الفت سنائے جا
صیّاد تا قفس بھی پہونچ جاؤنگا کبھی — تھوڑی سی اور شاخِ نشیمن جھکائے جا

گھبرا نہ شورشِ حرم و دیر سے آلمؔ
پردے سے ہر صدا کے انھیں کو بلائے جا

محسنِ ادب حضرتِ نشتر ہنگامی

ظرف آشنا ہے ہمتِ دل آزمائے جا — جینے کا کچھ اسی میں مزہ ہے ستائے جا
زحمت نہ ہو اگر، یونہی بجلی گرائے جا — میں تجھ کو دیکھتا رہوں، تو مسکرائے جا
محوِ ہوائے دوست ہوں اے شمعِ زندگی — کچھ دیر تک تو اور یوں ہی جھلملائے جا
آخر تو ایک روز کھُلیں گے ترے فریب — دُنیا کو اے محبتِ دُنیا بھلائے جا
ملنے کی اُس کے اور نہیں دوسری سبیل — جب تک ہو اپنے نقشِ خودی کو مٹائے جا
آنے نہ پاؤں ہوش میں اتنا رہے لحاظ — رکھنا ہے مجھ کو مست تو ساقی پلائے جا
اپنا نہیں مگر مجھے تیرا تو ہوش ہے — بیخود ابھی نہیں ہوں مغنّی تو گائے جا
آخر معاوضہ بھی تو کچھ چاہئے ہمیں — چھینا ہے تو نے ہوش تو جلوے دکھائے جا

نشترؔ تجھے تو عرضِ تمنّا سے ہے غرض
کوئی تری سُنے نہ سُنے تو سنائے جا

حضرت شاعر نہٹوری ایڈووکیٹ سواسرا

بزمِ تجلّیات میں آ، اور آئے جا — آئینۂ خیال میں صبحیں بنائے جا
پردے اُٹھائے جا کبھی چلمن گرائے جا — تابِ نگاہ و ذوقِ نظر آزمائے جا
مضمونِ شعر بن کے تصوّر میں آئے جا — باغِ سخن میں نت نئی کلیاں کھلائے جا
میں آرزو میں روح کو بھر کر رہا ہوں جذب — آ اے خیالِ یار، ابھی اور آئے جا
بھر کر نگاہِ شوق میں جلووں کی تابشیں — ذرّے کو چاند، چاند کو سورج بنائے جا
عزمِ بلند و راسخ و مضبوط و کامیاب — رکھ اپنے دل میں اور زمانے پہ چھائے جا
احساس کھو کے سوئی ہوئی ہیں جو میٹھی نیند — ٹھوکر سے اپنی انکو مسلسل جگائے جا
دیکھ آ چلا ہے وجد گل و برگ و شاخ کو — "اے مطرب بہار اُسی دھن میں گائے جا"

تارِ نفس پہ چھیڑ کے نغماتِ انبساط
اہلِ سخن کو شاعرِ رنگیں سنائے جا

جناب سلیم سہروردی گوالیاری

رہ رہ کے سوزِ عشق کی بجلی گرائے جا — ہے تیرگی یاس تو شمعیں جلائے جا
اُلفت کی راہ میں مری ہمت بڑھائے جا — اے ذوقِ عشق دل کو مری گد گدائے جا
"اے مطرب بہار اُسی دھن میں گائے جا" — اب تک نہ جو سُنے ہوں وہ نغمے سنائے جا
جلوت میں دردِ عشق کی رسوائیاں نہ کر — چُھپ چُھپ کے خونِ اشک کے دریا بہائے جا
کر لیگی جذب شمعِ حقیقت بھی ایک دن — پروانہ وار بزمِ محبت میں آئے جا
دُنیا سیاہ ہے مری نظروں میں شامِ غم — تاروں پہ کوئی نغمۂ ضو بار گائے جا
میں ایک شمع ہوں ترے ہاتھوں میں اے فلک — مجھ کو بجھا، جلا کے، جلا کر بجھائے جا
تیرا فسانۂ غمِ ہستی دراز ہے — تیری سُنے گا کون تو دل کو سنائے جا

منزل پہ یوں پہونچنے میں اک لطف ہی سلیمؔ
آسانیاں جو ہوں انھیں مشکل بنائے جا

جناب صادق از بھنڈ

تو یاد آئے جا مجھے تو یاد آئے جا
اور ماسوا کی یاد کو دل سے بھلائے جا

مجھ کو بقدرِ ذوقِ نظر آزمائے جا
پردہ اُٹھائے جا مجھے جلوہ دکھائے جا

تیری طرح ستم بھی ترا ہے مجھے پسند
ہاں اے ستم شعار ستم مجھ پہ ڈھائے جا

تدِ نظر جو چارۂ دردِ جگر نہیں
اچھا تو اور دردِ جگر کو بڑھائے جا

تجھ کو اگر ہے خواہشِ تکمیلِ آرزو
دل کو مذاقِ عشق کا مرکز بنائے جا

تنکے تو تنکے شاخِ نشیمن بھی جل اُٹھی
لے اور بجلیوں میں نشیمن بنائے جا!

بیگانۂ حواس نہ کر صاحبِ جمال
جلوہ بقدرِ تابِ نظارہ دکھائے جا

صادق ہے تجھ پہ حضرتِ سیماب کا کرم
باغِ سخن میں روز نئے گل کھلائے جا

جنابِ نقیر از چھاؤنی مئو

اشکوں کے ساتھ خونِ جگر بھی بہائے جا
افسانۂ حیات کو رنگیں بنائے جا

اس طرح رازِ حسن و محبت چھپائے جا
یعنی حقیقتوں کو فسانہ بنائے جا

مرے حواس و ہوش کے عالم پہ چھائے جا
"اے مطربِ بہار اُسی دُھن میں گائے جا"

بنجائے گا یہ تیرے لئے "ساحلِ مراد"
کشتی کو اپنی جانبِ "طوفاں" بڑھائے جا

اے حسن! تجھ کو اپنی تجلّی کا واسطہ
تاریکیوں کو نور کا مرکز بنائے جا

مرہونِ خضر بن نہ محبت کی راہ میں
ذوقِ طلب کو "رہبرِ منزل" بنائے جا

باقی نہ رکھ کمی ستمِ بے پناہ میں
میں خوگرِ الم ہوں خوشی سے ستائے جا

دل پر بھی اعتبار نہ کر عشق میں نقیر
اس سے بھی اپنا رازِ محبت چھپائے جا

حضرت آغاز برہانپوری

دُنیا کو انقلاب کی رَو میں بہائے جا
طوفاں اُٹھے تو اور بھی طوفاں اُٹھائے جا

اک شعلۂ جمال سے تو لَو لگائے جا
برقِ تپاں سے سلسلۂ دل ملائے جا

اُف یہ ترا جمال یہ مدہوش کُن جمال!
بیخود بنائے جا مجھے بیخود بنائے جا

ہمت فزا ہے سلسلۂ جستجوئے دوست
راہِ تلاش میں قدم آگے بڑھائے جا

مقصود بندگی ہے تغیر ہوا تو کیا
کعبے کو دیر دیر کو کعبہ بنائے جا

چسکا لگا ہوا ہے شرابِ جمال کا
ساقی پلائے جا کے ساقی پلائے جا

آغاز ظلمتوں کا ہے دورِ جہان میں
گم گشتہ کاروانوں کو مشعل دکھائے جا

حضرت ارشد صدیقی امروہوی از کوئٹہ

اندازِ نو میں نغمۂ ہستی سنائے جا
محفل میں ایک ایک کو ارشد جگائے جا

دُنیا کو امن و صلح کی جنت بنائے جا
انسانیت کے نام پہ سب کچھ لٹائے جا

تو مسکرا رہا ہے تو پھر مسکرائے جا
دیوانگی کو میری تماشا بنائے جا

کیوں پوچھتا ہے میری پریشانیوں کا حال
تو آئینے کے سامنے گیسو بنائے جا

خاموش کیوں یہ بزمِ محبت ہے مطربہ!
کچھ زیرِ لب خدا کے لئے گنگنائے جا

تعلیمِ ضبطِ آہ و فغاں اور عام کر
دُنیا کو رازدارِ محبت بنائے جا

سیماب سا ملا ہے جو اُستادِ باکمال
ارشد خدا کی دین ہے توفیق پائے جا

جناب شاہ کوکب از کوچن

دل نے پہ میرے برقِ تبسم گرائے جا
اے مسکرانے والے یونہی مسکرائے جا

سمجھا ہے جس کو درد وہی ہے دوا تری
جس طرح بھی ہو دردِ محبت بڑھائے جا

ہے اصل میں فنا ہی دلیلِ بقائے عین
بننا ہے گر تو عشق میں خود کو مٹائے جا

اے چارہ گر! دوا نہ سہی زہر ہی سہی
بیمارِ تشنہ کام کو کچھ تو پلائے جا

عزت کا راز عجز کے پردے میں ہے نہاں
ہونا ہے سرفراز تو سر کو جھکائے جا

تیرے ہی اختیار میں ہے غم ہو یا خوشی
چاہے رلائے جا مجھے چاہے ہنسائے جا

کوکب اسی میں لطف ہے ناز و نیاز کا
ہر چند وہ خفا ہو مگر تو منائے جا

جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی

وقتِ وداع ہوش نہ یوں مسکرائے جا
آنکھوں میں بھر شراب لبوں سے پلائے جا

اشکوں سے اپنے دل کی لگی کو بجھائے جا
ساون کے گیت موسمِ گرما میں گائے جا

او مسکرانے والے میری سمت دیکھ کر!
دل کی تڑپ کو طور کی بجلی بنائے جا

بے چینیوں سے دل کی کہیں دم نہ توڑ دے
آ اپنے دردمند کی ہمت بڑھائے جا

میں امتحانِ عشق و وفا میں ہوں پیش پیش
تو جس قدر بھی چاہے مجھے آزمائے جا

کو میں جسکو سنتے ہی آ جائیں وجد میں
ایسا بھی کوئی گیت مغنی! سنائے جا

طرفہ تری غزل میں ہیں نغماتِ سوزِ دل
ہر شعر اپنا سازِ محبت پہ گائے جا

جناب رعنا عشرتی

آنکھوں سے اپنی اشک کے دریا بہائے جا
موجِ رواں میں شمعِ محبت جلائے جا

خون اپنا سرزمینِ وطن پر بہائے جا
آزادیوں کو مقصدِ ہستی بنائے جا

مشقِ تصورات میں آنسو بہائے جا
تارِ نظر پہ نغمۂ دلسوز گائے جا

اے حسن پائے ناز سے ٹھوکر لگا کے تو
خفتہ نصیب عشق کو اپنے جگائے جا

اے برقِ حسن عشق کی ہستی جو پھونک دی
ایسی اک آگ قلب و جگر میں لگائے جا

جتنا نگاہِ حسن سمجھے بدگماں کرے
اُتنا ہی تو فریبِ محبت میں آئے جا

رعنا یہی ہے راز و نیازِ مذاقِ عشق
وہ روٹھیں تجھ سے اور تو اُن کو منائے جا

جناب ذاکر بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ازھو

ہستی کو اپنی عشق میں اُن کے مٹائے جا
عنواں کی کر نہ فکر، فسانے بنائے جا

اُن سے تصورات میں نظریں ملائے جا
تصویرِ دلنشیں کو مکمل بنائے جا

محرومِ انبساط ہے ہستی تری بغیر
نظروں میں، دل میں، روح میں تو ہی سمائے جا

ہے تیری ہر نوا میں صدا میرے درد کی
"اے مطربِ بہار اسی دُھن میں گائے جا"

ہر گل ہے باغِ دہر کا اک خارِ گل نما
دامن نظر کا لالہ و گل سے بچائے جا

یہ ابر، یہ بہار، یہ گلشن، یہ جوئے بار
ساقی تجھے قسم ہے پئے جا، پلائے جا

ذاکر وہ بالیقیں تجھے اپنا بنا چکے
تو بھی اب اُن کے درد کو اپنا بنائے جا

جناب نازک شکوہ آبادی

دل پر بلائے برقِ تبسم گرائے جا
جلوہ دکھا دکھا کے یونہی مسکرائے جا

ناکامِ آرزو کو رُلا کر ہنسائے جا
سازِ دلِ شکستہ پہ کچھ گنگنائے جا

پھر اک خزاں رسیدہ کو بیخود بنائے جا
"اے مطربِ بہار اسی دُھن میں گائے جا"

دونوں جہاں کی تو نے ہی بگڑی بنائی ہے
اے کارساز میری بھی بگڑی بنائے جا

مستِ شرابِ ناز بھی سُن سُن کے جھوم اُٹھو
کچھ ایسی دُھن میں اے غمِ دل گنگنائے جا

اک حرف بھی نہیں ہے وہ سننے کو مستعد
اور دل کی ضد یہ ہے کہ برابر سنائے جا

آجائے راس اُن کی جفا ہی ترے لئے
نازک وفا کی اوٹ میں صدمے اُٹھائے جا

جناب عارف برہانپوری

میرے دل و دماغ پہ اس طرح چھائے جا
احساسِ بے خودی و خودی کو مٹائے جا

خرمن پہ میرے صبر کے بجلی گرائے جا
اے مسکرانے والے یونہی مسکرائے جا

یوں راہِ عاشقی میں ہو تکمیلِ بندگی
ہر نقشِ پائے یار پہ سر کو جھکائے جا

میری نگاہِ شوق سے چھپنا محال ہے
تو خواہ لاکھ پردوں میں خود کو چھپائے جا

طاری ہو وجد جھوم رہا ہوں پئے بغیر
"اے مطربِ بہار اسی دُھن میں گائے جا"

قربان تیری فتنہ خرامی پہ کائنات
ہر اک قدم پہ ایک قیامت اُٹھائے جا

عارف وہ التفات کریں یا ستم کریں
تو اُن کو داستانِ غمِ دل سنائے جا

جناب موجؔ دیوبندی

میری نظر سے پردۂ باطل اُٹھائے جا
ایک اک قدم پہ حسنِ حقیقت دکھائے جا

سرمست دل کو روح کو بیخود بنائے جا
"اے مطربِ بہار اسی دُھن میں گائے جا"

ہنس ہنس کے بجلیاں مرے دل پر گرائے جا
نیرنگِ حسن و عشق جہاں کو دکھائے جا

ہوش و حواس و صبر و شکیب و متاعِ زیست
جب تک لُٹا سکے رہِ غم میں لُٹائے جا

باقی نہ فرقِ شیخ و برہمن میں کچھ رہے
کعبے کو دیر، دیر کو کعبہ بنائے جا

لائیگا رنگ خون شہیدوں کا ایک دن
مشقِ ستم نہ یوں رُکے قاتل بڑھائے جا

اے موجؔ تیری زندگی جاوداں ہو یہ
ہستی کو اپنی راہِ وفا میں مٹائے جا

جناب اثرؔ انصاری دھولیوی

اے دل کمالِ عشق و محبت دکھائے جا
یعنی وہ درد دیں تجھے تو مسکرائے جا

دل چھین لینے والی ادائیں دکھائے جا
اے مستِ ناز پھیر کے منہ مسکرائے جا

ہمت نہ ہار۔ ہار تو ہے عاشقی میں جیت
راہِ وفا میں جان کی بازی لگائے جا

جس کا سرور جائے نہ یوم النشور تک
ساقی پلائے جا مجھے ایسی پلائے جا

اے یادِ دوست آچکے اب وہ تو شامِ غم
تیرا ہی آسرا ہے مجھے تو ہی آئے جا

تجھ کو ابھی کہاں حق و باطل میں امتیاز
ذہن و نظر میں شمعِ حقیقت جلائے جا

گر چاہتا ہے جوشِ جنوں میں وفا کی داد
اُن کے ہر اک ستم پہ اثرؔ مسکرائے جا

جناب یاورؔ رائے پوری

اشک جفائے حسن کی سُرخی بڑھائے جا
افسانۂ حیات کو رنگیں بنائے جا

تھک جائیں تیری سعیِ مسلسل سے بجلیاں
گرنے دے اُن کو اپنا نشیمن بنائے جا

ہر سنگدل کو پھر خلشِ جانگداز دے
یعنی کہ پھر محال کو ممکن بنائے جا

پیدا ہر ایک دل میں نئی رسم و راہ کر
کوتہ نگر۔ حدودِ محبت بڑھائے جا

ظالم مری وفا کا فسانہ ہے جاوداں
یہ شمع تجھ سے بجھ نہ سکیگی بجھائے جا

ذہن و نگاہ کو نہ دے تکلیفِ انتخاب
بس دل جہاں جھکا دے وہیں سر جھکائے جا

ہے تیرے میکدے سے تعلق کی احتیاج
یاور کی خاک سے خم و ساغر بنائے جا

جناب صبا بھنڈاروی

تخصیص دیر و کعبہ کی دل سے مٹائے جا
ہر ذرے میں جمال کی دنیا بسائے جا

مجھ کو رہینِ نرگسِ شہلا بنائے جا
ساقی مئے نشاط کے ساغر پلائے جا

وہ نغمے جھوم جھوم کے رقص کرے کائناتِ عشق
آ اور میرے بربطِ خاطر پہ گائے جا

تخریب سے ہی قدر ہے تعمیر کی یہاں
میں آشیاں بناؤں تو بجلی گرائے جا

تو کیا ہے تجھ کو اہلِ نظر جانتے ہیں سب
میں کیا ہوں کون ہوں مجھے اتنا بتائے جا

دنیا فریب و مکر کی منزل کا نام ہے
اس کے غبار و گرد سے دامن بچائے جا

دو دن کی زندگی ہے بڑی قیمتی صبا
خاموش بیٹھ کر نہ اسے تو گنوائے جا

جناب عباس انصاری دھولیوی

گیت و سرود بن کے زمانہ پہ چھائے جا
"اے مطربِ بہار اسی دُھن میں گائے جا"

اپنی نظر تو میری نظر سے ملائے جا
یعنی شرابِ عشق سے جا پلائے جا

اے دل حریمِ ناز میں اچھا نہیں سکوت
روداد اپنے درد کی ان کو سنائے جا

جبتک نہ پتہ پتہ چمن کا ہو بدحواس
اے ساقیِ بہار برابر پلائے جا

بیدل نہ فکرِ دوریِ منزل سے ہو کبھی
اپنے قدم کو جانبِ منزل بڑھائے جا

مٹی میں مل نہ جائے کہیں شانِ عاشقی
صحرا کی خاک جوشِ جنوں میں اڑائے جا

عباس تو ہی چھیڑ کے نغماتِ آتشیں
محفل میں بجلیاں سی دلوں پر گرائے جا

جناب عبد الغنی اثر گوالیاری

بجلی گرائے جا مجھے بیخود بنائے جا
کچھ اور تھوڑی دیر یونہی مسکرائے جا

یوں رفتہ رفتہ اور بھی نزدیک آئے جا
آنکھوں کی راہ سے مرے دل میں سمائے جا

شکوہ نہ کر کسی کا بھی دنیائے عشق میں
غم بھی ملے تو سینے سے اپنے لگائے جا

جامِ شراب گو مری تقدیر میں نہیں
آنکھوں ہی سے شرابِ محبت پلائے جا

کوئی سنے سنے نہ سنے اس سے کیا غرض
اے دل تو اپنے غم کی کہانی سنائے جا

مانا کہ کٹ رہی ہے تری عمر قید میں
آزادیِ وطن کے مگر گیت گائے جا

اس کی جہاں جھلک نظر آ جائے اے اثر
اپنی جبینِ شوق وہیں پر جھکائے جا

جناب محمود اثر ایم۔ اے جوناگڈھ

مجبوریِ فراق کے صدمے اٹھائے جا
یہ رسمِ عاشقی دلِ غمگیں نبھائے جا

ہو کر تغیراتِ زمانہ سے آشنا
ان کی نظر کے رمز و اشارات پائے جا

کوئی نہیں شریکِ غمِ زندگی یہاں
تو خود مصیبتوں کو خوشی سے اٹھائے جا

بیدار ان کے دل میں ہوں جذباتِ عشق کے
اس ڈھنگ سے حدیثِ محبت سنائے جا

ان میکدہ بدوش نگاہوں کے میں نثار
سرگشتۂ خمارِ محبت بنائے جا

مانا کہ اک فریب ہے رنگینیِ حیات
اے دل تو یہ فریب بھی دنیا میں کھائے جا

یوں ہی اثر تصورِ جاناں میں رات دن
رنگیں تخیلات کی دنیا بسائے جا

جناب صہبا سرسری گیاوی۔ بی کام

غم میں بھی انبساط کا نقشہ دکھائے جا
دل میں ہزار درد اٹھے مسکرائے جا

اے جانے والے خاک میں مجھ کو ملائے جا
جاتا ہے تو تجھے بھی ٹھکانے لگائے جا

سنتا نہیں کوئی تو کچھ اس کا گلہ نہ کر
تو دردِ دل زمانہ کو اپنا سنائے جا

بدمست کر رہے ہیں ہمیں تیرے زمزمے
"اے مطربِ بہار اسی دھن میں گائے جا"

واماندگی ہے راہِ طلب میں بڑا گناہ
تھک تھک کے بھی قدم سوئے منزل بڑھائے جا

نکلے کبھی نہ دل سے تری ان بتوں کی یاد
کعبہ کو بھی صنمکدہ صہبا بنائے جا

جناب بسمل علوی بھنڈاروی

اے برقِ حسنِ یار یونہی مسکرائے جا
تمکین ہوش و صبر کا خرمن جلائے جا

ہر نقشِ پائے یار پہ سر کو جھکائے جا
ہر ہر قدم پہ اک نیا کعبہ بنائے جا

کون و مکاں کی وسعتیں ہو جائیں ساری تنگ
اندازِ شوقِ سجدہ کو ایسے بڑھائے جا

اے دوست مری جاں لبی کی تجھے قسم
تشنہ لبِ جمال ہوں جلوے دکھائے جا

رحمت کو پیار روزِ جزا آ ہی جائیگا
دامن پہ اپنے اشکِ ندامت گرائے جا

دنیا کمالِ ضبط کے جوہر تو دیکھ لے
بسمل پہ اپنا تیرِ نظر آزمائے جا

جناب مجروح صدیقی امراوتی از بھنڈارہ

دیپک کے راگ اونچے سُروں میں سنائے جا
اک آگ سی فضائے چمن میں لگائے جا

تیرِ نگاہ سے خلشِ دل بڑھائے جا
قربان تیرے درد کو پھر دل بنائے جا

خلوت میں حسن و عشق کے افسانے چھیڑ کر
دل کے لہو کو زینتِ داماں بنائے جا

مل جائیگا تجھے مری آغوش میں سکوں
نزدیک آئے جا، مرے نزدیک آئے جا

رہنے دے نقشِ پا پہ تو اپنے مری جبیں
اپنے نیازمند کے رتبے بڑھائے جا

مجروح ہجرِ یار میں رونے سے فائدہ؟
ناحق نہ دردِ عشق کی عظمت گھٹائے جا

جناب محمد عصمت اللہ قریشی جونابلاسپور

تلوؤں میں لاکھ خار چبھیں بھی تو کر نہ فکر
راہِ طلب میں اپنے قدم تو بڑھائے جا

سینے پہ تیر کھانا ہے مردانگی کی شان
جو غم کا تیر آئے جگر سے لگائے جا

موجوں سے کھیل بحرِ مصائب میں کود پڑ
غوطے لگا کے گوہرِ مقصود پائے جا

غم ہی سے اقتدار ہے قائم نشاط کا
آئے جو غم کا بار خوشی سے اٹھائے جا

اب تجھ پہ مسکراتی ہے دنیا تو کیا کریں
کس نے کہا تھا غم کے فسانے سنائے جا

یاروں کے طنز و طعن سے عصمت ہو ملول
ان کا تو کام ہے یہی تو مسکرائے جا

جناب بدر کوٹی ندوی

لمحہ بہ لمحہ جلوۂ جاناں دکھائے جا
اے دل حریمِ خاص کے پردے اٹھائے جا

سوزِ فراق، خرمنِ ہستی جلائے جا
جب پاس وہ نہیں تو مجھے بھی مٹائے جا

والہانہ جا مزارِ شہیدِ وفا سے یوں
اپنے نشانِ جور کی تختی لگائے جا

جان آتی جاتی ہے تنِ بے مایۂ عشق میں
ٹھوکر لگائے جا یونہی ٹھوکر لگائے جا

پھر اس چمن کو آج تو رنگِ بہار دے
پھر داغہائے سینہ کو گلشن بنائے جا

پردے میں وعظ کے دلِ مجروحِ بدر پر
نوکِ زباں سے شیخ نہ نشتر چلائے جا

جناب ضیا سنگاولی

ہر سازِ دل پہ نغمۂ جاں سوز گائے جا
رنگین حسن و عشق کی دنیا بنائے جا

دل سے تعینات کے پردے اٹھائے جا
ہر امتیازِ ما و شما کو مٹائے جا

ہستی کو اپنی راہِ طلب میں مٹائے جا
نقشِ قدم کو رہبرِ منزل بنائے جا

آنکھوں سے ان کی یاد میں آنسو گرائے جا
دل کی لگی کو دل کی لگی سے بجھائے جا

پستی میں دیکھنی ہیں جو اپنی بلندیاں
نظروں سے آسماں کی وسعت پہ چھائے جا

رودادِ ضبطِ گریۂ غم کچھ نہ کہہ ضیا
آنکھوں میں اپنی اشکِ الم کو چھپائے جا

جناب علی احمد خاں راز گوالیاری

الفت میں بیقراریِ دل کو بڑھائے جا
اے غم نصیب رنج اٹھا، مسکرائے جا

جتنی بھی آج پی سکوں ساقی پلائے جا
بےخود بنا رہا ہے تو بےخود بنائے جا

پروا نہ کر کہ برق مرے دل پہ کب گری
تو مسکرائے جا ارے تو مسکرائے جا

مشقِ تصورات میں مجبوریاں نہیں
مشقِ تصورات کی قوت بڑھائے جا

الفت یہ کیا کہ شکوۂ غم ہو زباں پہ
الفت یہ ہے کہ رنج میں بھی مسکرائے جا

اے راز ان کا حکم ہے تیرے لیے یہی
مجبوریوں کو اپنی ہمیشہ چھپائے جا

جناب محبوب اسحٰق ارمان صابری برہانپوری

نغماتِ کیف بار سے بےخود بنائے جا
اے مطربِ بہار اسی دھن میں گائے جا

بے التفات برق اگر ہے تو غم نہ کر
خود ہی بنا بنا کے نشیمن جلائے جا

جب تک بجا حواس ہیں ساقی نہ روک ہاتھ
ہم بہتے جائیں اور ہمیں تو پلائے جا

شرطِ وفا یہی ہے کہ سب کچھ سمجھ کے بھی
ان کے حسیں فریب میں دانستہ آئے جا

مرنے کے بعد قبر میں تاریکیاں نہ ہوں
داغوں سے اپنے خانۂ دل جگمگائے جا

ارماں کبھی تو تجھ پہ انھیں رحم آئے گا
رودادِ عشق ان کو برابر سنائے جا

جناب حافظ اسحاق ہلال پریمی

اے جانِ عشق میرے تصور میں آئے جا
دل پر جمالِ پاک کی بجلی گرائے جا

شعلوں سے دل کے دل کی لگی کو بجھائے جا
یعنی ہجومِ غم میں بھی تو مسکرائے جا

اے دل وفا کی ان سے امیدیں فضول ہیں
دانستہ ان کے عشق میں دھوکے نہ کھائے جا

وہ دیکھ ابرِ مست خرام آج پھر اٹھا
"اے مطربِ بہار اسی دھن میں گائے جا"

تو بے رخی سے دیکھ، مگر دیکھ تو سہی
وحشی کو اپنے اور بھی وحشی بنائے جا

کانٹے اگر بچھائے کوئی راہ میں ہلال
تو پھول رہگذار میں اس کی بچھائے جا

جناب کیف بہاری از بمبئی

ذوقِ طلب میں نقشِ خودی کے مٹائے جا
ہستی کو اپنی ہستیِ کامل بنائے جا

وحدت پرست ہے تو زمانے پہ چھائے جا
اللہ کی زمیں پہ قبضہ جمائے جا

دیتی ہے بتکدے میں تجھے پھر اذانِ صبح
تو ماسوا کی یاد کو دل سے بھلائے جا

ہو جائے جس سے تکملۂ ذوقِ ناتمام
اک جامِ بیخودی مجھے ایسا پلائے جا

ہوں دور جس سے قوم کی غفلت شعاریاں
اے کیف وہ فسانۂ ماضی سنائے جا

جناب نیر کھیمی (کرنول)

کر نالہ اور منظرِ فطرت پہ چھائے جا
ہر اشکِ خوں شدہ سے شگوفے کھلائے جا

پھر پستیوں کی عشق کو غیرت دلائے جا
پھر ناز کا نیاز کو خوگر بنائے جا

پھر آمدِ بہار نے پھونکی چمن میں روح
دامن کو چاک کر کے گریباں بنائے جا

در اصل ہے پیامِ اجل مژدۂ حیات
پھونکو سے تو چراغِ نفس کو بجھائے جا

افسانہ ہو زمانے پہ رازِ خدنگِ عشق
نیر برنگِ زخمِ جگر مسکرائے جا

جناب کوثر نقوی از گڑھی کوٹاہہ

اے چشمِ یار دہر کو گردش میں لائے جا
بجلی گرائے جا ابھی طوفاں اُٹھائے جا

کیوں دردِ عشق گوشہ نشینی ابھی سے کیوں!
چرکے فراقِ یار کے دل پر لگائے جا

ساون بھی ہے، ہوا بھی ہے، کالی گھٹا بھی ہے
"اے مطربِ بہار اسی دُھن میں گائے جا"

مشتاقِ حرّیت ہیں دل و جاں مغنّیہ
آزادیِ وطن کے ترانے سُنائے جا

تاریکیاں محیط ہیں دُنیائے عشق پر
کوثر چراغِ قصرِ محبت جلائے جا

جناب بزم امروہوی

پڑتے ہیں یاد ہی کے مرے پاس آئے جا
بھڑکی ہے دل میں آتشِ فرقت بجھائے جا

آنکھوں میں پھلے جا مرے دل میں سمائے جا
جلوہ دکھا کے تو مجھے بیخود بنائے جا

خاموش کیوں ہے نغمۂ دلکش سنائے جا
"اے مطربِ بہار اسی دُھن میں گائے جا"

میں تیرے قول و فعل کا کرتا رہوں یقیں
جھوٹی تو میرے سر کی قسم روز کھائے جا

خامی تری کلام میں اے بزم ہے ابھی
سیماب کو غزل تو برابر دکھائے جا

جناب منظر کلیمی جام پوری

دل میں جگر میں روح و نظر میں سمائے جا
تو میری زندگی کی فضاؤں پہ چھائے جا

اے چشمِ یاس خون کے آنسو بہائے جا
خاموش رہ کے دل کا فسانہ سُنائے جا

او جانے والے عشق کی دنیا بسائے جا
اک جنبشِ نگاہ سے بگڑی بنائے جا

جام و سبو و شیشہ و پیمانہ توڑ کر
ساقی نگاہِ مست سے مجھ کو پلائے جا

منظر کوئی تو پہنچے گا دامانِ حسن تک
آنکھوں سے بے دریغ تو موتی لُٹائے جا

جناب عارف ارشدی سیالکوٹی از کوئٹہ

عارف تعینات کے پردے اُٹھائے جا
یعنی بساطِ حُسن و محبت پہ چھائے جا

یونہی تصوّرات کی دُنیا میں آئے جا
کچھ لمحے زندگی کے ہماری بڑھائے جا

ہے آبِ سُرخ آبِ شرر انگیز ساقیا
ہاں رات دن شرابِ محبت پلائے جا

پھنستا نہیں ہے اس میں خردمند آدمی
آلائشوں سے دہر کی دامن بچائے جا

مدّت کے بعد بزمِ جہاں آزداں بنی
عارف فسانۂ غمِ ہستی سُنائے جا

جناب حامد برہانپوری

دردِ غمِ فراق کو حد سے بڑھائے جا
یاد آئے جا مجھے تو ابھی جلد آئے جا

کوئل کی کوک سُن کے مرے دل نے یوں کہا
"اے مطربِ بہار اسی دُھن میں گائے جا"

خوددار دل کو اپنے یہ سمجھا رہا ہوں میں
جا اُن کی بزمِ ناز میں اور بے بلائے جا

جلوہ فروز ہو مری آنکھوں کے سامنے
اپنی تجلیات سے حیراں بنائے جا

حامد تو دردِ عشق کسی سے بیاں نہ کر
اہلِ جہاں سے رازِ محبت چھپائے جا

جناب مضطر بھنڈاروی

خاموشیوں کو اپنی تبسم سکھائے جا
میرے جہانِ شوق کو رنگیں بنائے جا

رہ رہ کے میری سمت نگاہیں اُٹھائے جا
رُک رُک کے میرے ہوش پہ بجلی گرائے جا

جادہ بہ جادہ، دُور سے جلوے دکھائے جا
تشنہ لبیِ شوق کو حد سے بڑھائے جا

گہرائیوں میں روح کی آ کر سمائے جا
رگ رگ میں دل کی، درد کے طوفاں اُٹھائے جا

مضطر اسی میں ہے، تیری بہبودیوں کا راز
جو آئے غم کا بار، خوشی سے اُٹھائے جا

جناب بیتاب کالپوی

حُسنِ نظر فریب کے جلوے دکھائے جا
اس طرح کچھ تو حوصلۂ دل بڑھائے جا

اُچٹی سی اک نگاہِ کرم ڈالتے ہوئے
دل میں چراغِ نورِ محبت جلائے جا

آنکھیں ہوں محوِ دید جمالِ نظر نواز
دل میں تصوّرات کی دُنیا بسائے جا

جلوہ طراز دل میں ہوا اے شاہدِ جمال
یوں تشنگیٔ ذوقِ نظر کو بجھائے جا

یہ ہی صلہ خرابِ محبت کا ہے تو پھر
یوں ہی بنا بنا کے مٹا اور مٹائے جا

جناب پریم دہلوی

آنکھوں میں گھر بنا مرے دل میں سمائے جا
ویرانۂ حیات کو گلشن بنائے جا

اپنی ادائے مست سے عالم پہ چھائے جا
آئینِ حُسن و نازِ جہاں کو بتائے جا

اے شمع ہے تجھے بھی تو بجھنا قریبِ صبح
پروانے جتنے چاہے تو شب بھر جلائے جا

بنتا ہے کون دیکھئے پھر کس کا آئینہ
اپنی خودی مٹا کے خدا میں سمائے جا

اے پریم عشق کا یہی آئین و رسم ہے
ہوں سر پہ لاکھ کوہِ الم مسکرائے جا

جناب وارث صدیقی شہادوی

"اے مطربِ بہار اسی دُھن میں گائے جا"
دل کو سرورِ نغمہ سے بیخود بنائے جا

دو دن کی زندگی ہے غنیمت سمجھ اسے
بیکار زندگی کے نہ لمحے گنوائے جا

احساس بھی ہے قوتِ جذب و کشش بھی ہے
پتھر نہیں ہے دل ہے مرا آزمائے جا

کافور ہو گی ظلمتِ شامِ شبِ فراق
شمعِ اُمید خانۂ دل میں جلائے جا

دامن دریدہ پھولوں کا عالم ہے دیکھنا
صحنِ چمن میں آج ذرا مسکرائے جا

جناب اثر ذالفقی بنگلوری

حسن نظر فریب کے جلوے دکھائے جا
بیخود بنائے جا مجھے بیخود بنائے جا

او جانیوالے جاتے ہوئے مسکرائے جا
میرے متاعِ ہوش پہ بجلی گرائے جا

جسکی ہر ایک تان ہو فردوسِ گوشِ گل
"اے مطربِ بہار اسی دھن میں گائے جا"

دیکھوں میں جس طرف بھی نظر آئے تو ہی تو
یوں نقشِ ماسوا کو نظر سے مٹائے جا

کیا محو رنگ باغِ جہاں ہے تو اے اثرؔ
پہلوئے گل میں خار ہے دامن بچائے جا

جناب عبدالسبحان نقش جمشید پور

قیدِ تفکراتِ جہاں سے چھڑائے جا
ساقی پلائے جا، مری ساقی پلائے جا

ہنس ہنس کے راہِ عشق میں خود کو مٹائے جا
خود کو مٹا کے قدرِ وفا کی بڑھائے جا

اے مبتلائے غم ہے یہی شانِ عاشقی
آنکھیں ہوں اشکبار مگر مسکرائے جا

تجھ کو کسی کے محشرِ جذبات سے غرض
چٹکیاں بجا کے یونہی گنگنائے جا

ہاں ہاں اسی کا نام ہے اے نقشؔ زندگی
ہر حال میں خوشی ہو کہ غم، مسکرائے جا

جناب سید ضیا جالندہری

ہاں کیف و انبساط کے نغمے سنائے جا
"اے مطرب بہار اسی دھن میں گائے جا"

مضرابِ غم سے چھیڑ کے سازِ حیات کو
پھر میٹھے میٹھے عشق کے نغمے سنائے جا

حسرت بھری نگاہ کی مجبوریاں نہ دیکھ
نظروں کا تار بن کے نظر میں سمائے جا

خندہ بلب ہیں زخم، نگاہیں سکوں شناس
ایذا پسند عشق کا ضبط آزمائے جا

افسانۂ غیر تیری ادا پر ضیاؔ نثار
پھر ایک بار جاتے ہوئے مسکرائے جا

جناب کیفی احمد آباد

صحنِ چمن میں رازِ حقیقت سنائے جا
"اے مطرب بہار اسی دھن میں گائے جا"

موسیٰ کی طرح مجھ پہ نہ چھائیگی بیخودی
بے پردا ہو کے اپنی تجلی دکھائے جا

ہر ذرہ ذرہ موجِ تجلی بحسر ہے
دل سے تعینات کے پردے اٹھائے جا

دل میرا تیری نذر کے قابل نہیں مگر
لطفِ نظر سے تو اسے قابل بنائے جا

کیفیؔ شرابِ عشق سے سرشار ہے جو تو
منصورؔ کی طرح سے انا الحق سنائے جا

جناب محمد حسین خیال احمد آبادی

لحظہ بہ لحظہ میرے تخیل میں آئے جا
میرے تصورات کی وسعت پہ چھائے جا

بیخود بنائے جا مجھے بیخود بنائے جا
"اے مطرب بہار اسی دھن میں گائے جا"

ہاں مسکرائے جا تو یونہی مسکرائے جا
میرے دلِ شکستہ پہ بجلی گرائے جا

دنیائے ہست و بود کی ہر شے سے دور دور
اپنے تصورات کی دنیا بسائے جا

پارینہ ہو نہ جائے محبت کی داستاں
افسانۂ خیال مکرر سنائے جا

جناب تاباں بن خیر دھونکلی

آجائے جس سے وجد میں پھولوں کی انجمن
اے عندلیب زار وہ نغمے سنائے جا

اے شاہدِ حسین میری دنیائے روح پر
کیفیتِ نشاط و طرب بن کے چھائے جا

ہر تار نغمہ بار ہے سازِ حیات کا
"اے مطرب بہار اسی دھن میں گائے جا"

راز آشنائے دہر ہے تاباںؔ تری نظر
سب کو حیات و موت کے نکتے سمجھائے جا

جناب عنقا کاشمیری

گانا غذائے روح ہے گانا سنائے جا
"اے مطرب بہار اسی دھن میں گائے جا"

میں ہوں ظہورِ نورِ تجلی کا منتظر
آنکھوں کے راستہ مرے دل میں سمائے جا

بندے گناہگار ہیں ان کی طرف نہ دیکھ
یارب تو اپنے فیض کے دریا بہائے جا

عشرت کدہ بنا دے ہر اک لالہ زار کو
عنقاؔ گلوں پہ موجِ ہوا بن کے چھائے جا

جناب برگ از باندہ

نقشِ قدم پہ یار کے سر کو جھکائے جا
ہستی کو اپنی راہِ طلب میں مٹائے جا

ہاں ہاں پیامِ فطرتِ رنگیں سنائے جا
"اے مطرب بہار اسی دھن میں گائے جا"

اے جانے والے تجھ کو ترے حسن کی قسم
اک بار اور جلوۂ رنگیں دکھائے جا

مشقِ خرامِ ناز سے مستِ خرامِ ناز
سوتے ہوئے زمانہ کے فتنے جگائے جا

جناب بصیر از ملبا گل (میسور)

دکھ درد کا بصیرؔ اسے خوگر بنائے جا
فرقت میں دل کو رنج اٹھانا سکھائے جا

دل کے سرور آ مری دل میں سمائے جا
آنکھوں کے نور آ مری آنکھوں پہ چھائے جا

پیدا ہو خاکِ مردہ میں یکگونہ تازگی
"اے مطرب بہار اسی دھن میں گائے جا"

دنیا و دیں کی خوبیاں اے دل اسی میں ہیں
جا ان کے آستانے پہ جا بن بلائے جا

جناب خلیل ایلنری

ناوک نگاہِ ناز کے دل پر چلائے جا
بسمل بنائے جا مجھے بسمل بنائے جا

جانبازِ عشق منتظرِ طوفاں ہو کیا نہ خوف
بحرِ جہاں میں اپنا سفینہ بڑھائے جا

تو رہگذارِ عشق میں ہمت سے کام لے
منزل قریب ہے قدم اپنے بڑھائے جا

یوں ختم داستانِ محبت ہو اے خلیلؔ
رودادِ غم وہ سنتے رہیں تو سنائے جا

جناب عزیز دھولیوی

سازِ حسین پہ نغمۂ دلکش سنائے جا
"اے مطرب بہار اسی دھن میں گائے جا"

شاید اسی میں گوہرِ مقصود ہو عیاں
تاریکیٔ حیات کے پردے اٹھائے جا

راہِ وفا میں شوق ہے جب تیرا رہنما
ہمت نہ ہار ہاں قدم آگے بڑھائے جا
اس کے سوا کچھ اور نہیں دہر میں عزیز
اس واسطے اسی سے تو دل کو لگائے جا

جناب سالک حنیفی نذر آبادی

میخانۂ الست کا عالم دکھائے جا
ساقی کچھ آج جام میں ایسی پلائے جا
اے مردِ عشق، اپنی محبت کا دے ثبوت
ہو لاکھ درد دل میں مگر مسکرائے جا
اس سے بہت قریب جہنم کی آگ ہے
ناداں فریبِ نفس سے دامن بچائے جا
ممکن نہیں کہ راہِ وفا سے ہٹیں قدم
اے چرخ بار بار مجھے آزمائے جا

جناب حنیف انصاری دھولیوی

مردہ دلوں میں ایک نئی روح پھونک دے
سرمستیِ بہار کے قصے سنائے جا
آخر کہاں تلک ان کو نہ آئیگا تجھ پہ رحم
تو اپنی سرگزشت برابر سنائے جا
رحمت کا داغ اصل میں رحمت کا ہی نشاں
رحمت طلب ہی کہہ کے زحمت اٹھائے جا
یہ سلسلہ نہ ٹوٹنے پائے کبھی حنیف
کڑیاں رہِ طلب میں برابر اٹھائے جا

جناب عبدالغفور سراج احمد آبادی

اہلِ چمن کو نغمۂ عشرت سنائے جا
"اے مطربِ بہار اسی دھن میں گائے جا"
بےخود بنائے جا مجھے بےخود بنائے جا
یعنی شراب ناز نظر سے پلائے جا
صدقے ترے جمال کے اے پیکرِ جمیل
دنیا مرے خیال کی رنگیں بنائے جا
دل بار بار مجھ سے یہ کہتا ہے اے سراج
دنیائے مکر و حیلہ سے دامن بچائے جا

جناب عزیز از کاسگنج

بھولی ہوئی کہانی جوانی کی گائے جا
ہاں! یادِ عیش سے غمِ دنیا بھلائے جا
کیسا حرم، کہاں کا کلیسا، شوالہ کیا
تو دل میں اپنے حسن کے جلوے دکھائے جا
گر بے پناہ جورِ فلک ہے تو کیا عزیز
ہمت نہ ہار تو قدم آگے بڑھائے جا

جناب اوج حنیفی دھولیوی

ہر ایک ذرہ وجد میں ہے کائنات کا
"اے مطربِ بہار اسی دھن میں گائے جا"
چھٹنے نہ پائے دامنِ صبر و قرار دیکھ
اے ذوقِ عشق صدمۂ الفت اٹھائے جا
اے اوج کچھ حدیثِ محبت کے واقعات
اپنی زباں سے بزمِ سخن میں سنائے جا

جناب رحمت آندھیروی از جمشید پور

گر دل میں سوز ہے تو آنسو بہائے جا
پھر بھر کے کشتیوں میں موتی لٹائے جا
دقتِ عمل ہے فکرِ عمل کر جو ہو سکے
یوں مفت میں نہ بیٹھ کے باتیں بنائے جا
رحمت نکل رہی ہیں سبھی اشعار خود بخود
ٹھنڈی ہوا ہے بیٹھ کے کچھ گنگنائے جا

جناب محمد یعقوب آذر ناگپور

اک جنبشِ نگاہِ تبسم طراز پر
اپنے سکونِ قلب کی دولت لٹائے جا
یہ بحرِ بیکراں ہے کنارہ نہ کر تلاش
ہر موجِ بیقرار کو ساحل بنائے جا
آذر تجھے اگر ہے تمنائے وصل و دید
کچھ روز اور بارِ جدائی اٹھائے جا

جناب عزیز اختر سرحدی

ساون کی مست شام بہاروں میں ہمنشیں
انگڑائی لے گھٹا کی طرح مسکرائے جا
داغِ جگر کے نور سے سلمیٰ کی یاد میں
اختر شبِ فراق چراغاں منائے جا

جناب صغیر آثر اکبر آبادی

گل پاشیوں کا حکم دے اپنی نگاہ کو
آئینۂ بہار گلوں کو بنائے جا
ذراتِ عیاں ہے تری جلوہ گاہ سے
دل کو ہمارے وادیِ ایمن بنائے جا

جناب شباب دہلوی از ریواڑی

پردے تعیّنات کے سارے اٹھائے جا
بے پردہ سامنے مری نظروں کے آئے جا
ہاں نغمہ ہائے دردِ محبت سنائے جا
"اے مطربِ بہار اسی دھن میں گائے جا"

جناب بسمل سورتی

کھلنے لگی ہے باغِ جہاں کی کلی کلی
"اے مطربِ بہار اسی دھن میں گائے جا"
تشنہ لبوں کی پیاس بجھانا ثواب ہے
بھر بھر کے جامِ مے ہمیں ساقی پلائے جا

جناب من ساگری

اے نے نواز نغمۂ دلکش سنائے جا
تو روح بن کے مری رگوں میں سمائے جا
رحمت کا دیکھنا ہو تماشہ جو حشر میں
آنکھوں سے اپنی اشکِ ندامت بہائے جا

جناب اکبر علی اسمٰعیل جام نگری

احساس ہی نہ ہو کہ یہ گلشن ہے یا قفس
"اے مطربِ بہار اسی دھن میں گائے جا"
جلتی ہے تیرے سینہ میں جو آتشِ فراق
رو رو کے اشکِ گرم سے اکبر بجھائے جا

جناب ارمان مصطفٰے آبادی

اے یار ہر لباس میں جلوہ دکھائے جا
پہچان لیگی تجھ کو نظر آزمائے جا
ارمان پہلے آئینہ بن حسنِ یار کا
جلوے پھر اپنے سارے جہاں کو دکھائے جا

جناب اختر پھرسری از انبارہ

آئینہ حالِ دل مرا ہو جائے گا ابھی
آئینہ دیکھ دیکھ کے تو مسکرائے جا

جناب طالب املنیری

کر دے جلا کے خاک مرا خرمنِ امید
اپنی نگاہِ ناز کی بجلی گرائے جا

جناب سراج احمد قاضی پاردولوی

مشقِ تصورات میں قاضی تو محو رہ
تصویرِ یارِ صفحۂ دل پہ بنائے جا

اشتہاری ادویات

ذی ہوش اور تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے کبھی جاذب توجہ نہیں ہو سکتیں

لیکن ذیل کی ادویات ہر گھر کے لئے کار آمد اور ایک نعمت ثابت ہونگی

عالیجناب حکیم مولوی محمد نذیر صاحب بالقابہ ایچ۔ پی رئیس مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ

ہر اُس شخص کو جو ان ادویات کے اثر کو غلط ثابت کردیگا تاوان دینے کے لئے تیار ہیں حکیم صاحب قبلہ کی مندرجہ ذیل دونوں ادویا اپنے اثر کے اعتبار سے نیز ہمدرد ثابت ہوئی ہیں۔ ہزاروں معززین و معززات کے استعمال میں ادویات آچکی ہیں۔ اور آجتک کہیں سے شکایت نہیں آئی۔

قدرتی تیل رجسٹرڈ

یہ تیل سنہ ۱۹۰۰ء میں ایجاد کیا گیا تھا ثلث صدی ہی میں اپنے بیش بہا فوائد کی وجہ سے تمام دنیا میں اور خاص طور پر ہندوستان میں مشہور ہوگیا چنانچہ ہندوستان کے مشہور حکما ڈاکٹر اور وید صاحبان کے علاوہ ولایت سے کئی ڈاکٹروں نے بھی سرٹیفکٹ دیئے ہیں۔ ڈاکٹر اور حکیم اپنے مریضوں کو قدرتی تیل کی سفارش کرتے ہیں یہ تیل جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے **جو ہر قسم کے درد میں اکسیر ہے** اور فوری فائدہ کرتا ہے۔ بدن پر مالش کرکے نہانا۔ خراب پانی، موسمی بخار، سردی اور زکام سے محفوظ رکھتا ہے۔ بدن کو چست اور قوی بناتا ہے۔ سر پر مالش کرنے سے بالوں کی سیاہی قائم رہتی ہے۔ بال نرم اور چمکدار ہو جاتے ہیں۔ نزلہ۔ زکام کھانسی۔ سر۔ آنکھ۔ کان۔ دانت۔ کمر۔ سینے کے تمام درد۔ چوٹ۔ خراش۔ آگ سے جلنے۔ مستورات کے وضع حمل اور کمر ورگوں کے واسطے تریاق کا کام دیتا ہے **قدرتی تیل** رجسٹرڈ کی شہرت اور قبولیت کو دیکھتے ہوئے بعض نقال نام بدل بدل کر پبلک کو دھوکا دے رہے تھے۔ ہم معززین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ **قدرتی تیل** صرف ہم سے طلب فرمائیں اور اس کی خریداری میں احتیاط سے کام لیں، فائدہ نہ ہونے کی صورت میں کارخانہ ہر ممکن تاوان دینے کے لئے تیار ہے۔

نوٹ: ایک پاؤ سے کم قدرتی تیل نہیں بھیجا جا سکتا۔ قدرتی تیل مختلف شیشیوں میں پیک بھی مل سکتا ہے۔ **قیمت فی سیر** چار روپیہ علاوہ پیکنگ و محصول ڈاک۔

روغن بہار رجسٹرڈ

جسمانی صحت کا دارومدار دماغی صحت پر ہو۔ کامیاب زندگی اور کام کو پوری توجہ سے کرنے کے لئے دماغی سکون کی نہایت ضرورت ہے اور دماغی سکون حاصل کرنے کے واسطے حکیموں اور ڈاکٹروں کا قول ہے کہ مقوی دماغ و مفرح طبع اور خوشبودار تیل استعمال کیا جائے۔ چنانچہ آج کل مختلف قسم کے خوشبودار تیل رائج ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان کے استعمال سے فائدہ نہیں ہوتا جو دماغ کے لئے ضروری ہے۔ "**روغن بہار**" ان تمام خوبیوں کا حامل ہے جن کی بالوں کو ضرورت ہے اور تمام مضر اجزاء سے پاک ہے۔ خالص سفید تل کے تیل سے تیار کیا جاتا ہے اور ہم اعلان کرتے ہیں کہ اس میں آمیزش ثابت کرنے والے کو **ایک سو روپیہ** ملے گا۔

اس کے مستقل استعمال سے ہمیشہ کے واسطے امراض دماغی سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ دماغی کام کرنے والے معزز حضرات اور خواتین کے لئے ایک بیش بہا اور نادر تحفہ ہے۔ بالوں کے بڑھانے میں لاجواب ہے۔ اس کے قدرتی رنگ کو قائم رکھتا ہے۔ ملائم، خوبصورت اور چمکدار بناتا ہے۔ سر میں کیسا ہی درد کیوں نہ ہو ایک دو بار لگوانے سے کلی فائدہ ہو جاتا ہے۔

قیمت فی سیر چھ روپے
علاوہ محصول ڈاک وغیرہ

منیجر دار الصحت رجسٹرڈ مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ

اصلاحِ سخن

:- جنابِ طرفہ قریشی ہنڈاروی کی غزل پر ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائلؔ دہلوی کی اصلاح

رازِ مخفی کو خدا کے لئے افشا نہ کریں ۱ اُن سے کہدو کہ مری عشق کو رسوا نہ کریں

آپ اپنے کو عبث مُفت (جفا جوئی) میں رسوا نہ کریں ۲ قتل کا میری زمانے میں وہ چرچا نہ کریں

اپنے بیمار کو اچھا ہے وہ اچھا نہ کریں ۳ فکرِ درماں نہ کریں فکرِ مداوا نہ کریں

کیا کریں اُنکی جو تصویر کو دیکھا نہ کریں ۴ ہجر میں دل کے بہلنے کا نہیں اور علاج

بھول کر (سامنے) میرے تصوّر میں بھی آیا نہ کریں ۵ مجھ سے پردہ ہے تو پردے کی قسم ہے انکو

اُن سے ہم اُن کے تغافل کا بھی شکوا نہ کریں ۶ یہ عجب قید لئے قانونِ محبت ہے تیری!

کہدو عیسیٰ سے کہ تکلیفِ (ابنِ مریم سے کہو میرا) مداوا نہ کریں ۷ عشق میں چارہ گری دلِ محزوں ہے عبث

آپ بے پردہ جمالِ رخِ (بے پردگیٔ صورت) زیبا نہ کریں ۸ لگ (ہو) نہ جائے کہیں دشمن کی نظر محفل میں

ہے وہ رزّاق اسے فکر ہے سب کچھ (کی) طرفہ
۹
آپ اپنے کو یوں دقتِ غمِ (شدّتِ غمِ توشہ) فردا نہ کریں

توجیہ:-

(۲) عبث اور مُفت دونوں بھرتی کے الفاظ تھے، اس لئے "جفا جوئی" بنا دیا گیا۔ عبث اور مُفت مفہوماً ایک ہی ہیں۔

(۵) میرے خیال میں "سامنے" سے "بھول کر" اچھا ہے۔ جو شخص تصوّر میں آئے گا وہ سامنے ہی ہوگا

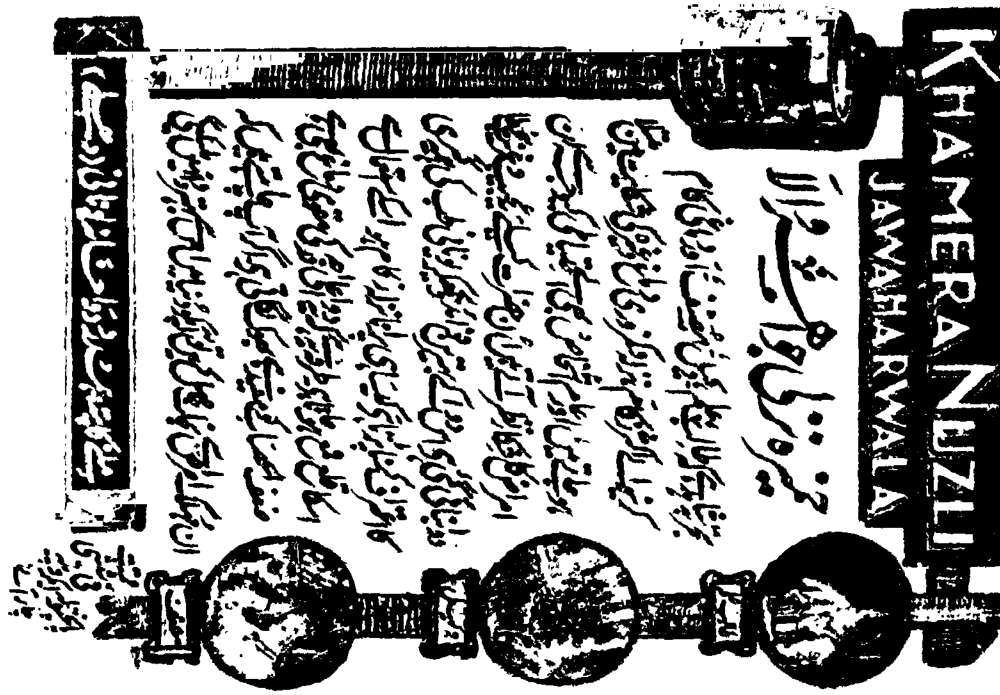
(۶) "اسے" بالکل دب رہا تھا۔ اب مصرع چست ہو گیا۔

(۷) اصلاح سے مصرع میں سلاست اور چستی پیدا ہو گئی

(۸) "نظر لگنا" اور "نظر ہونا" دونوں صحیح ہیں۔ طرفہ صاحب کا مصرع ثانی بھی صحیح تھا، اصلاح سے برجستگی پیدا ہو گئی اور مفہوم وہی رہا۔

(۹) مصرع اولیٰ میں "کچھ غلط تھا" "کی" کی ضرورت تھی۔ مصرع ثانی میں "یوں" دب رہا تھا اصلاح سے یہ سقم بھی جاتا رہا اور مفہوم بھی واضح ہو گیا۔

اعجاز صدیقی


KHAMERA NUZLI
JAWAHARWALA

نقد و نظر

خزینۂ رباعیات

از حضرت مولانا شفق عماد پوری. جیبی سائز حجم ۴۴ صفحات، لکھائی چھپائی، کاغذ دیدہ زیب قیمت ۴؍ . ملنے کا پتہ (۱) شمسی پریس بک ڈپو گھیار ٹولہ گیا (۲) شفق بک ڈپو حاجی پور رفیع گنج ضلع گیا۔

مولانا شفق عماد پوری ایک کہنہ مشق اور بہار کے نامور شاعر ہیں۔ جنھیں تمام اصنافِ سخن پر قدرت و ملکہ حاصل ہے آپ کی متعدد تصانیف شائع ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکی ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ چار سَو رباعیوں پر مشتمل ہے اور ہمہ گیر خیالات کا حامل ہے۔ توحید۔ نعت فلسفہ۔ اخلاق، ہستی۔ دنیا۔ جوانی۔ پیری۔ فنا۔ بقا۔ حسن و عشق۔ قومیات ضرب الامثال مختلف واقعات وغیرہ پر تمام شعری قوتوں کے ساتھ تجربات کی روشنی میں خیالات و جذبات کی تحلیل کی گئی ہے۔ قریب قریب تمام رباعیوں میں روانی، سلاست اور قوتِ بیان بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اصنافِ سخن میں رباعی بہت مشکل صنف ہے، اُردو میں رباعیوں کے مجموعے بہت کم ہیں۔ مولانا شفق عماد پوری کا یہ مجموعہ قابلِ قدر و مطالعہ ہے۔ حضرتِ کیفی چریا کوٹی نے اس مجموعہ پر مختصر سا مقدمہ بھی قلمبند فرمایا ہے۔ جس میں فارسی اور اُردو کے مشہور رباعی گو شعرا کا تذکرہ کیا ہے، لیکن افسوس کہ مولانا شفق کی رباعیات پر کوئی سیر حاصل تبصرہ نہیں فرمایا۔ حالانکہ ضرورت اسی کی تھی۔

ان دو رباعیوں سے مولانا شفق عماد پوری کی شعری قوتوں کا اندازہ فرمایئے، فرماتے ہیں ؎

اُٹھ جائیگا آنکھوں سے حجابِ ہستی — کھولے گی اجل بندِ نقابِ ہستی
کھول آنکھ ذرا نیند سے سونے والے — تعبیر عدم ہے ترا خوابِ ہستی

عقبیٰ مانگوں کہ تجھ سے دُنیا مانگوں — کوثر مانگوں کہ خلد و طوبیٰ مانگوں
سب کچھ تیرا تجھی سے سب کچھ مولا — میں تجھ سے، بتا ترے سوا کیا مانگوں

شہرِ خموشاں

از سید محمود مورخ بی۔ اے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۱۲ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی۔ قیمت عمہ ملنے کا پتہ محفوظ پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

سید محمود مورخ صاحب اُردو کے اچھے ادیب ہیں۔ ترجمہ کرنے میں تو آپ کو خاص ملکہ ہے، یہ آپ کے سات مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ نئی طرز کے سائنٹفک افسانے ہیں۔ اس طرز کے افسانے انگریزی زبان میں تو پائے جاتے ہیں لیکن اُردو میں بہت کم ہیں تمام افسانے دلچسپ اور افسانوی خوبیوں سے مالا مال ہیں۔ کتاب کے شروع میں مولوی شاہد احمد صاحب بی۔ اے (آنرز) مدیر "ساقی" کا "پیش لفظ" ہے۔

میلادِ شہید منظوم

از حضرت مولانا انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۴۰ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط۔ قیمت ۴؍ ملنے کا پتہ۔ مصطفائی بک ڈپو بلند اریسب متصل میوہ کٹرہ آگرہ۔

مولانا انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی تحقیقی اور تاریخی ادب پیش کرنے میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ آپ نے سینکڑوں علمار فضلا شعرا اور ادبا کو حیاتِ نو بخشی ہے۔ مولانا غلام امام شہید رحمۃ اللہ علیہ بڑے پایہ کے بزرگ گذرے ہیں آپ کے نعتیہ قصائد اور نظمیں اکثر محافلِ میلاد میں گرمی کا باعث ہوتی ہیں۔ مولانا انتظام اللہ صاحب نے مولانا غلام امام شہیدؒ کے کلام سے پورا میلاد مرتب فرمایا ہے جو منظوم ہے اور اس قابل ہے کہ ہر محفلِ میلاد میں پڑھا جائے۔

جرمنی کی جاسوسہ

از جناب وحشی آروی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۰۵ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط۔ قیمت ۴؍ ملنے کا پتہ۔ انجمن بکڈپو معرفت سنٹرل پرنٹنگ ورکس دہلی

یہ افسانے حیرت انگیز۔ ہولناک اور سنسنی خیز ہیں۔ جرمن جاسوسوں کے دل ہلا دینے والے واقعات اُردو کے سانچے میں ڈھالے گئے ہیں۔ ہر چند عامیانہ مذاق کی ان سے تسکین ہوتی ہے لیکن افسانے اپنی جگہ بہت دلچسپ ہیں۔ جناب وحشی آروی نے پورے زورِ قلم کے ساتھ ان افسانوں کا ترجمہ کیا ہے۔

اعجاز صدیقی

... نے رفاہ عام پریس ہنگ کی منڈی میں چھپوا کر قصر الادب ناہی منڈی آگرہ سے شائع کیا)

صبحِ مشرق۔ محمد صادق صاحب ضیا بی۔ اے۔ ایل ایل بی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ مع تصویرِ مصنف۔ قیمت دو روپیہ (عہ ؏)

نشتر کدہ۔ بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ایڈووکیٹ کا دیوان مع تصویرِ مصنف۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ ؏)

فغانِ آرزو۔ سید انوار حسین آرزو لکھنوی کا دیوان۔ قیمت دو روپیہ (عہ ؏)

گلکدہ۔ حضرت عزیز لکھنوی (استادِ جوش ملیح آبادی) کا دیوان۔ قیمت دو روپیہ

گلزارِ داغ۔ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی مرحوم و مغفور کا مشہور دیوان قیمت عہ

جگر پارہ۔ حضرت بیدم شاہ وارثی کا دیوان۔ قیمت ۱۲ ر

مصحفِ بیدم۔ بیدم شاہ مرحوم کا دوسرا دیوان۔ مع مقدمہ حضرت خواجہ حسن نظامی۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

کمالِ داغ۔ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے چاروں دیوانوں کا انتخاب مع مقالہ نقدی۔ قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ ۸)

روحِ نظیر از مخمور اکبرآبادی بی۔ اے۔ انتخاب کلام مع مقدمہ و تبصرہ قیمت دو روپیہ (عہ ؏)

قصائدِ نجم۔ حضرت نجم آفندی اکبرآبادی خلف حضرت بزم اکبرآبادی کے بلند پایہ قصائد۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ایوانِ تصور۔ شریمتی سروجنی نائیڈو کے رنگین اور دلکش گیتوں کا ترجمہ قیمت ایک روپیہ (عہ)

مختلف دواوین

دیوانِ غالب۔ غزلیات امیر و نظیر۔ انتخاب کلام اکبر الہ آبادی۔ دیوانِ اکبر دانا پوری دیوان کالے خاں سفل۔ کلامِ داغ۔ بہارِ معرفت۔ دیوان حافظ شیرازی

عروض کی منتخب، معتبر اور عام فہم کتابیں

عام فہم عروض۔ آسان زبان میں عروض کے درس دئے گئے ہیں قیمت ۸ ر

نکاتِ شاعری۔ عروضی معلومات کے علاوہ ہر لفظ کے کئی کئی قافیے اس میں درج ہیں۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

چراغِ سخن۔ عروض، علم قافیہ اور بحور وغیرہ کی تصریح میں مرزا یاس عظیم آبادی کی بہترین تصنیف۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

فکرِ بلیغ۔ مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم فنِ شاعری پر بہترین معلومات کے لئے نہایت بلیغ کتاب ہے۔ قیمت عہ

مشاطۂ سخن۔ مصنفہ صفدر مرزا پوری۔ مسلم الثبوت اور مشہور اساتذہ کی اصلاحوں کے نمونے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

جانِ سخن۔ بحور، صنائع بدائع۔ تقطیع کرنے کے قاعدے، اور علم قافیہ کی تشریح متروک الفاظ کی فہرست بھی شریکِ کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ایشیائی شاعری۔ مصنفہ مولانا اشہری مرحوم۔ اس کتاب میں تمام اصنافِ شاعری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ایضاح القوافی۔ علم قافیہ پر توضیحی اور تفصیلی کتاب۔ مصنفہ حضرت شوخ اکبرآبادی۔ قیمت دس آنہ (۱۰ ر)

مثنویاں

مثنوی عالمِ خیال۔ مصنفہ مرزا شوق قدوائی لکھنوی مرحوم مع تصاویر قیمت عہ۔ سادہ ۸ ر

مثنوی مادرِ ہند۔ مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم۔ قیمت ۱۲ ر

مثنوی ظہورِ رحمت ۸ ر مثنوی زہرِ عشق کامل عہ

مشہور افسانہ نگاروں کے مشہور افسانے

نگارستان۔ مصنفہ حضرت نیاز فتحپوری قیمت دو روپیہ (عہ ؏)

گہوارۂ تمدن۔ مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت کا کیا حصہ ہے قیمت عہ ؏

شہاب کی سرگذشت۔ مصنفہ مولانا نیاز فتحپوری اُردو لٹریچر میں بہت بلند اور بالکل نیا افسانہ۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

شمیم (با تصویر مکمل) مصنفہ فیاض علی بی۔ اے (علیگ) سبق آموز افسانہ بطور داستان۔ فنِ ناول نویسی میں ایک معرکۃ الآرا انقلابی تصنیف۔ قیمت ہر دو حصہ مکمل چار روپیہ (للعہ)

کیفستان۔ انتخاب قیسی رامپوری۔ اس میں کئی دل کش افسانے ہیں قیمت ایک روپیہ (عہ)

آتش پارے۔ از جناب سعادت حسن منٹو۔ مصنف کا نام افسانوں کی اہمیت کا خود ضامن ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

زندگی کے کھیل۔ ازل۔ احمد اکبرآبادی قیمت عہ

دنیا کی حور - مصنفہ حضرت کوثر چاند پوری مع دیگر افسانوں کے
قیمت دس آنہ (۱۰/)

محبت کا افسانہ - ازل۔ احمد اکبر آبادی قیمت دو روپیہ عہ/
شب چراغ - بہترین تہذیبی خوش شکل اور جذباتی افسانوں کا مجموعہ۔
ازجناب ضیا بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی قیمت ۸/
قاتل - مصنفہ ایم اسلم مع دوسرے افسانوں کے۔ قیمت دو روپیہ (عہ/)
نغمات - ازل۔ احمد اکبر آبادی قیمت ایک روپیہ
زادِ راہ - مصنفہ منشی پریم چند۔ آخری اور بہترین افسانہ قیمت عہ/
انشائے لطیف - ازل۔ احمد اکبر آبادی قیمت دو روپیہ (عہ/)

مختلف افسانے

سرگذشتِ اسیر عہ/۔ سمندر کی خداوندہ ۲/۔ محمودہ عہ/۔ دغا ۸/ فسانۂ سلطنت مغلیہ ۳/۔ طوفانِ زندگی عہ/۔ عروجِ زندگی عہ/۔ شیطان کا بچہ ۶/ عبرت کدہ ۱۲/۔ خانقاہ اشرار ۶/۔ چتوڑ کی دیوی ۱۲/۔ مغربی دلہن ۱۰/ بدرِ کمال عہ/۔ بالشویک شہزادی ۳/۔ انارکلی ۲/۔ جنات کی شہزادی ۳/۔ پری پروانہ ۳/ شیطان زادہ ۳/۔ شیطان کا چرخہ ۴/۔ دوست ۲/

ظریفانہ افسانے

بحرِ تبسم عہ/۔ موجِ تبسم عہ/۔ سیلابِ تبسم عہ/۔ طوفانِ تبسم عہ/
منشی جی عہ/

یہ پانچوں ظریفانہ کتابیں حضرت شوکت تھانوی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ ان کے پڑھنے سے دماغی تفریح ہوتی ہے اور ہنستے ہنستے آدمی لوٹن کبوتر بن جاتا ہے۔

صرف عورتوں کے لئے

بہشتی جھومر ۱۲/۔ گھر اور گھر والی ۴/۔ شوہر کی نصیحتیں ۴/ آدابِ نسواں ۶/۔ ثریا بیگم ۴/۔ صبر کی دیوی ۲/۔ ناصحِ مشفق ۲/ عقیلہ بیگم ۴/۔ معین الخواتین ۸/۔ زنانہ خطوط ۵/۔ کفایت شعاری ۳/ لوری نامہ ۲/۔ پہیلی نامہ ۶/۔ انشائے نسواں ۸/۔ اصلاح الرسوم ۲/ آفتابِ زندگی ۹/۔ شبابِ زندگی ۸/۔ چاند تارے ۸/

مختلف کمیاب کتابیں

مینائے سخن - منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی مرحوم کی تمام واسوختوں کا بے نظیر مجموعہ۔ قیمت عہ/

مغل اور اردو - ادیب الملک نواب نصیر حسین خاں خیال مرحوم کی لاجواب تصنیف۔ اس میں اردو کے ابتدائی دور سے لے کر مغلوں کے دور تک ہر زمانے کے تدریجی واقعات قلمبند کئے گئے ہیں۔ بڑا سائز حجم ۱۵۰ صفحات قیمت عہ/

نورِ مشرق - مہر لال ضیا سونی ایم۔ اے کی روح افروز معیاری نظموں کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ عہ/

اربعہ عناصر - حکیم محمود علی خاں ماہر اکبر آبادی کی رموز و نکات سے لبریز رباعیوں کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ (عہ/)

حسنِ کار - فنونِ لطیفہ پر دلچسپ پیرائے میں جامع تبصرہ۔ قیمت ۶/

داستانِ عجم - مصنفہ نواب نصیر حسین خاں خیال مرحوم۔ شاہنامہ فردوسی پر بے نظیر تبصرہ۔ قیمت ایک روپیہ (عہ/)

روحِ نظم - میرؔ سے لے کر آج تک کے اکثر شعرا کے کلام کا انتخاب۔ از مولانا تاجور نجیب آبادی کا دیلا رام صاحب وفا۔ دو حصے کمل قیمت ۳/

روحِ انتخاب - اردو نثر اور اردو لٹریچر کا ضروری تاریخی انتخاب دو حصوں میں۔ قیمت حصہ اول ۔ حصہ دوم
۱۲/ عہ/

محامد الخلفا - قرآن مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام کے مستند اور مکمل حالاتِ زندگی۔ قیمت مجلد ۸/

معین الشعرا - از غلام حسین خاں آفاق بنارسی مرحوم۔ یہ وہ عدیم المثال لغت ہے جس میں عربی۔ فارسی۔ اردو۔ انگریزی اور ہندی زبان کے ہزاروں الفاظ کے معنی کے علاوہ ہر لفظ کے اعدادِ ملفوظی صحت کیساتھ درج کئے گئے ہیں جو تاریخ نکالنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ہر لفظ کے متعلق یہ بھی درج ہے کہ وہ کس زبان کا ہے اور مذکر ہے یا مؤنث نہ صرف یہی بلکہ اساتذۂ متقدمین حال کے کلام سے ہر لفظ کی تذکیر و تانیث کا ثبوت بھی پیش کیا گیا ہے۔ حقیقتاً یہ لغت طالبانِ ادب و شعر کے لئے خضرِ راہ ہے۔ سائز ۲۲×۱۸/۴ حجم ۲۸۶ صفحات مجلد۔ قیمت چار روپیہ للعہ/

بزمِ خیال - ازجناب مقصود مرزا پوری۔ اس کتاب میں شعرائے اردو و فارسی کی مجالس کے لطائف و ظرائف کو جمع کیا گیا ہے۔ برجستہ گوئی اور حاضر جوابی کے بہترین نمونے دکھائے گئے ہیں حجم ۲۰۰ صفحات قیمت عہ/

منظور شدہ محکمہ ہائے تعلیم برائے ریاست میوا

تعارف

تصویر:- ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور آنجہانی

جلد ۱۲ | ماہنامہ "شاعر" آگرہ - ستمبر ۱۹۴۱ء | نمبر ۹

محسنین، معاونین، انیسان، ہمدردان ادب

محسنین ادب

(۱) محسن ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ۶۰ عہ سالانہ

(۲) محسن ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیّر خورجوی ۶۰ عہ سالانہ

(۳) محسنۂ ادب ہر ہائینس علیہ حضرت کلیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ عہ سالانہ

(۴) محسن ادب جناب محترم خانشری امام الدین خانصاحب مستانؔ ریواد ربار پاجود ۶۰ عہ سالانہ

(۵) محسنۂ ادب شہزادی تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ عہ سالانہ

معاونین ادب

(۶) معاون ادب مسٹر ایل۔ بی قلیس صابر بی۔ اے ۲۴ عہ سالانہ

(۷) معاونۂ ادب محترمہ نجمہ تصدق ایم۔ اے بی۔ ٹی ۲۴ عہ سالانہ

(۸) معاون ادب جناب مولوی محمد احمد صاحب سہو سہارنپوری ۲۴ عہ سالانہ

انیسان ادب

(۹) انیس ادب جناب سید تفضل کرم صاحب جمشید پور ۱۵ عہ سالانہ

ہمدردان ادب

(۱۰) ہمدرد ادب جناب مولوی عبد الغفور صاحب سبحان جالندھری ۱۲ عہ سالانہ

(۱۱) محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیم والیاری مرحوم ۱۲ عہ سالانہ

(۱۲) ہمدرد ادب جناب نواب زادہ کنور شکور حسین خانصاحب قیس آف بیندو ۱۲ عہ سالانہ

(۱۳) ہمدرد ادب جناب ابو عبد العظیم خانصاحب ونق دکنی ۱۲ عہ سالانہ

(۱۴) ہمدرد ادب جناب مولوی محمد قاسم صاحب نامی علوی دربھنگوی ۱۲ عہ سالانہ

(۱۵) ہمدرد ادب جناب صاحبزادہ سید مظفر حسین صاحب تسنیؔ زمیندار (والی دمام) ۱۲ عہ سالانہ

(۱۶) ہمدرد ادب جناب اسمٰعیل کھوکھر راز جوناگڈھی ۱۲ عہ سالانہ

خاصان ادب

(۱۷) جناب صاحبزادہ سلطان حامد خانصاحب ثروت گلشن آبادی صہ سالانہ

(۱۸) جناب صاحبزادہ شمس الرحمٰن خانصاحب شفق ٹونکی صہ سالانہ

(۱۹) جناب عبد الحفیظ صاحب قمر صدیقی جھونڈوی بی۔ اے صہ سالانہ

(۲۰) جناب محمد حسین خانصاحب ادیب صہ سالانہ

(۲۱) جناب [illegible] صاحب آذر سرہندی صہ سالانہ

(۲۲) جناب سید مظفر حسین صاحب قرشی دہلی صہ سالانہ

(۲۳) جناب دلبیراج شرما۔ بی سی۔ ڈی فرخنج صہ سالانہ

(۲۴) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی صہ سالانہ

(۲۵) جناب صاحبزادہ عبد الحمید خانصاحب بہادر عباسی بی۔ اے صہ سالانہ

(۲۶) جناب ماسٹر حسن خانصاحب اثر صہ سالانہ

(۲۷) جناب نذیر احمد صاحب نذیر سشبر کوٹی صہ سالانہ

(۲۸) جناب محمد صبغۃ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی صہ سالانہ

(۲۹) جناب محبوب حسن صاحب آسی متوطن رڑکی صہ سالانہ

(۳۰) جناب صاحبزادہ سیٹھ اکبر علی صاحب صہ سالانہ

(۳۱) جناب مخدوم سید علی اسد نقوی البخاری احمد آباد (جھنگ) صہ سالانہ

(۳۲) جناب طالق ہمدانی لدھیانوی صہ سالانہ

(۳۳) جناب سبحان خاں صاحب غافل بتول صہ سالانہ

(۳۴) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی۔ کوٹاہہ صہ سالانہ

(۳۵) جناب حبیب حسن خانصاحب حبیب شاہجہانپوری اڈکونٹ صہ سالانہ

(۳۶) جناب بابو نفر محمد خانصاحب عارف سیالکوٹی (کوئٹہ) صہ سالانہ

(۳۷) جناب مشیو پرشاد صاحب برگ باندوی صہ سالانہ

(۳۸) جناب ہدایت اللہ خاں صاحب تنہا کوٹی صہ سالانہ

(۳۹) جناب حکیم محمد آس عبد الرحمٰن صاحب [illegible] صہ سالانہ

(۴۰) جناب علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی صہ سالانہ

(۴۱) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب [illegible]

جرعات

مصورِ غم حضرت فانی بدایونی کا انتقال

کچھ تو مہلت دے کہ چشمِ یاس کو بے نم کریں
اے اجل کس کس کو روئیں تا کجا ماتم کریں
(اعجاز)

علمی اور ادبی حلقوں میں یہ اطلاع بعد افسوس سنی جائے گی کہ ہندوستان کے جلیل القدر اور حزنیہ شاعری کے بے مثال مصور حضرت فانی بدایونی ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو پونے چھ بجے شام کے وقت حیدر آباد میں انتقال فرما گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ حضرتِ فانی کی ذاتِ گرامی اُن چند مخصوص ہستیوں میں سے ایک تھی جنھوں نے شعر و سخن کو عروج و کمال بخشا۔ اُن کا شمار اس دور کے گنے چنے شعرا میں ہوتا تھا۔ عرصے سے مرحوم صاحب فراش تھے لیکن وہ خود اور اُن کے احباب اُنکی زندگی سے مایوس نہ تھے۔ ہر چند ناسازیٔ طبع کی وجہ سے موصوف بہت کم لکھتے تھے لیکن کبھی کبھی اُن کا تازہ ترین کلام نظروں سے گذر ہی جاتا تھا۔ دورِ آخر میں مرحوم نے بطورِ خاص "شاعر" کی طرف توجہ فرمائی تھی گو اُن کی علالت کی وجہ سے یہ سلسلہ تا دیر قائم نہ رہ سکا لیکن بشرطِ صحت مرحوم نے "شاعر" کو مستقلاً نوازنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ کاش وہ ہم سے اتنی جلد جُدا نہ ہو جاتے اور ہم تا دیر اُن کے ارشادات سے بہرہ مند ہوتے رہتے۔

ادب و شعر کا دامن جس تیزی سے اربابِ علم و فن سے خالی ہوتا جا رہا ہے اس کا تصور بھی اب رنج فرسا ہے۔ یہ سال تو خصوصیت کے ساتھ شعر و ادب کے لئے بیحد منحوس ثابت ہوا۔ ابھی حضرت احسن مارہروی، مولانا قمر بدایونی، ڈاکٹر اقبال و عظیم بیگ چغتائی کی وفات پر ادبی دنیا کے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے کہ حضرتِ فانی بھی چل بسے۔ موت ایک نہ ایک دن سب کے لئے ہے لیکن رونا تو یہ ہے کہ جانے والے اپنے ساتھ اپنی تمام خصوصیات اور امتیازات کو بھی لے جاتے ہیں اور جو جگہ خالی ہوتی ہے اُس کا پُر کرنے والا کوئی پیدا نہیں ہوتا۔

اکتوبر کے "شاعر" میں مرحوم کے مفصل حالات مع تصویر پیش کئے جائیں گے اور کوشش کی جائیگی کہ اُن پر چند مضامین بھی اسی اشاعت میں شائع ہوں۔ "شاعر" کے قلمی معاونین سے درخواست ہے کہ وہ نظم و نثر میں مرحوم کے متعلق اپنے تاثرات اور خیالات کا اظہار فرما کر مجھے اور ادبی دنیا کو ممنون فرمائیں۔

آج ۲۸ اگست کو حضرتِ فانی مرحوم کے خلفِ اکبر سعادت علی خاں کے خط سے جب اس سانحہ کی تصدیق ہوئی ہے اس وقت جبکہ یہ نوٹ لکھا ہے۔ اسی وقت حضرت قبلہ مولانا سیماب [illegible] نے قطعۂ تاریخِ وفات تحریر فرمایا ہے وہ بھی شریکِ اشاعت ہے۔

ھو الباقی

روز سہ شنبہ بست و شش ز اگست
خسرو ملکِ نکتہ دانی مُرد
رفت آں شاعرِ بدایونی
غالبِ وقت و میرِ ثانی مُرد
دردکن دور از وطن جاں داد
بغریبی و خستہ جانی مُرد
از سرِ سین و طا بگو سیماب
"خانِ شوکت علی فانی مُرد"
۱۹ ۶ ۴۱

آہ عظیم بیگ چغتائی

اس اطلاع سے دل بیٹھ گیا کہ ۲۱ اگست کو عظیم بیگ چغتائی کا [illegible] جودھپور میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم ۷-۸ سال سے دق میں مبتلا تھے اور اکثر اس مرض نے انھیں ختم ہی کر کے چھوڑا۔ یہ اُردو ادب کی بدبختی نہیں تو اور کیا ہے کہ اُردو کا [illegible] اُس سے چھین لیا گیا۔

عظیم بیگ چغتائی کا مزاج جس انفرادیت کا حامل تھا اس کا دوسری جگہ ملنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے وہ اپنے وقت کے کامیاب ترین مزاح نگار تھے اور اُن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مزاحیہ افسانے لکھتے وقت الفاظ تلاش نہیں کرتے تھے بلکہ خیال سے فسانے کی کوشش کرتے تھے۔ اُن کے افسانوں میں "خانم" ایک خاص کیرکٹر ہوتا تھا اور بعض افسانوں میں تو "خانم" حقیقی اور سچے واقعات کی روشنی میں جلوہ گر ہوتی تھیں اس لئے اُن کے افسانے نہ صرف دلچسپ بلکہ جاندار مزاح کہلانے کے مستحق ہیں۔ اُن کے کھیان پیوٹ کو تو ابھی دخل نہیں ہے عظیم بیگ چغتائی وکیل تھے لیکن بحیثیت وکیل کبھی کامیابی نہیں ہوئی "خانم" کا یہ اصرار کہ وہ وکالت میں زیادہ سے زیادہ توجہ صرف کریں اور اُن کی یہ ضد کہ وہ خانم کی تشہیر کریں۔ غرض اس کشمکش نے انھیں کامیاب ترین مزاح نگار بنا دیا۔ مجھے اور ادارۂ "شاعر" کو مرحوم کی "خانم" اور ان کے صاحبزادوں کے [illegible] گہری ہمدردی ہے۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔

یومِ عاشق

گزشتہ سال ماہ شعبان میں حضرت عاشق ٹونکی عرف بھائی جان یادگارِ ظہیر و داغ نے انتقال فرمایا تھا امسال ۹ ستمبر کو مرحوم کی یاد میں "یومِ عاشق" منایا جا رہا ہے۔ ریاست ٹونک کے اربابِ علم کی یہ کوشش قابلِ قدر و تحسین ہے [illegible] ہر سال اہتمام کی اس مایۂ ناز ہستی کی یادگار نے اسالیب کے ساتھ منائی جائیگی خصوصاً اس حالت میں کہ ہندوستان کی مردہ پرستی ہی تو اب [illegible]

شخصیات

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

مشرق میں ہندوستان خصوصیت کے ساتھ ہر دَور، ہر صدی اور ہر زمانہ میں ادب، آرٹ، روحانیت، قومیت اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وقت اور ماحول کے زیرِ اثر ان میں سے کسی میں جھول یا اضمحلال پیدا ہوگیا ہو لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ چیزیں یہاں جزوِ زندگی نہیں ہیں۔ زمانۂ قدیم اور زمانۂ وسطیٰ میں بھی یہاں اربابِ علم و فن، صناع، لیڈر اور روحانیت کے علمبردار موجود تھے۔ ممکن ہے کہ اُن کے کارنامے [illegible] ہندوستان نہ پہونچ سکے ہوں۔ اس لئے کہ وہ لوگ پروپیگنڈے کے عادی نہ تھے بلکہ وہ تو اپنے علم و تہذیب کو ایک ملکی خصوصیت سمجھتے ہوئے اُس کا اشتہار دینے کی کوشش ہی نہیں کرتے تھے لیکن آج مشرق کے بہت سے فلاسفر، شاعر، ادیب، صناع، روحانی پیشوا اور تہذیب و تمدن کے علمبردار تمام دُنیا کی نگاہوں کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ اُن کے اقوال، اُن کی تعلیم، اُن کی زندگی اور اُن کا کمال موضوعِ تنقید و غور بن رہے ہیں اگر بغور دیکھا جائے تو مغرب اکثر فنون میں مشرق کا خوشہ چیں معلوم ہوتا ہے۔

آٹھویں صدی کے آخر سے آج تک ہندوستان بیداری کے بہترین دَور سے گذر رہا ہے۔ اس دَور میں جہاں خاکِ ہند سے عظیم المرتبت ہستیاں صورت طراز ہوئیں وہاں اُن کے خصائص کی تشہیر کے لئے بھی بہتر سے بہتر اسباب مہیا ہو گئے۔ بلا امتیازِ مذہب و ملت ہندوستان میں ایسی بہت سی شخصیتیں پیدا ہوئیں جو اپنے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے نہ صرف دُنیا بھر میں مشہور ہوئیں بلکہ ابدی زندگی کی حامل نکلیں۔ — ادب کی پیغمبری ہندوستان میں نہ ختم ہوئی ہے اور نہ ابھی اس کے آثار [illegible] ہیں۔ کبھی یہ منصب غالب کو سونپا جاتا ہے، کبھی حالی اور اکبر کو، کبھی [illegible] اپنے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو کبھی ٹیگور [illegible] سے یہ کام لیتا ہے۔ وہ پیغمبرانِ ادب و شعر جو ہم سے جدا ہو چکے ہیں، اُن میں ڈاکٹر ٹیگور کی جدائی کا سانحہ ایک تازہ داغ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ٹیگور کو "ساحرِ بنگال" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جب ہم اُن کے ادبی سحر ودں سے روشناس ہوتے ہیں۔ تو ان کی سحر کارانہ تحریریں ہمارے دل پر نقشِ عظمت قائم کر دیتی ہیں۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے والد بزرگوار کا نام نامی دیوندر ناتھ ٹیگور تھا۔ ڈاکٹر ٹیگور ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو دوارکا ناتھ ٹیگور لین کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ۹ سال کی عمر سے سلسلۂ تعلیم شروع ہوا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے زمانۂ تعلیم میں باقاعدگی کے ساتھ کبھی نہیں پڑھا۔ تعلیم کی ابتدا نارمل اسکول کلکتہ سے ہوئی پھر کچھ عرصہ بعد اینگلو انڈین اسکول بنگال اکیڈیمی میں تعلیم پائی، مگر یہاں بھی دل نہ لگا۔ اُن کا زیادہ وقت شعر و شاعری اور فطری مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ فطرت کے اشارے اُن کے معلم تھے۔ تھوڑی بہت تعلیم نے حقیقی ذوق اور فطری صلاحیتوں کو نمایاں کر دیا۔ چنانچہ ۱۳ سال کی عمر میں وہ "پرتھوی راج پراجے" کے مصنف ہو گئے۔ اعزا کے مجبور کرنے سے سینٹ زیویرز کالج میں دوبارہ داخل ہوئے یہ وہ وقت تھا جبکہ ٹیگور ایک صاحبِ طرز انشا پرداز مانے جا چکے تھے ۱۷ سال کی عمر میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ انگلستان کا سفر کیا اور وہاں بھی کچھ عرصہ تعلیم پائی۔ اس دوران میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ بیس سال کی عمر میں پہلا ڈرامہ "بالمیکی" تصنیف فرمایا اور اس کا ایک کردار خود بنے۔ سُنا ہے کہ ۱۹ سال کی عمر میں ڈاکٹر ٹیگور پر ایک الہامی کیفیت طاری ہوئی اور اُن پر زندگی کی تمام شاہراہیں کھل گئیں۔

ڈاکٹر ٹیگور دوبارہ یورپ گئے۔ اٹلی، فرانس اور انگلستان وغیرہ کی سیاحت کی وہاں کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقہ کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ واپسی پر یورپ کا سفرنامہ مرتب کیا جو سیاحت سے وہ ایک غیر معمولی تاثر لیکر آئے چنانچہ اُن کا یہ تاثر چند مختصر نظموں کی شکل میں رونما ہوا۔ اسی اثنا میں بنگلہ زبان میں "سادھنا" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جو ادبی حلقوں میں بیحد مقبول ہوا بنگالی ڈرامہ "چترانگدا" اسی زمانہ کی تصنیف ہے جو سب سے زیادہ انگریزی زبان میں مقبول ہو چکا ہے [illegible]

"شانتی نکیتن" کی بنیاد ڈالی اور اپنی تمام تر توجہات اُسی پر مبذول کر دیں۔ کچھ عرصہ اس ادارۂ تعلیم میں ڈاکٹر صاحب نے خود بھی تعلیم دی۔ "شانتی نکیتن" کو چلانے میں انھیں جتنی مشکلات کا سامنا ہوا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی جائداد اور بیوی کا تمام زیور بیچ کر اُسے استحکام بخشا۔ شانتی نکیتن نہ صرف ایک تعلیم گاہ ہے بلکہ ٹیگور نے محبت۔ اخوت۔ سچائی اور بردباری پر اُس کی بنیادیں رکھی ہیں اور یہی اُن کا "مشن" تھا۔

۱۹۱۳ء میں ڈاکٹر ٹیگور نے تیسری بار یورپ کا سفر کیا۔ اب وہ یورپ کے لئے غیر معروف انسان نہ تھے۔ اُن کا استقبال پُرجوش طریقہ پر کیا گیا۔ یورپ کے مشہور ادبا اور شعرا نے انھیں عزت کے ساتھ نوازا "گیتان جلی" جو ڈاکٹر ٹیگور کی سب سے زیادہ مشہور و مقبول تصنیف ہے اُسے سُننے کے بعد اہلِ یورپ عالمِ حیرت میں پکار اُٹھے کہ واقعی ادبیات میں یہ تصنیف شاہکار ہے۔ یہاں سے ڈاکٹر صاحب امریکہ گئے اور شکاگو یونیورسٹی میں ہندوستان قدیم کی تہذیب پر متعدد لیکچر دیئے۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں بھی اِن کے متعدد لیکچر ہوئے۔ یہ تمام تقریریں کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ امریکہ سے ڈاکٹر ٹیگور انگلستان واپس آئے اور یہاں اُن کی خدمت میں ادبیات کا "نوبل پرائز" پیش کیا گیا۔ یہ اعزاز بحیثیت ہندوستانی سب سے پہلے انھیں کو حاصل ہوا۔ "نوبل پرائز" لینے کے بعد وہ ہندوستان واپس تشریف لائے تو انھیں گورنمنٹ برطانیہ نے "سر" کا خطاب دیا۔ لیکن اس حساس ہندی نژاد نے "جلیانوالہ باغ" کے واقعہ سے متاثر ہو کر یہ خطاب واپس کر دیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے انھیں "ڈاکٹر آف لٹریچر" کی اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔ یہ تھے وہ اعزازات جن کی وجہ سے وہ ہندوستان کی مایۂ ناز ہستی سمجھے گئے۔

۱۹۲۱ء میں تحریک ترکِ موالات کی پالیسی میں انھوں نے دلچسپی لی۔ ہندوستان کے مشہور شہروں کا دورہ کیا اور افرادِ ملک میں آزادی کے جذبات پیدا کئے۔ ۱۹۳۲ء میں چین۔ جنوبی امریکہ۔ اٹلی۔ فرانس۔ انگلستان۔ جرمنی روس۔ مصر اور ایران وغیرہ کا دورہ کیا۔ واپسی پر اُن کے وقت کا زیادہ حصہ شانتی نکیتن کے معاملات میں صرف ہوا۔ ۱۹۳۸ء سے ڈاکٹر ٹیگور کی صحت جواب دے چکی تھی چنانچہ بتقاضائے عمر اب وہ بہت کم سفر کرتے تھے۔ اس سال [illegible] کی عمر [illegible] سال ہو گئی تھی جون اور جولائی میں وہ شدید علیل رہے۔ اسی حالت میں شانتی نکیتن سے انھیں کلکتہ لایا گیا۔ یہاں بہترین معالج ہر وقت اُن کے نگراں رہے لیکن افسوس کہ ہندوستان کی یہ جلیل القدر ہستی ۷ اگست ۱۹۴۱ء کو ہم سے چھین لی گئی۔ دورانِ علالت میں نہ صرف ہندوستان بلکہ غیر ممالک کے افراد بھی اُن کی صحت کی اطلاع کے لئے بے چین رہتے تھے اور یہ اُن کی ہر دل عزیزی کا بہترین ثبوت ہے۔

۷ اگست کو جبکہ یہ آفتابِ مشرق غروب ہو رہا تھا، جائے علالت غمگین لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ اور ہر شخص بے چین نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد تمام دُنیا میں اُن کی وفات کی اطلاعیں پہونچ گئیں۔ کلکتہ کے تمام بازار اور دفاتر بند کر دیئے گئے۔ نہ صرف یہی بلکہ ہندوستان کے قریب قریب تمام تعلیمی ادارے اُن کے شریکِ ماتم رہے۔

ڈاکٹر ٹیگور عالمگیر شہرت کے حامل تھے وہ اپنی ادبی خدمات کی بدولت ابد تک زندہ رہیں گے۔ ہندوستانی تہذیب۔ تمدن رومانیت۔ اخلاق اور معاشرت کے وہ بہترین مبلغ تھے وہ صرف ایک مفکر اور مبصر ہی نہ تھے بلکہ ایک روحانی روشنی بھی اپنے دل میں رکھتے تھے۔ اُن کا مسلک صلح کل، پاکیزہ اور دلوں کو مسخر کرنے والا تھا۔ وہ یقیناً بنگال کے ایک رہنما تھے اور ایسے رہنما جن کی تمام زندگی بنی نوع انسان کی خدمت میں گذری۔ اُن کے میٹھے میٹھے بول، اُن کی تخیل کی بلندیاں اور اُن کے افکار کی ندرتیں ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتی ہیں کہ وہ ہندوستان کے ایک ایسے فرد تھے کہ اب ان کا جواب ناممکن ہے

ٹیگور ہندوستانی تھے اور اسی لئے وہ بلاقیدِ مذہب و ملت سب سے ربطِ خصوصی رکھتے تھے۔ عصبیت شاعرانہ عجب و غرور۔ فرقہ پرستی نہ اُن میں تھی نہ اُن کے کلام میں۔ وہ جس طرح انگریز کے دوست تھے اُسی طرح ہندو اور مسلمان کے بھی۔ اُن کی طبیعت میں ایک ایسا جذبۂ معصوم تھا کہ بسا اوقات وہ اپنی نظموں میں "بچہ" معلوم ہوتے تھے۔ میٹھے میٹھے الفاظ دل میں گھر کرنے والے خیالات اور بیجا طوالت سے گریز اُن کی نظم نگاری کی ایک خاص خوبی ہے۔ افسوس! آج وہ ہم میں نہیں ہیں —

اعجاز صدیقی

تحقیق و تصحیح :-

دعوتِ جلوہ

احمد آفاق نوری بی۔ اے۔ مدیر کارواں بمبئی اور ایک بدایونی کی جاہلانہ اُپج

جون ۱۹۴۱ء کے "شاعر" میں جناب رام پرکاش ساحر ایم۔ اے (بمبئی)۔ نے بایں الفاظ ایک استفسار کیا تھا

"مشاعرۂ "شاعر" ماہ اپریل میں حضرتِ نشتر ہنگامی کا ایک شعر یوں شائع ہوا ہے ؎

دیکھ نظر سے دعوتِ جلوہ جمال کو
پیدا نئے حجاب کئے جا رہا ہوں میں

دعوتِ جلوہ کی "ہ" ترکیبی صورت میں الف بن گئی ہے۔ کیا یہ جائز ہے؟"

میں نے جواباً عرض کیا تھا کہ آپ کو ذرا سا سہو ہوا ہے۔ حضرتِ نشتر کے پہلے مصرع میں "دعوتِ جلوہ" صحیح ہے۔ جلوہ کی "ہ" الف نہیں بنی ہے، البتہ یہ قاعدہ ضرور ہے کہ جب "ہ" اصلی ہو تو وہ ترکیباً الف سے نہیں بدلی جا سکتی۔ میرا ایک شعر ہے ؎

کہہ رہی ہے محرمِ جلوہ، بھری دُنیا مجھے
طورِ پر تم نے یہ کِس انداز سے دیکھا مجھے

یہاں بھی "محرمِ جلوہ" میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ "ہ" الف سے بدل گئی ہے۔ یہ محض خیال ہے، البتہ دُنیا۔ پیدا وغیرہ قوافی کے ساتھ اگر میں اپنے مصرع کو یوں لکھوں "کہہ رہی ہے ساری دُنیا محرمِ جلوا مجھے" تو یہ غلط ہوگا۔ اس لئے کہ "جلوہ" کی "ہ" اصلی ہے (اور قافیۂ ترکیبی میں اُس کا الف سے بدلنا ناجائز ہے۔)

(شاعر جون ۱۹۴۱ء)

ساحر صاحب کے اعتراض اور میرے جواب کو فنِ شعر کا ایک مبتدی بھی سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں نہ کسی قسم کا اُلجھاؤ ہے اور نہ فن کے دقیق مسائل پوشیدہ ہیں لیکن شخصیت کی نمائش کے لئے ایک بدایونی کی رگِ جہالت پھڑکی اور اصولاً مجھ سے مخاطب ہونے کے بجائے اُنھوں نے اخبار "کارواں" بمبئی کے ذریعہ حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ سے اپنی دانست میں بہت مودبانہ استفسار کیا۔ یہی نہیں بلکہ بزعم خود حضرتِ نشتر کے شعر کی تقطیع کر کے جلوہ کی "ہ" کو بغیر کسی اصول کے الف بنا دیا، اور بھی بہت سی لاطائل باتیں وہ ضبطِ تحریر میں لائے۔ محض یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ بھی معتقدِ فن سے آگاہ ہیں۔ اب ذرا بدایونی کا علمی و فنی وقوف ملاحظہ فرمائیے۔

"یہ کیسا اصول بیان کیا کہ جلوہ کی "ہ" کا ترکیبی صورت میں الف بن جانا سہو اور محض خیال ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ شاعر کے فاضل مدیر نے بطورِ سند اسی قبیل کی ترکیب میں اپنا شعر پیش کر دیا۔ جس کے بعد اس غلط تبدیلی پر اظہارِ شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ اس سلسلے میں فاضل مدیر کا یہ فرمانا کہ ــــــ "البتہ یہ قاعدہ ضرور ہے کہ جب "ہ" اصلی ہو تو وہ ترکیباً الف سے نہیں بدلی جا سکتی۔"

لیکن آخر میں فرماتے ہیں کہ :ــ

"دنیا۔ پیدا وغیرہ قوافی کے ساتھ میں اپنے مصرع کو یوں لکھوں "کہہ رہی ہے ساری دُنیا محرمِ جلوا مجھے" تو یہ غلط ہوگا۔ اس لئے کہ "جلوہ" کی "ہ" اصلی ہے۔"

اس عبارت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ شاعر کے مدیر صاحب واقعی طور پر فرمانا کیا چاہتے ہیں۔"

"یعنی جب "ہ" اصلی ہو تو وہ "الف" سے نہیں بدلی جا سکتی اور "جلوہ" کی "ہ" اصلی بھی بتائی جاتی ہے۔ تو پھر جلوہ کی "ہ" "الف" سے بدلی ہوئی دیکھکر بیچارے ساحر صاحب کے اظہارِ شک میں سہو یا محض خیال کو کیونکر دخل ہو گیا؟"

انا للہ و انا الیہ راجعون۔ جی چاہتا ہے کہ بدایونی کی اس کوتاہ فہمی، علمی بے مائیگی اور فنی بے بضاعتی پر رحم کھاتے ہوئے انھیں بخش دیا جائے لیکن ایسا کرنا اب خلافِ مصلحت و وقت ہے اس لئے کہ اُن کے مطبوعہ استفسار کا جواب حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ نے بہت سمجھا کر "کارواں" ہی کے ذریعہ دیدیا تھا لیکن اس پر بھی اُن کی جاہلانہ اور غیر ذمہ دارانہ ہٹ باقی ہے۔ ۲۱ اگست کے "کارواں" میں انھوں نے جوابُ الجواب بھی لکھا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہائے مختفی اصلی کی قسمیں بھی دریافت کی ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ معاملہ کو اُلجھانے اور خواہ مخواہ مرعوب کرنے کے لئے عروض کی کتابوں کے صفحے کے صفحے نقل کر دیے ہیں۔ ایک ذرا سی بات جو میرے یہاں عروض طرح میرا سی بھی سمجھ سکتا ہے۔ بدایونی اُردو مڈل پاس ہوتے ہوئے بھی نہ سمجھ سکے اس سے زیادہ قابلِ افسوس بعد کیا بات ہو سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا ہے۔ یعنی بمبئی میں انھیں جاہل ہی نہیں بلکہ اجہل قسم کے چند شاگرد مل گئے ہیں۔ اب بھلا وہ زمین پر پاؤں کیوں رکھنے لگے! میں ان بدایونی صاحب کو ۱۹۲۸ء سے جانتا ہوں۔ ۱۹۳۰ء میں جب پہلی بار میں نے بمبئی پہونچا تھا اس وقت محب گرامی جناب شمس الدین احمد صاحب چشتی میرٹھی سکریٹری بزم خیال بمبئی نے ان سے میرا تعارف کرایا تھا۔ ایک دو مشاعروں میں تو بدایونی نے میرے ساتھ شرکت کی لیکن بعد کو ...

بیکلہ شعر ... [illegible] ... اعجاز صدیقی

[illegible]

تک نہیں پہنچی تھی۔ ان بدایونی صاحب کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن میں نہیں قابلِ خطاب نہیں سمجھتا اور کچھ یوں بھی تم دیکھ رہے ہو کہ وہ حضرت مولانا قمر بدایونی مرحوم و مغفور کو اپنا استاد بتلاتے ہیں۔ ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں میں انھیں کوئی جانتا بھی نہیں۔ بتائیے کیا آپ نے کبھی ان کا نام سُنا ہے؟ وہ اپنی اس جہالت اور گمنامی کے باوجود استاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ در انحالیکہ شعر گوئی، شعر فہمی اور اصلاح دینے میں بالکل صفر ہیں۔

"چور کے بھائی گرہ کٹ" ایک بہت مشہور مثل ہے۔ یہ مثل احمد آفاق نوری لکھنوی مدیر "کارواں" بمبئی پر صادق آتی ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے بدایونی کا استفسار شائع کرتے ہوئے تنے [1] تکلّفی کا ڈھول پیٹ کر "تکلّف برطرف" کے تحت مجھے دل کھول کر گالیاں دیں۔ اب معلوم ہوا کہ ان کی ہرزہ سرائی میں بدایونی برابر کے حصہ دار ہیں۔ نہ صرف بدایونی بلکہ لکھنؤ، ناگپور اور جمشید پور کے بعض پردہ نشیں خود ساختہ اساتذہ بھی اس میں شریک ہیں۔ احمد آفاق نوری کے متعلق اب میں کیا کہوں، وہ ہنوز مجھے "طفلِ مکتب" سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک تحقیق و تفہیم کے جوابات "دور از کار، لغو اور لاطائل" ہوتے ہیں، اُن کی دانست میں مجھ میں "بے راہ روی، خود سری اور خود رائی" ہے۔ مجھ سے فنِ شعر کے متعلق کسی قسم کی بحث و تمحیص کو وہ "تضیعِ اوقات" سمجھتے ہیں۔ یہ سب کچھ لکھنے اور سمجھنے کے بعد جب اُن کی کورِ باطنی میں تسکین کی روشنی پیدا نہ ہوئی تو جگر، جوش اور احسان دانش [2] کا ذکر کرتے ہوئے اپنے پورے جوش و خروش کے ساتھ تہذیب و سنجیدگی کی لگام اپنے منہ سے ہٹا کر اس طرح بکواس کرنے لگے:—

"ان [3] حضرات کو نہ تو فنِ شاعری پر عبور ہے اور نہ زبان پر قدرت، مجھے بیساختہ ہنسی آتی ہے جب میاں اعجاز یہ لکھتے ہیں "میرا ایک شعر ہے" کے آدمی ہے کے پیر شدی۔ مدیرِ شاعر کو معلوم ہونا چاہئے کہ علامہ سیماب کے ارادت کیشوں میں استاد زادہ کا شعر سند ہو تو ہو دنیائے ادب و شعر میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا"

"من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کے مصداق آگے چل کر لکھتے ہیں:—

"جناب صاحب قمر صاحب بدایونی کے شاگردِ رشید ہیں اور ساتھ ہی دُنیائے ادب و شعر میں بھی خاصی شہرت حاصل ہے"

بیتہا منطق سا بند۔ نوری صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ دُنیائے ادب و شعر تو بہت وسیع ہے بمبئی اور بدایوں شریف میں بھی صرف چند نفوس کے علاوہ اِن ذاتِ شریف کو کوئی نہیں جانتا۔ نامہ احمد آفاق نوری کو اس کا احساس نہیں ہے کہ ان کے اس منشر پن نے بیچارے بدایونی کی لُٹیا ہی ڈبو دی۔ بدایونی کے مضمون کے متعلق مدیرِ کارواں لکھتے ہیں:—

"بدایونی کا مضمون ماہنامہ شاعر کی تحقیق و تفہیم کے حصّہ میں شائع ہوا ہے جس میں فنِ شعر کے ایک بہت اہم اور نازک مسئلہ پر بحث کی گئی ہے"

دیکھا آپ نے مدیرِ کارواں اپنی کم علمی کا ڈھنڈورا کس طرح پیٹ رہے ہیں۔ جو شخص دعوتِ جلوہ کی "ہ" کو فنِ شعر کا بہت اہم اور نازک مسئلہ قرار دے، اُس کے علمی افلاس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ مدیرِ کارواں تو نے شاید بی۔ اے تک بھاڑ جھونکا ہے۔ بی۔ اے میں اگر ان کے پاس اردو نہ ہوگی تو کم از کم میٹرک میں تو اس ترکیب کے سیکڑوں اشعار پڑھے ہونگے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لیدوہ اردو کے پرچوں میں رشوت دیکر پاس ہوئے ہیں۔ یوں تو مجھے گالیاں دیتے ہوئے وہ بہت سے جملے ربط اور بے ڈھنگے لکھ گئے ہیں۔ لیکن "لنگوٹ کھینچ کر" لغزشِ بیانی اُن کی اردو دانی کا بہترین ثبوت ہیں۔ شاید لکھنؤ والے "لنگوٹ کس کر" کو "لنگوٹ کھینچ کر" اور "وجوہ" کو "وجہوں" لکھتے ہونگے۔ جو شخص صحیح اُردو نہ لکھ سکے وہ مسائلِ فنِ شعر کیا سمجھ سکتا ہے۔

جلوہ کی "ہ" کے متعلق میں "شاعر" میں حسبِ ضرورت کافی صراحت کے ساتھ لکھ چکا ہوں اور اب پھر اپنا جواب اس مضمون کے شروع میں نقل کر رہا ہوں۔ بدایونی اور نوری کی تسکین کے لئے نہیں بلکہ ناظر صاحب اور اربابِ بمبئی کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے میرا جواب اب بھی یہی ہے کہ "دعوتِ جلوہ" اگر تماشا۔ دنیا اور اچھا وغیرہ قوافی کے ساتھ نظم کیا جائے تو وہ ازروئے فن غلط ہوگا۔ حضرتِ نشتر شالامی کے شعر میں "دعوتِ جلوہ" بالکل صحیح نظم ہوا ہے کوئی واقفِ فن اسے غلط ثابت نہیں کر سکتا۔

نشاطِ روح میں حضرتِ اصغر گونڈوی مرحوم و مغفور کی ایک غزل ہے۔ جس کے قوافی تنہا۔ تماشا۔ صحرا۔ دریا اور تڑپنا ہیں۔ اسی غزل کے اوپر ایک مطلع اور بھی ہے جس میں "ہ" کی قید ہے۔ فرماتے ہیں:—

ادنیٰ سا یہ حیرت کا کرشمہ نظر آیا | جو تھا پسِ پردہ، سرِ پردہ نظر آیا

اس کے بعد یہ اشعار ہیں ؎

پھر میں نظر آیا نہ تماشا نظر آیا | جب تو نظر آیا مجھے تنہا نظر آیا
اللہ رے دیوانگیٔ شوق کا عالم | اک رقص میں ہر ذرہ صحرا نظر آیا

ان اشعار سے مسئلہ مطلوبہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اصغر مرحوم اگر "تنہا نظر آیا" کے ساتھ "سرِ پردہ نظر آیا" لکھ دیتے تو یہ غلط تھا اس لئے کہ پردہ کی "ہ" اصلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرتِ اصغر مرحوم نے اس مطلع کو علیحدہ لکھا۔ "جو تھا پسِ پردہ سرِ پردہ نظر آیا" میں پردہ کی وہی صورت ہے جو "**دعوتِ جلوہ**" کی ہے۔ بطورِ سند حضرتِ اصغر گونڈوی اور فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے چند اشعار اور پیش کرتا ہوں ؎

---

[1] کارواں میں "تکلّف برطرف" ایک عنوان ہے جس میں بے تکلّفی کے نام سے احمد آفاق نوری خود مشاہیر کی پگڑیاں اچھالا کرتے ہیں۔

[2] حضرت جگر مراد آبادی، حضرت جوش ملیح آبادی اور حضرت احسان دانش۔

[3] کارواں مقامی پرچہ ہے۔ بمبئی کے علاوہ بہت کم باہر جاتا ہے۔

تھا مائلِ نظارہ" فقط ایک تحیر — جلوے کو کہے کون کہ اب گم ہے نظر بھی
کیونکر جیں برقِ سرِ طور کس طرح آئے — جو "موج بادہ" میں بیجانِ ارتعاش ہو

(اصغر گونڈوی مرحوم)

ہم ایسے محوِ نظارہ" نہ تھے کہ ہوش آتا — مگر تمہارے تغافل نے ہوشیار کیا
زبانِ شاعر سے نکلی صدائے بسم اللہ — جنوں کو جب "سرِ شوریدہ" پر سوار کیا

"باعثِ گریہ" نہ پوچھ اے ہمنشیں — کیا کہوں میں آ گیا تھا یاد کیا

کبھی عشق میں رہا "شبِ وعدہ" — کبھی گردن اُٹھا کے دیکھ لیا

(داغ دہلوی)

احمد آفاق نوری مدیر کارواں بمبئی اور بدایونی کے متعلق اگست کے "شاعر" میں میرا مختصر نوٹ پڑھ کر میرے دوستوں اور مخلصین نے میری اہلیہ کی حال پرسی کرتے ہوئے مجھے خلوص نیت کے ساتھ یہ مشورہ دیا کہ میں "کارواں" کے جواب میں ایک لفظ بھی نہ لکھوں اور جاہل قسم کے مخالفین کو اُن کے حال پر چھوڑ دوں، جواب دینے سے ان لوگوں کے حوصلے بڑھتے ہیں اور اُن کے مقصدِ شہرت کو تقویت پہونچتی ہے۔

میں یقیناً اپنے بزرگوں اور دوستوں کے اس گرانقدر مشورہ پر عمل کرتا اور اکثر کرتا رہتا ہوں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہ لوگ خاموشی سے بھی غلط فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ احمد آفاق نوری اور بدایونی نے جو طریقہ کار اختیار کیا ہے وہ نہایت ذلیل اور گھناؤنا ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے بھی اس قسم کا ایک مضمون "کارواں" میں شائع ہوا تھا، جسے میں نے اپنے ضبط و تحمل کی نذر کر دیا۔ یہ بیچارے احمد آفاق نوری اور بدایونی کس کھیت کی مولی ہیں، میں تو ان کے پیچھے چھپے ہوئے مددگاروں سے بھی ٹکر لینے کو تیار ہوں۔ اب تک انھیں جہلا سے واسطہ پڑا ہوگا۔ وہ ذرا سنجیدگی اور متانت کے ساتھ بے پردہ ہوں! سوال یہ ہے کہ جب احمد آفاق نوری فنِ شعر میں بالکل کورے ہیں تو بدایونی کے استفسار پر قبل از وقت انھیں اپنی رائے دینے اور اس قسم کے ناشائستہ الفاظ استعمال کرنے کا کیا حق حاصل تھا؟ بحیثیت انسان مجھ سے غلطی کا امکان ہے اور خصوصیت کے ساتھ ایسی حالت میں کہ شاعر کے باب "تحقیق و تصحیح" کے تحت میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اُس میں کسی دوسرے کا ہاتھ نہیں ہوتا، احمد آفاق نوری اس شبہ میں [illegible] ہیں کہ میرے جوابات میں حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہ کا ایما یا اشارہ بھی شامل ہوتا ہے۔ مولانا مدظلہ العالی سے شرف تلمذ میرے لئے باعثِ فخر و سعادت ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک مدت سے مولانا مدظلہ اس سے قطعی بے تعلق ہیں جو کچھ میں غلط یا صحیح لکھتا ہوں اُس کے زیادہ بے علم اور کون ہو سکتا ہے۔ میں علم و فن کی تحصیل علم کو اپنے لئے تمام عمر باعثِ فخر سمجھونگا۔ اگر احمد آفاق نوری اور بدایونی کو اپنی قابلیت پر ناز ہے اور وہ اردو کے حقیقی بڑے استاد بن چکے ہیں تو میں انھیں چیلنج دیتا ہوں کہ وہ مشعر معلومہ میں "جلوہ" کو غلط ثابت کر کے دکھا دیں ورنہ احمد آفاق نوری اپنی بی۔ اے کی ڈگری اور بدایونی اپنی شاعری کی خرافات "باب الہند" سے بحرِ عرب میں پھینک دیں اور اپنی سخن پروری گندہ ذہنی اور ڈھٹائی کو اس طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے بلکہ حسبِ عادت ہمیشہ کارواں کے ذریعہ اپنی تنگ نظری کا ثبوت دیتے رہیں گے اور اپنی شخصی شرافت کو اسی طرح اُچھالتے رہیں گے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جہلا کا یہ گروہ جس کے بمبئی، لکھنؤ، ناگپور اور جمشید پور میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مجھ پر میرے کلام پر تحقیق و تصحیح کے جوابات پر اور حضرت قبلہ مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہ کی تصانیف پر "کارواں" میں مسلسل گندگی اُچھالنا چاہتے ہیں لیکن میں آج کے بعد کبھی ان رسوا کنندگانِ علم و تہذیب کو جواب کے قابل نہیں سمجھوں گا۔ ان کی کھوکھلی معلومات اور گندہ ذہنیت ادبی دُنیا کے سامنے آ چکی ہے۔

لطویاً اتمامِ حجت "دعوتِ جلوہ" کے متعلق دورِ موجودہ کے بعض ممتاز اساتذہ کی گرانقدر رائیں بھی پیش کرتا ہوں اسی میں حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی کی وہ رائے بھی ہے جو بدایونی کے مطبوعہ استفسار کے جواب میں ۹ اگست کے کارواں میں شائع ہو چکی ہے۔

(۱) حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی

" ان اشعار میں فنی نکتہ صرف آشنا ہی کہ "جلوہ" کی واؤ کی حرکت (فتحہ) میں اشباع ہے جس سے الف کا دھوکا ہوتا ہے۔ تقطیع میں حرکت کے مقابلہ میں حرکت آتی ہے۔ اگر اس مصرع میں لفظ جلوہ کی جگہ "چلمن" یا "کافر" ہوتا تو بھی "من" اور "فر" فاعلاتن کے "فا" کے برابر ہی ہوتے۔ یہاں اشباع کا سوال تقطیع میں اہلِ فن اسے جائز سمجھتے ہیں۔

حرفِ "جلوہ" ہی نہیں بلکہ جن الفاظ میں ہائے مختفی ہو ان سب کا بصورتِ ترکیب اضافی الف سے بدل جانا بصورتِ قافیہ خصوصاً اور کسی دوسرے حصۂ شعر میں عموماً جائز نہیں ہے۔ لیکن اشباع جائز ہے

(۲) اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری

جو ناعرض ہے کہ ایسے استفسارات پر ہم بزرگوں کی رائے دریافت کر [illegible] پر وہ مولانا سیماب [illegible]

اور میں موصوف کی تحقیق منزلت کا احترام کرتا ہوں۔

معترض صاحب فرماتے ہیں کہ دعوتِ جلوہ کی "ہ" الف سے بدل گئی ہے میں ایسے اعتراض سے اب تک نا آشنا تھا۔ "ہ" الف سے بضرورت قافیہ بدل جاتی ہے مصرع کے اندر ایسی تبدیلی کی کیا ضرورت تھی۔ میں صاحب فراش ہوں۔ خالصہ اشعار کے لئے کلام اساتذہ کے مطالعہ کی ضرورت ہے اور بیماری فی الوقت ممکن نہیں۔

(۳)

بلبل بہار حضرت سرکاری مینائی گیاوی

حضرت نشتر ہنگامی کے شعر پر جو اعتراض کیا گیا ہے میری دانست میں بجا نہیں ہے "جلوہ کی "ہ" الف سے بدلی ہوئی اس وقت سمجھی جاسکتی تھی جب یہ قافیہ میں مبتی اس لئے کہ بضرورتِ قافیہ وہاں حذف ہونا لازمی ہوتا اور ترکیب غلط ہو جاتی۔ لیکن یہاں درمیانِ شعر واقع ہوئی ہے۔ اس لئے اس جلوہ کو حذف کرکے "جلوا" کہنا خواہ مخواہ غلطی کا الزام عائد کرنا ہے۔ مثال میں اساتذہ کے کلام بھرے پڑے ہیں۔ بر حضرت حضرتِ داغ مرحوم کا ایک شعر حوالہ قلم ہے ؎

"جوششِ گریہ" سے آنکھیں ارغنیاں ہو گئیں	میری بینا بیاں مشہورِ دوراں ہو گئیں

لیجئے دوسرا شعر بھی حضرت فصیح الملک کا یاد آ گیا ؎

گذار دی "شبِ وعدہ" اسی تمنا میں	مرے بلانے کو اب آدمی ضرور آیا

پہلے شعر میں گریہ اور دوسرے شعر میں وعدہ کی "ہ" پر صاف الف کا دھوکا ہوتا ہے مگر در حقیقت ہے نہیں۔ غالباً معترض کو حضرتِ نشتر ہنگامی کے شعر میں جلوہ کی "ہ" میں بھی دھوکا ہوا ہے

(۴)

حضرت مولانا دردؔ کاکوروی

دیکر نظر سے دعوتِ جلوہ جمال کو	پیدا نئے حجاب کئے جا رہا ہوں میں

اس پر یہ اعتراض کہ جلوہ کی "ہ" الف بن گئی ہے بالکل غلط ہے اس واسطے کہ یہاں یہ لفظ بطورِ قافیہ استعمال نہیں ہوا ہے۔ جب یہ لفظ بطورِ قافیہ استعمال نہیں ہوا ہے تو الف سے بدلنے کا شبہ بھی نہیں ہونا چاہئے۔ مثال میں چند اشعار لکھتا ہوں ؎

کانوں نے دی خبر جو "تپ لرزہ" مہر کو	کھولی نہ آنکھ ابرِ سیہ کے کمان سے

(ذوق دہلوی)

جذبِ نگاہِ شوق نے حسن کو کھینچ ہی لیا	پردہ نہ ہو سکا ذرا "پردۂ جلوہ ریز" سے

(شہیر مچھلی شہری مرحوم)

(۵)

حضرت مولانا اکمل مظفر نگری

دیکر نظر سے دعوتِ جلوہ جمال کو .... الخ

اسی شعر میں دعوتِ جلوہ کی ترکیب صحیح ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی ترکیب ہے جیسی کہ فیضی کے ان اشعار میں :-

می گداز و نظرم تا نگہی می کنمش	"جنبشِ غمزۂ" عجب دیدہ گذارست مرا
تیغ کہ گرد سرا پردہ ہائے مژگانت	"ہجومِ غمزۂ" چناں شد کہ تا نما جانیست

"جنبشِ غمزہ" اور "ہجومِ غمزہ" اور "دعوتِ جلوہ" ایک سی ترکیبیں ہیں ان میں "ہ" الف نہیں بنی ہے۔ معترض شاید شعر و شاعری کی الف۔ ب۔ ت سے بھی واقف نہیں۔

(۶) حضرت مولانا شفیق عماد پوری مینائی

سوال

دیکر نظر سے دعوتِ جلوہ جمال کو	پیدا نئے حجاب کئے جا رہا ہوں میں

اس شعر میں "دعوتِ جلوہ" والی ہائے ہوز الف سے بدل جاتی ہے بحالت اضافت فارسی یہ صورت ناجائز ہے یا جائز۔

جواب

الف والے قافیہ کے ساتھ جلوا ہو تو بے شک یہ بائے ہوز کے الف ہو جانے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ یہاں تو اظہار کی صورت ہے یعنی ہائے مختفی ہائے مظہرہ پڑھی جاتی ہے اور لکھی گئی ہے علامت ہائے ہوز کی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ "جلوہ" اشباع فتحہ ماقبل و ہائے مظہرہ کے ساتھ فارسی میں مستعمل ہے یا نہیں اگر ہے تو اضافت کے ساتھ بھی ممکن ہے۔ اب صورت سوال صحیح طور پر یوں ہوئی۔

۱۔ لفظ "جلوہ" ہائے مظہرہ کے ساتھ بھی ہے یا فقط ہائے مختفی کے ساتھ۔

۲۔ "دعوتِ جلوہ" اضافت ماقبل میں ہائے مختفی کے ہائے مظہرہ سے بدلنے کی صورت جائز ہے یا ناجائز۔

"جلوہ گاہ" "جلوہ گر" دونوں مرکب اکثر ہائے مختفی کے ساتھ مستعمل ہیں فاعلات و فاعلن کے وزن پر۔ ہائے مظہرہ کے ساتھ "جلوہ گاہ" "جلوہ گر" بروزن مفعولات و مفعولن قلیل الاستعمال ہیں۔ "جلوہ گاہ" مفعولات کے وزن پر بھی ممکن ہے استعمال ہوا ہو۔ چند الفاظ ہائے مختفی والے مثلاً شانہ و پردہ ہائے مظہرہ کے ساتھ فارسی میں بھی ملتے ہیں مثلاً

(حسن دہلوی) سینہ دندانِ ترا لیسن شانہ میدہد	صورت خم دارد حلقۂ گیسوئے تو
(مولانا روم) گر خدا خواہد کہ پردہ کسی درد	میلش اندر طعنۂ پاکاں برد

دونوں اشعار میں شانہ و پردہ ہائے مظہرہ کے ساتھ باشباع فتحہ ماقبل ہیں یا نہیں البتہ یہ مثالیں اضافت کے ساتھ نہیں جو سوال کی صورت ہے۔ پھر بھی ظاہر ہے کہ جو لفظ فارسی شعر میں جس صورت کے ساتھ بلا اضافت مستعمل ہو اضافت فارسی کے ساتھ بھی اسی صورت میں آ سکتا ہے پھر لفظ جلوہ فارسی میں ہائے مظہرہ کے ساتھ آیا ہے تو حالت اضافت میں بھی آ سکتا ہے۔

ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو عدم جواز کی صورت باقی نہیں رہتی ... جلوہ ہائے مختفی و ہائے مظہرہ دونوں طرح مستعمل ہوا ہے یا نہیں فافہم

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

[illegible] عنوان تک آ پہونچی ہے
بیتابیٔ دل ملک ملک تک آ پہونچی ہے
کچھ تم کو بھی معلوم ہے اے ہندوستان؟
یہ آگ اب ایران تک آ پہونچی ہے

جو معرضِ انقلاب ناگاہ میں ہیں
وہ سب کے سب نگاہِ آگاہ میں ہیں
طوفان نے اختیار کی ہے جو راہ
ترکی اور مصر بھی اسی راہ میں ہیں

دارائی رہی نہ کج کلاہی باقی
ہے کس کو دماغِ بادشاہی باقی
باقی ہے جو کچھ وہ ہے فنا ہونے کو
رہ جائیگا ایک نامِ الٰہی باقی

ہے تیل پہ جنگِ وقت کا دار و مدار
اور تیل کی تخلیق پہ قدرت مختار
پھر کیسے لڑیں یہ حامیانِ الحاد
[illegible] تیل کی پیداوار

خاموش [illegible] جنگ [illegible] ہوں
جذبات سے گرمائی ہوئی باتیں ہوں
[illegible] انقلاب [illegible]
[illegible]

[illegible] فتح و شکست [illegible]
دنیا کی زمیں [illegible]
[illegible]
[illegible] کیا ہو گی؟

معراجِ قضا نے برق باری کیسی
یہ خاک پہ خوں سے لالہ کاری کیسی
جن کا ہے نزاعِ للبقا نصب العین
اسبابِ فنا سے اُن کی یاری کیسی

جینے کو جہاں سے مطمئن ہو لینے دو
سبزے پہ سرِ نہر رواں سو لینے دو
دنیا جاتی سی نظر آتی ہے
دنیا سے گلے مل کے ذرا رو لینے دو

[illegible] نظر [illegible]
[illegible] ہستی کا اٹھا [illegible]
دنیا جب راکھ [illegible] ہو جائے گی
اس راکھ سے ہوگی نئی دنیا پیدا

اے عالمِ نو تیری فضاؤں کو سلام
تیری جنت نشاں زمینوں کو سلام
جو تجھ میں بسیں گے [illegible]
ان برتر و خوش نصیب [illegible] کو سلام

سیماب

DE [illegible] (VULGARI ELOQUENTIA) [illegible]

دانتے

ادبِ عالم کا رکنِ اعظم

[illegible]

اٹلی کے مشہور شہر فلورنس (FLORENCE) میں دانتے (DANTE) ۱۲۶۵ء کو پیدا ہوا۔ اس کا خاندان فلورنس کے قدیم [illegible] تھا جس کے اسلاف شہنشاہ کونارڈ سوم کے زمانے میں [illegible] اور صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے خلاف حصہ لے چکے تھے۔ دانتے دراصل دورانتے (DURANTE) کا مخفف ہے۔ اس کے باپ کا نام الیگیری (ALIGHIERI) اور ماں کا نام بیلا (BELLA) تھا۔ اس کے باپ کا فلورنس کے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا اور وہ [illegible] (COTADO) میں چھوٹی سی جاگیر کا بھی مالک تھا۔ نو سال کی عمر میں اس کی ملاقات بیٹرس (BEATRICE) سے ہوئی جس نے اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا اور بیٹرس اس کے تخیلات کی مرکز ہو کر رہ گئی بلکہ وہ اس کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھنے لگا جس کا اعتراف اس نے متعدد مقامات پر کیا ہے اور اس نے بعد میں "حیاتِ نو" (VITA NAURA) جیسی [illegible] کتاب لکھی جو اس کی محبت کے افسانے پر مشتمل ہے وہ اپنے خیالات کی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] (BRUNETTO [illegible]) [illegible] (VITA NAURA) [illegible]

[illegible]

سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تمام مذہبی علوم میں ماہر تھا اور اس کو مصوری کا بھی شوق تھا۔ وہ خود کہتا ہے کہ بیٹرس کے انتقال (۱۲۹۰ء) تک اعلیٰ تعلیم یا مختلف علوم جدیدہ کو کچھ زیادہ درک نہ تھا۔ محبت کی ناکامی کے ساتھ ہی اس نے [illegible] اور بہترین کتب کا مطالعہ کیا اور یہیں سے اس کے فطری ذوق میں ابھار ہوا۔ وہ کہتا ہے میں چاند کی تلاش میں نکلا تھا مجھے سورج مل گیا۔ مختلف مصنفین کی تصانیف سے جن نے سکونِ دل حاصل کیا اور [illegible] تمام علوم کی جان ہے پڑھنے لگا۔ بہرحال اس شریف خاتون نے اس کے خیالات کو راہ راست پر لگا دیا۔ اس وقت مطالعہ کا علم ہیں اس کی کتاب [illegible] (ROSA [illegible]) سے ہوتا ہے وہ اپنے مطالعہ میں اس قدر محو ہوا کہ اس کی آنکھوں کی روشنی کم ہونے لگی اور بیٹرس کا خیالی قریب قریب اس کے دل و دماغ سے نکلنے لگا۔ [illegible] میں آتے ہی اپنے بیانِ عشق کی تجدید کی [illegible] متعدد مطالعہ کو اخلاقی [illegible] تعبیر کیا۔ اس وقت دانتے کا دماغ تمام علوم و فنون میں پختہ تھا۔

فلسفہ اور محبت ہی اس کی زندگی کا [illegible] تھے۔ [illegible] زندگی بھی بسر کی اور [illegible] شوق [illegible] (ZL'DIDE [illegible]) میں اس کا مشہور عالم نظم جہنم (INFERNO) [illegible] تلمیحات استعمال کی ہیں اور ایسے متعدد [illegible] (RONA [illegible])

[illegible]

[illegible]

(GEMMA [illegible]) [illegible]

A lecture on Dante

[illegible]

پیٹرو (PIETRO) ڈانٹے کی شاہکار کامیڈی (COMEDY) کا اور اس سے چھوٹا لڑکا جیکپ (JACOPO) اس کے مشہور عالم "جہنم" کا حاشیہ نگار ہے۔ اس کی ایک لڑکی اس کی ملکہ تخیل کے نام پر بیٹرس بھی جو راہبہ مشہور ہے۔ اس کی ایک لڑکی کا علم نہیں مگر ۱۳۳۲ء تک اس کی موجودگی مسلّم ہے مختصر یہ کہ ڈانٹے کے بچوں نے اپنے شریف خاندان کی عظمت کو برقرار رکھا۔

ڈانٹے کی سیاسی زندگی سب سے زیادہ قابل غور ہے۔ فلورنس کی تمام حکومت اس زمانے کے تجارت پیشہ افراد کے ہاتھوں میں تھی ۱۲۹۵ء میں ایک نئے قانون کی رعایت سے ڈانٹے بھی کونسل کا ممبر ہوگیا اور ۱۲۹۶ء سے ۱۳۰۱ء تک کئی بار اس نے کونسل کی نمایاں کارروائیوں میں حصہ لیا بلکہ آخر زمانے میں تو وہ کونسل کی ان چند نمایاں ہستیوں میں سے شمار کیا جاتا تھا جن کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور تھی۔ فلورنس کی حکومت متزلزل تھی۔ غربا اور رؤسا کو کم اختیارات حاصل تھے اسی لئے وہ مسلسل ان تجارت پیشہ افراد کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی فکر میں لگے رہتے تھے جو پاپولانی (POPOLANI) کے نام سے مشہور تھی۔ یہی سیاسی پیچیدگیاں ڈانٹے کے حق میں مضرت رساں ثابت ہوئیں۔ حکومت میں نمایاں جماعتیں باہم دست و گریباں نظر آنے لگیں اور مفتوح جماعت کی اعانت ڈانٹے کے لئے گراں ثابت ہوئی۔ ۲۷ جنوری ۱۳۰۲ء کو فاتح جماعت نے ڈانٹے کو دو سال کیلئے جلاوطن کر دیا اور عمر بھر کے لئے حکومت فلورنس کا ہر عہدہ ممنوع قرار دیدیا۔ اس کشاکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۰ مارچ ۱۳۰۲ء کو احکامات صادر کئے گئے کہ ڈانٹے اور اس کے ساتھی حدود سلطنت میں داخل ہوتے ہی زندہ جلا دیئے جائیں۔

ڈانٹے اپنی جلاوطنی کے ایام میں (۱۳۰۲ء سے ۱۳۱۰ء تک) تمام سرزمینِ اطالیہ کا چکر لگاتا رہا بلکہ فرانس میں پیرس تک جانے کا امکان بھی پایا جاتا ہے وہ متعدد رؤسا کے پاس رہا اور یہاں بھی اپنے شوقِ سیاست کو بروئے کار لاتا رہا۔ اکتوبر ۱۳۰۶ء میں وہ موضع لونیجیانا کے ایک نواب کے پاس ایجنٹ مقرر ہوا اسی دور میں نواب کے اور ایک مشہور بشپ کے درمیان باہمی تنازع ہوگیا۔ ڈانٹے نے اپنے سیاسی تدبر سے فریقین کو ایک باہمی فیصلے پر رضامند کر لیا اور ملک کو تباہی سے بچا لیا۔

کہا جا سکتا ہے اس نے انہیں ایام میں دو نامکمل سی کتابیں لکھیں۔ پہلی DE (VULGARI ELOQUENTIA) ہے جو تقریباً ۱۳۰۴ء میں لکھی گئی دوسری (CONVIVIO) ہے جو ۱۳۰۶ء سے ۱۳۱۲ء کے زمانے میں تصنیف ہوئی۔ دوم اس نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ عام نظریات کے خلاف لاطینی کی بجائے اس نے مقامی زبان میں ان دونوں کتابوں کو تصنیف کیا۔ ہر چند ہنگامی و مقامی سیاست کی الجھنوں نے اس کی تصانیف پر براہِ راست اثر ڈالا اور وہ ان کو نامکمل چھوڑنے پر مجبور بھی ہوا مگر یہ دونوں نامکمل کتابیں اپنی جگہ مکمل اور اس کے عزائم ظریفانہ کی آئینہ دار ہیں اور ڈانٹے کا کردار ہر جگہ اپنی خصوصیات کے ساتھ نمایاں، واضح اور روشن تر ہے جن کے مطالعہ سے ڈانٹے اپنے اس مرکزی آئیڈیل (IDEAL) کی جانب آتا ہوا معلوم ہوتا ہے جس کی زندۂ جاوید یادگار مشہور عالم کتاب ڈیوائن کامیڈی (DEVINE COMEDY) ہے۔

۱۳۰۸ء میں ہنری (کاؤنٹ آف لکسمبرگ) شہنشاہ اٹلی منتخب ہوا۔ ڈانٹے کے دل میں پھر ایک جوش پیدا ہوا اور ہنری کی وساطت سے اپنی سیاسی گتھیوں کو سلجھا کر کامیابی حاصل کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اس نے ہنری سے ساز باز ہی نہیں کی بلکہ "شرفِ ملاقات" حاصل کر کے فلورنس پر قبضہ کرنے کی دعوت دی۔ اس موقع پر اہلِ فلورنس نے بڑی دانشمندی سے کام لیا اور مقابلے کے لئے ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا۔ تمام جلاوطن افراد کے لئے عام معافی کا اعلان کر دیا گیا اور اُن کو وطن آجانے کی اجازت مل گئی مگر ڈانٹے پر اہلِ فلورنس کا شبہ صحیح نکلا اور اُن کو ڈانٹے اور ہنری کی مراسلت و ملاقات کا پتا چل گیا۔ اہلِ فلورنس کی متحدہ قوت نے ہنری کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور وہ اپنے حریصانہ مقاصد میں ناکام رہا اور ڈانٹے کو بھی ناامید ہو جانا پڑا ——— ۳۱ مارچ ۱۳۱۱ء کو ڈانٹے نے اپنے ایک مضمون (خط) میں تمام اہلِ فلورنس کو بدکار ترین افراد سے موسوم کر کے دل کی بھڑاس نکالی اور شاعرانہ استدلال کے ساتھ سیاسی رنگ و یکر "شہنشاہ" کی اہمیت و رفعت کا اظہار کیا گرسب بے سود تھا۔ ۱۳۱۶ء کے موسم بہار میں اہلِ فلورنس کے دل کچھ نرم ہوئے اور ڈانٹے کو اس شرط پر وطن آنے کی اجازت دی گئی کہ وہ جرمانہ ادا [illegible]

ڈانٹے کی جلاوطنی پر ——— ادبی تصانیف کا ابتدائی دور

پورا کیا جائے۔ ڈانٹے اس ذلت کو کیسے برداشت کر سکتا تھا اس نے غضبناک ہوکر اہلِ فلورنس کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور ہمیشہ کے لئے جلاوطن رہنا گوارا کرلیا بلکہ ۶ نومبر ۱۳۱۵ء کو حکومت فلورنس نے احکامات جاری کردیئے کہ حدودِ سلطنت میں قدم رکھتے ہی ڈانٹے یا اس کے لڑکوں کا سر کاٹ ڈالا جائے۔ حقیقتاً اہلِ فلورنس اپنے اقدام میں حق بجانب نہیں تھے برخلاف اس کے ڈانٹے اپنی جگہ حق پر قائم رہا۔

ڈانٹے کی زندگی کے آخری ایّام اطمینان اور عزت سے بسر ہوئے مگر اس دور میں بھی وہ ناامید نہیں ہوا اور ایک روز فلورنس بلائے جانے کی امید میں زندگی گزارتا رہا۔ رؤسا اور نواب اس پر بے حد مہربان رہے اور اسی زمانے میں اس نے اپنے سب سے بڑے شاہکار ڈیوائن کامیڈی (DIVINE COMEDY) کی تکمیل کی۔ اس آخری اور رنگین دور کی دلچسپ جھلک ان شاعرانہ خطوط میں پائی جاتی ہے جو مشہور پروفیسر گیوانی (GIOVANNI) کو ڈانٹے نے لکھے۔ عام آدار کے تحت پروفیسر مذکور بھی اس نظریہ کے قائل تھے کہ بلند خیالات کے اظہار کے لئے لاطینی زبان سے بہتر کوئی ذریعہ موجود نہیں اور جب ڈانٹے نے ان کے پاس کامیڈی کے ابتدائی حصص میں سے جہنّم (INFERNO) اور اعراف (PURGATORY) بھیجدئے تو اُن کا یہ خیال اور بھی پختہ ہوگیا۔ چنانچہ صاحب موصوف نے اپنے پیام کو ایک نظم کی صورت میں ڈانٹے تک پہنچایا لیکن ان کو علم نہ تھا کہ ڈانٹے کے ترکش میں ابھی ایک خدنگِ آخری باقی ہے۔ جب ڈانٹے نے کامیڈی کا آخری حصہ فردوس (PARADISE) بھی اُن کے پاس بھیجدیا تو پروفیسر گیوانی کو ڈانٹے کے زورِ قلم اور شاعرانہ عظمت کا قائل ہونا پڑا اور ڈانٹے کو ورجل ثانی کا لقب دیا۔ ورجل قدیم لاطینی کا سب سے بڑا پایہ کا شاعر گزرا ہے اور عالمِ بالا کی سیر میں ڈانٹے کا راہنما ہے۔

(مفصل حالات کے لئے "شاعر" ماہ جولائی ۱۹۲۱ء ملاحظہ فرمایئے۔)

۱۳۲۰ء میں ڈانٹے نے مذہبی مباحث میں بیش از بیش حصہ لیا اور اس ضمن میں جو کچھ کہا اب بھی تحریری صورت میں موجود ہے۔ شہر راوینا (RAVENA) میں ڈانٹے کی زندگی کے آخری ایام بسر ہوئے تھے۔ ۱۳۲۱ء میں جمہوریہ وینس (VENICE) اور حکومت راوینا پر کچھ جانوروں کو نقصان پہنچانے کا الزام لگایا اور تاوان طلب کیا۔ حکومت نے ڈانٹے کو بطورِ خاص جمہوریہ وینس کو اطمینان دلانے کے لئے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ بدقسمتی سے ڈانٹے اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوسکا اور یہی سفر اس کے لئے موت کا باعث بنا۔ تکانِ سفر اور مرطوب آب و ہوا نے پہلے ہی اس کی صحت پر کافی اثر ڈالا تھا۔ اس پر مستزاد سیاسی انہماک اور کثرت کار سے اس کو بخار آنے لگا۔ ڈانٹے نے بیماری کی وجہ سے حکومت وینس کے سامنے درخواست کی کہ سمندر کی راہ سے اس کو جانے کی اجازت دیدی جائے مگر "سمندر کا راستہ" ہی تو باہمی نزاع کا باعث تھا۔ اس لئے ڈانٹے کی درخواست مسترد کردی گئی۔ ناچار ڈانٹے نے خشکی کا سفر اختیار کیا۔ دریائے پو (PO) کے دہانے کی گندی اور مرطوب آب و ہوا نے اس کے بخار کو تیز سے تیز تر کردیا اور راوینا پہنچنے کے چند روز بعد ۱۴ ستمبر ۱۳۲۱ء کو یہ آفتابِ علم و ادب غروب ہوگیا اور خانقاہ فرانسس کن میں اعزاز خصوصی کے ساتھ رؤسا و نوابانِ اطراف و اکناف کی موجودگی میں دفن کردیا گیا۔ ڈانٹے کا مقبرہ زیارت گاہِ عوام ہے اور اپنی دلچسپ تاریخ کے لحاظ سے خود عجیب شے ہے۔ راہبوں کی ایک مختلف العقائد جماعت نے اس کی ہڈیاں مقبرے سے نکال کر دوسری جگہ منتقل کردی تھیں مگر ۲۷ مئی ۱۸۶۵ء کو جب اٹلی میں پورے چھ سو برس کے بعد ڈانٹے کا یومِ پیدائش منایا جارہا تھا، یکایک اس راز کا انکشاف ہوگیا اور اس کی خاک کو دوبارہ اعزاز خصوصی کے ساتھ دفن کیا گیا۔

ڈانٹے[1] کا قد میانہ تھا اور آخر عمر میں کچھ جھک گیا تھا۔ اس کی آہستہ خرامی میں ایک شان پائی جاتی تھی، وہ ہمیشہ نہایت خوشنما پوشاک پہننے کا عادی تھا، اس کا چہرہ متین، بھرا ہوا، لمبا اور ملیح کا[2]سے رنگ کا تھا۔ ناک ستواں اور عقابی تھی،

---

[1] ماخوذ از:- Dante Alighieri by Toynbee page 109.

[2] ماخوذ از ترجمہ انگریزی "ڈانٹے کی سوانح حیات" (By BOCCACCIO)

(باکیشیو ڈانٹے کا پہلا سوانح نگار ہے)

[3] لطیفہ:- مشہور ہے کہ دو عورتوں نے ڈانٹے کو آتا ہوا دیکھا اور ایک نے دوسری کو دکھایا کہ وہ شخص یہی ہوتا، جو جب چاہے جب جہنم چلا جاتا ہے اور واپس آجاتا ہے؟ تو دوسری نے جواب دیا [illegible]

[illegible]

ڈانٹے کی تصانیف اور شاعری

[illegible] قدیم لاطینی زبان کے خلاف ایک تحریک شروع کی تھی مگر اس کو [illegible] کے مشہور ماہرین بھی اظہار خیال کے لئے لاطینی زبان [illegible] کرتے تھے اور شعراء اس میں نگینیاں پیدا کرکے آخری منزل تک پہنچ چکے تھے لیکن [illegible] اظہار خیال کے لئے [illegible] زبان کو بہتر سمجھا [illegible] کے ہم عصر مشہور نقاد [illegible] خیال [illegible] زبان کو قدیم لاطینی کے مقابلے میں ترجیح دینے پر مجبور ہو گئے۔ ڈانٹے کی تصانیف میں [illegible] (DE VULGARI ELOQUENTIA) [illegible] لکھی گئی ہے اور محققین [illegible]

[illegible] (CONVIVIO) [illegible]

[illegible]

[illegible] (VITA NUOVA) [illegible]

[illegible] (TROUBADOURS) [illegible]

[illegible] (BERNART) [illegible]

[illegible]

اور میں اُس کا فرمانبردار ہوں؟"

مانٹاڈن کا راہب (MONK OF MONTAUDON) جو باوجود انکار اپنے نغموں کی ہم آہنگی کے لئے مشہور ہے لکھتا ہے :-

"نغموں کی قدر و قیمت محبت کی چاشنی [illegible]"

اس ضمن میں آرناٹ ڈینیل (ARNAUT DANIEL) کہیں آگے بڑھ جاتا ہے اور کہتا ہے :- [illegible]

"محبت میرے دل میں موزوں الفاظ کو جگاتی ہے اور مجھے [illegible] لکھنے میں مدد دیتی ہے"

اے۔ جے۔ بٹلر (A. J. BUTLAR) [illegible] اپنی کتاب [illegible] ڈانٹے [illegible] ان کا درجہ بھی انتہائی بلند ہے۔ قدما کے [illegible] جذبات کو جزوی حیثیت [illegible] مگر جب نغمیں منازل میں دانتے کا قلم والہانہ رنگینیاں بکھیرتا ہوا [illegible] آنکھوں کے سامنے حقیقت کے جلوے [illegible] حالی ہوگا جس کا [illegible] دیتا ہے [illegible] کیفیت ہے [illegible] ان کو راہ راست سے [illegible] پھینکتا ہے۔ ڈانٹے کے یہاں ہر جگہ [illegible] پائی جاتی ہے اور خود محبت نے اس کو [illegible] بنا دیا ہے [illegible] کا قلم [illegible] جذبات [illegible] حقیقت کی تشریح ہر جگہ بیٹریس (BEATRICE) [illegible] کرتی رہتی ہے [illegible] کیا ہے؟ یہ ڈانٹے ہی کی زبان سے سنئے :-

"اُس کے حسن کو خدا کے نور کا خاص حصہ [illegible]"

اور آگے بڑھ کر اس مضمون کو اس طرح ختم کرتا ہے [illegible]

"آسمانوں کی مقدس بارگاہوں میں [illegible]

—— اُف! خاتون کتنا [illegible]

رہتی ہے اور میں باوجود میرا [illegible] اکتساب نور کرتا رہتا ہوں"

غور فرمایئے کہ دو شعروں سے یکایک خاتون کی طرف ڈانٹے [illegible] ادب [illegible] جانب [illegible] ہے [illegible] حیات [illegible]

اور آخر [illegible] تصوف کے مدارج دیدیتا ہے۔ اُس کی یہ متصوفانہ تخیل شرقی بعید کو بھی بالاتر ہے۔ [illegible] ہی نہیں بلکہ کم و بیش تمام مغربی ادبا کا دار و مدار ایک ہالہ رجولیت رہ گئی، حورا، شہزادی یا پری اور دیو وغیرہ پر تھا اور اس تصور میں ہزار ہا افسانے منظوم [illegible] پیش کئے گئے اور یہ دور مشرق و مغرب میں ایک دوسرے پر [illegible] رکھتا ہوا [illegible] بعض جگہ ان کا عنصر کبریٰ خلاصی جیز بنجاتا ہے اور [illegible] کے ساتھ [illegible] زندگی کی چیز معلوم ہوتی ہے اُنکی بزم کی داستانیں تھوڑی دیر کے لئے ہنگامہ محفل تو بن سکتی ہیں مگر بعد ازاں [illegible] کو نہیں جا سکتیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ قدما کا کلام [illegible] حاصل کرتا ہے۔ برخلاف اسکے ڈانٹے جب اپنی زمین کی [illegible] کے ساتھ [illegible] کلام سے تغزل کے ساتھ امرت ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور چونکہ [illegible] شیخ ہے آنہیں ہے۔ [illegible] تغزل پیدا کرنے میں بعید کامیاب رہتا ہے اُسکا کلام [illegible] بلکہ [illegible]

"حسن ہے میری خاتون [illegible] کہ جس خواتین [illegible] دیکھا ہے [illegible]

تمام و کمال حسن کو دیکھ لیا ہے —— وہ لوگ [illegible]

ہیں اس عرش کے خصوصی پر بعد عجز و نیاز خدا کا شکر ادا کرتے ہیں ——

اس کا چہرہ اس قدر حسین اور جمیل ہے کہ عقل و شعور [illegible]

کے احساس [illegible] اور [illegible]

—— اُس کا صرف ایک نظارہ ہر چیز کو [illegible] کر دیتا ہے

[illegible] مقدس ترین ہستی [illegible]

بلند و بالا [illegible] معلوم ہوتی ہے [illegible]

انتہائی التہاب محبت میں اُسکا بھی تخیل قائم نہیں کر سکتا"

ڈانٹے کی شاہراہ متقدمین سے [illegible] گلہ ہے کہ بعض اوقات اس پر اعلیٰ ترین شرقی رنگ تغزل کا دھوکا ہوتا ہے اور حقیقت یہ کہ جہاں تک واردات عشق کا تعلق ہے مشرق و مغرب اپنی اپنی طرز بیان میں بالا امتیاز ہو سکتے ہیں۔ افہام و تفہیم [illegible] ہرگز نہیں۔

شمیم نعمانی بیاوری

ماخوذ از:- Rossetti's English Translation of [illegible]

جنگ

روز و شب ہر ساعت و ہر لحظہ صبح و شام جنگ
خونفشاں و خونچکاں خوں ریز خوں آشام جنگ

ظالم و بے رحم، دہشت آفریں، خونخوار جنگ
عہدِ نو میں بربریت کی علم بردار جنگ

جس کی آتش بار سانسیں نارِ دوزخ کی نمود
جسکی ہر ٹھوکر سے لرزاں قصر و ایوانِ وجود

آسماں سے خاکداں پر آگ برساتی ہوئی
گو بجتی، شورِ دل کرتی رجز گاتی ہوئی

چھڑ گئی ہے یوں بصد صولت فنا انجام جنگ
خونفشاں و خونچکاں خوں ریز خوں آشام جنگ

مطلعِ عالم پہ بربادی کے بادل چھا گئے
جس طرف بھی جھک گئے ویرانیاں برسا گئے

اُف وہ گیسے شعلہ ریز و شعلہ بیز و شعلہ خیز
گڑگڑاہٹ وہ جہازوں کی کرخت و تند و تیز

اُف وہ طیّارہ شکن توپوں کا باہم چھوٹنا
اُف وہ اک گوشے سے پنہاں آتشیں بم پھوٹنا

آبِ دوزوں کی ہے یورش اس قدر شام و پگاہ
دامنِ ابرِ رواں میں بھی نہیں ملتی پناہ

موجبِ رنج و ہلاکت موردِ آلام جنگ
خونفشاں و خونچکاں خوں ریز خوں آشام جنگ

دامنِ تہذیبِ نو کی دھجیاں اڑنے لگیں
بے پر و بازو فضا میں گولیاں اڑنے لگیں

وہ یتیموں کا بلکنا اور بیواؤں کی چیخ
جن کے بچے چھن گئے گود سے ان ماؤں کی چیخ

وہ برادر کا برادر کے لئے سر پیٹنا
وہ کسی بیوی کا شوہر کے لئے سر پیٹنا

پیکرِ نظمِ تمدن لرزہ براندام ہے
کافر و دیندار کے لب پر خدا کا نام ہے

لیکر آئی نالہ و فریاد کا پیغام جنگ
خونفشاں و خونچکاں خوں ریز، خوں آشام جنگ

میکدے سنسان گھر ویران صنمخانے خراب
قصر افتادہ ہیں مسکینوں کے کاشانے خراب

سرنگوں ہیں صورتِ مجرم عماراتِ شہی
انقلابِ نو کو سجدہ کر رہی ہے قیصری

ڈوبتی جاتی ہیں نبضیں اہتمامِ دہر کی
آخری سانسیں ہیں کچھ باقی نظامِ دہر کی

موت انجامِ خمارِ زیست کا خمیازہ ہو
درہم و برہم کتابِ دہر کا شیرازہ ہو

کھولے دیتی ہے تباہی کا ورق خودکامِ جنگ
خونفشاں و خونچکاں خوں ریز، خوں آشام جنگ

امن پھر ہوگا مسلط فتنۂ دوراں کے بعد
سارے عالم میں سکوں چھا جائیگا طوفاں کے بعد

امن و آزادی کے جھنڈے ہر طرف لہرائینگے
لوگ مل جل کر محبت کے ترانے گا رہے ہیں گے

یہ تباہی یہ فنا کوشی فنا ہو جائیگی
جنگ کی دیوی سکوں کی گود میں سو جائیگی

پھر چمن بندی کو کچھ تازہ بہاریں آئینگی
بدلیاں جو آگ برساتی ہیں دھن برسائینگی

اک حسیں پیکر نظر آئیگی لالہ فام جنگ
خونفشاں و خونچکاں خوں ریز، خوں آشام جنگ

نثار سیمابی اٹاوی

افسانۂ ناتمام

ایک سہانی شام تھی، دن بھر کی دماغ سوزیوں سے اکتائے ہوئے انسان گھڑی دو گھڑی کے لئے دل بہلانے تفریح گاہوں کی جانب جا رہے تھے۔ صبح سے تاش کھیلتے کھیلتے دماغ کی کچھ عجیب سی حالت تھی اور سر میں ہلکا ہلکا سا درد ہو رہا تھا میں نے احباب سے اجازت چاہی۔ کوٹ اور ہیٹ اٹھایا اور مناظر قدرت سے لطف اندوز ہونے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ آبادی سے نکل کر میں اس سڑک پر ہو لیا جو "شالامار" کو جاتی ہے، میں اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک نوجوان سے جو مخالف سمت سے آ رہا تھا میری ٹکر ہو گئی۔ میں چیخ اٹھا

"اندھے ہو گیا"

"معاف کیجئے، غلطی ہوئی" اس نے زمین کی طرف تکتے ہوئے کہا۔

میں نے نظریں اٹھائیں۔ نوجوان اپنی "ٹائی" کی گرہ ٹھیک کر رہا تھا۔ اس کی صورت مجھے عہدِ رفتہ کی یاد دلا رہی تھی، میں ایسا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے ہم دونوں کی روحیں آپس میں بہت قریب ہوں۔ لیکن پھر بھی اس کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اٹھیں۔ تھوڑی دیر تک میرے چہرے پر جمیں، اور وہ "جاوید بھائی!" کہکر مجھ سے لپٹ گیا۔

"عزیز!" بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔

"شکر ہے۔ تم نے مجھے پہچان تو لیا"

"واہ، یہ بھی خوب کہا۔ کیا بھائی سے زیادہ عزیز دوست کو بھی نہ پہچانتا"

جواب میں وہ ہنس دیا۔ خدا جانے ہم کب تک سڑک پر کھڑے رہے۔

اسکول کی تعلیم ختم کر کے ہم جدا ہو گئے تھے۔ میں "انجینرنگ" سیکھنے کی غرض سے بمبئی چلا گیا، اور وہ پشاور کالج میں داخل ہو گیا پہلے پہل تو میں نے اسے دو چار بار خط لکھے۔ لیکن بہت جلد مجھے بمبئی کی رنگینیوں نے اپنے اندر جذب کر لیا نئی جگہ۔ نئے دوست اور نئی نئی دلچسپیاں میرے دل سے وطن کی یاد بھلا دینے میں کامیاب ہو گئیں یہ قصور میرا تھا۔ قصور اگر کچھ تھا تو میرے ماحول کا۔

کافی عرصہ تک عزیز کے خط مجھے ملتے رہے۔ لیکن کاہلی، عدیم الفرصتی، یا کسی اور وجہ سے وہ سب کے سب تشنۂ جواب رہے۔ جب اس کے تمام خطوط اندیطاق نسیاں کے رکھے گئے تو اس نے بھی خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

تعلیم ختم کر کے وطن آیا تو معلوم ہوا کہ عزیز کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور وہ کسی پرائیوٹ فرم میں ملازم ہو کر کہیں چلا گیا ہے۔ اور اپنے ساتھ گھر والوں کو بھی لے گیا ہے۔ اب تقریباً آٹھ سال بعد یوں ناگہانی طور پر ملاقات ہوئی تو دونوں مسرت میں۔ مجھے اتنا بھی ہوش نہ رہا کہ اس کے والد کی وفات پر اظہارِ افسوس کرتا۔ ہم ان آٹھ سالوں کے گزرے ہوئے واقعات ایک دوسرے کو کم و کاست سنا رہے تھے اور راہگیروں کی متجسس نگاہوں یا موٹروں اور تانگوں کے شور و غل سے قطعی بے نیازی کا ثبوت دے رہے تھے۔

دو چار بچیاں سڑک پر کھیل رہی تھیں۔ پیچھے پیچھے ان کی مائیں اور دوسری رشتہ دار عورتیں آ رہی تھیں۔ اچانک ایک بچی کا پاؤں پھسلا اور وہ زمین پر گر پڑی۔ چوٹ آ جانے کے باعث وہ رونے لگی۔ دوسری بچی اُسے مناتے ہوئے کہنے لگی "اٹھو زہرہ! روؤ نہیں، ورنہ اماں جان ناراض ہو جائیں گی۔"

یہ سن کر عزیز مڑا!

"کیا کہا۔ زہرہ! ... زہرہ! ..." یہ کہتے کہتے اس نے بچی کو گود میں اٹھا لیا، اور بھینچ بھینچ کر اسے پیار کرنے لگا۔ بچی سہم کر اور بھی زور زور سے رونے لگی۔ میں نے زبردستی بچی کو اس کی گود سے علیحدہ کیا اور جیب سے ایک اکنی نکال کر اسے دیدی۔ اکنی دیکھ کر بچی نے رونا بند کر دیا۔

"یہ کیا وحشیوں کی سی حرکتیں کرتے ہو"! میں نے غصے میں کہا۔

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"علامہ سیماب کا یہ شعر سنا ہے؟

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

میں نے جواب میں سر ہلایا۔

"جانتے ہو، اس بچی نے اُسے کس نام سے مخاطب کیا تھا"

"ہاں، زہرہ کہا تھا"

"تو یوں سمجھ لو، کہ اسی نام نے مجھے اتنا بے تاب کر دیا۔ زہرہ میری دُکھتی ہوئی رگ ہے۔ اس بچی نے نادانستہ طور پر میرے سازِ دل کے شکستہ تاروں کو چھیڑ دیا، اور نتیجہ تم نے خود دیکھ لیا"

میں نے غور سے عزیز کو دیکھا گو وہ اپنے آپ کو مطمئن بنانے کی کوشش کر رہا تھا تاہم اُس کے چہرے کی زردی اور نگاہوں کی بے قراری کسی اندرونی خلش کا پتہ دے رہی تھی۔ میں نے اب تک تصویر کا ایک رُخ دیکھا تھا۔ عزیز کے بچپن کی تصویر اب بھی میری نگاہوں میں رقصاں تھی۔ میں نے اُسے معصومانہ طور پر کھیل کود میں مصروف دیکھا تھا۔ محبت کے گہوارہ میں نہیں! آج غیر متوقع طور پر میں نے تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھ لیا۔ مجھے اب یہ محسوس ہو چلا تھا کہ ہر نوجوان کی طرح عزیز کے پہلو میں بھی ایک دھڑکتا ہوا دل ہے۔

قریب سے گذرنے والے موٹر کے ہارن کی آواز پر عزیز اپنی محویت سے چونکا اُس نے گھڑی دیکھی اور کہنے لگا "وقت کم ہے اور باتیں زیادہ۔ مجھے آج شام کی گاڑی سے دہلی جانا ضروری ہے۔ پلیٹ فارم پر چل کر تمھیں اپنی زندگی کا ایک راز بتاؤں گا۔ یہ میری کتاب کا ایک نامکمل باب ہے۔ جو شاید کبھی شرمندۂ تکمیل نہ ہو اس دور میں تقریباً ہر نوجوان کی زندگی میں ایک نہ ایک "حسین موت" واقع ہوتی ہے وہ محبت کا خوش آئند خواب دیکھتا ہے۔ آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک شاندار محل تیار کرتا ہے۔ مگر جب آنکھ کھلتی ہے تو اُس کی محبت کا عالیشان قصر زمین پر گر چکا ہوتا ہے۔ اور اُس کا حاصل رہ جاتی ہے ——— ایک نامعلوم سی خلش۔ ایک تڑپا دینے والی یاد اور ایک ٹوٹا ہوا دل۔ مجھے بھی ایک ایسی ہی "حسین موت" سے دوچار ہونا پڑا ہے جاوید"

اُس نے ایک آہ بھری اور کہنے لگا "شاید میں ضرورت سے کچھ زیادہ کہہ گیا چلو اب ہمیں چلنا چاہیے"

باقی راستہ ہم نے خاموشی کے ساتھ طے کیا۔ مجھے اخبار بینی کا بہت شوق ہے۔ صبح سے اخبار نہیں پڑھا تھا۔ اس لئے اسٹیشن پر میں نے تازہ "ٹریبیون" خریدا۔ عزیز بھی ٹکٹ لیکر اندر آ گیا۔ اُس نے ایک کاغذ پر اپنا پتہ لکھ کر مجھے دیا اور ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اُس نے سگریٹ سلگایا۔ دھواں نقرئی ملقے بناتا ہوا چھت کی طرف مائل بہ پرواز تھا، اُس نے یکایک نگاہِ غلط انداز سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا:—

"اپنے فطری ذوقِ تجسس سے مجبور ہو کر تم میرا افسانۂ ناتمام سننے کے لئے زیادہ مضطرب معلوم ہوتے ہو، چونکہ وقت کم ہے۔ اس لئے میں اختصار سے کام لونگا"

وہ کچھ سوچ کر کہنے لگا "اگر میں اس داستان کا آغاز تمہارے ہی شعر سے کروں تو تمھیں ناگوار تو نہ گزریگا؟"

میں نے سر ہلا دیا اور خاموشی سے اُس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھتا رہا اُس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہنے لگا ؎

میں بھی رودادِ غم کہوں جاوید
کاش مِل جائے راز داں مجھ کو

"شباب کا زمانہ، جب امنگوں کے بحرِ مواج کی ہر اک لہر میں آغوش در آغوش ہزاروں سیلابِ متلاطم خوابیدہ ہوتے ہیں اپنی رنگینی بہار آفرینی اور گہرائیوں کے لئے رسوائے عام ہے۔ نوخیز نوجوان جو ابھی اس رومان پرور ساحلِ بحر پر محوِ نظارہ ہیں شاید اسے رشک و شبہ کی نگاہ سے دیکھیں لیکن جن کی کشتیٔ حیات پہنائیوں، تھپیڑوں اور بھنور میں ہچکولے کھا کر بدقسمتی سے بچ نکلی ہے اب بھی کافر جوانی کا نام سُن کر لرز جاتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے افکار و حوادث کے سینکڑوں مجسمے رقص کرنے لگتے ہیں۔ اور وہ اس تلخ مگر حسین یاد میں بھی ایک نہ ایک قسم کی لطافت اور کیف و دلکشی محسوس کرتے ہیں۔

یہی عہد حادثات و واقعات تھا اور آزادانہ زندگی بسر کرنے کی دھن میں کالج کی رنگینی و شباب پرور فضا میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے قیام پذیر تھا لیکن سیر و تفریح کی خواہش جو فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ کسی پہلو چین سے بیٹھنے نہ دیتی تھی۔ کرسمس کے دن تھے، اور نمائش کا انعقاد، پھر وہ بھی لاہور جیسے شہر میں جہاں قدم قدم پر نگاہوں کو "دعوتِ سجدہ" اور چپے چپے پر "قاتل فروشِ علی صفحۂ قرطاس" اور گھنگھور گھٹا کے شیدائی کا بہانہ۔ کالج کے چند احباب کے اصرار سے میں نے

نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی اور ہم احباب کے ساتھ لاہور جا پہنچے۔ جب چند ہم مشرب مل جائیں تو بھلا پروگرام مرتب کرنا کونسا مشکل کام ہے۔

میں اس سے پہلے کبھی لاہور نہیں گیا تھا۔ ہر چند میرے لئے یہاں کے در و دیوار میں ہزارہا رنگینیاں اور دلفریبیاں موجود تھیں۔ تاہم سب سے پہلے نمائش گاہ جانے کی ٹھہری۔

اب تک مجھے حسن و محبت کے اسرار و رموز سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ ابھی تک میں نے اس راہ کی خاک نہیں چھانی تھی۔ صنفِ نازک میں کتنی کشش اور کتنا سحر ہوتا ہے۔ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ مجھے صنفِ لطیف سے ملنے جلنے کے اس سے پہلے بیسیوں مواقع میسر آئے تھے۔ عزیزوں کی شادیوں میں، اقربا کی موت پر ـــ لیکن ایکبار دیکھنے کے بعد دوبارہ دیکھنے کی ہوس کبھی نہیں ہوئی۔"

ہمارا ڈبہ تقریباً خالی تھا اس میں ہم دونوں کے علاوہ ایک اور صاحب بھی تھے۔ یہ ایک لکھنوی بزرگ تھے جو قریبی سیٹ پر بیٹھے اپنے مخصوص انداز میں "جگالی" فرما رہے تھے، وہ بہت غور سے ہم دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔ انہوں نے پیک فرش پر تھوکنے کے بجائے دیوار پر تھوک دی۔ ایک مکھی کہیں سے اڑ کر آئی اور اس بہتے ہوئے سرخ لعاب پر بیٹھ گئی۔ عزیز تھوڑی دیر مکھی پر نظریں جمائے رہا۔ اس کے خیالات کا ٹوٹا ہوا تار پھر جڑ گیا اور وہ کہنے لگا۔

"ہر رنگین چیز توجہات کا مرکز بن جاتی ہے۔ ہمارے آگے آگے ایک تانگہ جا رہا تھا، گو میری توجہ ابھی اس طرف منعطف نہیں ہوئی تھی مگر حسن ایک کشش کا نام ہے جس کی طرف انسان بلاارادہ کھنچا چلا جائے، میں اپنے خیالات میں محو تھا۔ کہ بلاقصد و ارادہ میری نگاہیں اٹھیں اور اٹھتے ہی سامنے جانے والے تانگے پر جم کر رہ گئیں۔ جہاں سے باوجود کوشش بھی نہ ہٹ سکیں۔ حسن کا نشانہ درست بیٹھا۔ آنکھوں نے جو کچھ دیکھا۔ دل نے اس کی تائید کی۔

شیکسپیئر کے ہم عصر اور مشہور ڈرامہ نویس "مارلو" کا یہ قول پڑھا ہوا تھا اور اکثر میری زبان پر جاری و ساری بھی رہا کرتا تھا۔ کہ جس نے بھی محبت کی پہلی ہی نظر میں کی "مارلو" کے قول کی صداقت کا مجھے آج اعتراف ہوا محبت کو عمداً یا اختیار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن مجھے [illegible] احتمال تھا اب پہلا

ایک غیر معمولی تڑپ کے تحت میرا دل دھڑکنے لگا اور میرے چہرے کا رنگ [illegible] ہو گیا میں نے "ان" کی رسوائی کے خوف سے جلدی ہی اپنی حالت درست کرنے کی کوشش کی ہر چند میں احباب کو اپنی حالت چھپا لینے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اس سحر کار حسینہ کی نگاہیں میری ذہنی و قلبی کیفیات میرے چہرے کے آئینے میں اچھی طرح دیکھ رہی تھیں۔ وہ میری حالت کا بغور مطالعہ کر رہی تھی۔ آخر شرم و حیا نے اسے اپنی نگاہیں نیچے کر لینے پر مجبور کر دیا۔ میں ابھی تک بت بنا ہوا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی نیچی نظروں سے گاہے گاہے میری طرف دیکھ لیتی تھی اور پھر اپنی سہیلی سے مصروفِ گفتگو ہو جاتی۔

احباب میری حالت سے بے خبر تھے اور اپنی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کہ دونوں یکے بعد دیگرے نمائش گاہ کے دروازے پر جا کر رک گئے۔ حسن پردہ نشیں نہ جانے ابھی تک کس خیال میں غرق تھا کہ اس نے تانگہ سے بے نقاب ہونے کی ابھی تک کوشش ہی نہیں کی۔ ہم اترے اور ابھی دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ میرے کانوں میں ایک آواز آئی۔

"زہرہ! چلو اترو بھی۔ آخر تم کس سوچ میں پڑ گئی ہو۔"

میں نے بے اختیار مڑ کر دیکھا اس کافرہ کی سہیلی اس کا شانہ ہلاتے ہوئے اسے مخاطب کر رہی تھی۔ غارت گرِ ہوش و عقل زہرہ نے میری طرف بسرعت نظریں دوڑائیں اور پھر کسی قدر چیں بجبیں ہو کر اپنی سہیلی کی طرف دیکھتے ہوئے تانگے سے اترنے لگی۔ شاید اسے اپنے نام کی تشہیر پر غصہ آ رہا تھا۔ کیا وہ مجھے یوں عارفہ بنا کر ہمیشہ کے لئے مجھ سے اپنی شخصیت کو بھی چھپائے رکھنے کی خواہاں تھی؟

میرے کانوں میں ابھی تک "زہرہ" کی سماعت نواز گونج باقی تھی کہ میرے دوست شاہد نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا عزیز ـــــ کیا بس یہیں تک آنا تھا ہمیں؟"

میں گھبرا سا گیا۔ میری نظریں پھر زہرہ کی طرف اٹھیں۔ وہ دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی کہ میرا نام سن کر ٹھٹک سی گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہماری نگاہیں ایک بار پھر ملیں، وہ مسکرائی۔ اس خندۂ یک لمحہ [illegible] کے بعد وہ اپنی سہیلی کے ہمراہ، اور میں اپنے احباب کی معیت میں نمائش گاہ میں داخل ہو گئے۔ [illegible]

...میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ سفید پوشاک پر باریک ململ کے رنگے ہوئے دوپٹے اپنی بہار دکھلا رہے تھے۔ آنکھوں کی معصوم تیز نگاہیں دیکھنے والوں کے دلوں کی دھڑکن میں اضافہ کر رہی تھیں۔ میرے احباب ان حسین مخلوق پر ناقدانہ نظریں ڈالتے ہوئے اور کبھی کبھی کسی مہ پارہ کی شان میں تعریفی کلمات ادا کرتے ہوئے نمائش گاہ کی سیر کر رہے تھے۔ اس وقت خواہ میں نے اپنے احباب کی "حسن پرستی" کو "ہوس پرستی" ہی پر محمول کیا ہو۔ لیکن اب میں "حقیقی قدر شناس" کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

روزانہ سینکڑوں خاکی پتلے کتم عدم سے عالم وجود میں آتے ہیں۔ اور ہزاروں ذی روح موت کی پرخطر گھاٹی کے پار اتر جاتے ہیں۔ انسان نقاش ازل کے موقلم کا حسین شاہکار ہے۔ اب اگر کوئی "صانع آرٹ" کی قدر کرے اور مصور کے کمالِ فن کی داد دے۔ یا اس کی بنائی ہوئی تصویر کو نظر بھر کر دیکھ لے تو اسے تصوروار ٹھہرا کر "پاپی" کہنا کہاں تک انصاف میں شامل ہے۔

ہم ایک دوکان کے باہر کھڑے کچھ خرید رہے تھے۔ مسعود اور شاہد دوکاندار سے اس لئے جھگڑ رہے تھے کہ اس نے کئی چیزوں کے زیادہ دام بتائے تھے۔ میری نگاہیں زہرہ کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں اچانک وہ ہمارے پاس سے گزری۔ اس نے ارادتاً اپنا وزیٹنگ کارڈ گرایا۔ میں بوئے گل سے زیادہ تیزی کے ساتھ "شامِ خاک تک پہونچا" وزیٹنگ کارڈ اٹھایا اور بجلی کی طرح اپنی جگہ واپس آگیا میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ برق رفتاری اور حرارتِ شوق مجھ میں کہاں سے آگئی ———

اس کا مجھے اچھی طرح یقین ہے کہ مجھے کسی نے دیکھا نہیں۔ میں نے کارڈ کو محفوظ طریقہ پہ جیب میں رکھ لیا۔ موقع پا کر جب میں نے اسے دیکھا تو چند خوبصورت الفاظ میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے "مس زہرہ جمیل"۔ میں نے بے اختیاری میں اسے سینے سے لگا لیا۔ جاتے جاتے اس نے ایک بار مڑ کر دیکھا اور میری اس دیوانگی پر وہ مسکرا دی۔

عزیز نے بٹوے میں سے نکال کر یہ کارڈ مجھے دکھایا۔ سادہ کارڈ پر سنہری حروف میں "مس زہرہ جمیل" لکھا ہوا تھا۔ عزیز نے کارڈ بٹوے میں رکھا۔ کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی اور کہنے لگا۔

"وہ مسکراتے ہوئے اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی۔ چلو بہن شام کافی دیر ہو چکی ہے [illegible] پھر کسی وقت آکر سیر کریں گے۔ ہم [illegible] سیر کرنے کے بعد اپنی قیام گاہ پر واپس [illegible] مصروف تھے [illegible] پر کر [illegible] میری کوشش

سو انہوں نے میری معذرت پر ملتوی کر دیا گیا اور طے پایا کہ دسہرہ کے بعد پھر نمائش دیکھی جائے۔

میں مسرور تھا کہ جمالِ جہاں آرا کو دوبارہ نظر بھر دیکھنے کا موقع ملے گا۔ لیکن برا ہو ان ہچکیوں کا جنہوں نے نیا بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ میں بارگاہِ حسن میں دوسری حاضری کے رنگین تصورات میں کھویا ہوا تھا کہ شاہد تار ہاتھ میں لئے کمرہ میں داخل ہوا۔ اس کی آنکھیں اشک آلود تھیں اور چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ آتے ہی صوفے میں گر پڑا اور بے اختیار رونے لگا۔ میں اپنی رومانی دنیا سے بیدار ہو گیا۔ اٹھا تار پڑھا "تمہارے والد کا آج چار بجے انتقال ہو گیا ہے جلد واپس آؤ" تار کے الفاظ تھے۔

شاہد کی دنیا سایۂ پدری کے اٹھ جانے سے تاریک ہو گئی تھی۔ تو میری دنیائے محبت زہرہ سے دوسری ملاقات نہ ہونے سے ظلمت بداماں تھی۔ ہم اسی رات لاہور کو خیرباد کہہ کر واپس آ گئے مگر زہرہ اور نمائش کی وہ شام میرے دل سے کبھی محو نہ ہوئی۔

چار پانچ بار پھر لاہور آیا۔ میں نے سیر گاہیں۔ ریسٹورانٹ سینما۔ غرضکہ لاہور کا گوشہ گوشہ اس کی تلاش میں چھان مارا۔ میری نگاہیں اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئیں لیکن اس جانِ تمنا کو دوبارہ دیکھنے کا موقع نصیب نہ ہو سکا۔

سگرٹ جلتے جلتے ختم ہو چکا تھا اور اب اس کی انگلیوں کو جلا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے گرے۔ گارڈ نے سبز جھنڈی دکھائی۔ انجن نے سیٹی دی اور میں عزیز سے ہاتھ ملا کر گاڑی سے اتر آیا۔

ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی روانہ ہو گئی۔ عزیز کھڑکی سے سر نکالے سفید رومال ہلا رہا تھا۔ میں نے اخبار والا ہاتھ ہلانے کی غرض سے اٹھایا۔ لیکن دوسرے لمحہ میری نظریں پہلے صفحہ کی ایک تصویر اور اس کے نیچے لکھے ہوئے الفاظ پر جم کر رہ گئیں۔ یہ ایک تازہ شادی شدہ جوڑے کی تصویر تھی۔ نیچے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

"مس زہرہ جمیل کی شادی کپتان ظہور سے"

میں زور سے چیخا "عزیز"!

لیکن میری آواز گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ میں دب گئی۔ گاڑی دور سے ایک رینگتی ہوئی سیاہ لکیر کی طرح نظر آ رہی تھی۔

میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ عزیز کو صاف صاف بتا دوں کہ اس کا رنگین افسانہ "ٹریجڈی" میں تبدیل ہو چکا ہے، یا اسے اسی حسین خیال میں رہنے دوں کہ اس کا افسانہ ابھی ناتمام ہے۔ اور شاید ——— کسی روز ان کی زہرہ سے ملاقات ہو جائیگی

جاوید کوہستانی

ٹیگور

ساحرِ بنگال، سازِ نغمۂ ہندوستاں
فلسفی، شاعر، مفکر، نکتہ سنج و نکتہ داں

جس نے کُفرِ شاعری کا بول بالا کر دیا
جسکے گیتوں نے اندھیرے میں اُجالا کر دیا

جس کے میٹھے بول دلکش، دلنواز و دلنشیں
جس کا ثانی صوبۂ بنگال میں کوئی نہیں

شاعری سے کام جس نے لے لیا پیغام کا
جس نے اس بیکار شعبے کو بنایا کام کا

خطۂ مشرق سے مغرب تک ملا جسکو قبول
بن گیا ہر غنچۂ سربستہ جسکی لے سے پھول

سادگی سے کام جسنے تیر و سر کا لیا
گفتگو نے جسکی دل کونین کا برما لیا

دخل جس کو پردۂ فطرت کی گہرائی میں تھا
سازِ فطرت نطق پیرا جسکی شہنائی میں تھا

جس نے قوموں کو دیا درس و پیامِ زندگی
جسکی نظروں سے تھی پیدا صبح و شامِ زندگی

آہ، اُسنے زندگی کو آخری کرکے سلام
کام اپنا کرلیا اِس دارِ فانی میں تمام

اُسکا پیکر ساحلِ ہستی پہ خاکستر ہوا
نام اُسکا خاک ہو جانے سے روشن تر ہوا

مرگیا ٹیگور لیکن نام اُس کا زندہ ہے
کام اُس کا پردۂ الفاظ میں تابندہ ہے

آنے والی نسل کا وہ رہنمائے جادہ ہے
موت اُسکی ایک شعرِ پیش پا افتادہ ہے

دورِ ماضی سے ملادیں حال کی اُسنے حدیں
زندگی پھیلائی کیا کیا اپنے رنگِ خاص میں

مغرب و مشرق پہ ہیں احسان اُسکے بیکراں
وہ ضمیرِ عالمِ ہستی کا فاضل ترجماں

اپنا سر دُھنتا رہیگا اُسکے نغموں پر جہاں
اُسکی صدیوں ملک میں آواز گونجیگی یہاں

تھا وہ اک دُرّ اک میرِ کاروانِ شاعری
بھول سکتا ہی نہیں اُسکو جہانِ شاعری

نظمِ مستقبل کا ہوگا اُسکے نامِ پاک سے
زندگی کے پھول پیدا ہونگے اُسکی خاک سے

حاجی نبی احمد بلوی

انگریزی مصطلحات

دنیا میں کئی CLASSICAL زبانیں ہیں ہر زبان میں کچھ نہ کچھ خوبیاں ضرور ہوتی ہیں۔ علم دوست اور اخبار بیں طبقہ اس حقیقت سے باخبر ہوگا کہ موجودہ دور میں اربابِ صحافت نے کس قدر فنی مصطلحات TECHNICAL اور POLITICAL TERMS وضع کر لی ہیں انسانی آبادی کے ساتھ ساتھ الفاظ بھی بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ جس قدر انسان کے خیالات میں وسعت اور ذہن میں ترقی ہوتی جا رہی ہے اُسی قدر الفاظ کی "نسل" بڑھتی جا رہی ہے اور ضرورت کے موافق نئی نئی مصطلحات تشکیل پا رہی ہیں چنانچہ بڑی سے بڑی تازہ سے تازہ "ڈکشنری" اس باب میں ناکام معلوم ہوتی ہے۔ انگریزی زبان میں یورپ کے اِلحاد و دہریت کے زیر اثر سینکڑوں نئے الفاظ بنتے رہتے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے قانونِ الٰہی سے بغاوت و انحراف کا اس طرح دنیا کو کبھی سکون و اطمینان نہیں حاصل ہو سکتا جب سے خدائی قانون سے منہ موڑ لیا گیا، کئی سیاسی فتنے پیدا ہو گئے ہیں۔ دماغوں میں شہنشاہیت، جمہوریت، استعماریت، جباریت، نازیت، فسطائیت، خود مختاریت AUTOCRACY ڈیموکریسی DEMOCRACY اور ملوکیت MONOCRACY وغیرہ کے تخیلات پرورش پانے لگے۔ مختلف طرزِ حکومت کے ماتحت سینکڑوں سیاسی مصطلحات وضع کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اُن کی فروعات و شعب میں اس قدر اضافہ ہوا کہ اب ان کا حصر و تجزیہ مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ ان سب کے معنی میں خفیف اور دقیق فرق پایا جاتا ہے لیکن ہمیں یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا ہے۔

انگریزی زبان کے چند نمایاں اور مشہور "لاحقے" یعنی SUFFIXES یہ ہیں GRAPHY ، LOGY اور ISM سیاسی مصطلحات کے ماورا جو اور بھی الفاظ وضع ہوئے ہیں یا پیشتر سے موجود تھے مختلف ایجادات و اختراعات کی بدولت ظہور میں آگئے ہیں ان کی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ یہ خیال کر لیا جائے کہ ان لاحقوں سے بنے ہوئے الفاظ صرف اتنے ہی ہیں بلکہ جس قدر اہم ہو سکے دلچسپی کے لئے لکھے جاتے ہیں۔

۱۔ گرافیات

بیان نباتات	PHYTOGRAPHY
علم عروق جسم انسان	ANGIOGRAPHY
پٹھوں کا بیان	MYOGRAPHY
تلغرافی	TELEGRAPHY
کتابت	CALLIGRAPHY
طغرا نویسی	MONOGRAPHY
سوانح عمری۔ سرگذشت	BIOGRAPHY
خود سرنوشت	AUTO-BIOGRAPHY
ترقیم و تسوید	AUTOGRAPHY
علم متعلق وبا و طاعون	LOIMOGRAPHY
ایک ہی دفعہ تمام لفظوں کو چھاپنا	LOGOGRAPHY
کتابی علم	BIBLEOGRAPHY
علم عکاسی	PHOTOGRAPHY
ایڈیسن کی ایجاد کردہ ٹیلیفون کے متعلق ترکیب	MOTOGRAPHY
بیان اصوات	PHONOGRAPHY
جغرافیہ	GEOGRAPHY
بیان و علم ریڈیو	RADIGRAPY

۲۔ لوجیات

علم حیوانات	ZOOLOGY
علم [illegible]	[illegible]

PATHOLOGY	علم تشخیص امراض
BIOLOGY	حیاتیات
ANTHROGRHPHY	علم تشریح
TUNTOLOGY	مکرر کہنا۔ ایک بات کو دہرانا
THEOLOGY	علم دینیات

۳۔ اِزمیات

ANARCH SM	فوضویت
NIHLISM	عدمیت
ZIONISM	صیہونیت
VANDALISM	ونڈالیت
(کتب‌خانے وغیرہ جلا دینے والی قوم ونڈال تھی اسی سے منسوب ہے)	
CHRISTIANISM	عیسائیت
HIDUISM	ہندوئیت
ANTISEMITISM	ضدسامیت
CAESARISM	قیصریت
COMMUNISM	اشتمالیت
PAN- ISLAMISM	ہمہ اسلامیت
FASCISM	فسطائیت
FENINISM	فنائیت
FORMALISM	تشکیلیت
IDEALISM	تخیلیت
CHAUVINISM	شاذیت
COLLECTIVISM	اجتماعیت
GUILD- SOCIALISM	گلڈ اشتراکیت
ISOLATIONISM	اجتنابیت
NATIONAL SOCIALISM	قومی اشتراکیت

PHRASEOLOGY	علم طرز کلام
PHYSIOLOGY	علم ترکیب حیوانات
PHILOLOGY	علم اللغت
AMPHIBOLOGY	مبہم امور کا علم
PETROLOGY	حجریات
MYTHOLOGY	دیوتاؤں کے اساطیر و قصص کا علم
PHARMACOLOGY	علم دواسازی۔ عطاری کا ہنر
EGYPTALOGY	مصریات
ANTHOLOGY	اشعار کا گلدستہ
ANTILOGY	ایک ہی مصنف کی خلاف بیانی
ANALOGY	علم تشبیہ۔ مطابقت
AETIOLOGY	بیماریوں کی تشخیص کا علم
HYDRALOGY	علم آب
IDEOLOGY	تخیلیت
CONCHOLOGY	ناقوسیات (سنکھ و ذیا)
PHANOLOGY	علم اصوات
PHOTOLOGY	علم عکس و روشنی
PHREMOLOGY	علم دماغ
PHYTOLOGY	علم ترکیب نباتات
AMPHIHIOLOGY	رسالہ حیوانات
AMPHILOGY	فقروں کا شبہ
ANGLELOLOGY	آسمانی فرشتوں یا ملکوت کی تعلیم و تلقین
ARCHAILOGY	قدیمی فنون کا علم
GEOLOGY	علم طبقات الارض
MACROLOGY	طول طویل بکواس۔ فضول گوئی
GENEOLOGY	شجرہ نسب کرسی نامہ
METEOROLOGY	علم ہوا

الحادیت	ATHEISM
وحدانیت	MONOTHEISM
استبدادیت	ABSOLULISM
پاپائیت	PAPISM
یہودیت	JUDAISM
اسلامیت	ISLAISM
جینیت	JANISM
بدھیت	BUDDAHISM
نازیت	NAZISM
بربریت	BARBERISM
عملیت	ACTIVISM
بالشویت	BALSHEVISM
راس المالیت۔ متاعیت	CAPITALISM
امنیت	PACEFISM
عمرانیت۔ جنفی اشتراکیت	SOCIALISM
انطاعیت	FEUDALISM
عصبیت	RACIALISM
اصلیت	REALISM
مرکزیت	CENTRALISM
کلیسائیت	CLERICALISM
انفرادیت	INDIVIDUALISM
ملوکیت	IMPERIALISM
مارکسیت	MARXISM
قومیت	COMMUNALISM
وسطانیت	MEDIEVALISM
میکاولیت	MACHIAVELLIANISM

(میکاولی یورپ کا ایک ماہر سیاست فلاسفر گذرا ہے اسکے معتقدات کا یہ نام ہے)

باشوریت۔ معقولیت	RATIONALISM
میکانیت	MECHANISM
شہود پرستی (صرف شہود کا قائل ہونا اور اسی پر ایمان لانا)	AGNOSTICISM
علم پرستی (صرف علم پر مطمئن ہوجانا اور یقین کرلینا کہ غیب کے ماورا صرف علم ہمیں روشنی اور نجات بخشتا ہے)	GNOSTICISM
غنڈائیت (غنڈہ پن)	GOONDAISM
آئینیت	CONSTITUTIONALISM
(صرف اپنے لوگوں کو نوازنا) یگانہ پروری	NEPOTISM
رجائیت	OPTIMISM
قنوطیت	PESSIMISM
قدیمیت	CONSERVATISM
مخالفیت	ANTAGONISM
صحافت۔ صحافیت	JOURNALISM
توازیت	PARALLALISM
وفاقیت	FAVOURITISM
ابن الوقتیت	OPPORTUNISM
تمثیلیت	SYMBOLISM
صوفیت (تصوف)	MYSTICISM

رمزی اٹاوی (از جودھپور)

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح برائے ماہ نومبر ۱۹۴۱ء

"یہ زندگی حقیقتاً [illegible] زندگی نہ ہو"

زندگی۔ خوشی وغیرہ قوافی۔ نہ ہو ردیف

[illegible]

میت سے پھول شہر میں

(اپنے نانا بزرگوار کے ہنگامۂ سوم سے متاثر ہوکر)

وہ ہجومِ عیش و عشرت شادیوں کی سی خوشی　　سوگ کے ماحول میں ہنستی ہوئی سی زندگی

وہ لباسِ نو میں رنگیں ہستیوں کا اژدھام　　وہ خواتین کا تکلف دعوتوں کا اہتمام

وہ عزا خانے میں پیہم ڈولیوں پر ڈولیاں　　کھیل میں مصروف وہ بچوں کی ہر سو ٹولیاں

"خوانچے والوں کی آوازیں" کہاروں کی صدا"　　"نانبائی کی شکایت" "گوشت والے کا گلہ

"گرم نانوں کے تقاضے، قورمے قلیے کی مانگ　　پان سگرٹ کی طلب چونے کی اور کتھے کی مانگ

موت کے خاموش گھر میں زیست کا شور و شغب　　محفلِ رنج و عزا میں شورش عیش و طرب

آنے والوں ہی کی دعوت کا نہیں ہے اہتمام　　جو نہیں آئے ہیں اُن کے گھر بھی جائیگا طعام

طشت لے لیکر گھروں پر جا رہی ہیں کولنیں
لٹ رہی ہے کامرانی بٹ رہی ہیں نعمتیں

اور اک بیکس کھڑا ہے یاس کا مارا ہوا　　آدمی جس کا مرا گھر بار جس کا لٹ گیا

دعوتِ رسمی کا کیا کیا کر رہا ہے اہتمام　　سب کو لیکن اپنے اپنے حلوے مانڈے سے ہے کام

چپکے چپکے رو رہا ہے دل ہی دل میں یہ غریب　　کہہ نہیں سکتا زباں سے کچھ بھی اپنی بدنصیب

اپنے ہاتھوں لٹ رہا ہے اسقدر مجبور ہے
پھول ہیں میت کے لازم شہر کا دستور ہے

آہ، اے قلاش و مفلس بے زر و نادار قوم　　بے خبر انجام سے آغاز سے سرشار قوم

قوم ناداں، قوم اندھی قوم بد اطوار قوم　　بے اصول و بے عمل بے عقل و بد کردار قوم

کیا یہی ہے حکم تجھ کو ہادیٔ اسلام کا؟　　کیا نتیجہ ہے یہی اسلام کے پیغام کا؟

کیا اسی کا نام ہے "ہمدردیٔ پسماندگاں"　　لذتِ کام و دہن اور موت والوں کے یہاں!

کھا رہے ہیں بیٹھ کر بھی لگ رہے ہیں قہقہے　　کیا کئے جاتے ہیں یونہی خشک آنسو موت کے؟

کیا مٹا دینگی دلِ پُر درد سے داغِ نہاں　　یہ جلوہ فرمائیاں اور یہ تبسم ریزیاں؟

[illegible] بتا یہ سمجھا گیا مرنے والے کو ثواب؟　　دعوتوں کا یہ تکلف نعمتوں کا انتخاب؟

[illegible] کیا [illegible] کچھ مرحوم کی　　دیکھ کر بزمِ عزا میں کثرتِ عیش و خوشی؟

ہے یہ سب اسرافِ بے جا غور کر انجام پر
ہاں اگر توفیق ہے تو دے خدا کے نام پر

صبا سیمابی متھراوی

ڈاکٹر

آخر کچھ بتائیے تو سہی، آپ شادی کیوں نہیں کریں گے؟ ہم لوگوں نے پھر ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا؟

ڈاکٹر نے کرسی پر بیٹھے ہوئے سگرٹ کا ایک کش لگایا۔ سگرٹ کا دھواں اُن کے خوبصورت چہرے کے چاروں طرف مختلف طریقوں سے سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا۔ ہمارا سوال سُن کر ایک پھونک سے سامنے کا دھواں اڑا کر انھوں نے ہم لوگوں کی طرف دیکھا اور کچھ مسکرائے۔ یہ تبسم ہم لوگوں کے لئے ایک دلخراش تبسم ہوتا تھا۔ ہم اکثر سوچا کرتے تھے کہ اس تبسم کی آڑ میں ایک دردانگیز کہانی پوشیدہ ہے۔ لیکن وہ کیا ہے؟ اس کا ہمیں علم نہیں تھا۔

ڈاکٹر نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کچھ آزردگی کے ساتھ کہا "شادی کیوں نہیں کرتا! اس کے اظہار کے لئے مجھے اپنی نامراد زندگی کی تاریخ دہرانی پڑے گی۔ سنو:-

"۱۸۹۶ء کی بات ہے۔ میں اس وقت تمہاری ہی طرح دُنیا سے ناواقف تھا اور کالج کا ایک معصوم متعلم تھا۔ اس وقت ایک ہم سبق سے میری گہری دوستی تھی وہ ایک ثروت آدمی کا لڑکا تھا۔ اُن دنوں چھوٹے بڑوں میں اس دور کے بہ نسبت کہیں زیادہ برادرانہ تعلقات وابستہ رہتے تھے۔

ایک دن میرے اسی دوست نے مجھ سے کہا "سنتے ہو مسٹر تیش، چلو! میرے گھر چلو۔ اب کے دونوں ساتھ ساتھ وہیں پر ایام تعطیل گزاریں گے۔ اگر تمام چھٹی وہاں ختم کرنے کا ارادہ نہ ہو تو کچھ دن وہاں رہ کر پھر اپنے گھر چلے آنا۔ میں ہمیشہ ایام تعطیل تنہائی میں گذارتا ہوں۔ اس مرتبہ تمہارے چلنے سے میری تنہائی دُور ہو جائے گی۔ وہاں تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ میں کئی بار اپنے والدین سے تمہارا ذکر کر چکا ہوں۔ وہ لوگ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے تمہارا وقت وہاں غیر دلچسپی کے ساتھ نہ گذرے گا اور اس حالت میں کہ تمہیں شکار کا شوق ہے۔ وہاں چڑیوں کے شکار کا بھی انتظام ہے۔" اس کے اصرار پر میں چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔

کئی دن کے بعد ہم لوگ تیسرے پہر کے وقت ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اترے میرا دوست اُترتے ہی اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

"ٹم ٹم آنی چاہیے تھی، دیکھتا ہوں آئی کہ نہیں۔"

اگر نہ بھی آئے تو کیا ہے ایسا زیادہ دُور تو ہوگا نہیں، پیدل ہی چلے چلیں گے۔ کچھ انتظار کے بعد ہم لوگ روانہ ہو گئے۔ ابھی تھوڑی ہی دُور گئے ہوں گے کہ گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور گھونگھروؤں کی آواز سامعہ نواز ہوئی۔ ایک لمحے کے بعد ایک تیز لال گھوڑے سے جُتی ہوئی کالی ٹم ٹم ہم لوگوں کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ قبل اس کے کہ میرا دوست کچھ کہے۔ سائیس نے کود کر سلام کیا اور بولا حضور نیا گھوڑا ہے۔ بڑا منہ زور ہے ...... اسی لئے دیر ہو گئی۔"

ہم لوگ گاڑی میں سنبھل کر بیٹھ گئے۔ میرے دوست نے گھوڑے کی لگامیں ہاتھ میں لے لیں اور چابک کھاتے ہی پل بھر میں غروب ہوتے ہوئے سورج کی شعاعوں سے سُرخی مائل سڑک پر ٹم ٹم تیزی سے چلنے لگی۔ ہم دونوں آس پاس کے ہرے بھرے کھیتوں کو پار کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ مسلسل آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد ایک عالیشان پھاٹک کے اندر ہو کر گاڑی کھڑی ہو گئی۔ سامنے اندی کی چادر اوڑھے ہوئے ایک بزرگ جنکے بال سفید تھے ہم لوگوں کا انتظار کر رہے تھے۔ گاڑی ٹھہرتے ہی وہ پاس آکر بولے "آگئے بیٹا، آؤ، آؤ......

میں سمجھ گیا کہ یہ میرے دوست کے والد ہیں۔ میں گاڑی سے اُترا اور آداب بجا لایا۔ وہ ہم لوگوں سے خیر و عافیت اور دیگر حالات دریافت کرتے ہوئے گھر کی طرف چلے۔

ابھی دن کا حصہ کچھ باقی تھا۔ میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد مکان کے دوسرے حصے کو دیکھنے کے لئے باہر نکل آیا۔ اپنی قدامت کے باوجود مکان مضبوط تھا۔ گھنے اور بڑے درختوں کی کئی قطاریں تھیں جنکی بلند شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ شام کی تر و تازہ ہوا انہیں برہم کر رہی تھی۔ جب تھوڑا سا اندھیرا ہو گیا تو میں کمرے میں واپس آ گیا۔

میرے دوست کے والد برآمدے میں بیٹھے ہوئے کسی سے گرم گرم

گفتگو کر رہے تھے۔ میرے آتے ہی اُنھوں نے سب کو رخصت کر دیا اور مجھ سے بات چیت شروع کر دی۔ وہ مجھے اپنے خاندان کی تاریخ سُنانے لگے۔ اُن کے جدامجد پہلے بہت غریب تھے، پھر بے شمار دولت کے مالک بنے، لیکن کچھ ہی دنوں بعد سب کچھ کھو بیٹھے اُن کے والد کے وقت سے خاندان کی حالت پھر اچھی ہو گئی۔

اس کے بعد ہم لوگ کھانا کھانے چلے گئے اور پھر شب باشی کا اہتمام ہونے لگا

میں پندرہ دن وہاں رہا اُن کے کنبے کے تمام لوگوں سے میرے تعلقات بڑھ گئے تھے۔ چلنے سے ایک دن قبل شب کے وقت ایک غیر معمولی واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد جب میں کمرے میں داخل ہوا تو میں نے بستر پر کاغذ کا ایک پرزہ پڑا ہوا دیکھا۔ میں نے بیتابانہ اُس پر نگاہیں دوڑائیں۔ اس میں لکھا تھا "آج رات کو جب تک سب لوگ سو نہ جائیں دروازہ بند نہ کیجئے گا" نیچے کسی کے دستخط تھے۔ یہ خط کس نے لکھا ہے یہ سوچتے سوچتے میرے دل میں ایک اضطراب سا پیدا ہو گیا۔ دروازہ کھلا چھوڑ کر، روشنی کم کر کے میں کھڑکی کے پاس جا بیٹھا۔ باہر آسمان پر ابر محیط تھا اور باغ کے درختوں میں سے گزر کر ہوا سَن سَن کرتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ چند منٹ بعد دور فاصلے پر ایک آواز سنائی دی اور لمحہ بھر میں قریب ہی زمین پر پانی کا چشمہ بہہ نکلا۔ ہوا میں کافی خنکی پیدا ہو چکی تھی۔

اس کے بعد آسمان صاف ہو گیا۔ پھر تارے نظر آنے لگے۔ اسوقت میں نے محسوس کیا کہ کوئی دروازے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں پُر شوق نظروں سے اس طرف دیکھتا رہا......... اب نسوانی خدوخال میری نظروں کے سامنے نمایاں تھے۔ میں نے آنکھوں کو مَلا اور اتنی دیر میں ایک جمالِ مجسم میرے کمرے میں تھا۔ میں نے دیکھا وہ میرے دوست کی بہن سرما تھی۔ مجھے خواب میں بھی اس جگہ سرما کے آنے کی اُمید نہ تھی۔ میں نے حیرت کے ساتھ کہا "کون سرما؟"

"ہاں، میرا تو خیال تھا کہ شاید آپ نے دروازہ بند کر لیا ہوگا۔"

کیا وہ پرچہ تمہارا ہی تھا۔

"ہاں، مجھے اُمید ہے کہ آپ اس کا خیال نہ کریں گے، حالانکہ بات خیال کرنے کے لائق ہی ہے۔ میں نے جرأت کی ہے، صرف جرأت........"

اُس نے بے تابانہ اور معصومانہ انداز میں کہا تو کیا "آپ کل چلے جائیں گے؟"

"ہاں"

"کہاں جائیے گا؟"

"پہلے گھر جاؤں گا وہاں ایک ہفتہ رہ کر رشتہ داروں اور عزیزوں سے ملتا ہوا پندرہ یوم کے بعد کلکتہ چلا جاؤں گا۔"

"معلوم ہوتا ہے اس طرف جلد واپسی بھی نہ ہوگی......"

"شاید نہیں ——— کیوں؟"

"یوں ہی دریافت کر رہی تھی"

مجھے اس کے چہرے پر کچھ حزن و ملال کے آثار نمایاں ہوتے ہوئے معلوم ہوئے یوں تو وہ پہلے ہی سے اداس تھی لیکن اب اُس پر رنج و غم کا پوری طرح تسلط ہو چکا تھا۔ اُس کے دونوں ہونٹھ کانپ رہے تھے۔ چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ اُس نے اپنا منہ پھیر لیا۔

میں نے پوچھا کیا ہوا؟

"کچھ نہیں آپ کا سامان بندھ گیا؟......... لائیے میں باندھ دوں۔"

"نہیں، نہیں، میں خود باندھ لوں گا۔ لیکن......"

"چابی دیجئے گا......... اُو، یہ مل گئی......"

وہ چابی لیکر ٹرنک کھول کر میری چیزیں احتیاط سے رکھنے میں مشغول ہو گئی میں حیرت کا پتلا بنا ہوا سب کچھ دیکھ رہا تھا..... دفعتاً میں چونکا۔ رات کی خاموشی میں ایک نوجوان عورت کا ایک مرد کے ساتھ ہونا یقیناً گناہ ہے، اتنی دیر تک یہ بات میری سمجھ میں کیوں نہ آئی؟ مجھے خود پر بڑا غصہ آرہا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے کہا "دیکھو تمھیں نے یہ خط لکھا ہوگا۔ میں نے اس کا اندازہ لگانے کے لئے کہ یہ خط کس نے لکھا تھا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا لیکن یہ معلوم کر کے کہ تمہاری تحریر ہے، مجھے تعجب اور افسوس ہو رہا ہے۔ تم ایک بھلے گھر کی لڑکی ہو اور میں ایک غیر شخص۔ میں تمہارے بھائی کا صرف دوست ہوں، ایسی حالت میں مجھ سے پوشیدہ طریقے سے ملنے کی کوشش کرنا کہاں تک جائز ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے تمھیں اس کا احساس نہیں ہے اور تم اس کے نتیجے سے بے خبر ہو۔ مجھ سے بھی غلطی ہوئی جو تمھیں اتنی دیر تک یہاں رہنے دیا۔ خیر جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ تمھیں میرا سامان ٹھیک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں سے چلی جاؤ......."

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور سر نیچا کئے بیٹھی رہی۔ میں نے کچھ دیر انتظار

کرنے کے بعد دوبارہ کہا "جاؤ خدا کے لئے چلی جاؤ۔ ۔ ۔ ۔ دیر نہ کرو"

میرا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اشک آلود آنکھوں کو جھکاتی ہوئی کانپتے ہوئے لہجے میں بولی "کیا میرا یہاں آنا آپ کو ناگوار معلوم ہوا ہے؟ میں یہاں کیوں آئی ہوں، کیا آپ کو معلوم نہیں۔ بالکل نہیں ؟ کیا میرے دل کے دہکتے ہوئے انگاروں کی گرمی آپ تک نہیں پہونچی۔ میں سمجھتی تھی، آپ بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

دفعتاً وہ رونے لگی۔

میں نے کہا "سرما، تم یہ سب کیا کہہ رہی ہو؟ معلوم ہوتا ہے تم "

اُس کے رخسار تمتمانے لگے۔ آنکھوں سے سیلاب اشک بہنے لگا اور "وہ ظالم، ظالم۔ ۔ ۔" کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اُس وقت میرا دل بیٹھا جارہا تھا مختلف قسم کے خیالات دل و دماغ میں نشتر زنی کر رہے تھے۔ اُس رات میں پھر نہ سو سکا دوسرے دن صبح اُٹھ کر سفر کے لئے روانہ ہوگیا، میرا دوست مجھے مجبور کرنے لگا کہ کلکتہ سے واپسی پر میں پھر آؤں۔ میں نے وعدہ کر لیا لیکن دل ہی دل میں تہیہ کر لیا کہ پھر یہاں لوٹ کر ہرگز نہ آؤں گا

ایک سال بعد سرما کی شادی ہوگئی، مجھے بھی دعوت نامہ ملا لیکن میں نہ آسکا۔

کئی سال کی بات ہے میں نے ڈاکٹری پاس کرکے کلکتہ میں پریکٹس شروع کر دی تھی۔

ایک دن جاڑے کی رات میں کھانا کھانے کے بعد میں سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ یکایک کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے سوچا خدا جانے کون ہے اتنی سردی میں اسوقت کون بھی دیکھنے جاتے۔ میں نے اندر ہی سے کہا اس وقت میں نہیں جاسکتا کسی اور کو لے جایئے۔

کسی نے درد انگیز لہجے میں کہا "اندر کوئی چلنے کے لئے تیار نہیں ہے ——— رحم کیجئے"۔

اس کی منت و سماجت سے دل کچھ نرم ہوا، شب تاریک کے دھندلکے میں ہانپتا کانپتا ساتھ ہولیا کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک مکان کے سامنے تھے۔ زینہ کے قریب ایک بیحد خوبصورت نوجوان کھڑا تھا وہ مجھے ساتھ لیکر اوپر کے حصے میں پہونچا۔ یہاں ایک مریضہ پڑی ہوئی تھی۔

جو صاحب میرے ساتھ تھے انھوں نے مریضہ کی پوری کیفیت بیان کی اور منت کے ساتھ بولے "ہمارے اوپر کرم فرماتے ہوئے آپ کو یہاں تمام رات رہنا ہوگا" مریضہ کی جو حالت ہے اُسے دیکھتے ہوئے بغیر ایک ڈاکٹر کی موجودگی کے ہم لوگوں کو رات کاٹنا مشکل ہو جائے گا۔

پاس والے کمرے میں میری رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔

کافی رات گزر جانے کے بعد میں ایک بار مریضہ کو دیکھنے اُس کے کمرے میں گیا۔ اُس پر نیم بیہوشی طاری تھی، لیکن میرے پہونچتے ہی اُس نے اپنے حواس درست کرکے کہا "کون؟"

"درست۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ڈاکٹر ہوں"

"کون ڈاکٹر؟"

"میں آج رات تمہاری دیکھ بھال کے لئے متعین کیا گیا ہوں" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب کیسی طبیعت ہے؟"

"آپ آج رات ہی آئے ہیں؟"

"ہاں، اب طبیعت کیسی ہے؟" میں نے پھر سوال کیا۔

وہ مجھے بغور دیکھتی رہی "کیا میں دل کی حرکت دیکھ سکتا ہوں"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اُسی طرح مجھے دیکھتی رہی، میں نے کہا "کیوں؟ تم جواب کیوں نہیں دیتی ہو؟"

"ستیش بابو؟"

میں متحیر تھا۔ سات سال قبل کے ایک واقعہ کی یاد بجلی کی طرح میرے دماغ میں دوڑ گئی۔ اُس دن اماوس کی رات میں جو غنچہ میری آغوش میں پناہ لیکر پھول بننا چاہتا تھا۔ کیا یہ وہی غنچہ ہے۔ کیا یہ وہی سرما ہے۔ اُس کے چہرے پر اتنی تبدیلی ہوگئی تھی کہ میں اُسے پہچان بھی نہ سکا وہ مجھے حیرت کے ساتھ دیکھ رہی تھی ——— "شاید آپ مجھے پہچان نہ سکے"! اُس نے نحیف اور کمزور آواز میں کہا۔

"ہاں، پہچان گیا ——— سرما"

"کیا آپ سرما کو بالکل بھول گئے؟"

"ابھی تمھیں زیادہ بات نہیں کرنی چاہئے۔ ابھی تم بہت کمزور ہو۔

"کمرے میں اسوقت اور کون ہے؟"

"اور کوئی نہیں، صرف میں ...."

"میرے مالک کہاں ہیں؟"

"وہ اس باغ والے کمرے میں ہیں"۔

"اچھا"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی "اس بار زندگی کی مجھے اُمید بھی نہیں تھی ...... کھڑے کیوں ہیں آپ بیٹھیے ..... "

——— میں بیٹھ گیا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینہ پر رکھ لیا ——— اور ایک سرد آہ کھینچی۔

میں سمجھا، میری موجودگی نے اُس کے دل میں پھر ہیجان برپا کر دیا ہے۔ میں پھر پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے اُٹھ کر چلے جانے کی کوشش کی، لیکن یہ خیال کر کے کہ دوبارہ اُسے صورت دکھا کر تڑپتا ہوا چھوڑ کر چلا جانا اُس کے لئے اس وقت بہت تکلیف دہ ہوگا، میں بیٹھ گیا۔

اُس نے کہا "ستیش بابو، کیوں آپ مجھے بچانے کی فضول کوشش کر رہے ہیں؟ .... میں بچ نہیں سکتی .... اور بچنا بھی نہیں چاہتی ......"

"کون کہتا ہے تم نہیں بچ سکتیں ...... میں تمہیں بچاؤں گا"۔

"نہیں میں اب نہیں بچ سکتی اور کیوں نہیں بچوں گی معلوم ہے آپ کو؟

——— آہ! یہ ایک کہانی ہے، دُکھ بھری، سنئے:-

"بہت دنوں کی بات ہے کسی جگہ ایک لڑکی رہتی تھی، رنگ و بُو میں ڈوبی ہوئی تتلی کی طرح وہ اپنے والدین کے محبت بھرے باغ میں اُڑتی پھرتی تھی۔ ایک دن ایک خوبصورت راجکمار اسی باغ میں ٹہلتا ہوا نکل آیا، وہ دیکھنے میں لڑکی کو بہت بھلا معلوم ہوا وہ اُس کے پاس پریم کی بھیک مانگنے گئی۔ لیکن چکور کی پیاس کیا چاند کی روشنی سے بجھ سکتی ہے؟ وہ ناامید ہو کر لوٹ آئی۔ راجکمار نے رخصت چاہی والدین کا محبت بھرا باغ پہلے ہی کی طرح شگفتہ تھا لیکن تتلی کی تمام رنگینیاں سوز میں منتقل ہوگئیں، اب وہ ایک شمع تھی، ہمیشہ جلنے والی۔

اس کے بعد دفعتاً وہ بے ہوش ہوگئی اور کچھ دیر بعد یہ زبان سے نکلے ——— "میں کتنی کوشش کرتی ہوں کہ بھول جاؤں ...... بھول نہیں پاتی ...... اس کی جوت ...... دن رات ...... میرے من میں ...... جاگتی رہتی ہے ...... میں نے سوامی کو دھوکا دیا ...... اُس کا دھیان کیا ...... کس بُرے وقت میں ...... میں نے ...... اُسے ...... دیکھا تھا ...... لا ...... م ......

بڑی تیزی سے اُس کے منہ سے خون بہنے لگا، تمام جسم نیلا ہو گیا ——— بے اختیارانہ طور پر میرے منہ سے ایک آہ نکل گئی اور آنسوؤں کے چند قطرے اُس کے رخساروں پر ٹپک گئے۔ اُس نے آنکھیں کھولیں ——— کچھ کہنا چاہا ——— لیکن سانس کا آخری ڈورا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔

ثُریا کے شوہر نے مجھے رخصت کرنا چاہا۔ مگر میں نے کہا "میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا"۔

دو گھنٹے کے بعد آگ کے شعلے لرزتے ہوئے آسمان سے باتیں کرنے لگے ——— ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے میرا دل سُلگا جا رہا ہے۔

اُسی دن سے کھاتے پیتے، سوتے جاگتے ثُریا کا خیال جاں گزیں رہتا ہے ——— اُس کی کہانی ——— آہ اب تک دل و دماغ کو کچلے دے رہی ہے۔

"میں مر رہی ہوں، اس کا سبب آپ ہیں"۔ میں ظالم ہوں ——— میں نے ایک معصوم جوانی کا نتیجۂ تغافل سے گلا گھونٹا ہے ———

میں اس گناہ کے خوف سے اب بھی لرزہ براندام ہو جاتا ہوں، میری روح اکثر گھبرا کر جسم سے نکل جانے کی کوشش کرتی ہے لیکن آہ ——— گناہوں کی سزا کے لئے زندہ ہوں، اور اسی کی پاداش میں شادی نہ کرنے کا تہیہ کر چکا ہوں۔

(ہندی سے آزاد ترجمہ) **شائق ہنگامی** بی۔اے

شمع و پروانہ

کانپ اُٹھا میں رات رنگِ شمع محفل دیکھکر — مجھ کو آئی ایک حُسن و عشق کی دُنیا نظر
معرکے تھے گرم کیا کیا سُوز و سازِ عشق کے — تھا لبِ پروانہ پر یوں شکوۂ سوزِ جگر
تو سراپا حُسن ہے اے رونقِ بزمِ حسیں — تیری جلووں سے ہوئے پُرنور سب دیوار و در
تیری سوزِ عشق نے پُھونکی ہے میرے دل میں آگ — صدقے ہونیکی تمنّا مجھ کو لائی کھینچکر
میرے ناچیز بال و پر یہ برقِ التہاب — یہ جدائی کا پہاڑ اور اک ذرا سی جان پر
کہتے کہتے ولولہ اتنا محبت کا بڑھا — جوشِ بیتابی میں آخر اُڑکے پہنچا شمع پر
عاشقِ صادق تھا وہ محوِ لقائے دوست تھا — جامۂ ہستی کو پُھونکا قطع کی راہِ سفر

⁂

دیکھ سکتی تھی نہ یہ نظارۂ نادیدنی — شمع سر دھننے لگی کہنے لگی با چشمِ تر
آہ کچھ کہنے نہ پائی تجھ سے اپنا حالِ زار — کیا ہے میرے دل کا عالم کیا تجھے اسکی خبر
آہ! دم بھر بھی نہ تو تابِ جدائی لا سکا — میں تری فرقت میں جلتی ہی رہی شام و سحر
نام روشن محفلِ عشاق میں تو نے کیا — میری قسمت میں فقط تھا صدمۂ داغِ جگر
حشر تک یہ خون تیرا میری گردن پر رہا — میری دامن سے نہ چھوٹیگا یہ دھبّہ عمر بھر

⁂

آگ اُلفت کی ازل ہی سے جو تھی بھڑکی ہوئی — روتے روتے جل بُجھی آخر کو ہنگامِ سحر
خرمنِ صبر و سکوں پر میری بجلی گر پڑی — یاد آیا یہ کسی کا مطلعِ جادو اثر

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود
تا نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

[illegible]

ادبی خطوط

عنوانِ بالا کی سابقہ قسط حضرت امیر مینائی کے چند خطوط پر مشتمل تھی۔ مدیرِ شاعر نے مجھے لکھا ہے کہ ایسے خطوط بھیجوں جن کا تعلق یکسر ادبی و فنی مباحث سے ہو۔ ایسا ممکن ہے اور اس قبیل کے صدہا خطوط میرے پاس محفوظ بھی ہیں لیکن میرا ارادہ چونکہ کچھ عرصے کے بعد ان خطوط کو مستقل کتاب کی شکل میں پیش کرنے کا ہے۔ اس لئے اس سلسلے کو روایت دار کر دیا ہے تاکہ معمولی اور غیر معمولی ہر قسم کی تحریریں پیش ہوتی رہیں، اس طرح یہ ضرور ہوگا کہ بہت معمولی اور غیر اہم خطوط بھی اس سلسلے میں آپ کو پڑھنا ہوں گے۔ لیکن چونکہ یہ سب تحریریں ملک کے مستند و موقر حضرات کی ہوں گی۔ اس لئے ان کا مطالعہ کسی صورت بھی زحمتِ نظر کا باعث نہیں ہو سکتا بلکہ معمولی معمولی تحریروں میں بھی کوئی نہ کوئی ادبی شان ضرور محسوس ہوگی اور اس سے لذت گیر ہونا آپ کے ذوقِ مطالعہ پر منحصر ہوگا۔

اس صحبت میں حضرت اکبر الہ آبادی کے خطوط سے لطف اندوز ہوجیے۔ حضرت احسن مارہروی اگرچہ اکبر الہ آبادی کے ہم عمر نہ تھے لیکن ایک حد تک اُن کے ہم عصر ضرور کہے جا سکتے ہیں۔ اربابِ کمال سے لطفِ صحبت اٹھانے اور اُن کی ملاقات سے فوائد حاصل کرنے کا مرحوم کو ہمیشہ شوق رہا، چنانچہ حضرتِ داغ، امیر، جلال اور امیر اللہ تسلیم وغیرہ وغیرہ کی طرح حضرت اکبر سے بھی جناب احسن مارہروی نے شرفِ ملاقات حاصل کیا اور مدتوں آپس میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔

مارہرہ کے ایک بزرگ منشی رضا حسین صاحب لکھنؤ میں میر منشی تھے۔ حضرت اکبر الہ آبادی کے خصوصی احباب میں ان کا شمار تھا۔ ۱۹۰۸ء میں اسی خصوصیت کی بنا پر منشی رضا حسین سے ملنے کے لئے مارہرے تشریف لائے اور اسی دورانِ قیام میں ایک روز حضرت احسن کے مکان پر بھی تشریف فرما ہوئے اور اس ایک ہی ملاقات نے اکبر و احسن میں اتنی گہری عقیدت قائم کر دی کہ جب تک مرحوم زندہ رہے حضرت احسن سے ملاقات اور خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ اکبر الہ آبادی کے جس قدر خطوط میرے پاس ہیں اُن کے دیکھنے سے جہاں مرحوم کی خصوصیات اور کمالات کا اظہار ہوتا ہے وہیں کاتب و مکتوب الیہ کی محبت و عقیدت کا ثبوت بھی ملتا ہے، یہ صرف وہ ہے کہ دو شخصوں کے تعلقات کا پتا بجز خط و کتابت کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے نہیں مل سکتا ایسی ہی مرقع ہے جس میں تصویر کا ہر رُخ روشن و واضح ہوتا ہے، انسانی تعلق، سادگی، اخلاق اور کج خلقی وغیرہ سب کی حقیقت خطوط کی چند معمولی سطروں میں پوشیدہ ہوا کرتی ہے۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں حضرت اکبر کے دیوان کا پہلا اڈیشن نکلا۔ حضرت احسن کی طلب پر ۲ مارچ سنہ ۱۹۰۹ء کو یہ تحریر کیا۔

"میرے پیارے دوست۔ میں معذوری کے سبب سے نہ دیوان کے لئے انتخاب کر سکا نہ نظرِ ثانی ہوئی۔ عشرت سلمہٗ کے اصرار سے بہ صرفِ کثیر چھپوایا اور سادا ئے معارف کے لئے یہ التزام کرنا پڑا کہ احباب بھی اس میں شریک ہوں۔ عشرت نے ایک شخص کو مہتمم مقرر کر دیا ہے میں کچھ نگرانی نہیں کر سکتا نہ مراسلت چونکہ بہ قیمت کی اجازت تھی، میں نے عنایت نامہ منشی عظمت علی کو بھجوا دیا وہ وی پی روانہ کریں گے میں خیال کرتا ہوں کہ بعض اشعار خارج شدہ بھی درج ہو گئے ہیں عشرت بھی اخیر میں چلے گئے۔ نا فہموں نے کام کیا، بہر کیف عیوب سے چشم پوشی فرمایئے۔ ہنر کی داد دیجئے۔ شرکتِ چندہ سے آپ کی ذمہ داری کم نہیں ہوئی۔ آپ لیشن انشاء اللہ دسمبر آئندہ میں ہوگا"

اس خط میں حضرت اکبر نے دیوان کی قیمت کی ادائگی کے باب میں جس ضرورت و معذوری اور مجبوری کا اظہار کیا ہے وہ اگرچہ حق بہ جانب تھی لیکن اکبر کی سیر چشمی اور مروت نے اس احتیاط کو گوارا نہ کیا اور قیمت دیوان واپس کرتے ہوئے ۸ اپریل سنہ ۱۹۰۹ء کو یہ خط لکھا:-

پیارے عنایت فرما۔ باوجود اس کے جو میں نے لکھا تھا آپ ہی قیمت کا لینا گوارا نہ ہوا، زرِ قیمت عطیۂ آپ کا واپس ہے اور قدر دانی کی شکر گزاری۔ قیمت اس وجہ سے واپس نہیں کی کہ قیمت آپ پر بار تھی اس سبب سے واپس نہیں کی کہ آپ سے محبت و تخصیص ہے، ایسا کیوں تو صدہا آدمیوں سے جھگڑا ہو۔ اصل یہ ہے کہ آپ اُن چیدہ چیدہ اشخاص میں ہیں جو پبلک کو وقتاً فوقتاً ان مضامین کی طرف متوجہ

فرمائیں گے اور کوئی شعر جو پسند آئے گا اس کو عنوان بنا کر مضمون لکھیں گے
یا کسی سلسلۂ مضمون میں کوئی شعر درج فرمائیں گے۔"

کچھ عرصہ پہلے شعرا، اپنے دواوین کی اشاعت ملک و قوم کی ضرورتوں کے پیشِ نظر عمل میں نہیں لایا کرتے تھے بلکہ ان کی اشاعت نام و نمود کے لئے ہوا کرتی تھی اور ایسے دواوین احباب و شائقین میں مفت تقسیم کئے جاتے تھے۔ اکبر بھی اگرچہ اسی زمانہ کے بزرگوں میں سے تھے لیکن زمانے کے حالات اور ضروریات سے بے خبر نہ تھے اس قسم کی فضول رواداری کو محض داد کی خاطر پسند نہیں فرماتے تھے بلکہ اُن کا خیال تھا کہ ہر کام ضابطہ کے ساتھ کیا جائے۔ پہلے مصارف ضروری کا بار ہلکا کیا جائے اس کے بعد اگر موقع ہو تو رعایت کی جائے اور اگر رعایت بھی ہو تو ایسے افراد کے حق میں جن کی ذات سے اُن کے کلام اور اُن کے دیوان کی اشاعت میں ترقی ہو۔ ۱۹۱۲ء میں حضرت اکبر کا دوسرا دیوان شائع ہوا۔ حضرت احسن مرحوم نے قیمتاً طلب کیا، حضرت اکبر کا جواب سُنئے:۔

کرمی۔ علالت اور دیگر ترددات کے سبب عنایت نامہ کا جواب ہنوز نہ لکھ سکا تھا۔ یادآوری کا ممنون ہوا۔ آپ الہ آباد تشریف لائے تھے اور غریب خانے پر قدم رنجہ بھی فرمایا۔ افسوس کہ میں باہر جا رہا تھا محروم رہا۔ آپ نے تشریف آوری کا وعدہ پورا نہ کیا حسرت رہ گئی آپ کا ذوقِ تحقیق زبان اور آپ کا عالمانہ و شاعرانہ مذاق نہایت قابلِ قدر ہے۔ مطبع کا بل ہنوز باقی ہے، گھر سے ادا کیا نہیں چاہتا۔ آپ کی قدرافزائی اور اس سے زیادہ خلوص عنایت و محبت کا شکرگزار ہوں کتاب ہدیتہً پیش ہے۔ دل نے گوارا نہ کیا کہ وی پی بھیجوں، ہاں اشاعت کا خیال رہے لیکن کچھ زحمت ضروری نہیں۔ اس کو بہ نظر اصلاح ملاحظہ فرمایئے ایک آدھ جگہ غلط العوام لفظ داخل ہوگئے ہیں مثلاً قریب المرگ وغیرہ وغیرہ، نہیں معلوم آپ کا پرچہ جاری رہا یا نہیں۔ اس میں ذکر تو کردیجئے کہ حصۂ دوم تیار ہے۔ مجھے تو دوٹ خواہوں نے پریشان کر رکھا ہے، گوشۂ عزلت پر قناعت نہیں، جان نہیں بچتی عجب زمانہ ہے خدا ہم لوگوں پر رحم کرے، فساد و اختلاف کا نام ترقی رکھا گیا ہے۔ رسیدِ کتاب سے مطلع فرمایئے اور اپنی خیریت مزاج سے۔

حضرت اکبر الہ آبادی کی بے شمار خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ زبردست مردم شناس تھے اور اسی اعتبار سے اپنے ملنے والوں کی قدرافزائی فرماتے تھے ہر چند حضرت احسن مرحوم کی ارادت شوقِ علم کے تحت تھی اور حضرت اکبر کا وجود ان کے لئے فنی و علمی استفادے کا باعث۔ چنانچہ اکبر بھی اُن کی قدرافزائی سے ذرا دریغ نہ فرماتے تھے۔ حضرتِ احسن کی خصوصیات و کمالات کا اُنھوں نے تحریراً و تقریراً ہمیشہ موقع بہ موقع اعتراف کیا۔ ذیل میں کچھ خطوط اس ثبوت میں ملاحظہ فرمایئے۔

کرمی۔ میں اسی سبب سے آپ کی بہت قدر کرتا ہوں کہ آپ کا مذاق طالب علمانہ ہے۔ آپ اردو زبان کے خیر طلب ہیں اور کتنے ہی معترض آپ پر ہوں۔ آپ بُرا نہیں مانتے اور آپ کے اعتراضات اگر صحیح نہ ثابت ہوں یا تسلیم نہ کئے جائیں جب بھی آپ کی خوش دلی قائم رہتی ہے اور آئندہ اظہارِ رائے میں آپ کو تامل نہیں ہوتا۔ میں نے اس بات کی مدح محمد نوح صاحب سے بھی کی ہے اور اکثر ذکر کیا ہے اور اگر کوئی انجمن زبان اردو کے لئے قائم ہو تو آپ کو اُس کے اعلیٰ اراکین میں تجویز کرنے کو تیار ہوں کیونکہ جس صفت کا میں نے ذکر کیا لوگوں میں وہ کم پائی جاتی ہے۔ یا شاید مجھ میں وہ صفت مفقود ہے یعنی کم از کم یہ کہ مباحث سے بچتا ہوں۔ جو عذر آپ کو گزرا درحقیقت اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں۔ علم عروض کے اکثر مدونوں کی کوتاہ علمی ہے، کبھی ملئے گا اور آپ کا جی چاہے گا تو کچھ تفصیل اس کی کروں گا۔ فنِ عروض شعرا کی طبع موزوں کا (جو ایک نیچرل چیز ہے) تابع ہے۔ شعرا کی طبع موزوں اس کی تابع نہیں پہلے شعر کہے گئے ہیں بعد اُس کے عروض کی تدوین ہوئی ہے اس مختصر ریمارک سے زیادہ کی گنجائش کارڈ میں نہیں ہے "دل میں حسد ہے نہ کوئی کد ہے" آپ نے نون کو متحرک رکھا اس سبب سے دقت ہوئی، تقطیع میں ہے کی ی کو خارج اور نہ کے نون کو ساکن کیجئے، بحر متدارک مقطوع میں یہ ہمیشہ جائز رکھا گیا ہے، کمال مرحوم نے ایک غلط فہمی کی ہے اگر آپ کو شوق ہوگا تو اس کا بیان سُنئے گا۔ اُمید کہ آپ اچھے ہوں۔ خدا کرے

آپ سے جلد ملاقات ہو۔

حضرت اکبر مرحوم کی یہ بھی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں اور قدر دانوں کے خط نہ پاکر متفکر ہو جایا کرتے تھے اور بغیر اس انتظار کے کہ اُس کا خط آئے خود پہل فرماتے اور خیر و عافیت پوچھتے۔ ملاحظہ ہو:۔

مکرمی دام مجدکم۔ مدت سے آپ کی خیریت دریافت نہیں ہوئی، آج ڈاک سامنے آگئی اور آپ کا نام نامی نظر آیا۔ دل میں آپ کی یاد تازہ ہو گئی بدریافت خیریت نیاز نامہ لکھتا ہوں، کچھ اشعار تازہ ہوں تو عنایت فرمائیے۔

اس خط کے جواب الجواب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

برادرم سلمہ اللہ تعالیٰ۔ اچھا نہ تھا۔ جواب نہ لکھ سکا۔ اب بھی علیل ہوں ضعف، آلام، تردداتِ کیا کہوں کیا گزر رہی ہے سخن سے بھی بیگانگی ہوتی جاتی ہے، زمانہ اور ہے اور پھر یہ بھی کہ میرا زمانہ ہو چکا۔ میں تو آپکو موجودہ شعراء میں ممتاز سمجھتا ہوں۔ آپ زبان کے حامی ہیں اور دعوےٰ شاعری کے مستحق، اگرچہ طرح اچھی نہ تھی لیکن آپ کے رنگ کی جھلک اشعار میں ہے ؎

گھٹ کر نہ طبیعت مری صیاد رہے گی
میں قید رہوں گا تو وہ آزاد رہے گی

اس خیال کی داد دیتا ہوں، زیادہ تر اس بات کی کہ کتنے تھوڑے لفظ مصرع کے لئے تھے آپنے استادانہ طور پر اظہارِ خیال کر دیا، مرحبا ؎

اسرارِ عاشقاں را باید زیادہ دیگر
درد آکہ نیست پیدا در شہرِ ہمزبانی (جامی)

میں کیا کہوں کہ حاضر ہو سکوں گا، زندگی بار ہے، دل پریشان ہے بہرکیف زندہ رہا تو دیکھا جائیگا۔

مفصلۂ بالا خطوط کے ملاحظے کے بعد یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ حضرتِ اکبر خط و کتابت میں صرف تعریف توصیفی کے ہی عادی تھے۔ وہ موقع و محل پاکر ادبی و فنی بحث و مباحث کے میدان میں بھی سپر انداختہ رہتے تھے، اس ثبوت میں چند خط ملاحظہ کیجئے مکرمی۔ ایک مدت سے طبیعت نادرست ہے اور کچھ ترددات بھی

لاحق ہیں، میں نے در باب تقطیع بے ساختہ آپ کو لکھدیا تھا۔ آپ خود ماہر فن ہیں بلکہ آئمہ فن میں سمجھوں تو بجا ہے اگر میں اسی قدر لکھدیتا کہ میں نے تقطیع کے لئے نون کو ساکن سمجھا ہے تو کافی تھا چونکہ ہم میں آپ میں بے تکلفی ہے لہذا کچھ خیال نہ رہا۔ بحث میں بات صاف ہو جاتی ہے ع

مرا سینہ ہے مشرقِ آفتابِ داغِ ہجراں کا

ہے کی ی کا اسکان اور آفتاب کی ف کی تحریک کے بغیر کام نہیں چلتا لیکن بحر متدارک مقطوع میں تو بے حد کثرت ہو جاتی ہے آپ ایسے مصرعہ کو پسند کرتے ہیں "تاکی آدمی بر من خواری" جو کتاب میں لکھا ہی لیکن یہ پابندی کہاں نبتی ہے، میر کے اس مصرع کو دیکھیے

"اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

ہو گئیں اصلی حالت میں فاعلن ہے مگر فعلن کے وزن پر پڑھنا پڑتا ہے محمد نوح صاحب غالباً شروع مارچ میں مشاعرہ کریں نہایت خوشی ہوگی۔ اگر آپ سے ملنا چاہا۔ تو دُنیا سے سیر ہو گیا ہوں، آپ ایسے احباب غنیمت ہیں۔ خدا تندرست رکھے۔

ایک دوسرا خط ملاحظہ فرمائیے جس میں تنباکو کے املا پر بحث ہے:۔

مکرمی جناب شاہ صاحب آپ نے مثل سُنی ہوگی" بہ مرگش گیر تا بہ تپ راضی شود" آپ نے اصلاحِ سخن ماہ اگست میں حضرت رنجور کا آرٹیکل تنباکو کی املا پر ملاحظہ فرمایا ہوگا، انھوں نے تو ڈر ہاہی پھونک دیا اور کہدیا کہ صدائے ملفوظ کو صورت مکتوب میں آنا چاہیے۔ عرب کے اتباع میں ایران نے نبہ، دنبہ، شنبہ وغیرہ کو نون سے لکھنا شروع کیا۔ اب ایرانی اس غلطی پر متنبہ ہوئے ہیں اور آم اور تمباکو لکھنا شروع کر دیا ہے لہذا ہم لوگ کیوں لکیر کے فقیر بنے رہیں۔ چلئے فراغت ہوئی۔ شمبہ لکھئے دو شمبہ لکھئے جائز بلکہ صحیح متصور ہوگا کیا آپ یہ اصول پسند فرماتے ہیں میں تو خیال کرتا ہوں کوئی بھی ہوا خواہِ اردو پسند نہ کرے گا۔ یہ تو مخالفین اردو کا عین منشا ہے کہ قیدِ املا شکست ہو جائے مولوی رنجور کا استدلال بالکل

غلط ہے بلا ثبوت و بلا دلیل انھوں نے حجت وغیرہ کی ہے میں نہیں جانتا حضرت رنجور کو املا میں رفارمری کی کیوں ضرورت ہوئی اور کس استحقاق سے، آگے چل کر اسی دلیل سے بدرودین (بدالدین) اور صاحب علی بھی لکھ سکیں گے۔ نیز یوں نے بھی مذہب کی نسبت یہی کی ہے۔ اب آپ کی تحریر کی قدر ہوتی ہے یعنی آپ نے یہ لکھا تھا کہ فارسی پہلو سے ہم تمنا کو قائم رکھیں گے اور ہندی پہلو سے تمنا کو، آپ نے فارسی کی عزت اور قاعدے کی پابندی قائم رکھی تھی۔ میں نہیں جانتا حضرت رنجور کو یہ کیا سوجھی۔ جو لوگ تمنا کو لکھتے ہیں ہرگز اُن کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فارسی املا کے اصول کو غلط اور منسوخ سمجھیں بلکہ اُنھوں نے اس کو ہندی لٹریچر کا لفظ تصور کیا ہے۔ یہ عجب تماشا ہے کہ حضرت رنجور تانبے سے بھی تمنا کو کو ملاتے ہیں اور یہ نہیں کہتے کہ جب تانبے میں نون موجود اور قائم ہے تو تمنا کو میں کیوں نہ ہو کیا ہم تانبے کو تاما لکھ سکتے ہیں اور کیا یہ اُردو صحیح ہوگی اور تانبے سے نسبت دیں تو تمنا کو ہوگا تب کہاں سے آئیگی۔ آپ نے جو اپنی تحریر میں احتیاط ملحوظ رکھی تھی یقیناً اس کا سبب یہ ہے کہ آپ ماہرِ فن ہیں، فارسی لٹریچر پیشِ نظر ہے اور عمدہ شاعر ہیں۔ مولوی رنجور صاحب کا معاملہ تو وہی ہے کہ "شعر مرا بمدرسہ کہ برد"۔ میں تو کوئی صاحب رسالہ نہیں ہوں نہ دل چاہتا ہے کہ از خود بلا استفسار کچھ لکھوں نہ وہ حلاوت زندگانی باقی ہے، نہ وہ سوسائٹی۔ لیکن خوش ہوں گا کہ آپ کچھ پیارک کریں مدلل اور مفصل نشر ملکیہ آپ کو حضرت رنجور سے اختلاف ہو۔ مدعی تو بہت ہیں لیکن آپ اُن چند اشخاص میں سے ہیں جن کو عملی توجہ ہے اور جن کے قلم میں زور ہے۔ اپنی خیریت سے مطلع فرمائیے۔ (باقی۔ باقی)

سیّد رفیق مارہروی

قند پارسی

دل از ہجوم یاس ہراساں نمی شود — دخلِ ہراس در دلِ مرداں نمی شود
تا جاں نثارِ شاہدِ یزداں نمی شود — در شرعِ ما زبہار مسلماں نمی شود
تا آں نگارِ مست خراماں نمی شود — روئے زمیں جوابِ گلستاں نمی شود
تا بے نیام خنجرِ احساں نمی شود — سامانِ قتلِ مردِ مسلماں نمی شود
تا ارتکاب قتلِ غلامی نمی کنی — دار السلام خانۂ زنداں نمی شود
تا سودہ مثلِ کحل صفاہاں نمی شوی — خاکت ضیائے دیدۂ دوراں نمی شود
معنیِ لفظِ یاس میرس از من اے جواں — کیں لفظ در لغاتِ جواناں نمی شود
در شاعری میائے کہ چوں عہدِ وصلِ یار — آساں ہمی نماید و آساں نمی شود
شاید غریب خدمتِ عشق اختیار کرد — کز شیخِ شہر طاعتِ یزداں نمی شود
ایں سرکشیِ نفس ہم از زندی داروںیست — طوفاں ہمیں کہ تابعِ عمّاں نمی شود

جبریلؑ را مساز بہ سیماب در سخن
کیں مرغِ بادسنجِ سلیماں نمی شود

(مولوی) عبد الغفور سلیمان

رازِ نہاں

کون سمجھے دردِ دل جب ہم زباں کوئی نہیں
آج دنیا میں ہمارا راز داں کوئی نہیں

اب محبت سے جہاں میں بدگماں کوئی نہیں
اب نگاہِ آرزو میں داستاں کوئی نہیں

عارضی اک منظر ہے فطرتِ پرواز کا
گلشنِ ہستی میں غافل آشیاں کوئی نہیں

میں گرفتارِ محبت اور تو صید ہوس
دہر میں آزاد زیرِ آسماں کوئی نہیں

کون اب شہرِ خموشاں میں سُنے تری فغاں
رونے والے کس کو روتا ہے یہاں کوئی نہیں

سب چمن میں آرہے ہیں لیکے پیغامِ بہار
واقفِ اندیشۂ دورِ خزاں کوئی نہیں

کون دیگا گلستاں میں نغمۂ بلبل کی داد
میں نہیں تو ماہرِ طرزِ فغاں کوئی نہیں

سیکڑوں دریائے ہستی میں ہیں دُرِّ شاہوار
ڈھونڈنے والا تہِ موجِ رواں کوئی نہیں

رہ گئے سب پہلی ہی منزل میں ہمت ہار کر
آشنائے قدرِ سعیِ رائگاں کوئی نہیں

میں ہوں تنہائی ہے اور مطلق تصورِ صبح و شام
اب مری خلوت میں آجاؤ یہاں کوئی نہیں

آپ ہی جلوہ ہے وہ اور آپ ہی جلوہ نگر
اس حقیقت کے سوا رازِ نہاں کوئی نہیں

ہے فسانہ بزمِ ہستی کا بعنوانِ عجب
میہماں کوئی نہیں ہے میزباں کوئی نہیں

رہنے والے سب کے سب خوش ہیں دیارِ عشق کے
یہ وہ بستی ہے جہاں ناشادماں کوئی نہیں

اے الم شاید جنوں کی آخری منزل ہے یہ
میں وہاں اب گرمِ جولاں ہوں جہاں کوئی نہیں

الم مظفر نگری

کیف و رنگ

یہ مے، یہ فضائیں، یہ جنوں ریز نظارے
اے کاش مجھے کوئی حسیں لے میں پکارے

اعجاز ہیں سب میری ہی تخئیل حسیں کا
جنت کے نظارے ہوں کہ دوزخ کے شرارے

یہ کون مری روح کی گہرائی میں جھوما
یہ کس نے مری بگڑے ہوئے حال سنوارے

کب تک نہ بہائیگا مرے حال پہ آنسو!
او میری محبت کے چمکتے ہوئے تارے!

برساتا ہوا پھول تبسم کے، نظر سے!
آ دل کے شوالے میں جوانی کو ابھارے

نجمہ، نہ گنہ گار کہیں مجھ کو بنا دیں،
یہ بہکی ہوئی رات، یہ ہنستے ہوئے تارے

(آنسہ) نجمہ تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

ڈرامہ:-

عربوں کے خیمے

کردار

بادشاہ ــــ شتربان (ایوب اور یعقوب) ــــ مصاحب ــــ حبشی ــــ عورت

پہلا سین

(تھلانا کی شہر پناہ کے باہر دو اشخاص معروفِ گفتگو ہیں)

یعقوب۔ شام ہونے تک ہم پھر صحرا میں ہونگے

ایوب۔ ہاں

یعقوب۔ پھر ہم مہینوں شہر کے پُرکیف نظاروں سے محروم رہیں گے۔

ایوب۔ آہ!

یعقوب۔ ہم اپنے اونٹوں پر سے مڑ کر شہر کی روشنی دیکھیں گے جو ہمیں الوداع کہہ رہی ہوگی۔

ایوب۔ صحرا کس قدر چالاکی سے اپنے کنوئیں چھپا لیتا ہے۔ تم کہو گے اسے انسان سے دشمنی ہے وہ شہروں کی طرح ہمارا خیر مقدم نہیں کرتا۔

یعقوب۔ صحرا کو دشمنی ضرور ہے۔ میں تو صحرا سے متنفر ہوں

ایوب۔ میرا خیال ہے دُنیا میں شہر سے بڑھکر کوئی چیز خوبصورت نہیں ہے۔

یعقوب۔ شہر واقعی دلفریب دلچسپ چیز ہے۔

ایوب۔ صبح کی چھاؤں میں شہر زیادہ خوشنما معلوم ہوتے ہیں وہ شب کو اپنا ملبوس اپنے جسم سے اُتار دیتے ہیں اور کسی کشادہ دریا میں اپنے عریاں حُسن کا عکس ڈالتے ہیں اُس وقت سورج کی کرنیں اُن کی پیشانی پر بوسہ دیتی ہیں۔ اور وہ ایک عروس کی طرح جاذبِ روح و دل ہو جاتے ہیں۔ کوچہ و بازار میں مرد و زن کی آواز میں جسم کی خاموشی کو چاک کرتی ہوئی آہستہ آہستہ بڑھتی ہیں اور تمام اطراف واکناف شہر میں پھیل جاتی ہیں، یہانتک کہ وہ سب ایک ہمہمہ شور و غل میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ میرے عالمِ خیال میں اس وقت شہر مجھ سے کہتا ہے "ایوب! ایوب!! تو کسی نہ کسی روز اس دُنیا سے کوچ کریگا تو عالمِ سفلی سے ہے اور میں اس عالم سے نہیں ہوں، میں ابدی ہوں، میری میعاد مقرر نہیں ہے"

یعقوب۔ مجھے اس سے اختلاف ہے کہ شہر صبح صادق میں زیادہ خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ صبح کی سحرکاریاں تو ہم صحرا میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ دن ڈھلنے پر زیادہ دلفریب معلوم ہوتے ہیں۔ شام کا دھندلاپن جسے نہ دن کہہ سکتے ہیں نہ رات۔ شہر کی تنگ گلیوں پر آہستہ آہستہ چھا جاتا ہے ایک دھوکا جس میں ہم ملبوس ہستیاں دیکھتے ہیں، تاہم پہچان نہیں سکتے جب تاریکی غالب آتی ہے تب وسعتِ صحرا میں سوائے تاریک اُفق اور سیاہ آسمان کے کچھ نظر نہیں آتا ٹھیک اُس وقت شہروں میں شمعیں روشن کی جاتی ہیں ہر دریچے سے روشنی نکلتی ہے اور پوشاکوں کے رنگ تبدیل ہو جاتے ہیں تب ایک عورت گھر کے چھوٹے دروازے سے نکل کر کوچوں میں ہوتی ہوئی غائب ہو جاتی ہے اور ایک مرد شاید کسی پُرانے جھگڑے کی خاطر ہاتھ میں خنجر لئے چپکے سے اپنی راہ لیتا ہے۔ مالکِ میخانہ شب بھر شراب بیچتا ہے۔ لوگ اُس کے شراب خانے کے باہر حقہ پینے میں معروف نظر آتے ہیں۔ سبز فانوس کی ہلکی ہلکی روشنی میں تاش کھیلتے ہیں۔ یہ سب نظارے کس قدر دلکش ہوتے ہیں۔ ان مناظر کے مقابلے میں میں یہ تصور کرتا ہوں کہ کہیں دُور صحرا کے سرے پر سُرخ بادل چھایا ہوا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ آندھی آئے گی۔

ایوب۔ جب ہم کسی شہر میں ٹھہرتا ہوں۔ اُس وقت آندھی کا خیال نہایت تکلیف دہ...

ہوتا ہے لیکن میں ابھی اسکا خیال بھی نہیں چاہتا کیونکہ شام ہونے سے پہلے ہم حاجیوں کو مکہ لے جا رہے ہونگے اور اس کی پیشین گوئی کون کر سکتا ہے کہ آگے کیا مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ صحرا میں جانا اپنی ہڈیاں کتوں کو دینا ہے ممکن ہے ہماری ہڈیاں صحرا کی نذر ہو جائیں۔ یا ہم بچ کر مکہ معظمہ پہنچ جائیں ادھر! کاش میں تاجر ہوتا اور کسی بازار میں ایک عارضی دُکان پر دن بھر خرید و فروخت کرتا رہتا۔

یعقوب۔ ہاں صحرا میں موت کو فریب دینے کے بجائے کسی امیر کو، جو ریشمی کپڑا یا زیور خریدنے آئے دغا دینا آسان ہے اے صحرا! میں شہروں کو چاہتا ہوں اور تجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

ایوب۔ (ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) وہ کون ہے؟

یعقوب۔ کیا؟ وہ!؟ وہاں!!!؟ جہاں اونٹ ہیں؟

ایوب۔ ہاں! ہاں، وہ کون ہے؟

یعقوب۔ وہ صحرا میں اونٹوں کو بغور دیکھ رہا ہے سکتے ہیں بادشاہ اکثر صحرا کی سرحد پر جا کر صحرا کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتا ہے، وہ وہاں دیر تک کھڑا رہتا ہے اور مکہ کی طرف نظریں دوڑاتا ہے۔

ایوب۔ بادشاہ کو مکہ کی طرف دیکھنے سے کیا فائدہ؟ وہ مکہ نہیں جا سکتا! وہ ایک دن بھی صحرا کی صعوبتوں کی تاب نہیں لا سکتا اور اگر وہ ایسا کرے گا تو لوگ اس کا پیچھا کرینگے، اُسے پکارینگے اور اُس کو مجلس شوریٰ میں یا دیوان عدالت میں واپس لے آئیں گے۔

یعقوب۔ نہیں بادشاہ صحرا میں نہیں جا سکتا۔ اگر خدا مجھے بادشاہ بنا دے تو میں ایک بار صحرا کے کنارے پر جا کر اپنی ڈاڑھی اور دستار میں سے ریت جھاڑ ڈالوں اور پھر کبھی اُس طرف کا رُخ نہ کروں۔ یہ ہزاروں شیطانوں کا لالچی بڈھا باپ چاہے تمام کنوئیں ریت سے بھر دے۔ سال در سال، صدی در صدی آندھیاں اور طوفان اُٹھائے تاہم یہ میری ایک بھی بد دعا کا شکار نہ ہوگا۔ خدا مجھے بادشاہ بنائے۔

ایوب۔ کہتے ہیں تم بالکل بادشاہ کے مشابہ ہو۔

یعقوب۔ بیشک میں بادشاہ کے مشابہ ہوں کیونکہ اُس کا باپ شتربان کے بھیس میں ہمارے گاؤں میں آیا کرتا تھا۔ میں اکثر اپنے دل میں کہتا ہوں کہ خدا انصاف پسند ہے۔ اگر میں بادشاہ کا بھیس بنا لوں اور اس کو شتربان بنا کر بھگا دوں تو یقیناً خدا خوش ہوگا کیونکہ وہ عادل ہے۔

ایوب۔ اگر تم ایسا کروگے تو خدا کہے گا، دیکھو! میں نے اس کو شتربان بنایا لیکن وہ شتربان ہونا بھول گیا، پھر خدا یعقوب کو بھی بھول جائیگا۔

یعقوب۔ یہ کون جانتا ہے کہ خدا کیا کہے گا۔

ایوب۔ کیا معلوم! اُس کی سزا تعجب خیز اور نامعلوم ہے۔

یعقوب۔ میں ہرگز ایسا نہ کروں گا۔ یہ خوش خیالیاں ــــــ جب میں حقہ پیتا ہوں یا صحرا میں ہوتا ہوں، تب کرتا ہوں اور کہتا ہوں "یعقوب فلاں کا بادشاہ ہے" پھر کہتا ہوں "حاجب ساقی کو شراب اور رنگین فانوس کے ساتھ حاضر کرو۔ تمام رعایا کو آنے دو، میرے محل کے سامنے شراب پینے دو اور میرا نام روشن کرنے دو"

حاجی (پکارتے ہوئے) یعقوب! یعقوب!! کُتے کے بچے کہاں ہے؟ آ اور اونٹوں کو کھول کر سفر کی تیاری کر۔

یعقوب۔ لعنت ہو صحرا پر

ایوب۔ اونٹ اُٹھ رہے ہیں قافلہ مکہ کے لئے روانہ ہوتا ہے، خدا حافظ اے خوبصورت شہر!

(حاجیوں کی آواز فاصلہ پر یعقوب! یعقوب)

یعقوب۔ آتا ہوں، اے شیطان زادو!

(یعقوب اور ایوب چلتے ہیں)

بادشاہ بڑے دروازے سے تاج پہن کر داخل ہوتا ہے اور زینے پر بیٹھ جاتا ہے

بادشاہ۔ تاج سر پر نہیں پہننا چاہئے بلکہ اسے زنجیر طلائی سے باندھ کر اُٹھانا چاہئے اور عصائے شاہی کو زمین میں گاڑ دینا چاہئے تاکہ بادشاہ کو اس سے پابہ زنجیر رکھا جائے اس وقت وہ غور کریگا کہ وہ خوشنما صحرا میں بھٹکنے کی آرزو نہ کرے اور کنوؤں کے قریب کھجور کے درختوں کا تصور نہ کرے۔ اے فلاناں! میں تجھ سے نفرت کرنے لگا ہوں، تیرے چھوٹے تنگ راستے۔ ہر شام کو نشہ میں

جو شتربانی اس بوڑھے سے فروش کے گھر میں بیٹھ کر جوا اور تاش کھیلتے ہیں۔ آہ!
میں کیوں نہ کسی ایسے گھرانے میں شادی کروں جس نے پشت ہا پشت سے شہر نہ دیکھا
ہو۔ ہم صحرا سے سواری کرتے ہوئے گذریں۔ صرف ہم دو۔ یہاں تک کہ ہم عربوں
کے خیموں میں پہنچ جائیں اور یہ تاج کسی لالچی کو اُس کی غم خواری کے لئے
دیدیا جائے۔

(ایک دروازے سے حاجب آتا ہے)

پادشاہ۔ حاجب! میرے لئے کوئی کام ہے؟

حاجب عالی جاہ بہت کام ہیں۔

پادشاہ۔ آج کی شام میں آزادی چاہتا تھا۔ کیونکہ قافلہ کو مغرب جا رہا ہے اور میں
اُس کو جاتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ شاید میں وہاں نہ جا سکوں۔

حاجب۔ عالی جاہ کے لئے بہت کام باقی ہیں۔ انترا میں شورش ہو گئی ہے

پادشاہ۔ انترا کہاں ہے؟

حاجب۔ یہ ایک پہاڑی ملک ہے جو عالی جاہ کو خراج دیتا ہے

پادشاہ۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میں تم سے رخصت لیکر چلا جاتا۔ میں پانچ سال سے تخت
شاہی پر سرفراز ہوں، اس عرصے میں میں اپنے وزراء کے مشورے سنتا
رہا لیکن ہر وقت صحرا مجھے اپنی طرف بلاتا رہا وہ مجھے ہر وقت آوازیں
دیتا رہا کہ میرے بچوں کے خیموں میں آ لیکن تم لوگوں نے مجھے رہائی نہ دی اور
حکومت۔ ثروت اور جاہ و جلال کی زنجیروں میں جکڑے رکھا۔

حاجب۔ اگر عالی جاہ، اگر ابھی ملک چھوڑ دیں تو ______

پادشاہ۔ میں نہیں جاؤں گا، ہم کو لشکر فراہم کر کے انترا والوں کو سزا دینی چاہیئے

حاجب۔ عالی جاہ افسروں کا تقرر فرمادیں۔

پادشاہ۔ سورج غروب ہونے کو ہے۔ ابتک قافلہ کوچ کیوں نہیں کرتا؟

حاجب۔ مجھے علم نہیں اعلیٰ حضرت.........

پادشاہ۔ (حاجب کے کندھوں پر ہاتھ رکھکر) دیکھو! دیکھو! یہ کیکر کیجانب
جاتے ہوئے اونٹوں کے سائے ہیں۔ کس قدر خاموشی سے زمین پر چل رہے
ہیں۔ خوبصورت سائے وہ بہت جلد سنہری صحرا میں نظر آئیں گے، پھر سورج
غروب ہو جائیگا اور پھر رات کی تاریکیوں میں مل جل کر ایک ہو جائیں گے۔

حاجب اگر عالی جاہ کو فرصت ہو تو ہمارے پاس اونٹ ہیں۔

پادشاہ۔ نہیں! نہیں۔ میں اونٹ دیکھنا نہیں چاہتا۔ وہ مجھے کبھی اس دلفریب
صحرا میں نہیں لے جائیں گے۔ مجھے یہاں حکومت کرنے کے لئے رہنا چاہیئے
صرف میرے خواب جا سکتے ہیں اور اونٹوں کے سائے اُن کو عربوں کے
خیموں تک لے جائیں گے۔

حاجب عالی جاہ! اب دربار میں تشریف لے چلیں۔

پادشاہ۔ ہاں، میں چلتا ہوں۔

(آواز ہایا۔ ہویا۔ ہویو۔ ہائے)

صد شکر کہ اب قافلہ چلا۔ باربرداری کے اونٹوں کے شتربانوں کو تو
دیکھو۔ آج وہ پہلے دس میل اُن کے پیچھے دوڑیں گے اور کل ان پر سوار
ہو جائیں گے پھر وہ تھلاتا کی نظروں سے غائب ہو جائیں گے۔ اُن کے چاروں طرف
صحرا ہوگا اور سورج اپنی مسکراتی ہوئی کرنیں اُن پر ڈال رہا ہوگا اور اُن کے
چہرے مسرت سے تمتماتے ہوئے معلوم ہونگے۔ رات کو جب صحرا اُن کے کان میں
کہتا ہوگا "میرے بچو آرام کرو" تو اُن کی روح کو کس قدر طمانیت اور تازگی
حاصل ہوتی ہوگی۔

(حاجب دروازہ کھولتا ہے اور سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

حاجب عالی جاہ! دربار میں تشریف لے چلیں۔

پادشاہ۔ ہاں آتا ہوں، اگر انترا کا واقعہ نہ ہوتا تو میں ایک سال کے لئے ضرور صحرا
میں جا کر رہتا اور کرمنظر کی زیارت کرتا۔

حاجب۔ اگر انترا کا واقعہ نہ ہوتا تو عالی جاہ ضرور تشریف لے جاتے؟

(لعنت ہو انترا پر (دروازے میں سے باہر جاتا ہے)

[ابھی بادشاہ اور حاجب دروازے ہی میں تھے کہ دوسرے
دروازے سے ایک مصاحب داخل ہوتا ہے]

مصاحب اعلیٰ حضرت!

پادشاہ۔ مغموم بادشاہ کے لئے کچھ اور کام؟

مصاحب انترا میں امن ہوگیا۔

پادشاہ۔ امن ہوگیا۔

مصاحب۔ جی حضور، بالکل یکایک، انتڑا کے چند لوگوں کی عالی جاہ کے سپاہیوں سے ڈبھیڑ ہوگئی اور قضارا ایک تیر سے شورش پسندوں کا سردار مارا گیا۔ چنانچہ سب فرار ہوگئے حالانکہ وہ زیادہ تعداد میں تھے۔

بادشاہ۔ اب تو میں مکہ معظمہ ضرور جاؤں گا اور عربوں کے خیمے بھی دیکھوں گا۔ میں اسی وقت صحرا کی سنہری ریت کو اپنے مشتاق اور خشک لبوں سے بوسہ دینے کے لئے سرگرم سفر ہوتا ہوں۔

حاجب۔ اعلیٰ حضرت!

بادشاہ۔ گھبراؤ نہیں چند سال میں واپس آجاؤں گا۔

حاجب۔ عالی جاہ! یہ نہیں ہوسکتا، ہم ایک سال سے زیادہ بارِ حکومت نہیں سنبھال سکتے۔ لوگ کہیں گے (خدا نہ کرے) بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔

بادشاہ۔ اچھا تو میں صرف ایک سال میں واپس آجاؤں گا۔

حاجب۔ عالی جاہ! یہ بہت لمبی مدت ہے۔

بادشاہ۔ آج سے پورے ایک سال کے بعد میں اسی وقت تم لوگوں کو اپنی دید سے شاد کام کروں گا۔

حاجب۔ لیکن عالی جاہ، تمھارا باسے شہزادی والا تبار تشریف لا رہی ہیں اور تین ماہ بعد یہاں آجائیں گی۔

بادشاہ۔ انھیں ایک سال اور ایک دن کے بعد یہاں آنے کی دعوت دو۔

حاجب۔ عالی جاہ!

بادشاہ۔ خدا حافظ، میں عجلت میں ہوں، میں صحرا میں جانے کے لئے بیتاب ہوں ؟ خوش قسمت لوگوں کی قدیم اور پیاری ماں" (بادشاہ یہ کہتا ہوا دروازے سے باہر جاتا ہے)

حاجب (مصاحب سے) اگر ہم دانشمند ہوتے تو اس دیوانے بادشاہ کو اس کی خبر نہ دیتے۔

مصاحب لیکن اس کی اطلاع کرنی ہی چاہئے تھی۔ اگر اطلاع نہ دی جاتی تو نہ معلوم کیا کیا دقتیں پیش آتیں۔

حاجب۔ مجھ تک یہ خبر صبح ہی پہنچ چکی تھی۔ وہ ... صحرا کی طرف چلا گیا ہوتا!

مصاحب۔ افسوس —— لیکن ہم اس کو واپس لاسکتے ہیں

حاجب۔ شاید ایک عرصہ تک تم ایسا نہ کرسکو۔

مصاحب۔ یہ بہت برا ہوا، مجھے افسوس ہے کہ میں نے یہ خبر کیوں دی۔ رعایا مفلوک الحال ہوجائے گی۔

حاجب۔ ہماری کوئی پروا نہ کریگا۔

مصاحب۔ پھر بھی تم تھلا با پر حکومت کروگے۔ تم تاجروں پر مالگذاری بڑھا سکتے ہو۔

حاجب۔ وہ صرف بادشاہ کو دیں گے۔

مصاحب۔ ہم واقعی مفلس ہوجائیں گے۔

حاجب۔ ہمیں کچھ بدمعاشوں سے مل جائیگا یا کسی متمول شخص کا جھگڑا چکانے میں کچھ حاصل ہوجائے گا لیکن بادشاہ جب تک واپس آئے اس سے زیادہ نہیں ملے گا۔ خدا اسے امن و امان میں رکھے۔

مصاحب۔ خدا اسے بہ حفاظت تمام یہاں لائے۔ کیا اب بھی اس کو روکنے کی کوشش کی جاسکتی ہے؟

حاجب۔ ہاں —— جب بادشاہ اپنے لشکر کے ساتھ رخصت ہوگا تو میں اس کے گھوڑے کے ساتھ چلوں گا اور کہونگا کہ صحرا میں جانے سے عربوں پر اس کے جاہ و جلال کا رعب پڑیگا اور خفیہ طور پر پیچھے کے رسالے کے کسی افسر سے کہدوں گا کہ تھوڑے ہی دنوں میں اونٹوں کی ٹولی چھوڑ دے اور بادشاہ کو صحرا میں بھٹکا دے اور اس بہانے تھلا با واپس لے آئے۔ ہم اس وقت تک یہیں اُنکا انتظار کریں گے۔

مصاحب۔ جب وہ رخصت ہونگے تو رات ہوجائیگی۔

حاجب۔ نہیں نہیں وہ بہت عجلت میں ہیں اور غروب سے پہلے ہی چلے جائیں گے۔

{ دروازے سے ایک شخص معمولی کپڑے پہنے منہ پر نقاب ڈالے تیزی سے نکلتا ہے۔ حاجب اور مصاحب اسے دیکھتے ہیں۔ }

حاجب۔ یہ کون ہے؟ دیکھو وہ سوار ہوا۔

مصاحب۔ کیا یہ بادشاہ ہوسکتا ہے؟

(آواز ہا ہا - ہو ہو)

حاجب۔ یہ کون شتربان ہے جو صحرا کی طرف جا رہا ہے

مصاحب۔ طوفان اسے نگل جائیگا

حاجب۔ اگر یہ بادشاہ ہوا تو ؟

مصاحب۔ اگر یہ بادشاہ ہوا تو ہم ایک سال بھوکے مریں گے۔

دوسرا سین

(مقام :۔ صحرا۔ باب تھلاما کے باہر)

(بادشاہ، شتربان کے لباس میں ایک جپسی عورت کے ساتھ بیٹھا ہے)

بادشاہ۔ اب میں نے صحرا نوردی کا لطف اٹھالیا اور عربوں کے خیمے میں بھی رہا۔

جپسی۔ دُنیا میں صحرا جیسی کوئی جگہ نہیں ؟ عربوں جیسی کوئی قوم نہیں

بادشاہ۔ سب کچھ ختم ہوا۔ اب مجھے اپنے دارالحکومت میں جانا پڑیگا۔

جپسی۔ وقت نہیں ٹل سکتا میں بھی صحرا کی طرف واپس جاتی ہوں۔ جہاں میں نے پرورش پائی ہے۔

بادشاہ۔ صحرا میں دن کتنے جلد ختم ہوتے ہیں جپسی ! اور صبح کیسی سہانی ہوتی ہے اس زمانے میں کبھی مجھے یہ خیال ہوا تھا کہ اپنا وعدہ پورا کرنے لئے مجھے پھر محل کی چار دیواری میں قید ہونا پڑیگا ؟

جپسی۔ مجھے معلوم تھا کہ وقت ایسا ہی کرے گا۔ کیونکہ میری قوم کے لوگ وقت گذار کے طریقے جانتے ہیں۔

بادشاہ۔ تو کیا وقت نے ہماری دعاؤں کو مضحکہ اڑایا ؟ کیا وہ بزرگتر ہے کہ ہماری دُعاؤں کی ہنسی اُڑاتا ہے ؟

جپسی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ خدا سے بڑا ہے۔ ہم نے دُعا مانگی کہ سال ختم نہ ہو خدا اسے ختم ہونے سے نہ روک سکا۔

بادشاہ ہاں، ہاں، ہم نے ایسی دُعا مانگی کہ اس پر سب لوگ ہنسیں گے۔

جپسی۔ دُعا مضحکہ خیز نہیں تھی لیکن وقت کا مالک ضدی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی ظالم اور بے رحم سلطان کے لئے درازیٔ عمر کی دُعا مانگے تو شاید سلطان کے غلام اس پر تعجب کریں اور یہ ہے بھی ٹھیک، لیکن زندگی کے لئے دُعا مانگنی مضحکہ خیز نہیں ہے۔

بادشاہ۔ ٹھیک ہم وقت کے غلام ہیں۔ شہزادی جو تھادربا سے آرہی ہے، کل آجائیگی، ہمیں وقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑیگا۔

جپسی میری قوم کہتی ہے، وقت صحرا میں رہتا ہے، وہ جلتے ہوئے سورج میں جلوہ فگن ہے۔

بادشاہ۔ نہیں نہیں صحرا میں نہیں۔ صحرا میں انقلاب نہیں آتا۔

جپسی میری قوم کا خیال ہے کہ صحرا اُس کا وطن ہے اور وہ اپنے وطن کو سزا نہیں دیتا لیکن وہ دُنیا کے دوسرے ملکوں کو تہ و بالا کر دیتا ہے

بادشاہ۔ بالکل ٹھیک ہے۔ صحرا ہر وقت ایک ہی حالت میں رہتا ہے۔

جپسی۔ کہتے ہیں وہ فنکس[1] کو چاہتا ہے وہ اُس کو ایذا نہیں دیتا۔ اُس نے وقت کے لئے بہت سے خدا تیار کئے ہیں اور بت پرست انھیں پوجتے ہیں۔

بادشاہ فنکس کا باپ سب جھوٹے خداؤں سے زیادہ خوفناک ہے۔

جپسی کاش ! وہ ہمارے چھوٹے سے ایک سال کو چھوڑ دیتا۔

بادشاہ۔ وہ ہر چیز کو بالکل برباد کر دیتا ہے۔

جپسی۔ لیکن ایک انسان کا بچہ اس سے بہت زیادہ طاقتور ہے جو دُنیا کو وقت کے پنجے سے بچا لیتا ہے۔

بادشاہ وقت سے زیادہ طاقتور کون سی چیز ہے ؟ کیا محبت اس سے زیادہ طاقتور ہے ؟

جپسی۔ نہیں محبت بھی نہیں ہے۔

بادشاہ اگر وہ عشق پر بھی غالب آجاتا ہے تو اُس سے زیادہ کوئی طاقتور نہیں ہے

جپسی وقت سفید بالوں اور شکنوں سے عشق کے نشانات مٹا دیتا ہے غریب عشق ! وقت اس کو بھی مٹا دیتا ہے۔

بادشاہ۔ تو کونسی چیز ہے جو وقت پر فتح حاصل کرتی ہے اور جو عشق سے زیادہ طاقتور ہے ؟

جپسی۔ کسی کی یاد۔

---

[1] ققنس

ایک فرضی پرندہ جو عہد سے صحرا میں [illegible] ہے [illegible] کے بعد پھر زندہ ہوگا

بادشاہ ۔ میں اس کو یاد کروں گا جب صحرا سے ہوا چلے گی اور جب تیز بارش میری ضدی دیواروں سے ٹکرائیں گی، میں اس کو یاد کروں گا جب میں صحرا کا تخیل بھی نہ کر سکوں گا اور ہوا کی سنسناہٹ نہ سن سکوں گا۔

جلیسی ۔ وقت کو ہمارا سال واپس لانا پڑیگا۔ وقت اسے برباد نہیں کر سکتا اگر یاد انکار کرے تو وقت کس حالت میں اسے برباد نہیں کر سکتا۔ اگر یاد تازہ ہے تو ہمارے سال کا ایک ایک دن اور ایک ایک لمحہ ہمارے سامنے رقص کریگا۔ پھر آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ پھر آ کر رقص کریگا تو وہ دور ہی دور رہیگا۔

بادشاہ ۔ یہ صحیح ہے وہ دن ہمارے پاس ضرور واپس آئیں گے میں خیال کرتا تھا کہ جو معجزے دکھانے والے ہیں چاہے وہ عرش پر ہوں یا فرش پر وہ بھی انکو واپس کرنے سے قاصر ہیں۔ میں سمجھا تھا کہ معجزے وہ دن واپس نہیں لا سکتے جو وقت کے غار میں گر جائیں

جلیسی ۔ یہ ایک معجزہ ہے جو صرف یاد سے ممکن ہے آہستہ خرابی کے ساتھ شہر اور صحرا میں آتا ہے اور وہاں لوگوں کے سامنے اپنے کرشمے دکھاتا ہے۔

بادشاہ ۔ ہم گزرے ہوئے دن ہر وقت یاد کریں گے۔

جلیسی ۔ وہ دن خوبصورت سنہری صحرا سے آئیں گے جن کے ذرے ریت لگی ہوئی ہوگی۔ ہر دن کے سر پر گذری ہوئی شام ہوگی۔ ان کے لبوں پر شام کی آنکھوں کا تبسم ہوگا۔

بادشاہ ۔ غالباً شام ہوگئی

جلیسی ۔ تو کیا ہم لوگوں کو جدا ہونا ہی پڑیگا۔

بادشاہ ۔ جلیسی شہر میں چل اور ملکہ بن، میں شہزادی کو تھار باد واپس بھیج دونگا تو تھلانا کی ملکہ کہلائے گی۔

جلیسی ۔ میں اب اپنی قوم میں واپس چلی جاؤں گی۔ تم شہزادی سے شادی کرنگے، یہ تمہارے الفاظ ہیں اور میں بھی یہ ہی چاہتی ہوں۔

بادشاہ ۔ کاش میں نے واپسی کا وعدہ نہ کیا ہوتا۔

جلیسی ۔ بادشاہ کی زبان بادشاہ کا تاج ہے، عصا ہے، تخت ہے۔

بادشاہ ۔ میں وعدہ خلافی نہیں کر سکتا لیکن تو تھلانا کی ملکہ ضرور بن سکتی ہے

جلیسی ۔ تھلانا کے لوگ ایک خانہ بدوش کو ملکہ کی حیثیت سے قبول نہیں کرینگے

بادشاہ ۔ میں انھیں مجبور کروں گا

جلیسی ۔ تمھیں ایک خانہ بدوش عورت سے شہر کی تنگ و تاریک فضا میں ایک سال بھی رہنے کی امید نہ رکھنی چاہئے۔

بادشاہ ۔ مجھے یاد ہے کہ شہر میں ایک خانہ بدوش عورت رہتی تھی۔

جلیسی ۔ وہ مجھ جیسی نہ ہوگی، عربوں کے خیموں کی طرف واپس چلو۔

بادشاہ ۔ میں نہیں چل سکتا، میں نے قول دیا ہے۔

جلیسی ۔ بادشاہوں نے قول توڑے ہیں۔

بادشاہ ۔ مجھ جیسے بادشاہ نے نہیں۔

جلیسی ۔ ہمارے پاس وہ چیز ہے جس کا نام یاد ہے جو ہمارے ماضی کو واپس لائیگی۔ آج کا دن تم وہی پہلا دن سمجھو جب ہم کنوئیں پر ملے تھے۔

بادشاہ ۔ آہ ہمیں پورا ایک سال بھی نہیں ملا میرا سال اس دن سے شروع ہوتا ہے جب میں اونٹ پر سوار ہو کر صحرا نوردی کے لئے روانہ ہوا تھا۔

جلیسی ۔ تم قافلے سے ذرا ہٹ کر مغرب کی جانب جا رہے تھے۔ تمہارا اونٹ جھوم رہا تھا اور تم تھک گئے تھے

بادشاہ ۔ تو کنوئیں پر پانی پینے آئی تھی۔ پہلے میں نے تیری آنکھیں دیکھیں اتنے میں آسمان پر تارے نظر آنے لگے اور اندھیرا ہو گیا میں نے صرف تیرا چہرہ ہی دیکھا تھا۔ تیرے بالوں میں کچھ جگنوؤں کی سی چمک تھی ممکن ہے ستاروں کی ہو میں اتنا جانتا ہوں کہ بال چمک رہے تھے۔

جلیسی ۔ اور پھر تم نے مجھ سے اونٹوں کے متعلق بات کی تھی۔

بادشاہ ۔ جب میں نے تجھے مخاطب کیا تو تو نے اپنی شیریں کلامی سے میرے دل کو موہ لیا، تیری باتیں ایسی دلکش تھیں جیسی تو اب کر رہی ہے۔

جلیسی ۔ بیشک نہیں تھیں۔

بادشاہ ۔ تیرا انداز گفتار یہ نہیں تھا۔

جلیسی ۔ ساعتیں کیسی رقص کرتی ہوئی چلی آ رہی ہیں۔

بادشاہ۔ بیعرب انکے محل میں بھر ہم رکھ گئے ہم سنہری صحرا میں خیموں میں رہے۔
ہم آزادوں کو اُن کی تمام آزادی کے ساتھ گاتے ہوئے سنتے تھے
ہم رات کی ہواؤں کی سنسناہٹ بھی سنتے تھے۔ یہ ہمارے سال کے محل میں
یاد اُن کے کوڑے مار رہی ہے اور وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ناچنے
سے انکار کر رہے ہیں۔

(جلیسی جواب نہیں دیتی)

ہم صحرا ہی میں ایکدوسرے کو خدا حافظ کہہ رہے ہیں جس کو شہر نہیں
سُنے گا

(جلیسی ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیتی ہے۔ بادشاہ آہستہ سے
اُٹھ کر چلا جاتا ہے۔ حاجب اور مصاحب ایک دوسرے کو
دیکھتے ہوئے اندر آتے ہیں)

حاجب۔ بادشاہ آئیگا اور ضرور آئیگا۔
مصاحب۔ لیکن سہ وقت دوپہر ہوچکی ہے ہماری فکر بڑھتی جارہی ہے اور دشمن
ہم پر ہنس رہے ہیں اگر وہ نہ آیا تو سمجھ لو کہ خدا ہم کو بھول گیا۔ ہمارے
دوست ہماری ہجو کیا کریں گے۔

(یعقوب اور ایوب اندر آتے ہیں)

حاجب۔ اگر وہ زندہ ہے تو ضرور آئیگا۔
مصاحب۔ مجھے خوف ہے کیونکہ دوپہر ہوچکی ہے۔
حاجب۔ تو یقیناً وہ مرگیا یا ڈاکوؤں کا شکار ہوگیا۔
ایوب (یعقوب سے) خدا انصاف پسند ہے۔
(حاجب اور مصاحب سے) میں بادشاہ ہوں

(بادشاہ کا ہاتھ دروازے پر تھا جب ایوب کو یہ کہتے سنا ہے تو
بادشاہ نیچے واپس چلا جاتا ہے اور جلیسی کے پاس بیٹھ جاتا ہے
وہ اپنے ہاتھ منہ پر سے ہٹاتی ہے اور غور سے دیکھتی ہے بادشاہ
حاجب، ایوب اور مصاحب کو غور سے دیکھتا ہے اور اپنا منہ رومال
سے چھپا لیتا ہے۔

حاجب کیا واقعی تم بادشاہ ہو؟

ایوب۔ میں بادشاہ ہوں۔
حاجب عالی جاہ! آپ ایک سال میں بہت تبدیل ہوگئے۔
ایوب۔ لوگ صحرا میں بہت زیادہ بدل جاتے ہیں۔
یعقوب واقعی یہ بادشاہ ہیں۔ جب بادشاہ بھیس بدل کر صحرا میں پھرا کرتے تھے
تب میں اُن کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ یہ بادشاہ ہی ہیں۔
مصاحب یہ بادشاہ ہیں؟ جب میں بادشاہ کو دیکھتا ہوں تو فوراً پہچان لیتا
ہوں۔
حاجب۔ (بادشاہ سے) عالی جاہ اگر آپ کو آپ کے ساتھی کے سوا کوئی اور
پہچان لے تو ہمیں تسکین ہوجائیگی۔
ایوب۔ اس کی ضرورت نہیں۔
(حقیقی بادشاہ اُٹھتا ہے اور ہاتھ اونچے کرتے ہوئے کہتا ہے)
بادشاہ۔ مکہ معظمہ سے ہم جانتے ہیں کہ یہ بادشاہ ہیں۔
ایوب۔ ہاں صحیح ہے میں نے اس شخص کو مکہ میں دیکھا تھا۔
حاجب۔ (جھکتے ہوئے) جاں بخشی کیجئے عالی جاہ! صحرا نے آپ کے حلیہ
میں بہت تبدیلی کردی ہے۔
مصاحب۔ میں عالی جاہ کو پہچانتا ہوں۔
یعقوب۔ میں بھی
ایوب۔ (بادشاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس شخص کو کافی انعام
دیا جائے۔ اس کو محل میں کوئی ملازمت دیدی جائے۔
حا[جب] بہت بہتر عالی جاہ۔
بادشاہ۔ میں شتربان ہوں اور اب اونٹوں کے پاس واپس جارہا ہوں۔
حاجب۔ جیسی تمہاری مرضی۔
(حاجب، مصاحب، ایوب، یعقوب سب باہر جاتے ہیں)
جلیسی۔ تم نے دانشمندی کی، دانشمندی۔ اور دانشمندی کا انعام سکھ ہے۔
بادشاہ اُن کو ان کا بادشاہ مل گیا۔ اب ہم واپس صحرا میں چلیں گے۔
جلیسی۔ وہ لوگ احمق ہیں۔
بادشاہ۔ اور اُن کو بادشاہ بھی احمق ملا ہے۔

جپسی۔ وہ بے وقوف ہے جو چار دیواری میں رہنا چاہتا ہے۔

بادشاہ۔ بعض لوگ بادشاہ پیدا ہوتے ہیں لیکن اُس شخص نے تو بادشاہ ہونا پسند کیا۔

جپسی۔ آؤ چلیں۔ اُن کو چھوڑو

بادشاہ۔ ہم واپس جائیں گے

جپسی۔ میری قوم میں واپس چلو

بادشاہ۔ ہم ذرا دُور اپنے بھورے خیمے بن میں گے۔

جپسی۔ ہم ہوا کو ریت سے سرگوشیاں کرتے ہوئے سنیں گے

بادشاہ۔ ہم خانہ بدوشوں کو اُن کے خیموں میں سے چلتے پھرتے دیکھیں گے۔

جپسی۔ ہم نیم جوانی کے عالم میں لومڑیوں کو پاس سے گذرتے ہوئے سنیں گے۔

بادشاہ۔ جب شام ہوگی تو ہم گذرتے ہوئے دن کا افسوس نہ کریں گے۔

جپسی۔ میں اپنا سیاہ بالوں کا سر آسمان کی طرف اٹھاؤں گی۔ قدیم اصول ستارے میرے بالوں میں سے چمکتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اور مجھے کسی شہزادی پر رشک نہ آئے گا

مترجمہ

سید ظہیر الدین مدنی ایم۔اے

روحِ سخن

قمر نعمانی سہسرامی

شبِ فراق تصور میں مسکرا نہ سکے
مرے خیال کی دُنیا وہ جگمگا نہ سکے

نہ ہوگا کوئی زمانہ میں غم نصیب ایسا
خوشی ہوئی بھی تو ہم کھل کے مسکرا نہ سکے

رہِ طلب میں خود اپنے کو بارہا کھویا
مگر وہ پہلی نظر آپ کی بھلا نہ سکے

رہا نہ اُنس کوئی پھر ہمیں زمانے سے
ترے خیال کو ہمدرد جب بنا نہ سکے

تمہارا حُسن ہی کر دیگا فیصلہ اس کا
نظر ہٹائی نہیں ہم نے یا ہٹا نہ سکے

نسیم بن کے وہ چھائے فضائے گلشن پر
قبائے گُل میں بھی اپنے کو جب چھپا نہ سکے

سنائے ہم نے جہاں کو ہزارہا نغمے
مگر جو روحِ سخن تھی زباں پہ لا نہ سکے

قمر یہ بات ہی شاید خلافِ فطرت تھی
زمانہ ساز طبیعت جو ہم بنا نہ سکے

جذباتِ ظہیر

سید ظہیر الدین حیدر

شیوہ نامہربانی اور ہے
اُن کو اب کچھ بدگمانی اور ہے

سادگیٔ حُسن و دزدیدہ نظر
یہ ادائے دلستانی اور ہے

یوں تو روتے ہیں لہو سب اہلِ غم
میری خونابہ فشانی اور ہے

چشمِ ساقی کی طرف بھی اک نگاہ
یہ شرابِ ارغوانی اور ہے

لوگ کچھ کہتے ہیں حالِ شامِ غم
شمعِ کشتہ کی زبانی اور ہے

خود نہیں ہیں واقفِ اسرارِ موت
رازدارِ زندگانی اور ہے

شمعِ محفل بجھ چکی لیکن ظہیر
میری دردافزا کہانی اور ہے

طوفانِ بہار

جب کبھی حدِ خودی سے ماورا جاتا ہوں میں
مسکرا کر قلبِ فطرت میں سما جاتا ہوں میں

قلزمِ افکار میں ڈوبا چلا جاتا ہوں میں
خار و خس کی طرح موجوں میں بہا جاتا ہوں میں

جب تموّج آفریں ہوتا ہے طوفانِ بہار
ذرّے ذرّے پر جوانی بن کے چھا جاتا ہوں میں

دیکھئے رکتی کہاں ہے کشتیٔ عمرِ رواں
موجزن طوفانِ ہستی ہے بہا جاتا ہوں میں

ہو رہا ہے کس طرح طے جادۂ ہستی یہ دیکھ
ہر قدم پر منزلوں آگے بڑھا جاتا ہوں میں

وہ کسی عنوان سے ہو، وہ کسی صورت سے ہو
بھولنے والے کو اکثر یاد آجاتا ہوں میں

جب نہیں ملتیں زمانے میں کہیں گنجائشیں
تیری آغوشِ تصور میں سما جاتا ہوں میں

تو وہاں محوِ خوشی ہے اور یہاں تیرے بغیر
زندگی اک آگ ہے جس میں جلا جاتا ہوں میں

اللہ اللہ لذتِ مرگِ محبت اے شفق
زندگی میں موت پر قرباں ہوا جاتا ہوں میں

(صاحبزادہ) شفق ٹونکی

سیم و زر

اچھا ہوا وہ شیوۂ ذوقِ نظر گیا
اچھا ہوا وہ نشۂ ہستی اتر گیا

اچھا ہوا خیال کی رعنائیاں گئیں
اچھا ہوا وہ عالمِ رنگیں گذر گیا

اچھا ہوا وہ رات کی بیداریاں گئیں
اچھا ہوا وہ ضبطِ تمنائے سحر گیا

وہ ولولے کہاں دلِ دیوانہ کو کہاں
طوفانِ ابر و بادِ تمنا آیا، گذر گیا

محوِ تخیلات تھی جو زندگی کبھی
سودا زدہ تھا جو دلِ شوریدہ سر گیا

فکرِ سخن میں پہلی سی اب محویت کہاں
شیرازۂ خیال و تصور بکھر گیا

ہر وقت ایک فکر تھی ہر وقت اک خیال
اچھا ہوا وہ سلسلۂ دردِ سر گیا

شعر و ادب کی ہو گئیں خاموش محفلیں
پر کیف وہ نظارۂ شام و سحر گیا

اب مطمئن ہوئے مری دنیا بگاڑ کر
اب ڈھونڈتے پھرو، وہ زمانہ کدھر گیا؟

اب سیم و زر سے کھیل رہا ہوں میں اے ضیا
شعر و ادب کا دور کبھی کا گذر گیا

محمد صادق ضیا بی۔اے، ایل ایل بی
(از کلکتہ)

ذاکر بی۔اے۔بی۔ٹی پر

(چاروں طرف سے)

جناب ذاکر نے اپنے استادِ محترم حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی کی نظم "موحدِ اعظم" پر بے محل اعتراض کر کے ملک کے صائب الرائے طبقہ کو خود موقع دیا ہے کہ وہ اُن کے برادر رکھے دل سے رائے زنی کریں۔ ذاکر صاحب کے خط کی اشاعت میں مصلحت کی گئی تھی کہ اُن کی طرح وہ لوگ بھی جن کے دل میں "موحدِ اعظم" کی اشاعت ہو کر کچھ شبہات پیدا ہو گئے ہوں اپنی تسکین فرمالیں۔ مقامِ حیرت ہے کہ بجز ایک "گوالیاری" صاحب کے کسی نے ذاکر صاحب کی تائید نہیں کی۔ ذیل میں جو خطوط چھاپے جا رہے ہیں تقریباً دو سو خطوط میں سے چند ہیں۔ یہ خطوط اپنوں کے بھی ہیں اور غیروں کے بھی۔ ان کی اشاعت کا مقصد صرف ذاکر صاحب کی غلط فہمی دور کرنا ہے اور کچھ نہیں۔ خدا اُنھیں نیک ہدایت دے۔ —— **اعجاز صدیقی**

(۱) بی۔اے۔بی۔ٹی صاحب نے جو بدتمیزی کا مضمون لکھا، اُس پر افسوس ہوا۔ استاد کا رتبہ وہ نہیں سمجھتے۔ بیری کمبختی تعلیم ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ اُستاد ہیں اور اُستاد رہیں گے۔ میں شاگرد ہوں اور اس پر فخر کرتا رہوں گا۔

(مولانا) حاجی ضیاءُ الاسلام ضیا کاندھلوی

(۲) ذاکر صاحب کی کم ظرفی اور سطحی ذہنیت پر ہنسی بھی آتی اور غصہ بھی۔ خدا نے کیسے کیسے آدمی پیدا کئے ہیں۔

(مولوی) رفیع احمد عبا متھراوی

(۳) ذاکر صاحب کا خط نہ قابلِ اشاعت تھا نہ قابلِ جواب۔ معلوم نہیں حضرت مولانا مدظلہٗ نے اُس کو کیوں قابلِ خطاب سمجھا۔ ایسے جاہلوں اور نادانوں کی طرف توجہ ہی نہ کرنی چاہئے۔ "فصوص الحکم" میں شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ شیطان کے متعلق لکھا ہے، مولانا کی نظم کا وہی منشا ہے مگر جہلا کو اس کی کیا خبر ہے؟

(مولانا) محمد اسحاق آلم مظفر نگری

(۴)

کسی سے مجھ کو عقیدت ہے غائبانہ تمر
یہ اور بات ہے حاصل اگر نیاز نہیں

قبلہ محترم علامہ سیماب صاحب آدابِ نیاز!

آپ کی نظم "موحدِ اعظم" نظر سے گذری۔ پڑھ کر دل پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوگئی۔ جو ہنوز قائم ہے۔ "موحدِ اعظم" عزازیل کی زندگی کا صحیح مرقع اور انسانوں کے لئے درسِ عبرت ہے۔

ذاکر صاحب کا خط پڑھ کر اُن کی کم علمی پر رونا آیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ آپ کا جواب پڑھ کر خوشی حاصل ہوئی جواب کیا ہے "موحدِ اعظم" کی اچھی خاصی تشریح ہے۔ جو نوآموز شعرا کے لئے بہترین سرمایہ ہے۔

عباس انصاری دہولیوی

(۵) اب کے "شاعر" میں "موحدِ اعظم" پر ذاکر صاحب کا خط پڑھا۔ اعتراض کرنا آسان ہے مگر سمجھنا مشکل۔ اس میں معلومات اور قابلیت کی ضرورت ہے۔

(نواب زادہ) کنور مشکور حسین خاں قیس (رئیس ہنڈوہ)

(۶) جناب ذاکر صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی نے جو تردید کہ علامہ (سیماب) کی مایۂ ناز نظم "موحدِ اعظم" پر کی ہے جنابِ موصوف نے اپنی پوچ دماغی اور گندہ ذہنی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

آثر انصاری دہولیوی

(۷) ذاکر کی حماقت پر بے اختیار ہنسی آتی۔ اللہ اللہ ایسے ایسے ناخلف ناہنجار لوگ بھی مادرِ گیتی نے پیدا کئے ہیں۔ جو لوگ اپنے اُستاد کی عقیدت و منزلت کے مدارج سے ناآشنا ہیں، وہ کلام کو خاک سمجھیں گے۔

سید دل محمد فضا جالندھری (منشی فاضل ادیب فاضل)

(۸) رسالہ "شاعر" میں ایک خط اور اُس کا جواب میری نظر سے گذرا۔ جو شخص اپنے استاد کا فرماں بردار نہیں وہ اپنے ماں باپ اور خدا کا بھی فرماں بردار نہیں ہو سکتا۔ ایسا شخص دین و دنیا میں ذلیل و خوار رہیگا۔ شاعری صرف انگریزی زبان کی ڈگری حاصل کر لینے سے نہیں آتی۔ بلکہ استاد کی صحیح خدمت اور ادبی کتب کے وسیع مطالعہ سے آتی ہے۔ جس شخص نے آپ کے کلام کو اچھی طرح نہ سمجھ کر اعتراض کیا ہے خدا اُس کا

---

[1] مولوی عبا کو بھی اس نظم سے اختلاف ہے مگر اُن کا اختلاف خلوصِ عقیدت پر مبنی ہے۔

..... کریگا۔ اور وہ دُنیا میں نامراد اور دین میں ذلیل ہوگا۔ ایسے شخص کو آپ کی شاگردی میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو اس غدار کو اپنی شاگردی سے خارج کر دیا جس سے دوسروں کو بھی سبق حاصل ہوتا ہے۔

خلیل کولاری (میسور)

(۹) اس ماہ کا "شاعر" ملا دو باتوں کو دیکھکر بڑی تکلیف ہوئی۔ ایک آپ کی اہلیہ محترمہ کی علالت دوسری جناب ذاکر کی کج فہمی و تنگ نظری۔ امید ہے کہ محترمہ کو اب صحت ہوگئی ہوگی۔ رہی ذاکر صاحب کی ایچ۔ اس کے بارہ میں حضرت مولانا مدظلہ اپنے جواب میں بہت کافی ارشاد فرما چکے ہیں۔ مجھے صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ مولانا مدظلہ نے ذاکر صاحب کے مکتوب سے اخلاقی پہلو کو اپنے جواب میں نظرانداز کر دیا ہے۔ اگر آپ نے اجازت دی تو میں مکتوب آئندہ میں اپنے خیالات پیش کروں گا۔ اس وقت مختصراً صرف اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ ذاکر صاحب صرف سطحی معلومات کے آدمی نہیں بلکہ اُن کی اخلاقی حیثیت بھی نہایت پست ہے۔

جمیل مہوبا روی (بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی)

(۱۰) "موحد اعظم" حضرت قبلہ سیماب صاحب کی نظم "ادبیات مشرق" میں بلند ترین مرتبہ پا سکی اور پا چکی ہے۔ آج اگر دنیا میں غیر متعصب ہستی کی جوتی تو ایک طوفان برپا کر دیتی اور لوگ اس کو سر پر اٹھا کر پھرتے و منہ تاں میں جا دیتے۔ افسوس کی حقیقت ہو مشرق کے "ما ہے آئینہ" کچھ نہیں لیکن چونکہ دولوں میں صرف عظمت تمام کرتی ہے اخلاف و بیان کی قریب کار۔ ہاں اس کو ہونہیں رکھتیں۔ ادبیات مشرقیہ میں موحد سمرت جگہ پیدا کر سکے گی۔ ایک بلند شیڈیل جو اس نظم کی مدت و دنوں ہے تنگ نظر مذاہب بھی خراج حاصل کریگا میرا خیال نہیں بلکہ پورا یقین ہے کہ ذاکر صاحب پہلے سے خوب سمجھتے تھے اور "خوے بد را بہانۂ بسیار" ابل پڑے ———— جلوخس کم جہاں پاک ——— یہی نہ کہنا چاہتے!

شمیم نعمانی از جبلپور

(۱۱) ذاکر صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی نے علامہ سیماب اکبرآبادی کی معرکۃ الآرا نظم "موحد اعظم" پر جو تخیلی شاعری کا ایک بیش بہا کارنامہ ہے جو اعتراض کیا ہے وہ در اصل اس قابل نہیں ہے کہ اس کا جواب دیا جائے۔ پھر بھی علامہ موصوف نے غلط فہمی دور کرنے کے خیال سے جبراً بیحد اختصار سے ان تمام لچر اور بے معنی اعتراضات کا جواب دیا ہے

اس کے بعد کسی مزید نقد و تبصرہ کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ نظم مذکور کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پہونچایا جائے اور علم و ادب سے صحیح ذوق رکھنے والوں کی رائے عامہ سے استصواب کیا جائے۔ یہی ذاکر صاحب کا بہترین جواب ہوگا۔ کاش وہ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی نہ ہوتے اور اعتراض کر کے اپنی علمی بے بضاعتی اور شاعرانہ وجدان کے فقدان کا بدترین نمونہ نہ پیش کرتے۔

حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی نے نظم زیر بحث میں جو اعلیٰ تخیل اور آرٹ کا بہترین نمونہ ہے ان رازہائے سربستہ کو نمایاں کیا ہے جو مولانا جیسا بلند پایہ شاعر ہی کر سکتا ہے۔ یوں تو دنیائے شاعری میں علامہ موصوف کا جو مرتبہ ہے وہ کسی سے چھپا نہیں ہے لیکن میں تو یہاں تک کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اگر مولانا کا تمام کلام ضائع ہو جائے اور صرف یہی ایک نظم باقی رہے تب بھی موصوف کا دُنیا کے بلند ترین شاعروں میں شمار ہوگا۔ جبتک دُنیا میں سخن سنج اور شعر و شاعری سے صحیح ذوق رکھنے والا ایک متنفس بھی باقی رہیگا مولانا زندہ رہیں گے اور اُن کی نظم باقی رہے گی

اس نظم کا شمار ان نظموں میں ہوتا ہے جنکے متعلق غالبؔ مرحوم نے فرمایا ہے کہ

خارِ چشمِ ساقی نیز پیوست۔ اور اگر وہ آج زندہ ہوتے تو یقیناً اسے اپنے سارے دیوان کے عوض خریدنے پر تیار ہو جاتے۔ اس میں وہ کیفیت ہے جو انسان صرف محسوس کر سکتا ہے بیان نہیں کر سکتا۔ شبلی نے ایک دفعہ کہا تھا کہ تخیل ہی شاعری ہے۔ "موحد اعظم" اعلیٰ تخیل کا بہترین نمونہ ہے۔ جس کو مولانا نے بالکل جُدا اور انوکھے انداز میں رقم فرمایا ہے۔ اگر مولانا کے کسی شاگرد کو اس نظم کا مغربی زبانوں میں ترجمہ کرنے کی توفیق ہو تو میں یہ عرض کرتا ہوں کہ یورپ میں صاحبانِ ذوق اس کو اس پسندیدگی اور قدر کی نظر سے دیکھیں گے جو آج تک کسی ہندوستانی شاعر کی نہ ہوئی ہو۔ میں اپنے انگریزی ادب کے محدود مطالعہ کے تحت جو کسی طرح ذاکر صاحب کے مطالعہ سے کم نہیں ہے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ "موحد اعظم" نے ورجل سے لیکر ملٹن تک مغربی شعرا کی اس موضوع کی تمام نظموں کو پست یا انگریزی محاورہ کے مطابق (THIRD- RATE) کر دیا ہے۔ مولانا نے ملٹن کی طرح بالکل روایات ہی پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ آپ کی نظر میں اصل و حقیقت پر تھیں جن کو موصوف نے تخیل کی ہلکی ہلکی رنگ آمیزی سے ایک ناقابلِ فراموش اور نہ مٹنے والا ادبی کارنامہ بنا دیا۔

معترض نے جو مولانا کے شاگرد بھی ہیں اس شعر کے مطابق کہ ؎

کس نیاموخت علم تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

ان کو کوئی دکھ نہیں پہونچا کیونکہ زمانہ اکثر ایسی مثالیں پیش کرتا رہا ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے لیکن افسوس اس کا ہے کہ انھوں نے اپنا بھرم خود کھولدیا۔ جو شخص باوجود قدیم شاگرد رہنے کے شاعری کے ابتدائی رموز سے بھی ناواقف ہو اُسے اپنے حلقۂ شاگردی میں رکھنے سے مولانا کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی بقول خود ان کی زبردست توہین ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اعتراضات کرکے تنگ نظری اور کوتاہ فہمی کا جو ثبوت پیش کیا ہے وہ اُن کے لئے نہایت شرمناک ہے۔ وہ بقول مولانا کبھی شاعر نہیں ہوسکتے مولانا اپنی شاعرانہ عظمتوں کے ساتھ ہندوستان کے آسمان ادب پر آفتاب و ماہتاب کی طرح ہمیشہ درخشندہ رہیں گے۔ ناسمجھ ناقدین اسی طرح اعتراض کرتے رہیں گے جو مولانا کے کلام کے مقبول عام ہونے کا بالواسطہ سبب بن جائیگا۔ غالباً علامہ اقبال مرحوم نے ایسے ہی ناسمجھ اور تنگ نظر معترضین سے متاثر ہوکر فرمایا تھا۔ ؎

یوں دادِ سخن مجھ کو دیتے ہیں عراق و پارس
یہ کافرِ ہندی ہے بے تیغ و سناں خونریز

وجدی الہ آبادی

(۱۲) "شاعر" اگست ۱۹۴۱ء کے صفحہ ۴۲ کا مضمون دیکھا بہت افسوس ہوا۔ مولانا سیماب صاحب نے جو کچھ لکھا ہے درست لکھا ہے۔ اعتراض کرنے والے صاحب نے غصے میں غور سے کام نہیں لیا۔ خیر مولانا نے جو کچھ لکھا وہ لکھا لیکن اس سے زیادہ سنئے حضرت سرمدؒ فرماتے ہیں ؎

رو شیوۂ بندگی ز شیطان آموز
یک قبلہ گزین و سجدۂ غیر مکن

آجکل مضمون نگار حضرات بے سوچے سمجھے جو دل میں آیا لکھ مارتے ہیں "نیرنگِ خیال" اگست ۱۹۴۱ء کے صفحہ ۴۲ میں فارسی کے ایک قدیم شعر کو اقبال کا شعر لکھدیا ہے۔ حالانکہ یہ شعر ملا ناجامی دہلوی کا ہے ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک پرتوِ صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

فرق اتنا ہے کہ پرتو کی جگہ جلوہ اور در کی جگہ وا لکھدیا ہے۔ حالانکہ اس ترمیم سے وہ زور باقی نہیں رہتا۔ غرض آجکل اسی قسم کی بدعنوانیاں ہورہی ہیں یہ وسعتِ معلومات ہے۔

(مولانا) درد کاکوروی

(۱۳) آپ کی نظم "موحد اعظم" ماہنامہ "شاعر" میں دیکھی۔ اس نظم نے جو اضافہ میری عقیدت میں کیا ضبطِ تحریر سے باہر ہے۔

میں نے مظاہر العلوم سہارنپور (یو۔ پی) میں عربی کی تعلیم حاصل کی ہے۔ ایک عرصہ تک اُن علمائے کرام کی خدمات کا فخر حاصل رہا ہے جو فی الحقیقت عاملین سنت نبویہ ہیں۔ کسی نوعیت سے یہ نظم قابلِ اعتراض نہیں۔ ہاں اگر کسی معوج الذہن، کج فہم کی سمجھ میں نہ آسکے تو یہ اُس کے فہم کا قصور ہے۔ ذالک مبلغہ من العلم

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

(مولانا) جالب مہلامی

(۱۴) اُستاذی قبلہ کے ایک نالائق شاگرد کا خط رسالہ "شاعر" میں دیکھ کر افسوس ہوا۔ بدبخت دُنیا نافہموں سے بھری ہوئی ہے۔ علی الخصوص مذہبی بصیرت کا ہندوستان کیا سارے عالم میں ماتم ہے۔ جس بدتمیز کو اتنی بھی تمیز نہیں کہ اپنے استاد سے کس قسم کے الفاظ میں گفتگو کی جاتی ہے۔ حیف ایسے کم نصیبوں پر عقیدتمندانہ جذبے کے بغیر اُستادی شاگردی ناممکن ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بقول استاذی قبلہ وہ شخص کبھی بحیثیت شاعر سر بلند نہیں ہو سکتا۔

سید عبدالغنی تنویر از کولار

(۱۵) اگست نمبر میں وہ مباحثہ دیکھا جو جناب سیماب کی ایک نظم سے متعلق اُن کے شاگرد سے ہے۔ حیرت ہے کہ آپ نے یا جناب سیماب نے انھیں منہ ہی کیوں لگایا وہ قابلِ اعتنا ہی کب تھا یہی وہ خرابیاں ہیں جو چھوٹوں کے مشہور ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

. . . .

. . . .

. . . .

عطاء اللہ پالوی

(۱۶) برادرم جناب اعجاز صدیقی صاحب ادام الطافکم

تسلیم۔ اگست کا شاعر ملا۔ ذاکر صاحب کی کم نظری و تنگ خیالی اور مولانائے محترم کی شان میں سوءِ ادبی دیکھکر سخت رنج ہوا۔ شاگرد اور استاد کے تعلقات سے قطع نظر محض ایک معمولی انسان کی حیثیت سے بھی اُن کا یہ فعل سخت دل آزاری کا باعث ہے، کاش وہ پہلے اس خصوص میں علامہ سے استفسار کر لیتے اور علامہ کے نقطۂ نظر کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔

اس نظم کے لکھنے سے علامہ کا ہرگز یہ منشا نہیں تھا کہ (نعوذ باللہ) انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقابلے میں شیطانِ رجیم کی افضلیت تسلیم کرائی جائے۔ میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں حاصلِ نظم یہ ہے کہ شیطان جیسی گمراہ و بدنام ہستی میں بھی اللہ جل شانہ کے ساتھ کم از کم محبت خالص کی جھلک تو پائی جاتی ہے اور اس جذبۂ محبت میں وہ اسقدر پابندِ وضع ہے کہ مردودِ بارگاہِ الٰہی اور بدنامِ خلائق ہوا لیکن اپنے اور اللہ کے درمیان کسی دوسرے کی شرکت کو گوارا نہ کرسکا۔ برخلاف اس کے اس پاکار موحد انسان کی فطرت کا جائزہ لیجئے جو بظاہر خدا کی بندگی اور محبت کا دعوےٰ کرتا ہے لیکن اس کے کسی عمل میں خلوص ہے اور نہ استواری۔ اور اس طرح علامہ اس نظم (موحدِ اعظم) کے ذریعے نوعِ انسان کو درس دیتے ہیں کہ وہ اپنی ذات کے شایانِ شان کام کرے اور بس شاعر کی یہی تو خوبی ہے کہ اُس کا حساس دل بُری سے بُری چیز سے بھی درسِ پیغام حاصل کرتا ہے اور اس کو موثر و دل نشین پیرایہ میں قوم کے آگے پیش کر دیتا ہے۔ اُس کے علاوہ اس نظم کے متعلق اور کچھ سمجھنا جناب ذاکر صاحب کے عامیانہ ذہن و خیال کا نتیجہ ہے۔

علامہ مدظلہ نے اپنی ساری خداداد شاعرانہ قوتوں کے ساتھ جس اچھوتے پن سے اس پیغام کو نظم کیا ہے۔ اس کو ایک حقیقی شاعر ہی سمجھ سکتا ہے۔

علامہ کی اس نظم کے متعلق ذاکر صاحب کا جو یہ خیال ہے تو غالب مرحوم کے اس شعر کی نسبت کیا ارشاد ہوتا ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

مرزا عالمپوری

(۱۷) فدائے سخن

حضرتِ مولانا صاحب السلام علیکم

مدت کے بعد حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں اُمید کہ حسبِ عادت حسب نوازش معاف کیا جاؤنگا کیونکہ دھندہ ہائے دنیا سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ جریدہ شاعر بابت ماہ اگست زیرِ مطالعہ ہے۔ ذاکر نانڈوری کا خط بے نمط نظر سے گزرا، آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ایک لاجواب جاہل کے جواب کی زحمت گوارا فرمائی ورنہ جواب جاہلاں باشد خموشی، ستم تو یہ ہو کہ آپ کسی کو سرتاش کے ابو جہلوں کے متعلق لب کشائی کی اجازت نہیں دیتے۔ خیر اب تو ماشاء اللہ ذاکر صاحب دنیائے شاعری کو سکھلت فرما رہے ہیں اگر ماتم کی تو اجازت دیجئے ابھی ذاکر صاحب سنئے اور سر دھنئے ؎

این سرکشی نفس ہم از روئے دادوریست
طوفاں ہمی کہ تابع عمّان نمی شود

(مولوی) سلیمان

مشاعرۂ شاعر

مصرعِ طرح :- "بن سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن"

(بہ ترتیب تعدادِ اشعار)

حضرت مولانا شفق عمادپوری مینائی

جسکی ہو تخریب بھی تعمیر وہ کاشانہ بن — کعبۂ دل ٹوٹکر بنتا ہے تو بتخانہ بن
قید کیا دیر و حرم کی روشنی سے کہ غرض — شمع روشن ہو کہیں تو شمع کا پروانہ بن
ہوش میں آلطف ہشیاری کا مدہوشی میں ہے — عقل کا سودائی کیوں ہے عشق کا دیوانہ بن
خم بھری خالی کئے جا ظرف عالی ہے ترا — شیشۂ مے کا دہن ہو جا لبِ پیمانہ بن
کاسۂ مے تیری آب و رنگ سے بنجائینگے خود — خادمِ پیرِ مغاں خاکِ درِ میخانہ بن
سوز تیری ساز میں ہو سوز میں تیرے گداز — نغمۂ تحسینِ مطرب۔ نعرۂ مستانہ بن
سلسلۂ شیخ و برہمن سے ملانے کے لئے — رشتۂ زنار و تارِ سبحہ صد دانہ بن
بجلیاں بنجوے خاکستر سے پیدا ہوں شرر — کر طواف شمع ایمن طور کا پروانہ بن

ہو گئی دو حرفوں سے رنگیں داستانِ غم شفق
دل کے ٹکڑے جوڑ کر عنوانِ سرِ افسانہ بن

حضرت شفق ٹونکی

اک مکمل داستانِ جلوۂ جانانہ بن — حسن کی روداد ہو جا عشق کا افسانہ بن
شامِ ماتم خانہ بن یا صبحِ عشرت خانہ بن — زندگی کا کوئی جیتا جاگتا افسانہ بن
شمع کا طالب بھی ہے اور شمع کا مطلوب بھی — انجمن میں ہم مذاقِ فطرتِ پروانہ بن
دے ہمہ گیری کا اپنی یوں زمانے کو ثبوت — خود ہی ساقی خود ہی ساغر خود ہی میخانہ بن
لوحِ عالم پر جو تیری یاد میں ہو جائے ثبت — یادگارِ زندگی ایسا کوئی افسانہ بن
ہر نفس سے پھوٹ نکلے حسن پر انوارِ دوست — کم سے کم اتنا تو محوِ جلوۂ جانانہ بن
محفلِ شام و سحر میں صورتِ خورشید و ماہ — رونقِ ہر بزم ہو تزئینِ ہر کاشانہ بن
ہر نفس کو اک نئی مستی عطا کرتا ہوا — زندگی کی گود میں جذبات کا میخانہ بن

زندگی کا تیری مقصد کچھ تو ہو آخر شفق
قابلِ محفل نہیں تو لائقِ ویرانہ بن

محسن ادب حضرتِ نشتر ہنگامی ایڈووکیٹ اورئی

سوز و سازِ ہستیٔ موہوم سے بیگانہ بن — بن سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن
یوں نہ محفل میں تماشائی دلِ دیوانہ بن — آئینہ بنتا ہے تو عکسِ رخِ جانانہ بن
ہے تقاضائے محبت عشق میں دیوانہ بن — اب یہ مرضی ہے تری ای بوالہوس بن یا نہ بن
یا نوازش دل پہ کر یا دل کو چکنا چور کر — یا بنا افسانہ یا غارت گرِ افسانہ بن
جلوۂ جانانہ بنجاتا ہے وہ ذرہ جسے — حکم دے دیتا ہوں جسکو جلوۂ جانانہ بن
بے نیازِ بادہ و ساغر بھی ہو ای بوالہوس — رندِ میکش بن چکا اب ساقیٔ میخانہ بن
میکشی میں آج بے لطفی سی ہے ای دودِ آہ — اٹھ خدا کے واسطے ابرِ سرِ میخانہ بن
عشقِ صادق ہے تو میں اپنا بنا لونگا تجھے — جسقدر بنتا ہو تجھ کو مجھ سے تو بیگانہ بن

یوں نشاطِ دہر ملتی ہے کہیں نشتر یہاں
سر سے پا تک پہلے تصویرِ غمِ جانانہ بن

حضرت شاعر نہٹوری ایڈووکیٹ سوامرا

ہے اگر دیوانہ بننا ہی تو بن دیوانہ بن — ہاں مگر باہوش ہو کر عقل سے بیگانہ بن
ذرہ ذرہ کو بنا کر ترجمانِ آرزو — منزلِ ہستی کا اک رازِ نہاں افسانہ بن
جل سکے تو سوزِ دل شمع کی صورت جلا — بن سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن
لوحِ دل پر نقش کر کے عشق کی خودداریاں — بے نیازِ حسن ہو جا۔ ناز سے بیگانہ بن
آ کے بے پردہ نظر تابِ نظارہ بخشدے — دل کو اپنا گھر سمجھ کر زینتِ کاشانہ بن
چھا نہ جائے بیخودی ای جراتِ دیدار پھر — ہوش میں آ کر رہینِ جلوۂ جانانہ بن
پھر نگاہِ ناز سے برہم جہانِ قلب کر — پھر حریمِ دل میں آ کر رونقِ کاشانہ بن
شمعِ بزمِ آرزو کی گرمیاں جانکاہ ہیں — شوقِ جانبازی اگر ہے پیروِ پروانہ بن

برقِ حسنِ عشق ہے شاعر تقاضائے فریب
ہے اگر بننا تو چل خاکِ درِ جانانہ بن

جناب طالب جبلی

بن مگر صرف اپنے دل کے جوش تک دیوانہ بن
تیری نخوت تا نہ لیں اہلِ نظر، افسانہ بن

ہے تری قسمت میں جلنا گو کسی صورت میں ہو
شمع بن محفل میں یا ہم مشربِ پروانہ بن

ہر جگہ صرف ایک ہو مرکز عقیدت کا تری
یعنی کعبہ ہو یا ساکنِ بت خانہ بن

کوئی لے سکتا ہے ٹکر موجِ ہستی سے کہیں
عافیت قطرہ ہی بننے میں ہے تو دریانہ بن

روشنی پھیلا زمانے میں کسی حد تک سہی
برق بننے کی نہیں ہمت، چراغِ خانہ بن

کیا بنا بیٹھا ہے مجبور ایک ذرے کی طرح
ظرف کو پھیلا کے اپنے وسعتِ ویرانہ بن

کر لیا بیگانہ دنیا کو تو کیا حاصل ہوا
بیخودی یہ ہے کہ اپنے آپ سے بیگانہ بن

دوست کے لب تک رسائی کی یہی ترکیب ہے
مٹ مٹا کر خاک ہو جا، خاک سے پیمانہ بن

بے طلب طالب تجھے جام و سبو مل جائیں گے
بے نیازِ بادہ ہو کر عاکفِ میخانہ بن

جناب جالب سہسرامی از بمبئی

باعثِ تبدیلیٔ حالِ دلِ ویرانہ بن
اے بہارِ زندگی! آ رونق کاشانہ بن

الاماں از سیر گہہائے شبِ غم الاماں
اے جمالِ دوست اب تو ہی چراغِ خانہ بن

چھپ نہیں سکتیں کسی صورت ادائیں حسن کی
خواہ شمعِ انجمن بن، خواہ تو پروانہ بن

یہ ہوا، یہ گھٹائے ابر، یہ صحنِ چمن
آج تو اے جانِ گلشن ساقیٔ میخانہ بن

بے نیازِ منتِ الطافہائے غیر ہو
باغِ ہستی میں مرید سبزۂ بیگانہ بن

دسترس ہے جو سلاطین کی بھی ہو محفوظ تر
اے نگہبانِ خودی! وہ گوہرِ یکدانہ بن

رفعتِ افلاک تک ممکن رسائی ہے تری
ہاں مگر پہلے سراپا ہمتِ مردانہ بن

چھوڑ کر عقل و خرد کو ڈھونڈ منزل دوستی کی
اور اس کو دیوانہ پن سمجھا ہے تو دیوانہ بن

ہے کہاں جالبؔ کسی میں ہمتِ قدرِ وفا
اے حقیقت آشنا ہر ایک سے بیگانہ بن

جناب مالک آدیبی ہردا سی۔ پی

منظرِ حسنِ حقیقت اے دلِ دیوانہ بن
خیر ہو تیری زسر تا پا تجلی خانہ بن

بزمِ ہست و بود میں کچھ تو دلِ دیوانہ بن
شمع بننے کی نہیں توفیق تو پروانہ بن

محرمِ غم کا آشنا ہو سازِ بیگانہ بن
ایک دن برہم زنِ عالم دلِ دیوانہ بن

میکدہ در میکدہ کو میکشوں سے ساز باز
پردہ در پردہ حجابِ شیشہ و پیمانہ بن

کائناتِ ہر دو عالم وجد فرمانے لگے
برابطِ دل پر اک ایسا نغمۂ مستانہ بن

ذرہ ذرہ لے رہا ہے سوتِ فکر و نظر
اب تجھے میں کیا بتاؤں ہوش کو بیگانہ بن

کر نہ یوں توہین احسانِ گدازِ عشق کی
شعلۂ غم دے رہا ہے تو چراغِ خانہ بن

قوتِ بالیدگی دے اعتمادِ شوق کو
بن سکے تو اے دلِ ذمتِ طلب دیوانہ بن

عالمِ نیرنگ میں اے سالکِ افسردہ دل
کون کہتا ہے مثالِ سبزۂ بیگانہ بن

جناب منظر کلیمی جام پوری

اے حریمِ دل نہ کعبہ بن نہ تو بت خانہ بن
بن دیارِ بیکسی اجڑا ہوا کاشانہ بن

غیر کے قدموں پہ کیوں ہے عشق میں سجدہ ترا
خود ہی جلوہ گاہ بن خود جلوۂ جانانہ بن

فطرتِ سائل! خودی کو اپنی کر اتنا بلند
بے نوائی میں بھی رشکِ شوکتِ شاہانہ بن

ہنستے ہنستے جان دے منہ سے مگر اُف تک نہ کر
بن سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن

کر کے ہمت خود اٹھا لے ساغرِ صہبائے ناب
تجھ میں طاقت ہے ابھی محتاجِ ساقی کا نہ بن

جذبِ دل! تجھ کو غرض کیا شمع سے پروانے سے
خود گدازِ شمع بن خود سوزشِ پروانہ بن

ہے تمیزِ کعبہ و بت خانہ وجہِ گمرہی
بن براہیمِ حرم اور آذرِ بت خانہ بن

اے نگاہِ شوق! پیدا کر اک اندازِ سکوں
باعثِ آشفتگی، جلوۂ جانانہ بن

میکدہ بردوش پھر آنے لگی منظر گھٹا
گر نہیں ساقی تو خود ہی ساقیٔ میخانہ بن

جناب جمیل سیوہاروی

شمع جس سے جل اٹھے وہ سوزشِ پروانہ بن
سُرخیٔ افسانہ بن کر حاصلِ افسانہ بن

آ کہ برہم ہو چلا ہے انتظامِ کائنات
وجہِ تسکین و سکونِ خاطرِ دیوانہ بن

جستجو میں تیری خود نکلے گا میر کارواں
رسمِ درا و کارواں سے تو ذرا بیگانہ بن

جز فنا ممکن نہیں تحصیلِ معراجِ بقا
"بن سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن"

ذرے ذرے میں ہے اک اہلیتِ نشو و نما
گھر کو ہی دنیا بنا لے طالبِ دنیا نہ بن

اخترِ شب تاب بن کر جگمگا دے کائنات
ذرہ بن کر کیا کرے گا وسعتِ ویرانہ بن

رسم و آدابِ پرستش سب تری ایجاد ہیں
بن سکے تو بے نیازِ کعبہ و بتخانہ بن

خود بخود مٹ جائے گا یہ فرقِ ما و تو جمیلؔ
ماورائے حدِ عقل و ہوش ہو دیوانہ بن

جناب حزیں قریشی احمد آبادی

شاہکارِ سوزِ الفت اے دلِ دیوانہ بن
"بن سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن"

ہے تقاضائے جنونِ عاشقی دیوانہ بن
بے نیازِ ہوش ہو کر عقل سے بیگانہ بن

ذرہ ذرہ اس زمیں کا ہے جوابِ آفتاب
پائمالِ آرزو خاکِ درِ جانانہ بن

ایک ہے دونوں جگہ تنویرِ حسنِ یار کی
یا [illegible] کعبہ بن یا مظہرِ بتخانہ بن

توڑ کر قیدِ طلسماتِ حجابِ زندگی
آئینہ دارِ ضیائے جلوۂ جانانہ بن

جس کا ایک اک لفظ ہو عنوانِ جذباتِ حیات
وہ سراپا درد میں ڈوبا ہوا افسانہ بن

خواہشِ تکمیلِ سوزِ عشق ہے تو بے خطر
شمعِ محفل بن کے جل خاکسترِ پروانہ بن

جس کی فطرت ہی ازل سے ہو جنوں پرور نہیں
ایسے دیوانے سے کوئی کیوں کہے دیوانہ بن

جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی

دل کی جانب دیکھ، اپنے آپ سے بیگانہ بن
طالبِ جلوہ رہینِ ایمن و سینا نہ بن

عشق کی دنیا میں چل، ہر ایک سے بیگانہ بن
موڑ آبادی سے منہ، رونق دہِ ویرانہ بن

عشق کی گرمی سے قائم حسن کی ہیں حدتیں
شمع کا شعلہ نہ بن، سوزِ دلِ پروانہ بن

سر اٹھا کر دیکھنے پائے نہ زندوں کی طرف
توڑ دے مینا کی گردن، دشمنِ پیمانہ بن

جس کا ہر منظر نظر آئے حقیقت در کنار
بزمِ عالم میں تو ایک ایسا نیا افسانہ بن

چاک دامانی جنونِ عشق کو شایاں نہیں
جس کو فرزانہ کہیں دیوانے، وہ دیوانہ بن

بارہا ساحل سے جو ٹکرا کے ہو طوفاں بدوش
بحرِ الفت میں تو وہ اک موجِ بیتابانہ بن

قلزمِ علم و ادب کی تہ میں کچھ دن بیٹھ کر
ناز ہو "سی۔ پی" کو طرفہ جس پہ وہ دُردانہ بن

حضرت مولانا آلم مظفر نگری

بن سکے تو شمع بنکر رونقِ کاشانہ بن
ورنہ جل کر دفعتہً خاکسترِ پروانہ بن

اے تجلائے چمن، دل کے لئے میخانہ بن
بن صراحی اے کلی، اے پھول تو پیمانہ بن

اپنی آنکھوں سے پلا، اپنے ارادوں سے پلا
تو ہی میخانہ ہے تو ہی صاحبِ میخانہ بن

منظرِ دشت و چمن ہے اک فریبِ عارضی
بے پئے مستانہ بن جا، بے جنوں دیوانہ بن

نبضِ ہستی میں رواں ہو بنکے روحِ اضطراب
عالمِ ضبط و سکونِ درد سے بیگانہ بن

دیکھ لے دنیا ترے جلووں کو ہم رنگِ بہار
تو برنگِ لالہ و گل سرخیِ افسانہ بن

ہے اگر مدِ نظر تعمیر اپنی اے آلم
شمع بن، پروانہ بن، مستانہ بن، دیوانہ بن

حضرت کوکب شاہجہانپوری

سر میں سودائے محبت رکھ، مگر فرزانہ بن
دل ہو غم سے خون لیکن رنج سے بیگانہ بن

اپنے دل کی آگ کچھ کم ہے جلانے کے لئے؟
شمع کو رہ جائے حسرت جس کی، وہ پروانہ بن

سوز بھی ہو ساز بھی ہو اے دلِ آتش بجاں
عشق کا گھر بن چکا، اب حسن کا کاشانہ بن

وہ جو پوچھیں بھی تو افشا کر نہ رازِ دردِ عشق
صاحبِ ذوقِ بلند و ہمتِ مردانہ بن

شوق بیجا ہو کسی کے سامنے، اچھا نہیں!
ان کے آگے بھی حقیقت کو چھپا، افسانہ بن

عشق تو در اصل خود ہے خالقِ حسن و جمال
حکم دے اپنی نظر کو جلوۂ جانانہ بن

دیکھ اے کوکب نہ آئے پائے خودداری میں فرق
باوجودِ عشق ہر ارماں سے بیگانہ بن

حضرت دعا ڈبائیوی

شوق کہتا ہے کہ سوزِ عشق میں پروانہ بن
لوگ جس کو حشر تک دہرائیں وہ افسانہ بن

امتیازِ کعبہ و بت خانہ ہے توہینِ عشق
عشق ہے تو بے نیازِ کعبہ و بتخانہ بن

سوزِ الفت پھونک دے تجھکو تو کچھ پروا نہ کر
سیکھ پروانے سے الفت عشق میں پروانہ بن

دوسروں کے کام آ، اس سے نہیں بڑھکر ثواب
زاہدِ نافہم کچھ دن ساقیِ مے خانہ بن

خاک تیری سرمۂ اہلِ وفا بن جائے گی
بن سکے تو عشق میں خاکسترِ پروانہ بن

ذلت و تحقیر کا جینا ہے بدتر موت سے
بن سکے تو فخرِ دنیا بن، سگِ دنیا نہ بن

درسِ عبرت ہو ترا قصہ جہانِ عشق میں
اے دعا تو اہلِ دنیا کے لئے افسانہ بن

حضرت ارشد صدیقی امروہوی از کوئٹہ

عشق میں اے دل نہ کعبہ بن نہ تو بتخانہ بن
جلوۂ حسنِ حقیقت کیش کا کاشانہ بن

اے دلِ ناقص مکمل عشق کا افسانہ بن
حسن دیوانہ بنے گا، پہلے خود دیوانہ بن

اپنی فطرت کو سکھا آدابِ عرفانِ خلیلؑ
کچھ اگر بننا ہے تو برہم زنِ بتخانہ بن

مدعا مل جائیگا اے رہروِ راہِ طلب
راہِ منزل میں امینِ ہمتِ مردانہ بن

میں سمجھ لوں گا کمالِ سجدہ حاصل ہو گیا
اے جبیں مصروفِ سنگِ درِ جانانہ بن

رہتی دنیا تک رہے جاری زبانِ حسن پر
مٹ کے راہِ عشق میں ایسا تو اک افسانہ بن

جتنے دیوانے ہیں ارشد تیرے دیوانے بنیں
تو محبت میں کچھ اس انداز سے دیوانہ بن

جناب رونق دکنی از جمشید پور

زیست کی جھوٹی کہانی سے ذرا بیگانہ بن
حسن کا عنوان بن جا، عشق کا افسانہ بن

گرمیِ سوزِ جگر سے کر طوافِ شمعِ حسن
کون کہتا ہے کہ جلنے کے لئے پروانہ بن

ہے یہی اک مختصر درسِ کمالِ بے خودی
بے نیازِ ہوش ہو جا آپ سے بیگانہ بن

کر حدودِ حسن و الفت سے الگ قائم محاذ
ان حسیں دھوکوں سے جتنا ہو سکے بیگانہ بن

کائناتِ حسن و الفت کچھ نہیں تیرے بغیر
صبحِ عشرت گر نہیں بنتا شبِ غم خانہ بن

آدمیت تو عبارت جوششِ وحشت سے ہے
آدمی بننے کی گر ہے آرزو دیوانہ بن

بوالہوس رکھتے ہیں رونق خواہشِ نام و نمود
اپنی ہستی کو مٹا، خاکِ رہِ جانانہ بن

جناب کیف بہاری از بمبئی

اپنی خودفہمی سے پہلے حسن و بیگانہ بن
پھر کہیں جلووں کا طالب اے دلِ دیوانہ بن

بن سکے تو بے نیازِ کعبہ و بتخانہ بن
حدِ ممکن سے گذر کر منظرِ جانانہ بن

غیر کا ممنون ہونا تو خلافِ وضع ہے
اپنا سوزِ دل بڑھا کر خود چراغِ خانہ بن

دورِ رعنائیِ دُنیائے وفا تو ہی تو ہے
اے جمالِ دوست! تابکے بے پروا نہ بن

ہستیِ دو روزہ میں کیوں آج تو کل کا منتظر
غم خورِ امروز بن، زحمت کشِ فردا نہ بن

کر کمالِ ناچیز سے ذوقِ فنا کا درس لے
اور تکمیلِ جنوں کر، ہمسرِ پروانہ بن

کیفؔ تو بزمِ جہاں میں جب فنا انجام ہے
حبِ دُنیا چھوڑ، شمعِ عشق کا پروانہ بن

جنابِ صادق از بھنڈ (ریاست گوالیار)

پہلے اُلفت میں کسی کے حسن کا پروانہ بن
بن کے پروانہ پھر اپنا آپ ہی افسانہ بن

وقتِ آخر اب تجھے شرمندگی ہے یا مجھے
میں نہ کہتا تھا کہ اے دل طالبِ دُنیا نہ بن

بھول جا خود کو بھی اُن کو دل میں اپنا یاد کر
اپنی ہستی کو بھی اُنکے عشق میں بیگانہ بن

ہے یہ ترکیبِ مجربِ التفاتِ حسن کی
دھجیاں کر پیرہن کی، خاک اُڑا، دیوانہ بن

تیری اُلفت دیکھ کر اُلفت انھیں ہو جائیگی
اُن کو پروانہ بنانا ہے تو خود پروانہ بن

یوں نہیں تو یوں مکمل کر فسانہ عشق کا
اپنا دیوانہ بنا لے یا مرا دیوانہ بن

لے سکے صادقؔ تو لے سوزِ محبت کے مزے
"بن سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن"

جنابِ حبیب آروی از جمشید پور

سرفرازِ عشق ہو، ہم مشربِ پروانہ بن
ہے جو کچھ بننا، تو جا خاکِ درِ جانانہ بن

اے جمالِ برق ساماں یوں دکھا اپنی بہار
ذوقِ عمراں، برقِ ایمن، طور کا افسانہ بن

لے ترے آگے کئے دیتا ہوں شرحِ بیخودی
سب سے ہو بیگانہ، پھر اپنے سے بھی بیگانہ بن

شمع و محفل کا محبت میں غلط ہے امتیاز
امتحانِ سوز دے، خاکسترِ پروانہ بن

کھیلتا تھا تجھ کو اے گیسو نسیمِ صبح سے
کہہ رہا کرنے دلِ صد چاک کا تو شانہ بن

میں بتا دیتا ہوں تجھکو آدمیت کا اصول
حاملِ آئینِ فقر و مسلکِ شاہانہ بن

چاہیئے تجھ کو تو اپنا ہو کے رہنا اے حبیبؔ
یہ تری مرضی اگر اپنا نہیں بنتا نہ بن

جنابِ عرشی لکھنوی (از دہلی)

سوزِ جاں یا سازِ تن یا شمع یا پروانہ بن
جو ہے بننا لے دلِ پرشوق بے باکانہ بن

چاک کر دے اپنا دامانِ خودی دیوانہ بن
حسن کو اپنا بنانا ہے تو خود بیگانہ بن

عشق میں افسانہ بن کر حاصلِ افسانہ بن
شمع بننا ہے تجھے تو اولاً پروانہ بن

بیخودی عشق کا عالم ہے اُٹھا دو حجاب
میری آنکھ کے دریا اب خودی پروانہ بن

دیکھنے والوں کی نظروں سے اُٹھا دو امتیاز
عشق کی تکمیل کر خود شمع خود پروانہ بن

ماورائے عقل کردے معنیٔ حسنِ مجاز
ہوش کے عالم میں رہتے ہوئے دیوانہ بن

خاکساری ہی سے مل جائیگی عرشیؔ رفعتیں
ذرہ بن کر ہی تماشا دیکھ تو دُنیا نہ بن

جنابِ کوکب از کونچ

ہو پرستارِ محبت بندۂ جانانہ بن
فارغِ رسم و رواجِ کعبہ و بتخانہ بن

مست نظروں سے کسی کی بیخود و مستانہ بن
بے نیازِ شیشہ و پیمانہ و میخانہ بن

عقلِ کل بھی خود تری دیوانگی پہ ہو نثار
بن سکے تو عشق میں اس شان سے دیوانہ بن

یوں بھلا دے اپنی ہستی کو کسی کی یاد میں
ماسوا کا ذکر کیا اپنے سے بھی بیگانہ بن

خونِ دل سے لکھ کتابِ زندگی کا ہر ورق
ہنسنے والے سُن کے روئیں جسکو وہ افسانہ بن

محو کر دے اپنے دل سے امتیازِ کفر و دیں
عشق میں وارفتۂ زلف و رُخِ جانانہ بن

کر کے اپنی جاں کو شمعِ حسن پہ کوکبؔ نثار
"ہو سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن"

جنابِ خلیل کولاری

جلوہ گاہِ طور پر جا کر نہ تو دیوانہ بن
شمعِ انوارِ حقیقت کا کبھی پروانہ بن

طالبِ ساغر نہ محوِ گردشِ پیمانہ بن
ہاں اگر بننا ہے تجھکو ساقیٔ میخانہ بن

مرتبہ دونوں کا یکساں ہے نگاہِ دوست میں
افتخارِ کعبہ بن یا نازشِ بتخانہ بن

تو اگر چاہے تو کیا کچھ بن نہیں سکتا یہاں
صبحِ عشرت خانہ بن یا شامِ ماتم خانہ بن

دل مرا پُرکیف ہو آنکھیں مری پُرنور ہوں
مرکزِ ذہن و نظر اے جلوۂ جانانہ بن

اے دلِ راحت طلب شمعِ شبستاں کی تجھے
جستجو ہے تو اندھیری رات کا پروانہ بن

اے خلیلؔ خوش بیاں دل کی یہی تاکید ہے
قوتِ علم و عمل کا دلنشیں افسانہ بن

جنابِ محمود یار خاں اثرؔ ایم۔ اے از جوناگڈھ

تیری ہستی ہے حقیقت، تو نہ اک افسانہ بن
چشمۂ خورشید بن، لیکن نہ ظلمت خانہ بن

اضطرابِ شوق قائم ہے حجابِ حسن سے
اے دلِ ناداں ہوائے دید سے بیگانہ بن

گر یہی سوزِ نفس سے شیشۂ دل کو گداز
ڈھال دے جو قالبِ اُلفت وہ آتش خانہ بن

تنگ ظرفی ہے خلافِ شانِ خودداری شوق
جس سے چھلکے بادۂ اُلفت نہ وہ پیمانہ بن

راہِ عرفاں میں یہ تخصیصِ معابد کس لئے
بے نیازِ اہتمامِ کعبہ و بتخانہ بن

تو بھی جل کر خاک ہو جا آتشِ فانوس سے
"بن سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن"

حالِ دل کہہ کر انھیں تکلیفِ شنوائی نہ دے　　اے اثر خاموش رہ کر عرضِ بیتابانہ بن

جناب رعنا عشرتی

آ مرے دل کی ضیا اے جلوۂ جانانہ بن　　میں بنوں موسیٰ تو کوہِ طور کا افسانہ بن
یوں مذاقِ عشق کی تکمیل ہونی چاہئے　　وہ بنیں شمعِ محبت اور تو پروانہ بن
سامنے اُن کے بجائے سر نگاہِ دل جھکا　　سجدہ کیسا بے نیازِ کعبہ و بتخانہ بن
اس جہانِ خود پرستی میں نہیں ساں کوئی　　رونقِ گلخانہ ہو یا زینتِ ویرانہ بن
اعتباراتِ حیات و موت سب بیکار ہیں　　زندگی چاہے تو ہر ہر سانس سے بیگانہ بن
خامکاری جنونِ عشق ہے قیدِ بہار　　ہے اگر دیوانہ بننا، مستقل دیوانہ بن
خود بخود جھکنے لگیں گے جام تیرے سامنے　　پہلے رعنا بے نیازِ گردشِ پیمانہ بن

جناب وصی عارف (برہانپوری)

عشق میں بیکار ہے فرزانگی دیوانہ بن　　خلق میں رہتے ہوئے بھی خلق سے بیگانہ بن
نشۂ عشقِ وطن کے جوش میں مستانہ بن　　وقت کی آواز سن منت کشِ صہبا نہ بن
اے دلِ ناداں بتوں سے اور اُمیدِ وفا　　ہوش میں آ ہوش میں فرزانہ بن فرزانہ بن
لوحِ دل پر تیرے جلوؤں کی حقیقت ہے رقم　　قصۂ منصور بن یا طور کا افسانہ بن
او ستم ایجاد باز آتا ہے کیوں بیداد سے　　تو خدا کے واسطے ایسا نہ کر ایسا نہ بن
ہو سکے تو آتشِ الفت میں جلکر خاک ہو　　"بن سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن"
پھیل جائے ایک سی دیر و حرم میں روشنی　　یوں دلِ عارف چراغِ کعبہ و بتخانہ بن

جناب حافظ اسحاق صاحب ہلال کوکشی ریاست دھار

اپنی ہستی کو مٹا کر آپ سے بیگانہ بن　　پرتوِ شمعِ ازل کا اس طرح پروانہ بن
چھوڑ دے دنیا کے سب جھگڑے بھی، تو بیگانہ بن　　اور مجنوں کی طرح پھر عشق میں دیوانہ بن
سیکھ نہ کچھ اُن کی طلب میں اے دلِ دیوانہ بن　　رہگذارِ طور بن یا جادۂ بتخانہ بن
میں یہ کہتا ہوں مجسم شمع اک بنجاؤں میں　　سب یہ کہتے ہیں حریفِ قسمتِ پروانہ بن
لطف تو جب ہے بغیرِ شیشہ و پیمانہ تو　　پی نگاہوں سے کسی کی اور پھر مستانہ بن
دیدنی ہو دہر میں یہ ارتباطِ حسن و عشق　　وہ بنیں افسانے کا عنوان تو افسانہ بن
زندگی گر چاہتا ہے عشق میں اُن کے ہلال　　شمعِ دل اُن کو بنا تو اور خود پروانہ بن

جناب صہبا سریری گیاوی (بی کام)

ہوش کی حد سے گذر جا عقل سے بیگانہ بن　　تجھ کو بننا ہے اگر فرزانہ تو دیوانہ بن
مست جامِ بیخودی بے شیشہ و پیمانہ بن　　التدر محوِ خیالِ نرگسِ مستانہ بن
خانۂ دل کو ہمارے مطلعِ انوار کر　　اے فروغِ حسنِ جاناں زینتِ کاشانہ بن
گریۂ پیہم سے تو اے شمع کچھ حاصل نہیں　　ہو سکے تو بزم میں سوزِ دلِ پروانہ بن
ننگ ہے تیرے لئے حسنِ مجازی کی طلب　　سر سے لیکر پاؤں تک تو رازِ ہی دمانہ بن
پھول ہو جائیں گے کانٹے مجھکو راہِ عشق میں　　ہر قدم پر راہبر اے ہمتِ مردانہ بن
مجھ کو اے صہبا جو ہے ذوقِ نظر دیدارِ دوست　　محوِ حیرت ہوکے تو آئینۂ جانانہ بن

جناب منیر نقشبندی کولاری از ریاست میسور

بزمِ عالم میں حباب گردشِ پیمانہ بن　　فاتحِ حدِ تعین ہمتِ مردانہ بن
دل میں پیدا کرکے اپنی شمع کا سوز و گداز　　عشق میں تو ہم مذاقِ فطرتِ پروانہ بن
بیکسی دیکھی نہیں جاتی دلِ رنجور کی　　ہجر میں تسکینِ دل اے جلوۂ جانانہ بن
عشق میں فرزانگی ہے مضحکہ انگیز بات　　ترک کر ہوش و خرد، دیوانہ بن دیوانہ بن
سرخوش و سرمست بن، مستی سے ہی ہے یہ مراد　　بزمِ رنگیں میں صدائے قلقلِ مینا نہ بن
چھوڑ دے مردِ خدا ناکامیِ ارماں کی فکر　　اے منیر اب سازگاری کا کوئی افسانہ بن

جناب سالک انصاری تن درباری

ہوش کی لے ہوش میں اپنے نہ تو بیگانہ بن　　ظرف کے اندازے سے مستانہ بن دیوانہ بن
لطف بے سوز و گدازِ عشق کچھ آتا نہیں　　بن سکے تو قیس بن فرہاد بن پروانہ بن
سرخرو کیا خاک ہوگا تو ہے شیدائے مجاز　　مائلِ حسنِ حقیقت اے دلِ دیوانہ بن
کیف زا آنکھوں سے ساقی کی برستی ہے شراب　　آ سوئے میخانہ زاہد بے پئے مستانہ بن
اپنی ہستی ہی میں اس کو ڈھونڈ وہ مل جائیگا　　یوں نہ محو میں طلسمِ کعبہ و بتخانہ بن
لو لگی ہے گر تجھے اس کے چراغِ حسن سے　　سالکِ بیتاب تو ہم مشربِ پروانہ بن

جناب سلیم سہروردی گوالیاری

گرمیِ احساس سے خاکسترِ پروانہ بن　　درد کی دنیا بسی ہو جس میں وہ افسانہ بن
ہمنشیں میری گریباں چاکیاں مہمل نہیں　　خود بہار آکر یہ کہتی ہے کہ اُٹھ دیوانہ بن
اس تنک ظرفی پہ تجھ کو شرم آنی چاہئے　　جس میں میخانے سما جائیں وہی پیمانہ بن
ہستیِ فانی پہ اپنی ثبت کر مہرِ ثبات　　جن کے مٹ جانے پہ روئے دہر تو ایسا نہ بن
جس کو سب ناکام کہتے ہیں وہی ہے کامیاب　　سعیِ پیہم سے مگر اک لمحہ بے پروانہ بن
دہر کے دار العمل میں اے سلیم بے نوا　　سعی کر امروز کی دیوانۂ فردا نہ بن

جناب تاباں قریشی احمد آبادی

یہ تقاضائے محبت ہے کہ تو دیوانہ بن — کیا غرض ہے کہ تو بلبل بن ترانہ بن
بھول جائیگی یہ دُنیا عشق کے قصے تمام — از سرِ نو انقلابِ دہر کا افسانہ بن
بول اٹھیں آفریں وحشت پہ تیری اہلِ ہوش — تجکو بننا ہے تو اس انداز سے دیوانہ بن
کیا کیا وارفتہ صحرا جو مجنوں کو کیا — مجھ سے اہلِ ہوش سے کہتا کوئی دیوانہ بن
ہے غرض سجدوں سے تجکو آستاں ہو یا حرم — تو اگر کعبہ نہیں بنتا نہ بن بتخانہ بن
تا ہو تکمیلِ محبت عشق کی تاباں نصیب — ہو سکے تو عشق میں ہم فطرتِ پروانہ بن

جناب عصمت اٹلا سپور سی۔ پی

عشق میں تو ہمخیالِ حضرتِ موسیٰ نہ بن — دیکھ سوئے دل ہلاک جلوۂ جانانہ بن
حُسن کی صورت انکی صورت دیکھنے سے فائدہ؟ — اپنی صورت پر نظر کر، اپنا ہی دیوانہ بن
حُسن والوں کا ہر اک وعدہ ہے شمشیرِ فریب — ہوشیار اے دل! ہلاکِ وعدۂ فردانہ بن
خاک گلیوں کی اڑانا سر پہ ہے توہینِ عشق — "بن سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن"
چاہتا ہے تو اگر دُنیا تجھے سجدہ کرے! — اپنی ہستی کو مٹا سنگِ درِ جانانہ بن
جس کی ہر انگڑائی ہے عصمت پیغامِ شعور! — جس کا مشرب ہو ادب وہ مرشدِ میخانہ بن

جناب زار کاندھلوی

بزمِ حسن و عشق میں افسانہ در افسانہ بن — سوزِ غم رکھتا ہے تو ہم مشربِ پروانہ بن
درد رکھتا ہے اگر دل میں تو اے درد آشنا — راحتِ جان و قرارِ خاطرِ بیگانہ بن
یہ شبِ تاریک، بحرِ غم، یہ طوفانِ حیات — تو ہی میری ناخدا اے ہمتِ مردانہ بن
سر جھکا ہر حکم پر تو بہرِ تسلیم و رضا — ترک کر چون و چرا دیوانہ بن دیوانہ بن
جان نثارِ جلوہ کردے سر فدائے جلوہ گاہ — ماورائے ماسوا سے بیخود و بیگانہ بن
جلوہ گاہِ حُسن میں دیوانگی ہی خوب ہے — زار یہ عقل و فراست چھوڑ کر دیوانہ بن

جناب ارمان برہانپوری

خود ہی موسیٰ اور خود ہی جلوۂ جانانہ بن — خود پلا اور خود ہی پی خود ساقیِ میخانہ بن
ہوش میں رہنا ہے آئینِ محبت میں گناہ — توبہ کر توبہ۔ ارے دیوانہ بن دیوانہ بن
سربلندی کی تمنا ہو جو دُنیا میں تجھے — لے جبینِ بندگی سنگِ درِ جانانہ بن
ہاتھ میں تسبیح اور ہے شیشۂ مے جیب میں — جانتے ہیں ہم تجھے اے شیخ تو انجانہ بن
ہو سکے تو ہو فدا اس شمع رو پہ بزم میں — "بن سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن"
حشر تک بھولیں نہ اے ارمان تیرا تذکرہ — زندۂ جاوید جینا جاگتا افسانہ بن

جناب عزیز از کاسگنج

دونوں عالم میں ہو جس کا دورِ دورہ پیمانہ بن — وسعتِ کونین ہو جس میں وہی ویرانہ بن
"بن سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن" — خاک ہو کر ہی غبارِ دامنِ جانانہ بن
اب نہیں کوئی دلِ وحشت زدہ کا آسرا — آ، شریکِ رنج ہو اور رونقِ غمخانہ بن
یوں تمنائے قدم بوسی کا ہوگا تکملہ — اے سرِ سودا زدہ سنگِ درِ جانانہ بن
زندگی دو بھر نہ کر اے خلوتِ غم آفریں — سمتِ صحرا مجھے جانے دے یا ویرانہ بن
جلوہ ہائے حُسن ارزانِ نظر ہیں اے عزیز — جذب کر ان بجلیوں کو طور کا افسانہ بن

جناب عارف ارشدی سیالکوٹی از کوئٹہ

شورش افزا ہو نہ وحشی بن نہ تو دیوانہ بن — ہو سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن
یوں در و دیوار سے ٹکرا کے مرنا ہے فضول — اے سرِ شوریدہ تیغِ ناز کا نذرانہ بن
دل یہ کہتا ہے کہ اب تو دشت پیمائی نہ کر — عشق کہتا ہے جوابِ گردشِ پیمانہ بن
قیس اور فرہاد کے افسانے کہنہ ہو چکے — اپنے عنواں سے تو اک نیا افسانہ بن
تجھ کو اے عارف سمجھنا ہے جو رازِ معرفت — بے نیازِ ہوش ہو جا عقل سے بیگانہ بن

جناب برگ از باندہ

حُسن کے جلووں میں گھر کر عشق کا ہنگامہ بن — کچھ نہیں بنتا تو خاکِ کوچۂ جانانہ بن
مٹ کے بزمِ دوست میں کچھ اور تو بن یا نہ بن — جلنے والے صورتِ خاکسترِ پروانہ بن
جل سکے تو جل کے خاکِ محفلِ جانانہ بن — "بن سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن"
خلق سے بیگانہ بننا تو بہت آسان ہے — تجھ کو بننا ہے تو اپنے آپ سے بیگانہ بن
برگ بیہوشی بقدرِ ہوشیاری چاہیے — تو نہ بن فرزانہ را وحشت میں دیوانہ بن

جناب بزم امروہوی

جوشِ الفت میں اے دلِ وحشی تو دیوانہ بن — "ہو سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن"
التجا اپنی لحد سے یہ کروں گا بعدِ مرگ — اے غبارِ قبر تو خاکِ درِ جانانہ بن
دم گئے گھر سے مرے برہم ہوئی بزمِ نشاط — اے مرے عشرت کدے اس وقت ماتم خانہ بن
اُنکی فرقت میں ہماری زندگانی تلخ ہے — اے غمِ شامِ جدائی موت کا پروانہ بن
ان سے تو بزم سے الفت قطع کرکے بزم تو — شمع رُوئے احمدِ مختار کا پروانہ بن

جنابِ وارث صدیقی شہادوی

با غباں سے دل کبھی صیاد سے کر گفتگو
رہ کے گلشن میں نہ مثلِ سبزۂ بیگانہ بن

ہر طرح رسوائیاں بدنامیاں ہیں عشق میں
زُلف کا سودائی بن یا حُسن کا دیوانہ بن

جلوے خود دینگے پیامِ دید کا مژدہ تجھے
طالبِ جلوہ تو پہلے اے دلِ دیوانہ بن

کیوں کسی کے عشق میں ہوتا ہے رسوا کو بکو
اپنی ہی تصویر کا آشفتہ و دیوانہ بن

پہلے وارثؔ سمجھ لے انجامِ لطفِ عاشقی
پھر کسی کی زُلفِ سودائی کا دیوانہ بن

جنابِ اثرؔ ذالقی بنگلوری

مست بننا ہے تو مستِ نرگسِ مستانہ بن
بے نیازِ بادہ ہو مستغنیٔ پیمانہ بن

دل کے ویرانے سے بھی بڑھکر کوئی ویرانہ ہو
ایسے ویرانے کے ہوتے رونقِ صحرانہ بن

دے رہا ہے دعوتِ نظارہ حُسنِ فریب
اے نگاہِ شوق تو بھی طور کا افسانہ بن

بے سروسامانیاں میری اگر یوں ہی رہیں
آئے گا اک دن ہو ہی جائیگا مرا کاشانہ بن

آہ میں جو بات ہے ہرگز نہیں وہ واہ میں
شعر گوئی میں اثرؔ تو میرؔ بن، سوداؔ نہ بن

جنابِ بیتابؔ کالپوی

"ہو سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن"
قصۂ دردِ محبت عشق کا افسانہ بن

حاصلِ عشق و محبت ہے اگر مدِ نظر
خود سراپا درد بن پھر درد سے بیگانہ بن

خواہشِ امیدِ ہستی کو مٹا کر عشق میں
تشنہ کامانِ محبت کے لئے پیمانہ بن

ماسوا کو چھوڑ کر ہو جا پرستارِ وفا
نشۂ صہبائے حسن و عشق کا مستانہ بن

صورتیں دو ہی تو ہیں بیتابؔ عرضِ شوق کی
یا خدا کا کعبہ ہو یا عاشقِ بتخانہ بن

جنابِ رحمتؔ آندھروی

جان دے گر ہو سکے شمعِ شبستاں کے لئے
بن سکے تو عشق میں ہم صورتِ پروانہ بن

فکرِ دنیا سے الگ ہو سانس آزادانہ لے
چھوڑ کر دیر اور کعبہ ساکنِ ویرانہ بن

تشنہ کامانِ محبت مست ہوں بے ہوش ہوں
اتنی قدرت ہے اگر تو ساقیٔ میخانہ بن

وصل کی دلبر تمنا ہو جواں کہتے ہیں تیرے
اپنی ہستی کو مٹا دو عینِ دردِ جانانہ بن

بچہ بچہ کی زباں پر نام ہو رحمتؔ ترا
اہلِ دنیا کے لئے ایسا کوئی افسانہ بن

جنابِ غازیؔ دہلوی از بمبئی

عشق کی تکمیل فرما عقل سے بیگانہ بن
وہ بھی دیوانہ سمجھ لیں تجھکو ایسا دیوانہ بن

چشمِ مستِ ناز ساقی تشنہ کامی تابکے
میکشوں کے واسطے پیمانہ بن میخانہ بن

مرکزِ جذب و کشش بن اور چھا جا دہر پر
کعبہ بن سکتا نہیں اے دل تو پھر بتخانہ بن

سعیٔ تکمیلِ جنوں پر لوگ ہنستے ہیں ہنسیں
عشق میں برباد ہو خاکِ رہِ جانانہ بن

عشق میں غازیؔ مٹا دے اپنی ہستی شوق سے
نام تیرا ہو زباں پر سب کی وہ افسانہ بن

جنابِ قیسؔ ملوری

تو سراپا سوزِ الفت اے دلِ دیوانہ بن
عشق میں شمعِ رخِ محبوب کا پروانہ بن

ان گھروں میں ہیں اسی کے جلوے اے شیخِ حرم
مدتوں کعبے رہا اب ساکنِ بتخانہ بن

گر تقرب چاہتا ہے تو جمالِ یار کا
ماسوا کو چھوڑ دے اور ہوش سے بیگانہ بن

بے پلائے مست کر دے تشنہ سامانوں کو آج
دیدۂ مخمورِ ساقی بزم میں پیمانہ بن

بعدِ مردن بھی زبانِ خلق پر جاری رہے
بن سکے تو قیسؔ ایسا عشق کا افسانہ بن

جنابِ تاباںؔ بن خیر دھونکلی

جس صدف میں دُر نہ ہو اسکی جہاں میں قدر کیا
اے دلِ مضطر! امینِ جلوۂ جانانہ بن

ہو سکے تو آشنائے سوزشِ الفت بھی ہو
"بن سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن"

لطف یہ ہے وہ بھی دردِ ہجر میں ہو بیقرار
وہ بنے دیوانہ تیرا اُس کا تو دیوانہ بن

ایک ہی محبوب ہے دونوں جہاں میں بے مثال
عشق صادق ہے تو تاباںؔ عاشقِ رحمانہ بن

جنابِ رسواؔ امروہوی مقیم بمبئی

بوالہوس یک رنگ ہو ہر رنگ کا شیدا نہ بن
آشنائے خلق ہو یا خلق سے بیگانہ بن

اے دلِ بیتاب وہ جب ہوش میں لائیں تجھے
آتے آتے ہوش میں پھر ہوش سے بیگانہ بن

وقت آخر اک نظر تو دیکھ لینے دے انھیں
اے نگاہِ واپسیں حائل نہ ہو پروانہ بن

کہہ رہی ہے مجھ سے رسواؔ یہ فضا بہکی ہوئی
موسمِ گل آگیا دیوانہ بن دیوانہ بن

جنابِ سراجؔ احمد آبادی

"ہو سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن"
ورنہ بزمِ حسن کے قابل کوئی افسانہ بن

ہے تصور میں تیرے رعنا فضائے دو جہاں
شاعرِ فطرت ہے تو سعدیؔ کا افسانہ بن

تیرگی ہی تیرگی ہر سمت پھیلی ہوئی ہیں
آ تصور میں خدارا رونقِ کاشانہ بن
منکشف خود تجھ پہ ہو جائیگا رازِ دو جہاں
بے نیازِ ہوش ہو اور عقل سے بیگانہ بن

جناب ناظم کاٹھوی

اپنی ذات کچھ بھی نہیں ہر ایک سے بیگانہ بن
توڑ کر سارے تعلق عشق میں دیوانہ بن
ہے تقاضائے سرِ شوریدہ ہستی چھوڑ دے
وحشتِ دل کہہ رہی ہے رہروِ ویرانہ بن
کب روا تقلید ہے مے کش کے نصب العین کی
پھینک کر جام و سبو غارت گرِ میخانہ بن
ترک کر دو جلد ناظم رشتہ ہائے دنیوی
الفتِ حق کے سوا ہر ایک سے بیگانہ بن

جناب اختر راز چاندپوری

چند روزہ ہے جوانی، چند روزہ زندگی
وحشی و دیوانہ بن یا عاقل و فرزانہ بن
خود بخود کھل جائیگا رازِ طلسمِ زندگی
شرط اتنی ہے کہ اپنے آپ سے بیگانہ بن
اے دلِ ویراں تجھے آباد ہونا چاہئے
کعبۂ مہر و وفا بن، حسن کا کاشانہ بن
سرگروہِ بادہ خوارانِ جہاں بنتا ہے کیوں
بن سکے اختر تو میرِ مجلسِ میخانہ بن

جناب حکیم اطہر از ناسک

جذبۂ الفت ہے اگر دل اسطرح دیوانہ بن
دو بنے شمعِ محبت اور تو پروانہ بن
دل یہ کہتا ہے نہ کعبہ بن نہ تو بتخانہ بن
دوست آ جائے نظر جس میں وہی کاشانہ بن
جس کے لئے خانۂ بت وحدت سے ہو لبریز تر
لے ساقی کا اگر ممکن ہو تو مستانہ بن
رشکِ صد فرزانگی ہے پایۂ دیوانگی
ہوش رکھتا ہو اگر اطہر تو بس دیوانہ بن

جناب بسمل سورتی

کامیابی کا اسی میں راز ہے دیوانہ بن
اے دلِ ناکام راہِ عشق میں دیوانہ بن
رو چکا کب ہو سکے تجھ میں خون رونے سے مگر
چشمِ گریاں اسطرح بہتا ہوا دریا نہ بن
عقل و الفت ہوں بہم ای دل یہ ممکن ہی نہیں
عقل کا پابند ہو یا عشق کا دیوانہ بن
اے دلِ مجروحِ بسمل سخت جانی تابکے
اور پتھر ہے تو پھر سنگِ درِ جانانہ بن

جناب ضیا سنگاولی (میرٹھ)

اے دلِ بیتاب شمعِ حسن کا دیوانہ بن
"ہو سکے تو عشق میں ہم مشربِ فرہاد بن"
رازِ حسن و عشق سے آگاہ ہونا ہے اگر
سب سے پہلے تو مریدِ مرشدِ میخانہ بن
کھو نہ دے سودائے حرص و آز دنیا سے تجھے
اے فدائے جاہ حرص و آز کا پتلا نہ بن
[illegible] سب سے تو
آپ کو بیگانہ کر لے آپ سے بیگانہ بن

جناب نجم جمیلی ایولوی

تابشِ جلوہ ہو اسکی قدرتِ قدرت سے عیاں
اے دلِ حق آشنا خود جلوۂ جانانہ بن
زندگی [illegible] ربطِ اختلاط
کون کہتا ہے کہ مثلِ سبزہ بیگانہ بن
[illegible] غنچہ کبھی نذرِ خزاں
انتہا ہو باغِ عالم تو بہار افسانہ بن
[illegible]
[illegible]

جناب نثار ناصر برہانپوری

سرگذشتِ عشق کا رنگین اک افسانہ بن
جو شکستہ ہو کے میخانے میں وہ پیمانہ بن
دیکھنا کیا ہے محبت میں مرا سوزِ دروں
ہو سکے تو خود بھی شمعِ حسن کا پروانہ بن
عشق کی سرمستیوں کا لیکے ناصر جائزہ
حسن کی رنگینیوں سے کیف سے مستانہ بن

جناب منشی بڑودوی

سوزِ الفت سے دلِ پُر آرزو دیوانہ بن
شمعِ حسنِ یار کا سو جان سے پروانہ بن
یاد سب کرتے رہیں ایسا کوئی افسانہ بن
"بن سکے تو عشق میں ہم مشربِ پروانہ بن"
رات دن ہوتی رہیگی پائے بوسی یار کی
اے دلِ پُر آرزو سنگِ درِ جانانہ بن

جناب غافل از بیتول

ہے تمنائے رسائی گر لبِ محبوب تک
میکدہ کی خاک ہو جا اور پھر پیمانہ بن
دونوں جلتے ہیں مگر جلنے میں کتنا فرق ہے
شمع بنکر یہ حقیقت جان پھر پروانہ بن
کچھ بنا چاہے اگر غافل تو باغِ دہر میں
ختم ہر روداد بن آغازِ ہر افسانہ بن

جناب محسن ساگری

خود بخود ہوتا ہے انسان مبتلائے درد و غم
کون کہتا ہے کسی کے عشق میں دیوانہ بن
رہروِ راہِ محبت پیرو پیرِ مغاں
کچھ بھی بن اے محسن [illegible] مگر بیگانہ بن

جناب مذاق

تلخیوں میں بھی لبِ شیریں کی شیرینی رہے
منہ لگا کر [illegible] سب ایسا کوئی پیمانہ بن
اپنی ہستی دو جہاں میں تو فنا کر دے مذاق
شمع سے مل کر کبھی خاکسترِ پروانہ بن

جناب واصف دہلوی

عشق میں پہلے خودی اپنا مٹا دیوانہ بن
جسکا پروانہ خدا ہے اسکا تو پروانہ بن
جلوۂ جاناں کا عاشق پھر دلِ دیوانہ بن
وہ بنے ہیں شمعِ محفل ان کا تو پروانہ بن

جناب بصیر از ملیاگل

عشق میں تکمیل حاصل ہیں جنوں ساماں
ترک کر فرزانگی، دیوانہ بن دیوانہ بن
ہے سکوں نا آشنا بے تابیِ فطرت بصیر
ضبطِ سوزِ عشق کر ہم مشربِ پروانہ بن

جناب قاسم از برہانپور سی پی

توڑ ڈالا جائے مجھ کو یا پھوڑا جا سکے
اتنا تو [illegible] اور استعداد پیمانہ بن
بات میری مان لے قاسم خدا سے لو لگا
باندھ آ جا ان بتوں کا [illegible] بن

جناب خلیل المنیری

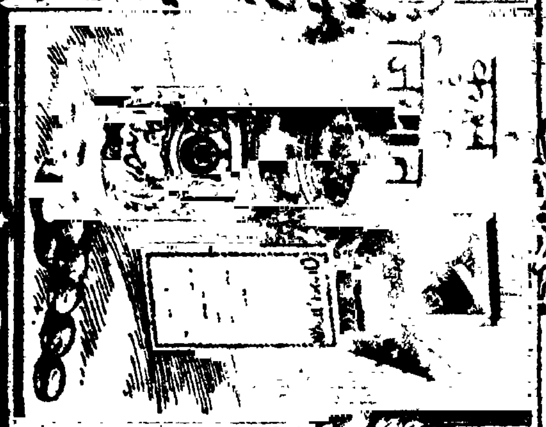
کامیابی کا ترے سر ہوگا سہرا اے خلیل
رہروِ راہِ طلب [illegible] بن

جناب قیس دالیٹر

ان بتوں کو دیکھ کر ہے آنکھوں میں کیا [illegible]
منکشف کعبے ہیں [illegible] بن

جناب فاطمی رائے گڑھی از برہانپور سی پی

نور اپنا دیکھ [illegible]
[illegible]



قرص جریان

جریان جیسے تباہ کن مرض کیلئے قرص جریان ایک نعمت ہیں جریان کا سبب خواہ کچھ ہو صرف
ہمیشہ اپنا موثر اثر دکھاتے ہیں۔ اعضائے تناسل کی بگڑی ہوئی حس کو اعتدال پر لاکر صحیح حالت
میں لاسکتے ہیں۔ اس دوا کی دو تین خوراکیں ہی کثرت احتلام کو روک دیتی ہیں۔ قیمت فی شیشی
جس میں ۲۰ یوم کے استعمال کی دوا ہے صرف دو روپے (۲) پرچہ ترکیب ہمراہ ہوگا۔

ہمارا پتہ: ہمدرد دواخانہ یونانی دہلی + ٹیلیفون نمبر [illegible]

کرشمۂ نجوم

اگر آپ زندگی کے آنے والے خطرات سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔
اگر آپ ماضی اور مستقبل کے کھرے اور صحیح واقعات معلوم کرنا چاہتے ہیں
اگر آپ اپنی زندگی کی مسرتوں میں اضافہ چاہتے ہیں۔

تو

ہم سے رجوع کیجئے ہم علم نجوم کی مدد سے آپ کے ہر سوال کا صحیح جواب دینگے۔ خط لکھتے وقت ٹھیک ٹھیک ٹائم نوٹ کر دیجئے۔ اگر زائچہ یا سال پیدائش موجود ہو تو تمام زندگی کے حالات بتلائے جاسکتے ہیں۔ فیس بذریعہ منی آرڈر پیشگی آنی ضروری ہے یا وی۔پی طلب کیجئے۔ جواب صرف اردو میں دیا جائیگا۔

تفصیل فیس

زائچہ سال ایک روپیہ۔ پرشن چل دو روپیہ۔ زائچہ دیکھکر مکمل حالات پانچ روپیہ۔ مکمل زائچہ [illegible] روپیہ۔

ایم۔ الیس۔ (ماہر نجوم) فردوس منزل مظفر نگر

گلشنِ صحافت میں ایک غنچۂ نو کا اضافہ

شباب

اُردو ادب کا ایک ترقی پسند ماہنامہ

ملک کے مشاہیر اہلِ قلم حضرات کے بلند پایہ مقالے۔ ترقی یافتہ ادب کے اعلیٰ مضامین، دلچسپ معیاری افسانے۔ اعلیٰ نفسیاتی ڈرامے تاریخی شہ پارے۔ روح نواز پر کیف غزلیں۔ وجد آفریں سرمدی نظمیں۔ دلآویز پیارے پیارے گیت۔ ماہ بماہ اپنی تمام رعنائیوں اور بہترین صوری و معنوی خوبیوں کے ساتھ مطلع صحافت پر عنقریب جلوہ گر ہوگا۔

نمونہ کا پرچہ بالکل مفت روانہ ہوگا۔ لہٰذا اپنے اسم گرامی اور مکمل پتے سے مطلع فرمادیں۔

منیجر شباب۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۱۴۹ بمبئی نمبر ۳

صبحِ مشرق محمد صادق صاحب ضیا بی۔اے ایل ایل بی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ مع تصویر مصنف قیمت دو روپیہ (عہ)

نشترکدہ ۔ بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ایڈووکیٹ کا دیوان مع تصویر مصنف۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)

فغانِ آرزو ۔ سید انوار حسین آرزو لکھنوی کا دیوان قیمت دو روپیہ (عہ)

گلکدہ ۔ حضرت عزیز لکھنوی (استاد جوش ملیح آبادی) کا دیوان۔ قیمت دو روپیہ

گلزارِ داغ ۔ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی مرحوم و مغفور کا مشہور دیوان قیمت عہ

جگر پارہ ۔ حضرت بیدم شاہ وارثی کا دیوان ۔ قیمت ۱۲

مصحفِ بیدم ۔ بیدم شاہ مرحوم کا دوسرا دیوان ۔ مع مقدمہ حضرت خواجہ حسن نظامی ۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

کمالِ داغ ۔ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے چاروں دیوانوں کا انتخاب مع مقالہ تنقیدی قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ)

روحِ نظیر ۔ از مخمور اکبرآبادی بی۔اے ۔ انتخاب کلام مع مقدمہ و تبصرہ قیمت دو روپیہ (عہ)

قصائدِ نجم ۔ حضرت نجم آفندی اکبرآبادی خلف حضرت بزم اکبرآبادی کے بلند پایہ قصائد ۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ایوانِ تصور ۔ شریمتی سروجنی نائیڈو کے رنگین اور دلکش گیتوں کا ترجمہ قیمت ایک روپیہ (عہ)

مختلف دواوین

دیوانِ غالب ۔ غزلیات امیر و نظیر ۔ انتخاب کلام اکبر الہ آبادی ۔ دیوانِ اکبر میناپوری ۔ دیوان کاسے خاں سنبل ۔ کلام داغ ۔ بہارِ معرفت ۔ دیوان حافظ شیرازی

عروض کی منتخب، معتبر اور عام فہم کتابیں

عام فہم عروض ۔ آسان زبان میں عروض کے درس دئے گئے ہیں۔ قیمت ۸

نکاتِ شاعری ۔ عروضی معلومات کے علاوہ ہر لفظ کے کئی کئی قافیے اس میں درج ہیں۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

چراغِ سخن ۔ عروض، علم قافیہ اور بحور وغیرہ کی تشریح میں مرزا یاس عظیم آبادی کی بہترین تصنیف ۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

[illegible]

معلومات کے لئے نہایت بلیغ کتاب ہے۔ قیمت عہ

مشاطۂ سخن ۔ مصنفہ مضطر مرزاپوری۔ مسلم الثبوت اور مشہور اساتذہ کی اصلاحوں کے نمونے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

جانِ سخن ۔ بحور، صنائع بدائع ۔ تقطیع کرنے کے قاعدے اور علم قافیہ کی تشریح متروک الفاظ کی فہرست بھی شریک کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ایشیائی شاعری ۔ مصنفہ مولانا شہری مرحوم۔ اس کتاب میں تمام اصناف شاعری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ایضاح القوافی ۔ علم قافیہ پر توضیحی اور تفصیلی کتاب۔ مصنفہ حضرت شوخ اکبرآبادی ۔ قیمت دس آنہ (۱۰)

مثنویاں

مثنوی عالمِ خیال ۔ مصنفہ مرزا شوق قدوائی لکھنوی مرحوم مع تصاویر قیمت عہ ۔ سادہ ۸

مثنوی مادرِ ہند ۔ مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم ۔ قیمت ۱۲

مثنوی ظہورِ رحمت ۸ ۔ مثنوی زہرِ عشق کامل عہ

مشہور افسانہ نگاروں کے مشہور افسانے

نگارستان ۔ مصنفہ حضرت نیاز فتحپوری قیمت دو روپیہ (عہ)

گہوارۂ تمدن ۔ مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت کا کیا حصہ ہے قیمت عہ

شہاب کی سرگذشت ۔ مصنفہ مولانا نیاز فتحپوری اُردو لٹریچر میں بہت بلند اور بالکل نیا افسانہ ۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

شمیم (باتصویر کامل) مصنفہ فیاض علی بی۔اے (علیگ) سبق آموز افسانہ بطور داستان ۔ فنِ ناول نویسی میں ایک معرکۃ الآرا انقلابی تصنیف۔ قیمت ہر دو حصہ کامل چار روپیہ (للعہ)

کیفستان ۔ انتخاب قیسی رامپوری ۔ اس میں کئی دل کش افسانے ہیں قیمت ایک روپیہ (عہ)

آتش پارے ۔ از جناب سعادت حسن منٹو مصنف کا نام افسانوں کی اہمیت کا ضامن ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

زندگی کے کھیل ۔ از [illegible] احمد اکبرآبادی قیمت [illegible]

دنیا کی حور۔ مصنفہ حضرت کوثر چاندپوری مع دیگر افسانوں کے
قیمت دس آنہ (۱۰/)

محبت کا افسانہ۔ ازل۔ احمد اکبرآبادی قیمت دو روپیہ عہ/
شب چراغ۔ بہترین تہذیبی خوشگل اور جذباتی افسانوں کا مجموعہ
از جناب ضیا بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی قیمت ۸/
قاتل۔ مصنفہ ایم اسلم مع دوسرے افسانوں کے۔ قیمت دو روپیہ (عہ/)
نغمات۔ ازل۔ احمد اکبرآبادی قیمت ایک روپیہ
زادِ راہ۔ مصنفہ منشی پریم چند۔ آخری اور بہترین افسانہ قیمت عہ/
انشائے لطیف۔ ازل۔ احمد اکبرآبادی قیمت دو روپیہ (عہ/)

مختلف افسانے

سرگذشتِ اسیر عہ/۔ سندر کی خداوندہ ۲/۔ مجودہ عہ/۔ دغا ۸/
فسانۂ سلطنت مغلیہ ے/۔ طوفانِ زندگی عہ/۔ عروجِ زندگی عہ/۔ شیطان کا پنجہ ۶/
عبرت کدہ ۱۲/۔ خانقاہ اسرار ۶/۔ چتوڑ کی دیوی ۱۲/۔ مغربی دلہن ۱۰/
بدرِ کمال عہ/۔ بالشویک شہزادی ۳/۔ انارکلی ۲/۔ جنات کی شہزادی ۳/۔ پر پروانہ ۳/
شیطان زادہ ۳/۔ شیطان کا چرخہ ۴/۔ دوست ۲/

ظریفانہ افسانے

بحرِ تبسم عہ/۔ موجِ تبسم عہ/۔ سیلابِ تبسم عہ/۔ طوفانِ تبسم عہ/
منشی جی عہ/

یہ پانچوں ظریفانہ کتابیں حضرت شوکت تھانوی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ ان کے پڑھنے سے دماغی تفریح ہوتی ہے اور ہنستے ہنستے آدمی لوٹن کبوتر بن جاتا ہے۔

صرف عورتوں کے لئے

بہشتی مجوہر ۱۲/۔ گھر اور گھر والی ۴/۔ شوہر کی نصیحتیں ۴/
آدابِ نسواں ۶/۔ شریا بیگم ۴/۔ صبر کی دیوی ۲/۔ ناصح مشفق ۲/
عقیلہ بیگم ۴/۔ معین الخواتین ۸/۔ زنانہ خطوط ۵/۔ کفایت شعاری ۳/
لوری نامہ ۲/۔ پہیلی نامہ ۲/۔ انشائے نسواں ۸/۔ اصلاح الرسوم ۲/
آفتابِ زندگی ۸/۔ مہتابِ زندگی ۸/۔ چاند تارے ۸/

مختلف کمیاب کتابیں

مینائے سخن۔ منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی مرحوم کی تمام
واسوختوں کا بے نظیر مجموعہ۔ قیمت عہ/
مغل اور اردو۔ ادیب الملک نواب نصیر حسین خاں خیال مرحوم کی لاجواب تصنیف۔ اس میں اردو کے ابتدائی دور سے لے کر مغلوں کے دور تک ہر زمانے کے تدریجی واقعات قلمبند کئے گئے ہیں۔ بڑا سائز حجم ۱۵۰ صفحات قیمت عہ/
نورِ مشرق مہرلال ضیا سونی ایم۔ اے کی روح افروز معیاری نظموں کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ عہ/
اربعہ عناصر۔ حکیم محمود علی خاں ماہر اکبرآبادی کی رموز و نکات سے لبریز رباعیوں کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ (عہ/)
حسنِ کار۔ فنونِ لطیفہ پر دلچسپ پیرائے میں جامع تبصرہ۔ قیمت ۶/
داستانِ عجم۔ مصنفہ نواب نصیر حسین خاں خیال مرحوم۔ شاہنامۂ فردوسی پر بے نظیر تبصرہ۔ قیمت ایک روپیہ (عہ/)
روحِ نظم۔ میر سے لے کر آج تک کے اکثر شعرا کے کلام کا انتخاب۔ از مولانا تاجور نجیب آبادی و میلارام صاحب وفا۔ دو حصے مکمل قیمت ے/
روحِ انتخاب۔ اردو نثر اور اردو لٹریچر کا ضروری تاریخی انتخاب دو حصوں میں۔ قیمت حصہ اوّل ۱۲/۔ حصہ دوم عہ/

محامد الخلفا۔ قرآن مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام کے مستند اور مکمل حالاتِ زندگی۔ قیمت مجلد ۸/
معین الشعرا۔ از غلام معین خاں آفاق بنارسی مرحوم۔ یہ وہ عدیم المثال لغت ہے جس میں عربی۔ فارسی۔ اردو۔ انگریزی اور ہندی زبان کے ہزاروں الفاظ کے معنی کے علاوہ ہر لفظ کے اعداد ملفوظی صحت کے ساتھ درج کر دئیے ہیں جو تاریخ نکالنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ہر لفظ کے متعلق یہ بھی درج ہے کہ وہ کس زبان کا ہے اور مذکر ہے یا مؤنث۔ نہ صرف یہی بلکہ اساتذۂ متقدمین و حال کے کلام سے ہر لفظ کی تذکیر و تانیث کا ثبوت بھی پیش کیا گیا ہے۔ حقیقتاً یہ لغت طالبانِ ادب و شعر کے لئے خضرِ راہ ہے۔ سائز ۲۲×۱۸/۴ حجم ۳۰۶ صفحات مجلد۔ قیمت چار روپیہ للعہ/
بزمِ خیال۔ از جناب معتدر مرزا ایڈیٹر۔ اس کتاب میں شعرائے اردو اور فارسی کی مجالس کے لطائف و ظرائف کو جمع کیا گیا ہے۔ برجستہ گوئی اور حاضر جوابی کے

تصانیف مولانا حالی پانی پتی

مسدس حالی (عکسی) ۱۲ر۔ مسدس حالی (سادہ) ۸ر۔ مرثیۂ غالب ۲ر
مناجات بیوہ ۲ر۔ شکوۂ ہند ۲ر۔ حبِ وطن ۲ر۔ چپ کی داد ۲ر

مختصر تصانیف علامہ ڈاکٹر سر اقبال مرحوم

شکوہ جواب شکوہ ۴ر۔ شمع و شاعر ۴ر۔ فریادِ امت ۴ر
اکبری اقبال ۳ر۔ نالۂ یتیم ۲ر۔ تصویرِ درد ۳ر

سوانح عمریاں

امت کی مائیں ۷ر۔ بنت الرسولؐ ۶ر۔ سوانح خاتونِ جنتؓ ۴ر۔ سوانح ام حسینؓ ۴ر
فاطمہ کا لالؓ ۱۲ر۔ سوانح حضرت صدیق اکبرؓ ۷ر۔ سوانح حضرت عمر فاروقؓ ۸ر
سوانح حضرت علی کرم ۱۲ر۔ سوانح امام اعظمؒ ۱۲ر۔ تذکرہ صابرؒ ۱۲ر۔ سوانح
خواجہ غریب نوازؒ ۱۲ر۔ سوانح غوث پاکؒ ۱۲ر۔ مناقب حضرت غوث گوالیاریؒ ۸ر
تحفۂ دربار ولایتؒ ۶ر۔ خمخانہ برکاتؒ ۳ر۔ قصص الانبیاء ۱۲ر۔ حیاتِ خواجہؒ ۶ر
تذکرہ خواجگانِ چشتؒ ۸ر۔ سوانح اورنگ زیب ۸ر۔ سوانح زیب النساء ۸ر
سوانح اکبر اعظم ۸ر۔ سوانح نورجہاں بیگم ۸ر۔ سوانح غازی محمد بن قاسم ۴ر
حیاتِ انیس ۱۲ر۔ حیاتِ سعدیؒ ۶ر۔ حیاتِ حافظؒ ۶ر۔ حیاتِ جانی اکبرآبادی ۶ر
خالدہ ادیبہ خانم ۱۰ر۔ حیاتِ خسروؒ ۶ر۔ سوانح شاہجہانؒ ۸ر۔ حیاتِ فردوسی ۶ر

صنعتی کتابیں

اسرارِ صنعت ۱۲ر۔ دولت کا ڈھیر ۸ر۔ چائے کی معلومات ۴ر

تاریخی کتابیں

تاریخ کا روشن پہلو ۸ر۔ حکایاتِ کشمیر ۸ر۔ کشمیر کی رانیاں ۴ر۔ معمارانِ کعبہ ۸ر۔ عروجِ ٹرکی ۸ر
کشمیر کا مستقبل ۴ر۔ ترکانِ احرار ۱۲ر۔ اشرف التواریخ کامل ۴ر۔ خضر منزل ۸ر۔ خلافت الٰہیہ ۱۲ر
انقلابِ فرانس ۱۲ر

مذہبی کتابیں

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق ۔ مؤلفہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
اخلاق اور فلسفۂ اخلاق کے تمام گوشوں پر دلپذیر اور مکمل بحث اور اسلام کے ابواب اخلاق کی عملی تشریح جس سے اسلامی اخلاقیات کی برتری نہ صرف اعتقادی طور پر بلکہ علم و تحقیق کے معیار پر تمام ملتوں کے ضابطہائے اخلاق کے مقابلہ میں واضح ہو جاتی ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہترین حجم ۴۴۲ صفحات۔ قیمت للعہ (بڑا سائز)

غلامانِ اسلام مؤلفہ حضرت مولانا سعید احمد ایم۔ اے اکبرآبادی فاضل دیوبند۔ جس میں ان مقتدر ہستیوں کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و جستجو سے یکجا کئے گئے ہیں۔ جن کو غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود اسلامی سوسائٹی میں عظمت و اقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا ہے اور جن کے علمی، مذہبی تاریخی اور اصلاحی کارنامے نقشِ دوام بن کر سینۂ عالم پر ثبت ہو چکے ہیں۔
حجم ۵۲۲ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ بہترین قیمت للعہ (بڑا سائز)

اسلام کا اقتصادی نظام ۔ مؤلفہ حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی جس میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا نظامِ اقتصادی ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کرکے اعتدال کی راہ پیدا کی ہے کتابت و طباعت اور کاغذ بہترین حجم ۲۴۸ صفحات ۳۰×۲۰/۱۶ قیمت ۱۲ر

اسلام میں غلامی کی حقیقت ۔ مؤلفہ حضرت مولانا سعید احمد ایم۔ اے اکبرآبادی فاضلِ دیوبند جس میں غلامی کی حقیقت، اس کے نفسیاتی، اخلاقی اور اقتصادی پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ غلامی کا آغاز کب سے ہوا۔ اسلام سے پہلے کن کن قوموں میں یہ رواج پایا جاتا تھا اور اس کی صورتیں کیا تھیں۔ اس کی کل تاریخ پھر اسلام نے اس رواج کو اس وقت کن مجبور کن حالات کی وجہ سے باقی رکھا اور اس میں کیا کیا اصلاحات کیں اور ان سب سے اسلام کا اصل منشا کیا ہے۔ اس کے بعد مشہور مصنفین یورپ کے بیانات اور یورپ کی اجتماعی غلامی پر مفصل بحث اور تبصرہ کیا گیا ہے۔ بڑا سائز کتابت و طباعت اور کاغذ بہترین حجم ۲۷۲ صفحات قیمت ۱۲ر

جوازِ تعزیہ ۸ر۔ ارشادِ احمدؐ ۲ر۔ قومی نظم ۴ر۔ تقویم الاسلام ۱۲ر۔ کمالاتِ قرآنی ۱۲ر

مولانا شرر لکھنوی کے ناول

حسن کا ڈاکو ۱۲ر۔ قیس و لبنیٰ ۱۲ر۔ یوسف و نجمہ ۱۲ر۔ فلپانا ۱۲ر
ملک العزیز ورجنا ۸ر۔ منصور موہنا ۱۰ر۔ فردوسِ بریں ۸ر۔ دلکش کامل ۱۲ر
بدر النساء کی مصیبت ۳ر۔ طوما فوزندا ۱۲ر۔ حسن کی ۱۲ر

عرصۂ اشاعت ۱۱ سال

منظور شدہ ہائے تعلیم بہار و ریاست میسور

نگار

تصاویر:- (۱) وزیرزادہ شجاعت خاں صاحب قہر جوناگڈھی (۲) جناب شہ زور کاشمیری - بی - اے

جلد ۱۲ | ماہنامہ "شاعر" آگرہ - نومبر ۱۹۴۱ء | نمبر ۱۱

[illegible] مولانا کے [illegible] ۱۲ سے [illegible] عہ ہندوستان عہ خواص سے عہ عوام سے عہ فی پرچہ ۴

سرپرستین محسنین معاونین انیسین ہمدردان ادب

سرپرست ادب و شعر

(۱) عالیجناب خان شری امام الدین خان متان فرسوا والئی پاجود کاٹھیاواڑ

محسنین ادب و شعر

(۲) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ۶۰ سالانہ

(۳) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد رضا صاحب نیر خورجوی ۶۰ سالانہ

(۴) محسنۂ ادب ہر ہائینس علیہ حضرت کتیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ سالانہ

(۵) محسنۂ ادب شہزادی تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ سالانہ

معاونینِ ادب

(۶) معاونِ ادب مسٹر اے۔ بی فلپس صابر بی۔ اے اکبرآبادی ۲۴ سالانہ

(۷) معاونۂ ادب محترمہ بیگم تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی ۲۴ سالانہ

(۸) معاونِ ادب جناب مولوی محمد احمد صاحب رسوا سہارنپوری ۲۴ سالانہ

انیسانِ ادب

(۹) انیسِ ادب جناب سید تفضل کریم صاحب جمشید پوری ۱۵ سالانہ

ہمدردانِ ادب

(۱۰) ہمدردِ ادب جناب مولوی عبد الغفور صاحب سلیمان جالندھری ۱۲ سالانہ

(۱۱) ہمدردِ ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید علی حسان نسیم گوالیاری مرحوم ۱۲ سالانہ

(۱۲) ہمدردِ ادب جناب نواب زادہ کنور مشکور حسین خانصاحب نفیس آف ہندوڑ ۱۲ سالانہ

(۱۳) ہمدردِ ادب جناب بابو عبد العظیم خانصاحب رونق دکنی ۱۲ سالانہ

(۱۴) ہمدردِ ادب جناب مولوی محمد قاسم صاحب نامی علوی دربھنگوی ۱۲ سالانہ

(۱۵) ہمدردِ ادب جناب اسمٰعیل کھوکھر صاحب ناز جوناگڈھی ۱۲ سالانہ

(۱۶) ہمدردِ ادب جناب صاحبزادہ سید مظفر حسین صاحب تبسم (ہندوارہ والی راجہ علم) ۱۲ سالانہ

(۱۷) ہمدردِ ادب جناب محمد حسن صاحب حق ہوٹل رڈکی ۱۲ سالانہ

خاصانِ ادب

(۱۸) جناب صاحبزادہ سلطان احمد خانصاحب ثروت گلشن آبادی ۱۰ سالانہ

(۱۹) جناب صاحبزادہ خلیق الزمان خانصاحب شفق ٹونکی ۱۰ سالانہ

(۲۰) جناب عبد الحفیظ صاحب شمر صدیقی پھلواروی بی۔ اے ۱۰ سالانہ

(۲۱) جناب محمد حسین خانصاحب [illegible] بہاری ۱۰ سالانہ

(۲۲) [illegible] ۱۰ سالانہ

(۲۳) جناب سید مظفر حسین صاحب عرشی دہلی ۱۰ سالانہ

(۲۴) جناب دیس راج شر ما بی۔ سی۔ ڈی۔ فرخ منڈی جہلم ۱۰ سالانہ

(۲۵) جناب سید علی حیدر صاحب عابد جمشید پور ۱۰ سالانہ

(۲۶) جناب صاحبزادہ عبد الحمید خانصاحب بہادر عباسی بی۔ اے ۱۰ سالانہ

(۲۷) جناب [illegible] حسن خانصاحب اثر بمبئی۔ ۱۰ سالانہ

(۲۸) جناب نذیر احمد صاحب نذیر شیرکوٹی ۱۰ سالانہ

(۲۹) جناب صبغت اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی ۱۰ سالانہ

(۳۰) جناب صاحبزادہ سیٹھ اکبر علی صاحب جنڈارہ ۱۰ سالانہ

(۳۱) جناب مخدوم سید علی آسد نقوی البخاری احمد آباد (جھنگ) ۱۰ سالانہ

(۳۲) جناب طالق ہمدانی لدھیانوی ۱۰ سالانہ

(۳۳) جناب سبحان خان صاحب غافل بٹولی ۱۰ سالانہ

(۳۴) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی گوپامہ ۱۰ سالانہ

(۳۵) جناب حبیب خانصاحب حبیب شاہجہانپوری ادکوٹ ۱۰ سالانہ

(۳۶) جناب بابو نقیر محمد خانصاحب عارف سیالکوٹی (کوئٹہ) ۱۰ سالانہ

(۳۷) جناب شیو پرشاد صاحب برگ باندوی ۱۰ سالانہ

(۳۸) جناب ہدایت اللہ خان صاحب شمیم کوٹلی ۱۰ سالانہ

(۳۹) جناب حکیم ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب نثار لکھنوی ۱۰ سالانہ

(۴۰) جناب علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی ۱۰ سالانہ

(۴۱) جناب [illegible] صاحب [illegible] ۱۰ سالانہ

(۴۲) [illegible]

جرعات

مفتیٔ راندیر — اور — "موحدِ اعظم"

حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب کو میں ایک بزرگ انسان کی حیثیت سے جانتا ہوں اور ان کا احترام کرتا ہوں۔ چند گھنٹے اُن کے مکان پر رہنے کا فخر بھی حاصل کر چکا ہوں۔ مجھے اب کچھ دن پہلے اُن کے علم و فضل پر اتنا ہی یقین و اعتقاد تھا جتنا اُن کی بزرگی پر آج تک ہے۔ لیکن مفتی صاحب نے ماہِ رمضان کی فرصت سے فائدہ اٹھا کر مولانا سیاب اکبرآبادی مدظلہ کی نظم "موحدِ اعظم" پر اپنی خواہش یا کسی کے کہنے سننے سے مذہبی تنقید کے ساتھ علمی و فنی غلط در غلط نکتہ چینی کر کے اپنی معلومات اور وسعتِ نظر کا کچھ اچھا ثبوت نہ دیا اور میرے معتقدات کو مجروح کر دیا، نہ صرف میں بلکہ اُن کے بہت سے مداح اُن سے دل برداشتہ نظر آتے ہیں۔

مذہب اور سیاست سے میں "شاعر" کا دامن ہمیشہ بچاتا رہا ہوں۔ لہٰذا مذہبی نقطۂ نگاہ سے مفتی صاحب کے اعتراضات کا جواب بمبئی اور مظفر نگر سے "مدینہ" اور "زمزم" لاہور میں دیا جا رہا ہے ناظرین ملاحظہ فرمالیں۔

جہاں تک علمی و فنی اعتراضات کی نوعیت کا تعلق ہے میرا فرض مدیری اور حق فائق ہے کہ میں مفتی صاحب کے ہر ارشاد کی تردید کروں۔ میرے احباب کا وسیع حلقہ مجھے اس بات پر مجبور بھی کر رہا ہے۔ میرے تمام احباب مطمئن رہیں کہ مذکورہ بالا جوابی مضامین ہر حیثیت سے فیصلہ کن ہونگے اور اگر پھر بھی کچھ ضرورت باقی رہے گی تو میں "شاعر" کے ذریعہ اس کی تکمیل باحسن الوجوہ کر دوں گا۔

میں جانتا ہوں کہ علمی و فنی اعتراضات کا جواب نہ دینا لوگوں کو گمراہی میں ڈال سکتا ہے مثلاً اگر کوئی کہدے کہ لفظِ "مفتی" "مفت" سے بنا ہے اور مفتی صاحب اس کی تردید میں یہ نہ فرمائیں کہ "مفتی" "فتویٰ" سے بنا ہے اور اس کے معنی فتویٰ دینے والے کے ہیں تو یقیناً اُن کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ یہی بنیاد میرے جواب کی ہوگی۔

اس بحث کا راستہ تا مدیریت ... [illegible] ... اس کی ایک خارج ... [illegible] ... کی سرحدیں [illegible]

کو درہم برہم کر دیگا۔ مسٹر رمنڈ ویلٹ کی طرح ہم دیکھیں گے کہ جرمنی اور رشیا کس فیصلے پر پہونچتے ہیں۔ اس کے بعد اگر ضرورت ہوئی تو عملاً ہمیں بھی برسرِ میدان سمجھئے۔

سرِ دست یہ کہدینا کافی ہے کہ "موحدِ اعظم" پر جس نقطۂ نگاہ سے اعتراض کیا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ افسوس یہ ہے کہ موجودہ علما مذہب کی سطح سے بلند جانا ہی نہیں چاہتے اور نہ عقل و مذہب کو متوازن دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ وہ مذہبی روایات کو معقولات سے بالکل الگ تھلگ رکھنا چاہتے ہیں۔ خیر، یہ اُن کا ذاتی نظریہ ہے۔ اس کے علاوہ "موحدِ اعظم" کے اشعار پر علم و فن کے پیشِ نظر جو اعتراضات کئے گئے ہیں وہ پرِ کاہ کی برابر بھی وزن نہیں رکھتے۔ اگر ضرورت کا تقاضا ہوا تو اس دعوے کی دلیل آپ کے سامنے ہوگی۔

فانیؔ مرحوم اور "شاعر"

شاعر کی گذشتہ اشاعت میں حضرت فانیؔ بدایونی مرحوم کے متعلق جو مضامین پیش کئے گئے تھے وہ عام طور پر ادبی حلقوں میں بہت پسند کئے گئے۔ ہر چند یہ مضامین بڑی عجلت میں فراہم کئے گئے تھے اور اُن میں زیادہ تر زیادہ "شاعر" کے فاضل مضمون نگاروں کی توجہ کو دخل تھا لیکن ایسی صورت میں جبکہ دور رسائل و اخبارات نے فانیؔ مرحوم پر اُن کی شاعرانہ عظمت کے مطابق مضامین لکھوانے اور انہیں شائع کرنے میں بخل سے کام لیا "شاعر" کی وہ یکجائی حقیر پیش کش یقیناً جاذبِ توجہ ہونی چاہئے تھی۔ ہم نے اپنا فرض ادا کیا تھا اور فرض کی ادائیگی فخر و نازش سے بے نیاز ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ ادبی دنیا کو "شاعر" کی علمی ادبی اور فنی خدمات کا اعتراف ہے۔

اس اشاعت میں بھی فانیؔ مرحوم پر ملک کے نامور ادیب مولوی آلِ احمد صاحب سرورؔ لیکچرار اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا وہ مقالہ شائع ہو رہا ہے جو موصوف نے ۱۵ اکتوبر کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے نشر فرمایا تھا۔ فانیؔ مرحوم پر مضامین کا یہ سلسلہ وقتاً فوقتاً جاری رہے گا۔ یو۔پی کی شخصیت پرستی کتنی ہی مُردہ اور دوسرے صوبوں کی صوبائی عصبیت کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو جائے "شاعر" مشاہیر ادبا اور شعرا کے اعلانِ کمال سے کبھی غافل نہ رہے گا۔

ماہنامہ "جامعہ" دہلی اور ماہنامہ "ادبِ لطیف" لاہور

[illegible]

اس لئے نہیں کہ اس کی بطو عات کی قصیدہ خوانی کی جائے بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ جس حیثیت کی جو تصنیف ہو اُس پر کھلے دل سے ایک ایسا تبصرہ کیا جائے کہ ادبی دُنیا کے سامنے اس تصنیف کے تمام پہلو آجائیں اور ایک تبصرہ نگار کا فرض بھی یہی ہے کہ وہ کتاب پر کم از کم اتنی روشنی ڈالے کہ پڑھنے والا اس کے حسن و قبح سے اچھی طرح واقف ہو جائے لیکن افسوس کہ بعض رسائل کے تبصرہ نگار مصنفین کو نیچا دکھانے کی کوشش میں اپنی بے لیاقتی کا ثبوت دیتے ہیں، اور خواہ مخواہ ایک غلط بحث پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو جانبدارانہ تبصرہ نگاری عصبیت اور ذاتی پرخاش ایک تبصرہ نگار کے لئے باعثِ شرم ہے

ابھی کچھ عرصہ ہوا کہ مکتبۂ قصر الادب کی نئی کتاب "ساز و آہنگ" ہندوستان کے چند اچھے اور بلند معیار رسائل کو تبصرہ کے لئے بھیجی گئی تھی ــــ ان میں سے "جامعہ" دہلی اور "ادبِ لطیف" لاہور کے مبصروں نے آنکھوں پر بغض و عناد کی عینک لگا کر جو دل میں آیا لکھ دیا۔ اب ان سے کون کہے کہ حضرت اپنے رسائل کے پرانے فائل اُٹھا کر دیکھئے کہ ان میں مولانا سیماب کی نظم نگاری کے متعلق کیا لکھا گیا ہے اور جناب نے کیا جھک مارا ہے۔ مجھے ان دونوں رسائل کے فاضل مدیروں سے سخت شکایت ہے کہ انھوں نے اپنے مبصرین کی غلط اور غیر ذمہ دارانہ رائے کی اشاعت کیوں روا رکھی۔ بغیر دلیل کچھ لکھ دینا دیوانہ کی بڑ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

یہ میں سمجھتا ہوں کہ ان رسائل کے مبصرین کی آواز اپنے اثر کے اعتبار سے صفر کی حیثیت بھی نہیں رکھتی، افسوس کہ ان دونوں رسائل میں مبصرین کے نام نہیں ہیں۔ ورنہ میں اُنھیں بتاتا کہ تبصرہ نگاری کسے کہتے ہیں۔ جن ادبا، شعرا اور صاحبِ نظر حضرات نے مجھے ان رسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان کی کا ممنون ہوں۔ شاعر کی آئندہ اشاعتوں میں "ساز و آہنگ" پر ایک تبصرہ شائع ہو رہا ہے۔ فاضل تبصرہ نگار نے ان رسائل کے تبصروں پر بھی روشنی ڈالنے کا وعدہ کیا ہے ناظرین پر مبصرینِ "جامعہ" اور "ادبِ لطیف" کی حقیقت آشکار ہو جائے گی۔

اس اشاعت کے مضامین

بغیر مبالغہ و فخر مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ "شاعر" جس کثرت سے علمی، فنی ادبی، تنقیدی، تحقیقی اور تاریخی مضامین پیش کر رہا ہے۔ اس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی۔ معدود معاصرین نے جب سے افسانوں، ڈراموں اور تراجم کو "ترقی یافتہ ادب" کا لیبل دیا ہے ہر وقت سے ہمارے ادب میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے۔ میں اُس ترقی کا قائل نہیں جو بے راہ روی کے باز دعوں سے جاہد جو علمی و ادبی قوتوں کے اثرات عوام کی خاطر ہلکے کر دے۔ ہماری سنئے قوم کے ادب کا زوال کیسے نکلتے ہیں۔ اور جب ہم اُردو کے "ترقی یافتہ ادب" کا اس کے ساتھ توازن کرتے ہیں۔ [illegible]

پہلے علمی و ادبی مضامین کی اشاعت رسائل کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھی ــــ اور اب ان کی جگہ افسانے اور نوجوان ناتجربہ کار ادیبوں کے ٹوٹے پھوٹے مضامین ہوتے ہیں

شاعر کی اس اشاعت میں پانچ علمی و ادبی مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ اگر شاعر کے صفحات اجازت دیں تو یہ تعداد دگنی اور تگنی کی جا سکتی ہے۔ میرے نزدیک تعداد کے ساتھ معیار بھی بڑی چیز ہے، اور شاعر کی زیر نظر اشاعت اس کا ایک ادنیٰ ثبوت ہے۔ پہلا مضمون "انیسویں صدی میں اُردو اخبارات و رسائل" اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے جو جولائی ۱۹۵۵ء کے شاعر میں شائع ہو چکی ہے۔ مولانا ابو اللیث صاحب صدیقی بدایونی نے جولائی کے شاعر میں رسائل کے نام اور مقامات مع ضروری حواشی پیش کئے تھے، زیر نظر مقالہ میں کارڈن پورٹ کا ترجمہ اور اس پر تبصرہ ہے ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے۔ مولانا ابو اللیث کی نگاہِ تحقیق ناظرینِ شاعر کے لئے بہت دلچسپ اور مفید سامانِ مطالعہ بہم پہنچا رہی ہے۔ "اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے ممنوعات و قیود کی ضرورت ہے۔" دوسرا مضمون ہے۔ جناب ولی گوالیاری نہ صرف ایک اچھے شاعر ہیں بلکہ ادیبانہ صلاحیتوں کے بھی مالک ہیں اور اُن کا یہ مضمون اس کا ثبوتِ بہترین ہے۔ ولی صاحب نے ممنوعات و قیود کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا ہے کہ ممنوعات و قیود ہی ہمیں دوسری مخلوق سے ممیز کرتے ہیں۔ ولی صاحب پہلی بار بحیثیت ایک ادیب کے صفحاتِ شاعر پر جلوہ گر ہو رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ "شاعر" کو اپنے ادبی شہ پاروں سے متقلاً نوازتے رہیں گے۔ تیسرا مضمون "ترجمہ" ہے۔ اس تحقیقی مضمون کے حصول کی نوعیت بھی عجیب ہے۔ غالباً اوائل ۱۹۴۸ء میں میرے مخلص جناب توکل ڈبائیوی بی۔ اے نے "ماڈرن ریویو" لاہور کے ایک بہت مختصر مضمون کا ترجمہ "شاعر" میں اشاعت کے لئے بھیجا تھا جو "زند" کی صد سالہ برسی اور اُس کے کمالِ فن سے متعلق تھا۔ میں نے اُس کے اختصار کی وجہ سے اُس کی اشاعت مناسب نہ سمجھی اور اس فکر میں رہا کہ کوئی صاحب چھان بین کر کے "زند" کے مفصل حالاتِ زندگی اور اس کے کلام کا کچھ حصہ اُردو کے قالب میں ڈھالدیں بڑے غور و فکر کے بعد میری نظر جناب سید ظہیر الدین مدنی ایم۔ اے پر پڑی۔ موصوف چونکہ سورت ہی کے رہنے والے ہیں جو "زند" کا وطن تھا اور گجراتی سے بھی واقف ہیں۔ اس لئے آپ سے میرے پیہم تقاضوں سے متاثر ہو کر اس اہم ترین کام کو انجام دیا مجھے اچھی طرح علم ہے کہ موصوف کو زیادہ بڑی دقتوں کا سامنا ہوا لیکن اُن کی یہ پیش کش اُردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ "زند" کو پڑھنے کے بعد ناظرین یقیناً مسرور ہونگے۔ میری خواہش پر ظہیر صاحب نے "زند" کی خود تصویر بھی بھیجی تھی لیکن افسوس کہ وہ اس قدر خراب تھی کہ اُس کا بلاک نہیں بن سکا۔ "اشاعتِ لطیف" [illegible]

"شاعر" [illegible]

کردہ خطوط مرحوم کے تھے اور یہ اُن ادبا و شعرا کے ہیں جو بقیدِ حیات ہیں۔ حضرت [illegible] مرتب کردہ خطوط اپنے افادہ میں کسی طرح کم نہیں ہیں۔ پانچواں اہم مضمون **شوکت علی خاں فانی** بدایونی ہے جو بدیر موصول ہونے کی وجہ سے اپنے صحیح مقام سے ہٹ گیا ہے۔ مولوی آل احمد سرور پہلی بار [illegible] فرما رہے ہیں۔ اپنے مختصر مقالہ میں سرور صاحب نے فانی مرحوم پر جو تنقید کیا ہے وہ ریڈیو کی وقت والی پابندی کی وجہ سے کتنا ہی اکھڑا ہوا اور مختصر سہی لیکن بڑی حد تک جامع ہے اور یہ موصوف کی ادیبانہ قوت ہے۔ مجھے اُن کے مقالہ کی یہ ادا بہت پسند ہے کہ اُنھوں نے کہیں غلو سے کام نہیں لیا ہے، بلکہ فانی مرحوم کو حقیقت سے نزدیک کرنے کی کوشش کی ہے۔

افسانوں میں "**رات کی رانی**" شاعر کے مخصوص افسانہ نگار جنابِ جاوید سرحدی کا رہینِ قلم ہے۔ جاوید صاحب کے افسانوں کا داخلی پہلو بیکاری، بھوک اور سرمایہ داری کے خلاف بغاوت ہے جو کسی نہ کسی پہلو سے اُن کے افسانوں میں موجود ہوتا ہے۔ یہ افسانہ بھی ایک بیکار نوجوان کی المناک داستان ہے۔ "**تارک الدنیا**" کے ساتھ ایک نیا افسانہ نگار آپ کے سامنے آیا ہے۔ آغا زاہد علی صاحب اکبرآبادی ہر چند نو آموز معلوم ہوتے ہیں لیکن اُن کا پیش کردہ رومان کافی دلچسپ ہے اور امید کی جاتی ہے کہ وہ اگر لکھتے رہے تو اچھے افسانہ نگار ہو جائیں گے۔ "**پتیارن**" ہندو عقائد سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ ماں کی کشمکش، ودیارتھی کے دو اہم پہلو ہیں۔ جناب شایق ہنگامی بی۔اے کے ترجمہ شدہ افسانے "شاعر" کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئے ہیں جو حقیقتاً کافی دلچسپ ہوتے ہیں۔

حصۂ نظم کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن "جائے تنگ است" والا مضمون ہے۔ شاعر کے حصۂ نظم کا معیار اتنا بلند ہوتا ہے کہ اس پر کچھ لکھتے ہوئے بھی قلم رُکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ میں اساتذہ، مشاہیر شعرا اور اپنے ترقی یافتہ نوجوان شعرا کے کلام کی حقیقی داد نہیں دے سکتا۔

اس اشاعت میں ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے کہ نظمیں بہت زیادہ ہیں اور غزلیں کم۔ **تبصرہ۔ میری حقیقت۔ حرام کیا ہے۔ خوابِ زندگی۔ پری محل** اور **طیارہ** مشاہیر شعرا کی بصیرت افروز، حقیقت آشکار اور بلند پایہ نظمیں ہیں۔ غزلیں بھی سب کی سب کیف آور اور روح نواز ہیں۔

مشاعرۂ شاعر میں خان بہادر علامہ رضا علی وحشت کلکتوی، علامہ سیماب اکبرآبادی اور جگل پیارے حضرت مولانا [illegible] کی [illegible] گیا دی ہے جیسے اساتذہ کی غزلوں نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اس مرتبہ ۲ فیصدی غزلیں خلافِ بحر وصول ہوئی ہیں۔ حالانکہ [illegible]

خلافِ بحر میں اس بحر پر عبور حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ مشق کرنی چاہئے۔

سنہ ۱۹۴۱ء میں "شاعر" نے نظم و نثر کا جو معیار پیش کیا ہے وہ علمی و ادبی رسائل کے لئے ناقابلِ مقابلہ ہے۔ میں کوشاں ہوں کہ "شاعر" کا ہر آنے والا پرچہ اپنی گزشتہ اشاعت سے بلند ہو۔ **دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء کے "شاعر"** کے لئے اہم ترین مضامین وصول ہو چکے ہیں۔ حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی کی معرکۃ الآرا اور ہیجان آفرین تازہ ترین نظم "**غیر اللہ کو پہلا سجدہ**" بھی شریکِ اشاعت ہوگی۔

عرضداشت

کاغذ اپنی گرانی کی آخری منزل پر پہنچ گیا ہے اور اب اُس کی فراہمی کے لئے جتنی مصیبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں وہ کچھ ادارہ ہی جانتا ہے۔ اس گرانی اور نایابی کے باوجود شاید ناظرین نے محسوس کیا ہو کہ تین ماہ سے "شاعر" کے حجم میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے اخبارات اور رسائل اپنے صفحات کم کر رہے ہیں اور "شاعر" اضافہ کر رہا ہے۔ دوسرے معاصرین قیمتیں بڑھا رہے ہیں اور "شاعر" اُسی قلیل چندہ میں "سستہ مفتِ نظر" بنا ہوا ہے ——— کس لئے؟ "چشمِ خریدار پہ احسان" کے لئے نہیں بلکہ زبان و ادب کی حقیقی خدمت کے لئے، اردو ادب کو پستی کی طرف لیجانے والوں کے خلاف محاذ قائم کرنے کے لئے اور آپ کے لئے زیادہ سے زیادہ معیاری سامانِ مطالعہ بہم کرنے کے لئے۔

آجکل اخبارات و رسائل نزع کی سی کیفیت محسوس کر رہے ہیں۔ سرمایہ داروں کے قدم ڈگمگا رہے ہیں تو ——— خود فرمائیے کہ اس گرانی کے بھنور میں سفینۂ "شاعر" قوت و برداشت کی کیا مجال رکھتا ہے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ وہ ایک خادمِ ادب کا آرگن ہے ——— میں بحیثیت ایک ادبی خادم کے آپ سے ایک عرصہ کے بعد یہ درخواست کر رہا ہوں کہ آپ اپنی ہمدردی کا ہاتھ بڑھا کر میری مشکلات کو کچھ ہلکا کر دیں۔ ہمیشہ میری تمنا یہی ہے کہ "شاعر" کا کوئی قدیم خریدار "شاعر" کا وی۔پی۔ واپس نہ کرے لیکن اکثر میری اس آرزو کو بری طرح کچل دیا جاتا ہے اور "شاعر" [illegible] نقصان کا بارِ گراں دکھایا جاتا ہے۔ کاش ناظرین خود اس کا احساس فرمائیں اور "شاعر" کی اقتصادی حالت کو سنوارنے میں میری مدد فرمائیں۔

اعجاز صدیقی

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

ہے حالِ جہاں غیر، خدا خیر کرے
دنیا میں بڑھا بیر، خدا خیر کرے
رشیا کا اٹل ہے شروعِ خطرات
اللہ کرے خیر، خدا خیر کرے

اب فرصتِ عرضِ مدعا بھی تو نہیں
امکانِ قبولِ التجا بھی تو نہیں
کس سے کرے فریادِ ستم بے چارہ
انسان کا کوئی خدا بھی تو نہیں

ٹھہرے گا نہ وقت کوچ کر جائے گا
آئیگا ادھر اور ادھر جائے گا
جس سے نپولین کبھی گذرا تھا
اسی راہ سے ہٹلر بھی گذر جائیگا

وہ چاہے تو پھر روس کو پھیلا دیوے
ہٹلر کو سزائے ظلمِ بے جا دیوے
شیطان کا حامی گر اب تک ہے خدا
مفتی سے کہو کفر کا فتوا دیوے؟

جو ظلم میں آمادۂ امداد رہے
آخر کو سدا ناشاد رہے
[illegible] اٹلی کی [illegible]
[illegible]

تیغ اُسکی جو بے نیام ہو جائے گی
وجہِ امن و سلام ہو جائے گی
ترکی نے جو میدان میں گاڑا پرچم
سب کی ترکی تمام ہو جائے گی

اللہ کی خوئے رحم کاری نہ گئی
شورش میں بھی فکرِ غمگساری نہ گئی
یورپ نے زمیں سے تا فلک بھر دی آگ
لیکن فطرت کی بردباری نہ گئی

یہ جنگ فنا ہونے کی دعوت تو نہیں
ہنگامِ وداع و وقتِ رخصت تو نہیں
آغاز ہی آغاز ہے جس کا ابتک
اُس جنگ کا انجام قیامت تو نہیں؟؟

آثار کے ساتھ ہی فضا بدلے گی
پہلو اپنا یہ دوسرا بدلے گی
تا چند بساطِ کہنہ و رنگِ قدیم؟
دنیا کوئی پیرہن نیا بدلے گی

زندانِ قدامت سے نکل جا تو بھی
ہے فرصتِ ہوش ابھی سنبھل جا تو بھی
رہنا ہے جو محفوظ قدامت سے [illegible]
کہتا ہے کہ ساتھ ہی بدل جا تو بھی

بیتاب

شخصیات :- وزیرزادہ شجاعت خاں صاحب مہر جوناگڈھی

آپ کا نام شجاعت خاں اور مہر تخلص ہے۔ وزیرزادہ خاندانی نسبت ہے آپ ۱۹۱۹ء اگست کو دوشنبہ کے دن ریاست جوناگڈھ (کاٹھیاواڑ) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ بزرگوار کا نامِ نامی عثمان خاں تھا۔ مہر صاحب کے جدِ امجد شیخ بہاؤالدین مرحوم کاٹھیاواڑ کی ترقی یافتہ اور اوّل درجہ کی ریاست جوناگڈھ کے وزیر اور مدارالمہام تھے۔ شیخ صاحب نے متواتر تین فرمانروایانِ جوناگڈھ کے عہد میں کرسیِ وزارت کو رونق بخشی۔ وزیر موصوف بڑے فیاض، ہر دلعزیز اور علم دوست بزرگ تھے۔ مہر صاحب کے والدِ محترم عثمان خاں صاحب مرحوم بڑے خلیق۔ ملنسار۔ علم دوست اور پایہ کے بزرگ تھے۔ کتب بینی کا بیحد شوق تھا۔ مرحوم کی ایک ذاتی لائبریری بھی تھی جس میں اردو۔ انگریزی۔ فارسی۔ عربی اور گجراتی زبان کی کثیر التعداد کتابیں تھی۔

ابھی مہر صاحب کی عمر ۳-۴ سال ہی کی تھی کہ آپ کے والدِ بزرگوار کا عین عالمِ شباب میں انتقال ہوگیا اور آپ کی تعلیم و تربیت کا بار آپ کی والدۂ ماجدہ کے سر پر آپڑا۔ آپ کی والدۂ محترمہ کو آپ کی تعلیم اور خاندانی اقتدار و روایات کو برقرار رکھنے کا حد سے زیادہ خیال تھا۔ چنانچہ آپ کی تعلیم کے لئے قابل معلمین مقرر کئے گئے جو آپ کو مکان ہی پر گجراتی اور انگریزی کی تعلیم دیتے تھے۔ خداداد فہم و فراست اور ذہانت کے باعث چند سال ہی میں آپ نے ان دونوں زبانوں میں کافی استعداد حاصل کرلی اور انگریزی زبان کے لکھنے اور بولنے میں آپ کو اچھا خاصہ ملکہ ہوگیا۔ ان زبانوں کے ساتھ ساتھ آپ کو اردو سے بھی ایک خاص لگاؤ تھا ہر چند جوناگڈھ کی فضائیں اردو کے لئے ناموافق تھیں لیکن آپ کے فطری ذوق نے اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر اردو کی اچھی کتابوں، ادباء کے مضامین اور مشاہیر شعراء کے کلام کا پابندی کے ساتھ مطالعہ شروع کردیا اور فیضِ مطالعہ نے آپ کو ایک قلیل مدت میں کہیں سے کہیں پہونچادیا۔

علمِ موسیقی سے آپ کو فطری لگاؤ ہے۔ اس کم عمری میں بھی آپ فنِ موسیقی کو اچھی طرح سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ تمام راگ راگنیوں سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ آپ کے کمالِ فن موسیقی کا اعتراف بڑے بڑے ماہرینِ فنِ موسیقی کو ہے۔

[illegible]

بھی ہو، ذوقِ شعرگوئی بھی ہو۔ علم بھی ہو اور موسیقی کا شغف بھی ہو تو اس کے لئے شعر کہنا کیا مشکل ہے۔ چنانچہ موسیقی مہر صاحب کی شاعری کی محرک ہوئی اور آپ نے اردو زبان میں شعر کہنا شروع کردیا۔ آپ کے اشعار سن کر مقامی اربابِ علم نے آپ کی ہمت بڑھائی اور اس طرح یہ ذوق ترقی کرتا گیا۔ شروع میں جوناگڈھ کے دو ایک کہنہ مشق شعراء کو آپ نے اپنا کلام دکھایا لیکن آپ جس بلندی پر پہونچنا چاہتے تھے وہ آپ کو حاصل نہ ہوئی۔ اور آپ ایک رہبرِ کامل کے متلاشی رہے۔ آخر بعض احباب اور سخن فہم حضرات کی تحریک سے ۔ ار مئی ۔ ۱۹۴۶ء کو آپ حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی مدظلہ کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوگئے۔ بڑھے ہوئے فطری ذوق۔ استاد مدظلہ کے کلام کے مطالعہ اور فیضِ اصلاح سے بہت جلد آپ کا رنگِ سخن کہیں سے کہیں پہونچ گیا۔ اب آپ کی رفتارِ ترقی سے پڑھا لکھا طبقہ اور خود آپ کے استاد بیحد مطمئن ہیں۔

آپ کا شمار رؤسائے جوناگڈھ میں ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ آپ کا سلسلہ قرابت بھی شاہی خاندان سے ہوگیا ہے۔ علیا حضرت کنیز فاطمہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ کی ہمشیرزادی آپ سے منسوب ہیں۔ ہز ہائینس نواب صاحب بہادر جوناگڈھ کو آپ کے اسلاف کی خدمات کا اس قدر خیال ہے کہ مہر صاحب کے والد کی وفات کے بعد آپ کی کفالت کے لئے ایک گرانقدر وظیفہ مقرر کردیا جس نے آپ کو فکرِ معاش سے بے نیاز کردیا۔

آپ اپنا زیادہ وقت کتب بینی اور علمی مشاغل میں صرف کرتے ہیں۔ اپنے والد مرحوم کے کتب خانہ کو ترقی دینے اور اچھی اچھی کتابوں کے جمع کرنے کا آپ کو ہر وقت خیال رہتا ہے۔ اردو کے کئی مقتدر رسائل آپ کے پاس آتے ہیں اور حسبِ مقدرت ان کی اعانت بھی فرماتے رہتے ہیں۔ آپ کے یہاں اکثر مجالسِ سخن منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ جوناگڈھ اور قرب و جوار کی ریاستوں کے مشاعروں میں بھی آپ شریک ہوتے ہیں اور آپ کا کلام بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ جوناگڈھ کے پہلے نوجوان شاعر ہیں۔ جن کے کلام کی اشاعت رسائل و اخبارات میں زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے اور آپ کو فخر ہے کہ جوناگڈھ میں شعر و ادب کا مرکز بن [illegible]

آپ نے بڑی شگفتہ طبیعت پائی ہے انتہائی خلیق اور ملنسار ہیں۔ اپنے رئیسانہ ماحول کے باوجود آپ میں رئیسانہ نخوت و غرور نہیں پایا جاتا۔

قمر صاحب کا حقیقی زمانۂ شاعری اُس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب سے آپ علامہ سیماب اکبر آبادی مدظلہ کے تلامذہ میں شریک ہوئے۔ اس قلیل مدت میں آپ نے جو ترقی کی ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار ؎

تصور کی صورت گری کے تصدق ۔۔۔ اُسے سامنے جلوہ گر دیکھتا ہوں
عجب چیز ہے حُسن کی دلکشی بھی ۔۔۔ ارادہ نہیں ہے مگر دیکھتا ہوں
جنونِ محبت کا عالم سلامت ۔۔۔ اب اُجڑا ہوا اپنا گھر دیکھتا ہوں
ترا دیکھنا غیر ممکن ہے پھر بھی ۔۔۔ بقدرِ مجالِ نظر دیکھتا ہوں

جن میں سلاست، روانی، معنویت اور لپک ہے، ایک ایسے شاعر کے ہو سکتے ہیں۔ جس کا زمانۂ شاعری بہت مختصر اور محورِ زبان کا ٹھیا وا رہے۔ یہ صرف قمر صاحب کی مشقِ مطالعہ اور استاد کا فیض ہے۔ قمر صاحب کا تغزل صحیح معنوں میں تغزل ہے، فلسفۂ حقائق اور معارف سے انھیں کوئی سروکار نہیں وہ اپنی غزلوں میں جذبات محبت سے کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں ؎

ہوگا کبھی تو ملتفت وہ تری عرضِ حال پر ۔۔۔ قمر تو داستانِ غم اپنی اُسے سُنائے جا
کم ہوگیا ہے اُن کا شوقِ نمود ۔۔۔ ہیں حسرتیں ہزاروں اشک کسی نظر میں
جس جگہ دم بھر تمہاری یاد کر لیتا ہوں میں ۔۔۔ اک نئی دُنیا وہیں آباد کر لیتا ہوں میں
قافلے پہنچے ہزاروں منزلِ مقصود پر ۔۔۔ رہ گئے ہم ہی ترا نقشِ کفِ پا دیکھنے
جب تصور ترا نہیں ہوتا ۔۔۔ زندگی میں مزا نہیں ہوتا
کتنا ہمدرد ہے خیال ترا ۔۔۔ مجھ سے دم بھر جدا نہیں ہوتا
قمر سے تم خفا ہوتے لیکن ۔۔۔ قمر تم سے خفا نہیں ہوتا
بری جا فطرت میں ہے یہ نیرنگ سازی ہنشیں ۔۔۔ فصلِ گل میں آشیاں کو یاد کر لیتا ہوں میں
قمر جب صبر آزما ہوتی ہے بیدادِ جمال ۔۔۔ کم نگاہِ عشق سے فریاد کر لیتا ہوں میں
نگاہِ شوق سے او چھپ کے بیٹھنے والے ۔۔۔ مری نگاہ میں ہیں وسعتیں زمانے کی
جُدا ہو کر مری بالیں سے وہ کہ موت آئی ۔۔۔ فضا تھی ناک میں گویا کسی بہانے کی
قمر شیدا ہوں خضر کی کیوں ہو جستجو ۔۔۔ عشق نے مجھے جہاں میں عشق سا رہنما دیا

اعجاز صدیقی

تحقیق و تصحیح

"شاعر" کی گذشتہ اشاعت میں جناب شفا گوالیاری نے بستی، پستی، ہستی وغیرہ قوافی کے ساتھ "ہنستی" اور "شروعات" کے متعلق استفسار فرمایا تھا۔ چونکہ اس مسئلے کو معمولی سمجھتے ہوئے مجلّہ نے اپنی رائے کا اظہار کر دینا کافی نہ تھا بلکہ تحقیق طلب تھا۔ ذیل میں شفا صاحب جن کی توجہ بسالہ رہنمائے تعلیم بابت اگست ۱۹۳۱ء کی طرف بھی مبذول فرمائی ہے۔ مذکورہ رہنمائے تعلیم دیکھنے سے معلوم ہوا کہ حضرت دعا ڈبائیوی نے اپنی ایک نظم میں یہ لفظ استعمال کیا ہے اور اس کے جواز کے متعلق بھی تحریری طور پر روشنی ڈالی ہے۔

حضرت دعا نے "شروعات" کی صحت کے سلسلے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ یہ ہے۔

(۱) "سب سے پہلے میں نے اپنے گھر میں دریافت کیا جو خدا کے فضل سے (دلی) کے ایک معزز خاندان کی لڑکی ہے۔ اُنہوں نے کہا یہ لفظ ہم لوگوں کی زبان پر ہے اور صحیح ہے۔"

(۲) مزید اطمینان کی غرض سے ابوالمعظم ثانی داغ نواب میرزا سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کے پاس میں نے ایک نیاز نامہ ارسال کیا۔ آں مخدوم نے باوجود اپنی علالت طبع کے میری خط کا جواب دیا ہے وہ بجنسہ برائے اشاعت رسالہ ہذا کو دیتا ہوں تاکہ اہلِ فن حضرات اس سے استفادہ حاصل کریں اور آئندہ شروعات کی صحت میں ان کو کوئی شک نہ رہے۔"

حضرت سائل نے جو کچھ تحریر فرمایا وہ یہ ہے۔

"لفظ "شروعات" جس کی سند تم چاہتے ہو میرے نزدیک بر انہیں زبان زد عام ہونے کے سبب غلط العام کے تحت میں آگیا ہے۔ میں نے کراہت کی نظر سے نہیں دیکھا۔ تمہاری خاطر کی بطور سند ایک شعر موزوں کرکے بھیجتا ہوں ؎

کیا اس سے کوئی ایسے سے کیا بات کرے
بدکلامی سے جو بات کی شروعات کرے"

حضرت سائل جیسے زبان کے سرچشمہ ہیں اور ان کی سند قابلِ تسلیم ہے۔ اس کا اعتراف میرا [illegible] ہے۔ حضرت سائل کی رائے سے استفادہ کرنے والا [illegible] جاتا ہے کہ [illegible]

[illegible] "شروعات" کے متعلق حضرت [illegible]

ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی جانشین مرزا داغ دہلوی اور وحید العصر حضرت بیخود دہلوی جانشین مرزا داغ دہلوی سے استفسار کیا چنانچہ ان دونوں استادانِ فنِ شعر نے جواباً جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) "شروعات" کوئی لغت نہیں ہے دلّی والے جاہل مرد اور عورتیں لڑائی کے وقت یہ کہا کرتی ہیں کہ "شروعات" تم نے کی تھی۔ میں نے پہل نہیں کی تھی۔ کیونکہ شروع کے املا میں "ع" ہے اس لئے کسی لکھے پڑھے جاہل نے شروعات کو بھی "ع" سے لکھ دیا۔ ورنہ "شرواتیں" بغیر عین کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی پہل کرنے کے ہیں جیسے "دولع" کو اہل زبان خصوصاً عورتوں کی زبان میں بدالکتے ہیں "ع" نہیں بولتے۔ اسی طرح "شروات" میں بھی "عین" نہیں بولتے۔

خم جاں بیخود دہلوی

(۲) "شروعات" غلط ہے۔

میں نے نہ اس کو کسی لغت میں نہ کسی مستند شاعر کے کلام میں دیکھا۔ میری بھی رائے وہی ہے جو بھائی بیخود صاحب کی ہے۔ نوح از نارہ

میں نے ذاتی طور پر حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی سے "شروعات" کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ:۔

"یہ لفظ میں نے جہلا سے سُنا ہے ـــــ مگر فصحا کو بولتے یا لکھتے نہیں دیکھا۔"

حضرت سائل، حضرت نوح، حضرت بیخود اور حضرت سیماب چاروں ایک ہی استاد کے تلامذہ جلیل ہیں جن کی ذاتی معلومات سے ٹکرانا بہت مشکل ہے اس علم کے بعد کہ حضرت سائل نے دعا صاحب کو بطور جواز میں سند دی ہے۔ بقیہ تینوں استادانِ فن کی رائے سے ہم کس طرح اختلاف کر سکتے ہیں اور اختلاف کی گنجائش ہی کہاں ہے۔ میرے خیال میں حضرت دعا کو اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیے اس سے ان کے وقارِ شاعری کو کوئی ٹھیس نہیں لگے گی۔ خصوصاً اس حالت میں کہ اس لفظ کی تغلیط میں خود ان کے استادِ محترم اور ان کے استاد بھائی بھی شریک ہیں۔

بستی، پستی کے ساتھ "ہنستی" کے قافیہ کے جواز اور عدمِ جواز کے متعلق آئندہ اشاعت میں ایک مفصل محققانہ جواب پیش کروں گا۔ ناظرین شاعر منتظر رہیں۔

اعجاز صدیقی

تبصرہ

(۱)

گردشِ افلاک کو زیر و زبر پاتا ہوں میں
انقلابِ تازہ کی پیہم خبر پاتا ہوں میں

ہر گھڑی میں سن رہا ہوں گونج طوفان کی
چشمکِ آفاق میں برق و شرر پاتا ہوں میں

ہر نفس، موجِ ہوا کا سنسناتا تیر ہے
لب پہ گیتی کے صدائے الحذر پاتا ہوں میں

گھر رہے ہیں قتل کے دَل بادل بلاؤں کو لئے
اک بھیانک تیرگی میں بحر و بر پاتا ہوں میں

زلزلے بیدار ہیں بنیادِ ہستی کے تلے
سعیِ لاحاصل کی صورت بام و در پاتا ہوں میں

جنگ کے شعلے لپکتے ہیں نگاہِ موت سے
خون میں ڈوبی ہوئی ہر رہگذر پاتا ہوں میں

اک تلاطم ہر طرف ہے، اک تصادم ہر طرف
عرصۂ ہستی میں رزمِ خیر و شر پاتا ہوں میں

(۲)

حرص کے ہاتھوں میں جلتا ہے چراغِ رنگ و بو
اہلِ محنت کے لئے خوف و خطر پاتا ہوں میں

دیکھتا ہوں فن کو اکثر کم نگاہوں کا شکار
در پہ استبداد کے فرقِ ہنر پاتا ہوں میں

سن رہا ہوں نوجواں کلیوں کی آہِ دردناک
نخل و برگ و گل کے سینے پر تبر پاتا ہوں میں

سلب ہے ظلم کے پنجے میں ناداری کی جان
بیکسی کی بھی مگر تیکھی نظر پاتا ہوں میں

پرفشاں گو ہیں فضاؤں میں شاہین و عقاب
ننھی چڑیوں کو مگر سینہ سپر پاتا ہوں میں

نبضِ خار و خس میں بھی بجلی کی بے چینی سی ہے
خاک پر گرتے ہوئے شمس و قمر پاتا ہوں میں

ہے جبیں پر گردِ مجبوری بگولوں کی نقیب،
ابروئے مظلوم کو تیغِ دو سر پاتا ہوں میں

بے لبوں کی آہ میں ہے اک سمومِ انتقام
مثلِ خورشیدِ تپاں داغِ جگر پاتا ہوں میں

(۳)

اہلِ شبِ تاریک کی چینِ جبیں میں منفعل
کچھ سراغِ خندۂ نورِ سحر پاتا ہوں میں

موجۂ سیلاب کی آغوش میں پلتے ہوئے
شاخِ مرجاں اور انبارِ گہر پاتا ہوں میں

وصل ہو ذروں کے اک کوہِ گراں بننے کو ہے
خاک میں پنہاں حدیثِ معتبر پاتا ہوں میں

دلگدازوں میں مچلتا ہے جمالِ آبشار
ناز فرما سنگ میں گھلتے شرر پاتا ہوں میں

لڑ رہے ہیں صبحِ تاریکی کے فرزندانِ شب
نیکیوں کی فتح اس میں مستتر پاتا ہوں میں

ہے بگڑنے میں چھپی اس کے سنورنے کی ادا
زندگی کو طرزِ نو سے جلوہ گر پاتا ہوں میں

آشنا ہوگی حیات اب اک نئی تعمیر سے
عزمِ انساں کو بہ اندازِ دگر پاتا ہوں میں

اب مقدر ہی یہی تعمیر کے خالق ہوں ہم
ہاں اسی جانب مشیت کی نظر پاتا ہوں میں

اختر اورینوی

اُنیسویں صدی میں اُردو اخبار اور رسالے

(بہ سلسلۂ شاعر جولائی ۱۹۴۱ء)

اُردو کے پُرانے اخباروں اور رسالوں کی فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں بھی آجکل کی طرح اخبار بینی کا شوق عام تھا اور اسی وجہ سے اخباروں کی تعداد میں سال بسال اضافہ اور ان کی اشاعتوں میں روز افزوں ترقی نظر آتی ہے لیکن ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان اخباروں کے تقریباً نصف پرچے حکومت ہند خریدا کرتی تھی اور باقی نصف میں انگریز اور ہندوستانی خریدار شامل تھے۔ ممالک مغربی وشمالی کے انتظام کے بارے میں ۱۸۷۰ء کی جو سرکاری رپورٹ شائع ہوئی تھی اس سے صحیح اعداد وشمار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کُل اخباروں کی تعداد	۳۳
کُل پرچے	۷۰۶۴
سرکاری خریداری	۲۹۱۰
انگریز خریدار	۳۴۸
ہندوستانی خریدار	۳۸۵۸

اِن ۳۳ اخباروں میں ۲۰ اخبار اُردو زبان کے ۶ ہندی کے ۵ مشترک اُردو اور ہندی کے۔ ایک بنگال کا اور ایک مشترکہ اُردو انگریزی کا نکلتا تھا۔

اِن کا مقابلہ ایک سال پہلے اعداد وشمار سے کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ سال ۱۸۶۹-۷۰ء میں صرف اس صوبہ میں ۲۶ اخبار نکلا کرتے تھے۔ جن کے پرچوں کی مجموعی تعداد ۵۰۰۹ تھی اُن میں سے صرف ۳۰۵۸ پرچے ہندوستانی اخبار پڑھنے والوں کے نام جاری تھے۔

ہندوستانی اخباروں کی کارگزاری کے متعلق ایک دلچسپ دستاویز وہ سرکاری رپورٹ ہے جو ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ چونکہ اس رپورٹ سے اس زمانہ کے اخباروں کی عام حالت پر اچھی روشنی پڑتی ہے اس لئے اس کے بعض حصے ہدیۂ ناظرین ہیں۔

[illegible] دیسی اخبارات [illegible] جو ۱۸۷۳ء میں اضلاع شمال و [illegible] ایم اے ڈائرکٹر

سررشتۂ تعلیم ممالک مغربی وشمالی۔

بنام سی۔ اے۔ ایلیٹ صاحب بہادر سکریٹری گورنمنٹ ممالک مغربی وشمالی۔

مقام الٰہ آباد ۲۵ مارچ ۱۸۷۳ء

۱۔ میں جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے لاحظہ کے واسطے ان نقشوں کو ارسال کرتا ہوں جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اضلاع شمال مغرب میں ۱۸۷۲ء میں دیسی اخبار اور رسالے کس زبان اور کس مقام پر چھاپے گئے اور ان کے کس قدر پرچے جاری ہوئے اور اس کے ساتھ اپنی مفصلۂ ذیل رائے پیش کرتا ہوں۔

۲۔ ۱۸۷۱ء میں تیس (۳۰) اخبار چھپتے تھے اور ان کے کل سات ہزار پانچسو چورانوے (۷۵۹۴) پرچے جاری ہوتے تھے۔ اس سال میں حسب ذیل جدید اخبار جاری ہوئے "بدھ پرکاش" الٰہ آباد جو "نور الابصار" کا ہندی ترجمہ ہے، "پریاگ دوت" جو بنگالی زبان کا ایک اخبار ہے۔ "محب ہند" میرٹھ۔ یہ ایک اُردو اخبار ہے جو لارنس گزٹ کے ایڈیٹر نے جاری کیا ہے۔ "ناگری پرکاش" جو اسی اخبار کا ہندی ترجمہ ہے۔ "لوح محفوظ" اردو مراد آباد۔ "سانڈرس گزٹ" اردو شاہجہانپور۔

۳۔ ۱۸۷۱-۷۲ء میں سررشتۂ تعلیم میں سولہ اخبار لئے جاتے تھے اور ان کے پرچوں کی تعداد ڈھائی سو سے لیکر تین سو تک تھی۔ جیسا کہ میری پچھلی رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے، اس سال گورنمنٹ نے تئیس (۲۳) اخبار لئے مگر کسی اخبار کے تیس سے زیادہ اور بیس سے کم پرچے نہیں لئے گئے۔ سب سے زیادہ پرچے اُردو اخباروں میں نور الابصار، آئینۂ علم الٰہ آباد اور علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے اور ہندی اخباروں میں "بدھ پرکاش" الٰہ آباد اور "منگل سماچار" میسوال اور کرو چن سردھا بنارس کے لئے گئے۔

۴۔ کسی اخبار کے تین سو اکیاسی سے زیادہ پرچے نہیں چھپے چنانچہ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے پرچوں کی یہی تعداد ہے، سابق میں اس اخبار کے چار سو باسٹھ (۴۶۲)

پرچے جاری تھے مگر چونکہ ان پرچوں میں کمی واقع ہو گئی جو سیر کار یعنی تھی اس وجہ سے کمی ہو گئی
[illegible] سب سے زیادہ پرچے یعنی تین سو سولہ (۳۱۶) دبدبہ سکندری رامپور کے چھپتے ہیں۔
انگریز لوگ آگرہ اخبار کو سب سے زیادہ لیتے ہیں۔ چنانچہ اس باب میں کوئی اٹھاسی کے
قریب ہیں۔ نقشے خاص ایڈیٹر کے پاس سے وصول ہوتے ہیں۔ پس ایک سو پچاس پرچے جو
انگریزی خریداروں کے خانے میں درج کیے گئے ہیں۔ ان کی نسبت اعتراض کرنے کی
مجھ کو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی، اس اخبار کا اڈیٹر آگرہ کالج کا منشی اول ہے۔ سال
پیوستہ میں علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے ۵۳ یوروپین خریدار تھے مگر اس سال ۲۸ درج
کیے گئے ہیں۔ نقشہ کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی لوگ دبدبہ سکندری کو سب سے زیادہ
لیتے ہیں یعنی اس کے دو سو سینتالیس (۲۴۷) ہندوستانی خریدار ہیں، بعد اس کے دو سو پچیس ۲۲۵
ہندوستانی خریدار الہ آباد کے بنگالی اخبار کے ہیں، سال پیوستہ میں اس کے ہندوستانی
خریداروں کی تعداد آٹھ سو پچیس (۸۲۵) درج کی گئی تھی مگر اس سال میں صرف دو سو (۲۰۰) ہندوستانی
اس کے خریدار ہیں اور پرچوں کی کل تعداد بجائے ایک ہزار پینسٹھ کے تین سو پانچ رہ گئی
میری دانست میں اڈیٹر نے نادہند خریداروں کے نام اپنی کتاب سے خارج کر دیے ہیں،
اخبارات کے پرچوں کی اوسط گھٹ کر بجائے دو سو ترپن (۲۵۳) کے ایک سو باسٹھ رہ گئی
مگر سرکاری امداد کی از سرِ نو تقسیم ہونے سے اُن کی اصلی تعداد برابر ہو گئی ہے ہندوستانی
اخباروں میں کم سے کم نصف اخبار تو ایسے ہیں جن کے جاری کرنے کی کوئی وجہ بجز اس کے
سمجھ میں نہیں آتی کہ چھاپے خانے کے ہونے سے ضرور ہوتا ہے کہ ملازموں سے کچھ نہ کچھ کام
ضرور لیا جاوے حالانکہ فائدہ برائے نام ہوتا ہے اور علاوہ اس کے سرکاری امداد
کی توقع ہوتی ہے اور ایڈیٹری کے پیشے کی بھی لوگ قدر کرتے ہیں۔

۵۔ جو امداد گورنمنٹ ہندوستانی اخبار نویسوں کو دیتی ہے اور جو نتیجے اس سے
پیدا ہوتے ہیں ان کی نسبت دہلی انسٹیٹیوٹ کے مئی کے مہینے کے رسالے میں بیان
کیا گیا ہے کہ ممالک مغربی شمالی میں جو بمقابلہ پنجاب کے زیادہ اخبار چھپتے ہیں اُس کا سبب
ہے کہ سرکاری مدارس کے استعمال کے واسطے ان کے پرچے خرید کیے جاتے ہیں مگر اس کے
باعث سے کچھ ان اخباروں کی عمدگی نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ پنجاب کے اخبار بھی جن کو
اس قسم کی امداد کم ملتی ہے ایسے ہی عمدہ ہیں جیسے کہ اضلاع شمال مغرب کے ہیں۔
اکثر اخبار اور اخباروں سے بیترا اطلاعنامہ کے مضمون لے لیتے ہیں اور معتبر خبریں جمع کرنے
یا اصلی مضامین کے لکھنے کا قصد نہیں کرتے بلکہ جانتے ہیں کہ وہ گورنمنٹ کی اس تدبیر
کو عمدہ بتلاتے ہیں کہ وہ اخباروں کو اصلی شوق اور تحقیقات کرنے کا ذریعہ ہو کر ان کے
اجرا کو ترقی دیتی ہے۔ اب دیہات کی چوپالوں میں بھی اخبار سننے کا شوق [illegible]
باعث سے گفتگو کے ایسے ذریعے حاصل ہوتے ہیں جو کہ اور طرح پہ ان کو خیال میں نہ آتا
چنانچہ دیہاتی لوگ دور دور اخباروں کے سننے کے واسطے جاتے ہیں میری دانست
میں تحریر مندرجہ صدر ان شخصوں کے واسطے خاطر خواہ جواب ہے جو ہندوستانی
اخباروں کو وقعت دینے کے اس طریقے کی نسبت اعتراض کرتے ہیں۔ اس میں کچھ
شبہ نہیں کہ عوام لوگ آزاد مطبع کے فائدوں سے ہنوز بخوبی واقف اور حکام کے افعال
اور احکامات کی نسبت آزادانہ طور پر رائے دینے کے عادی نہیں ہوتے ہیں اور
اکثر لوگوں کو بجز اپنے مطالب کے اور کسی بات کی پروا نہیں ہوتی ہے اور اُن کو ایک
دوسرے کا اعتبار نہیں ہوتا ہے اور وہ بجز مسلّمہ ضرورتوں کے اور کسی امر پر روپیہ
صرف کرنا نہیں چاہتے مگر غالب ہے کہ ان کے دل میں اور قسم کے خیالات بھی پیدا ہونگے
اور اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ جب پڑھنے اور نئی بات کے دریافت کرنے کا شوق
ایک مرتبہ پیدا ہو جاوے گا تو وہ اس کے پورا کرنے کے واسطے سامان تلاش
کریں گے۔

علاوہ اس کے ہمارے مدرسوں کو اور طرح پر ایک خاص فائدہ حاصل ہوتا ہے
یعنی یہ کہ معلموں اور طالب علموں کو بہت سے الفاظ معلوم ہو جاتے ہیں اور ان کی قوت
بیانیہ کو ترقی ہوتی ہے۔ اور اب چونکہ تحریری امتحانوں میں غالباً زیادہ تر صحت درکار
ہوگی اس وجہ سے یہ امر کسی قدر مفید معلوم ہوتا ہے۔

۶۔ سنہ ۱۸۷۲ء کے اخباروں کا جو ترجمہ اور انتخاب مترجم اخبارات ہندوستانی
نے کیا ہے۔ اس سے یہ بات عموماً اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ اخباروں نے خاص کر
کن مضامین پر بحث کی اور کن امور میں شوق اور توجہ ظاہر کی، مگر اکثر اصلی آرٹیکلوں کی
خوبی اور ان کی کیفیت صرف اصل کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہے مثلاً جن مضامین میں
غصہ یا کسی قسم کی خود غرضی ظاہر کی گئی ہے تا وقتیکہ انہیں الفاظ کو نہ دیکھا جاوے جو اصل
مصنف نے لکھے ہیں اس وقت تک ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم ہو سکتی کیونکہ خلاصے سے تھوڑی قدر
معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں مضمون جوش و خروش سے لکھا گیا ہے مگر بعض اوقات ایسا بھی
ہوتا ہے کہ جو مضامین ایک کالم میں پڑھے [illegible] ترجمے کے [illegible]
ان کا ان کے خلاصے [illegible]

تھیں معلوم ہوتا ہے اڈیٹروں کو اب یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ ایک گورنمنٹ رپورٹ موجود ہے اور بعض نے یہ بھی رائے دی ہے کہ رپورٹ کے خلاصہ کی نقل ان کی اطلاع کے واسطے مشتہر کی جاوے۔

۷۔ جس امر کی جانب ۱۸۷۰ء میں تمام ہندوستانی اخبار نویسوں کی توجہ برابر مائل رہی وہ جزیرہ پورٹ بلیر میں گورنر جنرل کا قتل ہونا تھا۔ ....

....

قوم کوکا کے مفسدہ کی جانب اس واقعہ کی نسبت اخبار نویسوں نے کم توجہ کی لیکن انھوں نے گورنمنٹ کی اس کارروائی کو پسند کیا کہ جس طریقہ سے ان لوگوں کو سزا دی تھی اس کی نسبت گورنمنٹ نے اعتراض کیا۔ "اخبار عالم" نے یہ رائے دی تھی کہ جس سے یہ قصور سرزد ہوا تھا یہ ہی منظور تھا کہ اس سزا سے اور شخصوں کو تنبیہ اور عبرت ہو تو مناسب ہوتا کہ وہ باغیوں کے ناک کان کٹوا کر جیل خانہ میں مقید رکھتا اور یہ حکم دیتا کہ ان کے ہمیشہ بید مارے جاویں۔

تیسرے اس رزولوشن پر اخبار نویسوں نے علی العموم توجہ کی جو جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے بنارس اخبار کے اڈیٹر پر جرمانہ ہونے کے باب میں صادر فرمایا تھا اور اُنکی یہ رائے تھی کہ چھاپہ کی آزادی اب صرف برائے نام نہیں ہے جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں۔

۸۔ ہندوستانی اخبار بلاشبہ خانگی اور اپنے ملکی حالات پر توسب سے زیادہ توجہ کرتے ہیں مگر غیر ملکوں کے حالات پر بجز اس کے کہ کبھی کبھی ہندوستانی راجاؤں کے اچھے یا بُرے افعال کی نسبت رائے دیں اور زیادہ توجہ نہیں کرتے۔ جو معاملات عدل و انصاف سے متعلق ہوتے ہیں ان پر اخبار نویس مالگذاری یا بندوبست کی بہ نسبت بہت ہی زیادہ توجہ کرتے ہیں (مثلاً انسٹیٹیوٹ گزٹ کا مضمون متعلق جیوری واسیسران، بنارس اخبار کا مضمون بابت خرابی انتظام پولیس و ڈاک "لارنس گزٹ" کا بیان بادشاہی حکومت کی تائید میں "شعلۂ طور" کی شکایت اس ظلم و تعدی کی نسبت جو رعایا پر چھوٹے چھوٹے سرکاری اہلکاروں کے ہاتھ سے ہوتا ہے "لوح محفوظ" کا مضمون کاشی پور کو مراد آباد سے علیحدہ کرنے پر "نورالابصار" کا مضمون میلہ ٹھوکر کی بند ہونے پر "بنارس اخبار" کی شکایت بابت ناقص انتظام صفائی۔)

۹۔ علمی مضامین خاص کر اس قسم کے اخباروں سے مخصوص ہوتے ہیں جیسے کہ "نجم الاخبار" میرٹھ "اکمل الاخبار" کہ ان معزز اخباروں کے مہتمم سررشتۂ تعلیم کے اہلکار ہیں یا جیسے کہ "نورالابصار" یا علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ جس میں آخر الذکر اخبار [illegible] باقی اور اخبار

صرف اتفاقیہ معاملات تعلیم کا ذکر کرتے ہیں (مدرسۃ العلوم کی کتب خواندگی کی فہرست، علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ۔ بحث متعلقہ انتخاب مقام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج۔ اخبار نویسوں کا اتفاق رائے بابت قیام میور کالج الہ آباد۔ نجم الاخبار اور علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے مضامین مدارس حلقہ بندی کے معلموں کی تنخواہ کی نسبت شکایت۔ اگرہ اخبار کا مضمون بابت کلکتہ یونیورسٹی کہ آئندہ امتحان داخلہ میں دیسی زبانوں کو بھی استعمال کیا جائے۔ عورتوں کی تعلیم کی نسبت بحث اور مضامین۔ علی گڑھ گزٹ میں مشرقی نظم کی لطافت کے متعلق ایک مضمون، دبدبۂ سکندری کا مضمون کہ تعلیم کی عام کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں: نورالابصار کا مضمون میونسپل فری اسکول کی نسبت۔)

۱۰۔ منجملہ معاملات معاشرت اور امور متفرقات کے خاص امر وہ لڑائی ہے جو منشی پیارے لال ایک بڑی دلیری کے ساتھ ہزاروں آدمیوں کے مقابلہ میں شادیوں میں فضول خرچی کے انسداد کے واسطے لڑ رہے ہیں۔

۱۱۔ اب تک ہندوستانی اخباروں میں اس امر پر بحث ہوتی ہے کہ ہندوستانیوں اور اہل یورپ کے درمیان کس طرح دوستانہ ربط و ضبط کو ترقی دینا چاہیے ....

.... جو بدسلوکی ریل میں ہندوستانیوں کے ساتھ کی جاتی ہے اور جو تکلیف عورتوں کو ہوتی ہے اُس کا متواتر ذکر کیا جاتا ہے۔

علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے نومبر کے مہینے کے ایک پرچہ میں ایک تعریض اس ناواقفیت کی نسبت جو اہل یورپ کو دیسی زبان سے ہوتی ہے بطور خواب کے سوال و جواب کے پیرایہ میں چھپی تھی، اس کے بعد راقم نورالابصار اخبار نے ایک سمن کا نقشہ چھاپا تھا جو کسی عہدہ دار صیغہ سول نے ایک شخص متوفی کے نام جاری کیا تھا۔

۱۲۔ میری دانست میں اخباروں کے اڈیٹر اپنا کام عمدہ طور سے انجام دیتے ہیں اور اگر یہ خیال کیا جاوے کہ ہندوستانی لوگ بہت کم ان کی معاونت کرتے ہیں تو یہ تعجب کی بات ہے کہ وہ اخبار کس طرح پر جاری ہیں طرز تحریر اس مضمون کے موافق جس کا ذکر ہو مختلف ہوتا ہے۔ ہندوستانیوں کے طرز بیان میں شستہ و رفتہ ہونے کی صنعت نہیں ہوتی اور اُن کی تقریر بہ نسبت تحریر کے اچھی ہوتی ہے کیونکہ دیسی زبان ہنوز علمی زبان کی بہ نسبت زیادہ تر روزمرہ گفتگو کی زبان ہے۔

۱۳۔ دوسرا لفظ معمولی رسالوں کا ہے اس میں اسی قدر رسالے مذکور ہیں جتنے سال گذشتہ میں تھے۔ (رسالہ پنڈت بنارس، منظر العلوم، گلشن بہاریں۔

پرنٹڈ بٹنگ سوسائٹی کا رسالہ تھا بھارت۔)

اس رپورٹ سے سنہ ۷۲-۷۱-۷۰-۱۸۶۹ عیسوی کے اُردو اخباروں کی حالت اور اُن کے اعداد و شمار کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اخباروں سے قطع نظر کرکے رسالوں کی طرف آئیں تو اُن کی تعداد میں غیر معمولی کمی نظر آتی ہے۔ ۱۸۶۹ء میں ضلاع شمال و مغرب میں صرف آٹھ رسالے شائع ہوتے تھے جن کے پرچوں کی تعداد ایک ہزار آٹھ سو چار تھی۔ ۱۸۷۰ء میں بھی ۸ ہی رسالے نکلے لیکن پرچوں کی تعداد ایک ہزار آٹھ سو چار سے بڑھکر دو ہزار ایک پندرہ تک پہنچ گئی جن میں ایک ہزار چھ سو نوے پرچے مدارس کے استعمال کے لئے حکومت ہند خریدتی تھی اور باقی ۴۲۹ پرچوں کے خریدار خود ہندوستانی تھے۔ ان آٹھ رسالوں میں ۶ اُردو زبان میں، ایک سنسکرت میں اور ایک دو زبانوں یعنی سنسکرت و بنگالی میں شائع ہوتے تھے۔

اُردو رسالوں کے اس ذکر کے سلسلہ میں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اُردو کا سب سے پہلا رسالہ کونسا تھا اور کہاں سے نکلتا تھا، جہاں تک تحقیق ہوا ہے اُردو کا پہلا رسالہ "خیر خواہ ہند"[۲] تھا جسے مدرسہ دہلی کے مدرس رام چندر نکالا کرتے تھے، اس کی ایک اشاعت پر جو اوّل اکتوبر ۱۸۴۸ء کی ہے جلد دوم لکھا ہوا ہے، یہ ایک ماہانہ رسالہ تھا اور اس کی سالانہ قیمت صرف ایک روپیہ تھی۔ یہ رسالہ مطبع دہلی اُردو اخبار میں طبع ہوتا تھا۔[۳]

اب ہم اس عہد کے اخباروں کی عام حالت کا جائزہ لیتے ہیں۔ پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی جن کا ایک مضمون[۵] بڑی شرح و بسط کے ساتھ اس عنوان پر شائع ہوا تھا۔ ابتدا سے ۱۸۸۴ء تک کے اخباروں کو تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ از ابتدا تا ۱۸۵۹ء

۲۔ ۱۸۶۰ء تا ۱۸۶۹ء

۳۔ ۱۸۷۰ء تا ۱۸۸۴ء

لیکن اس تقسیم کو قائم کرتے وقت کسی خاص اصول کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔

ہمارے خیال میں اُردو صحافت کا پہلا دور اُردو اخبار کے اجرا یعنی ۱۸۳۶ء سے ۱۸۵۷ء تک قائم کرنا چاہئے، ۱۸۵۷ء کے زمانہ کی قیدیں لگائی ہے کہ اس ہنگامہ میں جس کے لئے یہ سنہ ہندوستان کی تاریخ میں یادگار رہے۔ اُردو کے بہت سے اخبار بالکل بند ہوگئے اور بعض نے اس ہنگامہ کے فرو ہونے کے بعد دوبارہ جنم لیا اور اس نئے جنم میں نئے ملکی اور سیاسی حالات سے متاثر ہو کر اپنی پالیسی اور انداز میں بھی نئی صورت اختیار کی۔

دوسرا دور ۱۸۵۷ء سے شروع کرکے ۱۸۶۶ء تک ختم کرنا چاہئے۔ ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ کی سائنٹیفک سوسائٹی کا اخبار علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے نام سے جاری ہوا اور جیسا کہ اب عام طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے اس اخبار کے اجراء سے ہندوستانی اخباروں پر ایک خلقی اثر پڑا، ایک طرف تو اس اخبار نے انشا پردازی کے ایک نئے اسلوب کو رواج دیا دوسرے انگریزی اخبارات اور رسالوں کے دلچسپ مضامین کی تلخیص اور ترجمے شائع کرکے اُردو اخباروں کو اس نئے ماخذ کی طرف متوجہ کیا۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی اس خصوصیت کی طرف ان سرکاری رپورٹوں میں بھی اشارہ کیا گیا ہے جن کے حوالے اوپر نظر سے گزرے، انیسویں صدی کے اخباروں کا تیسرا دور ۱۸۶۶ء سے شروع کرکے محض سہولت کے لئے ۱۸۹۹ء پر ختم کرسکتے ہیں۔ بیسویں صدی اُردو صحافت کے دورِ جدید کا آغاز ہے۔ مذکورالصدر بیانات کی روشنی میں انیسویں صدی کے اخباروں کے حسب ذیل دور قرار پاتے ہیں:-

۱۔ ۱۸۳۶ء سے ۱۸۵۷ء

۲۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۶ء

۳۔ ۱۸۶۶ء سے ۱۸۹۹ء

آئندہ ہم بعض پرانے اخباروں اور رسالوں کے ایسے اقتباسات پیش کریں گے جن سے اخباروں کے عام مباحث، اخباری دنیا کی حالت، اخبار نویسوں کے جذبات اور اُن کی اُمیدیں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ آج تک پرانے اخباروں کے اقتباسات صحت تاریخی ترتیب اور سند کے ساتھ صرف کیفی صاحب نے اپنے اس مضمون میں جمع کئے ہیں جس کا حوالہ اوپر مذکور ہوا لیکن ہم نے اپنے مقالہ میں اُن اقتباسات سے قطع نظر کرکے ذاتی تحقیق و تفتیش سے جو اخبار اور مقالے فراہم کئے ہیں صرف اُن کو شامل کیا ہے۔ (باقی آئندہ)

محمد ابو اللیث بدایونی ایم اے

---

[۱] بحوالہ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ۲۰ مارچ ۱۸۷۲ء۔

صفحات ۱۷۹ لغایت ۱۸۶۔

[۲] اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو شاعر جولائی ۱۹۴۱ء۔

[۳] رسالہ اُردو اپریل ۱۹۳۹ء۔

میری حقیقت

مرے نطق سے نغمہ گر آبشاریں
ترنم مرا نغمۂ آبجو ہے
میں ہوں کوہِ قاف کے شہپروں پر خراماں
مرے علم سے نظمِ تکوین قائم
متانت کی قائم حکایات مجھ سے
میں وہم و گماں کی رسائی سے بالا
مری زندگی زندگی عظمتوں کی
میں ہوں خالقِ انقلابات و گردش
مری حکمتوں سے درخشاں مظاہر
میں طوفاں کی موجوں پہ محوِ روانی
سمندر کی لہریں خراماں ہیں مجھ سے
مرا ہر نفس شعلۂ بزمِ ایمن
مری ذات اسرارِ قدرت کی محرم
یہ کون و مکاں کیا یہ ارض و سما کیا
میں نقاشِ ایوان و قصرِ مشیت
نہیں اک زمیں مری آگے نگوں سر
میں ذروں بھری انجمن میں درخشاں

فروزاں مری نزہتوں سے بہاریں
تبسم مرا جنتِ رنگ و بو ہے
میں آتشکدے کے شراروں میں رقصاں
مرے دم سے جنبش میں ہے نبضِ عالم
ہیں زندہ جنوں کی روایات مجھ سے
میں خورشید و مہتاب میں جلوہ آرا
ستارے مری مشعلیں ظلمتوں کی
دو عالم میں ہے میرے ارادوں کی جنبش
فنا کی بہاریں، بقا کے مناظر
ہواؤں پہ کرتا ہوں میں حکمرانی
بہاریں گلستاں گلستاں ہیں مجھ سے
مری ہر تڑپ نبضِ فطرت کی دھڑکن
مرا رازِ تخلیق، ہے رازِ دو عالم
کیا ہے فرشتوں نے بھی مجھ کو سجدا
میں نباضِ قدرت میں نقادِ فطرت
جبیں فلک بھی ہے خم عظمتوں پر
میں تاروں بھرے آسماں پر خراماں

میں پھیلی ہوئی سطحِ عالم کی وسعت
میں فضا گستر ہوں میں خنداں سحر میں
میں ہفت آسمانوں پہ چھایا ہوا ہوں
میں بہتی ہوئی جوئباروں کا نغمہ
ترنم مرا ہر چٹکتی کلی میں
میں گذری ہوئی عشرتوں کی نشانی
قفس بھی میں ہوں آشیاں بھی میں ہی ہوں
کہیں ہوں کمال اور کہیں ہوں میں ہٹلر
کہیں روحِ نپولین بن گیا میں
کہیں بھیم، دارا، حسن کی صورت میں آیا
کہیں مسکرایا میں فکرِ شفق پر
کہیں تھا میں اکبر کہیں تھا میں ہمایوں
یہ بجلی یہ جگنو یہ چاند اور ستارے
یہ جذبات کی شورشیں سازِ جاں پر
یہ صبحیں منور، یہ شامیں معطر
یہ برسات کی مست و پرشور راتیں
ہیں سب میری فطرت کے آئینہ خانے

میں ہیبت فزا کوہساروں کی عظمت
درخشانیاں ہیں مری بحر و بر میں
میں قلبِ زمیں میں سمایا ہوا ہوں
میں اٹھتی ہوئی ہر گھٹا سے ہویدا
تبسم مرا ضو فشاں چاندنی میں
میں ہر دکھ بھرے دل کی غمگیں کہانی
یہاں بھی میں ہوں اور وہاں بھی میں ہی ہوں
کہیں ہوں میں خالدؓ کہیں ہوں سکندر
کہیں طارقؒ و ابنِ حیدرؓ بنا میں
کہیں کرشن اور بودھ میں جلوہ دکھایا
کہیں آیا سیماب و اقبال بن کر
کہیں میں ارسطو کہیں میں فلاطوں
یہ قوسِ قزح، کہکشاں یہ شرارے
یہ ابرِ رواں نیلگوں آسماں پر
یہ بہتی ہوائیں، یہ بیباک سمندر
یہ حسن و جوانی کی رنگین باتیں
رموزِ نہاں کے اچھوتے خزانے

حقیقت کوئی مری سمجھے گا کب تک؟
میں علمِ مشیت کا ہوں راز اب تک

شفق ٹونکی

رات کی رانی

"رات کی رانی" کی بھینی بھینی خوشبو سے پارک مہک رہا تھا۔ آوارہ گرد نوجوان دن بھر کی کوچہ گردی سے تھک کر پارک کے ایک خاموش گوشے میں ایک بنچ پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ رات نصف کے قریب بیت چکی تھی لیکن اس نوجوان سے جس کے سڈول چہرے پر استدادِ زمانہ نے کئی نشانیاں چھوڑ رکھی تھیں، شاید نیند کی دیوی روٹھ گئی تھی۔

سارا دن وہ شہر کے گلی کوچوں کی خاک چھانتا۔ دن بھر وہ خوش رہتا لیکن رات کی آمد اُس کے لئے قیامت سے کم نہ ہوتی۔ رات اپنے جلو میں اس کے لئے ہزار ہا پریشانیاں لئے آتی۔ اُسے رات بسر کرنے کے لئے ٹھکانہ تلاش کرنا پڑتا۔ دن کے وقت وہ پولیس والوں کے سامنے اکڑ اکڑ کر چلتا لیکن رات ہوتے ہی وہ اُن کے سائے سے بھی دُور بھاگ جاتا۔

"پبلک پارک" میں سونے کی اجازت نہیں تھی لیکن اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار بھی تو نہ تھا۔ آسمان پر اودے اودے کالے کالے بادل تیر رہے تھے۔ ننھے ننھے بادل آپس میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ چاند کسی دُلہن کی طرح بادلوں کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ بارش کا ہر گھڑی احتمال تھا۔ بارش کے وقت اُسے بنچ کے نیچے ہی پناہ مل سکتی تھی۔ اُس کی دانست میں اور کہیں بھی نہیں۔

وہ ایک انگڑائی لیکر بنچ پر نیم دراز ہوگیا۔ اس وقت جو آرام اُسے لکڑی کی اس سخت اور کھردرے بنچ پر لیٹنے سے حاصل ہو رہا تھا۔ شاید عیش پرست امیروں کو مخملی اور بیش قیمت صوفوں سے بھی نہ مل سکے۔

صبح اُس نے ایک برات دیکھی تھی۔ شادی کے اس جلوس میں ہر آدمی اس طرح مسرور تھا جیسے اُسی کی شادی ہو رہی ہے۔ نوجوان بھی تھوڑی دُور تک جلوس کے آگے آگے گیا تھا۔ اور اُس کے ذہن میں بھی یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ شاید وہ خود ہی دولہا بنا ہوا برات کے ساتھ ساتھ جا رہا ہے۔

لیکن ایک چیز کے سمجھنے سے وہ قاصر تھا۔ جلوس میں آتش بازی کا بھی انتظام تھا۔ ایک اندھا بھکاری پٹاخوں کی آواز سے ڈر کر بھاگا۔ کڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ سب لوگ اُسے پڑا چھوڑ کر جا رہے تھے۔

"اندھا کہیں کا"

نوجوان سوچ رہا تھا کہ وہ بیچارہ اندھا تو تھا ہی۔ لیکن باقی لوگ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے ہو رہے تھے۔ کیوں؟ وہ یہ نہیں سمجھ سکا۔

یکایک فضاؤں میں ارتعاش پیدا ہوا۔ بادلوں کے ٹکرانے سے ایک عجیب شور سُنائی دیا اور کسی غضب ناک ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی بجلی اُس کی نگاہوں کو خیرہ کرتی ہوئی فضا کی لامحدود گہرائیوں میں جذب ہو گئی۔ وہ بہت دیر تک ٹکٹکی باندھے آسمان کو تکتا رہا۔ اُس کی نگاہوں میں بار بار بجلی کوند جاتی تھی۔

وہ قدرت کے ان اسرار پر غور کرنے لگا کہ جہانِ رنگ و بُو میں غریب امیر میں ہمیشہ ٹکر ہوتی ہے۔ مزدور اور سرمایہ دار میں تصادم ہوتا ہے۔ پھر ان دونوں کے تصادم سے ایسی بجلی کیوں نہیں پیدا ہوتی جو سرمایہ دار کے خرمنِ ہستی کو جلا کر راکھ کر دے اور غریب مزدور کو اس کے پنجۂ استبداد سے رہائی دلائے۔ کیا اس میں بھی قدرت کا کوئی راز مضمر ہے؟ وہ تصورات کے بحرِ عمیق میں کھو گیا۔ اُس کی نظروں کے سامنے مفلسوں کی دردناک زندگی کا مرقع تھا۔ اس کا رواں رواں زبانِ حال سے پکار پکار کر کہتا تھا کہ سرمایہ داروں کا وجود انسانیت کے نیک نام پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ یہ تجارت کے شیدائی صبح و شام غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ انھیں غریبوں کے دکھوں کا شعور تک بھی نہیں۔ اُن کے ایوانوں کی بنیادیں مزدوروں کے خون پر رکھی گئی ہیں۔ اگر مزدور کا وجود نہ رہے تو سرمایہ داری کا نشان تک اس دُنیا سے مٹ جائے پھر بھی دولت کے نشے میں مست سرمایہ دار غریبوں کو ننگِ انسانیت سمجھتے ہوئے نہیں شرماتے۔ سرمایہ داری کی لعنت دُنیا سے نیست و نابود کر دینی چاہیے۔ اس کے مٹ جانے کا دنیا کے نظام میں کوئی تبدیلی بھی رونما نہیں ہوگی؟

پھر خود ہی کچھ سوچ کر بڑبڑایا "نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

[illegible]

[illegible]

کی شکستہ بجلی پیدا ہو کر غریبوں ہی کو جلا کر راکھ کر ڈالے...... ہاں۔ ہاں یہی قانونِ قدرت ہے اور اسی کو انصاف کہا جاتا ہے؟

اس کا دماغ انسانی گتھیاں سلجھانے سے قاصر رہا۔ وہ کہنی کو بنچ پر ٹیک کر ٹھوڑی کو ہتھیلی کا سہارا دیئے کچھ سوچنے لگا۔ کوندے کی لپک سے اس کے خیالات کا تار ٹوٹ گیا۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے اس کالی گھٹا کو دیکھا جو آسمان پر چھا رہی تھی وہ کانپ اٹھا۔ ساری رات بارش میں لکڑی کی ایک چھوٹی سی بنچ کے نیچے پناہ لینے کا خیال کتنا اذیت دہ ہے۔

اس نے ایک آہ بھری۔ "رات کی رانی" کی لطیف خوشبو سے اس کے جذبات میں ہلچل برپا ہو گئی، ایک جوان مرد اور ایک حسین و جمیل لڑکی کہیں سے ٹہلتے ہوئے ادھر آ نکلے اور سامنے بنچ پر بیٹھ گئے۔ ان دونوں کو وہ بخوبی جانتا تھا لڑکی اس کوچے کی رہنے والی تھی جہاں نہایت ارزاں نرخوں پر محبت کا سودا کیا جاتا ہے۔ جہاں حسن و جوانی چند سنہری رو پہلی ٹھیکریوں کے عوض خریدے جا سکتے ہیں۔ اور جہاں شب و روز معصیت و بدکاری کے نئے نئے ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔

کئی بار وہ بھی اپنے دل کا سودا کرنے اس بازار میں ڈگمگاتے قدموں اور ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ گیا تھا لیکن بقول ؎

مفت دل لینے کو بھی اب کوئی تیار نہیں
جنس بے مایہ پذیرا اسے خریدار نہیں (جاوید)

وہ دور ہی سے حسن کے بے پناہ جلووں سے مسرور ہو کر چلا آتا۔ اس کی خستہ حالی اس امر کی اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ بھی داؤ لگا کر ہارے ہوئے قمار بازوں میں شامل ہو سکے تھا۔

یہ نوجوان مشہور معلم اخلاق پروفیسر لطیف تھا۔ دن کے وقت وہ قوم و ملک کے نونہالوں کو اخلاق اور شرافت کا سبق پڑھایا کرتا لیکن جب رات سیاہ کاروں کے گناہوں پر تاریکی کا پردہ ڈالنے آتی تو وہ کوٹ کے کالر اٹھائے۔ ہیٹ کو نیچا کئے تیز تیز [illegible] ہوا شانتی کے "کاشانۂ جمیل" کی سمت روانہ ہو جاتا تھا۔

شانتی نے انگڑائی لیکر مخمور نگاہوں سے پروفیسر کو دیکھا۔ بیکار نوجوان کو ایسا معلوم ہوا جیسے پھولوں سے لدی ہوئی کوئی ٹہنی ہوا کے ایک لطیف جھونکے سے جھک کر پھر سیدھی ہو گئی ہو۔ اس رومان آفریں ماحول میں اسے ہر طرف محبت ہی محبت نظر آنے لگی [illegible] کو چھپ گئی ہے زیرِ لب مسکرا دی۔

تھی۔ پروفیسر کی تیوری پر بل پڑے۔ لیکن شانتی کی ایک ہی نگاہ نے اس کی پیشانی کے سارے بل غائب کر دیئے اور اس کی نگاہوں میں سرور و مستی جھلکنے لگی۔

"عورت کی نگاہوں میں کتنا جادو ہے" آوارہ گرد نوجوان سوچنے لگا۔

وہ ان کی مسرت میں مُخل انداز نہیں ہونا چاہتا تھا، اس نے اپنا منہ موڑ لیا۔ وہ دور افق کے اس پار بادلوں کی گھنیری چھاؤں میں کسی بھولی ہوئی صورت کو دیکھ رہا تھا۔ جذبِ محبت کی خوشگوار یاد نے اسے اپنی موجودہ حالت سے بے نیاز کر دیا۔

"رات کی رانی" کتنی سندر ہے" شانتی کہہ رہی تھی۔

"میری رانی تم ہو" پروفیسر کہنے لگا۔

رانی!...... رانی!...... ہاں وہ اسی نام سے پکارا کرتا تھا۔ اسے اب بھی وہ گھڑیاں یاد آ رہی تھیں جب اپنی رانی کے ساتھ پریم کی ایک نئی دنیا آباد کیا کرتا اور وہ "میرے راجہ!" کہہ کر پیار سے اپنی مرمریں باہیں اس کے گلے میں ڈال دیتی۔ مگر اب وہ سب کچھ خواب و خیال ہو کر رہ گیا تھا۔ اکثر اسے ایسا معلوم ہوتا گویا اس نے کوئی خوشگوار سپنا دیکھا ہو۔ جو کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا اور بس!

"اچھا چلو مجھے نیند آ رہی ہے" شانتی نے والہانہ انداز سے پروفیسر کو مخاطب کیا پروفیسر نے اسے سہارا دیکر اٹھایا۔ دونوں نے سامنے بنچ پر لیٹے ہوئے زرد رو نوجوان کو دیکھا۔ شانتی کے ہونٹوں پر ایک حسین تبسم کھیلنے لگا۔

نوجوان اس تبسم سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکا۔ وہ اسے ہمدردی پر محمول کرے یا نفرت و حقارت پر اس نے منہ موڑ لیا لیکن اسے ان کی نگاہیں اپنی پیٹھ میں چبھتی ہوئی معلوم ہوئیں اس نے ایک چیخ مار کر منہ موڑا لیکن وہ جا چکے تھے...... دور...... بہت دور سے ان کے قدموں کی مدھم چاپ سنائی دے رہی تھی...... اس نے اطمینان کی سانس لی اور آنکھیں بند کر لیں اس نے دیکھا کہ اس کی رانی اسے بادلوں میں سے بلا رہی ہے۔

"میرے راجہ!"

اور وہ بادلوں میں پرواز کر رہا ہے۔

بادلوں میں سے ایک ننھی سی بوند اپنا راستہ بھول گئی۔ یہ بھٹکی ہوئی بوند اپنا طویل سفر طے کرتی ہوئی اس کے رخسار پر آ گری۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بیک وقت ہزاروں بچھوؤں نے اسے کاٹ لیا ہو وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھا تو سامنے بڑی بڑی مونچھوں والا سپاہی [illegible] ہاتھ میں لئے اسے گھورتے ہوئے اس کی جانب [illegible]

حرام ـــــ کیا ہے؟

زورِ بازو سے نہ جو پہونچے وہ دولت ہی حرام
ہو رہینِ لطف بیگانہ، تو نعمت ہے حرام

جو خریدی جائی دانستہ وہ عظمت ہے حرام
مال و زر دے کر جو حاصل ہو وہ عزت ہے حرام

عشق کا خالص تعلق ہے خلوصِ روح سے
ہو ہوس جس میں شریک ایسی محبت ہے حرام

جن کے فتوی مول لے سکتے ہیں اربابِ غرض
اُنکو دعوائی تولائے شریعت ہے حرام

جو نہ ہو سنّت کا پیرو، پیروی اُسکی ہے کفر
ہو شریعت کی مخالف تو طریقت ہے حرام

جسکا مقصد پیٹ بھرنے کے سوا کچھ بھی نہ ہو
دیدۂ حق بیں میں ایسی مولویّت ہے حرام

سرفرازی غیر کے قدموں پہ جھک کر ہیچ ہے
ہو بِنا جسکی خوشامد وہ امارت ہے حرام

جلبِ شہرت جسکا مقصد اور نمود و نام ہو
قائدِ باطل ہے وہ۔ اُس کی قیادت ہے حرام

سر رگڑنا ہے دکھانے کے لئے، سجدہ نہیں
جس عبادت میں ریا ہو وہ عبادت ہے حرام

وہ سیاست ہے جو ہو حکمِ خدا سے ہم نوا
ہو نہ ہم آہنگِ مذہب تو سیاست ہے حرام

اُلفتِ قوم و وطن میں کیا سکوں، آرام کیا
عشق میں جیسے وفا والوں کو راحت ہے حرام

خواہشِ دُنیا رہے دلمیں تو ناقص ہے نماز
بے غرض ہو کر نہ کی جائی تو طاعت ہے حرام

آدمی وہ ہے جو ہو انسانیت سے کامگار
جو نہ ہو انسان اُس پر آدمیت ہے حرام

ہے سرورِ جاوداں شایانِ اہلِ اتقا
نفس کے کُتوں کو دُنیا بھر کی لذت ہے حرام

صرف ہی ذاتِ خدا حقدارِ جبر و اختیار
خود ہی جو مجبور ہو اسکو حکومت ہی حرام

حاجی نیاز احمد

اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے ممنوعات و قیود کی ضرورت ہے

موضوع زیر بحث میں دو اہم جزو غور طلب ہیں جن پر غور کرنے سے کل موضوع آسانی سے [illegible] سمجھا جا سکتا ہے، ایک جزو ہے "اچھی زندگی" دوسرا جزو "ممنوعات و قیود" اب دیکھنا یہ ہے کہ اچھی زندگی بسر کرنا کسے کہتے ہیں؟ با الفاظ دیگر اچھی زندگی کا معیار اور اس کی تعریف کیا ہے:-

اگر وسعت ذہن سے دیکھئے تو ہماری حیات خود مقدرت کے مورد کہ تنفس سے مشروط و پابند ہے اور معینہ حرکات و سکنات یا افعال و اعمال کا ایک مجموعہ ہے۔ افعال و اعمال ہمارے عزائم کے تابع ہیں، اور عزائم امکانات کے پابند ہیں اور چونکہ عزائم افعال و اعمال کی اچھائی برائی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے ان عزائم کو صحیح استعمال کرنے کی ذمہ داری عقل و شعور پر رکھی گئی ہے۔ عقل و شعور کی روشنی میں جب انسان اپنے وجود پر نظر ڈالتا ہے تو کائنات کی دیگر بے عقل و بے شعور مخلوقات سے باوجود بہت سی باتوں میں مماثل ہونے کے اپنے آپ کو علیحدہ پاتا ہے، اور اسی عقل و امتیاز کی روشنی سے کام لیکر جب وہ کائنات کی حیوانی مخلوق کی طرزِ زندگی یا رہن سہن، حرکات و سکنات اور افعال و اعمال کا مطالعہ کرتا ہے تو اُسے ان میں ایک بے ربطی، انفرادیت۔ بے قاعدگی، بے شعوری، خود غرضی۔ سنگدلی، [illegible] ہوسناکی وغیرہ وغیرہ باتیں نظر آتی ہیں، طبع سلیم ان باتوں سے نفرت کرتی ہے، وہ ایک اعلیٰ مقصدِ حیات متعین کرتی ہے، معیارِ حیات بناتی ہے، وہ انفرادی خود غرضیوں کو ختم کرتی ہے، اور انسانی زندگی کو ذہنیت کے تابع کرتی ہے۔ جنسی میل جول اور ذہنی ربط و ضبط کی خوشگواریاں لاتی ہے۔ افعال و اعمال کے مفید و مضر اثرات کی چھان بین کرتی ہے، ان کے استعمال میں قرینہ اور سلیقہ پیدا کرتی ہے، رہن سہن اور باہمی سلوک [illegible] کی تہذیب سکھا کر طرزِ زندگی بلند بناتی ہے۔ غرضیکہ مجلس کائنات کے وسیع فرش پر دیگر مخلوق کے بالمقابل جنس انسان کو صفِ اول میں لا بٹھاتی ہے۔

[illegible] ہماری انفرادیت اجتماعی زندگی کی ایک کڑی ہے یہی تخیل [illegible] ہے، جسے ہم نے دیگر مخلوق کے سامنے رکھ کر [illegible] اپنے افعال و اعمال کی [illegible]

دردِ دل پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی ہے یہی انساں ہونا

زندگی کی اچھائی یا بلندی و بہتری فرض کی ادائیگی میں ہے اور فرض کی ادائیگی ہی زندگی کا ایک اعلیٰ معیار ہے۔ اس لئے زندگی بسر کرنے کی بہتر تعریف یہی ہے کہ زندگی بسر کرنے والے کا ہر فعل، ہر عمل، ہر جنبش، ہر قدم جماعت کی بھلائی و بہتری کے لئے استعمال ہو یہی تخیل تمام مذاہب کی تعلیم کا نچوڑ ہے ؎

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا — کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا — خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں (مولانا حالی)

پھر چونکہ ہر فرض اور اس کی ادائیگی کے لئے کچھ طریقے اور ضابطے بھی متعین ہوتے ہیں، یہی ضابطے اور طریقے اوامر و نواہی، ممنوعات و قیود کی تعریف میں آتے ہیں اور یہیں سے یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ ممنوعات و قیود کے ساتھ ہی اچھی زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔

ہم انفرادی طور پر اچھے شہری یا ملکی ہونے کی حیثیت سے ان تمام قوانین کے پابند ہیں جو اجتماعی طور پر ہمارے ملک کی ابتری و خرابی کی روک تھام کرتے ہوں، ہم اچھے صحت ور ہونے کی حیثیت سے صحت کے اُن جملہ اصولوں کے پابند ہیں جو ہمیں مضراتِ صحت سے بچاتے ہیں۔ ہم تمدن کی گود میں پلے ہیں، ہم نے ممنوعات و قیود کے آغوش میں ہی آنکھ کھولی ہے۔ ہماری تربیت ہی ہدایت و احکام کے ہاتھوں ہوئی ہے بے شعوری و بچپن کے دور میں جب ہم کوئی ایسا کام کرتے تھے جس سے ہمارے ماں باپ کی پیشانی پر بل آجاتا تھا ہم سمجھ لیتے تھے کہ شاید یہ کام انہیں پسند نہیں ہے، گو ہم اپنی اس بے شعور حیوانی فطرت کے ساتھ جب سے ہم اس وقت قریب تر تھے۔ ضد کرتے تھے اور بار بار اسی کام کو کرنا چاہتے تھے ہم جانوروں کی طرح اچھل کود کرنا چاہتے تھے۔ ایک مقام سے دوسرے مقام پر جست لگانا، درختوں کی بلند چوٹیوں پر بیٹھنا، چہچہانا، اڑ جانا ہماری خواہش تھی، ہم طائروں کی طرح باد [illegible] کے ساتھ میں پرواز کرنا چاہتے تھے، مگر

ایک شعوری قوت ہمارے وجود میں رفتہ رفتہ بیدار ہو رہی تھی، عقل کے چراغ کی دھیمی لو آہستہ آہستہ بلند و تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہمارے وجود کے باطنی جوہر اُبھر رہے تھے ہماری روح جاگ کر انگڑائیاں لے رہی تھی۔ جب ہم وحوش و طیور کی آزادی، قوت اور اختیار کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے تو ہماری عقل ہماری نادانی پر مسکراتی تھی اور کہتی تھی او نادان! شعور سیکھ میرے ساتھ چل، اندھیرے غاروں کی طرف نہ جا۔ صاف اور روشن راستے اختیار کر، غرضکہ ہمیں جو کچھ بھی قوت و اقتدار، آزادی و اختیار ملے ہیں وہ سب عقل و شعور کے قوانین کی پابندی سے، اوامر و نواہی کا پیروی چلنے سے، قیود اختیار کرنے سے، ممنوعات پر عمل پیرا ہونے سے،

ممنوعات و قیود کو توڑ کر ہم ان قاعدوں اور اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں جو ہمیں اپنی زندگی کے اعلیٰ فرائض کی انجام دہی میں مدد دیتے ہیں اور اس طرح ہم اپنی جنس کی امتیازی شان سے گر جاتے ہیں اور پھر انھیں بے شعور حیوانوں میں شامل ہو جاتے ہیں جن کی دُنیائے حیات میں نہ کوئی امتیاز ہے، نہ ربطِ باہمی، نہ کوئی رحم ہے نہ درد نہ کوئی یگانگت ہے، نہ محبت بیٹھے ہیں کھانے کے لئے لڑتے اور مر جاتے ہیں۔ خواہشاتِ نفسانی کے لئے جو سبزہ گاہوں، سبزہ زاروں، پارکوں اور باغیچوں کے خاردار احاطوں کو پھاند کر نرم و لطیف شاخوں کے پھولوں کو پامال کرتے ہیں اور نازک پودوں کے برگ و بار کو اس لئے چرنے لگتے ہیں کہ اس سے اُن کی بھوک کی خواہش کو تسکین ملتی ہے اور اُن کا پیٹ بھرتا ہے اُن کی زندگی کا مقصد بھوک پیاس اور نفس کی خواہشات کی تکمیل کے سوا کچھ نہیں اور ان خواہشات کے پورا کرنے میں اُن کے نزدیک ہر ظلم و ستم روا ہے ہر مکر و دغا واجب ہے۔ اُن کی مملکت میں کمزور مغلوب ہے، طاقتور غالب ہے، جب جی چاہا کمزور و مجبور شکار کو آ دبوچا جب خواہش ہوئی ضعیف و لاغر پر حملہ کر دیا۔ اُن کے یہاں نہ کوئی چیز منع ہے نہ کسی چیز کی قید و پابندی، نہ انصاف ہے نہ رحم، وہ ہر طرح آزاد ہیں اپنی خواہشات نفسانی پوری کرنے اور حرص و ہوس کی پیاس بجھانے میں اُنھیں مزا آتا ہے اُنھیں صید کے تڑپنے اور چیخنے پر رحم نہیں آتا، انھیں کوئی بیمار، مضمحل اور سست رفتار شکار نظر آتا ہے تو خوشیاں مناتے ہیں اور ناخن تیز کرتے ہیں، کیونکہ اُن کے مسلک میں مزاج پرسی و عیادت کا یہی طریقہ ہے، خون کے گھونٹوں میں اُنھیں شراب ارغوانی کی لذتیں ملتی ہیں۔

غرضکہ یہ ہے ہماری حیوانی مخلوق کی دنیائے حیات، کیا ہماری عقل انسانی بھی عقل و شعور کی روشنی سے منہ موڑ کر ضلالت و تاریکی میں زندگی کی ایک منزل [illegible] ہے؟

نہیں ہرگز نہیں، اسی لئے اُس نے وحشت و بربریت کی تاریک دُنیا کے حرکات و سکنات افعال و اعمال کو ممنوعات و قیود کی زنجیروں سے جکڑ دیا، اور اپنی زندگی کے ایک ایک سانس کو اپنی نوع کی بھلائی اور بہبودی کے لئے آزاد بنا لیا، بالفاظ دیگر ہماری اچھی زندگی کی آزادی ممنوعات و قیود کی پابند ہے، ہماری حیات کی ایک ایک جنبش کا ہماری زندگی کے ہر فعل، ہر عمل، ہر قدم کا، فرائض و واجبات ترک و اختیار سے ربط ہے کیونکہ ہمیں قدرت نے عقل کی نعمت دی ہے عقل پر ذمہ داریوں کا بوجھ ہے جو فرائض کا اثر رکھتی ہیں، فرائض ترک و اختیار، قیود و ممنوعات کے مجموعہ کا نام ہے۔

اگر غور سے دیکھئے تو دُنیا میں عقل و شعور کے ساتھ انسانی و حیوانی زندگی کا ہر لمحہ مقابلہ ہو رہا ہے اور انسان کے لئے ہر وہ فعل قابلِ ترک ہے، جو حیوانوں کے لئے طرۂ امتیاز ہے، یہی متروکات انسانی زندگی کو بلند و برتر بنا کر ایک اچھی زندگی بسر کرنے کی خیال پیدا کرتے ہیں اور انسان ایک انشراحِ روح کے ساتھ زندہ رہتا ہے اور مطمئن ضمیر کے ساتھ موت کا استقبال کرتا ہے۔

ہمیں ایک ایسے حیوانی نفس کو مغلوب کرنے میں کتنی روحانی مسرت ہوتی ہے جو اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے دوسرے کے گلے میں غلامی کا پھندا ڈالنا چاہتا ہے اور اس کے لئے اپنی وحشیانہ قوتیں جمع کرتا ہے، طرح طرح کے دُکھ اور قسم قسم کی اذیتیں پہنچانا چاہتا ہے، ہم اپنے اس نفسِ حیوانی سے لڑتے ہیں اور اُس کی خواہش کے بالکل برعکس کرتے ہیں، ظالموں کے پنجے سے مظلوموں کو بچاتے ہیں، آقا کے قبضہ سے غلام کو چھڑاتے ہیں، کمزور کی امداد کرتے ہیں، ضعیفوں کو سہارا دیتے ہیں۔ بیماروں کو تسلی پہونچاتے ہیں، فریاد سنتے ہیں، حاجت روائی کرتے ہیں۔ غرضکہ ہم اپنی رہبرِ عقل کی امداد سے اپنی خواہشات پر قادر ہو جاتے ہیں، اپنی بھوک پیاس کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں، نہ ہمیں ہماری خواہش کسی کی حق تلفی کرنے دیتی ہے نہ ہمیں ہماری بھوک پیاس کسی کی نعمتوں کے چھیننے پر مجبور کرتی ہے، ہمارا ہاتھ قدرتی خزانوں کی طرف بڑھتا ہے، ہماری کوششیں اُن کے حاصل کرنے کے لئے ہی صرف ہوتی ہیں۔ ہمیں جو کچھ ملتا ہے اُس کی قدر کرتے ہیں۔ کچھ لمحے اُس پر قناعت کرتے ہیں اور اُس سے لطف اندوز ہوتے ہیں، حیوانات آپس میں بیگانہ و اجنبی بیدرد و بے رحم ہوتے ہیں، حیوانوں میں ایک دوسرے کے کام آنے کا کوئی خاص ربط نہیں ہے، ہم انسان ایک دوسرے کے کام آتے ہیں، ایک دوسرے کی مشکلات میں آسانیاں پیدا کرتے ہیں، باہم انس و محبت کرتے ہیں، محبت میں [illegible]

ایثار اور عظیم سے عظیم قربانیوں سے دریغ نہیں کرتے، ہم نے عقل کی روشنی میں اپنے وجود کو دیکھا ہے، اپنے دل کی گہرائیوں میں اُتر سے ہیں، ان گہرائیوں میں درد تلاش کیا ہے، اور درد میں ہمیں لذتِ حیات ملی ہے، ہم جتنا دل دوسروں کے لئے دکھاتے ہیں، ہمیں اتنا ہی لطفِ حیات ملتا ہے، ہم اُنس و محبت کے نشتر سے اپنے قلب کو جتنا مجروح کرتے ہیں، اُتنا ہی ہماری روح شگفتہ و مسرور ہوتی ہے۔ ہم مظلوم انسان کی پکار سنتے ہیں اور بیقرار ہوجاتے ہیں، بغض، عداوت، کینہ یہ حیوانی خصائل ہیں۔ ہمارے دل میں اُن کا ٹھکانہ کہاں؟

شد ست سینہ ظہوری پر از محبتِ دوست
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

غرضکہ مخلوقاتِ عالم کے بالمقابل یہ ہے ہمارا معیارِ زندگی جس سے اچھی زندگی بسر کرنیکا کوئی اور بہتر نمونہ اس عالمِ قیود و امکاں میں ہمارے سامنے نہیں ہے۔

لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہماری عقلوں پر حیوانی جذبات کا غلبہ ہوجاتا ہے طمع نفسانی جب ہمارے دماغوں پر چھا جاتی ہے، خود غرضی و ہوسنا کی بڑھکر دلوں پر قبضہ کرلیتی ہے، ہمیں اپنی خود غرضیاں پسند ہوتی ہیں، ہمیں اجتماعی و اشتراکی زندگی کی پابندیاں ناگوار ہوتی ہیں، ہم جنسی اور جماعتی مفاد کو انفرادی مفاد پر قربان کردیتے ہیں، ہم اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے اپنے افعال و اعمال میں وحشیانہ آزادی چاہتے ہیں۔ ہمیں تمام اوامر و نواہی، ممنوعات و قیود، اپنے حوصلوں کی تکمیل میں سنگِ راہ نظر آتے ہیں۔

بلاشبہ ہم اُس وقت حیوانی خصائل کا پیکر ہوتے ہیں، عقل کی روشنی سے محروم ہوتے ہیں اور وحشیانہ زندگی کے تاریک غار میں اپنے مفاد ڈھونڈتے ہوتے ہیں ضمیر ہمارے مُردہ ہوتے ہیں، عقل و روح ہماری کچلی ہوئی پڑی ہوتی ہے بالکل اُسی وقت ہم یہ سوچتے ہیں کہ :-

"اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے آخر ممنوعات قیود کی کیا ضرورت ہے؟"

ولی اللہ خاں ولی گوالیاری

رشحاتِ ارشد

مانا ترا ملنا مجھے مقسوم نہیں ہے — دل تیری محبت سے تو محروم نہیں ہے
میں اُسکے تجسس میں ہوں آوارۂ عالم — اور اُسکا نشاں تک مجھے معلوم نہیں ہے
ظالم سے کہو ظلم کرے تا حدِ امکاں — فریاد شعارِ لبِ مظلوم نہیں ہے
اک فیصلہ کن معرکہ منظور ہے قاتل! — یا تیغ نہیں یا مرا حلقوم نہیں ہے
مٹنا ہی مقدر ہے تری راہگذر میں — کچھ مجھکو غمِ ہستیٔ موہوم نہیں ہے
حوریں بھی ہیں مشتاق فرشتے بھی ہیں مشتاق — انسان کے جلووں کی کہاں دھوم نہیں ہے
کچھ دن ابھی باقی ہے اُجالا ہے مسافر! — ہشیار کہ منزل ابھی معدوم نہیں ہے

ارشد مری ہستی بھی سرِ محفلِ عالم
وہ قصہ ہے جس کا کوئی مفہوم نہیں ہے

ارشد صدیقی امروہوی

تصوّراتِ محبّت

مثمن بر خمسہ عالیجناب خانشری امام الدین خانصاحب سوا والی پاجود

(خمسہ پر مثمن، ایک بالکل جدید چیز ہے ——— اس اختراع پر انور صاحب کو داد دی جائے یا آگرہ اسکول کو؟ ——— ایڈیٹر)

پھر آج طورِ تصوّر پہ آگیا کوئی ۔۔۔ حسین آنکھوں سے پھر مسکرا گیا کوئی
نظر سے روح کا نغمہ سُنا گیا کوئی ۔۔۔ "دل و جگر میں سما کر چلا گیا کوئی"
"تمام ہستیٔ فطرت پہ چھا گیا کوئی" ۔۔۔ "مری نظر سے نگاہیں ملا گیا کوئی"

"شراب عشق کے ساغر پلا گیا کوئی"
"مرے خیال میں مستی جگا گیا کوئی"

شبِ اُمید کی بے چین ساعتیں آ کر ۔۔۔ تھپک تھپک کے سلائیں ہزار مجکو مگر
تڑپ تڑپ ہی کے گذرے گی زندگی یکسر ۔۔۔ "کسی کے عشق کی وہ چوٹ کھائی ہے دلبر"
"کہ جس سے چین کی صورت نہیں ہے آٹھ پہر" ۔۔۔ "شبِ فراق تصوّر میں ہو رہی ہے بسر"

"تصوّرات کی دُنیا ہے اک فریبِ نظر"
"وہ آگیا، وہ رُکا، وہ چلا گیا کوئی"

کبھی نہ شیمِ جنوں باغ کی ہواؤں سے ۔۔۔ ہوا نہ چین میسّر حسیں فضاؤں سے
سکوں ملا نہ مغنی کی بھی نواؤں سے ۔۔۔ "مریضِ عشق نہ اچھا ہوا دواؤں سے"
"شفا نصیب نہ اسکو ہوئی دعاؤں سے" ۔۔۔ "مگر علاج جو اُس نے کیا وفاؤں سے"

"چراغِ عارضِ پُرنور کی ضیاؤں سے"
"سیاہ خانۂ دل جگمگا گیا کوئی"

کسی کو گلکدۂ دل میں جب دی ہے جا ۔۔۔ ہے اپنا خلق میں انور جگہ جگہ چرچا
ہزار شکر محبت کا مل گیا ثمرا ۔۔۔ "کسی کے عشق میں پایا ہے ہمنے یہ تمغا"
"امامِ دیں تھے جو بیٹھے تراب ہوئے رسوا" ۔۔۔ "منم ز خوشی میں ہوں ہیچ نیاز نے بجا"

"نگاہِ مست سے بیخود بنا گیا کوئی"

انور بھوپالی

تارک الدُنیا

شہر کی چل پہل، دُنیا کی شورش اور آبادی کی ہنگامہ آرائیوں سے بہت دُور دُنیا کا ستایا ہوا اور سیاہ بختی کا مارا لوجود دنمودنہ "یوسف" ایک ویران اور بے کیف مقام پر اپنی زندگی کی گھڑیاں گن رہا تھا اور کائنات کی دلفریبیاں ــــــ اُس کے لئے رنگینیوں سے یکسر خالی ہو چکی تھیں

آبادی سے بہت دُور ــــــ جہاں صحرائی سلسلہ شروع ہوتا ہے ــــــ کسی پُرانے زمانے کی یادگار ایک شکستہ مسجد کھڑی زبانِ حال سے دُنیا کی بے ثباتی کا راگ الاپ رہی تھی۔ لوگ اس مسجد سے خائف تھے اور اسے "جناتوں کا مسکن" کہتے تھے مگر یوسف کو اُسے کوئی ڈر نہ تھا اور نہ خوف۔ مسلسل غموں اور خاصکر کارزارِ حیات کی اہم ناکامی کے بعد وہ شاید رہبانیت سے بھی گذرگیا تھا اور اس کی ظاہری حالت بھی کچھ ایسی ہی ہو رہی تھی۔ گنجان ڈاڑھی۔ گدھی اور کانوں کو چھپاتے ہوئے پریشان بال، ایک سفید بوسیدہ سا جبہ اُس کی ستر پوشی کرتا تھا۔ صحرا کی اُس ویران شکستہ مسجد میں اُس کی سکونت عوام کے لئے ایک پُراسرار داستان" کی سی اہمیت رکھتی تھی اور یہ تھا بھی سچ یوسف کی سکوں پسندیوں۔ عبادت گذاریوں میں اسکی زندگی کا اہم راز پوشیدہ تھا وہ ایک فریب خوردہ ایام شخص تھا۔ بعض عقیدتمند اُسے کوئی ولی یا اوتار سمجھتے تھے اور غدار دُنیا کے بعض مکار اُسے اپنی طرح دغاباز تصور کرتے تھے۔ ہر دو میں سے کوئی ایک بھی رائے قائم کرنے میں حق بجانب نہ تھا۔ یوسف کی زندگی کا راز کوئی خلافِ عقل و قیاس راز نہ تھا جو واقعات اس پر گذرے ایسے ہی بہتوں پر گذر گئے ہونگے۔ فرق تھا تو صرف اپنے اپنے جذبہ احساس کا ــــــ اپنی ہی کمزوری کا اور اپنے ہی ہم جنسوں کی چیرہ دستیوں کا۔

یوسف ایک متوسل خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ والدین نے اُسے، گویا سنبھال کر بچپن کی منزل سے نکالا تھا مگر قدرت اس کے لئے جو کچھ تجویز کر چکی تھی اُسے بہرحال پورا ہونا ہی تھا۔ یوسف کی صرف ایک بہن تھی جو عمر میں یوسف سے پانچ سال بڑی تھی۔ یوسف کمسن تھا تحصیلِ تعلیم میں مصروف۔

یوسف کی کتابِ زندگی کا پہلا ورق اس طرح اُلٹا کہ وہ ابھی پندرھویں سال ہی میں تھا اور نویں کلاس کا امتحان دے رہا تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ خاندان کے تمام خودغرض افراد ٹوٹ پڑے اور جو جس کے ہاتھ آیا لیکر چل دئے۔ یوسف کی بیوہ ماں جب اپنے غم سے قدرے سنبھلی تو اُسے احساس ہوا کہ غریب یوسف اپنے باپ کے تمام اثاث البیت سے محروم ہو چکا ہے اور سوائے ایک مکان کے یوسف کے لئے کچھ بھی نہیں رہا ہے۔ گیا ہوا مال تو گیا ہی تھا، یوسف اور اس کی ماں کے واویلا کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اعزا جن میں یوسف کا بہنوئی بھی شامل تھا ان دو مظلوموں کے خون کے پیاسے ہو گئے، اور

کچھ عرصے بعد جبکہ یوسف میٹرک میں شاندار کامیابی حاصل کرنے پر شادو خرم تھا فلکِ پیر نے اپنے ترکش کا دوسرا تیر یوسف پر پھر آزمایا۔ اُس کی ماں بھی اچانک راہی عدم ہو گئی۔ اب یوسف یکہ و تنہا تھا، رواں دواں۔ جسکے لئے زمین سخت تھی اور آسمان دور۔ بہزار دقت و دشواری ایک اسکول میں معلمی کی جگہ مل گئی اور وہ اسی پر قانع ہو کر بیٹھ رہا ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

یوسف اپنی عمرِ ناپائیدار کی اکیس منزلیں گذار کر جوانی کی حد پر آپہنچا اور اب اُسے ایک جیون ساتھی کی ضرورت سختی سے محسوس ہو رہی تھی، وقت گذرتا رہا۔

گرمی کی تعطیل تھی۔ اسکول بند ہوا تو یوسف نے بھی ارادہ کیا کہ کہیں گھوم پھر آئے کئی سال سے اُس نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی تھی اور انسان کو قدرت نے طبیعت ہی ایسی دی ہے کہ وہ ہر ایک چیز سے جلد گھبرا جاتا ہے پھر ایک طویل مدت تک ایک حالت میں تارکانہ زندگی گذارنا یوسف ہی کا کام تھا اور اب تفریحاً بمبئی جانے کی خواہش کوئی اہم حقیقت نہ رکھتی تھی۔

یوسف نے رختِ سفر باندھ لیا اور چل پڑا، ٹرین کی تیز رفتاری کا اسی ہر سیکنڈ

اپنی منزل کو طے کر رہی تھی۔ تعداد راہ میں خوبصورت سبزہ زار، فلک بوس درختوں اور صحرائی میدانوں کے سوا اور کوئی دلچسپ نظارہ نہ آ رہی تھی۔ اور یوسف مناظر سے بے نیاز، اپنے ہمسفروں کی چیخ پکار، شور و غل سے بے پرواہ ہو کر کسی گہرے سوچ میں غرق تھا کہ ایک ہمسفر کے تخاطب نے اُسے چونکا دیا "اجی حضرت" یوسف نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ اُس کو مخاطب کرنے والا ایک خوش پوش وجیہہ نوجوان تھا۔

"کیا مجھے مخاطب فرمایا ہے جناب نے؟" یوسف نے پوچھا،

"جی ہاں ہمسفر" نوجوان بولا "میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ آپ اس قدر محو کیوں بیٹھے ہیں؟ میں معاف کیا جاؤں! ہمسفروں کی ان خوش گپیوں میں ایک نوجوان کا یوں ساکت بیٹھ رہنا، مجھے کچھ اچھا نہ معلوم ہوا"۔

"کیا عرض کروں" یوسف نے جواب دیا "مجھے خاموش اور دُنیا کی ہنگامہ خیزیوں سے بے نیاز رہنے کی کچھ عادت پڑ گئی ہے"۔

نوجوان، یوسف میں غائبانہ طور پر خاص دلچسپی لے رہا تھا سفر طویل تھا اور وقت فرصت؛ یوسف نے نوجوان کے مزاج میں غمگساری کا مادہ پایا اور بہت جلد گھل مل گیا۔ یہ نوجوان بمبئی کے ایک نہایت متمول گھرانے کا چشم و چراغ تھا، وہ بھی ایک نیک سرشت دوست پا کر بہت خوش ہوا۔

بمبئی کا عظیم الشان اسٹیشن نظروں کے سامنے آ گیا اب دونوں کو علیحدہ ہونا تھا، مگر نوجوان تو یوسف کے اخلاق کا اتنا گرویدہ ہوا تھا کہ اُسے چھوڑنا چاہتا ہی نہ تھا اور جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ یوسف اپنے قیام کے لئے کسی ہوٹل یا سرائے کی تلاش میں ہے تو وہ بہ اصرار و زبردستی یوسف کو اپنے گھر لے گیا اور اب یوسف اپنے دوست کا مہمان تھا ——— نوجوان کے گھر میں ویسے تو کئی اشخاص تھے ضعیف العمر والد۔ ماں، بیوی اور چار بہنیں۔ مگر سب سے زیادہ قابلِ توجہ نوجوان کی ایک بہن تھی "نوشابہ"

گھر کی تمام مستورات پردے میں رہا کرتی تھیں۔ صرف ایک نوشابہ تھی جو آزادانہ بے پردہ پھرا کرتی تھی اور اُس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بے انتہا اپ ٹو ڈیٹ اور تہذیب مغرب کی پرستار تھی اور اس کے علاوہ مقامی کالج میں بی۔ اے کی ایک ممتاز طالبہ علم بھی تھی، حُسن صورت عطا کرنے میں تو قدرت نے خاص توجہ کو نوشابہ کی طرف منعطف کر دیا تھا۔ ایک متمول باپ کی ناز پروردہ گریجویٹ بیٹی، اُس کی ہر جنبش اپنی جگہ جاذب نظر ہی نہیں بلکہ قابلِ تحسین تھی۔ نوجوان نے یوسف سے جب نوشابہ کا تعارف کرایا تو یوسف، نوشابہ کے اخلاق کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ نوشابہ بھی یوسف جیسے حسین اور سادہ دل نوجوان سے مل کر بہت خوش ہوئی اور اسی طرح رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان بے تکلفی بڑھتی گئی۔

اس روز شام سہانی تھی، نسیم خوشگوار کے جھونکے مشامِ جاں کو معطر کر کے تازگی بخش رہے تھے۔ یوسف اپنے مہمان نواز دوست کے مکان کے بیرونی صحن میں بیٹھا ایک اخبار کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اتنے میں نوشابہ آ پہنچی۔ نوشابہ کا بھائی اُسی روز کسی کام سے باہر گیا تھا۔ چنانچہ نوشابہ کو تخلئے کا پورا پورا موقعہ مل گیا اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد نوشابہ نے دبی زبان سے اظہارِ محبت کر ہی دیا۔ یوسف خود۔ کچھ دنوں سے اپنے دل میں محبت کی خلش محسوس کر رہا تھا لیکن اُس کی شرافت اسکی مقتضی نہ ہوئی کہ وہ لفظِ مدعا کو زبان تک لا سکے۔ نوشابہ کے اظہارِ محبت نے یوسف کے جذبات میں ایک ہیجان پیدا کر دیا لیکن وہ زنہار اس کم ظرفی کو روا رکھنے کے لئے تیار نہ تھا جس سے اُسکے دوست کی عزت پر حرف آئے۔ یہ محسن کشی اور غداری یوسف کی طبعی افتاد کے سخت خلاف تھی۔ مگر پھر بھی۔

ایک طرف حسین نوشابہ کی محبت یوسف کو سبز باغ دکھا رہی تھی تو دوسری طرف دوست کی عزت بھی جان کے برابر عزیز تھی۔ یوسف سخت کشمکش میں مبتلا ہو کر نوشابہ سے کنارہ کشی اختیار کرتا جا رہا تھا لیکن نوشابہ برابر یوسف کے دل میں آتشِ محبت کو فروزاں کرنے کے لئے اپنی کوششیں ختم کر رہی تھی۔ وقت معمولی رفتار سے گذر رہا تھا مگر یوسف کے لئے ہر ایک لمحہ ایک قرن معلوم ہوتا تھا۔

اپنے دوست کی واپسی پر یوسف نے فوراً بمبئی کو خیرباد کہہ دیا۔ دل میں محبت کی ایک بیقرار تڑپ رکھتے ہوئے بھی یوسف محبت کا ڈرامہ کھیلنے پر تیار نہ تھا۔ روانگی کے وقت نوشابہ آبدیدہ تھی۔

ایک گریجویٹ لڑکی جس کا مقصدِ حیات قہقہوں میں پوشیدہ تھا کیا اُس کا اشکبار ہو جانا صداقتِ محبت کی دلیل نہ تھی؟ نوشابہ کے آنسوؤں پر یوسف کا دل سینے میں تڑپا اور تڑپ کر رہ گیا۔ ٹرین روانہ ہو گئی۔

پھر وہی کنجِ قفس پھر وہی صیاد کا ڈر

یوسف پھر اپنے ماتم کدے کو ایک نئے غم کی بجولانی میں آباد کئے بیٹھا تھا۔

اب اُس کے سامنے کوئی راہِ عمل ہی نہ رہی تھی۔ نوشابہ اُس کی رگ رگ میں سما چکی تھی۔ لیکن نوشابہ کے حصول کی آرزو ایک سودائے خام تھی۔

ایک طرف عظیم الشان کوٹھیاں تھیں تو دوسری طرف بوسیدہ جھونپڑا۔ اُس طرف بیش قیمت سازوسامان اور دولت کا انبار تھا تو اِس طرف حسرت۔ مایوسی اور غربت کا مہیب غبار۔ اور ان دو عبرت خیز مناظر کے درمیان تھی ایک وادی "وادیٔ محبت" جکا ہر کانٹا پھول نظر آرہا تھا ...... مگر فی الحقیقت یہ فریب نظر تھا۔ یوسف کے حق میں وہ پھول بھی خار بن گئے۔ اس تضاد باہمی کا انجام وہی ہو سکتا تھا جس کی توقع کیجا سکتی ہے ——— !

ایک روز خلافِ معمول یوسف جلدی اپنے مکان پر پہنچ گیا تھا کہ یکایک نوشابہ آپہنچی، وہ بی۔ اے میں نمایاں کامیابی حاصل کرکے آئی تھی اور اسی لئے وفورِ مسرت سے بے خود ہو رہی تھی۔ یوسف نے نوشابہ کے حسین چہرے کو دیکھا اُس کی مسرت کے بے پناہ ہجوم کو دیکھا اور پھر اپنے غربت کدے کو اور خود اپنی افسردہ و تباہ حالی کو ——— اُس کا رنگ فق ہوگیا۔ خون تیزی سے جسم میں دوڑنے لگا سانس کی رفتار تیز تر ہوگئی۔ مگر نوشابہ ؟ اُس نے یوسف کے ماحول سے مطلق بیزاری کا اظہار نہ کیا بلکہ اپنی شیریں کلامی سے یہی یقین دلاتی رہی کہ یوسف کا معیارِ زندگی بہت سادہ مگر دلکش ہے۔ جسے سکون کی شعاعیں منور کرتی رہتی ہیں لیکن،

محبت کا رُخ بدلا جا چکا تھا۔ نوشابہ یوسف سے ایک ہمدرد دوست کی طرح گفتگو کرتی۔ ایک غمگسار رفیق کی طرح تبادلۂ خیالات کرکے اُسے ترقی کی راہیں بتاتی تھی۔ مگر وہ "محبت" ؟ وہ "اظہارِ مدعا" نام کو بھی نہ تھا، اب نوشابہ کے دل میں ایک اور ہی جذبہ کارفرما نظر آرہا تھا جسے صرف "انسانی ہمدردی" سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ نوشابہ بہت جلد چار یوم کے بعد ہی واپس بمبئی چلی گئی، ورنہ اُس کے پروگرام میں یوسف کے پاس قیام کے لئے دو ہفتے طے ہو چکے تھے۔

یوسف نوشابہ کو خدا حافظ کہہ کر جب واپس آیا تو اُس نے اپنی اُداس، زینت نہ آرائش سے بے نیاز میز پر ایک رنگین معطر لفافہ رکھا ہوا دیکھا جس پر یوسف کا نام لکھا تھا۔ بعجلت کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ یہ مکتوب نوشابہ اپنی روانگی سے قبل لکھکر رکھ گئی تھی۔ لکھا تھا:-

مسٹر یوسف ! آپکے قیام بمبئی کے دوران میں جو نظریہ میں نے آپکے متعلق قائم کیا تھا وہ غلط ثابت ہوا۔ مجھے یہ عرض کرنے میں باک نہیں کہ میں یقیناً آپکے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور آپ کا اظہارِ محبت اسی خواہش کا ایک رُخ تھا اور اب میں اسی غرض سے آپکے پاس آئی تھی کہ اپنی اس آرزو کی تکمیل کر سکوں لیکن یہاں آکر وہ ہوائی قلعہ مسمار ہو گیا۔ میں نے اس چار روزہ قیام میں اندازہ لگایا کہ آپ کسی طرح بھی میرے قابل نہیں کیونکہ آپکے پاس تمول ہے اور نہ علم اور حُسن اِن دو چیزوں کے بغیر ایک ایسا پیکر ہے جو روح سے خالی ہو ایک مورتی ہے جو اپنی آب کھو چکا ہو ایک ایسا پھول ہے جس میں خوبصورتی ہے مگر خوشبو نہیں اس تضادِ باہمی کے باعث میری آپکی یکجائی آگ اور پانی کا ساتھ ہوگا۔ آپ مجھے ایک مخلص ہمدرد اور غمگسار دوست کے روپ میں ہمیشہ پائینگے اگرچہ حق کی رفاقت حیاتِ کیلئے تیار نہیں ہوں پھر بھی میری تمام ہمدردیاں آپکے ساتھ ہیں۔ فقط مخلص نوشابہ

یہ تھا غریب یوسف کی قسمت کا آخری فیصلہ۔ خط پڑھکر اُس کا سر چکرا گیا۔ اپنی ہستی کے مفہوم کو پہچان کر اُس نے اپنے لئے ایک عاجلانہ فیصلہ کر لیا اور وہ فیصلہ کیا تھا "ترکِ دنیا !" ؎

یہی کچھ یادگاریں رہ گئیں اپنی زمانے میں
قفس میں ہڈیاں یا چار تنکے آشیانے میں

آغا زاہد علی اکبرآبادی

قطعہ تاریخ وفات مولانا قاضی قمرالحسن صاحب قمر بدایونی مرحوم

آہ قمرالحسن بدایونی — غافل از یادِ حق نہ گاہے خفت
شاعرِ بے بدل و یکتا بود — گوہرِ عقدۂ معانی سفت

سالِ ترحیل ہاتفِ از احسان
"قمر خلد مہر عالم" گفت

احسان حسن خاں احسانؔ سلم پور ڈاکخانہ۔ ضلع مظفرپور (بہار)

خوابِ زندگی

(۱) بچپن :-

پیاری اماں! جلد آؤ اور کرلو مجھ کو پیار — دیر سے سورج کی کرنوں کو ہے میرا انتظار
روکتی ہو کس لئے تم؟ اب مجھے جانے بھی دو — ساتھیوں میں کھیل کر جی اپنا بہلانے بھی دو
دُور ہی حدِ نظر سے دُور میری رقص گاہ — وہ اُفق! یعنی نکلتے ہیں جہاں سے مہر و ماہ
غرق ہے ہر ذرّہ جس کا قلزمِ انوار میں — میری امیدوں کا مسکن ہے اُسی گلزار میں
غنچہ غنچہ اُس چمن کا ہے مجسّم اک بہار — پتّی پتّی کو وہاں پاؤں گا اپنا غمگسار
زندگی کے ساتھ کچھ چنگاریاں لایا ہوں میں — رازِ قدرت کا امیں بنکر یہاں آیا ہوں میں
میری ان آنکھوں سے کیفِ زندگانی ہے عیاں — میرے سینے میں ہیں کچھ جذباتِ پاکیزہ نہاں
میرے جاتے ہی وہاں ہر پھول ہوگا باغ باغ — گوشے گوشے میں جلاؤنگا محبت کا چراغ
جا کے میں بھی اُس گلستاں کے نواپیراؤں میں — سرمدی نغمات گاؤنگا شفق کی چھاؤں میں

پھیلے گی میرے رُخِ معصوم سے تابندگی
ہر طرف دیکھینگی آنکھیں زندگی ہی زندگی

(۲) جوانی :-

پیاری اماں! آؤ لیلو آخری اب میرا پیار — ہے عروسِ زندگی کو میرا یا ہر انتظار
دُور! ہاں! ہاں! حدِ نظر سے دُور جانا ہے مجھے — گوہرِ مقصود اپنا ڈھونڈھ لانا ہے مجھے
زندگانی کی بہاریں لوٹتا ہر گام پر — ہوگا طے، تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں میرا سفر
ہے کشادہ میرے آگے زندگی کی شاہراہ — لڑ رہی ہے رفعتِ افلاک سے میری نگاہ
ہر نفس سوزِ یقیں کی آگ شعلہ ریز ہے — قلزمِ جذبات کی ہر موج طوفاں خیز ہے
زندگی کا عقدۂ پیچیدہ مجھ پر کھل گیا — اک مسلسل جنگ کی کوئی ہے مجھ کو ابتدا
آج سے آغاز ہوگا اک نرالے باب کا — میری کوشش لیگی دل مٹھی میں شیخ و شاب کا
دل میں استقلال و ہمت موجزن پاتا ہوں میں — ابتلا و غم کو خاطر میں کہاں لاتا ہوں میں
سرنگوں سب کو کریگا میرا عزمِ آہنیں — میرے آگے ہوگی خم سرکش سے سرکش کی جبیں

جو کیا ہے فیصلہ میں نے وہ ٹل سکتا نہیں
کوئی اب میرے ارادوں کو بدل سکتا نہیں

(۳) بڑھاپا :-

کون باقی رہ گیا دنیا میں اپنا غمگسار — اے فرشتے موت کے! کر تو ہی میرا انتظار
ہوگیا اوجھل نظر سے زندگانی کا سراب — شام کے پردے میں چھپ جانے کو ہے اب آفتاب
خوب دیکھا! دیکھنا تھا جو کمالِ زندگی — عمر کا پیمانہ کیا ہے؟ ماہ و سالِ زندگی
غرقِ ظلمت زندگی کے چاند تارے ہو چکے — ختم وہ رنگیں مناظر آہ! سارے ہو چکے
چشمِ حیراں میں سمٹ کر رہ گئی میری نظر — شب کی تاریکی میں گم ہونے کو ہے نورِ سحر
وہ تڑپ دل میں نہ باقی روح کا وہ جوش ہے — جسم کا ڈھانچہ ہی کیا؟ اک بربطِ خاموش ہے
ٹکڑے ٹکڑے گم فضا میں ہوگیا آواز کا — ٹوٹ جانے کو ہے اک اک تار میرے ساز کا
جسم سارا ہوگیا پژمردہ، چہرہ زرد ہے — شعلہ زن جو آگ سینے میں تھی بالکل سرد ہے
عقل بھی دم تھی سراغِ نوجوانی ہوگئی — صبح ہوتے ہوتے ختم اپنی کہانی ہوگئی

زندگی خوابِ پریشاں کے سوا کچھ بھی نہیں
یعنی حالِ یاس و حرماں کے سوا کچھ بھی نہیں

مسلم مالیگانوی

نرمد ——— گجرات کا ایک عظیم المرتبت مصلح شاعر

نرمدا شنکر ۲۴ اگست سنہ ۱۸۳۳ء کو بوقت صبح بمقام سورت پیدا ہوئے۔ ان کے والد لال شنکر دوے قوم کے ناگر برہمن تھے لوگ انھیں بڑی عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لال شنکر وید اور سنسکرت کے عالم تو نہیں تھے لیکن ان علوم میں کافی دسترس حاصل تھی ان کا ذریعۂ معاش موروثی پیشہ خوشنویسی تھا اور بمبئی کے چھاپے خانے میں ملازم تھے لیکن تھوڑے عرصے کے بعد اس پیشہ کو ترک کر کے بمبئی کے ہائی کورٹ میں ۱۵ سے ۴۰ روپے ماہوار پر ملازمت کر لی۔

نرمد کے بچپن کا زمانہ ختم ہوا، پانچ سال کی عمر ہوتے ہی خانگی مدرسے میں بٹھا دیا گیا یہاں کچھ عرصے پڑھنے کے بعد سرکاری اسکول میں بٹھایا۔ یہاں ساڑھے تین سال میں گجراتی کی تعلیم ختم کر چکے تو ثانوی تعلیم کے لئے بمبئی کے الفنسٹن اسکول میں بھیجے گئے۔

نرمد چونکہ بہت ذہین و فہیم تھے۔ ابتدائی مدارج بہت جلد طے کرتے ہوئے چلے جاتے تھے لہذا اُن کے اساتذہ اُن کو بہت عزیز رکھتے تھے اور نرمد بھی اپنے اساتذہ کی بہت عزت و حرمت کرتے تھے۔ نرمد کو ادب اور علم حساب سے خاص شغف تھا خود لکھتے ہیں "مجھے انگریزی کتابیں پڑھنے میں اور اقلیدس کی شقیں حل کرنے میں بے حد لطف آتا تھا" اسی وجہ سے اُن کے استاد مسٹر گرینام نرمد کو جامیٹریشن (مہندس) کے نام سے یاد کرتے تھے۔

پانچ سال میں ہائی اسکول کی تعلیم ختم کر کے کالج میں داخلہ کے لئے انٹرنس کا امتحان دیا جس میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہو کر دس روپے کا وظیفہ حاصل کیا۔

کالج میں ابھی آٹھ ماہ گذرے ہونگے کہ نرمد کو اپنی پڑھائی ترک کر کے بمبئی کو خیرباد کہنا پڑا۔ نرمد بچپن ہی میں سلکِ ازدواج سے منسلک ہو چکے تھے اور جب دلہن سنِ بلوغ کو پہنچی تو نرمد کے خسر نے لال شنکر کو لکھا: "دونوں بچے سنِ شعور کو پہنچ گئے ہیں اور میرا خیال ہے کہ اب نرمد سورت آ کر اپنے گھر بار کی طرف توجہ مبذول کریں تو بہتر ہوگا"۔ لال شنکر نے خیال کیا کہ بہو کو بمبئی بلا لیں تاکہ نرمد کی پڑھائی میں خلل نہ آئے اور اس اثنا میں نرمد کی والدہ کا انتقال بھی ہو چکا تھا لہذا نرمد کو سورت میں تنہا بھی رکھنا نہیں چاہتے تھے لیکن چند مجبوریوں کی وجہ سے نرمد کو بمبئی چھوڑنا ہی پڑا۔

۱۸۵۰ء میں نرمد سورت آئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ پاؤں میں زنجیر پڑ چکی تھی، فکرِ معاش دامنگیر ہوئی خوش قسمتی سے چند روز ہی میں سورت سے تین میل دور قصبۂ راندیر میں ایک پرائمری اسکول میں مدرس کی جگہ مل گئی اور اس کے چند روز بعد ہی سورت کے ایک پرائمری اسکول میں پندرہ روپے ماہوار پر تقرر ہو گیا۔

سورت آنے کے بعد سلسلۂ تعلیم منقطع ہو گیا، نرمد اپنا بیشتر وقت یا تو دوستوں کی گرم صحبتوں میں گزارتے یا بھنگ پیکر خیالات کے سمندر میں غوطے لگایا کرتے۔ خود لکھتے ہیں "ان دنوں ایک دُھن سمائی تھی کہ عالموں کے شایانِ شان کوئی ایسا کام کیا جائے تاکہ شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہو" اس کی داغ بیل تو بمبئی ہی میں پڑ چکی تھی کالج کے زمانۂ تعلیم میں اصلاح قوم کے لئے ایک انجمن قائم کی تھی جس کے صدر خود تھے۔ سورت آنے کے بعد بھی یہ جوش و ولولہ کم نہ ہوا۔ یہاں بھی ایک انجمن قائم کی جس کے تحت میں ایک اخبار "گیان ساگر" شائع ہوتا تھا۔ نرمد اب تک خیالات کی دنیا میں رہتے۔ نرمد نے قیام سورت میں نہ تو اس اخبار کے لئے کوئی مضمون لکھا نہ کسی انگریزی یا گجراتی کتاب کا مطالعہ کیا۔

شادی کو ابھی تین سال بھی نہ ہوئے تھے کہ اس قید سے نجات مل گئی۔ اسقاطِ حمل سے بیوی راہیِ عدم ہوئی۔ بیوی کی وفات نے نرمد کو عالمِ خیال سے میدانِ عمل میں ڈھکیل دیا۔ سورت میں رہنے کی اب کوئی وجہ نہ رہی۔ پھر کالج یاد آیا اور بمبئی کا قصد کیا۔

سنہ ۱۸۵۴ء میں نرمد بمبئی گئے دوبارہ کالج میں داخلہ لیا اور ساتھ ساتھ جیون داس بابو کے بچوں کے اتالیق بھی ہو گئے۔ کالج کے ششماہی امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہو کر پندرہ روپے کا وظیفہ حاصل کیا لیکن یہ سب تین سال کی رنگ رلیوں کا کفارہ تھا کیونکہ اس کے بعد نرمد کا دل پڑھائی سے پھر ہٹ گیا۔

نرمد کا بیان ہے "جب دوسرے طلباء امتحان کی تیاری میں مشغول رہتے اس وقت میں ولایت جانے کے رنگین خواب دیکھتا۔ یہاں مجھے اتنا یاد ہے کہ اس سال انگریزی کے قریب تو شعر موزوں کر کے پروفیسر ریڈ کے سامنے پیش کئے اور انھوں نے ہنس کر ٹال دیا" یہ سال نرمد کی زندگی کے پہلے دور کا آخری سال تھا پہلے دور کے اختتام اور نئے عہد کے آغاز میں جنگ چھڑی تھی۔ خیالات میں کشمکش کی وجہ سے طبیعت پراگندہ رہتی تھی۔

ایک طرف تین سال کی رنگ رلیاں آنکھوں کے سامنے رقص کرتیں تو دوسری طرف شہرت حاصل کرنے کا خیال چین سے بیٹھنے نہ دیتا تھا، مزاج میں بھی پورا استقلال پیدا نہیں ہوا تھا اور خشک طبعی رنگین مزاجی کو کچل رہی تھی اسی کشمکش میں یہ سال بیکار گیا اور امتحان میں ناکامی ہوئی۔ اب پڑھائی کا سلسلہ ترک کرکے ملازمت کی اُدھیڑبن میں پڑ گئے اور بڑی کوششوں کے بعد انفسٹن اسکول میں ٹیچری کی جگہ پر فائز ہوئے

۲۲ سال کی عمر تک نرمدنے گجراتی کی دو چار سے زیادہ نظمیں نہ پڑھی ہونگی نہ کبھی شعر و شاعری کی طرف طبیعت راغب ہوئی۔ ۱۸۵۵ء کے اواخر میں نرمد کا رجحان اس طرف ہوا۔ خود لکھتے ہیں "اس سال کے ستمبر میں ڈھیر ابھگت کی دو چار نظمیں نظر سے گذریں۔ اس کے چار پانچ روز بعد مجھے شعر کہنے کے شوق نے گدگدایا۔ ایک نظم اسی بحر میں موزوں کی اور دوسرے ہی روز ایک اور نظم کہی۔ دل میں خیال آیا کہ اگر میں اس طرح شعر کہنے کی مشق کرتا رہوں تو شاعر ہو سکتا ہوں تحصیل علم، ملازمت، شادی وغیرہ سب میرے لئے سامانِ عیش و طرب ہیں اور شاعری سے بھی مجھے کیف و سرور حاصل ہوتا ہے تو پھر یہ بھی کیوں نہ کروں؟ پیٹ بھرنے کے لئے روٹی کا ٹکڑا کہیں سے بھی مل جائیگا"

نرمد اپنی شاعری کا آغاز ۲۱ ستمبر سے کرتے ہیں کیونکہ یہی دن اُن کی سالگرہ کا تھا۔

نرمد شاعروں کی صف میں تو بیٹھ گئے قلیل عرصے میں شاعری کی ہر صنف سے کم و بیش واقفیت بھی حاصل کر لی لیکن علم عروض سے نابلد تھے اس کمی سے نرمد کو سخت کوفت ہوتی تھی لہٰذا اس کے شوق میں سُورت آئے، یہاں ایک دوست کے پاس عروض پر قلمی نسخہ پایا۔ اس دوست نے یہ شرط لگائی کہ نرمد مکان پر آکر نقل کر لیں نرمد نے یہ قبول کیا اور قریب ڈیڑھ ماہ میں یہ کام ختم کرکے واپس بمبئی چلے گئے جب اس ایک کتاب سے کام چلتا نظر آیا تو بمبئی میں کسی پنڈت سے علم عروض سیکھنا شروع کیا اور اس طریقہ کو بھی تسلی بخش نہ پایا تو پونا جاکر کسی عروض داں سے یہ علم سیکھا بہت ہی قلیل عرصے میں اس علم میں اس قدر مہارت حاصل کر لی کہ جب اُن کے والد نے عروض پر ایک رسالہ لکھنے کو کہا تو نرمد نے چند ہی دنوں میں ایک مختصر رسالہ لکھکر اپنے والد کی خواہش پوری کر دی۔

نرمد اپنی قدر پر کہتے ہیں کہ ۱۸۵۸ء تک تین چار مجموعۂ کلام اور دو تین چھوٹی تصانیف بھی شائع ہو چکی تھیں اب ملازمت میں کوئی وابستگی نہ رہی قلم کو ذریعۂ معاش ٹھہرا کر ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ جس روز استعفیٰ دے کر مکان آئے اور قلم پر نگاہ پڑی تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اس کو خوب ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور کہا "اے قلم! اب ہم تیرے سہارے ہیں"

اس وقت نرمد شاعرہ بزی کر رہے تھے۔ ہر جگہ انہیں کا چرچا ہونے لگا۔ اُن کی نظموں پر تنقیدیں نکلنا شروع ہو گئیں۔ ان کے کلام کی عوام میں مقبولیت ہونے لگی قدامت پسندوں کے دلوں میں تخریب کا خوف پیدا ہو رہا تھا اور ریفارمر (Reformer) پھولے نہیں سماتے تھے۔

۱۸۵۶ء میں ڈاہی گوری نام کی ایک بیوہ سے دوبارہ عقد کیا لیکن یہ بیوی کم عمر ہونے کی وجہ سے نرمد کے مکان پر ۱۸۶۰ء میں آئیں۔ اس قدیم سماجی رسم کو توڑنے میں نرمد پر پہاڑ ٹوٹے لیکن نرمد نے کچھ پروا نہ کی۔ اس کے بعد ۱۸۶۳ء میں نرمد کے والد ۵۶ سال کی عمر میں اس دُنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ یہ نرمد کے عروج کا زمانہ تھا ۱۸۶۲ء میں نرمد نے اپنا سات سال کا کلام کتابی صورت میں شائع کیا اور اسکے بعد قریب قریب ہر سال کلام کا مجموعہ شائع ہوتا رہا قوم کی اصلاح پر قلم چل چکا تھا۔ اپنے خیالات کو عوام تک پہنچانے کے لئے ۱۸۶۴ء میں ڈانڈیو (منادی) نامی ہفتہ وار پرچے کا اجرا کیا اور اس میں مزاحیہ مضامین لکھکر لکھکر ہندو سوسائٹی کی خرابیوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا

والد کی وفات کے بعد نرمد نے محلہ آملی ران۔ سورت میں اپنے مکان کے سامنے ایک خوبصورت بنگلہ تعمیر کرایا اور اس کا نام سرسوتی مندر رکھا۔ اس بنگلے میں علمی و ادبی مجالس منعقد ہوتی تھیں۔ یہی اُن کا کتب خانہ تھا اور یہی دفتر بھی۔ زمانۂ عروج میں اس دفتر میں کئی کارکن بھی ملازم تھے۔

اس تعمیر میں نرمد کا کافی روپیہ خرچ ہو گیا۔ مکان کے مصارف بھی حدِ اعتدال سے متجاوز تھے، روزانہ روپیہ ڈیڑھ روپیہ تو صرف خاطر مدارات میں صرف ہو جاتا تھا ادھر تصانیف کی فروخت کم ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں نرمد پر دس بارہ ہزار کا قرض ہو گیا۔

چند سال تو عسرت میں گذار دے لیکن آخر تنگ آکر ۱۸۶۷ء میں پھر بمبئی گئے اور تھیٹروں کے لئے ڈرامے لکھنا شروع کئے۔ بمبئی میں بھی تنگ دستی کی یہ حد تھی کہ نرمد جیسے شاہی ٹھاٹ سے رہنے والے شخص کو بعض مرتبہ کھانا تک نصیب نہ ہوتا تھا جب ڈراموں سے بھی کچھ کام چلتا نظر نہ آیا تو کاروبار چلانا [illegible]

اور گوکل داس تیج پال چیرٹی فنڈ کے دفتر میں سو روپیہ ماہوار پر سکریٹری کی جگہ (جس کا اُنہیں کے بہی خواہوں نے مخفی طور پر انتظام کر رکھا تھا) دوستوں کے اصرار پر قبول کر لی۔

۲۰ جنوری کو جب پہلے روز دفتر جانے کو تھے اُن کے مکان پر عمداً چند دوست گئے اور نرمد کو تیاری کرتے ہوئے دیکھکر مسکرائے۔ نرمد نے اُس وقت اپنے دوستوں سے پُردرد لہجے میں کہا "ہنستے کیا ہو چوبیس سال عہد شکنی کروائی"۔ یہ کہتے ہوئے سر جھکائے زینہ سے اُتر گئے۔ اس ملازمت میں صرف ساڑھے تین سال گزرے ہونگے کہ سخت علالت کی وجہ سے سورت آنا پڑا۔ یہاں سات آٹھ ماہ بیماری کی تکلیفیں اُٹھانے کے بعد ۱۸۸۶ء کی ۲۵ فروری کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

۱۹۳۳ء کی ۲۴ اگست کو بمقام سورت نرمد میموریل کمیٹی کے تحت میں از روئے قدرشناسی و خدمات جلیلہ بہت اعلیٰ پیمانے پر صد سالہ برسی منائی گئی اور بطور یادگار سورت کے وکٹوریہ گارڈن میں نرمد کا مجسمہ نصب کیا گیا جس کو دیکھکر ہر ہندو شرمندۂ احسان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نرمد کا مکان "سرسوتی مندر" بھی نرمد میموریل کمیٹی نے خرید لیا ہے۔

نرمد کی پانچ چھ تصانیف میں سے "نرم پدھ"۔ "نرم گدھ" اور "نرم کوش" زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ "نرم پدھ" مجموعۂ نظم ہے۔ یہ قومی نظموں، عشق و محبت، جذبات فطرت اور مناظرِ قدرت کا بے بہا خزانہ ہے۔ "نرم گدھ" حصۂ نثر ہے اس میں علمی، ادبی اصلاحی، تاریخی اور مزاحیہ مضامین ہیں، خطوط اور ڈرامے بھی اس میں شامل ہیں۔ "نرم کوش" ایک بے نظیر لغت اور ادب میں مایۂ ناز اضافہ ہے۔ جس کے لئے گجراتی ادب ہمیشہ مرہونِ منت رہے گا۔

نرمد کی چند خصوصیات

نرمد نسلاً برہمن تھے لیکن فطرتاً کشتری تھے۔ اپنی قوم کے ایک مایۂ ناز سپاہی تھے۔ ایک نظم میں لکھتے ہیں "نرمد شیر سپاہی ہے"۔ نرمد نے اس مصرع میں اپنی زندگی کا ایک پہلو پیش کر دیا ہے۔ اُن کو پہلے سے سکھ چین کی زندگی سے نفرت تھی کیونکہ اُن کو دنیا ایک میدان کارزار نظر آتی تھی۔ ہر جگہ نرمد بہادر جواں ہمت اور جواں مرد عدو کو پکارتے نظر آتے ہیں۔ ایک بہادر سپاہی کی طرح نرمد ہر کام میں اپنے قدم [illegible] کہ بھر دنیا کی کوئی طاقت اُن کے خیالات میں تذبذب پیدا

نہیں کر سکتی تھی۔ صدہا سال کی بدعتوں کو توڑنا آسان کام نہ تھا۔ ایک طرف تمام قوم اور دوسری طرف تنہا نرمد تھے۔ نرمد دشمنوں کی جس قدر کثرت دیکھتے تھے اسی قدر اُنھیں جوش آتا تھا۔

ملک پر غیر قوم کا تسلط دیکھکر نرمد جیسا مرد لب خاموش بیٹھ سکتا تھا۔ ایک بہادر سورما کی طرح شمشیر بکف میدان میں کھڑے ہو کر للکار رہے ہیں۔

"آہ! حکومت نے ہتھیار چھین لئے۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر"

نرمد کو خانگی زندگی میں بھی بے شمار مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا تھا ۱۸۶۴ء سے دمِ واپسیں تک نرمد نے بڑی عسرت میں بسر کی۔ صدہا مواقع ایسے آئے کہ اچھے اچھوں کے بھی چھکے چھٹ جاتے۔ لیکن نرمد نے ہر وقت صبر و استقلال کے ساتھ بخندہ پیشانی ان مصیبتوں کا خیر مقدم کیا۔

حق گوئی اور بے باکی نرمد کے اوصاف حمیدہ میں سے تھے۔ ٹالسٹائے کی طرح نرمد بھی یہ کہنے کی جرأت کر سکتے تھے Truth is the hero of my tale. "صداقت میرے افسانے کا غازی ہے"

نرمد کی زبان سے ہر وقت یہ سنا گیا "سچ کہنے میں کیا خوف ہو سکتا ہے؟" ایک دفعہ بمبئی میں اُن کے ہمعصر حریف شاعر "دلپت رام" کو دعوت طعام میں مدعو کیا۔ طعام سے فارغ ہونے کے بعد بسبیل تذکرہ نرمد نے دلپت رام سے اُنکے کلام کی خصوصیات کے متعلق دریافت کیا۔ دلپت رام نے جو کچھ کہا وہ نرمد کے گلے سے نہیں اترا۔ نرمد نے سب سُن لینے کے بعد کہا "دلپت بھائی! آپ نے جو کچھ فرمایا اس میں سے میں تو ایک بھی چیز آپ کے کلام میں نہیں پاتا"

نرمد زندگی بھر سچ کہنے میں بے باک رہے۔ اپنے اخبار "ڈانڈیو" (منادی) میں وہ کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ گورنمنٹ کے بڑے بڑے عہدیداروں پر بھی وہ بہت بے باکانہ طریقہ پر ہاتھ صاف کرتے تھے۔ ایک وقت سورت کے ڈپٹی کلکٹر صاحب کسی بات پر بِگڑ گئے۔ اگر دوسرا کوئی شخص ہوتا تو دب کر بیٹھ جاتا۔ لیکن نرمد نے ان گوری چمڑے کے سب کس بل نکال دیے۔ لوگ اکثر کہتے تھے کہ "کوی ٹوپ والوں سے بھی نہیں ڈرتا"

حق گوئی اور بے باکی کی وجہ سے نرمد کو اکثر بڑے بڑے نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ لیکن نرمد نے کبھی اپنی روش کو چھوڑنا اصول کو نہ نرم کو [illegible]

طبع کرانے کے لئے بہت بڑے خرچ کی ضرورت تھی جب سورت میں اس کا کوئی انتظام نہ ہو سکا تو بھاؤ نگر (کاٹھیاواڑ میں ایک ریاست ہے) کے ایک متمول شخص نے اس کا ذمہ لیا۔

"نرم کوش" بھاؤ نگر کے کسی چھاپے خانے کو دیدیا گیا تھا لیکن اسی دوران میں بھاؤ نگر کے دیسائی قوم کے خلاف ڈانڈیو میں نرمد کا ایک مضمون شائع ہوا۔ وہاں کے دیسائی بگڑ گئے اور "نرم کوش" کی چھپائی کا کام رکوا دیا۔

نرمد عہد پر ثابت قدم رہنے کو جواں مردی تصور کرتے تھے۔ نرمد میں یہ صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ اس کی وہ بڑی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ نرمد کا اصول تھا کہ جان جائے لیکن عزت نہ جائے۔ آسمان ٹوٹے یا زمین پھٹے لیکن عہد نہ ٹوٹے۔ دل میں جو بات ٹھان لی پھر اس میں فرق نہ آئے۔ گھر بھر پیا، سر پر قرض کا انبار۔ گھر کا تمام اثاثہ صرف ایک روپیہ وہ بھی کسی کے دُکھ میں کام آگیا۔ لیکن بیس سال کا عہد کہ نوکری نہ کروں گا۔ نہ ٹوٹا! یہ دُنیا کے کھیل ہیں۔ ہر آفت کو برداشت کرنا بہادری ہے۔

نرمد نے "نرم کوش" اپنے ایک دوست "کرسنداس" کے نام معنون کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ہر زمانے میں نرمد بہت تنگدستی میں تھے۔ کرسنداس کا بھی خیال تھا کہ اس کی چھپائی کا خرچ وہ برداشت کرینگے۔ بدقسمتی سے شیر بازار سرد ہوا اور کرسنداس تباہ و برباد ہوگئے۔ نرمد کے دوستوں نے نرمد کو صلاح دی کہ "نرم کوش" کسی دوسرے شخص کے نام معنون کردیں لیکن نرمد اپنی زبان بدلنے کو گناہ سمجھتے تھے۔ سب کو ایک ہی جواب دیتے: "میں اپنا خیال بدلنے سے قاصر ہوں"

نرمد کی دریا دلی اور فیاضی کا ذکر نہ کیا جائے تو اُن کے اوصاف حمیدہ میں خلا رہ جائے گا۔ آسودہ حالی میں تو شاہانہ تمکنت سے بسر ہوتی ہی تھی لیکن زمانۂ عسرت میں بھی فیاضی کا وہی عالم تھا۔ تنگدستی اس وصف پر غالب نہ آسکی۔

ایک روز صبح کا وقت تھا جاڑے کی ابتدا تھی۔ سردی اپنا رنگ دکھا رہی تھی نرمد چائے پی کر کشمیری شال اوڑھے دالان میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک استادِ موسیقی جا دھمکے۔ تعارف کے بعد استاد نے گانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر گانا سننے کے بعد نرمد نے استاد کو ایک روپیہ دیا۔ اس روز گھر کی تمام دولت یہی ایک روپیہ تھی اور خدا معلوم کتنے روز اس ایک روپیہ پر بسر ہونے والے تھے۔ استاد ایک روپے سے سیر نہ ہوئے۔ کہنے لگے: "کوئی مہاراج میں آپ کا نام نامی سُن کر یہاں حاضر ہوا ہوں۔ آپ اور ایک روپیہ عنایت فرمائیں! یہ آپ کے شایانِ شان نہیں اور نہ میں اس ایک روپے سے خوش ہو سکتا تھا۔"

نرمد نے فوراً پچاس پچھتر روپے کی شال جو اوڑھے ہوئے تھے۔ استاد کو نذر کردی اور استاد کو مایوس نہ جانے دیا۔

ایک روز صبح کو قریب نو بجے نرمد اپنے کام میں مشغول تھے کہ ایک ضعیف کاٹھیاواڑی سفارشی خط لیکر آیا۔ نرمد نے مطلب معلوم کرلینے کے بعد اپنے کارکن نربھے رام کو بُلایا اور کہا کہ اس شخص کے لئے ایک سو روپے کا انتظام کردو۔ نربھے رام اس بڈھے کو اپنے کمرے میں لے گئے اور اس سے تین چار روز کا وعدہ کیا۔ نربھے رام گھر میں پیسوں کو دیکھتے ہیں تو صرف چھ سات روپے، وہ بھی دو تین روز کا خرچ کہیں سے قرض ملنے کی اُمید نہیں لہٰذا اس بڈھے سے تین چار روز کا وعدہ کردیا۔

یہ کشمکش اس وقت تک ہو رہی تھی کہ جب مکان میں کھانے کو بھی نہیں تھا۔ آخر تین چار روز میں چھ سات روپے ختم ہوگئے۔ اِدھر اس بڈھے کے آنے کی فکر اُدھر نرمد کا گزر کہیں باورچی خانے میں ہوا تو دیکھا کہ باورچی خانہ سرد پڑا ہوا ہے۔ نرمد نے نربھے رام کو بُلایا اور وجہ دریافت کی۔ نربھے رام نے کہا آج صرف چار آنے ہیں۔ نرمد نے یہ سُن کر بڑی خندہ پیشانی سے کہا اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بازار جاؤ اور دودھ اور مُرمُرے لے آؤ۔ آج اسی پر اکتفا کریں گے۔ (باقی)

سید ظہیر الدین مدنی۔ ایم۔ اے

مشاعرۂ شاعر۔ مصرع طرح برائے ماہِ جنوری ۱۹۴۲ء "تیری نظر ہنوز اسیر مجاز ہے"

مجاز۔ راز دفتر وفوقیہ رطب

غزلیں ہر مہینہ کی ... [illegible]

سجدۂ ناتمام

یہ کعبہ مجازِ عشق بھی ترا مقام ہے — مری نظر میں اس لئے بتوں کا احترام ہے
یہ نقص انتظام ہے کہ حسنِ انتظام ہے — مرے جہانِ ہجر میں نہ صبح ہے نہ شام ہے
نگاہِ اہلِ ظرف میں اسی کا احترام ہے — جو پیر میکدہ ہے اور خود ہی تشنہ کام ہے
رہے تو کس طرح رہے یہ کائنات ہوش میں — نظر نظر میں حسن کی شراب لالہ فام ہے
رہے نہ ہوشِ بندگی یہ ہے کمالِ بیخودی — اٹھالیا جھکا کے سر تو سجدہ ناتمام ہے
نظر میں اسکی کیا جچے یہ شانِ تاج و تخت کی — ہے بے نیازِ دو جہاں جو آپ کا غلام ہے
میں لاؤنگا کہاں سے پھر سکوں کے بعد اضطراب — یہیں سے انکے التفات کو مرا سلام ہے
سُنے گا کوئی یا نہیں ہے اس سے مجھکو کیا غرض — پکارتا ہوں میں، مجھے پکارنے سے کام ہے
خیالِ انقلاب سے لرز رہا ہے کس لئے — امید و بیم ہی نہ ہو تو زندگی حرام ہے
جہانِ بے ثبات میں ہے زندگی کا لطف کیا — خوشی بھی ناتمام ہے الم بھی ناتمام ہے
کچھ اور ہی طریق ہیں یہاں نمازِ عشق کے — اگر نہ خونِ دل سے ہو وضو بھی تو حرام ہے

میں باغِ دہر میں الم ہوں بے نیازِ عیش و غم
نہ کچھ بہار سے غرض نہ کچھ خزاں سے کام ہے

الم مظفر نگری

داستانِ حسن

عشق روح رواں نہ ہو جائے — یہ بلا جزوِ جاں نہ ہو جائے
مجھ کو دیکھو نہ مست نظروں سے — ضبطِ دل رائیگاں نہ ہو جائے
عشق کی وسعتیں ارے توبہ! — ذرہ ذرہ جہاں نہ ہو جائے
یہ تری انکھڑیوں کی دل طلبی! — پھر تمنا جواں نہ ہو جائے
یہ حوادث، یہ درد، یا اللہ — زیست بارِ گراں نہ ہو جائے

یہ مری داستانِ غم نجمہ
حسن کی داستاں نہ ہو جائے

(آنسہ) نجمہ تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی
اڈیٹر "ادیب" دہلی

انشائے لطیف

میرے پاس زمانۂ حال کے مشاہیر کے خطوط کثیر التعداد ہیں۔ ان میں سے آج دوسری قسط میں چند خطوط ناظرینؔ "شاعر" کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی "خطوط ریاض خیرآبادی" رسالہ ہٰذا میں شائع ہو چکے ہیں۔

(۱)
ڈاکٹر عبد الحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اُردو ہند کا خط بنام فضا جالندھری

دفتر انجمن ترقی اُردو ہند۔ نئی دہلی

۲۷ نومبر ۱۹۳۶ء

مکرم و مہربان بندہ تسلیم

"برزو" کہیں میرے دیکھنے میں نہیں آیا اور نہ مجھے اس کے متعلق کوئی علم ہے۔ البتہ برزہ تو ایک لفظ ہے جو ایک قسم کا کپڑا ہوتا ہے ریشم اور سوت ملا ہوا۔ میرا کتب خانہ ابھی نہیں پہنچا تحقیق کروں گا اگر کچھ سراغ لگا تو لکھ بھیجوں گا۔ آپ نے جو مری قواعد اُردو کے متعلق کوشش فرمائی ہے اس کا شکر گزار ہوں میں جو کچھ لکھتا ہوں انجمن کی نذر کرتا ہوں اگر یہ کتاب نصاب میں شریک ہو گئی تو انجمن کا فائدہ ہوگا۔ یہ حجم میں مصباح القواعد سے زیادہ ضخیم نہیں البتہ مطالب کے لحاظ سے بڑی ہے۔ مجھے تحریک کرنے میں تامل ہے۔ کہیں یہ خیال نہ ہو کہ میں اپنی کتاب کے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ حالانکہ اس سے میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں۔ البتہ انجمن کا فائدہ ہے اور یہ میں ضرور چاہتا ہوں ہمارے لغات کی تکمیل میں ابھی اور مدت درکار ہوگی۔ دو جلدیں بعد نظر ثانی طبع کے لئے تیار ہیں لیکن وہ حرف "الف" تک ہیں۔

"عبد الحق"

(۲)
ابو المعظم نواب سراج الدین صاحب سائل تلمیذ خاص فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کا خط بنام فضا جالندھری

سید صاحب عنایت فرمائے بندہ سلامت۔ السّلام علیکم عنایت نامہ شرف لایا۔ میں نے تعمیل حکم حسب الارشاد کر دی۔ کچھ اپنے اشعار نمونی کے سنداً حاضر کر دئے ہیں۔ جو کہ مجھے الفاظ متفرقہ کے متعلق یاد آئے کچھ کہہ دیے ہیں۔ میں کسی کا مخالف نہیں جس کا جو مسلک ہے ہو مذکر و تانیث جو میری زبان پر مرے روزمرہ میں جاری ہے۔ وہ مسلک ہٰذا ہے۔ صحت میری خراب ہے۔ پاؤں کے ٹوٹنے سے میں محتاج ہو کر فرش ایک سال سے ہو گیا۔ سردار جگت سنگھ صاحب سے بعد سلام فرما دیجئے کہ اختلاج قلب کے دورے سے نجات ہوگی تو کچھ حاضر کر دوں گا۔ رہنمائے تعلیم کی صورت سالہا سال سے نہیں دیکھی۔ آپ مجھے بھول گئے ہیں۔ میں بجائے خود خاموش ہو گیا۔ زیادہ

آثم ابو المعظم سراج الدین احمد خان سائل دہلوی

۴ دسمبر ۳۶ء

موٹر۔ مونث

سیاہ رنگ تھا از بسکہ تیز موٹر تھی — سواری کوئی نہ پہچانی میں نے اندر کی

بائیسکل۔ مونث

نئی لے آیا ہوں بے پوچھے دام بائیسکل — ادا کروں گا میں قیمت سمجھ کے دیکھ کے بِل

دہی۔ مذکر

تمہاری منہ کے بزرگوں کا قول یاد آیا — دہی کو اپنے بتاتا نہیں کوئی کھٹا

اپیل۔ مذکر

اپیل کرلیا منظور اگر عدالت نے   تو سمجھو کھایا ہے پلٹا تمہاری قسمت نے

رتھ ۔ مونث

سواری جو تھی مکلف سوار ہونے کی   فنس تھی ۔ بہلی تھی ۔ رتھ تھی تمام ڈر کی

گیند ۔ مونث

یہاں کھڑی تھی جو بچی حسین و گلرو تھی   اچھالتی رہی تا دیر گیند پھولوں کی

"سائل"

(۳)

اعتبار الملک جناب دلؔ شاہجہانپوری کا خط بنام فضاؔ جالندھری

شاہجہانپور

۲۴ مارچ ۳۶ء

دلنواز کرم ۔ السلام علیکم ۔ نعمۂ دل کے متعلق جن الفاظ میں جنابنے اظہارِ خیال فرمایا ہے وہ صرف حسنِ ظن ہے ورنہ من آنم کہ من دانم ۔ بہرحال آئندہ اشاعت میں ۔ نمونۂ دلکش نظر آئے گا مگر ان حضرات کو جو سوز و گداز حسرت درد کے قدرداں ہیں ۔ افسوس کہ میری قسمت میں سکون اطمینان نہیں ورنہ ترانۂ نشاط بھی پیش کرتا ۔ مگر ذوقِ سخن کو اس رنگ سے مناسبت کہاں مجھ کو تو مضطربِ دل ہی درکار ہے شمیم گل سے خلشِ خار مرے لئے زیادہ باعثِ تفریح ہے

نالہ را ہر چند می خواہم کہ پنہاں برکشم   سینہ می گوید کہ من تنگ آمدم فریاد کن

نشاطِ زندگی ختم ہو چکی اب اضطرار ہے اور دل ۔ دل ہے اور ماتم ۔ یادِ ماضی خوابِ خیال، مستقبل کچھ اور پریشان کن نظر آتا ہے ۔ بہرحال خدا کا شکر ادا کرتا ہوں ۔ مدیر "عالمگیر" کا گرامی نامہ صادر ہوا ہے ۔ سالنامہ کیلئے تازہ کلام کی فرمائش ہے تعمیل حکم کی کوشش کروں گا ۔ جنابکے کلام میں غیر معمولی جدت پیدا ہو گئی ہے ۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ۔ غزل بعد ترمیم ارسال ہے ۔ امید ہے کہ جناب بخیریت ہونگے ۔ برخوردار شبیر حسن سلمہ کا ۲۴ مارچ سے سالانہ امتحان ہے ۔ کامیابی کی دعا فرمایئے ۔   "دلؔ"

ایضاً (۴)

۳۰ اکتوبر ۱۹۳۶ء شاہجہانپور

مخلصی ۔ سلام نیاز ۔ غزل بعد ترمیم مناسب ارسال ہے ۔ آج کی قسط میں اپنی ایک نئی غزل پیش کر رہا ہوں ۔ خیالات پارینہ ہیں ۔ مگر انداز بیان قابلِ توجہ ہے ۔ اب میں کچھ نہیں کہتا بلکہ جناب فضاؔ کہلواتے ہیں مدت ہوئی دل فنا ہو گیا ۔ صرف خاکستر باقی ہے ممکن ہے کہ خاکسترِ دل کا کوئی ذرہ چمک اٹھے ۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہونگے ۔   "دلؔ"

ایضاً (۵)

مخلصی تسلیم ۔ بوجہ تحریک نزلہ آجکل طبیعت بہت بدمزہ ہے ۔ خفیف حرارت بھی ہے ۔ ڈاکٹروں کی یہ رائے ہے کہ تا صحت کامل آپ دماغی محنت اور شب بیداری ترک کر دیں ۔ دعا کیجئے کہ خدا صحت کامل عطا فرمائے ۔ آپ کے اشعار مطالعہ کے بعد ارسال ہیں ۔ نقاب کو اہلِ لکھنؤ مذکر لکھتے ہیں ۔ مرزا داغؔ تانیث کے قائل ہیں ۔ میں بھی بالتانیث کہتا ہوں ۔ حضرت امیرؔ علیہ الرحمۃ ؎

نقاب اٹھی تو کیا حاصل حیا اٹھ تو آنکھ اٹھے   بڑا گہرا تو یہ پردہ ہمارے آنکھ حائل ہے

جسکے گھر بیری ہوتی ہے پتھر آیا ہی کرتے ہیں ۔ مشہور مثل ہے ۔ یعنی بیر پھل کی وجہ سے پتھر آتے ہیں ۔ بیر نہ ہوں تو پتھر نہیں آسکتے ۔ پتھر برسانے والے کا مقصود ایذا رسانی نہیں ہے بلکہ پھل حاصل کرنا ہے ۔ گھر کے مالک کو اسکی شکایت نہ کرنی چاہئیے بالفاظ دیگر جسکے گھر جوان لڑکی ہوگی پیغام کا آنا ضروری ہے ۔   دلؔ ۲۶ اپریل ۳۷ء

(٦) علامہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب سیکریٹری انجمن ترقی اردو ہند کا خط

قادر منزل ۔ حیدرآباد دکن

۱۸ اگست ۳۰ء   مکرم و مہربان بندہ تسلیم

عنایت نامہ پہنچا ۔ شکریہ ۔ چند ہی روز ہوئے ہیں برار کے دورے سے واپس آیا ہوں ۔ یہاں زبان ہی کے لالے پڑے ہیں اور آپ غزل گوئی پر مضمون لکھنے کی فرمائش کر رہے ہیں ۔ مجھے اتنی فرصت کہاں آپکے خط کا جواب بھی کئی دن کے بعد ذرا سی فرصت نکال کر لکھ رہا ہوں ۔ مجبور ہوں معذور ہوں معافی چاہتا ہوں

"عبدالحق"

ایضاً (۷)

قادر منزل ۔ حیدرآباد دکن

۱۹ مارچ ۳۷ء   مکرمی میں آشوب چشم میں مبتلا ہوں لکھنے پڑھنے کی ممانعت ہے ۔ یہ خط بڑی مشکل سے لکھ رہا ہوں اور وہ بھی مختصر

زیادہ لکھنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ میں نہ شہوا ادیب ہوں اور نہ مستند شخص آپ کی طرح طالب علم ہوں، بہرحال مجھ سے جو خدمت ممکن ہوگی اس کے لئے حاضر ہوں

۱۔ جو الفاظ آپ نے لکھے ہیں ان میں کھیل رتھ، ادرک سب مختلف فیہ ہیں۔ لفظ کھیل میں نہیں اگر کھیل سے بازی مراد ہے تو یہ مذکر ہے، اور اگر ... مونث۔ ادرک مونث۔ گیند مونث۔ رتھ مونث۔ سانس ... ہے۔ مذکر و مونث دونوں طرح ... مونث کو ترجیح دیتا ہوں

شعر میں دستِ[1] گل خوردہ کے وہی معنی ہیں جو احسن صاحب مارہروی فرماتے ہیں۔ بہار کے قصیدے کا شعر ہے اور مبالغہ یہ ہے کہ دستِ گل خوردہ بھی شاخِ گل کی طرح نشو و نما پا رہا ہے۔

میں زیادہ نہیں لکھ سکتا بوجہ تکلیف۔ "عبدالحق"

(۸) اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری کا خط

۱۴ر ستمبر ۱۹۳۶ء

دلنواز سلام نیاز۔ شملہ کا ارادہ بوجہ مقدمہ غیر یقینی ہوگیا تھا بایں وجہ میں آپ کو مطلع نہ کرسکا۔ شملہ سے متواتر تار آتے رہے۔ ۹ ستمبر کو اتفاقیہ مجھکو پنجاب میل سے پیشتر فرصت ہوگئی معہ برخوردار شبیر حسن سلمہ فوراً روانہ ہوگیا۔ جوش ملسیانی صاحب سے ملاقات مشاعرہ میں ہوئی۔ پُرخلوص انسان ہیں۔ میری طلبی میں زیادہ حصہ محترمی جناب فتح محمد صاحب شگفتہ کا تھا۔ قابل اور مخلص انسان ہیں میری عزت بھی کی اور چار زونشی سے دو مرتبہ سرفراز فرمایا۔ آپ یہ سن کر بیحد خوش ہونگے کہ دوسری اجلاس میں سر چودھری شہاب الدین صاحب وزیر تعلیم پنجاب جو صدر مشاعرہ تھے ان کے تین بجے دن کو بضرورت خاص اٹھ جانے کے بعد تمام اراکین جلسہ نے مجھ کو صدر منتخب کیا۔ ۳ بجے سے ۸ بجے تک مشاعرہ میری صدارت میں ہوتا رہا۔ اس مشاعرہ میں اکثر مشاہیر تھے افسوس ہے کہ بوجہ عجلت میں آپ کو مطلع نہ کرسکا۔ میں ۱۱ر ستمبر کو واپس آیا۔

نواب مظفر خاں صاحب وزیر مال سے بھی نیاز ہوا۔ موصوف نے اپنی کوٹھی میں بلایا تھا مگر اس روز کچھ طبیعت بدمزہ ہوگئی تھی اس وجہ سے نہ جاسکا۔

فرمایا۔ کہ لاہور جب آپ تشریف لائیں مجھ سے ضرور ملیں۔ تمام مشاعرہ میں مجھے اعتبار الملک کے خطاب سے مخاطب کیا گیا۔ یہ اہلِ پنجاب کی عزت افزائی کا نتیجہ ہے۔ کلام بعد کو ارسال کرونگا۔

آپ کا نیازمند
"دل"

(۹)
علامہ حضرت نیاز فتحپوری کا خط ..... ایضاً

لکھنؤ ۱۱ر جون ۱۹۳۳ء

مکرمی معاف فرمایئے اس دوران میں شدت گرما کی وجہ سے آپ کے خطوط کا جواب بروقت نہ دے سکا۔ بیدل[1] نے دوسرے مصرعہ میں اپنی آنکھ کو ایک ایسے صاف آئینہ سے تشبیہ دی ہے جو شبنم کی طرح ہے۔ صافی بمعنی صاف شبنم اور آفتاب کا تعلق آپ کو معلوم ہی ہے۔ یعنی میں معشوق کے حُسن بے حجاب پر نگاہ ڈالنے کی تاب نہیں رکھتا کیونکہ اُس کا چہرہ مثل آفتاب کے ہے اور میرا دیدۂ حیراں شبنم کی طرح ہے

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

تردامنی یعنی معصیت۔ شیخ سے کہتا ہے کہ ہماری تردامنی یا معصیت کوشی کا خیال نہ کرو، وہ اتنی بلند مرتبہ کی چیز ہے کہ اگر دامن نچوڑ دیں تو..................

---

[1] سودا کا شعر

دستِ گل خوردہ و شاخِ گل و گلزار ایہم ۔۔۔ بہماں نشو و نما کرنے میں ہیں ضرب مثل

---

[1] بیدل کا شعر

نیارد چشمِ بیدل تابِ حُسن بے حجابش را ۔۔۔ کہ باشد صافیِ آئینۂ شبنم آفتابش را

محض تردامنی کی رعایت سے یہ جوڑ باندھا گیا ہے۔

شرح دیوان غالب آسی کی کچھ نہیں ہے سب سے بہتر شرح طباطبائی کی ہے۔ گو اس میں بھی کہیں کہیں خامی پائی جاتی ہے۔

"نیاز"

(۱۰)

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل القدر حضرت جلیل جانشین امیر مینائی کا خط بنام فضا جالندہری

حیدرآباد دکن

۲۳ اگست ۳۸ء

کرمی۔ سلام نیاز۔ حسب فرمائش ایک قطعۂ تاریخ آپ کے دیوان کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ امید کہ جواب بخیر ہونگے۔

جلیل کان اللہ

قطعۂ تاریخ

حق تو یہ ہے کہ ہے دیوان فضا[1] کا حصہ — یہ بہاریں گل و گلزار چمنِ معنی کی
مصرعِ سال بھی اک تحفۂ رنگیں ہے جلیل — دلفزا کیا یہ فضا ہے چمنِ معنی کی

۱۳ ۵ ۵۷

فضا جالندہری

[1] افسوس کہ دیوان بوجوہ اب تک شائع نہ کرا سکا —— بندہ فضا

جلوۂ طور

(خمسہ بر غزل جناب صدیق صاحب جوناگڈھی)

غم افزا داستاں ہے داستانِ زندگی اپنی — بیان کرتی ہے جس کو انجمن میں بے خودی اپنی
بالآخر ہمنشیں یہ رنگ لائی عاشقی اپنی — "یہاں تک بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی دیوانگی اپنی"
"کہ اُن کے ہجر میں اک روز ہم نے جان دی اپنی"

شکایت عشق میں کرنا نہیں عشاق کی عادت — اُٹھانا چاہئے ہر زخم پنہاں سے نئی لذت
مگر دیکھے تو کوئی اختلافِ صورت و اُلفت — "اُدھر وہ حسن اور نخوت، اِدھر یہ عشق اور حسرت"
"اُدھر وہ زندگی اُن کی، اِدھر یہ زندگی اپنی"

کوئی ایسا نہیں جو اُن کو اتنی بات سمجھا دے — کہ اپنے عاشقِ ناشاد کو کوئی نہ ایذا دے
قیامت یہ بھی بجلی نہ اُن کی بزم میں ڈھا دے — "مرے دل کی تڑپ ان کو سرِ محفل نہ تڑپا دے"
"مرے دل کی لگی کو وہ نہ سمجھیں دل لگی اپنی"

یہ وہ آنکھیں نہیں جن میں سمائے حور کا جلوہ — یہ وہ آنکھیں نہیں جن کا ہے مقصد طور کا جلوہ
یہ وہ آنکھیں ہیں جن میں بس رہا ہے دُور کا جلوہ — "مری نظروں میں ہے اُن کے رُخِ پُرنور کا جلوہ"
"دکھا اوروں کو تو اے چاند جا کر چاندنی اپنی"

تلاشِ یار میں سرحدِ ہستی سے گزرتا ہوں — تخیّل کے پروں سے ماسوا کی سیر کرتا ہوں
کسی کے عشق میں کب موت سے واعظ میں ڈرتا ہوں — "میں اُن کے چاہنے والوں پہ اے صدیق مرتا ہوں"
"زمانے سے جدا ہے عشق اپنا عاشقی اپنی"

وزیرزادہ شجاعت خاں مہر جوناگڈھی

پری محل[1]

یاد ہے وہ وادیٔ کشمیر کی فصلِ بہار — جب جنوں انگیز تھا رقصِ نسیمِ جوئبار
نزہتیں مستی بداماں اور ابر کیف بار — جب عروسِ نو کی آرائش میں تھی مصروفِ کار

جب فضا میں رنگ بھرتے تھے گلوں کے قہقہے
ہر طرف شور آفریں تھے بلبلوں کے چہچہے

دامنِ کہسار تھا آئینۂ نورِ ازل — دیکھ کر جس کو نکھرتے تھے حسین ڈل کے کنول
ڈال کر میرے سکونِ دل میں یکگونہ خلل — لے گیا لطفِ بہاراں مجھ کو پریوں کے محل

عیش و عشرت کا سماں گو کیف پرور تھا وہاں
مانعِ نظارہ لیکن پردۂ در تھا وہاں

تین صدیوں قبل کے اس بھاری پردے کا سرا — ڈرتے ڈرتے میرے ذوقِ دید نے سرکا دیا
گو اندھیرا تھا وہاں، تھا شوق لیکن صبر زا — ایک رنگیں ضو فشاں سورج سا روشن ہو گیا

دیکھتا ہوں اک بھڑک ہے دبدبہ ہے شان ہے
پردہ کے پیچھے محل ہے، قصر ہے، ایوان ہے

کوہِ سبزہ پوش پر ہے ضو فگن قصرِ زری — طور کی بجلی ہے گویا محوِ جلوہ گستری
سبز جھاڑی میں ہے بیٹھی کوئی رنگیں تیتری — یا زمرد زار میں ہے رقص فرما اک پری

چاند اترا ہے فلک سے سرزمینِ حسن پر
ثبت ہے یا قشقۂ رنگیں جبینِ حسن پر

عود کی خوشبو سے ساری فضا مہکی ہوئی — انتشارِ کیف سے موجِ ہوا بہکی ہوئی
سرخ رنگوں سے ہے یوں خاکِ چمن دہکی ہوئی — ہو چمن میں جس طرح گل کی قبا مہکی ہوئی

رنگ و بو کا حجلۂ نایاب زمانہ ہے تو یہ
نو عروسِ شام کا تصویر خانہ ہے تو یہ

بادۂ تقدیس کے بادل چھلکتے ہیں یہاں — گل چٹکتے ہیں یہاں، بلبل چہکتے ہیں یہاں
نرم ہوا اور عطر زا جھونکے مٹکتے ہیں یہاں — اور ملائک وجد میں آ کر بہکتے ہیں یہاں

ذہنِ شاعر کے تخیل کی یہ اک تصویر ہے
یا حسیں پریوں کے دلکش خواب کی تعبیر ہے

شام ہے اس گلکدہ کی بے مثال و لاجواب — سنبلستانِ جناں کا ایک نکھرا سا گلاب
ہے نمو کے جوش سے رنگِ سحر کی آب و تاب — یا کسی دوشیزۂ جنت کا ہے جوشِ شباب

ہر قدم پر ہے یہاں اک اہتمامِ رنگ و بو
ہر نہالِ نو کے ہاتھوں میں ہے جامِ رنگ و بو

ہر قدم پر ہیں یہاں فوارہ ہائے کیف بار — بھرتے ہیں دامانِ گلشن موتیوں سے بار بار
برلبِ رومانیت ہیں جوئبار و آبشار — اور ہے دھیمے سُروں سے ان کے گلشن نغمہ زار

یہ زمیں عرشِ بریں ہے رفعتِ تخیل کی
دیکھ کر جس کو پھسلتی ہے نظر جبریل کی

---

[1] کشمیر میں جھیل ڈل کے کنارے چشمہ شاہی کی داہنی طرف پہاڑ پر ایک عمارت ہے جسے "پری محل" کہتے ہیں۔ یہ عمارت دارا شکوہ کی بنوائی ہوئی ہے۔ لیکن اب ایک حسرت انگیز کھنڈر بن کر رہ گئی ہے۔

ـــــ شہزور

قصرِ تو قلموں سے نکلا اک ہجومِ مہوشاں — قہقہوں کی نہر کمبر رنگ و بو کا کارواں
ہر روش پر صحنِ گلشن کی ہوا وہ یوں رواں — خلد کی حوریں ہوں جیسے محوِ سیرِ کہکشاں

سینکڑوں انداز کی وہ نازنینیں شوخ و شنگ
اپنے ہاتھوں میں لئے دف اور رباب و ساز و چنگ

اپنے شیریں زمزموں کا کیف برساتی ہوئی — مستقل بجلی تبسم کی وہ چمکاتی ہوئی
کھلکھلاتی، گنگناتی، رقص فرماتی ہوئی — اپنی چشمِ مست سے گلشن کو بہکاتی ہوئی

وہ حسیں پریاں گئیں اک نقرئی تالاب پر
ثبت کرنے اپنے جلوے شیشۂ سیماب پر

جا کے بیٹھیں حوض پر پھیلا کے پائے نازنیں — آہ وہ خوش رنگ پانی اور انکے عکس کا ہیں
جیسے حوریں خلد کی، کافر ادا و دلنشیں — منزلِ مہتاب سے نظارہ افروزِ زمیں

مست اپنے حسن کی مستی میں با ناز و ادا
گود میں لیکر ربابوں کو ہوئیں نغمہ سرا

حوض سے کچھ دور تھا اک نوجوانِ سبز فام[1] — چور نشہ میں لئے ہاتھوں میں پیمانے کا جام
تھا ادائے کجکلاہانہ سے آہستہ خرام — چپکے سے اس کو کسی نے لیا پیچھے سے تھام

اور کہا کیوں کھیلتا ہے دین کے آئین سے
یہ کبھی دیکھا نہ جائیگا محی الدین[2] سے

دفعتہً برباد وہ عشرت کا ساماں ہو گیا — ایک ہلچل مچ گئی، گلزار ویراں ہو گیا
یک بیک ویراں وہ رنگیں ایواں ہو گیا — مسکنِ زاغ و زغن سارا پرستاں ہو گیا

جو ابھی اک بے بدل جنت بداماں باغ تھا
دم زدن میں وہ دلِ کشمیر کا اک داغ تھا

دم بخود تھا میں یہ منظر کے نظارہ دیکھ کر — کیوں کھلا تھا یہ چمن اور کیوں ہوا زیر و زبر
قصرِ عالیشاں بنا کیونکر غبارِ رہ گذر — دور سے کہنے لگا رو رو کے کوئی نوحہ گر

آہ یہ میری جوانی کا نرالا خواب تھا
کھو گیا خود اپنی ہی تعبیر میں کیا خواب تھا

ہوش کے آتے ہی تھیں مفقود وہ سب حسنیں — ہر طرف منڈلا رہی تھیں وحشتیں اس قصر میں
کاخِ ویراں میں بھی ہر سو تھیں کاہی کی تہیں — اُڑتے پھرتے تھے ہوا میں چند اک چمگادڑیں

ہائے گویا کوئی پردہ اُٹھایا ہی نہ تھا
ہر طرف مکڑی کے جالے کے سوا کچھ بھی نہ تھا

شہ زور کاشمیری

---

[1] دارا شکوہ۔ جس نے پری محل کی عمارت بنوائی۔
[2] محی الدین اورنگ زیب۔ جس نے دارا شکوہ کو اس کی مذہبی آزاد خیالی کی وجہ سے مروا ڈالا ——— شہ زور

شوکتِ علیخاں فانیؔ

(انسان اور شاعر)

اک عمر پرستارِ شبِ ہجر رہا تھا
اے زلفِ سیہ ماتمِ فانیؔ میں بکھر جا

یہ پرستارِ شبِ ہجر، یہ شہیدِ ستم، یہ دلِ سوگوار۔ یاسیات کا امام، ۲۶ اگست کو اس دنیا سے رخصت ہوا۔ خود اپنے الفاظ ہیں:—

"اس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دُور

وطن بدایوں تھا مگر قبر حیدرآباد میں بنی، سازگار نہ وطن کی ہوا ہوئی نہ پردیس کی، یہ احساس ہر وقت رہا ؎

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جسکو راس آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

شوکت علی خاں فانیؔ ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ شاہ عالم کے زمانے میں کابل سے آئے تھے۔ دہلی والوں نے بہت نوازا۔ فانیؔ کے پردادا نواب بشارت خاں صوبۂ بدایوں کے گورنر تھے مگر رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُن کے والد شجاعت علیخاں پولیس کی ملازمت پر مجبور ہوگئے تھے۔ فانیؔ نے آنکھ کھولی تو جو کچھ رہا سہا تھا جا رہا تھا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے بی۔ اے اور ۱۹۰۸ء میں ایل ایل بی علی گڈھ سے کیا۔ وکالت ایک عرصہ تک کی مگر کامیابی کبھی نہ ہوئی اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ فانیؔ نالائق تھے بلکہ وہ اس پیشہ سے نفرت کرتے تھے۔ بارہا دیکھا گیا کہ بڑے جبر کے بعد وہ موکلوں کی طرف متوجہ ہوتے مگر کوئی ملنے والا آگیا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر شعر و شاعری کا شغل شروع کر دیا۔ لکھنؤ۔ بریلی۔ بدایوں اور آگرہ میں عرصہ تک برائے نام وکالت کی مگر دراصل وہاں کے شاعروں اور ادبی صحبتوں کے روحِ رواں بنے رہے۔ اُن کی ابتدائی شاعری میں لکھنؤ کا اثر اس وجہ سے نمایاں ہے کہ جب انھیں شعر کہنا آیا تو وہ لکھنؤ میں تھے۔ اس ماحول سے کیسے متاثر نہ ہوتے مرحوم نے اپنی زمانۂ طالب علمی میں آگرہ میں اکثر دیکھا ہے وہ اس زمانہ میں تمام مشاعروں میں کم جاتے تھے مگر طالب علموں کی دعوت رد نہ کرتے تھے۔ ادبی حلقوں میں اُن کی شہرت سب سے پہلے نقیب اور علی گڈھ میگزین کے ذریعہ سے ہوئی۔ دیوانِ فانیؔ نقیب پریس سے سنہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ باقیات آگرہ اخبار پریس سے سنہ ۱۹۲۶ء میں نکلی۔ باقیات کی اشاعت کے بعد سے فانیؔ دورِ حاضر کے ممتاز شاعروں میں سمجھے جانے لگے۔ فانیؔ کے کلام کو لوگ سمجھیں یا نہ سمجھیں اُن کے کمال کا اعتراف مذاقِ سلیم کی پہچان تصور کیا جاتا تھا۔ دہلی اور لکھنؤ کے بیچ میں جو علاقہ ہے اس میں میراثنیں اکثر گھروں میں تقریبوں کے موقع پر گیت گاتی ہیں۔ اُن کے گیتوں کے ساتھ فانیؔ کی غزل "نالِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ" میں نے اکثر سنی ہے۔ جس مشاعرے میں فانیؔ ہوتے، لوگ اُن کا کلام سننے کے بڑے مشتاق نظر آتے۔ فانیؔ کا وجود بڑے بڑے مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت تھا۔ اُن کی آواز بہت اونچی نہ تھی اس لئے وہ بہت دُور تک سُنائی نہ دیتی تھی۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ فانیؔ نے کوئی شعر پڑھا۔ جو آگے بیٹھے تھے اُنھوں نے تو سُن لیا۔ مگر پیچھے کے لوگ نہ سُن سکے۔ اس پر ایک ہنگامہ شروع ہوا، مگر دوسرا شعر پڑھتے ہی جلدی خاموشی طاری ہوجاتی۔ یہ اپنی پُرسوز، دھیمی گرہلا کی پُرکیف آواز میں جُھوم جُھوم کر پڑھتے تو تھوڑی دیر کے لئے یہ معلوم ہوتا کہ کائنات پر ایک درد سا طاری ہوگیا ہے۔ ایسے ہی ایک موقع پر اُن کی غزل کا ایک شعر مجھے نہیں بھولتا ؎

وہاں سجدے سے ابتک قدسیوں کے سر نہیں اُٹھتے
پڑا تھا جس جگہ راہِ محبت میں قدم میرا

فانیؔ کے گھر پر شاعروں اور شعر سُننے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ صاحبِ ذوق لوگوں کو شعر سنانے میں بہت کم تکلف کرتے تھے۔ میرؔ کی طرح دوسروں کے کمال کا اعتراف گناہ نہ سمجھتے تھے۔ اپنے معاصرین میں سے بعض کے بڑے مداح تھے۔ ایک دفعہ اپنی ایک مشہور غزل ہستی کی کیا ہستی ہے [illegible]

اس شعر پر پہنچے تو بہت تعریف ہوئی ؎

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

کہنے لگے کہ میں نے کیا یاس (یگانہ) نے یہ قافیہ نظم کیا ہے ؎

جنوں سے ملتا ہے کچھ سُراغ باطن کا
چال پہ تو ظالم کی سادگی برستی ہے

جگر کے بعض اشعار کے بڑے مداح تھے۔ خصوصاً اس شعر کے جو در اصل اُن کے رنگ میں ہے ؎

یوں بسر کی زندگی ہم نے اسیری میں جگر
ہر طریقہ داخلِ آدابِ زنداں ہو گیا

آگرہ میں فانی نے کافی عرصہ گذارا مگر وہ مالی مشکلوں میں برابر مبتلا رہے۔

۱۹۳۲ء مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کی دعوت پر حیدرآباد گئے اور وہاں ۱۹۳۹ء تک صدر مدرس رہے۔ حیدرآباد میں شاد اور شہزادہ معظم جاہ ان پر بڑی عنایت کرتے تھے۔ شہزادہ کی غزلوں میں فانی کا رنگ نمایاں ہے۔ آخر میں فانی کی زندگی جو یوں بھی سوگوارانہ گذری تھی اور بھی تلخ ہو گئی۔ لڑکوں نے کچھ نہ کیا۔ جوان لڑکی ۱۹۳۳ء میں مر چکی تھی ۱۹۴۰ء میں بیوی بھی رخصت ہوئی۔ اس عالم میں ان پر جو گزری اسکا کچھ اندازہ اس مادہ تاریخ سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے اپنی موت کا نکالا تھا غالب تو صرف یہ کہہ کر رہ گئے ؎

زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

لیکن فانی اس سے بھی آگے بڑھ گئے "فنا نداشت" اس مایوسی اور تلخی کی آئینہ داری کرتا ہے۔ جو اس زمانے میں اُن کی طبیعت میں آ گئی تھی۔ بھوپال کے مشاعرے میں اُن کی شرکت کی وجہ سے بڑی رونق ہو گئی تھی۔ شمالی ہند والوں نے اُن کی زبانی آخری بار اُن کی غزل آل انڈیا ریڈیو کی مہربانی سے سُنی اُن کا مطلع یہ تھا ؎

جب پرسشِ حال وہ فرماتے ہیں جانے کیا ہو جاتا ہے
کچھ یوں بھی زباں نہیں کھلتی، کچھ درد سوا ہو جاتا ہے

اُن کی ایک اور غزل اس مشاعرے میں جگر نے پڑھی تھی اُس کا مقطع یہ تھا ؎

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

فانی بڑے خلیق اور متواضع آدمی تھے، مگر ان میں ایک سچے شاعر کی خودداری اور غیرت پوری طرح موجود تھی۔ اُنھوں نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی۔ اُنھوں نے معاصرین کی برائی کر کے بھی اپنا دل ٹھنڈا نہیں کیا۔ اُن کی شہرت تو بہت ہوئی مگر اُن کی قدر اچھی طرح نہیں ہوئی۔ خود اُن کے الفاظ میں اُن کی زندگی ایک مقدس قسم کا تماشا بنی رہی جسے دُور سے دیکھ دیکھ کر لوگ اٹھ لیتے رہے اُن کا دم نکلتے دیکھا مگر سمجھے کہ تمام عمر اُن پر نزع کی کیفیت طاری رہنا ہی ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ ایک یونیورسٹی میں ایک معمولی سے عہدے کے امیدوار تھے تو یہ کہہ کر اُنھیں ٹال دیا گیا کہ آپ نے کچھ ریسرچ بھی کی ہے یا نہیں۔ ہرن پر گھاس لادنے کی اس سے اچھی مثال بھی شاید ہی ہو سکے۔

فانی کا رنگ قدیم تھا وہ ساری عمر غزل کہتے رہے۔ وہ غزل ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے غزل اور نظم محض میں فرق کرتے تھے اُن کا ایمان یہ تھا کہ شعر کسی خاص غیر شاعرانہ مقصد کے حصول کے لئے آلہ کار نہیں بنایا جا سکتا خواہ وہ مقصد کچھ ہی کیوں نہ ہو، یہ نظریہ بھی "زندگی برائے ادب" فالاہی اور اس دور میں اس کی نارسائی واضح ہو چکی ہے فانی کا یہ بھی خیال تھا کہ جس دنیا میں شاعر کا ظہور ہوتا ہے وہ دنیا اسکی اپنی دنیا سے بہت پیچھے ہوا کرتی ہے دوسرے الفاظ میں وہ شاعر کو اس دنیا اور اس کے مسائل سے بلند سمجھتے تھے۔ انھیں اسکا اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ بلندی فرضی ہے ورنہ شاعر در اصل اپنے احول۔ اجتماعی اثرات۔ ذہنی الجھنوں اور مادی مشکلات سے اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اقبال کے زیادہ قائل نہیں تھے۔ شاید اس لئے کہ ان کے اپنے ذہن میں شاعری کا ایک خاص تصور اسقدر روشن تھا کہ وہ دوسرے کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

مگر بڑی بات یہ ہے کہ فانی کی شاعری، ہمارے ادب میں ایک مرتبہ رکھتی ہے فانی نے غزل کی صورت یا موضوع میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ انھوں نے غزل کی زبان بھی نہیں بدلی، بظاہر اُن کے یہاں وہی آشیاں، وہ قفس، زنداں اور صحرا، جنازہ اور کفن، شمع اور پروانے ملتے ہیں۔ جو اُن سے پہلے شاعر نظم کرتے آئے ہیں مگر شاید کم لوگوں نے یہ علامتیں اسقدر صداقت کے استعمال کی ہونگی جتنی فانی نے، فانی کے یہاں یہ چیزیں رسمی طور پر نہیں ہیں۔ اُن کی زندگی ہی اُن سے عبارت ہے میر کا ایک مشہور شعر ہے ؎

اک موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

فانیؔ کے یہاں ذرا اس چیز کو دیکھئے ؎

چمن سے رخصتِ فانیؔ قریب ہے شاید
کچھ اب کے بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے

دراصل اُردو شاعری میں میرؔ کے بعد اگر کوئی بے پایاں درد، لامحدود یاس اور بیکراں غم کا مالک ہے تو وہ فانیؔ ہیں پھر بھی اُن کی شاعری بعض لکھنؤ کے شعرا کی طرح روتی بسورتی نہیں ہے۔ اُن کے یہاں غم کا ایک عرفان ملتا ہے جو زندگی اور موت دونوں کو گوارا بنا دیتا ہے۔ فانیؔ موت سے گریزاں نہیں وہ موت کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہمارے کتنے ہی شاعر اتنی جرات نہیں رکھتے کہ موت سے آنکھیں چار کرسکیں، وہ غم سے بھاگ کر یا تو رنگینی جوشِ تغزل، میں پناہ لیتے ہیں یا بے دو شاہد کی آغوش میں۔ فانیؔ کے یہاں یہ بے رنگینی کا جذبہ نہ ملے گا۔ وہ تلخیٔ حیات کو زہر سمجھ کر چھوڑ نہیں دیتے۔ ایک حقیقت نگار شاعر کی طرح وہ اس تلخی سے اس قدر واقف ہیں کہ علانیہ کہتے ہیں:- ”بس اب تو زہر ہی دے زہر میں دوا نہ ملا“

فانیؔ کے یہاں شروع میں لکھنؤ کے اثر سے ایہام بھری ہوئی چھری ”بیداد“ ”میت“ ”لاش“ کی بے زبانی بہت زیادہ تھی۔ بعد میں غالبؔ کے اثر سے انہیں فلسفۂ غم سے زیادہ دلچسپی ہوئی۔ غالبؔ کا اثر اُردو میں بہت خوشگوار ہوا ہے۔ غالبؔ اُردو کے پہلے صاحبِ فکر شاعر ہیں انہوں نے جوانی دیوانی کی داستان بیان کرنے یا خشک نصیحت کرنے پر اکتفا نہیں کی۔ حیات و کائنات کے مسائل کو شاعرانہ زبان میں بیان کیا۔ اُن کا کلام ایک غیر معمولی ذہین آدمی کا کلام ہے۔ انکی شخصیت بڑی دلکش اور دلآویز ہے۔ انکی زبان انکی اپنی ہے مانگے کی نہیں۔ اُن کی ترکیبیں خیال آفریں ہیں۔ اقبالؔ اور فانیؔ دونوں اُن سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ اقبالؔ نے غالبؔ کی مفکری کو اختیار کر لیا۔ فانیؔ نے غالبؔ کے اسلوبِ فکر کو۔ غالبؔ کا اثر فانیؔ کے یہاں ساری عمر ملتا ہے مگر جنہوں نے فانیؔ کو فانیؔ بنایا وہ غالبؔ نہیں میرؔ ہیں۔ غالبؔ کے یہاں جو اثر بیدلؔ کا ہے وہ فانیؔ کے یہاں غالبؔ کا ہے۔ فانیؔ کے فلسفیانہ اشعار اتنے اہم نہیں جتنے انکے وہ اشعار جو میرؔ کے رنگ میں ہیں۔ فلسفیانہ اشعار میں بعض وقت خالی الفاظ رہ جاتے ہیں۔ میرؔ کے رنگ میں بعض وقت وہ میرؔ سے بھی بلند ہو جاتے ہیں۔ میرؔ اور غالبؔ ان دونوں کے رنگوں سے فانیؔ کا رنگ بنا ہے اگرچہ اس میں حسرتؔ کی جھلک بھی ہے ذرا دیکھئے ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا | بات پہنچی تری جوانی تک
اک برقِ سرِ طور ہے لہرائی ہوئی سی | دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی
غلط انداز نگاہوں کو سنبھال | میری گستاخ نگاہوں کو نہ پوچھ

کہیں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں | ابتک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی

فانیؔ کے اشعار میں بلا کی تاثیر ہے، یہ تاثیر زبان پر ایک حیرت انگیز قدرت کی وجہ سے بھی ہے عرفانیات ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی تھی اُن کے صاف اور سادہ شعر بہت ملتے ہیں، ان میں صرف خیال ہی سادہ نہیں کہیں کہیں بڑی بلاغت بھی آگئی ہے۔ فلسفیانہ اظہار آخر تک ہے مگر فلسفیانہ اشکال کم ہو گیا ہے۔ میرؔ کی سی چھوٹی بحریں بھی بکثرت ملتی ہیں۔ انکی زندگی اور شاعری میں اتنی مکمل ہم آہنگی ہے کہ دوسری جگہ کم نظر آئیگی وہ ہمارے صاحبِ فکر شاعروں میں ہیں۔ اُردو کے اچھے اچھے اشعار کا جب کوئی مجموعہ تیار کیا جائیگا، فانیؔ کے بہت سے اشعار اس میں ممتاز جگہ پر ہونگے شاید اُن میں سے چند یہ ہوں ؎

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا | زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قیدِ حیات | مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے
پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا | جب ذکرِ بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی
کیا عمر میں اک آہ بھی بخشی نہیں جاتی | اک سانس بھی کیا آپ کے ناکام نہ لیتے

میں نے فانیؔ ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ حسن کچھ برہم نظر آیا مجھے

محشر میں جبرِ دوست سے طالب ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لیے ہوئے

اچھا یقین نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ | اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے

اللہ رے سکونِ قلب اُس کا دل جس نے لاکھوں توڑ دیئے
جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

آخر میں فانیؔ کی دو رباعیاں بھی سن لیجئے۔ چوتھے مصرع کو پڑھتے وقت خیال ہوتا ہے کہ دل پر واقعی چھری چل رہی ہے ؎

بجھتی ہی نہیں شمع جلے جاتی ہے | کٹتی ہی نہیں رات ڈھلے جاتی ہے
جاری ہے نفس کی آمد و شد فانیؔ | سینے میں چھری ہے کہ چلے جاتی ہے

ناکامِ ازل کی کامرانی معلوم | قسمت میں نہ ہو تو شادمانی معلوم
جینے سے مراد ہے نہ مرنا شاید | ورنہ فانیؔ کی زندگانی معلوم

انکی زندگانی تو ختم ہو گئی مگر اُن کے اشعار کی زندگانی مدت تک قائم رہیگی

آل احمد سرور

طیارہ

اے فلک پرواز اے سیارۂ معجز نما ۔۔۔ تو ہے اک اُڑتا پرندہ عالمِ ایجاد کا
تو اُڑا سوئے فضا یا مرغِ بستانی اُڑا ۔۔۔ یا ہوا کے دوش پر تختِ سلیمانی اُڑا
تو سراپا قوتِ سائنس کا اعجاز ہے ۔۔۔ تیرے مصنوعی پروں میں عقل کی پرواز ہے
دیکھنے والوں کو ہو سکتا نہیں کچھ امتیاز ۔۔۔ تو اُڑا یا اُڑ کے آئی منزلِ دُور و دراز
لیکے انساں کو تہِ آغوش اُڑ جاتا ہے تو ۔۔۔ جس طرف مُڑنا تجھے ہوتا ہے مُڑ جاتا ہے تو
وہ مسافر تو ہے جسکو کچھ تھکن ہوتی نہیں ۔۔۔ منزلِ دشوار د مشکل بھی کٹھن ہوتی نہیں
ناموافق کب ہوئی موجِ ہوا تیرے لئے ۔۔۔ تو فضا کیواسطے ہے اور فضا تیرے لئے
مرکزِ پرواز ہے ملکوں میں اسٹیشن ترا ۔۔۔ پاک ہے گردِ سفر سے گوشۂ دامن ترا
کارنامے تیرے کب پابندِ صبح و شام ہیں ۔۔۔ مشرق و مغرب تری رفتار کے دو گام ہیں
تجھ سے انجن کا دھواں آگے نکل سکتا نہیں ۔۔۔ ترا سایہ تک ترے ہمراہ چل سکتا نہیں
جو تری پرواز ہے پرواز کی تکمیل ہے ۔۔۔ تیرے دونوں بازوؤں میں شہپرِ جبریلؑ ہے
تو فضا میں ہے مگر حملہ ترا میداں میں ہے ۔۔۔ آدمی کی روح تیرے قالبِ بیجاں میں ہے

جنگ پر جاتا ہے تو کس شان سے چھاتا ہوا ۔۔۔ حشر ڈھاتا بم گراتا آگ برساتا ہوا
ہاتھ میں جنکے ہے پرچم آجکل تہذیب کا ۔۔۔ اُن کو دیتا ہے سبق تعمیر کی تخریب کا
تجھ سے سیکھی ہے روانی جنگ کے طوفان نے ۔۔۔ جو بہائم بھی نہ کرتے وہ کیا انسان نے
کسقدر تنگ آ گئی دُنیا تری بیداد سے ۔۔۔ گونج اُٹھا سارا زمانہ نالہ و فریاد سے
آہ تو بھی حامیِ اہلِ دوَل ثابت ہوا ۔۔۔ بیگناہوں کیلئے پیکِ اجل ثابت ہوا

جب غریبوں کی مصیبت میں نہ کچھ کام آئے تو
ٹوٹ جائیں تیرے بازو خاک میں ملجائے تو

سرِیر کابری مینائی (گیاوی)

ہتیارِن

(۱)

یشودا اپنے والد کی بیماری کا حال سن کر میکہ گئی۔ میکہ میں پلیگ کا زور تھا۔ وہ وہاں پہونچی تو دیکھا کہ والد بیمار ہیں۔ پلیگ کے مرض میں وہ بھی مبتلا ہیں۔ سات سال کا بھائی اور ماں مکان میں ہیں۔ گاؤں میں قریب قریب نصف سے زیادہ لوگ اس وبا کی نذر ہو چکے تھے۔ یشودا کو دیکھکر ماں بولی "تم کہاں اس آفت میں آپہونچیں؟"

یشودا "والد کی بیماری کا حال سن کر بھلا میں کیونکر گھر پر رہ سکتی تھی، ماں!"

ماں "بیٹی دکھتی تو ہو۔ گھر کے گھر خالی ہو گئے ہیں اور تم اپنی گود میں ایک بچہ لئے ہوئے آپہونچیں"

یشودا "خدا ہی رحیم و کریم ہے"

یشودا والد کے قریب گئی۔ والد کی نظر لڑکی پر پڑی بولے "بیٹی اب بچنا دشوار ہے۔ تم اپنے ہاتھ سے ایک گھونٹ پانی پلا دو"

یشودا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور باپ کے منہ سے پانی کا گلاس لگا دیا۔

اس کے والد اسی رات کو اس دنیا سے چل بسے۔ جوں توں کر کے صبح کو ان کی لاش شمشان گئی۔ ماں کے لئے آہ و زاری کا وقت کہاں؟ یشودا سے بولی "بیٹی تو اپنے گھر واپس چلی جا"

یشودا "میں بغیر تمہیں ساتھ لئے گھر کیونکر چلی جاؤں، اماں؟"

ماں "میں کیسے چلوں یہاں سے چار چھ بیگھے کاشت ہے اس کا بچنا دشوار ہوگا۔ بیٹی ساتھ میں تو اپنے بھائی کو لیتی جا۔ شاید یہ وہاں آرام سے تم لوگوں کی قسمت سے بچ جائے"

یشودا نے ہر چند منت سماجت کی مگر ماں کسی طرح جانے پر راضی نہ ہوئی۔

(۲)

بھادوں کا مہینہ تھا۔ پانی برس رہا تھا۔ ندی پار کرنی تھی۔ ناؤ پر بھائی اور بیٹے کو لئے یشودا بیٹھی تھی آندھی اور مینہ دونوں ساتھ ساتھ تھے۔ کشتی جب وسط دریا میں پہونچی تو ڈوبنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔

ملاح "بیٹی، دونوں تو اب نہیں بچنے کے ایک کا صبر تمہیں کرنا ہی ہوگا معلوم اور بچہ ساتھ نہیں بیٹھتے" ہمارے اور مسافروں کی حفاظت کرو۔

یشودا پس و پیش میں پڑ گئی۔ آخر کروں کیا؟ بیٹا اور بھائی دونوں کی محبت دامنگیر ہے۔ دونوں یکساں ہیں اور بھائی تو ماں کا اکلوتا بیٹا ہے۔ میکے کا دارومدار اسی پر ہے۔ ماں بھلا لڑکے کے بغیر زندہ رہ سکے گی؟ اور میرا ہی کون بیٹھا ہے میں ہی زندہ رہ کر کیا کروں گی؟ انھیں خیالات میں غلطاں و پیچاں تھی کہ کشتی غرق ہونے لگی۔ مسافر شور و غل مچانے لگے۔ "ہم لوگوں نے کیا بگاڑا ہے۔ سوچنے کا وقت نہیں جلد اترو"

یشودا نے جھٹ پٹ لڑکے کو اٹھا کر پانی میں ڈال دیا۔ بعد ازاں خود بھی دریا میں کود پڑی۔ یہ دلخراش منظر دیکھ کر ایک ملاح دریا میں کودا۔ یشودا زندہ نکل آئی لیکن بچے کا پتہ نہ چلا۔

یشودا غشی کی حالت میں کشتی پر بٹھائی گئی۔ کشتی کنارے لگی۔ کچھ دیر کی دوا دوش اور تدبیر کے بعد یشودا ہوش میں آئی اور کہنے لگی "مجھے کیوں بچایا؟ مجھے بھی مرنے دیتے۔ میں بچے کو مار کر زندہ رہنے کی حقدار نہیں"

پولیس آئی اور ملاح اور یشودا کو گرفتار کر کے لے گئی۔

(۳)

ہتیا اور خودکشی کا مقدمہ عدالت میں چلا۔ جس دن یشودا کی پیشی تھی۔ کچہری کا ہال مرد اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ لوگ سوچ رہے تھے کہ دیکھیں آج یشودا کیا کہتی ہے۔ لوگ آپس میں کانا پھوسی کر رہے تھے "بھائی پیارا ہے، بیٹا نہیں؟" کچھ عورتیں کہتی تھیں "بھائی تو بھائی ہی ہے۔ لیکن بیٹا اس سے بھی پیارا ہے"

مجسٹریٹ آیا۔ یشودا بلائی گئی۔

مجسٹریٹ "آخر تم نے یہ کیا کیا؟ تم پر عدالت میں ایک ... [illegible]

ٹھکی۔ کیا ملاح نے تمھیں بچے کو دریا میں گرانے کے لئے مجبور کیا تھا؟

یشودا: بالکل نہیں۔

مجسٹریٹ: تم نے پھر کیوں بچے کو پھینکدیا؟

یشودا: اس لئے کہ کشتی مسافروں کو لئے ہوئے غرق ہو جاتی۔ ہر حالت میں بیسیوں بیگناہوں کا گناہ میرے سر ہوتا۔ بیسیوں مائیں اور بہنیں مجھے کوستیں۔ بد دعائیں دیتیں اور روتیں۔ اس عذاب سے نجات پانے کے لئے میں نے اپنا بچہ دریا میں ڈال دیا۔

مجسٹریٹ: بھائی کو کیوں نہ غرق ہونے دیا؟

یشودا: بھائی میرا ایک ہی ہے اُسے ماں نے میرے سپرد کر دیا تھا۔ بھائی اکیلا ہے اور تنہا گھر کا چشم و چراغ ہے اگر وہ بجھ جاتا تو میں زندہ رہ کر کیا کرتی؟ میرے والد صاحب بھی قضا کر چکے ہیں لڑکے تو اور بھی ہو سکتے ہیں۔

مجسٹریٹ: لیکن تم نے بھی تو خودکشی کی کوشش کی تھی؟

یشودا: تو اس سے کیا؟ میرا شوہر تو زندہ رہتا۔ وہ دوسری شادی کر کے اپنے خاندان کا نام چلاتا۔ میرے مرنے سے میرے خاندان کو ذرا بھی نقصان نہ ہوتا، میری ہستی ہی کیا تھی؟

مجسٹریٹ: معلوم ہے اسکی سزا؟ اس جرم کی سزا پھانسی ہے۔

یشودا: میں اس کے لئے تیار ہوں جو کام اب آپ کریں گے وہ تو میں پیشتر ہی کر رہی تھی۔ میں تو زندہ رہنا چاہتی ہی نہیں۔ آپ مرد ہیں۔ اس لئے آپ ایسا سوچ رہے ہیں۔ کوئی عورت ایسا نہیں سوچ سکتی۔ کوئی عورت بھلا اپنے بھائی اور بیٹے کو مار کر زندہ رہنا چاہے گی؟

مجسٹریٹ: دماغ ٹھکانے ہے یا نہیں؟ تمہارے ساتھ ساتھ وہ ملاح بھی جائے گا۔

یشودا: ملاح بالکل بے قصور ہے۔ اسکی بنیاد میں ہوں۔ جو سزا ہو مجھے دیجئے۔

ماں بھی وہیں موجود تھی اُس نے سوچا "میرے موجود ہوتے ہوئے بیٹی کو پھانسی" وہ کر مجسٹریٹ سے بولی: میں سب کی جڑ ہوں۔ صاحب یہ بالکل بے قصور ہے۔ مجھے پھانسی دیجئے۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ مجھے بڑا صدمہ ہے۔ زندگی میں اب رہا ہی کیا ہے

[illegible]

ایسا محسوس کر رہی تھیں کہ ابھی آسمان پھٹ پڑے گا۔

مجسٹریٹ: "اب تمہارا بیان کل ہوگا۔"

ملاح بلایا گیا۔ مجسٹریٹ نے دریافت کیا: "تم نے اس عورت کو لڑکا ڈبونے کے لئے کیوں مجبور کیا؟"

ملاح: "سرکار میری ناؤ ڈوب رہی تھی۔"

مجسٹریٹ: "کیا لڑکے کے ڈوبنے سے تمہاری ناؤ بچ گئی؟"

ملاح: ہمارے یہاں کچھ ایسا ہی یقین کیا جاتا ہے کہ اگر ماموں اور بھانجہ ساتھ ساتھ ناؤ میں سفر کریں تو ناؤ ڈوب جاتی ہے۔"

مجسٹریٹ: "تو پہلے ہی انھیں کشتی پر نہ بیٹھنے دیتے۔"

ملاح: "مجھے اس کا کیا علم؟ میں تو یہی سمجھا تھا کہ دونوں لڑکے یشودا کے ہیں۔"

مجسٹریٹ: "پھر تمھیں اس بات کا علم کیونکر ہوا؟ کس نے کہا کہ وہ ماموں بھانجے ہیں؟"

ملاح: "یشودا نے خود ہی اس راز کا انکشاف کیا۔ کیونکہ اسے بھی ایسا ہی معلوم ہے کہ ماموں بھانجے ساتھ ساتھ کشتی میں سوار نہیں ہوتے۔"

مجسٹریٹ: "یشودا کے ساتھ ساتھ تمھیں بھی پھانسی ہوگی!"

یشودا نزدیک ہی بیٹھی تھی بولی: "سرکار، یہ بے گناہ ہے۔ اس کو سزا نہیں ملنی چاہئے۔ سارا گناہ میرا ہے۔"

دوسرے دن کے لئے عدالت ملتوی ہوئی۔ پولیس والوں نے دونوں کو جیل میں بند کر دیا۔

پولیس والے دونوں کو پھانسنے لگے۔ یشودا سے کہا: "یہ سارا قصور ملاح کا ہے تم بچ سکتی ہو۔ اس نے تو تمھیں مجبور کیا تھا تم اسے کیوں بچا رہی ہو؟"

یشودا: "میں جانتی ہوں کہ ماموں بھانجے کا ساتھ ساتھ بیٹھنا اچھا نہیں ہوتا۔ کشتی گرداب میں تھی۔"

پولیس نے یشودا کی ماں سے کہا: "تم کچھ روپے جمع کر دو ہم اسے چھڑوا لیں گے۔"

ماں: "کیا وہ بچ سکتی ہے؟"

پولیس "کیوں نہیں؟ یہ تو خود ہی آگ میں کود رہی ہے۔ ہم اسے بچا سکتے ہیں"

بڈھی ماں سے اس قسم کی باتیں کرنے والے پولیس والوں پر یشودا کو بیحد غصہ آیا۔ بولی "ماں اگر تم مجھے بچانے کی کوشش کروگی تو میں خود اپنے گلے میں پھانسی لگالوں گی۔ ایک تو میں نے ہتیا کی دوسری ہتیا ملاح کی کروں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ ملاح کا سارا خاندان چوپٹ ہوجائے گا۔ پھر سوچو اگر تمھیں میری محبت ہے تو کیا ملاح کے خاندان کو ملاح کی موت سے صدمہ نہ ہوگا؟ ہم دوسروں کے دُکھ سے سکھ خریدیں یہ سراسر ظلم ہے۔ میرے مرجانے سے کیا بگڑتا ہے؟ اس کے مرجانے سے تو اُس کی گرہستی چوپٹ ہوجائے گی"

ماں "بیٹی، کیا کیا سوچو گی؟"

یشودا "ماں یہ سوچنے کی بات نہیں ہے۔ یہ بات سچ ہے۔ میں اس دُنیا کو چوپٹ ہی کرچکی ہوں۔ کیا دوسری دُنیا کو بھی چوپٹ کردوں؟"

ماں "بیٹی، تم نے یہ سب کچھ اپنے لئے تھوڑی کیا ہے۔ یہ تو تم نے میرے لئے کیا ہے۔ مرنا مجکو چاہئے۔ تم کیوں مرتی ہو؟"

یشودا "تم غلطی پر ہو، جہاں تمہارا رشتہ لگا ہوا ہے وہیں میرا بھی ہے۔ اگر تمہارا بیٹا تھا تو میرا بھائی تھا۔ اگر میرا بیٹا گیا تو وہ تمہارا ناتی۔ میں روتی ہوں تو تم پہلے روتی ہو۔ یہ گناہ میں نے اپنے لئے کیا ہے، نہ کہ تمہارے لئے۔ بس اگر بھائی کو تیاگ کردیتی تو اس میں میرا اطمینان نہیں تھا؟ میں نے سوچا ہوگا میری خبر کون لے گا؟ کہنے کے لئے بھائی اور بیٹا دو ہیں لیکن درحقیقت دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ خاصکر عورتوں کے لئے"

ماں۔ (روکر) "بیٹی تجھے پھانسی ہوجائے گی تو پھر میرا کون رہے گا؟ مجھے پوچھنے والا اور کون ہے؟"

یشودا "ماں مجھے تو تمھیں دینا ہی پڑے گا۔ فرض کرو تم نے مجھے بچا بھی لیا تو میں بیٹے کے رنج وغم میں شب و روز گھٹ گھٹ کر مرجاؤں گی۔ کیا یہ تمھیں اچھا معلوم ہوگا۔ جل جل کر مرنے سے تو جلد مرجانا کہیں اچھا ہے۔ اس ملاح نے میرے ساتھ ظلم تو ضرور کیا ہے۔ اگر میں ڈوب گئی ہوتی تو تمام دُکھوں سے چھٹکارا مل گیا ہوتا۔

ماں اسے بار بار سمجھاتی رہی۔ "بیٹی کیا مجھے درد نہیں ہے؟ کتنے دردوں کو ضبط کروں؟ آج سات دن ہوئے تیرے والد نہیں تین سال کا ناتی گنوا بیٹھی۔ تو ہی کہہ رہی ہے کہ میرے اندر جو درد ہے، وہ تمہارے اندر بھی ہے۔ سوچ، جب تجھے پھانسی ہوجائے گی تو میری کیا حالت ہوگی؟ تو تو پار لگ جائے گی۔ میں کب تک اس دُنیا میں رو رو کر اپنی زندگی گذاروں گی؟"

یشودا "یہاں کا رونا بُرا نہیں ماں، مگر دوسری دُنیا کا رونا بُرا ہے۔ میرے والد اپنی موت سے مرے۔ بیٹے کو خود غرق کیا۔ ملاح کی موت تو میری وجہ سے ہوگی۔ یہ کم گناہ ہوئے؟ انھیں کون برداشت کرے گا؟"

جیلر "یہاں ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ بڑھیا کو نکالو۔ پھاٹک بند کردو"

(۴)

دوسرے دن کچہری ہوئی۔ مجسٹریٹ آئے۔ یشودا کی طلبی ہوئی۔ عدالت آدمیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی میلہ ہے۔ سب اپنی اپنی سانس روکے ہوئے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوتا تھا سانس لینے کا موقع نہیں ہے۔ عورتوں کی روتے روتے سسکی بندھ گئی تھی۔ مردوں میں ایسا جذبہ تھا کہ ماں بہنوں کے پیروں پر سر ٹیک دیں۔ آج مردوں کا یہ طبقہ نہایت سنجیدگی سے عورتوں کے دل کو سمجھ رہا تھا اور اُن کی تکلیف پر انھیں رحم آرہا تھا۔ عورت کی یہ حالت دیکھکر مرد اپنی رذالت پر ہاتھ مل رہے تھے۔ عورتیں ہمارے لئے اپنا خون اس طرح بہادیتی ہیں۔

مجسٹریٹ جرح کرنے لگا "یشودا بولو کیا کہتی ہو؟"

یشودا "کہتی کیا ہوں۔ مجھے پھانسی کی سزا سنائیے۔ میں دوبارہ پھانسی کے تختے پر چڑھتی لیکن یہ ناممکن ہے۔ مجھ پر دو الزام ہیں۔ ہاں، میں پھر آپ سے عرض کرتی ہوں کہ ملاح کو چھوڑ دیجئے وہ بیچارا بے قصور ہے۔ مجھے جلد از جلد فیصلہ سے آگاہ کیجئے"

مجسٹریٹ "تمہارا دماغ مجھے صحیح نہیں معلوم ہوتا"

یشودا "میرا دماغ صحیح ہے آپ معلوم کرلیجئے۔ مجھے گناہوں کی سزا بھگتنے دیجئے"

مجسٹریٹ بھی آدمی تھا۔ اُس کا دل بھی بھر آیا تھا۔ [illegible]

ملاح کے پیچھے کیوں پڑی ہو؟"

یشودا: "مجھے ڈر ہے۔ اسے سزا نہ ہو جائے۔ گناہ میرا ہے۔ سزا مجھے ملنی چاہئے میں اپنے سر پر دوسرا گناہ نہیں لینا چاہتی۔"

مجسٹریٹ: "تم اکیلی ہی قصوروار ہو؟"

یشودا: "ہاں"

یشودا کا "ہاں" کہنا تھا کہ اس کی ماں اس کے قدموں پر گر پڑی اور بولی "سرکار۔ اسے چھوڑ دیجئے۔ اس نے میرے لئے ایسا کیا ہے۔ مجھے پھانسی ہونی چاہئے۔

مجسٹریٹ: "پھانسی مجرم کو ملتی ہے۔ میں بھی قانون سے مجبور ہوں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یشودا نے محبت میں پڑ کر ایسا کیا ہے۔ اس لئے میں اپنی طرف سے اُسے معافی کے قابل سمجھتا ہوں۔ اس لئے معاف کرتا ہوں

مجسٹریٹ کا اتنا کہنا تھا کہ مرد اور عورت جو اب تک بیہوش سے بیٹھے تھے۔ رونے لگے۔ مجسٹریٹ بھی آنسو پونچھتا ہوا باہر چلا گیا۔

فیصلہ سن کر جن لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ وہ دکھ کے نہیں سکھ کے تھے یشودا اُمگیں تھی۔ کھوئی سی بیٹھی تھی۔ اُس نے فیصلہ سن کر ایک آہ سرد بھری۔ شاید وہ سانس لڑکے سے محبت کی تھی"۔ لڑکے کو کھو کر کب تک زندہ رہوں گی"۔ شاید وہ بھی سوچ رہی تھی۔

یشودا، اب بھی زندہ ہے۔ لیکن دوسروں کی طرح نہیں، وہ نہ ہنستی ہے اور نہ کسی بات کو محسوس کرتی ہے۔ پاگلوں کی طرح کسی کو دیکھتی ہے تو دیکھتی ہی رہ جاتی ہے۔

لوگ اسے دیکھکر دانتوں تلے اُنگلی دبا لیتے ہیں

(از مادھوری بابت ستمبر ۱۹۴۰ء) مترجمہ **شایق ہنگامی** بی اے

ادائے میکشی

ہیولا سا نظر آنے لگی ہے زندگی میری
یہ کس مرکز پہ لے آئی ہے مجھ کو بیخودی میری

نہ ہوں اے کاش تھوڑی دیر بند آنکھیں بھی میری
کہ میرے سامنے ہے شرح خوابِ زندگی میری

در و دیوار اُڑاتے تھے جہاں ملکر ہنسی میری
اب اس محفل میں کیوں محسوس ہوتی ہے کمی میری؟

شب خاموش میں بھی گوش بر آواز ہے دنیا
مجھے بدنام کر دیگی یہ فریادِ شبی میری

برہنہ پا، گریباں چاک، سر بر خاک، آوارہ
دیارِ عشق میں دیکھے کوئی شاہنشہی میری

یقیناً طور بنتا ذرّہ ذرّہ میری ہستی کا
جو ہوتی بے نیازِ دیر و کعبہ بندگی میری

جہاں دیوانہ ہوں ذرات بھی نظروں کے ایما سے
اب اس نقطہ پر آ پہونچی ہے دیوانہ گری میری

خرابِ جستجوئے دوست اتنا ہو گیا ہوں میں
کہ میری گمرہی خود ہے دلیلِ آگہی میری

یہی ہے غالباً مایوسیوں کی آخری منزل
فنا بھی تو نہیں ہوتی حریفِ زندگی میری

لبِ گل سے سوادِ صبح میں پیتا ہوں جی بھر کر
الگ سب میکشوں سے ہے ادائے میکشی میری

ہلالؔ اُن کے تصوّر سے فروزاں دل کی بستی ہے
بنے بے اختیارانہ وہ جانِ شاعری میری

حافظ اسحاق ہلالؔ رہیمی (از گوشی)

راز و نیاز

دل حیراں ہے جانے کیا یہ راز — ہو چلا ہر ستم بھی روح نواز
کوئی شاید ہوا نوا پرداز — ذرہ ذرہ ہے گوش بر آواز
ہو چکیں پردہ داریاں اے دل — اشکِ پیہم ہیں شرحِ سوز و گداز
گریۂ عندلیب خندۂ گل — حسن اور عشق کے ہیں راز و نیاز
تم نظر میں رہو کہ دل میں رہو — یہ ہے ہمراز وہ ہے محرمِ راز
دل کو دل کہیے تیرے جلووں سے — ایک آئینہ ایک آئینہ ساز
فطرتِ حسن گو حجاب سہی — نگہِ شوق اٹھا دے پردۂ راز
فکرِ انجام اٹھ گئی دل سے — کوئی دیکھے تو حاصلِ آغاز
مجھکو محسوس یہ ہوا اکثر — گونجتی جیسے ہو تری آواز
کوئی حد تو فریبِ شوق کی ہو — ہر صدا پر ہوں گوش بر آواز
آگے بھی اک نظر دلِ مضطر — کبتک آخر یہ جوشِ سوز و گداز

آستانِ جنابِ دل سے فضا
اٹھ چکی اب مری جبینِ نیاز!

فضا جالندھری

جذباتِ شریف

خالِ مشکیں ہے جو اس نرگسِ بیدار کے پاس — دستِ قدرت کا یہ تعویذ ہے بیمار کے پاس
قتلِ عاشق کے لئے ایک فقط شوخی ہے — اور رکھا ہے بھلا کیا تری رفتار کے پاس
حرفِ مطلب کبھی آنا تھا نہ آیا لب پر — جب گئے بیٹھ رہے اس بتِ عیار کے پاس
یاد آتا ہے بھری بزم میں پروانوں کا — شمع کو چھوڑ کے گرنا ترے رخسار کے پاس
آنکھ وہ آنکھ ہے دیکھے جو کسی کا جلوہ — لب وہ لب ہیں جو پہنچ جائیں لبِ یار کے پاس
وائے ناکامیٔ قسمت کہ سرک جاتا ہے — بیٹھ جاتا ہوں اگر سایۂ دیوار کے پاس

کیا عیادت ہے کہ بڑھ جاتا ہے آزار شریف
نالے غیروں کے جو آتے ہیں وہ بیمار کے پاس

(رنگِ قدیم) — پروفیسر [illegible] شریف [illegible]

مکتبہ قصر ادب میں چند نئی کتابیں

شاعرِ انقلاب حضرتِ جوش ملیح آبادی کی معرکتہ الآرا تصانیف

نقش و نگار:۔ یہ حضرت جوش کی وجد آفریں اور پرکیف نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے (۱) نگارخانہ (۲) خمریات (۳) تاثرات (۴) مطالعہ و نظر (۵) نیب۔ ہر نظم اپنی جگہ مکمل مرصع اور زیادہ سے زیادہ کیف میں ڈوبی ہوئی ہے۔ شاعرِ انقلاب نے جو نغمے برسائے ہیں وہ دل و دماغ کے لئے ایک مستقل تسکین اور سکونِ روح کے لئے سرور انگیز ہیں۔ قیمت عہ حجم ۱۸۸ صفحات۔

شعلہ و شبنم:۔ یہ حضرتِ جوش ملیح آبادی کی پرجوش نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں حضرت جوش کی سیاسی و اسلامی نظموں کا بہترین انتخاب ہے اور اس خیال کی تردید کے لئے کہ مغربی شاعری کے مقابلے میں اُردو شاعری مناظر نگاری میں تہی مایہ ہے۔ شاعرِ انقلاب کی وہ نظمیں بھی دی گئی ہیں۔ جن میں آپ نے الفاظ میں مصوری کے کمال دکھائے ہیں حجم ۲۵۷ صفحات۔ قیمت ہے۔

فکر و نشاط:۔ یہ شاعرِ انقلاب حضرتِ جوش ملیح آبادی کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے جس میں مخاطب کو فکر کی پیچ در پیچ گھاٹیوں میں بھٹکتا ہوا نہیں چھوڑا گیا ہے بلکہ اُسے نشاط کی سرسبز وادیوں میں لے جایا گیا ہے۔ اس مجموعہ کی ہر نظم ایک گہرا اثر رکھتی ہے۔ حجم ۱۱۵ صفحات۔ قیمت عہ

حرف و حکایت۔ شاعرِ انقلاب کا چوتھا مجموعۂ کلام جو اُنکے تازہ واردات و مدرکات کا آئینہ دار ہے اور جو حضرت جوش کی شاعری کے دورِ ارتقا کا بہترین نمونہ ہے اس میں حسن و جوانی۔ واعظ و پند اور غور و فکر کے ایسے دلنشین پہلو ملیں گے کہ پڑھنے والا پھڑک جائیگا۔ حجم ۲۴۰ صفحات قیمت عہ

نوٹ

ہر کتاب مجلد ہے۔ بہترین لکھائی چھپائی اور کاغذ۔ جلد پر خوبصورت گرد پوش ہے۔

شہیدِ ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی اکبرآبادی کی موت سے پہلے ایک

پھریری

کولتار کا مصنف جب اپنی مسلسل علالت سے تنگ آگیا اور موت کا فرشتہ اُسکی رگِ ظرافت کا خون چوسنے لگا تو اُس نے ایک "**پھریری**" لی، پھر کیا تھا بسترِ علالت پر مسکراہٹیں پیدا ہوگئیں ——

پھریری مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم کی بالکل آخری تصنیف ہے جس میں مزاح نگاری اور سنجیدگی کے دونوں پہلو اِس قدر تابناک ہیں کہ بیساختہ منہ سے داد نکل جاتی ہے۔ اس میں باغی۔ برضا و رغبت۔ ہمارا پرنس۔ اونٹ گاڑی بالٹر کی مصیبت۔ "پھریری"۔ دھڑکا۔ ہیرو۔ اجمیری مل۔ ڈاکو کی بیوی۔ نکار حیلہ۔ وفادار احمد اور نوکری کُل ۱۴، افسانے ہیں، ہر افسانہ پورے زورِ قلم کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ پرستارانِ عظیم بیگ مرحوم کو مرحوم کی اس آخری تصنیف کا گرمجوشی کے ساتھ استقبال کرنا چاہیے۔

حجم ۲۰۸ صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ دیدہ زیب۔ کتاب مجلد ہے اور اُس پر بہترین رنگین گرد پوش ہے۔ قیمت عہ علاوہ محصول ڈاک۔

مکتبہ قصر الادب دفتر شاعر آگرہ

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح :- "یہ زندگی حقیقتاً فریبِ زندگی نہ ہو"

حضرت وحشت کلکتوی

فراق کا الم نہ ہو وصال کی خوشی نہ ہو
ہے وہ بھی کوئی زندگی کہ جس میں زندگی نہ ہو

میں ناحق اپنے دل کو کیوں امید آشنا کروں
جب ایسا وعدہ تم کرو کہ جو وفا کبھی نہ ہو

نہاں ہو دل میں عشق کا وہ راز جو کبھی عیاں
بطرزِ گفتگو نہ ہو بشکلِ خامشی نہ ہو

جو ذوقِ درد ہے تجھے تو دل کو خستہ تر بنا
گداز کا مزا کہاں اگر شکستگی نہ ہو

میں رازدارِ عشق ہوں بھرم رکھے خدا مرا
ٹپک پڑیں نہ اشکِ غم کہیں مری ہنسی نہ ہو

نہ ہو تو وحشتِ حزیں امیدِ عشق کے قریں
ہوائے زندگی کہیں بلائے زندگی نہ ہو

حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی

ترے خیال سے جو اکتسابِ بیخودی نہ ہو
تو خوش گوار میری ہولناک زندگی نہ ہو

شگفتِ دل کے التماس کا وہی تو وقت ہے
کہ ناتمام پھول ہوں کلی کوئی کھلی نہ ہو

ہوس پرست کی نظر کو کر رہا ہوں درگذر
جو میرا مدعا سمجھ سکے تو مدعی نہ ہو

ہزار درد مند ہوں، مگر نہیں مجھے جنوں
شکایت اس سے کیا کروں جسے خیال ہی نہ ہو

غلام نقش کی جبیں، سزائے سجدہ بھی نہیں
یہ تیری بندگی کہیں فریبِ بندگی نہ ہو

ہر ایک جنبشِ نظر، بنی ہوئی ہے نیشتر
نظر پہ کیا بنے اگر، بہار عارضی نہ ہو

وفا یہ ہے تو اس وفا پہ غور کر رہا ہوں میں
تری خوشی ہو رات دن مری خوشی کبھی نہ ہو

یہ عشوۂ نفاکنا، یہ جلوۂ دل آزما
جوابِ درنگِ خلد تھا، یہ آدمی وہی نہ ہو

مقامِ عشق، مذہب و معاد سے ہے ماورا
فقیہِ شہر سے کہو حریفِ عارفی نہ ہو

حضرت سرور کابری مینائی گیاوی

نہ ہے وہ دل کہ جس میں کوئی غم نہ ہو خوشی نہ ہو
فقط اک اس میں تو رہے ترے سوا کوئی نہ ہو

اجل کو لوگ کہتے ہیں کہ ہر مرض کی ہے دوا
مگر وہ کیا کرے کہ جس کے بس میں موت بھی نہ ہو

کسی غریب کو اگر مٹا دیا تو کیا کیا
تم اک نئی جفا کرو جو آسماں نے کی نہ ہو

جو تیرے در پہ سر جھکے تو حشر تک نہ پھر اٹھے
جو ایسی بندگی نہ ہو تو ایسی بندگی نہ ہو

یہ کس پہ آج تک کھلا کہ موت کیا ہے زیست کیا
"یہ زندگی حقیقتاً فریبِ زندگی نہ ہو"

گلی گلی نہ جانے کیوں ہے مشک سی بسی ہوئی
کسی کے گیسوؤں کی بو صبا لے اڑی نہ ہو

وفا کی تم سے کیا امید کیوں وفا کا نام لوں
خدا کے واسطے کہیں جفا میں بھی کمی نہ ہو

یہ کہنا ان کا ناز سے اٹھا اٹھا کے آئینہ
کوئی بتائے کیوں مجھے غرورِ دلبری نہ ہو

تمر کیوں گلہ کروں یہ سو کی ایک بات ہے
کسی سے دوستی نہ ہو تو کوئی دشمنی نہ ہو

محسن ادب حضرت نشتر ہنگامی

ہزار حیف آدمی کہا کے آدمی نہ ہو
خدا کا بندہ اور پھر خدا کی بندگی نہ ہو

الٰہی دے وہ دل مجھے کہ ننگِ عاشقی نہ ہو
جسے قرار بھی نہ ہو، جو بیقرار بھی نہ ہو

بہارِ زیست میں اگر رہے خزاں ہی پر نظر
خزاں کبھی نتیجۂ بہارِ زندگی نہ ہو

یہ ان کی یاد کے مزے، یہ انتظار کے مزے
شبِ فراق کی سحر خدا کرے کبھی نہ ہو

فنا کے واسطے مجھے نہ عذر تھا نہ عذر ہے
مگر فنا کے بعد پھر سوالِ زندگی نہ ہو

اجل نہ ہو تو زندگی وبالِ جاں ہو بالیقیں
اجل سے بھی لگاؤ رکھ غلامِ زندگی نہ ہو

یہ کیا کہ رات ہو کہ دن فغاں سے کام ہے تجھے
وہ کام کر دلِ حزیں کہ عشق میں ہنسی نہ ہو

بہت دنوں سے اب مجھے یہ شک سا ہو رہا ہے کچھ
سمجھ رہا ہوں دل جسے کہیں وہ درد ہی نہ ہو

شبِ فراق الحذر وہ درد تھا کہ الاماں
خدا سے ہے یہی دعا کہ نشتر اب کبھی نہ ہو

حضرت مولانا المِ مظفر نگری

جوابِ ہر سوال کا بتوں کی خامشی نہ ہو
سکوتِ بتکدہ کہیں کمالِ آگہی نہ ہو

فریفتہ رہے گا دل یونہی جمالِ دہر پہ
فریب خوردۂ نظر [illegible]

یہ کائنات سجدہ ریز ہے مری جناب میں
تصورِ خودی مرا کمالِ زندگی نہ ہو

حجابِ زندگی میں ہوں نہاں میں جس کے خوف سے
وہ چشمِ فتنہ زا مجھے بیاں بھی دیکھتی نہ ہو

غرورِ منزلِ خودی بہشتِ جاوداں سہی
قدم قدم پہ گر یہاں فریبِ آگہی نہ ہو

یہ بال و پر کی جنبشیں کچھ اور کہہ رہی ہیں آج
قفس کے قیدیو کہیں بہار آگئی نہ ہو

سمجھ رہے ہو تم جسے لطافتِ بہارِ گل
کسی کی دلبری ہجومِ شوق میں گھری نہ ہو

تری نظر میں بڑھ گئیں ستم کی چیرہ دستیاں
مجھے یہ احتمال ہے قیامت آگئی نہ ہو

جہانِ عشق میں کبھی نہ انقلاب آئے پھر
مزاجِ حسن کو الم جو خوئے برہمی نہ ہو

حضرت مسلم مالیگانوی

الم کا جب الم نہ ہو، خوشی کی جب خوشی نہ ہو
تو زندگی حقیقتاً فریبِ زندگی نہ ہو

جو برقِ حسن پردۂ مجاز میں چھپی نہ ہو
جہاں کے بتکدے میں تازہ رسمِ آذری نہ ہو

شراب کا سرور کیا؟ دل و نظر کا نور کیا؟
ضیائے شمعِ طور کیا؟ جو ذوقِ دیدنی نہ ہو

خدا کی بندگی خدائی زمین و آسماں
خدا کرے کہ دل سے کم مذاقِ بندگی نہ ہو

یہ کون پھول میں ہنسا؟ کلی سے کون بول اٹھا؟
جسے میں ڈھونڈتا پھرا، چمن چمن وہی نہ ہو؟

نہ بہلے اے دلِ حزیں، بہار آئی چل کہیں
بہار کا مزا نہیں، جو شغلِ میکشی نہ ہو

یہ پیاری پیاری صورتیں یہ موہنی سی مورتیں
جہان جس کا نام ہے طلسمِ بت گری نہ ہو؟

نہ آنکھ گریہ کوش ہے، نہ دل ہی گرم جوش ہے
جو آگ دل میں تھی لگی، وہ آگ بجھ گئی نہ ہو

ہے مسلمِ دل ایک غم مدام و ہر نفس ہے تلخ کام
کہیں یہ دردِ ناتمام، دردِ زندگی نہ ہو

حضرت قمر نعمانی سہسرامی

یہ تیری عقل ہی کہیں نشان پا ابھی نہ ہو
معاملاتِ حسن و عشق میں الجھ گئی نہ ہو

جنونِ عشق کو اگر نصیب پختگی نہ ہو
شرابِ حسن میں کبھی سرور و کیف ہی نہ ہو

کرشمہ ساز اگر مری نگاہِ شوق ہی نہ ہو
ادائے حسن میں کسی طرح کی ساحری نہ ہو

تم اس کا کچھ اثر نہ لو یہ خاصہ ہے عشق کا
وہ عشق عشق ہی نہیں کہ جس میں خود سری نہ ہو

پتہ نہیں نگاہوں میں تلاش کس کی ہے مجھے
یہ میرے شوقِ جستجو کی حد آخری نہ ہو

تمام ذمہ داریاں مجھے قبول ہیں مگر
وہ جوشِ بندگی بھی دے جو ننگِ بندگی نہ ہو

زمیں سے آسماں تک بچھا ہے دامِ گمرہی
کہیں خرد شکار یہ فریبِ آگہی نہ ہو

اب انقلابِ حال سے کچھ اور رنگ ہو چلا
جہانِ بے ثبات کا یہ دورِ آخری نہ ہو

قمر سے خیال میں تو وہ نہیں ہے شاعری
حقیقت بیاں کیا اگر مجاز بھی نہ ہو

حضرت جالب سہسرامی از بمبئی

غرورِ زہد، دشمنِ نجاتِ سرمدی نہ ہو
نصیبِ کفر، سجدۂ نیازِ بندگی نہ ہو

تلاش میں شریک اگر بصیرتِ دلی نہ ہو
فریبِ راہ سے کبھی خرد کو آگہی نہ ہو

قیامِ انتظامِ گلشنِ جہاں کبھی نہ ہو
خزاں کے رنگ میں اگر بہارِ زندگی نہ ہو

احاطۂ خطر میں ہیں سب ارتقا کی منزلیں
سکون و امن کی تجھے نصیبِ زندگی نہ ہو

زمانہ کر رہا ہے کیوں مرے خلاف سازشیں
الٰہی! مشتعل مری حمیّتِ خودی نہ ہو

الٰہی! آرہا ہوں میں مذاقِ غم لئے ہوئے
مرے لئے سکونتِ بہشتِ دائمی نہ ہو

وہی ہوں میں وہی ہے تو وہی ہے محفلِ جہاں
کہیں نگاہِ اوّلیں تری بدل گئی نہ ہو

بتا؟ یہ اختیار ہے، کہ سلبِ اختیار ہے
کہ میرے حسبِ اقتضا، تری قضا کبھی نہ ہو

وہ سوئے جالبِ سلیم دل مراجعہ کرے[1]
جو کورِ دل کہ قائلِ امامِ شاعری نہ ہو

حضرت آسی ڈڑرکوی

اگر شعورِ بیخودی شریکِ آگہی نہ ہو
تو میری مشتِ خاک بھی خدا ہو آدمی نہ ہو

کچھ اس خراب حال پر بھی التفات چاہئے
زبان جس کی بہرِ مدعا کبھی کھلی نہ ہو

کہیں گے حالِ دل تو ہم مگر یہ شرط میں ہے شرط
سزائے جرم بھی نہ ہو جزائے خیر بھی نہ ہو

فسردہ دل نہ ہو ابھی سے رہروِ وفا سنبھل
بس حجابِ غم کوئی حریفِ عاشقی نہ ہو

بجائے رخصتِ فغاں شارعِ ضبط دیجئے
دلِ ستم زدہ کے درد میں کوئی کمی نہ ہو

وفورِ یاس ہی سے کام ہے سحر سے شام تک
وہ کیا دعا کرے جسے امیدِ زیست ہی نہ ہو

مآلِ کار پر نظر نہ رکھ قدم بڑھائے جا
وہ کاوشِ تلاش کیا کبھی تو جو کبھی نہ ہو

کریگا انکشاف کیا وہ مفتیِ حرم نشیں
جسے جنونِ حق تو ہو شعورِ کافری نہ ہو

جہاں میں رازدارِ عشق کہہ رہی ہیں سب جسے
کہیں وہ تیرا آسیِ خراب حال ہی نہ ہو

جناب عباس انصاری دھولیوی

یہ واقعہ ہے کوئی بھی شریکِ بیکسی نہ ہو
جو میرے حال پر نگاہِ لطف آپ کی نہ ہو

شرابِ جنتِ نظر نواز جس نے پی نہ ہو
تمام عمر واقفِ رموزِ بیخودی نہ ہو

نہ سوز ہے فراق میں نہ لطف ہے وصال میں
جہانِ حسن و عشق کی فضا بدل گئی نہ ہو

کمالِ عشق کے لئے اگر نہ ہو جنوں کی شرط
تو عشق اور حرص میں کچھ امتیاز بھی نہ ہو

---

[1] حضرت استاذی علامہ سیماب صاحب قبلہ مدظلہ العالی۔

اگر نہ برقرار ہو نظام کائناتِ عشق
چمن میں رنگ و بو نہ ہو جنوں میں پختگی نہ ہو

تڑپ میں پا رہا ہوں میں سکونِ دوام کا لطف
خدا کرے کہ مطمئن دلِ حزیں کبھی نہ ہو

خدا شناس ہی اور ہے عبودیت کچھ اور ہے
نگاہِ حق شناس رکھ غلامِ بندگی نہ ہو

یہ زندگی حقیقتاً ہے اک فریبِ زندگی
ہلاکِ زندگی نہ بن اسیرِ زندگی نہ ہو

ہے میری ہم خیال یہ شباب و شعر کی فضا
بلند کس لئے مرا مقامِ شاعری نہ ہو

جو اشتیاقِ دید ہے، مجالِ دید چاہئے
تجلیوں کو حسن کی نظر کو خیرگی نہ ہو

حیاتِ مستعار کو سمجھ لیا ہے دائمی
"یہ زندگی حقیقتاً فریبِ زندگی نہ ہو"

شگفتِ گل، ضیائے ماہ اور خندۂ سحر
حسیں نہ ہوں اگر نگاہ میں شگفتگی نہ ہو

فضول رنج سے بچے، اگر جہان میں بشر
خیالِ برتری نہ ہو، شعورِ کمتری نہ ہو

اثرؔ نشاط و عیش میں نہ کوئی دلکشی رہے
اگر غمِ حیات بھی شریکِ زندگی نہ ہو

حضرت برقؔ صدیقی فتحپوری

عذابِ جاں ہو، زندگی میں کیف زندگی نہ ہو
اگر شریکِ تلخ کامیٔ اجل کبھی نہ ہو

وہ چیز قلب ہے ترا الٹ دے کائنات کو
اُٹھ اپنے دل سے کام لے شکارِ بیدلی نہ ہو

حقیقتاً ہے اضطرابِ دل کا نام زندگی
سکونِ دل طلب نہ کر، فنا کا ملتجی نہ ہو

ہر ایک شے ہے خواب کی سی خواب تک بھلا ہو کیا؟
"یہ زندگی حقیقتاً فریبِ زندگی نہ ہو"

خوشی کے بعد غم ہے، ہو چکا ہے اس کا تجربہ
دُعائیں مانگتا ہوں میں مجھے کبھی خوشی نہ ہو!

وہ ہی غرورِ حسن ہے، وہی ہیں لن ترانیاں
جو جلوہ گر تھا طور پر بتوں میں بھی وہی نہ ہو!

خوشی کی ساعتوں میں بھی یہ رو رہا ہے زار زار
تری طرح بھی غم نصیب دہر میں کوئی نہ ہو

بہشت کا خیال بھی ہے بندگی میں بے محل
شریک کرکے ماسوا کو برقؔ دوزخی نہ ہو

جناب کوکبؔ از قصبہ کوریج

مذاقِ حسن و عشق میں جو ربطِ باہمی نہ ہو
تری ستمگری نہ ہو، مری جفاکشی نہ ہو

نظر کو نور و نار میں کچھ امتیاز ہی نہ ہو
تجلیاتِ یار کی جو دل میں روشنی نہ ہو

نمودِ ہست ہی کہیں نشانِ نیستی نہ ہو
"یہ زندگی حقیقتاً، فریبِ زندگی نہ ہو"

ملے نہ خوئے عشق کو پھر اپنی عاجزی کی داد
مزاجِ حسن میں اگر ادائے برہمی نہ ہو

کبھی ہوں بتکدہ نشیں، کبھی ہوں ساکنِ حرم
مری طرح بھی یوں کوئی خرابِ بندگی نہ ہو

یہی ہے شانِ عاشقی، یہی ہے وصفِ دلبری
جفا سے دشمنی نہ ہو، وفا سے دوستی نہ ہو

اُسے خزاں بہار میں تمیز خاک ہو سکے؟
جسے شگفتگیٔ دل کبھی نصیب ہی نہ ہو

یہ غم ہے کوکبؔ حزیں، کہ غم بھی مستقل نہیں
خوشی کا ہم کو رنج کیا بلا سے گر خوشی نہ ہو

جناب کیفیؔ جام پوری

جو تیری زلفِ مشکبو میں شانِ برہمی نہ ہو
تو آشکار عقل پر فریبِ آگہی نہ ہو

یہ کیف چھا گیا ہے کیوں دلِ پُر اضطراب پر
نگاہِ آرزو نواز اس طرف اُٹھی نہ ہو

تری ہی سوزِ عشق کی اماں نہ لے تو کیا کرے
وہ جس الم نصیب کا جہاں میں کوئی نہ ہو

تری نگاہ کیا پھری کہ یہ گمان ہو چلا
"یہ زندگی حقیقتاً فریبِ زندگی نہ ہو"

غمِ حبیب کی یہ کم نہیں غریب پروری
کہ عین بیکسی میں بھی خیالِ بیکسی نہ ہو

ہوائے کوئے یار کو ہنوز یہ خیال ہے
کسی کلی کو باغ میں غمِ فسردگی نہ ہو

وہ جس کو اپنا جان کر چھپا رہا ہوں آج تک
کبھی تو دیکھ تو سہی وہ تیرا راز ہی نہ ہو

خدا کا نام لیکے پھر اُٹھا ہے کیفیؔ حزیں
کہو کہ رنگِ راہ اس سفر میں اب کوئی نہ ہو

جناب ارمانؔ صابری برہانپوری

دفورِ سعی و شوق میں اگر کبھی کمی نہ ہو
تو پھر مآلِ عشق کیوں مرے لئے خوشی نہ ہو

یہ زندگی ہو بے مزہ سرور و کیف ہی نہ ہو
اگر جہاں میں صابری یہ شعر و شاعری نہ ہو

الٰہی باغِ آرزو مرا رہے ہرا بھرا
بہار ہی بہار ہو غمِ خزاں کبھی نہ ہو

حوادثات سے جو کھیلتا رہا ہو سالہا دن
ق جسے جہاں کی مخمصوں کی کوئی فکر ہی نہ ہو

اُٹھا اسے پھر رہا ہو جو سمندِ شوق ہر طرف
کسی نے جس کی رہبری بھی اس جہاں میں کی نہ ہو

حیات اور موت کا نہ امتیاز ہو جسے
اُسے پھر اس سے کیا ملال ہو کہ زندگی نہ ہو

بشر پہ آشکار ہو فضا کی اہمیت اگر
"یہ زندگی حقیقتاً فریبِ زندگی نہ ہو"

وہ عشق کی لطافتوں سے بے خبر ہی صابری
نیاز و نازِ حسن سے بھی جس کو آگہی نہ ہو

جناب محمود یار خاں اثرؔ ایم۔اے جوناگڈھ

نہاں جو اس میں جلوۂ مذاقِ زندگی نہ ہو
تو ارتباطِ حسن و عشق وجہِ دلکشی نہ ہو

تو وصفِ حیات میں تلاش کر [illegible]
[illegible] رہِ جہاں [illegible] نہ ہو

[illegible]
[illegible] کیفِ زندگی نہ ہو

جناب کیفؔ بہاری

فنا پذیر ظاہرا وجودِ آدمی نہ ہو
ممات بھی حقیقتاً حیاتِ دائمی نہ ہو

مری نظر میں عاقل و فہیم وہ کبھی نہ ہو
[illegible] سے جو مجھ جوئی نہ ہو

نقیب غم کہیں [illegible] زندگی نہ ہو
جسے [illegible] ہے، عارضی نہ ہو

الٰہی! وہ سرشتِ غم نواز کر عطا مجھے — سرور سے ہمکنار جو کبھی ہوئی نہ ہو
سجودِ بے خلوص سے اس آستاں کو پاک رکھ — تری جبیں جو حاملِ مذاقِ بندگی نہ ہو
حدودِ عقل و فہم سے گذر کر ایک دن مجھے — پہنچنا ہے وہاں جہاں تیرو رہوا کوئی نہ ہو
کبھی نگاہِ شوق سے تو دل کا جائزہ بھی لے — شبیہِ دوست شیشۂ ضمیر پر کھچی نہ ہو
محال ہے کہ طے ہوں راہِ شاعری کی منزلیں — جنابِ کیف پر اگر نگاہِ وارثی نہ ہو

جناب زکی اورنگ آبادی

ہمیں مٹا کے زندگی عذابِ زندگی نہ ہو — ہماری خاک میں نہیبِ صاعقہ چھپی نہ ہو
ملال ہی میں ہے خوشی فراق میں وصال ہے — خوشی نہ ہو تو غم نہ ہو جو غم نہ ہو خوشی نہ ہو
نہ دیکھ لطفِ زندگی مآلِ زندگی بھی سوچ — "یہ زندگی حقیقتاً فریبِ زندگی نہ ہو"
بڑھی ہوئی ہیں دہر میں ستم کی بے پناہیاں — کہیں اس انقلاب کو ہوا کسی نے دی نہ ہو
شرار و شعلہ کو تو کیوں سمجھ رہا ہے لالہ زار — نمودِ زندگی تری سرابِ زندگی نہ ہو
ہماری تلخ کامیاں بڑھیں تو کچھ بھی غم نہیں — مگر یہ خوف ہے کہیں تمہیں بھی بیکلی نہ ہو
حوادثِ زمانہ سے کبھی نہ خوف کر زکی — جو آج تجھ کو غم نہ ہو تو کل تجھے خوشی نہ ہو

جناب رعنا عشرتی

وہ دل ہی کیا کہ جس میں آگ عشق کی لگی نہ ہو — وہ آنکھ کیا خرابِ جلوہ جو کبھی ہوئی نہ ہو
کچھ اس طرح ترا کرم مرا شریکِ حال ہے — فلک پہ جیسے چاند ہو زمیں پہ چاندنی نہ ہو
اسیرِ غم بہا تو اپنے آنسوؤں کو شوق سے — مگر یہ ڈر ہے ضبط کی کہیں تری ہنسی نہ ہو
محیطِ کائنات شعلہ ہائے جنگ آج ہیں — کہیں یہ دورِ حشر خیز دورِ آخری نہ ہو
اجازتیں تو دی ہے ہو سجدہ ریزیوں کی تم — خرابِ پردۂ کعبہ میرا ذوقِ بندگی نہ ہو!
جسے سمجھ رہا ہے خالقِ نسیمِ صبح تو — کہیں چھپا ہوا وہ گلستاں میں آپ ہی نہ ہو
یہ قیدِ جام اور سبو ہے بارِ روحِ تشنگی — جو آنکھ سے پلائے وہ تو عذرِ میکشی نہ ہو

جناب راز یزدانی دھولیوی

نیاز مندِ عشق ہوں تو بے نیاز بھی نہ ہو — مرے مذاقِ دید کی جہان میں ہنسی نہ ہو
اسیرِ نالہ و فغاں یہ شیوۂ وفا نہیں — نگاہِ حسن میں کہیں ذلیل عاشقی نہ ہو
ہیں تشنہ لب ہنوز ساقیٔ ازل ہو مجھ پہ بھی کرم — وہ جام مجھکو ہو عطا کہ تشنگی کبھی نہ ہو

وہ سر نہیں جو سر کہ آپ کا جنوں زدہ نہیں — وہ دل بھی کوئی دل ہے جس میں جلوۂ آگہی نہ ہو
یہ کیا ہوا تھا ضو فشاں ابھی حریمِ ناز میں — مری نگاہِ شوق ہی فریب کھا گئی نہ ہو
مریضِ عشق اب تو کوئی دم کا میہمان ہے — ستم ہے وقتِ آخری بھی دید آپ کی نہ ہو
تو جذبِ دل ہی کام راہِ عاشقی میں آ نہ لے — یہ کیوں تلاشِ خضر ہے رہینِ رہبری نہ ہو

جناب ہلال پریمی ازکوکشی

حریفِ ملک و مال بھول کر یہ آدمی نہ ہو — ہوا جو انقلابِ وقت کی اسے لگی نہ ہو
کشش نہ جس میں ہو وہ آستاں نہیں ہے آستاں — جبیں وہ کب جبیں ہے جس میں ذوقِ بندگی نہ ہو
وہ ملتفت ہیں آج ایک نامرادِ عشق سے — کہیں نظر کی چوٹ دل میں پھر ابھر گئی نہ ہو
خمار و کیف کی نزاکتوں کا اس کو کیا پتہ — لبوں سے جس نے پھول کے کبھی چمن میں پی نہ ہو
ہے اسقدر فریبِ رنگ و بو میں کیوں گھرا ہوا — خزاں کے بھیس میں کہیں بہارِ زندگی نہ ہو
تمام درد و کرب بن کے رہ گئی ہے زندگی — مری طرح رہینِ رنج و یاس بھی کوئی نہ ہو
نہیں ہیں شرطِ عشق گو ہلال بیقراریاں — وہ کیا کرے کہ جس کو دل پہ اختیار ہی نہ ہو

جناب باقی اعظمی

یہ کشت زارِ دل اگر کسی طرح ہری نہ ہو — شگفتگی بہار کی نظر نواز بھی نہ ہو
ہوائے خوشگوار سے ہو نغمہ سنج کیا کوئی — چمن کی جب شگفتگی جنوں طراز ہی نہ ہو
فریبِ حسن سے یہ دل ابھی نہیں ہے آشنا — ادائے دلنواز میں کہیں قضا چھپی نہ ہو
وقارِ عشق کھو نہ دے ہماری چشمِ تر کہیں — خدائے حسن صبر کی! یہ وجہ برہمی نہ ہو
ستم کو ربطِ خاص اگر نہ ہو غرورِ حسن سے — دلِ تباہ حال پر نگاہِ لطف بھی نہ ہو
اگر تمہارا حسن ہی کرے نہ جلوہ باریاں — تو منظرِ جہاں میں پھر کہیں نظر کشی نہ ہو
ہو باقیِ ستم زدہ کا پاس تم کو کس طرح — شکستِ سازِ دل کی جب صدا کبھی سنی نہ ہو

جناب تبر مالیگانوی

الٰہی سوزِ دردِ عشق میں کبھی کمی نہ ہو — یہ زندگی مستعار۔ بارِ زندگی نہ ہو
یہ کیا ہوا؟ یہ کیوں سکوتِ لامکاں پہ چھا گیا — چھڑی ہوئی یہ داستاں ہماری آپ کی نہ ہو
سنا ہے آج طور پر وہ بے نقاب آ گئے — الٰہی پھر مرے مذاقِ دید کی ہنسی نہ ہو
بشر کے واسطے کمال وجہ افتخار ہے — کمال تو یہ ہے کمال پر غرور بھی نہ ہو
یہ وہ گناہ ہے کہ جس سے چھوٹنا محال ہے — [illegible] کا شکار آدمی کبھی نہ ہو

امیرؔ کاروان کی شاعری کی پیروی کرو — غزل میں اے تبرؔ قدیم رنگِ شاعری نہ ہو

حضرتِ اثرؔ اکبرآبادی ایم۔ اے

بڑھا کے ہاتھ توڑ دوں مگر یہ سوچتا ہوں میں — چراغ مہر و ماہ میں تمہاری روشنی نہ ہو
نہ پڑ رہیں یہ ریل کی کری شباب خودکشی؟ — اگر ترے دیار میں سکون کی کمی نہ ہو
تمہیں میں اپنے ساتھ لے لوں مگر یہ خوف ہے — کہ میری وجہ سے کہیں تمہاری بھی ہنسی نہ ہو
متاعِ کائنات ہے محبتوں کی گود میں — وہ ایک زندگی کہ جو کسی کے کام کی نہ ہو
یہ رہگذارِ عام پر گھنے درخت کے تلے — ہمیں یہاں کھڑی ہوئی بہار دیکھتی نہ ہو
مجھے بہشت سے جہاں میں بھیجتا تو ہے مگر — تمام دہر کی طرح جو مجھ سی بندگی نہ ہو!

جناب جریؔ ہوشنگ آبادی از جبلپور

قضا کے پردے ہی میں زندگی چھپی ہوئی نہ ہو — مجھے کہیں یہ مژدۂ وصال سرسری نہ ہو
نہیں ہے لطفِ زندگی اگر یہ دل لگی نہ ہو — غمِ دوام ہی سہی نہیں اگر خوشی نہ ہو
لٹے یہ اپنا آشیاں، چمن جلے اٹھے دھواں — نہو نہو خدا کرے یہ سانحہ کبھی نہ ہو
عجیب دورِ جنگ ہے، زمانہ اس سے تنگ ہے — کہیں یہ چودھویں صدی کی آخری صدی نہ ہو
رباب بے صدا ہے وہ شراب بے خمار ہے — شباب جس میں کیفِ عشق و سکرِ عاشقی نہ ہو
ذرا سنبھل کے بزم سے اٹھائے گا مست کو — کہیں وہ بندۂ وفا جریؔ وہی جریؔ ہو

جناب نثارؔ ناصر برہانپوری

بڑھا دے اضطرابِ دل سکونِ دل کبھی نہ ہو — میری بھی ہے التجا کہ درد میں کمی نہ ہو
ہر ایک شئے لرز رہی ہے گلشنِ حیات میں — قریب میرے آشیاں کے برق کوندتی نہ ہو
جہانِ آرزو میں رہکے آرزو نہیں کوئی — علاج اسکا کیا کروں مجھے اگر خوشی نہ ہو
دیارِ حسن میں مجھے یہی فقط خیال ہے — میرے نیازِ عشق سے کسی کو برہمی نہ ہو
قفس سے آج چھوٹ کر چلا ہوں سوئے آشیاں — الٰہی خیر اب چمن کی رت بدل گئی نہ ہو
جہاں میں جس سے مطمئن ہے آج ناصرِ حزیں — "یہ زندگی حقیقتاً فریبِ زندگی نہ ہو"

جناب بیتابؔ کالپوی

وفائے زندگی یہ ہے کسی سے ملتجی نہ ہو — نہیں ہے زندگی اگر شعورِ زندگی نہ ہو
وہ درد و غم کی لذتیں وہ اشتیاق کی چمک — وہ آرزوئے شبِ فراق کی سحر ابھی نہ ہو

نیا جہاں نئی فضا ہو ذوقِ زندگی نیا — یہ طورِ زندگی نہ ہو یہ طرزِ زندگی نہ ہو
کسک دل و جگر ہی کی حیات کا پیام ہے — وہ قاتلِ جفا نہ ہوں تو لطفِ دلبری نہ ہو
غم و الم کا دور ہے، ہیں مطمئن اسی میں ہم — مسرتوں کے دن نہیں خوشی نہیں کمی نہ ہو
فریب خوردۂ ہوس میں جوشِ برتری کہاں — جو ہمتیں بلند ہوں تو اتنی بے بسی نہ ہو

جناب اثرؔ ذائقی

جہاں میں اس طرح رہو کسی سے کام ہی نہ ہو — کسی سے دشمنی نہ ہو کسی سے دوستی نہ ہو
کہاں کا عیش کیسا غم یہ جھوٹ ہے تو وہ دروغ — "یہ زندگی حقیقتاً فریبِ زندگی نہ ہو"
یہی ترا طریق ہو طریقِ عشقِ یار میں — الم کا بھی الم نہو خوشی کی بھی خوشی نہ ہو
ہے تو ہی جانِ زندگی ہے تو ہی مقصدِ حیات — جو تو نہ ہو تو کیا مجھے سرورِ زندگی نہ ہو
شبِ غم اے دلِ حزیں تو کام لے شکیب سے — کہیں ہماری یہ لگی کسی کی دل لگی نہ ہو
اثرؔ جہان کے حسیں بڑے ستم شعار ہیں — تو ان کی بھولی شکل پر فریفتہ کبھی نہ ہو

جناب قیسؔ ہلوری

جو جامِ چشمِ یار کی نصیب میکشی نہ ہو — سرور ہو نہ قلب کو نظر میں بیخودی نہ ہو
ہے گوشہ گوشہ ضوفشاں عجب ہے نور کا سماں — حریمِ دل میں جلوہ گر وہ نورِ سرمدی نہ ہو
تجلیاں جو دیکھ لے، کسی کے مہرِ حسن کی — تو برقِ طور کو کبھی خیالِ ہمسری نہ ہو
چمن چمن ہرا بھرا سحابِ لطف سے ترے — میری ہی کشتِ مدعا جہاں میں کیوں ہری نہ ہو
عروج میں زوال ہے، زوال میں عروج ہے — اگر خدا فروغ دے تو حشر تک کمی نہ ہو
تری زباں پہ قیسؔ ہو ثنائے وارثی سدا — کرے نہ وہ یہ ذکر جو گدائے وارثی نہ ہو

جناب انجمؔ احمد آبادی

تو میری بیخودی پہ اب مسلط اے خودی نہ ہو — یہ زندگی ہی خود کہیں فریبِ زندگی نہ ہو
جہان میں جسے عطا مذاقِ عاشقی نہ ہو — وہ کیا عجب جو واقفِ رموزِ بیخودی نہ ہو
بہارِ باغ پہ تجھے یہ ناز باغباں ہے کیوں — خزاں بہار و باغ کی یہی شگفتگی نہ ہو
وہ غم ہی غم نہیں کہ جو سکونِ دل پہ بار ہو — وہ درد درد ہی نہیں کہ جس میں بیکلی نہ ہو
نگاہِ کیف زا سے تم مری طرف جو دیکھ لو — تو عمر بھر کبھی مجھے خیالِ میکشی نہ ہو
وہ انجمؔ آئے بھی تو کیوں اماطۂ خیال میں — کہ جس کے دل میں شوق ہو شگفتگی نہ ہو

جناب شہید جبلی از بمبئی

اگر غرورِ حسن میں ادائے دلکشی نہ ہو
تو عشقِ سربلند کو خیالِ بندگی نہ ہو

جہاں کے ذرہ ذرہ پر جبیں جھکا رہا ہوں میں
مری طرح کسی کو بھی جنونِ بندگی نہ ہو

جنونِ عشق چھوڑ دے۔ خرد سے کچھ تو کام لے
فریبِ حسن میں نہ آ، طلاکِ سامری نہ ہو

بہار بن کے وہ اگر نہ آئے صحنِ باغ میں
فضا میں دلکشی نہ ہو گلوں میں تازگی نہ ہو

یہی دعا ہے بارگاہِ ایزدی میں اے شہید
کہ میرے اضطرابِ دل میں اب کوئی کمی نہ ہو

جناب برگ باندوی

وہ سجدہ گر ذوقِ سجدہ کی کہیں ہنسی نہ ہو
اُسی کی بندگی ہو بس کسی کی بندگی نہ ہو

ادا ہو کم سنی میں بھی گر شباب سی نہ ہو
بپا ہو حشر لیکن اے خرام نازا بھی نہ ہو

غمِ فنا سے بے خبر خرابِ زندگی نہ بن
"یہ زندگی حقیقتاً فریبِ زندگی نہ ہو"

نگاہِ یار ہر نظر کے ساتھ اس طرح آئے جا
مزہ تو جب ہے درد کا کہ درد میں کمی نہ ہو

ملالِ بیکسی ہو کیا خیالِ عاشقی ہے یہ
کہ اسکی مصلحت ہی برگ جزوِ بیکسی نہ ہو

جناب بسمل سورتی

وقارِ عشق دیکھنا کہیں تری ہنسی نہ ہو
مقابلِ غرورِ حسن عظمتِ خودی نہ ہو

عبث ہے دل کو آسرا حیاتِ بے ثبات کا
"یہ زندگی حقیقتاً فریبِ زندگی نہ ہو"

ہنسی اُڑے نہ حشر میں وقار و نازِ حسن کی
خدا کے روبرو کہیں شکایت آپ کی نہ ہو

جو آپ کی پسند ہو وہی پسندِ طبع ہے
ہماری وہ خوشی ہی کیا جو آپکی خوشی نہ ہو

جناب شاغل جبلی

بصیر و ہمنوا اگر وہ ذاتِ ایزدی نہ ہو
تو شاغلِ نحیف کا رفیق کوئی بھی نہ ہو

رفیق و آشنا اُسے بنائیں کس طرح سے
بغیر دشمنی جسے پسند آشتی نہ ہو

طلسم خیز گفتگو وہ کر رہے ہیں اس لئے
کہ شاغلِ نزار کو ملالِ دلدہی نہ ہو

جناب جنوں الہ آبادی

اگر مری نگاہ میں خلوص کی کمی نہ ہو
عیاں کسی کے حسن سے یہ شانِ خودسری نہ ہو

جھکے نہ تجھ کو چھوڑ کر بتوں کے سامنے یہ سر
سر انداق زندگی خرابِ بندگی نہ ہو

ہوا ہوں جس لئے جنوں میں ان سے دل شکستہ
"وہ زندگی حقیقتاً فریبِ زندگی نہ ہو"

جناب مَن ساگری

ازل سے حسن و عشق میں جو ربطِ باہمی نہ ہو
نہ روح ہو نہ قلب ہو وجودِ جسم بھی نہ ہو

ہے کہاں ثبات ہے ابھی ہے اور ابھی نہ ہو
"یہ زندگی حقیقتاً فریبِ زندگی نہ ہو"

ہمارے لفظِ مدعا پہ اُس نے یوں کہا کہ مَن
وہ بات چاہتے ہو جو ختم کبھی نہ ہو

جناب وجد حافظ آبادی

وہ کونسی ہے جستجو ترے لئے جو کی نہ ہو
وہ کونسی ہے آرزو جو خاک میں ملی نہ ہو

ہیں شب کو اشکبار یاں تو دن کو بیقراریاں
میری طرح خدا کرے کسی کی زندگی نہ ہو

اصلاح سخن

:- جناب صدیق حسن صاحب صدیقی مارہروی کی غزل پر حضرت احسن مارہروی مرحوم کی اصلاح

۱ کیا سوچ رہا ہے اے قاتل، ~~میں حاضر ہوں~~ تلوار اُٹھا بسمل کر دے
اللہ تجھے دے اس کی جزا آسان مری مشکل کر دے

۲ ان شوخ نگاہوں کو یارب، دل لینے کے قابل کر دے
~~مستی بھر دے، جادو بھر دے،~~ خنجر کر دے قاتل کر دے
دلکش کر دے، دلبر کر دے

۳ زینت کو جو قائم رکھتا ہے، شوخ اور بنا یہ رنگِ حنا
~~جس خون میں بوئے الفت ہو~~ وہ خونِ وفا شامل کر دے
جس خون کی رنگت مٹ نہ سکے

۴ وہ جام پلا دے اے ساقی، پھر نام نہ لوں میں دُنیا کا ع دُنیا سے مجھے کیا مطلب ہے دُنیا سے مجھے غافل کر دے

۵ دشوار بھی تجھ کو آساں ہے، آسان بھی مجھ کو مشکل ہے ع یہ بات تجھے کیا مشکل ہے، آسان مری مشکل کر دے

۶ اک دل میں ہے یادِ جاناں اک دل میں ہے خوفِ عصیاں
جب آئے مزا کچھ جینے کا پہلو میں جدا سے دو دل کر دے

۷ کس کام کا دل، یہ نام کا دل جب یاد سے تیری ہے غافل ع محتاجِ کرم ہے دل میرا اس دل کو الٰہی دل کر دے

صدیق کو کیا اوروں سے غرض وہ اور کسی سے کیوں مانگے
جس در سے ~~نہیں محتاج غنی~~ اُس در کا خدا سائل کر دے
گدا سلطان نہیں

توجیہ:-

۱- فاضل استاد نے "میں حاضر ہوں" کی جگہ "تلوار اُٹھا" بنا کر نہ صرف مصرع میں تیزی پیدا کر دی بلکہ علوِ ہمتی اور بسمل ہونے کے جذباتِ فراواں کی تصویر بھی کھینچ دی "میں حاضر ہوں" غلط نہیں تھا۔ اصلاح سے صرف مصرع کو ابھارا گیا ہے۔

۲- "مستی بھر دے جادو بھر دے"۔ یقیناً قابلِ اصلاح تھا۔ اصلاح کے بعد بھی پہلے مصرع میں شوخ نگاہوں کے بعد اگر "کو" کی جگہ "میں" ہوتا تو "بھر دے" صحیح تھا لیکن "خنجر کر دے اور قاتل کر دے" کے اعتبار سے "کو" ہی کی ضرورت تھی۔ حضرت احسن مرحوم نے "دلکش کر دے، دلبر کر دے" بنا کر شوخ نگاہوں کو دونوں مصرعوں سے مربوط کر دیا۔

۳- وفا وہی کرے گا جسے محبت اور اُلفت ہوگی۔ خونِ وفا کے ساتھ بوئے اُلفت کی شرط بیکار سی ہے۔ "شوخ اور بنا یہ رنگِ حنا" متقاضی ہے کہ کوئی مضبوط بات کہی جائے "جس خون کی رنگت مٹ نہ سکے" میں وہ زور بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جس کی مصرعِ ثانی کو ضرورت تھی۔

۶- کون کر دے؟ اصلاح نے اسے واضح کر دیا۔

۸- مصرعِ ثانی میں اصلاح سے ترقی پیدا کی گئی ہے۔ محتاج سے گدا کم تر اور غنی سے سلطان برتر ہے۔

اشتہاری ادویات

ذی ہوش اور تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے کبھی جاذبِ توجہ نہیں ہو سکتیں

لیکن ذیل کی ادویات ہر گھر کے لئے کار آمد اور ایک نعمت ثابت ہونگی

عالیجناب حکیم مولوی محمد نذیر صاحب بالقابہ ایچ۔ پی رئیس مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ

ہر اس شخص کو جو ان ادویات کے اثر کو غلط ثابت کردیگا تاوان دینے کے لئے تیار ہیں حکیم صاحب قبلہ کی مندرجہ ذیل دونوں ادویات اپنے اثر کے اعتبار سے تیر بہدف ثابت ہوئی ہیں، ہزاروں معززین و معززات کے استعمال میں یہ ادویات آچکی ہیں اور آج تک کہیں سے شکایت نہیں آئی۔

قدرتی تیل (رجسٹرڈ)

یہ تیل ۱۹۰۱ء میں ایجاد کیا گیا تھا لیکن مدت تک اپنی بیش بہا فوائد کی وجہ سے تمام دنیا میں اور خاص طور پر ہندوستان میں مشہور ہوگیا چنانچہ ہندوستان کے مشہور حکما، ڈاکٹر اور وید صاحبان کے علاوہ ولایت کے کئی ڈاکٹروں نے بھی سارٹیفکٹ دیئے ہیں۔ ڈاکٹر اور حکیم اپنے مریضوں کو قدرتی تیل کی سفارش کرتے ہیں۔ یہ تیل جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے جو ہر قسم کے درد میں اکسیر ہے اور فوری فائدہ کرتا ہے۔ بدن پر مالش کرکے نہانا، خراب پانی، موسمی بخار، سردی اور زکام سے محفوظ رکھتا ہے، بدن کو چست اور قوی بناتا ہے سر پر مالش کرنے سے بالوں کی سیاہی قائم رہتی ہے۔ بال نرم اور چمکدار ہو جاتے ہیں۔ نزلہ، زکام، کھانسی، سر، آنکھ، کان، دانت، کمر، سینہ کے تمام درد، چوٹ، خراش، آگ سے جلنے، مستورات کے وضع حمل اور کمر درد، بچوں کی سوکھا کے لئے تریاق کا کام دیتا ہے **قدرتی تیل** رجسٹرڈ کی شہرت اور قبولیت کو دیکھتے ہوئے بعض نقال نام بدل بدل کر دھوکا دے رہے ہیں۔ ہم معززین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ **قدرتی تیل** صرف ہم سے طلب فرمائیں اور اس کی خریداری میں احتیاط سے کام لیں فائدہ نہ ہونے کی صورت میں کارخانہ ہر ممکن تاوان دینے کے لئے تیار ہے۔

نوٹ:۔ ایک پاؤ سے کم قدرتی تیل نہیں بھیجا جا سکتا۔ قدرتی تیل مختلف شیشیوں میں پیک بھی ملتا ہے۔

قیمت فی سیر چار روپیہ علاوہ پیکنگ و محصولڈاک

روغن بہار (رجسٹرڈ)

جسمانی صحت کا دارومدار دماغی صحت پر مبنی ہے۔ کامیاب زندگی اور کام کو پوری توجہ سے کرنے کے لئے دماغی سکون کی نہایت ضرورت ہے اور دماغی سکون حاصل کرنے کے واسطے حکیموں اور ڈاکٹروں کا قول ہے کہ تقویٰ دماغ و مفرح طبع اور خوشبودار تیل استعمال کیا جائے چنانچہ آج کل مختلف قسم کے خوشبودار تیل رائج ہیں مگر افسوس ہے کہ ان کے استعمال سے وہ فائدہ نہیں ہوتا جو دماغ کے لئے ضروری ہے **روغن بہار** ان تمام خوبیوں کا مالک ہے جن کی بالوں کو سخت ضرورت ہے اور تمام مضر اجزاء سے پاک ہے خالص صندل کے تیل سے تیار کرایا جاتا ہے اور ہم اعلان کرتے ہیں کہ اس میں آمیزش ثابت کرنے والے کو **ایک سو روپیہ** ملے گا۔
اس کے متعلق استعمال سے ہمیشہ کے واسطے امراض دماغی سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ دماغی کام کرنے والے معزز حضرات اور خواتین کے لئے ایک بیش بہا نادر تحفہ ہے۔ بالوں کے بڑھانے میں لاجواب ہے۔ اس کے قدرتی رنگ کو قائم رکھتا ہے۔ ملائم خوبصورت اور چمکدار رہتا ہے۔ سر میں کیسا ہی درد کیوں نہ ہو ایک دو بار لگانے سے مکمل فائدہ ہو جاتا ہے۔

قیمت فی سیر چھ روپے (علاوہ محصولڈاک)

منیجر دار الصحت رجسٹرڈ مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ۔

نقد و نظر

منتخب داغ

منتخبہ حضرت مولانا احسن مارہروی مرحوم و مغفور۔ تقطیع ۲۶×۲۰ حجم ۸/ ۴۰۷ صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ معیاری (حصہ اوّل و دوم یکجائی) قیمت مجلد ؏۔ ملنے کا پتہ مطبع انوار احمدی پریس الہ آباد

فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی کے کلام کے ابتک متعدد انتخابات شائع ہو چکے ہیں زیرِ نظر انتخاب گذشتہ تمام انتخابوں سے مختلف اور جامع ہے۔ مرزا داغ کا کلام اپنی صفائی، لچک، آسانی اور فصاحت میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ مرزا داغ نے اپنے کلام کے ذریعہ عوام کو روزمرہ اور سلیس بول چال کی تعلیم دی تو اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔ ان کے کلام کا یہ افادی پہلو ان کے سادہ خیالات کی بڑی حد تک پردہ پوشی کرتا ہے۔ اگر وہ مذاق عام کی تسکین نہ کرتے اور اپنے کلام کا رنگ غالب اور مومن سے ملا دیتے جو ان کے لئے کچھ مشکل نہ تھا اس لئے کہ وہ عربی اور فارسی کے عادی تھے۔ تو ہم ان فوائد سے محروم رہ جاتے جو اردو زبان کی ترویج میں ان کے کلام سے ہوا ہے۔ مرزا داغ کا کلام بہت زیادہ ہے اور اس سے ایک ایسا ستھرا معیاری اور بلند مجموعے کا انتخاب تیار کیا جا سکتا ہے جو عام تغزل کے زمرہ میں نہ آسکے لیکن افسوس کہ آجتک کسی نے اس کی سعی نہ کی "منتخب داغ" بھی اس سے خالی ہے۔ لیکن مولانا احسن مرحوم نے اس انتخاب میں ایک حد تک مرزا داغ کے شوخ اور عریاں اشعار نکال دیئے ہیں "منتخب داغ" کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے پہلے حصے میں جو ۴۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایسے اشعار دیئے گئے ہیں۔ جن میں فارسی عطف و اضافت مطلق نہیں ہے۔ مولانا احسن مرحوم کی یہ کوشش و کاوش ہمیں مرزا داغ کے کلام کی سہل ترین طرزِ سخن پر غور و فکر کا موقع دیتی ہے دوسرے حصہ میں ایسے اشعار ہیں جن میں عطف و اضافت موجود ہے۔ اس جداگانہ نوعیت کے انتخاب سے نگاہِ مطالعہ مرزا داغ کے کمالِ فصاحت کا عرفان تیزی سے کر لیتی ہے۔

شروعِ کتاب میں مولانا احسن مرحوم کے حالات اور اس کے بعد مولانا احسن کا خود نوشت مقدمہ ہے۔ جس میں مرزا داغ کی شاعری پر لگائے ہوئے الزامات کو مختلف آرا سے ہلکا کیا گیا ہے۔ "منتخب داغ" کی تصحیح غور و فکر سے نہیں کی گئی ہے اس لئے جا بجا نظریں ٹھہرتی ہیں۔ اُمید کہ ناشرِ انتخاب ایک صحت نامہ مرتب فرما کر اس میں لگا دینگے۔

مرزا داغ اور مولانا احسن کی تصاویر بھی شریکِ کتاب ہیں۔ مرزا داغ کی تصویر کسی نومشق مصور سے بنوائی گئی ہے۔ چہرے کے خد و خال مسخ ہو کر رہ گئے ہیں۔ بلاشبہ یہ انتخاب گذشتہ انتخابوں سے وقیع اور قابلِ مطالعہ ہے۔

کلیاتِ میر تقی میر

اکبر آبادی

مطبوعہ مطبع منشی نولکشور پریس لکھنؤ۔ تقطیع ۲۶×۲۰ حجم زائد از ایک ہزار صفحات طباعت دیدہ زیب ٹائٹل منقش و رنگین۔ کتاب پر کہیں قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ مطبع منشی نولکشور پریس لکھنؤ۔

میرے خیال میں زیرِ نظر کلیات اُردو کا سب سے پہلا کلیات ہے جو اتنا ضخیم شائع کیا گیا ہے۔ ضخامت کے علاوہ اس کی ترتیب میں بھی بڑی کاوش اور دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ اس جدید کلیات کی ترتیب میں ملک کے مشہور ادیب مولانا آسی لکھنوی کا ہاتھ ہے۔ میں مولانا موصوف کو ہدیۂ مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ اُنھوں نے اپنی نگاہِ تحقیق سے دورِ اوّل کے سب سے بڑے شاعر کو حیاتِ ابدی بخشی۔ اس کلیات کا مقدمہ جو ۵۸ صفحات پر مشتمل ہے وہ مولانا آسی ہی کا رہینِ قلم ہے اور بڑی جاذبِ توجہ چیز ہے۔ اس میں میر صاحب کے مفصل تحقیقی حالات اور اُن کے کلام پر ایک سیر حاصل تبصرہ بھی کیا گیا ہے جو میر اور میر کے رنگِ سخن کے سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

زیرِ نظر "کلیاتِ میر" کی ترتیب کے وقت کلامِ میر کے گذشتہ تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخے مرتب نے سامنے رکھکر یہ کلیات ترتیب دیا ہے۔ اس میں ایک ترجیع بند کے سات بند۔ دو مثنویاں اور دو غزلیں بھی اضافی ہیں جو اس سے پہلے کسی مطبوعہ نسخے میں نہ تھیں۔ کتاب کے آخر میں ایسے اُردو الفاظ جو اب مستعمل نہیں ہیں اور موجودہ لغات میں نہیں ملتے۔ نیز فارسی کے وہ مشکل محاورات جو دوسرے شعرا کے یہاں نہیں ہیں یا لی سب کے لئے ایک فرہنگ مرتب کی گئی ہے۔

با اعتبار ترتیب بھی یہ کلیات "جدید" کے زمرہ میں آتا ہے۔ باقاعدہ فہرست کے علاوہ تضمینیں، رباعیات، ترکیب بند، نعت و منقبت۔ مدحیات۔ مثنویات۔ ہجویات۔ واسوخت نکارنامے وغیرہ ٹائٹل کے ساتھ دئیے گئے ہیں۔ غزلوں کے انتخاب میں بھی صحت کا خیال رکھا گیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ انتخاب لاجواب ہے۔ اُمید کہ اُردو دان طبقہ اس کی قدر کرے گا۔

خطِ تقدیر

مؤلفہ کنور محمد الیسین علی خاں صاحب حسن شہاب۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۱۵۶ صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ دیدہ زیب۔ کتاب مجلد ہے اور ٹائٹل دو رنگا۔ جلد پر خوبصورت گرد پوش ہے۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ "رفاہِ عام پریس آگرہ"۔ "دار الاشاعت اُردو اسپتال روڈ آگرہ"

پامسٹری یا علمِ دست شناسی ایک قدیم علم ہے اور بڑی حد تک کار آمد بھی ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں اس علم کے ماہرین کی کمی نہیں۔ شہاب صاحب کو بھی دست شناسی میں ملکہ حاصل ہے۔ ذاتی علم و دو فون کے علاوہ شہاب صاحب یہ بھی چاہتے تھے کہ افادۂ عام کے لئے اپنی معلومات اور اپنے تجربات کاغذ پر لے آئیں۔ چنانچہ اُن کی یہ تالیف اسی جذبہ کا نتیجہ ہے۔ اُردو زبان میں دست شناسی کے متعلق جتنی کتابیں ہیں وہ سب تیسرے درجہ کی ہیں۔ ضرورت تھی کہ کوئی پڑھا لکھا آدمی اس پر قلم اُٹھائے اور معیاری کتابوں کی طرح اس کی اشاعت ہو۔ **خطِ تقدیر** ان دونوں مقاصد کو پورا کرتی ہے۔ اصولِ فن تو محدودے چند ہی ہوتے ہیں لیکن اُن کی تشریح تجربات کی روشنی میں کام کی چیز ہوتی ہے۔ شہاب صاحب نے علم دست شناسی کی سلیس اور عام فہم زبان میں اس طرح وضاحت کی ہے کہ چند بار کے مطالعہ سے اس علم میں کافی ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔

بعض سرخیوں میں شہاب صاحب نے ہندی اور فارسی الفاظ کو مضاف مضاف الیہ بنایا ہے جو کسی طرح صحیح نہیں۔ مثلاً نشاناتِ اُبھارِ عطارد۔ اُبھارِ مریخ۔ اُبھارِ قمر اُمید کہ شہاب صاحب دوسرے ایڈیشن میں اس کی تصحیح فرما دیں گے۔

شروعِ کتاب میں مؤلف کا پیش لفظ اور دیباچہ بھی ہے۔ جگہ جگہ ہاتھوں اور انگلیوں کی مختلف شکلیں بھی ہیں۔ کتاب اپنی افادی حیثیت سے قابلِ قدر ہے۔

ریاضِ روح

مجموعۂ کلام جناب روحی آبھوری۔ تقطیع $\frac{18 \times 22}{}$ حجم ۱۴۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ عہ۔ ملنے کا پتہ محمد عزیز الدین صاحب روحی سوداگر پان آبھور (علاقہ مدراس)

روحی صاحب حضرت مولانا محوی لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ اس مجموعہ میں اُن کے نعتیہ کلام کے علاوہ عشقیہ غزلیں بھی ہیں۔ نیز رباعیات۔ قطعات اور چند نظمیں بھی! روحی صاحب کا رنگِ سخن نہ ترقی یافتہ ہے اور نہ بہت زیادہ پست۔ جس طرح ایک اوسط درجہ کا شاعر کہہ سکتا ہے۔ اسی طرح آپ نے بھی جذبات نگاری کی ہے مسرت کی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنا مجموعہ کلام شائع کر دیا اور ایک ایسے مقام سے جہاں اُردو کتب کی اشاعت کے امکانات مسدود ہیں۔

حقیقتِ سجّاد

از جناب عروج قادری تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۴۴ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط۔ قیمت ۵ ملنے کا پتہ ادبستان مراد پور بانکی پور پٹنہ۔

مولانا ابو المحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ پر جناب راغب احسن ایم۔ اے نے کچھ اعتراضات کئے تھے۔ یہ کتاب انھیں اعتراضات کے جواب میں مرتب کی گئی ہے چونکہ اعتراضی مضمون اور مولانا سجاد کی زندگی کے کل واقعات اس وقت سامنے نہیں ہیں۔ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ غلطی کہاں ہے۔ بہر طور اس معاملہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات "حقیقتِ سجاد" کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔

کملا

ترجمہ جناب راجہ مہدی علی خاں۔ تقطیع $\frac{22 \times 29}{16}$ حجم ۲۴۰ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ دیدہ زیب۔ کتاب مجلد ہے اور خوبصورت گرد پوش سے مزین۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجرانِ کتب لاہور

جناب راجہ مہدی علی خاں اُردو کے خوش فکر شاعر اور اچھے فسانہ نگار ہیں آپ کے اکثر فسانے ترقی یافتہ فسانہ نگاری کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں۔ "**کملا**" بنگالی زبان کے مشہور ناول "**بارواری**" کا آزاد اور رنگین ترجمہ ہے۔ "بارواری" بنگال کے مایۂ ناز ادبا کا رہینِ قلم ہے۔ اس کی تکمیل میں ان ادبا نے اپنا پورا زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔ یہ فسانہ اپنے اندر بڑی دلچسپی رکھتا ہے۔ جناب راجہ مہدی علی خاں کی یہ سعی اُردو افسانہ نگاری میں ایک اچھا اضافہ ہے ترجمہ پوری ادیبانہ شان کے ساتھ کیا گیا ہے اور ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔

دنیائے آرزو

از جناب میرزا ادیب بی۔ اے آنرز۔ ایڈیٹر "...."

بمبئی۔ تقطیع ۲۹×۲۲/۱۶ حجم ۲۲۸ صفحات۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پر خوبصورت گردپوش ہے۔ قیمت ؏ ملنے کا پتہ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

میرزا ادیب کا پنجاب کے چوٹی کے فسانہ نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ صحرا نورد کے خطوط لکھ کر موصوف نے دنیائے ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔ پنجاب کے عام فسانہ نگار واقعات کی تحلیل تو بڑی خوبی سے کرتے ہیں لیکن اُن کی تحریر ادبی حیثیت سے ہلکی ہوتی ہے۔ میرزا ادیب کی تحریر البتہ بلند ادب کے نادر نمونے پیش کرتی ہے۔ ادیبانہ وقار اور شگفتگی کو وہ کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

"دُنیائے آرزو" ایک ڈائری ہے جس میں اس دور کے تعلیم یافتہ طبقہ کی بیکاری کی بھیانک تصویر کچھ اس قدر موثر انداز میں پیش کی گئی ہے کہ پڑھنے والے کا ماحول آہ و بکا رنج و غم اور آنسوؤں کے طوفان میں ڈوب کر رہ جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد مصنف نے قلم اٹھایا ہے اسی لئے ہر واقعہ حقیقت سے ٹکراتا ہے۔

کیا خوب آدمی تھا

تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶ حجم ۱۲۰ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ معیاری۔ قیمت ۸ ملنے کا پتہ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی۔

یہ اُن تقاریر کا مجموعہ ہے جو مولانا راشد الخیری۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ مولوی نذیر احمد دہلوی۔ چکبست لکھنوی۔ داغ دہلوی۔ منشی پریم چند۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں ڈاکٹر انصاری۔ علامہ اقبال۔ سر راس مسعود اور مولانا محمد علی مرحوم پر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کی گئیں۔ مقررین میں قریب قریب تمام حضرات اچھے لکھنے والے ہیں اور ہر مقرر نے کوشش کی ہے کہ اُس سے جو شخصیت متعلق کی گئی ہے اُس کی زندگی کے اجمالی تبصرہ میں کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ شاہد کے متعلق آل انڈیا ریڈیو نے بہت کچھ کیا ہے اور ابھی اس سے کافی امیدیں ہیں۔

زہر ملی مکھی

از جناب سید محمود محمود رضوی بی۔ اے تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶ حجم ۱۴۴ صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط۔ قیمت عمر ملنے کا پتہ گلفروش پبلشنگ ہاؤس لال کنواں دہلی

ملک کے مشہور ادیب جناب سید محمود رضوی ایک اچھے فسانہ نگار ہیں۔ آپ کے افسانوں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ میں ۱۲ افسانے ہیں اور قریب قریب سب دلچسپ ہیں۔ افسانوں کی زبان کافی نکھری ہوئی ہے۔

گُل و مُل

از جناب سید علی عباس صاحب عباس ایڈووکیٹ سہارن پور۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم زائد از دو سو صفحات قیمت عہ لکھائی چھپائی اور کاغذ دیدہ زیب۔ ملنے کا پتہ۔ انجمن ترقیٔ ادب دہلی

یہ جناب عباس کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ عباس صاحب اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے ہیں۔ غزلوں کے مطالعہ سے عباس صاحب کے تبحر علمی کا تو پتہ چلتا ہے لیکن اُن کے کلام میں شاعری برائے نام بھی نظر نہیں آتی۔ اکثر غزلیں مشاہیر شعرا کے کلام کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہیں اور خیال و الفاظ کو اپنانے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً

یک قفس بیش نہیں گلشنِ عالم کا وجود — یعنی آزاد کبھی مُرغِ گرفتار نہ تھا

ترے اتقا کے صدقے تری زہد کے میں قربان — تجھے سب ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

وہ سمجھتے ہیں تلافیٔ جفا مشکل ہے — سہل ہے دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

آفتاب و ماہتابِ آسمانِ حسن و عشق — خاک میں کیا صورتیں اللہ پنہاں ہو گئیں

موت کا آخری آیا ہے پسینہ ہم کو — سادگی سے وہ سمجھتے ہیں کہ حال اچھا ہے

پوری کتاب کا تجزیہ کیا جائے تو اس قسم کے بہت سے اشعار مل سکتے ہیں۔ میں عباس صاحب کے بیشتر اشعار کے معنی بھی سمجھنے سے قاصر ہوں ؎

کوہ گیتی یادگارِ تیشہ کاری ہائے عشق — ہے شمر ہر سنگ میں سوزِ دلِ فرہاد کا

فصلِ بہار خاک و ہوا جلوہ بارِ گُل — موجِ نسیم عطر نفس گُل نثارِ گُل

کعبہ و دیر سے یاں جس کو سروکار نہ تھا — دار پندار میں وہ خوگرِ پندار نہ تھا

نقشِ لیلیٰ سر ہر ذرۂ خاکِ مجنوں — مر کے بھی قیس زبونِ کشِ ہجراں نہ ہوا

اکسیر گر نہ ہو تو تیمم سے کیا چلا — آبِ بقا نہ ہو تو فروغِ وضو ہے کیا

عباس صاحب نے جو اشعار خود سمجھ کر کہے ہیں وہ کسی حد تک اچھے ہیں۔ اور اُنکے کلام سے اُن کا فطری ذوق و شوق جھلکتا ہے مثلاً ؎

وہ سب مراتبِ ہستی تصورِ بنیش تھے — کہ قطرہ بحر نہ تھا، ذرہ آفتاب نہ تھا

روزِ ازل حریفِ غمِ عشق دل ہوا — مارا ہوا ہوں میں نگہِ انتخاب کا

گُل و مُل کے متعلق میری یہ رائے خلوص پر مبنی ہے۔

اعجاز صدیقی

دنیا کی حور ۔ مصنفہ حضرت کوثر چاندپوری مع دیگر افسانوں کے
قیمت دس آنہ (۱۰؍)

محبت کا افسانہ ۔ ازل ۔ احمد اکبر آبادی قیمت دو روپیہ عالہ

شب چراغ ۔ بہترین تہذیبی خوشگل اور جذباتی افسانوں کا مجموعہ ۔
از جناب ضیا بی ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی قیمت ۸؍

قاتل ۔ مصنفہ ایم اسلم مع دوسرے افسانوں کے ۔ قیمت دو روپیہ (عالہ)

نغمات ۔ ازل ۔ احمد اکبر آبادی قیمت ایک روپیہ

زاد راہ ۔ مصنفہ منشی پریم چند ۔ آخری اور بہترین افسانہ قیمت عہ

انشائے لطیف ۔ ازل ۔ احمد اکبر آبادی قیمت دو روپیہ (عالہ)

مختلف افسانے

سرگذشتِ اسیر عہ ۔ سندر کی خداوندہ ۲؍ ۔ مجبودہ عہ ۔ دغا ۸؍
فسانۂ سلطنت مغلیہ ۔ طوفانِ زندگی عہ ۔ عروجِ زندگی عہ ۔ شیطان کا بچہ ۶؍
عبرت کدہ ۱۲؍ ۔ خانقاہ اسرار ۶؍ ۔ چتوڑ کی دیوی ۱۲؍ ۔ مغربی دلہن ۱۰؍
بدرِ کمال عہ ۔ بالشویک شہزادی ۳؍ ۔ انارکلی ۲؍ ۔ جنات کی شہزادی ۳؍ ۔ پریزاد ۳؍
شیطان زادہ ۳؍ ۔ شیطان کا چرخہ ۴؍ ۔ دوست ۲؍

ظریفانہ افسانے

بحرِ تبسم عالہ ۔ موجِ تبسم عالہ ۔ سیلابِ تبسم عالہ ۔ طوفانِ تبسم عالہ
منشی جی عالہ

یہ پانچوں ظریفانہ کتابیں حضرت شوکت تھانوی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں ۔ ان کے پڑھنے سے دماغی تفریح ہوتی ہے اور ہنستے ہنستے آدمی لوٹن کبوتر بن جاتا ہے ۔

صرف عورتوں کے لئے

بہشتی جوہر ۱۲؍ ۔ گھر اور گھر والی ۴؍ ۔ شوہر کی نصیحتیں ۴؍
آدابِ نسواں ۶؍ ۔ ثریا بیگم ۴؍ ۔ صبر کی دیوی ۲؍ ۔ ناصحِ مشفق ۳؍
عقیلہ بیگم ۴؍ ۔ معین الخواتین ۸؍ ۔ زنانہ خطوط ۵؍ ۔ کفایت شعاری ۳؍
لوری نامہ ۲؍ ۔ پہیلی نامہ ۶؍ ۔ انشائے نسواں ۸؍ ۔ اصلاح الرسوم ۳؍
انقلابِ زندگی ۴؍ ۔ شبابِ زندگی ۸؍ ۔ چاند تارے ۸؍

مختلف کمیاب کتابیں

مینائے سخن ۔ منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی مرحوم کی تمام داسوختوں کا بے نظیر مجموعہ ۔ قیمت عہ

مغل اور اردو ۔ ادیب الملک نواب نصیر حسین خاں خیال مرحوم کی لاجواب تصنیف ۔ اس میں اردو کے ابتدائی دور سے لے کر مغلوں کے دور تک ہر زمانے کے تدریجی واقعات قلمبند کئے گئے ہیں ۔ بڑا سائز حجم ۱۵۰ صفحات قیمت عالہ

نورِ مشرق ۔ مہر لال ضیا سونی ایم ۔ اے کی روح افروز معیاری نظموں کا مجموعہ ۔ قیمت ایک روپیہ عہ

اربعہ عناصر ۔ حکیم محمود علی خاں ماہر اکبر آبادی کی رموز و نکات سے لبریز رباعیوں کا مجموعہ ۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

حسنِ کار ۔ فنونِ لطیفہ پر دلچسپ پیرائے میں جامع تبصرہ ۔ قیمت ۶؍

داستانِ عجم ۔ مصنفہ نواب نصیر حسین خاں خیال مرحوم ۔ شاہنامہ فردوسی پر بے نظیر تبصرہ ۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

روحِ نظم ۔ میر سے لے کر آج تک کے اکثر شعرا کے کلام کا انتخاب ۔ از مولانا تاجور نجیب آبادی و میلا رام صاحب وفا ۔ دو حصے کل قیمت سے

روحِ انتخاب ۔ اردو نثر اور اردو لٹریچر کا ضروری تاریخی انتخاب دو حصوں میں ۔ قیمت حصہ اول ۱۲؍ ۔ حصہ دوم عہ

محامد الخلفا ۔ قرآن مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام کے مستند اور مکمل حالاتِ زندگی ۔ قیمت مجلد ۸؍

معین الشعرا ۔ از غلام حسین خاں آفاق بنارسی مرحوم ۔ یہ وہ عدیم المثال لغت ہے جس میں عربی ۔ فارسی ۔ اردو ۔ انگریزی اور ہندی زبان کے ہزاروں الفاظ کے معنی کے علاوہ ہر لفظ کے اعداد و ملفوظی صحت کیساتھ درج کئے گئے ہیں جو تاریخ نکالنے میں معاون ہوتے ہیں ۔ ہر لفظ کے متعلق یہ بھی درج ہے کہ وہ کس زبان کا ہے اور مذکر ہے یا مؤنث ۔ نہ صرف یہی بلکہ اساتذۂ قدیم و حال کے کلام سے ہر لفظ کی تذکیر و تانیث کا ثبوت بھی پیش کیا گیا ہے ۔ حقیقتاً یہ لغت طالبانِ ادب و شعر کے لئے خضرِ راہ ہے ۔ سائز ۲۲×۱۸ حجم ۳۸۶ صفحات مجلد ۔ قیمت چار روپیہ للعہ

بزمِ خیال ۔ از جناب صفدر مرزا پوری ۔ اس کتاب میں شعرائے اردو و فارسی کی مجالس کے لطائف و ظرائف کو جمع کیا گیا ہے ۔ برجستہ گوئی اور حاضر جوابی کے

تصانیف مولانا حالی پانی پتی

مسدس حالی (عکسی) عہ، مسدس حالی (سادہ) ۸ر، مرثیۂ غالب ۲ر
مناجات بیوہ ۲ر، شکوۂ ہند ۲ر، حبِ وطن ۲ر، چُپ کی داد ۲ر

مختصر تصانیف علامہ ڈاکٹر سر اقبال مرحوم

شکوہ جواب شکوہ ۴ر، شمع و شاعر ۴ر، نفیر یادِ امت ۴ر
اکبری اقبال ۳ر، نالۂ یتیم ۲ر، تصویرِ درد ۳ر

سوانح عمریاں

اُمت کی مائیں ۶ر، بنت الرسولؐ ۶ر، سوانح خاتونِ جنتؓ ۴ر، سوانح ام حسینؓ ۴ر
فاطمہ کا لال ۱۲ عہ، سوانح حضرت صدیق اکبرؓ ۲ر، سوانح حضرت عمر فاروقؓ ۸ر
سوانح حضرت علیؓ کرم عہ، سوانح امام اعظمؒ ۱۲ر، تذکرۂ صابرؒ ۱۲ر، سوانح
خواجہ غریب نوازؒ عہ، سوانح غوث پاکؒ عہ، مناقب حضرت غوث گوالیاریؒ ۸ر
تحفۂ دربار ولایتؒ ۶ر، خمخانۂ برکاتؒ ۳ر، تصص الانبیاء ۱۲ عہ، حیات خواجہؒ ۶ر
تذکرہ خواجگانِ چشتؒ ۸ر، سوانح اورنگ زیب ۸ر، سوانح زیب النساء ۸ر
سوانح اکبر اعظم ۸ر، سوانح نور جہاں بیگم ۸ر، سوانح غازی محمد بن قاسم ۴ر
حیاتِ انیس عہ، حیات سعدیؒ ۶ر، حیاتِ حافظؒ ۸ر، حیاتِ جانی اکبرآبادی ۶ر
خالدہ ادیبہ خانم ۱۰ر، حیاتِ خسروؒ ۴ر، سوانح شاہجہانؒ ۸ر، حیاتِ فردوسی ۶ر

صنعتی کتابیں

اسرارِ صنعت عہ، دولت کا ڈھیر ۸ر، چائے کی معلومات ۴ر

تاریخی کتابیں

تاریخ کا روشن پہلو ۸ر، حکایاتِ کشمیر، کشمیر کی رانیاں ۴ر، معمارانِ کعبہ ۸ر، عروج ترکی ۸ر
کشمیر کا مستقبل ۴ر، ترکانِ احرار عہ، اشرف التواریخ کامل لِلعہ، خضر منزل ۸ر، خلافت الٰہیہ عہ
انقلابِ فرانس ۱۲ر

مذہبی کتابیں

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق - مؤلفہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
اصولِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق کے تمام گوشوں پر دلپذیر اور مکمل بحث اور اسلام کے ابواب اخلاق کی عملی تشریح جس سے اسلامی اخلاقیات کی برتری نہ صرف اعتقادی طور پر بلکہ علم و تحقیق کے معیار پر تمام ملتوں کے ضابطہائے اخلاق کے مقابلہ میں واضح ہو جاتی ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہترین حجم ۴۴۲ صفحات۔ قیمت للعہ (بڑا سائز)

غلامانِ اسلام مؤلفہ حضرت مولانا سعید احمد ایم۔ اے اکبرآبادی فاضل دیوبند۔ جس میں ان مقتدر ہستیوں کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و جستجو سے یکجا کئے گئے ہیں۔ جن کو غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود اسلامی سوسائٹی میں عظمت و اقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا ہے اور جن کے علمی، مذہبی تاریخی اور اصلاحی کارنامے نقشِ دوام بن کر سینۂ عالم پر ثبت ہو چکے ہیں۔
حجم ۴۲۲ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ بہترین قیمت للعہ (بڑا سائز)

اسلام کا اقتصادی نظام۔ مؤلفہ حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی
جس میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا نظام اقتصادی ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال کی راہ پیدا کی ہے
کتابت و طباعت اور کاغذ بہترین حجم ۲۴۸ صفحات قیمت عہ

اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مؤلفہ حضرت مولانا سعید احمد ایم۔ اے اکبرآبادی فاضل دیوبند جس میں غلامی کی حقیقت، اس کے نفسیاتی، اخلاقی اور اقتصادی پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ غلامی کا آغاز کب سے ہوا۔ اسلام سے پہلے کن کن قوموں میں یہ رواج پایا جاتا تھا اور اس کی صورتیں کیا تھیں۔ اس کی کل تاریخ پھر اسلام نے اس رواج کو اس وقت کن مجبور کن حالات کی وجہ سے باقی رکھا اور اس میں کیا کیا اصلاحات کیں اور ان سب سے اسلام کا اصل منشا کیا ہے۔ اس کے بعد مشہور مصنفین یورپ کے بیانات اور یورپ کی اجتماعی غلامی پر مفصل بحث اور تبصرہ کیا گیا ہے۔ بڑا سائز کتابت و طباعت اور کاغذ بہترین حجم ۲۰۲ صفحات قیمت عہ

جوازِ تعزیہ ۸ر، ارشاد احمد ۲ر، قومی نظم ۴ر، تعلیم الاسلام عہ، کمالاتِ قرآنی ۴ر

مولانا شرر لکھنوی کے ناول

حسن کا ڈاکو عہ، قیس و لبنیٰ عہ، یوسف و نجمہ عہ، فلپانا عہ
ملک العزیز ورجنا ۸ر، منصور موہنا ۱۰ر، فردوسِ بریں [illegible]
بدر النساء کی مصیبت عہ، [illegible] ۱۲ر، [illegible]

منظور شدۂ محکمہ ہائے تعلیم بہار و ریاست میسور

تعارف

تصاویر:- (۱) حضرت مولانا آلم مظفرنگری (۲) جناب محمد عبداللہ صاحب مضطر گجراتی

جلد ۱۲ | ماہنامہ "شاعر" - آگرہ - دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر ۱۲

چندہ سالانہ ... خواص ... عوام سے ... فی پرچہ ...

فہرست محسنین معاونین انیسان ہمدردان شاعر

سر پرست ادب و شعر

(۱) عالیجناب خان شری امام الدین خان صاحب مستان فرستوا والئی پاجود کاٹھیاواڑ

محسنین ادب و شعر

(۲) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ؎ سالانہ
(۳) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیّر خورجوی ؎ سالانہ
(۴) محسنۂ ادب ہر ہائینس علیہ حضرت کتیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ؎ سالانہ
(۵) محسنۂ ادب شہزادی تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ؎ سالانہ
(۶) محسنِ ادب جناب محترم وزیرزادہ شجاعت خانصاحب قمر جوناگڈھی ؎ سالانہ

معاونین ادب

(۷) معاونِ ادب مسٹر لے۔ بی فلپس صابر بی۔ اے اکبرآبادی ؎ سالانہ
(۸) معاونۂ ادب محترمہ نجم النصرت ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی ؎ سالانہ
(۹) معاونِ ادب جناب مولوی محمد احمد صاحب رسوا سہارنپوری ؎ سالانہ

انیسان ادب

(۱) انیسِ ادب جناب سید تفضل کریم صاحب جنید پوری ؎ سالانہ

ہمدردان ادب

ہمدردِ ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلیمان جالندھری ؎ سالانہ
ہمدردِ ادب محترمہ بیگم صاحبہ کرم علی صاحب نسیم گوالیاری مرحوم ؎ سالانہ
ہمدردِ ادب جناب نواب زادہ کنور شکور حسین خانصاحب قیس آف میندھو ؎ سالانہ
ہمدردِ ادب جناب ابوعبدالعظیم خانصاحب رونق دکنی ؎ سالانہ
ہمدردِ ادب جناب مولوی محمد قاسم صاحب تامی علوی دربھنگوی ؎ سالانہ
ہمدردِ ادب جناب اسمٰعیل کھوکر صاحب راز جوناگڈھی ؎ سالانہ
ہمدردِ ادب جناب صاحبزادہ سید مظفر حسین صاحب شمس زمیندار (مان دا دار لم) ؎ سالانہ
ہمدردِ ادب جناب محبوب حسن صاحب آسی متوطن رڑکی ؎ سالانہ
ہمدردِ ادب جناب قاضی عمر میاں حسن میاں صاحب چشتی نظامی۔ کٹول ؎ سالانہ
ہمدردِ ادب جناب مخدوم سید علی اسعد صاحب نقوی البخاری احمدآباد ؎ سالانہ

خاصانِ ادب

جناب صاحبزادہ سلطان حامد خانصاحب ثروت گلشن آبادی ؎ سالانہ
جناب صاحبزادہ شفیق الرحمان خانصاحب شفق ٹونکی ؎ سالانہ
جناب عبدالحفیظ صاحب فخر صدیقی پھپھوندوی بی۔ اے ؎ سالانہ

(۲۴) جناب محمد سعید خانصاحب ادیب ریواڑی ؎ سالانہ
(۲۵) جناب لالہ گنگا رام صاحب آبد سرہندی ؎ سالانہ
(۲۶) جناب سید مظفر حسین صاحب عرشی دہلی ؎ سالانہ
(۲۷) جناب دلیراج شرما بی۔ ایس۔ ڈی۔ فرینچ منڈی ضلع جہلم ؎ سالانہ
(۲۸) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی جمشید پور ؎ سالانہ
(۲۹) جناب صاحبزادہ عبدالمجید خانصاحب بہادر عباسی بی۔ اے ؎ سالانہ
(۳۰) جناب ماسٹر حسن خانصاحب اثر بمبئی۔ ؎ سالانہ
(۳۱) جناب نذیر احمد صاحب نذیر سشیرکوٹی ؎ سالانہ
(۳۲) جناب صبغت اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی ؎ سالانہ
(۳۳) جناب صاحبزادہ سید اکبر علی صاحب بشارہ ؎ سالانہ
(۳۴) جناب طالق ہمدانی لدھیانوی ؎ سالانہ
(۳۵) جناب سبحان خان صاحب غافل بیتول ؎ سالانہ
(۳۶) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی کوٹا ہہ ؎ سالانہ
(۳۷) جناب حبیب خانصاحب حبیب شاہجہانپوری (کوئٹہ) ؎ سالانہ
(۳۸) جناب بابو نقیر محمد خانصاحب عارف سیالکوٹی (کوئٹہ) ؎ سالانہ
(۳۹) جناب شیو پرشاد صاحب برگ باندوی ؎ سالانہ
(۴۰) جناب ہدایت اللہ خان صاحب شمیم کوٹی ؎ سالانہ
(۴۱) جناب حکیم ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب زار کاندھلوی ؎ سالانہ
(۴۲) جناب علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی ؎ سالانہ
(۴۳) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب قنبر منظوری ؎ سالانہ
(۴۴) [illegible] ؎ سالانہ
(۴۵) جناب ماسٹر [illegible] صاحب [illegible] ؎ سالانہ

اصول اصلاح [illegible]

جرعات

وداعِ سال

"یہ زمیں گردش میں ہے۔ یہ آسمان گردش میں ہے" —— اور گردش کا نتیجہ لازمی ہر چیز کا انقلاب کی زد میں آجانا اور ختم ہوجانا ہے۔ ۱۹۴۱ء بھی تقویمِ پارینہ کا ایک ورق بننے والا ہے۔ "محوری گردش" نے سال کے ان آخری لمحات تک ہمیں آلودۂ خاک و خون، ہمکنارِ شعلہ ہائے جنگ اور گرفتارِ آلام و مصائب رکھا ہے۔ معصوموں اور مظلوموں کی آہ و بکا، یتیموں اور بیواؤں کی گریہ و زاری نیز مفلسوں اور ناداروں کی تشنگی و گرسنگی ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اُمیدِ امن سراب، اور اطمینانِ خاطر نایاب ہو کر رہ گیا ہے

سالِ رواں کی لے جھلملاتی ہوئی شعاعِ آخری!

ہمیں بتاتی جا کہ یہ دَورِ بربریت —— یہ عہدِ خوں فشانی —— یہ زمانۂ شعلہ سامانی —— اور یہ قتل و غارت کی ارزانی کب ختم ہوگی؟ تو نے ہم سے ہمارے لاکھوں نوجوان چھین لئے تیرے خونخوار پنجے نے ہماری متعدد اہلِ کمال ختم کردیئے اور تیرے منحوس سائے نے انسان اور انسانیت کو نزع کی سی اذیت میں مبتلا کردیا۔ کیا تو اپنی آنے والی نشأۃ ثانیہ (۱۹۴۲ء) کو بھی تباہی کردار عطا کرنا چاہتی ہے؟ نہیں —— خدارا نہیں! انسان تیرے خالق سے رحم کا ملتجی ہے —— ناظرین!

آپ کا شاعر

بھی گوناگوں مصائب۔ حوصلہ شکن حالات اور اقتصادی مشکلات کے بھنور میں تھپیڑے کھاتا ہوا ۱۹۴۱ء کے ساحل سے آلگا ہے۔ اپنے بارہ (۱۲) سالہ طوفانی سفر کو طے کرتا ہوا اب وہ تیرہویں (۱۳) سال میں قدم رکھنے چلا ہے۔ جنابِ باری میں بے اختیارانہ سجدۂ شکر ادا کرنے کو جی چاہتا ہے کہ جنگِ عالمگیر کے تباہ کن اثرات کے باوجود "شاعر" اپنی پوری شان کے ساتھ زندہ ہے۔ رسائل پر کیا بیت رہی ہے، اس کا اندازہ معاصرِ گرامی "ساقی" دہلی کے اس تازہ نوٹ سے ہو سکتا ہے

> "سامانِ طباعت اور کاغذ کی بے انتہا گرانی کی وجہ سے جن دشواریوں سے اُردو رسائل کو دوچار ہونا پڑا ہے ان کا کچھ اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس رسالہ کا سالانہ خرچ دس ہزار (۱۰۰۰۰) تھا اب تقریباً پچیس ہزار (۲۵۰۰۰) ہوگیا ہے۔ ایک تو کریلا کڑوا اوپر سے نیم چڑھا دس ہزار سالانہ کی لاگت میں بھی منافع نہیں تھا تو اب پچیس ہزار کی لاگت میں ذرا غور تو فرمایئے۔ صاحبِ جریدہ کا کیا حشر ہوگا؟ پندرہ ہزار سالانہ کا نقصان خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کا بوتا اُردو کے کسی رسالہ میں تو ہے نہیں لہٰذا اس خسارے سے بچنے کے لئے بعض رسائل نے چندہ بڑھا دیا بعض نے ضخامت گھٹا دی۔ بعض نے دونوں تدبیروں پر عمل کیا اور ایک تیسری تدبیر نکالی کہ ماہوار شائع ہونے کے بجائے ڈیڑھ ڈیڑھ اور دو دو مہینے میں شائع ہونے لگے بعض ان سب سے بڑھ گئے کہ پانچ پانچ مہینے کے یکجا شائع ہونے لگے اور اس پر بھی بڑی ہمت سے جاری ہیں۔ بعض نے تنگ آکر خودکشی کر لی غرض اُردو رسائل پر عجب وقت پڑا ہے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن"

"شاعر" کے ناظرین اس کے گواہ ہیں کہ آں کا "شاعر" آغازِ جنگ سے اب تک ہر ماہ پابندی کے ساتھ تاریخِ مقررہ پر شائع ہو رہا ہے۔ نہ اس کا چندہ بڑھایا گیا اور نہ ضخامت میں کمی کی گئی بلکہ کئی ماہ سے چند صفحات کا اور اضافہ کردیا گیا ہے۔ رسائل و اخبارات قریب قریب تصاویر کی اشاعت سے دست کش ہوچکے ہیں اور جو شائع کرتے ہیں وہ نہایت معمولی کاغذ پر لیکن شاعر میں اچھے کاغذ پر تصاویر کی اشاعت کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ تصاویر کے سلسلے میں جہاں "شاعر" نے اساتذہ کو پیش کیا وہاں مشاہیر شعرا اور بعض گمنام ہستیوں کو بھی منظرِ عام پر لایا۔ شاعر کے مضامین کے متعلق بار بار لکھتے ہوئے میں ایک خوف سا محسوس کرتا ہوں، کہیں اسے خودستائی اور نازش سے تعبیر نہ کیا جائے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۴۱ء میں "شاعر" نے اپنے مستقل ابواب کے علاوہ جس کثرت سے ٹھوس علمی و ادبی مضامین پیش کئے۔ اور جتنی زیادہ تعداد میں گیت اور غزلیں اور معیاری نظمیں ناظرینِ "شاعر" تک پہونچائیں اُس کا اعتراف "شاعر" کے ہر دوست اور دشمن کو ہے۔

"شاعر" کسی سرمایہ دار کا جریدہ نہیں ہے بلکہ ایک ادبی ادارہ کا ترجمان ہے۔ اس صورت میں جبکہ اُس کا ایڈیٹر صبح سے شام تک ایڑی کا اور چوٹی کا

پسینہ ایک کردیتا ہے۔ ادارہ میں بجز ایک کلرک کے اور کوئی تنخواہ دار آدمی نہیں ہے پھر بھی دو سال کی قلیل مدت میں انتہائی احتیاط کے باوجود اسے **ساڑھے تین ہزار روپیہ کا نقصان برداشت کرنا پڑا ہے**۔ یقین فرمائیے جب مجھے اپنی بے بضاعتی اور کم سرمایگی کا خیال آتا ہے تو دل لرزنے لگتا ہے۔ ماضی کا نقصان اور مستقبل کی تاریکی کھینچنے کا خیال روح کو تڑپا رہا ہے، بعض مرتبہ تو یہ ادبی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے کو جی چاہتا ہے۔

اب سے نہیں دو سال سے میں بہ آواز بلند ناظرینِ شاعر" کو متوجہ کر رہا ہوں۔ لیکن افسوس کہ دس پانچ بہی خواہانِ ادب شعر کے علاوہ کسی کی رگِ احساس میرے کرب بےچینی کی عرفانی نہیں ہوئی۔

سال کے اس آخری شمارہ کے ذریعہ میں ناظرینِ شاعر" کو اردو زبان و ادب کا واسطہ دیکر پھر توجہ دلاتا ہوں کہ وہ خدارا ہندوستان کے اس واحد علمی فنی اور ادبی ماہنامہ کی اس دورِ ابتلا میں ہر ممکن مدد فرمائیں۔ مدیرِ "شاعر" آپ سے جاگیر یا ہزار دو ہزار روپیہ طلب نہیں کرتا بلکہ وہ آپ سے مندرجہ ذیل امکانی امداد کا طالب ہے۔

(۱) نئے سال کے آغاز سے "شاعر" کا ہر محترم خریدار اس کے لئے دو نئے خریدار پیدا کر دے۔

(۲) مکتبۂ قصر الادب سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں کتابیں طلب کی جائیں

(۳) اپنے شہر کے علم دوست رؤسا کو "شاعر" کی اعانت کے لئے ابھارا جائے۔

(۴) اپنے شہر کے دیانت دار ایجنٹوں، مشتہرین، اسکولوں، لائبریریوں اور کتب فروشوں کو "شاعر" اور مکتبۂ قصر الادب کی طرف متوجہ کیا جائے۔

اگر ناظرینِ "شاعر" اب بھی خاموش رہے تو اس کا نتیجہ اس وقت نہیں تو کچھ عرصہ بعد تحفظِ ادب و شعر کے لئے بہت غیر خوشگوار ثابت ہوگا۔ امید کہ "شاعر" کا ہر پرستار میری اس "پکار" کو سُن کر تڑپ جائے گا اور یہ ثابت کر دیگا کہ اس کے دل میں "شاعر" کا حقیقی درد ہے۔

جنوری ۱۹۴۲ء کا "شاعر" اپنی دلفریبوں، رنگینیوں اور ادبی ندرتوں کے ساتھ بجائے ۵ جنوری کے یکم جنوری ۱۹۴۲ء کو نظر نواز ہوگا اور آئندہ ہمیشہ مہینے کی پہلی تاریخ تک ناظرین تک پہونچ جایا کریگا۔

آپ کا زرِ سالانہ اگر دسمبر میں ختم ہو رہا ہے تو از راہ نوازش ۱۹۴۲ء کا چندہ ذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیجئے۔ اور اگر یہ صورت پسند نہ ہو تو "شاعر" کے حال پر رحم فرماتے ہوئے **جنوری کے شاعر کا وی۔ پی** ضرور وصول فرما لیجئے گا۔ مجھے اُمید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ شاعر کے ایسے تمام معزز خریدار جن کا سالِ خریداری اس ماہ میں ختم ہو رہا ہے، آئندہ سال بھی شاعر کو ضرور شرفِ اعانت و باریابی بخشیں گے۔

تلامذۂ حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی سے

برادرانِ محترم! میں نے مندرجہ بالا سطور میں ناظرینِ شاعر کے کانوں تک جو گذارشات پہونچائی ہیں۔ اُن کی پذیرائی کے لئے آپ حضرات سے بطورِ خاص ملتجی ہوں۔ "شاعر" آپ ہی کے اسکول کا آرگن ہے۔ اس دورِ کشمکش میں آپ ہی اس کا ساتھ نہ دیں گے تو کون دیگا؟ اپنی مستقل بے توجہی کو ختم کیجئے۔ اپنے ایک بھائی کی "پکار" پر تڑپ کر میدانِ عمل میں نکل آیئے اور ادبی دُنیا کو دکھا دیجئے کہ پرستارانِ سیماب (مدظلہ) اپنی جماعت کے واحد صحیفہ کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔

"شاعر نوازی"

میں اس اعلان میں بڑی مسرت محسوس کر رہا ہوں کہ جناب وزیرزادہ شجاعت خاں صاحب قمر جوناگڈھی نے اپنی ادب دوستی اور "شاعر" نوازی کا بہترین ثبوت دیتے ہوئے مجلسِ محسنینِ "شاعر" میں شرکت فرمائی ہے۔ قمر صاحب کی نوازشوں کے بوجھ سے "شاعر" کا سر اونچا نہیں ہو سکتا، یہ قصیدہ خوانی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ آپ ایک عرصہ سے "شاعر" کی خاموش خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ملک کے ایک اور نوجوان شاعر جناب سید علی اسد نقوی البخاری احمد آبادی نے بھی "صفِ ہمدردانِ شاعر" میں شمولیت فرما کر ادارہ کو مفتخر فرمایا ہے۔ میں دونوں حضرات کی فرض شناسی اور ادب نوازی کا ممنون ہوں۔

اس اشاعت کے مضامین

افسوس کہ اس مرتبہ تجزیہ کا باب عدم گنجائش کی وجہ سے شائع نہیں ہو رہا ہے۔ حالانکہ اس اشاعت کے مضامین اور نظمیں بہت اہم اور قابلِ توضیح ہیں۔ میں اس کمی کے لئے بطورِ خاص معذرت خواہ ہوں۔

اعجاز صدیقی

صحیفۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

جب قہرِ خدا غضب پر آجاتا ہے
انساں حدِ ادب پر آجاتا ہے
اتنا بھی غنیمت ہے کہ بھولے چوکے
اب صلح کا نام لب پر آجاتا ہے

انساں لاکھوں ہلاک ہوجاتے ہیں
گوشے دُنیا کے پاک ہوجاتے ہیں
خونِ انساں سے کھیلنے والے خود
آلودۂ خون و خاک ہوجاتے ہیں

ہے فطرتاً انسان کی دُنیا محدود
جینا محدود اور مرنا محدود
محدود ہے جب آمد و رفتِ اجسام
ہوگا کس طرح کشت و خوں لامحدود؟

جاپان کو سُوئے جنگ لانے والے
ہیں اپنی مصیبتیں بڑھانے والے
کرسکتے نہیں اپنی بنائیں مضبوط
کمزور سے فائدہ اُٹھانے والے

سنتے ہیں کہ لیبیا ہے پھر مرکزِ جنگ
چھایا ہے محاذِ کہنہ پر خونِ فرنگ
گنجائش موت ڈھونڈتی جاتی ہے
ہونے کو ہے زندگی پر اب دُنیا تنگ

ہٹلر ہو کہ روزوِلٹ ہوں یا چرچل
ہے سب کے لئے فکر و تامل کا محل
انسان جو آج ہوگئے سب نامید
پھر کس کو نویدِ امن دی جائیگی کل؟

قومیں جو ہلاکت ہی کو جوہر سمجھیں
وہ امن کی برتری کو کیونکر سمجھیں
جو صلح کا پیغام انھیں پہونچا دے
اس دَور کا ہم اُس کو پیمبر سمجھیں

ہٹلر دُنیا کو لُوٹتا جاتا ہے
روز ایک شگوفہ چھوڑتا جاتا ہے
وہ اپنا نظام کر رہا ہے قائم
دُنیا کا نظام ٹوٹتا جاتا ہے

اے سالِ رواں؟ - سالِ رواں؟ - سالِ رواں!؟
اے قہر نشاں؟ شعلہ چکاں! برق فشاں!؟
انساں ہوئے لاکھوں تری تاریخ میں دفن
کرتی ہے تجھے بھی دفن تقویمِ جہاں

گردش آئی تجھے مٹانے کے لئے
نقشِ عبرت ہے تو زمانے کے لئے
آیا جو یہاں چلا گیا آخرکار
جو آئے گا وہ آئے گا جانے کے لئے

سیماب

شخصیات

مولانا آلم مظفر نگری

بعض ہستیاں اپنے اندر کچھ ایسی غیر معمولی جاذبیت رکھتی ہیں کہ انسانی طبیعتیں بے اختیارانہ طور پر ان سے اثر پذیر ہو جاتی ہیں، جہاں تک انسانی طبیعت کی اثر گیری کا تعلق ہے اُس کے متعلق میری ذاتی رائے یہ ہے کہ صورت سیرت اور کمال یہی تین انسانی خصوصیتیں توجہ کا مرکز بنتی ہیں۔ مولانا آلم مظفر نگری کی صورت اور سیرت کا علم تو اُن لوگوں کو ہو نہیں سکتا جو آپ سے دُور ہیں اور جنھیں کبھی آپ کو دیکھنے یا آپ سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، تیسری چیز کمال ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ کشش ہے جس کی بنا پر مجھ سے اکثر مطالبہ کیا گیا ہے کہ میں مولانا آلم کی تصویر اور حالات "شاعر" میں شائع کروں۔

آپ کا نام محمد اسحاق ہے اور نسلاً افغان ہیں۔ آپ کے مورث اعلیٰ کڑے خاں موضع پڑانہ ملحقہ بادنی افغانان ضلع مظفر نگر و ضلع سہارنپور کے ایک مشہور زمیندار تھے۔ خان موصوف کے دو لڑکے تھے بڑے کا نام حسن خاں اور چھوٹے کا نام حسین خاں تھا۔ حسین خاں صاحب مولانا آلم کے پردادا تھے جو ایک خاندانی نزاع کی بنا پر ترکِ وطن کرنے کے لئے مجبور ہوئے اور ۱۸۵۰ء میں مستقلاً مظفر نگر کو اپنی سکونت گاہ بنا لیا۔ یہیں ایک مشہور عالم دین اور صاحبِ طریقت درویش سید نامدار علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے ہمیشہ کے لئے زمرۂ مردان خدا میں داخل ہو گئے آپ کے خاندان میں ذوقِ تصوف کی ابتدا حسین خاں صاحب ہی سے ہوئی اور یہ ذوق و شوق اب تک اِس خاندان میں پایا جاتا ہے۔ آلم صاحب کے والد بزرگوار اللہ دیا شاہ صاحب بھی بڑے پائے کے بزرگ تھے اور حضرت شاہ خاموش حیدر آبادیؒ کے خلیفہ سید مظہر علی شاہ صاحب ساکن میرٹھ کے مریدینِ خصوصی میں سے تھے۔ آلم صاحب کا خاندان کئی "کھوٹوں" پر قابض تھا۔ آج بھی آپ کے پردادا کے بھائی حسن خاں صاحب کی اولاد اِس جائداد پر قابض ہے۔ چونکہ آپ کے والد اہل اللہ سے تھے اس لئے کبھی جائداد کی پروا نہیں کی۔ پھر بھی آلم صاحب کے قبضہ میں اُس کا کچھ حصہ باقی ہے

مولانا آلم نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے مکان ہی پر حاصل کی اور علوم مشرقیہ کی باقاعدہ تعلیم مولانا صفدر علی شاہ صاحب طہرانی سے لی۔ فارسی میں درہ نادرہ قصائدِ عرفی۔ دیوانِ نظیری۔ سہ نثرِ ظہوری اور خاقانی کے قصائد عربی میں حماسہ متنبی۔ مقاماتِ بدیعی اور مقاماتِ حریری مولانائے موصوف سے پڑھیں۔ اِن زبانوں کا صحیح ذوق آپ ہی کے فیضِ صحبت سے پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ آپ نے پنجاب یونیورسٹی اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے بھی علومِ شرقیہ کے امتحانات پاس کئے ہیں عربی اور فارسی زبان میں تصوف کی کتابوں کا مطالعہ آپ نے بڑی گہری نظر سے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں تصوف اور جذب و سلوک کے مسائل بطورِ خاص پائے جاتے ہیں۔

۱۱ سال کی عمر سے آپ کو شعر گوئی کا چسکا لگا، عمر کے ساتھ ساتھ ذوقِ معلومات اور مشق میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ابتدا میں آپ نے چند غزلیں حضرت کلام سہارنپوری کو دکھائیں پھر ۱۹۳۰ء میں حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ آپ اپنے استاد کے واقعی طور پر پرستار ہیں۔ ہر چند اب آپ کو نظم و غزل میں اصلاح کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن آپ اپنی ہر چیز استاد کی نظر سے گذار دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ آگرہ اسکول کے ایک جلیل القدر فرد ہیں۔

میں چاہتا تھا کہ مولانا آلم کے فضل و کمال اور آپ کی شاعری کے تمام گوشوں پر ایک تفصیلی تبصرہ کروں لیکن "شاعر" کے محدود صفحات مجھے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ مجملاً میں عرض کروں گا کہ مولانا آلم مستقبل کے ایک عظیم المرتبت شاعر اور ماہرِ فن ادیب ہیں۔ ابھی ہندوستان کی ادبی فضاؤں میں اُن کے کمال کا پرچم پوری طور پر نہیں لہرایا ہے۔ اگر موصوف نے اپنی گوشہ نشینی اور خاموش پسندی کی روش کو بدل دیا تو وہ آسمانِ ادب پر مہرِ عالم تاب بن کر چمکیں گے۔ یہ مبالغہ یا قصیدہ گوئی نہیں بلکہ ایک کھری حقیقت ہے۔ جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ آپ صرف تین چار مخصوص اخبارات و رسائل کو اپنی غزلیں نظمیں اور نثر مضامین اشاعت کے لئے دیتے ہیں۔ جن لوگوں کی نظر سے آپ کے مضامین نظم و نثر گذرتے رہتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ

مولانا آلم مظفر نگری کس معیار اور پایہ کے ادیب شاعر ہیں؟ اس دورِ بےراہ روی میں جب کہ ایک طرف اہلِ کمال بساطِ ادب سے اُٹھتے چلے جا رہے ہیں، اور دوسری طرف بے علمی اور مغربی رجحانات ہمارے ادب کی جڑوں میں دیمک بن کر چپٹے ہوئے ہیں، ایک ایسے صاحبِ فن۔ محتاط اور معیاری شاعر کا وجود بہت خوش آئند ہے۔ کاش مولانا آلم اپنی شعری اور ادبی قوتوں کا مظاہرہ کھلے دل سے کر سکیں۔

آلم صاحب جہاں ایک اچھے اور معیاری شاعر ہیں، وہاں بہترین ناقد بھی ہیں آپ کی غزلیں علوئے فکر۔ ندرت۔ فصاحت اور سلاست کے اعتبار سے کسی طرح ترقی یافتہ تغزل سے پیچھے نہیں ہوتیں۔ آپ نے بڑی کثرت سے غزلیں اور نظمیں کہی ہیں۔ آپ کی نظم و غزل دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آپ کا صحیح میلانِ طبع کس طرف ہے۔ مجھے تو دونوں ہم وزن معلوم ہوتے ہیں۔ ناظرینِ "شاعر" کی نظر سے مولانا کی غزلیں تو اکثر گذرتی رہتی ہیں۔ میں یہاں بطورِ نمونۂ کلام آپ کی طویل نظم "اے مسلمان آ" کے چند بند پیش کرتا ہوں۔

اے مسلماں یوں گریباں چاک او ردقفِ ملال — جا رہا ہے کس طرف آزردہ و افسردہ حال
تیری آوازِ حزیں اک نوحۂ غمناک ہے — خارزارِ دشتِ غم تیرا دلِ صدچاک ہے
سچ بتا تو کس کی شمشیرِ ستم سے ہے زبوں — پاؤں تک سر سے نظر آتا ہے آغشتہ بخوں
کچھ سنا افسانۂ غم کس لئے خاموش ہے — کیوں ہجومِ حسرت و حرماں سے ہم آغوش ہے؟

میں سمجھتا ہوں سبب اِس پائمالی کا تری
آ بتاؤں تجھ کو درماں خستہ حالی کا تری

مجھے میں تیرے گلزارِ کہن میں لے چلوں — بھول بیٹھا ہے جسے اُس انجمن میں لے چلوں
جس کی تابانی پہ صدقے ہے شعاعِ آفتاب — جس کی زلفِ شام میں پنہاں ہے تاروں کا شباب
جس کی رنگینی سے شرمندہ ہے فردوسِ بریں — جس کا رضواں ہے ازل سے خادمِ سدرہ نشیں
جس کے غنچے ہیں سراسر عقدِ پروین کا جواب — جس کے پھولوں سے ٹپکتی ہے حقیقت کی شراب
ناز کرتا ہے فلک جس کی تجلی گاہ کا — جس کے ذروں پر گماں ہوتا ہے مہر و ماہ کا

مست ہے ساری فضا تسبیح سے تہلیل سے
گونجتی ہے فضا نوائے جبرئیل سے

سامنے ہے دیکھ ایوانِ محبوب جلوہ گر — جس کے جلووں سے ہے خیرہ مہرِ تاباں کی نظر
جس کے اوجِ معرفت سے پست چرخِ اخضری — وقفِ سجدہ ہے جہاں خانِ و شکوہِ قیصری
یہ میں کا عرش ہے وحدت کی جلوہ گاہ ہے — با ادب ہو سر جھکا، بزمِ رسول اللہؐ ہے
پوچھ لے جو پوچھنا ہے اب نہ تو مغموم ہو — تاکہ تجھ کو اپنی پستی کا سبب معلوم ہو

سُن توجہ سے ذرا اور کھول گوشِ التفات
تجھ سے کچھ فرما رہے ہیں بادشاہِ کائناتؐ

(ناتمام)

یہ اور مولانا آلم کی دوسری نظمیں اُردو کی بلند پایہ نظموں کے دوش بدوش رکھی جا سکتی ہیں۔

اعجاز صدیقی

"کمالاتِ کمالی تحقیق و تصحیح کی روشنی میں"

بدنصیب ہندوستان کی بدذوقی اور ادبی انحطاط کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے یہاں اول تو انضباطِ ادب کا ایسا کوئی معقول انتظام نہیں جس کے ذریعہ فطری اور غیر فطری شعرا اور ادبا کے مابین حدِ امتیاز قائم ہو سکے۔ پھر جو حضرات فنِ نقد کے ذریعہ امتیاز قائم رکھنا چاہتے ہیں ان میں سے بیشتر خود ادب سے بے بہرہ اور شاعرانہ لطافتوں سے محروم ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی تمام ذہنی کاوشوں اور ادبی کارناموں کا منشا اور ماحصل نام و نمود کے خبط اور جنونِ شہرت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا

ان ہرزہ سرایانِ ادب میں زیادہ تر وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ادبی بے مائیگی اور ذہنی پستی کا پردہ رکھنے کے لئے نقد اور تنقید کی آڑ لے لیتے ہیں تاکہ دنیا اُن کے ذاتی زائیدہ ہائے افکار کے اسقام و اغلاط سے آنکھیں بند کر لے اور وہ دوسروں پر گندگی اُچھالتے رہیں۔

بدقسمتی سے اُردو ادب میں اچھے کہنے سننے والوں کی ہمیشہ سے کمی رہی ہے اگر دورِ حاضر کا تجزیہ کیا جائے تو صرف چند نفوس ایسے نظر آئیں گے جو صحیح معنوں میں ادیب یا شاعر کہلائے جا سکتے ہیں۔ انھیں حضرات کا سرمایۂ افکار اُردو ادب کے لئے مایۂ ناز ہے اور ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ خود ساختہ فراعنۂ ادب۔ نقد کے داعی اور شہرت کے بندے انھیں اطمینان اور طمانیت کی سانسیں لینے دیں۔

حال ہی میں علامہ سیماب مدظلہ العالی کی ایک گرانقدر اصلاحی نظم "موحدِ اعظم" منصۂ شہود پر جلوہ گستر ہوئی ہے جس کے جلووں کی لطافتوں نے جہاں بیشمار دلوں کو حقیقت کا آئینہ دکھا کر نور سے معمور کیا ہے وہاں اُس کی گرم نوائیوں نے بعض کور ذوقوں کو شعلہ زیر پا بنا کر خاکستر بھی کر دیا ہے۔ نظم کا اس میں کوئی قصور نہیں۔

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

[illegible] صاحب کمالی بھی ہیں جن کے ساتھ خیر سے لفظ مولانا [illegible] بھی لگا ہوا ہے۔ آپ نے علامہ سیماب کی نظم "موحدِ اعظم" پر ایک منظوم تبصرہ کیا ہے جو "مدینہ" مجریہ ۱۳؍ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں "احترامِ حضرتِ آدم اما شاعر کا موحدِ اعظم" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

کمالی صاحب کا کمال یہی ہے کہ آپ کا یہ منظوم تبصرہ سراپا "گونگے اور بہرے کا خواب" جو شرمندۂ تعبیر ہوتا تو کبھی شرمندۂ سماعت و بصارت بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تو دعا دیں مدیرِ "مدینہ" کو جنھوں نے علامہ سیماب کی نظم کو ساتھ میں شائع کر کے کمالی صاحب کے ٹاٹ میں مخمل کا پیوند لگا دیا۔ کمالی صاحب کی اس چیستاں کا بوجھنا تو اب بھی بہت مشکل ہے لیکن اگر علامہ سیماب کی نظم ساتھ میں نہ ہوتی تو پھر تو دنیا کی تمام عقلیں مل کر بھی اس "ادب کے کوہِ خشک" سے پانی کی ایک بوند بھی پیدا نہیں کر سکتی تھیں

میں ان حضرات کے ہذیانِ موزوں کو درخورِ اعتنا تو نہیں سمجھتا لیکن سوچتا ہوں

کہ ؎ نکوئی با بداں کردن چناں است
کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

اگر آج ان کا منہ بند نہ کیا گیا تو خدا جانے کل یہ ذاتِ شریف اور کس کس کے منہ آئیں گے اور اُن کے جہل پسند احباب جو اکثر اُن سے استصوابِ رائے کیا کرتے ہیں خود بھی منہ کی کھائیں گے اور انھیں بھی کھلوائیں گے۔ اس لئے یہی مناسب ہے کہ ان کے اس منظوم تبصرہ کو "تحقیق و تصحیح" کی روشنی میں آج ہی دیکھ لیا جائے تاکہ اُنھیں اور کوئی منہ ہی نہ لگائے۔

آپ کا یہ منظوم تبصرہ اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

ہوش اسے آنکہ مستِ پندارِ تجلی
بشر اندر گماں داری خداوندی کہ جبریلی
بیا کردی چرا ایں ہنگامہ زیرِ گنبدِ نیلی
مسلمانی و دعوت گستری و عزازیلی

آپ دیکھ رہے ہیں کہ شاعر نے پہلے مصرعہ میں [illegible] کو دوسرے مصرعہ میں [illegible] [illegible] ہے

کمالی صاحب کا تو کمال تو "بشر انداز" کی ترکیب اور "خداوندی" کے بعد "جبریلی" کہنے سے ظاہر ہو رہا ہے۔

تیسرے مصرعہ کی سستی پر تبسم نہ فرمائیے۔ بلکہ بطور ہمدردی اصلاح کر دیجئے ع

"چہ ہنگامہ بپا کردی بزیرِ گنبدِ نیلی"

اب مصرعہ ضرور چست ہو گیا لیکن کمالی صاحب شاید ہی مانیں۔ چوتھے مصرعہ میں "دیو عزازیل" "لیلۃ القدر" کی بات کا جواب ہے۔ اور سنئے :۔

ذرا اے نظم کی پیغمبری کے مدعی سن لے ۔۔۔ تو اپنی کہہ چکا جی بھر کے اب تو ذکر میں سن لے
بھلے مانس پتہ کی بات اگر ہے آدمی سن لے ۔۔۔ نہ رکھ دینِ الٰہی سے روا یہ دل لگی سن لے

لے سبحان اللہ ان چاروں مصرعوں کی کون کمبخت داد نہ دیگا۔ پہلے مصرعہ میں "کی" کے "دوسرے میں "اب قدرے مری" قادر الکلامی کا بہترین ثبوت ہیں، تیسرا مصرعہ تو غضب کا ہے "اگر ہے آدمی" کا ٹکڑا درمیان میں کتنے مناسب مقام پر ہے اگر یہ نہ ہوتا تو تعقیدِ لفظی کی خوبی کس طرح پیدا ہوتی اور پھر "بھلے مانس" کے ساتھ "اگر ہے آدمی" تو کمال ہی کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ چوتھے مصرعہ سے آپ یہ نہ سمجھئے کہ کمالی صاحب کوئی دل لگی کی بات سنا رہے ہیں۔ نہیں ان کا مطلب ہے :۔

"نہ کر تکلیف غور و فکر میری بے تکی سن لے"

لہٰذا سنئے :۔

یہ دہر آشوب میں دجۂ شیطاں کی تشبیبیں ۔۔۔ سیہ کاری کی تصیحیں گنہ گاری کی تصویبیں
مفاہیمِ غلط کی پُر تکلف طرفہ تہذیبیں ۔۔۔ برنگِ فلسفہ الحاد پھیلانے کی ترکیبیں

اس بند میں "دہر آشوب" کی اضافتِ مقلوب۔ لفظوں کی عمومیت اور مفاہیمِ غلط کی طرفہ تہذیبیں وہ بھی پُر تکلف، کمالِ نکتہ دانی کی بہترین مثالیں ہیں۔

موحد وہ بھی تنہا وحدت و کثرت کی محفل میں ۔۔۔ کیا شیطان کو تسلیم خوف آیا نہ کچھ دل میں
اسے تبلیغ کا حق دیدیا عرفانِ کامل میں ۔۔۔ بنایا رہنما مجبوری رہزارِ منزل میں

کمالی صاحب! واللہ پہلا شعر خوب موزوں کیا ہے۔ آپ نے تو نثر لکھدی۔ اور لطف یہ ہے کہ "موحد" اور "کیا شیطان کو تسلیم" کے مابین ہی ذہن قاری کو وحدت و کثرت کے طلسم زاروں کی سیر بھی کرا دی

"خوف آیا نہ کچھ دل میں" کا ٹکڑا بھی جانِ فصاحت ہے۔ آپ کا دوسرا شعر تو واضح مثل ہے۔ مولانا سیماب نے "عرفانِ کامل" کے ساتھ لفظ "شعبہ" رکھکر تبلیغ کی خدمتوں کا ایک مقامِ محل تو بتا دیا تھا لیکن آپ کی محل ۔۔۔۔ امی تو ایجاز پسند طبیعت نے "شعبہ" کا لفظ نکال کر صرف "عرفانِ کامل" میں تبلیغ کرائی ہے۔ کیوں نہیں آپ ہیں بھی تو کمالی اور دیکھئے آپ کا چوتھا مصرعہ ۔

"بنایا رہنما مجبوری رہزارِ منزل میں"

کس قدر بامعنی اور لطیف ہے۔ "رہزار" لغات کمالیہ کا جدید لفظ ہوگا۔ معنی کی خشونت پر غور نہ فرمائیے۔ جدت و تصنع کی داد دیجئے۔

کہا ملکوت کا جبروت کا ناسوت کا دانا ۔۔۔ جو سماک تک سے ناواقف تھا علامہ اُسے جانا
فرشتوں کا وہ بیشک تھا معلم میں نے یہ مانا ۔۔۔ مگر کچھ سوچکر یہ بھی تو سکتے قبلہ مولانا

کمالی صاحب آپ واقعی دانا بیں ہیں۔ آپ کے پہلے مصرعہ میں لفظ دانا آپ کی دانائی بینش کا ثبوت ہے۔ اس لفظ میں کس قدر برجستگی ہے ذرا بھی تو کانوں کو ناگوار نہیں گزرتا۔ سیماب نے تو ملکوت کا عالم کہا تھا لیکن آپ نے دانا کہہ کر اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کا ہر مصرعہ آپ کی تو مشقی نہیں نہیں آپ کی کہنہ مشقی اور پختگی کا آئینہ دار ہے۔

بدیں تقدیر گو شیطاں کا نیک انجام ہوتا ہے ۔۔۔ فرشتوں پر تو عائد شرک کا الزام ہوتا ہے
رہا کیا نصِ قطعی میں خیالِ خام ہوتا ہے ۔۔۔ خدا بدنام ہوتا، شاعری کا نام ہوتا ہے

میرے ایک دوست یہ بند سنکر فرمانے لگے کہ سراسر مہمل ہے۔ میں نے انھیں امیر خسرو کا ایک دوہا سنایا :۔

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا ۔۔۔ آیا کُتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

اور عرض کیا کہ جناب خسرو نے ایک کوئیں پر چار عورتوں کی مختلف فرمائشات۔ کھیر۔ چرخہ۔ کتا اور ڈھول کو ایک ہی شعر میں موزوں کیا تھا۔ اسی طرح جناب کمالی نے اپنے ہم مشرب احباب کے استصواب خیالات پر یہ بند موزوں فرمایا ہوگا۔ آپ اسے مہمل نہ سمجھئے زیادہ سے زیادہ "دیر مدینہ" کو مطلب دریافت کر لیجئے۔ خدا جانے اُن کے احباب کی کیا مختلف فرمائشات ہوں جس کا نتیجہ یہ بند موزوں ہوا ہے اور پھر یوں بھی "المعنیٰ فی البطنِ شاعر" ۔

لگا کر آپ نے توحید میں یہ قیدِ یکتائی ۔۔۔ میاں یاں کی کھونگ دی ہے خاصی داد خود پائی
ازل سے جو بشر کی فہم میں اب تک نہ بات آئی ۔۔۔ وہ لاریب آپ نے بھی زمانے کو بھی سمجھائی

اس بند میں آپ نے "لگا کر" کا لفظ لگا کر قصرِ فصاحت کو جسقدر استحکام بخشا ہے وہ آپ ہی جیسے معمارانِ ادب کا حصہ ہے۔ لفظ توحید میں قیدِ یکتائی مولانا سیماب نے لگائی ہو یا نہ لگائی ہو لیکن آپ نے تو لگا ہی دی ــــ (باقی۔باقی)

صبا متھراوی

غیر اللہ کو پہلا سجدہ

سجدہ کا حکم کس نے دیا؟ ———— خود اللہ نے
سجدہ سے انکار کس نے کیا؟ ———— صرف عزازیل نے

اے قدامت کی تہوں میں رینگنے والے دماغ، سہو و نسیاں اور ظلم و جہل کے پالے دماغ
اے درایت کی مخالف اے روایت کے غلام، علمِ ظاہر کے پجاری لفظ و صورت کے غلام
پردۂ مذہب میں شاعر پر ہوا تو حملہ ور! الحذر اے منکرِ اسلامِ شاعر الحذر!
میرے فنِ شاعری پر تیری تنقیدِ کثیف آج پھر بوجہل ہے گویا پیمبر کا حریف
تو ابھی شاعر کا زورِ کشف پا سکتا نہیں تو ابھی اسرار کے پردے اٹھا سکتا نہیں
تو ابھی بزمِ ازل کے راز سے واقف نہیں واقفِ انجام ہے آغاز سے واقف نہیں
علم تیرا اکتبی ہے، عقل تیری خام ہے سایۂ جبریلؑ میں تو مرغِ زیرِ دام ہے
تو نوا و ساز کو یک رنگ کر سکتا نہیں عقل کو مذہب سے ہم آہنگ کر سکتا نہیں
ملتِ بیضا کے اے کافر گرِ بت خانہ ساز! کفر میں اور شرک میں تجھ کو کہاں ہے امتیاز
تجھ کو کیا حق ہے کہے شیطاں کو مردود و لعیں وہ اگر ابلیس ہے تبلیس ہے تیرا بھی دیں
کفرِ شیطاں پر نہیں تشریک کا ابتک قیاس اور تری توحید میں بھی شرک کا ہے التباس
"منکرِ سجدہ ہے مشرک" واہ کیا ارشاد ہے! عالمانہ اک تجاہل، وہ بھی بے بنیاد ہے
پوچھتا ہوں تجھ سے اے کرمِ کتابِ کہنگی؟ زور دے کر ذہن پر تو نے یہ سوچا ہے کبھی؟
سجدۂ غیرِ خدا تو جس کو کہتا ہے خطا، اس کو خود اللہ نے روزِ ازل رکھا روا،
اور تجھے انکار ہے سجدے سے غیر اللہ کے کیوں نہ پھر کہدوں خدا کے حکم کا منکر تجھے؟
کون سا سجدہ تھا وہ اس امر کی تحقیق کیا جھک گیا سجدے میں سر سجدے کی پھر تفریق کیا
سجدہ آدم کو۔ خدا کے سامنے بے جا ہی تھا تھا وہ تعظیمی مگر فی نفسہٖ سجدہ ہی تھا
ذاتِ آدم پر نہ تھا اطلاقِ غیر اللہ کیا؟ تھا اگر یہ امرِ رب، تو امرِ رب اب کیا ہوا؟
امرِ رب کیا امرِ رب سے ہو گیا ہے مسترد؟ دے خلافِ "اسجدوا" قرآن سے کوئی سند
تو یہ کہتا ہے کہ غیرِ حق کو سجدہ ہے حرام اور یہی شیطان کا بھی فیصلہ تھا لاکلام
اپنی کم فہمی پہ جاتی کیوں نہیں تیری نظر گمرہی کا بار رکھ دیتا ہے تو شیطان پر
یہ نہ سمجھا تو جو دی قدرت نے اس پر گمرہی وہ یہ کہتا ہی رہا [illegible]

دیکھ اُس کی بیکسی، بیچارگی و اضطرار
اور پھر نشانِ فطرت کا یہ جبر و اختیار

رہنے دے اس راز کو شاعر کے سینے میں نہاں
نعرۂ انی اعلم[1] کا تو کہاں ہے راز داں

آج غیر اللہ کے سجدے سے تو ناراض ہے
تیرا ماضی حال کا تیرے مگر ناقض ہے

حکم جب تو نے دیا اکبر[2] کو سجدہ ہے روا
کیا ترا زورِ شریعت اُن دنوں مفلوج تھا؟

پائے انساں پہ جھکا کرتا تھا جب انساں کا سر
کیا ترے فتووں پہ تھا اُس وقت تقوے کا اثر؟

حکمِ رب اسکو سمجھتا ہے تو پھر اے کم نگاہ
سجدۂ تعظیم کو اب کر دیا ہے کیوں گناہ؟

سجدۂ آدم کا پھر دنیا کو اذنِ عام دے
جو نہ شیطاں کر سکا اُس کام کو انجام دے

جھکنے دے انساں کے آگے جبیں انسان کی
جب مسلّم ہے کہ آدم سے بنا ہے آدمی

عظمتِ آدم فرشتوں کے لئے مسجود تھی
آدمی کو خیر سجدہ آدمی ہی کا سہی!

"آدمی کو ہے روا سجدہ" کھلا اقرار کر
ورنہ پھر شیطان کی تعریض سے انکار کر

تو اگر اس رسم میں ترمیم کر سکتا نہیں
حق پرستی میں تری تسلیم کر سکتا نہیں

یہ تو پہلا کارنامہ صرف[3] تھا شیطان کا
جس نے غیر اللہ کو سجدہ نہ آخر تک کیا

باوجودِ امرِ رب جس نے نہ جھکنے دی جبیں
کیوں نہ پھر کہئے اُسے وحدت پرستِ اوّلیں

اس ترے انکار میں ابلیس کی تائید ہے
اے موحّد! یہ بھی تو شیطان کی تقلید ہے

ہے مقلّد جبکہ، کہتا ہے اُسی کو راہزن
ترس کیوں آتی نہیں اے جانشینِ اہرمن!

تیری گمراہی سے ہے شیطان کو کیا واسطہ؟
وہ رقیب اس دل کا ہے جس دل میں ہو عشقِ خدا

تیرے دل میں خالصاً حق کی محبت ہی نہیں
کیا کریگا چور آ کر گھر میں دولت ہی نہیں

تیرے کاروبارِ دنیاوی سے بے پروا ہے وہ
ہاں ترا دشمن ہے لیکن دشمنِ دانا ہے وہ

راہزن ہوتا تو یہ آسان تھا اُس کے لئے
بند کر دیتا وہ تیری مسجدوں کے راستے

حجِ کعبہ کے سفر کی توڑ دیتا ہمتیں
مطلقاً ویراں پڑی رہتیں یہ تیری مسجدیں

تجھ میں اُس میں فرق ہے لاریب صبح و شام کا
تیرے دل میں ہے خودی اور اُسکے دل میں ہے خدا

اپنے رب سے واسطہ اُسکا براہِ راست ہے
اور تجھ پر منطبق "از ماست و بر ماست" ہے

عقل تیری اِس ادا پر تنگ بھی حیراں بھی ہے
منکرِ شیطاں بھی ہے تو پیروِ شیطاں بھی ہے

گو موحّد ہے، مگر کامل موحّد بھی نہیں
تو ابھی شیطاں کا پورا مقلّد بھی نہیں

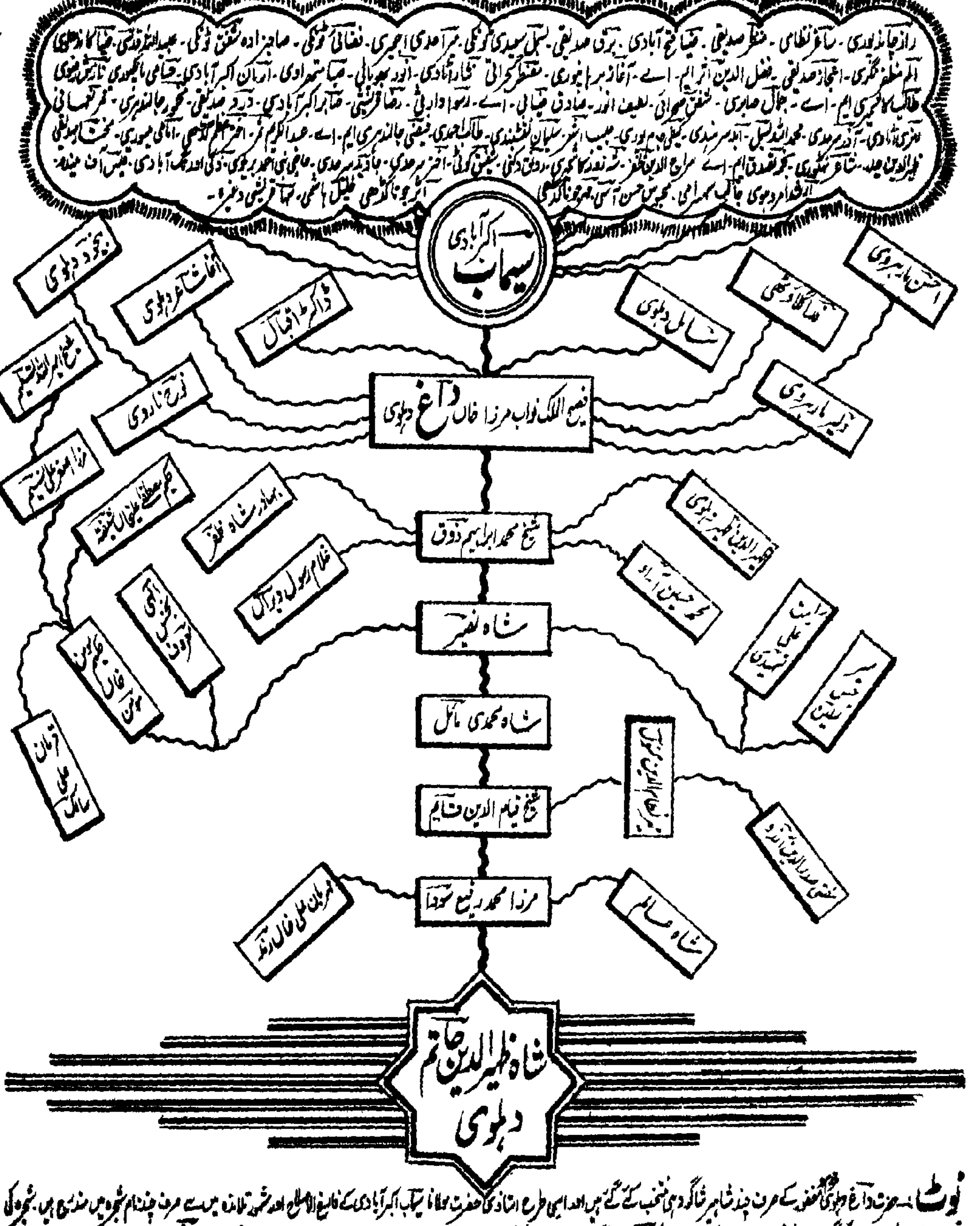
سیماب اکبرآبادی

---

[1] انی اعلم ما لا تعلمون [2] جلال الدین محمد اکبر بادشاہ [3] ابیٰ ابلیس

[illegible] مطبع روزنامہ [illegible] لاہور

سلسلۂ سیمابیہ اور خدمتِ اردو



نوٹ:- حضرت داغ دہلوی مغفور کے صرف چند شاہیر شاگرد ہی منتخب کئے گئے ہیں اور اسی طرح استاذی حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی کے فارغ الاصلاح اور مشہور تلامذہ میں سے صرف چند نام شجرہ میں مندرج ہیں۔ شجرہ کی تصنیف اردو تذکروں سے کی گئی ہے مثلاً آبِ حیات۔ گلِ رعنا۔ تذکرہ میر حسن۔ گلشنِ بے خار۔ تذکرہ شعرائے اردو وغیرہ۔

شجرہ مرتبہ نثار سیمابی اٹاوی

اُردو زبان کی تدوین و ترتیب اور اُس کی حقیقی خدمت کے سلسلے میں **خاندانِ سیماب** کی ایک ایسا ممتاز مرتبہ حاصل ہے کہ اُردو زبان کے تمام موجودہ تذکرے نہایت عزت و احترام سے صحیح طور پر اس کا اعتراف کر رہے ہیں اور اس عہد کا مورخِ زبان ان خدمات کو تسلیم کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی اسی طرح یہ حقیقت تسلیم کی جاتی رہے گی۔ اُردو زبان اور اُس کی قوم پر جو احسانات اس خاندان کے بزرگوں نے کئے ہیں وہ کسی طرح دوسرے ملکوں کے موسسانِ زبان اور مجددانِ فن و شعر سے کم نہیں بلکہ بعض خصوص میں ان سے بھی بالاتر ہیں، انھیں بزرگوں کی ہمت و کوشش بلیغ کا نتیجہ ہے کہ آج زبانِ اُردو دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش نظر آرہی ہے۔ **شاہ ظہور الدین حاتم دہلوی** سے لیکر (جو اس خاندان کے باوا آدم کہلانے کے مستحق ہیں) **مولانا سیماب اکبرآبادی** تک ایسے ایسے چاند سورج جگمگا رہے ہیں کہ جن کی روشنی سے ایوانِ اُردو کا ہر گوشہ منور نظر آتا ہے۔ آج کی صحبت میں ہم ان بزرگوں کا مختصر ذکر کر کے اُن کے لازوال اور بے نظیر کارناموں پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر قارئین کرام کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ کس کس طرح ہر عہد کے سخن آفرینوں نے **اُردو** کی ترتیب و تنقیح میں حصہ لیا اور آج زبانِ مذکور کو جو عروج و بلندی حاصل ہے وہ کن کن منزلوں سے گزر جانے کے بعد حاصل ہوئی ہے، مضامین و خیالات کی صحت کے لئے کون کون اصول بنائے گئے۔ محاورات کی ایجاد و اختراع کس نہج پر ہوتی رہی۔ سوسائٹی کے مختلف طرز و انداز زبان پر کس کس طرح اثر گیر ہوتے رہے۔

ان تمام مباحث پر غور و فکر کرنے کے بعد آسانی سے نتیجہ کے طور پر یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ **آگرہ اسکول** کا قیام دورِ جدید میں کن کن امیدوں کا حامل ہے اور اس کے بانی کی شاعری کن کن اثرات کے ماتحت وجود میں آئی اور زبان و شعر کی خدمت میں اُس کا کیا مرتبہ ہے؟

شاہ حاتم

شاہ ظہور الدین حاتم دہلوی جن کو ہم نے خاندانِ سیماب کا باوا آدم کہا ہے سپاہی پیشہ تھے۔

ظاہر ہے کہ سپاہیانہ دل و دماغ رکھنے والا انسان فطرتاً کس قدر آزاد ہوتا ہے۔ اُس کے احساسات نہایت شریفانہ اور کامل بہ ترقی ہوتے ہیں۔ جب ایسا انسان شاعری کی طرف مائل ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس کے خیالات و مضامین میں بلند حوصلگی اور انسانی شرافتوں کا جوہر زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوگا اسی بنا پر شاہ حاتم کا رنگِ کلام خاص طور پر معیاری ہے جس کا اعتراف تمام تذکرہ نگاروں نے ان الفاظ میں کیا ہے "شاہ حاتم رنگِ دہلی کے موجد ہیں"۔ دہلی کی شاعری ابتدا سے لکھنؤ کے رنگ سے مختلف رہی۔ اگرچہ درمیان میں کبھی کبھی ایسے شاعر بھی پیدا ہوتے رہے جو کسی قدر لکھنؤ کے رنگ سے متاثر ہوئے مگر یہ ہنگامی اور اتفاقی واقعات ہیں۔ رنگِ دہلی پر ان کا مستقل اثر نہیں ہوا اور شاہ حاتم نے جو رنگ قائم کیا تھا اس کے تحت میں زبان اُردو کی شاعری پھولتی پھلتی رہی

شاہ حاتم کا کلام نہایت صاف و سادہ ہے انھوں نے زبان کی صفائی میں پوری کوشش کی غیر مانوس الفاظ جہاں تک ہو سکا زبان سے نکالے۔ اُن کی صحتِ نظر کا اسی سے کافی اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے تمام کلام کا انتخاب خود کیا اور جس قدر ناہموار کلام تھا اُس کو نکال ڈالا نہایت صاف اور رواں کلام کو مرتب کر کے اُس کا نام "دیوان زادہ" رکھا۔ کلام کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ عام طور پر محفلوں میں اُن کی غزلیں گائی جاتی تھیں۔ میر حسن نے شاہ صاحب کی بہت تعریف کی ہے اور اُن کو "صاحب کمال اور پسندیدہ افعال" لکھا ہے۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اس زبان میں بھی اُن کا ایک دیوان موجود ہے شاہ صاحب کے شاگردوں میں سودا، رنگین، نثار اور تاباں بہت مشہور ہیں۔

سودا

مرزا سودا جن پر اُردو شاعری اور اُس کے شعرا جس قدر بھی فخر کریں کم ہے شاہ حاتم کے شاگرد رشید تھے اور اُن کے کلام پر شاہ صاحب کے اندازِ شاعری کا بہت بڑا اثر تھا مرزا کے یہاں خیالات میں آزادی، اور بانکپن علاوہ ازیں جرأت انداز کا جوہر بہت زیادہ نمایاں ہے اور یہ سب شاہ صاحب کی شاگردی کا طفیل ہے۔ مرزا نے دہلی کے اس رنگ کو جو شاہ حاتم نے قائم کیا تھا۔ آخر وقت تک نباہا۔ اُن کی تمام شاعری رنگِ دہلی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان کا کلام ہر صنفِ سخن میں موجود ہے۔ وہ اقلیمِ شعر کے شہنشاہ ہیں۔ مرزا نے اردو زبان کو ادبی زبان بنا کر اس میں ایسی سکت پیدا کر دی کہ اس میں ہر قسم کے سیاسی، مذہبی اور تاریخی مضامین بلا تکلف ادا کئے جا سکتے ہیں۔

فارسی شعرا کے مقابلے میں بہترین قصیدے لکھے اور اُن کی تشبیب میں ہر قسم کے خیالات و مضامین کو اس صفائی اور برجستگی سے سمویا کہ آج تک ان کا جواب نہیں۔ آج دورِ جدید کے شعرا جس طرزِ شعر اور نظم گوئی پر فخر کرتے ہیں وہ حقیقتہً مرزا کی تشبیب کا چربہ ہے "دورِ جدید" کے شعرا نے کوئی نیا رنگ پیدا نہیں کیا بلکہ متقدمین اور متوسطین شعرائے اُردو کے کلام سے استفادہ کر کے اور ان کے یہاں سے چند گوشے لیکر اُن کو اپنے خیال کی جولانگاہ بنایا جس کو وہ "جدید شعر" کا لقب دے رہے ہیں۔

مرزا نے فارسی الفاظ اور اُس کی ترکیبوں کو اُردو میں اس خوبی کے ساتھ سمویا کہ وہ

[illegible] جدت [illegible] کلام کی وجہ سے اِن کا کوئی قصیدہ [illegible]
سے پیچھے نہیں جن ہندی الفاظ کو اُردو کے لئے گراں اور ثقیل پایا ان کو کیقلم دور کردیا۔ یہ کام شاہ حاتم نے بھی کیا مگر زمانہ کے مطابق۔ لیکن مرزا نے اپنے استاد کی تقلید و پیروی میں اس کام کو حقیقی معنی میں انجام دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان نہایت ہموار صاف اور شستہ ہوگئی اس کے ساتھ ساتھ نئے نئے محاورے ایجاد کئے اور ان کے محلِ استعمال کے لئے دستور ترتیب دیئے محاورات کے استعمال اور اُن کی ایجاد کے باب میں اُردو کا کوئی شاعر مرزا کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

صنعتِ ایہام جس کی وجہ سے کلام میں تکلفِ بیجا پیدا ہو جاتا ہے۔ صفائی اور سادگی باقی نہیں رہتی نیز اثر کا جزو کم ہو جاتا ہے۔ مرزا نے اس کو قطعاً موقوف کردیا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں

(منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں)

آپ کو زبان پر پوری قدرت حاصل تھی نئی نئی بحروں اور مشکل زمینوں میں بڑی کامیابی سے شعر کہہ جاتے تھے۔ خیالات بلند و نازک ہیں یہی وجہ ہے کہ طبقات الشعراء میں مرزا کے قصائد کا عرفی و خاقانی کے قصائد سے مقابلہ کرکے دکھایا گیا ہے کہ وہ اساتذہ فارسی کے مقابلے میں کس قدر کامیاب شاعر ہیں۔ سرالفرڈ لائل نے اُن کو زبان اُردو کا سب سے بہتر شاعر مانا ہے۔۔

قائم

مرزا سودا کے شاگردوں میں شیخ قیام الدین قائم نے اپنے محترم استاد کی پیروی صحیح طور پر کی مضمون آفرینی اور معنی بندی میں کمال پیدا کیا۔ قطعات و رباعیات میں بلحاظِ مضامین نئے نئے انداز پیدا کئے بعض رباعیاں اس قدر بلند و اعلیٰ کہیں کہ ان کو اگر اُردو کا خیام کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا چونکہ دہلی کے مخصوص طرز کو ہر جگہ نباہتے تھے۔ اس لئے خیالات کی پاکیزگی زبان کی صفائی اور پرکاری میں جواب نہ رکھتے تھے شیخ مصحفی نے اُن کی پختگیٔ کلام اور زورِ طبع کا اعتراف کیا ہے تذکرہ گلشنِ ہند میں لکھا ہے کہ "مضمون آفرینی اور معنی بندی میں وہ میر و مرزا کے بعد تمام شعرا سے بلند ہیں"

شاہ حاتم سے لیکر شیخ قائم تک دہلی کا رنگ اپنے ممتاز مقام پر قائم رہا شگفتگی مضامین کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی خیال بندی، زبان کی صفائی اور روانی کا ہر ایک نے خیال رکھا غیر مانوس اور ثقیل الفاظ، برابر زبان سے نکالے جاتے رہے اور ان کی جگہ فارسی کے نرم و شیریں الفاظ داخل کئے گئے جس سے روز بروز زبان ترقی کرتی رہی یہ کام بہت مشکل تھا مگر ان بزرگوں کی قابلِ اعتراف محنتوں نے بہت آسان کردیا۔

شیخ قیام الدین قائم چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے سودا کے شاگردوں میں اُن کا درجہ بہت بلند ہے۔ اُن کے کلام میں مرزا سودا کا طرز و انداز ہر جگہ موجود ہے میر نظام الدین ممنون ان کے مشہور شاگرد ہیں۔

شاہ محمدی مائل اور شاہ نصیر

شاہ محمدی مائل شیخ قیام الدین قائم کے شاگرد تھے۔ اُن کا کلام بھی صفائی و پختگی میں [illegible] اساتذہ دہلی کے انداز پر ہے بعض اشعار میں تصوف کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ اُن کے شاگرد شاہ نصیر بہت مشہور ہیں۔ دہلی کا وہ مخصوص انداز شعر جو شاہ حاتم سے شروع ہو کر شاہ محمدی مائل تک قائم رہا۔ شاہ نصیر کے زمانے میں آکر بعض بے اعتدالیاں پیدا ہوگئیں تشبیہات و استعارات بے موقع اور بلا ضرورت استعمال کئے گئے۔ شاہ نصیر کے کلام میں یہ رنگ بہت زیادہ دخل ہوگیا تھا جس سے کلام میں صفائی و سادگی اور پرکاری کے بجائے ایک قسم کا تکلف پیدا ہوگیا۔ لیکن باوجود اس کے بعض استعارے اور تشبیہیں نہایت عمدہ ہیں خیالیہ اور اخلاقی مضامین اس جدت سے ادا کئے ہیں کہ وہ اُردو زبان کے صائب معلوم ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب نہایت پُرگو شاعر تھے ان کا بہت سا کلام ضائع ہوگیا مگر اب موجودہ کلام بھی جو مرتب ہوچکا ہے۔ ایک لاکھ اشعار پر مشتمل ہے۔

شاہ نصیر جہاں اپنے خاص رنگ پر آجاتے ہیں تو مضامین کے دریا بہاتے ہوئے کلام میں کافی زور اور اثر پیدا کردیتے ہیں اکثر غزلیں مشکل زمینوں میں کہی ہیں جن میں ان کا زورِ طبع اور شگفتِ خیال برابر جلوہ گر ہے ۔ شاہ صاحب نہایت سنجیدہ اور شگفتہ مزاج بزرگ تھے۔ لکھنو۔ دہلی اور حیدرآباد میں اُن کے بہت شاگرد تھے مگر ان سب میں مومن خاں مومن بہت مشہور ہیں۔

اُردو زبان کی تاریخ میں شاہ صاحب کا یہ کارنامہ قابلِ یادگار ہے کہ انہوں نے مومن و ذوق جیسے باکمال شاعر بنائے۔ مومن نازک خیالی اور بلند پروازی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کے عاشقانہ مضامین غزل کا صحیح معیار رکھتے ہیں۔ جذبات نگاری اور نفسیاتِ حسن و عشق کی ترجمانی میں ان کو یدِطولیٰ حاصل ہے۔ تخیل کی بلند پروازی کیلئے اُنھوں نے نئی نئی راہیں تلاش کیں۔ دہلی کے رنگ میں ان کا کلام خاص طور پر اپنے صحیح معیار پر قائم ہے۔

ذوق

اِن کے کلام میں تکلف بالکل نہیں۔ استعارے اور تشبیہیں نہایت احتیاط سے لائے ہیں۔ روانی و ترنم کی انتہا نہیں۔ عام طور پر حشو و زوائد سے پرہیز کرتے ہیں۔ آپ کی غزلیں تازگیٔ مضامین اور خوبیٔ محاورہ کے لئے بہت مشہور ہیں۔ شاہ عالم

نے صفائی وروانئ زبان کے لئے جو جو کوششیں کیں اور جن جن قواعد کو بروئے کار لائے ان سب کی تکمیل کلیۃً ذوق نے کی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں سودا کے بعد مومن و ذوق ایسے استاد پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی ان تھک کوششوں سے واقعی اردو کو مکمل زبان بنا دیا اور اپنے بعد آنے والے لوگوں کے لئے راہیں بالکل صاف کر دیں جس طرح فارسی زبان کی شاعری متوسطین کے بعد نظیری و عرفی وغیرہ کی کوششوں سے اپنے انتہائی کمال کو پہنچ گئی تھی اسی طرح ان دونوں صاحبان فنِ شعر کی بدولت اردو زبان کی شاعری ترقی کے تمام مدارج طے کر گئی۔ مومن نے جذبات نگاری، جدت ادا، ترکیبِ الفاظ اور تخیل کی بلندی کے لئے اپنی تمام کوششوں کو صرف کر دیا تھا ذوق نے صفائی زبان، تعیینِ محاورات اور اصولِ فن کی تکمیل کے لئے اتنا کچھ کیا کہ ان کے بعد اور کوئی نہ کر سکا سودا کے بعد قصائد نگاری ان کا حصہ ہو گیا۔ زبان میں وہ صفائی اور روانی پیدا کی کہ جس کی درحقیقت اس کو ضرورت تھی اور زمانہ واقعی طور پر جس کا مطالبہ کرتا تھا۔ مومن و ذوق کا اردو پر بہت بڑا احسان ہے ان کے کمالات اور خدمت زبان کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی منصف یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ

"گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے"

یہ وہ زمانہ تھا کہ غزل، قصیدہ، مثنوی اور دیگر تمام اصناف سخن میں جان پڑ گئی کوئی صنف محتاجِ اصلاح باقی نہ رہی۔ مورخِ زبان بلا تامل اس کا اعتراف کریگا کہ اس دور میں **اُردو** نے بلحاظ زبان و فن اتنی ترقی کر گئی جتنی کہ کسی زبان کو کرنی چاہئے۔

داغ اس کے بعد ذوق کے مشہور شاگرد حضرت داغ دہلوی نے زبان کو اور چار چاند لگائے انھوں نے اپنے استاد کی پیروی کرتے ہوئے اور زبان کی صفائی و روانی میں اضافہ کرتے ہوئے اس میں نہایت لطیف بانکپن بھی پیدا کر دیا اور غزل کو اور چار قدم آگے بڑھایا۔ روزمرہ کو جو غزل کی جان ہے اتنا صاف کیا کہ اب اس پر ترقی محال ہے۔ داغ کی زبان سامنے رکھتے ہوئے اس سے زیادہ صفائی اور روانی کا نہ کوئی ارادہ کر سکتا ہے نہ دعویٰ۔ داغ کے یہاں مومن و ذوق جیسی بلند پرواز زبان تو نہیں ہے مگر زبان دونوں استادوں سے صاف و رواں ہے۔

تلامذۂ داغ دورِ جدید میں حضرت داغ کے تلامذہ زیادہ تر اپنے محترم استاد کی پیروی کرتے ہیں۔ زبان کی صفائی اور روزمرہ کی طرف زیادہ رکھتے ہیں۔ [illegible]

وہی وجہ ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں یعنی داغ نے جس درجہ پر زبان کو پہنچا دیا ہے اس پر ترقی محال ہے۔ ذوق کے قصیدے اور داغ کی غزل کے مقابلے میں کچھ کہنا قطعی بے سود ہے اسی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے اقبال و سیماب نے اپنی راہیں جداگانہ ترتیب دیں یہ دونوں اگرچہ داغ کے شاگرد ہیں مگر ان کی خداداد ذہنیت اور قدرت شاعرانہ کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ دونوں صرف شاگردِ فطرت ہیں جس طرح ہر زمانہ کا مصوّر حقیقی اپنے رنگ و روغن اور طرزِ نقاشی اپنے ساتھ لاتا ہے اور قدیم رنگوں اور اصول نقاشی کا مطلق پابند نہیں ہوتا بالکل اسی طرح حقیقی شاعر اپنا انداز شعر، طرزِ سخن اور اصولِ زبان ساتھ لاتا ہے۔

اقبال کا فلسفہ، تصوف اور خطیبانہ انداز بالکل جدید رنگ میں جلوہ گر ہوا وہ مغربی خیالات کو اردو میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ جیسے انھیں کی ملکیت ہے اگرچہ اصولِ فن کی پابندی کم کرتے ہیں۔ مگر فارسی ترکیبوں اور ندرت خیال کی بہتات اور جدت کے ساتھ بات کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ گرمئ سخن کی تاب لانا دشوار ہو جاتا ہے اور ہم یہ کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان نے ایک ایسا فلسفی اور مفکر شاعر پیدا کیا جس کا مثیل دوسرے ممالک پیدا نہیں کر سکتے

سیماب اور آگرہ اسکول

مولانا سیماب اکبرآبادی بھی دورِ جدید میں اپنے طرز کے تنہا شاعر ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا جدید تغزل ہے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے تغزل پر غالب کا اثر ہے لیکن یہ خیال سطحی نظر سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ ان کی زبان بہت سنجیدہ، متین اور پُرزور ہے اس لئے بعض کو یہ گمان ہو جاتا ہے کہ وہ مقلد غالب ہیں ہم کہہ چکے ہیں کہ حقیقی شاعر کسی کا مقلد نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنا رنگِ سخن اپنے ساتھ لیکر پیدا ہوتا ہے۔ مولانا کے تغزل کو جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو اس میں کچھ ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو صرف انھیں کی طبع خداداد کا نتیجہ ہیں جن کی طرف ہم کچھ اشارات کرتے ہیں۔

(۱) بعض فلسفیانہ، متصوفانہ اور مذہبی، سیاسی، تاریخی مضامین ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو غزل کی زبان میں ادا کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ لیکن مولانا جب کبھی اس قسم کے مضامین کو غزل میں ادا کرتے ہیں تو تغزل کی حدود سے متجاوز نہیں ہوتے۔

درد و قیامت کو اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

[illegible]

"کلیمِ عجم" میں ہر قسم کے بہت سے اشعار ہیں اگر اُن کو نقل کیا جائیگا تو مضمون بہت طویل ہو جائیگا۔

(۲) عاشقانہ مضامین کا معیار بہت بلند ہے اُنکے نزدیک عشقِ مجازی بھی درحقیقت عشقِ حقیقی ہے وہ حُسن و عشق کو مادّیت سے بالاتر سمجھتے ہیں۔

(۳) اخلاقی مضامین میں عام طور پر واعظانہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے لیکن مولانا ان میں بھی سوز و گداز کے ساتھ اثر کا رنگ بھر دیتے ہیں۔

(۴) بعض جگہ صرف ایک ترکیبِ لفظی سے پوری نظم کا کام لیتے ہیں یہ قدرتِ بیان کا کرشمہ ہے۔

(۵) ان کا شعر روحانی لذت بخشتا ہے۔ زبان سے زیادہ کاغذ پر موثر نظر آتا ہے اُن کا شعر سوسائٹی کے اثر کو قبول نہیں کرتا بلکہ اُس کے رجحان کو اپنی طرف مائل کرتا ہے۔

(۶) اُن کا تغزل قطعاً صداقت و محبت ہے حقیقی وارداتِ قلبی کو پُرزور مگر اثر انگیز زبان میں ادا کرتا ہے۔

نظم

مولانا خود نظم کو غزل پر ترجیح دیتے ہیں اور انھیں اپنی نظم پر فخر ہے اس میں شک نہیں کہ ان کی نظم دورِ جدید میں ایک زبردست کارنامہ ہے اور ہر صنف میں وہ اپنے معاصرین سے بہت بلند اور تنہا نظر آتے ہیں بلکہ یہی یہ کہنے میں بالکل تامل نہیں کہ جس طرح فارسی میں قاآنی نے انقلاب پیدا کر دیا بالکل اسی طرح مولانا کی نظموں نے دفعتہً اُردو زبان کے دورِ جدید کی نظم نگاری میں حیرت انگیز ایجاد و اختراعِ فائقہ کا باب کھولدیا اور مضامین و طرزِ بیان کے لحاظ سے نئے نئے گوشے پیدا کر دیئے۔ اِس دور میں اقبال۔ سیماب اور جوش تین بلند مرتبت نظم نگار پیدا ہوئے۔ اقبال نے قوم کو جھنجوڑا۔ اسلام کے حقیقی خدوخال کو بے نقاب کیا۔ جوش نے وطن کے انقلابی رجحانات کو تقویت پہونچائی اور ساتھ ہی ساتھ رندی و سرمستی کی طرف بھی ذہنوں کو منتقل کیا۔ لیکن سیماب نے ان دونوں کی راہ سے ہٹ کر ایک راہ پیدا کی اور وہ بین القومی اصلاح ہے۔ معاشرت۔ اخلاق۔ اتحادِ قومی۔ وطنیت اور سیاست کو سیماب نے جس رنگ میں پیش کیا وہ ہمیں دوسری جگہ نہیں ملتا وہ ہر شعبۂ حیات میں اصلاح کے متمنی ہیں اور یہی اُن کی نظموں کی خصوصیتِ عالیہ ہے۔ سیماب کے مصلح ہونے سے اُن کے کسی دوست اور دشمن کو انکار نہیں۔ مستقبل کا مورخ ہمیں بتائے گا کہ اُن کے سرمایۂ کلام میں کہیں بھی مخربِ اخلاق اور ذہنیتوں کو پست کرنے والی چیز نہیں ملتی۔ میرا دعویٰ ہے کہ اتنا محتاط شاعر نہ ہندوستان نے پیدا کیا اور نہ کر سکے گا۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اِن کا تغزل اپنی جگہ اپنا آپ جواب ہے۔ غالب و داغ کی غزل کے بعد ایجادِ مضامین اور اجتہادِ بیان کی گنجائش کہاں تھی مگر "کلیمِ عجم" کو اُٹھا کر دیکھ لیجئے۔ ہر صفحہ پر تغزل کے قابلِ سجدہ کارنامے ملیں گے۔ مولانا آگرہ اسکول کے بانی ہیں اور اپنی روایاتِ سخن کی بڑی سختی کے ساتھ پابندی کرتے ہیں۔ دورِ جدید میں اس کی سخت ضرورت تھی کہ دہلی کے قدیم مخصوص طرز کو محفوظ کیا جائے۔ چنانچہ مولانا نے اسی خیال کے ماتحت اپنے اسکول کی بنیاد ڈالی اور اپنی خاندانی قدیم روایاتِ شعر کی حیثیتوں کو بہر طور محفوظ کر دیا۔ ایک ضروری بات جس کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ جس طرح فارسی میں قاآنی کی تقلید اس کے مخصوص رنگ میں دشوار ہے اسی طرح بانیٔ آگرہ اسکول کی تقلید بھی دشوار ہے۔ چنانچہ وہ نظمیں جو ان کے اتباع میں لکھی گئیں اگر نظر کے سامنے لائی جائیں تو معلوم ہوگا کہ وہ صرف الفاظ کا ڈھیر ہیں۔ ان میں مضامین کا پتہ بھی نہیں چنانچہ مولانا کے بعض شاگرد خود اس تیر کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کے مقلدین کو چاہیئے کہ وہ صرف اپنے فطری رنگ کو قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ مولانا کے ناقابلِ تقلید رنگ کی طرف نہ جائیں۔ مولانا سیماب کے تلامذہ مستقبل کے ہیرو ہیں لیکن حال کی ادبی فضاؤں پر بھی پوری طرح چھائے ہوئے ہیں۔ یہ صرف چند اشارات ہیں جن کی تفصیل وقت کی محتاج ہے۔

آلم مظفر نگری

فانی بدایونی

فانی کہ بود مہرِ گلستانِ شاعری ۔۔۔ صد حیف شد غروب کہ نادیر بر نتافت

سالِ وفات بے سر افسوس درد گفت ۔۔۔ فانی بہشتِ گلشنِ باقی [نہ] تافت

...کاکوروی

دولِ متحاربہ کے نام ایک پیغام

اے ریاضِ ہستی پر آگ ڈالنے والو!
حق ادا کیا تم نے۔ خوب دادخواہی کا
دفترِ شواہد کو۔ راکھ کر دیا تم نے
مسخ صورتیں کر دیں صحن و بامِ ہستی کی
کرّہ ہوائی کو۔ آتشیں بنا ڈالا
تیغ و تیر درکف ہیں برتشیں تکلّم کی
وہ جواں جو دشمن کی ہڈیاں چبا جائیں
پرورش ہوئی جن کی حوصلوں کے سائے میں
آگ جن کی سانسوں سے درسِ سوز لیتی ہے
وہ جدید آلوں کے یوں شکار ہوں افسوس!
آہ اُن کی بیوائیں! ہمکنارِ پامالی
جن کے خشک ہونٹوں پہ تیرتی ہیں فریادیں
دوپہر کی گرمی میں آگ جب برستی ہے
مضمحل فضاؤں میں منتشر نگاہیں ہیں
یوں تو ہر مصیبت سے متصل قیامت ہے
اُن کی بیوگی کا بھی کچھ ملال ہے تم کو؟
یاد تو تمھیں ہونگی امن کی پناہیں بھی
جن کا ذرّہ ذرّہ تھا جلوہ زارِ سینائی
جنّتِ تماشا تھے جن کے مست نظارے
اور وہ ادب خانے۔ حکمتوں کے آئینے
اب کھنڈر کی صورت میں عبرتِ تماشا ہیں

اے بساطِ گیتی پر۔ موت اُچھالنے والو!
ہر طرف تسلّط ہے۔ مستقل تباہی کا
خلد میں جہنّم کا رنگ بھر دیا تم نے
تم نے رُو بدل ڈالی صبح و شامِ ہستی کی
نزہت و لطافت کا سلسلہ مٹا ڈالا
خونفشانِ حسرت ہے موج موجِ قلزم کی
گرم ہوں تو دُنیا پر برق بن کے چھا جائیں
جن کو نیند آتی ہے برچھیوں کے سائے میں
فطرتِ غضب جن کو خود خراج دیتی ہے
وہ مہیب موجوں سے ہمکنار ہوں، افسوس!
جاں رہینِ نومیدی۔ دل شکارِ پامالی
نامکمل افسانے۔ ناتمام رودادیں
ان کی خانہ ویرانی سائے کو ترستی ہے
دل شکن ہیں فریادیں دلگداز آہیں ہیں
بیوگی مگر از خود۔ مستقل قیامت ہے
کیا یتیم بچوں کا کچھ خیال ہے تم کو؟
وہ نگار خانے بھی۔ وہ نشاط گاہیں بھی
جن کی عظمتوں پر تھا دنگ کاخِ مینائی
صبح و شام کیوپڈ کے گونجتے تھے نقارے
دانش و تدبر کے لازوال گنجینے
یہ جہان میں کیسے انقلاب برپا ہیں

یہ ہُنر کی بے قدری! یہ لہو کی ارزانی!
کیا اسی کو کہتے ہیں۔ ارتقائے انسانی؟

اے مہذب انسانو! یہ معاشرت کیا ہے؟ — آشتی کے دیوانو! یہ محاربت کیا ہے؟
کیا یہی ہے تہذیبِ مغربی کی گلکاری؟ — آدمی کے ہاتھوں سے آدمی پہ بمباری!
اور پھر سناتے ہو راگ خیر خواہی کا — امتزاج کرتے ہو نور میں سیاہی کا
اس دراز دستی کو کیوں روا سمجھتے ہو؟ — کیا خدائی میں خود کو۔ تم خدا سمجھتے ہو
کیوں کتاب ہستی کو داغدار کرتے ہو؟ — کیوں وطن پرستی کو شرمسار کرتے ہو؟
نشہ حکومت میں کیوں حواس کھو بیٹھے؟ — اپنی آدمیت سے۔ بے نیاز ہو بیٹھے؟
کس کے حکم سے تم کو۔ ہے روا یہ چنگیزی؟ — کس نے تم کو بخشا ہے اختیار خونریزی؟
جب زمیں خدا کی ہے۔ جب فلک خدا کا ہے — پھر یہ کچھ نہیں کھلتا۔ جنگ کی بنا کیا ہے؟
یہ فریب کارانہ طے کرو نظام اپنا — تم نے کتنے بندوں کو کر لیا غلام اپنا
یہ طریق آئینِ زیست کے منافی ہیں — ہاں اگر سنبھل جاؤ۔ درخورِ معافی ہیں
جانتا ہوں سنجیدہ انتظامِ فطرت ہے — لیکن اس سے سنگیں تر انتقامِ فطرت ہے
زندگی میں وہ سب کو آزمائے جاتی ہے — آزمائے جاتی ہے مسکرائے جاتی ہے
ہاتھ اسکا دریا و دشت پر مساوی ہے — وہ یہاں بھی حاوی ہے وہ وہاں بھی حاوی ہے
منہ پہ ڈال رکھا ہے وقت کا نقاب اس نے — ہاں نہیں لیا تم سے آج تک حساب اس نے
اس کا ہر قدم لیکن بے پناہ ہوتا ہے — اس کی دیرگیری میں انتباہ ہوتا ہے
کیا کبھی نہیں دیکھیں تم نے اسکی یلغاریں — پاؤں اسکے اٹھ اٹھ کر چومتی ہیں تلواریں
بجلیاں کڑکتی ہیں اس کی ہمنوائی میں — زلزلے بپھرتے ہیں اس کی رونمائی میں
یہ پہاڑ۔ یہ جنگل۔ یہ اداس ویرانے — یہ لطیف سیارے۔ یہ حسین گلخانے
سیل آفریں موجیں۔ یہ بحورِ بے پایاں — یہ نسیم کیف آور۔ یہ سحاب مے افشاں
غول یہ درندوں کے۔ ہولناک راہوں میں — خوفناک سناٹا۔ یہ نشیب گاہوں میں
اصل میں یہ سب کے سب خادمانِ فطرت ہیں — اور اگر بھڑک اٹھیں۔ قہرمانِ فطرت ہیں
انکے سامنے کوئی ہرگز آ نہیں سکتا — کوئی ان کے تیور کی تاب لا نہیں سکتا
قبل ازیں کہ فطرت کی آنکھ تم سے پھر جائے — یہ زمیں پھٹ جائے۔ آسمان گر جائے

شکریے کا موقع دو خادمانِ فطرت کو
استوار پھر کر لو۔ رشتۂ اخوت کو

محمد عبداللہ مضطر سیابی

ریڈیائی ڈرامہ
(ایک لطیف طنز)

"پہلے جو محبت سے......"

(ہوسٹل کی دوسری منزل پر ایک کرہ نیاز پردیسی فلم کا ایک ریکارڈ بجا رہا ہے)

پہلے جو محبت سے انکار کیا ہوتا
یوں ہم کو نہ دنیا سے بیزار کیا ہوتا

{ تھوڑی دیر تک ریکارڈ بجتا رہتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں ادھر اُدھر پھینکنے کی آواز۔ }

شوکت۔ میں پوچھتا ہوں آخر میری شیونگ اسٹک (SHAVING STICK) یہاں سے کون لے اُڑا۔

نیاز۔ لاحول ولا کیا طوفانِ بدتمیزی مچا رکھا ہے۔ گراموفون بھی سننے دو گے یا نہیں؟ دیکھتے نہیں کتنا رومان آفرین ماحول ہے۔ سورج کی آولیں شوخ و شنگ کرنیں' نرم رو نسیم عنبر بار۔ یاسمن و گلاب کی بھینی بھینی خوشبو ننھی ننھی کلیوں پر شبنم کے قطرے۔ اور ان سب پر کوئل جیسے گلے والی خورشید کی مست کر دینے والی تانیں۔ میں سچ کہتا ہوں جی۔ یہ رنگ میں بھنگ ڈالنا ٹھیک نہیں۔

شوکت (غصہ میں) جہنم میں جاؤ تم اور تمہارا گراموفون۔ دیکھتے نہیں مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ہر وقت کا مذاق اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لاؤ میری "شیونگ اسٹک" (SHAVING STICK)

نیاز (چڑکر) کیسے بدذوق سے پالا پڑا ہے۔

(گراموفون بند کر دیتا ہے)

اُف کتنا سریلا گلا پایا ہے۔ خورشید نے۔ اس کے نغمے سُن کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آدمی جیتے جی جنت میں پہنچ گیا ہو۔ ایک ایسی جنت میں جہاں فضاؤں میں محبت کے نغمے گونج رہے ہوں۔

شوکت۔ لیکن کل تک تو تم کانن پر جان دیتے تھے، اور اب کہتے ہوئیں باز آیا محبت سے اُٹھا لو پاندان اپنا۔

نیاز۔ شیوپیری کانن کے ہونٹ ذرا موٹے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خربوزے کی دو موٹی قاشیں نہایت بے ڈھنگے پن سے کاٹ کر رکھ دی گئی ہیں اور پھر اس کی اداؤں میں بھی تو کوئی خاص دلکشی نہیں۔

شوکت (طنزیہ) کل یہ کہنے لگو گے کہ خورشید کی آنکھیں بہت چھوٹی ہیں۔ اُس کے کان ایک ایسے جانور کی مانند ہیں جو ڈھیٹ ہونے کے باعث رسوائے عام ہے اور اُس کی ناک شاید جاپان سے تیار ہو کر آئی ہے۔ پرسوں سینیو پر بھاگی باری آئیگی۔ اور پھر ......

نیاز (تحکمانہ انداز سے) خاموش میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ تمھیں میری خورشید کے بارے میں اس قسم کے خیالات کے اظہار کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اس کی آنکھیں دو چمکتے ہوئے تارے۔ اُس کے ہونٹ سنگترے کی دو پھانکیں اور اس کے دانت موتی کی لڑیاں ہیں۔ اُس کی اداؤں میں جاذبیت اُس کی نگاہوں میں شوخی اور اُس کی باتوں میں شیرینی ہے۔ جب وہ اپنی زلفوں کو شانوں پر پریشان کرتی ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کالی گھٹائیں جھوم کر آگئی ہوں اور انھوں نے ماہ تاباں کو گھیر لیا ہو۔

{ نہایت کرخت آواز میں گانے کی کوشش کرتا ہے
"پہلے جو محبت سے انکار کیا ہوتا" }

(اُٹ...... ٹ...... رم۔ آئینے کے گر کر ٹوٹنے کی آواز)

نیاز۔ کمبخت یہ کیا کیا۔ میرا قیمتی آئینہ توڑ دیا

شوکت۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) میرے چہرے پر خراشیں پڑ گئیں۔ اس کا تمھیں خیال ہی نہیں اور اپنے معمولی سے آئینے کے ٹوٹ جانے پر اس قدر تلملا رہے ہو

نیاز کل ہی تو کباڑیے کے یہاں سے نیلام میں خرید کر لایا تھا۔

شوکت۔ تو کیا ہوا دوسرا خرید لینا۔

نیاز۔ "اقتصادیات" کا بھی تو خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ابھی تک درزی۔ حجام اور دھوبی کے بل بھی تو نہیں چکے، اور پھر سوسائٹی کے دوش بدوش بھی

چلا پڑتا ہے۔ بھئی میں تو اکتا گیا ہوں، اس جینے سے۔ اب تو جی یہی چاہتا ہے کہ......

شوکت کہ؟

نیاز۔ خودکشی

شوکت۔ ارے! ایسا لفظ منہ سے پھر نہ نکالنا، نہیں تو میرے قلب کی حرکت بند ہو جائے گی۔ جانتے ہو میرا دل کتنا کمزور ہے۔

نیاز۔ ہوں۔

(وقفہ)

شوکت۔ مصائب و آلام میں زندہ رہنا ہی اصل زندگی ہے۔ جانتے ہو کاہشِ پیہم اور سوز و گدازِ مسلسل کا دوسرا نام زندگی ہے، مرنا تو ہر کوئی جانتا ہے زندہ رہنا سیکھو میرے دوست!

(وقفہ)

میری ایک بات مانو گے

نیاز۔ بسر و چشم۔

شوکت۔ کسی پر عاشق ہو جاؤ۔

نیاز۔ کیوں؟

شوکت۔ یوں ہی زندگی کو سہل بنانے کے لئے۔

(وقفہ)

(معلوم ہوتا ہے دونوں کچھ سوچ رہے ہیں)

شوکت۔ (رازدارانہ لہجہ میں) جانتے ہو عشق کی کتنی قسمیں ہیں۔

نیاز۔ نہیں تو۔

شوکت۔ عشقِ حقیقی کو تو جانے دو۔ عشقِ مجازی کی قسمیں ہیں، گلے پڑا عشق۔ چلتا پھرتا عشق۔ بازاری عشق وغیرہ وغیرہ۔ تم بھی ان میں سے کوئی ایک عشق اپنے لئے پسند کر لو۔

نیاز۔ واہ ری زبردستی۔

شوکت ہاں.... ہاں.... زبردستی.... کسی پر عاشق ہو کر تو دیکھو، ہر طرف مسرت ہی مسرت نظر آئے گی۔

نیاز۔ یہ پٹی مجھی کو پڑھا رہے ہو، اپنے آپ پر بھی ایسی کی آزمائش کی ہے۔

شوکت کئی بار۔

نیاز۔ واقعی!

شوکت (جوش میں) تم کیا سمجھے تھے میں تو اس میدان کا پرانا کھلاڑی ہوں۔ میری محبت ہنگامی ہوا کرتی ہے۔ وہ وقتی اثرات کی حامل ہوتی ہے۔ اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا (ہنستا ہے) جو بھی حسین لڑکی نظر آجائے۔ نہایت شریفانہ انداز سے اُس کی خدمت میں نذرانہ دل پیش کر دینا ہمارا اوّلین فرض ہے اور پھر ہمارا دل بھی تو کوئی ایسا ویسا نہیں ہے۔ کئی بار حُسن کے قدموں میں پامال ہو چکا ہے۔ کئی بار "حسین مخلوق" کی بے مہری اور ستم پیشی کے باعث ٹوٹ چکا ہے اور کئی بار اسے بڑی مصیبتوں سے جوڑا جا چکا ہے۔ پھر بھی اس کی ہمت دیکھو کہ صنفِ لطیف کو دیکھتے ہی اُس کے قدموں میں لوٹنے اور ٹھوکریں کھانے کے لئے پہلو میں مچل اٹھتا ہے۔

نیاز۔ سُنا کرتے تھے کہ پچھلے زمانہ میں تم جیسے دل پھینکوں کا دل کسی بتِ رعنا کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو جاتا تھا، لیکن جلد ہی کنگھی میں اُلجھ کر باہر نکل آتا۔۔۔ کبھی کبھی یہ دشت و صحرا کی تپتی ہوئی دھوپ میں گرم گرم ریت پر پڑا جھلستا رہتا۔ معشوق کی گلیوں میں بھٹکتا پھرتا یا کوچۂ یار کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑا پایا جاتا۔ لیکن اس مہذب دور میں "دل" کے لئے کافی سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اب اُسے ناقۂ لیلیٰ کے ساتھ ساتھ دوڑنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اگر بیسویں صدی کی لیلیٰ موٹر میں سوار ہو تو بے چارے دل کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی سائیکل چڑھ ہی جاتی ہے۔ چاہے وہ چرا کر ہی کیوں نہ لائی گئی ہو اور پھر مہذب "دل" کے رہنے کی جگہ ہے۔ کلب۔ ناچ گھر سینما ہال وغیرہ آج کل تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مہذب اور فیشن زدہ خاتون سودا خریدنے کسی دوکان میں جاتی ہے۔ جب خرید و فروخت کر کے کافی دور چلی جاتی ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا دو پہیوں کا بٹوا کچھ وزنی معلوم ہو رہا ہے، وہ "بٹوا" کھولتی ہے لیکن اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب وہاں ایک تڑپتا ہوا دل ملتا ہے.... بے چارے دوکاندار کا دل.... مجبوراً اُسے دوکاندار کا دل لوٹانے اور اُسے [illegible] کرنے

کہ شمشاد اپنے دل کو حفاظت سے رکھا کرے دوکان تک واپس جانا پڑتا ہے۔

شوکت بھئی تم مجھے خواہ مخواہ جھینانے کی کوشش کر رہے ہو۔

(وقفہ)

شوکت نیاز! اپنا ہاتھ ادھر لاؤ میرے دل کے پاس۔ دیکھو تمہاری باتوں نے اس بیچارے کی کیا حالت کردی ہے۔

(نیاز ہنتا ہے)

شوکت اگر ہنسنا بند کرو تو تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔ تمہیں اپنا تازہ رومان سناتا ہوں بڑی رنگین داستان ہے۔

نیاز۔ میں تمہاری داستان سننے کے لئے تیار ہوں لیکن ایک شرط پر۔

شوکت۔ وہ کیا؟

نیاز۔ یہی کہ داستان سناتے سناتے اپنی شاعری شروع نہ کردینا

شوکت اچھا تو سنو کل شام ایک عجیب واقعہ رونپذیر ہوا۔ "ریجنٹ" میں "پکار" دیکھنے گیا تھا کتنی شاندار تصویر ہے گانے کتنے دلچسپ ہیں اور کیف آور ہیں۔ خصوصاً مس نسیم کا یہ گانا "زندگی کا ساز بھی"

نیاز۔ پھر وہی بے تکی ہانکنے لگے۔

شوکت۔ معاف کرنا۔ بات میں بات نکل ہی آتی ہے میں کیا کہہ رہا تھا .. ہاں زندگی کا

نیاز۔ یہ نہیں کل تم "پکار" دیکھنے گئے تھے پھر کیا ہوا؟

شوکت۔ پھر کیا ہوا... پھر.. ہاں پھر یہی ہوا کہ جب ہم فلم دیکھ رہے تھے .. کونسا سین تھا ... ؟ یاد نہیں آرہا ہے... ہاں پہلا سین تھا جہاں شیلا گاتی ہے "گیت سنو وہ گیت" اور ہم سب دل کے کانوں سے نہایت توجہ کے ساتھ اس کا گیت سن رہے تھے کہ اتنے میں عقبی دروازہ کھلا اور سینٹ کی خوشبو ہال میں پھیل گئی۔ ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ پر میں نے بے اختیار مڑ کر دیکھا۔ ایک سایہ آیا اور میرے پہلو والی کوچ میں جذب ہوگیا۔

نیاز۔ کوئی بھوت ہوگا۔

شوکت۔ (جھلا کر) تم بیچ میں خواہ مخواہ کیوں ٹوک دیا کرتے ہو۔ ہاں میں کہہ رہا تھا کہ وہ ایک لڑکی تھی حسین و جمیل دوشیزہ۔

نیاز۔ لیکن اندھیرے میں تم نے یہ کیسے معلوم کرلیا کہ وہ حسین تھی۔

شوکت۔ تم پر خدا کی مار۔ پہلے سارا قصہ تو سن لو پھر اعتراض کرلینا۔ ہاں تو وہ نہایت حسین تھی۔ ایک شاعر کے تخیل سے بھی زیادہ حسین۔ وہ میرے اسقدر قریب تھی۔ اور اس کے سر کے بال جو بجلی کی تیز ہوا سے پریشان ہو ہو کر لہرا رہے تھے میرے ہونٹوں کے اس قدر نزدیک آجاتے تھے کہ اگر میں چاہتا تو انھیں بآسانی چوم لیتا ۔ نیاز! نیاز! اٹھو بھی تم تو اونگھنے لگ گئے۔

نیاز۔ کہے جاؤ۔ سن تو رہا ہوں۔ ہاں جب تمہارے بالوں نے اس کے ہونٹوں کو چوم لیا تو پھر کیا ہوا۔

شوکت۔ تمہارا سر۔ میاں ہوش میں تو ہو۔

نیاز (جمائی لینے میں منہ سے ایک عجیب سی آواز پیدا کرتے ہوئے) پھر کیا ہوا؟

شوکت۔ اب آئے سیدھی راہ پر۔ اس سحرکار حسینہ کے قرب نے مجھے نیم دیوانہ کردیا اور وارفتگی کے عالم میں بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا "کتنی حسین"

ایک باریک اور پیاری آواز میرے کانوں میں آئی "آپ نے مجھے مخاطب کیا" میں سمجھ گیا کہ آواز کدھر سے آئی۔ اس لئے اس کی طرف دیکھنے کی جرات کئے بغیر میں نے نہایت مدھم آواز میں جواب دیا۔ "نہیں مس نسیم کو"

وقفہ راحت ہوا۔ ہال بجلی کے قمقموں کی روشنی سے جگمگا اٹھا۔ میں نے دیکھا۔ دو موٹی موٹی خوبصورت آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ ان نگاہوں میں شوخی بھی تھی اور سادگی بھی۔ خوبصورت ہونٹوں پر ایک دلفریب تبسم رقص کر رہا تھا۔ میں اس کی موہنی صورت دیکھنے میں اس قدر محو ہوا کہ مجھے اپنے گردوپیش کا بھی علم نہ رہا۔ وہ ناک سکیڑ کر کہنے لگی "بہت گستاخ"

بے ساختہ میری زبان سے نکلا "آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں"

"نہیں مہراب مودی سے" یہ کہکر اس نے منہ موڑ لیا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ ایک شریر قہقہہ اس کے پیارے پیارے ہونٹوں سے پھوٹ پڑنے کے لئے بے تاب تھا۔

نیاز۔ خوب۔ بہت رنگین۔

شوکت۔ بتیاں پھر گل کردی گئیں۔ فلم شروع ہوا۔ اگرچہ میری نگاہیں پردے پر لگی ہوئی تھیں لیکن مجھے کچھ بھی نظر نہ آرہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میری آنکھوں کے سامنے سرور و کیف کا ایک لطیف پردہ چھا گیا ہو۔ میرے کانوں

میں اُس کے الفاظ گونج رہے تھے "بہت گستاخ" فلم ختم ہو گیا۔ ہال ایک بار پھر بجلی کی روشنی سے جگمگا اُٹھا، وہ جانے کے لئے اُٹھی۔ نہ جانے میں نے کیسے کہہ دیا۔ "آپ کا نام۔ پھر کبھی اپنی ملاقات کا شرف بخشیں گی یا نہیں؟" وہ مسکرا کر کہنے لگی۔ "اگر آپ کو مجھ سے ملنے کا شوق ہو تو کل شام ساڑھے چھ بجے "راوی کے پل" پر تشریف لایئے" اُس نے مجھے اپنا نام وغیرہ بھی بتایا۔ لیکن اُس کا نام ظاہر کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔

نیاز۔ بہت دلچسپ۔ اب سمجھا۔ اس لئے آپ آج سویرے سویرے ہی اپنی "شیونگ اسٹک" ڈھونڈھ رہے تھے لیکن وعدہ تو ساڑھے چھ بجے ملنے کا تھا۔ آپ کو اتنی جلدی کاہے کی ہے۔

شوکت۔ (کھسیانے پن سے) میں نے سوچا شیو کرنے نہانے۔ کپڑے بدلنے۔ کھانا ہضم کرنے اور اس قسم کے دوسرے کاموں میں چھ بج ہی جائیں گے۔

نیاز۔ لیکن اس بات کا بھی کچھ دھیان ہے کل جو سوٹ تم نے پہنا تھا وہ تو بہت میلا ہے دھوبی کا بل ابھی تک ادا نہیں کیا اس لئے وہ کپڑے بھی نہیں لایا۔ آج اپنی "اُن" سے ملنے کے لئے کیا پہن کر جاؤ گے۔ (وقفہ)

(طنزیہ ہنسی)

دھوبی کا بل چکانے کی ہمت نہیں اور حسین لڑکیوں کے پیچھے گھومنے کا شوق سر پر بُری طرح سوار ہے۔

شوکت۔ بھئی خدارا مجھے پریشان نہ کرو۔ رات کو اختر سے پانچ روپے اُدھار لئے ہیں۔ تھوڑا بہت کام چل ہی جائیگا، اور سوٹ اصغر کا پہن لونگا۔

نیاز۔ لیکن یہ یاد رہے اصغر بہت بگڑے گا۔

شوکت۔ اُسے کسی نہ کسی طرح منا ہی لیں گے۔ آخر ایک لڑکی کی نظروں میں بھی تو اپنے آپ کو ذلیل نہیں کیا جا سکتا۔ ...... اور تم نے بھی تو نیا سوٹ نکال رکھا ہے کہیں جانے کے ارادے ہیں کیا..... یہ ٹائی تو آج مجھے دینا۔

نیاز۔ تم سے کیا چھپانا۔ میں بھی ایک لڑکی کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو چکا ہوں۔

شوکت۔ ارے! تم بھی چھپے رستم نکلے

نیاز۔ پرسوں میری طبیعت قدرے ناساز تھی۔ اس لئے "شالامار" کی سیر کے ارادے سے اکیلا ہی نکل کھڑا ہوا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ کیوپڈ اپنے بے پناہ تیروں کے ساتھ میری ہی تاک میں بیٹھا ہوگا۔ ایک رہزن تمکین ہوش ایک بینچ پر بیٹھی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ محبت پہلی نظر میں ہوا کرتی ہے۔ داستان بہت طویل ہے میں بیان نہ کر سکوں گا۔ بس یوں سمجھ لو کہ اس کی مست مست آنکھوں نے مجھے پیام اُلفت دیا۔ یہ نہیں جانتا کہ اُس نے مجھ سے باتیں کرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ یا میں نے خود ہی ایسے مواقع پیدا کئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے اس سے تعارف پیدا کر لیا اور بہت جلد ہم آپس میں گھل مل گئے۔ جاتے وقت اُس نے کہا تھا کہ اگر میں اس سے ملنا چاہوں تو پرسوں یعنی آج شام کو ساڑھے چھ بجے "راوی کے پل" پر اس کا انتظار کروں۔

شوکت (چونک کر) کہاں

نیاز۔ "راوی کے پل" پر

شوکت (ہنس کر) "خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو"[2]

نیاز۔ شوکت! ادھر آؤ کھڑکی کے پاس، کیا ونڈو میں دیکھو۔ اصغر، ستیش کیساتھ کیسے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے بعض اوقات میں یہ سوچا کرتا ہوں کہ اصغر اتنا بے فکر اور لاپروا کیوں ہے۔ کھیلنے کودنے کے سوا اُسے دُنیا میں اور کوئی کام ہی نہیں۔ خدا نے اُسے دولت بھی بہت دی ہے۔ لیکن سب سے عجیب بات یہ ہے کہ میں نے اُسے کبھی بھی کسی لڑکی کے ساتھ باتیں کرتے نہیں دیکھا معلوم ہوتا ہے صنفِ لطیف سے اُسے دلچسپی ہی نہیں۔

شوکت۔ اُسے تو ہے یا صنفِ لطیف کو اُس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ اگر سچ پوچھو تو اس میں دلکشی ہی کہاں ہے۔ بات کرنے کا سلیقہ اُسے نہیں۔ محبت کرنے کا طریقہ اس کی بلا جانے۔ حد درجہ غیر دلچسپ۔ لڑکیاں اس بے جان بت کو لے کر کیا چاٹینگی؟ اگر میں لڑکی ہوتا تو ایسی بھونڈی شکل والے سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرتا۔ ذرا دیکھو تو کیسے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چڑیا گھر کا کوئی بن مانس آدمیوں کی نقلیں اُتار رہا ہو۔

(دونوں ہنستے ہیں)

نیاز۔ کچھ بھی ہو لیکن وہ ہم سے زیادہ کامیاب انسان ہے۔

(دروازہ پر دستک۔ دروازہ کھلنے کی آواز)

اصغر۔ کہئے یہاں کیا ہو رہا ہے...... یہ کمرہ ہے یا کباڑیے کی دوکان.... یہ چیزیں ادھر اُدھر [illegible] ...... ارے

یہ آئینہ کس نے توڑ دیا۔ بمشکل ایک گھنٹہ کے لئے غیر حاضر رہا ہونگا اور اس دوران میں کمرے کی یہ حالت۔ آخر اس گڑبڑ کا مطلب؟

نیاز و شوکت۔ (یک آواز) ہوں

اصغر۔ معلوم ہوتا ہے تم دونوں نے "چپ شاہ" کا روزہ رکھا ہے۔

(وقفہ)

اصغر۔ ارے چائے بھی ابھی تک پڑے پڑے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

(پیالیوں میں چائے ڈالنے کی آواز)

اصغر۔ اوہ۔ یہ میرا سوٹ کس نے نکالا ہے۔ خوب! (حیران ہوکر) لیکن تمہیں پہلے ہی سے کیسے علم ہو گیا کہ میں باہر جا رہا ہوں ——— اور مجھے سوٹ کی ضرورت پڑیگی۔۔۔۔ سویرے ہی سویرے کسی نجومی کا منہ دیکھکر تو نہیں اٹھے۔

نیاز۔ بات در اصل یہ تھی کہ شوکت

شوکت نہیں نہیں۔۔۔ ہاں، ہاں۔۔ بات یہ تھی کہ میں نے سوچا۔ آج اتوار ہے اس لئے شاید تم نے باہر جانے کا کوئی خاص پروگرام مرتب کیا ہو۔

اصغر۔ (چٹکی بجا کر) بالکل ٹھیک لیکن میں اکیلا ہی جا رہا ہوں تم دونوں آج کوئی اور بندوبست کرو میرے ہمراہ آج "وہ" ہوگی

نیاز و شوکت۔ (تعجب سے) وہ کون؟

اصغر۔ (ہنس کر) میری محبوبۂ دلنواز

نیاز۔ لیکن تمہاری انگلی میں یہ انگوٹھی کہاں سے آئی؟

اصغر۔ نرے بیوقوف اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اسی کے لئے خرید کر لایا ہوں۔ میری اس سے منگنی ہونے والی ہے

نیاز۔ لیکن وہ ہے کون خوش نصیب؟

اصغر۔ ہمارے کالج کے ایک پروفیسر کی بھتیجی ہے۔ اپنے چچا سے ملنے آئی ہے۔

شوکت۔ نیاز۔ (یک آواز) اوہ! لیکن اس کا نام ———

اصغر۔ یہ نہیں بتاؤں گا

شوکت۔ پروفیسر جمیل کی بھتیجی تو نہیں۔

نیاز۔ زہرہ کے بارے میں تو نہیں کہہ رہے

اصغر۔ (ہنستے ہوئے) خوب تم دونوں اپنی ہونے والی "بھابی" کو پہلے ہی سے جانتے ہو

(دونوں کے ہاتھ سے چائے کی پیالیاں گر کر ٹوٹ جاتی ہیں)

اصغر۔ ارے یہ کیا ——— یہ تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے؟!

(وقفہ)

بھئی یہ سکوت تو مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ میں تو گراموفون بجاتا ہوں

(گراموفون بجاتا ہے)

"پہلے جو محبت سے انکار کیا ہوتا
یوں ہم کو نہ دنیا سے بیزار کیا ہوتا"

نیاز۔ خدارا اسے بند کر دو

شوکت۔ ہم سے ایسے زٹیل گانے نہیں سُنے جاتے۔

جاوید سرحدی

نغمات

شراب محبت پلائے چلا جا ۔۔۔ مجھے مست و بیخود بنائے چلا جا
چلا جا یونہی مسکرائے چلا جا ۔۔۔ مرے دل پہ بجلی گرائے چلا جا
نہ ہوگی کبھی اس سے سیری نظر کی ۔۔۔ مجھے اپنا جلوہ دکھائے چلا جا
جو چھیڑا ہے تارِ رگِ جاں کو مطرب ۔۔۔ تو اب نغمۂ غم سنائے چلا جا
ترے ہاتھ میں ہے مرے دل کی بستی ۔۔۔ اُجاڑے چلا جا بسائے چلا جا

کبھی تو وہ خوش ہو کے آئینگے خوشتر
محبت کی پینگیں بڑھائے چلا جا

خوشتر از کنڈہ

ساقی نامہ

طلب:-

صراحی اٹھا ساقیا بس بھری   کہ نیلا مجھے کر دے نیلم پری!
خلش درد فرقت کی دل سے مٹے   یہ غم اک غمِ متصل سے مٹے
بجھے اس طرح سوزِ ہجراں کی آگ   لگا میرے منہ سے یہ سیال ناگ
تمنا کی دنیا میں اڑتی ہے خاک   بٹھا دے اسے ساغرِ زہرناک
جدائی اور ایسی یہ ستم بے رخی   غموں میں ہے اک غم سا غم بے رخی
وہ قربت کی راتیں بھلائی گئیں   وہ الفت کی جوتیں بجھائی گئیں
لگاوٹ کے پہلے قرینے گئے   حوادث کی رو میں سفینے گئے
چھٹے دل میں خود کامیوں کے انار   لگے ٹوٹنے زر کے سکوں کے ہار
گلے میں ستم کے یہ ڈالے گئے   محبت کے شاداب مالے گئے!
یہی کامرانی شخصی ـــــ بنی   محبت کے پہلو میں برچھی انی!
گلے پر امیدوں کے پھری گئی   فراغ معیشت کی سیمیں چھری
قیامت کے ناموں میں رقعے پڑے   جو لکھے۔ تو لفظوں میں خنجر گڑے
رہبہ ہو گئے مادیت کے نام   زر و سیم کی ٹکلیوں کے غلام
ہمیں جوئے خوں میں ڈبو کر گئے   ہمارے کے تنکے بھی کھو کر گئے
پہنایا ہمیں زندگی کا کفن   اٹھا ساقیا جامِ ہستی شکن

پلا ساقیا بادۂ جاں گداز
کہ غم کا ہو طے جادۂ جاں گداز!

پی چکنے کے بعد:-

ترا زہر ہے تلخ، مے تلخ ہے   کہ پینے کی ہر ایک شے تلخ ہے!
گلے سے جو اتری تو دل کٹ گیا   کلیجہ غم و درد کا پھٹ گیا
رگوں کو لگے کھولنے نیشتر   چلے نبض کی بولیاں بول کر
جگر منہ کو کٹ کٹ کے آنے لگا   یہ مظلوم الفت ٹھکانے لگا
رگِ جاں کی دھیمی پڑی ہے پھڑک   دبی خوں کے چھینٹوں سے غم کی بھڑک
سماتا نہیں تنگ سینے میں دم   کھٹکتا ہے بے طرح خارِ الم
قیامت کے شور و غضب کی سپاہ   کہاں گھس رہی ہے ان آنکھوں کی راہ
بھڑکنے لگی میرے سینے میں آگ   لپکنے لگے بجھتی آنکھوں میں ناگ

گھلا جا رہا ہے جو رگ رگ میں نیل   یہی نیل منزل کا ہے سنگِ میل

مغنی ـــــ ذرا اپنا بربط سنبھال
سناؤں تجھے موت کا اک خیال!

(خیال)

۱- اندھیرے نہیں، ظلم کی چھاؤں بھی ہے   اجالا ہے جگنو تو شب پاؤں بھی ہے
ستاروں کی یلغار کی یادِ کہنہ   جہاں ایک آتش زدہ گاؤں بھی ہے!

۲- ہے میراث و ماحول کی نیک نامی   ہوئی زندگی آنسوؤں کی غلامی
حوادث کا لے نام اک عارضہ ہے   جو کرتا ہے اچھے بھلوں کو جذامی

۳- دلوں کی پکاریں جو دکھ جھیلتی ہیں   پرے آپ سے موت کو ریلتی ہیں
جوانی کے دو دن کی اتنی شکستیں   امیدوں سے گڑیاں پڑی کھیلتی ہیں

مغنی! ذرا پاس ہو کر تو سن   کہاں آ کے ٹوٹی مری تیز دھن؟
کیا بند کس نے تیرے ساز کو؟   یہ کیا ہو گیا میری آواز کو
گلے میں کوئی شے اٹکنے لگی   زباں خار بن کر کھٹکنے لگی!
اٹھائے گی کیا موت گونگا مجھے؟   جو گفتار دیتی ہے دھوکا مجھے
یہی ہے ـــ تو بیکار ہے قیل و قال   کہ آغوشِ تربت میں ماضی نہ حال!
مجھے بھی نہیں ہے سخن کا دماغ   کہ بجھنے کو ہے زندگی کا چراغ!
مغنی ـــ مری لحن میں سر کو ڈھال   دمِ آخریں دل کی حسرت نکال
رہو ہر تان میں میری آہوں کا ٹھاٹ   مری غم میں ڈوبی نگاہوں کا ٹھاٹ
تری لے میں ہو وہ دہکتی خلش   ستاروں کی آنکھیں جھپکتی خلش
جلاتی رہی جو مجھے عمر بھر ـــ   مٹاتی رہی جو مجھے سر بسر!
اسی لے میں اے رازدارِ ازل   سنا آخری مجھکو میری غزل!

جو موت آپ کی سرگرانی بنی   وہی رحمتِ آسمانی بنی
جگائی گئی لاکھ فتنوں سے رات   سحر ہو گئی تو کہانی بنی!
عطا کی مرے دل کو جو آپ نے   وہی بے دلی زندگانی بنی
دہکتی تھی دل میں جو الفت کی آگ   دھواں ہو کے آہوں کا پانی بنی

ابھی تک تھی جو جنتوں کو قبول
وہی موت میری نشانی بنی!!

نعیم صدیقی

کیا اُردو مسلمانوں کی زبان ہے؟

(وہ صدارتی تقریر جو حضرتِ ماہر القادری نے بنگلور کے ایک عظیم الشان مشاعرہ میں فرمائی)

محترم حضرات!

میرا تعارف جن شاندار اور وزنی الفاظ میں کرایا گیا ہے۔ اُس کے بارے میں میری رائے دی جا رہی ہے۔ تعریف سے کون خوش نہیں ہوتا، اپنی مدح و توصیف کس کو بُری لگتی ہے مگر میں آپ سے سچ کہتا ہوں ابھی ابھی جب میرا آپ سے تعارف کرایا جا رہا تھا تو میرے ضمیر کو پسینہ آ رہا تھا اور میرا دل شدید ندامت محسوس کر رہا تھا۔ خدا فریبِ نفس اور احساسِ پندار سے محفوظ رکھے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ کا "حسنِ ظن" مجھے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ کر دے۔

تشکر و امتنان کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ کہا جا سکتا ہے، الفاظ کی کمی نہیں ہے۔ یعنی زبان و ادب کے دامن میں بہت کچھ وسعت اور گنجائش ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اظہارِ تشکر کی رسم بہت زیادہ فرسودہ ہو گئی ہے، اور میں آپ کے خلوص و محبت کو آلودۂ رسم و تکلف کرنا نہیں چاہتا، آپ نے جس محبت کیساتھ میری پذیرائی کی ہے۔ اُس کے گہرے نقوش میرے قلب و دماغ پر مرتسم ہو گئے ہیں میں شکریہ ادا کر کے ان نقوش کی قیمت گھٹانا نہیں چاہتا۔

حاضرینِ کرام!

ادب اور زندگی

ایک زمانہ تھا جبکہ چند تقریریں کرنے، چند افسانے لکھنے اور کچھ شعر پڑھنے کے بعد لوگ سمجھتے تھے کہ خدمتِ زبان و ادب کا حق ادا ہو گیا۔ مگر اب زمانہ کے رجحانات و انقلابات نے ادب کو زندگی سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ ادب اور زندگی کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا مشکل ہے۔ اب زبان و ادب کا تعلق معاشرت سے ہے، تجارت سے ہے، سائنس سے ہے، سیاسیات سے ہے، غرض ادب زندگی کے تمام شعبوں اور فکر و عمل کے تمام حلقوں پر چھا گیا ہے۔ آج بازار میں کسی تاجر اور سوداگر کے مال کی مانگ اور کھپت ہے جو زبان و ادب کی نفسیاتی نزاکتوں کے سہارے بہتر طور پر نمائش (Advertise) کر سکتا ہے۔ آج اس آگ اور بھاپ کی دنیا اور مشینوں کی مارکیٹ میں "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" کا نظریہ باطل ہو گیا، اب تو عطار ہی کو مشک کا تعارف کرانا پڑتا ہے۔

سیاسیات کی گاڑی تو ادب کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتی۔ حکومتوں نے اپنے پروپیگنڈے کے لئے باقاعدہ محکمے قائم کر دیئے ہیں، جہاں زبان و ادب کے ذریعہ حسبِ مطلب خیالات کو پھیلایا جاتا ہے۔ آج جو حکومت اپنی پالیسی کا پروپیگنڈا نہیں کر سکتی وہ ناکام اور پست حکومت ہے۔ بیدار اور زمانہ شناس حکومتوں کی نشر گاہیں، زبان و ادب کے منتر سے ذہنیتیں بدل رہی ہیں۔ میں زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ میں آپ کی پیشانیوں کو پڑھ رہا ہوں کہ میرا مفہوم آپ سمجھ رہے ہیں اور اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔

اُردو کی ہمہ گیری

صاحبو! میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں، جو ہندوستان کو ایک قوم سمجھتے ہیں۔ میں کھلی ہوئی حقیقتوں سے آنکھیں پھیر کر "وحدتِ وطنی" کی خوبصورت اصطلاح میں آپ کی نگاہ و فکر کو اُلجھانا نہیں چاہتا، ہندوستان بہت سی قوموں، جماعتوں اور جاتیوں کا مجموعہ ہے یہاں کے بسنے والوں میں بہت سے سیاسی اور مذہبی اختلافات پائے جاتے ہیں، میں ان اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے دکھ محسوس کرتا ہوں، مگر اختلافات بہرحال ہیں اور اُن کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود ہندوستان کی تمام قومیں اگر کسی متحدہ مرکز پر جمع ہو سکتی ہیں تو وہ "زبان" کا مسئلہ ہے، اور جو زبان تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان کہی جا سکتی ہے، وہ "اُردو" ہے! ایک زبان بولنے والی قوموں میں عام طور پر صلح و آشتی پائی جاتی ہے، وحدتِ زبان، خیالات میں بھی یک جہتی اور یک رنگی پیدا کرتی ہے، زبان میل ملاپ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

ظاہر ہے کہ ہندوستان کی اتنی بہت سی قوموں کو جاگیہ اور راس کی زمی کی حدود ہی میں رہنا ہے، اختلافات عدمِ اعتمادی اور بدگمانی کا بحران جو آجکل پایا جا رہا ہے، اس کو بہرحال اعتدال پر آنا ہے، اس میل ملاپ اور اتحاد کا سنگِ بنیاد

اُردو زبان بن سکتی ہے۔

ہندوستان کے ہر خطے اور ہر صوبے میں اردو زبان کے سمجھنے اور بولنے والے پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان سے باہر غیر ملکوں میں اس زبان کا رواج ہے، اور رفتہ رفتہ ہماری اُردو زبان "بین الاقوامی" حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ ۱۹۳۲ء میں مجھے عراق جانے کا اتفاق ہوا۔ عراق کی زبان عربی ہے، لیکن مجھے وہاں ہر جگہ اُردو زبان کے جاننے والے ملے، میں نے عراقیوں کی دعوتوں اور پارٹیوں میں اپنے اُردو اشعار سنائے۔ آپ کو معلوم کر کے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوگی کہ عراق کے خوش باش لوگ اپنے بچوں کو اُردو زبان سکھاتے ہیں۔ اُردو زبان ... کو اہلِ عراق "لالہ" کہتے ہیں۔

کیا اُردو مسلمانوں کی زبان ہے

دوستو! اس آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر ... سب سے بڑا جھوٹ بلکہ "مہا جھوٹ" یہ ہے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے ... کے خلاف جذبۂ نفرت و عداوت پیدا کرنے کے لئے یہ بولی ... مشہور کہاوت ہے کہ "نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے"۔ اور یہ بھی ہم نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ مصر کے بازار میں ایک شخص پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ:-

"مجھے میرے نادان دوستوں سے بچاؤ"

مگر ہندوستان کے "دانا دشمنوں" نے اس پرانی کہاوت کو الٹ دیا اور ان کی دانا دشمنی بڑی مہنگی پڑ رہی ہے۔ ان لوگوں نے اُردو کے خلاف خوب سوچ سمجھ کر محاذ قائم کیا ہے اور اس مسئلہ کو مذہبی رنگ دینے کے لئے کہا جاتا ہے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔

بھائیو! مسلمانوں کی تاریخ کوئی پُراسرار افسانہ نہیں ہے۔ دُنیا میں شاید کسی قوم اور مذہب کی تاریخ اتنی واضح اور روشن نہ ہوگی، جتنی مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ ان کے کردار و اعمال کا ایک ایک نقش تاریخ نے محفوظ کر لیا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ مسلمان جب دنیا کی رشد و ہدایت کے لئے عرب سے چلے ہیں تو اُن کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے ہاتھ میں قرآن تھا، تلوار سے وہ رفع نزاع کرتے تھے اور تعلیم قرآن کی روشنی میں امن پھیلاتے تھے۔ اُن کے ساتھ خالص عربی زبان تھی۔ عرب سے نکلنے کے بعد عجمی تمدن سے مسلمانوں کی ٹکر ہوئی، اور بہت جلد وہ ایران جہاں جمشید و کیکاؤس کی عظمت کا پھریرا اُڑتا تھا، مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ ایران میں پہنچ کر مسلمانوں نے عربی کے مقابلہ میں فارسی کو بھی گوارا کر لیا، یہاں تک کہ فارسی ایک علمی زبان بن گئی۔ میں یہاں یہ چیز واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ فارسی بھی مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، مسلمانوں کی زبان تو عربی ہو سکتی تھی اور ہو سکتی ہے، وہ عربی جس میں خدا کا آخری قانون قرآن نازل ہوا، جس زبان میں حضرت محمد رسول اللہ صلعم پیغمبر اسلام اور اُن کے جاں نثار صحابہؓ گفتگو کرتے تھے۔ مسلمانوں کا تمام "کلچر" تو عربی ادب میں محفوظ ہے۔

مشترکہ زبان

ہندوستان میں جب مسلمان داخل ہوئے ہیں تو اُن کے ساتھ بہت زیادہ فارسی اور تھوڑی عربی تھی۔ یہاں آ کر اُن کو ایک بالکل نئے تمدن سے واسطہ پڑا آب و ہوا، رسم و رواج، مذہب طریق بود و ماند، بولی ٹھولی، غرض ایک ایک چیز اُن کے لئے نئی، انوکھی اور نامانوس تھی، مگر مسلمانوں نے اپنی طبیعت کو اُس نامانوس ماحول سے مانوس بنایا اور وہ "فاتح دوست" کی حیثیت سے رہنے سہنے لگے۔

آپس کے میل جول، بہت سے تمدنوں کے امتزاج، فطری اور اجتماعی محرکات نے خود بخود ایک ایسی زبان کو پیدا کر دیا۔ جو سب لوگوں کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کرتی تھی اور جس کو ہندوستان کے قریب قریب تمام لوگ "اپنا" سمجھتے تھے۔ اس نئی اور مشترکہ زبان کے لئے مسلمانوں نے عربی چھوڑ دی، ہندوؤں نے سنسکرت سے دست کشی اختیار کر لی اور پارسیوں نے فارسی سے منہ پھیر لیا۔ سب ہندوستانیوں نے مِل جُل کر اس پودے کو پروان چڑھایا، اس پودے کی آبیاری ہندوستان کی تمام قوموں کے خون، پسینہ سے ہوئی ہے خوب کہا سر تیج بہادر سپرو نے کہ "اُردو زبان ہمارے اسلاف کا مقدس ترکہ ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اولاد نہایت ہی ناخلف ہے جو اپنے اسلاف کے ترکہ کی حفاظت نہ کر سکے۔ ہندوستانیوں نے تو اپنے اسلاف کی ہمیشہ عزت کی ہے، یقین ہے کہ وہ اس مقدس ترکہ کی نہ صرف حفاظت کریں گے۔ بلکہ اس کو اور ترقی دیں گے، سپوت اولاد اپنے آبائی ترکہ کو ہمیشہ بڑھایا کرتی ہے۔

اُردو زبان میں دُنیا کی بہت سی زبانوں کے الفاظ ملتے ہیں، اُس گلدستے میں آپ کو ہر ملک کا پھول ملے گا اور لطف تو یہ ہے کہ دوسرے ملکوں کے پھول اس انداز کے ساتھ اس باغ میں نظر آتے ہیں گویا کہ یہ کہیں باہر سے نہیں آئے، یہیں کے اُگے ہوئے پودوں کا حصہ ہیں۔

زبان میں اسماء (Nouns) سے بھی زیادہ اہم درجہ

افعال (*Verbs*) کا ہے، اُردو کے تمام مصادر بیٹھنا، اُٹھنا، جانا، آنا، کھانا، ہنانا وغیرہ ہندی یا ہندوستانی ہیں، یہی حال متعلقاتِ فعل اور حروفِ جار کا ہے، نے، کو، پر، میں، سے تک یہ سب کے سب حروف عربی اور فارسی نہیں، ہندی ہیں، اُردو زبان کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے دوسری زبانوں کے لفظوں کو "اپنا لیا" ہے۔ عربی میں "غریب" عجیب (*Peculiar*) کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے۔ فارسی میں "غریب" کے معنیٰ مسافر کے لئے جانے لگے، مشہور شعر ہے:۔

بیا در ید گر ایں جا بود زباں دانے
غریب شہر! سخن ہائے گفتنی دارد

مگر اُردو کی لیبارٹری میں پہونچکر اس لفظ کی ماہیت بالکل ہی بدل گئی، اُردو میں "غریب" مفلس اور بیچارہ کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، تفصیل اور شرح کا یہ موقع نہیں ہے، ورنہ میں آپ کے ذہن و فکر کو ایسے بہت سے لفظوں کی معنوی تبدیلی سے روشناس کراتا۔

یادگارِ محبت

آج سے کئی سو برس قبل، بھاشا دھرش کے ٹھاکوی یعنی ملک الشعراء تلسی داس جی نے کہا تھا:۔

تُلسی آہ گریب کی کبھی نہ کھالی جائے
مَرے بیل کے چام سے سار بھسم ہو جائے

اس دوہے میں "غریب" (گریب) ٹھیک اُن ہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جن معنوں میں آجکل بولا جاتا ہے۔ "آہ" فارسی لفظ اور "خالی" (کھالی) खाली عربی لفظ ہے۔ اس سے بڑھکر اس بات کا اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ تلسی داس جی کے زمانے میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اور اُردو زبان کا مزاج اس امتزاج کو قبول کرتا چلا جا رہا تھا۔ کیا تلسی داس جی کے وقت میں بھی کوئی انجمنِ ترقیٔ اُردو قائم ہو چکی تھی؟ یا اُس گیانی کوی اور صاحب دل شاعر کو کسی نے رشوت دیدی تھی! تلسی داس کے دوہے، اُردو زبان کے تدریجی نشوونما کا افسانہ بکار بکار کر سنا رہے ہیں۔ اُن کانوں کو کیا کہئے جو سنی کو اَن سنی کر دیتے ہیں اور دیدہ و دانستہ غلط فہمیاں پیدا کرا کے اختلافات کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جا رہے ہیں۔

میں نو تکبر اور تلسی داس کے دوہوں اور کبتاؤں کو اُردو شاعری کا نقشِ اوّل سمجھتا ہوں، اسی بے تعصبی، میل ملاپ اور اُردو کو ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان سمجھنے کا اثر تھا کہ دیا شنکر نسیم اور برج نرائن چکبست جیسے مایۂ ناز شاعروں نے اُردو کے مزاج میں جنم لیا اور دوسری طرف پنڈت رتن ناتھ سرشار اور پریم چند نے اُردو زبان کو چار چاند لگا دیئے۔

آج کل کے جھگڑوں سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اُردو کی تخلیق اور اس کی نشوونما میں کسی حکومت اور بادشاہ نے ذرّہ برابر کوشش نہیں کی، یہ آزاد پیدا ہوئی، کسی بادشاہ کے احسانات کا رہینِ منت نہیں رہا، اُس کو فطرت نے خود ہی اُگایا اور آپ ہی آپ بڑھتا چلا گیا، ہاں یہ ضرور ہے کہ اُس کی شاخوں پر پچکاریوں سے پانی چھڑکا گیا ہے، جس میں آبِ زمزم کے قطرے اور رودِ گنگا کی بوندیں دونوں شامل تھیں، اُردو ادب ہندوستانی اقوام کے ربط و محبت کی یادگار ہے۔

اس یادگار کو مٹانے والا ہندوستان کا سب سے بڑا دشمن ہے!

نامسعود کوششیں

اُردو کے مخالفین نے اس مقدس اور مشترکہ قومی یادگار اور بقول سر تیج بہادر سپرو "ترکۂ اسلاف" کو مٹانے کے لئے نہایت ہی ذلیل کوششیں شروع کر دی ہیں۔ یہ دشمن دوست کہتے ہیں کہ ہم زبان کو آسان بنانا چاہتے ہیں، بولی عام فہم اور الفاظ انتہائی آسان اور سلیس ہونے چاہئیں۔

خیال بہت اچھا اور تجویز نہایت ہی معقول ہے، مگر دل کا چور اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ زبانوں پر چڑھے ہوئے اور مروج لفظوں کی جگہ نامانوس اور نہایت ہی کریہہ الفاظ بنائے جا رہے ہیں۔ مدعی کو "جھگڑا ابیلھڑد" اور مدعا علیہ کو "جھگڑا دوجے" کہا جا رہا ہے۔

اس جگہ ایک پُرلطف واقعہ یاد آیا، غور سے سنئے، آپ بہت لطف لیں گے صوبہ متوسط میں جب کانگریس وزارت قائم تھی تو وہاں اس "جناتی زبان" اور "بھوتوں اور راکششوں کی بول چال" کا استعمال دفتروں اور عدالتوں میں شروع ہو گیا تھا بلکہ کرایا گیا تھا۔ مجسٹریٹ کے سامنے مقدمہ پیش تھا اُس نے مدعی سے پوچھا۔

"کیا تم جھگڑا لو (یا جھگڑا ابیلھڑد) ہو"

مدعی نے فوراً جواب دیا:-

"سرکار! میں تو مدعی ہوں جھگڑالو نہیں ہوں، جھگڑالو تو مدعا علیہ ہے!"

اس ایک واقعہ سے آپ اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ جن الفاظ کو زبردستی بہ فسادِ ذہنی وجدان پر مسلط کرایا جا رہا ہے وہ کتنے نامانوس اور عام بول چال کے مزاج کے نامناسب بلکہ اُلٹے مخالف اور مُضر ہیں۔ آپ لوگ بے ساختہ ہنس دیں گے، جب میں ملاقاتی کارڈ یعنی (Visiting card) کا "قومی ترجمہ" سناؤں گا "قومی ترجمہ" میں نے اس لئے کہا کہ "قوم پرستوں" نے اس کا ترجمہ کیا ہے، ہاں! تو اس نئی "اکشنی بھاشا" میں ملاقاتی کارڈ کو "گھسیٹر پتر" کہتے ہیں (قہقہہ)

بنی بنائی اور رائج و مستعمل زبان کے ساتھ کس قدر افسوسناک اور خطرناک مذاق کیا جا رہا ہے؟ یہ آپ زبان کو سہل بنا رہے ہیں، یا اس غریب کو کُند چھری سے حلال کر رہے ہیں، قربان اس شانِ مسیحائی کے! اور صدقے اس جذبۂ اصلاح کے! اگر اسی کوشش کا نام زبان کا آسان بنانا ہے تو ایسی کوشش کو ہماری دُور ہی سے ڈنڈوت!

ایک طرف یہ مذاق ہو رہا ہے، اور دوسری طرف سنسکرت کے نامانوس الفاظ شامل کئے جا رہے ہیں، میں چیلنج دیتا ہوں کہ کسی چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں جا کر وہاں کے کسی ہندو یا مسلمان کے سامنے یہ دو جملے کہو:-

"تم کو کس وستو کی آوشکتا ہے"

اور

"تم کو کس چیز کی ضرورت ہے"

بس اسی پر فیصلہ ہے، جس جملہ کو گاؤں والے سمجھ لیں، وہی سیدھی اور عام فہم زبان ہے۔ مجھے ان لوگوں پر افسوس آتا ہے جو ہندوستان کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کرنے کا پرچار کرتے ہیں، مگر اُردو کے بارے میں ان کی روش نہایت شدید معاندانہ ہے۔ بنی بنائی وحدت کو پارہ پارہ کر کے قوم پرستی اور وحدتِ وطنی کے ڈھول پیٹنا مجھے تو فریب معلوم ہوتا ہے ـــــ نہایت خطرناک فریب!

کتنا زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ اختلافِ زبان کے مسئلے نے ہندوستان کے اتحاد کو! اس ایک ہی بات کی وجہ سے کتنے دل ایک دوسرے سے پھٹ گئے ہیں! اور حیرت تو اس پر ہے کہ تجربہ کے بعد بھی پشیمانی نہیں ہوتی اور ٹھوکر کھانے کے بعد بھی آنکھیں نہیں کھلتیں۔

جنّت نشان بنگلور

عزیزانِ گرامی! آپ اشعار سننے کے لئے بے تاب ہیں! اور میں نے تقریر کا غیر دلچسپ ساز چھیڑ دیا! آپ گھبرائیں نہیں میں اب زیادہ دیر تک اس عالم میں آپ کو نہیں رکھوں گا!

بنگلور آنے کا یہ میرا پہلا موقع ہے، آپ کا شہر کتنا خوشنما اور دلکش ہے، قدم قدم پر باغیچے، ہر موڑ پر باغ و بہار، صفا اور وسیع شاہراہیں، خوشنما بنگلے قدرت نے اپنی رعنائیوں کے دریا بہا دئیے ہیں ہریالی اور پھولوں کے لئے یہاں کی سرزمین بہت زیادہ سازگار ہے۔ تمام شہر "جنتِ نگاہ" بنا ہوا ہے۔ بنگلور کا ایک ایک ذرہ شعر طلب کرتا ہے یہاں کے پھول شاعر کی نگاہ کو دعوتِ فکر و نظر دیتے ہیں یہاں کی نرم ہوائیں شعر کے سانچے میں ڈھلنے کے لئے بے تاب رہتی ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ بنگلور میں قدرت کی طرف سے ہر لمحہ مشاعرہ ہوتا رہتا ہے ـــــ یہاں کی فضا میں مجھے شعریت کے انوار نظر آتے ہیں۔

یہ ترشح، یہ نمناک فضا، یہ کیف انگیز ماحول، یہ برسات کی بھیگی ہوئی رات، یہ جگمگاتے ہوئے قمقمے اور قدِ آدم آئینے، سراپا شعر بن جانے کو جی چاہتا ہے۔

تقریر کرنے کا وہم بھی نہ تھا، اور وہ بھی اتنی طویل تقریر! بہرحال قدرت نے بنگلور کے اس عظیم الشان ہال میں میرا تقریر کرنا اور آپ کا اسے سننا مقدر کر دیا تھا جو پورا ہو کر رہا، آپ کو زحمت ہوئی ہو تو قدرت سے شکایت کیجئے!

میرے ہذیانات ختم ہوئے، اب مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔ اب آپ اُن نغموں سے لطف اندوز ہوجئے جو دلوں کے ساز پر گائے گئے ہیں اور جن کا آپ کے سامعہ اور وجدان کو انتظار ہے!

ماہر القادری

امکاناتِ شاعر

معجزہ عزم اور ہمت کا دکھا سکتا ہوں میں — اپنے قدموں پر زمانے کو جھکا سکتا ہوں میں
تابشِ انوار سے ہر ذرۂ تاریک کو — مشعلِ اک آفتابِ نو بنا سکتا ہوں میں
کیا حقیقت تیرگیٔ شب کی میرے سامنے — پردۂ ظلمات کو بھی جگمگا سکتا ہوں میں
ذرّے ذرّے کو میں کر سکتا ہوں رشکِ مہر و ماہ — قطرے قطرے سے نیا طوفاں اٹھا سکتا ہوں میں
رات دن اٹھتی ہے جس خطہ سے شعلوں کی لپٹ — اس جہنم زار کو جنت بنا سکتا ہوں میں
دل کے ہر گوشہ میں بھر رکھی ہے وہ تابِ تپش — برق بنکر خرمنِ ہستی جلا سکتا ہوں میں
عشق بنکر پھیل سکتا ہوں فضائے دشت میں — حسن بنکر برگِ گل میں سما سکتا ہوں میں
برق بنکر میں چمک سکتا ہوں باغ و راغ میں — ابر بنکر عالمِ امکاں پہ چھا سکتا ہوں میں
چھوڑ سکتا ہوں سفینہ بحرِ طوفاں خیز میں — قوتِ گرداب کو بھی آزما سکتا ہوں میں
سر کٹا سکتا ہوں راہِ دوست میں مستانہ وار — خون پانی کی طرح اپنا بہا سکتا ہوں میں
ہر قدم پر دشتِ وحشت میں باندازِ جنوں — دھجیاں جیب و گریباں کی اڑا سکتا ہوں میں
پھونک سکتا ہوں نگاہِ آتشیں سے دہر کو — پھر وہیں چاہوں تو اک دنیا بسا سکتا ہوں میں
عشق کی بیتابیوں کو بخش سکتا ہوں سکوں — حسن کے جذبات میں طوفاں اٹھا سکتا ہوں میں
اک اشارہ میں بدل سکتا ہوں دنیا کا نظام — آگ پانی میں بھی چاہوں تو لگا سکتا ہوں میں
ایک ہی مرکز پہ لا سکتا ہوں حسن و عشق کو — سب نیاز و ناز کے جھگڑے مٹا سکتا ہوں میں
سینچ سکتا ہوں میں اپنے خون سے باغِ وطن — سعیٔ آزادی میں سر اپنا کٹا سکتا ہوں میں
میرے جلوؤں کی حقیقت سے کوئی واقف نہیں؟ — زندگی بھر جلوۂ ایمن دکھا سکتا ہوں میں
قوتِ تخییل اور پیکِ تصور کی قسم — آشیانہ، شاخِ سدرہ پر بنا سکتا ہوں میں
کیا بتاؤں اپنی قوت، اپنی ہمت، اپنا عزم — آسماں سے توڑ کر تارے بھی لا سکتا ہوں میں

از دیادِ غم سے گھبرا جاؤں میں ممکن نہیں
تیغ کے سائے میں اختر مسکرا سکتا ہوں میں

اختر اعظم گڈھی

سُلطانہ

کوسا نہایت طاقتور اور مضبوط انسان تھا اور جو ایک بار اسے دیکھ لیتا تھا دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ نام لیتے ہی اُس کی صورت میری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ وہی سیاہ فام سبز گھوڑے پر سوار، فولادی عزائم کی مظہر آنکھیں، گھنی مونچھیں ——— بھرا سا جسم گھوڑے پر سوار ہوتا تو کاندھے پر بندوق لٹک رہی ہوتی، کمر میں لمبا تیز چاقو کھوسا ہوتا ——— یہ تھا اسکا حُلیہ جو سب سے پہلے میرے سامنے آیا۔

میں بڈھا آدمی ہوں، میری عمر نوّ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ میں دنیا میں بہت زیادہ گھوما پھرا ہوں۔ بہت سے انسانوں کو دیکھا ہے، کئی چیزوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ تلخ تجربات بھی ہوئے ہیں ——— لیکن کوسا ریکورجیسا کوئی شخص آج تک میں نے نہیں دیکھا، جسمانی ساخت کے لحاظ وہ کوئی دیوہیکل بھی نہ تھا۔ صرف معمولی قدو قامت کا آدمی تھا مگر اُس کے جسم کا ایک ایک جوڑ فولاد کی طرح مضبوط تھا، اُس کا چہرہ دھوپ میں تپ تپ کے سیاہ پڑگیا تھا۔ لیکن تھا وہ ایک ہی قسم کا انسان، اس کو نظر بھر کر دیکھ لینا ہی کافی تھا ——— وہ مرد تھا!

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب ہمارے ملک میں خلفشار برپا تھا ترکوں اور یونانیوں نے ہمارے وطن روآنیہ کے اچھے علاقوں پر قبضہ جمالیا تھا۔ اور تمام باشندے کرب و اذیت میں مبتلا تھے، کیسا عجب وقت تھا، صرف کوسا ہی ایسا تھا جو عالمگیر انقلاب کی ہنگامہ آرائیوں سے بالکل لاپروا تھا، وہ آج یہاں تھا تو کل وہاں ——— بالکل لاپروا ——— قطعی مطمئن!

ہمارے علاقہ سے تمام لوگ دشمن کے خوف سے بھاگ گئے، مگر وہ وہیں رہا۔ دشمنوں نے اُسے گرفتار کرلیا اور اُس کی بڑی تحقیر کی وہ زنجیروں کو ہاتھ سے چھوتا اور زور سے جھٹکا دیکر توڑ ڈالتا، گھوڑے پر سوار ہوتا اور دُور بھاگ جاتا۔ صحیفۂ حیات میں ایسا ہی لکھا تھا کہ اس پر گولی اثر نہیں کرتی تھی، صرف چاندی کی گولی ہی اُس کو چھوسکتی تھی ——— ایسا شخص آجکل کہیں مل سکتا ہے؟ وہ تاریخی ایّام تھے کیا آپ نے ایک اور بہادر کا فسانہ سنا ہے جو خوبصورت بالوں والی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا، وہ بھی ایسا ہی شخص تھا، ولاسشیا میں اُس کی دھاک بیٹھی تھی اور کوسا مولڈاویا پر چھایا ہوا ——— ملکوں میں وہ دونوں ایک رات ملے، انھوں نے مالِ غنیمت کا تبادلہ کیا سرحدی محافظین نے انھیں پکڑنے کی کوشش کی مگر توبہ کیجئے جو وہ ہاتھ لگے ہوا کوسا کا گھوڑا بھوت کی طرح اڑگیا، اُن کی گولیاں کوسا تک نہ پہونچ سکیں

باکو کی پہاڑیوں سے سرحد تک بڑا فاصلہ ہے، اس فاصلہ کو ایک رات میں دو مرتبہ طے کرنا آسان نہیں۔ لیکن کوسا ریکور اور اُس کا سبز گھوڑا اُس کو بچوں کا کھیل سمجھتے تھے اس طرح گھنے جنگلوں اور کشادہ میدانوں میں اُس کی زندگی گذر رہی تھی! اُسے نہ تو کوئی خوف تھا اور نہ خدشہ! ——— وہ ہر قسم کے تفکرات اور محبت کی قیود سے بالکل آزاد تھا ——— مگر اُس کی ویران زندگی میں اچانک ایسا لمحہ آیا کہ وہ محبت کے دام سے نہ بچ سکا، ایک شاندار انسان جیسے میں اُس کو آج ہی دیکھ رہا ہوں!

اُن ہی دنوں دکی ٹرسٹی میں ایک یونانی آکر رہا تھا اور یہاں ہماری علاقہ میں ایک ویران قلعہ کے اندر روآنیہ کے ایک اعلیٰ خاندان کی معزز خاتون رہتی تھی اس کے حُسنِ سحر آگیں کا دُور دُور تک جواب نہ تھا ——— اتفاق دیکھئے کہ اس یونانی کو کہیں اُس سے محبت ہوگئی ——— اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، وہ عورت تھی بھی محبت کئے جانے کے لائق، اس کے ابرو کمان سے تھے اور آنکھیں تیر! وہ اپنی مرضی کے خلاف دمترو کو اس سے بیاہ دی گئی تھی، جو کچھ دن ہوئے اس دُنیا سے چل بسا تھا اور ——— اب سلطانہ ——— نوجوان بیوہ اپنی ہی املاک پر حکمراں تھی۔

میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یونانی نکولا اس عورت کی محبت میں مٹا جارہا تھا اُس نے عورت کو لبھانے کے لئے سب جتن کر ڈالے۔ جادو گروں اور صلاح کاروں سے مشورے لئے مگر کسی میں بھی کامیابی نہ ہوسکی۔

سلطانہ ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوئی کیا وہ بدشکل تھا؟ ——— یونانی نکولا

اچھی خاصی صورت تھی، بھوری آنکھیں، سیاہ بال ——— اور لمبا قد، بہت کچھ
وجہ خیز تھا، پھر کیا بات تھی؟ ——— وہ اسے بالکل نہیں چاہتی تھی۔ ———

ایک دن نکولا کمرہ میں بیٹھا اس نوجوان بیوہ "کو اپنے دامِ تزویر میں لانے کے منصوبے
سوچ رہا تھا ——— اُسے بس ایک ہی فکر تھی کہ کسی طرح اُس کی "معشوقۂ محبوبہ"
اُس کے قابو میں آ جائے، اُس نے اپنے دل میں سوچا کہ وہ اُس کی محبت کو آخر کیوں ٹھکرا
رہی ہے، کیا اُس کے دل میں میرے لئے خفیف سا بھی جذبۂ محبت نہیں ہے؟

یونانی نے اُس دن کا خیال کیا جب وہ سلطانہ کے قصر کے نیچے ایک خانہ بدوش
سے عشقیہ گیت گوا رہا تھا، لیکن اُس کی اس "سحر جانہ داستان سرائی" پر کسی نے توجہ
نہیں دی، اور عمارت میں برابر سکوت ہی طاری رہا۔

اب کیا ہوتا ہے نکولا نے سوچا۔

میں نہ تو بدصورت ہوں اور نہ احمق؟

پھر وہ مجھے کیوں نہیں چاہتی؟ کیا وہ کسی دوسرے سے محبت کرتی ہے۔
میں ——— ! میں کئی راتوں سے اُس پر نظر رکھے ہوئے ہوں، آج تک کوئی شخص
نہیں آیا!

جب نکولا خوابِ خیال کی دنیا میں ٹہلا اُٹھا تو وہ باہر چلا گیا اور صحن کی طرف، جہاں
اُس کے غلام گھوڑوں کو نہلا رہے تھے، "آیا" "اس طرح نہلاتے ہیں گھوڑے کو؟" وہ چیخا
اور اُس کا کوڑا ایک لڑکے کی پشت پر تڑاق سے لگا، چند قدم کے فاصلہ پر وہ مالی کو دھوپ
میں آرام کرتا ہوا دیکھ کر چلایا "کیا میں نے تجھے اس لئے رکھا ہے؟" مالی نے اپنے جسم پر
کوڑے کی شدید ضرب محسوس کی، لیکن بے قصور لوگوں پر غصہ اُتارنے سے فائدہ؟ محبت
میں البتہ بوالہوسی انسان کو وحشی ضرور بنا دیتی ہے؟

نکولا باغ میں جا کر ایک سنگین بینچ پر بیٹھ گیا اور پھر اپنی "حالتِ زار" پر غور
کرنے لگا، موسمِ خزاں کی ہوا سے سناٹا سا چھایا ہوا تھا، فضا سے حسرت و یاس جھلک رہی
تھی اور ماحول بھی بے کیف تھا، پتیاں درختوں سے رخصت ہو ہو کر فرشِ زمین پر بکھر
جاتی تھیں، اور کہیں کسی گوشہ تک تتلیوں کی طرح اُڑتی چلی جاتی تھیں ———
خوبانی کے درخت کے نیچے سُرخ پتیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا ——— جیسے خون کے قطرے
جمع ہو گئے ہوں۔

نکولا تصورات کی دنیا میں کھویا ہوا تھا، "اگر وہ مجھ پر ایک نظر بھی ڈالنے کی

روادار نہیں تو پھر یہ جینا بھی کوئی جینا ہے؟" اُس نے مرجھائی ہوئی پتیوں کی طرف
دیکھا اور سرد آہ بھری،

"وسّلی! وسّلی" وہ چلایا، ایک لمبے قد کا عمر رسیدہ آدمی دوڑ کر آیا۔

"وسّلی" آقا نے کہا "میری مدد کرو" بڈھا اُس کے سامنے چپ کھڑا تھا۔ وہ
اس شش و پنج میں تھا کہ ایک غلام اپنے آقا کی کیا مدد کر سکتا ہے ———

"وسّلی کیا تم میری مدد نہیں کر سکتے"۔

"کیسی مدد میرے آقا؟"

"اچھا فرض کرو تم اچھے مشورے دیتے ہو ——— تو اب میری مدد کرو"
بڈھا جادوگر بھی کچھ نہ کر سکا، خانہ بدوش بھی آتشِ عشق کو نہ بھڑکا سکا
تم تو میرا ساتھ دو ——— ایسے وقت پر"۔

"حضور! میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"وسّلی میرا دل نہ توڑو"۔

"میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں"۔

"کہو نا"

"مگر ہمت نہیں ہوتی"

"لو یہ ایک روپیہ ——— اب کہو"۔

وسّلی نے للچائی نظروں سے روپیہ کی طرف دیکھا،

"آقائے محترم! میں جانتا ہوں آپ دو نہیں ——— بلکہ تین روپیہ
دیں گے، معاملہ نازک ہے، ——— خیر سنئے اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو فراسنی
جاتا، اپنی محبوبہ کے کمرہ میں جبراً داخل ہو جاتا اور اُسے لیکر چلتا بنتا۔ سُنا حضور
نے میں تو یہ کرتا"۔

"تم نے جو کچھ کہا وسّلی اسے سمجھتے بھی ہو! کیا یہ ممکن بھی ہے؟"
وسّلی خاموش رہا، نکولا پیشانی پکڑ کر کچھ سوچنے لگا اور پھر بولا

"اچھا یہ بھی کر دیکھتا ہوں"۔

"میں سمجھتا ہوں یہ مشورہ دو روپیہ کے قابل ہے"۔ وسّلی نے حسرت
کے ساتھ کہا ———

اسی رات کو نکولا گھوڑے پر سوار ہو کر مع اپنے پانچ ساتھیوں کے فراسنی

روانہ ہوگیا۔ جنگل میں سرد ہوا سرسرا رہی تھی اور یہ سوار گھوڑوں پر اڑتے چلے جارہے تھے دُور فاصلہ پر کوّوں کی کائیں کائیں سُنائی دے رہی تھی۔ اِس کے علاوہ کوئی آواز نہ تھی،

آخر کار وہ سلطانہ کے قلعہ کے پاس پہونچے۔ قلعہ اندھیرے میں کوئلہ کا پہاڑ معلوم ہوتا تھا نکولا اور اُس کے ساتھی سایوں کی طرح بڑھتے ہوئے، تیزی سے قلعہ کی ہی رہ جاتا تھا پہونچے اور نہایت خاموشی سے گھوڑوں پرسے اُتر پڑے۔ اُنھوں نے دیوار، گھوڑے پر سوار، اور اوپر چڑھنے لگے، دوڑنا، پکڑنا کی چیخیں سُنائی دیں، مگر دیوار کے پاس پہ رسوار ٹھہر آیا۔ دروازے توڑ ڈالے گئے اور وہ اندر کی طرف بڑھے۔

رسی کا زینہ پھینکو!" نکولا نے کہا "میں نے تم کو پا ہی لیا!" نکولا ذرا بھی نہ گ

——— اچانک دروازہ کھلا اور فرش پر روشنی پڑی۔ نکولا بے دھڑک "آگے بڑھا چلا گیا سلطانہ اپنے کمرہ کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ سفید لباس زیبِ تن تھا۔ اُس نے نکولا کی طرف دیکھا، اُس کی سیاہ آنکھیں چمک رہی تھیں وہ خاموش کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جھک کر قدم چوم لے مگر جانتا تھا کہ اس کا کتنا مذاق اڑائے گی،

"ٹھہر جاؤ" اُس نے شیرنی کی طرح گرج کر کہا "میں سمجھی تھی کوئی چور ہوگا، مگر یہ تو آقا نکولا ہیں"

یکا یک سلطانہ کے ہاتھ میں ایک تیغہ چمکا اور اُس کے چپٹے سرے کی ضرب نکولا کے سر پر پڑی، وہ پھر بھی کھڑا رہا اُس کے آدمیوں نے لپکنے کی کوشش کی مگر سلطانہ کے آدمی چاروں طرف سے آگئے، نکولا اور اُس کے ساتھیوں کو پسپا ہونا پڑا، وہ گرتے پڑتے صحن میں پہونچے اور قلعہ سے باہر نکل کر سیدھا "ولی رسٹی" کا راستہ لیا۔

"خدا مجھ پر رحم کرے" نکولا نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا "میں بھی کیسا بدقسمت ہوں ——— اب کیا کروں"!

وہ نومبر کی سرد رات کو یہی سوچتا رہا کہ "مجھے چاہیے ——— مجھ سے محبت کرو"

وہ بڑبڑاتا "میں بدقسمت ہوں" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر کہتا "حیرت انگیز عورت ہے، اُس کی آنکھیں کس غضب کی ہیں، او خدا ——— او خدا میری مدد کر ——— میں مر جاؤں گا" وہ یہی خواب دیکھتا رہا "حیرت انگیز عورت ——— غضبناک آنکھیں"

——— اُس نے ایک بار پھر وسلی کو بلایا اور کہا "وسلی مجھے خالی ہاتھ واپس آنا پڑا ——— میں شرم سے زمین میں گڑا جا رہا ہوں۔ کیسی عورت ہے! ——— میری کالی روح اسکی آرزو مند ہے، میری مدد کرو، میں دو روپیہ دوں گا"

وسلی نے خاموشی سے جواب دیا،

"میں جانتا ہوں کہ آپ ڈر گئے، وہ ایک بہادر عورت ہے، اگر مجھے پانچ یا چھ روپے ملیں تو ایک نیا راستہ بتاتا ہوں ———"

"بتاؤ وسلی ——— ورنہ میں برباد ہوجاؤں گا"

"بتاتا ہوں آقا ——— ہاں تو پانچ روپیہ ملیں گے نا؟ ——— لیکن مجھے حضور سات ——— مرتبہ ——— سات دیں گے، خاتون آپ کے پاس آجائے گی آقا! میں کوسما رکیور کو آپ کے پاس لاؤں گا۔ آپ میرے ہاتھ پہ دو روپیہ رکھئے اور وہ سلطانہ کو آپ کے آغوش میں پہونچا دے گا۔

جب نکولا نے کوسما کا نام سُنا تو وہ چونکا اور آہ بھرتے ہوئے کہا:-

"اچھا یونہی سہی"

تیسرے دن کوسما آیا، نکولا صنوبر کے درخت کے نیچے بیٹھا تمباکو پی رہا تھا، وہ بڑی دیر تک کوسما کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا، کوسما آہستہ آہستہ آگے آیا، اُس کا بایاں ہاتھ گھوڑے کی گردن پر تھا، پاؤں میں لمبے بوٹ پہنے تھا جس میں لوہے کے نعل لگے تھے، اُس کی صدری چمڑے کے پٹکے سے نیچے ڈھلک آئی تھی کمر پر بندوق لٹک رہی تھی اور سر پر سیاہ اونی ٹوپی جھک رہی تھی، وہ ایک خاص شانِ استغنا کیساتھ قریب آرہا تھا، وسلی دوڑ کر اپنے آقا کے پاس پہونچا اور کہا آقا اس آدمی کی طرف دیکھئے یہ آپ کے لئے جہنم سے شیطان تک پکڑ لائیگا ———"

نکولا نے کوسما پر نظر ڈالی، اس نے نہایت متانت سے کہا "خدائی مدد آپ کے شاملِ حال ہو"

آقا خاموش رہا۔

"بھائی کوسما تم خوب وقت پر آگئے" وسلی نے کہا۔

"ہاں آگیا، کوسما نے جواب دیا۔

"ہمارا اسکیم میں مدد کرنے کے لئے نا؟"

میرے بزرگ مولوی انعام اللہ خاں گلی ذاتی کے واحد فرد تھے اُن کے یہاں اہلِ علم کا جماؤ رہتا تھا۔ میرے چچا ڈاکٹر انعام اللہ مرحوم کے احباب خاص سے تھے۔ مجھ پر نظرِ عنایت رکھتے تھے۔ میرے لکھنے پڑھنے کا شوق دیکھکر میری طرف متوجہ ہوگئے۔ خانصاحب ماسٹر مشنکر دیال بی۔ اے دکیل جو مرزا غالب کے نثر و نظم میں شاگرد تھے اُن سے نثر پر اصلاح لیتے۔ اس کے بعد خاں صاحب علاج کے لئے دلّی گئے۔ اپنی لطیفہ گوئی اور لیاقت سے حکیم محمود جان سے دربار کے رکن رکین تصور کئے جانے لگے۔ حکیم صاحب خاص شفقت فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ اُن کے خطوط لکھنے کی خدمت خانصاحب کے سپرد تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُردو نثر لکھنے میں اُردوئے معلیٰ کا سا لطف پیدا ہو جاتا تھا۔ راقم نے اُن سے ہی اصلاح لی۔ مرزا بھی خاں صاحب کے یہاں جاتے۔ خانصاحب مرزا کے والد اور چچا کے مخصوص دوستوں میں سے تھے۔ مرزا عظیم بیگ مرحوم کو بھی لکھنے پڑھنے کا شوق خانصاحب کی صحبت سے ہوا۔

اس زمانہ میں آگرہ میں شدھی اور سنگھٹن کا بڑا زور تھا۔ تبلیغی جماعتیں دُور دُور سے آگرہ آگئی تھیں۔ کچھ عرصہ کے لئے عجیب چہل پہل ہوگئی تھی۔ ہر شخص مبلغ بنا ہوا تھا۔ مرزا پر بھی اثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ بھرت پور کے مشن میں اپنے والد اور دیگر علمائے مشاہیر کے ساتھ یہ بھی گئے تھے۔ ایک مسجد راجہ نے ڈھادی تھی۔ اس کے سلسلے میں راجہ کے پاس وفد گیا تھا۔ ان واقعات کا اثر آنا پڑا کہ کفر توڑ وغیرہ دیکھ کر خود نے سنگھٹن توڑ نامی کتاب لکھ ماری۔ مگر اپنے چچا کے نام سے شائع کی۔ خان بہادر اپنے لڑکوں کی تعلیم کی خاطر علی گڈھ جا بسے۔ مرزا بھی رام پور سسرال گئے اور وہاں سے علی گڈھ جا پہنچے اور بی۔ اے کی تعلیم میں لگ گئے۔ مگر اُس کے ساتھ نواب مزمل اللہ خاں مرحوم کے کارخانہ میں بھی ملازمت اختیار کرلی۔ بی۔ اے کیا اور پھر ایل۔ ایل۔ بی۔ مزمل گولڈ میڈل یونیورسٹی سے اقتصادیات میں پایا۔ اُن کی تعلیمی کفالت میں بڑا حصہ آنریبل نواب بہادر ڈاکٹر حاجی سر محمد مزمل اللہ خاں کے۔ سی۔ آئی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی کا ہے۔

۱۹۲۲ء میں بموقعہ جبلی مسلم یونیورسٹی راقم سطور بھی گیا تھا۔ خان بہادر کی کوٹھی پر مقیم ہوا۔ مرزا فہیم بیگ صاحب اور حفظ الرحمٰن صاحب لاہوری جامع انسائیکلو پیڈیا سے بھی وہیں ملنا ہوا تھا۔

لطیفہ مرزا آگرہ میں جب رہتے تھے فرصت پاکر میرے پاس زیادہ وقت صرف کرتے۔ ستجارت فیل کا کاروبار اس وقت اچھا تھا۔ بچا ہے مرزا کو پاسیر کا عارضہ تھا جس سے قبض کی سخت شکایت رہتی۔ "اینما" کی عادت ڈال رکھی تھی۔ ایک روز کہنے لگے "جملہ امراضِ شکم کا واحد علاج "اینما" ہے" بات آئی گئی ہوئی۔ تھوڑے دن بعد حفظانِ صحت کے اصول پر گفتگو کرتے ہوئے "علاج بے دوا" کی اسکیم مرتب کی گئی۔ خود نے مفصل مضمون لکھا، اپنا نام اور میرا پتہ لکھکر "درویش" میں چھپنے کو بھیجدیا۔ موٹے موٹے اصول حفظانِ صحت کے پانی کا مقررہ وقت پر پینا آفتاب نکلنے سے پہلے ٹہلنا غسل کرنا کھانا خوب چبا کر کھانا وغیرہ چنانچہ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے کچھ باتوں کو معمول بنالیا جس سے فائدہ بھی ہوا۔ انھوں نے اس کا ذکر روزنامچہ میں کردیا۔ پھر کیا تھا ڈاک کا تانتا بندھ گیا ہر شخص اپنے حالات سے صفحہ کے صفحہ سیاہ کرتا۔ غرضکہ جوابی خط آتے ان کو کچھ حفظِ صحت کی ہدایات لکھی جاتیں اور آخر میں "اینما" کی تلقین ضرور ہوتی۔ مرزا کے علی گڈھ چلے جانے سے اس وبال سے جان چھٹی"۔

مرزا نے ۱۹۳۱ء سے افسانہ نگاری شروع کی ۱۹۳۴ء کے بعد سے مجھ سے پھر ملنا نہ ہوا۔ میں کشمیر تھا۔ مرزا اور شاہد احمد صاحب مدیر "ساقی" آگرہ آئے اور دائرہ شاہ دلگیر میں سید انتظام الدین شاہ کے یہاں ٹھہرے مجھے تلاش کرایا مگر میں تھا ہی نہیں جو ملتا۔ شاہد صاحب ہی نے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ مرزا مستقلاً جودھپور جاکر آباد ہوگئے۔ وہیں شغلِ وکالت شروع کیا۔ ۱۹۳۶ء میں جاورہ میں چیف جج ہوگئے۔ عارضہ ضیق النفس میں مبتلا تھے مگر لکھنے پڑھنے کا شوق جاری تھا۔ جب میں ۱۹۳۶ء میں "شاعر" کا آگرہ نمبر مرتب کر رہا تھا تو اُس وقت مرزا نے اپنے خود نوشت حالات بھیجے تھے پھر کوئی نہ اُن کا خط آیا اور نہ میں نے ہی لکھا۔

تصانیف مرزا نے فسانہ لکھنے کی دلربا طرز اختیار کی جس نے مرزا کو عام قبولیت دلوائی کثیر التعداد تصانیف یادگار رکھی ہیں

ناول خانم۔ کونتار۔ چینی کی انگوٹھی۔ شریر بیوی۔ گھر یا بہادر دیکھا جائیگا۔ وبہائر جنت کا بھوت۔ فل بوٹ۔ کمزوری۔ خطوط کی ستم ظریفی تہذوری۔ چکی وغیرہ۔ ڈرامہ۔ مرزا جنگی وغیرہ۔

افسانے روحِ ظرافت۔ روحِ لطافت۔ بحرِ ظرافت۔ قرضِ معراض۔

فرزند سرمد۔ قدردان۔

متفرق۔ نمرِ صحرا۔ ملفوظاتِ ٹامی۔ نفولیعن۔ ساقی کا چغتائی نمبر شائع ہوا ہے۔ مرزا نے مزاح نگاری میں جو معیاری درجہ حاصل کیا وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ موجودہ دور کے مزاح نگار الفاظ سے ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن مرزا کا یہ کارنامہ تھا کہ وہ خیالات سے ہنسا دیتے تھے۔ مزاحیہ رنگ میں ایک سکتے کی خودنوشت سوانح لکھی ہے۔ اُن کے مضامین کثرت سے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

مرزا عرصے سے علیل تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی مرزا نسیم بیگ بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی آگرہ میں وکالت کرتے ہیں۔ اُن سے حال معلوم ہو جاتا تھا۔

وفات ۲۵ رجب ۱۳۶۰ھ بروز سہ شنبہ انتقال فرمایا۔ باپ اور چچا کے پہلو میں گھوڑا پیر کی درگاہ میں سپردِ خاک کئے گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی

اَنیائے

کتنا گھور اَنیائے، ایشور کتنا گھور اَنیائے

بھلے کھٹور ہیں سنتاں کے، جو مات پتا کہلائے
پُتری کے ستونتی من کو دھن کی بھینٹ چڑھائے
جس سے پریم نہ ہو ناری کو، اُس سے بیاہ رچائے
کتنا گھور اَنیائے

پیٹ کے کارن دن بھر کوئی انیک کشٹ اُٹھائے
بیری پیٹ بھرے نا پھر بھی، بالک کُھلا جائے
بنئے کو ہو جائے ان پچھ، توندانی سہلائے
کتنا گھور اَنیائے

دے دکھیان دھرم ناش کا پنڈت جی رنگ لائے
مُلّا کہے "اسلام اِن ڈینجر" بے سُر کی یوں گائے
سیدھے سادے لوگوں کو یوں آپس میں لڑوائے
کتنا گھور اَنیائے

لیکر اوٹ جنیو کی، پنڈت روپ پہ ڈورے ڈالے
گیان کا دھیان کہاں جب پڑ گئے آپ ہی "کام" کے پالے
پھر بھی پاپی جگ میں مورکھ اک گیانی کہلائے
کتنا گھور اَنیائے

شاعر کہے سچ کی رو تو، مورکھ اِسے نہ بوجھے
جس کے من میں ہو اندھیارا، اُجیالا کیا سوجھے
اپرم پار پربھو کی مایا، کیا نیائے، اَنیائے
کتنا گھور اَنیائے

انتظام شہابی

Islam in Danger

ہمنشینِ اقبال کا ایک ترانہ

کوئی لازوال خلش ابھی میرے دل کے زخمِ نہاں میں ہے
کہ جواب میرے ضمیر کا نہ زمیں میں ہے نہ زماں میں ہے

نہ جلال میرے قیام میں نہ جمال میرے سجود میں
نہ حضور میری نماز میں نہ پیام میری اذاں میں ہے

مرا ذکرِ نیم شبی غلط۔ سخنِ خفی و جلی غلط
نہ فسوں ہے میرے کلام میں نہ طلسم میرے بیاں میں ہے

نہ وہ ملتفطے نہ وہ غلغلے نہ وہ شوکتیں نہ وہ ہیبتیں
نہ وہ رحمتیں نہ وہ بخششیں نہ وہ شان اہلِ جہاں میں ہے

مری سنگ رہ ہیں غلامیاں مری تلخیاں مری خامیاں
نہ کمال میری بہار میں نہ زوال میری خزاں میں ہے

ابھی نوجواں مری قوم کے نہ غیور ہیں نہ جسور ہیں
نہ مزاج ہے ابھی سنگ میں نہ جمود کوہِ گراں میں ہے

مرے دل کے بحرِ محیط میں نہ نشیب ہیں نہ فراز ہیں
ہے کہاں کی آبرو دیکھنی تو وہ جوشِ طبعِ رواں میں ہے

مجھے تیری ذات سے ہے گلا مجھے پیدا تونے وہاں کیا
جہاں ذہن اب بھی غلام ہیں جہاں تو بھی وہم و گماں میں ہے

یہ عجب نہیں ہے کچھ اے ثمر کہ جو کائنات لرز اُٹھے
جو ہوا تھا طور پہ شعلہ زن وہی سوز میری فغاں میں ہے

عبدالکریم ثمر

دخترانِ ہند اور جنگی تعلیم

لڑکیوں کی بھیڑ آتی ہے نظر اسکول میں
یہ وبا پھیلی ہے ہندوستاں کے عرض و طول میں

صبح ہوتے ہی دبا کر اپنی بغلوں میں کتاب
جا رہی ہیں منہ پہ ڈالے بے حجابی کی نقاب

بے حجابانہ نظر میں شرم و غیرت کچھ نہیں
پاسِ عصمت جذبۂ ناموسِ ملت کچھ نہیں

رہ کے ہندوستان میں تقلیدِ یورپ کا خیال!
کیوں نہ ہو اس ملک میں قومی شرافت کا زوال

رسم پردے کی اٹھانی ہے اگر مدِ نظر
جنگ کی تعلیم دینی چاہیے جی کھول کر

ان سنہلی تتلیوں سے کوئی نکلے کام بھی
چاہیے آغاز میں اندیشۂ انجام بھی

موہنی فوج اک نئی تیار ہونی چاہیے
نازنیں ہاتھوں میں بھی تلوار ہونی چاہیے

ساری دُنیا ہو چکی بسمل نگاہِ ناز سے
یہ بنا دستہ بھی اب نکلے نئے انداز سے

منہاج سریری گیاوی

ڈانٹے کا سرمایۂ شاعری اور ابو العلا

اکتوبر کے شاعر میں جنابِ شمیم نعمانی نے "ڈانٹے اور اُس کا سرمایۂ فکر" کے عنوان سے ایک مفید مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ اس مضمون میں فاضل مقالہ نگار نے ڈانٹے کے شاعرانہ کمالات کے متعلق کچھ مختصر اشارے کئے ہیں۔ مجھے اُن کے متعلق کچھ عرض کرنا نہیں ہے۔ اس مقام پر جو گذارشیں پیش کرنی ہیں وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے جناب شمیم کے موضوعِ بحث سے کسی قدر مختلف ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ڈانٹے کا شمار دُنیا کے "اعاظم شعرا" میں ہے۔ ہومر، شیکسپیر وغیرہ کے دوش بدوش اِن کا نام لیا جاتا ہے۔ خصوصیت سے اُس کی ڈیوائن کیڈی "العوبہ الہیہ" کا ذکر علمی وادبی ذوق رکھنے والوں میں بڑے احترام کے ساتھ کیا جاتا ہے تاہم اس سلسلہ میں اگر یہ تاریخی حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ ڈانٹے کا وہ شاہکار جس پر اُس کی شہرت کی عمارت قائم ہے بہت کچھ عرب کے ایک نابینا فیلسوف شاعر ابو العلا المعری کا رہینِ منت ہے تو علمی وادبی دیانت کے عین مطابق ہوگا۔

شاید قارئینِ "شاعر" مشرق کی موجودہ عقل و دانش کے اضمحلال کو دیکھتے ہوئے اس پر تعجب کریں کہ یورپ کے ادبی اقلیم کا ایک زبردست فرمانروا کسی ایشیائی شاعر کے خرمنِ ادب سے خوشہ چینی کر کے دنیا میں اپنی غیر معمولی سرمایہ داری کا سکہ چلائے۔ لیکن یہ ذرا بھی قابلِ تعجب نہیں ہے۔ مشرق کے موجودہ دورِ اضمحلال سے اس کے ماضی کی "علمی جلالتوں" کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مشرق کے علم و دانش کے ایوانوں میں کبھی وہ چراغ بھی جلتے تھے۔ جن سے یورپ کے ہر خطہ میں روشنی حاصل کی جاتی رہی ہے۔ ڈانٹے کا ابو العلا المعری کے خوانِ شاعری سے کچھ ریزے چن کر ڈیوائن کیڈی "العوبہ الہیہ" کا دسترخوان بچھانا آج کی بات نہیں ہے۔ یہ بھی اُس زمانہ کی داستان ہے جب عرب کی تہذیب و شائستگی کا مہرِ کمال عروج پر تھا۔

آئیے مختصر طور سے وہ داستان بھی سُن لیجئے۔ جس سے ڈیوائن کیڈی کے تخیل کی ندرت ڈانٹے سے ہٹ کر ایک عرب شاعر کے نام ہو جاتی ہے۔

عرب کا یہ مشہور فلسفی شاعر سنہ ۳۶۳ھ ہجری میں پیدا ہوا تھا اور ۴۴۹ھ میں اُس نے وفات پائی۔ اس زمانہ کے تمام علوم عصریہ بالخصوص فلسفہ و حکمت سے وہ خوب واقف تھا۔ اُس کا ایک دوست تھا ابن القارح جو فلسفیانہ خیالات میں اُس کا بالکل ہم مذاق تھا۔ اُس نے ابو العلا کو ایک خط لکھا تھا جس میں کچھ "حریتِ فکر" کے مظاہرے کئے گئے تھے۔ ابو العلا نے اس کے جواب میں ایک خاص قسم کا بہت بڑا طولانی خط لکھا جس میں نہایت ہی ظریفانہ پیرایہ میں عقائد کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے۔

ابو العلا کا یہ عجیب و غریب مکتوب رسالہ "الغفران" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس خط کا نام "الغفران" کس نے رکھا ہے۔ آیا خود معری نے یا ابن القارح نے یا کسی اور نے؟ آغاز خط میں ابو العلا نے ابن القارح کی زبان سے حشر و نشر اور حساب و کتاب کی داستان بیان کرنے کے بعد پل صراط کی منظر کشی کی ہے اور وہ تمام روداد بیان کی ہے جو ابن القارح پر عبور کی مصیبتوں کے وقت گذری ہو۔ وہاں سے پھر جنت میں ابن القارح کو پہونچایا ہے۔ عجیب عجیب دلنواز طریقوں سے وہاں کے پھلوں، وہاں کی حوروں، وہاں کے چشموں کے حالات لکھے ہیں۔ اس سیر و تماشا کے بعد ابن القارح کو دوسرے مقامات کی تفریح کراتے ہوئے عفریتوں اور ابلیسوں کی سکونت گاہوں تک لے گیا ہے۔ یہاں ابن القارح اور معلم الملکوت جناب عزازیل میں خوب خوب سب و شتم اور لعن و طعن کا مقابلہ رہا ہے۔ بعد میں پھر ابن القارح جنت واپس ہوئے ہیں۔ غرضکہ یہ مکتوب مسمی بہ الغفران جنت و اعراف وغیرہ کے سیر و تماشا کی ایک دلچسپ روداد ہے جس کی اندرونی تہوں میں جنت و اعراف وغیرہ کے مادی تخیل کے ساتھ "رندانہ استہزا" کی شوخیاں موجود ہیں۔

اس مکتوب میں جنت و دوزخ وغیرہ کی جو لطیف حکایات ابھرتے عنوان سے بیان کی گئی ہے بظاہر اسی پر ڈانٹے کی ڈیوائن کیڈی کی بنیاد ہے صرف اتنا فرق ضرور ہے کہ ڈانٹے نے ہر مقام پر جزئیات کی تفصیل بہت کر دی ہے اور اپنے مقامی و مذہبی تصورات کے رنگ میں اُسے رنگ دیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی

"ہاں"

کوسا کا چہرہ اسقدر سنجیدہ نظر آرہا تھا کہ جیسے مسکراہٹ کبھی اسکے چہرہ پر آئی ہی نہیں ہے۔

"اچھا ـــــ اچھا! تم آگئے کوسا"

نکولا نے کہا جیسے وہ خواب سے چونک پڑا ہو" وسلی! جاؤ جلدی کافی بھیجو!"

"میں کافی نہیں پیتا" کوسا نے کہا

"تم نہیں پیتے؟" نکولا نے آزردگی سے کہا" تم میری مدد کرنے آئے ہو ـــــ کیا قیمت لوگے اپنے کام کی؟"

"پچاس روپیہ"

"اچھا مجھے منظور ہے"

"وسلی منی بیگ لے آؤ"

"نہیں" کوسا نے کہا" مجھے روپیہ کی ضرورت نہیں"

"کیا؟" نکولا نے حیرت سے کہا" تمہیں ضرورت نہیں"

"یہ ایک قسم کا سودا ہے، میں پہلے فراسنی کی ملکہ کو لاؤں گا، جب خاتون آپ کے پاس پہونچے تو پھر مجھے روپیہ دیجئے گا"

"کیا بات ہے!" وسلی نے کہا" وہ آپ کو عورت دیگا، آپ اس کو روپیہ دیں گے۔ میں نے آپ سے کہا نہ تھا کہ یہ آپ کے لئے جہنم سے شیطان تک کو پکڑ لائیں گے ـــــ سلطانہ بھی اتنی ہی اچھی ہے جیسے آپ"

کوسا باغ میں آگیا، اُس نے اپنا گھوڑا ایک درخت سے باندھ دیا، اور اپنے لبادے کو اوڑھ کر سوگیا۔

ـــــ "بے شک وہ بہادر ہے ضرور کامیاب ہوگا" نکولا نے اپنے دل میں کہا۔

جب رات ہوگئی، تو کوسا نے گھوڑے پر زین کسی اور اُچک کر سوار ہوگیا، اُس نے چلتے وقت نکولا سے کہا:-

"آقا! کھیت کے سرے پر میرا انتظار کیجئے گا"

دروازے کھلے، گھوڑا نکلا اور تیر کی طرح اُڑا چلا گیا۔

چودھویں کا چاند چاندنی کی پاشی کر رہا تھا، موسم خزاں کے کہر میں سے روشنی چھن چھن کر خاموش پہاڑیوں اور تاریک جنگلوں پر پڑ رہی تھی۔ خاموشی اور سکوت میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازیں گونج رہی تھیں، کوسا کہر کو چیرتا جنگل میں سے گذرتا چلا جارہا تھا ـــــ وہ نیلی روشنی میں بالکل بھوت معلوم ہو رہا تھا ـــــ

آخرکار وہ فراسنی پہونچ گیا ہر شخص سو رہا تھا، دروازے بند تھے ـــــ کوسا نے دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔

"کھولو" کوسا نے کہا۔

"تم کون ہو آخر؟"

"کھولو" کوسا نے گرجکر کہا۔

اندر سے کھسر پھسر اور بڑبڑانے کی آوازیں آئیں۔

"میں کتنی دیر سے دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہا ہوں۔

"ہم نہیں کھول سکتے"

"کھولو ـــــ میں کوسا ریکور ہوں"

دروازے پر روشنی نمودار ہوئی اور پھر غائب ہوگئی۔ اس کے بعد دروازہ کھلا، کوسا صحن تک چلا گیا اور گھوڑے پر سے وہاں اُتر پڑا، وہ اندرونی دروازہ میں داخل ہوا،

"دروازہ کھلا ہے" اُس نے اپنے دل میں کہا" عورت بڑی دلیر معلوم ہوتی ہے ـــــ" اُس کے جوتے کے نعل اندھیرے میں بجے، کسی کمرہ میں کچھ شور سا ہوا، راستہ پر تیز روشنی پڑی، سلطانہ اپنے کمرہ کی دہلیز پر نمودار ہوئی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور سفید لباس پہنے ہوئے تھی۔

"تم کون ہو؟ اور کیا چاہتے ہو؟" اُس نے کہا

"میں تمہیں آقا نکولا کے پاس لیجانے کے لئے آیا ہوں" کوسا نے کہا

"اچھا تم اس لئے آئے ہو" سلطانہ نے اپنا قہقہہ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں اور تمہارے آقا کو اچھی طرح مزا چکھاؤں گی"

کوسا ایک قدم اور آگے بڑھ گیا، اُس نے سلطانہ کی کلائی پکڑ لی اور اسکا تیغہ دور جا گرا، سلطانہ چلائی۔

"گیبرل ـــــ تھکیسے، تودُو ـــــ مدد"

تمام لوگ نکل آئے، مگر وہ دروازہ پر ہی کھڑے رہے، کوسما پھر اُس کے قریب پہونچا، سلطانہ نے اُس کو پیچھے ڈھکیلا اور ایک دم ایک خنجر اٹھالیا۔

"تم لوگ بزدل سب کیوں کھڑے ہو ——— باندھ لو اس کو۔"

"سلطانہ" کوسما نے کہا "کیوں وقت ضائع کر رہی ہو ——— تم بہادر ہو

نوکروں نے آہستہ سے کہا۔

"ہم انھیں کیوں کر پکڑ سکتے ہیں محترمہ! یہ کوسما ہیں ——— کوسماریکولر طلسمی انسان!"

"ذلیل کہیں کے"! سلطانہ نے کہا، اور اپنے آپ کو کوسما پر گرا دیا، اُس نے دونوں کلائیاں مضبوطی سے باندھ دیں اور اُس کو اُٹھالیا ———

"راستہ دو" سب الگ ہوگئے، کیسی عورت ہے کوسما نے کمرہ سے باہر نکلتے ہوئے دل میں کہا "نکولا نے بھی کیسی عورت کو پسند کیا ہے"!

سلطانہ نے اپنے آدمیوں پر نظر ڈالی اُس کے بعد اُس نے اپنے صیاد کی فولادی عزم والی آنکھوں اور بھرے ہوئے چہرہ کی طرف دیکھا۔ جو اس کو اٹھائے ہوئے تھا۔

"تم کون ہو؟"

"کوسماریکولر"!

اُس نے خوفزدہ نوکروں کی طرف پھر دیکھا اور خاموش رہی، اب وہ سمجھ گئی، جب وہ باہر آگئے تو کوسما گھوڑے پر سوار ہوگیا اور آگے سلطانہ کو بٹھالیا ———

رات کی تاریکی میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازیں پھر گونج رہی تھیں۔

"کیسی عورت ہے"! اُس نے خیال کیا۔ اور اس کا گھوڑا سایہ کی طرح اڑنے لگا سلطانہ نے چاند کی روشنی میں کوسما کی طرف دیکھا۔

"سلطانہ میری طرف کیوں دیکھتی ہو؟"

گھوڑا اڑا چلا جا رہا تھا۔ سلطانہ کی زلفوں کی لٹیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ سلطانہ کوسما کے فولادی بازوؤں اور چمکیلی آنکھوں سے مسحور ہوگئی تھی۔

"سلطانہ کیوں گھور رہی ہو؟"

"تم کانپ کیوں رہے ہو؟"

"کچھ نہیں"

"کیا سردی معلوم ہو رہی ہے؟"

جنگل میں گھوڑے کی ٹاپیں گونج رہی تھیں، اچانک انھیں ادھر اُدھر کچھ سائے حرکت کرتے نظر پڑے۔

"یہاں کون ہے؟" سلطانہ نے پوچھا۔

"نکولا ——— تمہارا آقا ——— ہمارا انتظار کر رہا ہے"!

سلطانہ خاموش ہوگئی، لیکن کوسما نے محسوس کیا کہ سلطانہ کو کیا دھچکا لگا کیونکہ اُس کے بند ٹوٹ گئے، اُس کے نقرئی ہاتھ آزاد ہوچکے تھے، سلطانہ نے دائیں ہاتھ سے باگ پکڑلی۔ اور بایاں ہاتھ کوسما کی گردن میں حمائل کر دیا، گھوڑا چکرایا، سلطانہ نے اپنا سر کوسما کے سینہ پر رکھ دیا۔

"مجھے کسی دوسرے کے حوالے نہ کرو"!

اُس نے آہستہ سے کہا۔

——— اور گھوڑا بھوت کی طرح نیلی روشنی میں اُڑنے لگا اس کی ٹاپوں کی آواز کھیت کے کنارے پر سنائی دے رہی تھیں، نقرئی پتیاں چمک رہی تھیں ——— سلطانہ کی سیاہ زلفیں ہوا میں لہرا رہی تھیں ——— دونوں کے سایہ تیرتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ پہاڑیوں کی روشنی، گھنے کہر اور تاریک رات میں ——— وہ دُور ——— نکولا کی پہونچ سے بھی دُور ——— اُڑے چلے جا رہے تھے۔

(ترجمہ)

رشدی مدیر "ندیم" بھوپال

ماتھوں کی چاندنی میں

اکثر مشاہدہ سے گذرا ہے زندگی میں — پلتی ہے دشمنی بھی آغوشِ دوستی میں

جو رنگ چاہو بھر دو لیکن یہ یاد رکھو — تم بولتے ہو میری تصویرِ بیکسی میں

دل سے نہیں تو میری خاطر ہی مسکرا دو! — درکار ہے اضافہ سامانِ زندگی میں!

تصنیف ہم نے کی ہے برسوں کتابِ اُلفت — زُلفوں کی نکہتوں میں ماتھوں کی چاندنی میں

ہوش و خرد کی شمعیں بے نور ہو چلی ہیں — ساقی دیئے جلا دے ہر طاقِ بیخودی میں

یکسر نشاط و غم کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں — دل لگ گئے ہیں اکثر اَیسی کی دل لگی میں

ترسے ہوئے دلوں کی اللہ رے نزاکت — آنسو اُبل پڑے ہیں اکثر ہنسی ہنسی میں

تکمیل کا یقیں ہے دونوں سے بے تعلق — رولیں کہ مسکرالیں دو دن کی زندگی میں

ہر انجمن میں دیکھیں ہر انجمن میں پائیں — اندوہ کی خراشیں چہروں کی تازگی میں

اب یوں گذر رہے ہیں لیل و نہارِ ہستی — ہر سانس جا رہی ہے اَقساطِ خودکشی میں

ہوتی ہے بارِ خاطر احسان زندگی بھی
ایسا بھی اک زمانہ آتا ہے زندگی میں

احسان دانش

کلام و پیام

ترے ہوتے ہوئے ظلم و تشدّد — بتا! تو اسقدر خاموش کیوں ہے؟

ترے دامن پہ شعلے لوٹتے ہیں — ابھی تک تو مگر بیہوش کیوں ہے؟

سراپا لغزشِ مستانہ ہو کر — مجسّم ساغرِ مینوش کیوں ہے؟

تری جنبش میں پنہاں ہے قیامت — مٹا دے خواجگی، خاموش کیوں ہے؟

تری ہمت ہے۔ نسیمِ صبحگاہی — مسرت ریز ہو! غم کوش کیوں ہے؟

زمانہ ڈھونڈتا پھرتا ہے تجھکو — اِدھر آ سامنے روپوش کیوں ہے؟

پھر — ! ضربِ کلیمی اِک لگا دے
جہاں کا گوشہ گوشہ جگمگا دے

فرحت شاہجہانپوری

مرزا عظیم بیگ چغتائی

خاندانی حالات

مرزا عظیم بیگ ابن مرزا قسیم بیگ ابن مرزا کریم بیگ ابن مرزا رحیم بیگ چغتائی نبیرۂ امیر شمس الدین ملک، امیر شمس الدین احمد شاہ کے ساتھ آئے اور پانی پت کی جنگ میں کارہائے نمایاں کئے۔ مغلوں میں چغتائی اور برلاسی خاندان آگرہ کے مشہور ہیں۔

مرزا اکبر بیگ کوتوال ابن مرزا مبارک علی بیگ برلاس کو ہی نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی پھوپی زاد بہن موتی بیگم منسوب تھیں جن کے بطن سے ڈپٹی مرزا ذوالفقار علی بیگ تھے۔

مرزا کریم بیگ کے اسلاف کا پیشہ سپہ گری تھا جو ایک دو پشتوں سے کشمیر سے آگرہ آ گئے تھے مگر مرزا کریم بیگ نے علمائے عصر سے رسمیہ تعلیم پائی اور کرنل سیک فرگسن پریذیڈنٹ ریاست گوالیار کے سرمنشی ہو گئے وہاں سے سبکدوش ہوئے تو زرنگاری اور سرکہ سازی کی تجارت اختیار کی، وہ اپنے وقت کے کامیاب تاجر تھے۔ سرکہ والے کرکے مشہور تھے۔ مولوی مرزا ابراہیم بیگ ابن مرزا کریم بیگ ذی علم و ذی لیاقت بزرگ تھے ایف۔ اے تک انگریزی تعلیم حاصل کی تھی۔ فارسی کے بڑے ماہر تھے۔ عربی میں طالبعلمانہ استعداد تھی شعر گوئی سے شوق تھا۔ "مرقع کمال" اور "کارزارِ تسلی" وغیرہ اُن کی تصانیف سے ہیں۔ اُن کے دو شعر ہیں

اجل سے گئی سب کو زیرِ زمیں
نہ روتے رہے اور نہ ہنستے رہے

رہی اپنے مرقد پہ دائم بہار　　سدا ابرِ رحمت برستے رہے

مرزا قسیم بیگ نے سر سید احمد خاں کے عہد میں بی۔ اے محمڈن کالج سے کیا ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لی۔ خان بہادری کا خطاب پایا وطن لوٹے تو اسپیشل مجسٹریٹ ہو گئے۔ وقفِ امدادیہ کے نگراں رہے وکل کمیٹی اہلِ اسلام کے ممبر ہونا چاہتے تھے مگر مولوی ضیاء الاسلام اُن کے مقابلہ میں کامیاب ہو گئے۔ اربابِ وطن کی بے مہری سے دل چھوڑ دیا اس کے بعد جودھپور چلے گئے اور کچھ عرصہ بعد ریاست کی طرف سے سانبھر لیک میں مجسٹریٹ ہو گئے۔ آخر میں جودھپور آ گئے تھے۔ کچھ روز کے لئے آگرہ بھی آئے مرضِ اسہال میں مبتلا تھے پھر جودھپور لوٹ گئے اور ایسے گئے کہ وہیں پیوندِ خاک ہو گئے

پیدائش

مرزا عظیم بیگ چغتائی ۱۲ اگست ۱۸۹۵ء میں غازی پور میں پیدا ہوئے۔ خان بہادر وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مرزا ابراہیم بیگ متخلص مرزا نے تاریخ پیدائش ۱۳۱۲ھ سے نکالی۔ ۱۹۰۳ء میں خان بہادر زادہ بدل آئے۔ مرزا کی یہیں تقریب بسم اللہ ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد مین پوری کا تقرر عمل میں آیا۔ میاں جان جن کا مشغلہ کتب داری تھا اُن سے اُردو کا قاعدہ پڑھا ۱۹۰۴ء میں بدایوں بدلی ہو گئی۔ یہاں مرزا کو قرآن مجید پڑھانے کے لئے مولوی احمد حسین مقرر کئے گئے کچھ عرصہ بعد بدایوں کے تحصیلی اسکول میں داخل ہوئے ۱۹۱۱ء میں مرزا ساتویں درجہ میں تعلیم پاتے تھے۔ آخرش اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ سے انٹرنس پاس کیا۔ کوآپریٹو ٹریننگ کلاس میں بھی داخل ہوئے۔ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوئے۔

سوانح حیات

۱۹۲۰ء میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ بورڈ بنک ضلع ایٹہ مقرر ہوئے۔ حضرتِ فتنہ سندیلوی سے ملنا جلنا تھا۔ اُنکی شادی کی تقریب سے گوپامو تعلقدار عبدالصمد کے یہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ راقم سطور سے یہ کہا کرتے تھے کہ تمہارے بزرگوں کے کھنڈرات دیکھ آیا ہوں۔ سندیلہ سے نوکری چھٹی تو باپ کے پاس بہرائچ چلے گئے۔ ۱۹۲۱ء میں نائب تحصیلداری کے فراق میں وطن آئے۔ کمشنر صاحب نے توجہ ہی نہیں کی۔ پھر یہیں کچھ عرصہ کے لئے رہ پڑے۔ جبھی سے راقم سے راہ و رسم ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں خان بہادر مرزا قسیم بیگ پنشن لیکر وطن آ گئے انھیں دنوں میں مرزا عظیم بیگ کوآپریٹو بنک میں منسلک ہو گئے تھے۔ خان بہادر صاحب راقم سطور اور نواب اظہر حسین صاحب اہلِ حرفہ کی کوآپریٹو سوسائٹی قائم کرنے کے لئے مقرر ہوئے۔ دو سالہ سعی لاحاصل رہی۔ اس زمانہ میں مرزا میرے پاس بہت آیا جایا کرتے تھے اور اُن کا زیادہ وقت غریب خانہ ہی پر کٹتا تھا۔ راقم سطور کو بعد تحصیلِ علوم عربیہ بزرگوں کی دیکھا دیکھی لکھنے پڑھنے کا شوق زیادہ تھا۔ باپ دادا کی تصانیف اور فراجت دار علما کی علوم فلسفہ کی کتابیں ہر وقت زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ ہمہ تن مطالعہ نے خود مصنف بننے کا خبط پیدا کر رکھا تھا مرزا سے بھی یہی [illegible]

گیا ہے کہ ابوالعلا نے سیر و تفریح کی جو اسکیم پیش کی تھی اسے پلٹ دیا ہے۔ ابوالعلا پہلے جنت میں ابن القارح کو لے گیا ہے پھر جنت العفاریت میں پھر اعراف میں پھر دوزخ میں ڈانٹے نے اس کے بجائے یہ کیا ہے کہ پہلے جہنم میں گیا ہے پھر اعراف میں پھر بہشت وغیرہ میں۔

سوال ہوگا کہ ڈانٹے کو رسالۃ الغفران کا علم کیونکر ہوا جو اس نے ابوالعلا کے اس تخیل کو زیادہ تشریح و تفصیل کے ساتھ ڈیوائن کمیڈی میں پیش کر دیا۔ صورت واقعہ یوں ہے کہ ڈانٹے شہر فلورنس میں ابوالعلا کے دو سو آٹھ سال بعد ۱۲۶۵ء میں پیدا ہوا ہے۔

رسالۃ الغفران کی اشاعت مصنف کے عہد ہی میں ہو چکی تھی۔ اہل مغرب خصوصاً اہل اندلس میں اس کا چرچا تھا۔ اس زمانہ میں وہاں کے مسلمان بادشاہ علم و فضل کے پورے قدردان تھے۔ تمیمی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ امیر المومنین یوسف بن تاشفین کے دربار میں بڑے بڑے صاحبانِ علم و فضل جمع ہو گئے تھے۔ اُس کی بارگاہ مرکزیت اہل علم کے معاملہ میں بنی عباس کے اس دورِ حکومت کے مشابہ تھی جب اُن کی شان و شوکت کا شباب تھا۔ اُس کے دربار میں مسلمانوں کے مشہور فلاسفر ابو بکر محمد بن طفیل ابو بکر بن الصائغ المعروف با بن باجہ وغیرہ بھی موجود تھے۔ تمام اطراف و اکناف سے علما و فضلا اُن کی کشش کی وجہ سے یہاں جمع ہو رہے تھے۔ یہ اندلس کے یہودی علما اُن کی اور اُن سے جو متقدم و متاخر عرب کے فلسفی تھے اُن کی تصنیفات عربی سے لاطینی میں یا عبرانی میں اور پھر عبرانی سے لاطینی میں برابر ترجمہ کر رہے تھے۔

اندلس ۹۱۲ء سے برابر ہر مقام کے علما و فضلا کا مرکز بنا ہوا تھا۔ شوق کا عالم یہ تھا کہ جہاں عرب کے کسی عالم یا ادیب کی کوئی علمی تصنیف یا شعر و سخن کا مجموعہ منصۂ ظہور پر آتا۔ اندلس کے علما و فضلا اُس پر پتا بانہ گرتے۔ اُس کی نقلیں اپنے پاس محفوظ رکھتے۔ اُس میں جو مضامین ہوتے اُن پر برابر مباحثہ کرتے۔

ان تمام واقعات کے ساتھ اس تاریخی حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ اندلسی مسلمانوں سے افرنجی قومیں دسویں صدی عیسوی یعنی ابوالعلا کے مرنے سے پچاس سال پہلے سے علوم و فنون حاصل کر رہی تھیں۔ اس واقعہ کی تصدیق اُن تمام متعلقہ تاریخی کتابوں سے ہو سکتی ہے۔ جن کے دائرہ میں یہ چیزیں آتی ہیں۔

ان تمام حالات کی موجودگی میں یہ مانا نہیں جا سکتا کہ الغفران سے نادر مکتوب کا جو اپنی ندرت تخیل [illegible] مضمون کے لحاظ سے اپنا ثانی نہ رکھتا ہو، اور پھر ابوالعلا المعری سے شہرۂ آفاق فلسفی شاعر کا نتیجۂ فکر ہو۔ لاطینی میں ترجمہ نہ کیا گیا ہو ایسی صورت میں اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ڈانٹے عربی سے واقف نہ تھا اور اس نے اصل رسالۃ الغفران کا مطالعہ نہ کیا تھا تو شواہد بالا کی بنا پر اس کا ماننا لازمی ہے کہ ڈانٹے نے اس کے لاطینی ترجمہ سے ضرور آنکھیں روشن کی ہیں اور اسے عرب کے اس باکمال شاعر کی یہ تخیل اس قدر پسند آئی کہ اُس نے اسی تخیل میں اپنے قوم و مذہب و وطن کی خصوصیتوں کی مناسبت سے نئے نئے برگ و بار پیدا کئے اور ڈیوائن کمیڈی کے نام سے اُسے حیاتِ جاوید بخشی۔

شہر فلورنس میں ۱۳۰۰ء سے ۱۳۰۳ء تک بہت زیادہ سیاسی اختلافات اُبھرتے رہے تھے۔ اس سلسلہ میں بلوے بھی ہوتے تھے۔ بغاوتیں بھی ہوتی تھیں ان بلووں اور بغاوتوں کے نتیجہ میں جہاں بہت سے آدمی قتل کئے گئے وہاں ڈانٹے وغیرہ چھ سو آدمیوں کو جلا وطنی کی سزا دی گئی جلا وطنی کا زمانہ ڈانٹے نے اِدھر اُدھر بسر کیا۔ اسپین میں بھی اُس کا غالباً گذر ہوا ہے۔ علم و فضل کا دلدادہ تھا۔ علما و فضلا سے ملتا جلتا تھا ایسی حالت میں یہ اور بھی ناممکن ہو جاتا ہے کہ رسالۃ الغفران سے اُسے ناواقفیت رہی ہو۔

ڈانٹے کی یہ تقلید کچھ زیادہ قابلِ حیرت بھی نہیں ہے۔ اطالیہ کے شعرا کی صف میں اُسے صدر نشیں کا منصب حاصل سہی تاہم اُس کے کمال کے تاج میں اختراع و ابتداع کا طرہ آویزاں نظر نہیں آتا، وہ زیادہ تر متقدمین کا مقلد ہی رہا ہے۔

جو صاحب اس مسئلہ پر تفصیلی نظر کرنا چاہیں وہ قسطاکی حمص کی کتاب منہل الوراد فی النقد والانتقاد کی دوسری جلد کا مطالعہ کریں۔

سید اختر علی تلہری

تأثرات

زندگی کا خودکشی نشا نہیں
نامرادِ غم نہیں، ایسا نہیں

حسن پر بھی چھا گئیں مایوسیاں
رونے والے یوں کوئی روتا نہیں!

مجھکو دامن گیر، دامن کش تمہیں
دیکھنے والوں نے کیا دیکھا نہیں

یہ تری بیگانگی یہ بے رُخی!!
تو مرے پہلو میں تھا بھی یا نہیں

شکوۂ بیگانگی سے درگذر!
رنج کی باتوں میں کچھ رکھا نہیں

غم ہی دنیا ہے تو دے تیری خوشی
میں دگرنہ شادماں اتنا نہیں

زیست اور بیگانۂ عشق و وفا!
یہ خودی کی موت ہے جینا نہیں

اور بھی ہیں رہروِ راہِ طلب
میں خرابِ جستجو تنہا نہیں

عقل کی خوش فہمیوں کو کیا کہوں
فی الحقیقت عاشقی سودا نہیں

اے غمِ الفت یہ کیا اندھیر ہے
دل کسی پہلو بھی خوش ہوتا نہیں

کب نہیں آئی کسی کی یاد ابد
کب ہمارا دل تڑپ اٹھا نہیں

آبد سرہندی

حسن و جوانی

کہو تو میں اپنے غموں کی کہانی
سنادوں، تمہیں آنسوؤں کی زبانی

فنا ہو گیا آدمی عشق کر کے
خرد کی کوئی بات اس نے نہ مانی

بجھے آنسوؤں سے نہ آہوں سے کم ہو
محبت ہے اک آتشِ غیر فانی

یہ پُر کیف راتیں، یہ رنگیں نظارے
یہ میری تمنا، یہ تیری جوانی

سنا دے محبت کی تنہائیوں میں
دھڑکتے ہوئے دو دلوں کی کہانی

مرا سوزِ پنہاں، ترا سازِ مبہم
کہانی سے ہوتی ہے پیدا کہانی

بہکتی ہوئی، لڑکھڑاتی ہوئی سی
عجب شان سے آرہی ہے جوانی

زمانے میں مجھ کو نہ بدنام کر دے
مرے حال پر یہ تری مہربانی

محبت کی دیں داد دل جل کے بجھ کے
گنوائیں نہ لمحاتِ حسن و جوانی

(آنسہ) نجمہ تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

"نرمد" ـــــ گجرات کا ایک عظیم المرتبت مصلح شاعر

(قسط دوم)

اصلاحات ۱۸۵۰ء میں جو حالت مسلمانوں کی تھی ویسی ہی ہندوؤں کی بھی تھی۔ اس زمانے میں گجرات پر جہالت کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، ہندو قوم مسلمانوں کی طرح رسم ورواج کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی توہم پرستی مذہب کا جزو لاینفک بن چکی تھی۔ فرقہ بندی کی آگ جگہ جگہ بھڑک رہی تھی اور انگریزوں کی غلامی کا طوق گردن میں پڑ چکا تھا۔ ایسے زمانے میں ہندو قوم کے لئے ایک مصلح و مشیر کی ضرورت تھی اور یہ قرعۂ فال نرمد کے نام پڑا۔

زمانۂ طالب علمی ہی میں نرمد کے ہاتھوں اصلاحِ قوم کی داغ بیل پڑ چکی تھی نرمد اپنے مقصد کی طرف غیر ارادی طور پر جا رہے تھے جو انجمنیں نرمد نے صرف ناموری حاصل کرنے کے لئے قائم کی تھیں اور جو اخبار اپنی شہرت کی بنا پر جاری کیا تھا وہی آگے چل کر اصلاحِ قوم کے لئے زبردست آرگن ثابت ہوئے۔ نرمد کے دل میں پہلے صرف جذبات کا تلاطم ہی تھا۔ لیکن جب مزاج میں استقلال پیدا ہوا اور طریقۂ کار سمجھ میں آگیا تو میدانِ عمل میں جا کودے۔ نرمد کے خلوص اور قوم سے ہمدردی کی وجہ سے نرمد کے بہت سے ہم خیال پیدا ہو گئے اور یہی اُن کا لشکرِ صف شکن تھا جس کے بغیر شاید نرمد کبھی کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔

بمبئی میں "بدھی ور دھک سبھا" کے کارپردازوں نے سماج و مذہب کی تخریب اور تعلیم کی اہمیت پر دھواں دار تقریریں کرنا شروع کیں۔ جن کے چرچے بمبئی سے نکل کر قرب و جوار میں بھی ہونے لگے اور لوگوں میں بہت جلد دلچسپی پیدا ہونے لگی۔

قوم کی تمام خرابیوں میں سے یہاں تین خرابیاں زیادہ قابلِ ذکر ہیں ہندو قوم بچپن میں شادی کر دینا فرضِ عین اور بیوہ کا نکاح قوم و ملت کی تحقیر و ذلت سمجھتی تھی۔ لوگ اس قدر فرقہ پرست تھے کہ سماجی ضروریات میں سخت ہرج پیدا ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے اور انتہا یہ تھی کہ برہمن اپنوں سے کمتر کے ساتھ خورد و نوش بھی ہتک سمجھتے تھے۔ ایک طرف نرمد تقریریں کرتے تھے اور دوسری طرف *Charity begins at home* پر عمل جاری تھا۔ نرمد نے ۱۸۵۶ء میں ڈاہی گوری نام کی ایک بیوہ سے عقدِ ثانی کر کے برہمنوں کو ایک تازیانہ مارا۔ اپنے گھر کی مستورات کو کمتر فرقے کے لوگوں کے ساتھ کھانے کھلوائے، اور صدیوں سے جو رسم و رواج چلے آرہے تھے، اُن کے خلاف جہاد کیا ایک طرف عمل پیکار بند تھے تو دوسری طرف تقریروں کا سلسلہ جاری تھا۔ ادھر اخبار "ڈانڈیو" (منادی) میں رسم و رواج، توہم پرستی تعلیم نسواں پر مضامین لکھ لکھ کر لوگوں کے جذبات کو مشتعل کر رہے تھے۔ بڑے بڑے مہاراج اور مذہب کے ستون جو ہندوؤں کے دیوتا اور مذہب کے محافظ بنے بیٹھے تھے اور قوم کی جہالت سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہے تھے اُنھیں سامنے رکھ کر اُن کی بد اخلاقیوں کے راز فاش کئے۔ اس آگ کے شعلے اس قدر بلند ہوئے کہ ان سفید پوشوں کو عدالت کا منہ دیکھنا پڑا جہاں روشن خیالوں نے انکی بنی بنائی ساکھ بھی خاک میں ملا دی

اگر بنظرِ عمیق دیکھا جائے تو نرمد کی یہ تمام کوشش صرف اصلاحِ قوم کی تمہید تھیں۔ نرمد کی پچیس سال کی انتھک کوششوں کا نتیجہ خوشگوار آج نظر آرہا ہے۔ پہلے پہل نرمد قوم کی لعنت ملامت کا نشانہ بنے۔ برہمنوں نے اُن کے خاندان کے ساتھ مذہبی اور معاشرتی تمام تعلقات توڑ دیئے۔ جس دعوت میں نرمد کے گھر والے شریک ہوتے اُس دعوت میں سے قدامت پسند چلے جاتے۔ نرمد جس جگہ اور جس مکان میں بیٹھ کر قوم کی خرابیوں پر اظہارِ خیال کرتے وہ جگہ اُن کے جانے کے بعد پاک کی جاتی تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود نرمد اپنے مقصد سے ذرا علٰحدہ نہیں ہوئے اور یہی استقلال کی وجہ سے آخر کار بڑے بڑے دقیانوسی بھی نرمد کے زمرے میں داخل ہو گئے۔ پچیس ۲۵ سال کی کوششوں کے بعد بھی عمل کا فقدان تھا۔ اتنا ضرور ہوا کہ جو لوگ نرمد سے ایک لفظ سننے کو تیار نہیں تھے وہ نرمد کے اصلاحی مضامین شوق سے پڑھنے لگے۔ اب قومی جلسوں میں جوق در جوق آنے لگے اور نرمد کیلکچرز اُس پر غور و خوض کرنے لگے۔ مرد اور عورت کے حقوق پر بحثیں ہونے لگیں۔ فرقہ بندیوں کی تلخیاں کم ہونے لگیں۔

نرمد اور نثر

گجراتی نثر میں نرمد کے رجحانات کا موازنہ و مقابلہ اگر اُردو نثر میں سرسید کے رجحانات سے کیا جائے تو قریب قریب ایک ہی پائے جاتے ہیں۔ سرسید کی طرزِ تحریر سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اُن کی عبارتوں میں تصنع نہیں پایا جاتا۔ اُنھوں نے عام فہم الفاظ استعمال کر کے زبان کو آسان بنایا اُن کے خیالات لفظوں کی تلاش خراش میں گم نہیں ہو جاتے۔ اُن کی نثر خیالات کو صحیح طور پر پیش کرتی ہے۔ سید نے تشبیہوں اور استعاروں سے زیادہ کام نہیں لیا۔ اسی طرح نرمد بھی ایک طرزِ نو کے موجد ہیں۔ انکی عبارتوں میں تصنع نہیں پایا جاتا۔ زبان کی سلاست اُن کی نثر کی جان ہے۔ نثر میں عوام کی فہم و دانش کا بہت خیال رکھتے تھے۔ نرمد نے الفاظ کو خیالات پر کبھی ترجیح نہیں دی۔

ابتدائی نثر میں استعارے اور رنگینی پائی جاتی ہے لیکن جیسے جیسے نثر پختہ ہوتی گئی استعارے بھی کم ہوتے گئے۔ ابتدائی تحریروں میں مذکورہ بالا خصوصیات پائی جاتی ہیں لیکن بعد کی تحریروں اور تقریروں میں واعظانہ طرز جھلکتی ہے اُن کی نثر میں اوّل تا آخر اگر کوئی چیز قائم رہی تو وہ جوش و خروش ہے۔ ابتدا میں گنجلک بھی پائی جاتی تھی۔ لیکن یہ عیب بہت جلد نکل گیا۔

نرمد کے قلم سے شاید ہی کوئی موضوع بچ سکا ہوگا۔ اُن کا قلم سوانح حیات۔ مذہب قوم۔ اصلاح۔ علم و ادب۔ تاریخ۔ سیاست۔ معاشرت۔ ظرافت۔ غرضیکہ ہر ایک پر برابر چلا ہے ان کے نرم گدھ (نثر) میں جو مضامین ہیں ان میں سے چند ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

گجرات اور گجراتی۔ گجرات کی عورتیں۔ وطنیت۔ شجاعت گجرات کی عزت مشاہیرِ عالم کے نام مذہب کے محافظوں کا مذہب۔ تعلیم نسواں شکوۂ بیوہ۔ گجراتی زبان۔ ادب۔ شاعری۔ اسی میں چند خطوط اور ڈرامے بھی ہیں۔ ڈرامے بہت سطحی ہیں۔

نرمد کی نثر عوام میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نرمد کی نثر آسان اور عام فہم ہے۔ اس میں خلوص و محبت پائے جاتے ہیں۔ اُن کی نثر کے موضوع یا تو اصلاحِ قوم کے گرم مسائل ہوتے تھے۔ یا علمی تحقیقات یا کسی کے کچے چٹھے۔ المختصر جدید طرز میں جدید خیالات عوام کی دل کشی کا سامان تھے۔ خاص و عام نرمد کے مضامین نہایت شوق سے پڑھتے تھے اور آئندہ تصانیف و اشاعتوں کے بہت پہلے ہی سے منتظر رہتے تھے۔

نرمد اور ادب

نرمد کی ادبی خدمات قومی اور ملکی خدمات سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ نرمد سے پہلے لوگ شاعری سے بے بہرہ تھے۔ نثر میں بھی چند کتابیں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ گجراتی میں ڈرامہ جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ تاریخ میں چند اوراقِ پارینہ پائے جاتے تھے۔ لیکن نرمد نے ان تمام پر خامہ فرسائی کر کے ادب کی کایا پلٹ دی۔ الغرض نرمد کی نظم و نثر کے آغاز سے گجراتی ادب میں ایک نیا دور آیا اور اُن کے انوکھے اسلوبِ بیان اور قومی نظموں نے ادب کو مالا مال کر دیا۔ ۱۸۵۰ء سے قبل گجراتی ادب کا وہی حال تھا جو اُردو ادب کا تھا ادق زبان ادبی شان سمجھی جاتی تھی اور سنسکرت الفاظ کی بھرمار ادبیت کا کمال سمجھا جاتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت تک گجراتی زبان کے پاس الفاظ کا بھی پورا سرمایہ نہیں تھا، یہ مسئلہ نرمد ہی نے حل کیا۔ نرمد کی دُور بیں آنکھوں نے یہ معلوم کر لیا کہ مروجہ اسلوبِ بیان زبان کی ترقی و اشاعت کا سدِّباب ہے۔ زبان کبھی پھل پھول نہیں سکتی نیز اس کے ذریعہ سے خیالات کو عوام تک پہنچانا مشکل ہے لہٰذا زبان کو آسان بنانے کی کوشش شروع کی۔ خود لکھتے ہیں "زبان وہ اچھی جو جیسی بولی جائے ویسی لکھی جائے"۔ نرمد نے انگریزی زبان سے ترقی کا گُر معلوم کر لیا۔ خود لکھتے ہیں "انگریزی زبان جو آج مکمل زبان کہلاتی ہے۔ کئی زبانوں سے بنی ہوئی ہے اور ہماری گجراتی کو بھی پایۂ تکمیل کو پہنچنے کے لئے دوسری زبانوں کی مدد کی سخت ضرورت ہے"۔ نرمد سب سے بڑی مدد جو دوسری زبانوں سے چاہتے تھے وہ الفاظ کی تھی۔ لکھتے ہیں "جب ہماری نظر ادب پر پڑتی ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ خیالات کو ادا کرنے کے لئے ابھی الفاظ بھی نہیں ہیں۔ اس لئے ہم کو لازم ہے کہ ہم خیالات کی مناسبت میں الفاظ پسند کریں خواہ وہ سنسکرت ہوں، فارسی ہوں یا انگریزی"۔ نرمد نے زبان میں سوز و گداز اور شستگی پیدا کرنے کے لئے فارسی زبان سے خاص کام لیا۔ نرمد نے فارسی کی چند درسی کتابیں پڑھی تھیں وہ اس سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ نظم و نثر میں زیب بغل۔ عشق۔ عاشق۔ معشوق۔ غذا۔ دعا۔ محبوب۔ جنگ۔ آزار۔ عبارت خاک۔ اخبار وغیرہ صدہا الفاظ بے تکلف استعمال کئے ہیں۔ نرمد نے پہلے اس طرح زبان کو سلیس بنا دیا، پھر لوگوں کو نثر کی طرف رغبت دلائی کہ وہ ہر شعبے میں کتابیں لکھتے چلے جائیں اور گجراتی کی قواعد وغیرہ بعد میں بنائی جائے۔

نرمد سے پہلے گجراتی شاعری کا انحصار صرف تین موضوعات نظم، مذہب اور

اخلاق پر مقالے لکھیں۔ نرمد نے اس صنعت میں عشق و محبت کی داستانیں اور قومی نظمیں لکھکر نئی نئی راہیں کھولدیں۔ عشق و محبت کی داستانیں قلمبند کرنے کے لئے زبان بھی ویسی ہی لطیف ہونی چاہئے تھی لہذا نرمد نے فارسی الفاظ استعمال کر کے سوز و گداز پیدا ضرور کیا لیکن اُسوقت پورے کمال کو نہیں پہنچ سکی۔ اسوقت گجراتی زبان میں غزلیں لکھی جاتی ہیں جو فنی کسی قابل ہیں۔ اس خدمت کا اعزاز جناب سید عظیم الدین صاحب منادی مدیر "مسلم گجرات" (ایک ہفتہ وار گجراتی پرچہ) کو حاصل ہے یہ گجراتی ادب کے ماہر ہیں اور گجراتی ادب میں ان کا ایک علیحدہ اسکول ہے۔ ان کے ہم خیال ادیبوں کا سب سے بڑا اصول ——— گجراتی زبان میں اُردو الفاظ کو رواج دینا اور ان کو اس زبان میں صحیح ادا کرنا ہے۔ نرمد نے آزادی۔ حبّ وطن اور شجاعت پر نظمیں لکھکر زبان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ دوسری زبانوں کے مقابلہ میں رکھی جا سکے اور جن کے مطالعہ سے ہمارے دلوں میں جذبات کا ایک طلاطم برپا ہو جاتا ہے۔

نرمد کی سب سے زیادہ قابلِ قدر ادب کی خدمت اُن کا "نرم کوش" ہے یہ لغت گجراتی ادب میں ایک بے بہا خزانہ ہے جو ادب میں نرمد کا نام زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے

محاکمہ

نرمد کی ادبی، قومی اور ملکی خدمات کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نرمد آسمان ادب کے آفتاب، ہندوؤں کے حالی اور ملک کے غازی تھے۔ نرمد نے گلشن ادب سے خس و خاشاک کی صاف کر کے اُسے سرسبز و شاداب کیا نثر میں ایک طرز نو اور شاعری میں قومی نظموں کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔

حالی کی طرح نرمد نے اپنی قوم کے شانے ہلا ہلا کر خوابِ غفلت سے بیدار کیا ہندو مذہب و ملت پیوندِ خاک ہو رہے تھے۔ تعصب نے اُن کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے تھے۔ لوگ اپنے اسلاف کے کارناموں کو دل سے بھلا چکے تھے۔ ایسے وقت میں پستی سے اُبھارنے کے لئے ایک مصلح و مبشر کی ضرورت تھی اور یہ ذمہ داری نرمد نے اپنے اوپر لی۔

جب حکومت کی باگ ڈور غیر قوم کے ہاتھوں میں جا پڑی۔ ملک کی جاہ و ثروت اور شان و شوکت کا خاتمہ ہو گیا اور ستارۂ اقبال گردش میں آگیا تقاضائے قدرت کے مطابق لوگوں کی عقلیں زائل ہو گئیں۔ ذہنیتیں پست ہو چلیں اور غلامی آزادی کی انتہا نظر آنے لگی اسوقت نرمد نے لوگوں کی غیرت کو حرکت میں لائے۔ ماضی کا ماتم کیا۔ لیکن آخر میں امید بھی دلائی راہ بتلائی اور حوصلہ افزائی کی۔ یہ واضح رہے کہ نرمد آزادی کے پرستار تھے ان کو انگریز قوم سے کوئی پرخاش اور تعصب نہیں تھا کیونکہ یہی نرمد ایکطرف غیر قوم کی حکومت سے آزاد ہونا چاہتے تھے اور دوسری طرف یورپ کی خوبیوں سے فائدہ اُٹھانے کی تلقین کرتے تھے۔

نرمد کی تیس۳۰ سال کی کد و کاوش کے نتیجوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نرمد نے قید فرنگ اور قید برہمن سے آزاد ہونے کی صرف تمہید شروع کی تھی۔ نرمد نے اپنے خون سے سینچ سینچ کر جو نہال آزادی سرسبز کیا وہ پچاس سال کے بعد ثمر لایا اور قوم نے لئے زمد کی چیخ پکار۔ اگر سنی گئی تو پچاس سال کے بعد نرمد کو اپنی محنت کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی امید نہیں تھی۔ اور نہ اُن کی یہ خواہش تھی کہ قوم و ملک بے موقع و محل حکومت کے خلاف آزادی کی جنگ چھیڑ کر خود کو تباہ و برباد کر دے ہر وقت وہ یہ کہتے تھے کہ موقع کے منتظر رہو اور یہی اُن کی دانشمندی تھی۔ اصلاح قوم کی انتھک کوششوں کے نتائج آج نظر آتے ہیں۔ بیوہ کے نکاح کو روشن خیال طبقہ آج رواج دے رہا ہے۔ آج اچھوت کے ساتھ مساوات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آج ملک غلامی کی زنجیریں کھڑکھڑا رہا ہے۔ نرمد نے جو کچھ کیا وہ ایک جملے میں اس طرح ادا ہو سکتا ہے "O, mistief thou art afoot." اور شرارت تو عمل میں آئی۔

ہندو قوم نے نرمد کے مفید مجوزہ خیالات کو محفوظ رکھا اور اُن کی نسلوں نے آج اس پر عمل کیا۔ بنظرِ غائر دیکھا جائے تو نرمد کے خیالات کو گاندھی جی نے عملی جامہ پہنا لیا۔ اپنی قوم کو آزادی کی طرف مائل کیا۔ اس میں گاندھی جی کے خیالات کا تخلیقی پہلو کچھ بھی نہیں ہے۔

یہ لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ نرمد جیسا حبِّ وطن کا دیوانہ، شمع آزادی کا پروانہ اور قوم کا فرزانہ صرف گجرات ہی سے وابستہ رہا گجرات ہی اُس کا میدانِ عمل رہا جو تمام ہندوستان کا کردار بن سکتا تھا (باقی)

سید ظہیر الدین مدنی۔ ایم۔ اے

ادھوری کہانی

ابھی تو پڑی ہے ادھوری کہانی — کہاں اے جوانی۔ کدھر اے جوانی!؟
سکوتِ قیامت کی ہے ترجمانی — مری بے کلامی، مری بے زبانی
جہاں کی کہانی سنو آج ہم سے — جہاں کل کہے گا ہماری کہانی
محبت جوانی میں ہوتی ہے سب کو — محبت کو کہتے ہیں شاید جوانی
مرے دل میں رہنے دے بے چینیوں کو — یہی تو ہیں عہدِ وفا کی نشانی
وہ کیا سن سکینگے۔ نہیں سن سکینگے — بہت تلخ ہے مری افسانہ خوانی
تجھے بھول جانا بھی آساں نہیں ہے — مجھے بھول جانے کی تو بار ٹھانی
زمیں میں ندامت سے جب گڑ گیا میں — نگاہیں ہوئیں حسن کی پانی پانی
مجھے اس کی ہمدردیوں پر یقیں ہے — قسم کھا رہا ہے غمِ جاودانی
وجودِ یقیں عالمِ عشق میں کیا — ادھر بدگمانی۔ ادھر بدگمانی
غمِ زندگانی سے ہوش آ رہا ہے — بہت کام کا ہے غمِ زندگانی
غمِ دل کہیں کھل نہ جائے کسی پر — نگاہیں نہ کر دیں کہیں ترجمانی
یہ کس نے کہا ہے پسند انکو صابر — یہ شیریں زبانی۔ یہ نازک بیانی

صابر اکبرآبادی بی۔اے

نظارۂ جمال

عشق تو اپنا لازوال ہوا — غم نہیں دل جو پائمال ہوا
کہیے کس بات کا ملال ہوا — چاند سا چہرہ کیوں نڈھال ہوا
قرب تیرا جسے ہوا حاصل — دونوں عالم میں وہ نہال ہوا
خاک ہو قدر اس کو الفت کی — جس کو اندیشۂ مآل ہوا
پوچھتے کیا ہو حسن میں اس کی — آہ وہ دل جو پائمال ہوا
جس طرف آنکھ اٹھا کے دیکھ لیا — مجھ کو نظارۂ جمال ہوا
نہ ہوا جب شریکِ غم کوئی — ساتھ میرے ترا خیال ہوا
شانِ رحمت کی ہے ہتک یہیں — کیوں گناہوں پہ انفعال ہوا
پھنک گیا سوزِ غم سے نخلِ مراد — باغِ امید پائمال ہوا
حسن کا بھی کچھ قصور نہیں — جس کو ہونا تھا پائمال ہوا

وزیرزادہ شجاعت خاں مہر [illegible]

مشاعرۂ شاعر

مصرعِ طرح :- "حسن کی نگاہوں کا راز بن گیا ہوں میں"

حضرتِ الم مظفرنگری

عشق کی نگاہوں میں کیوں نہ باوفا ہوں میں / حسن کی اداؤں کا راز بن گیا ہوں میں
کھل گیا فنائیت کا حاصلِ بقا ہوں میں / قلبِ زندگانی پر نقشِ مدعا ہوں میں
حسن کے تقدس کا راز آشنا ہوں میں / چھپ کے سب کی نظروں سے اُن کو دیکھتا ہوں میں
مذہبِ محبت میں معنیٔ وفا کیا ہیں / تم ہی کچھ بتادو گے تم سے پوچھتا ہوں میں
دل مرا بہلتا ہے کچھ ترے تصور سے / عشق کی نگاہوں سے گرچہ آشنا ہوں میں
آپ نے مٹایا تھا مجھکو جن فضاؤں میں / آج انہیں فضاؤں سے پھر ابھر رہا ہوں میں
مجھکو بحرِ ہستی میں کیا ہو خوف طوفاں کا / آج اپنے بیڑے کا آپ ناخدا ہوں میں
روح کی فضاؤں میں وہ تو ہو چکا ہے گم / اب بھی اُن کے پیکاں کو دل میں ڈھونڈتا ہوں میں
اب میں دور رہتا ہوں اے الم زمانے سے / دوست کی تمنا میں غیر سے جدا ہوں میں

حضرتِ شفیق ٹونکی

مدعی کسی کا ہوں اور نہ مدعا ہوں میں / ان حدود سے کوسوں دور اب نکل گیا ہوں میں
حسن کا پیمبر ہوں عشق کا خدا ہوں میں / پوچھتا ہے کیا مجھ سے کیا بتاؤں کیا ہوں میں
خالقِ مسرت ہوں عیش آشنا ہوں میں / آئینہ در آئینہ مسکرا رہا ہوں میں
تیری جستجو اپنی بھول کا نتیجہ ہے / تجھ کو ڈھونڈ کر پھر دل خود کو ڈھونڈتا ہوں میں
ہائے وہ حسیں لمحے جب سرود پر دل کے / کوئی گیت گاتا ہو اور سن رہا ہوں میں
جب بلند ہوتا ہے مری فکر کا شاہیں / وسعتِ دو عالم کو تنگ دیکھتا ہوں میں
حسن کی اداؤں میں اک ادا سی پنہاں ہے / وہ فریبِ الفت جس میں مبتلا ہوں میں
یعنی سرودِ عالم کی آبرو مرے نغمے / اور خود حقیقت میں سازِ بے صدا ہوں میں
وہ بھی کیا وفائیں تھیں ہائے جن وفاؤں سے / اے شفیق انہیں اب تک یاد آ رہا ہوں میں

حضرتِ رونق دکنی از جمشید پور

اہلِ عشق کا جب سے نبض آشنا ہوں میں / حسن کی نگاہوں میں راز بن گیا ہوں میں
ذوقِ حسن کیا شے ہے لذتِ محبت کیا / بے ثبات ہیں دونوں ان سے ماورا ہوں میں
میں ہوں دردِ دل اب جانے فیصلہ کیا ہو / مجھ پہ چھا رہا ہے وہ اُس پہ چھا رہا ہوں میں
حاصلِ وفا ظاہر فطرتِ طلب معلوم / چیستانِ حسرت ہوں شرحِ مدعا ہوں میں
مہر جھکا گیا اک دن عالمِ محبت بھی / حسنِ غیر فانی کا عکسِ نقشِ پا ہوں میں
قصرِ غم کی بنیادیں پل میں ڈھا کے رکھ دیگا / بے پناہ اک طوفاں بن کے اٹھ رہا ہوں میں
حسن کو ہوئی محسوس جب ہی اپنی تنہائی / عشق نے کہا بڑھ کر تجھ سے کب جدا ہوں میں
چھیڑ شعلۂ نغمہ لیکن اتنا یاد رکھ / سوز ہوں سراپا گو سازِ بے صدا ہوں میں
سادگیٔ فطرت کیوں قائلِ رعونت ہو / خود غرض ہوں میں رونق اور نہ خود نما ہوں میں

حضرتِ قمر نعمانی سہسرامی

جب ترے تخیل کا آئینہ بنا ہوں میں / حسن بنکے نظروں پر تیری چھا گیا ہوں میں
ہے کدھر مری منزل اس سے آشنا ہوں میں / خود ہی راہبر اپنا خود ہی رہنما ہوں میں
جادۂ محبت سے جب ذرا ہٹا ہوں میں / دی صدا یہ اُس نے دیکھ! دیکھتا ہوں میں
کیا وہ سمجھے شاعر کو مہر جس کے دل پر ہو / حق تو یہ ہے دنیا میں مشعلِ ہدیٰ ہوں میں
اہلِ ہوش حیراں ہیں دیکھ کر جنوں میرا / ڈھونڈتا نہیں تجھکو دل کو ڈھونڈتا ہوں میں
جب حصولِ ہستی میں روز و شب رہا کوشاں / اب مآلِ ہستی پر غور کر رہا ہوں میں
میرا ظرف اعلیٰ ہے میرا ضبط کامل ہے / رو رہا ہے دل پھر بھی مسکرا رہا ہوں میں
طنزِ پست فطرت کو ذہن میں نہیں لاتا / جو بلند فطرت ہیں اُن کو دیکھتا ہوں میں
داد فکر دیتے ہیں اے قمر مرے مخلص / حاسدوں کی نظروں میں گو کھٹک رہا ہوں میں

حضرتِ شمیم نعمانی اجمیری

دل میں آرزو لے کر مائلِ وفا ہوں میں / زندگی کے خواب اکثر یونہی دیکھتا ہوں میں
بے خودی میں منزل سے اب گزر رہا ہوں میں / دیکھئے خود نما ہوں میں یا خدا نما ہوں میں؟
روز اُن کے وعدوں پر اعتبار کر لینا! / جانتا ہے دل مجھکو دل کو جانتا ہوں میں!

ہو چکو امت کا بہر کرم معاذ اللہ!   رہیں آرزو ہو کر ڈگمگا رہا ہوں میں
زندگی جانت ہے اضطراب پیہم سے   آرزوئے ہستی کی داد پا رہا ہوں میں
عشق لانہایت ہیں کچھ پتا نہیں چلتا   رقص کر رہا ہوں میں یا تڑپ رہا ہوں میں
یہ بہار نومیدی! یہ نشاطِ ناکامی!   دیکھ دیکھ کر ان کا دکھ دیکھتا ہوں میں
منزلِ وفا شاید ختم ہونے والی ہے   جادۂ محبت سے پھر بھٹک رہا ہوں میں
لو گیا تبسم آخر آسرا ابھر نے کا   نبضِ شوق کے بدلے آج ڈوبتا ہوں میں

جناب ماسٹر حسن خاں اثر گلشن آبادی

کیا حدودِ منزل تک اب پہنچ گیا ہوں میں   کیوں قدم لرزتے ہیں ڈگمگا رہا ہوں میں
جو مآلِ دنیا ہے اس سے آشنا ہوں میں   زندگی کی خوشیوں سے دور بھاگتا ہوں میں
یاد کیا تمہیں بھی ہیں وہ شباب کی راتیں   آج بھی تصور میں لطف پا رہا ہوں میں
میرے طرزِ عنواں میں اختلاف ہے لیکن   تیرے ہی محبت کے گیت گا رہا ہوں میں
جیسے دائمی سمجھا رنگ و بوئے ہستی کو   یوں بہارِ ہستی میں آ کے کھو گیا ہوں میں
تھا عجیب رومانی میرا دورِ ماضی بھی   یاد کر کے وہ لمحے مسکرا رہا ہوں میں
صبح و شام کے رنگیں اور حسیں مناظر میں   تم کو ڈھونڈتا ہوں میں تم کو دیکھتا ہوں میں
مائلِ کرم کب تم ہو رہے ہو غم یہ ہے   جب غمِ محبت میں لطف پا رہا ہوں میں
کیوں اثر کروں پروا طنزِ غیر کی آخر   میں نے کب کیا دعویٰ پاک بے ریا ہوں میں

جناب ایمن منصوری از کلکتہ

ترکِ مدعا کر کے جانِ مدعا ہوں میں   حسن کی نگاہوں کا راز بن گیا ہوں میں
جس کو لوگ کہتے اک شارعِ تصور ہ   پیکرِ وفا میں وہ جنبشِ ضیا ہوں میں
مدّ و جزرِ ہستی کا راز کیا کہوں اے دوست   بحرِ زندگی میں اک ساحلِ فنا ہوں میں
حسن بھی مجھی سے ہے، عشق بھی مجھی سے ہے   سازِ روح میں مثلِ نغمۂ وفا ہوں میں
زینتِ محبت ہوں، رونقِ حقیقت ہوں   عشق کی فضاؤں میں حسن کی ادا ہوں میں
میرے دم سے ٹوٹا ہے قفلِ کائناتِ عشق   فطرت، آ فضا مجھ فطرت آشنا ہوں میں
حیرت تماشائے طور، اے معاذ اللہ   حیرتوں کے عالم میں دل بنا ہوا ہوں میں
ہر قدم پہ لغزش ہے، ہر نفس پہ لرزش ہے   کونسی ہے یہ منزل جس میں چل رہا ہوں میں
وہ عدم میں کیا کیا ہم نشیں جہاں ہے ایمن   یہ خبر نہیں مجھ کو در آشنا ہوں میں

جناب محمود یار خاں اثر ایم اے

مائلِ تمنا ہوں، معرفت مدعا ہوں میں   زندگی کی خواہش میں کیا سے کیا ہوا ہوں میں
منزلِ فنا میں بھی کیا کشش ہے پوشیدہ   روز و شب اسی جانب بڑھتا جا رہا ہوں میں
میرے دل میں بھی نغمے درد و غم کے پنہاں ہیں   یہ نہیں کہ بالکل ہی ساز بے نوا ہوں میں
نامرادیوں کا میں اب رہینِ منت ہوں   اپنی طاقتوں سے کچھ باخبر ہوا ہوں میں
اضطرابِ دل میں ہے روحِ زندگی مضمر   شعلہ در نفس ہوں میں برقِ بے بہا ہوں میں
چشمِ حق نگر والے غور سے مجھے دیکھیں   کائناتِ عالم کی ابتدا تھا ہوں میں
شکر ہے کہ اب ان کا اعتماد حاصل ہے   حسن کی نگاہوں کا راز بن گیا ہوں میں
جلوہ پاشیاں ان کی عام ہیں اثر لیکن   شرم کم نگاہی میں خود ہی مبتلا ہوں میں

جناب بیتاب کالپوی

نغمۂ محبت کا ساز بن گیا ہوں میں   دردِ دل کا حامل ہوں درد آشنا ہوں میں
خود سے بھی ہوں میں واقف ان سے آشنا ہوں میں   عشق اور محبت کے راز جانتا ہوں میں
جبر کا ہوں میں خوگر رنج سے نہیں خائف   مشکلیں نہ ہوں آساں ضبط آشنا ہوں میں
فرشِ راہ ہیں آنکھیں قلب میں ہے بے چینی   یوں کسی کے آنے کی راہ دیکھتا ہوں میں
نذرِ جان و دل کر کے کر چکا فنا ہستی   موت سے بہت پہلے ان پہ مر چکا ہوں میں
وہ رلائے جاتے ہیں آزمائے جاتے ہیں   مسکرائے جاتے ہیں اور تڑپ رہا ہوں میں
کعبہ و کلیسا کیا دیر اور حرم کب کا   اب تو ذرے ذرے میں ان کو دیکھتا ہوں میں
ہاں جفائیں کر کر کے آزمائیں وہ بیتاب   منزلِ شکایت سے اب گذر چکا ہوں میں

جناب عبا انصاری دہولیوی

معجزہ محبت کا اب یہ دیکھتا ہوں میں   حسن کی نگاہوں کا راز بن گیا ہوں میں
تم جفا کئے جاؤ میں وفا کئے جاؤں   حاملِ جفا تم ہو پیکرِ وفا ہوں میں
حسن پہ نظر میری حسن کا اثر مجھ پر   نور آشنا مجھ سے نور آشنا ہوں میں
عرضِ غم نہ کر اے دل عرضِ غم سے کیا حاصل   مجھ سے وہ نہیں غافل مجھ سے بے نیاز ہوں میں
کیوں رہِ محبت میں خضر کی کروں پروا   شوقِ دل یہ کہتا ہے تیرا رہنما ہوں میں
یہ ہے مری بربادی یہ ہے میری ناکامی   اشکِ خاک آلودہ، آہ نارسا ہوں میں
تم ہو درد کے خالق میں ہوں درد کا بندہ   یہ بھی جانتا ہوں میں یہ بھی جانتا ہوں میں
دنیا سنوں عباس یہی غیر ممکن ہے   کیا وہ ہیں خدا تیرے ان کا مبتلا ہوں میں

جناب مہر لال صاحب سونی ضیا فتح آبادی ایم اے

کشمکش میں ہستی کی آہ مبتلا ہوں میں
اپنی آرزوؤں کا خون کر رہا ہوں میں

سعیِ زیست سے پھر بھی باز آ نہیں سکتا
سعیِ زیست کا حاصل خوب جانتا ہوں میں

غم نے اس قدر میرے دل پہ کر لیا قابو
اپنی ہر تمنا کو ترک کر چکا ہوں میں

ڈوبنا ہی جب ٹھہرا کیوں خدا کو دوں تکلیف
اپنے دل کی کشتی کا خود ہی ناخدا ہوں میں

حسن میری نظروں میں اک فریبِ رنگیں ہے
فطرتِ محبت سے شاید آشنا ہوں میں

دیکھتا ہے تو مجھ کو تا بہ کے نہیں ملتا
اپنے آپ کو کھو کر تجھ کو ڈھونڈتا ہوں میں

اے ضیا مجھے کیا کام فکرِ بزمِ امکاں سے
ہر حدِ تعین سے کچھ بڑھا ہوا ہوں میں

حضرت ارشد صدیقی امروہوی

کب سے اپنی ہستی پر غور کر رہا ہوں میں
بسکہ ایک سربستہ راز بن گیا ہوں میں

گاہ دیکھتا ہوں میں اسکو ہر کہیں موجود
گاہ حدِ بینش سے دور دیکھتا ہوں میں

تیری جستجو نکلی ایک سعیِ لا حاصل
تجھکو بھی نہیں پایا خود بھی کھو گیا ہوں میں

میرے عشق سے تیری حسن کی ہے یکتائی
تو ہی اک گلِ خوش بو صورتِ صبا ہوں میں

نت نئے تماشے ہیں بزمِ دہرِ فانی میں
جاگتا ہوں یا کوئی خواب دیکھتا ہوں میں؟

حسن و عشق میں کتنا فرق ہے معاذ اللہ
مائلِ جفا ہیں وہ خوگرِ وفا ہوں میں

فطرتاً یہ جوہر ہے میری روح میں ارشد
جو ہر ایک طرف دیکھے اس کا آئینا ہوں میں

جناب رعنا عشرتی

شمعِ آخرِ شب ہوں، چاند ڈوبتا ہوں میں
آہ کہ مثلِ شبنم اب جھلملا رہا ہوں میں

موت سے گریزاں ہوں زیست کا تمنائی
کیا فریبِ ہستی میں خود ہی آ گیا ہوں میں

بے نیازِ جادہ ہوں بچھڑا ہوں منزل سے
باوجودِ گمراہی ان کو ڈھونڈتا ہوں میں

ان کی نگاہیں بھی مجھ کو پا نہیں سکتیں
عشق کی حدوں سے دور اتنا آ گیا ہوں میں

ڈوبنا بھی آتا ہے ڈوب کر ابھرنا بھی
اپنی کشتیِ غم کا آپ ناخدا ہوں میں

میں تو خود ہوں سرگرداں راہ خود شناسی میں
اور سب سمجھتے ہیں تجھ سے آشنا ہوں میں

دل میں اک کسک سی ہے اور وہ بھی بے پایاں
کیا کسی کو پھر رعنا یاد آ رہا ہوں میں

جناب شیو پرشاد صاحب برگ از باندہ

چارہ گر بتا تو ہی بند کیوں ترا ہوں میں
درد دل کی جب سے آپ ہی دوا ہوں میں

کیا ہوا جو طوفاں پر ... ہوں میں
... بندۂ خدا ہوں میں

عشق نے کیا ایسا ...
حسن کی نگاہوں کا راز بن گیا ہوں میں

مجھکو رہ کے دنیا میں کیا خبر ہو دنیا کی
یہ بھی تو نہیں معلوم کیا تھا اور کیا ہوں میں

غور کر ذرا دل میں مجھ کو بھولنے والے
مرکزِ نظر تیرا آج تو سہ رہا ہوں میں

مٹ کے بھی ترے در سے سر اٹھا نہیں سکتا
بانیِ جفا حسن نے پیکرِ وفا ہوں میں

اہلِ بزم جتنے تھے سب دلوں کو تھامے تھے
بزمِ یار سے آ کر برگ مطلع اٹھا ہوں میں

جناب محمد حسین صاحب خیال احمد آبادی

دیکھتے ہیں وہ مجھکو ان کو دیکھتا ہوں میں
صبر آزما ہیں وہ ضبط آزما ہوں میں

نعرۂ انا الحق کا راز پا گیا ہوں میں
گو خدا نہیں لیکن مظہرِ خدا ہوں میں

اب نہ سر سے مطلب کچھ اور نہ سنگِ در سے کام
انکے آستانے میں جذب ہو گیا ہوں میں

کیا شریک تھے تم بھی میری شامِ ہجراں میں؟
ڈوبتے ہوئے تاروں سے پوچھتا ہوں میں

جس نگاہ میں لاکھوں بجلیاں ہیں پوشیدہ
اس نظر سے تسکیں کی بھیک مانگتا ہوں میں

رات کی خموشی میں محو خواب ہے دنیا
دل کے ساز پر غم کے گیت گا رہا ہوں میں

ہے خیال آنکھوں سے رازِ دل عیاں میرا
لاکھ اسے چھپانے کی سعی کر رہا ہوں میں

جناب ہلال پریمی از کوکشی ریاست دھار

بیخودی میں کہہ دونگا یہ دھڑک خدا ہوں میں
یہ سمجھ لیا جس دن، کون اور کیا ہوں میں

خاک و خوں میں آلودہ آج روحِ انساں ہے
موت کو ہم آغوشِ زیست دیکھتا ہوں میں

بزم سے تری تنہا اٹھ کے میں نہیں آیا
آرزو کی اک دنیا لیکے ساتھ اٹھا ہوں میں

کیوں ہوں میرے سجدوں پر طعنہ زن حرم والے
ہے مرادِ کعبہ جس طرف جھکا ہوں میں

اے مری نگاہوں کی چاندنی فروزاں ہو جا
بھیک تیرے جلووں کی تجھ سے مانگتا ہوں میں

آنسوؤں کی جھلمن ہے اور ترا تصور ہے
شامِ غم لگی دل کی یوں بجھا رہا ہوں میں

خضر کو ہلال اپنا راہبر بناؤں کیوں!
منزلِ محبت کا خود ہی رہنما ہوں میں

جناب خنجر جیلی الولوی

کیا بتاؤں اے ہمدم تجھ کو آہ کیا ہوں میں
حسن کی جفاؤں کا ایک ماجرا ہوں میں

حسنِ جلوہ ساماں کا راز بن گیا ہوں میں
ذرے ذرے میں اسکو آج پا رہا ہوں میں

میری میں ذلت ہے دے گر خدا ہمکو
درد بڑھ کے کہتا ہے اپنی خود دوا ہوں میں

مست ناز یا آ جا اپنی بے نیازی سے
دیکھو مجھ کو سرتاپا عرضِ مدعا ہوں میں

ہے قرار مانے کو عشق غیر فانی ہے
مٹ کے راہِ الفت میں اور بڑھ گیا ہوں میں

کس طرح اٹھائیگا جورِ حسن وناز اے دل
شیشہ سے بھی نازک تر ... ہوں میں

اہل بزم سے مجز کہتی ہے فغاں میری
اک دل شکستہ کی غم بھری صدا ہوں میں

ابوالمختار جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی

عارفِ جمال دوست جب سے ہو گیا ہوں میں
ذرّے میں بھی سورج کی تاب دیکھتا ہوں میں

چھیڑ کیوں کریں نظریں، مطربِ خوش الحانی کی
محفلِ جہاں میں اک سازِ بے صدا ہوں میں

میں اور اپنی ہستی کا اعتراف بے رنگی
فیصلہ کرے دنیا کون ہوں میں کیا ہوں میں

کیوں نہ دیکھیں مجھکو ہی تیرے دیکھنے والے
آئینے کا جوہر تو اور آئینہ ہوں میں

ہر نفس ہے اک نغمہ تیرے سازِ پنہاں کا
ہر نفس سے تیرا ہی ذکر سن رہا ہوں میں

اپنے دل میں دیکھے ہیں جب سے جلوے فطرت کے
رازدارِ صد معنیٰ طرفہ بن گیا ہوں میں

جناب محمد عصمت اللہ صاحب قریشی بلاسپوری

کیا بتاؤں اے ہمدم کس کو ڈھونڈتا ہوں میں
جب سے ان کو دیکھا ہے خود ہی کھو گیا ہوں میں

کیا بتاؤں میں میرا کون ہے یہاں مسجود
خود ہی اپنی ہستی کو سجدے کر رہا ہوں میں

تھی تلاش کل تک تو اسکی کو بکو مجھ کو
اور آج اپنے کو خود ہی ڈھونڈتا ہوں میں

بارگاہِ الفت میں میری قدر و قیمت کیا؟
دشمنی اثر کو ہے جس سے وہ دعا ہوں میں

کوئی مجھکو کیا سمجھے کوئی مجھکو کیا جانے
حسن کی نگاہوں کا راز بن گیا ہوں میں

مجھ سے بزمِ عالم کو کیا لگاؤ اے عصمت
گونجتے ہیں ویرانے جس سے وہ صدا ہوں میں

جناب محبوب الحق صاحب ارمانؔ صابری بریلی نوری

عشق کے حوادث سے گو مٹا ہوا ہوں میں
حسن کی نگاہوں کا راز بن گیا ہوں میں

خضر کیا بتائینگے راہ کوئے جاناں کی
خود ہی راہبر ہوں میں خود ہی رہنما ہوں میں

آئینگے وہ آئینگے بالیقیں وہ آئینگے
صرف اس سہارے پر اب تو جی رہا ہوں میں

ترکِ جستجو کرکے دست کش ہوا جب سے
اپنے خانۂ دل میں انکو پا رہا ہوں میں

صابری گذاری ہے ساری عمر مر مر کر
دردمند ہوں میں رنج آشنا ہوں میں

جناب ارمانؔ ایمانی مصطفےٰ آبادی

حسن میں فنا ہوں میں عشق میں بقا ہوں میں
صبر کے حجابوں میں حسرتِ فغاں ہوں میں

خوبیاں ہیں مجھ میں کل حسنِ دلربا ہوں میں
سب سے میں ہی ملتا اور پھر جدا ہوں میں

نازِ حسن و عجزِ عشق دونوں جوش پر ہیں آج
دو دھڑے جا رہے ہیں وہ اور خفا ہوں میں

تیرے حق سمجھنے کو علم و عقل ہے درکار
اتنا مانتا ہوں میں جتنا جانتا ہوں میں

دہر کی ہوا ارماںؔ کیا کریگی گل مجھکو
شعلۂ جفا ہیں وہ جلوۂ وفا ہوں میں

جناب ماسٹر کالو میاں صاحب مذاقؔ سکندر ووی

حسن کی عنایت ہی کیا سے کیا ہوا ہوں میں
حسن کی نگاہوں کا راز بن گیا ہوں میں

نغمۂ خودی کی ہے پردۂ تجملِ شوق
آپ سننے والا ہوں آپ ہی صدا ہوں میں

ہے یہی ہم آہنگی زندگی کی آزادی
میرا مدعا دل ہے دل کا مدعا ہوں میں

میری گردشوں کو تم پوچھتے ہو کیا مجھ سے
جب یہی بھر رہا تھا میں اب بھی پھر رہا ہوں میں

یہ خدا کی رحمت ہے یہ خدا کی بخشش ہے
اے مذاقؔ الفت میں خود آشنا ہوں میں

جناب حوالدار رحیم اللہ صاحب شاغل

بتکدے سے بیگانہ اسلئے ہوا ہوں میں
بت کی کیوں کروں پوجا بندۂ خدا ہوں میں

خاکسار ہونے کا راز پا گیا ہوں میں
خاک اس ہے میری خاک سے بنا ہوں میں

کردگار کی نظریں جانتی ہیں میرا حال
جرم پیشہ ہوں میں یا نیک پارسا ہوں میں

اور کچھ نہیں شاغلؔ وقتِ واپسیں ہمراہ
صرف اک غمِ الفت ساتھ لیچلا ہوں میں

جناب حسنؔ ساگری

بندۂ خدا ہوں میں مورِد خطا ہوں میں
اعترافِ عصیاں ہے قابلِ عطا ہوں میں

جستجو میں روز و شب چار سو پھرا ہوں میں
بے نشاں ملا ہے جب بے نشاں ہوا ہوں میں

بانیٔ وفا ہوں میں عشق کی بنا ہوں میں
حسن کی نگاہوں کا راز بن گیا ہوں میں

صورتِ حنا اے حسنؔ کوچۂ محبت میں
پائمال ہوکر بھی سرخ رُو ہوا ہوں میں

اسی نمبر میں مولانا سیمابؔ اکبرآبادی کی نظم "غیر اللہ کو پہلا سجدہ" صفحہ ۱۲-۱۳ پر آپ کی نظر سے گذری ہو گی اس میں مندرجۂ ذیل غلطیوں کی صحت فرما لیجئے۔

صفحہ ۱۲	شعر نمبر ۱۰ "تبلیس"	غلط ہے	"تلبیس"	بنا لیجئے
"	شعر نمبر ۱۷ "سجدہ"	غلط ہے	"سجدا"	بنا لیجئے
صفحہ ۱۳	شعر نمبر ۲۲ "منتطبق"	غلط ہے	"منطبق"	بنا لیجئے

اصلاحِ سخن :- جناب اثر انصاری دھولیوی کی غزل پر ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی کی اصلاح

(بشر ہو کے تجھ سے)
تری ذات میں میں ملا چاہتا ہوں ۱ مرا حوصلہ دیکھ کیا چاہتا ہوں

(کوئی ... چھپالے)
مجھے اپنے دامن میں اب تو چھپالو ۲ زمانے میں رسوا ہوا چاہتا ہوں

(ہے دھیان)
جنونِ محبت میں اب یاد کس کو ۳ میں کیا چاہتا تھا میں کیا چاہتا ہوں

بڑھا جا رہا ہے جنونِ محبت ۴ سراپا محبت ہوا چاہتا ہوں

(وحشت)
کوئی حد بھی ہے میری دیوانگی کی ۵ کہ منزل سے آگے بڑھا چاہتا ہوں

(اقرار ... کب)
قیامت کا وعدہ کہاں جینے دیگا ۶ کوئی دم میں رخصت ہوا چاہتا ہوں

(مطلب نہ نکلا)
اثر عرض مطلب سے اب کام ہی کیا ۷
(سمجھتے)
وہ خود جانتے ہیں میں کیا چاہتا ہوں

توجیہ :-

(۱) "میں میں" کے اتصال نے مصرع میں تعقید پیدا کردی تھی اور ایک قسم کا اہمال بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اصلاح سے دونوں عیب دُور ہو گئے۔

(۲) بظاہر مصرع اولیٰ ترمیم طلب نہ تھا لیکن فاضل استاد نے "اب تو" کی جگہ "کوئی" بنا کر نفسیاتی نزاکت اور وسعت پیدا کردی۔ اثر صاحب نے (DIRECT) براہِ راست تخاطب سے کام لیا تھا اور حضرتِ نوح نے اُسے (INDIRECT) بنا کر لطف پیدا کر دیا۔

(۳) پہلے مصرع کی اصلاح میں یاد اور دھیان میں تو خیر ایسا کوئی فرق نہ تھا۔ البتہ اب زوائد میں سے تھا وہ دُور ہو گیا۔ دوسرے مصرع کی اصلاح میری سمجھ میں نہیں آئی" وہ کیا چاہتا تھا" اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن" یہ کیا چاہتا ہوں" سے کچھ سمجھ میں نہیں آتا ——— غالباً ردیف نے" میں" کی جگہ" یہ" بنانے پر مجبور کیا۔ اگر" میں" کو قائم رکھا جاتا تو" ہوں" کی جگہ ردیف "تھا" ہونی چاہئے تھی۔ اِسی لئے" یہ" بنایا گیا لیکن مصرع کا مفہوم واضح نہیں ہوا۔" یہ" کے ساتھ بھی" میں" کی ضرورت باقی رہتی ہے

(۵) میری رائے ناقص میں مصرعِ اولیٰ ترمیم طلب ہے۔ لفظِ وحشت سے ایک مفہوم تو پیدا ہوا لیکن شعر میں ترقی نہیں ہوئی۔ مصرعِ ثانی اپنی اصلی حالت میں اچھا ہے۔

(۶) "کہاں" کی جگہ "کب" صحیح اور اچھا ہے۔

(۷) مقطع پر اچھی اصلاح دی گئی ہے" مطلب سے مطلب نہ نکلا" بہت خوب ہے۔

اعجاز صدیقی

انتخاب ماہانہ مشاعرہ بزمِ حلقۂ خیال کولار (میسور)

زیرِ صدارت :- عالی جناب احمد حسین صاحب عنابی اے۔ بی۔ ٹی انسپکٹر اردو ایجوکیشن کولار

بردولت کدۂ عالیجناب فیض مآب جی غوث صاحب مالک کارخانہ سورن بیڑی کولار

مصرعِ طرح "جوانی کی کہانی کیا جوانی خود کہانی ہے" (حضرت سیماب مدظلہٗ)

رودادِ مشاعرہ

۳۱ اکتوبر ۱۹۴۱ء کی شب کو ٹھیک ۹ بجے غوث منزل" کولار میں مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ مولانا مولوی حضرت عبدالغفور صاحب نے قرآن شریف سے مشاعرہ کا افتتاح کیا۔ پھر جناب عبدالمجید صاحب نے اپنی سریلی آواز سے نعت رسول صلعم پڑھی۔ اس کے بعد جناب سراج زیبائی نے بورنگ پیٹ کے شعراء کا تعارف کرایا۔

مقامی شعراء میں خلیل سیمابی کولاری جناب منیر سیمابی کولاری جناب تنویر سیمابی بنگلوری جناب رونق سیمابی چن پٹنی مقیم حال کولار۔ جناب رحمٰن حیدرآبادی جناب مظلوم کولاری تلمیذ حضرت جذب عالمپوری۔ جناب عاجز کولاری۔ جناب عادل کولاری۔ جناب ماہر کولاری۔ جناب حاذق کولاری۔ جناب نصرت کولاری۔ جناب بصیر کولاری مقیم حال بلیاگل۔ اور بورنگ پیٹ سے آئے ہوئے شعراء میں جناب سلیم علوی۔ جناب قدسی۔ جناب بقنی جناب ثاقب اور جناب مجنوں قابلِ ذکر ہیں۔

شعراء نے اپنے اپنے نمبر پر طرحی غزلیں پڑھیں۔ طرحی غزلوں کا سلسلہ ختم ہوتے ہی محترم صدر نے موجودہ اردو شاعری کی ضرورت پر ایک مدلل تقریر فرمائی۔ اس کے بعد جناب حاجی غوث صاحب سرپرست بزمِ حلقۂ خیال کولار نے بھی بورنگ پیٹ سے آئے ہوئے شعراء کا شکریہ ادا کرتے ہوئے قومی شاعری کی اہمیت پر لاجواب تقریر فرمائی۔ جس کو سامعین نے بہت غور سے سنا۔ الغرض یہ شعر و سخن کی کامیاب محفل شب کے ۲ بجے ختم ہوئی۔

خلیل کولاری - ناظم حلقۂ خیال کولار ملک میسور۔

جناب سید عبدالغنی صاحب تنویر سیمابی بنگلوری

اجل کیا ہے؟ حقیقت میں پیامِ زندگانی ہے ۔۔۔ یہی سرچشمۂ حیاتِ جاوید و عمرِ جاودانی ہے

جبیں کو ذوقِ طلعت ہو تو پیشانی ہی خود کعبہ ۔۔۔ نہ ہو ایسا تو پھر سجدوں کا حاصل سرگرانی ہے

چمن کی زندگی کو خطرۂ صیاد ہے لازم ۔۔۔ تپش انجم میں بھی کچھ باقی مذاقِ گلستانی ہے

بنا افلاک کی گھٹنے سے عروجِ آدمیت پر ۔۔۔ وگرنہ شعر خوانی محض اک طوطا کہانی ہے

ملا دل جو تلاشِ جادۂ منزل سے مستغنی ۔۔۔ نہیں معلوم یہ ہے گمرہی یا راہ دانی ہے

حقیقت سے جہاں میں آشنا کوئی نہیں ورنہ ۔۔۔ کلیمی رازدارانِ حقیقت کی تن آسانی ہے

[illegible] ۔۔۔ کبھی دل ہے کبھی تابِ نظر پہ بدگمانی ہے

بیاں کی قوتوں سے درد کی انداز پیدا ہیں ۔۔۔ نوا سنجی مری تنویر خونابہ فشانی ہے

یہ ادنیٰ سا ہے فیضانِ نظر سیماب کا مجھ پر ۔۔۔ تڑپ ہے سوز ہے مری طبیعت میں روانی ہے

خلیل سیمابی کولاری

تجھے شام و سحر احساسِ گل کی سرگرانی ہے ۔۔۔ مجھے صبح و مسا فکرِ حیاتِ جاودانی ہے

مری ہر بات اک عشق و محبت کی کہانی ہے ۔۔۔ مری ہر سانس اک گنجینۂ سرِ معانی ہے

کسی کی یاد سے وابستہ اشکوں کی روانی ہے ۔۔۔ مذاقِ درد سے خالی کہاں میری کہانی ہے

نظر آتا نہیں کوئی پرستارِ وفا مجھ کو ۔۔۔ جہاں میں ہر طرف جنسِ محبت کی گرانی ہے

نہیں معلوم یہ کس کی محبت کا تصرف ہے ۔۔۔ مری آنکھوں میں [illegible]

کسی کے عشق میں مر مر کے جینا کام ہے میرا — جہاں میں لے بتیاز موت میری زندگانی ہے
بھڑک اٹھی ہے ایسی آگ دل میں ہجرِ جاناں کی — سمندر میں بھی اب تشنہ ہوں پانی کی گرانی ہے
بتا اے مطربِ الفت اٹھا کر پردۂ فطرت — مرے سازِ رگِ دل میں یہ کس کی نغمہ خوانی ہے؟
مجھے حاصل تلمذ ہے خلیل اپنے سخنور کا — کہ جس کی آج دنیائے ادب پر حکمرانی ہے

جناب منیر نقشبندی سیمابی کولاری

نظر انجام میں ہو تو نشانِ کامرانی ہے — شعورِ زندگانی ہی فروغِ زندگانی ہے
زباں از بس ہے عاجز ماجرائے غم سنانے سے — مری صورت سے ظاہر حالِ دل کی ترجمانی ہے
جہاں کا ذرہ ذرہ جاگ اٹھا دیرینہ خوابی سے — ابھی تک روح میری محوِ خوابِ سرگرانی ہے
رواں ہیں اشک پیہم آنکھ سے اربابِ محفل کی — دلِ افسردہ کی کس درجہ دردآگیں کہانی ہے
مرا ہر سانس ہے پیغمبرِ بزمِ طرب، گویا — جہانِ کیف پر چھائی ہوئی میری جوانی ہے
سمجھتا ہے جہاں ناآشنائے غم ہنوز اس کو — کچھ ایسا خوگرِ صبر و رضا ہندوستانی ہے
ہمارا آشیاں طوفِ قفس کرنے کو ہے شاید — چمن میں آج کل صیاد محوِ باغبانی ہے
منیر آخر صلہ ترکِ خودی کا بھی نہ کچھ پایا — شعورِ زندگی بھی کیا گناہِ زندگانی ہے
منیر اپنی غزل بھی ہے مرقع یاس و حسرت کا — کہ ہر ہر شعر میں سوز و گدازِ میر و فانی ہے

جناب ایم یحییٰ صاحب رونق سیمابی خوندمیری چن پٹنی

ہماری زندگانی بھی انوکھی زندگانی ہے — کبھی مجبورِ غم ہے گاہ محوِ شادمانی ہے
گدازِ روح و دل ان کا اک سوزِ نہانی ہے — محبت جانے کیا ہوگی جو یہ اس کی نشانی ہے
یہیں ہے شامِ غم تصویرِ مرگِ ناگہانی ہے — الٰہی! ایسے جینے سے تو بہتر موت آنی ہے
نہ گھبرا آفتوں سے، صبر کر اے مضطرب بسمل — جو پیشانی میں ہے تیری یقیناً پیش آنی ہے
میں اس خوش قسمتی پر کیوں کروں نازش نہ اے رونق — مجھے دیدارِ حق ہے، تم کو حکمِ لن ترانی ہے
بتایا قصۂ غم ان کو رو رو کر تو فرمایا — ابھی تیری وفا ہم کو بہت کچھ آزمانی ہے
تڑپنے لوٹنے سے کوئی دن خالی نہیں جاتا — تمھارا دھیان ہے اور کاہشِ دردِ نہانی ہے
جوانی کی گزرگہ یاد ہے ہم! عہدِ پیری میں — وہ اک خوابِ پریشاں، ایک بھولی سی کہانی ہے
طفیلِ حضرتِ سیماب* رونق کا سخن چمکا — جو سنتا ہے وہ کہتا ہے عجب جادو بیانی ہے

از جناب سید روشن میاں صاحب روشن حیدرآبادی

بسر ہوتی نہیں یکساں یہ خوئے زندگانی ہے — اُسے غم لازمی ہے جس کو حاصل شادمانی ہے
جگہ کوئی نہیں باقی جہاں میں امن و راحت کی — جدھر جاتا ہوں ادھر سر پر بلائے آسمانی ہے
ابھی تک میری آنکھوں میں ہے کچھ کچھ نمی باقی — ابھی تک میرے کانوں میں صدائے لن ترانی ہے
تماشا اپنی ہستی کا دیکھ لے پھر اس کو بھی پردہ — تری ہستی ہی غافل ایک پردہ درمیانی ہے
جو جیتا ہے دنیا میں اسے مٹنا ہے دنیا سے — جو مر جاتا ہے اس کی زندگانی غیر فانی ہے
الٰہی حضرتِ سیماب کو تا حشر زندہ رکھ — کہ جن کے فیض سے باقی سخن کی قدردانی ہے
دکھاؤں کس کو میں جوہر طبیعت اہلِ بینش — نہ اگلے قدرداں باقی نہ اگلی قدردانی ہے

جناب امیر بیگ صاحب مظلوم کولاری

میرے اشعار میں پنہاں مرادِ زندگانی ہے — میرے نکتے میں گویا موجزن بحرِ معانی ہے
سنا دو مطربا پردے سے پھر دلکش نوا اپنی — کہ گوشِ دل طلبگارِ صدائے لن ترانی ہے
حقیقت چھپ نہیں سکتی کبھی دردِ محبت کی — ہر اک آنسو کا قطرہ کاشفِ رازِ نہانی ہے
زمانہ کیوں نہ ہو محزوں مری رودادِ غم سن کر — کہ یاس و درد میں ڈوبی ہوئی میری کہانی ہے
گدائی ہے مقدر میں تو پھر کوچہ بھی دے ان کا — کہاں مجھ کو تمنائے سریرِ خسروانی ہے
نہیں کہتے ہیں مجھ کو لوگ یونہی خاک کا پتلا — ترے کوچہ کی آخر زندگی بھر خاک چھانی ہے
میری رودادِ الفت سن کے اک عالم یہ کہتا ہے — عجب رنگیں فسانہ ہے عجب دلکش کہانی ہے
بلاؤ ان کو بزمِ سرفروشانِ محبت میں — دلِ مظلوم کی مشہور آشفتہ بیانی ہے

از جناب حاذق کولاری

اڑا کر لے چلے یا حیدر مشتِ خاک کو میری — مدینہ گر صبا لیجائے تیری مہربانی ہے
نظر آجائیگا تجھ کو خدا کا جلوۂ مخفی — من و تو کے مٹا جھگڑے یہی شوقِ لامکانی ہے
درود و فاتحہ کی اک بنا کر چادرِ نوری — مزارِ مصطفےٰ پر ایک دن مجھ کو چڑھانی ہے
میں ہجرِ مصطفےٰ میں اس قدر آنسو بہاتا ہوں — کہ جس کو دیکھ کر شرمندہ دریا کی روانی ہے
ہوئے کفر و ضلالت سرنگوں اسلام کے آگے — یہ تعلیمِ محمد کی صداقت کی نشانی ہے
جسے چاہے امیری دے جسے چاہے فقیری دے — الٰہی تیرے ہاتھوں میں جہاں کی حکمرانی ہے
زمانے کے حوادث کا تجھے کیوں رنج ہے حاذق — گزر جائیگی سر سے جو بلائے آسمانی ہے

جناب حسین شریف صاحب عاجز کولاری

میرے وحشت زدہ دل پر جنوں کی حکمرانی ہے — یہ حاصل زندگی کا یہ مآلِ زندگانی ہے
بجز ذاتِ خدائے پاک ہر اک چیز فانی ہے — شہادت کیلئے کافی کتابِ آسمانی ہے
پڑا ہوں ہجر میں لاچار، بے حد ناتوانی ہے — نہ باقی صحت ہے دل میں نہ آنکھوں میں جوانی ہے
سنا کر تو اٹھا تا سکا یہ جو بنیادِ ہستی فانی ہے — جناب [illegible] عاجز کی کہانی ہے

* اشارہ حضرت مولانا سیماب مدظلہ العالی کی طرف ہے۔

میرے مسکن کے نگے کیا حقیقت بوریا کی — ٹپک کر آنکھ سے بنتا ہے گوہر جو معانی ہے
خدا امید ہے اسکے نہ ہو مایوس اے عاجز — وہیں رکھا اپنی پیشانی جو قسمت آزمانی ہے

جناب عبدالرزاق صاحب حاضر کولاری

عمل سے تیرے گو مسلم نظامِ زندگانی ہے — مگر قدرت نہ یاد ہو تو مشکل کامرانی ہے
فنا ہر قوت بزمِ فسادِ دنیا نے مانی ہے — تو پھر کیوں خواہشِ آبِ بقا کی غیر فانی ہے
پئے تسکینِ دل کیوں اہتمامِ جانفشانی ہے — تری بیتابیوں میں ہی سکون و شادمانی ہے
ابھی کوسوں پڑی ہے منزلِ مقصود اے رہرو — تجھے اس راہ میں ٹھوکر پہ ٹھوکر اور کھانی ہے
تو پیغامِ عمل پہنچا دے ہر گوشے میں دنیا کے — ترے سینہ میں گر پوشیدہ رازِ زندگانی ہے
سمجھ سکتی ہے کیا اے طاقتِ ادراک تم اسکو — پتہ ہے لاپتہ جسکا نشانی بے نشانی ہے
تجسس چاہیے راہِ فنا میں آبِ حیواں کا — اگر تجھکو تمنائے حیاتِ جاودانی ہے
اسی میں ڈھونڈ لے وہ گوہرِ نایاب اے غافل — نہاں دل میں ترے گنجینۂ کون و مکانی ہے
نہیں اعزاز مقصد شعر گوئی سے مجھے حاضر — دلی جذبات کی تاثیر عالم کو دکھانی ہے

جناب عبدالکریم صاحب عادل کولاری

مسافر کے لیے دو دن یہاں کی میہمانی ہے — تماشہ گاہِ عالم یہ سرائے دارِ فانی ہے
اوسی کے در کا ہے کافی سہارا دونوں عالم کو — ملی روح الامیں کو جس کے گھر کی پاسبانی ہے
ٹھنی ہے جی میں اک دن یہ جنابِ خضر سے پوچھوں — ہے افضل موت یا بہتر حیاتِ جاودانی ہے
حقیقت موت کی انساں کوئی سمجھے تو کیا سمجھے — پرے ادراکِ انسانی سے یہ رازِ نہانی ہے
ملا عادل کو نسخہ جیسے ذوقِ عمل اریکا — ہر اک ہوش نے اُس کی خاکِ در اکسیر مانی ہے

جناب ڈاکٹر پی کے محمد ابراہیم صاحب بصیر ملیاگل

ضعیفی کا ہے عالم رخصتِ عمرِ جوانی ہے — کوئی دم ہی میں بجھنے کو چراغِ زندگانی ہے
نہایت سعی فرسا سرگذشتِ زندگانی ہے — ترا یا درد و اندوہ و الم دل کی کہانی ہے
ادھر مشکل ہے ضبطِ آرزوئے دل بہت مشکل — ادھر اک جوش پر دریائے حسنِ نوجوانی ہے
مجھے اس کا نہیں کچھ غم جو ہونا تھا ہوا لیکن — مرے مولا تجھے آئینہ مری بگڑی بنانی ہے
میرے دل کی طرف کیا دیکھتے ہو تم تعجب سے — یہ داغِ دل نہیں تمغائے عشقِ غیر فانی ہے
غمِ دنیا نہ مجھ کو اور نہ فکرِ عاقبت مجھ کو — نہ فکرِ نقشِ اول ہے نہ فکرِ نقشِ ثانی ہے
جہاں کا ذرہ ذرہ اس کا مجھ پر مائلِ جدت — اساسِ ارتقا ہی پر مدارِ زندگانی ہے
بصیر [illegible] — وہی رنگِ سخن ہے اور وہی پر گلفشانی ہے

جناب سلیم علوی پورنگ پیٹ

یہ دنیا آنی جانی ہے تمرّد ہرزہ خوانی ہے — جنابِ خضر کے دن کی حیاتِ جاودانی ہے
ریاضِ خلد سے حوروں کے پیغام انکو آتے ہیں — گنہگارانِ الفت کی بھی کیسی قدردانی ہے
گھٹائیں اودی اودی دیکھ کر کیوں جی نہ للچائے — خدائی ہاتھ میں ساقی کے جامِ ارغوانی ہے
لبِ رنگیں پہ ہر دم آپ کے موجِ تبسم ہے — ہماری آنکھ اور دن رات اشکوں کی روانی ہے
خدا کا شکر کرتا ہوں ادھر رحمت اُدھر حوریں — ہجومِ حشر میں بھی میری کتنی قدردانی ہے
جگر بے چین دل مضطر کبھی آہیں کبھی نالے — محبت آپ کی کیا ہے عذابِ زندگانی ہے
شریک حسن جس کا اس خدائی میں نہیں کوئی — ہمارے کشورِ دل پر اسی کی حکمرانی ہے
تلمذ مجھکو حاصل ہے جگر سے اور مجوی سے — سلیم اُن کی ہی دنیائے سخن پہ حکمرانی ہے

جناب حکیم محمد عبدالغفار صاحب عاقب لونگیٹ

اُنہیں پر جان دیکر نام پیدا کیوں نہ ہم کرلیں — ہمیں معلوم ہے آخر ہماری جان جانی ہے
قیامت پر قیامت ڈھا گئیں جبکا لڑکپن ہی — الٰہی خیر ہو آغاز پر اُن کی جوانی ہے
شبِ فرقت کا قصہ سنکے یوں کہنے لگا کوئی — کہ دکھ جانا ہے دل جس سے یہ وہ غم کی کہانی ہے
بجھائی ہے انہیں وہ آگ جو سینے میں ہے پنہاں — نہیں بے وجہ آنکھوں سے یہ اشکوں کی روانی ہے
مسخر ہو گیا جس نے سنا ثاقب سخن تیرا — غزل خوانی تری کیا ہے کوئی جادو بیانی ہے

جناب سید ابراہیم صاحب لطفی کولاری

ستم تیرا ہے یا کوئی بلائے آسمانی ہے — تہ و بالا مرا سارا نظامِ زندگانی ہے
ہجومِ حسرت و ارماں ہو یا اندوہ و حرماں ہو — یہ جو کچھ ہے دلِ مضطر سب انکی مہربانی ہے
یہ طوفاں سا جو اٹھا ہے ہماری دیدۂ تر سے — ہجومِ یاس نے کی دردِ دل کی ترجمانی ہے
مجھی سے بار بار اب وفا کا عہد لیتے ہیں — مری جانب سے شاید انکو اب تک بدگمانی ہے
نہ اہلِ دل یہاں کوئی، نہ میرا چارہ گر کوئی — سنیگا کون آخر دردِ دل کی جو کہانی ہے
کشاکش دیکھ کے قابل ہے جذباتِ محبت کی — ادھر بھی نوجوانی ہے، اُدھر بھی نوجوانی ہے
نہ پوچھو قتل ہو کر کیا سعادت مل گئی لطفی — دلِ بیکس ہم آغوشِ حیاتِ جاودانی ہے

جناب سید عبدالرحمن صاحب قدری پورنگ پیٹ

کسی کی یاد ہے دن رات اشکوں کی روانی ہے — جگر میں درد پنہاں دل میں کسکی نہانی ہے
مرے دل میں وہ مخفی اور رہیں نا آشنا مجھ سے — تلاشِ دوست میں دونوں جہاں کی خاک چھانی ہے
یہ دانا جیسے اُگتا ہے آخر خاک میں ملکر — یونہی ہر مرگ بشر وجہ حیاتِ جاودانی ہے

جناب [illegible] — [illegible] حقیقت ہی کا [illegible] کہلاتی ہے۔ تخلص میرا مجذوب ہے مجھے منشی ہی کہتے ہیں [illegible]

(اعجاز حسین صدیقی پرنٹر و پبلشر نے رفاہِ عام برقی پریس آگرہ سے چھپوا کر دفتر "شاعر" قصر الادب نائی منڈی آگرہ سے شائع کیا)

سالِ اجرا موسم بہار سنہ ۱۹۳۰ع (اس فہرست کے تمام مضامین نظم و نثر کے جملہ حقوق محفوظ ہیں) عرصۂ اشاعت ۱۲ سال

منظور شدہ محکمہ ہائے تعلیم برار و ریاست میسور

نگار ۔

تصویر :- محمد اسمٰعیل اوج قریشی احمد آبادی مرحوم

جلد ۱۳ | ماہنامہ "شاعر" - اگرہ - جنوری سنہ ۱۹۴۲ع | نمبر ۱

چندہ سالانہ اشرمیوں سے کم از کم ما محسنین نند معاونین للعہ رئیسوں سے عشہ ہندوؤں سے عم خواص سے شر عوام سے ہے فی پرچہ ۴

سرپرست، محسنین، معاونین، انیسان، ہمدردانِ شاعر

سرپرستِ ادب و شعر

(۱) عالیجناب خان شری امام الدین خاں صاحب مستانؔ رسوا والئی پاجود کاٹھیاواڑ

محسنینِ ادب و شعر

(۲) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشترؔ ہنگامی ۶۰ عـہ سالانہ

(۳) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیرؔ خورجوی ۶۰ عـہ سالانہ

(۴) محسنۂ ادب ہر ہائینس علیہ حضرت کتیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ عـہ سالانہ

(۵) محسنۂ ادب شہزادی تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ عـہ سالانہ

(۶) محسنِ ادب جناب محترم وزیر زادہ شجاعت خانصاحب قمرؔ جوناگڈھی ۶۰ عـہ سالانہ

معاونینِ ادب

(۷) معاونِ ادب مسٹر اے۔ بی فلپس صابرؔ بی۔ اے اکبرآبادی ۲۴ عـہ سالانہ

(۸) معاونِ ادب محترمہ نجمہ تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی ۲۴ عـہ سالانہ

(۹) معاونِ ادب جناب مولوی محمد احمد صاحب رسواؔ سہارنپوری ۲۴ عـہ سالانہ

انیسانِ ادب

(۱۰) انیسِ ادب جناب سید تفضل کریم صاحب جمشید پور ۱۵ عـہ سالانہ

ہمدردانِ ادب

(۱۱) ہمدردِ ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلیمانؔ جالندہری ۱۲ عـہ سالانہ

(۱۲) ہمدردِ ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیمؔ گوالیاری مرحوم ۱۲ عـہ سالانہ

(۱۳) ہمدردِ ادب جناب نوابزادہ کنور شکور حسین خانصاحب قیسؔ آف ہنڈوہ ۱۲ عـہ سالانہ

(۱۴) ہمدردِ ادب جناب بابو عبدالعظیم خانصاحب رونقؔ دکنی ۱۲ عـہ سالانہ

(۱۵) ہمدردِ ادب جناب مولوی محمد قاسم صاحب نامیؔ علوی دیوبنگوی ۱۲ عـہ سالانہ

(۱۶) ہمدردِ ادب جناب اسمٰعیل کھوکر صاحب رازؔ جوناگڈھی ۱۲ عـہ سالانہ

(۱۷) ہمدردِ ادب جناب صاحبزادہ سید مظفر حسین صاحب قیسؔ زمیندار (وان راڈھارام) ۱۲ عـہ سالانہ

(۱۸) ہمدردِ ادب جناب محبوب حسن صاحب آسیؔ متوطن رڑکی ۱۲ عـہ سالانہ

(۱۹) ہمدردِ ادب جناب لالٹی عمر میاں حسن میاں صاحب چشتی نظامی۔ کٹول ۱۲ عـہ سالانہ

(۲۰) ہمدردِ ادب جناب مخدوم سید علی اسعدؔ صاحب نقوی البخاری احمدآبادی ۱۲ عـہ سالانہ

خاصانِ ادب

(۲۱) جناب صاحبزادہ سلطان حامد خانصاحب ثروتؔ گلشن آبادی صہ سالانہ

(۲۲) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمان خانصاحب شفقؔ ٹونکی صہ سالانہ

(۲۳) جناب عبدالحفیظ صاحب ثمرؔ صدیقی پھلواری بی۔ اے صہ سالانہ

(۲۴) جناب محمد سعید خانصاحب ادیبؔ ریواڑی صہ سالانہ

(۲۵) جناب لالہ گنگارام صاحب آبدؔ سرہندی صہ سالانہ

(۲۶) جناب سید مظفر حسین صاحب عرشیؔ صہ سالانہ

(۲۷) جناب دلیپراج شرما۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ فرنچ منڈی ضلع جہلم صہ سالانہ

(۲۸) جناب سید علی حیدر صاحب عابدیؔ جمشید پور صہ سالانہ

(۲۹) جناب صاحبزادہ عبدالحمید خانصاحب بہادر عباسی بی۔ اے صہ سالانہ

(۳۰) جناب ماسٹر حسن خانصاحب اثرؔ ببئی صہ سالانہ

(۳۱) جناب نذیر احمد صاحب نذیرؔ سشیر کوٹی صہ سالانہ

(۳۲) جناب صبغۃ اللہ صاحب ارشدؔ صدیقی امروہوی صہ سالانہ

(۳۳) جناب صاحبزادہ سیٹھ اکبر علی صاحب ہنڈارہ صہ سالانہ

(۳۴) جناب طالقؔ ہمدانی لدھیانوی صہ سالانہ

(۳۵) جناب سبحان خاں صاحب غافلؔ بیتول صہ سالانہ

(۳۶) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثرؔ نقوی کوٹا ہہ صہ سالانہ

(۳۷) جناب حبیب حسن خانصاحب حبیبؔ شاہجہانپوری (کوئٹہ) صہ سالانہ

(۳۸) جناب بابو غفور محمد خانصاحب عارفؔ سیالکوٹی (کوئٹہ) صہ سالانہ

(۳۹) جناب شیو پرشاد صاحب برقؔ باندوی صہ سالانہ

(۴۰) جناب حکیم ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب زارؔ کاندہلوی صہ سالانہ

(۴۱) جناب علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفیؔ دہلوی صہ سالانہ

(۴۲) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعرؔ نہٹوری صہ سالانہ

(۴۳) ابوالافتخار ڈاکٹر ایس۔ ایم محمود خاں صاحب شاہجہانپوری ادیب عالم فاضل گیانی کوئٹہ صہ سالانہ

(۴۴) جناب ماسٹر کالو میاں صاحب نادانؔ گوہری (بڑودہ اسٹیٹ) صہ سالانہ

جرعات

کارزارِ ہندوستان

"ہندوستان خطرہ میں ہے" کی آواز تو اب سے بہت پہلے سامعہ خراش ہو چکی تھی دیسری بات ہے کہ ہمارا احساس جس سے اثر پذیر نہ ہوا ہو، ہماری تن آسانی نے ہمیں اس پر غور و فکر کا موقع نہ دیا ہو اور ہماری غلامی آزادی کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ لگا سکی ہو لیکن اب تو ساحلِ شرقی سے ارضِ ہند میں جنگ کے شعلے داخل ہو چکے ہیں۔ سالِ نو کی مسرت انھیں تو ہو سکتی ہے جنھیں خطابات سے نوازا گیا اور جن کے طوقِ غلامی پر طلع کاری کی گئی ——— خستہ حال اور بھوکے ہندوستانیوں سے کوئی پوچھے، بیواؤں، یتیموں اور ماتا کی ماری ماؤں سے دریافت کرے، وہ بتائینگی کہ نیا سالِ نو نغمۂ مسرت ہے یا صورِ غم ——— ؟

آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ سالِ نو ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا خونی ورق ہوگا جس پر مجبوروں، بیکسوں اور بے بسوں کی روحیں تڑپتی اور تلملاتی ہوئی نظر آئینگی جاپان کا جارحانہ اقدام اور مدافعت کی بے آب تلوار قیامتِ کبریٰ سے کم نہیں ——— آہ بے بس ہندوستان!!

ہندوستانی قزاق

کچھ تو حکومت کی بے توجہی سے اور کچھ ہوس کارانہ ذہنیت کی وجہ سے اس عالم آشوب میں ہندوستانی اپنے بھائیوں ہی کو لوٹ رہے ہیں۔ وطن کے گوشہ گوشہ میں "بناشاہی" رجحانات کام کر رہے ہیں اور آندھی کے آم سمجھ کر وطن و دشمن دونوں ہاتھوں سے روپیہ ٹھیکریاں سمیٹ رہے ہیں۔ اُن کی بلا سے غریبوں کی جانوں پر بن جائے۔ مفلس پیٹ سے پتھر باندھے باندھے پھریں اور نادار ایک ایک چنے کے لئے ترسیں ———

کاغذ پر بھی دولت کے اندھے سانپ کنڈلی مارے بیٹھے ہیں۔ جاپان کے میدانِ کارزار میں قدم رکھتے ہی اِن قوم فروش شیطان زادوں اور غداروں کے رشتہ داروں کی اور بھی بن پڑی ہے اب کاغذ اپنی آٹھ گنی قیمت پر بھی نایاب ہے۔ حکومت نے جہاں بعض رسائل و جرائد کو کاغذ کا لائسنس عطا فرمایا ہے وہاں اُس کے صرف کو نصف کر دینے کی بھی تجدید فرمائی ہے یعنی اگر "شاعر" میں بیس رِم ماہانہ چھپتے تھے اب گیارہ آٹھ تو رِم میں کام چلانا چاہئے اور لطف کی بات یہ ہے کہ قیمت اصل سے چوگنا زیادہ ——— پھر اس کاغذ دار کمی نہیں ہے تاکہ کاغذ وقت پر ملے گا بھی یا نہیں اور ملے گا تو کس سائز کا!

ادارہ نے یہ انتظام کیا تھا کہ جنوری ۱۹۴۲ء کا "شاعر" ۱۴ دسمبر کو شائع ہو جاتا لیکن افسوس کہ یہ کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں کچھ کاغذ دہلی سے منگایا گیا اور کچھ آگرہ سے خریدا گیا اس طرح چند دن کی تاخیر سے رسالہ شائع کیا جا رہا ہے۔

ناظرین وقت کی نزاکت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے تاخیرِ اشاعت کو محسوس فرمایا کرینگے "شاعر" ہر ماہ شائع ضرور ہوگا، اگر خدا کا فضل و کرم شامل حال رہا تو ادب و شعر کا یہ دا صحیفہ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی اپنی زندگی کا ثبوت دیتا رہے گا۔ توفیق الٰہی شامل حال رہنی چاہئے۔

جمودِ مستقل

دسمبر ۱۹۴۱ء کے "جرعات" میں میں نے اُردو زبان و ادب کا واسطہ دیکر ناظرین کو "شاعر" کی توسیعِ اشاعت کی طرف متوجہ کیا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُردو نواز طبقہ بے حسی کے بدترین دور سے گذر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "شاعر" کی پکار" خاموشی کی نذر ہو کر رہ گئی دوسری بانقطہ کے اخبارات و رسائل کے ساتھ اُن زمانوں کے بہی خواہ وقت کی نزاکت کے تحت کیا کچھ کر رہے ہیں۔ اگر میں اس کے اعداد و شمار پیش کروں تو اُردو نواز طبقہ کو بڑی ندامت ہوگی میں مصلحتاً اس سے گریز کر رہا ہوں۔ کاش ناظرینِ شاعر اب بھی توجہ فرمائیں۔

ایک طرف تو اُردو داں طبقہ کے جمود کا یہ حال ہے دوسری طرف ویلیوں کی واپسی کا سلسلہ بھی برابر جاری ہے گویا ہر طرح "شاعر" کو نقصان پہونچانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس سلسلے میں ہر درخواست بیکار ثابت ہو رہی ہے۔ ایک طبقہ اور بھی ہے جو ایک ایک دو دو سال کا چندہ دبائے بیٹھا ہے اور کئی بار کی یاددہانی کے باوجود خاموش ہے ادارہ نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ اشاعت میں ایسے تمام حضرات کے نام شائع کر دیئے جائیں اور پھر رسالہ اُن کے نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا جائے۔

یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ جواب طلب امور کے لئے جب تک جوابی کارڈ یا لفافہ نہ آئیگا اُس وقت تک کسی کو جواب نہیں دیا جائے گا خواہ وہ اپنا ہو یا بیگانہ اور کتنا ہی اہم کام کیوں نہ ہو۔ ناظرینِ "شاعر" بطورِ خاص نوٹ فرمالیں۔

مشاعرۂ شاعر

"مشاعرۂ شاعر" کے لئے وقت کے تعین کے باوجود ۲۰ تاریخ تک غزلیں پہونچتی رہتی ہیں اس مرتبہ ایسی تمام غزلیں روک لی گئی ہیں۔ جو مقررہ تاریخ کے بعد وصول ہوئی تھیں اس کے علاوہ بعض غزلیں غیر معیاری ہونے کی وجہ سے اور بعض عدم گنجائش کی وجہ سے اس مرتبہ شریک مشاعرہ نہ ہو سکیں "شاعر" کے محدود صفحات چونکہ زیادہ اشعار کے متحمل نہیں ہو سکتے اس لئے انتخاب میں بھی سختی سے کام لیا گیا ہے۔ آئندہ بغیر کسی رو رعایت کے مشاعرہ میں وہی اشعار شائع ہو سکیں گے جو زیادہ سے زیادہ معیاری ہونگے۔

اعجاز صدیقی

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

انساں پہ حقیقت کا نہ در باز ہوا
اُلٹا ہی یہ عالم اثر انداز ہوا
انجام یہ دُنیا ہے پہونچنے والی
کہتے ہیں کہ نوروز کا آغاز ہوا

تقویم کا گو صفحۂ نَو باز ہوا
ماحول کہاں سُکون پرداز ہوا
رفتارِ جب انقلاب کی تھڑے گی
سمجھونگا کہ عہدِ نَو کا آغاز ہوا

خطرے میں مرے وطن کی آبادی ہے
جاپان اب آمادۂ صیادی ہے
یا تو مقسومِ ہند ہے بربادی
یا بانگِ دہل نویدِ آزادی ہے

دشمن کا اِدھر گذر نہیں ہوسکتا
امکان تو ہے ۔ مگر نہیں ہوسکتا
اے ہند! ہے محفوظ یہاں جبتک "تاج"
نیچا کبھی تیرا سر نہیں ہوسکتا

اے اہلِ چمن اب ہے چمن خطرے میں
آزادیٔ گنگ و جمن خطرے میں
اخلاف سے کہدو کہ خبردار رہیں
ہے ارجن و بھیم کا وطن خطرے میں

جو صاحبِ ہمت ہے وہ ممتاز ہے آج
سُن لو کہ یہی وقت کی آواز ہے آج
کیوں اپنے وطن پر آنچ آنے دیگا
ہندی ہر جنگ میں سرافراز ہے آج

بازیچۂ مکر دفن سے آگے نہ بڑھا
خودبیں حدِ ماؤ من سے آگے نہ بڑھا
مفتوح نہ ماسکو ہوا آخرکار
ہٹلر، نپولین سے آگے نہ بڑھا

یورپ میں تدبّر کی ہے مشعل کوئی
کامل ہے کوئی عقل میں اکمل کوئی
دو اپنے وطن کو بھی تحفظ کا پیام
کیا آج نہیں ہند میں چرچل کوئی؟

طوفاں سے نکلنے کا ہے یارا باقی
جب تک ہے ایک بھی کنارا باقی
ٹرکی ہے محفوظ، کہ اسکے دم سے
ہے کوششِ امن کا سہارا باقی

کیا دین کی خیر، کیا ہوا ایمان کی خیر
انسان کدے میں نہیں انسان کی خیر
شورش کدۂ جہاں کو دیکھ دعوتِ صلح
اے ملتِ ترکیہ تری جان کی خیر!

سیماب

(۲۳) جناب عبدالحفیظ صاحب عمر صدیقی چھاؤنی ۱۰ ۔۔۔

شخصیات:۔ محمد اسمٰعیل اوج قریشی احمد آبادی مرحوم

آج میں اس باب میں ایک ایسے مرحوم شاعر کو پیش کر رہا ہوں جس کو شاعری سے دیرینہ لگاؤ تھا۔ نہ وہ زبان داں تھا اور نہ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ ہنجاسنی اول میں آنکھ کھولی اور اسی میں ختم ہوگیا۔ لیکن فطرت نے اُس کے ذہن و فکر کی آنکھیں کھول دی تھیں اور اس کے اشعار میں بڑی حد تک آتش نفسی، سنجیدگی اور بلندی پیدا ہوگئی تھی۔

اوج مرحوم کو جوانی سازگار نہ آئی وہ ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے اور صرف ۲۲ سال کی عمر میں ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو راہی عدم ہوگئے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام علی محمد ہے اور آپ جماعتِ قریش کے نیک دل، سادہ لوح اور پاک طینت بزرگ ہیں اور جماعتِ قریش کے بڑل عزیز چودھری بھی۔

اوج مرحوم کا رجحان بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف تھا۔ اسکول کی درسی کتابوں کے سیکڑوں اشعار آپ نے حفظ کرلئے تھے — اُن کی عادت تھی کہ ہر بات کا جواب شعر کی صورت میں دیا کرتے تھے اور اس پر انھیں بڑا فخر تھا۔ رفتہ رفتہ یہ ذوقِ شعری جنون کی حد تک پہونچ گیا اور وہ مجسم شعریت بن کر رہ گئے۔ آخرکار جناب ذبیح قریشی احمد آبادی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ جناب احمد حسین صاحب حزیں قریشی۔ محمد عادل صاحب دہلوی اور مولانا عبدالکریم صاحب کلیم کی صحبتوں سے بھی مستفیض ہوئے۔ مطالعہ کا شوق بہت زیادہ تھا۔ ہمہ وقت کتب بینی میں مشغول رہتے تھے اس انہماک نے مرحوم کی صحت پر بہت بُرا اثر کیا۔

"انجمن اراکینِ قریش" کے مشاعرہ کی بنیاد بھی مرحوم اور پٹیل چودھری یار محمد سند یافتہ حکیم عبدالرحمٰن سائیں (بتی والے) کی کوششوں کا نتیجہ ہے مرحوم احمد آباد کے مشاعروں میں بے دھڑک شریک ہوتے تھے ان کا کلام "شاعر" کے علاوہ اور بھی بعض اخبارات و رسائل میں شائع ہوتا تھا۔ ان ادبی سرگرمیوں نے احمد آباد کی فضاؤں میں اچھی خاصی شعریت پیدا کردی۔ مرحوم مشاعرہ میں جب اپنی غزل سُناتے تو لوگ بہت خوش ہوتے اور بعض تو یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے کہ "یہ جھلملاتا ہوا ذرہ نہ جانے کس آسمان کا خورشید بننے والا ہے"!

مولانا عبدالکریم کلیم قریشی احمد آبادی اکثر اوج مرحوم کی ترقیوں کے لئے دُعا فرمایا کرتے تھے اور مرحوم کے مستقبل کی تابناکی سے بہت خوش تھے۔ آپ نے قطعۂ وفات بھی تحریر فرمایا ہے جس کا مادۂ تاریخ یہ ہے:۔

اس پہ سایہ ہو "خاص رحمت کا"
۱۳۶۰ھ

انتخابِ کلام

وہ ڈوبتے ہوئے تارے وہ شب کا سناٹا
وہ منتظر مری دُنیا کسی کے آنے کی

ہے جبہ سائی سے مطلب کنشت ہو کہ حرم
مری جبیں نہیں پابند آستانے کی

گرا جو تیری نگاہوں سے پھر وہ اُٹھ نہ سکا
رہا جو تیری نظر میں وہ سرفراز رہا

فطرتِ غم نصیب کیوں اس سے اثر پذیر ہو | نغمۂ غم کی کوئی لَے سازِ بہار میں نہیں
ہر موجِ طوفانِ دریائے محبت نے | تو بار ڈبویا ہے تو بار ابھارا ہے
خوابِ جلوۂ حسنِ ازل ہائے اجنبی لقاں | ادائے دلکشیٔ حُسنِ عالمگیر کیا کہنا
جہاں کی خود غرضی روزگار کا ماتم | غرض کسی نہ کسی کے شکار ہو کے چلے
دراصل مقصدِ دنیا ہی بیقراری ہے | قرار کب تھا کہ ہم بیقرار ہو کے چلے
برق کو جو کام کرنا تھا وہ آخر کر گئی | کرنے والے اہتمامِ گلستاں کرتے رہے
کس سے بہلائینگے ہم آخر دلِ بیتاب کو | آپ جاتے ہیں مگر یہ تو بتاتے جاتے
آ اے خیالِ جلوۂ صد رنگ حسنِ دوست | میرے تصورات کو رنگیں بنا بھی دے

مشاعرۂ شاعر۔ مصرعِ طرح برائے ماہ مارچ ۱۹۴۲ء

"طلوعِ صبح ہے تاراج محفل ہوتی جاتی ہے"

محفل۔ دل وغیرہ قوافی ہوتی جاتی ہے ردیف

نوٹ۔ ۸ر فروری ۱۹۴۲ء کے بعد جو غزلیں وصول ہونگی وہ شریکِ اشاعت نہ ہوسکینگی

منیجر

طوفان کی گرج

اسی جانب ہو کیا رفتار امواجِ پریشاں کی؟
مسلسل آ رہی ہے کان میں آوازِ طوفاں کی

اسی جانب بڑھا آتا ہے سیلابِ فنا ساماں
جہنم در نفس، دشنہ بکف، طوفان در داماں

چٹانیں جسقدر بھی راستے میں اُسکے آتی ہیں
وہ اُس کی ٹھوکروں سے پِس کے پانی ہوتی جاتی ہیں

سفینے اور جہاز اُڑتے ہیں آتشبار پھونکوں سے
سمندر آگ بن جاتا ہے اُسکے گرم شعلوں سے

بھری کھیتوں کو تل پٹ کر دیا ہے تند موجوں نے
چمن ویراں کئے ہیں اسکی بے ترتیب فوجوں نے

تباہی عالمِ انسانیت میں اُس نے ڈالی ہے
کروڑوں ایسی مائیں ہیں کہ جنکی گود خالی ہے

یتیم اس نے کیا بچّوں کو اور بیچارگی دیدی
جوانی میں سہاگن عورتوں کو بیوگی دیدی

کئے تہذیب کے ٹکڑے تمدّن کو مٹا ڈالا
جو تھے تعمیرِ عالم کا سبب اُن کو مٹا ڈالا

صدا پردے میں اسکے گونجتی ہو اک درندی کی
جسے ہے ہوش میں پروا نہ مُردے کی نہ زندی کی

ہزاروں مقبرے روندے گئے رفتار سے اُس کی
زمیں کے دل پہ گہرے زخم ہیں تلوار سے اُسکی

ہزاروں قصر و ایواں کر دئیے برباد دُنیا میں
نہیں چنگل سے اسکے کوئی ملک آزاد دُنیا میں

سکون و امن کی لاشیں کچلتا اور تبر تولے
ہلاکت کا فرشتہ آ رہا ہے اپنے پَر تولے

حوادث کے تھپیڑے بے تحاشا سہ رہی ہیں اُسکے
رگِ ہستی پہ قابو یاب دونوں ہاتھ ہیں اُسکے

نظر آتی ہیں اسکی شورشیں مشرق کے ساحل سے
مگر مشرق کو فرصت ہی نہیں اشغالِ باطل سے

نہیں اربابِ ساحل پر اثر آثارِ طوفاں کا
ہے ان پر خواب طاری اب بھی دورِ اسی ساحل کا

وہی رقص و ادا کاری وہی نغمات و ساز اب تک
وہی ہے گرمئی محفل سرودِ دلنواز اب تک

وہ ہی ساقی وہی مینا وہی ساغر وہی بادہ
وہی سفلہ پرستی رندی و مستی پر آمادہ

وہی عشوہ فروشی ہے صنم خانوں کی راہوں میں
وہی مُردہ پرستی ہو رہی ہے خانقاہوں میں

وہی شعروں میں فرضی حسن کاری ہے تخیل کی
وہی نازش ہے دقائے ہوئے جاہ و تجمل کی

وہی ہیں بین الاقوامی مباحث ہر طرف جاری
غلامی کی وہی پھیلی ہوئی ہے ان میں بیماری

وہی جلسے، وہی سیریں، وہی تفریح خانے ہیں ۔۔۔ پذیرائی ہوس کی ہے، محبت کے بہانے میں
برہنہ سر ہیں لیکن اب بھی نازِ کجکلاہی ہے ۔۔۔ ہیں فاقہ مست اس پر بھی دماغِ پادشاہی ہے
مسلط ہے بلا کی طرح ان پر خوابِ غفلت کا ۔۔۔ وہی کابوس نخوت کا، وہی سودا جہالت کا
یہ سن سکتے ہیں در پردہ نوا سازِ رگِ جاں کی ۔۔۔ نہیں آتی صدا کانوں میں لیکن شورِ طوفاں کی
نہیں معلوم یہ طوفان کب مشرق پہ چھا جائے ۔۔۔ کب ان اونگھی ہوئی بیداریوں کو نیند آ جائے
کیا ہے **وقت** نے جو وار، وہ خالی نہ جائیگا ۔۔۔ گرج طوفاں کی آج آتی ہے، کل طوفان بھی آئیگا
بہت پھونکے ہیں میں نے صُورا ُنکی خواب گاہوں میں ۔۔۔ بنا ناقوسِ بتخانہ، اذاں دی خانقاہوں میں
فنا کی آخری ٹھوکر جگانے آئی ہے اِن کو ۔۔۔ پیامِ آخرِ فطرت سنانے آئی ہے اِن کو

کہ جن قوموں کا غفلت اور عشرت کام ہوتا ہے
جہاں میں اُن کا مستقبل فنا انجام ہوتا ہے

کہاں ہیں وہ مدبّر جنکو دعوائے سیاست ہے؟ ۔۔۔ کہاں ہیں وہ مفکّر جنکو زعمِ علم و حکمت ہے؟
کہاں ہیں جلوۂ اسرارِ نہاں دیکھنے والے؟ ۔۔۔ کہاں ہیں اک نظر سے نبضِ طوفاں دیکھنے والے؟
کہاں ہیں وہ مزاج آگاہ، رزم و بزمِ امکاں کے؟ ۔۔۔ کہاں ہیں وہ شناور قلزمِ ادراک و عرفاں کے؟
کہاں ہیں وہ علمبردار خالدؓ اور حیدرؓ کے؟ ۔۔۔ کہاں ہیں آزمودہ کار ماضیاتِ خیبر کے؟
کہاں ہیں بھیشم و ارجن سے رشتہ جوڑنے والے؟ ۔۔۔ کہاں ہیں اپنے سر آپس میں لڑ کر پھوڑنے والے؟
کہاں ہیں کوندنے والے مجالس اور سبھاؤں میں؟ ۔۔۔ کہاں ہیں اُڑنے والے لفظ و معنی کی ہواؤں میں؟
کہاں ہیں انقلابِ وقت کا منہ پھیرنے والے؟ ۔۔۔ کہاں ہیں گردشوں کو زد میں لا کر گھیرنے والے؟
کہاں ہیں وہ جو کہتے تھے کہ جب ہم مسکرا دینگے ۔۔۔ تو عقل و ہوش کے انبار پر بجلی گرا دیں گے؟
کہاں ہیں وہ جو کہتے تھے وطن کے پاسباں ہم ہیں؟ ۔۔۔ نہیں صیاد و گلچیں، ذمہ دارِ آشیاں ہم ہیں
کہاں ہیں ناخدایانِ وطن اب سامنے آئیں ۔۔۔ سفینہ ڈوبتا ہے، ڈوبتے کو تھامنے آئیں
کوئی ہے روک دے جو انقلابِ حشر ساماں کو؟ ۔۔۔ کوئی ہے جو بدل دے حاصلِ تقدیرِ طوفاں کو؟

نظامِ حال بعد از وقت بھی ہے اور مشکل بھی
کہ اب ساحل بھی خطرے میں ہے، موجود اساحل بھی

سیماب اکبرآبادی

"کمالاتِ کمالی تحقیق و تصحیح کی روشنی میں"

(گذشتہ سے پیوستہ)

نقطہ اک آپ ہی نے مرتبہ سمجھا ہو ٹھیک اُسکا لقب رکھا لوجہ وحدہٗ یا لاشریک اسکا
تمرّد بر خلافِ حکم ملاک و ملیک اُس کا بڑا حُسنِ عمل ٹھہرا یہی فعلِ رکیک اُس کا

کمالی صاحب آپ کے ساتھ لفظ مولانا ہی اس بات کا ثبوت تھا کہ آپ قال قال یا رسول اللہ صلعم" پڑھنے والے اور فَعَلَ فَعِلَ فَعُلَ کی رٹ لگانے والے مولوی ہیں آپ نے اپنی عربیت اور قاموسیت کا بھرم کیوں کھولا؟

لوجہ وحدہٗ اور ملاک و ملیک مولانا سیماب کی نظم میں تو کہیں نہیں۔ یہ تو آپ ہی جیسے عربی داں استعمال کر سکتے ہیں۔ سبحان اللہ ملاک و ملیک کتنے ملوک الفاظ ہیں۔ (ملوک ہندی میں نہایت حسین اور پیارے کو کہتے ہیں۔ آپ عربی داں ہیں اس لئے بتا دیا گیا ہے)

" لوجہ وحدہٗ لاشریک" کو" لوجہ وحدہٗ یا لاشریک" کہنا کمالِ شاعری اور انتہائے قادر الکلامی نہیں تو اور کیا ہے؟

وہ محوِ سرکشی۔ کل عالم ملکوت سرخم ہے خدا کا سامنا اور خودستائی کا یہ عالم ہے
اب اسکو ترکِ شرک و ترکِ بدعت جو کہو کم ہے کسی کے جوشِ معلومات پر افسوس و ماتم ہے

پہلے مصرع کو سُن کر بھی آپ داد نہ دیں تو یہ آپ کی ستم ظریفی ہے۔ آپ "وہ" کی ضمیر کا مرجع مولانا کمالی ہی کی ذاتِ شریف کو کیوں سمجھ رہے ہیں۔ شیطان ہی کو سمجھئے۔ "عالم ملکوت سرخم ہے"۔ اس اُردو دانی کا کیا ٹھکانہ ہے۔ کوئی اور شاعر ہوتا تو عالم ملکوت کا سرخم ہے" لکھتا۔ یا یوں لکھتا کہ عالمِ ملکوت سرخمیدہ ہے۔ مگر مولانا کمالی اگر شاہراہِ عام سے ہٹ کر نہ چلیں تو پھر کمال ہی کیا رہ جاتا ہے؟

چوتھا مصرع ان تینوں مصرعوں کے ساتھ مربوط ہو یا نہ ہو۔ مربوط ہونے کا تو سوال ہی نہیں اس کا مفہوم تو کمالی صاحب کے ذہن میں محفوظ ہے۔ آپ اگر چاہیں تو پوچھ لیجیے۔

عومن سجدے کے آیا وصف اپنا برملا کہنے لگا احمق خدا کے سامنے لفظ" انا" کہنے
چلا ہے خاک و آتش کا خدا سے ماجرا کہنے خدا کو دو جہاں میں پوچھنے والے کے کیا کہنے

کمالی صاحب شیطان سے ناراض کیوں نہ ہوں اس احمق نے کبھی تو صرف اپنے لئے ہی لفظ" انا" استعمال کیا مولانا کمالی کو نظر انداز ہی کر دیا۔ مولانا کمالی کو اپنے ساتھ شامل کر کے اُسے "نحنُ" کہنا چاہئے تھا اور دیئے خاک و آتش کا ماجرا وہ بھی کہنے چلا ہے خدا سے۔ "چلا ہے" کا کچھ خیال نہ کیجئے" خاک و آتش" کی اگر تفصیل دیکھنی ہو تو "خلقتنی من نار و خلقتہ من طین" پڑھ لیجئے۔ کمالی کا پھر کمال ہی کیا اگر آپ سب کچھ بغیر بتائے ہی سمجھ جائیں۔

رُکا آدم کے سجدے سے جو تھا حکم خداوندی فرشتوں سے تو چڑھ جانیکا موقع ہی نہ تھا کوئی
علی الرغم ملائک کی بھی پھبتی ایک ہی سوجھی شگونِ غیر کی خاطر خود اپنی ناک کٹوائی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ نظم کہتے وقت کمالی صاحب کی طبیعت حاضر نہ تھی دوستوں نے ان سے اصرار کیا نہ کہتے تو بات ہیٹی ہوتی۔ بات رکھنے کے لئے غریب کو نظم لکھنی پڑی اب دُنیا کی غلط فہمی دیکھئے کہ ہر بند اور ہر مصرعہ میں معنی اور شعریت تلاش کرتی ہے۔ معنی سمجھنے ہیں تو پہلے مولانا سیماب کی نظم پڑھئے اور پھر بھی سمجھ میں نہ آئیں تو خدا رکھے کمالی زندہ ہیں اُن سے دریافت کر لیجئے۔ انہیں اپنی بات رکھنی ہے تو مطلب بھی بتا ہی دینگے۔" فرشتوں سے تو چڑھ جانے کا موقع" محاورہ ہے۔" بڑھ جانے کا موقع" لکھتے تو اس میں کیا بے کمالی تھی؟

بدلے خود انکار ہنر اس کو ہی کہتے ہیں طویلے کی بلا بندر کے سر اسکو ہی کہتے ہیں
گداز عشق بے شل و دگر اسکو ہی کہتے ہیں کمال سند و تقدان شمر اسکو ہی کہتے ہیں

کس کو کہتے ہیں وہ کمالی صاحب کی نظم سے آپ سمجھ سکیں گے۔ "گداز عشق بے [illegible] [illegible] وسیماب صاحب نے نظم لکھی اور اہلِ فن میں [illegible]

• کمالاتِ کمالی پر کمالِ افسوس و ماتم ہے

[illegible] غریب کمالی کا لاء طویلے کی بلا بندر کے سر نہیں ہے؟

نہ ہوتی ایسے تاری کی بھلا کیوں ہمہ دانی   خودی کے زعم میں جس نے کیا دعویٰ ربانی
اسی کا سایہ میسّر ہو مجھے جوشِ ہمہ دانی   یہاں اسکو نہ سوجھے کیوں محبت کی فراوانی

جوشِ ہمہ دانی اور پھر میسّر ایک قہقہہ لگائیے اور خاموش ہو جائیے۔ چوتھی مصرع پر ہم سے اصلاح لے لی جاتی تو ہم یوں بنا دیتے: "اسی کو سوجھ سکتی ہے محبت کی فراوانی" یہاں اس کو۔ نہ سوجھے کیوں؟ کیا فصیح اردو ہے!

خدا کے حکم کی تعمیل غیروں کی پرستش ہے   کسے سمجھا ہے ہو کیا یہی منشائے دانش ہے
خدارا ایک ہی کیا استقامت اور لغزش ہے   یہ کوئی علم ہے یا علم کی خالی نمائش ہے

کمالی صاحب واقعی آپ کو سمجھنے کی ضرورت نہیں آپ کو اپنے مہمل اشعار سمجھانے سے فرصت ملے تو آپ دوسروں کا کلام سمجھیں۔ دیکھئے اس بند کے تیسرے مصرعہ سے آپ جو مفہوم پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ پیدا نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں تو آپ اسے یوں بنا لیجئے اور اپنی نظم سے متعلق سمجھئے ؎

نہیں ہے استقامت نام کو لغزش ہی لغزش ہے
یہ کوئی علم ہے یا علم کی خالی نمائش ہے

مجھے فضلِ کرم فرمانہ تسلیم کیا معنی   مگر با اقتضائے حسن میں ترمیم کیا معنی
جنابِ یوسفی میں سجدۂ تنظیم کیا معنی   نمودِ کبر کی اور عشق میں تعمیم کیا معنی

مولانا سیماب نے تو نظم شیطان پر لکھی ہے آپ پر نہیں آپ اپنا ذکر کیوں کر بیٹھے اقتضائے حسن میں ترمیم واقعی آپ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ بہت ارفع مقام ہے۔ آپ تو ان لوگوں میں سے ہیں جن کا عقیدہ ہے ؎

"روز و شب ہنگامہ برپا ہے میانِ کوئے دوست   ہڈیوں پر میری لڑتے ہیں سگانِ کوئے دوست"

اور یہ "فضلِ کرم فرما" کیا بلا ہے؟ ذرا اس کے معنی سمجھ کر سمجھا دیجئے۔ "جنابِ یوسفی میں سجدۂ تنظیم" اے سبحان اللہ! اگر اب بھی نہ سمجھے وہ تو اُس بُت کو خدا سمجھے

جو تھی تکلیف شرعِ ایزدی کی سترد کر دی   بڑا احسان کیا ابلیس کی تصدیق کد کر دی
تعبد کی گراں سرمایگی نذرِ خرد کر دی   خدا سمجھے سخن گر کو سخن سازی کی حد کر دی

کیوں صاحب یہ "تصدیق کد" کرنا کیا کوئی بھاری محاورہ ہے؟ شرعِ ایزدی کی تکلیف تو آپ کی من مانی ہے۔ سیماب صاحب کی نظم میں تو کہیں نہیں۔ تعبد کی گراں سرمایگی بھی آپ ہی نذرِ خرد کر رہے ہیں کیا یہ سخن سازی نہیں؟ اگر کوئی اس بند کا چوتھا مصرع یوں پڑھے تو بیجا نہ ہوگا۔ "خدا سمجھے کمالی کو سخن سازی کی حد کر دی"

(باقی۔ باقی)

صبا متھراوی

شعاع

اُفق چمکا، ہوئی کافور شب کی ظلمتِ بہیم — پیامِ صبح دیتی ہے، سحر کی آسماں تابی
دمِ خورشید نے اک روح پھونکی نبضِ ہستی میں — تپش پیدا ہوئی ذرّوں میں مثلِ رقصِ سیمابی
چلی موجِ نسیمِ صبح اُٹھکر کنجِ گلشن سے — گریزاں چشمِ غنچہ سے ہوا کیفِ گراں خوابی
ہر اک شاخِ چمن جھومی گلوں کی انجمن جھومی — بہی پیمانۂ خورشید سے جوشِ مئے تابی

طلسمِ خوابِ شب ٹوٹا نمودِ صبحِ روشن سے
پر افشاں ہو گئے طائر نکلکر اپنے مسکن سے

شعاعِ مہرِ تاباں کیا ہے، اک پیغامِ بیداری — سکوتِ غنچۂ گل کو صلائے لغزشِ گفتاری
ہوا ہے سست رو جو قافلہ تاریکیٔ شب سے — چمک کر اُس کو دیتی ہے نوید برق رفتاری
بجھا دیتی ہے جا کر آسماں پر شمعِ انجم کو — زمیں پر آ کے ذرّوں کو عطا کرتی ہے بیداری
چمن کو تابشِ شبنم سے کر دیتی ہے آئینہ — قبائے گل پہ تارِ زر سے پھر کرتی ہے زرکاری
شعاعِ مہر ہے شاید دیارِ نور کا قاصد — جہانِ خاکِ تیرہ پر ہوا فرمانِ خور جاری

جھلک نورِ ازل کی، جلوۂ خود بیں کا آئینا
یہی بن جائیگی اک دن شرارِ آتشِ سینا

کبھی یہ بن کے برقِ نور تڑپی کوہِ فاراں پر — سمٹ کر بن گئی جگنو شبِ تارِ بیاباں پر
کبھی شمعِ حقیقت ہے دلِ تاریکِ گو تم میں — کبھی رازِ تجلّی ہے کفِ موسیٰ عمراں پر
کبھی نورِ نگہ بنکر یہ نکلی چشمِ بینا سے — کبھی خود بن گئی پردہ ضیائے عقلِ انساں پر
کیا روشن کبھی صحرا چراغِ لالہ و گل سے — کبھی بن کر سحر پھیلی جبینِ مہرِ تاباں پر
کسی کو مشعلِ اُمید بنکر راہ دکھلائی — گری بن کر کبھی بجلی کسی کے خرمنِ جاں پر

ہر اک ذرّہ میں پیدا ہے جھلک نورِ حقیقت کی
زمیں سے آسماں تک موجزن ہے روح وحدت کی

تمیزِ رنگ و بو یکسر فریبِ چشمِ باطل ہے — گلستاں میں جو گل ہے پہلوئے انساں میں وہ دل ہے
تہِ دریا جو گوہر ہے، اُدھر ہی گلشن میں ہے شبنم — وہی ہے سوزِ پروانہ جو نورِ شمعِ محفل ہے
زباں پر جو تکلّم ہے تبسّم ہے وہ ہی لب پر — وہی ہے تابشِ خنجر جو رشکِ چشمِ بسمل ہے
وہی ہے رنگ و بو گل میں جو نغمہ قلبِ بلبل میں — وہی ہے نور تاروں میں جو شیخ پیکرِ گل ہے

وہی ہے ایک جلوہ جس سے ہر محفل ہے نورانی
چراغِ ماہ کیا ہے، پرتوِ مہرِ درخشانی

[illegible]

مسلمات ادب میں اخلاق کی جگہ

(وہ خطبۂ صدارت جو حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی نے ۱۳ دسمبر ۱۹۴۱ء کو ماڈرن انگلش انسٹی ٹیوٹ آگرہ کے سالانہ مشاعرہ میں ارشاد فرمایا)

معزز اراکین مشاعرہ کمیٹی و گرامی شرکائے جلسہ

میں آپ کی اس عزت افزائی کا ممنون ہوں کہ آپ نے بحیثیت صدرِ مشاعرہ مجھے ایک تعلیم یافتہ جماعت کے سامنے اظہارِ خیال کا موقع دیا۔ صدارت کسی زمانے میں ایک رسمی اعزاز اور ایک وقتی امتیاز سمجھی جاتی تھی مگر اب یہ ایک ذمہ دارانہ منصب ہے۔ اب صدر کے ذمہ یہ بھی فرض ہے کہ وہ جس جلسے کی صدارت پر مامور ہو اُس کی نصب العینی نسبت سے کچھ اظہارِ خیال بھی کرے۔

مشاعروں کی صدارت میں خصوصیت کے ساتھ یہ فرض زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ مشاعروں کا حاصل تفریحِ سماعت کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ شعرا نے غزلیں پڑھیں آپ نے داد دی۔ مشاعرہ ختم ہو گیا اور جب صبح آپ سو کر اُٹھے تو آپ کے احساسات میں مشاعرہ کا حاصل کسل اور تکان کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ خطبۂ صدارت سے کم از کم اتنا تو فائدہ ہے کہ طلبائے ادب اور شرکائے مشاعرہ کے کانوں تک بعض ایسی باتیں پہونچ جاتی ہیں جن سے معلومات میں اضافہ ہونے کے علاوہ بعض اوقات فکر و غور کرنے کے لئے کچھ مواد مل جاتا ہے۔

میں اس وقت آپ حضرات کے سامنے اس موضوع پر مختصراً کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ "فنونِ لطیفہ" میں اخلاقیات کا کیا درجہ ہے؟ فنونِ لطیفہ یعنی مصوری، شاعری، موسیقی اور صناعی، بظاہر اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اخلاقیات کا معنوی تعلق مذہب اور معاشرت سے ہونا چاہئے۔ لیکن تمدن و تہذیب کے اس دورِ ارتقا میں کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہیں ہے جس میں اخلاقیات کی تلاش نہ کی جائے۔

فنونِ لطیفہ میں جمالیاتی نقطۂ نگاہ ہمیشہ قابلِ لحاظ رہا ہے۔ اخلاق کا مطالبہ کبھی نہیں ہوا۔ یہی سبب ہے کہ زمانہ قدیم میں مصوری، شاعری، موسیقی اور صناعی میں خیال کی جس قدر [illegible] اور عریانیاں زیادہ ہوتی تھیں اتنا ہی ان شعبوں کو زیادہ دلچسپ سمجھا جاتا تھا [illegible] اگر تمام فنونِ لطیفہ پر بحث کروں گا تو میرا خطبہ بہت طویل ہو جائیگا [illegible] صرف "ادب اور اخلاقیات" پر اظہارِ خیال کرنا ہی مصلحتِ وقت سمجھتا ہوں۔

اُردو ادب کے قدیم الایام شہ پاروں کا اگر آج تجزیہ کیا جائے تو ان میں بیشتر کتابیں ایسی نکلیں گی جن میں تفریحی یا تخریبی عنصر زیادہ ہوگا اور اخلاقی عنصر اگر ہوگا بھی تو بہت کم۔ فسانۂ عجائب۔ باغ و بہار۔ گل بکاؤلی۔ منوہر پریم کرد۔ حاتم طائی۔ فسانۂ آزاد۔ طلسمِ ہوشربا۔ داستان امیر حمزہ۔ طوطا مینا اور دوسرے قصص اخلاقی حیثیت سے کوئی درجہ نہیں رکھتے۔ ان کے بعد ناول کے دور میں چھبیلی بھٹیاری۔ امراؤ جان ادا اور بوالہوس بنگالی جیسے ہزاروں ناول اخلاقی درجہ سے بہت زیادہ گرے ہوئے ملینگے۔ مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی نے تاریخی ناول لکھکر اس موضوع میں ایک انقلاب ضرور پیدا کر دیا لیکن اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ تخریبی اور تفریحی عناصر کے فقدان سے ناول بینی کا شوق ہی ہندوستان سے رخصت ہو گیا۔

اس کے بعد تیسرا دور مختصر افسانوں کا شروع ہوا جو اس وقت تک جاری ہے۔ ان افسانوں میں بھی سوشل افسانوں کو چھوڑ کر جمالیاتی اور جنسی عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ اخلاقی پہلو بہت کم ملتے ہیں۔

یہ تو اُردو ادب کا مختصر تجزیہ ہوا۔ اب اُردو کے شعبۂ جلیل "شاعری" کو لیجئے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک اُردو شاعری میں بھی اخلاقیات کا رنگ بہت کم۔ در اصل کہیں کہیں شاذ و نادر نظر آتا ہے۔ ولی سے لیکر مرزا داغ تک اُردو شاعری جنسی معاملات اور جمالیاتی نفسیات تک محدود رہی۔ لکھنؤ اور دہلی کے نثر نگار بھی اس اسلوب سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اگر اساتذۂ قدیم کے تمام دیوانوں کا تجزیہ کیا جائے تو فیصدی ۸۰ اشعار ایسے نکلیں گے جن میں جوبن۔ کنگھی چوٹی۔ بوس و کنار۔ دہن کا فتنہ۔ وصل و ملال۔ چھیڑ چھاڑ۔ دوپٹہ۔ بانہیں۔ بھویں کی بیس۔ نشہ مستی۔ انگیا چولی۔ وغیرہ موضوع بھرے پڑے ہیں۔ مثلاً چند اشعار سُن لیجئے۔

[illegible] نے لیا ازی مستی کا [illegible]

امیر لکھنوی سے

شباب آچکا اب کے دیکھتا ہے ... امیر اٹھ کے ہر بار جوبن کسی کا

راسخ دہلوی سے

نوجوانی ہے نئے تم ہو نرالا جوبن ... بالا بالا نہ اڑا لے کوئی بالا جوبن

نامعلوم سے

کسی کا ہائے شبِ وصل اس طرح آنا ... کڑے چڑھائے ہوئے پائینچے اٹھائے ہوئے

جلال لکھنوی سے

نام خدا ہے اُن کی جوانی اُمنگ پر ... وہ کیوں نہ اینڈا اینڈ کے سوئیں پلنگ پر

داغ دہلوی سے

وہ آئے اگر اس طرح سو ہوں پیار کی باتیں ... ہمارا ہاتھ سینے پر تمہارا ہاتھ گردن میں

غالب اکبرآبادی سے

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا ... ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

نظیر اکبرآبادی کے یہاں تو غیر اخلاقی موضوعات کی اس قدر بھرمار ہے کہ دنیائے شاعری میں اس کی نظیر نہیں ملتی

یہ اور اس قبیل کے ہزاروں اشعار اساتذۂ قدیم کے کلام میں ملتے ہیں تنقید کا ذوق کسی نہ کسی نوعیت سے ہر زمانے میں رہا ہے مگر ان اشعار کے متعلق ہمیں اس زمانے میں کوئی ایسی تنقید نہیں ملتی جس میں اس قسم کے خیالات کو غیر اخلاقی سمجھ کر قابلِ ترک ثابت کیا گیا ہو۔ عصرِ موجود کا تنقید نگار ان اشعار کو سُن کر البتہ ناک بھوں چڑھاتا ہے اور اخلاقیات کے درجے سے گرا ہوا قرار دیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اب سے پہلے ادب اور اخلاقیات میں ربط و تعلق نہ تھا۔ ادب کو اخلاقی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کا ذوق موجودہ نصف صدی کی پیداوار ہے۔ آج ہر شعبۂ زندگی میں ہم اخلاق و تہذیب کے متلاشی ہیں اور اسکے یہ معنی ہیں کہ ہمارا جمالیاتی نقطۂ نگاہ بہ اقتضائے وقت بدل گیا ہے۔

یہی سبب ہے کہ غزل میں تغزلِ محض اب اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول نہیں ہے۔ اب وہ نظمیں اور غزلیں توجہ سے سُنی جاتی ہیں جن میں سیاسی، اخلاقی مذہبی یا اصلاحی (TOUCHES) یعنی التفاتات ہوں

شاعری پر سب سے زیادہ اثر ماحول کا ہوتا ہے۔ کسی زمانے کی شاعری کا احتساب کر لیجئے۔ اپنے ماحول کے زیرِ اثر نظر آئے گی۔ اردو ادب مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں پروان چڑھا ہے۔ حکمرانی اور تعیش ہمیشہ لازم و ملزوم رہے ہیں۔ اسی لئے تعیش کی جھلک اردو شاعری میں بھی تھی۔ چونکہ اس عیش و عشرت پر بداخلاقی کا فتویٰ لگانے کی کسی میں جرات نہ تھی اس لئے عیش و عشرت کی ترجمانی پر بھی بداخلاقی کا الزام نہ لگایا جاسکا۔ اب وہ شاہانہ تعیش غلامانہ تردد سے بدل چکا ہے۔ اور اس تردد کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی کے نظریات بدل گئے ہیں اور ہماری زندگی کی قدریں نئے پیراہن اختیار کرکے ہمارے سامنے آرہی ہیں۔ ہمارا ماحول بدل کر وسیع ہو چکا ہے۔ اب ہمیں نظر اٹھا کر دُور تک دیکھنے کی فرصت ہے۔ اب پھول والوں کی سیر اور آرام باغ کے میلوں سے زیادہ ہمیں کھیتوں کی پیداوار اور کاشتکار کی مشکلات کے سمجھنے میں زیادہ دلچسپی ہے۔ اب سرمایہ داروں کی شان میں قصیدہ خوانی ناگوارِ خاطر اور مزدور کی بے چارگی و خستہ حالی کی تصویر کشی عشرتِ فکر و خیال ہے۔ اب ساقی و شراب اور مطرب و چنگ کا ذکر ہمارے ذہنوں کو آسودہ نہیں کرتا۔ اس لئے کہ زندگی کی یہ قدریں نظرانداز ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ نئی قدروں نے لے لی ہے۔

تغزل میں قدیم موضوعات کی رمق جو اب تک نظر آرہی ہے وہ جذباتِ انسانی کی حقیقی ترجمانی ہے۔ مگر متانت اور سنجیدگی کے ساتھ۔ اس لئے کہ "حُسن و محبت" یعنی انسانی فطری جذبات جیسے پہلے تھے ویسے ہی اب بھی ہیں۔ مگر اب خیالات میں عریانی نہیں رہی اخلاقیات کا محتسب ہر وقت ذہن و دماغ کے دروازے پر تنِ سرسُو نگراں بیٹھا ہوا ہے ادھر کوئی رکیک یا عریاں خیال دماغ میں پیدا ہوا، اُدھر اُس نے ٹوکا۔ یہ محتسب سوسائٹی کی طرف سے متعین نہیں ہے۔ سوسائٹی تو اب بھی شاعر کو اپنا آلۂ تفریح سمجھتی ہے۔ رقص و سرود کو رسم و رواج نے مردود کر دیا تو سوسائٹی نے شاعر سے یہ دونوں کام لینے شروع کر دئے گویا اور خوش الحان شاعر آج سوسائٹی میں اُسی دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جس نگاہ سے طوائفیں، بھانڈ اور ایکٹر دیکھے جاتے تھے۔

خیر۔ تو یہ محتسب سوسائٹی کا متعین کردہ محتسب نہیں ہے۔ بلکہ تعلیم یافتہ اور صاحبِ علم طبقے نے، اور بین الاقوامی تہذیب کی ہمہ گیری نے اسے بالواسطہ فطرت متعین کیا ہے۔ یہ ادب میں حدودِ خیال کا تعین کرتا ہے اور خیالات کی بے راہ روی کا سدِباب کرتا رہتا ہے۔ بعض شعرا ایسے بھی ہیں جو ایک رند بدمست کی طرح احتساب کی پروا نہیں کرتے لیکن اُن کے ضمیر ٹٹولئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بے راہ روی اور کم سوادی سے خود بھی منفعل و محجوب ہیں اور چونکہ اہلِ علم کے دوش بدوش [illegible] نہیں چل سکتے

اس لئے اپنی پرانی روش کو بہ لطائف الحیل بنا رہے ہیں۔

ادب میں تخریبی عناصر کی فراوانی ملک اور قوم کے زوال کی غماز ہوتی ہے۔ چنانچہ طلبائے تاریخ اچھی طرح واقف ہیں کہ اُردو شاعری نے جب تخریبی خیالات کے انبار لگا دیئے تو اُس کا نتیجہ کیا ہوا۔ زوالِ شہنشاہی۔ آج اگر ادب اُردو میں اخلاقیات کی تلاش ہے تو یہ بیداریٔ اقوام کے مبارک آثار ہیں۔ جو ہمیں ختمِ زوال کی خبر دے رہے ہیں

موجودہ زمانہ زمانۂ انقلاب ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ آج کی رات کے بعد جو صبح آنے والی ہے وہ اپنے نئے دامانِ وسیع میں کس قسم کے حالات یا حادثات لا رہی ہے لیکن موجودہ شاعری میں بقدرِ ضرورت اس انقلاب کی اطلاعیں اور پیش گوئیاں موجود ہیں اور یہ انھیں اخلاقی نظریاتِ جدید کا فیضان ہے جو ضرورتِ زمانہ نے شعراء کے ذہنوں میں پیدا کر دیئے ہیں۔ ایک بات اور باقی رہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ ادب میں اخلاق کا کیا درجہ ہے؟ یعنی ادب میں اخلاق کی ضرورت تو مسلّم ہو چکی مگر مسلّماتِ ادب میں اخلاق کی جگہ کا تعین بھی ہونا چاہئے۔

یہ ایک بالکل نیا سوال ہے۔ مشکل اور ذہن آزما۔ مگر چونکہ ہر سوال کا کچھ نہ کچھ جواب دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے میں اپنی استعداد اور اپنے ذوقِ شعوری کے مطابق اس سوال کا حل آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ بزرگ جن کا علمی تجربہ مجھ سے زیادہ ہے، اس سوال کا کوئی اور بہتر حل بتا سکیں۔

ادب میں اخلاقی درجہ کا تعین یہ معنی رکھتا ہے کہ ادب ایک مجموعۂ مدارج ہے۔ یعنی وہ چند درجوں سے مرکب ہے۔ جن میں سے ایک درجہ اخلاق بھی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ادب علمی و لسانی چند مدارج ہی سے مرکب ہے۔ الفاظ معنیٰ۔ زبان۔ فصاحت۔ بلاغت۔ محاکات۔ اسلوبِ بیان۔ تخیل۔ اثر وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے زیادہ باتیں علمِ کلام سے متعلق ہیں، مگر "اخلاق" ان سب سے جداگانہ ایک چیز ہے۔ تو میری رائے میں اخلاق ادب کے لئے کوئی بنیادی اور داخلی عنصر نہیں ہے بلکہ ایک خارجی اثر ہے جو تخیل کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا بلکہ تخیل اور فکر کے رابطے سے پیدا ہوتا ہے۔

مثلاً تخیل ہمارے دماغ میں ایک خیال پیدا کرتا ہے۔ کہ —— ایک برہمن ساری رات بُت خانے میں جاگتا ہے اور صبح کے وقت باہر آتا ہے تو اُس کا چہرہ زرد ہوتا ہے۔ جو اُس کی [illegible] دیتا ہے۔ آخر وہ رات بھر بُت خانے میں کیا کرتا رہا؟ بتوں کی عبادت یا بتوں سے محبت؟ چہرے کی زردی کس بات کا ثبوت دیتی ہے؟

اب یہ تخیل فکر کے سانچے میں ڈھلا۔ تو اس طرح موزوں ہوا ؎

کوئی اُس وقت برہمن کی صباحت دیکھے
نکلے جب رات کا جاگا ہوا بُت خانے سے

اس شعر میں "اخلاق" کا درجہ لفظِ "صباحت" پر متعین ہے۔ اگر اخلاق کرنے کا لحاظ نہ ہوتا تو یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ "کوئی اُس وقت برہمن کی نگاہیں دیکھے" یا "کوئی اُس وقت برہمن کی ادائیں دیکھے" —— یا "کوئی اُس وقت برہمن کا تقدس دیکھے" یا "کوئی اُس وقت برہمن کا تبسم دیکھے" مگر نگاہوں۔ اداؤں۔ تقدس اور تبسم سے برہمن کی نفسیاتِ شب باشی کا راز افشا ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے "صباحت" کہہ کر اخلاق کا درجہ قائم کر دیا۔ اور خیال کی وہ رکاکت جو تخیل کے ساتھ ذہن میں آئی تھی اس ایک اخلاقی لفظ سے کمزور ہو گئی۔

دوسری مثال ملاحظہ فرمائیے :۔

شاعر کا محبوب عینِ انتظار میں کہیں سے گھبرایا ہوا آتا ہے۔ پریشان حال اور لغزیدہ قدم —— شاعر پوچھتا ہے ؎

بال ہیں بکھرے ہوئے، بندِ قبا ٹوٹے ہوئے
آئے کس بے درد کے چنگل سے تم چھوٹے ہوئے

اس شعر میں اخلاقیات کا کوئی درجہ نظر نہیں آتا۔ بکھرے ہوئے بال اور ٹوٹے ہوئے بندِ قبا۔ پھر کسی بے درد کے چنگل کی طرف اشارہ۔ رقیب کی طرف سے بدگمانی کا مکمل مظاہرہ ہے۔ لیکن اسی حالت کو ایک دوسرا شاعر یوں موزوں کرتا ہے :۔

گرے ہوتے اُلجھ کر آسماں سے
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے؟

دیکھئے اس شعر میں صورتِ استفہام تو وہی ہے مگر اخلاقی پہلو سے رقیب اور بدگمانی کے اسباب کو ایسی خوبصورتی سے چھپا دیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

ایک اور مطلع میں اسی کیفیت کی ترجمانی حضرتِ داغ دہلوی مرحوم و مغفور اس طرح فرماتے ہیں ؎

نہ ہم سمجھے، نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

آپ نے دیکھا۔ کچھ نہیں کہا اور سب کچھ کہدیا۔ یہی اس شعر کا اخلاقی درجہ ہے۔

اندریں حالات اخلاق ایک رنگ ہے جو تخیل اور الفاظ کی ہم آہنگی سے شعر میں بھرا جاتا ہے البتہ ان اشعار میں رنگ ریزی کی ضرورت نہیں ہوتی جو اخلاقی یا اصلاحی موضوعات ہی پر مبنی ہوتے ہیں۔ مثلاً میرا ایک مطلع ہے :-

دماغ و روح یکساں چاہیے انسانِ کامل میں
یہ کیا تقسیمِ ناقص ہے خودی سر میں خدا دل میں

ظاہر ہے کہ یہ اخلاقی درس ہے جس میں کسی دوسرے رنگ کی آمیزش ہو ہی نہیں سکتی اگر آپ کہیں گے کہ اس شعر میں تغزل کا رنگ بالکل نہیں ہے تو میں عرض کروں گا کہ اب غزل میں تغزل کی نہیں بلکہ **تخیل** کی ضرورت ہے اور اس شعر میں تخیل بدرجۂ اتم موجود ہے۔

اگر اردو شاعری بلحاظ تخیل یہی اسلوب اختیار کرلے تو پھر یہ سوال باقی ہی نہیں رہتا کہ ادب میں اخلاق کا کیا درجہ ہے۔ پھر تو ہم علیٰ رؤس الاشہاد اور علی الاعلان کہہ سکتے ہیں کہ اردو شاعری سراسر اخلاق ہے۔ اس میں اخلاق کا درجہ ڈھونڈنا شکر میں مٹھاس تلاش کرنا ہے

میرے خیال میں وہ زمانہ دور نہیں ہے کہ ہماری شاعری اخلاق و تہذیب کے پیغامات کا سرچشمہ بن جائے۔ ضرورت زمانہ اور مصلحتِ وقت شعرا کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اخلاقیات کی طرف رجوع ہو جائیں۔ غریبوں کی آہیں۔ مزدوروں کی ہڈیوں کی چرچراہٹ بیواؤں اور یتیموں کی چیخیں۔ بیماروں کی چیخ پکار۔ کسانوں کی مایوس نگاہیں۔ کاشتکاروں کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں۔ قوموں کے نفاق۔ جماعتوں کی منافقت۔ سامانِ زندگی کی گرانی۔ مستقبل کی اندیشہ سامانی۔ جنگ۔ فتنہ و فساد۔ یہ تمام اسباب متقاضی ہیں کہ شاعر کی آواز کو موجودہ ماحول کے زیر اثر لائیں، اور شاعر کی زبان سے ہم وہ ہی سنیں جسکی ہمیں ضرورت ہے۔ شاعر یا تو ہمارے جذبات کا ترجمان ہو یا خاموش ہو جائے۔

اب میں اپنا خطبہ ختم کرتا ہوں، اور آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ اس خطبے کو محفوظِ سماعت رکھتے ہوئے آپ معزز شعرا کا کلام سنیں اور خود فیصلہ کریں کہ ہماری موجودہ شاعری میں اخلاقیات کا کیا درجہ ہے؟ ———

۱۲ دسمبر ۱۹۴۱ء

سیماب اکبر آبادی

سازِ غلامی

طبیعت جبرِ تسکین سے گھبرائی جاتی ہے
ہنسی ہونٹوں پر آتی ہے مگر تھرائی جاتی ہے

بہت چمکا رہا ہوں خال و خد کو سعیٔ رنگیں سے
مگر پژمردگی سی خال و خد پر چھائی جاتی ہے

جوانی چھیڑتی ہے لاکھ خوابیدہ تمنا کو
تمنا ہے کہ اسکو نیند ہی سی آئی جاتی ہے

محبت کی نگونساری سے دل ڈوبا سا جاتا ہے
محبت دل کے اضمحلال سے شرمائی جاتی ہے

یہ رنگِ مے نہیں ساقی جھلک ہے خوں شدہ دل کی
جو اک دھندلی سی سرخی انکھڑیوں میں پائی جاتی ہے

فضا کا سوگ اترا آ رہا ہے ظرفِ ہستی میں
نگاہِ شوق، روحِ آرزو، کجلائی جاتی ہے

مرے مطرب! نہ دے لِلّٰہ مجھکو دعوتِ نغمہ
کہیں سازِ غلامی پر غزل بھی گائی جاتی ہے

کیفی اعظمی

یقین و عمل

یقیں، پردۂ اسرار چاک کرتا ہے ۔۔۔ یقیں کا نام ہے قلب و جگر کی آگاہی
وہ فلسفہ ہو کہ علمِ کلام یا منطق ۔۔۔ بغیرِ جذبِ یقیں ہے تمام گمراہی
اسی کے واسطے گردش میں ہیں یہ افلاک ۔۔۔ وہ فقر جس سے لرزنے لگے شہنشاہی
یہ دل ازل سے جری ہے پر اس کو کیا کیجیے! ۔۔۔ سکھا دئے ہیں خرد نے طریقِ روباہی
مجھے پسند نہیں ہے یہ مسلکِ تقدیر ۔۔۔ اسی کا نام ہے فکر و عمل کی کوتاہی
نہ مجھ سے سن مری روداد، اس میں شامل ہے ۔۔۔ فغانِ نیم شبی، نالۂ سحرگاہی

فرنگ جلوہ دگر داد، رسمِ آذر را
حذر ز اہلِ سیاست اگر خدا خواہی

جہاں کو ایسے مجاہد کی پھر ضرورت ہے ۔۔۔ کہ جس نے چھاؤں میں تیغوں کے لی ہو انگڑائی
وہ فقر جس نے مداین سے تاج چھین لیا ۔۔۔ اسی کو ڈھونڈھ رہا ہے شکوہِ دارائی
یہ کیا کہا کہ غلامی میں سخت ہوں مجبور ۔۔۔ یہ تیرا عذر ہے ناقابلِ پذیرائی
پناہ مانگ رہا ہوں میں اس تمدن سے ۔۔۔ متاع جس کی ہو رخسار و لب کی رعنائی
محبت ایک حقیقت ہے جس کی دنیا میں ۔۔۔ نہ فکرِ سود و زیاں ہے نہ خوفِ رسوائی
میں اس نگاہ کو پہچان ہی گیا سرِ حشر ۔۔۔ ازل کے روز کی کام آ گئی شناسائی

بہ ہر نگاہ نمایم ترا رخِ فردا
اگر ز خانۂ امروزِ خود بروں آئی

ماہر القادری

فانی بدایونی مرحوم ارضِ تاج میں

گندمی رنگ، چھریرا بدن، قد مائل بہ درازی، کندھے ذرا آگے کو جھکے ہوئے، ترکی ٹوپی، چست شیروانی، تنگ موری کا پاجامہ، ایک کھویا ہوا سا آدمی جیسے کچھ سوچ رہا ہو ——— آپ ہیں جناب فانی بدایونی ہندوستان کے مشہور اور مایۂ ناز شاعر! منظر اکبرآبادی مرحوم نے مجھ سے تعارف کرایا، میں اپنے ملاقات کے کمرے میں رائفل لئے بیٹھا ہوا تھا۔ بڑی کوشش اور تمنا کے بعد رائفل مجھے دستیاب ہوئی تھی۔ "آپ فرمائیں تو اس بندوق کو ایک طرف رکھدوں"! یہ کہتے ہوئے منظر صاحب نے میری رائفل کونے میں رکھدی۔ مجھے اس وقت فانی صاحب سے بہت زیادہ اپنی رائفل سے دلچسپی تھی فانی صاحب تشریف لائے، شعر سُنے سنائے آدھ گھنٹے میں یہ صحبت ختم ہوگئی معلوم ہوا کہ فانی صاحب اب آگرے ہی میں وکالت کریں گے۔ اس کے بعد چھ سات ماہ تک کبھی وہ تشریف لے آتے اور کبھی میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوجاتا۔ رفتہ رفتہ دلچسپیاں اور اُس کے ساتھ ملاقات بڑھتی گئی، معلوم ہوا کہ یہ کھویا ہوا سا آدمی نہایت ذہین زود فہم اور باریک بیں ہے وہ ایک اچٹتی ہوئی نظر میں اتنا دیکھ لیتا ہے جو گھنٹوں میں نہیں دیکھا جا سکتا وہ بڑھا ہوا متین متفکر جو صورت سے ایک بجھتا ہوا انگارہ معلوم ہوتا ہے۔ جذبات و کیفیات کا کوہِ آتش فشاں ہے۔

فانی کے دیکھنے میں بڑا زبردست آرٹ تھا تبسم، غصہ، تنبیہ، شکوہ، سب کچھ وہ صرف نظروں سے ادا کر دیتے تھے۔ ۳۵ء میں جب وہ حیدرآباد سے ایک مشاعرہ کے سلسلے میں مجھے بمدآتے ہوئے تھے میں نے اُن سے اور جوش صاحب سے کہا چلئے آپ کو سبجے پور کا حُسن دکھلاؤں۔ جوش اپنی سادہ گرمجوشی اور فانی متبسم خاموشی سے میرے ساتھ ہو لئے، جگر بھی اس اجتماع کو فالِ نیک سمجھ کر شریک ہوگئے۔ موٹر سارے شہر کا چکر لگا کر تاج گنج آکر رُک گئی۔ مجھ پر الزاموں اور شکایتوں کی بھرمار ہونے لگی۔ فانی خاموش رہے لیکن اُنھوں نے گھور گھور کر مجھے ادھ مرا کر دیا۔ اُن کی آنکھیں دوسروں کی زبان سے زیادہ بولتی تھیں۔ فانی کا سمجھ لینا آسان تھا اُن کی غیر معمولی متانت اور ایک قسم کی ربودگی کی وجہ سے اکثر لوگ انھیں مغرور سمجھتے تھے وہ کبھی مجمع عام یا محفل میں احباب سے بھی بے تکلف نہ ہوتے تھے لیکن اس سن و سال میں بھی اِن کے جذبات کی حدت کم نہ ہوئی تھی جب میں اُن سے کہتا کہ آپ کی مثال اس خاموش صحرا کی سی ہے جس پر سے ہزاروں آندھیاں اور سیلاب گزر گئے ہوں تو ٹھنڈی سانس لیکر کہتے "جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا"

عام مشاعروں یا مخصوص صحبتوں میں کبھی کسی کی داد سے اُن کے چہرے پر تغیر نہ ہوتا کوئی طنز یا اعتراض کرتا تو اس سے بھی متاثر نہ ہوتے۔ ایک شعر کو کبھی دو مرتبہ نہ پڑھتے جب تک خاص طور سے اصرار نہ کیا جائے۔ خواہ مخواہ شعر سننے سنانے کا انھیں بالکل ذوق نہ تھا اُن کے بعض معاصران پر طنز کرتے تو معلوم ہوتا کہ انھوں نے سُنا ہی نہیں میں کہتا فانی صاحب یہ تحمل نہیں ہے، اخلاقی کمزوری ہے۔ آپ ان لوگوں کو جرأت دلاتے ہیں خلوت ہوتی تو قہقہہ لگا کر خاموش ہو جاتے۔ محفل ہوتی تو میرے زانو میں چٹکیاں لیتے کہتے خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ کیا لڑوگے؟ فانی کبھی کسی کے کلام پر طنز یا تعریض نہ کرتے نہ احباب کو اُن کی غلطیاں بتانے میری اُن کی ہمیشہ اس بات پر ان بن رہتی تھی میری تعمیر احباب کے تنقید و تبصرے ہی سے ہوئی ہے۔ میں فانی سے کہا کرتا تھا کہ کہیں غلطی ہو تو بتا دیا کیجئے دوسرے میرے شعروں پر اعتراض کریں گے تو آپ کو خوشی ہوگی؟ مگر وہ کبھی کچھ نہ کہتے البتہ اُن کا داد دینے کا طریقہ ایسا تھا جس سے خود اپنی نظروں میں شعر کی حیثیت قائم ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ میں انھیں غزل سُنا رہا تھا یہ مقطع آیا ؎

میں ہر فلسفے کی حقیقت ہوں سیکش

سرے سامنے ہیچ ہر فلسفہ ہے

فانی کے انداز سے میں سمجھا کہ اس شعر میں انھیں کسی چیز سے اختلاف ہے میں نے دریافت کیا تو کہنے لگے کوئی خاص بات نہیں میں فارسی الفاظ کو اس طرح الف لگا کر قافیہ کرنا اچھا نہیں سمجھتا ہوں۔

فانی شعر ترنم سے پڑھتے تھے۔ آواز روشن تھی مگر بلند نہ تھی لحن میں دلکشی

تھی مگر ادا کاری بالکل نہ تھی نہ کسی کو مخاطب کرتے تھے۔ نہ بالعموم کسی کی طرف دیکھتے تھے۔ خصوصاً شاعروں میں — انکی شہرت میں اُن کے ترنم یا اداکاری اور اسی طرح اخبارات و رسائل کو قطعی دخل نہ تھا۔ اُن کی شہرت حقیقی اور ٹھوس تھی اُن کا تغزل بہت لطیف اور اُن کا تخیل نہایت بلند تھا۔

میری رائے میں ان کا شاعرانہ آرٹ میر و غالب سے نہیں بلکہ نظیری نیشاپوری سے بہت مشابہ ہے اگر نظیری اُردو میں شعر کہتا تو ایسے ہی کہتا جیسے فانی نے کہے ہیں یا اگر فانی فارسی میں شعر کہتے تو ایسے ہی کہتے جیسے نظیری نے کہے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ اُن سے کہا آپ کے شعر ایسے نہیں ہوتے ہیں جنھیں ہر آدمی سنتے ہی سمجھ لے مگر لوگ شعر پورا سننے سے پہلے داد دینا شروع کر دیتے ہیں کہنے لگے اس لئے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ شعر اُن کی سمجھ میں نہیں آیا۔

فانی کبھی داد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے اور خود داد دینے میں بخیل نہ تھے لیکن جو شعر انھیں پسند نہ ہو کبھی اس کی داد نہ دیتے۔ بابو لچھمن پرشاد صاحب اس زمانے میں آگرہ میں سب جج تھے۔ خدا نے موصوف کو سخن فہمی کی عجیب دولت دی ہے۔ فانی صاحب سے انھیں تعلق بحدِ محبت تھا۔ کبھی جگر صاحب آگرہ آجاتے تو سب جج صاحب حضرت اعجز اکبرآبادی اور شاہ دلگیر مرحوم کو بھی بلا لیتے۔ جناب مخمور اکبرآبادی اور حضرت مآل جالسی کی زیادہ تر اور میری کثر سب جج صاحب کے یہاں آمد و رفت رہتی ہی تھی۔ ایک روز ایسا ہی مجمع تھا۔ .... داد حاصل کرنے اور داد دینے دونوں میں کمال رکھتے تھے، انھوں نے غزل پڑھنا شروع کی سب لوگ داد دیتے رہے۔ فانی صاحب بالکل خاموش آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے .... نے کہا، فانی صاحب شعر ملاحظہ ہو۔ فانی صاحب مخاطب ہوئے شعر سُنا اور پھر خاموش ہو گئے دوسرے شعر پر .... نے کہا فانی صاحب شاید آپ متوجہ نہیں ہیں۔ فانی صاحب نے کہا آپ ارشاد فرمائیں میں پوری توجہ سے سُن رہا ہوں اور پھر خاموش ہو گئے

مشاعروں سے فانی کو نفرت تھی، آٹھ نو سال کے دوران قیام میں کسی مشاعرے میں میں نے انھیں غزل پڑھتے ہوئے نہ دیکھا۔ آگرہ کالج کے مشاعروں میں ضرور کبھی شریک ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ علی گڑھ کالج کے مشاعرے میں بھی مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے ورنہ ہمیشہ مشاعروں کی شرکت سے منع ہی کیا کرتے تھے۔ ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے فانی صاحب سے ان کے اس شعر کا مطلب پوچھا ؎

دُنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

فانی صاحب کہنے لگے اب تو مجھے بھی اس کا مطلب نہیں معلوم جب کہا ہوگا ضرور کچھ سمجھ کر ہی کہا ہوگا۔ میں نے اپنی اور اُن کی استعداد کے مطابق مطلب بتانے کی کوشش کی۔ فرمانے لگے یہ مطلب تو فانی صاحب بھی نہ سمجھے ہونگے۔ میں نے یہ تمام تذکرہ فانی صاحب سے کیا اور اُن کے اس طرزِ عمل کی شکایت بھی کی۔ مسکراتے رہے پھر کہا میں تمھیں بھی نصیحت کرتا ہوں کبھی اپنے شعر کا مطلب نہ بتانا، کہدیا کرو اگر آپ کو پسند ہے تو لطف اندوز ہو لیجئے ورنہ نہ پڑھئے۔

فانی مجھ سے اکثر فلسفۂ الٰہیات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ وہ سوال کرتے تھے میں جواب دیتا۔ وہ اعتراض کرتے، مجھے اُلجھاتے اور مسکراتے۔ ایک بار پوچھا کہ مجاز و حقیقت میں کیا فرق ہے۔ میں نے تقریر شروع کی۔ اُنھوں نے اعتراض کرنا شروع کر دئیے۔ اعتراض ہی نہیں بلکہ محض اُلجھانے کے لئے کچھ کہتے رہے آخر میں جب اس جملے پر آیا کہ حقیقت و مجاز کا فرق حقیقی نہیں ہے، محض اعتباری ہے، تو زبردستی مجھے خاموش کر کے کہنے لگے سُنو ؎

کچھ نہ وحدت ہے نہ کثرت نہ حقیقت نہ مجاز
یہ ترا عالمِ مستی وہ ترا عالمِ ہوش (فانی)

خواہ مخواہ اظہارِ قابلیت کے لئے وہ کبھی گفتگو نہ کرتے پھر بھی اکثر فلسفے کے مشکل مسائل چھیڑ دیتے اور ایسا انداز اختیار کرتے کہ ناواقف آدمی اُن کی واقفیت کو سطحی سمجھتا اور آخر میں اس طرح شاباشی دیتے جیسے کوئی پروفیسر کسی مستعد طالب علم کو۔ اُن کے دماغ میں ذرا بھی اُلجھن نہ تھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر مسئلے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اس پر جہانتک مجھے علم ہے فانی عملاً صوفی نہ تھے لیکن عقائد میں وہ شدت سے صوفیوں کے معتقد تھے اور علمی تصوف سے پوری طرح واقف تھے۔ مسئلہ جبر اور وحدۃ الوجود کے شدت سے قائل تھے۔ علامہ اقبال کے بعد ان مسائل کا فانی سے بہتر سمجھنے والا شاید ہی کوئی اور اُردو کا شاعر ہو، کیا عارفانہ شعر کہا ہے ؎

یہ جستجو ہے کہ ہے عالمِ مجاز کہاں
تلاشِ چشمِ حقیقت نگر نہیں ہے مجھے

فانی کی قانونی قابلیت بہت اچھی بیان کی جاتی ہے لیکن وہ اس پیشے میں کامیاب نہ تھے وہ اپنی قدیم تہذیب غیر معمولی مروت اور خودداری کی وجہ سے کسی پیشے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ اُن کا اخلاق بہت بلند تھا۔ ایک روز فیروز صاحب اُن کے بڑے صاحبزادے نے مجھ سے فرمایا کہ فانی صاحب نے آپ کو بلایا ہے سینے میں سخت درد ہے تین روز سے لیٹ بھی نہیں سکے ہیں۔ میں فیروز صاحب کے ساتھ نہ جا سکا۔

اسی روز شام کو پہونچا، دروازے کی زنجیر ہلائی، کچھ دیر انتظار کیا پھر زنجیر ہلائی۔ کچھ وقفے کے بعد دیکھا کہ فانی صاحب بیٹھے ہوئے ہاتھوں کے بل چلے آرہے ہیں۔ کہنے لگے اچھا کیا۔ آپ نے آواز دیدی ورنہ مجھے نہ ملنے کا افسوس رہتا۔ بمشکل میں نے انھیں پلنگ پر پہونچایا معلوم ہوا کوئی آدمی نہ تھا جو دروازے کی زنجیر کھولتا۔ ایک دفعہ میرے پاس تشریف لائے صبح سے دوپہر تک ٹھہرے چلتے وقت پیشاب سے فارغ ہونا چاہتے تھے۔ مگر باوجود میرے اصرار کے کہنے لگے، اب گھر جاکر ہی فارغ ہونگا، گھر پہونچے تو مولوی سعید الدین صاحب سب جج آگرہ ملنے آگئے۔ فانی صاحب باوجود کافی بے تکلفی ہونے کے انھیں تھوڑی دیر تنہا نہ چھوڑ سکے۔ آخر بے ہوش ہوگئے اور کئی روز تک علیل رہے۔

مصائب اور غموں کی کثرت کے باوجود فانی کی زندہ دلی میں فرق نہ آیا تھا، وہ ہمیشہ مسکرا کر ملتے اور جتنی دیر بیٹھتے ہنستے ہنساتے رہنے کی کوشش کرتے۔ ان میں ظرافت بھی بدرجۂ اتم تھی۔ ایک مرتبہ ایک صاحب سے انھوں نے میرا تعارف کرایا اور یہ نہ بتایا کہ ان کا وطن کہاں ہے میں نے دریافت کیا تو کہنے لگے۔ آپ کو اس سے کیا مطلب ہے۔ میں فانی صاحب کی نگاہوں کی شوخی سمجھ گیا میں نے ان نووارد صاحب سے ان کا وطن پوچھا۔ فرمایا ڈبائی کے پاس رہتا ہوں میں نے کہا پاس سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ فانی پھر مجھ پر خفا ہوئے وہ صاحب خاموش رہے میں نے پھر اُن سے دریافت کیا۔ فانی کہنے لگے آپ کا دولت خانہ شکار پور ہے۔ اب کہئے۔

ایک معروف شاعر تھے جنھیں دوسرے شعرا کی غزلیں اور اشعار اپنا کرکے پڑھ دینے کی بہت اچھی مشق تھی منجملہ اور اشعار کے یہ شعر بھی وہ اپنا کہہ کر سُنایا کرتے تھے ؎

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئے کئی دَور ہوگئے

ہم میں سے کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ یہ شعر کس کا ہے اس لئے انھیں کا سمجھتے تھے اور اُس کے معترف تھے کہ کم سے کم ایک شعر تو انھوں نے بھی کہہ پایا ہے۔ ایک روز فانی صاحب مسکراتے ہوئے تشریف لائے، فرمانے لگے بھئی آج فلاں صاحب کچہری میں تشریف لے آئے تھے مجھ سے شعر سننے پر مصر تھے۔ میں نے ہرچند معذرت کی کہ مجھے کچھ یاد نہیں ہے، انھوں نے کہا میں تو آج آپ سے شعر سن کر جاؤں گا۔ اپنے یاد نہیں ہیں تو کسی اور ہی کے سُنا دیجئے۔ میں نے مزاحاً انھیں کا شعر انھیں سُنایا۔ اُنھوں نے سنجیدہ ہوکر داد دی میں سمجھ گیا کہ شعر اُن کا نہیں ہے، میں نے تجاہل عارفانہ کے انداز میں پوچھا۔ آپ کو معلوم ہے یہ شعر کس کا ہے؟ بہت دھیمی آواز سے فرمانے لگے "جی ہاں شاد عظیم آبادی کا ہے۔

ایک مرتبہ عید کے تیسرے روز تشریف لائے میں نے تعظیم و مصافحہ کیا کنایتاً فرمانے لگے کیا اس مرتبہ آپ کے یہاں عید نہیں ہوئی۔ میں نے شرمندہ ہوکر معانقہ کیا ہنسنے لگے۔ وہ معمولی رسوم و قیود کا بھی لحاظ رکھتے تھے۔ ایک دفعہ سالِ نو کی مبارکباد دینے آئے فرمانے لگے چلو نجم صاحب کے یہاں بھی ہو آئیں۔ مجھے یہ بات نئی سی معلوم ہوئی۔ مگر اُن کے ساتھ ہولیا واپسی پر راستے میں نہ معلوم کیا خیال اُن کے دماغ پر چھا گیا کہ میرا یہ شعر پڑھتے آئے ؎

ترکِ جستجو کرکے دل کا مدعا پایا
ترکِ جستجو لیکن فیضِ جستجو ہی ہے

ایک مرتبہ بہت روز کے بعد ملے کہنے لگے اپنا ایک شعر سُناؤ سوچ مت میں نے کہا ؎

بیگانگی نے تیری دیا درسِ غیرت
ثابت ہوئے ہیں کیں ستم ناروا سے ہم

بہت خوش ہوئے بار بار سُنا۔ غالباً وہ یہ اندازہ کرنا چاہتے تھے کہ اتنے روز میں کچھ ترقی کی یا کچھ اور بات ہوگئی۔

فانی اقبال کو شاعر سے زیادہ ناظم سمجھتے تھے پہلے میرا بھی خیال یہی تھا اور جس نے بھی "بانگِ درا" کی غزلیں دیکھی ہوں وہ غالباً یہی رائے رکھے گا۔ ایک مرتبہ میں سفر سے واپس آیا تو فانی ملنے کے لئے آئے کہنے لگے کیا تحفہ لائے۔ میں نے کہا ایک شعر بھی موزوں نہ ہو سکا۔ البتہ چند فارسی کے شعر ایک صاحب کے یاد ہوگئے ہیں، وہ سُن لیجئے۔ میں نے اس سفر میں "زبورِ عجم" پڑھی تھی اور اُس کے چیدہ اشعار کا انتخاب کر لیا تھا انھیں سُنایا، بہت پسند کیا بے حد تعریف کی یہ شعر جو مجھے سب سے زیادہ پسند تھا آخر میں سُنایا ؎

چناں بیشِ حریم او کشیدم نعرۂ دردے
کہ دادم محرماں را لذتِ سوزِ جدائی ہا

فانی تڑپ گئے بار بار سُنتے تھے اور جھومتے تھے جب ہائے وائے ختم ہوئی تو میں نے کہا حضرت یہ علامہ اقبال کے شعر ہیں بے حد معترف ہوئے پھر اپنا یہ شعر سُنایا۔ اقبال کے شعر کی طرح کتنا بلند اور اچھوتا ہے ؎

از جلوتیاں لذتِ ذوقِ نگہے پرس
بر خلوتیاں فرصتِ نظارہ حرام است

بعض بہکے ہوئے لوگوں کا خیال ہے کہ شاعری بغیر شراب و شاہد کے ناممکن ہے۔ شاہد کے متعلق تو میں کچھ عرض نہیں کر سکتا مگر یہ یقینی امر ہے کہ شراب سے شاعری کا کوئی تعلق ضرور

میں نے اپنے ایک ادیب دوست سے جو اس چیز کے عادی ہیں اس کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ میں شراب پی کر شعر غلط کہہ سکتا ہوں مگر اچھے نہیں کہہ سکتا کیوں کہ اس وقت فکر کی قوت زائل ہو جاتی ہے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس نظریہ کے ماتحت فانی صاحب بھی اس الزام کے شکار ہوتے رہے۔ اُن کے دوران قیام آگرہ میں اکثر لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا مگر واقعہ یہ ہے کہ فانی شراب سے قطعاً مجتنب تھے میں اُن کا جلوت و خلوت میں ساتھ رہا ہے میں اُن کے ساتھ سفر حضر میں رہا ہوں اور میں اُن کے ساتھ ایسی صحبت میں بیٹھا ہوں۔ جہاں اُن کے بے تکلف احباب نے مے نوشی کی ہے۔ میری رائے میں شاعر کی اس سے زیادہ کوئی توہین نہیں ہو سکتی کہ لوگ کہیں فلاں صاحب جب تک شراب نہ پی لیں شعر نہیں کہہ سکتے یا فلاں صاحب جب تک کسی کو پاس نہ بٹھائیں مصرع موزوں نہیں کر سکتے۔ شاعر تو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔

قیام آگرہ کے آخری دَور میں میرے اور فانی کے تعلقات بہت بڑھ گئے تھے ہم نے ایک دوسرے کو پوری طرح سمجھ لیا تھا تعطیل کے دن صبح سے تیسرے پہر تک میرے پاس گزار دیتے انھیں میرے دل کی گہرائی تک پہونچنے میں بہت لطف آتا تھا، وہ میری فریب اور کتمان راز کے بڑے شاکی رہتے تھے اس معاملے میں اُن کے ساتھ ایک بڑی لطیف شفقت شامل ہو گئی تھی جب وہ دونوں مل جاتے تو میرے لئے بڑی مشکل کا سامنا ہوتا ہماری باتیں دو گتکا پھری والوں کی سی ہوتی تھیں۔ سارے داؤں پیچ ختم ہو جاتے تو میں زیادہ ہارتا تھا اور فانی اگر ہار بھی جاتے تھے تو اُن کا تبسم غیر مفتوح ہی رہتا تھا۔ فانی کو اس ہستی سے بڑی وابستگی تھی اسی عہد کے متعلق انھوں نے کہا تھا

گرچہ تھی صبحِ آگرہ بے نور
اوج پر تھا گرستارۂ شام

آگرے میں فانی کو اچھے سُننے والے میسر آگئے تھے۔ میری رائے میں فانی کی آگرے کی غزلیں فانی کی بہترین غزلیں ہیں اس شاعری میں وہ قنوطیت نہیں ہے جو اُن کے کلام کا عیب ہے آگرے سے فانی حیدرآباد چلے گئے وہاں اُن کی ابتدائی زندگی آگرہ کی زندگی سے بہتر اور مطمئن کی تھی۔ اس لئے اُن کے حیدرآبادی کلام میں تفکر سے زیادہ سادگی آ گئی ہے۔ سب سے پہلی غزل کے جو انھوں نے حیدرآباد سے آگرہ بھیجی تھی چند شعر یاد رہ گئے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

دیر میں یا حرم میں گذرے گی — عمر تیرے ہی غم میں گذرے گی
دل کو شوقِ نشاطِ وصل نہ چھیڑ — غم میں گذری ہے غم میں گذرے گی
کچھ اُمیدِ کرم میں گذری عمر — کچھ اُمیدِ کرم میں گذرے گی

اپریل ۱۹۳۵ء میں وہ حیدرآباد سے جے پور آئے تھے لباس قدرے معمول سے مکلف تھا ایک پاندان بھی ساتھ تھا جے پور میں مجھے اندازہ ہوا کہ فانی کو میرے ساتھ کتنا تعلق ہے۔ وہاں سارے ہندوستان کے شاعر جمع تھے۔ مگر فانی مجھے ایک لمحے کے لئے نہ چھوڑتے تھے۔ آرام کرنے اور سونے کے لئے ہم دونوں جدا ہوتے تھے وہ اپنے سب دوستوں کا کردار مجھے بتلاتے رہتے۔ میرے معاشرتی معاملات میں مجھے تنبیہ کرتے تھے۔ جے پور سے انھیں زبردستی آگرہ لے آیا۔ بعض وجوہ سے وہ آگرہ ہوٹل میں اور کھانا میری ساتھ کھایا دو تین روز قیام رہا۔ دو تین روز کے لئے گذرے ہوئے دن پلٹ آئے تھے۔ وقت کی موجیں تھم گئی تھیں اور پھر —— ؟ نہ معلوم اب کب ملنا ہو۔

میکش اکبرآبادی

میرِ کارواں بدلا

خزاں کے دَور میں سو بار گلستاں بدلا — مگر کبھی نہ مرا ذوقِ آشیاں بدلا
ہوئے وہ جلوہ گرِ دل اب آستاں بدلا — بہت دنوں میں یقیں سے مرا گماں بدلا
ہزار بار بدلنے کو آسماں بدلا — مگر نوشتۂ قسمت مرا کہاں بدلا؟
یہ کس نے چھیڑ دیا دردِ ہجر کا قصّہ — ستارے ڈوب گئے رنگِ آسماں بدلا
چلو گے راہِ کہن اہلِ قافلہ کب تک — بدل دو رہگذر، میرِ کارواں بدلا
قفس سے چھٹ کے بہت دیر میں ہم آئے مگر — نہ اہلِ باغ ہی بدلے نہ آشیاں بدلا

یہاں رہے گا یونہی ظلمت آشنا کب تک
ہلاؔل تو بھی بدل، دَورِ آسماں بدلا

ہلاؔل پریمی از کوکشی

عیدِ قرباں

(وہ نظم جو مدیرِ "شاعر" نے عید الضحیٰ کے دن ۲۹ دسمبر ۱۹۴۱ء کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے نشر کی)

عید اے ایثار و قربانی کی روشن یادگار
ترے دامن میں نہاں ہے عزمِ مسلم کا وقار

درسِ نو جوشِ عمل کا تو نے دُنیا کو دیا
کام جو ممکن نہ تھا انسان سے وہ لے لیا

باپ سے چلوا ہی دی بیٹے کی گردن پر چھری
مامتا بھی رہ گئی منہ دیکھتی کی دیکھتی

لرزہ براندام ہو کر رہ گئی یہ کائنات
کانپ اُٹھا ضربِ براہیمی سے قلبِ شش جہات

سر و بال دوش ہو جاتا ہے حق کی راہ میں
تو نے چھپ کر کہدیا عزمِ ذبیح اللہ میں

اے نشاطِ عیدِ اضحیٰ اے نویدِ سرخوشی
تو نے بخشی روحِ مسلم کو حقیقی تازگی

عزم و ایثار و عمل کی شعلہ کاری تجھ میں ہے
تجھ میں ہے بیشک مذاقِ جاں نثاری تجھ میں ہے

لیکن اب اک رسم بنکر قوم میں آتی ہے تو
عارضی اک جذبۂ عزم و عمل لاتی ہے تو

رہ گئی ہیں آجکل قربانیاں وقتی نمود
سال بھر رہتا ہے طاری قومِ مسلم پر جمود

لذتِ کام و دہن کی فکر رہتی ہے ہمیں
ایک دُنیا اب غلامِ نفس کہتی ہے ہمیں

تھی جو قربانی کی غایت بھول بیٹھے ہم اُسے
خالصاً للہ جو جذبے تھے وہ سب مٹ گئے

ہم سمجھتے ہیں کہ بس ہے اک ذبیحہ سال میں
اس یقیں کے ساتھ برکت ہوگی جان و مال میں

وائے کم فہمی ہمیں ادراکِ قربانی نہیں
شوقِ خود فہمی نہیں ذوقِ خدادانی نہیں

کیا خدا بھوکا ہے قربانی کا سوچیں تو ذرا؟
اُس پہ ہوتا ہے اثر کیا نیک و بد افعال کا؟

ذات ہے اُس کی منزہ نفس و نفسیات سے
کچھ غرض دُنیا سے ہے اُس کو نہ موجودات سے

ہم اگر قربانیاں کرتے ہیں اُس کی راہ میں
پھول اور کلیاں بچھاتے ہیں خود اپنی راہ میں

لیکن اس میں وقت و ماہ و سال کی تخصیص کیا؟
بات تو جب ہے کریں قربانیاں صبح و مسا!

یہ عمل گاہِ کہن، یہ حشر زارِ زندگی
فی الحقیقت ہے کسوٹی نیک و بد افعال کی

ہر غلط خواہش کو ہم اپنی یہاں قربان کریں
بینواؤں، بیکسوں، بے آسروں کا ساتھ دیں

راہِ ملک و قوم میں قربان کردیں جان ہم
فرصتِ عمرِ دو روزہ کو سمجھ لیں مغتنم

عیدِ اضحیٰ واجباتِ مذہبی سے ہے — مگر
آپ شاعر سے سُن لے اس کی شرحِ مختصر

زندگی میں ہے ضرورت ہر نفس ایثار کی
ہے اہم تر سب سے قربانی بُتِ پندار کی

اعجاز صدیقی

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو)

اہلِ علم قید خانوں میں

تاریخِ علم و دانش کا ایک عجیب ورق

دانش و ادب کی تاریخ کا ایک ایک ورق گواہ ہے کہ اہلِ علم اور صاحبانِ فکر و بصیرت نے قید خانوں کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بیٹھ کر علم و دانش کے چراغ روشن کئے ہیں۔ قرائن سے نہیں تجربۂ شہود سے اس بات کی دلیل ملتی ہے کہ سچائی اور حقانیت کا پودا مظلومیت اور بیکسی کے پانی سے پرورش پاکر، برگ و بار لاتا ہے، اور سچ بولنے والی زبان پھانسی کے تختہ پر بھی خاموش نہیں ہتی۔ حق و صداقت نے انتہائی مظلومیت کے باوجود باطل اور عدوان کو ہر محاذ پر شکست دی ہے۔ دُنیا شکست و فتح کو ظاہری اسباب کے پیمانہ سے ناپتی ہے، حالانکہ:-

"قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے"

اور سچائی کو فتح پانے کے لئے ایک نہ ایک "کربلا" سے گذرنا پڑتا ہے۔ سچائی کے لئے ابتلا و آزمائش کے آتشکدے بھڑکائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ:-

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

امتحان و آزمائش کی آتشیں کسوٹی پر کھرے، کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے۔ آزمائش کی ایک ہی آنچ میں ریاکاری اور بناوٹ کا ملمع اُتر جاتا ہے۔

حکومتیں، مبلغینِ حق و صداقت کو قید کرکے اس غلط فہمی سے تسکین حاصل کرتی ہیں کہ سچائی کی آواز کو دبا دیا گیا، حالانکہ قید و بند میں حقانیت اور زیادہ فروغ پاتی ہے۔ جسم کو فولادی بیڑیاں اور آہنی ہتھکڑیاں پہنائی جاسکتی ہیں مگر خیال و ضمیر کو جکڑنے کے لئے آج تک دُنیا کوئی آلہ نہیں بنا سکی۔

انسان کی فطرت کا خاصّہ ہے کہ وہ "بڑے فائدہ" کے لئے چھوٹی چھوٹی چیزوں کا نقصان یا قربانی گوارا کرلیتی ہے، سچائی کا پرچار کرنے والوں کو "سچ" میں سب سے بڑا فائدہ نظر آتا ہے، اس لئے اس "نفع عظیم" کے لئے وہ جان و مال کی ہر قربانی کو گوارا کرسکتے ہیں، بلکہ قربانی میں اُن کو اور مزہ آتا ہے اور وہ ہنستے ہوئے جلّاد کا استقبال کرتے ہیں۔

حضرت امام احمد بن حنبل

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے ہر وہ دل جس میں رائی کے دانہ کی برابر بھی سچائی موجود ہے، حضرت امام حنبل کے کارناموں کو ہمیشہ تحسین و عقیدت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ ایک مذہبی مسئلہ میں بادشاہ سے اُن کا اختلاف ہوگیا، بادشاہ نے ڈرایا، دھمکایا کہ میری ہاں میں ہاں ملاؤ نہیں تو سخت سزا دوں گا۔ بہت سے جاہ پرست اور شیطان صفت علماء خلیفہ کے ہمنوا ہوگئے۔ مگر امام حنبلؒ نے کہا کہ چاہے دُنیا اِدھر کی اُدھر کیوں نہ ہوجائے اور میرے جسم کے ٹکڑے کیوں نہ اُڑا دیئے جائیں جس بات کو میں سچ سمجھتا ہوں، اُس کو آخر وقت تک سچ کہے جاؤں گا خلیفہ کے عتاب کا پارہ بہت اونچا ہوگیا۔ ملوکیت کے جبر و استبداد کو حرکت ہوئی اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ پر سختیاں شروع ہوگئیں، اُن کی پیٹھ پر بے تحاشا کوڑے پڑنے لگے۔ بدن سے خون جاری ہوگیا، اسی حالت میں انھوں نے نماز پڑھی، نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو پھر کوڑوں کی اذیت سے دوچار ہونا پڑا، لیکن خدا کا وہ برگزیدہ بندہ اور حق و صداقت کا پیکر اعلائے کلمۂ حق سے باز نہ آیا۔

جبر و ظلم کے کلیجہ میں اب بھی ٹھنڈک نہیں پڑی، حضرت امام کی سرِ بازار تشہیر کرائی گئی۔ نادان خلیفہ سمجھتا تھا کہ امام حنبل رسوا ہو رہے ہیں، حالانکہ وہ زیادہ معزز ہوتے چلے جارہے تھے۔ تشہیر کے بعد انھیں جیل خانہ میں بند کردیا گیا اور یہاں پہونچکر حضرت امام حنبل نے قرآن و حدیث کا باقاعدہ درس شروع کردیا۔ امام حنبل نے قید خانہ کو خانقاہ اور دانش گاہ بنالیا، آزمائش کی سختیوں نے آئینۂ دل کو اور زیادہ مجلّا بنادیا تھا، اس لئے قید خانہ میں انھوں نے وہ باتیں بیان کیں جو منبر پر اُن کی زبان سے ادا نہ ہوسکی تھیں۔ خلیفہ معتصم کا قید خانہ مجلسِ درس بن گیا اور ایک زمانہ تک لوگوں کے دلوں میں اس مجلس کی یاد تازہ رہی

رئیس الاحرار

ہاں! تو میں نے اس مضمون کی ابتدا ان جملوں سے کی تھی

کہ اہلِ علم اور صاحبانِ فکر و بصیرت نے قید خانوں کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بھی علم و دانش کے چراغ روشن کئے ہیں۔ دُور کیوں جایئے اسی آپ کے غلامِ ہندوستان کا واقعہ ہے کہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم نے قیدِ فرنگ میں ہی قرآن شریف حفظ کر لیا اور جب وہ قید سے چھوٹے ہیں تو اُن کا سینہ قرآن کے انوار سے معمور تھا مبارک تھی محمد علی کی قید اور قابلِ رشک تھی اُن کی مظلومیت! اسی سوز ایمان کا تو اثر تھا کہ موت لندن میں آئی اور جگہ ملی انبیائے کرام کے آغوش میں!

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

امامِ اعظمؒ

فقہ کے سب سے بڑے اور مستند امام حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو بھی حکومت کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ ملوکیت کے پاس پھانسی کے تختوں اور جیل خانہ کی کوٹھریوں کے سوا ہوتا ہی کیا ہے، حضرت امامِ اعظم کو قید خانہ میں بند کر دیا گیا، لیکن وہاں پہونچ کر بھی اُن کے علم کا دریا جاری رہا، بلکہ اُس کا بہاؤ اور زیادہ تیز ہو گیا، اسی قید خانے کے فیض نے حضرت امام محمد جیسے شاگرد کو پیدا کیا، جس پر قانونِ شریعت ہمیشہ فخر کرے گا

صاحبِ سیف و قلم

حضرت علامہ امام ابن تیمیہ الحرّانی نہ صرف قلم و کتاب کے امام بلکہ تلوار کے بھی دھنی تھے، اُنھوں نے قلم سے زبان سے اور تلوار سے ظالم حکومت کے خلاف جہاد کیا۔ اُن کی ہر سانس تبلیغِ حق کے لئے وقف تھی، وہ محرابوں کے سایہ میں اور منبروں کی بلندیوں پر بھی کلمۂ حق بلند کرتے تھے اور جنگ کے میدانوں میں بھی سچائی کی تبلیغ فرماتے تھے، اُن کی بہت سی گرانقدر تصنیفات اسی مظلومیت اور ابتلا و آزمائش کے زمانہ کی یادگار ہیں۔

مبسوط کہاں لکھی گئی؟

علامہ سرخسی جو شمس الائمہ کے نام سے مشہور ہیں اور جن کو حنفی فقہ کا معلّمِ ثانی کہا جاتا ہے ترکستان کے مشہور شہر اوزگند کے جیل خانہ میں قید کر دئے گئے۔ اسی قید خانہ میں بیٹھ کر انھوں نے اپنی مشہور تصنیف مبسوط کی پندرہ جلدیں تصنیف کیں اور جیل خانہ کی دیواریں اُن کے ذہن و فکر کے طوفان کو نہ روک سکیں، اوزگند کا جیل خانہ مٹ گیا، مگر مبسوط کا ایک ایک حرف زندہ ہے۔

جیل خانہ کی کھڑکی سے

قاضی بکار کو زندانِ مصر کی ہوا کھانی پڑی، قید خانہ میں اُن پر بیسیوں طرح کی پابندیاں عاید تھیں، لیکن فیضانِ علم بہرحال اپنے لئے راستہ نکال لیتا ہے، شائقینِ علم جیل خانہ کی دیوار کے نیچے جمع ہو جایا کرتے تھے اور قاضی بکار جیل خانہ کی کھڑکی سے منہ نکال کر درس دیتے تھے، بہت دن تک یہ سلسلہ جاری رہا اور تشنگانِ علم و ادب سیراب ہوتے رہے۔

ہیئت و ریاضی کا عالم

اندلس کے مشہور عالم ہیئت و ریاضی اُمیہ بن عبدالعزیز ۵۰۸ھ میں، اسکندریہ کے قید خانہ میں محبوس ہوئے۔ قید خانہ میں قیدی کو درد و اذیت کے سوا ملتا ہی کیا ہے۔ اُمیہ کو بھی مصائبِ زنداں سے دوچار ہونا پڑا لیکن ان تمام پریشانیوں کے باوجود وہ بدستور تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے، اور ہیئت و ریاضی کی بہت سی کتابیں قید خانہ میں ہی رہ کر تصنیف کیں۔

ہندوستان کے مشاہیر

اس خصوص میں ہندوستان کے بعض مشاہیر کا تذکرہ کرنا ظلم ہوگا۔ مولانا فضلِ حق خیرآبادی کا نام کون نہیں جانتا اُن کے "قصائد حبسیات" بھی زمانۂ قید و بند کی یادگار ہیں۔

انگریزوں کا جب ہندوستان میں تسلط ہوا تو اُنھوں نے بھی مبلغینِ حق و صداقت کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ چنانچہ مفتی عنایت احمد صاحب کو بھی وطن سے ہجرت کر کے انڈمان جانا پڑا اور وہاں رہ کر اُنھوں نے صرف و نحو کے موضوع پر کتاب لکھی۔

فخر المتاخرین، راس المجاہدین حضرت شیخ الہند محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کو بھی حق و صداقت کے جرم میں جلاوطنی کی سزا بھگتنی پڑی، جزیرہ مالٹا کے بام و در اُن کی مظلومیت اور حق گوئی کی آج بھی شہادت دے رہے ہیں۔ حضرت شیخ الہند پر حکومت کی بڑی سخت نگرانی تھی، پھر بھی اُنھوں نے قرآن شریف کے چند پاروں کی تفسیر لکھی۔

حرفِ آخر

اس دور میں جہاں ڈراموں، افسانوں اور رنگین نظموں کی پرستش ہو رہی ہے میرا یہ مضمون شاید دلچسپی اور شوق کے ساتھ نہ پڑھا جائے گا، لیکن اگر ایک اور صرف ایک دل بھی اس مضمون کی معنویت سے متاثر ہو کر، حرکت میں آگیا تو میری محنت وصول ہو جائے گی۔

مضمون بہت مختصر ہے۔ میں نے صرف اجمالی اشارات سے کام لیا ہے لیکن سمجھنے والے کے لئے ایک بات بھی بہت ہوتی ہے اور میں نے تو بہت سی باتیں بیان کر دی ہیں حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی طرح افراد کی سربلندی و کامرانی کا راز بھی "قربانی" میں پنہاں ہے پھولوں کی سیج پر بیٹھ کر کوئی آدمی بڑا نہیں بن سکتا اور وہ جن کو پھولوں کی سیج اور جاہ و حشمت ورثہ میں ملتے ہیں، اُن کے ہاتھوں انسانیت کو طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا ہونا پڑا ہے خوب کہا اقبال نے ؎

بہ دوشِ منعم بے دین و دانش
قبائے زیست پامالِ جراحت

ماہر القادری

کافر گری!

اے دیارِ ہند کے کافر گر و بتخانہ ساز
اے خودی دستور، خود فہم و خود آرا، خود نواز!

ذہنِ ناقص میں سمجھکر اپنے کافر خُوب مجھے
دعوتِ "تجدیدِ ایماں" دے رہا ہے تو مجھے

دوسرے سمجھا نہیں سکتے تجھے مطلب مرا
سُن ذرا میری زباں سے مذہب و مشرب مرا

چند صدیوں سے نہیں، روزِ ازل سے بیش و کم
میں مسلماں ہوں، تری ریشِ مقدس کی قسم

میں موحد ہوں، خدا کی ذات کا عرفان ہے
انبیا، صحف و ملائک پر مرا ایمان ہے

علم ہے یزدان و شیطاں کے مراتب کا مجھے
ہیں مری نظروں میں درجے خالق و مخلوق کے

ہے عقیدت بھی محبت بھی مجھے "اسلام" سے
ہوں مسلماں پہلے، اسکے بعد دُنیا جو کہے

شاہدِ توحیدِ رب میرا دلِ آگاہ ہے
اک نفس ہے "لا الٰہ" ایک "الا اللہ" ہے

میں نے حمد و نعت میں لکھی ہیں نظمیں جسقدر
غالباً اُتنا نہیں ہے تیرا درسِ مختصر

یہ تو ظاہر ہے مرا، اب سُن مرے باطن کا حال
ہے مرے رنگِ عبودیت میں بھی شانِ کمال

ہر نفس ہوں میں درِ معبود پر صرفِ سجود
میرا سجدہ بے ریا، میری عبادت بے نمود

جب لحافِ گرم میں سوتا ہے تو آرام سے
کھیلتا ہوں میں جمالِ شاہدِ الہام سے

ہیں معیّن رات دن میں تیرے اوقاتِ نماز
اور میں لمحہ بہ لمحہ در خورِ راز و نیاز

حجرۂ مسجد میں تو گوشہ نشیں، تسبیح خواں
اور میں کہتا ہوں بتخانوں میں تکبیر و اذاں

ہے مسلمانوں کو بھی کافر بنانا تیرا کام
اور میں اسلام کا دُنیا کو دیتا ہوں پیام

تو سکھاتا ہے مسلمانوں کو درسِ کافری
اور میں ضربِ خلیل اللہ بہرِ آذری

میں ہوں شاعر، مجھکو منبر پر بٹھاتے تھے رسولؐ
کیا کبھی حاصل ہوا ہے تجھ کو یہ حُسنِ قبول؟

آج بھی روح القدس سے ہیں ملاقاتیں مری   اور ترے پاس تو آتا نہیں شیطان بھی!

زادۂ الہام کے اسلام سے منکر ہے تو
خود ہی کر انصاف میں کافر ہوں یا کافر ہے تو؟

اے قدامت کے کھلونے جانتا ہوں میں تجھے   مذہبی بہروپئے پہچانتا ہوں میں تجھے
حال میرا سُن چکا اب دیکھ اپنا حال بھی   کم نہیں اعمالِ شیطاں سے ترے اعمال بھی
تیرا مذہب ہے فقط دینار کی جھنکار میں   بیچتا ہے اپنے فتوے قوم کے بازار میں
تو نے پتھر کے پجاری کو تو مشرک کہدیا   سنگِ اسود کی طرف رکھتا ہی خود سجدہ روا
کیا خدا محدود ہے محدود ہی مملوک ہے؟   "ثم وجہ اللہ" کیا اب آیتِ متروک ہے؟
نذر لینا وعظ کہہ کر کیا یہ نازیبا نہیں؟   چار پیسے ہیں ترے فتوے کی قیمت یا نہیں؟
کیا نہیں علمِ شریعت کی یہ بیع و اشترا؟   جذبۂ ایثار کس میں ہے ذرا مجھ کو بتا؟
کیا نہیں ہیں بندۂ تنخواہ مُلّا و امام؟   تو کبھی بے مزد پڑھتا ہے تراویحِ صیام؟
کیا نہیں ہے تیرا یہ عمامہ اور یہ پیرہن   مرنے والوں کا لباسِ مفت اور جزوِ کفن؟
جبر تیرا زندگی پر، موت پہ ہے زور بھی   مفت خوری تیرا پیشہ، تو ہی مُردہ خور بھی
عیش کوشی اور ہے تن پروری تیرا اصول   ہر فسانے کو ہے "قال اللہ" اور "قال الرسول"
حافظِ شیراز تیرا خلوتی راز ہے   اسکا یہ مطلع ترے اشغال کا غمّاز ہے
"واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند   چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر مے کنند"
پھر بھی آخر نہ کیوں آئے تری ایمان پر   مرغ و ماہی دیکھتا ہوں تری دسترخوان پر

"شرک دشمن" کو موحد میں کہوں تو ہے گناہ   تو موحد کو کہے کافر تو ٹھہرے دیں پناہ
ہے جو تیرے قول پر تکفیر کا دار و مدار   رہ نہیں سکتی کبھی بنیادِ مذہب استوار
منحصر نیت پہ ہیں اعمال یا الفاظ پر؟   غور کر مذہب کے جھگڑے وار اب بھی غور کر!
کب کسی کو مرتد و کافر بنا سکتا ہے تو   نیتوں سے جب نہیں واقف تو کیوں بکتا ہے تو!
اور اگر الفاظ پر ہی ہے اساسِ ارتداد   قدرتاً تجھ سے زیادہ ہیں مجھے الفاظ یاد

دشمنِ اسلام ہے ملت کا غارتگر ہے تو
اے [illegible]

(۱۰ دسمبر ۱۹۳۱ء)   سیماب اکبرآبادی

چھوٹی تصویر

یہ قصہ میں نے ایک پرلطف دعوت میں جو سادہ گسکشن میں منعقد ہوئی تھی سنا تھا۔ ایسے موقعوں پر کوئی قرینہ غیر معمولی یا بعید از قیاس واقعات سننے کا نہیں ہوتا مگر وہاں کچھ ایسی ہی بات چھڑ گئی۔

یہ مختصر قصہ مجھے ایسا عجیب اور دلچسپ معلوم ہوا کہ گھر پہنچتے ہی میں نے اس کو من و عن قلمبند کر لیا اور اگر یہ سراسر خلاف قیاس ہی معلوم ہو تو میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ میری من گھڑت نہیں ہے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جنرل کی بیوی نے بھی جنکا یہ ذاتی تجربہ ہے اُس کو نہیں گھڑا ہے

طعام سے فارغ ہو کر ہم لوگ گول کمرہ میں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے اور اپنے میزبان کے سامانِ آرائش، نفاست خانہ اور فرنیچر کی مدح سرائی میں مشغول تھے کیونکہ ہمارے میزبان معہ اپنی بیگم کے حال ہی میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر گھر آئے تھے اور اپنے نئے مکان اور سامان پر ایسے اترائے تھے کہ گویا وہ دونوں نئے دولہا دلہن تھے۔ وہ دونوں اس امر کو فراموش کئے ہوئے تھے کہ ہم اپنی شاہانہ زندگی کے بیس سال پنجاب میں گذار چکے ہیں اور اب من کھولت کا دور شروع ہے اُن کے سامان میں جیل کے بنے ہوئے کمبل اور کشیدہ کاری کے نمونے، منقش برنجی اور چینی ظروف و اشیاء، چاندی، ہاتھی دانت اور آبنوس کی عجیب غریب آرائشی چیزیں، احباب، عمارات اور اپنی پسند کے جانوروں کے بے شمار فوٹو اور دیگر بہت سی اشیاء جو ان کے زمانۂ قیام ہندوستان کی یادگار تھیں موجود تھیں۔ ایسی متضاد چیزوں کا مجموعہ ہونے کے باوجود یہ سارا ذخیرہ اپنی جگہ پر اتنا بھلا، خوشنما اور دلچسپ معلوم ہوتا تھا کہ ہم لوگ ایک ایک شے کو بغور دیکھتے رہے اور اس سلسلے میں خاص کر ہندوستان ہی کے تذکرے ہوتے رہے کہ اتنے میں کسی صاحب نے ایک میز پر سے ایک چھوٹا سا چرمی خاکہ اُٹھا کر کہا "یہ کیا ہے" اس کے بعد کچھ دیر سکوت رہا اور ایک ہی لمحے بعد ایک صاحب یوں گویا ہوئے "ہاں تو ہندوستانی استدر دقیانوسی خیال کے لوگ ہیں کہ ان کو اب بھی بھوت پریت وغیرہ دکھائی دیتے ہیں اور وہ ایسی چیزوں کے بہت قائل ہیں"۔ ایک گداز جسم اور سن رسیدہ عمر کی سفید بالوں والی خاتون جو ہماری میزبان تھیں اور جن کی تیز نیلی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی اور جن کا رنگ ... ہندوستان کے گرم میدانوں میں گذارنے کے باوجود نہایت صاف تھا ایک گوشے سے اپنی ہمجولیوں کے مجمع میں سے آگے بڑھیں اور معترض کے ہاتھ میں سے چرمی خاکہ لیکر کہنے لگیں "اگر آپ اس کا ثبوت چاہتے ہیں تو یہ موجود ہے"۔

یہ کہتے ہوئے اُس خاتون نے اس خاکہ کو کھولا اور اندر سے ایک نوجوان عورت کی چھوٹی سی تصویر نکالی جو ایک سفید ململ کی اونچی چولی والی گون اور ایک قدیم وضع کی ٹوپی پہنے ہوئے تھی۔ یہ تصویر کیا تھی گویا سچ مچ منہ سے بول رہی تھی ہم سب لوگوں کو دلچسپی پیدا ہوئی اور اس چھوٹی تصویر کا قصہ ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے "یہ میری پردادی ہیں" خاتون نے چھوٹے خوش رنگ مرقع پر محبت بھری نظر ڈال کر کہا "یہ ہندوستان ہی میں اپنے ایام جوانی میں ہیضے سے دفعتاً انتقال کر گئی تھیں اور ان کے شوہر یعنی میرے پردادا کو ان کی بیوقت موت کا اسقدر صدمہ ہوا کہ انہوں نے خودکشی کر لی۔ بہرحال مرے دونوں قریب قریب ایک وقت میں لیکن یہ سب واقعات کہاں ہوئے یا کس شہر میں ہوئے؟ اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔

پرانے زمانے میں ہندوستان سے خبریں بہت دیر میں پہنچتی تھیں اور تفصیلات کا معلوم کرنا دشوار ہوتا تھا اور اگر کچھ حالات مل بھی جاتے تھے تو لوگ ان کو فراموش کر دیتے تھے اور واقف ہو جاتے تھے: بچپن میں ہم اپنے بوڑھوں کا مبہم سا حال سنا کرتے تھے اور ہم جانتے تھے کہ ہمارا دادا جو ان کی تنہا اولاد تھا اپنے والدین کی موت سے ایک سال قبل ہی خورد سالی میں ولایت بھیج دیا گیا تھا لیکن جب ہم بڑے ہوئے تو ہمیں کوئی خط یا تحریر اس غمناک واقعہ کی نہیں ملی اور نہ ہمیں کوئی پتہ اس چھوٹی تصویر ہی کا چل سکا جو ہماری پردادی کی شادی کیلئے ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے بنائی گئی تھی۔ یہ چھوٹی تصویر بعد میں کس طرح دستیاب ہوئی یہ میں ابھی بیان کرتی ہوں کیونکہ وہ بھی ماجرا عجیب ہی ہے"۔

اُس نے وہ سنہرے کنارے والی چھوٹی تصویر ہم سب کے دیکھنے کے لئے ہمارے سامنے کر دی اور پھر اپنا قصہ یوں بیان کرنا شروع کیا۔ "لڑکپن میں مجھے اکثر اپنی پردادی اور اُس کے المناک انجام کا خیال آیا کرتا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ اس تصویر کا کیا حشر ہوا۔ جب میں اپنی شادی کے بعد ہندوستان گئی تو مجھے اور بھی اس کا خیال رہنے لگا۔ سرکاری ملازمت کے دوران میں مجھے جس جس شہر میں رہنے کا اتفاق ہوا میں ...

گورستان میں ضرور جایا کرتی تھی۔ اس اُمید پر کہ شاید کسی لوحِ مزار پر اُن کا نام کندہ ہو۔ میرے صاحب میری اس قبرستان میں جانے کی عادت کا بہت مذاق اُڑایا کرتے تھے اور اِسے خبط سے تعبیر کیا کرتے تھے لیکن میں بار بار تلاش کرتی ہی رہتی اور جگہ جگہ مختلف لوگوں سے استفسار کرتی اور تیم تاریخی کتابیں جن میں شروع میں ہندوستان آنے والے انگریزوں کے حالات مل سکتے تھے پڑھتی رہتی۔ میری یہ بے نتیجہ تلاش سرگرمی کے ساتھ جاری رہی۔ یہاں تک کہ آخرکار ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ میرے شوہر کے ملکی محکمے میں آنے کے بعد اُن کا تبادلہ ایک چھوٹی سی نئی جگہ ہو گیا۔ ریل سے بہت دُور ——— پختہ سڑکوں سے بھی علیحدہ، گمنام اور نئی دُور افتادہ بستی اور ایک خاص وجہ سے ذرا تاریخی قسم کی بھیانک جگہ تھی۔ کیونکہ وہ جان کمپنی کے زمانہ میں ایک فوجی چھاؤنی رہ چکی تھی اور قدیم وضع کے بنگلوں سے جو کہ اب زیادہ تر ویران تھے اور خالی منہدم بارکوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی زمانہ میں اچھا خاصا انگلینڈ کے محلہ کا حصہ دار معلوم ہوتا ہوگا۔ وہاں کا گورستان بہت گنجان تھا مگر جس نام کی مجھے تلاش تھی اُس کا پتہ وہاں بھی نہ چلا۔ ہم اپنے وسیع اور کسی قدر شکستہ بنگلے میں جا کر فروکش ہو گئے۔ جو کہ شاید ڈیڑھ صدی قبل کسی عہدہ دار کے لئے تعمیر کیا گیا ہوگا۔ بنگلہ کی وسعت اور تعمیر سے پتہ چلتا تھا کہ کسی نہایت شان و شوکت والے سردار کے لئے اُس کی مرضی کے مطابق تعمیر کیا گیا ہے۔ پشت پر ایک بڑا صحن تھا اور ہندوستان کی مختلف النوع سخت آب و ہوا سے مقابلہ کرنے کے لئے تین رُخ کے کمرے بنے ہوئے تھے اور ایک رُخ پر کوٹھی کا ذرا بلند عقب والا برآمدہ تھا اور اُس کے نیچے بڑی لمبی چوڑی غلام گردش۔ کوارٹر۔ اصطبل فیل خانہ اور مرغی خانہ وغیرہ کئی ایکڑ زمین پر بنے ہوئے تھے۔ تیرنے کے لئے ایک حوض بھی تھا جس کے چاروں طرف جالی کا شکستہ جنگلا تھا کل جگہ صحیح اور صاف حالت میں رکھنا ہماری حیثیت سے بالاتر تھا۔ کیونکہ باوجود ہندوستان کی سستی مزدوری کے کل مکان کی صفائی اور مرمت پر خرچ کرنے کے لئے ہماری تنہائی آمدنی بھی کافی نہ ہو سکتی تھی۔ لہذا ہم نے مکان کا ایک اچھا سا حصہ اور صحن میں ایک جانب تھوڑا سا "لان" غرض کچھ جگہ اپنی ضرورت کے مطابق درست کر لی اور باقی بدستور چھوڑ دیا۔

میں اس ویران اور دُور افتادہ جگہ پر کچھ زیادہ ناخوش نہیں تھی۔ کیونکہ محدودے چند لوگ جو ہماری سوسائٹی کے قابل تھے وہ واقعی بہت اچھے اور نیک تھے۔ شکار کی کثرت، اور سوسائٹی کا ہم خیال اور مختصر سا دائرہ، خوب گذرتی تھی۔ اور شکار کا گوشت تو باورچی خانہ میں کبھی ختم ہی نہیں ہوتا تھا ——— تنہائی میں ایک پیانو ——— وسیع اور ٹھنڈے کمرے اور مختصر سے باغیچہ میں گرم ملک کے خوشبودار پھول میرے رفیق تھے۔ میرے آرام کے کمرے میں سے ایک خوب چوڑا سا زینہ باغ کی طرف اُترتا تھا اور زینہ کے دائیں سے چند قدم کے فاصلہ پر ایک بڑا پُرانا پیپل کا درخت کھڑا تھا۔ درخت کے نیچے ایک چبوترہ تھا اور اُس پر ایک چھوٹا سا ستون بیچوں بیچ میں نصب تھا۔ جس پر ایک قبر کا اطلاق ہو سکتا تھا۔ مگر چونکہ اُس پر کوئی کتبہ وغیرہ نہ تھا لہذا اُس کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ کہ وہ قبر ہے یا یہاں کے ہندو باشندوں کی عبادت گاہ وغیرہ کی قسم کی کوئی چیز ——— یہ ہندوستانی باغ کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی۔ اس قسم کی چیزیں یہاں باغوں، راستوں اور گھروں کے اندر تک پائی جاتی ہیں۔ ظاہراً بہت سے لوگ اسے کسی مسلمان کی قبر سمجھتے تھے۔ کیونکہ وضعِ تعمیر عیسائی قبر سے قدرے مختلف تھی اور پھر کتبہ بھی نہ تھا مگر تعمیر کا سامان نہایت مضبوط اور سنگین تھا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ یہ مسلمان کی قبر سے بھی کچھ مختلف تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ بنگلے اور احاطہ کے بننے سے پہلے یہ قبر یا کچھ بھی کہئے یہاں پیپل کے سائے میں بنی ہوگی پیپل کی جڑیں جگہ جگہ سے قبر کے سنگین چبوترے کو شق کر رہی تھیں۔

میں جب اپنے کمرے میں کپڑے وغیرہ پہنتی ہوتی تو اکثر اس چھوٹی سی یادگار کو دیکھتی رہتی اور سوچا کرتی کہ اگر یہ کسی کا مرقد ہے تو نہ معلوم اس شخص کے حالاتِ زندگی کیا رہے ہونگے جو ان پتھروں کے نیچے ابدی نیند سو رہا ہے۔

میری آیا ایک مہینہ کی رخصت پر چلی گئی تھی اور میں نے بغیر دوسری آیا بلائے ہوئے اس زمانہ کو کاٹنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ کیونکہ اس ویران جگہ میں کسی کارکردہ ملازمہ کا ملنا بھی دشوار تھا اور کسی بڑے شہر سے بلانے میں اور وہ بھی اتنے تھوڑے عرصہ کے لئے خواہ مخواہ کا بار اُٹھانا تھا۔ لہذا میں نے کچھ ذمہ داریاں اپنے اوپر اور کچھ اپنے بیرے کے اوپر عائد کر لیں جس سے میرے آرام میں یکگونہ خلل سا پیدا ہو گیا۔ میں دوسری آیا کو نہ بلانے پر افسوس کر رہی تھی کہ ایک صبح جب میرا دھوبی آیا تو اُس نے میری پریشانی دیکھ کر اپنی نوجوان عورت کو عارضی طور پر میری خدمت کے لئے پیش کیا اور میں نے اُس کی تجویز کو بصد شکریہ کے ساتھ منظور کر لیا۔ میں نے غور کیا کہ دراصل دھوبی اپنی بیوی کو بھیجنا چاہتا تھا اور اُس کی یہ عطا مفت کرم داشتن کا مضمون تھی مگر میں نے اُس کے الفاظ پکڑ لئے اور باوجود اس عذر کے کہ اُس کی عورت نے صاحب لوگوں میں کبھی کام نہیں کیا ہے۔ اس کو کام سکھانے کا وعدہ کر کے پوری تنخواہ پر بلا لیا دوسرے دن صبح دھوبی عورت کو لیکر آیا۔ ایک نوعمر لڑکی سی، چمپئی رنگ اور غزالی آنکھوں اور بلند پیشانی اور ستواں ناک والا چھوٹا سا اُٹھے ہوئے خدوخال کا چہرہ جس میں نزاکت اور خوبصورتی کیساتھ ساتھ سخت محنت کے آثار جو مستقل طور پر گرم ملک میں رہنے والی عام

صاف کی تو معلوم ہوا کہ سنگِ مرمر کی گول ڈبیہ ہے۔ منقش جس کے نقوش میں مٹی بھری ہوئی ہے۔ میں اُسے لیکر اندر چلی آئی ——— اور بغیر کپڑوں اور ہاتھوں سے گرد صاف کئے بغیر اُسے کھولنے کی تدبیر کرنے لگی ——— اُس کے اندر سے یہ چھوٹی سی تصویر ایسی ہی جگمگاتی ہوئی نکلی جیسی کہ اس وقت چمک رہی ہے ——— اور یہ میری پردادی کی تصویر ہے"۔

"اچھا آپ کی پردادی صاحبہ کی تصویر" ہم میں سے کسی نے کہا،

"بیشک" انھوں نے جواب دیا ——— اگر میری چھوٹی دھوبن کو دادا مرحوم کا بھوت نظر نہ آتا تو یہ میری خاندانی یادگار کبھی میرے ہاتھ نہ لگتی ——— یہ کہکر وہ ان صاحب کی جانب متوجہ ہوئیں جو ہندوستانیوں کی توہم پرستی پر معترض تھے اور جنکی وجہ سے اُنھوں نے یہ قصہ سُنایا تھا ——— کیوں جناب کیا آپ کے لئے یہ ثبوت کافی نہیں ہے ——— ؟

لیکن جنرل نے دخل در معقولات کرکے سارے معاملہ کا تیاپانچہ کر دیا اور بولا "آخر اسے آپ کی پردادی ہی کی تصویر کیوں سمجھ لیا جائے ——— ممکن ہے وہ کسی عاشقِ ناشاد کا مرقد ہو جو اپنی محبوبہ کی جدائی میں خودکشی کرکے مرگیا ہو ——— اور اُس کی تصویر ساتھ دفن کر دی گئی ہو ——— آخر وہ سفید بالوں اور ٹھوڑی اور جبیں والے آپکے پردادا ہی کیوں سمجھ لئے جائیں ——— ؟

(۵، فیصدی ترجمہ) **چودھری ابو مسلم صدیقی** ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

دیوِ جنگ کا رجز

ہے میرا نام دیوِ جنگ پیشہ کشت و خوں میرا — حق و باطل میں ہوتا ہے حَکَم دستِ جنوں میرا
اگر ہوتی ہے ظلم و جور کی دُنیا پہ سلطانی — جہاں میں اہرمن نخوت کا کرتا ہے ستمرانی
گلا جب گھونٹتا ہے بیکسوں کا دستِ فولادی — دبا لیتے ہیں جب مغرور کمزوروں کی آزادی
رہینِ شیطنت ہوتے ہیں جب انفاسِ انسانی — فزوں ہوتی ہے جس دم آدمی میں خوئے حیوانی
زمانہ جب بھلا دیتا ہے احکامِ خداوندی — وداعی اذن جب لیتی ہے انساں سے خردمندی
علی الاعلان جب کفر و ضلالت رائج کرتے ہیں — حق و انصاف کو دُنیا سے جب تاراج کرتے ہیں
جہاں میں عیش و عشرت کی جب ہوتی ہے ارزانی — جوانوں میں سرایت کرتا ہے ذوقِ تن آسانی

تو پھر عالم پہ چھا جاتا ہوں میں قہرِ خدا ہو کر
جھپٹتا ہوں سرِ فرقِ ستم برقِ بلا ہو کر

مری شمشیر کو قدرت نے دی ہے وہ درخشانی — کیا کرتی ہے اک عالم کو خیرہ جسکی تابانی
بدل دیتی ہے اک جنبش مری، قسمت کی تحریریں — چمک اٹھتی ہیں میرے نام سے قوموں کی تقدیریں
مری نوکِ سناں پر رقص کرتی ہے جہانبانی — مری پھونکوں سے اڑ جاتے ہیں اکثر تاجِ سلطانی
میں تڑپاتا ہوں ظلم و جور کو جب بسترِ خوں پر — حق و انصاف پھر بنتے ہیں اُن کے تخت داؤں پر
مٹا دیتا ہوں میں دم بھر میں نقشہ بربریت کا — الٹ جاتا ہے میرے نام سے تختہ رعونت کا
مری ہیبت سے ہل جاتے ہیں سینے کجکلاہوں کے — لرز جاتے ہیں میرے خوف سے دل بادشاہوں کے
مری انگڑائی ہے تمہید ظالم کے مٹانے کی — ہلا دیتا ہوں چولیں ایک کروٹ میں زمانے کی

مری شمشیرِ خوں آشام جب جنبش میں آتی ہے
سرِ مغرور کو مظلوم کے آگے جھکاتی ہے

عطاء الرحمن منظر فہمی

ہے اور کھولنا سخت ناجائز اور پھر صاحب بھی موجود نہیں ہیں اگر کچھ گڑبڑ ہوئی تو سب الزام مجھ پر ہوگا۔

میرے بیٹھنے پر ہم کہا کہ سرکار ہر جگہ پر ایک بھوت وقتاً فوقتاً نظر پڑتا ہے ——— اور سرکار فرنگی بھوت ——— سب بہات والوں کو بیسیوں مرتبہ نظر آچکا ہے ——— میں نے بھی چند مرتبہ دیکھا ہے اور پھر اپنی شہادت میں چند مزدور پیش کئے جنھوں نے بیک وقت لمبے سفید بالوں اور بڑے ٹوپ اور ٹین دار پاجامہ والے بھوت کو کئی مرتبہ دیکھا تھا ——— میں نے دیکھا کہ یہ سب مزدور بھی اتنے ہی خائف ہیں جتنی کہ نو عمر دھوبن ——— تو میں نے انھیں سخت ملامت کرنا شروع کی اور کچھ غصے کا اظہار بھی ——— مجھے ایک عرصہ سے ہندوستان کی چھوٹی پبلک سے سابقہ تھا اور آج پہلی مرتبہ میں نے غور کیا کہ یہ اس قسم کی ضد کا مظاہرہ کر رہے ہیں ورنہ جس قسم کا ضابطہ حکم دیا جاتا ہے فوراً ہندوستانی تعمیل کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ تمام مزدور سر پا باندھے خوف زدہ خاموش ہاتھوں میں بیلچے لئے کھڑے تھے جمعدار علیحدہ پریشان تھا اور میٹ مزدوروں کی حکم عدولی کی وجہ سے گھبرایا ہوا سا تھا مگر ان میں سے کوئی بھی باوجود میری غیر معمولی خفگی کے ٹس سے مس ہوتا دکھائی نہ دیتا تھا ——— اور گویا زبانِ حال سے یہ سارا مجمع کہہ رہا تھا کہ خواہ میم صاحب کاٹ کر پھینک دیں مگر یہ ممکن نہیں کہ ہم قبر کو ہاتھ لگائیں ——— یہ رنگ دیکھ کر میں نے سب کو ڈانٹ کر بھگا دیا اور قبر کو چاروں طرف سے بغور دیکھنا شروع کیا ——— میں نے غور کیا کہ قبر کو جگہ جگہ سے پیپل کی جڑوں نے شق کر دیا ہے اور قبر کا ہر حصہ کھلا ہوا ہے۔ بہت سی درزیں ایسی ہیں کہ جن کے اندر کائی اور مٹی نکال دینے کے بعد ہاتھ پہنچ سکتا ہے۔ قبر کا ایک گوشہ بالکل منہدم تھا جو پیپل کے تنے سے ملحق تھا اور اس میں ایک سوراخ کافی بڑا اندر کو معلوم ہوتا تھا ——— میں اندر سے ایک کدال اٹھا کر لائی ——— اور اس شکستہ حصہ پر سوراخ کے اردگرد چند ضربیں لگا کر دیکھیں میں نے غور کیا کہ اینٹ پتھر اور مسالہ وغیرہ کدال کی ضربوں سے بہت آسانی سے میری امید کے خلاف علیحدہ ہو رہا ہے ——— سوراخ چند ہی ضربوں میں کافی بڑا ہو گیا اور بالائی تعمیر کا ایک حصہ ٹوٹ گیا ——— میں نے سوراخ کے اندر جھانک کر دیکھا تو مجھے کچھ اینٹوں کی چنائی دکھائی دی مگر اس میں بھی جڑوں نے گھس کر بہت سی درازیں پیدا کر دی تھیں۔ میں نے سوراخ کے اندر بڑھ کر ان اینٹوں پر بھی ضربیں لگائیں۔ اینٹوں کے اکھیڑنے میں تو کوئی خاص دقت نہ ہوئی البتہ پیپل کی باریک اور نرم جڑیں کام میں کچھ رکاوٹیں پیدا کر رہی تھیں ——— میں پسینہ میں شرابور ہو گئی اور میرا حلق خشک ہو گیا۔ میں نے اپنے ملازمین سے جو دور کھڑے میرے اس ہولناک فعل کو بڑی متعجب اور خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے، پانی طلب کیا اور میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی کہ میرے بڈھے لمبی ڈاڑھی والے بیرے نے قریب آنے سے نہایت مہذب الفاظ میں انکار کر دیا ——— میں نے پیاس کی مطلق پروا نہ کی۔ میرے نیور دں کو دیکھ کر بیرا پانی لیکر آیا اور بڑی ہمت کر کے مجھ سے تین چار قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ اُس کا بیرا کچھ لحاظ بھی کرتی تھی ——— میں جب پانی پینے کو اٹھی تو اُس نے خلافِ معمول مجھ سے گفتگو میں پیش قدمی کی اور بہت ہی دلیل و حجت کے ساتھ مجھ کو اس کام سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کہا کہ سانپ اور بچھو کا ڈر ہے۔ قبروں میں پرانے سانپ ہوتے ہیں ——— تھکان سے بخار آنے کا خوف دلایا ——— خصوصاً سانپ کا ڈر تو مجھے بھی محسوس ہوا۔ ایسے موسم میں ایسے قدیم درخت اور قبر کے ساتھ ——— جبکہ سوراخ ایک سرنگ کی شکل میں تبدیل ہو گیا تھا اور اُس کے اندر اندھیرا تھا ——— بوڑھا بیرا قدرے جھکا اور تاریک سرنگ کے اندر جھانک کر بولا "سرکار غضب کر رہی ہیں اگر کوئی سانپ بچھو نکل آیا تو مصیبت پڑ جائیگی ——— صاحب ہم کو مار ڈالینگے ——— بھلا غور کیجئے کیسی بھیانک سرنگ ہے ———"

میں نے کہا "اچھا تمھیں ایسی ہی ہمدردی ہے تو برقی لیمپ اندر سے لے آؤ اور دُور کھڑے ہو کر روشنی ڈالتے رہو ———"

بیرا برقی لیمپ اُٹھا لایا ——— میں نے ایک ضرب لگائی اور نیچے والی چنائی میں ایک سوراخ پیدا کر دیا۔ اب میں نے غور کیا کہ یہ واقعی قبر ہے اور میرا بنایا ہوا سوراخ اصل مدفن تک پہونچ گیا ہے۔

میں نے اور آگے بڑھ کر اس سوراخ میں ہاتھ ڈال کر اندر ٹٹولنا چاہا۔ مگر میرے بیرے نے اس تاریک سوراخ میں ہاتھ ڈالنے کے ارادے سے باز رکھا اور اس کو بڑھانے کا مشورہ دیا۔ میں نے نیچے والی اینٹوں میں بھی اوپر کے برابر سرنگ بنالی اور بیرے کے ہاتھ سے لیمپ لیکر بڑی تیزی سے اندر کی طرف کھسک گئی ——— اندر کسی چیز کا ایک بے قاعدہ سا ڈھیر معلوم ہوتا تھا جیسے سوکھی ہوئی لکڑی کی پچڑیں ——— اور چاروں طرف پرانے جالے کے انبار ——— میں نے کدال کی نوک سے جگہ جگہ زمین پر ٹٹولنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ جس چیز کو میں لکڑی کے ٹکڑے سمجھ رہی تھی وہ گلی ہوئی ہڈیاں ہیں جن پر کدال لگتے ہی سفید سفید چونا سا پھیل گیا مگر ساتھ ہی ایسا معلوم ہوا کہ کدال کسی سخت چیز سے ٹکرا رہی ہے ——— میں نے بیرے سے چمٹا منگوایا ——— اور روشنی ڈال ڈال کر اس چیز کو تلاش کرنا شروع کیا ——— ٹٹولتے ٹٹولتے وہ سخت چیز چمٹے میں پھنس گئی ——— اوپر نکال کر دیکھا تو مٹی میں اٹا ہوا کوئی چیز تھی ——— میں نے بے صبری کے ساتھ مٹی

کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ خصوصاً انگریز بھوت کے نام پر ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ اور جب اُن کے اس قدر مضحکہ کے باوجود میں بدستور سنجیدہ رہی تو انھوں نے کہا "اس بگلی دھوبن نے تو شاید کبھی کسی انگریز کی تصویر دیکھ لی ہے اور ہسٹریا کی مریض ہے، وہ ہی آنکھوں میں گھومتی ہے اور دماغ تخیل میں اس کو پیش کر دیتا ہے۔"

"غلط ——— بھلا سولہ سترہ برس کی چھوکری۔ پہلی مرتبہ ایک انگریز کا گھر اندر سے دیکھا ——— پھر میرے گھر میں کوئی تصویر اس قسم کی موجود نہیں ——— اور یہ تو میں نے اندازہ کیا ہے کہ گاؤں کے رہنے والے ہندوستانی جھلا جانور، پہاڑ اور عمارت کی تصویر میں تمیز نہیں کر سکتے" ——— میں نے پُر زور الفاظ میں کہا۔

"اچھا!! تو پھر یہ کسی انگریز کی قبر ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نو وارد آیا نے اُس کا بھوت دیکھا ہے ——— چلو ایک ہم وطن اور مل گیا ——— دو سے تین تو ہو گئے پردیس اور جنگل میں ———" میرے شوہر نے مضحکہ اُڑاتے ہوئے نہایت سوکھے منہ سے کہا۔ اِن کے اس انداز اور مضحکے پہ مجھے غصہ آ گیا مگر میں سمجھ گئی کہ اگر اس وقت غصہ کا مظاہرہ کیا تو ان کو مذاق اُڑانے کا اور بھی زیادہ موقع ملے گا لہٰذا میں نے ضبط کر کے کہا "جی ہاں ——— کیا عجب ہے کہ یہ کسی انگریز کی قبر ہو اور وہی قبر جو میں تلاش کر رہی ہوں۔"

"اچھا تو یہ بھی ممکن ہے کہ تمہاری پردادی مرنے کے بعد مرد بن گئی ہوں" اُنھوں نے کہا کیونکہ آیا نے تو انگریز کا بھوت دیکھا ہے۔"

میں نے اُن کے مضحکے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا "تو ممکن ہے کہ یہ قبر پردادا مرحوم کی ہو" ——— آپ جانتے ہیں کہ اپنی بیوی کی موت سے متاثر ہو کر وہ خودکشی کر چکے تھے ——— اور ممکن ہے کہ اسی احاطہ میں یہ سب واقعہ گزرا ہو اور یہ قبر کی جگہ خودکشی کا ثبوت بھی ہے کیونکہ انھیں قبرستان میں جگہ نہیں مل سکتی تھی ——— اور غور کرنے سے اس پر زیادہ گمان قبر ہی کا ہوتا ہے ——— اور انگریز کی قبر کا ——— کیونکہ مسلمان اپنی قبروں کے بیچوں بیچ ستون قائم نہیں کرتے بلکہ سر کی جانب بناتے ہیں ——— ہندو استھانوں وغیرہ پر بھی میں نے غور کیا ہے۔ ان چیزوں سے بہت کچھ مختلف ہوتے ہیں اور پھر کچھ نہ کچھ مشابہت تو معمار کے طرز سے پیدا ہو ہی جائے گی۔"

"اچھا تو پھر پردادی کی قبر کہاں گئی؟" اُنھوں نے اُسی انداز میں کہا

"پردادی کی قبر! ——— ممکن ہے کہ گورستان میں اُن ٹوٹی پھوٹی قبروں میں ہو جس کے سنگِ مزار گر گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"بیکار مت بکو ——— اچھا یہ مان بھی لیا جائے کہ پیپل کے نیچے والی قبر کسی انگریز کی ہے اور اُس کو کھول کر اُس کی صد سالہ ہڈیاں برآمد بھی کی جائیں تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ پردادی مرحوم کی ہیں ——— کیا ہڈیوں پر پردادی مرحوم کی مُہر ثبت ہو گی؟ ——— ان بیکار خیالات کو دماغ سے نکال دو ——— ایک انگریزی تعلیم یافتہ متمدن خاتون کے دماغ میں ایسے خیالات کا آنا سخت معیوب ہے ——— بھلا غور تو کرو ایک جاہل ہندوستانی کمسن چھوکری نے تمہارے دماغ میں بھی وہمی چیز ٹھونس دی اور آپ ہیں کہ قائل ہو بیٹھیں ——— بڑے شرم کی بات ہے ———"

میں نے شوہر کا انداز دیکھ کر اس گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا مگر چھوٹی آیا سے کرید کرید کر تفصیل کے ساتھ بھوت کے حالات دریافت کئے اور مجھے اس پر بھی یقین ہے کہ اس معاملہ میں میری دلچسپی دیکھ کر کچھ نہ کچھ گپ بھی ہانکتی ہو گی ——— میں نے بہا تک کیا کہ خود جا کر پیپل کے درخت کے نیچے دھوبن کے بیان کردہ گھنٹوں میں بیٹھی۔ گو مجھے کبھی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ مگر یہ واہمہ کہ پیپل کے نیچے میرے کرسے ہے، بقدر قریب دادا مرحوم محو استراحت ہیں۔ میرے دماغ میں اچھی طرح جاگزیں ہو گیا ——— اور مجھے قبر کھولنے کا خبط سوار ہو گیا ——— ممکن ہے کہ کوئی ایسی چیز نکل آئے جس سے اس کی رہبری ہو سکے ——— دادا فوجی تھے ممکن ہے کوئی فوجی نشان، ہتھیار، بٹن ڈھال وغیرہ اس کے ثبوت میں برآمد ہو۔ فوجیوں کے اکثر ہتھیار وغیرہ اور اسی قسم کی چیزیں اُن کے ساتھ دفن کر دی جاتی ہیں۔ آخر کار میں اپنی طبیعت سے مجبور ہو گئی اور مصمم ارادہ کر لیا کہ قبر ضرور کھولوں گی ——— چنانچہ جب میرے شوہر ایک ہفتہ کے لئے دورے پر جانے لگے تو میں نے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کیونکہ میں جانتی تھی کہ صاحب کی موجودگی میں یہ ناممکن ہے اور وہ ایسا ہرگز نہ کرنے دینگے ———

اِدھر تو میں نے صاحب کو رخصت کیا اور گھنٹہ ہی بھر بعد وہاں کے تمام مزدوروں کو قبر کھودنے کے لئے جمع کیا۔ مگر میرے تعجب اور غصے کی کوئی حد نہیں رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ سب کے سب اس کام سے انکار کر رہے ہیں۔ تب میں نے جمعدار کو بلایا اور اُس نے بھی انھیں خیالات کا اظہار کیا اور نہایت ادب سے کہا "سرکار ہمارے یہاں قبروں میں مداخلت خالی از خطرہ خیال نہیں کی جاتی۔ پتہ نہیں کہ ہم سب پر اس فعل کی سزا میں کیا بلا نازل ہو۔ اور پھر سرکار میں تو مسلمان ہوں۔ میرے مذہب میں قبر کی عظمت

ہے اور کھولنا سخت ناجائز اور پھر صاحب بھی موجود نہیں ہیں اگر کچھ گڑبڑ ہوئی تو سب الزام مجھ پر ہی آئیگا۔

بیرے نے جھجک کر کہا کہ سرکار اس جگہ پر ایک بھوت گاہے گاہے نظر پڑتا ہے —— اور سرکار فرنگی بھوت —— سب یہاں والوں کو بیسیوں مرتبہ نظر آچکا ہے —— میں نے بھی چند مرتبہ دیکھا ہے اور پھر اپنی شہادت میں چند مزدور پیش کئے جنھوں نے ایک نہایت لمبے سفید بالوں اور بہت ٹوپ اور ٹپ اور پاجامہ والے بھوت کو کئی مرتبہ دیکھا تھا —— میں نے دیکھا کہ یہ سب مزدور بھی اتنے ہی خائف ہیں جتنی کہ وہ عورت —— تو میں نے انھیں لعنت ملامت کرنا شروع کی اور کچھ غصّے کا اظہار بھی —— مجھے ایک عرصہ سے ہندوستان کی چھوٹی پبلک سے سابقہ تھا اور آج پہلی مرتبہ میں نے غور کیا کہ یہ اس قسم کی ضد کا مظاہرہ کر رہے ہیں ورنہ جس قسم کا ضابطہ حکم دیا جاتا ہے فوراً ہندوستانی تعمیل کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ تمام مزدور برا باندھے خوف زدہ خاموش ہاتھوں میں بیلچے لئے کھڑے تھے جمعدار علیحدہ پریشان تھا اور میٹ مزدوروں کی حکم عدولی کی وجہ سے گھبرایا ہوا سا تھا مگر ان میں سے کوئی بھی باوجود میری غیر معمولی خفگی کے ٹس سے مس ہوتا دکھائی نہ دیتا تھا —— اور گویا زبان حال سے یہ سارا مجمع کہہ رہا تھا کہ خواہ میم صاحب کاٹ کر پھینک دیں مگر یہ ممکن نہیں کہ ہم قبر کو ہاتھ لگائیں —— یہ رنگ دیکھ کر میں نے سب کو ڈانٹ کر بھگا دیا اور قبر کو چاروں طرف سے بغور دیکھنا شروع کیا —— میں نے غور کیا کہ قبر کو جگہ جگہ سے پیپل کی جڑوں نے شق کر دیا ہے اور قبر کا ہر حصّہ کھلا ہوا ہے۔ بہت سی دراڑیں ایسی ہیں کہ جن کے اندر کائی اور مٹی نکال دینے کے بعد ہاتھ پہنچ سکتا ہے۔ قبر کا ایک گوشہ بالکل منہدم تھا جو پیپل کے تنے سے ملحق تھا اور اس میں ایک سوراخ کافی بڑا اندر کو معلوم ہوتا تھا —— میں اندر سے ایک کدال اُٹھا کر لائی —— اور اس شکستہ حصہ پر سوراخ کے ارد گرد چند ضربیں لگا کر دیکھیں میں نے غور کیا کہ اینٹ پتھر اور مسالہ وغیرہ کدال کی ضربوں سے بہت آسانی سے میری امید کے خلاف علیحدہ ہو رہا ہے —— سوراخ چند ہی ضربوں میں کافی بڑا ہو گیا اور بالائی تعمیر کا ایک حصّہ ٹوٹ گیا —— میں نے سوراخ کے اندر جھانک کر دیکھا تو مجھے کچھ اینٹوں کی چنائی دکھائی دی مگر اس میں بھی جڑوں نے گھس کر بہت سی دراڑیں پیدا کر دی تھیں۔ میں نے سوراخ کے اندر بڑھ کر ان اینٹوں پر بھی ضربیں لگائیں۔ اینٹوں کے اکھڑنے میں تو کوئی خاص دقت نہ ہوئی البتہ پیپل کی باریک اور نرم جڑیں کام میں کچھ رکاوٹیں پیدا کر رہی تھیں —— میں پسینہ میں شرابور ہو گئی اور میرا حلق خشک ہو گیا۔ میں نے اپنے ملازمین سے جو دور کھڑے ہوئے میں ہولناک فعل کو بڑی تعجب اور خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے، پانی طلب کیا اور مجھے تعجب ہوا کہ کوئی اقدام نہ کر سکے ... بہت ... دلانے پر بیرے

نے قریب آنے سے نہایت مہذب الفاظ میں انکار کر دیا —— میں نے پیاس کی مطلق پروا نہ کی۔ بیرے تیوروں کو دیکھ کر بیرا پانی لیکر آیا اور بڑی ہمت کر کے مجھ سے تین چار قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ اُس کا میں کچھ لحاظ بھی کرتی تھی —— میں جب پانی پینے کو اُٹھی تو اُس نے خلافِ معمول مجھ سے گفتگو میں پیش قدمی کی اور بہت ہی دلیل و حجت کے ساتھ مجھ کام سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کہا کہ سانپ اور بچھو کا ڈر ہے۔ قبروں میں پُرانے سانپ ہوتے ہیں —— تکان سے بخار آنے کا خوف دلایا —— خصوصاً سانپ کا ڈر تو مجھے بھی محسوس ہوا۔ ایسے موسم میں ایسے قدیم درخت اور قبر کے ساتھ —— جبکہ سوراخ ایک سرنگ کی شکل میں تبدیل ہو گیا تھا اور اُس کے اندر اندھیرا تھا —— بوڑھا بیرا قدرے جھکا اور تاریک سرنگ کے اندر جھانک کر بولا "سرکار غضب کر رہی ہیں اگر کوئی سانپ بچھو نکل آیا تو مصیبت پڑ جائیگی —— صاحب ہم کو مار ڈالینگے —— بھلا غور کیجئے کیسی بھیانک سرنگ ہے ——"

میں نے کہا" اچھا تمھیں ایسی ہی ہمدردی ہے تو برقی لیمپ اندر سے لے آؤ اور دُور کھڑے ہو کر روشنی ڈالتے رہو ——"

بیرا برقی لیمپ اُٹھا لایا —— میں نے ایک ضرب لگائی اور نیچے والی چنائی میں ایک سوراخ پیدا کر دیا۔ اب میں نے غور کیا کہ یہ اصلی قبر ہے اور میرا بنایا ہوا سوراخ اصل مدفن تک پہونچ گیا ہے۔

میں نے اور آگے بڑھ کر اس سوراخ میں ہاتھ ڈال کر اندر ٹٹولنا چاہا۔ مگر میرے بیرے نے اس تاریک سوراخ میں ہاتھ ڈالنے کے ارادے سے باز رکھا اور اس کو بڑھانے کا مشورہ دیا۔ میں نے نیچے والی اینٹوں میں بھی اوپر کے برابر سرنگ بنالی اور بیرے کے ہاتھ سے لیمپ لیکر بڑی تیزی سے اندر کی طرف کھسک گئی —— اندر کسی چیز کا ایک بے قاعدہ سا ڈھیر معلوم ہوتا تھا جیسے سوکھی ہوئی لکڑی کی پچڑیں —— اور چاروں طرف پُرانے جالے کے انبار —— میں نے کدال کی نوک سے جگہ جگہ زمین پر ٹٹولنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ جس چیز کو میں لکڑی کے ٹکڑے سمجھ رہی تھی وہ گلی ہوئی ہڈیاں ہیں جن پر کدال لگتے ہی سفید سفید چونا سا چھن گیا مگر ساتھ ہی ایسا معلوم ہوا کہ کدال کسی سخت چیز سے ٹکرا رہی ہے —— میں نے بیرے سے جھٹا ہٹوا لیا —— اور روشنی ڈال ڈال کر اس چیز کو تلاش کرنا شروع کیا —— تھوڑی دیر تک ٹٹولتے وہ سخت چیز جٹے میں پھنس گئی —— میں نے بے صبری کے ساتھ نہی ... [illegible]

کھلکھلا کر ہنس پڑے خصوصاً انگریز بھوت کے نام پر ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ اور جب اُن کے اس قدر مضحکہ کے باوجود میں بدستور سنجیدہ رہی تو انہوں نے کہا " اس پگلی دھوبن نے تمہارے سامنے کسی انگریز کی تصویر دیکھ لی ہے اور ہسٹریا کی مریض ہے، وہی آنکھوں میں گھوم رہی ہے اور دماغ تخیل میں اُس کو پیش کر دیتا ہے۔"

" غلط ——— بھلا سولہ ۱۶ سترہ ۱۷ برس کی چھوکری۔ پہلی مرتبہ ایک انگریز کا گھر اندر سے دیکھا ——— پھر میرے گھر میں کسی تصویر اس قسم کی موجود نہیں ——— اور یہ تو میں نے اندازہ کیا ہے کہ گاؤں کے رہنے والے ہندوستانی جہلا جانور پہاڑ اور عمارت کی تصویر میں تمیز نہیں کر سکتے " ——— میں نے پُرزور الفاظ میں کہا۔

" اچھا!! تو پھر کسی انگریز کی قبر ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نو وارد آیا نے اُس کا بھوت دیکھا ہے ——— چلو ایک ہم وطن اور مل گیا ——— دو سے تین تو ہو گئے پردیس اور جنگل میں ———" میرے شوہر نے مضحکہ اُڑاتے ہوئے نہایت سوکھے منہ سے کہا۔ اِن کے اس انداز اور مضحکے پہ مجھے غصہ آ گیا مگر میں سمجھ گئی کہ اگر اس وقت غصہ کا اظہار کیا تو ان کو مذاق اُڑانے کا اور بھی زیادہ موقع ملے گا لہذا میں نے ضبط کر کے کہا

" جی ہاں ——— کیا عجب ہے کہ یہ کسی انگریز کی قبر ہو اور وہی قبر جو میں تلاش کر رہی ہوں۔"

" اچھا تو یہ بھی ممکن ہے کہ تمہاری پردادی مرنے کے بعد مرد بن گئی ہوں " انہوں نے کہا کیونکہ آیا نے تو انگریز کا بھوت دیکھا ہے۔"

میں نے اُن کے مضحکے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا " تو ممکن ہے کہ یہ قبر پردادا مرحوم کی ہو " ——— آپ جانتے ہیں کہ اپنی بیوی کی موت سے متاثر ہو کر وہ خودکشی کر بیٹھے تھے ——— اور ممکن ہے کہ اسی احاطے میں یہ سب واقعہ گزرا ہو اور یہ قبر کی جگہ خودکشی کا ثبوت بھی ہے کیونکہ انھیں قبرستان میں جگہ نہیں مل سکتی تھی ——— اور غور کرنے سے اس پر زیادہ گمان قبر ہی کا ہوتا ہے ——— اور انگریز کی قبر کا ——— کیونکہ مسلمان اپنی قبروں کے بیچوں بیچ ستون قائم نہیں کرتے بلکہ سر کی جانب بناتے ہیں ——— ہندو استھانوں وغیرہ پر بھی جس قدر کیا ہے مطابق چیز سے بہت کچھ مختلف ہوتے ہیں اور پھر بھی نہ کچھ مشابہت تو معمار کے طرز سے پیدا ہو ہی جائے گی۔"

" اچھا تو پھر پردادی کی قبر کہاں گئی ؟ " انہوں نے اسی انداز میں کہا " پردادی کی قبر ! ——— ممکن ہے کہ گورستان میں اُن ٹوٹی پھوٹی قبروں میں ہو جس کے سنگِ مزار گر گئے ہیں " میں نے کہا۔

" بیکار مت بکو ——— اچھا یہ مان بھی لیا جائے کہ پیپل کے نیچے والی قبر کسی انگریز کی ہے اور اُس کو کھول کر اُس کی صد سالہ ہڈیاں برآمد بھی کی جائیں تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ پردادی مرحوم کی ہیں ——— کیا ہڈیوں پہ پردادی مرحوم کی مُہر ثبت ہو گی ؟ ——— ان بیکار خیالات کو دماغ سے نکال دو ——— ایک انگریزی تعلیم یافتہ متمدن خاتون کے دماغ میں ایسے خیالات کا آنا سخت معیوب ہے ——— بھلا غور تو کرو ایک جاہل ہندوستانی کمسن چھوکری نے تمہارے دماغ میں بھی وہی چیز ٹھونس دی اور آپ ہیں کہ قائل ہو بیٹھیں ——— بڑے شرم کی بات ہے ———"

میں نے شوہر کا انداز دیکھ کر اس گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا مگر چھوٹی آیا سے کرید کرید کر تفصیل کے ساتھ بھوت کے حالات دریافت کئے اور مجھے اس پر بھی یقین ہے کہ اس معاملہ میں میری دلچسپی دیکھ کر کچھ نہ کچھ گپ بھی ہانکتی ہوگی ——— میں نے بہاں تک کیا کہ خود جا کر پیپل کے درخت کے نیچے دھوبن کے بیان کردہ گھنٹوں میں بیٹھی۔ مگر مجھے کبھی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ مگر یہ واہمہ کہ پیپل کے نیچے میرے کرے سے اعتقد قریب دادا مرحوم محوِ استراحت ہیں۔ میرے دماغ میں اچھی طرح جاگزیں ہو گیا ——— اور مجھے قبر کھولنے کا خبط سوار ہو گیا ——— ممکن ہے کہ کوئی ایسی چیز نکل آئے جس سے اُس کی رہبری ہو سکے ——— دادا فوجی تھے ممکن ہے کوئی فوجی نشان، ہتھیار، بٹن ڈھال وغیرہ اس کے ثبوت میں برآمد ہو۔ فوجیوں کے اکثر ہتھیار وغیرہ اور اسی قسم کی چیزیں اُن کے ساتھ دفن کر دی جاتی ہیں۔ آخرکار میں اپنی طبیعت سے مجبور ہو گئی اور مصمم ارادہ کر لیا کہ قبر ضرور کھولوں گی ——— چنانچہ جب میرے شوہر ایک ہفتہ کے لئے دورے پر جانے لگے تو میں نے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کیونکہ میں جانتی تھی کہ صاحب کی موجودگی میں یہ ناممکن ہے اور وہ ایسا ہرگز نہ کرنے دیں گے ———

اِدھر تو میں نے صاحب کو رخصت کیا اور گھنٹہ ہی بھر بعد وہاں کے تمام مزدوروں کو قبر کھودنے کے لئے جمع کیا۔ مگر میرے تعجب اور غصے کی کوئی حد نہیں رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ سب کے سب اس کام سے انکار کر رہے ہیں۔ تب میں نے جمعدار کو بلایا اور اُس نے بھی انھیں خیالات کا اظہار کیا اور نہایت ادب سے کہا " سرکار ہمارے یہاں قبروں میں مداخلت خالی از خطرہ خیال نہیں کی جاتی۔ پتہ نہیں کہ ہم سب پر اس فعل کی سزا میں کیا بلا نازل ہو۔ اور پھر سرکار میں تو مسلمان ہوں۔ میرے مذہب میں قبر کی عظمت

کرنے سے پیدا ہو جاتے ہیں، بہت نمایاں تھے۔ ہر چند کہ جسم اکہرا تھا مگر پھر بھی مضبوط معلوم ہوتا تھا اور حرکات و سکنات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف پھرتی اور تیزی بکھرتی پھرتی ہے۔ غسل کا سامان تیار کرنا۔ کمرے کی صفائی اور خاص گھنٹوں میں حاضر رہنا اُس نے بہت جلد سیکھ لیا اور تین چار ہی دن میں اچھی خاصی آیا بن گئی۔ میں نے اُس سے ہدایت کر دی تھی کہ وہ میرے کمرے کے قریب پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھی رہا کرے اور جس وقت میں طلب کروں فوراً حاضر ہو جایا کرے۔ دو تین دن وہ بیکاری کے وقت میں اس پر عمل پیرا رہی ——— ایک دن وہ نہایت پریشانی کے عالم میں میرے پاس آئی میں نے غور کیا کہ اس کے چہرے پر انتہائی پریشانی اور سراسیمگی کے آثار ہیں جس کا اثر اُس کے تمام جسم پر ہی اُس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے اور میں نے اندازہ کیا کہ وہ عنقریب گرا چاہتی ہے۔ اُس نے دروازے کا سہارا لیکر خود کو بمشکل سنبھالا۔ میں نے یہ حالت دیکھ کر ذرا تعجب سے کہا۔

"کیا معاملہ ہے؟"

میں اُس وقت شکار سے واپس آئی تھی اور بہت خستہ ہو رہی تھی۔ اُس نے کہا،

"میم صاحب، کیا میرے لئے یہی حکم ہے کہ میں پیپل کے نیچے بیٹھوں ——— کیا میں سیڑھیوں پر نہیں بیٹھ سکتی"۔ "بیشک" میں نے کہا" میں نے تو سائے کی وجہ سے کہا تھا ——— اگر تمھیں سیڑھیاں پسند ہیں تو تم یہیں بیٹھو ——— کیوں ہاں کیا بات ہے؟

وہ کچھ ہچکچائی اور جلدی جلدی ہونٹوں پر زبان پھیر کر دوسری جانب دیکھنے لگی اور میں نے غور کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر اُس کی آواز حلق میں رُک گئی ہے اور میرے آنکھوں سے استفسار کرنے پر اُس نے ہونٹ بھینچے اور زبان پر انتہائی زور دے کر ایک لفظ بڑی مشکل سے پیدا کیا "بھوت"۔ ——— "ایں ——— بھوت" میں نے اور زیادہ متعجب ہو کر پوچھا "کیا پیپل پر کوئی بھوت رہتا ہے؟"

اُس نے پھر اُسی صورت سے بڑی مشکل سے "ہاں" کہا۔

میں نے بمشکل ہنسی ضبط کر کے اور چہرے پر بدستور سنجیدگی کے آثار پیدا کر کے اور خود کو اس کا ہم خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا "تو پھر کیا بات ہے ——— گاؤں کے پنڈت جی کو بُلا لانا وہ بھگا دینگے ——— " اس پر اُس نے گردن ہلائی ——— میں نے کہا کیوں کیا بات ہے۔ اُس سے کام کیوں نہیں چلے گا ——— "کیا پنڈت جی کے قابو میں یہ بھوت نہیں آئے گا؟" میں نے پھر ہنسی ضبط کی۔

"ہاں حضور ———" اُس نے اپنی آواز کو درست کر کے کہا "پنڈت جی سے کام نہ چلے گا کیونکہ حضور بھوت تو فرنگی ہے" ——— "وہ اس قبر پر بیٹھتا ہے اور فرنگی ہے ——— مجھے تو بہت ڈر معلوم ہوتا ہے۔ جب میں اُسے دیکھتی ہوں تو میرا پتہ پانی ہو جاتا ہے"۔

اچھا تو یہ دوسری بات ہے" میں نے پنچایتی آواز میں گویا اُس کی تائید کرتے ہوئے کہا "مگر ہاں تم لوگ زندہ انگریزوں سے جب اس قدر ڈرتے ہو تو اُس کا بھوت تم لوگوں کے قبضے میں بھلا کیسے آجائے گا ——— ٹھیک تو ہے پنڈت جی کچھ نہیں کر سکتے"۔ میں نے مسکرا کر کہا "اس کے لئے تو انگریز پنڈت درکار ہوگا ——— جب قابو میں آئیگا ———" اور آخر کار میری ہنسی ضبط نہ ہو سکی اور میں ایک قہقہہ لگا بیٹھی یا اور پیشتر اس کے کہ دھوبن کچھ جواب دینے پائے یا اچھی طرح میرے اس بے محل قہقہے کے مفہوم کو سمجھے میں نے جلدی سے سنبھل کر اور اپنے چہرے پر دوبارہ سنجیدگی کے آثار پیدا کر کے کہا۔

"کس شکل کا ہے ——— صاحب کی طرح ہے؟"

"نہیں حضور صاحب کی طرح نہیں ہے۔ سفید لمبے لمبے بال ہیں" اُس نے اپنی گُدی پر ہاتھ رکھ کر کہا "پر اس پر بندھے ہوئے ہیں ——— اُس کے پائجامہ پر گھٹنوں کے ارد گرد بٹن لگے ہوئے ہیں اور وہ اونچا موٹی قسم کا موزہ پہنے ہوئے ہے اُس کے جوتے پر چاندی کے پھول لگے ہوئے ہیں اس کے ہمارے صاحب سے یا کسی اور صاحب سے جو میں نے دیکھے ہیں۔ کپڑے اور بال بالکل علیحدہ ہیں۔ البتہ رنگ ایسا ہی گورا چٹا ہے، اور ہاں سر پر ٹوپ بھی ہمارے صاحب جیسا نہیں پہنتا۔ ذرا ایک طرف کو جھکا ہوا بڑا سا ———"

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا ——— بیچاری دھوبی کی عورت ——— بمشکل سولہ سترہ سال کی عمر۔ کبھی اپنے گاؤں سے قدم نہیں دیا ——— حتیٰ کہ ایک مرتبہ ریل بھی نہیں دیکھی اور نہ اس سے پیشتر کسی انگریز کا گھر اندر سے دیکھا اور ایک انگریز کا حلیہ اُنیسویں صدی کے لباس وضع میں بیان کر رہی ہے۔ وہ تو وہ شہروں میں بھی ایسے بوڑھے ہندوستانی زندہ نہیں جنھوں نے اس وضع کے انگریز دیکھے ہوں۔ ناممکن تھا کہ اُس کی نظر سے کبھی ایسا لباس پہنے ہوئے کوئی آدمی گذرا ہو۔ حتیٰ کہ میں نے بھی اس قسم کا کوئی لباس علاوہ تصویروں کے نہیں دیکھا تھا اور جب میں نے اپنے شوہر سے اس کا مفصل تذکرہ کیا تو وہ بھی فکر میں پڑ گئے اور جب انھوں نے یہ اندازہ کیا کہ مجھ پر بھی کچھ اثر ہے تو دوسرے

نغمۂ نشاط

آنکھ سے تقسیم صہبا کیجئے
جام کیوں خالی دکھایا کیجئے

آنکھ کو محوِ تماشا کیجئے
دل کو فردوسِ سراپا کیجئے

ہے تصوّر کا تماشا بھی عجیب
بند آنکھیں کرکے دیکھا کیجئے

سامنے آنے سے جب ہے منع ہے
آپ دل میں بھی نہ آیا کیجئے

کچھ تو ہے جب تو خدا پردے میں ہے
بات پردے کی ہے پردا کیجئے

جس کو کہتے ہیں عنایت کی نظر
اُس نظر سے مجھ کو دیکھا کیجئے

شمع کو جل کر سستی ہونا پڑا
سوچ کر مجھ کو جلایا کیجئے

زندگی ہے دوسرا نامِ فنا
زندگی کا کیا بھروسا کیجئے

عشق اور اس بے وفا دنیا سے عشق
"اپنی دُنیا آپ پیدا کیجئے"

پیش آتی ہے جو پیشانی میں ہے
دشمنوں کا پھر گلہ کیا کیجئے

اس میں ہونگی آپ کی رسوائیاں
آپ رسوا کو نہ رسوا کیجئے

منشی امام الدین خاں رسوا
دالئی باجود

آجکل

پیشِ نگاہ زُلفِ پریشاں ہے آجکل
گویا جنونِ عشق کا ساماں ہے آجکل

رنگینیٔ تصوّرِ جاناں ہے آجکل
بزمِ خیال رشکِ گلستاں ہے آجکل

پروانہ بن کے حسرت و ارماں نثار ہوں
ہر داغ دل کا شمع فروزاں ہے آجکل

کیا میرے فرطِ شوق کی تم کو خبر نہیں
سینے میں اضطراب کا طوفاں ہے آجکل

موقوف کب چمن پہ ہے رنگینیٔ بہار
دامن بھی آنسوؤں سے گلستاں ہے آجکل

ہے یہ فریبِ حُسنِ تغافل شعار کا
اپنی جفا پہ کوئی پشیماں ہے آجکل

آزادیٔ جنوں کا زمانہ پھر آگیا
جوشِ بہار سلسلہ جنباں ہے آجکل

پھر مسکرا کے چھیڑا ہے مطربِ بہار
پھر بیقرار سازِ رگِ جاں ہے آجکل

جس دل کو احتیاط سے رکھتے تھے ہم کبھی
وہ نذرِ یک تبسمِ جاناں ہے آجکل

سمجھوں نہ کس لئے شبِ غم کو شبِ نشاط
ایک ایک داغ شمع فروزاں ہے آجکل

انگڑائی لے کے کون ادھر سے گزر گیا
ہر گُل چمن میں چاک گریباں ہے آجکل

مثلِ شرر قرار نہیں مجھ کو اے فضا
دل میں کسی کی یاد جو مہماں ہے آجکل

نرمد ——— گجرات کا ایک عظیم المرتبت مصلح شاعر

(قسط سوم)

نرمد اور شاعری | نرمد کے کلام کو اگر شاعری کے اصولوں پر جانچا جائے تو شاید وہ پورا نہ اُترے۔ کلام میں فنی اعتبار سے شاعرانہ لغزشیں ضرور پائی جاتی ہیں تاہم نرمد شاعروں کی صفِ اوّل میں بٹھلائے جاتے ہیں۔ نرمد نے خیالات کو زبان پر ترجیح دی اور اسی لئے نرمد کی شاعری اُنکے جذبات کا صحیح مرقع ہے۔ اگر نرمد کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک طرف یارانِ بزم میں ساغر و مینا سے کھیل رہے ہیں کہیں محبوب کے سامنے کلیجہ تھامے کھڑے ہوئے ہیں تو دوسری طرف میدانِ رزم میں آزادی کا پرچم لہرا رہے ہیں کہیں سپاہی کی صف میں کھڑے ہیں تو کہیں سردار کی حیثیت سے فرضِ سرداری انجام دے رہے ہیں۔ غرضکہ نرمد اپنے پہلو میں دل لائے تھے اور اُس دل میں محبت کا سمندر اُمنڈ رہا تھا اور یہ محبت کہیں حسن و عشق، شمع و پروانہ بن کر جلوہ گر ہوئی تو کہیں اُس نے وطنیت اور اصلاح قوم و ملت کی صورت اختیار کرلی اور جب ملک و قوم کی محبت کی آگ کے شعلے بلند ہوئے تو اس میں سے آزادی کے نعرے نکلے۔ لہٰذا نرمد کی شاعری کے دو پہلو ہیں ایک محبت اور دوسرا شجاعت اور خود نرمد نے اپنی شاعری کو پریم اور شوریہ (محبت اور شجاعت) سے تعبیر کیا ہے۔ اسی (پریم اور شوریہ) محبت اور شجاعت کی بدولت نرمد کا نام گجراتی ادب میں زندہ ہے۔

نرمد کا میدانِ فکر بہت وسیع تھا محبت، شجاعت، وطنیت، مناظر قدرت وغیرہ اُن کی جولانگاہیں تھیں، یہاں چند نظموں کے عنوانات درج کئے دیتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ ہر عنوان محبت اور شجاعت پر مبنی ہے۔

محبت:- پریم کی بانسری۔ بوہنی۔ میں ہاری۔ مجھ کو کیا چھوڑ دیگا؟ دلدار کو سلام وغیرہ۔ **شجاعت و وطنیت**:- بہادر کہاں ہیں؟ بہادر۔ حیف اس غلامی پر رونے سے کیا فائدہ۔ حق طلب کرو۔ چلو بھیا۔ قدم بڑھاؤ۔ نہیں ہٹنا۔ چلو چلو کیا دیر لگاتے ہو۔ جنگ سے جیت ہے۔ **اصلاح قوم و مذہب**:- توہمات کا کوٹ۔ دُنیا چھوڑوں گی۔ اندھیر مشکل ہوہ۔ ہری کی جستجو۔ [illegible] نیا پار اتار وغیرہ۔ **مناظر قدرت**:- برسات۔ چندا۔ جنگل۔ کبیر وڑ۔ مدگھرا بارہ ماسا وغیرہ۔

نرمد نے جہاں حسن و محبت میں قلبی واردات قلم بند کئے ہیں وہاں وہ کچھ کچھ اردو غزل کے قریب نظر آتے ہیں۔ ان کے اس حصہ کلام کی خصوصیات درد اور سوز و گداز ہیں۔ ایک جگہ خود لکھتے ہیں:- "ای کودہ! اگر تو شعر کہے تو اس میں اپنا درد دل نمایاں کر"

نرمد نے عشق و محبت میں جو مشاہدات و محسوسات پیش کئے ہیں وہ حقیقت پر مبنی ہیں نرمد ابتدا سے سچی محبت کی تلاش میں تھے اور محبت ہی میں وہ سکھ چین دیکھتے تھے۔ خود لکھتے ہیں "زندگی میں میری سب سے بڑی کوشش سچی محبت کی تلاش رہی اور میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ محبت کے لئے عورت موزوں ہے اور اگر اپنی بیوی سے محبت کی جائے تو اس سے بہتر اور موزوں کوئی نہیں ہوسکتا .... اور اسی لئے میں حلقۂ احباب کا بہت خیال رکھتا تھا اور ہر وقت کوشش کرتا تھا کہ دوستوں میں باہم محبت بڑھے۔"

نرمد کی شاعری کا دوسرا پہلو شجاعت ہے انکی قومی نظموں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نرمد نے ماحول کی ترجمانی کی ہے۔ حالی و اکبر کی طرح نرمد بھی ماحول سے بہت متاثر ہوئے۔ ابھی نرمد کے کانوں میں ۱۸۵۷ء کا شور محشر گونج رہا تھا۔ اُن کی آنکھوں نے سورت کے نواب کا تخت اُجڑتے دیکھا تھا۔ قوم کی ذہنیت پست ہوتی جارہی تھی۔ ہندوؤں کے تنزل کا منظر آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ مذہب کی درگت بن رہی تھی اور سب سے زیادہ غیرت دلانے والی چیز غیر قوم کی اطاعت تھی۔ ان تمام باتوں کو دیکھکر نرمد جیسا غیرتمند شخص کب خاموش رہ سکتا تھا؟ نرمد کے جذبات کا دریا موج زن ہوا تو وہ بے ساختہ پکار اُٹھے:-

"افسوس حکومت نے ہم سے ہتھیار چھین لئے۔ تف ہے ایسی زندگی پر"

حالی کی طرح نرمد نے [illegible] کیا [illegible] غیرت دلائی، سورت کی جانفزا

اور شان و شوکت پہ آنسو بہائے۔ اس نظم کا مطلع ہے :—

"اے سورت سہانے کی مورت تیری کیا حالت ہوگئی۔ سورت کی پہ دنی
صورت اور بُری حالت تو بنتے بنتے۔ رنتی ردنی ہوگئی کایا کندن میں
تیری نشست تھی اور تو چمک رہی تھی آج ماند پڑگئی"

اسی طرح "ہندوؤں کا تنزل" ایک طویل نظم لکھی جس میں ہندو قوم کی ترقی کا مرقعہ کھینچا ہے اور تنزل کے اسباب بیان کئے ہیں آخر میں "آشا" (اُمید) کی سرخی کی تحت میں چند شعر لکھے ہیں جس میں تلقین کی ہے اور اچھے دنوں کی اُمید دلائی ہے۔ یہ نظم گجراتی ادب میں ہندوؤں کے لئے مسدس حالی کے برابر ہے۔ اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں :—

" جیسے جیسے صنعت و حرفت ترقی کریں گے وطن میں دولت بڑھے گی اور وطن کے
لوگ سکھ سے رہیں گے"

"علم کا طالب رہنا اچھی صحبت سے مستفید ہونا یہ ترقی کا زینہ ہے اور اسی میں
سکھ چین ہے"

" بچپن میں شادی نہ ہو اور شادی ہو تو سینہ سے ہو۔ دانشمند عورتیں اپنے
بچّہ کی اچھی تربیت کرسکیں گی"

"جیسے جیسے فرقہ بندی ٹوٹے گی تو لوگ آپس میں مل جل کر دعوتوں میں یک
ہونگے اور جسقدر میل ملاپ بڑھیگا اتنا ہی لوگوں میں اتفاق و اتحاد قائم رہیگا"

نرمد کا نصب العین آزادی تھا پھر وہ ملکی ہو یا قومی۔ آزادی قید فرنگ سے ہو یا قید برہمن سے۔ نرمد بچپن سے آزادی کے دلدادہ اور غلامی سے متنفر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ملازمت کو بھی خیرباد کہدیا۔ اپنی ایک نظم میں آزادی کے متعلق اظہار خیال اس طرح کرتے ہیں :—

"انسانی حقوق تو اَن گنت ہیں لیکن آزادی انسان کا سب سے
بڑا حق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں"

نرمد کا زمانہ وہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے سیلاب نے لوگوں کو پست ہمت اور ڈرپوک بنادیا تھا۔ اُن کی بلند ہمتی کا خون ہوچکا تھا اُنکی حق تلفی ہورہی تھی لیکن زبان سے ایک لفظ نکلتا تھا اور اپنی ہتک گوارا کرتے تھے یہ دیکھکر نرمد کو کہنا پڑا :—

"سب اُٹھو بیٹھو بستر خواب غفلت جلد چھوڑ دو۔ آدمی ہوکر جو
اپنا حق نہ سمجھے وہ جانور ہے۔ جانور بھی اپنے ظالم سے کیسا انتقام
لیتا ہے"

ایک اور جگہ اس طرح غیرت دلائی ہے :—

" زبوں فطرت غلام دنیا میں لعنت کا مستحق ہے جو زخم کھاتا ہے خلق
خدا اُسکی عزت کرتا ہے"

اس زمانہ میں لوگوں کی آنکھیں امن و سکون ڈھونڈ رہی تھیں اور سینوں پست بکنے کے لئے پناہ کی متلاشی تھیں۔ لیکن پناہ لی بھی تو درندے کے غار میں۔ انگریز کی حکومت اُن کو آزادی کا منتہا نظر آنے لگی۔ نرمد کے ایک ہمعصر شاعر کوی دلپت رام انگریز کی حکومت اور انصاف کے گن گاتے تھے کہ" انگریز کی حکومت میں کسی شخص کی مجال نہیں کہ راستہ چلتی بکری کا کان تک پکڑ سکے" لیکن نرمد کو ہر طرف جبر استبداد نظر آتا تھا، انھوں نے اصل راز کو پالیا۔ اُن کو آزادی کا خواب سراب نظر آتا تھا وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے :—

" نرمد کہہ رہا ہے اے شاعر بھائیو! سب مل کر حب الوطنی کے جذبات اُبھارو۔
اور آزادی کے گیت گاکر دلیس میں شجاعت اور وطن کی خدمت کا احساس
پیدا کرو۔"

نرمد نے ملک و قوم کو خواب غفلت سے بیدار کیا اُنکی کمزوریوں کو طشت ازبام کیا اُن کو ہمت دلائی اور آزادی کی طرف مائل کیا اور اس کے بعد حصول آزادی کے لئے شجاعت و بہادری پر نظمیں لکھ لکھکر لوگوں کو گرمادیا اور میدان کارزار کا نقشہ بھی کھینچ دیا۔

نرمد قدرت کے عاشق تھے۔ نرمد نے مناظر قدرت کی عریاں تصویریں کھینچی ہیں جس سے اُن کے مشاہدات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کاروباری دنیا سے جب کبھی جی گھبراتا تو قدرت سے دل بہلاتے اور اپنا غم غلط کرتے تھے لکھتے ہیں :—

قدرت سے میرا یارانہ ہے اُس سے میرا بہت لین دین ہے۔
قدرت میری معشوق ہے اور اس سے مجھے سکھ ملتا ہے۔
جب دُنیا سے بہت گھبراجاتا ہوں تو تنہائی میں جاکر بیٹھ جاتا ہوں۔
"قدرت کے مطالعہ میں غرق ہوجاتا ہوں اور تمام دُکھ بھول جاتا ہوں"

نرمد کے زمانے میں ورڈز ورتھ، شیلے، بائرن جیسے شاعر قدرت کی پرستش کررہے تھے۔ نرمد نے بھی ان سے روحانی فیض حاصل کیا اور گجراتی ادب

میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ زمد کی نظم "جنگل" اور "زکبیر وڈ" شہ پارے ہیں۔ زمد نے قدرت کو جس انداز میں پایا اسی انداز میں پیش کر دیا۔ ان تمام نظموں میں اس قدر جاذبیت ہے کہ پڑھنے والا بیساختہ کہہ اٹھتا ہے "کس قدر سلیس اور پُراثر ہیں!"

زمد نے چند انگریزی نظموں کا ترجمہ بھی کیا ہے لیکن وہ معمولی ترجمہ ہے Lucy Grey کو انھوں نے للیتا نام دیا ہے we are Seven Quality of mercy کو دیا کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ اِن سب ترجموں میں کوئی خاص خوبی نہیں پائی جاتی۔

زمد ایک سچے محبِ وطن تھے وہ صرف وطن کے گلی کوچوں اور باغ و بازار سے ہی محبت نہیں کرتے تھے۔ وہ وطنیوں کو خوش دیکھکر بھی خوش ہوتے تھے اور اُن کو دُکھ میں دیکھکر خود بھی تکلیف محسوس کرتے تھے۔ ایک نظم میں لکھتے ہیں:-

"وطن بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہے اُسے دیکھکر زمد کا دل جلتا ہے۔ پردیسی کو دیس میں سُکھی دیکھکر زمد کا دل دکھتا ہے"

زمد کو اپنے ملک پر بہت فخر تھا گجراتی ادب کو لفظ "سودیشا بھیمان" (ملکی فخر) سے منسوب کیا کرتے تھے۔ زمد کے کلام میں "سورت" "جیہ جیہ گردی گجرات" "سکی ہے گجرات" اور حبِ وطن کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔

سیّد ظہیر الدین مدنی ایم۔ اے
(سورت)

تیرے بغیر

کتنے وحشت خیز ہیں دیوار و در تیرے بغیر
مجھ کو ویرانہ نظر آتا ہے گھر تیرے بغیر

یہ فراق و بے بسی کی تلخ و تیرہ زندگی
میرے دل کے چاند ہو کیونکر بسر تیرے بغیر

کیا بتاؤں کون ہوں کس حال ہوں کس حالت میں ہوں
اُف مری وارفتگی اے بے خبر تیرے بغیر

تیری قربت ہی سرور و کیف و مستی کا پیام
زندگی ہی درد و نیش و نیشتر تیرے بغیر

ہے اسی کا نام شاید اختلاطِ حسن و عشق
مضطرب رہتی ہوں میں شام و سحر تیرے بغیر

کاش تو آکر سنواری میرے حالاتِ خراب
جو سنور سکتے نہیں اب عمر بھر تیرے بغیر

بھر دیا تیری نوا سنجی نے نجمہ سوز و ساز
ورنہ تھا سازِ محبت بے اثر تیرے بغیر

نجمہ صدیقی ایم اے بی ٹی
[illegible]

ایک خط اور نظم

پیارے مولانا، اخلاص آلود تسلیم

آپکی مشہور معرکۃ الآرا نظم "موعد اعظم" باعث افروز ہوئی اور اس کے چند ہی دن بعد مفتی زماندیر کا طویل و خالص تاثیرانگیز مضمون بھی میری نظر سے گذرا،

جس میں مفتی صاحب نے اپنی شدت پسند ذہنیت کی مغوت اور غیر محمود نمائش کی ہے۔ خدا اصغر مرحوم کی ہڈیوں کو خاک میں آسودہ رکھے انھوں نے سچ کہا تھا "نا قدچاہے کلام کے حسن و قبح کو ظاہر نہ کرسکے لیکن وہ اپنے آپ کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا"

اشعار کے نقائص کو نمایاں کرنا آسان سہی لیکن انکو سمجھنا یقیناً بہت توجہ طلب اور مشکل چیز ہے۔ کوئی بچھو کا منتر نہ جانے اور سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالے تو آپ بھی مار کے سوا کوئی اور مفہوم نہیں ہوسکتا۔ شعر محض تخیل ہی کا حقیقت محسوسات کی بنا میں تلاش کرنا کوئی دانشمندی نہیں، شعر کو شعر ہی کے لفظہ نظر سے دیکھنا چاہئیے نہ کہ قرآن و احادیث کی روشنی میں کیا کوئی فلسفہ کا مسئلہ ادب کے اصول و قواعد پر کبھی جانچا گیا ہے؟

کافر گر مفتی نے تو جھاگ اڑاتے ہوئے اپنے دار التکفیر سے کفر کا فتوی صادر کرنے میں بھی تامل نہ کیا ع "مرے شیر شاباش رحمت خدا کی"

یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ جب کسی انسان پر خفگی کا دورہ پڑتا ہے تو اسکی عقل کی وسیع گنجائش بیکار اور مسموم ہو جاتی ہیں

اور اس سے ایسی مضحکہ خیز و خندہ آور بوالعجبیاں ظہور میں آتی ہیں کہ متانت اور سنجیدگی بھی قہقہہ لب ہوئے بغیر نہیں رہتی، اور مجبوراً کہنا پڑتا ہے ع "مزاج تو از حال طفلی نہ گشت"

تنقید سراپا افادیت ہے لیکن اسوقت جبکہ اسے اسکے صحیح اصولوں پر مرتب کیا جائے اگر اسکو کسی فرد مخالف پر گندگی اچھالنے کا آلۂ کار بنالیا جائے تو اس سے زیادہ کوئی تہذیب سوز اور مکروہ فعل نہیں ہوسکتا جو یقیناً دنائت اخلاق کا لازمی نتیجہ ہے۔ کوئی سنجیدہ مزاج اور شریف طبع ایسی تحریری غرفش کو ہرگز پسند نہ کریگا۔

میرا خیال بلا ایقان ہے کہ مفتی صاحب نے اس مضمون کو لکھکر واقعی اپنی سنجیدہ اور عالمانہ عظمت کو بہت صدمہ پہنچایا ہے اور اسکی اشاعت کرکے تو اپنی حماقت انگیز مذموم ذہنیت کا نہایت بھونڈا مظاہرہ کیا ہے۔

میرے فرید العصر مولانا، آپ ان اہلیان مسجد کی غیر سنجیدہ حرکات سے ہراساں نہوجیے: تاریخ کے اوراق الٹ ڈالئے اور دیکھئے کہ وہ کون ایسا ریفارمر ہے جس پر ان لوگوں نے ظلم و ستم نہیں توڑے اور اپنی دریدہ دہنی کا نشانہ نہیں بنایا وہ دن دور نہیں جبکہ ایشیا آپکے قدموں پر سر رکھیگا اور اعتراف کمال و عظمت کرے میرے دل کی ہر دھڑکن آپ کے لئے دعا طلب ہے

مفتی نے فنی حیثیت سے جو تنقیص کی اسے دیکھکر مجھ سے نہیں رہا گیا چند شعر موزوں ہوگئے ہیں انھیں پیش کرتا ہوں۔

(حضرت) سیماب (قبلہ) کے معترض سے

کسکو مشق نقد اپنا نکتہ چیں کرتا ہے تو
ہم نشینوں کو بھی اپنے شرمگیں کرتا ہے تو

عیب کس کے ڈھونڈھتا پھرتا ہے تو اے بدشعار
جس نے رکھا ہندیوں کے سر پہ تاج زرنگار

جس کے نغموں سے جہاں میں اک تلاطم ہے بپا
کشتیٔ اقوام کا کہتے ہیں جس کو ناخدا

جس کے عرفاں پاش نغموں نے لگادی دل میں آگ
جس نے گائے بزم محکومی میں آزادی کے راگ

جس نے قلب مضمحل میں بھر دیا سوز شرر
جسکی ضرب شعر سے ہے اک جہاں زیر و زبر

آگ سے جس نے نچوڑا بارہا عطر گلاب
جسکا نعرہ ہے ہمیشہ انقلاب و انقلاب

جسکی نغمہ سنجیاں باغ ادب کی ہیں بہار
جس کے دم سے کل زبانوں کی ہے اردو تاجدار

چہرۂ اسرار سے جس نے ہٹایا ہے نقاب
جس کے ناخن نے کیا حل عقدۂ ام الکتاب

برق دوڑا دی ہے جس نے سینۂ ذرات میں
ہمنوا رہتے ہیں تارے جسکے پچھلی رات میں

جس نے جان جاں مردہ ہڈیوں میں ڈالدی
روح اپنے نطق سے فانوسیوں میں ڈالدی

ایک مصرع لکھ نہیں سکتا اور اس پر یہ غرور!
شیشۂ پندار تیرا ہو گیا ہے چور چور

تولتے جاتا ہے کن اشعار کو اے بدگہر
خشک و فرسودہ قواعد کی لیے میزان پر

الحذر اے ناشناس روح کیف سرمدی
پھر رہا ہے کیوں حقائق پر قواعد کی چھری

گندگی کے ڈھونڈھنے والے جہان نور میں
نغمۂ عشرت کے جویا بانگ ہائے صور میں

پھیکہ ندامت کی لکیریں تیرا ایماں ہیں ہنوز
اپنے محور پر تری نظریں پریشاں ہیں ہنوز

تو تعصب چھوڑ کر دیکھے اگر سیماب کو
اسکے ہر نقطہ میں پائے مہر عالمتاب کو

سہا دہلوری

ازالۂ شک

قبلہ ایڈیٹر صاحب تسلیم ۔ مزاج شریف

میں نے آپ کا مضمون بابت شبہات جو اخبار "کارواں" میں شائع ہوئے تھے دیکھا۔ اس میں جو آپ نے یہ اشارہ کیا ہے کہ ناگپور اور لکھنؤ سے ادارۂ "کارواں" میں ان مضامین کے متعلق کچھ اعانت یا شہ مل رہی ہے۔ یہ بات مجھے بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ کیونکہ میں علامہ سیاب مدظلہ العالی کا بیحد معتقد ہوں اور مجھے بحیثیت مولانا ناطق مدظلہ کے خاص نیازمند اور شاگرد ہونے کے یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ مولانا ناطق، علامہ سیاب کا بہت احترام کرتے ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جب مولانا ناطق لکھنؤ کی نمائش کے آل انڈیا مشاعرے سے تشریف لائے تو انھوں نے اپنے خاص خدام اور نیازمندوں سے یہ فرمایا تھا کہ "اور تو کچھ لکھنؤ میں ہوا یا نہ ہوا مگر مجھے اس بات کی بیحد مسرت ہے کہ ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گیا جو بعض بد باطنوں نے میرے اور علامہ سیاب کے درمیان پیدا کر دی تھیں"۔ مگر میرے دل میں آپ کے اس مضمون سے پھر کچھ خلش سی ہوئی۔ تا اینکہ مجھے ناگپور سے تار ملا کہ میرے ماموں صاحب کی حالت جو وہاں بسلسلۂ ملازمت مقیم ہیں۔ بہت سقیم ہے۔ میں ناگپور گیا اور مولانا سے ملکر خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا تو انھوں نے یہ فرمایا کہ "شاعر" میرے پاس نہیں آتا اور مجھے اس مضمون کا کوئی علم نہیں لیکن شباب صاحب و نوری صاحب کی علامہ سیاب سے جو خط و کتابت "کارواں" میں ہوئی اُسے ضرور پڑھا ہے"۔ مگر مولانا نے بقسم فرمایا کہ "نہ مجھے اس کی اصلیت کا کوئی علم ہے اور نہ میں آپس میں اس قسم کی اخباری خط و کتابت کو پسند کرتا ہوں"۔ یہ بھی فرمایا کہ "اب تو کیا جس وقت کہ مولانا سیاب کے اور میرے درمیان میں غلط فہمیاں ڈالدی گئی تھیں اُسوقت بھی جب "شاعر" میں کئی مضامین مجھ سے تعریض کرتے ہوئے شائع ہوتے تھے، میں نے اُن کا بھی کوئی جواب دینا پسند نہیں کیا۔ حالانکہ اسوقت ناگپور میں میں خود ایک اخبار کا نگران تھا اور ہندوستان میں اور بھی کئی رسالے اور اخبارات ایسے تھے کہ جو میرے مضامین کو نہ صرف خوشی بلکہ شکریہ کے ساتھ شائع کرتے"۔ مولانا نے مجھ سے یہ بھی فرمایا کہ "میں ہمیشہ شاگردانِ داغ کا نیازمند رہا ہوں اور ہمیشہ اُنکی طرفداری کو اپنے لئے ضروری سمجھا ہے"۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ "گزشتہ سال جب میں نے جمشید پور کے ایک بڑے مشاعرے کی صدارت کی تھی تو وہاں اپنی صدارتی تقریر میں علامہ سیاب کے متعلق بڑے گراں بہا خیالات کا اظہار کیا تھا" اور یہ بھی فرمایا کہ "قمر صاحب بدایونی مرحوم سے مجھے کوئی تعارف نہ تھا اور ایسی باتوں کی اشاعت کو جو قمر صاحب کے حوالے سے اخبار کارواں میں ہوئیں میں ناپسند کرتا ہوں۔ اور یہ بھی فرمایا کہ یہ میری قسمت ہے کہ میں ہمیشہ علامہ سیاب کیساتھ نیازمندانہ برتاؤ کرتا ہوں اور مجھے اُسکا جواب اس طرح ملتا ہے جس طرح کہ آپنے "شاعر" کے ستمبر والے نمبر میں دیکھا اور جب میں نے لکھنؤ کے حوالے سے مولانا آسی کے متعلق کہا تو انھوں نے یہ فرمایا کہ اب سے چند سال قبل مولانا آسی و علامہ سیاب کے درمیان میں کچھ اختلاف ہوا تھا اور تحریر کا سلسلہ اخبارات تک پہنچا تھا۔ مگر بعد میں میں نے آسی صاحب سے درخواست کر کے اُسے بھی بند کرا دیا تھا اور فرمایا کہ جہانتک واقعات کا علم ہے میں سمجھتا ہوں کہ آسی صاحب کی بھی "کارواں" کی خط و کتابت میں کوئی شارکت نہیں۔ نوری صاحب مولانا آسی کے شاگرد ضرور ہیں مگر مولانا نے فرمایا یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ برسوں سے ان دونوں صاحبوں میں خط و کتابت بھی نہیں ہے تو اب میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شباب صاحب بدایونی کی تحریروں کو کسی حیثیت سے بھی مولانا ناطق یا مولانا آسی سے کوئی واسطہ نہیں اور یہ کہ آپ ازراہِ کرم اس غلط فہمی کو نکال دیجئے۔ فقط

والسلام

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں خوشتر (میونسپل کمشنر)

کھنڈوہ (سی پی)

مدیرِ شاعرؔ کی گذارش :-

آپ کے مکتوبِ گرامی کے حرف حرف پر مجھے یقین و اعتماد ہے۔ شبابؔ صاحب بدایونی اور نوریؔ صاحب اخبارؔ "کارواں" بمبئی کے ذریعہ مجھ سے اور حضرت قبلہ مولانا سیمابؔ مدظلہٗ سے جس غیر سنجیدگی اور بدتہذیبی کے ساتھ پیش آئے اور ایک معمولی سی بات کا جو بتنگڑ بنایا، میں نے مختصراً شاعر میں اُس کا جواب دیا تھا اور اسی ذیل میں ناگپور اور لکھنؤ کا ذکر بھی آگیا تھا۔ میرے احباب کا حلقہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں موجود ہے، بمبئی۔ ناگپور اور لکھنؤ کے احباب نے مجھے جو واقعات تحریر فرمائے اُن کی روشنی میں میرے شبہات کا پرورش پانا اقتضائے بشریت تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں ان مقامات کا ذکر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ چونکہ شبہ میں یقین کا پہلو بہت کمزور ہوتا ہے۔ اسی لئے میں نے دانستہ کسی کا نام نہیں لیا۔ آپ کی تحریر کے مطابق حضرت مولانا ناطقؔ گلاؤٹھوی اور حضرت مولانا آسیؔ لکھنوی نے چونکہ شبہ کا رُخ اپنی طرف منتقل کر لیا ہے اس لئے میرا فرض ہے کہ میں معذرت اور صفائی کے ساتھ ساتھ یہ شکایت بھی کروں کہ جب "کارواں" کا وہ سلسلۂ مضامین جس میں نوریؔ صاحب نے زیادہ سے زیادہ دشنام طرازی سے کام لیا تھا اور ایک صحیح چیز کو خواہ مخواہ غلط ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی اور یہ سب کچھ میرے دونوں محترم بزرگوں کی نظر سے گذر رہا تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آسیؔ نے نوریؔ صاحب کے استاد کی حیثیت سے اور حضرت مولانا ناطقؔ نے بحیثیت مولانا سیمابؔ کے ایک دوست، ایک صاحبِ فن اور میرے بزرگ کے نوریؔ صاحب کو اُن ہفوات سے کیوں نہ روکا؟ اگر میرے یہ دونوں بزرگ نوریؔ صاحب کا منہ اُسی وقت بند کر دیتے تو نہ میرے جواب کی نوبت آتی نہ نوریؔ صاحب ادارۂ "کارواں" سے علیحدہ کئے جاتے نہ شبابؔ صاحب اِدھر اُدھر بھاگے بھاگے پھرتے اور نہ شبہ کی گنجائش پیدا ہوتی؟؟

ادارۂ "کارواں" کسی کے ابھارنے سے اب کسی کسی اشاعت میں وہی گندگی اچھال رہا ہے۔ چونکہ میں اُس کی دریدہ دہنی کا جواب نہ دینے کا تہیہ کر چکا ہوں اور وہ اپنی مذموم حرکات سے باز نہیں آتا ہے اس لئے اب اُس کا منہ تو **عدالت** ہی بند کرے گی اور [illegible] سیمابؔ مدظلہٗ کی آنکھیں اُس وقت تک نہیں کھلیں گی جب تک انھیں قانون کے شکنجے میں نہ کھینچا جائے۔ کوئی معقول بات ہو تو اُس کا جواب بھی دیا جائے دشنام طرازی کا جواب ہی کیا؟

جب سے میں نے "شاعر" کی ادارت کے فرائض اپنے اوپر عائد کئے ہیں، اسے کم و بیش آٹھ سال ہوگئے اُس وقت سے تا ایندم جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے "شاعر" میں کبھی حضرت مولانا ناطقؔ گلاؤٹھوی یا حضرت مولانا آسیؔ لکھنوی کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھا گیا۔ حضرت مولانا ناطقؔ نے آپ سے جن خیالات کا اظہار فرمایا، حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہٗ کو اس کا اعتراف ہے اور وہ دونوں حضرات کو اپنا معاصر اور دوست سمجھتے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں میں خود بھی مولانا ناطقؔ سے ناگپور میں ملا ہوں حضرت مولانا آسیؔ لکھنوی سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے، دونوں محترم بزرگوں نے کبھی میرے اور حضرت مولانا سیمابؔ مدظلہٗ کے روبرو کسی قسم کا احساسِ مخالفت نہیں فرمایا۔ اور احساس کی گنجائش ہی کہاں ہے جب کہ ہم لوگوں کے دل صاف ہیں۔ یہ ہندوستان کے بعض شعرا اور ادبا کی خوش فہمی ہے کہ وہ اربابِ قصر الادب کو اپنا مخالف سمجھتے ہیں، مخالفت کی پرورش وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں فرصت ہی فرصت ہو، یہاں تو ۲۴ گھنٹے دماغ ادبی مشین بنا رہتا ہے ہاں وقت پر چوکنا ہمارے مشرب کے خلاف ہے۔

میں منافقت کو کفر کے مترادف سمجھتا ہوں، اگر ایک مسلمان کے قول و فعل کا کوئی اعتبار اور وزن ہے تو میرے دونوں محترم بزرگ یقین فرمائیں کہ میرے اور حضرت قبلہ مولانا سیمابؔ مدظلہٗ کے دل میں اُن کی طرف سے شائبہ مخالفت بھی نہیں ہے۔

میں اپنے دونوں محترم بزرگوں سے ملتجی ہوں کہ **"دعوتِ جلوہ"** اور میری مذکورۂ بالا گذارشات کے متعلق اپنے قلم سے بھی کچھ تحریر فرمائیں تاکہ اس غلط مبحث اور غلط فہمی کا خاتمہ ہو۔ اور تعلقات میں وہی پہلی سی خوشگواری پیدا ہو جائے

اعجاز صدیقی

مشاعرۂ شاعر

مصرعِ طرح :۔ "تیری نظر ہنوز اسیرِ مجاز ہے"

حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی

جو کچھ جاں گداز ہے وہ جاں نواز ہے
خوش ہوں کہ میری عمرِ محبت دراز ہے

تعمیرِ کائنات ہیں غم کی شانتیں
بگڑی ہوئی نظر مری کونین ساز ہے

پھر بھی نیازِ عشق کی دنیا ہو دعوتیں
گو جانتا ہوں میں کہ تجھے خوئے ناز ہے

دھوکا نہ کھا نمود و نمائش سے دہر کی
جو شے ہے آشکار یہاں وہ بھی راز ہے

میرے تصورات کی قدوسیت نہ پوچھ
مجھکو حریمِ عرش میں اذنِ نماز ہے

کشتی کے ٹوٹنے سے میں کیوں دل کو توڑ دوں
اب ناخدا نہیں تو خدا کارساز ہے

سیماب قصدِ طیبہ کراچی سے کیجئے
اب کتنی دور روضۂ شاہِ حجاز ہے!

حضرت نوح ناروی

اس کی بھی کچھ خبر تجھے اے حیلہ ساز ہے
تو جس کو پوچھتا ہے وہ تیرا ہی راز ہے

قائل مرے نیاز کا وہ مستِ ناز ہے
صورت یہ ہے تو ناز کے قابل نیاز ہے

محشر میں بے سبب یہ مری خامشی نہیں
دفتر ہے کم فسانۂ الفت دراز ہے

اے آرزوئے دید توجہ سے کام لے
جلووں ہی کے حجاب میں وہ جلوہ ساز ہے

کہدوں تو کھینچ لائے حقیقت کو سامنے
میرا مجاز وہ ہے جسے یہ مجاز ہے

مانگے خدا سے کیوں نہ دعا دردمندِ عشق
سب چارہ ساز ہیں وہ مگر کارساز ہے

اے نوح دورِ کشتی و طوفاں گزر گیا
اب آسماں ہے اور ہوائی جہاز ہے

حضرت الم مظفر نگری

حسنِ جہاں نواز سے دل بے نیاز ہے
میری نظر تو آپ ہی جلوہ طراز ہے

تشریح کر رہا ہے کوئی حسن و عشق کی
دیکھو یہ کون واقفِ راز و نیاز ہے

پروانوار رہنا ہے سوزِ شمع میں ہو گداز
جس انجمن کو دیکھئے بے سوز و ساز ہے

میری جبیں جھکے تو یہاں کس طرح جھکے
کعبے پہ یہ گماں ہے کہ دیرِ مجاز ہے

دیتا ہے کوئی یوں بھی الم دادِ بندگی
سر اٹھ سکا نہ جھک کے کیسی نماز ہے

حضرت تسلیم مالیگانوی

خاموش رات، فکرِ رسا، دل کا ساز ہے
رقصاں مری نظر میں دو عالم کا راز ہے

ہر چند طرفہ کاریِ اصل و مجاز ہے
حسنِ ازل کا راز بدستور راز ہے

شبنم کہیں ستارے کہیں پھول ہیں کہیں
دنیا کرشمۂ نگہِ امتیاز ہے

فطرت نے گرچہ کوششِ اخفا ہزار کی
اک اک کلی کے لب پہ گلستاں کا راز ہے

تسلیم اغزل سرا جو چمن میں ہوا تو کیا؟
نغمہ ترا ہنوز گرفتارِ ساز ہے

حضرت ارشد صدیقی امروہوی از کوئٹہ

میرا وجود حسنِ حقیقت کا راز ہے
اس آئینے میں صورتِ آئینہ ساز ہے

ٹھکرا دیا تھا تیرے تغافل نے دل مرا
لیکن تری نگاہ بڑی دلنواز ہے

پھر لذتِ جنوں میں کمی دیکھتا ہوں میں
پھر اک وہی نگاہ جو دیوانہ ساز ہے!

اُن کا تو راز تھا ہی حدِ فہم سے بعید
حیران ہوں کہ اب مری ہستی بھی راز ہے

ارشد ہے مجھ پہ حضرتِ سیماب کا کرم
مجھ کو بھی اپنی خوبیٔ قسمت پہ ناز ہے

حضرت قمر نعمانی سہسرامی (از بمبئی)

ایسا جہاں میں کون ہے جو بے نیاز ہے
پہلو میں ہر بشر کے دلِ فکر ساز ہے

اُس پر حقیقتیں نہ کبھی ہونگی منکشف
جس کی نظر اسیرِ طلسمِ مجاز ہے

جب اور جہاں بھی چاہا ہے میں نے سجدہ کر لئے
آزاد قید و بند سے میری نماز ہے

کیوں التماسِ جلوہ کروں مجھ کو کیا غرض
میری نگاہِ شوق ہی جلوہ طراز ہے

دعوائے ہوش و عقل کرے کیا کوئی قمر
غارت گرِ حواس طلسمِ مجاز ہے

جنابِ اختر اعظم گڈھی

تو جس کی جستجو میں خرابِ مجاز ہے
غافل، وہ تیرے دل ہی میں جلوہ طراز ہے

اُس کے قدم پہ میری جبینِ نیاز ہے
دنیائے عشق کا جو خدائے مجاز ہے

سوزِ دروں کی چاہوں تو اسکو بھی پھونک دوں
یہ درمیاں جو پردۂ حسنِ مجاز ہے

تو ہے خدائے حسن تو میں ہوں خدائے عشق
تجھ سے مجھے نیاز علی وجہ ناز ہے

کیونکر سکوں نصیب ہو اختر شبِ فراق
اس شوخ کا خیال بھی دیوانہ ساز ہے

حضرت برق صدیقی فتحپوری

قدرت کا راز اب بھی پسِ پردہ ساز ہے
سجدے میں اک نگاہِ حقیقت مجاز ہے

دُنیا کا ساز ہے مری بزمِ سرود میں
چنگِ عجم ہے اور نوائے حجاز ہے

پھر ہے تلاشِ سنگ سرِ آستانِ ناز
پھر مائلِ سجود جبینِ نیاز ہے

دشوار ہے کہ رنگِ طبیعت بدل سکے
دل فطرتاً ازل سے محبت نواز ہے

اے حسنِ دوست برق میں ہو فطرتِ کلیم!
اُس کی نگاہِ شوق سے کیوں احتراز ہے؟

جناب رونق دکنی

جوشِ کرم کسی کا عقیدت نواز ہے
اب سنگِ آستاں ہی جبینِ نیاز ہے

اے صبح تیری دعوتِ نزہت کا شکریہ
پردردِ الم میری شامِ دراز ہے

تکمیلِ داستانِ محبت کی ہے اُمید
اب تو نگاہِ حسن بھی افسانہ ساز ہے

یہ چشمِ خشمگیں یہ تری چشمِ التفات
اک آئینہ شکن ہے اک آئینہ ساز ہے

رونق نیاز و ناز کی سرمستیاں نہ پوچھ
سجدہ میں اور جبیں میں کہاں امتیاز ہے

جناب قمر نقوی جیپوری

ہر لحظ سجدہ ریز جبینِ نیاز ہے
ہر وقت میرے واسطے وقتِ نماز ہے

سجدوں میں شائبہ بھی نہ ہو جب خلوص کا
تو پھر تری نماز، فریبِ نماز ہے

دل آئینہ بنا ہے جو بزمِ جمال کا
حیرت میں خود بھی فطرتِ آئینہ ساز ہے

جوشِ بہار سے ہمیں وحشت کا خوف کیا
اپنا تو کوئی اور ہی دیوانہ ساز ہے

دُنیا میں یوں جو قمر سا خوددار ہی خراب
اس میں بھی کوئی تیری محبت کا راز ہے

حضرت جالب سہسرامی

کیوں میرے دل یہ تابِ تکالیف بار ہے
طبعِ نیاز مند، سزاوارِ ناز ہے

اے ہمنشیں! بتا ہے نہ بارغِ اَمل نہ سُن
تاراجیِ خزاں کی حکایت دراز ہے

وہ غم دیا ہے تو نے کبھی جو دیا نہ تھا!
اے دوست! وقفِ شکر دلِ غم نواز ہے

انکارِ امرِ سجدہ آدمؑ بھی راز تھا!
منطق سے کہد و بحث یہ دامن دراز ہے

سینہ فگار، قلب تپاں، چشم اشکبار!
جالب جہاں آرا کا غم جانگداز ہے

جناب شفا گوالیاری

کوئی نیاز مند، کوئی بے نیاز ہے
دُنیائے حسن و عشق معمہ ہے، راز ہے

کوئی انیس ہے، نہ کوئی چارہ ساز ہے
دل کی کسک ہی شامِ الم دلنواز ہے

اُس سے حدیثِ عشق کہیں بھی تو کیا کہیں
جو ناشناسِ لذتِ سوز و گداز ہے

دل ہے کہیں، نگاہ کہیں ہے، جبیں کہیں
یہ کوئی بندگی ہے، یہ کوئی نماز ہے

نظارہ اُنکے جلوؤں سے محو ہے شفا
اب تو مری نگاہ بھی امینِ نماز ہے

جناب سید عبد الغنی صاحب تنویر بنگلوری

گر ہے نیازِ سجدہ، سرِ کبر و ناز ہے
خلاقِ دو جہاں بھی بہت بے نیاز ہے

ذرّے اور آفتاب کی ہو کنہ ایک ہی
نقصِ نظر تمام سبب امتیاز ہے

چھٹنے لگا ہے صبر کا دامن بھی ہاتھ سے
کیا کیف آفریں نفسِ نے نواز ہے

ہر ظرفِ اہلِ دل ہی کے شایاں شرابِ عشق
سچ پوچھئے تو یہ مئے مینا گداز ہے

کیونکر سکوں نصیب ہو تنویرؔ ہند میں
ہر وقت اب تصورِ دشتِ حجاز ہے

جناب رعنا عشرتی

شایانِ دید منظرِ ناز و نیاز ہے
جو درد بخشِ دل تھا وہی چارہ ساز ہے

اے عشق سونپ دی تو اُسے اپنی زندگی
منظور آج حسن کو تکمیلِ راز ہے

بے نورِ شمع ہو گئی، پروانے جل بجھے
اتنا ہی صرف حاصلِ سوز و گداز ہے

آساں نہیں کہ جلوۂ باطل میں ہو اسیر
دل کیا، مری نظر بھی حریفِ مجاز ہے

رعنا سا کشتۂ غمِ ایام جی اُٹھا
کتنی تری نگاہ بھی اُمید ساز ہے

جناب صادق (از بھند گوالیار)

حسنِ مجاز میں جو وہ جلوہ طراز ہے
دل صرفِ طوفِ کعبۂ حسنِ مجاز ہے

مضمر اسی میں میری مسرت کا راز ہے
کچھ غم نہیں جو سلسلۂ غم دراز ہے

دشمن کا آستاں ہو کہ ہو تیرا آستاں
کیفِ سجود میں بھی کسے امتیاز ہے

متروک ہو گئی تھی زمانے میں رسمِ عشق
میرے ہی دم قدم سے اب اسکا جواز ہے

صادقؔ مریضِ عشق کی خوش قسمتی نہ پوچھ
جس نے دیا تھا درد وہی چارہ ساز ہے

جناب شفیق اللہ خاں صاحب شفیق کوٹی

ذرہ نواز نقشِ کفِ پائے ناز ہے
سجدوں سے فیض یاب جبینِ نیاز ہے

مجھ کو نہیں ہے غم جو کوئی بے نیاز ہے
شائستۂ نیاز تو پھر اس پہ ناز ہے

میں ہوں کہ عکسِ حسنِ حقیقت نواز ہے
آئینہ سامنے ہے کہ آئینہ ساز ہے

جس نے بھی کوئی غم کا فسانہ سنا دیا
سمجھا میں یہ کہ اس کو بھی عرفانِ راز ہے

خود بینی حجاب مجھے لائی ہے یہاں
میں جانتا ہوں مجھ میں جو پوشیدہ راز ہے

جناب رونق خوندمیری حسن ٹینی (کولار)

دل میں تڑپ ہو درد ہے سوز و گداز ہے
کن کن کرشمہ ساز ترا حسنِ ناز ہے

جب یاد تیری آئی، سر اپنا جھکا لیا
یہ اپنی بندگی ہے یہ اپنی نماز ہے

یارب نہ ہو سحر شبِ تنہائی کی کبھی
ما بین حسن و عشق ابھی راز و نیاز ہے

کیوں نہ بیکر دل میں مرے قیامت ہو جانگداز
[illegible]

اپنے کرم سے رونقِ عاصی کو بخشدے — غفّار تو رحیم ہے بندہ نواز ہے

جناب حزیں قریشی احمد آبادی

کہتے ہیں لوگ عشق کو دہشت نواز ہے — کیوں اے نگاہِ عشق یہ کیا حسن راز ہے
پوشیدہ میرے مرنے میں جینے کا راز ہے — میں ہوں فنا تو عمرِ محبت دراز ہے
میں ذرّہ حقیر وہ ذرّہ نواز ہے — یہ مختصر سی شرحِ حدیثِ نیاز ہے
بے وجہ اہلِ دید نہیں حالِ جنوں — در پردہ کوئی جلوۂ دیوانہ ساز ہے
نا آشنائے رازِ حقیقت نہیں حزیں — "تیری نظر ہنوز اسیرِ مجاز ہے"

جناب ثاقب بڑوانی

قاتل جو کل تھا آج وہی چارہ ساز ہے — کتنا عجیب منظرِ ناز و نیاز ہے
وہ کعبہ ہو کہ دیر نہیں اس سے کچھ غرض — جھک جائے سر جہاں وہیں اپنی نماز ہے
تو کیا سمجھ سکے گا حقیقت کی رفعتیں — "تیری نظر ہنوز اسیرِ مجاز ہے"
رگ رگ میں میری کوندتی ہیں بجلیاں سی آج — شاید وہ میری روح میں جلوہ طراز ہے
تقدیر آزمائی کا ثاقب یہی ہے وقت — برہم پھر آج وہ نگہِ فتنہ ساز ہے

جناب رسا اورنگ آبادی

میری نگاہ واقفِ راز و نیاز ہے — آئینہ دارِ حسنِ حقیقت مجاز ہے
آئے ہیں تیرے در پہ تمنا لئے ہوئے — کہتی ہے ساری خلق تو بندہ نواز ہے
تیرے کرم سے کرتے ہیں جرأت گناہ کی — بندوں کو ناز ہے کہ تو بندہ نواز ہے
کیوں دیکھتے ہی دیکھتے میں مست ہو گیا — ساقی کی چشمِ مست بھی کیا نشہ ساز ہے
جوشِ وفا کبھی نہ مرا کم ہوا رسا — اُس کے ستم کو بھی میں سمجھتا ہوں ناز ہے

جناب عارف ارشدی سیالکوٹی از کوئٹہ

مائل بہ التفات جو وہ چشمِ ناز ہے — نغمات سے بھرا ہوا ہستی کا ساز ہے
جب سے سنا نہیں تری رحمت کی انتہا — مجھکو بھی اپنے دفترِ عصیاں پہ ناز ہے
رکھتا ہوں راہِ منزلِ مقصود میں قدم — صرف اتنا سوچکر کہ خدا کارساز ہے
باقی رہے نہ جبکہ من و تو کا امتیاز — اس وقت کی نماز حقیقی مجاز ہے
عارف بتوں کے حسن میں نورِ خدا کہاں — "تیری نظر ہنوز اسیرِ مجاز ہے"

جناب اکرم دھولیوی

دلکش ہے دلپذیر ہے خاطر نواز ہے — ماشاءاللہ کیا حقیقتِ حسنِ مجاز ہے
مرعوب ہو رہا ہوں میں رعبِ جمال سے — کس شان سے وہ بزم میں جلوہ طراز ہے
اک میری جان کے لئے اتنی مصیبتیں — غم ہے الم ہے رنج ہے سوز و گداز ہے
اے تشنہ کام جلوۂ حسنِ ازل یہ کیا — "تیری نظر ہنوز اسیرِ مجاز ہے"
اکرم نوائے درد سے کیا اُن کو واسطہ — ہاں گو تیرے شعر میں سوز و گداز ہے

جناب فاروق ارشدی از کوئٹہ

لبریزِ درد و غم مری ہستی کا ساز ہے — ہر نغمہ اس کا حاملِ سوز و گداز ہے
کہدے جفا شعار سے کوئی کہ ہوشیار! — اب میرے لب پہ نالۂ آہن گداز ہے
اے چرخ تجھکو شمس و قمر پر اگر ہے ناز — مجھکو بھی دل کے داغِ محبت پہ ناز ہے
ہوتی نہیں ہے ختم ہماری شبِ فراق — شاید کہ صبحِ حشر سے کچھ ساز باز ہے
فاروق تو کچھ اور حقیقت شناس بن — "تیری نظر ہنوز اسیرِ مجاز ہے"

جناب سالک صاحب تن درباری

اللہ رے وہ حسن جو موسیٰ نواز ہے — میرے حریمِ قلب میں جلوہ طراز ہے
دیر و حرم سے اس کو نہیں کوئی واسطہ — اُس سنگِ در پہ جس کی جبینِ نیاز ہے
مستی برس رہی ہے فضاؤں میں ہر طرف — یہ آج کون باغ میں نغمہ طراز ہے
بیمارِ غم کے حال پہ روتی ہے بیکسی — غمخوار ہے کوئی نہ کوئی چارہ ساز ہے
سالک نہ پوچھ مجھ سے حقیقت تو حسن کی — وہ تو مری حیات کا سربستہ راز ہے

جناب حبیب شاہجہانپوری از کوئٹہ

ہشیار ہو کہ عشق کی منزل دراز ہے — غافل قدم قدم پہ نشیب و فراز ہے
زاہد تجھے فضول عبادت پہ ناز ہے — کیا یہ نہیں سنا کہ وہ ذرّہ نواز ہے
اے دل ضرور منزلِ مقصود پائیگا — ہمت سے کام لے کہ خدا کارساز ہے
قسمت ہے میری اوجِ ثریا سے بھی بلند — اس آستاں پہ جب سے جبینِ نیاز ہے
ہر شے میں اے حبیب حقیقت کا حسن دیکھ — "تیری نظر ہنوز اسیرِ مجاز ہے"

جناب عبدالغفار اُلفت بھنڈاروی

اُس بت کے آستاں پہ جبینِ نیاز ہے — اب کفر کی حدوں میں ہماری نماز ہے
نادان! دیر و کعبہ میں اس کا کہاں قیام — "تیری نظر ہنوز اسیرِ مجاز ہے"
اے ہمنشیں فسانۂ درد و الم نہ پوچھ — میری شبِ فراق کا قصہ دراز ہے
میرے گناہ قابلِ بخشش نہیں مگر! — اے میرے کارساز تو بندہ نواز ہے
کیوں دُور ہی سے وہ نہ تو کر کے کری سلام — اُلفت کے دل میں اُلفتِ شاہِ حجاز ہے

جناب اُلفت بی۔ اے فنڈیر آبادی

حاجت نہیں ہے نغمہ کی جب دل گداز ہے — جو رنج میں ہے سوز تو رگ رگ میں ساز ہے
ہے سر جھکانے سے مجھے کچھ عار فطرتاً — جس میں نہیں سجود وہ میری نماز ہے

دستِ دعا اٹھیں گے نہ سوئے فلک کبھی
میں اُس کا بندہ ہوں جو بڑا بے نیاز ہے

ہے قربِ حق کی مشق ہی اک بہترین سبیل
طاعت بھی ایک راہ ہے لیکن دراز ہے

اظہارِ راستی سے ہیں انسان سربلند
اُلفت روا ہے مجھکو اگر اس پہ ناز ہے

جناب قاری ابوالہاشم صاحب کیف بہلدی

دیر و حرم کی قید سے جو بے نیاز ہے
دنیائے رنگ و بو میں وہ دانائے راز ہے

عصیاں سے سرگراں ہوں مگر پھر بھی ناز ہے
بندہ ہوں میں اُسی کا جو بندہ نواز ہے

ممکن نہیں بشر ہو حقیقت سے آشنا
ہر ذرّہ اس جہان کا سربستہ راز ہے

کیفیتِ جراحتِ دل ہمنشیں نہ پوچھ
بے سود ہر معالجۂ چارہ ساز ہے

خدمت گذارِ بارگہِ مصطفےٰ ہوں میں
اے کیف مجھ کو اُن کی غلامی پہ ناز ہے

جناب زکی اورنگ آبادی

منظر کچھ ایسا سامنے اب جانگداز ہے
خود اپنی زیست سے بھی ہمیں احتراز ہے

اے بوالہوس! نصیب کہاں تجھکو نورِ عشق؟
"تیری نظر ہنوز اسیرِ مجاز ہے"

اشکِ چکیدہ دیکھ مری لغزشیں نہ دیکھ
احساسِ انفعال میں کتنا گداز ہے

روشن جب ایک شمع ہی سے ہیں دونوں گھر
دیر و حرم میں کس لئے پھر امتیاز ہے

ٹوٹے ہوئے دلوں کو جو چاہے تو جوڑ دے
تو آئینہ شکن تو ہی آئینہ ساز ہے

جناب سلیم سہروردی گوالیاری

کوتاہیٔ نظر سبب امتیاز ہے
ورنہ حقیقتوں ہی کا سایہ مجاز ہے

اے بے خبر تو جادۂ مقصد سے ہٹ گیا
ننگِ عبودیت تری طرزِ نماز ہے

یہ کشمکش ہے سُرخیٔ عنوانِ زندگی
امن و سکوں سے مجھکو بہت احتراز ہے

تیرے خیال سے دلِ کونین فیضیاب
تیرا خیال سب کے لئے جاں نواز ہے

جب مدعی کو زعمِ حقیقت ہے اے سلیم
کیوں آج پھر نمائشِ رنگِ مجاز ہے

جناب منظر کلیمی جام پوری

پیمانۂ نگاہ عرش ہے یا بادۂ ناز ہے
جو سرنگوں یہاں ہے وہی سرفراز ہے

کعبہ جہاں کہ صنم زار کچھ بھی ہو
اب بے نیازِ سجدہ جبینِ نیاز ہے

نیرنگیٔ آب و رنگ ہے رنگیں ہے اک فریب
جس حسنِ بے دفا پہ تجھے اتنا ناز ہے

محشر بپا ہی نہ داورِ محشر کو ہو خبر
اے رازدار! دیکھ یہ اُلفت کا راز ہے

بسمل تڑپ رہے ہیں وہاں پھول جسم تک
منظر جہاں مزارِ شہیدانِ ناز ہے

جناب [illegible] قریشی بھنداروی

اب [illegible] حسن جہاں محو ناز ہے
اب گم حقیقتوں میں نگاہِ مجاز ہے

دو چار اشک آنکھ سے ٹپکے تھے شامِ غم
ان کم نظر پہ تہمتِ افشائے راز ہے

یہ رنگ و بو، یہ حسنِ چمن، یہ شگفتِ گل
نیرنگیٔ طلسمِ جہانِ مجاز ہے

اُس دل سے اہلِ عشق کریں اکتسابِ درد
جو آشنائے لذتِ سوز و گداز ہے

تا عمر فرو بیزار ہے گناہوں میں تاکے
اٹھو، اور توبہ کرو کہ درِ توبہ باز ہے

جناب ابراہیم خاں صاحب خلیل الیمنری (ضلع مشرقی خاندیش)

خم تیرے آستانے پہ فرقِ نیاز ہے
جو ہے بری قیود سے یہ وہ نماز ہے

اس بات سے ہر اہلِ حقیقت ہے آشنا
تو رُونما جہاں ہے بشکلِ مجاز ہے

کون و مکاں میں گونج رہی ہے نوائے شوق
کیا جانے نغمہ ریز محبت کا ساز ہے

کس طرح اُن کی زد سے بچے آشیاں مرا
صیاد تاک میں ہے۔ ہوا فتنہ ساز ہے

محروم اُسکے لطف سے کیونکر رہوں خلیل
بندہ ہوں اُسکا اور وہ بندہ نواز ہے

جناب عزیز انوری از بیادر

اُلٹے ہوئے نقاب چلے آرہے ہیں وہ
ایک ایک ذرہ جلوۂ عریانِ ناز ہے

پہلو میں ایک دل ہے مگر کچھ نہ پوچھئے
ظالم تمام درد، ہمہ سوز و ساز ہے

دل ہی پر انحصار نہیں دردِ شوق کا
میرے جگر میں بھی خلشِ جانگداز ہے

آنکھوں میں ایک نشہ سا سر میں خمار سا
کیا یہ عنایتِ نگہِ نیم باز ہے

دل کے تمام زخم ابھی ہیں ہرے عزیز
حالانکہ دوست خود ہی مرا چارہ ساز ہے

جناب عبدالرحمٰن صاحب نزار کاندہلوی

تیری جبیں جو محوِ سجودِ نیاز ہے
اے نزار بزمِ ناز میں تو سرفراز ہے

اے ناخدا بتا کوئی صورت نجات کی
طوفانِ زندگی میں ہمارا جہاز ہے

یہ کیا جنوں، کہ دیرِ خودی اور نمازِ عشق؟
محرابِ بیخودی ہی میں لطفِ نماز ہے

نالاں ہے گر چمن میں خزاں دیدہ عندلیب
میرے لئے بھی یادِ وطن جانگداز ہے

لطف و نشاط اور الم جانگداز سے
یہ قلبِ زار بھی کوئی سربستہ راز ہے

جناب بیتاب کالپوی

اچھا تو ہے کہ پھر شبِ فرقت دراز ہے
دل بھی دوائے درد سے اب بے نیاز ہے

دُنیائے دل کرم سے ترے سرفراز ہے
رنج و خوشی میں آج کسے امتیاز ہے

حُسنِ نظر فروز کی نیرنگیاں نہ پوچھ
دل کا بھی اس مقام پہ زہرہ گداز ہے

کچھ زندگی و موت کا عقدہ نہ کھل سکا
رازِ حیات سچ تو یہ ہے اب بھی راز ہے

بیتاب ہوں غرورِ نفس سے بچا ہوا
اچھا ہے اُن کو مجھ سے اگر احتراز ہے

جناب عباس انصاری دھولیوی

بندہ نواز ہو کے بھی تو بے نیاز ہے
اے میرے کردگار عجب تیرا راز ہے

رنگینیٔ جمال سے محروم ہے ابھی
وہ آنکھ جو اسیر طلسم مجاز ہے

ڈوبی ہوئی سی نبض ہے بیٹھا ہوا سا دل
اب کشتیٔ حیات مری تشنہ نواز ہے

اپنا سا غیر کو نہ سمجھ اے ہوا پرست
کب مائل گناہ دل پاکباز ہے

کیوں ہو نہ مجھ کو برق جمالوں سے واسطہ
عباس ہر خیال مرا طور ساز ہے

جناب عزیز اجمیری

بے وجہ کیوں نقاب میں حسن مجاز ہے
طالب جمال کی نگہ پاکباز ہے

مجھ پر جو آپ کی نگہ امتیاز ہے
یہ امتیاز میرے لئے وجہ ناز ہے

اب میری بندگی میں کہاں کیف بندگی
اب اُنکے در سے دور جبین نیاز ہے

نازک مزاج حسن سے فریاد کیا کروں
میری فغان نیم شبی دلگداز ہے

پھر کیوں عزیز گوشۂ عزلت نہ ہو مجھے
جسکا خیال ہے وہ تصور نواز ہے

جناب غلام احمد صاحب انجم احمد آبادی

کتنا مآل میکدہ حسرت نواز ہے
وہ بزم عیش ہے نہ وہ مطرب نہ ساز ہے

ہر شے سے اس جہاں کی اُسے احتراز ہے
تیرا نیاز مند بہت بے نیاز ہے

ہیں رفتہ رفتہ دل کی خلش میں ترقیاں
اب کارگر تری نگہ عشوہ ساز ہے

دیر و حرم سے اب مجھے کچھ واسطہ نہیں
خم نقش پائے یار پہ فرق نیاز ہے

انجم نگاہ چشم حقیقت سے دیکھ تو
یہ کون تیرے سامنے جلوہ طراز ہے

جناب محبوب اسحٰق صاحب ارمان صابری برہانپور

ہر چند میں رہین غم و اضطراب ہوں
لیکن حصول ذوق محبت پہ ناز ہے

اے دوست انکسار ہی تیرا شعار ہو
حاصل اگر جہاں میں تجھے امتیاز ہے

میں ہوں مریض غم مجھے چھوڑا ہے حال پر
چارہ گری کی فکر عبث چارہ ساز ہے

اللہ رے کمال محبت ترا عروج
میرا سر اور نقش کف پائے ناز ہے

اس پر بھی ایک بار نگاہ کرم کریں
ارمان آپ ہی کا تو بندہ نواز ہے

جناب حافظ اسحاق ہلال کوکشی (دھار)

ہے تجھکو اس پہ فخر کہ تو بے نیاز ہے
میں ہوں نیاز مند مجھے اس پہ ناز ہے

دیر و حرم میں اب نہ رہی کوئی دلکشی
شاید وہ میری روح میں جلوہ طراز ہے

مانا کہ میکشی نہیں اے دل تجھے پسند
آنکھوں سے وہ پلائیں تو کیا احتراز ہے

خیابان بندگی وہ ہی سر ہے تری قسم
دیر و حرم کی قید سے جو بے نیاز ہے

یہ کیا بتاؤں عشق میں کیا کیا ملا ہلالؔ
آنسو میں درد و کرب ہے سوز و گداز ہے

جناب شفیع گوالیاری

اب کیا بتاؤں کون تصور نواز ہے
اتنا مری نظر کو کہاں امتیاز ہے

سب سے جدا ہماری ادائے نماز ہے
یعنی سر نیاز ہے اور پائے ناز ہے

اے دل وفور شوق میں حد سے نہ یوں گذر
کم بخت بزم ناز ہے، یہ بزم ناز ہے

ساقی کی چشم مست کی اللہ رے مستیاں
جو گردش نظر ہے وہ میخانہ ساز ہے

للہ کور چشمیٔ زاہد سے لے سبق
اچھے برے کا تجھ کو شفیع امتیاز ہے

جناب فلسفی برہانپوری

وہ عشق غزنوی نہ وہ حسن ایاز ہے
دل ہے کہ اب بھی مدعیٔ سوز و ساز ہے

ہر شے میں دیکھتا ہوں خدوخال حسن دوست
شاید مرا مذاق نظر جلوہ ساز ہے

خود بینیوں نے مد مقابل بنا لیا
آئینہ خود ہی روکش آئینہ ساز ہے

مدت ہوئی نقوش قدم کو مٹے ہوئے
راہ طلب میں اب بھی جبین نیاز ہے

موہوم ہر نشاط تمنا ہے فلسفی
تا صبح حشر دامن فرقت دراز ہے

جناب آذر ناگپوری

اک بیخود نیاز ہے اک مست ناز ہے
اتنا ہی عشق و حسن میں کچھ امتیاز ہے

پھر دور ہو چلا ہوں تری بزم ناز سے
پھر دل فریب خوردۂ حسن مجاز ہے

جس جس پہ پڑ گئی اُسے دیوانہ کر دیا
ہر جنبش نظر تری، دیوانہ ساز ہے

دل کا مذاق تلخ پسندی تو دیکھئے
منت پذیر لذت سوز و گداز ہے

آذر اسی کا نام ہے معراج بندگی
ہر خط مری جبیں کا تجلی نواز ہے

جناب شنکر لال صاحب وفا اکبر آبادی

جو محو عشق دوست ہے وہ سرفراز ہے
کہتے ہیں جس کو عشق بڑا کار ساز ہے

ٹھکرائے مجھ کو لاکھ زمانہ قصوروار
میں یوں ہوں مطمئن کہ وہ نکتہ نواز ہے

اے برہمن کھلیں گی نہ تجھ پر حقیقتیں
"تیری نظر ہنوز اسیر مجاز ہے"

سجدہ سہی اسی کو کام ہے قدموں پہ حسن کے
دیوانہ جانتا نہیں کیسی نماز ہے

بے مہریٔ بتاں سے وفا ہو ملول کیوں
ہر آسکی چاہئے وہ بڑا کار ساز ہے

جناب غافل بیتول

در پر جو سر نگوں ہے ترے، سرفراز ہے
جو سرفراز ہے وہ ہی آگاہ راز ہے

ہر چند روشناس حقیقت ہوا مگر
"تیری نظر ہنوز اسیر مجاز ہے"

خلوت نشیں ازل سے ہو اب تک تو کیا ہوئے
جلوت میں آ کر مجمع اہل نیاز ہے

اصلاحِ سخن :- مدیرِ "شاعر" کی غزل پر حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی اصلاح

۱	پوچھا کیا ہے تصور کی کرم فرمائیاں	بن گئی ہیں جنتِ ذوقِ نظر تنہائیاں
۲	بڑھ گئیں اس درجہ ذوقِ عشق کی رعنائیاں	حسن کی فطرت کو لینی ہی پڑیں انگڑائیاں
۳	چاندنی میں "تاج" کی ~~اللہ رے~~ [خاموش] جلوہ زائیاں	جیسے ہستی کی سمٹ آئی ہوں سب رعنائیاں
۴	~~شعلۂ~~ [شدت] جذبات خود ہی باعثِ تشہیر ہے	حسن سے منسوب کیوں ہوں عشق کی رسوائیاں
۵	~~اس طرح الفت میں ہر~~ [یوں محبت میں ہر اک] تارِ نفس ہے نغمہ زن	دور جیسے بج رہی ہوں غم رُبا شہنائیاں
۶	فی الحقیقت مل گیا کونین کا حاصل اُسے	عشق میں ~~قسمت سے مل جائیں جسے~~ [جس کو میسر ہو گئیں] تنہائیاں
۷	خود ہی آساں منزلِ راہِ وفا ہو جائیگی	پہلے ~~اپنے ضبط میں~~ [اپنے ذوقِ طلب] پیدا تو کر گیرائیاں
۸	حسن اُتنا ہی ہر پہلو بنے گا تابناک	عشق پر کی جائینگی جتنی خیال آرائیاں
۹	خود سے غافل ہو کے کھو جاتا ہوں اُن کی یاد میں	ہیں بڑی نعمت محبت میں ~~مجھے~~ [مری] تنہائیاں
۱۰	منجلی کر بیخودی سے تو خودی کا آئینہ	روح میں کرنے لگیں گے وہ جلوہ فرمائیاں
۱۱	وہ سکوں مندِ محبت جو کبھی تڑپا نہ ہو	کیا سمجھ سکتا ہے میرے درد کی پہنائیاں
۱۲	دیدیا جاتا ہے نظمِ گل خزاں کے ہاتھ میں	جب بہاروں سے نہیں ہوتیں چمن آرائیاں
۱۳	وہ تصور کی حدوں کو چھو رہے ہیں بار بار	چھن رہی ہیں آج یوں مجھ سے مری تنہائیاں

۱۴
ربط ان کے مرمریں جلووں سے ہے اعجاز کو
کیا ~~انہیں بھائیں مہ و انجم کی یہ~~ [پسند آئیں ستاروں کی اُسے] رعنائیاں

جنوری ۱۹۴۳ء

توجیہہ:-

(۳) "اللہ رے" کی "ے" دب رہی تھی اور یوں بھی یہ ٹکڑا قدیم الفاظ غزل سے تعلق رکھتا ہے "خاموش" نے جہاں ان معائب کو دور کیا وہاں خیال کو حقیقت سے بہت کچھ قریب کر دیا۔ چاندنی رات میں "تاج" کی خاموشی بڑی جاذبیت کی حامل ہوتی ہے۔

(۴) شعلہ کا کام بھڑکنا یا آگ لگانا ہے، تشہیر کرنا نہیں "شدت" اسی لئے بنایا گیا۔

(۵) طرح "میں" "ر" پر ختم نہیں ہے بلکہ "ح" کو ساکن ہونا تھا یہی وجہ اصلاح ہے۔

(۶) مصرع ثانی میں زمانہ غلط تھا۔ "مل گیا" کے اعتبار سے مصرع ثانی میں "مل گئیں" یا "ہو گئیں" کی ضرورت تھی۔

(۷) ضبط بے محل تھا۔ ذوقِ طلب نے مصرع کو بہت بلند کر دیا۔

(۹) "مجھے تنہائیاں بہت نعمت ہیں" خلافِ محاورہ تھا اس لئے "مری" بنایا گیا

(۱۴) پہلا مصرع چست نہ تھا "یہ" بھی زوائد میں سے تھا۔ اصلاح سے دونوں عیب دور ہو گئے۔

اعجاز صدیقی

تصویر:- اعتبار الملک حکیم منیر حسن خانصاحب دلؔ شاہجہانپوری

جلد ۱۳ | ماہنامہ "شاعر" آگرہ - فروری سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۲

سرپرست محسنین معاونین و انیسانِ ہمدردانِ شاعر

سرپرست ادب و شعر

(۱) عالیجناب خان شری امام الدین خان صاحب ممتاز رسوا والئی پاجود کاٹھیاواڑ

محسنین ادب و شعر

(۲) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی سنہ ۶۰ سالانہ

(۳) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیر خورجوی سنہ ۶۰ سالانہ

(۴) محسنۂ ادب ہر ہائینس علیہ حضرت کلیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ سنہ ۶۰ سالانہ

(۵) محسنۂ ادب شہزادی تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ سنہ ۶۰ سالانہ

(۶) محسنِ ادب جناب محترم وزیرزادہ شجاعت خانصاحب قہر جوناگڈھی سنہ ۶۰ سالانہ

معاونینِ ادب

۷) معاونِ ادب مسٹر ایل۔بی خلیس صابر بی۔ اے اکبرآبادی عہ ۲۴ سالانہ

۸) معاونِ ادب محترمہ مجیبہ تصدق ایم۔اے۔بی۔ٹی عہ ۲۴ سالانہ

۹) معاونِ ادب جناب مولوی محمد احمد صاحب رسوا سہارنپوری عہ ۲۴ سالانہ

انیسانِ ادب

۱۰) انیسِ ادب جناب سید تفضل کریم صاحب جمشید پور عہ ۱۵ سالانہ

۱۱) انیسِ ادب جناب محبوب حسن صاحب آسی متوطن رڑکی۔ بمبئی عہ ۱۵ سالانہ

ہمدردانِ ادب

۱۲) ہمدردِ ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلیمان جالندھری عہ ۱۲ سالانہ

۱۳) ہمدردِ ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری مرحوم عہ ۱۲ سالانہ

۱۴) ہمدردِ ادب جناب نواب زادہ کنور تسکور حسین خانصاحب تیس آف ہنڈو عہ ۱۲ سالانہ

۱۵) ہمدردِ ادب جناب ابو عبدالعظیم خانصاحب ذوق دکنی عہ ۱۲ سالانہ

۱۶) ہمدردِ ادب جناب اسمٰعیل کھوکر صاحب راز جوناگڈھی عہ ۱۲ سالانہ

۱۷) ہمدردِ ادب جناب صاحبزادہ سید مظفر حسین صاحب تبسم زمیندار (دان دانا رام) عہ ۱۲ سالانہ

۱۸) ہمدردِ ادب جناب تلاش عمر میاں حسن میاں صاحب چشتی نظامی کلول عہ ۱۲ سالانہ

۱۹) ہمدردِ ادب جناب مخدوم سید علی اسد صاحب نقوی البخاری احمدآباد عہ ۱۲ سالانہ

خاصانِ ادب

۲۰) جناب صاحبزادہ سلطان حامد خانصاحب ثروت گلشن آبادی صہ سالانہ

۲۰) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمان خانصاحب شفق ٹونکی صہ سالانہ

۲۱) جناب عبدالحمید صاحب قمر صدیقی پھرادی بی۔ اے صہ سالانہ

۲۳) جناب لالہ گنگا رام صاحب ابر سرہندی صہ سالانہ

(۲۴) جناب سید مظفر حسین صاحب عرشی صہ سالانہ

(۲۵) جناب دیسراج شرما۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ فرنج منڈی ضلع جہلم صہ سالانہ

(۲۶) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی جمشید پور صہ سالانہ

(۲۷) جناب صاحبزادہ عبدالحمید خانصاحب بہادر عباسی بی۔ اے صہ سالانہ

(۲۸) جناب ماسٹر حسن خانصاحب اختر بمبئی صہ سالانہ

(۲۹) جناب نذیر احمد صاحب نذیر شیر کوٹی صہ سالانہ

(۳۰) جناب صبغۃ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی صہ سالانہ

(۳۱) جناب صاحبزادہ سیٹھ اکبر علی صاحب بھنڈارہ صہ سالانہ

(۳۲) جناب طالق ہمدانی لدھیانوی صہ سالانہ

(۳۳) جناب سبحان خان صاحب غافل بیتول صہ سالانہ

(۳۴) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی کوٹا ہہ صہ سالانہ

(۳۵) جناب حبیب حسن خانصاحب حبیب شاہجہانپوری (کوئٹہ) صہ سالانہ

(۳۶) جناب بابو فقیر محمد خانصاحب عارف سیالکوٹی (کوئٹہ) صہ سالانہ

(۳۷) جناب شیو پرشاد صاحب برگ باندوی صہ سالانہ

(۳۸) جناب حکیم ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب زار کاندہلوی صہ سالانہ

(۳۹) جناب علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی صہ سالانہ

(۴۰) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب قاعر نہٹوری صہ سالانہ

(۴۱) ابوالافتخار ڈاکٹر ایس۔ ایم محمود صاحب شاہجہانپوری ادیب تام فاضل گیانی کوئٹہ صہ سالانہ

(۴۲) جناب ماسٹر کالو میاں صاحب مذاق ڈبوہی (بڑودہ اسٹیٹ) صہ سالانہ

(۴۳) جناب ایم عنایت اللہ خان صاحب عنایت گورداسپوری رئیس و پنچایت کمشنر گورداسپور صہ سالانہ

(۴۴) جناب کنور فاسق علیخان صاحب عارف رئیس ہنڈو صہ سالانہ

(۴۵) جناب صوبیدار اختر علی صاحب اختر مراد (گوالیار) صہ سالانہ

جرعات

یو۔پی کا جو تھا جلیل القدر شاعر خاکِ حیدرآباد میں

پچھلا سال دنیائے ادب و شعر کے لئے بطورِ خاص بہت نقصان رساں ثابت ہوا تھا۔ مولانا فرید دہلوی، حضرت فانی بدایونی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، ڈاکٹر ٹیگور، ڈاکٹر سر گنگا ناتھ جھا وائس چانسلر الٰہ آباد یونیورسٹی جیسی بلند پایہ ہستیاں ہم میں سے اٹھ گئیں، یہ تو ظاہر ہے کہ اس نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی لیکن جس تیزی کے ساتھ ہندوستان کے مایۂ ناز اساتذۂ سخن، ادبا اور مشاہیر اٹھتے چلے جا رہے ہیں، اس کا خیال بھی اب تو کرب و بے چینی پیدا کر دیتا ہے اور مجبوراً پرستارانِ کمال دل تھام کر رہ جاتے ہیں۔

جنوری ۱۹۴۲ء نے **سر اکبر حیدری** کی وفات سے ہر طبقہ اور ملک کے افراد کو مغموم کیا لیکن ادبی اور شعری دنیا میں اس اطلاع سے یقیناً رنج و افسوس کی ایک لہر دوڑ گئی ہے کہ ۱۸ جنوری ۴۲ء کو اردو کے مشہور شاعر اور یادگارِ حالی حضرت حکیم **آزاد انصاری** نے بھی حیدرآباد دکن میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ابھی چند دن ہوا ایک صاحب نے اس سانحہ کی اطلاع دی تھی لیکن یقین نہیں آتا تھا اس لئے کہ علاوہ پرچہ جات میں حضرت آزاد انصاری کی وفات کی اطلاعات نہیں آئیں۔ اب معاصر محترم ساقی دہلی سے اس جانکاہ اطلاع کی تصدیق ہوئی۔

حضرت آزاد انصاری سہارنپوری مسلم الثبوت استاد اور کاملینِ فن میں سے تھے، ان کا تغزل ایک خاص اسلوب کا حامل تھا۔ افسوس کہ دنیا والوں نے ان کی قدر نہ کی، مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری چند سال بڑی کس مپرسی میں گزارے، دمہ کے مریض تھے، آخر دسمبر تک وہ دہلی ہی میں مقیم تھے، شروع جنوری میں مرض کا زور ہوا اور خاکِ دکن انھیں دہلی سے حیدرآباد کھینچ لے گئی جہاں داغ، امیر اور فانی آسودہ ہیں وہیں یو۔پی کا یہ آفتاب بھی جا چھپا۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون"۔

حضرت قبلہ مولانا سیماب مد ظلہ نے مرحوم کے لوحِ مزار کے لئے یہ قطعۂ تاریخ مرحمت فرمایا ہے

هو الباقی

تیس ذی الحجہ کو یکشنبہ کے دن	ہو گئے خلد میں آباد آزاد
آہ وہ بزم نشینِ حالی	طرزِ اسلوب کے استاد آزاد
بھول سکتی نہیں دنیائے ادب	آئیں گے سب کو بہت یاد آزاد
حیدرآباد ہی میں دفن ہوئے	بس کہ یو۔پی سے تھے ناشاد آزاد

کہا سیماب نے سالِ ترحیل
"بارِ غم سے ہوئے آزاد آزاد"

۱۳۶۰ھ

اپریل کے "شاعر" میں مرحوم کے مفصل سوانحِ حیات پیش کئے جائیں گے۔ ادبا اور شعرا سے گزارش ہے کہ وہ یو۔پی کے اس جلیل القدر شاعر کے تمام گوشہ ہائے کمال پر روشنی ڈال کر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیں۔ مرحوم کا صحیح تر مطالعہ کرنے والے ... انکی زندگی میں جیسا کہ ہم نے عرض کیا ... تو اب مرنے کے بعد ہی ان کی ادبی خدمات پر خراجِ تحسین دیں۔

کچھ "شاعر" کے متعلق

عام طور پر علمی و ادبی ادارے اور اردو داں طبقے کی مجبوری شاکی ہیں، یہ مجبوری کشمکشِ روزگار کا نتیجۂ لازمی ہے اس لئے نہ شکوہ کی گنجائش ہے اور نہ شکایت کا موقع۔ سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں، کوئی طوفان سے ہمکنار ہونے میں لذت محسوس کر رہا ہے اور کوئی اذیت، کسی میں ہاتھ پاؤں مار کر نکل جانے کی قوت ہے اور کوئی طوفان کے تھپیڑے سے مجالِ سرتابی نہیں رکھتا۔ جنگ کی ہولناکیاں سبھی کو متاثر کئے ہوئے ہیں۔ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ، زمانۂ انقلاب میں فرائض سے غافل ہونا دانشمندی نہیں، ادب قوموں کی زندگانی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس کی بقا ثبوتِ زندگی، اگر یہی لیل و نہار ہے اور اردو داں طبقہ کی غفلت کا یہی عالم رہا تو وہ زمانہ دور نہیں کہ اردو کے متعدد رسائل کچھ مدت کے لئے بند ہو جائیں۔ آخر کہاں تک نقصان برداشت کیا جائے گا۔

ویلیوں کی واپسی، نمونوں کا مفت مطالبہ، جوابی امور کے لئے ٹکٹ نہ بھیجنا، خریداری کا اعادہ نہ کرنا یہ سب ایسی صورتیں ہیں جو بڑھتے بڑھتے ناقابلِ برداشت ہو سکتی ہیں کاش ناظرین "شاعر" نزاکتِ وقت کا احساس فرمائیں۔ دسمبر ۴۱ء اور جنوری ۴۲ء کے "شاعر" میں "جرعات" کے تحت جو گزارشات پیش کی گئی ہیں، ادارہ ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ناظرین سے ملتجی ہے۔

دسمبر ۴۱ء تک دفتر "شاعر" میں سیکڑوں نظمیں اور غزلیں اشاعت کیلئے جمع ہو چکی ہیں اور ان کا شائع نہ ہونا شعرا کی دل شکنی کا باعث ہے لہذا عام شعرا تین ماہ تک اب اپنی غزلیں اور نظمیں اشاعت کے لئے نہ بھیجیں، اساتذہ اور مشاہیر نظم نگار اس قید سے بری ہیں۔

ادارہ جناب محبوب حسن صاحب آسی متوطن رڑکی حال مقیم بمبئی کا ممنون ہے کہ موصوف نے ازراہِ ادب نوازی "تحفۂ انسانِ ادب" میں شمولیت فرما کر شکریہ کا موقع دیا ہے۔

ہدیۂ تشکر

میں اپنے معنوی بھائیوں اور احباب کا بیحد ممنون ہوں کہ انھوں نے میری اہلیہ کے زمانۂ علالت میں مخلصانہ پرسشِ حال سے اپنے خلوص و محبت کا بہترین ثبوت دیا، خدا کے فضل و کرم سے میری اہلیہ اب بالکل اچھی ہو چکی ہیں۔ مرض کی خطرناک صورت اور مایوس کن حالت میں جب مقامی اطبا ناکام ہو گئے تو مجبوراً میں انھیں دہلی لے گیا، مجھے بیحد مسرت ہے کہ محترمی حکیم حاجی عبدالمجید صاحب دہلوی مالک "ہمدرد دواخانہ" دہلی نے غیر معمولی توجہ سے کام لیکر ناامیدیوں میں امید کی جھلک پیدا کر دی، میں حکیم صاحب موصوف کی عنایات کے بوجھ سے دبا جا رہا ہوں اگر حکیم صاحب کی فوری توجہ شاملِ حال نہ ہوتی تو شاید اس شکریہ سرور کی نوبت نہ آتی۔ حکیم صاحب کے متعلق میں نے جیسا سنا تھا اس سے کہیں زیادہ پایا۔ حکیم صاحب کی ذات اور ان کے دواخانہ سے ملک کو جو فائدہ پہنچ رہا ہے وہ ایک یادگار چیز ہے۔

اعجاز صدیقی

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

فطرت کی ہمہ گیر جو رعنائی ہے
قسمت میں دیارِ ہند کے آئی ہے
گوتم اور کرشن نے حیاتِ ابدی
میرکز ہی وطن کی گود میں پائی ہے

انگلینڈ وفاکیش اسے کہتا ہے
رشیا بھی خوش اندیش اسے کہتا ہے
عظمت ہے مرے وطن کی سب کے دل میں
جاپان، "گرودیش" اسے کہتا ہے

یہ ہند جو ایشیا کی اک جنت ہے
انوار بدوش مشرقی عظمت ہے
ہر شام اک اندیشۂ فردا ہے یہاں
ہر صبح اک انقلاب کی دعوت ہے

خوں ریختہ پیرہن بدل کر آئے
تسکین کی رفتار سے چل کر آئے
ہے دعوتِ انقلاب منظور مگر
کہہ دو کہ ذرا ادھر سنبھل کر آئے

سنگین و قدم گداز رستے ہیں جہاں
قہر آفریں توکمبت کے دستے ہیں یہاں
ہے عورتوں کے دلوں میں بھی جوشِ وطن
چالیس کرور مرد بستے ہیں یہاں

کر فکر نہ اس چمن میں صیادی کی
تمہید نہ ہو یہ تیری بربادی کی
ہندی ہیں غلام گو بظاہر لیکن
سینوں میں دبی ہے آگ آزادی کی

آزادی سے محروم نہیں رہ سکتے
آزردہ و مظلوم نہیں رہ سکتے
احساس جنھیں اپنی غلامی کا ہے
تا دیر وہ محکوم نہیں رہ سکتے

احساسِ گرانی و گرانباری ہے
جذبہ فکر اور سعی کا طاری ہے
سب جاگ رہے ہیں کوئی غفلت میں نہیں
اب خواب کہاں، ساعتِ بیداری ہے

دنیا میں سکوں کی باریابی ہو جائے
قسمت ہے خرابی تو خرابی ہو جائے
جب ہوتی ہے صبحِ نو تو کہتا ہوں میں
یارب یہی صبح "انقلابی" ہو جائے

تحویل ہے نشأۂ الٰہی میں ابھی
ڈوبا نہیں خورشید سیاہی میں ابھی
ہر چند کہ یکجا ہیں زحل اور مریخ
تاخیر ہے دنیا کی تباہی میں ابھی

سیماب

شخصیات :- اعتبار الملک حکیم ضمیر حسن خاں صاحب دلؔ شاہجہانپوری

ستمبر ۱۹۳۶ء کے شاعر میں حضرتِ دلؔ شاہجہانپوری کے تفصیلی حالات شائع ہو چکے ہیں لیکن اس کے ساتھ تصویر شائع نہیں ہوئی تھی آج ادارہ موصوف کی تصویر اور مختصر حالات شائع کرنے کی مسرت حاصل کر رہا ہے۔

حضرتِ دلؔ ۱۸۸۵ء میں شاہجہانپور کے ایک معزز اور ممتاز خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرتِ شاہ قاسم سلیمانیؒ سے ملتا ہے، ہر دور میں علم و فضل، بزرگی اور جاہ و جلال آپ کے خاندان میں پایا گیا ہے، آپ کے خاندان کو تصوف سے خاص لگاؤ رہا ہے۔ حضرت شاہ قاسم سلیمانیؒ اپنے وقت کے بلند پایہ بزرگ اور مشائخ میں سے تھے۔ بحرِ ذخار میں شاہ صاحب قبلہ کے مفصل حالات موجود ہیں۔

حضرتِ دلؔ نے ابتدائی تعلیم کی منازل گھر ہی میں طے کیں۔ پندرہ سال کی عمر میں شاعری کا ذوق پیدا ہوا کئی سال تک کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا، شاعروں میں ذاتی انتخاب سے بغیر اصلاح غزلیں پڑھیں لیکن استادِ کامل کی جستجو برابر رہی۔ آخر کار آپ نے اپنے کلام کی اصلاح کے لئے حضرتِ امیر مینائیؒ کو منتخب کیا۔ کچھ عرصہ تک خط و کتابت کے ذریعہ یہ سلسلہ جاری رہا اس کے بعد آپ خود رامپور تشریف لے گئے اور استاد کی زیارت کی حضرتِ امیر مینائیؒ بڑی شفقت سے پیش آئے اور فرمایا "ضمیر تمہاری شوخیِ طبیعت ظاہر کر رہی ہے کہ دنیائے شاعری میں تمہارا مستقبل بہت نمایاں ہوگا، لیکن شاعری کے لئے علمی استعداد کی کافی ضرورت ہے لہٰذا اس طرف توجہ لازمی ہے۔"

فارسی کتبِ درسیہ کی تو آپ تکمیل کر چکے تھے، استاد کے ارشاد کے مطابق عربی تعلیم بھی شروع کر دی مدرسہ سعادت العلوم شاہجہانپور میں داخل ہو گئے اور مولوی سید محمد علی خاں سے استفادہ کیا۔ ملا حسن دیوبندی و مولوی نادر الدین صاحب شاگرد رشید شمس العلماء علامہ عبدالحق خیر آبادی سے بھی تعلیم حاصل کی فقہ کی تکمیل کے بعد مشکوٰۃ شریف و تفسیر جلالین مولوی بشیر احمد صاحب مراد آبادی اور مولوی عبدالباسط صاحب شاہجہانپوری سے پڑھیں۔ از آں بعد علم طب کا درس جو خاندانی مشغلہ ہے، شروع کیا، قانون کا کچھ حصہ مولوی حکیم ..... صاحب شاگرد رشید حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں دہلوی سے کیا۔ ان کے انتقال کے بعد حکیم محمد بشیر الدین خاں صاحب نائب افسر الاطبا، ریاست بھوپال کے مطب میں عملی مشغلہ شروع کیا تین سال تک حکیم صاحب کے زیرِ ہدایت کام کرتے رہے اور اُس وقت سے اب تک بغیر کسی ذاتی منفعت کے بغرض رفاہِ عام طب کا مشغلہ جاری ہے۔

حضرتِ امیر مینائیؒ کے انتقال کے بعد آپ نے کسی سے مشورہ نہیں لیا۔ چونکہ حضرتِ دلؔ دولت علم و فضل سے مالا مال تھے اور عروض و بیان پر قدرت حاصل ہو چکی تھی اس لئے کچھ زمانے کے بعد ہی آپ کا شمار بلند شعرا میں ہونے لگا اور رفتہ رفتہ آفتابِ شہرت نصف النہار پر پہونچ گیا۔

حضرتِ دلؔ چوٹی کے اساتذہ میں سے ہیں۔ آپ کے تلامذہ کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے اور بہت غور و فکر کے ساتھ اصلاح دیتے ہیں۔ اصنافِ سخن میں سب پر ملکہ ہے لیکن غزل بطورِ خاص اچھی کہتے ہیں۔ نہایت خلیق، ملنسار اور بلند اخلاق بزرگ ہیں۔ عیب جوئی کی مطلق عادت نہیں اور نہ اعتراف کمال میں آپ جھجک محسوس کرتے ہیں۔ آپ کا ایک دیوان شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا زیرِ طبع ہے۔

شاعری میں مومنؔ کے رنگِ تغزل کا اتباع محبوب ہے۔ قدیم تغزل خیالات اور رجحانات کے اعتبار سے محدود ہے ان حدود میں رہ کر حضرتِ دلؔ نے اپنے میدانِ فکر کو وسعت دی ہے یعنی قدیم خیالات اور جذبات کو نئے رکھ رکھاؤ اور پُر تاثیر الفاظ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پختگی، روانی اور معنی آفرینی سب ہی کچھ آپ کے کلام میں موجود ہے۔ سوز و گداز کو آپ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ موصوف کا ہلکے سے ہلکا شعر کچھ نہ کچھ اثر ضرور رکھتا ہے۔ آپ کے یہاں تغزل کا موضوع وہی ہے جو داغؔ اور امیرؔ کے یہاں تھا لیکن اس میں سنجیدگی اور علوِ فکر نے بلندیاں پیدا کر دی ہیں۔

"شاعر" میں حضرتِ دلؔ کا کلام اکثر شائع ہوتا رہتا ہے، میں بطورِ نمونہ کلام یہاں چند ایسے اشعار پیش کرتا ہوں جو بہر اعتبار تغزل کا نادر ترین نمونہ ہیں۔

ہر سجدہ نماز ہے محرومِ آستاں ۔۔۔ میری جبیں کا اب کوئی حاصل نہیں رہا
کیا کہئے اب مآلِ محبت کی سرگذشت ۔۔۔ یاد اُس کی رہ گئی ہے مگر دل نہیں رہا

تکمیلِ وفا سمجھیں اے کاش تری نظریں ۔۔۔ مٹتا ہوا اک دل ہوں جاتی ہوئی دنیا ہوں
اک ہستیِ بے مقصد اک مقصدِ بے حاصل ۔۔۔ جس حال میں ہوں اب تک ناکامِ تمنا ہوں

سرگذشتِ ناکمل، واقعاتِ ناتمام ۔۔۔ ایک افسانہ ہے دنیا، دوسرا افسانہ ہم

پاس رہ کر بے تکلف ساتھ رہ کر یہ حجاب ۔۔۔ میرا اُن کا فاصلہ گویا کئی منزل کا ہے
سینہ مجروح سے اے چارہ گر پیکاں نہ کھینچ ۔۔۔ ناشناسِ راز یہ ٹکڑا تو میرے دل کا ہے
شمع پروانہ بنے، پروانہ جل کر خاک ہو ۔۔۔ یہ تقاضا تھا لئے گرمیِ محفل کا ہے

قدم قدم پہ بہارِ تازہ، نشاطِ تازہ حیاتِ تازہ ۔۔۔ رہِ محبت کی لغزشوں میں سکونِ خاطر بھی پا رہا ہوں
مری تمنا وہ دائرہ ہے نہ جس کا اول نہ جس کا آخر ۔۔۔ کہ جن حدود سے گذر چکا تھا انھیں حدوں میں پھر آ رہا ہوں

اعجاز صدیقی

"کمالاتِ کمالی تحقیق و تصحیح کی روشنی میں"

(گذشتہ سے پیوستہ)

بہائم ہی نے قدموں پہ سر رکھنے کی کاوش کی — صحابہ نے بھی سمت مصطفےٰ سجدہ کی خواہش کی
رکوع و سجدہ یا جو اور ہوں وضعیں پرستش کی — حقیقت میں ہیں یہ سب نیازِ دل کی آزمائش کی

خدا جانے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا — بھان متی نے کنبہ جوڑا

نیز ادبی حیثیت سے دیکھئے

کیا یہاں کاوش کا محل استعمال صحیح ہے، تیسرے مصرعہ میں "یا جو اور ہوں" کہیں فصاحت تو نہیں ہے؟ "کی آزمائش کی" سماعت پر بار تو نہیں گذرتا؟

وہ سجدہ آج ہے جو ناسزا کو ناگوارا ہے — مگر آدم کا ذکر افسانۂ تکوین کا ٹکڑا ہے
وہی کل تھا میں کیونکر مان لوں جو آج ہوتا ہے — ازل کی بات وہ تھی اور یہ ترکیب دینا ہے

آپ کی قادر الکلامی کی تو داد ہی نہیں دی جا سکتی بجز طبیعت تو آپ نے نام کو نہیں "وہ سجدہ آج ہے" "وہی کل تھا جو آج ہوتا ہے" کس قدر لطیف ٹکڑے ہیں جن پر فصاحت ہی نہیں قواعد بھی مع اپنے تمام اصولوں کے قربان ہو رہی ہے اور شعریت کی دیوی تو آپ کے ہر مصرعہ میں انگڑائی لے رہی ہے۔ چوتھے مصرعہ میں آپ نے بڑی ترکیب کے ساتھ بات کے مقابلہ میں ترکیب کا لفظ رکھا ہے "ازل کی بات" اور "ترکیب دینا" اے سبحان اللہ۔

یہی جذبہ یقیناً فطرتِ عشقِ مجازی ہے — مگر آدم کو سجدہ مستقل بندہ نوازی ہے
پس و پیش عز از دل ایک طرزِ حیلہ سازی ہے — جواز سجدہ مرآۃ جمالِ بے نیازی ہے

اگر کوئی صاحب جذبہ کی تفصیل دیکھنا چاہیں تو مولانا سیماب مدظلہٗ کی نظم پڑھیں۔ کمالی کا کمال صرف اشارہ کرتا ہے۔ اگر ایک مصرعہ دوسرے سے مربوط نہیں ہے تو نہ ہو خیر ہے اور موزوں ہے اسی کو غنیمت جانئے۔ کمالی صاحب نے جواز سجدہ میں دو چیزیں پیش کی ہیں "مستقل بندہ نوازی" اور "مرآۃ جمالِ بے نیازی" ان میں اجمال نہیں بلکہ یہ خود ساختہ متصوفانہ اصطلاحیں ہیں جو کمالِ علم و ادراک کے بعد سمجھ میں آ سکتی ہیں اور وہ صرف حضرت کمالی میں ہے۔

یہاں ہوتے ہیں "وہ" "تم" اور تمہارے جاننے والے — نیازِ ان جاکو دھکّے پڑتے ہیں پالے
حقیقت کو جو دل دے بازو دعویٰ کی قسم کھاتے — نہیں تو جان کے بھی غالباً پڑ جائیں گے لالے

آپ یہ بند پڑھ کر کیوں مسکرا رہے ہیں کیا یہ غیر موزوں ہے۔ "وہ" پر غور نہ کیجئے "وہ" سے تو مصرعہ پورا کیا گیا ہے۔ رہا زبان کا سوال تو زبان ان چار مصرعوں ہی کی کیا پوری نظم کی داد کے قابل ہے۔ آخر تو بہلد کے ایک صاحبِ کمال کی زبان ہے۔

انھیں چاہو خدا اُن کے جاننے والوں کو بھی چاہو — جنھیں چاہیں وہ ان سے بھی نہ جھگڑا و حق آگاہ ہو
یہ سب کچھ بس وہی وہ ہیں بھلا میں کون تم کیا ہو — وہ جلوہ جس نے اک اک رُخ منظرِ تماشا ہو

ہر بند کی طرح اس بند کا مطلب بھی وہ ہی سمجھ سکتا ہے جس میں مجذوب کی بڑ سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ پہلے مصرع میں "اور اُن کے" دوسرے میں "نہ جھگڑا" تیسرے میں "یہ سب کچھ بس" اور چوتھے مصرعہ میں "وہ ہوں جس نے رخ" خاص طور پر داد طلب ہیں۔

مجازِ مضطر و حُسنِ حقیقی یا وہ اطلاقے — جمالِ ذات گنجائش نیابد اندر آفاقے
مجو ہموارہ ذوق جلوہ مختلفے بہ مختلفے — الا ابلیس و آدم امتیازی نہ در اخلاقے

کمالی صاحب آپ کے اُردو اشعار ہی میں زبان کے کب کیا کم ہیں۔ غریب فارسی کو تو بخشئے یہ آپ کی ٹیڑھی ترچھی چالوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ "مجازِ مضطر" یعنی چہ؟ چوتھے مصرعہ میں "نہ" پر تو غور فرمائیے یہ بُری طرح کُب پیدا کر رہا ہے ایکی "ہ" الف سے بدلی جا رہی ہے، اور اگر اسے "نہ" نہادن کا امر سمجھا جائے تو "امتیاز نہادن" شاید کمالی صاحب کے گھر کی فارسی ہو گی۔ اس کے علاوہ ان چاروں مصرعوں کی نثر یا ترجمہ کیجئے تو انشاء اللہ آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے۔

پسند سرخی مضمون موحد پھر سرِ اعظم — نکالے آپ نے شیطان کو بزمِ خرابے کے کیا کم
نہیں عشق حقیقی کے منافی سجدۂ آدم — مرے اس قول کا ضامن ہو ... عالم

کیوں کمالی صاحب! آپ کے پہلے مصرعہ میں فعل معاون کون سا ہے۔ کیا اس میں پسند کے آتے ہے "یا "ہو" یا "تھی" یا "تھی" کی کیضرورت تو نہیں اور پھر "مصرعۂ علم کا ٹکڑا" کوئی الجھن تو پیدا نہیں کرتا؟ دیکھئے موصد اور علم کے ابین آپ نے کتنا بُعد پیدا کر دیا۔ کیا یہ عجزِ طبیعت اور "تعقید لفظی" نہیں؟

سرخاب کا پر لگانا محاورہ ضرور ہے لیکن اوّل تو آپ نے محاورے میں رد و بدل کیا جو جائز نہیں "آپ نے شیطان کو سرخاب کے پر کیا کم لگائے"۔ یہ ہے آپ کے مصرعہ کی نثر! آپ نے محاورہ مروجہ میں "کیا کم" اضافہ کر دیا ہے اور پھر محاورے کا محل استعمال بھی صحیح نہیں۔ آپ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو شیطان کی کچھ اور بھی خوبیاں معلوم ہیں۔ مولانا سیماب نے ابھی پوری خوبیاں نہیں بتائی ہیں اسی لئے آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے کیا سرخاب کے پر لگا دیئے یہ خوبیاں تو موجود ہی ہیں کچھ اور بتائیے۔

آپ کے تیسرے مصرعہ میں بھی "الجھاؤ" ہے منافی کے محل استعمال میں غرابت نمایاں ہے" سجدۂ آدم " کہہ کر آپ تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آدم کے لئے یا آدم کو جو سجدہ کیا گیا لیکن آپ کے پیش کردہ الفاظ "آدم نے جو سجدہ کیا یا آدمی جو کرتا ہے" کے ترجمان ہیں چوتھے مصرعہ میں اذن کو ضامن کہا ہے۔ یہ آپ ہی کا کام ہے۔ حالانکہ ضامن کی جگہ ثبوت ہونا چاہئے جو آپ نہ لاسکے یہ بدترین شاعرانہ کمزوری ہے۔

یقین مرضیٔ رب سجدہ ہو آلائشِ شرکت — سکون یکگی کا نام رکھئے جنبشِ شرکت

ہم وحدت کی موجوں پر گمانِ جوششِ شرکت — احد کے سکۂ رائج میں تنقیدِ غشِ شرکت

قطع نظر شعری فقدان کے ہر مصرعہ میں لغوی اور اصطلاحی غلطیاں کمالی کے کمال پر مسکرا رہی ہیں۔

غور فرمائیے:—

پہلے مصرعہ میں آلائشِ شرکت آلودہ شرکت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

دوسرے مصرعہ میں "سکون یکگی " خدا جانے کیا لفظ ہے۔ یہ کاتب کی غلطی ہے یا صاحبِ کلام کی؟ بہر حال اسے چھوڑیئے "جنبشِ شرکت" پر مزید غور کیجئے مگر یہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئیگا یہ تو لغات کا لیکا لفظ ہے۔

"گمانِ جوششِ شرکت" اور "تنقیدِ غشِ شرکت" بھی اسی قبیل کی ترکیبیں ہیں۔ اور پھر سب سے بڑا لطف یہ ہے کہ ان چاروں مصرعوں کے پڑھنے کے بعد آپ کو کمالی صاحب کو مطلب دریافت کرنے کے لئے تلاش کرنا پڑیگا۔

یہ اچھا واسطہ تھا عاشقِ من حسن و الفت کا — کہ عدواں پر جما جا کر قدم بیہودہ جرأت کا

ہُوا ہو اس قیامت زا تقاضائے محبت کا — ہمیشہ کے لئے گردن میں ڈالا طوق لعنت کا

پہلے مصرعہ میں عاشقِ من کو ٹھونس کر اور دوسرے مصرعہ میں عدواں کے نون کو غنہ کرکے کمالِ فصاحت کا ثبوت دیا گیا ہے۔

تیسرے مصرعہ میں قیامت زا کے ٹکڑے نے میدانِ فصاحت میں جتنی قدر قیامتیں اُٹھائی ہیں۔ اُسے اہلِ نظر ہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ چوتھے مصرعہ میں مفعول محذوف ہے لعنت کا طوق کس کی گردن میں ڈالا گیا۔ مصرعہ میں یہ نہیں بتایا گیا۔

اس سے قبل بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ کمالی صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک خاص مفہوم ذہن میں رکھ کر شعر کہتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اِن کا سوچا ہوا مفہوم ان کے موزوں کئے ہوئے شعر سے ظاہر بھی ہوا یا نہیں۔ خیر سے آپ نے طبیعت نہایت بُجھی ہوئی پائی ہے۔ شعریت کا فقدان لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔ اُلجھاؤ۔ اہمال۔ تعقید غرابت اور غلط محاورے آپ کی تمام نظم پر چھائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ آپ نے حسب عادت علامہ سیماب کے اس ایک گرانقدر شعر؂

جبینِ حسن پہ لاکھوں شکن آئیں ادا یہ ہے
مگر عاشق نہ چھوڑے وضع کو اپنی وفا یہ ہے

کے جواب میں مندرجۂ ذیل تین بند موزوں فرمائے ہیں؂

تو صد کی غضبناکی بھی ہے فاعل تقاضا یہ ہے — لقب چینِ جبینِ ناز کا بانکی ادا یہ ہے

لگاوٹ بھی مناسب ہے کبھی تو بھی بجا یہ ہے — فریضہ عاشقی کا شدتِ ضبط و وفا یہ ہے

گر یکیا کہا عاشق نہ چھوڑے وضع کو اپنی — وفاداری سے ہٹ کر اور بھی کچھ وضع ہے اسکی

سُنی جاتی تھی اب تک عشق بازی کی یہ پابندی — کہ فرمائش جو ہو محبوب کی کیجائے سب پوری

انوکھی عشق کی یہ وضع یہ اُلفت نرالی ہے — کہ اُس نے خود خدا کی بات مکاری کی ٹالی ہے

نہ معلوم آپ کا کیا فلسفہ کیا رائے عالی ہے — مرے نزدیک تو یہ رنگِ جدتِ لاابالی ہے

(باقی۔ باقی)

صبا متھراوی

سلام

گیا عشرہ، مگر ہوں محرمی میں خستہ جاں ابتک
کوئی رہ رہ کے دل میں لے رہا ہے چٹکیاں ابتک

زمینِ کربلا ہے لالہ خیز و گل فشاں ابتک
ہیں اک افسانۂ خونیں کی باقی سرخیاں ابتک

نہ جانے کتنی تکبیریں کہی تھیں کعبے والوں نے
ہوا کی موج سے آتی ہے آوازِ اذاں ابتک

الٰہی کربلا میں کس بلا کی گردش آئی تھی
لیا کرتا ہے کروٹ انقلابِ آسماں ابتک

ابھی ہیں یاد شب بیداریاں سبطِ پیمبرؐ کی
ملا کعبے کو پھر ایسا نہ کوئی پاسباں ابتک

جہاں خونِ اہلِ بیتِ مصطفٰےؐ کا رنگ لایا تھا
سنا ہے دور تک سبزہ نہیں اگتا وہاں ابتک

حسینؑ ابنِ علیؑ نے جن پہ اپنا سر جھکایا تھا
جھکا کرتا ہے ان ذرّوں پہ فرقِ دو جہاں ابتک

فرات ابتک ہے محرومی پہ اپنی شعلہ در دامن
مثالِ موج اسکے دل سے اٹھتا ہے دھواں ابتک

نمازِ فجر ادا کی تھی جہاں اللہ والوں نے
نسیمِ صبح دیتی ہے وہاں آکر اذاں ابتک

جو لے کر کارواں منزل پہ پہونچا چند ساعت میں
ہوا پیدا نہ پھر ایسا امیرِ کارواں ابتک

شفق ہر شام کو خونابۂ نو بھر کے لاتی ہے
دکھاتی ہے کہ دامن شام کا ہے خونچکاں ابتک

بقا کی روشنی، تجھ کو فنا میں کیا نظر آئے
کہ تو ہے ناشناسِ انقلابِ جسم و جاں ابتک

جو تیرہ سو برس پہلے چلے تھے جادۂ حق پر
انھیں کے نقشِ پا ہیں کارواں در کارواں ابتک

چمن والوں نے جس کو جان دے دے کر دبایا تھا
وہی شورش ہے جاری بر بنائے آشیاں ابتک

ہوا کرتا ہے ماتم نزہتِ رفتہ کا سالانہ
خزاں کا روپ بھرتی ہے بہارِ گلستاں ابتک

بغیر سر فروشی، وہم ہے آزادیِ ملت
مگر سمجھا نہیں اس راز کو ہندوستاں ابتک

گراں ہیں جانِ ہستی پر یزید اس دورِ ناقص کے
بہانے ڈھونڈتی پھرتی ہے مرگِ ناگہاں ابتک

یقیناً ایک ضربِ حیدریؑ کی پھر ضرورت ہے
کہ باطل لے رہا ہے نزع کی سی ہچکیاں ابتک

اگر لنگر نہ بن جاتیں، گراں لاشیں شہیدوں کی
تو ہو جاتی یہ دنیا زلزلوں سے رائیگاں ابتک

حسینؑ اپنا لوائے حریت لے کر پھر آ جاؤ
غلامی کی تہوں میں قید ہیں آزادیاں ابتک

وہی ظلم اور وہی مظلومیت، سیماب کیا کہئے
کسی کا منتظر ہے انقلابِ آسماں ابتک

سیماب اکبرآبادی

ایک غزل اور اسکی تشریح

(یہ مضمون ریڈیو کی فرمائش پر لکھا گیا تھا، لیکن بوقت نشر مصلحتاً اسے بالکل تبدیل کر دیا گیا۔)

جناب شائستہ اختر سہروردی نے اپنے ایک مضمون میں جو دہلی کے شملا اسٹوڈیو سے براڈ کاسٹ ہوا تھا، نہایت آزادی کے ساتھ کہا تھا کہ "انسان کا دل متضاد اور مختلف جذبات کی جولانگاہ ہے۔ اس کا سمجھنا اور دوسرے کو سمجھانا لٹریچر کا سب سے اہم فرض ہے لیکن ہمارا ادب اس فرض کو ادا نہیں کرتا۔ کیونکہ ہمارا ادب زندگی کا صحیح ترجمان نہیں۔ جس قسم کا سکر آمیز لٹریچر ہم پیدا کر رہے ہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا اور نہ یہ حقیقت سے بیگانہ شاعری کبھی دوام حاصل کر سکتی ہے۔ شاعر شعر کہتے ہیں لیکن سمی طور پر، ناول نویس ناول لکھتے ہیں رسمی شکنجے کے اندر۔ ڈرامے کی تو وہ خستہ حالت ہے کہ اس کے بارے میں تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ البتہ چند باہمت ہستیاں اس ڈگر سے علیحدہ ہو کر کچھ لکھنے اور کہنے لگی ہیں"

میں تو اپنی زبان سے کہہ نہیں سکتا کہ میں بھی انھیں باہمت ہستیوں میں سے ہوں جن کا اعتراف مسٹر سہروردی کو ہے۔ لیکن مجھے اپنی ذات پر اتنا اعتماد ضرور ہے کہ میں نے یا میرے اسکول نے ادب شاعری سے رسمی و تقلیدی عنصر کو جزو فضول سمجھ کر خارج کر دیا ہے اور گو بقول مولانا نیاز فتحپوری، حقائق و معارف کی ترجمانی میں یگونہ خشکی اور بدمزگی سامعین ناظرین کو محسوس ہوتی ہے، مگر شاید حقیقتوں کا کانوں تک پہونچ جانا ہی اس بے کیفی اور بدمزگی کی تلافی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ ریڈیو تفریح خاطر کے لئے سنتے ہیں۔ شاعروں میں حظ سماعت کے لئے شریک ہوتے ہیں اور شعراء کے دیوان اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ شاید ان میں کوئی شعر جذبات کو برانگیختہ کرنے والا مل جائے لیکن آپ کا یہ رجحان عارضی اور ہنگامی ہوتا ہے۔ اور آپ کے منشا کی تکمیل آپ کو کوئی حقیقی کیف، کوئی یقینی آسودگی، اور کوئی واقعی مسرت نہیں پہونچا سکتی۔

اس کے برعکس جب آپ کے کان کسی حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں یا جب کوئی واقعیت ساز و سخن کے ذریعہ آپ کی سماعت سے گذر کر آپ کی روح تک پہونچ جاتی ہے تو اس کا اثر دیرپا اور نتائج دور رس ہوتے ہیں۔

اردو شاعری ایک "وراثت" ہے۔ جو متقدمین شعرائے اردو سے ہمیں ملی ہے اس "وراثت" میں بتدریج اضافے اور تجزیے ہوتے رہے ہیں۔ بہت سی زمینیں جو بنجر تھیں بیکار کر دی گئیں، بہت سے پودے جو کرم خوردہ تھے جڑ سے اکھاڑ دیئے گئے۔ پرانی زمینوں میں نیا بیج اور نئی کھاد ڈالی گئی۔ وقت اور موسم کے لحاظ سے ان کی آبیاری کی گئی اور انھیں اس قابل بنا دیا گیا کہ وہ مستقبل میں آنے والی نسلوں کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہو سکیں۔

جو لوگ موجودہ شاعری میں ولی اور میر کا رنگ ڈھونڈتے ہیں۔ ان کی ماضی پرستی اور رجعت پسندی قابل رحم ہے۔ ولی اور میر تو درکنار، اب اردو شاعری میں داغ و امیر و جلال کے اسالیب و رجحانات تلاش کرنا بھی دفتر ادب کی "دیمک" بننا ہے۔ اب زمانہ کچھ اور ہے وقت بدل چکا ہے۔ ہماری شاعری کی قدریں بھی اپنی قدر و قیمت بدل چکی ہیں۔ اب زندہ اور جاندار شاعری کا معیار یہ ہے کہ اس میں عصری رجحانات ہوں شعر اور زندگی میں ہم آہنگی ہو اور جس دور سے ہم گذر رہے ہیں اس دور کی حقیقتیں ہمارے کلام سے واضح ہوتی رہیں۔

اب تو غزل بھی صرف کائنات کے جمالیاتی تجزیے تک محدود نہیں ہے۔ جو لوگ اسے محدود کئے ہوئے یا محدود سمجھے ہوئے ہیں۔ ان کے ضمیر سے پوچھئے کہ شاعروں میں حقائق و معارف کی ترجمانی کے دوش بدوش وہ اپنی پرانی ڈفلی بجاتے ہوئے کس قدر شرم و ندامت محسوس کرتے ہیں۔ یہ لوگ صحیح وارث علم و ادب نہیں ہیں۔ یہ اپنے آباد اجداد سے ملی ہوئی "وراثت" کو علی حالہ محفوظ و محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ قدامت میں اور زیادہ رنگ قدامت بھر دینا چاہتے ہیں۔ کہنگی و فرسودگی کو اور زیادہ کہنہ و فرسودہ کر دینا پسند کرتے ہیں۔ اس کے نتائج خود ان کے سامنے ہیں اور آئندہ ایک نتیجہ یہ بھی نکلنے والا ہے کہ ان کی "وراثت" ان سے چھین لی جائے گی اور اس پر وہ لوگ قابض ہو جائیں گے جو حوالی امز نعمتسے واقف اور انقلاب استداد پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب میں آپ کے سامنے اپنی ایک "غزل" پیش کرتا ہوں، یہ "غزل" اپنی معنوی حیثیت سے "غزل" نہیں ہے بلکہ صرف فنی حیثیت سے "غزل" ہے یعنی اس میں ردیف بھی ہے قوافی بھی ہیں، مطلع بھی ہے اور مقطع بھی۔ مگر موضوعاتِ غزل سے معرّا ہے۔ چونکہ اس قسم کی "غزل" کے لئے "غزل" کے علاوہ اور کوئی نیا نام ابتک تجویز نہیں ہوا ہے اس لئے مجبوراً میں بھی اسے "غزل" ہی کا عنوان دیتا ہوں۔ مطلع ملاحظہ فرمائیے۔

(۱)
دل ہے خطرے میں، زباں خطرے میں سر خطرے میں ہے
خیر کس کس کی منائیں، گھر کا گھر خطرے میں ہے

موجودہ جنگ نے "خطرہ" کے مفہوم کو اس قدر عام کر دیا ہے کہ اب اُس کی توضیح و تشریح تحصیلِ حاصل معلوم ہوتی ہے۔ ہر طرف خطرہ ہی خطرہ نظر آرہا ہے۔ جنگ کی ہولناک خبریں سن کر اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں دل بیٹھ نہ جائے۔ اس لئے دل خطرے میں ہے۔ "زباں بندی" عام طور پر ہو رہی ہے۔ اس لئے زبان بھی خطرے میں ہے۔ اور یہ خبر نہیں کہ فضائے بلند سے کب کوئی بم گر پڑے۔ اس لئے سر بھی خطرے میں ہے۔ غرضکہ انسانی ماحول خطرات میں گھرا ہوا ہے ——— کس کو بچائیے اور کس کی حفاظت کیجئے۔ ایک کو خطرے سے نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو دوسرا خطرے میں خود بخود مبتلا نظر آتا ہے۔ یہ تو ہوا خطرات کی ہمہ گیری کا اظہار،
اب دوسرا مطلع سنئے :—

(۲)
کوہ و صحرا کو ہے خطرہ، بحر و بر خطرے میں ہے
کون ہے خطرے سے باہر تو اگر خطرے میں ہے؟

انسان دوسروں کی مصیبت دیکھ کر اپنی مصیبت بھول جاتا ہے ——— "مرگِ انبوہ جشنے دارد"۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری ہی طرح دُنیا کے پہاڑ، جنگل، دریا اور سمندر سب خطرے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ سب ہم سے زیادہ مجبور ہیں کہ ہم حتی الامکان خطرات کی مدافعت تو کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ تو خاموشی کے ساتھ خطروں میں پڑ جانا ہی ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ان کی زبان سے تو ایک آہ بھی نہیں نکلتی۔ اور یہ حقیقت ہمیں یک گونہ مطمئن کر دیتی ہے کہ صرف ہمیں خطرے میں نہیں ہیں بلکہ ہماری طرح ساری کائنات خطرے میں ہے۔

تیسرا مطلع سنئے :—

(۳)
اب جانداری کا سارا کرّ و فر خطرے میں ہے
اب کلاہ و افسر و تاج و کمر خطرے میں ہے

پہلے دنیا کا دماغ ملوکیت پرست تھا، اور اب جمہوریت پسند ہے۔ حاکم اور حاکمیت کے غلبۂ امتیازی سے دُنیا آزاد ہونا چاہتی ہے۔ شخصیت پرستی اب غلامی کے مترادف ہے اور یہ ہر جہتی خطرات ملوکیت و سرمایہ داری کو فنا کر دینے میں بھی مساوی الاثر ہیں۔ ان خطرات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک دن دُنیا میں "جمہوریت" قائم ہو جائے گی۔ ہر شخص اپنے کردار و گفتار میں آزاد ہوگا اور ایک مطلق "مساوات" دُنیا کو کامل آزادی کی معراج تک پہونچا دیگی۔

(۴)
لیکن ان خطروں میں پڑنا اقتضائے وقت ہے
کیوں تو اتنا بے حواس و منتشر خطرے میں ہے

اس شعر میں "اقتضائے وقت" کا ٹکڑا ہی مقتضائے فکر ہے۔ خطرے میں خود بخود پڑنا کوئی نہیں چاہتا، لیکن کہنگی اور قدامت، یکسانیت اور جمود کے خمیر سے جو اُبھان اُٹھتا ہے اُسی میں خطرے کے جراثیم ہوتے ہیں۔ تجدید و ارتقا کی صحت بخش قوتیں ان جراثیم کا مقابلہ کرتی ہیں اور بالآخر انھیں فنا کر دیتی ہیں۔ اس لئے خطرات کی موجودگی میں ذہنی انتشار اور بے حواسی کی ضرورت نہیں ——— بلکہ "اقتضائے وقت" کا ساتھ دے کر خطرات کو شکست دینے کی ضرورت ہے۔

(۵)
مطلقاً خطروں کی شدّت پر نہیں میری نگاہ
دیکھنا یہ ہے کہاں تیری نظر خطرے میں ہے؟

میں تو شدّتِ خطرات کو کبھی نہیں دیکھتا۔ بلکہ اس شدّت کے اثر سے جو نرم و ہموار فضا بتدریج بطورِ پسِ منظر پیدا ہوتی رہتی ہے ——— میری نظریں اس کے خوشگوار نظارے میں محو رہتی ہیں۔ میں کلی کے چٹکنے سے شگفتہ دل ضرور ہوتا ہوں لیکن اُس کے پھول بنجانے کا تصور میرے دل کی شگفتگی کو فوراً شگفتگی سے بدل دیتا ہے۔ خطرات کے نتائج پر غور کرنے والے خطرات سے پیدا شدہ حوادث پر زیادہ غور نہیں کیا کرتے۔

(۶)
مشعلِ منزل ہیں خطروں کی یہ آتش کاریاں
کامیابی کا جمالِ منتظر خطرے میں ہے

شام کی اُداسی اور رات کا بھیانک پن یا "قتلِ صد ہزار انجم" اگر وقوع پذیر نہ ہو تو صبح کا روشن چہرہ دیکھنے سے دُنیا محروم ہو جائے۔ جدال و قتال، جنگ و دغا خونِ انسانی کی ارزانی۔ بموں اور توپوں کی آتش فشانی۔ یہ سب صبحِ انقلاب کے آثار

ہیں۔ دُنیا کی صبح جدید بڑی دھوم دھام اور آن بان سے آ رہی ہے۔ خطرات کے پردے میں بڑی سے بڑی قربانیوں کے انداز میں اُسے نذریں دی جا رہی ہیں۔ دُنیا کب سے ایک ایسی نورانی اور فردوسی صبح کے انتظار میں ہے جس کی روشنی امن و سکون، رجائیت و طمانیت، آزادی و آبادی اور حقیقی مسرتوں سے مالامال ہو وہ نئی صبح اسی گھنگھور اندھیرے سے طلوع ہو گی۔ دُنیا کے روزِ تخلیق سے آج تک کوئی رات ایسی نہیں آئی جس کے بعد صبح نہ ہوئی ہو۔ یہ مشاہدہ ہی اس بات کی دلیل کافی ہے کہ ان خطرات کی تیرگی میں بھی آسودگی اور امن و تسکین کی کافوری شمعیں جھلک رہی ہیں۔ اور وہ ایک دن ضرور محفلِ ہستی میں اُجالا کر کے رہیں گی۔

(۷)
دو قدم بڑھ کر جہاں سے پھر کوئی خطرہ نہیں
زندگی کا وہ مقامِ بے خطر، خطرے میں ہے

خطرات، منزلِ امن و سکون کی حدِ فاصل ہیں۔ اس حد پر کھڑے ہو کر جھجکتے اور کانپتے رہنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ہمت کر کے ایک چھلانگ مارنے کی ضرورت ہے۔ پھوڑا کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو آنکھ بند کر کے نشگاف دے دیجئے۔ تمام خطرے مواد کی صورت میں بہہ جائیں گے۔ اسی طرح قنوطیت اور رجائیت کے مابین بھی ایک خطرہ اور ایک اندیشہ حائل رہتا ہے۔ لیکن پُر اُمید دل اس خلیج کو پار کر لیتے ہیں۔ اور بزدل ہانپتے کانپتے خلیج میں گر پڑتے ہیں۔ ہر خطرناک مقام پر ٹھہر جانے سے چل پڑنا ہی ضامنِ نجات ہے ——— "دو قدم بڑھ کر جہاں سے پھر کوئی خطرہ نہیں"

(۸)
اتفاقی حادثوں سے اتنا گھبراتا ہے کیوں؟
زندگی تو ہر طرح اے بے خبر خطرے میں ہے

جو لوگ زندگی کو بے خطر سمجھتے ہیں۔ یا اُسے خطرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں وہ یقیناً زندگی کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ انسان کی زندگی خصوصیت کے ساتھ لاتعداد خطروں سے گھری ہوئی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ زندگی فی نفسہ ایک خطرہ ہے۔ انسان اپنی زندگی بھر مختلف قسم کے تجربے کرتا رہتا ہے اور بالآخر تجربہ کرتے کرتے ایک دن مر جاتا ہے۔ یہ تجربے، اور زندگی کے یہ رکھ رکھاؤ سب ذہنی تسلیاں ہیں۔ ان سے خطراتِ زندگی کے ازالہ میں کوئی واقعی مدد نہیں ملتی۔ جب علم الحیات کے مطالعہ سے زندگی کا پُرخطر ہونا مسلّم ہو چکا تو پھر اتفاقی حوادث سے گھبرانا تجاہلِ عارفانہ ہے ——— یعنی سمجھ بوجھ کر گھبراتا ہے "قیدِ حیات و بند — غم اصل میں دونوں ایک ہیں" ——— کوئی غمناک حادثہ ہو یا مسرت خیز واقعہ ——— دونوں کو لازمۂ زندگی یقین کیجئے۔ پھر کوئی گھبراہٹ نہ ہو گی۔ ایک رہگیر جو اپنی منزلِ مقصود کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اُسے راستے میں جنگل، پہاڑ، ندیاں۔ دریا، سمندر، غار، پھول، کانٹے، بھیڑ، سبزہ زار سب کا سامنا ہو گا اس لئے کہ یہ سب راستے میں پہلے سے موجود ہیں۔ بھیڑ کو دیکھ کر گھبرانا اور سبزہ زار کے نظارے سے رقص کرنے لگنا۔ بوالعجبی نہیں تو اور کیا ہے؟

جب زندگی عوارض، غم و فکر، مجبوری و بے اختیاری، حادثات و اتفاقات ہی سے مرکب ہے تو پھر کسی اتفاقی حادثہ سے گھبرا جانا فضول ہے۔ جہاں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند۔ پر جن کی نظر ہے وہ غم اور خوشی دونوں کو نظارۂ رہگذار سمجھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور اُن کی طرف پیچھے مڑ کر بھی کبھی نہیں دیکھتے۔

(۹)
کون جانے کب بدل جائے نظامِ آفتاب
روز و شب خطرے میں ہیں شام و سحر خطرے میں ہے

یہ سب سے بڑا خطرہ ہے جس کا ذکر میں نے اس شعر میں کیا ہے۔ عقل و علم دونوں نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ یہ کائنات ایک نادیدہ قوت کے ماتحت آباد ہے۔ ایک ایسی قوت جس کا مقابلہ نہ انسانی علم کر سکتا ہے اور نہ انسانی قوتیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ میدانِ جنگ میں گھمسان لڑائی ہو رہی ہے اور فریقین جنگ کسی خاص نتیجے پر پہونچنے والے ہیں کہ یکایک دھواں دھار بارش ہونے لگی۔ لڑائی رُک گئی اور اس فطری حملہ بالجبر کو کوئی قوت نہ روک سکی۔ اسی طرح طوفانوں اور زلزلوں سے ہزاروں رخنے ہماری کوششوں اور تدبیروں میں پڑ جاتے ہیں۔ کبھی دھوپ ہمارے کاموں میں حارج ہوتی ہے۔ کبھی تاریکی، کبھی ہوا، اور کبھی گھٹا۔ مگر ہم ان فطری واقعات کا مقابلہ اپنی پوری قوتوں کے باوجود بھی نہیں کر سکتے۔ نظامِ شمسی، جس کی رُو سے دُنیا اور ما فیہا قائم ہیں۔ جب ہمارے قابو اور اختیار میں نہیں تو اُس میں کسی فطری انقلاب کو آنے سے ہم کیونکر روک سکتے ہیں؟ یہ صبح و شام اور یہ رات دن، جن کی روشنی اور تاریکی میں ہم اپنے زندگی کے تمام کاروبار کرتے ہیں اگر اُسی چھپی ہوئی قوت کے منشا سے دفعتاً درہم و برہم ہو جائیں۔ تو پھر اس کا ہمارے پاس کیا علاج ہے؟ جب نظامِ کائنات خود بھی اس قدر خطرے میں ہے تو جو لوگ اس نظام کے ماتحت ایک وقتِ محدود تک سانس لینے کے لئے زندہ چھوڑ دئیے گئے ہیں، خطروں سے کیونکر محفوظ رہ سکتے ہیں؟

ہو رہی ہے ہر طرف سے اس کی کیا کیا روک تھام
(۱۰)
یہ بھی دیکھا تو نے خطرہ کس قدر خطرے میں ہے

اس شعر کو موضوعِ غزل کا کلائمیکس سمجھئے۔ یعنی میں نے یہ ثابت کیا ہے کہ کائنات اور مافیہا تو کیا، خطرہ خود بھی خطرے میں ہے۔ خطرے سے خطرہ بھی خالی نہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ بمبار ہوائی جہازوں کے خطرات پر غالب آنے کے لئے طیارہ شکن توپیں برابر کام کر رہی ہیں۔ بحری جہازوں کی آبروتار پیڈو اور آبدوز کشتیوں کے حملے سے خود خطرے میں ہے۔ توپ کا جواب توپ سے اور بندوق کا جواب بندوق سے دیا جا رہا ہے "آگ اور تلوار" دونوں خطرناک ہیں۔ مگر آگ پانی سے بجھا دی جاتی ہے اور تلوار کا پانی ڈھال سے اتار دیا جاتا ہے۔ (آپ اس فقرے سے ضرور محظوظ ہوئے ہونگے۔ اور آپ کا خیال ہوگا کہ اسی کا نام شاعری ہے۔ مگر میں اپنے اشعار کی تصریح میں شاعری سے بالکل کام نہیں لے رہا ہوں۔ میرا مقصد صرف اظہارِ واقعیت ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری تصریحات پوری توجہ سے سُن رہے ہونگے —— میں عبارت میں تسلسل قائم رکھنے کے لئے اوپر کے چند جملوں کو پھر دہراتا ہوں۔) مقصد یہ ہے کہ ہر خطرہ کو کمزور اور بے اثر کرنے کے لئے دوسرے قوی خطرات پیدا کر لئے گئے ہیں۔ اس لئے خطرہ خود بھی خطرے سے باہر نہیں۔

ہمتِ انساں کے آگے سب بلائیں ہیچ ہیں
(۱۱)
حوصلہ ہی اک فسونِ کارگر خطرے میں ہے

یہ شعر گویا "بر سرِ فرزندِ آدم ہر چہ آید بگذرد" کی تفسیر ہے۔ مگر یہ "بگذرد" کچھ اسباب اور کچھ ذرائع چاہتا ہے۔ سب سے بڑا ذریعہ خطرات سے گذر جانے اور بلاؤں کو ہیچ کر دینے کا "ہمت اور حوصلہ" ہے۔ اگر انسان میں ہمت و حوصلہ ہو تو پھر اُسے سب بلائیں ہیچ نظر آتی ہیں۔ اور وہ حوصلے اور ہمت کی کشتی میں بیٹھ کر بڑے بڑے طوفانوں سے ہنستا کھیلتا گذر جاتا ہے۔

کعبۂ مقصود آسانی سے ملتا ہے کہیں؟
(۱۲)
ہے وہ منزل رس جو سرگرمِ سفر خطرے میں ہے

انسان کا مقصدِ تخلیق ہی سعی و کوشش ہے۔ جب خطرات چاروں طرف محیط ہوں تو ان سے خائف ہو کر قدم روک لینا خطرات کا سدِّباب نہیں کرتا اور نہ منزل رسی کا ضامن ہو سکتا ہے۔ منزل پر وہی لوگ پہونچتے ہیں جو اِن خطرات کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھتے ہیں اور ان خطرات کو راستے کے سنگہائے راہ اور جھاڑیوں سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتے

تاریخِ عالم ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اجتماعی یا انفرادی حیثیت سے اُس وقت تک اپنے نصب العین کو نہیں پہونچی جب تک کہ خطرات سے قطع نظر کر کے اُس نے اپنا سفر منزل کی طرف جاری نہ رکھا۔ کامیابی نام ہے سعیٔ مسلسل کا۔ وہ کوششیں ہمیشہ ناکام ہوتی ہیں۔ جن میں تسلسل اور تواتر نہیں ہوتا۔ منزل جس قدر نزدیک ہوتی جاتی ہے۔ خطرات بڑھتے جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح صبح ہونے سے پہلے رات کی تاریکی زیادہ گہری اور زیادہ ہیبت ناک ہو جاتی ہے۔ خطرات گویا آثارِ منزل ہیں۔ آثارِ منزل سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، خوش ہونے کی ضرورت ہے۔ خطرات جتنے فراواں ہوں قدم بھی اتنے ہی تیز ہونے چاہئیں۔ عروجیا کامیابی تن آسانی سے ہمکنار نہیں ہوتی —— کعبۂ مقصود آسانی سے نہیں ملتا۔ کروڑوں نفوس خطرات سے خائف ہو کر نذرِ رہگذر ہو گئے مگر جو کارواں منزل تک پہونچا وہ وہی تھا جو خطرات کی موجودگی میں بھی ہمت اور حوصلے کے ساتھ سرگرمِ سفر رہا۔

(۱۳) ہے سکونستانِ بے خوفی انہیں خطروں کے بعد
ہے وہ آسانی خطر جو جس قدر خطرے میں ہے

جو شخص خطرے سے باہر ہے اُسے فطرتاً خطرے میں پڑنے کی توقع رکھنی چاہئے اس لئے کہ خطرہ انسانی زندگی کا لازمہ ہے۔ لیکن جو شخص خطرے میں مبتلا ہے اُسے خوش ہونا چاہئے کہ خطرے سے نکلنے کے بعد جو منزل ہے وہ بے خوفی، سکون اور اطمینان کی منزل ہے۔ خطرات اُسے منزلِ مقصود کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہے ہیں۔ یہ ایک دستورِ فطرت ہے کہ جب انسان بہت زیادہ ہنستا ہے تو اس کے بعد اُسے کوئی رنج ضرور ہوتا ہے اور رنج نہیں ہوتا تو زیادہ ہنسنے سے آنسو تو ضرور ہی نکل آتے ہیں جو رنج و غم کی علامت ہے۔ اسی طرح جو شخص بہت زیادہ مغموم ہوتا ہے۔ اُسے مسرت بھی ضرور ہوتی ہے۔ رنج کے بعد خوشی اور خوشی کے بعد غم لازمی ہے۔ اس لئے جو لوگ خطرات میں گھرے ہوئے ہیں، اُنھیں پھر خطرات میں گھرنے کا اندیشہ نہیں۔ دُنیا کا کوئی واقعہ اور کوئی حال، یکساں نہیں رہتا۔ اگر آج خطرہ ہے تو یہ بھی عارضی اور وقتی ہے۔ اس کے بعد بے خوفی ہی کی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ خطرہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم زندگی کے اِن مدارج اور اس صغرا کبریٰ کو اچھی طرح سمجھ لیں تو ہر وقت خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اب ہمیں کونسی منزلِ حیات پر پہونچنا ہے اور ہم آنے والے لمحوں میں مغموم رہیں گے یا مسرور —— پُر امید ہونگے یا مایوس؟

اس کے سمجھنے کے لئے کسی نجومی یا رمّال سے مشورہ لینے کی ضرورت نہیں۔ صرف کلیۂ فطرت پر غور کر لینے کی ضرورت ہے ——— اور وہ یہی ہے کہ ہر خطرہ کے بعد بے خوفی اور ہر بے خوفی کے بعد خطرہ ہے۔ مگر اپنی اپنی جگہ دونوں عارضی اور فانی ہیں اور بالآخر نہ خطرہ رہتا ہے اور نہ بے خوفی اور انسان ان تمام منزلوں سے گذر کر ایک ایسی نئی منزل پر پہونچ جاتا ہے جہاں دائمی سکون اور ابدی نجات ہے۔

(۱۴) خندہ زن ہو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
قہقہوں کا لطف ہے تو خاص کر خطرے میں ہے

اوپر کے تین چار اشعار میں، میں نے جو درس دیا ہے، اُس کا خلاصہ یہ شعر ہے۔ بیشک موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنسنا معمولی کام نہیں۔ یہ کام صرف ان لوگوں کا ہے جو زندگی کو زندگی اور موت کو موت نہیں سمجھتے۔ لیکن زندگی ہو یا موت دونوں کا لطف اسی میں ہے کہ انسان اپنے حواس قائم رکھے۔ جب اُس کے سامنے زندگی ناچتی کھیلتی آئے تو وہ مسکرا کر اُس کا خیر مقدم کرے لیکن یہ ضرور سمجھ لے کہ یہ زندگی کا کھیل صرف ایک رنگین دھوکا ہے اور جب موت کا سامنا ہو تو ایک ایسا قہقہہ لگائے کہ موت بھی جھجک کر منہ پھیر لے اور مرنے والا اس خیال سے متسلّی ہو کہ زندگی کی یہ ایک معینہ آخری منزل ہے جس پر کائنات کے ہر متنفس کو ایک دن پہونچنا ہے۔ جب موت ہی زندگی کی منزلِ مقصود ہے تو اُس تک پہونچنے سے جھجکنا کیا؟ کیا ڈرنے، گھبرانے، جھجکنے، بھاگنے، احتجاج کرنے، واویلا کرنے، رونے، چلّانے یا شور مچانے سے موت کا وقت ٹل سکتا ہے؟ ——— اگر نہیں ٹل سکتا اور موت فطرت کا عائد کردہ ایک اٹل قانون ہے تو اُس کا خیر مقدم ہم بخندہ پیشانی کیوں نہ کریں اور موت کو یہ یقین کیوں نہ دلادیں کہ وہ جو پیغام لے کر آئی ہے ہم اُس کے پہلے سے منتظر تھے۔

"خندہ زن ہو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر"۔ اگر خطرہ موت کی صورت میں ہے تو ٹل نہیں سکتا اور اگر موت نے خطرہ کا صرف روپ بھر لیا ہے تو اس خندہ زنی کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خطرہ ٹل جائے اور موت موت ثابت نہ ہو۔ خندہ زنی کے لئے حواس قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر سوءِ اتفاق سے سانپ سامنے آجائے اور اس کے حملہ کرنے کا امکان بھی ہو تو چلّانے اور کپکپانے سے بہتر یہ ہے کہ حواس قائم کر کے مسکراتے ہوئے اس کے حملے سے پہلے اُس پر حملہ کر دیا جائے۔ رونے چلّانے اور گھبرانے سے ظاہر ہے کہ سانپ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑ سکتا۔ اور نہ وہ حملہ کرنے سے باز رہ سکتا ہے لیکن ہوش و حواس کے ساتھ اگر اس پر ایک قوی حملہ کر دیا جائے تو قضائے مبرم ٹل سکتی ہے اور سانپ کا خطرہ بھی اس وقت کے بعد دوسرے اوقات کے لئے اُسکے زندہ رہنے کی صورت میں باقی رہتا، ہمیشہ کے لئے دُور ہو سکتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ خطرے سے خواہ وہ موت کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو، بدحواس ہو جانے کی ضرورت نہیں۔ مردانگی، ہمت وری، حوصلہ مندی، اور جگرداری کے معنی یہ ہیں کہ خطرات کا مقابلہ مسکرا کر قہقہہ لگا کر کیا جائے۔ خوشی اور مسرّت کے موقع پر قہقہہ لگانا کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن خطرے کی موجودگی میں شگفتگیٔ خاطر اور آسودہ ذہنی کا ثبوت دینا حقیقت میں ایک بلند ترین کیرکٹر کی دلیل ہے۔

اب مقطع سُنئے:-

(۱۵) چاہیئے سیمابؔ اندازِ سخن میں احتیاط
آجکل ہر شعبۂ علم و ہنر خطرے میں ہے

یہ مقطع ایک نفسیاتی اور طبعی جذبے کا ترجمان ہے۔ شاعر فطرتاً آزاد ہوتا ہے۔ اُس کے خیالات، تصورات اور جذبات بھی آزاد ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے آزادی کیساتھ کہنا چاہتا ہے لیکن اس عہدِ پُرخطر کا کرشمہ یہ ہے کہ آج "شاعر" کی آزادی بھی خطرے میں ہے۔ پہلے میں ایک نظم واقعاتِ حاضرہ سے متاثر ہو کر ایک اخبار کو بھیجی، وہ وصول کر کے خاموش ہو گیا وہی نظم" دوسرے اخبار کو بھیجی۔ اُس نے خاموشی سے کام نہ لیا مگر اشاعت سے بمقتضائے وقت اظہارِ مجبوری کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نظم شائع نہ ہو سکی۔ عدمِ اشاعت کا سبب وہی "خطرہ" تھا۔ جو اس غزل کا موضوعِ حقیقی ہے۔ میں نے اس خطرے کی پروا نہ کرتے ہوئے نظم لکھی اور اشاعت کے لئے بھیجدی۔ مگر شائع کرنے والے اداروں نے اُس خطرہ کو محسوس کیا جو اس نظم کی اشاعت کا نتیجہ ہوتا اور اُسے نظر انداز نہ کر سکے۔ اس لئے میں نے اس مقطع میں خود اپنی طبیعت کو محتاط رہنے کا پیغام دیا ہے ——— اب ماننے یا نہ ماننے یہ اُس کے اختیار میں ہے۔ موجودہ خطرناک دورِ زندگی میں ایک حقیقی "شاعر کے" زبان و قلم" پر جو پابندیاں مصلحتِ وقت نے عائد کر دی ہیں۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ملک میں صرف جمالیاتی احساس کی ترجمانی فرسودہ اسلوبِ غزل کے ذریعے ہوتی رہے۔ اور مسٹر سہروردی بالآخر مایوس ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ "ہمارا ادب اب زندگی کا بالکل ترجمان نہیں" کاش اس مایوسی کے ساتھ انھیں ادبائے ملک کی مجبوریوں کا بھی احساس ہو۔

(۱۵ ستمبر ۱۹۴۱ء)

سیمابؔ اکبرآبادی

طوفانِ تغزّل

ممنونِ منصفی کے ہوتے ہم اپنے جی میں
تھوڑا سا غم جو ملتا تھوڑی سی زندگی میں

عمرِ دوروزۂ غم گذری مری اسی میں
ناکامیوں کو رونا سب لے کام زندگی میں

پایا نہ فرق کچھ بھی سوچا جو ہم نے جی میں
دانا کی دشمنی میں ناداں کی دوستی میں

داغِ جگر کا شعلہ دل کو بجھا رہا ہے
یہ چاند ڈوبتا ہے سورج کی روشنی میں

موسیٰؑ سے اور مجھ سے جلووں کی بحث کیسی
وہ کوہِ طور پہ ہیں میں ہوں تری گلی میں

عمرِ ابد کی خواہش اے خضر کیا کریں ہم
لاکھوں الم اُٹھائے دو دن کی زندگی میں

بے کاریٔ شبِ غم دل سے یہ کہہ رہی ہے
داغوں کو اپنے گن لے تاروں کی روشنی میں

جیسے نہ کچھ تو ہم جیسے نہ کچھ تردد
اُٹھے ہم اپنے گھر سے پہنچے تری گلی میں

فطرت کا ہر کرشمہ اپنی جگہ چمن ہے
رنگینیاں بھی دیکھیں پھولوں کی سادگی میں

یوں اُنکے ساتھ ہم نے دن لطف سے گذارے
کچھ کہہ دیا ہنسی سے کچھ سُن لیا ہنسی میں

میں یاد کرکے جن کو آنسو بہا رہا ہوں
ایسی بھی چند گھڑیاں گذری میں زندگی میں

قہرِ کرم نما نے کھولا یہ راز مجھ پر
ہے دشمنی بھی داخل آدابِ دوستی میں

ممکن ہے اس سبب سے کوئی بلا نہ آئے
میں اپنے دل کو دے دوں اُنکی سپردگی میں

غنچہ تو گل بنے گا گُل کچھ نہ بن سکے گا
وہ پھول میں کہاں ہے جو بات ہے کلی میں

اچھی کہی بُھلا دو کیونکر کوئی بُھلا دے
سَو دن کی دشمنی کو دس دن کی دوستی میں

وقتِ نشاط کم ہے لُطفِ نشاط جب تھا
دونوں جہان ملتے دو دن کی زندگی میں

کیا روزِ حشر کا ڈر میں تو یہ جانتا ہوں
تاریکیٔ شبِ غم آئی ہے روشنی میں

مجھ کو نگاہِ بد کا کھٹکا لگا ہوا ہے
تھوڑا سا غم بھی یارب شامل رہے خوشی میں

شاید وہ پھر بگڑ کر طوفان تو اُٹھا دے
تم نوحؔ کو نہ چھیڑو بس خیر ہے اسی میں

نوحؔ ناروی

وعدہ

اُس نے کہا تھا .... "آؤنگی"

کلب سے واپس آکر میں اپنے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوا "شاہکار" کا مطالعہ کر رہا تھا۔ مطالعے کے شغف اور انہماک کی انتہائی حالت میں سگریٹ کا گُل ایش ٹرے میں گرانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ رانی کمرے میں داخل ہوئی اور میرے سامنے والی کوچ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ذرا سُنو"

"کیا ہے؟" میں نے اپنی کرسی سے بلا ارادہ اُٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"بیٹھو! کھڑے کھڑے سننے کی بات نہیں"

"بہت اچھا" کہتے ہوئے اسکی کُرسی کے ہتھے پر بیٹھ گیا۔

"تم بعض وقت پاگل بھی ہو جاتے ہو" اُس نے گھوم کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر مہاجن آجائے تو وہ کیا سمجھے؟"

انھیں لمحات میں دروازے کے نیلگوں پردہ کو جنبش ہوئی اور "چائے تیار ہے" کی صدا کے ساتھ مہاجن نے ٹیبل پر چار لاکر رکھدی اور ہم دونوں کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

"کل اُس مقدمہ میں کیا ہوا؟" رانی نے چائے بناتے ہوئے پوچھا۔

رانی کے سوال نے مجھے ایک دم چونکا دیا اور میں نے فوراً شاہکار کو اس طرح ہاتھ میں لے لیا کہ رانی میرے قلبی تاثرات کو جو اس کے یکایک سوال کرنے سے پیدا ہو گئے تھے، میرے چہرہ پر نہ پڑھ سکے۔

"میرے نزدیک وہ عورت بیگناہ ہے" میں نے "شاہکار" کے سرورق پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

"کیا ملزمہ کوئی خوبصورت عورت ہے؟"

"ہاں اتنی خوبصورت کہ کوئی مرد اُس کو دیکھکر اپنے ہوش و حواس قائم نہیں رکھ سکتا"

رانی کو چھیڑنے کی غرض سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے میں نے جواب دیا۔

"اس لئے وہ تمہارے نزدیک بیگناہ ہے"۔ رانی نے کہا اور اُٹھ کر چلدی۔

دوسرے دن میں عدالت کا وقت ختم ہونے سے تین گھنٹے قبل ہی واپس آگیا۔ پورٹیکو میں کار کھڑی ہونے کی آواز سُن کر رانی بھی دوڑتی ہوئی آئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"کیوں آج جلدی کیوں واپس چلے آئے"

"سر میں کچھ درد سا معلوم ہوتا ہے" میں نے ہیٹ اسٹینڈ پر لٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

"سیکڑوں مرتبہ کہا کہ سگریٹ زیادہ نہ پیا کرو مگر تم مانتے کہاں ہو"

رانی نصیحتیں کر رہی تھی اور میں کپڑے اُتار رہا تھا۔ جب میں آرام کرسی پر بیٹھ گیا تو رانی نے سر دابتے ہوئے کہا:-

"کیا بہت زیادہ درد ہے؟"

"نہیں تو" میں نے اُس کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا، جس کے جواب میں وہ بھی مسکرا دی۔

"مگر ہاں یہ تو بتاؤ کہ وہ عورت کیا تمہارے نزدیک بیگناہ نہیں ہے؟"

"اچھا .... اس لئے سر میں درد ہو رہا تھا، لیکن تم کو اس کی اتنی فکر کیوں ہے۔ کیا تم اُس کو پہلے سے جانتے ہو؟"

"ہاں .... رانی" میں نے ایک طویل اور سرد سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کب سے؟"

"یہ نہ پوچھو"

"کیوں بتانے میں کیا حرج ہے؟"

"کچھ نہیں ...." اور میں سنانے لگا۔

میں نے اس کو پہلی بار اُس وقت دیکھا جبکہ میں نویں درجہ میں پڑھتا تھا اُس وقت ——اُس کی عمر قریب ۱۳-۱۴ سال کی تھی۔ روزانہ وہ اسکول سے واپسی پر میرے گھر کے سامنے سے گذرا کرتی۔ کالی ساڑھی اسکا مرغوب ترین لباس تھا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ جب وہ اُس کو پہن کر اپنی بھولی اور معصوم شکل کے ساتھ وہاں سے گذرتی تو ہر دیکھنے والے کو اسکے سامنے دُنیا ہیچ نظر آتی۔ میرے کمرے کے سامنے سے جب وہ گذرتی تو اُس کی آنکھیں میری کھڑکی پر ضرور پڑتیں اور میں اُس کی نگاہوں سے مستقبل کے رنگین خوابوں کی تعبیریں لینے کے لئے اُس کی آمد سے قبل اپنی کھڑکی پر اُسکا منتظر رہتا۔

"اُسکا نام کیا تھا؟"

"تارا"

اسی طرح دن گذرتے چلے جا رہے تھے کہ ایک دن جبکہ میں علی الصبح اپنے مکان کے سامنے والے نل پر نہا رہا تھا، وہ پانی بھرنے آئی۔ اُس کے نازک ہاتھ میں گھڑا تھا، میں نے پوچھا:-

"تارا —— تم اور اتنے اندھیرے میں تنہا؟"

"اگر نہ آتی تو تمہارے درشن کس طرح ہوتے" کہتے ہوئے اُس نے گھڑا نل کے نیچے رکھ کر نل کھول دیا۔

"تارا تم اسقدر خوبصورت کیوں ہو؟"

"کیا کہا —— میں نے سُنا نہیں!"

"کچھ نہیں"

"کچھ کہا تو آپ نے ضرور ہے"

"یہی کہ تم خوبصورت ہو" میں نے مسکراتے ہوئے کہا

"ایسی پاگل پن کی باتیں اچھی معلوم نہیں ہوتیں!"

"ہاں! اگر تم کو دیکھ کر کوئی پاگل ہو جائے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔"

گھڑا بھر چکا تھا اُس نے اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اُٹھا کر اُسکے سر پر رکھدیا۔ وہ مسکرا کر بولی:-

"ارے ... !چھولیا آپ نے!"

اور چلنے کے لئے قدم بڑھایا، کائی جمی ہوئی تھی پیر رکھتے ہی پھسل گیا مگر میں نے بڑھ کر سنبھال لیا۔ اس نے میری طرف ایک رم کردہ غزال کی طرح دیکھا اور میری باہوں کی گرفت میں کسمسانے لگی۔

"قصور وار تو ضرور ہوں مگر قابلِ معافی" کہتے ہوئے میں نے اُسے چھوڑ دیا جواب میں وہ مسکرائی اور چلی گئی!

اس طرح کبھی نل پر کبھی بازار میں اور کبھی اسکول سے واپسی پر ہماری ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ اور ہم دونوں دن میں ایک بار جبتک نہ مل لیتے طبیعت مکدّر اور بےچین رہتی۔

انھیں رنگین نظاروں اور خوش آیند ملاقاتوں میں آہستہ آہستہ ایک سال گذر گیا۔

ایک دن جبکہ میں میٹرک میں تھا۔ جولائی کا مہینہ۔ ساون کا دن اور ناگ پنچمی کا تیوہار تھا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میں سینما کا پہلا شو دیکھ کر واپس آ رہا تھا۔ تاریکی کی وجہ سے راستہ نظر نہ آتا تھا۔ بجلی کے کھمبوں پر جو روشنی تھی ان سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ صرف کھمبا بتلانے کے لئے لگائی گئی ہے تاکہ کوئی کھمبے سے ٹکرا نہ جائے۔ میں جلد جلد قدم اُٹھاتا ہوا سنبھل سنبھل کر چلا آ رہا تھا کہ گلی کے موڑ پر ایک لڑکی نظر آئی، دُور سے تو میں اُس کو پہچان نہ سکا مگر جب وہ نزدیک آگئی تو معلوم ہوا کہ وہ "تارا" ہے۔ میں نے پوچھا "تارا یہ کیا، اتنی رات گئے اس بارش میں کہاں کا ارادہ ہے، تمھیں ڈر نہیں لگتا؟"

"میں بھوتوں سے نہیں ڈرتی!"

"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں۔ لیکن تم اتنی رات کو جا کہاں رہی ہو؟"

"اماں کے سخت درد ہے۔ بابو اور بھیا گھر نہیں ہیں۔ سوا میرے اور دوا لانے والا کون تھا"

"تو دوا لے آئیں؟" میں نے اُس کو اپنے چھاتے میں لیتے ہوئے کہا کیونکہ بوندیں پڑنی شروع ہو گئی تھیں۔ اُس نے کہا:-

"نہیں"

"اچھا میرے ساتھ چلو میں دوا دلا دونگا"

"آپ کے ساتھ!"

"کیوں! کیا ڈر ہے؟"

"نہیں؛..... کچھ نہیں!......... مجھے آپ پر پورا اطمینان ہے!" اور اب بجلی کی چمک اور بادل کی گرج کے ساتھ موسلا دھار بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ بجلی بار بار کوند کر ہم دونوں کو راستہ دکھانے میں مدد دے رہی تھی اور ہم دونوں اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے راستہ طے کر رہے تھے کہ تارا نے بجلی کی چمک کے ساتھ ہی میرا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کو جھٹکا دیا۔

"ارے! ارے؟؟ سانپ!!!"

ایک کالا سانپ چار پانچ فٹ لانبا میرے بالکل سامنے سے گذر رہا تھا۔ اگر تارا نہ روکتی تو یقیناً میرا قدم اُسی پر پڑتا۔ میں نے کہا

"تارا۔ آج تم نے مجھے بچا لیا ورنہ........"

جملہ ختم کرنے سے پہلے تارا نے میرا منہ اپنے ہاتھ سے بند کر دیا اور میں آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

میں نے اپنے مکان کے قریب کے ایک انگریزی دواخانہ سے اُسے دوا دلوا دی اور واپس ہوتے وقت اُس نے مجھ کو اپنے ساتھ جانے میں مستعد دیکھ کر کہا۔

"نہیں۔ میں چلی جاؤنگی۔ قریب ہی تو ہے اور اب تو بارش بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔"

"اتنی رات کو میں اور تم کو تنہا جانے دوں!"

جب اُسکا گھر آ گیا تو اُس نے کہا

"آپ کو بیکار تکلیف ہوئی۔"

"یہ بیکار باتیں، میں پسند نہیں کرتا۔"

"ہاں.. ...."

وہ مسکرائی اور ایک عجیب انداز سے دیکھ کر اندر داخل ہو گئی۔

میرا امتحان ختم ہو چکا تھا اور میں گھر جانے کے لئے رختِ سفر باندھ رہا تھا کہ تارا آ گئی۔

"اچھا جانے کی طیاری ہو رہی ہے" مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اُس نے کہا:—

"ہاں — تارا — کل گھر سے خط آیا ہے اس میں جلد آنے کی تاکید لکھی ہے لو دیکھو۔"

میں نے خط بڑھاتے ہوئے کہا۔

اُس نے خط لیکر پڑھا اور پوچھا،

"اب کب آؤ گے؟"

"اب شاید نہ آ سکوں۔ یہاں کالج ہوتا تو پھر آنے کی اُمید ہوتی؟"

میں نے جواب دیا اور اپنا سوٹ کیس کھول کر اپنا ایک فوٹو نکالا اور تارا کو دیتے ہوئے کہا۔

"اسے تم اپنے پاس رکھنا یہ تم کو میری یاد دلاتا رہے گا۔"

اُس نے فوٹو لے کر دیکھا اور دیکھ کر کہا "بہت اچھا ہے۔ مگر میں اسے رکھونگی کہاں اگر پتا جی نے یا بھیا نے دیکھ لیا . . . "

اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکنے کی وجہ سے اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

"تارا . . . ... زندگی میں ایک بار تم سے ضرور ملوں گا!"

میں نے اپنی اُنگلی سے انگوٹھی اُتار کر اُس کی اُنگلی میں پہناتے ہوئے کہا۔

"اگر تم نہیں آؤ گے تو میں ہی تمہارے پاس آؤنگی!"

اُس نے گلوگیر آواز سے آنسوؤں کو ساری کے آنچل سے صاف کرتے ہوئے کہا اور اس سے زیادہ جذبات پر قابو نہ رکھ سکنے کی وجہ سے مڑی اور مُڑ کر چل دی۔

وہ چلی گئی — اور میں دیکھتا رہا — اور وہ — رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"اُس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا!"

"رانی! —" اُس نے کہا تھا کہ میں آؤنگی" اور وہ آئی! جب وہ پیسے دن ملزموں کے کٹہرے میں کھڑی کی گئی تو اُسے دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ میں نے ایسے کہیں دیکھا ہے۔ وہ بھی مجھ کو بار بار بغور دیکھ رہی تھی۔ میں اور وہ خیالیا

دونوں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہم نے ایک دوسرے کو کہاں دیکھا ہے اور دیکھنے والے سمجھ رہے تھے کہ وہ مجھ کو اپنے بے پناہ حُسن سے مسحور کرنا چاہتی ہے۔ میں ان تمام باتوں پر غور کر رہا تھا کہ میرے منشی نے اُس کا نام لیا "تارا" کا نام سنتے ہی میں ایکدم چونک گیا اور ایک پھریری کے ساتھ گذشتہ زندگی کے تمام واقعات نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ وہی "تارا" ہے جو مجھ کو ایکبار موت کے منہ سے نکال چکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں "تارا" کو دنیا سے زیادہ جانتا ہوں میرا خیال ہے کہ وہ بالکل بے قصور ہے! وہ کبھی خونی نہیں ہوسکتی!! اگر تم اس سے ایک بار بھی مل سکتیں تو تم بھی یقیناً وہی کہتیں جو میں کہہ رہا ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں رانی کہ تارا کبھی خونی نہیں ہوسکتی۔ بالکل غلط ہے! جھوٹ ہے!! بہتان ہے!!!

"آخر حادثہ کیا ہے؟" رانی نے میرے بڑھتے ہوئے جوش کو دبانے کے لئے سوال کیا۔

"کہتے ہیں کہ اُسکا پڑوسی نشے کی حالت میں اسکے گھر میں داخل ہوا۔ وہ تنہا تھی ڈر گئی۔ گھبرا گئی۔ نزدیک ہی سوڈے کی بوتل رکھی ہوئی تھی اُٹھائی اور پھینک کر ماردی۔ جو اس کے سر پہ پڑی اور وہ جانبر نہ ہوسکا۔"

رانی نے میری انگلیوں میں اپنی انگلیاں لیتے ہوئے کہا۔

"اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو اس شرابی کو پھانسی پر لٹکا دیتی۔"

رانی کے فیصلہ سے مجھے بیساختہ ہنسی آگئی۔ مگر رانی کی آنکھیں اشک آلود تھیں۔

پولیس نے میرے فیصلہ کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کیا جہاں سے "تارا" کیلئے سخت سزا تجویز کی گئی۔

(ماخوذ از ہندی)

بشیر احمد قریشی گوالیاری

روداد ماضی و حال

اک دور مجھ پہ ایسا گذرا ہے زندگی میں — دُنیا کو دیکھتا تھا اپنی ہی روشنی میں
تخیل کی فضا میں اک گھر بنا لیا تھا — تھا مست صرف اپنے جذبوں کی خرمستی میں
تخیل کا سمندر یونہی رواں دواں تھا — دل بہہ رہا تھا میرا موجوں کی دلکشی میں
ہر وقت اک تبسم، ہر وقت اک تصور — ہر وقت محو تھی اپنی ہی سرخوشی میں
ہر کیفیت سے دل میں سرشاریاں تھی پیدا — ہر غم سے کھیلتا تھا پہروں ہنسی خوشی میں
ہر وقت اک تخیل، ہر وقت اک مسرت — ہر وقت ایک نازش احساس برتری میں
ہر وقت سُن رہا تھا سرمدی نوائیں — ہر وقت اُٹھ رہا تھا طوفان زندگی میں
یوں محو ذات ہو کر سرشار ہو گیا تھا — خود اپنی شخصیت کو سمجھا تھا بیخودی میں
یوں جلوہ بار مجھ پر اکثر ہوئی لطافت — جیسے کوئی ڈبو دے پھولوں کی تازگی میں
چھوتی تھی چاند تارے اکثر مری بلندی — آگے نکل گیا ہوں ان سے کبھی بیخودی میں
آنکھیں کھلیں تو ہمدم برہم ہوئی وہ دُنیا — تعمیر کر رہا تھا جس کو میں سرخوشی میں
ادبار کی جہاں میں چلنے لگیں ہوائیں — اب ہیں شکستہ نغمے اک ساز خودسری میں

تخیل اک بھیانک اب خواب دیکھتی ہے
دریائے زندگی کو پایاب دیکھتی ہے

محمد صادق ضیا بی۔ اے ایل ایل بی

تزکیۂ نفس

شب جمعہ کی فضیلت اور اُسوۂ شبیر علیہ السّلام

تزکیہ نفس کا مشکل بھی ہے دشوار بھی ہے
نفس شیطان بھی ہے اور بُتِ پندار بھی ہے

تزکیہ نفس کا ہوتا ہے بڑی مشکل سے
محو کی جاتی ہے عالم کی کشاکش دل سے

رات کی نیند تجی جاتی ہے ، دن کا آرام
عشرت و لہو و لعب سے نہیں رہتا کچھ کام

نفس کی سعی سے جو قت جلا ہوتی ہے
وہ ہی کیفیت عرفانِ خدا ہوتی ہے

نفس جبتک کہ نہ زنگارِ کثافت سے ہو پاک
کُنہہ اور معرفتِ حق کا ہے مشکل ادراک

جذبۂ بیم و رجا ، صبر و رضا و تسلیم
منزلِ تزکیۂ نفس کی یہ ہے تقسیم

اِن منازل کو جو طے کرنے کے قابل ہوگا
فی الحقیقت وہی آسودۂ منزل ہوگا

ایک دن مسجد نبوی میں یہ تھا قولِ نبی
جمعہ کے روز زمانے میں قیامت ہوگی

سانحے جتنے بڑے ، دہر میں گذرے ہیں ہنوز
تھا ہر اک سانحے کے روز یہی جمعہ کا روز

توبہ آدمؑ کی اسی روز ہوئی تھی مقبول
اور اسی روز ہوا نوحؑ کے طوفاں کا نزول

صبر ایوبؑ نے پایا تھا اسی دن انجام
قومِ موسیٰؑ کو اسی روز ملی فتح تمام

اسی دن خلقتِ عالم بھی ہوئی تھی ممکن
اس لئے روزِ قیامت ہے یہی جمعہ کا دن

جب سے شبیرؑ نے یہ بات سُنی نانا کی
کہ قیامت کسی جمعہ کو بالآخر ہوگی

ہوگیا آپ کا اُس وقت سے دستورِ دوام
جب جمعرات گذرتی تھی اور آجاتی تھی شام

خانۂ کعبہ میں جاتے تھے امام الشہدا
اور ہاتھوں سے پکڑتے تھے غلافِ کعبا

رات بھر روتے تھے ، رونے کی صدا آتی تھی
اسی حالت میں سحر جمعہ کی آجاتی تھی

نفس کا تزکیہ کرتے تھے بعد گریۂ و آہ
سمت کعبہ سے نہ ہٹتی تھی کسی وقت نگاہ

کہتے تھے کس کو خبر کل ہی قیامت آجائے
جمعہ کے روز فنا ہونے کی ساعت آجائے

عمر بھر ابنِ علیؑ کا یہی دستور رہا
جمعہ کی رات کو ہر عیش سے دل دُور رہا

شام سے تا بہ سحر صرفِ عبادت رہنا
صبح سے منتظرِ روزِ قیامت رہنا

ساٹھویں سال جو ہجرت کے محرم آیا
دسویں تاریخ کو وہ جمعہ قیامت ہی کا تھا

صبحِ عشرہ جو بہ اندازِ قیامت آئی
کام شبیرؑ کے ، خالق کی اطاعت آئی

منصبِ پاک شہادت کا بھرے گھر کو ملا
مرتبہ سب سے بڑا سبطِ پیمبرؐ کو ملا

نفس کا تزکیہ صبر اور توکل سے ہوا
نیک انجام ، عبادت کے تسلسل سے ہوا

حاجی نبی احمد بریلوی

یورپ کی تہذیب ہندوستان کی تہذیب سے بالاتر نہیں

موضوع زیر بحث میں جیسی لفظِ "تہذیب" کا تجزیہ کرنا ہے اور بعدہٗ اس کا مقابلہ شرقی ممالک بالخصوص ہندوستان اور مغربی ممالک کے درمیان کرنا ہے۔

لغوی اور اصطلاحی طور پر لفظِ تہذیب ایک وسیع المعانی لفظ ہے جو بہت سے محاسن اور خوبیوں پر حاوی ہے۔ آراستگی، صفائی، درستی، اصلاح، شائستگی، خوش اخلاقی پاکی، اہلیت، لیاقت، آدمیت، ترتیب، انسانیت وغیرہ وغیرہ، یہ تمام خوبیاں ہیں جو مجموعی حیثیت سے ساتھ لفظِ تہذیب کے دائرہ میں سما جاتی ہیں، دوسرے الفاظ میں ایک جامع تعریف تہذیب کی یہ بھی ہے کہ افعالِ انسانی کا اس طرح منظم کیا جانا جس سے جماعتی یا قومی بہتری و بلندی ظاہر ہو۔

کسی تہذیب کی بلندی و بہتری اگر اس کے عام نتائج و اثرات سے معلوم کی جاسکتی ہے تو شاید ہمارے محکوم ملک میں یورپ کی تہذیب کا زیادہ سے زیادہ مکمل نقشہ نظر آسکے گا۔ ہمارے مادرِ ہند کے فرزندانِ اولو العزم جنھوں نے یورپ و ہندوستان کو گھر آنگن بنا دیا، جو وہاں کے طور طریق، عادات و اطوار، طرزِ زندگی، سوچ و چار یا تہذیب کے سانچہ میں ڈھلکر آتے ہیں۔ دراصل اُنھوں نے ہمارے سامنے یورپ کی تہذیب کا قدِ آدم آئینہ رکھدیا ہے اور آج ہم اون کے اوضاع و اطوار، اخلاق و عادات میں یورپ کی تہذیب جلوہ گر پاتے ہیں، اور اس طرح ہم اُن دیکھنے والوں کی نظر میں مغربی تہذیب کی کرشمہ کاریاں اور جلوہ ریزیاں بخوبی دیکھ رہے ہیں ؎

سب لوگ جدھر وہ ہیں اُدھر دیکھ رہے ہیں
ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

تمام جزئیات و تفصیلات کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو یورپ کی تہذیب کا نمایاں پہلو خود غرضی، ہوسناکی، مطلب پرستی، طمعِ نفسانی، حصولِ عیش اور قول و عمل کا فرق قرار پائیگا اور یہی عناصرِ لطیف یورپ کی اعلیٰ تہذیب کے روح رواں نظر آئیں گے، پھر اس تہذیب کو زمانہ میں جتنا جتنا فروغ ملتا گیا اُتنی اُتنی دُنیا کی بے چینیاں، قلبوں کے اضطراب بڑھتے رہے، حتیٰ کہ آج یہ تہذیب خود اپنے ہی دست و گریباں سے اُلجھی ہوئی ہے، جو تہذیب دوسروں کے حقوق چھین کر اُن کو مٹا کر خود زندہ رہنے کی آرزومند ہو، جس تہذیب میں ضعیف و کمزور قوموں کو دُنیا میں زندہ رہنے کا کوئی انسانی حق نہ ملتا ہو۔ جس تہذیب میں اعلیٰ درجہ کا جھوٹ بہترین مصلحتوں کے نام سے مستعمل ہو، جس تہذیب میں شراب نوشی، قماربازی، اور عریانیت کا علانیہ جواز ہو، جو تہذیب عورت کو مشترکہ لطف اندوزی کا مجسمہ بناتی ہو۔ جس تہذیب میں نوعِ انسانی کے درمیان رنگ و نسل کا غرور و امتیاز موجود ہو، بیشک اُس تہذیب کو وہ مغرب زدہ لوگ تو سراہ سکتے ہیں۔ جنکا مطمحِ نظر محض اجتماعِ دولت اور حصولِ عیش ہو، لیکن دُنیا کے بیشمار انسانی قلوب اس لغو تہذیب کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات سے لبریز ہیں۔

یورپ کی تہذیب کو اگر خالص تمدنی و معاشرتی پہلو سے دیکھا جائے اور اوّلاً صنعت و حرفت یا ایجاد و اختراع کے کمالات پر ہی نظر ڈالی جائے جو کسی ملک و قوم کی تہذیب کا ایک جز کہے جاسکتے ہیں، تو بھی تاریخِ انسانی کی اس روشن حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ انسانی ترقی تدریجی طور پر ظہور میں آئی ہے اور ہر نسل اپنی پچھلی نسل کے تجربات و مشاہدات سے فائدہ اُٹھا کر اپنی معلومات کو آگے بڑھا رہی ہے۔ انسانی تجربات سے استفادہ کرنے میں، ملک و قوم کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ موجودہ انسانی تہذیب ماحصل ہے پچھلی تہذیبوں کا، ایک ملک و قوم کی تحقیق و ایجاد دوسرے ملک و قوم کے ہاتھ لگی اور اس ملک کے محققوں اور موجدوں کے لئے نئی نئی شاہراہیں کھل گئیں مثلاً علم ہندسہ اہلِ یورپ کا اہلِ عرب سے حاصل کرنا اور اہلِ عرب کا اُسے ہندوستان سے حاصل کرنا اور اہلِ ہندوستان کا اُسے ایجاد کرنا، کتب تاریخ کا ایک مشہور تذکرہ ہے۔ ہر گھنٹہ کے ساٹھ منٹ اور ہر منٹ کے ساٹھ سیکنڈ کا تعین بابل والوں نے کیا بارود اور قطب نما کی ایجاد اہلِ چین کا حصہ تھی۔ مختصر یہ کہ یورپ کی اختراعی ترقی میں بھی کچھ اُسکا ذاتی سرمایہ نہیں ہے۔ اہلِ یورپ دنیا کی تاریخ سے الگ نہیں ہوسکتے، یہ سرمایہ مشترک ہے بلا تخصیص امتیازِ ملک و قوم، انسانی دماغوں کی پیداوار کے ساتھ،

ثانیاً جہاں تک تمدنی و معاشرتی تہذیب کا تعلق کسی ملک کے رسم و رواج، وضع اور لباس سے ہے اس میں بھی کسی تفوق و مقابلہ کی جستجو بیکار ہے۔ "ہر ملکے۔ و ہر رسمے" کی مشہور مثل کی روشنی میں رسم و رواج ترکیب پاتے ہیں۔ اپنے اپنے ملک کی آب ہوا یا موسم معتقدات یا خیالات کے ماحول سے رسم رواج میں کمی بیشی یا اصلاح و درستی اپنے اپنے ملک کی روایتوں کو سامنے رکھکر ہی ہونا زیادہ مناسب ہے لیکن ان معاملات میں محض تقلید تو کوئی تیجہ پیدا نہیں کرتی، جابجا بعض صورتوں میں تو مضحکہ خیز اور قابل ملامت بن جاتی ہے۔

بہر حال تہذیبیں تو ہمیشہ اپنے علمبرداروں کی عملی قوتوں یا کمزوریوں کی بدولت زمانہ کی گردشوں کے ساتھ اپنے اپنے مادّی کمالات یا قوتِ ایجادات و اختراعات لے کر بنتی بگڑتی رہتی ہیں اور ہر مادّی کمال اپنے عروج کے بعد زوال کی پستیوں کیطرف سرنگوں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ تھوڑے ہی زمانے کی لوٹ پھیر کے بعد وہ کمال دُنیا کے دلوں سے فراموش ہو جاتا ہے۔ کسی متحیر کر دینے والے مادّی کمال کو کسی طلسماتی ایجاد کو کسی ہونہار اختراع کو بقائے دوام حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ان کمالات کا اثر ہماری نظروں تک رہتا ہے۔ لیکن نظروں سے اُتر کر ہمارے قلوب کی گہرائیاں ان کمالات کے اثرات سے پُر نہیں ہوتیں۔ دلوں کی گہرائیوں تک پہونچنے والی چیز اخلاق ہے۔ اخلاق تہذیب کا وہ عنصرِ اہم ہے جس کے بغیر تہذیب کاغذ کا ایک بے رنگ و بُو پھول ہے گو اُس کو بندگانِ حرص و غرض اپنی قبیح عادتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے ایک خیالی چیز کہتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھئے تو ہماری سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی روزمرہ کی زندگی کے عام برتاؤ میں یہ چیز کس قدر دخیل ہے اور کس حد تک انسانی اعمال و افعال کے رگ و ریشہ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

جس تہذیب میں اخلاق کا عنصر غالب رہا ہے وہ تہذیب اپنے بے عمل علمبرداروں کی بدولت خواہ کتنی ہی کمزور و مضمحل کیوں نہ ہو چکی ہو، لیکن غیر اخلاقی تہذیب کے تباہ کن نتائج و اثرات سے لرز کر دُنیا کے قلوب پھر ایک بار اُسی تہذیب کی طرف کھنچتے ہیں۔ اور عام طور پر دلوں میں ایسی تہذیب کے لئے ایک تڑپ پائی جاتی ہے۔ دلوں میں اس قسم کی تڑپ یا کشش کوئی واہمہ یا خیالی چیز نہیں ہے۔ یہ چیز نظر آسکتی ہے مگر کسی خورد بین سے نہیں۔ سنہری فریموں کے پرتکلف چشموں سے نہیں یہ کشش یا تڑپ دل کی نظروں سے دیکھی جاسکتی ہے، دل بھی وہ بیادل نہیں جن کی رگوں میں خود غرضی کا سفید خون دوڑ رہا ہو جو انسان کو انسان سے نفرت دلانے کی عملی تعلیم دے رہے ہوں۔ جو اپنی خواہشات و نفسیات کی طرف بے تحاشا دوڑ رہے ہوں۔ جو انسانی آبادی سے بھاگ کر جنگلوں میں اپنا مسکن بنا رہے ہوں جو آبِ ہوا کے نام سے اپنی عشرتوں اور ہوس کاریوں کے لئے تمام نگاہوں سے محفوظ خلوتیں ٹٹول رہے ہوں، ایسے دل اور ایسے دل رکھنے والے انسان وہ نظر نہیں رکھتے جو ہزاروں لاکھوں نفوس کی بے چینیاں دیکھنے کے قابل ہو۔

دوسرے لفظوں میں دو قسم کی چیزوں کا باہم مقابلہ کر کے تجربہ نے جسے مُضر و کمتر قرار دیا ہو۔ اس سے دلوں میں ایک تنفر پیدا ہونا اور جس چیز کو مفید و بہتر تسلیم کیا ہو، دلوں کا اُس کی طرف رجوع ہونا بالکل ایک نفسیاتی و فطری چیز ہے۔ یہ کوئی وہمی اور خیالی چیز نہیں ہے۔

ایشیائی تہذیب کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں اخلاق کا عنصر غالب رہا ہے۔ اس سرزمین کے مہذب انسانوں نے بے نفس ہو کر بنی نوع انسان کی بھلائی و بہتری کی عملی تعلیم دی ہے۔ اُنھوں نے انسانی دُکھ درد کے مسائل پر غور و خوض کرنے میں کھانا، پینا، سونا ترک کر دیا ہے۔ اُنھوں نے انسانوں سے محبت کی ہے۔ پریم اُن کے یہاں کا سب سے بڑا جوہر ہے، رحمدلی اُن کی محبت کا ایک عنصر قوی ہے وہ انسان تو انسان چوپایوں پر بھی رحم کھاتے ہیں، چوپائے تو چوپائے کیڑی کموڑوں پر بھی انھیں ترس آتا ہے۔ کسی فارسی شاعر نے بہت صحیح ترجمانی کی ہے کہ:-

آہستہ خرام بلکہ مخرام
زیر قدمت ہزار جانست

ایشیا کی خاک کے خمیر نے پیغمبر بنائے ہیں، دیوتا پیدا کئے ہیں۔ جنکی بے نفسی کی سچی تعلیم کا اثر دُنیا کے گوشہ گوشہ میں پہونچا ہے۔ دیوتا یا پیغمبر کا لفظ خوش عقیدہ لوگوں کی ایجاد سہی، لیکن دراصل یہ لفظ اعترافِ عظمت کی دلیل ہے۔ ان بے نفس و ایثار پسند انسانوں کی ہدایات و تعلیمات دلوں کی گہرائیوں تک پہونچیں اور نقوش بنکر رہیں، یہی نقوش جب اُبھرے تو کوئی پیغمبر کا تصور پیش کرتا تھا، کوئی نقش دیوتا کی شکل میں نمودار تھا۔ یورپ کے صدہا خود غرضی کے فلسفہ کے قائل معلّموں کے لئے، کروڑوں انسانوں کے دلوں میں اعترافِ عظمت کے یہ نقوش کہاں؟

ایک زمانہ تھا کہ ہمارا ملک تمام علوم و فنون کا اور مختلف تہذیبوں کا مرکز تھا۔ دنیا کی تمام قومیں اسے رشک کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ مصریوں کا تمدن،

یونانیوں کی شائستگی، ایرانیوں کا عروج، آریوں کا اقتدار، عربوں کی تہذیب۔ یہاں کیا کچھ نہ تھا سیاحانِ عالم ہمارے ملک کی تہذیب سے متاثر ہوتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ تک اُسے پہونچاتے تھے۔

مگر:- ؎ مدّت ہوئی کہ دل کا جنازہ نکل گیا

اب اُس تہذیب کا چشمہ خشک ہے وہ تہذیب پرانے محلوں کے کھنڈر اور مزارات میں دفن ہے آج ہم اس تہذیب کو زندہ کرنے اور فروغ دینے کے لئے اُس تہذیب کے جواہر ریزوں کو نکالنے کے لئے دُنیا کی تجارت گاہوں میں مال کے کھرے اور کھوٹے کی کسوٹی پیش کرنے کے لئے نہ آزاد ہیں نہ اپنے میں قوتِ عمل کی ایک ہلکی سی بھی لہر پاتے ہیں۔ ہم پر یورپ کی تہذیب مسلّط ہے وہ ایک ہی چیز ہے جو مغرب سے مشرق تک پھیلی ہوئی ہے۔ وہی خود غرضی کا فلسفہ ہے جو ہزاروں شکلوں میں پھوٹ نکلا ہے۔ محکوم ملک میں اس کی صورت اور بھی بھیانک نظر آرہی ہے، ہندوستان میں یہ فلسفہ جسقدر کریہہ صورت میں نمودار ہے، ہوسکتا ہے کہ یورپ کے آزاد و دولت مند ممالک میں اس کی بدشکلی پر کوئی غازہ مل دیا گیا ہو۔ جس کے سبب سطحی نظر سے دیکھنے والوں کو موجودہ یورپ ہندوستان کے درمیان دو مختلف تہذیبوں کا فرق نظر آرہا ہو اور وہ ان میں سے ایک کو فوقیت دینا چاہتے ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ یہاں ڈسپلن نہیں ہے۔ یہاں تنظیم نہیں ہے۔ یہاں باپ کو بیٹے پر بیٹے کو باپ پر اعتماد نہیں ہے۔ یہاں بھائی کے لئے بھائی چھری لئے پھرتا ہے یہاں غریبوں کو دولت مندوں کی جانب سے معمولی زندگی کی سہولتیں بھی نہیں پہونچنے دی جاتیں سے شما غریب انسانوں کی قدرتی صلاحیتوں اور استعدادوں کے گلے پر رشک وحسد کی تیز چھری پھیردی جاتی ہے، ترقی کی دوڑ میں دو انسان اپنی اپنی صحیح قوتوں کی آزمائش کے ساتھ دوڑ میں حصّہ نہیں لیتے بلکہ ایک دوسرے کو گرا کر آگے نکل جانے کی فکروں میں مبتلا رہتے ہیں۔ سینماؤں کی اور ٹکٹ کی کھڑکیوں پر تماشہ گاہوں اور سیر گاہوں کے دروازوں سے داخل ہوتے اور باہر آتے وقت، جلوسوں کے نظاروں کے مواقع پر جو کشمکش ہوتی ہے جس طرح ہاتھا پائی اور زور آزمائیاں ایک دوسرے سے پہلے نکلنے اور ٹکٹ پہلے حاصل ہوجانے کے لئے کی جاتی ہیں۔ صبح سے شام تک گھر اور باہر کی زندگی میں جس طرح ہم بد معاشی، فریب، غیر ایمانداری، جھوٹ بے قاعدگی اور ناانصافی سے کام لیتے ہیں، جس طرح ہم کسی چشم دید واقعہ کے خلاف آزادانہ اور سچی شہادت دینے کے ناقابل ہیں۔ جس طرح ہم مصلحتوں سے بلند ہو کر انصاف کرنے سے عاجز ہیں اسی طرح ہماری باہمی بے اعتمادیاں قانون کو جابرانہ طور پر ہمارے ہی گلے کا پھندا بنا رہی ہیں اور ہم اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ رہے ہیں، یہاں ممنوعات کو توڑنے کی طرف ایک خاص رجحان پایا جاتا ہے۔ صاف شفاف سڑکوں کے کنارے دفاتر میں عوام کی گزرگاہوں پر جہاں تھوکنے اور پیشاب کرنے کی ممانعت کی تختی لگی ہوگی، ذرا تامل اور خاموشی کے ساتھ آپ دیکھیں گے تو عین انہیں تختیوں کے نیچے تھوکتے ہوئے بھی پائیں گے اور پیشاب کرتے ہوئے بھی، بہرطور یہ، اور بہت سی باتیں ہماری جہالت اور تہذیب سے عریانیت کی دلیل میں پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن غور سے دیکھئے تو ان ہزاروں خرابیوں اور تباہیوں میں وہی نفس پرستی اور خود غرضی کا فلسفہ نظر آئیگا جس نے ایک شیطانی تہذیب میں ظاہر ہو کر بے نفسی اور ایثار کی روحانی تعلیم کی جگہ لے لی ہے۔ موجودہ ہندوستان کی عام تہذیبی خرابیوں پر نظر ڈالنا دراصل یورپ ہی کی تہذیب کے نتائج و اثرات کو معلوم کرنا اور اُس پر حرف گیری کرنا ہے۔ اس لئے موجودہ ہندوستان کی عام تہذیب کوئی اُس کی اپنی تہذیب نہیں ہے۔ جس کے مختلف ہونے کی حالت میں یورپ کی تہذیب سے مقابلہ کیا جاسکے۔ غلاموں کی کون سی تہذیب ہوتی ہے؟ جیلوں کے قیدیوں کو کس تہذیب کی زنجیریں جکڑے ہوئے ہوتی ہیں؟ یہ سبھی جانتے ہیں اس لئے موجودہ محکوم ہندوستان کی تہذیب کے مقابلہ کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ ایسے مقابلہ کے لئے تصور کا قدم پیچھے ہٹانا پڑیگا اور مشرقِ گذشتہ کی تہذیب کو سامنے لانا پڑیگا۔ جسے دُنیا یقیناً یورپ کی موجودہ تہذیب سے کہیں بلند و بالا تر پائیگی

ولی اللہ خاں فرقی گوالیاری

مشاعرہ شاعر

مصرع طرح برائے ماہ اپریل ۱۹۴۲ء

"خزاں کے بھیس میں دورِ بہارِ خوشگوار آیا"

بہار۔ قرار وغیرہ قوافی۔ آیا ردیف

نوٹ:- ۱۰ مارچ ۱۹۴۲ء کے بعد جو غزلیں وصول ہونگی وہ غیر مطبوعہ اشاعت نہ ہوسکیگی

مدیر

رقصِ بسمل

وہ نگاہیں مہربانی پر جو مائل ہوگئیں — سچ تو یہ ہے اور بھی غارتگرِ دل ہوگئیں
میرے سوزِ دل سے ہوتی ہیں انھیں تحریکِ عیش — میری آہیں باعثِ گرمیٔ محفل ہوگئیں
کیا ضرورت انتظارِ جلوۂ لیلیٰ کی تھی — آرزوئیں قیس کی قربانِ محمل ہوگئیں
جو تمنائیں کہ قاتل سے ابھی تک تھیں نہاں — کچھ نمایاں وہ بشکلِ رقصِ بسمل ہوگئیں
اُن نگاہوں سے ہمیں تھی آرزوئے التفات — ملتفت ہوکر وہ برقِ خرمنِ دل ہوگئیں
وہ ادائیں جو نزاکت کی سراسر جان تھیں — اللہ اللہ کس طرح شمشیرِ قاتل ہوگئیں
تھیں تمنائیں کبھی رونق فروزِ بزمِ دل — رفتہ رفتہ محو مثلِ حرفِ باطل ہوگئیں
اسکو کہتے ہیں وفاداری کبھی چھوڑا نہ ساتھ — حسرتیں دل کی چراغِ تربتِ دل ہوگئیں
وہ نگاہوں سے مری بچتے ہیں، ڈرتے ہیں کہیں — یہ اگر ہم سے کسی مطلب کی سائل ہوگئیں

تا بمنزل جب رسائی ہوگئی وحشت محال
دقتیں ہر ہر قدم پر مجھکو منزل ہوگئیں

(خان بہادر) رضا علی وحشت

رفتارِ سخن

جب بھی تھی عذاب میں جان سی اور اب بھی جان ہے مشکل میں — ماضی کا جو رونا حال میں ہے شاید ہے وہی مستقبل میں
آ اور سما جا آنکھوں میں آنکھوں سے مری آ جا دل میں — بڑھ جائیگی رونق محفل کی تو شمع بنا کر محفل میں
دیوانہ بنایا ہے تونے پروانہ بنایا ہے تونے — میں تجھ کو شمع بناؤنگا گر جذب ہے سوزِ کامل میں
جب مرنے پر تھے آمادہ دل جینے کا تھا دلدادہ — جب موت ہماری مشکل تھی اب جان پڑی ہے مشکل میں
اے وحشتِ دل ہے شکر ترا، یکسوئی کا موقع تو ملا — اپنا ہے نہ بیگانہ ہے وہاں آ پہونچا ہوں جس منزل میں
پھر اُس دل کا کیا رونا ہے جب مفت ہی اُسکو کھونا ہے — حاصل دراصل ہے لاحاصل پھر رکھا کیا ہے حاصل میں
سمجھو جو برا تو برا ہوں میں اچھا سمجھو اچھا ہوں میں — گھٹنے کو ماہِ کامل ہے گو داغ ہے ماہِ کامل میں
احساس کسی شے کا ہے برا اس سے بھی برا ہے گلہ شکوہ — اے غافل مایوسی کے سوا کیا ہے خمیازہ منزل میں
ظالم دنیا کو چھوڑ نہ دے گھبرا کے دم اپنا توڑ نہ دے — اک بار تڑپ کر مرنے کی طاقت ہے ابھی تک بسمل میں

کیا کیا اعجاز دکھاتی ہے رفتار مری گفتار مری
جذبات کے طوفاں اٹھتے ہیں جب اے صابر ہیں ہم دل میں

صابر اکبرآبادی بی۔ اے

ملا

پ

اُس روز میں آئیں ہاؤس کے پاس کھڑا موٹر بس کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے سُنا

"لینا ہے تو لے نہیں تو بھاگ جا!"

"نہیں سرکار چار آنے دیجئے۔"

"ہم دُو آنہ سے ایک کوڑی بھی زیادہ نہیں دے گا!"

"چار آنے سے کم نہیں ہونگے سرکار۔ بہت دُور ہے۔"

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آخر معاملہ کیا ہے جدھر سے آواز آرہی تھی میں اُدھر ہو لیا جہاں ایک بڑے تن و توش کا اینگلو انڈین اپنی میم کے ساتھ رکشا کے نزدیک کھڑا تھا۔ رکشا والا دست بستہ نہایت عاجزانہ طور پر یہ کہتے ہوئے صاحب کی طرف بڑھا "دُو آنے تو بہت کم ہیں۔" اس کے جواب میں صاحب نے نہایت بیدردی کے ساتھ اُس کے سینہ پر ایک گھونسہ مارا۔ رکشے والے کے منہ سے ایک آہ نکلی اور وہ پاس ہی کیچڑ میں جاگرا رکشے کے پاس دوانی ڈال کر صاحب اور میم چل دیئے۔

رکشے والے کو بڑی چوٹ آئی تھی۔ وہ کراہتا ہوا اٹھا۔ مجھے اُس پر رحم آگیا۔ پاس جاکر میں نے دریافت کیا "کیوں بھائی چوٹ زیادہ تو نہیں لگی؟"

وہ رکشے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "نہیں بابوجی"

"کہاں سے آرہے ہو؟"

"اسپنر سے۔"

"کرایہ کتنا ٹھہرایا تھا؟"

"ٹھہرایا تو کچھ بھی نہیں تھا بابوجی۔ میں نے سوچا بھلے آدمی ہیں چار آنے سے کیا کم دیں گے۔ یہاں آکر وہ صرف دُو آنے دینے لگے۔ میں چار آنے مانگتا تھا!"

"تم دن بھر میں کتنا کما لیتے ہو؟"

"یہی دس پانچ آنے بابوجی۔"

"تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"ہمارا گھر کہاں ہے بابو ——— دن بھر مزدوری کرتے ہیں۔ رات کو کسی کے گھر کے چھجے کے نیچے یا سڑک کی پٹری پر سو جاتے ہیں۔"

"تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"میرا مکان ننگاصہ کے پاس ہے۔"

"پھر تم وہاں سے یہاں کیسے آئے؟"

(پیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے) اس پاپی پیٹ کے لئے بابو! ہمارا نصیب ہی پھوٹا ہے۔" اتنا کہہ کر دفعتاً رکشے والا خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار صاف طور پر نمایاں ہو رہے تھے۔ ہاتھ سے اُس نے پیشانی کا پسینہ پونچھا اور رکشا اُٹھاتے ہوئے بولا "حضور آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"یہیں پل کے پاس۔"

"میں اُدھر ہی جا رہا ہوں۔ آیئے پہونچا دوں۔"

"نہیں، ابھی میں اُدھر نہیں جاؤں گا۔ ماؤنٹ روڈ پر تھوڑا کام ہے" یہ کہکر میں نے عنوان تبدیل کرتے ہوئے دریافت کیا "مکان پر تمہارے کون کون ہے؟"

"میری ایک لڑکی اور اُسکا ایک لڑکا ہے۔"

"اور تمہارا داماد کہاں رہتا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

رکشا والا خاموشی سے زمین کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر آہ سرد بھر کر بولا

"آپ یہ کیوں دریافت کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا "یوں ہی، آخر تم اپنا مکان چھوڑ کر یہاں کیسے آئے؟"

"حضور یہ ایک طویل داستان ہے۔"

"کسی سے جھگڑا کر کے تو نہیں آئے ہو؟"

"نہیں"

"تو؟"

"حضور ہماری قوم بڑی خراب ہے۔ دوسروں کے رنج و غم پر ہم مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسروں کو روتے دیکھکر ہم ہنستے ہیں۔ اپنے عیبوں کی پردہ پوشی کرتا ہیں

دوسروں کے معمولی قطعوں کو پہاڑ بنا دیتے ہیں۔ دوسرا اسقائی کھاتا ہے تو ہم جی میں ۔گرد ملانا جانتے ہیں۔ ہمارا مکان چاہے سونے سے بھرا پڑا ہو، لیکن دوسرے کو سوکھی روٹی کھاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ نہ معلوم کب سے یہ تو تو میں میں چلی آ رہی ہے۔ پھر بھی ہم آدمی ہیں۔ انسانی پیٹ کے لیے سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی خاموش ہو جانا پڑتا ہے۔"

"لیکن بھائی یہ تو کہو کہ آخر بات کیا ہے؟ تم انسان کو اتنا کوستے کیوں ہو؟ معلوم ہوتا ہے تمہارے دل پر کسی نے بڑی ٹھیس لگائی ہے۔"

"کیا پوچھتے ہیں آپ حضور! آپ کی طرح اتنی محبت آمیز گفتگو کرنے والا آدمی میں نے اس شہر میں دوسرا نہیں دیکھا۔ میں نے اپنی بات اب تک کسی سے نہیں کہی۔ لیکن اب آپ سے کیا پوشیدہ رکھوں!"

"ننذگام کے پاس بیرل باندو نام کا ایک موضع ہے۔ وہیں کا میں رہنے والا ہوں۔ میرے والد کے پاس سو ایکڑ زمین تھی اس میں سے بیس پچیس ایکڑ زمین مقدمے بازی کے چکر میں پڑ کر وکیل اور عدالت کی نذر ہو گئی۔ کچھ زمین میری چار بہنوں کی شادی بیاہ میں تھوڑی تھوڑی کر کے فروخت کر دی گئی۔ باقی ماندہ زمین میرے والد کی وفات کے بعد بھائیوں میں تقسیم ہو گئی۔

ایک دن پاس کے موضع سے جب میں تھکا ماندہ گھر لوٹا تو تھانے کے پاس برگد کے نیچے کچھ لوگوں کو جمع دیکھا۔ اپنی طرف ان کی اشارہ بازی اور آپس میں کانا پھوسی دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ کسی سے گفت و شنید کئے بغیر میں سیدھا اپنے مکان میں آ گیا گھر میں قدم رکھتے ہی میں نے دیکھا کہ میری بیٹی گھبرائی ہوئی سی ایک کونے میں بیٹھی ہے۔ میں تاڑ گیا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ میرا نوکر بیلوں کے لئے پوال نکال رہا تھا۔ میں نے اُسے پاس بلایا اور پوچھا "کیا معاملہ ہے رے؟" لیکن نوکر نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے جب اُسے دوبارہ ڈانٹا تو بڑی جھجک کے ساتھ اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا "لوگ امائی (میری لڑکی) کے بارہ میں نجانے کیا کیا بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔" میں دو تین منٹ خاموشی کے ساتھ کھڑا رہا۔ نوکر کی بات سنتے ہی میں سب کچھ سمجھ گیا۔ میں لڑکی کے پاس گیا دیکھا کہ وہ پسینے سے تربتر اپنی آنکھیں نیچی کئے ہوئے سسک رہی تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ہاتھ کی کوڑی سے اُسے روئی کی طرح دُھن ڈالا، اُس کے ہاتھوں کی چوڑیاں چور چور ہو گئیں، وہ آہستہ آہستہ درد سے کراہتی رہی۔ لیکن گریہ و زاری نہیں کی۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اُسے پیٹا تھا اور اس قدر کہ مجھے خود تعجب ہو رہا تھا۔ نجانے اُس دن میرے سر پر کون سا شیطان سوار ہو گیا تھا!

اس واقعہ کے بعد کئی روز تک میں مکان کے باہر نہیں نکلا۔ باہر سے کوئی چیز منگانی ہوتی تو نوکر کے ہاتھ منگا لیتا۔ گاؤں کے لوگ نوکر کو روک کر بڑی دیر تک نہ معلوم اُس سے کیا کیا پوچھا کرتے۔ یہ دن کاٹنے مشکل ہو گئے۔ لڑکی کی منگنی ہو چکی تھی۔ اُس کی سسرال سے ایک طویل خط آیا جو نہایت طنز آمیز تھا "آپ ایسی ہی لڑکی کو میرے لڑکے کے گلے منڈھنا چاہتے تھے؟ آپ کو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہئے!" بیچاری لڑکی کا تو اور بھی بُرا حال تھا۔ اُس سے کوئی بولتا تک نہیں تھا۔ اُسے خوف تھا مجھے غصہ اور نوکر کو شرم۔

آخر اس ذلت کی زندگی سے تنگ آ کر ایک دن میں نے مع لڑکی کے گاؤں کو خیرباد کہا اور مدراس چلا آیا۔ یہاں آ کر ہم دونوں دھرم شالہ میں مقیم ہوئے۔ مدراس دو ایک بار پہلے بھی آ چکا تھا۔ سویرے ہی میں کسی کام کاج کی تلاش میں باہر نکلتا اور شام ہوتے ہوتے خالی ہاتھ واپس لوٹ آتا۔ اس طرح دن گذرتے جا رہے تھے۔ پاس پلے جو بھی تھا آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ میں دیہاتی کسان ٹھہرا شہر میں کیونکر کام ملتا؟ میرا دل زندگی سے اُچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن بیٹی کی محبت مجھے جکڑے ہوئے تھی۔ میں رات میں جہاں سوتا تھا وہیں برآمدہ میں ایک رکشا والا آ کر سویا کرتا تھا۔ وہ بڑا ہی ملنسار اور رحم دل تھا۔ وہ روزانہ اپنی زندگی کے واقعات سُنایا کرتا تھا اُس نے مجھے بھی فاقہ کشی اور تقدیر کو سخت سُست کہنے کے بجائے رکشا چلانے کی ترغیب دی۔ مجھے یہ کام بہت ہی نفرت آمیز معلوم ہوا۔ ہر چند میں امیر نہ تھا پھر بھی ایک اچھے کھاتے پیتے گھر سے تعلق رکھتا تھا۔ جانوروں کی طرح آدمیوں کو ڈھونا اور دو دو چار چار پیسے کے لئے لوگوں کی لعنت ملامت برداشت کرنا مجھے کچھ اچھا نہ معلوم ہوا لیکن پیٹ جو نہ کرائے وہ تھوڑا ہے۔ اسی اثنا میں میری لڑکی کے ایک لڑکا ہوا اور میرے لئے کچھ نہ کچھ کمانا لازمی ہو گیا۔ آخرکار میں نے حلیہ تبدیل کر کے رکشا چلانا شروع کر لیا۔ اسی سے ہماری گذر بسر ہونے لگی۔ مجھے اب کسی سے گلہ نہیں۔ جو قسمت میں لکھا تھا وہی ہو رہا ہے۔ کسی کو کیوں قصوروار ٹھہراؤں!"

اس قصے کو سُن کر میرا دل جذباتِ محبت سے لبریز ہو گیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے رکشے والے سے دریافت کیا "اپنے داماد کا نام بتا سکتے ہو؟"

"داماد کیسا بابو؟"

"ارے وہ ہی جس کے کرتوت کی بنا پر تمھیں یہ مصیبتیں اُٹھانی پڑ رہی ہیں"

بڑی جھجک کے ساتھ رکشے والا بولا "بن کیا"

"بن کیا؟" میرا سر چکرا گیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ خود کو سنبھال کر میں نے پوچھا "تم رہتے کہاں ہو؟"

"بار برس برج کے پاس"

میں "تمہارا نام؟"

رکشے والا "مجھے لوگ کوٹیا کہتے ہیں"

اتنے میں میری بس آگئی۔ اور میں پھر اُس سے ملنے کا وعدہ کرکے اُس پر سوار ہو گیا۔

(۲)

آج سے قریباً پانچ سال پہلے کی بات ہے کہ میں میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا میرے ساتھ اور بھی طلبا رہتے تھے جو قریب قریب سبھی جوان تھے۔ یوں تو کئی طلبا سے میری دوستی تھی لیکن میرا ایک ایسا بھی ساتھی تھا جس پر مجھے پورا اعتماد تھا۔ وہ ہمارے دوستوں میں سب سے زیادہ تیز طبع اور اتنا ہی نٹ کھٹ بھی تھا۔ اس میں وصف تھا تو صرف اتنا کہ پڑھائی میں اُسکا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا باقی اُس میں شرارت ہی شرارت تھی۔ پھر بھی نہ معلوم کیوں میں اُس سے بہت محبت کرتا تھا۔ بدقسمتی سے میں ایک سال فیل ہو جانے کی وجہ سے اُس سے بچھڑ گیا۔ میرا دوست امتحان پاس کرکے گاؤں چلا گیا۔ ہم لوگوں کی خط و کتابت برابر جاری رہی۔

ایک دن صبح کے وقت منہ ہاتھ دھوکر میں اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا کہ ایک لانبا، چھریرے بدن کا کوئی اجنبی سا آدمی آتا دکھائی دیا۔ اُس کے چہرے پر تفکر کے آثار نمایاں تھے۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ پاس پہونچنے پر میں نے دیکھا تو وہ میرا دوست چودھری تھا۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر میں نے تعجب سے دریافت کیا "تم ادھر کیسے چلے آئے؟ تمہاری تو شادی کی گفتگو ہو رہی تھی نا؟"

لیکن میری ایک بات کا بھی اُس نے جواب نہ دیا۔ میں جیسے جیسے اس سے دریافت کرتا ویسے ہی ویسے اُس کے دل کی کسک اور بھی بڑھتی جاتی تھی۔ میں نے ذرا نزدیک جا کر اُس سے دریافت کیا "چودھری کیا بات ہے؟ تجھے یہ ہو کیا گیا ہے؟"

وہ میرے گلے سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگا۔ میں نے پھر کوئی سوال نہیں

کیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے خود بخود کہا "میں نے ایک گناہِ عظیم کیا ہے"

"آخر کیا کر ڈالا؟" میں نے کہا۔ لیکن وہ پھر خاموش ہو گیا۔ میں نے اس کے شانے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا "کیوں بولتے کیوں نہیں؟ سچ سچ کہو آخر بات کیا ہے؟"

تب اُس نے بڑی جھجک اور شرم کے ساتھ کہا "میں نے ایک بات تم سے بہت دنوں سے پوشیدہ رکھی تھی لیکن اب تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ میں بچپن میں اپنے گاؤں کے جس اسکول میں پڑھتا تھا، اُسی اسکول میں ایک لڑکی بھی پڑھتی تھی۔ میں ساتویں درجے میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور وہ تیسرے درجے میں۔ وہ میرے پاس حساب سیکھنے کے لئے آیا کرتی تھی۔ اس کے بعد میں شہر کے ہائی اسکول میں پڑھنے چلا گیا جب کبھی میں اپنے گاؤں جاتا تو اس کے یہاں بھی جاتا۔ اُسے بھی مجھ سے ملے بغیر چین نہ پڑتا تھا۔ ہم دونوں کی محبت اور کشش بڑھتی ہی گئی۔ اس کے والد نہایت سیدھے سادے آدمی تھے وہ کبھی کسی پر شک نہیں کرتے تھے۔ آخر جو ہونا تھا وہ ہو کر ہی رہا۔ جس کا گمان بھی نہ تھا وہ بھول ہو گئی۔ ہم دونوں گھبرا گئے۔ لیکن اب ہو ہی کیا سکتا تھا۔ میں اپنے اور اپنے خاندان کی بدنامی برداشت نہ کر سکا۔ اُسی رات بلا کسی سے کچھ کہے سُنے گاؤں چھوڑ کر مدراس چلا آیا۔"

میرے سر پر جیسے بجلی گری۔ میں نے کہا "لعنت ہے تم پر، تم جیسے بہادر چلو بھر پانی میں ڈوب نہیں مرتے؟ تمھیں اپنی بدنامی کا خیال ہے اور اس بیچاری معصوم لڑکی کی آئندہ زندگی کا خیال نہیں؟ شرم نہیں آتی تمھیں؟ چلے جاؤ اسی وقت میرے یہاں سے سمجھنا کہ تمہارا دوست مر گیا۔" میں خاموشی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

چودھری کچھ عرصے تک جہاں کا تہاں کھڑا رہا۔ بعد ازاں خاموشی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ مجھے گناہ سے بڑھ کر اُس کی بزدلی پر غصہ آ رہا تھا۔ اس معصوم دوشیزہ کو بے یار و مددگار چھوڑ کر وہ اپنی بدنامی کے ڈر سے مدراس بھاگ آیا۔ یہ سوچ کر میرے رُوئیں رُوئیں میں آگ لگ رہی تھی اُس بیچاری پر کیا گزرے گی۔ یہ اُس نے سوچا تک نہیں۔ مجھے اُس سے نفرت ہو گئی۔ قریب دو ماہ بعد وہ پھر مجھ سے ملا اور بولا "مجھ سے غلطی ضرور سرزد ہوئی۔ لیکن اب میں کر ہی کیا سکتا ہوں؟ میں اُس کی تلاش میں گیا لیکن اسکا کوئی پتہ نہ ملا۔ اب میں کیا کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" میں نے جواب نہ دیا۔ وہ تھوڑی دیر چُپ رہا اور پھر چلا گیا۔

مدراس سے لوٹ کر اُس نے ایک روز میں ایک دو افسانہ کھولا۔ وہ ملنسار اور

اور ہوشیار۔ تو تھا ہی اُس کی پریکٹس خوب چلنے لگی۔ چار پانچ سال کے اندر ہی ڈاکٹر چودہری کے نام سے مشہور ہوگیا۔

گھر پہونچ کر میں چائے پی رہا تھا کہ ڈاکٹر چودہری کی موٹر دروازہ پر آکر کھڑی ہوگئی اور ہلو ہلو شیام بابو کی آواز میرے کان میں پڑی۔ شیام میرے لڑکے کا نام تھا۔ دوسرے ہی لمحے اسے گود میں لئے ہوئے ڈاکٹر چودہری میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے کہا "آج اُدہر کیسے بھول کر چلے آئے؟"

"ایسے ہی، سر جانس کی بیوی بیمار ہے۔ اُس کو دیکھنے آیا تھا تم تو اِدہر کبھی آتے ہی نہیں۔ اسوقت کوئی خاص کام نہ ہو تو کہیں چلا جائے۔" پھر میرے لڑکے کو اُس نے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "کیوں شیام بابو، چلوگے نا؟"

میرے لڑکے نے سر ہلاکر رائے دیدی مجھے بھی کوئی خاص کام نہ تھا، اس لئے ڈاکٹر چودہری کی موٹر میں بیٹھ کر ہم تینوں ہوا خوری کو نکل پڑے۔ موٹر میں چلا رہا تھا اڈیار سے قریب آدھ میل آگے چل کر میں نے ایک تنگ گلی میں موٹر کا رُخ کیا۔

ڈاکٹر چودہری نے تعجب سے پوچھا "ارے اِدہر کہاں؟ کیا اس گندی گلی میں ہوا خوری ہوگی؟"

میں نے کہا "نہیں، اِدہر شیام بابو کا ایک دوست رہتا ہے۔ اس سے ملنے چل رہے ہیں۔"

"شیام بابو کا دوست؟" ڈاکٹر چودہری نے دریافت کیا اور بلا کچھ کہے خاموش ہوگئے۔

کچھ دُور جاکر میں نے موٹر روک دی اور اُتر کر چودہری سے کہا "تم یہاں ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔"

"لیکن تم جا کہاں رہے ہو؟" ڈاکٹر چودہری نے متحیّر ہوکر سوال کیا۔ میں بلا کچھ جواب دیئے آگے بڑھا اور رکشا والی کوٹیا کا مکان تلاش کرنے لگا۔ نزدیک ہی میونسپل کے نل پر گھڑا لئے ایک عورت پانی بھر رہی تھی، میں نے اُس سے پوچھا "کوٹیا چودہری کا مکان کونسا ہے؟"

وہ عورت شرماکر اپنے آنچل کو سنبھالتے ہوئے آنکھوں سے سامنے والے مکان کی طرف اشارہ کرکے بولی "یہی ہے۔"

ایک تعلیم یافتہ، صاف ستھرے کپڑے پہنے امیر آدمی کو اس محلہ میں آتا دیکھکر وہ متحیّر سی تھی۔ میرے دریافت کرنے کے طریقے نے اُسے اور بھی تعجب میں ڈالدیا۔ اُس عورت کے پاس ایک لڑکا کھڑا تھا۔ میں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا "بچے تمہارے نانا کب آئیں گے؟"

لڑکے نے جواب دیا "رات میں"

"چلو ہمارے ساتھ چلو، ہم تمھیں مٹھائی دیں گے۔" کہتے ہوئے میں نے اُسے گود میں اُٹھالیا اور موٹر کی طرف بڑھا۔

چودہری نے پوچھا "یہ کس کا لڑکا گود میں لئے چلے آرہے ہو؟ تم بھی عجیب آدمی ہو۔"

میں نے کہا "یہ کسی رکشا والے کا ہی ہوگا۔ یہ شیام کا دوست ہے۔"

میرے اس طرزِ عمل سے عورت دنگ رہ گئی۔ گھڑے کو آدھا بھرا ہی رکھ کر وہ گھبرائی ہوئی سی میرے پیچھے پیچھے دوڑی آئی۔ چودہری اُس کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اُس عورت نے پہلے تو اُسے پہچانا نہیں کیونکہ وہ سوٹ بوٹ میں پورا صاحب بنا ہوا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اُسے پہچان کر پانی پانی ہوگئی۔ غصہ اور خوف سے اُسکا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ پاس پڑوس کی عورتیں یہ تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہوگئیں تھیں۔ اُسے کچھ نہ سوجھتا تھا۔ چودہری کی نظریں دفعتاً زمین میں گڑگئیں۔

میں نے اُس بدنصیب عورت کو سمجھا دیا کہ ہم اسی بغل کے شوالے میں بیٹھے ہیں تمہارے باوجی آئیں تو ان سے کہنا کہ اُن کے ایک دوست جو آج سویرے اُنھیں آیس ہاؤس کے پاس ملے تھے۔ اپنے ایک دوست کے ساتھ اُن سے ملنے آئے ہیں۔

رات کے قریب قریب نو بج گئے تھے۔ شیام اور شیاما کا دوست کھیل کود موٹر ہی میں سو گئے تھے۔ ڈاکٹر چودہری کے ہوش و حواس ٹھکانے نہ تھے۔ اُس کے دماغ میں ایک عجیب ہل چل مچی ہوئی تھی۔ دوڑتا ہوا ایک آدمی ہماری طرف آیا مجھے پہچاننے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی وہ کوٹیا چودہری ہی تھا۔ ڈاکٹر چودہری اُسے دیکھکر دُور کھڑا ہوگیا۔ کوٹیا نے اسے نہیں پہچانا۔

میں نے کہا "یہ میرے ایک دوست ہیں۔ یہاں بڑے ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر چودہری کا نام تو آپ نے سُنا ہے نا؟"

کوٹیا "یہ آپ کیا کہتے ہیں سرکار؟ آپ کا نام بھلا کون نہیں جانتا [illegible]

میں آپ ہی کا تو بنگلہ ہے نا جہاں تو کئی بار میں سوا... یاں لے جا چکا ہوں"

میں نے کہا "ہاں، ہاں، وہی"

اسی وقت چودہری آگے بڑھا اور جھک کر کوٹیا کے قدموں کو چھوا۔ وہ ہکا بکا سا رہ گیا۔

میں نے کہا "ان کو پہچانا نہیں؟"

گلی کے موڑ پر لگی ہوئی بتی کی دھندلی روشنی میں کوٹیا نے ڈاکٹر چودہری کو پہچانا اور اُسے اپنی لڑکی کے بچپن کے ساتھی جن کیا کی یاد آگئی۔ اس کا تعجب غم میں تبدیل ہو گیا۔ دانت پیس کر وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کو غش آگیا اور وہ وہیں گر پڑا

اسی رات کوٹیا اس کی بیٹی، ڈاکٹر چودہری اور شیام بابو کا دوست میرے مہمان تھے۔

ترجمہ **شایق ہنگامی بی۔ اے**

فکرِ لطیف

وفائے رائیگاں کو بھول جاؤں
کسی نامہرباں کو بھول جاؤں

نہ جانے کب ہو آزادی میسر
قفس میں آشیاں کو بھول جاؤں

یہی تو منتہائے بے خودی ہے
کہ ہر سود و زیاں کو بھول جاؤں

طلسمِ روز و شب ٹوٹے نہ ٹوٹے
سلوکِ آسماں کو بھول جاؤں

نہیں جب قوتِ پرواز باقی
فضائے بے کراں کو بھول جاؤں

تمہاری یاد کا یہ ہے تقاضا
کہ میں سارے جہاں کو بھول جاؤں

جبیں کو بے نیازِ سجدہ کر لوں
جو تیرے آستاں کو بھول جاؤں

نہیں ممکن کہ اے وعدہ فراموش
فریبِ داستاں کو بھول جاؤں

بہاروں کا تقاضا ہے کہ انور
جفائے باغباں کو بھول جاؤں

لطیف انور

میری جوانی

یہ اُنکا تصور یہ راتیں سہانی
یہ آغازِ اُلفت یہ عہدِ جوانی

مرے عہدِ رنگیں کی رنگیں کہانی
گئی اپنے ہمراہ لیکر جوانی

کروں کیا قفس اور نشیمن کی پروا
نہ یہ جاودانی نہ وہ جاودانی

نہیں اب ہوس عشرتِ عارضی کی
مجھے مل گیا ہے غمِ جاودانی

محبت کی نیرنگیوں کی ہے شاہد
مری نوحہ خوانی مری شادمانی

یہ نالے یہ آہیں یہ اختر شماری
نہ کردیں کہیں فاش رازِ نہانی

یہ کافر گھٹائیں یہ بہکی فضائیں
یہ ساون کی راتیں یہ میری جوانی

اُمنگوں کا طوفان پھر اُٹھ رہا ہے
نہ ہو جائے اونچا کہیں سر سے پانی

چھپایا اگر عابدی راز ہم نے
نم آلود آنکھوں کی ترجمانی

عابدی سیمابی

نافرمان شاگرد سے خطاب

باش اے شاگردِ ناہنجار اے مطلب پرست
کیوں شرابِ خودسری کے نشہ میں پھرتا ہے مست

تیری نظروں میں نہیں ہے احترام استاد کا
تو نے پہچانا نہیں شاید مقام استاد کا

سوقیانہ تیرے حملے عزتِ استاد پر
تو ہے اک دھبہ جبینِ اسوۂ اجداد پر

مرتبہ استاد کا حق نے کیا اتنا بلند
خدمتِ استاد ہی سے آدمی ہے ارجمند

جس کے فیضِ تربیت سے تو بھی کامل ہوگیا
اب وہ تیرے جذبۂ نفرت کے قابل ہوگیا!

کون؟ وہ استاد جسکی اک نگاہِ التفات
مصلحِ اخلاق اور پیغمبرِ درسِ حیات

کون؟ وہ استاد جس کا ہر سبق ہے زندگی
زندگی وہ زندگی جس میں ہے اک تابندگی

کون؟ وہ استاد وہ افضل شفیق و مہرباں
جسکے سائے میں ہوا کرتا ہے انساں کامراں

کون؟ وہ استاد جو ہے نازشِ انسانیت
خاک ہے جسکے قدم کی دولتِ روحانیت

جس نے تیرے نام کو دنیا میں روشن کردیا
جس نے تیری عقل کے تانبے کو کندن کردیا

گلشنِ ہستی میں تھا تو اک گلِ بے رنگ و بو
دب رہا تھا تیری فطرت میں ابھی ذوقِ نمو

اک نظر استاد کی پڑتے ہی تو کیا ہوگیا
اہلِ عالم کے لئے دلکش تماشا ہوگیا

تیری ہستی فطرتاً تھی ایک مہمل سی غزل
جا بجا تھا جس میں بے ترتیب جملوں کا محل

جب تری اصلاح کو اٹھی نظر استاد کی
پھر وہی مہمل غزل جانِ فصاحت بن گئی

دور تھا تیری سمجھ سے مقصدِ ہستی کا راز
خیر و شر میں کر نہیں سکتا تھا کوئی امتیاز

اٹھ گیا جب تیرے چہرے سے جہالت کا نقاب
آسمانِ معرفت کا بن گیا تو آفتاب

کون تھا جس نے تجھے قطرے سے دریا کردیا
کون تھا جس نے تجھے پستی سے بالا کردیا

تھا وہ تیرا مہرباں استاد اے نادان سن!
آدمی وہ کیا کہ جو استاد کے گائے نہ گن

جو کوئی استاد کی عظمت سے ٹکر کھائیگا
قعرِ ذلت میں وہ جاہل خود بخود گر جائیگا

باپ سے بڑھ کر ہے ناداں مرتبہ استاد کا
یہ خلاصہ ہے رسول اللہؐ کے ارشاد کا

ارشد صدیقی امروہوی

تجنیسِ مضارع

"تجنیسِ مضارع" کے عنوان سے ذیل میں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے وہ جنابِ سید خورشید علی قمر نقوی بے پوری کی زیرِ طبع کتاب کا ایک مختصر حصہ ہے، جو اسی نام سے عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ اردو زبان میں آسانی اور سہولت پیدا کرنے کے لئے قمر صاحب نے جو خدمت انجام دی ہے وہ بہت اہم اور قابلِ قدر ہے۔ متوسط قابلیت کے لوگوں کے لئے تو واقعی یہ چیز مشعلِ راہ ہے۔ جہانتک مجھے علم ہے اردو زبان میں کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جو اس مقصد کو بہ تمام و کمال پورا کر دے۔ صحت املائے پہلوؤں کو روشن ترین بنانے کے لئے اس سے بہتر تالیف نہیں ہو سکتی ــــــ

اعجاز صدیقی

جس طرح انگریزی زبان میں متفق الصوت (ہم آواز) و مختلف الہجا والمعانی الفاظ مثلاً Bad اور Bed یا Lad اور Lead اکثر پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح عربی زبان میں بھی اس قسم کے الفاظ کی بیحد فراوانی ہے۔ مثلاً "اسم" اور "اثم"۔ "احتراز" اور "اعتراض"۔ "حسین" اور "حصین"۔ "سورت اور صورت وغیرہم اس کے علاوہ بعض الفاظِ فارسی و اردو میں بھی اس قسم کا اشتباہ پایا جاتا ہے جیسے "باد" اور "بعد"۔ "باز" اور "بعض"۔ "آج" اور "عاج" وغیرہ ــــــ

اور اردو زبان میں عربی کے الفاظ بکثرت شامل ہیں۔ جن میں ہم آواز ہونے کی وجہ سے اکثر املا میں غلطی ہو جاتی ہے۔ اس بات کو اردو کی بدنصیبی سمجھئے، یا اردو داں حضرات کی بے پروائی، عدم توجہی اور کم ذوقی، کہ بعض اوقات اچھے اچھے لکھے پڑھے حضرات بھی اس قسم کے الفاظ کی تحریر میں غلطی کر جاتے ہیں۔

فنِ املا کی رہبری میں اسوقت تک کوئی مبسوط اور مکمل کتاب نہیں لکھی گئی حالانکہ فی زمانہ بلحاظ قدامت، اردو اپنے اُن مدارج سے گزر چکی ہے۔ جن کو اسکا ابتدائی اور الھڑپن کا زمانہ کہا جا سکتا تھا۔ نیز اردو میں علوم ادبیہ کا کافی ذخیرہ بھی جمع ہو چکا ہے۔ لغت، صرف، نحو، ریاضی، عروض، اخلاق، فلسفہ اور ہیئت وغیرہ کی ہزار ہا کتابیں تصنیف و تالیف ہو چکی ہیں، تاہم صحتِ املا کے لئے لغت کے سوا کوئی ایسا رہنما مجموعہ تالیف نہیں ہوا کہ جس سے اسکی موجودہ دشواریاں رفع ہوتیں۔

تحریرِ مضامین میں املا کی درستی مضمون نگار کی قابلیت علمی کی آئینہ دار ہوتی ہے اور یہ بات فارسی و عربی کی اعلیٰ تعلیم کے بغیر بآسانی حاصل نہیں ہوتی۔ کتب لغت میں اگرچہ ہر لفظ کے ساتھ اُسکا مخرج اور مادہ وغیرہ تشریح و صراحت کیساتھ درج کیا گیا ہے۔ مگر اُس کے ساتھ اُس کا ہم آواز دوسرے مادہ اور مخرج کا لفظ درج نہیں ہوتا۔ حالانکہ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کو سُن کر یہ بات خواب و خیال میں بھی نہیں آتی کہ اسی آواز سے ملتا جلتا کوئی دوسرا لفظ کسی دوسرے مادہ اور ہجا کا بھی زبان میں موجود ہے۔

اگرچہ "تجنیسِ مضارع" کا ماخذ کتب لغت ہی ہیں، لیکن حُسن ترتیب سے اس میں ایک خاص جدّت و ندرت پیدا ہو گئی ہے۔ اس میں تمام ایسے الفاظ جو بلحاظ آواز متفق اور ہجے اور معنی کے لحاظ سے مختلف ہیں، جمع کئے گئے ہیں اور ہر لفظ کے سامنے ہی اُس کا ہم آواز لفظ درج کر کے اُس کے ہجے اور معانی کا اختلاف بتا کر رفع شک کیا گیا ہے جس سے اسکی ہم آہنگی کا اہمال بھی دور ہو گیا ــــــ

الفاظ		الفاظ متجانس	
الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
آثار۔ ع	اثر کی جمع، پرانے درختوں کے نشانات، تاثیرات کھوج۔	اعصار۔ ع	زمانے، زمانے کے بہت سے دور، عصر کی جمع
آثار۔ ف	سیر بھر وزن		
آج۔ اردو	موجودہ دن	عاج۔ ع	ہاتھی دانت۔

الفاظ	معانی	الفاظ متجانس	معانی
آثم ۔ ع	گنہگار۔	عاصم ۔ ع	باز رکھنے والا۔ نگاہ رکھنے والا
آجل ۔ ع	عُقبیٰ	عاجل ۔ ع	جلدی کرنے والا، جلدباز، نیز "دنیا" سے مراد لی جاتی ہے۔
آس ۔ ع	ایک درخت کا نام جس کو فارسی میں مُورد کہتے ہیں اسی کا پھل "حب الآس" ہے۔	عاس ۔ ع	رات کے وقت گشت کرنے والا
آس ۔ ف	آٹا پیسنے کی چکی		
آس ۔ اردو	اُمید		
آسی ۔ ع	بید، طبیب، الطبیب راہ نشیں غمناک	عاسی ۔ ع	بہت بوڑھا۔
		عاصی ۔ ع	خطاکار، گنہگار، مجرم، نافرمان وہ ابر جو نہ برسے اور طبیبوں کی اصطلاح میں وہ معدہ جو مسہل کا اثر قبول نہ کرے۔ اور "رگ عاصی" وہ رگ جو فصد میں خون نہ دے
آسیا ۔ ف	آٹا پیسنے کی چکی	آسیہ ۔ ع	فرعون کی بیوی کا نام۔
آصف ۔ ع	حضرت سلیمان کے وزیر کا نام	عاصف ۔ ع	تیز آندھی، وہ دن جب تیز آندھی چلے۔
آلم ۔ ع	رنج پہنچانے والا	عالم ۔ ع	جاننے والا، علم سے واقف لکھا پڑھا آدمی
آلی ۔ ع	منسوب بہ آل	عالی ۔ ع	برتر۔ بلند
آم ۔ اردو	انبہ، ایک مشہور میوہ	عام ۔ ع	برس۔ سال
		عامّ ۔ ع	پھیلا ہوا، مشہور
آمال ۔ ع	اَمَل کی جمع۔ اُمیدیں	اعمال ۔ ع	عمل کی جمع، کارہا۔ دیہات، پرگنے

الفاظ	معانی	الفاظ متجانس	معانی
آملی ۔ ع	آرزومند	عامل ۔ ع	حاکم۔ عمل کرنے والا، کاریگر کام کرنے والا۔
آنا ۔ اردو	پاس ہو جانا۔ نزدیک ہو جانا۔	آنہ ۔ ف	کا، نسبت۔ جیسے ماہانہ اور سالانہ میں۔
		آنہ ۔ اردو	چار پیسے۔ روپیہ کا سولھواں حصّہ
		عانہ ۔ ع	پیڑو۔ ناف سے نیچے کا حصّہ
ابر ۔ ف	بادل۔	عبر ۔ ع	انجام کی خبر دینا خواب کی تعبیر کہنا۔ دریا کا کنارہ۔ گھاٹ
اثم ۔ ع	گناہ، وہ کام جو شرع اسلام میں ناجائز و ممنوع ہو۔ مثل زنا و شراب خوری وغیرہ	اسم ۔ ع	نام
اثیر ۔ ع	بلند۔ عالی۔ کرۂ نار۔ نیز بمعنی آسمان	اسیر ۔ ع	قیدی۔ گرفتار
		عسیر ۔ ع	دشوار۔ مشکل
		عصیر ۔ ع	انگور وغیرہ کا نچوڑا ہوا شیرہ۔ انگوری شراب ہر چیز کا نچوڑا ہوا پانی
احتراز ۔ ع	بچنا۔ پرہیز کرنا۔	اعتراض ۔ ع	شبہ کرنا، کوئی عیب نکالنا
احتظاظ ۔ ع	صاحب نصیب ہونا۔ لذت اٹھانا	اہتزاز ۔ ع	اونٹ کا آواز حدی سے خوش ہو کر جھومنا۔ خوشحالی، خوشی، ستارے کا ڈوبتے وقت چمکنا۔ گھاس کا لنا۔ ہر چیز کا جھومنا اور ہلنا۔
احساس ۔ ع	چھونا، حس کرنا، معلوم کرنے کی قوت	احصاص ۔ ع	حصّہ دینا

الفاظ	معانی	الفاظ متجانس	معانی
احسان۔ ع	بدلہ۔ نیکی	احصان۔ ع	برائی سے بچنا۔ پرہیزگار ہونا، شوہر کرنا۔ عورت چاہنا
احوال ع	حالات، حال کی جمع۔ کیفیات	اہوال۔ ع	خوف، ڈر، "ہول" کی جمع
آدم۔ ع	"ادیم" کی جمع خلاف قیاس چمڑے	عدم۔ ع	ناپید مقام
ادیم۔ ع	ادھوڑی، چمڑا، روئے زمین سے مراد۔	عدیم ع	ناپید
اذل۔ ع	ذلیل تر	ازل۔ ع	دنیا کی پیدائش کا دن۔
		اضل ع	بہت زیادہ گمراہ۔
		عزل۔ ع	بے ہتھیار ہونا۔
		عضل۔ ع	"عضلہ" کی جمع، گوشت کے دو ٹکڑے جن کے ہر ریشے میں چربی ملی ہوئی ہو۔
ارز۔ ف	بھاؤ، قیمت، مول	ارض۔ ع	زمین۔
		عرض۔ ع	چوڑائی، درخواست کرنا، دیوانگی، کسی بڑے اور بزرگ آدمی سے کوئی بات کہنی، کسی شخص پر کسی بات کا ظاہر کرنا،

الفاظ	معانی	الفاظ متجانس	معانی
ارضی۔ ع	زمینی، زمین کا، متعلق بہ زمین	عرضی۔ ع	گھر کا اسباب، ملامت درخواست، وہ استدعا جو کسی کے روبرو تحریری طور پر پیش کی جائے۔
ارق۔ ع	بے خوابی، بیداری۔ سہر	عرق۔ ع	جسم کا پسینہ، وہ پانی جو دواؤں کو گرم کر کے یا بھگو کر یا بخارات اٹھا کر حاصل کیا جائے
ازہر۔ ع	بہت چمکدار، بہت روشن	اظہر۔ ع	بہت زیادہ ظاہر۔
اسباب۔ ع	سبب کی جمع۔ نیز بمعنی سامان	اصباب۔ ع	زمین کے بہت سے نشیب
استعفا۔ ع	طلبِ عفو کرنا۔ معافی چاہنا۔ ملازمت سے دست بردار ہونا۔	استیفا۔ ع	پورا کرنا
اسرف۔ ع	بے فائدہ خرچ کرنا، فضولخرچی۔ فضول خرچی کرنا۔	اصرف۔ ع	خرچ کرنا۔

سید خورشید علی مہر تقوی جے پوری

خطاب و جواب

کنول سے خطاب :-

گذشتہ شب یہ میں نے خواب میں دیکھا عجب منظر
بہ تا باں کا فیض عام تھا دُنیائے گلشن پر
کہیں گلہائے رنگا رنگ تھے شل پری پیکر
کہیں نرگس اشارے کر رہی تھی مست ہو ہو کر

کنول اسوقت کیوں مجھکو تمہاری یاد آتی تھی؟

ادہر فواروں سے پانی کے قطرے یوں چھلکتے تھے
کہ جیسے نازنیں پہنے کھڑے ہوں ہار موتی کے
چھما چھم اک طرف قطروں کی وہ آواز تھی جیسے
پری رقص پریاں قاف سے آئی ہوں بن ٹھنکے

کنول اسوقت کیوں مجھ کو تمہاری یاد آتی تھی؟

مجھے ایک سمت سے بلبل نے یہ آواز دی رسوا
حسینان چمن آرام سے سوتے ہیں چپ رہنا
مجھے معلوم ہے تو جستجو میں جس کی ہے آیا
نہیں آیا گلستاں میں ابھی وہ رشک گل تیرا

کنول اسوقت کیوں مجھ کو تمہاری یاد آتی تھی؟

پپیہے نے کہا جب پی تو میں رونے لگا پیہم
مجھے یاد اپنے پی کی آگئی، دل ہوگیا پر غم
مری دُنیائے دل کا ادہر ہی کچھ ہوگیا عالم
مرے احوال پہ کرنے لگا سارا چمن ماتم

کنول اسوقت کیوں مجھ کو تمہاری یاد آتی تھی؟

چمن میں ہر طرف شاخوں پہ بلبل گیت گاتے تھے
ہم سُن سُن کے جسکو تالیاں پتے بجاتے تھے
خوشی و سرخوشی میں غنچہ و گل مسکراتے تھے
ادہر اک ہم تھے گوشے میں کہ آنسو بہاتے تھے

کنول اسوقت کیوں مجھ کو تمہاری یاد آتی تھی؟

فلک نے ماہ کو آغوش میں لیکر کیا پردا
حجاب پردۂ محمل میں جیسے چھپ گئی لیلیٰ
یکایک چھاگیا صحن گلستاں پر اندھیرا سا
نہ پوچھو کسقدر غمگیں ہوا اس سے دل رسوا

کنول اسوقت کیوں مجھ کو تمہاری یاد آتی تھی؟

کنول کا جواب :-

وہی یہ باغ ہے جس باغ میں تمکو ستاتی تھی
پکڑتے تم مجھے آتے تھے ادہر میں بھاگ جاتی تھی
مناتے تم خوشامد سے تو میں آنسو بہاتی تھی
مگر آخر یہی ہوتا کہ سینے سے لگاتی تھی

وہ دن جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتی ہیں

یہی وہ سر ہے جو رہتا تھا ہر دم تیرے زانو پر
یہی وہ زُلف ہے جس سے تجھے میں باندھتی اکثر
یہی وہ دل ہے جو رہتا تھا تیری یاد میں مضطر
یہی وہ آنکھ ہے جس کو کہا کرتا تھا تو ساغر

وہ دن جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

وہی رات اور وہی دن ہے مگر اب تم نہیں پیارے
نہ ہو ساقی تو یہ اسباب پھر بیکار ہیں سارے
فلک پر میں گنا کرتی ہوں اب بھی رات کو تارے
مگر جب تو نہیں، تو یہ نظر آتے ہیں انگارے

وہ دن جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

سمجھنا یہ نہ تو ہرگز کہ تجھ کو بھول جاؤنگی
زمانہ جس کو دیکھے گا وہ اکدن کر دکھاؤنگی
جو سینے میں بھڑکتی آگ ہے اسکو بجھاؤنگی
نہیں آتا، نہ آ تو، ایکدن میں آپ آؤنگی

وہ دن جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

خیال آتے ہی تیرا نیند سے میں چونک جاتی ہوں
تری تصویر کو سینے سے میں اپنے لگاتی ہوں
یہی ایک آسرا ہے جس سے کچھ تسکین پاتی ہوں
تبارے رسوا کبھی تجھ کو بھی اب میں یاد آتی ہوں

وہ دن جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

—— (((رسوا پاجودوی))) ——

انشائے لطیف

لسان الملک حضرت ریاض مرحوم خیرآبادی کا خط

عزیز من۔ بھاگل ہسپتال سے شگفتہ صاحب کا جواب ذریعہ کارڈ آیا۔
ملک سر فیروز خاں نون[1] جو کچھ آپ چاہیں لکھ دیں گے۔ چند غزلیں بھیجئے یا
خود تقریظ۔ سر عبدالقادر ولایت میں ہیں۔ آپنے پر جیسا کہئے نہیں کہا گئی
آپ میری طرف سے شکریہ لکھ دیجئے۔ وقت پر جو داے آپ قائم کریں گے
لکھ جائیگا۔ معلوم نہیں آپ لاہور گئے یا نہیں۔ میں نے حکیم یوسف حسن صاحب
کو غزل بھیجدی انھوں نے لکھا کہ وقت باقی نہیں ہے۔ میں نے غزل بھیجی اور
لکھ دیا کہ نقشا صاحب خود معاوضہ دینا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ میری مدد کرتے
رہتے ہیں۔ وہ خود کسی معاوضے پہ میری غزل کسی اور پرچے کو دے دیتے
تو میں آپ سے شرمندہ ہوتا۔ غزل کا ہر قافیہ ممتنع الجواب ہے اور بغیر
قید قافیہ یہ شعر متقدمین متاخرین کیا کسی زبان میں کوئی صاحب دعویٰ
کے لئے شعر کسی کا بھیجدیں یہی صلا ہے۔ غزل آپ نیرنگ خیال میں دیکھئے
مطلع درج ذیل ہے ؎

صبح[2] بہار میں نہ یہ شام بہار میں
کھلتے ہیں پھول جائے حسینوں کے ہار میں

خدا کرے آپ ہر طرح بہ صحت و عافیت اور مطمئن ہوں

تبہ ریاض احمد خیرآبادی

سادہ جگہ رہی جاتی ہے اس لئے ایک اور شعر یاد آیا لکھے دیتا ہوں ؎

لیتی ہے سانس ایک ہوا میں تمام خلق
جتنے ہیں سب بندھے ہوئے ہیں اک تار میں

"ساقی" کا نام نمبر ضرور دیکھئے۔

ریاض۔ ۲۷ ستمبر ۳۳ء

لسان الملک حضرت ریاض مرحوم خیرآبادی کا خط

اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری کے نام

کرمی تسلیم میرا دست مرتعش نہ دلکشی سے لکھ سکتا ہے نہ کچھ لکھ سکتا ہے
آپ کی کہنہ مشقی اور خدائے سخن آبر کے ساتھ امتیازی خصوصیات مقدمۂ
تبصرۂ دیوان کی محتاج نہ تھی مگر ظلم تھا اگر مقدمے اور تبصرے سے
نیاز[3] و عزیز[4] آپ کی قدر افزائی نہ فرماتے۔ عزیز صاحب کی کم نگاری
جن اسباب سے ہو سحر طراز مدیر نگار سے دوش بدوش ہے۔ میں
اس لئے دونوں حضرات کا شکر گذار ہوں کہ میرے پہلو نشین حضرت دل
کا معاملہ ہے مجھ میں دل میں اتنا فرق ہے کہ میرا مجموعہ کلام ابتذال
سے خالی نہیں اور اُن کا کلام اس سے پاک ہے اور جس کی تمام خصوصیتیں
مقدمے اور تبصرے میں نہایت حسن سے ظاہر کر دی گئی ہیں۔ کتابت
طباعت تقطیع کا نقصان ہے سوا تمام مجموعہ جاذب و نظر فریب ہے۔ انگریزی
مذاق بہ اعتبار تعلیم شاید حرف گیری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش
کرے مگر سحر طراز نیاز کے مقدمے اور جناب عزیز کے تبصرے نے
دیوان[5] کو اس سے بھی بے نیاز کر دیا ہے۔
مذاق کی پاکیزگی۔ زبان کی پاکیزگی۔ حسن بیان۔ سحر بیان۔ معنی آفرینی
جدت طرازی سب کچھ اس مجموعہ میں ہے۔ وہ اچھوتی چیز بھی چھوتی نہیں
جس کے لئے مجھے نیاز نے نئے افسانے مقدمے میں انگشت نما کیا
وہ انگشت جس پر لب ساغر کی لالہ گوں جھلک ہے خالی نہیں۔

میں عمر بھر کا طالب تھا ہر صبا از دست دوست میر سد نیکوست
نمونے کے طور پر اپنے بیان کے ثبوت میں کم از کم اشعار لکھوں تو مقدمے

---

[1] وزیر تعلیم پنجاب [2] افسوس کہ یہ غزل ریاض مرحوم کے مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں
[3] نیاز فتحپوری مدیر نگار [4] لسان الملک حضرت عزیز لکھنوی [5] دیوان نورِ دل

زیادہ ضخامت ہو جائے۔ کچھ اشعار کسی کافر کی بیاض کے لئے لکھے دیتا ہوں ؎

راحتِ وصل بھی تو دور رہے شام و پگاہ　　ذوق ملے دل نہ ہو کم بادۂ مینائی کا

دل بھی مٹ جاتا تمنا میں اگر مٹنے کو تھیں　　رہنے والا کون ہے کس کے لئے گھر رہ گیا

شوق سے تقویٰ شکن بن جاؤ تم ای دل مگر　　یہ سمجھ لو آج پی تو جام کوثر رہ گیا

غبار بن کے اٹھے اور چلے گئے مجھ پر　　مآل دیکھ لیا اے فلک مٹانے کا

دردِ الفت میری تسکین کا پہلو ہی سہی　　ہاتھ دل پر کوئی رکھے تو سوا ہو جانا

وقتِ رخصت تسلیاں دے کر　　اور بھی تم نے بے قرار کیا

اے دل بس اب خدا کے بھروسہ پہ چل نکل　　رہبر تو راہِ عشق میں آیا گیا ہوا

ہنگامِ گریہ آہ نکلتی ہے بار بار
گویا نظامِ جوششِ طبیعت بدل گیا

بندہ ریاض

۱۵ اکتوبر ۱۹۲۳ء از خیرآباد

آغا طاہر نبیرہ شمس العلما حضرت آزاد دہلوی کا خط

دہلی کوچہ چیلان آزاد بک ڈپو
۱۳ اگست ۲۷ء

محبی نفضا صاحب، آداب عرض۔ مزاجِ گرامی والانامہ شرف صدور لایا۔

آپ کی محبت اور شفقت سے اس سے زیادہ اُمیدیں وابستہ ہیں۔ میں بھی لاہور گیا ہوا تھا ایک دیوانی مقدمہ نے دیوانہ بنا رکھا تھا بحمد اللہ کہ وہ ختم ہوا۔ تذکیر و تانیث کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ اُسکا اصول عرض کرتا ہوں۔

لکھنؤ والے جب تک خاص وجہ سامنے نہ ہو عام طور پر بے جان چیزوں کو مونث بولتے ہیں جیسے ترازو۔ سگریٹ وغیرہ

دہلی والے۔ ہر بے جان چیز کو عام طور پر مذکر کہتے ہیں۔ جب تک خاص وجہ نہ ہو اور وہ خاص وجہ کی صورت یہ ہے اوّل تو ہم نام سے ملتے جلتے نام دیکھتے ہیں جیسے ترازو سے ملتے بازو۔ دوسرے اس لفظ کی آواز میں اور حرکات میں کیا شبہ پڑتا ہے۔ تیسرے اُسکی شکل و شباہت میں کہاں تک زنانہ پن ہے ایسے اندازے سے تذکیر و تانیث پر حکم لگایا جاتا ہے۔ اہلِ پنجاب زبان کے ہر معاملہ میں اہلِ اسکول کے پابند ہیں۔ مگر تذکیر و تانیث کا اکثر مغالطہ ہو جاتا ہے کیونکہ گھر میں اُردو اور سرے دو پنجابی ہے اور پنجابی میں سب دہرے ہر چیز کو مونث کہہ سکتے ہیں بلکہ آپ کے علاقے میں اور غضب ہے "سر نار صاحب گیا تھی" یہ مخفف ہے "گیا سی گا" کا

قلم ہر حال میں مذکر ہے۔ خواہ لکھنے کا ہو یا پودے کا۔ کیونکہ شکل ایک ہے البتہ مآل بدل جاتا ہے کیونکہ معنی بدل جاتے ہیں۔ حضرت ذوق کی تصویر ناپید ہے۔ بس وہی تصویر باقی ہے جو میاں بادا نے نوکِ قلم سے دیوانِ ذوق میں کھینچی ہے۔ دراصل میں کچھ مقدمہ بازی کچھ افکار کچھ اپنی علالت کی وجہ سے بالکل بیکار ہو رہا ہوں ذرا ان حوادث سے نکل لوں تو شرفِ حاضر ہوں۔

زیادہ آداب۔

ناچیز طاہر

اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری کا خط

شاہجہانپور
۱۲ مئی ۱۹۳۳ء

کرمی تسلیم۔ غزل بعد ترمیم مناسب ارسال ہے۔ جناب نے تلمذ کے متعلق جو اظہار خیال فرمایا ہے یہ جناب کا حسن ظن ہے مجھکو بیحد مسرت ہوگی اگر آپ یہی محبت قائم رکھیں۔ تلامذۂ حضرت امیر علیہ الرحمۃ میں باہم کوئی رنگ نہیں جناب جلیل کے بیر قدیمی مخلص ہیں ایک مرتبہ جناب مضطر مرزا پوری نے ایک مقطع جناب جلیل کی خدمت میں پیش کیا ؎

چُن چُن کے پھول لائے ہیں باغِ جلیل سے
مضطر عروسِ نظم کا زیور بنائیں گے

جناب جلیل نے فرمایا کہ اگر بجائے جلیل آپ امیر لکھتے تو میں زیادہ خوش ہوتا ایک مرتبہ سندیلہ کے عظیم الشان مشاعرہ میں تمام شاہیر شریک تھے میں بھی تھا حضرت ریاض خیرآبادی بھی وہاں مقیم تھے۔ مگر شرکت مشاعرہ کا قصد نہ تھا بایں وجہ خلوت نشیں ہو گئے میری خبر پاکر جناب تسلیم مرحوم کو سمجھا کر میں بوجہ حاضری قاصر ہوں۔ آپ تنہا مجھ سے ملئے لکھنؤ میں جب وہ میری حاضری کی خبر پاتے ہیں مخلصانہ اور برادرانہ طور پر ملنے آتے ہیں بہرحال ہم لوگ ایک ہی آستانہ کے خادم ہیں اگر جناب کو میرے شرکتِ سخن کا اعلان ہی کرنا مقصود ہو تو بے تکلف دونوں نام لکھئے۔ میری یہ رائے ہے آئندہ جو آپکی مشقِ سخن جاری ہو جناب نے دورِ جدید کے خوشگوار شعرا کے مطالعۂ دیوان کی بابت مجھ سے استفسار فرمایا ہے لہذا گذارش ہے کہ اصغر گونڈوی۔ جگر مرادآبادی فانی بدایونی اس رنگ میں کہتے ہیں صفات کی تقلید کیجئے اور نقائص سے گریز۔ نقائص کے متعلق مجملاً گذارش ہے کہ بعض جگہ صرف الفاظ ہوتے ہیں۔ جنکو مفہوم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تغزل کا رنگ قائم رہے۔ غزل مرثیہ یا مجموعہ پند نامہ نہ ہو جائے۔ جناب عزیز لکھنوی سے عرصہ ہوا کہ شاعری کی بحث پر مجھ سے

نوائے دلِ نشیں

زندگی صرفِ انقلاب، دہر میں گر کبھی نہ ہو
ذہن و نظر میں کامیاب عشرتِ زندگی نہ ہو

غم نہ اگر ہو دل نواز، دل سے بھی آگہی نہ ہو
میری خوشی اسی میں ہے میری خوشی کبھی نہ ہو

کیف و سرور و عیش پر اسکی نگاہ کیوں پڑے
رنج و ملال و یاس کی جس کے لئے کمی نہ ہو

وقفِ خزاں چمن سہی، کیوں ہو اسیرِ تیرگی
صبحِ بہار اگر نہیں، شامِ بہار بھی نہ ہو

ساغر و مے کا اہتمام میرے لئے فضول ہے
زحمتِ لب تو وہ اُٹھائے جسنے نظر سے پی نہ ہو

عجز و نیاز عشق میں رنگ نہ آئے ناز کا
قسمتِ بیخودی اگر حوصلۂ خودی نہ ہو

ایسا سکونِ جاوداں، دونوں جہاں میں ہے کہاں
موت کا ہو نہ ڈر جہاں خطرۂ زندگی نہ ہو

عرضِ غمِ فراق کا اُسپہ غلط ہے اتہام
ضبط کے بند و بست میں آہ بھی جسنے کی نہ ہو

ہوں ابھی تشنۂ کرم۔ دل کا نہیں ہے درد کم
میں ہوں ابھی اسیرِ غم مجھ سے خفا ابھی نہ ہو

آگ بھری ہے آجکل میرے چمن میں ہم نشیں
ایسی کوئی جگہ نہیں، برق جہاں گری نہ ہو

اُسکو حدیثِ بے کسی کوئی سنائے کس طرح؟
جسکے حریمِ ناز میں پرسشِ حال ہی نہ ہو

راہرو رہِ وفا صبر و رضا سے کام لے
حائلِ منزلِ مراد، شکوۂ نارسی نہ ہو

آئی کدھر سے آج یہ درد بھری ہوئی صدا
صحنِ چمن میں دیکھنا نیرؔ خورجوی نہ ہو

نیرؔ خورجوی

فریبِ مدّعا

جفائے نارواہے اور میں ہوں
وفا کا آسرا ہے اور میں ہوں

معاذ اللہ جنونِ کاوشِ غم
فریبِ مدعا ہے اور میں ہوں

نہیں کوئی رفیقِ راہِ منزل
کسی کا نقشِ پا ہے اور میں ہوں

دیارِ عشق کی راہوں میں تنہا
دلِ نا آشنا ہے اور میں ہوں

شکستہ دل ہے اک پہلو میں میرے
یہ سازِ بے صدا ہے اور میں ہوں

مرے ظلمت کدے کی شامِ غم میں
کوئی جلوہ نما ہے اور میں ہوں

خفا گوہرؔ وہ مجھ سے ہو گئے ہیں
خدا کا آسرا ہے اور میں ہوں

سید مظفر حسین گوہرؔ (علیگ)

حقیقتِ لفظ "شروعات"

رسالۂ "رہنمائے تعلیم" کا سالانہ نمبر میرے پیشِ نظر ہے جو ماہ جنوری و فروری ۱۹۴۲ء کا مشترکہ پرچہ ہے۔ رسالہ مذکورہ پر سرسری نظر ڈالنے سے ایک بلند پایہ مضمون "لفظ شروعات تحقیق کی روشنی میں" دیکھنے میں آیا۔ شروع میں تو اڈیٹر رسالہ مذکور جناب جوش ملسیانی مدیر حصہ نظم نے اس لفظ کی صحت میں بہت کچھ گہر افشانی کی ہے اور حتی المقدور ثبوت بہم پہونچانے کی سعیٔ بلیغ فرمائی ہے مگر پھر بھی آپ اس کی دلیل میں کافی ثبوت پیش نہیں کر سکے ہیں۔ اور خود بھی مشکوک سے نظر آتے ہیں۔ جناب بیخود صاحب دہلوی کا یہ فرمانا کہ لفظ شروعات کی کوئی ہستی نہیں بالکل بجا ہے۔ جہلائے دہلی کی زبان پر اس لفظ کا ہونا اس لفظ کی صحت کی دلیل نہیں دُنیا میں ایسے ہزارہا الفاظ ہیں جو عوام کی زبان پر ہیں مگر وہ عام نہیں اور اساتذہ اُسے غلط جانتے ہیں مثال کے طور پر،

سودا ؎ تجھکو فقط چراغِ شام ڈھونڈے نہیں ہے گھر بگھر
پھرتی ہے بادِ صبحگاہ خانہ بخانہ کو بکو

یہاں گھر گھر کے بجائے گھر بگھر غلط اور جاہل عوام کی زبان ہے

حفیظ جونپوری ؎ یہ سُنتے تھے ترکِ محبت ہے مشکل
بجبراً مگر اسکو بھی کر کے دیکھا

بہ جبر یا جبراً کے بجائے بجبراً صحیح نہیں۔

حفیظ جونپوری ؎ اجل کی بیرخی نے مار ڈالا
طویل زندگی نے مار ڈالا

طویلِ زندگی کے بجائے طویل زندگی بلا اضافت ہونا چاہئے اضافت کے ساتھ استعمال جائز ہو

سودا ؎ اس چشم کا غمزہ جو کرے قتل دو عالم
گوشے کو نگہ کے نہیں پرواہ کسی کا

یہاں پرواہ بجائے پروا عوام کی زبان ہے۔

اسی طرح احمق کی جگہ احمقائی۔ اسرار کی جگہ اسرارات۔ جواہر کی جگہ جواہرات امور کے بجائے امورات۔ چاہ کی بجائے چاہات۔ قریب المرگ بجائے قریبِ مرگ۔ حسب الخواہش بجائے حسبِ خواہش صحیح نہیں اس لئے کہ فارسی الفاظ کو بقاعدۂ عربی استعمال کرنا غلط ہے

اسی طرح لاچار غلط ناچار صحیح ہے اس لئے کہ چار فارسی کلمہ ہے اس کے ساتھ کلمہ لا غلط ہے اور اسی طرح یگانگت بجائے یگانگی چونکہ فارسی میں تائے مصدری نہیں آسکتی۔ آگے چلکر ہمارے فاضل دوست نے لفظ شروعات کی الف اور ت کا کثرت کے لئے "ثابت فرمایا ہے۔ مگر شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اس باب میں بھی اساتذۂ متقدمین و حال نے کافی غور و فکر سے کام لیا ہے اور متروکات الفاظ کی ایک کتاب بھی لکھدی ہے اور اسی کے زیر نظر زندگانی۔ آغوش۔ شراکت غلطی۔ انتظاری وغیرہ وغیرہ جملہ الفاظ غلط ٹھہرائے ہیں اس لئے کہ فاضل مردِ ضد کے لانے ہی کی ضرورت کیا جب زندگی۔ آغوش۔ شرکت۔ غلط اور انتظار سے وہی معنی پیدا ہوتے ہیں بلکہ اس سے تو شاعر کی کمزوری پائی جاتی ہے۔ لیکن آپ نے اس کی سند میں بہت سے ثبات اور اقوال سے ادبیات پیش کیا ہے مگر یہاں پھر آپ پر وہی سوال عائد ہوتا ہے۔ مجھے زمانے کے لکھنے اور بولنے سے مطلب نہیں بلکہ شاہیر شعرا اور اساتذہ کا متفق الرائے ہو کر استعمال کرنا مقصود نظر ہے اور اگر ایسا نہیں تو وہ بازاری زبان ہے اور ہرگز قابلِ استعمال نہیں بلکہ اس سے پرہیز کرنا بہتر اور مناسب ہے۔

اس لئے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو غلط العام اور غلط العوام یہ دونوں زبانیں خلط ملط ہو کر اُردو کا قلع قمع کر دیں گی اور وہ زبان جو اپنی لطافت اور پاکیزگی اور محاسن کے لحاظ سے آج ترقی کے زینۂ معراج تک پہونچ چکی ہے اور جس کو شاہیرِ گذشتہ و حال نے اپنے خون سے سینچا ہے۔ چشم زدن میں برباد اور رائیگاں ہو جائیگی۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب میں اپنے فاضل مضمون نگار جناب مولانا آبر احسنی گنوری سے دست بستہ عرض کروں گا کہ انھوں نے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے ہر پہلو کو بچاتے ہوئے مضمون نگاری کی ہے۔ مگر پھر بھی نفاق اور کدورت کی بو جا بجا پائی جاتی ہے۔ آپ کا روئے سخن جناب اعجاز صاحب مدیر رسالہ "شاعر" کی طرف ہے۔ آپ کو تنازع اعجاز صاحب[۱] جو بھی ہو اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں لیکن جہانتک شروعات کا تعلق ہے

۱؎ مجھے جناب آبر گنوری سے ذرہ بھی پرخاش ہے اور نہ میں انھیں اپنا حریف و مقابل سمجھتا ہوں۔ وہ اکثر افسرا[illegible] لوا کے خلاف لکھتے رہے ہیں لیکن آج تک انھیں قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا اور نہ سمجھا جائیگا۔ کاش وہ تعلقات کی اس خوشگواری کو ملحوظِ نظر رکھیں جو اُن کے استادِ محترم اور میرے عم بزرگوار حضرت مولانا احسن مارہروی مرحوم و مغفور کے ساتھ رہی ہے اور جس کا ثبوت خود مدیر [illegible] ارباب سلا کی وفات سے [illegible] دیتے چلے آرہے ہیں۔ [illegible]

اور جس کے متعلق مشاہیر شعرا میں قبلہ استادی نافداسے سخن حضرت نوح ناروی و جناب بیخود صاحب دہلوی کا خیال ظاہر ہو چکا اور یہ دو اساتذہ اسکی صحت کے خلاف ہیں تو جناب دعا صاحب جو خود استادی حضرت نوح ناروی کے شاگرد رشید ہیں اس سے گریز کیونکر کر سکتے ہیں۔ بہتر یہ تھا کہ ان مشاہیر کے علاوہ مثلاً نوح۔ بیخود۔ سیماب آپ اپنے ثبوت میں اس طرح چند بلند پایہ شاعر کا کلام پیش کرتے۔ مگر آپ نے صرف جناب سائل صاحب کا حوالہ دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جناب سائل صاحب ایک مستند شاعر ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ جناب داغ کے جملہ عزیز و اقارب کی زبان جیسا کہ آپ تحریر فرماتے ہیں لامحالہ داغ کے تلامذہ کو سند ہونی چاہئے۔" آج دنیا میں ایک سے ایک علامۂ روزگار۔ فلسفی اور قابل موجود ہیں مگر شاعری کی دنیا میں اُن کی کوئی سند قابل وثوق نہیں ہو سکتی چونکہ وہ باضابطہ شاعر نہیں۔ جناب اثر صاحب جو میرے خیال میں جناب احسن مارہروی مرحوم و مغفور کے تلامذہ میں سے ہیں۔ کاش وہ اپنے استاد کا کوئی شعر پیش کرتے۔ نظام گلشن آبادی یا آپ جیسے غیر مشہور شاعر کی دلیل کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ اگر ایسی ایسی دلیلیں پیش کی جائیں تو میرے خیال میں ہر غلط العوام لفظ کا وجود ہی سرے سے جاتا رہے اور آپ خود تحریر فرماتے ہیں" آج ملک کی شاعری میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہو رہا ہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک ایسا گروہ جو علوم شرقی اور فن شعر سے تو ناواقف محض ہے مگر شاعر بننے کا شوق اسے بیتاب کئے ہوئے ہے" اب اُن کی شاعری کی خصوصیات کیا ہیں۔ جناب اثر صاحب خود تحریر فرماتے ہیں:۔

"(۱) شعر کو معائب محاسن کی زنجیروں سے آزادی دی جائے وہ عیوب جو اساتذہ نے مقرر کئے ہیں اگر جدید شاعر کے اشعار میں ہوں تو کسی کو حق نہیں کہ انھیں عیب کہے یا سمجھے" اب جہاں شعرا کا یہ حال ہو اور انکا ذوق سلیم اس قدر پست ہو چکا ہو وہاں کسی شاعر کا کوئی شعر ثبوت میں پیش کرنا چہ معنی دارد۔ اب میں اپنی دلیل کے ثبوت میں جناب اثر صاحب کی خدمت میں ایک مسئلہ نظریہ پیش کرتا ہوں جو اصحاب اُردو کے لئے مشعل ہدایت ہے اس باب میں مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی نے ۱۹۱۲ء کے اُردوئے معلی میں ایک بہت طویل مضمون لکھا تھا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اُردو لکھنے والے اور نظم کرنے والے اس بات سے بے خبر نہ رہیں کہ اس زبان میں عربی فارسی کے جو الفاظ ملے ہوئے ہیں وہ تین طرح کے ہیں:۔

(۱) ایک وہ جس میں اہل ہند نے لفظی و معنوی تغیر نہیں کیا جیسے الم۔ درد تم ایسے الفاظ بے کھٹکے استعمال کر سکتے ہیں۔

(۲) دوسرے الفاظ جن میں لفظی تغیر ہو گیا ہے۔ مثلاً جو لفظ ساکن الاوسط ہو اسی متحرک الاوسط بولنے لگے ہیں جیسے غلط کو غلط۔ حرف کو حرف اس قسم کے الفاظ کا صحیح طور سے استعمال کرنا لازم ہے۔

(۳) تیسرے وہ الفاظ عربی فارسی کے جن میں معنوی تغیر ہو گیا ہے۔ اہل زبان ان الفاظ کو اور معنی میں بولتے ہیں اہل ہند اور معنی میں بولنے لگے مثلاً محرم کا لفظ اُردو میں چھوٹے کپڑے کے معنی پر مشتمل ہے یا تردد کا لفظ عربی میں آمد و رفت کے معنی پر ہے اور اُردو میں فکر اور تشویش کے معنی پر بولتے ہیں یا جیسے لفظ خفت اردو میں شرمندگی کے معنی پر مشتمل ہے۔ اس قسم کے جمیع الفاظ کا تفحص کرنا چاہئے۔ اور ان سب الفاظ کو ہندی سمجھنا چاہئے اور ترکیب فارسی یا عربی میں جس طرح ہندی الفاظ کو لانا غلط ہے اسی طرح ان الفاظ کا استعمال بھی ہر اس قسم کے لئے اضافت و عطف فارسی وغیرہ میں ناجائز ہوگا یعنی جس طرح کپڑے رنگین کہنا صحیح نہیں اسی طرح محرم رنگین اور چشم نم کہنا بھی ناجائز ہے۔ کیونکہ کسرہ توصیفی ترکیب فارسی کے لئے مخصوص ہے انکے علاوہ ایسے الفاظ بھی اُردو میں بکثرت بولے جاتے ہیں کہ ہندیوں نے کسی عربی یا فارسی لفظ سے اُن کا اشتقاق کر لیا ہے اور اہل زبان اس سے بے خبر ہیں۔ مثلاً نزاکت لفظ فارسی ہے اس سے ہندیوں نے نزاکت کے قیاس پر مصدر عربی بنا لیا اسی طرح علالت۔ نجابت ذہانت۔ لیاقت۔ ملت اور یگانگت وغیرہ وغیرہ ہندیوں نے قیاس سے مصدر بنا لئے ہیں ایسے الفاظ کا استعمال ناجائز ہے اور اگر کوئی لفظ فصحا کی زبان پر چڑھ گیا ہے۔ جیسے بادشاہت اُسے ہندی لفظ سمجھنا چاہئے اور بعض الفاظ میں یائے مصدری زیادہ کی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ سب الفاظ خود معنی مصدری رکھتے ہیں۔ یہ بھی ہندیوں کا تصرف ہے۔ جیسے انتظاری۔ تغافلی۔ غلطی وغیرہ وغیرہ اور بعض الفاظ جمع کر دیتے ہیں حالانکہ وہ سب الفاظ خود جمع ہیں۔ جیسے اخباروں۔ کفاروں۔ آثاروں۔ اعمالوں اور اسراروں یا یہ کہ وہ الفاظ فارسی و ہندی ہیں علامت جمع عربی کی اس میں لگادی ہے۔ مثلاً جاگیرات دیہات۔ باغات و جہازات وغیرہ وغیرہ۔ البتہ وہ الفاظ جو محاورۂ عام میں داخل ہوں وہ کیسے ہی غلط ہوں انکی تصحیح محل حق ہے۔ لہذا زبان عام اور زبان عوام کی تصریح بخوبی ہو چکی اب میں انھیں الفاظ کیساتھ اپنے فاضل مضمون نگار جناب اثر صاحب سے عرض کروں گا کہ وہ دوسرے کی جنگ کو اپنے سر مول نہ لیں اور واقعات کی روشنی میں اس مسئلہ کی جانچ پڑتال فرماکر مزید غور و فکر سے کام لیں اور زیادہ بہتر ہو کہ اسکی صحت یا غیر صحت کا فیصلہ خود جناب دعا صاحب پر چھوڑ دیں۔ اس لئے کہ مجھے کامل یقین ہے کہ وہ میری رائے سے متفق ہونگے۔ زیادہ والسلام والاکرام۔

راقم نور نوحی آروی

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح: "جب نام لیا ہے ترا، دل تھام لیا ہے"

حضرت خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی

نالوں سے اگر میں نے کبھی کام لیا ہے — خود ہی اثرِ نالہ سے دل تھام لیا ہے
آزادیٔ اندوہ فزا سے ہے رہائی — اب میں نے کچھ آرام تہِ دام لیا ہے
اُٹھتی تھیں اُمنگیں اُنھیں بڑھنے نہ دیا پھر — میں نے دلِ ناکام سے اک کام لیا ہے
جُز مشغلۂ نالہ و فریاد نہ تھا کچھ — جو کام کہ دل سے سحر و شام لیا ہے
خود پوچھو تو تم اپنی نگاہوں سے جو کیا تھا — جو تم نے دیا میں نے وہ پیغام لیا ہے
تھا تیرا اشارہ کہ نہ تھا، میں نے دیا دل — اور اپنے ہی سر جُرم کا الزام لیا ہے
غم کیسے غلط کرتے جدائی میں تری ہم — ڈھونڈا ہے تجھے ہاتھ میں جب جام لیا ہے
آرام کے اب نام سے میں ڈرنے لگا ہوں — تکلیف اُٹھائی ہے جب آرام لیا ہے
معلوم انھیں خوب ہے جو واقفِ فن ہیں — وحشت نے محاکات سے جو کام لیا ہے

محسن ادب حضرت نشتر متگامی

پیغام دیا ہے کبھی پیغام لیا ہے — نظروں سے محبت میں بڑا کام لیا ہے
جب میں نے کبھی دل سے ترا نام لیا ہے — ہر شے سے ترے عشق کا پیغام لیا ہے
تکلیف میں آرام کا پیغام لیا ہے — ہم نے یہ محبت میں نیا کام لیا ہے
کیا غم ہے محبت میں اگر کام ہم آئے — ہم نے بھی محبت سے بڑا کام لیا ہے
تو بازِ محبت میں ہوئی ہے مجھے لغزش — تو بارِ محبت نے مجھے تھام لیا ہے
کیوں میرے فسانے پہ ہوئے جاتے ہو برہم — کیا میں نے تمہارا بھی کہیں نام لیا ہے
بچھڑے ہوئے مدت ہوئی تجھ سے مگر اب تک — "جب نام لیا ہے ترا دل تھام لیا ہے"
کہہ دو کہ گھٹاؤں کو ہوائیں نہ اُڑائیں — اک عمر ہوئی ہاتھ میں اب جام لیا ہے
کیا ظرف ہے کیا قوتِ برداشت ہے نشتر — خود مانگ کے بارِ غمِ آلام لیا ہے

حضرت مہر تقوی جے پوری

خلوت میں بھی ہم نے جو ترا نام لیا ہے — اللہ کے ڈر سے بصد ابہام لیا ہے
ہم نے جو تجھے دیکھ کے دل تھام لیا ہے — آدابِ محبت سے بڑا کام لیا ہے
اے صورِ سرافیل! نہ کر شور کہ ہم نے — اس عالمِ نو میں ابھی آرام لیا ہے
خود اپنے ہی جلووں کا بنایا اُسے مظہر — فطرت نے بھی انسان سے کیا کام لیا ہے
ممکن نہیں لغزش ہو پھر اُس دستِ طلب میں — اے دستِ کرم! تو نے جسے تھام لیا ہے
قدرت کے گرانقدر خزانوں سے بعذرِ حق — خود ہم نے ہی چُن کر دلِ ناکام لیا ہے
ہم سا بھی نہ ہوگا کوئی مشتاقِ شہادت — جو سانس لیا ہے تہِ صمصام لیا ہے
اللہ رے ہمارے دلِ غم دوست کی ہمت — فردوس میں بھی عیشِ غم انجام لیا ہے
خورشیدِ قیامت پہ گھٹا چھا گئی اے مہر! — تو نے نفسِ سرد سے کیا کام لیا ہے!

جناب سلیم سہروردی گوالیاری

دوری میں تری ضبط سے یوں کام لیا ہے — جب نام لیا ہے ترا دل تھام لیا ہے
یہ دامنِ صد چاک یہ آنسو یہ گریباں — ہر عشق میں کیا کیا نہ کچھ الزام لیا ہے
اس برہمیٔ حسن کی کچھ وجہ تو ہوگی — محفل میں مرا کس نے ابھی نام لیا ہے
جو سعیٔ تمنا سے نہ پورا ہوا اب تک — اب ترکِ تمنا سے وہی کام لیا ہے
اس بارِ محبت کو اُٹھاتا کوئی کیونکر — بس اپنے ہی سر ہم نے یہ الزام لیا ہے
بیتاب ہوئے جاتے ہیں گُل رشک کے مارے — کانٹوں نے جو دامن کو ترے تھام لیا ہے
جو بزم میں سازِ طرب افزا سے نہ ہوگا — ہم نے وہ خموشی سے یہاں کام لیا ہے
جل جل کے یہ مرتا ہے مگر اُف نہیں کرتا — پروانے سے فطرت نے عجب کام لیا ہے
یہ طبعِ سلیم اور یہ اشعار کی بارش — تخیل کی موجوں سے بڑا کام لیا ہے

حضرت مسلم مالیگانوی

جب آئینہ تو نے بتِ خود کام لیا ہے — تھرائے جوانی نے جگر تھام لیا ہے
ناکامیٔ پیہم پہ بھی ہم پی گئے آنسو — اس عشق میں ہمت سے بہت کام لیا ہے
اے شورِ قیامت! نہ جگا کشتۂ غم کو — آئی ہے ابھی نیند، ابھی آرام لیا ہے

مایوس تھا دل تم نے گر دے کے سہارا
گویا مرا گرتا ہوا گھر تھام لیا ہے

لہرا کے اٹھایا ہے جو میخواروں نے ساغر
اے ساقیِ میخانہ ترا نام لیا ہے

بے خواہ محبت کی سزا دے کہ جزا دے
ہم نے ترا دامانِ کرم تھام لیا ہے

مسلم! نہیں جب مقصدِ ہستی کی خبر بھی!
کیوں مفت یہ ہستی کا بھی الزام لیا ہے؟

حضرت برق صدیقی فتحپوری

باتوں میں کسی نے جو ترا نام لیا ہے
وہ تیر لگایا ہے کہ دل تھام لیا ہے

صیاد ٹھہر، رنجِ اسیری نہ ابھی دے
دم بھی تو نہیں میں نے تہِ دام لیا ہے

دیکھا کہ رہِ عشق میں ہے خاک بسر دل
ہاتھوں میں جب آئینۂ انجام لیا ہے

دُنیا میں سرافراز ہوئی لغزشِ پا بھی
یہ کس نے مجھے گرتے ہوئے تھام لیا ہے

اٹھتا نظر آیا ہے سرا پردۂ حائل
جب دستِ تصور سے ذرا کام لیا ہے

معلوم ہوا ہے کہ فقط وہم و گماں میں
جب جائزۂ عشرت و آلام لیا ہے

بیکار نہیں، برقؔ بڑے کام کا ہے دل
لے کام، ابھی اس سے کہاں کام لیا ہے

پروفیسر دانشؔ ایم۔اے۔ بریلوی

کیوں دل نے یقیں کھو کے یہ انعام لیا ہے
ادراک سے گنجینۂ اوہام لیا ہے

ہم نے انھیں آنکھوں سے بڑا کام لیا ہے
بے دیکھے تری دید کا الزام لیا ہے

ہستی کی کشش پاؤں اٹھانے نہیں دیتی
میں نے بھی کہاں بیٹھ کے آرام لیا ہے

منہ سے بھی اگر آہ نکل جائے تو کیا ہو
چپکے سے ابھی دل نے ترا نام لیا ہے

کیسا ہوں نگوں سو کبھی تا روں میں پھرا ہوں
کس کس کا سہارا سحر و شام لیا ہے

انجامِ دُعا کیا ہے، کبھی دیکھ ہی لینا
تاثیر سے کب میں نے ابھی کام لیا ہے

دانشؔ نے ملائی ہیں بہت اُن سے نگاہیں
پیغام دیا ہے کبھی پیغام لیا ہے

حضرتِ ارشد صدیقی امروہوی از کوئٹہ

ان کا پیتے ہاتھوں سے بڑا کام لیا ہے
اک گوشۂ دامانِ کرم تھام لیا ہے

محسوس تو ہے عشق کو معلوم نہیں ہے
جو کچھ نگہِ حُسن سے انعام لیا ہے

ٹھکرا دیا جب محفلِ عالم نے تو آخر
مجبور نے دامن کو ترے تھام لیا ہے

بیمارِ محبت کی یہ حالت تھی شبِ غم
جب ہوش میں آیا ہے ترا نام لیا ہے

کیوں ہم نے کیا اُن سے گلہ کم نگہی کا
کیا دیکھ کے سر اپنے یہ الزام لیا ہے

کیوں پھیر گئے لائی نہیں دن عہدِ سلف کے
کیا ہم نے ترا گردشِ ایام لیا ہے

ارشدؔ کو جوانی میں کسی نے نہیں مارا
ہر دیکھنے والے نے ترا نام لیا ہے

حضرتِ قمر نعمانی سہسرامی

جب جائزۂ کوششِ ناکام لیا ہے
وہ ہوک سی اُٹھی ہے کہ دل تھام لیا ہے

جب جوشِ محبت میں ترا نام لیا ہے
گھبرا کے فرشتوں نے بھی دل تھام لیا ہے

کیوں کوئی پشیماں ہو مرے غمِ دل سے
میں نے تو خود اپنے ہی سر الزام لیا ہے

کچھ اور اُسے ہو گیا دشوار زمانہ
جس نے اثرِ گردشِ ایام لیا ہے

آرام نہ دیتا مجھے ہنگامۂ ہستی
میں نے تو زبردستی کچھ آرام لیا ہے

کیوں شکوۂ تقدیر سے تم ہوتے ہو برہم
کیا میں نے تمہارا بھی کبھی نام لیا ہے

تھا روزِ ازل پاس قمرؔ اُن کی خوشی کا
دانستہ یہ میں نے دلِ ناکام لیا ہے

حضرتِ جالب سہسرامی

جب یاس کے عالم میں ترا نام لیا ہے
اک طاقتِ غیبی نے مجھے تھام لیا ہے

ہر چند ہلاہل ہے مئے نابِ محبت
کچھ سوچ سمجھ کر ہی تو یہ جام لیا ہے

جب غوطہ زنِ بحرِ خیالات ہوا ہوں
تو ساحلِ مقصد ہی پہ آرام لیا ہے

معمور تھا جلووں سے یہ خانۂ ہجراں
تصویرِ تصور سے بڑا کام لیا ہے

اس طور سے طے میں نے کیا مرحلۂ شوق
ہر ذرہ سے پیغام بہ ہر گام لیا ہے

کیوں شاکیِ ناکامیِ اقدام ہے دُنیا
آغاز نے کب ذمۂ انجام لیا ہے

تقدیر کی تاثیر تھی موجود وہاں بھی
تدبیر سے جالبؔ نے جہاں کام لیا ہے

جناب محمود یار خاں اثر ایم۔ اے جونا گڑھ

رودادِ غمِ عشق کی تاثیر نہ پوچھو
سُن کر اسے ہر ایک نے دل تھام لیا ہے

پوچھا ہے کسی نے جو کبھی حال ہمارا
اک آہ بھری اور جگر تھام لیا ہے

ٹوٹی ہوئی ہمت کو بنایا ہے سہارا
ناکامیِ مقصد سے بڑا کام لیا ہے

تاریکیِ غم ہے کبھی تنویرِ مسرت
فطرت سے سبق یہ سحر و شام لیا ہے

اُن کے کرمِ خاص کی امید میں ہم نے
رسوائیِ الفت کا بھی الزام لیا ہے

جو وقت ملا ہم کو تری یاد میں کاٹا
یوں فائدۂ فرصتِ ہنگام لیا ہے

سمجھے ہیں اثرؔ اس کو بھی ہم حاصلِ الفت
یوں لطفِ زبوں کامیِ انجام لیا ہے

جناب شفا گوالیاری

اُس نے نگہِ ناز سے جب کام لیا ہے
ہر طالبِ دیدار نے دل تھام لیا ہے

اللہ رے ہشیاری مدہوشِ محبت
جب ہوش میں آیا ہے ترا نام لیا ہے

انجامِ محبت تھا نگاہوں میں ازل سے
خود مانگ کے میں نے دلِ ناکام لیا ہے

پھر تھا زباں پر ہے فسانۂ غمِ دل کا
کس بھولنے والے نے مرا نام لیا ہے

ہر پھر کے یہ کیوں مرکزِ آلام ہمیں ہیں
کیا ہم نے ترا گردشِ ایام لیا ہے

ممکن ہی نہ تھا شکرِ عبادت دمِ آخر
بیمار نے آنکھوں سے بڑا کام لیا ہے

ہیں رند تشنہ ہم بھی، مگر ہاتھ میں ہم نے
شیشہ ہی لیا ہے نہ کبھی جام لیا ہے

جناب کیف بہاری از بمبئی

جب دل سے مصیبت میں ترا نام لیا ہے
رحمت نے تری بڑھ کے مجھے تھام لیا ہے

گھائے فسردہ سے بڑا کام لیا ہے
یعنی سبق گردشِ ایام لیا ہے

مایوس نہ ہو مومنِ ناشاد تو اتنا
توحید پرستوں نے کب آرام لیا ہے

صد شکر کہ میں بھی ہوا رسوائے زمانہ
خوش ہوں کہ ترے عشق میں الزام لیا ہے

پورا ہوئی پوری مری ایک ایک تمنا
جب جوشِ محبت میں ترا نام لیا ہے

مجبورِ تمنا ہی کہیں ہو جائے نہ دُنیا
اب تک تو تحمل سے بہت کام لیا ہے

کیوں خوفِ قیامت ہو کہ محبوبِ خدا کا
دامانِ کرم کیف نے بھی تھام لیا ہے

جناب منظر کلیمی جام پوری

جب دل نے غمِ دوست میں آرام لیا ہے
بھولے سے بھی عشرت کا نہ پھر نام لیا ہے

گلشن کی فضاؤں میں رہا دُور سکوں سے
آرام لیا ہے تو تہِ دام لیا ہے

اِن جو تری یاد سکوں ہو گیا رخصت
"جب نام لیا ہے ترا، دل تھام لیا ہے"

ہر سمت نظر آنے لگی ہے مجھے جنت
تربت میں جو بھی میں نے ترا نام لیا ہے

آنسو ہوئے کب خشک مرے دیدۂ تر سے
کب دل نے ترے عشق میں آرام لیا ہے

قسامِ ازل سے مری تقدیر نے منظر
روتی ہوئی آنکھیں، دلِ ناکام لیا ہے

جناب انجم احمد آبادی

کہہ صبح لیا ہے تو کبھی شام لیا ہے
اے دوست بہت میں نے ترا نام لیا ہے

کچھ ہمتِ گفتار ہے کچھ طاقتِ دیدار
بے وجہ نہیں عشق کا الزام لیا ہے

کیا دیکھ لیا ذرۂ منزل میں دعا نے
کیوں رہروِ منزل نے جگر تھام لیا ہے

مایوسِ طلب کس لئے ہے بندۂ تقدیر
تدبیر سے بھی تو نے کبھی کام لیا ہے

بُت خانے میں تنہا ہو کہ کعبے کے ظاہر
جب نام ترا اے بتِ بے نام لیا ہے

کیوں فخر نہ قسمت پہ ہو اپنی مجھے انجم
آج اُس نے بصد ناز مرا نام لیا ہے

جناب حافظ عاشق علی جنوں الہ آبادی

آفات میں جذبات سے یوں کام لیا ہے
جب کوئی بلا آئی ترا نام لیا ہے

رودادِ شبِ غم اسے توبہ ارے توبہ
ہر لفظ پہ لوگوں نے جگر تھام لیا ہے

اب دیکھئے کیا مجھ پہ گزرتی ہے شبِ غم
نام آج ترا میں نے سرِ شام لیا ہے

تکتے رہے سب تجھ کو بھری بزم میں لیکن
میں نے تری آنکھوں سے بھرا جام لیا ہے

لے آئے جنوں قلبِ شکستہ میں تم اُن کو
ٹوٹے ہوئے شیشے سے بڑا کام لیا ہے

جناب شمس از بمبئی

اس دل نے پھر اے دوست ترا نام لیا ہے
اس پر یہ قیامت کہ سرِ شام لیا ہے

یوں میں نے رہِ عشق کو آسان بنایا
اے دوست ترا نام بہر گام لیا ہے

اس دل کو نہ چھیڑا کبھی تری یاد نے تنہا
اس کو نہ ستا، میں نے ترا نام لیا ہے

ناکامیٔ اُلفت کا مجھے غم ہو بھلا کیا
میں نے تو ازل سے دلِ ناکام لیا ہے

کس دل سے کہوں شمس کہ غم دُور ہو دل سے
میں نے تو محبت میں یہ انعام لیا ہے

جناب عقیل رحمانی مالیگانوی

جب تو نے تبسم سے کبھی کام لیا ہے
ہر دیکھنے والے نے جگر تھام لیا ہے

درماندہ مسافر ہوں مگر میں نہ چھڑیں
منزل پہ پہونچکر بھی آرام لیا ہے

ہر گام پہ لیتی تھی قدم منزلِ مقصود
ہم نے کبھی ہمت سے اگر کام لیا ہے

یہ سچ ہے کہ مشکل مری آسان ہوئی ہے
جب میں نے تہِ دل سے ترا نام لیا ہے

دریائے غم و یاس میں بہہ جاتا عقیل آج
اُمید دل نے بڑھ کے اسے پھر تھام لیا ہے

جناب باقی اعظمی

اُلفت کا کسی نے بھی اگر نام لیا ہے
دل اور جگر میں نے وہیں تھام لیا ہے

اس میں نظر آئی مجھے اپنی ہی تباہی
جب جائزۂ وسعتِ انجام لیا ہے

اکبار اُنھیں نغمۂ پرسوز سُنا دوں
یہ سوچ کے سازِ دلِ ناکام لیا ہے

تجھ کو تو وہ معلوم ہے اے خالقِ عالم
میں نے تری دُنیا میں جو آرام لیا ہے

باقی نے فراموش کیا دل سے نہ تجھ کو
جب ہوش میں آیا ہے ترا نام لیا ہے

جناب بزم امروہوی از گیان پور

جب شامِ الم ہم نے ترا نام لیا ہے
افلاک نے بھی ہاتھ سے دل تھام لیا ہے

تنہائی میں بھی ضبط ہی سے کام لیا ہے
"جب نام لیا ہے تو بس دل تھام لیا ہے"

دل دے کے خریدا ہے تری زلف کا سودا
سودے کے لئے تجھ کو اے بت گلفام لیا ہے

میں بہہ گیا ہوتا یم الفت میں کبھی کا
بہتے ہوئے کو آپ ہی نے تھام لیا ہے

اس میں بھی کوئی راز ہے پوشیدہ یقیناً
قاصد سے جو خط بزم نے گمنام لیا ہے

جناب عاصی ننگلوی

اک دیر کا پردہ ہے احرام لیا ہے
ہم نے تو برہمن سے بھی سلام لیا ہے

اک آبلہ ہے پاؤں میں اک داغ جگر میں
سرکار محبت سے یہ انعام لیا ہے

پھر ڈال جھمیلوں میں نہ اے شورش محشر
لیٹے ہیں لحد میں ابھی آرام لیا ہے

رخشاں مری نظروں میں ہیں لمحات محبت
اک جائزہ جلوۂ ہنگام لیا ہے

شرکت نہیں عاصی کے گناہوں میں کسی کی کچھ
پردہ مرا کھولے کہ ترا نام لیا ہے

جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی

آہوں سے کسی روز اگر کام لیا ہے
دامن دل وحشی نے ترا تھام لیا ہے

دیکھا ہے کئی بار تجھے گوشۂ دل میں
میں نے بھی نگاہوں سے بڑا کام لیا ہے

جب شوق نے کی جرأت نظارہ حرم میں
جلووں نے نگاہوں کو وہیں تھام لیا ہے

اللہ رے میرے حرم دل کی فضیلت
خود حسن نے آکر یہاں آرام لیا ہے

طرفہ یہ ترے شعر ہیں یا تیر کے ٹکڑے
سنتے ہی حریفوں نے جگر تھام لیا ہے

جناب بیتاب کالپوی

وہ بار دیا جو نہ اٹھا جن و ملک سے
انسان سے فطرت نے بھی کیا کام لیا ہے

اک لذت پُر کیف سی محسوس ہوئی ہے
جب دل سے کسی وقت ترا نام لیا ہے

اُس نے غم و اندوہ میں پایا ہے سکوں بھی
جس نے کہ مصیبت میں ترا نام لیا ہے

مشکل نہیں اس دور زمانہ سے گذرنا
دامن تری رحمت کا اگر تھام لیا ہے

بیتاب وہ میکش ہوں کہ ساقی کرم کی
آنکھوں ہی سے جام مئے گلفام لیا ہے

جناب ملال اڑکوکشی

ہنگام سحر جب بھی ترا نام لیا ہے
ہر ڈوبتے تارے نے جگر تھام لیا ہے

رقصاں نظر آنے لگی فطرت کی مسرت
ہم نے غم امروز سے یہ کام لیا ہے

سائے سے بھی جو میرے گریزاں رہا تا عمر
صد شکر کہ آج اس نے مرا نام لیا ہے

کیا موت کی آغوش میں چین آ گیا اس کو
جس نے نہ کبھی زیست میں آرام لیا ہے

پھر چھیڑ رہا ہے کوئی نغمات محبت
پھر عشق کے مارے نے جگر تھام لیا ہے

جناب رسا اورنگ آبادی

ایما سے ترے مرکز آلام لیا ہے
کیا بنی خوشی سے دل ناکام لیا ہے

کس طرح میں سمجھوں کہ نہیں ان کو محبت
جب حال سنا ہے مرا، دل تھام لیا ہے

دن رات گذرتے ہیں تصور میں کسی کے
دل دینے کا میں نے یہی انعام لیا ہے

ہیں یاد رسا کو وہ محبت کے زمانے
دل تھام لیا ہے، ترا جب نام لیا ہے

جناب اثر ذائقی بنگلوری

الفت میں تری ضبط سے یوں کام لیا ہے
جب نام لیا ہے ترا دل تھام لیا ہے

افکار و حوادث سے رہائی نہیں ملتی
کیا میں نے ترا گردش ایام لیا ہے

جب اُن کے اشارے پہ ستم ہیں یہ اے چرخ
پھر مفت میں کیوں اپنے سر الزام لیا ہے

میں داغ محبت پہ اثر کیوں نہ کروں فخر
یہ عشق کی سرکار سے انعام لیا ہے

جناب مرزا سالک انصاری نندربار

اکبار جو عاشق نے ترا نام لیا ہے
تو بار شب ہجر جگر تھام لیا ہے

کہدو کہ نکیرین ابھی مرقد میں نہ آئیں
بیمار نے آکر ابھی آرام لیا ہے

جس نام نے دن بھر مجھے بے چین سا رکھا
راتوں کو بھی اُٹھ اُٹھ کے وہی نام لیا ہے

اب ہو جو مناسب تو کرو اس کی حفاظت
سالک کا جو تم نے دل ناکام لیا ہے

جناب عصمت قریشی بلاسپور سی پی

اے شبنمی پلکوں سے گہر رولنے والے
دل سے بھی شب ہجر کوئی کام لیا ہے

آئی ہے تری نرگسی آنکھوں کی جہاں یاد
توبہ نے مچل کر وہیں اک جام لیا ہے

اپنوں سے ہے عصمت تجھے کیوں لطف کی امید
موتی سے صدف نے بھی کبھی کام لیا ہے

جناب مذاق ڈبھوئی

سوچا ہے کبھی تو نے کہ اس دہر سے غافل
کیا کام تجھے لینا تھا کیا کام لیا ہے

جب جان پہ بنی ہے تری ناکامی وفا کی
امید نے بڑھ کر وہیں دل تھام لیا ہے

جناب شیخ احمد سہیل شہادوی

دنیا کی مصیبت سے میں گھبرا نہیں سکتا
تلوار کے سایہ میں بھی آرام لیا ہے

لا چوم لوں قاصد میں تیرے ہاتھ خوشی میں
اُس نے ترے ہاتھوں مرا پیغام لیا ہے

جناب اے سی ملک بالن پوری

لبریز تھی آنکھوں کی ترے چہرے پہ لالی
ہر اشک کے موتی پہ ترا نام لیا ہے

ہے منزل مقصود ابھی دور بہت دور
آرام یہاں کیوں دل ناکام لیا ہے

جناب امن ساگری

اصلاحِ سخن

جنابِ سید محمد مبین ماہر بیتھوی کی غزل پر جانشینِ داغ حضرت بیخود دہلوی کی اصلاح

عاشق وہ نہیں جو ترا مستانہ نہیں ہے ۱ دیوانہ ہے وہ جو ترا دیوانہ نہیں ہے

گذرا ہے یہی

حالات میرے آپ ذرا غور سے سُنئے ۲ ~~یہ واقعہ ہے~~ واقعہ افسانہ نہیں ہے

مرتا ہے ترے حُسن پہ اے یار زمانہ ۳ ہے کون جو اس شمع کا پروانہ نہیں ہے

کوئی ویرانہ

رندوں میں، کدھر آپ چلے آتے ہیں زاہد ۴ میخانہ ہے حضرت، ~~یہ عزا خانہ~~ نہیں ہے

غیروں سے تم اپنوں کی طرح ملتے تو دیکھو ۵ ہر ایک ہے اپنا کوئی بیگانہ نہیں ہے

دیوانہ تو وہ ہے جسے کچھ بھی نہ خبر ہو ۶ جو ہوش میں آجائے وہ دیوانہ نہیں ہے

جب دیکھئے اس کو تو حسینوں میں ہے موجود ۷ ماہر سا کوئی حُسن کا دیوانہ نہیں ہے

توجیہ:-

(۲) غالباً مصرعِ ثانی میں "واقعہ" کی تکرار اچھی معلوم نہ ہوئی۔ اس لئے اصلاح دی گئی۔ مگر میرے خیال میں اس تکرار ہی میں زور تھا۔

(۴) اس شعر کے مصرعِ ثانی میں حضرت بیخود نے جو اصلاح دی ہے اُس سے بھی مجھے اتفاق نہیں عام طور پر اُردو شاعری میں شیخ و زاہد پر جو پھبتیاں کسی جاتی ہیں اُن کے متعلقات میخانہ۔ بتخانہ مسجد اور حرم وغیرہ ہی ہوتے ہیں۔ "ویرانہ" کا شیخ و زاہد سے کوئی تعلق نہیں "ویرانہ" دیوانہ کے لئے موزوں ہوتا ہے۔ ماہر صاحب کا شعر علیٰ حالہٖ اچھا تھا۔

جنابِ وارث صدیقی شاہدوی کی غزل پر حضرت مولانا محوی صدیقی لکھنوی کی اصلاح

جب تک حجابِ حُسن سے وہ رونما نہ ہو ۱ اہلِ سجود کے لئے سجدہ روا نہ ہو

مطرب ذرا ٹھہر

سلمیٰ سے کر رہا ہوں میں ذکرِ شبابِ عیش ۲ ~~ٹھہرا اے مغنی~~ تو ابھی نغمہ سرا نہ ہو

ہیں کہ جھکتے ہیں سر سرا ———— گذرا ادھر سے بھی وہ ستم

یہ کس کے نقشِ پا ~~ہے سر راہ گذار میں~~ ۳ ~~گذرا ہوا ادھر سے کہیں~~ آشنا نہ ہو

وہ مسکرا رہے تھے چمن میں کھڑے ہوئے ۴ بجلی کا باغباں کو تصور ہوا نہ ہو

دامن گلوں کا جوشِ جنوں سے ہوا چاک ۵ دیوانہ بہار چمن میں ہنسا نہ ہو

ہے میکدہ بدوش مرا ساقی بہار

~~کیوں ساقی بہار ہے بردوشِ میکدہ~~ ۶ مغرب سے جھومتا ہوا بادل اٹھا نہ ہو

وارث نیاز مند غریب آدمی سہی ۷

ممکن نہیں

~~یہ کیا کہا کہ~~ حقِ محبت ادا نہ ہو

توجیہ:-

(۲) وارث صاحب نے "ٹھہر" کے بجائے "ٹھیر" نظم کیا تھا، جو غلط ہے۔ یہی وجہ اصلاح ہے۔ "تو" بھی حشو تھا۔

(۳) مصرعِ اولیٰ میں "سر رہگذار" کے ساتھ "میں" غلط تھا اس کے علاوہ "کس کے نقشِ پا ہے" کی جگہ "کس کے نقشِ پا ہیں" ہونا چاہئے۔ مصرعِ اولیٰ میں معنویت بھی نہیں تھی اصلاح سے تمام عیوب دُور ہوگئے۔ مصرعِ ثانی کے الفاظ خلافِ محاورہ تھے۔ اصلاح سے مفہوم وہی رہا لیکن عیب دُور ہوگیا یہی حقیقی اصلاح کہلاتی ہے۔ لیکن "بھی" اب بھی حشو ہے۔

(۶) "بردوشِ میکدہ" مہمل ترکیب تھی۔ اصلاح بہت اچھی دی گئی ہے۔

(۷) "کیا کہا کہ" اس میں تین جگہ "ک" آیا ہے جو مخلِ فصاحت ہے۔ "ممکن نہیں" سے مفہوم وہی رہا اور مصرع زیادہ پُرزور ہوگیا۔

اعجاز صدیقی

اشتہاری ادویات

ذی ہوش اور تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے کبھی جاذب توجہ نہیں ہو سکتیں
لیکن ذیل کی ادویات ہر گھر کے لئے کارآمد اور ایک نعمت ثابت ہونگی

عالیجناب حکیم مولوی محمد نذیر صاحب بالقابہ
ایچ۔ پی۔ رئیس مئوناتھ بھنجن
ضلع اعظم گڈھ

ہر اس شخص کو جو ان ادویات کے اثر کو غلط ثابت کر دیگا تاوان دینے کے لئے تیار ہیں۔ حکیم صاحب قبلہ کی مندرجہ ذیل دونوں ادویات اپنے اثر کے اعتبار سے بیحد مفید ثابت ہوتی ہیں، ہزاروں معززین و معززات کے استعمال میں یہ ادویات آچکی ہیں اور آج تک کہیں سے شکایت نہیں آئی

قدرتی تیل (رجسٹرڈ)

یہ تیل سنہ ۱۹۰۰ء میں ایجاد کیا گیا تھا اب صدہا میں اپنی بیش بہا فوائد کی وجہ سے تمام دنیا میں اور خاص طور پر ہندوستان میں مشہور ہو گیا۔ چنانچہ ہندوستان کے مشہور حکما، ڈاکٹر اور رؤسا صاحبان نے علاوہ اس کے کئی ڈاکٹر و حکما نے بھی سرٹیفکیٹ دیئے ہیں۔ ڈاکٹر اور حکیم اس کو مریضوں کو قدرتی تیل کی سفارش کرتے ہیں۔ یہ تیل جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے جو ہر قسم کے درد میں اکسیر ہے اور فوری فائدہ کرتا ہے۔ بدن پر پالش کرکے نہانا، خواب پانی۔ موسمی بخار، سردی اور زکام سے محفوظ رکھتا ہے۔ بدن کو چست اور قوی بناتا ہے۔ سر پر مالش کرنے سے بالوں کی سیاہی قائم رہتی ہے۔ بال نرم اور چمکدار ہو جاتے ہیں۔ نزلہ زکام، کھانسی۔ سر، آنکھ، کان، دانت، کمر، سینے کے تمام درد۔ چوٹ خارش آگ سے جلنے، مستورات کے وضع حمل اور کمر درد بچوں کے دانتوں کے لئے تریاق کا کام دیتا ہے "قدرتی تیل" (رجسٹرڈ) کی شہرت اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے بعض نقال نام بدل بدل کر دھوکہ دے رہے ہیں۔ ہم معززین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ "قدرتی تیل" صرف ہم سے طلب فرمائیں اور اس کی خریداری میں احتیاط سے کام لیں۔ فائدہ نہ ہونے کی صورت میں کارخانہ ہر ممکن تاوان دینے کے لئے تیار ہے

نوٹ:- ایک پاؤ سے کم قدرتی تیل نہیں بھیجا جا سکتا۔ قدرتی تیل مختلف شیشیوں میں پیک ہوتا ہے۔

قیمت فی سیر چار روپیہ۔ علاوہ پیکنگ و محصول ڈاک

روغنِ بہار (رجسٹرڈ)

جسمانی صحت کا دارومدار دماغی صحت پر مبنی ہے۔ کامیاب زندگی اور کام کرنے قائم کرنے کے لئے دماغی سکون کی نہایت ضرورت ہے اور دماغی سکون حاصل کرنے کے واسطے مکمل آرام۔ ڈاکٹروں کا قول ہے کہ مقوی دماغ اور مفرح طبع اور خوشبودار تیل استعمال کیا جائے چنانچہ آجکل مختلف قسم کے خوشبودار تیل رائج ہیں مگر افسوس ہے کہ ان کے استعمال سے وہ فائدہ نہیں ہوتا جو دماغ کے لئے ضروری ہے۔ "روغن بہار" ان تمام خوبیوں کا حامل ہے جن کی بالوں کو سخت ضرورت ہے اور تمام مضر اجزا سے پاک ہے۔ خالص سفید تل کے تیل سے تیار کرایا جاتا ہے اور ہم اعلان کرتے ہیں کہ اس میں آمیزش ثابت کرنے والے کو ایک سو روپیہ ملے گا۔

اس کے مستقل استعمال سے امراض دماغی سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ دماغی کام کرنے والے معزز حضرات اور خواتین کے لئے ایک بیش بہا نادر تحفہ ہے بالوں کے بڑھانے میں لاجواب ہے اُن کے قدرتی رنگ کو قائم رکھتا ہے۔ ملائم خوبصورت اور چمکدار بناتا ہے۔ سر میں کیسا ہی درد کیوں نہ ہو ایک دو بار ملنے سے کلی فائدہ ہو جاتا ہے۔

قیمت فی سیر چھ روپے
(علاوہ محصول ڈاک)

منیجر
دار الصحت رجسٹرڈ مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ

کاروباری تبصرے

ہمدرد دواخانہ دھلی

۱۹۰۶ء میں شہید فن ہمدرد خلائق حکیم حافظ عبد المجید صاحب دہلوی نے اس دواخانہ کی بنیاد رکھی اور اپنی تمام عمر اس کے استحکام میں صرف کردی۔ حکیم صاحب مرحوم کی محنت کا بینظیر کارنامہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ "ہمدرد دواخانہ" ہندوستان کا سب سے زیادہ مشہور، منظم اور قابل اعتماد دواخانہ ہے جس کا جواب پیدا ہونا مشکل ہے۔ یوں تو یونانی ادویات کے اور بھی دواخانے ہیں لیکن "ہمدرد دواخانہ" ان سب میں ممتاز ہے جس نے دنیائے دوا سازی میں ایک مفید اور خوشگوار انقلاب پیدا کردیا ہے۔ ماہرین فن کی نظروں میں "ہمدرد" کی دوائیں معیاری اور سو فیصدی صحیح اور خالص اجزا کی حامل ہوتی ہیں۔ یہ دواخانہ اپنے انتظام کے اعتبار سے یورپ کا کوئی ترقی یافتہ دواخانہ معلوم ہوتا ہے، جس میں مشینوں کے ذریعہ دوائیں تیار کی جاتی ہیں۔ تعلیم یافتہ اور فن کار دواسازوں کی ایک بہت بڑی جماعت اس میں کام کرتی ہے ہر دوا کو اصول، معیار اور فن پر پرکھا جاتا ہے۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جو لوگ دہلی جاتے ہیں وہ وہاں کی مشہور عمارتوں اور بازاروں وغیرہ کے ساتھ ساتھ ہمدرد دواخانہ کی بھی سیر کرتے ہیں اور اپنے دل میں اس کی باقاعدگی، صفائی اور حسن انتظام کا ایک گہرا نقش لیکر واپس لوٹتے ہیں۔

ہمدرد دواخانہ کی دوائیں چونکہ صحیح اجزا اور پوری نگرانی کے ساتھ تیار ہوتی ہیں۔ اس لئے معمولی سے معمولی دوا اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ ہمدرد دواخانہ کے مریضوں اور دواؤں کی فروخت کے سالانہ اعداد و شمار دیکھکر بڑی حیرت ہوتی ہے۔ ہر سال لاکھوں مریض صحت یاب ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے تمام اطبا قریب قریب ہمدرد دواخانہ ہی کے مرکبات استعمال کرتے ہیں۔ دواؤں کی عمدگی کے ساتھ ساتھ ان کی مناسب قیمت بھی عوام و خواص کے لئے جاذب توجہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمدرد کی دوائیں بہت بڑی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔

جہاں ہمدرد دواخانہ میں اعلیٰ درجہ کی دوائیں ملتی ہیں۔ وہاں ایک شعبۂ تشخیص و تجویز بھی قائم ہے جس میں قابل اطبا کا ہاتھ ہے اور امراض کی تشخیص بڑی توجہ سے ہوتی ہے۔

دار الصحت رجسٹرڈ منوناتھ بھنجن

دار الصحت رجسٹرڈ نے ہمیں اپنی دو خاص دوائیں قدرتی تیل اور روغن بہار تبصرے کے لئے بھیجی ہیں۔ دو تین ماہ تک ان دواؤں کو ذاتی طور پر استعمال کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ یہ دوائیں واقعی مفید اور کارآمد ہیں۔ ان ادویہ کے متعلق دار الصحت رجسٹرڈ نے جو کچھ لکھے ہیں وہ حرف بحرف صحیح ہے اور اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔ دار الصحت رجسٹرڈ بہت پرانا دواخانہ ہے اور اس کا انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو تجارت سے زیادہ پبلک کی خدمت ملحوظ نظر رکھتے ہیں اور انتہائی دیانت داری کے ساتھ اپنا کام کررہے ہیں۔ "روغن بہار" دماغی کام کرنے والوں کے لئے بہت ہی اچھا روغن ہے۔ خواتین کی دماغی کمزوری دور کرنے اور بالوں کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں سریع الاثر ہے "قدرتی تیل" متعدد امراض میں کام آنے والی چیز ہے۔ ہمارے خیال میں گھر میں اس کی ایک شیشی ضرور رہنی چاہئے۔

دار الشفا گولیاں رجسٹرڈ بٹالہ (پنجاب)

یہ دواخانہ مشہور کامیاب دواخانوں میں غالباً سب سے نیا ہے ۱۹۳۵ء میں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ ۵۔۶ سال میں اس دواخانہ نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ دار الشفا گولیاں اس دواخانہ کی مایۂ ناز گولیاں ہیں۔ جن سے ہزاروں مریضوں کو مکمل فائدہ ہوچکا ہے، ہمیں تحقیقی طور پر یہ معلوم ہوا ہے کہ دار الشفا گولیوں کے کارخانہ میں ہزارہا سرٹیفکٹ موجود ہیں جن میں مریضوں کے علاوہ ڈاکٹر، وید اور حکیم بھی شامل ہیں۔ زنانہ امراض کی زوداثر اور کامیاب دوائیں اس کارخانہ میں خاص طور پر تیار ہوتی ہیں اور پبلک کو لوٹا نہیں جاتا بلکہ فائدہ نہ ہونے کی صورت میں دواؤں کی قیمت واپس کردی جاتی ہے اور یہی اس کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

کارخانہ امرت دھارا کی فراخدلی

کارخانہ امرت دھارا ہر سال اپنے سالانہ جلسے کے موقع پر ماہ مارچ میں اپنی ادویات میں کافی رعایت کیا کرتا تھا۔ مگر حالات سے مجبور ہوکر اس کو اعلان کرنا پڑا ہے (جیسا کہ دوسری جگہ ناظرین اشتہار میں پڑھینگے) کہ وہ رعایت اب نہ کی جایا کریگی۔ مگر خوشی کی بات ہے کہ کارخانہ نے اپنی تقریباً تمام ادویات میں ہمیشہ کے واسطے کچھ نہ کچھ کمی کردی ہے۔ اس گرانی کے زمانے میں کارخانہ کی یہ فراخدلی قابل تعریف ہے۔

نیجر شعبہ اشتہارات

مشاہیر شعرا کے دیوان

گلزارِ داغ ۔ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی مرحوم و مغفور کا مشہور دیوان قیمت ...

کمالِ داغ ۔ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے چاروں دیوانوں کا انتخاب مع مبسوط مقالہ تنقیدی ۔ قیمت مجلد عہ

روحِ نظیر ۔ مرتبہ جناب مخمور اکبرآبادی بی ۔ اے میاں نظیر اکبرآبادی کے منتخب کلام کا مجموعہ مع بسیط مقدمہ و تبصرہ حجم ۰ ۴ صفحات ۔ قیمت ۶ ر

جگر پارہ ۔ حضرت بیدم شاہ وارثی مرحوم کا متصوفانہ اور سوز و گداز سے پُر کلام کا مجموعہ ۔ قیمت صرف ۱۲ ر

مصحفِ بیدم حضرت بیدم شاہ وارثی مرحوم کا دوسرا مجموعۂ کلام جس میں ان کا تمام کلام مع ٹھمری اور دادروں کے درج ہے اس دیوان کا مقدمہ حضرت خواجہ حسن نظامی نے تحریر فرمایا ہے مع تصویر مصنف ۔ قیمت عہ ر

نشاطِ روح ۔ حضرت اصغر گونڈوی مرحوم کا مشہور و معروف دیوان جو آٹھویں بار بڑے اہتمام سے چھاپا گیا ہے مع تصویر مصنف ۔ قیمت ۶ ر

گلکدہ ۔ حضرت عزیز لکھنوی (اُستاد حضرت جوش ملیح آبادی) کا دیوان غزلیات جو سوز و گداز اور حقیقت و معارف کا ایک خزانہ ہے ۔ قیمت ۶ ر

ایاغِ بزم حضرت مرزا عاشق حسین بزم آفندی اکبرآبادی کا دوسرا مطبوعہ دیوان جس میں معاملات و تاثرات کا دریا موجزن ہے ۔ قیمت ۶ ر

قصائدِ نجم ۔ حضرت نجم آفندی اکبرآبادی خلف حضرت بزم آفندی اکبرآبادی کی لاجواب تصنیف مدح رسولؐ و آلِ رسولؐ میں بلند پایہ نظمیں اور قصائد قیمت عہ

نقوشِ مانی حضرت مانی جائسی کا دیوان ایک ایک شعر جذبات و واردات کا صحیح نمونہ ہے ۔ قیمت صرف دو روپیہ (۶ ر)

میکدہ ۔ جناب مولوی سید محمد علی شاہ صاحب میکش قادری اکبرآبادی کے جذبات عشق اور متصوفانہ کلام کا بہترین مجموعہ مع تصویر مصنف ۔ قیمت عہ ر

فغانِ آرزو حضرت آرزو لکھنوی کی غزلیات کا مجموعہ جس میں زبان و بیان کی خوبیوں نے مل کر عجیب لطف پیدا کر دیا ہے ۔ قیمت ۶ ر

نشترکدہ ۔ مجموعۂ غزلیات بابو گوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ایڈووکیٹ اگر آپ قدیم رنگ تغزل کو جدید مذاقِ بلند کے ہمدوش دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ دیوان ملاحظہ فرمائیے ۔ کتابت و طباعت اعلیٰ حجم ۲۶۸ صفحات مع تصویر مصنف ۶ ر

نورِ مشرق ۔ جناب مہرلال ضیا فتح آبادی ایم ۔ اے کی روح افزا نظموں کا مجموعہ حجم ۱۳۶ صفحات مجلد مع تصویر مصنف ۔ قیمت عہ

صبحِ مشرق ۔ جناب محمد صادق صاحب ضیائی ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی کا کلیاتِ نظم و غزل حجم ۲۵۶ صفحات مجلد مع تصویر مصنف قیمت ۶ ر

دیگر منظومات

الہامِ منظوم حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی نے مثنوی مولانا رومؒ کے مکمل چھ دفتروں کا منظوم ترجمہ کیا ہے ۔ نثر کے ترجمے تو آپ نے بہت دیکھے ہوں گے منظوم ترجمہ بھی دیکھئے ۔ اوپر اصل شعر ہے نیچے اس کا منظوم ترجمہ ۔ ایک شاہکار کتاب ہے قیمت مکمل ...

مثنوی عالمِ خیال مصنفہ مرزا شوق قدوائی لکھنوی مرحوم ۔ شوہر اور بیوی کی محبت آمیز جذباتی منظوم خطوط ۔ ایک نظم کے چار رخ جو چار خوبصورت تصاویر سے مزین ہیں ۔ قیمت مجلد مع رنگین تصویر عہ ر سادہ غیر مجلد ۸ ر

مثنوی مادرِ ہند ۔ مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم یہ مثنوی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نئی ہے ۔ اس میں ہندوستان کی مکمل سیاسی تاریخ ہے ۔ علامہ سیماب اکبرآبادی اور رشید احمد صدیقی کے مقدمے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ قیمت صرف ۱۲ ر حجم ۱۸۰ صفحات ۔

مثنوی ظہورِ رحمت :۔ مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی یہ مثنوی ولادتِ نبویؐ کے متعلق دلکش اور عقیدت مندانہ پیرایہ میں لکھی گئی ہے قیمت ...

مثنوی زہرِ عشق کامل عہ ر **مثنوی گلزارِ نسیم** ۶ ر **مثنوی میر حسن** ۶ ر

اربعہ عناصر ۔ حکیم محمود علیخاں صاحب ماہر اکبرآبادی کی رموز و نکات سے لبریز رباعیات کا مجموعہ ۔ مجلد قیمت عہ

مینائے سخن یعنی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی مرحوم کی تمام داسوختوں کا بے نظیر مجموعہ قیمت ...

شباب بہاریات ۔ مصنفہ حضرت ساغر نظامی موضوع شباب پر ۲ حسین رباعیات کا بے مثل مجموعہ قیمت صرف ۸ ر

مختلف دواوین

دیوان غالب ۶ ر ۔ غزلیات امیر و نظیر ۶ ر ۔ انتخاب کلام اکبر الہ آبادی ۶ ر ۔ دیوان کامل حالی مع ستکلی ۸ ر کلام داغ ۶ ر ۔ بہار معرفت عہ ر دیوان حافظ شیرازی ۶ ر دیوان ذوق دہلوی ۶ ر ۔ دیوان ... دیوان مہر عہ ر ۔ حدیقۂ ناتمام ۱۲ ر

حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کی مختلف نظمیں

شکوہ جواب شکوہ ۶ ر شمع و شاعر ۲ ر فریاد امت ۲ ر اکبر و اقبال ۳ ر نالۂ یتیم ۲ ر تصویر درد ۲ ر

تصانیف حضرت مولانا حالی پانی پتی مرحوم

مسدس حالی (عکسی) ۶ ر مسدس حالی (سادہ) ۸ ر مرثیہ مرزا غالب ۲ ر مناجات بیوہ ۲ ر شکوۂ ہند ۲ ر حب وطن ۲ ر چپ کی داد ۲ ر

دیگر مختلف نظمیں

ارشاد احمد (چہل احادیث نبوی کا منظوم ترجمہ) ۴ ر کشمیر کا مستقبل ۲ ر قومی نظم ۵ ر تشریح الشعار سر سے پاؤں تک کی تمام بیماریوں کا علاج منظوم ۶ ر

مشہور افسانہ نگاروں کے مشہور افسانے

تصانیف حضرت نیاز فتح پوری

نگارستان۔ یہ مجموعہ ہندوستان کے عدیم المثال افسانہ نگار حضرت نیاز فتح پوری کا ایک شاہکار ہے اس مجموعہ کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ اسکے متعدد مضامین دوسری زبانوں میں منتقل کئے گئے ہیں۔ قیمت صرف عہ

شہاب کی سرگذشت۔ مولانا نیاز فتحپوری کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو لٹریچر میں بالکل نئی چیز تسلیم کیا گیا ہے۔ جزئیات نگاری اور تحلیل جذبات کے ایسے نمونے اسمیں نظر آئیں گے جو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتے۔ قیمت عہ

تصانیف حضرت لطیف الدین احمد اکبر آبادی

انشائے لطیف۔ یہ لطیف صاحب کے پندرہ افسانوں کا بہترین مجموعہ ہے اس میں آپ کو حسن و عشق کی صحیح نقاشی ملے گی۔ قیمت مجلد عہ

محبت کا افسانہ۔ یہ ایک طویل افسانہ ہے جسمیں مسئلہ ازدواج پر بحث کی گئی ہے قیمت

زندگی کے کھیل۔ بارہ کہانیوں کا نیا مجموعہ فلاکت زدہ سماج کی زندہ تصویر قیمت

کیفستان۔ جناب تبسی رامپوری کے دلچسپ افسانوں کا مجموعہ قیمت عہ

شب چراغ۔ بہترین تہذیبی سوشل اور جذباتی افسانوں کا مجموعہ از جناب محمد صادق صاحب ضیائی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی قیمت ۸ر

قاتل۔ اور دوسرے افسانے جناب ایم اسلم کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ قیمت

ظریفانہ افسانے

ہندوستان کے مشہور و معروف ظرافت نگار مسٹر شوکت تھانوی کی پیٹ میں درد ڈالدینے والی مقبول ترین کتابیں جن کے پڑھنے سے سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی لوٹن کبوتر بن جاتا ہے۔

موج تبسم ۔ طوفان تبسم ۔ سیلاب تبسم ۔ بحر تبسم ۔ منشی جی

عہ ۔ عہ ۔ عہ ۔ عہ ۔ عہ

شہید ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی کی بالکل آخری تصنیف

پھریری۔ جس میں مزاح نگاری اور سنجیدگی کے دونوں پہلو اسقدر تابناک ہیں کہ بیساختہ منہ سے داد نکل جاتی ہے۔ اسمیں کل ۱۴ افسانے ہیں ہر افسانہ پورے زور قلم کیساتھ لکھا گیا ہے حجم ۲۸۸ صفحات مجلد مع بہترین گرد پوش قیمت عہ

مختلف افسانے

سرگذشت اسیر عہ ۔ سمندر کی خداوند ۲ر محمود ہ عہ ۔ دغا ۸ر طوفان زندگی عہ ۔ بہار زندگی عہ ۔ شیطان کا پنجہ ۲ر عبرت کدہ ۱۲ر خانقاہ اشرار ۱۲ر جیتو تو کی دلہن ۱۲ر مغربی دلہن ۱۰ر بدر کمال عہ ۔ بالشویک شہزادی ۲ر انار کلی ۲ر جنات کی شہزادی ۲ر ہیکر واز ۳ر شیطان زادہ ۳ر شیطان کا چرخہ ۴ر دوست ۴ر

فن عروض کی منتخب معتبر اور عام فہم کتابیں

معین الشعرا۔ از غلام حسین خاں آفاق بنارسی مرحوم۔ یہ وہ عدیم المثال لغت ہے جس میں عربی۔ فارسی، اردو، انگریزی اور ہندی زبان کے ہزاروں الفاظ کے معنی کے علاوہ ہر لفظ کے اعداد ملفوظی صحت کے ساتھ درج کئے گئے ہیں جو تاریخ نکالنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ہر لفظ کے متعلق یہ بھی درج ہے کہ وہ کس زبان کا ہے اور مذکر ہے یا مؤنث۔ نہ صرف یہی بلکہ اساتذۂ ماضی و حال کے کلام سے ہر لفظ کی تذکیر و تانیث کا ثبوت بھی پیش کیا گیا ہے حقیقتاً یہ لغت طالبان ادب و شعر کے لئے خضر راہ ہے بڑی تقطیع حجم ۲۸۶ صفحات مجلد للعہ

دستور الاصلاح۔ از حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی۔ اصلاح لینے اور اصلاح دینے کے طریقوں کا انضباط شعرائے متقدمین و متاخرین کی یکجائی جملہ جملہ اصلاحات کی توجیہہ یہ پہلی فنی کتاب ہے جو مبتدی اور منتہی دونوں کے لئے شمع راہ ہے فنی نکات اور ادبی اصلاحات کی تشریح میں اپنی نوعیت کی پہلی اور آخری کتاب ہے حجم ۱۴۴ صفحات۔ قیمت عہ

مشاطۂ سخن۔ مصنفہ صفدر مرزاپوری اسمیں مسلم الثبوت اور مشہور اساتذہ کی اصلاحوں کے نمونے دیئے گئے ہیں قیمت عہ

رازِ عروض۔ از حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی۔ عروض کی بڑی بڑی ادق کتابوں کا عام فہم نچوڑ مبادیات شاعری پر مختصر مگر جامع کتاب ہے مبتدی کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کتاب سے بغیر کسی استاد کی مدد کے شاعری کے ابتدائی مراحل آسانی کیساتھ طے ہوجاتے ہیں دوسرا ایڈیشن قریباً ختم ہے قیمت ۸ر

عام فہم عروض۔ از حضرت منظر صدیقی۔ اس کتاب میں نہایت آسان طریقہ سے عروض کے درس دیئے گئے ہیں قیمت صرف ۸ر

نکات شاعری۔ اس کتاب میں عروض کے بڑے بڑے نکات سمجھائے گئے ہیں نہ صرف یہی بلکہ ہر لفظ کے کئی کئی قافیے بھی درج ہیں۔ قیمت عہ

چراغ سخن۔ عروض، علم قافیہ اور بحور وغیرہ کی تشریح میں مرزا یاس یگانہ عظیم آبادی کی بہترین تصنیف۔ قیمت عہ

فکر بلیغ۔ مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم۔ فن شاعری پر ضروری معلومات کے لئے نہایت بلیغ کتاب ہے۔ قیمت عہ

ایشیائی شاعری۔ مصنفہ مولانا اثری مرحوم۔ اس کتاب میں تمام اصناف شاعری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت عہ

جان سخن۔ بحور، صنائع۔ بدائع۔ تقطیع کرنے کے قاعدے اور علم قافیہ کی تشریح نیز متروک الفاظ کی فہرست بھی شریک کتاب ہے۔ قیمت عہ

ایضاح القوافی۔ علم قافیہ پر توضیحی اور تفصیلی کتاب قیمت ۱ر

علمی و ادبی کتابیں

مغل اور اُردو - ادیب الملک نواب مرزا نصیر حسین خاں خیال عظیم آبادی مرحوم کی لاجواب تصنیف اس میں اُردو کے ابتدائی دور سے لیکر مغلوں کے دور تک ہر زمانے کے تدریجی واقعات قلمبند کئے گئے ہیں۔ شاعر سائز حجم ۱۰۶ صفحات قیمت عہ

داستانِ عجم - یہ بھی خیال عظیم آبادی مرحوم کی تصنیف ہے۔ شاہنامۂ فردوسی پر ایک بے نظیر تبصرہ ہے۔ قیمت عہ

بزمِ خیال - از جناب صفدر مرزا پوری۔ اس کتاب میں شعرائے اُردو و فارسی کی مجالس کے لطائف کو جمع کیا گیا ہے۔ برجستہ گوئی اور حاضر جوابی کے بہترین نمونے دکھائے گئے ہیں حجم ۱۶۰ صفحات قیمت عہ

گہوارۂ تمدن - حضرت مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ و سائنس سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت کا کیا درجہ ہے قیمت عہ

نغمات - سلیم الدین احمد اکبر آبادی کے مضامین کا بہترین مجموعہ کتابت و طباعت بہترین قیمت صرف عہ

حسن کاری - فنون لطیفہ پر دلچسپ پیرایہ میں جامع تبصرہ قیمت ۲ر

ایوانِ تصور - مس سروجنی نائیڈو کے رنگین اور دلکش گیتوں کا ترجمہ قیمت عہ

روحِ نظم - میر اکبر آبادی سے لیکر آج تک کے اکثر شعرا کے کلام کا انتخاب از مولانا تاجور نجیب آبادی و پنڈت میلا رام وفا دو حصے مکمل۔ قیمت سے

روحِ انتخاب - اُردو نثر اور اُردو لٹریچر کا ضروری تاریخی انتخاب دو حصوں میں۔ از مولانا تاجور نجیب آبادی و پنڈت میلا رام وفا قیمت مکمل سے

تصانیف حضرت مولانا عبد المالک آروی

الہاماتِ شاد - شاد عظیم آبادی ہندوستان میں ایک خاص رنگ کے شاعر گذرے ہیں ان کا مثل نہ دہلی اسکول میں گذرا اور نہ لکھنؤ اسکول میں۔ یہ کتاب شاد کی نفسیاتی شاعری اور شاعرانہ ابداع و اختراع پر بے مثل کتاب ہے۔ اسی کے ساتھ اُن کے کلام کا بہترین انتخاب بھی دیا گیا ہے۔ قیمت آٹھ آنے۔

اقبال کی شاعری - ڈاکٹر اقبال مرحوم کی شاعری اور فلسفہ پر اُردو زبان میں بے نظیر محققانہ تالیف حکومت بہار نے اس کی ۲۰۰ جلدیں خریدیں اور پٹنہ یونیورسٹی نے اسے ایم۔اے کے نصاب میں داخل کیا قیمت صرف ایک روپیہ

خواب کی دُنیا - آسٹریا کے مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ کی کتاب کی تلخیص خواب کی ماہیت اور فلسفہ پر بہترین تصنیف مغربی اور مشرقی ادبیات کا دلچسپ اور مفید مجموعہ زبان شگفتہ۔ انداز بیان محققانہ۔ اس کے پڑھنے کے بعد آپ خواب کے بہت سے معمے حل کر سکیں گے۔ قیمت عہ

مذہبی کتابیں

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق - مؤلفہ حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اصولِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق کے تمام گوشوں پر دلپذیر اور مکمل بحث اور اسلام کے ابواب اخلاقی کی علمی تشریح جس سے اسلامی اخلاقیات کی برتری نہ صرف اعتقادی طور پر بلکہ علم و تحقیق کے معیار پر تمام ملتوں کے مقابلہ میں واضح ہو جاتی ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہترین بڑا سائز حجم ۵۴۴ صفحات قیمت للعہ

غلامانِ اسلام - مؤلفہ حضرت مولانا سعید احمد ایم۔اے اکبر آبادی فاضل دیوبند جس میں ان مقدس ہستیوں کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و جستجو سے یکجا کئے گئے ہیں جن کو غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود اسلامی سوسائٹی میں عظمت و اقتدار کا افلک الافلاک سمجھا گیا ہے اور جن کے علمی، مذہبی، تاریخی اور اصلاحی کارنامے نقش دوام بن کر سینۂ عالم پر ثبت ہو چکے ہیں۔ بڑا سائز حجم ۵۲۲ صفحات۔ کتابت و طباعت اور کاغذ بہترین۔ قیمت للعہ

اسلام کا اقتصادی نظام - مؤلفہ حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی۔ جس میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دُنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا نظام اقتصادی ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال کی راہ پیدا کی ہے کتابت۔ طباعت بہترین حجم ۲۴۸ صفحات قیمت عہ

اسلام میں غلامی کی حقیقت - مؤلفہ حضرت مولانا سعید احمد ایم۔اے اکبر آبادی فاضل دیوبند جس میں غلامی کی حقیقت اس کے نفسیاتی، اخلاقی اور اقتصادی پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ غلامی کا آغاز کب سے ہوا۔ اسلام سے پہلے کن کن قوموں میں یہ رواج پایا جاتا تھا اور اس کی صورتیں کیا تھیں۔ اس کی مکمل تاریخ پھر اسلام نے اس رواج کو اس وقت کن مجبور کن حالات کی وجہ سے باقی رکھا اور اس میں کیا کیا اصلاحات کیں اور ان سب سے اسلام کا اصل منشا کیا ہے۔ اس کے بعد مشہور مصنفین یورپ کی اجتماعی غلامی پر مفصل بحث اور تبصرہ کیا گیا ہے۔ بڑا سائز کتابت و طباعت اور کاغذ بہترین حجم ۲۷۲ صفحات قیمت عہ

محامد الخلفاء - قرآن مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام رض کے مستند و مکمل حالاتِ زندگی۔ قیمت ۸ر

سوانح عمریاں

اُمت کی مائیں ۷ر، بنت الرسول ۲ر، فاطمہ کا لال عہ، سوانح صدیق اکبر رض، سوانح حضرت عمر فاروق رض ۸ر، سوانح حضرت علی کرم عہ، سوانح امام اعظم رح ۱۲ر، تذکرۂ صابر رح ۱۲ر، سوانح غریب نواز رح عہ، سوانح غوث پاک عہ، مناقب حضرت غوث گوالیاری رح ۸ر، تحفۂ دربار ولایت رح ۲ر، سوانح اورنگ زیب ۸ر، سوانح زیب النساء ۸ر، سوانح نورجہاں ۸ر

سالِ اجراء موسم بہار ۱۹۳۰ء (اس شمارے سے تمام مضامین قلم دستی بمعنی ہوتے ہیں) عرصہ اشاعت ۱۳ سال

منظور شدہ محکمہ ہائے تعلیم بلاد و ریاست ہند

تعارف

تصاویر:- (۱) حضرت آزاد انصاری (۲) حضرت جگر مرادآبادی کی غزل پر حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی کی اصلاح (۳) حضرت علامہ سیماب کے دیوانِ قدیم کا سرورق، نوشتہ حضرت جگر مرادآبادی۔

جلد ۱۳ | ماہنامہ "شاعر" آگرہ - مارچ ۱۹۴۲ء | نمبر ۳

چندہ سالانہ سرپرستوں سے کم از کم محسنین سے ۵۰ معاونین سے ۲۴ انیسوں سے ۱۵ ہمدردوں سے ۱۲ خواص سے ۸ عوام سے ۵ فی پرچہ ۸

سرپرستِ محسنین معاونین اور انیسان و ہمدردانِ شاعر

سرپرستِ ادب و شعر

(۱) عالیجناب خان شہری امام الدین صاحب مستان ورتسوا والئی پاجود کاٹھیاواڑ

محسنینِ ادب و شعر

(۲) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی للعہ سالانہ
(۳) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیر خورجوی للعہ سالانہ
(۴) محسنۂ ادب ہر ہائنس علیہ حضرت کیتانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ للعہ سالانہ
(۵) محسنۂ ادب شہزادی تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ للعہ سالانہ
(۶) محسنِ ادب جناب محترم وزیرزادہ شجاعت خانصاحب مہر جوناگڈھی للعہ سالانہ

معاونینِ ادب

(۷) معاونِ ادب مسٹر اجی قلیس صاحب بی۔ اے اکبرآبادی ۲۲ للعہ سالانہ
(۸) معاونِ ادب محترمہ نجمہ تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی ۲۲ للعہ سالانہ
(۹) مقبول احمد صاحب اعظم گڈھ ۲۲ للعہ سالانہ

انیسانِ ادب

(۱۰) انیسِ ادب جناب سید تفضل کریم صاحب جمشید پور ۱۵ للعہ سالانہ
(۱۱) انیسِ ادب جناب محبوب حسن صاحب آسی متوطن رڑکی۔ بمبئی ۱۵ للعہ سالانہ

ہمدردانِ ادب

(۱۲) ہمدردِ ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلیمان جالندہری ۱۲ للعہ سالانہ
(۱۳) ہمدردِ ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری مرحوم ۱۲ للعہ سالانہ
(۱۴) ہمدردِ ادب جناب نواب زادہ کنور کشور حسین خانصاحب تاج آف عینڈ د ۱۲ للعہ سالانہ
(۱۵) ہمدردِ ادب جناب ابو محمد عبدالعظیم خانصاحب رونق دکنی ۱۲ للعہ سالانہ
(۱۶) ہمدردِ ادب جناب لطیف یوسف صاحب راز جوناگڈھی ۱۲ للعہ سالانہ
(۱۷) ہمدردِ ادب جناب صاحبزادہ سید مظفر حسین صاحب ضیا زمیندار دولت رادھارام ۱۲ للعہ سالانہ
(۱۸) ہمدردِ ادب جناب ملانی عمر میاں حسین میاں صاحب چشتی نظامی کلول ۱۲ للعہ سالانہ
(۱۹) ہمدردِ ادب جناب مخدوم سید علی احمد صاحب نقوی البخاری احمد آباد ۱۲ للعہ سالانہ

خاصانِ ادب

(۲۰) جناب صاحبزادہ سلطان حامد خانصاحب ثروت گلشن آبادی صہ سالانہ
(۲۱) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمان خانصاحب شفق ٹونکی صہ سالانہ
(۲۲) جناب عبدالحفیظ صاحب قمر صدیقی چھپراوی بی اے صہ سالانہ
(۲۳) جناب لالہ گنگا رام صاحب آبد سرہندی صہ سالانہ
(۲۴) جناب سید مظفر حسین صاحب عرشی صہ سالانہ
(۲۵) لائبریرین صاحب پبلک لائبریری میسور صہ سالانہ
(۲۶) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی جمشید پور صہ سالانہ
(۲۷) محمد عبداللہ خاں صاحب نیر امروہوی صہ سالانہ
(۲۸) جناب ماسٹر حسن خانصاحب اثر بمبئی صہ سالانہ
(۲۹) جناب نذیر احمد صاحب نذیر شیرکوٹی صہ سالانہ
(۳۰) جناب صبغت اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی صہ سالانہ
(۳۱) پریم چند صاحب پریم دہلوی صہ سالانہ
(۳۲) جناب طالق ہمدانی لدھیانوی صہ سالانہ
(۳۳) جناب سبحان خاں صاحب غافل بیتول صہ سالانہ
(۳۴) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی کوٹاہہ صہ سالانہ
(۳۵) جناب حبیب حسن خانصاحب حبیب شاہجہانپوری (کوئٹہ) صہ سالانہ
(۳۶) جناب ابو فقیر محمد خانصاحب عارف سیالکوٹی (کوئٹہ) صہ سالانہ
(۳۷) جناب شیو پرشاد صاحب برگ باندوی صہ سالانہ
(۳۸) جناب حکیم ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب زار کاندہلوی صہ سالانہ
(۳۹) جناب علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی صہ سالانہ
(۴۰) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعر نہٹوری صہ سالانہ
(۴۱) ابوالافتخار ڈاکٹر ایس۔ ایم محمود صاحب شاہ مجدراسی اوچ عالم فاضل گیانی کوئٹہ
(۴۲) جناب ماسٹر کالو میاں صاحب فراق ڈبوہی (رجمود کاٹھیاواڑ) صہ سالانہ
(۴۳) جناب ایم عنایت اللہ خانصاحب عنایت گورداسپوری کمیشن سپرنٹنڈنٹ گورداسپور
(۴۴) جناب کنور فاروق علی خانصاحب ثاقب رئیس عینڈ د صہ سالانہ
(۴۵) جناب صوبیدار اختر علی صاحب اختر سردار دگوالیار صہ سالانہ

جُرعات

مُلّا گردی

جہاں تک مذہبی پیشواؤں کے ادب و احترام کا تعلق ہے میں اور میری طرح ہر مسلمان اُن کی شان میں بے ادبی کو بُرا سمجھے گا لیکن میزانِ عمل و اخلاق پر تولنے کے بعد۔ ایسے علماء جو مذہبی ٹھیکیدار ثابت ہوں۔ جن کے دماغ و ذہن میں بجز "جائز و ناجائز" اور کچھ نہ ہو اور جو اسلام کو اپنے تنور شکم کی خاطر جُھلسا دینا چاہتے ہوں جن کا مقصد تعمیر قومیت کے برعکس مذہبی کاوشیں دے کر مسلمانوں کو پاگل بنانا اور اپنا اُلّو سیدھا کرنا ہو کسی صاحب فہم مسلمان کی نظر میں قابل احترام نہیں ہو سکتے۔ موجودہ دور میں مُلّا گردی کا جو زور شور ہے اُس نے علمائے حق کو سانس لینا دشوار کر دیا ہے اور انہیں دستار فضیلت سنبھالنی مشکل ہو گئی ہے۔

ناظرین "شاعر" ابھی حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی نظم "موحدِ اعظم" کو بھولے نہ ہوں گے اس کی اشاعت کے بعد مولوی مہدی حسن صاحب مفتی راندیر نے جو فتنہ برپا کیا وہ معلوم ہے مفتی صاحب اور اُن کے حواری ہمہ وقت مولانا سیماب کی شہرت کو نقصان پہنچانے اور ان کے مذہبی جذبات و معتقدات کو ٹھیس لگانے میں مصروف ہیں۔ اپنے زیر اثر اخبارات و رسائل میں دوسروں کے نام سے مضامین لکھ لکھ کر شائع کرا رہے ہیں، نہ صرف یہ بلکہ اس آگ کو بیانتک بھڑکانے میں کوشاں ہیں کہ عوام اس سے متاثر ہو کر نعوذباللہ صاحب کو سجدہ کرنے لگیں۔ ایک طرف تو مفتی صاحب کی یہ مذموم حرکات ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کا سب سے بڑا اور کثیر الاشاعت اخبار "مدینہ" منافقانہ پالیسی کے تحت میں کئی ماہ سے اس مضمون کی اشاعت سے گریز کر رہا ہے جو مفتی مہدی حسن صاحب کے مضمون کے جواب میں اُسی وقت حضرت مولانا مولوی سلیم الدین صاحب جاکب مظاہری سہسرامی نے اسے بھیج دیا تھا۔ "مدینہ" کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اب مولانا سلیم الدین صاحب مظاہری کا مضمون بدرجۂ مجبوری "شاعر" میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ہر چند اس کا امکان بچیس فیصدی ہے کہ جو لوگ "مدینہ" میں مفتی راندیر کا مضمون دیکھ چکے ہیں وہ شاعر کا یہ جوابی مضمون بھی دیکھ سکیں گے۔ لیکن ہمارے پاس اس کے سوا اور چارہ کار بھی کیا ہے؟ ایک واقعی مسلمان کو مولوی مجید حسن صاحب کے اخبار "مدینہ" میں کا ذکر کیا جائے کہ صاحب مضمون مذہبی جنایات کا مرتکب اور پھر بھی مدینہ جواب کی اشاعت سے گریز کرے تو ایسی حالت میں اس کے سوا اور کیا

کہا جا سکتا ہے کہ اخبار "مدینہ" اور اس کے مالک اسلام دوست نہیں بلکہ اسلام دشمن ہیں۔ تاریخ جب ان واقعات کو دُہرائیگی اور جلالِ خداوندی مولوی مہدی حسن اور مولوی مجید حسن مالک اخبار "مدینہ" سے باز پرس کریگا اُس وقت اس حقیقت پر پردہ ڈالنے والوں کو اپنی حقیقت معلوم ہو جائیگی۔ ہمارے بعض دوستوں نے ہمیں یہ مشورہ دیا کہ ہم "مدینہ" کے مالک پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر دیں لیکن ہم نے اپنی کامیابی کے یقین کے باوجود اب تک اس طرف توجہ نہیں کی۔ آئندہ جو کچھ ہو ہمارا ایمان ہے کہ حق و صداقت کا آفتاب ضرور طلوع ہو کر رہے گا اور دشمنانِ سیماب ذلیل و خوار ہونگے انشاءاللہ۔

آئندہ اشاعت میں ہم "مدینہ" کی وہ تمام خط و کتابت شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس میں اس نے جوابی مضمون کی اشاعت کے وعدے کئے ہیں۔ مفتی مہدی حسن صاحب اور اُن کے مؤیدین سے ہم باادب گذارش کرینگے کہ وہ اپنے اوچھے اور گمنام ہتھیاروں کو استعمال کرنا چھوڑ دیں۔ اگر ان کے علم و فضل میں کچھ جان ہے تو کھُل کر میدان میں آئیں۔ حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہ کا ان معاند ناقص حضرات نے بزعم خویش جس طرح استخفاف کیا ہے اور اُن کی روشن اسلامی خدمات کو مٹانے کی جو ناکام کوشش کی ہے اس کا انتقام ان سے ضرور لیا جائیگا اور اسی کے ساتھ ساتھ ان سب کی عمداً مذہبی غلط بیانی اور قرآن و احادیث سے چشم پوشی کا جواب ہماری طرف سے اتنا سخت ہوگا کہ سب کی آنکھوں کے سامنے اپنے زعم باطل اور ناقص علم و فضل کا جنازہ آ جائے گا۔

اظہارِ تشکر اور معذرت و مجبوری۔

ہم بیحد ممنون ہیں کہ ازراہ شاعر نوازی محترمی مقبول احمد صاحب اعظم گڈھی نے معاونین "شاعر" خان صاحب عبدالحمید خان آف ناناوڑ نے ہمدردانِ شاعر لائبریرین صاحب پبلک لائبریری میسور محمد عبداللہ خاں صاحب بزم امروہوی اور پریم چند صاحب پریم دہلوی نے خاصانِ "شاعر" میں شرکت فرما کر اپنی ادب دوستی کا بہترین ثبوت دیا۔ اُمید کہ شاعر نواز طبقہ اسی طرح شاعر نوازی کا ثبوت دیتا رہیگا۔

ہمیں افسوس ہے کہ کئی ماہ سے شاعر دو چار دن کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے یہ تاخیر بالکل غیر متوقع ہوتی ہے ناظرین شاعر بالکل مطمئن رہیں، اُنکا شاعر ہر ماہ پابندی کے ساتھ اُن تک ضرور پہونچے گا۔ ایسی حالت میں کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے رسائل ایک ایک دو دو ماہ کی تعویق سے شائع ہو رہے ہیں شاعر کی دو چار دن کی تعویق کا احساس نہیں ہونا چاہیئے۔

اس اشاعت میں اساتذہ اور مشاہیر شعرا کی نظموں اور غزلوں کے علاوہ تین خاص نظمیں سرمایہ۔ تاج کے خلد زار میں اور کاروانِ نمود شائع ہو رہی ہیں۔ یہ تینوں نظمیں اُردو

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

جب وقت کی تغیر ہوا کرتی ہے
انجام میں تاخیر ہوا کرتی ہے
ہے لازمی قوموں کا بگڑ کر بننا
تخریب سے تعمیر ہوا کرتی ہے

میلا سا زمانہ بھی تو باقی نہ رہا
ماضی کا فسانہ بھی تو باقی نہ رہا
لوہا اور تیسل کیا رہے گا باقی
قاروں کا خزانہ بھی تو باقی نہ رہا

رفتار ہے جنگ کی خطرناک ہنوز
خوں ریز ہیں ظالم اور سفاک ہنوز
اللہ رے، فطرت کی وسیع النظری
قائم ہے فروغِ کرۂ خاک ہنوز

دل وہ ہے، جو بے دلی سے مایوس نہ ہو
کیسا ہی غم و رنج ہو، محسوس نہ ہو
مختاریٔ فطرت پہ عقیدہ ہو اگر
انسان کسی حال میں مایوس نہ ہو

اندوہ عبیر میں چمکتا دیکھا
اور خون گلال میں جھلکتا دیکھا
ہولی میں لگی آگ تو سینے اُس وقت
لوگوں [illegible] دیکھا

آگاہ ہے خاکیوں کے شر سے فطرت
واقف ہے ہر اک ذہن و نظر سے فطرت
یہ لیل و نہار، یہ غروب اور طلوع!
غافل تو نہیں ہے اپنے گھر سے فطرت

پیمانۂ انقلاب ڈھلتے دیکھا
دنیا کو عجب رنگ بدلتے دیکھا
دیکھا کہ گہن میں چاند آیا لیکن
پھر اُسکو گہن سے نہ نکلتے دیکھا

دنیا میں کسی کو کبریائی نہ ملی
اور موت کے پنجے سے رہائی نہ ملی
دعویٰ تو خدائی کا ہزاروں نے کیا
لیکن کسی بندے کو خدائی نہ ملی

اپنی ہی مدد کو آپ تیار رہے
ہے گھات میں انقلاب ہشیار رہے
ہمدردیٔ دنیا ہے فقط اک دھوکا
ہر شخص اپنی جگہ خبردار رہے

دراصل ہے قوتِ ارادی قوت
اجماع کی قوت ہے فسادی قوت
ہوتا نہیں اتحاد قوموں میں جہاں
کام آتی ہے صرف انفرادی قوت

سیماب

شخصیات :- حکیم آزاد انصاری سہارنپوری مرحوم

مرحوم کا نام الطاف احمد اور ابوالاحسان کنیت تھی ۔ والد ماجد کا اسم گرامی محمد حسین خلف امیر احمد تھا۔ وطن خاص سہارنپور تھا۔ آپ نسلاً شیخ انصاری تھے۔ آپکا سلسلۂ نسب حضرت ایوب انصاری رضی تک پہونچتا ہے ۔ ۲۷ رجب ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء بمقام ناگپور (سی۔پی) جہاں آپ کے والد بعہدۂ اورسیری متعین تھے، پیدا ہوئے۔ آپ کے اجداد میں ایک مشہور بزرگ شمس الدین انصاری گزرے ہیں جنہیں خدمات ملکی کے صلے میں شاہجہاں بادشاہ نے ۹۰ گاؤں معافی الدوام عطا فرمائے تھے۔ ۹۰ گاؤں زرخرید تھے، یہ سب کے سب نسلاً بعد نسل آپ کے پردادا مرحوم تک جن کا نام شیخ محمد بخش انصاری تھا منتقل ہوتے چلے آئے ۱۸۵۷ء میں اضلاع مظفرنگر اور سہارنپور میں سکھ گردی کی بدولت گورنمنٹ برطانیہ نے سب کی جائدادیں اور گاؤں وغیرہ کچھ عرصہ کے ضبط کر لئے اور واپسی کے لئے سندیں مانگیں حضرت آزاد انصاری مرحوم کے دادا بیحد غیور اور خوددار تھے انہوں نے خوشامد مناسب نہ سمجھی اور اسطرح یہ تمام گاؤں ہاتھ سے نکل گئے۔ لیکن آپ کے دادا مرحوم کا ایک ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ تاحین حیات مقرر ہو گیا ۔ ہرچند جائداد اور گاؤں کی ضبطی سے پہلے ان کی آمدنی و اخراجات دو لاکھ ماہانہ تھے، لیکن انہوں نے ایک ہزاری پر اکتفا کیا اور کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن گذار دئے ۔

حضرت آزاد انصاری مرحوم ناگپور میں پیدا ہوئے تھے جب آپ کی عمر ۴ سال کی تھی تو آپ کے والد کا تبادلہ سیونی ہو گیا اور پھر کامٹی۔ کامٹی ہی میں حضرت آزاد انصاری کی بسم اللہ ہوئی۔ ابھی مرحوم پارۂ عم ختم نہ کرنے پائے تھے کہ والد کا تبادلہ ساگر ہو گیا۔ یہاں آپ ایک حافظ کے زیر تعلیم رہے۔ ابھی آپ نے عمر کے ساتویں ہی سال میں قدم رکھا تھا کہ اچانک والد ماجد کا ہیضہ میں انتقال ہو گیا، حضرت آزاد انصاری اور ان کے چھوٹے بھائی اشفاق احمد انصاری مع اپنی والدۂ ماجدہ کے پردیس میں بے یار و مددگار رہ گئے ۔ ددھیال میں آپ کا کوئی مددگار نہ تھا اس لئے ننہال میں پناہ لینی پڑی جہاں ماموں اور دیگر اعزا بقید حیات تھے ۔ آپ کے نانا شاہ مجید علی مرحوم آپ کو اپنے وطن مالوف انبہٹہ (ضلع سہارنپور) میں لے آئے اور یہیں دو سال میں آپ نے [illegible] ختم کیا۔ ختم کلام پاک کے بعد مولوی عبد اللہ صاحب انصاری کی نگرانی میں جو

پہلے مدرسۂ عربی گلاؤٹھی کے صدر مدرس تھے اور بعد میں ناظم امور دینیات علیگڈھ کالج مقرر ہوئے، گلاؤٹھی بھیجدئے گئے، یہاں ایک سال تک فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر اپنی والدہ کے چچازاد بھائی مولوی صدیق احمد کے پاس مالیر کوٹلہ چلے گئے اور یہاں دو سال تک عربی اور فارسی پڑھی ۔ اس کے بعد تھانہ بھون میں دو سال تک عربی اور فارسی پڑھی ۔ پھر مدرسۂ فیض عام میں تعلیم حاصل کی ۔ حضرت آزاد انصاری مرحوم اپنے والد کی ناگہانی وفات کی وجہ سے ننہال کے ایسے ماحول میں تربیت پانے پر مجبور ہو گئے، جہاں انگریزی تعلیم کفر میں داخل تھی ۔

مختصر یہ کہ مرحوم ۱۸ - ۱۹ سال کی عمر تک فارسی اور عربی کی تعلیم پاتے رہے اس کے بعد شادی ہو گئی اور فکر معاش نے گھیر لیا چنانچہ حکیم نور احمد صاحب سہارنپوری اور ڈاکٹر احمد خاں صاحب لکھنوی اور دیگر حکما سے طب پڑھی ۔ مولوی حکیم معین الدین نانوتوی سے سند لینے کے بعد باقاعدہ مطب شروع کر دیا ۔ ۱۹۰۱ء میں دو سال دہرہ دون میں ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۹ء تک کانپور میں اور آٹھ سال تک انبالہ میں مطب کرتے رہے ۔ یہاں سے یہ سلسلہ ختم ہوا تو علیگڈھ میں مطب کیا جب وہاں بھی نہ چلا تو دہلی آگئے اور دہلی سے حیدرآباد تشریف لے گئے یہاں پہونچنے کے بعد کاروبار مطب چھوڑ کر عینک فروشی اختیار کر لی ۔

تھانہ بھون ضلع مظفرنگر سے آپ کو شاعری کا شوق ہوا ۔ اس وقت آپکی عمر ۱۴ - ۱۵ سال تھی ۔ وہاں ماہانہ مشاعرہ ہوتا تھا، دیگر طلبہ کو فکر سخن کرتے دیکھکر آپ نے بھی کوشش کی اور دو ، ۳ شعر کہہ لئے ۔ آہستہ آہستہ یہ شغل اور ذوق ترقی کرتا رہا۔ شروع میں عطار تخلص فرماتے تھے ۔ اصلاح کلام کے لئے مولانا عبد الرحمٰن صاحب بیدل سہارنپوری صدر مدرس مدرسۂ مظاہر العلوم کو منتخب کیا اس زمانہ کا کلام "پیام یار" لکھنؤ "پیام عاشق" قنوج اور "زبان" دہلی میں شایع ہوتا رہا ۔ ابتدائی مشق کے دور میں ذوق کا رنگ طبیعت پر غالب رہا ۔ پھر ناسخ ۔ رشک ۔ وزیر اور اسیر وغیرہ کا تتبع کیا جس سے کلام میں لکھنویت پیدا ہو گئی لیکن یہ رنگ بھی دیرپا نہ رہا لیکن زمانہ تھا کہ مرزا داغ دہلوی ۔ ظہیر دہلوی اسیر مینائی تسلیم لکھنوی اور جلال لکھنوی کا طوطی بول رہا تھا۔ مختلف گلدستوں

بعض حضرات کا کلام بھی شائع ہوتا رہتا تھا چنانچہ حضرت آزاد مرحوم ان باکمال اساتذہ کی صاف و سادہ زبان ۔ شوخ و دلکش انداز بیان اور خوشگوار ترکیبوں سے متاثر ہوگئے ان کے دواوین بازار سے خرید کر لائے اور غور و فکر سے مطالعہ شروع کر دیا ۔ نتیجتاً آپ کے کلام میں بھی شوخی اور رنگینی پیدا ہوگئی ۵ - ۶ سال تک مرحوم اسی رنگ کی شاعری کرتے رہے ، کچھ مدت بعد آپ اس سے بھی اکتا گئے اور سوچنے لگے کہ تقلید اچھی چیز نہیں ہوتی ہذا ہمیں خود کوئی نئی راہ اختیار کرنی چاہئے ۔ چنانچہ مرحوم نے اپنا تمام سرمایۂ کلام ضائع کر دیا ۔ اور تہیہ کر لیا کہ اب جو کہیں گے تو کوئی خاص انداز پیدا کر کے کہیں گے ۔ آپ کے استاد حضرت بیدل نے مشورہ دیا کہ اگر ترقی کرنی ہے تو میر ، مومن اور غالب کے کلام کا مطالعہ کرو چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا ۔ اسی دوران میں مولانا حالی پانی پتی کا دیوان آپ کے ہاتھ لگ گیا ان کی جدید رنگ کی شاعری سے متاثر تو پہلے ہی سے تھے اب دیوان کے مطالعہ نے آنکھیں کھول دیں ۔ مقدمہ شعر و شاعری کے گہرے مطالعہ نے شاعری کا ایک نیا ولولہ آپ کے دل میں بھر دیا ۔ اور نشانِ منزل مقصود نظر آنے لگے ۔ ابھی آپ کو شاہراہِ جدید پر چلتے ہوئے ایک سال ہی ہوا تھا کہ مولانا بیدل سہارنپوری حیدر آباد تشریف لے گئے اور مرحوم آزاد ان کے فیض سے محروم ہو گئے ۔ بڑے غور و فکر کے بعد آپ نے اسی سبدِ فیض سے الگ ہونے کے متعلق فیصلہ کیا جس نے شاعری کا رنگ بدلا تھا اور پانی پت تشریف لے جا کر مولانا حالی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا ۔ ۷ ، ۸ سال کے بعد دسمبر ۱۹۱۴ء میں یہ سلسلہ مولانا حالی کی وفات سے منقطع ہوگیا ۔ اب آپ کے خیالات میں رفعت ۔ افکار میں گہرائی زبان میں صفائی اور انداز بیان میں لوچ پیدا ہو چکا تھا ۔

حکیم آزاد انصاری مرحوم نے اپنے دیوان میں اپنے کلام کی جو خصوصیات تحریر فرمائی ہیں وہ یہ ہیں (۱) کلام کی اصلی ترتیب (۲) سلاست و صفائی زبان (۳) ندرتِ بیان (۴) تکرار الفاظ (۵) صنعتِ ترصیع و تقابل (۶) صنعتِ ترصیع جدید کی ایجاد (۷) شعر میں اصطلاحاتِ علمیہ کا استعمال ۔

ان تمام خصوصیات کی مثالیں اُن کے کلام میں جابجا ملتی ہیں اور بڑے کمال کی بات یہ ہے کہ مرحوم نے عمر بھر ان قواعد کی پابندی کی ۔ اس جکڑ بندی سے جہاں بہت سی خوبیاں پیدا ہوئیں وہاں کلام میں دکھاپن بھی پیدا ہوگیا ۔ چونکہ یہاں کلام پر تبصرہ مقصود نہیں اس لئے میں دانستہ اس سے گریز کرتا ہوں ۔

حکیم آزاد انصاری مرحوم پابند وضع سادگی پسند اور بڑے ملنسار انسان تھے علمی و فنی اعتبار سے بھی ان کا پایہ بلند تھا ۔ سینکڑوں غزلوں کے علاوہ قطعات ، رباعیات اور چند نظمیں بھی آپ کی یادگار ہیں مرحوم کا مجموعۂ کلام "معارفِ جمیل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے ۔ میری نظر سے مرحوم کے بعض مضامین بھی گذرے ہیں نظم کی طرح اُن کی نثر بھی بیج اور پُر اثر ہوتی تھی ۔ وہ غزل کے سب سے بڑے حامی تھے اور غزل کی گہرائی اُنہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی ۔

باوجود کوشش مرحوم کی آخری زندگی ۔ بیماری اور موت کے حالات دستیاب نہ ہو سکے اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اُردو رسائل و اخبارات نے بہت کم مرحوم کی وفات کا ذکر کیا ، اُمید کہ ادبی دنیا یوپی کے اس جلیل القدر شاعر کو زندہ رکھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش سے کام لے گی ۔

اعجاز صدیقی

کمالاتِ کمالی تحقیق و تصحیح کی روشنی میں

(گذشتہ سے پیوستہ)

اب دیکھئے پہلے بند میں توہم کی غضناکی ۔ بانکی ادا ۔ لگاوٹ کھچاوٹ ۔ فریضۂ عاشقی ۔ ثبوت ضبط ۔ یہ سب کمالی تخیلات کی بے محل پیداوار ہے ان کا ذکر مولانا سیماب کے شعر مذکورالصدر میں کہیں نہیں ۔

ذرا ادبی نقطۂ نگاہ کے اعتبار سے بھی دیکھ لیجئے ۔ پہلا مصرعہ مفہوم سے بے نیاز ہے دوسرے مصرعہ میں ادا کے ساتھ بانکی کا اضافہ کرکے بازاریت کو نمایاں کیا گیا ہے ۔ تیسرے مصرعہ میں قطع نظر لگاوٹ اور کھچاوٹ اور ابتذال کے ہیچ ہے کی ردیف بالکل بیکار ہے ۔ "فریضہ عاشقی کا" یہ بھی ایک معجونِ مرکب ہے عاشق کے فریضہ کی بجائے عاشقی کا فریضہ لکھ کر کمال ہمہ دانی کا ثبوت دیا گیا ہے ۔

دوسرا بند چونکہ پہلے بند سے متعلق ہے اس لئے لفظ گر سے شروع ہوا ہے جو شاعر کے کمالِ عجز کی دلیل ہے ۔

کمالی کا عشق بازاری ہے جو صرف فرمائشات کی تعمیل تک محدود ہے ۔ اسی لئے وہ مولانا سیماب کے اس بلند نظریہ کو نہیں سمجھ سکے ۔ مولانا سیماب کی خودداری پابندئ وضع کو بھی وفا سمجھتی ہے اور کمالی کا عجز ٹھوکریں کھانا اپنی معراج سمجھے ہوئے ہے یہ اپنا اپنا مذاق ہے کمالی صاحب نے عشق کے ساتھ بازی کا لفظ رکھ کر اپنے نظریۂ عشق کی تشریح کی ہے ساتھ ہی اس کے یہ بات بھی غور طلب ہے کہ کمالی "عشق بازی کی پابندی" سنتے آئے ہیں انھوں نے "عشق بازی میں پابندی" نہیں سنی ۔ اسی طرح چوتھے مصرعہ میں ایک فرمائش کے ساتھ "سب پہ ہی" بھی محل نظر ہے ۔

تیسرا بند پڑھ کر کمالی کے کمال کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ "صحتِ ذوق" پہلے مصرعہ میں اک "ہے" کی اور ضرورت محسوس کرتی ہے اور اہلِ نظر انوکھی اور وضع کے مابین تعقید کا عیب سمجھتے ہیں ۔

دوسرے مصرعہ میں "اُس نے" کی ضمیر اپنے مرجع کی مرہونِ منت نہیں ۔ اس بند کے تیسرے مصرعہ میں اگر نہ معلوم کی بجائے سمجھ سکے نہ کہدیا جاتا تو خدا جانے کیا بے کمالی ہو جاتی اسی مصرعہ میں لفظ "آپ کا" کو آپ فلسفہ تک ہی محدود رکھئے ۔ راہِ عالی پر منطبق نہ کیجئے ۔

اور سنئے "یہ رنگ جدت لاابالی ہے" سبحان اللہ، سبحان اللہ لاابالی طبیعت اور لاابالی مزاج تو تمام فصحانے کہا ہے لیکن لاابالی رنگِ جدت "قاموسِ کمالی" کا شاہکار ہے ع

"مرے نزدیک تو علم کمالی "بے کمالی" ہے"

ملے حکمِ خدا اور نام ہو اس کا وفاداری ‏ حقیقی عشق حبِ خاص ہو تعبیر جیدی
رہے ہر حال میں ابلیس سچا عاشق باری ‏ تقدس آپ کے صدقے صداقت آپ پر واری

کمالی صاحب آپ کیا کہنا چاہتے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں ۔ مولانا سیماب نے تو خدا کی عدولِ حکمی کو کہیں وفاداری سے تعبیر نہیں کیا اور یہاں حقیقی عشق کے ساتھ حُبِ خاص کی کیا ضرورت تھی شاید آپ نے حب بمعنی محبت استعمال نہیں کیا ہے بلکہ حَب بمعنی "گولی" استعمال ہوا ہے ۔ آپ کو حَبِّ خاص کی واقعی ضرورت ہونی چاہیے کیونکہ آپ چودھویں صدی کے مولوی ہیں

اور کیوں صاحب یہ تعبیرِ عیاری کیا بلا ہے ؟ تیسرے مصرعہ میں "آپ کا" رہے" بھی قابلِ داد ہے آپ کا چوتھا مصرعہ بعد ترمیم آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے

گر قبول افتد زہے عز و شرف

"فصاحت آپ کے صدقے بلاغت آپ پر واری"

غضب ہے انحرافِ حکم ہو فرضِ عبودیت ‏ کھلے اعراض پر صادر ہو فتوائے حقِ الفت
معانی خواہ ہوں للہ یہ ارشاد ہو حضرت ‏ کہ ہے اس امر کی شاہد کتاب اللہ یا سنت

کمالی صاحب آپ کورے مولوی ہیں شاعر نہیں آپ شاعرانہ تاویلات نہ کر سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں ۔ سیماب صاحب نے کہا ہے ؎

خدا کے سامنے سجدہ بشر کو نقصِ غیرت تھا ‏ یہی فرضِ عبودیت یہی حق محبت تھا

دیکھئے اس میں شاعرانہ تاویل موجود ہے۔ خدا اور بشر کا لفظ پڑھئے اور پھر پڑھئے۔ کیا کتاب اللہ اور سنت کے مطابق فرضِ عبودیت یہ نہیں کہ خدا کے ہوتے ہوئے کسی بشر کو سجدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سیماب کی شاعرانہ تاویل ہے۔ آپ اسے نہیں سمجھ سکتے۔ آپ فرضِ عبودیت کو انحرافِ حکم سے تاویل کرتے ہیں۔ یہ آپ کی سمجھ ہے۔

گُھلا اعراض اور حقِ اُلفت آپ ہی جیسے اہلِ کمال لکھ سکتے ہیں۔

ذرا غور کیجئے حقِ الفت اور حقِ محبت کی ترکیب پر۔ تیسرا اور چوتھا مصرع [illegible] دبی حیثیت سے پست ہیں۔ معانی خواہ اور اللہ صرف برائے [illegible] ہیں۔

[illegible] چوتھے مصرع میں آپ امر پر شہادت مانگ رہے ہیں۔ حالانکہ مولانا سیماب [illegible] مراد کلام کا فرق سمجھئے؟

چنانچہ آپ نے [illegible] دخیط سجدۂ آدم معاذاللہ | ہر یں بیباک گفتن سخت ناشادم معاذاللہ
[illegible] بیاں بادم معاذاللہ | میر اسانم زسر بر خاک اقدام معاذاللہ

[illegible] کمالی کے کلام میں اجمال اور الجھنوں کی بہتات ہے۔ جب اُردو ہی جو

غالباً اُن کی مادری زبان ہے ان عیوب سے پاک نہیں تو پھر فارسی میں تو کمالی کے یہاں جس قدر اُلجھاؤ ہو کم ہے۔

فارسی کے اسی بند کو دیکھئے پہلے مصرع میں رضائے حق دخبطِ سجدۂ آدم کی تشریح سمجھنے کے لئے عقلِ کل سے مشورہ کی ضرورت ہے۔

دوسرے مصرع میں ردیف کی کمزوری کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ تیسرے میں تعقیدِ لفظی کا عیب بھی نظر انداز کر دیجئے۔ چوتھے مصرع میں "زسر بر خاک اقدام" پر ایک قہقہہ لگائیے اور خاموش ہو جائیے۔

شیطان کی آنت بہت طویل مشہور ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کمالی صاحب کی یہ نظم اس سے بھی زیادہ طویل ہے۔ ابھی اس نظم نما نثر کے دو حصوں پر تنقید ہوئی ہے چار حصے اور باقی ہیں۔

قیاس کُن زگلستانِ من بہارِ مرا

(باقی۔ باقی)

صبا متھراوی

محسوسات

چاندنی رات میں خیال ترا | اس طرح دل کو گدگداتا ہے
جیسے بربط کے تار پر بچّہ | انگلیاں رکھ کے مسکراتا ہے

سمٹ کر آ گئے دونوں جہاں کیوں ایک مرکز پر | کسے آوازِ قلبِ ناتواں دیتا ہوا اُٹھا
یہ کس کے حسن پر خیّام تھی اک نیند سی طاری | مرے شعروں میں کون انگڑائیاں لیتا ہوا اُٹھا

خیّام ہندی

تاج کے خلد زار میں

جب نہ مجھے سکوں ملا عرصۂ روزگار میں
لے گیا ذوقِ جستجو "تاج" کے خلد زار میں

چشمِ حواس کھل گئی صنعتِ کار دیکھ کر
صنعتِ کار سے سوا شانِ ہنر از دیکھ کر

عقل کی موشگافیاں پائے نظر پہ جھک گئیں
پائے نظر کی لغزشیں تاج کے در پہ رک گئیں

ناز کی سرفرازیاں ڈوب گئیں نیاز میں
شوق کو بار مل گیا خلوتیانِ راز میں

ہوش و خودی کی شورشیں جھوم کے ہو گئیں خموش
خوابِ سکوں کا آستاں چوم کے ہو گئیں خموش

روح کے اضطراب میں کیفِ دوام ڈھل گیا
دوشِ نفس سے جبر کا بارِ عظیم ٹل گیا

زمزمۂ سروش سے جاگ اٹھیں سماعتیں
صبحِ ازل کی لوٹ آئیں وجد طراز ساعتیں

دل میں سمٹ کر آ گئے جلوے فضائے عرش کے
بڑھ کے نظر نے چھو لیے پاؤں خدائے عرش کے

جب یہ ملیں بصیرتیں آئینۂ حواس کو
میں نے محیط کر لیا عالمِ بے قیاس کو

غور سے جائزہ لیا میں نے دیارِ تاج کا
خوب مطالعہ کیا نقش و نگارِ "تاج" کا

سرو و سمن کی سیر کی ۔ باغ و بہار میں پھرا
گلکدۂ جمال کے لیل و نہار میں پھرا

طوطی و سار کو کیا میں نے سلامِ آرزو
سرو و چنار کو دیا میں نے پیامِ آرزو

نغمۂ عندلیب کی میں نے تڑپ کے داد دی
نرگس و نسترن کو بھی ہنس کے اشیر باد دی

میں نے مراقبے کئے کیف بھری فضاؤں میں
میں نے غزل سرائی کی تاج کی خوب چھاؤں میں

میں نے مشاہدہ کئے نقشِ خرامِ خسروی
میں نے بہر روش دیئے خطبے بنامِ خسروی

رودِ حسن کی نظم کیں میں نے سبک روانیاں
زیر و بمِ حیات کی بہتی ہوئی کہانیاں

مقتضیاتِ عشق پر حسن سے ساز بازکی
گل کے ہر ایک برگ پر میں نے ادا نماز کی

حیف کسی کو عظمتِ "تاج" کا پاس ہی نہیں
عظمتِ "تاج" کا کوئی راز شناس ہی نہیں

اب بھی دماغِ خاک ہے خندہ زن آسمان پر
اب بھی ہے آسمان خم "تاج" کی آن بان پر

جلوہ فگن ہے قیصری اب بھی بحالِ قیصری
اب بھی ستانتوں میں ہے رعبِ جلالِ قیصری

ہیبتِ ناز آفریں اب بھی فضا پہ ہے محیط
اب بھی شکوہِ زندگی آب و ہوا پہ ہے محیط

اب بھی خلا میں گونج ہے آمدِ قہرمان کی
اب بھی ہیں گوش بر صدا بتیاں سبزہ زار کی

سرو و چنار کے نقیب چشم براہ ہیں ابھی
نور فشاں و زر فشاں شام و پگاہ ہیں ابھی

جھانک رہی ہیں سطوتیں اب بھی منارِ تاج سے
پھوٹ رہی ہیں عظمتیں اب بھی کنارِ تاج سے

شاخ شاخ تذکرے بادشہ زلو ہوں کے ہیں
نقش و نگارِ حال میں قہقہے ماضیوں کے ہیں

اب بھی گدازِ گفتگو شب کی خموشیوں میں ہے
اب بھی لسانِ رنگ و بو خواب فروشیوں میں ہے

زیست نواز ہے فنا ۔ زیست فنا نواز ہے
کتنی لطیف رمز ہے کتنا حسین راز ہے

سلسلۂ باغ و راغ کا زد میں ہے انقلاب کی
شامِ سکوں سے متصل صبح ہے اضطراب کی

آئینۂ بہار ہے رنگِ خزاں لئے ہوئے
امن کا دیوتا ہے آج تیغ و سناں لئے ہوئے

گردشِ آسماں کا ہے دوسرا نام زندگی
خود ہے حصارِ موت میں محوِ خرام زندگی

موت تو ناگزیر ہے عالمِ ممکنات میں
موت مگر کچھ اور ہے عشق کی کائنات میں

عشق ہے حسن آفریں حسن صفات آفریں
وہ بھی حیات آفریں یہ بھی حیات آفریں

عشق کی کائنات میں حسن کا انتظام ہے
اس کو سکوں محال ہے اس کو فنا حرام ہے

فطرتِ سوز و ساز خود حسن و وفا کی ہے امیں
ساز کی ابتدا نہیں ۔ سوز کی انتہا نہیں

"تاج" وفا و حسن کی خوابگہِ جمیل ہے
اس کے دوام کی یہی سب سے بڑی دلیل ہے

قرن اگرچہ بیت جائیں شاہجہاں کے راج کو
شورشِ انقلابِ وقت چھو نہ سکیگی "تاج" کو

عبداللہ مضطر سیمابی (گجراتی)

"سید سلیمان ندوی ایک شاعر کے روپ میں"

بہتوں کے لئے یہ خبر بہت تعجب خیز ثابت ہوگی کہ مشہور سیرت نگار مولانا سلیمان ندوی کا شباب آزمودہ قلم کسی زمانے میں "شاعری" کو بھی اپنے لطیف سایہ میں جگہ دے چکا ہے۔

سنہ ۱۹۱۷ء کا وہ ہنگامہ آفریں زمانہ جبکہ نظم اپنی تیز فرازگی کے ابتدائی منازل میں تھا اور سامعی اور مطلع ہند پر جہالت کے گہرآلود دُھندلکے میں سیاہی بیداری کی نیم مدھم روشنی میں پھیلتی جا رہی تھی۔ غزل اس دور میں بھی شمع شبستانِ سخن بنی ہوئی تھی اور اُس کے ہمہ گیر اثرات ابھی اچھی طرح زائل نہ ہوئے تھے۔ ہنوز دماغوں میں "کیف و دشنیں" کا جمود افزا خمار باقی تھا، تغزل کی نشیلی شراب کے متوالے اس کو اس آسانی سے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے، وہ واقعات، مشاہدات اور تجربات کے تلخ عناصر کو ادب میں داخل کرنے کے مخالف تھے کہ اس سے ادب میں ایک نوع کی کرختگی اور ایک مادی خشونت پیدا ہو جاتی ہے وہ ادب کو صرف حسن و عشق کی رسیلی کیفیات تک محدود کر کے اپنے ذہنی اہتزاز کے متمنی تھے۔ بعید تحقیقت، تعیّرنا آشنا اور خواب نواز خیالی دُنیا میں گم ہو جانا ضعیف پسند تھا لیکن حقیقت کل ایک کل سی مزب بھی اُن کی شوخیِ طبع اور نفاست کے لئے "سنگِ راہ" سے کچھ کم نہ تھی۔

اور تو اور مولانا محمد علی جوہر مرحوم جیسے ملک کے اچھے اچھے لائق افراد بھی ایک حد تک اُسی "گل و بلبل" اور "زلف و کمر" کے فسانۂ دراز میں اپنے تخیّل دماغی کے جویا تھے۔

انھیں گرد و پیش کے واقعات اور ماحول کے یہ لازمی نتائج تھے کہ مولانائے ندوی بھی ایک غزل گو کے روپ میں مزمزمہ پرداز ہوئے۔

اور اُن کے سحر پاش قلم کی مست گردنیں غزل کے رومان آفریں دائرے سے باہر نہ نکل سکیں اگرچہ آپ کے ہاں سیماب اور جگر کی سی گہری مستی، مدہوشانہ بیخودی اور اسلوب کی رعنائی نہیں پائی جاتی مگر ایک سرور بخش شیرینی ایک شاداب روانی اور ایک مدھم شوخی ضرور نظر آتی ہے جو اپنے اندر جذب و کشش کی ایک غیر محدود دُنیا پنہاں رکھتی ہے۔

مولانا کا شاعری میں کوئی خاص مقام نہیں ہے اور نہ آپ ہی نے اس کی کبھی کوشش کی، وہ کسی خاص واقعہ سے متاثر ہوتے تھے تو شعر کہہ لیتے تھے ورنہ نہیں،

عربوں کے نزدیک شعراء کے دو گروہ ہیں ایک مکثرین دوسرے مقلّین۔

مکثرین وہ جنھوں نے شاعری کو بطور پیشہ دوامًا اختیار کر لیا۔ مقلّین وہ جو کبھی کبھی تفریحًا شعر کہہ لیا کرتے ہیں۔ محترم سید صاحب کو اسی موخر الذکر گروہ میں شمار کرنا چاہئے۔

بسیار کوششوں کے بعد صرف دو تین غزلیں اور ایک رباعی فراہم ہوئی ہے انھیں اس مختصر نوٹ کے ساتھ پیش کئے دیتا ہوں۔

فارسی تراکیب

وہ اہلِ لکھنؤ کی طرح فارسی تراکیب کے استعمال کرنے کے مخالف نہیں ہیں۔ اسی ترکیب دوستی نے اُن کے کلام میں کہیں کہیں سنجیدگی اور متانت کی وقار آمیز شان پیدا کر دی ہے۔ مثالہٗ

یہ عالمِ امکاں ہے تماشا گہِ قدرت	جو کچھ یہاں دکھلائے تجھے دستِ قضا دیکھ
بیکار ہے دشواریِ منزل کی شکایت	بے راہ روی خضرِ رہنما دیکھ
مقبول ہوئے یوسفِ زنداں میرا تحفہ	لایا ہے جو پیغامبرِ ملکِ سبا دیکھ
ہمسفر وادیِ ہستی میں وہ دلبر نہ ہوا	شمع اس راہ میں اسکا رُخِ انور نہ ہوا

نزاکتِ خیال اور نفاستِ زبان

نزاکتِ خیال اور نفاستِ زبان لکھنؤ والوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ مولانا کا دامن بحیثیت ایک لکھنوی کے ان نفیس پھولوں سے کیوں خالی ہوتا۔ چنانچہ ؎

کس سے کیجے دلِ شیدا گلۂ تنہائی	مسند آرا میرے[1] پہلو میں جو دلبر نہ ہوا
دل کو کیوں مورد احساس بنایا یا رب	حسرت اسکی ہے کہ یہ دل ہوا پتھر نہ ہوا
حیف اس تن کی قسمت جو مژہ سے ٹپکے	قطرۂ اشک ہوا بادۂ احمر نہ ہوا

[1] یہ غزل مولانا نے اپنی بیگم کے انتقال پر کہی تھی۔

"شوخیِ معانی شگفتگی اور چستیِ بندش" جو کلام میں ایک عجیب بانکپن اور ایک خاص تیور پیدا کر دیتی ہے اور جو شعر کی حقیقی روح ہے اس کی مولانا کے ہاں کمی نہیں۔ مثلاً

صبر اور توکل نہیں عشاق کا شیوہ	جو بن سکے تجھ سے تو نہ رکھ اسکو اٹھا دیکھ
تاثیرِ وفا دعوی باطل ہے سراسر	اس شوخ ستمگار پہ کچھ کر کے جفا دیکھ
نکلے گا وہ خورشیدِ جمال آج ادھر سے	اڑ جائیں مری خاک کے ذرے نہ صبا دیکھ
جس چشم فسوں ساز سے برہم ہے زمانہ	چل جائے کسی کا نہ فسوں اس پہ ذرا دیکھ

آزاد مکاں سے ہے اسے قیدِ مکاں کیا
گر آنکھ ہو بتخانہ میں بھی نور خدا دیکھ

آخر میں ہماری آرزو ہے کہ مولانا پھر ایک بار اپنے کلکِ سحر طراز کے دھارے کا رخ "غزل" نہیں "نظم" کی طرف پھیر دیں جو قدر ناشناس ہاتھوں پامال ہو رہی ہے اور جس کے الجھے ہوئے گیسو ابھی محتاجِ شانہ ہیں۔

اور ہر طرح "آگرہ اسکول" کا ساتھ دیں جو اردو شاعری کا ایک **جلیل القدر نمائندہ ہے۔**

ممکن ہے "آگرہ اسکول" کی خارا شگاف ادبی کوششیں اور آپکی توجہات "اردو نظم" کو اس قابل کر دے کہ وہ مستقبل قریب میں دوسری زبانوں کی نظمیات کے مقابل میں سربلندی کا دعویٰ کر سکے۔

آخر میں اس بے پناہ رباعی کو پیش کر کے رخصت ہوتا ہوں جو "ڈاکٹر آف دی لٹریچر" (یعنی حکیم ادب) کے انکسارِ طبع اور خلقی تواضع کی جیتی جاگتی تصویر ہے ؎

انسان وہ ہے جو سب کو انساں سمجھے	سائل ہو کوئی اسے بھی سلطاں سمجھے
احباب کے حسنِ ظن کا ممنون ہوں میں	جو "مورِ ضعیف" کو سلیماں سمجھے

سید انوار حسین سہا ویلوری

حدیثِ غم

جنونِ مستقل کی فتنہ سامانی نہیں جاتی	کوئی عالم ہو اپنی چاک دامانی نہیں جاتی
چمن میں رہ کے گل کی چاک دامانی نہیں جاتی	محبت اور تمکیں و بات یہ مانی نہیں جاتی
جنونِ عشق میں خواہش ہو کیوں صحرانوردی کی	کہ خود میرے ہی کاشانے سے ویرانی نہیں جاتی
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب دل ملنے لگتے ہیں	محبت کی نظر اس وقت پہچانی نہیں جاتی
نہ کیوں سعئی عمل اپنی مجھے وجہ مسرت ہو	تن آسانی نہیں آتی پریشانی نہیں جاتی
بیان کر کے حدیثِ غم مجھے کیا کیا ندامت ہے	وہ جب ملتے ہیں نظروں کی پشیمانی نہیں جاتی
کبھی ایسا خودی کا زعم ہو جاتا ہے انساں کو	خدا کی بھی حقیقت اس سے پھر مانی نہیں جاتی
معاذ اللہ کیا انقلاب آیا محبت میں	کہ اپنی شکل بھی اب ہم سے پہچانی نہیں جاتی
تمھیں اب کیا بتاؤں ہے کہاں سوزشِ محبت کی	کہ یہ محسوس تو ہوتی ہے پہچانی نہیں جاتی
جلا کرتی ہے شب بھر شمع تو آپ پاک پروانوں کی	کبھی بیکار پروانوں کی قربانی نہیں جاتی

تپش غم کی تو اکثر دور ہو جاتی ہے اشکوں سے
محبت میں مگر نجمہ پریشانی نہیں جاتی

(آنسہ) **نجمہ تصدق** ایم۔اے۔ بی۔ٹی

دو آتشہ

(اس زمین میں حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ کی ایک غزل "کلیم عجم" میں موجود ہے اسکے بعد ۱۳ دسمبر ۱۹۴۱ء کو ایک مشاعرہ کے لئے مولانا نے یہ تازہ غزل کہی ہے) ایڈیٹر

سورج کا ڈھونڈنا کیا تاروں کی روشنی میں
کوسوں کا فاصلہ ہے عرفان و آگہی میں

رنگِ شگفت بھی ہے دل کی فسردگی میں
عالم ہے پھول کا سا کھلی ہوئی کلی میں

مفہوم تھا خودی کا درسِ خود آگہی میں
مصروف ہے اب انساں اپنی ہی بندگی میں

ہو انقلاب ممکن جب مرگِ بے حسی میں
وہ زندگی کا دن ہے قوموں کی زندگی میں

کونین میرے آگے حاضر ہیں سر خمیدہ
کیا ہے مری نظر کے اندازِ ملتجی میں

سجدے ترے قدم پر میں کر سکے تو کیا ہے
اس سے بھی کچھ سوا ہے امکانِ بیخودی میں

اہلِ خودی کی راتیں خود بینیوں میں گذریں
ہم نیند بھر کے سوئے آغوشِ بیخودی میں

تو ہی تو ہے کسی کا اک مظہرِ مجازی
دیوانے اس کے جلوے ڈھونڈیں اپنے آپ ہی میں

میں بام طور پر تھا نازانِ ہم کلامی
جب اُن سے گفتگو کی ہمت نہ تھی کسی میں

پہلے ہی کیوں نہ کر لیں تجدید زندگی کی
اک انقلاب آخر آنا ہے زندگی میں

کہنہ قبائے ہستی، مجبورِ نیستی ہے
پیوند لگ چکے ہیں دامانِ زندگی میں

جیسے کوئی امانت کر دے کسی کو واپس
کتنی طمانیت تھی دل کی سپردگی میں

ذرّوں کے دل میں لاکھوں اسرار گفتنی ہیں
کوئی زباں لگا دو فطرت کی خامشی میں

اے زندگی پرستو اک بات سنتے جاؤ
کچھ تم سے کہہ رہا ہوں انفاسِ آخری میں

سیماب میرے نغمے، نغمے ہیں سازِ دل کے
گاتا ہوں گیت اپنے، اپنی ہی بانسری میں

(۱۳ر دسمبر ۱۹۴۱ء)

سیماب اکبرآبادی

(۲)

تکمیلِ بندگی کی دستورِ عاشقی میں
ایسا بھی اک زمانہ گزرا ہے زندگی میں

شانِ جلال دیکھی جلووں کی دلکشی میں
اک برقِ شوخ اکثر چمکی ہے سادگی میں

دل کی سرشت وحشت دل مرکزِ محبت
بربادیاں اسی سے آبادیاں اسی میں

تسلیمِ حکمِ واعظ تعمیل میں تامل
لغزش ہوئی یہ اکثر کشمکش کو بیخودی میں

مجروح ہر قدم تھا مایوس ہر نظر تھی
گزری ہے عمر اپنی صحرائے بیکسی میں

نشتر کی چھیڑ کیا تھی اک عذرِ خونفشانی
کم ظرف زخمِ دل ہیں جو رو دیئے ہنسی میں

اللہ رے چشمِ میگوں پُرکیف ہر کرشمہ
کھینچی ہے روحِ بادہ نازک سی پنکھڑی میں

بھر دامنِ نظر کو رعنائیِ چمن سے
قدرت نے ہیں کرشمے کھلتی ہوئی کلی میں

دل محوِ آستاں ہو سر نذرِ آستاں ہو
شامل ہیں ایسے سجدے آدابِ بندگی میں

ساقی کی ہر نظر کو سمجھا ہوں جامِ کوثر
اتنے حواس اب تک قائم ہیں بیخودی میں

دل ہی کا شعبدہ ہے اے دل فریبِ ہستی
لاکھوں طلسم باندھے دم بھر کی زندگی میں

دل شاہجہانپوری

آئینہ

لڑکی کا نام تھا نیلی ـــــ اس کے والد کوئی معمولی حیثیت کے آدمی نہیں تھے ـــــ وہ ایک بہت بڑے زمیندار تھے ـــــ اور کافی سے زیادہ دولتمند اور صاحبِ اثر بھی کیا مجال جو نیلی کو ذرا بھی تکلیف پہنچ جائے - امیر باپ کی امیر بیٹی تھی ـــــ مزید براں خدا نے اس کو غیر معمولی حسن کا مالک بنایا تھا ـــــ اُسے کوئی بھی کام نہ تھا سوائے روز پہننا کھیلنا، اور طرح طرح سے اپنی زیبائش کرنا ـــــ یہی اس کے محبوب مشاغل تھے جن کی لذتوں میں اس کا وقت خاموش اور تیز رفتاری سے گذر رہا تھا۔

آہستہ آہستہ اُس کا الہڑ پن ختم ہونے لگا ـــــ اور جوانی اپنی تمام تر رعنائیوں اور جاذبیتوں کے ساتھ اس کے پیکرِ فتنہ زا میں مسکراتی ہوئی بیدار ہونے لگی ـــــ نیلی اب بچی نہ رہی ـــــ

عجیب بات تھی کہ غیر محسوس طور پر ایک آرزو اُس کے دل میں پیدا ہوئی، اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی ـــــ اور یہ آرزو جس کی لذیذ چٹکیاں اُس کے نوجوان دل کو بے چین بنائے رکھتی تھیں "شادی" سے متعلق تھی۔

بھولی لڑکی دن رات اسی تصور میں محو رہتی کہ "اس کا بیاہ ہو چکا ہے ـــــ اس کے شوہر اس سے بہت محبت کرتے ہیں ـــــ وہ بہت مالدار آدمی ہیں ـــــ خوب تندرست اور شکیل ـــــ بڑے مزے سے اُن کی ازدواجی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ مسرت و انبساط اُن کے چاروں طرف رقصاں ہے"

تصورات کی رو میں بہتی ہوئی وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتی اور سوچتی "اس کے ایک بیٹا پیدا ہوا ہے ـــــ پھول کی طرح خوبصورت اور نازک ـــــ شوہر اس بچہ سے بہت محبت کرتے ہیں ـــــ بچہ آہستہ آہستہ ہنستا ہے ـــــ اوہ!"

اسی طرح وہ شب و روز عالمِ خیال میں کھوئی رہتی۔ وہ بیٹھ کر سوچتی ـــــ اور سوچتی رہتی ـــــ اب اس کا بچپن ختم ہو چکا تھا ـــــ وہ پہلی سی شوخیاں اور شرارتیں رخصت ہو چکی تھیں ـــــ ایک لے دے کے صرف تصوری دنیا باقی رہ گئی تھی جو یکسر عبارت تھی۔ ازدواجی زندگی سے!

سال کا سب سے پہلا دن تھا۔ معمول کے مطابق آج بھی نیلی آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی کپڑے پہن رہی تھی آج بھی وہ معمولاً فرضی شوہر، بچوں اور دوسرے گھریلو امور کے تصور میں محو تھی۔ کپڑے پہن کر بھی تصور سے فارغ نہ ہو سکا۔ یہ شغل یہاں تک عروج پذیر ہوا کہ اس کے ہوش و حواس اور سمجھ بوجھ بھی آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی ـــــ وہ خود کو بھی بھول گئی ـــــ اُس کی نظریں آئینہ میں جذب ہو کر رہ گئیں۔ اُس کی آنکھیں نیم باز تھیں۔ کوئی دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ بیدار ہے۔ نیلی کسی اور ہی دُنیا میں پہنچ گئی تھی، وہ اس صاف شفاف آئینہ میں اپنی تمناؤں کا نظارہ کر رہی تھی۔

نیلی کیا دیکھ رہی تھی؟ ـــــ اس نے شیشے کے اُس پار اپنی پُرخمار آنکھیں دیکھیں اس کے بعد ان آنکھوں کے اوپر کمان کی طرح بھویں دیکھیں پھر رفتہ رفتہ پورا چہرہ اس کے سامنے آگیا بعد ازاں ایک مکمل جسم ـــــ اُسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ اُسے بہت عرصہ سے جانتی ہے ـــــ وہ اس کا پیارا شوہر ہے ـــــ اوہ! وہ کتنا خوبصورت معلوم ہو رہا ہے۔

آہستہ آہستہ نیلی کا شوہر اُس کے پاس آکھڑا ہوا۔ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا ـــــ اس کی گفتگو محبت کے کتنے اثر آفریں جذبات سے لبریز ہے ـــــ اس میں حرج ہی کیا ہے ـــــ آخر نیلی سے اُس کی شادی بھی تو ہوئی ہے شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ دونوں بہت جلد بے تکلف ہو گئے۔ مسرت و انبساط کے جھونکوں میں جھولنے لگے۔ اُس نے اپنے خیال کے مطابق اپنا تن من اس کے قدموں پر نثار کر دیا۔ اُس کا شوہر بھی اُس کو دُنیا کی ہر شے سے زیادہ پیار کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ دونوں جدائی کے چند لمحات بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

جاڑے کی اندھیری رات ـــــ سڑکیں سنسان ـــــ آمد و رفت بند ـــــ چاروں طرف سناٹا ـــــ گر ہائے ـــــ نیلی کیا کرے وہ بیچاری اس غضب کی سردی میں گھر سے نکل کر سنسان اور

بھیانک راستوں کو قطع کرتی ہوئی دروازہ پر پہنچتی ہے۔ دروازہ اندر سے بند ہے نیلی دستک دیتی ہے۔ ملازم باہر آتا ہے، اُسے دیکھتے ہی —— نیلی مضطربانہ سوال کرتی ہے "ڈاکٹر صاحب ہیں؟"

نوکر نے آہستہ سے کہا "ہیں —— مگر اس وقت ملاقات نہیں ہو سکتی۔ دن بھر مریضوں کو دیکھتے رہے، ابھی ابھی لیٹے ہیں —— مجھے جگانے کی سخت ممانعت کر دی ہے

نیلی غم و اندوہ میں ڈوب کر کہتی ہے "ملاقات نہیں ہو سکتی۔ جگانے کو منع کر دیا ہے" یہ کہتی کہتی وہ مکان میں داخل ہو جاتی ہے —— مکان میں داخل ہو کر وہ ڈاکٹر کے کمرۂ استراحت کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔ کرسی سے ٹھوکر کھاتی ہے۔ سر دیوار سے ٹکراتا ہے۔ گرتے گرتے بچتی ہے۔ مگر آخر کسی نہ کسی طرح وہ گرتی پڑتی ڈاکٹر کے کمرہ میں پہنچ ہی جاتی ہے۔

کمرہ میں ڈاکٹر صاحب اپنے بستر پر لیٹے ہوئے ہیں۔ چراغ کی ہلکی سی روشنی کمرہ کی تاریکی پر اپنا تسلط جمائے ہوئے ہے۔ چند لمحات تک نیلی اُن کو ٹھٹک کر دیکھتی رہتی ہے۔ شدتِ غم و اضطراب سے اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگتے ہیں آخر جرأت کر کے ڈاکٹر کے سامنے جا پہنچتی ہے۔ کسی قدر ضبط سے کام لیتی ہوئی لرزیدہ آواز میں کہتی ہے:—

"میرے شوہر بیمار ہیں ڈاکٹر صاحب"

آواز سُن کر اُنھوں نے آہستہ سے نیلی کی طرف کروٹ بدلی،

چند منٹ کے بعد آنکھیں نیم باز کیں —— نیلی پر ایک نظر ڈالی۔ اُس نے پھر کہا،

"میرے شوہر سخت علیل ہیں ڈاکٹر صاحب! جلدی کیجئے"

ڈاکٹر صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا، نفرت انگیز اور بھونڈے طریق پر منھ بنا کر ایک عجیب طرح کی آواز سے کراہے —— "آہ!" —— اُٹھئے ڈاکٹر صاحب! ابھی اُٹھئے۔ چلئے، میں آپ کے پاؤں پکڑتی ہوں —— جلدی کیجئے

تاخیر میں بڑا نقصان ہے ڈاکٹر صاحب!"

بے چاری نیلی کس قدر تھکی ہوئی ہے اُس کے چہرہ پر اُداسی برس رہی ہے وہ اشکباری کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو اپنے شوہر کی علالت کی مفصل کیفیت سنا رہی ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب ہیں کہ سُنتے ہی نہیں۔ اس کے قلب میں کربِ اضطراب کا ایک طوفان بپا ہے۔ دل بیٹھا جا رہا ہے۔ کوئی سنگدل سے سنگدل انسان بھی نیلی کی بےچینیوں کو دیکھ کر اپنے دل میں ہمدردانہ جذبات کی آفرینش کو نہیں روک سکتا۔ اگر پتھر کو مخاطب کیا جاتا تو وہ بھی پگھل اُٹھتے —— مگر ڈاکٹر صاحب پر کوئی اثر نہیں ہوتا پلک جھپکا کر نیلی پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہیں، پھر ایک سکون آمیز اور طویل سانس لیتے ہوئے کہتے ہیں:—

"اچھا، کل آنا —— کل!"

—— نیلی روتے ہوئے کہتی ہے:—

"نہیں ڈاکٹر صاحب! رحم کیجئے، للہ رحم۔ ابھی چلئے، انھیں سرسام ہو گیا ہے —— اتنی بیدردی نہ کیجئے ڈاکٹر صاحب!"

ڈاکٹر انتہائی اطمینان کے ساتھ جواب دیتا ہے:—

"میں ابھی ابھی آکر لیٹا ہوں، صبح سے اب تک مریضوں کا تانتا بندھا رہا۔ خود میری حالت بھی اچھی نہیں ہے۔ میں اس وقت کہیں بھی جانے کے قابل نہیں ہوں"

اس کے بعد اُنھوں نے "مقیاس الحرارت" لگا کر نیلی کو دکھایا کہ انھیں بھی ۱۰۲ ڈگری کا بخار چڑھا ہوا ہے۔

اور پھر چارپائی پر دراز ہو گئے اور آنکھیں بند کر کے کہہ دیا

"اس وقت مجھے معاف کرو، تھوڑی دیر سو لینے دو"

"ہائے اب وہ کیا کرے؟" چاروں طرف نا امیدی اور مایوسی —— وہ ڈاکٹر کے پاؤں پکڑ کر کہنے لگی:— "ڈاکٹر صاحب! رحم کیجئے، للہ رحم، میری زندگی ختم ہو جائیگی۔ میں آپ کو پوری پوری فیس ادا کرونگی"

ڈاکٹر نے آنکھیں بند کئے ہوئے ہی جواب دیا:—

"مجھے پریشان مت کرو۔ میں اس وقت کسی طرح بھی نہیں جا سکتا"

اب بے چاری نیلی کے آنسوؤں کا سیلاب نہیں رُک سکا۔ سسک سسک کر رونے لگی۔ ہائے وہ اپنا دُکھ، درد ڈاکٹر کو کس طرح محسوس کرائے۔ انھیں کس طرح راضی کرے۔ اب اُس کی طاقتِ گویائی جواب دے چکی ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا علاج کرے۔

یکایک ڈاکٹر نے کہا:—

"تم سرکاری ڈاکٹر کے یہاں جاؤ، وہ تمہارے ہمراہ چلا جائیگا"

نیلی نے جواب دیا:—

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ سرکاری ڈاکٹر کا مکان یہاں سے بیس میل کے فاصلہ پر ہے
رات میں کوئی سواری بھی نہیں جا سکتی —— یہ نہیں ہوگا ڈاکٹر صاحب!
ہی چلئے —— کیا آپ کو میرے اوپر رحم نہیں آتا، ڈاکٹر صاحب!"
"کیا کروں، مجبور ہوں، میں خود بھی بیمار ہو رہا ہوں۔ ایسی خستہ حالت میں
بھلا کسی کو دیکھنے کیسے جاؤں تمہاری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ جاؤ مجھے آرام کرنے دو"
"آپ کو چلنا ہی پڑے گا۔ دنیا دوسروں کے مفاد کے لئے اپنی جان تک
دینے سے دریغ نہیں کرتی اور آپ میرے شوہر کو چل کر دیکھنا قطعاً پسند نہیں
تے میں آپ پر —— آپ پر عدالت میں دعویٰ ...... !"
"اوہ اس میں کیا!" —— ڈاکٹر پہلو بدل کر سو گیا۔ نیلی کا دل قطعی طور پر
مایوس ہوگیا۔ اس نے ڈاکٹر کے قدموں پر سر رکھدیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
تب ڈاکٹر صاحب کھانستے ہوئے اٹھ بیٹھے اور آنکھیں بند کئے ہوئے
ہی کہا:- "اچھا، میرا کوٹ تو لاؤ!"
نیلی نے کوٹ اتار کر خود انہیں پہنایا اور کہنے لگی:-
"ڈاکٹر صاحب! میں آپ کو تین گنی زیادہ فیس دونگی۔ تشریف لے چلئے
آپ کے اس احسان کو تاحیات فراموش نہیں کرسکتی، چلئے!"
لیکن کیا ہوا! ڈاکٹر صاحب خلاف توقع کوٹ پہن کر پھر چارپائی
پر ڈھیر ہوگئے۔
نیلی نوکر کو بلا کر لائی، دونوں نے بمشکل ڈاکٹر کو اٹھایا اور گاڑی میں
بٹھا دیا۔
سرد اور لرزہ خیز ہوا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔ سڑک برف سے لبریز تھی
بند ہو رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گاڑیبان کو اتر کر راستہ
صاف کرنا پڑتا تھا —— اسی طرح تیس میل کی مسافت طے کرنی تھی۔
گھوڑے تھک کر چور ہوگئے۔ ان کی رفتار سست پڑگئی۔ نیلی نے
کہا:- "تیزی سے ہانکو!"
گھر پہنچتے پہنچتے، صبح ہوگئی۔ نیلی نے ڈاکٹر صاحب کو باہر کے کمرہ میں ایک
کرسی پر بٹھا دیا اور خود اندر چلی گئی۔
ڈاکٹر صاحب آرام کرسی پر بیٹھے اور بیٹھتے ہی انہیں نیند آگئی۔

نیلی نے اندر سے واپس آکر پکارا:-
"ڈاکٹر صاحب!"
ڈاکٹر نے عالمِ غنودگی میں جواب دیا:-
"یہ سب فضول ہے!"
نیلی گھبرائی:-
"کیا بک رہے ہیں آپ ڈاکٹر صاحب!"
ڈاکٹر نے کہا:- "ہاں ٹھیک ہے اس روز میٹنگ میں کہا تھا
بلاسو نے کہا تھا:"
"ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب!! یہ آپ کیا بک رہے ہیں آخر؟"
"خداوندا!"
نیلی کا شوہر صحت یاب ہوگیا لیکن اس پر قرض کا ایک بارِ عظیم ہوگیا تھا
تمام زمین و جائداد رہن رکھی جا چکی تھی۔ سود بھی ادا نہ ہوسکا تھا۔
بیچارے میاں بیوی دن رات اسی فکر میں رہتے کیا کریں؟ اب ان کے
اولاد بھی ہوگئی تھی —— کئی بچے تھے، ان سب کو کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا۔
کبھی کھانسی —— کبھی بخار —— اور کبھی کسی کو دست آنے لگتے ہیں۔
اتفاقاً ایک بچہ کا انتقال ہوگیا۔ بیچاری نیلی پر کس قدر شدید آفت آپڑی
اس کا شوہر ہمیشہ متفکر رہنے لگا۔
شہر میں طاعون کی وبا پھیلی۔ بیچاری نیلی ہر وقت خوف زدہ رہتی —
وہ شب و روز اپنے شوہر کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی اور انہیں گھر سے باہر نہ
نکلنے دیتی لیکن تمام تدابیر بے سود ثابت ہوئیں۔
افسوس طاعون نے اس کا سب کچھ لوٹ لیا —— اس کا محبوب شوہر
بھی اس وبا کی نذر ہوگیا ——
نیلی اس کی نعش کے نزدیک بیٹھی ہوئی ہے اور ٹکٹکی باندھ کر اس کی
طرف دیکھ رہی ہے۔

—— آئینہ روبرو ہے ——

امتیاز نسیمی رکن کاسموپالیٹن لٹریری سوسائٹی دہلی

سرمایہ

خلش نے ہنس کے لی چٹکی اک ایسی قلبِ انساں میں
تہلکہ پڑ گیا ہر فضائے بزمِ امکاں میں

ہوائیں تھر تھرا کر رہ گئیں ماحولِ جنت کی
فضائیں کپکپا اٹھیں گلستانِ محبت کی

اُمیدیں مسکرائیں آرزوؤں کو ہنسی آئی
ضرورت مخزنِ فطرت کا سرمایہ اٹھا لائی

ڈھلے روشن ستاروں کے فلک پر سکّے سیمیں
شعاعوں نے بنایا ان کے اپنا مرکزِ زریں

سنہری دھوپ کا سہرا جو سورج باندھ کر آیا
تو چاندی چاندنی کی مسکرا کر چاند بھی لایا

گہر شبنم نے چُن چُن کر رکھے نرگس میں سوسن میں
زرِ گل دور کر لائیں بہاریں گل کے دامن میں

منوّر کہکشاں نے ہار اپنا تحفتاً بھیجا
بڑھیں کوثر کی موجیں لیکر آئینہ محبت کا

کھٹک ہوتی رہی دل میں مگر دولت بڑھانے کی
کوئی غایت نہ سمجھا حسرتوں کے مسکرانے کی

فضائے چرخ سے پھینکا گیا پھر آدمیں تارہ
نکل کر خلد سے انساں ہوا دنیا میں آوارہ

سکوں چھوڑا نہ جانے کیا دل بے تاب میں آیا
ارم سے کوچ کر کے عالمِ اسباب میں آیا

تمنائیں تڑپ اٹھیں دل کے دبے ارماں ابھر آئے
ضرورت نے بقدرِ ذوق اپنے پاؤں پھیلائے

اگرچہ مجرمِ فطرت تھا فطرت ساتھ تھی لیکن
لٹا بیٹھا تھا سارا مال قسمت ساتھ تھی لیکن

اُمیدیں جب تڑپتی تھیں تمنا جب مچلتی تھی
فلک سے سیم برستا تھا زمیں سونا اگلتی تھی

اُدھر فطرت منظم کر رہی تھی نظمِ پیہم کو
اِدھر حرص و ہوا گھیرے ہوئے تھی نسلِ آدم کو

دفینے جو زمیں میں دفن تھے سارے ابھر آئے
سمندر کی جو تہ میں تھے وہ موتی سطح پر آئے

خزف ریزے چمک اٹھے گہر بادل کی صورت میں
جہاں کے سنگریزے ہنس دیئے تاروں کی صورت میں

زمیں کا ذرہ ذرہ بن گئے چمکا لعل اور گوہر
سر کہسار سے یاقوت بن کر آ گئے پتھر

زمیں نے پیش کر دیں اپنی ساری دھات کی کانیں
ارم سے آنے والے کو ملیں نعمات کی کانیں

کہیں تانبا کہیں پیتل کہیں لوہا کہیں پارہ
کہیں چاندی کی زیبائش کہیں سونے کا نظارہ

پہاڑوں کے دلوں کو چیر کر دریا نکل آئے
زمینوں کی تہوں سے تیل کے چشمے ابل آئے

بکثرت دیکھ کر چاروں طرف دنیا میں سرمایہ
حریصِ زندگی کے منہ میں پانی اور بھر آیا

اصولِ زندگی بھے نظامِ زندگی بدلا
غلامِ زندگی نے اہتمامِ زندگی بدلا

بدل کر ہیئتِ اشیا خصوصیت مٹا ڈالی
جہاں تک ہو سکا ہر چیز کی نقدی بنا ڈالی

اِدھر لالچ بڑھا لیکر سہارے عیش و عشرت کے
اُدھر اٹھنے لگے شعلے جہاں میں بربریت کے

اِدھر بننے لگے اپنے خیالی عیش کے خاکے
اُدھر بھنبھوڑ ڈالی دل کے ڈالی عیش پر ڈاکے

ازل کا لالچی آئینِ فطرت کو بھلا بیٹھا
جسے جو کچھ ملا جتنا ملا قبضہ جما بیٹھا

وہ سرمایہ جو تھا فطرت کے رنگیں جلوہ خانوں میں
کیا جانے لگا اب بند بنکوں میں خزانوں میں

وہ سرمایہ جو بٹتا تھا رفاہِ عام کی خاطر
دیا جانے لگا قرضہ میں اپنے نام کی خاطر

وہ سرمایہ سکون و امن تھی جس کی پناہوں میں
لگا رہنے لٹیروں اور ڈکیتوں کی نگاہوں میں

وہ سرمایہ محافظ تھا جو تہذیب و تمدن کا
اسی بربریت نے نظامِ زیست کو پلٹا

وہ سرمایہ جو لٹتا تھا ہر سو رہگزاروں میں
وہ بٹ کر رہ گیا گنتی کے کچھ سرمایہ داروں میں

وہ سرمایہ سبب تھا جو خدا کے یاد آنے کا
سبب اسکو بنا ڈالا خدا کے بھول جانے کا

پھنسی دامِ ہوا میں رشتۂ حق توڑ کر دنیا
جھکی قدموں میں زر کے حق پرستی چھوڑ کر دنیا

یہ سرمایہ جو پھیلا ہے کمالِ سرفروشی بن کر
حکومت کر رہا ہے ناخدائے زندگی بن کر

اسی "فرعون" نے دنیا کی حالت کو بدل ڈالا
لہو چوسا کسانوں کا غریبوں کو کچل ڈالا

اسی "مغرور" نے مجبورِ عالم کو بنایا ہے
اُمیدیں روند ڈالیں آرزوؤں کو مٹایا ہے

یہی وہ "زہر" ہے جو چڑھ رہا ہے سرخوشی بن کر
یہی وہ "خون" ہے بگڑا ہے جو رنگِ خودی بن کر

یہی وہ "شیر" ہے جو دوڑتا ہے پھاڑ کھانے کو
یہی وہ "سانپ" ہے جو ڈس رہا ہے کل زمانے کو

یہی وہ "آگ" ہے جو پھونکتی ہے اہلِ عالم کو
یہی وہ "تیغ" ہے جو کاٹتی ہے نسلِ آدم کو

اکڑتا ہے دماغ اس کا تمہارے اسکے کس بل پر
ستم کی بجلیاں گرتی ہیں اسکی آڑ لے لے کر

اسی کے دم سے اٹھتے ہیں تلاطم کبر و نخوت کے
اسی کے سارے نقارے بجے ہیں بربریت کے

اسی کے روپ میں شیطان اکڑ کر مسکراتا ہے
اسی بڑی میں عفریت ہوس آنکھیں دکھاتا ہے

اساسیں اس سے ہل جاتی ہیں اکثر نظمِ فطرت کی
اسی سے لوٹ لی جاتی ہے عصمت اہلِ عصمت کی

یہ انسان کاش سرمایہ کی غایت کو سمجھ جاتا
جہاں کی کشمکش سے نظمِ فطرت کو سمجھ جاتا

ہوس پرور امنگیں یہ اگر اپنی مٹا دیتا
تو سرمایہ خدائی کیا خدا سے بھی ملا دیتا

[illegible]

شعراء کا آخری کلام

ہنگامہ خیز اور کیف انگیز لمحات زندگی کے بعد ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جبکہ کائنات اور اس کی ہر چیز انسان کو تاریک اور بھیانک معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس موت کا خوف انسان سے وہ سب کچھ کہلواتا ہے جس کو کہنے کی زندگی میں کبھی اُسے فرصت نہیں ملتی، یا خود بخود زبان سے چند کلمات نکل جاتے ہیں جو اُس کی طبیعت کے آئینہ دار ہوتے ہیں انسانوں کے اس گروہ میں مختلف خیال و طبائع کے لوگ شامل ہیں جن میں شاعر بھی شریک ہے، زندگی کی ان گھڑیوں میں شعرا کی زبان پر جو شعر تھے یا اُس وقت بے ساختہ نکل گئے اُن کا ذکر خالی از دلچسپی نہیں چنانچہ چند نامور شعرا کے آخری اشعار ذرا جستجو سے میں نے ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں۔

خواجہ وزیر لکھنوی شاگرد ناسخ مرحوم نے عین حالتِ نزع میں مرنے سے ایک گھنٹہ پہلے یہ شعر کہا تھا ؎

بیمارِ محبت نے ابھی یاد کیا تھا
خوب آگئی اے موت تری عمر بڑی ہو

ملا فیضی جو دربارِ اکبری کا شاعر تھا حالتِ بیماری میں یہ شعر اُس کی وردِ زبان تھا ؎

گر ہمہ عالم بہم آید بہ جنگ
نہ شود پائے یکے مورِ لنگ

سدانند جوگی بہاری لال رمز حیدرآباد دکن کے ایک صوفی شاعر گذرے ہیں۔ حضرت نیفض رح سے ان کو خاص عقیدت تھی۔ عرسِ نیفض رح کی تقریب میں ایک مشاعرے میں شریک تھے وہ اپنی غزل کا یہ شعر پڑھ رہے تھے کہ یکایک گر پڑے اور واصلِ حق ہوئے ؎

چو دل شد مستقل، کُن ہر چہ خواہی
کنوں گویم چہ رمز این کن کہ آں کُن

خاقانی ہند استاد ذوق مرحوم نے مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی نے مرنے سے دو تین گھنٹے قبل یہ شعر کہا تھا ؎

پہنچی نہ راحت ہم سے کسی کو ایسے اذیت کوش ہوئے
جان پڑی تب بارِ شکم تھے مرے وبالِ دوش ہوئے

میر ببر علی انیس نے مرنے سے چند گھنٹے پہلے مرزا دبیر نے جب حال دریافت کیا تو یہ شعر پڑھا ؎

آخر ہے عمر زیست سے دل سیر ہے
پیمانہ بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے

حضرت صوفی سرمد شاہ رح نے اپنے قتل کے وقت یہ شعر پڑھا ؎

سر جدا کرد از تنم شوخے کہ با ما یار بود
قصہ کوتہ گشت ورنہ دردِ سر بسیار بود

انشاء اللہ خاں انشا کی علالت کی خبر سُن کر مصحفی جب عیادت کو گئے تو دیکھا کہ انشاء عالمِ نزع میں ہیں۔ مصحفی کی زبان سے بے ساختہ یہ مصرعہ نکلا ع

”ترے بیمار کو ہے عزمِ سفر آج کی رات“

یہ سُن کر انشاء نے آنکھیں کھول دیں اور بے اختیار یہ مصرعہ کہا:—

”نبض چل بسنے کی دیتی ہے خبر آج کی رات“

اس کے بعد جاں بحق تسلیم ہوئے۔

واجد علی شاہ اختر کا جب آخری وقت تھا، نزع کی تکلیف سے کراہتے تھے، حاضرین نے کہا کہ آپ کراہیں نہیں۔ یہ سُن کر آپ نے بے ساختہ یہ شعر کہا ؎

آہ کرتے ہیں تو سب لوگ خفا ہوتے ہیں
اے نسیمِ سحری ہم تو ہوا ہوتے ہیں

یہ کہنے کے بعد آپ کی روح پرواز کر گئی۔

میر نفیس لکھنوی خلف میر انیس لکھنوی نے مرنے سے چار مہینے قبل ایک مرثیہ لکھا جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

دُعائے خیر سے روحِ حزیں کو شاد کریں
ہمارے بعد بھی احباب ہم کو یاد کریں

پھر آپ کو نیا مرثیہ لکھنا نصیب نہ ہوا۔

غالب مرحوم نے انتقال سے چند روز پہلے یہ شعر کہا تھا اور اکثر یہی پڑھتے تھے ؎

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی نے مرتے وقت یہ کہا جبکہ ایک دوست نے انھیں شراب کی بجائے پانی کا گلاس دیا تھا۔

بجائے مے دیا پانی کا اک گلاس مجھے
سمجھ لیا مرے ساقی نے بدحواس مجھے

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے وفات سے چند لمحے پہلے یہ رباعی کہی ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ نہ آید — نسیمے از حجاز آید کہ نہ آید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ نہ آید

انتقال سے قبل اُنھوں نے یہ شعر بھی پڑھا تھا ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست

شوکت علی خاں فانی مرحوم نے مرنے سے چند دن پہلے یہ شعر کہا تھا جو اُن کا آخری شعر ہے ؎

جب دیکھئے جی رہا ہے فانی
اللہ رے اُسکی سخت جانی

مرزا عالمپوری

آنکھ تر نہ ہوئی!

کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی — نہ ہوئی شامِ غم سحر نہ ہوئی
زندگی چین سے بسر نہ ہوئی — غم کی روداد مختصر نہ ہوئی
اُسکی ناکامیاں ہیں قابلِ دید — دید ہی جس کو عمر بھر نہ ہوئی
اللہ اللہ کسی کا رعبِ جمال — بات کرنی تھی کچھ مگر نہ ہوئی
میرے دل کے سیاہ خانے میں — کبھی اُمیدِ جلوہ گر نہ ہوئی
دل تو روتا رہا محبت میں — وضعداری سے آنکھ تر نہ ہوئی
اُن کے جلووں میں رہ گئی کھوکر — نگہِ شوق کارگر نہ ہوئی
جو ہوئی تھی شروعِ اُلفت میں — پھر وہ امید عمر بھر نہ ہوئی

سب پہ تیری ہوئی نگاہِ کرم
مگر اک صرف مہر پہ نہ ہوئی

وزیرزادہ شجاعت خاں مہر جوناگڈھی

کاروانِ نمود

(جہیز دیکھکر)

مضمحل ہو کر سمٹتا جا رہا ہے آفتاب
نیند سے بوجھل ہوئی ہو جیسے کافر کی چشمِ خواب

سو چلی ہے رفتہ رفتہ شورشِ دُنیائے دوں
بھٹ ٹیا برسا رہا ہے اپنی جادو کا سکوں

جلوہ گر ہیں کچھ جزیرے سے متاع و مال کے
نفس نے پھندے بچھائے ہیں سنہرے جال کے

اک سہری پر سجا ہے کبر کا باطل وقار
ہنس رہی ہے زینتِ ہستی کی مصنوعی بہار

صف بصف رنگیں حُلے ریشمین و زرنگار
جیسے رومانی فضاؤں میں ہو پریوں کی قطار

سرد سائے، گرم شالیں کہکشاں گوں ریاں
جن میں ہیں سلمے ستارے کی خنک چنگاریاں

نازنیں مقیش، دامن میں سنہری جھالریں
جھلملیں تکی ہوں جیسے حلقۂ قندیل میں

نرم گدے گدگُدے قالین خوابِ آبگینہ لحاف
میز کرسی، کوچ، صوفے، نرنشیں پردے غلاف

جن میں تصویریں مناظر کی ہیں دلکش ہر یاں
بعض میں دو اِک صحرا بعض میں مرغابیاں

قدِ آدم آئینہ اک بھاری بھر کم پاندان
پیکدان، حقہ، سلفچی، عطر دان و مرتبان

مخمل و کمخواب و زربفت اور اطلس کے تھان
کر رہا ہے تبصرہ ان پر ہر اک بوڑھا جوان

کانچ اور چینی کے ساغر سونے چاندی کے گلاس
تشنگی بجھ جائے ایسا رنگ کا ہے انعکاس

فرش پر آراستہ ہیں شوخ و رخشندہ ظروف
چرخ کے صفحے پہ جیسے چاند تاروں کے حروف

بزمِ معراجِ غنا کے جگمگاتے شمعدات
خوشۂ پرویں کی صورت اک لگن میں بورات

خوبصورت جانماز اِک صندلی سی رحل بھی رکھی ہوئی
اک طرف ہے خوشنما جزدان میں قرآن بھی
ہے بلائے بیت وہ بھی بانتی رکھی ہوئی
تاکہ لوگوں کو یقیں ہو ہیں یہ با ایمان بھی

بہر آرائش حسیں گلدان اور فانوس بھی
رسم کے گندے صنم خانے میں ہیں ناقوس بھی

استری بجلی کے پنکھے، پاؤں کی سنگر مشین
پھول سے رومال مخملی چیسٹر، برقع حسین

سینٹ پاؤڈر، ڈیسلن، عینک گھڑی موزے بناف
اک دوکان کھولی گئی ہے حکمِ قدرت کے خلاف

اس اثاثہ کے سوا ہیں ساز و آلاتِ طرب
مرثیہ مذہب کا ہے تفریح ہی جنکا لقب

دائلن طبلے کی جوڑی بھی گراموفون بھی
رسم کی چوکھٹ پہ غیرت و آبرو کا خون بھی

میں یہ منظر دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا
میری حیرت کا پسینہ اشک بنکر بہ گیا

یہ جہیز انبارِ حرص و آز کی تصویر ہے
جس کا ہر نقشِ جلی اسراف کی تفسیر ہے

خواب کے وہمی مناظر کا طلسمی سلسلہ
یا مسلسل حسرتوں کا ایک جھوٹا قہقہہ

شوق کی گرمی سے بیہودہ رواجوں کا ابال
یا کفِ افسوس پر آسودہ حالی کا اکال

ایک ناجائز نمائش شفقت و احسان کی ہے
برملا توہین گویا دفتِ انسان کی ہے

دیکھکر خوش ہو رہا ہے اک رنگیلا آدمی
جسکی آنکھوں میں ہے افسردہ و ستارۂ زندگی

اس کے چہرے سے عیاں ہے غیر آسودہ فراغ
بتکدے میں مشتعل ہو جیسے بے روغن چراغ

قلب تیرہ، ذہن ناقص، جہل پژمردہ دماغ
سر میں شہرت کا جنوں ہے، قرض کا سینے میں داغ

وائے دولت کا جنازہ مفلسی کے دوش پر
کیوں نہیں گرتی ہے بجلی ان کے عقل و ہوش پر

اللہ اللہ یہ سجاوٹ، یہ غرورِ رائیگاں!
منزلِ فانی میں ان کا یہ مزیّن کارواں

ضو فشاں ہے سیکڑوں سوغات کا انبار دیکھ
عرصۂ ہستی میں آب و رنگ کا بازار دیکھ

کس طرح دیتی ہے نخوت دعوتِ ادبار دیکھ
آنے والی پستیوں کے دور سے آثار دیکھ

اس بہارستاں میں بوئے خزاں پاتا ہوں میں
بطنِ مستقبل میں آسیب گراں پاتا ہوں میں

خطرۂ افلاس پوشیدہ یہاں پاتا ہوں میں
روحِ انساں کو شکارِ صد زیاں پاتا ہوں میں

دوسروں کو جو دیا کرتے تھے درسِ سادگی
خود انہیں گھیرے ہوئے ہیں ظلمتیں اسراف کی

(ابو الاسرار رمزی اٹاوی)

اوراقِ پریشاں

زندگی کی تلخ کامیوں سے آشنا کرنے والی کے نام

" نوجوان ادیب شاعر نے ایک لڑکی دیکھی۔ جو اُس کے اپنے تخیل سے بھی زیادہ حسین تھی۔ گھٹاؤں کی طرح پریشان بال۔ تھرتی آنکھوں میں آنسو۔ جیسے گلاب کی ناز ک پنکھڑی پر شبنم کے قطرے۔ یاقوتی ہونٹوں پر غم انگیز مسکراہٹ۔ صانعِ ازل کے موقلم کے اس حسین شاہکار کو سماج نے ایک معمولی سی لغزش کی پاداش میں ہمیشہ کے لئے ٹھکرا دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ایک ستارہ آسمان کی بلندیوں سے ٹوٹ کر زمین پر آگرا ہو۔

پھول کی جگہ گلزار میں ہے خار زار میں نہیں، لیکن وہ ایک نازک پھول ہوتے ہوئے بھی خار زار میں تھی۔ کیوں؟ شاید اس کا جواب سماج کے ٹھیکیدار ہی دے سکیں۔

شاعر نے اُسے دیکھا اور اُس کی بے بسی پر اُس کا دل تڑپ اُٹھا۔ لڑکی کی نگاہوں نے شاعر کی معصوم نگاہوں میں اُس کے دل کا حال پڑھ لیا۔ اُس کی نظروں نے شاعر سے اپنی محبت کی قیمت مانگی۔ شاعر نے نذرانہ دل پیش کر دیا جس سے پاک محبت کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ لڑکی کو شاید یہ تحفہ پسند نہ آیا۔ کیونکہ اُسے بے لوث محبت سے زیادہ ہوس آمیز "محبت" کی ضرورت تھی۔ شاعر کی خودداری کو ٹھیس لگی۔ لڑکی کے ہونٹوں پر ایک شرارت انگیز مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

جب شاعر کو ہوش آیا تو اُس کا ٹوٹا ہوا تارہ کہیں دُور، بہت دُور افق کی گہرائیوں میں غائب ہو چکا تھا۔ شاید اُس نے ایک خواب دیکھا جو کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا اور بس!

شاعر کے پاس اُس کی صرف ایک یادگار رہ گئی تھی اور وہ اُس کی کتابِ حیات کے چند بکھرے ہوئے اوراق تھے شاعر نے اُنھیں پھر سے جوڑنا شروع کیا۔ اب اُس کے نغمں میں پہلے سے زیادہ سوز اور افسانوں میں پہلے سے زیادہ درد تھا۔ وہ اپنی ناکام محبت کے افسانے لکھ لکھ کر زمانے میں رسوا ہونے لگا۔ اس "حسین رسوائی" کے لئے اُسے کس کا رہینِ منت ہونا چاہیے؟"

جاوید

(حیدرآباد دکن)

یکم مارچ

ہزاروں نواب روزانہ درگاہِ حُسن پر نذرانہ دل چڑھانے آتے ہیں۔ میرے لئے سب یکساں ہیں، کسی کو کرنہار میں سرخاب کا پَر تو لگا ہوتا نہیں کہ میں سراپا انتظار بن کر بیٹھ رہوں۔ جب کبھی فرصت ہوتی ہے یا میرے دل میں آتی ہے مل لیا کرتی ہوں۔

آج بھی مجھے فرصت نہیں۔ ابھی ابھی نواب امجد حسین کے ہاں دعوت میں شرکت کے لئے کپڑے پہن کر تیار ہو رہی تھی کہ حفاظت علی (برعکس نہند نامِ زنگی کافور) بلائے ناگہانی کی طرح میرے کمرے میں آیا۔

"آج محل بھر کسی کو یاد ہے پیالی کی دعوت دینے کیلئے تیار ہو۔ یا ہیرو زہرہ بائی؟" اُس نے مجھے باہر جانے کے لئے تیار دیکھتے ہوئے کہا، جب اُس نے یہ سنا کہ میں دعوت میں شامل ہونے جا رہی ہوں تو ہنس کر کہنے لگا "رہنے دو یہ بچپنے کے مشغلے۔ ایسی دعوتیں قبول کرنا بھی کہاں کی دانائی ہے۔ کہ جانے کے لئے موٹر کا پیٹرول بھی گرہ سے خریدنا پڑے۔ چھوڑ دو بھی اس خیال کو۔"

میں نے کہا "حفاظت علی سرکار کی ناراضی کا بھی تو خیال رکھنا پڑتا ہے۔" ہنس کر کہنے لگا "واہ یہ بھی ایک ہی کہی تم نے۔ بائی! تمھیں خوش ہونا چاہیے کہ ایک اور نئے نواب صاحب کو تمہاری خوبصورتی اور خوش گلوئی نے اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ وہ مدت سے

مشتاقِ دید تھے۔ آج انھیں فرصت نصیب ہوئی ہے اس لئے وہ گھڑی بھر کے لئے تم سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ آج تم کہیں آنے جانے کا خیال ترک کردو۔ آخر دُنیا میں ہر شخص اپنے ہی بھلے کی سوچا کرتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ لوگ اپنے فائدہ کے لئے انسانی لاشوں پر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے سے نہیں چوکتے۔ پھر کیا تمہارے لئے یہ اچھا نہیں ہے کہ آج بجائے اس کے کہ تم اپنا وقت فضول ہاؤ ہُو میں ضائع کرو۔ چند لمحوں کے لئے نواب صاحب کی ہم نشینی کے مزے بھی لوٹو اور مُفت کی دولت پر بھی ہاتھ صاف کرو۔ کیوں کیسی کہی — زہرہ بائی!" اُس نے ویسے ہی ہنستے ہوئے کہا "ہنگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے"!

میں ہنس کر خاموش ہو رہی۔ مرد بھی کتنے نادان ہیں عورت کی فطرت کو سمجھنے سے قاصر۔ آہ! نہ معلوم عورت کو خدا نے راز کیوں بنایا۔ کیا یہ راز اسی قابل ہے کہ کبھی افشا نہ ہو۔ ہاں! اسی میں مصلحت ہے۔ راز کی طرف دل اسی وقت کھنچتا ہے جب تک وہ راز ہے۔ بھید کھُل جانے پر اپنی قیمت کھو بیٹھتا ہے۔ موتی کی قیمت اُس وقت ہوتی ہے جب تک وہ سمندر کی آغوش میں کسی صدف کی گود میں مچلتا رہے۔ جونہی کسی بے رحم کے ہاتھوں بازار میں آیا۔ اپنی آب کھو بیٹھا۔ آج اس کے آغوش کی زینت ہے تو کل اُس کے کان کا آویزہ۔ چند سنہری روپہلی ٹھیکریوں کے عوض خریدا جا سکنے والا ایک حقیر ٹکڑا۔

حفاظت علی کو کیا معلوم۔ کہ جو عورت شب روز نوابوں اور رئیسوں کے عیش پرست ہاتھوں میں خوبصورت پتلی کی طرح ناچنے پر مجبور کی گئی ہے، اور جس کا جذبۂ انتقام اُسے اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ بھی بھولے بھالے نوجوان رئیس زادوں کی حسین زندگی کا حسین کنول اپنے نازک ہاتھوں سے مسل دیا کرے۔ اسے کسی "خاص" نواب زادے سے کوئی سروکار نہیں۔ اُسے کسی کی کیا پروا۔ اس کو تو ہر وقت تلخ زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے بہانہ چاہئے۔

میں نے اُس کی باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی۔ میں کسی طرح بھی دعوت میں شرکت کا ارادہ نہیں بدل سکتی تھی لیکن حفاظت علی بھی اپنی بات پر اُسی طرح متانت و سنجیدگی سے اصرار کرتا رہا۔ جب میں نے کوئی چارۂ کار نہ دیکھا، تو اقرار کر لیا کہ دعوت پر جاتے ہوئے "باغِ عام" میں پانچ دس منٹ کے لئے موٹر ٹھہرا کر اُن سے مل لونگی حفاظت علی نے بھی یہ تجویز پسند کی اور چلا گیا۔

میں "باغِ عام" کے قریب غیر ارادی طور پر موٹر رکوا کر اُتر پڑی۔ "نواب صاحب" موجود تھے۔ بیس۲ برس کا نوجوان، بھولی بھالی صورت اور حُسنِ مردانہ کا مجسم نمونہ کتنا پیارا نام تھا۔ نواب احمد سلیم اقبال...... ہاں اقبال!...... نواب تسلیم حسین رئیسِ اعظم حیدرآباد کے فرزندِ صغیر۔ اُف اتنی بڑی ہستی اور اُس کے فرزند کا یہ حال۔ لیکن اسی کا نام دُنیا ہے۔

ہم کافی عرصہ تک ایک دوسرے کو محض دیکھا کئے۔ آج میرے دل میں پہلی بار سچی محبت چٹکیاں لینے لگی۔ دل چاہتا تھا کہ یونہی بیٹھے بیٹھے ہمیشہ اس پیاری صورت کو تکتی رہوں اور اسی طرح دیکھتے دیکھتے یہ آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں۔

آہ! جنسِ لطیف ایک بار پھر محبت کے رنگین جال میں گرفتار ہو گئی۔ شاید عورت کو تباہ کرنے کے لئے محبت کا وجود تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ زہر امرت کے روپ میں تیار ہوا ہے۔ میں جان بوجھ کر یہ امرت رس پی رہی تھی اور پینا چاہتی تھی۔ کاش دُنیا میں عورت اور محبت دونوں کا وجود بیک وقت یکجا نہ ہوا ہوتا۔ کیا ایک کے بغیر دوسرے کی ہستی قائم نہیں رہ سکتی؟ رہ سکتی ہے اور ضرور رہ سکتی ہے... پھر اس ستم ظریفی کے کیا معنی؟

میرے دماغ میں اس قسم کے خیالات چکر لگا رہے تھے۔ کہ اُس کے دوست نے جو اس وقت اس کے ہمراہ تھا کہا "زہرہ بائی۔ سوچ میں کیوں پڑ گئی ہیں آپ؟" میں چونک پڑی۔ اُس نے پھر کہا "کیا آپ ہمارے ہمراہ تشریف لے چلنا منظور فرمائینگی؟" میرے جذبات میں کشمکش کا طوفان برپا تھا۔ میں نے انکار کے طور پر سر ہلا کر کہا "نہیں سرکار اس وقت تو مجبور ہوں کیونکہ بغیر اطلاع دیئے دعوت میں نہ جانے سے "سرکار" کے ناراض ہو جانے کا احتمال ہے۔ اُن کا عتاب ہم جیسی حقیر مخلوق کے لئے قہرِ آسمانی سے کم نہیں۔ اس لئے اُن کے ہر جائز و ناجائز حکم کی بجا آوری پر ہم بے طرح مجبور ہیں۔"

جب انھوں نے بہت اصرار کیا۔ تو ایک گھنٹہ بعد "ویکاجی ہوٹل" میں ملنے کا وعدہ کر کے وہاں سے رخصت ہوئی لیکن دل شاید وہیں "باغِ عام" میں کھو آئی تھی۔ اس لئے راستے سے واپس لوٹ آئی۔ باوجود کوشش دعوت میں شرکت نہ کر سکی۔

۲ر مارچ :—

"رائل ہوٹل" ان دنوں میری قیام گاہ ہے واپس سیدھی اپنے کمرے

یہ پہنچی کسی کی یاد دل میں کچوکے لگا رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ پر لگا کر اڑوں اور ابھی اسی وقت "ویکاجی" ہوٹل جا پہنچوں۔

کاش اس خوشنما آغاز کا انجام مجھے معلوم ہو جاتا۔

ایک گھنٹہ بعد "ویکاجی" ہوٹل میں موجود تھی۔ اقبال کے سامنے ایک میز پڑی تھی جس پر گلاس شراب کا رکھا ہوا تھا۔ جس پر نظریں جمائے وہ کسی گہرے خیال میں غرق تھا۔ میری آمد پر وہ اپنی خیالی دنیا سے جاگ اٹھا۔ اس سراپا شراب نے دعوتِ مے پرستی دی۔ ہم نے پی کر پی اور جی کھول کر پی۔ وہ بادہ گلگوں سے مست تھا اور میں شرابِ دید سے سرشار۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس کے سینے میں بھی محبت کی چنگاریاں سلگ اٹھی ہیں

نہیں میں غلطی پر ہوں۔ کہاں اتنے بڑے آدمی کا بیٹا اور کہاں میں بازار میں بکنے والی عورت کیا وہ مجھ سے محبت کر سکتا ہے۔ میں جو امراء و روسا کی نظروں میں ایک کش کھلونے کی حیثیت رکھتی ہوں کہ جب اور جس کا جی چاہے مجھے خریدلے اور جب تک چاہے مجھ سے دل بہلائے اور پھر ایک معصوم بچے کی طرح جب اُس کا جی بھر جائے توڑ کر پھینک دے۔ کیا ہم محبت کئے جانے کی اہل نہیں ہیں؟

ہاں! یہی حقیقت ہے ہم سے محبت کرنا جرم ہے۔ یہی سماج کا قانون ہے۔ اُف! ظالم سماج۔ عورت کی سرشت سے ناواقف۔ فریب خوردہ اندھا سماج۔ جی چاہتا ہے پھونک دوں اس سماج کو اور توڑ ڈالوں اس کے ظالم قانون کو۔ مگر میں بھی کتنی نادان ہوں۔ کمزور عورت میں اتنی طاقت ہی کہاں کہ وہ مردوں کے بنائے ہوئے سماج اور قانون کی مخالفت کر سکے

۲ر مارچ :۔

رات کے نشے کا خمار ابھی تک باقی ہے کتنی رنگین تھی یہ رات۔ کائنات کا ذرہ ذرہ شرابِ محبت سے سرشار تھا۔ میں اپنے دل کے چاند کی آغوش میں زندگی کے حسین خواب دیکھ رہی تھی۔ میں اپنی ساری زندگی ان چند رنگین لمحات کے عوض دے دینے کو تیار ہوں۔ کاش میں اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں بھی اسی طرح اطمینان سے گذار سکوں۔ اقبال کا آنا میرے لئے پیامِ زیست سے کم نہیں۔ اس کی باتوں میں جو شیرینی اور حلاوت ہے۔ اُسے میرا ہی دل اچھی طرح جان سکتا ہے وہ میرے پاس کیا ہوتا ہے کہ زندگی کی تمام رنگینیاں سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ لیکن جاتے ہوئے وہ میرا سکون و آرام بھی مجھ سے چھین کر لیجاتا ہے میری روح بے چین ہو جاتی ہے اور میں اپنے دل میں خلا محسوس کرتی ہوں۔

وہ کل ملنے کا وعدہ کر گیا ہے۔ میرے خدا میں یہ دن کیسے کاٹونگی۔ کاش میں یہ جان سکتی کہ اس وقت وہ جانِ تمنا کہاں ہے۔ آج تو اُس کا رنگین تصور ہوگا اور بس!

۳ر مارچ :۔

وعدہ تو آج کا تھا۔ مگر کل شام ہوتے ہی وہ میرے پاس تھا۔ کیا یہ میری محبت کا اثر ہے۔ یا وہ بھی میری طرح میرے لئے بیقرار رہتا ہے۔ اگر یہ ممکن ہو تو میں اپنی خوش بختی پر جسقدر بھی ناز کروں کم ہے

کیا ایک بازاری عورت سے محبت کی جا سکتی ہے۔ کیا اس کے پہلو میں بھی دل ہوتا ہے۔ کیا وہ محبت کر سکتی ہے؟ صبح سے میرا دماغ انہیں خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ قسم قسم کے افکار ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور مٹتے جاتے ہیں۔ میں ابھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی ہوں۔ تجربہ سب کچھ سکھا دیگا۔

کل اُس نے دبے لفظوں میں کہدیا کہ وہ ایسے معمولی ہوٹل میں نہیں آ سکتا۔ لوگوں میں اس کے یہاں آنے جانے پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں کسی اعلیٰ درجہ کے ہوٹل میں قیام کروں۔ اس کے لئے اُس نے مجھے مالی امداد دینا چاہی۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔

دل میں ایک تڑپ سی اُٹھتی ہے۔ جانتی ہوں پھر بھی انجان بنی جا رہی ہوں۔ کیا محبت کے لئے عالیشان محلات اور سر بفلک عمارت کی ضرورت ہوتی ہے کیا محبت کی تخلیق ایسی ہی جگہوں پر ہوتی ہے اور کیا غریب کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں محبت کا چراغ نہیں جلا کرتا۔ میں بھی کتنی نادان ہوں۔ کاش میں سوچ سکتی کہ جو شخص محبت میں پہلا قدم بھی دلیرانہ نہیں رکھ سکتا جو میری غریبانہ زندگی کو دیکھتے ہوئے مجھ سے ملنا باعثِ ننگ و عار سمجھتا ہے۔ جو لوگوں کی زبان سے ڈرتا ہے۔ کیا وہ سچی محبت کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ مگر یہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ کیا یہ میری بھول نہیں۔ اس نے کب مجھ سے محبت کا اظہار کیا۔ یہ آگ تو میرے ہی دل میں جل رہی ہے اُف دل بیٹھا جا رہا ہے۔ طبیعت بے چین ہوئی جا رہی ہے۔ شاید کل سکندر آباد جاؤں۔

۸ مارچ :-

سکندر آباد۔

"کنگز وے ہوٹل" میں مقیم ہوں۔ چار دن سے اس کی صورت نظر نہیں آئی شاید مجھ سے ناراض ہوگیا ہے کئی بار اُسے خط لکھ بیٹھی۔ لیکن افشائے راز کے خوف سے لکھ لکھ کر پھاڑتی رہی۔ معلوم ہوا ہے کہ کم بخت حفاظت نے اُس سے میری محبت کا ذکر کردیا ہے۔ شاید میری محبت کے احساس سے اُس کے سر میں غرور کا سودا سما گیا ہے اب وہ مجھ سے کھچا کھچا رہتا ہے میں نے اُس کی آسانی کے لئے پانچ روپے روز کے بدلے پندرہ روپیہ یومیہ کرایہ کا ہوٹل اپنی رہائش کے لئے منتخب کیا ہے۔ یہاں تو بڑے بڑے نواب اور رئیس آتے ہیں۔ اب تو یہاں آنے میں اُس کو کوئی عذر نہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اُس نے میری قدر نہ جانی۔ شاید وہ مجھ سے بیزار ہو چکا ہے۔ بھونرا پھول کا رس چوس کر اُڑ جاتا ہے۔ مرد کی بھی تو یہی فطرت ہے۔ پھر کسی کا گلہ کیوں۔

۱۰ مارچ :-

کل اقبال کا ملازم پیام لایا تھا۔ آج شام کو میرے دل کی تاریک دنیا میں اُجالا ہونے والا ہے۔ مجھے یہ جان کر کتنی مسرت ہوئی بیان نہیں کر سکتی انہوں نے پہلے سے ایک خط بھی لکھا ہے۔ کتنا روح پرور ہے یہ نامۂ اُلفت میرے دل کی تسکین کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ انھوں نے مجھے یاد کیا۔ وہ مجھے بھلانا چاہیں تو بھلا سکینگے؟ یقین تو نہیں آتا۔ شاید وہ ایسا نہ کرسکینگے۔ خدا کرے وہ ایسا نہ کر سکیں۔

۱۱ مارچ :-

کل رات زندگی کی معدودے چند حسین راتوں میں سے ایک تھی۔ ہم دیر تک باغ کی روشوں پر ٹہلتے رہے۔ اُس نے گلاب کا ایک پھول شاخ سے توڑا پھر ایک ادا کے ساتھ اُس کی پتیاں فضا میں منتشر کردیں۔ اُن کو اُڑتا ہوا دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ میں اِدھر اُدھر دوڑی اور بکھری ہوئی پتیاں جمع کرنے لگی۔ وہ میرے اس فعل کو خاموش مسکراہٹ سے دیکھتا رہا۔ میں نے بڑی مشکل سے سب پتیاں جمع کیں۔ اور اُن کا رنگ زرد پڑ گیا۔ کیا میری محبت کا بھی یہی انجام ہونے والا ہے۔ دل کے اجزا پریشان ہو چکے ہیں۔ کیا ان کی شیرازہ بندی اب ممکن ہے؟ کاش میں جان سکتی۔

جاوید سرحدی

بیخودیٔ نشاط

سرخوشِ انبساط ہوں پھر بھی خوشی خوشی نہیں | فکرِ مآل، موت سے زندگی، زندگی نہیں
ذرّوں میں آتی ہیں نظر، عرش کی جلوہ ریزیاں | اہلِ نیاز کے لئے اُنکی گلی، گلی نہیں
حُسن کی بارگاہ میں عشق کی رسم و راہ میں | کوئی خوشی خوشی نہیں کوئی غمی غمی نہیں
جب وہ تھے مجھ پہ مہرباں زندگی تھی نشاط خیز | نام کی زندگی ہے اب زندگی، زندگی نہیں
روئے حسیں ہے بے نقاب حُسن ہے محوِ نظارہ تاب | بے خودیٔ نشاط ہے میری غشی غشی نہیں
کعبہ و خانقاہ کیا، سجدہ، سجدہ گاہ کیا | سامنے تم نہیں اگر بندگی، بندگی نہیں

میں ہوں معینؔ شادماں اپنے ہر ایک حال میں
اُن کی خوشی کے سامنے میری خوشی خوشی نہیں

معین میرٹھی

آہنگِ اقبال

ثمرات

زندگانی قوت و جوش و خرد و ہش — سخت جان و سخت کار و سخت کوش
تو حقیقت میں جمالِ جاوداں — میرے ہنگامے مگر روداد دوش
حسن کیا ہے جلوۂ روئے حیات — عشق کیوں ہے جاں سپار و جاں فروش
یہ نوائے زندگی کے زیر و بم — تار لرزاں ہیں مگر نغمے خموش
فیض گستر دو جہاں میں لا الٰہ — میری فطرت ہے مگر زنار پوش
مردِ مومن کی نظر تیغ اصیل — قلب مومن بے نیاز و سخت کوش
روحِ مومن ہے ضمیرِ کائنات — شانِ مومن دلگداز و تیغ پوش
جن کے قدموں میں تھا تختِ خسروی — ہو گئے ناپید ایسے دلق پوش

ہو گئی تبدیل گر ہیئت تو کیا
میرا مشرب ہے ثمرؔ آہن بدوش

حکیم عبدالکریم ثمرؔ سیمابی اچھروی

لا الٰہ الا اللہ

خودی کی روح رواں لا الٰہ الا اللہ — خودی ترانۂ جاں لا الٰہ الا اللہ
خرد کی شورش پیہم تمام کسل و جمود — خودی دوائے دواں لا الٰہ الا اللہ
نوائے خانقہی حرف و صوت و رامش و رنگ — کلید سرِّ اذاں لا الٰہ الا اللہ
کمالِ عشق شکوہِ مقام ابراہیم — جلالِ حسن عیاں لا الٰہ الا اللہ
بہائے یک دو نفس کہنہ دامئ افرنگ — دوامِ عالمیاں لا الٰہ الا اللہ
حجابِ منظرِ مقصودِ عالم من و تو — نہ بیش میری فغاں لا الٰہ الا اللہ
نمودِ جوہرِ ذاتی صلوٰۃ و صوم و درود — قلندری میں نہاں لا الٰہ الا اللہ
یہ نو نیاز زمان و مکاں سے بیگانہ — بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

ہنوز روح میں لرزش سی پائی جاتی ہے
کہاں یہ خاک کہاں لا الٰہ الا اللہ

افسرؔ سیمابی (احمد نگر)

اصولِ تغزّل —— (چند اشارات)

کلام وہی اچھا ہوتا ہے جسکے ظاہر اور باطن دونوں آراستہ و پیراستہ ہوں۔ جو لوگ صرف زبان کے عادی ہیں وہ صرف حُسنِ ظاہر پر فریفتہ ہیں کیونکہ اُن کا بیشتر کلام معنویت سے معرّا ہے اُن کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کلام میں اضافتیں کم آئیں، دور دور کے استعارے اور تشبیہیں بھی مفقود ہوں مناسبت الفاظ کی بھی پروا نہیں۔ معمولی بازاری باتیں اور عامیانہ گفتگو کو درست اور فصیح روزمرّہ میں نظم کر دیں۔ اس قسم کا کلام گویّوں اور بازاری عورتوں میں شدّت سے پایا جاتا ہے مگر شاعری کے بلند معیار سے گرا ہوا ہوتا ہے مثالیں ؎

سوالِ وصل پر پہلے تو جھڑ کا پھر یہ فرمایا ابھی کچھ اور کہنا ہے ابھی کچھ اور سُننا ہے

تمھیں چاہو تمھیں چاہو تمھیں چاہو نہیں کوئی کبھی ہم نے نہ چاہا تھا نہ چاہیں گے نہ چاہا ہے

زبان اور روزمرہ شستہ ہے مگر اس میں بازاری باتیں ہیں۔ صورت پرستی کے سوا کچھ نہیں سیرت کا نام و نشان نہیں۔ کوئی تخیل موجود نہیں ہے۔ شاعرانہ ایجاد اور معنی آفرینی سب ندارد ہیں۔

بعض لوگ صرف تخیل کے پابند ہیں اور زبان کی پروا نہیں کرتے۔ اگرچہ آجکل یہ جماعت نہ ہونے کے برابر ہے مگر زمانہ سابق میں موجود تھی، دُور دُور کی معنی آفرینی زمین آسمان کے قلابے ملانا۔ استعارہ در استعارہ، تشبیہ در تشبیہ، تکلف در تکلف۔ غرضیکہ اِن کی شاعری معمہ گوئی سے کم نہ تھی۔

شاعری کا مقصد عوام کے جذبات پر آتش گیر اثر پیدا کرنا ہے۔ جب سُننے والا سمجھا ہی نہیں تو جذبات پر کیا اثر ہوگا۔ اگر دو چار آدمی مطلب کو پا گئے تو اس سے شاعری کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ بس یہ دونوں باتیں مدِّ نظر رکھ کر میری پختہ رائے یہ ہے کہ شاعری میں حُسنِ ظاہر اور حُسنِ باطن دونوں موجود ہوں۔ یعنی شاعرانہ انداز ہر ایک شعر میں موجود ہو یہ ایک خاص شے ہے۔ بازاری طرزِ بیان اس کے ساتھ صنعت تضاد پیدا کرتی ہے۔ میر تقی فرماتے ہیں اور کیا لاجواب فرماتے ہیں ؎

نرگسی آنکھیں شرم آلودہ فلک ہیں ہم کو تاکینگی کیا یہ نگاہیں نیچی نیچی اوپر اوپر جائینگی

اللہ اللہ کیا طرزِ بیان ہے۔ یہی وہ رنگ ہے جس کو میں پسند کرتا ہوں۔ اس میں ظاہر و باطن دونوں خوبیوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مصرعِ ثانی کا اندازِ بیان وہ ہے جس کو میں شاعرانہ انداز کی تشریح کے لئے بیان کرنا چاہتا ہوں ؎

”کیا یہ نگاہیں نیچی نیچی اوپر اوپر جائینگی!“

سبحان اللہ۔ اور سُنئے ؎

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر (سیماب)

یہاں بھی مصرعِ ثانی کا انداز خاص شاعرانہ ہے۔ دونوں شعروں میں کوئی پیچیدگی نہیں کوئی معمّا نہیں، فارسیت بھی نہیں زبان بھی صاف اور شستہ ہے مگر بایں ہمہ شاعرانہ ایجاد اور معنی آفرینی، سخنورانہ جدّتِ تخیل کا زور غرضکہ کلام کا باطن ظاہری حُسن سے بھی زیادہ خوبصورت اور دلکش ہے۔

ایک طالبِ علم یہ کہتا ہے کہ ”جناب پھر کبھی یہ خط لکھوں تو میرے ہاتھ کاٹ دیجئے۔“ دوسرا کہتا ہے کہ ”جناب پھر کبھی یہ خط لکھوں تو میرے ہاتھ قلم کر دیجئے۔“ صاف ظاہر ہے کہ پہلے طالبِ علم کی گفتگو عامیانہ ہے مگر دوسرے کا اندازِ بیان شاعرانہ ہے۔ اگرچہ زبان کے لحاظ سے دونوں ایک درجہ پر ہیں:—

اس بحث سے آپ یہ سمجھ گئے ہونگے کہ شاعرانہ انداز سے میرا کیا مطلب ہے ماحصل یہ ہے کہ کلام میں شاعرانہ انداز کو ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور اسکے ساتھ صاف بیانی اور زبان کی شستگی روزمرہ کو بھی قائم رکھا جائے یہ دونوں اوصاف جس جگہ بھی مجتمع پائے جائینگے۔ کلام لاجواب ہوگا۔ جب حُسنِ ظاہر اور حُسنِ باطن دونوں کی موجودگی کلام میں لازم سمجھ لی جائے تو پھر یہ امر تشریح طلب رہ جاتا ہے کہ غزل میں حُسنِ ظاہر اور حُسنِ باطن کی تعریف کیا ہے۔ حُسنِ ظاہر جس کو کتابوں میں لباسِ شاعری لکھا ہے۔ کئی باتوں پر مشتمل ہے:—

(۱) کوئی مصرعہ یا شعر موزونیت و تقطیع سے خارج نہ ہو۔

(۲) قوافی درست ہوں خاص کر مطلع میں عیوب قافیہ کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے ایطا سے بچا جائے۔

(۳) تقدیم و تاخیر جہاں تک ممکن ہو کم رکھی جائے مثلاً ؎

نوبت خانوں میں ہے نے بھی ہوٹل میں ہے جائز نے بھی
مسجد بھی ہو حق کی لے بھی مندر میں ہم ہم بجے بجے بھی

"ہوٹل میں ہے جائز نے بھی"۔ اس ٹکڑے میں اگرچہ کوئی خاص تقدیم و تاخیر نہیں ہے کوئی اپنے متعلقات سے زیادہ دور واقع نہیں ہوا مگر پھر بھی جسقدر تقدیم و تاخیر موجود ہے اس کو اور بھی کم کیا جا سکتا ہے "ہے جائز" کے بجائے جائز ہے۔ کہنے سے وزن ٹھیک رہتا ہے۔ چونکہ جائز ہے۔ روزمرہ بولا جاتا ہے "ہے جائز" کوئی نہیں بولتا اس لئے "ہے جائز" کے بجائے "جائز ہے" لازمی طور پر فصیح ہوا۔

(۴) الفاظ کی صحت لغت کے مطابق ہو یا اساتذہ کے کلام سے مطابقت رکھتی ہو اس کے لئے بیشتر مطالعہ کی ضرورت ہے۔

(۵) الفاظ کا استعمال برمحل ہو۔ مثلاً نفاست کے لفظ کو اگر اس طرح استعمال کیا جائے کہ بدر رو میں پانی بڑی نفاست سے بہ رہا تھا تو یہ لفظ نفاست کی مٹی خراب کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ صفت بڑی مشق پر منحصر ہے۔

(۶) ندرت الفاظ نہ ہو عجیب و غریب الفاظ مثلاً

رسیدہ سارباں از نزد مجنوں
طماق و تلون و تلطاق و طلبوں

نہ ہوں۔ متعارف الفاظ استعمال کئے جائیں۔

(۷) بندش چست ہو۔ ایک حرف کی ترمیم کی گنجائش نہ رہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ حشو و زوائد سے کلام کو پاک رکھا جائے اور ایک ایک مصرع کو کئی کئی طریقہ سے الٹ کر باندھا جائے اور اس طرح طبیعت کی موزونیت سے فیصلہ طلب کیا جائے کہ کونسی بندش اچھی ہے۔ یہ ایک بڑی صفت ہے اور اس کے بجز کلام کچھ نہیں۔ ٹھوس کلام چستی بندش ہی سے بنتا ہے جس میں کوئی لفظ بیکار نہیں ہوتا۔

(۸) شتر گربہ کا عیب نہ ہو ایک مصرع میں "تو" اور دوسرے میں "تم" ایک مصرعہ میں "میں" اور دوسرے میں "ہم"۔

(۹) تعقید لفظی اور تعقید معنوی مطلق نہ ہو۔ تعقید لفظی سے مراد الفاظ کا الٹ پھیر پوری طرح واقع ہونا جس سے نثر بنانے میں دقت واقع ہو۔

(۱۰) زبان عام فہم با محاورہ اور متعارف الفاظ پر مشتمل ہو۔ دقیق سے دقیق مضامین کو عام فہم صورت میں پیش کیا جائے ؎

یہ فتنہ آدمی کا خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو (غالب)

(۱۱) مناسب الفاظ۔ خوبصورت تشبیہیں، استعارہ کنایہ کے زیور سے آراستہ ہو۔

(۱۲) تین سے زیادہ اضافتیں ایک جگہ نہ آئیں۔

(۱۳) متروکات کا ہمیشہ خیال کیا جائے۔

(۱۴) الفاظ کم سے کم استعمال کئے جائیں۔

(۱۵) صحت زبان میں فصحائے دہلی یا فصحائے لکھنؤ کا تتبع ہو۔

(۱۶) ٹکسال باہر الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔

(۱۷) غزل کی زبان اور ہے۔ مرثیہ کی اور ہے۔ قصیدہ کی اور ہے۔ یہ تمام باتیں حسن ظاہری میں شامل ہیں۔

حسن باطنی میں مفصلۂ ذیل باتیں شامل ہیں:—

(۱) مضمون میں جدت اور خیالات میں ندرت پائی جائے۔

(۲) شعر کو معما کی حد تک نہ پہنچایا جائے۔

(۳) اس غرض کو ہمیشہ مدنظر رکھا جائے کہ اصل مدعا لفظوں سے مکمل طور پر واضح ہوتا ہے یا کہ نہیں۔

(۴) خیالات ایسے ہوں جو پڑھنے والے کے جذبات پر اثر ڈالنے والے اور ان کو ابھارنے والے ہوں

(۵) خیالات میں سنجیدگی، معقولیت موجود ہو۔ فحش گوئی حد سے بڑھے ہوئے اقوال ظریفانہ نہ ہوں، بازاری خیالات سے پرہیز لازم ہے۔ فحش گوئی کھلے لفظوں میں ممنوع ہے۔ لیکن در پردہ بھی فحش معنی نکلتے ہوں تو بھی قابل اعتراض ہے۔ مثلاً ؎

ہم نے کس انداز سے ان کو کیا شب بے حجاب
ایک بات ایسی کہی جامے کے باہر ہو گئے

حسن ظاہر پر فریفتہ ہونے والے تو شعر کی تعریف کے پل باندھینگے۔ اس میں شک نہیں کہ شاعرانہ انداز بیان کی یہ نہایت عمدہ مثال ہے۔ معنی آفرینی بھی ہے۔ تخیل بھی ہے

جانے سے باہر ہونا اس محاورے کا استعمال اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا غرضکہ ظاہری باطنی سب محاسن موجود ہیں۔ کنایات میں بات پیدا کی ہے۔ بندش زبان شوخی تاثیر غرضکہ سب کچھ ہے۔ مگر نتیجہ کیا ہے۔ سوائے فحش کلامی اور کچھ نہیں۔ اس لئے اس قسم کا کلام شاعری کو بدنام کرنے والا ہے۔

(۶) غزل میں خیالات زیادہ تر اس موضوع سے باہر نہ ہوں جس کی شاخیں عام طور پر یہ ہیں۔

زاہد و ناصح۔ حسن طلب۔ نالہ و فریاد۔ شکایت روزگار و بخت۔ بے مہری فلک ناپائیداری عالم۔ صحبت اہلِ عالم۔ شکایت بیوفائی زمانہ۔ ناؤ نوش۔ آشیاں و قفس برق و صیاد۔ شیخ و شباب۔ حسن و عشق کے کرشمے۔ عشوے اور غمزے معاملہ بندی۔ حسن و عشق۔ راز و نیاز۔ راہِ طلب کی مصیبتیں۔ غرضکہ ہر قسم کے مضامین مختلف انداز سے غزل میں آسکتے ہیں۔ سوائے مضامین قصیدہ و مرثیہ کے مثلاً ظلم کا ماتم۔ لاشوں پر لاشوں کا اٹھنا۔ ہائے ہائے کی آوازیں۔ بین و بکا۔ اسی طرح بے فائدہ واہ وا۔ اہاہاہا، اوہو ہو ہو اس قسم کے مضامین شانِ تغزل سے گرے ہوئے ہیں۔

(۷) بے شمار دیوان دیکھنے کے بجائے بندش کو تنقیدی مضامین کا مطالعہ کثرت سے کرنا چاہئے۔ اب میں چند ہدایات بطور تتمہ قلمبند کرتا ہوں۔

غزل گوئی کے متعلق فنی ہدایات

(۱) غزل میں مطلع تین سے زیادہ نہ ہوں کیونکہ کثرت معیوب ہو جایا کرتی ہے۔

(۲) فارسی الفاظ کا کوئی حصہ تقطیع میں نہ گرے اُن کو پوری آواز میں باندھنا چاہئے مثلاً

(۱) مری کشتی اُبھری نہ ڈوبی ہوئی

(۲) یہ کشتی نہ اُبھری نہ ڈوبی ہوئی

پہلی صورت میں کشتی کی "ی" تخفیف میں آگئی ہے۔ یہ عیب ہے دوسری صورت میں پوری آواز نکلتی ہے وہ فصیح ہے۔

(۳) اُردو کے ایسے الفاظ جن کے آخر میں الف ہے اور وہ فعل نہیں ہیں تخفیف کے ساتھ نہ باندھے جائیں سوائے اسمائے ضمیر و حروف اضافت کے

لکھا قسمت کا مٹ نہیں سکتا
تیرا بیمار جو سنبھلا نہ سنبھالا لیکر
کہا دل نے کہ کیا قیامت ہے

یہ تخفیف جائز ہے مگر گویا سدا دوا بھلا میں الف کی تخفیف درست نہیں ہے جو الف تذکیر و تانیث یا حروفِ عامل آنے پر بدل جاتا ہو وہ تخفیف میں آسکتا ہے

(۴) فارسی زبان کا لفظ دوسری زبان کے ساتھ بحالت اضافت یا بحالت ترکیب نہ لایا جائے۔ مثلاً امیدِ ڈاکٹر

(۵) جن لفظوں کے آخر میں نون غنہ ہے اُن کو اُردو میں نون غنہ کے ساتھ نہیں بولا جاتا۔ اُردو میں میداں کو میدان، دیواں کو دیوان۔ آسماں کو آسمان جاں کو جان بولتے ہیں۔ پس اس قسم کے لفظ نظم میں نون کی آواز دیتے ہوئے باندھنے چاہئیں۔ ہاں اگر مضاف الیہ یا صفت موصوف یا کسی اور فارسی مرکب کی حالت میں لائے جائیں تو نون غنہ رکھنا چاہئے۔ اگر اس قسم کے لفظ بغیر ترکیب کے واحد حالت میں لئے جائیں تو پوری آواز نون کی آنی چاہئے مثلاً

"جھوٹ ہی جانو کلام اس رہزنِ ایمان کا"

ظاہر ہے کہ اس موقع پر رہزنِ ایماں کہنا چاہئے۔ کیونکہ فارسی ترکیب ہے۔

پس یہ بندش ناقص ہوئی۔ قافیہ کی ضرورت سے شاید یہ عیب ہلکا رہ جائے لیکن مصرع کے باقی حصہ میں یہی حالت پیدا ہو تو یہ عیب زیادہ وزن دار ہو جاتا ہے ذوق دہلوی تک یہ رواج عام رہا۔ اس کے بعد متروک ٹھہرایا گیا ہے۔

(۶) جن فارسی الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی ہو اُن کا قافیہ بحالت ترکیب صحرا۔ دریا کے ساتھ معیوب ہے۔ مثلاً ایک مصرعہ میں "صحرا دیکھو" کہا جائے اور دوسرے میں "شوخیِ جلوہ دیکھو" یہ تو یہ عیب پیدا ہوا۔ ہاں صرف جلوہ دیکھو بغیر اضافت کے آئے تو قافیہ درست ہوا۔ کیونکہ ایسی حالت میں یہ لفظ فارسی نہ رہا۔ جلوہ ہو کر اُردو کا بن گیا۔ آئندہ قسط میں غزل گوئی کی تعریف، معیارِ تغزل۔ مضامین تغزل اور زمانۂ حال کے مخصوص شعرا کے کلام کے پاکیزہ نمونے پیش کئے جائیں گے۔

سید دل محمد شاہ فضا جالندھری

راز و نیاز

مجھ کو اُس پر اُسکو مجھ پر ناز ہے — مَیں کسیکا کوئی میرا راز ہے
تو نے پایا ہے جو حُسنِ بے نظیر!! — مجھ کو اپنی عاشقی پر ناز ہے
جان لیوا ہے تیری ترچھی نظر! — اور پھر جاں بخش ہر انداز ہے
چہرہ پُر نور اور باتیں لطیف — کیا تیری شوخی بتِ طناز ہے
ہو رہی ہے عشق میں تیری فنا — مجھ کو اپنی زندگی پر ناز ہے
دیکھئے تو منظرِ ناز و نیاز! — اپنا سر ہے اُنکا پائے ناز ہے
ہیں قفس میں بھی وہی آزادیاں — ہر خیال اپنا پر پرواز ہے
کہہ رہا ہے اسکو فرزانہ جہاں — تیرا دیوانہ کرشمہ ساز ہے
ہر نفس اک راز سے معمور ہے — پردہ پردہ اُسکا نغمہ ساز ہے
زندگی کو زندگی سمجھیں اگر — زندگی خود زندگی کا راز ہے

ہو نہ جائے دیکھ اے رسوا عیاں
تیری ہر رسوائی میں اک راز ہے

خانشری امام الدین خاں رسوا والئی پاچود

جہانِ آرزو

حُسن جب بیزارِ پردہ ہو کے بے پردا ہوا — ذوقِ نظارہ حجابِ دیدۂ موسیٰؑ ہوا
انقلابِ ناگہانی کا مجھے شکوہ ہوا — جب مری بربادیوں پر تو کرم فرما ہوا
اسقدر مستغرقِ حُسنِ لطافت زا ہوا — اپنی ہستی پر گمانِ شاہدِ معنیٰ ہوا
عشق میں کیوں زندگانی موت سے بدتر نہ ہو — دوسرا رُخ بھی اِس تصویر کا دیکھا ہوا
کس قدر نشو و نما پرور تھا خیالِ حُسنِ دوست — ہر نظر سے اک جہانِ آرزو پیدا ہوا
جن کے جلووں کے لئے بیتاب رہتی ہے نظر — کیوں نہ میں اُن کے حریمِ ناز کا پردا ہوا
گو ہر اک ذرہ میں دیکھیں سوا دائیں حُسن کی — پھر بھی فطرت کے مناظر کا نہ اندازہ ہوا
جزو دانِ قلزمِ ہستی انساں دیکھئے — ایک قطرہ تھا جو پھیلا پھیل کر دریا ہوا

پھر دکھایا یہ تلوّن ہم نے حسن و عشق کا
خود کہیں مجنوں بنا اور خود کہیں لیلیٰ ہوا

قہر نظامی میرٹھی

حکیم آزاد انصاری مرحوم کی شاعری

آزاد انصاری کا تغزل نہایت حساس اور واقفکارانہ ہے۔ وہ
ایک نئے قابل قدر اور مخصوص اسلوب و انداز کے مالک ہیں
اور اُن کا کلام ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے"
(نگار جنوری فروری ۱۹۴۱ء)

یہ تو تھی ایک ایسے ناقد کی رائے جس کے چہرہ پر نقاب ہے خود مدیر نگار مولانا نیاز فتحپوری کی رائے ہے کہ آزاد انصاری کے کلام میں حالی کی سی سادگی ہے اُن کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور الفاظ کی تکرار سے اپنے بیان میں بہت زور پیدا کر دیتے ہیں اور بعض شعروں میں انکا انداز واقعی سحر حلال کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے"۔۔۔ لیکن تعجب ہے کہ ایک سال کے بعد یعنی جنوری ۱۹۴۲ء کے "نگار" میں دوسرے ناقدین کی آرا سے متاثر ہو کر مولانا نیاز فتحپوری کی رائے بدل جاتی ہے فرماتے ہیں۔

"آزاد انصاری کا تغزل الفاظ کا تغزل ہے۔ اِن کی شاعری
کی زبان وہ نہیں ہے جو مفہوم اور معنی سے پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ مفہوم کو
الفاظ کا تابع بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے اسکا اثر دیرپا نہیں"

ناقدین کی تین رائیں ہمارے سامنے ہیں۔ ان سب سے ہٹکر آزاد انصاری کی شاعری کے متعلق ایک رائے یہ بھی ہے کہ ان کے کلام کا زیادہ حصہ ایسا ہے جو اپنی جگہ نظم بھی ہے اور نثر بھی۔ یعنی اگر اُس کی نثر کی جائے تو شاید ہی ترتیب الفاظ بدلنے کی ضرورت محسوس ہو۔

جو کاشی میں ترے درشن تو کعبہ میں ترا جلوہ	جدھر ڈھونڈھا تجھے پایا۔ جدھر دیکھا تجھ کو دیکھا
سنا دریں تری سیوا مساجد میں تری پوجا	تجھے سب نے خدا مانا تجھے سب نے خدا مانا
بظاہر یادگی کی بحث موزوں بھی ہے دلکش بھی	مگر جب غور سے دیکھو تو ناحکمہ کھلا دیکھا
کہاں کا مادہ کس کی قدامت یہ تو قصے ہیں	کوئی تیرے سوا خلاقِ عالم ہو نہیں سکتا

محبت میں بقا میری محبت میں فنا میری	محبت ابتدا میری محبت انتہا میری

یہ شعر ترتیب الفاظ کی بہترین مثال ہے لیکن بقا اور فنا۔ ابتدا اور انتہا ایک ہی مفہوم کے حامل ہیں۔ گویا دونوں مصرعے متحد المعنی ہیں، الفاظ کی ترتیب کے خیال نے شعر میں نہ مفہوم پیدا ہونے دیا اور نہ کیفیت۔ ناقدین نے جس بے اثری کا ذکر کیا ہے وہ ایسے ہی اشعار سے متعلق ہے۔ ترتیب الفاظ کے ساتھ ان کے کلام میں تکرار الفاظ بھی زیادہ سے زیادہ پائی جاتی ہے ان کے دیوان کے ۵۰ فیصدی اشعار تکرار الفاظ سے بھرے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی خوبی کی افراط بھی بے رنگی اور بدنمائی پیدا کر دیتی ہے۔ بارش کا ہر قطرہ یکساں نہیں ہو سکتا کہنے کو وہ قطرہ ہی ہے۔ اور یوں بھی تکرار کلام ایک بڑا عیب سمجھی جاتی ہے لیکن اگر ایسی تکرار ہو جو آزاد انصاری مرحوم کے مندرجہ ذیل اشعار میں پائی جاتی ہے تو وہ بڑی حد تک حسن میں داخل ہے۔

تم اور دل آزاریٔ اربابِ محبت	اربابِ محبت کا یہ شیوہ نہیں ہوتا
مسلسل ستم کی حکومت کے بانی	مسلسل ستم کی حکومت کہاں تک

لیکن ایسی تکرار:۔

روزگارِ عزم و ہمت ہو چکا	اے دورِ عزم و ہمت! الفراق
اعتبارِ بخت و قسمت ہو چکا	اے غرورِ بخت و قسمت! الفراق
سب نشانِ تاب و طاقت مٹ گیا	اے زبانِ تاب و طاقت! الفراق
سب گمانِ استقامت مٹ گیا	اے جہانِ استقامت! الفراق

میرے خیال میں حسن کی حدود سے بہت پیچھے ہے۔ چونکہ آزاد مرحوم کی طبیعت کو اس سے خاص لگاؤ تھا اس لئے انہوں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی یا یوں کہیے کہ انہیں ایسی تکرار میں حسن ہی حسن نظر آیا۔

مندرجۂ بالا چار متالیہ اشعار میں ایک اور صنعت پائی جاتی ہے جسے صنعتِ ترصیع کہتے ہیں یعنی جس طرح نثر قوافی کے التزام سے لکھی جاتی تھی اسی طرح پہلا اور تیسرا شعر ہم قافیہ ہے اور دوسرا اور تیسرا۔ یہ صنعت پرانے شعرا کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے اور جدید شعرا کے یہاں بھی ہے لیکن

خال خال حکیم آزاد انصاری مرحوم نے اس صنعت کو زیادہ سے زیادہ اپنانے کی کوشش کی ان کے دیوان میں ایسے اشعار بہت کافی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اُن کے یہاں صنعتِ تقابل کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔

وہ ترا روزِ ازل گرمِ تماشا ہونا   وہ مرا پہلے پہل تجھ سے شناسا ہونا
وہ ترا پردۂ تفرید سے باہر آنا   وہ مرا سرمۂ توحید سے بینا ہونا
وہ ترا جوشِ غضب اور زیادہ بڑھنا   وہ مرا شوقِ طلب اور دو بالا ہونا

مولانا نیاز نے جس حُسنِ سادگی اور سحرِ حلال کا ذکر کیا ہے وہ آزاد انصاری مرحوم کے ان اشعار میں بدرجۂ اتم موجود ہے اور پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا ؎

صبر کبھی آیا ہے نہ آئے   سب عادت بھول نہ جانا
آہ! ہماری ناؤ کی حالت   موجیں حائل۔ طوفاں برپا
میں تو تیرے خیال کو سو بار چھوڑ دوں   لیکن ترا خیال نہیں چھوڑتا مجھے
اسبابِ سکوں رخصت تسکینِ دل رخصت   اب درد کی باری ہے اب درد مزا دیگا
جب ہمیں بزم میں آنے کی اجازت نہ رہی   پھر یہ کیوں پرسشِ حالات ہے یہ بھی نہ سہی
تو اور پاسِ خاطرِ اہلِ وفا کرے   امید تو نہیں ہے مگر ہاں خدا کرے
غیر فانی خوشی عطا کر دی   اے غمِ دوست تیری عمر دراز
آؤ پھر موقع ہے کچھ اسرار کی باتیں کریں   صحبتِ منصور پھیلیں دار کی باتیں کریں
آ، مگر اس قدر قریب نہ آ   کہ تماشا محال ہو جائے

مندرجۂ بالا اشعار میں الفاظ مفہوم کے تابع ہیں نہ کہ مفہوم الفاظ کے لیکن ایسے اشعار آزاد مرحوم کے دیوان میں نسبتاً کم ہیں۔ ہاں بقول مولانا نیاز اُن کے ایسے اشعار۔

عالم ترے وجود سے تکمیل پا گیا   آئندہ ارتقا کی ضرورت نہیں رہی
کبھی عالم کی ہستی اصل پر مبنی سمجھتا ہوں   کبھی بالکل نمودِ سیمیا معلوم ہوتی ہے
یوں یاد آؤ گے نہیں اصلاح نہ تھی   یوں بھول جاؤ گے ہمیں وہم و گمان نہ تھا

بیدل بھی ہوں شاداں بھی شاکی بھی ہوں نازاں بھی
جو داغ دیا ہو گا دلچسپ دیا ہو گا

وہ اک حیرت فزا سا وہ اک بالکل نئی حالت   وہ اک جلوہ نظر آنا وہ اک عالم گذر جانا
نزاکت ہے کہ قرباں ہے تری ترکیبِ اعضا پر   قیامت ہے کہ پنہاں ہے ترے بیساختہ پن میں

دیرپا اثر کے حامل نہیں اور صرف الفاظ کا الٹ پھیر معلوم ہوتے ہیں۔

آزاد انصاری مرحوم کی یہ رعایتِ لفظی اُس صناعت کا ایک لازمی نتیجہ ہے جس کا وہ اکثر و بیشتر خیال رکھتے تھے یعنی ترتیبِ الفاظ۔ اپنی اس خاص صناعی کے خیال میں انہیں مفہوم کا بالکل احساس نہیں رہتا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اُن شعرا کے کلام میں جو رعایتِ لفظی سے کام لیتے ہیں مفہوم ہوتا ہی نہیں مفہوم ہوتا ہے لیکن کچلا ہوا۔ تخیل ہوتی ہے لیکن سامنے کی۔ معانی ہوتے ہیں لیکن ایسے کہ دل و دماغ ان سے اثر گیر نہیں ہوتے روح میں چبھن محسوس نہیں ہوتی اور شعر وہی ہوتا ہے جو دل میں نشتر کی طرح چبھے۔ احساس کو گرمادے اور روح میں ہیجان و ارتعاش پیدا کر دے۔ آزاد مرحوم کی طبیعت بہت دقت پسند اور فن کار واقع ہوئی تھی۔ فنی التزام میں انہیں جذبات سے زیادہ غور و فکر سے کام پڑتا تھا تصوف یا فلسفہ کا تعمق نہیں بلکہ وہ صنعتی پابندیاں تھیں جو مرحوم نے اپنے اوپر عائد کر لی تھیں فرماتے ہیں ؎

اگر آزاد شاعر بھی نظروں میں نہیں جچتا
تو جا اور جا کے پہلے شعر کی پہچان پیدا کر

شعر کی پہچان جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اُنہوں نے وجدان پر قائم نہیں کی بلکہ فنی موشگافیوں کا نام اُن کے یہاں شعر تھا۔ میر اور مومن کو چھوڑ کر قدیم شعرا میں سب نے شاعری کو فن کا اکھاڑہ بنایا اور اُن کا تتبع بعد میں آنے والی نسلوں نے بھی کیا حکیم آزاد انصاری مرحوم امیر۔ داغ۔ جلال۔ حالی وغیرہ کی فن کاری دیکھ چکے تھے، یہ بزرگ تو اپنی جگہ صاحبِ فن اور مخصوص رنگ کے حامل تھے ہی، مرحوم ان سے بھی کچھ آگے نکل گئے۔ ایک نہیں بلکہ کئی کئی پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لیں اور آخر عمر تک انھیں نبھاتے رہے۔ وضعداری بھی اسی کا نام ہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ میں اُن کی یہ دشوار پسندی یاد رہے گی۔

گمنام نقاد نے اُن کے تغزل کو حساس اور واقف کارانہ کہا ہے۔ میرے خیال میں آزاد مرحوم کے یہاں حساس تغزل تو نہیں۔ ہاں ان کی واقف کاری میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اُن کا مطالعہ

بڑی حد تک وسیع تھا الخ ہیں۔ غور و فکر کا مادّہ بھی تھا چنانچہ ذیل کے اشعار اُن کی واقف کاری کے آئینہ دار ہیں۔

دیدار کی طلب کے طریقوں سے بے خبر! — دیدار کی طلب ہے تو پہلے نگاہ مانگ
یارائے زہد و تاب ورع کچھ طلب نہ کر — توفیق ہو تو صرف مجالِ گناہ مانگ
جو چاہتا ہے چاہ مگر قاعدے کے ساتھ — جو مانگنا ہے مانگ مگر راہ راہ مانگ

اٹھو درد کی جستجو کر کے دیکھیں — تلاشِ سکونِ طبیعت کہاں تک
سماعت نہ پُرسش، توجہ نہ پروا — تمنائے اظہارِ حالت کہاں تک

اب تو ملا تو اس ترے ملنے کی کیا خوشی — اب اپنی جستجو ہے کہ اپنا پتہ نہیں
بیچارگی نے صبر کا خوگر بنا دیا — سو کلفتیں ہیں اور زباں پر گلا نہیں

غلامانہ خو اتفاقی ہے ورنہ — روایاتِ ہندوستاں اور بھی ہیں
جو اہلِ حرم درپئے دشمنی ہیں — تو پروا نہیں آستاں اور بھی ہیں

صبر مشکل سہی، امکان سے خارج تو نہیں — ہم کو خود دردِ محبت کی دوا آتی ہے
طلب عاشقِ صادق میں اثر ہوتا ہے — گو ذرا دیر سے ہوتا ہے مگر ہوتا ہے

آزاد انصاری مرحوم کے کلام کی سب سے بڑی خوبی سادگی ہے، جسے وہ کسی حالت میں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اُن کے یہاں ایسے لغات بہت کم ملتے ہیں جو اشعار کو چیستاں نہیں تو کم از کم قابلِ غور و فکر ضرور بنا دیتے ہیں، مشکل سے مشکل زمین میں اُنھوں نے سادہ سے سادہ اشعار لکھے ہیں۔

مرحوم ہر صنفِ سخن پر قادر تھے، کچھ نظمیں بھی اُن کے مجموعۂ کلام میں ملتی ہیں جن کے موضوع اسالیب اور رجحانات قدیم ہیں۔ رباعیات بھی ہیں بطور تکملہ میں ان کی چند رباعیاں اور پیش کرتا ہوں۔

درمانِ دلِ زار کہاں سے لاؤں — دُکھ درد کے غمخوار کہاں سے لاؤں
تقدیر موافق نہ زمانہ دمساز — یارانِ وفادار کہاں سے لاؤں

تقدیر کا حکم ٹل سکے ناممکن — تدبیر کا زور چل سکے ناممکن
ناداں غمِ این و آں سے کچھ حاصل بھی — قانونِ قضا بدل سکے ناممکن

اعجاز صدیقی

فصلِ بہار کی چاندنی میں

بہار کی چاندنی چمن میں نکھر کے نکلی ہے کیا سہانی
کہیں ہے اودی کہیں گلابی کہیں سنہری کہیں ہے دھانی

فضا کی بدمستیوں نے کر دی ہے دل میں اک گدگدی سی پیدا
صبا نے کلیوں کا منہ جو چوما ابھر آیا شبنم کے منہ میں پانی

خرامِ مستانہ چاند کا اک شراب خانہ لٹا رہا ہے
برس رہی ہے قدم قدم پر اداؤں میں ڈوبی ہوئی جوانی

چمک اٹھا نور کی شعاعوں سے باغِ عالم کا ذرہ ذرہ
دماغ گلچیں کا آسماں پر گلوں کے ہونٹوں پہ لن ترانی

سفید جوڑا پہن کے نکلی ہے کوئی دوشیزہ خراماں
کہ جس کی اک اک ادا سے ہوتی ہے حسنِ فطرت کی ترجمانی

چمک کے جگنو جلا رہے ہیں چراغ پھولوں کی انجمن میں
چمن ہر شاخِ گل ہے گویا جوابِ قندیلِ آسمانی

اڑائے پھرتا ہے نکہتِ گل کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا
ستارے مشعل دکھا رہے ہیں ٹہل رہی ہے چمن کی رانی

کوئی نشیب و فراز کا امتیاز رہتا نہیں ہے رہ میں
ہے اک بہتا ہوا سا دھارا کہ پرسکوں جس کی ہے روانی

جو دھیمی دھیمی سی روشنی چھن کے آشیانوں میں آ رہی ہے
تو مرغِ گلشن سحر کے دھوکے میں کرتے ہیں قصدِ پرفشانی

سریہ کابری نائی گیاوی

نشاطِ تغزل

بتاؤں کیا تمھیں اب کون ہوں میں اور کیا ہوں میں
کسی ٹوٹے ہوئے دل کا فسردہ مدعا ہوں میں

محبت تیرے صدقے دیکھ کیا سے کیا اب ہو گیا ہوں میں
نگاہِ ہر دو عالم میں سماتا جا رہا ہوں میں

خودی میں کیا بتاؤں خود کو کیا سمجھا ہوا ہوں میں
مبادا ایک دن بے ساختہ کہہ دوں خدا ہوں میں

مری حالت یہ ہے ہر شے سے اب بیگانہ سا ہوں میں
نہ محرم ہوں کسی کا اور نہ محرم آشنا ہوں میں

سحر ہونے کو ہے آثارِ وحشت بڑھتے جاتے ہیں
کوئی دم کا ہوں مہماں ٹمٹماتا سا دیا ہوں میں

تمھیں نے تو ازل میں مجھ سے تجدیدِ وفا کی تھی
میں اب سمجھا کہ تم ہو ابتدا میں انتہا ہوں میں

مٹاتا جا رہا ہے کیوں زمانہ میری ہستی کو
بساطِ ارض پر کیا کوئی داغِ بدنما ہوں میں

اگرچہ گل ہوں میں لیکن زمانے کی نگاہوں میں
مثالِ خار جانے کیوں کھٹکتا جا رہا ہوں میں

وہ کچھ کچھ مہرباں سے مجھ پر اب معلوم ہوتے ہیں
بتا اے دل! حقیقت ہے کہ دھوکا کھا رہا ہوں میں

اگر دیکھو تو مجھ میں وسعتِ دریا بھی پاؤ گے
بظاہر دیکھنے میں قطرۂ ناآشنا ہوں میں

اگر چاہوں تو پل میں عرش کی زنجیر کو چھو لوں
بایں کوتاہ دستی بھی نشاط اتنا رسا ہوں میں

نشاط اعظمی

موحدِ اعظم اور مفتیٔ اعظم

مفتی المرا ئدیہ وافتار الکفر بالشعر

از جناب مولانا مولوی سلیم الدین صاحب جالبؔ مظاہری سہسرامی

حضرت مولانا سیمابؔ اکبرآبادی مدظلہٗ کی نظم "موحد اعظم" دنیائے ادب میں تاریخی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور یہ احسان ایک فتویٰ فروش مفتی کا ہے۔ نظم کا ماحصل و مقصد کیا ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہر معمولی علم رکھنے والا جس کو ادب سے دلچسپی ہو سمجھ سکتا ہے لیکن افسوس ایک **"عالم دین"** (بقول مدینہ) نہ سمجھ سکا یا سمجھا تو اس کو اس آئینے میں جو اپنے خد و خال نظر آئے کیونکہ مولانا سیمابؔ نے **نام نہاد اور ریاکارانہ عبادت کرنے والوں کو جھنجھوڑا تھا**۔ بات تھی معقول "چور کی ڈاڑھی میں تنکا" یہ مثل صادق آئی اور حملہ کا محاذ بطریق مخالف قائم کر دیا گیا یعنی نظم کی روح کو نظر انداز کر کے فروعات سے بحث ہونے لگی اس کی مثال یوں ہے ؎

من ز قرآں مغز را برداشتم ——— استخواں پیش سگاں انداختم ——— (مولانا رومؒ)

قرآن حکیم میں طب و یابس تمام چیزیں بیان کی گئی ہیں اسی لئے مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اچھی چیزوں کو لے لیا اور بری چیزوں کو چھوڑ دیا جیسے "بیع" اللہ تعالیٰ نے حلال کی اور "ربا" حرام۔ انھوں نے "بیع" اختیار کی اور دیگروں نے "ربا" کو بھی شاملِ جواز کر لیا بالکل اسی طرح ہمارے نام نہاد مفتی نے اصل مقصد کو قصداً چھوڑ دیا اور فروعات پر بحث فضول کر ڈالی جس وقت ایک مخالف کی نظم "مدینہ" میں مدیر کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی میں نے اسی وقت اندازہ لگا لیا تھا کہ مدیر مدینہ اور لوگوں کو اس کے خلاف لکھنے کی دعوت دے رہے ہیں غالباً یہی سمجھ کر حضرت آلِ مظفر نگری نے کوئی نوٹ لکھا جس کا ذکر خود مدیر "مدینہ" نے کیا ہے۔ لیکن شائع نہیں کیا۔ پھر ہمارے مفتی صاحب نے اپنا بیش بہا مضمون شروع کیا۔ اس دوران میں کچھ نظمیں بھی مخالفت میں شائع ہوئیں۔ میں نے مدیر "مدینہ" کو جوابی خط لکھا کہ جس طرح ایک مسلمان کو کافر بنانے کے لئے آپ نے "مدینہ" کے صفحات وقف فرما دیئے ہیں۔ امید ہے کہ اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ اُسے مسلمان ثابت کرنے کے لئے بھی فراخدلی سے کام لیں گے اگرچہ آپ نے نوٹ میں وعدہ فرمایا ہے کہ حامیانِ نظم کو موقع دیا جائیگا لیکن مزید اطمینان کے لئے آپ مجھے جواب دیں تو کرم ہوگا۔" لیکن افسوس کہ حامیٔ عالمِ دین نے میرے جوابی خط کا جس میں "سلام" بھی لکھا تھا کوئی جواب نہ دیا پھر میں نے احمد بخش صاحب ایجنٹ اخبارات سے خط لکھوایا اس کا جواب والیسی ڈاک سے آیا۔ اس لئے کہ لین دین کا معاملہ تھا۔ فرماتے ہیں:—

مکرمی!

دفتر میں مفتی مہدی حسن صاحب کے جواب میں مولوی سلیم الدین صاحب جالبؔ سہسرامی کا کوئی مضمون موصول نہیں ہوا ہے۔

اگر وہ مضمون آپ کو واپس پہنچ جائے تو دوبارہ بھیج دیجئے یا اُس کی نقل روانہ کر دیجئے۔ مضمون دیکھنے کے بعد ضرور شائع کر دیا جائیگا۔

"مدینہ" اپنی روایات اور اپنی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس رکھتا ہے، اطمینان رکھئے۔ والسلام

دستخط نائب مدیر

اس کے بعد میں نے مضمون رجسٹری کر کے بھیج دیا۔ ڈاکخانہ کی رسید ملی جس سے یہ معلوم ہوا کہ مضمون وصول کر لیا گیا ہے۔ لیکن آج تک یہ اطلاع نہ دی گئی کہ مضمون اشاعت کے قابل ہے یا نہیں۔ مجھے تو اس کا یقین ہو گیا کہ غریب ایڈیٹر کو خلافِ امید "عالم دین" کے خلاف مضمون پہنچا یا یہ کہ خود نوٹ لکھنے کی وجہ سے پس و پیش ہوا کہ اب تو "عالم دین" کے ساتھ ساتھ میں بھی کہیں کا نہیں رہا۔ اس میں دو بزرگوں کی آرا بھی شامل تھیں جو عالم بھی ہیں اور قابل بھی۔ تو مدیر صاحب نے خاموشی ہی بہتر سمجھی لیکن چونکہ وہ حامیٔ دین ہیں اس لئے ذرا اپنا فعل بھی

قرآن کی روشنی میں دیکھیں۔ قرآن کریم تو ہر وعدہ کی وفا کے لئے تاکید کرتا۔ اور "اوفوا بالعقود" فالباً مدیر "مدینہ" کے نزدیک ایک مسلمان کو خواہ مخواہ کافر بنا دینا زیادہ اہمیت رکھتا ہے بہ نسبت اس کے کہ وعدہ وفا کیا جائے۔ مگر وعدہ خلافی کرنے والوں کے لئے بھی تعزیر موجود ہے "لعنۃ اللّٰہ علی الکاذبین"۔

اب میں "عالم دین" اور مدیر "مدینہ" سے بطور خاص گذارش کروں گا کہ آپ حضرات جب سب کاموں سے فراغت پا چکیں اور اطمینان سے سونے لگیں تو اپنے اپنے ضمیر سے دریافت کریں، ماشاء اللہ آپ حضرات کے قلوب نور ایمان سے خوب روشن ہیں دیکھئے تو جواب کیا ملتا ہے آفریں؟ یا نفریں؟ ابھی تک تو سیماب کو خوب کھول کھول کر رسوا کر لیا گیا اب کلیجہ پر پتھر رکھکر دیکھتے جائیے، جواب نہ شائع کرنے سے بہت ایسے کم مایہ بھی سیماب کو کوسنے لگے جن کا میں نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا۔ ایک صاحب سمجھاتے ہیں ؎

سجدۂ آدم سے منکر اس لئے شیطاں ہوا ۔۔۔۔ اس کو خاکی جانتا تھا اور خود کو نور کا

ایک صاحب جمشید پور سے بذریعۂ "مدینہ" بولتے ہیں ؎

جو گزر گذرے کئے پر منفعل ہوتے سے کیا حاصل ۔۔۔۔ یہ کیا ہم منہ ادھر ہو حرم اُدھر تو بہ یہ ہو کل

لیجئے اب سیماب کا تو یہ بھی قول نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ خدا تو صرف اُن ملّاؤں کا ہے جو کافر سازی کا شغل رکھتے ہیں یا یہ کہ ان اللّٰہ علیٰ کل شیئ قدیر کہا ہے تو خدا جھوٹ بھی بول سکتا ہے یا حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو "علم کل" تھا یا "جزوی"۔ خدا شاہد ہے کہ کسی شاعر کی یہ جرأت کبھی نہیں ہو سکتی۔ ایک واقعہ سُنئے ایک مولوی صاحب ایک مولوی شاعر کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مولوی فلاں اور مولوی فلاں امکانِ کذب کے قائل ہیں لہٰذا وہ کافر ہیں۔ شاعر نے جواب دیا کہ مجھ سے کیوں کہلاتے ہیں۔ ہمارے یہاں تو ایک ہی کافر ہے اور وہ بہت کافر" ہے مگر مولوی صاحب پکے مولوی تھے کہا آپ بڑی غلطی پر ہیں جو کافر کو کافر نہ کہے وہ بھی کافر۔ اب شاعر گھبرایا، لیکن سنبھل کر جواب دیا "مولانا اگر آپ کے جانے کے بعد اُن میں سے کوئی آئے اور وہ آپ کے متعلق بھی مجھ سے چند باتیں کہہ کر مطالبۂ تکفیر کرے تو میں کدھر کا رہونگا، یہاں آکر مولوی صاحب کی منطق ختم ہوئی لیکن گئے تو شاعر پر افسوس کرتے ہوئے۔

یہ ہے آجکل کے خود ساختہ "عالم دین" کا کارنامہ جسے خالصاً لوجہ اللہ کہا جاتا ہے۔ آقائے نامدار حضور اکرم صلعم نے فرمایا ہے "ان شر الشر شرار العلماء"

دینِ حق از کافری رسوا تر است ۔۔۔۔ زانکہ ملّا مومنِ کافر گر است
دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد ۔۔۔۔ دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد
(اقبال)

اس فساد کی تشریح جالب صاحب نے اپنے اس مضمون میں اچھی طرح کی ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ کے بعد ناظرین سے گذارش ہے کہ جس نتیجہ پر پہنچیں اپنی رائے سے بذریعۂ "شاعر" مطلع فرمائیں تاکہ وہ رائیں مفتی صاحب کی خدمت میں بطور ہدیہ، کافر گری کے عوض میں پیش کر دی جائیں۔

انتہائی مجبوری سے یہ مضمون شاعر میں شائع ہو رہا ہے ادارۂ "شاعر" راضی نہیں تھا اور اس کی اشاعت مدیر "مدینہ" کی مصلحت کے خلاف تھی پھر کمال یہ کہ آجتک سیماب کو ماہ بماہ سے گالیاں دی جا رہی ہیں۔ مجھے اس کا اچھی طرح تجربہ ہو چکا ہے کہ مولانا سیماب کے جتنے مخالف ہیں وہ اتنے کم ظرف ہیں کہ مضمون اُن کے خلاف لکھتے اور لکھواتے ہیں۔ لیکن جب ادھر سے جواب جاتا ہے تو ہزار طرح کے حیلے حوالے کرتے ہیں۔

اگر مولانا سیماب "اللہ واحد" کے عنوان سے بھی نظم لکھیں تو کم ظرف حضرات اعتراض کرینگے کہ "کیا سیماب صاحب ابھی تک خدا کو چند سمجھتے تھے"؟ اس فتویٰ فروش مفتی کی حمایت میں ایسے حضرات بھی شامل ہیں جن کے کردار تو درکنار صورت بھی مسلمانوں کی سی نہیں لیکن ہیں مسلمان۔

جب مولانا سیماب نے جلم و شراب کے خلاف آواز بلند کی اور عابد و زاہد کا مذاق اُڑانے سے احتراز کرنے کو کہا۔ اُس وقت بھی خوب خوب گالیاں دی گئیں مگر یہ عالم دین اُس وقت خاموش رہا کیونکہ سیماب نے یہ تحریک پیش کی تھی، ان باتوں کو دیکھتے ہوئے مخالفین سیماب سے علاوہ اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ خدا ان کی خباثت دور کرے۔

بہر حال میں اپنا نوٹ ایک دیہاتی شاعر کے شعر پر ختم کرتا ہوں جو اُس نے شاید اسی دن کے لئے عالم رویا میں کہا تھا آج اُس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ بھی مفتی کے رتبہ برابر کا شریک ہے ؎

"شہید دشتِ پندار مفتی کو خدا رکھے بھلے مانس پہ لوٹ آئیں عبث کی تہمتیں جو نکلا ہیں"

قمر نعمانی سہسرامی

حضرت مولانا سیماب مدظلہ العالی (اکبرآبادی) کی نظم "موحدِ اعظم" کے متعلق جناب سید مہدی حسن صاحب مفتیؔ راندیر (سورت) کا وہ طول و طویل مقالہ جو اخبار "مدینہ" میں یکم اکتوبر ۱۹۴۱ء سے باقساط شائع ہوا ہے اگرچہ اس قابل نہیں کہ اس کا جواب دیا جائے لیکن صرف اس خیال سے کہ اکثر خاموشی کو کمزوری پر محمول کیا جاتا ہے۔ تردیدی مضمون کی ضرورت سمجھی گئی جو ہدیۂ ناظرین ہے۔

چونکہ ہر نظم اور مضمون کی تخلیق کی غرض و غایت ہوا کرتی ہے اس لئے جوابی یا تردیدی مضمون لکھنے سے پہلے زیرِ بحث نظم یا مضمون کی غرض و غایت معلوم کر لینی ضروری ہے تاکہ دور از کار اور خارج از بحث عنصر مقالہ میں شامل ہو کر غلط مبحث نہ پیدا کرے اور صاحبِ مضمون کو کہیں سے کہیں نہ پہونچا دے۔ اسی اصول کے ماتحت میں مفتی صاحب کے زیرِ نظر مضمون کے وہ اقتباسات درج ذیل کرتا ہوں جن سے اُن کے مضمون کی غرض و غایت پر روشنی پڑتی ہے :—

(۱) "نظم موحدِ اعظم کو میں نے اپنی بضاعتِ علمی کے مطابق چند بار بغور پڑھا اور ہر بار اس کے سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مجھ کو اس سے بحث نہیں کہ مولانا نے یہ نظم کس جذبہ کے ماتحت لکھی ہے اور نہ اس سے بحث کہ مولانا کے معتقدات کیا ہیں کہ ؎

محتسب را درونِ خانہ چہ کار

لیکن واقعہ یہ ہے کہ نظم کے اکثر اشعار زیادہ خطرناک اور اصولِ اسلامی کے نقطۂ نظر سے بہت بُرا اثر پیدا کرنے والے ہیں۔ کوئی ذی علم روشن خیال صحیح العقیدہ مسلمان ان کے مفہوم سے متفق نہیں ہو سکتا"

(۲) "جوابات کی جو نوعیت ہے اس سے یہ خوف پیدا ہو گیا کہ ذاکر صاحب کی طرح کہیں میری بھی شامت نہ آجائے لیکن پھر آزادانہ طور پر کچھ عرض کرنے کی جرأتِ بیباکانہ کی ہے۔ عناد مقصود نہیں اور نہ ایسے امور میں پڑ کر عزیز وقت ضائع کرنے کا عادی ہوں"

(۳) شرعی نقطۂ نظر سے میرا خیال ہے کہ اس نظم سے مذہب پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ خدائے پاک کی ذات اس کے صفات قدرت علم صدق عدل و انصاف وغیرہ پر بھی یہ نظم اثر انداز ہے اور جماعت انبیاء و رسل ملائکہ اور رفاصان امت پر بھی جو اسلامی اصول کے خلاف ہے"

اگرچہ مندرجۂ بالا اقتباسات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کو مولانا سیماب مدظلہ العالی سے نہ عناد ہے نہ اس سے بحث کہ مولانا نے یہ نظم کس جذبہ کے ماتحت لکھی اور نہ اس سے بحث کہ مولانا کے معتقدات کیا ہیں جبکہ اُن کا موضوع صرف مولانا کی نظم "موحدِ اعظم" ہے جسے وہ بوجوہ اسلامی اصول کے خلاف سمجھتے ہیں لیکن خود ان کے مضمون سے اسکی تصدیق نہیں ہوتی کیونکہ انھوں نے اپنے مقالہ میں متذکرہ بالا نظریہ کے بار ثبوت سے تجاوز ہو کر لا دبی اعتراضات۔ ذاکر صاحب کا خط، مولانا سیماب مدظلہ کا جواب، اور ذاکر صاحب کی نظم کو اس طرح جڑ دیا ہے کہ متذکرہ بالا اقتباس نمبر دو[۲] کی حیثیت عبارت آرائی سے زیادہ نہیں رہتی اور مفتی صاحب کا اصل منشا صرف ذاکر صاحب کی حمایت میں قصیدہ لکھنا معلوم ہوتا ہے مفتی صاحب اگر اسی پر اکتفا کرتے تو غنیمت تھا مگر وہ مفتی ہی کیا جو دس بیس مسلمانوں کو کافر نہ بنا ڈالے چنانچہ آپ نے مولانا سیماب مدظلہ العالی پر پے در پے کفر کا فتویٰ صادر فرما کر تجدیدِ ایمان کا مطالبہ بھی کر دیا۔ اللہ اللہ ایک مفتی اور یہ تلون مزاجی! یہ تضادِ بیان!! مفتی صاحب اور اُن کے حامیان کا اس غلط مبحث کی سعی نامشکور کو خواہ کچھ بھی سمجھیں مگر اہلِ نظر اُن کے فریب میں نہیں آسکتے۔ یہ دعویٰ ہی دعویٰ نہیں بلکہ حقیقت بھی ہے۔ چنانچہ میں تمہیداً صرف دو صاحبانِ علم و فضل کی رائے اس نظم کے متعلق، جس پر آپ کفر کا فتویٰ صادر فرما کر تجدیدِ ایمان کی دھمکی دے رہے ہیں،

درج کر رہا ہوں۔

"موحدِ اعظم"

حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم۔اے۔ فاضل دیوبند ایڈیٹر "برہان" و رفیق "ندوۃ المصنفین" دہلی کی گراں قدر رائے

"موحدِ اعظم کی نسبت عرض ہے کہ میں اس طرح کی لایعنی بحثوں میں شریک ہونا تضیعِ وقت سمجھتا ہوں۔ لیکن جب جبکہ آپ میری ذاتی خیال دریافت کرتے ہیں تو گذارش کرتا ہوں کہ میں نے ماہنامہ "ادیب" کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ نظم از اول تا آخر پڑھی تھی مگر مجھ کو اس کا گمان بھی نہیں ہوا کہ مولانا نے قرآنی حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کی ہے اس نظم کو پڑھ کر میرے دل پر یہ اثر ہوا کہ شاعر کا نقطۂ خیال مسلمانوں کو اُن کی موجودہ ریاکارانہ اور بے روح عبادت پر عار دلانا اور شاعرانہ انداز میں شیطان کے استقلال و پامردی کو بیان کرکے اُنھیں شرمندہ کرنا ہے صنائع اور بدائع میں ایک صنعت کا نام ہے حُسنِ تعلیل۔ اس صنعت کا مفاد یہی ہے کہ کسی چیز کی علت کوئی ایسی چیز بیان کی جائے جو درحقیقت اس کی علت نہ ہو مثلاً ؎

تا چشمِ تو ریخت خونِ عشاق
زلفِ تو گرفت رنگِ ماتم

پھر جب کوئی شاعر اس صنعت سے کام لیتا ہے تو اُس کا مقصد صرف ایک شاعرانہ خوبی پیدا کرنی ہوتی ہے اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اُس نے جو علت بیان کی ہے وہی اصلی علت ہے اور لوگوں کو چاہیے کہ وہ پہلے خیال کو چھوڑ کر اب شاعر کی بتائی ہوئی چیز کو حقیقی علت ماننے لگیں۔ اب سوال یہ ہے کہ شاعر کو اس صنعت کے استعمال کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ بے شمار صوفی اور عالم شعرا کے کلام سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ شعرا اس صنعت کا استعمال کثرت سے کرتے رہے ہیں۔ لیکن کبھی ان پر تبرّا نہیں کیا گیا۔

پس موحدِ اعظم میں بھی مولانا سیماب نے اگر اس اعتقاد کے باوجود کہ شیطان کا آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کرنا بربنائے استکبار تھا جیسا کہ خود قرآن سے ثابت ہے۔ شاعرانہ تخیل سے کام لیتے ہوئے بطور حُسنِ تعلیل کے یہ لکھدیا کہ اس کا انکار غایتِ توحید پر مبنی تھا تو میرے نزدیک مولانا نے کوئی گناہ نہیں کیا کیونکہ مولانا کا اصل مقصد تو عبادتوں میں خلوص پیدا کرنے کی ترغیب دینا ہے اس میں شیطان کے انکارِ سجود کی توجیہ ہا تو وہ محض ایک شاعرانہ تخیل ہے۔ مولانا یا کسی مسلمان کا یہ منشا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ وہ قرآن مجید کے بیان "ابیٰ واستکبر" کے بالمقابل اب اپنی طرف سے کوئی اور حقیقی علت بیان کرے۔ رہا شیطان کو موحد کہنا! تو میرے خیال میں اسلام کی اس سے توہین نہیں ہوتی۔ اسلام سے پہلے جو لوگ خدا کو ایک مانتے تھے وہ بھی موحدین کہلاتے تھے اگر اُن میں سے کسی شخص کو "موحدِ اعظم" کہہ دیا جائے تو کیا اس سے اسلام کی یا کسی اور مسلمان کی توہین ہوجائے گی؟ سبحان اللہ!

ہمارے یہاں بھی کیسے کیسے نکتہ آفریں حضرات موجود ہیں پھر کیسی دیدہ دلیری ہے کہ کلام پر اعتراض کرتے وقت لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ انھوں نے کلام سے جو مراد لی ہے آیا خود متکلم بھی اپنے مشہور و معروف عقائد نا اعمال کے باعث وہ مراد معہود فی الذہن رکھتا ہے یا نہیں؟ مولانا سیماب کو کون نہیں جانتا پرانی وضع قطع کے بزرگ ہیں۔ مذہبی رکھ رکھاؤ بہت رکھتے ہیں اور جہاں تک مجھ کو علم ہے نماز و روزہ کے بھی پابند ہیں۔ انھوں نے کسی نظم میں ملحدانہ یا زندقہ آمیز خیال ظاہر نہیں کیا۔ بزرگوں کے اسلامی اخلاق کو اختیار کرنے کی دعوت اُن کی نظموں میں اکثر جگہ ملے گی اُنھوں نے تو شاید ایک مرتبہ بھی اقبال کی طرح خدا کی شان میں یہ نہیں کہا "بخیل ہے یہ رزاق نہیں ہے" یا "بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے"!

مفتی صاحب کے مضمون کو میں نے بستہ جستہ کہیں کہیں سے

"پڑھا ہے میں اُسے دیکھوں کیا" "میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں"
مگر میرے نزدیک مولانا کی طرف سے ان سب باتوں کا مختصر جواب یہ ہے کہ
"شعر مرا بمدرسہ کہ برد"

حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب نظامی بدایونی مدیر "ذو القرنین" کی رائے

"آپ کی بے مثل نظم "موحد اعظم" نے تو اخباری دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ آپ کی یہ جدت طبع قابل داد ہے۔ افسوس کہ کافر ساز دنیا نے آپ کے مطلب کو سمجھا ہی نہیں"

اگرچہ ان بزرگوں کی رائے کے بعد مفتی صاحب کے فتوے کی کوئی اہمیت نہیں رہتی تاہم بطور تشریح اس فتوے پر روشنی ڈالنا مناسب سمجھتا ہوں
تکفیر کا فتویٰ بڑی اہمیت کا حامل ہے بازیچۂ اطفال نہیں شرعی معاملہ ہے جس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ فقہانے کہاں تک اس مسئلہ میں احتیاط برتنے کی تاکید کی ہے اس کا اندازہ اس عبارت سے کیجئے جس سے آپ قصداً چشم پوشی کرکے خیانت شرعی کے مرتکب ہوئے ہیں:—

"قالوا لو وجد سبعون روایۃ ولو ضعیفۃ بعدمہ یاخذ المفتی والقاضی بھا دون غیرھا۔

ترجمہ فقہانے کہا ہے کہ اگر کسی مسلمان کی تکفیر کے اثبات پر ستر روایتیں ہوں اور ایک روایت عدم تکفیر پر ہو خواہ وہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو تو مفتی اور قاضی کو اس ضعیف روایت کو معمول بنانا چاہیے نہ کہ دوسری روایتوں کو"

مفتی صاحب! کیا اصول فقہا کے مطابق مولانا سیماب مدظلہ العالی کی نظم ہی میں مسلمان ہونے کا ثبوت موجود نہ تھا؟ پھر آپ کو ان اشعار سے چشم پوشی پر کس جذبہ نے مجبور کیا؟

وہاں اک ترکِ سجدے سے ہوئی یہ برہمی پیدا قضا کتنے ہوئے ہیں تیرے سجدوں کا حساب اُن کا
وہ گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے سے اگر لاکھوں برس سجدہ میں سر مارا تو کیا مارا!"
ترکِ سجدہ سے بہت ارزاں ہیں فتنے ربائی میں میں واقف ہوں خدا تیری بہت ہلکی خدائی میں

کبھی سجدہ میں تیرے آستانے پر ملکوت کے کبھی ہیں جبۂ سجود در وازے تیارات کے
کبھی تو حسن کے قدموں پہ سجدہ ریز ہوتا ہے ترا ہر ایک سجدہ معصیت خیز ہوتا ہے
درخت و سنگ اور ابر و ہوا سجود میں تیرے ہیں جتنے اہل مذہب یہ سب سجود میں تیرے
وہی سجدہ خدا کو اور وہی سجدہ ہے انساں کو ترا نقص پرستش برہنمی آتی ہے شیطاں کو

پوری نظم میں اڑتالیس اشعار ہیں جن میں سے آپ نے اکتالیس شعر پر تکفیر کا حکم دیا ہے اور باقی سات اشعار چھوڑ دئیے ہیں۔ اگر اکتالیس اشعار کو اکتالیس علامات کفر درست تسلیم کر لیا جائے تو صرف ایک علامت ایمان سمجھی جائے تو بھی ایک علامت ایمان کی ہیں اکتالیس علامات کفر پر بقول فقہا غالب سمجھی جائے گی۔ اس موقع پر اسی مضمون کی حدیث کا اقتباس بھی بے محل نہ ہوگا۔

"وعن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلث من اصل الایمان الکف عمن قال لا الہ الا اللہ لا تکفرہ بذنب ولا تخرجہ من الاسلام بعمل الحدیث

ترجمہ انسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزیں ایمان کی اصل ہیں۔ رک جانا اس شخص سے جس نے لا الہ الا اللہ کہا، نہ کرو تکفیر اس کی کسی گناہ کی وجہ سے (اگرچہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو) اور نہ نکالو اس کو اسلام سے کسی عمل کی وجہ سے"

مفتی صاحب اب آپ اپنی دیانت داری کا اندازہ کیجئے۔ اگر یہ ناکافی ہو تو آئیے اس شئے (نیت) کی اہمیت بھی بیان کردوں جسے شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے "مدار اعمال" فرمایا ہے اور جس سے بحث کرنے سے آپ نے قصداً گریز کیا ہے:—

"عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انما الاعمال بالنیات الحدیث

(بخاری شریف باب کیف کان بدء الوحی)

ترجمہ حضرت عمرؓ بن خطاب سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ تمام اعمال نیتوں پر موقوف ہیں"

اس کے بعد مصنفِ نظم حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی کی نیت و عقائد پر بھی نظر ڈال لیجئے مولانا نے اپنے ایک ذاتی مکتوب میں مجھے لکھا تھا:—

"موعدِ اعظم لکھنے سے میرا منشا ہرگز یہ نہ تھا کہ شعائرِ اسلامی یا اسلامی شریعت کے خلاف اظہارِ خیال کروں۔ میرے معتقدات بفضلِ قرآن اور شریعت کی تعلیم پر قائم ہیں۔ نظم کو جس روشنی (اسپرٹ) میں پڑھا گیا وہ قطعاً غلط ہے۔ میں نے شخصیت اور انفرادیت کے مسئلہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس مسئلہ کی وضاحت کی تھی اور مسلمانوں کو سجود و طاعت بے ریا کا پیغام دیا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ مخالفین میری نظم کو غلط رنگ میں پیش کریں گے۔ افسوس،

"شعرِ من بمدرسہ رسید و کفر شد"

الحمد للہ کہ میں ایک سچا مسلمان ہوں اور میرے خیالات بھی وہی ہیں جو جمہور مسلمانوں کے ہیں۔ ایک ادبی اور مجلسی بحث کو مذہبی رنگ دے کر غلط بحث پیدا کر دینا اس "نو" "کفر انگیز" و "کافر ساز" کا بدترین کارنامہ جہالت ہے۔

"اللہم احفظنا من شرور العصر"

میں افسوس صد افسوس کہ آپ بحیثیتِ مفتی تجدیدِ ایماں کی دعوت دیں اور "نیت" کو نظر انداز فرما دیں۔ آپ نے محض اپنے مقصد کے اثبات اور قارئین کو غلط فہمی میں ڈالنے کے لئے قصداً مشہور و معروف حدیث سے اغماض کیا ہے اور یہ شرعی خیانت ہے۔ کیا اب بھی آپ کے اس کہنے کی کوئی وقعت رہ جاتی ہے کہ "اس نظم کے سلسلہ میں جو فریضۂ اسلامی مجھ پر عائد ہوتا تھا حتی الامکان اس کے ادا کرنے کی کوشش کی ہے خدائے پاک اسے قبول فرمائے"۔ تعجب نہیں کہ آپ جواب میں ظاہر و باطن کی آڑ ڈھونڈیں اس لئے وہ حدیث بھی پیش کئے دیتا ہوں جس میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تفحصِ معتقدات و جذبات کے متعلق تاکید فرمائی ہے:-

"وعن اسامۃ بن زید قال بعثنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی اناس من جھینۃ فاتیت علی رجل منھم فذھبت اطعنہ فقال لا الٰہ الا اللہ فطعنتہ فقتلتہ فجئت الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاخبرتہ فقال اقتلتہ وقد شھد ان لا الٰہ الا اللہ قلت یا رسول اللہ انما فعل ذالک تعوذاً قال فھلا شققت عن قلبہ متفق علیہ۔

(وشق القلب مستعار للفحص والبحث من حال قلبہ و لھذا اعداہ لعن)

ترجمہ:- اُسامہؓ ابن زید سے مروی ہے کہ کہا انھوں نے کہ بھیجا ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ جہینہ کے لوگوں کی طرف پس آیا میں ان لوگوں میں سے ایک مرد کے پاس اور اُس کو نیزہ مارا پس اُس نے کہا لا الٰہ الا اللہ پس میں نے اُس کو قتل کر دیا پھر میں آیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اور اِس واقعہ کی آپ کو خبر دی۔ آپ نے ارشاد فرمایا، کیا تم نے اُس کو قتل کر دیا؟ حالانکہ اُس نے لا الٰہ الا اللہ کہا۔ کہا میں نے یا رسول اللہ اُس نے پناہ لینے کے لئے ایسا کہا تھا۔ پس فرمایا آپ نے کیوں نہیں تم نے چیرا اُس کے دل کو۔ (ظاہر ہے کہ شقِ قلب سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کی نیت تفحص ہے)"۔

میں آپ کو آپ جیسے غیر ذمہ دار علمائے دین کے متعلق اللہ کے رسول کا ایک فرمان اور بتا دوں۔ بخاری شریف کتاب العلم کی پہلی حدیث ہے جس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ حدیث لمبی ہے مختصراً ذکر تا ہوں:-

"جاءہ اعرابی فقال متی الساعۃ؟ قال فاذا ضیعت الامانۃ فانتظر الساعۃ فقال کیف اضاعتھا قال اذا وسد الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ۔

ترجمہ۔ ایک اعرابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر پوچھا قیامت کب ہوگی؟ آپ نے جواباً ارشاد فرمایا جس وقت امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرنا، اُس نے عرض کی امانت کا ضائع کرنا کس طرح ہوگا؟ آپ نے فرمایا جب کام نااہل کے سپرد کر دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرنا"۔

آپ نے غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر کفر عائد کرتے ہوئے تجدیدِ ایماں کی دعوت دیدی ہے اور وہ کسی طرح عائد نہیں ہوتی اور جب عائد نہیں ہوتی تو فتویٰ دینے والے کے لئے جو ہمارے آقائے نامدار نے فرمایا ہے وہ بھی سن لیجئے:-

"عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ایما رجل قال لاخیہ کافر فقد باء بھا احدھما ھذا حدیث صحیح

(رواہ الترمذی (یعنی من قال لاحد ھو کافر وھو لیس بکافر فقد کفر قائلہ)۔

ترجمہ:۔ حضرت ابن عمرؓ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مسلمان نے اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہا پس تحقیق کہ لوٹے گا یہ کہنا ان دونوں میں سے ایک کی طرف (یعنی جس شخص نے کسی مسلمان کو کافر کہا حالانکہ وہ کافر نہیں ہے تو اس حالت میں کہنے والے پر کفر عائد ہوگا۔)"

"عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلعم من افتی بغیر علم کان اثمہ علی من افتاہ ومن استار علی اخیہ بامر یعلم ان الرشد فی غیرہ فقد خانہ (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شخص پر فتویٰ دیا گیا بغیر علم کے ہوگا گناہ اُس کا اوپر اس شخص کے جس نے فتویٰ دیا ہے۔ (یعنی مفتی) اور جس شخص نے اشارہ کیا اپنے بھائی پر ایسے امر کا کہ وہ جانتا ہے کہ اس کی بھلائی اس امر میں نہیں ہے تو اُس نے اپنے بھائی کی خیانت کی (ابوداؤدؒ)

مفتی صاحب! ابھی وقت ہے کہ ان تمام خرافات سے توبہ کر لی جائے ورنہ آئندہ بجز پشیمانی کے اور کچھ حاصل نہیں۔

یہ تو تھا مسئلہ تکفیر کے متعلق مختصر التماس، اس سے ناظرین کو اچھی طرح اندازہ ہوگیا ہوگا کہ مفتی صاحب نے اس نازک معاملہ میں احادیث اور اقوال فقہا کو نظر انداز کر کے کس قدر بے احتیاطی برتی ہے۔ اب میں یہاں سے مفتی صاحب کے ہر اعتراض پر مفصل بحث کر کے ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اس عالم دین نے نفسانی جذبات سے مغلوب ہو کر کس قدر غیر ذمہ داری سے کام لیا ہے۔ مفتی صاحب نے نظم مذکور کو اصولِ اسلام کے خلاف سمجھ کر اس پر اعتراضات کئے ہیں۔ اور ان اعتراضات کو قرآن وحدیث کی روشنی میں صحیح ثابت کرنے کی کوشش بلیغ فرمائی ہے یہ دوسری ذات شریف ہو جسے "موحد اعظم" اصول اسلام کے خلاف معلوم ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے اس نظم کے خلاف حضرت مولانا سیماب کو ایک خط لکھا تھا وہ خط جواب کے ساتھ "شاعر" اگست ۱۹۴۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ حضرت مولانا نے اُن کی غلط فہمی دُور کرنے کے خیال سے جس اختصار سے اُن کے دلائل لاطائل اور بے معنی اعتراضات کا جواب دیا ہے اگر وہ اس کا بنظر غور مطالعہ کرتے تو ان کی تمام غلط فہمیاں دُور ہو جاتیں۔ سچ پوچھئے تو مولانا کا جواب "موحد اعظم" کی خاصی تشریح ہے۔ برخلاف اس کے کہ جواب پر غور وخوض کیا جاتا "مدینہ" مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۴۲ء میں بعنوان "مشرکِ اولیٰ" آپ نے اپنی جوابی نظم شائع کرائی۔ جو نئی تحقیقت علمی خیالات کا مجموعہ اور ماتری کی پوٹ ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کی حمایت میں مفتی صاحب کا مضمون "مدینہ" یکم اکتوبر ۱۹۴۲ء سے شائع ہونا شروع ہوا۔ جو فضول اور اسقدر طول وطویل اور دلائلِ لاطائل سے مملو ہے کہ اس سے ایک عالم کی بے علمی کا بھرم کھل جاتا ہے۔ مجھے مفتی صاحب کی علمی ذہنیت پر سخت تعجب ہے کہ اُنھوں نے اپنی ان ذمہ داریوں کو جو شرعاً منصب جلیل پر عائد ہوتی ہیں بالائے طاق رکھ کر اور جذبۂ بغض وعناد سے مغلوب ہو کر یہ مضمون تحریر فرمایا کما لا ینبغی علی من لہ طبع سلیم حقیقت یہ ہے کہ جو کام کسی جذبۂ خاص اور بے جا طرفداری کے ماتحت ہوتا ہے وہ بس ہی خیانت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مفتی صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ فتویٰ نہیں بلکہ اُن کی شرعی خیانت اور علمی بے بضاعتی کا بدترین نمونہ ہے۔ مفتی صاحب کو کبھی خبر نہیں کہ نظم کا حُسن وقبح نتیجہ پر موقوف ہوتا ہے۔ اس کا تجزیہ نہیں کیا جاتا۔ ایک ایک شعر کا تجزیہ انتہائی جہالت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح تجزیہ کر کے نظم کو اسلامی نقطۂ نظر کے خلاف کہنے والا ایسی راہ پر گامزن ہے جو قطعی غلط ہے اور اہل اسلام کو ایسے دھوکے میں ڈالتا ہے جس کے مواخذہ سے وہ عند اللہ کسی طرح بری نہیں ہو سکتا۔ ضلّ فاضلّ ______

فرماتے ہیں:۔ "میں شاعر کا خریدار نہیں لیکن کبھی کبھی میرے پڑھنے میں بھی آجاتا ہے۔ اور زیادہ تر اس کے منظوم حصہ کو ہی شوق سے پڑھتا ہوں" اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے "مذہبی اہل علم کے پاس شاید ہی شاعر جاتا ہو اور شاید ہی اُن کو اس کے مطالعہ کا موقعہ نصیب ہوتا ہو کہ وہ ایسے رسالوں کے دیکھنے کے عادی نہیں ورنہ ان کو منظومات خیالیہ کے دیکھنے کی فرصت" آپ نے غور کیا کہ مفتی صاحب کی مندرجہ بالا دونوں عبارتوں کس قدر تضاد ہے اور کذب بیانی کا کیسا بین ثبوت ہے۔ ثانی الذکر عبارت سے ثابت

ہوتا ہے کہ مذہبی اہل علم تک "شاعر" کی رسائی نہیں اور نہ ان کو اس کے مطالعہ کا موقع نصیب ہوتا ہے کیونکہ وہ ایسے رسائل دیکھنے کے عادی نہیں یہ عجب الٹی منطق ہے مفتی صاحب کو اس کی بھی خبر نہیں کہ "عدم العلم بالشیٔ دلیل عدم استعمال الشیٔ" نہیں ہوتی یعنی کسی شے کے دیکھنے، کھانے پینے کے عادی نہ ہونے سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ آپ دیکھتے اور کھاتے پیتے ہی نہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس کسی رسالے کے مطالعہ کے متعلق بھی یہی کہا جائیگا دوسری وجہ مطالعہ کا موقع نصیب نہ ہونے کی یہ بتائی گئی ہے کہ "مذہبی اہل علم" کو منظومات خیالیہ کے دیکھنے کی فرصت نہیں۔ نیز بہ عدم الفرصتی کی وجہ خدمات دینیہ ہیں مثلاً:- درس و تدریس، تبلیغ، امامت تصنیف و افتا وغیرہ۔ مذکورۂ بالا عہدہ جس پر مفتی صاحب فائز ہیں، اپنے لوازمات و متعلقات کے لحاظ سے چوبیس گھنٹہ مصروفیت کا نہیں، غالباً صبح سے شام تک مفتی صاحب تحقیق و تحریر میں مشغول رہتے ہونگے۔ باوجود اس کے آپ کو رسالہ "شاعر" کے مطالعہ کا موقع نصیب ہوجاتا ہے پھر دوسرے صاحبانِ عہدہ مذکور کے لئے اس کی کلیتہً کیونکر نفی کی جاسکتی ہے۔ اس بنا پر کیا نتیجہ مرتب ہوسکتا ہے؟ مفتی صاحب کو جماعت اہل علم میں شمار کیا جائے یا جماعت . . . . . میں؟ پھر ایسے شخص کا فیصلہ دوسرے اہل علم کے حق میں کس طرح صحیح ہوسکتا ہے کہ ماہنامہ "شاعر" انکی نظر سے نہیں گذرتا ع وللناس فیما یعشقون مذاھب

اس کے بعد مفتی صاحب مدیر "شاعر" کی یہ تحریر نقل کرتے ہیں "ہزاروں علما، فضلا، اور فداکارانِ قوم کی نظر سے یہ نظم گذری، لیکن کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا (شاعر اگست ۱۹۴۱ء) اور اس کے متعلق فرمایا جاتا ہے کہ:- "میرے نزدیک مبالغۂ غیر معمولی ہے جو غلو کی حدود سے بھی خارج ہوکر غیر واقعی بنگیا ہے"

سبحان اللہ ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

مفتی صاحب نے مدیر "شاعر" کی تحریر سمجھی ہی نہیں، ورنہ اس اعتراض کی نوبت نہ آتی، مدیر "شاعر" کی عبارت مذکورہ من حیث اجتماعی ہے نہ من حیث انفرادی ——— یعنی مدیر شاعر نے یہ کہاں کہا کہ ہزاروں علما اور ہزاروں فضلا اور ہزاروں فداکارانِ قوم کی نظروں سے یہ نظم گذری۔ علما، فضلا، کا ذکر بغیر حرفِ عطف میرے دعوے کے لئے شاہد صادق ہے کیا بحیثیت مجموعی کوئی صاحب عقل، ذی علم اس سے انکار کرسکتا ہے کہ نظم "موعدِ اعظم"، ہزاروں علما، فضلا کی نگاہوں سے نہیں گذری ہوگی؟ علاوہ ازیں مدیر "شاعر" بذیل عنوان تجزیہ "شاعر" جولائی ۱۹۴۱ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ:- "یہ نظم ماہنامہ "ادیب" دہلی کے لئے لکھی گئی تھی اُس میں شائع ہونے کے بعد چونکہ یہ بے حد مقبول ہوئی اس لئے بطورِ خاص "شاعر" میں بھی شائع کررہا ہوں"۔ کیا ماہنامہ "ادیب" (دہلی) جو ایک کثیر الاشاعت رسالہ ہے اور پھر ماہنامہ "شاعر" (آگرہ) میں نظم مذکور کے شائع ہونے کے بعد بھی اس شبہ کی گنجائش باقی رہ سکتی ہے؟ اس سے معلوم ہوگیا کہ مدیر "شاعر" کی مندرجہ بالا تحریر مبالغہ نہیں بلکہ بیانِ امرِ واقعی ہے ع

رأیت شیأ و غابت عنک الاشیاء

کیا میں آپ سے دریافت کرسکتا ہوں کہ آپ نے مدیر "شاعر" کی تحریر "اعتراض نہیں کیا" تک نقل کرکے کیوں چھوڑ دی؟ اس کے بعد مدیر "شاعر" نے یہ بھی تو لکھا تھا کہ:- "خود مولانا سید محمد ارتضیٰ صاحب واحدی مدیر "ادیب" و "نظام المشائخ" دہلی نے بڑے اہتمام سے یہ نظم شائع کی ہے"۔ اس نقل سے کون شے مانع ہوئی؟ درست ہے جب آپ اس کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:- "لیکن واقعہ یہ ہے کہ نظم کے اکثر اشعار یقیناً زیادہ خطرناک اور اصول اسلامی کے نقطۂ نظر سے بہت برا اثر پیدا کرنے والے ہیں۔ کوئی ذی علم روشن خیال صحیح العقیدہ مسلمان ان کے مفہوم سے کبھی متفق نہیں ہوسکتا"۔ اور حضرت مولانا واحدی نے کُل نظم سے متفق ہوکر اپنے ماہنامہ "ادیب" میں اہتمام کے ساتھ اس نظم کو شائع کیا تو بھلا وہ آپ کے نزدیک روشن خیال، صحیح العقیدہ مسلمان کس طرح ہوسکتے، اور ان کا جماعتِ مذکورہ میں کس طرح شمار ہوسکتا ع

کیا کہوں آپ کی دانائی ہی دانائی ہے

صرف آپ اور ذاکر صاحب ان اوصاف سے متصف ہیں اور صرف آپ ہی لوگوں کے قلوب میں شمع ایمان روشن ہے اور کسی نظم پڑھنے والے کا دل نورِ ایمان سے منور نہیں۔

"لا تزکوا انفسکم" ـــــ "اللہ اعلم باھل البدعۃ منکم"۔ ناظرین! مفتی صاحب کی لغوی تحقیق کی بلند پائگی بھی ملاحظہ فرمالیں کہ ہنوز حضرت کو مبالغہ کے معنی اور اس کے اقسام سے بھی واقفیت نہیں۔ اس پر آپ نے "موعدِ اعظم" کے اس مصرع "کبھی یہ بات آئی تیری تخئیل کہن میں بھی" کے ماتحت لفظ "تخئیل" کے نظم

کرنے پر اپنی لغت دانی کا پرزور الفاظ میں دعویٰ کیا ہے درست ہے ؎

کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

مصرع مذکورہ میں لفظ "تخیل" کے متعلق وہیں بحث کی جائیگی یہاں مبالغہ کی تحقیق لغوی ملاحظہ فرمائیے "مبالغہ بضم میم و فتح لام سخت کوشیدگاں در کارے و با صطلاح صفات محمودہ یا مذموم شخصے بطریقے بیان کردن کہ مستبعد نماید یا محال اگر بعقل و عادت ممکن باشد مبالغہ تبلیغ گویند و اگر بہ عقل ممکن و بہ عادت ناممکن باشد مبالغہ اغراق خوانند و اگر بعقل و عادت ہر دو محال باشد مبالغہ غلو نامند"

حاصل:- مبالغہ تین قسموں پر ہے (۱) جو عقل و عادت کے موافق ہو اس کو تبلیغ کہتے ہیں (۲) جو عقل کی رُو سے ٹھیک اور عادت کے خلاف ہو اُسے "اغراق" کہتے ہیں (۳) جو عقل اور عادت دونوں سے لگاؤ نہ کھائے "غلو" کہلاتا ہے۔

اب محقق مفتی صاحب کی لغت دانی پر نظر کیجئے۔ آپ فرماتے ہیں مدیر شاعر" کا یہ کہنا وہ مبالغہ ہے جو غلو کی حدود سے خارج ہو کر غیر واقعی بن گیا ہے۔ آپ نے صرف مبالغہ غلو پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سے بھی ترقی دیدی اب میں کہتا ہوں کہ کیا کوئی معمولی پڑھا لکھا انسان بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہزاروں علما، فضلا اور فدا کارانِ قوم کی نظروں سے اس نظم کا گذرنا باعتبار عقل و عادت محال ہے۔ چہ جائیکہ مفتی رانتد پڑ جسے علم عربی و فارسی اور اردو میں بزعم خود ید طولیٰ حاصل ہے۔ گذشتہ تحریر سے بخوبی معلوم ہوگیا کہ مفتی صاحب کا اسے مبالغہ غلو کہنا غلط اور مبالغہ غلو سے تجاوز کرنا غلط در غلط ہے! العجب ثم العجب

نہ محقق بود نہ دانشمند
چارپائے بر دکتابے چند

آگے ارشاد ہوتا ہے :- "مذکورہ شذرہ میں جن کے نام ظاہر کئے گئے ہیں مستند مذہبی علما کی جماعت میں اُن کا شمار نہیں تاکہ وہ مذہبی نقطۂ نظر سے پرکھ کر اس پر کوئی شرعی حکم لگا سکیں اور وہ خواص و عام میں مسلم اور قابلِ قبول ہوں ان کی مذہبی علمی حیثیت سے عام طور مسلمان واقف ہیں اور یہ بڑی مذہبی ذمہ داری ہے۔"

مذکورہ شذرہ سے اگر الاقرب فالاقرب کی بنا پر شاعر" اگست ۱۹۴۱ء نمبر ۶ مراد ہے تو یہ قطعاً غلط ہے کیونکہ اس میں مدیر نے علما کے نام ظاہر نہیں کئے ہیں الا مولانا سید محمد ارتضیٰ صاحب واحدی مدیر "ادیب" کا اسم گرامی۔ کیا آپ کے نزدیک موصوف کا شمار مستند مذہبی علما کی جماعت میں نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو یہ آپ کی نفسانیت کا بدترین ثبوت ہے۔ صرف آپ کے استثنا سے دنیائے اسلام موصوف کے نام نامی کو مذہبی علما کی جماعت سے مستثنیٰ نہیں کر سکتی۔ علاوہ ازیں آپ کے دعوے کے ثبوت کیلئے صرف مولانا واحدی کا ذکر کافی نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ نے فرمایا ہے "جن کے نام ظاہر کئے گئے ہیں"۔ اس جملے سے جمع کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور واحد پر جمع کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ کما لا یخفی علی من یعلم قواعد العربیہ ——— اور اس سے اوپر "شاعر" جولائی ۱۹۴۱ء کا ذکر ملتا ہے جسے نظم "موحد اعظم" کا دیباچہ تنقید بنایا گیا ہے وہ عبارت یہ ہے:—

"شاعر جولائی ۱۹۴۱ء میں شیطان سے متعلق مولانا سیماب کی ایک نظم "موحد اعظم" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جو ماہنامہ "ادیب" دہلی میں بھی نکل چکی ہے"۔ مذکورہ ماہنامہ میں بھی کہیں مذہبی علمائے کے نام کا ذکر نہیں!

معلوم ہوگیا آپ کے مذکورہ شذرہ میں کوئی ایسا نہیں جس میں مذہبی علما کے اسمائے گرامی بیان کئے گئے ہوں سچ ہے "دروغ گو را حافظہ نباشد" اور اگر اس سے آپ کی مراد مدیر "شاعر" کی یہ عبارت ہے :-

"ہزاروں علما، فضلا اور فدا کاران قوم" تو ظاہر ہے کہ نام کا اطلاق الفاظ مذکورہ پر نہیں ہو سکتا۔ کیا کوئی معمولی پڑھا لکھا بھی، عالم، فاضل کو نام کہہ سکتا ہے؟ ناظرین کو "حوالۃ المفتی فی ذہن المفتی" سے متعجب نہیں ہونا چاہئے اس کے علاوہ چارہ کار ہی کیا تھا کہ مدیر شاعر" نے جس نمبر میں علما کے ان تائیدی خطوط کو جو نظم کی موافقت میں دفتر میں موصول ہوئے تھے اُن کے ناموں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ناظرین کو ان سے ناواقف رکھتے ہوئے اُنہیں غیر مستند ظاہر کر کے اپنا ہم خیال بنا لیا جائے لیکن ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

مفتی صاحب! اس طرح رجماً بالغیب عدم استناد کی نسبت قائم کرنی آپ کی جہالت ہے کیا آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ از روئے شرع ان کے غیر مستند ہونے کے متعلق آپ نے تحقیق کی ہے؟ کیا یہ مذہبی ذمہ داری نہیں؟ صرف آپ کے غیر مستند کہہ دینے سے کوئی غیر مستند نہیں ہو سکتا اور بغیر دلیل قوی کافر کہہ دینے سے کافر ہو سکتا ہے خوب یاد رکھئے اور آئندہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ حکم سے احتراز کیجئے کہ ان بعض الظن اثم۔ ناظرین وہ خطوط

خطوط ستمبر ۱۹۴۱ء کے "شاعر" میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مخفی نہ رہے کہ یہ خطوط مذکورہ ماہنامہ کے شذرہ میں نہیں شائع ہوئے ہیں۔ جناب مفتی صاحب کو باوجود ادعائے ہمہ دانی شذرہ کے معنی کی بھی خبر نہیں۔ انھیں خطوط میں اس خاکسار خادمِ علامہ سیماب مدظلہٗ کا بھی خط شامل ہے فخر یہ نہیں کہتا اور نہ آپ کی طرح خدانخواستہ مجھے غرورِ علم ہے "وفوق کل ذی علم علیم" بہ صفت آپ ہی کو مبارک ہو۔ صرف آپ کے دعوے کی تغلیط کی غرض سے واما بنعمۃ ربک فحدث کے ماتحت اس کے اظہار پر مجبور ہوا کہ خاکسار نے مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور (یو۔ پی) میں عربی علوم کی تکمیل کرکے بفضلہ امتیازی سند حاصل کی ہے ؎

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے

مفتی صاحب آپ کے بُتِ پندار اور ادعائے ہمہ دانی کو شکست دینے کے لئے صرف یہی خادمِ سیماب کافی ہے۔ "تا بدیگراں چہ رسی"

مفتی صاحب کا ارشاد ہے کہ "شاعر" میں جن کے نام ظاہر کئے گئے ہیں وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ نظم "موحدِ اعظم" کو مذہبی نقطۂ نظر سے پرکھ کر اس کی صحت یا عدمِ صحت کا حکم لگا سکیں"۔ ع "بجا ارشاد ہوتا ہے بجا ارشاد کرتے ہیں"

اس اعتبار سے پرکھنے کی قوت تو قدرت نے صرف آپ ہی کو عطا کی ہے پھر دوسرے مذہبی علماء کا حکم آپ کی موجودگی میں کس طرح مسلّم اور قابلِ قبول ہو سکتا ہے ماشاء اللہ کس طرح پردہ پردہ میں اپنی علمی قابلیت کے اظہار کی کوشش کی گئی ہے اور دوسروں کو اپنے مقابلہ میں جاہلِ محض ثابت کیا گیا ہے! ؎

غرورِ علم نے سکھلا دیا ہے مفتی کو
کہ عالمانِ زماں پر زبانِ راز کرے
(اقبال) (رباعی تصرف)

یہی نہیں کہ آپ نے اس خیال کو صرف اپنے ہی تک محدود رکھا ہے بلکہ آپ صاف الفاظ میں فرماتے ہیں "ان کی مذہبی علمی حیثیت سے عام طور پر مسلمان واقف ہیں" سبحان اللہ، عام مسلمانوں کی رائے کا علم آپ کو کیونکر ہو گیا؟ جس کی بنا پر آپ نے سب کو اپنا ہمنوا خیال کر لیا ع

"ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب میری نظر سے آپ کی وہ تحریر گذری جس سے حضرت مولانا پر اثباتِ کفر کا حکم دیا گیا ہے۔ کیوں صاحب؟ اگر نظم "موحدِ اعظم" آپ کے خیال میں اسلامی نقطۂ نظر کے خلاف اور کھلا کفر ہے اور اسی بنا پر آپ نے حضرت مولانا پر کفر کا فتویٰ صادر فرمایا ہے اور تجدیدِ ایمان کی دعوت دی ہے تو ان لوگوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جنھوں نے اس نظم کی موافقت میں خطوط لکھے ہیں؟ اور جو آپ کی نظرِ تکفیر اثر سے گذر چکے ہیں کیا اُن پر بھی "الرضاء بالکفر کفر" کے ماتحت کفر کا حکم عائد نہیں ہوتا؟ آخر اس فریضہ کی انجام دہی میں آپ نے کیوں پہلو تہی کی؟ ع

"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے"

مجھے افسوس ہے کہ آپ اس سلسلہ میں اپنے فریضۂ اسلامی سے کماحقہٗ سبکدوش نہ ہو سکے تو پھر کیونکر امید رکھتے ہیں کہ خدائے پاک آپ کی اس کوشش کو جو آپ نے خالصاً لوجہ اللہ کی ہے قبول فرمائے گا۔ کاش آپ موافقین نظم کے لئے بھی تھوڑی سی کوشش اور کرتے تو بہت ممکن تھا کہ آپ کی یہ سعی عند اللہ مقبول ہو جاتی مگر اس صورت میں عند اللہ ماجور ہونے کی توقع تو نہیں ہاں عند الشیطان ضرور مقبول ہوگی اور اس سعیِ نامسعود کا اجر ضرور ملیگا۔

ہر آنکہ تخمِ بدی کشت و چشمِ نیکی داشت
دماغ بیہدہ پخت و خیالِ باطل بست

مفتی صاحب فرماتے ہیں: "آج دُنیا مولانا کے لفظ سے نہ گھبراتی نہ دھوکہ کھاتی ہے کہ ہر کس و ناکس کے لئے اس لفظ کے استعمال کا عام رواج ہے اب تو یہ غریب لفظ ہمارے ہاتھوں اتنا پامال ہو چکا ہے کہ خود یہ اپنے اوپر ماتم کناں ہے اور ہر ساعت ہم کو کوستا ہے اب اس کی کسی بھاؤ قدر نہیں"۔ گذشتہ تحریر کے بعد اس تحریر کی کوئی ضرورت نہیں تھی پھر یہ الگ لفظ "مولانا" کے اطلاق کے متعلق صفحۂ قرطاس مفتی صاحب کی خامہ فرسائی کا کیوں رہینِ منت بنا؟ ناظرین کرام اس سے متعجب ہوں اس سے مفتی صاحب کا روئے سخن مولانا سیماب کی طرف ہے چنانچہ تیسری قسط میں آپ نے "علی الرغم ملائکہ" کی ترکیب پر اعتراض کرتے ہوئے اس کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ ملاحظہ ہو:—

"اب اس گواہ عادل نے بتایا کہ "علی الرغم ملائکہ" کاتب کی غلطی نہیں ناظم ہی کی عادت ہے۔ اسی لئے عرض کیا کہ "مولانا" کے لفظ سے اب دُنیا گھبراتی نہیں ہے کہ اب یہ غیر معمولی با اہتمام بالشان لفظ نہیں رہا"۔ مفتی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ

حضرت مولانا سیماب مدظلہ کو لوگ "مولانا" کیوں کہتے ہیں؟ اگر مفتی صاحب کے خیال میں مولانا کہلانے کا صرف وہی مستحق ہے جس نے مدارس اسلامیہ میں تکمیل علم کے بعد سند حاصل کی ہو تو بفضلہ تعالیٰ مولانا سیماب اس طرح بھی اس نعمت سے شرف یاب ہیں۔ کاش مولانا کے علمی مراتب کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی۔ اس کدورت باطنی کا بُرا ہو کہ جن کے متعلق جو چاہا لکھ مارا۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ راندیری کے مطالعہ میں "کلیم عجم" ہے کیونکہ اس کے اشعار بے جا اپنے مضمون میں نقل کئے ہیں اور مولانا سیماب نے جو "شعر الحیات" کے عنوان اپنے حالات لکھے ہیں وہ بھی یقیناً نظر سے گذر چکے ہیں۔ اس لئے کہ "شعر الحیات" کا یہ ٹکڑا لے کر "دیکھا جو کچھ دیکھا اور پایا جو کچھ پایا" باندازِ تمسخر مختلف مقام میں نقل کیا ہے۔ میں راندیری سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جہاں مولانا سیماب نے اپنے تعلیمی حالات لکھے ہیں وہاں اس عبارت کے دیکھنے سے آپ کی آنکھیں کیوں بے نور ہوگئیں؟ دیکھی آپ کی غالباً لوجہ اللہ سعی! خیر طوعاً ہو یا کرہاً وہ عبارت ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت مولانا سیماب تحریر فرماتے ہیں:—

"شاعری میرا فطری ذوق اور پدری میراث ہے۔ جب میں حضرت
مولانا جمال الدین سرحدی مرحوم، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی مرحوم
حضرت مولانا قمر الدین مرحوم اور حضرت مولانا عبد الغفور مرحوم
انار اللہ برہانہم سے عربی ادب، اصول اور منطق کی تکمیل میں
مصروف تھا اور فارسی میں سکندر نامہ، مینا بازار، مثنوی غنیمت
رقعات مرزا قتیل، سہ نثر ظہوری، ابوالفضل وغیرہ کتابیں ختم کرچکا
تھا اور علم عروض بھی میرے درس میں تھا اُس وقت میں یکتا تھا
کہ اس علم سے مجھے خاص دلچسپی ہے کتب متداولہ عربی و فارسی کی تکمیل
کے بعد حضرت والد مرحوم نے مجھے انگریزی مدرسہ میں داخل کردیا جو
گورنمنٹ کالج اجمیر کے تعلق والحاق سے برانچ اسکول کہلاتا تھا اور
اب بھی بدستور موجود ہے۔"

کیا حضرت مولانا سیماب اس حقیقت کے باوجود بھی راندیری کے نزدیک مولانا کہلانے کی اہلیت نہیں رکھتے؟ اور وہ لوگ جو حضرت سیماب کو لفظ مولانا سے یاد کرتے ہیں، ہمیں وہ راندیری کے نزدیک حق بجانب نہیں؟ ہاں یہ اور بات ہے کہ راندیری صاحب تعصب اور نفسانیت کی بنا پر مولانا کا اطلاق حضرت سیماب پر جائز نہ سمجھیں لیکن ان کو یقین رکھنا چاہئے کہ صرف اُن کے انکار سے مولانا کے فضل و کمال میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوسکتی وللہ در القائل

نقل للعیون العمی للشمس اعین — سواک یراہا فی مغیب ومطلع

اے مخاطب اندھی آنکھوں والوں سے کہدے تمہارے سوا اور آنکھیں ایسی موجود ہیں جو آفتاب کو طلوع اور غروب ہوتے دیکھتی ہیں اگر تم نے نہ دیکھا تو کیا ہوا تمہارے نہ دیکھنے سے آفتاب کی نفی نہیں ہوسکتی۔ ونعم ما قال السعدی رح

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم — چشمۂ آفتاب را چہ گناہ
راست خواہی ہزار چشم چناں — کور بہتر کہ آفتاب سیاہ

اور اگر آپ کے نزدیک مولانا کہلانے کا معیار ادائے خاص سے سرِ بے مغز پر دستارِ فضیلت کا لپیٹنا، پنڈلیوں تک پائجامہ کا ہونا ایک عصا کا بدست اور ایک جبّہ دراز کا زیبِ تن ہونا ہے تو یہ ہیئت کذائیہ آپ ہی کو مبارک ہو خواہ عقیدہ اور عمل اس کے برعکس ہی کیوں نہ ہو۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎ :—

خانۂ شرع خراب است کہ اربابِ صلاح
در عمارت گری گنبد دستارِ خودند

ناظرین نے اب اچھی طرح مفتی صاحب کے جذبۂ عناد و بغض کا اندازہ کرلیا ہوگا، اللہ اللہ کیا اندھیر ہے کہ ایک طرف تو سب کو غیر مستند ثابت کردیا گیا۔ دوسری طرف لفظ "مولانا" کا اطلاق غلط قرار دیا گیا ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

گویا مجموعۂ اوصاف صرف آپ ہی کی ذات بابرکات ہے اور تمام امتیازی شان صرف آپ ہی کے شایانِ شان ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی میں اس کی صلاحیت نہیں کہ لفظ "مولانا" کا صحیح استعمال سمجھ سکے۔ اس لئے اب لوگوں کو چاہئے کہ کسی کو مولانا کہنے کی اس وقت تک جرأت نہ کریں جب تک حضرت علامہ مفتی سید مہدی حسن صاحب قبلہ سے باضابطہ اجازت حاصل نہ کرلیں تاکہ اُن کے قول کے مطابق لفظ "مولانا" صحیح معنی میں مستعمل ہو اور اس کے نامی سلسلہ کا سدِ باب ہوجائے اور مفتی صاحب اس کے ہر ساعت کوسنے کی تکلیف سے نجات پاجائیں۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں یہ کہونگا کہ لفظ "مولانا" اپنے اوپر صرف اس لئے نام کناں ہے کہ اس کا اطلاق مفتی صاحب جیسی غیر ذمہ دار "کافر گر" شخصیت پر بھی ہونے لگا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بیچارے کی اب کسی بھاؤ قدر نہیں۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا ان شر الشر شرار العلماء

جناب راندیری صاحب اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں "مدیر کے مذکورہ شذرہ کے بعد نظم کے اچھوتے اور فلسفیانہ خیالات کے متعلق کچھ عرض کرنا بعد از وقت بعید اور چھوٹا منہ بڑی بات کے مرادف ہے پھر وہ بھی ایسی صورت میں کہ ذاکر صاحب کا خط اور اس کا جواب از مولانا سیماب "شاعر" اگست ۱۹۴۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ جواب کی جو نوعیت ہے اس سے یہ خوف پیدا ہو گیا کہ ذاکر صاحب کی طرح کہیں میری بھی شامت نہ آجائے۔ لیکن پھر آزادانہ طور پر کچھ عرض کرنے کی جرأت بے باکانہ کی ہے۔ عناد مقصود نہیں اور نہ ایسے امور میں پڑکر عزیز وقت ضائع کرنے کا عادی ہوں کہیں ایسا نہ ہو اقبال مرحوم کی تقلید میں میرے معروضات کو بھی مولانا روایات خرافاتیہ سے تعبیر کر دیں۔"

سبحان اللہ چشم بد دور لفظ مولانا کی تکذیب فرمانے کے بعد مفتی صاحب مولانا سیماب کو خود مولانا لکھ رہے ہیں۔ "جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے" پھر اس عبارت آرائی کا کیا کہنا جو اجتماع ضدین کی حامل ہے۔ یعنی آپ نظم کے متعلق کچھ فرمانا بھی چاہتے ہیں اور نہیں بھی لا الی ھؤلاء و لا الی ھؤلاء کی حیرت انگیز کشمکش میں مبتلا ہیں اول الذکر صورت کے لئے ذاکر صاحب کا خط اور اس کا جواب از حضرت مولانا سیماب عناں گیر ہے اور ثانی الذکر کے لئے جرأت بے باکانہ کو پیش آہنگ بنایا جاتا ہے۔ آپ کی اس جرأت بے باکانہ کا کیا کہنا! کہاں تو کچھ ارشاد فرمانا چھوٹا منہ بڑی بات کے مرادف تھا لیکن جب جرأت بے باکانہ ہوئی تو ایسی کہ خوف خدا اور ارشادات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پس پشت ڈال کر ایک مسلمان کو دائرہ اسلام ہی سے خارج کر دیا۔ درست ہے موجودہ دور میں ایک مفتی کی جرأت بے باکانہ کم از کم اتنی تو ضرور ہونی چاہیئے کہ ایک مسلمان کا اسلام اس کی تکفیر کی نذر ہو جائے ورنہ پھر جرأت بے باکانہ ہی کیا۔ حضرت مولانا مدظلہ مستحق صد تبریک ہیں کہ اس عہد کفر انگیز میں مفتی راندیری نے اپنی جرأت بے باکانہ سے کام لیکر کفر کا فتویٰ صادر کیا جو اس دور میں ایک مسلمان کے لئے حقیقتاً ایمان کامل کی سند ہے مولانا حالی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح فرمایا ہے۔

کہنا فقہا کا مومنوں کو بے دیں | سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقیں
مومن سے ضرور ہوگا ہر قدمیں سوال | تکفیر ہی کی تھی فقہا نے کہ نہیں؟

مبارک ہیں وہ ہستیاں جن کو فقہائے دور حاضر نے اس سوال کا اثبات میں جواب دینے کا موقع دیدیا ہو

تحریر زیر بحث میں آپ نے ذاکر صاحب کے اس خط کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جسے انہوں نے نظم "موحد اعظم" کی مخالفت میں لکھا تھا ناظرین "شاعر" اس خط کی گستاخانہ تحریر سے بخوبی واقف ہیں غالباً ناظرین اخبار "مدینہ" کی نظروں سے بھی وہ خط گذرا ہو گا۔ جس میں املا کی کافی غلطیاں موجود ہیں ملاحظہ ہوں "فلسفہ" کو فُسلفہ، "شعبہ" کو شُبعہ، انبیاء علیہم الصلوٰۃ کو علیہ الصلوٰۃ و التسلیم کو تسلیم صلی علیٰ کو صلّے علےٰ خدائے تعالیٰ کو خدا تعلیٰ یہ یونیورسٹی میں بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ تک بھاڑ جھونکنے اور استاد سے عقیدت نہونے کی بیّن دلیل ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

خط کا انداز تحریر ناگفتہ بہ ہے اختلاف رائے کوئی بری شے نہیں لیکن بہر حال استاد کے حفظ مراتب کا لحاظ واجب التقدیم ہے۔

کچھ تو ہوتا ہی اُسے حفظ مراتب کا لحاظ
کچھ بھی ذاکر میں اگر جوہر انساں ہوتا

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس موقع پر استاد کے احترام و اکرام کے متعلق حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ارشادات اور فقہائے عظام کے اقوال نقل کر دوں تاکہ ذاکر نامذکور کو استاذ کی حرمت کا بخوبی اندازہ ہو جائے اور وہ اپنے صحیح العقیدہ ہونے کا فیصلہ کر سکے اور مفتی صاحب بھی اپنی حمایت بیجا پر پشیمان ہوں۔ اعلم بان طالب العلم لاینال العلم ولا ینتفع بہ الا بتعظیم العلم واھلہ وتعظیم الاستاذ

وتوقیرہ قیل ما وصل من وصل الا بالحرمۃ، ما سقط من سقط الا بترك الحرمۃ والتعظیم وقیل الحرمۃ خیر من الطاعۃ الا یری ان الانسان لا یکفر بالمعصیۃ وانما یکفر بترك الحرمۃ ومن تعظیم العلم تعظیم المعلم۔ قال علی کرم اللہ وجہہ انا عبد من علمنی حرفا واحدا ان شاء باع وان شاء اعتق وان شاء استرق

رأیت احق الحق حق المعلم ۔ واوجبہ حفظا علی کل مسلم
لقد حق ان یھدی الیہ کرامۃ ۔ لتعلیم حرف واحد الف درھم

وقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من علم عبد آیۃ من کتاب اللہ فھو مولاہ۔ فانہ روی عنہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال خیر الاباء من علمك۔ روی انہ قیل الاسکندر ذی القرنین لم تعظم استاذك اکثر من ابیك فقال ولنعم ما قال لان ابی انزلنی من السماء الی الارض واستاذی یرفعنی من الارض الی السماء ووجہ ما قال ان تعلق الروح بالبدن فی ارحام الامھات ھو نزولہ من عالم الملکوت الی عالم الکون والفساد والسبب بحدوث البدن ھو الوالدان واما الاستاذ فسبب لعروج الروح الانسانی من عالم الفنا عالم البقا بسبب التکمیل بالمعارف الربانیۃ۔

قال الشیخ الزرنوجی۔ — وکان استاذنا شیخ الاسلام برھان الدین صاحب الھدایۃ یحکی ان واحدا من کبار ائمۃ بخاری کان یجلس مجلس الدرس وکان یقوم فی خلال الدرس احیانا وسألوا عنہ ولیقول ان ابن استاذی یلعب مع الصبیان فی السکۃ فاذا رأیتہ اقوم لہ تعظیما لاستاذی والشیخ الامام الاجل شمس الائمۃ الحلوائی قد کان خرج من بخاری فی بعض القری ایاما بحادثۃ وقعت وقد زارتہ تلامذۃ غیر الشیخ الامام القاضی ابی بکر الزرنجی فقال لہ حین لقیہ لماذا لم تزرنی فقال کنت مشغولا بخدمۃ الوالدۃ قال ترزق العمر ولا ترزق رونق الدرس وکان کذلك فانہ کان لیسکن فی اکثر اوقاتہ فی القری ولم ینتظم لہ الدرس۔ فمن تاذی منہ استاذہ یحرم برکۃ العلم ولا ینتفع بہ الا قلیلاً (شرح تعلیم المتعلم)

(ترجمہ) کوئی متعلم بغیر علم اور اہل علم کی تعظیم کے اور بغیر استاذ کی تعظیم و توقیر کے علم حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے کوئی پہنچنے والا کسی مطلوب کو نہیں پہنچا۔ مگر استاذ اور علم کے احترام کی وجہ سے اور کوئی گرنے والا مراتب عالیہ سے نہیں گرا مگر اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے چھوڑنے کی وجہ سے اس طرح کہ اسے حقیر سمجھے اور اس کی اہانت کرے کیونکہ اہانت و حقارت صریح کفر ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ احترام اطاعت سے بہتر ہے۔ کیا نہیں دیکھنے میں آیا کہ کسی مسلمان پر معصیت کی وجہ سے کفر کا فتویٰ عائد نہیں کیا جاتا لیکن ترک احترام کی وجہ سے وہ قابل تکفیر ہو جاتا ہے علم کی تعظیم میں معلم کی تعظیم بھی داخل ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ میں اُس شخص کا غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف کی بھی تعلیم دی اسے اختیار ہے خواہ مجھے فروخت کر دے خواہ آزاد کر دے خواہ محبوس رکھے۔ تمام حقوق سے معلم کے حق کو میں زیادہ سمجھتا ہوں۔ اور ہر مسلمان کیلئے تمام حقوق سے زیادہ قابل حفاظت معلم کا حق ہے۔ اگر معلم کو ایک حرف کی تعلیم کے عوض میں ایک ہزار دینار بطور اعزاز دئے جائیں تو یہ مناسب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس شخص نے کسی کو قرآن مجید کی ایک آیت کی بھی تعلیم دی تو وہ اس کا آقا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے تمہیں تعلیم دی وہ تمہارا بہترین باپ ہے سکندر ذوالقرنین سے پوچھا گیا کہ آپ اپنے استاذ کی تعظیم اپنے باپ کی تعظیم سے زیادہ کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے کیا خوب جواب دیا۔ اس لئے کہ میرے باپ نے آسمان سے زمین کی طرف اتارا اور میرا استاذ زمین سے مجھے آسمان کی طرف لے جاتا ہے اور اُن کے یہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ روح کا تعلق بدن کے ساتھ ارحام امہات میں ہوتا ہے اور وہ سبب نزول ہے عالم ملکوت سے عالم کون و فساد کی طرف اور حدوث بدن کا سبب والدین ہوتے ہیں اور استاذ روح انسانی کے لئے عروج کا سبب ہے

دنیا سے عقبیٰ کی طرف کیونکہ اس سے معرفت رب کی تکمیل ہوتی ہے۔

اور شیخ زرنوجی نے کہا کہ میرے استاذ شیخ الاسلام برہان الدین صاحب "ہدایہ" بیان کرتے تھے کہ بخارا کے ایک بہت بڑے امام جو ایک مجلس درس میں بیٹھے تھے اور بسا اوقات درمیان درس کھڑے ہو جایا کرتے تھے لوگوں نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ میرا استاذ زادہ بچوں کے ساتھ گلی میں کھیل رہا ہے۔ جب میں اُسے دیکھتا ہوں تو اپنے استاذ کی حرمت کا لحاظ رکھتے ہوئے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اور شیخ امام شمس الائمہ حلوائی بخارا سے ایک دیہات میں کسی مجبوری کی وجہ سے چند روز کیلئے چلے گئے ان کے تمام شاگرد ان کی ملاقات کو آئے لیکن شیخ امام قاضی ابوبکر زرنجی نہ آئے جب وہ اُن سے ملے تو آپ نے فرمایا کہ تم مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے قاضی ابوبکر نے جواباً عرض کیا کہ میں اپنی والدہ کی خدمت میں مشغول تھا یہ جواب سنکر آپ نے فرمایا کہ تمہاری عمر میں برکت ہو گی لیکن تم زینتِ درس سے محروم رہوگے اور ایسا ہی ہوا۔ کیونکہ وہ زیادہ تر دیہات میں رہتے تھے اسلئے ان کو درس کا موقع نصیب نہ ہوا اور جس شخص سے استاذ کو کوئی تکلیف پہنچی تو وہ علم کی برکت سے محروم رہتا ہے اور اس سے بہت کم فائدہ حاصل کرتا ہے۔

مذکورہ اقتباس سے استاذ کے مرتبہ کا اندازہ کیجئے اور اسی روشنی میں ذاکر کی حماقت اور مفتی راندیر کی حمایت پر بھی ایک نظر کر لیجئے ذاکر گستاخ و بے ادب نے جس طرح اپنے استاد کو خط لکھا ہے وہ ہرگز ایک شاگرد کے لئے نہ عقلاً زیبا ہے نہ شرعاً۔ اگر ان کو اس نظم کے متعلق شبہات تھے تو شاگردانہ انداز میں استفسار کرنا تھا۔ لیکن ان کی جہالت اور ناقدر دانی استاذ کا یہ عالم ہے کہ لکھتے ہیں۔

بہرحال میں اس خط کے بعد سے آپ کا شاگرد نہیں ہوں" سبحان اللہ محض اختلاف رائے کی بنا پر آپ شاگردی سے مستغنی ہو رہے ہیں اور استاد کے مرتبہ کو جو والدین کے مراتب سے بھی بلند تر ہے پس پشت ڈالکر اپنی سعادت مندی کا ثبوت دے رہے ہیں درست ہے ؎

بے ادب محروم گشت از فضل رب

اب اس بدظن خیالی کے ماتحت آپ کو اپنے بزرگوں سے کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو وہاں کس چیز سے مستغنی ہونگے؟

اگر ذاکر صاحب بخیال خود اپنے استاذ کی نظم "توحید اعظم" کو اصول اسلامی کے خلاف سمجھکر ان کی شاگردی سے مستغنی ہوتے ہیں تو پھر ان کا یہ استعفا ایک حیرت انگیز اقدام ہے کیا جس یونیورسٹی میں بی۔ اے بی۔ ٹی۔ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس وقت انکے تمام اساتذہ صرف مسلمان ہی تھے! یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ اسلئے کہ کوئی یونیورسٹی ایسی نہیں ہے جس میں مختلف اقوام وملل کے اساتذہ نہوں لہٰذا اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جائیگا کہ اس وقت آپ یا تو سرے سے مسلمان ہی نہ تھے اور اگر تھے تو روشن خیال اور صحیح العقیدہ نہ تھے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آپ ان لوگوں کی شاگردی کسی طرح گوارا نہ کرتے یا یہ کہ عقل وفہم سے اس قدر کورے تھے کہ ان باتوں کو سمجھ ہی نہ سکتے تھے۔ کیا امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ امام ابوحنیفہ سے مسائل شرعیہ میں اختلاف نہیں کرتے تھے؟ یہانتک کہ آج متعدد مسائل میں امام ابوحنیفہ کا قول ہوتے ہوئے بھی صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ان حضرات کا اختلاف کبھی حد ادب سے متجاوز ہوا؟

مفتی صاحب بھی ماشاء اللہ کسی اسلامی مدرس گاہ کے ہی فارغ التحصیل ہیں آداب استاذ سے واقف ہونگے مگر افسوس کہ ذاکر کی گستاخانہ تحریر اور استاذ کی شان میں بدتمیزی کے متعلق آپ نے انہیں قابل ملامت نہیں سمجھا بلکہ اسکے برعکس ہمت افزائی فرمائی۔ یہاں تک کہ خط کے املا اور زبان کی خامیوں کو بھی نظرانداز کر دیا۔ یہ ہے ایک عالم دین کی حق شناسی و دیانت داری۔ حضرت مولانا نے اپنے جواب میں جو کچھ لکھا ہے بالکل درست ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ جواب کی نوعیت ایسے ناہنجار اور نالائق شاگرد کے لئے جو ہونی چاہیئے تھی وہ نہیں ہے۔

کاش جناب مفتی صاحب ذاکر کے خط کی نوعیت کو پیش نظر رکھتے تو جواب کی نوعیت سے ہراس پیدا ہوتا لیکن تعجب ہے کہ ذاکر کے جواب خط کی نوعیت سے تو مفتی صاحب مستفسر ہراساں ہیں حالانکہ جواب خلاف

اور یاد رکھئیے کہ آپ نے الیس غلطی کے اتھ پھر ترکیب میں صفت واحد مونث ہے اور صفا

اسکی جمع اور یہ قاعدہ یاد رکھیے کہ مونث کی جمع مونث ہی آتی ہے اور مذکر کی جمع مذکر۔ یہ تو آپکی زبان دانی کا حال ہے۔ اس پر یہ دلیری کہ ایک مسلم الثبوت استاد کے کلام پر تنقید اگر شرم کو مگر نہیں آتی۔ آگے چلکر اپنی علمی تحقیق کا اس طرح ثبوت دیا جاتا ہے

"حیات شیطان ماقبل واقعۂ آدم اتنی تاریک اور اس قدر بھیانک ہے کہ عقل سلیم اور فکر صحیح کے بھی وہاں پاؤں لڑکھڑاتے ہیں جس کی وجہ سے اس کا کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا دشوار ہے کہ اکثر و بیشتر حصہ اس کا روایات اسرائیلیہ پر مبنی ہے۔ بن میں اس کا خاندانی اور سید الیشی نسب نامہ گرگ زادگی اور شیر زادگی پر ختم ہوتا ہے شیطان کی صحیح تاریخ وہی ہے جس کو قرآن عزیز بیان کرے یا اس کے بعد احادیث صحیحہ میں بیان کی گئی ہو اور مستند کتب تواریخ میں بیان ہو ورنہ بے سروپا قصص پر کسی طرح اعتماد نہیں کیا جاسکتا"

قبل اس کے کہ مذکورہ عبارت کے متعلق کچھ عرض کیا جائے ناظرین پر ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ "حیات ابلیس" دو مختلف ادوار سے متعلق ہے۔ اول ماقبل واقعۂ آدم جو اس کی عبادات و ریاضات سے وابستہ ہے جس کا ثبوت کتب مذہبیہ معتبرہ سے درج ذیل ہے۔

روئے زمین پر اللہ پاک نے جنات کو آباد کر رکھا تھا جب جنات میں فسق و فجور اور معصیت کی کثرت ہو گئی تو اللہ پاک کا فرشتوں کو حکم ہوا کہ یہ شریر مفسد مخلوق اس سطح ارض پر آباد رہنے کے قابل نہیں۔ ان کو پہاڑوں اور جزیروں میں بسا دو اور زمین ان سے خالی کرالو اور ان کی جگہ تم آباد ہو جاؤ۔ غرض جنات کے قائم مقام فرشتے ہوئے اور ان سب کا مرشد اور افسر عزازیل کو مقرر کیا گیا اور معلم الملکوت کے لقب سے اس کو اعزاز بخشا گیا ہزاروں برس اس نے اللہ پاک کی وہ اطاعت کی جو واقعی میں اسی کا کام تھا سطح ارض و سما پر بالشت برابر جگہ ایسی نہ چھوڑی جس پر اس نے سجدہ نہ کیا ہو۔

(حاشیہ از ترجمہ قرآن مجید مترجم مولانا عاشق الٰہی میرٹھی)

قال کعب الاحبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان ابلیس اللعین (عزازیل) کان خازن الجنۃ اربعین الف سنۃ، ومع الملائکۃ ثمانین الف سنۃ، ووعظ الملائکۃ عشرین الف سنۃ، وسید الکروبیین ثلاثین الف سنۃ، وسید الروحانیین الف سنۃ، وطاف حول العرش اربعۃ عشر الف سنۃ، کان اسمہ فی السماء الدنیا العابد وفی السماء ثانیۃ الزاهد وفی السماء الثالثۃ العارف و فی الرابعۃ الوالی وفی الخامسۃ التقی وفی السادسۃ الخازن والسابعۃ عزازیل وفی اللوح المحفوظ ابلیس وھو غافل عن عاقبۃ امرہ (فتدبر) (تفسیر جمل)

(ترجمہ) کہا کعب الاحبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہ ابلیس لعین (عزازیل) چالیس ہزار برس تک جنت کا خازن تھا، اور ملائکہ کے ساتھ اسی ہزار برس تک رہا اور تبلیغ کی ملائکہ کی جماعت میں بیس ہزار برس اور سرداری کی مقرب فرشتوں کی تیس ہزار برس اور روحانیوں کا سردار رہا ہزار برس اور طواف کیا عرش کے گرد چودہ ہزار برس اور اس کا نام پہلے آسمان میں عابد دوسرے میں زاهد تیسرے میں عارف چوتھے میں ولی پانچویں میں تقی چھٹے میں خازن ساتویں میں عزازیل اور لوح محفوظ میں ابلیس تھا اور اسکو اپنے انجام کی خبر نہ تھی۔"

ان اللہ تعالیٰ خلق الارض والسماء وخلق الملائکۃ والجن فاسکن الملائکۃ السماء واسکن الجن الارض فعبدوا دھرا طویلا ثم ظہر فیہم الحسد والبغی فافسدوا واقتتلوا فبعث اللہ الیہم جندا من الملائکۃ یقال لہم الجان ورأسہم ابلیس (عزازیل) وھم خزان الجنان فہبطوا الی الارض وطردوا الجن الی جزائر البحور وشعوب الجبال وسکنوا الارض وخفف اللہ عنہم العبادۃ واعطی اللہ ابلیس (عزازیل) ملک الارض وملک السماء الدنیا وخزانۃ الجنۃ وکان رئیسہم ومرشدھم واکثرھم علما فکان یعبد اللہ تارۃ فی الارض و تارۃ فی السماء وتارۃ فی الجنۃ (تفسیر خازن)

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا زمین و آسمان کو اور جنوں اور فرشتوں کو پس فرشتوں کو آسمان پر ٹھہرایا اور جنوں کو زمین پر۔ پس ان لوگوں نے بہت مدت تک عبادت کی پھر ان لوگوں میں حسد اور بغاوت پھیلی تو انہوں نے فساد اور خونریزی کی پس اللہ نے فرشتوں کا ایک لشکر ان کی طرف بھیجا جو جان کے نام سے موسوم تھا جن کا سردار عزازیل تھا، اور وہ لوگ جنت کے خازن تھے پس اترے وہ لوگ زمین پر اور

جنوں نے جنوں کو سمندر کے جزیروں اور پہاڑوں کے غاروں میں بھگا دیا اور خود زمین پر بسنے لگے۔ [illegible]

کیا جگر مرادآبادی مولانا سیماب اکبرآبادی کے شاگرد ہیں؟

یہ ہے وہ سوال جو ۱۹۳۳ء سے اس وقت تک معرضِ بحث میں ہے ہوا یوں کہ ۱۹۳۳ء میں جب شاعر آگرہ کا اسکول نمبر شائع ہوا تو اس میں حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی کے تلامذہ کی قدیم و جدید فہرست بھی شائع کی گئی اسی میں جناب علی سکندر جگر مرادآبادی کا نام بھی تھا۔ چنانچہ ادبی حلقوں میں اس پر خوب خوب چہ مگوئیاں ہوئیں مخالفینِ سیماب نے بڑی لے دے کی اور بعض حضرات نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ سیماب صاحب نے جگر صاحب کی شہرت سے متاثر ہو کر انھیں اپنے شاگردوں میں زبردستی شامل کر لیا ہے۔ مخالفین نے اس چیز کو جو رنگ دیا وہ مولانا سیماب کے لئے قابلِ توجہ نہ تھا اس لئے کہ اصلاح لینے والا خود خاموش تھا یعنی جگر صاحب نے اس کی تردید میں تحریری طور پر کوئی ثبوت بہم نہیں پہونچایا اور نہ اسکی امید کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے مجازی باپ سے انکار کر دینگے لیکن پورے پانچ سال بعد جنوری ۱۹۴۳ء کے ماہنامہ "ایشیا" میرٹھ کے مکاتیب نمبر میں جناب جگر مرادآبادی کا یہ خط شائع ہوتا ہے۔

محبی و مخلصی جناب ساغر نظامی زید کرمہٗ السلام علیکم۔ سنا ہے کہ جناب سیماب اکبرآبادی کوئی ماہنامہ "شاعر" نامی نکالتے ہیں اسی رسالہ میں انہوں نے اپنے شاگردوں کی فہرست پیش کی ہے اور مجھ پر اپنے شاگرد ہونے کا بہتانِ عظیم لگایا ہے۔ میں آپ کو صاف لفظوں میں مطلع کرتا ہوں کہ میں نے کبھی انہیں اپنا کلام نہیں دکھایا۔

جگر مرادآبادی

چونکہ اس خط کی اشاعت سے قبل مولانا سیماب سے جگر صاحب کی شاگردی کا سوال ایک ضمنی چیز تھا جس پر ایک طبقہ کو یقین تھا اور ایک کو نہیں اور کسی کا شاگرد ہونا بھی کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا اسلئے کبھی اس حقیقت کے انکشاف کی کوشش نہیں کی گئی۔ اب جبکہ جناب جگر تحریری طور پر مولانا سیماب کا شاگرد ہونے سے انکار کر رہے ہیں تو رفعِ شک کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کے انکار اور سعیٔ اخفائے حقیقت کو بے نقاب کر دیا جائے تاکہ ادبی حلقے مولانا سیماب کو غضب کی نظر سے نہ دیکھیں اور تاریخ اس بات کی شاہد رہے کہ ہندوستانی شاعر نام و نمود کے زعم میں اپنے استاد اور محسنِ اعظم کو بھی بھول جاتے ہیں۔ قبل اس کے کہ میں اس ذیل میں خود کچھ عرض کروں جناب عبدالحمید خاں صاحب شاداب اکبرآبادی کا ایک مکتوب پیش کرتا ہوں اس سے جناب جگر مرادآبادی کی شاگردی کے سب سے پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔ جناب شاداب بفضلہ بقیدِ حیات ہیں اور وہ دونوں حضرات بھی جن کا ذکر انہوں نے اپنے خط میں کیا ہے۔

محترم مولانا - سلام نیاز

جناب ساغر نظامی سیمابی کے رسالہ "ایشیا" کا مکاتیب نمبر جو جنوری ۴۳ء میں "نگار نامہ" کے نام سے شائع ہوا ہے میری نظر سے گذرا۔ اسی میں جناب علی سکندر جگر مرادآبادی کا ایک خط بھی ہے جسے پڑھنے کے بعد میں حیرت، استعجاب، غم اور غصہ میں ڈوب کر رہ گیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "مولانا سیماب نے مجھ پر اپنے شاگرد ہونے کا بہتانِ عظیم لگایا ہے"

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جگر صاحب نے اس حقیقت کو چھپانے کی کیوں کوشش کی ہے جس کا علم ایک دو کو نہیں بلکہ متعدد حضرات کو ہے اور میں واقعات دلائل اور براہین سے یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ انھوں نے ایک مدت تک آپ سے فیض حاصل کیا ہے۔ جس زمانہ میں وہ آگرہ کی مشہور عینک فروش کمپنی رضوی لمیٹڈ کو اور بی این بیجل اینڈ کمپنی کے یہاں چشمے کے ایجنٹ تھے اس وقت آپ کے اٹلی والے مکان کی "مردانہ نشست" میں اپنے وقت کا بیشتر حصہ گذارتے

تھے میرے سامنے وہ آپ کے باقاعدہ شاگرد ہوئے۔ جناب محمد اسماعیل صاحب فضا اکبرآبادی رشیا نزو سب بعض شرکاء اور حاجی عطاء اللہ صاحب بھی اسکے شاہد ہیں۔ سب سے بڑی شہادت وہ اصلاحی غزل ہے جو جگر صاحب ایک مرتبہ آپ سے اصلاح لینے کے بعد مجھے سنانے کیلئے لائے تھے اور اتفاقاً میرے یہاں بھول گئے۔ جناب جگر مرادآبادی کی تکمیل مشق میں قطعاً آپ کا فیض شامل ہے اس کا وہ زبان سے اعتراف کریں یا نہ کریں۔ لیکن اُن کا ضمیر اسے کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ آپ نے جگر کو جگر بنادیا۔ غالباً اپنی موجودہ ہنگامی اور وقتی شہرت کے تحت میں وہ اس نسبت کا اظہار کرتے ہوئے شرم محسوس کر رہے ہیں۔ کاش انھیں آپکی عظمت، احسانات اور رشتۂ استادی کا خیال ہوتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب اُن کی اُس عقیدت اور نیازمندی کو کیا ہوگیا جس نے کبھی اُنھیں آپ کا دیوان مرتب کرنے اُس کے سرورق کو خوشخط لکھنے اور آپکی غزلیں نقل کرنے پر مجبور کیا تھا۔ خدا اُنھیں راہِ راست پر لائے اور وہ استاد کے مراتب کو سمجھ سکیں

خادم۔ شاداب اکبرآبادی

جناب شاداب نے جس غزل اور سرورق کا ذکر اپنے مکتوب میں کیا ہے وہ اسی مضمون کے ساتھ عکسی بلاک کی صورت میں شائع کئے جارہے ہیں۔ دونوں کی اصل محفوظ ہے "شاعر" کے "آگرہ اسکول نمبر" مطبوعہ ۱۹۳۶ء میں مولانا سیماب کے تلامذہ کی جو فہرست شائع ہوچکی ہے۔ اُسمیں جناب جگر مرادآبادی کا سن شاگردی ۱۹۱۳ء تحریر ہے۔ یہ غزل جو ۱۹۲۲ء میں جناب شاداب نے مرحمت فرمائی ہے اس پر بھی ۱۲ ستمبر ۱۹۲۲ء لکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا سیماب کے دیوان کے سرورق کی بعض سطور جس سیاہی سے لکھی گئی ہیں اُسی سیاہی سے غزل بھی لکھی ہوئی ہے۔

جگر صاحب کی طرزِ تحریر اور رنگِ سخن کا اندازہ تو غزل سے ہو ہی جاتا ہے۔

حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہ نے مجھے بتایا کہ جگر صاحب نے ڈیڑھ یا دو سال آپ سے اصلاح لی ہے۔ دورانِ قیام آگرہ کی قریب قریب تمام غزلیں مولانا ہی کی اصلاح شدہ ہیں۔ چند سال کے قیام کے بعد جگر صاحب یکایک آگرہ سے چلے گئے اور پھر اُنکی کوئی غزل اصلاح کے لئے نہیں آئی۔ ایک مدت ہونے کے بعد جب مولانا کو یہ معلوم ہوا کہ وہ اصغر گونڈوی مرحوم سے اصلاح لینے لگے ہیں تو اُنھوں نے خود ہی اس رشتہ کو منقطع سمجھ لیا۔

مولانا سیماب کے علاوہ جناب جگر نے بعض دیگر اساتذہ سے بھی اصلاح لی ہے لیکن حسبِ عادت وہ اس کے اظہار میں شاید اپنی توہین سمجھتے ہیں اور اسی سے اُن کی نیّت کا پتہ چلتا ہے۔ مرزا خادم حسین رئیس اکبرآبادی مرحوم اپنے زمانہ کے مشہور استاد تھے اور علمی و فنی معلومات میں جواب نہ رکھتے تھے مولانا سیماب کا شاگرد ہونے سے پہلے جگر صاحب نے آستانۂ رئیس مرحوم پر بھی جبیں سائی کی اُنھیں متعدد غزلیں دکھائیں لیکن افسوس کہ اپنے اساتذہ میں اُنھوں نے کبھی مرزا صاحب کا نام بھی نہیں لیا۔ جناب پربھو دیال صاحب شام اکبرآبادی نے اس سلسلہ میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بھی ایک یادگار چیز ہے۔ موصوف لکھتے ہیں۔

محترم و مکرم بندہ سیماب صاحب۔ آداب

جواب طلب امر کے بارے میں عرض ہے کہ اس بات کو ایک مدت کی گذر گئی اس لئے یہ کہ مشاعرہ کا مصرعہ کیا تھا یاد نہیں۔ ہاں وہ مشاعرہ جسمیں میرے مخلص دوست و کرم فرما جناب علی سکندر صاحب جگر مرادآبادی، عالیجناب مرزا خادم حسین صاحب رئیس اکبرآبادی مرحوم کے شاگرد ہوئے تھے۔ وہ مشاعرہ محلہ پائی گلی اگوان میں ہوا تھا۔ اس مشاعرہ کے بانی مرزا خادم حسین صاحب رئیس مرحوم کے ایک شاگرد جناب صدرالدین بیگ صاحب آتشک اکبرآبادی تھے مشاعرہ ہمیں بعد دوپہر مقرر تھا لیکن ہندوستانی مزاج کے موافق بعد نماز مغرب شروع ہوا اور ابتدا ہی میں جناب جگر مرادآبادی باقاعدہ طور پر مرزا خادم حسین صاحب رئیس مرحوم کے شاگرد ہوئے کہ جو "شیرینیاں" جناب جگر مرادآبادی فاتحہ کے لئے لائے تھے انھیں برفیوں سے حسبِ دستورِ قدیم مرزا صاحب قبلہ نے جناب جگر مرادآبادی کا منہ میٹھا کیا اور بر سرِ مشاعرہ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ یہ جگر دگر بھی کوئی تخلص ہے۔ اب آئندہ سے افسر تخلص کیا کرو

اس کے بعد جگر صاحب نے چند غزلیں آفر کے تخلص سے فرمائیں
مرزا صاحب سے برابران پر اصلاح لی اور آگرہ میں پڑھیں۔ اندازاً
اس واقعہ کے سال ڈیڑھ سال بعد جگر صاحب جو اس وقت
ای۔ این۔ بیجل صاحب کے یہاں ایجنسی کی خدمت انجام دیتے
تھے کہیں ایجنسی کے کام پر ایسے باہر گئے کہ پھر مجھے چند سال
بعد ریاست رامپور کی ایک سرائے میں عجیب عالم میں اتفاقیہ ملاقات ہوئی

خادم دیرینہ پربھو دیال شائق اکبرآبادی

جناب جگر مراد آبادی نے اپنے تذکرہ مطبوعہ نگار جنوری ۱۹۳۲ء میں اپنا
سلسلہ تلمذ پہلے مرزا داغ اور اس کے بعد منشی امیر اللہ تسلیم سے ظاہر کیا ہے
اب اس حقیقت کا بھی تجزیہ کرکے دیکھنا چاہیئے۔ جگر صاحب کا سنہ ولادت
۱۸۹۰ ہے اور مرزا داغ نے ۱۹۰۵ء میں انتقال فرمایا گویا جس وقت جناب
جگر کی عمر صرف ۱۵ سال تھی اس وقت مرزا داغ رحلت فرما چکے تھے کیا یہ ممکن ہو سکتا
ہے کہ جگر صاحب ۱۴ سال کی عمر میں اتنا اچھا شعر کہنے لگے ہوں کہ مرزا
داغ نے انھیں اپنے تلامذہ میں شامل کر لیا ہو۔ جب کہ واقعات شاہد ہیں
کہ مشاق لوگوں کی غزلیں بھی فصیح الملک واپس کر دیا کرتے تھے۔ اگر
ذرا سی دیر کے لئے ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ جگر صاحب کو فصیح الملک نے
اجازت دیدی ہوگی تو ان کے تلامذہ کی کسی فہرست میں جگر صاحب کا نام
کیوں نہیں ملتا؟ فصیح الملک مرحوم کے ایسے ارشد تلامذہ موجود ہیں جو اُن کے ساتھ
رہے وہ بھی اس سے بے خبر ہیں۔ محترمی ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب
سائل دہلوی اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

عزیزی اعجاز میاں سلمہٗ دعا کے بعد واضح ہو کہ تمہارا خط اس وقت
وصول ہوا۔ میں نے جگر کے متعلق دو روایتیں سنی ہیں ایک یہ کہ اصغر مرحوم سے
استفادہ اُنھوں نے کیا اور دوسرے رسا مرحوم سے مجھے خاص طور پر اسکی
تحقیق کا اتفاق نہیں ہوا نہ میں نے داغ صاحب مرحوم کے تلامذہ کی فہرست
میں اُن کا نام دیکھا۔" زیادہ والدعا۔

سراج الدین سائل دہلوی

حضرت سائل کی تحریر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جگر صاحب نے
رسا صاحب مرحوم سے بھی استفادہ کیا ہو لیکن جگر صاحب نے اس نسبت کا
بھی کبھی اظہار نہیں کیا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جگر صاحب کی شعری نشو و نما میں متعدد
اساتذہ کی توجہ شامل ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کا نام لیتے
ہوئے مصلحتاً جھجک محسوس کریں میں اسے فن کے اخلاق کی کمزوری پر محمول
کرتا ہوں۔ علما۔ فضلا اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُستاد کی بزرگی اور
فضیلت بیان فرمائی ہے۔ اور اس ذیل میں جو اقوال ہم تک پہونچے ہیں اُن کی
روشنی میں جگر صاحب کا اپنے اساتذہ سے انحراف باعث افسوس ہے۔
رسا مرحوم اور مرزا رئیس کے علاوہ اُنکی ابتدائی مشق کی تکمیل میں حضرت قبلہ مولانا
سیماب مدظلہ نے جس کاوش سے کام لیا وہ جگر صاحب اچھی طرح جانتے ہیں تکمیلِ
مشق کے بعد وہ اصغر گونڈوی مرحوم سے رجوع ہوئے غالباً اب انہیں اصلاح
کی ضرورت نہ تھی اور میرا ایمان ہے کہ اصغر مرحوم ان کی عام پسند شاعری اور عریاں نگاری
کو پسند بھی نہ فرماتے ہونگے پھر اصلاح تو بڑی چیز ہے لیکن یہ ایک علاوہ تہا صاحب کا علم بے گناہ
سیکڑوں حضرات کو ہے اور جسکا انکشاف حضرت اصغر گونڈوی کی وفات کے بعد۔
"مدت میں وہ پھر تازہ ملاقات کا عالم"
سے ہوا۔
جناب جگر مراد آبادی کی شاگردی حضرت مولانا سیماب مدظلہ کیلئے باعث
افتخار نہیں ہے۔ اس رشتہ کے قطع ہونے کے بعد مولانا نے کبھی کسی سے یہ نہیں کہا کہ
جگر میرے شاگرد ہیں۔ چونکہ فہرست تلامذہ میں اُنکا نام موجود تھا اسلئے وہ غیر ارادی طور پر
شائع ہو گیا، جسے جگر صاحب "ہتبان عظیم" سے تعبیر کر رہے ہیں کاش وہ اس وجہ
اپنی اخلاقی کمزوری کا ثبوت نہ دیتے۔

اعجاز صدیقی

قطعہ تاریخ وفات

حکیم آزاد انصاری سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ

آہ آزاد جو تھے رونقِ بزمِ حالی
اُٹھ کے دنیا سے کیا خلدِ بریں کو آباد
حرفِ مخطوط میں مطلوب ہے گر سالِ وفات
اے وفا کہدو سخن سنج و سخنور آزاد
۱۳۶۰

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح:- طلوعِ صبح ہے تاراج محفل ہوتی جاتی ہے

حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی

خودی خود آگہی کی حد میں داخل ہوتی جاتی ہے / خدا کی معرفت کچھ اور مشکل ہوتی جاتی ہے
بجھے جلتے ہیں دل تاریک محفل ہوتی جاتی ہے / یہ دنیا قبر بن جانے کے قابل ہوتی جاتی ہے
رہائی گوشۂ زنداں سے مشکل ہوتی جاتی ہے / طبیعت خوگرِ طوق و سلاسل ہوتی جاتی ہے
عجب عالم ہے بیدارانِ راہِ عزم و ہمت کا / سبیلِ خواب ہی منزل بہ منزل ہوتی جاتی ہے
جگا دی دل نگاہِ حسن نے جسکو جگہ دی تھی / وہ بیجا انس اب بڑھتے بڑھتے [illegible] ہوتی جاتی ہے
عجب کیا رفتہ رفتہ وہ طوفاں ختم ہو جائیں / نئی جو موج اٹھتی ہے وہ ساحل ہوتی جاتی ہے
محبت کا یقیں ہونے لگا ہے اب ہوس کو بھی / حقیقت غلبۂ باطل سے باطل ہوتی جاتی ہے
محبت ہو وفا ہو آرزومندی ہو یا حسرت / اب اک لا حاصلی ان سب کا حاصل ہوتی جاتی ہے
نشاطِ عالم نے سیماب ایسی لوریاں دی ہیں / خدائی اپنے مستقبل سے غافل ہوتی جاتی ہے

حضرت وحشت کلکتوی

طبیعت یاس کی جانب جو مائل ہوتی جاتی ہے / دلِ بیتاب کو تسکین حاصل ہوتی جاتی ہے
سید افزا نہیں نقشِ امید اپنا تو کیا حاصل / یہ تحریر اب مٹا دینے کے قابل ہوتی جاتی ہے
مرے تیری کبھی تھی ضامنِ تاب و توانِ دل / وہی اب باعثِ بربادیٔ دل ہوتی جاتی ہے
از عشق بڑھتا جا رہا ہے جسقدر میرا / تری شمشیرِ ناز اتنی ہی قاتل ہوتی جاتی ہے
ہی کا جلوہ شاید مائلِ عاشق نوازی ہے / سکون آموز خود بیتابیٔ دل ہوتی جاتی ہے
ہ دشواریاں دینے لگیں پیغامِ آسانی / مری مشکل نویدِ حلِ مشکل ہوتی جاتی ہے
ب کیا ہے کہ چکنا چور ہو ٹکرا کے ساحل سے / مری کشتی جو اب نزدیکِ ساحل ہوتی جاتی ہے
ید افزا ہوئی ہے خستگی حد سے سوا ہو کر / تھکن میری دلیلِ قربِ منزل ہوتی جاتی ہے
ی دی غزل کو وحشتِ رنگیں طبیعت نے / نشاط انگیز اہلِ فن کی محفل ہوتی جاتی ہے

حضرت آلم مظفرنگری

نیا اب نگاہِ شوق کا حائل ہوتی جاتی ہے / مری نظروں میں دنیا انکی محفل ہوتی جاتی ہے
بہ طوفاں سبق آموز ہے بحرِ حوادث کا / جو موج اٹھتی ہے خضرِ راہِ ساحل ہوتی جاتی ہے
کیا ہو مصلحت بے بیانِ راہبر جب سے / دلیلِ راہِ الفت ہمتِ دل ہوتی جاتی ہے
سمجھتا ہی نہیں مفہوم [illegible] چمن کوئی / چمن میں کوششِ فرمانہ باطل ہوتی جاتی ہے
نئے امتحاں شاید ہوا ہے کوئی آمادہ / سمٹ کر بزمِ ہستی صورتِ دل ہوتی جاتی ہے
چلے آتے ہیں لاکھوں قافلے گو ریگزاروں میں / کہیں ویراں کہیں آباد منزل ہوتی جاتی ہے
بہی جاتی ہے بن کر اشکِ غم رخسارِ ہستی پہ / سبکدوشِ وفا اب شمعِ محفل ہوتی جاتی ہے
نہ گھبرا اے مسافر ظلمتِ شامِ غریباں سے / یہ تاریکی سوادِ صبحِ منزل ہوتی جاتی ہے
آلم رازِ محبت کون پروانوں کو سمجھائے / ہوائے غم سے ٹھنڈی شمعِ محفل ہوتی جاتی ہے

حضرت شفق ٹونکی

مسرت گریۂ پیہم پہ مائل ہوتی جاتی ہے / طبیعت واقفِ انجامِ محفل ہوتی جاتی ہے
حدیثِ زندگی کی شرح کامل ہوتی جاتی ہے / مسلسل اک تباہی قسمتِ دل ہوتی جاتی ہے
یہ رقصِ جام و پیمانہ یہ سوزِ شمع و پروانہ / تری محفل بہار دم سے محفل ہوتی جاتی ہے
یہ کیسا سانحہ ہے دیکھتے ہی دیکھتے ہمدم / پریشاں صحبتِ یارانِ محفل ہوتی جاتی ہے
میں اہلِ فطرت کی نیرنگی پہ ہوں قربان ہر لحظہ / کبھی ساحل کبھی طوفانِ ساحل ہوتی جاتی ہے
نظامِ اختیارِ جزو و کل کو ہاتھ میں لے کر / محبت کردگارِ قسمتِ دل ہوتی جاتی ہے
وہاں تعمیر سے تخریب اچھی ہے بہر صورت / جہاں تخریب تعمیرِ کامل ہوتی جاتی ہے
حیاتِ جاوداں لبس میں مرگِ ناگہاں لبس میں / محبت کردگارِ قسمتِ دل ہوتی جاتی ہے

حضرت مسلم مالیگانوی

نظر کو معرفت اسکی جو حاصل ہوتی جاتی ہے / نگاہوں کو تمیزِ حق و باطل ہوتی جاتی ہے
جہاں جلوے دکھا دیں طورِ سینا بنتا جاتا ہے / جہاں وہ شمع رکھ دیں مجمعِ محفل ہوتی جاتی ہے
کسی تدبیر عقدہ زندگانی کا نہیں کھلتا / ہر صورت یہ مشکل اور مشکل ہوتی جاتی ہے
دکھاتی جا رہی ہے فطرتِ ہر رنگ نیرنگی / کہیں شبنم کہیں آنسو کہیں دل ہوتی جاتی ہے
سفینۂ دل کا تھا گرمِ سفر جس کے سہارے پر / وہ موج آسودۂ آغوشِ ساحل ہوتی جاتی ہے

کہیں اشکِ رواں ہو کر کہیں موجِ فغاں ہو کر
نمایاں ہر طرح بیتابیٔ دل ہوتی جاتی ہے

ہوائے یاس نے تعیین بنا دی ماہ و انجم کی
طلوعِ صبح ہے تاراجِ محفل ہوتی جاتی ہے

ابھی پورا تماشا سوزِ پنہاں کا کہاں دیکھا
ابھی سے کیوں فسردہ شمعِ محفل ہوتی جاتی ہے

دلوں میں سوز بھرتا ہے مرا سازِ غزل مسلم
مری نغمہ سرائی جانِ محفل ہوتی جاتی ہے

حضرت قمر نعمانی سہسرامی

مری تنہائی بھی اب رشکِ محفل ہوتی جاتی ہے
تری صورت بہر صورت مقابل ہوتی جاتی ہے

دلِ گمراہ کی آسان مشکل ہوتی جاتی ہے
شکستِ آرزو تدبیرِ منزل ہوتی جاتی ہے

جسے ہر موج آ آ کر پیامِ مرگ دیتی تھی
وہ کشتی زینتِ آغوشِ ساحل ہوتی جاتی ہے

نیازِ جستجو میں مل گیا یہ رتبہ ملا آخر
ہماری خاک بھی سجدے کے قابل ہوتی جاتی ہے

بہار آئی جلو میں کاروانِ رنگ و بو لے کر
نشاط انگیز آوازِ عنادل ہوتی جاتی ہے

سراپا درد بن کر عشق آیا ہے سرِ محشر
ہر اک تاویلِ جورِ حسن باطل ہوتی جاتی ہے

بڑا احساں ہے مجھ پر تمہاری بے نیازی کا
محبت میری اس سے اور کامل ہوتی جاتی ہے

محبت پر ابھی تک تبصرہ میں کرتا رہتا ہوں
مجھے تمیز کچھ ہستی کی حاصل ہوتی جاتی ہے

قمر کچھ سوچ کر میں نے لیا تھا ساتھ دنیا کے
مگر اب اس طرح بھی زیست مشکل ہوتی جاتی ہے

حضرت مہر تقوی جیپوری

تجلی خیز شمعِ کعبۂ دل ہوتی جاتی ہے
مری بزمِ تصور نورِ منزل ہوتی جاتی ہے

رہِ الفت میں یہ معراج حاصل ہوتی جاتی ہے
ہماری خاک بھی اب عرش منزل ہوتی جاتی ہے

نقوشِ ماسوا سب رفتہ رفتہ مٹتے جاتے ہیں
تصور سے بھی ہر تصویر زائل ہوتی جاتی ہے

زیارت کو چلے آتے ہیں قدسی دشتِ ایمن سے
نمایاں عظمتِ خاکسترِ دل ہوتی جاتی ہے

سبق ملتا ہے اہلِ عشق کو حفظِ مراتب کا
خودی آموز خود تیری ہی محفل ہوتی جاتی ہے

تصور ہے یہ کس صورتگرِ کونین کا دل میں
ہر اک تصویر نقشِ پردۂ دل ہوتی جاتی ہے

مصائب میں بھی جو مسرت کے جلوے دیکھ لیتی تھی
وہ قوت کیوں ہمارے دل سے زائل ہوتی جاتی ہے

ترے جلووں کی ہوتی جا رہی ہے جتنی افزائش
مجھے ادراک میں اتنی ہی مشکل ہوتی جاتی ہے

فضائے بیخودی جانم جو کبھی تھی مہر کی منزل
خدا کی شان اب قلب و دل کی منزل ہوتی جاتی ہے

حضرت جالب سہسرامی

مری ہر سعی جالب سعیٔ باطل ہوتی جاتی ہے
وہ مشکل جو کہ آساں تھی وہ مشکل ہوتی جاتی ہے

حقیقت کوششِ دل کی سخت منزل ہوتی جاتی ہے
خرد کی موشگافی عقدۂ مشکل ہوتی جاتی ہے

کبھی تسکینِ دل تھی آیۂ لا تقنطوا لیکن
عدوئے یاس پر اب وہ بھی زائل ہوتی جاتی ہے

بحدِ عزم راہِ شوق میں طے کرتا جاتا ہوں
بقدرِ قرب مجھ سے دور منزل ہوتی جاتی ہے

مبارک سنگلاخیٔ زمیں کی آبلہ پائی
طبیعت خوگرِ سختیٔ منزل ہوتی جاتی ہے

فراقِ آگہیں وحشت، الفراق اے لطفِ ہمدردی
بہت کمزور آوازِ سلاسل ہوتی جاتی ہے

عدو کی خردہ بینی وجہِ تکمیلِ عمل ٹھہری
ہماری طبع کامل اور کامل ہوتی جاتی ہے

بشکلِ دائرہ پیرامنِ مرکز یہ گرداں ہوں
نصیب ہر قدم تحصیلِ حاصل ہوتی جاتی ہے

مبارک آمدِ وقتِ مساعد طالبِ خستہ
علی الرغمِ عدو، حل مشکل اب ہوتی جاتی ہے

حضرت طالب جہلمی

مری منزل رسی ایک وہمِ باطل ہوتی جاتی ہے
رہینِ انقلاب اب راہِ منزل ہوتی جاتی ہے

بنی جاتی ہے کاشانہ دلوں کا شامِ گلشن کی
شکستہ ہر کلی گویا مرادِ دل ہوتی جاتی ہے

دلِ ہستی میں اب آیا دیا ہر سو سکونی کی
مرادِ انقلابِ وقت حاصل ہوتی جاتی ہے

چمن اہلِ چمن کے ساتھ رخصت ہو گیا ہے
خزاں کا سہرا گلبانگِ عنادل ہوتی جاتی ہے

جسے ٹھکرا دیا تھا میرے استغنائے فطرت نے
وہ مایوسی مری فطرت میں شامل ہوتی جاتی ہے

نہ وہ جانسوز پروانے نہ وہ ضو آفریں شمعیں
طلوعِ صبح ہے تاراجِ محفل ہوتی جاتی ہے

میں اس دنیا کو اب بھی اپنی خاطر میں نہیں لاتا
یہ پھر بھی میری گردن میں حمائل ہوتی جاتی ہے

قریب الختم ہے وہ سرخوشی جو رنگِ محفل تھی
ادا ہی پردہ دارِ شمعِ محفل ہوتی جاتی ہے

رہِ عشق و وفا میں ہے خودی کا دخل بھی طالب
طلب کچھ اور بھی مشکل سے مشکل ہوتی جاتی ہے

جناب زار کاندھلوی

الٰہی زندگی دنیا میں مشکل ہوتی جاتی ہے
نفاقِ باہمی پر خلق مائل ہوتی جاتی ہے

مروت تیری کہ خلق سے لیس ہوتی جاتی ہے
شرافت سیرتِ انساں سے زائل ہوتی جاتی ہے

قضا اس قوم کی بالکل قریب آئی ہوئی سمجھو
فنا جس کی تمیزِ حق و باطل ہوتی جاتی ہے

ازل سے ہے یہی دستورِ قومیت زمانے میں
وہی برباد ہے جو قوم غافل ہوتی جاتی ہے

ہے پندار کچھ ایسی سمائی ہے رگ رگ میں
کہ خود منزل ہی سدِ راہِ منزل ہوتی جاتی ہے

رسوماتِ قبیحہ کا نتیجہ اور کیا ہوگا
فلاکت اپنی گردن میں حمائل ہوتی جاتی ہے

اسے دشوار ہوگا کیا پہنچنا اپنی منزل تک
جو ہمت جو وقفِ راہِ منزل ہوتی جاتی ہے

ترقی ملکی ان کو جو قوموں میں ہیں کمر بستہ
یہ فطرت ہے کہ دعوت انہیں شامل ہوتی جاتی ہے
وہ قوم شیر دل جو ہر طرح دنیا پہ غالب تھی
غلامی کے اثر سے زار بزدل ہوتی جاتی ہے

جناب وسیع رتلامی

خدا جانے یہ کیا کیفیت دل ہوتی جاتی ہے
نیاز و ناز میں تفریق مشکل ہوتی جاتی ہے
خوشی سے جز بنایا اور معیار محبت کو
مری روداد غم سننے کے قابل ہوتی جاتی ہے
فنا کے بعد بھی ذوق سفر ہے زندہ و قائم
مری مٹی شریک گرد منزل ہوتی جاتی ہے
میں دنیا کے کسی گوشہ کو چھوڑ کر اپنے چلا جاتا
تو دنیا کیوں مرے رستے میں حائل ہوتی جاتی ہے
فسانہ کہہ رہا ہے میری بربادی کا ہر آنسو
مری ہر سانس اب پیغمبر دل ہوتی جاتی ہے
پتنگے جل چکے وہ اٹھ چکے سب بیٹھنے والے ہیں
"طلوع صبح ہے تاراج محفل ہوتی جاتی ہے"
صدائیں ڈوبنے والوں کی آتی ہیں کنارے سے
گذرتی ہے جو سر سے موج ساحل ہوتی جاتی ہے
وسیع بیٹھو اب وہ تری حالت پہ گریاں ہیں
خموشی بھی شریک ماتم دل ہوتی جاتی ہے

جناب بیتاب کالپوی

تڑپ جاتی ہے اکثر اور بسمل ہوتی جاتی ہے
نگاہ ناز بھی ان کی مراد دل ہوتی جاتی ہے
دل بیتاب ہے مجموعۂ درد و غم دنیا
ہر اک مشکل جہاں کی میری مشکل ہوتی جاتی ہے
کسی کی ترچھی نظریں کر رہی ہیں کام نشتر کا
میری ہر آرزو تڑپ کے بسمل ہوتی جاتی ہے
ترقی کر رہا ہوں اس طرح دور ترقی میں
مری فطرت میں بربادی بھی شامل ہوتی جاتی ہے
زمانہ جان دیتا جا رہا ہے مثل پروانہ
کچھ اس انداز سے رنگین محفل ہوتی جاتی ہے
مٹا جاتا ہے حسن خلق اور حسن وفاداری
کبھی جو بات حق تھی آج باطل ہوتی جاتی ہے
یہ قسمت ہے مری بیتاب جس پر شکر کرتا ہوں
مرے ہر قصد میں مشکل ہی حائل ہوتی جاتی ہے

جناب کلیم آزر بجنوری

جنون عشق کی [illegible] مشکل ہوتی جاتی ہے
محبت اب [illegible] کامل ہوتی جاتی ہے
[illegible] حاصل ہوتی جاتی ہے
شکستہ پا کیوں ہے وہ منزل ہوتی جاتی ہے
[illegible] ہوتی جاتی ہے
بہت بیباک میری حسرت دل ہوتی جاتی ہے
[illegible] فطرت چاہتی ہے [illegible]
مگر قید تعین سے حاصل ہوتی جاتی ہے
[illegible] لایا ہے جنون خون پروانہ
فروزاں شمع [illegible] محفل ہوتی جاتی ہے
[illegible] عالم میں
[illegible] خودداری سے غافل ہوتی جاتی ہے
[illegible]
[illegible] ہوتی جاتی ہے

کلیم اب حسن کی اک تجلی اور دل ہے سینا
یہ وادی طور سینا کے مقابل ہوتی جاتی ہے

محسن ادب حضرت نشتر ہنگامی

مری ہمت جو صرف فکر منزل ہوتی جاتی ہے
رسائی تا بمنزل اور مشکل ہوتی جاتی ہے
تمنا اسکی جذبات بے جو شامل ہوتی جاتی ہے
تو گھر بیٹھے ہوئے نزدیک منزل ہوتی جاتی ہے
کہاں اب شام عشرت کی رہیں رنگینیاں باقی
طلوع صبح ہے تاراج محفل ہوتی جاتی ہے
مآل آخر یہ دنیا کا ہوا علم حقیقت سے
نگاہوں میں مری اک نقش باطل ہوتی جاتی ہے
ذرا ایکبار دیکھئے تو کوئی حسرت دل کی
جو حسرت آتی جاتی ہے سراپا [illegible] ہوتی جاتی ہے
محبت ہو کسی کو انگبیں تو مجھکو کیا اس سے
مرے حق میں تو ظالم زہر قاتل ہوتی جاتی ہے
اگر ڈھونڈھیے تو قاتل کا نہیں کوسوں پتہ نشتر
مگر دنیا شکار حسن قاتل ہوتی جاتی ہے

پروفیسر قمر صدیقی ایم۔ اے۔ کلکتہ

وہ کیفیت مجھے الفت میں حاصل ہوتی جاتی ہے
کہ جس سے یاد تیری عطر شامل ہوتی جاتی ہے
یہ کیسا امتحان شوق ہے راہ محبت میں
کہ ہر اک جستجو سے دور منزل ہوتی جاتی ہے
جبر کیونکر کروں میں اسکے حسن شعلہ افزا کو
کہ دل کی آرزو خود رنگ دل ہوتی جاتی ہے
یہ کس کا حسن رنگیں کار فرما ہے تصور میں
کہ اب خلوت ہماری رشک محفل ہوتی جاتی ہے
نہ جائیں گے اگر چھوٹے کبھی اک بار زنجیر جنوں
کہ زنداں کی کشش بند سلاسل ہوتی جاتی ہے
عجب کیا ہے جو بیتابی خانۂ دل میں فزوں کش ہو
کہ تابش داغ دل کی رونق دل ہوتی جاتی ہے
قمر اس بیوفا سے کس طرح ترک محبت ہو
کہ اسکی بے رخی بھی لذت دل ہوتی جاتی ہے

حضرت ارشد صدیقی امروہی

محبت رفتہ رفتہ فطرت دل ہوتی جاتی ہے
لہو بن کر رگ ہستی میں داخل ہوتی جاتی ہے
کرشمہ دیکھئے طوفان دریائے محبت کا
مری ٹوٹی ہوئی کشتی بھی ساحل ہوتی جاتی ہے
سبب اسکا فقط کوتاہی عرض محبت ہے
مری وحشت جو پابند سلاسل ہوتی جاتی ہے
خدایا خیر ہر جادۂ [illegible] مشکل ہو گئے
ہمیں تو زندگی دو دن کی مشکل ہوتی جاتی ہے
یہ ہے تیر نظر قاتل کا اعجاز [illegible]
جو دل [illegible] کامل ہوتی جاتی ہے
[illegible]
مری ہمت [illegible] مقابل ہوتی جاتی ہے
[illegible]
[illegible] حائل ہوتی جاتی ہے

حضرت [illegible] صدیقی [illegible]

[illegible] ہوتی جاتی ہے

یہ رندِ بے نشیمن ... کی ... جا رہا ہوں
مرے ... منزل ہوتی جاتی ہے

قیامت ہے کہ الفت ... بھی ... جبر
مصیبت ہے کہ حیراں دیدۂ ... ہوتی جاتی ہے

ادھر بھی ہے سماں ... سا کوئی چھپا
فسردہ کیفیت محسوسات حاصل ہوتی جاتی ہے

کمی پر ہے دلِ وحشی کا احساس گرانباری
طبیعت خوگرِ طوق و سلاسل ہوتی جاتی ہے

جنوں کو سنگساری کا نہیں غم ... اسکا ہے
ہوس کے ہاتھ سے توہینِ محمل ہوتی جاتی ہے

گھرے ہیں مطلعِ انوار پر ظلمات کے بادل
حقیقت برق پیرِ خلوتِ باطل ہوتی جاتی ہے

جناب منظر کلیمی جاپیوری

کنارہ گیر مجھ سے تیری محفل ہوتی جاتی ہے
مرے جذبِ جنوں کی وہ بھی قائل ہوتی جاتی ہے

خودی سے منزلِ مقصود حاصل ہوتی جاتی ہے
خودی ہی سیرِ عرفاں کامل ہوتی جاتی ہے

عقیدت ناخدا کی دل سے زائل ہوتی جاتی ہے
خدا کے لطف سے امیدِ ساحل ہوتی جاتی ہے

ہے کچھ ایثار کا جذبہ نمایاں اہلِ غم میں
کچھ استغنا پسند اب خود سائل ہوتی جاتی ہے

غروبِ شمع ہے اٹھنے کو ہے اب خاکِ پروانہ
طلوعِ صبح ہے تاراجِ محفل ہوتی جاتی ہے

جہانِ عشق میں کیا گل کھلائیگی خدا جانے
لہو کی بوند جو اشکوں میں شامل ہوتی جاتی ہے

میں ہوں سیماب کے اعجاز کا قائل تو اے منظر
یہ ساری کائنات اب میری قائل ہوتی جاتی ہے

جناب صغیر آثر اکبرآبادی

تمہارے غم کی شدت دل کو حاصل ہوتی جاتی ہے
مقدر ہے یہ نعمت قسمتِ دل ہوتی جاتی ہے

تلاشِ یار بھی ہے اور جنونِ فتنہ ساماں بھی
مری راہِ طلب مشکل سے مشکل ہوتی جاتی ہے

تعین اور تعین کچھ نہیں ہے بزمِ دنیا میں
نیا عالم نئی روداد محفل ہوتی جاتی ہے

چلی آتی ہیں لہریں دل میں ان کے حسنِ کامل کی
یہ محفل چاند اور تاروں کی محفل ہوتی جاتی ہے

جسے تو نے کبھی اپنی نگاہوں سے گرایا تھا
اسے عزت ترے کوچہ میں حاصل ہوتی جاتی ہے

یہ دنیا گرتی جاتی ہے نظر ہونے سے مری حتی
تخیل کو بلندی اور حاصل ہوتی جاتی ہے

اثر اتنی محبت ہی محبت جزوِ ایماں ہے
محبت میں مسرت مجھکو حاصل ہوتی جاتی ہے

جناب شفا سیمابی گوالیاری

طبیعت خود بخود مانوسِ مشکل ہوتی جاتی ہے
سکوں انجام ہی مایوسیٔ دل ہوتی جاتی ہے

نگاہوں کو جو تابِ دید حاصل ہوتی جاتی ہے
مری دنیائے دل خورشیدِ منزل ہوتی جاتی ہے

بحمد اللہ اب میں کامیابِ راہِ الفت ہوں
مجھے ہر گام پر امیدِ منزل ہوتی جاتی ہے

ابھی کامل ... شاید کامیابی ہے محبت کی
کہ ہر کاوش مجھے تسکینِ دل ہوتی جاتی ہے

گلہ ہو نا تباہ ... ہماری ... ہے
کہ عذبِ بسمل ... وحشتِ دل ہوتی جاتی ہے

یہ پروانوں کی لغزشیں ہو دامِ شمع ... کا
قریب اور اک محفل میں محفل ہوتی جاتی ہے

وہ ناکام ہو منزل ... بنتا بڑھتا جاتا ہوں
شفا ابھی ہی مجھسے دور منزل ہوتی جاتی ہے

جناب شاد اٹاوی

مری کشتی جو طوفاں کے مقابل ہوتی جاتی ہے
تو ہر موجِ بلا انگیز ساحل ہوتی جاتی ہے

نظر جتنی تری غارتگرِ دل ہوتی جاتی ہے
کچھ اتنی ہی تمیزِ حق و باطل ہوتی جاتی ہے

گرچہ طوفان کی اک موج محشر ہے مگر پھر بھی
قیامت ہے کہ دنیا اور غافل ہوتی جاتی ہے

زمانہ منحرف اپنے مخالف تم کشیدہ ہو
کہاں کی زندگی اب تو مشکل ہوتی جاتی ہے

سہو پہنچنے ہی کو ہوں جیسے میں اپنی جادۂ منزل پر
تسلی یوں مجھے منزل بہ منزل ہوتی جاتی ہے

محبت جانے کیا کرکے رہیگی اور کیا ہوگا
مجھے اب سانس لینی بھی تو مشکل ہوتی جاتی ہے

جسے کل دیکھ کر ہنستے تھے ہم اور مسکراتے تھے
وہی تصویر اب اے شاد قاتل ہوتی جاتی ہے

جناب سلیم سہروردی گوالیاری

اب ان کی ہر ادائے ناز قاتل ہوتی جاتی ہے
خدائی ہے کہ بے تلوار بسمل ہوتی جاتی ہے

گلوں کو اپنے ہی چاکِ گریباں سے نہیں فرصت
مری دیوانگی کیوں ان میں شامل ہوتی جاتی ہے

فنا کے بعد ہوگی بارِ ہستی سے سبکدوشی
خدا کا شکر اب نزدیک منزل ہوتی جاتی ہے

مرا ہم مقصد ہیں اور منزل ... مجھے
مری تدبیر میں تقدیر شامل ہوتی جاتی ہے

الٰہی نعشِ پروانہ اٹھانے کون آئیگا
طلوعِ صبح ہے تاراجِ محفل ہوتی جاتی ہے

تصدق جائیے جوشِ جنونِ عشق پر ہمدم
نظر اب ... نازِ محفل ہوتی جاتی ہے

سلیم بے خبر کو جستجو جس شے کی رہتی تھی
بفیضِ حضرتِ سیماب حاصل ہوتی جاتی ہے

جناب ہلال پیرمی ازکوکشی

دعا ہی نیند پروانوں کو حاصل ہوتی جاتی ہے
"طلوعِ صبح ہے تاراجِ محفل ہوتی جاتی ہے"

نہ رنگ رہرو دلیل کامیابی ہو یہی شاید
کہ اب ہر گام پر امیدِ منزل ہوتی جاتی ہے

اب اٹھ جائیگا پردہ درمیاں سے میں و تو کا
مری ہستی تری ہستی میں شامل ہوتی جاتی ہے

تصور کو حذر رکھے اسیری کا نہیں کچھ غم
قفس میں بھی چمن کی دید حاصل ہوتی جاتی ہے

کوئی ہر سو نکہ ہے جو روح پروانوں کی خوش ہیں
خموشی پھر شریکِ رنگِ محفل ہوتی جاتی ہے

یہ ہے معراجِ گمراہی کہ ذوقِ جادہ پیمائی
میں پاس آتا ہوں جتنا دور منزل ہوتی جاتی ہے

ہلال اس بے خبر کو کاش کوئی یہ خبر کر دے
کہ تیری یاد اب جزوِ رگِ دل ہوتی جاتی ہے

جناب ظفر قریشی جھنڈاروی

چھپی جاتی ہیں تمنائیں غم ہجراں ہوتی جاتی ہے
محبت بے نیاز راحت جاں ہوتی جاتی ہے

ہلنا تھا دل مضطر تمہاری یاد میں اب تک
تمہاری یاد بھی اب مجبور فراق ہوتی جاتی ہے

حقیقت کی شعاعیں دیکھ کر عشق مجازی میں
نظر صرف تمیز حق و باطل ہوتی جاتی ہے

تبسم برق پاشی کر رہا ہے آپ کی نظروں کا
چمک بجلی کی پیوست رگ دل ہوتی جاتی ہے

چمکا جاتا ہے ہر ہر گام پر برق نیاز آگیں
ادائیں بیخودی میں ہم منزل ہوتی جاتی ہے

دکھائی دے رہا ہے ہر طرف منظر تغافل کا
نہیں معلوم دنیا کس کی محفل ہوتی جاتی ہے

ترے اشعار ظفر کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتے
تری طرز بیاں کیوں اتنی مشکل ہوتی جاتی ہے

جناب باقی اعظمی

نمایاں رفتہ رفتہ شکل ساحل ہوتی جاتی ہے
خدا کا شکر ہے آساں مشکل ہوتی جاتی ہے

مٹا جاتا ہے سود و زیاں حق پرستی کا زمانے سے
یہ دنیا کیوں شکار وہم باطل ہوتی جاتی ہے

سجدہ شوق دل ہونے لگی ہے جلوہ زیبائی
ضیائے حسن سے معمور محفل ہوتی جاتی ہے

کہیں ایسا نہ ہو میں جادۂ مقصد سے ہٹ جاؤں
ہٹائے دل کہ اب نزدیک منزل ہوتی جاتی ہے

نہیں ہے طاقت نظارہ جب میری نگاہوں کو
تجلی کیوں تری پیہم مقابل ہوتی جاتی ہے

رہ منزل میں ہوں کیونکر نہ آخر مشکلیں حائل
شکستہ پائی میری عزم فاصل ہوتی جاتی ہے

محبت کیجئے باقی اب آیا رنج محرومی
کوئی شے ہے جو پیوست رگ دل ہوتی جاتی ہے

جناب آذر ناگپوری

حدیث درد و غم سننے کے قابل ہوتی جاتی ہے
مری افسردگی محفل کا حاصل ہوتی جاتی ہے

نظر منت پذیر عشق کامل ہوتی جاتی ہے
حقیقت آشنائے حق و باطل ہوتی جاتی ہے

تپش درد محبت کی جو شامل ہوتی جاتی ہے
گداز عشق سے لذت سی حاصل ہوتی جاتی ہے

عجب اک چیز مایوسی بھی ہے بحر محبت میں
ہر اک موج تلاطم خیز ساحل ہوتی جاتی ہے

انہیں اب دیکھتا ہوں بزم ماہ و انجم میں
مری تاب نظر جلوؤں کی حامل ہوتی جاتی ہے

جنون عشق کی تسخیر عالمگیر تو دیکھو
نظر ترقی ہے جب غم پر مراحل ہوتی جاتی ہے

رہ الفت میں آیا ہوں کہ ایسا دشت پیمائی
کہ سر ہر گام پہ منزل ہوتی جاتی ہے

جناب رسا اورنگ آبادی

جہاں تک ہے ان کی قربت مجھ کو حاصل ہوتی جاتی ہے
فزوں کچھ اور بھی بیتابی دل ہوتی جاتی ہے

بہت کچھ کی ہے کوشش اس سے باز آ نہیں سکتی
مگر تقدیر سے تدبیر باطل ہوتی جاتی ہے

خدا محفوظ رکھے بحر عشق میں اب کشتی دل کا
[illegible] ساحل ہوتی جاتی ہے

بہت آساں راہ عشق کو پہلے سمجھتا تھا
مگر چلتا ہوں جتنا دور منزل ہوتی جاتی ہے

نظر جس کو اپنی کامیابی کا سمجھتا تھا
وہی شے باعث محرومی دل ہوتی جاتی ہے

ہوئی اب شمع بیکس خاک پروانے کو مل کر
طلوع صبح ہے تاریک محفل ہوتی جاتی ہے

رسا وہ کیف باری کر رہی ہے چشم میگوں سے
شراب حسن سے مخمور محفل ہوتی جاتی ہے

جناب شمس زبیری مرادآبادی۔

نگاہ ناز پیوست رگ دل ہوتی جاتی ہے
یہ کشتی خود بخود نزدیک ساحل ہوتی جاتی ہے

فریب رہبری دیتا ہے کیوں آئے راہزن مجھ کو
میں جتنا بڑھ رہا ہوں دور منزل ہوتی جاتی ہے

مری وحشت سے جو حیراں ہیں انکو کیا خبر اس کی
مری دیوانگی کس شے کی حامل ہوتی جاتی ہے

میں جب یہ کہہ چکا ہوں مجھ کو دنیا سے نہیں مطلب
تو پھر کیوں یہ مرے مد مقابل ہوتی جاتی ہے

میں جتنا مشکل الفت کو آساں کرتا جاتا ہوں
مری قسمت سے اتنی اور مشکل ہوتی جاتی ہے

میں ویرانہ سے گھبرا کر جو پہنچا صحن گلشن میں
صدا آئی کہ تجھ سے دور منزل ہوتی جاتی ہے

پسند آئے مجھے اے شمس کیا ہنگامۂ محشر
طبیعت خوگر ویرانئ دل ہوتی جاتی ہے

جناب ضیا میرٹھی

تغافل کیش جب سے خود ہی قاتل ہوتی جاتی ہے
طبیعت خود بخود شکووں کی مائل ہوتی جاتی ہے

رہ مقصود جب طے منزل بمنزل ہوتی جاتی ہے
سمجھتا ہوں کہ آساں میری مشکل ہوتی جاتی ہے

محبت کی ہمہ گیری جو حاصل ہوتی جاتی ہے
مری نظروں میں دنیا نقش باطل ہوتی جاتی ہے

زبیر دامنوں کی کثرت ہے نہ شمعوں میں ضیا باقی
طلوع صبح ہے تاریک محفل ہوتی جاتی ہے

مسافر بیٹھ جائے تو کر دل کو سمجھا لینا
سفر کٹتا ہے جتنا دور منزل ہوتی جاتی ہے

خدا سے نقد طلب ترغیب ہے میری نظروں کو
ستم یا مہربانی اُن کی حائل ہوتی جاتی ہے

گلا اب کیا کروں کوئی جفا کا اے ضیا ان کی
بیاں اپنی وفا ہی نقش باطل ہوتی جاتی ہے

جناب زیب بریلوی

نشاط زندگی نذر سلاسل ہوتی جاتی ہے
بنائے عاشقی اب جستجوئے دل ہوتی جاتی ہے

طلسم حسن سے آباد محفل ہوتی جاتی ہے
فریب عشق سے بربادئ دل ہوتی جاتی ہے

حیا و شرم سے اے جان دل دیکھنے والے
تری ان شوخیوں سے زیست مشکل ہوتی جاتی ہے

کبھی ہوتے نہ تھے دیدہ کبھی آج بتقلب میں
نہ جانے کیوں ان کی ادا قاتل ہوتی جاتی ہے

وہ اب پاکیزگی عشق کی ادا دیکھتے ہیں
انہیں بھی اب تمیز حق و باطل ہوتی جاتی ہے

مجبور وحشی عہد حالت دیکھ کر ... / چھپا دو کوئی تسکین پہلو دل ہو اللہ جاتی ہے

کسی کی نرگسِ شیخ آرزو بھیجی ہے دنیا میں / نیاز و ناز کی تا آنکہ کامل ہوتی جاتی ہے

حضرت آسی رزگوی (از بمبئی)

مآلِ نازِ محبت زیست مشکل ہوتی جاتی ہے / مگر ہر طرح کیفیتِ دل ہوتی جاتی ہے

وہ کشتی ہے کہ ٹوٹی تھا موجِ طوفان سے / مآلِ کار غرقِ موجِ ساحل ہوتی جاتی ہے

سمجھا تھا کہ جنونِ زندگی ہو نازاں ہی نہیں / مگر کیا کیجئے اب غارتِ دل ہوتی جاتی ہے

تصور جیسے جیسے صورت کا اُن کی بڑھتا جاتا ہے / مری تصویر ہی میرے مقابل ہوتی جاتی ہے

اٹھاتا ہوں قدم پھر کچھ سمجھ کر بیٹھ جاتا ہوں / یہ کیا حالت مری نزدیکِ منزل ہوتی جاتی ہے

کبھی کچھ جو کی اب کیا شکایت کیجئے آسی / طبیعت خوگرِ آلام و مشکل ہوتی جاتی ہے

جناب عزیز اختر وارثی

نوشتِ کاتبِ فطرت مقابل ہوتی جاتی ہے / مجھے کچھ کچھ تمیزِ حق و باطل ہوتی جاتی ہے

توجہ تیری کم ای جذبِ کامل ہوتی جاتی ہے / کہ جتنا دوڑتا ہوں دور منزل ہوتی جاتی ہے

بچا اے ناخدائے عشق سیلِ نارسائی سے / مری کشتی غریقِ موجِ ساحل ہوتی جاتی ہے

اب اسکے بعد شاید ہی کوئی غم آن آئیگا / محبت دو جہاں کے غم کا حاصل ہوتی جاتی ہے

حقیقت میں سرورِ معرفت شامل کچھ ایسی ہے / گناہوں میں جو اک لذت سی حاصل ہوتی جاتی ہے

سرگشتِ چمن، سیرِ شبِ مہتاب اے اختر / بقدرِ ذوق معمولِ مشاغل ہوتی جاتی ہے

جناب ممتاز احمد خان خوشتر از کھنڈوہ

ہمیں شہرت جہانِ آرزو میں حاصل ہوتی جاتی ہے / ہماری داستان سننے کے قابل ہوتی جاتی ہے

نہیں کچھ غم نہیں ملتا جو ساحل بحرِ ہستی کا / خوشی یہ ہے کہ اب کم فکرِ ساحل ہوتی جاتی ہے

ہجومِ غم دلِ ویران میں جاتا ہے تو ہو نے دو / بُرا کیا ہے اگر آباد محفل ہوتی جاتی ہے

کسے معلوم تھا دشوار راہِ عشق ہے ہمدم / جسے آساں سمجھتے تھے وہ مشکل ہوتی جاتی ہے

ہوا جاتا ہے اندھا پند گو کوتاہ بینی سے / حقیقت بھی نظر میں اسکی باطل ہوتی جاتی ہے

لہو کے گھونٹ پی لیتے ہیں ساقی کی عنایت ہے / یہ بات اب شہیدانِ وفا میں داخل ہوتی جاتی ہے

سنبھالا جب سے ہے خوشتر نے دامن اسکی رحمت کا / جہانِ الفت میں عزت اسکو حاصل ہوتی جاتی ہے

جناب معین نظامی میرٹھی

کوئی لطف اسکی جانب دل ہوتی جاتی ہے / مری ہستی حیاتِ نو کی حامل ہوتی جاتی ہے

تمنا میری حریفِ حسن کامل ہوتی جاتی ہے / حقیقت ہی حقیقت سے مقابل ہوتی جاتی ہے

حمد الٰہی کا یاں جو تاب ہیں ... ہے / مری کشتی ... منزل ہوتی جاتی ہے

کہیں ہے شوق خود بینی بہم تکرار نظارہ / نظر کے سامنے جلوہ کامل ہوتی جاتی ہے

ہوئے دردِ دل تکمیل اور شوقِ انتظاری / تمہاری ہر نظر صورت کمال ہوتی جاتی ہے

زہے مشقِ تصور ہے تمہیں اب دل نہیں ہیرا / نزول حسن کے جلوہ دل محفل ہوتی جاتی ہے

جناب لطیف انجمی (مقیم احمد آباد)

طبیعت بے نیازِ حسرتِ دل ہوتی جاتی ہے / محبت لو مشکل او مشکل ہوتی جاتی ہے

جہاں عشق کی ہر ایک شے دل ہوتی جاتی تھی / مجھے اب دولتِ کونین حاصل ہوتی جاتی ہے

جہاں تک میں بقدرِ شوق آگے بڑھتا جاتا ہوں / ستم ہے اور بھی کچھ دور منزل ہوتی جاتی ہے

مجھے اب ناخدا کی بے رخی کا خوف کیونکر ہو / مری قسمت سے اب ہر موج ساحل ہوتی جاتی ہے

کرلی نیرنگیاں دیکھے بہارِ حسنِ فطرت کی / مجھے ہر دم جیسے ہر کلی دل ہوتی جاتی ہے

لطیف اسکو خدا حافظ ہے میرے ذوقِ ایماں کا / طبیعت پھر کسی کافر پہ مائل ہوتی جاتی ہے

جناب اشعر ہاشمی ملیح آبادی

نگاہ تیر ان کی جب سے غافل ہوتی جاتی ہے / دلِ مضطر کو کچھ تسکین حاصل ہوتی جاتی ہے

الٰہی جستجوئے یار میں کیسا یہ دور آیا / کہ میں جتنا چلا اتنا ہی وہ منزل ہوتی جاتی ہے

ادھر میرے دلِ برباد کا بسنا ہے ناممکن / ادھر آباد ہر ویران محفل ہوتی جاتی ہے

نہ رو اے شمعِ محفل ہو چکا جو کچھ کہ ہونا تھا / طلوعِ صبح ہے تاریک محفل ہوتی جاتی ہے

نہ اب اضطراب کی حالت ہے نہ وہ وحشت / تصور سے ترے تسکین حاصل ہوتی جاتی ہے

مرے شکووں کو سنکر جب اشعر رو دیا ہیں / تو ہر وہ بات جو آساں تھی مشکل ہوتی جاتی ہے

جناب ظفر کھاتولوی

مجھے تاکید کیا خاموش رہنے کی ظالم نے / خموشی خود مری فطرت میں شامل ہوتی جاتی ہے

ذرا نزدیک جب ہوتا ہوں منزل لوٹ آتا ہوں / قریب آ کے مجھ سے دور منزل ہوتی جاتی ہے

کوئی ساحل سے جا کر موج واپس نہیں آتی / جو ساحل تک پہنچتی ہے وہ ساحل ہوتی جاتی ہے

کوئی حسرت مرے دل سے نکلنے ہی نہیں پاتی / جو پیدا دل میں ہوتی ہے مراد ہوتی جاتی ہے

مرے اللہ کیا انجام ہونا ہے زمانے کا / تری مخلوق اب تجھ سے ہی غافل ہوتی جاتی ہے

عنایت مجھ پہ ہوتی جا رہی ہے اے ظفر جتنی / اسی حد تک مری فریاد باطل ہوتی جاتی ہے

جناب فارغ از اودے پور

طبیعت خود بخود بیزار باطل ہوتی جاتی ہے / نگاہ آشنا کیفیتِ دل ہوتی جاتی ہے

دکھائیں کس طرح سینہ چیر کر دنیا کو زخمِ دل
خدا جانے تجسس کا مرے انجام کیا ہوگا
نہیں معلوم میری کم نصیبی جلوہ گر کب تک

جناب قیس بدایونی

تصور سے نہیں تسکین تو حاصل ہو ہی جاتی ہے
بھلاتا ہوں انھیں جتنا انہی کا ہو رہا ہوں میں
مجھے ہے جستجو جس کی تماشہ [illegible]
غمِ فرقت میں اتنا ہے سہارا [illegible]
نظر آتا ہے ہر سو در ترا ذوقِ تصور سے

جناب نسیم از سرگودھا

رگِ جاں سے قریں عشق قاتل ہو ہی جاتی ہے
مصیبت جھیلنی آخر مری شوقِ تصور بھی
خدا کے واسطے خنجر چلا رگ رگ کے اے قاتل
کسی دن تو کبھی [illegible] نمایاں ہے
نسیم اے دل حسرت سے کبھی تاثیر ہو پیدا

جناب مخمور بریلوی

غم و ماتم کی تنویر یا طل ہو ہی جاتی ہے
بجز دونوں یہ ناکامی یہ بربادی اور اسیری
ادھر موت کے جھگڑے نہیں [illegible]
او ناز جو تھی باعثِ بربادی ہم
تم کو بھی شکایت [illegible]

جناب شجر کوئی از فتحپور

مجھے جب [illegible] مشکل ہو ہی جاتی ہے
دم یاس [illegible] کی کثرت
نہ کو میری کب تھی [illegible] نظارہ [illegible]
زلفیں حسین [illegible]
[illegible] چاہ کر نہیں

کبھی کیا آپ کو حالِ دل ہو ہی جاتی ہے
مجھے جب انتہا میں سخت مشکل ہو ہی جاتی ہے
تبھی پر اس قدر دنیا حائل ہو ہی جاتی ہے

مگر کم لذتِ بیتابی دل ہو ہی جاتی ہے
طبیعت میری اور پر حائل ہو ہی جاتی ہے
وہ ہم کو بے خودی میں اپنی حاصل ہو ہی جاتی ہے
وہ آساں ہو ہی جاتی یہ مشکل ہو ہی جاتی ہے
جبینِ شوق کے سجدہ کو مشکل ہو ہی جاتی ہے

مبارک ساعتِ نزدیک منزل ہو ہی جاتی ہے
مجھے خلوت میں تنہائی بھی مشکل ہو ہی جاتی ہے
مجھے اس میں عجب لذت سی حاصل ہو ہی جاتی ہے
ضیائے حق سے خود تحریب باطل ہو ہی جاتی ہے
"طلوعِ صبح ہے تاراج محفل ہو ہی جاتی ہے"

"طلوعِ صبح ہے تاراج محفل ہو ہی جاتی ہے"
طبیعت [illegible] مائل ہو ہی جاتی ہے
نشاطِ زندگی ہر لمحہ باطل ہو ہی جاتی ہے
اسی سے اب غزل کی محفل ہو ہی جاتی ہے
کہ ماتو میں الم [illegible] ہو ہی جاتی ہے

یہ حسن و عشق میں اکثر حاصل ہو ہی جاتی ہے
کہ آرزو مندی بھی مشکل ہو ہی جاتی ہے
تمنا بنتی جاتی ہے مقابل ہو ہی جاتی ہے
[illegible] شامل ہو ہی جاتی ہے
نگاہ [illegible] مقابل ہو ہی جاتی ہے

[illegible] شوخی [illegible]

جناب شفیق کوانیاڈی

نگاہِ ناز مائل جانبِ دل ہو ہی جاتی ہے
نگاہِ شوق جلوؤں کے مقابل ہو ہی جاتی ہے
خدا کی شان [illegible] ہو جاتا ہے
ہماری کشتی پھر رواں کا اب خدا حافظ
ہوا احساس شاید [illegible]

جناب ضمیر حسینی احمد آبادی

سرِ مقتل [illegible] تیغِ قاتل ہو ہی جاتی ہے
مری دعوت [illegible] منظور [illegible]
پہنچی ہیں [illegible]
جبیں سائی کا [illegible] در پہ

جناب واقف سرحدی

دعائیں ہے [illegible] کو طوفاں کے
سجود دم بدم فریاد شب [illegible]
مری وہ آرزو جسکو نکلنے کی تمنا تھی
کسی کے نام سے جب ابتدائے [illegible] کرتا ہوں

جناب بسمل علوی بھنڈاروی

کسی کا نام ہے لب پر کسی کی یاد ہے دل میں
بھلا اس [illegible] کریں کیا تو بہائے خونِ ناحق ہو
تغیر ان [illegible] کیسی قلمرو ئے محبت میں
یہ ظرف استقامت کا مری ہے امتحاں شاید

جناب سہیل شاہاوری

شبِ فرقت کی [illegible] مشکل ہو ہی جاتی
[illegible] الفت کی [illegible]
[illegible] جلوہ سازی [illegible]
[illegible]

جناب عاقل از بیتول

مری منزل [illegible]
[illegible] ساحل [illegible] سفینہ [illegible]
[illegible] مشکل [illegible] آساں [illegible]

خدا معلوم یہ کیا حالتِ دل ہو ہی جاتی ہے

مرتب ایک تمنا [illegible] ہو ہی جاتی ہے
بحمد اللہ تاب [illegible] حاصل ہو ہی جاتی ہے
نظر آتی ہے [illegible] مقابل ہو ہی جاتی ہے
کہ بحرِ غم کی اک اک موج ساحل ہو ہی جاتی ہے
[illegible] کچھ محفل ہو ہی جاتی ہے

تو قالب میں پریشاں روحِ بسمل ہو ہی جاتی ہے
تجوں پر کیوں طبیعت میری مائل ہو ہی جاتی ہے
طلوعِ صبح ہے تاراج محفل ہو ہی جاتی ہے
ضمیر اب بار یابی مجھکو حاصل ہو ہی جاتی ہے

انہیں کے دم سے کشتی نذرِ ساحل ہو ہی جاتی ہے
یہ راحت ہے تو راحت دل کو حاصل ہو ہی جاتی ہے
رہی اب دل میں [illegible] ہو ہی جاتی ہے
تو واقف خود بخود آساں مشکل ہو ہی جاتی ہے

مجھے آساں [illegible] مشکل ہو ہی جاتی ہے
کہ ہر [illegible] چشمِ قاتل ہو ہی جاتی ہے
بیاں تفسیرِ [illegible] ہو ہی جاتی ہے
نمایاں ہر قدم پر ایک منزل ہو ہی جاتی ہے

طلوعِ صبح ہے تاراج محفل ہو ہی جاتی ہے
[illegible] منزل ہو ہی جاتی ہے
[illegible] منزل ہو ہی جاتی ہے
سہیل [illegible] ہو ہی جاتی ہے

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

اصلاحِ سخن

ابوالمختار طرفہ قریشی بھنڈاروی کی نعت پر حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی کی اصلاح

کسی را ہم زباں دارم نہ یارو ہمنوا دارم ۱ فقط عشقِ نبی محمد مصطفےٰ را آشنا دارم

نظر بر آں سوئے روضۂ خیر الوریٰ دارم ۲ عنایاتِ نبی کہ بر گدائے بینوا دارم

گذر یابد چرا در سینہ ظلمت ببینی تن ۳ بدل روشن چراغِ عشقِ محبوبِ خدا دارم

چرا باشد مرا خوف جفا و پرسشِ عصیاں ۴ شفیعِ عاصیاں را روزِ محشر التجا دارم

گنہگارم سزاوارم ولے امیدِ رحمت ہم ۵ کرم کن یا رسول اللہ نجز تو آسرا دارم

بجز تو حالِ قلبِ زار گویم با کسے مولا ۶ باین عالم بجز تو من کسی را آشنا دارم

ہوس دارم کہ سر را خم کنم بر آستان تو ۷ نمی خواہم متاعِ زر نہ دیگر مدعا دارم

اگر بر سر ندارد کہ ... ۸ بگویم اے نکیراں راشوقِ وصلِ مصطفےٰ دارم

توجیہہ:- (۱) مصرعہ میں "یک" برائے بیت تھا اس کے علاوہ ردیف میں ضمیر متکلم موجود ہے اسلئے "من" کی بھی ضرورت نہ تھی۔

(۲) "من آن نبوا" میں زور نہ تھا نہ کوئی خاص بات تھی "محالم بین" سے مصرع میں جان سی پڑ گئی اور زور بھی پیدا ہو گیا۔

(۳) "لحد" صحیح وزن پر نہ تھا کہ شعر کے وزن پر ہی وجہ اصلاح ہے۔

(۴) "آشنا" غزل کا لفظ معلوم ہوتا تھا اسلئے "مدعا" بنا دیا گیا۔

(۵) ... [illegible]

(۶) "بجز تو" کو اس لئے بدلا گیا کہ بیان ... کی ضرورت تھی۔

(۷) ... [illegible]

شیدا صاحب اٹاوی مرحوم کی نعت پر حضرت مولانا احسن مارہروی مرحوم کی اصلاح

سہارا ہے تمہیں روز جزا نہیں بس محمد کا ۱ اشارہ ہو گنہگاروں کو سیم مشفقِ دوکا

خدا جانے کہ اس نے دور میں کیا اسرار مخفی ہیں ۲ اعادہ میں کہیں تنظرآتا ہو دونوں میم احمد کا

سہارا ہے کہ ... ۳ بہت مشکل ہے دونوں جہاں عقیدہ کا

ہر اک سینہ پہ سے ہی طوقِ الفت ... ۴ جہاں میں آج کل شہرہ ہے ایسا اس سہی قد کا

... جالیوں کی گرد پھرتی ہے ۵ نکالا ہے نسیمِ صبح نے سینہ خوشامد کا

الٰہی یہ تمنا ہے کہ وہ دن دیکھ لوں میں بھی ۶ کروں جا کر طواف اس سید عالم کے مرقد کا

طفیلِ مصطفےٰ یا رب مری امید بر آئے ۷ ... میرے دل کے مقصد کا

کراماً کاتبیں کیا نامۂ اعمال لکھیں گے ۸ بھروسہ ہے مجھے تو حشر میں ذات محمد کا

غزل یثرب میں جا کر ... نعت محمد میں ۹ لقب پایا ہے میں نے شیدائے محمد کا

توجیہہ:- (۳) دیدار دکھانا۔ خلاف محاورۂ فصحا ہے۔ دکھانا کی جگہ دکھلانا بھی خلاف فصاحت ہے۔ اسی لئے اصلاح دی گئی۔

(۴) "مثل قمری کے" اس میں "کے" زائد تھا

(۵) پاؤں فعلن کے وزن پر نہ کہنا چاہئیے دیتے ہوئے واؤ کی ضرورت ہے

(۷) غنچہ کھول دینا محاورہ نہیں ہے بلکہ غنچہ کھلنا محاورہ ہے اصلاح سے یہ ضرورت ... ہے

(۹) مدینہ منورہ کو ایام جاہلیت میں یثرب کہتے تھے۔ حضور اکرم نے طیبہ فرمایا ہے گو بڑے بڑے لوگ یثرب کہہ گئے ہیں مگر علما اور محدثین اسے پسند نہیں کرتے پھر شعرا کیوں پسند کریں۔ یثرب کو طیبہ سے بدل دینے کا یہی سبب ہے

اعجاز صدیقی


خون معدہ اور جگر صاف رہتے ہیں تو عمر بڑھتی ہے!
"تم جو چاہو کھاؤ، مگر آج کل بہار کے موسم میں معدہ، جگر اور خون کا خیال رکھو۔ ان میں زہر نہ پھیلنے پائے۔"
"امی جان! آپ فکر نہ کیجیے۔ میں صحت کا بڑا خیال رکھتا ہوں۔ ۵۰ روز تک دونوں وقت صافی پی چکا ہوں۔ ایک میں کیا؟ آج کل ہر زبان پر صافی کا لفظ ہے۔
"میں جانتا ہوں کہ چیچک، خسرہ، نکسیر، حلق میں ورم، کن پیڑے، کھجلی، پھوڑے، پھنسیاں، داغ روکنے، اور ان کو دفع کرنے، جلد صاف ستھری رکھنے، خون، معدہ اور جگر سے آسان راستوں سے زہر نکال دینے کے لیے سائنس کے پاس صافی سے بہتر کوئی دوا نہیں ہے۔"
قیمت فی شیشی (۱۰ خوراک) صرف دس آنے۔ ابھی منگائیے
رسالہ ہمدرد بہار اور ہمدرد اطفال دواخانہ سے مفت طلب فرمائیے۔

ضروری اطلاع

اس کے پڑھنے سے [illegible]

صاحبان! میں اشتہاری حکیم [illegible] ڈاکٹر [illegible] آدمی [illegible] جب بدقسمتی سے مجھے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی کو [illegible] تباہ [illegible] [illegible]

[illegible]

مقوی گولیاں فی شیشی جس میں ۲۱ روز کی ۴۲ خوراک موجود ہیں صرف تین روپے دو آنے، قیمت روغن مالش طلاء جو ۱۲ روز تک رگوں [illegible]

فی شیشی تین روپے آٹھ آنے (۳/۸) [illegible]

[illegible]

مشاہیر شعرائے دیوان

گلزارِ داغ - فصیح الملک حضرت داغ دہلوی مرحوم و مغفور کا مشہور دیوان قیمت

کمالِ داغ - فصیح الملک حضرتِ داغ دہلوی کے چاروں دیوانوں کا انتخاب مع مبسوط مقالۂ تنقیدی۔ قیمت مجلد ۔

روحِ نظیر - مرتبہ جناب مخمور اکبرآبادی بی۔اے۔ میاں نظیر اکبرآبادی کے منتخب کلام کا مجموعہ مع بسیط مقدمہ و تبصرہ حجم ۔۔۴ صفحات۔ قیمت ۔

جگر پارہ - حضرت بیدم شاہ وارثی مرحوم کا متصوفانہ اور سوز و گداز سے پُر کلام کا مجموعہ۔ قیمت صرف ۱۲ ۔

مصحفِ بیدم حضرت بیدم شاہ وارثی مرحوم کا دوسرا مجموعۂ کلام جس میں ان کا تمام کلام مع ٹھمری اور دادروں کے درج ہے۔ اس دیوان کا مقدمہ حضرت خواجہ حسن نظامی نے تحریر فرمایا ہے مع تصویرِ مصنف۔ قیمت ۔

نشاطِ روح حضرت اصغر گونڈوی مرحوم کا مشہور و معروف دیوان جو آرٹ پیپر پر بڑے اہتمام سے چھاپا گیا ہے مع تصویرِ مصنف۔ قیمت ۔

گلکدہ - حضرت عزیز لکھنوی (استاد حضرت جوش ملیح آبادی) کا دیوان غزلیات جو سوز و گداز اور حقیقت و معارف کا ایک خزانہ ہے۔ قیمت ۔

ایاغِ بزم حضرتِ مرزا عاشق حسین بزم آفندی اکبرآبادی کا دوسرا مطبوعہ دیوان جس میں محاکات و تاثرات کا دریا موجزن ہے۔ قیمت ۔

قصائدِ نجم - حضرت نجم آفندی اکبرآبادی خلف حضرت بزم آفندی اکبرآبادی کی لاجواب تصنیف مدحِ رسولؐ و آلِ رسولؐ میں بلند پایہ نظمیں اور قصائد قیمت ۔

نقوشِ مانی حضرتِ مانی جائسی کا دیوان ایک ایک شعر جذبات و ارادت کا صحیح نمونہ ہے۔ قیمت صرف دو روپیہ ( )

میکدہ - جناب مولوی سید محمد علی شاہ صاحب میکش قادری اکبرآبادی کے جذباتِ حُسن و عشق اور متصوفانہ کلام کا بہترین مجموعہ مع تصویرِ مصنف۔ قیمت ۔

فغانِ آرزو حضرتِ آرزو لکھنوی کی غزلیات کا مجموعہ جس میں زبان و بیان کی خوبیوں نے مل کر عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ قیمت ۔

آتش کدہ - مجموعۂ غزلیات بابو گوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ایم۔ اے۔ دی۔ اگر آپ قدیم رنگ تغزل کو جدید مذاقِ بلند کے ہمراہ دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ دیوان ملاحظہ فرمائیے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ حجم ۲۶۸ صفحات مع تصویرِ مصنف قیمت ۔

نورِ مشرق - جناب مہر لال ضیا فتح آبادی ایم۔ اے۔ کی روح افزا و معیاری نظموں کا مجموعہ۔ حجم ۱۳۶ صفحات مجلد مع تصویرِ مصنف۔ قیمت ۔

صبحِ مشرق - جناب محمد صادق صاحب ضیائی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کا کلیاتِ نظم و غزل حجم ۲۵۶ صفحات مجلد مع تصویرِ مصنف قیمت ۔

دیگر منظومات

الہامِ منظوم حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی نے مثنوی مولانا روم کے مکمل دفتر اول کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ نثر کے ترجمے تو آپ نے بہت دیکھے ہوں گے منظوم ترجمہ بھی دیکھیے۔ اوپر اصل شعر دیجیے اس کا منظوم ترجمہ۔ یہ ایک شاہکار کتاب ہے قیمت مکمل ۔

مثنوی عالمِ خیال مصنفہ مرزا شوق قدوائی لکھنوی مرحوم، شوہر اور بیوی کی محبت آمیز جذباتی منظوم خطوط۔ ایک نظم کے چار رخ جو چار خوبصورت تصاویر سے مزین ہیں۔ قیمت مجلد مع رنگین تصویر ۔ سادہ غیر مجلد ۸ ۔

مثنوی مادرِ ہند - مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم
یہ مثنوی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نئی ہے۔ اس میں ہندوستان کی مکمل سیاسی تاریخ ہے۔ علامہ سیماب اکبرآبادی اور رشید احمد صدیقی کے مقدمے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قیمت صرف ۱۲ ۔ حجم ۱۸۰ صفحات۔

مثنوی ظہورِ رحمت :- مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی
یہ مثنوی ولادتِ نبویؐ کے متعلق دلکش اور عقیدت مندانہ پیرایہ میں لکھی گئی ہے قیمت صرف ۸

مثنوی زہرِ عشق کامل ۔ **مثنوی گلزارِ نسیم** ۶ ۔

مثنوی میر حسن ۶ ۔

اربعہ عناصر - حکیم محمود علیخاں صاحب ماہر اکبرآبادی کی رموز و نکات سے لبریز رباعیات کا مجموعہ۔ مجلد قیمت ۔

مینائے سخن منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی مرحوم کی تمام داسوختوں کا بے نظیر مجموعہ قیمت ۔

شبابیات مصنفہ حضرت ساغر نظامی موضوع شباب پر ۴۶ حسین رباعیات کا بے مثل مجموعہ قیمت صرف ۸ ۔

مختلف دواوین

دیوانِ غالب ۶ ۔ غزلیات امیر و نظیر ۔ انتخاب کلام اکبر الہ آبادی ۔ دیوانِ کلیم عامل سکلی ۸ ۔ کلامِ داغ ۔ بہارِ معرفت ۔ دیوانِ حافظ شیرازی ۔ دیوان ذوق دہلوی ۶ ۔ دیوان پروین ۔ دیوان جوہر ۔ حدیثِ ناتمام ۱۲ ۔

حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کی مختلف نظمیں

شکوہ جواب شکوہ ۔ شمع و شاعر ۔ فریادِ اُمت ۔ اکبر و اقبال ۔ ترانۂ یتیم ۔ تصویرِ درد ۔

تصانیف حضرت مولانا حالی پانی پتی مرحوم

مسدس حالی (عکسی) ۔ مسدس حالی (سادہ) ۸ ۔ مرثیہ مرزا غالب ۔ مناجاتِ بیوہ ۔ شکوۂ ہند ۲ ۔ حبِ وطن ۲ ۔ چپ کی داد ۲ ۔

دیگر مختلف نظمیں

ارشاداتِ احمد (چند احادیثِ نبویؐ کا منظوم ترجمہ) ۔ کشمیر کا مستقبل ۔ قومی نظم ۔ تشریح الشفا (سر سے پاؤں تک کی تمام بیماریوں کا علاج منظوم) ۔

ملنے کا پتہ

مکتبۂ قصر الادب دفتر "شاعر" آگرہ

مشہور افسانہ نگاروں کے مشہور افسانے

تصانیف حضرت نیاز فتح پوری

نگارستان - یہ مجموعہ ہندوستان کے عدیم المثال افسانہ نگار حضرت نیاز فتح پوری کا ایک شاہکار ہے اس مجموعہ کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ اسکے متعدد مضامین دوسری زبانوں میں منتقل کئے گئے ہیں۔ قیمت صرف ۱۲؍

شہاب کی سرگذشت - مولانا نیاز فتحپوری کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو لٹریچر میں بالکل نئی چیز تسلیم کیا گیا ہے۔ جزئیات سیرت نگاری اور تحلیل جذبات کے ایسے نادر نمونے اسمیں نظر آئیں گے جو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتے۔ قیمت ۱۰؍

تصانیف حضرت لطیف الدین احمد اکبرآبادی

انشائے لطیف - یہ لطیف صاحب کے پندرہ افسانوں کا بہترین مجموعہ ہے اس میں آپ کو حسن و عشق کی صحیح نقاشی ملے گی۔ قیمت مجلد ۱۲؍

محبت کا افسانہ - یہ ایک طویل افسانہ ہے جسمیں مسئلہ ازدواج سے بحث کی گئی ہے قیمت ۱۲؍

زندگی کے کھیل - بارہ کہانیوں کا نیا مجموعہ فلاکت زدہ سماج کی زندہ تصویر قیمت ۱۲؍

کیفستان - جناب کیفی رامپوری کے دلچسپ افسانوں کا مجموعہ قیمت ۱۰؍

شب چراغ - بہترین تہذیبی سوشل اور جذباتی افسانوں کا مجموعہ از جناب محمد صادق صاحب ضیائی - اے - ایل - ایل - بی۔ قیمت ۸؍

قاتل - اور دوسرے افسانے۔ جناب ایم اسلم کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ قیمت ۱۲؍

ظریفانہ افسانے

ہندوستان کے مشہور و معروف ظرافت نگار مسٹر شوکت تھانوی کی پیٹ میں درد ڈال دینے والی مقبول ترین کتابیں جن کے پڑھنے سے سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی لوٹن کبوتر بن جاتا ہے۔

موج تبسم ۸؍ طوفانِ تبسم ۸؍ سیلاب تبسم ۱۰؍ بحر تبسم ۱۰؍ منشی جی ۱۰؍

شہید ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی کی بالکل آخری تصنیف

پھریری جس میں مزاح نگاری اور سنجیدگی کے دونوں پہلو سقدر تابناک ہیں کہ بیساختہ منہ سے داد نکل جاتی ہے۔ اسمیں کل ۱۴ افسانے ہیں ہر افسانہ پورے زور قلم کیساتھ لکھا گیا ہے حجم ۲۸۸ صفحات مجلد معہ بہترین گرد پوش قیمت ۱۲؍

مختلف افسانے

سرگذشت اسیر ۱۰؍ - سمندر کی خداوندہ ۲؍ محمودہ ۱۰؍ دغا ۸؍ طوفان زندگی ۱۰؍ عروج زندگی ۱۰؍ شیطان کا پنجہ ۱؍ عبرت کدہ ۱۲؍ خانقاہِ اشرار ۱۲؍ چھنو کی دیوی ۱۲؍ مغربی دلہن ۱۰؍ ابد رکمال ۱۰؍ - بالشوک شہزادی ۲؍ انارکلی ۲؍ جنات کی شہزادی ۲؍ پھر پھر داتہ ۳؍ شیطان زادہ ۳؍ شیطان کا چرخہ ۴؍ دوست ۴؍

فن عروض کی منتخب معتبر اور عام فہم کتابیں

معین الشعرا - از غلام حسین خاں آفاق بنارسی مرحوم۔ یہ وہ عدیم المثال لغت ہے جس میں عربی - فارسی، اردو، انگریزی اور ہندی زبان کے ہزاروں الفاظ کے معنی کے علاوہ ہر لفظ کے اعداد ملفوظی صحت کے ساتھ درج کئے گئے ہیں جو تاریخ نکالنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ہر لفظ کے متعلق یہ بھی درج ہے کہ وہ کس زبان کا ہے اور مذکر یا مؤنث۔ نہ صرف یہی بلکہ اساتذہ ماضی و حال کے کلام سے ہر لفظ کی تذکیر و تانیث کا ثبوت بھی پیش کیا گیا ہے۔ حقیقتاً یہ لغت طالبان ادب و شعر کے لئے خضر راہ ہے بڑی تقطیع حجم ۲۸۶ صفحات مجلد للعہ

دستور الاصلاح - از حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی۔ اصلاح لینے اور اصلاح دینے کے طریقوں کا انضباط شعرائے متقدمین و متاخرین کی یکجائی اصلاحیں اور انکی توجیہہ۔ یہ پہلی فنی کتاب ہے جو مبتدی اور منتہی دونوں کے لئے شمع راہ ہے۔ فنی نکات اور ادبی اصلاحات کی تشریح میں اپنی نوعیت کی پہلی اور آخری کتاب ہے حجم ۴۴ صفحات۔ قیمت ۱۲؍

مشاطہ سخن - مصنفہ صفدر مرزا پوری اسمیں مسلم الثبوت اور مشہور اساتذہ کی اصلاحوں کے نمونے دئے گئے ہیں قیمت ۱۰؍

رازِ عروض - از حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی۔ عروض کی سیکڑوں ادق کتابوں کا عام فہم نچوڑ۔ مبادیات شاعری پر مختصر مگر جامع کتاب ہر مبتدی کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کتاب سے بغیر کسی استاد کی مدد کے شاعری کے ابتدائی مراحل آسانی کیساتھ طے ہو جاتے ہیں دوسرا ایڈیشن قریب الختم ہے قیمت ۱؍

عام فہم عروض - از حضرت منظر صدیقی۔ اس کتاب میں نہایت آسان زبان میں عروض کے درس دئیے گئے ہیں قیمت صرف ۸؍

نکات شاعری - اس کتاب میں عروض کے بڑے بڑے نکات سمجھائے گئے ہیں نہ صرف یہی بلکہ ہر لفظ کے کئی کئی قافیے بھی درج ہیں۔ قیمت ۱۰؍

چراغ سخن - عروض، علم قافیہ اور بحر وغیرہ کی تشریح میں مرزا یاس یگانہ عظیم آبادی کی بہترین تصنیف۔ قیمت ۱۰؍

فکر بلیغ مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم۔ فن شاعری پر جو شخص معلومات کے لئے نہایت بلیغ کتاب ہے۔ قیمت ۱۲؍

ایشیائی شاعری مصنفہ مولانا اشہری مرحوم۔ اس کتاب میں تمام اصناف شاعری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۱۰؍

جان سخن - بحور، صنائع - بدائع۔ تقطیع کرنے کے قاعدے اور علم قافیہ کی تشریح نیز متروک الفاظ کی فہرست بھی شریک کتاب ہے قیمت ۱۰؍

اصلاح القوافی - علم قافیہ پر توضیحی اور تفصیلی کتاب قیمت ۱؍

ملنے کا پتہ

مکتبۂ قصر الادب دفتر "شاعر"، آگرہ

محصول بذمہ خریدار

جلد ۱۳ | ماہنامہ "شاعر"۔ آگرہ۔ جون سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۶

تصویر:۔ حضرت فدا گلاؤٹھوی مرحوم

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
	مقالاتِ مدیری		
۱	جہات	اعجاز صدیقی	۶
۲	منتخبات	اعجاز صدیقی	۸
۳	اصلاحِ سخن	اعجاز صدیقی	۲۳
	علم و ادب		
۴	شاعری اور حیاتِ انسانی	جناب عبدالباری صدیقی (کالا کانکر)	۱۴
۵	سرودی کی کہانی سرود کی زبانی	حضرت مولانا احتشام شہابی اکبرآبادی	۲۴
۶	آرٹ کیا ہے؟	جناب عبدالرحمٰن مستقیم	۳۰
۷	انسدادِ ارتداد	جناب عطار اشرفی	۳۵
۸	موعودہ نظم (مسلسل)	حضرت مولانا سلیم الدین غالب ظاہری سہسرامی	۳۹
	حکایات و افسانہ		
۹	[illegible]	حضرت صبا متھراوی	۳۳
۱۰	[illegible]	جناب [illegible] گیاباری	۳۸
۱۱	[illegible] کی بھول	جناب [illegible] (دیوبند)	۴۱
	منظومات		
[illegible]	[illegible] انقلاب	حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی	۵
۱۳	جنونِ جنگ	حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی	۷
۱۴	سہاد پوری	حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی	۱۰
۱۵	ظلم کے آنسو	حضرت [illegible] زور کاشمیری	۱۳
۱۶	انجامِ محبت	جناب محمد حق سرمدی	۱۹
۱۷	سازِ لاموجود	حضرت میکش اکبرآبادی	۲۰
۱۸	محشرِ خاموش	حضرت رونق دکنی	۲۱
۱۹	نگارِ یاس	حضرت مضطر گجراتی	۲۳
۲۰	سپاہی کا مکتوب	جناب اقبال احمد الہ آبادی	۲۴
۲۱	[illegible] محبت	(آنسہ) محمد تصدق ایم۔اے۔بی۔ٹی	۲۵
۲۲	[illegible] شاعرہ	جناب سیدہ سردار اختر بیگم اختر حیدرآبادی	۲۶
۲۳	رنگ و بو	جناب [illegible] سنائی	۲۹
۲۴	جنگ	حضرت صبا متھراوی	۴۰
۲۵	نیم کا درخت	حضرت مسلم [illegible]	۴۳
۲۶	[illegible] بہار	حضرت نثار [illegible]	۴۴
۲۷	[illegible]	جناب [illegible]	۴۵
۲۸	[illegible]	جناب [illegible] عثمانی	۴۸
	مشاعرۂ شاعر		
۲۹	[illegible]	[illegible]	۵۰

سرپرست ادب و شعر

(۱) عالیجناب خان شری امام الدین خانصاحب متان وزیر رسوا والئی باجود کاٹھیاواڑ

محسنین ادب و شعر

(۲) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی للعہ سالانہ

(۳) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیر خورجوی للعہ سالانہ

(۴) محسنۂ ادب ہر ہائنس علیہ حضرت کنیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ للعہ سالانہ

(۵) محسنۂ ادب شہزادی تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ للعہ سالانہ

(۶) محسنِ ادب جناب محترم وزیرزادہ شجاعت خانصاحب قہر جوناگڈھی للعہ سالانہ

معاونین ادب

(۷) معاون ادب مسٹر اے۔ بی قیس صابر بی۔ اے اکبرآبادی [illegible] سالانہ

(۸) معاون ادب جناب عزیز سندی ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی [illegible] سالانہ

انیسان ادب

(۹) انیس ادب جناب سید تفضل کریم صاحب جمشید پوری [illegible] سالانہ

(۱۰) انیس ادب جناب محبوب حسن صاحب آسی متوطن زرتلی۔ بمبئی [illegible] سالانہ

ہمدردان ادب

(۱۱) ہمدرد ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب تبیان جالندھری [illegible] سالانہ

(۱۲) ہمدرد ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب تسنیم گوالیاری مرحوم [illegible] سالانہ

(۱۳) ہمدرد ادب جناب نوابزادہ محمد [illegible] حسین خانصاحب [illegible] آف بنڈول [illegible] سالانہ

(۱۴) ہمدرد ادب جناب اسمٰعیل ابوبکر صاحب ناز جوناگڈھی [illegible] سالانہ

(۱۵) ہمدرد ادب جناب عبدالعلیم خانصاحب رونق دکنی جمشید پوری [illegible] سالانہ

(۱۶) ہمدرد ادب جناب [illegible] سید مظفر حسین صاحب گوہر [illegible] زمیندار (دان داودھام) [illegible] سالانہ

(۱۷) ہمدرد ادب جناب [illegible] حسن میاں صاحب چشتی نظامی کلول [illegible] سالانہ

(۱۸) ہمدرد ادب جناب مخدوم سید علی اسد صاحب نقوی البخاری احمدآبادی [illegible] سالانہ

(۱۹) ہمدرد ادب [illegible] صاحب عبدالحمید خاں آف مانا ودر [illegible] سالانہ

خاصانِ ادب

جناب [illegible] صاحب [illegible] گلشن آبادی عہ سالانہ

جناب [illegible] شفیق الرحمان خانصاحب شفق [illegible] عہ سالانہ

جناب [illegible] صاحب [illegible] پھلواری بی۔ اے عہ سالانہ

[illegible] عہ سالانہ

[illegible] عہ سالانہ

(۲۶) جناب سید علی احمد صاحب عابد جمشید پوری عہ سالانہ

(۲۷) جناب محمد عبداللہ خاں صاحب بزم امروہوی عہ سالانہ

(۲۸) جناب اشرف حسن خانصاحب اثر بمبئی عہ سالانہ

(۲۹) جناب نذیر احمد صاحب نذیر شیرکوٹی عہ سالانہ

(۳۰) جناب صبغۃ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی عہ سالانہ

(۳۱) جناب پریم چند صاحب پریم دہلوی عہ سالانہ

(۳۲) جناب فائق ہمدانی لدھیانوی عہ سالانہ

(۳۳) جناب سبحان خانصاحب فائق بیتول عہ سالانہ

(۳۴) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی [illegible] عہ سالانہ

(۳۵) جناب حبیب حسن خانصاحب حبیب شاہجہانپوری (کوئٹہ) عہ سالانہ

(۳۶) جناب ابوظفر محمد خانصاحب عارف بالکوٹی (کوئٹہ) عہ سالانہ

(۳۷) جناب شبیر شاہ صاحب برق باندوی عہ سالانہ

(۳۸) جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب شاد کاندھلوی عہ سالانہ

(۳۹) جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی عہ سالانہ

(۴۰) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعر لکھنوی عہ سالانہ

(۴۱) ابوالافتخار ڈاکٹر محمود صاحب شاہ مجلس ادب عالم فاضل گیانی عہ سالانہ

(۴۲) جناب ماسٹر کالومیاں صاحب عاشق ڈبوہی (بڑودہ) اسٹیٹ عہ سالانہ

(۴۳) جناب امام عنایت اللہ خانصاحب [illegible] سالانہ

(۴۴) جناب محمد فاروق علیخاں صاحب [illegible] عہ سالانہ

(۴۵) جناب سید ارشد علی صاحب [illegible] عہ سالانہ

(۴۶) جناب سید ڈاکٹر [illegible] شاہ صاحب [illegible] عہ سالانہ

(۴۷) جناب [illegible] صاحب [illegible] عہ سالانہ

شعرِ انقلاب

ذرا آواز دو میرے وطن کے نوجوانوں کو!

وطن اندیشۂ بیم و رجا سے سرگراں کیوں ہے؟
بپا شورش خلافِ دولتِ ہندوستاں کیوں ہے؟
سکوں گاہوں سے نغمے ابر بن کر کیوں نہیں اٹھتے؟
زبانوں پر حدیثِ غارتِ امن و اماں کیوں ہے؟
یہ مشرق ہے، یہاں راتوں کو بھی ظلمت نہیں ہوتی
تو ہر جانب "چراغِ زیرِ داماں" کا سماں کیوں ہے؟
جرس کی گونج تھرائی ہوئی کیوں ہے شوالے میں؟
صدِ مسجد میں بھرائی ہوئی بانگِ اذاں کیوں ہے؟
تحفظ کا یہاں کیوں ہو رہا ہے اہتمامِ نو؟
جو تھی مغرب کی قسمت میں وہ بے چینی یہاں کیوں ہے؟

ذرا آواز دو میرے وطن کے نوجوانوں کو!

جوانانِ وطن اس وقت کیا کام آ نہیں سکتے؟
قوی تدبیر کیا کوئی عمل میں لا نہیں سکتے؟
مہارت ہے انھیں کرکٹ میں بازو آزمائی کی
تو کیا پتھر فضائے جنگ پر برسا نہیں سکتے؟
انھیں فٹ بال کی تعلیم دی ہے درسگاہوں نے
تو کیا یہ پاؤں سے دشمن کا سر ٹھکرا نہیں سکتے؟
محرم میں چھری اور نیمچہ سے کھیلنے والے
اس آڑے وقت میں کیا سعی کچھ فرما نہیں سکتے؟
کمان و گرز لے کر جھومنے والے دسہرے میں
مسلح ہو کے کیا دشمن کی لنکا ڈھا نہیں سکتے؟

ذرا آواز دو میرے وطن کے نوجوانوں کو!

مسلم جنگجو، جنگ آشنا، جنگ آزما ہیں یہ
بہادر ہیں، شجیع و بے جگر ہیں، سورما ہیں یہ
جوانانِ وطن کا زورِ بازو میں نے دیکھا ہے
فسادِ باہمی میں مدتوں سے مبتلا ہیں یہ
انھیں اب انقلابِ وقت دعوت دینے آیا ہے
حقیقت ان کی اب کھل جائے گی، کتنے ہیں، کیا ہیں یہ؟
میں امواجِ سرِ ساحل سے یہ فریاد سنتا ہوں
کہ وہ گرداب میں ہے جس وطن کے ناخدا ہیں یہ
اٹھانے ان کو آیا ہوں بساطِ محفلِ گل سے
جگانے ان کو آیا ہوں اگر خواب آشنا ہیں یہ

ذرا آواز دو میرے وطن کے نوجوانوں کو!

سیماب اکبرآبادی

جرعات

مُردہ قوموں کے مُردہ شاعر!!

تاریخ عالم شاہد ہے کہ جب تہذیب و تمدن کی نبضیں سست ہو گئیں جب فکر و عالمگیری کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا، جب بربریت اور سامراجی منصوبے خونخوار بھیڑیوں کی کھال [illegible] فضائیں مغلوب کر لئے، جب جنگ کے میدان میں فوجوں کے پاؤں اکھڑنے لگے جب غلامی کے زہریلے ہیبت ناک اور گہرے ہو گئے، جب شہنشاہیت عیش و عشرت کا گہوارہ بن گئی جب زندگی آستین فرو ماندہ خون آلود ہو گئی، جب محبوب کی بالمعیہ ناممکن اور جب بہار کی امیدیں منقطع ہو گئیں اور جب ذہنوں کی بجلیاں ہر طرف کوندنے لگیں تو شاعر احساس کی شمعیں لیکر بڑھا، واردات و جذبات کو اپنے نطق میں محو کر کے اور ضرب یداللّٰہی کا سہارا لیکر وہ اعجاز نمائی کی کہ ناممکن کو ممکن اور لاینحل کو قابلِ حل بنا دیا۔

دور کیوں جائیے جنگ بلقان ہی کے واقعات پر ایک نظر ڈال لیجئے جب ہندوستانی مسلمانوں کی غیرت کے شانے سایوں کی طرح جھلانے لگی اور جب ان کی ہڈیاں زنگ آلود ہو گئیں تو اقبال نے "شکوہ" یا بہ الفاظ دیگر "فریاد" اور حضرت سے "شکایت" ——— [illegible] شاعر ہند کی نظم تاریخ اسلامی کا شاہکار ہے اور اس سے جو نتائج مرتب ہوئے وہ سب کے سامنے ہیں۔

آج "جنگ عظیم" "جنگ بلقان اور جنگ فلسطین" سے کہیں زیادہ موجودہ "جنگ عالمگیر" ہمارا تباہ کن، خونریز اور گرم اثرات کی حامل ہے جس کی معمولی زد میں آنے کے بعد سنگ و خشت کا تو ذکر ہی کیا پہاڑ سوئی کی طرح بکھرتے ہیں اور انسانی جسم روئی کے گالوں کی طرح اڑتے ہیں جس کے شعلے بحر و بر کو آپس میں ملاتے ہوئے ہیں اور جس کے بم قلب زمین میں شگاف ڈالتے ہیں ——— لیکن ہندوستان کا شاعر وہی "شاعر" ہی کا کیف و دوش [illegible] ہے وہی جام، وہی گلابیاں وہی لب لعلیں وہی ساقی سیمیں، وہی زلف و کمر، وہی ہجر و وصال، وہی نامہ و پیام [illegible] وہی [illegible] اور وہی [illegible] شکوہ و شکایت ——— غرض حظِ نفس کی تمام آسائشیں اور [illegible] ہیں اور وہ قوم کی رگوں کا خون کھولانے کے بجائے [illegible] کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ کیا قیامت ہے کہ [illegible]

[illegible]

نو آفریں ہے اللہ کو کہ کیسے کیسے ہیجانات و جذبات برداشت کر رہا ہے [illegible] جس نے ہمارے حکیم قوم، فخر وطن، پیغمبر انقلاب اور مصلح اقوام بنکر میدان میں نکل آئے ——— وطن کی خفتہ صفوں کو جگانے اور قوم کے افراد کو خواب گراں سے جھنجھوڑے ——— آگے وہ یہ نہیں کہ شاعر یقیناً غدار وطن اور بدخواہ قوم ہے۔

شاعر انقلاب، شاعر شباب، شاعر رومان، شاعر فطرت، شاعر ہند، بلبل چمن، حکیم ملت، شاعر ساحات (اور نہ جانے کیا کیا) کو ذرا آواز دیکر آؤ تاریخ فطرت، وطن اور قوم تمہاری شاعری کا امتحان لینا چاہتی ہے، آج تمہارے وطن کی کشتی گرداب میں پھنسی ہوئی ہے، اگر تم میں اتنی قوت نہیں ہے کہ اس طوفان کے تھپیڑوں سے بچا سکو یا قوم کو ابھار کر سامان مدافعت پیدا کر سکو تو تمہاری شاعری جھوٹی اور دعائے انقلاب اور ہمدردی قوم و ملت کا دعویٰ غلط ہے۔

مقام حیرت ہے کہ بیسویں صدی کے گلے باز شاعر، شاعروں کے علاوہ اگر آج کل اخبارات و رسائل میں کبھی کبھی نظر آتے ہیں تو ان کے افکار سے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نتیجہ برآمد نہیں ہو جاتا کہ وہ ان فضاؤں میں سانس لے رہے ہیں۔ یا ایسے زمانہ کے شاعر ہیں جس میں آگ اور خاک و خون کی بارش ہو رہی ہے۔ اگر زمانہ جنگ کی تمام تصانیف، انفرادی مطالعے، نظموں اور غزلوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایک فیصدی بھی جنگ کے تاثرات یا مناظر [illegible] قابل نہیں ہیں اور کیا جس ملک کے ادیب و شاعر اتنے مردہ ہوں اس کی زندگی خطرہ میں نہیں ہے؟

[illegible] بعض شعراء کو کہتے سنا ہے کہ "بھلا [illegible]" کون سنتا ہے، [illegible] شاعری [illegible] ———

اللہ اللہ [illegible] شاعری [illegible] ——— کیا [illegible]

[illegible]

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

تنقید کی تردید سے ذلت پائی
تکفیر کے بدلے میں ندامت پائی
شیطان کی طرح ہو گیا ہے مشہور
مفتی نے مری نظم سے شہرت پائی

الزام سے اتہام و بہتان سے ڈر
اس اپنے اٹھائے ہوئے طوفان سے ڈر
شیطان ہے ترے وجود پر قابو یاب
اللہ سے ڈرتا نہیں، شیطان سے ڈر

مفتی نہ زباں سے قولِ فاسد کہتا
خالق کے فدا کار کو عابد کہتا
اک پاسِ سخن مہرِ دہاں ہے ورنہ
شیطان کو "موحد" نہیں واحد کہتا

کافر کو مسلماں کیا ہے کہ نہیں؟
طاعت کرنا سکھا دیا ہے کہ نہیں؟
مفتی کہیے ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر
ہندوؤں میں اک بنا مرزا ہو کہ نہیں؟

انساں معروفِ کشمکش عالم میں ہے
یزداں کے ارادے سے [illegible]
[illegible]

جس کوشش و سعی کی ضرورت سمجھو
اس کو شایانِ وقتِ فرصت سمجھو
جاپان نے رخ بدل لیا ہے اپنا
اس عارضی وقفے کو غنیمت سمجھو

یہ ہند پیمبروں کی جو مسند ہے
روحانیت اس کی اصل میں بے حد ہے
مشکل سے بڑھے گا مادیت کا قدم
گوتم کا وطن ہے، کرشن کا مولد ہے

جاپان ادھر آ کے بھلا کیا لے گا
ہاتھی کو یہ مور لنگ کیا پا لے گا
"ارضِ ہندوستاں" اسے کہتے ہیں
برما یہ نہیں کہ غیر برما لے گا

ہنگامہ و اضطراب ناممکن ہے
ہو امن و سکوں خراب ناممکن ہے
ہو جائیں جو متحد یہاں کی قومیں
اک ذرے میں انقلاب ناممکن ہے

ہر فرد بہادر ہے سپاہی ہے یہاں
ہر شخص کو زعمِ کج کلاہی ہے یہاں
ہیں جانثار اور [illegible] زندہ قائم
[illegible]

شخصیات :-

حضرت فدا گلاؤٹھوی مرحوم

گلاؤٹھی، ضلع بلند شہر کا ایک مردم خیز علاقہ ہے جو ہر دور میں مشاہیر کا مسکن رہا ہے۔ ہر دور میں بھی وہاں کی خاک سے حضرت ناطق گلاؤٹھوی اور حضرت فدا گلاؤٹھوی مرحوم ہندوستان کی ادبی فضاؤں میں چمکے۔ حضرت فدا کا نام عبدالوحید تھا، مرحوم حسینی الواسطی خاندانِ سادات کے ایک ممتاز فرد تھے۔ اُن کے والد بزرگوار مولوی سید حیات اللہ شاہ صاحبؒ نقشبندیہ اور قادریہ سلسلے کے ایک برگزیدہ اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ جن کا انتقال ضلع فتحپور ہسوہ میں ہوا تھا۔ شاہ صاحب وہاں بعہدۂ تحصیلداری متمکن تھے۔

حضرت فدا مرحوم گلاؤٹھی ہی میں ۱۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ گویا مرحوم نے کم و بیش ۹۳ سال کی عمر پائی۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی میں حاصل کی۔ اُن کے عربی کے استاد مولانا شاہ عبداللہ صاحب داماد حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور فارسی کے استاد حضرت مولانا صوفی سید محمد حسن صاحبؒ تھے۔ موخرالذکر نقشبندیہ سلسلہ کے ایک بانسبت بزرگ تھے۔ گویا مرحوم کے معلم بھی ایسے ہی خدارسیدہ بزرگ تھے جیسے کہ مرحوم کا خاندانی سلسلہ ہے۔ زمانۂ شباب میں حضرت علامہ سید محمد حسین یقین گلاؤٹھوی شاگردِ رشید حضرت مولانا امام بخش صہبائی دہلوی سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ چونکہ حضرت یقین خود ایک خوش گوار شاعر تھے۔ اس لئے شاگرد پر فطرتاً اثر پڑنا ہی چاہئے۔ چنانچہ انھیں کے فیضِ صحبت نے حضرت فدا مرحوم میں ذوقِ شعر گوئی پیدا کیا۔ ابتداءً مرحوم اپنا کلام مولانا سید کفایت علی صاحب علوی بانپوری کو دکھاتے رہے اور اُن کے انتقال کے بعد جہاں استاد فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا اور اصلاحِ کلام کی منزلیں خط و کتابت سے طے ہوتی رہیں۔ فصیح الملک کی زندگی تک سلسلۂ اصلاح برابر جاری رہا۔ اُن کے انتقال کے بعد مرحوم نے کسی کو اپنا کلام نہیں دکھایا۔ متعدد بار فصیح الملک نے آپ کی ترقیٔ مستقبل کے متعلق حوصلہ افزا خیالات کا اظہار فرمایا۔

اپریل ۱۹۰۱ء سے مارچ ۱۹۲۵ء تک مرحوم مین پوری میں بسلسلۂ ملازمت مقیم رہے۔ اس کے بعد پنشن لیکر اپنے وطن میں مستقلاً سکونت اختیار کی۔ زمانۂ ملازمت میں شعر و سخن کا شغل برابر جاری رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ عبادت و ریاضت بھی کرتے رہے۔ مرحوم [illegible]

نقشبندیہ اور قادریہ سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت مولانا عبید فخر الدین ملقب بہ حکیم [illegible] الہ آبادیؒ سے انھیں خلافتِ معنوی کا شرف حاصل ہوا۔ چشتیہ سلسلے میں قدم [illegible] طریقت حضرت محمود احمد علی شاہ صاحب پھلواریؒ سے رجوع کیا اور اپنے پیر طریقت حضرت شاہ محبوب عالم صاحبؒ عرف خلیفہ محبوب علی صاحبؒ متوطن مین پوری سے چشتیہ نظامیہ نیازیہ سلسلے میں خلافت کا اعزاز حاصل کیا۔ غرض حضرت فدا مرحوم دینی اور دنیاوی دونوں اعزازات سے بہرہ ور تھے۔

مرحوم بیحد خلیق، خوش باش، روشن دماغ اور ملنسار بزرگ تھے۔ جو لوگ اُن کی صحبت میں بیٹھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کی گفتگو میں کتنی حلاوت اور شیرینی ہوتی تھی۔ اُن کے کردار میں زہد و اتقا کے باوجود خشکی نام کو نہ تھی۔ بلکہ ہر آن زندہ دلی ٹپکتی تھی۔ خورد و کلاں سبھی آپکے شگفتہ و فریفتہ تھے۔

مرحوم کے معمولات عبادت و ریاضت کچھ اس قسم کے تھے کہ شعر و سخن کے لئے زیادہ وقت نکالنا مشکل تھا، اس کے باوجود تکمیلِ ذوق اور تلامذہ کی اصلاح کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ حضرت فدا کو جہانِ شعر میں جس مقام پر پہونچنا تھا۔ مشاغل حیات نے انھیں وہاں نہ پہونچنے دیا۔ وہ فطرتاً عزلت پسند بھی واقع ہوئے تھے۔ پھر بھی اکثر ادبی مجالس اور محافلِ شعر و سخن میں حصہ گیر ہوتے تھے۔ اُن کا کلام بھی اخبارات و رسائل کی زینت بنا اور شہرت کی خواہش نہ ہونے ہوئے بھی ہندوستان کے مخصوص ادبی حلقوں میں اُن کی شہرت ہوئی۔

مجھے مرحوم سے صرف ایک بار شرفِ نیاز حاصل ہوا تھا، غالباً تقریب کوئی دہلی میں مشاعرہ تھا اور ریڈیو کے ذریعہ نشر بھی ہوا تھا مرحوم کے شاگرد رشید جناب [illegible] گلاؤٹھوی بمشکل سہارا دیکر [illegible] یہ کوئی سال پہلے کا واقعہ ہے۔ [illegible] صحت جواب دے چکی تھی۔ غزل پڑھی اور [illegible]

چونکہ مجھے مرحوم کی زندگی اور علمی و ادبی [illegible]

[illegible]

میں سب ... [illegible] مرزا ... کا ستایا ہے ... [illegible] والے جان ... [illegible]
رنگ ... [illegible] معاملات اور استغراق بڑھ گیا اتنی ہی آپ کے جذباتِ شعری میں بھی نکھار ... [illegible] حضرت کا کلام ہر طرح قابلِ دید و شنید ہے۔ مرحوم کے یہاں قدیم و جدید تغزل کا ایک ... [illegible] امتزاج ملتا ہے جو ابتذال سے پاک اور نفسیات سے قریب رہے، چونکہ قدیم رنگِ تغزل سے ... [illegible] کا زیادہ معاملہ رہا اور خود اُن کے استاد بھی خالص تغزل کے شہنشاہ تھے اس لئے اچھے اشعار کے ساتھ ساتھ ایسے اشعار پر بھی نگاہیں ٹھہرتی ہیں جنھیں پامال اور پیش پا افتادہ کہا جا سکتا ہے جن میں برائے نام بھی حقیقی واردات و جذبات نہیں ملتے اور وہ صرف الفاظ کا مجموعہ معلوم ہوتے ہیں۔ مرحوم کے چند بلند پایہ اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

گنہ ہوں میں تیری رضا چاہتا ہوں — مرا حوصلہ دیکھ کیا چاہتا ہوں
حیا سے نہ پوچھو کہ شرمائیگی وہ — تبسم سے پوچھو کہ کیا چاہتا ہوں

شرکت میں آنسوؤں کی خریدیں ندامتیں — رحمت کے مول بیچ رہا ہوں گناہ کو
چھپتا ... [illegible] جوابِ کرم تک خبر گئی — کہہ دو مواخذہ سے نہ چھیڑے گناہ کو
میری نگاہِ شوق تو پلکوں نے چھین لی — آنکھیں کہاں سے لاؤں ترے فرشِ راہ کو

آئینہ کی بے محل ترکیبِ حیرت دیکھنا — کس کی صورت دیکھتا ہوں اسکی صورت دیکھنا

سونے سے اُٹھے وہ مسکراتے — کلیاں کھلیں دامنِ سحر کی

مری ڈوبی ہوئی نبضوں سے پوچھو — کہ اُن کے ہاتھ سے کیا جا رہا ہے
ہوا ہے کون سرگرمِ تبسم — کہ پھولوں کو پسینہ آ رہا ہے
تھکے ماندے مسافر کو نہ چھیڑو — دمِ آخر ذرا سستا رہا ہے

... [illegible] کہتا ہے دیدۂ لیلائے بے محل مجھے
آنا بے پردہ نہ کر لے قربتِ منزل مجھے

کتنی معصوم ... [illegible] ہے تری دیوانوں کی — صبح کھاتی ہے قسم ان کے گریبانوں کی
حسرت ... [illegible] میں ... [illegible] غلام — آج آباد ہے دنیا ترے ... [illegible] کی
حیرت ... [illegible] الزام ... [illegible] کیوں ہے — خیر ... [illegible] آیا ہوں نگہبانوں کی
... [illegible] شاعری ... [illegible] سے فصاحت آباد
... [illegible] زبان دانوں کی

اعجاز صدیقی

شُہا ویلوری

"خوش درخشید و لے دولتِ مستعجل بود"

فلکی عالمِ خاکی میں نمودار ہوا
سنگریزوں میں ضیا بن کے منور رہا ہوا

خیرگی چھا گئی ہر چشمِ تماشائی پر
قدر کیا کرتے، کہ مفہوم نہ تھی تابِ نظر

ابھی ادراک مکمل نہیں حیوانوں کو
ابھی عرفانِ حقیقت نہیں انسانوں کو

نہیں شائستۂ انوار، محیطِ ظلمات
شعبدہ کار ہے نیرنگ سے چھپی ہوئی رات

عرش پر عالمِ ایجاد سے لازم تھا صعود
جانبِ خاک مناسب ہی نہ تھا تیرا ورود

اور پھر خاک بھی مشرق کے سیہ خانے کی
ظلمت جس میں چمکنے کی نہ چمکانے کی

دھوپ کے روپ میں در اصل اندھیرا ہے یہاں
رات گویا ملک الموت کا پھیرا ہے یہاں

آگ مذہب کے یہاں زہر چکاں ہیں ہر سو
سامری ہی کے آثار عیاں ہیں ہر سو

آگ میں اپنی ہی جلنے کو ہیں آپ یہ لئیم
حرکت خانۂ سیماب کی ہے ضربِ کلیم

دیکھنا تھا مری نصرت کا زمانہ تجھ کو
اک صدی بعد تھا اس دہر میں آنا تجھ کو

پھر بھی اس دور کے اے پردہ در دیدہ نشیں!
نہیں آتا ترے مرنے کا کسی طرح یقیں

زیست کیا یوں سرِ انجام ہوا کرتی ہے؟!
صبح ہوتے ہی کہیں شام ہوا کرتی ہے؟!

امرِ واقع نہ ہو دُنیا سے گزرنا تیرا
کاش ہو مصلحتِ وقت یہ مرنا تیرا

واقعہ ہے جو تری موت، تو لے حوصلہ کا دار
سیکڑوں زندگیاں اس ترے مرنے پہ نثار

تو نے رکھ دی ہے عقیدت کی نئی اک بنیاد
آج دنیا تجھے کہتی ہے "شہیدِ اسناد"

اور میں تجھ کو سمجھتا ہوں "شہیدِ تکفیر"
اس ستم کا متحمل نہ ہوا تیرا ضمیر

غلط الزام کا اس درجہ لیا تو نے اثر
تیرے احساس کی اک یہ بھی نزاکت تھی مگر

صرف کہہ دینے سے کافر کوئی ہوتا ہے کہیں
"کفر و اسلام" سے برتر ہیں مقاماتِ یقیں

"کفر و اسلام" اب الفاظ ہیں دو — بے معنی
ان کا مفہوم ہے زباں تک، نہیں ایمان کا

جس کا باطن ہو غلیظ اور ہو ظاہر اچھا
ہم مسلمان کا مری بات میں کافر اچھا

فرقے بستے دنیا کے ہیں دنیا والے
حالِ دل غیرِ خدا اور کوئی کیا جانے

تیرے مذہب میں جو تکرار کرے وہ کافر
تیری عظمت سے جو انکار کرے وہ کافر

جا افتاب مرکز [illegible] پہ [illegible]
لے کے تنہا ہی [illegible]

دسترس ہے [illegible] بالا ہے تو
ہر کہیں [illegible] کا آنا جانا ہے تو

ابدی زندگی دی کی مری نسبت نے تجھے
[illegible] بادِ [illegible] نے مجھے

[illegible]

سیماب

کمالاتِ کمالی تحقیق و تصحیح کی روشنی میں

آشوبِ چشم کی ناگہانی تکلیف کی وجہ سے پانچ کے بعد اس سلسلہ میں کچھ نہیں لکھا جاسکا۔ اس عرصہ میں جن احباب و دوست حضرات نے میرے اس مضمون کا مطالبہ اور پیہم مطالبہ کیا ہے میں اُن جملہ حضرات کا شکر گذار ہوں اور جناب کمالی سے معذرت خواہ ہوں کہ انھیں کمال درجہ زحمتِ انتظار برداشت کرنی پڑی۔ بہرصورت اب میں پھر اپنی بساطِ ادب پر متمکن ہوں۔

"چل مرے خامے بسم اللہ" نظم کا تیسرا حصہ اس بند سے شروع ہوتا ہے۔

کہیں خشکی میں مسلم کی ڈوبی تو نہیں کشتی
کہ پھر افسردہ زرتشتیوں کا گشت برگشتی

دُروں شہرِ خشناک چوں آوارہ دردشتی
یہ بندِ قوم استادی و خود اسلام بگذشتی

صاف ظاہر ہے کہ قوافی کی پابندی نے کمالی صاحب کو اہمال اور الجھنوں کے خارزار میں پھنسا دیا ہے۔ ورنہ یہ معمولی بات تو کمالی صاحب بھی سمجھ سکتے ہیں کہ کشتی طوفان میں ڈوبا کرتی ہے خشکی میں نہیں ڈوبتی۔ کمالی صاحب سے شاعرانہ انتظام نہ ہوسکا یہ دوسری بات ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ گشت برگشتی۔ آوارہ دردشتی اور زاسلام بگذشتی صرف "کشتی" کا قافیہ پورا کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ کیا کمالی صاحب گشت برگشتی کی تشریح کرسکتے ہیں۔ زرتشتیوں کا فلسفہ کیا ہے! گشت برگشتی کے لئے "ژند اور پاژند" کا مطالعہ تو نہیں کرنا پڑیگا؟ دوسرا شعر پہلے شعر سے زبان ہی کے اعتبار سے نہیں مضمون کے اعتبار سے بھی متنافر ہے۔ خدا جانے کمالی صاحب کہ اس میں کیا اظہار کرنا ہے۔ چوتھے مصرعے کے دونوں ٹکڑے بھی باہم غیر متعلق ہیں اور بغیر کسی ثبوت کے جوڑ دیئے گئے ہیں؟

"زاسلام بگذشتی" شعر میں عجزِ بیان کا شکار ہو کر قافیہ کی ضرورت سے نظم کردیا گیا ہے۔ لیکن کمالی صاحب نے معنی پر غور نہیں کیا۔ "یہ بندِ قوم استادی" بھی عجیب جملہ ہے جس کے معنی شاید اہلِ فارس ہی سمجھ سکیں۔ "بندِ قوم" قوم کو دعا بان کر اسکا "بند" قائم کیا گیا ہے۔ پھر اس پر غالب کو کھڑا کیا گیا ہے۔ ماشاء اللہ کیا کیا کمالات صرف فرماتے ہیں۔ ہمیں "ہم بہاری اللفظ بن المعانی" کا بھی دھوکا ہوا۔ کہ شاید کمالی صاحب مولانا بیاب کا ارشاد کہہ رہے ہیں۔ لیکن شعر کے مفہوم سے اسکا بھی کوئی تعلق نہ نکلا۔

چلی [illegible] خشکی میں نہیں کشتی
جہاں زنجاں کی قوت اسی [illegible]

[illegible]
حقیقت کی جھلک [illegible]

"موجِ اعظم" میں علامہ سیاب کا ایک مصرعہ ہے "کبھی یہ بات آئی تیری تجلّی کہن میں" جسے پڑھ کر کمالی صاحب نے کمال یہ کیا کہ تجلّیٔ کہن کو "تجلّیٔ نو" بنایا اور تجلّیٔ نو میں بھی جب کمی دیکھی تو "تخیّلِ نوی" نظم کردیا۔ اب سوچئے کہ تخیّلِ نوی اور خطۂ کہن میں کیا ربط ہے۔ خطۂ کہن کی بجائے "ذہنِ کہن" کیا بُرا تھا۔ تخیّل کا تعلق ذہن سے زیادہ مناسب ہے۔ یا خطہ سے خطہ یہاں کوئی معنی ہی نہیں دیتا۔ دوسرے مصرعہ میں "یہاں" ظرفِ مکاں ہے جو بغیر ظرف کے استعمال کردیا گیا ہے۔

اس بند کا دوسرا شعر بھی اپنے پہلے شعر سے بہ اعتبارِ مضمون بغاوت کر رہا ہے اس میں بھی محض قافیہ بندی ہے فن سے کوئی تعلق نہیں۔ "برقِ سخن" یہاں کو دیکھئے اور اس نظریہ کو سمجھئے کہ "سخن میں حقیقت نہیں مل سکتی"۔ حضرت سخن کے کیا معنی ہیں۔ کلامِ الٰہی اور حدیثِ نبوی سخن ہیں یا نہیں؟ تو کیا ان میں بھی کوئی حقیقت نظر نہیں آتی؟ اس کے علاوہ جھلک نظر آتی ہے یا ملتی ہے؟ برقِ سخن کی ترکیب کس قدر ثقیل ہے۔

خدا محفوظ رکھے ہر مسلماں کو اس آفت سے
ہمیں کیا کام اس مردود کی قید محبت سے

جسے ہو شوق دہریت کا اور نفرت شریعت سے
وہ رکھے واسطہ اس جستجوئے بے ضرورت سے

"اس آفت" "اس مردود" اور "جستجوئے بے ضرورت" کا خارز "الیہ اور مرجع کہاں ہے؟ دہریت کا شوق کیا بلا ہے۔ تیسرے مصرعہ میں الفاظ کا رکھ رکھاؤ بھی قابلِ غور طلب ہے۔

یہ ابن شیطاں کی کیا علوم اپنی فوقیت کیا ہیں
جو عمر تا قیامت کے لئے کافی سہارا ہیں

خدا اور بندے اور بتوں کے سے آگے بالکل اکیلے ہیں
زباں سے منہ میں پڑے فرمائے جاتے ہیں بھی جاہیں

اب اس کی زندگی تا قیامت رہ گئی باقی
گذارش اسکی پھر تحسیس کیا ہے ابن شیطاں کی

رہینگے باوجودِ سجدہ آدم ملائک بھی
محبت کا اثر ہے یا نہیں سرکار حق کوئی

ان دونوں بندوں کو پڑھئے اور کمالی کے کمالِ شاعری کی داد دیجئے۔ کمالی کی زبان جس قدر بے ربط، بے کیف اور شعریت سے بے نیاز ہے وہ تو ان کے ہر لفظ سے ظاہر ہے لیکن ان بندوں کے پڑھنے کے بعد بے اختیار بربادیٔ ادب کا ماتم کرنا پڑتا ہے۔

یہ ابن شیطاں۔ عمر تا قیامت۔ بالکل اکیلے ہیں۔ زندگی تا قیامت گذارش اسکی۔ رہینگے باوجود سجدہ آدم۔ سرکار حق کوئی کرنا بار بار پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف ان کا سرسری مطالعہ ہی جذبۂ ادب کی قوت سامعہ کو مجروح کرنے کے لئے کافی ہے۔

مجھے کمالی صاحب سے زیادہ "مدیرِ مدینہ" کی نکتہ سنجی اور نکتہ فہمی سے شکوہ ہے جو بناؤ بغیر دیکھے ہی مرغوبیت کو قبول کر لیا۔ علامہ سیاب کے کسی نظریہ سے اختلاف دوسری چیز ہے لیکن [illegible] سے وہ دریافت کریں کہ کیا یہ نظم مدینہ میں شائع ہونے کے قابل تھی ——

ظلم کے آنسو

اشتراکیت کی صبحِ سیمگوں ضو خیز ہے — خاطرِ مظلومیت تسکین سے لبریز ہے
باغِ عالم میں صبائے مست نکہت بیز ہے — گلشنِ دہقاں کا ہر اک خار لالہ خیز ہے
رقص میں ہے مست ہر اک رود بلد و جوئبار — طائرانِ خوشنوا کا گیت وجد انگیز ہے
ہر کلی مخمور ہے، ہر پھول ہے کیف آشنا — جوشش زن کیا رنگ و نکہت کی آبریز ہے
ارتقائے روح کا ضامن ہوا جوشِ نمو — جاذبِ تخیل دلکش سبزۂ نوخیز ہے
دے رہی ہے ہر کلی کھل کھل کے پیغامِ عمل — گلشنِ ہستی کا منظر ولولہ انگیز ہے
دے رہی ہے درسِ آزادی کا بجلی کوند کر — اور بادل کی گرج میں نعرۂ "برخیز" ہے

اک نیا پہلو بدل ڈالا نظامِ دہر نے
جذبۂ غیرت ابھارا صبح و شامِ دہر نے

ہو چکے ہیں ظلم و استبداد کے شعلے خموش — ہر طرف امن و سکوں کا ابرِ گوہر بدوش
ہر نفس ہے آدمی کا ایک پیغامِ سروش — ہے بجائے خود ہر اک انساں اک دنیائے ہوش
ہو چکی ہے خواجگی کی تیرگی کافور اب — فطرتِ بیدار کی ہے ضو فشاں، تنویر کوش
جزوِ ایماں بن گیا ہر شخص کا عزم و عمل — سربکف ہر پیر ہے، ہر نوجواں ہے سرفروش
اب بقدرِ غیرت و الفت محیطِ دہر ہے — حریت کا اک بڑا طوفاں بصد جوش و خروش
انقلابِ تازہ لایا غفلتوں کو ہوش میں — بزمِ گیتی میں ہیں اب بیداریاں تنظیم کوش
دیکھ کر انجام اپنی شیطنت کا ظلم راں — اب نقابِ لعنتِ پائندہ میں ہے چہرہ پوش

اپنے اعمالِ سیہ کو دورِ آب و تاب میں
دفن کرنا چاہتا ہے اشک کے سیلاب میں

آ ادھر اے ظلم گستر ظلم راں سرمایہ دار — پیرہن کر دوں تری "انساں کشی" کا تار تار
آ پرکھ دوں تیری روحِ آدمیت سوز کو — اے غلامِ سیم و زر اے منعمِ قاروں شعار
آ دکھا دوں میں ترے ماضی کا تجھ کو آئینہ — آ کروں میں تیرے مستقبل کو تجھ پر آشکار
تو بزعمِ خود خدا تھا اختیار و جبر کا — سانس لینا بھی غریبوں کا تجھے تھا ناگوار
نالۂ "بیکس" سے ہلتے تھے کنگورے عرش کے — بار تھی تیری سماعت پر مگر اس کی پکار
سینچتا تھا خون سے اپنے جو تیرے باغ کو — تو اسی مزدور کو کہتا تھا "گنجِ گل کا مار"
کیجئے مظلوموں کو تجھ پر رحم آ سکتا نہیں — عشرت [illegible] اب تیری آنکھیں اشکبار

اے جفا پرور ستمگر دشمنِ امن و سکوں

تھا تجھے آسائشوں پر اپنی کبر و فخر و ناز اور تھی مزدور کی بے چارگی فطرت کا راز
تیری راتیں مست تھیں صد حسن و نغمہ در بغل تھیں مگر مزدور کی راتیں بھیانک اور دراز
اشتہا اپنی بڑھاتا تھا مئے گلگوں سے تو بھوک کی شدت سے تھا مزدور کے دل میں گداز
تیرے عیبوں کو چھپاتے تھے تری لعل و گہر تو ہی تھا دشمن بیکسوں کا، تو ہی تھا قانون ساز
تیری خواہش تھی کہ تیرے واسطے شمس و قمر مفلسوں کے جھونپڑوں سے رخ کے ہو جلوہ طراز
بھول بیٹھا تھا تو خالق کو بھی شاید اس لئے ایک بیکس بھی اسی مولا کی پڑھتا ہے نماز
تیری خواہش تھی بدل جائے یہ قانونِ قضا اور تجھے ہو موت و پیدائش میں حاصل امتیاز

تھا نہ جس بیکس کا دنیا میں کوئی پرسانِ حال
حدِ امکاں تک کیا تو نے اسی کو پائمال

آج کس سے مانگتا ہے رحم تو اے حیلہ گر تیرے دل پر بھی کبھی ہوتا تھا نالوں کا اثر؟
تو نے مفلس کے عرق سے اخذ موتی کر لیے خون سے مزدور کے تو نے نچوڑا سیم و زر
مست ہو کر جھولتا تھا عیش کے جھونکوں میں تو نامرادی چیرتی تھی جب یتیموں کے جگر
تیری آنکھوں میں ہیں یہ آنسو بھی یکگونہ فریب داد کس سے مانگتا ہے رو کر اب بیدادگر؟
بیکسوں کے دل کی آہیں چھو کے پائے عرش کو بارشِ لعنت کریں گی آج تیرے رخ پر
سسکیاں بیواؤں کی، پروردۂ فطرت جو تھیں آج تیرے دل پہ برسائیں گی لاکھوں نیشتر
جن کو تو آنسو سمجھ کر رخ پہ ڈھلکاتا ہے آج ہیں یہی فاقہ زدوں کے قلبِ سوزاں کے شرر

بازگشتِ آہِ مظلوماں یہ زاری ہے تری
معصیت کے بار سے اب روح بھاری ہے تری

رو، اور اتنا رو کہ تیرے دل کی حسرت ختم ہو غرقِ غم ہو روح تیری، بربریت ختم ہو
رو، اور اتنا رو کہ تیرے اس سرِ مغرور سے خودسری کا زعم، خبطِ بادشاہت ختم ہو
رو، اور اتنا رو کہ تیرے ذہنِ استعمار سے خودنمائی اور خودبینی کی وحشت ختم ہو
رو، اور اتنا رو کہ تیری آستین و جیب پر اشک کی صورت ٹپک کر کبر و نخوت ختم ہو
رو، اور اتنا رو کہ برسے خون آنکھوں سے تری دل ترا پانی ہو، آنکھوں کی بصارت ختم ہو
رو، اور اتنا رو کہ تیرے اشک کے سیلاب میں تیری ہستی یعنی ننگِ آدمیت ختم ہو
رو، اور اتنا رو کہ اس امن و سکوں کے دور میں تیرا زعمِ سلطنت، زورِ نجاست ختم ہو

گریۂ مظلوم میں پیدا ہے جوشِ انتقام
یاد ہیں مظلومیت کو سختیاں تیری تمام

شہ زور کاشمیری

شاعری اور حیاتِ انسانی

حیاتِ انسانی کی تاریخ کو اگر اُلٹ پلٹ کر دیکھا جائے اور اُس کے علوم و فنون کا تجزیہ کیا جائے تو یقیناً یہ نتیجہ مرتب ہوگا کہ شاعری ہی فنونِ لطیفہ میں سے ایک ایسی چیز ہے جس کی مخالفت ہر دور اور زمانہ میں کی گئی ہے۔ زمانہ نے شاعری کو ایک ایسی بیکار شئے سمجھا ہے کہ جس کا وجود نہ صرف انسانیت ہی کے لئے بیکار و بے محل قرار دیا بلکہ مجموعی حیثیت سے مخربِ اخلاق بھی ٹھہرایا۔ حکومت اور سماج دونوں نے مل کر اُس کے وجود کو فنا کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ تاہم اس کا وجود کچھ اس درجہ سخت جان اور حقیقت پر مبنی ہے کہ اب بھی یہ اپنی اصلی صورت میں نہ صرف قائم ہے بلکہ آسمانِ ادب کا تارا بنی ہوئی ہے۔ شدید ترین مخالفتوں کے باوجود اس کا پھلنا پھولنا یقیناً منشائے فطرت پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔

افلاطون نے جب اپنی ریاست (REPUBLIC) کے بنیادی اصول قائم کئے تو اس میں اُس نے شاعر کے لئے کوئی جگہ نہ رکھی۔ کاشتکار اور تجار وغیرہ کو اس وجہ سے حقوق دئیے گئے کہ ان کی کوششوں پر ملکی بہبود کا انحصار ہے۔ لیکن چونکہ اس کے نزدیک شاعری بے اصل اور غیر مفید شے تھی۔ اس لئے اس نے اپنی حکومت میں شاعر کے لئے کوئی حق نہیں رکھا۔ شاعری کے بے اصل اور بے حقیقت ہونے کے ثبوت میں اُس نے جو استدلال پیش کئے۔ ذرا وہ بھی ملاحظہ کیجئے:۔

وہ کہتا ہے کہ شاعر اپنے احساسات اور جذبات کو الفاظ کے جامے میں پیش کرتا ہے۔ اس جامے میں احساسات اصلی نہیں ہوتے، بلکہ اُن کی نقل (IMITATION) ہوتی ہے۔ اصلی احساسات کی ترجمانی غیر ممکن ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک جب تک احساسات ذہن میں ہوں اس وقت تک اصلی ہیں اور جب بیان کر دئیے گئے تو ان میں تکلف اور تصنع پیدا ہو جاتا ہے نہ صرف یہی بلکہ وہ سچائی اور صداقت سے بھی دُور ہو جاتے ہیں۔ شعر احساسِ زندگی کی محض ایک نقل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جو چیز نقل ہوتی ہے وہ قابلِ اعتبار نہیں۔ اس لئے شعر بھی ایک ناقابلِ اعتبار اور [illegible]

آگے چل کر افلاطون نے شاعری کو "حقیقت نسبتی" قرار دیا ہے۔ اور اُس کے نزدیک صرف حقیقت مطلق قابلِ اعتبار ہے۔ اس نہج سے بھی شاعری کا وجود ریاست (REPUBLIC) کے لئے نقصان سے خالی نہیں ہے۔

بہرحال یہ تھا خیال افلاطون کا۔ لطف یہ ہے کہ اُس کے ایک خاص شاگرد یعنی ارسطو نے اُس کے اس خیال کی زبردست مخالفت کی ہے۔ استاد اور شاگرد کے نظریوں میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "جس طریقے سے قسامِ ازل نے مغنی کی آواز میں اور مصور کے قلم میں ایک طاقت دی ہے اور دونوں اپنے کمال سے انسان کے دل کو مسرت پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح شاعر بھی قدرت کی طرف سے ایک ایسا دماغ لایا ہے جو اپنے نتیجۂ تخیل سے لوگوں کے سامنے پوشیدہ حقائق ظاہر کر کے حقیقی مسرت کا پیغام پیش کرتا ہے۔ ایک شاعر کی شاعری میں اتنی ہی اہمیت اور اصلیت ہوتی ہے کہ جتنی ایک مصور کی تصویر یا ایک مغنی کے راگ میں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ"

ارسطو کا نظریہ ہمیں بتا رہا ہے کہ "شاعری اور حیاتِ انسانی" میں ایک گہرا تعلق ہے۔ شاعری کا وجود حقیقی اور اصلی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر ہم یہ بات مان بھی لیں کہ شاعری دروغگوئی ہے تو ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ ایسی دروغگوئی ہے جسے ہر شخص اپنا معمول نہیں بنا سکتا۔ اور یہی دروغگوئی اکثر و بیشتر جب واقعات سے ٹکراتی ہے تو حقیقت کا جامہ پہنے ہوئے معلوم ہوتی ہے۔

شاعری ایک ایسا عطیۂ فطرت ہے جس کا حصول اکتسابی نہیں۔ اگر شاعری اکتسابی ہوتی تو شاید ہر ایک صاحبِ علم و فن اپنی جگہ شاعر بن بیٹھتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ لاکھوں علماء اور فضلاء اکتسابِ سخن کرنا چاہتے ہیں لیکن نہیں کر سکتے اور باوجود کوشش ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکتے۔ بخلاف اس کے بہت سے کم علم [illegible] ایسے ملیں گے جن کے [illegible]

ایسی مثالیں کثرت کے ساتھ ملیں گی۔ عرفی اگرچہ عنفوانِ شباب ہی میں مر گیا لیکن اُس کا کلام استادوں کے مقابلہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ فانی نے سولہ برس کی عمر میں اپنا ایک دیوان تیار کر لیا تھا۔ [illegible] کی بہت سی نظمیں ایسی ملیں گی جو انھوں نے تیرہ سال کی عمر میں لکھی تھیں۔ مگر ان میں شعریت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ جگر مرادآبادی بہ اعتبار علم ادنیٰ درجہ رکھتے ہیں لیکن اُن کا تغزل کتنا واقف کارانہ ہے۔ انگریزی ادب میں بھی (KEATS) چھبیس سال کی عمر میں مرا اور (SHALY) شیلے تیس سال میں پھر بھی اُن کا کلام مغربی ادب کا شاہکار سمجھا جاتا ہے اور مغربی اقوام اِن پر فخر کرتی ہیں۔

ارسطو اور افلاطون کی مثالوں سے کم از کم یہ تو معلوم ہو گیا کہ شاعری کے متعلق دو ہزار برس پہلے سے نظریات پیش کئے جا رہے ہیں۔ چنانچہ کچھ لوگ شاعری کو صرف (Art) سمجھے تھے اور اس کا مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے کرتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ شاعری کا کام عوام الناس کو فائدہ پہنچانا ہے۔ اگر شعر فائدہ نہ پہنچا سکے تو یقیناً وہ شعر معیار سے گرا ہوا ہے۔ انھیں خیالات کے ماتحت بعض لوگ شعر کی ترکیبِ لفظی کو شعر کی اصلی خوبی سمجھتے تھے۔ الفاظ کی بندش محاوروں کی روانی وغیرہ یعنی شعر کی ظاہری ترکیب ایسے لوگوں کے نزدیک حسنِ شعر کی کسوٹی تھی۔ ان کو اس سے غرض نہیں کہ شاعر نے کس جذبہ کا اظہار کیا ہے یا جو بات شاعر نے بیان کی ہے وہ غلط ہے یا صحیح۔ انسانی زندگی سے اسکا کہاں تک تعلق ہے اگر اُن کے سامنے اصغر کا یہ شعر پڑھ دیا جائے کہ ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

تو وہ کبھی اس پر غور نہ کریں گے کہ شاعر نے اس شعر کے اندر انسانی زندگی کا کس قدر اہم فلسفہ بیان کیا ہے بلکہ اس کی خوبی کا معیار ان کے نزدیک یہ ہوگا کہ شاعر نے اس میں کس قسم کے الفاظ بندشیں اور محاورے استعمال کئے ہیں۔ الفاظ کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ مختصر یہ کہ انھیں اس سے غرض نہیں کہ "کیا کہا گیا" بلکہ "کیسے کہا گیا" پر نظر ہوگی۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ خیال انتہائی غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ [illegible] زبان سے نہیں نکالتا پہلے اس کے دماغ میں تخیل پیدا ہوتا ہے اور بعد میں وہی الفاظ کا جامہ اختیار کر لیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ الفاظ کو وجود میں لانے والی اور انسان کو حرکت دینے والی کوئی اور چیز ہے۔ جسے ہم ارادہ یا جذبہ کہتے ہیں۔ بغیر ارادہ جو لوگ زبان سے کوئی بات نکالتے ہیں وہ فضول اور بامعنی نہیں ہوتی ——— پس کسی شعر کی لفظی ترکیب سے اس شعر کی خوبی کا اندازہ کر لینا انتہائی بے معنی بات ہے۔ اس کے ثبوت میں چند محققین کے نظریے پیش کرنے زیادہ سود مند اور مفید ہونگے۔

ڈاکٹر جانسن کے نزدیک "شعر مقفیٰ انشا ہے جو تعقل اور تخیل کی مدد سے انبساط کا پیوند صداقت کے ساتھ لگاتا ہے۔"

کالرج شعر کی یہ تعریف کرتا ہے "شعر انشا کی وہ نوع ہے کہ جو سائنس کی مدمقابل ہے اور اس کا راست مقصد انبساط ہے نہ کہ صداقت۔"

مکالے نے اپنی کتاب ESSAY ON MILTON میں شعر کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے "شعر الفاظ کا ایسا استعمال ہے کہ اس سے تخیل دھوکا کھا جائے۔ مصور رنگ کی مدد سے جو کام کرتا ہے، اُسے الفاظ کے ذریعہ سرانجام دینے کی صنعت کا نام شاعری ہے۔"

شیلے DEFENCE OF POETRY میں لکھتا ہے کہ "شعر تخیل کی زبان ہے۔"

ورڈس ورتھ کا خیال شعر کے متعلق یہ ہے "شعر انسان اور فطرت کا عکس اور شدید جذبات کا از خود چھلکنا ہے۔"

میتھیو آرنلڈ نے (STUDY OF POETRY) میں ایک جگہ شعر کی یوں تعریف کی ہے "شاعری تنقیدِ حیات ہے۔ ان اصولوں کے تحت جو شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے مقرر کردہ ہیں۔"

مشرقی محققین نے بھی شعر کی کم و بیش یہی تعریف کی ہے۔ چنانچہ ابن رشیق نے کتاب العمدۃ میں شعر کی یہ تعریف لکھی ہے "شعر ایسا کلام ہے جو موزوں اور مقفیٰ ہو اور بالارادہ کہا گیا ہو۔"

یہاں مغربی اور مشرقی دونوں نظریے شعر کی ماہیت کے متعلق میں نے پیش کر دیئے ہیں۔ اس سے میرا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ شعر صرف الفاظ کی ترکیب کا نام نہیں ہے۔ بلکہ شعر کا کچھ مدعا اور مطلب ہوتا ہے۔ [illegible]

کہ انسان کا دل ایک بربط ہے جب واقعات اور حوادث کی مضراب اسے چھیڑتی
ہے تو دل پر احساسات کی ایک برقی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اسی احساسی شعور کو شاعر
تخیلات کی رنگ آمیزیوں سے الفاظ کے جامے میں لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے
اور اسی کا نام شاعری ہے۔ شاعر کے اندر دو زبردست تخیلی اور تخلیقی قوتیں ہوتی ہیں
جن کی مدد سے وہ اپنے تمام کام سرانجام دیتا ہے۔

مندرجۂ بالا بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعری بے مقصد چیز نہیں
ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس کا تعلق ہماری زندگی کے ساتھ کہاں تک ہے۔

ہمارے جذبات اکثر خوابیدہ ہوتے ہیں ہم ان سے اتنے زیادہ بے خبر ہوتے
ہیں کہ انکا صرف دھندلا سا خاکہ دماغ میں باقی رہ جاتا ہے، ہمیں ان کے اجزا
کی تفصیل کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر شاعر کا دل ان سب سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔
وہ اس کی ایک مکمل تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ جب ہم شعر کے آئینہ
میں خود اپنے جذبات کا مرقع دیکھتے ہیں تو ہم دنگ رہ جاتے ہیں کہ شاعر کیونکر ہمارے
اندرونی جذبات سے واقف ہو گیا۔ ہمارے پوشیدہ جذبات کے نقوش خود بخود
جگمگانے لگتے ہیں۔ اس طرح ہمارے دل میں شاعر کی طرف سے ایک ہمدردی پیدا
ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ ہمارے پوشیدہ جذبات کا رازدار ہے۔ وہ کہیں بھی ہو اس سے
ایک لگاؤ اور ایک محبت سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ محبت بسا اوقات شدید عشق
کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ انگلستان میں اکثر ایسی مثالیں ملینگی کہ بعض شاعر کے اشعار
پڑھ کر عورتیں اس پر عاشق ہو گئیں جیسا کہ بائرن کا قصہ مشہور ہے۔

جذبات کا تعلق صرف شاعری ہی سے نہیں ہے بلکہ انسانی معاشرت سے
بھی ہے۔ اگر ایک طرف شاعر کی دنیا میں ان کی وجہ سے چہل پہل ہے تو دوسری طرف
معاشرتی دنیا کا نظام بھی انہی کے واقف کارانہ جذبات کا مرہون منت ہے یہ ماننا
کہ معاشرتی زندگی کا وجود صرف سائنس اور فلسفہ ہی پر ہے بالکل غلط ہے
اگر آج دنیا سے ماں کی مامتا، دوستوں کی محبت، موت کا رنج، صحت کی خوشی،
غرض اسی قسم کے اور سب جذبات فنا ہو جائیں تو یقیناً دنیا بے رنگ و بو ہو کر
رہ جائے۔ شراب بے کیف ہو جائے۔ میخانوں پر سناٹا چھا جائے۔ غرض
حیات و ذات میں کوئی شے باعث امتیاز نہ رہے۔ پس ثابت ہوا کہ دنیا کو انکی
اصلی حالت پر قائم رکھنے کے لئے اگر ایک طرف سائنس کی ضرورت ہے تو دوسری
طرف جذبات شاعرانہ کی بھی۔ گویا ہماری زندگی کے لئے دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

اکثر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ شاعری کی بنیاد خیالی باتوں پر ہوتی ہے
شاعر ہمیشہ ایک خیالی دنیا کی سیر کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اسکی باتوں پر اعتبار
کرنا بالکل بے معنی شے ہے۔ اس اعتراض کا جواب بہت آسانی کے ساتھ دیا جا سکتا
ہے۔ عموماً انسان کا مقصد ہر کام میں یہ ہوتا ہے کہ اس میں اسکا کوئی فائدہ ہو
بے فائدہ وہ کوئی کام نہیں کرتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ انسان ہر کام
خود غرضی کے ماتحت کرتا ہے۔ اس قسم کی خود غرضی انسان کے دل کو پژمردہ
بنا دیتی ہے۔ اسی نوعیت کے اور بہت سے مادی تاثرات کو دور کرنے کے لئے
شاعر اپنے جذبات کی بانسری لیکر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور اپنے میٹھے میٹھے
ترنم سے ہمیں ایک ایسی دنیا میں کھینچ لیجاتا ہے جہاں آب و ہوا کی بالیدگی ہماری
روح میں تازگی پیدا کر دیتی ہے اور ہماری رگ رگ میں مسرت اور زندگی کی
برقی لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔ شاعر کے اشعار کے مطالعے سے ہم ایک ایسی
عشرت گاہ میں پہنچ جاتے ہیں جہاں مادیت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور روح کو
حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ ایسی عشرت گاہ
جسے شاعر نے اپنی تخیلی قوت سے تعمیر کیا ہو کیا قابل قدر نہیں ہے اور یقیناً ہے
اس سے انکار کرنا کفران نعمت کے مترادف ہے۔

خواب کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ وہ آنے والے واقعات کا ایک
دھندلا سا خاکہ اور پیشین گوئی ہوتا ہے۔ حالانکہ اس خیال میں کوئی حقیقت نہیں
ہے اور نہ اس کا کوئی ثبوت ہے۔ علم النفس کی تحقیقات بھی اس کے خلاف ہے
شعر کو بھی لوگ پیشین گوئی کہتے ہیں۔ اکثر و بیشتر واقعات اس امر کی تصدیق
کرتے ہیں۔ یونان کی تاریخ کا مطالعہ اس معاملہ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔
"اپولو" جو شاعری کا بادشاہ تھا، پیشین گوئی کا بھی خدا مانا گیا ہے۔ اس نے
اپنی اکثر پیشین گوئیاں اپنی نظم ہی میں کی ہیں۔ شیلے نے خود شاعر کو نبی
اور قانون ساز بتایا ہے وہ کہتا ہے کہ "شاعر [illegible]
کیونکہ وہ نہ صرف حال کو شدت کے ساتھ دیکھتا ہے اور قانون [illegible]
بنی نوع انسان عمل کرتے ہیں بلکہ وہ حال میں آئندہ کو بھی دیکھتا ہے [illegible]
[illegible]

یک نہیں بلکہ متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ ٹیگور نے خود اپنے غرق ہونے کے متعلق ایک نظم میں ذکر کیا تھا۔ ایک نے بھی اپنے سولی پر چڑھنے کی پیشین گوئی ایک نظم میں کی تھی۔ اس کے علاوہ حافظ شیرازی کے دیوان سے آج تک ادنیٰ اور اعلیٰ طبقہ فال نکالتا ہے۔

مولانا روم نے لکھا ہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" اسی خیال کے تحت شاعر کو مصلحِ قوم اور رہبرِ ملت کہا گیا ہے۔ شاعر کا فرضِ منصبی ہے کہ وہ قوم کو ضلالت اور گمراہی کے راستے سے بچائے اور فلاح و بہبود کے راستہ پر لگا کر قوم کی رہنمائی اور دستگیری کرے۔ اخلاقی پہلو کی تعمیر اور اصلاح میں ہر امکانی کوشش کرے۔ اگرچہ اس قسم کی ذمہ داری کسی مذہبی پیشوا کے دوش پر ہونی چاہیے لیکن واقعات شاہد ہیں کہ شاعر نے اس کام کو کتنی عمدگی کے ساتھ سرانجام دیا ہے۔

ورڈس ورتھ کا خیال تھا کہ "جو شخص شاعر کو معلم نہیں سمجھتا وہ اس پر ظلم کرتا ہے۔" فارسی شاعری نے تو اس کے لئے ایک علیحدہ صنف قائم کر دی ہے۔ اس میدان کا مرد وہ شخص ہے جسے اہلِ یورپ GREAT MORALIST کے خطاب سے یاد کرتے ہیں اور جس کا نام سعدی ہے۔ شاعری کے اصلاحی دور میں بھی اس قسم کے بہت سے شعرا ملیں گے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ اصلاحی شاعری کا تذکرہ ہو اور حالی، اکبر، آزاد، اقبال، سیماب اور جوش وغیرہ کے نام نہ لئے جائیں۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ شاعری مخربِ اخلاق ہے۔ یہ اعتراض اپنی جگہ بالکل نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور صحیح ہے مگر شاعری پر اس قسم کے اعتراض کرنے سے پہلے یہ بات دماغ میں ضرور رکھ لینی چاہئے کہ شاعری اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں۔ دونوں کے فرائض اور اصول علیحدہ علیحدہ ہیں۔ شاعری کی خصوصیات تو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اس کے دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں رہا مذہب! مذہب کا کام اخلاقیات اور عملیات کی دنیا کے لئے قانون بنانا اور قوم کو راہِ راست پر گامزن ہونے کی دعوت دینا ہے۔ شاعر اپنے دوش پر اس قسم کی ذمہ داری نہیں لیتا، کیونکہ وہ عمل کی تعلیم دینا مذہب کا فرض سمجھتا ہے۔ شاعر اخلاقی تعلیم دے یا نہ دے اس میں اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کیونکہ مذہب اس کے لئے کافی ہے۔

اس اعتراض کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ شاعر اپنی زندگی میں دو قسم کے اچھے اور برے واقعات کا شاہد ہوتا ہے، اور دونوں واقعات اس کے دل میں کچھ اس قسم کے تاثرات پیدا کرتے ہیں کہ وہ انہیں اشعار کی صورت میں پیش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اچھے جذبات کے ماتحت جو اشعار شاعر کہتا ہے وہ سامعین کی روح میں بالیدگی پیدا کرتے ہیں اور اخلاقیات کے پہلو کو بلند کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے واقعات شاعر کے جذبات کو کثیف کر دیتے ہیں ایسی صورت میں شاعر کا نتیجۂ فکر سوسائٹی کے لئے مضر اور مخربِ اخلاق ہوتا ہے، اور اسی قسم کے اشعار پر لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں شاعر کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ سراسر ذمہ داری ان واقعات پر ہے جو شاعر کے دورانِ حیات میں رونما ہوتے ہیں۔ کیونکہ شاعر کا دل ایک آئینہ ہوتا ہے۔ وہ جس ماحول سے گذرے گا، اسی قسم کے خیالات کا اپنے اشعار میں اظہار کریگا۔ اس لئے ایسے مخربِ اخلاق واقعات ہی کو کیوں نہ جڑ سے اکھیڑ دیا جائے۔ جنکا اثر شاعر کے جذبات کو کثیف کر دیتا ہے۔ لیکن یہ بات قابلِ تسلیم نہیں ہے۔ انسان اپنی طبیعت کا مالک ہے وہ جس طرف چاہتا ہے اسے رجوع کر سکتا ہے۔ شاعر اپنی طبیعت میں کیوں نہ اس درجہ لطافت اور شگفتگی پیدا کرلے کہ برے واقعات اس پر اثر ہی نہ ڈال سکیں۔ اگر وہ برے واقعات کے برے اثرات قبول کرتا ہے اور ان کے ماتحت طبع آزمائی کرتا ہے تو یہ اس کی لطافتِ طبعی کی کمی کا ثبوت ہوگا۔ اور ایسی صورت میں سو فیصدی ذمہ داری اسی پر عائد ہوگی

اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ قدرت کی بہت سی چیزیں ہماری عدم توجہی کی وجہ سے بے کیف ہو جاتی ہیں۔ ہم اپنے مشاغل جات میں کچھ اس درجہ منہمک ہوتے ہیں کہ ان پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ہماری دلچسپیاں پہاڑ، دریا، جنگل اور باغ کے سطحی محاسن تک محدود ہوتی ہیں اسی قسم کا مسلسل تغافل ہم کو اشیاء کی ماہیت شناخت اور اس کے عرفان سے محروم کر دیتا ہے لیکن جب شاعر انہیں بہ امعانِ نظر دیکھتا ہے تو اس کے اندرونی محاسن کی لامحدود گہرائیوں میں غرق ہو جاتا ہے اور واپسی میں انہیں محاسن کے کچھ تفصیلی نقوش اپنے دماغ میں لاتا ہے اور جب تخیل کی مدد سے ان کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے تو ہماری آنکھیں کھل جاتی ہیں اور ہم اپنے تغافل کو کوسنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ چیزیں [illegible]

ہماری نظروں کے لئے بے کیف اور بے حقیقت چیزیں مسحور، اور پُر کیف ہو جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ شاعر اشیاء کی حقیقت اور حسن شناسی کی صلاحیت ہمارے اندر پیدا کر دیتا ہے اور کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

(UTILITARIAN) افادیوں کا خیال ہے کہ اگرچہ قوت متخیلہ کا عمل مسرت بخش ہے لیکن ادراک عمل اس سے زیادہ مفید ہے۔ انکے نزدیک صرف ایسے ہی کاموں کی فکر ضروری ہے، جن سے کچھ فائدہ ہو، سوچا جائے تو یہ بحث کسی قدر غلطی پر مبنی ہے۔ ہمارے خیال میں کارآمد وہ چیز ہے جس سے انسان کے دل کو خوشی اور مسرت ہو مثلاً غذا اور پھل اس لئے مفید ہیں کہ ان سے بھوک زائل ہوتی ہے اور قوئی نشو و نما پاتے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سی چیزیں ہیں جنکو ہم مفید محض اس لئے کہتے ہیں کہ ان کے استعمال سے ہم کو خوشی ہوتی ہے بس اگر خوشی ہی معیار ہے تو آپ ہی فرمایئے کہ شعر سے بڑھکر کونسی چیز مسرت بخش ہو سکتی ہے۔ پس شاعری انسان کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ غذا کا استعمال بلکہ اس سے بھی اور زیادہ کیونکہ غذا جسم کے قیام کے لئے ضروری ہے اور شعر روح و دل میں بالیدگی اور کیف پیدا کرتا ہے۔

شاعری اور زندگی میں ایک اور بہت گہرا تعلق ہے ہر دور کی شاعری اس دور کے حالات کا آئینہ ہوتی ہے۔ جس سے اس دور کے انسانوں کے اخلاقی، سیاسی علمی، معاشرتی، تمدنی اور آئینی رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے علاوہ چونکہ شعر کی زبان نثر سے زیادہ موثر اور محرک جذبات ہوتی ہے۔ اس لئے جنگ آزادی کے موقعوں پر لوگوں کے جذبات کو ابھارنے میں شاعر کا سب سے زیادہ حصہ ہوتا ہے۔ شاعر وطن کی محبت اور جاں نثاری کے جذبات قوم کے اندر پیدا کرکے رگِ حریت اور جذباتِ غیرت کو اس طرح حرکت دیتا ہے کہ لوگ وطن کے لئے ہر ممکن قربانی پیش کرنے کے لئے خوشی سے تیار ہو جاتے ہیں۔ عربی شاعری اس معاملہ میں بہت آگے بڑھی ہوئی ہے۔ مثالیں ایک نہیں سیکڑوں ملتی ہیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر موقعوں پر شاعری نے انسان کی زندگی میں یکایک کئی زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اس کے اثر سے بڑے بڑے بادشاہ بھی نہ بچ سکے "نصر سامانی" نے ہرات کے سفر میں مقام بادغیس میں پڑاؤ ڈالا اور ٹھہر گیا۔ اسے اس مقام کی فضا کا منظر بہت پسند آیا۔ وہ فصلیں گذر گئیں اور قیام وہیں رہا۔ بادشاہ چلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ امراء اور اراکین پریشان ہو گئے۔ سیکڑوں تدبیریں کیں۔ آخر میں رودکی کو جو دربار کا سب سے بڑا شاعر تھا پانچ ہزار اشرفیاں دے کر اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ بادشاہ کو بخارا چلنے پر آمادہ کر دے۔ رودکی نے ایک قصیدہ کہا اور موقعہ پاکر بادشاہ کے سامنے خوش الحانی سے پڑھا۔ قصیدہ سنتے ہی بادشاہ کا یہ حال ہوا کہ موزہ بھی نہ پہنا اور روانہ ہو گیا اور ایک منزل جاکر دم لیا۔ اس طرح دارالسلطنت کو واپس ہوا۔

اس قصیدے کے چند شعر ذیل میں درج ہیں ؎

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی — یاد یار مہرباں آید ہمی
ریگ آموی و درشتیہای او — زیر پایم پرنیاں آید ہمی
اے بخارا شاد باش و شاد زی — شاہ سویت میہماں آید ہمی
شاہ سرو است و بخارا بوستاں — سرو سوئے بوستاں آید ہمی

۱۲۳۳ء میں جب بادشاہ حسن شکست کھا کر بغداد پہنچا تو سلمان ساوجی نے بادشاہ اور فوج کی شکستہ دلی کا اندازہ کرکے ایک بے نظیر قصیدہ کہا تشبیب اور مدح کے اشعار میں تفریح اور تسکین کا خیال رکھا اور آخر میں بہت ہمت افزا اشعار کہے۔ جب بادشاہ نے اس قصیدہ کو سنا تو وہ اس قدر متاثر ہوا کہ سال بھر میں ایک بڑی فوج جمع کرکے دشمن کے اوپر حملہ کر دیا اور فتحیاب ہوا۔

اس قصیدے کے چند اشعار بھی سنئے ؎

نقطۂ دائرۂ بادشہی شیخ حسن
شاہ خورشید محل خسرو جمشید آثار
کف او مقسم ارزاق و ضمیر است و شریف
دیدہ او کعبۂ آمال صغار است و کبار
آخر دست بر آرد اثر دولت شاہ
از نہاد سر تسلیم اسپ [illegible]

ماہرین علم النفس کی تحقیق نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اگر انسان کے جذبات کو نہ ابھرنے دیا جائے اور ان کی خواہشات کسی وجہ سے [illegible]

ایسی صورت میں کہ اُس کے دماغ میں ایک قسم کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ عالمِ بیداری میں بھی ایک خواب دیکھا کریگا۔ دماغ ہمہ وقت غیر حاضر رہیگا۔ مثلاً کوئی شخص کسی سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے ملکر کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے لیکن چند وجوہات کی بنا پر اس کی خواہش پوری نہ ہو تو اُس کے دماغ میں ایک بیماری سی پیدا ہوجائے گی اور ہمیشہ وہ اپنے محبوب ہی کا خواب اُٹھتے بیٹھتے دیکھے گا۔ اس مرض کو دُور کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی شغل اس کے لئے ضروری ہوگا جو اس کے جذبات کو ہمیشہ ٹھیک رکھ سکے۔ موسیقی اور شاعری اس کام کے لئے ہمارے خیال سے بہترین مشغلے ہوں گے اور یہاں بھی شاعری کو درجہ اوّلیت حاصل ہے۔ چوٹ کھایا ہوا دل جب جذباتِ محبت کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کریگا تو دُنیا تڑپ جائے گی اور خود محبت کرنے والے کے جذبات بھی ہلکے ہوجائیں گے، اس کے ثبوت میں شعرا کے اقوال بہتات سے ساتھ ملیں گے۔

نیومین (NEW MAN) کہتا ہے کہ "جب وہ شعر کہتا ہے تو اُس کے دماغ کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے" ارسطو کہتا ہے کہ "شاعری مریض کی دوا ہے" گیٹے جرمنی کا سب سے بڑا فلسفی کہتا ہے کہ "وہ اپنے دماغ کو سکون میں لانے کے لئے شعر کہتا ہے"

حقیقت یہ ہے کہ شعر کا انسان کی زندگی سے ایک گہرا تعلق ہے اگرچہ آغازِ تمدن میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ شعر کو فضول بکواس قرار دیکر اُسے تہذیبِ انسانی سے خارج کر دیا جائے لیکن جیوں جیوں تہذیب بڑھتی جاتی ہے ویسے ہی ویسے اُس کی اہمیت زیادہ ہوتی جارہی ہے۔ ملکی فضا بدل گئی لوگوں کے مشاغل پہلے جیسے نہ رہے۔ خیالات میں تغیر ہوگیا تہذیب نے اپنا چولا بدل ڈالا۔ نہ اب وہ حکومت کا طریقہ ہے اور نہ وہ اگلی سی معاشرت ہے مختصر یہ کہ پورا انسان مع روح و دماغ بدل چکا ہے۔ لیکن شعر کے داخلی اثرات اور اُس کی دلکشی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ آج ہم اپنے شاعر کی اتنی ہی قدر کرتے ہیں جتنی مسیح سے تین سو برس پہلے یونان کے لوگ کرتے تھے۔ اگر شعر کا انسان کی زندگی سے اتنا گہرا تعلق نہ ہوتا تو جہاں اتنی تہذیب و تمدن اور معاشرت میں تبدیلیاں ہوئیں۔ زبانیں مٹیں حکومتوں نے پلٹے کھائے انقلابات آئے۔ خشکی سمندروں میں اور سمندر خشکی میں تبدیل ہوئے شاعری بھی کسی مہلک انقلاب کی نذر ہو کر ختم ہو جاتی لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ختم ہونے کے بجائے وہ آفتابِ ہستی بنی ہوئی ہے۔

عبدالباری

انجامِ محبت

حُسن نیلے آسماں پر چاند بن کر چھا گیا — ذرّے ذرّے کو محبت کی تڑپ تڑپا گئی
آہ شاعر رہ گیا، لب تشنۂ انوارِ حُسن — چھُپ گیا مہتاب دُنیا پر سیاہی چھا گئی

شام سے شبنم لگی پڑنے فضائے باغ میں — رات کچھ قطروں نے کاٹی پھُول کے رُخسار پر
صبحدم سورج کی کرنوں نے دیا پیغامِ مرگ — آہ چشمِ عشق کے بکھرے ہوئے کچھ اشکِ تر

مختصر راز و نیازِ شمع و پروانہ بھی دیکھ — فیصلہ حُسن و محبت کا یہاں کچھ ہو چلا
اہلِ محفل کر رہے ہیں اعترافِ سوزِ عشق — نور کی آغوش میں اُلفت کا نغمہ سو چلا

جب نمو نے گلشنِ ہستی کو دی فصلِ بہار — حُسنِ گل اور جذبۂ بلبل سے کی اک ابتدا
دن گیا، فرقت کی رات آئی۔ چلی بادِ خزاں — آہ انجامِ محبت اسقدر حسرت فزا

پنڈت گوبند داس خموش ٹیری
(صوبہ سرحد)

سازِ لاموجود

تو ہی ہے میرا یقیں میرا علم میرا شہود ترے سوا کسی شے کی نمود ہے نہ وجود

جنوں کو سجدۂ بے سر مرا مبارک ہو وہ انکا جلوۂ بے سمت پھر ہوا مشہود

نگاہ پھیر کے مجھ سے تجھے سکوں نہ ملا تری نظر کی طرح عشق بھی نہیں محدود

یقین کفر یہ کافر کو بے ترے نہ ہوا تو ہی حقیقتِ باطل تو ہی عدم کا وجود

ہر اک حجاب سے نکلی نوائے الا اللہ کمالِ کفر نے چھیڑا جو سازِ لاموجود

ہر ایک سمت ترا رُخ ہر ایک رُخ تری ذات کروں میں کسکی طرف پشت کسکی سمت سجود

وہی ہے میکشِ گمنام تیرا دیوانہ
رہا حرم سے جو محروم دیر سے مردود

میکش اکبر آبادی

محشرِ خاموش

زندگی ہم سے ہو گئی روپوش ہو اجل تو ہی آکے ہم آغوش

سازِ فطرت ہے انقلاب بدوش نغمۂ عیش ہے وبالِ گوش

جانے کیا حشر ہونے والا ہے دل نہیں درد سے تحمل کوش

وہ اُمنگیں نہ وہ ترنگیں ہیں خانۂ دل ہے محشرِ خاموش

حاصلِ زندگی معاذ اللہ زندگی ہے قضا سے ہم آغوش

کر دیا بے نیازِ یاس و اُمید اُف رے طوفانِ مرگ تیرا جوش

کس سے رودادِ شامِ غم پوچھیں شمع تھی ایک، وہ بھی ہے خاموش

قافلہ ناتواں قدم بقدم بیکسی اور یاس دوش بدوش

پھر نہ آئیگی کیا بہار کبھی آج بلبل ہے آشیاں بردوش

حسن کی جلوہ گاہ میں لے دل کھو نہ دینا کہیں متاعِ ہوش

آج افسانہ خواں ہیں ہم رونق
کبھی ہو جائینگے فسانۂ دوش

رونق دکنی

پریم ندی

(۱)

عالم ارواح میں دو روحوں کا اتصال ہوا اور مدتوں تک فضائے لطیف میں یہ روحیں محو رقص رہیں — تبسم کناں — خندان و شاداں — روزانہ محبت میں بسی ہوئی ہوائیں اُنھیں جھولا جھلاتی رہیں — ہر لمحہ — ہر گھڑی — اور ہر منٹ — اور صبح و شام پریم ساگر میں اُنکے اشنان ہوتے رہے — دنوں — مہینوں — اور برسوں —

قدرت نے ان دونوں کی لطیف ہیئت کو ابدی بنانے کے لئے اُنھیں احساس کا ایک آئینہ دیا ہنستا ہوا اور جگمگاتا ہوا — دونوں نے آئینہ دیکھا اور ایک دوسرے پر نظر ڈالی — نظر ڈالی اور وہ نظر ڈالی جس نے بیک لمحہ نکہتوں اور لطافتوں کے بے شمار، لازوالی ذخیرے — اور تقدس و عرفان کے بے انتہا غیر فانی شیرازے ایک دوسرے کو سونپ دیئے۔ قدسی مسکرائے — حوروں کو ہنسی آئی۔ دریائے رحمت کو جوش آیا اور عالم اجسام کا اقبال درخشاں کرنے کے لئے اُنھیں دُنیا میں بھیجدیا گیا۔

ایک روح اقبال کے کالبد شعریت میں جلوہ گستر ہوئی اور دوسری درخشاں کے پیکر لطیف میں ضو فگن۔

عالم اسباب میں اقبال ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے روشناس اور مشہور ہوا درخشاں ایک مصورہ کی حیثیت سے متعارف ہوئی اور کامیاب بنی اقبال نسبی وجاہت میں درخشاں سے ممتاز رہا تو درخشاں مالی حیثیت میں اقبال سے مفتخر۔

آئینۂ احساس دونوں کے پاس تھا دونوں ایک دوسرے سے غائبانہ متاثر ہو رہے تھے متاثر ہو رہے تھے اور نامعلوم طریقہ پر متاثر ہو رہے تھے دونوں کو کسی کھوئی نامعلوم چیز کی تلاش تھی — تلاش تھی اور بے ارادہ تلاش تھی — [illegible] تھے اور دونوں کے دلوں میں آگ دہک رہی تھی جو محسوس ہوتی تھی لیکن نظر نہیں آتی تھی۔ آخر — تاثر بڑھا — پیاس زیادہ ہوئی — آگ بھڑکی اور دونوں کی — بے ارادہ — بہار کی سانولی فضاؤں میں ایک حسین شام کو ملاقات ہو گئی — —

(۲)

درخشاں سر جھکائے ایک خیالی تصویر کا خاکہ بنا رہی تھی —

وہ تصویر کس کی تھی؟ یہ اُسے خود بھی نہیں معلوم تھا —

اقبال بے ارادہ ایک گیت گنگنا رہا تھا — اس گیت میں کس کا ذکر تھا؟ وہ خود بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔

درخشاں نے گیت سُنا۔ — اقبال نے تصویر دیکھی —

درخشاں بولی "ہیں! میرا ذکر" اقبال نے کہا "اوہ! میری تصویر" دو پیاسی نگاہوں کا تصادم ہوا۔ تصادم سے پریم کا سوتا پھوٹا اور ایک ندی بہہ نکلی — گنگناتی ہوئی اور بل کھاتی ہوئی۔ اس کے بعد جھجک۔ شرم اور حجاب کی منزلیں جو مادی اجسام میں حسن زندگی کا رنگ بن کر حلول کئے ہوئے ہیں۔ لطیف گفتگو اور رنگین مذاق کے ذریعہ طے کی گئیں —

ندی بہہ رہی تھی۔ آہستہ — آہستہ — خراماں خراماں —

لیکن رفتار بتدریج بڑھ رہی تھی۔

(۳)

اب درخشاں اور اقبال دو پریمی تھے جنکی دُنیا میں پریم ہی کا سورج تھا۔ پریم ہی کا چاند اور پریم ہی کے تارے — اُن کا ہر دن پریم تھا اور ہر رات پریم وہ ہنستے تھے تو انکے رنگیں لبوں سے پریم کے پھول جھڑتے تھے اور روتے تھے تو ان کی ترنم آنکھوں سے پریم کے موتی برستے تھے۔

مسکراتے ہوئے دنوں اور ہنستی ہوئی راتوں میں وہ اکثر مل مل کر پریم کے گیت گایا کرتے تھے ساتھی زندگی کی ناؤ پریم ندی میں بہہ چلی جا رہی تھی [illegible]

سیلاب سے بچتی ہوئی ۔۔۔ دُور ۔۔۔ بہت دُور ۔۔۔ اور دُور سے بھی دُور دونوں
گرد و پیش سے بے خبر تھے اور ماضی و مستقبل سے بے نیاز۔ لیکن ہاں کسی نہ کسی طرح اقبال و ہمکا
اس نے درخشاں کو سنبھالا اور دونوں مل کر رم ندی کے کنارے آشاؤں کا ایک محل بنایا
جس میں دل کے دیئے روشن کئے گئے، آرزوؤں کا چراغاں ہوا اور تمناؤں کی
ندیاں بہہ نکلیں۔ اقبال نے درخشاں پر غیر فانی نظمیں لکھیں اور درخشاں نے اقبال کی
بیاضِ شعر پر ابدی نقش و نگار بنائے۔

محل میں رونق تھی، نغمے برس رہے تھے اور حسن مچل رہا تھا ۔۔۔ ندی بہہ رہی
اور پورے زور و شور کے ساتھ بہہ رہی تھی ۔۔۔ گرجتی ہوئی اور دندناتی ہوئی

(۴)

ایک دن درخشاں نے اپنی اور اقبال کی تصویر بنائی ۔۔۔ ہنستے ہوئے
اور مسکراتے ہوئے ۔۔۔ اقبال کھڑا ہوا شعر پڑھ رہا تھا اور درخشاں اقبال
کی بیاض لئے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

یہ تصویر عقیدت کی محراب میں آویزاں کی گئی اور خلوص و صدق کے مہکتے ہوئے
پھول اس پر چڑھائے گئے اور چڑھائے جاتے رہے۔ دنوں۔ ہفتوں اور مہینوں
اور چڑھائے جاتے رہتے۔ برسوں۔ صدیوں اور قرنوں۔ اگر بد بینی اور کوتاہ نظر انسان
کی بدبینی اور کوتاہ نظری کا احتمال نہ ہوتا۔

محل جگمگا رہا تھا ۔۔۔ تصویر سجی ہوئی تھی۔ لیکن دنیا کی نظروں میں پھول
کر دیا گیا تھا۔ ندی بہہ رہی تھی اور بدستور۔ زور و شور کے ساتھ بہہ رہی تھی
لیکن چھوٹی چھوٹی چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی اور چکراتی ہوئی ۔۔۔

(۵)

شام کا وقت تھا۔ اقبال اور درخشاں آشاؤں کے محل میں چراغاں کر رہے
تھے ہنستی ہوئی تمنائیں گیت گا رہی تھیں اور مسکراتی ہوئی آرزوئیں بربط لئے
بیٹھی تھیں۔

یکایک منصوری سے درخشاں کے والد کا تار آیا

Come soon arrival marriage

جلد آؤ۔ آ مر رہے ہیں۔ اقبال کچھ نہ کہہ سکا، خاموش رہا۔ ششدر و حیران
اور متحیر ۔۔۔ [illegible]

واپسی کا وعدہ لے ہی لیا۔

درخشاں رخصت ہوئی۔ سراسیمہ، مضطرب اور بے چین۔ لیکن ہاں امنگیں اور ہمتیں نئے
جو اسکی آنکھوں سے جھانک رہی تھیں۔ اقبال کی جرأتوں سے واپسی کا وعدہ کر ہی لیا۔

محل متزلزل ہوا لیکن قائم رہا۔ تصویر پر اُداسی چھا گئی، لیکن آویزاں رہی
ندی بہہ رہی تھی کبھی زور سے اور کبھی آہستہ۔ رکتی ہوئی اور تھمتی ہوئی ۔۔۔
لیکن بہہ رہی تھی۔

(۶)

درخشاں واپس آئی لیکن ہمیشہ جانے کے لئے۔ درخشاں کے والد نے منصوری میں
اسکے مستقل قیام کا بجبر بندوبست کر دیا، اُسے جانا پڑا اور "مجبوراً" جانا پڑا۔

اقبال نے درخشاں کو رخصت کیا۔ تمناؤں کو دفنا کر، آرزوؤں کا خون کر کے اور
حسرتوں کا گلا گھونٹ کر۔

درخشاں پھر رخصت ہوئی۔ ناکامی کے شکوے کرتی ہوئی نامرادی کے مرثیے
پڑھتی ہوئی اور نارسائی کے "سوز" سناتی ہوئی۔

اقبال اور درخشاں ملے اور شاید بظاہر آخری مرتبہ ملے ۔۔۔ نظر میں
سوگوار ۔۔۔ دل بیقرار اور صورت اُداس۔

اقبال نے رخصت کے وقت ایک نظم پیش کی، درخشاں نے اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا ایک
فوٹو اور ایک ہار، منصوری پہونچکر درخشاں نے اقبال کو خط لکھے۔ اوّل اوّل روزانہ
پھر ہفتہ وار ۔۔۔ پھر ماہوار ۔۔۔ اور پھر ....

احساس کا آئینہ اب بھی دونوں کے پاس ہے لیکن بُعد اور دُوری کے گرد و غبار
سے دھندلا سا ہو گیا ہے آشاؤں کا محل اب بھی اپنی بنیاد پر قائم ہے لیکن امتدادِ
ایام کے جھٹکوں سے کھنڈر کی صورت میں تبدیل ہو چکا ہے۔

تصویر محرابِ عقیدت میں اب بھی آویزاں ہے لیکن کبھی کبھی مخالف ہواؤں کے
جھونکوں سے یہ بھی متزلزل ہو جاتی ہے۔

ندی اب بھی بہہ رہی ہے لیکن ... کی سنگینیں ... اسکی راہ میں حائل ہو چکی ہیں
اقبال کو خیال ہے اور درخشاں کو یقین ہے کہ ... ان کو بھی ...
[illegible] ... یہ خشک
[illegible]

تکملۂ یاس

جُھٹ پٹا ہو گیا۔ خاموش ہوئے ہنگامے — دامنِ چرخ میں روپوش ہوئے ہنگامے
مضمحل دھوپ سسکنے لگی دیواروں پر — اوس پڑنے لگی جذبات کے انگاروں پر
ہو گئے سائے فلک بوس چناروں کے دراز — ہمصفیروں کی ہوئی جاتی ہے مدھم آواز
کوہساروں سے اُتر آئے حزیں چرواہے — خستہ و ماندہ و افسردہ جبیں چرواہے
تھرتھرانے لگے دیہات کی راہوں میں نشے — بھر دیئے حسن نے بیتاب نگاہوں میں نشے
ہیئتیں دہر کی تبدیل ہوئی جاتی ہیں — کاوشیں خاک میں تحلیل ہوئی جاتی ہیں

اُن کے آنے کی اب اُمید بھی باقی نہ رہی

شام نے ڈال دیا دھوپ کے چہرے پہ نقاب — تھم گئے حشر در آغوش بگولوں کے رباب
مٹ گئے سرو و صنوبر کے تھرکتے سائے — خاک پر سانپ کی مانند سرکتے سائے
کھول دی ساحرۂ شب نے بھیانک آغوش — سازِ ناہید سے ڈھلنے لگے نغماتِ خموش
پھوٹ نکلا لبِ فطرت سے سکوں ریز سکوت — چھا گیا گلشن و صحرا پہ دلآویز سکوت
وادیٔ کوہ میں چشموں کی صدا ڈوب گئی — فکرِ فردا میں طربناک فضا ڈوب گئی
دیوِ ظلمات نے بے نور نگاہیں کر دیں — اور مسدود ملاقات کی راہیں کر دیں

اُن کے آنے کی اب اُمید بھی باقی نہ رہی

ڈھل گئی رات۔ سمٹنے لگا دامانِ نشاط — چھپ گیا چاند۔ اُٹھنے لگی تاروں کی بساط
ذرّے ذرّے میں ہے کیفیت راز آگینی — ہو چکی عشرتِ محبوب کی ناز آگینی
یادِ ماضی کو غبارِ رہِ ماضی کر دو — جنت آبادِ تصور میں سیاہی بھر دو
روحِ اوہامِ خیالی میں بہت جھوم چکی — زندگی موت کے منحوس قدم چوم چکی
ان لرزتے ہوئے بابوں پہ گرا دو پردے — ساغر اُٹھوا دو۔ شرابوں پہ گرا دو پردے
توڑ دو بربط و مضراب ہٹا دو شمعیں — بزمِ افسانہ کرو ختم بُجھا دو شمعیں

اُن کے آنے کی اب اُمید بھی باقی نہ رہی

مضطر گرامی

سرور کی کہانی سرور کی زبانی

سوانح حیات سرور از رقعاتِ سرور

(گذشتہ سے پیوستہ)

ملازمت اس کے بعد بنارس آ گئے اور راجہ صاحب رام نگر کے یہاں منسلک ہو گئے۔ یہ زمانہ ۱۸۵۶ء کا تھا مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ والیٔ بنارس تھے۔ پچاس روپیہ ماہوار مشاہرہ مقرر ہوا اور اصطبل خاص کی خدمت سپرد ہوئی مگر یہ رقم کافی نہ تھی لیکن مخلص احباب حتی الوسع ان کی دستگیری اور مالی امداد سے اعانت کرتے تھے۔ سید علی حسن۔ سید قربان علی۔ منشی شیو پرشاد قابلِ ذکر ہیں۔ مہاراجہ پٹیالہ اور مہاراجہ الور کی عنایات بھی ان پر مبذول رہتی تھیں۔

ہنگامہ ۱۲۷۳ھ

"کچھ دن کانپور میں اوقات بسر کی پھر بنارس روانہ ہوا صعوبت سفر کا بہانہ ہوا، بنارس پہونچا راجہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دفعتاً عجب واردات ہوئی کہ خبر ویرانی و بربادی لکھنؤ کو یہ کہ شہرہ ہوئی شیشۂ دل سنگِ حوادث سے چور ہوا، لکھنؤ میں ہنگامہ ۵۷ء کا ظہور ہوا۔

ہر چند مہاراج بہادر نے بڑی عنایت کی کفالت کی راہ سے بہت کچھ رعایت کی مگر دل و دماغ نہ رہا غم سے فراغ نہ رہا ہر کیف اتفاق دفعتاً ان آتش ریزاں لکھنؤ میں آیا ایک عالم کو تہلکۂ عظیم میں مبتلا پایا۔ شہر میں سناٹا چھوٹا بڑا آفت میں مبتلا ہر گلی کوچہ میں انگریزی بندوبست اپنے اپنے حال میں ہر ایک مست۔

جناب قبلہ و کعبہ مرزا خانی نوازش بندے کے استاد جو غازی آباد سے تشریف لے گئے عجب صدمۂ جانکاہ دے گئے زمانہ نظر میں سیاہ ہوا الم جانکاہ ہوا ایسے شفیق کا مرنا ہم سا غم میں بے صبر کتا کر اپنا غم سے مرہوگئی طبیعت [illegible]

پھر ایسے مکروہات میں گھرا کہ آج تک پھر وہاں جانا نہیں ہوا۔

فلک نے لکھنؤ کی خوب خاک اڑائی ہے۔ کیا لکھوں جو جو ایذا دکھائی ہے، نہ دن کو چین نہ رات کو آرام ہے۔ ہر دم جان کا دغدغہ ہے۔ زیست بلا نام ہے اگر یہاں کی خرابی تحریر کروں وہ جزو میں تمام نہ ہو۔ اگر زیست باقی ہے اور جیتے مل جائیںگے یہ کہانی زبانی سنائیں گے"

سفر مرزا صاحب لکھنؤ سے کانپور آئے اپنے بیٹے مرزا احمد علی کے پاس کچھ عرصہ رہ کر الہ آباد اور بنارس کے لئے روانہ ہوئے۔

"تم سے (مرزا احمد علی سے) جدا ہو کے ہوا سے تیز تر سرگرم سفر ہوئے ہر چند کہ پانچ جگہ راہ میں ریل ٹھہری کہیں پانی لیا کہیں مسافر چڑھا اس پہ جب الہ آباد کی سرا میں آیا دس بجے دو منٹ اوپر پانچ گھنٹہ میں طے الارض ہوا۔ اب صبح یکشنبہ تھا۔ گاڑی کا انتظار تا شام رہا مگر نہ آئی طبیعت سخت گھبرائی۔ القصہ صبح دوشنبہ تھا قریب دوپہر سب مد نظر ہوئے کچھ گاڑی بان کا تساہل کچھ سوار ہونے والوں کا تامل مگر بخیر ایک جا ہو گئے اب پھر وہی سہ شنبہ تھا۔ بنارس سے پل ٹوٹ گیا کشتی سے عبور گنگ ہوا وہاں سے دس کوس سعد آباد میں مقام ہوا کھانا کھا کے بیٹھے تھے دفعتاً ابر گھر آیا پھر تو خدا کی پناہ حشر کا سامان ہو گیا، بجلی ہر بار زمین کو چھو جاتی تھی کڑک کے شور سے آواز کسی کے کان تک نہ آتی تھی اس وقت کی الجھن اور خفقان کا عالم ہے نہ بیان کا یارا ہے خدا خدا کر کے نصف شب گذری [illegible]

[illegible]

راہی ہوئے مرزا مراد مرزا کا نام ہے وہاں پہونچے اور اس دن خبر گذری وہاں سے بعد جمعہ قریب دوپہر بنارس میں آگئے اور نگ آباد (بنارس) کی سرا میں رہے۔ مرزا مغلجان آئے حال سنا غضب کا سانحہ ہوا۔ مہاراج کے چھوٹے بھائی جو ولی عہد اور نائب تھے ہمارے آنے کے قبل راہی ملک عدم ہوئے، راجہ صاحب کو نہایت صدمۂ جانکاہ ہے۔ آج تک کسی سے بات ہے نہ ملاقات ہے۔ یہ سن کے بہت ملال ہوا صبح شنبہ تھا میر (ببر علی) انیس (لکھنوی) کی ملاقات کو گیا، دوپہر کو محمد حسن آئے سب حال مفصل بزبان لائے۔ قریب شام رخصت ہوئے سہ شنبہ سہ پہر کو محمد حسن رتھ سواری کو اونٹ باربرداری کو لائے سرائے لیچلے قریب شام دریا پر پہونچے قلعے کے نیچے گنگا جمنا دونوں کا عبور کیا۔ در دولت پر قیام ہوا۔

جس دن سے لکھنؤ آیا ہوں دو چار ملاقاتیں مہاراج سے ہوئیں وہ چپکا کے جنگل میں شکار کھیل رہے ہیں ....

یہ رئیس بہت غنیمت ہے اگر نان خشک اس سرکار میں میسر آئے، اور کے قلیہ سے اتحد ہوئے نہ کھائے .... جیتے رہے تو مہاراجہ کلکتہ ضرور جائیں گے بشرط زیست ہمارا بھی قصد مصمم ہے

(مگر) حادثہ یہ ہوا محرم کے مہینے میں خواص صاحب مرگئے داغ فرقت مہاراج کے دل پر دھر گئے۔ نہایت ملال ہوا عجب حال ہوا نہ دربار سے کام نہ ملک کا انتظام ہے، مرنے سے پہلے ایک مہینے صاحب فراش رہا اس میں پریشانی رہی جب مرگیا تو زیادہ انتشار ہوا کچھ دن موقوف دربار رہا کسی کی تنخواہ کا ٹھکانہ نہ تھا اسے پیچ حال میں ہر شخص دیوانہ تھا۔

۱۸ صفر پانچویں ستمبر چارشنبہ کو دربار ہوا (آمیں) پیادہ جاتا تھا۔ خفظ اللہ ساتھ قلعہ کے قریب دو گائیں دوڑی آئیں۔ ایک نکل گئی دوسری کی جھپٹ مجھکو لگی گر پڑا۔ کپڑے سنے ہو گئے چشمہ بستہ کل عبارت گیا۔

ایام ضعیفی

در حقیقت پریشانیوں کے باعث جو طبیعت ٹھہری تھی پھر بگڑ گئی۔ الجھن اور گھبراہٹ ہونے لگی، ایک تو غلہ کی گرانی، پندرہ سولہ آدمیوں کا خرچ دوسرے تہیدستی کی پریشانی، قرضخواہوں کا تقاضا یہ سب سامان خفقان کے ہیں، زیادہ تر فتور آنکھ کا ہے کہ غبار آجاتا ہے، اس وجہ سے جی بہت گھبراتا ہے۔ دیکھئے خدا کو کیا منظور ہے اب سب اعضائے جسم جواب دیتے جاتے ہیں کسی دن انکے نشیب فراز میں کوچ ہو جائے گا۔"

گردش تقدیر دیکھئے کہ پیہم صدمے ہوتے ہیں ادھر مرزا حسین بیگ صاحب کا رنج ہوا۔ جو اس میں ٹڑا فتور ہے نسیان کا دورہ ہے ابھی کچھ کہا بھول گیا۔

۱۷ ذالحجہ دوشنبہ کا دن گذر کے نصف شب باقی تھی، زیر ناف درد ہونے لگا یہ نوبت ہوئی کہ تڑپتے تڑپتے صبح پھر دن چڑھے گردہ کی باری آئی۔ تے کی تو آنکھ لگ گئی۔ تمام رات کا جاگا تھا یہاں تک سویا کہ پہر دن رہے آنکھ کھلی۔ بارے درد موقوف ہوگیا۔ بارہ پہر کے بعد غذا ہوئی۔ دوسری کیفیت یہ ہے۔ عرصہ سے پیشاب میں ریت آتی ہے۔ اسی کی وجہ سے طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ دیکھئے انجام اسکا پروردگار کیا کرتا ہے۔ ضعف کی یہ ترقی ہے۔ چار قدم چلنے میں دم چڑھتا ہے۔ دوسرے گاہ گاہ یہ تماشا ہوتا ہے۔ دم تحریر ہاتھ میں رعشہ ہوتا ہے، نظر کی یہ صورت ہے لکھنے میں دقت ہے جہاں سے قلم اٹھایا پھر وہاں نہ آیا ؎

کیسی خوشی کہاں کی ہنسی کیسا اختلاط
ہم کو نہ چھیڑ دو تم کہ دو اب ہم نہیں رہے

عارضوں نے گھیرا ہے، صحت نے منہ پھیرا ہے۔ آنکھ بہت چشم پوشی سے خیرگی کرتی ہے۔ نگاہ ہاتھ بھر پھر تیرگی کرتی ہے۔ ہر بار تقاضائے اجل ہے، ہوش و حواس میں خلل ہے۔ معاملہ در پیش ہوگیا، کوچ آج نہیں کل ہے۔ فلک کو غریب الوطنی میں یہ روز سیاہ

دکھاتا تھا۔ آنا بہانا تھا جاں کا کام تقدیر کے موافق ہوتا ہے اس میں گھٹانے بڑھانے یا نفع و نقصان کی کسی کو طاقت نہیں جو بندے پر گذرے راضی برضا ہے کہ تیر قضا کیواسطے سوائے صبر کے اور کوئی چیز نہیں لیکن جب انجام کا خیال آتا ہے۔ طبیعت کا اوبھنا دل کا دھڑکنا ہر بار بڑھ جاتا ہے اور غور کرو کہ یار نہ مددگار بجز ذات پروردگار ہم تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں آج ہیں کل اسی کا سامنا ہے" دنیا مقام گذران ہے جو ہے رواں دواں ہے۔ بقا بجز ذات خداوند قدیر دوسرے کو کہاں ہے۔

یہ خیال رہے کہ قضا کا وقت مقرر ہے وہ کبھی نہ ٹلے گا۔ رستم کا بس نہ چلے گا کہ خدا فرماتا ہے اِذَا جَاءَ اَجَلُھُمْ لَا یَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ۔ یعنی جو تمہاری اجل کا وقت معین ہے اُس میں ایک لحظہ نہ دیر ہوگی نہ جلدی ہوگی

(رقعہ ۷۹۔ ۲۳ محرم ۱۲۷۹ھ)

وفات افسوس ہے اس قابل قدر ہستی نے ۸۲ برس کی عمر میں ۱۲۸۴ھ ۱۸۶۷ء میں بمقام رام نگر بنارس میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور وہیں پرانے قبرستان میں دفن ہوئے۔ اب مزار کا نشان تک باقی نہیں ہے

نتائجِ فکر

ہزار صدمہ پہ دل نے ہمارے اُف بھی نہ کی
جو ایک رفیق ملا وہ بھی بے زبان ملا۔

شمع رو محفل میں کب دیں بار پروانے کو ہم
ایک کیڑے سے بھی کیا کچھ کم ہیں جلجانے کو ہم

مجھکو رونے کو نہ تم منع کرو ہم نفسو ۔ غم دل کرتا ہوں میں یہ تو ترے خال

حالت ہے کسی یا غم کی بیٹھ وغیرہ کی ۔ [illegible]

عشرت کدے جہاں میں جو سنکو دل دیا ۔ اک دل بچا تھا اسکو بھی تم نے گنوادیا
کیا دیکھتا ہے بیٹھے کہ پیرے تو لئے سرور ۔ اُٹھ اور یا دامن میں نہیں دوسرا دیا

تصانیف و ترجمہ

گلزارِ سرور ۱۸۵۸ء :۔ ایک روز حسب اتفاق نسخہ حدائق العشاق نظر سے گذرا اسکے ترجمہ کرنے کو (مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ کا) فقیر سے ارشاد ہوا، ہر چند عذر کیا، کہا کہ اب تحریر کا زمانہ نہیں۔ حواس مختل، ہوش کا ٹھکانا نہیں۔ نشۂ جوانی لطف زندگانی گھٹ گیا۔ جہاں کے قصے کہانی ہو گئے، دل ہٹ گیا۔ قبول نہ ہوا ناچار الامر فوق الادب سمجھ کے احکام بجا لایا۔ اطاعت سے سر نہ پھرایا۔ خزاں باریابی سے معذور ہے۔ نام اُس کا گلزار سرور ہے۔ گو مزے اور کیفیت سے یہ نثر عاری ہے فقط تحریر فرمانبرداری ہے۔[۱]

شبستانِ سرور ۱۲۷۹ھ ۱۸۶۲ء الف لیلہ نظم و نثر منشی نولکشور صاحب نے بہت روپیہ دیکے لکھوائی ہے؟ کچھ ہم سخن زبان بکا ہے اسکے چھپنے کی بھی نوبت آئی ہے۔[۲]

شرارِ عشق ۱۸۵۶ء ۔ بلقیس زبان شیریں بیان نواب سکندر بیگم صاحبہ دام دولتہا (والیہ بھوپال) کی فرمائش سے اسکا "شرار عشق" نام ہے منصفو کو انصاف کرنا ضرور ہے غلطی اگر ہوگئی ہو معاف کرنا ضرور ہے[۳]

انشاء سرور ۱۸۹۲ء سرور کے خطوط کا مجموعہ مرتبہ مرزا احمد علی کانپوری۔[۴]

رقعاتِ سرور ۱۹۶۱ء چند غیر مطبوعہ رقعات سرور کا مجموعہ مرتبہ انتظام اللہ شہابی۔[۵]

سرور سلطانی ۱۸۵۵ء شمشیر خانی کو اردو میں لکھ کے سرور سلطانی نام رکھا ہے یہ کتاب بہت صاف اردو میں لکھی ہے۔[۶]

فسانۂ عجائب جس کا ذکر آچکا ہے۔[۷]

دیوانِ سرور۔ قلمی و مطبوعہ بہر دو ام [illegible] کے کتب خانہ سرکار میں موجود ہیں۔ خود راقم السطور نے منشی [illegible] میں [illegible]

شرح تاریخ [illegible]

انتظام اللہ شہابی

[illegible] شرح [illegible] انتظار [illegible] بہادر [illegible] راقم السطور کے کتب خانہ [illegible]

سپاہی کا مکتوب — شریکِ زندگی کے نام

السلام اے راحتِ دل، مونسِ جاں السلام
رازدارِ زندگی، عصمت بداماں السلام

خط تمہارا مل گیا جس کا تھا مجھ کو انتظار
اور میں جس کے لئے رہتا تھا ہر دم بیقرار

میں تو سمجھا تھا بہم راحت کا ساماں ہو گیا
خط مگر پڑھتے ہی میرا دل پریشاں ہو گیا

یاد کیوں تم نے دلایا وہ زمانہ عیش کا
جس میں چھیڑا تھا کبھی ہم نے ترانہ عیش کا

کہہ کے اپنا حالِ فرقت تم نے یہ کیا کر دیا
اور احساسِ جدائی کو دوبالا کر دیا

میں نے یہ مانا کہ تم میرے لئے ہو بیقرار
میں نے یہ مانا کہ چشمِ منتظر ہے اشکبار

میں نے یہ مانا کہ تم بے چین ہو بیخواب ہو
میں نے یہ مانا کہ تم میرے لئے بیتاب ہو

میں نے یہ مانا تمہیں دل کا سکوں حاصل نہیں
اُس سمندر میں ہو جس میں دُور تک ساحل نہیں

تم کو لیکن منظرِ خونیں دکھاؤں کس طرح
فرض مجھ پر کیا ہے یہ تم کو بتاؤں کس طرح

کس طرح کہہ دوں تمہارے پاس آسکتا نہیں
میں تمہاری عیش کی محفل سجا سکتا نہیں

جنگ کی حالت میں بھی اے راحتِ جانِ حزیں
عیشِ رفتہ کی قسم اب تک تمہیں بھولا نہیں

جنگ میں اچھے نہیں لگتے مگر راحت کے گیت
مرد ایسے وقت گا سکتے نہیں عشرت کے گیت

شوق لافانی تمہارا عشق میرا لازوال
دل میں لیکن کیا کبھی گذرا تمہارے یہ خیال؟

اے انیسِ دردِ الفت تو نے سوچا بھی کبھی
کیا حقیقی عشق ہے، کیا ہے حقیقی زندگی؟

فطرتِ معصوم! کیا اتنا تجھے معلوم ہے
کیا ہے فرضِ زندگی، کیا عشق کا مفہوم ہے؟

زندگی دراصل وہ ہے جو وطن کے کام آئے
زندگی وہ ہے نہ جس پر شرم کا الزام آئے

عشق و الفت نام ہے ایمان کا ایثار کا
دل میں رہ رہ کر مچلنا جذبۂ بیدار کا

میری قسمت کچھ بھی ہو فطرت غلامانہ نہیں
میری زلفِ زندگی منت کشِ شانہ نہیں

اُنکا ماتم کیا؟ جو مرتے ہیں وطن کے نام پر
مجھکو آتی ہے ہنسی ایسے خیالِ خام پر

جو وطن کا، تیغ کے سایہ میں بھی گائیگا راگ
عمر بھر قائم رہے گا اسکی بیوہ کا سہاگ

جس طرف جائیگا اُس کا باپ ہوگا سرخرو
اُسکے بیٹے پائیں گے اپنے وطن میں آبرو

تیغ سے روکے گا جب وہ ظلم و جور و کشت و خوں
امن ہوگا ہر طرف ہر سمت پھیلے گا سکوں

جنگ سے لوٹے گا جب مردِ مجاہد کامیاب
وقفِ عشرت ہوگا آزادی کی دیوی کا شباب

محفلوں میں قوم کی پہونچے گا جب شاہانہ وار
باعقیدت لوگ پہنائیں گے تاجِ زرنگار

جب کہیں گے لوگ تجھ کو کامیاب و فتحمند
افتخارِ خاص سے ہوگا تمہارا سر بلند

میں تمہارے پاس ہنستا، مسکراتا آؤنگا
سازِ آزادی پہ رنگیں گیت گاتا آؤنگا

جو تمہارا گھر ہے، میرے دل کی محفل ہے وہی
میں یہاں ہوں اک مسافر، میری منزل ہے وہی

اقبال ماہر الہ آبادی

افسانہ

بیرسٹر نے تیوری بدل کر اس کی طرف دیکھا اور کہا:۔

"مجھے عقل سکھاتا ہے، نمک حرام، کام چور تیرا لڑکا مرے یا زندہ رہے میں تجھے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دونگا"

بھیکو نے گڑگڑا کر کہا ——— "سرکار ... ؟"

"خاموش چلا جا یہاں سے ورنہ اچھا نہ ہوگا!"

بھیکو باوجود کوشش آنسوؤں کا سیلاب نہ روک سکا اور اپنی بوسیدہ دھوتی سے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے بولا۔

"مالک ——— پرماتما کسی پر ایسی مصیبت نہ ڈالے اگر ہریا کی حالت نازک نہ ہوتی تو میں گھر ——— آپ میرے مالک ہیں میری حالت پر رحم کیجئے!"

بیرسٹر کے غصے کا ٹمپریچر بڑھتا جا رہا تھا۔

"جھوٹ بولتا ہے، نادری کو پیسے نہ ملنے بہانے تراشتا ہے!"

بھیکو کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"سرکار ——— ! گنگا مائی کی قسم جو میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ چل کر سرکار خود دیکھ لیجئے۔

میرے ہریا کی حالت کس قدر نازک ہے! ایشور دیا کرے۔

یہ کہتے ہوئے بھیکو بیرسٹر صاحب کے قدموں پر گر پڑا۔

بیرسٹر نے ٹھوکر ہی سے اسکا سر پیروں پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

تیری حرکتیں جانتا ہوں گھر میں بھی کوئی ڈھونگ رچا کر آیا ہوگا۔ جا.... چلا جا........!! میرے سامنے سے ورنہ........ ...

بھیکو اپنا سر دونوں ہاتھوں سے سنبھالتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا۔ منت سماجت بیکار۔ عرض و معروض فضول۔ رونے گڑگڑانے میں کوئی اثر نہیں اپنی امیدوں سے مایوس ہو کر ایک بار پھر سنبھل کر بولا۔

مالک ——— ! میں بھیک نہیں مانگتا۔ اپنی اجرت مانگتا ہوں۔ مجھے اب آپ کی نوکری نہیں کرنی۔ میرا حساب کر دیجئے۔

بیرسٹر نے ایک مخصوص انداز میں جواب دیا ——— "حساب ......؟"

"ہاں حضور حساب! پیسہ، دھیلا، چھدام، جو کچھ میری قسمت کا آپ کے حساب سے نکلے وہ دیدیجئے۔ بہت دن بھگتا حضور ——— اب بھگتنے کی طاقت نہیں"

بیرسٹر اُٹھ کر کھڑا ہوا، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا بھیکو کے قریب آیا۔

بھیکو نے اس کی طرف نگاہیں اُٹھا کر دیکھا مگر تاب نہ لا سکا اور ڈر کر پیچھے ہٹ گیا بیرسٹر نے اُس کی گردن پکڑ کر جھٹکا دیا جس کے ساتھ ہی بھیکو سامنے کی کرسی سے ٹکراتا ہوا گر پڑا۔ بیرسٹر نے قریب آکر جوتے کی ٹھوکریں مارتے ہوئے کہا

"لے ..... ! یہ تیرا حساب ہے"

———•(۲)•———

اسی رات کو ———

اپنی زندگی کے سرمائے کو سپرد زمین کر کے بھیکو لوٹ آیا تھا اور ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا اپنی غریبی پر آنسو بہا رہا تھا۔ گھر میں خاموشی اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ چراغ اس لئے روشن نہ ہوا تھا کہ اس گھر کا جیتا جاگتا چراغ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو چکا۔ بھیکو ٹھنڈی سانسیں لے لیکر مفلسی اور سرمایہ داری کا ماتم کر رہا تھا، اور اپنے خیالات میں اس قدر محو تھا کہ اس کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ پیشانی پر بار بار ہاتھ پھیرنے سے زخم کی پٹی ہٹ گئی ہے۔ یکایک نہ معلوم کس نتیجہ پر پہنچ کر وہ ہنس دیا۔ اُسکی بیوی اس بے موقع ہنسی کے معنی نہ سمجھ سکی۔ آہستہ آہستہ اُس کے قریب آکر بولی

——— "کیسی طبیعت ہے؟"

"........ ..." کچھ دیر جواب کا انتظار کر کے۔

"لیٹ رہو! تمہاری طبیعت اچھی نہیں ہے!"

بھیکو پھر ہنسا اور ایک قہقہے کے ساتھ رات کے سناٹے میں ٹوٹے پھوٹے گھر میں اس کی آواز گونج گئی۔ جس کو سُن کر وہ بار بار کہنے لگا [illegible]

سسکنے کو اس کی بیوی نے زیادہ دیر قائم نہ رہنے دیا اور سہارا دیکر بستر پر لٹا دیا۔ ماتھے پر ہاتھ پھیرا تو بہت تیز بخار تھا۔ ایک کثیف اور بوسیدہ سی چادر لاکر اس پر ڈالدی اور خود ایک کونے میں جاکر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد بھیکو نے کروٹ بدلی اور پکارا ——— "سنتی ہو؟"

"آنچل سے آنسو صاف کرتی ہوئی ہریا کی ماں اس کے پاس آبیٹھی۔

بھیکو نے کہا ——— "ہریا کی ماں! میں سوچتا ہوں...... میں یہ سوچتا ہوں۔ . میں یہ ...."

"——— کیا سوچتے ہو؟"

لیکن کوئی جواب نہ پاکر اس نے بھیکو کا جسم اندھیرے میں ٹٹولا اور پھر پوچھا،

"کہونا! کیا کہہ رہے تھے؟"

"——— کچھ نہیں"

"کچھ تو- کیا سوچتے ہو؟"

مگر بھیکو خاموش رہا

رات کا خاموش سناٹا اور بھیانک تاریکی ہریا کی ماں کو کھائے جارہی تھی۔ اس نے بھیکو کی پیشانی پر ایک بار پھر ہاتھ پھیرا۔ جس کے ساتھ ہی بھیکو نے کروٹ بدلی اور پانی مانگا۔ پانی پینے کے بعد جب اسے کچھ سکون حاصل ہوا تو بولا

"ہریا کی ماں اب ہم کیا کرینگے؟"

بیوی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مگر اپنے دل پر قابو پانیکی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"کیوں ———! جیسے پرماتما رکھے گا دیکھ لینگے ہی سے تم اچھے ہو جاؤ پرماتما اپنے دن بھی کبھی ....

"سچ کہتی ہو ———؟

"ہاں ——— ہاں ———! پرماتما کا بھروسا تو ہے ہی۔ وہی سب کا رکھوالا ہے"

"ٹھیک کہتی ہو .... اس نے ہریا کی رکھوالی تو نہیں کی ... ہم کو چھوڑ کر چلا گیا۔ کیا وہ اب کبھی نہیں آئیگا؟ بولو نا؟"

ماں کا دل دھڑکنے لگا۔ ایک آگ سی سلگتی ہوئی معلوم ہوئی۔ مگر عورت کا فرض اور بیوی کا دل خاموش نہ رہ سکا۔

"وہ ہمارا نہیں تھا، جہاں سے آیا تھا وہیں چلا گیا۔ جس نے دیا تھا اسی نے لے لیا۔ تم ایسی باتیں نہ کرو- ایشور بڑا دیالو ہے"

"اچھا ایک بات بتاؤ گی؟"

"ہاں ——— پوچھو"

"مجھ سے کہتی ہو غم نہ کرو لیکن ...... لیکن تم خود روتی ہو اور بہت روتی ہو ہریا کی ماں میں سب جانتا ہوں...... ایسا کیوں ہے ...؟"

" ... ."

"بولو نا؟"

"کیا بولوں؟"

"جواب دو میری بات کا؟"

"میں نہیں روتی تم روتے ہو"

"ہریا کی ماں تم نہیں روتیں؟ جھوٹ بولتی ہو"

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک نہیں ہے ——— تمہیں تو نجانے کیا ہوگیا ہے۔ کچھ دیر خاموشی سے لیٹ جاؤ تو کچھ طبیعت ہی ٹھیک ہو جائے"

اور ساتھ ہی ہریا کی ماں اٹھ کر جانے لگی تو بھیکو نے کہا ——— "اچھا کچھ نہیں کہتا تم بیٹھو تو ——— مجھے چھوڑ کر جاؤ گی تو نہیں؟"

"تمہیں ہو کیا گیا ہے تمہارے نزدیک ہی تو بیٹھی ہوں کہاں جا رہی ہوں"

"میں نے یوں ہی کہا تھا ——— کہ ——— تم مجھے چھوڑ کر چلی نہ جاؤ"

"تمہیں چھوڑ کر"

"ہاں مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں تم بھی مجھے چھوڑ کر نہ چل دو۔ جیسے وہ چلا گیا ——— مجھے چھوڑ کر" کہتے کہتے بھیکو نے بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہریا کی ماں آنسوؤں کے سیلاب کو ضبط نہ کر سکی تو بھیکو پر گر کر رونے لگی۔ جب کچھ دل ہلکا ہوگیا تو بولی۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں نہ جاؤنگی ——— کبھی نہ جاؤنگی ——— تمہیں تنہا

چھوڑ کر کبھی نہ جاؤں گی"

ایک اطمینان کا سانس لیتے ہوئے بھیکو نے آہستہ سے کہا ——"اچھا"

—— (۳) ——

لیکن اس رات کا وعدہ ہریا کی ماں یاد نہ رکھ سکی اور دو مہینے بعد ہی بھیکو کو اس دنیا میں رنج و غم اٹھانے کے لئے تنہا چھوڑ کر چل بسی۔ اپنی مرضی کے مطابق یا خلاف یہ شاید کوئی بھی نہیں جانتا مگر بھیکو اتنا ضرور جانتا تھا کہ اس کی بیوی نے ایک دن اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کو چھوڑ کر کہیں نہ جائیگی۔ اور وہ اسی وعدہ پر بھروسہ کئے بیٹھا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اسکا اندیشہ اتنی جلد پورا ہو کر رہیگا۔ دنیا ایک دھوکے کی ٹٹی ہے۔ دنیا میں کسی کا بھروسہ ایک خیال خام ہے۔

زندگی کے وسیع میدان میں غم ہی کو قدم قدم پر جھیلتا ہوا بھیکو ایک نئے راستہ پر چل نکلا۔ اب وہ دن بھر بازار میں آوارہ پھرتا ہوا نظر آتا اور رات کو شراب خانہ میں ملتا جسم پر کپڑا نہ تھا۔ روح کو سکون نہ تھا پیٹ میں غذا نہ تھی اور دنیا کی نظروں میں وہ اب ایک چور، بدمعاش اور شرابی تھا۔

دن گذرے مہینے گذرے یہاں تک کہ سال ختم ہونے کو آیا مگر بھیکو کو نہ سنبھلنا تھا نہ سنبھلا وہ اپنی زندگی کی رو میں برابر بہا چلا جا رہا تھا۔ ایک دن جبکہ وہ ہاتھ میں چنے لئے ہوئے بیرسٹر کی کوٹھی کے سامنے سے گذر رہا تھا کسی نے اسے پکارا۔

بھیکو نے گھوم کر دیکھا بیرسٹر کا اردلی مادھو گاڑی میں چھوٹے بچے کو بٹھائے ڈھکیلتا ہوا ٹہلانے لیجا رہا تھا۔

بھیکو ٹھہر گیا۔ مادھو نے قریب آکر کہا۔

"بھیکو تم اب دکھلائی بھی نہیں دیتے۔ نوکری چھوڑی تو چھوڑی کیا ہم لوگوں کو بھی چھوڑ دیا؟"

بھیکو نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے بچے کی طرف نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں بھیا۔ لیکن کس منہ سے ملوں۔ پرماتما نے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا ہریا گیا۔ گھر والی گئی۔ اب کیا ہے"

سنا تھا میں نے بڑا افسوس ہوا تم پر تو گویا مصیبت کا پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا۔ مگر کیا چارہ۔ اس کی مرضی۔ صبر کرو اور کبھی کبھی ملتے رہا کرو۔

"ہاں —— جا کہاں رہے ہو؟"

"کمپنی باغ تک لالہ جی کو سیر کرانے"

"لال جی تو مجھے پہچانتے بھی نہیں۔ سال بھر کے بھی کہاں تھے جب میں نے نوکری چھوڑی تھی۔ اچھا چلو ادھر ہی میں جا رہا ہوں"

راستے بھر باتیں ہوتی گئیں۔ مادھو اپنی گھر گرہستی کا حال سناتا رہا اور بھیکو لال جی کے منہ میں ایک ایک چنا ڈالتا جا رہا تھا۔ کمپنی باغ پہنچکر بھیکو نے بچے کو گود میں لے لیا اور سبز گھاس پر بیٹھ کر کھلانے لگا۔

مادھو نے کہا —— بھیکو بھیا بیڑی ہو تو پلاؤ؟"

"نہیں بھیا ہے تو نہیں لیکن اگر پینا ہے تو سڑک پر سے لپک کر لے لو"

اور ساتھ ہی دھوتی میں سے گھرسا ہوا پیسہ نکال کر دیا اور جب مادھو بیڑی لینے چلا گیا تو بھیکو پھر بچے کو کھلانے لگا بچے کے ہاتھ میں تین چار چنے دیکر بھیکو نے اپنا منہ کھول کر کہا۔

"لال جی بھیا مجھے بھی کھلاؤ"

بچے نے سب چنے اپنے منہ میں رکھکر سر ہلاتے ہوئے کہا ——

"اوں ہوں"

جسکے ساتھ ہی بھیکو کو کچھ اور یاد آیا اور بچے کی ایک "اوں ہوں" اس سے برداشت نہ ہو سکی —— وہ سوچنے لگا "آخر ہے تو بیرسٹر ہی کا فرزند۔ کیطرح نہ ہو میرا ہی مال اور مجھی سے "اوں ہوں" اب بھیکو کے سامنے سال بھر کے واقعات رقص کر رہے تھے۔ "اس نے بیرسٹر سے تنخواہ مانگی اور بیرسٹر نے ٹھوکریں دیں ہریا بستر مرگ پر ہے اور اس کے پاس علاج معالجہ کے لئے پیسہ تک نہیں، آخر وہ چل بسا اور اس کے بعد ہی اسکی ماں بھی"

بھیکو کے دل میں ایک آگ سی سلگ اٹھی ابھی تک وہ بچے کو نہایت پیار محبت سے کھلا رہا تھا مگر اب اسکی ایک "اوں ہوں" سے اسکی آنکھوں میں خون اتر آیا وہ یکایک کھڑا ہو گیا اور بچے کو گود میں لیکر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ باغ کے پچھلے دروازے سے نکل کر چھوٹے بڑے راستوں سے گذرتا ہوا جمنا پر جا پہنچا پل پر اسوقت کوئی نہ تھا ہر طرف خموشی ہی خاموشی مسلط تھی۔ بچے کو سینے سے لگائے ہوئے جب وہ پل کے درمیان پہنچا تو ایک کنارے پر رک گیا ...

ٹہلا دیا اور چھوٹنے سے قبل ایک آخری نگاہ بچے پر ڈالی —— بچہ نہایت معصومیت کے ساتھ مسکرا رہا تھا اُس کی دونوں آنکھیں چمک رہی تھیں جن سے پورا اطمینان چھلک رہا تھا۔ بھیکو اسکی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا —— اُس کا دل کانپنے لگا۔ بچے کو بیتاب ہو کر سینے سے لگا کر ایک بار پھر پیار کیا اور کندھے پر پڑی ہوئی دھوتی سے اُسے چھپاتا ہوا ایک طرف بھاگ نکلا۔

اور اُس دن کے بعد پھر کسی نے اُس کو اُس شہر میں نہ دیکھا۔

——— (((۴))) ———

وقت گذرتے دیر نہیں لگتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے اٹھارہ سال گذر گئے آگرہ کے صدر بازار میں ایک گلی کے موڑ پر پوری کچوری کی دوکان ہے جسکا مالک موتی نامی ایک بوڑھا ہے۔ موتی کا ایک جوان لڑکا بھی ہے جس کو سب بھیروں کہتے ہیں۔

بھیروں توانا تندرست اور کسرتی جوان ہے۔ دونوں باپ بیٹے اسی دوکان کے اندر ایک کوٹھری میں رہتے تھے۔ برسات کے موسم میں اسی دوکان پر بیٹھ کر بھیروں کو آلہ گاتے اکثر لوگوں نے سنا ہے میلے تماشوں پر کشتی بھی لڑتے اکثر و بیشتر اُسے دیکھا گیا ہے۔ لڑائی جھگڑے میں کمزوروں کی مدد کرنے میں کبھی اُسکی لاٹھی نہیں رُکی۔ بازار بھر اُسکا دوست ہے اور اُسکو عزیز رکھتا ہے۔

ایک رات کو ———

بارش ہو چکی تھی دوکان بڑھا کر موتی کمرے میں آ لیٹا تھا، پیچھے کے دروازے پر کچھ کھٹکا پا کر اُس نے پوچھا ——— "کون ؟"

"میں ہوں بابو"

"آواز پہچان کر موتی نے اٹھکر دروازہ کھول دیا۔ بھیروں اندر داخل ہوا، لاٹھی کونے میں رکھکر کرتا اتارا اور نچوڑنے لگا۔

"بھیگ گئے کیا؟" موتی نے پوچھا

"ہاں! راستے ہی میں پانی برسنے لگا تھا بابو؟"

موتی کو کھانسی اٹھی۔ بھیروں بولا

"بابو معلوم ہوتا ہے دوا نہیں کھائی ؟"

"بیٹا کی باتیں۔ بڑھاپے کی بیماری کیا دوا سے اچھی ہوتی ہے ؟"

"بابو تم میرا کہا نہیں مانتے، دوا لا کر رکھدی تھی تم سے اتنا بھی نہ ہوا کہ کھا لیتے"

"بیٹا! میری بیماری اب لاعلاج ہے۔ دوا کھانے یا نہ کھانے سے کیا ہوتا ہے" موتی نے کھانستے ہوئے کہا۔

بھیروں موتی کا مایوس کُن جواب سُن کر غمگین ہو گیا۔

"بابو کل سے تم دوکان پر نہ بیٹھنا۔ ایک تو کھانسی اور پھر بھٹی کا دھواں اب میں تم کو نہ بیٹھنے دونگا۔ دوکان چلے یا نہ چلے۔

یہ کہتے کہتے اُسکا دل بھر آیا سامنے ہی موتی بیٹھا ——— کبیروں کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ بھیروں کو آج پہلی بار اُس نے روتے ہوئے دیکھا تھا۔ موتی کا رُواں رُواں کانپنے لگا۔ بھیروں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا

"روتا کیوں ہے ؟"

بھیروں اور زیادہ رونے لگا۔

"بابو! آنکھ میں انگلی چھو کر پوچھتے ہو آنسو کیوں آئے۔ تمہاری باتیں اب نجانے کیسی ہو گئی ہیں تم ہر وقت نہ معلوم کیا سوچتے رہتے ہو۔ ایسا کیوں ہے بابو؟"

"موتی سوائے ایک ٹھنڈی سانس لینے کے اور کوئی جواب نہ دے سکا ایک بار پھر کھانسی اٹھی اور جب کچھ دیر میں سانس قائم ہو گئی تو بولا۔

"بیٹا! بھیروں"

"کیا ہے بابو"؟

"بھیروں آج دل چاہتا ہے کہ تمہیں ایک کہانی سناؤں ——— سُنو گے"؟

"ہاں! ——— کہو"

"پہلے لیٹ رہو آرام سے تب سناؤنگا"

——— (۵) ———

وہ کہانی کیا تھی ———

موتی کی آڑ میں چھپے ہوئے بھیکو کی زندگی کے واقعات تھے۔

پھر پیرسٹر کے لڑکے کو بھیکو نے اٹھارہ سال پرورش کیا۔ [illegible]

اپنے لڑکے کی طرح اپنے کھوٹے ہوئے ہریا کی طرح؟"

یہانتک پہونچکر موتی کا گلا بھر آیا اور وہ اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

کچھ دیر بھیروں نے انتظار کرنے کے بعد کہا ——— "بابو! پھر کیا ہوا؟"

"اب سو جاؤ بیٹا ——— باقی کل!"

بھیروں خاموش ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا اور یکایک کسی نتیجہ پر پہنچ کر بولا

وعدہ کیا تھا کہ وہ ہیرسٹر کی طرح خود غرض اور بے رحم انسان دنیا میں بہت سے

ہوتے تھا۔ وہ یہ نہیں

[illegible] ٹھیک کہتی ہے۔ ڈِیبسے آدمیوں کے دل نہیں ہوتا!"

[illegible] زندگی کے دل طرح بھی؟"

[illegible] نہیں ——— ہر غریب کو زندگی میں اس طرح کے سیکڑوں

نیتیں آتے ہیں۔"

دکو چاہتے تھا کہ ہیرسٹر کے لڑکے کا گلا گھونٹ کر مار ڈالتا یا

جمنا ہی میں چھوڑ دیتا۔ ایسے بدمعاش سے بدلا لینے کا یہی ایک مناسب طریقہ تھا

بھیکو نے غلطی کی۔ کیوں نہ بابو؟"

"نہیں بیٹا ——— بھیکو نے ٹھیک کیا باپ کا بدلا بیٹے سے لینا انسانیت

کے خلاف ہوتا۔"

"مگر ہیرسٹر نے بھی تو بھیکو کے لڑکے کو مار ڈالا تھا کیا یہ انسانیت تھی اگر وہ

بھیکو کو اسکی تنخواہ دیدیتا تو بھیکو کا لڑکا کیوں مرتا؟"

بھیروں کی رائے سن کر موتی ایک بناوٹی ہنسی ہنستے ہوئے بولا

"بھیروں تم ٹھیک کہتے ہو اگر وہ اسکا حساب کر دیتا تو یقیناً اسکا ہریا

نہ مرتا۔"

"اور بیٹے کے غم میں گھل گھل کر مرنے والی اسکی ماں بھی۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ ماں بھی نہ مرتی۔"

"اچھا بابو! آخر بھیکو نے ہیرسٹر سے بدلا لیا یا نہیں؟"

موتی خاموش رہا اور جواب دئے بغیر ہی سو گیا۔

——— (۶) ———

ایک دن ———

دوپہر کے وقت پشاوری پٹھانوں کا ایک گروہ آگرے کے بازاروں

میں گھوم رہا تھا۔ دکان داروں سے سختی کا برتاؤ لوٹ کھسوٹ انکا دلچسپ

شغل تھا۔ گھومتے پھرتے چار پانچ پٹھان موتی کی دوکان پر بھی آ نکلے اور

سامنے والی بینچ پر بیٹھ کر پوڑی وغیرہ مانگیں۔ موتی نے اُن کے حکم کی تعمیل کی

اور جو چیزیں دکان میں موجود تھیں حاضر کردیں اور ساتھ ہی آبخوروں میں

پانی بھی۔

ایک پٹھان نے جیب سے چمڑے کا بٹوا نکالتے ہوئے کہا ——— "کتنا پیسہ ہوا؟"

"موتی نے حساب لگا کر بتلایا ——— ساڑھے بارہ آنے۔"

ارے بابا ساڑھے بارہ آنہ۔ تم لوٹتا ہے ہم کو، لوٹتا ہے۔"

پٹھان نے تیور پر بل ڈال کر کہا اور بٹوا اپنی جیب میں واپس رکھتے

ہوئے کہنے لگا:—

"ہم چار آنہ پیسہ دیگا۔ خوشی ہو تیرا تو لے۔ نہیں تو سلام"

غریب موتی اُنکی اس بے انصافی پر بیتاب ہو گیا اور کھڑا ہو کر بولا۔

"خوب سرکار کھا پی کر بغیر دام دئے ہی چلے جاؤ گے کیا؟"

اور ساتھ ہی کہتے کہتے باہر نکل آیا۔

پٹھان نے جواب میں گالی دی۔

موتی بولا ——— "سرکار زبان سنبھال کر بولئے۔"

پٹھان نے موتی کا گریبان پکڑ کر کھینچ لیا، موتی بھی لپٹ پڑا۔

دونوں اُلجھ کر گرے۔ موتی کو الجھا دیکھ کر پٹھان کے دوسرے ہمراہیوں نے

موتی پر لکڑیوں کے وار کئے۔ بہت سے تماشبین بھی جمع ہو گئے مگر کسی میں اتنی

ہمت و جرأت نہ تھی کہ پٹھانوں کی چوری اور سینہ زوری دیکھتے ہوئے بھی

اُن کے خلاف کوئی آواز بلند کرے۔ اس طرف موتی تنہا تھا اور وہ چار

پانچ تھے جو ہونا چاہئے تھا وہی ہوا۔ موتی زخمی ہو کر بیہوش ہو گیا اور پٹھان

ہنستے ہوئے ایک طرف چلدیے۔ مگر وہ ابھی کچھ دور بھی نہ پہنچے تھے کہ بھیروں

جو کہیں گیا ہوا تھا آ گیا۔ باپ کی یہ حالت دیکھی اور لوگوں سے واقعہ سنا تو

بوڑھے باپ کی بے بسی دیکھ کر بیتاب ہو گیا اور [illegible] پٹھان [illegible] کے

پیچھے لپکا۔ کسی نے آواز دی "بھیروں [illegible] [illegible]"

بس نے چودھری کو مارا ہے" اشارہ کافی تھا بھیروں لے بڑھ کر جلوا سی پر کیا اور وہ
بن پر آرہا۔ دوسرے ہمراہیوں نے اپنی اپنی لاٹھیاں سنبھالیں اور ایک ساتھ بھیروں
پر حملہ آور ہوئے مگر وہ بھی کچھ کم نہ تھا۔ ابھی کل دو کو زخمی کیا تھا کہ چار اور آپہنچے
اور اس طرح آہستہ آہستہ ۱۵۔ ۲۰ تک تعداد پہنچ گئی۔ اب بھیروں نے ٹھہرنا مناسب نہ
سمجھا اور لاٹھی گھماتا ہوا ایک طرف نکل کر بھاگ گیا۔

پولس بھی آپہنچی اور تحقیقات شروع ہوئی ہرے صافے والا مر چکا تھا
پولس نے بھیروں کی تلاش شروع کی اور رات تک گرفتار کر لیا۔

تمام بازار میں بھیروں کی بہادری کے چرچے ہو رہے تھے اور موتی اسپتال
میں پٹی بندھوا رہا تھا مگر اسے اپنی تکلیف کا کوئی احساس نہ تھا اُس کا دل
بیتاب تھا۔ فکر تھی۔ غم تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے مگر اپنی تکلیف کے لئے نہیں بھیروں
کے لئے اُس کا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔

—— (۷) ——

سیشن جج میں مقدمہ کی پہلی پیشی تھی، پبلک کو اس معاملہ سے
چونکہ خاص دلچسپی تھی اس لئے کمرہ عدالت لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ جن کے ساتھ ہی
موتی بھی ایک گوشے میں سمٹا ہوا کھڑا تھا، اُس نے اپنا تمام سرمایہ صرف کر کے
تین چار مشہور وکیل پیروی کے لئے مقرر کئے تھے۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے
جج صاحب کمرہ عدالت میں تشریف لائے۔

موتی کی جوں ہی اُن پر نظر پڑی اُس کے منہ سے بیساختہ یہ الفاظ نکلے
"ہیں بیرسٹر صاحب؟!!" —— اُس نے اپنے پرانے مالک کو
پہچانا، اور نیچا سر کر کے خاموش ہو گیا اور سوچنے لگا:۔

"اب وہ بھیکو کمار تھا۔ بیرسٹر کا نوکر۔ اُس کے سامنے پردۂ سینما پر
متحرک ہونے والی تصاویر کی مانند ماضی کے تمام واقعات رقص کر رہے تھے، اور
یہ طلسم اسوقت ٹوٹا جب ملزم کٹہرے میں لایا گیا۔

موتی نے ایک نظر بھیروں اور جج صاحب کی طرف دیکھا اسکا دل اسوقت
اس کے قابو سے باہر تھا اور کہہ رہا تھا

"وہ دشمن کا لڑکا ہے...... پھر اُسے بچانے کے لئے اُس نے اپنی
ساری کمائی کیوں صرف کر ڈالی...... برسوں کی کمائی......
دشمن کا لڑکا بھی تو دشمن ہی ہے...... اس نے خون کیا...... اور خون
کی سزا...... پھانسی ہے...... ہونے دو...... باپ کے بجائے
اسے...... بدلا...... بدلا...... ہریا کا بدلہ......
"بھیروں کو پھانسی!"

عدالت کی کارروائی شروع ہوئی اور چند گواہوں کے بیانات کے بعد
ختم بھی ہو گئی مگر موتی کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہوا وہ برابر اپنے خیالات میں بہا چلا
جا رہا تھا۔ صرف دوران مقدمہ میں کبھی کبھی نظر اُٹھا کر دونوں کو دیکھ لیتا تھا اور
بس۔ ان خیالات کا سلسلہ اسوقت ٹوٹا جب ہمسایوں نے آکر کہا کہ چار دن بعد
کی تاریخ مقرر ہوئی ہے—چودھری گھبرانا نہیں بھیروں کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ مگر
وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا اور اُس کی سماعت ان باتوں کے لئے بے بہری
ہو چکی تھی——

—— (۸) ——

پیشی کی مقررہ تاریخ آنے کے ایک دن قبل ہی موتی نے اپنے سب وکیلوں
سے کہدیا کہ کوئی عدالت میں نہ جائے۔ کیونکہ وہ کسی مزید صرفے کو برداشت
کرنے سے قاصر ہے۔ وکیلوں کا کام تو روپیہ لینا ہے۔ مردہ دوزخ میں جائے
یا جنت میں وہ کیوں جانے اور موتی بھی نہ گیا۔ بھیروں کی نگاہیں جب تک
پیشی ہوتی رہی برابر موتی کو تلاش کرتی رہیں مگر وہ نظر آنا تھا نہ آیا۔

تیسری پیشی ایک ہفتہ بعد مقرر ہوئی مگر اس پر بھی موتی غیر حاضر تھا اور
نہ کوئی وکیل ہی ملزم کی طرف سے پیروی کر رہا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مقدمہ قطعی
بھیروں کے خلاف جا رہا تھا۔ اُس پر دو جرائم کا الزام تھا" قتل اور بلوہ" آہستہ
آہستہ مقدمہ کی تمام کارروائی ختم ہو گئی اور فیصلہ سنائے جانے کی تاریخ مقرر
ہوئی مگر موتی کے درشن اُس دن کے بعد پھر بھیروں کو نہ ہوئے۔ بھیروں مضطرب
تھا۔ اس لئے کہ اس سوال کا جواب نہ تو خود اسکی سمجھ میں آتا تھا اور نہ کوئی
دوسرا ہی دیتا تھا" کہ بابو کیوں نہیں آئے؟"

—— (۹) ——

"چودھری! تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ کل فیصلہ سنایا جائیگا اور تم آرام
سے لیٹے ہوئے ہو۔

آدھر جوان بیٹے کی جان پر بنی ہے مگر تم ہو کہ کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہو۔"

آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

موتی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"لالہ جی! رام کرے سب ہونے۔ میں بوڑھا آدمی کیا کروں اور کیا نہ کروں جو کچھ کمایا تھا وہ پہلی پیشی ہی میں وکیلوں کی نذر ہو گیا۔"

"پھر بھی چودھری! وہ تمہارا لڑکا ہے۔ کم سے کم عدالت تو جاتے۔ ہم لوگوں نے اُسی وقت کہا تھا کہ جس طرح بھی ہوگا تمہارے مقدمہ کی پیشی کرائینگے۔"

"بوڑھے کی عقل ماری گئی ہے۔ اسے ہوش کہاں ہے۔ جب لڑکا پھانسی کے تختہ پر چڑھ جائیگا تب آنکھیں کھلینگی۔ جوان بیٹے کو پھانسی۔ رام رے رام!"

"بھیا چودھری کیا سوچا ہے تم نے؟ کچھ کہو تو؟"

"لالہ جی! میں کیا بتاؤں۔ مگر ہاں بھیرون کو اگر کچھ ہو گیا تو...... "

"یہ تو تمام دنیا جانتی ہے مگر جیلوں میں دودھ دھو کر قسمت کو دشنام دینا کیا معنی۔ عدالت تک تم جاتے نہیں، گویا مہندی لگائے بیٹھے ہو۔ کم سے کم جج صاحب ہی سے گڑگڑا لیتے۔ ممکن تھا کہ اُنھیں تم پر رحم آجاتا اور وہ کچھ کر دیتے۔ رحم و کرم ہر انسان میں ہوتا ہے۔ مگر کوئی مانگنے والا بھی ہو۔"

"بھلا دیکھو تو ان کی عقل کو، مقدمہ ہو رہا ہے اور خود گھر میں پیر پھیلائے پڑے ہیں۔ غریب بھیرون نہ جانے دل میں کیا کہتا ہوگا اور کیا سوچتا ہوگا۔"

موتی کے دل میں ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دل کے تاروں کو مضراب چھیڑ رہا ہے۔ اسکو چاروں طرف سے یہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں،

"بھیرون دل میں کیا کہتا ہوگا...... کیا سوچتا ہوگا۔"

وہ بیتاب ہو کر اُٹھ بیٹھا اور گھبرا کر دریافت کیا۔

"جج صاحب کا بنگلہ کہاں ہے؟"

"چھاؤنی میں کہیں رہتے ہیں۔"

موتی نے دوہرایا "چھاؤنی میں کہیں رہتے ہیں" اور پھر یکایک سوال کیا جیسے کوئی سو کر جاگا ہو —— "فیصلہ کی تاریخ کل ہے نہ؟"

"ہاں —— ہاں —— کل ہے بھیا چودھری —— کل ہے۔"

موتی نے جلد جلد کرتا پہنا۔ ٹوپی سر پر رکھی اور لاٹھی اُٹھا کر چل دیا۔

—— (۱۰) ——

جج صاحب نے آرام کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"بھیکو مجھے افسوس ہے کہ میں اس معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہارا لڑکا گنہگار ہے اسکے خلاف کافی ثبوت بہم ہو چکے ہیں۔ اسے میں اب نہیں بچا سکتا۔ مجھے تم صرف اتنا اور بتا دو کہ میرے لال جی کو تم نے کیا کیا؟"

موتی کے جسم میں رونے والی بھیکو کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔

"خوب جج صاحب! اپنے الفاظ دوبارہ دوہرائیے۔ میرے بیٹے کو آپ پھانسی دینے جا رہے ہیں اور آپ کے بیٹے کا میں پتہ بتا دوں۔"

جج صاحب نے موتی کی آنکھیں اشک آلود دیکھیں مگر ساتھ ہی طعنہ زنی بھی۔

"بھیکو بُری گھڑی ٹل نہیں سکتی۔ میری مجبوری پر بھی تو غور کرو مجھے بہت بڑا رنج ہے کہ میں تمہارے بھیرون کو بچانے سے مجبور ہوں۔ مگر تم میرے بچے کو مجھے واپس دے سکتے ہو۔ تم کہہ چکے ہو کہ وہ زندہ ہے۔ پرماتما کے لئے مجھ پر رحم کرو۔"

رحم کا لفظ جج صاحب کے منہ سے سن کر موتی بھڑک اُٹھا ہو گیا۔

"جج صاحب! آپ انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر بھی یہ نہیں جانتے کہ انصاف کسے کہتے ہیں۔ ایک ناممکن تجویز میرے سامنے رکھتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آتی۔ رحم کی بھیک مانگتے وقت رحم کرنا بھی تو سیکھئے کیا انسانیت اسی کو کہتے ہیں؟"

جج صاحب کی خودداری جاگ اٹھی اُنکی عزت کو سخت صدمہ پہنچا وہ برداشت نہ کر سکے۔

"بس خاموش! ناممکن کو ممکن بنانا میرے اختیار میں ہے یہ شاید تو نہیں جانتا تھا اور شاید یہ بھی نہیں جانتا کہ میں یہاں کا سیشن جج ہوں تجھ کو عمر بھر کے لئے جیل بھیج سکتا ہوں۔ میرے بیٹے کو چرا کر مجھی کو بیوقوف بنانے آیا ہے۔ اب دیکھتا ہوں کہ بغیر میرے بیٹے کا پتہ بتلائے تو یہاں سے کیونکر جاتا ہے۔"

ساتھ ہی میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ چوکیدار حاضر ہوا۔

"حکم حضور!"

جج صاحب نے چوکیدار کی بندوق کی طرف دیکھا اور پھر موتی کی طرف موتی نہایت اطمینان کے ساتھ بُت بنا کھڑا ہوا یہ سب کارروائی دیکھ رہا تھا۔

"یہ شخص کوٹھی سے باہر نہ جانے —— سمجھا —— اگر باہر جانے کی کوشش کرے تو ......"

چوکیدار نے سلام کیا اُس کے چلے جانے کے بعد موتی نے ایک [illegible]

اور کہا:

"جج صاحب! میں اب بڈھا ہو چکا ہوں۔ آج مرا کل دوسرا دن۔ مجھے سزا دینے سے کیا فائدہ، میں کہیں نہ جاؤں گا۔ جو آپ کے دل میں آئے وہ کر گذریئے مگر یہ یاد رکھئے کہ اگر بھیکو کو پھانسی ہوتی تو آپ کو عمر بھر لال جی کا پتہ نہ لگے گا خواہ آپ میری بوٹی بوٹی کیوں نہ کرا دیں۔"

جج صاحب بڑی بے چینی کے ساتھ کمرے میں ٹہلنے لگے۔ اُن کی پیشانی پسینے سے تر بتر ہوگئی تھی۔

بھیکو! اُن کا غلام آج حاکمانہ گفتگو کر رہا تھا۔ کوئی تدبیر اُس کو قبضہ میں لانے کے لئے اُن کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

"اچھا اگر میں تمہارے لڑکے کو چھوڑ دوں تو؟"

موتی نے ہنس کر جواب دیا ــــ "یہ تو کل عدالت ختم ہونے پر معلوم ہوگا، ابھی سے کیسے مان لوں۔"

"میرے کہنے کا یقین نہیں؟"

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔"

"میری بات پر بھیکو تم کو اعتماد نہیں؟"

"یہ کون کہتا ہے سرکار کہ آپ کی بات پر بھروسہ نہیں۔"

"پھر تم کیا چاہتے ہو؟"

"جج صاحب! آپ بڑے آدمی ہیں، میں غریب ہوں، جاہل ہوں، بیوقوف ہوں مگر اونچ نیچ ضرور سمجھتا ہوں۔ آپ جو کچھ سوچ رہے ہیں وہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔"

جج صاحب نے جھنجھلا کر اپنے دونوں ہاتھ کرسی پر زور سے دے مارے اور بولے

"بدمعاش کہیں کا۔"

موتی بھیکو بولا ــ

"جج صاحب! یہ تو کھلا ہوا سودا ہے۔ میں بدمعاش، لُچا سب کچھ ہی مگر میں آپ کو مجبور تو نہیں کرتا۔ آپ کی غرض پڑے تو سودا کیجئے ورنہ نہیں۔"

جج صاحب نے [illegible] کر پانی پیا اور ٹہلنے لگے۔

"بھیکو ــــ! تو پہلے تو ایسا نہ تھا۔ تو نے میری نوکری کی ہے میرا نمک کھایا ہے، میرے بچے کو لیکر بھاگ گیا اور آج سامنے آیا تب بھی میں نے کچھ نہ کہا، اور اپنے غصے کو ضبط کئے بیٹھا رہا۔ اب میرے برتاؤ کا اپنے برتاؤ سے مقابلہ کر، کیا تجھے یہ زیب دیتا ہے؟"

جج صاحب کی آواز میں نرمی پیدا ہوگئی تھی۔ موتی نے سُنا اور سب کچھ اچھی طرح سُنا اور دل پر ہاتھ رکھکر بولا۔

"حضور ــــ! آپ جیسے پہلے میرے مالک تھے ویسے ہی آج بھی ہیں۔ مگر بھیکو اب وہ بھیکو نہیں رہا ہے۔ جب وہ بھیکو تھا تب آپ نے اسے تنخواہ مانگنے پر جوتوں کی ٹھوکریں ماریں۔ علاج نہ ہو سکنے کی وجہ سے اُسکا بیٹا مرا اور اس کے غم میں اس کی ماں مری۔ بدقسمت بھیکو در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرا اور آج اٹھارہ سال کے بعد بھیکو کی اُمید، زندگی کا سہارا اور دل کی روشنی بھی آپ موت کے حوالے کئے دیتے ہیں، پھر بھی آپ یہ اُمید رکھتے ہیں کہ بھیکو بھیکو ہی بنا رہے......"

جج صاحب موتی کی تقریر خاموشی سے سُن رہے تھے گویا اُن کے پاس زبان ہی نہ تھی۔

"اور ــــ اور آپ کے بیٹے لال جی کو میں نے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھا، خود روکھا سوکھا کھایا اور اُس کو اپنے بیٹے سے بھی اچھا کھلایا، اچھا پہنایا۔ حتیٰ کہ وہ مجھے ہی اپنا باپ سمجھتا ہے۔ آپ کے ہزار بار کہنے پر بھی وہ آپ کو اپنا باپ نہ سمجھے گا۔ جب تک کہ میں نہ کہوں آپ لال جی کا پتا پاکر بھی اُسے پا نہیں سکتے۔"

جج صاحب کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔

"سوچئے ذرا غور کیجئے۔ آپ اس کو پاکر بھی اپنا نہیں بنا سکتے، اگر بنا سکتا ہے تو صرف بھیکو۔ پھر اسی بھیکو کے ساتھ آپ کا یہ برتاؤ کہ اُس کو چوکیدار کی نگرانی میں دیدیا ہے۔ کل کے دن اُسی بھیکو کے لڑکے کو آپ پھانسی کی سزا دینگے۔ آپ کے سینے میں بھی ایک باپ کا دل ہے۔ لال جی کے لئے جتنی محبت دل میں ہے اتنی ہی بھیکو کے دل میں بیرون کی ہے

جج صاحب کا جسم کانپ رہا تھا۔ اُن کے ہاتھ پیر اور دماغ جواب دے چکے تھے۔ کوئی تدبیر نہ دیکھ کر اُٹھے اور موتی کے پیروں پر گرنے لگے مگر موتی نے انہیں اُن کے ارادے میں کامیاب نہ ہونے دیا اور پیچھے ہٹ کر بولا۔

"ارے مالک یہ کیا ——"

جج صاحب نے موتی کو سینے سے لگا لیا اور روتے ہوئے بولے

"بھیکو تو جیتا میں ہارا"

موتی کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔

—— ٠(١١)٠ ——

دوسرے دن ——

فیصلہ سُنایا گیا مگر بھیروں بے گناہ ثابت ہوا۔ شہادت بالواسطہ قرار دی گئی۔ کیونکہ پٹھانوں کے سوا اور کوئی شہادت اُسکے خلاف نہ تھی۔

لوگوں کی خوشی کی انتہا نہ تھی اور موتی تو پھولا نہ سماتا تھا۔ سب لوگ کہہ رہے تھے کہ موتی نے جج صاحب جادو کر دیا ہے۔

اُسی رات کو ——

جج صاحبؒ کی موٹر موتی کی دوکان پر کھڑی تھی اور موتی بھیروں کو اچھے اچھے کپڑے پہنا رہا تھا۔ ریشمی کرتا، باریک دھوتی۔ نیا جوتا، ریشمی رومال اور نئی ٹوپی، یہ سب پہن کر بھیروں نے لاٹھی اُٹھائی تو موتی نے روک دیا اور کہا۔

"اب اسکی ضرورت نہیں۔"

جب دونوں بنگلے پر پہونچے تو جج صاحب کو منتظر پایا۔

"آؤ آؤ وہاں کیوں رُک گئے۔" جج صاحب نے ڈرائنگ روم میں سے کہا۔

موتی نے بھیروں سے کہا —— بیٹا آؤ! جج صاحب بُلا رہے ہیں۔"

بھیروں ڈرتا ڈرتا کمرے میں داخل ہوا

جج صاحب نے کہا —— "بیٹھو بھیکو"

"سرکار —— ! اسے بٹھایئے !! —— یہ ہے آپ کا ....!!؟"

جج صاحب نے بھیروں کی طرف گھوم کر غور سے دیکھا اور "لال جی بیٹا" کہہ کر بھیروں کو سینے سے لگا لیا۔

مگر بھیروں یہ سب کچھ نہ سمجھ سکا اور جج صاحب کے گرم گرم آنسو اپنے شانے پر ٹپکتے دیکھ کر بولا۔

"بابو —— ؟"

دھوتی کے کونے سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بھیکو نے پلٹ کر بھیروں کی طرف دیکھا اور بھیروں کی پُر معنی نظروں کا مطلب سمجھ کر بولا۔

"ہاں بیٹا —— ! تمہارے پتا یہ ہیں —— میں تو ایک نوکر ہوں —— اور تم بھی بھیروں نہیں ہو —— لال جی ہو —— اور میرے نہیں اِنکے۔

اسی رات کو قریب دو بجے جج صاحب کے بنگلے سے نکل کر وہ سڑک پر آیا —— گھوم کر اُس نے ایک بار پھر بنگلے کی طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس لیکر سر جھکائے ہوئے ایک نا معلوم راستے پر چل دیا اُس وقت اسکی حالت بالکل ایسی ہی تھی جیسے کوئی اپنی عمر بھر کی دولت خیرات کرکے سکون حاصل کر چکا ہو اور اطمینان قلب کے ساتھ زندگی کی آخری منزل پر پہونچنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"وہ چلا جا رہا تھا —— خاموش اور پُرسکون سڑک کے سینے کو چاک کرتا ہوا —— کسی نا معلوم سمت"

بشیر احمد قریشی گوالیاری

جوشِ محبت

سینے میں میرے جوشِ محبت کو دیکھ لے
سامانِ صد ہزار قیامت کو دیکھ لے

کیوں بادہ خواروں کی اٹھاتا ہے زحمتیں
مستی بھری ان آنکھوں کی حالت کو دیکھ لے

روداد آزمائشِ فرہاد دیکھ کیا
اے دل تو آج اپنی ہی ہمت کو دیکھ لے

کیا تجھ سے ماجرائے بہارِ چمن کہوں
خود آج اپنے رنگِ طبیعت کو دیکھ لے

فرصت ہو سیر لالہ و گل سے اگر تجھے
اے دوست میری خوں شدہ حسرت کو دیکھ لے

تو آفتابِ حشر ہے میں ہوں شبِ فراق
آ اور میری صبحِ قیامت کو دیکھ لے

پھر کر سکے نہ تذکرۂ آہوئے حرم
کوئی اگر اس آنکھ کی وحشت کو دیکھ لے

پہلو میں اس قدر نہ مچل اے نگارِ شوخ
کیا ہو جو کوئی تیری شرارت کو دیکھ لے

پھر بجلیاں تجھیں گی نہ تیری نگاہ میں
اک دن تو میری شوخیٔ طبیعت کو دیکھ لے

دوزخ ہے جس کا نام وہ اس کا فراق ہے
آغوش اس کا دیکھ لے جنت کو دیکھ لے

نشتر بھی تو ہے مرہمِ زخمِ نہاں بھی تو
اے چشمِ یار دل کی جراحت کو دیکھ لے

اپنے آنکھ لطف دیتی ہے صبحِ شبِ وصال
لوٹی لٹائی حسن کی دولت کو دیکھ لے

نجمہ ترے بدلتے ہی دنیا بدل گئی
کوئی کسی کی پھری ہوئی قسمت کو دیکھ لے

نجمہ تصدق — بی اے، بی ٹی

خدماتِ شاعرہ

ہر ایک ذرے کو بخشی ہے دلکشی میں نے
عطائے خاص میں اپنی زندگی میں نے

مری نوا کی حیات آفرینیاں توبہ
کہ زندگی کو دیا درسِ زندگی میں نے

بنا کے سبزۂ تازہ کو فرشِ صحنِ چمن
نسیمِ صبح کو شانِ خرام دی میں نے

چمن چمن مری رعنائیوں کے آئینے
کلی کلی کو عطا کی شگفتگی میں نے

جبینِ گل کو زرافشاں بنا کے شبنم سے
شعاعِ مہر کو تکلیفِ دید دی میں نے

کبھی جو منظرِ فطرت ...
تو بخش دی مہ و انجم کو ...

سمجھ سکے نہ جسے اہلِ معرفت وہ تصویر
بیاں کئے ہیں بعنوانِ شاعری میں نے

بنا کے اپنی نگاہوں کو آشنائے مجاز
مجاز میں بھی حقیقت کی سیر کی میں نے

بتائے اہلِ طریقت کو رازہائے نیاز
سکھائی اہلِ محبت کو کافری میں نے

نوائے سرمد و منصور و قیس بن بن کر
کسی کو چھیڑ دیا ہے کبھی کبھی میں نے؟

یہ سب زمان و مکاں عرش و فرش تیرے ہیں
کہ ان میں اپنی حقیقت کی سیر کی میں نے

مرے نیاز کے آگے جھکے ہیں سب کے سر
بلباسِ عجز میں کی ہے خدائی بھی میں نے

یہی ہے بس مری رودادِ مختصر اختر
زمیں سے کی ہے فلک تک پیمبری میں نے

آرٹسٹ کیا ہے؟

اگر ہمارے تصورات میں گہرائی اور نگاہوں میں بلندی ہو تو ہم کائنات کی ہر چیز کے اندر ایک حسین دُنیا کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ مناظرِ قدرت کی رنگینیوں اور بوقلمونیوں سے ہر شخص کے جذبات میں گدگدی پیدا ہو جاتی ہے اور ایک حسین و خوبصورت چیز کو دیکھکر سب کی طبیعتیں مچل جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قدرت کے دستِ صناع نے کائنات کی ہر چیز کے اندر کچھ ایسا آہنگ اور تناسب رکھدیا ہے کہ خواہ مخواہ انسان ان سے مست و بیخود ہونے لگتا ہے اور جب ان کے قریب جا کر وہ ان کا [illegible] کرتا ہے تو ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے ان تاثرات کو قلمبند کرے۔ یہی وجہ [illegible] فیصلہ سُنایا گیا اگر بصیروں [illegible] دستوں میں حساس دل اور سروں میں بیدار دماغ رکھنے [illegible] دی گئی۔ کیونکہ پٹھانوں کے [illegible] اپنے دل و دماغ میں اس طرح محفوظ رکھتے ہیں [illegible] لوگوں کی خوشی کی [illegible] دیتے۔ بعض حضرات جو اپنی بے اختیار طبائع پر قابو [illegible] بکھرے ہوئے حُسن کو اپنے دماغ سے نکال کر صفحۂ قرطاس پر جمع کر دیتے ہیں اور اس طرح ان کے جذبات و احساسات کو ایک عامی سے عامی آدمی بھی دیکھ سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مصوّر یا صنّاع۔ قدرت کی فیض بخشیوں سے پوری طرح بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اُن کی وجدانی اور تصوّری قوتیں بھی عام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ بڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ دُنیا کی تمام اشیاء، خواہ ذی روح ہوں یا غیر ذی روح سب کے اندر ایک قسم کا حُسن تلاش کرتے ہیں وہ صرف یہی نہیں دیکھتے کہ فلاں عمارت، فلاں دریا یا فلاں کوہسار کیسا قدرت کی صناعیوں نے کام کیا ہے بلکہ اُن کی نظر معمولی پتھروں، شہتیروں، آموں کے باغوں، کسانوں کی کھیتیوں [illegible] سب پر پڑتی ہے۔ وہ ایک پھٹی پرانی [illegible] دہقانی لڑکی کے اندر بھی [illegible] دیکھتے ہیں۔ انھیں [illegible]

دیکھتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم بہ امعانِ نظر قدرت کی تمام صناعیوں کو دیکھیں تو ہمیں اسکی ہر کاریگری کے اندر کسی نہ کسی قسم کا حُسن یا کیفیت ضرور نظر آئیگی جس سے ہمارے احساسات تھوڑی دیر کے لئے بیدار ہو سکتے ہیں۔

اس لئے کہنا چاہئے کہ حُسن کار یا آرٹسٹ ہمیشہ حسن کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور اس کے لئے اپنی وجدانی و تصوّری قوتوں کو بیک رنگ وجود کرتا ہے اُس کی نگاہیں کبھی پیش پا افتادہ مضامین پر پڑتی ہیں اور کبھی اُفق کی بلندیوں پر۔ —— وہ بذاتِ خود ہر چیز کا قریب سے تجربہ کرتا ہے اور اُس کے نقائص و محاسن سے آگاہ ہو کر دوسروں کو اس سے آگاہ کرتا ہے۔ لیکن سچ تو یہی ہے کہ اُس کی نگاہیں زیادہ تر انھیں چیزوں کی جستجو کرتی ہیں جن کے اندر اعتدال، موزونیت، حسن و جمال، دلکشی و رعنائی اور مجموعی دلآویزی ہو۔ وہ انھیں مناظر کو دکھا کر ہمارے قلوب کے اندر وہ روح پھونک دیتا ہے کہ ہم اُسے دیکھکر بے قابو ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

کبھی کبھی اس کا قلم اگر کسی چیز کی تصویر کشی پورے طور پر نہیں کر سکتا تو اس کے کئی اسباب ہوتے ہیں۔ کیونکہ بعض دفعہ وہ احساساتِ حسن کو حافظہ اور قوتِ متخیلہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس صورت میں اسکی طبیعت ان حسین اجزاء کو جوڑنے میں بیقرار ہو جاتی ہے اور وہ ان کے لئے الگ کیف زارِ تخیل بنا لیتی ہے اور پھر وہ اس نئے کیف زار کو مرئی و محسوس شکل میں دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے اور بیتاب ہو کر اسے نقش کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس پر [illegible] "پاسبانِ عقل" تھوڑی دیر کے لئے [illegible] ہو جاتا ہے اور پھر اس کیفیت میں اُس کی فطرت مجبور کرتی [illegible] یہی وجہ ہے کہ جب اس کا اشہب [illegible] ہو جاتا ہے تو رنگوں کی آمیزش اور خطوط [illegible] اپنی کوشش میں

کام ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی جس وقت وہ اپنی تخیلی تصویروں کو پیش کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آئینہ میں کسی شے کا عکس جھلک رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آرٹسٹ کے لئے جہاں عمدہ قلم اور خوبصورت ذرائع کی ضرورت ہے، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی تخیلی قوتوں میں بڑی پائداری ہو۔ اعلیٰ کے فن معماری۔ مصوری کے کمال مصوری۔ ادیب کی شگفتہ عبارتوں اور شاعر کی شاعری میں نہیں پایا جا سکتا، جبتک کہ اُن کا ذہن تخیل سے آراستہ نہ ہو

حقیقتاً اسی وقت دیکھے اندر حقیقت نگاری کی جِلا بھی پیدا ہو گی جبکہ اُن کی بنیاد خوبصورت اور موزوں خیالات و تصورات پر مبنی ہو اور اسی وقت اُن کا فن شاہکار کا درجہ بھی حاصل کر سکتا ہے جبکہ وہ صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے مکمل ہو۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک اعلیٰ درجہ کا معمار اپنے فن کے اظہار کے لئے سنگ و خشت تلاش کرتا ہے۔ ایک بلند پایہ مصور رنگ آمیزی کے لئے بیقرار رہتا ہے۔ اسی طرح ایک شاعر الفاظ آفرینی سے کام لیتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی خیال رکھتا ہے کہ اُن کا دارومدار [illegible] کیونکہ یہ چیزیں اس کے نزدیک اُسی وقت کارآمد ہو سکتی ہیں جبکہ [illegible] ہوں۔ چنانچہ یہ چیزیں صرف اس کے لئے موزوں [illegible] ذریعہ تخیل مجسمات کو زندۂ جاوید بنا دیتا ہے اور حقیقت [illegible] اور موثر ذرائع تصویر کو چمکانے کے لئے میسر نہ آئیں تو تخیل [illegible] ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ اصل میں دونوں کی آمیزش اس طرح ہونی چاہئے کہ ہم جوہر نہ بتا سکیں کہ شراب شیشے میں ہے یا شیشہ شراب میں۔ سچ پوچھئے تو اسی جگہ اکثر اُس کا فطری کمال اجاگر ہوتا ہے اور پھر بعض جگہ اگر اُسے تفصیل اور آرائش سے بھی کام لینا ہوتا ہے تو اُسے بلند پروازی۔ ذوق سلیم۔ تخیل اور قدرتِ اظہار سب کا جوہر دکھانا پڑتا ہے۔

مختصر یہ کہ فن کار یا صنعت گر نکتہ رس دماغ اور حقیقت بین نگاہیں لیکر پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کا آئینۂ دماغ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ جاذبِ نقوش ہوتا ہے۔ اُن کے دل عوام کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتے ہیں وہ قدرت کے جلووں کو دیکھتے ہیں۔ فطرت کی نیرنگیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ انھیں کائنات کے ہر ذرہ کے اندر حُسن و جمال نظر آتا ہے۔ دُنیا کا ہر واقعہ اُن کے لئے آئینۂ عبرت ہوتا ہے وہ ہر لحظہ ہر شے میں بے مثال حقیقت کو جلوہ گر دیکھتے ہیں اور اس احساسِ حُسن، اس درسِ عبرت اور اس فلسفۂ حقیقت کے اظہار کے لئے اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔ گویا حُسن کار یا صناع۔ حسین و جمیل اشیاء کو دیکھتا اور دوسروں کو بھی اسے دکھا کر اُس کے کیف سے آشنا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے قلم کی خاموش تصویروں کے اندر وہ ایسی زندگی پیدا کر دیتا ہے کہ جنکے حرکات و سکنات ہر حساس دل پر تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس کی یہی تصویریں بعض دفعہ الہامی درجہ حاصل کر لیتی ہیں اور خاص و عام کی نگاہ میں کچھ اس طرح افسوں پھونکتی ہیں کہ ہر شخص اُن کا دالہ و شیدا ہو جاتا ہے۔

عبدالرحمن مستقیمی

رنگ و بُو

[illegible]

مری ہستی مری ہستی میں تو ہے — نظر پھر بھی ہلاکِ جستجو ہے
کبھی ہم ڈھونڈھ ہی لینگے کسی کو — اگر قسمت شریکِ جستجو ہے
مری قسمت ہے محسودِ ملائک — مری فطرت اسیرِ رنگ و بو ہے
وہاں اب ان سے باتیں ہو رہی ہیں — جہاں یہ آپ ہے تم ہے نہ تو ہے
کروں کیا گر نہ بیٹھوں تن بہ تقدیر — عدو تدبیر سے جب دُور تو ہے
کرے گا آرزوئے مرگ وہ کیا — جو جیتے جی شہیدِ آرزو ہے

قسم ہے وسعتِ ارض و سما کی
شفق کے عشق کا دنیا ہے تو ہے

جنگ

حکمراں ہوتا ہے جب ذہنِ حکومت پر غرور
آمریت جب کچل دیتی ہے ذہنوں کا نظام
آڑ میں ہمدردیوں کی ہر طرف بیڑیاں
جب بنا دیتا ہے تہذیب و تمدن کا جمود
جب بدن میں آگ بن جاتا ہے غیرت کا لہو
ہر طرح ہوتے ہیں جب تہذیب کے ہتھیار کند
بجلیاں بھرتی ہے فطرت غیرتِ احرار میں
اک طرف غربت نکل آتی ہے لیکر زلزلے
اک طرف دولت کی بھٹی سے نکلتا ہے دھواں
اک طرف ہوتی ہیں نخوت کی نگاہیں تیز تیز
اک طرف ہوتا ہے دل میں ملک گیری کا خیال
اک طرف رکھنا ہی پڑتا ہے وجاہت کا بھرم
عام کر دیتا ہے بزمِ دہر میں سوز و گداز

لوٹتی ہے بدشعوری زندگانی کا شعور
خوابگاہِ عیش میں ہوتی ہیں جب نیندیں حرام
پھونکتی پھرتی ہیں ہر سو خرمنِ امن و اماں
قیدیِ ذوقِ نمائش بندۂ نام و نمود
کرتے ہیں جب اہلِ حق بھی غیرِ حق کی جستجو
کند مذہب کی چھری، اخلاق کی تلوار کند
زندہ لاشیں بے کفن پھرتی ہیں جب بازار میں
اک طرف دل میں ابھر آتے ہیں خونی ولولے
اک طرف غربت کے شعلے پھونکتے ہیں جسم و جاں
اک طرف ہوتے ہیں مجبوری کے نالے حشر خیز
اک طرف باغی بناتا ہے غلامی کا ملال
اک طرف سرکش بنا دیتا ہے احساسِ ستم
اک طرف زعمِ حکومت اک طرف پاسِ نیاز

ہر طرف ہوتی ہے پھر دنیا میں عالمگیر جنگ
جنگ، خونی جنگ، اندھی جنگ، بد تعبیر جنگ

جنگ، ہاں وہ جنگ جس کے ہر اشارے پر نثار
جنگ ہاں وہ جنگ جس کی ساز شوں سے ہمکنار
جنگ، ہاں وہ جنگ جس کے ہر نفس میں سازشیں
جنگ، ہاں وہ جنگ جس کے ساتھ ہے خیل و خدم
جنگ، ہاں وہ جنگ جس کے ہر تبسم میں نہاں
جنگ، ہاں وہ جنگ جس کے آستاں پر بار یاب
جنگ، ہاں وہ جنگ جس کے ارتقا کی یادگار
جنگ، ہاں وہ جنگ جس کی کامیابی کا خراج
جنگ، ہاں وہ جنگ جس میں دن دہاڑے ظلمتیں
جنگ، ہاں وہ جنگ جب خطرے میں ہو ہر کارواں
جنگ، ہاں وہ جنگ جس کے ہر نفس میں انقلاب

دبدبہ، دولت۔ حکومت، آمریت اور وقار
زلزلے۔ طوفان۔ آندھی شورشیں چیخیں پکار
آگ گیسیں۔ بھاپ۔ شعلے اور لہو کی بارشیں
توپ، گولے، ٹینک۔ طیارے، تفنگیں اور بم
ٹیکس۔ چندے۔ ڈنڈ۔ جرمانے سزائیں سختیاں
بے سکونی بدنظامی، بدحواسی۔ اضطراب
سنسناہٹ۔ گڑگڑاہٹ۔ قتل و غارت لوٹ مار
زندگانی، سرخوشی، عیش و مسرت تخت و تاج
غالب آکر توڑ دیتی ہیں نظر کی ہمتیں
گھر رہی ہوں ہر طرف خطرے کی جس میں گھٹیاں
موت جس میں زندگی ہو زندگی جس میں عذاب

جنگ کے ایام میں کیسا سکوں کیسی خوشی
موت کی آغوش اور سہمی ہوئی سی زندگی؟

صبا متھراوی

اُس کی بھول

تم ہی بتاؤ، بھول کس سے نہیں ہوتی۔ اس عالم امکاں میں ہم لوگ بے شمار دیدہ و نادیدہ لغزشوں اور خطاؤں سے گھرے ہوئے ہیں۔ بھول انسان کے لئے لازمی ہے اسی پر سماج کی بنیاد قایم ہے ـــــ یہی اکثر قلبِ انسانی میں نرمی و نزاکت کی تخلیق کا باعث ثابت ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے انسان کی فطری نفس پرستی میں کمی ہو جاتی ہے ـــــ کسی شخص سے تمام کام ہمیشہ درست ہی سرزد ہوں یہ ناممکن ہے ـــــ آدمی کی تمام لغزشیں معاف کی جا سکتی ہیں لیکن دوسروں کے لئے نفرت انگیز بن جانا ایسی خطا ہے جس پر عفو و درگذر سے کام نہیں لیا جا سکتا اس لئے کہ انسانوں کے درمیان نفرت و حقارت پھیلانا نا قابلِ معافی جرم ہے ـــــ اگر ہمارا وجود ہی ایک دوسرے کے لئے وجہ تنفر ہے تو ہمیں اپنے مکان کے کسی گوشہ میں تنہا بیٹھے رہنا چاہئے ـــــ لیکن خیر ـــــ

اب ہم مودر کے قصہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ نوجوان مودر بہت ہی بدنصیب تھا ـــــ اگرچہ وہ بہت عقلمند اور نرم دل تھا۔ اس کا اندازِ گفتگو بھی شیریں تھا، مگر یہ تینوں باتیں بھول ہیں اور ان سے بہت سی غلطیوں کا پیدا ہو جانا بعید از امکان نہیں ہے۔

تعلیمی زمانہ کو ختم کر کے جب اُس نے پہلی مرتبہ سماج کی حدود میں قدم رکھا۔ وہ اسی وقت سے ہر کام کو درست انجام دینے کی کوشش کر رہا تھا ـــــ مگر تم دیکھو گے کہ اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ ـــــ اتفاق سے ایک رکنِ سلطنت اور اس کی بیگم سے اُس کی واقفیت اور گہرا دوستانہ تھا۔ بیگم نے محسوس کیا کہ وہ بہت عقلمند ہے کیونکہ اُس کی جسمانی تشکیل بہت حسین تھی۔ بیگم کے شوہر نے خیال کیا کہ اس میں عقل و فہم کا مادہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے خیالات اور مودر کے نظریات میں زمین و آسمان کا تضاد تھا۔

مودر کی فراست و عقلمندی کی وجہ سے بیگم اُس کو محبت آگیں نظروں سے دیکھنے لگی۔ مگر اُس کو بیگم سے بالکل محبت نہیں تھی اور اسی وجہ سے وہ بیگم کی توجہات کا مطلب بھی سمجھنے سے قاصر رہا۔ بیگم کے شوہر نے اپنی ایک نئی شائع شدہ کتاب دیکر اس پر رائے ظاہر کرنے کی درخواست کی۔ مودر نے کتاب پڑھ کر نہایت دیانتداری کے ساتھ کہا کہ اس کتاب کا مصنف جنگ کی بجائے صلح کا کام زیادہ خوبی کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔

اُسی زمانہ میں ایک بڑے فوجی افسر کا عہدہ خالی ہوا۔ یہ عہدہ ایک شخص مارکس کو دیا گیا جو اس کے لئے قطعاً ناقابل تھا ـــــ اُس نے جنگ کے موضوع پر شائع شدہ کتاب پر رائے زنی کرتے ہوئے مصنف کی غیر معمولی قابلیت اور اس کی بیوی کے انتہائی حسین ہونے کا اعتراف کیا تھا ـــــ اپنے کاروبار کے باعث اس کے عورتوں سے کافی تعلقات تھے، یہی وجہ تھی کہ اُس کو کرنل کے عہدہ پر تعینات کر دیا گیا ـــــ مودر ایک صداقت پسند اور راست گو آدمی تھا مگر اس کی یہ صداقت پسندی اور راست گوئی ایک بڑی بھول تھی ـــــ اس حادثہ کی وجہ سے اس کی تمام تدابیر خاک میں مل گئیں ـــــ بالآخر اُس نے حصولِ عہدہ کے خیال کو ترک کر کے برس میں خاموش بیٹھ کر تعلقات بڑھانے کا عزم صمیم کر لیا ـــــ یہ اس کی کتنی بڑی بھول تھی؟ ـــــ اس نے خیال کیا کہ نوجوان "آلسپ" اُس کا ایک مخلص دوست ہے ـــــ آلسپ بہت خوبصورت آدمی تھا اُس کے چہرہ کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا تھا کہ وہ بہت ایماندار ہے اُس کے خیالات پختہ اور بہترین تھے۔

وہ ایک روز مودر کے پاس آیا۔ اُس کا چہرہ الم انگیز اور یاس آفریں تھا۔ مودر یہ دیکھکر اذیت محسوس کرنے لگا۔ مگر جن کی عقل و فہم بھی بہترین ہو، اور دل بھی عمدہ، اُن سے زیادہ بیوقوف کوئی نہیں ہے ـــــ آلسپ نے بتلایا کہ اس نے سو پونڈ کا ایک نوٹ لکھ دیا ہے ـــــ مودر نے رسید وغیرہ لئے بغیر ہی اُس کو وہ روپیہ قرض دیدیا۔ اُس نے خیال کیا تھا کہ یہ روپیہ ہم دونوں کے درمیان دوستی کی بنیادوں کو اور زیادہ محکم اور پختہ کر دے گا ـــــ مگر یہ اُس کی

ایک بھول تھی۔ اس کے بعد مدت تک مودر سے پھر ملاقات نہیں کی ——— اس طرف سے مایوس ہو کر اُس نے ادبا سے تعلقات پیدا کئے۔

ان لوگوں نے سوچا کہ مودر کے ذریعہ ہم اپنے تصنیف کردہ ڈراموں کی اصلاح کر سکیں گے ——— مودر کو صرف ایک شخص کا ڈرامہ پسند آیا۔ اُس نے اس ڈرامہ کے کئی غیر ضروری حصوں کو نکال دیا اور مشورہ دیا کہ مناظر میں یک فطری تعلق ہونا ضروری ہے۔ ایک منظر سے دوسرا منظر خود بخود امکانی طور پر پیدا ہو جانا چاہئے۔ ہیرو کا کردار بہترین ہونا چاہئے۔ مکالمہ میں صرف حکیمانہ گفتگو کا ہونا درست نہیں ہے۔ بات چیت میں جان اور زور ہونا چاہئے۔ کسی کردار کو ٹھوس اور جامع طریق پر پیش کرنا ہی خوبی نہیں ہے۔ اس میں تفاوت ہونا چاہئے ——— مصنف نے مودر کے مشورہ کے مطابق اپنے ڈرامہ کی اصلاح کر لی ——— مگر بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ مودر ایک اچھا مشیر نہیں ہے ——— کیونکہ اداکاروں نے کہا کہ اس ڈرامہ کو اسٹیج پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

مودر نے پریشان ہو کر مشورہ دینا ہی بند کر دیا۔ جس مصنف کو اُس نے ابتداءً مشورہ دیا تھا اُسی نے ایک اور ڈرامہ تصنیف کیا۔ کئی بے ترتیب اور غیر منظم مناظر کو مجتمع کر کے یہ ڈرامہ تیار کیا گیا تھا۔ مودر کو جرات نہ ہوئی کہ وہ مصنف کو یہ مشورہ دے کہ یہ ڈرامہ اس قابل نہیں ہے کہ اسٹیج پر پیش کیا جائے ——— ایسا کر کے اُس نے ایک اور بھول کا ارتکاب کیا ——— ڈرامہ کی ایکٹنگ کے دوران میں ناظرین اور ناقدین نے شور و غل مچا کر اُس کو نامکمل ہی ختم کرا دیا۔ مودر بڑی اُلجھن میں پڑ گیا۔ مشورہ دینے پر بھی وہ ایک بھول کا مرتکب ہوتا ہے اور نہ دینے پر بھی ——— شہر کے تمام ڈرامہ نویسوں سے اُس نے تعلقات منقطع کر لئے ——— اب وہ علما کی طرف رجوع ہوا اور اُن سے میل جول پیدا کر لیا۔ ڈرامہ نویسوں کی گفتگو جس قدر سُست، واہیات اور بے کیف ہوتی تھی۔ یہ لوگ بھی اسی قسم کے واقع ہوئے تھے۔ جب اُن کو کچھ کہنا ہوتا تو یہ بولتے ورنہ زیادہ تر خاموش ہی رہتے۔ مودر آخر اس کو صبر کے ساتھ کب تک برداشت کرتا ——— اُس نے اُن لوگوں کا ساتھ چھوڑ کر چند نوجوان لڑکیوں کی ہمراہی اختیار کر لی ——— یہ اس کی ایک اور بھول تھی ——— مودر نے دیکھا کہ ایک ہی بات شب و روز اُن کے دماغ میں رقص کرتی رہتی ہے۔ وہ اس بات سے پہلو تہی کبھی نہیں کرتیں اور یہی ایک بات اُن کی تمام حرکتوں میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ مودر اب سمجھا کہ یہ تعلقات پیدا کر کے اُس نے ایک عظیم بھول کا ارتکاب کیا ہے۔ عورتیں کسی بھی موضوع پر دماغ سوزی کرنے وقت وہ غور کرتیں کہ یہ شخص ناتجربہ کار اور بیوقوف ہے اور جب یہ اُن سے کسی قسم کا مذاق کرنے کی کوشش کرتا تو وہ سوچتیں کہ یہ آدمی آدابِ مجلس سے واقف نہیں ہے۔

بہت زیادہ عاقل و فہیم ہونے پر بھی وہ اس نتیجہ پر نہ پہنچ سکا کہ کس جانب کو اختیار کرنا درست ہے۔ اُس نے سوچا کہ غلط راہ اختیار کرنے پر بھی اتنا نقصان ہوتا ہے جتنا کہ حتی الوسع ایک صحیح راستہ اختیار کرنے میں ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے اُس نے فوجی افسر بننے کی کوشش کی۔ مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ پھر اُس نے مخلص دوست پیدا کرنے کی سعی کی مگر وہاں بھی دھوکا کھایا۔ بعد ازاں ڈرامہ نویسوں، علما اور عورتوں سے تعلقات پیدا کئے مگر یہ سب تنفر انگیز ثابت ہوئے۔

"جو عورتیں اور مرد ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں" ایک صاحب ایسے مرد و زن کی تعریف و توصیف کر رہے تھے یہ سن کر اُس نے غور کیا کہ کسی سے محبت کرنا یقیناً عاقلانہ فعل ہے۔ اُس نے یہی راستہ اختیار کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا محبت کس چیز کا نام ہے؟ ——— اس حقیقت سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اُس نے یہ ارادہ کیا اور نہ محبت کو قصد و ارادہ سے کیا تعلق۔ وہ تو ایک غیر ارادی چیز ہے ——— وہ اپنی واقف کار جوان لڑکیوں کی خوبیاں معلوم کرنے کی فکر میں منہمک ہو گیا اُس نے فیصلہ کیا وہ اس سے محبت کرے گا جس میں سب سے زیادہ خوبیاں ہوں گی۔ وہ ہر ایک کے حسن و خوبی کو اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس نے خیال کیا کہ کیونکہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو محبت کے کاروبار میں کافی معاونت کر سکتا ہے۔

یہ تمام کوشش اور جد و جہد بیکار رہی۔ زبردستی محبت کرنے کی سعی کامیاب نہ ہو سکی اور یہ تمام چیزیں بے معنی ثابت ہو کر رہ گئیں۔ ایک روز وہ اچانک کسی غور و فکر کے بغیر ایک بدصورت اور خیالی عورت کے تصور میں محو ہو گیا۔ اُس نے سوچا تھا کہ اس کا انتخاب بہت اچھا ہوا ہے۔ لیکن بعد میں اُس نے دیکھا کہ اس میں خوبصورتی کا نام و نشان تک نہیں ہے ——— مگر وہ اُس سے خوش ہوا اور سوچا کہ اچھا ہے اُن میں آپس میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا کرے گا ——— یہ اُس کی بھول تھی وہ بے خبر تھا کہ عورت خواہ کتنی ہی بدصورت کیوں نہ ہو

وہ آدمی کا دل اپنی طرف کھینچنے کی کوشش ہر وقت کرتی رہتی ہے۔ اس کے رنگ ڈھنگ میں، اُس کی آنکھوں اور تیکھی چتون میں، اُس کی معمولی معمولی باتوں میں غرض سب ہی میں ایک گہرا مطلب پوشیدہ ہوتا ہے ــــــ ایک کسان جس طرح انتہائی شدید محنت سے ایک بنجر زمین سے غلہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس طرح عورت بھی اپنے بدصورت چہرہ پر خوبصورتی پیدا کرنے کی سعی کرتی ہے ــــ وہ مرد سے والہانہ محبت کا اظہار اس لئے کرتی ہے کہ اس کو اپنی طرف مائل کر سکے۔ وہ اس میں کامیاب ہوتی ہے اور مرد بڑے فخر سے اُس کی محبت میں اندھا ہو جاتا ہے اور اس کی بدصورتی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

اُس نے ٹھوکریں کھا کر بہت سی باتیں حاصل کی تھیں۔ اُس نے دیکھا کہ وہ بہت سی الجھنوں میں پھنسا ہوا ہے۔ اُس کا دل مچلنے لگا ــــ یہ بھی اُس کی ایک بھول تھی ــــ اور یہ بھول ایک اور زبردست بھول کی تخلیق کا سبب ثابت ہوئی ــــ اُس نے شادی کر لی ــــ وہ اپنی بیوی سے ضرورت سے زیادہ اچھا برتاؤ کرنے لگا ــــ مگر یہاں بھی اُس نے بھول کا ارتکاب کیا۔ اُس کی بیوی نے اُس کی شیریں زبانی کو اُس کی کمزوری پر محمول کیا اور اُس کے ساتھ تحکمانہ سلوک شروع کر دیا۔ موور نے جھگڑا کرنا چاہا۔ یہ بھی اُس کی بھول تھی اور جھگڑا کرنے کی دھن سے اُس نے ایک اور بھول اختیار کر لی، وہ تھی ــــ تجدید تعلق ــــ اور اس تجدید تعلق نے اس کو دو بچوں کا باپ بنا دیا۔ یعنی دو اور فراموشیوں نے اس کے یہاں جنم لیا۔ اُس نے آخرکار سب سے ترک تعلق کر لیا ــــ یہ درست ہوا ــــ مگر ایسا کر کے اُس نے ایک اور بھول کی ــــ اب وہ اس بے کیفی سے تنگ آ کر اپنی زمینداری میں جا کر رہنے لگا۔

اُس نے وہاں جا کر دیکھا کہ ایک امیر اور دولتمند آدمی وہاں بڑے غرور سے رہتا ہے۔ وہ اپنے پڑوسیوں سے کبھی نہیں ملتا۔ موور نے خیال کیا کہ یہ اس شخص کی بھول ہے۔ اور اُس نے اس کے برعکس، جس قدر وہ لوگوں سے مغرورانہ طور پر پیش آتا تھا، اسی قدر نرمی اور انکسار کا برتاؤ شروع کر دیا اور لوگوں سے کافی میل جول بڑھا لیا ــــ یہ اُس کی ایک بھول تھی ــــ اُس کا گھر آدمیوں کی عام بیٹھک بن کر رہ گیا۔ اُسے ایک لمحہ کے لئے آرام کرنے کی مہلت نہ تھی۔ وہ اپنے مغرور ہمسایہ سے حسد کرنے لگا اُس نے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر بھگا دیا، اور اس بھول کو، لوگوں کے ہر وقت گھیرے رہنے کی بھول کے بجائے بہتر خیال کیا۔

ایک زمین کی ملکیت پر اُس کے نام عدالت میں نالش دائر ہوئی۔ اُس نے بے ایمانی اور جھوٹ کا جواب دینے سے بہتر یہ سمجھا کہ اپنی ملکیت سے دستبردار ہو جائے۔ اور ایک بردبار آدمی کی طرح سب کچھ برداشت کر لے اُس نے ان آدمیوں کو دعوت دے کر نقصان برداشت کرتے ہوئے صلح کر لی۔

پڑوسیوں نے سوچا کہ یہ تو روپیہ کے حصول کا ایک بہترین اور سہل طریقہ ہے اُس کے چھوٹے بڑے سب پڑوسیوں نے اُس کی جائداد کا خود کو فرضی مالک قرار دے کر عدالت میں نالشیں دائر کر دیں۔ اس طرح ایک مقدمے سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے موور کو دس مقدموں میں پھنسنا پڑا۔

پریشان ہو کر اُس نے اپنی تمام جائداد فروخت کر ڈالی ــــ یہ بھی اُس کی بھول تھی ــــ اب وہ اپنی پونجی کس کام میں لگائے وہ ابھی غور کر ہی رہا تھا کہ ایک آدمی نے اُس کے پاس آ کر کسی بڑے شہر میں رقص و موسیقی کے لئے ناچ گھر قائم کرنے اور اُس میں روپیہ لگانے کا مشورہ دیا۔ ڈائریکٹر ایک اچھا آدمی تھا اُس نے اس کام کو چلانے کے لئے روپیہ حاصل کرنے کے واسطے وکالت شروع کر دی۔ وکیل کی ہر کام میں گہری نظر ہوتی ہے مگر اس کے باوجود ناچ گھر فیل ہو گیا اور موور کا سب مال و متاع خاک میں مل گیا ــــ اب اُس کے دل میں دنیا کی طرف سے جذبۂ نفرت پیدا ہو گیا ــــ اور دنیا سے منہ موڑ کر اس نے راہبانہ زندگی اختیار کر لی، اس کے بعد حیات دنیوی سے تھک کر موت کے آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو گیا ــــ یہ اُس کی آخری بھول تھی ــــ ــــ مگر سچ تو یہ ہے کہ اُس نے پیدا ہو کر ہی ایک بڑی بھول کا ارتکاب کیا۔

(فرانسیسی افسانہ نگار دے لیلی ادم)

مترجمہ

امتیاز نسیمی (دیوبندی)

نیم کا درخت

وہ نیم کا درخت، محبت کی یادگار
تم جسکی گہری چھاؤں میں ملتے تھے بار بار

وہ اُس کا سایہ حُسنِ مجسم کی جلوہ گاہ
وہ اُس کی تازگی کہ ہو فردوس بھی نثار

وہ سبز سبز پتے، وہ شاخوں کا جھومنا
وہ اُس کے پھولنے سے فضا مست و کیف بار

وہ چاندنی، وہ رات کا نظارۂ خموش
وہ نغمہ ریز بربطِ ہستی کا تار تار

وہ حسبِ وعدہ آنے میں تاخیر جا نگزا
وہ بدگمانیٔ دلِ بیتاب و بیقرار

وہ جھینپتی، لجاتی ہوئی سی تمہاری چال
وہ مست انکھڑیوں میں جوانی بلا خمار

وہ تلخیٔ کلام میں رنجبولیوں کا لطف
بے التفاتیوں کی شکایت وہ بار بار

تاخیر پر تمہارا وہ کرنا ہزار عذر
آنکھوں کا فرطِ شرم سے ہونا نہ وہ دوچار

لپٹانا گلے وہ شوق سے، باتیں وہ پیار کی
کرنا وہ پھر سے عہدِ محبت کو اُستوار

وہ دل پہ جبر کرکے جُدا ہونا آہ! آہ!
مُڑ مُڑ کے پھر بھی دیکھتے جانا وہ بار بار

معلوم ایسا ہوتا ہے گویا ہے کل کی بات
بھولے نہیں ہیں مجھ کو وہ ایامِ سازگار

اب بھی وہی گلی ہے، وہی نیم کا درخت
لیکن ہیں وہ ہماری محبت کے سوگوار

مجھکو وہ پُرنشاط زمانہ رہیگا یاد
یعنی شباب کا وہ فسانہ رہیگا یاد

مسلم مالیگانوی

خمکدۂ بہار

صبر گیا، سکوں گیا، عیش گیا، خوشی گئی
ایک نظر کے ساتھ ساتھ حسرتِ زندگی گئی

اور نہیں کوئی ملال ہے تو فقط ہے یہ خیال
حُسن سے کرکے عرضِ حالِ عشق کی بات بھی گئی

ہائے وہ شامِ انتظار، دشنۂ تیز در کنار
غرقِ بخونِ جانِ زار، رات کی چاندنی گئی

پھر گئی چشمِ التفات، نذرِ ستم ہوئی حیات
ہمکو بھی مل گئی نجات اُن کی بھی برہمی گئی

خمکدۂ بہار میں رات کو جتنی ڈھل سکی
وقتِ سحر کلی کلی آنکھ بچا کے پی گئی

اب کے خانقاہ میں سجدۂ شوق کیجئے
اُن سے قدم ہٹا لئے لذتِ بندگی گئی

راز و نیازِ حُسن و عشق کتنے ستم ظریف ہیں
موت نہ آئی اے نثار ہاتھ سے زندگی گئی

نثار اٹاوی

انسداد ارتداد

ہزار بستہ زبانی نے ہم کو رو کا شاد
مقام سرزنشِ قیل و قال آہی گیا

اس میں شبہ نہیں کہ دُنیا مجموعۂ اضداد ہے مگر انسان اس سے بھی زیادہ مجموعۂ اضداد ہے "کلیم" (دہلی) کے جنوری نمبر ۱۹۳۷ء میں سیّد فرید جعفری مچھلی شہری نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "دنیا کا پہلا افسانۂ محبت"۔ اس میں انھوں نے لکھدیا کہ :-

"حوّا نے اپنے لب پیش کر دیئے اور آدمؑ نے ان پر اپنے لب پیوست کر دیئے"

بس پھر کیا تھا مذہبی دنیا میں آگ لگ گئی۔ ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور سارے مذہب گزیدہ شیر میلے اصحاب فرید صاحب کے خون کے پیاسے ہو گئے۔

ملٹن کی اس عبارت کو کہ :-

"حوّا کے بطیع و دلکش حُسن سے خوش ہو کر آدمؑ مُسکرائے اس تبسم میں اعلیٰ محبت شامل تھی .... آدمؑ نے اس تبسم سے حوّا کے لب پر پاک بوسے دیئے" (فردوسِ گمشدہ)

اگر یہ کہہ کر ٹھکرا دیا گیا تھا کہ وہ کافر ہے اور مسلمان نہیں جو اُسے آدمؑ کی عزت کا پاس اور حوّا کی عصمت کا لحاظ ہوتا تو شر میلے مسلمانوں کو سیّد یامین ہاشمی صاحب کی اس جسارت کے خلاف تو صدائے احتجاج بلند کرنا تھی :-

"آدم پر ایک پُر لطف مستی طاری تھی .... جذبات سے بے خود ہو کر اُنھوں نے کچھ بولنا چاہا مگر آواز لبوں تک آکر رہ گئی۔ اب آدمؑ کے لب تمام جذبات و محسوسات کے مرکز تھے وہ چاہتے تھے کہ ان لبوں کو حوّا کے جسم سے مس کریں۔ جگہ سمجھ میں نہ آئی۔ حوا کے جسم میں ایسے حصّے بھی تھے جو آدم میں مفقود تھے لیکن یہی فقدان بجائے تجسس کے خوف کا باعث ہوا۔ شکل کی شکل سے شفقت ہوتی ہے۔ آدمؑ نے اپنے لب حوّا کے لب سے مس کر دیئے"
("نگار" (لکھنؤ) جنوری ۱۹۳۴ء)

مگر کسی عالم دین اور حامیٔ شرع متین نے کوئی فتویٰ شائع نہیں فرمایا بلکہ شربت کا گھونٹ سمجھ کے مزہ لے کر پی گئے۔

بالکل یہی حال سیماب اکبر آبادی کی نظم "موحدِ اعظم" کا ہے۔ جس وقت سے یہ نظم شائع ہوئی ہے۔ ایک قیامت برپا ہے، ایک حشر قائم ہے وہ کافر قرار دیئے جا رہے ہیں وہ ملحد بنائے جا رہے ہیں اور خدا جانے کیا کیا کہا جا رہا ہے۔ تقریباً ایک سال سے جو یہ ہنگامہ بپا ہوا ہے تو اب تک ختم ہونے کو نہیں آیا ہے۔ شاعروں، ادیبوں اور فسانہ نگاروں نے اُدھر انھیں جتنا کچھ کہا تھا وہ تو کہا ہی تھا مگر اِدھر پھر ۲۸ اپریل ۱۹۴۲ء کے "مدینہ" میں متعدد فتاوے شائع ہوئے ہیں جن میں اُن کے کافر و زندیق ہونے کا دینی فیصلہ صادر فرمایا گیا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ آخر ان اہل فتاویٰ کو دُنیا میں اور کوئی کام ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو وہ اس دورِ اضطراب میں اس قضیے کو لیکر بیٹھے ہیں؟ اور اگر سوائے اس کے اُن کو اور کوئی کام نہیں کہ شاعروں، ادیبوں اور فسانہ نگاروں کے شاعرانہ اور صناعانہ تخیل کو دینی روشنی میں دیکھا کریں۔ یا اسلامی نقطۂ نگاہ سے جانچا کریں۔ تو پھر انھوں نے "شاعرِ اسلام" حضرت اقبال علیہ الرحمہ کو کیوں معاف کر دیا جنھوں نے خود اس خبیث و رذیل "شیطان" کو "موحدِ اعظم" کا لقب دیا ہے۔ اور اس کی ہر جہت سے ثنا خوانی میں آسمان و زمین کے قلابے ملا دیئے ہیں۔ ہم اگر اپنے الفاظ میں حضرت اقبال کے خیالات کی ترجمانی کرینگے تو ممکن ہے کہ ہمیں بھی مردود قرار دیا جائے لہٰذا ہم جناب مسعود احمد قریشی کے مضمون کا وہ حصہ پیش کئے دیتے ہیں جس میں حضرت اقبال کے اس بلند تخیل کی داد "اقبال کا تصورِ ابلیس" کے عنوان سے دی گئی ہے جو لاہور، یعنی مقامِ اقبال ہی سے شائع ہوا تھا۔ وہ فرماتے ہیں :-

"انکارِ سجدہ کی دوسری وجہ داخلی ہے اور یہی اُسکا زیادہ شاندار رُخ ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ ابلیس کا انکار تکبر و غرور کا نتیجہ نہیں۔ ابلیس نے خوب سوچ سمجھ کر یہ اقدام کیا۔

ابلیس اس بات کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ جو جبین نیاز خدائے لم یزل کے سامنے جھکائی جا چکی ہے وہ کسی اور کے حضور میں بھی جھکے۔ اس طرح وہ انسان کو یہ سبق دینا چاہتا تھا کہ "وحدت" کسے کہتے ہیں اور لا الٰہ کا کیا مطلب ہے۔ وہ انسان کو بتلانا چاہتا تھا کہ لا الٰہ کا مظاہرہ اپنی عزیز ترین متاع کھو کر بھی کیا جانا چاہیے وہ دکھانا چاہتا تھا کہ ؎

ہر کس خود گردہم خود گداز است	ز ہر کس مستِ ناز اند ر نیاز ست
بقائے لا الٰہ خونیں قبائے است	کہ بر بالائے نامرداں دراز است

دوسرے وہ عشق کے رمزوں سے خوب واقف تھا وہ جانتا تھا کہ "وصال" محبت کی موت کا پروانہ ہے اور وصال دائم تو ابدی موت، وہ فراق کی لذت سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ وہ "سبکساران ساحل" اور "تن آساں عرشیوں" کے سرد بے کیف ذکر و تسبیح سے متنفر ہو چکا تھا اور ان ہمرہان سست عناصر سے بیزار تھا وہ

نہ چھین لذتِ آہِ سحر گہی مجھ سے
نہ کر نگہ کو تغافل سے التفات آمیز

کا درد چاہتا تھا، وہ سرمایۂ سوز و درد چاہتا تھا۔ لیکن بغیر کسی حسین و لطیف گناہ کے وہ فراق حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا اسکی غیرت عشق گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ کسی بھونڈے طریقے سے اپنے محبوب کو ناراض کر کے اسکا غصہ خرید لے۔ وہ "کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے" کا منتظر تھا۔ چنانچہ اُسے یہ موقع مل ہی گیا کہ اپنے محبوب کی عظمت کی یکتائی کی خاطر وصالِ یار کو بھی قربان کر دے اور اپنی محبت کو بیگانۂ وصال بنا کر دوامی کر لے۔ چنانچہ "جاوید نامے" میں رومی اقبال کو انکار سجدہ کی وجہ یوں بتلاتا ہے ؎

فطرتش بیگانۂ ذوقِ وصال	زہد او ترکِ جمال لایزال
تا گسستن از جمال آساں نبود	کار پیش افگند از ترکِ سجود

اس کے علاوہ اس مجسمۂ قربانی کے دل میں ایک اور خیال بھی تھا جس نے اسکو ترکِ سجدہ پر مجبور کیا اور وہ تھی آدمؑ کی بھلائی۔ وہ اُس کو مجبوری کے گوشے سے نکال کر اختیار کی بلندیوں پر فائز کرنا چاہتا تھا اور اُس کو خلافت ارضی کا تاج پہنانا چاہتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اگر آدمؑ کا کوئی حریف نہ ہوا تو اُس کے قوائے عمل مفلوج ہو جائینگے وہ جانتا تھا کہ ؎

زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش

وہ اسکی پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لانا چاہتا تھا وہ اُسے جنت کی تن آسانیوں سے نکالکر کارگاہِ عالم اور دُنیائے مکافات میں لانا چاہتا تھا۔ جہاں وہ اپنے جوہر کو چمکا سکے اور اپنی فطرت کے مطابق خیر و شر کے دو راہے پر جونسی راہ چاہے منتخب کر سکے۔ چنانچہ ابلیس اقبالؒ سے کہتا ہے ؎

تا نصیب از درد آدم داشتم	قہر یار از بہر او نگذاشتم
شعلہ ہا از کشت زار من دمید	او ز مجبوری بہ مختاری رسید
زشتیٔ خود را نمودم آشکار	با تو دادم ذوقِ ترک و اختیار

یہ مضمون صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ "ادبی دنیا" (اپریل نمبر ۱۹۴۱ء) کے آٹھ صفحے اُن "خیالاتِ اقبال" کی ترجمانی پر صرف ہوئے ہیں جن میں آدم کے بہا بہ پہلو شیطان کے "موحد اعظم" "مجسمۂ قربانی" "عاشقِ خدا" اور "خیر خواہ آدمؑ" ہونے کا ذکر ہے۔

یہ خیالات اقبال کے ہیں تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ انھوں نے سیماب صاحب سے کم کیا کہا ہے۔ اور اس صورت میں وہ اُن تمام لعنتوں کے مستحق کیوں نہیں قرار دئیے جا سکتے۔ جو سیماب اکبر آبادی کے لئے ازروئے فتویٰ لازمی طور سے جائز سمجھی گئی ہیں اور اگر یہ غلط ہے (جسکا کوئی امکان نہیں) تو بھی ہم نہیں سمجھ سکتے کہ حضرتِ اقبال علیہ الرحمہ پر اتنا زبردست بہتان باندھنے والے انشا پرداز کے خلاف ہمارے مفتیوں اور عالموں کے ساتھ ساتھ اقبال پرستوں نے آخر تک کوئی صدائے احتجاج کیوں نہ بلند کی؟ اور اس افترا پردازی سے مضمون نگار کا کیا مقصد تھا؟ اور اگر یہ بات ہے کہ اقبال

چاہے جو کچھ بھی کہیں وہ قابلِ گرفت نہیں اور انھیں پوری آزادی ہے برخلاف اس کے سیماب اپنے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکال سکتے، تو ہم نہیں جانتے کہ تنگ نظری کی اس سے بڑھکے اور کیا مثال پیش کی جا سکتی ہے اور ہم نہیں سمجھ سکتے کہ خود اقبال کی روح کو اس سے کیا تکلیف پہنچے گی۔

یہ تو بحث کا ایک پہلو تھا۔ رہا دوسرا کہ آیا واقعی ابلیس نے سجدہ نہ کرکے اپنے "نافرمان" بننے کا ثبوت دیا یا "عشقِ خدا" کی بہتات میں اُس نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنے "محبوبِ خدا" کو سجدہ کرنے کے بعد کسی انسان کے پتلے کے سامنے سر جھکائے بقول ہمارے مولویوں اور مفتیوں کے نصِ قرآنی یہ ہے کہ :-

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا
اِلَّآ اِبْلِيْسَ۔ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ

لہٰذا اُن کے نزدیک سیماب کا یہ کہنا کہ اُس نے نافرمانی نہیں کی بلکہ وہ ذاتِ احدیت کے عشق میں اسقدر سرشار تھا کہ اُس نے غیر کو اپنا محبوب و مسجود بنانا گوارا نہیں کیا بالکل خلاف حکمِ خدا ہے اور اس جرم سے وہ تمام لعنتوں کے مستحق ہیں۔ ہم حیران ہیں کہ آخر ہمارے ان اہلِ فتاویٰ علما کو ہو کیا گیا ہے؟

آدم کی گندم خوری کے متعلق قرآن میں یہ صریح حکم موجود ہے کہ :-

"وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ"

اُنھیں حکم دیا گیا تھا کہ اس کے نزدیک تک مت جاؤ مگر اُنھوں نے صریحاً حکمِ خدا کی خلاف ورزی کی۔ جس کے لئے خدا نے انھیں ڈانٹا کہ :-

"اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ؟"

اور اس کی سزا میں اُنھیں جنت سے زمین پر پھینکدیا۔

مگر مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ "مثنوی کلید" میں فرماتے ہیں :-

"حضرت آدم نے ارتکاب خلاف کیا ہی نہیں بلکہ
اُنھوں نے اکل حنطہ سے ایک طاعت کی ہے
اور اس سے اُن کی ترقی ہوئی"

ہم حیران ہیں کہ ہمارے علما نے اُن پر کہیں اور کسی جگہ بھی کوئی لعنت نہیں کی ہے دراںحالیکہ ان حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے صریحاً نصِ قرآنی کے خلاف آدمؑ کی "خلاف ورزی" کو "عینِ اطاعت" قرار دیا ہے۔ بہرکیف سیماب صاحب نے اعتراضات کا کیا اثر لیا ہے۔ اور اُن کے بہی خواہوں نے کیا کیا جواب دئیے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم۔ میرے خیال میں تو اس طرح کے غیر شاعرانہ اعتراضات کا بہترین جواب "خاموشی" تھا اور ہے۔ اس لئے کہ یہ اعتراضات اسلامی اور شرعی نقطۂ نظر سے نہیں کئے گئے ہیں ورنہ اُن سے پہلے جن لوگوں نے اس طرح کی جرأت کی ہے اُنھیں بھی ضرور ٹوکا جاتا۔ یہ محض ذاتی عناد کی حیثیت رکھتی ہیں لہٰذا اُن کا نہ جواب دینا ضروری اور نہ اثر لینا عقلمندی ہے ہمارے علمائے سوء کے متعلق بھی ہم سیماب صاحب سے اتنا ہی کہیں گے :-

معاف کردو انہیں دل نہیں گداز اِن کے

عطاء اللہ پالوی

حیرانیاں

بہت مدت ہوئی وہ راہ تک بھی چھوڑ دی میں نے — طبیعت سے مگر آوارہ سامانی نہیں جاتی
معطر ہے تصور کی فضا ہر چند پھولوں سے — مگر دنیائے نظارہ کی ویرانی نہیں جاتی
گذاری تھیں جہاں پر زندگی کی بہتریں گھڑیاں — چمن میں شاخ بھی وہ اب تو پہچانی نہیں جاتی
ہوئی مدت وہ عکس آرا ہوئے تھے محفلِ دل میں — ابھی تک دل کے آئینے کی حیرانی نہیں جاتی

جو ہونا تھا کبھی کا ہو چکا صحرائیؔ الفت میں
تو ان اشکوں کی اب تک کیوں فراوانی نہیں جاتی

صحرائی

محرابِ بیخودی

(تضمین برغزل علامہ سیماب اکبرآبادی مدظلہ العالی)

ترمیم جب سے کی ہے، دستورِ عاشقی میں — اک لطف آچلا ہے، عرفان و آگہی میں
محسوس کر رہا ہوں، تقدیس اپنے جی میں — "پوجا ہے جب سے تجھکو، محرابِ بیخودی میں"
"سو حسن بڑھ گئے ہیں، آدابِ بندگی میں"

بزمِ نشاط پر اب مایوسیاں ہیں طاری — رنج و الم کی ہر سو، کچھ بدلیاں ہیں طاری
دل کی بساط پر بھی بے کیفیاں ہیں طاری — "بعدِ شباب کتنی بے لطفیاں ہیں طاری"
"جیسے کوئی کمی ہو، سامانِ زندگی میں"

آنکھوں سے اشک لیکر، اک کائنات نکلا — ترسے ہوئے دلوں کی، اک وارِدات نکلا
سمجھے تھے جزو جس کو، وہ عینِ ذات نکلا — "آنسو کا قطرہ قطرہ، موجِ حیات نکلا"
"لختِ جگر کسی میں، خونِ جگر کسی میں"

رنگینیٔ جہاں کی، رنگینیاں تو دیکھو — دلچسپ زندگی کی، دلچسپیاں تو دیکھو
ہوتے ہوئے یہ سب کچھ، مجبوریاں تو دیکھو — "معمورۂ فنا کی کوتاہیاں تو دیکھو"
"اک موت کا بھی دن ہے، دو دن کی زندگی میں"

اے قمر کب ہے دنیا صدق و صفا سے خالی — اے قمر کب ہے دنیا نور و ضیا سے خالی
اے قمر کب ہے دنیا ناز و ادا سے خالی — "سیماب کب ہے دنیا حسن و وفا سے خالی"
"اب بھی وفا ہے باقی، لیکن کسی کسی میں"

شہزادہ قمر عثمانی بنگالی

موحدِ اعظم اور مفتیٔ اعظم

مفتی الراندیر و افتاء الکفر بالشعر

از حضرت مولانا مولوی سلیم الدین صاحب جالبؔ مظاہری سہسرامی

(قسط چہارم)

"موحدِ اعظم" پر علمائے حق اور فضلائے عصر کی مزید تازہ اور گرانقدر رائیں

گذشتہ اشاعتوں میں ہندوستان کے تیرہ جلیل القدر علمائے حق کی آرا پیش کی جا چکی ہیں۔ سب نے حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہ کی نظم کو بے عیب، طنزیہ شاعری کا شاہکار، وحدت پرستی کا آئینہ دار، بے ریا عبادت کا ایک پیغام اور ابلیسِ لعین کے کردار اور اس کی لغزش سے مسلمانوں میں صحیح احساس و ذوقِ عبادت پیدا کرنے والا اور موزوں قرار دیا ہے۔ حضرت مولانا جالبؔ سہسرامی کے سلسلۂ مضمون سے پہلے پھر چند رائیں شائع کی جا رہی ہیں۔ گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے متعدد رائیں روک لی گئی ہیں جو آئندہ اشاعتوں میں پیش کی جائینگی۔

(ادارہ)

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب انصاری ندوی سابق ایڈیٹر "خلافت" و ترجمان بمبئی

حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی کی بلند پایہ اور بے مثال نظم "موحدِ اعظم" کے خلاف آجکل اخباری دنیا میں ایک طوفان برپا ہے اور مخالفین کی طرف سے دھڑا دھڑ کفر و الحاد کے فتوے صادر ہو رہے ہیں۔ اس کارِ خیر میں سب سے "زیادہ حصہ" راندیر کے ایک "فرشتہ صورت" بزرگوار لے رہے ہیں۔ جو بقول خود عالم دین ہیں اور مفتی شرع متین بھی ہیں۔

فاضل مفتی نے اس سلسلہ میں جو کچھ ارقام فرمایا ہے وہ درحقیقت ایک مولویانہ بحث ہے اور اس کو "خرافات" سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔ میرا خیال ہے کہ اگر کفر سازی کا یہی عالم رہا تو دنیا کا کوئی شاعر اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ وہ کونسا شاعر ہے جس کے کلام میں اس قسم کی بے شمار مثالیں نہیں پائی جاتیں؟

میرے نزدیک کسی شاعر کے جذبات و احساسات پر پابندی عائد کرنا اور اس کو مذہب اور تاریخ کے معیار پر جانچنا، جیسا کہ مفتی اعظم نے کیا ہے، انتہائی نادانی اور مضحکہ انگیز بات ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جس نے اپنا یہی شعار بنا لیا ہے اور مسلمانوں کو کافر بنانا اس کا مستقل شیوہ ہے۔ اس قسم کے بے شمار جاہلانہ فتووں سے گذر سے ہیں اور ان پر بحث و تمحیص تضیعِ اوقات کے برابر سمجھتا ہوں۔ اس لئے مذکورہ فتویٰ پر تبصرہ کی بجائے، نظم کے متعلق صرف اپنے تاثرات بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

میں نے یہ بحث نظم کو ایک سے زائد بار پڑھا ہے اور ہر مرتبہ نیا لطف پایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظم انتہائی سبق آموز اور عبرت انگیز ہے۔ جس میں شاعر نے

دنیا بھر کے مسلمانوں کو اُن کی بے حسی اور غفلت شعاری سے جھنجھوڑ کر غیرت دلانا مقصود ہے ان کی اطاعت و اتباع کی دعوت دی ہے اور شیطان کی خصلت کا ذکر کرکے

کہیں کہیں کہ مسلمانوں کی کمزوری اور پستی، وہ وہ ہمتی اور کم حوصلگی پر انھیں غیرت دلاکر سرمایہ دارانہ اور آمرانہ و مستبدانہ نظام سے بغاوت و سرکشی کا سبق دیا ہے۔

ناانصافی ہوگی اگر اس نظم کے چند اشعار یہاں پیش نہ کردئے جائیں۔ قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں اور لطف اندوز ہوں۔ مسلمانوں کی ذلت و خواری کا کتنا صحیح نقشہ ہے اور انھیں غلامانہ زندگی سے عار دلاکر کتنے موثر انداز میں آزادی و حریت، خودداری اور سربلندی کا سبق دیا ہے۔ شیطان کے حالات و واقعات بیان کرنے کے بعد سیماب صاحب فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں پڑھئے اور سر دھنئے ؎

وہاں اک ترک سجدہ سے ہوئی یہ برہمی پیدا — فضا گنتے ہوئے ہیں تیرے سجدے کے حساب ان کا

"گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے سے — اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا"

ترے سجدے بہت ارزاں ہوئے دنیا کی رسوائی میں — جبیں اقدس ہوں خدا لاکھوں ہیں تیری کج ادائی میں

کبھی سجدے ہیں تیرے آستانے پر حکومت کے — کبھی ہیں کعبۂ مسجود در دوازے تجارت کے

کبھی تو حُسن کے قدموں پہ سجدہ ریز ہوتا ہے — ترا ہر ایک سجدہ معصیت انگیز ہوتا ہے

درخت و سنگ اور ابر و ہوا مسجود ہیں تیرے — یہ جتنے اہلِ سرمایہ ہیں سب معبود ہیں تیرے

وہی سجدہ خدا کو اور وہی سجدہ ہے انساں کو
ترے نفسِ پرستش پر ہنسی آتی ہے شیطاں کو

ہر وہ شخص جس کو خدا نے بصیرت و بصارت کی روشنی سے محروم نہیں کیا ہے۔ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ اس نظم سے شاعر کا مقصد و مدعا کیا ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان تشریحات و توضیحات سے قطع نظر جو شاعر نے اپنی صفائی میں اور حُسن نیت کے متعلق بیان کئے ہیں۔ ان اشعار کی موجودگی میں کس طرح کافر کہا جاتا ہے؟

اور اگر ایسی چیز کا نام کفر و الحاد ہے جس کی شاعر نے مسلمانوں کو دعوت دی ہے تو کوئی خدارا بتلائے پھر اسلام کیا ہے؟

خادم العلماء

محمد یوسف الانصاری غفرلہ الباری

حضرت مولانا قاری دین محمد صاحب معلم دینیات اسلامیہ ہائی اسکول لودیانہ

مولانا سیماب صاحب اکبرآبادی ایک جلیل القدر شاعر اور بزرگ ہیں۔ آپ کا وجود ہندوستان کے لئے باعثِ صد فخر و ناز ہے۔ چند ماہ ہوئے آپ کی نظم بعنوان "موعظۂ عظیم" جو بظاہر شیطان سے متعلق ہے اور درحقیقت شیطانی وسوسوں کو جلاکر راکھ کر دینے والا پیام ہے۔ رسالہ "ادیب" دہلی میں شائع ہوئی تھی مجھے یہ سُن کر تعجب ہوا کہ مذکورہ نظم کی بنا پر مولانا سیماب کو کافر ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کافر سازی کا فرمش کی مقبولیت پر افسوس صد افسوس!

حضرت سیماب سے میری تو یہی عرض ہے کہ ان ملاؤں کے فتاویٰ کی سمت التفات نہ فرمائیں۔ اپنے کام کو بدستور سابق جاری رکھیں۔

بقلم خود قاری دین محمد

وحدثنی موسی ابن هارون قال حدثنا عمرو بن حماد قال حدثنا — وعن مرة عن ابن مسعود وعن ناس من اصحاب النبی [illegible]

اسباط عن السدی فی خبر ذکره عن ابی مالک وعن ابی صالح عن ابن عباس — ابلیس علی ملک سماء الدنیا [illegible]

وانما سموا الجن لانهم خزان الجنة وكان ابليس مع ملكه خازنا۔

(ترجمہ) باسناد مذکورہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے کہ آسمان دنیا کی سلطنت پر ابلیس کا تقرر کیا گیا اور وہ فرشتوں کے اس قبیلے سے تھا جن کو جن کہتے ہیں اور ان کو جن اس لئے کہا گیا کہ وہ جنت کے خازن تھے، اور ابلیس اپنی سلطنت کا خازن تھا

وحدثنا القاسم بن الحسن قال حدثنا حسين قال حدثني حجاج عن ابن جريج قال قال عباس کان ابليس من اشراف الملائكة واكرمهم قبيلة وكان خازنا على الجنان وكان له سلطان سماء الدنيا وكان له سلطان الارض قال قال ابن عباس کان من الجن انما سمي بالجنان انه کان خازنا عليها كما يقال للرجل مكي ومدني وكوفي وبصري قال ابن جريج وقال آخرون هم سبط من الملائكة قبيلة فكان اسم قبيلة الجن۔

(ترجمہ) باسناد مذکورہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ابلیس معزز ین ملائکہ سے تھا اور ان میں زیادہ مکرم تھا باعتبار قبیلے کے اور وہ جنت کا خازن تھا اور اس کے لئے آسمان دنیا اور زمین کی بادشاہت تھی، فرمایا ابن عباس نے کہ ابلیس کو جن اس لئے کہتے ہیں کہ وہ جنت کا خازن تھا جس طرح کی، مدنی، کوفی اور بصری کہتے ہیں، فرمایا ابن جریج نے اور کہا ابن عباس نے کہ فرشتوں کا ایک قبیلہ ہے جس کا نام جن ہے

وحدثنا القاسم قال حدثنا الحسين قال حدثني حجاج عن ابن جريج عن صالح مولى التوأمة وشريك بن ابي نمر احدهما او كلاهما عن ابن عباس قال ان من الملائكة قبيلة من الجن وكان ابليس منها وكان يسوس ما بين السماء والارض۔

(ترجمہ) باسناد مذکورہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ فرشتوں کا ایک قبیلہ ہے جس کا نام جن ہے اور ابلیس اسی قبیلے سے تھا اور وہ مالک تھا ان چیزوں کا جو آسمان اور زمین کے درمیان تھیں۔

وحدثنا محمد بن المثنى قال حدثني شيبان قال حدثنا سلام بن مسكين عن قتادة عن سعيد بن المسيب قال كان ابليس رئيس ملائكة سماء الدنيا۔

(ترجمہ) باسناد مذکورہ سعید بن مسیب سے مروی ہے، فرمایا انھوں نے کہ ابلیس آسمان دنیا کے فرشتوں کا سردار تھا۔

وحدثنا بشر بن معاذ قال حدثنا يزيد قال حدثنا سعيد عن قتادة قوله واذ قلنا للملائكة اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابليس كان من الجن قبيلة من الملائكة يقال لهم الجن وكان ابن عباس يقول لو لم يكن من الملائكة لم يؤمر بالسجود وكان على خزانة سماء الدنيا جن عن طاعة ربه۔

باسناد مذکورہ حضرت قتادہ سے اللہ تعالیٰ کے قول واذ قلنا للملائكة اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابليس كان من الجن کی تفسیر میں مروی ہے کہ ملائکہ کا ایک قبیلہ تھا جن کو جن کہا جاتا ہے اور حضرت ابن عباس فرماتے تھے کہ اگر ابلیس فرشتوں سے نہ ہوتا تو اس کو سجدہ کا حکم نہ دیا جاتا اور آسمان دنیا کے خزانہ پر اس کا تقرر تھا۔ اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔

وحدثنا الحسين بن يحيى قال اخبرنا عبد الرزاق قال اخبرنا معمر عن قتادة في قوله الا ابليس كان من الجن كان من قبيل من الملائكة يقال لهم الجن۔

باسناد مذکورہ حضرت قتادہ سے اللہ تعالیٰ کے قول الا ابليس كان من الجن کی تفسیر میں مروی ہے۔ فرمایا انھوں نے کہ ابلیس ملائکہ کے اس قبیلہ میں سے تھا جن کو جن کہتے ہیں۔

وحدثنا ابن حميد قال حدثنا سلمة قال حدثنا محمد بن اسحق قال اما العرب فيقولون ما الجن الا كل من اجتن فلم يروا ما قوله الا ابليس كان من الجن اي كان من الملائكة وذلك ان الملائكة اجتنوا فلم يروا وقد قال الله جل ثناءه وجعلوا بينه وبين الجنة نسبا ولقد علمت الجنة انهم لمحضرون وذلك لقول قريش ان الملائكة بنات الله فيقول الله ان تكن الملائكة بناتي فابليس منها وقد جعلوا بيني وبين ابليس وذريته نسبا اهـ۔

ترجمہ باسناد مذکورہ محمد ابن اسحق سے مروی ہے فرمایا انھوں نے کہ اصطلاح عرب میں جن ہر اس مخلوق کو کہتے ہیں جو پوشیدہ ہونے کی وجہ سے

نظر آتے اور اللہ تعالیٰ کا قول الا ابلیس کان من الجن ۔ یعنی ابلیس فرشتوں سے تھا اور یہ اس لئے کہ فرشتے بھی پوشیدہ ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتے اور اللہ تعالیٰ کا قول وجعلوا بینہ وبین الجنۃ الآیۃ اور یہ اس لئے کہ قریش نے کہا فرشتے اللہ کی لڑکیاں ہیں پس اللہ تعالیٰ نے جواب دیا اگر فرشتے اللہ کی لڑکیاں ہیں تو ابلیس بھی ان ہی لڑکیوں میں سے ہے اور قائم کیا میرے اور ابلیس اور اس کی اولاد کے درمیان نسب (قریش نے تو یہ کہا کہ ملائکہ اللہ کی لڑکیاں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اس کی حکایت اس طرح کی کہ قائم کیا میرے اور جنوں کے درمیان نسب، مطلب یہ ہوا کہ فرشتے پر بھی جن کا اطلاق درست ہے جیسے بین الجنۃ نسبا میں ۔

تفسیر ابن جریر میں بھی اقوال صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین اور اللہ تعالیٰ کے قول سے بھی یہی ثابت ہے کہ جن فرشتوں کا ایک قبیلہ ہے اور ابلیس اسی قبیلہ میں سے تھا، یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر اس مخلوق کو جو نگاہوں سے پوشیدہ ہو جن کہہ سکتے ہیں چونکہ فرشتے بھی پوشیدہ ہیں اس لئے ان پر بھی جن کا اطلاق صحیح ہے لہذا کان من الجن کو پیش کرکے راندیری کا یہ کہنا کہ وہ فرشتہ نہیں تھا ان تمام اقوال صحابہ سے دیدہ و دانستہ (چونکہ عالم دین ہیں) انکار کرکے عوام کو دھوکے میں ڈال کر فساد برپا کرنا مقصود ہے۔ اسے کہتے ہیں "جرأت بیباکانہ"!

مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

مفتی صاحب آپ تو "عالم دین" ہیں یہ آیت حافظہ میں تو ضرور ہوگی والفتنۃ اشد من القتل لیکن پھر بھی مولانا سیماب پر کفر کا فتویٰ صادر کرنے کے خبط میں آیت قرآنیہ اور اقوال صحابہ رضوان اللہ علیہم سب کو پس پشت ڈال دیا اور ستم ظرفی یہ کہ آپ اپنے دارالافتاء سے بذریعہ "مدینہ" "خالصاً لوجہ اللہ" کا نعرہ بلند فرمارہے ہیں ؎

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

آئیے مفتی جی! ذرا "تفسیر مدارک" پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔

فسجدوا الا ابلیس۔ الاستثناء متصل لانہ کان من الملائکۃ کذا قالہ علی وابن عباس وابن مسعود رضی اللہ عنہم ولان الاصل ان الاستثناء یکون من جنس المستثنیٰ منہ ولھذا قال ما منعک ان لا تسجد اذ امرتک وقولہ کان من الجن معناہ صار من الجن کقولہ فکان من المغرقین

(ترجمہ) "استثناء متصل ہے اس لئے کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا۔ اور یہی قول حضرت علی ابن طالب اور عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور اس لئے کہ اصل یہ ہے کہ مستثنیٰ مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہو اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ما منعک ان لا تسجد اذ امرتک اور اللہ تعالیٰ کا قول کان من الجن اس کے یہ معنی ہیں کہ صار من الجن (وہ جن سے ہو گیا یعنی سرکشوں سے ہو گیا) یہ ایسا ہی ہے جیسا اللہ تعالیٰ کا قول فکان من المغرقین یعنی صار من المغرقین

اور اس کے فرشتہ نہ ہونے کی دلیلیں "مدارک" میں وہی ہیں جو میں مع جواب اوپر نقل کرچکا ہوں اور ان پر سیر حاصل بحث کرچکا ہوں۔ اس تفسیر میں بھی اس کے فرشتہ ہونے کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس کے بعد اس کا حاصل یہی ہے کہ کمزور دلائل کو کوئی سنی، حنفی "عالم دین" اختیار نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اس کے فرشتہ نہ ہونے کے زیادہ تر معتزلہ قائل ہیں۔ جن کی دلائل تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال سے علمائے دین نے ہر طرح باطل کردئے ہیں۔ لیکن پھر بھی راندیری کا قلم یہ لکھتے ہوئے نہ رکا کہ وہ فرشتہ نہیں تھا۔ کیا وہ بھی علمائے معتزلہ میں سے ہیں؟

مفتی جی! جب "مدارک" کے ملاحظہ کی تکلیف دی گئی ہے تو ایک زحمت اور سہی یعنی اسکا حاشیہ "الاکلیل" بھی ملاحظہ فرمالیجئے تاکہ آئندہ آپ کو زحمت تلاش نہ ہو۔

واختلفوا فی انہ من الملائکۃ فروی عن طاؤس ومجاھد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما انہ کان من الملائکۃ وکان اسمہ عزازیل فلما عصی اللہ لعنہ اللہ وجعلہ شیطانا مریدا وسماہ ابلیس وبھذا قال ابن مسعود وابن المسیب وقتادۃ وابن جریج وابن جریر واختارہ الزجاج وابن الانباری قالوا وھو مستثنیٰ من جنس المستثنیٰ منہ قالوا وقول اللہ تعالیٰ کان من الجن ای طائفۃ من الملائکۃ یقال لھم الجن وقال الحسن وعبدالرحمن بن زید وشھر بن حوشب ما کان من الملائکۃ والاستثناء منقطع والمعنی عندھم ان الملائکۃ وابلیس امروا بالسجود فاطاعت الملائکۃ کلھم وعصی ابلیس والصحیح انہ من الملائکۃ لانہ لم ینقل ان غیر الملائکۃ امر بالسجود والاصل فی الاستثناء ان یکون من جنس المستثنیٰ منہ

ترجمہ۔ ابلیس کے فرشتہ ہونے میں اختلاف ہے [illegible]

ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرشتہ تھا اور اُس کا نام عزازیل تھا جب اُس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے اُس کو ملعون اور شیطان مردود کر دیا اور یہی قول حضرت ابن مسعود اور ابن مسیب اور قتادہ اور ابن جریج اور ابن جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ہے اور اسی کو زجاج اور ابن انباری نے اختیار کیا ہے۔ کہا ہے لوگوں نے کہ یہ مستثنیٰ اجنس مستثنیٰ منہ سے ہے اور قول اللہ تعالیٰ کا کان من الجن کی تفسیر میں بیان فرماتے ہیں کہ ایک جماعت ہے فرشتوں کی جن کو جن کہتے ہیں اور حسن اور عبدالرحمٰن ابن زید نے کہا ہے کہ وہ فرشتہ ہی نہ تھا اور یہ "استثنا منقطع" ہے اُن کے نزدیک معنی یہ ہیں کہ فرشتے اور ابلیس دونوں کو سجدہ کا حکم دیا گیا تھا۔ فرشتوں نے قبول کیا، اور ابلیس نے نافرمانی کی اور صحیح یہی ہے کہ وہ فرشتوں میں سے تھا۔ اس لئے کہ یہ کہیں منقول نہیں کہ غیر ملائکہ کو بھی سجدہ کا حکم دیا گیا تھا، اور اصل مستثنیٰ میں یہ ہے کہ وہ جنس مستثنیٰ منہ سے ہو۔

آئیے! اب ایک تفسیر اور سامنے رہی جاتی ہے، اسے بھی دیکھتے چلیں۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے کہ کس کو دھوکا دینے کو ٹھانی تھی اور کبھی کفر کا فتویٰ دیا تھا وہ بھی شاعر کو! ...."الا ابلیس قال ابن عباسؓ کان ابلیس من الملائکۃ بدلیل انہ استثناہ منہم وقیل انہ من الجن لانہ خلق من النار والملائکۃ خلقوا من النور ولانہ اصل الجن کما ان ادم اصل الانس والاول اصح لان الخطاب کان مع الملائکۃ فھو داخل فیھم ثم استثناہ منہم (تفسیر خازن)

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا دلیل یہ ہے کہ فرشتوں سے اس کو مستثنیٰ کیا، بعض حضرات کا قول ہے کہ وہ جن تھا اس لئے کہ وہ آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور فرشتہ نور سے، اور اس لئے کہ وہ اصل جن ہے جس طرح آدمؑ اصل انس ہیں۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے اس لئے کہ خطاب فرشتوں کو تھا۔ پس وہ داخل تھا فرشتوں میں پھر فرشتوں سے اُس کو مستثنیٰ کیا گیا۔

مگر اس کا کیا علاج کہ مفتی جی یہ ماننے پر تیار ہی نہیں کہ وہ فرشتہ تھا مولانا ہی ذہن میں بسنے کہ گڑے گاڑے جا رہے ہیں کہ وہ تو فرشتہ ہی تھا جلیل القدر فرشتہ، ناظرین یہ نہ خیال کریں کہ ان کی نظر سے یہ چیزیں پوشیدہ تھیں۔ ہاں دنیا کو جاہل ضرور سمجھ لیا گیا تھا کہ دنیا کے سامنے تو سیمابؔ کو کافر ثابت ہی کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ تجدید ایمان کی بھی دعوت دے دی۔ حالانکہ جتنی تفاسیر کے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں سب کی سب نہایت معتبر اور مشہور ہیں اور سب کا لب لباب یہی نکلتا ہے کہ عزازیل فرشتہ ہی نہیں بلکہ جلیل القدر فرشتہ تھا۔

اب "عالم دین" اور شاعر کے قول کا موازنہ کیجئے کہ کس کا پلہ بھاری ہے۔ اور اس میں کون حماقت کا شکار رہا ہے؟

"حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم موحد اعظم[1] ضرور تھے لیکن انسان کامل کی حیثیت سے اور عزازیل موحد اعظم تھا ایک جلیل القدر فرشتہ ہونے کی حیثیت سے اگر شیطان انسان ہوتا تو آپ کا ایراد قابلِ غور تھا۔ اس فرق و امتیاز پر آپ غور کرتے رہتے"!

(سیمابؔ "شاعر" اگست ۱۹۴۱ء)

(اور اب ذاکر کے ساتھ مفتی جی بھی غور فرماتے رہیں۔)

جالب

"قرآن اس کو جن کہتا ہے۔ مولانا اس کو فرشتہ اور جلیل القدر فرشتہ کہتے ہیں جن اور فرشتہ میں بُعد ہے۔ دو متضاد حقیقتیں ہیں جو ایک دوسرے پر صادق[2] نہیں آتیں۔ مجاز یا کسی صفت کے غلبہ کا یہاں گذر نہیں تاکہ تشبیہ وغیرہ کی الجھن میں ناظرین کے خیال کو مشغول کر دیا جائے"

مدی حسن "مدینہ" یکم اکتوبر ۱۹۴۱ء

---

[1] حضرت مولانا سیماب مدظلہ العالی کی اصل عبارت یہ ہے جو نقل کی گئی۔ مفتی جی نے غلط عبارت نقل کی ہے:-

"بیشک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت انسان کامل ہونے کے موحد اعظم تھے اور عزازیل موحد اعظم تھا ایک جلیل القدر فرشتہ ہونے کی حیثیت سے"

"مدینہ" یکم اکتوبر ۱۹۴۱ء

کیوں نہ ہو "عالم دین" ہیں "عالم دین"!!

[2] مفتی جی پر صادق آتی ہے کما سیاتی ہذا مفصلاً

[3] چونکہ مفتی جی فرما رہے ہیں اس لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی تحقیق کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ استغفر اللہ

جالب

دیکھا! آپ نے سیماب کی حماقت کس منظم و کرم اور بزرگ ہستیوں کے اقوال کی کس دلیری سے "مدینہ" کے "عالم دین" نے تردید کر دی ہے! کیا اب بھی یہ کہنے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ مفتی جی نے "جرأت بیباکانہ" سے کام نہیں لیا؟

آپ نے ابلیس کے فرشتہ نہ ہونے کی دلیل میں جتنی آیات پیش کی ہیں، اُن کے متعلق کافی سے زیادہ ثبوت دے دیا گیا کہ اُن آیات سے کوئی بھی اس کے فرشتہ ہونے کے منافی نہیں۔ باقی رہا آپ کا یہ اعتراض کہ "تبلیغ کی ضرورت اُسی وقت ہوتی ہے جب اچھی صورت بدل کر بُری صورت اختیار کرے ورنہ تحصیل حاصل ہے جو علم معقول میں عبث بلکہ محال ثابت ہو چکی ہے۔"

آپ کا یہ نظریہ قابل تسلیم نہیں، کیونکہ تبلیغ اچھی صورت پر مضبوطی سے قائم رکھنے کے لئے بھی کی جاتی ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے:۔

یا ایہا الذین امنوا امنوا باللّٰہ ورسولہ والکتاب الذی نزل علی رسولہ والکتاب الذی انزل من قبل۔

اے ایمان والو ایمان رکھو اللہ اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول (محمدؐ) پر اتاری اور ان کتابوں پر جو پہلے اُتار چکا۔ اور قرآن مجید مکمل تبلیغ ہے اور اس کی یہ آیت ہے ھذا بلغ للناس الآیۃ

اگر آپ کا نظریہ تسلیم کر لیا جائے تو تحصیل حاصل لازم آتی ہے کیونکہ ایمان والوں کو ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اس تبلیغ سے مقصود مستقبل میں مضبوطی سے ایمان پر قائم رہنے کی تاکید ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر خازن۔

قیل ھو خطاب للمومنین والمعنی یا ایہا الذین امنوا فی الماضی والحال امنوا فی المستقبل ودوموا واثبتوا علی الایمان

اسی نوعیت کی تبلیغ پر ابلیس کی تبلیغ کو بھی جو اُس نے ملائکہ میں کی تھی محمول کیا جائے گا۔ جس کے ثبوت میں تفسیر جمل کی یہ عبارت پیش کی جا چکی ہے وعظ الملائکۃ عشرین الف سنۃ اور بھی اس کی تبلیغ کا جو ذکر آیا ہے۔ اسی نوعیت کی تبلیغ کی حامل ہے۔ اس کے بعد آپ کا اعتراض بڑی اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے کیونکہ یہ اعتراض براہ راست آیت کریمہ یا ایہا الذین امنوا امنوا الآیۃ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس روشنی میں اپنے ایمان کی تحقیق کیجئے۔

اور عزازیل کے فرشتہ ہونے کے سلسلہ میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے۔ اُس کی روشنی میں نظم کا دوسرا شعر پڑھئے! اور اپنی سخن فہمی کا ماتم کیجئے۔

فرشتوں کا معلم عالم ملکوت کا عالم
وہ عارف بینۂ جبروت کا ناسوت کا عالم

اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی تفسیر جو گذر چکی ہے اس کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے! "غرض جنات کے قائم مقام فرشتے ہوئے اور ان سب کا مرشد و افسر عزازیل کو مقرر کیا گیا اور معلم ملکوت کے لقب سے اس کو اعزاز بخشا گیا۔"

یہ بات قابل ذکر نہیں کہ مرشد و افسر مُعلِّم یعنی بصیغہ اسم فاعل ہوگا یا مُعلَّم یعنی بصیغہ اسم مفعول، لیکن ہمارا "عالم دین" پوچھتا ہے کہ "یہ دوسری بحث ہے کہ لفظ معلم اسم فاعل ہے یا اسم مفعول" الخ کیا معلم الملکوت کہنے کے بعد بھی اسم فاعل اور اسم مفعول کی بحث کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی جی ان ہی لوگوں میں ہیں جن کے متعلق یہ کہا گیا ہے:۔

آنکس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابد الدھر بماند

اس کے بعد کیا کوئی اجہل بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ مولانا سیماب نے یہ شعر دُنیا کے اعتبار سے کہا ہے۔ حالانکہ ان کے جس خط پر حماقت آمیز تبصرہ کیا گیا ہے۔ اسی میں مولانا سیماب نے ذاکر کو خطاب کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ آپ عزازیل کی حیات ما قبل واقعۂ آدم سے بھی واقف نہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ "وہ ایک جلیل القدر فرشتہ تھا" مولانا سیماب کی عبارت سامنے ہوتے ہوئے بھی "عالم دین" کہتا ہے کہ "سیماب صاحب نے دُنیا کے اعتبار ہی سے اس کی تعریف کی ہے" اور اسی کے تحت دو کفر کا فتویٰ صادر کرتا ہے۔ اب اسے استحواذ شیطانی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے مدیر "مدینہ" اس کو استحواذ میں کوئی نکتہ نظر آ رہا ہو۔ ہاں "عالم دین" کا ایک ادبی اعتراض بھی ملاحظہ فرماتے چلئے۔ اور آپ کی اُردو دانی کی داد دل کھول کر دیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"اس شعر میں ملکوت و جبروت کو بہ سکون یا و لام پڑھا جائے تو شعر میزان عروض میں پورا اترتا ہے ورنہ صحیح تلفظ اور لغوی تحقیق کا لحاظ کیا جائے تو شعر سلامت روانی معلوم

ہو جاتی ہے اور اپنے اصلی وزن سے خارج ہو کر شعر غیر موزوں ہو جاتا ہے۔ عربی و فارسی لغت میں ملک و شجر دونوں میں کلمہ کا تحرّک صحیح اور سکون غلط ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ذکر وہ دونوں لفظ بہ ترکیب فارسی نظم ہوئے ہیں۔"

حق جی! آپ اپنی مولویت کے زعم میں شعرا پر خواہ مخواہ تنقید کر کے اپنی علامیت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ آپ فن شاعری سے نابلد محض ہیں۔ آپ جیسے اجہل کو کیا خبر کہ علم عروض میں یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جب کسی رکن میں تین حرکتیں متواتر پائی جائیں تو وسط کی حرکت کو ساکن کر دیتے ہیں اور اسے "تسکین اوسط" کہتے ہیں۔ جیسے **فَعِلَاتُن** میں تینوں حروف متحرک ہیں، عین کو ساکن کر دیا تو **فَعْلَاتُن** بسکون عین وہ گیا اس کو **مَفْعُولُن** سے بدل دیتے ہیں۔ اس حالت میں یہ رکن **مسکن** کہلاتا ہے۔ تسکین اوسط زحافات عامہ میں سے ہے ہر بحر ہر مقام پر آ سکتا ہے اسی قاعدہ کو ملحوظ رکھ کر حضرت مولانا سیماب مدظلہ العالی نے ملکوت و جبروت کو تقطیع میں بہ سکون با و لام نظم کیا ہے۔

آیئے! ذرا "دریائے لطافت" میں بھی آپ کو غوطے دے کر آپ کی کثافت ذہنی کا ازالہ کر دوں۔

توالی حرکات

عربی میں ایک کلمہ میں توالی حرکات اربعہ ممنوع ہے یہی حال ہندی میں توالی حرکات ثلاثہ کا ہے۔ مثال شرف الفسا، دوسرے حرف 'ر' کو سکون کے ساتھ بولنا اچھا ہے اس کے فتح کے ساتھ غلط اور مکروہ ہے اگرچہ اصل کے اعتبار سے صحیح ہے۔ اسی طرح تمکرانہ 'کاف' کے سکون کے ساتھ اور 'نظر دن' 'ظ' کے سکون کے ساتھ بولنا اور باندھنا صحیح اور فصیح ہے۔ دیکھا آپ نے! کہ آپ بقول خود "اجہل" ہی نہیں بلکہ اس سے بھی اسفل درجہ میں ہیں۔ اور سنئے! صاحب غیاث فرماتے ہیں۔ "صحف" بضم اوّل و فتح ثانی بضمتین نیز جمع صحیفہ از منتخب، مگر در استعمال فارسیان بہ سکون ثانی نیز آمدہ چنانچہ نظامی گوید ع گلہ صحف پیشینیاں در سر گیر۔ و ہمچنیں لفظ ظلمات اور لفظ کتب بہ سکون ثانی آوردہ اند۔ یہ لغت ہی سے لکھا جا رہا ہے اور فارسی لغت سے آپ نے شاید لغت مدینہ میں دیکھا ہوگا جو آپ ہی کے سینے میں محفوظ ہے۔

یہ فارسی شعرا کا قاعدہ ہے جسے آپ غلط کہہ رہے ہیں اور ان ہی کی تقلید میں شعرائے اردو بھی اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔ حضرت مفتی امیر احمد مینائی فرماتے ہیں:۔

میکدے میں کہیں پڑے ہوں گے
شب جمعہ ہے آج امیرؔ کہاں

خط کشیدہ لفظ بہ ترکیب فارسی نظم ہوا ہے اور لغت میں بضمتین ہے۔ چونکہ مفتی امیر احمد صاحب شاعر بھی تھے اس لئے وہ اس قاعدہ سے واقف تھے اسی لئے لفظ جمعہ کو بہ سکون میم استعمال کیا ہے۔

لسان الغیب حضرت حافظ شیرازی فرماتے ہیں:۔

سواد موئے تو تفسیر جاعل الظلمات
بیاض روئے تو تبیان فالق الاصباح (حافظ)

ظلمات لغت میں بضمتین ہے لیکن شعر میں بہ سکون لام نظم ہوا ہے۔ جب توالی حرکات کا یہ قاعدہ مسلمہ ہے اور اسی طرح استعمال فصیح بھی ہے تو اس سے کسی استاد کی قدرت کلامی پر کیوں کر حرف آ سکتا ہے؟ اب تو آپ کو یقین ہو جانا چاہئے کہ آپ اپنے اعتراض میں بقول خود اجہل ہی نہیں بلکہ احمق بھی ہیں۔ مولانا سیماب نے شاید فطرت نے آپ ہی جیسے کور مغز منقد کے لئے یہ کہلایا تھا ع

"جنھیں یہ بھی نہیں معلوم نظریں ہیں کہاں میری" (سیماب)

مفتی صاحب! بغیر جزئی، کلی کی بحث چھیڑے آپ سے نہ رہا گیا۔ حضرت! اس میدان کے تو مرد آپ ہی لوگ ہیں کہ روز و شب اس بحث میں مشغول رہتے ہیں کہ آقائے نامدار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم جزئی تھا یا کلی اور اسی سلسلہ میں ایک دوسرے پر کفر کا فتویٰ صادر فرماتے رہتے ہیں۔ شاعر کبھی ایسی بحث کی جراءت نہیں کر سکتا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر کسی نوعیت سے بھی حرف آنے کا شائبہ ہو۔ یہ "جراءت بیباکانہ" آپ ہی جیسے حضرات کو مبارک ہو۔ شاعر کو تو اس سے بحث نہیں۔ شاعر تو بس اسی قدر جانتا ہے کہ ع

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔

"جب شیطانی مراتب اسما، و صفات خداوندی کا عالم و عارف تھا جس کو عالم ملکوت و جبروت کہتے ہیں جب عالم ناسوت کا

مسلم عالم تو تھا جو علم صحیح و عرفان کا حامل تھا تو اس سے یہ ناپسندیدہ فعل اور کفر و انکار کس طرح سرزد ہوا؟"

مفتی جی! آپ نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اعتراض تو بہت خوب کیا ذرا اسے اپنے خزانۂ خیال میں محفوظ رکھئے۔ دیکھئے بھول نہ جائے گا اس سلسلہ میں ایک حدیث شریف پیش کرتا ہوں ———— اس حدیث شریف میں جو جواب عصیان آدم کا ہے وہی جواب انکار ابلیس کا بھی ہوگا۔

عن ابی ہریرہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احتج آدم وموسیٰ عند ربہما فحج آدم موسیٰ قال موسیٰ انت آدم الذی خلقک اللہ بیدہ ونفخ فیک من روحہ واسجد لک ملائکتہ واسکنک فی جنتہ ثم اھبطت الناس بخطیئتک الی الارض قال آدم انت موسیٰ الذی اصطفاک اللہ برسالتہ وبکلامہ واعطاک الالواح فیہا تبیان کل شیٔ وقربک نجیا فبکم وجدت اللہ کتب التوراۃ قبل ان اخلق قال موسیٰ باربعین عاما قال آدم فہل وجدت فیہا وعصیٰ آدم ربہ فغویٰ قال نعم قال اتلومنی علی ان عملت عملا کتبہ اللہ علی ان اعملہ قبل ان یخلقنی باربعین سنۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فحج آدم موسیٰ

رواہ مسلم

ابوہریرہؓ سے مروی ہے فرمایا انھوں نے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ آدمؑ و موسیٰؑ نے اپنے رب کے پاس باہم مناظرہ کیا۔ جس میں آدمؑ موسیٰؑ پر غالب آئے۔ موسیٰؑ نے کہا آپ وہ آدمؑ ہیں جن کا پتلا اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے بنایا۔ اس میں اپنی (پیدا کی ہوئی) روح ڈالی، ملائکہ سے سجدہ کرایا اور جنت میں بسایا۔ پھر آپ نے اپنے گناہ کے سبب آدمیوں کو زمین پر اتار دیا۔ آدمؑ نے کہا آپ وہی موسیٰؑ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت و کلام سے سرفرازی بخشی اور وہ الواح دیئے جن میں ہر ایک چیز کا بیان تھا اور اپنی ہمکلامی کا خاص قرب عنایت کیا۔ تو یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے توریت کو میری پیدائش سے کتنا پہلے لکھا ہے۔ موسیٰؑ نے کہا چالیس سال۔ آدم نے کہا کیا اس میں یہ نہیں دیکھا وعصیٰ آدم ربہ فغویٰ (اور آدمؑ نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور (راہ صواب سے) بھٹک گئے) موسیٰؑ نے کہا بیشک یہ اس میں موجود ہے۔ تب آدمؑ نے کہا تو آپ مجھے اس کام کرنے پر ملامت کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے میرے پیدا کرنے سے چالیس سال پیشتر لکھ دیا تھا کہ وہ مجھ سے ظہور میں آئے گا۔ پس آدمؑ موسیٰؑ پر غالب آئے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حضرت آدمؑ و موسیٰؑ نے باہم مناظرہ کیا۔ موسیٰؑ کہنے لگے اے آدمؑ آپ ہمارے باپ ہیں۔ اور آپ نے ہم کو یہ نقصان پہنچایا کہ ہمیں جنت سے باہر نکالا۔ یہ سن کر آدمؑ بولے آپ وہی موسیٰ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام سے سرفراز کیا اور اپنے ہاتھ سے توریت لکھ کر عنایت فرمائی تو پھر اس بات پر جو اللہ تعالیٰ نے میری پیدائش سے چالیس سال پہلے مقدر فرما دی تھی آپ مجھے کیسے ملامت کرتے ہیں۔ پس آدمؑ موسیٰؑ پر غالب آئے (یہ جملہ آنحضرتؐ نے تین بار فرمایا یعنی آدمؑ کا جواب ٹھیک تھا جس کے سننے سے موسیٰؑ خاموش ہوگئے۔

ایک دوسری روایت میں اس طرح آیا ہے کہ آدمؑ اور موسیٰؑ نے باہم مناظرہ کیا جس میں آدمؑ موسیٰؑ پر غالب آئے۔ موسیٰؑ نے کہا آپ وہ آدمؑ ہیں جنھوں نے لوگوں کی راہ ماری اور انھیں جنت سے نکالا آدمؑ نے فرمایا کہ آپ وہی موسیٰؑ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کا علم تمام عطا کیا اور اپنی رسالت سے لوگوں میں ممتاز فرمایا موسیٰؑ نے کہا ہاں وہی ہوں آدمؑ بولے تو پھر اس بات پر جو میرے مخلوق ہونے سے پہلے مقدر ہو چکی تھی آپ مجھے کیسے ملامت کرتے ہیں۔

نیز حضرت مجاہدؓ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ شیطان اس کی نافرمانی کریگا اور اسی واسطے اس کو پیدا کیا گیا۔

حضرت قتادہؓ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اس خلیفہ کی نسل میں انبیاء، رسول، صلحا اور ایسے لوگ پیدا ہونگے جو آخرت میں جنت میں جائیں گے

ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ اعلم ما لا تعلمون کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کی نسبت مجھے وہ علم ہے جو تم کو حاصل نہیں۔"

(شفاء العلیل فی مسائل القضاء والقدر والحکمۃ والتعلیل مصنفہ علامہ ابن قیم) (باقی۔ باقی)

جالب سہرامی

صحت نامہ مضمون "موحد اعظم" اور "مفتی اعظم" مطبوعہ مئی سنہ ۱۹۴۲ء

صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح
۵۱	اول	۱۵	الآیتہ	الآیۃ
"	دوم	۵	الی یتخذہ	ان یتخذہ
"	"	۸	صاعر	صار
۵۲	اول	۱	مستحق نہیں	بہتر نہیں
"	"	۴	وکآیۃ نزل	والآیۃ تدل
"	"	۱۳	اس لئے کہ	صحیح ہوگا اس لئے کہ
"	"	۱۵	فحبوا للائکۃ	نسجد الملائکۃ
"	"	۱۷	اذالاصل	اذ الاصل
"	دوم	۲۷	وکان الغالب	وان کان الغالب
"	"	"	عوام العصمۃ	عدم العصمۃ
۵۳	اول	۵	لا یخاف	لا یخالف
"	"	۲	یتمنها	یشملها
"	"	۱۶	بالنور الجواهر	بالنور الجوهر
"	"	۱۹	نکفت	نکمت
"	دوم	۱	اس پر پرہیز	اس سے پرہیز
۵۴	اول	۱۱	وهو النز	وهو الستر
"	دوم	۳	سے لفظ "جن"	سے اطلاق لفظ "جن"
"	"	"	ان الملائکۃ	(ثانیها) ان الملائکۃ
"	"	۱۹	افتتخذونہ	افتتخذونہ
"	"	۲۱	فیهم	ولا انثی فیهم
"	"	"	جعلوا الملائکۃ	جعلوا الملائکۃ
"	"	۲۳	اشهدوا افلقهم	اشهدوا خلقهم
۵۵	اول	۲	وجعلوا الملائکۃ	وجعلوا الملائکۃ
"	"	۱۱	مرابعها	مرابعها
"	دوم	۵	جواب دو برو	جواب الدید
۵۶	اول	۳	مشتبین ان کو	منقضین کی ان کو
۵۶	اول	۱۳	علی ذلک سمیۃ وعقلیۃ	علی ذلک بوجوہ سمعیۃ وعقلیۃ
"	"	۲۲	ادین فرصت	اولین فرصت
"	"	۲۶	او نبحو	اولصح
"	"	۲۷	المنتقطم	المنقطع
"	دوم	۲	تحسدوا	نسجدوا
"	"	۱۱	الہ	انہ
"	"	۲۷	یقتل	ان یقتل
"	حاشیہ	"	مبافۃ العبرۃ	ساقطۃ العبرۃ
۵۷	اول	۲۲	فی الملائکۃ	من الملائکۃ
"	"	۲۳	متناولہ	متناولاً
"	دوم	۱	نشاعر	نشاء
"	"	۸	مع شرۃ	مع شدۃ
"	"	۹	شوہ المخالطۃ	شدۃ المخالطۃ
"	"	۱۲	السجدوا	اسجدوا
"	"	۲۷	شدت مخالطت کی وجہ سے	شدت مخالطت سے، اسی طرح شدت، مخالطت کی وجہ سے
۵۸	اول	۸	استجدوا	اسجدوا
"	دوم	۱	حادث	حارث
"	"	۲۰	یسمون	یسمّون

تصحیح مضمون "موحد اعظم" اور "مفتی اعظم" مطبوعہ شمارہ اپریل سنہ ۴۲ء

غلط	صحیح
ولم یخش الا اللہ نفسی	ولم یخش الا اللہ تعالی
ان یکونو	اولئک ان یکونوا

جالب بسرامی

مشاعرۂ شاعر

مصرعِ طرح :- "مقاماتِ فتح و ظفر اور بھی ہیں"

محسنِ ادب حضرت نشتر ہنگامی

مری طرح خستہ جگر اور بھی ہیں
سزاوارِ لطفِ نظر اور بھی ہیں

نگاہیں جو عبرت نگر اور بھی ہیں
تو پہنا حدودِ نظر اور بھی ہیں

جلا کر مری دل کو خوش ہو نہ ظالم
ابھی اس میں پنہاں شرر اور بھی ہیں

کوئی جنگ پر مرنے والوں سے کہدے
"مقاماتِ فتح و ظفر اور بھی ہیں"

جو تیری نظر میں ہیں اُنکے علاوہ
کئی زخم اے چارہ گر اور بھی ہیں

چمک پھر کہیں اور اے برقِ جلوہ
پہاڑ اور بھی ہیں شجر اور بھی ہیں

خودی ہی تو پردہ نہیں مردِ نشتر
کئی پردہ ہائے نظر اور بھی ہیں

نقین کے پردے اُٹھا کر تو دیکھیں
حجاباتِ اہلِ نظر اور بھی ہیں

محبت ہی پر کیا ہے موقوف انور
سوائے محبت ہنر اور بھی ہیں

حضرت فضل الدین اثر

تری انجمن میں ٹھہر جاؤں کیونکر
نگاہوں میں شام و سحر اور بھی ہیں

نشیمن کے برباد ہونے کا غم کیا
نشیمن کو شاخ و شجر اور بھی ہیں

سمجھ سوچ کر برق ٹوٹے قفس پر
مرے ساتھ بے بال و پر اور بھی ہیں

نہیں ماہ و انجم پہ موقوف تیرے
مرے آشنائے نظر اور بھی ہیں

نہ رہ جا فروغِ سمن میں اُلجھ کر
چراغِ سرِ رہگذر اور بھی ہیں

پکارو بہاروں کی شہزادیوں کو
کہ جیب و گریبان و سر اور بھی ہیں

نہیں ہم ہی حسن و محبت کے عارف
اثر کچھ یہاں باخبر اور بھی ہیں

حضرت آلم مظفر نگری

دل آزردہ خستہ جگر اور بھی ہیں
طلبگار لطفِ نظر اور بھی ہیں

نگاہوں سے پوشیدہ اے چارہ فرما
ابھی چند زخمِ جگر اور بھی ہیں

ابھی کو ہے صیاد ؟ حکمِ رہائی
قفس میں تو بے بال و پر اور بھی ہیں

سُن اے داورِ حشر میری خطائیں
ابھی لائقِ درگزر اور بھی ہیں

کوئی، تیز پا چلنے والوں سے کہدے
سرِ راہ گرمِ سفر اور بھی ہیں

ترا سنگِ در، سنگِ در ہی، وگرنہ
زمانے میں دیوار و در اور بھی ہیں

آلم چھوڑیئے ذکر فرہاد و مجنوں
یہ قصے تو دیوانہ گر اور بھی ہیں

حضرت شاعر نہٹوری ایڈوکیٹ سوا سرا

مقدر میں کچھ خیر و شر اور بھی ہیں
کئی مرحلے پُر خطر اور بھی ہیں

ابھی شعلے بنکر بھڑکنے کے قابل
ہمارے دلوں میں شرر اور بھی ہیں

میں امیدِ پرواز کیوں چھوڑ بیٹھوں
ابھی میرے بازو میں پر اور بھی ہیں

مرے سر ہی کیوں ہوگئی بادِ صرصر
چمن میں شجر بارور اور بھی ہیں

بعجلت پہونچنے کو منزل بہ منزل
کمربستہ اہلِ سفر اور بھی ہیں

ابھی ہم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے؟
کمالاتِ حسنِ نظر اور بھی ہیں

نہیں لالہ و گل پہ موقوف شاعر
حریفانِ داغِ جگر اور بھی ہیں

حضرت انور بھوپالی

محبت میں شوریدہ سر اور بھی ہیں
ہمیں اک نہیں بے خبر اور بھی ہیں

تمہیں اب اگر میری پروا نہیں ہے
تو پروا نہیں چارہ گر اور بھی ہیں

غمِ عشق ہے بہترین مشاغل
ہمیں ورنہ کارِ دگر اور بھی ہیں

دل و دیدہ پر ہی نہیں منحصر کچھ
کہ انکے سوا پردہ ور اور بھی ہیں

اگر ساری دنیا ہو مفتوح پھر بھی
"مقاماتِ فتح و ظفر اور بھی ہیں"

جناب عزیز اختر وارثی سرحدی

زمانے میں آشفتہ سر اور بھی ہیں
ہمیں تو نہیں بے خبر اور بھی ہیں

پڑا رہنے دو ہم کو بھی اپنے در پر
یہاں کچھ خرابِ نظر اور بھی ہیں

ترے نقشِ پا کے برابر برابر
"مقاماتِ فتح و ظفر اور بھی ہیں"

عدم سے یہاں تک یہاں سے عدم تک
کئی راستے پُرخطر اور بھی ہیں

وہ تعبیر فرمائے محفل تو ہولیں
ابھی یادِ خوابِ سحر اور بھی ہیں

مرے سوختہ آشیاں کے مقابل
ہزاروں فلک بوس گھر اور بھی ہیں

رہی کائناتِ محبت میں اخترؔ
طریقِ فروغِ نظر اور بھی ہیں

حضرت مولانا جالبؔ سہرامی

تری بزم میں باخبر اور بھی ہیں
شناسائے طرزِ نظر اور بھی ہیں

خبردار! اے جذبۂ شوقِ منزل
مواقع ابھی پُرخطر اور بھی ہیں

مبارک ہو موسیٰؑ کو وادیٔ ایمن
مناظر، نشاطِ نظر اور بھی ہیں

ہٹا دے حجابِ فروغِ تجلّی
سراسیمہ قلب و جگر اور بھی ہیں

یہ گردوں، یہ شمس و قمر، یہ ستارے
ہمارے رفیقِ سفر اور بھی ہیں

کوئی اجہل الناس مفتی سے کہدے!
ترے جہل سے باخبر اور بھی ہیں

یہ جالبؔ ہی معتوب کیوں ہے؟ الٰہی
خطاوار تیرے، بشر اور بھی ہیں

جناب منظرؔ کلیمی جام پوری

ادھر بھی کرم ہو ادھر اور بھی ہیں
ترے در پہ مستِ نظر اور بھی ہیں

فقط اک جنوں ہی نہیں خضرِ منزل
رہِ عشق کے راہبر اور بھی ہیں

ترے در پہ کیوں جھک رہی ہے خدائی
یہاں سجدہ کرنے کو در اور بھی ہیں

ترے ظلم میں کچھ عجب لذتیں ہیں
یہ مانا کہ بیداد گر اور بھی ہیں

مری ہی صدا پر ہے کیوں لن ترانی
ترے در پہ دریوزہ گر اور بھی ہیں

بہت بہہ چکے لیکن آنکھوں میں اب بھی
گہر ہائے تابندہ تر اور بھی ہیں

خدایا ہے کیوں مرکزِ درد منظرؔ
زمانے میں لاکھوں بشر اور بھی ہیں

جناب شمسؔ زبیری مرادآبادی

رہِ عشق سے باخبر اور بھی ہیں
ترے آستانے پہ سر اور بھی ہیں

نہ ٹھکراؤ میری جبینِ محبت
دگرنہ یہاں سنگِ در اور بھی ہیں

مسافر سرِ جادہ آرام کیسا!
ابھی راستے پُرخطر اور بھی ہیں

نہ کر اس کو محدود دیر و حرم میں
ارے بے خبر اُسکے گھر اور بھی ہیں

تعلق ہے مجھکو ترے سنگِ در سے
جو اور آستاں ہیں تو سر اور بھی ہیں

رہِ عشق میں میں اکیلا نہیں ہوں
مرے ساتھ گرمِ سفر اور بھی ہیں

تمھیں سے شکایت نہیں بے رُخی کی
مرے حال سے بے خبر اور بھی ہیں

جناب ظرفہؔ قریشی بھنڈاروی

مری طرح لختِ جگر اور بھی ہیں
شکارِ خدنگِ نظر اور بھی ہیں

ہیں اک نہیں جلوہ بینِ حقیقت
ہماری طرح دیدہ ور اور بھی ہیں

سمجھتا ہے صیاد کیوں مجھکو بے بس؟
ابھی میرے بازو میں پر اور بھی ہیں

نشیمن مرا شاخِ گل ہی پہ کیوں ہو
گلستاں میں شاخ و شجر اور بھی ہیں

نہیں دیر و کعبہ ہی پر منحصر کچھ
ہمیں تم سے ملنے کو گھر اور بھی ہیں

جبیں میری وقفِ درِ یار کیا ہو
کہ اس آستانے پہ سر اور بھی ہیں

مجھے اپنے فن پر ہو کیا ناز ظرفہؔ!
یہاں مجھ سے اہلِ ہنر اور بھی ہیں

جناب شادؔ اٹاوی

شہیدانِ تیغِ نظر اور بھی ہیں
محبت کے زیرِ اثر اور بھی ہیں

تجھے ناز کیوں بے خودی پر ہے اپنی
خبردار ملے بے خبر اور بھی ہیں

بس اک در سے نسبت ہے میری جبیں کو
مجھے کیا جو دیوار و در اور بھی ہیں

نگاہ و دل و خضر ہی پر نہ بس کر
رہِ عشق میں راہبر اور بھی ہیں

انھیں چاند تاروں کی بستی سے آگے
"مقاماتِ فتح و ظفر اور بھی ہیں"

یہ سنسان وادی و صحرا ہی کیا ہے
محبت کے بندوں کے گھر اور بھی ہیں

فقط اک انھیں کی نوازش نہیں ہے
مرے شادؔ دیوانہ گر اور بھی ہیں

جناب سلیمؔ سہروردی گوالیاری

"مقاماتِ فتح و ظفر اور بھی ہیں"
نظارے سرِ رہگذر اور بھی ہیں

جو گلچیں سے چھوٹا تو بجلی پکاری
ٹھہر جا کہ بیداد گر اور بھی ہیں

غمِ دل کبھی کھل ہی جائیگا اُن پر
کہ اس راز کے پردہ در اور بھی ہیں

نہیں میں ہی کیفِ تجلی سے بیخود
ہلاکِ خدنگِ نظر اور بھی ہیں

میں گھبراؤں کیا جادۂ زندگی سے
ابھی اس سے مشکل سفر اور بھی ہیں

تصوّر کے صدقے وہ کھنچتے ہیں جتنے
مرے اُسے نزدیک تر اور بھی ہیں

سلیمؔ حزیں پر چمن خندہ زن ہے
کہیں ایسے آشفتہ سر اور بھی ہیں

جناب زارؔ کاندھلوی

جو تھے کوہِ فاراں کی چوٹی پہ رخشاں
وہ جلوے کہیں جلوہ گر اور بھی ہیں

انھیں بھی تو لے شمعِ محفل جلا کے
پتنگوں کے کچھ بال و پر اور بھی ہیں

چلا چل، نہ کر دیر، آگے ٹھہرنا
تری راہ میں منتظر اور بھی ہیں

ابھی فیضِ سیماب جاری ہے ہر سُو
ابھی ذوق و غالب ظفر اور بھی ہیں

ہے قابو میں گر دامنِ صبر و ہمت
"مقاماتِ فتح و ظفر اور بھی ہیں"

نظر جنگی سے کیمیائے حقیقت
ابھی ہم میں ایسے بشر اور بھی ہیں

ابھی سے لیے زار تسکرا لم کیا
محبت کے شہر میں ثمر اور بھی ہیں

ہے شاعر گری تیرا منصب سلیماں
مگر دہر میں شعر گر اور بھی ہیں

جناب جنوں الہ آبادی

مناظر فریبِ نظر اور بھی ہیں
ترے جلوے دیوانہ گر اور بھی ہیں

درِ گوشئہ پُرناز فرمانے والے
مری چشمِ تر میں گہر اور بھی ہیں

حرم سے کچھ آگے ہے چشمِ تماشا
مقاماتِ سیر و سفر اور بھی ہیں

اُٹھا پردہ چشم اور ناوک افگن
کہ محفل میں بخستہ جگر اور بھی ہیں

بتا تو ہی سلسلے میری وحشت کے تا کی؟
ترے جیسے آہو نظر اور بھی ہیں

فلک یہ تو شرمندہ ہیں داغِ دل سے
ترے پاس شمس و قمر اور بھی ہیں؟

جنوں اُن سے کہہ دو ابھی دل نہ تھا میں
ابھی نالے وحشت اثر اور بھی ہیں

جناب اختر اعظمی

ہلاکِ نگاہ و نظر اور بھی ہیں
ہمیں کیا ہیں تفتہ جگر اور بھی ہیں

ترے ہی لئے ہیں سجودِ محبت
اگرچہ یہاں سنگِ در اور بھی ہیں؟

نہ کر ناز دل پر مرے فتح پا کر
"مقاماتِ فتح و ظفر اور بھی ہیں"

ابھی میری دیوانگی پر نہ ہنسئے
ابھی لوگ شوریدہ سر اور بھی ہیں

ابھی ہے وہی آرزوئے تجلی
تو کیا جلوے کچھ طور پر اور بھی ہیں؟

سخن گوئی پر ناز بیجا ہے اختر
کہ دنیا میں اہلِ ہنر اور بھی ہیں

جناب شفیق کوٹی

"مقاماتِ فتح و ظفر اور بھی ہیں"
نہیں صرف دل یا جگر اور بھی ہیں

مقامِ تجلی کوئی پھر بتاؤ
کہ مشتاق اہلِ نظر اور بھی ہیں

نہیں خیر جانِ حزیں کی ہماری
جُدائی کی گھڑیاں اگر اور بھی ہیں

کمر بستہ جتنے مظالم پہ وہ ہیں
ہم اتنے ہی سینہ سپر اور بھی ہیں

نہیں طور و ایمن میں محدود جلوے
مقاماتِ اہلِ نظر اور بھی ہیں

شفیق اُن کا چھپنا بھی ہے اک کرشمہ
چھپے ہیں تو وہ جلوہ گر اور بھی ہیں

جناب باقی اعظمی

مری طرح سینہ سپر اور بھی ہیں
لئے اپنے ہاتھوں پہ سر اور بھی ہیں

محبت ہی تیری ہو دیوانہ گر کیوں
خیالات دیوانہ گر اور بھی ہیں

ہوا کون میری طرح تجھ سے واقف
یہ مانا کہ بالغ نظر اور بھی ہیں

تری بزم میں آکے اب میں یہ سمجھا
مرے دانے سے باخبر اور بھی ہیں

مری شاخ ہی کیوں ہو بجلی کی زد میں
چمن میں ہزاروں شجر اور بھی ہیں

کسی کا اثر کیوں نہیں دل پہ ہوتا
زمانہ میں جادو نظر اور بھی ہیں

غمِ ہجر کی سختیاں کیا ہیں باقی
مناظر ابھی غم اثر اور بھی ہیں

جناب اقبال ماہر الہ آبادی

تری طرح دیوانہ گر اور بھی ہیں
مری طرح شوریدہ سر اور بھی ہیں

مہ و شبنم و گُل کی دُنیا سے آگے
مقاماتِ سیرِ نظر اور بھی ہیں

سلامت رہے یہ مرا شوقِ سجدہ
جبیں کے لئے سنگِ در اور بھی ہیں

مہ و مہر و سیارگاں کے علاوہ
مرے ہمسفر و ہمسفر اور بھی ہیں

سمندر کی تاریک گہرائیوں میں
صدف اور بھی ہیں گہر اور بھی ہیں

ابھی ناتراشیدہ حالت میں ماہر
مضامینِ نو کے گہر اور بھی ہیں

حضرت سلیماں نقشبندی مجددی جالندھری

"مقاماتِ فتح و ظفر اور بھی ہیں؟
مکاں لامکاں سے اُدھر اور بھی ہیں؟

تجسس کرو فتح نرد اور بھی ہیں
کہ کلبس ہو بحر و بر اور بھی ہیں

سوادِ سمندِ نظر اور بھی ہیں
ٹھہلے تیرے ہمسفر اور بھی ہیں

نظر نرگسِ زار پر کرنے والے
یہاں سیکڑوں دیدہ ور اور بھی ہیں

اثر لیلیٰ قیس سے لینے والے
یہاں چند دیوانہ گر اور بھی ہیں

جناب ہنر مالیگانوی

شجر اور بھی ہیں ثمر اور بھی ہیں
بہاریں چمن سے اُدھر اور بھی ہیں

مناظر رہین نظر اور بھی ہیں
"مقاماتِ فتح و ظفر اور بھی ہیں"

سرِ طور پھر جلوہ گر ہو کسی دن
کہ مشتاق اہلِ نظر اور بھی ہیں

کوئی تم سے بڑھکر ستمگر نہ ہوگا
زمانے میں بیداد گر اور بھی ہیں

بغاوت کی تحریک ایدل ہو جائی — کہ زنداں میں شوریدہ سر اور بھی ہیں
جو عامل نہ ہوگا وہ کامل نہ ہوگا — ترقی کی شرطیں ہنر اور بھی ہیں

جناب عباس انصاری دھولیوی

یہ مانا کہ اہلِ نظر اور بھی ہیں — مگر مجھ سے جلوہ نگر اور بھی ہیں؟
شباب اک تمہیں پر نہیں چھٹ پڑا ہے — جوانی کے زیرِ اثر اور بھی ہیں
نہ جا کور چشمی پہ غنچوں کی ناداں — ابھی باغ میں دیدہ ور اور بھی ہیں
ذرا ڈوب جا اور گہرائیوں میں — تہِ موجِ دریا گہر اور بھی ہیں
بچا لے چلے آئے ہم جن سے دامن — وہ کانٹے سرِ رہ گذر اور بھی ہیں
تمہیں کو تو عباس وحشت نہیں ہے — محبت میں شوریدہ سر اور بھی ہیں

جناب خلیل ازسگولی

جفائیں اگر فتنہ گر اور بھی ہیں — تو کچھ آرزوئیں ادھر اور بھی ہیں
تری تابشوں کی قسم برقِ ایمن — طلبگارِ جلوہ نگر اور بھی ہیں
یہ آغازِ الفت ہے گھبرا نہ اے دل — محبت میں شام و سحر اور بھی ہیں
نکل آئیے اب تو خلوت سے باہر — مرے ساتھ اہلِ نظر اور بھی ہیں
میں نازاں تھا در پر ترے سر جھکا کر — نشاناتِ سجدہ مگر اور بھی ہیں
خلیل ایک میں ہی نہیں اس پہ شیدا — دُر و لعل و شمس و قمر اور بھی ہیں

جناب بیتاب کالپوی

ہے راہِ محبت ہی فردوس منزل — زمانے میں یوں رہگذر اور بھی ہیں
پہونچتا ہے تجھ تک ترا راستہ ہی — یہ مانا جہاتِ سفر اور بھی ہیں
قفس اور خالی ہو غیر ممکن — مری طرح بے بال و پر اور بھی ہیں
تمہیں پر نہیں منحصر فتنہ سازی — یہ دنیا ہے اور فتنہ گر اور بھی ہیں
دبے جا نہیں زندگی کی محبت — ابھی خاکِ دل میں شرر اور بھی ہیں
نہیں کوئی بیتاب الفت کے قابل — بشر کی طبیعت میں شر اور بھی ہیں

جناب مختار مالیگانوی

ابھی مجھ سے وحشت اثر اور بھی ہیں — محبت کے شوریدہ سر اور بھی ہیں
[illegible] — چمن میں اگر نیشتر اور بھی ہیں
[illegible] — "مقاماتِ فتح و ظفر اور بھی ہیں"

ترا نازِ بے جا ہے ملے چشمِ نرگس — چمن میں ابھی دیدہ ور اور بھی ہیں
میں یہ سوچ کر روک لیتا ہوں نالے — اسیروں میں بے بال و پر اور بھی ہیں
ابھی چند لمحات مختار ٹھہریں — ابھی آپ کے ہمسفر اور بھی ہیں

جناب اکرم دھولیوی

جو ہم ان کے زیرِ اثر اور بھی ہیں — زیاں اور بھی ہیں ضرر اور بھی ہیں
ابھی آپ سے چارہ گر اور بھی ہیں — مسیحا ہے دردِ جگر اور بھی ہیں
اگر کوئی منزل ہوئی سر بھی تو کیا — کہ راہیں ابھی پُر خطر اور بھی ہیں
ترے دردِ الفت کے صدقے میں ظالم — بلائیں مری جان پر اور بھی ہیں
مری دل کو قبضے میں کر لینے والے — "مقاماتِ فتح و ظفر اور بھی ہیں"
ابھی بطنِ گیتی میں پوشیدہ اکرم — گراں قدر لعل و گہر اور بھی ہیں

جناب نازک حسنی شکوہ آبادی

خوشا دل میں تیرِ نظر اور بھی ہیں — مداوائے دردِ جگر اور بھی ہیں
باندازِ ارماں، بعنوانِ حسرت — محبت میں کچھ دردِ سر اور بھی ہیں
نہیں آہ پر منحصر یا فغاں پر — علاماتِ سوزِ جگر اور بھی ہیں
نشیمن ہی زد میں نہیں بجلیوں کی — گلستاں میں چند ایسے گھر اور بھی ہیں
نگاہوں پہ دل ہی پہ نازک اثر کیا — "مقاماتِ فتح و ظفر اور بھی ہیں"

جناب مجروح صدیقی

مجھی کو دکھاتے ہو کیوں اپنا جلوہ — زمانے میں اہلِ نظر اور بھی ہیں
نہیں ایک میں ہی پریشان و مضطر — محبت کے مارے بشر اور بھی ہیں
کہاں تم سی رعنائیاں ہیں کسی میں — لبِ بام گو جلوہ گر اور بھی ہیں
مجھے بھی تو ہے علم تیرے کرم کا — تمنائے الطاف اگر اور بھی ہیں
نہیں دعوائے عشق مجروح کیا ہو — یہاں ہم سے اہلِ جگر اور بھی ہیں

جناب ثاقب بڑودانی

ابھی رک نہ صیادِ مشقِ جفا سے — کہ باقی مرے بال و پر اور بھی ہیں
دکھا دو پھر اک بار جلوہ دکھا دو — کہ مشتاق اہلِ نظر اور بھی ہیں
سمجھ کر کچھ آیا ہوں چوکھٹ پہ تیری — ٹپکنے کو سرِ سنگِ در اور بھی ہیں
بڑھے جا مسافر تو منزل بہ منزل — "مقاماتِ فتح و ظفر اور بھی ہیں"

ہو نگاہ راہ وفا سے یوں ثاقب بلا سے جو اس پر خطر اور بھی ہیں

جناب محسن ساگری

اکیلے ہمیں کیا بشر اور بھی ہیں حسینوں کے صید نظر اور بھی ہیں

ابھی دل پہ قبضہ کیا ہے کسی نے "مقامات فتح و ظفر اور بھی ہیں"

نہ جانے ابھی کیا قیامت ہو برپا ستم انگیز تیر نظر اور بھی ہیں

نہیں تو ہی جاناں زمانے میں نرالا زمانے میں سینہ سپر اور بھی ہیں

جناب حنیف خلیقی ایدلوی

جہاں اور بھی بحر و بر اور بھی ہیں "مقامات فتح و ظفر اور بھی ہیں"

نہ توصیف کر صرف دندان لب کی زمانے میں لعل و گہر اور بھی ہیں

نہ ہو تیز گامی پہ اپنی تو نازاں تری طرح گرم سفر اور بھی ہیں

تجھے ذوق ہی جشن رخ کا ہو ورنہ زمانے میں نجم و قمر اور بھی ہیں

جناب نظر اعظمی

ہے تسلیم رنگینی بزم گلشن فریب نظر کچھ مگر اور بھی ہیں

بڑھائے چلیں کاروان پاؤں اپنے زمانے میں گرم سفر اور بھی ہیں

نہیں گردش قسمت دل پہ حیرت کہ گردش میں شمس و قمر اور بھی ہیں

ہے لوگوں میں کچھ ذکر اس انجمن کا تو کیا ہم مقام نظر اور بھی ہیں

جناب سالک ندرت آبادی

حوادث کے روندی ہوئی اک نہیں ہم زمانے میں لاکھوں بشر اور بھی ہیں

تمہارے سوا کیا جہان وفا میں فسوں ساز جادو نظر اور بھی ہیں

مجھی پر ہے کیوں رنج و غم کی چڑھائی "مقامات فتح و ظفر اور بھی ہیں"

ابھی ہم جو زندہ ہیں دنیا میں سالک نظارے فریب نظر اور بھی ہیں

جناب سید ضمیر الحسینی احمد آبادی

نہیں دیر و کعبہ پہ محدود سجدے اگر سر سلامت ہے در اور بھی ہیں

تغافل شعار آج الفت میں تیری پریشان قلب و جگر اور بھی ہیں

فقط میں ہی وحشی الفت نہیں ہوں محبت میں شوریدہ سر اور بھی ہیں

جناب سہیل شہادوی

صدا آ رہی ہے یہ راہ طلب میں ابھی منزلیں پر خطر اور بھی ہیں

نہ کر جرأت حملہ میرے وطن پر "مقامات فتح و ظفر اور بھی ہیں"

سہیل ایک میں ہی نہیں سر بسجدہ کسی کے کف پا پہ سر اور بھی ہیں

جناب شمیم سہروردی گوالیاری

اٹھے جا بنیں گے خضر تک یوں ہی فتنے جہاں میں ابھی فتنہ گر اور بھی ہیں

تری بارگہ میں بہت سی خطائیں ابھی قابل در گذر اور بھی ہیں

جناب جویا شکوہ آبادی

مرے زخم دل گر بھر آئے تو کیا ہے ترے پاس تیر نظر اور بھی ہیں

امیری غریبی ہیں دنیا کے دھوکے ہزاروں فریب نظر اور بھی ہیں۔

جناب خواجہ محفوظ گوالیاری

نئی راہیں اور رہگذر اور بھی ہیں ابھی اے مسافر سفر اور بھی ہیں

محبت سے میں ہی پریشاں نہیں ہوں زمانہ میں آشفتہ سر اور بھی ہیں

جناب تاباں بن خیر دھونکلی

شروع محبت ہی میں ڈر رہا ہوں مصائب ابھی عمر بھر اور بھی ہیں

پڑا ہوں اسی آستانے میں تاباں مجھے اس سے کیا در اگر اور بھی ہیں

جناب شافی شکوہ آبادی

خدارا ادھر بھی نمک پاش نظریں کہ زخمی تیر نظر اور بھی ہیں

جناب ضبط الہ آبادی

ابھی ایک دل ہی پہ قابو نہیں ہے "مقامات فتح و ظفر اور بھی ہیں"

جناب اختر شہادوی

بسر کیا ہو اختر شماری میں اختر ہمیں کام کچھ رات بھر اور بھی ہیں

اصلاحِ سخن :- جناب سید ذکی محمد رضا فضا جالندھری کے کلام پر عندلیب الملک حضرت ذکی شاہجہانپوری کی اصلاح

مزاجِ حضرتِ پیرِ مغاں نہیں ملتا	۱	شریکِ بزم ہوا کوئی ~~ہو کے~~ (اگر ہوں تو کہیں توقع پر)
قفس سے چھوٹے تو اب آشیاں نہیں ملتا	۲	نگاہِ شوق کی ~~دشواریاں~~ (ناکامیاں) ارے توبہ
~~ضبط نے اور کیا~~ (ضبط کرنا ہی پڑا ... گیا) راز نمایاں میرا	۳	سب کی نظروں میں ہے اب حالِ پریشاں میرا
ہو چکا تم سے علاجِ غمِ پنہاں میرا	۴	آہ (کیوں) تم پوچھتے ہو میری تمنا مجھ سے
مرے خیال میں تو بار بار آئے جا	۵	~~کرم کے نام سے ظلم و ستم بھی ڈھائے جا~~ (کرم نہیں تو نہ سہی جور و ظلم ڈھائے جا)
~~یونہی تبسمِ~~ (اسی طرح لب) رنگیں سے مسکرائے جا	۶	کوئی گھڑی میں کلی دل کی کھلنے والی ہے
تو میری خاک کے ذروں کو بھی اڑائے جا	۷	جلا کے خاک ~~اگر تو نے کر دیا مجھ کو~~ (جو کرنا ہے غمِ نصیبوں کو)

۸ استاد نے کیوں — اور — اب دو لفظ لکھ دیئے تھے میں نے کیوں کو لیا۔ فضا	۸	چمن میں آتشِ گل ~~سے بھڑک اٹھے شعلے~~ (کے اثر سے اے شبنم)
		~~جو تجھ سے ہو سکے شبنم~~ (بھڑک رہے ہیں جو شعلے) انھیں بجھائے جا

توجیہِ اصلاح :-

(۱) مصرعِ ثانی سے مصرعِ اولیٰ کو ربط نہ تھا اور کوئی واضح مفہوم بھی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اب شعر صاف اور مفہوم واضح ہو گیا۔

(۲) دشواریوں کے بعد ناکامیاں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ پھر آشیاں نہ ملنے میں دشواری اتنا گہرا اثر نہیں رکھتی جتنا ناکامی۔ نگاہ کے لئے یوں بھی ناکامی دشواری سے زیادہ بہتر اور قدر دل ہے۔

(۳) فضا صاحب کا مصرعِ ثانی بذاتِ خود اچھا اور صحیح تھا۔ "ضبط نے اور کیا" میں خاص برجستگی اور بے ساختگی تھی پھر سوال یہ ہے کہ فاضل استاد کو اصلاح کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جب کوئی کام شغف اور انہماک سے کیا جاتا ہے تو لامحالہ لوگ اس طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ یہی اشارہ اس اصلاح میں ہے کہ اگر ضبط کرنے میں کوشش اور کاوش سے کام نہ لیا جاتا تو راز نمایاں نہ ہوتا محض کاوشِ ضبط نے راز کو نمایاں کر دیا۔ بہت اچھی اصلاح ہے۔

(۴) مصرعِ اولیٰ میں "تم" بھی غلط نہ تھا لیکن "کیوں" میں ایک ایسا پہلو ہے جو حسرت و ناکامی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں "کیوں" استفہامی نہیں بلکہ "نہی" ہے یعنی مجھ سے میری تمنا نہ پوچھو، گو تم نے ایسا کیا تو تم سے غمِ پنہاں کا علاج ہو چکا! —— "آہ کیوں تم پوچھتے ہو" میں ایک شکایت اور لجاجت سی بھی پائی جاتی ہے۔

(۵) فضا صاحب کے مصرعِ اولیٰ میں "بھی" حشو تھا اس سے کسی قسم کا زور پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن حضرتِ ذکی کی اصلاح میں "نہ سہی" نے وہ زور پیدا کر دیا جس کی ضرورت تھی مفہوم وہی رہا اور مصرعہ برجستہ ہو گیا۔

(۶) مصرعِ ثانی میں کئی عیب تھے۔ اوّلاً یہ کہ تبسم اور مسکراہٹ ایک ہی بات ہے دوم "تبسمِ رنگیں" میرے خیال میں ایک مبالغہ ہے اس لئے کہ تبسم کا کوئی رنگ ہی نہیں ہوتا۔ ہاں "لبِ رنگیں" صحیح اور موزوں ہے۔

(۷) اصلاح سے طرزِ بیان میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور جلانے کے مفہوم کو "غم نصیبوں" نے زیادہ واضح کر دیا۔ اگر شعر کے کسی ایک مصرعہ میں سے "خاک" نکل جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔

(۸) دونوں مصرعوں میں الفاظ کی ترتیب ناقص تھی۔ الفاظ کے بے محل ہونے کی وجہ سے شعر کا حسن زائل ہو گیا تھا اب اصلاح سے یہ عیب دور ہو کر شعر مرصع ہو گیا اور مفہوم میں ذرہ برابر تبدیلی عارض نہ ہوئی۔ سبحان اللہ۔

اعجاز صدیقی

ضروری اطلاع

اس کے پڑھنے سے لاکھوں کا بھلا ہوگا

صاحبان! [illegible] بدقسمتی سے مجھے اپنے ہاتھوں [illegible] ڈیڑھ سال [illegible] نامردی کا [illegible] ہوگیا۔

[illegible] سستی [illegible] احباب میری [illegible]

[illegible] مشہور شہروں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں [illegible] اشتہاروں کی کوئی حد نہ تھی۔ ادویات منگا کر استعمال کرتا رہا۔ لیکن مجھے [illegible]

[illegible] مایوسی کی حالت میں زندہ در گور رہنے کو ترجیح دیتا تھا۔ اتفاقاً خوش قسمتی سے مجھے ملازمت کے سلسلہ میں [illegible]

جس جگہ میں ٹھہرا وہاں ایک فقیر خضر صورت [illegible] اپنا سارا دکھ درد [illegible]

[illegible] زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس خضر صورت صاحب کمال نے ازراہ شفقت [illegible] ایک نسخہ [illegible] مقوی گولیاں [illegible]

[illegible] سستی دور کرنے کے لیے مالش کا بتایا۔ چنانچہ میں نے [illegible] ادویات بازار سے خرید کر [illegible] استعمال کرنا شروع

[illegible] ناظرین با خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہتا ہوں [illegible] اگرچہ مجھے چند ہی روز کے استعمال سے [illegible]

[illegible] ۲۱ روز تک [illegible] علاج جاری رکھا [illegible] بدن مضبوط [illegible]

[illegible] نامردی سستی، جریان، احتلام [illegible]

[illegible] اشتہار [illegible] علاج [illegible]

[illegible] استعمال [illegible] قیمت صرف لاگت ادویات [illegible] اشتہار [illegible]

قیمت مقوی گولیاں فی شیشی جس میں ۲۱ روز کی ۴۲ خوراک موجود ہیں صرف تین روپے (سے) قیمت روغن مالش طلاء جو ۲۱ روز تک گولیوں کے ساتھ [illegible] کے لیے کافی ہے فی شیشی تین روپے آٹھ آنے (سے) [illegible]

[illegible] استعمال [illegible]

[illegible] اشتہار [illegible]

[illegible] فائدہ [illegible]

[illegible] مالش طلاء [illegible] استعمال [illegible] الغرض تمام [illegible]

[illegible] استعمال کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ مختصر یہ کہ تمام دنیا کی دواؤں سے عجیب غریب علاج ہے۔

ضروری اطلاع :- یاد رہے کہ میری دوائی صرف نامردی، سستی، جریان، احتلام [illegible]

[illegible]

[illegible] علاج اور [illegible] :- ہندو، سکھ اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے

[illegible] دوائی کے استعمال سے [illegible] فائدہ [illegible]

[illegible]

مکتبۂ قصر الادب آگرہ کا پسندیدہ اور منتخب علمی و ادبی ذخیرہ

تصانیف حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی

کلیم عجم۔ یہ حضرت مولانا مدظلہ کی غزلوں کا نادر ترین مجموعہ ہے جس کا ایک ایک شعر درس و پیام عرفان ہستی اور واردات و مدرکات کا آئینہ دار ہے۔ اس میں آپ کو تغزل کا وہ معیاری نمونہ ملے گا جو دوسری جگہ شاذ ہی نظر آسکتا ہے ساتھ ہی ساتھ مولانا کے چودہ خطبے بھی شریک ہیں جن سے اردو شاعری کے ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے کتابت و طباعت اعلیٰ حجم ۸۰۰ صفحات مجلد جلد پر سنہری ڈائی کندہ ہے۔ مولانا کی تین تصویریں بھی شریک کتاب ہیں۔ قیمت تین روپے (سے)

کارِ امروز۔ مولانا کا پہلا مجموعۂ نظمیات جس کی اشاعت پر مولانا کو "شاعر تاج" کا خطاب ملا۔ اس مجموعہ میں ہر جتنی نظمیں معیاری شان کیساتھ شایع ہوئی ہیں کوئی نظم ایسی نہیں جو دلنشین اور سماعت آویز نہ ہو حجم ۲۵۶ صفحات مجلد مع تصویر مصنف

ساز و آہنگ۔ مولانا کا دوسرا مجموعۂ نظمیات آزادی خیال و ضمیر کے اعلیٰ ترین نمونے متحدہ قومیت کے درس نغمے، ہندو مسلم سکھ عیسائی سب کے لئے مشترک پیغام انسانی زندگی کا پس منظر اس سے بہتر کسی نے کبھی نمایاں نہیں کیا حجم ۴۰ صفحات مجلد مع تصویر مصنف۔ قیمت تین روپے (سے)

سرود غم۔ مجالس محرم میں پڑھنے کے لئے بہترین سلاموں کا مجموعہ دل ہلا دینے والے پیغام اور رباعیات۔ روح گداز سوز اور دلدوز نظمیں شہیدان کربلا کی یاد تازہ کرنے کیلئے اس سے بہتر مجموعہ کہیں نہیں ملے گا حجم ۹۶ صفحات قیمت ۱۲ر

تصانیف حضرت فانی بدایونی مرحوم

باقیات فانی۔ کون نہیں جانتا کہ سوز و گداز حضرت فانی بدایونی مرحوم کا حصہ تھا اگر آپ کو جذباتی شاعری کا لطف اٹھانا ہے تو ایک جلد ضرور منگا لیجئے مع تصویر مصنف قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عـہ۸ر)

عرفانیات فانی۔ یہ حضرت فانی بدایونی مرحوم کی وہ غزلیں بھی آپ کو ملیں گی جو مرحوم کی آخری زندگی کا شاہکار کہی جا سکتی ہیں قیمت ۱۲ر

تصنیف حضرت ماہر القادری

محسوسات ماہر۔ ہندوستان کے ہر دلعزیز اور نامور شاعر حضرت ماہر القادری کا پہلا مجموعۂ کلام جس کے نغمے غریبوں کی جھونپڑیوں اور امیروں کے محلوں میں گائے جا رہے ہیں جذبات کے نقطے حسن و جمال کے پھول محبت کے نغمے اور کوثر میں دُھلی ہوئی زبان تڑپتی ہوئی روحوں کیلئے سامان تسکین سوتے ہوؤں کیلئے تیر و نشتر کاغذ پر نغمہ، فریاد اور حسن و محبت کی تصاویر دیکھنا ہوں تو ضرور ملاحظہ کیجئے حجم ۲۳۰ صفحات مجلد رنگین گرد پوش قیمت صرف

تصانیف شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

نقش و نگار۔ یہ حضرت جوش کی وجد آفرین اور پُرکیف نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو ہر نظم اپنی جگہ مکمل مرقع اور زیادہ سے زیادہ کیف میں ڈوبی ہوئی ہے۔ شاعر انقلاب نے جو نغمے برسائے ہیں وہ دل و دماغ کے لئے ایک مستقل تسکین اور سکون روح کیلئے سرور انگیز ہیں حجم ۸۸ صفحات مجلد مع بہترین گرد پوش قیمت عہ

شعلہ و شبنم۔ یہ حضرت جوش کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے اس میں حضرت جوش کی سیاسی اور اسلامی نظموں کا بہترین انتخاب ہے اور اس خیال کی تردید کے لئے کہ مغربی شاعری کے مقابلے میں اردو شاعری مناظر نگاری میں تہی مایہ ہے۔ شاعر انقلاب کی وہ نظمیں بھی دی گئی ہیں جن میں آپ نے الفاظ میں مصوری کے کمال دکھائے ہیں حجم ۲۵۰ صفحات مجلد مع بہترین گرد پوش۔ قیمت سے

فکر و نشاط۔ یہ حضرت جوش کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے جس میں تمام طالب کو فکر کی پیچ در پیچ گھاٹیوں میں بھٹکتا ہوا نہیں چھوڑا گیا ہے۔ بلکہ اسے نشاط کی سرسبز وادیوں میں لیجایا گیا ہے۔ اس مجموعہ کی ہر نظم ایک گہرا اثر رکھتی ہے حجم ۱۵۰ صفحات مجلد قیمت عہ

حرف و حکایت۔ شاعر انقلاب کا چوتھا مجموعۂ کلام جو ان کے تازہ واردات و مدرکات کا آئینہ دار ہے اور جو حضرت جوش کی شاعری کے دور ارتقا کا بہترین نمونہ ہے اس میں حسن و جوانی، وعظ و پند اور غور و فکر کے ایسے دلنشین پہلو ملیں گے کہ پڑھنے والا پھڑک جائیگا۔ حجم ۲۴۸ صفحات مجلد قیمت عا

تصانیف حضرت احسان دانش

حضرت احسان دانش کی شاعری دُکھے ہوئے دلوں کی پکار ہے۔ احسان کو فطرت نے ایک ایسی قوت بیان عطا کی ہے کہ اس میں "آہ" اور "واہ" کے دونوں پہلو ملتے ہیں موسیقی اور جذب و اثر احسان کی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ جب وہ کسی واقعہ سے متاثر ہوکر اس کو نظم کا جامہ دیتے ہیں تو اُن کی شاعری دُکھے ہوئے دلوں اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کا مرقع بن جاتی ہے جب وہ مناظر فطرت کی کیفیات میں ڈوب کر کوئی نغمہ الاپتے ہیں تو چاروں طرف بہاریں رقص کرنے لگتی ہیں جب وہ تغزل کو چھیڑتے ہیں تو ان کی غزل کا ہر شعر محاکات واردات اور حسیات کا ایک مرقع بن کر رہ جاتا ہے۔ ہمارے یہاں ان کے تمام مجموعہ ہائے کلام آگئے ہیں۔ امید کہ ناظرین اس حقیقی شاعر کے کلام کا گرمجوشی سے خیر مقدم کریں گے۔

نوائے کارگر عہ۔ چراغاں عا۔ نفیر فطرت عا۔ جادۂ نو ۱۲ر

دردِ زندگی دو روپیہ آٹھ آنہ (عـہ۸ر)

ملنے کا پتہ

مکتبۂ قصر الادب دفتر "شاعر" آگرہ

محصول بذمہ خریدار

مشاہیر شعرا کے دیوان

گلزارِ داغ ۔ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی مرحوم و مغفور کا مشہور دیوان قیمت ۱۲ر

کمالِ داغ ۔ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے چاروں دیوانوں کا انتخاب مع مبسوط مقالہ تنقیدی ۔ قیمت مجلد عہ

روحِ نظیر ۔ مرتبہ جناب مخمور اکبرآبادی بی ۔ اے ۔ میاں نظیر اکبرآبادی کے منتخب کلام کا مجموعہ مع بسیط مقدمہ و تبصرہ حجم ۔ ۴۰۰ صفحات ۔ قیمت ۶ر

جگر پارہ ۔ حضرت بیدم شاہ وارثی مرحوم کا متصوفانہ اور سوز و گداز سے پر کلام کا مجموعہ ۔ قیمت صرف ۱۲ر

مصحفِ بیدم حضرت بیدم شاہ وارثی مرحوم کا دوسرا مجموعۂ کلام جس میں ان کا تمام کلام مع ٹھمری اور دادروں کے درج ہے اس دیوان کا مقدمہ حضرت خواجہ حسن نظامی نے تحریر فرمایا ہے مع تصویر مصنف ۔ قیمت عہ

نشاطِ روح ۔ حضرت اصغر گونڈوی مرحوم کا مشہور و معروف دیوان جو آٹھ پیپر پر بڑے اہتمام سے چھاپا گیا ہے مع تصویر مصنف ۔ قیمت ۶ر

گلکدہ ۔ حضرت عزیز لکھنوی (استاد حضرت جوش ملیح آبادی) کا دیوان غزلیات جو سوز و گداز اور حقیقت و معارف کا ایک خزانہ ہے ۔ قیمت ۶ر

ایاغِ بزم حضرت مرزا عاشق حسین بزم آفندی اکبرآبادی کا دوسرا نو مطبوعہ دیوان جس میں محاکات و تاثرات کا دریا موجزن ہے قیمت ۶ر

قصائدِ نجم ۔ حضرت نجم آفندی اکبرآبادی خلف حضرت بزم آفندی اکبرآبادی کی لاجواب تصنیف مدح رسول و آل رسول میں بلند پایہ نظمیں اور قصائد قیمت عہ

نقوشِ مانی ۔ حضرت مانی جائسی کا دیوان ایک ایک شعر جذبات و ارادت کا صحیح نمونہ ہے ۔ قیمت صرف دو روپیہ (۲ر)

میکدہ ۔ جناب مولوی سید محمد علی شاہ صاحب میکش قادری اکبرآبادی کے جذبات حسن و عشق اور متصوفانہ کلام کا بہترین مجموعہ مع تصویر مصنف ۔ قیمت عہ

فغانِ آرزو ۔ حضرت آرزو لکھنوی کی غزلیات کا مجموعہ جس میں زبان و بیان کی خوبیوں نے مل کر عجیب لطف پیدا کر دیا ہے ۔ قیمت ۶ر

نشترکدہ ۔ مجموعۂ غزلیات بابو گوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ایڈیٹر ریاست اگر آپ قدیم رنگ تغزل کو جدید مذاقِ بلند کے ہمدوش دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ دیوان ملاحظہ فرمایئے ۔ کتابت و طباعت اعلیٰ حجم ۳۶۸ صفحات مع تصویر مصنف قیمت ۶ر

نورِ مشرق ۔ جناب مہرلال ضیا فتح آبادی ایم ۔ اے کی روح افزا و معیاری نظموں کا مجموعہ ۔ حجم ۱۳۶ صفحات مجلد مع تصویر مصنف ۔ قیمت عہ

صبحِ مشرق ۔ جناب محمد صادق صاحب ضیائی ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی کا کلیات نظم و غزل حجم ۲۵۶ صفحات مجلد مع تصویر مصنف قیمت ۶ر

دیگر منظومات

الہامِ منظوم ۔ حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی نے مثنوی مولانا روم کے مکمل چھ دفتروں کا منظوم ترجمہ کیا ہے ۔ نثر کے ترجمے تو آپ نے بہت دیکھے ہوں گے منظوم ترجمہ بھی دیکھیے ۔ اوپر اصل شعر ہے نیچے اس کا منظوم ترجمہ ۔ یہ ایک شاہکار کتاب ہے قیمت مکمل چھ دفتر ۔

مثنوی عالمِ خیال ۔ مصنفہ مرزا شوق قدوائی لکھنوی مرحوم مشہور اور بیوی کی محبت آمیز جذباتی منظوم خطوط ۔ ایک نظم کے چار رخ جو چار خوبصورت تصاویر سے مزین ہیں ۔ قیمت مجلد مع رنگین تصویر عہ سادہ غیر مجلد ۸ر

مثنوی مادرِ ہند ۔ مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم
یہ مثنوی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نئی ہے ۔ اس میں ہندوستان کی مکمل سیاسی تاریخ ہے ۔ علامہ سیماب اکبرآبادی اور رشید احمد صدیقی کے مقدمے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ قیمت صرف ۱۲ر حجم ۱۸۰ صفحات ۔

مثنوی ظہورِ رحمت :۔ مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی
یہ مثنوی ولادتِ نبوی کے متعلق دلکش اور عقیدت مندانہ پیرایہ میں لکھی گئی ہے قیمت صرف ۸ر

مثنوی زہرِ عشق کامل عہ ۔ **مثنوی گلزارِ نسیم** ۶ر
مثنوی میر حسن ۶ر

اربعہ عناصر ۔ حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبرآبادی کی رموز و نکات سے لبریز رباعیات کا مجموعہ ۔ مجلد قیمت عہ

مینائے سخن ۔ منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی مرحوم کی تمام واسوختوں کا بے نظیر مجموعہ قیمت عہ

شبابیات ۔ مصنفہ حضرت ساغر نظامی موضوع شباب پر ۴۰ حسین رباعیات کا بے مثل مجموعہ قیمت صرف ۸ر

مختلف دواوین

دیوانِ غالب ۱۲ر ۔ غزلیات امیر و نظیر ۱۲ر ۔ انتخاب کلام اکبر الہ آبادی ۱۲ر ۔ دیوانِ کلیِ غالب مکمل ۸ر ۔ کلام داغ ۱۲ر ۔ بہار معرفت عہ ۔ دیوانِ حافظ شیرازی ۱۲ر ۔ دیوان ذوق دہلوی ۶ر ۔ دیوان پروین ۶ر ۔ دیوان جہر عہ ۔ حدیث ناتمام ۱۲ر

حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کی مختلف نظمیں

شکوہ جواب شکوہ ۴ر شمع و شاعر ۴ر فریاد امت ۴ر اکبری اقبال ۳ر نالۂ یتیم ۲ر تصویر درد ۴ر

تصانیف حضرت مولانا حالی پانی پتی مرحوم

مسدس حالی (عکسی) ۶ر مسدس حالی (سادہ) ۸ر مرثیہ مرزا غالب ۲ر مناجات بیوہ ۲ر شکوۂ ہند ۲ر حب وطن ۲ر چپ کی داد ۲ر

دیگر مختلف نظمیں

ارشاد احمد (چند احادیث نبوی کا منظوم ترجمہ) ۲ر کشمیر کا مستقبل ار قومی نظم ۵ر تشریح التشفا سر سے پاؤں تک کی تمام بیماریوں کا علاج منظوم ۴ر

ملنے کا پتہ
مکتبۂ قصر الادب دفتر شاعر آگرہ

محصول بذمہ خریدار

مشہور افسانہ نگاروں کے مشہور افسانے

تصانیف حضرت نیاز فتح پوری

نگارستان۔ یہ مجموعہ ہندوستان کے عدیم المثال افسانہ نگار حضرت نیاز فتح پوری کا ایک شاہکار ہے اس مجموعہ کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ اسکے متعدد مضامین دوسری زبانوں میں منتقل کئے گئے ہیں۔ قیمت صرف ۲؎

شہاب کی سرگذشت۔ مولانا نیاز فتحپوری کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو لٹریچر میں بالکل نئی چیز تسلیم کیا گیا ہے۔ جزئیات نگاری اور تحلیل جذبات کے ایسے نادر نمونے اسمیں نظر آئیں گے جو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتے۔ قیمت عہ

تصانیف حضرت لطیف الدین احمد اکبرآبادی

انشائے لطیف۔ یہ لطیف صاحب کے پندرہ افسانوں کا بہترین مجموعہ ہے اس میں آپ کو حسن و عشق کی صحیح نقاشی ملے گی۔ قیمت مجلد ۲؎

محبت کا افسانہ۔ یہ ایک طویل افسانہ ہے جسمیں مسئلہ ازدواج سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۲؎

زندگی کے کھیل۔ بارہ کہانیوں کا نیا مجموعہ فلاکت زدہ سماج کی زندہ تصویر۔ قیمت عہ

کیفستان۔ جناب تبسم رامپوری کے دلچسپ افسانوں کا مجموعہ قیمت عہ

شب چراغ۔ بہترین تہذیبی سوشل اور جذباتی افسانوں کا مجموعہ از جناب محمد صادق صاحب ضیائی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی قیمت ۸

قاتل۔ اور دوسرے افسانے جناب ایم اسلم کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ قیمت ۲؎

ظریفانہ افسانے

ہندوستان کے مشہور و معروف ظرافت نگار مسٹر شوکت تھانوی کی پیٹ میں درد ڈالدینے والی مقبول ترین کتابیں جن کے پڑھنے سے سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی لوٹن کبوتر بن جاتا ہے۔

موج تبسم ۱؎ طوفان تبسم ۱؎ سیلاب تبسم ۲؎ بحر تبسم ۲؎ منشی جی ۲؎

شہید ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی کی بالکل آخری تصنیف

پھریری۔ جس میں مزاح نگاری اور سنجیدگی کے دونوں پہلو اسقدر تابناک ہیں کہ بیساختہ منہ سے داد نکل جاتی ہے۔ اسمیں کل ۱۴ افسانے ہیں ہر افسانہ پورے زور قلم کیساتھ لکھا گیا ہے حجم ۲۸۸ صفحات مجلد معہ بہترین گردپوش قیمت ۲؎

مختلف افسانے

سرگذشت اسیر عہ۔ سمندر کی خداوندہ ۲؎ محمود عہ، دغا ۸؎ طوفان زندگی عہ، عریج زندگی عہ، شیطان کا پنجہ ۲؎ عبرت کدہ ۱۲؎ خانقاہ اشرار ۱۶؎ چینوں کی دیوی ۱۲؎ مغربی دلہن ۱۰؎ بدر کمال عہ۔ بالشویک شہزادی ۲؎ انارکلی ۲؎ جنات کی شہزادی ۲؎ چمرہ پچہ ۱۲؎ شیطان زادہ ۲؎ شیطان کا چرخہ ۲؎ دوست ۲؎

فن عروض کی منتخب معتبر اور عام فہم کتابیں

معین الشعرا۔ از غلام حسین خاں آفاق بنارسی مرحوم۔ یہ وہ عدیم المثال لغت ہے جس میں عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور ہندی زبان کے ہزاروں الفاظ کے معنی کے علاوہ ہر لفظ کے اعداد ملفوظی صحت کے ساتھ درج کئے گئے ہیں جو تاریخ نکالنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ہر لفظ کے متعلق یہ بھی درج ہے کہ وہ کس زبان کا ہے اور مذکر ہے یا مؤنث۔ نہ صرف یہی بلکہ اساتذۂ ماضی و حال کے کلام سے ہر لفظ کی تذکیر و تانیث کا ثبوت بھی پیش کیا گیا ہے حقیقتاً یہ لغت طالبان ادب و شعر کے لئے خضر راہ ہے بڑی تقطیع حجم ۲۸۶ صفحات مجلد للعہ

دستور الاصلاح۔ از حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی اصلاح لینے اور اصلاح دینے کے طریقوں کا انضباط شعرائے متقدمین و متاخرین کی یکجائی جملا صلاح اور انکی توجیہہ یہ پہلی فنی کتاب ہے جو مبتدی اور منتہی دونوں کے لئے شمع راہ ہے۔ فنی نکات اور ادبی اصطلاحات کی تشریح میں اپنی نوعیت کی پہلی اور آخری کتاب ہے حجم ۱۴۴ صفحات۔ قیمت عہ

مناظرۂ سخن۔ مصنفہ صفدر مرزاپوری اسمیں مسلم الثبوت اور مشہور اساتذہ کی اصلاحوں کے نمونے دئے گئے ہیں قیمت عہ

رازِ عروض۔ از حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی عروض کی سیکڑوں ادق کتابوں کا عام فہم نچوڑ۔ مبادیاتِ شاعری پر مختصر مگر جامع کتاب ہر مبتدی کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کتاب سے بغیر کسی استاد کی مدد کے شاعری کے ابتدائی مراحل آسانی کیساتھ طے ہوجاتے ہیں دوسرا ایڈیشن قریب الختم ہے قیمت ۱؎

عام فہم عروض۔ از حضرت منظر صدیقی۔ اس کتاب میں نہایت آسان زبان میں عروض کے درس دئیے گئے ہیں قیمت صرف ۸

نکاتِ شاعری۔ اس کتاب میں عروض کے بڑے بڑے نکات سمجھائے گئے ہیں نہ صرف یہی بلکہ ہر لفظ کے کئی کئی قافیے بھی درج ہیں۔ قیمت عہ

چراغِ سخن۔ عروض، علم قافیہ اور بحور وغیرہ کی تشریح میں مرزا یاس یگانہ عظیم آبادی کی بہترین تصنیف۔ قیمت عہ

فکرِ بلیغ۔ مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم۔ فن شاعری پر ہر جہتی معلومات کے لئے نہایت بلیغ کتاب ہے۔ قیمت عہ

ایشیائی شاعری۔ مصنفہ مولانا اشہری مرحوم۔ اس کتاب میں تمام اصناف شاعری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت عہ

جانِ سخن۔ بحور، صنائع، بدائع، تقطیع کرنے کے قاعدے اور علم قافیہ کی تشریح نیز متروک الفاظ کی فہرست بھی شریک کتاب ہے قیمت عہ

الفصاح القوافی۔ علم قافیہ پر توضیحی اور تفصیلی کتاب قیمت ۱؎

ملنے کا پتہ

مکتبۂ قصر الادب، دفتر شاعر، آگرہ

محصول بذمۂ خریدار

علمی و ادبی کتابیں

مغل اور اردو ۔ ادیب الملک نواب مرزا نصیر حسین خاں خیال عظیم آبادی مرحوم کی لاجواب تصنیف اس میں اردو کے ابتدائی دور سے لیکر مغلوں کے دور تک ہونے کے مذہبی واقعات قلمبند کئے گئے ہیں خاص طور سائز حجم ۱۵۰ صفحات قیمت عہ

داستان عجم ۔ یہ بھی خیال عظیم آبادی مرحوم کی تصنیف ہے۔ شاہنامہ فردوسی پر ایک بے نظیر تبصرہ ہے۔ قیمت عہ

بزم خیال ۔ از جناب صفدر مرزا پوری۔ اس کتاب میں شعرائے اردو اور فارسی کی مجالس کے لطائف کو جمع کیا گیا ہے۔ برجستہ گوئی اور حاضر جوابی کے بہترین نمونے دکھائے گئے ہیں حجم ۱۶۰ صفحات قیمت عہ

گہوارۂ تمدن ۔ حضرت مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت کا کیا درجہ ہے۔ قیمت عہ

لغات ۔ لطیف الدین احمد اکبرآبادی کے مضامین کا بہترین مجموعہ کتابت و طباعت بہترین۔ قیمت صرف عہ

حسن کاری ۔ فنون لطیفہ پر دلچسپ پیرایہ میں جامع تبصرہ قیمت ۱ر

ایوان تصویر ۔ ملل ہندسر میتی سروجنی نائیڈو کے رنگین اور دلکش گیتوں کا ترجمہ قیمت عہ

روح نظم ۔ میر اکبرآبادی سے لیکر آج تک کے اکثر شعرا کے کلام کا انتخاب از مولانا تاجور نجیب آبادی و پنڈت میلا رام وفا دو حصے مکمل۔ قیمت سے

روح انتخاب ۔ اردو نثر اور اردو لٹریچر کا فردی تاریخی انتخاب دو حصوں میں۔ از مولانا تاجور نجیب آبادی و پنڈت میلا رام وفا قیمت مکمل سے

تصانیف حضرت مولانا عبدالمالک آروی

الہامات شاد ۔ شاد عظیم آبادی ہندوستان میں ایک خاص رنگ کے شاعر گذرے ہیں ان کا تعلق نہ دہلی اسکول میں گذرا اور نہ لکھنؤ اسکول میں۔ یہ کتاب شاد کی نفسیاتی شاعری اور شاعرانہ ابداع و اختراع پر بے مثل کتاب ہے۔ اسی کے ساتھ اُن کے کلام کا بہترین انتخاب بھی دیا گیا ہے قیمت آٹھ آنے۔

اقبال کی شاعری ۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی شاعری اور فلسفہ پر اردو زبان میں بے نظیر مختصر تالیف حکومت بہار نے اس کی ۲۰۰ جلدیں خریدیں اور پٹنہ یونیورسٹی نے اسے ایم۔ اے کے نصاب میں داخل کیا قیمت صرف ایک روپیہ

خواب کی دنیا ۔ آسٹریا کے مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ کی کتاب کی تلخیص خواب کی ماہیت اور فلسفہ پر بہترین تصنیف مغربی اور مشرقی ادبیات کا دلچسپ اور مفید مجموعہ زبان شگفتہ۔ انداز بیان محققانہ۔ اس کے پڑھنے کے بعد آپ خواب کے بہت سے معمے حل کر سکیں گے۔ قیمت عہ

مذہبی کتابیں

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق مؤلفہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اصول اخلاق اور فلسفۂ اخلاق کے تمام گوشوں پر دلپذیر اور مکمل بحث اور اسلام کے ابواب اخلاقی کی علمی تشریح جس سے اسلامی اخلاقیات کی برتری نہ صرف اعتقادی طور پر بلکہ علم و تحقیق کے معیار پر تمام ملتوں کے مقابلہ میں واضح ہو جاتی ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہترین بڑا سائز حجم ۵۴۴ صفحات قیمت للعہ

غلامان اسلام مؤلفہ حضرت مولانا سعید احمد ایم۔ اے اکبرآبادی فاضل دیوبند جس میں ان مقتدر ہستیوں کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و جستجو سے یکجا کئے گئے ہیں جن کو غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود اسلامی سوسائٹی میں عظمت و اقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا ہے اور جن کے علمی، مذہبی، تاریخی اور اصلاحی کارنامے نقش دوام بن کر سینۂ عالم پر ثبت ہو چکے ہیں۔ بڑا سائز حجم ۵۳۲ صفحات۔ کتابت و طباعت اور کاغذ بہترین۔ قیمت للعہ

اسلام کا اقتصادی نظام ۔ مؤلفہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔ جس میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا نظام اقتصادی ہی ایک نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال کی راہ پیدا کی ہے کتابت۔ طباعت بہترین حجم ۲۴۸ صفحات قیمت عہ

اسلام میں غلامی کی حقیقت ۔ مؤلفہ حضرت مولانا سعید احمد ایم۔ اے اکبرآبادی فاضل دیوبند جس میں غلامی کی حقیقت اس کے نفسیاتی اخلاقی اور اقتصادی پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ غلامی کا آغاز کب سے ہوا۔ اسلام سے پہلے کن کن قوموں میں یہ رواج پایا جاتا تھا اور اس کی صورت کیا تھی۔ اس کی مکمل تاریخ پھر اسلام نے اس رواج کو اس وقت کن مجبور کن حالات کی وجہ سے باقی رکھا اور اس میں کیا کیا اصلاحات کیں اور ان سب سے اسلام کا اصل منشا کیا ہے۔ اس کے بعد مشہور مصنفین یورپ کی اجتماعی غلامی پر مفصل بحث اور تبصرہ کیا گیا ہے۔ بڑا سائز کتابت و طباعت اور کاغذ بہترین حجم ۲۷۰ صفحات قیمت عہ

صحابۃ الخلفاء قرآن مجید اور احادیث نبویؐ کی روشنی میں خلفائے راشدین اور صحابۂ کرامؓ کے مستند و مکمل حالات زندگی۔ قیمت ۸ر

سوانح عمریاں

اُمت کی مائیں، بنت الرسولؐ ۲ر فاطمۃ الزہراؓ عہ سوانح صدیق اکبرؓ، سوانح حضرت عمر فاروقؓ ۸ر سوانح حضرت علیؓ عہ سوانح امام اعظمؒ ۱۲ر تذکرۂ صابریہ ۱۲ر سوانح غریب نوازؒ عہ سوانح غوث پاک عہ مناقب حضرت غوث گوالیاریؒ ۸ر تحفۂ سبا علامات ۲ر سوانح اورنگ زیب ۸ر سوانح زیب النساء عہ سوانح نور جہاں عہ

ملنے کا پتہ

مکتبہ تعمیر ادب دفتر شاعر آگرہ

محصول ڈاک بذمہ خریدار

محصول ڈاک بذمہ خریدار

منظور شدۂ محکمہ ہائے تعلیم صوبہ ممالک متوسط و برار ریاست بھوپال و کشمیر

تعارف

تصاویر (۱) حضرت [illegible] جالندھری (۲) جناب رشدی بھوپالی

جلد ۱۳ | ماہنامہ "شاعر" آگرہ — جولائی سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۷

چندہ سالانہ محروسی کم از کم ما انجمن سے ۶۰ معاونین کے لئے ۲۴ لائف ممبروں سے ۱۵ ہمدردوں سے ۱۲ خواص سے ۳ عوام سے ۲ فی پرچہ ۴

فہرست محسنین معاونین انیسان ہمدردان شاعر

سرپرست ادب و شعر

(۱) عالیجناب خان شری امام الدین خانصاحب مستان و رسوا والئی پاجود کاٹھیاواڑ

محسنین ادب و شعر

(۲) محسن ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ۶۰ سالانہ
(۳) محسن ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیر خورجوی ۶۰ سالانہ
(۴) محسنہ ادب ہر ہائنس علیہ حضرت کتیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ سالانہ
(۵) محسنہ ادب شہزادی تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ سالانہ
(۶) محسن ادب جناب محترم وزیرزادہ شجاعت خانصاحب مہر جوناگڈھی ۶۰ سالانہ

معاونین ادب

(۷) معاون ادب مسٹر اے۔ بی ظیس صابر بی۔ اے اکبرآبادی ۲۴ سالانہ
(۸) معاونہ ادب محترمہ نجمہ تصدق ایم۔ اے۔ بی ٹی للعہ ۲۴ سالانہ

انیسان ادب

(۹) انیس ادب جناب سید لالفضل کریم صاحب جمشید پوری ۱۵ سالانہ
(۱۰) انیس ادب جناب محبوب حسن صاحب آسی متوطن رڑکی بمبئی۔ ۱۵ سالانہ

ہمدردان ادب

(۱۱) ہمدرد ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلطان جالندھری ۱۲ سالانہ
(۱۲) ہمدرد ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری مرحوم ۱۲ سالانہ
(۱۳) ہمدرد ادب جناب کنور زادہ کنور شکور حسین خانصاحب قیس آف بینڈوہ ۱۲ سالانہ
(۱۴) ہمدرد ادب جناب سمیل گوکھر صاحب راز جوناگڈھی ۱۲ سالانہ
(۱۵) ہمدرد ادب جناب عبدالعظیم خانصاحب رونق دکنی جمشید پوری ۱۲ سالانہ
(۱۶) ہمدرد ادب جناب صاحبزادہ سید مظفر حسین صاحب گوہر رئیس و زمیندار (دان ساد ھارام) ۱۲ سالانہ
(۱۷) ہمدرد ادب جناب مخدوم سید علی احمد صاحب نقوی البخاری احمدآبادی ۱۲ سالانہ
(۱۸) ہمدرد ادب جناب ملک محمد میاں حسن میاں صاحب چشتی نظامی کلول ۱۲ سالانہ
(۱۹) ہمدرد ادب خانصاحب عبدالمجید خاں آف مانا ودر ۱۲ سالانہ

خاصان ادب

(۲۰) جناب صاحبزادہ سلطان حامد خانصاحب ثروت گلشن آبادی صہ سالانہ
(۲۱) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمن خانصاحب شفق ٹونکی صہ سالانہ
(۲۲) جناب عبدالحفیظ صاحب ثمر صدیقی پھرادی بی۔ اے صہ سالانہ
(۲۳) جناب لالہ گنگا رام صاحب آبدیر ہستدکی صہ سالانہ
(۲۴) جناب سید مظفر حسین صاحب عرشی دہلی صہ سالانہ
(۲۵) لائبریرین صاحب پبلک لائبریری بیور صہ سالانہ
(۲۶) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی جمشید پور صہ سالانہ
(۲۷) جناب محمد عبداللہ خاں صاحب بزم امروہوی صہ سالانہ
(۲۸) جناب ماسٹر حسن خانصاحب اختر بمبئی صہ سالانہ
(۲۹) جناب نذیر احمد صاحب نذیر سشیر کوٹی صہ سالانہ
(۳۰) جناب صبغۃ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی صہ سالانہ
(۳۱) جناب پریم چند صاحب پریم دہلوی صہ سالانہ
(۳۲) جناب طالق ہمدانی لدھیانوی صہ سالانہ
(۳۳) جناب سبحان خانصاحب غافل بیتول صہ سالانہ
(۳۴) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی کوکھا بہ صہ سالانہ
(۳۵) جناب حبیب حسن خانصاحب حبیب شاہجہانپوری (کوٹہ) صہ سالانہ
(۳۶) جناب بابو فقیر محمد خانصاحب عارف سیالکوٹی (کوٹہ) صہ سالانہ
(۳۷) جناب شیو پرشاد صاحب برگ باندوی صہ سالانہ
(۳۸) جناب ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب زار کاندھلوی صہ سالانہ
(۳۹) جناب پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی صہ سالانہ
(۴۰) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعر ہٹوری صہ سالانہ
(۴۱) ابوالفتح ڈاکٹر محمود سعاد صاحب قائم محمد اسی ادیب عالم فاضل گیانی صہ سالانہ
(۴۲) جناب ماسٹر کالوسیاں صاحب مذاق ڈبوہی (بڑودہ) اسٹیٹ صہ سالانہ
(۴۳) جناب ایم عنایت اللہ خانصاحب عنایت گوردم سپوری ٹیس میونسپل کمشنر صہ سالانہ
(۴۴) جناب کنور فاروق علیخاں صاحب عارف رئیس بینڈوہ صہ سالانہ
(۴۵) جناب صوبیدار اختر علی صاحب اختر گوالیاری صہ سالانہ
(۴۶) جناب ڈاکٹر ماتا پرشاد صاحب استھانہ زیب بریلوی صہ سالانہ
(۴۷) جناب مقبول احمد صاحب اعظم گڈھی صہ سالانہ
(۴۸) جناب مولوی ظہیر الدین صاحب ظہیر ناطاسی گجراتی سپہدی صہ سالانہ
(۴۹) جناب سید حبیب الرحمان صاحب ... جمشید پور صہ سالانہ
(۵۰) جناب ... صاحب ... صہ سالانہ

جرعات

حدیثِ جنگ

جو عالمگیر جنگ دو سال گذرنے کے بعد بھی ہنوز شباب پر ہے۔ اس کے انجام اور آیندہ پیدا ہونے والی تباہیوں کا علم کسے ہو سکتا ہے جتنی قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں وہ ابھی ہوئی صورتِ حالات کو کچھ اور اُلجھا دیتی ہیں اور باوجود کوشش کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچا جاتا۔ مختصر یہ کہ دنیا پر انقلاب کے شکنجے روز بروز تنگ اور سخت ہوتے جا رہے ہیں اور حشرات الارض کی طرح پسنے والے انسانوں کی کراہ دُور سے سنائی دے رہی ہے۔ جن ممالک میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اُن کا تو ذکر ہی کیا ـــــ ہمارے وطن کے اندرونی حصے بھی جو ہنوز محفوظ دامون ہیں جنگ کے پیدا شدہ نتائج سے اسقدر ماؤف ہو کر رہ گئے ہیں کہ کاروبارِ حیات میں مصروف ہونے کے باوجود ان میں زندگی کی کوئی ہلکی سی شعاع بھی چمکتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ سرمایہ داروں کا ذکر نہ کیجئے ـــــ مختاروں کو تصور میں جگہ نہ دیجئے بلکہ مزدوروں اور مجبوروں کا خیال کیجئے۔ جیسے خزاں آلود بہار اور جیسے بھری ہوئی دھوپ میں بارش کے چند چھینٹے۔

اقتصادی۔ معاشی۔ سیاسی اور ادبی الجھنیں اب اس مقام پر پہونچ گئی ہیں۔ جہاں سانس گھٹنے لگتی ہے۔ جہاں انسان بغیر ارادہ خودکشی پر مجبور ہو جاتا ہے اور جہاں زندگی کے روپ میں موت نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ ہنگامی حالات کے تحت ہیں اس کا کوئی کامیاب حل نہیں سوچا جا سکتا لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ نزاکتِ وقت کا علم ہوتے ہوئے ہم وطن اور اہلِ وطن سے بے نیازی اور بیگانگی برتیں اگر ہم قوم اور وطن کی زندگی کو سانس لیتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہونا چاہیے کہ ہم کسی نہ کسی طرح عام انتشار پر قابو پاتے ہوئے اور مل جل کر ایک ایسا لائحہ عمل بنائیں جس سے ایک دوسرے کی مدد ہو سکے۔

ہم وثوق کیساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جنگ کے جتنے بُرے اثرات ادب و صحافت پر پڑ رہے ہیں اتنے کسی دوسرے شعبۂ حیات پر نہیں پڑے۔ ہر شہر میں متعدد اخبار رسالے اور چھاپے خانے بند ہو چکے ہیں۔ بعض سسک رہے ہیں اور بعض جان و مال کی بازی لگا کر زندہ رہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جن مشاہیر شعرا اور ادبا کی تصانیف اشاعت کا انتظار ہو رہی ہیں ختم ہو چکی ہیں۔ دوبارہ اُنکی اشاعت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کاغذ بے گراں تھا ہی لیکن کسی نہ کسی قیمت پر مل ضرور جاتا تھا۔ اب جب سے گورنمنٹ نے کاغذ پر "کنٹرول" کیا ہے ایک عجیب مصیبت پیدا ہو گئی ہے مصیبت ہی نہیں بلکہ Dead lock ۔ یعنی دوکان سے کاغذ فروش غائب اور گھر دوکان کی طرف سے حیران کیجئے اور گھر سے استفسارِ حال۔ اگر کوئی کاغذ فروش اتفاق سے مل بھی گیا تو سیدھا سا جواب دے دیتا ہے کہ "مِل سے مال آ ہی نہیں رہا ہے"۔ یہ حالت ہے عام کاغذ فروشوں کی اب انھیں دیکھئے جنھیں گورنمنٹ نے "رف کاغذ" کی خرید و فروخت کی اجازت دیدی ہے اور جو صرف چوگنے نفع پر کاغذ فروخت کر رہے ہیں۔ اُن کا جواب یہ ہے کہ دیکھو مال لینی ہی نہیں شہروں میں پہونچے کس طرح۔ لیجئے معاملہ ختم ہو گیا۔ یہ مصیبتیں کچھ کم نہ تھیں کہ فرقہ وارانہ جذبات بھی پیدا ہو گئے۔ مسلمان کاغذی مسلمانوں کو نوازتے ہیں اور ہندو ہندوؤں کو۔ یہ ہندوستانیوں کی کسقدر شرمناک ذہنیت ہے۔

اس تہ پیدا ہونے کا مہینہ کاغذ حاصل کرنے کی سعی میں صرف ہوا اور بڑی دقتوں کے بعد شاعر وقت پر شائع ہو سکا۔ شاید کسی کو یقین آسکے کہ اس تہ آٹھ گنی زیادہ قیمت پر کاغذ ملا ہے۔ ہندوستان کے وہ رسائل یا اخبارات جو بند ہو چکے ہیں یا دیر شائع ہو رہے ہیں یا جنھوں نے اپنا چندہ بڑھا دیا ہے یا حجم کم کر دیا ہے۔ ناظرین کے عتاب اور ناراضگی کے نہیں بلکہ دلی ہمدردی اور اعانت کے مستحق ہیں یقین کیجئے صحافت دم توڑ رہی ہے۔ اگر اب بھی آپ اس کے حلق میں چند قطرے پانی کے نہ ڈالیں گے تو ایثار و ہمدردی کے اظہار کا وقت پھر کب آئیگا؟

زمانۂ جنگ میں "شاعر" جس پابندی اور اہتمام سے شائع ہوتا رہا ہے اس کا ناظرین کو علم ہے خود ستائی گناہ کے مترادف ہے۔ بہرکیف یہ فیصلہ کیا جا چکا ہے کہ حالات کا تقاضہ کچھ بھی ہو، واقعات کتنے ہی مایوس کن کیوں نہ ہو جائیں جب تک کاغذ کے ملنے کا امکان ہے "شاعر" کی اشاعت اسی اہتمام سے ہوتی رہے گی۔ خواہ اس سلسلے میں کتنی ہی عظیم قربانیاں کیوں نہ کرنی پڑیں۔ مئی ۱۹۴۲ء کی اشاعت تک مصمم ارادہ تھا کہ اسی قلیل چندہ میں "شاعر" کے ہزارہا خریداروں کو تا اختتامِ جنگ رسالہ پہونچایا جائے اور یقین تھا کہ کاغذ کی قیمت اب اور نہ بڑھے گی لیکن اس مہینہ کے پیدا شدہ واقعات نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم بھی دوسرے رسائل اور اخبارات کی طرح "شاعر" کے چندہ میں برائے نام اضافہ کر دیں۔ شاعر جتنے صفحات پر شائع ہو رہا ہے اتنے ہی صفحات کے رسائل کی سالانہ قیمت پانچ روپیہ اور چھ روپیہ تک ہے۔ تاہم "شاعر" کے ناظرین کی مجبوریوں کا خیال ہے اسلئے چندہ میں صرف ایک روپیہ کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اگست ۱۹۴۲ء سے "شاعر" کا سالانہ چندہ بجائے تین روپے کے چار روپیہ (للعہ) ہوگا۔ اُمید کہ "شاعر" نواز ناظرین ہماری مجبوری اور بے بسی کے پیشِ نظر اس اضافہ کو گوارا فرمالیں گے۔

جن حضرات کی طرف چندہ باقی ہے وہ براہِ کرم اپنی اوّلین فرصت میں روانہ فرما دیں۔

آخر جولائی تک جتنے خریدار ہو گئے اُن سے تین روپیہ ہی لئے جائینگے۔ اپنے احبا اور اعزا کو "شاعر" کی خریداری کے لئے آمادہ فرمائیے۔ آپ کی توجہ فرمائی اردو زبان و ادب کے لئے آبِ حیات کا کام

شعرِ انقلاب ـــــ اذانِ شاعر

سُن اک دلِ بیدار ہے معروفِ فغاں، سُن ہے تا بہ زباں سلسلۂ دردِ نہاں سُن
اشکوں سے وضو کر کے میں کرتا ہوں بیاں، سُن اک شور سا برپا ہے قریبِ رگِ جاں سُن

اے گوشِ گراں، گوشِ گراں، گوشِ گراں سُن
شاعر کی اذاں سُن!

بڑھتی ہی چلی جاتی ہے فتنوں کی کہانی ہے اب بھی بدستور وہی شعلہ فشانی
کی اپنے وطن کی جو نہ تو نے نگرانی کس کام پھر آئے گی یہ شہ زور جوانی؟

اے مردِ جواں، مردِ جواں، مردِ جواں سُن
شاعر کی اذاں سن!

آسائشِ مشرق سے ہے ہیجان ہم آغوش نرغے سے حوادث کے ہے انسان ہم آغوش
ہے موجِ ہلاکت سے ہر ایوان ہم آغوش اب ہند کے ساحل سے ہے طوفان ہم آغوش

اب دیر کہاں، دیر کہاں، دیر کہاں، سُن
شاعر کی اذاں سُن!

اُٹھ بیٹھ، کہ ہنگامِ نمازِ وطن آیا کیا لالہ و گل، وقتِ وداعِ چمن آیا
وہ مرحلہ، جو تھا خلشِ حسنِ ظن آیا ہر قافلہ تا منزلِ قبر و کفن آیا

یہ رازِ نہاں، رازِ نہاں، رازِ نہاں سن
شاعر کی اذاں سُن!

سیماب اکبرآبادی

شخصیات :- حضرتِ فضا جالندھری

سید فضل محمود شاہ نام، ابن شاہ امام الدین علی ابن سید امیر شاہ ابن سید اکبر شاہ ۔

آپکے آباؤ اجداد اوچہ شریف (ملتان) سے لاہور آئے اور تلاش معاش میں پھرتے پھراتے نور محل (کندھولہ) ضلع جالندھر پہونچے ۔ ۲۷ جولائی ۱۹۰۵ء کو فضا صاحب یہیں پیدا ہوئے ۔ ۱۹۲۱ء تک ابتدائی تعلیم ورنیکلر مڈل اسکول نور محل میں پائی اور یہیں مولانا نوازش علی دانش تلمیذ شمس العلما علامہ آزاد دہلوی سے فارسی کی تکمیل کی پھر اپنے والد ماجد سے طب اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ۱۹۲۱ء میں مڈل فائنل کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۲۳ء میں جالندھر سے نارمل پاس کیا پھر ۱۹۲۵ء میں سینیر اعلیٰ ورنیکلر کی سند حاصل کی ۱۹۳۰ء میں منشی فاضل اور ۱۹۳۶ء میں ادیب فاضل کے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کئے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۲۶-۱۹۲۵ء دو سال ورنیکلر مڈل اسکول کلیان پور میں ملازم رہے وہاں سے ۱۹۲۷ء میں گڑھ شنکر ہائی اسکول میں تبادلہ ہوگیا ۳۰-۱۹۲۸ء تک نارمل اسکول ہوشیارپور میں بحیثیت مدرس فارسی کام کرتے رہے اور آخر کار ۱۹۳۰ء میں آپ کو مستقلاً گورنمنٹ ہائی اسکول جالندھر میں بحیثیت اورینٹل ٹیچر بھیجدیا گیا، اور ۱۹۴۰ء تک آپ وہیں رہے۔ آجکل گڑھ شنکر ہائی اسکول میں فارسی کے مدرس اوّل ہیں۔

حضرت فضا کے والد بزرگوار حضرت امام الدین علی شاہ مرحوم بڑے بلند پایہ بزرگ اور اپنے افراد خاندان میں ممتاز تھے ۱۹۳۳ء میں بمقام جالندھر انتقال فرمایا۔ فضا صاحب کے لئے ہمیشہ دست بدعا رہتے تھے، بقول فضا صاحب میرا درخشاں مستقبل میرے والد بزرگوار ہی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے"

۱۹۲۴ء میں آپ میں ذوقِ شعر پیدا ہوا، زمانۂ تعلیم میں کوئی بھی کھل کر اپنے کسی ذوق کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ جب آپ برسرِ کار ہوگئے تو ذرا آزادی کے ساتھ شعر و سخن کی طرف متوجہ ہوئے ابتدائی کلام لسان الملک ریاض خیرآبادی مرحوم اور فصاحت جنگ حضرت نواب جلیل مانکپوری کو دکھلایا حضرتِ فضا ذرا انقلاب پسند واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ بہت جلد آپ قدیم رنگِ تغزل سے دل برداشتہ ہوگئے اور جدید رنگ اختیار کرلیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ عزیز۔ فانی۔ سیماب حسرت۔ اصغر اور یاس وغیرہ جدید تغزل کو بامِ عروج پر پہنچا رہے تھے اور تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ سے زیادہ متاثر ہو رہا تھا فضا صاحب نے رنگِ جدید تو اختیار کرلیا لیکن اس رنگ کی رہنمائی کا سوال ہنوز تشنہ تھا کہ آپ ...... کے .... ہوگئے۔ نگار .... ہندوستان کے مشہور اساتذہ کا کلام شائع ہوتا تھا اُسی کے متعدد شماروں میں اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری کا کلام دیکھنے کے بعد آپ بہت متاثر ہوئے اور ۱۹۳۱ء میں حضرت دل کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے فیض اور باکمال استاد کے فیض کرم سے آپ کا رنگ بہت جلد نکھر گیا اور اس وقت سے تا ایندم آپ حضرتِ دل ہی کے دامنِ فیض سے وابستہ ہیں ایک طرف اُستاد کی عنایت و شفقت ہے تو دوسری طرف عشق کے درجہ تک پہونچی ہوئی عقیدت و محبت ـــــــ اس گھرے لگاؤ کا نتیجہ جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہ ظاہر ہے۔ دو مرتبہ فضا صاحب شفیق استاد کی خدمت میں بھی حاضر ہوچکے ہیں، آپ نے اپنے کلام میں متعدد جگہ استاد سے اظہارِ عقیدت کیا ہے ؎

آستانِ جنابِ دل سے فضا ۔۔۔ اُٹھ چکی اب مری جبینِ نیاز

تاجدارِ سخن ہیں آپ فضا ۔۔۔ فیض پایا ہے حضرتِ دل سے

یہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ شاعری کی تکمیل کے لئے محرکات اور ماحول کی ضرورت ہوتی ہے اور دیکھا بھی یہی گیا ہے کہ ماحول کی مغایرت نے کسی اچھے سے اچھے شاعر کو آگے نہیں بڑھنے دیا فضا صاحب کی عمر کا ابتدائی حصہ حصول تعلیم میں گذرا۔ اس سے فارغ ہوئے تو آپ ادہر اسکول میں اور کل اُس اسکول میں۔ غرض کہیں سکون سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ خوش قسمتی سے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کا دس سالہ عہد جالندھر کی ادبی اور رومانی فضاؤں میں گذرا اور یوں کہنا چاہئے کہ اس دور میں آپ کی زندگی نکھر کر ادبی بن کر رہ گئی۔ رسا جالندھری۔ حفیظ جالندھری۔ جوش ملسیانی اور آذر جالندھری وغیرہ کی پُرلطف صحبتیں، پے در پے مشاعروں کی شرکت۔ علمی و ادبی مجالس۔ مباحث اور ماحول کی رنگ سامانیوں نے ہوا دیکر ان چنگاریوں کو شعلہ بنا دیا جو ذہن و فکر میں دبی ہوئی تھیں شیخ بشیر احمد صاحب ضیا کی ادبی صحبتوں سے بھی فضا صاحب نے کافی فائدہ اُٹھایا شیخ صاحب نقد و نظر کی بہترین صلاحیت رکھتے ہیں۔ حضرتِ فضا کے ارتقائی تغزل کا مشاہدہ جالندھر کی پیداوار ہے۔ یہیں سے آپ کا کلام اخبارات و رسائل میں شائع ہونا شروع ہوا اور آپ نے شہرت و قبولیت کی نئی منزل میں قدم رکھا۔ ۱۹۴۰ء میں جگراؤں تبادلہ ہوگیا۔ وہاں اسطرح تازہ ہندیر سید رجب علی مرحوم کے خاندان سے مراسم و تعلقات پیدا ہوگئے اور علمی و ادبی مجالس گرم رہیں۔ جگراؤں میں اسی خاندان کے ایک ممتاز فرد اور خوش فکر شاعر سید ظہیر الدین حیدر کے دوستانہ تعلقات نے اور بھی سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ ایک بار فرماتے تھے کہ فصیح الملک مرحوم نے انھیں لکھا کہ "جتنا علم کا مطلع صاف ہوگا اتنا ہی شعر کا مطلع صاف ہوگا"۔ چنانچہ حضرت فضاؔ کے کلام کو میں اسی روشنی میں دیکھتا ہوں مشرقی علوم کے ماہر ہونے کے علاوہ آپ نے فن کو جس طرح حاصل کیا ہے۔ قدیم و جدید تغزل کے متعلق بھی مطالعہ وسیع ہے اور ادب و شعر کی جدید تحریکوں سے بھی آپ کما حقہٗ واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں خاص انفرادیت ہے۔ فضا صاحب جو کچھ کہتے ہیں سمجھ کر کہتے ہیں۔ میں نے آپ کے کسی شعر میں اہمال نہیں دیکھا پھر یا اس قنوطیت کا آپ کے یہاں نام تک نہیں۔ یاس انگیز مضامین میں شگفتگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور رکھتے ہیں ہر چند آپ کے یہاں بلند الفاظ اور نئی ترکیبیں کثرت سے نہیں ہوتیں۔ لیکن پھر بھی شعر لطیف معنی کا حامل ضرور ہوتا ہے اور یہ حضرتِ دلؔ شاہجہانپوری کے صحیح تتبع کا نتیجہ ہے۔ حضرتِ دلؔ کے کلام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ سادہ اور عام فہم الفاظ میں بھی مضمون پیدا کر دیتے ہیں۔

اس قسم کی شاعری قدیم و جدید تغزل کا ایک درمیانی عکس ہے اور اپنے اثر و تاثر کے اعتبار سے کامیاب۔ مولانا حسرتؔ موہانی کے کلام کی بھی یہی خصوصیت ہے۔ فضا صاحب کو غالبؔ، مومنؔ، سیمابؔ، دلؔ، عزیزؔ، فانیؔ اور حسرتؔ وغیرہ کا کلام محبوب ہے۔ اہلِ نظر سمجھ سکتے ہیں کہ جو شاعر ان آتش نفس شعرا کے کلام کو عزیز رکھتا ہو اور اس کا مطالعہ بھی کرتا ہو۔ اس کی منزل کہاں ہوگی؟ یہی وجہ ہے کہ ریاضؔ خیرآبادی۔ نواب فصاحت جنگ جلیلؔ، اثرؔ صہبائی، عزیزؔ لکھنوی اور عابدؔ شاہجہانپوری وغیرہ شعرا نے فضا صاحب کے کلام کے متعلق بڑے حوصلہ افزا خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔

مشاہیر ادبا اور شعرا سے خط و کتابت کرنا آپ کا محبوب شغل ہے۔ چنانچہ آپ کے پاس ایسے خطوط کثرت سے موجود ہیں جن میں علمی، ادبی مباحث پر گفتگو کی گئی ہے اور "گلدستہ مکتوب" کے عنوان سے انھیں شائع کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ "مکتوباتِ دلؔ"، "لالہ زارِ فطرت" (دیوان) "لالہ و گل" (مجموعۂ قصائد) "سمن زار" (مجموعۂ نظم) "اصولِ فارسی" (فارسی قواعد اور ترجمے کے اصول) اشاعت کے لئے بالکل تیار ہیں۔

حضرتِ فضاؔ نے تنقیدی مضامین بھی کثرت سے لکھے ہیں۔ نظم و نثر پر آپ کو یکساں قدرت حاصل ہے۔ فضا صاحب کی سب سے بڑی خوبی جس سے کم از کم میں متاثر ہوں یہ ہے کہ آپ ہمیشہ مسائل علمیہ کی چھان بین کرتے رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ادب و شعر کا علمی و فنی وقار قائم رہے۔ حالانکہ وہ اسی صوبہ پنجاب کے ایک فرد ہیں جہاں آجکل شعر و ادب میں علم و فن کا کوئی درجہ نہیں۔ موضوعاتِ ادب و شعر میں تبدیلی پیدا کر کے اُسے زندگی اور واقعیت سے قریب تر لانا تو ایک احسن فعل ہو سکتا ہے لیکن علم و فن سے بغاوت ایک انتہائی غیر دانشمندانہ اقدام ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ پنجاب کے ماہرینِ علم و فن اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی طرف متوجہ بھی نہیں ہیں!

فضا صاحب سے مشورۂ سخن کرنے والے حضرات کی تعداد بھی کافی ہے ان میں علی محمد ارشدؔ جالندھری۔ عبدالرشید فخریؔ۔ ساغرؔ راولپنڈوی۔ عبدالغنی صاحب شوقؔ فرحتؔ جالندھری اور اخترؔ جالندھری کے نام نمایاں ہیں۔

نمونۂ کلام

یارب نہ ہمکنارِ اثر ہو مری دُعا
کم ہو نہ جائے کیف کہیں انتظار کا

تم اندازِ نظر سے پوچھ لو خود
ہماری آرزو کیا مدعا کیا

آنکھیں کہاں سے چھپائیں گی۔ کیونکر یہ مان لوں
جو رازِ عشق دل سے چھپایا نہ جائیگا

کیا دیکھتے ہو ڈوبنے والے کا اب مآل
موجوں کے اختیار میں ساحل نہیں رہا

اُن کی نگاہِ ناز ہے کیوں محوِ التفات
اب کوئی عرضِ حال کے قابل نہیں رہا

حسن ہر الزام سے ہے بے نیاز
بندگی میں شکوۂ بیداد کیا

اے نیازِ عشق پیدا کر وہ شانِ آرزو
اضطرابِ شوق ہو اُن کے تغافل کا جواب

ہر نفس اب کیوں نہ پیغامِ وداعِ ہوش ہو
یہ ہوائے سرد، یہ عالم، یہ [illegible]

دل کو دل کہئے تیرے جلووں سے
اک آئینہ ایک آئینہ ہے

تم نظر میں رہو کہ دل میں رہو
یہ ہے ہمراز وہ ہے محرم

کوئی حد بھی فریبِ شوق کی ہو
ہر صدا پر ہوں گوش بر آواز

جانتا ہوں رازِ فطرت اے دلِ درد آشنا
عشق اک تصویرِ غم ہے حسن تصویر

موقوف کب چمن پہ ہے رنگینیٔ بہار
دامن بھی آنسوؤں سے گلستاں ہے

لبِ خاموش سے رودادِ محبت کہئے
شیوۂ اہلِ وفا ضبط ہے فریاد نہیں

کیا تسلی دلِ ہنگامہ طلب کو ہوتی
طور پر اب وہ تجلی سرِ طور نہیں

اک نظر جانبِ دل اے نگہِ حور سرشت
میری تقدیر بدل جائے تو کچھ دُور نہیں

کیا کہئے دل پہ کیا دمِ رخصت گذر گئی
دیکھا کئے ہم اُن کو جہاں تک نظر گئی

ٹھوکریں کھائیں کسی کی رہگذر میں غم نصیب
کاش یہ پہلو بھی بدلے انقلابِ زندگی

مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں فضاؔ اپنی ادبی و شعری خوبیوں سے زبان اور ملک کی بیش از بیش خدمت کر سکیں گے اور دُنیائے شعر میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہوں گے۔

اعجاز صدیقی

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

طوفان کی پُر شکن جبیں ہے ابتک
تسکین کا امکاں نہیں ہے ابتک
وہ بھی کرۂ نار ہے بننے والا
محفوظ جو گوشۂ زمیں ہے ابتک

سُنتا ہوں کہ مصر پر بھی اب یورش ہے
یوسفؑ کا وطن موردِ آویزش ہے
فرعون ہے رودِ نیل کی سمت رجوع
موسیٰؑ کو پکارنے کی یہ کوشش ہے

اے مسلمِ عہد، اے پرستارِ نبیؐ
اے مصری و ترکی یمنی و عربی
خوں اپنا ملا کے ٹال اس موذی کو
بجھتی نہیں دیوِ جنگ کی تشنہ لبی

بے مثل ہے شانِ سخت کوشی تیری
اس وقت ہے ناروا خموشی تیری
سر دے کے کیا ہے امن قائم تو نے
دُنیا کو ہے یاد سرفروشی تیری

ارباب فساد کو دلاتا ہوں میں یاد
اسلام ہے متحد پئے رفعِ فساد
تیار ہیں سب حق کی حمایت کیلئے
باطل نہیں عہد نامۂ سعد آباد

سمٹے ہوئے طوفاں کو صدا دیتا ہے
خاموش شراروں کو ہوا دیتا ہے
جیشِ مسلم کو چھیڑنا دانستہ
سوئے ہوئے شیر کو جگا دینا ہے

اے وہ کہ ہے احساں ترا انسانوں پر
بالواسطہ ہے کرم مسلمانوں پر
لاریب تری ہاتھ ہے اب شرم ان کی
بات آکے پڑی ہے تری دیوانوں پر

بدلا ہوا رُخ ہے روشِ دُنیا کا
جادہ ہے نیا قیامتِ برپا کا
شاید پھر امتحان ہے دُنیا میں
اسلام کی عسکریتِ کبریٰ کا

مومن کہ ہے شایانِ سرافرازی بھی
مفسوم ہوئی ہے اسی جانبازی بھی
اسلام کی تاریخ ہے زندہ شاہد
اسلام میں احرار بھی ہیں غازی بھی

اک حربۂ ممتاز ابھی باقی ہے
تاثیر بھرا ساز ابھی باقی ہے
بے حرب کے آلات ہوئے کُند مگر
"تکبیر کی آواز" ابھی باقی ہے

سیماب

نوٹ: [illegible] (بحوالۂ "شاعر") نقل کر سکتے ہیں ——— ایڈیٹر

کمالاتِ کمالی تحقیق و تصحیح کی روشنی میں

اور سنیئے :۔

مجھے تو بالیقیں اقرار حضرت ہیں بڑے فاضل ... اعوذ کو مگر مبحث یہاں ہے محض لاحاصل
اگر ہو بھی کوئی یہ شرطِ استعدادِ جان و دل ... ضمیرِ ہر مسلماں ہے اسی استحکام میں شامل

اس استحکام کے تنافر کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر آپ معنی سمجھنا چاہیں تو پہلے علامہ سیماب کو یہ شعر پڑھئے ؎

خدا کے ساتھ اعوذ میں بھی استحکام ہے اسکا
کلام اللہ میں سب سے زیادہ نام ہے اسکا

کمال یہ ہے کہ مولانا کمالی تو سو فیصدی علامہ سیماب کے فاضل اجل ہونے کا اعتراف کر رہے ہیں اور اُن کے حاشیہ نشین کلکتہ کے ایک رسالہ میں مولانا کے علم و فضل سے منکر ہوتے جاتے ہیں۔ "من چہ سرایم و طنبورہ من چہ سے سراید" شاگردانِ کمالی کو چاہیئے کہ وہ اپنے استاد کے ممدوح کا ادب کریں، ورنہ وہ ہی مثل ہوگی کہ "مدعی سست اور گواہ چست" "اعوذ کو مگر مبحث" کی جگہ اگر "اعوذ کا مگر مبحث" ہوتا تو شاید بحث و مبحث سے قطع نظر اس میں کچھ معنی پیدا ہو سکتے، مگر کمالی کا وہ شعر ہی نہیں جو معنی پیدا کرتا ہو۔

دوسرے شعر میں "یہ شرطِ استعدادِ جان و دل" اور "ضمیرِ ہر مسلماں" کمالی صاحب کی اہمال آمیز خصوصیات کا آئینہ ہیں

لگا کر قید یہ سب سے زیادہ کی کرم گستر ... کیا احسان نادانستہ یا دانستہ عالم پر
شریک اس میں آ ہی نام خدا بھی کیوں نہ ہو اور ... کسی کا نام قرآں میں نہیں اس نام سے بڑھ کر

کتابت کی غلطی سے فائدہ اٹھانا میرے مشربِ تنقید میں کفر ہے اسی لئے دوسرے مصرعہ میں "ہو" زیادہ کر کے میں نے قافیہ کے خلا کو بھر دیا ہے۔ "مدینہ" مجریہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۱ء میں اس مصرعہ میں "ہو" شائع نہیں ہوا ہے۔ اسے کمالی کے قلم کی چوک سمجھئے یا مدیر "مدینہ" کا سہو نظر یا کاتب "مدینہ" کی غلطی، بہرحال میں اسے نظر انداز کرتا ہوں۔ کمالی صاحب کی نظم جس قدر طویل ہوتی گئی ہے اُسی قدر اس میں معنی مطلب اور فن کی کوتاہیاں بڑھتی گئی ہیں۔ اسی بند کو دیکھ لیجئے مطلب سے بے نیاز ہے "سب سے زیادہ" کی تفصیل "اس میں" کا مشار الیہ کمالی صاحب کے ذہن میں محفوظ ہے، کیوں نہ ہو "اور" کا ٹکڑا درمیان میں کس بُری طرح سے ٹھونس دیا گیا ہے۔ قرآن کے نون کو غنہ کر دیا گیا ہے جو غیر فصیح ہے۔

اسی قسم کے چند بند اور سنیئے جو جناب کمالی کے تعلّمستان کے شاہکار ہیں۔

وہ پہنچا تا بہ آدم اندرونِ روضۂ جنت ... پھر اسکو ضبطِ رازِ قادر و قدرت سے کیا نسبت
جو کچھ ہو بھی تو شیطاں ہی کا کیا ذکرِ خصوصیت ... ملائک بھی ہوا کرتے تھے اکثر حاضرِ خدمت
ہوا خاک آگ پانی بن سکے ہر جن کی فطرت ہے ... فرشتوں کی طرح شکلیں بدلنا ان کی عادت ہے
پڑے ہیں امتحاں میں نفس یزدانی مشیت ہو ... حکومت اور خدا بنکر؟ یہ کس کی تاب و طاقت ہے
وہ انساں کی ہدایت سو فزوں تر آشفتہ دل بھی ہے ... پئے تفصیلِ عالم صرفِ سعی جانگسل بھی ہے
خرابی آدمی کی اسکا عزمِ مستقل بھی ہے ... وہ پانچ نیتوں میں بھی نمازوں میں مخل بھی ہے

ان بندوں کا مطلب سمجھنا تو "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے مصداق ہے ہاں ذرا الفاظ کے رکھ رکھاؤ، ترکیبوں کی چستی اور بندشوں کی برجستگی پر سرسری نظر ڈال لیجئے۔

پہلے بند میں "اندرونِ روضۂ جنت"، "ضبطِ رازِ قادر و قدرت" اور "شیطاں کے ذکرِ خصوصیت" سے آپ کا مذاقِ فصاحت کدر ضرور ہوگا لیکن دوسرے بند میں "فرشتوں کی شکلیں بدلنے" پر آپ بے اختیار ہنس پڑینگے۔ اسی طرح "پڑے ہیں امتحاں میں نفس" "صرفِ سعی جانگسل" اور "خرابی آدمی کی" دیکھکر کمالی کے کمالِ فصاحت کی داد دینی پڑیگی۔ آخری بند میں "بھی ہے" کی ردیف کس قدر برجستگی اور روانی کے ساتھ استعمال ہوئی ہے یہ دوسری بات ہے کہ اسے ہر جگہ اپنے معنی کا ماتم کرنا پڑ رہا ہے سچ ہے کمالی کے کمالِ علم میں کوئی مخل بھی ہے؟ ایک شاہکار اور دیکھئے۔

خدا کے راز میں بندوں کی شرکت وہ نہیں چاہتا ... وہ دل، دات اس لئے کبھی آدمی اور ملک کو بہکاتا
مگر یہ رمز میری فہمِ ناقص میں نہیں آتا ... "تقاضائے محبت" ہے لئے کیوں کوئی فرماتا

کمالی صاحب۔ چاہتا کی "ہ" کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑئیے۔ یہ گم پاکر آمادۂ گریز ہے مگر معلوم ہوتا ہے آپ اسے دانستہ بھگا رہے ہیں جب ہی چاہتا کا قافیہ بہکاتا لکھدیا ہے اتنا تو نہ ہوتا بھکے مصرعوں کی سستی پر تو آپ کی توجہ دلانا ہی فضول ہے نظم میں جستہ جستہ کمالی صاحب جو آپ سستی محسوس کریں مجھکو بس مطلع فرما دیجئے یہ آپ کے آدمی ذرا دیر سے کاوش کی لذت تو نہیں معلوم ہوتے اور رمز فہم جنہیں آتا کمال تک پہنچ ہے مرزاؔ کی ہدایت جہاں [illegible]

صبا متھراوی

زندگی — شاعر کی نظر میں

زندگی کی عشرتوں میں گم ہوا جاتا ہوں میں — زندگی میں اپنے جذبوں کی کشش پاتا ہوں میں
کس قدر دلچسپ ہے یہ نغمۂ سازِ حیات — زندگی کے گیت سے دل اپنا بہلاتا ہوں میں
یہ سمندر یہ ہوا اور یہ فضائے دل نشیں! — کیا بتاؤں تجھ کو ہمدم کیوں اُڑا جاتا ہوں میں
ہر قدم پر اک فسانہ ہر قدم پر اک فسوں — دل نہیں قابو میں دل کو لاکھ سمجھاتا ہوں میں
دسترس میری کہاں ہے سرحدِ آزاد تک — تنگنائے کشمکش میں پاؤں پھیلاتا ہوں میں
فی الحقیقت زندگی ہے اک معمہ ایک راز — جس قدر کھوتا ہوں اس میں راز ہی پاتا ہوں میں
ہے کبھی درد و الم سے زندگی ماتم سرا — اور کبھی اس زندگی کو خوش نوا پاتا ہوں میں
ہے کبھی عیش و مسرت اور کبھی رومانِ غم — یہ تماشا دیکھ کر حیراں ہوا جاتا ہوں میں

شعلہؔ آسا کھیلتا ہوں زندگی کے ساز پر
دل تڑپ اٹھتا ہے میرا اسکی ہر آواز پر

اک طرف کیف و مسرت کا سماں میرے لئے — اک طرف ہستی ہے دردِ جاوداں میرے لئے
اک طرف رنگین تسکیں اک طرف رنگین آگ — زندگی ہے ہر جہت سے گلستاں میرے لئے
اپنی منزل تک میں پہونچا ہوں بڑی مشکل کے بعد — زندگی ثابت ہوئی ہے ہفتخواں میرے لئے
اک طرف رنگیں بہاروں کے لئے ہے اہتمام — اک طرف ہے نظمِ آثارِ خزاں میرے لئے
کتنی راتیں صرف کی ہیں دل نوازی میں مری — صبح تک جاگا کیا ہے آسماں میرے لئے
ابتدا میں زندگی کو خوش ادا سمجھا تھا میں — زندگی کی سب ادائیں تھیں جواں میرے لئے
کس قدر تھا خوشنما اس زندگی کا پیرہن — زندگی گویا کہ تھی تسکینِ جاں میرے لئے
آہ لیکن جس قدر اس راہ میں بڑھتا گیا — زندگی ہوتی گئی بارِ گراں میرے لئے

زندگی آسان بھی ہے زندگی دشوار بھی
ہے سبکساری بھی اس میں یہ دلِ پُر بار بھی

زندگی کے راز سے پردہ اُٹھا سکتا ہوں میں
زندگی کا راز اگر جاہوں تو پا سکتا ہوں میں

ہے بھروسہ مجھ کو اپنی قوتِ ادراک پر
عرش کیا ہے عرش سے آگے بھی جا سکتا ہوں میں

دیکھتا ہوں زندگی کے حسن کو پیشِ نظر
زندگی کیا ہے حقیقت میں، دکھا سکتا ہوں میں

یاد ہے مجھ کو سرودِ نغمۂ سوزِ حیات
زندگی کے ساز پر ہر دھن میں گا سکتا ہوں میں

زندگی کا سیل بن کر زندگی میں ڈوب کر
ذہنِ انسانی میں اک طوفاں اُٹھا سکتا ہوں میں

محفلِ خوابیدۂ ہستی کو، ہو کر گرمجوش
نو بہ نو بیدار نغموں سے جگا سکتا ہوں میں

خاک کے ذروں کو دے کر ایک ترکیبِ جدید
زندگی کا خوش نوا ایواں سجا سکتا ہوں میں

ہے فنا نا آشنا میری نظر میں زندگی
موت کے چنگل سے بھی اس کو چھڑا سکتا ہوں میں

میری ہمت بے کراں، میری نگاہیں بھی بلند
میرے نغمے ہیں فلک رس میری آہیں بھی بلند

عارفِ ہستی ہوں، میں ہوں ترجمانِ زندگی
میری نظروں میں نہاں ہے اک جہانِ زندگی

ہے ازل سے تا ابد اک زندگی کا سلسلہ
ہے زمیں سے آسماں تک آشیانِ زندگی

زندگی وہ ایک قوت، ایک جذبہ ایک عزم
زندگی ہے اصل میں تاب و توانِ زندگی

زندگی کی ایک مظہر ہے یہ ساری کائنات
بے در و دیوار کا گھر ہے مکانِ زندگی

ابتدا و انتہا اس کی ہے نظروں سے نہاں
جادہ پیما ہے مسلسل کاروانِ زندگی

عالمِ احساس میں ہیں زندگی کی نزہتیں
یعنی ہے دشوار شرحِ داستانِ زندگی

ہر کسی پر زندگی عقدہ کشا ہوتی نہیں
ہے بہت مشکل سمجھ لینا فغانِ زندگی

زندگی ہے اک تصور زندگی اک نظریہ
زندگی سے خود ہی ملتا ہے نشانِ زندگی

زندگی کا نام لے کر آج پھر اٹھتا ہوں میں
اہلِ عالم کو بتانا چاہتا ہوں کیا ہوں میں

محمد صادق ضیا
بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

اُردو کی دو زندۂ جاوید تصانیف

اردو نثر کی ابتدا مذہبی تبلیغ کے زیر اثر ہوئی صوفیوں نے اس کا سنگِ بنیاد رکھا اور تارک الدنیا فقیروں نے اسے پروان چڑھایا مگر رفتہ رفتہ اُردو میں بھی افسانہ سازی اور قصہ نویسی کا رواج ہوگیا۔ اُردو کے اوّلین افسانے اور بیشتر منظوم قصے یعنی مثنویاں براہِ راست فارسی سے ترجمہ کئے ہوئے ہیں اور جو ترجمہ نہیں ہیں ان کا ماخذ فارسی ادب ہی ہے۔ غالباً اسی قسم کے قصوں میں فسانۂ عجائب اور باغ و بہار کا شمار ہے۔ ابھی تک یہ دریافت نہیں کیا جا سکا ہے کہ فسانۂ عجائب کس فارسی قصہ کا ترجمہ ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سرور نے اس کا پلاٹ مختلف قصوں سے اخذ کرکے ایک ڈھانچہ تیار کر لیا ہو مگر اب اسے ایک طبعزاد افسانہ کہنا ہی بہتر ہے۔ باغ و بہار جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں مشہور فارسی قصۂ چہار درویش کا ترجمہ ہے۔

یہ دونوں کتابیں ادبی اعتبار سے بہت اہم ہیں اتنی اہم کہ ادب اردو کا طالبعلم ان کے مطالعہ سے گریز کر ہی نہیں سکتا اور پھر ایک خاص بات یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں کو پڑھنے کے بعد ہمارا ذہن قدرتی طور پر ان کے مقابلہ کی طرف ملتفت ہوتا ہے اور ہم بے اختیار ان کا مقابلہ کرنے لگتے ہیں سب سے پہلی بات جو ہمیں مقابلہ کرنے پر آمادہ کرتی ہے وہ ان دونوں کتابوں کی زبان کا فرق ہے۔ زبان کا رجحان مشکل پسندی سے سادگی کی طرف ہوتا ہے۔ دوسری زبانوں میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے اور اُردو میں تو یہ امر محتاج ثبوت نہیں۔ ہم جب باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کا مطالعہ کرتے ہیں تو زبانوں کا فرق ہمیں حیرت و استعجاب میں ڈال دیتا ہے اور یہ تعجب اور بھی بڑھ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ فسانۂ عجائب باغ و بہار سے تقریباً ایک صدی کے ایک ربع بعد کی تصنیف ہے ان دونوں کتابوں کی تاریخ تصنیف کا معاملہ بھی ذرا تحقیق طلب ہے، باغ و بہار میر امن نے ۱۲۱۵ھ میں لکھنی شروع کی اور ۱۲۱۷ھ میں اختتام کو پہنچائی یعنی باغ و بہار ۱۸۰۲ء کی تصنیف ہے۔ فسانۂ عجائب کی تاریخ تصنیف کے بارے میں بعض تذکرہ نویسوں نے غلطی کی ہے اور اس کا سنہ تصنیف معلوم کن اثرات کے تحت ۱۸۴۲ء بتایا ہے، لیکن یہ غلط ہے معلوم ہوتا ہے کہ غلطی کرنے والے حضرات نے بالکل تحقیق و تدقیق سے کام نہیں لیا ہے۔ کیونکہ اس مشہور افسانے کا سنہ تصنیف بہت آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کی شہادت میں ہاتفِ غیبی آج بھی قطعۂ تاریخ کی صورت میں موجود ہے۔ اس سے زیادہ معتبر شہادت اور کیا ہو سکتی ہے۔ ایک نہیں۔ بلکہ پورے تین قطعات موجود ہیں۔ خود سرور کا قطعہ ہے

جب نے کہ سنا اسکو جی میں یہ لگا کہنے   یارب یہ فسانہ ہے یا سحر ہے بابل کا

تاریخ سرور اسکی منظور ہوئی جسدم   بے ختہ جی بولا نشتر ہے رگِ دل کا

اس سے ۱۲۴۰ھ نکلتا ہے جو ۱۸۲۴ء کے مطابق پڑتا ہے۔

نوازش کا قطعۂ تاریخ ہے ؎

برائے خاطرِ یاران و احباب   سرور ایں قصہ را چوں کرد ایجاد

بجستم سالِ تاریخش نوازش   فلک ایں گلستانِ بے خزاں داد

قطعہ کے آخری مصرع سے ۱۲۴۰ نکلتے ہیں۔

مدہوش لکھتے ہیں ؎

ہوئی جو مدہوش کی یہ خواہش کہ سال تاریخ اسکا لکھئے

تو کھینچکر آہ دل سے نکلا خزاں سے رنگِ بہار دیکھا

اس سے بھی ۱۲۴۰ھ نکلتے ہیں۔

اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ باغ و بہار فسانۂ عجائب سے ٹھیک ۲۴ سال پیشتر کی تصنیف ہے۔ اگر ہم اس مسئلہ سے اتفاق کریں کہ زبان کا رجحان سادگی کی طرف ہوتا ہے تو پھر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس جگہ یہ کلیّہ کیوں غلط معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ ان دونوں کتابوں کی زبانوں میں کیا فرق ہے۔ باغ و بہار سادہ و سلیس نثر عاری میں لکھی گئی ہے اور فسانۂ عجائب کا طرز نہایت رنگین و پُر تکلف ہے جس میں جگہ جگہ ضلع جگت کی ناہموار گھاٹیاں اور رعایت لفظی کی پُر پیچ وادیاں ہیں اس کی نثر مقفیٰ و مسجع ہے۔ اگر مشکل پسندی سے سادگی کی طرف والا مسئلہ صحیح مانا جائے تو ہونا یہ چاہئے

تھا کہ فسانۂ عجائب کی زبان و عبارت کے بہ نسبت باغ و بہار کی زبان و عبارت زیادہ رنگین و دقیق ہوتی اور باغ و بہار کا طرز بھی نہایت پرتکلف ہوتا۔ اس نازک اور عجیب فرق کی وجہ معلوم کرنے کے لئے ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ دونوں کتابیں کس ماحول اور فضا کی پیداوار ہیں اور آیا کسی بیرونی اثر کے ماتحت تصنیف ہوئی ہیں اور ان دونوں کتابوں کا مقابلہ کرنا کوئی ادبی گناہ تو نہیں ہے کیونکہ ان میں سے ایک ترجمہ ہے اور دوسری طبعزاد تصنیف۔ ترجمہ سے طبعزاد تصنیف کا مقابلہ کرنا اصول تنقید کے خلاف ہے۔ اس موقع پر ہم کو ذرا گہری نظر سے دیکھنا چاہئے کہ باغ و بہار کس کتاب کا ترجمہ ہے اور آیا لفظی ترجمہ ہے یا اس میں کچھ قطع و برید و ذاتی اُپج سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس موقع پر ہم کو محققین کا ایک اور اختلاف ملتا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ میرامن نے اصل فارسی کتاب سے ترجمہ نہیں کیا۔ بلکہ نوطرزِ مرصع یعنی تحسین کے ترجمہ سے پلاٹ اخذ کرکے قصہ دوہرایا ہے۔ مولوی عبدالحق کا اعتراض یہ ہے کہ میرامن نے دیباچہ میں نوطرز مرصع کا ذکر کیوں نہیں کیا حالانکہ اُنھوں نے اصل فارسی کتاب کا ذکر کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ایسے ثبوت پیش کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ میرامن نے اصل فارسی کتاب یا اُس کے اصل ترجمہ سے زیادہ فائدہ نہیں اُٹھایا ہے بلکہ نوطرز مرصع ہی کو پیش نظر رکھا ہے۔ دوسرا گروہ میرامن کی طرف سے یہ صفائی پیش کرتا ہے کہ یہ میرامن کی غلطی نہیں ہے پہلی مرتبہ جب باغ و بہار چھپی ہے تو اس کے نام کے ساتھ یہ الفاظ درج تھے "باغ و بہار تالیف کیا ہوا میرامن دلّی والے کا ماخذ اس کا نوطرز مرصع کہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین کا ہے فارسی قصہ چار درویش سے"۔ یہ عبارت باغ و بہار کی پہلی اشاعت پر تھی جو کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بعد کی اشاعت میں یہ عبارت اُڑادی گئی۔ اس سے اتنا تو فیصلہ ہوا کہ میرامن کا دامن صاف ہوگیا اور وہ اس الزام سے بچ گئے جو مولوی عبدالحق نے ان پر لگایا تھا لیکن اس عبارت سے دوسری بات یہ ظاہر ہوئی کہ میرامن نے اس کتاب کو اپنی تصنیف نہیں بلکہ تالیف بتایا ہے کیا ایسی حالت میں جبکہ ایک مصنف خود اپنی کتاب کو تالیف کہتا ہے ہم کسی آزاد تصنیف سے اس کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم نوطرز مرصع اور اصل فارسی قصہ چار درویش کا مطالعہ کرینگے بعد میرامن کے باغ و بہار کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ میرامن کا قصہ اصل فارسی کتاب اور نوطرز مرصع دونوں سے جگہ جگہ مختلف ہے۔ یعنی بعض باتیں اس میں ایسی پائی جاتی ہیں جو اصل قصہ فارسی میں نہیں اور نوطرز مرصع میں موجود ہیں اور بعض باتیں ایسی بھی ہیں جو نوطرز مرصع میں نہیں بلکہ اصل قصہ میں مل سکتی ہیں اور وہ ایک جگہ صاحب کتاب نے اپنی دماغی اُپج سے بھی کام لیا ہے۔ ان کی تفصیل ہم پیش کرتے مگر چونکہ یہ موضوع زیر بحث سے ذرا علیحدہ ہے اور تفصیل طلب اس لئے سردست اس سے گریز کیا جاتا ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ ضرور نکالا جا سکتا ہے کہ باغ و بہار ایک ایسا ترجمہ ہے جو آزاد ترجمہ کہے جانے کا مستحق ہے، اور اس نے ایک طبعزاد تصنیف کی سی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ ایسی حالت میں ان دونوں کا مقابلہ کرنا ادبی ناانصافی نہیں ہوگی اور ہم ان دونوں کتابوں کا مقابلہ کرکے زبانوں کے فرق کے اسباب کو روشنی میں لا سکتے ہیں۔

باغ و بہار اور فسانۂ عجائب دونوں دو مختلف دبستانوں سے تعلق رکھتی ہیں اور ان دبستانوں کی زبانوں کا فرق تا حشر نمایاں رہیگا۔ موضوع کے لحاظ سے بھی ان دونوں قصوں میں چند باتیں مشترک پائی جاتی ہیں۔ اس لئے ان کا مقابلہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ دونوں کتابیں جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ دو مختلف اسکولوں کی زندۂ جاوید یادگاریں ہیں کیونکہ فسانۂ عجائب ایک لکھنوی کا کارنامہ ہے اور باغ و بہار ایک دہلوی کا۔ جس طرح فسانۂ عجائب میں اس کے مصنف اور اہل لکھنؤ کے دماغی رجحانات و تخیلات کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ اسی طرح باغ و بہار بھی اہل دہلی اور اپنے مصنف کے خیالات و جذبات کی جولانگاہ بنی ہوئی ہے۔ اور ان دونوں کتابوں سے ان کے مصنفوں کی قلبی کیفیات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے

ان قدرتی وجوہ کے علاوہ مقابلہ کی چند وجوہ ایسی بھی ہیں جو عمداً اختیار کی گئی ہیں اور چونکہ ان دونوں کتابوں کے مقابلہ کا خیال فسانۂ عجائب کے مصنف کے دل میں بھی پیدا ہو چکا ہے۔ لہٰذا ان دونوں کتابوں کا مقابلہ کرنا ایک نہایت اہم ادبی فرض ہے۔ کیونکہ فسانۂ عجائب عمداً باغ و بہار کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ ثبوت کے لئے ہم سرور کا دیباچہ ہی پیش کرسکتے ہیں۔ پھر دیباچہ میں سرور کا لب و لہجہ بھی اسکا پتہ دیتا ہے کہ وہ واقعی مقابلہ کرنا چاہتے تھے اور سرور نے دیباچہ میں میرامن پر طنز بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

"اگرچہ اس ہیچ میرز کا یارا نہیں کہ دعویٰ اردو زبان پر لائے
یا اس افسانہ کو بہ نظرِ شادی سب کو سُنائے۔ اگر شاہجہاں آباد
کہ مسکنِ اہل زبان کبھی بیت السلطنت ہندوستان کا تھا وہاں
چندے بودوباش کرتا تو فصاحت کا دم بھرتا جیسا میرامن صاحب

چار درویش کے قصے میں بکھیر اگیا ہے۔ ہم لوگوں کے ذہن دھنے میں یہ زبان آئی ہے۔ دلی کے روڑے ہیں۔ محاورات کے ہاتھ منھ توڑتے ہیں۔ پتھر پڑیں اس کچھ پر یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے۔ مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو دعوئے کب سزاوار ہے کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار ہے۔

مشک آنست کہ خود ببوید نہ آنکہ عطار بگوید

وہ ہی مثل سننے میں آئی کہ اپنے منہ سے دھنا بائی۔"

سرور نے اپنے اس قول کو اپنی کتاب میں عملی طور پر بھی پورا کر دکھایا ہے کیونکہ جس طرح میرامن نے کتاب کے شروع میں دلی اور دلی والوں کی تعریف لکھی ہے بالکل اسی طرح سرور نے بھی اپنی کتاب کے آغاز میں لکھنؤ کا ذکر بہت بڑھا چڑھا کر کیا ہے، اور دوسرے شہروں کی برائی بھی کی ہے اور اس موقع پر انتہائی پُر تکلف، رنگین و مسجع و مقفی طرزِ تحریر اختیار کیا ہے اور جس طرح میرامن نے عام روش سے پلٹ کر ایک نئے طرز میں اس کتاب کو پیش کیا ہے۔ بالکل اسی طرح سرور نے بھی عام روش سے قدرے علیحدہ طرز اختیار کیا ہے۔ سرور کی اور کتابوں کے مقابلہ میں فسانۂ عجائب کی عبارت زیادہ رنگین اور پر پیچ ہے جس کی وجہ صرف یہی ہے کہ یہ باغ و بہار کی ضد پر لکھی گئی ہے۔

یہاں ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا سرور طرزِ عبارت کے معاملہ میں عام روش سے زیادہ ہٹے ہیں یا میرامن۔ اس بات کو صحیح طور پر معلوم کرنے کے لئے ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ دونوں کتابیں کن اثرات کے ماتحت اور کس فضا میں لکھی گئیں۔ باغ و بہار چونکہ نسبتاً قدیم ہے لہذا پہلے اسی کو لیا جاتا ہے۔ باغ و بہار فورٹ ولیم اسکول کے بانی ڈاکٹر گلکرائسٹ کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔ گلکرائسٹ کو اردو ادب کا مربی خیال کیا جاتا ہے مگر حقیقت کچھ اور ہے۔ اس کا مقصد اردو زبان کی خدمت کرنا بالکل نہ تھا۔ بلکہ وہ تو صرف یہ چاہتا تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان پر حکومت کرنے میں آسانی ہو اور اس لئے انھیں اردو زبان سکھانا بیحد ضروری تھا۔ صرف اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر گلکرائسٹ نے چند کتابوں کے ترجمے سادہ و سلیس اردو میں کرائے۔ جن کے ترجمے موجود تھے انھیں پھر سلیس زبان میں لکھوایا۔ قصوں کے ترجمے صرف اس لئے کرائے گئے کہ جدیدوں کو وقت نہ ہو اور انھیں دلچسپی پیدا ہو جائے یہ ہے حقیقت فورٹ ولیم اسکول کے بانی کی! کہاں صدق دلی اور کجا ادبی خدمات!! باغ و بہار کے ترجمے پیشتر سے بھی موجود تھے مگر ڈاکٹر مذکور کی مطلب براری ان سے نہ ہوتی تھی۔ اس لئے ایسے نئے ترجمہ کی ضرورت پیش آئی میرامن نے قلم اٹھاتے ہی سمجھ لیا تھا کہ "نوطرز مرصع کی قسم کے ترجمے تو موجود ہیں اسی عبارت میں ترجمہ کرنا بیکار ہوگا۔ دوسرے وہ ڈاکٹر گلکرائسٹ کا مقصد اچھی طرح جانتے تھے لہذا انھوں نے عام روش سے ہٹ کر ایک نہایت ہی سیدھا سادا اور رواں طرز اختیار کیا اور اسے نہایت کامیابی سے نبھایا۔ ہندی کے بہت سے شیریں اور قابل استعمال الفاظ بھی جگہ جگہ ڈال دیئے ہزاروں محاورے استعمال کئے اور بیشمار کہتیں اور ہندی کے دوہے بھی یہ صرف اس لئے تھا کہ غیر زبان والوں کو زبان کے سمجھنے اور سیکھنے میں آسانی ہو، انھیں کیا خبر تھی کہ خضر راہ آبحیات سے سینچ رہے ہیں۔ اور اس باغ کے پھول سدا بہار ہیں۔ مقفی عبارت آرائی اس عہد کا طغرائے امتیاز تھا۔ باغ و بہار میں بھی جگہ جگہ مقفی عبارت پائی جاتی ہے مگر یہ قافیے عبارت کی روانی میں کوئی فرق نہیں آنے دیتے۔ فسانۂ عجائب جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں باغ و بہار کے جواب میں لکھی گئی ہے اور اسی لئے سرور نے بھی عام روش سے ہٹ کر ایک نئی شاہراہ اختیار کی مگر ایسی کہ ان کے بعد اس پر کوئی بھی نہ چل سکا جس طرح باغ و بہار میں بیشمار ہندی الفاظ اور دوہے اور محاورے ملتے ہیں اسی طرح فسانۂ عجائب میں بھی فارسی الفاظ فارسی اشعار اور عربی و فارسی مقولوں کی بھرمار ہے۔ اس کا ایک زبردست ثبوت کہ فسانۂ عجائب کا طرز بالکل مخصوص ہے یہ بھی ہے کہ سرور باوجودیکہ اس زمانہ کی پیداوار ہیں جبکہ ناسخ و آتش اور ان کے تلامذہ آسمانِ شاعری پر چھائے ہوئے تھے مگر سرور کی شاعری ان کے اثر سے محفوظ رہی۔ سرور کا درجہ نظم کی دنیا میں بلند ہے اور ان کی غزلیں جوش، صفائی بیان اور زورِ کلام کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں مگر اس موقع پر سرور کی شاعری اور دیگر تصانیف سے ع

"لطف کچھ دامن بچا کر ہی نکل جانے میں ہے"

سرور کی اس مشہور تصنیف کی زبان اور سرور کی انشا پردازی کی تعریف ایک بزرگ ان الفاظ میں فرماتے ہیں "فسانۂ عجائب کی نثر اس طرزِ تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کی بنا تصنع اور بناوٹ پر ہے اور جس کی دلبری کا مدار مصنوعی حسن پر ہے"

ایک زمانے میں اُردو کے انشا پردازوں میں یہ طرز نہایت مقبول تھی مگر اب کچھ تو غالب اور آزاد کی تقلید اور کچھ انگریزی تہذیب کے اثر سے لوگوں نے اس کو ترک کر دیا تاہم فسانۂ عجائب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کا انشا پرداز اس رنگ میں بھی کیا کیا رنگینیاں پیدا کر سکتا ہے۔ گویا اس کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس طرز کا میدان کس قدر تنگ ہے اور زمانہ حال کی داد و دہش کے لئے کس قدر ناموزوں ہے" متذکرہ رائے میں ایک آدھ غلطی ہے، یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے! کیونکہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" لیکن ہم اسے قطعی طور پر صحیح ماننے کو بھی تیار نہیں کیونکہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ غالب کے ساتھ آزاد کا نام کس طرح پیش کر دیا گیا - کیا آزاد نے واقعی اُردو نثر کو سادہ اور سلیس بنانے کی سعی کی ہے؟ آزاد کی نثر تو رعایتِ لفظی اور رنگین بیانی کی وجہ سے زرنگار معلوم ہوتی ہے۔ ان کی نسبت تو اتنا تک کہا گیا ہے کہ ــــــ "آقائے اُردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں" اور صرف ان کی عبارت آرائی اور حسنِ بیان کی وجہ سے ان کو "صنعت گر" کا خطاب دیا گیا ہے۔ کس طرح تسلیم کر لیا جائے کہ آزاد نے نثر کو سادہ اور سلیس و رواں بنانے کی کوشش کی۔ ان کی نسبت تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ ــــــ "صنعت گر است اما طبع رواں ندارد" کیا آزاد نے کہیں بھی سرور کی نثر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ ہمارے خیال میں اگر سرور کا کوئی بھی کامیاب مقلد ہو سکتا ہے تو وہ پروفیسر آزاد ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں کی طرزِ تحریر میں فرق ضرور ہے۔ ہاں غالب کے ساتھ سرسید اور حالی کا نام لینا ایک ناانصافی ہے۔ خود غالب سے زیادہ سرسید اور حالی نے نثر کو قافیہ اور سجع کی بندشوں سے آزاد کیا ہے۔ اور آجکل کے طرزِ ادا میں انھیں کا اسٹائل کارفرما نظر آ رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نثر کا طرز سرور کے بعد کسی سے بھی نہ نبھ سکا۔ اصلاً نثر مقفیٰ کی دشواریاں بہت زہرہ گداز اور حوصلہ شکن ہیں اور یہ طرز موجودہ موضوعات کا بارِ گراں اٹھانے کے بھی قابل نہیں ہے۔ اس لئے بالکل مردہ طرز ہو کر رہ گئی اور فسانۂ عجائب اسکی زندہ یادگار!

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ
آثار پدید است صنادیدِ عجم را

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ سرور نے فسانۂ عجائب لکھکر باغ و بہار کا جواب نہیں دیا ہے مگر اس کا ایک خاص ثبوت اور بھی ہے کہ سرور نے باغ و بہار کا جواب لکھا تھا۔ فسانۂ عجائب کے جواب میں دلی اسکول سے ایک اور تحفہ لکھنؤ اسکول کو بھیجا گیا۔ یہ تحفہ سید محمد فخرالدین متخلص بہ سخن نے بھیجا تھا اس کا نام "سروشِ سخن" ہے "سروشِ سخن" کے دیباچہ میں سخن نے اس طنز کا بھی جواب دیا ہے جو سرور نے فسانۂ عجائب میر امن پر کیا تھا اور سروشِ سخن کی وجہ تصنیف و تالیف بھی بیان کی ہے۔ جس میں نہ صرف سرور پر طعن ہے بلکہ بعض بے بنیاد الزامات بھی لگائے گئے ہیں وجہ تالیف سخن ہی کی زبان میں سنئے:-

"جو اس قصہ کو ملاحظہ کرے وہ یہ نہ سمجھے کہ فسانۂ عجائب کا جواب لکھا ہے، جتنا لکھا ہے لاجواب لکھا ہے نہیں مرزا صاحب یگانہ ہیں یکتائے زمانہ ہیں وہ موجد ہیں ہم مقلد فرق اس قدر ہے کہ ہم کمسن اور مرزا صاحب پرانے آدمی ضعیف پھر کہاں ان کی تالیف اور کہاں ہماری تصنیف ہم نوجوان وہ صدہا باران دیدہ سنجیدہ اور فہمیدہ پیر کمسن پھر کہاں فسانۂ عجائب اور کہاں سروشِ سخن شمس کو سہا کے ساتھ کیا ہمسری ذرہ کو سہا کے ساتھ کیا برابری جو لف و نشر مرتب سمجھے وہ البتہ ہمارا مطلب سمجھے وہ صاحب موصوف نے جو تالیف میں بیچارے میر امن دہلوی کو بنایا ہے۔ اپنی زبان کی تیزی سے اس صاف گو کو ایک دہی کرا فقرا سنایا ہے اور ہم بھی اب کہتے ہیں کہ سرور نے اٹھارہ مرتبہ فسانۂ عجائب کو درست کیا جو فقرہ سست پایا اس کو چست کیا مگر غلطی نظر نہ آئی کئی مرتبہ کتاب چھپی مگر وہ بات نہ چھپی۔ قصہ از سر نو ملاحظہ فرمائیں ابتدا سے انتہا تک دیکھ جائیں۔ اور سمجھیں کہ کئی جگہ تانیث کو تذکیر لکھا ہے اور تذکیر کو تانیث بنا ڈھالا ہے۔ اربابِ بینش پر سب آشکارا ہے۔ حاجتِ تصریح نہیں اکثر غلطی بالکل صحیح نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ جو اُردوئے معلیٰ کی زبان نہیں جانتا، تذکیر و تانیث کو نہیں پہچانتا۔ جو شاہجہان آباد میں نہیں رہا ہے جس نے دربار شاہی نہیں دیکھا ہے وہ فسانہ کیا لکھے اسکا منہ کیا ہے یوں تو کہنے کو بہت سے داستان گو دہلی لکھنؤ میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اگر وہ بھی چاہیں تو فسانہ گھڑ ڈالیں متقدمین کے سخن پر نکتہ چینی کریں۔ ان کے کلام میں کلام کریں۔"

[ج]ناب تحسین نے ۱۸۶۱ء یعنی ۱۲۷۶ھ میں تکمیل کو پہنچائی اس کا جواب طلسم حیرت کے
[نا]م ۱۸۷۲ء میں جعفر علیخاں خیون نے لکھا سرور اور لکھنؤ کو خوب سراہا گیا یہ
[د]ونوں کتابیں کچھ مقبول نہ ہوئیں لیکن فسانۂ عجائب اور باغ و بہار کی شہرت اور
[مق]بولیت پر البتہ مہر ثبت ہوگئیں. متذکرۂ بالا بیان سے ہم ہر جگہ اتفاق نہیں
[کر]تے کیونکہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ؎

لگے منھ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیا دہن بگڑا

آگے ہم فسانۂ عجائب کے معائب پر بھی ایک نظر ڈال لیں گے اس سے صاف
[ظ]اہر ہے کہ سرور اور میر امن دونوں عام روش سے ہٹ گئے ہیں اور دونوں
[ن]ے اپنے عہد کی فضا کے خلاف قلم اٹھایا ہے.

زبان پر اتنا کہہ چکنے کے بعد ان قصوں کی ماہیت اور پلاٹ پر بھی ایک نظر
ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے. یہ قصے ہمارے ادب کے اوّلین کارنامے ہیں. انہیں
موجودہ قصوں یا ناولوں کی کسوٹی پر پرکھنا نہ صرف زیادتی بلکہ ادبی گناہ ہے. بعض
حضرات ان میں یگانگت زبان و مکاں تلاش کرتے ہیں اور بعض حضرات ان میں
موجودہ معیار کے کردار نہ پاکر ناک بھوں سکیڑتے ہیں یہ چیزیں اسوقت بھلا ہمارے
ادب میں کہاں تھیں جبکہ بقول شخصے ابھی اسکے دودھ کے دانت بھی نہ اکھڑے تھے.
یہ تو موجودہ زمانے کی چیزیں اور باتیں ہیں، موجودہ افسانے بھی ابھی مکمل طور پر ان
خوبیوں کے حامل نہیں ہیں سب سے پہلی چیز جو ان افسانوں میں قابل اعتراض ہے وہ
ان کا عشقیہ عنصر ہے. عشق کی ترجمانی ہر ادب میں موجود ہے. ہمیں اس پر فخر حاصل ہے
کہ ہمارے ادب کے اوّلین نمونے بھی اسکے حامل ہیں. مگر ان دونوں قصوں میں فحاشی
اور بیہودہ گوئی اپنے اعلیٰ مدارج پر پہنچ گئی ہے یہ ہی چیز ہماری دو لافانی زندۂ جاوید
مثنویوں یعنی "سحر البیان" اور "گلزار نسیم" میں بھی پائی جاتی ہے ممکن ہے کہ یہ دونوں
مصنفین بھی "سحر البیان" سے متاثر ہوئے ہوں بعض مخرب اخلاق باتیں جو ان قصوں
میں منصۂ شہود پر لائی گئی ہیں پس پردہ بھی بیان کی جا سکتی تھیں بلکہ اشارے
کنایوں میں بیان کرنے سے زیادہ لطف پیدا ہو جاتا، لیکن اسکی تمام تر ذمہ داری
ان مصنفین پر ہی نہیں ہے. ادب میں جذبۂ عشق کی ترجمانی ہمارے خیال میں خارجی
چیز ہے. اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان قصوں کی فضا پر بھی روشنی ڈال
لی جائے. یہ قصے جس عہد کی پیداوار ہیں اس وقت ملک میں مغلیہ خاندان کا چراغ
بظاہر ٹمٹما رہا تھا مگر درحقیقت وہ شمع کشتہ سے زیادہ کچھ نہ تھا. مسلمانوں کی
ہفت صد سالہ سلطنت کا شیرازہ، اس سلطنت کا شیرازہ جس کی بنیاد محمود غزنوی نے
اپنے حملوں سے رکھی تھی اور جس کی عمارت پر بابر، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں،
اورنگ زیب نے اپنے خون سے گلکاری کی تھی، پریشان ہو رہا تھا. مسلمانوں
کا دماغی توازن بھلا ایسے حالات میں کس طرح قائم رہ سکتا تھا. ان کی اس وقت
کی حالت اقبال مرحوم کے اس شعر کی تفسیر تھی ؎

آ تجھکو بتاؤں میں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

اور قوموں کی طرح ہماری قوم نے بھی شمشیر و سناں کے سائے میں آنکھ کھولی تھی
مگر رفتہ رفتہ عیش و عشرت کی فراوانی سے متاثر ہو کر بجائے تلوار کے قبضہ کے
طاؤس و رباب ہاتھ میں آگئے. جب کسی قوم پر ادبار آتا ہے تو اسکی ساری ذہنی
قوتیں مسخ ہو جاتی ہیں، مسلمان بھی اس اصول سے گریز نہ کر سکے لہذا ان میں بھی
وہی فحاشی اور بیہودہ گوئی پیدا ہوگئی اور اس کا اثر ادب میں صاف نمایاں ہے
یہ قصے ایسی ہی فضا کی پیداوار اور ایسی ہی عہد کی یادگار ہیں. پلاٹ کے لحاظ سے یہ
قصے چنداں دلچسپ نہیں. دونوں قصے پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ
میر امن کی نظر عام گھریلو اور معمولی روزمرہ کے استعمال کی اشیا پر زیادہ گہری
پڑتی ہے جسکی وجہ سے ان کی تحریر ایسی اشیاء کے ذکر سے پر ہے لیکن سرور
کی اعلیٰ معلومات علمی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں جنکا میر امن کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں
ایک اپنی عملی معلومات سے روزمرہ کی زندگی کے نمونے پیش کرکے ہماری عملی دنیا کی معلومات
میں اضافہ کرتا ہے تو دوسرا اپنی وسیع علمی معلومات کے ذریعہ ہماری دماغی فضا کی پرورش
کرتا ہے. اکثر جگہ سرور اور میر امن کو ایک ہی قسم کی اشیاء کے ذکر کا موقع ملا ہے
لیکن ایسے موقعوں پر ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ باوجودیکہ میر امن کا قلم نسبتاً زیادہ
آزادانہ تھا مگر معلومات وسیع ہونے کی وجہ سے ان کا قلم آزاد معلوم ہوتا ہے مثلاً
دونوں نے کھانوں کے اقسام کا ذکر کیا ہے. میر امن کی فہرست اس موقع پر بڑی
سیر حاصل ہے. ان کے یہاں یہ نام ملتے ہیں. پلاؤ. قورمہ پلاؤ. کوکو پلاؤ، زردہ
قلیہ، دوپیازہ، نرگسی، نادری، روغن جوش. روٹیاں. باقرخانی، تنکی شیرمال

گاؤدیدہ۔ گاؤزبان، نان نعمت پراٹھے۔ کباب۔ کوفتے۔ مرغ کے خاگینے ملغوبہ۔ شب دیگ دم پخت حلیم، ہریسہ، سنبوسے، درتی، قبولی، فیرنی، شیر برنج، بالائی۔ حلوا فالودہ، آبشورہ، ساق عروس، لرزیات مربع آچار، دہی کی قتلیاں۔ لیکن سرور کی زبان سے حالانکہ ان کا قلم نسبتاً زیادہ آزاد تھا اور وہ اودھ کی زندگی کا اعلیٰ نمونہ دیکھ چکے تھے۔ کھانوں کے صرف یہ نام نکلتے ہیں۔ پلاؤ قلیہ۔ زردہ، قورمہ۔ شیرمال فیرنی۔ کباب۔ مسلمانوں کے کھانے، پوری کچوری مٹھائی آچار ہندوؤں کے کھانے۔

سرور پر الزام ہے کہ انھوں نے کم نام گنائے ہیں اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ سرور کی معلومات کم تھی۔ میرامن نے جو نام کھانوں کے لکھے ہیں ان میں سے اکثر ٹھیٹ ایرانی ہیں اور یہ چیزیں صاف بتاتی ہیں کہ میرامن نے ترجمہ کرکے لکھدیے ہیں۔ سرور نے جو نام لکھے وہ برخلاف اس کے عام طور پر ہندوستان میں رائج ہیں، دوسرے یہ کہ میرامن نے ہندو کھانوں کے نام بالکل نہیں لکھے، حالانکہ ہندوؤں کے قصے لکھے ہیں سرور کے یہاں یہ چیز موجود ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فسانۂ عجائب ایک طبع زاد تصنیف ہے۔ کھانے کے اقسام کی طرح دونوں مصنفوں نے شکاری جانوروں کا بھی ذکر کیا ہے چنانچہ میرامن نے یہ نام لکھے ہیں۔ باز۔ بہری۔ جرہ۔ باشہ۔ عقاب اور سرور کے یہاں مندرجہ ذیل نام پائے جاتے ہیں۔ باز۔ بہری۔ باشہ۔ عقاب۔ اسی طرح ملازمین کا ذکر دونوں جگہ مشترک ہے۔ میرامن کے یہاں یہ نام ملتے ہیں۔ اردبیگنیاں۔ قلماقیاں جشیاں۔ ترکنیاں۔ کشمیرنیاں اور دائی۔ مغلانیاں لونڈیاں۔ باندیاں یہی نام قریب قریب سرور کے یہاں بھی موجود ہیں۔

سرور دراصل انھیں چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جو انھیں انشاپردازی میں استعمال کرنا پڑتی ہیں وہ واقعہ کو رنگینی کے ساتھ بیان کرنے اور خارجی حالات کی ترجمانی کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ دونوں کتابوں میں قصہ در قصہ بیان کرنے کا التزام کیا گیا ہے جس کا مقصد سامعین کی دلچسپی کو قائم رکھنا ہے تاکہ وہ قصہ کی طوالت سے گھبرا نہ جائیں اس قصے در قصے کے التزام سے ایک خاص نقص پیدا ہوگیا ہے وہ یہ کہ بعض جگہ سے قصہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔ مثلاً اس شہزادے کا قصہ جو بیل پر سوار ہوا کرتا تھا۔

یہ قصے جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں پلاٹ کے لحاظ سے چنداں دلچسپ نہیں مگر زبان کے لحاظ سے اہم ہونے کے علاوہ ایک اور لحاظ سے بھی اہم ہیں وہ یہ کہ ان سے اُس کی فضا کا خاکہ بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے۔ صاف صاف پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں لوگوں کے خیالات کیا تھے۔ اگر اس عہد کی تمام کتابیں جل جائیں تو بھی ہم یہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس وقت کیا کیا رسم ورواج زور پکڑے ہوئے تھے شادی، بیاہ، فاتحہ درود کے موقع پر لوگ کیا کیا رسمیں ادا کرتے تھے۔ لڑکیوں کو جہیز میں کس کس قسم کی چیزیں دیجاتی تھیں۔ گھروں میں عام استعمال کے لئے کیا کیا چیزیں کام میں آتی تھیں۔ بچہ کی پیدائش کے وقت لوگ خصوصاً عورتیں کیا کیا عجیب وغریب رسمیں ادا کرتی تھیں۔ کس قسم کا لباس پہنا جاتا تھا۔ موت کے وقت کیا کیا رسمیں پوری کرنا ضروری تھیں لڑائیوں میں کس کس قسم کے ہتھیار استعمال ہوتے تھے اور کیسے کیسے مشتعل ہوجانے والے مادّے (Explosives) دشمنوں پر آزمائے جاتے تھے۔ کن کن جانوروں سے لڑائی میں کام لیا جاتا تھا۔ سفر کے ذرائع کیا تھے اور راستے پُرامن تھے یا پُرخطر بادشاہ کس طرح بھیس بدل کر رعایا کی حالت معلوم کرنے کو رات کو گشت کیا کرتے تھے۔ مذہبی عقائد کیا تھے — اس عہد میں لوگ جادو کرنے کے بڑے قائل تھے۔ جادوگر عجیب وغریب قوتوں کے مالک خیال کئے جاتے تھے۔ وہ جس وقت جس کو چاہتے جادو کے اثر سے اپنے قبضہ میں لے آتے تھے۔ حد ہے کہ روحیں بھی ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل کردیتے تھے۔ ان سے بڑھکر جن اور پریاں تھیں جو ہر وقت انسانی زندگی میں حصہ لینے کو تیار رہتی تھیں۔ عورتوں کو بیمار کردینا بچوں کو اٹھا لے جانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اگر کوئی عورت بیمار ہوجاتی یا کوئی شخص دریا میں ڈوب جاتا یا جنگل بیابان میں سے ایکدم غائب ہوجاتا تو لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ اس پر جنوں کا اثر ہوگیا ہے یا جن اسے اپنے ملک میں اڑا لے گئے ہیں۔ اس ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے پیروں اور فقیروں کی بڑی قدر تھی یہ لوگ بھی جنگلوں اور پہاڑوں اور دریاؤں میں ہر جگہ موجود رہتے تھے۔ ان کے نقش بھی بڑے کارگر ہوتے تھے۔ جہاں جنوں کی دقتیں اور پریوں کی مصیبتیں تھیں وہاں پیروں کی اماں بھی تھی، اور ان مصائب کے ساتھ ساتھ اس عہد میں آسانیاں بھی بڑی بڑی تھیں۔ حضرت خضر علیہ السلام اور جناب حضرت علیؓ ہر وقت عام لوگوں کی رہنمائی اور مشکل کشائی مادّی صورتوں میں آکر کرتے تھے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم ان قصوں کا مقابلہ اپنی زندہ جاوید مثنوی "سحر البیان" اور "گلزار نسیم" اور "انگلستان کے عہد تیرہ کے

نامور اور مایۂ ناز شاعر کے شاہکار "ساون رین کا سپنا" (A mid summer nights' dream) نے بھی کر سکتے ہیں کیونکہ ان میں بھی جن، پریاں انسانی زندگی میں حصہ لیتے ہیں اور لوگوں کی شکلیں تک تبدیل کر دیتے ہیں ... زیر بحث دونوں تصانیف صاف بتاتی ہیں کہ اس عہد میں کیسے کیسے ماہر فن طبیب اور جراح موجود تھے اور کیسی کیسی زود اثر آبجات صفت دوائیں اور مرہم موجود تھے۔ انھیں خوبیوں کی وجہ سے یہ کتابیں زندۂ جاوید ہو کر رہ گئی ہیں۔

فسانۂ عجائب اور باغ و بہار دونوں کو جیسا کہ ہم پیشتر کہہ چکے ہیں موجودہ افسانوں کے معیار پر دیکھنا غلطی ہے۔ مگر پھر بھی بعض بعض جگہ دونوں مصنفوں کے یہاں ایسی فاش غلطیاں ملتی ہیں جنھیں باوجود جانبداری اور رعایت خصوصی کے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً سرور نے "جلی کٹی سنانے کو" "کٹی جلی سنانا" لکھا ہے۔ دو ایک جگہ شتر گربگی بھی نمایاں ہے، مثلاً تم اور آپ میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے لکھتے ہیں۔ "وہ بولا یہ کشتہ تمہارا ہے آپ کے جور و ستم نے اس کو مارا ہے" ایک جگہ لکھتے ہیں "درگزر کرو ورنہ آفت کا مبتلا ہو" یہ غلط ہے ایک جگہ لکھتے ہیں "دونوں نے رو دیا" یہ غلطی بھی قابل گرفت ہے ممکن ہے کہ ان سب خامیوں کے جواب میں یہ کہا جائے کہ ممکن ہے کہ اس زمانے میں اسی طرح مستعمل ہو مگر اہل نظر کے لئے یہ توجیہ کوئی زور نہیں رکھتی۔ اس کے علاوہ بعض غلطیاں ایسی ہیں جن کی کوئی معقول وجہ پیش نہیں کی جا سکتی۔ فسانۂ عجائب میں سردی کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے "ہوش لوگوں کے کانپتے تھے، کیچوے کی مٹی کو الاؤ سمجھ کر پھونکتے تاپتے تھے۔ ملائم لوگوں کے حواس جم گئے تھے۔ جگنو کو چنگاری کے دھوکے اٹھانے کو تھم گئے تھے" بھلا جاڑے کا موسم اور کیچوے کی مٹی اور جگنو یہ چیزیں اپنی جگہ پر ہیں ع

"وہ دہانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ"

سے کم نہیں۔ اس کے علاوہ بعض غلطیاں ان دونوں کتابوں میں ایسی بھی ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ علم جغرافیہ سے بالکل واقفیت نہ رکھتے تھے۔ باغ و بہار میں میر امن نے ایک جگہ زیر باد یعنی برہما کو فرنگ کے بالکل قریب بتایا ہے۔ پہلے درویش کا راستہ یمن سے بیت المقدس کو دمشق ہو کر دکھایا ہے جو ... "لندن کو سنگاپور ہو کر" جانے سے کم نہیں۔ بالکل اسی طرح کے نقائص فسانۂ عجائب میں بھی موجود ہیں۔ سرور کے قصے کا جائے وقوع لکھنؤ آباد سرزمین ختن میں ہے اور ملک زرنگار اس سے بہت دور شمال میں واقع ہے۔ اس لحاظ سے قصے کی ہیرو کی تمام سرگذشت کی جولانگاہ جغرافیائی لحاظ سے سائبیریا کا برفستانی علاقہ ہے۔ سرور نے اس میدان میں گرم گرم ریگستان اور ہندوستان کے موسم دکھانے کے ساتھ ساتھ آباد شہر، بڑے بڑے اعلیٰ اعلیٰ باغات اور نہایت اعلیٰ تہذیب یافتہ اور پرتکلف زندگی بسر کرنے والے باشندے دکھائے ہیں۔ جانور بھی ہندوستان کے پیش کئے ہیں۔ یہ اصول افسانہ نگاری کے سراسر منافی ہے یہ سب کچھ سہی مگر یہ غلطیاں اس وقت بھی کہ اردو افسانہ نویسی ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کر رہی ہے۔ ہمارے افسانوں میں پائی جاتی ہیں۔

ہاں ایک خاص چیز جو سرور کے یہاں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ سرور نے چیزیں پیش کی ہیں۔ آدمی پیش نہیں کئے ہیں۔ سرور کا دیباچہ اس کا بہترین شاہد ہے۔ سرور کے یہاں انسانوں کا نہیں بلکہ اشیاء کا ذکر ہے ان کی تصویریں اصلی نہیں بلکہ خیالی ہیں۔ ان کے یہاں میلے ٹھیلوں کی بہترین قلمی تصویریں نظر آتی ہیں۔ حلوائی، پان فروش، ملائی والے، جوہری، پنساری افیونی وغیرہ کے ذکر ملتے ہیں۔ چوک بازار اور دیگر بازاروں کے مناظر عالی شان عمارتیں اور ان کے غرفات میں سے جھانکتی ہوئی سحر آفریں صورتیں اپنی تیکھی چتونوں سمیت نظر آتی ہیں مگر ان میں آثار حیات مفقود ہیں۔ حرارت غریزی کا پتہ نہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ لکھنؤ پر مدہوشی کا عالم طاری ہے۔ دوکانیں کھلی ہیں، مگر دوکاندار غائب ہیں۔ پھر خرید و فروخت کا کیا مذکور۔ مٹھائیاں اعلیٰ سے اعلیٰ موجود ہیں۔ مگر افسوس کہ ہمارے کام و دہن ان کی لذت سے آشنا نہیں ہوتے ہم لوگوں کی بھیڑ میں غائب تو ہو جاتے ہیں مگر ہمارا شانہ سے شانہ نہیں چھلتا، حسین و جمیل عورتیں موجود ہیں مگر وہ ہماری باتوں کا جواب نہیں دیتیں اور نہ ہی وہ ہماری محبت آفریں ملتجیانہ نظروں سے کوئی اثر لیتی ہیں گانے والے تان سین کے بھی استاد موجود ہیں مگر افسوس کہ ہم ان کا گانا نہیں سن سکتے۔

اصلاً سرور اپنے اسلوب تحریر میں گرفتار ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان جیسے

ہم سرور کے اس مشہور شاہکار کا موازنہ انگریزی کے مشہور و معروف شاہکار (Day dream) "خواب روز" سے کر سکتے ہیں۔ میر امن اپنی طرز کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے اُن کا طرزِ تحریر نذیر احمد کے قلم کے بعض میں آج بھی زندہ ہے اُن کی تصانیف میں صاف میر امن کا طرز جھلکتا ہے، ان کی زبان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نذیر احمد کے زمانے کے میر امن بول رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر نذیر احمد نے اپنی عبارت میں جگہ جگہ "عربی کے روڑے بچھائے ہیں" تو میر امن نے بھی جگہ جگہ ہندی کے پہاڑ کھڑے کر دیئے ہیں۔ لیکن اس حیثیت سے باغ و بہار آج بھی زندہ ہے سرور کا طرز ناقابلِ تقلید تھا۔ اور اسی لئے ناپید ہو گیا۔

مگر قدیم افسانہ نگار اور ادیب کی حیثیت سے سرور کی شخصیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے مخصوص دائرہ عمل میں سرور ایک خاص شخصیت کا مالک ہے اور اپنی خوبیوں اور زبان کی لذت کی وجہ سے فسانہ عجائب قطعاً غیر فانی ہے اور سرور کی ابدیت کے لئے یہی کافی ہے

زندگی اپنی فسانہ ہے زمانے کے لئے
گم ہوئے ہیں ہم جہاں میں یاد آنے کے لئے

ابو مسلم صدیقی

ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) بدایوں

حرفِ شوق — تضمین بر غزل حضرت اصغر گونڈوی مرحوم

"ذرّوں کا رقص مستیِ صہبائے عشق ہے" — دنیائے ہست و بود میں غوغائے عشق ہے
ہر چیز غرقِ شورشِ دریائے عشق ہے — "عالم رواں دواں بہ تقاضائے عشق ہے"

"بیٹھا ہے ایک خاک نشیں محوِ بے خودی" — دل بے نیاز کا ہوس غمائے عشق ہے
احساس کیف و غم کی بھی کاوش نہیں رہی — "کچھ حسن سے غرض ہے نہ پروائے عشق ہے"

"ہیجان و اضطراب ہے امیدِ وصل سے" — ذہن و نظر محیطِ تمنائے عشق ہے
در اصل زندگی ہے یہی اور کچھ نہیں — "رازِ حیات شورشِ ہیجائے عشق ہے"

"ہر عشوہ حجاب، طریقِ نمودِ حسن" — ہر التفاتِ حسن تمنائے عشق ہے
ہے ہر نگاہ حائلِ صد آرزوئے حسن — "ہر حرفِ شوق پردہ اخفائے عشق ہے"

"اب خود یہاں تغافل و بیگانگی سی ہے" — سود و زیاں سے دور تقاضائے عشق ہے
احساسِ غم رہا نہ خوشی کی ہوس رہی — "کچھ یہ بھی طرفہ کاریِ سودائے عشق ہے"

"جب یہ نہیں تو ختم ہیں رنگینیاں تمام" — آباد سوز درد سے دنیائے عشق ہے
رازِ "انا" سمجھ نہ سکی عقلِ سطح بیں — "سازِ خودی میں جوشِ نوہائے عشق ہے"

"کس درجہ ایک خاک کے ذرے میں ہے تپش" — یہ ظرفِ مختصر ہے کہ پہنائے عشق ہے
کل عالمِ وجود میں لرزش سی ہے قمر — "ارض و سما میں شورشِ غوغائے عشق ہے"

قمر نعمانی سہسرامی

دُعا کے بعد

آئی جو نکہتِ خمِ گیسو صبا کے بعد
یاد آگئی کسی کی عنایت حیا کے بعد

دے دے تو ہی جواب خدا سے ہی کو سوال
تجھ پر لگی ہوئی ہیں نگاہیں دُعا کے بعد

توفیقِ جرم اس پہ یہ لذت گناہ کی
بڑھتا گیا یقین کرم ہر خطا کے بعد

ملتا ہوا ہے میرے جنوں سے ترا مزاج
اللہ یہ بے رُخی نگہِ آشنا کے بعد

کی تھی سکونِ دل سے تری التجا مگر
روئے سکونِ دل کو تری التجا کے بعد

میکش کو قتلِ دشنۂ انکار سے نہ کر
وہ خود ہی منفعل ہے بہت التجا کے بعد

میکش اکبر آبادی

مومن

لاہوت میں خوابیدہ انوار ہے مومن
ناسوت کا ہنگامۂ بیدار ہے مومن

ہر لحظہ سبک سیر و جہانگیر و جہاں تاب
ہر لمحہ فسوں ریز و فسوں کار ہے مومن

ہم پایۂ کردار نہ پرویز نہ چنگیز
بے نیزہ و شمشیر بھی خونخوار ہے مومن

افکار میں پیوندِ نہاں خانۂ جبروت
قرآن کا مفہوم شرربار ہے مومن

ہے دہشتِ جلالِ ازلی اُس کی نظر میں
اللہ کا اِک شیر جگردار ہے مومن

اس مردِ قلندر کی خودی اصلِ خدائی
صاحب نظراں! عقدۂ دشوار ہے مومن

وہ ضرب جو خیبر شکن و برق فشاں تھی
اس ضربتِ کاری کا پرستار ہے مومن

افسر سیمابی (احمد نگر)

ماہی گیر!

وکٹر ہیگو کا ایک درد انگیز شاہکار

رات کا وقت تھا۔ جھونپڑی سے اگرچہ نکبت و افلاس ٹپک رہا تھا مگر خوشگواری خاص طور پر نمایاں تھی:

وہ اندر سے گرم تھی، دھندلی روشنی سے جو ایک چراغ سے آرہی تھی۔ اندر کی تمام چیزیں بڑی حد تک نظر آرہی تھیں۔ ماہی گیر کے جال دیوار پر لٹک رہے تھے، ایک گوشہ میں رکھی ہوئی پرانی الماری میں چند برتن تھے۔ ایک بڑے بستر کے پاس جو پردہ کی آڑ میں تھا، دو بنچوں پر ایک توشک بچھی ہوئی تھی اور اس پر پانچ بچے اس طرح محوِ خواب تھے جیسے گھونسلہ میں معصوم فرشتے آگئے ہوں۔

بستر کے قریب پلنگ پوش پر اپنے سر کو رکھے بچوں کی ماں جھکی ہوئی تھی، وہ اس وقت اکیلی تھی۔ جھونپڑی کے باہر سیاہ سمندر طوفانی لہروں سے ٹکریں مار رہا تھا، پانی کے اتار چڑھاؤ اور لہروں کا اضطراب ہی بس اسکا مونس تھا ——

اسکا شوہر مچھلیاں پکڑنے سمندر پر گیا ہوا تھا!

وہ بچپن ہی سے ماہی گیر تھا اسکی زندگی کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ سمندر کی پرشور لہروں کا مقابلہ کرنے کے لئے وقف تھی، کیونکہ بچوں کا بہرحال روزانہ پیٹ بھرنا لازمی تھا!

اور ہر روز طوفان، بارش یا ہوا —— اپنی ستم ظریفی سے اسکی کشتی کو مچھلیوں سے پوری طرح بھرنے نہ دیتی تھی!

جب وہ اپنی چار بادبانوں والی کشتی میں سمندر پر شکار کی تلاش میں جاتا تو اسکی بیوی جینی گھر پر پرانے بادبانوں کو درست کرتی۔ جالوں کو بناتی، کانٹوں کی دیکھ بھال کرتی —— یا چولہے کی طرف دیکھا کرتی جہاں مچھلیوں کا شوربہ ابل رہا ہوتا، جب پانچوں بچے سو جاتے تو وہ دوزانو ہوکر خدا سے اپنے خاوند کی سلامتی کے لئے دعا کرتی جو تاریکی میں سمندروں کی لہروں سے لڑنے میں مصروف ہوتا تھا —— فی الحقیقت عجب کٹھن زندگی تھی!

چٹانوں پر آکر ٹکرانے والی لہروں میں مچھلیوں کے پانے کا امکانی مقام صرف ایک خاص نشان تھا، جو خود اسکی جھونپڑی سے لمبا ہوگا، ایک ناقابلِ فہم نشان —— جو محرک صحرا کے رستہ پر لہروں کے طوفانی سیلاب کے درمیان اس نے خیال کر رکھا تھا، جو کہر اور طوفان کی تاریکی میں بھی اس کو نظر آجاتا تھا۔ جس کے لئے وہ مد و جزر اور ہواؤں کی رفتار کا ممنون تھا! مگر خود وہاں حالت یہ تھی کہ سمندر کی لہریں غضبناک اژدھوں کی طرح پھنکاریں مارتی تھیں، اسکو اپنی کشتی ڈوبتی ہوئی معلوم ہونے لگتی اور وہ اس میں اِدھر اُدھر لڑھکنے لگتا ایسے وقت میں اسکو جینی کا خیال آجاتا اور جینی جھونپڑی کے اندر اس کے خیال میں ڈوبی ہوئی ہوتی!

اس وقت جینی کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے وہ اپنے شوہر کے تصور میں تلاوتِ دعا مانگ رہی تھی، سمندر کی لہریں اسکی پریشانی میں اضافہ کر رہی تھیں اور بعض اوقات تو ہوا کے خوفناک تھپیڑوں کے خیال سے جینی کا رواں رواں کانپ جاتا مگر وہ اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں تھی وہ اپنی نکبت و مفلسی کا خیال کر رہی تھی، اس کے بچے جاڑوں اور گرمیوں میں ننگے پاؤں ہی رہتے، گیہوں کی روٹی کی تو انہوں نے کبھی صورت ہی نہ دیکھی، صرف جَو کی روٹی ان کی غذا تھی —— خدایا!

ہوا نہایت تیزی سے سرسراتی ہوئی گذر گئی، اور سمندر کی طرف شور سنائی دیا، وہ رونے لگی، اس کی روح تھرتھرا رہی تھی، غریب بیویاں جن کے شوہر سمندر میں جد و جہد کر رہے ہیں! یہ کتنا کس قدر المناک ہے میرے عزیز!! —— باپ، محبوب، بھائی، بیٹے —— طوفان میں گھرکر ہوئے ہیں

لیکن وہ اس سے بھی کہیں زیادہ غمگین تھی، اسکا شوہر اکیلا تھا ــــ بالکل تنہا! اسکا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہ تھا۔ اسکے بچے بہت چھوٹے تھے! غریب ماں!!

" وہ کہنے لگی " میری دلی تمنا ہے کہ یہ بچے جلد بڑے ہو کر اپنے باپ کی امداد کریں"

کیسا بھلا خیال ہے!

طوفانی رات میں اپنے باپ کا ساتھ دینے کے لئے بچوں کو مدتیں چاہئیں ــــ

پھر وہ کہنے لگی" وہ تو ابھی بچے ہی ہیں"

ــــ (۲) ــــ

جینی نے اپنی لالٹین اٹھائی اور کاندھے پر چادر ڈالی، اس نے اپنے آپ سے کہا" ان کے آنے کا وقت قریب آگیا ہے۔ مجھے چلکر دیکھنا چاہئے آیا سمندر پرسکون ہوا یا نہیں، مستول کے سگنل پر روشنی ہو رہی ہے کہ نہیں؟"

وہ اپنی جھونپڑی سے باہر نکل گئی، کوئی بھی چیز صاف نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ صرف افق پر ایک سفید دھاری نمودار تھی، بارش ہو رہی تھی اور اندھیرا برابر چھایا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا جسم کو یخ بستہ کئے دے رہی تھی۔ سب جھونپڑیاں بند تھیں کہیں سے بھی روشنی نہیں آرہی تھی،

گردوپیش کے ان موسمی حوادث میں گھرے ہونے کے باوجود، اسکی نظر ایک شکستہ جھونپڑی پر جا پڑی۔ جہاں روشنی اور آگ کے کوئی آثار ہی نظر نہیں آتے تھے، دروازہ ہوا کے رحم وکرم سے از خود کھل کر بند ہو جاتا تھا۔ "کرم خوردہ" دیواروں سے معلوم ہوتا تھا کہ اب چھت گری، ہوا کے تھپیڑے زرد پوس کو اپنے ساتھ اڑا لیجانے پر تلے ہوئے تھے"ــــ

" ٹھہر جا" جینی نے از خود کہا " مجھے ذرا اس بیوہ عورت کو بھی چلکر دیکھ لینا چاہئے جسے کل میرے شوہر نے نہایت بیچارگی کے عالم میں تنہا اور بیمار پایا تھا؛"

اُس نے دروازہ پر دستک دی، مگر کوئی جواب نہ ملا، جینی ٹھنڈی سمندری ہوا سے لرز گئی،

"وہ بیمار ہے! اور اسکے بچے صرف دو ہیں ــ وہ بیحد غریب ہے ستم بالائے ستم یہ کہ اسکا شوہر بھی نہیں ہے"

اُس نے پھر دستک دی اور آواز دیتے ہوئے کہا" ارے بی ہمسائی"

مگر جھونپڑی خاموش تھی!

" او خدا" اُس نے کہا" کتنی گہری نیند سو رہی ہے اسکو جگانا کتنا مشکل ہے"

اتنے میں دروازہ ہوا سے اپنے آپ کھل گیا۔

وہ اندر داخل ہو گئی۔ اسکی لالٹین سے جھونپڑی میں روشنی ہو گئی۔

چاروں طرف موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا، چھت الگ ٹپک رہی تھی۔ ایک گوشہ میں ایک عورت بے حس و حرکت لیٹی تھی۔ اُس کے پاؤں ننگے ہوئے تھے اور آنکھیں بے نور تھیں، اسکا سفید سرد ہاتھ ایک جانب لٹک رہا تھا'

وہ مر چکی تھی، کسی وقت وہ ایک توانا اور خوش بخت ماں تھی مگر آج موت نے اسکو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا تھا۔ دنیا کی طویل جدوجہد سے تھک کر وہ دائمی نیند سو چکی تھی! جس بستر پر ماں پڑی تھی اسی کے قریب جھولے میں دو ننھے بچے ــــ ایک لڑکا اور ایک لڑکی ــــ اپنے خوابوں کی دنیا میں مسکرا رہے تھے!

مرتے وقت انکی ماں نے اپنی چادر ان بچوں کے پاؤں پر ڈالدی تھی اور اُن کو اس میں اچھی طرح لپیٹ دیا تھا تاکہ وہ گرم رہیں ــــ اور خود ہمیشہ کے لئے سرد ہو گئی!

وہ اپنے جھولے میں کتنے سکون کے ساتھ سو رہے تھے! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان خوابیدہ بچوں کو کوئی چیز بیدار نہیں کر سکتی، بارش نے باہر طوفان برپا کر رکھا تھا، شکستہ چھت سے اندر کی طرف ہوا سرسراتی ہوئی آرہی تھی، پانی کا ایک قطرہ اُس کے مردہ چہرہ پر گرا اور آنسو کی طرح رخسار پر سے ڈھلک گیا۔

ــــ (۳) ــــ

مردہ عورت کے گھر میں جینی کیا کر رہی تھی؟

وہ اپنی چادر کے نیچے چھپا کر کیا لے جا رہی تھی؟

اُسکا دل کیوں اتنا تیز تیز دھڑک رہا تھا؟

وہ لڑکھڑاتی ہوئی گھر کی طرف کیوں بھاگی جا رہی تھی؟

اُس نے اپنے بستر میں پردہ کے پیچھے کیا چھپا دیا؟ ــــ

وہ کیا چیز چرا کر لائی تھی؟

جب وہ جھونپڑی میں داخل ہوئی تو چٹانوں پر سفیدی آچلی تھی، وہ بستر کے قریب وہم سے گر پڑی، اسکا چہرہ زرد ہو رہا تھا، جیسے وہ سخت ندامت

محسوس کر رہی ہو۔ اُس نے تکیہ پر اپنی پیشانی رگڑ دی اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے
اپنے آپ بڑبڑانے لگی۔ باہر وحشی سمندر چیخ رہا تھا "میرا غریب شوہر! او خدا! وہ کیا
کرے گا؟ وہ پہلے ہی سے مصیبت میں گرفتار ہے، یہ میں نے کیا کیا؟ پانچ بچے تو ہمارے
پاس پہلے ہی ہیں! ان کا باپ کس قدر کشمکش اور سخت جدوجہد سے کماتا ہے مگر اب وہ
اور مشکلات میں پھنس جائیگا ——— نہیں نہیں! میں نے بڑی غلطی کی اگر
اُس نے مجھے اسکی سزا دی تو وہ حق بجانب ہوگا کیا واقعی وہ ایسا کرے گا؟ نہیں!
وہ بہت اچھا ہے، دروازہ ہل کیوں رہا ہے، کیا کوئی آ رہا ہے؟ مگر کوئی نہیں ہے'
یہ محض میرا وہم ہے، مجھے اسکی آمد سے ڈر لگ رہا ہے۔" اس کے بعد وہ خیالات کی
دنیا میں کھو گئی، اسے باہر ہوا کے شور و غل کی کوئی خبر نہ تھی۔ سمندر کی لہریں
کنارے سے آ آ کر ٹکرا رہی تھیں لیکن وہ ان سے بالکل ناآشنا تھی!

ہوا اور سمندر کے غصے کی اُسے ذرا پروا نہ تھی!

یکایک دروازہ کھُل گیا۔ سپیدۂ سحر کی کرن اندر داخل ہوئی اور ماہی گیر
ہاتھ میں جال لئے ہوئے، جس سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ نمودار ہوا
اور خوشی سے مسکراتے ہوئے اُس نے کہا،

"بحری بیڑہ آگیا"

"جینی نے کہا! اور اپنے خاوند سے ایک محبوب کی طرح لپٹ گئی
اور اُس نے جینی کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

"ہاں میں آگیا جینی" اُس نے آگ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا، جہاں
اسکا وجیہہ چہرہ صاف نظر آ رہا تھا جسکی جینی ہمیشہ سے پرستار تھی!

اُس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"آج پھر بدقسمتی سے کچھ ہاتھ نہ لگا"

"موسم کیسا تھا؟"

"بیحد مہیب"

"اور مچھلیاں پکڑنا؟"

"بہت ہی دشوار تھا! خیر کوئی بات نہیں، تم تو میرے پاس ہو، مجھے پھر کیا غم؟"

"افسوس!"

"افسوس کی کیا ضرورت، ایک بھی مچھلی نہیں پکڑی جا سکی اور جال بھی
پھٹ گیا، آج بہت [illegible] طوفان میں ایک دفعہ تو
میری کشتی اُلٹتے اُلٹتے رہ گئی ——— لیکن ہاں اس تمام وقت میں تم کیا
کرتی رہیں؟"

جینی گھبرا سی گئی، جیسے کسی بِڑ نے اُسکے ڈنک مار دیا ہو!

"میں؟" اُس نے بمشکل کہا، "کچھ نہیں حسب معمول سیتی پروتی رہی۔ سمندر
کی بڑی بڑی لہروں سے ڈر رہی تھی ———

"ہاں موسم بہت خراب تھا۔ لیکن اب کیا پروا!"

اس کے بعد اُس نے کانپتے ہوئے جیسے وہ کوئی جرم کرنا چاہتی ہے، "کیا تمہیں
معلوم ہے کہ ہماری وہ بیمار ہمسائی مر گئی، وہ گذشتہ شب تمہارے جانے کے تھوڑی
دیر بعد، بیچاری چل بسی، وہ دو بچے چھوڑ گئی ہے، ایک کا نام ولیم دوسرے
کا میڈلن ہے۔ لڑکا مشکل سے چل سکتا ہے اور لڑکی تتلا تتلا کر بات کرتی ہے
——— بیچاری نیک عورت کسی بُری طرح افلاس کا شکار ہو گئی"

ماہی گیر سنجیدہ نظر آ رہا تھا، اپنی چمڑے کی ٹوپی کو جو طوفان سے اور بھی
خستہ ہو گئی تھی، ایک گوشے میں پھینکتے ہوئے اُس نے کہا "شیطان کا بُرا ہو"

ہمارے پاس پہلے ہی سے پانچ بچے ہیں۔ اب اس طرح سات ہو جائیں گے،
خرابیٔ موسم کی بدولت ہم بسا اوقات کھانے سے بھی محروم رہتے ہیں! اب ہم کیا کریں گے؟
یہ میرا قصور نہیں ——— یہ سب کچھ خدا ہی کے حکم سے ہو رہا ہے۔ یہ معمّا میری سمجھ
سے بالاتر ہے۔ ان معصوم فرشتوں سے اس نے انکی ماں کو کیوں چھین لیا۔ ان معاملات
کو جاننا بہت دشوار ہے، انکی تہہ تک پہونچنے کے لئے عارف بننے کی ضرورت ہے! ایسے
ننھے منے بچے ——— جینی جاؤ اور ان بچوں کو وہاں سے لے آؤ، ایسا نہ ہو وہ
جاگتے ہوں اور اپنی مردہ ماں سے خوف زدہ ہوں، ہم اپنے بچوں کیساتھ انکی بھی پرورش
کریں گے وہ ہمارے پانچ بچوں کے بھائی بہن ہونگے، جب خدا یہ دیکھے گا کہ ہم اپنے پانچ
بچوں کے علاوہ اس ننھی لڑکی اور لڑکے کو بھی پالتے ہیں تو وہ ہمیں یقیناً زیادہ مچھلیاں
دیگا۔ رہا میں، تو پانی پی کر ہی گذارہ کر لونگا، اب میں پہلے سے زیادہ محنت کرونگا
——— جاؤ نا جلدی سے اُنھیں لے آؤ ——— کیا بات ہے؟ کیا تمہیں کوئی پریشانی ہے؟
تم تو عام طور پر بہت زیادہ پھرتیلی ہو!"

اسکی بیوی نے پردہ ہٹا کر کہا

"ادھر دیکھو!"

اے۔ آر۔ رشدی مدیر "نسیم" بھوپال

قصر الادب (آگرہ)

سرِ بازار اک چھوٹا سا اور بے رنگ کاشانہ
تکلف کے نقوشِ عارضی سے پاک دیواریں
بساطِ فرش سادہ، صحن سادہ۔ بام و در سادہ
مسلط اک ادب آموز خاموشی دریچوں پر
معمر طاقچوں پر سرمدی تخیل کا عالم
نشیبی سیڑھیوں میں اجنبیت ریز تنہائی
پرانی چوکھٹیں کھوئی ہوئی افکارِ ہستی میں
منڈیروں کی جبیں پر سنناتی شام کے سائے
خمیدہ کھونٹیوں پر دائمی خوابوں کی تعبیریں
فضا بے چین لیکن اضطرابِ غم سے آسودہ

حریم قدس کے نغموں سے ہم آہنگ کاشانہ
بقیدِ سادگی مسرور و بہجت ناک دیواریں
نوشت و خواند کے سامان سادہ۔ فرنیچر سادہ
خزاں کے مضمحل آثار گرد آلود گملوں پر
کواڑوں سے عیاں تسبیح اور تہلیل کا عالم
متانت آفریں گوشوں میں معنی خیز تنہائی
سیہ الماریاں لپٹی ہوئی انوارِ ہستی میں
لب ہر کش پہ جیسے تھرتھراتے جام کے سائے
نمایاں کرسیوں پر گُشدہ جلووں کی تنویریں
فشارِ غم سے آزاد۔ انقلابِ غم سے آسودہ

اسے "قصر الادب" کہتے ہیں۔ یہ "شاعر" کا مسکن ہے
یہاں اک کارواں سالارِ فطرت جلوہ افگن ہے

جہاں کے نکتہ داں جس کو سمجھتے ہیں امام اپنا
سخنور جسکو دارائے سخن تسلیم کرتے ہیں
مفکر دنگ ہیں جسکی ادائے فکر زائی پر
ابھی لا انتہا ہیں راز باقی جسکے سینے میں
مسلّم کشورِ شعر و معانی میں ہے نام اسکا
تعجب ہے کہ اک ایسے مکاں میں ہو بسر اسکی
یہ محرومی اور ایسے مایۂ آفاقِ انساں کی
مناسب تھا کہ اب تک قصر اک تیار ہو جاتا
ستا سکتی نہ یوں ناسازگاریٔ حیات اسکو
سخنداں و وجود اس کاملِ فن کا غنیمت ہے

زباں داں اس عجز سے پہنچاتے ہیں جسکو سلام اپنا
معلم جسکے فرمودات کی تعلیم کرتے ہیں
مفسر جھومتے ہیں جسکی طرزِ لب کشائی پر
مئے مستقبلِ ہستی ہے جسکے آبگینے میں
مگر اب تک نہیں دُنیا نے پہچانا مقام اسکا
یہ اندازِ قفس تنگ آشیاں میں ہو بسر اسکی
یقیناً اک شکستِ فاش ہے احساسِ عرفاں کی
جہاں یہ "شاعرِ مشرق" ترنم بار ہو جاتا
معاشی فکر اور کاہش سے مل جاتی نجات اسکو
عمل ہے دو ثبوت اسکا اگر سچی عقیدت ہے

بشرطِ زندگی مضطرؔ اگر دُنیا نے فرصت دی
کرونگا پھر زیارت میں اقامت گاہِ شاعر کی

عبداللہ مضطرؔ گجراتی

دُرّۂ نادرہ کی چند رباعیات

مشہور کتاب دُرّۂ نادرہ مرزا محمد مہدی کوکب کی تصنیف ہے جو نادر شاہ کے وقائع نگار تھے، اس کتاب کی تمام تر خوبی صنائع بدائع لفظی پر منحصر ہے۔ صنعت تذنیب کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے، یہ کتاب اپنی بلند خصوصیات کی وجہ سے "تاریخ وصاف" اور "مقامات حریری" کے دوش بدوش رکھی جا سکتی ہے۔ صنعت تذنیب کی وجہ سے چونکہ لغات بہم قریب المخارج اور متحد الہیئت لائے گئے ہیں۔ اس لئے پڑھنے اور سمجھنے میں دقت واقع ہوتی ہے۔ دورِ حاضر میں اس قسم کی تصانیف قابل اعتنا خیال نہیں کی جاتیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جس وقت دُرّۂ نادرہ اور اسی قسم کی دوسری کتابیں تصنیف کی گئیں، اس وقت یہ طرز روش نہایت مقبول تھی لہذا ہم کو چاہئے کہ اس قسم کی تصانیف کا مطالعہ کریں تو اس ماحول کو بھی مدِ نظر رکھیں جس میں کہ وہ کتابیں لکھی گئیں، دُرّۂ نادرہ اوّل سے آخر تک اپنے مخصوص التزام کے ساتھ لکھی گئی ہے لیکن جہاں کہیں تھوڑا بہت صفائی بیان و زبان کا لحاظ رکھا گیا ہے وہاں نظم و نثر میں ناقابلِ مقابلہ ادبی بلندیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ کتاب کے آخر میں ایک مختصر باب نصیحت آمیز کلمات پر مشتمل ہے۔ اس میں چند رباعیاں بھی ہیں آج کی صحبت میں انھیں رباعیوں کو ناظرینِ "شاعر" کی خدمت میں پیش کر کے میں اُن پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

خودداری اور خود اعتمادی اخلاقیات کے ذیل میں ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کے بغیر انسان کو انسانی بلندیاں نصیب نہیں ہو سکتیں، مذہب و معاشرت کی اصلاحات کا تمام تر دار و مدار اسی پر ہے اگر یہ ملکہ انسان پیدا نہیں کر سکتا تو اس میں اور بہائم میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے روح اور اس کے صحیح تاثرات خودداری اور خود اعتمادی کے سائے میں پرورش پاتے ہیں۔ مرزا کوکب اس حقیقت کو اس طرح سمجھاتے ہیں ؎

مطلب مطلب گرچہ ہمہ پادشہی است | پیوستہ سرانجام طلب روسیہی است
گر ماہ شود طالب و مطلوبش مہر | ہر چند کہ کاسہ پر کند بازتہی است

دعویٰ یہ ہے کہ طلب کا سرانجام ہمیشہ روسیاہی ہوتا ہے دوسرا شعر بطور دلیل لایا گیا ہے، اگر بالفرض چاند طالب اور سورج مطلوب ہو اور وہ اُسکا کاسہ پر بھی کرے لیکن انجام کار خالی رہیگا۔ کس قدر بلیغ اندازِ بیان ہے۔

حقیقت انسانی پر اس طرح تبصرہ فرماتے ہیں ؎

چوں حاصلِ عمر تو فریبے و دمے است | دو داد مکن گوشت بہم بستہ است
مغرور مشو بخود کہ اصلِ من و تو | گردے و شرارے و نسیمے و دمے است

حیاتِ مستعار کا حاصل سوائے ایک فریب اور ایک وہمی طلسم کے اور کیا ہے؟ انسان کو اس پر مغرور نہ ہونا چاہئے جبکہ اسکی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ اسکا وجود اربعہ عناصر یعنی اضداد کے ہنگامی امتزاج پر منحصر ہے۔ ان میں سے اگر ایک بھی اعتدال سے گزر جائے تو انسان کو زندہ رہنا مشکل ہو جائیگا۔ عمر خیام نے بھی ایک رباعی میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

چوں مردن تو، مردن یکبارگی است | یک بار بمیر این چہ بیچارگی است
خونے و نجاستے و مشتے رگ و پوست | در کار نبود این چہ غمخوارگی است

مگر مرزا کی رباعی میں گردے و شرارے الخ سے جو زور اور لطافت پیدا ہو گئی وہ عمر خیام کے یہاں نہیں ہے خونے و نجاستے و مشتے وغیرہ سے جس بے حقیقتی کا اظہار ہوتا ہے وہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے گردے و شرارے وغیرہ کے مقابلے میں یقیناً تشنہ ہے۔ مرزا کی رباعی میں خاص طور سے "مغرور مشو بخود" کا ٹکڑا نہایت بلیغ ہے اور ذہنی سرعت کی بے پناہ قوتوں کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

جب تک انسان اپنے نفس کا مطالعہ قوتِ عقلیہ کی مدد سے نہیں کرتا اسکو ادراک واقعی حاصل نہیں ہوتا۔ حدیث میں آیا ہے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ یعنی مطالعۂ نفس ہی مطالعۂ حقیقت ہے جس نے اپنے نفس کو نہ پہچانا

ورنہ ایک کامل کا احساس ہونا معلوم ، شعور نشر کی حقیقت بھی ہمیں معلوم ہو جاتی ہے اگر انسان اپنا علم خود بھی جانے تو اپنی تمام اخلاقی اور روحانی کمزوریاں دور کر سکتا ہے ۔ قاآنی نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

دل من پیر تعلیم است و من طفل زباندانش
دم تسلیم سر عشر و سر زانو دبستانش

سالک کے لئے پہلی منزل کتب عقل ہی ہے اس سے گزر کر دوسری سرحدیں شروع ہوتی ہیں ، اگر یہیں کامیابی نہ ہوئی تو ہمیشہ کے لئے گمراہ ہو جاتا ہے ۔ مرزا نے اس رباعی میں زبان و بیان کی ہمہ گیری کے ساتھ اس مسئلہ پر نہایت کامیابی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

در مکتب عقل خود کتاب خود باش   در فکر سوال حق جواب خود باش
در پائے حساب تا نمانی فردا   زنہار امروز سر حساب خود باش

"امروز سر حساب خود باش" یعنی مواخذۂ خود کن ۔ اس رباعی میں عقل و مذہب کو ایسے متوازن طریق پر پیش کیا ہے کہ دونوں کی صحیح حقیقت پر ایمان لائے بغیر چارہ نہیں ۔ جزا و سزا کی پوری تشریح بھی موجود ہے اور اعمال انسانی کے نتائج و عواقب کا تصور بھی ۔ عمر خیام کی رباعی بھی سن لیجئے ۔

فردا کہ بنامۂ سیہ در نگری   بس دست تحسر کہ بدندان بری
بفروختہ دین بدنیا از بے خردی   یوسف کہ بدہ درم فروشی چہ خری

خیام کی رباعی ایک گنہگار کے لئے سخت تنبیہ کا حکم رکھتی ہے ۔ اس میں کوئی درس و پیغام نہیں ہے بلکہ صرف خطاکار کو شرمندۂ خجل کیا جا رہا ہے ۔ بخلاف اس کے مرزا کی رباعی میں درس و پیغام ہے اور ایک ایسے بے راہ چلنے والے کو جو بے خردی کا شکار ہونے والا ہے ۔ غلط اقدام سے روکا جا رہا ہے ۔ اس جا پر ان کا بیان نہایت موثر و کارآمد ہے ۔

فرماتے ہیں ؎

تا بستہ این جہاں پر تزویرے   از بہر نجات خود بجو تدبیرے
اہل تجرید ہم بنا شند آزاد   دارند ز نقش بوریا زنجیرے

انسان جب تک حرص و ہوا میں گرفتار ہے یعنی نفس کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے ، اس وقت تک رہائی کا امکان نہیں ۔ بیان میں زور پیدا کرنے کے لئے دوسرے شعر میں حسن تعلیل سے کام لیا گیا ہے اس کے ساتھ دوسری رباعی بھی دیکھئے ؎

ما را نہ بہ نیست اختیار و نہ بہست   از ہستی ذات اوست ہر نیست کہ ہست
ہر ہست کہ نیست شد ہماں نیست کہ ہست   ہر نیست کہ ہست شد ہماں ہست کہ ہست

وحدت وجودی کے ماننے والے اور قائلین جبر قریب قریب ایک ہی منزل کے رہ پیما ہیں ، مرزا کوکب نے اس رباعی میں ان دونوں باتوں کو ایک جگہ بڑی خوش اسلوبی سے جمع کر دیا ہے ، کہتے ہیں ہم کو ہست و نیست پر اختیار نہیں ہر ہست کہ ہست یعنی جو کچھ موجود ہے وہ سب اس کی ذات سے ہے یعنی عین ذات ہے دوسرے مصرع سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ توحید شہودی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں مگر ایسا نہیں کیونکہ دوسرا شعر قطعاً توحید وجودی کی تشریح ہے " ہر ہست کہ نیست شد ہماں نیست کہ ہست " یعنی جو ہستی کہ نیست ہوئی وہ وہی نیستی تو ہے جسے ہم ہست کہتے ہیں یعنی عدم و وجود اعتباری شے ہے اسی طرح دوسرے مصرع کو دیکھئے " ہر نیست کہ ہست شد ہماں ہست کہ ہست " یعنی جو نیستی سے وجود میں آیا وہ وہی وجود ہے جس پر ہستی کا اطلاق کیا جاتا ہے " الوجود عین العدم " کی تفسیر نہایت خوبی سے کی گئی ہے ۔

عارف بوجود خود چو بینا گردد   ہر چیز دلش خواست ، مہیا گردد
دریاب حباب را کہ در بحر وجود   پرداخت چو دل ز خویش دریا گردد

عارف جب اپنے وجود کو پہچانتا ہے تو معرفت حقیقی کا شناسا ہو جاتا ہے ۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ حباب مٹ کر دریا میں ملتا ہے تو دریا بنتا ہے ع

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے

" پرداخت چو دل " کہکر دل کے اس ممتاز مقام کی طرف اشارہ کیا ہے جس کو اہل معرفت ایک لطیفۂ غیبی کی منزل سے تعبیر کرتے ہیں ۔

اس رباعی میں بھی وجود انساں کو بلبلے کی بے ثباتی سے تشبیہ دی ہے ۔

ہر کس کہ خدا شناس شد آزاد است   از نیک و بد زمانہ دائم شاد است
بر ہستی خویش دل چہ بندی چو حباب   بنیاد وجود تو گرہے بر باد است

مرزا کوکب کی رباعیات میں بخلاف بعض شعراء کے مسائل کی تلقین و تبلیغ کا پہلو نہایت گہرا ہے ۔ اس رباعی کو دیکھئے کہ دوسرے شعر میں مسئلہ کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے لیکن پہلے شعر میں درس و پیغام موجود ہے ۔ یہ شاعری کا ایک بڑا اہم نکتہ ہے بعض تخئیل کی مدد سے مسائل کو تو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اپنی طرف سے

کوئی پیغام و درس نہیں دیتے جس قسم کی شاعری اہلِ غفلت کو جھنجوڑتی ضرور ہے لیکن انکو کوئی سیدھا راستہ نہیں دکھاتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک گمراہی سے نکلکر کسی اور دوسری غلطی کا شکار ہوجاتے ہیں، مولانا روم علیہ الرحمۃ کی مثنوی کا ایک بڑا جوہر جسکی بنا پر وہ دوسری کتابوں کے مقابلے میں ممتاز ہوگئی ہے یہی ہے کہ وہ پہلے کسی رُخ کی طرف مخاطب کو پوری توجہ کے ساتھ کھینچ لے آتے ہیں اور پھر بہت نرمی اور اخلاقی قوتوں کی مدد سے اسکو درس پیغام دیتے ہیں، جسکا نتیجہ بیک وقت یہ ہوتا ہے کہ انکا مخاطب غلطیِ راہ اور اسکے علاج دونوں سے واقف ہوجاتا ہے۔ یہی بات مرزا کوکب کی رباعیوں میں پائی جاتی ہے۔ اگرچہ انکا کلام بہت محدود ہے مگر جس قدر بھی ہے نہایت کامیاب و پرکار ہے دیکھئے اس رباعی میں فنائے وجود کا تصور دلاتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ درحقیقت عزّت و ذلت واقعی کیا ہیں اور انسان نجات کیونکر حاصل کرسکتا ہے ؎

دنیا مطلب کہ رستگاری این است　　عزّت مطلب کہ اصل خواری این است
گر مفلس یا غنی کہ می باید رفت　　داری اینست اگر نداری این است

عزّت و ذلتِ واقعی اور رستگاری حقیقی کیا ہیں پہلے یہ بتایا اسکے بعد فنا کے عقیدے کو یوں مضبوط کیا کہ خواہ تو مفلس ہے یا غنی دونوں حالتوں میں مرنا ضرور ہے آخری مصرع تمامتر زوردار ہے ؎

اے خواجہ کہ از تو یافت عالم تزئین　　وز ذاتِ تو شد روئے زمین خلدبرین
گر دیدہ ز دارائی دنیا پوشی　　ہرگز نخوری سکندری دردِ دین

یہ نہیں کہتا کہ حکومت و دولت پر ٹھوکر مار کر اس سے قطع تعلق کرلو بلکہ سیدھی راہ کی طرف یوں رہنمائی کرتا ہے کہ باوجود دولت و ثروت کے غلامیٔ نفس اور غفلت و پندار سے دُور رہو اس صورت میں تم صحیح راستے سے نہ بھٹکوگے اور دینی و دنیوی دونوں برکتیں حاصل کروگے۔ دارائی و سکندری دونوں لفظ نہایت خوبی سے نظم ہوئے ہیں۔ عمر کی بے ثباتی کے لئے کتنی خوبصورت تشبیہ لائی گئی ہے، ملاحظہ کیجئے ؎

غرہ چہ شوی بمسکن و کاشانہ　　بر عمر کہ ہست حاصلش افسانہ
ہمخانۂ صرصری چہ افروزی شمع　　بر رہ گذرِ سیل چہ سازی خانہ

ہمخانۂ صرصری یعنی ہمخانۂ صرصرِ ہستی، باد تند کی موجودگی میں چراغ جلانا کارِ عبث ہے اسی طرح سیل کی راہ میں مکان بنانا نادانی ہے۔ دونوں آخری مصرعے شاعر کے مقصد کو سمجھانے کے لئے کافی ہی نہیں بلکہ پورے طور پر اثر کی مدد سے کر رہے ہیں ؎

پیونے دو صد دست برکشا یند ترا　　اندر بد و نیک آزمایند ترا
گرد تو فلک حصارے از آئینہ است　　تا ہر چہ کنی ہماں نمایند ترا

دست برکشایند ترا، یعنی قضا و قدر تجھ کو ڈھیل دیتے ہیں اور بد و نیک میں تجھ کو آزماتے ہیں، تیرے چاروں طرف آئینہ کا حصار ہے۔ اس لئے کہ تو جو کچھ کررہا ہے۔ وہی تجھ کو دکھاتے ہیں۔ انسان اپنے بہت سے اعمال کے نتائج اسی دنیا میں دیکھ لیتا ہے۔ اس لئے اسکو مکافات عمل سے غافل نہ ہونا چاہئے۔ انسان کی عمرانی زندگی کو توسط پر قائم رکھنے کے لئے اس سے بہتر پیرایۂ بیان اختیار کرنا دشوار ہے۔ زندگی چند روزہ ہے اس حقیقت کو دونیم دست برکشایند کہکر سمجھایا۔ نیکی و بدی کا امتیاز ضروری ہے۔ اس بات کو دوسرے مصرع میں نہایت خوبی سے رکھا اور پھر بطور نتیجہ جو کچھ کہنا تھا اُس کو آخری دو مصرعوں میں اس طرح کہا کہ شاہد اور اعتقاد دونوں دست و گریباں ہوگئے

دو تین رباعیاں اسی انداز کی اور دیکھئے۔

نازاری این جہاں زدارائی بہ　　دلق خود از اطلس و دارائی بہ
آسودہ ز شغلِ ہر دو عالم بودن　　صد رہ ز سکندری و دارائی بہ

آسودہ کسے کہ در غمِ بیشی نیست　　در بند تونگری و درویشی نیست
فارغ ز جہان و از غمِ خلقِ جہاں　　با خویشتنش نیز سرِ خویشی نیست

چون نیست ہر چہ ہست جز باد بدست　　چوں ہست ہر چہ ہست نقصان و شکست
انگار کہ ہر چہ ہست در عالم نیست　　پندار کہ ہر چہ نیست در عالم ہست

مرزا کوکب کی نثر کا عام طور پر یہ انداز ہے:-

"اگر جم ہست و اگر جاماسپ کہ جام مرگ را در کشیدنی ہست و اگر دارا و اگر داری کہ دار وئے اجل را چشیدنی ست ہر شاہ شہد و شہد لعلت را نوشیدنی ہست و ہر جان طفلے را چشم جان بیں از حباب پوشیدنی الی محل عتبۂ عطبۂ فنا بوسیدنی ست و جسم بے بقا پوسیدنی۔ ان الدنیا ظل الغمام و حلم المنام والفرح الموصول بالغم والعسل المشوب بالسم مسلا بتۃ النعم کالۃ النقم"

* تاریخ وصاف اور مقامات حریری کے بعد دُرّۂ نادرہ سے بہتر کتاب اس وقت کسی نے پیش نہیں کیا

داغِ دل

تضمین بر غزل فصیح الملک حضرت داغ رحمۃ اللہ علیہ

عدو لاکھ ہوں، خوف کیا ہے کسی کا　　خدا کا کرم آسرا ہے کسی کا
یہی آخری فیصلا ہے کسی کا　　بلا سے جو دشمن ہوا ہے کسی کا

وہ کافر صنم کیا خدا ہے کسی کا

گریں بجلیاں لاکھ بھی آسماں سے　　اُٹھے گا سر اس کا نہ اس آستاں سے
ہے عاشق تمہارا انوکھا جہاں سے　　دُعا مانگ لو تم بھی اپنی زباں سے

کہ پورا ہو جو مدّعا ہے کسی کا

ذرا اسطرف دیکھ، تیری بلا لوں　　تو روٹھا ہے کس بات پر آ منا لوں
محبت بھرے دل کی حسرت نکالوں　　اِدھر آ کلیجے سے تجھ کو لگا لوں

تجھی پر تو دل آگیا ہے کسی کا

بڑی دلنشیں بے رُخی ہے کسی کی　　گلا اپنا ہے اور چھُری ہے کسی کی
کیسی لگی دل لگی ہے کسی کی　　کسی کی طپش میں خوشی ہے کسی کی

کسی کی خلش میں مزا ہے کسی کا

یہ حیلے حوالے یہ چکمے بہانے　　تجھے کوئی جانے تو رسوا ہی جانے
کوئی میری یہ بات مانے نہ مانے　　بظاہر نہ جانے نہ جانے نہ جانے

تجھے داغ دل جانتا ہے کسی کا

رسوا مظلومی دہلی

ادیب کی ڈائری

مجھے ایک نوجوان ادیب کی ڈائری دستیاب ہوئی ہے جس میں اس ادیب کی زندگی کے گزشتہ دس سال کے حالات درج ہیں۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ ادیب اب بھی اپنی سرگزشت قلم بند کرتا ہے یا نہیں۔ البتہ دس سال کے حالات کے مطالعے سے اس ادیب کی پوری شخصیت نمایاں اور واضح ہو جاتی ہے اور اس سلسلۂ مضمون کا مقصد اس ادیب کی زندگی کو اسی کی زبان سے بے نقاب کرنا ہے۔

۱۸ سال کی عمر سے ۲۸ سال تک مسلسل وہ ادیب اپنے حالات لکھتا رہا۔ ایک نوجوان انسان کی عمر کا یہ دور انتہائی نازک ہوتا ہے۔ اس دور میں انسان اپنے مستقبل کے متعلق ایک فیصلہ کرتا ہے۔ مختلف مرحلوں سے گزرنے کے بعد ایک راہ اختیار کرنی پڑتی ہے اور اپنے لیے ایک نصب العین منتخب کرنا پڑتا ہے۔

میں نے ارادہ کیا ہے کہ مختلف نشستوں میں اس نوجوان ادیب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو قارئین کرام کے سامنے پیش کرتا رہوں۔ ایک طرف تو اس نوجوان ادیب کے خیالات معلوم ہوتے رہیں گے اور دوسری طرف یہ معلوم ہوتا رہے گا کہ عملی زندگی میں ایک ہندوستانی نوجوان کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آج کی فرصت میں، میں نوجوان ادیب کی ڈائری کا ایک مسلسل حصہ پیش کرتا ہوں۔ ۲۴ سال کی عمر میں ہمارے نوجوان ادیب کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہوا کہ اپنے ملک کے رہنماؤں سے ہندوستانی نوجوان کی زندگی اور لائحۂ عمل کے متعلق اُن کے خیالات معلوم کیے جائیں اور اگر ممکن ہو تو انھیں خیالات کی روشنی میں وہ نوجوان اپنا نصب العین مرتب کرے۔ اس کو اپنے اس مقصد میں کہاں تک کامیابی ہوئی اُس کی کیفیت کا اندازہ اس ادیب کی ڈائری سے ہو سکتا ہے۔

۹ جون ۱۹۳۶ء کو ہمارا یہ نوجوان ادیب اپنے دل میں عزائم کی ایک دنیا آباد کیے ہوئے دہلی پہونچا۔ دہلی جانے سے اُس کا مقصد یہ تھا کہ وہاں کے ادبی طبقے سے جان پہچان پیدا کرے اور ملک کی مقتدر ہستیوں سے تعارف حاصل کر کے ہندوستانی نوجوان کے لائحۂ عمل کے متعلق اُن کی رائے معلوم کرے۔ اس پس منظر کے بعد میں اُس کی ڈائری کے چند اوراق نقل کرتا ہوں۔ ادیب کی داستان ادیب ہی کی زبان سے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ضیا

۱۰۔ جون ۱۹۳۶ء۔ بدھ

کل شام کو دہلی پہونچا تھا، آج دوسرا دن ہے۔ دہلی میں کلکتہ اور بمبئی کی طرح ہر وقت ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ بازاروں اور سڑکوں پر سارا دن چہل پہل رہتی ہے اور بیکار رہتے ہوئے بھی انسان مصروفیت محسوس کرتا ہے۔

آج میرا سارا دن اخباری دنیا میں گزرا۔ ایک اردو روزنامے کے ایڈیٹر، ایک ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر اور ایک انگریزی روزنامے کے ایڈیٹر سے ملاقات کی۔

اردو اخبار کے ایڈیٹر سے ملنا ایک حد تک تکلیف دہ ہوتا ہے خصوصیت سے ایسی حالت میں جب آپ اُن کے اخبار میں مضمون بھی لکھتے ہوں۔ مجھے اردو اخباروں کے ایڈیٹروں سے مل کر خوشی نہیں ہوئی۔ البتہ تازہ بہ تازہ، نو بہ نو، مضامین کے چند تقاضے میرے حصے میں آئے اب اپنے مستقر پر پہونچ کر مجھے یہ مطالبات پورے کرنے ہونگے۔

روزانہ اخبار کے ایک ایڈیٹر کا جرنلزم کے متعلق یہ خیال ہے

"...... جرنلزم ایک ایسا نشہ ہے جس میں گم ہونے کے بعد انسان کسی دوسرے کام کا نہیں رہتا، ہزار مشکلات کا سامنا ہو، جرنلزم کا ذوق انسان کو ایسا بے خود اور بدمست بنا دیتا ہے کہ کوئی مشکل، مشکل نہیں معلوم ہوتی۔ جرنلزم سے زندگی بھر نجات نہیں مل سکتی۔"

ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر نے فرمایا:—

"ایک ادیب کی زندگی جو دوسرے اخبارات میں مضامین بھیج کر معاوضے کی توقع رکھتا ہے، مصیبت اور پریشانی میں کٹتی ہے۔ اگر جرنلزم سے کچھ منفعت حاصل کرنا ہو تو انسان کو اپنا اخبار نکالنا چاہئیے"

انگریزی اخبار کے ایڈیٹر ذرا مزاج پُرس واقع ہوئے ہیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں قانون کا طالب علم ہوں مجھے جرنلزم سے بھی دلچسپی ہے اور یہی ذوق مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں آپ کے اخبار کی خدمت کروں۔ خدمت کا لفظ سنتے ہی وہ چونکے اور مجھ سے سوال کیا۔ آپ کس طرح خدمت کر سکتے ہیں؟ میں نے جواب دیا نوجوان ہندوستانی کی سوشل اور سیاسی ترقی کے متعلق مضامین لکھ کر۔ یہ الفاظ سنتے ہی وہ حضرات آگ بگولا ہو گئے اور مجھ پر برس پڑے۔ اگر میرا بس چلتا تو میں بالائی منزل کی کھڑکی سے کود کر بھاگ جاتا۔ لیکن اُن کی گرفت معمولی نہ تھی۔ فرمانے لگے آج کل ہندوستانی نوجوان نئی نئی تحریکوں میں اُلجھ کر اپنا دماغ پریشان کر رہے ہیں حالانکہ ترقی تحریکوں سے حاصل نہیں ہوتی۔ عمل سے ہوتی ہے۔ عمل کا نام زندگی ہے....... الغرض اس مختصر ملاقات میں انھوں نے ایک پورا لیکچر دے ڈالا۔ میں نے اپنے دو مضامین (انگریزی) اُن کی خدمت میں پیش کئے اس پر وہ ٹھنڈے ہوئے اور کہا۔ کل شب آٹھ بجے تشریف لائیے گا۔ میں آپ کے مضامین پڑھ کر رائے دے سکوں گا۔

۱۱۔ جون ۳۶ء۔ جمعرات

اخبار کی دُنیا کے کل کے تلخ تجربے نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ جو لوگ اپنی دُنیا خود نہیں بنا سکتے، اپنی زندگی اپنی کوششوں سے نہیں سنوار سکتے اور اپنے شام و سحر خوشگوار نہیں بنا سکتے وہ دوسروں کے کیا خاک کام آئیں گے۔ اخبار کی دنیا صرف اس وقت تک انسان کی امیدوں کا مرکز رہتی ہے جب تک وہ اس دُنیا سے دُور رہتا ہے۔ قریب آ جانے کے بعد یہ طلسم کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ جاتا ہے۔

آج میں نے اپنی توجہ اور اپنے خیال کو دوسری طرف مائل کیا

دہلی کی تاریخی عمارات اپنے اندر ایک خاص جذب و کشش رکھتی ہیں۔ جسے صرف ایک حساس دل ہی محسوس کر سکتا ہے وہ سرزمین جس نے ہزارہا برس تک بادشاہ پیدا کئے اور پھر اُن کو اپنی آغوش میں ہی جذب کر لیا۔ یقیناً ایک مقدس اور پاکیزہ زمین ہے۔ مجھے ہر قدم پر دہلی کی عظمت محسوس ہو رہی تھی اور مجھے وہاں کے ذرے ذرے پر ہندوستان کی تاریخ ثبت نظر آ رہی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں کی فضائیں اب بھی شہنشاہ سازی کی قوتیں رکھتی ہیں۔

ہمایوں کے مقبرے میں داخل ہوتے ہی میں نے ایک انگریزی نوٹ پڑھا جو اسی عمارت سے متعلق تھا۔ مقبرے کے حالات کے آخر میں لکھا تھا کہ بہادر شاہ ثانی غدر میں یہاں آ کر پناہ گزین ہوئے تھے اور میجر ہڈسن نے اُن کے شہزادوں کو یہیں گرفتار کیا تھا۔ ان الفاظ کا پڑھنا تھا کہ میرے رگ و پے میں دہشت کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک طوفان اُمڈا آ رہا تھا۔ قدم وہیں جم گئے۔ اگر کوئی مجھے وہاں سے آواز دے کر نہ بُلا لیتا تو شاید میں سارا دن وہیں کھڑا رہتا۔

آہ اے فطرت یہ نظارہ یہ تیرا اہتمام!!

اس کے بعد ہم درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ گئے۔ چند گلیوں سے گزرتے ہوئے ہم حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے گھر پہونچے خواجہ صاحب اپنے جدِ امجد کی عبادت گاہ تعمیر کرا رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی ہمارے ساتھ اپنے دفتر میں آئے۔ ان کی سادہ مزاجی اور بردباری سے میں بہت متاثر ہوا۔ میں نے اپنا مسئلہ پیش کیا تو فرمایا کہ میں نے پہلی مرتبہ آپ کو دیکھتے ہی آپ کے متعلق رائے قائم کر لی تھی۔ سُنئے :۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔

دوسری خصوصیت آپ میں یہ ہے کہ آپ دُنیا سے ہمدردی کرتے ہیں لیکن آپ کو اس ہمدردی کا جواب نہیں ملتا۔ میری طرف

متوجہ ہوتے ہوئے اُنھوں نے فرمایا کہ آپ کی دونوں بھوؤں کا درمیانی فاصلہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ مستقبل میں بہت بڑے آدمی بننے والے ہیں۔ میں نے تین چیزیں اُن کے سامنے پیش کیں۔ اوّل جرنلزم، دوسری قانون اور تیسری تجارت۔ اُنھوں نے تجارت کو پسند کیا اور مجھے رائے دی کہ میں آبائی پیشہ اختیار کر دوں۔

آج میری روح میں کچھ سکون سا محسوس ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یکایک آندھی اور طوفان کی گرد آلود فضا میں بارش کا ایک چھینٹا پڑ جائے۔ نہ معلوم کیوں؟

پروگرام کے مطابق شب کے آٹھ بجے ہم انگریزی اخبار کے دفتر گئے۔ ایڈیٹر صاحب نے فرمایا کہ لکھنے سے زیادہ آپ کو سوچنے کی ضرورت ہے۔ مجھے اُن کی اس رائے نے بہت متاثر کیا کہ مجھے ہر خوشنما چیز کی طرف نہ دوڑنا چاہیئے بلکہ ایک لائحہ عمل منتخب کر کے اسی کا پابند ہونا چاہیئے۔

مشورہ تو ان حضرت کا خوب ہے اور میں دہلی آیا کس غرض سے ہوں۔ یہ خیال تو مدتوں سے میرے ذہن و دماغ میں گونج رہا ہے۔ اپنے رہنماؤں سے یہی سننا چاہتا ہوں کہ مجھے کون لائحہ عمل منتخب کرنا چاہیئے؟

۱۲۔ جون ۱۹۳۶ء۔ جمعہ

آج میں ایک ایسے تعلیمی ادارے میں گیا جو اپنے نصب العین اور اپنے لائحہ عمل کے سبب سارے ہندوستان میں مشہور ہے۔ اس ادارے کے ایک ذمہ دار رکن سے گفتگو کی اور مجھے افسوس ہے کہ دہلی میں سب سے زیادہ مایوسی ان ہی سے مل کر ہوئی۔ اپنے ایک مضمون "جدید قومیت کے تخیل" میں میں نے اس ادارے کی بہت تعریف کی ہے مگر افسوس کہ مجھے اپنے الفاظ واپس لینے پڑیں گے۔ تعجب ہے کہ ایک ذمہ دار شخص جس کی ملک میں ایک حیثیت ہے اور جو ایک ذمہ دار ادارے کا مالک ہے۔ ہندوستانی نوجوانوں کے متعلق کوئی مستقل رائے قائم نہیں کر سکتا اور صرف یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ انسان کا مستقبل اس کے رجحانات پر مبنی ہے۔ "اخبار نکال لیجئے"۔ "دوکان کھول لیجئے"۔ "ملازمت اختیار کر لیجئے"۔ "جو آپ کا جی چاہے کیجئے"۔ بہت خوب

میں حاضر ہوا ہوں ہندوستان کے نوجوانوں کے متعلق آپ کے ادارے کا عندیہ معلوم کرنے اور آپ چلے ہیں بے پر کی اُڑانے۔ خواجہ صاحب نے بالکل صحیح فرمایا تھا کہ "یہ نیا ادارہ مایوسوں کا ایک گروہ ہے"۔

اس ادارے سے رخصت ہو کر ہم آصف علی صاحب کے یہاں آئے جو دہلی کے ایک کامیاب بیرسٹر ہیں اور اپنے روشن خیالات کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہیں۔

آصف علی صاحب۔ ادھیڑ عمر کے انسان ہیں۔ ڈاڑھی مونچھ صفاچٹ، چہرہ متین اور سنجیدہ، چہرے سے انتہائی خشک انسان معلوم ہوتے ہیں۔ مگر باتوں میں اس قدر چاشنی کہ بس سُنتے ہی جایئے۔ میری ملاقات کا سبب دریافت کرنے کے بعد انھوں نے میرے حالات دریافت کئے، میرے رجحانات سے آگاہی حاصل کی اور معاملات کو اس طرح سلجھایا گویا کسی مقدمے میں رائے دے رہے ہیں۔ جب کوئی نوجوان اپنے لیڈروں سے اپنے مستقبل کے متعلق رائے لیتا ہے تو لیڈروں کا فرض ہے کہ اس کی ہمت افزائی کریں اس کے حالات دریافت کرنے کے بعد اپنے تخیل اور اپنے معیار کے مطابق اس کو رائے دیں۔ ہر ذمہ دار شخص اپنے ملکی مسائل کے متعلق ایک ذمہ دار رائے رکھتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ذمہ دار افراد عملی طور پر سوسائٹی کو اپنے خیال کے مطابق ترتیب دیں۔ اور بونیورسٹی کی کرسیوں پر بیٹھ کر کنووکیشن ایڈریسوں میں اپنی عظمت اور بڑائی کا ڈھول پیٹنا چھوڑ دیں۔

زندگی کی پریشانیاں کسی کو اجازت نہیں دیتیں کہ کسی سے کوئی مشورہ یا رائے لے۔ زندگی دریا کی ایک موج ہے جو اپنی روانی میں کسی سہارے کی محتاج نہیں۔ اس سچّے کے باوجود

اگر کوئی اپنے حالات اور مواقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے ملک کے
رہنماؤں کے پاس بغرضِ مشورہ جاتا ہے تو انھیں اپنا بہترین وقت
صرف کرنا چاہیئے۔ مجھے مسرت ہے کہ آصف علی صاحب سے مل کر میری
تمام توقعات پوری ہوئیں اور آدھے گھنٹے میں اُن سے بہت کچھ
لے کر آیا۔

سب سے پہلے اُنھوں نے میرے حالات دریافت کئے والدین
کے متعلق پوچھا۔ امیر کارواں نے کہا وہ کھاتے پیتے آدمی ہیں پھر
میرے رجحانات کے متعلق سوال کیا۔ میں نے کہا میرا زیادہ وقت
ادبی فضا میں صرف ہوا ہے اور قانون پڑھنا بھی میرے فرائض
میں داخل ہے۔ انھوں نے کہا کہ جہاں تک آپ کے ذاتی رجحانات کا
تعلق ہے ایک غیر شخص آپ کے ساتھ تھوڑی دور تک چل سکتا ہے
اور آپ کو راستہ دے سکتا ہے لیکن اس کے باوجود ایک منزل
انسان کی زندگی میں ایسی آتی ہے جہاں پہنچ کر انسان کو اپنے
متعلق خود فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ میں جہاں تک آپ کے حالات سے
اندازہ لگا سکا ہوں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا دماغ ابھی اتنا
پختہ نہیں ہوا ہے کہ آپ اپنی قوتِ فیصلہ کو کام میں لا سکیں۔ میں
آپ کو مشورہ دوں گا کہ مواقع سے فائدہ اُٹھائیے اور اپنے دماغ
کی قوتوں کو استحکام دیجئے۔ یہ چیز ہندوستانی یونیورسٹیوں میں حاصل
نہیں ہوتی۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو فوراً یورپ روانہ ہو جاتا۔ میں
یہ رائے دے کر خوش نہیں ہوں، مگر کیا کیا جائے۔ ہندوستانی
یونیورسٹیاں کسی قابل نہیں ہیں۔"

ادب اور قانون کے متعلق فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں زیادہ
دور تک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ میں آپ کو رائے نہیں دیتا کہ
آپ قانون میں اپنا وقت ضائع کریں۔ آپ قوم کی خدمت کرنا
چاہتے ہیں تو یورپ جائیے۔ وہاں آپ کو معلوم ہوگا آپ کونسی
راہ اختیار کریں۔"

آصف علی صاحب کی گفتگو اس قدر مدبرانہ اور پختہ تھی
کہ میں دل ہی دل میں اُن کا معترف ہو رہا تھا۔ وہ یہ تو سمجھ چکے
تھے کہ مجھے ادب سے ذوق ہے۔ اس کے بعد انھوں نے تقریر کا
جو پہلو اختیار کیا اس میں ادبی پہلو زیادہ نمایاں تھا۔ وہ اپنی
گفتگو میں خود اس قدر محو اور مستغرق ہو جاتے تھے کہ تھوڑی تھوڑی
دیر کے بعد ان کو بھی علم نہ رہتا تھا کہ خیالات کی کڑی کہاں سے
ٹوٹ گئی۔

دہلی کے تمام پروگرام ختم ہو چکے ہیں۔ کل ہم یہاں سے روانہ
ہو جائیں گے۔ دہلی کے سفر سے میں نے کیا حاصل کیا۔ اس کے متعلق
میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں
کہ انسان اپنی کشتی کا خود ہی ناخدا ہے۔ جو لوگ دوسروں
کے سہارے اور دوسروں کی مدد سے اپنی کشتی چلانا چاہتے
ہیں وہ کہیں کے نہیں رہتے۔ ہندوستانی سوسائٹی کے نقائص
میری نگاہ میں ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان نقائص کی اصلاح
ہونی چاہیئے لیکن اصلاح کے ذرائع کہاں ہیں؟ میں نے
اخباروں کے دفتر، اپنے تعلیمی اداروں اور اپنے ملک کے
رہنماؤں کے سامنے ہاتھ پھیلائے مگر تہی دامن رہا۔
مستقبل کے حالات میرے متعلق فیصلہ کریں گے۔
خود میری ذاتی رائے یہ ہے کہ انسان کو سب سے پہلے
سوسائٹی میں ایک جگہ حاصل کرنی چاہیئے۔ اقتصادی حیثیت
سے مضبوط ہونا چاہیئے، اس قدر مضبوط کہ دنیا انسان کے
قدموں میں نظر آئے۔ اس کے بعد سوسائٹی کی تعمیر، ادبیت
اور ہندوستانی نوجوانوں کی ذہنی تعمیر کے ذرائع سوچنے کا موقع ہے۔

محمد صادق ضیا

بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

شعلہ و شبنم

وہی منزل ترے بھٹکے ہوؤں کی آخری ہوگی
جہاں پر ختم سرحدِ خودی و بیخودی ہوگی

فسردہ شمع ہوگی، ساری محفل رو رہی ہوگی
بڑی بے کیفیوں سے نعشِ پروانہ اٹھی ہوگی

بڑی پُرکیف اور معصوم تر وہ بندگی ہوگی
کہیں کچھ نہ ہوگا اور پرستش آپ کی ہوگی

نظر جب بھی ہماری اپنے مرکز سے ہٹی ہوگی
وہیں چھلکی ترے جلووں کی گیرائی نے لی ہوگی

پیالہ چاند کا ہوگا، صراحی پھول کی ہوگی
جو پی ہوگی تو اس انداز نو سے ہم نے لی ہوگی

انھیں دل میں چھپا کر بھول جاؤں ساری دنیا کو
مرے مشرب میں صرف اتنی ہی جائز بیخودی ہوگی

حیاتِ جاوداں دی ہے مذاقِ عشق نے مجھ کو
یہ مرگِ اتفاقی کیا حریفِ زندگی ہوگی؟

سوادِ طور سے صبحیں ہزاروں حسن نے پیدا کیں
وہ بجلی اب بھی اِن ذراتِ خاکی میں چھپی ہوگی

حجابِ شب سے انوارِ سحر بیدار ہوتے ہیں
یہ غم کی پھانس بھی لے دل گرفتہ بافنی ہوگی

نہ ہو اے حسن برہم یہ تو امر اتفاقی ہے
شب غم غیر ارادی طور پر نیند آگئی ہوگی

یہاں ہے لالہ گوں آنکھوں سے دامن خرمنِ انجم
وہاں اوراقِ گل پر رات موتی جھڑ رہی ہوگی

جبھی تو شعلہ کاری ہے گریبانِ محبت تک
یہ غم کی آگ شاید دامنِ دل میں لگی ہوگی

تو کیوں آنسو بہاتا ہے شکستِ غنچہ و گل پر
نظامِ دورِ گلشن نے کوئی انگڑائی لی ہوگی

نہ کر اغماض اے مادہ تمامِ رنگ و بو تا
ترے جلووں سے تعمیرِ جہانِ عاشقی ہوگی

وہاں پہونچونگا میں اعجاز لیکر شمعِ آزادی
جہاں ظلمت کے پردوں میں غلامی اینڈتی ہوگی

اعجاز صدیقی

آج کی رات

"تیرے بیمار کا ہے عزمِ سفر آج کی رات"
"نبض چل بسنے کی دیتی ہے خبر آج کی رات"

مہ و انجم نے مری جب سے کہانی چھیڑی
چشمِ فطرت ہے اسی وقت سے تر آج کی رات

شام سے آج فضاؤں میں اداسی کیوں ہے
کیا نہ ہوگا مرے نالوں میں اثر آج کی رات؟

کاوشِ غم ہے کہ نشتر کی خلش ہے، کیا ہے؟
ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے جگر آج کی رات

مرے چل بسنے کا ان کو بھی قلق ہے شاید
ورنہ تاریک ہیں کیوں نجم و قمر آج کی رات

شامِ غربت میں امڈ آئیں گھٹائیں غم کی
کیا نہ ہوگی مرے اللہ سحر آج کی رات

عمر بھر جسکی تمنا میں نہ سوئیں آنکھیں
ہے دمِ نزع وہ محفوظِ نظر آج کی رات

دل میں بھر دی ہے شبِ غم نے بڑی آگ اسد
ہے ہر اک سانس میں بجلی کا اثر آج کی رات

اسد احمد آبادی

معاصرینِ میر تقی میر

(اکبرآبادی)

آبرو

نجم الدین نام شاہ مبارک لقب، آبرو تخلص تھا حضرت محمد غوث گوالیاری کی اولاد سے تھے۔

حضرت محمد غوث آگرہ میں رہتے تھے یہیں انتقال ہوا[1] اور نعش گوالیار گئی انکے صاحبزادہ شیخ ضیاء اللہ آگرہ میں رہے[2] انکی اولاد یہیں پروان چڑھی۔

آبرو اسی خاندان سے تھے، خانِ آرزو سے بھی قرابت قریبہ تھی[5]۔ وطن سے نارنول گئے۔ بعد عنفوان شباب میں دلی چلے گئے۔ ساری عمر وہیں گذار دی۔

میر تقی میر لکھتے ہیں:-

"شاعر نادرہ گوئے ریختہ میگویند کہ طبعی شوخی داشت غرض متعنی وقت خود بود کہ عہد محمد شاہ بادشاہ"

میر حسن نے لکھا ہے:-

"نبیرہ حضرت محمد غوث گوالیاری نور اللہ مرقدہٗ از ابتدائے جوانی مشق سخن میکرد شاعر خوشگو در وقت خود بود۔"

ایک آنکھ اِن کی جاتی رہی تھی مگر جو کمال ان کو خدا نے عنایت فرمایا تھا اُس نے اس عیب کی پردہ پوشی کر دی تھی۔

ابنائے وطن نے دل کھول کر ان کی قدر دانی کی اور حق یہ ہے کہ دلّی میں اُردو شاعری کا باقاعدہ آغاز انہیں سے ہوا۔

طبیعت رسا اور فکر معنی یاب تھی...... دیوان انکا غدر میں ضائع ہو گیا ایک مختصر دیوان اب بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے[6]۔

سراج الدین علی خان آرزو سے عمر میں کم تھے مگر کلام انھیں کو دکھاتے تھے۔

مولوی کریم الدین تاریخ شعرائے اُردو میں اُنکی نسبت لکھتے ہیں:-

"صاحب دیوان ریختہ ہے جس میں کہ اکثر اچھی اچھی تشبیہات اور صنعت ایہام مندرج ہیں۔"

عہد محمد شاہ میں انتقال ہوا، فارسی میں بھی مجموعہ کلام کا ہے۔ ایک مثنوی بھی یادگار ہے

دل تو دیکھو آدم بیباک کا عشق سے پتلا بھرا ہے خاک کا

مضمون

مضمون شیخ شرف الدین حاجمؤ مضافات اکبرآباد کے رہنے والے حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر کی اولاد سے تھے عنفوان شباب میں دلی گئے اور زینت المساجد میں قیام کیا اور وہیں عمر تمام کی شیخ الدین علی خان آرزو کے شاگرد تھے زلزلے سے دانت گر گئے تو آرزو شاعر بیدانہ کہا کرتے تھے[1]۔

نکات الشعراء میں میر صاحب لکھتے ہیں:-

"ظریف ظریف بشاش بشاش ہنگامہ گرم کن مجلسہا ہر چند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیادہ دیوانش ہم جہت دو صد بیت خواہد بود۔"

چمنستانِ شعرا میں ہے:-

"شاعریست نادر درس و سخن پرور لیت معنی رس مضمون شیر بیش، حرف بر نبات می دارد و کلام شکر ینش مذاق جاں را لذت خاص می بخشد اصلاح سخن او مرزا مظہر و سراج الدین علی خاں آرزو می گرفت و گاہے بتفنن گوہر سخن بسلک نظم می سفت چنانچہ دلیل کم گوئی خود می گوید

درد دل سے جس طرح بیمار اُٹھتا ہے کراہ
اس طرح اک شعر مضموں بھی کہے ہے گاہ گاہ

فتح علی شاہ گردیزی در تذکرہ اومی طراز د کہ با وصف بر دو دست

---

[1] منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی [2] دربار اکبری [3] آبِ حیات۔

[4] چمنستانِ شعرا، گل رعنا صفحہ ۱۰۲

پیری و فرطِ ضعف و ناتوانی بامرسے بود بغایت گرم جوش:
.... ہرگاہ دندانش از نزلہ ریختند خانِ آرزو از مزاج
شاعرِ بیدانہ می گفت۔

دیوانش بجمع چنانِ قریب صد بیت بملاحظہ در آمد از سخن معلوم
می شود کہ اولادِ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر قدس سرہ است چنانچہ
خود می گوید ؎

لبِ شیریں سے دے مضموں کو میٹھا
کہ ہے فرزندہ گنج شکر کا

ایں چند ابیات از دیوان مضمون برآوردہ بساحلِ قرطاس
می نگارد ؎

کیا طفلاں کی خاطر ریختہ کو دگرنہ شعر کہنا فارسی کا
کوئی اس جنس کا دہلی میں خریدار نہیں دل تو حاضر ہے و لیکن کہیں دلدار نہیں

مضمون کے انتقال پر مرزا سودا نے غزل کہی جسکا مقطع یہ ہے ؎

بنائیں اٹھ گئیں یارو غزل کے خوب کہنے کی
گیا مضمون دنیا سے رہا سودا اسو ستانہ

خواجہ احسن اللہ بیاں اکبرآبادی

خواجہ احسن اللہ بیاں۔

مولدش خاک پاک اکبرآباد ست[1]

اوائل عمر میں وطن سے دلی آن رہے تھے۔ مولانا فخرالدین دہلوی کے مرید تھے۔
شعر و شاعری سے دلچسپی تھی حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے آغوش میں ان کی شاعری
نے ترقی کی۔ آخر عمر میں حیدر آباد چلے اور نواب آصف جاہ ثانی کی سرکار سے
تعلق ہو گیا باعزت زندگی بسر ہونے لگی[3]۔

از وجاہت صوری و حسن سیرت بہرۂ وافی برداشتہ بود
و در معنی طرازی مزاج والاش علم اندیشہ آسمانِ پیمائی داشت[2]

مولانا عبدالحئی گلِ رعنا میں لکھتے ہیں:۔

"خوش خلق پاکیزہ سیرت ظریف طبع اور لطیف مزاج تھے ہر شخص
سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے اور جو ایک بار ان سے ملتا وہ
ہمیشہ اُن سے ملنے کا متمنی رہتا۔"

خواجہ صاحب اصول شاعری سے باخبر خوش گو تیز طبع اور مشاق سخنور تھے۔
ان کے کلام میں نمکینی اور رنگینی ایسے غضب کی ہے کہ شعر کو پڑھکر دل تڑپ جاتا ہے
دور از قیاس استعاروں اور پیچیدہ بندشوں سے کلام پاک و صاف ہے اور
سادگی میں بھی اس کا انداز ایسا ہے جس پر ہزاروں بناوٹیں قربان کر دی جائیں۔

میر حسن دہلوی لکھتے ہیں:۔

"شاعر عذب البیان از خوشگویان زماں ...... بسیار
خوب گفتہ رباعیات دلپذیر دارد۔"

ان کے دیوان کا قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ہندوستان
میں بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے "زیچ نامہ" تصنیف سے ہے[4]۔
سنہ ۱۲۱۳ھ میں وفات پائی حیدر آباد میں دفن ہوئے۔ انکے شاگرد رائے
گلاب چند ہمدم نے تاریخ لکھی۔

"استاد از جہاں رفت"[5]

کیوں آج سماتا نہیں سینہ میں خوشی سے پہنچا ہے مگر دل! تجھے پیغام کسی کا

شیخ بقاء اللہ بقا اکبرآبادی

شیخ بقاء اللہ بقا ابن حافظ لطف اللہ خوش نویس اکبرآبادی۔

اصلش از اکبرآباد و نشاء ان لکھنؤ[6]

آگرہ سے دہلی گئے پھر لکھنؤ چلے۔ طبیعت فنِ شعر کے لئے بہت مناسب تھی۔
نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ گلشنِ بے خار میں لکھتے ہیں:۔

خاطر ظرافت پسند داشت بل از ظرافت درگذشتہ
سر بہجا کشیدہ و شریک دارو میر و سودا و با اینہاں پنجہ زن
شدہ و ہجوہا گفتہ و در مراتب نظم طبعی شگفتہ و رنگین و طرزی

[1] تذکرہ ہندی گویاں میر فتح علی گردیزی [2] گلِ رعنا
[3] چمنستانِ شعرا صفحہ ۵۲۔

[4] تذکرہ میر حسن [5] گلِ رعنا صفحہ ۹۲ [6] گلشنِ بے خار صفحہ ۱۰...

بامزہ و شیریں داشت۔ گرچہ بفندپارسی ہم کام وزبان را حلاوت آگیں می نمود باپارسی شاگرد مرزا فاخر مکیں و در ریختہ از افاضۂ حاتم و فاہ مرتبۂ شعرش بجا ذوشتاند۔"

حضرت مصحفی فرماتے ہیں:۔

"جوان سراپا خُلق وظریف مزاج و قانع وش طبع زخش بطرف ہجو نیز مائل افتادہ در شاہجہاں آباد با میر درد در لکھنؤ با مرزا رفیع معرکہ گیریہا کردہ وقت طبع خود در اظہار نمود۔"

بقا فرماتے ہیں:۔

میر و مرزا کی شعر خوانی نے | بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
کھول دیوان دونوں صاحب کے | اے بقا ہم نے جب زیارت کی
کچھ نہ پایا سوائے اسکے سخن | ایک تو تو کہے ہے اک ہے ہے

صاحب گل رعنا نے لکھا ہے:۔

"بقا نے زندگی بہت بے مزہ گذاری، افلاس سے تنگ آکر کسی کی رہنمائی سے تسخیر کواکب کے اعمال شروع کئے تھے۔ اس نے سودائی بنادیا۔ جب ہر طرف سے مایوس ہوئے تو سنہ ۱۲۰۶ھ میں عتبات عالیات کی زیارت کو چلے۔ راستہ میں موت نے اس ارمان کو بھی نکلنے نہ دیا ؎ یار کو پہنچی خبر نالۂ تنہائی کی
مدعی کون کھڑا تھا پسِ دیوار لگا

حضرتِ سجاد اکبرآبادی

حکیم میر محمد سجاد ولد میر محمد عظیم ابن میر محمد اکرم خاں اکبرآبادی۔ میاں نظیر کے معاصر تھے کم عمری میں شاہ مبارک آبرو کو کلام دکھایا۔ فکر شگفتہ اور استعداد معقول تھی[۱]

میر حسن دہلوی لکھتے ہیں۔

"در اکبرآباد بمساکن قدیم اقامت دارند و شوق طلسمات و انشار و خوشنویسی و شعر فہمی را بمراتب اعلیٰ رسانیدہ اند[۲]"

قدرت اللہ شوق اپنے تذکرہ میں رقمطراز ہیں کہ ان کا کلام نہایت شیریں اور دلفریب ہوتا تھا کلام میں متانت پختگی کے علاوہ وغضب کی ہمواری ہوتی تھی۔

فتح علی حسینی گردیزی تذکرہ ریختہ گویاں میں لکھتے ہیں:۔

"میر سجاد در معنی مرتبہ اش بلند الیست و پایہ اش ارجمند ہرچند از تربیت یافتگان میاں آبرو است۔ لیکن شعرش در چشم منصفاں حق بیں بہتر۔"

میر تقی میر کے زمانہ میں نوجوانی کا عالم تھا انکی شعرگوئی کی شہرت ہو چکی تھی۔ نکات الشعرا میں انکا حال لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"سخن او بپایۂ استادی رسیدہ"

میر صاحب میر سجاد کے ایک شعر پر وجد کرتے ہیں اور توارد کی تمنا کرتے ہیں۔

سجاد کا شعر ہے ؎ عشق کی ناؤ پار کیا ہووے
جو یہ کشتی تری تو بس ڈوبی

میر صاحب داد دیتے ہیں:۔

"ہمہ شعر سبحان اللہ لیکن فقیر را از دیدن این شعر تواجد دست بہم می دہد از بسکہ از خواندن این شعر حظے برمیدارم میخواہم کہ بصد جا بنویسم۔"

آگرہ سے میر سجاد گئے تو وہاں محفل مشاعرہ منعقد کرنے لگے:۔

"ہنگام ورود دہلی بزم مشاعرہ می آراست[۳]"

صاحب چمنستان شعرا لکھتے ہیں:۔

"شعر ایہام بسیار میگوید و مضامین خوب خوب بنظم می آرد حقا کہ رتبۂ عالی او فوقیت بر رتبہ میاں آبرو میدارد و شعر شیرینش در عذوبت این حقیر بہتر از و می شمارد[۴]"

دو شعر نمونہ کے پیش ہیں:۔

کیوں نشت گل بھی دل کی تڑپنے میں بہہ گئی | سجاد مجکو باقی ہے چشموں سے یہ گلا
بے تکلف ہو سبھوں سے وہ ملے ہے سجاد | دختِ رز بھی عجب اطوار کی مستانی ہے

[۱] خمخانۂ جاوید جلد چہارم صفحہ ۸۴ [۲] تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۱۰
[۳] طبقات سخن صفحہ ؟ [۴] چمنستان شعرا صفحہ ۲۷۹

حضرت بیدار اکبرآبادی

بیدار محمد علی شہرت محمد یار نام سے ہے۔ آگرہ وطن تھا تذکرۂ قدرت میں ہے۔

"از سادات مستقر الخلافت اکبرآباد بود"[1]

علمی استعداد معقول تھی فارسی اُردو ہر دو میں فکر کرتے تھے، نوجوانی میں دہلی آن رہے تھے فارسی میں مرتضیٰ قلی بیگ فراق سے اور اُردو میں خواجہ میر درد سے اصلاح سخن لی۔

میر تقی میر نکات الشعرا میں لکھتے ہیں:-

"جوانے ست از یاران مرزا مرتضیٰ قلی بیگ فراق مصرع ریختہ
درست موزوں می کند و مرزا مرتضیٰ قلی شاعر مربوط فارسی ست
اکثر در صحبتہائے فقیر بگرمی پیش می آید"

میر حسن نے اپنے تذکرہ میں یہ ذکر کیا ہے:-

"جواں محمد شاہی است ..... قریب چاردہ سال شدہ باشد
کہ فقیر اورا در لباس درویشی در شاہجہان آباد دیدہ بود طبع
در مند داشت باریک و منحنی بزیور علم و حیا آراستہ"

طبیعت کا رجحان فقر کی طرف تھا مولانا فخر الدین دہلوی کے فیضان صحبت سے بہرہ ور ہوئے اور طریقہ چشتیہ کے اذکار و اشغال کی مشق سے خرقۂ خلافت پہنا۔ اور آخر عمر میں وطن لوٹ آئے۔ کٹرہ دندان میں اقامت پذیر ہوگئے۔

مصحفی لکھتے ہیں:-

"حالا گویند کہ از چندے اکبرآباد رونق افزاست"[2]

دو دیوان یادگار چھوڑے ۱۲۰۹ھ میں وفات پائی اور آگرہ میں دفن ہوئے۔

ہم پہ تو ظلم و ستم کیجے گا   ایک ملنے کو نہ کم کیجے گا
کس بدمعاش سے آتی ہے بتا مجھکو کہ یہ آج   کچھ اور ہی بو تجھ میں نسیم سحری ہے

حضرت محسن اکبرآبادی

میر محمد محسن ابن حافظ محمد حسین ابن میر محمد علی متقی اکبرآبادی حافظ محمد حسین خاں آنند کے ہمشیر زادہ تھے اور محسن براد رزادہ میر محمد تقی میر۔

علوم رسمی سے واقف تھا آنند کے فیض صحبت کی خاطر یہ بھی دہلی جا بسے۔

شعر و شاعری سے لگاؤ تھا اپنے بزرگوں سے استفادہ کیا۔ چمنستان شعرا میں ہے۔

"برادر زادہ میر محمد تقی میر و ذلہ بر فضل ان معنی پرد صاحب تخلص است
ابیات او از ہر دو تذکرہ (نکات شعرا و تذکرۂ ریختہ گویان) می طرازند"[3]

کیا جانئے وہ شوخ کدھر ہو کدھر نہیں   ہم کو تو تن بدن کی بھی اپنے خبر نہیں
محسن تمام عمر مری روتے ہی کٹی   اس جھگڑے میں آہ کہیں بھی سحر ہے

حضرت سلام اکبرآبادی

نجم الدین علی خاں سلام خلف شرف الدین علی خاں پیام۔

چمنستان شعرا میں ہے:-

"معنی تلاش والا مقام و از شعرائے شیریں کلام است مولدش دار الخلافہ
اکبرآباد، و طبع نکتہ سنجش معنی ایجاد!"

میر صاحب نے نکات الشعرا میں لکھا ہے:-

"جوانے خوب است خدا زندہ دارد"

بلے تابیو قسم ہے تمہیں کی صبر کی   مسلخ ہیں بعد ذبح تحمل نہ کیجو
حدیث زلف چشم یار سے پوچھ   درازی رات کی بیمار سے پوچھ

شوق اکبرآبادی

شیخ الٰہی بخش شوق "از سکنائے اکبرآباد"

مرزا مظفر بخت کے ملازم تھے موزوں طبع رکھتے تھے ۱۲۴۱ھ میں انتقال ہوا۔

اُس خاکسار کو کوئی کیونکر اٹھا سکے   جوں نقش پا جہاں پہ بیٹھا وہیں رہا

آشفتہ اکبرآبادی

مرزا رضا قلی خلف حکیم محمد شفیع اکبرآبادی باپ کے زیر سایہ نشو و نما پائی۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ لکھتے ہیں:-

"بعض اورا از لکھنؤ و بعضے از اکبرآباد دانند بہر حال جوانی گذاشتہ و
در دہلی و در فن طب دستے از بلند داشت ہمت بہ ترتیب محفل مشاعرہ
میگماشت کلامش بنظر سرسبز در آوردہ ہمت شورش دشت شہوات و فکرش"

مطبوع اہل انصاف ہے

بجائے اشک نکلتے ہیں پارہ ہائے جگر   تمہارا جنہیں تھا ارمان دیکھتے جاؤ
اگرچہ ہو دیگی تصدیع لیکن آشفتہ   کوئی گھڑی کا ہے مہمان دیکھتے جاؤ
چہرہ کچھ ان دنوں غم نہاں سے زرد ہے   ظاہر میں کچھ مرض نہیں پر دل میں درد ہے

انتظام اللہ شہابی

---

[1] تذکرۂ قدرت صفحہ ۱۱ [2] تذکرۂ شعرائے مصحفی صفحہ ۳۱ [3] چمنستان شعرا

صدائے بازگشت

اضطراب دل بنا سوزِ دلِ بسمل بنا
اک پتنگا جب کہیں پروانۂ محفل بنا

ہر گھڑی ہر لحظہ ہر ساعت نئی منزل بنا
دل کبھی دریا کبھی طوفاں کبھی ساحل بنا

ایک بھی چلنے نہ دی تقدیر نے تدبیر کی
میرا ہر جوشِ عمل اک سعیٔ لاحاصل بنا

سرخیٔ افسانۂ الفت ہے پروانے کی خاک
مٹ مٹا کر یادگارِ رونقِ محفل بنا

اب تو اس میں چاک بھی ہیں زخم بھی ہیں داغ بھی
دیکھئے اب بھی مرا دل آپکے قابل بنا؟

بے نیازِ عقل ہی رہنے دے رمزِ عشق کو
یوں نہ الجھا کر اک آساں بات کو مشکل بنا

واہ رے صورتگریٔ دستِ نقاشِ ازل
نقشِ باطل بھی بنا تو زینتِ محفل بنا

حسن کو انکار ہے کیوں عشق کی تقدیم سے
موجِ مضطر جب ہو چکا دریا تو پھر ساحل بنا

جبکی شمعیں اور پروانے بقا انجام ہوں
اب کے تو اس خاکسترِ محفل سے وہ محفل بنا

سوچتا کیا ہے بڑی دولت ہے وقتِ آخری
ڈوبنے والے سنبھل ہر موج کو ساحل بنا

دل نہیں دل کی جگہ اک داغ تو موجود ہے
اب اسی کو رفتہ رفتہ یادگارِ دل بنا

آ رہی ہے ہر نفس سے گو صدائے بازگشت
دل کے نالوں کو اکمل پھر بھی کسی قابل بنا

اکمل مظفر نگری

برقِ رقصاں

یہ ہستیٔ انساں بھی کیا ہستیٔ انساں ہے
سمٹے تو ہے اک غنچہ، پھیلے تو گلستاں ہے

جلوہ گہِ ہستی میں، یہ کون خراماں ہے
جلوؤں کا تلاطم ہے، انوار کا طوفاں ہے

سمجھے میں کلیسا میں گو ہم نے کئے سجدے
سنگِ درِ جاناں پھر سنگِ درِ جاناں ہے

چہرے پہ خوشی سی ہے، آنکھوں میں نمی سی ہے
یہ شانِ خدا دیکھو، گلشن میں بیاباں ہے

حسرت بھرے آنسو میں تاثیریں ہیں دو پنہاں
دیکھیں تو یہ قطرہ ہے سمجھیں تو یہ طوفاں ہے

ان شوخ اداؤں کا انداز کوئی دیکھے
اوراقِ گل تر پہ، اک برق سی رقصاں ہے

ہر موجِ نفس میری، کہتی ہے یہی مجھ سے
پابندیٔ انساں ہی آزادیٔ انساں ہے

بکھرے ہوئے گیسو ہیں، ان کے رخِ رنگیں پہ
یا شام کے پہلو میں، اک صبحِ درخشاں ہے

کیوں اسکو ستاتے ہو، کیوں اسکو جلاتے ہو
یہ قمر ازل سے خود اک سوختہ ساماں ہے

وزیرزادہ قمر عثمانی جناگڈھ

چراگاہ کے بھوت!؟

بھولا سنگھ اور تارا سنگھ کنور راجپوت اور کھرے راجپوت گھر میں پیدا ہوئے مگر غریبوں نے قفس ہی میں آنکھ کھولی اور قفس ہی میں پر نکالے۔ جبوقت بیچاروں کی عمر پانچ سال اور سات سال کی تھی ماں اور باپ دونوں کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور یہ دونوں علاوہ جھنگ کے بغیر اور تمام خدمات چچا کی کرنے کو رہ گئے۔ کہنے کو تو کیہری سنگھ چچا تھا اور بے اولاد چچا مگر چچی نے کبھی بھتیجوں کو مزدوری پر کام کرنے والے چاروں سے زیادہ نہ سمجھنے دیا۔ غرض ٹھاکر کے گھر میں جنم لیکر موروثی دخیل کار ہوتے ہوئے جاڑے کے سرد دنوں میں ننگے بدن اور بیساکھ کے لالامال گرم دنوں میں نیم شکم بسر کر کے غم مرگ کی سرپرستی میں بچپن سے جوانی کی سرحد میں قدم رکھا تو چچا صاحب قبلہ نے ہتھیں گاؤں کا ڈنڈا ہاتھ سے پکڑ بل کا مٹھیا دیدیا۔ گھر سے باہر کیہری سنگھ نام کا نہیں دل کا بھی کیہری تھا مگر گھر کی چار دیواری کے اندر ٹھکرائن شیرنی اور کیہری سنگھ بھیڑ تھا اسکا کوئی فعل بغیر بیوی کی مرضی کے نہ ہوسکتا تھا۔ نتیجہ میں اپنے سگے بھتیجوں کی جانب سے لہو سفید تھا اور بیوی کے بھانجوں اور بھتیجوں پر فدا تھا۔ جو ہمیشہ کم و بیش نصف درجن کی تعداد میں لہان بصورت میزبان بنے ہی رہتے۔ جب بھولا سنگھ ذرا سیانا ہوا تو ٹھکرائت میں چاروں طرف سے شادی کی بات چیت آنے لگی اور کیوں نہ آتی دادا کی ہزار بیگہ موروثی زمین کے یہی دو بھائی وارث تھے۔ پہلے تو ٹھکرائن ٹالتی رہی مگر جب چاروں طرف سے موند جھٹ ٹھاکرات نے انگشت نمائیاں کیں کہ لڑکے کے موند پر مونچھیں آگئیں تو کوئی ٹھاکر لڑکی نہیں دیگا تو مجبوراً شادی کرنا پڑی۔ شادی کے بعد بھولا سنگھ اور تارا سنگھ نے اپنے باپ والے گھر کی مرمت کی اور بمشکل تمام ٹھاکروں کی پنچایت کرا کر اپنے حصے کی پانچ سو بیگہ زمین میں سے صرف ساٹھ بیگہ زمین حاصل کی اور ایک چھوٹی سی چراگاہ۔ بھولا سنگھ کا خسر اچھا خاصہ کھاتا پیتا ٹھاکر تھا۔ لڑکی کے جہیز میں داماد کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے دو تین اچھی نسل کی بھینسیں ایک اونچی ناس کے بیلوں کی جوڑی اور خانہ داری کا ضروری ضروری سامان دیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں بھائیوں نے الٹا سیدھا گھر کر لیا اور پیٹ کا گزر کرنے کے لئے ساہوجی کے سامنے ہاتھ پھیلانے لگے۔

دونوں بھائیوں کے حصے کی قریب چار سو بیگہ زمین چچا کے قبضے میں تھی اور یہ ساٹھ بیگہ زمین اور چھوٹی چراگاہ اس صورت سے قبضے میں تھی کہ دونوں بھائی چچا کے مویشیوں کا پیٹ بھرنے اور ساٹھ ہی بیگہ چچا کے لئے علیحدہ بونے کے ٹھیکیدار تھے اور اس کے صلے میں ہر مہینے میں دو ایک مرتبہ چچی کے کوسنے پیٹنے اور چچا کی گالیاں سننے کے ذمہ دار ــــــ شادی کو دو سال ہو گئے تھے اور دونوں بھائی چچا کے پانی سے بھی واقف نہ تھے وہ قریب قریب روزانہ چچا کے مہمانوں کو شراب پی کر مستی کے عالم میں بکتا ہوا سنتے اور چچا کی رسوئی سے گوشت بھننے کی خوشبو اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے سونگھتے رہتے مگر ان کے دل میں کبھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ یہ ان ہی کی دولت اڑ رہی ہے۔ ان کی قناعت کے لئے ساٹھ بیگہ زمین اور چھوٹی سی چراگاہ بہت تھی۔ جس معیار سے انھوں نے بچپن کاٹا تھا ان کی شباب اس سے کہیں بلند معیار پر بسر ہو رہا تھا۔

گاؤں سے قریب دو میل کے فاصلے پر پینٹھ لگتی تھی۔ شام کے وقت بھولا سنگھ گھی کی ٹنکی سر پر رکھے لپکتا ہوا آنکلا، سامنے اپنے دروازہ پر ٹھکرائن کھڑی تھیں دو روپیہ ہاتھ میں دیکر بولیں: سوا سیر گوشت اور ایک بوتل دارو کی لیتے آنا، ہر سنگھ اور شیر سنگھ آئے ہیں ــــــ وہ بغیر دارو اور گوشت کے نوالہ نہیں اٹھاتے ہیں۔ بھولا سنگھ روپے لیکر راستہ پر پڑ گیا۔ آج پینٹھ ذرا دیر سے پہنچا تھا۔ اکثر گھی خریدنے والے گھی خرید چکے تھے اور اسکی کل ٹنکی یکمشت نہ بک سکی شام تک دو دو چار چار آنہ فروخت کرتا رہا اور پھر بھی تھوڑا سا باقی رہ گیا جب فارغ ہو کر گوشت کی دکان پر پہنچا تو گوشت بھی قریب قریب ختم ہو چکا تھا کچھ پسلیاں اور پتلا گوشت رہ گیا تھا مجبوراً وہی کٹوا کر رکھ لیا۔ شراب قریب کے موضع میں ایک کوڑی ناجائز طور پر کشید کر کے فروخت کرتا تھا اور اپنے مستقل گاہکوں کو جن پر اسے بھروسہ ہوتا تھا دیتا تھا، چونکہ بھولا سنگھ کئی سال بعد گیا تھا لہٰذا اس نے مخبری کے خوف سے دینے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ جب بھولا سنگھ چچا کے ساتھ رہتا تھا تو سیکڑوں روپیہ کی سالانہ شراب خریدا کرتا تھا مگر اب چونکہ دو تین سال سے نہ خریدی تھی ہو گئے

اُس نے منع کر دیا۔ اس میں کافی دیر ہوگئی اور بھولا سنگھ خوب اندھیرا ہونے گھر پہنچا ــــ چچی پہلے سے گھر میں ایک کہرام مچا رہی تھیں۔ پہلے تو نہایت تند اور سخت الفاظ میں دیر ہونے کا سبب پوچھا، اس کے بعد شراب نہ ملنے پر سینکڑوں سُنا ڈالیں ــــ اور گوشت دیکھکر تو آگ بگولا ہوگئیں ــــ "اب بتلاؤ میں تیرے ان دونوں ہاتوں کو کیا تیرا کلیجہ کھلاؤں اور تیرا خون پلاؤں، یہ آدمی مائی کی ہڈیاں لاکر میرے سر تھوپ دیں ــــ اس میں کوئی بوٹی بھی ڈھنگ کی ہے ــــ بھولا سنگھ بچپن سے ان چیزوں کا عادی تھا ــــ اسکی بیوی جو رسوئی میں بھی جوتی جیسی ساس کا یہ بکھڑا سن پہلے ہی تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق تن کر کھڑی ہوگئی، اور ذرا بڑھکر بولی "آگ میں جلیں وہ ہن کے ــــ نہ یہاں کوئی تمہارے دھن دولت کو بہاتا ہے نہ اپنا کلیجہ کھوانا ہے" ــــ اتنا سنتے ہی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح جھپٹ کر ٹھکرائن اس پر جا پڑی ــــ موہنی غریب اس کو تُند حملے کی تاب نہ لا سکی اور دھڑ سے پیچھے آ رہی ــــ سر چارپائی کے پائے سے لگا اور پھٹ گیا ــــ بھولا سنگھ ایک جانب سہما کھڑا تھا ــــ اُس کی ہمت بیوی کو بچانے کی نہ ہوئی ــــ تارا سنگھ یہ شور سُن کر اندر آیا ــــ بھاوج کے سر سے خون بہتے دیکھکر اُس نے کہا "چلی جاؤ یہاں سے" اور ایک دھکا دیا۔ ٹھکرائن نے دھکے کے جواب میں جس برتن میں گوشت رکھا ہوا تھا وہ اٹھا کر سامنے کھڑے ہوئے بھولا سنگھ کے مونھ پر دے مارا جس سے اسکا ایک ہونٹ پھٹ گیا اور نکسیر پھوٹ گئی ــــ تارا سنگھ نے ٹھکرائن کو دھکے دیکر دروازہ سے باہر کر دیا۔ ٹھکرائن زخمی شیرنی کی طرح گرجتی بجائے زنانے مکان کے سیدھی چوپال میں پہنچی۔ پہنچتے ہی بولی "ٹھاکر! اب ہم تمہارے گھر میں رہ چکے ــــ" کھیری سنگھ نے کہا "کیا ہوا؟" "ہوا ہوایا کچھ نہیں اب ہم سمجھ گئے کہ ہمارا تمہارا نباہ نہ ہوگا ٹھاکر ــــ آج تمہارے بھتیجوں نے ہماری آبرو لے لی اور اپنی رنڈی سے سیکڑوں جوتے لگوائے، اور خود لاٹھیوں سے اپنے گھر میں گھیر کر مارا ہے ــــ اب ہمارے جینے کا کیا کام رہ گیا ہے" جیسے کوئی تو دہ بارود میں آگ لگا دے کھیری سنگھ اپنا ڈھائی سیر والا لٹھ لیکر بام چوپال کی دس بارہ فیٹ بلند فصیل پر سے پھاند پڑا اور سیدھا بھتیجوں کے . . . زینے پر پہنچ کر گرجنے لگا۔ ان بیچاروں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی، گھر کے [illegible] بے چھٹے کواڑ بند کر کے کوٹھریں نیچی کئے چپ چاپ اندر بیٹھے [illegible] اور چچا کی [illegible] چیخ اور الٹی سیدھی سنتے رہے ــــ

بستی کے لوگ جمع ہوگئے اور سب یک طرفہ لڑائی کا بیچ بچاؤ کرنے لگے ــــ ٹھاکر کو پکڑ کر لے گئے اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

ہر روز صبح کے چار بجے سے تارا سنگھ اپنے اور اپنے چچا کے مویشی لیکر چراگاہ جاتا ــــ گزشتہ شب کے قضیے آئے دن کا مشغلہ اور روزانہ کا معمول تھے اور ایسی معمولی باتوں کی وجہ سے چچا بھتیجوں کے تعلقات یا روزمرہ کے معمول میں کوئی فرق نہ آتا تھا ــــ چنانچہ حسب معمول اس صبح کو بھی تارا سنگھ چچا کے مویشی خانہ میں اپنے مویشی کھولنے کے بعد چچا کے مویشی کھولنے لگا۔ چچی کو حسب معمول دودھ والی بھینسوں کی سانی کرتے پایا ــــ دیکھتے ہی بولیں "کیوں بے حرامی میرے یہاں کیوں آیا ــــ خبردار جو میری بھینس کی زنجیر چھوئی ــــ جو آنکھیں نکال لوں گی" ــــ تارا سنگھ یہ سمجھ کر کہ چچی یہ جملے حسب عادت اور از راہ تکلف فرما رہی ہیں۔ ایک مرتبہ پھر بھینس کھولنے کو بڑھا ــــ تو ٹھکرائن سانی کرنے کا ڈنڈا لے کر بڑھیں اور بولیں "حرامی مر سے میری بھینس کو ہاتھ لگایا تو کھوپڑی توڑ دوں گی نکل یہاں سے" یہ دم خم اور ناگن کے سے بل دیکھکر تارا سنگھ چپ چاپ کان دبائے باہر نکل آیا ــــ اور اپنی بھینس لیکر چراگاہ کو روانہ ہوگیا ــــ ٹھکرائن دودھ والی بھینس کی سانی کر چکی اور ذرا دن نکل آیا تو ٹھاکر دوہنیاں لیکر بھینسوں کا دودھ دوہنے آیا تو چیا خستہ بولا "ایں آج یہ گابھن بھینس کیوں نہیں کھلیں" ٹھکرائن بولی "ہاں گابھن بھینس کیوں نہیں کھلیں ــــ میں تو ادھر کی اُدھر کرتی ہی ہوں ــــ اب تم نے دیکھلی تو تم سے کہتی ہوں کہ تمہارا سپوت بھتیجا اپنے گھر سے اپنی بھینس لیکر چرانے کے لئے نکلا میں یہاں سانی کر رہی تھی۔ میں نے دروازے پر آواز سُنی۔ جب ذرا دیر ہوئی تو میں نے خیال کیا آیا نہیں دیکھوں تو کیا بات ہے تو وہ مجھے لٹھ کے بانس تھی کندھے پر رکھے دکھائی دیا ــــ میں نے کہا بیٹا تارو آج ہماری بھینس نہیں کھولیں تو ٹھاکر د (ہنس کر) کتنے لاج بھی معلوم ہوتی ہے، میں پانی پانی ہوگئی۔ جوان مرا بولا ــــ تارو کیا تمہاری ماں کے خصم ہیں یا تمہارے باپ کے نوکر۔ آئی تھی وہاں سے باتیں مارتی ــــ اس پر میں نے کہا "تو پھر ہماری گھاس پر اپنی بھینسیں مت لیجانا ــــ تو اس پر بولا کہ تیرے خصم کی گھاس ہے جس میں ہمت ہو روک لے ــــ ٹھاکر کی عمر اگرچہ ساٹھ ستر سال

کی تھی مگر طاقت پھرتی اور تیزی میں دس آدمیوں کے مقابلے سے بھی نہ ہٹتا اور دو تین بیٹا پچیس سال کے نوجوان کے لئے کافی تھا بغیر اس دودھ دوہے ہوئے لٹھ لیکر بیٹا چراگاہ کی طرف چل دیا ـــــ اور تارا سنگھ کو دیکھتے ہی بولا "کیوں رے حرامی موت تیری بج ہت" اور تارا سنگھ غریب جیتک اس کے کہ اپنے قصور کی تفصیل کا سوال پیش کرے کہ چانٹوں اور جوتوں کی بوچھار ہونے لگی ـــــ اور دو تین لاٹھیوں کے ہاتھ بھی مار دیئے گئے ـــــ اور ہر سوال کا یہی ایک جواب اور ہر ضرب کا یہی ٹیپ کا بند۔

"کیوں رے حرامی موت تیری بج ہت" غرض اس سے پیشتر اور بعد چانٹوں اور جوتوں کی بوچھار ہوتی تھی، تارا سنگھ چچا کی مضبوط اور بزرگ گرفت سے نہ معلوم کسطرح رہا ہو کر بھاگا اور بڑے بھائی کو کل حال سنایا۔ جب بھولا سنگھ وہاں پہونچا تو ٹھاکر کانجی ہوس کے راستہ پر بھینس لئے چیختا چلاتا اور گرجتا برستا جا رہا تھا۔ بھولا سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر کہا "چاچا جی سب گھر بھوکوں مر جائیگا" ٹھاکر نے اس کے بھی دو چپت رسید کئے اور دھکا دیدیا اور وہی جملہ "کیوں رے حرامی موت تیری بج ہت" اس صورت سے ٹھاکر نے ایک میل کا فاصلہ طے کیا اور اس دوران میں بھولا سنگھ پر ستر گھونسے لاتیں اور چپت رسید کئے اور بھینس کانجی ہاؤس میں بند کر دیں ـــــ اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ گاؤں میں اعلان کر دیا کہ کوئی اپنی گھاس پر انکو مویشی نہ چرانے دے، نہ دھوبی ان کے کپڑے دھوئے اور نہ کہار پانی بھرے اور نہ بھنگی صفائی کرے اور حجام حجامت کے لئے ان کے یہاں جائے ـــــ دو دن اس طرح گذر گئے دو دودھ والی بھینسیں گھر میں اور چار بھینسیں کانجی ہاؤس میں تھیں۔ ان کے لئے چارے کا اور ان کے محصول کا سوال دونوں اپنی اپنی جگہ پڑ بیٹھے تھے۔ گھر میں جو دام گھی بیچ کر آتے تھے وہ محض دو بھینسوں کے محصول کی کفالت کرتے تھے۔ دودھ والی بھینسیں بھوکی چلا رہی تھیں اور انکے بچے بھوک سے نڈھال ہو رہے تھے۔ بھینسیں بار بار زنجیر توڑنے کی ناکام کوشش کرتی تھیں اور اپنے مالکوں کی طرف عجیب نگاہوں سے دیکھکر زبان نکال کر آہستہ آہستہ آواز پیدا کرتیں، گویا زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں کہ آخر ہماری کیا خطا ہے کہ ہم کو بھوکا مارا جا رہا ہے۔ غرض اسوقت اس گھر کے کیا آدمی اور کیا جانور سب کے سب فاقے سے تھے۔ دونوں بھائی اپنی مجبوری پر ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو جاتے اور ایک دوسرے کا منہ تکتے ـــــ مشہور بات ہے کہ عورت کو دودھ کی پوت سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ یہ حال دیکھکر موہنی اٹھکر اپنی ایک بھینس کے پاس جاکر کھڑی ہو گئی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی، دیکھو تو کل صبح اس نے پانچ سیر دودھ دیا تھا۔ بھینس اسے قریب اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے دیکھکر آہستہ آہستہ آواز نکالنے لگی۔ موہنی تارا سنگھ سے بے اختیار ہوکر بولی "بھیا مارو قصور ہے تو ہمارا یہ بے منہ کے جانور کیوں بھگتیں تم سب جانوروں کو چاچا جی کے یہاں پہنچا آؤ ـــــ" تارا سنگھ نے ایک ایسی نظر ڈالی کہ جس کا مطلب موہنی فوراً سمجھ گئی اور اپنے ہاتھ سے نقرئی کڑا اتار کر اسکی جانب پھینکا، اور کہا لو اسے بیچکر اور گھی کے دام ڈال کر کانجی ہاؤس کا محصول ادا کردو" کبھی تو مریگا ہی ـــــ بے ایمان گدھ کی تو عمر پا گیا۔ بھاوج کے ان الفاظ اور کڑا اتارنے پر تارا سنگھ کی رگِ حمیت ذرا پھڑکی اور ذرا اچھلی خون میں جھاگ اٹھنے لگے "بھابھی آج اسکے گنڈاسے سے چوپال میں جاکر سوتے میں ٹکڑے کر دوں اور پھر میں اقبال کر لوں، تمہاری توہین سے کٹ جائیگی" تارا سنگھ نے انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں کہا۔ اتنی بڑی بات اور اتنے چھوٹے منہ سے سُن کر بھولا سنگھ اس طرح مرعوب ہو گیا جیسے کسی شہنشاہِ وقت کے قتل کی سازش پر اسکا ادنیٰ خدمتگار غلام ـــــ اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ موہنی بول اٹھی "نہیں بھیا ـــــ تم ایسا خیال مت کرو وہ تو ویسے ہی مریگا آج نہیں تو کل اور بیرن ہمارے بھی سوائے تیرے اور کون ہے بھائی ہے تو تو ہے اور بیٹا ہے تو تو ہے، ایشور تیرے ہاتھ پیر بنائے رکھے ہمیں سب کچھ تجھ سے اور جب یہ مریگا تو دادا کی ساری زمین کے تو تم ہی دونوں بھائی مالک ہونگے"!

"اجی جب ہونگے جب ہونگے! ابھی تو وہ ہمیں مارے ڈالتا ہے" تارا سنگھ نے کہا۔

بھولا سنگھ بولا "توبہ کرو ـــــ وہ کبھی نہیں مر سکتا ـــــ وہ تو ہم دونوں کو مار کر مرے گا ـــــ" اور ہاں خوب یاد آیا مجھے آج تین چار دن ہوئے لالہ جی ملے تھے تو کہتے تھے کہ ٹھاکر اُن سے اپنے خاص آدمی کو میاں کے پاس بھیجا تھا کہ موروثی زمین میں جو چچا کے حصے کی ہے بیگہ اور جسبیر سنگھ کو شریک کاشت تسلیم کرلیں اور دس روپیہ بیگہ خام کے حساب سے نذرانہ لیکر باقاعدہ نام عدالت سرکاری میں اندراج کرا دیں۔ سو لالہ تو یہ کہتے تھے تم کسان بات ...

بولے کہ ٹھکرائن نے میرے پاس ایسی بھونڈی بات کیوں کہلا کر بھیجی کیا مجھے کوئی نیا زمیندار سمجھا جو میں روپیہ لیکر اپنے پرانے پشتینی کاشتکاروں کے ساتھ بے ایمانی کروں ۔۔ مجھے میاں کے سلام کو بھی جانا ہے ۔۔۔"

اب بھینس کا تو سہارا رہ گیا ہے ۔۔۔ نہیں تو یہ ہم کو نہ معلوم کب کا کھا چکا ہوتا ۔۔۔ اب میں سمجھا ٹھکرائن اس مرتبہ اسی لئے ترود رہی ہے ۔۔۔ ادہو میں بھی کہتا تھا کہ یہ تعذ کیا ہے کہ اس مرتبہ ٹھکرائن کو زیادہ غصہ سوار ہے ۔۔۔۔ میاں کی بات پر چل گئی ہے۔

مو ہنی نے کہا ایک ترکیب تم کو اور بھی بتاتی ہوں، ہمارے پتا کے گاؤں میں ایک سادھو رہتا ہے وہ آدمی کی مت بھی کاٹ دیتا ہے اور بھوت بھی چھٹا دیتا ہے۔ اس سے ملکر سب حال کہنا، اگر تم نے اسکو راضی کر لیا تو یہ ٹھاکر سب ٹھکرائت بھول جائیگا ۔۔۔ " اچھا اب تم تیاری کرو۔ اور جلدی بھینس چھڑا لاؤ۔ سنار کے ہاتھ کڑا بیچ ڈالو۔

نادا سنگھ کڑا لیکر چل دیا اور شام کے قریب دونوں بھائی اپنے مولیشی لیکر بستی سے روانہ ہوگئے۔

—— ۰ (۲) ۰ ——

ٹھکرائن کے نادری حکم کے مطابق کہری سنگھ نے بھتیجوں کو چراگاہ سے تو ضرور بیدخل کر دیا مگر اسکی پریشانیوں میں بہت اضافہ اور کام میں خاصی ابتری پیدا ہوگئی، وہ لاکھ طاقتور اور اچھے قویٰ والا بوڑھا سہی مگر تاہم بوڑھا تھا اب اُسے محسوس ہوا کہ یہ مفت کے ملازم کتنا ہاتھ بٹاتے تھے، اُس نے خیال بھی کیا کہ کام پھر بھتیجوں کے سپرد کر دوں مگر ٹھکرائن کی ناراضی کے آثار اس مرتبہ کچھ غیر معمولی شدید تھے لہذا اس پر عمل کرنا تو درکنار اس کے اظہار کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ گاؤں میں عام مزدوری کی شرح دو آنہ یومیہ اور دو روٹی تھی، حالانکہ کہری سنگھ ۱/ روپیہ دیتا تھا اور دونوں روٹیوں سے مستثنیٰ تھا مگر پھر بھی ساڑھے تین آنہ یومیہ کے دو مزدور ٹرہانا پڑے اور اپنا یہ پروگرام بنانا پڑا کہ رات کے تین بجے سے اٹھتا اور صبح ۸ بجے تک اپنے نصف مولیشی چراگاہ سے چرا کر واپس لے آتا۔ اور بقیہ نصف اسکے بعد لیجاتا اور بارہ بجے دن تک ان کا پیٹ بھرتا۔ اس صورت میں کھانا بھی وقت بے وقت ملتا اور بارہ بجے کے بعد وہ اسقدر خستہ ہو جاتا کہ ساڑھے تین آنہ یومیہ والے مزدور مشکل سے دس پیسے کا کام کر کے دیتے اور ٹھاکر خود کوئی کام کرنا تو درکنار ان کی دیکھ بھال بھی صحیح طریقے سے نہ کر سکتا تھا۔ بھتیجوں کو نکالے ہوئے آٹھواں دن تھا۔ کہری سنگھ صبح ۸ بجے اپنی بھینس لیکر چراگاہ پہنچا اور اپنی لاٹھی میں اٹکی ہوئی پگڑی پیپل کے نیچے ڈال کر بیٹھ گیا ابھی اُسے بیٹھے ہوئے بمشکل پانچ منٹ ہوئے ہونگے کہ اُسے طبلہ بجانے کی آواز سنائی دی۔ اُس نے پہلے تو چونک کر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر یہ اندازہ کر کے کہ آواز اوپر سے آرہی ہے، اُس نے جو اوپر مونھ اٹھا کر دیکھا تو اُس کی رگوں میں خون کی گردش رک سی گئی اور دفور خوف سے غیر اختیاری طور پر اسکی آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں۔ کچھ زیادہ اونچی نہیں اس کے سر سے ایک یا ڈیڑھ بالشت کے فاصلہ پر بھیانک اندھیری پیپل کی شاخوں کے درمیان میں ایک کالی ڈراؤنی مخلوق دیکھی جس کے سیاہ چوکھونٹے چہرے کے گرد روشنی کا ایک حلقہ تھا اور تقریباً ڈھائی ڈھائی تین تین انچ لمبے اور موٹے موٹے ٹیڑھے بھینڑے دانت اور کھڑی چڑی ہوئی آنکھیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اور پیپل کے چوڑے چوڑے پتوں کی پھٹ پھٹ میں سے برابر طبلے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ اُس نے سامنے میدان پر نظر کی تو معلوم ہوا کہ اوپر سے انگاروں کی بارش ہو رہی ہے اور سیاہ سیاہ گھاس پر جگہ جگہ سُرخ انگارے پھیلے پڑے ہیں۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے جسم کی تمام طاقت سلب ہو گئی ہے اور اُسے پیڑھی پر کسی نے کس کر باندھ دیا ہے۔ اس کے تمام جسم پر رعشے کی کیفیت طاری تھی تاہم وہ نہایت ہمت اور طاقت صرف کر کے اُٹھنے میں کامیاب ہوا۔ اور بمشکل کانپتی ہوئی ٹانگوں سے چند قدم راستے کی جانب بڑھا ہے۔ اُسے متواتر طبلہ بجانے کی آواز ایسی معلوم ہو رہی تھی کہ جیسے تیز و تند موسم میں ٹیلیفون کی آواز ۔۔۔ اُس نے غور کیا کہ اُس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے ہیں۔ اُس کے جسم کی رعشے کی حالت نے تشنجی کیفیت اختیار کر لی تھی اور اسکا وہی عالم تھا جو مار گزیدہ کو ہر تبدیلی کا احساس ہوتا ہے اور وہ ان سب تبدیلیوں کو رفتہ رفتہ بھوت کی مضبوط گرفت کی جانب منسوب کر رہا تھا۔ خدا خدا کر کے اُس نے راستہ لیا راستہ پر دو رویہ جھاڑیوں اور سرکنڈے کے جھنڈوں کی قطار تھی اور راستہ کے بیچوں بیچ ایک سیاہ پوش انسان کھڑا تھا جسکا قد دس فیٹ سے کم نہ ہوگا اُسے دیکھکر وہ ذرا ٹھٹکا اور ذرا ہمت کر کے کنکھیوں سے پیچھے دیکھا مڑ کر دیکھنے کی کس میں

ہمت تھی سائیں سنے غور کیا کہ پیچھے ذرا داہنی جانب کو راستے سے علیحدہ اُس سے بیس پچیس گز کے فاصلے پر ایک آگ کا ہالہ نظر آرہا ہے جو برابر چار پانچ فٹ کے قطر میں متحرک ہے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن، اگر پیچھے بھاگتا ہے تو آگ والا بھوت کھائے جاتا ہے اور آگے قدم بڑھاتا ہے تو کالا لمبا بھوت چٹ کئے لیتا ہے مگر جلدی ہی سامنے والا بھوت یکایک غائب ہوگیا تو اُس نے ہمت کرکے چند قدم آگے کی جانب بڑھائے اور پھر جو نظر کی تو متحرک آتشی حلقہ اسے سامنے والے جھنڈ والے میں نظر پڑا اور بائیں جانب راستے سے علیحدہ لمبا سیاہ بھوت اس مرتبہ کچھ اور زیادہ طویل ہوکر دکھائی دیا، اور گھوڑے کی ٹاپوں کی اور بگل بجانے کی آواز سنائی دی۔ وہ عالم بیخودی میں لڑکھڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ یکایک اُسے آتشی حلقہ اپنے بہت ہی قریب نظر پڑا اور سپیدۂ صبح کی روشنی میں بیل والی مخلوق کی شکل کا کچھ عکس بھی۔ اور وہی عجیب الخلقت مخلوق حلقے کو جیسے حرکت دے رہی تھی۔ اور دوسری جانب سرکرے کے جھنڈ میں سیاہ لمبا بھوت اس مرتبہ صرف آٹھ فٹ کے قد میں کھڑا تھا اور بگل کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی ۔۔ جسوقت وہ لمبا سیاہ بھوت غائب ہوتا تو گھوڑا دوڑانے کی آواز سنائی دیتی تھی، ٹھاکر کیہری سنگھ ضرور بوڑھا تھا اور جوانی میں جب اس پر گوشت رہا ہوگا تو نہ معلوم کیا دکھائی دیتا ہوگا۔ اب بھی چوڑی چکلی ہڈیوں اور چیتٹ دار کھال کا ایک پہاڑ سا معلوم ہوتا تھا اور بس بڑھاپے کی حالت میں بھی دس بیس موقع دن اور رات میں فوجداری کے اور چوروں سے لڑنے کے ایسے پڑ چکے تھے کہ تنہا بوڑھے ٹھاکر نے آٹھ آٹھ دس دس جوانوں کو ایک ہی لکڑی سے مار بھگایا۔ جسوقت شام کے قریب مزدوروں کو جلدی جلدی کام کرنے کی ہدایت میں للکارتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ شیر گونج رہا ہے۔ اپنے اسقدر قریب دو بھوتوں کو دیکھکر اُس نے اپنے اوسان صحیح رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے حلق اور زبان پر پوری طاقت صرف کرکے اپنے خشک گلے سے تھرتھراتی ہوئی آواز نکالی "کون" لمبے سیاہ بھوت نے جواب دیا "بھوت" ۔۔۔ ٹھاکر نے پھر کہا "کیا چاہتا ہے" آگ کے حلقے والا بھوت اپنی بھیانک آواز میں بولا "تیرا کلیجہ" ۔۔۔ اُس نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے لاٹھی اوپر اُٹھائی اور لمبے سیاہ بھوت پر چلائی جو اُسے نسبتاً قریب معلوم ہو رہا تھا۔ مگر وہ بجائے بھوت کے ایک اونچے سرکرے کے جھنڈ پر پڑی اور ساتھ ہی تمام جنگل میں اتنی زبردست روشنی ہوئی کہ ایک آن کی آن میں ہر طرف دن سا پھیل گیا اور اُسے جھاڑیاں اور جھنڈوں کے سائے دور تک میدانوں میں لمبے لمبے ہوکر نظر آنے لگے اور پھر ایک دم اندھیرا اور ایسا اندھیرا ہوا کہ راستہ نظر آنا مشکل ہوگیا اور پھر بڑے زور سے بگل اور ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔

— (۳) —

صبح صادق کا وقت تھا جگہ جگہ چڑیوں نے اپنے بسیرے کے مقام سے پرواز کرنا شروع کر دی تھی۔ کوّے شور مچا رہے تھے اور کوئی کوئی تارا آسمان پر دکھائی دے رہا تھا۔ ٹھکرائن اپنے مویشی خانے میں حسب معمول دودھ والی بھینسوں کی سانی کر رہی تھی کہ مویشی خانہ کا دروازہ کھٹ کھٹانے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی ایک دھماکا اور کراہنے کی آواز۔ ٹھکرائن کھلی کا گھڑا رکھکر دوڑتی ہوئی دروازے پر پہنچی اور دروازہ کھول کر دیکھا تو سیڑھیوں پر آدھا اوپر آدھا نیچے ٹھاکر بیہوش سا پڑا تھا اور سخت تعفن آرہی تھی ۔۔۔ بڑی مشکل سے ایک مزدور کی مدد سے اٹھاکر "پابدستے دیگرے دست بدست دگرے" زنانے مکان میں لے گئی۔ غلیظ دھوتی علیحدہ کی جسم اُلٹا سیدھا دھویا اور کپڑے تبدیل کراکر لٹا دیا۔ اور بڑی ہمدردی کے ساتھ سرہانے پیڑھی ڈال کر پنکھا جھلنے بیٹھ گئی اور ایک ہاتھ سے پسینہ آلود پیشانی اور سر کو دبانے لگی ۔۔۔ اور بار بار آہستہ آہستہ "ٹھاکرو، ٹھاکرو" کہکر چونکانے کی کوشش کرنے لگی۔ جب ٹھاکر کو ذرا ہوش آیا تو بڑے زور سے بھیانک آواز میں "بھوت! بھوت!" کہکر چلایا۔ بھوت کا نام سنتے ہی، بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ٹھکرائن اچھل کر کھڑی ہوگئی اور "بھوت! بھوت!" کہکر اُسکی چارپائی کے قریب سے بھاگ کر مکان کے دوسرے حصے میں جا کھڑی ہوئی۔ اسوقت اُسکی بوٹی بوٹی خوف سے کانپ رہی تھی اور وہ دُور سے کھڑی کھڑی پھٹی ہوئی خوف زدہ آنکھوں سے ٹھاکر کی چارپائی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ٹھاکر جسبیر سنگھ اور ٹھاکر بیر سنگھ نے جو یہ رنگ دیکھا تو یہ خیال کرکے کہ آدمی ہو تو اس سے مقابلہ کرے، بھوت سے لڑنے کون جائے چپکے سے بغیر ٹھکرائن کو مطلع کئے فرار ہوگئے اور اپنے گھر تک خوف کے مارے تمام راستہ مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے کہ کہیں بھوت ٹھاکر کو چھوڑ کر ہمارے پیچھے تو نہیں لگ گیا ہے۔ دوپہر ہوتے ہوتے ٹھاکر کو اتنے نعدکا

بخار چڑھ آیا کہ ہذیاں تک پہنچنے لگیں اور ہذیان میں وہی بھوت بھوت کہکر بار بار چیختا تھا اور بھوت کا حلیہ بیان کرتا تھا۔

دو پہر ڈھلے پور لیک، ہفتہ بھر بعد تارا سنگھ اور بھولا سنگھ واپس ہوئے آتے ہی موہنی نے کہا "دیکھو تم تو اتنے ہی نہیں تھے۔ سادھو کے بھوتوں نے آج صبح تڑکے ٹھاکر کو پکڑ لیا" دونوں بھائیوں نے اس پر بےساختہ قہقہہ مارا۔ موہنی کچھ متعجب سی ہوئی اور اس بےمحل قہقہہ کا مفہوم نہ سمجھ سکی، مثل مشہور ہے کہ کھوٹا پیسہ اور بُرا بیٹا وقت پڑے کام آتا ہے۔ دونوں بھائی بغیر ہاتھ مونھ دھوئے اور کھانا کھائے چچا کی عیادت کو جا دھمکے اور چاچا جی کہہ کر زور زور سے آوازیں دیں۔ انھیں دیکھکر ٹھکرائن کی ڈھارس بندھی۔ دونوں بھائی بےتکلفی سے چچا کی چارپائی کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ ٹھکرائن بھی ہمت کرکے چارپائی سے چار پانچ گز کے فاصلے پر آکر باہر کے حصہ میں کھڑی ہو گئیں، اور بولیں "بیٹا تارو تمہارے چاچا جی کو بھوت نے پکڑ لیا ہے ——— اب درست کرو ——— سیانوں اور ملاؤں کو بلا کر لاؤ ——— اور بیٹا بھولا تم چاچا جی کی پٹی سے رہو ———"

"ارے وہ ہواں پکڑا ہوگا ——— پیپل والے بنجر پر ——— مجھے تو بہت دنوں سے معلوم ہے ——— وہاں تو تین بھوت ہیں" بلکہ دو بھوت اور ایک چڑیل کہو ——— میں تو بیس مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ ایک بھوت تو دس بارہ گز لمبا ہوگا ——— اجی وہ تو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے ——— اور چڑیل تو مونھ سے آگ نکالتی رہتی ہے۔

مونھ سے کیا وہ تو ہر وقت آگ ہی سے جو کھیلتی ہے ——— وہ بنی ہی آگ سے ہے ——— ہر وقت آگ کھاتی رہتی ہے۔ اجی وہ ایک بھوت تو پیپل سے اترتا ہی نہیں ہے وہ تو وہیں بیٹھا طبلہ بجاتا رہتا ہے اور ان دونوں سے کام لیتا ہے۔ ہاں ——— وہ پیپل والا اسکے تو بالشت بالشت بھر کے دانت ہیں اور اس کی آنکھوں سے ہر وقت بڑی تیز روشنی نکلتی ہے ——— اسکی کھڑی آنکھیں ہیں ان سے آگ نکلتی ہے ——— میں نے بیس مرتبہ دیکھا ہے مگر میں تو صاف بھاگ بھاگ آیا معلوم ہوتا ہے کہ چاچا جی کو بھاگنا نہیں ملا جب ہی تو پکڑ لیا

ارے وہ بھاگنے ہی نہیں دیتا ہے وہ تو پہلے اکیلا تھا مگر ایک مرتبہ اُس نے ایک سوار کو مار کر کھا لیا، اسکے ساتھ ایک عورت بھی تھی سو وہ عورت تو چڑیل ہوگئی اور سوار بھوت بن گیا۔ بس وہ اب انھیں دونوں سے کام لیتا ہے اور اپنے آپ ٹھاٹھ سے پیپل پر بیٹھا طبلہ بجاتا رہتا ہے۔ اس چڑیل اور بھوت کو ایسا تابع کر لیا ہے کہ جس کو چاہتا ہے چمٹا دیتا ہے۔ میں اس کے ہاتھ کبھی نہیں آیا "گولی تو قدم بندہ یا نو قدم" اور ہاں وہ تو اسکا گھوڑا بھی کھا گیا تھا، سنا ہے کہ وہ جس وقت آدمی کو کھاتا ہے تو ہڈیاں اتنی زور سے چٹختی ہیں کہ کوس کوس بھر آواز جاتی ہے۔ جس وقت ایک بھائی بولتا تھا تو دوسرا چچا کو نیند سے آواز دے کر بیدار کرنے کی کوشش کرتا تھا اور چچا نیم بےہوشی میں بھتیجوں کی گفتگو اور بھوتوں کا حلیہ سُن کر اشاروں اور ٹوٹی پھوٹی زبان سے تائید کرتے۔ اس گفتگو سے بڈھے ٹھاکر کی جو حالت ہوئی سو ہوئی مگر ٹھکرائن کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی اور شام کو تو یہ کیفیت ہوئی کہ ٹھکرائن کا گھر کا ہر کواڑ لمبے دانتوں والا بھوت اور ہر کوٹھا آگ کی چڑیل معلوم ہونے لگا اور جب ذرا اندھیرا ہوا تو اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام گھر میں بھوتوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں دوڑ رہی ہیں۔

ٹھکرائن کے اصرار پر تارا سنگھ سیانوں اور ملاؤں کے پاس پہنچا ان میں سے ہر ایک نے اسکا خیر مقدم اور پیشین گوئیاں کیں جیسے گویا کُل کچا چٹھا پہلے سے معلوم تھا اور بھوت گویا خاص اُن کی اجازت سے گئے تھے اور شام ہوتے ہوتے ٹھاکر کی حویلی ملاؤں اور سیانوں سے بھر گئی۔ سادات نگر کی مسجد کے پیش امام غیبو آپیر کی زیارت کے سجادہ نشین مع اپنے تمام مریدوں کے کنا شہید کے مزار کے پیر جی، بھگنیاں والے بھگت اپنے چیلوں سمیت اور گنڈیوٹ کے پیلنے اپنے پورے آشرم کے ساتھ آموجود ہوئے۔ سیانوں اور بھگتوں نے تمام گھر میں سیکڑوں گھی کے چراغ جلا دیئے۔ زمین اور طاقوں پر، اور جگہ جگہ گھر میں چراغ اس طرح چُنے کہ ان سے مختلف گول تکونی شکلیں قائم ہو گئیں۔ مُلا جی نے "برد، برد" کہکر فارسی میں بھوت کو نکالنا شروع کیا، ادھر سیانوں اور بھگتوں نے بھی اپنے اپنے منتر جنتر پڑھ پڑھ کر پھلتے بلار کرنا شروع کئے غیبو آپیر کی زیارت کے سجادہ نشین اور کنا شہید کے مزار کے مجاور دونوں نے متفق ہو کر بھوت کے چڑھنے اترنے کا فلسفہ اس طرح بیان کیا کہ بھوت سر سے چڑھتا ہے اور پیروں سے اترتا ہے چنانچہ چارپائی کی تین پٹیوں کے اردگرد یہ روحانی طبیب

بیٹھے اور پائنتی کا راستہ بھوت کے جانے کے لئے خالی چھوڑ دیا ـــ اور سب باتوں میں یہ ہندو اور مسلمان بھوت اتارنے والے متفق ہوگئے مگر اختلاف محض اس بات پر ہوگیا کہ ملّا تو یہ کہتے تھے کہ ایک بھوت نے پکڑا ہے اور سیانے اور بھگت لوگ فرماتے تھے کہ پوری چوکی نے پکڑا ہے۔ غرض جب دونوں فریقوں نے اپنا سامان تیار کرلیا تو پہلے سب نے اطمینان سے کھانا کھایا گاؤں کے پنڈت جی کے یہاں ٹھکرائن نے سیانوں اور بھگتوں کے کھانے کا اور جولاہوں کے یہاں مسلمان مہمانوں کے کھانے کا پرتکلف سامان کرایا تھا کیونکہ یہ لوگ ہندو کے ہاتھ کا چھوا کھاتے نہیں تھے اور نہ دونوں ہاتھوں سے کنوئیں کا کھینچا ہوا پانی پیتے تھے، چنانچہ ان کے لئے غریب جولاہے ہاتھ پر رسّی لپیٹ لپیٹ بڑی مشکل اور بڑی عقیدت کے ساتھ ایک بالٹی پانی کھینچ کر لائے۔ کھانے سے فراغت ہونے کے بعد سب لوگ اپنے کام میں مشغول ہوئے اور ناک میں فلیتوں کی دھونیاں دینا شروع کیں تمام رات یہی عمل جاری رہا، کچھ لوگ فلیتے تیار کرنے میں مشغول رہے اور کچھ لوگ جلا جلا کر ناک میں دھونیاں دیتے رہے اور ہر دو تین فلیتوں کے بعد کسی نہ کسی نیاز نذر کی ضرورت پیش آتی تھی اور ادھر سیانوں اور بھگتوں کے بھی فلیتے اور منتروں کو کوئی نہ کوئی "برہم" روک دیتا تھا۔ جسکے چڑھاوے کی فوری ضرورت ہوتی تھی۔ لہذا ان چیزوں کا انتظام یہاں تو ہو نہ سکتا تھا۔ اسکی قیمت فوراً ٹھکرائن ادا کرتی تھیں۔ غرض تمام شب یہی عمل جاری رہا۔ صبح تک بیچارے زردہ دماغ پر فلیتوں کے دھوئیں نے زہر کا کام کیا۔ وہ تو پہلے ہی سے بخار کی تیزی سے ماؤف ہو رہا تھا اب مکمل طور پر سرسامی کیفیت طاری ہوگئی اور ٹھاکر بار بار ترنگیں بھرنے لگا اور بری طرح چیخنے لگا۔ جس پر بار بار ملّا جی کہہ اٹھتے "اچھا موذی دیکھوں گا تجھ کو آج تو نہیں یا میں نہیں" ان روحانی طبیبوں کی جماعت نے دو پہر کا مرغن کھانا کھانے کے بعد جب ٹھاکر کی حالت غیر دیکھی تو چلنے کی ٹھہرائی اور پہلے سجادہ نشین اور پیر لوگوں نے متفقہ طور پر کہا کہ بھوت بہت زبردست ہے اور ہم کو اسکی سرکوبی کے لئے شاہ اجّا کو تکلیف دینا پڑے گی۔ ان کی دعوت کا سامان نہایت ضروری ہے لہذا فرمایا کہ سات سفید بکرے جن کے جسم پر ایک بھی دھبا رنگ کا نہ ہو اور اکیس سفید مرغ ایک ہی عمر کے سوا من کچی مٹھائی دس سیر سرخ گائے کا گھی اور پانچ پانچ تولہ عنبر، مشک اور زعفران ان کے ایک وقت کے کھانے کے لئے درکار ہوگا ہر چند کہ یہ لوگ چاہتے تھے کہ ان تمام اشیاء کا انتظام صاحب خانہ خود ہی کردیں مگر ٹھکرائن کی خوشامد اور تارا سنگھ کے بار بار اصرار پر حساب کرکے ان کی قیمت لے لی۔ چلتے وقت پیر جی نے یہ بھی فرمایا کہ اگر شاہ اجّا کو اس بھوت کی سرکوبی کے لئے اپنی فوج بلانا پڑی تو اس فوج کے کھانے کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔ مگر سجادہ نشین صاحب نے فرمایا کہ فوج کی ضرورت پیش نہ آئیگی، شاہ اجّا کی ایک ڈانٹ ہی سے بھاگ جائیگا اور سات فلیتے ناک میں دھونی دینے کے لئے دیکر چلے گئے۔

تیسرے پہر تک سیانے اور بھگت مصروف کار رہے اور منتر پڑھ پڑھ کر ناک اور کانوں میں دھونیاں دیتے رہے۔ تیسرے پہر کے بعد ان لوگوں نے بھی بھوت کی عظمت کو تسلیم کرلیا اور ایک بڑی لمبی چوڑی فہرست ہَون کے لئے سامان کی لکھائی جو گنگا جی کے کنارے پر کیا جائیگا اور اس ہَون کی خوشبو سے ان کے گرد گنگا کی دھارے بر آمد ہونگے تو وہ اس بھوت سے کشتی لڑینگے۔ لہذا اس سب سامان کا حساب ہوا اور قیمت لیکر یہ سب رخصت ہوگئے۔ تمام شب ٹھاکر سخت قسم کے سرسام میں مبتلا رہا اور چارپائی سے اٹھ اٹھ کر بھاگ جاتا تھا اور بھوتوں کا حلیہ اور قصہ بیان کرتا رہا۔ ٹھکرائن ڈر کے مارے قریب نہ آئی مگر دونوں سعادتمند بھتیجے تمام رات تیمارداری کرتے رہے۔ صبح ہوتے ہوتے ٹھاکر کی سانس اکھڑ گئی اور دوپہر تک مرگیا۔ ٹھاکر کے ماتم کرنے والوں میں سب سے زیادہ بلند اور سوزناک آوازیں تارا سنگھ اور بھولا سنگھ کی تھیں۔

ٹھاکر کو مرے ہوئے عرصہ گذر گیا تھا ـــ ٹھکرائن موروثی زمین اور مکان چھوڑ کر جو کچھ نقد اور زیور کی شکل میں اس کے پاس تھا لیکر بھوتوں کے خوف سے میکے جا بسی تھیں اور ہر چیز پر بھولا سنگھ اور تارا سنگھ کا جائز اور قانونی قبضہ تھا، ایک روز چچا کا ذکر کرتے ہوئے بھولا سنگھ بولا ـــ "تارا ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ چاچا جی مر جائیں گے۔ یہ کہتے ہوئے اسکی آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے بیساختہ نکل پڑے ـــ تارا سنگھ نے آنسو ضبط کرکے کہا "تم نے آخر تک پیچھا نہیں چھوڑا وہ تو ایک مرتبہ کنستر بجاکر آگ دکھانے کے بعد بجر کے پاس بھی نہ پھٹکتے ـــ" بھولا سنگھ آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر کہا "واقعی انھیں کچھ بہت زیادہ ڈرا دیا گیا ـــ سادھو نے تو بہت سا

سامان اس کے ساتھ کر دیا تھا کہ ہم لوگوں نے اس سے کہا تھا کہ وہ بہت دلیر اور بھوت آدمی ہیں ممکن ہے کہ ایک آدھ چیز سے نہ ڈریں سوال پر ایک ایک چیز کو کے سب ہی آزمائیں ـــــ" وہ تو آگ اور کنستر کی آواز کے بعد ہی بیٹھیں اور ہمارے حوصلے کم کر دیتے ـــــ" موہنی قریب بیٹھی ان دونوں کی گفتگو سُن رہی تھی ـــــ اچھا تو کہو کہ تم دونوں نے ڈرایا تھا ـــ سب غلط سب جھوٹ، بھلا تمہارے ڈر سے وہ مرجاتے ـــــ اور پھر یہ اتنے بہت سے ملّانے اور بھگت سب نے کیوں بتایا کہ بھوتوں ہی نے پکڑا ہے ـــــ" اس پر دونوں بھائی ہنسنے لگے اور بھولا سنگھ بولا کہ یہ ملّانے اور بھگت جھوٹ بول کر ہی کھاتے ہیں۔ درحقیقت وہ سادھو جسکے بارے میں تم بھوت بتاتی ہو بڑا چالاک اور جرنوں کا بنا ہوا آدمی ہے۔ پہلے تو جس سے معاملہ کرتا ہے اُس سے جو کچھ مل سکتا ہے انٹی میں لگا لیتا ہے پھر سب کچا چٹھا سن کر کچھ ترکیبیں بتاتا ہے اور کچھ چیزیں دیدیتا ہے۔ اس نے موہن پر ملنے کے لئے ایک مسالہ دیا جس سے تمام جسم کے آس پاس ہری ہری روشنی کا گول حلقہ سا بن گیا تھا۔ ایک بجلی کا تار جلانے کو دیا۔ دسہرہ میں جن چیزوں سے روپ بھرا جاتا ہے ویسا ہی ایک چہرہ دیا، باقی اور کوئی خاص چیز نہ تھی اور ترکیبیں ہی ترکیبیں تھیں۔ ایک مٹی کے تیل کا پرانا کنستر، ایک کھوکھلے تنوں کا بگل۔ ایک ہانڈی میں دہکتے انگارے لیکر تارو پیپل پر بیٹھ گیا اور پہلے کنستر بجا کر انگارے پھینکے۔ جب چاچا جی اُٹھ کر بھاگے تو پیچھے پیچھے آگ کی بنٹی گھماتا ہوا چلا اور میں کمبل اوڑھے راستے پر کھڑا تھا اور کبھی کمبل لاٹھی پر اٹھا کر اونچی کر دیتا تھا اور کبھی نیچا کر لیتا تھا ـــــ اور جھنڈوں اور جھاڑیوں میں ہو کر کبھی میں آگے ہو جاتا اور کبھی تارو آگ کی بنٹی گھماتا ہوا سامنے آجاتا۔ میں کبھی تین گز کا ہو جاتا اور کبھی ڈھائی گز کا رہجاتا: باقی جو کچھ کمی رہ گئی تھی وہ سب جب چاچا جی بخار میں پڑے تھے ہم دونوں بھائیوں نے رات کے بھوتوں کا حلیہ بیان کر کے پوری کر دی ـــــ تارا سنگھ نے کہا۔

"تو اس ڈر کے مارے مر گئے؟" موہنی نے طنز سے کہا ـــــ بھولا سنگھ بولا "اس سے نہیں مرے ـــــ مرے ان حرامی مُفت بھگتوں اور ملّاؤں کے فلیتوں سے ـــــ نہ معلوم مرچوں کی اور کس کس چیز کی دھونی ناک میں دے کر ان کا دماغ خراب کر دیا ـــــ انھیں بخار البتہ ڈر کے مارے آگیا تھا اس بخار میں جو دھونیاں دیں اس سے سرسام ہو گیا اور چاچا جی مر گئے۔" یہ کہتے ہوئے بھولا سنگھ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

موہنی نے بھولا سنگھ کے رونے کی پروا نہ کرتے ہوئے قہقہہ مارا اور کہا "میں اس قدر بیوقوف نہیں ہوں، سادھو کے بھوت سیکڑوں مرتبہ کے آزمائے ہوئے ہیں تم دونوں بھائی مجھے عورت ذات سمجھ کر احمق بنا رہے ہو" ـــــ تارا سنگھ اور بھولا سنگھ دونوں ہمیشہ ہر چند قسمیں کھا کھا کر موہنی کو یقین دلانے کی کوشش کرتے مگر وہ ہمیشہ یہی کہتی رہی کہ "تارا کو سادھو کے بھوت کھا گئے ـــــ"

چودھری ابوالفضل صدیقی البدایونی

(بقیہ جرعات صفحہ ۵)

عقدِ صابر

گو یہ اطلاع بہ دیر شائع ہو رہی ہے لیکن ناظرین شاعر کے لئے عموماً اور حلقۂ ادبیہ سیمابیہ کے لئے خصوصاً مسرت افزوں ہوگی کہ ہمارے جواں بخت و جواں سال مہذب مسٹر اے۔ بی **فلیس صابر** بی۔ اے، ایل۔ ٹی۔ سی، بی۔ ای۔ ٹی کی شادی ۱۴ اپریل ۱۹۴۲ء کو مرادآباد میں مس **اینی**۔ اے۔ ایم اسپیک سے ہوگئی۔ ہم صابر صاحب کو ان کی ازدواجی زندگی پر مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کا یہ نیا باب خوشگوار اور فرحت آفریں ہو۔

اعجاز صدیقی

انگارے

یاد آ رہی ہے عہدِ گذشتہ کی داستاں پھر دل میں آرزو کی کھٹکنے لگی ہے پھانس
چھایا ہوا ہے ہر در و دیوار پر سکوت بادِ صبا بھی ڈرتے ہوئے لے رہی ہے سانس

لمحے ماضی کے یاد آ آ کر آرزو کے دیئے جلاتے ہیں
ہوک سی میرے دل میں اٹھتی ہے میرؔ کے شعر یاد آتے ہیں

یہ کالی رات اور یہ ہُو کا عالم دلِ غم آشنا گھبرا رہا ہے
ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی چل رہی ہیں کوئی بھولا ہوا یاد آ رہا ہے

لغزشِ عشق کا افسانہ ہوا جاتا ہوں قسمتِ گردشِ پیمانہ ہوا جاتا ہوں
دل پہ للہ مرے بارشِ اکرام نہ کر! میرے محبوب! میں دیوانہ ہوا جاتا ہوں

نگہِ ناز کے انداز کو پہچان گئی نگہِ یاس بھی اب شوخ ہوئی جاتی ہے
[illegible] کسی روز جگر میں چٹکی ابھی جا جا کے فقط پاؤں کو چھو آتی ہے

خیامؔ ہندی

چاند اور تارے

ظالم ترے تیور کے یہ رنگین اشارے بنکر رہے آخر مری قسمت کے سہارے
ہر سمت سے ہونے لگے جینے کے اشارے پھر بھونے لگی زندگی کسل طرارے
اتنی تو خبر ہے انہیں جیتا ہوں ابھی تک اور یہ نہیں معلوم کہ انکے ہی سہارے
مر جائیں بلا سے ہمیں اتنا تو بتائیں تقدیر کے مارے ہیں کہ تدبیر کے مارے
طوفان کے جھونکوں نے بھی ہر طرح نبھایا دل کھول کے کشتی سے الجھتے رہے دھارے
اب یہ تری مرضی ہے بنائے کہ بگاڑے نظروں پہ چڑھائے کہ مجھے دل سے اتارے
آنکھوں کے نقابوں میں نہاں یوں ہے وہ صورت جس طرح پری کو کوئی شیشے میں اتارے
جذباتِ محبت نے کرشمے یہ دکھائے کہتے ہی بنی آج کہ ہم آپ سے ہارے
امید بھی ہمدرد تھا ارمان بھی ہمدرد لیکن مگر آیا نہ کوئی کام ہمارے
درماں نہ ہوا چارہ گروں سے مرے دل کا اب درد ہی اس پار اتارے تو اتارے
کونین کی وسعت میں دھڑکتا ہوا اک دل وہ چودھویں کا چاند، وہ مدھم سے ستارے
کیا ختم ہوئی روشنی شمعِ شبِ غم کی کیوں آج سرِ شام چمکتے ہیں ستارے

وہ جیں بہ جبیں ہوں تو یہ کہہ دیجئے صابرؔ
اوّل بھی ہمارے ہوا اور آخر بھی ہمارے

صابرؔ اکبرآبادی

موحّدِ اعظم اور مفتیٔ اعظم

مفتی الراندیر و افتاء الکفر بالشعر

از حضرت مولانا مولوی سلیم الدین صاحب جالب مظاہری سہسرامی

(قسط پنجم)

"موحّدِ اعظم" پر علمائے حق اور فضلائے عصر کی مزید تازہ اور گرانقدر رائیں

شاعر کی گذشتہ اشاعتوں میں ہندوستان کے پندرہ جلیل القدر علمائے حق کی آراء پیش کی جاچکی ہیں۔ سب نے حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہ العالی کی نظم کو بے عیب، طنزیہ شاعری کا شاہکار، وحدت پرستی کا آئینہ دار، بے ریا عبادت کا ایک پیغام اور **ابلیسِ لعین** کے کردار اور اس کی لغزش سے مسلمانوں میں صحیح احساس و ذوقِ عبادت پیدا کرنے والا درس موعظت قرار دیا ہے۔ حضرت مولانا جالب مظاہری سہسرامی کے سلسلۂ مضمون سے پہلے پھر چند رائیں شائع کی جارہی ہیں۔ گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے متعدد رائیں روک لی گئی ہیں جو آئندہ اشاعتوں میں پیش کی جائینگی ——— ادارہ

حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب صدر مدرس مدرسۂ حسنیہ لدھیانہ

موحدِ اعظم پر کفر کا فتویٰ عائد نہیں ہوتا، البتہ ایسے الفاظ سے تبرعاً احتراز ضروری ہے جب تک کسی مسلمان کے کلام کا محل صحیح ہوسکتا ہے۔ کفر کا اطلاق نہیں کیا جاتا۔ خود متکلم نے اپنی روداد بیان کردی ہے۔ ایسی صورت میں کفر کا فتویٰ بے محل ہے۔

حضرت مولوی عبد النبیؒ الکمال مولانا مست جمال قادری فاضل رسولپوری

موحدِ اعظم کی وجہ سے حضرت مولانا سیماب مدظلہ کو کافر بنانا مریحاً جہالت ہے۔ غالباً مفتی صاحب کا علم محدود ہے۔ وہ تنگ نظر فتوے فروش مولویوں میں سے ایک مولوی ہونگے۔ انھیں چاہئے کہ بزرگانِ دین کی کتب کا مطالعہ کریں۔ اور اگر وہ بزرگانِ دین کی کتب کا مطالعہ کرچکے ہیں تو انھیں چاہئے کہ روپے دیکھکر جھوٹے فتوے صادر نہ فرمایا کریں مولانا سیماب اُن بزرگوں میں سے ایک بزرگ ہیں جن پر صدی حسن جیسے علما ہزار فتوے کفر کے لگائیں دنیا اُن کو پھر بھی کافر نہ کہے گی فی صدی ۹۹ علما مولانا سیماب کے حق میں ہیں۔

حضرت مولانا مولوی حافظ مظہر الدین صاحب مداسی خطیب جامع مسجد گورداسپور (پنجاب)

مولانا سیماب مدظلہ العالی کی نظم سے شریفانہ اختلاف تو ہوسکتا ہے مگر مولانا پر کفر کا فتویٰ لگانا انتہائی بے دانشی اور ادبی ذوق سے محرومی کی بین دلیل ہے۔ اگر میرے

دل میں خدا کا خوف نہ ہوتا تو میں بھی راندیر کے مفتی پر کفر کا فتویٰ لگا کر اسے کفرسازی کا مزہ چکھا دیتا مگر مولیٰ تعالیٰ ہمیں نفس کی شرارتوں سے محفوظ و مامون رکھے۔ آمین۔

یہ ایک سیدھی سی بات ہے جو راندیر کے مفتی کی عقل میں نہیں آتی کہ اگر اعتباراتِ شعری اور کنایاتِ شاعری پر کفر کا فتویٰ لگانا درست ہے تو ان کفر کے فتووں سے کوئی شاعر بھی نہیں بچ سکتا۔

دیکھئے اسلام کا یہ ایک واضح مسئلہ ہے کہ "کفر کا اقرار کفر ہے" اور حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ ارشاد فرماتے ہیں ؎

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست ہر رگِ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

امیر خسرو اپنے اس شعر میں کفر کا صراحتہً اقرار کر رہے ہیں اور مفتی راندیر کے نزدیک وہ پکے مسلمان اور عارف باللہ صوفی ہیں اور مولانا سیماب اپنے ایمان کے ساتھ متعلق ہونے کے باوجود کافر العیاذ باللہ ؎

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

اور ایسے ہی اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے ؎

از مذہبم چہ پرسی نہ مومن نے کافرم من رسمِ ایں دیار نہ دانم مسافرم

الغرض اس قسم کے دس بیس نہیں ہزاروں اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جنکا تذکرہ محض تطویل کا باعث ہوگا۔

مولانا مدظلہ العالی نے ابلیس کو موحدِ اعظم کہہ دیا تو راندیری صاحب نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ مگر میں راندیری صاحب سے دریافت کرتا ہوں کہ آپ حضرت امام ابو حنیفہ علیہ رحمۃ کو امامِ اعظم کہتے ہیں حالانکہ "امامِ اعظم امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اگر امام ابو حنیفہ کو امامِ اعظم کہنے سے حضور علیہ السلام کی توہین نہیں ہوتی تو ابلیس کو موحدِ اعظم کہنے سے سرکار ابد قرار کی توہین کس طرح ہوگئی۔ فما جوابکم فھو جوابنا

میری دانست میں مولانا مدظلہ نے راندیری صاحب کے جواب میں ایک شعر ہی لکھکر اس کی تمام خرافات کا قلع قمع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے یا جو کہا جا سکتا ہے وہ اس اجمال ہی کی تفصیل ہوگی، وہ شعر یہ ہے ؎

مقامِ عشق مذہب معاد سے ہے ماورا فقیہہ شہر سے کہو حریفِ وارثی نہ ہو

حضرت مولانا مولوی محمود یٰسین صاحب متولی مسجد باغ والی لدھیانہ

مولانا سیماب اکبرآبادی پر کفر کا فتویٰ تو اک فضول سی چیز ہے۔ شیطان موحد ضرور تھا لیکن اُس نے خدا کے امر کو شکستہ کرنے پر اپنے آپ کو چاہِ ضلالت میں ڈال دیا۔

حضرت مولانا طالب حسین صاحب جالندھری

حضرت سیماب اکبرآبادی نے ایک نظم موحدِ اعظم کے عنوان سے تحریر فرمائی ہے جس کا مطالعہ میں نے اچھی طرح کیا ہے جو بظاہر تو ابلیس سے متعلق ہے لیکن درحقیقت توحیدِ خداوندِ دو عالم کا ایک سبق ہے۔

افسوس کہ مفتی صاحب نے نظم کے مفہوم کو نہ سمجھتے ہوئے کفر کا فتویٰ دیکر اپنی جہالت کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔

حضرت مولانا مولوی فتح الدین صاحب منشی عالم منشی فاضل سابق منیجر اخبار پولیس ریویو و سابق ایڈیٹر الاصلاح لاہور

حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی کی نظم موحدِ اعظم کو میں نے بنظرِ تعمق پڑھا۔ حیران ہوں کہ مفتی نے اسکی وجہ سے مولانا سیماب مدظلہ العالی ایسے روشن ضمیر بزرگ اور بلند پایہ شاعر کو کیوں کافر قرار دے دیا۔ علمائے حق کو بدنام کرنے والا۔ علمائے سوء کا سرتاج اپنی ذمہ داریوں سے بے پرواہ۔ اپنے فرائضِ منصبی سے غافل۔ ناحق شناس ملّا اور مفتی از روئے حدیث ملعونا المسلم کافر کا مصداق بن رہا ہے۔ موحدِ اعظم کے بند پر تو یہ کہتا ہوں کہ ؎

کردیئے لاکھوں مسائل ایک مصرع سے عیاں ۔۔۔ کیا سمجھ سکتا ہے راندیری نوا سیماب کی

عارف و مومن ہیں وہ پیغمبر شعر و سخن ۔۔۔ ہے نوائے حق حقیقت میں نوا سیماب کی

(طالب ہمدانی از رسالہ خانقاہ بابت ماہ مئی ۱۹۴۲ء کوٹ عبدالخالق ضلع ہوشیارپور)

الحمد للہ ہندوستان کے اکثر مسلم مشاہیر کی طرح علامہ موصوف تکفیر کا شکار ہو گئے لیکن اس سے ناراض نہ ہونا چاہئے۔ بقول غالب معترض رہیے ؎

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے ۔۔۔ ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے

حضرت مولانا بشیر احمد صاحب بشیر بی۔اے لدھیانہ

حضرت سیماب کی نظم "موحد اعظم" عرصہ پانچ چھ ماہ سے حلقۂ احباب کا مرغوب مشغلہ بنی ہوئی ہے اور اسے ہر صبح و شام زیر بحث لایا جاتا ہے۔ مذکورہ نظم کا ہر شعر میرے احباب کی ٹھوس بحث سے گزر چکا ہے۔ اب میں جرأت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ موصوف کی نظم "موحد اعظم" کا کوئی شعر بھی ایسا نہیں ہے جس پر آپ کو کفر کا فتویٰ دیا جا سکے۔ بلکہ نظم ہذا کا بغور مطالعہ سخن فہم انسان کو دادِ سخن پر مجبور کرتا ہے۔ حضرت سیماب نے اپنی اس نظم میں صرف ایک اور ایک معبود کی پرستش کا راگ ایک عجیب انداز میں الاپا ہے اور ہر ایک شعر میں کسی نہ کسی نفسیاتی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے اشعار صرف وہی شخص لکھ سکتا ہے۔ جسے علوم معقول و منقول سے گہرا تعلق ہو۔

اعتراض کرنے والے اصحاب کا کوئی قصور نہیں صاحب ادراک کے اشاروں کو صاحب ادراک ہی سمجھ سکتا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا ان لوگوں نے اسلام کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ جسے چاہا نکال دیا، جسے چاہا رکھ لیا! کیا یہ وہی روش نہیں ہے۔؟ جو ریفرمیشن REFORMATION سے قبل یورپ کے پادریوں نے پکڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو جنت کا ٹھیکہ دار خیال کرتے تھے بعینہٖ یہ لوگ اپنے آپ کو دوزخ کا ٹھیکہ دار تصور کر رہے ہیں۔ لیکن انہیں یاد رکھنا چاہئے۔ خداوندِ حقیقی ان کی اصلاح کے لئے بھی۔ کوئی مارٹن لوتھر (MORTIN LUTHOR) پیدا کر دیگا۔

حضرت سیماب سے عرض ہے کہ وہ ان نکتہ چینیوں کی چہ گوئیوں کو بالائے طاق رکھ کر قومی و ملی خدمات سرانجام دیتے رہیں ؎

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں ۔۔۔ آواز سگاں کم نکند رزق گدا را

ان احادیث کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے (مفتی جی! کہیں یہاں بھی جرأت بیباکانہ سے کام نہ لیجئے گا۔)

مفتی جی! آپ بطور خاص فجِّ اُدم موسیٰ پر غور فرمائیں۔

اور میں ناظرین پر یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ راندیری نے یہ اعتراض کرکے اپنے منکرِ تقدیر ہونے کا کھلا ثبوت پیش کر دیا ہے اور منکرِ تقدیر کے متعلق قرآن و حدیث کا جو حکم ہے اُسے میں آگے بیان کر چکا ہوں۔ اس روشنی میں معترض کے ایمان کی تحقیق بہت ضروری ہے اور اس کے بعد پھر آپ نے ابوزید سروجی کی طرح وعظ شروع کر دیا ہے۔ "قریب قریب مدینہ" کی پہنچ میں اسی طرح صفحہ کا صفحہ اپنے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ کر ڈالا ہے ؎

بشر سمجھا نہ اب تک مرتبہ دنیا میں ٹھیک اس کا ۔۔۔ کہ ترکِ شرک و بدعت میں نہیں کوئی شریک اس کا

اس شعر پر اعتراض کیا جاتا ہے "کہ مولانا نے (بشر سمجھا نہ اب تک) نظم کیا ہے اگر (بشر اب تک نہ سمجھا) ہوتا تو دنیائے شاعری میں کیا انقلاب ہو جاتا"

جی ہاں انقلاب آ جاتا لیکن آپ جیسے کور مغز کی سمجھ میں آنا ایسا ہی ہے جیسے کفار کے جنت میں داخل ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ کا یہ قول حتی یلج الجمل فی سم الخیاط خیر یہ نے اور سر دھنئے۔ عربی میں جس طرح الیٰ انتہائے غایت کے لئے آتا ہے خواہ وہ انتہا مکانی ہو جیسے خرجت الی السوق خواہ زمانی جیسے اتموا الصیام الی اللیل خیر اپنے حسن ظن کی بنا پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کو عربی قاعدہ معلوم ہوگا۔ کیونکہ یہ ابتدائی قواعد ہیں جسے عربی کا ہر مبتدی طالب علم جانتا ہے لیکن آئیے "اُردو کا قاعدہ" بھی پڑھا دوں، جس میں آپ بالکل اجہل ہیں اور یہی اعتراض کی وجہ ہے۔

تک انتہا کے لئے بہ لحاظ مکان جیسے شہر تک، سر سے پاؤں تک، بہ لحاظ زماں جیسے شام تک، مہینہ بھر یا سال بھر تک، چھ بجے تک وغیرہ اب تو غالباً تک کا محل استعمال سمجھ میں آگیا ہوگا کہ جس طرح تک معنیٰ موخر ہے۔ اسی طرح لفظاً بھی ذکر میں موخر کیا جاتا ہے۔ مزید اطمینان کے لئے امثلۂ مذکورہ پر اچھی طرح غور کر لیجئے اسی اصول کے تحت میں مولانا سیماب نے لفظ تک (بشر سمجھا نہ اب تک) میں لفظاً بھی موخر رکھا ہے۔ رہی آپ کی اصلاح تو وہ جہالت قواعد پر مبنی ہے۔ کاش آپ قواعدِ اردو سے واقف ہوتے تو اس "جرأت بیباکانہ" پر خجالت و شرمندگی نہ اٹھانی پڑتی۔ اور آپ کا یہ اعتراض کہ "لفظ بشر کو جنس اور نکرہ کی صورت میں اتنا عام کر دیا گیا ہے کہ جملہ نوعِ انسانی کو شامل ہو گیا ہے" اس کا جواب میں آگے دے چکا ہوں۔ اس کے بعد بھی جہاں جہاں آپ نے جنس اور نکرہ اور حصر جنسی اور ترکیب حصری لیکر جگالی کی ہے۔ اس کے متعلق میرا وہی ایک جواب ہے۔ میں بار بار آپ ہی کی طرح ایک چیز کا ذکر نہیں کروں گا۔ کیونکہ "شاعر" کے صفحات "مدینہ" کی طرح ارزاں نہیں۔ دوسرے مصرع میں بھی ماقبل واقعہ آدم کی طرف اشارہ ہے۔ اوسکی تفسیر کے لئے **خازن** کی وہ عبارت ملاحظہ فرمایئے جو لکھی جا چکی ہے یعنی ان اللہ خلق الارض والسماء الخ اس کے بعد مفتی جی یوں گوہر افشانی فرماتے ہیں:-

> "چونکہ ناظم کے ذہن میں یہ نظریہ پہلے سے قائم ہے کہ ابلیس نے سجدہ کرنے سے جو انکار کیا وہ تبری عن الشرک پر مبنی تھا اسی نظریہ کے ماتحت پہلے تمام شعر کہے گئے ہیں اور ذاکر صاحب کے جواب میں اس کی تصریح بھی کر دی گئی ہے۔ مولانا سیماب فرماتے ہیں ظاہر ہے کہ شیطان نے خدا کی ذات و صفات میں کسی کو شریک نہیں کیا بلکہ وہ سجدۂ آدم کو شر سمجھا (شرک کی جگہ اسرار العمل نے شر لکھا ہے۔) جو اس کے موحد ہونے کی تنہا دلیل ہے۔"

"اس عالم دین" (جو حتی الرغم قول مدیر "مدینہ" علوم دینیہ سے نابلد ہے) اور مولانا سیماب کی عبارت کے ساتھ **مدارک التنزیل** کی عبارتِ ذیل کو ملایئے اور دیکھئے کہ کس کی عبارت تفسیر سے ملتی ہے۔

والجمہور علی ان المامور بہ وضع الوجہ علی الارض وکان السجود تحیۃ لآدم فی الصحیح اذ لو کان للہ تعالیٰ لما امتنع عنہ ابلیس۔

ترجمہ:۔ "اور جمہور کا قول یہ ہے کہ جس سجدہ کا فرشتوں کو حکم دیا گیا تھا وہ صرف خم ہونا نہیں تھا۔ بلکہ پیشانی زمین پر ٹیک دینا تھا اور اس سجدے سے مقصد آدم کا احترام تھا اس لئے کہ اگر یہ سجدہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتا تو ابلیس اس سجدہ سے انکار نہ کرتا۔"

یہ قول جمہور علمائے دین کا ہے اور یہی قول مولانا سیماب مدظلہ العالی کا بھی ہے۔ لیکن مفتی جی مولانا سیماب کی اسی عبارت کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اگر یہی اعتقاد مولانا کا ہے تو قرآن و حدیث اور اسلامی اصول کی روشنی میں بقائے ایمان کے متعلق تحقیق کرنی چاہئے" مفتی جی! میری گذارش ہے کہ مولانا سیماب کے ایمان کی بقا جمہور علما کے ایمان کی بقا کے ساتھ ہے اب آپ خود اپنے ایمان کی بقا کی خیر منایئے۔ دیکھا! مولانا سیماب کی تکفیر کے خبط میں کس طرح ؏

یہ مفتی خرافات میں کھو گیا

بہت خوب! ؏

کوئی تو سرخیِ افسانہ یادگار رہے

شیطان کی مذمت میں جو آیتیں پیش کی گئی ہیں وہ غلط نقل کی گئی ہیں ناظرین اس "عالم دین" کے آیاتِ قرآنی پر عبور کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں، ہر آیت کو بالترتیب پیش کئے دیتا ہوں ابیٰ واستکبر وکان من الکافرین یہ آیت سورہ بقر کی ہے حوالہ میں بقورہ لکھا گیا ہے۔ قال ابلیس مالک الا تکون مع الساجدین قال لم اکن لاسجد لبشر خلقتہ من صلصال من حماء مسنون (الحجر) قال یا ابلیس ما منعک ان تسجد لما خلقت بیدی استکبرت ام کنت من العالین قال انا خیر منہ خلقتنی من نار و خلقتہ من طین (ص) قال ما منعک الا تسجد اذ امرتک قال انا خیر منہ خلقتنی من نار و خلقتہ من طین (الاعراف)

ف[1] یہ آیت سورہ الحجر کی ہے مفتی علام نے خلقتہ کی جگہ خلقۃ لکھا ہے
ف[2] یہ آیت سورہ ص کی ہے اس میں بھی خلقتہ کی جگہ خلقۃ تنوین کے ساتھ ہے۔ ("مدینہ" ۵ اکتوبر ۱۹۴۳ء قسط دوم)

مدینہ کی تیسری قسط سے پہلے مجھے یقین تھا کہ یہ کاتب کی غلطی ہے لیکن تیسری قسط میں جب اُن کی تصحیح نہیں کی گئی تو یہ یقین کرنا ہی پڑا کہ یہ کاتب صاحب کے عمل بالید کا کرشمہ نہیں بلکہ "مدینہ" کے عالم دین کی "جرارت بیباکانہ" ہی کی کارفرمائی ہے۔ اللہ اللہ! اس جرارت ملعونہ کا کچھ ٹھکانہ ہے کہ کلام اللہ میں بھی تحریف سے جھجک محسوس نہیں ہوئی العیاذ باللہ

اگر اس کا احساس ہوتا تو اس کے بعد چھ قسطیں شائع ہوئی تھیں، کسی میں تصحیح کردی جاتی، آئیے! اس سے بھی زیادہ "جرارت بیباکانہ" کی حیرت انگیز کارفرمائی ملاحظہ فرمائیے قال یا ابلیس ما منعک ان لا تسجد لما خلقت بیدی استکبرت ام کنت من العالین قال انا خیر منه خلقتنی من نار وخلقةٍ من طین۔ یہ آیت سورہ ص کی ہے اس میں خلقته کی جگہ خلقة لکھا گیا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ تنوین کا بھی اضافہ کردیا گیا ہے۔ غالباً تنوین کے اضافہ سے قرآن مجید میں فصاحت و بلاغت کی زیادتی مقصود ہوگی۔ یہ سلسلہ اصلاح یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ قرآن مجید میں ان تسجد ہے لیکن ادارۂ مدینہ کے سند یافتہ نے ان کے بعد لا کے اضافہ سے اصلاح فرمائی ہے مفتی جی! یہ تو کلام خدا ہے جو سہو و خطا سے پاک ہے۔ بندۂ خدا! یہاں تو "جرارت بیباکانہ" سے کام نہ لیا ہوتا۔ کلام شاعر میں آپ نے اپنی اصلاح کے جتنے کمالات دکھائے ہیں وہی بہت کافی تھے۔ لعنت اس "جرارت بیباکانہ" پر جس سے خدا کا کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ اس اصلاح میں مفتی جی کی حالت بالکل اس جلد ساز جیسی ہے جو اپنے فن جلد سازی میں جواب نہیں رکھتا تھا (جس طرح راندیری کافر گری میں) لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی خبط تھا کہ جب کوئی کتاب جلد بندی کے لئے آتی تو اس میں خواہ مخواہ کچھ نہ کچھ اصلاح ضرور کردیتا (جس طرح راندیری نے نظم موجد اعظم میں جا بجا اصلاح دے کر اپنی سخن فہمی کا ثبوت پیش کیا ہے) ایک مرتبہ ایک بزرگ قرآن مجید جلد بندی کے لئے اس کے پاس لائے چونکہ اس کی اس عادت سے خاص و عام واقف تھے اس لئے تاکید کردی کہ کبھی یہ کلام اللہ ہے اس پر رحم کرنا۔ جلد ساز صاحب کو خبط اصلاح کے ماتحت ہر کتاب کا مطالعہ ضروری تھا، قرآن مجید کا بھی مطالعہ کیا جس میں تین جگہیں آپ کو ایسی معلوم ہوئیں جن کی وجہ سے قاری کے کفر کا اندیشہ تھا لہذا اپنی فطری استادی سے کام لیتے ہوئے اصلاح کرکے جلد باندھ دی۔ جب بزرگ صاحب تشریف لائے تو قرآن مجید حوالہ کردیا۔ بزرگ صاحب نے اپنا اندیشہ دفع کرنے کے لئے پوچھا کہ کہیں کہیں اصلاح تو نہیں کی ہے؟ جلد ساز صاحب نے نہایت متانت سے فرمایا کہ صرف ان تین جگہوں پر جہاں کفر کا اندیشہ تھا مجبوراً اصلاح کرنی پڑی۔ بزرگ صاحب نے چونک کر پوچھا وہ کون کون سی جگہیں ہیں؟ جواب دیا جاتا ہے

(۱) وخر موسیٰ صعقا اس آیت میں اللہ میاں سے بڑی غلطی ہوگئی (العیاذ باللہ) خر تو عیسیٰؑ کے پاس تھا اس لئے میں نے موسیٰ کو قلم زد کرکے عیسیٰؑ بنا دیا ہے۔ بزرگ صاحب نے فرمایا اور دوسری۔ جلد ساز صاحب فرماتے ہیں۔ وعصیٰ آدم ربه فغویٰ اس آیت میں بھی اللہ میاں سے پہلے ہی جیسی غلطی ہوگئی (العیاذ باللہ) عصیٰ تو موسیٰؑ کا تھا اس لئے میں نے اسے قلم زد کرکے موسیٰ بنا دیا اور تیسری جگہ تو حضور کچھ نہ پوچھئے غضب ہوگیا ہے! قرآن مجید جو اللہ کا کلام ہے اور اس کی تلاوت کرنے والوں کو ہر لفظ پر نہیں بلکہ ہر حرف پر ثواب ملتا ہے۔ ایسی متبرک کتاب میں شیطان اور کفار کے نام ہوں پھر ان کے ناموں پر ثواب کا وعدہ!! اس لئے میں نے ایسے تمام ناموں کو قلم زد کرکے اپنے اور اپنے والد بزرگوار کے نام لکھ دیئے ہیں تیسری غلطی پر تو کسی طرح بزرگ صاحب سے ضبط نہ ہو سکا اور بری طرح برسنا شروع کردیا۔ جلد ساز صاحب نے نہایت انکسار اور عاجزانہ انداز سے فرمایا کہ شاید آپ اس لئے برافروختہ ہیں کہ میں نے اپنا اور اپنے والد کا نام لکھ دیا ہے۔ لائیے! آپ اور آپ کے والد کے بھی نام درج کردوں۔

بس یہی حال ہمارے راندیری صاحب کی اصلاح کا ہے کہ آپ نے ان تسجد کو الا تسجد اور خلقته کو خلقةً اور وہ بھی ایک ہی جگہ نہیں بلکہ تین جگہ ہی لکھا ہے۔ آپ کا سلسلہ اصلاح بھی براہ راست جلد ساز سے مل جاتا ہے ممکن ہے کہ آپ کو بھی جلد سازی کی طرح کوئی نکتہ نظر آیا ہو۔ ادارۂ "مدینہ" ہی اس پر پوری طرح روشنی ڈال سکتا ہے۔

یہ ہے "عالم دین" اور "مفتی علام" جسے آیات قرآنی پر پورا پورا عبور ہے۔ میں یہ باتیں عرض کرنے کے بعد یہی کہوں گا کہ ممکن ہے اور تمام غلطیاں کاتب ہی کی ہوں لیکن ان تسجد کو لا تسجد لکھنے کی غلطی اُن کے علم کی وادی کو کسی طرح تھا نہیں سکتی اور کسی صورت سے طویلہ کی بلا بندر کے سر نہیں تھوپی جاسکتی۔

یہ طرۂ امتیاز تو ان ہی کی دستارِ فضیلت پر زیب دیتا ہے۔ بہرحال مفتی جی اس پر پشیمان نہیں ہوتے اور مولانا سیماب کی نظم میں بجائے ہما کے کاتب نے ہما لکھدیا ہے جو عربی کتابت میں بالکل مشابہ ہیں اس پر ان کی طرف سے برابر گندگی اچھالی جارہی ہے۔ اس کے بعد مفتی صاحب فرماتے ہیں:۔

"گو شیطان نے کھلے لفظوں میں خدا کے ساتھ برابری کا دعویٰ نہیں کیا لیکن استکبار و تکبر کے ساتھ خدا کے حکم سجدہ سے انکار کردینا شرکت مساوات کو مستلزم ہے" مفتی جی! اس تاویل فاسد کا کچھ ٹھکانہ ہے کہ آپ زبردستی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ابلیس نے اپنے کو خدا کے مساوی سمجھا! ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

حالانکہ اس نے مردود و مطرود ہونے کے بعد بھی یہ التجا کی قال رب فانظرنی الی یوم یبعثون الایۃ کہا اے میرے پروردگار تو مجھ کو قیامت تک کی مہلت دے۔ ابلیس کا "رب" کہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے مساوی نہیں سمجھتا۔ مفتی جی! کیا عبد و معبود میں بھی مساوات ہوتی ہے؟ آپ کی منطق ہی الٹی ہے! آپ بالاستلزام مساوات ثابت کررہے ہیں اور قرآن مجید میں خود اس کے قول سے صراحتاً عبدیت اور معبودیت کا اظہار ہے جو عدم مساوات کو مستلزم ہے۔

چہل سال عمرِ عزیز ت گذشت
مزاجِ تو از حالِ طفلی نگشت

قال فبعزتک لاغوینھم اجمعین کہا قسم ہے تیری عزت کی کہ میں اولادِ آدم کو ضرور گمراہ کرونگا۔ مفتی جی! اس کی اس قسم سے بھی صاف ظاہر ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے مساوی نہیں سمجھا۔ سورہ انفال کی آیت ہے انی اری مالا ترون انی اخاف اللہ واللہ شدید العقاب" اور کہا کہ مجھ کو تم سے کچھ سروکار نہیں میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں، اور اللہ کی مار تو بڑی سخت ہے!"

اگر وہ خود کو اللہ کے مساوی سمجھتا تو یہ نہ کہتا ان آیات کے بعد ابلیس کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے اپنے آپ کو اللہ کے مساوی سمجھا۔ آپ سیماب پر اعتراض کررہے ہیں۔ یا کلام اللہ پر۔ رہا آپ کا یہ کہنا کہ خود بدولت کی ہمسری کے قائل ہیں،

اور اس کے ثبوت میں نظم موعظۂ عظیم کا پندرھواں اور سولھواں شعر نقل کیا ہے۔ ان کا جواب میں وہاں دونگا جہاں آپ نے ان اشعار پر مفصل بحث کی ہے۔

وہ صرف اللہ کو ارض و سما میں پوجنے والا
علی الرغم ملائک جس نے حکم سجدہ کو ٹالا

اس شعر پر راندیری کا اعتراض یہ ہے کہ :۔"خط کشیدہ عربی فقرہ ہے عربی ترکیب سے نظم ہوا ہے۔ بصورت منظومہ عربی اصول نحو کے لحاظ سے غلط ہے الرغم ملائک مضاف مضاف الیہ ہے۔ اضافتِ حقیقیہ کی صورت میں عربی زبان میں مضاف پر الف لام داخل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا یہ ترکیب غلط ہے"

راندیری صاحب! آپ نے یہ ترکیب سمجھی ہی نہیں اور اپنی عادت کے مطابق اعتراض کرکے اپنی عربی دانی کا بھرم کھول دیا۔ حضرت سعدی رحؒ نے درست فرمایا۔

تامرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

آیئے! میں پہلے اصول نحو کے لحاظ سے اس ترکیب کی صحت کو سمجھا دوں، کیونکہ آپ کے مبلغ علم کی رسائی بغیر سمجھائے یہاں تک ممکن نہیں، سنئے! زیر بحث ترکیب میں "ملائک" کو آپ نے مضاف الیہ سمجھا ہے اور "الرغم" کو اس کا مضاف حالانکہ "ملائک" "الرغم" کا مضاف الیہ نہیں بلکہ "الرغم" کا مضاف الیہ محذوف ہے جو لفظ "جماعت" ہے اصل عبارت اس طرح ہوگی :۔"علی رغم جماعۃ ملائک" لفظ جماعت کو جو مضاف الیہ تھا حذف کرکے مضاف پر الف لام مضاف الیہ کے عوض میں داخل کیا گیا ہے کیونکہ محذوف یعنی "جماعت" کے مدلول ہونے پر لفظ "ملائک" جو جمع ہے بطور قرینہ موجود ہے۔

مضاف الیہ کو حذف کرکے مضاف پر اس کے عوض الف لام داخل کئے جانے کی چند مثالیں قرآن پاک کی آیتوں سے پیش کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

وعلم آدم الاسماء کلھا ای اسماء المسمیات اس ترکیب میں لفظ "مسمیات" کو جو مضاف الیہ ہے حذف کرکے اس کے عوض میں مضاف یعنی "اسماء" پر الف لام داخل ہوا ہے۔ لکونہ مدلولا علیہ بذکر الاسماء لانھا ... یدل علی المسمی وعوض منہ اللام ہی مذہب نحاۃ بصرہ کا ہے اور اسی کو ... کوفہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ اور جیسے قول اللہ تعالیٰ کا واشتعل الراس شیبا یعنی میرے سر میں بڑھاپے کی

استعمال اسمی ہے۔ ضمیر متکلم کو جو مضاف الیہ تھی حذف کرکے اس کے عوض میں مضاف پر الف لام داخل ہوا ہے۔" علی الرغم ملا کی صحت تو آپ کو عربی اصول نحو کے لحاظ سے سمجھا دی گئی۔ خدا کرے سمجھ میں آجائے ورنہ یوں تو آپ نرے ہی ...... ہیں۔ مولانا سیماب نے درست فرمایا ہے ؎

یہ تیرا نقص طلب تھا کہ تو رہا تشنہ
جو ڈھونڈتا تو تمہارا جہاں سراب نہ تھا

چونکہ اس ترکیب پر آپ کا اعتراض عربی اصول نحو کے ماتحت تھا اس لئے عربی ہی اصول کے ماتحت جواب دیا گیا۔ یہ صرف آپ کی عربی دانی پر روشنی ڈالنے کی غرض سے تاکہ آپ کو معلوم ہوجائے کہ آپ کے بیان کردہ اصول کے بھی ماتحت مولانا سیماب کے شعر میں یہ ترکیب غلط نہیں ہے بلکہ ع

خود غلط بود آنچہ تو پنداشتی

اب آیئے دیکھیں کہ فارسیوں نے اسی ترکیب کو بعینہٖ اپنے تصرف میں لاکر استعمال کیا ہے یا نہیں۔

لسان الغیب حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

ہست امیدم کہ علی الرغم عدو روزِ جزا   فیض عفوش ننہد بارِ گنہ بر دوشم

فارسی شعرا کی تقلید میں اردو شعرا نے بھی اس ترکیب کو استعمال کیا ہے۔

آپ کے استاد غالب فرماتے ہیں ؎

علی الرغم دشمن شہید وفا ہوں   مبارک مبارک سلامت سلامت

تیسرا شعر مومن دہلوی کا ملاحظہ ہو:—

وہ علی الرغم عدو مجھ پہ کرم کرتے ہیں   ہے ستم لطف کے پردے میں ستم کرتے ہیں

(کلیات مومن مطبوعہ نولکشور پریس صفحہ ۱۲۳)

مہدی حسن صاحب! عربی ترکیبیں خواہ نحوی ہوں یا صرفی عربی کلام نظم و نثر ہی کے لئے ضروری ہیں۔ جب یہ ترکیبیں فارسی یا اردو میں مستعمل ہوکر متصرف ہوجاتی ہیں تو ان کی اصلی صورت باقی نہیں رہتی۔ یہی صورت "علی الرغم" کی بھی ہے جیسا کہ مثالوں سے آپ پر واضح کیا جاچکا ہے اساتذۂ فارسی نے بے محابا استعمال کیا ہے اور ان ہی کی تقلید اساتذۂ اردو نے بھی کی ہے۔ اسی لئے میں نے آپ کو غوک چاہ کہا ہے کہ آپ کا مطالعہ بہت محدود و مختصر ہے

ممکن ہے آپ اپنی "جرأت بیباکانہ" سے کام لیکر یہ کہہ دیں کہ ان اساتذہ نے بھی غلط نظم کیا ہے لیکن آپ جیسے زبان فارسی و اردو سے نابلد محض کے کہنے سے یہ ترکیب کبھی غلط نہیں ہوسکتی۔ اب آپ کی "جرأت بیباکانہ" کے لئے ایک حربہ باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ آپ کہہ دیں کہ ان سب اشعار میں کتابت کی غلطی ہے اگرچہ مولانا سیماب کے معاملہ میں آپ "لما" اور "ربما" میں کتابت کی غلطی کسی طرح تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ یہ کتنا بہترین ثبوت ہوگا آپ کے اس کہنے کا کہ "ضد مقصود نہیں"

ہوگئی تکمیل تعمیر محبت پر شکست
تم نے ٹھکرا دیا مرا ٹوٹا ہوا دل دیکھ کر
(علامہ سیماب)

مہدی حسن صاحب! زبان اردو میں آپ نقادی کا شوق رکھتے ہیں تو "قصر الادب" کے کسی طالب علم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیجئے یقیناً آپ جیسا کوڑمغز بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوجائیگا۔ اسی سلسلہ میں آپ نے مولانا کے خطبہ کے اس جملہ "وذلک خسران العظیم" پر یہ اعتراض کیا ہے "عظیم پر الف لام داخل کرکے اس کو معرفہ بنایا ہے اور "خسران" نکرہ ہے بقاعدہ عربی "عظیم" "خسران" کی صفت ہے عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ موصوف و صفت کی یکساں حالت ہوتی ہے موصوف معرفہ ہو تو صفت بھی معرفہ ہوتی ہے۔ موصوف نکرہ ہو تو صفت بھی نکرہ ہوگی لہذا یہ صورت ترکیب غلط ہے۔"

مہدی حسن صاحب! افسوس صد افسوس کہ اردو اور فارسی میں تو آپ نے اپنی زبانِ قلم سے خود کو اجہل تسلیم کر ہی لیا ہے مگر باوجود "عالم دین" ہونے کے عربی اصول نحو سے بھی واقف نہیں۔ اگر آپ کو شرح جامی پر عبور ہوتا تو یہ مضحکہ خیز اعتراض کرکے اپنے اس لقب کو جو آپ کو بجنور سے عطا کیا گیا ہے رسوا نہ کرتے۔ آیئے! مجھ سے اس کی ترکیب سنئے۔ جملہ مذکورہ میں اضافت موصوف کی جو "خسران" ہے صفت کی طرف ہے جو "عظیم" ہے دراصل یہ الخسران العظیم تھا۔ لیکن جب اضافت موصوف کی صفت کی طرف کی گئی تو الف لام بموجب قاعدہ اضافت حذف کردیا گیا جس طرح کہتے ہیں "مسجد الجامع" "جانب الغربی" "صلوۃ الاولیٰ" "بقلۃ الحمقاء" کہ دراصل "المسجد الجامع" "الجانب الغربی" "الصلوۃ الاولیٰ" "البقلۃ الحمقاء" تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ مثلاً المسجد مثال مذکورہ میں موصوف ہے اور الجامع صفت پھر جب مسجد الجامع کہا تو ظاہر ہے کہ اس ترکیب میں موصوف کو صفت کی طرف

مضاف کیا گیا ہے۔ یہی حال مولانا کے اس جملہ "وذلک الخسران العظیم" کا ہے جب موصوف "الخسران" کو صفت "العظیم" کی طرف مضاف کیا گیا تو خسران العظیم بحذف الف لام کہا گیا۔ آیا خیال ناقص ہیں؟ یہ تو میں نے نحاۃ کوفہ کے قاعدہ کی بنا پر سمجھایا ہے جن کے یہاں اضافت موصوف کی صفت کی طرف اور اضافت صفت کی موصوف کی طرف جائز ہے۔ ملاحظہ ہو عبارت حاشیہ شرح ملا جامی "وذهب الكوفيون الى جواز اضافة الموصوف الى صفته وبالعكس للتخفيف مع افادة التعريف والتخصيص متمسكين بمسجد الجامع واخواته وجرد نطيفة وامثاله فان اصل مسجد الجامع ضيف للتخفيف بحذف اللام وكسب التعريف من المضاف اليه لان المسجد هو الجامع بعينه وقس عليه اضرابه"

ہاں بصریوں کے یہاں اضافت صفت کی موصوف کی طرف اور اضافت موصوف کی صفت کی طرف جائز نہیں ملاحظہ ہو عبارت شرح ملا جامی کی "ولا يضاف موصوف الى صفته ولا صفة الى موصوفها ومثل مسجد الجامع وجانب الغربي وصلوة الاولى وبقلة الحمقاء متناول"

چونکہ یہ ترکیبیں نحاۃ بصرہ کے اصول کے خلاف ہیں اس لئے یہ لوگ تراکیب کی تاویل کرتے ہیں لہذا کہتے ہیں کہ مسجد الجامع دراصل مسجد الوقت الجامع ہے اور صلوۃ الاولی دراصل صلوۃ الساعۃ الاولی ہے اور جانب الغربی دراصل جانب الجزء الغربی ہے اور بقلۃ الحمقاء دراصل بقلۃ الحبۃ الحمقاء ہے۔ مثلاً مسجد جامع میں وقت مقدر ہے اور مسجد وقت کی طرف مضاف ہے اور الجامع صفت ہے وقت کی نہ کہ مسجد کی مطلب یہ ہے کہ الجامع نہ مضاف الیہ ہے اور نہ مضاف کی صفت بلکہ وقت کی صفت ہے بس نحاۃ بصرہ کے اصول کی بنا پر بھی حضرت مولانا مدظلہ کی یہ ترکیب "وذلک خسران العظیم" کسی طرح غلط نہیں ہو سکتی کیونکہ جس طرح بصریوں کے نزدیک متذکرہ بالا تراکیب میں ایک ایک لفظ مقدر مانا گیا ہے۔ اسی طرح مولانا کے اس جملہ میں بھی ایک لفظ مقدر ہے اور وہ لفظ "فوز" ہے اصل عبارت یہ ہوگی وذلک خسران الفوز العظیم لہذا "العظیم" نہ مضاف الیہ اور نہ صفت مضاف کی بلکہ وہ صفت ہے الفوز کی جو مقدر ہے۔ اب بیان ما سبق سے صراحتاً واضح ہو گیا کہ مولانا مدظلہ العالی کی یہ ترکیب صحیح اور بالکل صحیح ہے البتہ آپ کا اعتراض مہمل اور بالکل مہمل ہے

حضرت مولانا نے قرآن مجید کی آیت نہیں پیش کی ہے کہ آپ یہ فرما دیں کہ قرآن مجید میں "وذلک هو الخسران العظیم" ہے۔ مہدی حسن صاحب! شرح کے لفظ "ومثل" کو بطور خاص ملحوظ خاطر رکھیں۔ آپ نے اس سلسلہ میں ہمیں یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ آپ عربی سے صرف اتنا ہی واقف ہیں کہ الٹا سیدھا ترجمہ کر لیں اور آپ کی فتویٰ نویسی بہشتی زیور وغیرہ جیسی اردو کتابوں پر قائم ہے آپ نے مسئلہ تکفیر میں الجھ کر اپنا رہا سہا بھرم کھو دیا۔ آپ اچھے تھے ان جہلاء میں جو آپ کو "سیدنا"، "قبلہ"، "کعبہ" اور خدا جانے کن کن القاب سے نوازتے رہتے ہیں مگر ؎

مرے دشتِ وحشت میں آ تو دکھاؤں
زمیں پر کئی آسماں اور بھی ہیں
(علامہ سیماب)

(باقی - باقی)

جالب سہسرامی

صحت نامہ مضمون "مقصد اعظم اور مفتی اعظم" مطبوعہ جون ۱۹۴۲ء

صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح
۵۰	دوم	۲	من قبیلہ من الملائکہ	من قبیلہ من الملائکۃ
۵۱	〃	۲	من جتن	من اجتن
〃	〃	۲۵	نسا	نسا
۵۲	اوّل	۲۴	فسجدوا کا	فسجدوا الا
〃	دوم	۲۰	ابن المسبب	وابن المسبب
۵۳	〃	حاشیہ ۲	مفتی جی پر صادق آتی ہے	مفتی جی! صادق آتی ہیں۔
			کما ربیان	کما مر بیان
۵۴	اوّل	۱۳	ردل	رسول
〃	〃	۲۶	امنوا کالایۃ	امنوا الایۃ
〃	دوم	۲۲	اس کو	کو اس
۵۵	اوّل	۸	احد موسیٰ	اد موسیٰ
〃	〃	۹	ملائکۃ	ملائکۃ
〃	〃	۱۱	[illegible]	[illegible]

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح :- "یارب مرے وطن کو سکینِ جاوداں دے"

محسنِ ادب حضرت نشتر ہنگامی

آلام سو طرح کے جب روز آسماں دے ـــ کیا ساتھ آدمی کا اک جانِ ناتواں دے
آپس کے دن کے جھگڑے کیوں نظر نہیں آیا ـــ "یارب مرے وطن کو تسکینِ جاوداں دے"
منزل سے نابلد ہیں کھو جائیں گے کہیں ہم ـــ آواز ہر قدم پر لے میر کارواں دے
اس وقت کوئی دیکھے اہلِ چمن کا عالم ـــ جب کوند جائے بجلی اور آتش دھواں دے
آخر زمیں کو بھی تو زینت کی ہے ضرورت ـــ تارے زمیں کو بھی لے پیرِ آسماں دے
جس زندگی پہ دم بھر اسکو نہیں بھروسہ ـــ اس زندگی پہ انساں افسوس اپنی جاں دے
ہیں یاد سیکڑوں دُکھ حسبِ آہ و فغاں کے ہم کو ـــ گر ضبطِ عشق نشتر کھلنے لبِ فغاں دے

حضرت مولانا آلم مظفرنگری

اے عشق میرے دل کو اک عزمِ نوجواں دے ـــ ہستی کو پھونک ڈالے وہ گرمیٔ فغاں دے
اذنِ سجود مجھکو لے سنگِ آستاں دے ـــ پھر ذرۂ بیاں کو تقدیرِ آسماں دے
قیدی ترے قفس میں گھٹ گھٹ کے مر جائیں ـــ صیاد انہیں رہا کر یا فرصتِ فغاں دے
ترا پتہ چمن میں پھولوں سے پوچھتا ہوں ـــ شاید نشانِ منزل خاموش کارواں دے
میں نے خودی کے آئین دل کو سکھا دیئے ہیں ـــ اب جنبشِ نظر کو تو اذنِ امتحاں دے
موجوں پہ آ رہا ہے دریائے فیض اسکا ـــ ذروں کو پھر وہ شاید تقدیرِ آسماں دے
شام و سحر دعا یہ مانگا کیجئے آلم تو ـــ "یارب مرے وطن کو تسکینِ جاوداں دے"

حضرت شاعر نہٹوری ایڈووکیٹ سواسرا

یارب مری فغاں کو وہ جذبِ کامراں دے ـــ موجِ نفس قفس میں پیغامِ بوستاں دے
انسانِ ناتواں کو وہ تاب و قفس میں دے ـــ فاراں کی چوٹیوں پر چڑھ کر جو پھر اذاں دے
صیاد کی نظر سے محفوظ کر کے اماں دے ـــ "یارب مرے وطن کو تسکینِ جاوداں دے"
اے باغبانِ فطرت فطرت کے گلکدے میں ـــ اک شاخِ گل مجھے بھی شایانِ آشیاں دے
گھر ٹوٹ گیا ہے کسی کی چھپ کے بجلی ـــ تاریکیٔ وطن کو پھر شمعِ ضوفشاں دے

اے سوزِ خود نمائی کیوں تو یہ رہا ہے دیکھ ـــ دل خاکِ معرفت ہو ممکن نہیں دھواں دے
منزل رسی تو شاعر مشکل نہیں ہے لیکن ـــ منزل شناس کوئی منزل کا گر نشاں دے!

حضرت جمیل سیوہاروی

ہستی مٹا کر اپنی منزل کا یوں نشاں دے ـــ خاکِ دل و جگر سے ترتیبِ کارواں دے
نمرود کی آڑ میں یہ کافری کہاں تک ـــ آ صحنِ بت کدہ میں لعنت شکن اذاں دے
یا دستیں عطا کر رنگینیٔ چمن کو ـــ یا دل کو تابِ ضبطِ بے رنگیٔ خزاں دے
دیر و حرم ہیں داعی تیری تجلیوں کے ـــ آواز تجھکو آخر کوئی کہاں کہاں دے
زخمہ زنِ جہاں ہو مضرابِ آدمیت ـــ "یارب مرے وطن کو تسکینِ جاوداں دے"
تو ہیں جستجو ہے تخصیصِ طور و ایمن ـــ تابِ نظر کو وسعت تا حدِ لامکاں دے
میں بھی جمیل کہہ دوں افسانۂ محبت ـــ گر ضبطِ رازداری کچھ فرصتِ بیاں دے

حضرت قمر نعمانی سہسرامی

جس کو اماں نہ تو ہی لے مالکِ جہاں دے ـــ بزمِ جہاں میں کوئی پھر کیا اسے اماں دے
یہ آرزو نہیں ہے تو عیشِ جاوداں دے ـــ دو دن کی زندگی میں اک تو کامراں دے
ماموں ہو خزاں سے ہر برگ و بار جس کا ـــ اب کوئی مجھکو ایسا شاداب گلستاں دے
رودادِ زندگی کو ترتیب دے سکوں میں ـــ اتنا تو چین مجھ کو ہنگامۂ جہاں دے
جس میں کسی کے دل کو کاوش نہ ہو کسی سے ـــ اے خالقِ محبت ایسا کوئی جہاں دے
لطفِ بہار لوٹا اندیشۂ خزاں نے ـــ یارب بہار مجھ کو بے وردۂ خزاں دے
میں بھی قمر ہوں واقفِ تنگِ قفس سے لیکن ـــ بے بس جو ہر طرح ہو کس طرح امتحاں دے

حضرت آسی (رڑکوی) بمبئی

یارائے گفتگو دے قدرتِ بیاں دے ـــ یعنی مری زباں کو اپنی ہی اب زباں دے
ہر قطرۂ لہو کو غم کی وہ بجلیاں دے ـــ جلکر جو راکھ اب یہ دل نہ پھر دھواں دے
مایوسِ جستجو ہوں تھک کر نہ بیٹھ جاؤں ـــ نظروں سے چھپنے والے اپنا کوئی نشاں دے

جمنا

وہ شے طرز سوز ہے وا دیکھی خستہ دلی — میری ہی خامشی کو اب طرز بیاں دے
موقع ہے اب کہ میں کو اک بہار دکھا دوں — فرصت کا بھروسہ مگر شاید نہ آسماں دے
منزل کی جستجو میں دارفتگی ہو اتنی — آواز ماہ پرد کو خود میر کارواں دے
آسی کسی کو حق کیا اس کو برا کہے کیوں — دل سے جسے دعائیں ملیدوان آدے

جناب عزیز اختر وارثی سرہندی

یارب کلی کلی کے منہ میں نئی زباں دے — پھر ذہن باغباں کو اک فکر نوجواں دے
یا مجھ کو انجمن میں آزادی بیاں دے — یا میرے بولنے کو اک دری زباں دے
گمراہ ہو چکا ہوں تقلید راہبر سے — کچھ تو مجھے تسلی اے میر کارواں دے
ٹوٹے ہوئے نشیمن کو استوار کرلوں — تھوڑی سی اور مہلت برق بے اماں دے
دنیا کا ہر تغیر زیر قدم ہو تیرے — تو اس طرح سے اپنا ترغیب کارواں دے
رہتے ہوئے زمیں پر اکتا گیا ہوں یارب — رہنے کو آسماں دے بسنے کو کہکشاں دے
اختر کی التجا ہے ہر شخص کو الٰہی — سیماب نکتہ داں سا استاد مہرباں دے

جناب منظر کلیمی جام پوری

یارب میرے وطن کو تسکین جاوداں دے — ہر دشمن وطن کو کچھ بے قراریاں دے
میرے وطن کو ایسا سالار کارواں دے — خون اگ سکو سے منزل کا جو نشاں دے
شیرازۂ اخوت جس سے رہے پریشاں — ہندوستاں کو ایسی تجویز سو اماں دے
صیاد ہو کہیں میں یا بجلیاں ہوں سر پہ — جو کچھ ہو گلستاں کو پھر ظرف آشیاں دے
دل کی تہوں میں بھر دے جذبہ سکندری کا — اور ذہن کو مذاق دارائی جہاں دے
سینوں میں جوش بھر دے جو عشرت وطن کے — تو شہر وطن کو وہ قدرت بیاں دے
آکر پڑھے نمازیں مسجد میں ہر برہمن — اور مندروں میں منظر شیخ حرم اذاں دے

جناب صغیر اثر اکبر آبادی

جس پہ ہو ذکر تیرا یارب وہی زباں دے — جس میں ہو نطق تیرا وہ قوت بیاں دے
آزاد ہر الم سے کردے نفس کو میرے — جس میں بھری ہو لذت دُرد دل وہ دے
جس میں تیری نکہت جس میں ہو رنگ تیرا — وہ پھول تو عطا کر وہ باغ وہ بوستاں دے
دیر و حرم میں تیرا میں نے پتہ نہ پایا — کچھ تو نشان اپنا ای یار بے نشاں دے
تیرا سرور الفت لے جائے وادیوں میں — ہو کوہ سے مقابل وہ قلب کامراں دے
مستغنی عطا ہوں داو وفا میں کٹ کر — لینا نہیں ہے مجکو تو چاہے کل جہاں دے

پامال کر رہا ہے کیوں پستی اثر کو — اب تو فراز اسکو اے پیر آسماں دے

جناب ضیا میرٹھی

یارب مرے وطن کو تسکین جاوداں دے — امن و برابری میں آرام دے اماں دے
قدموں پہ لوٹتی ہو جس کے بہار دنیا — کیوں نہ آسمان اسکو اندیشۂ خزاں دے
بجلی چمک رہی ہے نزدیک آشیاں کے — اس برق بے اماں سے یارب اب تو اماں دے
جو چاہتے ہیں لینا آزادیاں کسی کی — آزادیاں انہیں بھی پھر کیوں بیاں دے
تنظیم گلستاں کی اہل چمن ہی کرلیں — اہل چمن کو عقل سلیم گلستاں دے
اُسکی جبیں جھکے پھر بدن میں کیوں نہ اسکے — ہندوستاں سا جسکو یارب تو آستاں دے
یارب یہی دعا ہے تجھ سے دل ضیا کی — میرے وطن کو باغ جنت کی خوبیاں دے

جناب اکرم دھولیوی

اس دور ابتلا میں بیخوف امتحاں دے — پھر تجھکو ایسا موقع شاید ہی آسماں دے
کیا دیر ہے مجاہد اٹھ وقت آگیا ہے — باطل پرستیوں پر اک ضرب گراں دے
زنداں شکن ابھی میں رکھتا ہوں دل میں آہیں — صیاد پھر مجھے کیوں آزادی فغاں دے
مردہ دلوں میں بھی جو آک تازہ روح پھونکے — پیغام کوئی ایسا اے میر کارواں دے
باطل پرستیاں پھر مجبور کر رہی ہیں — دنیا کی وسعتوں میں چل تجھ پھر اذاں دے
میں خوب جانتا ہوں تجھ میں وفا نہیں ہے — مجھے کو نہ یوں دلاسے ای میری جاں دے
آزادیوں کے نغمے ساز سخن پہ گاؤں — اکرم ذرا سی مہلت مجھ کو اگر جہاں دے

جناب ثاقب بڑوانی۔ سی۔ آئی

کیوں کر نہ جان اپنی پھر تیرا ناتواں دے — جب چارہ ساز ہو کر تو درد بیکراں دے
یا دہمی سکوں دے یا سوز بیکراں دے — کچھ تو مریض غم کو ای دور آسماں دے
بلبل کو راس کیونکر آئے فضائے گلشن — صیاد بنکے خود جب تکلیف باغباں دے
لینا اگر ہو لطف دور بہار تجھ کو — کر لے اُسے گوارا جو رنج باغباں دے
حسن اور عشق دونوں خاکستر وفا ہوں — یا آج ایک ایسی سوز غم نہاں دے
دیر و حرم ہوں جس پہ مجبور سجدہ ریزی — یارب ہی جبیں کو ایسا اک آستاں دے
ثاقب وہ پوچھتے ہیں مجھ سے سر جھکا کے — جو خود بتائے نشاں جو پتا وہ کیا نشاں دے

جناب محمود یار خاں ایم۔ اے جونا گڑھ

اندوہ مستقل ہے یا عیش جاوداں دے — وہ چاہے مجکو جو کچھ ای شورش جہاں دے

صیاد اگر چمن میں آزادیٔ فغاں دے — ہر اک کلی چٹک کر رنگین لب بیاں دے
سو اُس سنگ جبہ کو ثبت نقش لب — گم راہ قافلوں کو منزل کا جو نشاں دے
یہ جذبِ مسلسل ہے مانعِ ترقی — "یارب مرے وطن کو تسکینِ جاوداں دے"
آشنا ہو ہم آہنگ احساسِ کمزوریاں — ناقوس کی فغاں بھی آوازۂ اذاں دے
افسردہ ہستیوں کو سوزِ تمام بخشے — فکرِ اثر کو یارب وہ گرمیٔ بیاں دے

جناب وجدی الہ آبادی

جوشِ طلب میں میرے وہ قوتِ نہاں دے — منزل مجھے پکارے۔ آواز کارواں دے
صیاد و باغباں سے میں انتقام لوں گا — اے کاش ساتھ میرا آہِ شرر فشاں دے
آنکھیں لڑا سکے جو سفاک بجلیوں سے — مرغانِ گلستاں کو ایسا اک آشیاں دے
وہ مغربی اُفق پر تاروں کو نیند آئی — یہ وقت ہے مؤذن تکبیر کہہ اذاں دے
تدبیر سوچ لوں کچھ تعمیرِ آشیاں کی — وہ ذہن تو مجھ کو اہلِ گلستاں دے
قیدِ مکاں آ تو گھبرا گیا ہے وجدی — اس اپنے خلوتی کو تقدیرِ لامکاں دے

جناب حامی (سگولی)

ہندوستاں کو یارب وہ طاقتِ نہاں دے — اس جنگ کی بلا سے دُنیا کو جو اماں دے
اب عزمِ سرفروشی دے ہر جواں کو یارب — فرزندِ ملک اپنی جرأت کا امتحاں دے
ہے وقت کا تقاضا اے ہند کے جوانو — ناموس پر وطن کے ہر فرد نقدِ جاں دے
پھر ہند کی فضا میں نصرت ہو کارفرما — اکبر سا کوئی یارب پھر اس کو حکمراں دے
آشوبِ جنگ سے ہے اب بیقرار عالم — "یارب مرے وطن کو تسکینِ جاوداں دے"
حامی یہ ساری دنیا ہے خون کی پیاسی — اللہ کے سوا ہے اب کون ۔ جو اماں دے

جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی

یارب مرے وطن کو تسکینِ جاوداں دے" — ہر اک فضا یہاں کی پیغامِ دلستاں دے
شاخوں پہ مسکرائیں پھر وقتِ گل چمن میں — گلچیں کے دل میں شوقِ تزئینِ گلستاں دے
[illegible] ہیں سب کی — توفیقِ زندگی دے تسکینِ جاوداں دے
[illegible] — ہم بے بسوں کو یارب وہ میرِ کارواں دے
بن جائے رشکِ جنت میرا وطن الٰہی! — امن و اماں کا مژدہ ہر شاخِ آشیاں دے
[illegible] — اقبال کا تخیل سیماب کی زباں دے

جناب نازک حسنی شکوہ آبادی

چھوڑا ہے تو سجا کر گلزارِ آشیاں دے — آخر قفس قفس ہے، دو گوشۂ بلبلاں دے
جو تم پہ مٹ چکا ہو، جو تم پہ مر گیا ہو — کیا نام وہ بتائے، اپنا وہ کیا نشاں دے
ہاں اہلِ دل کو آزمانے لے گردشِ زمانہ — سو بار امتحاں لے، سو بار امتحاں دے
جینے کی ایک صورت فرقت میں ہے تو یہ ہے — کچھ آہ دے تسلی، تسکین کچھ فغاں دے
یارب ہے میرے لب پر افسانۂ تمنا — کچھ قوتِ بیاں دے کچھ طاقتِ زباں دے
نازک ہے اس کی حالت نازک دعا یہ کرے — "یارب مرے وطن کو تسکینِ جاوداں دے"

جناب اثر ذائقی بنگلوری

یہ تجھ سے کب کہا تھا تو عیشِ دو جہاں دے — یارب غمِ محبت دے اور جاوداں دے
تیری طلب میں میری ہستی بھی مٹ چلی ہے — اور بے نشان کچھ تو اپنا مجھے نشاں دے
یہ زندگی مجسم ہے انتشارِ پیہم — آکر سکوں مجھ کو اے مرگِ ناگہاں دے
اکتا گیا ہوں قیدِ ہجر و وصال سے میں — یا عیشِ کامراں دے یا رنجِ جاوداں دے
اس دورِ حاضرہ میں ہر فرد ہے پریشاں — "یارب مرے وطن کو تسکینِ جاوداں دے"
زاہد سے اے اثر تم پوچھو نہ رازِ حق کا — کیونکر نشانِ منزل گم کردہ کارواں دے

جناب اسعد السدیدی لکھنوی

دو نعمتیں مجھے تو اے ربِّ دو جہاں دے — منزل نما نظر دے، اور قلبِ زرداں دے
تعمیر کر لوں اپنا کاشانہ از سرِ نو! — اک وہ گھڑی کی مہلت مجھ کو جو آسماں دے
جو ہند کو بچالیں غیروں کی یورشوں سے — توفیق اے الٰہی کچھ ایسے پاسباں دے
ہندوستاں کا بچہ بچہ یہ کہہ رہا ہے — "یارب مرے وطن کو تسکینِ جاوداں دے"
برباد کر دیا ہے دورِ خزانِ گلشن — جو پُر بہار کر دے اک ایسا باغباں دے
وہ تھا سرفروشی کا مدتوں سے اسعد — اب وقت آزمائش آیا ہے امتحاں دے

جناب سراج احمد آبادی

اے جلوۂ حقیقت اک جنبشِ نظر سے — پھر بیقرار کر دے پھر بیقراریاں دے
اب کشتیٔ وطن ہے طوفانِ ابتلا میں — رحمت کے دامنوں میں یارب اسے اماں دے
یہ انقلاب تو سے بے چین ہو رہا ہے — "یارب مرے وطن کو تسکینِ جاوداں دے"
اب دیکھنا ہے کیسی آخر سے چمن کی — صبحِ نسیم کچھ تو پیغامِ آشیاں دے
در اصل بے نشانی اک مستقل نشاں ہے — راہِ طلب میں شکر لے دل تو امتحاں دے

ہم ہندیوں کے سینوں میں جب اندل سے
وہ ہم کو سرفروشی کی بالاذتِ جہاں دے

جناب غنی گلفوری (حیدرآباد دکن)

اپنی کہاں یہ قسمت آرام آسماں دے
پھرنے کو صحنِ گلشن لینے کو آشیاں دے

وہ چاہے مجھکو جو کچھ خلاقِ انس و جاں دے
یا ذوقِ سعیِ دل دے یا رنگِ ناگہاں دے

ہر ہر نفس ہو یکسو نیکی کے جام محو یہ
یارب رگوں میں ایسی بہتی نہر نشاں دے

کم تا بیاں یہ تیری آخر فنا نہ کر دیں
جل تیرے آرزو میں جل اور نیست کا نشاں دے

ساحل سے کیا ہیں تیری سرگوشیاں مسلسل
کچھ تو پتہ ہمیں بھی اے بحرِ بیکراں دے

جناب خلیق (سگلی)

اہلِ چمن کو یارب اک ایسا باغباں دے
جو شاخِ گل پہ اذنِ تعمیرِ آشیاں دے

سنتو یارو، میں جھکا دوں گردن کو زیرِ خنجر
اک بار کوئی ہنسکر ایسا امتحاں دے

کنجِ قفس میں یارب لطفِ چمن اٹھاؤں
داغِ جگر میں رنگِ تصویرِ گلستاں دے

گونج اٹھیں کوہ و صحرا آوازِ حریت سے
ہر ذرۂ وطن کو آزادیِ بیاں دے

گو زک اٹھا چکا ہے تیرے خلیل لیکن
اک بار پھر نویدِ نظارۂ بتاں دے

جناب سلیم سہروردی گوالیاری

بدل ذوقِ جستجو کو تقدیرِ کامراں دے
تمیزِ رنگ و بوئے صحرا و گلستاں دے

گلشن کو گل سپاہ کر افلاک کو ستارے
میرے دلِ حزیں کو اک داغِ خونچکاں دے

اے خالقِ مسرت میں کیا کروں گا عشرت
اک قلبِ مضطرب دے اک روحِ ناتواں دے

بے کار شورشوں میں صدیاں گذر چکی ہیں
"یارب مرے وطن کو تسکینِ جاوداں دے"

یہ فکرِ ماسوا سے بیزار ہو گیا ہے
قلبِ سلیم کو اب تسکینِ جاوداں دے

جناب غافل بیتول

ستو جان سے فدا ہو جس پر بہارِ دنیا
یارب مرے وطن کو ایسی کوئی خزاں دے

روزِ ازل سے اب تک مارا کبھی جلایا
اب تو سکون ہم کو بے دردِ آسماں دے

نامِ وطن پہ مرکر دشمن کو پست کر دیں
ہندوستاں کو یارب ایسے ہی کچھ جواں دے

کچھ اور بھی نئے نغمے سریلے گا لوں
کھویا ہوا وہ میرا پھر مجھکو گلستاں دے

سلم تو خیر لیکن کافر بھی سجدہ کر لیں
شانِ بلال سے تو غافل کو اذاں دے

جناب حباب کالپوی

کام آؤں جو وطن کے وہ تابِ شوق تواں دے
پھر دسترس ہمیں پر قبضہ میں آسماں دے

معمورہ ہوں فضائیں نغموں سے حریت کے
رنگین آرزو میں ہم رنگِ گلستاں دے

اک ذوقِ والہانہ ہو گلشنِ وطن سے
[illegible]

خورشید بن کے چمکے اپنا وطن جہاں میں
وہ نور سرمدی دے وہ اوجِ کہکشاں دے

جناب عبدالخالق صاحب خلیق جمیل الٰہی

پھر کو سراب آسا دھوکا نہ مہرباں دے
اپنی حقیقتوں کا کچھ تو پتہ نشاں دے

باتیں بنانے والے میداں میں نکل آ
جینا اگر ہے تجھکو آ اور امتحاں دے

بتا رہی قوم ہے قہر کیوں ہے یہ محو غفلت
کچھ درس قوم کو بھی اے مرغِ کہنہ داں دے

اٹھ اے خلیق خفتہ غفلت سے باز آجا
دنیا کے جنگلوں میں اک بار پھر اذاں دے

جناب شاد سلیمانی نقشبندی جالندھری

ہر رہزنِ وفا سے یارب ہمیں اماں دے
ہمدم لئے جو دائم وہ میرِ کارواں دے

کشتیِ دل ہے میری طوفانِ غم نے گھیرا
تو ہی اسے سہارا اے ناخدائے جہاں دے

دیر و حرم میں اسکی اے شاد جستجو ہے
دے بے نشاں مجھے بھی اپنا کہیں نشاں دے

جناب اختر انصاری شاہدی

الزام بزدلی کا مجھ کو نہ یہ جہاں دے
مردانگی کا اپنی اٹھ اور امتحاں دے

اپنی اماں میں لے کر ظالم سے تو اماں دے
"یارب مرے وطن کو تسکینِ جاوداں دے"

احساسِ قوم کا گر دل میں نہاں ہو تیرے
اپنے وطن کی خاطر اختر تو اپنی جاں دے

جناب حسن ساگری

رنج و غم و مصیبت جو چاہے بیکراں دے
تفریق دو دلوں میں لیکن نہ آسماں دے

دامانِ عافیت میں اپنے لے اماں دے
"یارب مرے وطن کو تسکینِ جاوداں دے"

دیدارِ یار تجھ کو مطلوب ہے اگر حسن
جانبازی و وفا کا پہلے تو امتحاں دے

جناب طالق ہمدانی لدھیانوی

جو بار با وفا ہو مجھ کو وہ دلستاں دے
یارب دلِ حزیں کو تسکینِ جاوداں دے

اجڑے ہوئے چمن سے تسکیں نہیں نظر کو
جس میں خزاں نہ آئے وہ مجھکو گلستاں دے

جناب سوز انبالوی

لذت ہو جس سے حاصل ایسا غمِ نہاں دے
اس غم کو پھر الٰہی تاثیرِ جاوداں دے

ایفا کیا نہ کوئی وعدہ بتوں نے اپنا
سمجھاؤں کو میری یارب تنہا ہی آستاں دے

جناب محسن ساگری

دامن چھڑانے والے محشر میں دیکھ لونگا
جب سامنے کسی کے انگوٹھا دکھایاں دے

گلشن میں اس طرح تو نالوں پہ محسن ہو
صیاد خود بنا دے ہر شاخ آشیاں دے

جناب سہیل شہادوی

اے مرد [illegible]
ملک نہیں جہاں کی گردش کہاں دے

اصلاحِ سخن

:۔ خواجہ حمید الدین صاحب حمید لکھنوی کے متفرق اشعار پر حضرت خواجہ عشرت لکھنوی مرحوم و مغفور کی اصلاح

دستور
خیالِ دوست کو ہر حال میں پیشِ نظر رکھا ۱ محبت کا یہی انداز ہم نے عمر بھر رکھا

ان کے دامن تک مری
انہ کی چہ اجب ناموافق ہو تو مشکل ہے ۲ پہونچنا تا بدامن ذرۂ خاکِ پریشاں کا

فریاد
امید سے زائد ہوا ہے نالوں کا ۳ کلیجہ ہل گیا آواز سننے والوں کا

کہ دل میں سوز الفت ہے رہی ہا بار میں
جل ہی معشوق کا گیا دلیلِ مرگ ہے ۴ شمع تک پہونچا جو پروانہ تو جل کر رہ گیا

تنگے
اور شہر
بڑھے کہیں بڑھکر مری شہرت کا قدم ہے ۵ میں گھر میں ہوں بازار میں افسانہ ہے میرا

دلیل
ثبوت سوز غم ہے شمع کا سر سے گذر جانا ۶ وفا کی آخری منزل ہے پروانے کا مرجانا

ہر اک
ہے
کھائی ہیں ٹھوکریں جو محبت کی راہ میں ۷ تا لئے بلندیٔ جہاں ہیں نگاہ میں

فطرت
طینت بدل گئی ہے ستم جھیلتے ہوئے ۸ بیداد تم کرو مجھے کوئی گلا نہیں

انکی آنکھیں ہیں
جب سے کہتے ہیں ترے جلوؤں میں رعنائی نہیں ۹ دیکھتے ہیں وہ مگر آنکھوں میں بینائی نہیں

کو ہوں
دوسروں پر جبر کرتا ہے جو خود مجبور ہے ۱۰ درحقیقت عقل سے انسان کتنا دور ہے

لیتا ہے فلک ظلم کی تعلیم ہمیں سے
اللہ بچائے ترے کوچہ کی زمیں سے ۱۱ ~~ہوتی ہے شروع آگ محبت کی یہیں سے~~

خط بھی اظہار تمنا کا ذریعہ ہے
اگرچہ ~~خود سے~~ بھی اظہارِ حال ممکن ہے ۱۲ مگر کچھ اور ہی ہے بات پیغام زبانی میں

توجیہ

(۱) "دستور" بہ انداز سے زیادہ معنویت ہے۔ عام طور پر دستورِ محبت" ہی مستعمل ہے۔ ہر چند انداز محبت غلط نہیں تھا بلکہ ایک حسن پیدا ہو جاتا لیکن دستور اپنی جگہ کمل ہے اور اس سے قانون و قاعدہ کے واضح معنی پیدا ہونے ہیں

(۲) مصرعِ ثانی سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کس کے دامن تک خاکِ پریشاں کا پہونچنا مشکل ہے" بجز اکے پریشاں کا ایک ذرہ کا پہونچنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اصلاح سے یہ عیب دُور ہو گیا۔

(۳) "آواز" سے کلیجہ ہلنا کسی خصوصیت کا حامل نہیں۔ توپ۔ بم اور شیر وغیرہ کی آواز سے بھی کلیجہ ہل جاتا ہے اس لئے فریاد بنا دیا۔

(۴) مصرعِ اولیٰ بہت عمومیت لئے ہوئے تھا کسی قسم کی ترقی اور مضمون آفرینی نہ تھی۔ اب مصرع اچھا ہو گیا

(۵) "بڑھکر" زیادتی کی طرف خیال کو رجوع کرتا ہے اور "قدم" کسی ایسے لفظ کو چاہتا تھا جس سے پیش بینی ہونا ثابت ہو اس لئے "تنگے" بنا دیا گیا۔ اسی طرح مصرع ثانی میں "بازار" محدود چیز تھا اسے "شہر" بنا دیا گیا۔ اب شہرت "پایۂ تکمیل کو پہونچی اور شعر میں بانداریت بھی نہیں رہی۔

(۶) "دلیل" کے بعد ہی کوئی بات پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے اس لئے دلیل کا درجہ ثبوت سے بلند ہے۔
" ثبوت" کا محلِ استعمال میرے اس مطلع سے واضح ہو جاتا ہے ؎

لبوں پر مسکراہٹ، خون اشکوں کی روانی میں
ثبوتِ زندگی یوں دے رہا ہوں زندگانی میں

یہاں "دلیلِ زندگی" نہیں کہہ سکتے۔

(۷) حمید صاحب کا مصرع صحیح ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وجہ اصلاح یہی ہو سکتی ہے کہ غالباً حضرت عشرت مرحوم معطوف و معطوف الیہ کے واحد ہونے کی صورت میں "فعل" بھی واحد ہی استعمال فرماتے ہونگے۔

(۸) لغوی اعتبار سے یہاں "طینت" صحیح ہے لیکن شاعرانہ نکتہ "فطرت" ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ فطرت کے معنی میں اب اتنی ہمہ گیری پیدا ہو گئی ہے کہ عادت، سرشت سبھی کچھ اس میں آجاتی ہے۔

(۹) اس شعر پر بہت اچھی اصلاح دی گئی ہے۔ "جب آنکھوں میں بینائی نہیں تو دیکھ کس طرح سکتے ہیں؟" اصلاح سے نہ صرف مصرعِ ثانی میں برجستگی پیدا ہو گئی بلکہ مفہوم بھی اچھا ہو گیا۔ یعنی آنکھیں تو ہیں مگر ان میں بینائی نہیں۔ سبحان اللہ۔

(۱۰) "درحقیقت" "کتنا" کے سبب بے محل تھا اگر درحقیقت کی جگہ "غور کیجئے ۔۔۔ یہ تو دیکھو" وغیرہ قسم کا کوئی ٹکڑا ہوتا تو "کتنا" نبھ سکتا تھا۔ فاضل استاد نے "کتنا" کی جگہ "کوسوں" بناکر ہر عیب دُور کر دیا۔

(۱۱) مصرعِ ثانی مصرعِ اولیٰ سے مربوط نہ تھا۔ زمین کے اعتبار سے مصرعِ ثانی میں فلک رکھکر حضرت عشرت مرحوم نے نہ صرف صنعتِ تضاد پیدا کر دی بلکہ اس سے محبوب کی سنگ دلی بھی واضح ہو گئی۔
مصرعِ ثانی میں "شروع" کا عین بھی تقطیع سے خارج تھا

(۱۲) شعر میں معنوی خلل تھی وہ لفظ "تمنا" نے دُور کر دی اس کے علاوہ مصرع بھی چست ہو گیا۔ لیکن مصرعِ ثانی میں "ہی ہے" اب بھی زبان پر گراں ہے۔ مصرع یوں ہو سکتا تھا ؎
"مگر ہے بات ہی کچھ اور پیغام زبانی میں"

اعجاز صدیقی

ابیا کہاں ڈھونڈے کہ چلیں ... دل اُس کے تماشائی میں

کس گل نے اُٹھایا تھا جنازہ مرا یارب · مدت ہوئی لیکن وہی نکہت ہو کفن میں
اس برقِ تبسم سے لڑیں ایسی نگاہیں · ہے ہر بن مو شعلہ مرے سارے بدن میں

کتاب کے آخری حصہ میں چند قطعے اور رباعیات بھی ہیں۔ رباعیات سے حضرتِ عشرت کی فکر کا اندازہ کچھ زیادہ ہوتا ہے فرماتے ہیں۔

پیدا تو کرے دیدہ بینا کوئی · لائے تو یہاں تابِ تجلی کوئی
وہ کہتے ہیں ہم اٹھائیں پردہ اپنا · موجود بھی ہو دیکھنے والا کوئی

مہکے ہوئے پھول تھے چمن سے نکلے · تھے شمع خموش انجمن سے نکلے
جس طرح بدن سے روح نکلے باہر · ہم بھی عشرت یونہیں وطن سے نکلے

شیرِ میسور | از جناب تیمور مصطفیٰ تقطیع $\frac{22 \times 29}{16}$ حجم دوصد صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط۔ جلد پر خوبصورت گرد پوش قیمت ہے ملنے کا پتہ زمزم بک ایجنسی بیرون موری دروازہ لاہور۔

مجاہدِ ملت ٹیپو سلطان سب سے پہلے ہندوستانی تھے جو وطن سے غیر ملکی اقتدار کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ ٹیپو سلطان کی زندگی ملک و قوم کی بہبود کے علاوہ سیاسی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ تقریباً دو صدی پہلے انھوں نے آزادی کا جو تخیل پیش کیا اور شہید ہونے سے پہلے جو پیغام اہلِ وطن کو دیا وہ آج بھی شمعِ راہ ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہندوستانی قومیں مذہب کی آڑ لیکر اپنے سر ملیل القدر رہنما کو اس کے مرتبہ سے گرانے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہی حال بطلِ حریت سلطان ٹیپو کا ہوا اور اُن کی ذات پر طرح طرح کے بہتان لگائے گئے۔ زیرِ نظر کتاب کافی محنت اور تلاش و جستجو سے مرتب کی گئی ہے اور اس سے سلطان مرحوم کے خاندان، حکومت اور قومی و ملکی تحریکوں پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ پیدائش سے شہادت تک کے تمام واقعات تسلسل کے ساتھ قلمبند کئے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری حصہ میں دوسری قوموں کے مورخین کے تاثرات بھی دیے گئے ہیں۔ ان میں مہاتما گاندھی کی تحریر خصوصیت کے ساتھ قابلِ مطالعہ ہے۔ متعدد تصاویر بھی زینتِ کتاب ہیں۔

تاریخِ احرار | از چودھری افضل حق مرحوم۔ تقطیع $\frac{22 \times 29}{16}$ حجم ۲۶۰ صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پر سنہری ڈائی کندہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک خوبصورت گرد پوش بھی ہے۔ قیمت ہے ملنے کا پتہ زمزم بک ایجنسی بیرون موری دروازہ لاہور۔

مسلم لیگ اور کانگریس کی طرح احرار بھی ایک سیاسی جماعت ہے جو گذشتہ چند سالوں میں ترقی کی بہترین منزلوں پر پہونچ کر دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح بہت زیادہ منظم ہو گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ احرار نے سیاست کے میدان کی پرخار راستے اور قوم و وطن کی خدمت کو اپنے ایثار سے اتنا قریب کر لیا ہے اور بعض ایسی زندہ مثالیں پیش کی ہیں جو اس جماعت کو تاریخِ سیاست میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ اس سے قطع نظر کہ میرا سیاسی عقیدہ کیا ہے میں یہ کھلے دل سے کہنے کے لئے تیار ہوں کہ احرار کی تحریک میں بسا اوقات سرفروشی کے ایسے جذبات چمک اُٹھتے ہیں جنھیں قوت کبھی نہیں دبا سکتی۔ ہر موجِ عمل نامِ زندگی ہے اور جماعت احرار اس زندگی سے بہرہ ور نظر آتی ہے۔

"تاریخِ احرار" احرار کے ایک سرگرم لیڈر کی تصنیف ہے جس کے مطالعہ سے بڑی حد تک ہم اس جماعت کو سمجھ سکتے ہیں۔ احراری مجاہدین کی قربانیاں، مجلسِ احرار کی تشکیل کن وجوہ کی بنا پر ہوئی، دوسری سیاسی جماعتوں سے احرار کا تعلق سنہ ۱۹۲۳ء سے ابتک کی سیاسی تحریکوں میں احرار کا حصہ اس کے اثرات و نتائج اور جماعت احرار کی خدمات پر بحرپور مضامین ہیں۔ اس جماعت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ بلکہ دوسری سیاسی جماعتوں کے افراد کے لئے بھی اس میں کافی مواد موجود ہے۔

سازِ حیات | از جناب محمد صغیر اثر صدیقی اکبرآبادی۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۴۸ صفحات لکھائی چھپائی اوسط قیمت ۶ر ملنے کا پتہ۔ غفار احمد صدیقی ۳۶۵ (الف) باقر گنج حسن منزل الہ آباد۔

جناب اثر صدیقی ایک پرگو اور حساس شاعر ہیں۔ آج جبکہ تمام دنیا جنگ کے تباہ کن اثرات سے بیچین ہو رہی ہے۔ جناب اثر کے دل میں بھی شاعرانہ جذبات نے انگڑائی لی اور موضوعِ جنگ پر اُنھوں نے ۲۴ نظمیں لکھ دیں۔ جن میں بعض نظمیں بہت اچھی اور پُراثر ہیں۔ مثلاً ایک فوج کے سپاہی۔ دعوتِ عمل۔ غازی صف شکن مردِ جنگ۔ ہمارا نشان۔ قیدی سپہ سالار۔ شری طاقتوں اور قوموں کی بھی یہاں تھوڑی کمی نہیں ہے۔ آغازِ جنگ سے ابتک میری نظر سے کسی شاعر کا ایسا مجموعہ نہیں گذرا، جس میں صرف جنگ اور متعلقاتِ جنگ پر نظمیں ہوں۔ اس اعتبار سے بھی یہ مجموعہ قابلِ قدر ہے۔ آغازِ کتاب میں مشہور ادیب جناب ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری بار ایٹ لا کا ایک مختصر مقدمہ اور مصنف کی تصویر ہے۔ اُمید کہ اہلِ ذوق اس مجموعہ کی قدر فرمائینگے۔

اعجاز صدیقی

ایک صاحب کمال سنیاسی کا بیش قیمت عطیہ

ضروری اطلاع ـــــ جنگ ختم ہو گئی

یہ مادی جنگ نہیں بلکہ وہ حقیقی جنگ جس نے میاں بیوی کے تعلقات میں ناخوشگواری پیدا کر دی تھی اور جس کی وجہ سے دنیا جہنم معلوم ہوتی تھی۔ نامردی اور مایوسی کی خلیج وسیع ہو گئی تھی صرف **دار الشفاء گولیاں** اور **روغن مالش طلاء** نے ہزارہا خاندانوں کو تباہی اور بربادی سے بچا لیا **ناظرین** ہم خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتے ہیں کہ یہ دونوں دوائیں نامردی کی آخری منزل میں بھی خدا کے فضل و کرم سے تیر بہدف ثابت ہوتی ہیں **دار الشفاء گولیوں** کے استعمال سے جریان۔ احتلام۔ سرعت انزال۔ پیشاب سے پہلے یا بعد میں سفید رطوبت کا آنا۔ چہرہ زرد رہنا۔ دل گھبرانا۔ آنکھوں کے تلے اندھیرا چھانا۔ کام میں جی نہ لگنا۔ عورت کے خیال سے مادہ تولید کا بہہ جانا۔ غرض وہ تمام شکایتیں جو غلط کاریوں سے پیدا ہو گئی ہوں ایک ہفتہ ہی میں نیست و نابود ہونی شروع ہو جاتی ہیں اور ۲۱ دن کے مسلسل استعمال سے انسان فولاد کی طرح مضبوط ہو جاتا ہے۔ تہذیب ہمیں زیادہ وضاحت کی اجازت نہیں دیتی ان گولیوں کے استعمال سے اس قدر صالح خون پیدا ہوتا ہے کہ رگ رگ میں بجلی کوندتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایمان اور دھرم سے ہم کہتے ہیں کہ بالکل حقیقت ہے صرف ایک بار آزما کر دیکھئے قیمت ۲۱ خوراک **صرف تین روپیہ Rs. 3/-**

روغن مالش طلاء نمبر ۱۔ ہندوستان میں ہزارہا قسم کے طلاء آئے دن اخباروں اور رسالوں میں مشتہر ہوتے رہتے ہیں اور ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں نوے فیصدی غلط اثر کرنے والے ہوتے ہیں۔ "روغن مالش طلاء" سے عضو مخصوص کی تمام خرابیاں نہایت آسانی سے دور ہو جاتی ہیں۔ کجی۔ لاغری۔ رگوں کا ابھار۔ خمی۔ خواہش کا پیدا نہ ہونا یا ہونے کے بعد جوش کا ختم ہو جانا۔ سستی غرض ہر شکایت صرف چند بار کے استعمال سے دور ہونی شروع ہو جاتی ہے اور لطف یہ ہے کہ پھر کسی دوا کے استعمال کی ضرورت نہیں رہتی یقین کیجئے یہ روغن ہر رگ اور ریشوں میں نئی روح اور زندگی پیدا ہو جاتی ہے ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے ادنیٰ کارہ سو ناکارہ انسان تندرست ہو جاتا ہے قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ **Rs. 3/8/-**

شرطیہ علاج اور شرطیہ عہدہ:۔ ہندو کو دھرم اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے کہ اگر ان ادویات کے استعمال سے فائدہ نہ ہو تو حلفی تحریر بھیج کر قیمت واپس منگا لیں۔ یہ یاد رہے کہ میری دوائی صرف نامردی۔ سستی۔ جریان۔ احتلام۔ سرعت۔ کمزوری اور عضو مخصوص کی لاغری کے لئے مخصوص ہیں خواہ کسی سبب سے ہوں جلق یا کثرت مباشرت یا عادت بد سے ہو۔ سوزاک یا آتشک سے پیدا شدہ کمزوری کے لئے بھی یہ طاقت کا بھید ہے۔

حکیم چونی لال لاہور

یہ دوائی اولاد پیدا کرنے کے قابل بنا دی ہے۔

اخبار چونچ کلکتہ

اخبار چونچ کے بڑے ناول میں ہندوستان بلکہ ہانگ کانگ تک ہو دار الشفاء گولیوں کی تعریف لکھی ہے۔ دفتر چونچ کے سابق منیجر صاحب نے خود بھی ان دواؤں کا استعمال کیا اور حسب منشاء فائدہ ہوا اور مجھ سے کہا کہ یہ دعا قوی دوا ہے۔ ہر شخص یہ دوا منگا کر کھوئی ہوئی صحت حاصل کیجئے۔

عنایت دہلوی۔ ایڈیٹر چونچ کلکتہ

مسٹر ایم ڈی انور خاں بی۔ اے

چتوڑ سے تحریر فرماتے ہیں کہ مجھے جریان کا مرض لاحق تھا۔ اس مرض سے زندہ در گور تھا۔ آپ کی دعا نے مرض کو جڑ سے غائب کر دیا میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں مہربانی فرما کر ایک شیشی مقوی گولیاں اور بھیج کر مشکور فرمائیں۔

مسٹر ہری رام

[illegible] سپتال گوالیار [illegible] مرض کو استعمال [illegible] بے حد مفید پائی گئی۔

[illegible]

[illegible] یہ دوائیں استعمال کیں [illegible] بیں کہ چند مریضوں پر استعمال کرائی بے حد مفید پائی۔

ڈاکٹر ڈی۔ این ساما راؤ

مدراس سے تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کی مقوی گولیاں اپنے ایک مریض کو استعمال کرائیں۔ مریض کمزوری وغیرہ کی شکایات میں مبتلا تھا۔ استعمال کرانے پر حسب خواہش تندرست ہو گیا واقعی یہ دوا بہت فائدہ مند ہے۔

حکیم اینڈ وید پنڈت ارجن داس شرما

ہوشیارپور سے تحریر فرماتے ہیں۔ یہ دوائی ان مریضوں کے لئے جو بچپن کی غلط کاریوں کے باعث ناکارہ ہو چکے ہیں از حد فائدہ مند ہے میرے خیال میں اس کے برابر دنیا بھر میں کوئی دوائی نہیں جس مریض کے لئے یہ دوائی منگائی تھی وہ بالکل تندرست ہو گیا ہے براہ کرم دو کورس مزید دوائی فرمائیں۔

ڈاکٹر شاہ خیرات امام

[illegible]

سال اجرا موسم بہار ۱۹۳۰ء — عرصہ اشاعت ۱۲ سال

قصر الادب کا خالص علمی۔ ادبی اور فنی ماہنامہ

شاعر آگرہ

زیر سرپرستی

اعلیٰحضرت رسوا مظلومی والیٔ پاجود (کاٹھیاواڑ)

منظور شدہ

محکمہ ہائے تعلیم صوبہ ممالک متوسط و برار - ریاست میسور - ریاست کشمیر

چندہ سالانہ

عوام سے	۴	معاونین سے	۲۴
خواص سے	۶	مربیوں سے	۵۰
ہمدردوں سے	۱۲	محسنین سے	۶۰
انیسوں سے	۱۵	سرپرستوں سے	۱۲۵

ششماہی ۳ ــــــ فی پرچہ ۶

اشاعت گاہ مکتبہ قصر الادب آگرہ

تعارُف

تصویر :- مخدوم سیّد علی اسد نقوی البخاری احمد آبادی

جلد ۱۳ | ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۹

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
	مقالاتِ مدیری		
۱	جرعات	اعجاز صدیقی	۷
۲	شخصیات	اعجاز صدیقی	۹
	علم و ادب		
۳	ایک غلط فہمی کا ازالہ	ماہر القادری	۱۲
۴	سیماب کی بعض شاعرانہ خصوصیات	حیدر رضا بدایونی	۱۴
۵	مرزا رجب علی بیگ سرور کے غیر مطبوعہ خطوط	اعجاز صدیقی	۲۵
۶	زندگی شاعر کی نظر میں	محمد صادق ضیائی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی	۳۶
۷	کیا "شرعات" فیضی کا مختار ہے؟	اعجاز صدیقی	۴۴
۸	موحد اعظم اور مفتی اعظم	مولانا سلیم الدین جالب مظاہری سہسرامی	۵۵
	حکایت و افسانہ		
۹	ماں	مخمور عثمانی	۲۲
۱۰	کیا وہ طوائف تھی؟	اعلیحضرت رسوا مظلومی والئی باجود	۳۲
۱۱	اقتضائے محبت	صبا متھرادی	۴۹
	منظومات		
۱۲	شعر انقلاب	علامہ سیماب اکبرآبادی	۸
۱۳	صفیر جنگ	علامہ سیماب اکبرآبادی	۱۱
۱۴	مشاہداتِ نو	مضطر گجراتی	۱۳
۱۵	معصوم آرزوئیں	شائق ہنگامی بی۔ اے	۲۳
۱۶	نشاطِ خاطر	علامہ سیماب اکبرآبادی	۲۴
۱۷	مسرتِ آشیاں سے پہلے	ڈاکٹر زیب بریلوی	۳۰
۱۸	نوائے میکش	میکش اکبرآبادی	۳۱
۱۹	حفظِ امانت	کوکب شاہجہانپوری	۳۱
۲۰	محسوساتِ ماہر	ماہر القادری	۳۵
۲۱	گذارش	خیام ہندی	۳۵
۲۲	کہکشاں اٹھی	ہلال رہبی کوکشی	۳۷
۲۳	سوزِ تمام	افسر سیمابی احمد نگری	۳۸
۲۴	حیات	درد کاکوروی	۳۸
۲۵	نفی و اثبات	مہر نظامی میرٹھی	۴۲
۲۶	عروسِ فطرت	الم مظفر نگری	۴۳
۲۷	**مشاعرۂ شاعر** — حضرت نشتر ہنگامی۔ حضرت الم مظفر نگری حضرت صابر اکبرآبادی بی اے حضرت رونق دکنی۔ حضرت مہر نقوی جے پوری۔ حضرت شاعر نہٹوری وغیرہ		۵۵

محسنین مربی معاونین انیسان ہمدردان شاعر

محسنین ادب و شعر

(۱) محسن ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ۶۰ عہ سالانہ

(۲) محسن ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیر خورجوی ۶۰ عہ سالانہ

(۳) محسنہ ادب ہر ہائینس علیہ حضرت کتیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ عہ سالانہ

(۴) محسنہ ادب شہزادی تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ عہ سالانہ

(۵) محسن ادب جناب محترم وزیرزادہ شجاعت خانصاحب قہر جوناگڈھی ۶۰ عہ سالانہ

مربیان ادب و شعر

(۶) مربی ادب جناب محترم میاں نعمت اللہ خانصاحب خلف میاں سرکرنل حشمت اللہ خاں مرحوم کے۔ بی ہوم منسٹر ریاست گوالیار ۵۰ عہ سالانہ

معاونین ادب

(۷) معاون ادب شرماجی بی فلیس صابر بی۔ اے اکبرآبادی للوعہ ۲۴ سالانہ

(۸) معاونہ ادب محترمہ تصدق ایم۔ اے بی ٹی للوعہ ۲۴ سالانہ

(۹) معاون ادب جناب مولوی محبوب حسن صاحب آسی مومن ٹرنگ بمبئی للوعہ ۲۴ سالانہ

انیسان ادب

(۱۰) انیس ادب جناب سید تفضل کریم صاحب جمشید پور عہ ۱۵ سالانہ

ہمدردان ادب

(۱۱) ہمدرد ادب جناب گوری عبدالغفور صاحب سلطان جالندھری عہ ۱۲ سالانہ

(۱۲) ہمدرد ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب تسنیم گوالیاری مرحوم عہ ۱۲ سالانہ

(۱۳) ہمدرد ادب جناب نوابزادہ شکوہ حسین خانصاحب قیس آف پنڈول عہ ۱۲ سالانہ

(۱۴) ہمدرد ادب جناب عبدالعظیم خانصاحب وفا دکنی جمشید پور عہ ۱۲ سالانہ

(۱۵) ہمدرد ادب جناب صاحبزادہ سید مظفر حسین صاحب گورنمنٹ جمعدار (فائل رادھارام) عہ ۱۲ سالانہ

(۱۶) ہمدرد ادب جناب اکمل لوکھر صاحب ناز جوناگڈھی عہ ۱۲ سالانہ

(۱۷) ہمدرد ادب جناب مخدوم سید علی اختر صاحب نقوی البخاری احمدآبادی عہ ۱۲ سالانہ

(۱۸) ہمدرد ادب جناب لالہ عمر میاں حسن میاں صاحب نظامی کھول عہ ۱۲ سالانہ

(۱۹) ہمدرد ادب خانصاحب عبدالمجید خاں آف ماندور عہ ۱۲ سالانہ

خاصان ادب

(۲۰) جناب صاحبزادہ سلطان حامد خانصاحب فردی محسن آبادی ۶ سے سالانہ

(۲۱) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمان خانصاحب شفق ٹونکی ۶ سے سالانہ

(۲۲) جناب سید الحفیظ صاحب تر صدیقی جیراوی بی۔ اے ۶ سے سالانہ

(۲۳) جناب بالک رام صاحب ادیب بہندی ۶ سے سالانہ

(۲۴) [illegible]

[illegible]

(۲۹) جناب نذیر احمد صاحب نذیر سشیر کوٹی ۶ سے سالانہ

(۳۰) جناب صبغۃ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی ۶ سے سالانہ

(۳۱) جناب پریم چند صاحب پریم دہلوی ۶ سے سالانہ

(۳۲) جناب ملک نرنجن لال لدھیانوی ۶ سے سالانہ

(۳۳) جناب سبحان خانصاحب غافل بتول ۶ سے سالانہ

(۳۴) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی کوٹا ہہ ۶ سے سالانہ

(۳۵) جناب حبیب حسن خانصاحب حبیب خاں جہانپوری (کوئٹہ) ۶ سے سالانہ

(۳۶) جناب ابو نیفر محمد خانصاحب عارف سیالکوٹی (کوئٹہ) ۶ سے سالانہ

(۳۷) جناب شیو پرشاد صاحب برگ باندوی ۶ سے سالانہ

(۳۸) جناب ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب نازر کاندھلوی ۶ سے سالانہ

(۳۹) جناب علامہ پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی ۶ سے سالانہ

(۴۰) جناب سید غلام مرتضی صاحب شاعر شکوری ۶ سے سالانہ

(۴۱) جناب مسٹر کالو میاں صاحب مذاق ڈبوہی (تھدود) اسٹیٹ ۶ سے سالانہ

(۴۲) جناب ایم عنایت اللہ خانصاحب عنایت گورداسپوری رئیس میونسپل کمشنر ۶ سے سالانہ

(۴۳) جناب کنور فاروق علیخاں صاحب عارف رئیس مینڈو ۶ سے سالانہ

(۴۴) جناب صوبیدار افتر علی صاحب اختر گوالیاری ۶ سے سالانہ

(۴۵) جناب ڈاکٹر ماتا پرشاد صاحب استمانہ زیب بریلوی ۶ سے سالانہ

(۴۶) جناب مقبول احمد صاحب اعظم گڈھی ۶ سے سالانہ

(۴۷) جناب مولوی مظہر الدین صاحب مظہر رامداسی گورداسپوری ۶ سے سالانہ

(۴۸) جناب حبیب الرحمان صاحب حبیب آروی جمشید پور ۶ سے سالانہ

(۴۹) جناب مولوی محمد احسان خانصاحب احسان توقیع پھلواری (بہار) ۶ سے سالانہ

(۵۰) جناب مولوی نصیر الدین صاحب جنتہ اسارہ (میرٹھ) ۶ سے سالانہ

(۵۱) [illegible]

[illegible]

جرعات

گذارشِ احوالِ واقعی

روس کے اہم ترین حصہ زمین **کاکیشیا** کا اُن ہمارے سامنے کاکیشیا کے بعض وسیع علاقوں پر جرمنوں کے قبضہ نے جنگ کا ایک نیا رُخ پیش کر دیا ہے۔ اس سے **بقول** خود اتحادیوں کی مشکلوں میں اضافے ہو گئے ہیں اور مشرقی ممالک، خصوصاً **عراق** و ایران کے لئے زیادہ خطرہ بڑھ گیا ہے۔ نئے محاذوں کی تیاری تیزی سے ہو رہی ہے ہندوستان کا اندرونی خلفشار بڑھتا جا رہا ہے اور تحریکِ آزادی کو دبا دینے کے باوجود اُس کی بازگشت فضا میں محسوس کی جا رہی ہے کانگریس اور حکومت کی رسہ کشی کا پہلا ڈراپ، ہم دیکھ چکے گرانی اور اجناس کی کمیابی ونایابی ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہے اور اب سب گراں جانی محسوس کر رہے ہیں رسل و رسائل کے ذرائع کم سے کم تر ہو چکے ہیں۔ جگہ جگہ ہندوستانیوں پر بلووں کا تاوان لگایا جا رہا ہے۔ ایک طرف سیلاب کی تباہ کاریاں ہیں تو دوسری طرف وباؤں کی گرم بازاری ——— وقت کا یہی تقاضا ہے کہ ہم ہر لمحہ ہوشیار و خبردار رہیں اور اپنے عزائم میں اضمحلال پیدا نہ ہونے دیں۔

گذشتہ دو ماہ میں ہماری صحافت موجودہ انقلاب سے جتنی اثر پذیر ہوئی ہے اتنی اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ حریت پرست اخبارات کی ایک بہت بڑی تعداد بند ہو چکی ہے اور جو جاری ہیں وہ بھی شاید جاری نہ رہ سکیں۔ مسلسل ہڑتال اور انفرادی طور پر کاغذیوں کی دکانیں بند ہونے کی وجہ سے اس ماہ ادبی رسائل تاخیر سے شائع ہو رہے ہیں اور بعض دو ماہ کی مشترکہ اشاعت پیش کرنے پر مجبور ہیں۔ دوسرے رسائل کے لئے جو دقتیں ہیں وہی بلکہ یوں کہیئے کہ اُن سے کچھ زیادہ آپ کے "شاعر" کے لئے بھی ہیں۔ گذشتہ ماہ کا "شاعر" صرف دو دن کی تاخیر سے شائع ہوا تھا اور اس کی اشاعت کے فوراً ہی بعد ملک میں جگہ جگہ ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت بڑی تعداد میں پرچے غائب ہو گئے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح خریداروں کو دوبارہ بھیج دیئے گئے۔

گذشتہ ماہ کا "شاعر" بہت پسند کیا گیا چونکہ اس ماہ کے مضامین کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ اس لئے تازہ اشاعت کے دیکھنے کا اشتیاق عام طور پر بڑھ گیا۔ مجھے بیحد افسوس ہے کہ بعض مضامین کی طوالت نے باب "**اصلاحِ سخن**" اور اعلان کردہ مضامین میں سے **مولوی احسان اللہ خاں ثاقب** اور **نغماتِ حجاز کی ایک لے** کی اشاعت کو ناممکن بنا دیا۔ یہ دونوں مضامین آئندہ اشاعت میں شریک ہونگے **حضرت صبا رشیدی** ایم۔ اے ہمارے ایک ممتاز ادیب شاعر ہیں۔ آپکی نثر اس قدر دلکش اور معیاری ہوتی ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے موصوف اپنی طویل علالت کی وجہ سے مدت سے شریکِ بزمِ "شاعر" نہ ہو سکے تھے۔ آئندہ اشاعت میں آپ انھیں سازِ حجاز پر زمزمہ پرداز دیکھیں گے۔ ذیل میں آئندہ اشاعت کے مضامین کی ایک بے ترتیب فہرست پیش کی جا رہی ہے۔ یوں تو ہر مضمون دلچسپ اور معلومات آفریں ہوگا لیکن **حضرت ماہر القادری** کا مضمون **کتب خانہ میں ایک سانحہ** کچھ ایسے انداز میں پیش کریگا جو اُردو ادب میں اضافے کے جا سکینگے اور جن کا علم بہت کم لوگوں کو ہے۔ یہ مضمون ریاست رامپور کی سرکاری لائبریری سے متعلق ہے۔ گویا ایک تحقیق اور شاہانہ چیز ہے پھر ماہر القادری کی رس بھری زبان سونے میں سہاگہ ہے۔ **نغماتِ حجاز کی ایک لے** از صبا رشیدی ایم۔ اے۔ **مولوی احسان اللہ خاں ثاقب** از مولانا انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی **عمر قبل الحجاب** از سید ظہیر الدین مدنی ایم۔ اے۔ **حضرت مذاق جبلپوری** از پروفیسر غلام مصطفےٰ خاں ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) **پنجابی شعر و شاعری** از مخدوم سید علی اسد نقوی البخاری۔ **مرنے سے کے باہر** (افسانہ) از رشدی بھوپالی **طالب** (افسانہ) از ظلال بریمی۔ ان کے علاوہ مشاہیر شعرا کی نظمیں و غزلیں بھی پیشِ نظر ہونگی۔ عام طور پر اُردو رسائل افسانوی ادب پیش کر رہے ہیں۔ میں افسانوں کا مخالف نہیں لیکن یہ بھی نہ ہونا چاہیئے کہ کسی رسالے میں سرے سے علمی و ادبی مضامین ہی نہ ہوں ——— یہ تو ہمارے مذاق کو پست کرنا ہے۔ پھر افسانے بھی تیسرے درجہ کے جن میں زیادہ تر پرانے شائع شدہ افسانوں کی صدائے بازگشت ہوتی ہے۔ تخلیقی چیزیں صرف وہی افسانہ نگار پیش کر رہے ہیں جو اپنے دل و دماغ پر قابو یافتہ ہیں اور افسانوی ادب کا بطورِ خاص مطالعہ کر چکے ہیں۔ ورنہ عام طور پر چربے اتارے جاتے ہیں اور پلاٹ چرائے جاتے ہیں۔ اس ذیل میں اگر تحقیق سے کام لیا جائے تو اسّی فیصدی افسانے پرانے افسانوں کی بگڑی ہوئی صورت ہونگے۔ "شاعر" کی کسی آئندہ اشاعت میں ایک مشہور افسانہ نگار کی جرات بیباکانہ پر قلم اٹھایا جائے گا۔ کاش ایسے ادبا اور افسانہ نگاروں کے لئے کوئی قانونی گرفت ہوتی۔

اگست کے "شاعر" میں چندہ کے بڑھانے اور شاعرانہ طبقات کی فراخ حوصلگی کے متعلق اظہارِ مسرت کیا گیا لیکن **وی پیوں** کی واپسی نے میری توقعات کو بُری طرح مجروح کر دیا۔ کب تک یہ گذارش کیجئے کہ اگر خریداری منظور نہ ہو تو ایک کارڈ کے ذریعہ اطلاع دیدی جائے تاکہ ادارہ کو نقصان نہ ہو "شاعر" کا نقصان زبان و ادب کا نقصان ہے اور زبان و ادب کا نقصان آپ کا نقصان ہے۔

کیا اب بھی میری گذارش قابلِ اعتنا نہ ہوگی؟ اس ماہ سے "شاعر" کا بین السطور اور گنجان کر دیا گیا ہے تاکہ مضامین کے لئے زیادہ سے زیادہ جگہ نکل سکے ——— میں اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوں آپ کو بھی "**شاعر نوازی**" کا احساس ہونا چاہیئے۔

اعجاز صدیقی

شعرِ انقلاب

ناگزیر

نیامِ کہنۂ ہندوستاں ہے زنگ آلود — یہاں رُکی ہوئی صدیوں سے ہیں فتوح وکشود

جلالِ تیغ وکمر صرف ہے دکھانے کو — کمالِ علم و ہنر سے غرض ہے نام ونمود

معاشرت ہو کہ مذہب ہو یا تمدّن ہو — رواج و رسمِ غلط کے سوا نہیں مقصود

اسی مٹی ہوئی تہذیب کا نتیجہ ہے — ترنگ محلوں میں عشرت مآبیوں کا وجود

جمود عام سہی زادگانِ فطرت کا — مگر نہیں ابھی فطرت پر اعتبارِ جمود

ہیں انقلاب کے آثار فطرتاً پیدا — اور اب علاج ہے اس کا نہ آرتھی نہ سجود

یہ اختلال جو پیدا ہے خلطِ مبحث سے — خلا کو بھرنے پہ مجبور ہے بدیر و بزود

بکا و نالہ سے توہینِ انقلاب نہ کر — صلائے وقت کا شکوہ گذار ہے مردود

فریبِ کوششِ اصلاحِ حال ہی بیکار — کہ ہے گرفتِ فنا میں یہ دورِ نامسعود

پُرآب شد چو سفینہ ز بندِ سیل چہ سود!

سیماب اکبر آبادی

شخصیات :- جناب اسدؔ نقوی البخاری احمد آبادی

پنجاب اِس دَور میں اُردو کے جتنے نئے اور خوش فکر ادیب و شاعر پیش کر رہا ہے اُس کا مقابلہ کوئی صوبہ نہیں کر سکتا اور اس اعتبار سے تمام ہندوستان کے ادبی مراکز میں پنجاب کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ یو۔پی میں بہت سے نوجوان ادیب و شاعر اُٹھے لیکن اسے ذوقِ صحیح کی کمی سمجھئے یا وقت کی نامساعدت کہ اب اُن میں سے بہت کم نظر آتے ہیں۔ پنجاب میں بھی یہی ہوتا رہا ہے کہ کچھ نئے ادیب اور شاعر اُبھرے اور کچھ تھک کر بیٹھ رہے لیکن وہاں اُبھرنے والوں کی تعداد زیادہ اور تھک کر بیٹھ جانے والوں کی تعداد کم ہے۔

جناب اسدؔ نقوی بھی پنجاب کے نوخیز و نوجوان شاعر ہیں اور بظاہر تھک کر بیٹھ جانے والوں میں سے معلوم نہیں ہوتے۔ اِن کے ساتھ عزائم کا ایک طوفان اور ارادوں کی ایک بھیڑ ہے۔ خدا اِس کا پورا نام سید علی ہی اسدؔ تخلص ہے۔ نقوی البخاری نسبتی الحاق ہے ۱۳ نومبر ۱۹۲۰ء کو موضع احمد آباد تحصیل چنیوٹ ضلع جھنگ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام نامی مخدوم سردار سید میاں چراغ علی شاہ ہے۔ ضلع جھنگ کے بڑے رؤسا میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ اسدؔ صاحب کا خاندان ساداتِ ہند میں بہت ہی افضل و اعلیٰ ہے۔ آپ مجددِ اعظم مخدوم حضرت پیر شیخ اسمٰعیل بخاریؒ کی اولاد سے ہیں۔ خاندانی سلسلہ حضرت پیر مخدوم جہانیاں جہاں گشت اور حضرت پیر شیر شاہ سید جلال قطب کمال تک پہونچ کر حضرت امام نقی رضہ سے مل جاتا ہے۔ آپ کے جدّ امجد حضرت پیر شیخ اسمٰعیل بخاریؒ کا مزار پاک چنیوٹ ضلع جھنگ میں ہے۔ صوبہ پنجاب کی تمام دیہی اقوام شاہ صاحب کی مرید ہیں آپکے خاندان کے سید پانچ اضلاع میں پھیلے ہوئے ہیں، شاہ پور۔ جھنگ۔ ملتان لائل پور اور شیخوپورہ ان میں سے ہر قبیلہ دینی اور دنیاوی نعمتوں سے مالا مال اور بڑی بڑی جائدادوں کا مالک ہے۔

چونکہ اسدؔ صاحب کے خاندانی افراد اونچے درجے کے زمیندار اور وسیع و عریض زمینوں کے مالک ہیں اس لئے اعلیٰ تعلیم کی طرف زیادہ متوجہ نہیں۔ حالانکہ آپ سے سو سال پہلے اس خاندان میں عربی اور فارسی کے ماہر اور عالم موجود تھے۔ جن کی تصانیف کے قلمی نسخے ابتک محفوظ ہیں۔ انگریزی تعلیم اور تہذیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے رہا سہا ذوقِ علم بھی اِن لوگوں سے چھین لیا۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہو کہ اسدؔ صاحب اپنے خاندان میں پہلے انگریزی تعلیم یافتہ ہیں۔

اسدؔ صاحب نے ڈی۔ بی لوور مڈل اسکول احمد آباد سے پرائمری امتحان پاس کیا۔ پھر ۱۹۳۰ء میں اسلامیہ ہائی اسکول چنیوٹ کی پانچویں جماعت میں داخل ہوگئے۔ اور جناب سید عبد الجلیل شاہ صاحب سیالکوٹی سکنڈ ٹیچر اسکول مذکور کی نگرانی میں تعلیم پاتے رہے۔ وہیں سے ۱۹۳۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر مرے کالج" سیالکوٹ میں داخلہ لے لیا۔ اسی سال [illegible] جب آپ وطن آئے تو دل میں نیا جوش اور ایک تڑپنے والا ولولہ تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ اپنے خاندان میں سیاسی بیداری پیدا کریں۔ اُس زمانہ کے جذبات کا ذیل کی نظم سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ اُسی زمانہ کی نظم ہے۔

باغی کی دُعا

خداوندا! غلام آباد کے ہر بسنے والے کو | اک ایسا سر عطا کر دے، اک ایسا دل عطا کر دے
جو ظلم و جور و استبداد کی شرح بیاں کر کے | وطن کے ہر سپاہی کو بغاوت آشنا کر دے
عطا کر اس طرح ہر ایک دل کو ذوقِ آزادی | کہ ماں بیٹے کو مرنے کی اجازت مسکرا کر دے
دلوں میں اسقدر حُبِّ وطن کا جوش پیدا ہو | کہ دولہا کو عروسِ نو بھی مجبورِ وغا کر دے
کہیں مانگے سے تخت و تاج جیسی شے بھی ملتی ہے | اُٹھو اور اُٹھ کے لو، خود ہی یہ جو خدا کر دے
رنگے تھے ہاتھ جن لوگوں نے خون سے تیری بچوں کے | لہو سے اُنکے ہولی کھیلنے کی ابتدا کر دے
غضب ہے تو نے یادِ اسلاف کی بالکل بھلا ڈالی | یہی ہے وہ یاد تازہ ہو تو اک محشر بپا کر دے
خدایا! ہند میں ٹیپو سا پھر جرار پیدا کر | جو ضربِ آہنی سے قصرِ باطل کو فنا کر دے
الٰہی! جس کو اک نانِ جویں بخشی ہے کھانے کو | اُسے اپنے کرم سے زورِ حیدرؓ بھی عطا کر دے
تپنے تکمیلِ جذباتِ شہادت اسے سرفروشوں کو | اسیرِ گیسوئے رسمِ شہیدِ کربلا کر دے

اسدؔ تیرا ملوکیت کا باغی ہے، اُسے یارب
کمالِ لطف سے تو کامیابِ مدعا کر دے

جب خیالات و جذبات کا یہ عالم ہو تو تعلیم میں جی نہ لگنا ایک فطری امر ہے۔ چنانچہ "مرے کالج" میں آپ کا دل نہ لگا۔ نومبر ۱۹۳۶ء میں وہاں سے منتقل ہو کر گورنمنٹ کالج لائل پور میں آگئے یہاں سے چنیوٹ صرف بائیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ چنانچہ وہاں آنے جانے میں آسانی پیدا ہوگئی اور آپ سیاسی معاملات میں دل کھول کر حصّہ لینے لگے۔ اسی سلسلے میں دو سال تک کالج بھی نہ گئے۔ آپ نے اپنے بیش قیمت وقت کی عظیم قربانی دیکر اپنی قوم میں زندگی اور بیداری پیدا کی۔ اسی چنیوٹ میں جہاں افرادِ خاندان کی غفلتوں سے "قاضی گردی" کا دور دورہ تھا اور وہ لوگ جو آپ ہی کے خاندان کی دولت سے بڑھے تھے، میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ پر اپنا تسلط کئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا اور آپ کے خاندان کی سیادت کا علم لہرانے لگا۔

شعر و سخن کا ذوق آپ کو فطرتاً ودیعت ہوا ہے۔ کسی فطری شاعر کے لئے یہ کہنا کہ اُس نے ہوش سنبھالتے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا ایک رسمی بات ہے۔ اسدؔ صاحب کا ذوقِ شعری تحت الشعور کو پہونچکر نمایاں ہوا۔ یعنی جب آپ اسکول کی نویں جماعت میں تھے تو پہلی ایک غزل جس کا مطلع یہ تھا ؎

آنکھوں میں شیخ و شاب کی مے کا خمار دیکھ
زاہد بھی کہہ رہا ہے کہ آئی بہار دیکھ

اپنے اُردو فارسی کے استاد مرزا عاشق علی بیگ صاحب خیالؔ مرادآبادی کے پاس اصلاح کے لئے لے گئے تو انھوں نے بجائے حوصلہ افزائی کے شعرگوئی کی ممانعت کر دی۔ کچھ دن تک اسدؔ صاحب نے اُن کے حکم کی تعمیل کی، لیکن سیلاب کہیں بند باندھنے سے رکتا ہے، یہ قید عارضی ثابت ہوئی اور پھر طبیعت کا دھارا بہنے لگا۔ لیکن اسدؔ صاحب کو اس کا یقین نہ تھا کہ اس دھارے نے صحیح راستہ اختیار کیا ہے یا غلط۔ چنانچہ شعر کہتے رہے، بے مقصد بلا ارادہ اور جب ذوق و وجدان نے کلام میں سنجیدگی پیدا کر دی اور آپ فکر کی پیچ در پیچ وادیوں میں بھٹکنے لگے تو رہبر کی ضرورت ہوئی اور سنہ ۱۹۴۹ء میں حضرت علامہ سیمابؔ مدظلہ کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو گئے۔

ابھی مکمل طور پر زندگی کی خود اختیاریوں اور خود اعتمادیوں پر قابو یاب نہیں ہوئے ہیں۔ اِدھر حالات بھی ساعد نہیں گویا ایک بھٹکے ہوئے آہو کی طرح حیات کی وسعتوں میں دوڑ رہے ہیں۔ زندگی کا وہ باب ابھی شروع نہیں ہوا ہے جہاں سکون کی دیویاں رقص کرتی ہیں اور مسرت کے آفتاب و ماہتاب طلوع ہوتے ہیں۔ اگر مشیت نے وہ دن رات دکھائے تو اُمید کی جاتی ہے کہ برجِ اسد سے طلوع ہونے والا یہ تارہ ضرور فروزاں اور تاباں ہوگا۔

اسدؔ صاحب کے کلام میں ایک سادگی اور تیکھا پن ہے ہر چند خیالات میں پختگی اور علو نہیں لیکن پڑھنے والے کو ایک لذت ضرور محسوس ہوتی ہے، جوانی میں عشق و محبت کے حادثے ناگزیر اور نظم و غزل پر اُن کا اثر نابدی کہا جا سکتا ہے اس لئے نوجوانوں سے تغزل کا مطالبہ کچھ بیجا ہی ہے لیکن سنجیدگی اور متانت کا خیال ضرور رکھنا چاہئے ——— اسدؔ صاحب کے یہاں یہ چیز پائی جاتی ہے۔ پنجاب کے نوجوان شعرا میں اسدؔ صاحب کو خاص انفرادیت حاصل ہے۔ **نمونۂ کلام ملاحظہ ہو** ؎

وہ جانِ صد بہار آئے نہ آئے — مرے دل کو قرار آئے نہ آئے
قفس کو باغ میں صیاد رکھ دے — نہ جانے پھر بہار آئے نہ آئے
ہم اپنی جان دے بیٹھے وفا میں — کوئی سوئے مزار آئے نہ آئے

چمن ہی پہ موقوف نزہت نہیں ہے — نظر ہو تو گلہائے تر اور بھی ہیں

شامِ غربت میں اُمڈ آئیں گھٹائیں غم کی — کیا نہ ہوگی مرے اللہ سحر آج کی رات

عمر بھر جن کی تمنا میں نہ سوئیں آنکھیں — ہیں دمِ نزع وہ محفوظِ نظر آج کی رات

ہے عمرِ خضر ہیچ جو ذوقِ عمل نہ ہو — پروانہ وار چند نفس جاوداں بنا

اسدؔ فرزانگی سے ہے بھلی دیوانگی بہتر — کہ دیوانوں کو احساسِ غم دنیا نہیں ہوتا

اعجاز صدیقی

صفحۂ جنا

(نفسیاتی اشارات)

اِس عقدۂ بے حسی کا حل کیا ہوگا
نادانیوں کا ردِّ عمل کیا ہوگا
ہیں آج کے حالات سے ہم ناواقف
اور یہ بھی خبر نہیں ہے۔ کل کیا ہوگا؟

مستقبلِ عالم آل کیا ہوگا؟
اس پر اثرِ جنگ و جدل کیا ہوگا؟
آئیگا اک انقلاب، اسکا ہے یقیں
یہ کون کہے ردّ و بدل کیا ہوگا؟

ہاں نیتِ یارانِ وطن صاف نہیں
ظاہر ہے کہ باطنِ چمن صاف نہیں
تہذیبِ نوی کی دیکھ صنعت کاری
تن صاف ہے انسان کا مَن صاف نہیں

ارشاد کی مجلسیں سجانے والے
دنیا کو فریب میں ہیں لانے والے
کردار کے تاریک ملے تجربتاً
گفتار کی بجلیاں گرانے والے

نیرنگِ نظر ہے عالمِ امکاں بھی
دشوار ہے زندگی یہاں آساں بھی
آزاد ہوا انساں تو گیتی ہے ایواں
ورنہ زنداں ہے قصرِ آغا خاں بھی

مانا سُلطانِ ہفت کشور تُو ہے
دلدار نہیں تو گُلِ بےخوشبو ہے
اجسام پہ غالب آکے مغرور نہ ہو
یہ دیکھ، دِلوں پر بھی ترا قابو ہے؟

دل جس نے محبت سے یہاں جیت لئے
اُسنے دراصل دو جہاں جیت لئے
دل توڑ دیا شکستِ کامل پائی
دل جیت لیا۔ کون و مکاں جیت لئے

آہن نہ سہی، روئی کا گالا بھی نہیں
آسانی سے فتح ہونے والا بھی نہیں
ذہنِ اغیار میں ہے گو "لقمۂ تر"
یہ ہند مگر منہ کا نوالا بھی نہیں

باطل منزل کی داستانیں ہیں ابھی
اسلام کی سدِّ راہ شانیں ہیں ابھی
ٹرکی و عراق مصر و ایران و حجاز
اس راہ میں کچھ سخت چٹانیں ہیں ابھی

ہنگامے سے نظمِ ہست و بود اچھا ہے
پیرایۂ آئین و قیود اچھا ہے
جس شور سے امن میں خلل واقع ہو
اُس شور سے "عالمِ جمود" اچھا ہے

سیماب

تحقیق و تصحیح :-

ایک غلط فہمی کا ازالہ

میں اس چیز کا قائل نہیں ہوں کہ ہر جدت اور ہر نئی بات دلچسپ مفید اور ماننے کے قابل ہوتی ہے۔ ابداع، اجتہاد اور تخلیق کے بعض پہلو بہت زیادہ روشن ہوتے ہیں اور بعض بہت زیادہ تاریک۔ عام لوگوں کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی نئی آواز اٹھتی ہے تو وہ بغیر سوچے سمجھے اس کو "لبیک" کہنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، ایسے لوگوں ہی کے لئے تو "عوام کالانعام" کہا گیا ہے۔ میں ذہنی طور پر ہر چیز کو نقد و نظر کا مستحق سمجھتا ہوں، اور جب تک کوئی بات میری سمجھ میں آ جائے اور میرے ذوقِ جستجو کی تسکین نہ ہو جائے، میں صرف شخصیتوں سے متاثر ہو کر اپنے ضمیر کو زبردستی مطمئن نہیں بنا سکتا۔ شعر و ادب کے مسئلہ میں ہر شخص کو غور و فکر کا خوگر ہونا چاہئے۔ غور و فکر کی یہی عادت نگاہ کو عمیق اور مذاق کو بلند بناتی ہے۔

چند سال ہوئے پنجاب کے ایک مشہور رسالے نے "لفظی تحقیق" اور "غلطیوں کی اصلاح" کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، اس سلسلہ کی بعض کڑیاں اچھی مفید تھیں، مگر اس تصویر کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ موٹی موٹی سرخیوں اور جلی عنوانوں کے تحت "روحِ رواں" کو غلط بتایا گیا اور اس کی جگہ "روح و رواں" بولنے، لکھنے اور رواج دینے کی سفارش کی گئی۔ چنانچہ یہ بدعت اتنی زیادہ مقبول ہوئی کہ روزمرہ کی صحبتوں میں کوئی "روحِ رواں" بولتا ہے تو لوگ اس کو ٹوکتے ہیں کہ تم غلط بکتے ہو، صحیح لفظ "روح و رواں" ہے!

بہت دنوں سے یہ چیز کھٹک رہی تھی اور میں اس موضوع پر لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا، مگر میرا ارادہ صرف خیالی دنیا تک محدود تھا، چند دن ہوئے ایک ادبی اجتماع میں اس لفظ پر مجھ کو ایک صاحب سے مباحثہ ہوا اور اس بحث نے تحقیقِ لفظی کی بڑی دلچسپ صورت اختیار کر لی، اس ادبی مناظرہ نے مجھے اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے اکسایا، اور مختصر مضمون لوحِ خیال سے منتقل ہو کر صفحۂ قرطاس پر منقش ہو گیا، مضمون لکھنے کے بعد میں نے سوچا کہ ہندوستان کے کس پرچہ میں اسے اشاعت کے لئے بھیجنا چاہئے۔ تھوڑی دیر کے غور و فکر کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ماہنامہ "شاعر" جو شاعروں اور ادیبوں کا ترجمان اور نقیب ہے، اس مضمون کی اشاعت کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ فارسی شاعروں اور ادیبوں نے "روح و رواں" (واو عطف کے ساتھ) بھی لکھا ہے، مرزا غالب کی تحریروں میں بھی "روح و رواں" ملتا ہے، اس اعتراف کے بعد میں اصل مبحث کی طرف آتا ہوں۔

معترضین کا کہنا ہے کہ روح کے ساتھ رواں کا استعمال نامناسب اور فضول ہے کیونکہ روح تو رواں ہی ہوتی ہے، روانی اور جاری و ساری ہونا اس کی خاصیت میں داخل ہے، غیر رواں روح ہوتی ہی نہیں، اصل لفظ "روح و رواں" ہے، رواں کے معنی جان[1] کے ہیں اور مترادف الفاظ مثلاً عشق و محبت، خواہش و تمنا .... عام طور پر مستعمل ہوتے ہیں۔

اعتراض کا جواب

میری گزارش یہ ہے کہ اردو میں "روحِ رواں" کی طرح بہت سے الفاظ بولتے اور لکھتے ہیں، مثلاً "برقِ تپاں"۔ نظم و نثر دونوں صنفوں میں استعمال ہوتا ہے۔ معترضین نے "روحِ رواں" پر جو اعتراض وارد کیا تھا، اس کے لحاظ سے برقِ تپاں بھی غلط ہے کیونکہ تڑپنا (تپیدن) برق کی فطرت ہے، برق ساکت ہو ہی نہیں سکتی، برقِ غیر تپاں کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے، لیکن یہ بات ہر شخص پر روشن ہے کہ برقِ تپاں کی ترکیب پر آج تک کوئی اعتراض نہیں کیا گیا اور یہ لفظ عوام و خواص میں رائج بلکہ زبانوں پر چڑھا ہوا ہے تو پھر "روحِ رواں" نے آخر کیا قصور کیا ہے۔ کہ اس ترکیب کو آپ مردود قرار دیتے ہیں، بالکل اسی جیسی دوسری ترکیب (برقِ تپاں) کو آپ صحیح، جائز، درست اور فصیح سمجھ کر استعمال فرماتے ہیں۔

کلی جب کھل جاتی ہے تو اسے "پھول" کہا جاتا ہے۔ پھول کی فطرت ہی کھلنا اور ہنسنا ہے لیکن اس کے باوجود "گلِ خنداں" لکھا اور بولا جاتا ہے۔ اس قسم کے بہت سے لفظ مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ "خنداں" "لرزاں" "تپاں" اور "رواں" اسم حالیہ ہیں جو "گلِ خنداں" اور "روحِ رواں" میں اضافت کے ساتھ صفت کا کام دیتے ہیں۔ اس قسم کی صفتیں (جو حقیقت میں موصوف کی فطرت اور جوہرِ ذاتی ہوتی ہیں) کلام میں زور (FORCE) پیدا کرنے اور موصوف کی اہمیت دکھانے کے لئے بطورِ مبالغہ (EXAGGERATION) استعمال کی جاتی ہیں اور ان کو کسی عنوان غلط اور حشو و زوائد میں شمار نہیں کیا جا سکتا، جب ہم برقِ تپاں بولتے ہیں تو اس سے ہماری مراد بجلی کی تڑپ کا پُر زور اظہار ہوتا ہے، بالکل یہی صورت "روحِ رواں" کی ہے۔ "روحِ رواں" سے روح کی طاقت، اہمیت اور اس کی فاعلانہ حیثیت ظاہر ہوتی ہے۔ اردو میں جب ایسی بہت سی ترکیبیں مروج ہیں تو "روحِ رواں" کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔

میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ "روح و رواں" نہ لکھیں، میرا کہنا یہ ہے کہ "روحِ رواں" غلط نہیں ہے دونوں ترکیبیں استعمال ہونی چاہئیں، ناقدانِ ادب کی خدمت میں میری گزارش ہے کہ مروجہ الفاظ کی اصلاح کرنے سے پہلے لفظ کی ساخت اور اس کے ماقبل و مابعد پر اچھی طرح غور کر لینا چاہئے۔ میرا اجتہادی حکم نہیں ہے بلکہ مخلصانہ اور نیاز مندانہ مشورہ ہے — ماہر القادری

[1] سنسکرت میں اسے آتما کہتے ہیں

مشاہداتِ نو

آتش بہ پیرہن ہے چمن دیکھتا ہوں میں
بگڑا ہوا جہاں کا چلن دیکھتا ہوں میں

تیغوں تُلے ہیں مظاہرے میراثِ ارض پر
تجدیدِ رسمِ عہدِ کہن دیکھتا ہوں میں

نسرین و نسترن کے ہیں تیور چڑھے ہوئے
برہم مزاجِ سرو و سمن دیکھتا ہوں میں

وہ بستیاں جو جنتِ تسکیں فروش تھیں
اُنکو پُراز فساد و فتن دیکھتا ہوں میں

وہ ہستیاں جو عشرتِ تمکیں بدوش تھیں
اُنکو شکارِ رنج و محن دیکھتا ہوں میں

اُن مسکنوں کو تھے جو بہشتِ رباب و چنگ
خلوت سرائے بُوم و زغن دیکھتا ہوں میں

اُن ساکنوں کو تھے جو بہر حال مطمئن
آوارۂ سوادِ وطن دیکھتا ہوں میں

کتنا مہیب ہے یہ عناصر کا انقلاب
پانی میں آگ کی سی جلن دیکھتا ہوں میں

غلطاں بخاک و خوں ہے پریخانۂ بہار
دیوِ خزاں کو قہقہہ زن دیکھتا ہوں میں

طاری ہے برگ برگ پہ رنگِ شکستگی
کتنا گراں مآلِ چمن دیکھتا ہوں میں

تخریبِ کائنات میں فطرت بھی ہے شریک
جھونکوں کے دوش پر بھی کفن دیکھتا ہوں میں

قانونِ زندگی ہے بغاوت کے ہاتھ میں
ہر سُو ہجومِ دار و رسن دیکھتا ہوں میں

اب اُن لبوں پہ تھے جو مغنیٔ نشاط کے
آہوں کو جانشینِ سخن دیکھتا ہوں میں

اب اُن سَروں کو تھے جو خزانے حیات کے
بارِ تن و وبالِ بدن دیکھتا ہوں میں

اُن بے کسوں کو تھے جو زمانہ میں گوشہ گیر
قلبِ فضا میں غلغلہ زن دیکھتا ہوں میں

جنکو نہ گفتگو کا سلیقہ تھا اب اُنھیں
شائستۂ مذاقِ سخن دیکھتا ہوں میں

مجبورِ انقلاب رہے جو تمام عمر
آج اُنکو انقلاب فگن دیکھتا ہوں میں

کیف و الم کی صورِ طلب ہیں مثانتیں
بدلا ہوا وفا کا چلن دیکھتا ہوں میں

کس کا مزاج آج شریکِ چمن ہوا
پھولوں کی پتیوں پہ شکن دیکھتا ہوں میں

مضطرؔ ہے کوئی، جو مری نظروں کی ادا سے
شعلوں میں اہتمامِ چمن دیکھتا ہوں میں

مضطرؔ گجراتی

سیمابؔ کی بعض شاعرانہ خصوصیات

اردو کے مایۂ ناز ادیب مولانا حالیؔ مرحوم رقمطراز ہیں:۔

" قاعدہ ہے کہ جسقدر سوسائٹی کے خیالات، اسکی رائیں، اسکی عادتیں، اسکی رغبتیں اُسکا میلان اور مذاق بدلتا ہے اسی قدر شعر کی حالت بدلتی ہے"

حقیقت امر یہ ہے کہ ایک قومی شاعر کے لئے ناگزیر ہے کہ اپنے ماحول کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے سوسائٹی کے لئے مفید لائحہ عمل پیش کرے۔ غالباً ان ہی حقائق کی بنا پر ڈاکٹر ٹیگور کو اعتراف ہے:۔

"یہ صحیح ہے کہ تنہائی میں ادیب اپنے نفس سے ہمگوش ہوتا ہے لیکن سماج کو جاننے پہچاننے اور اسکی ترقی کی راہ کا پتہ دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم سماج کی نبض پر ہاتھ رکھیں اور اسکے دل کی دھڑکن کو سُنیں"

دیکھنا یہ ہے کہ سیمابؔ کے کلام نے متذکرۂ صدر نظریہ کی کس حد تک تائید و اعانت کی۔

سب سے پیشتر ہم اُسکے وطنیت آمیز اشعار پر بالاجمال روشنی ڈالیں گے اور دیکھیں گے کہ وہ کن وجوہ کی بنا پر افضل و فائق ہے۔

اہلِ ہند کی مغلوبانہ ذہنیت کا خاصہ یہ ہے کہ اپنے ملک و قوم کے لئے کسی قسم کی عملی قربانی پیش کرنے میں بگونہ انفعال محسوس کرتے ہیں ظاہر ہے کہ ایک وطن پرست شاعر اس جمود و تعطل کو بنظرِ استحسان نہیں دیکھ سکتا۔

سیمابؔ:۔

خواب طاری ہے تمہارے جذبۂ زرخیز پر   بارشِ تخریب ہے جذباتِ جوش انگیز پر
مرد ہو لیکن خلافِ اُسوۂ دیرینہ ہو   عورتوں کی طرح محوِ شانہ و آئینہ ہو

اس کے بعد سخت کوشی اور اعلائے ہمت کی تلقین کرتا ہے:۔

گلفشاں سبحوں پہ کب تک نازو اندازِ ایاز   لیکر اٹھو غزنوی کی ہمتِ آہن گداز
پھر وطن کے جیش میں بن جاؤ برق کارواں   پھر بساطِ عرش پر چھا جاؤ بنکر بجلیاں
پھینک دو ہاتھوں سے مایوسی کی تصویریں تمام   کھول دو پائے وطن سے آج زنجیریں تمام
توڑ دو بندِ غلامی اے غلامانِ وطن

یہی بات ایک دوسرے مقام پر ادا کی ہے:۔

گلستاں نزدیک تر ہے خانۂ صیاد سے   ہیں جوانانِ چمن مصروف خوابِ ناز میں
کاوشوں کی بجلیاں جب شعلہ افشاں ہو گئیں   خود بخود رنگِ چمن آتش نگن ہو جائیگا

اس مفہوم کا ایک اور شعر دیکھئے اور سیمابؔ کی جدت طرازِ فطنت کی داد دیجئے۔

لہو کی چند بوندیں چاہئیں عنوانِ افسانہ
کہیں سُرخ اشتہاروں سے ملا کرتی ہے آزادی

اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے روشن مستقبل کی طرف اشارہ کرنا بھی سیمابؔ ہی کا کام ہے۔

"خواب آشنائے جمود سے خطاب کرتا ہے:۔

جہاں میں انقلاب تازہ برپا ہونیوالا ہے   غلامی کے اندھیرے میں اُجالا ہونیوالا ہے
جوانانِ وطن میں اک تڑپ اک جوش پیدا ہے   گلستانِ وطن کا پتہ پتہ چونک اٹھا ہے
درائے کارواں نے جنبشیں دی ہیں زمانے کو   صدائے صور بنکر آئے ہیں نالے جگانے کو
بڑھے جائیں یہی کہدے کوئی یارانِ محفل سے   صدا "لبیک" کی آنے لگی ہے ضبطِ منزل سے

زمانہ کی ناساعدت کا اسے پورا پورا احساس ہے لیکن اسکے باوجود وہ نہایت تبسم آمیز انداز میں کہتا ہے:۔

ہوں لاکھ مشکلیں پیدا قدم بڑھانے میں   فلک ہے تمہیں مصروف آزمانے میں
بجا کہ شعلہ فشاں رہگزار بیجد ہے   بجا کہ زیرِ قدم خارزار بیجد ہے
بجا کہ چار طرف انتشار بیجد ہے   بجا کہ راہ میں گرد و غبار بیجد ہے
تم اپنے دامنوں کو ہاتھ سے اُٹھائے چلو!

ہندو مسلم اتحاد

منجملہ دیگر قابل تاسف مشکلات کے ہمارے ملک کی ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ باشندگانِ ہند کے مذاہب میں یکسر اختلاف ہے۔ یوماً فیوماً تنازعات روپذیر

لے مقدمۂ شعر و شاعری

ہوتے ہیں۔ ہندو مسلم طبقات علی الخصوص آمادۂ پیکار نظر آتے ہیں۔ دورِ حاضرہ میں سیاسی مفکرین اس بحرانی سقم کو دور کرنے میں معروف ہیں۔ اقبال مرحوم نے اپنی معروف نظم "نیا شوالہ" میں برہمن سے خطاب کیا ہے :۔

کچھ فکر پھوٹ کی کر، مالی ہے تو چمن کا　　گلشن کو پھونک ڈالا اس لس بھری ہوا نے
آ، اک نئی محبت کے پردوں کو پھر اٹھا دیں　　بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں

سیماب کو بھی اس نبرد آزمائی سے قلبی اذیت محسوس ہوتی ہے ؎

غبار اندوزیِ آئینۂ صبحِ چمن کب تک　　گوارا اضطرابِ نسترن و نسترن کب تک
شرارے اسکے بام و درپہ اب بھی جھلملاتے ہیں　　مگر یہ آگ برسے گی درونِ انجمن کب تک

مذاقِ کوثر و تسنیم تھا گنگا کی موجوں میں　　محبت کھیلتی تھی حسن سے جمنا کی موجوں میں
گئے وہ دن کہ حامی باغباں کے تھے گل و لالہ　　اب ان میں خود نمائی ہے تو ان میں شانِ خود رائی
نہ ہے خاموش مسلم اور نہ ہندو مائل تسکین　　نہ اس میں صبر کی قوت نہ اس میں ہے شکیبائی

اسکی خواہش یہ تھی کہ اہلِ ہند متفق الاغراض ہو کر سعیٔ آزادی کرتے لیکن فرقہ پرستی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا :۔

کہاں فرقہ پرستی اور کہاں سودائے آزادی　　یہاں تو وحدتِ قومی ہے شرطِ جادہ پیمائی
درائے کارواں میں اک توازن کی ضرورت ہے　　صدائیں متفق ہونگی تو گونج اٹھے گی آزادی

سیماب نے جہاں آزادی کی تصویر پیش کی ہے اس میں بھی اسی نظریہ کی جھلک نظر آتی ہے :۔

خلشِ گل کی جگر میں اور دل میں درد لالے کا　　ادھر اک ہاتھ میں مسجد ادھر گنبد شوالے کا
زباں پر نغمۂ ناقوس سے تنویر کی موجیں　　لبِ خود رنگ پر مچلی ہوئی تکبیر کی موجیں
ہمالہ کی پری اور طور کا اک جلوۂ رعنا　　جو اسکی اک نظر زمزم تو اسکی اک نظر گنگا

اسکا خیال ہے کہ ہماری غلامی اسوقت تک ہے جبتک ان فروعی اختلافات کو بالکل مسترد نہ کر دیا جائے۔ بالفاظِ دیگر نفاق اور محکومیت لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں :۔

اگر آئینۂ وطنی کا آئین مٹ نہیں سکتا　　تو ہے مشکل سکھانا صید کو آئینِ صیادی
موافق ہو فضا تو شاید اسکی دید ہو جائے　　ابھی سرگشتۂ محمل ہے حریت کی شہزادی

مختصراً اگر اتفاق و افتراق کے محاسن اور معائب کی جانب بھی اشارہ کر دیا جائے تو تاثرِ کلام میں مزید اضافہ ہو جائیگا۔ چنانچہ لکھتا ہے :۔

پھول جبتک شاخ سے اپنی جدا ہوتا نہیں　　مبتلائے شورشِ صرصر ہوا ہوتا نہیں
متحد تارے ہیں جبتک عالمِ افلاک پر　　زندگی تاباں ہے انکے دیدۂ ضوناک پر
جو مسافر کارواں سے اپنے آوارہ ہوا　　وادیٔ غربت کا وہ بے نور سیارہ ہوا

آخر کار بالتصریح کہتا ہے :۔

قوتِ کامل نہیں ہے دنیا میں بے اتحاد　　انکی قوت پر ہوا کرتا ہے قوموں کا جہاد

ہے اگر ثابت قدم تقلیدِ سیارہ نہ کر
رقصِ آزادی کی دھن میں خود کو آوارہ نہ کر

قومیت

سیماب جس طرح اپنے ہم وطنوں سے خاص شغف رکھتا ہے بعینہٖ وہ طبقۂ مسلمین کا بھی خواہ ہے اسی تخصیص سے ہمارے اکثر شعرا بے بہرہ رہے ہیں۔ ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سیماب انکی روبہ انحطاط حالت کو دیکھکر قنوطیت کا درس نہیں دیتا بلکہ خوش فکری اور اعلائے ہمت کی تلقین کرتا ہے۔

مسلم سے خطاب :۔

دکھا دے پھر زمانے کو کہ تو صلاً حجازی ہے　　جسے کہتے ہیں غفلت تیری شانِ بے نیازی ہے
چٹانوں پر ابھی تکبیر کی آواز کندہ ہے　　پہاڑ اب تک لرز جاتے ہیں تجھ سے تو وہ غازی ہے

اسکے بعد دعوتِ انقلاب دیتا ہے۔

حواسِ خمسہ کو لے ساتھ اور پھر جادہ پیما ہو　　غبارِ کارواں کب تک امیرِ کارواں ہو جا
ثبوت اس دور میں دے اپنی فطرت کی بلندی کا　　زمیں گردِ کدورت جب اٹھائے آسماں ہو جا

مذکورہ بالا مثالوں سے معلوم ہو گیا کہ سیماب ہمارے کسل و جمود کا سخت مانع ہے۔ ایک اور مقام پر بارگاہِ ایزدی میں استدعا پیش کرتا ہے :۔

عمل کی کند رفتاری کو اک بجلی عطا فرما　　دلِ مجبور کو پھر ہمتِ خود اختیاری دے
بہت مجبور ہے نشو و نمائے جسمِ قومیت　　ہوائے باغِ ملت کو مذاقِ سازگاری دے
مٹا ناہے تو پہنچا کر مثالِ عرش ترقی پر　　فلک جسکی زمیں ہو وہ عروجِ خاکساری دے
نظامِ ہستیٔ مسلم بدل دے حدِ ممکن تک　　قلم کو لوح پر پھر رحمتِ قسمت نگاری دے

چناں در گلشنِ ملت بہارِ اولیں آید
ز ہر برگش صدائے شہپرِ روح الامیں آید

یہاں تک ہم نے سیماب کے وطنیت و قومیت آمیز پیغامات سے بحث کی، اب ہم دیکھیں گے کہ وہ ایک بین الاقوامی شاعر کی حیثیت سے کیا درجہ رکھتا ہے ؟

بین الاقوامیت

سیماب کی شاعری کا بنظرِ تعمق مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی قومیت و وطنیت چند قدم آگے بڑھکر بین الاقوامیت کی شکل اختیار کرلیتی ہے، یعنی وہ اپنے ملک و قوم کے ساتھ ساتھ دیگر بنی نوعِ انسان کی مفاد رسانی اپنا فرضِ منصبی متصور کرتا ہے۔ اسکی قومیت بھی بین الاقوامیت کا متصل جزو ہے۔ جس میں عصبیانہ خشونت و تنگ نظری کا عنصر سراسر مفقود ہے۔ حقیقتاً یہ کوئی استعجاب انگیز امر نہیں۔ اس مسئلہ پر مزید بحث کرنیکے بجائے اُردو کے ایک فائق ترین شاعر حضرت جوش ملیح آبادی کی وقیع رائے نقل کردینا کافی ہوگی۔

جناب موصوف اپنے مجموعۂ نظم "شعلہ و شبنم" میں رقمطراز ہیں:۔

"میں تمام بنی نوعِ انسان کو ایک خاندان سمجھتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں اور وطنیت کے اس ناپاک تخیل کو جو خود غرضی تنگ نظری منافرت اور ابنِ آدم کی تقسیم چاہتا ہے۔ انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں لیکن اسقدر وطنیت میرا ایمان ہے کہ اپنے گھر کو غاصبوں کی دسترس سے محفوظ رکھا جائے"۔

اقبال نے اسی خیال کی صراحت اس طرح کی ہے:۔

آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو — امتیازِ ملت و آئیں سے دل آزاد ہو
بستۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں — نوعِ انساں قوم ہو میری وطن میرا جہاں

شاہدِ قدرت کا آئینہ ہو دل میرا نہ ہو
سر میں جز ہمدردیٔ انساں کوئی سودا نہ ہو

سیماب بھی فرقہ وارانہ خود غرضی کو بنظرِ پسندیدگی نہیں دیکھتا، اسکا خیال ہے:۔

مجھے کافی ہے دیوانگی بھولوں کی لغت ہے — عقیدت میں مری کل کائنات ایک نظمِ فطرت ہے
نہیں محدود رسم و راہ تک ذہنِ رسا میرا — ہو گرد آلود کیوں ان الجھنوں سے آئینہ میرا
خدا کا نام لیکر توڑتی ہیں میری تکبیریں — یہ کس نے ڈالدی ہیں پاؤں میں انسان کے زنجیریں؟

"وطن" کے زیرِ عنوان نظم بھی سیماب کے بین الاقوامی رجحانات کی آئینہ دار ہے دو شعر دیکھئے ؎

چمک تاروں کی راتوں کو یہ منزل بتاتی ہے — کسی کا ہو چمن خوشبو مجھے پھولوں کی آتی ہے

حقیقت میں زمیں سے آسماں تک ہے وطن میرا
یقیناً وسعتِ کون و مکاں تک ہے وطن میرا

وہ تمام نسلِ آدم کو ایک خاندان سمجھتا ہے اور فی الحقیقت تمیزِ رنگ و بو ... احوام امت کا قائل ہے ؎

رکھ لئے ہیں نام پھولوں کے ہمیں نے مختلف
فطرتِ گلشن مگر اس قید سے آزاد ہے

ذرا مختلف پیرایہ میں یہی مفہوم بیان کرتا ہے:۔

گلشنِ ہستی میں یکرنگی کا عالم عام تھا — پہلے صرف اک قوم تھی انساں جسکا نام تھا
کی گئی تقسیم بقدر منزلت جب سطحِ زمیں — دہر کے نقشے بعنوانِ وطن بدلے گئے

مزدور اور سرمایہ دار

"مزدور اور سرمایہ دار" کا مختلف فیہ مسئلہ عصرِ حاضر میں جسقدر اہم حیثیت رکھتا ہے اربابِ فہم صحیح بخوبی واقف ہیں۔ حامیانِ "اجتماعیت" ایک مدتِ مدید سے اس کے سلجھانے میں مصروف ہیں۔ دُنیا میں متمولین کے ساتھ ساتھ ایسے مفلوک الحال لوگوں کی مثالیں بھی بکثرت ملینگی جنکی صحیفۂ زیست میں مسرتوں کا باب یکسر مفقود ہے ایک انسان ہونے کی حیثیت سے انکی فلاح و بہبودی کے لئے سعی کرنا ہمارا سماجی فرض ہے۔ بصورتِ موجودہ، سیماب بھی لایعنی دولت پرستی و استبدادیت کا مخالف ہے اس نے مزدور کا نقشہ پیش کیا ہے جس سے بالتصریح واضح ہے کہ وہ مفلس طبقات کو کس درجہ ترحم و استحسان کی نظر سے دیکھتا ہے:۔

گرد چہرے پر پسینہ میں جبیں ڈوبی ہوئی — کمنیوں تک آنسوؤں میں آستیں ڈوبی ہوئی
پیٹھ پر ناقابلِ برداشت اک بارِ گراں — ضعف سے لرزی ہوئی سارے بدن کی جھریاں
ہڈیوں میں تیز چلنے سے چٹخنے کی صدا — درد میں ڈوبی ہوئی مجروح ٹخنے کی صدا
پانوں مٹی کی تہوں میں میل سے چکٹے ہوئے — ایک بدبودار میلا چیتھڑا باندھے ہوئے

بالآخر کہتا ہے:۔

جا رہا ہے جانور کی طرح گھبراتا ہوا — ہانپتا، گرتا، لرزتا ٹھوکریں کھاتا ہوا

سیماب کے ذہن میں مزدور کی سقیم حالی کا جو تصور ہے اُسکا بہترین اندازہ ان اشعار سے ہوسکتا ہے:۔

زندگی کو ناگوار اک سانحہ جانے ہوئے — بزم گیر دنیا زمیں فرضِ اپنا پہچانے ہوئے
اُسکے دل تک زندگی کی روشنی جاتی نہیں — بھول کر بھی اسکے ہونٹوں تک ہنسی آتی نہیں
ایک لمحہ بھی نہیں فکرِ معیشت سے نجات — صبح ہو یا شام ہے تاریک اُسکی کائنات

اسکی زبوں ترین حالت کو سپردِ قلم کردینا ہی کافی نہیں بلکہ کوئی صحیح لائحۂ عمل پیش کرنا ایک مفکر شاعر کا فرض ہے۔ سیماب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ مشرقی مزدور سے خطاب:۔

یہ خاموشی یہ اضمحلال یہ پستی ارادوں میں — اسے تو بھی تو ہے انساں انہیں انسانزادوں میں
اگر سوسائٹی مجبور ہے تو بھی رخ ادا بن جا — اسے مجبور کر تقلید پر خود رہنما بن جا
اگر سرمایہ داری ہو نہ تیری غمگساری میں — لگا دے آگ اٹھ کر خرمنِ سرمایہ داری میں

اسی سلسلہ میں ایک اور امر قابلِ لحاظ ہے وہ یہ کہ سیماب ہر شئے کو انقلابی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اسی طرح اسکو ان معاصرین کی موجودہ آشفتہ حالی میں انقلابیت کے آثار کارفرما نظر آتے ہیں۔ تمام انقلابیت پسند شعراء نے اس امر کی تائید کی ہے۔

اقبال۔ مزدور سے خطاب :— ؎

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

جوش فرماتے ہیں ؎

آج جس عنب ہے روئے امارت پہ شکوہ
کل وہ مزدور کے چہرہ سے نمایاں ہوگا

سیماب بھی تاریک ترین رُخ دکھانے کے بعد رجائیت آمیز پہلو قلمبند کرتا ہے ؎

خیر اب نزدیک ہے رفعت کی منزل اور بڑھ — اور بڑھ مزدور اک دو چار منزل اور بڑھ
اک صدی کے بعد تجھ میں انقلاب آنیکو ہے — شادباش اک دور تیرا کامیاب آنیکو ہے

"مزدور و کسان سے"

مسرور ہو اے غریب مزدور — دُنیا کا بدل رہا ہے دستور
دل شاد ہو اے کسان دل شاد — ہونیکو ہے تیرا دیس آزاد
آنیکو ہے فصلِ شادکامی — ہے عالمِ نزع میں غلامی

آخرکار بالتوضیح کہتا ہے :-

اب رنگِ چمن بدل رہا ہے — دستورِ وطن بدل رہا ہے
ہر باغ میں ہے شباب پیدا — جنگل میں ہے انقلاب پیدا
اب ختم ہوا وہ دورِ بیداد — اب تم ہوئے ہر بلا سے آزاد

بے ثباتیٔ دنیا

یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر ہمارے شعراء عموماً طبع آزمائی کرتے رہے ہیں لیکن سیماب نے اس صنف میں بھی عظیم الشان اختصاص حاصل کیا۔ اس لئے اس یبوست آمیز عنصر کو نہ صرف نازک، لطیف اور موثر ہی بنا دیا ہے بلکہ ایک بڑی تعداد میں جدید اور اُسکے ذاتی تخیل کا مختص رنگ ہے۔ ہمارا دعویٰ غیر مکمل رہیگا جب تک بعض مثالیں سند میں پیش نہ کی جائیں۔

تعمیر و تخریب

دُنیا اجتماعِ اضداد ہے کوئی ابتدا ایسی نہیں جسکی انتہا نہ ہو۔ یا یوں کہئے کہ ہر شئے کی تعمیر میں اسکی تخریب مضمر ہے تمام اکابر شعراء اسکے مؤید ہیں۔

ہمارے مایۂ افتخار شاعر مرزا غالب لکھتے ہیں :—

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

یا مثلاً جنابِ جوش رقمطراز ہیں :—

جب ایکدم ہو تعمیر مادہ سالِ خراب
تو کوئی کس لئے آخر فریبِ ہستی کھائے

سیماب اسی مضمون کو واضح کرتا ہے :—

کہتے ہیں جسے ہستی وہ اک ترکیبِ عروج و پستی ہے
ہر بستی اک ویرانہ ہے ہر ویرانہ اک بستی ہے

جوش کے تمام شعر میں وہ بات نہیں جو سیماب کے "ترکیب عروج و پستی" والے ٹکڑے میں مضمر ہے۔

یہی بات ذرا مختلف انداز میں کہتا ہے :-

جو مسرت کا محل عیش کا گھر بنتے ہیں
اُن ہی ایوانوں سے دُنیا میں کھنڈر بنتے ہیں

اسی مفہوم کا ایک اور پہلو دیکھئے :—

نہ ہو افسردہ خاطر انقلابِ بزمِ امکاں سے
یہاں صحرا ہمیشہ بنتے آئے ہیں گلستاں سے

فلسفۂ زوال

اس ضمن میں ایک امر ملاحظہ طلب ہے۔ اوراقِ تاریخ شاہد ہیں کہ وہ صاحبانِ جاہ و ثروت جو کبھی سریر آرائے سلطنت رہا کرتے تھے۔ زندگی کا ایک پانسہ پلٹ جانے سے قعرِ مذلت کا شکار ہوئے اور ایک پل میں انکا شاہانہ طمطراق روبہ اضمحلال نظر آنے لگا۔ ایک مفکر شاعر کے کلام کے دورانِ تبصرہ میں اس اختصاص کی جانب اشارہ کرنا فی الحقیقت ناگزیر ہے۔ علامہ اقبال نے اسی حقیقت کو بیان کیا ہے :—

کیا یہی ہے اِن شہنشاہوں کی عظمت کا مآل — جنکی تدبیرِ جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال
رعبِ فغفوری ہو دُنیا میں کہ شانِ قیصری — ٹل نہیں سکتی غنیمِ موت کی یورش کبھی

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

جناب جوشؔ فرماتے ہیں :-

نظر کی ہے غلطی تختِ قیصر و جمشید
سراب کی ہے چمک تاجِ نادر و پرویز

اِسی صنف میں سیمابؔ کا حصّہ بھی ملاحظہ ہو۔ شہنشاہِ روس کے متعلق کہتا ہے :-

تختِ عظمت پر بیٹھا تھا حول کی خوش سامانی میں
سمجھا تھا جز و باقی ہوں میں اِس نیلے فانی میں

آگے چلکر اسکی حیات کا دوسرا رُخ پیش کرتا ہے :-

آخر گردش کی موجوں میں جب آ پہنچا قطرہ بن کر
ادبار کا اک سیلاب اُٹھا اور پھیل گیا دریا بن کر

انجام بھی سُن لیجئے :-

جن سے عشرت وابستہ تھی وہ سارے رشتے ٹوٹ گئے
وہ قصر وہ ایوانِ خم اب ہو کر دل ٹوٹ گئے جی چھوٹ گئے

ایک دوسرے مقام پر اسی کا خلاصہ پیش کرتا ہے :-

جتنی فانی لذتیں ہیں ہیں جہانِ خواب کی
انحطاط انکا نتیجہ ہے مآل انکا عذاب

سیمابؔ نے یہی چیز کو اپنے کلام میں طرح طرح سے ادا کیا ہے۔ مثلاً :-

سورج تنکر نکلا تھا اپنی کرنوں کی رعنائی میں ۔۔۔ آخر جھک کر جا ہی پہنچا تاریکی کی گہرائی میں
نکلا تھا پھول جو بوٹے پر دین کا گہوارہ بنکر ۔۔۔ آخر پامالِ گلشن تھا اک برگِ آوارہ بنکر

بعد میں کہتا ہے :-

جو چاند ابھی لیلیٰ کی طرح محمل سے اُفق کے پیدا تھا ۔۔۔ جب صبح ہوئی تو رنگ اسکا رنگِ مجنوں سے پھیکا تھا

یہ فطرت کی اک عادت ہے جو اُبھریگا گر جائیگا
شعلے کی طرح جو لپکے گا اُس پر پانی پھر جائیگا

اگر ایک مسلّم حقیقت کو سادہ طور پر بیان کر دیا جائے تو وہ اثر نہیں پیدا ہوتا جو استفہامیہ رنگ میں ہوتا ہے :-

کیا کبھی اسپہ غور تونے کیا کہ انجامِ اب کیا ہے؟ ۔۔۔ یہ صبح کو ارتحال کیوں ہے یہ رات کا انقلاب کیا ہے؟
تغیرات اور عمل التماتر تصرفات اور بے محابا ۔۔۔ کمال عُمرِ زوال کیا ہے؟ زوالِ شیب و شباب کیا ہے؟
بہار کی اصل بو دکیا ہے؟ ہے یہ قصر و مرا نشار کب ہے؟ ۔۔۔ ہر ایک منظر رنگ و بو کہاں تک؟ طلسمِ زر و جاب کیا ہے؟

یہ کیوں درخشندہ ہیں کواکب؟ یہ آسماں کیوں گردش میں ہے؟ یہ چرخ میں التہاب کیسا؟ و رنہ ہیبت و اضطراب کیا ہے؟

غم و عیش

"تعرف الاشیاء باضدادھا" اگر ہمارے دورِ حیات میں غم واندوہ کا یکسر فقدان ہو تو راحت فرطِ راحت کیوجہ سے راحت نہ معلوم ہو۔ سیمابؔ :-

چمن میں آبروئے رنگ ہیں آنسو ستاروں کے
نمودِ لالہ و گُل ہے سرشکِ ابرِ باراں سے

زوال اک ساعتِ زرّیں ہے فکرِ ارجمندی کی
نہ ہو پستی تو پھر تمیز کیونکر ہو بلندی کی

نور کے ساتھ ظلمت فلسفۂ عالم کا ناگزیر پہلو ہے۔ غم و عیش فی الاصل ایک دوسرے سے توام ہیں۔ سیمابؔ کے کلام میں اس نظریہ کے اشعار جابجا پائے جاتے ہیں۔ اُسکا یہی قول ہے۔

مسرت منقلب گردید عالم نالہ یکسر شد
ہلالِ عید و شمعِ شامِ مایوسی برابر شد

جوشؔ نے اسی خیال کی تصریح اس طرح کی ہے :-

تیرگی لپٹی ہوئی ہے دہر میں ہر ضو کے ساتھ
عربدہ کرتا ہے یاں ہر راستہ رہرو کے ساتھ

اقبالؔ کہتے ہیں :-

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی

سیمابؔ اسی مضمون کی وضاحت کرتا ہے :-

زوال اک باطنی تمہید ہو آثارِ رفعت کی
حدودِ شام ہم آغوش ہیں صبحِ درخشاں سے

فلسفۂ عالم پر ہم نے بہت مجمل روشنی ڈالی ہے اگر تفصیلی بحث کی جائے تو مقالہ بہت طویل ہو جائیگا۔ سیمابؔ نے اس نوع میں بھی سیر حاصل قلم آزمائی کی ہے۔

انقلابیت

یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ غیر متنوع امور سے دل برداشتہ ہوکر انسان اپنے ماحول میں تجدید کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور اسکا معیارِ لیاقت درحقیقت ذاتی قابلیت کے مظاہرے کے وقت منصۂ شہود پر آتا ہے۔ اسلاف کی کورانہ مثالیت مرکوزِ خاطر ہونا کسی قابلِ ستائش امر کا

مصداق نہیں بقول کسے

والفتی من یقول ھا انا ذا
لیس الفتی من یقول کان ابی

اقبال نے انقلابیت کا نظریہ اس طرح پیش کیا ہے:۔

نراش از جادۂ خود تیشۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن حرام است

حاضرین میں سیماب کی ممتاز ترین صفت بھی یہی ہے کہ وہ ہر شے کو انقلابی زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے اس کا قول ہے

نظامِ بزمِ محبت کو فرصتِ تغیر — اک انقلاب ہی مرے دردِ دین و ہوش
شروع ہوتے ہیں کچھ واقعاتِ نوساماں — مغنیہ سے کہو ختم کر فسانۂ دوش

یہی مفہوم دوسرے مقام پر ادا کرتا ہے:۔

نغمۂ تازہ مرے ہونٹوں پہ پھر بیتاب ہے
پھر مرے تارِ نفس پر بارشِ مضراب ہے

اشعارِ ذیل میں بھی انقلابیت کی تلقین کی گئی ہے۔

نئے اصول مرتب کریں برائے چمن — بنائیں کچھ نئے آداب گلستاں کے لئے
نئی فضا ہے نئی آرزو نئے جذبات — دعائے خیر تمنائے رفتگاں کے لئے
نہ خاک جادہ اگر پیش رو کو جذب کرے — تو راہ بند ہو پسماندہ کارواں کے لئے

"نوجوانانِ ہندوستاں سے"

سجاؤ ایک نئی بزم شام سے پہلے — سحر ہوئی اثرِ انجمن تمام ہوا
نئے سبوئے پیمانے بارباب کرو — تمام بادۂ یارانِ فن تمام ہوا
حریم نو سے مغنی کو کہ دو آواز — شکستہ نغمۂ سازِ کہن تمام ہوا

شاعرِ امروز

یہ امر مسلم ہے کہ ہماری شاعری فارسی شاعری کے عوائد و رسوم فرسودہ کی روئداد ہے، جیسا کہ سر چارلس لائل کا قول ہے:۔

"اردو شاعری فارسی شاعری کا کافی اتباع کرتی ہے اور بار بار وہی مضمون دہراتی ہے جنکو خود اساتذۂ فارس نے بارہا پامال کیا۔"[1]

لیکن سیماب انقلابیت کا شدید پرستار ہے۔ اس طرح اس نے ان رسمی مقلدین کی اس شاہراہ سے ترک راہ کرکے اپنے لئے ایک جداگانہ مسلک قائم کر لیا ہے۔ جو برابر مستحسن ہے اور اپنے مسندِ شاعری کو نمایاں مجددات سے مرتسم و مرصع کیا ہے جسکا اس نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔

ادب کو میرے انفاسِ جواں نے زندگی بخشی
بنا اک سوز پیدا ہو گیا سازِ قدامت میں

اس کو اس کورانہ نقالی سے دلی کوفت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ شاعرِ امروز سے خطاب کرتا ہے:۔

اے کہ تو تقلید کے دھوکے میں ہے آیا ہوا — دل ہے تیرا ظلمتوں میں پرورش پایا ہوا
اڑ چکا مدت ہوئی بلبل ترا ایماں سے — روپ جن کے چمکتا ہے تو ہر عنوان سے
قبر لیلیٰ گورِ مجنوں ہو چکے جزوِ زمیں — تو سمجھتا ہے ابھی صحرا میں محمل نشیں

اس کے بعد کے دو شعر ہیں

اے سخن دشمن اگر حاصل نہیں یہ مرتبہ — خون کیوں کرتا ہے اس کا ہیر پھیر الفاظ کا
تو بھی ہے ناکام تیری فکر بھی ناکام ہے — سچ بتا اس شاعری کا تیری کیا انجام ہے

آخر کار جھنجھلا کر کہتا ہے:۔

میں ترے پھیکے ہوئے جذبات کا قائل نہیں
صاف کہتا ہوں کہ یہ مندرجہ قابل نہیں

شاعر کا نصب العین

سطورِ بالا سے پہلے بالتوضیح ظاہر ہو گیا کہ سیماب شعرائے فارس کی تقلید کو بنظرِ استحقار دیکھتا ہے۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں ایک حقیقی شاعر کا تصور کیا ہونا چاہئے؟

مثل مشہور ہے کہ "من احب شیئا اکثر ذکرہ" یعنی انسان کو جس شے سے دلبستگی ہوتی ہے وہ اسکو اپنے تذکرہ میں لایا کرتا ہے۔ یہی حال سیماب کا ہے۔ اور واقعہ ماسبق میں یہ بات دکھائی جا چکی ہے کہ وہ اپنے قوم و وطن کی بھلائی کا حتی الوسع خواہاں ہے بلبلۂ اسکے سطح نظر کے بموجب ہر شاعر کو اپنے ملک و قوم کا بدرجۂ اتم ہمدرد بھی ضرور ہونا چاہئے۔ اس صفت میں سیماب علامہ اقبال مرحوم کا ہم آہنگ ہے۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں:

محفلِ نظمِ حکومت چہرۂ زیبائے قوم — شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ — کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

جیسا کہ سیماب شاعرِ امروز سے استفسار کرتا ہے:۔

کیا ہے کوئی شعر تیرا ترجمانِ دردِ قوم؟ — تو نے کیا منظوم کی ہے داستانِ دردِ قوم؟

---

[1] از شعری آئینہ اردو لٹریچر (مترجمہ مرزا احمد عسکری)

شاعری پیغمبری کا جزو کہتے ہیں جسے — کیا یہ ہے ہیں میں کوئی واقعی حصہ تجھے؟
تو کبھی محفل میں آیا دیپ جیسے گاتا ہوا — گو بظاہر روتا گرجتا آگ برساتا ہوا؟
قوم کے غم میں کیا ہے خون کو پانی کبھی — رہگذارِ جنگ میں کی ہے حدی خوانی کبھی؟

آگے چلکر اسکی مزید وضاحت کی ہے:—

کیا کوئی مطلع کہا ہے قابلِ شانِ وطن؟ — کیا کوئی تشبیب سوچی ہے بعنوانِ وطن؟
کیا اُڑا لایا ہے تو نے کسی مضمون سے — نظم آزادی کبھی لکھی ہے اپنے خون سے؟

لیکن انصاف یہ ہے کہ سیماب کے یہاں طرزِ ادا اور نشستِ الفاظ لطیف تر ہے۔

شاعر کی موت | تقریباً تمام اکابر، قادر الکلام اور پُرگو شعرانے اس امر کی متفق اللفظ ہو کر تائید کی ہے کہ شاعر کا وجود بجائے "فنا بردوش" ہونے کے ہمہ وقت "ہر دم رواں پیہم دواں" کی حیثیت رکھتا ہے۔ مرزا غالب فرماتے ہیں:—

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب — ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

یا اقبال مرحوم کا شعر ہے:—

تجھے کیا بتائے ہمنشیں ہمیں کیا نشاطِ ہُنر ملا — نہ ملا مسیح و خضر کو بھی وہ نشاطِ عمرِ دراز میں

غالباً یہ اشعار پڑھتے ہی قارئین کو ٹیگور کا یہ قول یاد آگیا ہوگا:—

What you call life death is its another name — I do not want to die in this beautiful world but I want to live among people

سیماب کا خیال بھی یہی ہے۔ اُن کے نزدیک ایک حقیقی شاعر کی موت دراصل "فنا اندر بقا" ہوتی ہے۔ مگر اس صنف میں وہ اپنے رنگ کا بادشاہ ہے:—

نفسِ شاعر فطرتاً نقشِ فنا پیرا نہیں — یعنی اسکی زندگی میں موت کا جھگڑا نہیں
گونجتی رہتی ہے اسکی بزمِ عالم میں صدا — خامشی دیتی ہے اسکے ساز کو رنگِ نوا
مسکراتا ہے وہ اپنی نظمِ گوہر بار میں — رونق کر لیتا ہے باتیں پردۂ اشعار میں

یہی حقیقت ایک دوسری جگہ مختلف استعارات کے ذریعہ سے بیان کی ہے۔

برگ فانی ہیں مگر نفسِ نمو فانی نہیں — پھول فانی ہیں مگر پھولوں کی بو فانی نہیں
چند قطروں کے نہ ہونے سے نہیں کچھ آبرو — خشک ہونے پر بھی شانِ آبجو فانی نہیں
آرزو رہتی ہے باقی آرزو مندی کے بعد — دل فنا آگیں ہے دل کی آرزو فانی نہیں

سیماب نے شاعر کی تربت کا نقشہ جس نظم میں پیش کیا ہے۔ اس سے بھی یہی خصوصیت مترشح ہوتی ہے:—

جنگل بیاباں — ظلمت بداماں
شاعر کا مدفن — اس میں فروزاں
خاموش منزل — ماحول ویراں
ٹوٹا سا کتبہ — لیکن غزلخواں

پُر ہول منظر
لیکن نوا گر

اسکے بعد لکھتا ہے:—

کیا تازگی ہے — کیا دلکشی ہے
اک زندگی سی — چھائی ہوئی ہے

آخر کار صاف صاف کہہ دیتا ہے:—

مر کر ہو زندہ — شاعر وہی ہے

خاتمہ | دنیائے ادب میں سیماب کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اسکے کلام میں جملہ اصنافِ سخن بیک وقت مجتمع نظر آتے ہیں۔ حقیقتاً ایسے شعراء کی مثالیں کمیاب ہیں۔ انکا دعویٰ ہے۔

میخانۂ سخن کا گدائے قدیم ہوں — ہر رنگ کی شراب پیالے میں ہے مرے

یہ ضرور ہے کہ میری نظر میں سیماب کے کلام میں شاذ و نادر خامیاں موجود ہیں جنکو النادر کالمعدوم کہکر چھوڑ دینا بجا ہے۔ لوگ اُن شعرا کو معیار قرار دیتے ہیں جنکا عرصۂ شاعری چند عشقیہ خیالات تک محدود ہے لیکن جو شخص سیکڑوں قسم کے واقعات کو شعریت کے سانچے میں ڈھالنا چاہے اُسکا کلام ان اسقام سے کیونکر منزہ ہو سکتا ہے۔ حقیقتاً ان سطحی تسامحات سے اسکے شاعرانہ وقار میں کسی قسم کا اختلال واقع نہیں ہوتا۔ اگر اسکے ان تمام گرانبہا احسانات پر جو اُسنے اُردو پر کئے ہیں بالتفصیل تبصرہ کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب مدوّن کی جا سکتی ہے۔ یہ کہنا بیجا نہیں کہ انکا کلام اپنی جگہ پر نہایت ہی مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اُردو ادب میں فی الواقع ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ جسکی ہمارے شعرا کی ایک تعدادِ کثیر محتاج بنی ہوئی ہے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اُنہوں نے اپنے کلام میں بہت سی معتدبہ مجددات کو جگہ دیکر اُردو لٹریچر کو دراصل حیاتِ نو بخشدی ہے۔ وہ خود کہتا ہے:—

ادب کو میرے انفاسِ مسیحائی نے زندگی بخشی — نیا اک سوز پیدا ہو گیا سازِ قدامت میں
جہاں منزل پہ میرا کارواں اسکے بعد پہنچیگا — امیرِ کارواں ہے کارواں میرا حقیقت میں

لیکن اسپر بھی ہمارے ابنائے زمانہ اسکی جگر کاویوں کی خاطر خواہ داد رسی نہیں کرتے اور اگر وہ کبھی یہ پکار اُٹھے تو بیجا نہیں:—

"زخمہا برداشتیم و فتح باکردیم لیک
ہر گناہ از خونِ گلگوں شد بدامانِ ما"

حسین رضا بدایونی

معصوم آرزو

رنگ رنگ کے پھولوں کا ہر یالہ باغ لگائیں
باغ لگائیں سندر سندر اس میں کنج بنائیں
اندر لوک کی چنچل پریاں جس پر واری جائیں
پریم نگر کے باسی ہو کر اپنا مان بڑھائیں
اپنے من مندر کے اندر جیون جوت جگائیں
اس دنیا کو چھوڑ چلیں اک دنیا نئی بسائیں

نرمل[1] جل سے بھری ندی کی گت[2] ہو پیاری پیاری
اس کی پرکھا سی کرتی ہو پیاری باد بہاری
انگوروں کے بیلوں سے ہو لدی ہوئی پھلواری
اور دو دھارا کی نہریں سی پاس پاس ہوں جاری
ایسے میں ہم تم دونوں جی بھر کر بین بجائیں
اس دنیا کو چھوڑ چلیں اک دنیا نئی بسائیں

آسمان پر کہیں کہیں ہوں روشن کچھ کچھ تارے
سونی اور سیاہ رات میں بکھری ہوں مہ پارے
آنکھوں کو دیں جوت ندی کی جھرنے پیارے پیارے
اٹھے جدھر نگاہ ہماری ہوں دلکش نظارے
نور کا ایک چمکتا دریا ہم بھی وہیں بہائیں
اس دنیا کو چھوڑ چلیں اک دنیا نئی بسائیں

شب کو روز ہماری محفل چاند سجانے آئے
خواب آور میٹھے نغموں کو ہر دے مست بنائے
حسن اور سندرتا کا ہر سو نکھرا روپ دکھائے
چاندنی کی سی مورت بن کر اپنے پر اترائے
ہم بھی اپنا رنگ جمائیں ہم بھی جشن منائیں
اس دنیا کو چھوڑ چلیں اک دنیا نئی بسائیں

ڈالی ڈالی اڑتی پھرتی کو کل کو کو کرتی
رت[3] سے اپنا پیار دکھا کر سب کا من ہرتی
اپنے مستانہ نغموں کے کیف فضا میں بھرتی
کبھی گزرتی اس ڈالی سے اس سے کبھی گزرتی
اب ہم دونوں بھی مل کر اپنا راگ سنائیں
اس دنیا کو چھوڑ چلیں اک دنیا نئی بسائیں

دریا کی موجیں بھی ہم تک جیسا بادہ آئیں
اور انھیں دیتی ہوں تھپکی مستی بھری ہوائیں
پیڑ ہوا سے جھوم جھوم کر ہم کو مست بنائیں
ہم یوں ہی اس لمبے بن سے کچھ اوپر اٹھ جائیں
آؤ کسی دنیا میں مل کر ہم تم بھی کھو جائیں
اس دنیا کو چھوڑ چلیں اک دنیا نئی بسائیں

ٹپکے برساتی چتون سے مستی اور جوانی
کہتی ہو ہونٹوں کی جنبش دل کی رام کہانی
دے رکھی ہے تمھیں خدا نے یہ کیسی تابانی
اپنی ان آنکھوں کے پردے ہیں جن سے نورانی
تم کو اپنے دل کی دیوی آؤ آج بنائیں
اس دنیا کو چھوڑ چلیں اک دنیا نئی بسائیں

آنکھیں ہوں خورشید منور چہرہ ہو مہتابی
اور درخشاں پیشانی پر موتی کی خوش آبی
کشتِ جہاں کو سیر بنائے نغموں کی شادابی
نکہتِ آوارہ کی صورت ہے یہ کیوں بیتابی
ڈھونڈھ رہی ہو جسکو تم ہم اسکا راز بتائیں
اس دنیا کو چھوڑ چلیں اک دنیا نئی بسائیں

تاروں کا یہ روشن جھرمٹ کنج کو خوب سجائے
سورج بھی قدموں پر گر کر زریں تاج جھکائے
اور ہوا روحانی نغمے ہر دم تمھیں سنائے
کنج تمہارا دیر و حرم کا اک مندر بن جائے
ہم بھی اپنی بھینٹ چڑھانے اس مندر میں آئیں
اس دنیا کو چھوڑ چلیں اک دنیا نئی بسائیں

کفر اور دین کے سارے جھگڑے ختم یہیں ہو جائیں
ہندو اور مسلماں دونوں ہم مذہب کہلائیں
دیر و حرم کے جھوٹے قصے کیوں سننے میں آئیں
تم کو پا کر دونوں اپنی قسمت پر اترائیں
ہم بھی کیوں نہ تمھیں کو اپنا پھر معبود بنائیں
اس دنیا کو چھوڑ چلیں اک دنیا نئی بسائیں

پھولوں کے متوالے بن کر تم کو پھول بنائیں
جتنے رس پیدا ہیں تم سے سب ہم میں کھنچ آئیں
رنگ اور بو میں گھل مل کر ہم تم میں کھو جائیں
دھیان تمہارا کرتے کرتے جوگی کا پد[1] پائیں
ہاں تم پر ہم آنسو رکھیں آخر تمھیں رجھائیں
اس دنیا کو چھوڑ چلیں اک دنیا نئی بسائیں

اپنے در کے اس سائل کی یاد تمھیں بھی آئے
اس کے دل کے ارمانوں میں جیون جوت جگائے
شایقؔ کی معصوم تمنا بھی جادو دکھلائے
ہم میں تم میں کچھ بھی باقی فرق نہ رہنے پائے
جو کچھ تم ہو تم سے مل کر ہم تم سے ہو جائیں
اس دنیا کو چھوڑ چلیں اک دنیا نئی بسائیں

[1] صاف پانی
[2] رفتار
[3] موسم۔ فصل
[1] مرتبہ۔ درجہ

شایقؔ ہنگامی بی۔ اے

ماں

تامل زبان کے مشہور افسانہ نگار "چم موری" کا ایک بہترین افسانہ

میں ریل میں سفر کر رہا تھا اور دُھندلی سی تصویروں کی طرح تیزی سے دوڑنے والے تاروں، درختوں، پانی کے گڑھوں اور تاریکی کے وسیع سینے کو چیرتی ہوئی چلنے والی انجن کی سرخ لائٹ کو مسلسل طور پر دیکھنے میں محو تھا۔ اچانک میری توجہ ایک بچے کے رونے کی آواز سن کر ڈبے کے اندر منعطف ہوگئی اور میں نے گاڑی کی کھڑکی سے باہر نکلی ہوئی گردن کو اندر کی جانب کھینچ لیا۔

اوّلاً مجھے ایک پتلی دُبلی اور سوکھے جسم والی عورت نظر پڑی ——— نائڈ عورت، وہ چند بچوں کے درمیان ڈبے کے فرش پر راستے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسکے قریب ہی سات، آٹھ ماہ کا ایک بچہ پڑا ہوا زور زور سے رو رہا تھا اور کنبھ کونم کے کچھ ایسے باشندے بھی ڈبے میں پڑے سوئے تھے، جنکو بچے کی مسلسل چیخ پکار بھی بیدار نہ کرسکی۔

گاڑی کے مسافروں میں سے ایک بوڑھی عورت بولی:—

"اجی! بچے کو گود میں لیکر کچھ دودھ ہی پلادو"

"اونہہ! میں یہ سب کرچکی ہوں" ——— نائڈ عورت نے کچھ ایسی آواز میں جواب دیا جو اسکے سینے میں دبی ہوئی آتشِ اضطراب و اذیت کی مظہر تھی ——— "اس نے دودھ خوب پی لیا ہے۔ پھر بھی روتا ہے۔ لیکن اب دودھ کے بجائے خون آئیگا"

بے چاری ننھی سی جان کو حقیقت کی کیا خبر؟! ——— اس دودھ سے خالی سینے کی تڑپ کو وہ کیسے جان سکتا تھا؟! وہ ماں کی گود میں آنے کی کوشش کرنے لگا، مگر ماں نے اُسے جبراً نیچے اتار دیا ——— ٹھیک اسی طرح، جیسے سمندر سے ٹکرانے والی موجوں کو ساحل دھکیل کر واپس کر دیتا ہے۔ بچہ پانچ منٹ تک اور روتا رہا، آخر تھک کر سوگیا۔ لیکن سوجانے پر بھی اسکی ہچکیوں کا تار نہ ٹوٹا۔

میرے بالمقابل بنچ پر ایک شریف صورت آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے:—

"عورتیں تو بس بہری ہوتی ہیں"

"کیوں؟" ——— میں نے پوچھا

"بہری نہ ہوں تو بچوں کی اتنی گریہ و زاری سنکر خودکشی نہ کرلیں۔ یا اُن کے کانوں کے پردے نہ پھٹ جائیں؟!"

"نہیں صاحب!" ——— مجھے کچھ نہ کچھ جواب دینا ہی تھا میں نے کہا ——— "مرد تو بچوں کا ذرا سا بھی شور برداشت نہیں کرسکتے۔ خصوصاً بچوں کے رونے کی آواز ——— باورچی خانے میں کام کرنے والی یا گلی کے نل سے پانی لانے والی عورتیں اگر بچوں کی آواز سے اس طرح ڈرنے لگیں تو بس ہوچکا دُنیا کا کام"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہوگئے، تھوڑی دیر بعد عقب سے ایک اور بچے نے کھانسی کے ساتھ رونا شروع کر دیا۔ لیکن فوراً ہی ایک مرد کی موٹی اور بھدی آواز سنائی دی ——— وہ لوری ٹے کر بچے کو چُپ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور ساتھ ہی اُس نائڈ عورت نے بھی۔

ایک آدمی جسکی عمر تقریباً چالیس سال سے تجاوز کرچکی تھی۔ کانوں میں کھوراج کے "کنبھول" پہنے ہوئے بیٹھا تھا۔ اسکا چہرہ رئیسانہ اور حاکمانہ شان و شوکت کا مظہر تھا۔ اُسے دیکھ کر صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پردیس سے اپنے وطن کو واپس جارہا ہے۔ اسکے پاس تخمیناً چھ سال کا ایک لڑکا، دو سال کی لڑکی اور ایک اور چھوٹی بچی تھی۔ منجھلی بچی کے گلے میں ایک ہار اور لاکیٹ کی طرح سیاہ ڈورے میں بندھا ہوا "پنبل" لٹک رہا تھا۔

سب سے چھوٹی بچی کھانستی ہوئی رو رہی تھی۔ میں نے سوچا شاید معمولی کھانسی ہو، مگر بچی کی آنکھوں میں پانی کا امڈ آنا، چہرے پر سُرخی دوڑ جانی اور ہونٹوں پر کف دار تھوک کا جمنا دیکھ کر میں چونک پڑا اور سوچنے لگا یہ چھوٹی سی بچی اس خطرناک کھانسی کو کس طرح برداشت کریگی؟ اسی دوران میں دوسری بچی بھی کھانستے ہوئے اُٹھ بیٹھی۔ اُسے بھی اسی قسم کی کھانسی تھی۔

میں نے اس آدمی کے چہرے پر شدید کرب و اضطراب کی لہریں سی دوڑتی ہوئی محسوس کیں۔ بوڑھی نے اس سے پوچھا:—

"کیوں بیٹا! ان بچوں کو ساتھ رکھ کر تم کس طرح اپنے دن گذارتے ہو؟"

اُس آدمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنے پاؤں کے قریب رکھے ہوئے بیگ میں سے ایک شیشی نکالی اور اس میں سے ایک آدھ گھونٹ نہ جانے کیا دوا لیکر دونوں بچوں کو پلادی۔ دوا پینے کے فوراً ہی بعد بچے لیٹ گئے اور پھر نہ وہ روئے اور نہ انھیں کھانسی اُٹھی "نپل" کو چوستے چوستے منجھلی بچی پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اُس آدمی نے بڑی آہستگی کیساتھ بچوں کو تھپکی دیتے ہوئے بڑھیا کی طرف مخاطب ہوکر دریافت کیا۔

"ماں جی! کیا پوچھ رہی تھیں آپ؟"

"بیٹا! میں نے پوچھا تھا، تم ان ننھے ننھے اور بیمار بچوں کے ساتھ اپنے دن کیسے بسر کرتے ہوگے؟"

ہاں ——— ایسے ہی ——— کسی نہ کسی طرح، بھگوان کی دیا سے ———

"وہ" جو چل بسیں، اسکا بھی مجھے چنداں غم نہیں۔ بچوں کی دیکھ بھال کے ساتھ "ٹی اسٹیٹ" میں بھی کام کرتا رہتا ہوں۔ مگر اب "دو ماہ سے" بچوں کی یہ کھانسی مجھے بہت ستا رہی ہے۔ میرے بچے بیچارے ہر بار مرکر زندہ ہوتے ہیں خیر، بھگوان کی مرضی!!"

"ہائے ہائے بیچارہ!" ——— بڑھیا بولی ——— اچھا، کیا دوا پلائی تھی تم نے ابھی ابھی ان کو؟"

"نہیں ماں! اس کھانسی کے لئے کوئی دوا نہیں ہے، کہتے ہیں جس طرح آئی اُسی طرح جائیگی۔ میں نے اُن کو برانڈی پلائی تھی"

"رام رام رام ——— ارے ظالم! بچے مر نہ جائینگے برانڈی سے!!"

"تو پھر وہ سکون کے ساتھ کس طرح سو سکتے ہیں۔ دوسری راہ ہی کیا ہے؟"

نائیڈ عورت بھی اُٹھکر وہاں آگئی تھی، اُسکی رحمدلانہ آواز میں بولی:-

"اِن بیچاروں کی ماں نہیں ہے؟" اُسکی آواز سے اسکے گہرے جذباتِ ہمدردی کا اظہار ہورہا تھا۔

"ہاں، اپنی ماں کی یاد میں روتے ہیں، کھانسی اُٹھتی ہے، روتے ہیں ——— میں مرد کیا کرسکتا ہوں، بجز اِس کے کہ برانڈی پلاکر انکا احساسِ تکلیف زائل کردوں"

نصف گھنٹہ اور گذر گیا۔ ہم سب نوشتۂ قسمت اور مشیتِ ایزدی پر گفتگو کررہے تھے کہ چھوٹی بچی پھر کھانسی کی شدت سے تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس کے منہ سے ربر کی "نپل" چھوٹ کر گر پڑی تھی۔

مجھسے ضبط نہ ہوسکا۔ اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ بچوں کے باپ کا ہاتھ پھر برانڈی کی شیشی کیطرف بڑھا۔ اچانک نائیڈ عورت بولی:-

"آپ برانڈی کو مت چھوئیے ——— بچوں کو ادہر لائیے"

اُسنے دونوں ہاتھوں سے چھوٹی بچی کو گود میں اُٹھاکر اُسکے منہ میں اپنی خشک اور بے دودھ چھاتی دیدی۔ بچی کی کھانسی یک لخت بند ہوگئی۔ نائیڈ عورت کے مامتا بھرے دل سے محبت و شفقت کے جذبات اُبل پڑے۔ لیکن اسکی چھاتی سے دودھ بھی نکلا یا نہیں؟ ——— یہ کون جانے!!

مترجمہ:- **مخمور عثمانی**

(بقیہ صفحہ ۴۵)

جناب ماہر دہلوی

گلستاں میں طوفاں نیا آرہا ہے ہر اک غنچہ دہشت سے تھرا رہا ہے
مصیبت کی منڈلا رہی ہیں گھٹائیں "مگر جنا ہوا انقلاب آرہا ہے"

جناب ہر فن (جمشید پور)

ہوا تنگ جینے سے انسان اتنا حیات دو روزہ سے گھبرا رہا ہے
بڑا منچلا ہے یہ ہندی سپاہی ہزاروں میں تنہا چلا جارہا ہے

جناب نسیم (آدھونی)

یہ کیک جوانی کی مخمور آنکھیں زمانہ ہمیشہ بدلتا رہا ہے
تری چتونوں کے تصور سے خوش ہوں مجھے تو گناہوں میں لطف آرہا ہے

جناب ملک پالن پوری

[illegible] سے آرہا ہے مرا دل متور کئے جارہا ہے
وہ پہنچے گا منزل کو اپنی یقیناً جو خود کو مٹاتا چلا جارہا ہے

جناب قاضی ادونی

نہ برسے کہیں آکے ہندوستاں پر "گرجتا ہوا انقلاب آرہا ہے"
مرے زخمِ پنہاں کی یہ ہے نشانی بعوض آنسوؤں کے لہو آرہا ہے

جناب لطیف جنیدوی

مرے خونِ غیرت کو کھولا رہا ہے "گرجتا ہوا انقلاب آرہا ہے"
نہ پھر جائے رُخ اُس ستم کا ادہر بھی جو آج آگ یورپ میں برسا رہا ہے

جناب ماہر احمد نگری

گرجتا ہوا انقلاب آرہا ہے خدا جانے وہ ساتھ کیا لا رہا ہے

جناب فاروقی رکن ادارۃ "الاسلام" کوئٹہ

مقدر کا شکوہ بڑی بزدلی ہے تدبر یہ فاروقی سمجھا رہا ہے

نشاطِ نظر

جہانِ سرابِ نظر کے سوا کچھ اور نہیں کمالِ شعبدہ گر کے سوا کچھ اور نہیں

نمودِ خاکِ بسر کے سوا کچھ اور نہیں چمن، فریبِ نظر کے سوا کچھ اور نہیں

کبھی شباب کی راتوں پہ صبح کا تھا گماں اب انتظارِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں

نوید آتشِ گُل کو کہ آج گلشن میں ہجومِ برق و شرر کے سوا کچھ اور نہیں

تمام عمر کیا تجزیہ محبت کا ہلاکِ جان و جگر کے سوا کچھ اور نہیں

کسی طرح ہو، نوازش سہی ہو کہ نفرت سہی علاج سر ترے در کے سوا کچھ اور نہیں

یہ کائنات کہ جس میں ترا جمال بھی ہے ہمارے حسنِ نظر کے سوا کچھ اور نہیں

مَیں نو پرست و تنوع پسند اور فطرت طلوعِ شام و سحر کے سوا کچھ اور نہیں

ہو جلوہ گر کسی پردے میں شورشِ عالم جنونِ تاج و کمر کے سوا کچھ اور نہیں

مذاقِ جلوہ پسندی سے بدگمان نہ ہو غرض نشاطِ نظر کے سوا کچھ اور نہیں

پتنگ، جس کی ہے معراجِ نو تک پرواز وہ اک ہیولۂ پر کے سوا کچھ اور نہیں

سمجھ رہے ہیں جسے اہلِ کارواں منزل غبارِ راہگذر کے سوا کچھ اور نہیں

بجائے ہاتھ بڑھانے کے اپنے پاؤں بڑھا دُعا تو وہمِ اثر کے سوا کچھ اور نہیں

غرور کر نہ سجود و قعود پر، کہ وہاں قبول، دیدۂ تر کے سوا کچھ اور نہیں

نگاہِ برق ہے میری ہی آشیاں کی طرف تو کیا یہاں مرے گھر کے سوا کچھ اور نہیں

تمہارے پاس تجلّی کے سیکڑوں امکاں ہمارے پاس نظر کے سوا کچھ اور نہیں

کمالِ علم و ہنر کا مآل اے سیماب
زوالِ علم و ہنر کے سوا کچھ اور نہیں

سیماب اکبرآبادی

مرزا رجب علی بیگ سرور کے غیر مطبوعہ خطوط

(وہ مقالہ جو مدیر "شاعر" نے ۱۰ اگست ۴۲ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کیا)

وقت کی کمی اور ریڈیو کی مصلحت کار کے مطابق زیر نظر مقالہ، تمہید ـــــ ایک خط اور بعض الفاظ کے حذف و اضافہ کے بعد نشر کیا گیا تھا۔ یہاں اصل مقالہ شائع کیا جا رہا ہے

ہر زبان کا اَدب عصری تقاضوں اور فطری میلانات کی سرحدوں سے ہو کر گذرتا ہے۔ اُس کی قدریں بنتی، بگڑتی اور بڑھتی ہیں۔ انقلاب کے تند و تیز تھپیڑے اُس کی ہیئت کو کتنا ہی تبدیل کیوں نہ کر دیں۔ لیکن ادب کے بنیادی اصول وہی رہتے ہیں جو ایک بار قائم ہو چکتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ خواہ کسی عمارت کو یک منزلہ تعمیر کیا جائے یا سہ منزلہ بنیاد ایک ہی رہے گی۔ اَدب بظاہر ایک سہ حرفی لفظ ہے لیکن اگر ہم جزئیاتِ اَدب کا جائزہ لیں تو یہ ہمیں متعدد اصناف کا ایک مجموعہ نظر آئے گا جو شعوری اور غیر شعوری طور پر آہستہ آہستہ اُس میں داخل ہوتی گئیں اور بالآخر ادب نے کُل کا درجہ حاصل کر لیا۔ ادب اُس گلدستۂ رنگین و شاداب کا نام ہے جس میں شعر و سخن کے خوش رنگ پھول بھی ہیں اور افسانہ نگاری کی نوشگفتہ کلیاں بھی۔ ڈرامائی برگ و بار سے بھی اُس کی زینت ہے۔ زبان اور محاورے کی نازک ٹہنیاں بھی اسکی معاون ہیں ـــــ ہاں ہم اپنے مجلسی مذاق اور ذاتی ذوق و وجدان کی تسکین کے لئے کبھی اُسے سُرخ رنگ کے گلدستہ دان میں آویزاں کر دیتے ہیں اور کبھی سبز میں۔ لیکن گلدستہ بحیثیتِ گلدستہ وہی رہتا ہے۔

جہاں اَدب کی بنیاد افسانوں۔ ڈراموں۔ غزلوں۔ نظموں۔ سیاسی مذہبی۔ معاشرتی۔ سماجی اور اخلاقی مضامین پر قائم ہے وہاں اُس زبان سے بنہایت دلچسپی رکھنے اور اُسے کلاسیکل بنانے والوں کے خطوط بھی ارتقاءِ ادب کا بہترین ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔ ہر چند ازمنۂ قدیم میں مشاہیر کے مکاتیب کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی لیکن تقریباً دو صدی سے ہر ملک اور ہر زبان نے اپنے مشاہیر کے خطوط محفوظ کر کے اُن کے افادی پہلوؤں پر دلدادگانِ ادب کو غور و فکر کا موقع دیا ہے اور اس کا نتیجہ جسقدر خوشگوار نکلا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

کوئی مصنف اپنی بڑی سے بڑی تصنیف میں اپنے ذاتی رجحانات، معتقدات اور خیالات کا پوری آزادی کے ساتھ اظہار نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے اُس کی تصنیف بازارِ ادب میں جنتِ نگاہ بنے گی اور ہزارہا افراد اُسے دیکھیں گے۔ یہ احساس مصنف کو نہ موضوع سے الگ ہونے دیتا ہے اور نہ اُس کا قلم آزادروی اختیار کرتا ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ ہر تصنیف سطحی جذبات و خیالات اور مصلحتوں کے تحت میں ایک ارادی چیز ہوتی ہے۔ جس کا مقصد کسی نہ کسی طرح دوسروں کو متاثر کرنا ہوتا ہے۔ داخلیت سے اُسے دُور کا بھی تعلق نہیں ہوتا اور یہ مصنف کے خلوتیانِ راز جانتے ہیں کہ اُس کے کردار اور قول و فعل کا اسکی تصنیف سے کہاں تک تعلق ہے۔ اس جکڑ بندی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں اکثر مصنف کی ذات کا عرفان نہیں ہوتا اور نہ اُس کے حقیقی رجحانات تک ہماری نظریں پہونچتی ہیں ـــــ اس کے برعکس **خطوط** نہ کسی خاص اہتمام و التزام سے لکھے جاتے ہیں اور نہ اُن میں کسی قسم کی حد بندی ہوتی ہے۔ مکتوب نگار بڑی حد تک مطمئن ہوتا ہے کہ اُس کی تحریر ایک شخصِ واحد کے علاوہ کسی دوسرے کی نظر سے نہیں گذرے گی۔ اس لئے وہ بالکل غیر ارادی طور پر حالات، ضروریات اور تقاضوں کے تحت میں بڑی آزادی اور خود اعتمادی کے ساتھ وہ سب کچھ لکھ جاتا ہے جس سے بعد میں افسانے بنا کرتے ہیں۔ چونکہ ایک حقیقی ادیب، شاعر، مصوّر اور فن کار ضرورت سے زیادہ حسّاس ہوتا ہے اور ہر لمحہ اُس کے حالات و واقعات متغیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر اُس کے خطوط مختلف جذبات و احساسات کا آئینہ ہوتے ہیں اور بسا اوقات اُس کے قلم سے ایسی باتیں بھی نکل جاتی ہیں۔ جنہیں وہ کسی بڑی سے بڑی قیمت پر بھی زبان سے نہیں نکال سکتا۔

بلائنڈ (BLIND) کا یہ قول کہ:-

"اصولاً بڑے آدمیوں کے خطوط شائع ہونے کی غرض سے نہیں
لکھے جاتے ہیں اس لئے وہ اُن ذرائع میں سب سے زیادہ مستند ذریعہ ہیں
جن سے اُن کی زندگی اور ماحول کا صحیح اور واضح علم ہوتا ہے"

حقیقت اور واقعیت سے بالکل قریب تر ہے۔ مشاہیر کے خطوط جذبات و حسیات رنج و الم۔ کیف و نشاط۔ روابط و تعلقات۔ فخر و مباہات۔ علم و فضل۔ عجز و انکسار نظریاتِ حیات۔ محبت اور نفرت۔ ناز و نیاز۔ مذہبی اور سیاسی معتقدات بے تکلفی ہجو و ثنا۔ خودداری و خود اعتمادی۔ سرمستی و بدمستی، غرض تمام ذاتی اور داخلی میلانات کے ایسے آئینے ہوتے ہیں جن سے اُن کی زندگی کے تمام گوشے بے نقاب ہو جاتے ہیں اور ہم انہیں بالکل قریب سے دیکھ سکتے ہیں۔

اُردو ادب میں غالب۔ شبلی۔ سرسید۔ محمد علی۔ اکبر الٰہ آبادی اور امیر مینائی وغیرہ کے خطوط جس قدر و منزلت کے حامل ہیں اور زبان و ادب کی تحریکوں کو ان سے جو مدد ملی ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ایسے ہی خطوط **مرزا رجب علی بیگ** سرور کے ہیں۔ چونکہ دوسرے مشاہیر کے خطوط میرے موضوع سے خارج ہیں اس لئے میں انہیں کی طرف رجوع ہوتا ہوں۔

مرزا رجب علی بیگ سرور صاحبِ "فسانۂ عجائب" اکبرآباد میں پیدا ہوئے یہیں پڑھے اور یہیں تعلیم حاصل کی۔ مرہٹہ اور جاٹ گردی میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ تشریف لے گئے۔ مدتِ دراز تک کانپور میں مقیم رہے۔ عمر کے آخری حصہ میں مہاراجہ بنارس کے یہاں ملازم ہو گئے اور وہیں بمقام رام نگر انتقال فرمایا۔

ہرچند سرور کا وطنِ اصلی لکھنؤ نہ تھا لیکن چونکہ عمر کا ایک بڑا حصہ اسی دیارِ ادب میں گذرا تھا اس لئے وہ لکھنوی الاصل معلوم ہوتے ہیں اور لکھنؤ والوں کو آپ کی ذات پر فخر و ناز بھی ہے۔ لکھنؤ کی انشا پردازی میں سرور کا وہی درجہ ہے جو شاعری میں ناسخ کا ہے۔

اُردو نثرِ قدیم کے اسالیب نگارش دو ہیں ایک سادہ اور دوسرا رنگین۔ ثانی الذکر رنگینی اس قدر پُرتکلف ہے کہ اس میں قدم قدم پر صنائع اور بدائع ملتے ہیں لکھنؤ کی یہ رنگینی چونکہ بالطبع تھی اس لئے مدت تک اس میں کسی قسم کا اضمحلال پیدا نہ ہوا اور وہ نکھرتی ہی گئی۔ ہرچند یہ طرز عام بول چال سے بالکل علیحدہ ہو کر رہ گئی لیکن چونکہ اہلِ لکھنؤ ہمیشہ تکلف اور تصنع کو حاصلِ زندگی سمجھتے رہے اس لئے ان کی انشا میں فطرتاً یہ رنگ پیدا ہو گیا۔ مسجع اور مقفیٰ عبارتیں۔ ہلکے پھلکے الفاظ، جگہ جگہ تکرار کلام اور صنعتِ رعایت انھیں کچھ ایسا لطف دیتی تھی کہ وہ اس پر سادہ طرزِ بیان کو قربان کر دیتے تھے۔

سرور کی ادبی قدروں نے بھی اسی ماحول میں سانس لی چنانچہ اُن کی انشا کی رنگینی کا بہترین شاہکار "فسانۂ عجائب" ہے۔ یہ تکلف اور رنگین طرز اُن کی زبان میں اس قدر رس بس گئی تھی کہ تصانیف کے علاوہ روزمرہ کی گفتگو اور اُن کے خطوط بھی اسی رنگ میں غرق ہو کر رہ گئے۔ اُن کے خطوط کا مطبوعہ نسخہ "انشائے سرور" مقفیٰ اور مسجع عبارتوں سے بھرا ہوا ہے۔ مطبوعہ انشائے سرور کے خطوط دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ سرور تمام عمر مصائبِ روزگار کا شکار رہے اُن کے خطوط کے داخلی پہلو صرف مصائب و آلامِ زندگی ہیں اپنے کسی خط میں انھوں نے سکون و اطمینان اور حیات کی خوشگواریوں کا ذکر نہیں کیا۔ اُن کا ہر لفظ جگر خراشِ آہ اور ہر جملہ نوحۂ زندگی ہے۔ آج جو غیر مطبوعہ خطوط میں آپ کے سماعت نشیں کر رہا ہوں وہ بھی بڑی حد تک اسی قبیل کے ہیں۔ لیکن ان کا ایک پہلو سرور کے مطبوعہ خطوط سے بالکل مختلف ہے یعنی "انشائے سرور" کے تمام خطوط مختلف لوگوں کے نام ہیں یا پھر سرور نے اپنے صاحبزادے احمد علی کو مخاطب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک باپ اپنے بیٹے کو خانگی امور کے علاوہ آزادی کے ساتھ اور کچھ نہیں لکھ سکتا۔ لیکن جو غیر مطبوعہ خطوط ابھی آپ سنیں گے اُن سب کا مکتوب الیہ فردِ واحد ہے اور ساتھ ہی ساتھ مکتوب نگار کا بے تکلف دوست بھی۔

اِن خطوط کی اصل منشی مہیش پرشاد صاحب مُلّا فاضل صدر شعبۂ فارسی و اُردو، ہندو یونیورسٹی بنارس کے پاس محفوظ ہے اور اُس کی نقل حضرت مولانا انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی کے ذریعہ مجھ تک پہونچی ہے۔ مولانا موصوف ہی کی اجازت سے میں انھیں آل انڈیا ریڈیو سے نشر کر رہا ہوں۔

پہلا خط ملاحظہ کیجئے یہ خط سرور نے رام نگر سے واپسی پر کانپور آ کر لکھا تھا۔

مرزا صاحب مظہرِ لطف و احسان، دوست یکرنگ مجمعِ خوبی ہائے بیکران
زاد لطفہٗ

بعد سلام۔ محبت التیام معاطراز ہوں جس روز سے تم سے جدا ہو کے روبراہ ہوئے بجز ملالِ خاطر خوشی سے ناآگاہ ہوئے۔ کانپور میں آ کے رنج سے دوچار رہے۔ تردد میں گرفتار رہے اور تمہارے خط کا ہر دم انتظار رہا طبیعت کو اپنے انتشار رہا۔ یہ سوچے کہ خط ملف ہوا تمہارے پاس ارباب ڈاک نے نہ پہنچایا ہم کو جواب نہ آیا۔ خیر جب کیف یہاں سے فرصت پا کے ۲۲ بائیسویں شعبان کو لکھنؤ چلے وہاں سے اتفاق بہت سا

ہمراہ لیکے کانپور پہنچے۔ چوتھی رمضان کو تمہارا مہربانی نامہ آیا۔ مگر حال عارضۂ طبیعت معلوم اور کچھ نہ معلوم ہوا کہ نقشہ کیا ہے۔ خداوند نعمت در نیولا کہاں رونق فزا ہیں۔ کس شغل میں در نیولا ہیں۔ محمد حسن خاں صاحب کو دیکھئے کہ اُنھوں نے بھی پوچھ نہ لکھا۔ میاں حفیظ اللہ تو سیر کرتے ہیں۔ دید گلگشت و دیر کرتے ہیں۔ دُنیا کا عجب نقشہ ہے۔ کچھ خیال کسی سے کسی بات کا رکھنا بہت بیجا ہے وہ لوگ بہت ثابت قدم راسخ العزم ہیں جو حاضر و غائب یکساں رہتے ہیں۔ مرد کیا جوانمرد انھیں کو کہتے ہیں جو کچھ آپ سے وقوع میں آیا۔ یا جیسا تم نے ہم کو اپنا رہین منت بنایا۔ پروردگار اس کا اجر دیگا۔ مسافر پروری آپ سے وقوع میں آئی وہ کیفیت دکھائی۔ خیر زیادہ تحریر خوشامد کا پتہ ہے اسکا لکھنا نہیں اچھا ہے۔ یا زندہ صحبت باقی۔ آپ اپنے آدمی سے رحمان نام وہ جو میرے پاس وقت رخصت آیا تھا۔ اس کو بلوا کے پانچ روپے حوالے کیجئے اس واسطے کہ ایک مہینے کا خرچ دیکے آیا تھا سو آج ایک مہینہ اور پانچ دن ہوئے تکلیف خرچ کی ضرور ہوگی۔ بمجرد خط دیکھنے کے آپ بلا کے حوالہ کریں اور جو ابھی عارضۂ طبیعت باقی ہو تو کہنا حکیم پناہ علی صاحب کے مکان پر جاکے میرا نام لے۔ وہ بدل علاج کرینگے اور کہدیجیگا آج کے دسویں دن جو جیتا ہوں تو آتا ہوں۔ آیندہ مرضی خدا اور یہاں کا ماجرا طول طویل ہے زبانی تقریر پر موقوف رکھا اور میر باسط علی صاحب کا حال خدا جانے کیا ہوا۔ اگر جس دن ہمارا خط پہنچے اور صبح کو جواب تم روانہ کرو تو البتہ ہم تک آئے اس واسطے کہ آٹھ دن ہم اور یہاں ہیں، پھر روانہ ہونگے جو خط لکھو تو سب کا حال لکھنا اور فرمائش تمہاری ضرور لاؤنگا۔ مجھ کو یاد ہے اب اور تاکید ہوئی اور صاحبان مہر سے ہمارا سلام کہنا۔ وہ بھی تیار ہوگئیں۔ مرزا مغل خانصاحب کو سلام شوق اس وقت جلدی کے باعث ضروری کا جواب لکھا۔ احمد علی کی طرف سے باشتیاقِ تمام سلام پہنچے اور مرزا مغل خاں صاحب کو بھی اور جو کوئی ہم کو پوچھے سلام شوق کہدینا اور حق ہمسایہ بھی سلام کا متقاضی ہے کہدینا فقط

۵ رمضان و پنجشنبہ رجب علی بیگ عفی عنہ

(۲۹ مارچ ۱۸۶۰ء ۱۲۷۶ھ)

مندرجہ بالا خط کے لفافہ پر مرزا صاحب نے جو پتہ لکھا ہے وہ بھی قابلِ دید و شنید ہے۔ لکھتے ہیں:۔

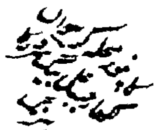
بحولہ تعالیٰ

شہر بنارس دال کی منڈی حویلی بی بیگن صاحبہ مغفورہ یا بُرانا چوک مرزا مغل جانصاحب کی دوکان۔

مطالعہ ساطعہ مرزا صاحب مہربان کرمفرمائے دوستاں مرزا نوجحسن زاد لطفہٗ آئے بہت ضروری ہے۔

۲۹ مارچ ۱۸۶۰ء اور پانچویں ماہ رمضان چار گھڑی دن آیا ہے

لفافہ کے گوشے میں سلہ یا FROM کی جگہ یہ لکھا ہے:۔



دوسرا خط:۔ اِس خط میں اُنھوں نے کسی کے انتقال پر اظہارِ تاسف کیا ہے اور حصہ ۵ انداز تحریر بتاتا ہے کہ غالباً اُنکی اہلیہ نے انتقال فرمایا ہوگا۔ اس کا تو پتہ چلتا ہے کہ وہ (رام نگر) بنارس سے کسی ضروری سلسلے میں کانپور آئے تھے اور شاید وہ اُنکی اہلیہ کی علالت ہی ہو۔

مرزا صاحب شفیق وعنایت فرمائے بندہ زاد لطفہٗ

بعد تحریر سلام اصل کلام یہ ہے کہ ہم تم سے جُدا ہوکے مصیبت میں مبتلا ہوکے دم بخود ہیں۔ حال اپنا کیا کہیں ہمیں شاید دسواں دن تھا جو اُنھوں نے انتقال کیا اب اُس وقت کی کیفیت وہ جانے جس پر کچھ ایسا ماجرا گذرا ہو ساٹھ برس کا غمخوار دوستدار جس کی بدولت جہاں کا لطف اُٹھایا، وزیر زادوں کو ہمارا حال دیکھ کے رشک آیا، وہ آنکھوں کے سامنے زیرِ خاک ہوا۔ پنجہ مصیبت سے گریباں تا دامن چاک ہوا۔ زمانہ نظر میں سیاہ ہے۔ لب پر فغان و آہ ہے۔ کسی طرح طبیعت کو قرار نہیں آتا۔ آرام قریب زنہار نہیں آتا مگر لبشرہ مجبور ہے۔ زمین سخت آسماں دُور ہے چارہ کیا ہے ضعیفی میں بڑا صدمہ ہوا ہے۔ دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ ایسا رنج بُرا ہوتا ہے۔ رات دن پریشانی ہے۔ خستہ حالی ہے نہ کوئی سرپرست ہے نہ وارث ہے نہ والی ہے۔ اور وہ کیا کہوں جو جو خیال آتے ہیں جنگل کی راہ دکھاتے ہیں انھیں بکھیڑوں میں لیل و نہار گذرتے ہیں۔ اُدھر میں سسکتے ہیں۔ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں کسی طرح چہلم ہوجائے تو پھر دیکھا جائے کہ فلک کیا دکھائے۔ وحشیوں کی صورت تنہائی میں رات دن

بسر کرتا ہوں۔ اپنی طبیعت کی بے کیفی سے بہت ڈرتا ہوں۔ غرضکہ آپکی بدولت جوانی میں جیسے چین اٹھائے ہیں اس کے بدلے اس سن میں ایذا اُٹھاتا ہوں۔ بیشتر راہ بھول جاتا ہوں، تمہارے مزاج کی خبر پائی تب دوسرے محمد حسن خاں صاحب کے تحریر سے دریا کی طغیانی حد بڑھنے کے پانی پانی سُن کے بہت طبیعت گھبرائی۔ ضرور اصد بھی اب بہت معلوم ہوتا ہے لازم ہے کہ اپنے مزاج کی کیفیت۔ مکانوں کی حقیقت سے آگہی بخشو کہ جی کو تسکین ہو۔ ہماری طرف سے بی حیدری کی ماں کو سلام اور اُن کو ہمارے حادثے کی نقل تمام سُنا دینا اور جو کوئی دوست ملے اور ہم کو پوچھے سلام کہدینا۔ فقط دوست سے جُدا مصیبت کا مبتلا خوشی سے دُور رجب علی بیگ سرور عفی عنہ ۱۲ ربیع الاول چارشنبہ کانپور

لفافہ پر یہ مضمون ہے۔ پہلے خط کا پتہ جتنا طویل تھا یہ اتنا ہی مختصر ہے اور اسی سے اُن کی طبیعت کی پریشانی ظاہر ہوتی ہے۔

انشاء اللہ تعالیٰ بخدمت مرزا صاحب عنایت فرمائے دوستاں مرزا ہو صاحب کو پہونچے۔

مرسلہ

رجب علی بیگ سرور کانپور

۱۸ ستمبر چارشنبہ ۱۲ ربیع الاوّل

(۱۸۶۱ء ۱۲۷۸ھ)

تیسرا خط :- اس تیسرے خط سے مکتوب الیہ کے ساتھ اُن کے خلوص کا زیادہ سے زیادہ پتہ چلتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

مرزا صاحب الطاف فرمائے بیکراں مظہر لطف و احسان سلمہ اللہ تعالیٰ بعد سلام اور اشتیاق ملاقات مسرت آیات کہ حد سے زیادہ ہے۔ واضح خاطر ہو مہربانی نامہ ۲۶ کا لکھا ہوا ۲۹ پنجشنبہ کا دن تھا۔ ڈاک کا ہرکارہ لایا دیکھنے میں آیا۔ عجب مضمون وحشت ناک تھا۔ مکان کا شق ہونا۔ بنگلہ کا حال درست کرنے کا سوال سب دیکھا۔ ایک تو ہم پریشان خاطر دن رات ملال میں سے معروف اپنے حال میں تھے کہ اس پر طرہ ہوا فلک جفا شعار ہمیشہ درپئے آزار رہتا ہے ہر شخص اُس کے جفا سہتا ہے ہر چند اس دیوار کے دہلنے کا ہم کو کھٹکا تھا۔ خلش تازہ آنکلا تھا۔ اسی کا سامنا ہوا۔ اسی کا شکر ہے کہ جان سلامت رہی اور کسی بشر کو گزند نہ پہنچی۔ ورنہ دشمنوں کو ایذا پہنچنے کی اور سند ہوتی زیادہ کیا ہوتی؟ خدا تم کو مع سلامت رکھے روپیہ ہاتھ کی میل مشہور ہے۔ بہت کچھ کھایا کھلایا زندگی کا لطف اٹھایا اور اٹھاؤ گے خدا جس کو آبرو دیتا ہے کسی کے مٹانے سے مٹتی نہیں اور یہ لیل و نہار زمانے کے یونہی چلے آئے ہیں۔ گذشتہ بھی ایکی شکایت برزبان لائے ہیں کہانیاں قصے تحریر فرمائے ہیں۔ دُنیا جائے گزراں ہے ع

بر سر فرزند آدم ہرچہ آید بگذرد

نہ وہ زمانہ رہا نہ یہ رہیگا۔ مگر نیک کو نیک بُرے کمبخت کو ہر شخص بُرا کہے گا فضل الٰہی شامل حال ہے تو دشمن روسیاہ پشم کا بال ہے۔ لیکن مہاراج بہادر کی اس حرکت کا بہت عجب ہوا کہ یہ کیا غضب ہوا۔ خدا جانے ان صاحبوں نے کیا سمجھا کہ کون سی بات خلاف مزاج سُنا کہ اس طرف طبیعت لائے فقیر کو اپنے نہ ہونے کا بہت افسوس ہوا ورنہ اس قدر طول نہ ہوتا۔ خدا جانتا ہے جس قدر مجبور ہوں اور اتنی دُور ہوں نہیں تو ابھی روانہ ہوتا نہ عذر ہوتا نہ بہانہ ہوتا۔ اس پر بھی خدا نے چاہا تو بہت جلد آتا ہوں گھبراتا نہیں۔ مگر یہ جو دو چار کلمے لکھتا ہوں ضرور ضرور عمل میں لانا بھول نہ جانا پہلے تو یہ ہے گھورن سنگھ کے ذریعہ سے خواص صاحب کی خدمت میں جانا مفصل سب حال سنانا کہ خداوند اس قصور پر مارا جاتا ہوں۔ آپکے سوا کہیں ٹھکانا نہیں کسی کے پاس آنا جانا نہیں اگر آپ میرے حال پر غور نہ کرینگے تو بے سبب میری آبرو جاتی رہے گی۔ خلق خدا بے وسیلہ کہے گی۔ میری دستگیری ضرور ہے کہ فدوی بیکس مجبور ہے۔ مہاراج بہادر کو خدا سلامت رکھے مجھ کو پرورش کی اُمید تھی یہ خیال نہ تھا ناحق میرے گلے پر چھری چلتی ہے۔ میرے حال پر صنعت کف افسوس ملتی ہے ؎

جب مسیحا دشمن جاں ہو تو کیا ہو زندگی

کون رہ بتلا سکے جب خضر بہکانے لگا

دو چار بار اُنکا دربار ضرور ہے جس دن اُن کو خیال آیا یا کچھ فرمایا وہ پتھر کی لکیر ہوگی کوئی دم نہ مار سکے گا۔ نوشتہ تقدیر ہوگی۔ دوسرے یہ کہ اپنے راجہ صاحب دیونارائن سنگھ سے یہ حال کہنا اگر وہ ذرا کے بھی اس مقدمہ میں مہاراج سے کہدینگے کافی ہے اور بابو گھورن سنگھ کو تمہاری پرداخت ہر کیف منظور ہے۔ جب تم کہوگے وہ منہ نہ پھیرینگے۔ اگر زندگی ہے تو مجھ کو بہت جلد آیا سمجھو میری کمائی پریشانی بہت

طول طویل ہے خفقان سے فرصت قلیل ہے۔ ہزارہا روپے کا اسباب تلف ہو گیا پتہ نہ ملا۔ ایک تو ایسے غمخوار کی جان گئی اس پر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ مخالفوں نے ہاتھ صاف کیا خوب چرایا دو چار باہم ہیں یکہ و تنہا ہم ہیں جس سے پوچھا جواب دیا کیا ہمیں معلوم اور جب قریب مرگ سمجھے اس وقت مجھ کو لکھا بھائی صاحب کو فقط میرے لینے کو بھیجا تھا انھوں نے چلتے چلتے کچھ نہ کہا دوسرے کا شکوہ کیا اور اپنے راجہ صاحب دیونرائن سنگھ سے عرض کرنا میں فقط آپکا نا بعدار بے یار و مددگار رہوں۔ اگر آپ اس مقدمہ میں سعی نہ کرینگے میری ناحق آبرو جائیگی۔ چار ارنج بہادر کے ہاتھ دولت نہ لگ جائیگی فقط میر صاحب نے مکان نہ دینے سے میرے گلے پر چھری پھیری ہے۔ آپ کے سوا کس سے عرض حال کروں، سعی کا سوال کروں، اگر یہ امر ظہور میں آئیگا فدوی گریبان چاک کر کے شہر سے نکل جائیگا جب کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا تو اس شہر میں رہنے سے کیا حاصل رہا خدا کو یاد کرو وہ عادل ہے فریادرس ہے وہی سرپرست بس ہے دنیا چند روزہ ہے۔ وقت نکل جاتا ہے بات باقی رہ جاتی ہے نہ ظالم رہتا ہے نہ مظلوم رہتا ہے۔ حرامزادے حلال زادے کا حال سب کو معلوم رہتا ہے۔ پروردگار ارحم الراحمین ہے دیکھو تو وہ کیا کرتا ہے۔ میں نے وہاں سے خرچ منگوایا ہے جس وقت آیا پھر یہاں ایک دم کا وقفہ نہ ہوگا۔ ابھی تک لکھنؤ جانا نہیں ہوا۔ تہیدستی مانع ہے مگر اس حادثے سے پہلے میں نے روپے مرزا صاحب کے پاس بھیجدیے تھے۔ کل تیسری تاریخ چہار شنبہ تھا خط انکا آیا لکھا تھا فرمائش مرزا بنو صاحب کی تیار ہے اور سب صاحبوں کو نام بنام ہمارا سلام کہدینا اور بی حیدری صاحب کو ہمارا سلام کہنا اور ان کی ماں کو کہنا اور بی محمدی جان صاحب اور انکی ماں انکو بھی کہدینا۔ حکیم صاحب سے جو کبھی ملاقات ہو جائے سلام نیاز کہدینا۔ باقی اور سب بزرگواروں کو جو مناسب ہو کہدینا شاہ صاحب مشفق[۵] جنھوں نے خط لکھا تھا انھیں بھی سلام۔ مرزا مغل خاں صاحب کو شوق تمام مولا کو دعا۔ خدا بخش کو بندگی ۴ ربیع الثانی پنجشنبہ راقم رجب علی بیگ عفی عنہ اور محمد حسن خاں صاحب اگر ملیں اُن سے کہنا روپیہ جلد بھیجو

بڑا ہرج ہے۔

اس خط کا پتہ پہلے خط کی طرح طول طویل ہے، سنئے:۔

انشاء اللہ المستعان

شہر بنارس دال کی منڈی بڑی بی ہیگن مرحومہ کے مکان میں بگرامی مطالعہ سعدہ مرزا صاحب مظہر لطف و احسان عنایت فرمائے بیکراں مرزا بنو صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچانا۔

بھیجا رجب علی بیگ سرور کا کانپور محلہ کرسواں ۱۰ اکتوبر ۱۸۶۱ء

۴ ربیع الثانی پنجشنبہ

بیرنگ ضروری ہے

یہ **چوتھا خط** مرزا کی بلند ظرفی اور اُن کے مضبوط کردار کا آئینہ دار ہے اللہ اکبر "گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا" کا صحیح اطلاق انھیں جیسے بزرگوں پر ہوتا ہے۔

شفیق اور مہربان میر دوست لی اور قدر دان میرے غفلت شعار فراموش خویباں بنو صاحب سلمہ۔

بعد از سلام شوق اور دیکھنے کی آرزو جو دل محبت خو میں ہے اس کو کہاں تک لکھوں دفتر چاہیے۔ بخدا ہمیشہ تمہاری ملاقات کی تمنا ہے۔ عرصہ ہوا آپ کا خط آیا تھا مسرور فرمایا تھا خدا تم کو خوش خرم ہر دم رکھے ہم تمہارے ممنون ہیں لیکن ایک بڑا گلہ ہے شکوہ لا انتہا ہے۔ جب تم نے اُنکا نام لکھا کہ میرے دوست ہیں اس باعث سے تم سے شکایت کی پہلے جانتا کہ تم اُن کو نہ جانتے ہوگے جن کا نام آپ نے مرزا اسد بیگ صاحب لکھا تھا میں نے اُنکا کیا بگاڑا تھا میں تو اُن کی صورت بھی نہیں جانتا نہ اُن کو پہچانتا ہوں، اس بندۂ خدا نے بلا واسطہ ہزاروں گالیاں دیں سرنامہ پر تمہارا نام لکھا میں نے بہت خوش ہو کے کھولا واہ واہ پڑھتا جو ہوں لاکھوں فحش کلمہ۔ حیران ہوں کہ وہ کون ہیں میرا قصور کیا ہے۔ خدا اُنکا بھلا کرے اور جو کچھ جی میں آئے فرمائیں اگر بر دُو دو کہنے میں چپ سُن لینا۔ گالی کی عوض اُن کو دعا دینا۔ بھائی میں تو بدترین خلائق ہوں۔ حقیقت میں اسی لائق ہوں۔ جو کچھ جس کے جی میں آئے وہ فرمائے میں اسی کا سزاوار ہوں۔ ایک بُرا اللہ کا بندہ سب کا گنہگار ہوں۔ خدا ان کو اس کی جزا دے۔ سیدھے راہ لگا دے۔ نوازی کا شکار

اور کہیں اس کا عوض ہو جائیگا۔ اُن کے بُرا کہنے سے میرا بھلا ہوگا۔ اُن کے ہاتھ کیا آئیگا۔ اس واسطے اُن کا خط تمہارے پاس بھیجا ہے۔ دیکھا کے میری خطا معاف کروانا پوچھنا کیا تقصیر مجھ سے ہوئی۔ جس کے عوض میں میری خرابی کی اشراف ایسی باتیں زبان پر نہیں لاتے ہیں۔ حلال زادے یہ کلمہ کسی کو کب لکھ کے بھجواتے ہیں اور جس قدر مجھ میں عیب ہیں اُن کو کہاں معلوم ہیں میں تو ہمہ تن سراپا خطا کا پتلا ہوں، اور کیا لکھوں لیکن مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ میرے اُن کے کبھی کوئی معاملہ قصہ بکھیڑا کچھ نہیں ہوا۔ صورت سے بھی آشنا نہیں۔ یہ معاملہ بھی کسی نے سُنا نہیں۔ بغض للّٰہ اسی کو کہتے ہیں۔ ایسے شخص سے ڈرتے رہتے ہیں کہ جان نہ پہچان جو منہ میں آیا کہنے لگے۔ نالی کی طرح بہنے لگے۔ انشاء اللہ بشرط زیست اگر بنارس میں آؤنگا اُن کی قدمبوسی سے مشرف ہونگا۔ اس کے بدلے میں خدمت بجالاؤنگا۔ سبحان اللہ بحمدہٖ ایسے نیک طینت آدمی دُنیا میں کہاں ہوتے ہیں بے تقصیر و گناہ گالیوں کے بچھے بیاں بھیجتے ہیں۔ اُن کے منہ سے کیا خوب پھول جھڑتے ہیں۔ کیا کیا دلچسپ فقرے گڑھتے ہیں۔ یہ خط میری امانت ہیں اُن کو سُنا کے بہت حفاظت سے اپنے پاس رکھنا میں آ کر تم سے لونگا اور جو کھو دوگے تو بہت خفا ہونگا وہاں آ کے سب کو سُناؤنگا جب مزا پاؤنگا اور مرزا مغل جان کو مزدہ دکھانا۔ تم پڑھ کے سُنانا فقط جواب کا منتظر ہوں بی محمدی صاحب کو بہت سلام شوق کہنا اور مرزا یعقوب بیگ صاحب کو۔

۱۸ جمادی الاوّل پنجشنبہ

مرزا رجب علی بیگ سرور مرحوم کے مندرجہ بالا چاروں خطوط اُنکی انشا کی انفرادیت کا ایک عکس ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ ان خطوط میں ایسے جملے اکثر و بیشتر ملجائینگے جو تکلف اور تصنع کے باوجود زیادہ سے زیادہ دلکشی اور جاذبیت کے حامل ہیں اور جنھیں پڑھکر روح میں اہتزاز پیدا ہوتا ہے —— اُن کا چوتھا خط تو خصوصیت کیساتھ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا بہترین نمونہ ہے اور نفسِ خط کے تو کیا کہنے، ایک ایک لفظ دل میں چبھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ میرے پیش کردہ خطوط اُردو ادب میں "اضافی نوادر" کی حیثیت سے دیکھے جائینگے۔

اعجاز صدیقی

مسرتِ آشیاں سے پہلے

وجودِ مطلق تھا حسنِ رنگیں وجودِ کون و مکاں سے پہلے
ہوئی نہ اصلا خبر کسی کو یہ پھوٹ نکلا کہاں سے پہلے

کرشمۂ غم کہ انجمن میں اثر ہوا اُن پہ خامشی کا
وہ کہہ چلے داستانِ پُرغم ہمارے شرح و بیاں سے پہلے

ترے اشاروں سے باز آئے تری کنایوں سے تنگ ہیں ہم
سُنا دیا تو نے چشمِ تر! اُنکو حالِ دل کا زباں سے پہلے

تم اپنی شانِ نمود دیکھو ہمارا ذوقِ سجود دیکھو
جبینِ سجدہ جھکی ہوئی ہے تعیّنِ آستاں سے پہلے

یہی تھے جلوے یہی نظارے یہی تھے نقشے یہی تماشے
کسے تھا پاسِ حسنِ رنگیں نگاہ کے امتحاں سے پہلے

قفس کے غمناک خواب مجھکو ابھی سے آنکھیں دکھا رہے ہیں
تباہیاں سامنے کھڑی ہیں مسرتِ آشیاں سے پہلے

یہی ہے رسوائیوں کا باعث چھپا سکے ہم نہ رازِ اُلفت
خدائی کیوں رازِ عشق سے آشنا ہوئی رازداں سے پہلے

ہے آرزو دل میں زیب میرے پیوں وہ جامِ مئے محبت
جو دے مجھے ایک شباب تازہ زوالِ عہدِ جواں سے پہلے

ڈاکٹر زیب بلوی

نوائے میکش

باتے ہیں مدعا کو غم مدعا سے ہم — سرشار ہیں گذارشِ بے التجا سے ہم

بیگانگی نے تیری دیا ہوشِ غیریت — ثابت ہوئے ہیں کس ستمِ ناروا سے ہم

تیرا شباب ہے غمِ الفت کی ابتدا — یعنی ہوئے شروع تری انتہا سے ہم

کس سے کہیں تمہاری شکایت کی داستاں — تم سے بھی پہلے روٹھ چکے ہیں خدا سے ہم

پھر اعتبارِ عشق کا انکو نہیں رہا — پھر یاد کر رہے ہیں سبق ابتدا سے ہم

آزاد ہے علائقِ رسم و رواج سے — میکش کو جانتے ہیں بہت ابتدا سے ہم

میکش اکبرآبادی

حفظِ امانت

وہ کہ جوہر ہے مرے آئینۂ ہستی کا — وہ کہ ہے رازِ مری بےخودی و مستی کا

وہ کہ ہے رونق و زیبائشِ ایوانِ وجود — وہ کہ ہے حسن و بہارِ چمنستانِ وجود

جس کے مفہوم کی حامل ہے مری دل کی کتاب — جس کے جلوہ کے لئے ہے مری ہستی کا حجاب

جس کی نکہت سے معطر ہیں مرے صبح و مسا — جس کی طلعت سے منور ہیں مرے ارض و سما

جس کے پرتو سے مرے دل کا عمق ہے روشن — جس کی ضو سے مری ہستی کا افق ہے روشن

جس کی در پردہ تجلی سے ہیں نظریں پرنور — جس کی جاں بخش حرارت سے ہیں سانسیں معمور

جس کے بل بوتے پہ سہتا ہوں غم و رنجِ حیات — جس کے عرفان سے کافور ہوا خوفِ ممات

جس کے بس میں ہیں مرے ہوش و خرد خواب و خیال — جس کے قابو میں ہیں جذبات، اشارات، اعمال

جس کا قبضہ ہے اگرچہ مرے جز و کل پر — جس نے پھر بھی نہ دکھائی مجھے صورت کھل کر

جس نے اُلٹی نہیں اب تک رخِ زیبا سے نقاب — جو بہ رنگِ مہِ تاباں ہے ابھی زیرِ سحاب

دل میں رہ کر بھی جو آہوں کی رسائی سے ہے دور — بس کے آنکھوں میں نگاہوں کی رسائی سے ہے دور

دیکھ! وہ تیری امانت ہے امانت اب تک — بھول کر بھی نہ ہوئی اُس میں خیانت اب تک

تجھ کو معلوم ہے کس کس نے لبھایا دل کو — گاہ ویران کیا گاہ بسایا دل کو

زلزلے آئے ہزاروں ہوئے طوفاں بپا — دل کے شق ہونے پہ بھی اُس کا دریچہ نہ کھلا

کوئی محجوب سے محجوب اُسے پا نہ سکا — حرفِ اُس خاص ودیعت پہ کبھی آ نہ سکا

اُس کا رس ہے تری توحید کے نغموں کے لئے
ہے وہ مخصوص ابھی تک ترے قدموں کے لئے

کوکب شاہجہانپوری

کیا وہ طوائف تھی؟

ساون کی پُر کیف شام ہر طرف گھٹائے رنگا رنگ۔ جس طرف دیکھئے جوانی ہی جوانی بکھری پڑی تھی، ہلکا سا ترشح ہونے کے بعد مطلع صاف ہوگیا تھا۔ میں تفریحاً ہینگنگ باغ جا نکلا۔ قدموں تلے سبزے کی مخمل سر پر نیلگوں آسمان اور باغ کی ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا میں دل پر ایک وجدانی کیفیت طاری کر رہی تھیں۔ میں ایک روش کے کنارے بیٹھکر چند اشعار موزوں کرنے لگا۔ اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ نظر اٹھائی تو ایک مہوش کو گل چینی میں مصروف دیکھا۔ کالے کالے گھونگھر بال۔ سر سے پاؤں تک پھول ہی پھول اور نگاہیں تھوڑی اٹھتی۔ تھوڑی دیر تک تو میں اُسے دیکھتا ہی رہا۔ اور آہستہ آہستہ گنگنانے لگا ؎

پھیلے پڑے ہیں جسقدر حُسن کے جلوۂ لطیف
جی میں ہے سب سمیٹ لوں امن امتیاز میں

سورج اپنی کرنوں کو آغوش میں لے چکا تھا اور شام کا دھندلکا دن کی روشنی پر غالب آتا جا رہا تھا۔ وہ پھول چننے میں اتنی مشغول تھی کہ اُسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ کوئی نگرانِ جمال ہے اور اس حُسنِ مجسم کے نظارے سے تشنگیٔ دید بجھا رہا ہے۔ میں نے کچھ زور سے ترنم میں ایکبار کہا ؎

تنگ دامن، وقت کم، گل بے حساب
انتخاب اے دستِ گلچیں انتخاب

جسے سنکر تھوڑی دیر کیلئے وہ بھی کچھ کھو سی گئی اور میرے قریب آکر کہنے لگی "کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ یہ شعر کس کا ہے؟ یہ تو مجھے یاد نہیں۔ میں نے کہا۔ "اس وقت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ اسی لئے گنگنا رہا ہوں۔ کیا محترمہ کو شعر و سخن سے دلچسپی ہے؟" "شعر و سخن سے [illegible] البتہ جب کوئی شعر پسند آجاتا ہے تو یاد ضرور کر لیتی ہوں۔ اگر بار خاطر نہ ہو تو یہ شعر مجھے بھی لکھ دیجئے" اس نے کہا۔

"تشریف رکھئے" میں نے بنچ کے ایک کونے کی طرف کھسکتے ہوئے کہا۔ "ابھی لکھے دیتا ہوں۔"

وہ بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ سامنے سے ایک دوشیزہ آنچل اڑاتی ہوئی آئی جو شکل و صورت میں اس سے کچھ مشابہ تھی اور کہنے لگی:-

"شمیم چلو اندھیرا ہو رہا ہے، تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

وہ مُسکراہٹ کے ساتھ چلی اور پرندہ میرے ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ میں اُسے اُس وقت تک دیکھتا رہا جبتک وہ میری آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگئی ؎

اُسکے پیچھے مری نگاہ گئی
تھک گئی جب نگہ تو آہ گئی

اُسکے اوجھل ہوتے ہی دل نے مجھ سے کہا وہ کتنی حسین ہے، میں نے کہا ہوگی تجھے کیا۔ یہ سُن کر دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور جذبے ربط سے جملے میرے خشک ہونٹوں پر رقص کرنے لگے۔

شمیم ــــ کتنا ــــ پیارا ــــ نام ہے ــــ کیا میں ــــ
پوچھ ــــ سکتی ہوں اور ــــ اور ــــ کیا ــــ کہا تھا ــــ

آخر موٹر کے ہارن نے مجھے چونکا دیا۔ ارے کتنا اندھیرا ہوگیا۔ یہ کہکر میں اُٹھ کھڑا ہوا اور گھر کی راہ لی۔ تمام رات بے چینی رہی اور ہزاروں خیالات ذہن میں گردش کرتے رہے، وہ کون تھی، کہاں رہتی ہے، کل باغ آئے گی یا نہیں ....؟ بڑی مشکل سے رات کاٹی، اللہ اللہ کرکے دن نکلا اور دس بجے کے قریب میں دفتر چلا گیا۔ وہاں بھی دن بھر کام میں جی نہ لگا۔ بڑی مشکل سے دن کاٹا اور دفتر سے سیدھا باغ کی طرف چلا گیا۔ میں یہ دیکھکر حیران سا رہ گیا کہ مجھ سے پہلے وہ وہاں موجود تھی۔ مجھے آتا دیکھکر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ تشریف لے آئے۔ میں آپ ہی سے معافی مانگنے حاضر ہوئی ہوں کہ میں نے کل انتہائی بد اخلاقی کا ثبوت دیا۔"

"ارے صاحب" میں نے کہا۔ "ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ فرمایئے مزاج تو اچھے ہیں؟"

"آپکی مہربانی ہے۔"

"ہاں میں یہ پوچھنا بھول ہی گیا کہ کل آپکے ہمراہ وہ کون تھیں؟"

"وہ میری [illegible] طبیعت خراب رہتی ہے اس لئے تفریح کے لئے [illegible] ہم لوگوں کو اتنی فرصت کہاں جو سیر و تفریح [illegible]

"کیوں؟ آخر کونسی معروفیتیں مانع ہیں؟" میں نے پوچھا
"یہی کہ گانے بجانے سے کام رہتا ہے" اُس نے جواب دیا۔
"اچھا تو آپ طوائف ہیں!"
لفظِ طوائف پر وہ کچھ شرما سی گئی اور کہا "ہوں تو نہیں لیکن کچھ روز میں ہونیوالی ہوں۔ اس لئے کہ آئندہ ماہ میری رسم ہو جائے گی، یہ کہتے ہوئے وہ گھبرا کر اٹھی اور جلدی سے کہا لائیے وہ کل والا پرزہ" میں نے پرزہ اس کے حوالے کیا اُس نے اپنی راہ لی اور میں نے لفظِ طوائف کے ساتھ تمام باتیں فراموش کر دیں۔

جس راستے سے میں دفتر جایا کرتا تھا اسی راستہ میں سردرنگر "(طوائفوں کا محلہ)" واقع تھا۔ اور بالکل سرِراہ شمیم کا مکان۔ مجھے جاتا دیکھکر شمیم کبھی کبھی دروازے پر آکر مسکرا دیتی اور چلی جاتی۔ ایک دن اُس نے مجھے بلا کر کہا کہ کل دفتر سے واپسی پر غریب خانے پر چائے نوش فرمائیے گا۔ میں نے بلا تکلف منظور کر لیا اور دوسرے روز حسبِ وعدہ میں نے چائے میں شرکت کی، دورانِ چائے نوشی میں میں نے کہا، آج کل آپ باغ تشریف نہیں لاتیں۔
"جی نہیں اب ہمشیرہ بفضلہ تندرست ہیں اور آپ تو اِس طرف سے گذرتے ہی رہتے ہیں۔ اِس طرح نصف ملاقات کا لطف آ جاتا ہے۔
اس جملے پر میں کچھ حیران سا رہ گیا کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ میں نے جلد جلد چائے ختم کی اور دوسرے روز شام کو اُسے کراؤن ہوٹل میں چائے پر مدعو کر دیا چند گھنٹوں کے لئے میں نے کراؤن ہوٹل کا ایک کمرہ لے لیا تھا۔ ٹھیک ساڑھے پانچ بجے وہ کراؤن ہوٹل پہنچ گئی اور اُس نے سلسلۂ گفتگو یوں چھیڑا کہ آج ذرا اچھے اچھے شعر سنائیے۔ میں نے چند اشعار سنائے جنکو سُن کر وہ آب دیدہ سی ہو گئی۔
"شمیم! تم رو رہی ہو" میں نے تعجب سے کہا۔

بے سبب آ گئے ہیں کچھ آنسو
میری آنکھوں کا اعتبار نہ کر

"آخر کوئی تو سبب ہوگا!"
"سبب ——— ؟ طوائف کا رونا ہی کیا اور پھر طوائف آخر طوائف ہے۔"
"اس میں کیا شک ہے۔ خدا وہ دن جلد لائے کہ لوگوں کو اس بلا سے نجات ملے۔"
"کیا [illegible] ہے۔ ایک عورت اگر طوائف ہو گئی تو اسکا الزام سماج کے سر ہے۔"
"اِس میں سماج کا کیا قصور ہے!"
"سماج کا کیا قصور ہے۔ (کسی قدر زور سے) سماج ظالم سماج اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے ہمیں شکار بناتی ہے اور ہم سے دادِ عیش لیتی ہے!"
"کیا خوب، آپ کی منطق بھی نرالی ہے!"
"اِس میں منطق کو کیا دخل ہے۔ آپ کا بھی شمار سماجیوں میں ہے۔ بتلائیے وہ کونسی شے ہے جو آپ کو ہمارے یہاں کھینچ کر لاتی ہے اور آپ لوگ اپنی دولت کو پانی کی طرح بہاتے ہیں۔
"گانا سننے، جی بہلانے۔ تمام تفکرات سے چھٹکارا پانے۔ کیونکہ گانا روح کی غذا ہے۔
خوب! کیوں صاحب؟ آپ کی بیویوں میں عورتوں کی خصوصیات موجود نہیں؟ آپ انہیں گانا سکھا کر روح کی غذا کیوں حاصل نہیں کرتے!"
"معاف کیجئے میں آپ کا ہم خیال نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو جائے تو ایک گھر گرہست اور بازاری میں کیا فرق رہے۔ ایک کی محبت مستحکم اور دوسری کی ناپائدار میں نے آج تک نہیں سُنا کہ طوائف نے کسی سے وفا کی ہو۔ ——— آپ اپنے ضمیر کو ٹٹولئے!"
"اور میں نے بھی آج تک کسی مرد کو صحیح معنوں میں محبت کرتے نہیں دیکھا۔ البتہ ہوس کا شکار ہوتے ضرور دیکھا ہے اور اب محبت رہی کہاں؟ محبت رہیگی کیسے؟ اسے تو آپ لوگوں نے دولت پر قربان کر دیا ہے!"
"آپ لوگوں کا بھی تو نصب العین یہی ہے کہ محبت کا فریب دے دے کر لوگوں کی جیبیں خالی کریں!"
"آپ میرے جذبات سے کھیل رہے ہیں۔ للہ ایسے جملے نہ کہئے!" اُس نے آبدیدہ ہو کر کہا۔
میں اپنی غلطی پر نادم تھا کہ ایک عورت کا دل دکھایا۔ آخر شرمندہ ہو کر کہا کہ "اچھا شمیم میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں!"
"الفاظ واپس لینے کے بجائے کاش آپ میرے زخموں کو مندمل کرنیکی کوشش کرتے۔ کاش مردوں کو عورتوں کے جذبات کا احساس ہوتا!"
"شمیم میں شرمندہ ہوں۔ بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"
"کیا آپ کی خودداری ان الفاظ کا پاس کریگی جو ابھی آپ کی زبان سے

نکلے ہیں؟"

"انشاء اللہ تعالیٰ۔ جہاں تک میرے امکان میں ہوگا میں ضرور کرونگا۔"

کہو آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟"

"یہی کہ آنیوالی مصیبت سے بچایئے اور مجھے اپنی غلامی کا شرف بخشئے۔"

اس جملے کے سنتے ہی میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ نگاہوں کے سامنے گھر کا تمام نقشہ پھر گیا۔ میرے دونوں معصوم بچے مسکراتے ہوئے نظر آئے جنکو میری بیوی لئے کھڑی تھی۔ یکایک میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ میری یہ حالت دیکھکر شمیم کچھ مضطرب سی ہوگئی، اور کہنے لگی۔

"آپ رو رہے ہیں!"

....

"آپ بولتے نہیں!"

....

"آپ نہیں بولیں گے" یہ کہہ کر شمیم نے زور سے میرے چٹکی لی اور میں چونک پڑا۔"

میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا؛

"کیا کہتی ہو شمیم، مجھے معاف کرو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔"

"آپ میری کوئی مدد نہیں کرسکتے؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

"اسکا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے"

"تو کیا میں مایوس ہوجاؤں؟"

"افسوس میں اس کے متعلق کوئی رائے بھی نہیں دے سکتا۔"

"اُف آپ نے یہ کس وقت کا انتقام لیا، او خدا ؎

اُمیدیں جن سے تھیں کچھ خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے!

"آخر آپ نے مجھے فریبِ التفات کیوں دیا؟"

"شمیم! ؎

اک طرف کعبہ ہے اک سمت صنم خانہ ہے
سالکِ راہِ طلب بیچ میں دیوانہ ہے

"میرے دو معصوم بچے اور میری بیوی جنکی محبت پر مجھے ناز ہے اور مجھ پر فخر کرتی ہے۔ کیا کہے گی۔ ظاہر ہے کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔"

"اسکا انجام بُرا ہے۔ سوچ لیجئے ——— یا تو ایفائے عہد کیجئے نہیں تو میں.............."

"سوچ لیا شمیم مجھے معاف کرو۔"

میں صوفے کے ہتے پر سر رکھکر غافل سا ہوگیا۔ ہوٹل کے نوکر نے مجھے آکر بیدار کیا اور کہا کہ ایک بائی جی یہ خط دے گئی ہیں۔

میں یہ دیکھکر حیران ہوگیا کہ شمیم کمرے میں نہیں ہے۔ لفافہ چاک کیا، یہ شمیم کا خط تھا جسمیں لکھا تھا۔

"دوست نما دشمن!

میں نے آپ سے التفات کی بھیک مانگی ——— ہوس کے پھندوں سے نکالنے کی التجی کی۔ گناہ کے اندھیروں سے تقدس کے اُجالوں میں لانے کی درخواست کی لیکن افسوس آپ نے توجہ نہ کی۔ مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ ساری دُنیا رہزنِ معصومیت ہے ——

خیر ؎ تم سے شکوہ ہی کیا مرا دل بھی
میری بربادیوں میں شامل تھا

میری آخری گذارش یہ ہے کہ آپ کل باغ میں ضرور تشریف لائیں۔ اگر یہ بھی منظور نہیں تو نہ سہی۔ اچھا رخصت شمیم۔"

دوسرے روز میں باغ پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ اُسی روش کے قریب (جہاں میں اکثر بیٹھا کرتا تھا) لوگوں کا ہجوم ہے۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ لوگ کسی چیز کے چاروں طرف دائرہ بنائے کھڑے ہیں۔ قریب جاکر دیکھا تو پولیس پنچ نامہ لکھ رہی تھی۔ اور ایک عورت کی لاش پڑی ہوئی تھی، سینے پر ایک کاغذ لگا تھا جس پر لکھا ہوا تھا ؎

تنگ دامن۔ وقت کم۔ گل بے حساب
انتخاب اے دستِ گلچیں انتخاب

یہ ہوش رُبا نظارہ دیکھکر مجھ میں سے زندگی کی تمام قوتیں سلب ہوگئیں۔ سر چکرانے لگا دل ڈوبا غ ماؤف ہوکر رہ گئے اور قدم لڑکھڑانے لگے۔ محبت اپنا کام کرچکی تھی اور ہوس شرمسار ہو چکی تھی۔

رسوا مظلومی والی پاجود (کانپولہ)

محسوساتِ ماہر

کیا یہ بہار بھی نہ مجھے آسکے گی راس — بجلی چمک رہی ہے نشیمن کے آس پاس
ہے وقتِ نزع آپ کے آنیکا انتظار — ٹوٹی ہوئی امید میں بھی ہوتی ہے آس
وہ اک جھلک دکھا کے کبھی کے چلے گئے — اب ان کو ڈھونڈتے رہیں کھوئے ہوئے حواس
وعدہ کا ذکر تھا کوئی دشنام تو نہ تھی — اتنی ذرا سی بات پہ تم ہوگئے اداس
نظروں کو ہر مجاز یہ ہے اعترافِ عجز — جلوے قدم قدم پہ ہیں بے حد و بے قیاس
یہ راہِ غم میں پہلا قدم ہے بہ اذنِ دوست — گھبرا گیا ابھی سے دلِ قدر ناشناس
خود بینی کفر، نغمۂ و شاہد حرام ہیں — وہ میرا اجتہاد ہے، یہ شیخ کا قیاس

ماہر وہ آشنائے غم و درد ہی نہیں
تم اُن سے کس اُمید پہ کرتے ہو التماس

ماہر القادری

گذارش

(شاہینہ سے)

فنا انجام ہے میرا بقا کی سمت مائل ہوں — بھرا ہے درد جس میں دونوں عالم کا میں وہ دل ہوں
محبت کے لئے پیدا کیا تھا مجھکو قدرت نے — اماں دیدی مجھے آغوش میں تیری محبت نے
سراپا درد و غم ہوں اور مجسم یاس و حسرت ہوں — قسم تیری محبت کی میں سرتاپا محبت ہوں
مری آنکھوں کو تو نے کردیا محرومِ خواب ایسا — کہ میں ہوں رات ہے اور شغل ہے اختر شماری کا
ترے گھر کی طرف سے جب بھی ہوتا ہے گذر میرا — خدا معلوم کیوں آگے قدم جلدی نہیں بڑھتا
اچانک دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے سینے میں — بہت کم فرق رہ جاتا ہے مرنے اور جینے میں
وہیں دل تھام کر میں رہ گذر میں بیٹھ جاتا ہوں — بڑی مشکل سے اپنے آپ کو قابو میں لاتا ہوں
کروں کچھ بھی مگر کوشش ضبط کی بیکار ہوتی ہے — محبت خود ہی مجھ سے برسرِ پیکار ہوتی ہے
امنڈ آتا ہے آنکھوں سے میری طوفان اشکوں کا — میں ہوجاتا ہوں یوں جیسے کوئی بیمار برسوں کا
یہ حالت دیکھکر احباب میرے مسکراتے ہیں — یہ ناداں اور دیوانے کو دیوانہ بناتے ہیں
زمانے کے میں طعن و طنز سنکر کچھ نہیں کہتا — میرے زخموں سے گویا کھیلتی ہے فطرتِ دنیا
مگر پھر بھی زباں پر راز الفت کا نہیں آتا — گذر کی ہے جو دل پر اُسکو لفظوں میں نہیں لاتا
محبت راز ہے اور راز بنکر رہ نہیں سکتی — نظر کہتی ہے سب کچھ اور پھر کچھ کہہ نہیں سکتی

ہر اک جا میری بربادی کے چرچے ہوتے رہتے ہیں
ترے خیام کو شاہینہ سب دیوانہ کہتے ہیں

خیام ہندی

زندگی ——— شاعر کی نظر میں

زندگی ایک ایسا وسیع اور لامحدود موضوع ہے کہ انسان جس رنگ میں چاہے اُسے دیکھ سکتا ہے۔ انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر اس عنوان کے تحت اظہارِ خیال کیا جا سکتا ہے۔ انسانی حیات کی ابتدا، نشو و نما، اور منتہائے کمال، یہ تو سامنے کی باتیں ہیں۔ انسانی ذہن کی کیفیات، مدارج، اور انسان کا نقطۂ نظر، معاشرتی مسائل، سیاسی اور اقتصادی پہلو، غرض کہ کوئی ایک شعبہ ایسا نہیں جس کو آپ زندگی سے متعلق نہ کر سکتے ہوں۔ شاعر کی نگاہ سے دیکھئے تو تصورات کی دنیا آباد نظر آتی ہے۔ ایک فلسفی اور سیاست داں سے زندگی کی حقیقت پوچھئے تو وہ فلسفیانہ اور سیاسی مسائل کی اُلجھنوں کی عقدہ کشائی کو زندگی کہے گا، اور اسی طرح ہماری زندگی کے دوسرے مبصر اپنے اپنے مفہوم کے مطابق زندگی کی تشریح اور توضیح کرتے نظر آئیں گے۔

سوال یہ ہے کہ ان تمام پیچیدگیوں کے باوجود زندگی کی حقیقت کیا ہے۔ زندگی کسے کہتے ہیں اور زندگی کا شعور کس طرح بیدار ہوتا ہے۔

یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر ذی ہوش انسان کے دماغ کو پریشان کرتا رہتا ہے اور ہر انسان اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی نظر کے مطابق زندگی کا ایک مفہوم اپنے ذہن میں قائم کر لیتا ہے۔

زندگی کے موضوع پر سوچے بغیر کوئی چارہ کار بھی تو نہیں۔ زندگی ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے ذہنی قویٰ کو مصروف و مطمئن رکھتی ہے اگر انسان سے یہ شغلِ لطیف بھی چھین لیا جائے تو انسان کی زندگی اجیرن ہو کر رہ جائے اور پھر اس کے نتائج معلوم۔

زندگی کی تمام ممکن تشریحات اور توضیحات کے باوجود مجھے زندگی، ایک ٹھوس حقیقت اور جامع تصور نظر آتی ہے۔ میں اس کی پہنائیوں میں کھو کر اپنے ذہن و دماغ کو آسودہ کیا کرتا ہوں اور زندگی اپنے جلوہ ہائے رنگا رنگ سے میری روح کو شگفتہ کیا کرتی ہے۔

زندگی فطرت کا ایک کھیل ہے جسے وہ ازل سے کھیل رہی ہے اور ابد تک کھیلتی رہے گی۔ میں زندگی کا احساس اور زندگی کے شعور کو صرف انسانی ذہن و دماغ کی اُپج ہی محسوس نہیں کرتا بلکہ کائنات کی ہر چیز مجھے زندگی سے کیف سے معمور نظر آتی ہے اور میں جذبۂ زندگی کو تخلیق کا ایک ضروری و لابدی جزو محسوس کرتا ہوں۔

مجھے زندگی سے دلچسپی ہے۔ زندگی کے تمام لوازم اور متعلقات میرے لئے سامانِ دلچسپی ہیں۔ زندگی کا کوئی پہلو میرے نزدیک بُرا نہیں۔ اور میں زندگی کے کسی عکس کو غیر جاذب نہیں کہہ سکتا۔ میری نگاہ میں زندگی ایک ایسا مقدس جذبہ ہے جس کی نمود کے بعد انسان تمام کائنات سے ہم رنگ اور ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

میں ایک عرصے سے زندگی کے اس پہلو پر غور کر رہا ہوں اور جذبۂ زندگی کو پروان چڑھا رہا ہوں۔ میری قوتِ فکر محسوس کرتی ہے کہ دُنیا میں جو کچھ ہے زندگی ہے اس کے بعد کچھ نہیں۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ

۱۔ زندگی اپنے وجود میں غیر فانی ہے۔ جذبۂ زندگی ایک ایسا اٹل جذبہ ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتا۔ انسان مر جاتا ہے مگر اس کے جذبات اور احساسات اس انسان کے کارناموں کی شکل میں دُنیا کو زندگی کے جاوداں ہونے کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔

۲۔ زندگی کی دوسری خصوصیت اس کا تسلسل اور روانی ہے۔ جذبۂ زندگی کسی رکاوٹ اور کسی مداخلت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایک مرتبہ زندگی کی قوت اور اس کے غیر فانی جذبے کی دلیل کے ادراک کے بعد ناممکن ہے کہ آپ اپنی عمر کے کسی دَور میں اس جذبے سے بے نیاز ہو سکیں اور اُسے خیرباد کہہ سکیں۔

۳۔ زندگی کی تیسری خصوصیت جذبۂ زندگی کا احساسِ وجود ہے۔ انسان اپنی شخصیت کے پیرہن میں زندگی کے وجود کا اظہار کرتا ہے۔ دریا کی موجیں اپنی مسلسل تڑپ اور مسلسل نقل و حرکت سے اپنی ہستی کا ثبوت دیتی ہیں۔ پرندے اور چرندے، غرض کہ زندگی کی کوئی ہیئت احساسِ وجود سے بے نیاز نہیں۔

زندگی کی ایک خصوصیت دوسری خصوصیت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اور مندرجۂ بالا تینوں خصوصیات کے مجموعے کا نام زندگی ہے۔ میری نگاہ میں زندگی، جاودانیت، تسلسل اور احساسِ وجود کے مجموعے کا نام ہے اور میں اپنے نظریے تک انہیں تینوں خصوصیات کی مدد سے پہنچا ہوں۔

میں غیر فانی ہوں اس لئے کہ میری زندگی غیر فانی ہے میرا جسم موت کا شکار ہو جائے میری روح فنا نہیں ہو سکتی۔

زندگی کی مجبوریاں اور پابندیاں میرے لئے درخورِ اعتنا نہیں۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں برابر کرتا رہوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ ایک وقت معین کے بعد انسان عالمِ وجود سے عالمِ لا محدود کو سفر اختیار کرتا ہے لیکن اس جاننے کے باوجود میرے پروگرام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ اور میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں تعینات کا بندہ ہو کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ رہوں۔ فطرت نے مجھے زندگی دی ہے اور میرا فرض ہے کہ اس زندگی کو کام لوں۔ طوفان اور بادِ حوادث کو خاطر میں نہ لاؤں بلکہ ان میں بھی زندگی کی معجز نمائی اور کار فرمائی کا مشاہدہ کر کے زندگی کی گوناگوں نیرنگیوں کا معترف ہو جاؤں۔

آیئے۔ اب زندگی کے ادراک کے بعد عالمِ ہست و بود کا تجزیہ کریں اور اس نظریے کا ردِ عمل ملاحظہ کریں۔ میں یہ عرض کر دوں کہ نظریۂ زندگی جس کی توضیح مندرجۂ بالا سطور میں کی گئی محض تصوراتی چیز نہیں ہے۔ میرے جذبے کی بنیاد کسی موہوم خیال اور موہوم امید پر قائم نہیں ہے بلکہ میں اپنے اس نظریے کو ایک ٹھوس حقیقت محسوس کرتا ہوں۔ ایمان و ایقان کی روشنی میں مجھے یہ حقیقت صحیح نظر آتی ہے اور جوں جوں شاہراہِ زندگی میں میں قدم بڑھاتا جا رہا ہوں میرا خیال پختہ اور میرا یقین، قوی سے قوی تر ہوتا جا رہا ہے۔

میں اس بات کی تشریح کر دینا بھی مناسب خیال کرتا ہوں کہ زندگی کے متعلق میرے نظریات کسی جذبۂ رہبانیت پر قائم نہیں ہیں۔ میری نگاہ میں طربناکی اور حزنیت دونوں سے الگ ہو کر زندگی کا تصور ہے۔ میں غمہائے زندگی سے مجبور ہو کر رنگ رلیوں میں مصروف نہیں ہوتا۔

میرا کردار ان فروعات سے بہت بلند ہے۔ میرے نظریۂ زندگی کا اثر میرے کردار میں ہر وقت نمایاں رہتا ہے۔ میں ہر قدم پر زندگی کی قوت محسوس کرتا ہوں اور ہر وقت یہی سوچتا رہتا ہوں کہ اس قوت کو کام میں لاؤں بے حس اور بے خود ہو کر نہ رہ جاؤں۔

میں ادارہ ہائے حیات کی نئی ترتیب و تدوین چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں زندگی کی قوتیں ہر لحظہ ارتقا پذیر ہیں اور اسی ارتقا پر ہمارے اداروں کی بنیاد قائم ہونی چاہئے۔ میں اپنے اداروں میں ایک ایسی لچک اور ایک ایسا تسلسل اور ایسی ہم آہنگی دیکھنے کا آرزومند ہوں جو زندگی بلکہ یوں کہئے کہ شعورِ زندگی کا جوہر ہے۔ مختصر یہ کہ ہر فرد کو زندگی کے جذبے سے معمور دیکھنا چاہتا ہوں۔

جو فلسفہ، جو سائنس، جو تمدن اور جو اخلاق زندگی سے مطابقت نہیں کرتا وہ جامد اور بے حس ہے۔ ہم کو اپنے مسائلِ حیات میں زندگی کے نقطۂ نظر سے غور و فکر کرنا چاہئے۔

دنیا میں نئی نئی تحریکیں اٹھ رہی ہیں، کوئی تمام قدیم اداروں کو ڈھا دینا چاہتا ہے کوئی انہیں قدیم اداروں میں ترمیم و تنسیخ کے خواب دیکھتا ہے۔ ایک تحریک کی اور اشاعت ہونی چاہئے۔ اور وہ ہے جدید نظریۂ زندگی کی تحریک جس کی نقاب کشائی مندرجہ بالا سطور میں کی گئی ہے۔

ہمارے اجتماعی اور انفرادی تصورات میں ایک انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ ہم ایک نئی دنیا تعمیر کر سکتے ہیں۔ دنیا میں "کامیاب زندگی" کا عملی نمونہ ہم کو نظر آسکتا ہے اور اس کی صورت یہی ہے کہ زندگی کے رخ سے پیچیدگی، جمود اور بے حسی کا نقاب ہٹا دیا جائے اور زندگی کو زندگی کی نظر سے دیکھا جائے۔

یہ ہے شاعر کی نگاہ میں زندگی کا تصور!

محمد صادق ضیا
بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی

کہکشاں اُٹھی

ہلال پریمی (گوگشی)

سرو و سمن کے رخ سے نقابِ خزاں اٹھی — وہ جھوم کر گھٹا طرفِ گلستاں اٹھی
گلشن تمام غنچہ و گل سے لرز گیا — جب برق کی نگاہ سوئے آشیاں اٹھی
یاد آ گئی معیتِ حسنِ جہاں فروز — لیکر جلو میں چاند کو جب کہکشاں اٹھی
جل تو گئے وہ، طورِ سنا اور دل کا کیا سوال! — کیا کم ہے یہ، کہ قیدِ غمِ این و آں اٹھی
اے نامراد، تیرِ حوادث کے کھائے جا — کونین سوز چیخ ابھی دل سے کہاں اٹھی
وہ باوجودِ سعی نہ خود کو چھپا سکے — جب بھی نگاہِ عشق اٹھی کامراں اٹھی

تاریکیوں میں غم کی اُجالے نہ ہو سکے
جگنو اٹھے، ہلال اٹھا، کہکشاں اٹھی

سوزِ تمام

ایکہ معلوم نہیں تجھ کو خودی کا مقصود
آتشِ عزم سے ہے، معرکۂ بود و نمود

عشق و مستی ہمہ تن دبدبہ ہائے محمود
پاک ہے اسود و احمر سے شبستانِ وجود

ولولہ ہائے جنوں فاتحِ قندھار و عراق
غلغلہ ہائے خردِ نغمۂ و ساقی و سرود

زندگی جس سے لرزتی ہے خلیل اللّٰہی
ہو خرابِ ظن و تخمیں تو ہے نارِ نمرود

مجھ سے نومیدیِ نظارۂ انوار نہ پوچھ
اب مرا جذبِ دروں بھی ہے پشیمانِ نمود

کبرِ فرعونِ خودی ضربِ کلیم اللّٰہی
سرمدی آگ کہاں اور کہاں موجۂ دود

تو ہے نا محرمِ تاب و تپِ باطن ورنہ
تیری آہوں سے پگھل جائے ستاروں کا وجود

سینۂ لالہ ہو یا آئینہ زارِ شبنم
ڈھونڈ لیتی ہے نظر جلوہ گہہِ لا موجود

ایک ہنگامۂ عرفان و تجسس کے بغیر
زیست بیکار، یقیں خام، نمازیں بیسود

افسر سیمابی

حیات

تجھ کو ملی نویدِ زیست جلوۂ کائنات سے
درسِ حیات کچھ تو لے فلسفۂ حیات سے

علم و عمل کی ندیاں بہنے لگیں جو ہر طرف
دہر کا راز فاش ہو قیدِ تعینات سے

پا کے نویدِ برقِ زیست دہر میں جگمگا اٹھی
تیری حریمِ آرزو حسنِ تجلیات سے

ہو نہ اسیرِ شش جہات یہ نہیں تیری کائنات
اور ابھی قدم بڑھا حدِ تعلقات سے

دہر میں کام کر نیا سازِ عمل بجا ذرا
عہدِ کہن بدل گیا مشقِ تصورات سے

تیری نظر دخیل ہے بارگہِ کمال میں
دونوں جہاں میں زلزلے تیرے تخیلات سے

تو ہے مکینِ لامکاں دل کی زمیں کا آسماں
تو ہے بہارِ بے خزاں عشق کے تصورات سے

شوقِ جمال ہے اگر دیکھ نہ جا بجا ٹھہر
ذوقِ نگاہ درگذر حدِ تجلیات سے

عشق کی گرم جوشیاں درد کی سخت کوشیاں
حسن کی چشم پوشیاں مقصدِ کائنات سے

درد کاکوروی

اقتضائے محبّت

— (۱) —

اقبال!

کاش تم نے زندگی کا مفہوم متعین کرنے سے قبل میرے دھڑکتے ہوئے دل کی دم توڑتی ہوئی تمناؤں اور سسکتی ہوئی امیدوں کا جائزہ لے لیا ہوتا۔

تمہاری زندگی افروز نظروں کی قسم کبھی کبھی یاس کے دھندلکے میں اب بھی ایک تصویر متبسم نظر آجاتی ہے۔ جسے دیکھ کر امیدیں عقیدت کے پھول نثار کرنے کو بڑھتی ہیں اور تمنائیں خلوص کے موتی نچھاور کرنے کے لئے اٹھتی ہیں لیکن آہ! یہ تصویر بھی شاید خوددار ہے مجھ کمبخت کی تمناؤں کو تڑپتا چھوڑ کر یہ بھی غائب ہوجاتی ہے اور ایسی غائب ہوتی ہے کہ باوجود کوشش مہینوں نظر نہیں آتی .... اُف زندگی۔

میری اس تحریر سے یہ مطلب نہ سمجھنا کہ میں تمہاری طرح زندگی سے بیزار ہوں نہیں مجھ سے پوچھو کہ زندگی کیا ہے؟ دو دھڑکتے ہوئے دلوں کی معیت —— دو مچلتی ہوئی نگاہوں کا تصادم —— اور دو مضطرب سینوں کا ابدی اتصال —— سمجھتے ہو۔ اس معیت۔ تصادم اور اتصال ہی سے محبت کا وہ چشمہ پھوٹتا ہے جسے تم "قید علائق" سمجھتے ہو اور میں "فردوسِ حیات"

آؤ ہم تم بھی اس فردوسِ حیات کی سیر کریں۔ ہم دونوں کے دھڑکتے ہوئے دلوں کو معیت نصیب ہوچکی ہے اور ہم دونوں کی مچلتی ہوئی نگاہوں کا تصادم بھی ہوچکا ہے۔ صرف ہم دو مضطرب سینوں کا ابدی اتصال باقی ہے۔ یہ اتصال جو ناممکن نہیں ہے، اگر ہوگیا تو میں تم کو دکھا دونگی کہ زندگی ہمارے قدم چوم رہی ہے۔ ہماری ہر نظر زندگی ہے اور ہماری ہر ادا زندگی کا عکسِ جمیل۔

خدارا میری امیدوں کو اپنی خودداریوں سے مجروح نہ کرو۔ خاموش رہو —— لیکن متبسم —— دور رہو —— لیکن متوجہ —— اور بے عمل ہو —— لیکن مستعد —— عمل کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ میں ہزار مجبور سہی لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اپنی زندگی کی تعمیر کے لئے وہ تمام اختیارات حاصل کرلوں گی جو میری تہذیب اور میری صنف سے چھین کر دبا بیٹھے ہیں۔ خدا رکھے میرے روشن دماغ والدین کو۔

ہاں تم سے صرف یہ چاہتی ہوں کہ میری آواز پر لبیک کہہ دینا خواہ تمہاری ان خودساختہ اور بے جا خودداریوں کا خون ہی کیوں نہ ہو۔

اطمینان رکھو۔ تمہیں میں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ تمہاری زندگی کا ہر شعبہ میری نظر میں ہے۔ بی۔ اے کے پورے دو سال اور ایم۔ اے کا پہلا ایک سال ملا کر کامل تین برس ہم تم دونوں ساتھ رہے اس عرصہ میں غالباً تم نے بھی میرا مطالعہ کرلیا ہوگا، کہ میں دولت وصورت کی پرستار نہیں بلکہ سیرت کی پجارن ہوں اچھا خدا حافظ۔ مجھے امید ہے کہ تمہاری خودداریاں ترسیلِ مکتوب میں تو مانع نہ ہونگی۔

جواب کی متمنی
"درخشاں"

— ((۲)) —

خوددار پریتم!

تمہارا مکتوبِ محبت خودداریوں کے گیت سُناتا ہوا کاشفِ حالات ہوا۔

آہ! میری حسرتوں کا تم احترام کرنا چاہتے ہو لیکن نہیں کرسکتے۔ میری آرزوؤں کا وقار تم کو منظور ہے لیکن تحفظِ وقار کی کوئی معقول تدبیر تمہارے ذہن میں نہیں۔ میری اُمیدوں کو سسکتا دیکھ کر تمہارا دل دُکھتا ہے۔ لیکن انھیں زندگی بخشنا تمہارے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ میری تمناؤں کا دم توڑنا تمہارے لئے سوہانِ روح ہے لیکن انھیں آبِ حیات پلانا تمہاری دسترس سے دور ہے۔ اس لئے کہ تم اپنی خودداریوں کو منفعل دیکھنا نہیں چاہتے۔ تمہیں سماج سے —— اور سماج کے بندھنوں سے میری بھیک مانگنا منظور نہیں —— اور یوں بھی تمہارے نزدیک

"زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانیکا"

اقبال میرا کہنا مانو —— یہ نظریہ پست ہمت۔ مردہ دل اور بے عمل قوموں کا ہے وہ قومیں جنکے جذبات سوجاتے ہیں۔ جنکے ولولے عالمِ وجود میں آنے سے قبل ہی ختم ہوجاتے ہیں۔ جنکی اُمنگیں پیدا ہونے سے پہلے ہی فنا ہوجاتی ہیں ایسے ہی گیت گایا کرتی ہیں —— تم جس قوم کے فرد ہو اسکے حال پر لاکھ جمود

کی گھٹائیں منتظر تھیں لیکن اسکے "ماضی" کی تبسم ریزیاں اب ان گھٹاؤں میں برق پاشیاں کرکے "مستقبل" کی درخشانیوں کے لئے سامانِ عمل مہیا کرنے کی دعوت دیتی رہتی ہیں۔ تم کیوں مایوس ہوتے ہو ــــ تمہارا اور تمہاری قوم کا ماضی زندہ ہے اور مستقبل کو زندہ کرنا تمہارے امکان میں ہے ــــ ہاں عارضی دولت کی فکر نہ کرو۔ تمہارے پاس تمہاری شرافت ــــ تمہارا علم ــــ اور تمہارے اخلاقِ حسنہ ایک مستقل سرمایہ ہیں ــــ جن کو کبھی زوال نہیں ہو سکتا ــــ اور پھر خدا کا دیا سب کچھ ہو جائیگا ــــ بابو جی کا سوائے میرے اور کون ہے، شہر کی اتنی بڑی جائداد اور چار سو گانوں کے مالک و منتظم ہم تم ہونگے۔ زندگی بہر صورت اطمینان سے گذر جائیگی۔

یہ نہ سمجھنا کہ میرا معیارِ زندگی وجاہت طلب اور عشرت پسند ہے یہ تو میں نے تمہارے موہوم تصورات کی ترجمانی کی ہے۔ میں تو سنہری اور روپہلی ٹھیکریوں سے کھیلنے ہی کو زندگی سمجھتی ہوں اور نہ مرمر کے بچھتے جانے کا نام ہی زندگی رکھتی ہوں۔ میرے نزدیک تو دو دلوں کا ایک ہو جانا زندگی ہے۔ خواہ دنیاوی مسرت انھیں نصیب ہو یا نہ ہو۔ میری تو بس یہ تمنا ہے کہ ہم تم دونوں ایک دوسرے کا سہارا لئے ہوئے فردوسِ محبت کی ابدی مسرتوں میں کھو جائیں اور یہ زندگی ہمیں خود تلاش کرتی پھرے یہ ڈھونڈے اور ہم نہ ملیں۔ ہس پر ہم ہنس اور قہقہے لگائیں اور پھر ہماری ہنسی سے دنیا کو زندگی ملے اور ہمارے قہقہوں میں نغمۂ حیات گونجے۔

تم نے شاید میری فطرت کا مطالعہ نہیں کیا۔ تم نے یہ کیا سوچکر لکھا ہے کہ "درخشاں اس سے زیادہ میری خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی تھی کہ تمہاری حسین معیت میں میری زندگی کے لمحات بسر ہوتے۔ میری آرزوؤں کی دنیا بن جاتی۔ میری تمناؤں کی جنت مہکتی اور میری امیدوں کے خواب بیداریوں سے بدل جاتے۔ لیکن آہ ظالم قسمت نے بے مائیگی کے تاریک اور زہریں دوزخ خانوں سے باوجود کوشش ابھرنے ہی نہیں دیا اور اقتصادی تفکرات کی آندھیوں کو چلا کر میرے حسین تصورات کی تمام شمعوں کو بجھا دیا۔ اب تمہیں بتاؤ میں تمہیں اپنی آشاؤں کے محل کی رانی کیونکر بناؤں اور تمہارے والدین سے کس منہ سے تمہاری بھیک مانگوں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے والدین تمہاری سفارش کا احترام کریں۔ لیکن آغوشِ نعم میں پلنے والی معصوم حسینہ کیس کون سے دل سے تمہیں محل سے نکالکر جھونپڑی میں لا بساؤں اور پھولوں کی سیجوں سے اٹھا کر کانٹوں کی باڑ پر بٹھا دوں۔ تم چاند ہو۔ تمہیں بساطِ فلک ہی کی ضرورت ہے ــــ فرشِ زمین تمہارے لئے موزوں نہیں۔ تم پھول ہو جو گل پر ہی شگفتہ رہ سکتی ہو ــــ ورنہ کہیں بھی مرجھانے کا اندیشہ ہے ــــ تم شمع ہو۔ انجمن ہی تمہاری ضیاپاشی کے لئے زیادہ موزوں ہے ــــ بیابان میں گل ہو جانے کا خطرہ ہے۔ تمہیں اپنی تلخ اور نامراد زندگی میں شریک کرکے تمہاری مسرتوں کا خون نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہی اچھا ہے کہ تم مجھے بھول جاؤ۔ اسکے علاوہ اور کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی

میری خاکسترِ دل میں زندگی نہ ڈھونڈو۔ میرے یہاں تو
"زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانیکا"

اقبال خدارا اپنے معیارِ محبت کو اتنا بلند نہ کرو۔ کسی اور کمبخت کی محبت کا بھی خیال رکھو ــــ باور کرو دو مضطرب ہستیوں کی ابدی محبت کے بعد جھونپڑی کی ویرانیاں فردوس کی رنگینیوں سے زیادہ پُر کیف ہو جاتی ہیں ــــ اور کانٹوں کی باڑیں پھولوں کی سیجوں سے زیادہ آرام دہ ثابت ہوتی ہیں ــــ میرے لئے تمہاری جھونپڑی کا ہر گوشہ فردوس کا ایک مہکتا ہوا پھول بن جائیگا جسکی خوشبو سے مست ہو کر میں متاعِ کونین کو ٹھکرا دوں گی مجھے تو بس تمہاری ایک ہستیٔ جمیل کی ضرورت ہے اور کچھ نہیں چاہئے ؎

تیرے صدقے تری اس مست نظر کے صدقے
اپنے میخوار کو نظروں سے پلا دے ساقی

اچھا۔ خدا حافظ۔

محبت کی پیاسی
"درخشاں"

(۳)

میری رگ رگ میں پیوست ہو جانے والے اقبال

اس سے قبل ایک اضطراب نامہ روانہ کر چکی ہوں۔ جسکے لفظوں میں میرے دل کی دھڑکنیں بند تھیں۔ جسکے حرفوں میں میری ناکام تمنائیں مچل رہی تھیں اور جس کے نقطوں میں میری خون شدہ آرزوئیں تڑپ رہی تھیں۔ آج پورا ایک ہفتہ ہو گیا لیکن جواب سے محروم ہوں۔ "اللہ اللہ اس قدر خود آرائی" وہ کیا مجھے ناکام کر دینا بھی کوئی کام ہے۔ تم سنو یا نہ سنو .... میری بے چینیاں تمہارے دل کی دھڑکنیں بن کر تمہیں آواز دے رہی ہیں ــــ تم مانو یا نہ مانو .... محبت کی ہر نظر میں مستقبل کی درخشانیاں

رفعتاں چین اور بہنگی۔ تم جواب دو یا نہ دو .... تمہیں فردوسِ حیات کی رنگینیاں دعوت دے رہی ہیں اور دیتی رہینگی۔ اور اس وقت تک دیتی رہینگی جب تک کہ تم زندگی کو "حال" کے اندھیروں میں درخشاں نہ دیکھوگے۔

تم اپنے "ماضی" کو خواب اور نسیان کے جزیروں میں دفن کرسکتے ہو۔ اپنے "حال" کو مجبوری اور ویرانیوں میں سسکتا دیکھ سکتے ہو لیکن اپنے مستقبل کی حیات افروزیوں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔

اقبال —— قدرت تمہیں زندگی کے اُفق پر درخشاں دیکھنا چاہتی ہے۔ تم کیوں جھجک رہے ہو۔ قسمت تمہیں مینارۂ حیات کی چوٹی پر پہونچا رہی ہے تم کیوں پس و پیش کر رہے ہو۔ واقعات تمہیں کامرانی کے کاخِ بلند کی طرف موقع بموقع دعوت دے رہے ہیں۔ تم کیوں رُک رہے ہو۔ آؤ میری بے اختیاریوں کے اختیارات بھی دیکھ لو! "سنو" میری مجبوریاں عشق کی رستگاریوں کے گیت گا رہی ہیں۔

رات امّی جان سے جو گفتگو ہوئی ہے وہ نقل کر رہی ہوں۔ کھانے سے فارغ ہوکر میں اپنے سونے کے کمرے میں جانا چاہتی تھی کہ پیچھے سے اُمّی جان نے آواز دی اور اپنے کمرے میں لیجا کر کہنے لگیں۔

"درخشاں کل جب تم جمیلہ کے یہاں گئی ہوئی تھیں تو تمہارے پیچھے بیگم حامد علی آئی تھیں۔ خدا رکھے اُن کا بڑا لڑکا ولایت سے بیرسٹری پاس کرکے آگیا ہے۔ وہ ہمارے یہاں رشتہ کرنا چاہتی ہیں تمہارا پیغام لائی تھیں۔ خاندان تو اچھا ہے۔ شریف بھی ہیں اور کھاتے پیتے بھی۔ مجھ سے اقرار کرانا چاہتی تھیں۔ لیکن میں نے انھیں کوئی جواب نہیں دیا اور صاف کہدیا کہ میری ایک لڑکی ہے میں بغیر اُس کی مرضی کے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اسکے والد نے بھی یہ مسئلہ اُسی کی رائے پر چھوڑ دیا ہے۔

بیٹی تمہارا کیا خیال ہے۔ تم اقبال کی بہت تعریف کیا کرتی تھیں وہ آج کل کہاں ہیں۔ اور کیا کر رہے ہیں۔ تم اپنی ازدواجی زندگی کے متعلق صحیح اور آخری فیصلہ جلد کرلو۔ ہم لوگ چراغِ سحری ہیں، زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تمہیں اپنی آنکھوں سے سدا سہاگن دیکھ لیں۔ ہم نے آج تک کسی معاملہ میں تمہاری دلشکنی نہیں کی ہے۔ اسی لئے شادی کا مسئلہ بھی تمہاری رائے پر چھوڑ دیا ہے۔ اگر ہم اپنی مرضی سے یہ کام کرنا چاہتے تو اب تک کبھی کی تمہاری شادی ہوچکی ہوتی۔ اب تمہیں بھی ہماری آرزوؤں اور امیدوں کا احترام کرنا چاہیئے اور جلد از جلد اپنی شادی کا فیصلہ کرلینا چاہیئے ہمیں تمہاری ذات اور علم پر اعتماد ہے کہ تم انتخاب میں غلطی نہ کروگی۔

میں سر جھکائے یہ تمام باتیں سنتی رہی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ اُمّی جان سمجھیں کہ شاید ان کی یہ باتیں مجھے شاق گذری ہیں۔ مجھے گلے سے لگالیا اور کہنے لگیں:-

بیٹی ہراساں نہ ہو، میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم میرے بتائے ہوئے رشتہ ہی کو پسند کرلو، یقین مانو تم جہاں چاہوگی تمہارا رشتہ کیا جائیگا اور تم جس خوش نصیب کو اپنا شریکِ زندگی بنانا چاہوگی، وہی ہماری اس تمام جائداد اور املاک کا مالک ہوگا!"

آہ! اقبال امی جان کو کیا خبر کہ ان کی بدنصیب بیٹی جس کو اپنا شریکِ زندگی بنانا چاہتی ہے وہ زندگی کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔ وہ خوددار ہے اور اسکی خودداریاں کسی کی مرہونِ منت نہیں ہونا چاہتیں۔

آہ! انھیں کون بتلائے کہ تمہاری وہ لختِ جگر جسکی تم نے کبھی دلشکنی نہیں کی۔ کسی کی بیجا خودداریوں سے —— اپنے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کرا چکی ہے۔

ہاں تو امی جان سب کچھ کہتی رہیں اور میں سب کچھ سنتی رہی انھوں نے تمہارے متعلق اور بھی کچھ سوالات کئے اور جہاں تک میرا خیال ہے میں نے ہر ایک کا مناسب جواب دیا۔ وہ مطمئن ہیں انھوں نے مجھے آٹھ دن کی مہلت دی ہے۔ اس عرصہ میں مجھے اپنا فیصلہ اُنھیں بتا دینا چاہیئے۔

اقبال تمہیں اپنی خودداریوں کا واسطہ میرے فیصلے اور امید کی لاج رکھ لو۔ میں تمہارے جواب کی منتظر ہوں اور اسی طرح منتظر ہوں جیسے سوکھی ہوئی کھیتی بارانِ رحمت کی اور پیاسی زمین آبِ رواں کی منتظر ہوتی ہے۔

مضطرب
"درخشاں"

—— (۴) ——

اقبال صاحب

آپکی شادی کا دعوت نامہ جو والد صاحب کے نام آیا تھا وہ والدہ صاحبہ کو مل گیا۔ جملہ اعزا کی طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ اس پردۂ التفات میں مجھے

اوپر جو خاص کرم فرمایا گیا ہے اُسکا شکریہ۔

باجی تو شاید آپ کی اس تقریب سعید میں شریک نہ ہوسکیں کیونکہ وہ کل سے دورہ پر جارہے ہیں۔ البتہ میں ضرور شرکت کی کوشش کرونگی۔

آپ کی خوش قسمت شریک زندگی کے لئے بطور تحفہ ایک تصویر بنا رہی ہوں ہنستی ہوئی تمناؤں کی مسکراتی ہوئی امیدوں کی اور گیت گاتی ہوئی آرزوؤں کی ——— خاکہ تو پہلے ہی تیار ہے۔ صرف رنگ بھرنا باقی ہے۔ آپ نے وقت بہت کم رکھا ہے۔ اب رنگ کے لئے کہاں جاؤں ——— خیر ——— اپنی حسرتوں کا خون اس میں بھر دونگی ——— اور کوئی میرے لائق کا رخدمت ہو تو تحریر فرمائیے۔

خط ختم کرچکی تھی کہ ابھی ابھی آپ کا نوازش نامہ ملا:—

"درخشاں معاف کرنا۔ میں نے عمداً یہ خودکشی کی ہے تمہیں تکلیف ضرور پہونچے گی۔ لیکن کیا کرتا۔ مجبور تھا۔ تمہیں اپنی مصیبتوں میں شریک کرنا تقاضائے محبت کے خلاف تھا اور تمہاری دولت سے فائدہ اُٹھانا خودداریوں کے منافی"

اس کا جواب یہی ہے کہ زیادہ نہ ستائیے۔

نامراد
بے
"درخشاں"

صبا متھراوی

نفی و اثبات

جو جلوہ آغوش سے بے ہوش نہیں ہے — وہ شاہدِ مقصد سے ہم آغوش نہیں ہے

ہستی بھی مری نیستی کی ہے مترادف — کچھ بھی نہیں گر اپنا مجھے ہوش نہیں ہے

نغماتِ محبت سے ہیں پُر شور فضائیں — اِس ساز کا پردہ کوئی خاموش نہیں ہے

جب تک پسِ پردہ رہے بیتاب تھیں نظریں — اب سامنے تم ہو تو ہمیں ہوش نہیں ہے

شاہد ہے زمانہ کہ تری راہِ طلب میں — مجھ سا بھی کوئی خانماں بردوش نہیں ہے

کیا ہوں اثر انداز دلِ حسن پہ آہیں — جذباتِ محبت میں اگر جوش نہیں ہے

بیخود ہوں مگر اب بھی ترا نام ہے لب پر — دُنیا یہ کہے جائے لِسے ہوش نہیں ہے

وہ بزم میں بیٹھے ہیں مرے پہلو بہ پہلو — دُنیا مری ہمسایۂ دہمدوش نہیں ہے

کِس طرح سمائے مری آغوشِ نظر میں — اُس جلوۂ یکسر کا، تن و توش نہیں ہے

ہاں یاد ہے دیکھا تھا تمہیں میں نے ازل میں — فطرت مری نظارہ فراموش نہیں ہے

اے مہر کوئی آ گیا پھر جلوہ بجلوہ
کیا غم کدہ اب ضو کدہ بردوش نہیں ہے؟

مہر نظامی میرٹھی

عروسِ فطرت

(حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی کی ایک غزل پر تضمین)

یہ رنگِ صحرا یہ حسنِ گلشن ہے جلوۂ بے حجاب تیرا — ریاضِ ہستی کی روح بنکر مہک رہا ہے گلاب تیرا
ہے باعثِ بیخودیٔ عالم سرورِ صہبائے ناب تیرا — عروسِ فطرت مری نگاہوں پہ چھا رہا ہے شباب تیرا
لطیف پردوں سے چھن رہا ہے جمال زیرِ نقاب تیرا

ہجومِ حرمان و یاس و غم میں سرِ توکل کا تاج ہے تو — جراحتِ قلبِ خستگاں کا سکون ہے تو علاج ہے تو
شبِ جدائی کی خلوتوں میں فغانِ بیکس کی لاج ہے تو — زوال سے اور نیند سے بے نیاز و بے احتیاج ہے تو
حدوث کی خستہ کاریوں میں ہوا ہے تقسیم خواب تیرا

میں دولتِ لازوال سمجھوں نہ کیوں محبت کی سوگواری — کمالِ ہستی بنی ہوئی ہے دلِ ستم کش کی بیقراری
زباں ہو خاموش کیوں فغاں سے کرو نہ کیوں آنکھ اشکباری — اگرچہ صبر آزما بہت ہے تری خموشی و پردہ داری
مگر ہے دامن کشِ عقیدت سکوت تیرا حجاب تیرا

میں دیکھتا ہوں وجودِ ہستی کو یوں تو گرمِ کلام اکثر — مگر حقیقت میں رازدارانہ خامشی کا ہے اک دفتر
جبینِ عالم جھکی ہے بہرِ سجود، مطلق نیاز بن کر — جلال و جبروت نے لگا دی ہے مہرِ حیرت زبان و لب پر
جمال و صحرا کے ذہن میں ہے اشارۂ انقلاب تیرا

جو تیری رحمت کا ابرِ رنگیں چمن میں برسے نہ کھل کے پیہم — جلا کے غنچوں کو خاک کر دے بشکلِ آتش فشار شبنم
جو تو دکھائے نہ گیسو و رخ نظامِ صبح و مسا ہو برہم — ترے جلال و جمال ہی سے ہے اعتدالِ مزاجِ عالم
کبھی غضب بے پناہ تیرا کبھی کرم بے حساب تیرا

یہ شمعِ سوزاں نے چپکے چپکے لیا ہے جلنے کا ڈھنگ تجھ سے — جلے نہ محفل میں شمع پر کیوں کہ آشنا ہے پتنگ تجھ سے
دلِ محبت کی بڑھ رہی ہے ازل کے دن سے امنگ تجھ سے — نہ حسن پر تو سے تیرے خالی نہ بے نیازِ آب و رنگ تجھ سے
تمام کافر جوانیوں پر برس رہا ہے شباب تیرا

تو اضطرابِ رواں کا نغمہ ہے سنکے کوئل کی کوک بن میں — تو ہی ہے خوشبوئے روح پرور شگفتہ پھولوں کے پیرہن میں
تجلیوں کا ہے ایک سیلاب مہر و مہ کی کرن کرن میں — تو محوِ آرائشِ مسلسل ہے اپنے جلووں کی انجمن میں
اک آئینہ ماہتاب تیرا اک آئینہ آفتاب تیرا

یہ سچ ہے مطلق غرور ہے تو مگر ابھی تجھ کو یاد ہوگا — نگاہ و دل سے نفور ہے تو مگر ابھی تجھ کو یاد ہوگا
ورائے عالم ضرور ہے تو مگر ابھی تجھ کو یاد ہوگا — مری رسائی سے دور ہے تو مگر ابھی تجھ کو یاد ہوگا
کہ میں نے ایمن کی وادیوں میں الٹ دیا تھا نقاب تیرا

یہ گل کھلائیگی ہوش فرسا روش ترے عشقِ جانگزا کی — جمال کو اک دن سمیٹ لیگی کشش ترے عشقِ جانگزا کی
جلا رہی ہے لہو جگر کا تپش ترے عشقِ جانگزا کی — جبیں سے دل تک بھری ہوئی ہے خلش ترے عشقِ جانگزا کی
ترے ارادے کو ہو مبارک کہ ہو رہے کامیاب تیرا

بسانِ مستی حسین رنگیں تری محبت جواں ہے اس میں — خودی کی ایماں فریبیوں کا طلسمِ غفلت کہاں ہے اس میں
الم کی ہستی ہے ایک قطرہ تو ہو نہ کیوں کہ دریا رواں ہے اس میں — ہے شرحِ سیماب ساز تیرا تو سوز بنکر نہاں ہے اس میں
تڑپ کے دل جہاں میں ہے یہ سکی اگر نہیں اضطراب تیرا؟

الم مظفر نگری

کیا "شروعات" فصحا کا مختار ہے؟

اب سے کئی ماہ پہلے یہ مضمون جوش صاحب ملیسانی مدیر حصۂ نظم "رہنمائے تعلیم" لاہور کو بھیجا گیا تھا۔ کچھ دنوں جوش صاحب نے مضمون اپنے پاس رکھا۔ پھر مدیرانہ اختیارات سے کام لیتے ہوئے اپنے دوست گنوری کو بھیجدیا اور میرا مضمون شائع کئے بغیر جولائی کے رسالہ میں گنوری کے مضمون کا سلسلہ ختم کرتے ہوئے ایک نوٹ دیدیا کہ

"چونکہ جناب سائل۔ میرزا یگانہ۔ حضرت نوح۔ جناب ظفر۔ جناب طپش۔ جناب اختر نگینوی۔ جناب جامی بدایونی۔ جناب مہر گوالیاری۔ خواجہ حسن نظامی۔ خواجہ ناصر نذیر فراق مرحوم۔ مرزا ارشد گورگانی مرحوم نے "شروعات" کی تائید کردی ہے تو بجز اس کے کہ اعجاز صاحب کا دعویٰ حق بجانب اعجاز صاحب کے خیالات[1] کو غلط بیانی قرار دیا جائے اور کوئی نتیجہ مستخرج نہیں ہوتا۔ اس لئے ادارہ اعجاز صاحب کو کامیاب سمجھ کر مزید بحث کو اب بے ضرورت خیال کرتا ہے فقط"

اس فیصلہ کے بعد اب اگست میں میرے مضمون کا یہ حصہ نہایت مسخ شدہ صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اور ۲۸ صفحات کے مذاکرے کے علاوہ ابتدا میں ایک نوٹ ہے اور دوران مضمون میں ۲۰ نوٹ ہیں جونکہ جوش صاحب ملیسانی مدیر حصۂ نظم "رہنمائے تعلیم" اور ابر گنوری دونوں نے ملکر یہ کام انجام دیا ہے اس لئے گالیوں کی بوچھار دوہری قوت کے ساتھ کی گئی ہے —— اس اشاعت میں گنجائش نہیں ہے اس لئے اکتوبر کے "شاعر" میں ان دونوں حضرات کی دریدہ دہنی کا شکریہ ادا کرونگا۔

اعجاز صدیقی

یہ ہے وہ سوال جس کے سلسلے میں "رہنمائے تعلیم" (بابت ماہ فروری۔ اپریل اور مئی ۱۹۴۲ء) کے ۲۸ صفحات کالے کئے گئے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ کسی طرح میری اُس رائے کے وزن کو ہلکا کردیا جائے جس کا اظہار میں اکتوبر اور نومبر ۱۹۴۱ء کے "شاعر" میں کرچکا ہوں اور جس کا اجمالی خاکہ یہ ہے۔

"شروعات" نہ کسی لغت میں ملتا ہے اور نہ فصحا استعمال کرتے ہیں"

میری ان ڈھائی سطری گذارش کو غلط ثابت کرنے کے لئے جناب ابر احسنی گنوری نے جو جو رنگ بدلے ہیں اور جس جس انداز میں خامہ فرسائی کی ہے وہ ناظرین "رہنمائے تعلیم" کی یادداشت میں تازہ ہوگی۔ اس کے بعض حصوں کا کچھ تفصیلی جواب بمشکل وقت نکالکر ۲۰ مئی ۱۹۴۲ء کو لکھ چکا تھا اور اُسے سپرد ڈاک کرنا ہی چاہتا تھا کہ ۲۱ مئی کو مئی کا "رہنمائے تعلیم" آگیا جس میں ادارہ کا مضمون "رسالہ شاعر کے ایڈیٹر کی جنگجویانہ ذہنیت" اور گنوری کے مضمون کی تیسری قسط شائع ہوئی ہے۔ ان دونوں تازہ مضامین کو دیکھکر میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ مخالف جماعت اب اُس مقام پر پہونچ گئی ہے جہاں معقولیت کی بضاعت ٹوٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جو لوگ نفسیات کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب ایک قوت دوسری قوت سے ٹکراتی ہے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ مدمقابل اوچھے وار کرنے پر اُتر آیا ہے تو جذبات مقابلہ سرد ہوجاتے ہیں۔ میری بھی بعینہٖ یہی حالت ہوئی اور میں نے اپنے سابقہ تیار شدہ مضمون کو ردی کی ٹوکری میں ڈالدیا۔ کچھ تو اس لئے کہ اُسے شائع کرنے میں طوالت کا بہانہ کیا جاتا اور کچھ اس لئے کہ بعض مویدین کا تعلق براہ راست "رہنمائے تعلیم" ہی سے ہے۔ ایسی حالت میں اگر میں کچھ تفصیل کے ساتھ گنوری صاحب کے مضمون کا جواب دوں تو وہ شائع نہیں ہوسکتا اور اُن کی ہر طویل "تنقیص" کو زینت صفحات رسالہ بنایا جاسکتا ہے یہ ممکن ہے کہ میں اُن کے مضامین کے ایک ایک لفظ کا جواب اُن سے کہیں زیادہ درشت لب و لہجہ میں دوں اور انھیں معلوم بھی ہے کہ میری رگوں میں اُن سے زیادہ تیز۔ گرم اور جوان خون ہے۔ وہ گذشتہ ۶۔۷ سال کے اُن ادبی جھگڑوں سے بھی واقف ہیں۔ جن میں بڑے بڑے "فراعنۂ ادب" منہ کی کھا چکے ہیں۔ اندریں حالات اب یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سلجھے ہوئے انداز میں نفس موضوع پر ایک اجمالی نظر ڈالکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس بحث کو ختم کردوں۔ گنوری صاحب تمام عمر اسی طرح لکھتے رہیں لیکن وہ مطمئن رہیں کہ میں آج کے بعد کبھی اس سلسلے میں قلم نہ اٹھاؤنگا میں سمجھتا ہوں کہ میرے اس جملے سے وہ حسب عادت یہ نتیجہ اخذ کرینگے کہ اعجاز میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور اُسے شکست ہوگئی۔ لیکن اس مضمون کے آخری حصے بتائینگے کہ شکست کسے ہوئی! —— یہ دوسری بات ہے کہ کوئی بار بار ہیں کہے جائے

[1] اگر اخلاقی جرأت تھی تو پھر میرے خیالات کی اشاعت کیوں نہ کی؟ کیا صرف یہی ہے کہ بہرصورت کہہ دیا جائے کہ وہ نہ شاعر ہیں نہ ادیب ... طریقے سے ... [illegible]

"اب تم جانو"۔۔۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ گنوری صاحب کی تحریر نے مجھے زیادہ سے زیادہ متنفر کر دیا ہے۔ میں تو اپنی جگہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ بازار ادب میں ذرا سنجیدگی کے ساتھ آئیں گے اور کچھ دنوں بحث و مباحثہ کی گرما گرمی رہے گی، اچھا ہے اس طرح ہمیں کچھ حاصل ہو جائے گا لیکن وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ فریب ہی کی آخر کوئی انتہا بھی ہو! تنقیدات میں ایسی ایسی گرم نوائی دیکھی ہے کہ جو ایک دوسرے کے خرمن معلومات کو یکسر راکھ کر دے۔ لیکن چاند گو بہیں چلتے ہوئے کسی ناقد کو نہیں دیکھا۔

اگر حکم زباں بندی نہ ہو تو اتنا اور عرض کر دوں کہ اس بحث کے سلسلے میں گنوری صاحب نے میری ذات پر جتنے حملے کئے ہیں اُن کے لئے میں بیحد شکر گذار ہوں کبھی خلوت میں وہ میرے اور اپنے ظرف کے عرفان کی کوشش کریں۔ صرف اس لئے کہ ناظرین معاملہ کی تہ تک نہ پہونچ سکیں۔ انھوں نے اپنے مضامین کو نہایت اُلجھے ہوئے پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ قدم قدم پر "دانہ و دام" موجود ہے اور دُور از کار تاویلات کو سپر بنایا گیا ہے۔ انھوں نے خود کو ماہر علم و فن۔ ہمدرد زبان و ادب شاعر بے مثال۔ ادیب جلیل۔ ناقد بے ہمتا اور مجھے "متعصب۔ غلط نویس۔ سطحی معلومات رکھنے والا۔ ہٹ دھرم۔ بے ایمان۔ بدکلام۔ فریبی۔ طفل مکتب۔ جاہل مطلق" وغیرہ لکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اُن کی نظر میں میں نے "اعلان قابلیت و تحقیق اور اظہار تفوق کیا۔ زبردستی کی۔ دھونس دی، اور میں تہذیب و انسانیت سے بھی خارج ہوں" اگر کوئی پوچھے کہ گنوری صاحب نے ایسا کیوں لکھا۔۔۔۔۔؟ تو میرے یا کسی اور کے پاس اس کے علاوہ کیا جواب ہو سکتا ہے کہ وہ ناظرین کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں تاکہ سب آنکھ بند کر کے "تردعات" کو مضبوط دلائل کے بغیر ہی صحیح اور فصیح مان لیں۔ اس اظہار خیال کے بعد سب سے پہلے اُن کے پیش کردہ دلائل کا تجزیہ ضروری ہے۔ فرماتے ہیں:۔

(۱) "تردعات" غلط العام فصیح کے ذیل میں آچکا ہے۔ (آبر)

(۲) یہ لفظ شہرت و قبولیت کے تمام مدارج طے کر چکا ہے۔ (آبر)

(۳) یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی لفظ کو فصیح اور صحیح ثابت کرنے کے لئے تمام فصحا اور مستند اساتذہ کا نقطۂ خیال ایک ہو۔ (آبر)

(۴) جواز میں پانچ اساتذہ کی رائیں شائع کی جا چکی ہیں اب اگر پچاس اساتذہ بھی اس کی مخالفت کریں تو یہ لفظ غیر فصیح نہیں ہو سکتا۔ (آبر)

اگر غور و فکر سے دیکھا جائے تو نمبر ۱ ہی میں بقیہ نمبر ۲۔۳۔۴ آ جاتے ہیں لیکن جزءاً میں اس لئے کہ غلط مبحث پیدا نہ ہو اور ہر بات آئینہ کی طرح صاف رہے میں گنوری صاحب کے دلائل کے متعلق علیحدہ علیحدہ عرض کرتا ہوں:۔

(۱) "غلط العام فصیح" کی وہ تعریف جو عام طور پر بلاغت کی کتابوں میں پائی جاتی ہے مندرجہ ذیل ہے۔

"غلط العام فصیح" کا اطلاق صرف انھیں غلط الفاظ پر ہو سکتا ہے جنھیں فصحا۔ محققین۔ مستند اساتذۂ سخن سبھی اپنی تحریر و تقریر میں بلا تکلف استعمال کرتے ہوں اور اُن پر کسی کو انگشت نمائی کی جرأت نہ ہو۔"

اس تعریف سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی غلط لفظ اُس وقت تک فصیح نہیں ہو سکتا یا "غلط العام" کے ذیل میں نہیں آسکتا۔ جب تک عام فصحا اسے بلا تکلف استعمال نہ کریں اور اس میں اختلاف کا مطلق شائبہ نہ ہو یعنی انفرادی طور پر کسی غلط لفظ کا استعمال مستند نہیں سمجھا جاسکتا۔ جب "تردعات" پر اس کے استعمال کے اعتبار سے نظر ڈالی جاتی ہے تو تنہائی یا مایوسی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ لفظ متقدمین۔ متوسطین متاخرین اور دور موجود کے مستند اساتذہ اور محققین زبان و ادب کے کلام اور تحریروں میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ اگر بفرض محال دو چار جگہ مل بھی جائے تو یہ انفرادیت وجہ جواز نہیں ہو سکتی "غلط العام فصیح" کی تعریف میں یہ فرض کر دیا گیا ہے کہ جب تک محققین اور فصحا بکثرت استعمال نہ کریں کوئی غلط لفظ فصاحت کے درجہ تک نہیں پہونچ سکتا۔ گنوری صاحب کا یہ کہنا اور حضرت بیخود دہلوی۔ حضرت نوح ناروی اور حضرت مولانا سیماب کی آرا سے یہ غلط نتیجہ نکالنا کہ "اعجاز صاحب کے پیش کردہ مواد ہی سے تردعات کا غلط العام کے ماتحت ہونا ثابت ہو چکا" اپنے ضمیر اور دوسروں کے ذہن و نظر کو دھوکا دینا ہے۔ میرا تو اب بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ اس لفظ کو کھینچ تان کر بھی "غلط العام" کے تحت میں نہیں لا سکتے۔ اُن جیسے لاکھوں ادبا اور شعرا بھی اگر استعمال کریں تو "تردعات" نہ ٹکسالی ہو سکتا ہے اور نہ "غلط العام فصیح" کی تعریف اس پر منطبق ہو سکتی ہے۔

(۲) اگر "تردعات" نے شہرت و قبولیت کے تمام مدارج طے کر لئے ہوتے تو آج گنوری صاحب کو اتنی کاوش نہ کرنی پڑتی، نہ اس رسہ کشی کی نوبت آتی، اور نہ اُن کا احساس کمتری انھیں اساتذہ کے دروازے جھانکنے پر مجبور کرتا۔

(۳) گنوری صاحب اسے غیر ضروری کہا کریں لیکن غلط العام فصیح کے لئے یہ لابدی ہے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اکثریت اقلیت کے سوال کو ختم کر سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہوگا کہ مخالفین اور موافقین کس درجہ

اور کہیں پائے سکتے ہیں!

(۴) سبحان اللہ! ایک غلط لفظ کو آپ غلط العام کے تحت میں لا رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ پانچ نے جواز میں سند دیدی ہے۔ لہذا پچاس کا عدم جواز قابلِ اعتنا نہیں۔ کیا غلط العام فصیح کی یہی تعریف ہے؟

نمبر ۴ کے تحت میں اب ذرا اُن آراء پر بھی نظر ڈالنی چاہئے جنھیں حاصل کرنے کے بعد گنوری صاحب یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ کامیابی کی دیوی سے ہمکنار ہو گئے اور اپنے مدمقابل (اعجاز صدیقی) کو بزعم خود ایسی شکست دی کہ ہر طرف سے (Cheers) ہونے لگیں۔ مجھے حیرت ہے کہ انھوں نے "یگانہ زندہ باد" کی جگہ "آبرو زندہ باد" کیوں نہ لکھا۔ میرے خیال میں ہر تنقید نگار کو "زندہ باد" کے نعرے ضرور لگانے چاہئیں۔

اپریل کے "رہنمائے تعلیم" میں جن حضرات کی رائیں شائع ہوئی ہیں۔ وہ سب بقول گنوری صاحب مرزا داغ ہی کے شاگرد ہیں۔ میرے علم میں تو یہ بات ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے تمام مشاہیر اور مستند اساتذہ سے رائیں طلب کی تھیں۔ پھر اپنے ہی خاندان کے بزرگوں کی رائیں شائع کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟؟ آئیے ذرا میں اسکی بھی سلسلہ وار وضاحت کر دوں (۱) جب گنوری صاحب نے یہ دیکھا کہ حضرت سائل کی رائے سے بالاتفاق یہ سمجھا گیا کہ انھوں نے دعا صاحب کے پاسِ خاطر سے جواز میں شعر موزوں کر کے بھیجا اور اس سے قبل موصوف نے تمام عمر یہ لفظ استعمال نہیں کیا۔ (۲) حضرت بیخود دہلوی۔ حضرت نوح[1] ناروی اور حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی نے بھی "شمردعات" کو جہلا کی زبان کا لفظ قرار دیا۔ (۳) اور خفیہ طور پر گنوری صاحب نے ہندوستان کے تمام مستند اساتذہ سے استصواب رائے کیا تو انھوں نے بھی بالاتفاق یہی کہا کہ "شمردعات" جہلا کا محاورہ ہے۔ تو اس مایوسی کی حالت میں اُن کی نگاہیں کسی سہارے کی جویا تھیں۔ چنانچہ اپنے استاد مرحوم حضرت مولانا احسن کا وطن مارہرہ نگاہ کا مرکز بنا۔ جہاں حضرت دلبر اور حضرت طپش متمکن ہیں۔ یہ بھی واضح ہے کہ باعتبار سن و سال یہ دونوں بزرگ ترین ہستیاں اب اُس مقام پر ہیں جہاں زیادہ گہرائی اور غور و فکر[2] کی قوتیں زائل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ جب گنوری صاحب نے اپنے استاد کا واسطہ دیا اور گڑگڑا کے اپنی عزت اور آبرو کا سوال سامنے رکھا اور ساتھ ہی ساتھ ایک الجھا ہوا استفسار بھی بھیجا تو یہ دونوں قابلِ تعظیم ہستیاں مجبور ہوگئیں کہ گنوری صاحب کے بتلائے ہوئے اشارات کے مطابق اپنی رائے کا اظہار کر دیں، انھیں کیا معلوم کہ اس کی تہ میں کیا راز ہے اور ہندوستان کے تمام مستند اساتذہ "شمردعات" کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ میری اس گذارش کا شاہد حضرت دلبر مارہروی کا یہ شعر ہے ؎

وہ افسانہ جو ہم سے کہنے کو تھا
اب اُس کی "شمردعات" کرتا ہوں میں

(۵) جناب جوش ملسیانی (مدیر حصہ نظم "رہنمائے تعلیم") کی رائے کوئی نئی رائے نہیں ہے۔ وہ شروع سے اس لفظ کی تائید میں ہیں۔

حضرت سائل دہلوی۔ حضرت نوح ناروی (بدلی ہوئی رائے) حضرت دلبر مارہروی۔ حضرت طپش مارہروی اور حضرت جوش ملسیانی کی یہ پانچ رائیں جو گنوری صاحب نے جواز میں پیش کی ہیں۔ ان میں ابھی کافی بحث کی گنجائش ہے۔ لیکن خوفِ طوالت اور شدید مصروفیت مانع ہے۔ ان پانچ آراء کے حقیقی خدوخال واضح کرنے کے بعد اب میں اُن آراء کو لیتا ہوں جو مئی کے تازہ "رہنمائے تعلیم" میں شائع ہوئی ہیں پہلی رائے حضرت اختر نگینوی تلمیذ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کی ہے۔ گویا یہ بھی اپنے ہی خاندان کی رائے ہوئی۔ دوسری رائے حضرت جلیل مانکپوری کی ہے۔ موصوف نے کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ "شمردعات" غلط العام فصیح کے ذیل میں آسکتا ہے۔ یا میں اسے صحیح، فصیح اور قابلِ استعمال سمجھتا ہوں۔ ہاں گنوری صاحب سے یہ کہدیا کہ انھیں ذوق ہو تو وہ استعمال کریں۔ یعنی وہ جانیں اور اُن کا کام۔ تیسری رائے نہیں بلکہ حضرت خواجہ حسن نظامی کی کسی کتاب سے ایک جملہ نقل کیا گیا ہے جو قابلِ اعتماد نہیں۔ چوتھی رائے حضرت یگانہ چنگیزی کی ہے۔ گول مول ہونے کے علاوہ اس میں کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی ثبوت ۔ "جو لفظ جس طرح فصحا کے یہاں رواج پا گیا وہ ہی صحیح ہو گا"

---

[1] اب حضرت نوح نے اپنی رائے بدل دی ہے۔ شاعر میں آپ کی جو رائے شائع ہوئی تھی وہ مضمون کے آخری حصہ میں ملاحظہ کیجئے۔ اس تبدیلی کی بظاہر تین وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ "شمردعات" آپ کے شاگرد رشید جنابِ دعا ڈبائیوی نے استعمال کیا اور وہیں سے بحث کا آغاز ہوا۔ دوسرے آپ "رہنمائے تعلیم" کے سرپرست ہیں۔ تیسرے گنوری صاحب نے معاملہ کی نزاکت کا احساس دلاتے ہوئے آں مرحوم کو زیادہ سے زیادہ مجبور کیا۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک ایسا کہنہ مشق استاد یہ سمجھتے ہوئے بھی اپنی رائے بدل دے کہ "غلط العام کی تعریف کیا ہے؟" "شمردعات" کس حیثیت کا لفظ ہے۔ نہ خود کبھی استعمال کیا۔ نہ اپنے استاد مرزا داغ کے یہاں دیکھا اور نہ ہمعصروں کے کلام میں ——— اعجاز

[2] غور و فکر کا مقصد یہ نہیں ہے کہ حضرات اچھے اور برے میں تمیز نہیں کر سکتے بلکہ کہنا یہ ہے کہ [illegible] کی نیت اور [illegible] کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے [illegible] ——— اعجاز

سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ماضی و حال کے مستند شعرا نے "شروعات" کو رواج دیا ہے؟ حضرت یگانہ و جوش ملسیانی کے متعلق جناب گنوری نے جو بے موقع قصیدہ خوانی کی ہے (محض اس لئے کہ ان حضرات نے ذرا زور شور سے شروعات پر بحث کی ہے) اور اپنی پیش کردہ آرا کی جتنی غلط توجیہ بیان کی ہے میں اُسے بخوفِ طوالت نظر انداز کرتا ہوں غالباً گنوری صاحب اپنی جگہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ان کے مضامین کا مطالعہ کرنے والے سطحی ذہنیت کے حامل ہیں اور معاملہ کی حقیقت کو بالکل نہ سمجھ سکیں گے ورنہ وہ محض اپنے مقصد کی کفالت اور بات کی پچ میں آرا کی اتنی غلط توجیہ نہ کرتے۔ ثبوت میں گنوری صاحب کے مویدین کی آرا کی "جامع" پیش کرتا ہوں، جو پُر لطف، نتیجہ خیز اور حقیقت و واقعیت پر مبنی ہے یہ بھی واضح رہے کہ اس میں میں نے اپنی طرف سے ایک حرف کا بھی اضافہ نہیں کیا ہے۔

(۱) "تمہاری خاطر سے بطورِ سند ایک شعر موزوں کرکے بھیجتا ہوں"۔ (سائل دہلوی)

(۲) "اپنا ایک شعر حاضر کرتا ہوں"۔ (دلبر مارہروی)

(۳) "شروعات" کو فصیح قرار دینے کی تائید کرتا ہوں (جوش ملسیانی)

(۴) اس لفظ کو لوگ عام طور پر لکھتے اور بولتے ہیں۔ (طپش مارہروی)

(۵) لہٰذا اگر کوئی شخص بقول حضرت سائل دہلوی اس لفظ کو لکھے تو کوئی بُرا نہیں (نوح ناروی۔ بدلی ہوئی رائے)

(۶) میں اس لفظ کو مستعمل کرتا تو اس طرح کرتا ؎

پڑتی ہیں ہر آغازِ جوانی پہ نگاہیں کچھ اور ہی ہوتا ہے "شروعات" کا عالم

(اختر نگینوی)

(۷) "شروعات کا لفظ میں نے فصحا کی زبان سے نہیں سُنا۔ اگر آپ نے فصحا کو بولتے سُنا ہے اور آپ کو وثوق ہے تو آپ بے تکلف استعمال کرسکتے ہیں"۔

(فصاحت جنگ جلیل)

نتیجہ و محاکمہ:-

(۱) استفسار سے قبل حضرت سائل نے کبھی "شروعات" اپنے کلام میں استعمال نہیں کیا اور نہ آئندہ کا وعدہ کرتے ہیں۔

(۲) حضرت دلبر مارہروی نے فوری طور پر ایک شعر موزوں کرکے بھیج دیا اگر یہ لفظ اُن کے استعمال میں ہوتا تو درجنوں اشعار بھیجتے۔ آئندہ استعمال کے لئے آپ نے بھی کوئی وعدہ نہیں کیا۔

(۳) جوش صاحب نے صرف فصیح قرار دینے کی تائید کی ہے۔ پہلے کبھی استعمال نہیں کیا اور نہ آئندہ کے لئے کوئی ارادہ ظاہر کیا۔

(۴) طپش صاحب نے اپنے متعلق کچھ نہیں لکھا کہ وہ اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں یا کرینگے۔

(۵) "کوئی شخص" کہہ کر حضرت نوح نے معاملے کو بہ حُسن و خوبی ٹالا ہے۔ اپنے متعلق کچھ نہیں لکھا۔

(۶) اختر صاحب نگینوی کے جملہ "میں کرتا" غور طلب ہے۔

(۷) فصاحت جنگ حضرت جلیل مانکپوری کی رائے سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس لفظ کو جائز نہیں سمجھتے۔

میں نے مندرجۂ بالا نتائج اخذ کرنے میں گنوری صاحب کی طرح کسی تاویل یا اُلجھاؤ سے کام نہیں لیا ہے۔ اب گنوری صاحب سخن پروری کو چھوڑ کر ایمانداری سے بتائیں کہ اُنھوں نے جن شعرا کی آرا پیش کی ہیں وہ اِن کے موافق ہیں یا مخالف اور انھیں آرا کے پیشِ نظر کیا "شروعات" غلط العام کے تحت میں آسکتا ہے؟ کس قدر کھلا ہوا فریب ہے کہ جن مستند حضرات کی وہ رائیں پیش کر رہے ہیں اور انھیں زبردستی اپنی تائید میں سمجھ رہے ہیں۔ اُن اساتذہ نے استفسار سے قبل کبھی "شروعات" کا استعمال نہیں کیا اور نہ آئندہ کے لئے کوئی وعدہ کیا۔ تو پھر کیا صرف گنوری صاحب کی "تاویلات" "شروعات" کو ٹکسالی بنا سکتی ہیں؟

گنوری صاحب کی پیش کردہ آٹھ تائیدی آرا میں چھ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے تلامذہ کی ہیں اور ان پر "ثنائے خود بدہانِ خود" کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ کیا اپنے خاندان کے ان بزرگوں کے علاوہ انھیں ہندوستان میں چوٹی کے مستند اساتذہ اور محققین ملے ہی نہیں؟ اور کیا یہ گنوری صاحب کی کوتاہ نظری اور عصبیت نہیں ہے؟ میرے لئے وہ سب ہستیاں قابلِ تعظیم ہیں جن کی رائیں گنوری صاحب منظرِ عام پر لائے ہیں لیکن انھوں نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے ان اساتذہ کے وقار کو بڑی حد تک ٹھیس بھی لگائی ہے اور اس نکتہ کو وہ ہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جنھوں نے گنوری کے مضامین دیکھے ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اُن میں سے بیشتر بزرگوں نے زبان و ادب کے مسائل اور علمی و فنی مباحث میں کبھی نمایاں حصہ نہیں لیا تو بیجا نہ ہوگا۔ جب شہرت و قبولیت ہی پر بات کا دار و مدار ہے تو کیا حضرت آرزو لکھنوی۔ حضرت صفی لکھنوی۔ حضرت ثاقب لکھنوی۔ حضرت دل شاہجہانپوری۔ حضرت مولانا حسرت موہانی۔ حضرت بیخود دہلوی۔ حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی۔ حضرت وحشت کلکتوی۔ فصاحت جنگ حضرت جلیل مانکپوری۔ حضرت شفق عماد پوری۔ ناخدائے سخن

حضرت نوح ناروی، حضرت سر ریکا پرس گیادی عیانی اور شمس العلما علامہ تاجور نجیب آبادی شہرت و قبولیت کے حامل نہیں ہیں؟ اور کیا ان بزرگوں نے ہمیشہ علمی و فنی مسائل کی گتھیاں نہیں سلجھائی ہیں؟ ——— میں یہ بانگِ دہل کہہ سکتا ہوں کہ یہ وہ ہستیاں ہیں جو زبان و ادب کی پشت و پناہ کہی جاتی ہیں اور جن کے دل و دماغ اتنی وسیع معلومات کے حامل ہیں کہ ہم انھیں ادب کا بحرِ ناپیدا کنار کہہ سکتے ہیں۔ یہ سب وہ استادانِ فن اور رہنمایانِ سخن ہیں۔ جن کی زندگی ہی گیسوئے اُردو کو سنوارنے اور اُس کی تحقیق و تدوین میں گذری ہے۔ انکی انتھک کوششوں نے "گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے" کو غلط ثابت کردیا ہے۔ گنوری صاحب ذرا کھلے دل سے جواب دیں کہ انھوں نے ان تمام بزرگوں سے استصواب رائے کیوں نہ کیا؟ اچھا وہ جواب کی زحمت گوارا نہ فرمائیں۔ میں خود ہی اس راز کو افشا کئے دیتا ہوں کہ مندرجہ بالا استادانِ فن میں سے بیشتر حضرات سے انھوں رائیں طلب کیں۔ اور جب سب نے "شروعات" کو جہلا کا فتویٰ قرار دیا تو گنوری صاحب خاموشی کے ساتھ انھیں گول کر گئے۔ بالفاظِ دیگر اپنی ضد۔ ہٹ اور زیچ پر ان آرائے گرامی کو قربان کردیا۔ افسوس صد افسوس۔ جن اساتذہ کی رائیں انھوں نے اپنی تائید میں پیش کی ہیں انکی توجیہہ۔ تاویل۔ اہمال اور اغلاق کے پیمانہ میں ڈھلی ہوئی ہے اور سنئے۔

وہ چیختے ہی رہے کہ لکھنؤ کے مستند اساتذۂ سخن اور محققین "شروعات" کے جواز میں اپنی رائے دیں لیکن اُن کی آواز مطلق بے اثر ثابت ہوئی ——— خیر

میں نے جن محققین اور اساتذۂ صفِ اوّل کے اسمائے گرامی سطورِ بالا میں پیش کئے ہیں وہ مومن۔ غالب۔ جلال۔ داغ۔ امیر مینائی۔ تسلیم غرض دورِ متاخرین اور دورِ متوسطین میں جتنے جلیل القدر اساتذہ گزرے ہیں قریب قریب سب کے مستند متبعین، تلامذۂ جلیل اور اُن کی شاعری کے اسکولوں کی صحیح یادگار ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ اُردو کے مشہور مراکز دلّی۔ لکھنؤ۔ آگرہ۔ بنگال۔ بہار اور حیدرآباد وغیرہ کے نامور نمائندے بھی ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ سب اساتذۂ سخن جن کا میں نے ذکر کیا ہے "شروعات" کو غیر فصیح اور جہلا کا فتویٰ قرار دیدیں تو کیا یہ تمام ادبی ہندوستان کی آواز نہ ہوگی؟ اور کیا پھر بھی کسی کو تاویل کی گنجائش ہوگی؟ یہ امر واضح کردوں کہ باعتبارِ شخصیت۔ شہرت۔ قبولیت و تعداد بھی اِن بزرگانِ ادب سے کوئی نہیں ٹکرا سکتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میری مندرجہ بالا گذارش کو جو حقیقت پر مبنی ہے گنوری صاحب ذہنی نیت کے مطابق اس بات پر محمول کرینگے اور سند دینگے کہ میں نے اُن کے پیش کردہ اساتذہ کی خدانخواستہ توہین کی ہے۔ حاشا ایسا نہیں ہے۔ میرے پیش کردہ بزرگوں کے متعلق ہر طبقہ اور ہر فرد کی یہی رائے ہے) ان محققین لُدھو کی نظر میں "شروعات" کا کیا درجہ ہے اُسے گنوری صاحب اور اُن کے مویدین نگاہِ عبرت سے ملاحظہ فرمائیں۔

"شروعات" محققینِ زبان و ادب اور جلیل القدر اساتذۂ سخن کی نظر میں

(۱) حضرتِ آرزو لکھنوی

"شروعات"۔ اُن لفظوں میں سے ایک ہے جو ....." لوگوں کے اپنے زمانہ عروج میں مثل نور چشمی وغیرہ کے رائج کردیئے تھے۔ جنکو پڑھے لکھے لوگ بولتے اور لکھتے ہیں۔ مگر ادبا نے ہمیشہ ایسے لفظوں کے استعمال سے احتراز کیا۔ میں تو مدت العمر میں ایک بار بھی اس لفظ کو نہ بولا ہونگا۔ چہ جائیکہ لکھنا۔ فقط

آرزو لکھنوی

(۲) لسان القوم حضرت صفی لکھنوی

۱۔ الفاظ غلط العام فصیح، کے لئے یہ ضروری ہے کہ انھیں مستند ادبا نے استعمال کیا ہو۔

۲۔ لفظ "شروعات" پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

۳۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے کسی مستند شاعر کے کلام میں اس لفظ کا استعمال نہیں دیکھا اور خود بھی اس کا استعمال نہیں کیا۔ اس لئے کہ میری رائے میں یہ غلط العوام ہے غلط العام سے نہیں۔

۴۔ جو فریق اسے عوام کی زبان قرار دیتا ہے وہی حق پر ہے۔

صفی لکھنوی

(۳) حضرت ثاقب لکھنوی

"شروعات"۔ آراضی۔ آراضیات۔ موازیات یہ جملہ الفاظ باوجود غلطِ محض ہونے کے عرفِ عام میں رائج ہیں اور اُردو زبان میں بولے جاتے ہیں۔ "شروعات" بازاری اور سوقیانہ لفظ ہے۔ میں غلط العام فصیح کا معتقد نہیں ہوں۔ دورِ حاضر کے شعرا چونکہ کسی اصول کے پابند نہیں ہیں اور دلّی اور لکھنؤ کی مستند زبانوں کو طاقِ نسیاں پر رکھکر اپنی ہی دہقانی زبان اور محاورات کو ٹکسالی زبان قرار دیتے ہیں ان کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں، جو جی میں آئے ارشاد فرمائیں۔

ثاقب لکھنوی[۱]

(۴) اعتبار الملک حضرتِ دل شاہجہانپوری

کرمی ابرا حسنی نے مجھ سے لفظ "شروعات" کے متعلق رائے طلب فرمائی تھی۔ بحالتِ جواز غلط العام فصیح ایک شعر بطورِ سند چاہا تھا۔ میں نے تفصیل اظہارِ خیال

۱۔ دیکھا آپ نے، گنوری صاحب حضرتِ دل کی رائے کو کس ڈھنگ سے چھپائے رکھا ——— اعجاز

کردیا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے۔ "غلط العام فصیح" سے مراد مجرد عوام کی بول چال میں مستعمل ہونا سند نہیں ہے بلکہ نظم میں شعرا کا استعمال ہو کیونکہ بعض ۔ ۔ ۔ شعرا تک اپنے یہاں کی بول چال کے اعتبار سے بعض لفظ غلط بولتے ہیں مگر نظم میں اسکا استعمال جائز نہیں سمجھتے۔ مجرد شعرا کا نظم میں استعمال کرنا بھی سند نہیں ہے بلکہ وہ شعرا جو محقق ہیں اُن کا نظم کرنا سند ہوسکتا ہے۔ لہذا میری رائے میں لفظ "شرد عات" کا استعمال جائز نہیں۔ جب لفظ شروع بھی آغاز مفہوم پیدا کرتا ہے تو دو حرف اضافہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

دل شاہجہانپوری

(۵) حضرت مولانا حسرت موہانی

لفظ "شرد عات" نہ میں نے خود کبھی استعمال کیا اور نہ کسی مستند شاعر کے کلام میں دیکھا۔ میرے نزدیک اس لفظ پر "غلط العوام" کا اطلاق ہوسکتا ہے "غلط العام" کا نہیں۔ فقط

حسرت موہانی

(۶) حضرت بیخود دہلوی

"شرد عات" کوئی لغت نہیں ہے۔ دلی والے جاہل مرد اور عورتیں لڑائی کے وقت یہ کہا کرتے ہیں کہ "شرد عات" تم نے کی تھی۔ میں نے پہل نہیں کی۔ کیونکہ شروع کے املا میں "ع" ہے اس لئے کسی پڑھے لکھے جاہل نے شردآت کو بھی عین سے لکھدیا۔

بیخود دہلوی

(۷) حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی[1]

عزیزی اثر صاحب، السلام علیکم

آپکا کارڈ پہونچا۔ میں پندرہ بیس روز سے علیل ہوں۔ ضروری کاموں کے سوا سب کام بند ہیں۔ آپکے استفسار کو بھی ضروری سمجھ کر جواب لکھ رہا ہوں۔

آج تک آپ کا کوئی خط میرے پاس ایسا نہیں آیا جس میں آپ نے احیاناً کوئی وجہ اشتعال پیدا نہ کی ہو[2]۔ اس کارڈ میں دو محل ایسے ہیں کہ اگر میں آپ ہی کے انداز میں جواب دوں تو ذرا سی بات کا افسانہ بن جائے۔ لیکن میں دانستہ آپ کی ایسی باتوں کو نظرانداز کرتا رہا ہوں اور اب بھی نظرانداز کر رہا ہوں۔ اپنے استاد مرحوم کے بعد آپکو زیادہ سے زیادہ متین، رواداراور خلیق ہونا چاہئے تھا۔ یہی طریقہ ترقی تھا مگر افسوس کہ آپ نے اپنی ترقی اور شہرت کے لئے غلط راستہ اختیار کرلیا۔ یعنی علی الرغم اساتذہ، آپ اپنی آواز بلند کرنے لگے۔ ترقی وہ کرتا ہے جو ہمیشہ طالبعلم رہے اور انانیت وخودی کو اپنے پاس بھی نہ پھٹکنے دے۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کے کارڈ کا جواب دوں مگر جواب دینا اور وہ بھی مفصل اس لئے ضروری سمجھا کہ شاید میرے اس خط سے آپ کو اطمینان ہوجائے اور آپ اپنی غلطی پر متنبہ ہوکر لفظ "شرد عات" کے متعلق بیکار خامہ فرسائی سے آئندہ محترز رہیں۔

اب اپنے خط کا جواب سنئے :۔

(۱) "غلط العام فصیح" کا اطلاق ہمیشہ اُن غلط الفاظ پر ہوتا ہے جو عام طور پر اہلِ زبان بولنے اور لکھنے میں استعمال کرتے ہوں

(۲) اس استفسار میں "استعمالِ عام وعوام" سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ عام وعوام میں تمیز نہیں کرسکتے۔ عوام کالانعام علمی وادبی مباحث میں ہمیشہ خارج از بحث سمجھے جاتے ہیں۔ غلط العام فصیح" ایک پرانا کلیہ ہے نہ کہ غلط العوام فصیح"۔ استفسار کی صورت یہ ہونی چاہئے کہ "اگر شہرت وقبولیت نیز استعمالِ عام کسی لفظ کو رائج"

لفظ "شرد عات" عام اہلِ زبان کی زبان سے کبھی نہیں سُنا گیا۔ البتہ جہلا کی زبان سے شاذ ونادر سُنا گیا ہے یہ بھی غلط ہے کہ ملک کے بیشتر ادبا اور مضمون نگار اپنے مضامین میں اس لفظ کو استعمال کر رہے ہیں اور یہ بھی غلط کہ عام تحریروں اور مطبوعہ کتب میں بھی یہ لفظ نظر آتا ہے۔

آجکل مضمون نگاروں اور ناقص العلم لکھنے والوں نے اُردو کی جو تخریب کی ہے اُس سے کون واقف نہیں۔ ہر وہ شخص جسے معمولی لکھنا پڑھنا آتا ہے مضمون نگار بن بیٹھتا ہے۔ اس کا تجربہ آپ سے زیادہ مجھے ہے اس لئے عام مضامین اور عام تحریروں میں یہ لفظ کہیں کہیں اور کبھی کبھی نظر آتا ہے تو مستند نہیں ہوسکتا۔ النادر کالمعدوم۔ البتہ اگر آپ مشاہیر اہلِ قلم اور اہلِ زبان کی مثالیں پیش کریں تو اُن پر غور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ایک دو مثالوں سے کام نہیں چل سکتا اور نہ وہ غلط العام کے تحت میں آسکتی ہیں۔

---

[1] حضرت مولانا سیماب مدظلہ کی مختصر رائے نومبر ۱۹۳۱ء کے "شاعر" میں شائع ہوچکی ہے، یہاں میں وہ تفصیلی رائے پیش کر رہا ہوں جو قبلہ وکعبہ نے اثر صاحب کے ایک خط کے جواب میں بھیجی تھی اور جسے اُنھوں نے ابتک شائع نہیں کیا۔

[2] ناظرین اثر صاحب کے خط کا ایک جملہ ملاحظہ فرمائیں سوالات برادرم اعجاز کے واسطے نہیں کر رہا ہوں بلکہ ملک کے ایک مشہور ادیب شاعر سے خطاب ہے امید کہ اسی نظریہ پر جواب عنایت ہوگا۔ اعجاز

لفظ "شردعات" ذرصحیح ہے مگر تعجب ہے کہ قدیم و جدید شعرا نے اسے کبھی استعمال نہیں کیا۔ میر سے داغ تک اور داغ سے آج تک کسی شاعر نے اپنے کلام میں اس لفظ کا استعمال جائز نہیں سمجھا، پھر کس طرح سمجھ لیا جائے کہ یہ لفظ صحیح و فصیح ہے؟

میر کے کلیات میں تین غزلیں ایسی پائی جاتی ہیں جن کے قوافی میں "شردعات" بھی آسکتا تھا۔ ایک غزل تو یہ ہے ؎

تا پھونکئے نہ خرقۂ طامات کے تئیں　　　حسن قبول کیا ہو مناجات کے تئیں

اس غزل میں خرابات، آفات، حالات، ہات، بات، ذات، ملاقات، اور رات قوافی استعمال کئے گئے ہیں۔ مگر "شردعات" کہیں نہیں ہے۔

دوسری غزل یہ ہے ؎

کل پاس میرے ہم سے ملاقات ہوگئی　　　دو دو بچن کے ہونے میں اک بات ہوگئی

اس میں رات، خرابات، مکافات، کرامات، مساوات، حاجات اور برسات قافیے ہیں "شردعات" نہیں ہے۔ حالانکہ شردعات اس زمین کا خاص قافیہ تھا "شردعات ہوگئی"۔

تیسری غزل یہ ہے ؎

دیر کچھ کھنچتی نہ کتنے بھی ملاقات کی بات　　　ملنا اپنا جو ہوا اُس سے تو وہ بات کی بات

اس غزل میں بھی خرابات، مساوات، گھات، طامات، رات اور ذات قافیے استعمال کئے گئے ہیں۔ "شردعات" کہیں نہیں۔ حالانکہ "شردعات کی بات" کہہ سکتے تھے۔

اب افصح الفصحا حضرت داغ دہلوی مرحوم و مغفور کے دواوین کی طرف رجوع کیجئے۔

ایک غزل ہے ؎

شکوہ نہیں کسی سے ملاقات کا مجھے　　　تم جانتے ہو وہم ہے جس بات کا مجھے

اس میں گھات، برسات، حکایات، رات، مناجات اور ذات وغیرہ قوافی ملتے ہیں مگر نہیں ملتا تو لفظ "شردعات"

دوسری غزل ؎

کیوں کرتے ہو دُنیا کی کسی بات سے توبہ　　　منظور تو ہے میری ملاقات سے توبہ

اس میں برسات، گھات، خرابات، عنایات، رات اور ہات وغیرہ قوافی ہیں "شردعات" نہیں ہے۔

تیسری غزل ؎

ہائے وہ دن کہ میسر تھی ہمیں رات نئی　　　روز معشوق نیا روز ملاقات نئی

(اس میں بات، مدارات، سوغات وغیرہ قوافی موجود ہیں اور "شردعات" شدارد۔

چوتھی غزل ؎

عاشقی میں یہ بڑی بات ہوا کرتی ہے　　　نِت نئے رنگ، ملاقات ہوا کرتی ہے

اس غزل میں رات، خیرات، بات، مدارات، مکافات وغیرہ قوافی ہیں۔ لیکن "شردعات ہوا کرتی ہے" نہیں ہے۔ اگر شردعات کوئی لفظ ہوتا تو اُردو کا یہ بہترین مستند شاعر اس زمین میں ضرور رکھتا۔

پانچویں غزل ؎

ہونے کو تو کیا اُن سے ملاقات نہ ہوگی　　　جس بات کی خواہش ہے وہی بات نہ ہوگی

اس میں حاجات، کرامات، اوقات، مدارات وغیرہ قوافی ہیں "شردعات نہ ہوگی" نہیں ہے۔

چھٹی غزل ؎

تم گلے جب نہ ملو لطفِ ملاقات ہی کیا　　　مان بھی جاؤ مری بات یہ ہے بات ہی کیا

قوافیِ غزل اوقات، کرامات، خرابات، برسات، حاجات ہیں "شردعات" کہیں نہیں۔

ساتویں غزل ؎

قول و قسم کی شرط ملاقات کا لحاظ　　　انسان کو ضرور ہے ہر بات کا لحاظ

اس غزل میں خرابات، اوقات، رات، گھات، مدارات، حاجات وغیرہ قوافی موجود ہیں مگر "شردعات" کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

آٹھویں غزل ؎

رہتا ہے روز اُس کی ملاقات کا خیال　　　ہوجائے خواب کاش یہ دن رات کا خیال

اس غزل میں بھی مدارات، بات، خرابات، برسات، عنایات وغیرہ قوافی ہیں مگر "شردعات" خارج از خیال ہے۔

یہ میرا سرسری تجزیہ ہے ممکن ہے ان قوافی میں میر و داغ کی اور غزلیں بھی ہوں اب اِس قدر کے اساتذہ کے کلام کا تجزیہ کیجئے۔ فانی بدایونی مرحوم اور قمر بدایونی مرحوم کے یہاں اس لفظ کا پتہ نہیں۔ حضرت آرزو کی بھی ایک غزل انہیں قوافی میں نظر سے گذری جس کا مطلع یہ ہے ؎

پلٹی رُت، بدلا سماں ہوگئی ہر بات نئی　　　ہم نئے چاند نئی چاندنیاں رات نئی

اس غزل میں بات، گھات، برسات اور نکات وغیرہ قوافی ہیں "شردعات" نہیں ہے۔

حضرت مولانا احسن مارہروی مرحوم کا دیوان ہنوز معرضِ اشاعت میں نہیں آیا لیکن اس عمر تک جتنی غزلیں مرحوم کی میری نظر سے گذریں اُن میں لفظ "شروعات" میں نے نہیں دیکھا نہ اُن کی زبان سے کسی مشاعرے میں سُنا۔ حضرت نوح ناروی اور حضرت بیخود دہلوی دونوں اس لفظ کی صحت سے انکار کرچکے ہیں[1]۔ اب رہ گئے حضرت سائل دہلوی، تو انھوں نے بھی عمر بھر اس لفظ کا استعمال نہیں کیا۔ البتہ کسی کے **پاسِ خاطر** برجستہ ایک شعر کہدیا تو کلام و فن میں **پاسِ خاطر** کا جو درجہ ہے وہ مجھے، آپ کو، اور سب کو معلوم ہے۔

اجتہاد و ایجاد بُری چیز نہیں۔ اجتہاد ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہیگا لیکن اجتہاد کی بنیاد اگر از روئے علم و فن کمزور ہے تو وہ اجتہاد نہیں ادبی بدعت ہے۔

آیئے اب خالص علمی نقطۂ نگاہ سے بھی "شروعات" کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ کرکے دیکھ لیں یہ لفظ شروع سے بنایا گیا ہے۔ عربی الفاظ کے آخر میں "ا۔ ت" جمع کے لئے لاتے ہیں جیسے حالات، کیفیات، ممنوعات۔ حکایات۔ فردعات وغیرہ وغیرہ۔ بنائً علیٰ ہذا اس لفظ کے معنی "ابتدائیں" ہوسکتے ہیں لیکن یہ لفظ جہلا میں بالاتفاق مفرد مؤنث مستعمل ہے۔ جیسا کہ حضرت سائل دہلوی نے بھی مثالاً ایک شعر کہہ کر ثابت کردیا تو معلوم ہوا کہ یہ جمع عربی لحاظ سے بے معنی ہے۔

(۳) اُردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ غلط کرکے استعمال نہیں کئے گئے بلکہ بعض الفاظ کے اعراب بدل کر جیسے کِشتی۔ مُحبت۔ مَشاعِرہ۔ شِکوہ وغیرہ جو اصل میں کَشتی، مَحَبَّت، مُشاعَرہ اور شَکوہ تھے۔ یا معنی بدل کر جیسے مشکور بمعنی ممنون اور عرصہ بمعنی مدت وغیرہ۔ مگر ثقہ شعرا آج بھی ان الفاظ کے اعراب و معنی میں احتیاط کرتے ہیں حالانکہ عام طور پر یہ الفاظ اسی طرح مستعمل ہیں۔ اعراب کا اختلاف غالباً تکلف کی وجہ سے ہوا ہوگا اور معنی کا اختلاف نادانستہ طور پر ——— اختلافِ اعراب زبان زد ہوگیا لیکن اختلافِ معنی ابتک ناجائز اور غلط ہی سمجھا جاتا ہے۔

بوجوہِ بالا آپ پر اچھی طرح واضح ہوگیا ہوگا کہ "شروعات" فصیح تو کیا صحیح بھی نہیں ہے اور صرف جہلا کا مختار ہے۔

اگر جہلا کے مختارات کو اپنایا جائے اور اُن کی صحت پر اصرار کیا جائے تو اُردو زبان کا علمی پایہ یقیناً گر جائے گا اور زبان بے قاعدہ سمجھی جائیگی جاہل عورتیں اور مرد عام طور پر لبِ سڑک۔ دن بدن۔ اپنے سگنے۔ نریا۔ نوچ ہشد سرِ عام، بدبخ۔ گوشت۔ مرچ۔ دس پنا۔ اگری۔ بجامہ۔ صبح (بفتح با) گجک۔ برف بولتے ہیں۔ تو کیا یہ تمام الفاظ "غلط العام" کے ماتحت صحیح و فصیح مانے جاسکتے ہیں؟ جبکہ ان کی صحت اور اصلیت کا ہمیں علم ہے کہ یہ الفاظ۔ سڑک کے کنارے۔ روزبروز گنے چنے۔ مرنجا۔ نعوذباللہ۔ شاہراہِ عام۔ بطیا بالطیخ۔ گوشت، مرچ۔ دست پناہ انگری۔ پائے جامہ۔ صُبح۔ گزک اور بَرف کی مسخ شدہ صورتیں ہیں۔ اہلِ علم کبھی جہلا کے ان الفاظ کو اپنانے کی کوشش نہیں کرسکتے۔ میں نے یہ چند الفاظ مثالاً لکھے ہیں، لیکن اگر آپ بازار میں کھڑے ہوجائیں اور بازاری زبان پر بتجزیہ غور کریں تو ایسے سیکڑوں غلط الفاظ سننے میں آئینگے۔

غلط رواج یہیں سے شروع ہوتا ہے کہ آپ ایک غلط لفظ کسی جاہل سے سُنکر لکھدیں اور اسکی کورانہ تقلید ہونے لگے۔ جب "شروعات" کی جگہ ہماری زبان میں ابتدا آغاز۔ پہل۔ بسم اللہ اور شروع پانچ الفاظ مذکر و مؤنث موجود ہیں تو "ا۔ ت" کے فضول اضافہ کے ساتھ نہیں معلوم کیوں "شروعات" لکھا جاتا ہے؟ جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟ خصوصاً جبکہ تلک۔ دکھلا۔ بتلا محض اضافہ "لام" ہی کی وجہ سے شعرائے متاخرین نے متروک کردیے ہیں۔

میری ذاتی رائے یہی ہے کہ "شروعات" نہ صحیح ہے نہ فصیح اور نہ قابلِ ترجیح۔

پھر بھی اگر آپ یا آپ کے مویدین اس لفظ کو اپنانے کے لئے مصر ہوں تو انھیں اختیار ہے ضرور لکھیں اور اطمینان رکھیں کہ اُن پر کوئی قانونی جرم عائد نہ ہوگا۔ اس لئے کہ زبان اور قلم پر گورنمنٹ کی طرف سے کوئی لائسنس نہیں ہے۔ اُمید کہ آپ مع الخیر ہونگے۔

دُعا گو

سیماب اکبرآبادی

(۸) خان بہادر حضرت رضا علی وحشت کلکتوی

میں آپ سے متفق ہوں کہ ان الفاظ کے لئے جو غلط العام فصیح کے ذیل میں آتے ہیں۔ ضروری ہے کہ مستند اساتذۂ سخن اور فصحا نے ان کا استعمال بکثرت کیا ہو۔

لفظ "شروعات" پر غلط العام فصیح کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔

میں نے کبھی اس لفظ کا استعمال نہیں کیا ہے اور نہ کسی مستند شاعر کے کلام میں دیکھا ہے مولوی نذیر احمد۔ مولانا حالی۔ مولانا شبلی کسی کی نثر میں بھی میں نے یہ لفظ نہیں دیکھا۔ یہ عوام کی زبان کا لفظ ہے اور بے ڈھنگا ہے۔

وحشت

(۹) فصاحت جنگ حضرت نواب جلیل مانکپوری شاعرِ دربارِ دکن

غلط العام فصیح سے مراد وہ الفاظ ہیں جو باوجود غلط ہونے کے خاص و عام

[1] جریدہ "شاعر" نومبر ۱۹۴۱ء صفحہ ۱۱ سیماب

کے استعمال میں آگئے ہوں مثلاً گھمار۔ دلدار۔ قاعدے سے غلط ہیں مگر فصحا کے یہاں بھی مستعمل ہیں چنانچہ ناسخ کا شعر ہے ؎

حُسن سے خالی نہیں گر ہیں بھرے رخسارِ یار
واقعی خوبی ہے جس درجہ ہو دلدار آئینہ

شردعات کا لفظ فصحا کی زبان سے میں نے نہیں سُنا اور اُن کے کلام میں بھی نہیں دیکھا۔ لہٰذا میری رائے میں اس سے احتراز اولیٰ ہے۔

اسی مضمون کا خط بدایوں سے ایک صاحب کا آیا تھا۔ اُن کو بھی میں نے یہی جواب دیا۔

فصاحت جنگ جلیل

(۱۰) حضرت مولانا شفق عماد پوری مینائی

لفظ "شردعات" لغتاً غلط ہے۔ اس کے ماننے میں جب تامل نہیں تو بات صرف غلط العام و غلط العوام پر آکر ٹھہرتی ہے۔ غلط العام جب فصحا کے استعمال میں ہو تو غلط العام فصیح ہے ورنہ غلط العوام غیر فصیح۔ اب یہی منفرد رائے یا قلیل دخل خیال لائقِ استناد نہیں **بپاسِ خاطر** کسی کا کوئی شعر موزوں کر دینا جس میں "شردعات" کسی طرح آجائے پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ یہ کہنا کہ کسی نے پہلے سوچے سمجھے شردعات کو غلط لکھ دیا لیکن پھر کسی وجہ سے اپنی رائے بدل دی یہ بھی ایک دھوکے کی بات ہے۔ آخر وجہ کونسی تھی۔ کیا یہ تھی کہ جس نے لفظ "شردعات" کو نظم میں استعمال کیا وہ بھی اپنے ہی حلقے یا گروہ کا ہے۔ میرے خیال میں تغلیط کے بعد تصحیح ٹھیک نہیں۔ تغلیط بھی ایسی جو مبہم نہیں بلکہ صاف لفظوں میں تھی اور ایک مستند خواجہ تابش کی رائے سے بھی اتفاق کیا گیا تھا۔

المختصر "شردعات" غلط العام نہیں غلط العوام کے تحت میں ہے۔ زبان کی صحت اور ردد کی فصاحت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اتنا کہہ دینا چاہیے کہ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے اور اس بحث کو بند کر دینا بہتر ہے۔ میری جو رائے تھی میں نے لکھ دی۔

شفق

(۱۱) ناخدائے سخن حضرتِ نوحؔ ناروی

شردعات غلط ہے۔

میں نے اس کو کسی لغت میں نہ کسی مستند شاعر کے کلام میں دیکھا۔ میری بھی رائے وہی ہے جو بھائی بیخود صاحب کی ہے۔

نوح اشارہ

(۱۲) بلبل بہار حضرت سریر کابری گیاوی مینائی

"شردعات" میری نگاہ سے کسی صاحبِ قلم یا اہلِ سخن کے کلام میں نہیں گذرا۔ میری دانست میں صحیح نہیں ہے اگر ہو بھی تو اس جہت سے اس کی صحت قابلِ سند نہیں ہے کہ شعرائے حال نے اس کو متروک کر دیا ہے اور جو لفظ متروک ہو جاتا ہے وہ غیر صحیح کہا جاتا ہے۔ غلط العام فصیح کے متعلق یہ کہنا ہے کہ غلط العام فصیح ہے نہ کہ غلط العوام۔ عام میں خاص کا جزو شامل ہوتا ہے عوام میں یہ بات نہیں ایسی حالت میں غلط العام فصیح سے یہاں کام نہیں لیا جا سکتا۔

ٹکسالی زبان بھی وہی مستند سمجھی جاتی ہے جس کو فصحا اور مستند شعرا نے استعمال کیا ہو اور اب تک کرتے ہوں۔ دہلی اور لکھنؤ کے عوام اہلِ زبان نہیں سمجھے جا سکتے۔ شرفا کا روزمرہ شعرا کا کلام مانا جاتا ہے۔

سریر کابری

مندرجۂ بالا محققین اور اساتذۂ سخن کی آرا کتنی وقیع اور کس وزن کی حامل ہیں۔ اس کے متعلق وضاحت کی ضرورت نہیں ——— ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک "شردعات" نہ صرف غلط غیر فصیح بلکہ جہلا کا محاورہ ہے اور یہی میں نے اکتوبر ۱۹۴۱ء کے "شاعر" میں عرض کیا تھا جس پر جناب گنوری نے اتنی حاشیہ آرائی کی کہ بادی النظر میں میری ذات سے لوگوں کو شبہ پیدا ہو گیا ہو گا اس لیے کہ گنوری صاحب نے اپنے پہلے مضمون میں جگہ جگہ اس بات پر زور دیا ہے کہ میں نے دعا صاحب کو "جاہل" کہا ——— اب میں انہیں سے پوچھتا ہوں کہ مندرجۂ بالا آرا میں بھی یہ حکم لگایا گیا ہے کہ "شردعات" جہلا کی زبان کا لفظ ہے ———

حاشا میرا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ میں دعا صاحب کو اپنا مخاطب سمجھوں غیر ارادی طور پر اُن سے غلطی کا ہو جانا اُن کی جہالت پر دلالت نہیں کرتا۔ یہ گنوری صاحب کا ایک افترا تھا محض اس لیے کہ دعا صاحب انہیں اپنا بہترین ہمدرد سمجھنے لگیں۔ خیر یہ تو اپنی جگہ جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ اب ذرا وہ الفاظ بھی ملاحظہ کیجیے جو گنوری صاحب نے اپنے پہلے مضمون مطبوعہ "رہنمائے تعلیم" صفحہ ۹، سطر ۱۳ بابت ماہ فروری ۱۹۴۲ء میں استعمال کئے ہیں:-

"پس ان (یعنی حضرتِ سائل دہلوی جنہوں نے بپاسِ خاطر ایک شعر لطور سند لکھ کر بھیجا) کی بات کے آگے داغ کے کسی سرکش سے سرکش فنا کردہ گردیدہ شاگرد کی مجال نہیں کہ سرتابی کر سکے۔ اور اگر کرے تو اپنے جہلِ مرکب کا ثبوت دیتا ہے اور اپنی دیوانگی کا اعلان کرتا ہے۔"

خدائے بزرگ و برتر کی قسم میں جب بھی ان سطور کو پڑھتا ہوں میرے جسم میں آگ سی لگ جاتی ہے اور غم و غصہ کی انتہا نہیں رہتی، جی چاہتا ہے کہ راقم سطور سے بدترین قسم کا انتقام لوں۔ لیکن مجبور ہوں ہماری سوسائٹی کے قوانین ہی کچھ ایسے ہیں کہ انسان آزادی کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتا۔ گنوری صاحب کے یہ جملے فروری ۱۹۴۲ء کے "رہنمائے تعلیم" میں شائع ہوئے ہیں اور اس سے تقریباً تین ماہ قبل میں نومبر ۱۹۴۱ء کے "شاعر" میں وحیدالعصر حضرت بیخود دہلوی۔ حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی اور ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی مدظلہم کی آرائے گرامی شائع کر چکا تھا، ان تینوں بزرگوں نے "شردعات" کو غلط اور جہلا کا محاورہ قرار دیا تھا۔ لہٰذا گنوری صاحب نے براہِ راست ان مقدس اور محترم ہستیوں کو "جہلِ مرکب" اور "دیوانگی" کا حامل قرار دیا۔

اب حضرت نوح نے اپنے خیال میں تبدیلی کر دی ہے ——— اعجاز

افسوس صد افسوس میں ان سطور کو قلمبند کرتے ہوئے میری رگ رگ میں شعلے بھڑک رہے ہیں لیکن وہ یہی خیال مانع ہے کہ اگر میں نے زبان کھولی تو میرا جوابی مضمون "رہنمائے تعلیم" میں شائع نہ ہوسکے گا اس لئے صبر و ضبط سے کام لیکر خاموشی اختیار کر رہا ہوں۔ عم محترم حضرت مولانا احسن مارہروی مرحوم و مغفور کی روح اُس وقت سے جب سے اُن کے شاگرد جناب آبر نے مرحوم کے تین عزیز ترین بھائیوں کی اس طرح توہین کی ہے کتنی اضطراری کیفیت محسوس کر رہی ہوگی ——— !!

میں نے "شروعات" کے ذیل میں شمس العلماء حضرت علامہ تاجور نجیب آبادی سے بھی استفسار کیا تھا۔ آں محترم نے ایک تفصیلی جواب مرحمت فرمایا وہ جواب اور میرا استفسار چونکہ موصوف نے خود ہی مئی ۱۹۴۲ء کے "شاہکار" میں شائع فرما دیا ہے اس لئے یہاں مکمل جواب کا نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا، چند ابتدائی حصے پیش کرتا ہوں:-

(۱) یہ لفظ غلط العام نہیں، الغلط العام ہے یعنی ترکیب اضافی نہیں توصیفی ہے یہ الفاظِ دیگر مروجہ غلطی اُسی صورت میں فصیح سمجھی جائے گی جبکہ خاصانِ ادب میں بھی اس کا استعمال عام ہو جائے۔ اس لئے مستند اساتذۂ سخن اور فصحا کے کلام کی کثرتِ استعمال کسی غلط لفظ کی فصاحت کے لئے ضروری شرط ہے۔

(۲) شروعات کا لفظ محتاط ادبا و شعرا کے کلام میں میری نگاہ سے تو نہیں گذرا مگر میری نگاہ کی وسعتیں محدود ہیں اس لئے میرا قیاس قیاسِ استقرائی نہیں کہا جا سکتا۔

(۳) یہ لفظ میری گفتگو میں تو غالباً آتا ہے مگر اپنی نظم و نثر میں اس کے استعمال سے اجتناب کرتا ہوں۔"

اس کے بعد علامہ محترم نے تحریر فرمایا ہے کہ شروعات میں یہ اہلیت ضرور ہے کہ اسے فصحا اپنے کلام میں جگہ دیں اور وہ قابلِ التفات ہے۔ بس اس کے بعد اسے اپنی تحریر میں استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔

موصوف نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ممکن ہے کہ وہ دس پانچ سال میں انفرادی طور پر رہینِ عمل ہو جائیں اور فصحا "شروعات" کو غلط العام کے ذیل میں لے لیں۔ لیکن ابتک کی بحث اور آراء سے یہ اچھی طرح واضح ہو گیا کہ کوئی مستند شاعر اور محقق اسے فصیح سمجھتا ہے اور نہ اپنے کلام میں کبھی اس کا استعمال جائز رکھا ——— میں نے اکتوبر کے شاعر میں جو کچھ عرض کیا تھا اس کا بھی مقصد یہی تھا کہ "شروعات" نہ کسی لغت میں ملتا ہے اور نہ اسے مستند ادبا اور شعرا اپنی تحریروں میں استعمال کرتے ہیں۔" علامہ تاجور کی تحریر سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شروعات غلط العام کے تحت میں نہیں آتا اور نہ موصوف نے کبھی اپنے کلام میں اس کا استعمال کیا ——— لیکن ہمارے گنوری صاحب حضرت تاجور کی رائے کو بھی کھینچ تان کر اپنی تائید میں کر لینگے ——— خیر

"چمن میں ابھی دیدہ ور اور بھی ہیں"

المختصر تمام ہندوستان کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ "شروعات" نہ غلط العام فصیح کے تحت میں آتا ہے اور نہ اسے محققین و فصحا قابلِ قبول و استعمال سمجھتے ہیں۔ اس لئے گنوری صاحب کا یہ جملہ "اب اعجاز صاحب کو اپنی ضد چھوڑ کر اپنی تغلیط کا اقرار ذریعۂ "شاعر" کر لینا چاہئے اس سے اُنکی شانِ ادارت کو ٹھیس نہ لگے گی" میں "اعجاز" کی جگہ "آبر" - "تغلیط" کی جگہ "غلطی" "شاعر" کی جگہ "رہنمائے تعلیم" اور "ادارت" کی جگہ "ادبیت" بناکر انھیں کی طرف واپس کرتا ہوں۔

جو مرگِ دوست پر کل خندہ زن تھے دلئے محرومی
انھیں آج ایک آنسو پونچھنے والا نہیں ملتا
(اعجاز)

رہا ادارہ کا مضمون "رسالہ شاعر آگرہ کے ایڈیٹر کی جنگجویانہ ذہنیت" [1]

تو اس سلسلے میں میں وہی عرض کرنا چاہتا ہوں جو ایک ذاتی مکتوب میں جناب جوش ملسیانی یا اُن کو لکھ چکا ہوں۔ یعنی ۴، یا ۵ سال کی مدت میں جب سے "شاعر" کی ادارت میرے سپرد کی گئی ہے۔ "شاعر" میں برائے نام بھی کوئی ایسا مضمون شائع نہیں ہوا جس کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ رہنمائے تعلیم سے ہو۔ ہاں میرے زمانہ ادارت سے پہلے اگر اس میں رہنمائے تعلیم کے مضامین کے خلاف مضامین شائع ہوئے ہوں اور پرچہ نہ بھیجا گیا ہو تو اسکی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہو سکتی۔ نور صاحب زخمی نے چونکہ وہ مضمون جو "شاعر" میں شائع ہوا ہے "رہنمائے تعلیم" کو بھی اشاعت کے لئے بھیجا تھا اس لئے رسالہ بھیجنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ رہا یہ سوال کہ میری شائستگی اور تربیت میں میرے والد بزرگوار کی غفلت یا کوتاہی کی" تو اس کا جواب مجھ سے بہتر وہ بزرگ، دوست اور عزیز دے سکتے ہیں جنکے دل صاف اور عصبیت سے پاک ہیں، یا پھر مستقبل کا مورخ بتائیگا۔ ادارہ کو یہ خوف ہے کہ میں اس کے مضمون کا جواب "خلوص" میں دونگا تو وہ اس سے بالکل مطمئن رہے میں ایک حرف بھی جواباً نہ لکھونگا۔ ادارہ کے مضمون کی بے لاگ تحریر کے علاوہ ——— ہے خوشنے کہ گذری ازل سے نطرت میں

شکایتوں کی جگہ میرے ظرف دل میں نہیں
(اعجاز)

اعجاز صدیقی

---

[1] "شروعات" کی بحث سے بالکل الگ اور میرے خلاف ایک مضمون لکھا ہے اور وہ صرف اس جرم میں کہ "شاعر" تبادلہ میں نہ جا سکا اور نہ "رہنمائے تعلیم" کا نکالا گیا۔ جب پہلی بار "رہنمائے تعلیم" میں شروعات کے متعلق مضمون شائع ہوا

مسلسل:-

موحدِ اعظم اور مفتی اعظم

مفتی الراندیر وافتار الکفر بالشعر

از ـــ حضرت مولانا مولوی سلیم الدین صاحب جالب مظاہری ہسرامی

(قسط ہفتم)

"موحد اعظم" پر علمائے حق اور فضلائے عصر کی مزید تازہ اور گرانقدر رائیں

"شاعر" کی گذشتہ اشاعتوں میں ستائیس جلیل القدر علمائے حق کی آراء پیش کی جاچکی ہیں سب نے حضرت علامہ سیماب کی نظم کو بے عیب طنزیہ شاعری کا شاہکار ـــــ وحدت پرستی کا آئینہ دار بے ریا عبادت کا ایک پیغام اور **ابلیس لعین** کے کردار اور اس کی لغزش پر مسلمانوں میں صحیح احساس ذوقِ عبادت پیدا کرنے والا دریں مونڈوں قرار دیا ہے۔ حضرت مولانا جالب مظاہری ہسرامی کے سلسلہ مضمون سے پہلے پھر چند رائیں شائع کی جارہی ہیں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے متعدد رائیں روک لی گئی ہیں جو آئندہ اشاعتوں میں پیش کی جائیں گی ـــــ **ادارہ**

حضرت مولانا عبدالستار صاحب چشتی کرلوی ("مولوی عالم" و "مولوی فاضل") صدر مدرس مدرسۂ فاروقیہ مسجد جمیل بمبئی

میں نے حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی کی نظم بعنوان "موحد اعظم" متعدد مرتبہ پڑھی ہے۔ نظم مذکور کا مضمون بہت بلند ہے جو ادبی و مذہبی رنگ میں پیش کیا گیا ہے مگر افسوس کہ مفتی راندیر نے اپنی دقیانوسی سمجھ کی بنا پر مولانا سیماب جیسے جلیل القدر شاعرِ اسلام پر کفر کی بوچھار کردی۔

موصوف کی نظم پر کفر کا فتویٰ دینا نہ صرف ایک خالص مسلمان کو کافر بنانا ہے بلکہ ادبی دنیا پر بھی ایک ضرب کاری ہے۔

مفتی صاحب نے ایک ہی حماقت پر اکتفا نہیں کی بلکہ اشعار کو بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ علم عروض سے قطعی نابلد ہیں اور اعتبارات شاعری سے بالکل ناواقف۔ بالفاظِ دیگر اس حماقت پر حماقت کو یوں سمجھئے کہ "کریلا اور نیم چڑھا" یا یوں سمجھئے "کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی چال بھول گیا۔"

قطع نظر اس بات سے کہ مولانا کے اشعار ادبی حیثیت سے نہایت اعلیٰ ہیں۔ اگر صوفیانہ نظریہ سے بھی دیکھا جائے تو ایک ایک شعر میں تصوف کی روح موجزن نظر آئیگی۔ بطورِ نمونہ ایک شعر درج ہے ؎

تو کہتا ہے کہ شیطاں باعثِ غفلت ہے یزداں سے
میں کہتا ہوں کہ ہے تمیزِ یزداں صرف شیطاں سے

لیکن ہمارے مفتی صاحب کو ان چیزوں سے کیا واسطہ کہ ایک شاعر اپنا کلام کس طرح پیش کرتا ہے اور ایک ادیب اپنا ما فی الضمیر کس طرح ظاہر کرتا ہے۔

ان متقشف مفتیوں کا تو کام ہی یہ ہے کہ کافروں کی تعداد میں اضافہ کرتے رہیں اور مآل پر غور نہیں کرتے کہ کفر کا اعادہ خود کفر کی طرف ہوتا ہے۔

مفتی صاحب نے جتنی سعی ایک خالص اسلام کے متوالے کو کافر بنانے کے لئے کی ہے۔ کاش ایک کافر کو مسلمان بنانے کے لئے کرتے!

۳ جولائی ۱۹۶۲ء

عبدالستار کرلوی

حضرت مولانا ابوالحسن جلال پوری فیض آبادی مدرس اول مدرسۂ فیض العلوم و مفتی شہر سگولی (چمپارن)

مجھ سے نظم موحد اعظم کے مصنف کے کفر و اسلام کے بارے میں دریافت کیا گیا اور وہ نظم اور مصنف صاحب کی وہ تحریر جو انھوں نے اپنے ذاتی خط میں مولانا جالب مظاہری ہمسری کو لکھی ہے پیش کی گئی۔ اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ناظم صاحب نے شاعرانہ انداز بیان میں طنزیہ اشعار کہے ہیں اور مسلمانوں کو ریاکاری اور بے روح عبادت سے غیرت دلائی ہے۔ اس نظم سے ہرگز یہ منشا نکلا نہیں کہ شیطان کی تعریف اور حمایت کی جائے اور قرآنی بیان کو جھٹلایا جائے۔ مقصد مسلمانوں کی عبادت میں خلوص پیدا کرانا اور ریاکاری سے باز رکھنا ہے جیسا کہ انھوں نے اپنے خط میں اپنی نیت ظاہر کی ہے۔ میرے نزدیک ناظم صاحب پر کفر کا فتویٰ دینا مناسب نہیں۔

حضرت مولوی محمد اظہر الحق صاحب بی۔ اے۔ ہیڈ مولوی مدرسۂ روضۃ العلوم پکھی (چمپارن)

سیماب صاحب اکبرآبادی کے "موحد اعظم" کا میں نے بغور مطالعہ کیا۔ سیماب صاحب نے اس نظم میں ایک عجیب انداز میں خدائے بزرگ و برتر کی پرستش کا نمونہ پیش کیا ہے۔ ہر عقل سلیم رکھنے والا شخص نظم مذکور کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے کہ ناظم کا مقصد ریاکاروں کے لئے درس عبرت اور معبود حقیقی کی پرستش کے سوا دوسرا نہیں ہے مجھے تعجب ہے کہ مفتی صاحب نے کس جرأت پر سیماب صاحب جیسے پکے مسلمان پر کفر کا فتویٰ عائد کیا ہے میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سیماب صاحب پر کفر کا فتویٰ سراسر جذبہ نفسانیت پر مبنی ہے۔ اللہ جل شانہ ایسے لوگوں کو ہدایت دے جو کسی دیندار مسلمان کو کافر بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔

حضرت مولانا مولوی محمد یٰسین صاحب آداپور (چمپارن)

میں نے نظم موحد اعظم کا مطالعہ کیا۔ شاعر کے تخیلات سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر نے تبلیغی نقطۂ نگاہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نظم کو مرتب کیا ہے۔ میرے خیال میں مفتی صاحب نے تبلیغی نقطۂ نگاہ سے پہلو تہی کرتے ہوئے نظم مذکور کے بعض بعض مصرعوں کو ظاہری معنی کا جامہ پہنا کر ناظم پر کفر کا فتویٰ عائد کیا ہے جو مفتی صاحب کی کم سمجھی کی بین دلیل ہے۔ میرے نزدیک قرآن و حدیث کے اصول کے مطابق ہرگز موحد اعظم کا ناظم کافر نہیں ہو سکتا ہے جبکہ خود ناظم نے اپنے کسی خط میں تردیدی بیان دے کر اپنے عقائد کا پورا ثبوت دیا ہے۔

پندرھواں شعر ۔ کبھی یہ بات آئی تیری تخیل کہن میں بھی
کہ جو قوت ہے یزداں میں وہی ہے اہرمن میں بھی

مہدی حسن صاحب کا اس شعر پر اعتراض یہ ہے کہ "دوسرے مصرع میں خدا اور شیطان کی قوت کو یکساں قرار دیا گیا ہے جس میں کسی موٹی سمجھ والے کو بھی شک نہیں ہو سکتا، اسی کا نام ہمسری اور برابری ہے۔" لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ مہدی حسن صاحب! بھلا یہ کسی مسلمان کا عقیدہ ہو سکتا ہے کہ یزداں اور اہرمن مساوی ہیں؟ شعر مذکور میں "یزداں" سے مراد خدا ہے اور "اہرمن" سے مراد شیطان ——— ہاں مجوسی دو خدا مانتے ہیں ایک خالق خیر "یزداں" اور دوسرا خالق شر "اہرمن" اس شعر میں نسبت تضاد ہے۔ یعنی جس طرح خدا جل شانہ خیر و ہدایت کو چاہتا ہے۔ اسی طرح شیطان شر و ضلالت کو چاہتا ہے۔

اللہ ولی الذین آمنوا یخرجہم من الظلمات الی النور والذین کفروا اولیٰئہم الطاغوت یخرجونہم من النور الی الظلمات الآیۃ۔ الشیطن یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء واللہ یعدکم مغفرۃ منہ وفضلا۔ خدا کی طاقت بالذات ہے اور شیطان کی طاقت بالعرض۔ یہی وہ فرق و امتیاز ہے۔ جہاں آپ کی نظر تکفیر اثر نہ پہنچ سکی ورنہ اس بے بنیاد اعتراض کی نوبت نہ آتی۔ کوئی اجہل بھی نہیں کہہ سکتا کہ اشعار میں قیود کا منضبط کر دینا بھی ضروری ہے بلکہ اشعار قرائن سے سمجھے جاتے ہیں لہذا آپ کا یہ کہنا کہ "یہاں بالذات اور بالعرض کی قید سے آزاد ہو کر علی الاطلاق شیطان کو یزداں کی ضد اور اپنی قوتوں کے ساتھ قیامت تک اس کا زندہ رہنا تسلیم ہے۔" غلط اور بالکل غلط بلکہ بہتان عظیم ہے۔ نیز قیود کے عدم ذکر سے اسکی نفی نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی موقع پر کوئی یہ کہے کہ خدائے تعالیٰ بڑا رحمان و رحیم ہے تو کیا آپ یہ اعتراض فرما دیں گے کہ جبار و قہار کیوں نہ کہا یا عدم ذکر سے اس کی جباریت اور قہاریت کی نفی ہو جائے گی؟ مثلاً یہ شعر جو تذکرۂ غوثیہ سے نقل کیا جا چکا ہے ؎

در مذہب عاشقان یک رنگ
ابلیس و محمدؐ ست ہم سنگ

دیکھئے! ظاہراً تو اس شعر میں خط کشیدہ جملے سے برابری کا اظہار ہو رہا ہے اور کوئی قید و تعریض موجود نہیں بلکہ علی الاطلاق ہے۔ آپ تو اپنے جنون تکفیر سے مجبور ہو کر شاعر پر کفر عائد کر دیں گے کہ اس میں بھی کوئی قید نہیں۔ لیکن یہاں بھی آپ کی سمجھ ہی کا قصور ہوگا نہ تو شعر کا یہ مطلب، اور نہ شاعر کا یہ مقصد بلکہ خدائے تعالیٰ

کی دو شانیں بیان کرتی ہیں۔ ایک جمالی، اور ایک جلالی۔ اوّل کے مظہر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور دوسری کا مظہر ابلیس ہے ؎

واقف وہ کیا ہو لطفِ آزادیٔ نظر سے
جو عمر بھر نہ نکلا زندانِ بام و در سے (علامہ سیماب)

سولھواں شعر ؎

کبھی پہنچا ہے تو شیطاں کی حدِ محبت تک
جو اپنی قوتوں کے ساتھ زندہ ہے قیامت تک

مہدی حسن صاحب نے یہاں بھی اپنے غلط نظریے کے مطابق خطاب کو جنسِ بشر پر محمول کر کے ان ہی غلط اعتراضات کی بھرمار کر دی ہے جو ابتدائے مضمون سے آپ کی روش رہی ہے۔ میرا جواب بھی وہی ہے جو پہلے مندرجۂ ذیل شعر کے تحت لکھ چکا ہوں۔ "بشر سمجھا نہ اب تک الخ"

اور جو کچھ آپ نے اس کے جذبۂ محبت کے متعلق کہا اس کی ہے اس کا بھی جواب میں نے اس شعر "عزازیل اور خدا میں واسطہ الخ"

اور اس کے قبل کافی شرح و بسط کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔ ہاں آپ نے جو اس شعر کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ "جو شیطان بن چکا ہو وہی اُسکی حدِ محبت تک پہنچ سکتا ہے" اس کے متعلق میں یہی کہوں گا کہ آپ کو شیطان نے کافر گری پر اس طرح اکسایا ہے کہ آپ کی نظر حدودِ تکفیر سے آگے بڑھتی ہی نہیں اس لئے اس جملہ کے صحیح مصداق آپ ہی ہو سکتے ہیں ؎

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

اب رہا دوسرے مصرع پر آپ کا یہ اعتراض کہ "کتنا کُھلا ہوا اقرار ہے بلکہ دعویٰ ہے کہ شیطان اپنی قوتوں کے ساتھ قیامت تک زندہ ہے یہ قوتیں کسی کی عطیہ نہیں بلکہ ذاتی اور اصلی ہیں" آپ کی اس کج بحثی کی داد کس طرح دی جائے افسوس! جو سمجھا اُلٹا ہی سمجھا اور اس اُلٹی سمجھ کے ماتحت ابو زید سروجی کا وعظ شروع کر دیا۔ بھلا یہ کس مسلمان کا عقیدہ ہو سکتا ہے کہ شیطان میں جو طاقت ہے وہ ذاتی اور اصلی ہے عام اور عالم کی تمام اشیاء اور جن و انس اور شیاطین میں جو قوتیں ہیں وہ ان کی ذاتی اور اصلی نہیں بلکہ سب اللہ تبارک و تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں کسی جنس کی طرف جو قوت نسبت کی جاتی ہے وہ مجازاً ہوتی ہے اور اسی نظریہ کے ماتحت اس شعر میں بھی شیطان کی قوت کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ہے ؎

تری نگاہ فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ
ترا گنہ کہ نخیل بلند کا ہے گناہ (اقبال)

آپ کے نظریہ کے مطابق قرآن مجید کی اس آیت مالکِ یوم الدین کا کیا مفہوم ہوگا؟ کیا اللہ تعالیٰ کل امور کا جمیع ایام اور اوقات میں مالک نہیں؟ صاحب "خازن" اس آیت کی تفسیر اس طرح فرماتے ہیں "فان قلت لم خص یوم الدین بالذکر مع کونہ مالکا للایام کلھا؟ اگر تم کہو کہ جب اللہ تعالیٰ تمام ایام کا مالک ہے تو پھر یوم دین کی تخصیص کیوں کی گئی؟ قلت لان ملک الاملاک یومئذ زائل فلا ملک ولا امر الا للہ تعالیٰ" کما قال تعالیٰ الملک یومئذ الحق للرحمن وقال لمن الملک الیوم للہ الواحد القہار وقولیسمی فی دار الدنیا آحاد الناس بالملک وذلک علی المجاز لا علی الحقیقۃ۔ تو میں کہوں گا کہ آج کے دن اشیائے مملوکہ کی ملکیت زائل ہے نہ کسی کا آج حکم ہے اور نہ کسی کی آج کوئی ملکیت جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ حقیقی سلطنت اس دن رحمٰن کی ہوگی (اللہ تعالیٰ فرمائیگا) کہ کس کی بادشاہی ہے آج (پھر خود ہی جواب دے گا) کہ اکیلے اللہ کی جو بڑا زبردست ہے۔ دُنیا میں جو لوگوں کو کسی چیز کا مالک کہا جاتا ہے وہ مجازاً نہ کہ حقیقتاً اور اسی طرح یہ آیت ولہ الملک یوم ینفخ فی الصور۔ اور اسی کی حکومت ہے جس دن صور پھونکا جائیگا ان آیات قرآنی نے جس طرح یہ بتایا کہ آج کے دن خدائے تعالیٰ ہی کی سلطنت ہے اسی کا امر ہے اسی طرح یہ بھی بتایا کہ آج کے پہلے جو ان چیزوں کی نسبت دوسروں کی طرف کی جاتی تھی وہ مجازاً تھی حقیقتاً نہیں۔ اور اس انتساب میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر آپ کو آیاتِ قرآنی پر عبور ہوتا تو مولانا سیماب پر اعتراض کر کے ان آیات کو اپنا ہدفِ اعتراض نہ بناتے ـــــــ العیاذ باللہ! لیکن آپ کر ہی کیا سکتے ہیں کہ آپ کی "جرارتِ بیباکانہ" آپ کو اوندھے منہ ایسے ہی تنگ و تاریک گڑھے میں گرائیگی! آخر استحواذِ شیطانی کا اور مآل ہی کیا ہوگا! خود باری تعالیٰ عز اسمہ نے اس آیت واستفزز من استطعت منہم بصوتک واجلب علیہم بخیلک ورجلک وشارکہم فی الاموال والاولاد وعدہم وما یعدہم الشیطن الا غرورا (بنی اسرائیل) اور بہکالے ان میں سے جن کو تو بہکا سکے اپنی آواز سے اور کھینچ لا ان پر اپنے سوار اور پیادے اور ان سے اپنا ساجھا لگا مال اور اولاد میں اور ان سے وعدے کر اور کچھ نہیں وعدہ کرتا شیطان مگر دغابازی میں **صوت** و **خیل** اور **رجل** کی شیطان کی طرف نسبت

کی ہے حالانکہ یہ تمام چیزیں اس کو اللہ تعالیٰ ہی نے عطا کی ہیں اور قیامت تک ہی کو ان چیزوں سے جس طرح گمراہ کرنے بن پڑے گمراہ کرنے کی مہلت دی ہے۔ جو اعتراض آپ کا مولانا کے شعر پر عائد ہی اس آیت کریمہ پر بھی عائد ہو رہا ہے۔ اب آپ لامحالہ یہی جواب دیں گے کہ اس آیت میں ان چیزوں کی نسبت شیطان کی طرف مجازاً ہے۔ یعنی بالعرض بالذات نہیں، تو میرا بھی جواب یہی ہوگا کہ حضرت مولانا سیماب کے شعر میں بھی قوت کی نسبت شیطان کی طرف مجازاً ہے۔ حقیقتاً نہیں

ستر ھواں شعر

خدا کے ساتھ اعوذ میں بھی استحکام ہے اُس کا
کلام اللہ میں سب سے زیادہ نام ہے اُس کا

اس شعر کے متعلق ارشاد عالی ہے:۔ "اعوذ" خدا کے ساتھ غلط ہے اعوذ کے ہمزہ پہ کھڑا زبر ہے۔ عربی میں اور قرآن میں اَعوذ پڑے زبر کے ساتھ ہے اس طرح جاہل پڑھا کرتے ہیں"

لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم! یہاں بھی مہدی حسن صاحب نے اپنی جبلی عادت کے موافق کتابت کی غلطی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جاہلانہ اعتراض اور پھر جاہلانہ انداز میں کر کے اپنے کٹھ ملا ہونے کا پورا پورا ثبوت پیش کیا ہے۔ مجھے اس جہل اعتراض پر تعجب ہوتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ معوذتین جن سے مسلمان کا بچہ بچہ واقف ہے اور جو کثیر التلاوۃ ہے اس میں ایسی صریح غلطی کا ارتکاب ایک شخص سے ہونا بعید ہے مگر اس کو کیا جائے کہ مہدی حسن کو علاوہ ایسے اوچھے ہتھیاروں کے اور کچھ ہاتھ نہیں لگا۔ اسی لئے ایسے موقع پر آپ کی گرفت سخت ہوتی ہے اور صفحہ کا صفحہ سیاہ کر ڈالا ہے۔ مہدی حسن صاحب تو قرآن مجید کی تلاوت غالباً روز کرتے ہونگے۔ خدا رکھے آپ "عالم دین" ہیں۔ تلاوت کے ثواب سے کما حقہٗ واقف ہونگے۔ مگر باوجود اس کے آیت ما منعک ان تسجد کو "مدینہ" ۵ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں پانچویں کالم میں الا تسجد لکھ گئے ہیں اسے کہتے ہیں:۔

اے ہنر ہا نہادہ بر کف دست
عیبہا را گرفتہ زیر بغل

دراصل شعر اس طرح ہے:۔

خدا کے ساتھ اعوذ میں بھی استحکام ہے اس کا کلام اللہ میں سب سے زیادہ الخ

"بھی" میں جو زور و ترقی کا پہلو موجود ہے وہ اس کند ہٴ ناتراش اصلاح میں مفقود ہے۔ کما لا یخفیٰ علیٰ من لہٗ طبع سلیم۔ مہدی حسن صاحب! شعر گوئی سے

زیادہ مشکل شعر فہمی ہے جس جوہر سے آپ کے دماغ کو قدرت نے محروم رکھا ہے پھر اس محرومی کے ساتھ آپ کی جو تنقید ہوگی وہ ایسے ہی کرشمے کی آئینہ دار ہوگی دوسرے مصرع کے متعلق ارشاد ہوتا ہے "کہ یہ خلاف واقعہ ہے کیا کبھی ایسی نوبت آئی ہے کہ قرآن پاک کے تیس پاروں میں شیطان کے نام کی گنتی کی ہو اور سب سے زیادہ تعداد میں شیطان کا نام نکلا ہو الخ

مہدی حسن صاحب اس جگہ بھی اسی ترکیب حصری وغیرہ وغیرہ کی حماقت کے شکار ہوتے ہیں اور شعر میں جو "سب سے زیادہ" کا ٹکڑا ہے اس میں خدا اور رسول اکرم صلعم اور انبیاء علیہم السّلام کو شامل کر کے خود لوچ کی اور الزام مولانا سیماب پر رکھدیا۔ مولانا سیماب نے درست فرمایا:۔

میں اپنے نشیمن کی کیا خیر مانگوں
مرے سامنے آشیاں اور بھی ہیں

حالانکہ شعر میں "سب سے زیادہ" سے مراد یہ ہے کہ ملائکہ کے اعتبار سے سب سے زیادہ قرآن مجید میں اس کا نام ہے اور اس سے مقصود بیان امر واقعی ہے۔

دشمن عقل! تجھے اتنا تو لحاظ ہوتا:۔ ع

کہ آدمی جو کہے بات سوچ کر تو کہے

(باقی۔باقی)

جالب سہرامی

صحت نامہ مضمون "موحد اعظم اور مفتی اعظم" مطبوعہ جولائی ۱۹۴۲ء

صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح
۵۲	دوم	۱۹	سورۂ بقر	سورۂ بقرہ
۵۳	اول	۳	علی بالید	عمل بالید
۵۴	″	۲۰	اسی نے	اُس نے
″	″	۳۱	سورۂ انفال	سورۂ انفال
″	دوم	۲۳	"سمیات"	مسمیات
″	″	۲۲	وعدی منہ اللام	وحذف منہ اللام
۵۶	اول	۶	التخفیف	للتخفیف
″	″	۸	اہل مسجد الجماع	اہل مسجد الجامع المسجد الجامع

صحت نامہ مضمون "موحد اعظم اور مفتی اعظم" مطبوعہ اگست ۱۹۴۲ء

صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح
۵۱	دوم	۱	ہیہات ثم ہیہات	ہیہات ثم ہیہات

جالب سہرامی

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح :- "گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"

ابتدائی چند غزلوں میں قافیہ بدلا ہوا ہے اور غالباً یہ تبدیلی شعراء سے غیر ارادی طور پر ہوئی ہوگی۔ اسی لئے ان غزلوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اعجاز صدیقی

محسن ادب حضرت نشتر ہشتگامی

چمن میں وہ بے نقاب آ رہا ہے ستاروں میں اک ماہتاب آ رہا ہے
نہ خوش ہو کہ عہدِ شباب آ رہا ہے بڑھاپا بھی تو ہم رکاب آ رہا ہے
نیا رنگ تصویرِ دنیا میں بھرنے "گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"
جو آیا تو کمبخت دو دن نہ ٹھہرا بہت شور و غل تھا شباب آ رہا ہے
تصدق تری مست نظروں کے ساقی مجھے لطفِ جامِ شراب آ رہا ہے
محبت میں جو رات دن دیکھتا تھا مجھے یاد اب تک وہ خواب آ رہا ہے
جسے دیکھئے سیرِ ہستی کو نشتر عدم سے بچشمِ پُر آب آ رہا ہے

حضرت مولانا آلم مظفر نگری

شباب آ رہا ہے شباب آ رہا ہے "گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"
ہے بدست نورِ سحر کی روانی کہ دریائے صہبائے ناب آ رہا ہے
یہ ہلکا سا بادل یہ دھندلا سا تارا لبِ نہر کوئی حباب آ رہا ہے
اٹھاتے ہیں چہرے سے رہ رہ کے پردا کچھ ان کو بھی لطفِ حجاب آ رہا ہے
کسی میں لہو، لختِ دل ہے کسی میں ہر اک اشکِ غم کامیاب آ رہا ہے
سوا میرے ان کا نہ تھا اور کوئی مجھے یاد اب تک وہ خواب آ رہا ہے
کہیں آج پی لی آلم نے بھی شاید پریشان و مستِ خراب آ رہا ہے

حضرت رونق دکنی (جمشید پور)

"گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے" کہ پیغامِ دورِ خراب آ رہا ہے
نیا ایک طوفانِ آفت بداماں بدیر آ رہا ہے شتاب آ رہا ہے
ہیں آبادیاں شامِ غم کا نمونہ کہ بربادیوں پر شباب آ رہا ہے
نقاب اٹھ رہا ہے جہانداریوں سے جہانبانیوں پر حجاب آ رہا ہے
ہے مقصود شیخ و برہمن کا واحد تعصب مگر سدِ باب آ رہا ہے
ستم رانیاں ہیں شریکِ حکومت جہانِ الم ہم رکاب آ رہا ہے
کرم کیوں میں تکلیف اور بے سکونی کہوں کیوں زمانہ خراب آ رہا ہے

جناب مجاز لودھی اکبرآبادی

دما دم پیامِ شباب آ رہا ہے کہ اک مستقل انقلاب آ رہا ہے
مری گمرہی عینِ منزل رسی ہے زمانہ مرے ہم رکاب آ رہا ہے
بدلتا ہوا ذہنِ سرمایہ داری نئے رنگ سے انقلاب آ رہا ہے
وطن کی مرے عظمتیں اب نہ پوچھو نئے سر سے اس پر شباب آ رہا ہے
غلامی کہاں اینڈتی پھر رہی ہے سرِ رہگذر انقلاب آ رہا ہے
جلو میں لئے اک تباہی کا طوفاں "گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"
مجاز ان سے کہہ دو جو دل مضطرب ہیں کہ اب چارۂ اضطراب آ رہا ہے

جناب رفیق صدیقی اکبرآبادی

زمانہ پہ تازہ شباب آ رہا ہے جوانی نہیں انقلاب آ رہا ہے
نئے فتنوں کے ہم رکاب آ رہا ہے قیامت کا نائب شباب آ رہا ہے
مسلط ہیں دنیا پہ خونی گھٹائیں "گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"
زمانے کے تخریب زادوں سے کہہ دو زمانہ بہت ہی خراب آ رہا ہے
سنا ہے کہ مغرب سے مشرق کی جانب نئے روپ میں اضطراب آ رہا ہے
جوانوں نے انگڑائیاں لی ہیں تازہ وطن پر مرے پھر شباب آ رہا ہے
رفیق اب غلامی نہ باقی رہے گی غلامی میں اب انقلاب آ رہا ہے

جناب نازک احسنی شکوہ آبادی

انہیں سائے سے بھی حجاب آ رہا ہے یہ در پردہ گویا شباب آ رہا ہے
وہ مستِ مئے حسن یوں ہے خراماں کہ جیسے مجسم شباب آ رہا ہے
یہ مخمور آنکھیں یہ مستانہ چالیں زمانے پہ کیفِ شباب آ رہا ہے
وہ اب اور برپا قیامت کریں گے کہ ہمراہِ شوخی شباب آ رہا ہے
وہ نامِ خدا کیا جواں ہو گئے ہیں ہر اک شے پہ نازک شباب آ رہا ہے

حضرت شاعر نہٹوری ایڈووکیٹ سوا پیرا

وہ ہر سو مجھے اب نظر آ رہا ہے تعین کا جھگڑا مٹا جا رہا ہے
ادھر عشق نظروں کو گرما رہا ہے ادھر حسن پردوں میں شرما رہا ہے

وطن پر جو اپنے مٹا جا رہا ہے / فنا میں وہ لطفِ بقا پا رہا ہے
اٹھے گا کوئی سرمایہ داری کا تختہ / "مگر جتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"
وطن کی وہ گتھی سلجھ جائے کیونکر / زمانہ جسے روز الجھا رہا ہے
بہر طور اہلِ وطن کا ہارے / تمدن بدلتا چلا جا رہا ہے
قدامت کی کایا پلٹ ہوکے شاعر / زمانہ پہ عہدِ شباب آ رہا ہے

حضرت صابر اکبر آبادی بی۔اے

ستم میں کرم کا مزہ آ رہا ہے / زمانہ ستم پر مٹا جا رہا ہے
خدا ہی خدائی سے ہے اپنی برہم / مجھے اور ہی کچھ نظر آ رہا ہے
نظر ہے کسی پر نشانہ کسی پر / زمانہ بھی کیا کیا ستم ڈھا رہا ہے
ہر اک سر میں سودا ہے غارتگری کا / ہر اک دل فریبی نظر آ رہا ہے
رواں آب جو میں لہو ہی لہو ہے / بنا رنگ انساں کا خوں لا رہا ہے
جسے دیکھئے بھر کے آنکھوں میں آنسو / فسانے مظالم کے دہرا رہا ہے
ہوئے ہیں جو خوگر جفا کے تو صابر / جفا میں بھی لطفِ وفا آ رہا ہے

حضرت قہر تقوی جے پوری

جہاں وہ بہارِ تمنا رہا ہے / وہیں میرا ذوقِ تماشا رہا ہے
نہ قائم کوئی نقشِ زیبا رہا ہے / نگاہوں کو دھوکا ہی دھوکا رہا ہے
زمانہ بھلا کب کسی کا رہا ہے / تمہارا رہیگا، نہ میرا رہا ہے
مرے ایمنِ قلب کی وادیوں میں / ازل سے وہ تکلیف فرما رہا ہے
مرے سامنے تجھ کو اپنا نہ سمجھیں / دو عالم سے برسوں یہ جھگڑا رہا ہے
نہ پہلے سے رنگین منظر رہے ہیں / نہ پہلا سا ذوقِ تماشا رہا ہے
جبیں قہر کی کیوں نہ ہوتی منور / ترے در پہ برسوں جبیں سا رہا ہے

حضرت عزیز اختر وارثی سرحدی (کوہاٹ)

فضائے چمن پر دھواں چھا رہا ہے / نشیمن ہوا میں اڑا جا رہا ہے
ہر اک گام پر آج شمعیں جلا دو / اندھیرا امڈتا چلا آ رہا ہے
مسافر کی نظروں سے ہے دور منزل / مگر رستہ طے کئے جا رہا ہے
وطن کے تحفظ کی تدبیر کر لو / "مگر جتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"
بہارِ طرب کا تصرف تو دیکھو / قفس بھی گلستاں نظر آ رہا ہے
محبت نہیں جس کو ملت سے اپنی / وطن سے بغاوت کئے جا رہا ہے
غریبوں کی تربت پہ ہنس ہنس کے اختر / فلک رات دن پھول برسا رہا ہے

جناب ایم۔ ظفر پریمی [illegible]

یہیں اندازے سے انقلاب آ رہا ہے / جو آتا ہے زد میں لٹا جا رہا ہے
برستی ہوئی آ رہی ہے تباہی / "مگر جتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"
مرے دامنِ ضبط کی خیر یا رب / یہ وہ جا رہے ہیں کہ دل جا رہا ہے!
ابھرتی چلی آ رہی ہے تمنا / سفینہ مگر ڈوبتا جا رہا ہے
محبت کے قربان محبت کے صدقے / ہر اک ٹیس میں اب مزا آ رہا ہے
محبت کی دشواریاں ساتھ لیکر / مسافر اکیلا چلا جا رہا ہے
ظفر اب کرے رہنمائی وہ کسکی / جو خود گمرہی میں بھٹکتا رہا ہے

جناب اقبال ماہر الہ آبادی

چمن پر جو گھر کر سحاب آ رہا ہے / وہ پانی نہیں، آگ برسا رہا ہے
کمال سے یہ اک دیوِ تخریب اٹھکر / تمدن کی تعمیر کو ڈھا رہا ہے
عناصر کی شورش ہی میں زندگی ہے / سکوں سے یہ دل اور گھبرا رہا ہے
سنا ہے جو پانی میں طوفاں اٹھا ہے / وہ ساحل سے سر اپنا ٹکرا رہا ہے
خبر بھی ہے کچھ زندگی کا سفینہ / مصیبت کے گرداب میں آ رہا ہے
جو دل یاد سے تیری جیتا تھا پہلے / وہ اب نام سے تیرے گھبرا رہا ہے
مٹا کر وطن کے یہ حالات ماہر / کوئی خون کو میرے گرما رہا ہے

جناب شفیق کوٹی

کوئی نغمۂ جانفزا گا رہا ہے / گلستاں میں پھولوں کو وجد آ رہا ہے
غلامی میں اک انقلاب آ رہا ہے / خیالِ خودی پرورش پا رہا ہے
تخیل کی آزادگامی کے صدقے / "مگر جتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"
زمانہ سے سنتا چلا آ رہا ہوں / زمانہ میں دور اک نیا آ رہا ہے
زمانہ کی غفلت شکن ٹھوکروں سے / اب اہلِ وطن کو بھی ہوش آ رہا ہے
پھر آزادیاں کروٹیں لے رہی ہیں / بہت سوئے اب ہم کو ہوش آ رہا ہے
شفیق ان کے جلووں سے معمور ہے دل / مجھے طور کا سا مزا آ رہا ہے

جناب عابدی بنارسی (منشی کامل)

مقابل میں دشمن کہاں جا رہا ہے / تری آزمائش کا وقت آ رہا ہے
ثمر زندگی کا وہ پائیگا اک دن / جو اپنے وطن پر مٹا جا رہا ہے
وطن کی امیدیں ہیں وابستہ تجھ سے / کدھر جا رہا ہے، کہاں جا رہا ہے
ہے سیلِ فنا یا ہے طوفاں کوئی / کہ عالم کا عالم بہا جا رہا ہے
[illegible] / زمیں تو زمیں چرخ تھرا رہا ہے
کہاں تک قسمت کو رو دے گا اپنی / کہ تدبیر کا وقت بھی جا رہا ہے

نئی روشنی کا اثر ہے یا دی اب — اندھیرا ہر اک سمت پھیلا رہا ہے

جناب شمس زبیری مراد آبادی

قفس میں جو دل آج گھبرا رہا ہے — سُنا ہے کہ عہدِ بہار آ رہا ہے
ڈبو دے نہ یارب سفینہ کو میرے — یہ طوفان جو ساحل سے ٹکرا رہا ہے
جفاؤں سے دادِ وفا مل رہی ہے — دل اپنے کئے کی سزا پا رہا ہے
مسلل نہ پامال کر میرے دل کو — نشانِ محبت مٹا جا رہا ہے
نگہبانِ گلشن کو ہشیار کر دو — چمن کی طرف انقلاب آ رہا ہے
بہار آ رہی ہے گلستاں میں یارب — مرا آشیاں کیوں جلا جا رہا ہے
ذرا شمس رہبر کو آواز دینا — یہ منزل سے آگے بڑھا جا رہا ہے

جناب سالک نند رباری

مرا جذبۂ شوق کام آ رہا ہے — مجھے سوئے منزل لئے جا رہا ہے
زمانہ بدلتا چلا جا رہا ہے — "گر جتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"
قفس میں کوئی گیت آزادیوں کے — المناک آواز میں گا رہا ہے
ابھی دل کہاں اپنی منزل پہ پہنچا — ابھی راہ میں ٹھوکریں کھا رہا ہے
یہ کیا آندھیاں یاس کی چل رہی ہیں — چراغِ تمنا بجھا جا رہا ہے
ترے انتہائے کرم کے تصدق — کہ ہر حال میں مجھ پہ پیار آ رہا ہے
یہ ہے حال دنیائے فانی کا سالک — کوئی آ رہا ہے کوئی جا رہا ہے

جناب خادم شلوی از دہلی

ترا غم مجھے اس طرح کھا رہا ہے — کلیجہ کوئی جیسے برما رہا ہے
یہ ہے کس کی آمد یہ کون آ رہا ہے؟ — کہ دل آج پہلو میں گھبرا رہا ہے
وطن کا سپاہی چلا جا رہا ہے — مگر نغمۂ حریت گا رہا ہے
سکوں از سرِ نو زمانے میں ہوگا — نہ گھبراؤ وہ وقت بھی آ رہا ہے
قدم اہلِ دنیا سنبھل کر اٹھائیں — زمانہ بہت ہی خراب آ رہا ہے
عجب کارخانہ ہے دنیائے فانی — کوئی آ رہا ہے کوئی جا رہا ہے
جو ہونا ہے خادم وہ ہو کر رہیگا — فضول اپنے دل میں تو گھبرا رہا ہے

جناب محسن ساگری

(مسلسل)

زمانے میں اک آگ بھڑکا رہا ہے — "گر جتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"
کہیں آ گیا ہے کہیں آ رہا ہے — یہاں بھی قدم بڑھ کر بڑھا رہا ہے
خدا جانے تخریب کو لا رہا ہے — کہ سامانِ تعمیر بھی لا رہا ہے
ابھی دخل کامل ہوا بھی نہیں ہے — ابھی سے مگر سب کو گرما رہا ہے
جمائیگا سکہ ہر اک جا پہ اپنا — جو منزل بمنزل چلا آ رہا ہے
تغیر ہے زیرِ قدم اسکے ہر جا — تمدن میں وہ رنگِ نو لا رہا ہے
ذرا محسن زمانے کا نیرنگ دیکھو — کوئی آ رہا ہے کوئی جا رہا ہے

جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی

سماں جنگ کا خون برسا رہا ہے — نئی رو میں عالم بہا جا رہا ہے
گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے — ہر اک شخص دنیا کا گھبرا رہا ہے
دہانا ہے پھر جنگ کے دیوتا کو — یہ کمبخت پھر پاؤں پھیلا رہا ہے
یہ ہنگامہ زارِ ستم، یہ تشدد — غریبوں کا ہونٹوں پہ دم آ رہا ہے
یہ لرزہ بر اندام خونیں فضائیں! — قیامت کا منظر نظر آ رہا ہے
نہ کیوں ہند ہو دورِ ظلم طرفہ — دغا اون کا اپنی پھلا پا رہا ہے

جناب منظر کلیمی جام پوری

بلا کی طرح ابرِ غم چھا رہا ہے — "گر جتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"
ہوئے ہیں زمانے میں فتنے وہ پیدا — کہ محشر کا فتنہ بھی شرما رہا ہے
کدورت سے معمور دل ہو رہے ہیں — نشانِ محبت مٹا جا رہا ہے
وہ انساں جو ہے مظہرِ خاص باری — تمدن کے ہاتھوں مٹا جا رہا ہے
اخوت سے عالم کو ہے حد عداوت — عداوت پہ عالم مٹا جا رہا ہے
زمانے کو اپنا سمجھنا نہ منظر — ہمیشہ یہ کم بخت کس کا رہا ہے

جناب حامی (سگولی) چمپارن

تصور ترا دل کو گرما رہا ہے — محبت کی آگ اور بھڑکا رہا ہے
یہ دل آج کیوں اتنا گھبرا رہا ہے — مجھے کیا کوئی یاد فرما رہا ہے
تمہارے سوا میں جدھر دیکھتا ہوں — ہر اک شئے میں اک انقلاب آ رہا ہے
سراغ انکا شاید ملا ابر کو بھی — کہ موجِ ہوا پر اڑا جا رہا ہے
یہ منظر جہاں کا نہ باقی رہے گا — "گر جتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"
جو کل تک تھا ہمدرد و غمخوار حامی — وہی آج دشمن بنا جا رہا ہے

جناب کوکب القادری از کوچ

حجابات اٹھتے چلے جا رہے ہیں — کوئی خود بخود سامنے آ رہا ہے
کوئی حد ہے ناصح کی دیوانگی کی — سمجھتا نہیں اور سمجھا رہا ہے
ازل سے ہے یہ رنگ بزمِ جہاں کا — کوئی آ رہا ہے کوئی جا رہا ہے
بتوں کی کچھ ایسی ہوئی مہربانی — کہ اب یاد ہم کو خدا آ رہا ہے

تصور کے صدقے، تخیل کے قرباں
کہاں سے انہیں کھینچ کر لا رہا ہے

خلش ہے یہ شاید محبت کی کوکب
کہ نشتر سا دل میں چبھا جا رہا ہے

جناب باقی اعظمی

وہ نذرِ جفا کیلئے جا رہا ہے
کہ جوشِ وفا اور بھڑکا رہا ہے

ترقی کا انساں کی ہے یہ عالم
کہ انسانیت ہی سے گھبرا رہا ہے

گدائے محبت ہے مغرور کتنا
متاعِ دو عالم کو ٹھکرا رہا ہے

تکلم کا اُن کے سلیقہ تو دیکھو
کہ جیسے کوئی پھول برسا رہا ہے

اُٹھایا نہ احسان جس نے کسی کا
ترے سامنے ہاتھ پھیلا رہا ہے

کسی کے تغافل کے صدقے میں باقی
غمِ زندگی پرورش پا رہا ہے

جناب اثر احمد آبادی

فضاؤں میں نغمے کوئی گا رہا ہے
چمن کا چمن وجد میں آ رہا ہے

حجابِ تعین اُٹھا جا رہا ہے
حقیقت کا جلوہ نظر آ رہا ہے

نہیں ہے وہ ظرفِ حقیقت سے خالی
جو قطرہ ہم آغوشِ دریا رہا ہے

قیامت نما پیشتر از قیامت
بپا اور اک انقلاب آ رہا ہے

ٹھہر جا ہوائے مخالف خدارا
چراغِ تمنا بجھا جا رہا ہے

اثر مرکزِ عیش و عشرت سے ہٹ کر
حدیثِ غمِ عشق دہرا رہا ہے

جناب اکرم حنیفی۔ دھولیوی

یہ کیا بجلیاں چرخ برسا رہا ہے
چمن کا چمن سب جلا جا رہا ہے

نہ ہو تو پریشاں، پریشانیوں سے
بگڑ کر ہر اک کام بنتا رہا ہے

وہ قعرِ تباہی میں آخر ہے کیوں
جو شاہیں بلندی پہ اُڑتا رہا ہے

سُنا کر کوئی حریت کے ترانے
اسیرانِ زنداں کو تڑپا رہا ہے

مرے دامنِ امن سے خارِ حسرت
اُلجھتا رہے گا اُلجھتا رہا ہے

تدبر سے ہم کام لیتے ہیں اکرم
فضا کا افق فکر پہ چھا رہا ہے

جناب بیتاب کالپوی

کوئی نغمۂ سرمدی گا رہا ہے
فضاؤں سے اک کیف برسا رہا ہے

[illegible]کرتا رہا ابرِ رحمت کی بارش
وہی آسماں آگ برسا رہا ہے

بساطِ چمن اُٹھ رہی ہے جہاں سے
"گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"

زمانے کی نیرنگیاں ہیں کہ مفلس
جبینِ نیاز اپنی جھکا رہا ہے

فضا میں ہے مسموم ہندوستاں کی
یہ ہندی جواں پھر بھی اٹھلا رہا ہے

زمانے کے نیرنگ بیتاب ہیں یہ
کوئی مطمئن کوئی پچھتا رہا ہے

جناب حاجی جوہر چاندوری

وہی نعمتِ دو جہاں پا رہا ہے
جو راہِ وفا میں مٹا جا رہا ہے

درِ دوست کی خاک جو پا رہا ہے
وہ دُنیا کی دولت کو ٹھکرا رہا ہے

کہیں اُن کا دیوانہ کروٹ نہ بدلے
"گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"

جنوں کی یہ ذرہ نوازی تو دیکھو
ہر اک باغ، صحرا نظر آ رہا ہے

نہ پوچھو آہ، تو وجہ بیتابیٔ دل
ترا درد رہ رہ کے تڑپا رہا ہے

تنزل دلیلِ ترقی ہے جوہر
جو دبتا رہا ہے، اُبھرتا رہا ہے

جناب غنی کلنوروی (حیدرآباد دکن)

گلستاں گلستاں بیاباں بیاباں
جنونِ پرچمِ عشق لہرا رہا ہے

یہی ابنِ آدم ہے تیری ترقی؟
کہ مجلس پہ آگ برسا رہا ہے

جنوں لاکھ صحرا میں بھٹکائے لیکن
بہر حال اس دل کو بہلا رہا ہے

خبردار، ہشیار اے اہلِ ساحل
کہ ساحل سے طوفان ٹکرا رہا ہے

یہ غفلت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
دو روزہ جوانی پہ اترا رہا ہے

نفوسِ شرربار سے کام لیکر
غنی خونِ دہقاں کو گرما رہا ہے

جناب سراج احمد آبادی

اگر پاس ہے تجھ کو اپنے وطن کا
تو کیوں جان دینے سے گھبرا رہا ہے

نہ ہو اتنا بیگانہ سعیِ عمل سے
ترا امتحاں اب قریب آ رہا ہے

کمر کس لے اپنی تو سعیِ عمل پر
"گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"

نہ ہو اتنا بیتاب موجِ فنا سے
فنا ہونے والا ہی زندہ رہا ہے

فسانہ ہے یہ بھی مری ہمتوں کا
زمانہ جسے آج دُہرا رہا ہے

سراج اپنے ماضی کا رنگیں فسانہ
بہاروں میں بھی یاد آ رہا ہے

جناب پریم دہلوی

زمانہ یہ اِن خوف تھرا رہا ہے
"گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"

گلستاں پہ صیاد گرنے دے بجلی
نشیمن میں جلنے کو اب کیا رہا ہے

بہ فیضِ غمِ زندگی رفتہ رفتہ
یقینِ مسرت اُٹھا جا رہا ہے

نئے سر سے گلشن کو ترتیب دینے
چمن میں وہ جانِ بہار آ رہا ہے

ہے خوف اتنا بزمِ تصور پہ طاری
کہ ہستی کا ہر تار تھرا رہا ہے

سُنا کر کوئی پریم دلسوز نغمہ
مجھے سازِ فطرت سے تڑپا رہا ہے

جناب انجم احمد آبادی

تو کیا سربکف ہنس کے گزرا رہا ہے
"گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"

شہیدانِ ملت کا خونیں فسانہ
لباسِ شفق میں نظر آ رہا ہے

خبردار آسودگانِ تمدن
تمہاری طرف انقلاب آ رہا ہے

اُٹھو نوجوانو، بڑھو نوجوانو
"گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"

زمین آسماں تنگ بدبُو ہوئے ہیں
فضا سے یہ کون آگ برسا رہا ہے

مہ و مہر و انجم کی محفل میں اب بھی
کوئی تیرا افسانہ دُہرا رہا ہے

جناب جنوں الہ آبادی

بتاتی ہے تاریخِ عالم یہ ہم کو
تغیر زمانے میں ہوتا رہا ہے

کوئی اپنی تدبیر پر لا فزن ہے
کوئی اپنی حکمت کے گُن گا رہا ہے

دلوں میں اب اک ہوک سی اُٹھ رہی ہے
سروں پر اک ادبار سا چھا رہا ہے

نہیں چین فکرِ گرانی سے اک پل
یہ غم دل کو گھُن کی طرح کھا رہا ہے

تڑپتے ہیں ہر وقت سکانِ عالم
نہ جانے انھیں کون تڑپا رہا ہے

کرو فکر کچھ جنگ کے دیوتا کی
جنوں تم پہ آفت یہی لا رہا ہے

جناب عباس انصاری دہلوی

زمانہ یہ کس راہ پر جا رہا ہے
ہماری اُمیدوں کو ٹھکرا رہا ہے

کوئی مطربِ قوم سازِ وطن پر
ترانے مساوات کے گا رہا ہے

زباں پر جو آیا تھا دل سے نکل کر
وہی سوز محفل کو گرما رہا ہے

زمیں پر بھڑکتے ہیں شعلے غضب کے
بساطِ فلک پر دھواں چھا رہا ہے

اگر چاہتا میں تو کیا کیا نہ کرتا
مرے ہاتھ میں نظمِ دنیا رہا ہے

تغزل سے اب ذہنِ عباس ہٹ کر
تدبر کی گتھی کو سلجھا رہا ہے

جناب ثاقب ساحر بڑوانی۔ سی۔ آئی

الٰہی یہ کیا انقلاب آ رہا ہے
کہ اپنا پرایا ہوا جا رہا ہے

نہ جانے برس جائے یہ کس زمیں پر
"گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"

جگر دوز مظلوم کی آہ سُن کر
زمیں کیا، فلک بھی تو تھرا رہا ہے

یہ دورِ پر آشوب کب ختم ہوگا
نشاں عنبریوں کا مٹا جا رہا ہے

غلامانِ حرص و ہوس سے یہ پوچھو
کسی کا بھی یکساں زمانہ رہا ہے؟

نہ کوتاہیاں ہوں خرافتیں ہیں ثاقب
بلا سے اگر انقلاب آ رہا ہے

جناب فخر دہلوی

ترے حسن کی کوئی شہ پا رہا ہے
خرابِ محبت ہوا جا رہا ہے

کوئی کھو رہا ہے کوئی پا رہا ہے
ہمیشہ یہ دستورِ دنیا رہا ہے

بہا دا کہ جس نے قدم میری اکڑن
جہاں آج کیوں مجھ کو ٹھکرا رہا ہے

وہ طوفاں اٹھانے چلے آ رہے ہیں
جہاں اپنی رَو میں بہا جا رہا ہے

تفکر ترے رخ سے ہے فخر ظاہر
تخیل ترا اوج پر آ رہا ہے

جناب منظر دہلوی

تصور میں وہ جلوہ فرما رہا ہے
یہ شاید مرے دل کو دھوکا رہا ہے

تڑپتی ہے سینا میں کیوں برقِ ایمن
نظر کوئی اہلِ نظر آ رہا ہے

تری جستجو میں مرا جوشِ وحشت
ہمیشہ خود سے اُلجھتا رہا ہے

کوئی داغ سینہ کا پھوٹا ہے شاید
تنفس کے ساتھ اب دھواں آ رہا ہے

سفینہ مری آرزوؤں کا منظر
بس اب غرق ہوتا نظر آ رہا ہے

جناب شاد سلیمانی نقشبندی جالندہری

گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے
زمانے پہ طوفانِ غم چھا رہا ہے

کبھی جا ہی پہنچے گا منزل پہ اپنی
قدم جس کا آگے بڑھا جا رہا ہے

اُٹھو خدمتِ دہر کر لو جوانو
کہ عہدِ جوانی چلا جا رہا ہے

وطن کی محبت سے معمور ہے دل
یہ نغمہ ہر اک نوجواں گا رہا ہے

تخیل ترا "شاد" "شاعر" میں آکر
خدا رکھے کیسی اوج پر آ رہا ہے

جناب خلیل ازسگولی

کوئی شادماں کوئی غم کھا رہا ہے
جہاں میں عجب انقلاب آ رہا ہے

زمانہ کی نیرنگیاں دیکھتا جا
بھرے باغ سے باغباں جا رہا ہے

مجھے دیدے صیاد حکمِ رہائی
گلستاں میں دَورِ بہار آ رہا ہے

اُٹھو خوابِ غفلت سے اے نوجوانو
وطن نغمۂ حریت گا رہا ہے

جسے ہم نے سینچا تھا خونِ جگر سے
خلیل آج وہ باغ مُرجھا رہا ہے

بلقیس فاطمہ صاحبہ بیکس (گوالیار)

سکوں آشنا دل ہلا جا رہا ہے
"گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"

مکدر دلوں کا وہ پھیکا سا جذبہ
جو سوتا تھا طوفاں بنا جا رہا ہے

نہیں اب مسافر کو رہبر کی حاجت
مسافر ہی رہبر بنا جا رہا ہے

وہ نغمہ جو دھیمے سروں میں چلا تھا
بہ بانگِ دہل اب سنا جا رہا ہے

تو بیکس ہے زیبِ ثریا بنے گی
فلک تیرے زیرِ قدم آ رہا ہے

جناب موج دہلوی

زمیں کانپ اُٹھی چرخ تھرا رہا ہے
"گرجتا ہوا انقلاب آ رہا ہے"

ستاروں پہ چھائی ہے مایوسیِ غم
چراغِ تمنا بجھا جا رہا ہے

بدل دوں گا نظمِ جہاں کی روش کو
یہ کہتا ہوا انقلاب آ رہا ہے

سیکڑوں تعریفی خطوط میں سے چند خطوط کا خلاصہ ملاحظہ کیجئے

ایک صاحبِ کمال سنیاسی کا بیش قیمت عطیہ

ضروری اطلاع ——— جنگ ختم ہوگئی

یہ مادی جنگ نہیں بلکہ وہ حقیقی جنگ جس نے ہمارے تعلقات میں ناخوشگواری پیدا کردی تھی اور جسکی وجہ سے دنیا جہنم معلوم ہوتی تھی۔ نامردی اور مایوسی کی خلیج وسیع ہوگئی تھی صرف **دارالشفاء گولیاں اور روغن مالش طلاء** نے ہزارہا خاندانوں کو تباہی اور بربادی سے بچالیا **ناظرین** ہم خدا کو حاضر وناظر جان کر کہتے ہیں کہ یہ دونوں ادویات نامردی کی آخری منزل میں بھی خدا کے فضل وکرم سے تیر بہدف ثابت ہوتی ہیں **دارالشفاء گولیوں** کے استعمال سے جریان۔ احتلام۔ سرعت انزال۔ پیشاب سے پہلے یا بعد میں سفید رطوبت کا آنا چہرہ زرد رہنا۔ دل گھبرانا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھاجانا۔ کام میں جی نہ لگنا۔ عورت کے خیال سے مادہ تولید کا بہہ جانا۔ غرض وہ تمام شکایتیں جو غلط کاریوں سے پیدا ہوگئی ہوں۔ ایک ہفتہ میں ختم ہوجاتی ہیں اور اکیس دن کے مسلسل استعمال سے انسان فولاد کی طرح مضبوط ہوجاتا ہے۔ تہذیب ہمیں زیادہ وضاحت کی اجازت نہیں دیتی۔ ان گولیوں کے استعمال سے اسقدر صالح خون پیدا ہوتا ہے کہ رگ رگ میں بجلی کوندتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایمان اور دھرم سے ہم کہتے ہیں کہ بالکل حقیقت ہے صرف ایک بار آزما کر دیکھئے۔

قیمت ۲۱ خوراک صرف تین روپیہ -/R.S. 3

روغن مالش طلاء:۔ ہندوستان میں ہزارہا قسم کے طلاء روزانہ اخبارات اور رسالوں میں مشتہر ہوتے رہتے ہیں ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں نوّے فیصدی غلط اثر کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہمارے روغن مالش طلاء سے عضو مخصوص کی تمام خرابیاں نہایت آسانی سے دور ہوجاتی ہیں۔ کجی۔ لاغری۔ رگوں کا ابھار۔ کمی خواہش کا پیدا نہ ہونا یا ہونے کے بعد جوش کا ختم ہوجانا۔ سستی غرض ہر شکایت صرف چند بار کے استعمال سے دور ہو کر تفریح ہوجاتی ہے اور لطف یہ ہے کہ پھر کسی دوا کے استعمال کی ضرورت نہیں رہتی۔ یقین کیجئے اس روغن سے رگوں اور پٹھوں میں نئی روح اور زندگی پیدا ہوجاتی ہے ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے اور ناکارہ سے ناکارہ انسان تندرست ہوجاتا ہے۔

قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ -/R.S. 3/8

شرطیہ علاج اور شرطیہ عدہ:۔ ہندو کو دھرم اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے۔ اگر ان ادویات کے استعمال سے فائدہ نہ ہو تو حلفی تحریر بھیجکر قیمت واپس منگالیں یہ یاد رہے کہ یہ دوائی صرف نامردی۔ سستی۔ جریان۔ احتلام۔ سرعت کمزوری اور عضوِ مخصوص کی لاغری کے لئے مخصوص ہیں۔ خواہ کسی سبب سے ہوں۔ جلق یا کثرت مباشرت یا عادت بد سے سوزاک یا آتشک سے پیدا شدہ کمزوری کے لئے بھی بے طاقت کا جبہ ہے۔

ملنے کا پتہ: منیجر دارالشفاء گولیاں جھنگ (پنجاب)

منیجر صاحب اخبار مدینہ بجنور

بیان کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ہماری معرفت یہ دوائیں منگائیں وہ اطلاع دیتے ہیں کہ چند مریضوں پر استعمال کرائی اور بیحد مفید پائی۔

ڈاکٹر وی این سامار او

مدراس سے تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کی مقوی گولیاں اپنے ایک مریض کو استعمال کرائیں۔ مریض کمزوری وغیرہ کی شکایت میں مبتلا تھا استعمال کرانے پر حسب خواہش تندرست ہوگیا۔ واقعی یہ دوا بہت فائدہ مند ہے۔

حکیم اینڈ وید پنڈت ارجن داس شرما

پلوشا شریف سے تحریر فرماتے ہیں یہ دوا ان مریضوں کے لئے جو بچپن کی غلط کاریوں کے باعث ناکارہ ہوچکے ہیں از حد فائدہ مند ہے۔ میرے خیال میں اس کے برابر دنیا بھر میں کوئی دوائی نہیں جس مریض کے لئے یہ دوائی منگائی گئی وہ بالکل تندرست ہوگیا ہے براہ کرم دو کورس مزید روانہ فرمائیں۔

ڈاکٹر شاہ خیرت امام

حسین آباد سے تحریر فرماتے ہیں کہ یہ دوا گم شدہ قوتِ مردی کو دوبارہ بحال کردیتی ہے نامرد کو از سرِ نو قابل فخر مرد بنادیتی ہے

حکیم چونی لال لاہور

یہ دوائی اولاد پیدا کرنے کے قابل بنادیتی ہے

اخبار چوپنچ کلکتہ

اخبار چوپنچ کے پڑھنے والے نہ صرف ہندوستان بلکہ ہانگ کانگ تک دارالشفاء گولیوں کی تعریف لکھی ہے۔ دفتر چوپنچ کے سابق منیجر صاحب نے خود بھی اس دوا کو استعمال کیا اور جسے بھی فائدہ ہوا اور مجبور کیا کہ یہ دوا واقعی دوا ہے۔ اس لئے یہ دوا منگوا کر کھوئی ہوئی صحت حاصل کیجئے۔

عنایت علی۔ ایڈیٹر "چوپنچ" کلکتہ

مسٹر ایم ڈی انور خان

بی۔ اے

جھنگ سے تحریر فرماتے ہیں کہ مجھے جو یہ عارضہ لاحق تھا اس مرض سے زندہ در گور رہتا آپ کی دوا نے مرض کو جڑ سے غائب کردیا۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں مہربانی فرماکر ایک شیشی مقوی گولیاں اور بھیج کر مشکور فرمائیں۔

مسٹر ہری رام

از سرکاری ہسپتال گوالیار

یہ دوائی نامردی کے مریض کو استعمال کرائی گئی اور بیحد مفید پائی گئی

(اعجاز حسین صدیقی پرنٹر و پبلشر نے آگرہ اخبار برقی پریس میں چھپوا کر دفتر "شاعر" قصر الادب آگرہ سے شائع کیا)

سالِ اجرا موسم بہار ۱۹۳۰ء ———— عرصۂ اشاعت ۱۲ سال

قصر الادب کا خالص علمی۔ ادبی اور فنّی ماہنامہ

شاعر آگرہ

زیر سرپرستی

اعلیحضرت رسوا مظلومی والیٔ پاجود (کاٹھیاواڑ)

منظور شدہ

محکمہ ہائے تعلیم صوبہ ممالک متوسط و برار۔ ریاست میسور۔ ریاست کشمیر

چندہ سالانہ

عوام سے	۴	معاونین سے	۲۴
خواص سے	۶	مربیوں سے	۵۰
ہمدردوں سے	۱۲	محسنین سے	۶۰
انیوں سے	۱۵	سرپرستوں سے	۱۲۵

ششماہی عہ ———— فی پرچہ ۶/

اشاعت گاہ، مکتبۂ قصر الادب آگرہ

تعارف

تصاویر :- (۱) حضرتِ جگر مرادآبادی (۲) جناب صابر اکبرآبادی

جلد ۱۳ — نومبر ۱۹۴۲ء — نمبر ۱۱

محسنین، مربی، معاونین، انیسان و ہمدردان شاعر

محسنین ادب و شعر

(۱) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہر گوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ۶۰ سالانہ

(۲) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیر خورجوی ۶۰ سالانہ

(۳) محسنہ ادب ہر ہائینس علیہ حضرت کیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ سالانہ

(۴) محسنہ ادب شہزادی تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ سالانہ

(۵) محسنِ ادب جناب محترم وزیر زادہ شجاعت خانصاحب قہر جوناگڈھی ۶۰ سالانہ

مربیانِ ادب و شعر

(۶) مربیِ ادب جناب محترم میاں نعمت اللہ خانصاحب خلف میاں سر کرنل حشمت اللہ خاں مرحوم کے۔ ٹی ہوم منسٹر ریاست گوالیار ۵۰ سالانہ

معاونینِ ادب

(۷) معاونِ ادب محترمہ ۔ بی فلیس صابر بی۔ اے اکبر آبادی ۲۴ سالانہ

(۸) معاونہ ادب محترمہ نجمہ تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی ۲۴ سالانہ

(۹) معاونِ ادب جناب مولوی محبوب حسن صاحب آسی متوطن رڑکی بمبئی ۲۴ سالانہ

انیسانِ ادب

(۱۰) انیس ادب جناب سید تفضل کریم صاحب جمشید پور ۱۵ سالانہ

ہمدردانِ ادب

(۱۱) ہمدرد ادب جناب مولوی عبد الغفور صاحب سلیمان جالندہری ۱۲ سالانہ

(۱۲) ہمدرد ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری مرحوم ۱۲ سالانہ

(۱۳) ہمدرد ادب جناب نوابزادہ مشکور حسین خاں صاحب قیس آف بنڈو ۱۲ سالانہ

(۱۴) ہمدرد ادب جناب بابو عبد العظیم خانصاحب ذوق دکنی جمشید پور ۱۲ سالانہ

(۱۵) ہمدرد ادب جناب صاحبزادہ سید مظفر حسین صاحب گوہر زمیندار (دارالعلوم) ۱۲ سالانہ

(۱۶) ہمدرد ادب جناب اسمعیل کھوکھر صاحب راز جوناگڈھی ۱۲ سالانہ

(۱۷) ہمدرد ادب جناب عالی عمر میاں حسن میاں صاحب نظامی کوول ۱۲ سالانہ

(۱۸) ہمدرد ادب جناب خانصاحب عبد الحمید خاں آف مانادور ۱۲ سالانہ

خاصانِ ادب

(۱۹) جناب صاحبزادہ سلطان حامد خانصاحب ثروت گلشن آبادی ۶ سالانہ

(۲۰) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمان خانصاحب شفق ٹونکی ۶ سالانہ

(۲۱) جناب عبد الحفیظ صاحب اثر صدیقی چھپراوی بی۔ اے ۶ سالانہ

(۲۲) جناب لالہ گنگا رام صاحب اندر سرہندی ۶ سالانہ

(۲۳) جناب سید مظفر حسین صاحب عرشی دہلی ۶ سالانہ

(۲۴) ڈاکٹر برن صاحب بیک لائبریری میسور ۶ سالانہ

(۲۵) جناب سید علی حیدر صاحب عابد تقی جمشید پور ۶ سالانہ

(۲۶) جناب محمد عبید اللہ خاں صاحب بزم امروہوی ۶ سالانہ

(۲۷) جناب ناصر حسن خانصاحب اکبر بستی ۶ سالانہ

(۲۸) جناب نیاز احمد صاحب نذیر سرگودھی ۶ سالانہ

(۲۹) جناب صبغۃ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی ۶ سالانہ

(۳۰) جناب پریم چند صاحب پریم دہلوی ۶ سالانہ

(۳۱) جناب طالق ہمدانی لدھیانوی ۶ سالانہ

(۳۲) جناب سبحان خانصاحب غافل بیتول ۶ سالانہ

(۳۳) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی کوٹاہرہ ۶ سالانہ

(۳۴) جناب حبیب حسن خاں صاحب حبیب شاہجہانپوری (کوئٹہ) ۶ سالانہ

(۳۵) جناب بابو فقیر محمد خانصاحب عارف سیالکوٹی (کوئٹہ) ۶ سالانہ

(۳۶) جناب شیو پرشاد صاحب برگ باندوی ۶ سالانہ

(۳۷) جناب حکیم مولوی عبد الرحمن صاحب شاعر کاندھلوی ۶ سالانہ

(۳۸) جناب علامہ پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی ۶ سالانہ

(۳۹) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعر نہٹوری ۶ سالانہ

(۴۰) جناب محمد فاروق علی خاں صاحب عارف رئیس مینڈو ۶ سالانہ

(۴۱) جناب صوبیدار اختر علی صاحب اختر گوالیاری ۶ سالانہ

(۴۲) جناب ڈاکٹر ماتا پرشاد صاحب مستانہ زیب بریلوی ۶ سالانہ

(۴۳) جناب مقبول احمد صاحب سحر اعظم گڈھی ۶ سالانہ

(۴۴) جناب مولوی مظہر الدین صاحب مظہر راداسی گوردا سپوری ۶ سالانہ

(۴۵) جناب حبیب الرحمان صاحب حبیب آروی جمشید پور ۶ سالانہ

(۴۶) جناب مولوی محمد احسان خانصاحب احسان مونگیری ابنی (بہار) ۶ سالانہ

(۴۷) جناب مولوی نصیر الدین صاحب حیدر اسارہ (میرٹھ) ۶ سالانہ

(۴۸) جناب عطاء الرحمن صاحب عطا جالندہری دہلی ۶ سالانہ

(۴۹) جناب عبد الرؤف صاحب ثاقب بڑوانی اسٹیٹ ۶ سالانہ

(۵۰) جناب لیس بشیر احمد صاحب فاروق رکن انجمن الاسلام کوئٹہ ۶ سالانہ

(۵۱) جناب بابو من موہن لال صاحب ساگری مجنوں اردو (سی۔ پی) ۶ سالانہ

(۵۲) جناب میاں محمد مخدوم صاحب رئیس ملک میانہ (پنجاب) ۶ سالانہ

(۵۳) جناب محمد حسین صاحب خادم تیموری دہلی ۶ سالانہ

(۵۴) جناب [illegible] صاحب [illegible] ۶ سالانہ

شعرِ انقلاب —— بازیگرانِ قوم و وطن سے!

جس قدر قومیں دیارِ ہند میں آباد ہیں — فطرتاً اپنے عقائد میں وہ سب آزاد ہیں
لعنتِ بیگانگی سے مائلِ فریاد ہیں — "اتحاد" ان میں نہیں ہے اس لئے ناشاد ہیں

"اتحادِ قومیت" سے ان کا رشتہ جوڑ دو

ورنہ اے بازی گرو، ہندوستاں کو چھوڑ دو!

کون ہندو، کون مسلم، سب ہیں مخلوقِ خدا — ایک ہی منزل ہے سب کی، مختلف ہیں راستا
رہ چکے الفاظِ بے معنیٰ بہت ذہن آزما — اب ہے مقصودِ نظر "انسانیت کا ارتقا"

اِن قدیم و کہنہ زنجیروں کی کڑیاں توڑ دو

ورنہ اے بازی گرو، ہندوستاں کو چھوڑ دو!

جس میں چل سکتا نہ ہو چھوت اور نفرت کا فسوں — جس کے ذرّے ہوں نہ بد نظمی کے ہاتھوں سرنگوں
جس کے رہرو کو نہ ہو ضد اور تعصّب کا جنوں — جس کی حدِ آخری ہو منزلِ امن و سکوں

مُلک کی باگیں اُسی جادے کی جانب موڑ دو

ورنہ اے بازی گرو، ہندوستاں کو چھوڑ دو!

مردِ میداں ہو، تو کیوں ہے حوصلوں میں برہمی؟ — دست و بازو بھی ہیں شل اور پائے استقلال بھی!
گریۂ بے دست و پائی، نالۂ کم ہمتی! — نارسائی کی شکایت، شکوۂ درماندگی!

ہیں یہ تکلیفِ خرام اِن آبلوں کو پھوڑ دو

ورنہ اے بازی گرو، ہندوستاں کو چھوڑ دو!

سیماب اکبرآبادی

جرعات

اُردو کانفرنس بنگلور

کئی ماہ سے یہ خبر گرم تھی کہ خلد زارِ ریاستِ میسور بنگلور میں ایک آل انڈیا اُردو کانفرنس اور مشاعرہ کا اہتمام زیرِ غور ہے۔ تاریخوں میں ترمیم و تنسیخ ہوتے ہوتے اب نومبر کی آخری تاریخیں کانفرنس کے لئے تجویز ہوئی ہیں۔ کانفرنس اور مشاعرہ عظیم الشان پیمانہ پر منعقد ہوگا جس میں شمالی ہند کے مشہور ادبا اور شعرا کی شرکت کی بھی توقع اور ایک حد تک یقینی ہے۔

کانفرنس کا اہتمام ملک کی مشہور شاعرہ و ادیبہ سیّدہ نواب سردار بیگم اختر حیدرآبادی کر رہی ہیں اور سکرٹری حکیم محمد امام امامی میسوری ہیں۔ یہ بھی سُنا ہے کہ بنگلور کے تمام عمائد و اکابر اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ اُمید کہ جنوبی ہند کی یہ علمی و ادبی مجلس یادگار ثابت ہوگی اور اس میں وہ بدنظمی نہ ہوگی جو عام طور پر ایسے اجتماعات میں ہوا کرتی ہے۔

حضرت قبلہ علامہ سیماب مدظلہ کو اور مجھے بھی کانفرنس میں بہ اصرار مدعو کیا گیا ہے۔ اس ہنگامہ آرائی اور معروفیت کے زمانہ میں سفر دور و دراز صرف بانیانِ کانفرنس اور عقیدتمندوں کے اصرار سے کیا جائیگا۔ جاتے ہوئے یا واپسی پر کچھ دن **باب الہند بمبئی** میں بھی قیام کا ارادہ ہے۔ قبلہ و کعبہ کو اور مجھے بڑی خوشی ہے کہ بنگلور، کولار، بورنگ پیٹ، میسور اور بمبئی گویا کل جنوبی ہند کے تلامذہ احباب اور کرم فرماؤں سے ملاقات کا موقع ملے گا۔ سفر کا پروگرام خط کے ذریعہ پوچھا جا سکتا ہے۔

سحر ہنگامی

گزشتہ ماہ کا رسالہ تیار ہونے کے بعد یہ پُر الم اطلاع ملی کہ منشی اقبال ورما سحر ہنگامی نے ۲۲ ستمبر ۳۷ء کو ۵۵ سال کی عمر میں چند دن بیمار رہکر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ادارہ کو پسماندگان کے ساتھ عموماً اور اُن کے صاحبزادہ جناب کیلاش ورما شائق ہنگامی بی۔ اے کے ساتھ خصوصاً دلی ہمدردی ہے۔

سحر ہنگامی ادیب بھی تھے اور شاعر بھی۔ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں شاعری کا شوق ہوا لیکن کسی کے شاگرد نہ ہوئے بلکہ اپنی فطری قوتوں ہی سے کام لیکر ترقی کی۔ ۱۹۰۹ء میں کالیداس کے مشہور ڈرامہ "سکنتلا" کا نظم میں ترجمہ کیا جو "مثنوی سحر" کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں ہندی زبان میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔

آنجہانی سحر اُردو و ہندی کے خاموش خدمت گذار تھے۔ عمر خیام کی تقریباً ۵۰۰ رباعیوں "اوٹکر یا" کا ہندی نظم میں ترجمہ اُن کا نادر کارنامہ حیات ہے۔ منشی پریم چند کے متعدد ناولوں خصوصاً کرم بھومی، رنگ بھومی، نرملا اور گئودان کا اُردو ترجمہ بھی انہیں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی کی فرمائش پر "تحقیقات" نامی کتاب کا بھی ترجمہ کیا جو ہنوز شائع نہیں ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی غیر مطبوعہ کتابیں اُن کی یادگار رہ گئی ہیں۔ رسالۂ "زمانہ" اور ہندی کے مشہور رسائل میں اُن کے ہندی اُردو مضامین نظم و نثر شائع ہوتے رہتے تھے۔ اُن کی وفات سے ہندی اور اُردو ادب کو واقعی نقصان پہنچا ہے۔ سحر آنجہانی کی ایک غیر مطبوعہ نظم اسی اشاعت میں شائع ہوئی ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کے جذبات کتنے سچے اور فطری تھے۔

آہ وصل بلگرامی!

رسالہ "ندیم" گیا کے "نظرات" میں بحوالہ ہمعصر "صدق" لکھنؤ یہ جگر خراش اطلاع نظر سے گذری کہ ملک کے مشہور شاعر و ادیب **سیّد مقبول حسین وصل بلگرامی** نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہا "اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن"۔ وصل کی موت پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے وہ اپنے اخلاق و عادات اور احباب پرستی میں فقید المثال تھے۔ قصر الادب سے تو اِن کے خصوصی تعلقات تھے، ابھی چند دن ہوئے مرحوم کا خط آیا تھا۔ بیماری اور تاریخ وفات وغیرہ کا ہنوز کوئی علم نہ ہوا۔

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

"شاعر" کے مضامین

گزشتہ اشاعت کے تمام مضامینِ نظم و نثر عموماً اور حضرت ماہر القادری، حضرت صبا رشیدی کے مضامین اور حضرت جوش ملیح آبادی کے حالات و کلام پر تبصرہ خصوصیت کے ساتھ بہت ہی پسند کئے گئے۔ بابِ "شخصیات" کو ادبی حلقوں میں بڑی قبولیت اور وقعت حاصل ہو رہی ہے۔

زیرِ نظر "شاعر" کے دو مضمون بہت طویل مگر مفید اور دلچسپ ہیں۔ اِن مضامین کی طوالت نے اعلان کردہ مضامین میں سے **"عزیز لکھنوی مرحوم کی قصیدہ گوئی"** اور "آتشدان" کی اشاعت کو ناممکن بنا دیا۔ یہ دونوں مضمون آئندہ اشاعت میں شائع ہونگے۔ دسمبر کے "شاعر" میں شائع ہونے والے مضامین کی بھی ایک جھلک دیکھ لیجئے۔

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

دُنیا وہی ابتر و ہراساں ہے ہنوز
انساں خرابِ خونِ انساں ہے ہنوز
نکلی نہیں جنگ کی ابھی کچھ تعبیر
خوابِ امن و سکوں پریشاں ہی ہنوز

وہ حوصلہ عرض و دُعا ہی نہ رہا
کس سے کہئے کہ آسرا ہی نہ رہا
برہم ہے خدائی، اور فطرت خاموش
جیسے کوئی دُنیا کا خدا ہی نہ رہا

گذرے ہوئے اپنے دَورِ بیضا کو بُلا!
امواجِ فرو رفتۂ دریا کو بُلا!
فرعون نے پھر خودی کی انگڑائی لی
اے مصر ذرا طُور سے موسیٰؑ کو بلا!

آہن کدۂ قوتِ جسمی نکلا
توقیر دہِ شہرتِ اسمی نکلا
مغلوب ہوا مگر نہ مفتوح ہوا
اسٹالن گراڈ بھی طلسمی نکلا

تقدیر سراپردۂ تدبیر میں ہے
تدبیر تلاشِ حسنِ تقدیر میں ہے
تخریب کے آلودۂ خوں دامن میں
اک عالمِ نو معرضِ تعمیر میں ہے

ہے ہند کا ذکر چین و امریکا تک
لیکن نہیں امید کا اک جلوا تک
مُردہ تہِ خاک دفن ہو جائیگا
شاید پہونچے گی جب خبر عیسیٰؑ تک!

آسام میں طوفان اُٹھاتا ہے کوئی
بنگال پہ بجلیاں گراتا ہے کوئی
دیکھو کہیں انقلاب کا ہاتھ نہ ہو
دروازۂ ہند کھٹکھٹاتا ہے کوئی!

اشیا کی گرانی سے گرانباری ہے
کمیابیٔ اجناس وہی جاری ہے
ماضی کی طرف معاشرت کی رجعت
تہذیب پر ایک ضربۂ کاری ہے

جمعیتِ باقی کا دھواں ہو جائے
غربت میں ہلاکت کا سماں ہو جائے
ایسا نہ ہو اس گرانیٔ پیہم سے
انسان کی زندگی گراں ہو جائے

حیرت جو مصیبت کے بیانوں پہ نہیں
اس کا الزام رازدانوں پہ نہیں
کیا خاک اثر ہو، بے اثر باتوں کا
جو کچھ دل میں ہے وہ زبانوں پہ نہیں

سیماب

شخصیات :- (۱) حضرتِ جگر مرادآبادی

اُردو کی سب سے زیادہ مشہور اور مقبول صنف "غزل" ہے۔ دُنیا کی دوسری زبانوں میں تو کیا، ہندوستان کی قدیم و جدید زبان **سنسکرت** اور **برج بھاشا** میں بھی غزل نہیں ملتی۔ غزل اہلِ فارس کا طغرائے امتیاز ہے اور انھیں کی جدّت پسند طبیعت کا اختراع۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فارسی غزل عربی شعرا کے قصائد کی "تشبیب" کا ایک نمایاں عکس ہے۔ ہندوستان میں غزل کی پیداوار بیرونی اہلِ علم مسلمانوں کی یادگار ہے اور کلیتہً فارسی غزل کی تقلید۔ اہلِ عرب اپنی "تشبیب" میں عورتوں سے تخاطب کرتے تھے۔ اہلِ فارس نے اس میں اتنی ترمیم کی کہ مخاطبہ بجائے عورت کے مرد سے کرنے لگے اور یہی چیز ہندوستان میں رائج ہو گئی۔ ہر چند یہ مخاطبہ غیر فطری ہے لیکن جب علم الکلام میں ہندوستانی شعرا نے ایرانی شعرا کا تتبع کیا۔ تو تذکیر و تانیث میں کیوں پیچھے رہتے۔ حالانکہ ہندوستان کی خاص زبان سنسکرت اور برج بھاشا کی شاعری میں تخاطب عورت ہی سے کیا جاتا ہے۔ اُردو شعرا کے ایک طبقہ نے چونکہ مضامینِ غزل کو بہت عریاں کر دیا۔ اس لئے "پیارے" وغیرہ الفاظ نے ایک مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی اور اب مرد سے تخاطب بعض طبائع پر بار گذر رہا ہے۔ اہلِ عرب اپنے قصائد کی "تشبیب" میں مطلقاً جذباتِ محبت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ لیکن ترسے لطیف اور سنجیدہ پیرائے میں فارسی میں بھی کچھ مدّت تک غزل اظہارِ محبت ہی کے لئے مخصوص رہی لیکن وقت اور طبیعت کے تقاضوں سے متاثر ہو کر خواجہ عطار۔ مولانا روم اور شمس تبریز وغیرہ نے متصوفانہ خیالات کو بھی "تنگنائے غزل" میں بھر دیا اس لطف کے ساتھ کہ غزل کی تنگنائی مطلق محسوس نہ ہوئی فارسی غزل کا ارتقا سلاست اور روانی کے اعتبار سے سعدی اور خسرو کے یہاں پایا جاتا ہے اور جذبات و واردات کے اعتبار سے حافظ شیرازی کا کلام حقیقی تغزل کا آئینہ دار ہے۔

اُردو غزل اپنے عہدِ طفلی ہی میں مختلف النوع خیالات کے اظہار کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اخلاق۔ فلسفہ۔ تصوف اور جذباتِ حسن و عشق سبھی کچھ اس میں پائے جاتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ کسی شاعر کے یہاں کم اور کسی کے یہاں زیادہ۔ ہوتے ہوتے غزل میں اتنی پختگی پیدا ہو گئی کہ ہندوستان کے مشاہیر شعرا نے اپنے کلام میں انفرادیت پیدا کرنے کے لئے مضامینِ غزل بھی اپنے لئے مخصوص کر لئے یہی نہیں بلکہ اسلوبِ بیان اور اظہارِ جذبات میں بھی اتنی احتیاط سے کام لیا کہ ان کا رنگ لاکھ پردوں میں نہ چھپ سکا۔ مثلاً میر۔ مومن۔ مصحفی اور داغ کو لیجئے۔ ان سب کے یہاں جذباتِ حسن و عشق بہت گہرے ہیں۔ یہ سب ایک موضوع کے شاعر ہیں لیکن پھر بھی سب کا رنگ جُدا جُدا ہے۔ میر سوز و گداز اور سادگی میں۔ مصحفی حسن و عشق کے جذبات کو اعتدال اور سنجیدہ پیرایہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مومن جدتِ خیال۔ مضمون آفرینی اور اثر میں اور مرزا داغ فصاحت۔ سلاست۔ سادگی اور چلبلے پن میں مشہور ہیں۔ جذباتِ حسن و عشق کے ساتھ ساتھ جن شعرا نے دوسرے مضامین کو جزوِ غزل بنایا اُن میں مرزا غالب فلسفہ میں اور میر درد تصوف میں شہرۂ آفاق ہیں۔ ان شعرا کے بعد ہندوستان میں جن شعرا کا طوطی بولا وہ اپنا ایک مخصوص رنگ قائم کرنے کے بعد ان شعرا کے اتباع پر مجبور ہوئے اس مرتبہ "شخصیات" میں جس مشہور شاعر کو پیش کیا جا رہا ہے وہ بڑی حد تک مرزا داغ دہلوی کا متبع ہے۔

حضرت جگر مرادآبادی کا نام علی سکندر ہے۔ ۱۸۹۰ء میں بمقام مرادآباد پیدا ہوئے۔ مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع دہلی کے باشندے اور شاہجہاں کے استاد تھے۔ جگر صاحب کے دادا حافظ محمد نور بھی شاعر تھے اور والد بزرگوار مولوی علی نظر صاحب وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ گویا شاعری انہیں ورثے میں ملی تھی۔ جگر کی تعلیم کے متعلق کوئی تحقیقی بات معلوم نہ ہو سکی۔ رسالہ "نگار" لکھنؤ جنوری فروری ۱۹۴۱ء میں معیارِ تعلیم "انٹرنس" لکھا ہوا ہے لیکن یہ قابلِ وثوق نہیں، جگر صاحب کے دیگر حالات بھی "راز درونِ پردہ" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ اُن کی ابتدائی زندگی بڑی کشمکش میں گذری ۱۹۱۳ء میں محمد عمر صاحب ایجنٹ کارخانہ این۔ اے۔ جعفری انہیں دھولپور سے بڑی کسمپرسی کی حالت میں آگرہ لائے اور "رضوی اینڈ کو" کے یہاں چشمہ کا ایجنٹ کرا دیا۔ جگر صاحب نے اس کام میں خصوصی مہارت بھی پیدا کر لی۔ چونکہ طبیعت میں آزادی اور غیر یکسوئی بہت زیادہ تھی اس لئے ایک مدت تک یہ کام کیا اور پھر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد سے پھر اپنے اوپر کسی قسم کی پابندی نہ لی۔ بھوپال سے کلامِ جگر شائع ہوا۔ اِدھر مشاعروں میں زیادہ سے زیادہ بلائے جانے لگے اور اسی کو تکیۂ زندگی بنا لیا۔

یہ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرتِ جگر کی شاعری کا آغاز کب ہوا لیکن ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت ہی کم سنی میں شاعری شروع کی ہوگی اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو مرزا داغ اور منشی امیر اللہ تسلیم کا شاگرد بتاتے ہیں۔ یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ جگر حقیقتاً کس کے شاگرد ہیں۔ لیکن جہاں تک میری تحقیق اور بعض پرانے رسائل کا تعلق ہے۔ انھوں نے رسا رامپوری مرحوم، مولانا سیماب اکبرآبادی، مرزا رئیس

اکبر آبادی مرحوم ۔ شہیر مچھلی شہری ۔ ناز جونپوری اور مولانا اصغر گونڈوی سے بھی کم و بیش اصلاح لی ہے ۔

اُردو غزل پر ایک دو نہیں سینکڑوں تبصرے ہو چکے ہیں اور اس ضمن میں تغزل یعنی اُردو کی خصوصیت اور انفرادیت پر بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن بہت کم تنقیدیں ایسی نظر آتی ہیں جن میں "ذاتی پسند" کو بجائے نقد و نظر نہ بنا لیا گیا ہو اور یہ خود پسندی اصولِ تنقید کے سراسر خلاف ہے کسی شاعر کو اپنے ذوق و وجدان کی کسوٹی پر پرکھنا ۔ اپنی مزاجی کیفیت کو اس کے کلام سے متوازن کرنا اور اپنے قائم کردہ نظریات کو اس کے یہاں ڈھونڈنا بوالعجبی سے کم نہیں ۔ میرا ایمان ہے کہ شعر عطیۂ فطرت ہے ۔ ہر چند داخلی اور خارجی محرکاتِ خیال کو موزوں صورت میں پیش کرتے ہیں لیکن خود شاعر کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ شعر صفحۂ قرطاس پر کیونکر ڈھل گیا ۔ اسی لئے اچھا سچّا اور وارداتی شعر جہاں نصف سامعین کو متاثر نہیں کرتا وہیں اس سے کم یا اس سے زیادہ تعداد متاثر بھی ہو جاتی ہے ۔ تو معلوم ہوا کہ بہ اعتبارِ اثر شعر کی اچھائی اور بُرائی طبائع پر منحصر ہے ایک ہی شعر ایک دُکھے ہوئے دل کو زیادہ دُکھا سکتا ہے اور ایک مسرور قلب اس سے مطلق اثر پذیر نہیں ہوتا ۔ غزل ہو یا نظم ۔ رباعی ہو یا قصیدہ ۔ ان اصنافِ سخن کے جانچنے کے لئے ہمیں ان اصولوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے جو اتفاق رائے سے منضبط ہو چکے ہیں ۔ مثلاً غزل میں پہلے ہمیں بندشیں ۔ شیرینیِ الفاظ ۔ صحیح محاورے ۔ اندازِ بیان ۔ صنائع لفظی و معنوی ۔ ردیف قافیوں کی شگفتگی ۔ بحور کا ترنم ۔ الفاظ کا صحیح محل استعمال ۔ سلاست ۔ روانی ۔ متروکات سے گریز اور فن کے دیگر گوشوں پر نظر رکھنی چاہئے ۔ جب ایک شاعر ان ظاہری خوبیوں پر پورا اترے تو پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ تخیل میں نیا پن ہے یا نہیں ۔ شعر میں جذبات و واردات کو ٹٹولنا چاہئے ۔ اس پر بھی ہماری نظر ہے کہ شعر ہماری زندگی سے قریب تر ہے یا نہیں ۔ جس شعر میں جتنی زیادہ داخلیت ہوگی وہ اتنا ہی موثر بھی ہوگا ۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرتِ جگر مراد آبادی مرزا داغ دہلوی کے متبعین میں سے ہیں ۔ اور اُن کے بعض اشعار پر یہی دھوکا بھی ہوتا ہے ۔ اگر یہ بات پایۂ ثبوت سے ساقط بھی ہو کہ اُنھوں نے مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لی تو کم از کم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے داغ کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے ۔ اسی لئے ان کے کلام میں روانی ۔ سلاست اور بیساختگی بہت زیادہ ہے ۔ ان کے نوّے فیصدی اشعار پہلی ہی بار سُن کر سمجھ میں آ جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ ہمارے دل میں چُبھ جائیں گے ۔ عام فہم شگفتہ الفاظ مترنم بحریں ، بپھرے ہوئے جذبات ۔ آتشِ عشق و محبت کو تیز کرنے والے خیالات ۔ سیدھی سادی ترکیبیں اور سامعہ کو لذت بخشنے والے تجربے اُن کی شاعری کا خاصہ ہیں ۔ اس وقت تمام ہندوستان میں فوری طور پر جذبات میں ہیجانی کیفیت پیدا کرنے والا ان سے بہتر کوئی شاعر نہیں ۔ ان کی زبان بھی بہت میٹھی اور زود اثر ہے ۔ ذیل کے اشعار دیکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر اور داغ دونوں مل کر اپنے تکلم سے پھول برسا رہے ہیں ؎

چھپتے ہیں اور چھپا نہیں جاتا
ہم ادائے حجاب نے مارا

میں ترا عکس ہوں کہ تو میرا
اس سوال و جواب نے مارا

پھر زبانِ بے ادب پر ذکرِ یار آ ہی گیا
ہاں سزا دے اے خدائے عشق اے توفیقِ غم

دیکھا نہ گیا حال فقیرانہ کسی کا
بیساختہ آج اُن کے بھی آنسو نکل آئے

جہاں جائے گا ، ہمیں پائے گا
نگاہوں سے چھپ کر کہاں جائے گا

کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا
ہمیں جب نہ ہونگے تو کیا رنگِ محفل

اب تو یہ بھی نہیں رہا احساس
درد ہوتا ہے یا نہیں ہوتا

ہائے کیا ہو گیا طبیعت کو
غم بھی راحت فزا نہیں ہوتا

جس پہ تیری نظر نہیں ہوتی
اُس کی جانب خدا نہیں ہوتا

دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے
جب کوئی آسرا نہیں ہوتا

ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب اُن کا
عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں باقی

دُنیا میں ترا نقشِ کفِ پا نہ رہے گا
مٹ جائیگی جس دن مرے سجدوں کی حقیقت

اتنے بھی دُور دُور تری آستاں سے کیا!
مانا غرورِ عشق بھی اک چیز ہے مگر

یہ حال ہو تو فائدہ ضبطِ فغاں سے کیا
چہرہ بھی زرد زرد ، نظر بھی اداس اداس

شکوہ ستم کرکے خود مجھے حجاب آیا
وہ جھکی جھکی پلکیں ، وہ عرق عرق عارض

مجسّم سازِ بے آواز بن جا
کسی ٹوٹے ہوئے دل کی صدا کیا

نہیں معلوم محبت میں اثر ہے کہ نہیں ؟
جو ادھر ہے مری حالت وہ اُدھر ہے کہ نہیں

پوچھتا پھرتا ہوں اک ایک سے اُس کوچے میں
جس کا دیوانہ ہوں اسکو بھی خبر ہے کہ نہیں ؟

ایک دھڑکتا سا دل ایک لرزتی سی آہ
اس کے سوا اور کیا پیشکشِ حسنِ دوست

طے منزلیں ہوئی ہیں یوں عشق و آرزو کی
کچھ میں نے جستجو کی کچھ اس نے جستجو کی

جگر کے یہاں محاکاتی اشعار بہت کافی ملتے ہیں ۔ اُن کے مخصوص اور منتخب اشعار میں تخیل نئی ہو یا نہ ہو ، لیکن اندازِ بیان میں ندرت ضرور ہوتی ہے ۔ اُن کے یہاں ایک خاص قسم کی بیخودی اور سرشاری پائی جاتی ہے لیکن افسوس کہ بااوقات یہ سرمستی سے متجاوز ہو کر بدمستی تک پہونچ جاتی ہے اور اُن کے جذبات کے ہیجان و ارتعاش میں بیہودگی نظر آنے لگتی ہے ۔ جگر کے یہاں تغزل محض ہے لیکن جہاں وہ اس میں ذرا سا تفکر شامل کر دیتے ہیں وہاں لطف آ جاتا ہے ۔ یہ اشعار دیکھئے کس قدر لطیف ۔ سنجیدہ اور چبھنے والے ہیں ؎

فکرِ منزل ہے نہ ہوشِ جادۂ منزل مجھے
جا رہا ہوں ، جس طرف لیجا رہا ہے دل مجھے

یوں تڑپ کر دل نے تڑپایا سرِ محفل مجھے — اُس کو قاتل کہنے والے کہہ اُٹھے قاتل مجھے
اب کدھر جاؤں؟ بتا اے جذبۂ کامل مجھے — ہر طرف سے آج آتی ہے صدائے دل مجھے
روک سکتی ہو تو بڑھ کر روک لے منزل مجھے — لے اڑی ہے ایک موجِ بیقرارِ دل مجھے
پھونک دے اے غیرتِ سوزِ محبت پھونک دے — اب بھی ہیں وہ نظرِ رحم کے قابل مجھے
توڑ کر بیٹھا ہوں راہِ شوق میں پائے طلب — دیکھنا ہے جذبۂ بیتابیٔ منزل مجھے

جگر کے مجموعۂ کلام میں جہاں سستے اور عامیانہ قسم کے تغزل کی فراوانی ہے وہاں ایک مخصوص انداز و اسلوب کا تغزل بھی پایا جاتا ہے اس لئے کوئی ناقد بہ یک قلم یہ فتویٰ نہیں لگا سکتا کہ جگر معمولی قسم کے شاعر ہیں۔ بہوا ان کی شخصیت کا بہر حال اعتراف کرنا پڑیگا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے کلام کا زیادہ حصہ جنسی میلانات کو عریانی کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ چونکہ اس کا تعلق ان کے ذوق و وجدان سے ہے اور انھیں عوام میں اسی سے شہرت و قبولیت حاصل ہوئی ہے اس لئے آجتک انھوں نے اس رنگ کو نہ چھوڑا۔ خواہ کسی کو برا لگے یا اچھا۔ ان کا یہ استقلال انھیں صاحب طرز شاعر ماننے پر ہمیں مجبور کرتا ہے۔ بکھرے ہوئے جذباتِ حسن و عشق اُس پر جگر کا مخصوص ترنم، کیوں نہ مشاعروں میں جان سی پڑ جائے۔ سب کو معلوم ہے کہ مشاعرہ میں جتنی کامیابی جگر کو ہوتی ہے کسی دوسرے شاعر کو نہیں ہوتی۔ جگر اپنی زندگی میں ہندوستان گیر شہرت و قبولیت حاصل کر چکے ہیں اور ان کا رنگِ تغزل اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اب اس میں کسی قسم کی تبدیلی ناممکن ہے۔ وہ ناقدین کی اس آواز کو سنتے ہیں کہ ان کا کلام صرف سامعہ نواز ہے۔ پڑھنے، پرکھنے اور غور کرنے کی چیز نہیں۔ وہ حالیہ شاعر ہیں اور اُن کا مستقبل تاریک ہے۔ اس کے باوجود وہ نہیں سنبھلتے۔ میرے خیال میں جگر سے سنبھلنے کا مطالبہ جائز بھی نہیں۔ مجھے اور میری طرح بہت سے ناقدین کو اُن کی یہ ادا پسند ہے کہ اُن کا حالی و قالی یکساں ہے۔ انھوں نے اس کا اندازہ بہت صحیح کیا کہ وہ صرف "تغزل" کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور اُن کی فطرت جس رنگ کو پسند کرتی ہے وہ اس میں مطلقاً رنگے ہوئے ہیں۔

اگر جگر جذبات کی رو میں متعلقاتِ فن کا بھی خیال رکھتے اور اپنی شاعری میں بے راہ روی کو دخل نہ دیتے تو وہ داغ تو نہیں البتہ شاگردِ داغ فرود دہلوی لے جاتے۔ مرزا داغ کے کلام پر بھی بہت کچھ اعتراضات ہوئے ہیں لیکن علمی و فنی اعتبار سے اُن کا پایہ ہر دور کے مشاہیر شعرا سے بہت ممتاز ہے اور صرف یہی ایک خصوصیت انھیں ابد تک زندہ رکھ سکتی ہے۔

جگر کے یہاں سب سے بڑی خامی اعادۂ خیال اور مصرعوں کے غیر مربوط ہونے کی ہے سادہ الفاظ کے باوجود اُن کے بہت سے اشعار صحیح معنی نہیں دیتے۔ اِن کے خیالات محدود اور متعارف ہیں۔ تجربات میں بھی پختگی نہیں، مومن کا مشہور شعر ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اب حضرتِ جگر کا شعر دیکھئے ؎

وہ ہمارے قریب ہوتے ہیں — جب ہمارا پتا نہیں ہوتا

یہ تو غیر و معاصر شعرا کے ساتھ اُن کا ربط و ضبط ہے۔ انھیں تو اس کا بھی احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہی غزل میں اعادۂ خیال کر رہے ہیں ؎

مئے شوق پیتا پلاتا چلا جا — یونہی لوٹتا چل لٹاتا چلا جا
جوانی دِوانی اسی کام کی ہے — کہیں لوٹتا چل لٹاتا چلا جا

وہ حروف و حرکات کا خیال بھی نہیں کرتے مثلاً دِوانی۔ بتلا۔ دکھلا وغیرہ الفاظ انکے یہاں بکثرت ملتے ہیں اکثر الفاظ تقطیع سے خارج ہوتے ہیں۔ محاورہ اور روزمرہ کے خلاف بھی اُن کے یہاں اشعار موجود ہیں۔ اور اسی قسم کی دوسری خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ یہاں تفصیل کا موقع ہے اور نہ احتراض مقصود۔ غیر ارادی طور پر جو چیزیں سامنے آگئی ہیں ان میں سے چند کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ اگر اس حصہ پر زور دوں تو ایک طویل مضمون تیار ہو سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر ادیب و شاعر سے غلطی ہوتی ہے لیکن جگر کے یہاں نسبتاً اغلاط زیادہ ہیں۔ میری رائے میں اگر حضرتِ جگر مشغلۂ عمر پر گہری نظر ڈالیں اور نقائص سے پاک اور سنجیدہ قسم کے اشعار کا ایک منتخب مجموعہ مرتب فرما دیں تو یہ اُن کی حیاتِ شعری کے لئے زیادہ موثر ثابت ہوگا۔

تھا کھیل سا پہلے عشق، لیکن جو کھلیں آنکھیں (۲) ڈوبا ہوا رگ رگ میں وہ تیرِ نظر دیکھا
دھیان تیرا کیا آیا جانِ صد بہار آئی (۱) یاد تیری کیا آئی حاصلِ شراب آیا
مانا غرورِ عشق بھی اک چیز ہے مگر — اتنے بھی دور دور ترے آستاں سے کیا
خود حسن کی زبان ہو اور داستانِ عشق — اپنا بیانِ درد خود اپنی زباں سے ہو
کانٹا تھا چشمِ یاس میں ایک ایک برگِ گل — میرے لئے چمن بھی بیاباں نکل گیا
آئی ہچکی ایسے میں اُس جانِ تمنا کو — سکوتِ شب کا سناٹا ہے اور دل کی کہانی ہے
ہم کو دعوائے عشق بازی ہے — مستحقِ عذاب ہیں ہم لوگ
ہم نہیں جانتے خزاں کیا ہے — کشتگانِ شباب ہیں ہم لوگ
ہر وہ ناچیز سا ذرہ جسے تم دیکھتے ہو — اُس کو سن لو تو یہ نغمہ بھی ہے فریاد بھی ہے

پہلے شعر میں "دھیان" کی (ے) دوسرے میں "عشق" کا (ق) تقطیع سے خارج ہے تیسرے اور چوتھے شعر میں "بھی" اور "خود" کی تکرار نازیبا ہے۔ پانچویں شعر کے دوسرے مصرع میں "بیاباں نکلا" کی بجائے "بیاباں نکل گیا" خلافِ محاورہ و فصاحت ہے۔ چھٹے شعر میں "سکوتِ شب کا سناٹا" محلِ نظر ہے۔ ساتویں شعر میں "مستحق" مشدد نظم ہے آٹھویں شعر میں "خزاں" اور "شباب" کی مناسبت سمجھ میں نہیں آتی۔ نویں شعر میں "ذرہ" کو سننا بھی ... اس کے علاوہ تو یہ "نغمہ" کے بجائے "زمزمہ" ہونا چاہئے۔

کئی سال سے جگر کی فکرِ سخن کم ہو گئی ہے۔ دو سال میں مشکل سے تین چار ہی غزلیں سننے میں آئی ہیں۔ ان آخری دور کی بعض غزلیں بہت اچھی ہیں۔ چونکہ جگر بار بار یہی غزلیں ہر جگہ پڑھتے رہے اس لئے مشہور بھی ہو گئی ہیں۔ اب کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا کاروانِ شاعری پیچھے رک گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی مزاجی کیفیت اور مشرب میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہے۔ شاید رنگ [illegible]

(۲) جناب صابر اکبرآبادی

ہندوستان میں اردو شاعری کو جتنا قبول عام حاصل ہوا اتنا کسی اور زبان کی شاعری کو نہ ہوگا یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اُردو زبان نے اپنے زمانہ طفولیت ہی میں بچپانہ شوخیوں سے ہر قوم اور ہر مذہب و ملت کے افراد کو اپنا پرستار بنالیا تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کے متعلق تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُردو ان کی مادری زبانوں کے میل جول سے معرض وجود میں آئی تھی اس لئے ان قوموں کا اُردو میں تصنیفی اور تالیفی کام کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا لیکن دُنیا کی دوسری قوموں کا زبان دانوں کی طرح اُردو میں گفتگو کرنا اور اپنی تصنیف و تالیف کے لئے اسے ثانوی زبان قرار دینا یقیناً قابلِ تعریف ہے۔ اُردو ادب و شعر کی تاریخ میں ہمیں بہت سے یورپین، یہودی اور ہندی نژاد عیسائی ایسے ملتے ہیں۔ جنھوں نے بحیثیت ادیب و شاعر کافی شہرت و قبولیت حاصل کی۔ اٹھارویں صدی عیسوی ہی میں، صاحب۔ ڈالس سوبر طوماس۔ اسیر اور فراسو وغیرہ مشہور یورپین شعرا گذرے ہیں۔ اب جبکہ اُردو کلاسیکل زبان ہو چکی ہے تو کیوں نہ یورپین اور عیسائی شعرا کی تعداد کافی ہو۔ ملک میں ایسے تذکرے مرتب کئے جارہے ہیں جن میں عیسائی اور یوروپین شعرا کے تفصیلی حالات اور کلام کے نمونے ہونگے۔ میں بھی "شخصیات" میں ایک مشہور عیسائی ادیب و شاعر کے حالات پیش کر رہا ہوں۔ اس اعادہ کی تو ضرورت ہی نہیں کہ "شاعر" کا مسلک رواداری ہے۔ میں کوشش کرونگا کہ آئندہ بھی ہندو۔ سکھ۔ عیسائی شعرا اور ادبا کو ان صفحات پر پیش کروں۔

صابر صاحب کا نام اے۔ بی فلپس ہے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں بمقام اکبرآباد پیدا ہوئے۔ آپ آگرہ کے مشہور ڈاکٹر مسٹر فلپس کے حقیقی بھتیجے ہیں اور ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں آپکے افراد خاندان تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور اعلیٰ عہدوں پر مامور ہیں۔

کچھ دن آپ نے الہ آباد میں تعلیم حاصل کی۔ پھر اپنے چچا کے پاس آگرہ آگئے اور یہیں رہ کر گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے سینٹ جانس کالج آگرہ میں داخلہ لیا اور وہاں سے بی۔ اے پاس کیا ایم۔ اے کے امتحان کی تیاری بھی کر رہے تھے کہ ملازمت مل گئی اور جمشید پور (ٹاٹا نگر) چلے گئے۔ وہاں بحیثیت مدرس ایک مدت سے ملازم ہیں شعبۂ تعلیم کے امتحانات لے۔ ٹی۔ سی اور بی۔ اے۔ ٹی بھی پاس کر چکے ہیں۔ اب اُردو میں ایم۔ اے کے امتحان کی تیاری کر رہے ہیں۔

صابر صاحب کو اُردو سے خصوصی لگاؤ بچپن ہی میں پیدا ہوگیا تھا۔ اسکول کی "بیت بازی" میں خصوصیت کیساتھ حصہ لیتے تھے۔ اشعار کے مطالعے اور انھیں حافظہ میں محفوظ رکھنے کی سعی نے فطری موزونیت کو بہت اُبھارا۔ صابر کا آغاز شعرگوئی بھی دلچسپ ہے۔ الہ آباد کے زمانۂ تعلیم میں بورڈنگ میں رہتے تھے۔ چنانچہ وہاں طلبہ کو جو دال ملتی تھی اُس میں کیڑے نکلتے تھے۔ وارڈن صاحب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی، لیکن کوئی تدارک نہ ہوا۔ صابر صاحب نے "کیڑے" کے عنوان سے ایک ہجو ملیح تیار کی اور وارڈن صاحب تک پہونچادی۔ یہ نظم بہت مقبول ہوئی۔ اس طرح شکایت کی تلافی کے ساتھ ساتھ آپ کو اپنی شعری قوتوں کا بھی احساس ہوا۔ اس کے بعد غیر اصولی طور پر صرف دوستوں کو خوش کرنے کیلئے شعر کہتے رہے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول آگرہ میں جب آئے تو مولوی مجاور حسین صاحب شاد رامپوری نے بحد کافی ان کے ذوقِ شعری کو مدد دی اور آپ اسکولوں کے مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ اسکول سے کالج میں آئے تو مولوی حامد حسن صاحب قادری اور مولوی عابد حسین صاحب فریدی کے فیضِ صحبت نے مذاقِ شعرگوئی پر جلا کی۔ مولوی اعجاز حسین قادری مرحوم اُردو لیکچرار سینٹ جانس کالج آگرہ کی طرف سے "فرسٹ ایئر" میں ہر سال اوّل آنے والے طالبعلم کو ایک طلائی میڈل دیا جاتا تھا۔ چنانچہ سالانہ امتحان کے بعد یہ میڈل صابر کو ملا بعض طلبہ اور اساتذہ نے اسے جانبداری پر محمول کیا۔ لیکن جب صابر کی ذہانت۔ ذکاوت اور اُردو کی قابلیت کا علم ہوا تو سب خاموش ہوگئے۔ سینٹ جانس کالج اور آگرہ کالج کے مشاعروں میں اکثر آپ کو اوّل درجہ کے انعامات ملے۔ ادھر مقامی مشاعروں میں بھی کامیابی ہونے لگی اور اہلِ ذوق و نظر طبقہ صابر کی شاعری کو پسند کرنے لگا۔

اس یقین کے بعد کہ مستقبل میں ان کی شاعری اور زیادہ چمک سکتی ہے۔ صابر حضرت نجم آفندی اکبرآبادی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے اور چند سال تک بالکل استاد کے ہوکر فیض حاصل کرتے رہے۔ اُدھر حضرت نجم حیدرآباد جاچکے تھے اور اِدھر حالات و واقعات کچھ اس قسم کے ہوگئے تھے کہ آپ انقطاعِ تلمذ پر مجبور ہوکر ستمبر سنہ ۱۹۳۵ء میں حضرت علامہ سیماب مدظلہ کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوگئے۔ "دائرہ ادبیہ سیمابیہ" میں صابر کے رنگِ سخن کو عروجی محرکات ملے۔ اور کچھ ہی مدت میں پرانی ڈگر کو چھوڑ کر ترقی یافتہ تغزل کے راہرو بن گئے سنہ ۱۹۳۵ء میں سیماب لٹریری سوسائٹی کے "ڈکیٹر" ہوئے اور سوسائٹی کو مذاقِ بلند تک پہونچایا۔ کئی سال سے سیماب لٹریری سوسائٹی جمشید پور کے بھی صدر ہیں۔

صابر نہایت باذاق۔ ملنسار۔ زندہ دل۔ علم دوست اور سلیم الطبع نوجوان ہیں۔ ان سے ملنے کے بعد کوئی یہ محسوس نہیں کرسکتا کہ وہ اہلِ زبان نہیں۔ صابر کے حقیقی شاعر ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ لیکن نثر بھی بہت دلکش اور معیاری لکھتے ہیں۔ ابتک نثر کی کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ تنقید کا مذاق بھی بہت اعلیٰ ہے۔ ملک کے مشہور رسائل اور اخبارات میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔

میں نے جناب صابر کی شاعری کے ہر رنگ دیکھے ہیں۔ یعنی ابتدائی۔ وسطی اور موجودہ

اِن کی شاعری کے گذشتہ پانچ سال بہت تابناک گذرے ہیں، اور اب وہ اُس منزل میں ہیں جہاں نسان اکسیر بن جاتا ہے جب تک کوئی شاعر اپنا خاص رنگ اختیار نہ کرے خواہ وہ تقلیدی ہو یا تخلیقی اس وقت تک اہلِ نظر اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ مقامِ مسرت ہے کہ صابر کا رنگِ تغزل اب عوام کی پسند سے ہٹ کر خواص کی نظروں میں بھی جگہ پانے لگا ہے۔ اگر وہ اپنی پوری توجہ اسی طرف مبذول کردیں تو میں ذوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بہت جلد نوجوان شاعر شعرا میں ان کا شمار ہونے لگے۔

اب سے چند سال پہلے صابر لکھنوی رنگِ تغزل کا اتباع کرتے تھے اور اُن کی شاعری میں خارجی اثرات نمایاں تھے۔ یعنی غزل کے الفاظ اچھے، مناسب اور نظر کش ہونے کے باوجود شورِ جذبات کو نہ چھوتا تھا۔ مثلاً ؎

آشنا اپنی حقیقت سے اگر دل ہو جائے — خود بخود اُٹھ کے الگ پردہ حائل ہو جائے

حسرتیں جمع ہوں میری تو بنے اُن کی شبیہ — اُن کے جلوے جو ہوں یکجا تو مرا دل ہو جائے

کلیجہ تھام لے ہر سانس پر اس بزمِ ہستی میں — خدا توفیق دے تو ہر نفس کو امتحاں سمجھے

وہ حرفِ مدعا سُن کر تسلی کے لئے اکثر — نہیں بھی کچھ سمجھتے ہیں تو کہدیتے ہیں ہاں سمجھے

ظالم لہو لگا کے شہیدوں میں مل جائے — دل کے لہو سے زینتِ پیکاں نہ کیجئے

شہادت کی تمنا میں رہا ہوں نیم جاں برسوں — فنا کی گود میں کھیلی ہے عمرِ جاوداں برسوں

قفس میں وہ نشیمن سے زیادہ یاد آتا ہے — رہا تھا باغ میں جو پھول شمعِ آشیاں برسوں

اور اب ان کا تغزل جذبات و حسیات سے مملو ہے۔ پڑھنے والا دلی کیفیت و اثر محسوس کرتا ہے اور کم از کم یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے دماغ کے ساتھ روح و دل سے بھی کام لیا ہے، یہ چند شعر دیکھئے کتنا حساس اور تیز تغزل ہے ؎

اتنی تو خبر ہے انھیں جیتا ہوں ابھی تک — اور یہ نہیں معلوم کہ اُن کے ہی سہارے

اُمید بھی ہمدرد تھی، ارمان بھی ہمدرد — اب تک مگر آیا نہ کوئی کام ہمارے

درماں نہ ہوا چارہ گر و دل مرے دل کا — اب درد بھی اُس بار کا آمادہ سے توانا رہے

کونین کی وسعت میں دھڑکتا ہوا اک دل — وہ چودھویں کا چاند وہ مدھم سے ستارے

کیا ختم ہوئی روشنیٔ شمعِ شبِ غم — کیوں آج سرِ شام چمکتے ہیں ستارے

ٹپکا ہوا ہر اشک محبت کا مرقع — اُبھری ہوئی ہر چوٹ محبت کی نشانی

اب ملنے لگی ہیں مجھے انجام کی خبریں — کچھ درد دل، کچھ آپ کی نظروں کی زبانی

ابھی تو پڑی ہے ادھوری کہانی — کہاں لے چلے جوانی۔ کدھر لے جوانی!

مرے دل میں بیٹھے ہیں بیٹھیں کو — یہی تو ہیں عہدِ وفا کی نشانی

وجودِ یقیں عالمِ عشق میں کیا، — اِدھر بدگمانی، اُدھر بدگمانی

میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ صابر کو اظہارِ جذبات میں اور زیادہ گہرے تاثر سے کام لینا چاہیئے وہ تغزل کے خدوخال سے قریب تر ہیں لیکن ابھی اُس تک پہنچے نہیں ہیں۔ اشعار کے انتخاب کا سلیقہ بھی صابر کو نہیں آتا اسی لئے اُن کی غزلوں میں بعض بے رنگ اشعار محلِ نظر نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض اشعار میں نری سادگی ہی سادگی ہوتی ہے تفکر نہیں ہوتا۔ شعر میں جب تک اشاراتی عنصر نہ ہو اور وہ دل و دماغ دونوں کو متاثر نہ کرے اُس وقت تک تغزل کا مکمل نمونہ نہیں ہوتا۔

بہرحال صابر محفلِ ادب شعر میں جگمگانے کی کافی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اُن کا مستقبل روشن تر ہے اور وہ اہلِ زبان شعرا سے کسی طرح کم نہیں۔

نمونہ کلام

تجلیات کا دھندلا سا عکس تھا مرا دل — تمام حسن کا عالم حجاب ہو نہ سکا

تری تلون مزاجیوں کا، میں اس لئے ترجماں نہیں تھا
گماں پہ دل کو یقیں تھا جتنا، یقیں پر اتنا گماں نہیں تھا

یہ کائناتِ عشق و آرزو کے طلسم جب فاش کر رہی تھی
تمھیں بتاؤ ہر ایک آنسو شباب کی داستاں نہیں تھا؟

حائل دلوں کی راہ میں مجبوریاں نہیں — اُمیدِ التفات ابھی رائیگاں نہیں

اک پردۂ لطیف ہے وہ بھی حجاب کا — میرے تمہارے اور کوئی درمیاں نہیں

ہے زندگی گناہ تو عذرِ گناہ موت — سودے میں مرگ و زیست کے سود و زیاں نہیں

محبت ہے حریفِ جلوۂ جانانہ برسوں سے — چلا آتا ہے بے تکمیل اک افسانہ برسوں سے

یہ معراجِ جنوں ہے با صدِ احساسِ خودداری — پڑا ہے اپنے سجدوں میں ترا دیوانہ برسوں سے

ساعتِ غم میں تھا تصورِ دوست — یہ خزاں کس بہار میں گذری

ایک ٹھنڈی سانس بنجاتی ہے ساری کائنات — یاد آجاتی ہے جب وہ گرمیٔ محفل مجھے

نتیجہ کیا رہا زیرِ جبیں گر آستاں برسوں — وہ سجدہ اُن کے در پر ہو جو ہو جبیں نثار برسوں

حجابِ جلوہ گاہِ ناز اُٹھا بھی تو کیا حاصل — نظر حائل رہے گی میری اُن کے درمیاں برسوں

اعجاز صدیقی

صدائے میکش

وہ ستم دوست بنا دوست کسی کا نہ بنے
کیا بنے بات جہاں دل سے تمنا نہ بنے

بیخودی جرم نہیں ہے جو تماشا نہ بنے
حسن بھی عیب ہے گر حسن کا افسانہ نہ بنے

دل ہی اور آپ کے وعدے کا یقیں کیا کہئے
کوئی اتنا نہ بنائے کوئی اتنا نہ بنے

مجھ میں بھی اک ترا جلوہ ہے وہ کافر جلوہ
دیکھ لے تو بھی جو اے شمع تو پروانہ نہ بنے

ترے وعدے نے عجب سحر کیا ہے مجھ پر
تو بھی خود یاد دلائے تو تقاضا نہ بنے

وہ فضیلت کی ہو دستار کہ واعظ کی کتاب
ہاتھ آجائے جو میکش کے وہ پیمانہ نہ بنے

میکش اکبر آبادی

شکریہ!

اے دوست تیرے لطف و عنایت کا شکریہ
تیرے پیامِ چشمِ محبت کا شکریہ

شوخیِ حسن و حسنِ متانت کا شکریہ
آنکھوں کی ہر متین شرارت کا شکریہ

جوشِ نمو سے سرخیِ عارض ہے بے نقاب
چہرے پہ دوڑتی ہوئی رنگت کا شکریہ

کن مشکلوں کے بعد پشیماں ہوئی ہو تم
اے چشمِ ناز تیری ندامت کا شکریہ

یہ نرم نرم رس بھری رنگیں گلابیاں
لب ہائے نازنیں کی نزاکت کا شکریہ

دامن ملا ہوا ہے گریباں سے ان دنوں
آغوشِ آرزو تری جرأت کا شکریہ

اے روشنیِ عارضِ رنگیں تجھے سلام
اے کاکلِ دراز تری نکہت کا شکریہ

رنگین انکھڑیوں سے تری، جو ادا ہوئی
اے دوست اس جمیل حکایت کا شکریہ

پستیِ بخت کا نہ رہا کچھ گلہ نشاط
اس بارگاہِ حسن کی رفعت کا شکریہ

نشاط القادری

خودی اور اُس کا صحیح مفہوم

(سلسلہ کے لئے رسالہ "شاعر" ستمبر ۱۹۴۲ء دیکھئے)

"ڈاکٹر اقبال کا نظریۂ خودی" ان کی زندگی ہی میں تعدد فکر کا مرکز بن گیا تھا اور آج تک اُس پر مخالف و موافق خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے ـــــ لفظِ "خودی" کا تعلق جہاں تک لغت سے ہے اور جن معنوں میں یہ مستعمل چلا آیا ہے اُس اعتبار سے تو ہم اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔ چونکہ شعرائے پیشیں نے بھی کبھی اس لفظ کو خلافِ لغت استعمال نہیں کیا اس لئے ڈاکٹر اقبال کے اختراع پر ہمیں یقیناً چونکنا چاہیے۔ اختراع خواہ علمی۔ فنی۔ لسانی اور ادبی ہو یا صنعتی۔ طبیعاتی۔ جغرافیائی۔ تاریخی اور حرفتی یا اُس کا تعلق سائنس سے ہو بحث و نظر کی سرحدوں سے ضرور گذرتا ہے اگر اُس میں جان ہوتی ہے تو وہ اہلِ نظر کی کثرتِ رائے سے بقائے دوام حاصل کر لیتا ہے ورنہ فنا ہو جاتا ہے۔

میں بھی اب سے کچھ دن پہلے ڈاکٹر اقبال کے نظریۂ "خودی" کے خلاف تھا اور اُسے تعلیمِ اسلام کے منافی سمجھتا تھا لیکن میں نے جتنا غور کیا اور ڈاکٹر صاحب کے اشارات کے تحت میں اسے سمجھا اُتنا ہی میں اُن کی تائید پر مجبور ہوتا گیا۔ ڈاکٹر اقبال نے لفظ "خودی" کو بڑی کثرت سے استعمال کیا ہے۔ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ خودی" میں تو خصوصیت کے ساتھ "خودی" کی تفسیر بہ اندازِ گوناگوں کی گئی ہے لیکن اُن کے کسی شعر سے ناظر کے خیالات بُرائی کی طرف رجوع نہیں ہوتے۔ نہ پڑھنے والے کو اس کا شبہ ہوتا ہے کہ وہ درسِ خودی دے کر خدا کے خلاف محاذ قائم کر رہے ہیں۔ کئی سال کے غور و فکر کے بعد اب عام طور پر مشککین نے اس کا اعتراف کر لیا ہے کہ اقبال کے یہاں خودی کے معنی غرور و گھمنڈ اور خود بینی کے نہیں بلکہ اپنی ہستی کا عرفان و ادراک اور اپنی صحیح قوتوں کو محسوس کرنا ہے۔ خود اعتمادی۔ عرفانِ ذات۔ عزتِ نفس۔ بیداریٔ احساس۔ حسِ انفرادیت اور جذبۂ عمل کا نام "خودی" ہے کسی اور لفظ میں اتنی جامعیت نظر نہیں آتی۔ اردو فارسی اور عربی میں ایسے بہت سے الفاظ ہیں جو لغت کے اعتبار سے اچھے مفہوم و معنی کے حامل نہیں لیکن اصطلاح میں اکثر انھیں اچھے معنی میں استعمال کرتے ہیں یہی حال "خودی" کا ہے اور بحث و نظر سے گذر کر قبولِ عام حاصل کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ لفظِ "خودی" میں بڑی جان ہے۔

اقبال اُس دور کے شاعر ہیں جس میں مذہبِ اسلام سے حقیقی قوتِ عمل مفقود ہو چکی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمان اسیرِ مدرسہ و خانقاہ ہو چکے ہیں اور حجرہ نشیں متاعِ ایماں کے رہزن بن گئے ہیں۔ گویا مسلمان کی خودداری پستی کی اُس منزل میں تھی کہ وہ اپنی شمعِ عمل بجھا کر دوسروں سے روشنی مانگ رہا تھا۔ اسی احساس نے انھیں صوفیوں اور ملّاؤں کے خلاف بغاوت پر مجبور کیا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ صوفیا کا احترام نہیں کرتے تھے۔ کرتے تھے اور ضرور کرتے تھے یورپ جانے سے پہلے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزارِ مبارک پر انھوں نے جو منظوم دُعا مانگی وہ آج بھی زبانِ زدِ عام ہے۔ اس کی ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ انھیں بزرگانِ دین سے ہمیشہ عقیدت رہی وہ مسائلِ تصوّف سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ چونکہ انھیں اس کا احساس ہو چکا تھا کہ ہندوستان میں تصوّف ایک ڈھونگ بنتا جا رہا ہے۔ اور مسلمانوں کو ناکارہ بنانے میں اس دور کے صوفیا زیادہ سے زیادہ کوشاں ہیں اس لئے رنگیلے سجیلے صوفیا اور پیٹ بھرے فقرا کو قلاڈر بتائی۔ وہ مسلمانوں کے زوال کا سبب تعلیمِ اسلام سے غفلت کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے اسلام کی صحیح تعلیم کو اپنی شاعری کے ذریعہ پھیلایا اور شریعت کے اتباع پر زور دیا۔ یوں بھی شریعت اور طریقت میں بُعد ہے اگر ایک شخص طریقت پر شریعت کو ترجیح دیتا ہے تو وہ کوئی گناہ نہیں کرتا۔ یہ صحیح ہے کہ دونوں راستے ایک ہی منزل کی طرف جاتے ہیں لیکن شریعت پاس کا راستہ ہے اور طریقت دُور کا پھر شریعت کا راستہ جمہور مسلمانوں کو صحیح راستہ پر لگا سکتا ہے اور طریقت ایک جادۂ دشوار ہے ہر شخص کا کام نہیں کہ وہ اس راستہ پر چلے۔

اقبال کی "خودی" کا منشا انفرادی قوتوں کی نشوونما ہے۔ یقین۔ وثوق اور عمل جس کے خاص اجزا ہیں۔ جب اس میں کلام نہیں کہ انسان خدا کی ذات کا ایک پرتو ہے تو پھر عرفانِ ذات کے بغیر خدا کا عرفان کس طرح ممکن ہے؟ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ"۔

مولانا دردؔ کاکوروی نے "خودی" کے خلاف جو کچھ لکھا ہے وہ قدیم نظریہ کے مطابق صحیح ہے اس میں کسی اعتراض کی گنجائش نہیں کہ خودی سے خدا نہیں مل سکتا لیکن ڈاکٹر اقبال کی "خودی" وہ خودی نہیں ہے جو خدا سے دُور کر کے خود سر بنا دے۔ اقبال کی خودی میں "سوز و گداز" ـــ "گریہ و زاری" اور "عجز و انکسار"

غرض وہ سب کچھ ہے جو ملنغ امیری میں فقیری کا احساس پیدا کردے اور عرفانِ ذات کی اس منزل تک پہونچادے جہاں جاں جانانی تو کیا خدا دانی بھی مشکل نہیں۔ اُن کا پیام خودی صرف اتنا ہے کہ خود کو پہچانو، یعنی "خودی" سے انکا مطلب "خود شناسی" ہے۔ اُن کے کلام سے اس کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ یہ صرف چند اشارات ہیں۔ اگر حالات نے اجازت دی تو کسی وقت اقبال کی خودی پر شرح و بسط سے لکھوں گا"

اعجاز صدیقی

کتاب "جوہر اقبال" ہماری نظر سے گذری ممکن ہے کہ اس سے دوسرے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہوجائیں اس لئے فی الحال بعض ضروری امور پر ہم ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

جناب ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں ؎

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو

ہمارا مضمون اسی کی تشریح میں ہوگا۔ یعنی اقبال کی تقلید کرکے تم اپنی خودی کو ناکارہ نہ کرو مگر اُن کے عقیدتمند اس پر عمل نہیں کرتے۔ اس لئے کہ حضرات اولیاء اللہ کے نزدیک خودی جس چیز کا نام ہے اس سے اقبال عقیدت مند منکر اور تصوف کی طرف سے بدگمان ہیں ان سب کی تردید آگے آتی ہے۔

ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں :۔

"تصوف رہبانیت ہے، اسلام تصوف کے خلاف ایک صدائے

احتجاج ہے۔ تصوف قیود شرعی کو فنا کردینے کی کوشش کرتا ہے

تاریخ اسلام پڑھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ میں غلطی پر تھا تصوف اور فلسفہ

یورپ بھی غلط ثابت ہوا اسواسطے میں نے تصوف کو ترک کردیا"

تصوف نے کہیں یہ حکم نہیں دیا کہ عقد وغیرہ نہ کرو اگر کسی بزرگ نے ایسا کیا تو وہ اُن کا ذاتی فعل ہے بڑے بڑے اولیاء اللہ مثلاً حضرت غوث اعظمؒ حضرت مولانا رومؒ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ وغیرہ وغیرہ سب نے عقد کیا اور صاحب اولاد ہوئے تصوف ہرگز رہبانیت نہیں سکھاتا، یہ الزام بالکل غلط ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

چیست دُنیا از خدا غافل بدن

نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

شاید کوئی صاحب یہ کہیں کہ دوسری جگہ مولانا رومؒ ہی فرماتے ہیں ؎

ہم خدا خواہی و ہم دُنیائے دوں

ایں خیال ست و محال ست و جنوں

تو اس کا جواب یہ ہے کہ "خواہی" کا لفظ خود اسکی تشریح کررہا ہے یعنی تم اپنی خودی سے اگر یہ چاہو کہ خدا بھی ملے اور دُنیا بھی تو یہ محال ہے اور تم نے اگر اپنی خودی کو یہ نہ چاہا بلکہ اسکو خدا کی مرضی پر چھوڑ دیا تو پھر محال نہیں ہے کیونکہ ہر انسان کا مقصد صرف اپنے مالک کی رضامندی ہونا چاہئے۔ دیگر اشعار میں اسکی تصریح آتی ہے

تصوف ہرگز قیودِ شرعی کو فنا نہیں کرتا تصوف کی بابت کسی منافق عیسائی کی کتاب آپ نے دیکھی ہوگی اس سے آپ نے یہ رائے قائم کرلی ورنہ جتنے صوفی ہیں سب کا یہی قول ہے کہ سب سے پہلے شریعت اور اسکی پابندی ہے اگر کسی صوفی نے قیود شرعی کو فنا کرنے کی بابت لکھا ہے تو حوالہ پیش کیا جائے، اول تو اُس نے لکھا نہ ہوگا اور لکھا ہوگا تو آپ اسکو سمجھے نہیں صرف تاریخ اسلام پڑھکر تصوف کی بابت رائے قائم کرلینا فاش غلطی ہے جسکی تفصیل آگے آتی ہے ہم سے پہلے جناب پیرزادہ مظفر الدین احمد صاحب متخلص بہ فضلی پنشنر ڈپٹی کلکٹر محکمۂ انہار پنجاب نے **رازِ بیخودی** ڈاکٹر اقبال کی **اسرار خودی** کے جواب میں لکھی ہے انھوں نے لکھا ہے کہ اسلام عین تصوف ہے اور تصوف عین اسلام۔ جناب مولوی اسلم صاحب جیراجپوری نے اپنے نزدیک فضلی صاحب کی بہت کچھ تردید کی ہے مگر صحیح معنوں میں تردید نہ کرسکے پیر مظفر الدین احمد صاحب نے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی کتاب تو رتع کے حوالے سے جواباً جو کچھ تردید کی ہے اسکو مولوی صاحب کوئی وقعت نہیں دیتے بلکہ تحریر فرماتے ہیں "فلسفۂ استدلال جاننے والوں کے لئے یہ جواب ایک لطیفہ ہے" آپ نے استدلال پر غور نہیں فرمایا اگر آپ کے نزدیک ایسا استدلال قابل تضحیک ہے تو یاد رکھئے۔ مَن ضَحِکَ ضُحِکَ پیرزادہ صاحب مذکور نے خوب لکھا ہے ؎

اے بعلم خویش مخمور عمل

تو چہ دانی سرِّ مستانِ ازل

ڈاکٹر اقبال کے خط کا فقرہ ہے "پیرزادہ مظفر الدین صاحب نے میرا مقصد مطلق نہیں سمجھا" مگر کیا از روئے ادب اردو یہ جملہ صحیح ہوسکتا ہے؟ اول تو خلاقی طور پر "سمجھے" ہونا چاہئے اس کے علاوہ لفظ "نے" بالکل زائد ہے۔ جملہ یوں ہونا چاہئے تھا "پیرزادہ مظفر الدین صاحب میرا مقصد نہیں سمجھے" کتاب جوہر اقبال

لے جملہ، قواعد۔ انشا اور اخلاق کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے۔ اگر علامت فاعل "نے" جملہ میں نہ ہوتی تو اعتراض کیا جاسکتا تھا ——— **اعجاز صدیقی**

میں ڈاکٹر اقبال کے خط کا فوٹو شائع ہوا ہے ایسی صورت میں اسکو سہو کتابت بھی نہیں کہہ سکتے۔
ڈاکٹر اقبال نے جناب مولوی اسلم جیراجپوری کو لکھا ہے:-

"ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اسکے خلاف بغاوت کرتی ہے۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ تصوف نے کبھی فلسفہ بننے کی کوشش نہیں کی اگر کسی نے اسکو فلسفہ بنانے کی کوشش کی تو یہ صرف اس کا فعل ہے۔ نفس تصوف کا کیا قصور؟ ذات باری تعالیٰ کے متعلق اگر کسی نے موشگافیاں کی ہیں اور وہ حدیث شریف اور قرآن مجید کے خلاف ہیں تو اسکو ہم خود تسلیم کرنے کو تیار نہیں پہلے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ موشگافیاں کیا ہیں۔

اگر جناب اقبال صاحب کی روح تصوف سے بغاوت کرتی ہے تو کیا کریں تصوف وہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے من اراد ان یجلس مع اللہ فلیجلس مع اھل التصوف۔ یعنی جو اللہ کے پاس بیٹھنے کا ارادہ کرے پس اہل تصوف کے پاس بیٹھے ایسی صورت میں ڈاکٹر اقبال کی بغاوت کیا اچھی نظر سے دیکھی جا سکتی ہے؟

مولوی اسلم صاحب جیراجپوری نے اقبال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "یہ لفظ (تصوف) دوسری صدی ہجری میں عربی زبان میں داخل ہوا" مگر یہ غلط ہے اس لئے کہ ہم نے جو حدیث اوپر لکھی ہے اس میں یہ لفظ تصوف موجود ہے جس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت کے زمانے میں یہ لفظ عربی زبان میں موجود تھا تب تو آنحضرت نے یہ حدیث فرمائی اور یہ حدیث حضرت مولانا رومؒ نے مثنوی شریف میں لکھی ہے۔ اسکے علاوہ ایک اور حدیث ہے۔ علیکم بلبس الصوف تجدون حلاوت الایمان۔ (دیکھئے کشف المحجوب) **ترجمہ**:- "صوف پہننا اپنے اوپر لازم کر لو ایمان کی حلاوت پاؤ گے۔"

غرض تصوف کا یہ درجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صوفیوں کے پاس بیٹھنے کو اللہ کے پاس بیٹھنے کے برابر فرمایا ہے اب آپ آنحضرت کے ارشاد پر چلئے یا ڈاکٹر اقبال کے کہنے پر "اخلاص فی العمل موجودہ تصوف نہیں رہا" یہ صرف بدگمانی ہی بدگمانی ہے حالانکہ حدیث شریف ہے ان بعض الظن اثم۔

کشفی نظریہ جسکی وجہ سے اقبال صاحب تصوف سے بدظن ہوگئے اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کی مصلحت نہیں ہوتی تو کشفی نظریہ بھی بدل جاتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں دیکھا تھا کہ کعبہ کا حج کیا ہے اس لئے اسی سال صحابہؓ کے ساتھ آپ حج کے لئے تشریف لے گئے لیکن کافروں نے آپ کو کعبہ کی زیارت سے روک دیا اور یہ تصفیہ ہوا کہ آئندہ سال حج کیا جائے جسکے دل میں ایمان تھا اور شک کی گنجائش نہ تھی وہ ثابت قدم رہے اور واپسی عمل میں آئی۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں جب ایسا ہوا کہ خدا کی مصلحت کے تحت کشفی نظریہ بدل گیا تو آنحضرتؐ کے زمانے کے بعد اگر کشفی نظریہ کسی وقت بدل جائے تو اس سے بدگمان ہو جانا صحیح نہیں۔

مولانا شبلیؒ نے الغزالی میں لکھا ہے کہ امام غزالیؒ کے زمانے میں جس قدر مذہبی فرقے موجود تھے انہوں نے ان کے عقائد و خیالات پر غور کیا اسوقت اسلام میں چار فرقے تھے۔ متکلمین۔ باطنیہ۔ فلاسفہ۔ صوفیہ ان سب کی کتابیں انہوں نے پڑھیں الغزالی صفحہ ۱۴ و ۷۱ کا خلاصہ یہ ہے:-

"حضرت امام غزالیؒ نے سب سے آخر میں تصوف کی طرف توجہ کی۔ اس فن میں حضرت جنیدؒ۔ حضرت شبلیؒ حضرت بایزید بسطامیؒ کے جو ملفوظات ہیں ان کو دیکھا۔ ابو طالبؒ کی قوت القلوب اور حرث محاسبی کی تصانیف پڑھیں لیکن چونکہ یہ فن در اصل عملی فن ہے اس لئے صرف علم سے کچھ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا اور عمل کے لئے ضرور تھا کہ زہد و ریاضت اختیار کیا جائے ادھر اپنے اشغال کو دیکھا تو کوئی خلوص پر مبنی نہ تھا درس و تدریس کی طرف طبیعت کا میلان اسوجہ سے تھا کہ وہ جاہ پرستی اور شہرت عامہ کا ذریعہ تھی ان ترددات میں یہانتک نوبت پہنچی کہ زبان رک چلی درس دینا بند ہوگیا بالآخر امام صاحب نے تصریح کی ہے کہ خلوت و ریاضت کا طریقہ میں نے تصوف کی کتابوں سے سیکھا تھا لیکن چونکہ یہ علم کتابوں سے نہیں آتا اس لئے شیخ ابو علی فارمدی سے عملی طور پر رشد و ہدایت حاصل کی حضرت امام غزالیؒ کا بیان ہے کہ مجاہدات و ریاضات سے قلب میں ایسی صفائی پیدا ہوگئی کہ تمام حجاب اٹھ گئے اور سب شک و شبہ جاتے رہے۔"

جب عملی طور پر تصوف سے حضرت امام غزالیؒ کامیاب ہوگئے تو تائید غیبی ہوئی اور مختلف طریقوں سے ان کو بشارت دی گئی کہ اب اغیار کی تردید کرو چنانچہ اسکے بعد

انھوں نے جو تردید کی اور اصلاحی قدم اُٹھایا تو کمل طور پر اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے جسکو دُنیا جانتی ہے۔ اگرچہ تصوف کشفی علم ہے لیکن حضرت جنید وغیرہ کے **کشفی علم کو حضرت امام غزالی رح نے فلسفی ہونے کے باوجود بڑی وقعت دی اور اسکو بلا شک و شبہ مان لیا**۔ جناب اقبالؔ اگر فلسفی تھے تو ان کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ محض تاریخ سے تصوف کو حاصل نہ کرتے نہ تصوف کی کتابیں دیکھنے پر اکتفا کرتے بلکہ کسی کے حلقہ بگوش ہوجاتے اور عملی طور پر ریاضت و مجاہدے کرتے تو نہ بھٹکتے۔ اقبالؔ ایسا کرنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ ان کی شہرت میں فرق آجاتا اور کیوں کرتے وہ تو موجودہ دور کے صوفیوں سے انتہائی بدگمان تھے۔ ان کو شبہات نے راہ راست پر آنے ہی نہ دیا۔ قرآن پاک کا پارہ (۲۴) سورہ مومن نصف سے پہلے کی آیت ملاحظہ ہو یضل اللہ من ھو مسرف مرتاب یعنی حد سے گذرنے والوں اور شک رکھنے والوں کی اللہ ہدایت نہیں کرتا۔ اقبالؔ شک میں رہے کامیاب نہ ہوئے امام غزالی رح نے شک نہیں کیا کامیاب ہوگئے۔ ہدایت پاگئے۔ اقبالؔ نے علمی طور پر اپنا جدید نظریہ قائم کرکے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی۔ دُنیا میں آج بھی اس علم تصوف کے باعمل حضرات موجود ہیں ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

جناب اقبالؔ کی زندگی ہی میں جناب پیرزادہ مظفر الدین صاحب نے انکے نظریوں کی تردید کی اُن کے علاوہ **بالِ جبریل** دیکھکر ایک اور فاضل جناب میر نور بخش صاحب مائرؔ سیالکوٹی کی طویل نظم بعنوان "علامہ اقبالؔ کے نام" اخبار "مدینہ" ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ - ۲۱ جولائی ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تھی۔

اسکے چند اشعار قابل ملاحظہ ہیں ؎

زمانہ اس کا ہے جو بنائے عمل کو تقدیر جاودانہ
جو اپنی قسمت کا راز داں ہے نظر اسی کی ہے عارفانہ
چمن میں ہنگامہ دار رہنا وطن میں بے اختیار رہنا
جہاں میں بے اعتبار رہنا یہی ہیں کردار عاقلانہ
تو فخرِ ہندوستاں نہیں ہے تو شاعرِ ایشیا نہیں ہے
تو فرقہ پرور ہے فتنہ پرور برنگِ اعجازِ شاعرانہ
وطن اسیر و غلام تیرا کلام ہے بے پیام تیرا
گرہ غلامی کی کون کھولے تری خموشی ہے مجرمانہ
مثالِ فکرِ فرنگ تو نے دلوں کو دردِ ہوس دیا ہے
تجھے فقیری سے واسطہ کیا کہ روح تیری ہے قیصرانہ
وہ خون آشام تیرا شاہیں کبوتروں کی ہوس ہے جسکو
وہ خون رکھنے کا گرم جسکو ملا ہے کیا خوب اک بہانہ
حسینؓ پیدا ہوں اس چمن میں تری نوا سے یہ غیر ممکن
کہ لے حجازی ہے تیری بیشک مگر لبِ طرزِ معاویانہ

اور یہ سیالکوٹی صاحب نے بالکل صحیح فرمایا کہ اقبالؔ کی دعوت کا بالکل معاویانہ انداز ہے حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

جملۂ حیرتِ تو از جملۂ شک و تجربہ ست
تجربہ چوں گذاشتی لیل و نہار آیدت

اقبالؔ شک میں پڑ کر نور یقین سے محروم ہوگئے۔ خدا کی بڑی تعریف کرتے ہیں افرئیت من اتخذ الٰھہٗ ھواہ قرآن شریف میں ہے اسکی طرف توجہ اور غور نہیں کیا۔ اس آیت شریف کے یہ معنی ہیں، کیا تم نے اسکی طرف دیکھا جس نے خودی کو اپنا خدا بنا لیا ہے معلوم ہوا کہ خودی بُری چیز ہے تب تو خدا نے بیزاری کا اظہار فرمایا ہے حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

آں نفسے کہ باخودی یار چو خار آیدت	واں نفسے کہ بیخودی یار چہ کار آیدت
آں نفسے کہ باخودی زہرۂ گراں کند زتو	واں نفسے کہ بیخودی مہ بکنار آیدت
آں نفسے کہ باخودی خود تو شکار پشۂ	واں نفسے کہ بیخودی پیل شکار آیدت
آں نفسے کہ باخودی حوصلۂ تو ذرہ ایست	واں نفسے کہ بیخودی دل چو بحار آیدت
آں نفسے کہ باخودی ہجر خزاں فزود	واں نفسے کہ بیخودی ہم چو بہار آیدت

مولوی اسلم جیراجپوری صاحب نے ڈاکٹر اقبالؔ صاحب کی حمایت میں حضرات صوفیہ کے سرمایۂ توکل و قناعت وغیرہ پر جو حملے کئے ہیں اس سے ہم کو بہت صدمہ پہنچا ہے اس لئے ہم اسکی تردید کرنے پر مجبور ہیں مولوی صاحب ہم کو معاف فرمائیں۔ یہ لکھنا کہ "تصوف کی وجہ سے مسلمانوں کے فاتحانہ جذبات مردہ ہوگئے۔ قوتِ عمل جاتی رہی" وغیرہ وغیرہ یہ محض خیال ہی خیال ہے۔

ہلاکو خاں اور چنگیزی سلطنت نے اگرچہ سلطنت کے ٹکڑے اُڑا دیئے اور اسلام کو نقصان پہونچایا مگر زیادہ زمانہ نہیں گذرنے پایا کہ نصف صدی کے اندر ہی دشمن خود اسلام کے قدموں پر سر جھکا دیتے ہیں۔ وہی قوم ہے جسکو ترک کہا جاتا ہے اور جسکو اسلامی دشمن کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا دشمنوں کے مقابلہ میں اسلام کے لئے وہی قوم آج سینہ سپر نظر آرہی ہے۔ یہی قرآن کا تصوف اور تعرف ہے جسکے سمجھنے کے لئے فرصت ہو

کر علم تصوف پر عملی عبور ہو۔ صوفی وہ ہے جو کائنات کی ہر جنبش کو مرضیٔ مولا کے تابع سمجھے۔

آپ کا یہ نظریہ کہ مسلمانوں کے فتوحاتی جذبات فنا ہو گئے مردہ ہو گئے۔ خانقاہوں سجادوں اور بوریوں کو انھوں نے اپنا سرمایۂ حیات سمجھکر بیکار زندگی بسر کی۔ مگر آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا ع

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

وریانشیں وہ کام کر گئے جو ایک سپاہی میدانِ جنگ میں برہنہ شمشیر سے کرتا ہے **چنگیز خاں ہلاکو** کے مظالم سے صوفیوں کے قلوب مردہ نہیں ہوئے بلکہ اور زندہ ہو گئے اور انھوں نے اپنے حق تعالیٰ سے بالاعلان نہیں بلکہ درپردہ اسلام اور مسلمانوں کو فلاح و بہبود کے لئے جو التجائیں پیش کیں وہ بارگاہِ الٰہی سے فرمانِ قبولیت لیکر واپس ہوئیں اور مناجات سحری کام آئی اور وہی قوم جو اسلام کی دشمن تھی آج اسلام کی حلقہ بگوش ہے اور اپنے مظالم کے کفارہ میں اپنے آپ کو سینہ سپر کئے ہوئے ہے صرف قولاً فعلاً نہیں بلکہ عملاً بھی۔

جب اسلامی سلطنت کو عروج ہوا تو اکثر لوگ تصوف یعنی رجوع الی اللہ ہونے سے دور ہو گئے۔ عیش و عشرت میں پڑ کر خدا کو بھول گئے کیونکہ اقبالی والی خودی اُنکے ذہن نشین تھی[1] کہ ہم اس وقت حاکم ہیں ہم کو کون نقصان پہونچا سکتا ہے۔ ہم سے دنیا لرزتی ہے۔ تو اسی خودی کا منجانب اللہ یہ جواب ملا کہ کچھ نہ رہا۔ عادت الٰہی یہی جاری رہی ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے کہ من فئۃ غلبت علی کثیر یعنی کم تعداد کو اللہ نے ہمیشہ فتح دی ہے کیونکہ کثیر تعداد کی وجہ سے غرور ہو جاتا ہے چنانچہ بزمانہ آنحضرتؐ ایک جنگ میں جب بہت سی اسلامی فوج تھی تو حضرت معاذؓ نے خوش ہو کر کہا آج ہماری فوج دشمن کی فوج سے بہت زیادہ ہے اب تو فتح لازمی ہے مگر مسلمانوں کو شکست ہو گئی حضرت معاذ اور دیگر صحابہ کو بہت تعجب و افسوس ہوا۔ آنحضرتؐ کے پاس حضرت جبرئیل آئے اور فرمایا کہ مسلمانوں کو اپنی کثیر تعداد اور قوت پر بھروسہ تھا۔ خدا پر بھروسہ نہ تھا اس لئے شکست ہوئی۔ **اسی وجہ سے اقبالی خودی کی تقلید ہمارے لئے مفید نہیں** کیونکہ وہ خدا پر بھروسہ نہیں سکھاتی۔ خانقاہوں کو تخلیقِ خودی کی کیا ضرورت ہے وہ آپ کے نزدیک شعلۂ نمخوردہ ہیں تو رہنے دیجئے۔

صوفیوں کی بیخودی جس پر مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ اُس کے متعلق حضرت مولانا رومؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

شمس الحق تبریزیؒ مستی و مدہوشی
کارے نکند ہرگز ناکارہ نخواہد شد

آپ یہ سمجھتے ہونگے کہ انکی مستی اور مدہوشی اسلام کے حق میں سم قاتل ہے نہیں ہرگز نہیں بلکہ مسلمانوں کو جو کچھ فتوحات یا مراتب دنیوی حاصل ہوئے یہ سب اُنکی بیخودی کے طفیل میں نصیب ہوئے ہیں۔ اپنی ہمایوں کے باوجود اکثر بادشاہ اولیا اللہ سے دُعا کے طالب ہوئے ہیں اور صوفیوں کی دُعا و توجہ سے اُن کو فتح حاصل ہوئی ہے حضرات صوفیہ کے ملفوظ جنکے شاہد ہیں کہ اُنھوں نے حسب اشارۂ غیب ان کو محروم واپس نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ تھوڑے دن میں ظہور پذیر ہو گیا۔ یہ خیال کہ تصوف یا صوفی ایک بیکار اور لاشے محض ہیں بالکل غلط ہے اگر غور سے کام لیا جائے تو حقیقی واقعات خود اسکی حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس کے لئے اولیا اللہ کی سیریں ملاحظہ فرمائیے۔ شاہانِ مغلیہ کی فتوحات میں صرف اسکی جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً گول کنڈے کے قلعہ کا واقعہ۔ اسکو کالجوں کی تاریخوں میں نہ دیکھئے جس میں اورنگ زیب کو متعصب بادشاہ بتایا گیا ہے جس سے غیر مسلم اسکے نام سے آج تک نفرت کرتے ہیں اسکو تاریخ نہیں کہا جا سکتا اگر اس قسم کی تاریخوں سے نتیجہ نکالا جائے گا تو قابلِ اعتماد نہیں۔ ہاں تو۔ بمقام حیدرآباد جب عالمگیر کو فتوحات میں مشکل کا سامنا ہوا تو اس نے صوفیوں سے دُعا کی درخواست کی اور مدد چاہی۔ جسکی تفصیل یہ ہے کہ تقریباً چھ ماہ تک اورنگ زیب نے گولکنڈہ کے قلعہ کا محاصرہ کیا فتح نہ ہوتی تھی۔ وہ صوفی منش آدمی تھا۔ اس سے اسکو یقین تھا کہ جب تک اسمیں کسی کامل کا ہاتھ نہ ہوگا کامیابی ناممکن ہے۔ بالآخر ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دُعا چاہی اُنھوں نے کہا کہ یہ کام تمہاری فوج کے اُن تندبھائیوں

---

[1] اس نفسانیت کا کچھ نہ کچھ حصہ ہر اسلامی حکومت میں آپ ضرور پائیں گے اور یہی تباہی کا باعث ہوتی ہے ملاحظہ ہو **تاریخ الامت** مؤلفہ مولوی اسلم جیراجپوری حصہ سوم صفحہ ۱۲۵ کہ خلفائے بنی امیہ نے اپنے جوش انتقام میں امت کے بہت سے نامور سپہ سالاروں اور بے نظیر بہادروں کو اپنے اس ناپاک نفسانی جذبہ پر قربان کر ڈالا۔ سلیمان بن عبدالملک نے خلیفہ ہونے کے بعد اس غصہ میں کہ حجاج نے اسکو ولی عہدی سے معزول کرانے میں ولید کی موافقت کی تھی اس کے تمام رشتہ داروں اور ماتحت عاملوں کو سزائیں دیں (سب بڑھکر یہ کہ) **محمد بن قاسم فاتح سندھ** کو مار ڈالا۔ **صفحہ ۱۲۸ حصہ سوم تاریخ الامت** - خلیفہ مستنصر کا جب انتقال ہوا تو اس کا بیٹا ابو احمد مستعصم باللہ کے لقب سے تختِ خلافت پر بیٹھا سارا کاروبار خلافت اپنے وزیر ابن علقمی رافضی پر ڈال دیا اور خود عیش و طرب میں منہمک ہو گیا۔ تاریخ الخلفا صفحہ ۴۸۴۔

نفسانیت دیکھئے مستعصم خلیفہ کے بیٹے ابوبکر کے اشارہ سے اہلِ سنت نے شیعوں کے محلہ کرخ کو لوٹ لیا اور اسکے باشندوں کو مارا اسی عناد و تعصب کی وجہ سے خلیفہ کے وزیر ابن علقمی نے جو نہایت غالی شیعہ تھا ہلاکو خاں کو بغداد پر حملہ کرنے کی ترغیب دلائی صفحہ ۲۱۱ تاریخ الامت ——— **درد کاکوروی**

کے ہاتھ سے انجام پائے گا جن میں سے ایک کا نام یوسف دوسرے کا نام شریف ہے تم کل ان کے ہاتھ میں جھنڈا دیکر حملہ کرو اور کہا آج شب کو تمہارے کیمپ میں ایک آندھی آئے گی اسقدر سخت کہ تمام ڈیرے خیمے اُڑ جائیں گے اور تمہاری فوج کے بہت لوگ منتشر ہو جائیں گے. سخت بے چینی پھیلے گی تم اسی حالت میں اُٹھکر اپنے کیمپ کا معائنہ کرتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہونچو گے جہاں ایک خیمہ صحیح سلامت نظر آئے گا اس خیمے میں وہ دونوں بھائی قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہوئے نظر آئیں گے. چراغ روشن ہوگا تم انکے ہاتھ میں جھنڈا دے کر حملہ کرنا. عالمگیر نے ایسا ہی کیا اور فتح پائی. حیدرآباد میں ان دونوں بھائیوں یوسف صاحبؒ شریف صاحبؒ کے مزار موجود ہیں. اور یہ قصہ زبان زد خاص و عام ہے. یہ صوفیوں کا تصرف نہیں تو اور کیا ہے.

حضرت مولانا رومؒ کے حالات میں حضرت شمس الدین افلاکی نے مناقب العارفین کتاب لکھی ہے اس میں بھی اس قسم کے واقعات درج ہیں کہ مولانا سے سلطان وقت نے دُعا چاہی ہے. اسی طرح حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں صفحہ ۲۰۰ ہمایوں بادشاہ کا قصہ لکھا ہے کہ شاہ منصورؒ مجذوب کے پاس فتح کی دُعا کے لئے گیا تھا. غازی عثمان جو ترکوں کی سلطنت کا بانی ہوا اس کا اصل قصہ مختصر یہ ہے کہ غازی عثمان کو ایک روشن ضمیر بزرگ شیخ ادب عالی کی لڑکی مال خاتون سے عشق تھا. غازی عثمان نے جب نکاح کی درخواست کی تو اس کو شیخ ادب عالی نے اپنی درویشانہ اور عثمان کی امیرانہ حالت کا فرق دیکھکر قبول نہ کیا (دراصل الحیاءُ شعبۃ من الایمان کے تحت بظاہر اظہار عشق کی وجہ سے انکار کر دیا اور درپردہ ایسی دعا و توجہ کی کہ غازی عثمان نے) خواب میں دیکھا کہ شیخ کے سینے سے ایک ہلال نکل کر بلند ہوا اور بدر کامل بن کر میرے آغوش میں اُتر آیا. (دیکھئے تاریخ الامت حصہ ہفتم صفحہ ۷) اس سے ایک درخت نکلا جسکی شاخیں بحر و بر اور دشت و جبل پر چھاگئیں اور اسکی پتیاں لنگی ہوئی تلوار کی طرح ہوا کے جھونکوں سے قسطنطنیہ کی طرف بڑھنے لگیں. غازی عثمان نے روشن ضمیر بزرگ ادب عالی سے یہ خواب بیان کیا انھوں نے مبارک فال کی تعبیر دیکھکر مال خاتون کو عثمان کے نکاح میں دے دیا. نکاح کے وقت ان بزرگ نے کیا کچھ مزید دُعائیں نہ دی ہوں گی. غرض سلطنت عثمانیہ ترکی انھیں بزرگ کی دُعا سے غازی عثمان کو ملی. اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں اگر لکھے جائیں تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا.

ڈاکٹر اقبالؔ صاحب نے مولوی اسلم جیراجپوری کو اپنے خط میں لکھا ہے :-

"میں نے ایک تاریخ تصوف لکھنی شروع کی تھی مگر افسوس کہ مسالہ نہ مل سکا وہ ایک باب لکھ کر رہ گیا. پروفیسر نکلسن اسلامی شاعری اور تصوف کے نام سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں جو عنقریب شائع ہوگی. ممکن ہے کہ یہ کتاب ایک حد تک وہی کام کرے جو میں کرنا چاہتا تھا."

اقبالؔ صاحب نے ڈاکٹر نکلسن کی جس کتاب کا حوالہ دیا ہے وہ جب نظر سے گذریگی اسوقت دیکھا جائیگا لیکن ڈاکٹر نکلسن نے لفظ تصوف کی بابت جو خیال ظاہر فرمایا ہے اس کا ترجمہ رسالہ جامعہ دہلی محرم ۱۳۴۵ھ مطابق جولائی ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا اس کا وہ حصہ جو ہماری تائید میں ہے حسب ذیل ہے.

"یہ سمجھا گیا ہے کہ تصوف کے اہم تخیلات غیر اسلامی سرچشموں مثلاً عیسائی رہبانیت یونانی مذہب حکمت یا ہندوستانی معتقدات وغیرہ سے ماخوذ ہیں اس میں کچھ حقیقت ہے لیکن حقیقت تامہ نہیں میری رائے میں اگرچہ تصوف نے اثنائے ارتقا میں متفرق تحریکات سے بھی جن سے اسکو سابقہ پڑا بہت کچھ حاصل کیا لیکن اصلی اور بنیادی طور پر وہ اسلام ہی سے تعلق رکھتا ہے."

تصوف اور اسکی حقیقت کو غیر متعلق حضرات سے معلوم کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہم مختلف کھانوں کی اصلیت وغیرہ باورچی کو چھوڑ کر بڑھئی یا لوہار وغیرہ سے معلوم کریں.

اب ہم حضرات صوفیہ ہی کی کتاب سے اسکی حقیقت بتاتے ہیں حضرت شاہ علی حیدر قلندر (زینت بخش سجادہ کاظمیہ کاکوروی) نے تصوف کا ایک لغت لکھا ہے جس کے دیباچہ میں تصوف پر اچھی بحث کی ہے ہم اس کا ضروری حصہ یہاں درج کرتے ہیں.

"تصوف بروزن تفعل اسکے معنی صوف پہننے کے ہیں اور صوف بضم صاد اس کپڑے کو کہتے ہیں جو پشم گوسفند کا بنایا جائے زمانہ سابق میں حضرات اولیا اللہ انتہائی انکساری کی وجہ سے صوف[1] پہنتے اور اسی پر قناعت کرتے چنانچہ حضرت موسیٰؑ طور پر جاتے تو صوف کی کملی اوڑھے ہوتے تھے یہ بھی ممکن ہے کہ تصوف صوف بفتح صاد سے ماخوذ ہو جسکے معنی یکسو ہونے اور روگردانی کے ہیں چونکہ واصلانِ حق ماسوا اللہ سے یکسوئی اور روگردانی اختیار کرتے ہیں اس لئے ان کے اعمال اور معارف کو تصوف اور خود ان کو صوفی کہا گیا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صوفیہ اہل صفہ کی طرف منسوب ہو جو آنحضرتؐ کے زمانے میں تھے."

[1] صوف والی حدیث ہم پہلے لکھ چکے ہیں ——— وارد

مولوی اسلم صاحب جیراجپوری کا حضرات صوفیہ پر اعتراض ہے کہ "سجادہ ہی پر سفر در وطن کی کڑی منزلیں طے ہونے لگیں"۔ حالانکہ سفر در وطن کی کڑی منزلیں ہمیشہ سے سجادہ ہی پر طے ہوئی ہیں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک جہاد سے واپس ہوئے تو فرمایا رجعنا من جہاد الاصغر الی جہاد الاکبر۔ یعنی ہم چھوٹے جہاد کی طرف واپس ہوئے تو آنحضرتؐ نے اس دنیا کے جہاد کو چھوٹا جہاد فرمایا اور نفس کے جہاد کو بڑا جہاد۔ اور جب ایسا جہاد بھی ہے جس کا تعلق جائے قیام سے ہے تو پھر ایسا سفر بھی ہوگا جس کا تعلق جائے قیام سے ہو۔ حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

قرب نے پستی ز بالا رفتن ست
ہم بااصل خویش واصل گشتن ست

پھر کہیں سفر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مصنف گلشن راز فرماتے ہیں ؎

آسماں ہاست در ولایت جاں
کار فرمائے آسمانِ جہاں

اس سے ظاہر ہے کہ جس سفر در وطن کو حضرات صوفیہ سجادے پر طے کرتے ہیں وہ روحانی سفر ہے نہ کہ جسمانی۔

جناب اسلم صاحب فرماتے ہیں "شریعت اور حقیقت دو راستے قرار پائے"۔ کچھ صوفیوں نے دو راستے نہیں قرار دیئے روز ازل سے فطرت ہی نے یہ اصول رکھا ہے۔ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کا ایک ظاہر اور ایک باطن نہ ہو آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن چنانچہ آنحضرتؐ ہی کے وقت سے اسکی تفریق موجود تھی یوں تو سب اصحاب تھے مگر اصحاب صفہ وہ صحابی تھے جنکو صرف خدا کی عبادت سے کام تھا۔ جنگل سے لکڑیاں لاتے اور خدا کی عبادت کرتے ان کو سیاست سے کوئی ظاہری واسطہ نہ تھا جس سے شریعت اور حقیقت کی خود بخود وضاحت ہوگئی۔

اسلام کے متعلق ڈاکٹر لیبان کی رائے کوئی وقعت نہیں رکھتی اس کا یہ کہنا کہ ہندوستان میں آکر اسلام کی مٹی خراب ہوئی یا ہندوستان میں جو اسلام رائج ہے اسکی بالکل وہی حالت ہے جو ہندو مذہب کی سراسر غلط ہے۔ ہندوستان میں اسلام نے بہت نشوونما پائی۔ کیا حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی۔ حضرت خواجہ اجمیریؒ۔ سید سالار مسعود غازی وغیرہ جیسے حضرات نہیں ہوئے۔ کیا ان کے کارناموں کو فراموش کر دیا جائے۔ کیا ان سے ہندوستان میں آفتاب کی طرح اسلام نہیں چمکا۔ بلکہ ان حضرات نے اپنے تصوف اور تصرف سے ایسا اسلام کا ڈنکا بجایا کہ ہندو بھی آج اسلام کے اکابر اولیا اللہ حضرت غوث اعظمؒ جیسے بزرگوں کے معتقد ہیں۔

جناب اسلم صاحب کا یہ کہنا کہ "تصوف کے مسئلہ فنا و نفس کشی نے مسلمانوں کی قوت عمل کو باطل کر دیا"۔ یہ بھی صحیح نہیں تصوف کا یہ مسئلہ قرآن شریف کی آیت ما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء اور حدیث شریف لاحول ولا قوۃ الا باللہ سے ماخوذ ہے پھر قوتِ عمل بیکار اور باطل کس طرح ہو سکتی ہے بلکہ اس سے تو راہ عمل کے خس و خاشاک صاف ہو جاتے ہیں نفس کو ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ اب رہا لاحول تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم میں فی نفسہٖ کوئی روحانی قوت نہیں ہے اگر ہے تو صرف اللہ کی مدد سے روحانی طاقت ہے جب ہم یہ سمجھیں گے تب ہم میں خدائی قوت ظہور کرے گی۔

ہمارے بھائی مولوی وصی علی صاحب مرحوم اپنے مواعظ میں اکثر حضرت مولانا جمالیؒ کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

موسیٰ زہوش رفت بیک پرتو صفات
تو عینِ ذات می نگری در تبسمے

بچپن سے یہ شعر کانوں میں پڑا ہوا ہے ایک روز ہمارے دوست مولوی صوفی عبدالرحمٰن صاحب فتحپوری نے تذکرہ کیا کہ بھائی عبداللہ صاحب کہتے تھے کہ ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر کیسا اچھا ہے۔ پھر "نیرنگ خیال" کے ایک پرچہ میں بھی ایک مضمون نظر سے گذرا صاحب مضمون نے بھی اسکو ڈاکٹر اقبال کے اور اشعار کے ساتھ لکھا تھا جدید تعلیم یافتہ حضرات کی تحقیق اس سے ظاہر ہے کہ کس پایہ کی ہے۔ میں نے اڈیٹر صاحب "نیرنگ خیال" کو اسکے متعلق لکھا تھا مگر انھوں نے ادھر کوئی توجہ نہیں کی۔ اس دلیل میں کہ یہ شعر حضرت مولانا جمالی کا ہے۔ ہم دو کتابوں کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔ ایک تاریخ المشاہیر کا صفحہ ۲۱۲ ملاحظہ ہو۔ دوسرے حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب اخبار الاخیار کا صفحہ ۳۲۷۔

ڈاکٹر اقبال صاحب فرماتے ہیں ؎

در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

مطلب یہ ہے کہ میرے جنونی ہاتھ میں جبریلؑ بڑا شکار ہے اے ہمت مردانہ یزداں یعنی اللہ کو جال میں پھانس لے۔ جتنے انبیا گذرے ہیں سب کے پاس جبریلؑ آتے رہے سب سے بڑھکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے اور وحی لاتے تھے۔ اس لئے انکو "زبوں صید" کہنا آداب شریعت کے خلاف ہے اس میں ذم کا پہلو بھی ہے یعنی آنحضرتؐ نے جبریلؑ سے استفادہ کیا ان کو اپنے جال میں پھانسا بہت بڑا شکار کیا اگر مردانہ ہمت تھی (گویا یہ آنحضرتؐ پر اعتراض ہے استغفر اللہ) تو اللہ کو جال میں

پھانسا ہوتا۔ مگر جبرئیلؑ کو زبوں صید ایک فلسفی لامذہب ہی کہہ سکتا ہے جسکو ذرا بھی مذہب سے لگاؤ ہے کبھی جبرئیلؑ کو زبوں صید نہ کہے گا۔ نہ مذہبی حیثیت سے اسکو ایسی جرات ہوگی کہ وہ اللہ کو جال میں پھانسو" کہے۔ اگر کوئی شخص طب کی کتابیں دیکھکر علاج کرنے لگے تو نیم حکیم خطرہ جان کہا جاتا ہے۔ طبیب ہرگز نہیں کہا جاتا کیونکہ جب تک کسی ماہر فن کو استاد بناکر اسکی شاگردی نہ کرے ایڑیاں نہ رگڑے اور اس فن کو نہ صرف علمی بلکہ عملی طور پر حاصل نہ کرے صحیح معنوں میں صاحب فن نہ کہا جائیگا۔ ڈاکٹر اقبال کا یہی حال ہے کہ من مانے صوفیانہ دون کی لینے لگے۔ حضرت مولانا رومؒ کا جو شعر سامنے رکھکر یہ شعر کہا گیا ہے وہ یہ ہے ؎

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند
فرشتہ صید پیمبر شکار یزداں گیر

مگر حضرت مولانا رومؒ کے اس تخیل اور اقبال کے تخیل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اصل اصل ہے۔ نقل نقل۔ اس لئے کہ مولانا نے "بزیر کنگرۂ کبریاش" کہکر اپنے دعوے کو خودی، کبر، نخوت سے بچالیا۔ تاکہ رجال الغیب یا اولیا اللہ کی جس عظمت کا تذکرہ کیا جارہا ہے وہ اللہ کی جلالت اور کبریائی سے ٹکر نہ کھائے مگر اقبال اپنے آپ کو نہ بچاسکے۔ اپنے نفسیاتی غرور میں "جبریل زبوں صیدے" کہدیا یہ نہ خیال کیا کہ اسکا اثر کہاں تک پہونچتا ہے کیا اس سے آنحضرتؐ کی شان میں گستاخی نہیں ہوتی مولانا کا شعر اس سے بالکل پاک ہے انھوں نے نام نہیں لیا صرف فرشتہ صید کہا جس سے عام فرشتے مراد ہیں جیسا حضرات صوفیہ کی کتابوں سے پتہ چل سکتا ہے کہ خاص فرشتے کون ہیں اور عام کون۔ اب رہا پیمبر شکار تو قیامت میں تمام پیغمبر آنحضرتؐ سے شفاعت چاہیں گے اسی طرف اشارہ ہے اس کے بعد یزداں گیر ہے تو یزداں گیر سے مولانا رومؒ کا مطلب یہ ہے کہ عشق الٰہی حاصل کرنے والے، یزداں بکمند آور سے حصول عشق الٰہی مراد نہیں لیا جاسکتا کیونکہ یہاں "گیر" نہیں ہے" بکمند آور" ہے جس سے خودی اور نخوت ٹپک رہی ہے جو فلسفیانہ جنوں کا مظاہرہ ہے اسکو روحانیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ ڈاکٹر اقبال کی حیثیت نیم حکیم خطرہ جان کی سی ہے جس سے امت خطرہ میں پڑگئی۔

حضرت حافظ شیرازؒ

جناب اسلم جیراجپوری صاحب نے اپنے مضمون میں اس امر پر بہت ناگواری کا اظہار کیا ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے حافظ شیرازی کے اشعار کے متعلق جو کچھ لکھا تھا اسکو ناحق دیباچہ سے نکال دیا حالانکہ ڈاکٹر اقبال نے اپنے خط میں خود اقبال کیا ہے کہ :-

"میں خود مطمئن نہ تھا اور اس پر بحث لے دے ہوتی اس لئے میں نے اسکو دیباچہ سے خارج کردیا"

مولانا حکیم فیروز الدین صاحب طغرائی نے ڈاکٹر اقبال کے جواب میں حضرت حافظ شیرازؒ کے کلام پر لسان الغیب ایک کتاب لکھی ہے۔ جو شائع ہوچکی ہے۔ مولوی اسلم صاحب نے زور میں آکر اپنے مضمون میں طنزاً حافظ کا یہ شعر لکھا ہے ؎

مئے دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ
ہمیں بس ست مرا صحبت صغیر و کبیر

گویا اپنے نزدیک حضرت حافظ شیرازؒ کو مطعون کرنے کے لئے یہ شعر لکھا ہے مگر افسوس کہ انھوں نے غور سے کام نہیں لیا۔ مولوی اسلم صاحب جب تصوف کے کوچے سے ناآشنا ہیں تو ان کو خامہ فرسائی کی کیا ضرورت ہے۔ پہلے اصطلاحات تصوف پر عبور حاصل کریں تب صوفیانہ اشعار کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اس شعر میں مئے دو سالہ" سے شراب کلام اللہ باعتبار نزول مراد ہے کیونکہ کلام اللہ پہلے شب قدر میں دو مرتبہ باری آنحضرت پر بذریعہ جبرئیل علیہ السلام نازل ہوا۔ یہی مئے دو سالہ ہے۔ اور محبوب چاردہ سالہ سے محبوب کبریا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں۔ صغیر سے قرآن شریف اور کبیر سے آنحضرت کی طرف اشارہ ہے۔ جو چودہ سال میں بھی ایسے تھے کہ جناب باری کے منظور نظر ہوچکے تھے اور لوگ آپ کے تقدس کے قائل تھے اور آپ کو امین کہا کرتے تھے۔ آنحضرت کے اس زمانے کو اس طرح بھی کہا گیا ہے ؎

نگار ما کہ بمکتب نرفت و خط نہ نوشت
بغمزہ مسئلہ آموخت صد مدرس شد

بقول حضرت مولانا رومؒ ہر ایک کی اصطلاح جدا ہے۔

ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم ہر کسے را اصطلاحے دادہ ایم
در حق او نور در حق تو نار در حق او ورد و در حق تو خار

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

اصطلاحات تصوف سے واقف ہونے کے لئے مصباح التعرف لارباب التصوف (تصوف کا لغت) دیکھئے۔ جو قیم کتب خانہ انوریہ ڈاک خانہ کاکوری ضلع لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

۱؎ یہ وہی جبرئیل علیہ السلام قرآن لانے والے ہیں جنکو اقبال نے زبوں صید بنادیا ہے ——— وارد

حضرت منصورؒ کی انا

"ڈاکٹر اقبال اپنی انا (خودی) کو ڈنکے کی چوٹ منوانا چاہتے ہیں اور حضرت منصورؒ کی انا سے بہت بیزار ہیں جیسا کہ اُن کے خط سے ظاہر ہے وہی مثل ہے گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز۔ ڈاکٹر اقبال حضرات صوفیہ کی انا کو کیا جانیں۔ ان کو اسکی ہو بھی نہیں لگی۔ حضرات صوفیہ کا کثیر گروہ حضرت منصورؒ کا موید ہے اسکے علاوہ خود حضرت مولانا رومؒ جنکو ڈاکٹر اقبال نے لفظی رہبر بنایا ہے دیکھئے انا کی بابت کیا فرماتے ہیں ؎

گفت فرعونے انا الحق گشت پست
گفت منصورے انا الحق او برست

یعنی فرعون اور منصور دونوں نے انا الحق کا دعویٰ کیا مگر فرعون مردود ہوا اور حضرت منصورؒ خودی ترک کرنے سے مقبول بارگاہ الٰہی ہوگئے ؎

ایں انا را رحمۃ اللہ اے عجب
واں انا را لعنۃ اللہ اے عقب

ایک انا کہنے والا ترک انانیت کی وجہ سے رحمت کا مستحق ہوا اور دوسرا انا کہنے والا خدا کی لعنت کا مستحق قرار پایا ؎

زانکہ او سنگِ سیہ بود ایں عقیق	آں عدوے نور بود وایں عشیق
ایں انا گفت وز خود آزاد شد	واں انا گفت وز خود برباد شد

فرعون سنگ سیاہ تھا یعنی اس کا دل سیاہ پتھر تھا اپنی نفسانیت اپنی خودی سے خدا کی دشمنی میں انا کہتا تھا اس لئے نور کا دشمن تھا اسی لئے برباد ہوا حضرت منصورؒ عقیق تھے اللہ کے سچے عاشق تھے انھوں نے اپنی خودی اپنی نفسانیت سے انا نہیں کہا بلکہ خدا کی دوستی یعنی بیخودی سے انا کہا اس لئے وہ نار کے دشمن قرار پائے اور قید تعین سے آزاد ہوگئے یعنی سب حجاب اٹھ گئے اللہ نے ان کو اپنا ولی بنالیا۔

اس طرح ہم اقبالی خودی سے انا کہنے کو تیار نہیں کیونکہ حضرات صوفیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا منافقت ہے کیونکہ اقبالی خودی یا اقبالی انا کی بنیاد نفسانیت پر ہے اور حضرت منصورؒ کے انا کی بنیاد روحانیت پر ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ اللہ کے رسول ہیں لیکن منافقوں نے جب اسکی گواہی دی تو اللہ نے خود اسکی تردید کردی (حالانکہ بات سچی تھی) ملاحظہ ہو سورۃ منافقون۔ پارہ قد سمع اللہ (۲۸) اذا جاءک المنافقون قالوا نشھد انک لرسول اللہ واللہ یعلم انک لرسولہ واللہ یشھد ان المنافقون لکاذبون[1] (ترجمہ) جب آپ کے پاس منافق آئیں اور کہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ آپ اسکے رسولؐ ہیں اور گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔

اب ذرا غور فرمایئے کہ آنحضرتؐ اللہ کے رسول ہیں یہ کتنی سچی بات ہے لیکن جب یہی بات منافقوں کی زبان سے نکلی تو اللہ نے اسکو جھوٹا قرار دیا۔ اسی طرح مرتبہ انا کا دعویٰ اور اظہار جب نفسانی دنیا والے کریں تو وہ جھوٹے ہیں اور جب روحانی دُنیا والے انا کا دعویٰ کریں تو سچے ہیں۔ حضرت منصورؒ کیا ہر صوفی کامل کی انا بجائے خود سچی اور حقیقی ہے کیونکہ بقول مولانا رومؒ وہ اللہ کے عشیق ہیں اور وہ انسان جس کا نفسانی دُنیا سے تعلق ہے۔ عدوئے نور ہے ناری ہے۔ اپنی خودی اور نفسانیت کے مدنظر انا کہتا ہے وہ ہرگز قبول نہیں۔ اسکی حد حاصل کیا ہے اس کو قطب وقت یا کسی کامل سے پوچھنا چاہئے اور اس کے پاس نیک گمان لیکر آیئے تو کچھ ملے گا۔ دل میں بغض و کینہ اور حضرات صوفیہ سے بغاوت ہے تو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ممتاز ترین شاعرِ ایشیا علامہ سیاب نے اپنی نظم "غازی" میں خودی کی ترجمانی فرمائی ہے جسکے چند اشعار قابلِ ملاحظہ ہیں:۔

خدا میں اور خودی میں جنگ کا اقدام ہوتا ہے	مزاجِ خاک میں کب جوشِ بے ہنگام ہوتا ہے
خدا ہنستا ہے اس دیوانگی پر خود پرستوں کی	زبردستی نظر آتی ہے مضحک زبر دستوں کی
عطا کرتا ہے اک احساس نیز خاص بندوں کو	کھڑا کرتا ہے دیکر خاص قوت مستندوں کو
وہ بندے جن میں خودداری بقدرِ خود شناسی ہے	وہ بندے جنکو روح و دل کا احساسِ اساسی ہے
جو اپنی روح کو فطرت کا اک ایما سمجھتے ہیں	جو اپنی ہر ادا کو مرضیِ مولا سمجھتے ہیں
خودی و خود شناسی میں جنھیں تمیز ہوتی ہے	اشاروں پر خدا کے جنکی ہر تجویز ہوتی ہے
وہ اٹھتے ہی خودی کے جام و ساغر توڑ دیتے ہیں	غرور و نخوت و پندار کا سر توڑ دیتے ہیں

یہ ہے تفسیرِ خودی اور قومی شاعری اسے کہتے ہیں اور یوں دعوت دیا کرتے ہیں۔ دراصل اقبال صاحب نے خود تصوف میں فلسفہ کو ملا دیا ہے۔

غرض اقبال صاحب نے اپنی خواہشوں کو اور ملک گیری کی ہوس کو مذہبی رنگ دیکر پیش کیا ہے۔ ایسی طلب ایسی خودی ایسی ہوس سراسر قابل ترک ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمان بھائیوں کو اسکی توفیق و ہدایت دے جب ہم ہر حالت میں اپنے کو تصور بلا اور گناہگار جانیں گے تب خدا کا کرم ہوگا۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

درد کاکوروی

[1] اسی لئے منافق اگر آنحضرتؐ کی تعریف کریں یا نعرۂ تکبیر خود تعریف کریں تو وہ قبول نہیں۔ درد

غلام کا خواب

کاٹ کر دھانوں کو ہو کر چور محنت سے غریب　　سو رہا ہے ہاتھ میں کھُرپی دبائے بدنصیب
پیکرِ بے پیرہن، بالوں کی ژولیدہ لٹیں　　دفن ہوں جیسے کچھ ایسے اٹ رہی ہیں ریت میں
گرد آلودہ فضائے خواب میں آیا نظر　　یک بیک اسکو وطن کا جلوۂ نزہت اثر

دیکھتا کیا ہے کہ وسطِ سبزہ زارِ خواب سے　　نائجر[1] بہتی چلی جاتی ہے آب و تاب سے
دیکھتا کیا ہے کہ زیرِ نخلِ خرما دشت میں　　بادشاہوں کی طرح ہے محوِ سیر و گشت میں
سُن رہا ہے دور سے بانگِ درائے کارواں　　جو پہاڑی راستوں سے ہے کسی جانب رواں

اپنی ملکہ پھر بچشمِ نم نظر آئی اُسے　　منتظر بیٹھی ہوئی معصوم بچوں کو لئے
دیکھتے ہی دوڑ کر بوسے لئے رخسار پر　　اور بحسرت رہ گئی گردن میں باہیں ڈال کر
چشمِ خوابیدہ سے آخر ایک آنسو بہہ گیا　　آنکھ سے ڈھلکا زمیں میں جذب ہو کر رہ گیا

پھر بڑھا تیزی سے وہ ہو کر سوارِ راہوار　　نائجر کا ساحلِ فردوس منظر درکنار
یوں رواں تھا خواب میں پکڑی ہوئی زریں لگام　　جنگ پر جائے سپاہی جیسے کوئی شادکام
جست پر رہوار کی محسوس وہ کرتا رہا　　اک نیامِ آہنی زانو سے ٹکراتا ہوا

مائلِ پرواز سرخابوں کے پھر دیکھے پرے　　رزمگہ میں جیسے جھنڈے خون میں ڈوبے ہوئے
شام تک گرمِ تعاقب ہی رہا وہ نیک بخت　　اُگ رہے تھے جس جگہ سرسبز املی کے درخت
قصرِ کافر[2] کی چھتیں آخر نظر آنے لگیں　　سامنے امواجِ قلزم رقص فرمانے لگیں

رات میں اُسنے سنی جنگل میں شیروں کی دہاڑ　　وہ ٹکرے بھگوں کی آوازیں وہ ہاتھی کی چنگھاڑ
اور کسی چشمہ پہ وہ دریائی گھوڑے کی صدا　　جا رہا ہے نرکلوں کے کھیت کو جو روندتا
خواب کیا تھا اک گذرگاہِ جلوسِ عام تھا　　شادیانے بج رہے تھے عیش کا پیغام تھا

صد زباں ہو کر فضائے خوشنما کا ہر شجر　　گا رہا تھا سازِ آزادی پہ نغمے جھوم کر
چل رہی تھیں سرسراتی غل مچاتی آندھیاں　　ریگزاروں میں مزاحم تھا نہ کوئی پاسباں
روح اسکی جاگ اُٹھی کیفِ فطرت چھا گیا　　تھرتھرایا جسم ہونٹوں پر تبسم آ گیا

تازیانہ بھی نہ آقا کا جگا پایا اسے　　اور نہ پھر دن کی تمازت ہی نے گرمایا اُسے
جلوۂ نورِ اجل سے تھی منور خوابگاہ　　خاک کے بستر پہ تھا اِک جسمِ مُردہ بے پناہ
روح ہر طوقِ غلامی توڑ کر آزاد تھی　　نعش اُسکی یادگارِ جبر و استبداد تھی

نثار اٹاوی

۱؎ افریقہ کا ایک دریا　۲؎ ایک قوم جو افریقہ کے جنگلوں میں آباد ہے۔

خدا کی فتح ہو

ایک بہترین فرانسیسی افسانہ

گاؤں کے ایک گوشے میں ناشپاتی کا ایک درخت تھا۔ موسمِ بہار میں اس پر اس قدر کثرت سے پھول آتے تھے کہ وہ پھولوں کی ایک حسین چھتری بن جاتا تھا۔ سڑک کی دوسری جانب ایک خوشحال و متمول کسان کا مکان تھا۔ جس کا دروازہ خالص پتھر کا تعمیر کیا گیا تھا۔ کسان کے ایک لڑکی تھی ـــــ جسکا نام تھا، پے رین ـــــ اسی پے رین کے ساتھ میری منگنی قرار پائی تھی۔

پے رین اب عمر کی سولہویں بہار میں پھول رہی تھی۔ اسکے رخسار گلاب کے بہت سے نوشگفتہ پھولوں کا مجموعہ معلوم ہوتے تھے۔ اس روز پھولوں سے لدے ہوئے ناشپاتی کے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھکر میں نے اس سے کہا:۔

"پے رین! ـــــ پے رین!! بتاؤ تو سہی ہماری شادی کب ہوگی؟"

میرا سوال سن کر سر سے پاؤں تک اس کے ہر ایک عضو میں سرور و انبساط کی ایک برقی لہر سی دوڑ گئی۔ اس کے ان ریشمی بالوں میں جن کے ساتھ ہوا اٹکھیلیاں کر رہی تھی ـــــ اسکے دونوں پاؤں میں جن میں لکڑی کے خوبصورت و سبک جوتے تھے۔ ـــــ اسکے ان دونوں ہاتھوں میں، جن کے ذریعہ وہ ایک ڈالی جھکا کر پھول سونگھ رہی تھی ـــــ اس کی حسین و روشن پیشانی میں ـــــ اور اسکے موتی جیسے سفید دانتوں میں گویا ایک غیر مرئی تبسم رقصاں ہو گیا تھا ـــــ مجھے اس سے انتہائی محبت تھی۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا:۔

"اگر شہنشاہ تمھیں فوج میں نہ بلائیں تو فصل کی کاشت کے وقت تک ہماری شادی ہو جائیگی!"

جبریہ فوجی بھرتی بڑے زور شور سے جاری تھی۔ خدا کا رحم و کرم حاصل کرنے کے لئے میں گرجے میں پہنچا اور ایک موم بتی جلا کر گڑگڑا کر دعا مانگنے لگا۔ تاکہ پے رین سے جدا ہو کر مجھے کسی دور دراز علاقہ میں نہ جانا پڑے ـــــ خدا کی فتح ہو!

ـــــ داخلۂ فوج کی فہرست میں میرا نام نہ تھا۔ میرے بجائے میرے ایک بعیدی رشتے کے بھائی جان کا نام درج تھا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلِ بے پناہ جاری ہے اور وہ کہہ رہا ہے:۔

"اب میری بدقسمت والدہ کا کیا ہوگا؟"

"خاموش ہو جاؤ جان! تم فکر و غم نہ کرو، دیکھو ـــــ میرے والدین نہیں ہیں، تمہارے بجائے میں فوج میں اپنا نام درج کرا لونگا!"

میری بات پر اسے ایک دم یقین نہ آیا۔ اس وقت پے رین ناشپاتی کے درخت کے نیچے آئی اسکی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ پیشتر ازیں میں نے اسے کبھی اشکبار نہ دیکھا تھا۔ گریۂ خاموش کی گود میں سعی تبسم نے اسکے چہرے کو اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگی:۔

"تم نے بہت اچھا کام کیا ہے، تم بڑے رحمدل ہو پیٹر!
اب جاؤ، خدا حافظ! میں تمہاری واپسی تک تمہارا انتظار کرونگی!"

فوجی کوچ کا بگل بج اٹھا ـــــ افسران احکام صادر کرنے لگے:۔

"دائیں، بائیں ـــــ دائیں، بائیں ـــــ بڑھے چلو، بڑھے چلو" ـــــ

واسے گاؤں تک ہم نے سفر کیا۔ میں دل ہی دل میں بولا: "پیٹر! دل کو مضبوط کرو، دامنِ ہمت ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ دشمن سامنے ہے!"

اب میں نے ایک طویل آتشیں لائن دیکھی۔ پانچسو توپیں بیک وقت گرج رہی تھیں۔ انکے دھوئیں میں مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ زمین پر اس قدر خون پڑا ہوا تھا کہ میرے پاؤں پھسلنے لگے۔ ہزار سعی ضبط کے باوجود دل میں خوف و ہراس پیدا ہوا ہی گیا۔ میں نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔

میری پشت پر فرانس اور میرا گاؤں تھا۔ ناشپاتی کے درخت کے تمام پھول پھلوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ گذرے ہوئے لمحات یاد آکر دل بے اختیار تڑپ اٹھا میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور میں تصورات کی بستی میں پہنچ گیا

——— میں نے دیکھا پے رین میرے لئے دست بدعا ہے ——— خدا کی فتح ہو

اب میں سنبھل چکا تھا اور میرا دل قوی ہو گیا تھا۔

"آگے بڑھو ——— آگے بڑھو! ——— دائیں، بائیں ——— دائیں بائیں!

گولی چلاؤ ——— سنگینیں سنبھالو ——— شاباش، شاباش! یہ رنگروٹ سپاہی تو بڑی قابلیت

دکھا رہا ہے ——— تمہارا کیا نام ہے بیٹا؟"

"کرنل! میرا نام پئیر ہے"۔

"پئیر! آج تمہیں بریگیڈیر کا عہدہ دیا جاتا ہے"۔

پے رین! پے رین!! ——— اب میں بریگیڈیر ہوں ——— جنگ کی فتح ہو ———

لڑائی کا دن تو ایک مسرت بخش دن ہے ——— جنگ کا سفر بہت دلچسپ اور آسان ہے۔

"دائیں، بائیں! ——— آفریں پئیر! تم اس بار بھی سب سے آگے ہو

اچھا، زمین سے کپتان کا تمغہ اٹھا لو"!

بہت سے کپتانوں کی لاشیں زمین پر پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے جھک کر ایک کی وردی

میں سے تمغہ نکال کر اپنی وردی میں لگا لیا۔

"شہنشاہ! مجھ پر آپ بے حد مہربان ہیں"!

"بڑھو! ——— ماسکو تک جانا ہے"!

یہی ہماری آخری منزل تھی ——— دور، حد نظر تک برف ہی برف پھیلا ہوا تھا۔ تمام راستہ

لاشوں سے بھرا پڑا تھا ——— ایک طرف ندی تھی، دوسری جانب دشمن کی فوج اور دونوں کناروں پر بیشمار لاشوں کے انبار۔

"پل بنانے کے لئے پہلی کشتی کون چلائے گا"؟

"شاباش کپتان پئیر! ——— اولیت کا سہرا ہمیشہ تمہارے سر رہتا ہے"!

اس مرتبہ شہنشاہ نے مجھے نائٹ کا عہدہ عطا فرمایا۔

خدا کی فتح ہو، پے رین! اب تم مجھ پر فخر کر سکتی ہو جنگ ختم ہو گئی ہے اور مجھے رخصت مل چکی

ہے۔ اب ہم شادی کا بندوبست کرو ——— گرجے کا گھنٹہ بجانے کے لئے کہو۔ راستہ بہت طویل ہے مگر

امید اس سے کہیں زیادہ تیز رفتار ہے ——— دیکھو وہ نظر آ رہا ہے، اس اونچی زمین کے

پیچھے ہمارا وطن ———

"ارے وہی تو ہے ہمارے گرجا گھر کی چوٹی ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گرجا میں گھنٹہ بج رہا ہے"۔

"بے شبہ گھنٹہ بج رہا ہے ——— مگر وہ ناشپاتی کا درخت کہاں گیا۔ یہ تو پھول

کھلنے کا مہینہ ہے، لیکن کہاں؟! وہ پھولوں سے لدا ہوا درخت تو اب کہیں نظر نہیں

آتا۔ حالانکہ پہلے وہ دور ہی سے دکھائی دیتا تھا ——— آہ! میرا عزیز دوست وہ درخت!!

اسے کس نے کاٹ ڈالا ——— مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس پر رنگین و دلکش پھول کھلے ہوئے

ہیں۔ لیکن اسکی تراشیدہ ڈالیاں اب تک گھاس پر بکھری پڑی ہیں"!

"گرجا کا گھنٹہ کیوں بج رہا ہے ماتھو"؟

"ایک شادی ہو رہی ہے کپتان صاحب"! ——— ماتھو مجھے پہچان سکا تھا۔

"شادی؟ ——— ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ گرجا کے سیڑھیوں پر دولہا دلہن چڑھ رہے

ہیں ——— آہا! میری پے رین ——— آج بھی اسی طرح مسرور و شاداں اور حسین و متبسم

ہے ——— پے رین ہی دولہن ہے مگر دولہا؟ ——— اوہ! میرا بھائی جان!!" ———

میرے ارد گرد کھڑے ہوئے لوگ کہہ رہے تھے:-

"بڑی محبت کرتے تھے دونوں ایک دوسرے سے"!

"اب پئیر کا کیا ہو گا"؟ میں نے پوچھا

"پئیر ——— کون پئیر؟!" ——— جواب ملا ——— وہ سب مجھ کو فراموش کر چکے تھے۔

میں فوراً گرجا کے فرش پر گھٹنوں کے بل جھک کر پے رین کی فلاح و مسرت دوام کے لئے

دست بدعا ہو گیا۔ مجھے ان دونوں سے محبت تھی۔ شادی ختم ہو جانے کے بعد گرجے سے باہر آ گیا

گھاس پر پڑی ہوئی ناشپاتی کی ایک ٹہنی سے ایک پژمردہ پھول توڑ کر میں نے پیرس کی راہ

لی اور ایسا گیا کہ ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا ——— خدا کی فتح ہو ———

"وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں ——— جہاں رہیں خوش رہیں"۔

"ارے، آؤ پئیر! تم واپس آ گئے؟!"

"ہاں، شہنشاہ!"

"تمہاری عمر بائیس برس کی ہے۔ ہونہار ہونے کے باعث تم بہت جلد ترقی کر کے

کرنل کے عہدے تک پہنچ گئے ہو۔ تم چاہو تو تمہاری شادی کسی اعلیٰ گھرانے کی لڑکی سے کرا دوں"۔

ناشپاتی کی ٹہنی سے ٹوٹے ہوئے پژمردہ پھول کو پئیر نے جیب سے نکالکر بادشاہ کے آگے کر دیا۔

"حضور! اس پھول کی طرح ہے میرے قلب کی حالت بھی ——— اب میری خواہش

صرف یہ ہے کہ میں سب سے پہلے پیش قدمی کرنے والی محافظ فوج میں تعینات ہو کر جنگ میں

ایک جانباز کی موت مروں"!

پئیر آگے بڑھنے والی محافظ فوج میں تعینات کر دیا گیا

فتح کے ... ز گاؤں کے ایک گوشے میں ایک بائیس ۲۲ سالہ نوجوان کرنل کی جو جنگ میں مارا گیا تھا

قبر بنائی گئی اور اسکے پتھر پر نام کے بجائے صرف یہ جملہ لکھا گیا:-

"خدا کی فتح ہو!"

مترجمہ
مخمور عثمانی

چلے گئے

نقشِ قرار دل سے مٹا کر چلے گئے
جلتا ہوا چراغ بُجھا کر چلے گئے

بے کیفیٔ فراق کا عالم، نہ پوچھئے
ہر سانس کو اُداس بنا کر چلے گئے

ہر بام و در خموش ہر اک انجمن اداس
ویرانیوں کو گھر میں بسا کر چلے گئے

بامِ نگاہِ شوق سے ہو کر بلند تر
حدِ تصوّرات پہ چھا کر چلے گئے

اب کِس کو یاد کیجئے کِس کو بُھلائیے
وہ ہر ادا سے دل میں سما کر چلے گئے

وہ اپنے ساتھ لے گئے اپنے لبوں کے جام
چھلکی ہوئی شراب پلا کر چلے گئے

جیسے وہ اپنے وعدہ پہ پھر آہی جائینگے
یوں محوِ انتظار بنا کر چلے گئے

میں چاہتا تھا قیدِ غمِ ہجر سے نجات
وہ اور قیدِ غم کو بڑھا کر چلے گئے

آشوبِ غم، ہجومِ الم، شورشِ ملال
کیا کیا قیامتیں وہ اٹھا کر چلے گئے

بھولا ہوا تھا آہ میں جن واقعات کو
پھر آج اُن کی یاد دلا کر چلے گئے

وہ عہدِ اوّلینِ محبت وہ التفات
اک خوابِ ناتمام دکھا کر چلے گئے

شبنم ہو یا بہار ہو تارا ہو یا شراب
ہر شے کی ماہیت میں سما کر چلے گئے

اک عارضی سکون عطا کرکے روح کو
دوشِ ہوا پہ شمع جلا کر چلے گئے

آئے تھے کائناتِ سرور و سکوں لئے
اور دولتِ اُمید لٹا کر چلے گئے

میرے نفس نفس کی خموشی کو وہ شفق
اک مستقل عذاب بنا کر چلے گئے

شفق ٹونکی

مرزا غالب کے اکبرآبادی معاصرین

نجم الدولہ۔ دبیر الملک نواب **مرزا اسد اللہ خاں غالب اکبرآبادی** کے مشہور معاصرین کے تذکرے ادبِ اردو کی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ ہندوستان کے دوسرے شہروں سے قطع نظر، مرزا غالب کے وطن اکبرآباد میں بھی ایسے بہت سے لوگ تھے جن سے مرزا ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے لیکن افسوس کہ مرورِ ایام نے ہمیں ان میں سے بعض کے حالات سے ابتک بے خبر رکھا۔ اس میں تو کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں کہ مرزا غالب نے اپنا زمانۂ شباب **"ارضِ تاج"** ہی میں بسر کیا۔ آگرہ سے جانے کے بعد بھی وہ اکثر وطن آتے رہے اور گرمیٔ اربابِ محفل بنتے رہے۔ مرزا کے خصوصی دوستوں اور ہم مجلس شعرا کا بھی ابھی تک ذکر کسی نے نہ کیا تھا۔ مقامِ مسرت ہے کہ حضرت مولانا انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی نے اپنے ذوقِ تحقیق سے کام لیتے ہوئے اس کمی کو پورا کر دیا۔ مرزا غالب کے معاصرین اکبرآباد میں معظم۔ حقیر۔ ساحر۔ تپش۔ نغمہ۔ قاضی ابو الفضل بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

کسی غیر معروف ادیب یا شاعر کا سالِ پیدائش و وفات اور کلام کا کچھ حصہ معلوم ہو جانا اتنا اہم نہیں جتنا اُس کے ذاتی حالات کا علم۔ مولانا انتظام اللہ صاحب نے بڑی محنت سے وہ واقعات جمع کئے ہیں جو خلوت و جلوت دونوں کا ایک اجمالی خاکہ ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ مولانا کو پرانے لوگوں کے حالات مرتب کرنے کا خاص ذوق ہے۔ ان کا پڑھنے والا تاریخی خشکیوں کو محسوس نہیں کرتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ دلچسپی محسوس کرتا ہے۔ ممکن ہے مولانا کے پیش کردہ شعرا کا تذکرہ کہیں ہو چکا ہو لیکن اس اعتبار سے ان لوگوں کو کوئی بھی نہ جانتا ہوگا کہ مرزا غالب کے یہ معاصرین اکبرآبادی تھے ورنہ اتنی تفصیل سے کسی نے لکھا ہوگا ——

اعجاز صدیقی

معظم — معظم تخلص نام مولوی محمد معظم قریشی شیوخ اکبرآباد سے تھے۔ علم و فضل سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ شغل کتب داری تھا۔ آپ کے بھائی مولوی محمد کامل جو نجوم و ہیئت و ہندسہ میں یگانۂ روزگار اور وحیدِ قرن اور ادوار سے تھے[1]۔ جناب معظم کے حالات محمد صادق اختر شاگرد مرزا قتیل فریدآبادی نے اپنے تذکرہ "آفتابِ عالم تاب" میں یوں لکھے ہیں

"معظم محمد معظم اکبرآبادی مردے بود متوکل و در نظم فارسی اورا
قدرت کامل شصت و چند سال بر کرسی زندگی نشست و در
وسط مائۃ ثالث عشر برحمت ایزدی پیوست"[1]

مرزا غالب نے مولوی معظم سے بھی تعلیم پائی۔ مولوی صاحب کی تعلیم و تربیت نے سپاہی زادہ کو فارسی ادب کا بے بدل شاعر و ادیب کر دیا۔ مولوی صاحب قاضی گلی میں رہتے تھے۔ انکے مکان کے قریب ملا ولی محمد شارح مثنوی مولانا رومؒ رہتے تھے جو مولوی صاحب کے معاصر تھے۔

آپ کے فکرِ سخن سے شمع انجمن سے ایک شعر یہاں نقل ہے[2]

حضرت احمدِ مرسل کہ اساسِ افلاک
دارد از بارقۂ جلوۂ نورش تاسیس

مجرم — مجرم تخلص رحمت اللہ نام آگرہ کے رہنے والے مشغلہ کندلہ کشی تھا۔ جاٹ گردی میں دلی چلے گئے شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ حضرت بیدار اکبرآبادی سے مشورۂ سخن کیا۔ آخر عمر میں بریلی چلے گئے وہیں عمر گذار دی۔ صاحبِ فکر ایسے تھے حکیم آغا جان عیش استاد ظفر مفتی صدر الدین خاں آزردہ سے حضرات نے شعر گوئی میں تلمذ اختیار کیا۔ حضرت عیش دہلوی فرماتے ہیں:-

مجرم کا میں شاگرد وہ بیدار کے شاگرد
ہے عیش سلسلہ مرا یوں درد واثر تک

مولوی اکرام اللہ شہابی صاحب تصویر شعرا کی بیاض سے شعر نقل ہے ؎

نگہ دزدیدہ کیوں پھینکے ہے تو اے بتِ عیسی
دل و سینہ کو توڑے ہے یہ پستولِ فرانسیسی

---

[1] گلستانِ سخن صابر دہلوی (حال رہا اکبرآبادی)
[2] شمع انجمن از نواب صدیق حسن خاں قنوجی

حقیر منشی نبی بخش خلف شیخ حسین بخش اکبرآبادی صاحب علم و ذی استعداد بزرگ تھے فوجداری کورٹ میں سررشتہ دار تھے۔ مولوی اکرام اللہ تصویر الشعرا میں لکھتے ہیں۔

"در علم فارسی ید طولیٰ داشت ذوق سخن دارد و کسب سخن از خلیفہ گلزار علی اسیر نمودہ"

مولانا حالی نے لکھا ہے کہ

"حقیر کی سخن فہمی و سخن سنجی کی بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سنی گئی"[1]

مرزا غالب سے بیحد تعلقات تھے۔ مرزا تفتہ کے خط میں حقیر کے متعلق مرزا صاحب لکھتے ہیں:—

"خدا نے میری بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایسے شخص کو مرے پاس بھیجا جو مرے زخموں کا مرہم اور مرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا اور جس نے مری اندھیری رات کو روشن کردیا اس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جسکی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود مری نگاہ سے مخفی تھی دیکھی میں حیران ہوں کہ اس فرزانہ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجہ کی سخن فہمی و سخن سنجی عنایت ہوئی ہے حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں یہ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کئے آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام بنی نوع انسان کو، کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوق معنی کے بھی دو حصے کئے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصہ میں آیا ہو گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانہ کی دشمنی سے بے فکر ہوں اور اس نعمت پر دنیا سے فارغ"[2]

ظاہر ہے کہ غالب کے دل میں حقیر کی کتنی عزت تھی وہ ہر جگہ اپنے خطوط میں ان کو بھائی اور ان کے فرزند عبداللطیف کو بھتیجے کے رشتہ سے یاد کرتے تھے۔ جب انھوں نے اپنی کتاب دستنبو آگرہ میں چھپوائی تو منشی نبی بخش ہی نے اس کی تصحیح وغیرہ کا ذمہ لیا

[1] یادگار غالب [2] اردوئے معلی

غالب کو ان پر بے حد اعتماد تھا اور ان دونوں کے آپس میں کوئی بیگانگی نہ تھی۔[1]

آخر عمر میں پنشن لیکر وطن آ گئے تھے آپ کی غزلیں اسعد الاخبار ۱۸۴۷ء میں اکثر شائع ہوئی ہیں۔ ۱۲۸۴ھ میں انتقال کیا۔ مرزا غالب نے تاریخ لکھی۔

شیخ نبی بخش کہ با حسن خلق — داشت مذاق سخن و فہم تیز
مرگ ستم پیشہ امانش نداد — کیست کہ با مرگ بسنجد ستیز
سال وفاتش زپئے یادگار — بادل زار و مژہ دجلہ ریز
خواستم از غالب آشفتہ سر — گفت مدہ طول و بگو رستخیز

۱۸۶۰ء

نمونہ کلام

سایۂ قصر ترا یاد آیا — پھر ہمیں ظل ہما یاد آیا
زخم کے منہ میں بھر آیا پانی — جبکہ پیکاں کا مزا یاد آیا
بسکہ مصنوع ہے صانع کی صفت — بت کو دیکھا تو خدا یاد آیا
پھر گریباں کے اڑیں گے ٹکڑے — پھر وہی چاک قبا یاد آیا

سنتے ہیں گئے مانی و بہزاد عدم کو — اب کھینچیں تو کھینچیں کہ یار کی تصویر
ہاتھ دوڑائے جنوں نے پھر گریباں دیکھکر — پاؤں پھر وحشت نے پھیلائے بیاباں دیکھکر
وہ نگاہیں جن سے تھی مجکو تسلی کی امید — تشنۂ خوں آفت دل دشمن جاں ہو گئیں
قتل تم کس کس کے کروگے تو مرینگے لاکھوں — کشتہ ہر کشتہ کے ہمراہ صد ارماں ہونگے

ید بیضا کا جو مذکور ہوا — اُن کا نقش کف پا یاد آیا

دیوانہ بن گیا کبھی فرزانہ بن گیا — کیا کیا نہ مجھ پہ گذرا میں کیا کیا نہ بن گیا
مجھ خفتہ بخت کا جو سنا ذکر سو گئے — احوال غم بھی خواب کا افسانہ بن گیا

کیا یک رو ہیں رہروان عدم — کہ کسی کا نہ نقش پا دیکھا

ساحر مفتی انعام اللہ خلف مفتی محمد انعام اللہ شہابی بن محمد اسحاق سہروردی آپ کے مورث اعلیٰ شیخ آدم نبیرۂ شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی۔[3]

[1] روح غالب مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری صفحہ ۶۲ [2] اردو معلی
[3] تذکرۃ الانساب لمولوی مصطفیٰ علی خاں گوپاموی۔

شاہ ملتان کے وزیر تھے۔ ترک وزارت کیا اور سنہ ... میں گوپامؤ آئے اور مقیم ہوگئے۔ اُن کے پوتے شیخ آدم دانشمند محدث کو بابر نے سنہ ۹۳۳ھ میں عہدۂ افتا و نذور پر ممتاز کیا[1]۔ ان کے خلف شیخ عیسیٰ محدث صوفی[2] سبط شیخ نظام الدین الہ دیہ الرضوی خیرآبادی خلیفہ علامہ وجیہ الدین گجراتی تھے جنکے صاحبزادہ مفتی عبید اللہ اور ملا وجیہ الدین مؤلف ربع حصہ فتاویٰ عالمگیری و منصب دار سہ ہزاری تھے[3]۔ شیخ آدم ثانی سے عہدۂ افتا انکے خاندان میں رہا۔ علامہ ابوسعید بن علیم اللہ اور مفتی محمد امان[4] مشہور و معروف تھے انکے پوتے مفتی محمد اسحاق ابن مفتی محمد ولی تھے۔ مفتی انعام اللہ نے اپنے والد اور چچا سے علوم عقلیات و نقلیات کی تحصیل کی آپ کے چچا قاضی محمد اسمٰعیل مدراس میں قاضی القضات تھے آپ نے لکھنؤ آکر حیکلہ داری کی سعی کی۔ یہاں سے کلکتہ گئے۔ سر ایڈورڈ کول برک سے تعلقات ہوگئے وہ ریذیڈینٹ ہوکر دلی آئے یہ انکے ہمراہ تھے اُس نے اپنے محکمہ کا ناظم کردیا جب ولایت جانے لگا محکمۂ قضات میں مفتی کرا گیا۔

اکبر شاہ ثانی نے "خانی" خطاب مرحمت کیا جب محکمہ قضاۃ شکست ہوا۔ صدر نظامت قائم ہوا سرکاری وکیل کئے گئے۔ ولسن گردی میں وکالت ترک کی۔ ٹونک گئے۔ نواب وزیر الدولہ امیر الملک محمد وزیر خان بہادر نصرت جنگ نے سنہ ۱۲۶۹ھ میں مہتمم بندوبست کردیا۔ کچھ دن بعد آگرہ آئے۔ ۲۱ شوال سنہ ۱۲۷۴ھ میں انتقال ہوا درگاہ ابوالعلا احراری میں دفن ہوئے۔

مولانا غلام امام شہید نے یہ قطعہ تاریخ لکھا:—

شیخ فرخندہ لقب مولوی انعام اللہ	خوش خصالے کہ عدیلش بجہاں بود عدیم
فخر اعیان سلف شمع شبستان شرف	یادگار اب و اجداد کریم ابن کریم
گشت با اہل جناں مائل گلگشت بہشت	بابروحی کہ رسد مژدہ سرائے تعدیم

قول رضواں کہ شنیدم ہمہ تاریخش بود
اول انعام کند سیر گلستاں نعیم[5]

۱۲۷۴ھ

مولوی معظم الحق صدر الصدور (بنی عم نواب محمد علی والاجاہ و سبط قاضی حکیم علی بن قاضی مبارک شارح سلم) کی دختر مفتی صاحب سے منسوب تھی۔ جن سے اہلیہ مفتی نور اللہ آباد و اہلیہ خواجہ غلام غوث خان بہادر ذوالقدر بیخبر و مولوی اکرام اللہ صاحب تصویر الشعرا[6]۔ ڈاکٹر الہام اللہ متوفی ۳۰ اپریل سنہ ۱۹۱۳ء و مفتی افہام اللہ ساحر یادگار سے تھے۔

ساحر صاحب سے مولانا فضل امام خیرآبادی سے قرابت قریبہ تھی اور افضل العلما قاضی ارتضیٰ علی خاں قاضی القضات مدراس آپ کے ماموں تھے۔ جناب ساحر نے علوم رسمیہ باپ سے پڑھے۔ اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر الہام اللہ کے ساتھ ڈاکٹر مکندلال سے فن ڈاکٹری حاصل کیا۔ شعر و شاعری سے شوق تھا۔ مشورۂ سخن حضرت بیخبر سے لیا۔ نوعمری میں محرم سنہ ۱۲۹۱ھ میں انتقال کیا۔ ایک دیوان۔ سراپا واسوخت یادگار چھوڑا پہلے افہام تخلص تھا، پھر ساحر تخلص کرنے لگے۔ جناب مہر آغا وغیرہ سے دوستانہ مراسم تھے۔ مہینہ میں ایک مرتبہ محفلِ مشاعرہ کیا کرتے جس میں آگرہ کی مشہور مغنیہ شریک ہوتیں۔ درگا بائی صنم اکثر آیا جایا کرتی تھی۔ مہر بھی آجاتے اور بساط شطرنج بچھا کر صنم کو شطرنج میں لگا لیتے ہر دو مشاق شاطر تھے۔ شام سے صبح ہو ہوگئی ہے۔ مہر فرماتے ہیں ؎

شطرنج میں جی انکا بہل جائے تو اچھا
اے مہر یہ چال اچھی ہے چل جائے تو اچھا

ایک موقعہ پر فرماتے ہیں ؎

ہم تو اللہ کو بھی یوں نہیں کرتے سجدہ
اے صنم سر کو ترے پانوں دھرتے ہیں

مہر وکالت میں مشہور تھے گورنمنٹ نے منصف کے عہدہ پر سرفراز کیا، کہتے ہیں ؎

اے مہر سوز ہجر سے خوگر ہوئے ہیں ہم
منصف جہاں گڈھ کے مقرر ہوئے ہیں ہم[7]

ایک دن محفلِ مشاعرہ میں درگا بائی صنم کے ساتھ کالی خانم بھی شریک ہوگئی۔ اس محفل میں بڑے بڑے طرح دار شریک ہوتے تھے۔ مہر وضعداری میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ ساحر صاحب کے بڑے بھائی اکرام اللہ صاحب جو خوبصورتی میں یگانہ تھے۔ گورے میاں کرکے مشہور تھے بیلمان شکوہ اپنی بہن ان سے منسوب کرنا چاہتا تھا۔ جناب آغا یہ بھی مرزا منش اور شکیل آدمی تھے اس دن ایسا لباس زیب جسم تھا کہ ہر دو رقاصہ انکی طرف زیادہ نظریں ڈال رہی تھیں۔ مہر وغیرہ نے آغا صاحب کو چھیڑنا شروع کیا فی البدیہہ کہتے ہیں ؎

---

[1] نزہۃ الخواطر للمولوی حکیم عبدالحی [2] تذکرۃ المتقین [3] مرآۃ عالم [4] گزیٹیر ہردوئی سنہ ۱۹۰۴ء
[5] کلیات شہید صفحہ ۲۲۹ و خمخانۂ جاوید حصہ چہارم ذکر ساحر۔

[6] داستان تاریخ اردو [7] ادبی لطائف از انتظام اللہ شہابی

کبھی ہنسکر ذرا بولے کبھی پیش آئے گالی سے　　خدا محفوظ رکھے اس مزاجِ لاابالی سے
برہمن پوچھتے ہیں بت کو میں مردِ مسلماں ہوں　　نہ دیر کا سے غرض مجکو نہ کچھ مطلب ہے کالی سے

نتیجۂ فکر

ہجر میں ایک پری رو کے ہوا ہوں بیمار　　ہائے کرتا نہیں کوئی بھی مددگاری دل
زلف کے دام میں تُسنے ہے لیا دل کو پھنسا　　ہو نہیں سکتی پر اس گل سے کبھی غمخواری دل

بدگماں کیوں نہ ہو تم غیر کے گھر میں جاؤ　　گو یہ مانا کہ وہ رہتا ہے بشر سے خالی[۱]

رہا منشی غلام محمد خاں افغانی ان کے دادا بھرت پور میں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز تھے اور ان کے والد بزرگوار فوج میں رسالدار اور فن سپہ گری میں یگانۂ روزگار تھے۔ رہا نے باپ کے سایہ میں نشو و نما پائی۔ مولوی محمد کامل جو نجوم و ہیئت و ہندسہ میں ابناء روزگار میں امتیاز رکھتے تھے۔ ان سے کتب درسیہ کی تحصیل کی۔ اگرہ کالج میں مدرس فارسی ہو گئے تھے۔ خوش مذاق اور حسن اخلاق اچھا تھا فنِ سخن میں خلیفہ گلزار علی اسیر کے شاگرد تھے۔ ایک دیوان یادگار چھوڑا جو اُن کے پوتے سرفراز حسین خاں ولد امجد حسین خاں مرحوم کے پاس ہے۔ مرے والد مرحوم مولوی اکرام اللہ شہابی کے احباب خاص سے تھے۔

دل لگ چلا ہے ادسکا بھی شاید کسی طرف
آنے لگا جو کچھ مرے غم کا بیاں پسند

حسن مفتی محمد حسن بن شیخ نور اللہ بن شیخ سلیم اللہ بن قاضی محمد اسمٰعیل شہابی گوپاموی۔ حسن ۱۲۵۷ھ میں پیدا ہوئے اپنے چچا مولوی علیم اللہ اور اگرہ آکر اپنے نانا خان بہادر مفتی انعام اللہ شہابی سے علوم رسمیہ کی تکمیل کی۔ محکمہ بندوبست میں سررشتہ دار رہے۔ پھر بھوپال میں تحصیلدار ہو گئے تعلقہ بہرہ ضلع سلطان پور میں سکرٹری ریاست کے عہدہ پر بلائے گئے پھر وکالت کا امتحان دیکر بعد کامیابی جونپور میں شغل وکالت اختیار کیا۔ شعر و شاعری سے شوق تھا۔ تہرسے مشورہ سخن لیا۔ مرثیہ گوئی میں دبیر کے شاگرد ہوئے۔ نور انا نوادر فی ذکر سید الابرار تاریخ خاندان مفتیان گوپامئو اور دیوان یادگار چھوڑے۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۱۹ھ

کو انتقال ہوا۔ (خمخانۂ جاوید حصہ دوم و تاریخ گوپامئو)

مشتاق ہوں ازل سے کسی کے جمال کا　　حافظ خدائے عز و جل ہے مآل کا
بوسہ طلب کیا تو وہ خاموش ہو گئے　　انجام یہ ہوا مرے پہلے سوال کا

بابو بینی پرشاد وکیل صدر کامیاب وکیل تھے۔ عزاداری امام میں اپنی کمائی کا روپیہ صرف کیا کرتے۔ انکے یہاں مجالسِ عزا بڑے اہتمام سے ہوتیں۔ انکا امام باڑہ آج بھی الہ آباد میں مشہور ہے۔ محبِ اہل بیت سے تھے اگرہ میں آپ کے دم سے شاعری بڑے آب و تاب سے ہوتے۔ اُن کے ایک مشاعرہ جو ۱۲۶۷ھ میں ہوا اسکی روداد تصویر الشعرا کے نام سے مولوی اکرام اللہ شہابی نے لکھی جو شائع ہو گئی۔ مولوی صاحب سے اور وکیل صاحب سے بیحد مراسم تھے۔ عالم ضعیفی میں وکیل صاحب وطن جانے لگے تو مفتی محمد حسن حسن۔ مرزا عباس ملیح۔ شاہ نجف علی نجف سید محمد سید سے حضرات رخصت کرنے آئے۔

جناب حسن رباعی پیش کرتے ہیں ؎

ہر سمت پریشانی و حیرانی ہے　　اس شہر کی ہر طرف سے ویرانی ہے
جاتا ہے وطن کو اپنے وہ آہ حسن　　فی الحال زمانہ میں جو لاثانی ہے

ممکن ہے کہ سارا شہر برباد نہ ہو　　ہو سکتا ہے خاص و عام ناشاد نہ ہو
رونق کہیں اگرہ میں رہ سکتی ہے　　جس وقت کہ بابو بینی پرشاد نہ ہو

جناب ملیح فرماتے ہیں ؎

اس غم سے طبیعت مری گھبراتی ہے　　فریاد کی ہر سو سے صدا آتی ہے
جاتے ہیں جو اگرہ سے بینی پرشاد　　اس شہر سے رونقِ عزا جاتی ہے

جناب سید سندیلوی فرماتے ہیں ؎

افلاک نے اگرہ کو برباد کیا　　ہر فرد بشر کو آہ ناشاد کیا
نالاں رہی اگرہ کی خلقت سید　　بابو نے الہ آباد آباد کیا

جناب نجف رام پوری فرماتے ہیں ؎

افسوس کہ ویران ہوا اکبر آباد　　جاتے ہیں وطن کو اپنے بینی پرشاد
رہ رہ کے صدا دل سے یہ آتی ہے نجف　　فریاد ہے فریاد ہے یار و فریاد

زماں محمد زماں خاں زماں رسالدار اکبرآبادی دیسی پر رہا کرتے تھے عمر کا بڑا حصہ گوالیار میں گذرا، مہاراجہ سندھیا کی فوج میں

---

[۱] نگارستان شعرا۔ خمخانۂ جاوید حصہ چہارم تذکرۂ ساحر تاریخ گوپاموی للمولوی حکیم بہاء الدین صدیقی گوپاموی۔ [۲] گلستان سخن و خمخانۂ جاوید۔

رسالدار تھے پنشن لیکر وطن لوٹ آئے۔ صاحب استعداد تھے ذوق سخن تھا۔ لطیفہ گوئی میں مشہور تھے۔ ستار بجانے میں استاد کامل تھے کہتے ہیں ؎

پوچھو نہ مجھ سے آپ محمد زماں کا حال
موٹے سے ہیں اور بجاتے ستار ہیں

آگرہ میں عرسوں کی گرم بازاری تھی۔ مرزا کرامت علی خاں کمسریٹ میں ملازم تھے پنشن لیکر گھر لوٹے۔ یہاں ملنے جلنے والوں نے اپنے اپنے بزرگوں کے عرس کر کر کے رنگ جما رکھا تھا۔ دیکھا دیکھی اپنے باپ کا عرس یہ بھی کر بیٹھے۔ اشتہار شائع کیا۔ زماں خاں نے جو اشتہار پڑھا شعر موزوں کرکے مرزا صاحب کے پاس بھیجدیا دوسرے دن پیر گیلانی میں عرس تھا جو آتا یہ شعر پڑھتا آتا ؎

کرامت خاں کرامت ہا چہا کرد
بزور زر پدر را اولیا کرد

دوسرے سال پھر عرس کرنے کی ہمت نہ پڑی[1]۔

کالے خاں سفلی آپ کے شاگرد تھے زماں کے متعلق کہتے ہیں ؎

استاد بھی ہیں یار بھی ہیں بامذاق بھی
کیونکر نہ دل ہو شیخ محمد زماں سے خوش

دو تین جگہ آگرہ میں ایسی نشستیں تھیں جہاں پڑھے لکھے لوگ جمع ہو جایا کرتے تھے۔ مولوی اکرام اللہ شہابی صاحب تصویر الشعرا حکیم سید معصوم علی۔ ڈپٹی مرزا دلدار علی بیگ۔ ڈپٹی نثار علی بیگ۔ مرزا خادم حسین رئیس علی ذکر داذ کار میں اکثر شعر و شاعری کا چرچا رہتا۔ مرزا فدا علی مرزا نثار علی رؤسائے آگرہ سے تھے۔ مولوی بنارسی خاں تحصیلدار شیخ بلاقی زر۔ زماں۔ سفلی کسی جگہ جمع ہو جاتے تو مجلس کو چار چاند لگ جاتے۔ چھیڑ چھاڑ میں ارباب مجلس لطف اٹھاتے۔ مولوی اکرام اللہ صاحب کے یہاں مرزا فدا علی و مرزا نثار اور جناب زماں کی نشست اکثر رہتی مرزا صاحب رسالدار صاحب کو کوس رحلت کرکے چھیڑا کرتے۔ رسالدار موٹے تازے آدمی تھے۔ قد ٹھنگنا اور اس پر طرہ یہ تھا پیٹ آگے کو نکلا ہوا۔ کوس رحلت کی پھبتی اُن پر چسپاں رہتی۔ یار لوگ قہقہہ لگا کر اور پھبتی کو حضرت زماں کے سر تھوپ دیتے۔

ایک دن رسالدار صاحب خوش خوش آئے اور کہنے لگے۔ گورے میاں صاحب مرزا صاحبان سے ہم پر خوب آوازے کسواتے ہو۔ آج ہماری باری ہے۔ مولوی صاحب کی عرفیت گورے میاں تھی، یہ مسکرا دیئے۔ مرزا صاحبان آگئے مرزا اصغر علی بیگ بھی ہمراہ تھے۔ حضرت زماں نے مرزا صاحبان کو خطاب کرکے کہا ایک رباعی عرض کی ہے داد دیجئے گا ہر ایک مشتاق ہوا کہتے ہیں ؎

ایمان من محبت آل محمدؐ است	جانم فدائے خاک رہ مرتضیٰ علی
من کوس رحلتم نگر از لشکر حسینؑ	نے رایت یزید چو مرزا فدا علی

مرزا صاحب کا مذہب لا سا تھا۔

احباب میں اس رباعی نے کچھ عرصہ تک چھیڑ چھاڑ کا لطف رکھا۔ مرزا مغل بیگ کے کمرہ پر بھی گاہے صحبت احباب گرم رہا کرتی۔ مرزا حسام الدین جب کبھی اپنے برارسے گاؤں سے آجاتے سفلی قہر وماہ وغیرہ احباب جمع ہو جایا کرتے مرزا غالب جب کبھی آگرہ آتے ہیں مقیم ہوتے ہیں۔ حسن اتفاق میرزا صاحب اور رسالدار صاحب بھی کمرہ پر آدھمکے۔

مرزا فدا علی اور جناب زماں میں جہاں کہیں ملنا ہوتا باہم۔ چوٹ ضرور چلتی مرزا صاحب نے کسی کے تذکرہ پر یہ کہا "یار ماری بھی عجب شئے ہے" جناب زماں فی البدیہہ کہتے ہیں ؎

اپنا مشرب ہے ثنا خوانی احباب زماں
اُن پہ لعنت ہے جو یاروں کو بُرا کہتے ہیں[1]

۱۸۹۵ء کے قریب رسالدار صاحب نے انتقال کیا۔ نتیجہ فکر سے دو شعر نقل ہیں ؎

بڑھ بڑھ کے سما جائینگے دیوار میں ہم بھی	سرکے گا ترا سایۂ دیوار کہاں تک

دل اگر کہنے میں ہوتا تو یہ دکھ کیوں ہوتا	ہے بغل ہی میں مرے دشمن جانی فوصا

افضل

حکیم سید نظام علیخاں ابن حکیم وارث علی خاں برادر قاضی باقر علیخاں نبیرہ قاضی محمد باسط علی خاں اول قاضی شہر۔

جناب افضل کی نشو ونما امیرانہ ہوئی۔ مولوی محمد عالم سے علوم رسمیہ کی تحصیل کی۔ فن طب باپ سے حاصل کیا۔ کالے محل سے نزدیک قاضی گلی ہے یہیں قاضیوں کا خاندان رہتا تھا۔ افضل عہدۂ بخشی گری پر مامور ہوئے پھر صدر نظامت میں وکالت کرنے لگے۔ مولوی اکرام اللہ تصویر الشعرا میں لکھتے ہیں:-

"مردے خوش مزاج است با راقم سطور اخلاص درست میدارد"

---

[1] ادبی لطائف۔ از انتظام اللہ شہابی

ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد عہدۂ منصفی پر فائز ہوئے زیادہ تر قیام فتح آباد میں رہتا تھا ہر شب یکشنبہ کو آگرہ آتے اور محفل مشاعرہ منعقد کرتے تھے ۱۲۹۴ھ میں انتقال ہوا. باغ نواب مجید الدولہ میں دفن ہوئے۔

آپ کی ایک صاحبزادی افضل النساء بیگم تھیں جو فضیلت علمی کے ساتھ فن طب میں مہارت رکھتی تھیں۔ ڈپٹی سید اصغر علی خاں بھرت پوری کو منسوب تھیں۔ میاں حامد علی خاں صاحب نائب تحصیلدار ان کے خلف ارشد ہیں۔ سفرنامہ حجاز بیگم صاحبہ کا یادگار ہے جب افضل اردو فارسی میں فکر سخن کرتے تھے۔ منظوم نامہ و پیام کے عادی تھے۔ مجموعہ راقم السطور نے خان بہادر ڈپٹی محمد یوسف صاحب کو طبع کرانے کے لئے دیا ہے مطبوعہ اشعار ان کی یادگار ہیں۔ افضل کہتے ہیں ؎

نہ ہوئی اشکوں سے آہِ دلِ سوزاں ٹھنڈی — آگ کر دیتے ہیں گو دیدۂ گریاں ٹھنڈی
گرم اغیار سے واں رہتی ہے صحبت ہر روز — شام سے ہوتی ہے یاں شمع شبستاں ٹھنڈی
گرم اغیار کے پہلو تو کیا کرتے ہو — گلے لگ کر نہ کی چھاتی مری اے جاں ٹھنڈی

مر گیا آتشِ فرقت سے جو افضل جلکر
نہ ہوئی نعش نہ تا گورِ غریباں ٹھنڈی

کچھ محتسب کا ڈر نہیں خوفِ خدا نہیں — وہ ہم کو بے خودی ہے کہ اپنی خبر نہیں

منصفی سے پنشن لی آپ چارج دینے گئے تو برجستہ مطلع ارشاد فرمایا ؎

پنشن لی ملیں گے بت شوخ و رنگ سے
اچھا ہوا کہ چھٹ گئے قیدِ فرنگ سے[1]

راجہ مہاراجہ بلونت سنگھ متخلص بہ راجہ ابن مہاراجہ چیت سنگھ والیٔ کاشی۔ وارن ہیسٹنگ کے مظالم کے نذر انکی حکومت ہوئی۔ کچھ عرصہ گوالیار میں نظربند رہے پھر آگرہ میں آن رہے سرکار سے لبتی جرنل لیک دو ہزار روپیہ ماہوار ملتا تھا خوش فکری سے بسر کرتے تھے۔ اہل علم کے قدر دان۔ سخی و سیر چشم خلیق و متواضع بزرگ تھے۔ پنڈت سوہن لال جو فن نجوم کے بڑے ماہر تھے ان سے اور راجہ سے گہرے تعلقات تھے۔ مفتی انعام اللہ خاں بہادر گوپاموی اور حضرت نجر سے بھی مراسم تھے۔ شعر و شاعری سے شوق تھا ہر ماہ مشاعرہ کیا کرتے تھے۔ تہر اور اسیر سے اصلاح کلام لی۔ ۱۸۵۸ء کے بعد انتقال ہوا۔ صاحب دیوان ہیں[2]

اقلیم کبھی زیر نگیں رہتی تھی راجہ — اب خوف یہ غالب ہے نگیں پر نہ رہیگی

تو ہے وہ گل کہ نام ترا باغِ دہر میں — دو دو پہر وظیفۂ مرغِ سحر ہوا

لطیفہ:- راجہ کے یہاں مشاعرہ عام تھا۔ ان کے یہاں دستور تھا کہ ہر بڑے اُستاد کے سامنے بلوریں پیچوان لگایا جاتا۔ خود راجہ کے لئے بھی ویسا ہی لگتا۔ عنایت اللہ سفلی مشاعرہ میں آئے۔ مجلس کا رنگ دیکھ کر کہنے لگے۔

دُور سے تودۂ بلور نظر آتا ہے

راجہ نے پیچوان کی سٹک منہ سے لگائی۔ فی البدیہہ سفلی دوسرا مصرع کہتے ہیں۔

دُم دباتا ہوا لنگور نظر آتا ہے

محفل میں قہقہہ لگا راجہ صاحب مسکرا کر رہ گئے۔ بعد ختم مشاعرہ ایک شال جناب سفلی کو عطا کی گئی ؎

قائم رہے یہ راجہ کاشی کی سلطنت
یہ اک طلسم گاہ ہے دربار ہی نہیں (سفلی)

راجہ کہتے ہیں ؎ پہلو میں بیٹھ کر مرے ایکدم وہ چلدیئے
سب دلمیں حوصلے دلِ مضطر کے رہ گئے

لطیفہ:- راجہ صاحب کے یہاں مشاعرہ تھا۔ اسیر آئے ان کو دائیں جانب جگہ دی۔ تہر کو بائیں طرف بٹھایا۔ ہر ایک کی حسب مرتبہ آؤ بھگت کی گئی۔ ان دونوں استادوں کے سامنے خصوصیت سے چاندی کے حقہ لگائے گئے۔ حقہ کی نہال چھوٹی تھی۔ جناب اسیر کو بھلا یہ حقہ کیوں بھانے لگا۔ مجلس میں حقہ کے لئے ساقن مقرر تھی۔ اُنھوں نے نہال سے رُخ بدل کے ساقن کی طرف رُخ کیا۔ اور اُسی کے گرما گرم دھوئیں دار حقے سے اپنی خواہش کی آگ کو بجھانے لگے۔ تہر نے یہ جو رنگ دیکھا تو کنایۃً کہا حضرت کیا خوب اب تو آپ کی طبیعت کسی اور ہی طرف مائل ہے۔ جناب اسیر چھوٹتے ہی بولے

دل میں اُلفت ہے جو اک سانولی متوالی کی
گو مسلمان ہوں پر بول اُٹھتا ہوں جے کالی کی

لطیفہ:- ایک دن راجہ کے یہاں تہر و اسیر صبح اتفاقیہ آگئے یہاں بھنگ گھٹ رہی تھی۔ اسیر افیون اور اسکا بھی شوق رکھتے تھے۔ جب بھنگ گھٹ گئی۔ چاندی کے کٹوروں میں ان ہر دو کے سامنے لائی گئی۔ تہر کہتے ہیں ع

نشہ میں بھنگ کے ہوں فکر ہے مضمون عالی کی

مصرع کہا اور شکریہ کے ساتھ کٹورا پھیر دیا۔ اسیر صاحب چڑھا گئے اور کہا ؎

چڑھائی بھنگ کی مٹکی صراحی مے کی خالی تھی — نشہ میں بھنگ کے ہم نے بھی نازک خیالی کی

---

[1] تصویر الشعرا۔ گلستان سخن۔ شعر و سخن۔ نغمہ ستان نثار [2] انشائے نجر

سفلی سفلی تخلص نام محمد عنایت اللہ خاں عرف کالے خاں ابن عظیم اللہ خاں کمال زئی اصل وطن رام پور تھا۔ سفلی کے نانا احمد خاں سوار لارڈ لیک کی فوج میں تھے۔ فتح اکبرآباد کے صلہ میں ایک گاؤں ضلع آگرہ میں احمد خاں کو ملا۔ اس گاؤں کے انتظام کے لئے رام پور سے سفلی آگرہ آئے اور یہیں رہ پڑے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ فنِ کتابت میں منشی رام دھن جوہر رقم کے شاگرد تھے۔ مولوی روح اللہ وکیل صدر نظامت کے محرر رہے۔ مسٹر اکمین جج خفیفہ کے زمانہ میں عرائض نویس دیوانی میں ہو گئے۔ انکی لطیفہ گوئی مشہور ہے۔ موزوں طبع تھے۔ حضرت زماں سے تلمذ تھا۔ نوجوانی میں رنگ رلیاں بھی خوب منالیں۔ کندن سے تعلق رہا ؎

نیا کشتہ ہو ہو کے کندن کا دل
یہ نسخہ مجھے کیمیا ہو گیا

کندن کی سہیلیوں پر بہت مہربان تھے۔ فرماتے ہیں ؎

شہزادی۔ منی۔ بسنتی گھسیٹی گئی ہیں سب
جلسہ یہ چل کے دیکھئے کس کرد فر کا ہے

کچھ عرصہ تک لچھمی سے بھی لگا ؤ رکھا۔

ان دنوں لچھمی سے صحبت ہے　　　آج کل اپنے پاس دولت ہے

سفلی کے ملنے والے مجو خاں گویے تھے انکا انتقال ہو گیا۔ کندن کے استاد تھے۔ کندن نے سفلی سے کہا مجو خاں کی تاریخ وفات کہدیجئے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

جب مجو خاں گویے کا آیا قریب وقت　　　سارنگی لے کے چلنے کو بیٹھا کمر کسے
مرتے ہی رنڈیوں نے یہ نوحہ بپا کیا　　　زہرہ کا رقص دیکھنے استاد چل بسے

۱۲۹۸ھ

احکام اللہ صاحب کہتے تھے کالی موتی ایک ڈیرہ دار طوائف تھی اسکی نوچی امام باندی بہت حسینہ وجمیلہ تھی وہ اپنے آشنا کے ساتھ نکل بھاگی۔ سفلی کہتے ہیں ؎

موتی کے شل آب جو کچھ تھی وہ ڈھل گئی　　　بی بی کی دھول اڑ گئی باندی نکل گئی

بلا سے سر پہ تو چڑھتا کسی بریدہ کے　　　میں شیخ سدو نہ ہوتا کمال خاں ہوتا

جب مہر و لطف و عنایت نہیں یہاں　　　تو آگرہ بھی مطلع انوار ہی نہیں

آرام ہے سر درہے کیا سکھ بدن کے ساتھ　　　کمبخت ہیں جو لوگ نصیبن کے یار ہیں

لو اور جاکے رہو خوجہ کی حویلی میں　　　تمھیں بھی شیخ جی سب ہیجڑا سمجھتے ہیں

ناچ ہو رنگ ہو احباب کی مہمانی ہو　　　ہو عجب لطف جو لڑکوں کی مسلمانی ہو
قورمہ۔ زردہ ہو، اور نان ہو بریانی ہو　　　ہانڈی موقوف کے تکیہ میں یہ دیوانی ہو

محبت شاہ کا تکیہ ہو میں ہوں وحشت ہو　　　نہیں خواہاں کہ حاصل مجکو مال و جاہ و دولت ہو

سفلی سوائے نیر اعظم جناب مہر　　　سمجھے تمہارے شعر کسے امتیاز ہے

شعلے نے رکھ کے کف پہ اگر زر دیا تو کیا　　　اہلِ کرم کی جلتی ہے مٹھی بندھی ہوئی

لے گیا شاید اڑا کر کوئی طفلِ بیتمیز　　　کیا سبب کیوں کم ہوا ای زر یہ سونا چار سُرخ

معشوق بچہ کش سے تو سفلی خدا بچائے　　　جی انتشار ہوتا ہے کل بل کو دیکھ کر

سفلی نے ۱۳۱۶ھ میں انتقال فرمایا ایک دیوان یادگار ہے۔

زر شیخ بلاقی زر ابن شیخ سعادت اللہ اکبرآبادی۔ اصل لاہور ہے۔ سادہ کاری میں استاد تھے۔ شیخ امام بخش سادے کار دہلوی سے کسبِ ہنر کیا۔ موزوں طبع تھے۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ حضرت بنجر سے دوستانہ تعلقات تھے۔ ایک دیوان دا سوخت مثنوی حضرت موسیٰؑ و فرعون یادگار ہے۔ غدر کے بعد انتقال کیا۔

کالے خاں سفلی زر کے لئے کہتے ہیں ؎

لے گیا شاید اڑا کر کوئی طفل بیتمیز
کیا سبب کیوں کم ہوا اے زر یہ سونا چار سرخ

زر فرماتے ہیں ؎

دل میں جگر میں سینہ میں یکساں ہے درد آج　　　اے چارہ گر بتاؤں کدھر کم کدھر بہت

خوفِ افلاس نہیں سیم تنوں کو اے زر　　　زرق و برق انکو ہوئی ہے مری بار لئے

شبِ ہجراں بسر نہیں ہوتی　　نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی
کیا تماشا ہے ہم تو مرتے ہیں　　انکو اصلا خبر نہیں ہوتی
کیا غضب ہے کہ وصل میں بھی کبھی　　بات دو دو پہر نہیں ہوتی
پتلیاں پھر گئیں ہماری ہائے
انکی سیدھی نظر نہیں ہوتی[1]

تپش مولوی سید مدد علی خلف مولوی نجف علی سبزواری شرفائے اکبر آباد سے تھے۔ علمی استعداد معقول تھی پہلے ~~[illegible]~~ مرزا غالب سے مشورہ سخن کیا فارسی میں مولوی قمر الدین خاں سے اعلیٰ استعداد بہم پہنچائی۔ مفتی ریاض الدین سے علوم عربیہ حاصل کئے۔ خزانۃ القواعد۔ جغرافیہ منظوم۔ تاریخ ہند یادگار ہیں منشی عبد الحمید تاج محلی آپ کے پوتے ہیں[2]۔

ریختہ

اسیرانِ محبت کوچۂ دلدار میں جاکر　　کبھی رسوا ہوئے گہ موردِ لطف و عطا ٹھہرے

فارسی

ز خوبی قدانِ سیہ چشم مدعا مطلب　　دلا کنارہ ازینہا کن و دوا مطلب
تو اینکہ آب بقا خواہی و حیات ابد　　بہ تیغ ناز کسے ہست جا بجا مطلب
بہ پیش خاک در یار سیم ابدل　　ز طور سرمہ مجو خاک کیمیا مطلب
ز دست قاتل خود کشتہ سو تپش یعنی
تو ناز عیسی مریم کش دوا مطلب[3]

سعید قاضی میر سعادت علی ابن سید مہر علی خاندانِ سادات سے تھے انکے بھائی سید بہادر علی نائب ناظر تھے۔ سعید صاحب علوم رسمیہ سے واقف تھے۔ مطالعہ کتب کا شوق تھا۔ مشغلہ نکاح خوانی تھا گرد اکبر آباد کی قضاۃ آپ کے گھرانہ میں تھی۔ تصنیف و تالیف سے دلی لگاؤ تھا۔ کثیر التعداد کتب کے مصنف ہیں۔ گلدستہ نثر۔ تاریخ انبیا منظوم دیوان اردو فارسی یادگار سے ہیں۔ امیر علی شاہ سے بیعت تھے۔ قاضی احتشام علی صاحب آپ کے اخلاف سے ہیں۔

تفتہ ہر گوپال متخلص بہ تفتہ آبا و اجداد کا وطن سکندر آباد تھا۔ ۱۲۲۰ھ کے قریب پیدا ہوئے استادانِ فن سے علوم فارسی کی استعداد بہم پہونچائی۔ مولوی اکرام اللہ تصویر الشعرا میں لکھتے ہیں:—

"تفتہ تخلص ہر گوپال نام از قوم کالستہ مولدش چکلہ سکندر آباد در محلہ قانون گویان تلمذ بمرزا قتیل است گویند مردے آزاد طبع ست و لطیف مزاج چندے بہ تحصیلداری کاشی پور ٹھاکر دوارہ ضلع مراد آباد در عمال ملازم بود حالا شنیدم کہ تخفیف در آمدہ طبع خوشی دارد و نکات موزوں در ہندی و فارسی می آرد۔"

کم عمری سے شعر و شاعری سے لگاؤ تھا۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ مرزا قتیل کا شہرہ تھا ان سے ہی مشورہ سخن کیا۔ طبیعت میں جدت تھی کچھ عرصے میں قادر الکلام شعرا میں شمار ہونے لگا۔ کچھ عرصہ کول میں بھی قیام کیا۔ یہاں منشی نبی بخش حقیر اکبر آبادی سے تعلقات ہوگئے۔ حقیر صاحب کول میں سررشتہ دار تھے اور مرزا غالب کے احباب سے تھے۔ خلیفہ گلزار علی اسیر کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ سخن فہمی میں جواب نہ رکھتے تھے۔ تفتہ سے بھی مراسم پیدا ہوگئے۔ مرزا غالب کا ڈنکا بجنے لگا۔ تفتہ نے بھی رجوع کیا۔ مرزا صاحب نے توجہ کی اور انکے فارسی کلام کی اصلاح دینی شروع کی۔ پھر تو مرزا غالب کے رشید شاگردوں میں شمار ہونے لگا۔ مرزا صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں:—

"مجکو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں۔ جسکا ہر گوپال نام اور تفتہ تخلص ہے" تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پرسش کیوں کرتے ہو۔ چار جزو نہیں تو بیس جزو تو بے تکلف بھیجدو۔

تمہاری شاعری کو میں جانتا ہوں کہ کوئی دم تم کو فکر سخن سے فرصت نہ ہوگی پھر جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع صنعت کا اور دو لخت شعر لکھنے کا اس میں ضرور نشست معنی بھی ملحوظ رکھا کرو اور جو کچھ لکھو اس کو دوبارہ سہ بارہ دیکھا کرو۔

اشعار سابق و حال میرے پاس امانت ہیں بعد اچھے ہونے کے ان کو دیکھوں گا اور تم کو بھیجدوں گا۔ بھائی تضمین گلستاں چھپوا کر کیا فائدہ اٹھایا ہے جو انطباع سنبلستاں سے نفع اٹھاؤ گے۔ سعدی نے بوستاں سے کیا پھل پایا جو تم سنبلستاں سے پاؤ گے۔ مضمنا یہ بھی ہے کہ اب مشق تمہاری پختہ ہوگئی خاطر مری جمع ہے۔

---

[1] گلستانِ سخن۔ و سخن الشعرا بناز علی بریلی۔ نگارستانِ شعار
[2] شعر و سخن۔ خمخانہ جاوید حصہ دوم [3] اسعد الاخبار ۱۸۴۹ء نمبر ۹ جلد اوّل

سنو صاحب جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے اسکا نام عیش ہے تمہاری توجہ مفرط بطرف شعر و سخن تمہاری شرافت اور حسن طبع کی دلیل ہے اور بھائی یہ جو تمہاری سخن گستری ہے اس کی شہرت میں مری بھی تو نام آوری ہے"۔[۴]

خطاب:۔ مرزا غالب نے تفتہ کو مرزا کا خطاب عطا کیا تھا۔

۱۸۴۷ء میں اگرہ مستقل طور سے آ رہے تھے۔ ڈاکٹر مکندلال کے مکان کے قریب مقیم تھے حضرت شہید حضرت بیجز کاظم علی کاظم جناب قہر مولوی واجد علی صاحب مطلع العلوم مولوی قمرالدین قمر فارسی گو شعرا کی ایک علیحدہ مجلس جمع تھی۔ اسکے ایک رکن تفتہ بھی تھے۔ آخر عمر سکندرہ آباد میں گذاری۔ چار دیوان فارسی کے تھے۔ پختہ عمر پاکر ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا۔[۵]

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جسکے فیض سے — ہم سے ہزاروں ہیچداں نامور ہوئے

تاریخ عطائے خطاب و خلعت از حضور شاہ دہلی بجناب اسداللہ خاں غالب

از مرزا تفتہ

سراج الدین بہادر شاہ غازی داد غالب را — خطابے جوہر ہر لفظ آں روشن تر از اختر
دبیر الملک و نجم الدولہ دیگر جرعہ دیگر ہم — نظام اول بود زاں بعد لفظ جنگ ای سرور
خطاب و خلعت شش پارچہ بخشید در خلعت — فزودہ جیغہ و سرپیچ و مالائے در و گوہر
بدیں توقیر دانستم کہ باشد خسرو دہلی — سخن فہم و سخن گو پرورد دانا و دانشور
پئے تحریر تاریخ خطاب و خلعت شاہی — بدریائے تفکر غوطہ زد طبع سخن گستر
بہ ہنگامے کہ شد در غوطہ پالیش بر زمیں قائم — بگوش تفتہ ہاتف گفت کا ی لہ نذ زباں آور

بگو گر سال ایں پیش آمد اقبال میخواہی
بکے ساماں و دم حشمت سوم اعزاز چارم فر

۱۲۶۶ھ

باسط | قاضی میر باسط علی خاں باسط خلف قاضی میر باقر علی خاں بن قاضی واجد علیخاں بن باسط علیخاں بن حافظ ثابت علیخاں بن محمد عارف بن محمد ہاشم بن امین علی بن حبیب علی بن خواجہ علی نوشیری بن حافظ سید علی جعفری ہمدانی بعد ارتحال حضرت شیخ سلیم چشتی اکبر نے آپ کو ہمدان سے بلایا کچھ عرصہ اگرہ رہے پھر کشمیر چلے گئے وہیں انتقال ہوا۔ سید حبیب علی کو جہانگیر نے کشمیر سے بلا کر شہزادگان اور تاج کی نگرانی سپرد کی۔ انکے پوتے سید ثابت علی متخلص فائز تھے۔ انھوں نے اپنے والد محمد عارف کے انتقال کی تاریخ یہ کہی ہے ؎

چوں محمد عارف غفراں پناہ — جامۂ تن در رہ حق کردہ شق
سال تاریخش شنیدم از خرد — عارف حق نیک (۹) واصل بحق

جناب فائز اگرہ شہر کے قاضی مقرر ہوئے انکے پوتے قاضی واجد علی خاں تھے تخلص تو ہو کرتے تھے انکی ذیل کی تاریخ مشہور ہے ؎

قدوۂ دیں آں محمد باسط اہل مجد و فضل — ذی بلاغت ذی فراست صاحب ذہن ذکی
مسند آرائے شریعت کار فرمائے قضا — حاکم احکام ملت از کمال بخردی

انکے صاحبزادہ میر باقر علی قاضی شہر تھے۔

قاضی باسط علی باسط علی استعداد معقول رکھتے تھے۔ ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار بصیلہ نگرانی تاج محل ورثہ میں تھا مگر سرکار نے کچھ عرصہ بعد بند کر دیا۔ فتح آباد میں ناظر مضعفی ہو گئے تھے رجسٹری کا دفتر متعلق تھا وہ اُن سے لے لیا گیا اور للعہ بہرانہ قائم رہا۔ میخواری حد سے بڑھی ہوئی تھی تمام املاک فروخت کرکے نذر میخانہ کر گئے۔

رباعی

بارش میں بھرے ہے بادہ مشک ٹپکی — عابد زاہد سے دُور بھٹکی بھٹکی
قاضی سے بچی نہ محتسب سے باسط — یہ دخترِ رز ہے جس سے اٹکی اٹکی

بحالت کیفیت ۱۹۰۹ء کے بعد انتقال کیا۔

غمزہ و ناز و کرشمہ وہ دکھانے بھی نہیں — ایسے روٹھے ہیں کہ گھر تک مرے آنے بھی نہیں
فرقت یار میں ہم جان سے جانے بھی نہیں — خواہش وصل بھی ہے زہر کو کھانے بھی نہیں
رقص بسمل کا مزا لیتے ہیں زخمی کرکے — فیصلا کا وہ کوئی ہاتھ لگانے بھی نہیں
محو ہو جاتا ہوں باسط کہوں کیا دل کا حال — سامنے اُنکے مجھے ہوش تو آنے بھی نہیں

رات ساری کٹ گئی آیا نہیں وہ سنگ دل — انتظار تب میں یاں آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئی

لطیفہ:۔ جناب باسط کے مکان کے قریب مرزا الف بیگ رہا کرتے تھے۔ یہ پیدائشی بے ریش و بروت تھے۔ مرزا کو علمی ذوق تھا دفتر کلکٹری میں منیجر رہتے تھے تو اضع و مدارات کا یہ نتیجہ تھا کہ اہل علم حضرات روزانہ شام کو انکی ڈیوڑھی پر آ جمع ہوتے اور خوش گپیاں کرکے شاد کام گھروں کو سدھارتے۔

مرزا بابر کا امام باڑہ بارش سے گر گیا۔ تعمیر کی کوئی سبیل نہ تھی امامی خاں عطار فی سبیل اللہ کاموں میں بہت لگے رہتے تھے۔ امام باڑہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے وقت کی بات مرزا الف بیگ سے گفتگو ہوئی انھوں نے دو سو روپیہ جو لگا رکھے تھے وہ امامی خاں کو دیدیے اُنھوں نے اس میں ہی امام باڑہ تعمیر کرا دیا۔ مرزا الف بیگ کی ہر طرف سے بہت شہرت ہوئی۔ قاضی باسط علی خاں نے بھی تُرنت کہنے لگے ؎

بے ڈاڑھی مونچھوں والے نے بابر کی کی مدد — مردوں میں سکہ پڑ گیا خوجوں کے نام کا

انتظام اللہ شہابی

(۹) ۲ ــ

۵ ـ سالہ اردو دستہ سی مرزا غالب

مزدور

(تبرکات حضرت اقبال ورما سحر ہنگامی مرحوم)

کام سے فارغ نہیں دم بھر بھی اے مزدور تو
اس پہ بھی افلاس سے کس درجہ ہے مجبور تو

دکھ اٹھا کر دن رات سہنا ہی تری قسمت میں ہے
جیتے جی مر مر کے رہنا ہی تری قسمت میں ہے

رکھ رہا ہے ساری دولتمندیوں کی لاج تو
خود مگر ہے کوڑی کوڑی کے لئے محتاج تو

کیا خبر یہ حال اب کیا رنگ دکھلانے کو ہے
"خون دل پینے کو ہے، لخت جگر کھانے کو ہے"

کپڑے سلتے ہوں کہاں سے تن بدن کیواسطے
چیتھڑے تک جب نہیں تیرے کفن کیواسطے

دھوپ، پانی اور ہوا کا ظلم سہتا ہے کہیں
اور کہیں تو لطف بھی ان سے اٹھا سکتا نہیں

ہے کہیں اک تنگ حجرہ تیرے رہنے کیلئے
اور کہیں اک گھر جو گھر ہے صرف کہنے کیلئے

کارخانوں میں جو کل بنکر گھسا جاتا ہے تو
کام کی چکی میں باہر بھی پسا جاتا ہے تو

سختیوں کی حد نہیں پھر بھی ہے اک حال تک
مالکوں کی سختیاں گویا ہیں زخموں پر نمک

الغرض ملتا نہیں آرام، تجکو کام سے
اور نہ بیکاری میں رہ سکتا ہے تو آرام سے

زندگی میں جب ہوں تیری کلفتیں اتنی شدید
مر کے بھی کیا ہو سکے پھر تجکو راحت کی امید

کیا ہے کوئی تیرے اس رنج و قلق کی انتہا
کیا ہے کوئی تیرے اس تلافِ حق کی انتہا

محنت اب تیرے لئے ثمرے سے عاری ہو گئی
ذات تیری تابع سرمایہ داری ہو گئی

تابع سرمایہ داری ہو گئی اور اس قدر
تجھ میں شخصیت کا بھی باقی نہیں مطلق اثر

قدرتاً جب مٹ گئی اس طرح خودداری تری
پھر تو پورے طور پر ہو کر رہی خواری تری

آج تو ان ساری بدکرداریوں کا ہے شکار
جن سے خالی رہ نہیں سکتا غلامانہ شعار

علم کا تو پیشتر ہی سے نہ تھا دل میں گزر
پس عمل سے اور بھی ہوتا گیا تو بے خبر

کچھ نہیں ہے اب تجھے اچھی بری گت کا خیال
اور نہ ہے کچھ اپنی صحت کا نہ صحبت کا خیال

دیکھنے میں گو سراپا صورتِ انساں ہے تو
اپنی سیرت میں زیادہ تر مگر حیواں ہے تو

صرف تجھ تک ہی نہیں محدود یہ سب حالتیں
بن رہی ہیں تیرے بچوں کی بھی ویسی ہی گتیں

ہوتی جاتی ہیں یہ ساری مشکلیں پائندہ بھی
ہے بہت سی دقتوں کا احتمال آئندہ بھی

لیکن اے مزدور! کیا سب دن رہے گا یہ سماں؟
کیا نہ بدلے گا نہ بدلے گا کبھی دورِ زماں؟

اس سے تو پڑ جائے گا قانونِ قدرت میں خلل
اس جہاں میں کچھ بھی رہ سکتا نہیں ہو کر اٹل

اپنے دامن میں لئے اب ایک رنگِ تازہ کار
آ رہی ہے دیکھ جنت سے ہوائے خوشگوار

جدت آخر رفتہ رفتہ دخل جمنے پائے گی
تیری دنیا بھی بدل کر دوسری ہو جائیگی

اور جب یوں ہی تری بگڑی بھی پھر جائیگی بن
تو اسی انداز پر بن جائے گا سب کا چلن

اقتضائے وقت سے آئے گا ہر دل میں وہیں
تیرے ساتھ انصاف کرنے کا خیال اولیں

تجھ میں آئے گا صداقت اور امنا کا وہ بل
ٹھیک ہی ہو جائیں گے اپنے پرائے سب عمل

تجھ میں ہوگا میل کچھ ایسا کہ دکھلا کر اثر
ہر کس و ناکس کو مائل کر ہی دے گا میل پر

ہر طرف سے ہوگی کچھ ایسی ترقی آشکار
دیکھتے ہی دیکھتے ہو جائیگا خاصا سدھار

پھر نہ ہوگا کوئی رچھن جانے کا موقع یا محل
لوگ خود دیں گے تجھے جو تیری محنت کا ہے پھل

ہو کے ہر قطرہ پسینے کا ترے تن سے جدا
واقعی تیرے لئے ہوگا دُرِ نایاب سا

جس سے پھر ہوگی میسر فارغ البالی تجھے
منہ دکھائیگی پھر اپنا آکے خوشحالی تجھے

یوں مشقت کا ملے گا اجر کافی ایک دن
یوں ترے نقصان کی ہوگی تلافی ایک دن

ایک دن پھر جا بجا ہوگا اجالا دہر میں
ایک دن ہوگا ترا پھر بول بالا دہر میں

ایک دن آخر غرور و کبر کھا جائینگے ہار
فتح ان پر پائیں گے بے شبہ عجز و انکسار

ایک دن ہو کر رہے گا اس صداقت کا ظہور
دولت و عزت پہ ہے ترجیح محنت کو ضرور

ایک دن ہو جائے گا ظاہر حق و باطل کا فرق
دور ہوگا بیشتر جس سے دوئی میں ہر دل کا فرق

ایک دن سب تیرگیٔ کفر ہو جائے گی دور
جلوہ گر ہوگا خدائی میں خدا کا پاک نور

ایک دن زوروں پہ ہونگی طاقتیں ایمان کی
قدر ہوگی قلب میں انسان کے انسان کی

ایک دن ایمان ہی کے فیض سے اپنا وطن
پا کے آزادی مٹا دے گا سب آلام و محن

سحر وہ دن گو ابھی ہم کو نظر آتا نہیں
ہند میں آئیگا آئیگا مگر وہ بالیقیں

"یہی اب جو بار ہے دوش پر یہی سر تھا زانوئے یار پر"

آنکھ جھپکی ہی تھی کہ دوسری دُنیا میں تھا۔ ایک پلنگ پر ہم دونوں ایک ہی برتن میں دودھ چانول کھا رہے تھے۔ اُنکی جاگتی رنگاہوں کی پہنائیوں میں معصومیت آسودہ تھی دل" دزدیدہ فگندی ہمن از ناز نگاہے" کے ساتھ ساتھ "کز این خویش می شوئم بہ بہتا" کے صحیح مفہوم سے بالکل پہلی مرتبہ آشنا ہو رہا تھا۔ اضطراری یا غیر اضطراری بشعوری یا نیم شعوری طور پر کئی مرتبہ اُنھوں نے کھانے کا چمچہ اپنے منہ کی بجائے میرے منہ سے لگا دیا۔ میں اُن سے پہلے دست کش ہوگیا۔ انھوں نے جھٹ پٹ ایک گلوری بنا کر میرے منہ میں رکھدی۔ تمباکو کی تیزی نے دماغ کو متاثر کیا اور میں تکیہ کا سہارا لیکر لیٹ گیا، وہ کھاتی رہیں۔ اُن کا زانو آہستہ آہستہ میرے سر کی طرف بڑھ رہا تھا، بڑھتا رہا اور بالآخر میرے سر نے اُن کے زانو کے ایک کیف آگیں لمس کے ساتھ ایسا محسوس کیا کہ کوئی وزنی چیز پہلے تو سر اور پھر تمام وجود پر رکھدی گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ مجھ پر کوئی دیو مسلط ہے۔ اعضا بے لس۔ جوارح مختل اور دماغ ماؤف تھا۔ جد و جہد کے باوجود جسم حرکت سے معذور ہوگیا۔ ایک دہشت انگیز چیخ کے ساتھ آنکھ کھل گئی۔

"ڈراؤنے خواب میں نے پہلے بھی دیکھے تھے۔ خواب میں بارہا چیخا اور رویا بھی تھا۔ لیکن اس خواب کی نوعیت ہی جدا تھی۔ ایک نظر آشنا شکل مرکز نگاہ تھی۔ وہ شکل جسے میں نے پہلے ایک ہی بار دیکھا تھا اور وہ بھی" دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو" کے انداز میں۔ میں گردن جھکائے پاؤں سے زمین کرید رہا تھا اور وہ میری جانب پشت کئے ہوئے کھانا پکانے میں مشغول تھیں۔ کبھی کبھی دفع دخل مقدر کے خیال سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر لیتیں اور میں" ہاں" یا "نہ" سے اپنی موجودگی کا ثبوت دیدیتا۔ البتہ چلتے وقت بالکل اتفاقیہ طور پر ہماری نظریں متصادم ہوگئیں، اور میں نے اُنھیں" زہیر دا اندر ردائے نور عریاں دیدہ ایم" والی شان سے دیکھا اور تھوڑی دیر کے لئے سوچنے لگا کہ کہیں" ز موج گل بہاراں لبستہ زنار" اسی مذبوحی منظر کی تفسیر تو نہیں ہے۔ وہ میرے ایک قریبی عزیز کی رفیقۂ حیات تھیں اور میرا ضمیر مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں اُنھیں حسین نہ سمجھوں۔ عقل میرے وجدان پر غالب آسکا کہ نہیں یہ تو میں نہیں جانتا البتہ اس دن کے بعد مجھے ان کے یہاں جانے کی جرارت نہیں ہوئی۔ میں اسے حفظ ماتقدم کہتا ہوں آپ کو اختیار ہے آپ اسے رعبِ حُسن کہیں یا" دل کے چور" سے تعبیر کریں۔ اُن کے بے محابا تصور نے خلوت میں جلوت میں بارہا گدگدایا مگر میں نے اسے" درد لیست در دم کہ بہ درماں برابر است" سے زیادہ اہمیت نہیں دی اور اُنکی یاد میں نے ہمیشہ" بیفشاں دامن وآزاد برخیز" سے خیر مقدم کیا۔

اُن کے شوہر ضرورت سے زیادہ سادہ اوقات اور ناخوش ذوق واقع ہوئے ہیں۔ ناخواندہ ہیں اور اُنکی شخصیت کسی بھی حیثیت سے جاذب توجہ نہیں کہی جاسکتی۔ پھر بھی بیحد پُرخلوص اور متواضع ہیں۔ انھیں ہمیشہ شکایت رہی کہ میں اُن کے یہاں کیوں نہیں آتا جاتا جبکہ وہ اور اُنکی اہلیہ میرے یہاں اکثر آتے جاتے ہیں۔ مجھے علم تھا کہ میری عدم موجودگی میں وہ میری بیوہ ہمشیرہ کے پاس اکثر آتی تھیں۔ لیکن خدا جانے کیوں مجھ میں اُن کے یہاں جانے کی سکت نہ تھی ——— ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ خواب اپنی نوعیت کا پہلا خواب تھا۔ اس لئے نہیں کہ اُن کا زانو سر پر رکھتے ہی کوئی سر پر سوار ہوگیا تھا بلکہ اس لئے بھی کہ میں اب روز یہی خواب دیکھتا اور مجھے ہر روز اسی مذبوحی کشاکش سے دوچار ہونا پڑتا۔ خواب میں دودھ چانول کھاتے کھاتے وہ اپنا زانو میرے سر پر رکھدیتیں اور مجھے محسوس ہوتا کہ کسی اژدہے نے جکڑ لیا میں اس کوفت سے تھوڑے ہی عرصے میں" ز دشواری زیستن مردہ" بن کر رہ گیا میں نے ایک روز تنگ آکر تمام ماجرا نتھو شاہ سے بیان کر دیا۔ یہ صاحب دور حاضر کے زبردست عامل سمجھے جاتے ہیں اور اُن کے حوارین کا بیان ہے کہ جنوں کا بادشاہ اُن کا تابع فرماں ہے۔ اُنھوں نے میرے غریب خانہ تک آنے کی زحمت گوارا فرمائی آتے ہی اُنکی چمکدار سرمگیں آنکھوں نے میری خوابگاہ کا جائزہ لینا شروع کر دیا اور قدرے تامل کے بعد انھوں نے نظر بچانے کی کوشش کرتے ہوئے میرے پلنگ کی بالین سے کوئی چیز نکال کر اپنی جیب میں رکھ لی اور میرے دفع مرض کا مژدۂ جانبخش فاتحانہ انداز میں سُناتے ہوئے چلدیئے۔ میری تمام خوشامدیں کہ وہ مجھے تشخیص مرض سے مطلع فرمادیں بے سود ثابت ہوئیں اس رات کو میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا کئی راتیں گزر گئیں اور مجھے کوئی خواب نظر نہ آیا۔ میں اب رو بہ صحت تھا شاہ صاحب نے

آج تک میرے مرض کی نوعیت اور اپنے طریقِ علاج سے مجھے مطلع نہیں فرمایا۔ کوئی کہتا ہے میں "کابوس" کا شکار تھا اور کوئی کہتا ہے مجھ پر کسی تعویذ کا اثر تھا۔ کچھ بھی ہو مجھے شاہ صاحب کے کمالِ فن کا اعتراف ہے۔

تمام رمضان اس درد میں مبتلا رہنے کے بعد عید اور اسکی لذتیں میرے لئے کیا ہوں گی۔ اس کا جان لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ عید کی نماز سے فارغ ہوکر مکان آیا دستور کے مطابق اعزا اور احباب کے یہاں جانے کے قصد سے اُن کے مکان کی طرف چلا یا بلکہ یوں کہو "لے جا رہا ہے شوق چلا جا رہا ہوں میں" اور بس۔ تنہا جانا ٹھیک نہیں ان کے شوہر ابھی عیدگاہ سے واپس نہ ہوئے ہونگے، لیکن اپنے عزیز ہی تو ہیں ضرور جانا چاہئے۔ اسی قسم کے خیالات کے ہجوم میں اُن کی چوکھٹ تک پہونچ گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا انھیں میرے پہونچنے کی اطلاع کیونکر ہوئی۔ آواز دینے سے پہلے ہی دروازہ کھلا اور اندر داخل ہونے کا حکم صادر ہوا۔ ایک پلنگ پر ایک تن میں دودھ چاول اور دو چمچے رکھے ہوئے تھے۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گئیں اور میں بھی دونوں نے ساتھ کھانا شروع کیا،

الٰہی ایں چہ کافر ماجرا ایست

ہو بہو وہی منظر جو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ مسکرائیں ہوائیں چلنے لگیں۔ وہ گنگنائیں فضا سنک گئی۔ میں نے انھیں گھورا وہ مجھے تکنے لگیں۔ در و دیوار جھومنے اور عشق و حُسن مچلنے لگے۔ ذرّوں سے ۔ ۵

امروز نگاہ من و عرفی بہم افتاد
باہم نگرستیم و گرستیم و گذشتیم

کے نغمے پھوٹ پڑے۔ خواب اور خواب کی تعبیر میں صرف اتنا فرق تھا کہ اس دن جوڑا نو دیہ کے بوجھ کا مترادف تھا آج وہ پھول سے کہیں زیادہ سبک تھا۔ میں فرطِ کیف سے چیخ اٹھا۔

چہ آتشے ست کہ برجان ما نہادی باز

اور اُنھوں نے ایک مذبوحی انداز میں فرمایا:۔

گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

وہ تھی عید ۱۹۲۳ء کی جب بقول کسے کائنات کی ہر چیز پر عید کا اطلاق ہوتا تھا۔

اور یہ ہے عید ۱۹۴۲ء کی جسکی پذیرائی میں ۔ ۵

ارمان رہ گیا کسی کافر کی دید کا
خالی کا چاند اب کے ہوا چاند عید کا

یا زیادہ سے زیادہ "وائے بر عیدے کہ گزشت ایں چنیں" کہکر خاموش ہو جانے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

بہار کوٹی

قطعۂ تاریخ وفات حسرت آیات علامۂ آزاد مرحوم (عظیم آبادی)

از غمِ آزاد شد جانم فگار — چشمِ من شد اشکبار و جوبار
کاملِ علم و عمل، ممدوحِ ہند — مصدرِ الطاف و جود و ذی وقار
محرمِ سرِّ سخن عالی نژاد — ذی کمال و نکتہ داں فخرِ بہار
مطلعِ او تازگیِ زندگی — مصرعِ او صد بہار اندر بہار
از سحابش داغِ حسرت ناک داد — گشت روحِ شاعری ماتم گسار

سالِ رحلت گفت ہاتف اے زکی
فضلِ حق آزاد در دارِ قرار

۱۹۴۲

زکی اورنگ آبادی

ایک خواب

کل شاعرِ مشرق نے کہا خواب میں مجھ سے
افسوس کہ مومن ہے غلامی پہ رضامند

کھلتا نہیں یہ راز کہ اے بندۂ مجبور
تو صاحبِ لولاک ہے یا دانۂ اسپند

کیا عالمِ تدبیر تجھے راس نہ آیا
کیوں تیری خودی ہو گئی تقدیر کی پابند

ہر حال میں محکوم ہے مغموم ہے معذور
تدبیر سے خورسند نہ تقدیر سے خورسند

تو کشورِ انجم کی حکومت کا سزاوار
کیوں تجھ پہ زمیں تنگ ہے اے مردِ ہنرمند

آغوشِ صدف جس کے لئے وا ہو وہ قطرہ
رکھتا ہے نظر میں مہ و پرویں کو نظر بند

لیتا ہے ستاروں سے خراج اپنے جنوں کا
ہے اسکا نشیمن نہ بخارا نہ سمرقند

غمگیں نہ ہو پژمردگیِ لالہ و گل سے
اس دہر میں تعمیر ہے تخریب کی مانند

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز (اقبال) از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز

افسر سیمابی (احمدنگر)

مطلع نور

چین حسرت نہ خنجر سے نہ قاتل سے ملا
کچھ سکوں مجھ کو ملا تو دلِ بسمل سے ملا

یہ بھی ملنے میں ہے ملنا کوئی اے حاصلِ شوق
آنکھ سے آنکھ ملی، دل نہ مگر دل سے ملا

مل گئی ساری خدائی تمہیں آسانی سے
اے بتو ہم کو خدا بھی بڑی مشکل سے ملا

جھک گئے خود، دوریِ منزل نے کئے مجھ کو سلام
میں بھٹکتا ہوا جب رہبرِ منزل سے ملا

وائے قسمت، کہ تمنا کے سفینے کو سکوں
کبھی دریا کبھی طوفاں کبھی ساحل سے ملا

ساری دنیا نظر آنے لگی اک مطلعِ نور
سلسلہ جب بھی نگاہوں کا تری دل سے ملا

شکر صد شکر کہ امید مری بر آئی
آج حسرت کا سفینہ لبِ ساحل سے ملا

کعبہ و دیر میں سب ڈھونڈتے پھرتے تھے جسے
اتفاقاً وہ مجھے جلوہ گہِ دل سے ملا

مطلعِ شعر پہ چمکا کرے تو یوں ہی ہلال
دہر والوں کو اجالا تری محفل سے ملا

ہلال پریمی

پنجابی شعر و شاعری

(قسط دوم)

مارچ ۱۹۴۳ء کے "شاعر" میں میرے محترم جناب آنور مختار صاحب صدیقی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے عنوان بالا کے تحت پنجابی غزل پیش کی تھی اور ساتھ ہی "ماہیا" کا صبر آزما وعدہ کیا تھا جو ہنوز شرمندۂ ایفا نہیں ہو سکا جسکے نمونے کے طور پر میں آج پنجابی شاعری کی جذباتی صنف "ماہیا" پیش کر رہا ہوں ——— اسد

"پنجابی" ہندوستان کے اس حصہ خطہ کی زبان ہے، جس کو پنجاب کہتے ہیں۔

پنجاب ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے ہر لحاظ ممتاز رہا ہے۔ اور شاید مستقبل میں بھی رہے گا۔ اس نے ایسے ایسے صاحب سیف و قلم پیدا کئے جن کے کارنامے مطلع دُنیا پر قیامت تک آفتاب و ماہتاب بنکر چمکتے رہیں گے۔ جنگ عظیم میں جن ہندوستانیوں نے یورپ سے اپنی تلوار کا لوہا منوایا تھا وہ اسی زمین پاک کے فرزند تھے۔ دور نہ جایئے موجودہ جنگ ہی کو لے لیجئے۔ اس وقت جبکہ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے لیڈر متفقہ طور پر بہ آواز بلند پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ انگریز کو مدد دو۔ اس جنت نظیر خطہ کی سرمست شہزور جوانیاں وزیر اعظم پنجاب کے ادنیٰ سے اشارے پر خاک و خوں کی نذر ہو رہی ہیں۔

یہ تو تعاملین کا معاملہ رہا اب قلم کو لیجئے اس وقت جبکہ جنگ کی ہولناک تباہ کاریوں نے انسان تو کیا ہر جاندار کو سانس تک لینا دشوار کر دیا ہے۔ پنجابیوں کو دیکھئے کہ کس بے جگری سے اخبارات و رسائل کی گراں باری کے متحمل ہو رہے ہیں۔ آج یو۔پی والے کہتے ہیں کہ ہم اہل زبان ہیں[1]، تو میں مدیر "شاعر" سے معذرت کے بعد اپنے ان بھائیوں سے عرض کرونگا کہ برادران "خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا" محض بلند بانگ دعاوی سے کام نہیں چلتا بلکہ ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد کے مصداق "سر میداں جو سر دیوے وہی سردار و غازی ہے" خدارا انصاف فرمایئے کہ آپ نے خدمت ادب زیادہ کی ہے یا پنجابیوں نے۔[2] اگر پنجابی اور اُنکے بعد حیدرآبادی اہل ذوق حضرات اُردو کو سہارا نہ دیتے تو اب تک زمانہ کی ناسازگاری کے کانٹوں سے اس غریب کا دامن کب کا تار تار ہو چکا ہوتا۔ یہ خدمت اُردو ہی تھی کہ جس نے پنجابیوں کو اپنی پیاری اور میٹھی[3] زبان پنجابی سے بے نیاز کر دیا اور آج جتنا اُسے پنپنا چاہئے تھا نہ پنپ سکی مگر پھر بھی ستلج۔ بیاس۔ راوی اور جہلم کے سرتاج دریائے چناب کی دھانی لہروں سے سیراب کی ہوئی وادیوں میں سوہنی مہینوال، ہیر رانجھا اور مرزا صاحباں کے گیت چھیڑنے والے شاعروں نے پنجابی زبان کو مالا مال کر دیا ہے۔

پنجابی عشقیہ شاعری کا جمن زار مندرجہ بالا افسانہ ہائے عشق پر مشتمل ہے اور جھوک، باراں ماہ، سی حرفی۔ دوہڑہ، کافی، ڈھولا اور ماہیا کے گلہائے تر سے اس کی زینت ہے۔ اگر شاعری اظہار جذبات کا نام ہے تو بیشک اُردو، فارسی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، کیونکہ ذہنی تشبیہات اور غیر فطری استعارات سے کلام کو رنگین نہیں بنایا جا سکتا، ہونا یہ چاہئے کہ سیدھی سادی باتیں دلکش پیرائے میں ادا کر دی جائیں جو تیر بن کر دل میں پیوست ہونگی۔ ہندی کی طرح اس زبان میں بھی تخاطب اقتضائے فطرت کے عین مطابق ہوتا ہے یعنی عورت کا مرد سے اور مرد کا عورت سے۔

دیہاتیوں کی طرز بود و باش معاشی اُلجھنوں کی وجہ سے بالکل سادہ ہوتی ہے۔ اگر ماں باپ کھیتوں میں جا کر ہل جوتتے ہیں تو لڑکے لڑکیاں مویشی اور ریوڑ وغیرہ کو چراگاہوں میں لیجا کر چراتے ہیں۔ ان شواریوں کے پیش نظر کسان اور مزدور

---

[1] اہل زبان اور غیر اہل زبان کی بحث کا یہاں موقع نہ تھا۔ پنجاب، حیدرآباد یا اور کوئی صوبہ اگر اُردو کی خدمت کر رہا ہے تو وہ یو۔پی پر احسان نہیں ہے۔ یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ اردو میں ہمہ گیری ایسی ہے کہ وہ سب کو اپنا لیتی ہے۔ اور لوگ اس زبان میں اظہار خیال پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ارباب پنجاب کی اردو نوازی اور خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن یہ لازمی نہیں کہ ادبا و شعرا اور رسائل و اخبارات کی زیادتی معیار زبان کی بھی ضامن ہو۔ اگر بطور کثرت بھی کچھ قطع نظر بھی کیا جائے تو اس تاریخی حقیقت پر کیونکر پردے ڈالے جا سکتے ہیں کہ ہر صوبے نے یو۔پی والوں ہی سے استفادہ کیا ہے میرے خیال میں یہ ذکر تنازعہ فیہ خیالات کے اظہار کا نہیں جو صوبہ کچھ کر رہا ہے وہ اچھا ہی کر رہا ہے۔

[2] میرے خیال میں سب سے زیادہ شعرا اس وقت پنجاب میں ہے اور اس کے بعد اُردو میں۔

[3] [illegible]

کسی سے پردہ نہیں کرتے

ساون میں جب گھٹائیں بدمستوں کی طرح گرجتی، گونجتی اور گاتی ہوئی نظر آتی ہیں کوئلیں کوکتی ہیں اور پپیہے "پی کہاں" کی فراق میں ڈوبی ہوئی دلدوز آوازیں نکالتے ہیں تو اس وقت جواں سال الہڑ دوشیزائیں چاند سے گورے گورے چہروں، ابھرے ہوئے سینوں اور سرو جیسے قدوں کے ساتھ انسانی جذبات کو برانگیختہ کرتی ہوئی جھولوں پر، اور سرمست و نہزور دیہاتی لڑکے چراگاہوں میں "ماہیا" کی جگر خراش اور غم و اندوہ سے لبریز مؤثر تانیں ہوا میں اڑاکر دلوں کا غبار نکالتے اور سینوں میں محبت کی سلگتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔

"ماہیا" اس وقت تک وجود میں نہیں آتا جب تک قلوب نشتر عشق سے مجروح نہ ہوں۔ دل کے ساز سے اس وقت نغمے نکلتے ہیں جب اُسے مضراب سے چھیڑا جائے اُس میں دلبر، دلربا، معشوق اور محبوب وغیرہ الفاظ کی جگہ صرف تین لفظ "ڈھول"، "ماہی" اور "چن" مستعمل ہیں۔ جو کشش اور جذب و اثر لفظ "چن" میں ہے وہ اس کے ہم معنی الفاظ چاند، ماہ، قمر اور بدر میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اس لئے جب "ماہیا" میں "چن" کا پیارا پیارا لفظ استعمال ہوتا ہے تو کیف و سرور کی موجیں انسان کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتی ہیں۔

ماہیا میں شعر کے تین جز (مصرعے) ہوتے ہیں پہلا جز (مصرع) عموماً قافیہ کی ضرورت کے لئے لایا جاتا ہے۔ شاذ و نادر ایسا ہوتا ہے کہ تینوں جز ہم معنی ہوں۔

(۱)

ایک عورت کا خاوند پردیس میں ہے، رات کو برشگال کی آمد سے دنیا کا منظر بہت سہانا اور دلکش ہو جاتا ہے۔ خالی بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے اس کے منہ سے بے اختیار فراق میں ڈوبی ہوئی ہوک نکلتی ہے۔

آ مل چن میرے۔ سڑ گیاں ہڈیاں خون سکایا غم تیرے۔

(سڑ۔ جل۔ گیاں۔ گئیں، سکایا۔ خشک کیا۔)

مطلب:۔ اے میرے چاند تو کس بدلی میں نہاں ہے۔ جلد آ کہ تیرے غم نے میرا خون خشک کر دیا ہے اور میری ہڈیاں جلا دی ہیں۔

(۲)

ہجر اور فراق کی کاوش اور کاہش میں جو آرزو پیدا ہوتی ہے اس کا اندازہ ذیل کے شعر سے ہوگا۔

ساویاں جو دریاں چن تیری ویکھن نوں اکھیں ڈاہڈھیاں او دریاں

(دیکھانوں۔ دیکھنے کو، اکھیں۔ آنکھیں، ڈاہڈھیاں۔ بہت، اودریاں۔ بیتاب۔ ساویاں جو دریاں۔ ایکقسم کا چارہ جو کئی طرح کا ہوتا ہے۔)

مطلب:۔ سبز سبز کھیت لہلہا رہے ہیں۔ اے میرے پیارے تو کہاں ہے تیرے دیکھنے کو میری آنکھیں بہت بیتاب ہیں۔

(۳)

ایک عورت کا خاوند پردیس گیا ہوا ہے وہ اداس ہو کر کہتی ہے۔

پانی ساگاں نوں۔ سفری ڈھولا کدن موڑ لیسیں اگاں نوں

(سفری۔ پردیسی، ڈھولا۔ محبوب، کدن۔ کب، موڑ لیسیں۔ واپس آؤ گے۔)

مطلب:۔ اے میرے پیارے، تمہیں پردیس گئے مدت ہوگئی۔ کب واپس آؤ گے۔

(۴)

ایک لڑکی کی نئی نئی شادی ہوئی ہے، خاوند تلاش معاش میں پردیس جانا چاہتا ہے جب رات کو وہ اپنی نئی نویلی دلہن کو سفر کے متعلق بتاتا ہے تو اس کے نرم و نازک دل سے درد بھری ہوک اٹھتی ہے۔

پانی کھوہ منگدا۔ اللہ نہ نکھڑے نہیں نکھڑن تے روح منگدا

(نکھڑے۔ جدا کرے، روح منگدا۔ دل چاہتا۔)

مطلب:۔ خدا نہ کرے کہ میں اپنے پیا سے جدا ہو جاؤں۔ میرا جدا ہونے کو دل نہیں چاہتا۔

(۵)

انسانی فطرت برائی اور بدنامی سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔ کوئی انسان یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ کسی قسم کی برائی اس کے سر تھوپ دی جائے۔ اور خاصکر صنف لطیف عصمت و عفت کی بدنامی گوارا نہیں کر سکتی مگر ایک دوشیزہ جس کو اس کا خاوند کہتا ہے کہ فلاں سے تیرے ناجائز تعلقات ہیں۔ اور دن رات بیچاری کو تنگ کرتا ہے۔ دل میں اپنے محبوب کو مخاطب کر کے کہتی ہے۔

نوبتاں وگن پیاں۔ تیرے جہے ڈھولے دیاں بدنامیاں لگن پیاں

(نوبتاں۔ نقارے، وگن پیاں۔ بجتے رہیں، تیرے جہے۔ تجھ ایسے حسین، لگن پیاں۔ لگی رہیں۔)

مطلب:۔ اے میرے پیارے تجھ ایسے دلبر کی بدنامی میں خوشی سے منظور کرنے کو تیار ہوں۔

(۶)

ایک لڑکے کو ایک لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے۔ دونوں میں ایک دوسرے کے ساتھ شادی کرنے کے عہد و پیماں بھی ہو جاتے ہیں۔ کہ اگر شادی کریں گے تو آپس میں ورنہ تمام عمر غیر شادی شدہ رہینگے۔ آخر لڑکی کی شادی ہو جاتی ہے۔ تو لڑکا اسکو

مخاطب کرکے کہتا ہے۔

پیّا دم لاکے۔ اساں کی کھٹیا پچھے تسا ڈے غم لاکے۔

(اساں۔ ہم نے، کی کھٹیا۔ کیا حاصل ہوا۔ پچھے تسا ڈے۔ تمہارے لئے۔ غم لاکے۔ غم کرکے۔)

مطلب: تونے آخر اپنا پیمان توڑ دیا۔ مجھے بتا کہ تیرے ساتھ محبت کرنے میں مجھے کیا حاصل ہوا۔

(۷)

چڑیاں بولدیاں۔ کنڈ کر لنگدا ایں پرواہیاں ڈھول دیاں۔

(کنڈ کر لنگدا۔ منہ پھیر کر گذرتا ہے۔)

مطلب: شام کا وقت ہے۔ چڑیاں اپنے گھونسلوں کی طرف جاتی ہوئی چہچہا رہی ہیں۔ میرا پیارا میرے دلی جذبات کا احترام نہ کرتے ہوئے روٹھ گیا ہے اور جب بھی میرے پاس سے گذرتا ہے تو منہ دوسری طرف کرلیتا ہے۔

(۸)

حقہ چھکیا دم لاکے۔ آیاں دیاں کی خوشیاں ٹرے ویندے غم لاکے

(چھکیا۔ پیتا، دم لاکے۔ مزہ سے، ٹرے ویندے۔ جارہے ہیں۔ غم لاکے، غم دے کر۔)

مطلب: میرے محبوب بڑی مدت کے بعد آئے ہو، اور ایک رات رہے بغیر پھر جارہے ہو۔ مجھے آنے کی جو خوشی ہوئی تھی اب جانے کا غم اس سے دوبالا ہوگیا ہے

(۹)

ایک عورت کا خاوند جنگ میں جاچکا ہے۔ ساون کا مہینہ آپہونچا ہے۔ دیہات بھر میں جھولے پڑے ہیں۔ الہڑ دیہاتی دوشیزائیں پیارے پیارے گیت گا رہی ہیں مگر اس غریب کے ٹوٹے ہوئے دل سے صدا آتی ہے

کالے کاں ماہیا۔ ٹرگیاں سجناں دے رہندے دل تے ناں ماہیا

(کالے۔ سیاہ، کاں۔ کوّے، ٹرگیاں۔ جو چلے گئے ہوں، سجن۔ پیارے دوست، رہندے۔ رہتے ہیں دل تے۔ دل میں، ناں۔ نام۔)

مطلب: اے میرے دل کے چاند اے میرے پیارے محبوب ہر چند تم مجبورہ کی مادی کو تڑپتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے ہو مگر میرے دل میں ہر وقت تمہاری ہی یاد رہتی ہے اور اس تمہاری یاد سے میری دنیا آباد ہے۔

یہ تو "ماہیا" کا ایک مختصر نمونہ تھا، آئندہ اشاعت میں پنجابی کی رزمیہ شاعری "ڈھولے" پیش کرونگا، آپ دیکھیں گے کہ کس طرح دیہاتی جاٹ "ڈھولوں" کے ذریعہ جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں اور لوگوں کو آمادۂ جنگ کرتے ہیں۔

سیّد علی اسد نقوی البخاری احمد آبادی

قطعۂ تاریخ وفات نورچشمی ماہِ انور بنت جناب منظر اکبر آبادی

دے گئی داغ دخترِ منظر　　کیوں نہ اس غم سے دل ہو ٹکڑے ہائے

لوحِ مرقد پہ لکھو سالِ فضا　　ہے تہِ خاک "ماہِ انور" دائے

قطعۂ تاریخ وفات علّامہ حافظ سید فضل حق آزاد عظیم آبادی

نہیں دنیا میں حضرت آزاد　　اُن سے آباد آج ہے جنت

توڑ کر قلب زار لکھدو فضا　　مرقدِ فضلِ حق، سرِ تربت

۱۳ — ۶۱ — ۱۳۶۱ھ

قطعۂ تاریخ وفات حضرت نصیر عظیم آبادی

کس کس کا رنج کیجئے کس کس کی فکر آہ　　ساحر اُٹھے جہاں سے سُدھارے حضرتِ نصیر

درکار اگر ہو مرگ کی تاریخ اے فضا　　لکھ۔ روضۂ نصیر۔ سرِ تربتِ نصیر

۶۱ — ۱۳ھ

فضا کوثری از بنگلور

لہ حضرت ساحر دہلوی

دعوتِ انقلاب

نظامِ نو سے نظامِ کہن بدل ڈالو
اُٹھو اور اُٹھ کے فضائے وطن بدل ڈالو

تم اپنے قلب میں تاب و تواں کرو پیدا — دلوں میں ہمت و عزمِ جواں کرو پیدا
زباں ہے منہ میں تو زورِ بیاں کرو پیدا — نئی زمین نیا آسماں کرو پیدا
یہ آفتاب یہ چرخِ کہن بدل ڈالو

پھرو نہ یوں صفتِ قیس عامری بن میں — لگاؤ آگ نہ ہوش و خرد کے خرمن میں
گنواؤ عمر نہ اپنی بکاؤ شیون میں — نئے نئے گل و ریحاں کھلاؤ گلشن میں
یہ لالہ و سمن و نسترن بدل ڈالو

اُٹھو عروجِ تمدن کی کھول دو راہیں — ہلا دو قصرِ تعصب کی اُٹھ کے بنیادیں
گرا دو کینہ و بغض و حسد کی دیواریں — جس آسماں کے نیچے ہوں بے اثر آہیں
اُس آسماں کی سقفِ کہن بدل ڈالو

کرو کبھی نہ گوارا زوال و پستی کو — مٹا دو دہر سے بیداد و چیرہ دستی کو
ضیائے علم سے چمکاؤ دل کی بستی کو — دُرِ عمل سے سنوارو عروسِ ہستی کو
نمائشِ دُر و لعلِ یمن بدل ڈالو

سروں پہ چھایا ہوا ہے سحابِ نکبت بھی — ہے گھر کئے ہوئے دل میں غرور و نخوت بھی
ہوئی ہے غیر کے ہاتھوں نصیب ذلت بھی — جو دل میں رکھتے ہو کچھ غیرت و حمیت بھی
تو اُٹھو قسمتِ اہلِ وطن بدل ڈالو

کھلائی گردشِ دوراں نے بارہا ٹھوکر — نہ گامزن ہوئے تم پھر بھی راہِ منزل پر
رہیگی تابکجا حالتِ وطن ابتر — رہیگا تابکجا آستانِ غیر پہ سر
یہ طرز یہ روش اور یہ چلن بدل ڈالو

کرو کبھی اشہبِ ہمت کو اے شرفؔ جولاں — کہ ہونگی سعیِ مسلسل سے مشکلیں آساں
قدم بڑھاؤ تو ہوتا ہے سرا بھی میداں — دلوں میں جوشِ خودی سے بپا کرو طوفاں
وطن سے پرچمِ اہلِ فتن بدل ڈالو

شرفؔ انصاری دھولیوی

مونگ پھلی

"بابو"

"کیا ہے؟"

"مونگ پھلی"

"اچھا لیتا آؤنگا"

"لیکن دو ہی پیسے کی لانا بابو"

"ہاں ہاں دو ہی پیسے کی لاؤنگا"

یہ کہکر منگرو نے اپنی میلی جھولی پیٹھ پر رکھی، بغل میں ٹوٹا چھاتا دبایا اور شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔

منگرو ایک موچی تھا ——— بہت ہی غریب! پھٹے پرانے جوتوں کی مرمت کرکے وہ اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی پرورش کرتا تھا۔ اپنے بیوی بچوں کے لئے کھانا مہیا کرنے کے لئے وہ دن نکلتے ہی جھولی لیکر شہر کی طرف روانہ ہوجاتا۔

نردھن پور سے شہر دور تھا لیکن چھ میل کا راستہ طے کرکے آٹھ بجتے بجتے وہ شہر کے اس بڑے کلاک ٹاور کے نزدیک پہونچ ہی جاتا جہاں اسکی بیٹھک تھی، وہاں پہونچ کر وہ تمام دن بابو لوگوں کے جوتوں کی مرمت اور پالش کرتا ——— یہی اسکے جینے کا سہارا تھا۔

دن ڈھلتے ڈھلتے منگرو ساگ، ستو اور اپنے گھسیٹا کے لئے مونگ پھلی لیکر گاؤں کی طرف روانہ ہوجاتا اور اندھیرا ہونے سے قبل ہی اپنی جھونپڑی میں آجاتا جھونپڑی میں داخل ہونے سے پہلے اُس کا لڑکا گھسیٹا روزانہ دروازہ پر کھڑا ملتا۔ وہ اُسکی جیب میں مونگ پھلی ڈال کر اُسے گود میں اُٹھا کے اندر آجاتا، وہ گھسیٹا کو بہت ہی عزیز رکھتا تھا۔ وہ ہی اسکی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کا روشن چراغ تھا۔ اس سے اسکی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں وہ اسکے متعلق سونے سے پہلے گھنٹوں سوچتا رہتا۔ بس یہی اسکی زندگی کا پروگرام تھا۔

چلچلاتی ہوئی دھوپ میں بیٹھے بیٹھے منگرو پسینہ میں شرابور ہوگیا۔ دو بج چکا تھا مگر اسے ایک بھی گاہک نہ ملا۔ ایک پیسہ کی بھی آمدنی نہیں ہوئی۔ اُس کی روح کراہ اُٹھی ——— آج کیا ہوگیا ہے۔ سویرے سویرے نہ جانے کس کا منہ دیکھا تھا جو آج ایک بھی گاہک نہیں آرہا ہے۔ گھسیٹا کی مونگ پھلی تک کے لئے بھی پیسے نہیں۔ آخر اب کیا ہوگا ———

وہ اسی اُدھیڑبن میں تھا کہ پاس سے ایک آدمی گاتا ہوا گذرا۔ منگرو نے اُسے پکارتے ہوئے کہا ——— "بابوجی، آپکے پالش کردوں"

"نہیں! نہیں پالش والش نہیں کرانی ہے" اپنے جوتوں کی طرف دیکھتے ہوئے بابو صاحب نے کہا اور گاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ع

"کیسے چھوگے او سلونے ساجنا اب کیسے چھوگے"

منگرو کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے جینے کا سہارا اسکے پاس آکر چلا گیا۔ وہ بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر نہ جانے کیا اُس کے دل میں آیا کہ وہ بھی گانے لگا

کیسے چھوگے ... .!!

ٹن ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔

ہر روز کی طرح کلاک ٹاور نے چار بجائے اور منگرو یکبارگی اُٹھا۔ ابھی وہ جھولی کندھے پر رکھنے ہی پایا تھا کہ ٹھن۔ ٹھن۔ ٹھن کی آواز کیساتھ "چل چل رے نوجوان" الاپتا ہوا ایک رکشا والا اسکے نزدیک رکشا لئے آپہنچا۔

"اے موچی"

"کیا ہے بابوجی"

"میرے اس جوتے میں ٹانکے لگا دے گا؟"

"لگا کیوں نہیں دونگا بابوجی، یہی تو ہمارا کام ہے"

"کیا لوگے"

جو آپ دیدیں"

"آخر"

"کام زیادہ ہے صرف ٹانکے ہی سے کام نہ چلے گا۔ چمڑا بھی لگانا ہوگا اسلئے تیا وقیمت تو صرف چھ پیسے دیدینا بابوجی"

"نہیں۔ نہیں۔ دو پیسے!"

گھسیٹا کی مونگ پھلی کا خیال کرکے آئے ہوئے دو پیسے کے گاہک کو واپس کر دینا منگرو نے کوئی عقلمندی نہ سمجھا۔ اس لئے رکشا والے سے جوتا لیکر ٹانکے لگانے لگا۔

ڈھلتے ہوئے آفتاب کی کرنیں منگرو کے چہرے پر پڑ رہی تھیں، لیکن وہ اپنے کام میں مشغول تھا اور خوش خوش اس لئے کہ گھسیٹا کی مونگ پھلی خریدنے کے لئے دو پیسے ملنے کی امید تھی۔

رکشا والا دو پیسے دیکر جوتا پہنتے ہی گاتا ہوا، ہوا کی طرح لمبی چوڑی سڑک کے بائیں جانب غائب ہوگیا اور منگرو دو پیسے کی مونگ پھلی لیکر گھر کی طرف چل دیا۔ وہ راستہ میں سوچتا جا رہا تھا ——— واہ رے بھگوان کا بیچارہ آج تو روٹی کا بھی انتظام نہیں آخر بھوکے کیسے رہیں گے۔ کل صبح تک انتظار کرنا پڑیگا۔ خیر گھسیٹا کی تو آرزو پوری ہوگئی ان ہی خیالات میں غرق وہ طویل راستہ طے کر رہا تھا۔ گھبرا گھبرا کر وہ تیزی سے قدم بڑھاتا اس لئے کہ آج اُسے دیر ہوگئی تھی۔

چاروں طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ گھر کے نزدیک پہنچکر اُس نے گھسیٹا کو اندھیرے میں آنکھوں سے ٹٹولنا شروع کیا مگر گھسیٹا اُسے کہیں نظر نہیں آیا۔ اُس کی وجہ منگرو نے گہری تاریکی اور اپنی غیر معمولی تاخیر کے علاوہ کچھ نہ سمجھی اور دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی گھسیٹا کو پکارنے لگا ——— گھسیٹا! ارے بیٹا۔ لے اپنی مونگ پھلی۔

مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس کی بیوی کی آنکھوں سے آنسو کے دو موٹے موٹے قطرے نکل پڑے اور بس!! منگرو نے پلنگڑی کے قریب آکر دیکھا تو گھسیٹا پھٹے پرانے کپڑے میں بدحال پڑا تھا۔ اور سرہانے اسکی ماں مٹی کا غذ سے پنکھا جھل رہی تھی۔ منگرو پریشان ہوگیا اور اپنی جھولی زمین پر رکھتے ہوئے۔ بیوی سے دریافت کیا:—

"یہ کیسے ہے؟ کیا ہوا گھسیٹا کو؟"

"آج دوپہر سے گھسیٹا بیہوش پڑا ہے، نہ جانے کیا ہوگیا ہے اسکو!"

منگرو نے اس کے بدن پر ہاتھ رکھکر دیکھا تو اُسے محسوس ہوا جیسے آگ کی بھٹی دہک رہی ہے۔ اسے پیروں تلے کی زمین سرکتی ہوئی معلوم ہوئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا مگر اپنے حواس درست کرتے ہوئے گھسیٹا کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"بیٹا، گھسیٹا! اے بیٹا، مونگ پھلی، یہ دیکھ میں تیرے ہی لئے لایا ہوں!"

کوئی جواب نہیں ملا۔ گھسیٹا کی آنکھیں بند ہی رہیں۔ اُس نے بہت جھنجھوڑا مگر جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ یکبارگی اُٹھ کھڑا ہوا اور اُسی تاریکی میں اپنے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر پھیل پور قصبہ کے ویدسندر پنڈت کے مکان کی طرف دوڑ پڑا۔

"ویدجی مہاراج! ویدجی مہاراج"

"کون ہے جو اتنی رات کو دق کرنے آیا ہے!"

"میں ہوں سرکار منگرو نردھن پور کا"

ابھی وہ اپنا جملہ ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ ویدجی مہاراج دروازہ کھول کر باہر آئے اور زور سے ڈانٹ کر بولے ——— "کیا ہے؟"

"میرے بچے کو چل کر دیکھ لیجئے ——— بخار سے بیہوش پڑا ہے!"

"اتنی رات کو ہم نہیں جا سکتے۔ جاؤ!"

"مہاراج! دکھیوں پر دیا کرو۔ بھگوان آپ کا بھلا کریگا!"

"کیا ہوا ہے تیرے بچے کو!"

"آج دوپہر سے بخار کی وجہ سے بے ہوش ہے!"

"اچھا چلتا ہوں، مگر نردھن پور ہے کتنی دور؟ کہار بلایا ہے کہ نہیں!"

"ویدجی مہاراج! میں گریب ہوں۔ کہار کہاں سے لاؤں۔ جوتے کی مرمت سے گجر بسر (گذر بسر) کرتا ہوں۔ بھلا وہ"

"کیا تم چمار ہو!"۔ ویدجی بات کاٹ کر بولے ——— "بھاگ بھاگ چمار۔ رات کو دق کرنے آیا ہے۔ میں رات کو تیرے یہاں نہیں جا سکتا!"

اور یہ کہکر ویدجی نے دروازہ بند کر لیا۔

منگرو کو تاریکی میں ایک سایہ نظر آیا۔ جیسے کوئی اُس کے بیٹے کو اُٹھائے لئے جا رہا ہے۔ یکبارگی وہ خوف سے چیخ اُٹھا، اور تیزی سے ——— بے تحاشا۔ ٹوٹی ہوئی امیدوں کی لاش لئے گھر کی طرف بھاگا۔ بھاگتا گیا راستہ میں ٹھوکریں کھاتا ہوا اندھیرے کو چیرتا جب وہ دروازے پر پہنچا تو اُسے اندر سے رونے چیخنے کی آواز آئی۔ جو آسمان پر پہنچ کر بھگوان سے اُس کے اپنانے کی وجہ پوچھ رہی تھی۔

منگرو آہستہ آہستہ جھونپڑی میں داخل ہوا ——— اُس کا گھسیٹا مُردہ پڑا تھا ——— افلاس زدہ منگرو کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ چکا تھا۔ اُس کی زندگی کا سہارا موت کے ایک ہی جھٹکے سے ٹوٹ گیا تھا جسے اُس کی بیوی گود میں لئے چیخ چیخ کر رو رہی تھی، اور منگرو سامنے کھڑا اپنی جھولی ٹٹول رہا تھا۔ جس میں مونگ پھلیاں ——— جیون کی تیوں پڑی تھیں ———

بدر اورنگ آبادی

ترانۂ محبت

محبت کے دُکھ سکھ اُٹھاتی رہونگی
یونہی زندگانی بناتی رہونگی

غمِ ہجر میں مسکراتی رہونگی
تری یاد کے ناز اُٹھاتی رہونگی

محبت میں نقشے نئی زندگی کے
بناتی رہونگی مٹاتی رہونگی

سِوا میرے دُنیا میں ہے کون تیرا
میں اے غم ترے کام آتی رہونگی

رکھونگی ہری زندگانی کی کھیتی
محبت کے آنسو بہاتی رہونگی

جو مجھ پر وہ بیداد کرتے رہیں گے
محبت کی میں داد پاتی رہونگی

محبت کی بزمِ سکون و طرب میں
میں لَو کی طرح تھرتھراتی رہونگی

ہو کیوں رائیگاں دردِ دِل میری صدا کا
ترانے محبت کے گاتی رہونگی

یہی سعیِ بے سود ہے شغل میرا
تری یاد دل سے بھلاتی رہونگی

نظر ہے مری داستانِ محبت
کہانی سی تم کو سُناتی رہونگی

شبِ غم کی آنکھوں کا آنسو ہوں نجمہ
یونہی صبح تک جھلملاتی رہونگی

(آنسہ) **نجمہ تصدق** ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی
ایڈیٹر ماہنامہ "ادیب" دہلی

موجِ کوثر

انھیں کو دیکھتا ہوں میں گذرتا ہوں جدھر ہوکر
یقیناً رہ گئے ہیں وہ مری حدِ نظر ہوکر

سُنا ہے آئے تھے وہ سوئے یمن پردہ در ہوکر
مگر ـ بزمِ تماشا رہ گئی زیر و زبر ہوکر

گلوں میں رنگ و بُو بن کر۔ فضاؤں میں قمر ہوکر
نظر آیا کئے وہ رات بھر خلدِ نظر ہوکر

کبھی دل میں کسک بنکر۔ کبھی دردِ جگر ہوکر
نظر آتے ہیں وہ لیکن حجاباتِ نظر ہوکر

مرے دردِ جگر کو پھر نہ ہوتی کاوشِ درماں
مرے پہلو میں رہتے کاش وہ دردِ جگر ہوکر

تمنائیں نہ کیوں رہ رہ کے مچلیں قلبِ مضطر میں
دُعائیں آ رہی ہیں آج لبریزِ اثر ہوکر

غضب ٹوٹا، نگاہِ ناز کیا اُٹھی مری جانب
یکایک رہ گئے اجزائے ہستی منتشر ہوکر

فضائے دل پہ ابرِ درد بنکر ہی برس جاتے
جو آنکھوں میں نہ آنا تھا تمنائے نظر ہوکر

سرشکِ دیدۂ تر خاک پر گرنے نہ پایا تھا
شعلۂ حسنِ جاناں لے اُڑی خود بال و پر ہوکر

تمنا ہے میں کھو جاؤں تری جلوؤں کی وسعت میں
غبارِ کارواں بنکر۔ سجودِ رہگذر ہوکر

یہاں تھی چینِ بستر میں وہی گرمی ابھی کوثر
وہاں وہ لوٹ بھی آئے رواقِ عرش پر ہوکر

کوثر نقوی

مکتوبِ نیاز فتحپوری

بنام سیّد دل محمد فضا جالندہری (منشی فاضل ادیب فاضل)

تسلیم،

"عزیز لکھنوی ہرچند اُس دور کے شاعر ہیں، جب لکھنؤ میں خالص لکھنوی رنگ رچا ہوا تھا اور سوائے رعایاتِ لفظی کے تغزل کا کوئی خاص مفہوم متعین نہ ہوا تھا، لیکن جب اہلِ لکھنؤ نے اس کو محسوس کرلیا کہ اب دُنیا میں اُن کی جنس کاسد کی مانگ نہیں ہے اور غزل میں جذباتِ محبت کے اظہار کی ضرورت ہے تو سب سے پہلے عزیز نے اس انقلاب کو قبول کیا اور آرٹ کی شاعری کو ترک کرکے جذباتی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن چونکہ تصنع و آورد ہی کی فضا میں ان کی تربیت ہوئی تھی، اس لئے جذباتِ محبت میں زیادہ تر حُزنیہ (PENIMISTIC) پہلو پیدا ہوگیا جو شاعرانہ فنادگی سے علیحدہ صرف بین اور ماتم کی چیز تھی۔ اس میں انکا شیعہ ہونا بھی بڑی حد تک معاون ثابت ہوا۔

عزیز کے یہاں صحیح تغزل کے اشعار بھی پائے جاتے ہیں لیکن کم! الفاظ کا رکھ رکھاؤ، ان کی خصوصیت خاص ہے اور یہی لئے اُن کے قصائد غزلوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔

یاس عظیم آبادی جس وقت لکھنؤ میں آئے تو یہاں کا قدیم رنگ شاعری کچھ بدل چلا تھا۔ لیکن غالب کیفیت اسی تصنع و تکلف کی تھی۔ یاس چونکہ شاد عظیم آبادی کے تبع تھے جو خالص جذباتی شاعر تھے۔ اس لئے انھوں نے لکھنؤ میں آکر اسی رنگ کو فروغ دینا چاہا، لیکن کامیاب نہ ہوئے اور سب کو دشمن بناکر یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوگئے۔ یاس کے کلام میں یقیناً عزیز سے زیادہ جذبات پائے جاتے ہیں، لیکن وہ عذوبت و حلاوت نہیں ہے جو دہلی اسکول کے شعرا کا حصہ ہے۔

فانی اور اصغر دونوں ایک ہی قسم کے شاعر ہیں۔ یعنی دونوں نے غزل میں فلسفہ و حکمت، الٰہیات و تصوف کی بھل اور دور دراز کی باتیں شامل کرنا چاہیں لیکن جبتک ہلکی ہلکی آمیزش ان کی رہی کلام گوارا رہا لیکن بعد کو بالکل بھل ہوکر رہ گیا۔ فانی اور اصغر میں فرق یہ ہے کہ فانی کو تو خیر اس گمراہی میں کچھ دن بھی لگے لیکن اصغر غریب شروع ہی سے بہک گئے۔ فانی کے پہلے کلام میں بیس فیصدی اشعار رنگِ تغزل کے مل جاتے ہیں۔ لیکن اب ۸۰ فیصدی بھل کہتے ہیں۔ اصغر کی شاعری شروع ہی سے بھل تھی بلکہ اُن کو تو شاعر کہنا بھی شاعری کی جان پر ظلم کرنا ہے۔

جگر مرادآبادی ضرور ایک خاص رنگ کے شاعر ہیں اور اُس رنگ کو "شوخی" کہا جاسکتا ہے۔ کیف و گداز اُن کے یہاں بھی معدوم ہے۔ حضرتِ دل نے امیر مینائی کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے ایک طرف یہ خصوصیت حاصل کی کہ اُن کا کلام بے عیب ہوتا ہے اور دوسری طرف زمانہ کا رنگ دیکھ کر یا خود اپنی فطرت کے تقاضہ سے مجبور ہوکر جذبات نگاری کی طرف بھی مائل ہوئے اور تلامذۂ امیر میں یہ خصوصیت شاید ہی کسی اور کے کلام میں ملے۔ کوئی خاص جدّت اُنکے یہاں بھی نہیں پائی جاتی اور نہ وہ والہانہ کیفیتِ محبت کہیں پائی جاتی ہے جو "دہلی اسکول" کی خصوصیت رہی ہے۔

معیارِ تغزل ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور رہیگا۔ اگر دورِ حاضر میں کوئی معیار بدلا گیا ہے تو وہ بدعتِ سیئہ کہلائیگی۔ تغزل کے صحیح معیار میر، درد، مصحفی، مومن اور شعرائے حال میں حسرت موہانی کے کلام میں تلاش کیجئے۔

جدید رنگِ تغزل میں غالب و مومن سے لیکر حسرت تک کیا تدریجی ارتقا رہا۔ اس کا جواب بہت تفصیل طلب ہے۔ کیونکہ غالب و مومن کے بعد دہلی کی شاعری تو ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی اور لکھنؤ میں بازار گرم ہوا، پھر لکھنوی شاعری کے مختلف ادوار پر گفتگو کرنا کافی وقت بھی چاہتا ہے اور سکونِ دماغ بھی سو آجکل گرمی میں وہ تو بہت ہے لیکن یہ معدوم!

نیاز

شاعرِ خوابیدہ سُن!

آج پر ہے مغربی تہذیب کی جادوگری — چھا رہا ہے ذہنِ انساں پر طلسمِ سامری
فطرتِ آزاد بھی محکوم ہو کر رہ گئی — کر گئی مسحور ہندی کو کسی کی ساحری
ہے دلوں میں جذبۂ توقیرِ تہذیبِ فرنگ — ایک عالم پر مسلط ہے شعارِ آذری
غیرتِ محمودؒ پر اب طعنہ زن ہے سومنات — بت شکن ہے گوش بر آہنگِ سازِ بتگری
دعویٔ جمہوریت اک نقشِ باطل ہو گیا — ہے جنوں انگیز سودائے دماغِ قیصری
حشر اقوامِ مہذب کا بھی دیکھا چاہیئے — رنگ کیا لاتی ہے آخر اُن کی شوریدہ سری؟
حضرتِ اقبال کا یہ شعر بھی الہام ہے — "سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک افسوں گری"
بعد یک مدت بدل جاتا ہے دُنیا کا نظام — لوٹ لیتا ہے زمانہ اقتدارِ قیصری
گونج اُٹھتی ہے فضاؤں میں صدائے انقلاب — اور کانپ اُٹھتی ہے بنیادِ حریمِ سروری
کہہ رہے ہیں یہ زبانِ حال سے لیل و نہار — چال کوئی اور چلنے کو ہے چرخِ چنبری
بتکدے کی خاک سے اُٹھنے کو ہے اک بت شکن — ابنِ آذر توڑنے کو ہے بتانِ آذری
کیا عجب دُنیا میں پھر آئے کوئی مردِ خدا — پھر عنایت ہو کسی کو سطوتِ پیغمبری
صحنِ مسجد سے ہو پھر تکبیر کا نعرہ بلند — یا کسی مندر میں پھر گونجے صدائے "شیو ہری"
اُٹھ، کہ ہیں گم گشتگانِ راہ تیرے منتظر — زیب دیتی ہے تجھی کو اس جہاں کی رہبری

ذرّے ذرّے کی زباں سے نعرۂ برخیز سُن
"از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن"

خموش سرحدی

ہندی ادب :-

ہندوستانی عورت کی شوہر پرستی

ہندوستانی عورت کی شوہر پرستی وہ طرۂ امتیاز تھی جو اسکو دنیا کی تمام عورتوں سے ممتاز و برتر بنائے ہوئے تھی۔ شوہر سے جدا ہو جانے کے بعد برسوں انکو یہ خبر تک نہ ہوتی تھی کہ انکا شوہر زندہ ہے بھی یا نہیں اور اگر زندہ ہے تو محبت میں ثابت قدم ہے یا نہیں لیکن وہ اسکی یاد کو ایک موہوم سی اُمید پر ہر وقت دل سے لگائے بیٹھی رہتی تھیں۔

لیکن افسوس! موجودہ دورِ تہذیب ایسی ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتا۔ عہدِ حاضر ہندوستان کو جس رنگ میں رنگ رہا ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اب مشرقی روایات مغرب کی اندھی تقلید کی نذر ہوتی جا رہی ہیں۔

چونکہ ہندوستان کی ذہنیت بدل چکی ہے اس لئے ممکن ہے کہ کوئی اس گیت کو پسند کرے لیکن میں تو یہی کہونگا کہ مشرق کی یہ روایت جب سے ختم ہوئی ہے ہم حقیقی جذبۂ محبت سے محروم ہوگئے ہیں۔ اور ہندوستانی عورت بے حیائی کا مرقع بن کر رہ گئی ہے۔

نظم کا پس منظر یہ ہے کہ ایک وفا کی دیوی اپنے شوہر کے پردیس چلے جانے اور مدت تک خبر نہ لینے کے بعد بیتاب ہو کر گاؤں سے باہر نکل آتی ہے اور روزانہ آموں کے درختوں کی گھنیری چھاؤں میں کھڑی ہو کر اُس کا انتظار کرتی ہے۔

اگرچہ ہندی الفاظ کے معنوی محاسن سے ہم اچھی طرح لذت اندوز نہیں ہو سکتے لیکن ترجمہ میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ مفہوم کی دلکشی اور حلاوت ہاتھ سے نہ جانے اور اُس میں وہ ہی سوز و گداز باقی رہے جو اصل نظم میں ہے۔

آم گھنے، گھنے مہوا، بیچ راہ لگی
اس تل کھڑی ہے سندر، من برگ بھری

"سرِ راہ گھنے آموں اور مہوؤں کی قطاروں کے درمیان ایک حسینہ اور جذبۂ پریم کی دیوانی کھڑی ہے۔ حسینہ راہ گیروں کی آمد و رفت کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔"

راہ جو پوچھے بٹوہیا، سندر کیوں ای کھڑی
کیا تیرا نیہر دور، کیا تیری ساسو بُری

اوّل اوّل تو کوئی مسافر اسکی طرف مخاطب ہی نہیں ہوتا لیکن ایک نوجوان جب اسکے قریب سے گذرتا ہے تو اسکو شام کے سہانے وقت میں مغموم و رنجیدہ پاکر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اور حسینہ سے گفتگو کا آغاز اس طرح کرتا ہے۔

"اے خوبصورت دیوی تو سرِ راہ کیوں کھڑی ہے کہیں تیری ساس بدمزاج اور سخت تو نہیں ہے اور کہیں تیرا میکہ دُور تو نہیں ہے جسکی وجہ سے تو ملول و رنجیدہ ہے؟"

چلا جا رے بات بٹوہیا، تجھے کیا لے پڑی

"اے مسافر تو اپنی راہ لے تجھے ان باتوں سے کیا غرض؟"

نا میرا نیہر دُور، نہیں گھر ساسو بُری
میرا بنجارہ بدیس گیا میں ہی برگ بھری

لیکن معاً کسی خیال کے تحت وہ جواب دینا ضروری سمجھتی ہے اور اپنی صفائی پیش کرتی ہے۔

"تیرا یہ خیال کہ میری ساس بُری ہے یا یہ کہ میکہ دُور ہے غلط اور بالکل غلط ہے نہ میرا میکہ دُور ہے اور ساس ہی بُری ہے ——— ان دونوں میں کوئی بھی سبب نہیں۔"

شرم و حیا اسکی زبان سے شوہر کا نام ادا نہیں ہونے دیتی اس لئے کہتی ہے :-

"میرا تاجر بہت دنوں سے پردیس گیا ہوا ہے اور میں اسکی راہ تک رہی ہوں۔ یہی وجہ میرے رنج و غم کی ہے۔"

مسافر جو اسکے قد و قامت اور اسکی آواز سے پہلے ہی چونکا ہو رہا تھا۔ کہتا ہے :-

دینگے رے سندر سونواں، موتی مانگ بھری
چھوڑ دے بیوٹے کی آس چلو میری سنگ لگی

"اے حسین و مہ جبین بہو (بیاہے ہوئے) شوہر کا خیال دل سے جُدا کر دے۔ اُس کی اُمید میں اپنے حسن و شباب کو یوں برباد نہ کر، آ اور میرے ساتھ چل، میں تجھے سونے سے لاد دونگا۔ تیری مانگ موتیوں سے بھر دونگا اور تجھے اپنے دل کی ملکہ بناؤنگا۔

آگ لگو تورے سونواں، موتی مانگ جڑی
آویگا میرا بنجارہ، لٹا دینگے بلدی لدی

"تیری دولت اور سونے چاندی کے زیورات میں ان موتیوں میں جن سے مانگ جڑی جائیگی، آگ لگے، میرا بنجارہ مال و دولت سے لدا ہوا آئیگا، تو میں اس دولت کو اُسکی آمد کی خوشی میں لٹا دونگی نچھاور کر دونگی۔ دولت کی میرے نزدیک کوئی قدر نہیں نہ میں دولت کی پروا کرتی ہوں۔"

یہ سُن کر مسافر کے چہرہ پر خوشی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں اور اسکے وہ جذبات جنکو وہ اب تک چھپائے ہوا تھا اُمڈ آتے ہیں اور وہ بیتابانہ کہتا ہے :-

دھن تیرے سندر تیرے بھاگ، سیندور مانگ بھری
ہم ہی ہیں تیرے بنجارہ، لٹا میری بلدی لدی

"اے سندر دیوی تو بیحد خوش قسمت ہے تیری مانگ سیندور سے بھری ہوئی ہے، تو سہاگن ہے۔ تیرا شوہر

والد کی موت پر

آجکل دُنیائے حرماں درد سے نزدیک ہے — آجکل میری نظر میں کُل جہاں تاریک ہے

یک بیک سر پر مصیبت کا گرا کوہِ گراں — روح ہے بیتاب دل آمادۂ آہ و فغاں

تھی جہاں محوِ خرامانی ہلکی ہلکی سی نسیم — کیا خبر تھی اس جگہ آئیگا طوفانِ عظیم

یہ خبر کس کو تھی یوں تاراج ہو جائیگا باغ — یعنی گُل ہوگا میاں[1] کی زندگانی کا چراغ

پاک باطن پاک طینت وہ امیرِ خانداں — جا بسے آرام سے زیرِ زمیں میرے میاں

موت اور وہ موت کیسی، وہ مری والد کی موت — تھا کسے معلوم اتنی جلد ہو جائیں گے فوت

زندگی کی ہاؤ ہو سے عہد و پیماں توڑ کر — چل دیئے وہ اک بھرے گھر کو اکیلا چھوڑ کر

جسمِ خاکی آہ جو کل تک سراپا جوش تھا — آنکھ جب جھپکی تو دیکھا بے نیازِ ہوش تھا

ڈھونڈتی ہیں اب نگاہیں میری والد ہیں کہاں — عمر بھر دیدار کو ترسے گی چشمِ خونفشاں

ہر مسرت سرنگوں ہے ہر خوشی ہے پائمال — اب نظر آتا ہے مشکل زخمِ دل کا اندمال

ہو گیا دل آج سے آماجگاہِ رنج و غم — خون، اشکوں کی عوض برسا رہی ہے چشمِ نم

آہ یہ انساں کی ناکامیاں مجبوریاں — زندگی بس میں نہ ہے قابو میں مرگِ ناگہاں

موت ہے وہ جسکو کہتے ہیں کمالِ زندگی — یاس و حسرت کے سوا کیا ہے مآلِ زندگی

بھائی، بیٹے منظرِ غمناک پر رویا کئے — دُور بیٹھے موت کی بیباکیاں دیکھا کئے

اب مری لغزش پہ مجھ کو آکے سمجھائیگا کون؟ — گھر کے ان مچلے ہوئے بچوں کو بہلائیگا کون؟

آج سے اب کون گھر میں مسکراتا آئیگا — کون اب ہر ہر قدم پر گُل کھلاتا آئیگا

حل کریگا کون میری زندگی کی مشکلات — کون سمجھائیگا مجھ کو اونچے نیچے واقعات

کون اب محظوظ ہوگا دلنشیں گفتار سے — ہو گئے محروم بچے آج سچے پیار سے

اے خدا ہم غم کے ماروں کو مجالِ صبر دے — آہ بھی لب تک نہ آئے دستگاہِ جبر دے

زندگی انساں کی بھی کس قدر ہے بے ثبات — موت ہے انجام اسکا جسکو کہتے ہیں حیات

اک معمہ ہے کہ جس کو حل نہ کوئی کر سکا — ہو گیا مجبور انساں آگئی جس دم قضا

موت کے جھونکے سے بجھتا ہے چراغِ زندگی

ایک دن بھر کر چھلکتا ہے ایاغِ زندگی

وجدی سیمابی الہ آبادی

---

[1] ہم لوگ والد کو میاں کہتے تھے۔

موحدِ اعظم اور مفتیٔ اعظم

مفتی الراندیر وافتاء الکفر بالشعر

از ـــــ حضرت مولانا مولوی سلیم الدین صاحب جالب مظاہری سہرامی

(قسط نہم)

"شاعر" کی گذشتہ اشاعتوں میں اکتیس [۳۱] علماء اور فضلاء نے حضرت علامہ سیماب مدظلہ کی نظم کو صحیح احساس و ذوقِ عبادت پیدا کرنے والا درس موزوں قرار دیا ہے۔ ناظرین ابتک صرف جلیل القدر علماء کی آراء دیکھتے رہے ہیں۔ اب ایک مشہور ادیب اور شاعر کی رائے بھی ملاحظہ کریں ـــــ ادارہ

جناب مولانا محمود الحسن خاں صاحب بہارکوٹی

جہاں تک مذہبی پہلو کا تعلق ہے مجھے "موحدِ اعظم" میں کوئی برائی نظر نہیں آتی نفسِ مضمون کی حیثیت سے تو اس کی افادیت سے کوئی کافر بھی انکار نہیں کر سکتا ـــــ میں نے آپ کا مضمون اور مولانا نیاز صاحب کا ریمارک "نگار" میں پڑھا۔ نیاز صاحب سے مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے ـــــ اپنی اصابتِ رائے کا عمدہ ثبوت نہیں دیا، وہ بڑی حد تک PREJUDICED نظر آرہے ہیں۔ اُن کا یہ فرمانا کہ فنی حیثیت سے نظم کا معیار بلند نہیں، بڑی حد تک یکسر غلط ہے، خدا جانے "فن" سے وہ کیا مراد لیتے ہیں۔ شاید وہ "لسانی حیثیت" کہنا چاہتے ہوں ـــــ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے کلام پر نقد و نظر کی اجارہ داری اس جماعت کے ہاتھ میں ہے جسے شعر و شاعری سے ذرا بھی تعلق نہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ کوئی غیر شاعر یا متشاعر اس خدمت سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا ـــــ جنھیں مولانا کی لسانی یا ادبی غلطیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک اُردو شاعری کی دُنیا میں وہ غلطیاں کسی حال میں غلطیاں نہیں کہی جاسکتیں۔ ہمیں مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ ہم اُن اسماء یا صفات کو جو دوسری زبان سے ہمارے یہاں آگئے ہیں انکو اُس زبان کی گرامر کا پابند قرار دیں۔ اگر "نقطہ" عربی میں مونث ہے ہوا کرے، یہ ضروری قرار دینا کہ اسے اُردو میں بھی مونث سمجھا جائے اندھی تقلید ہے ـــــ میں نے نمونتہً اور اندازاً کا استعمال ثقات کے یہاں بھی دیکھا ہے اور وہ بھی نثر میں، جہاں اگر وہ چاہتے تو کوئی دوسرا لفظ استعمال کر سکتے تھے پھر نظم میں ضرورت شعری کی حیثیت سے سرِ شتاً، یا آدم ادنیٰ لکھنا کسی حال میں غلط نہیں قرار دیا جاسکتا ـــــ ضرورت تھی کہ اس سلسلہ میں مولانا (علامہ سیماب) خود اپنے مسلک کی وضاحت فرما کر معاملہ کو ختم کر دیتے ـــــ بہرحال نظم "موحدِ اعظم" ایک بلند پایہ نظم ہے اور اس میں جو پیغام دیا گیا ہے وہ دقیع اور موثر ہے۔ اس میں زور و اثر بدرجۂ اتم موجود ہے ـــــ اور آپ کے خیال کے مطابق اس موضوع پر اس سے زیادہ کامیاب نظم آجتک نہیں لکھی گئی ـــــ رہیں وہ خامیاں جنھیں ادبی یا فنی یا لسانی کہہ کر مخالفین اچھال رہے ہیں۔ کسی حال میں خامیاں نہیں کہی جاسکتیں ـــــ یہ ہے میرا ذاتی خیال جس کا میں نے صفائی سے اظہار کر دیا ـــــ مولانا کی خدمت میں میرا سلام پہونچادیں اور میری طرف سے یہ گذارش پیش کر دیں کہ وہ یا تو خود اپنے مسلک کی توضیح فرما کر مخالفین کو خاموش کر دیں، یا اس سلسلہ میں کسی کو کچھ لکھنے کی آئندہ اجازت نہ دیں ـــــ یہ خیال کہ حربۂ تکفیر سے ثقات کی نگاہ میں مولانا کا پوزیشن گر گیا ہے غلط ہے ـــــ نظر پہچانتے ہیں نگینۂ محفل دیکھنے والے ـــــ مولانا کی ادبی خدمات کے مقابلہ میں اس قسم کی جسارتیں فروغ نہیں پاسکتیں ـــــ خیر مولانا تو بڑی چیز ہیں مجھ جیسا بے بضاعت انسان بھی مولوی مہدی حسن کے ہفوات کا جواب قلم سے دینا تضیعِ وقت سمجھتا ـــــ "شورِ من بمدرسہ کہ برد" کہکر خوش ہو جانا ہی مناسب ہے ـــــ والسلام

بہارکوٹی

ستائیسواں شعر ؎ (۲۷)

سرشتاً تجھ کو ہونی چاہیے شیطان سے نفرت
کہ تیرے باپ کو سجدہ نہ کرنا اس کی تھی نیت

اس شعر کے تحت بھی اعتراض کی خوب خوب قلابازیاں دکھائی گئی ہیں۔ فرماتے ہیں
"سرشت فارسی ہے (جی ہاں) استادِ وقت نے اس کو بقاعدۂ عربی یقیناً، فطرتاً یوماً فیوماً وغیرہ کی طرح منصوب بناکر فطرتاً کی جگہ پر نظم کیا ہے"

جہاں تک اصول و قواعد کا تعلق ہے فارسی لفظ "سرشت" پر تنوین غلط ہے لیکن عربی اور فارسی کے کچھ الفاظ اتنے ملتے جلتے ہیں کہ اچھے اچھے اہلِ نظر اپنی رو میں انھیں بقاعدۂ عربی استعمال کر جاتے ہیں۔ عام طور پر سنجیدہ حضرات اردو میں نمونتہً۔ اندازاً۔ آزمائشاً۔ نمائشاً۔ سفارشاً وغیرہ الفاظ لکھ رہے ہیں۔ عام ادبا اور شعرا کے متعلق تو کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن ثقہ اور صاحب نظر ادبا و شعرا ایسی غلطی کریں تو وہ سہوِ نظر کے سوا اور کچھ نہیں، اس لئے کہ خیالات کی رو میں غیر ارادی طور پر ایسی غلطی ہو جاتی ہے۔ اگر ان حضرات سے دریافت کیا جائے تو وہ کبھی ایسی غلطی کو جائز قرار نہ دینگے۔ **مولانا نیاز فتحپوری** ایڈیٹر رسالہ "نگار" لکھنؤ کا شمار ملک کے مشہور ادبا اور ناقدین میں ہوتا ہے۔ لیکن اُن کے یہاں بھی اس قسم کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اپنے ایک افسانہ "**چاند کے سفر**" میں لکھتے ہیں:-

"**اندازاً**" دو گھنٹے بعد ہماری سواری پھر نیچے کی طرف مائل ہوئی اور رفتہ رفتہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر جاکر ٹھہر گئی۔ میرے ساتھی بھی تھوڑی دیر میں وہیں آگئے ــــــ"

مولانا نیاز، مندرجۂ بالا عبارت میں **اندازاً** لکھ گئے تو یہ بالکل اتفاقی امر ہے۔ لیکن آج وہ بھی "سرشتاً" پر اعتراض کرتے ہیں یہ بوالعجبی نہیں تو اور کیا ہے، یہی اتفاق ــــ اور سہوِ سرشتاً کے سلسلے میں سمجھئے۔ کیا علامہ سیماب جیسے قادر الکلام اور فن داں ادیب شاعر یہاں دوسرا لفظ نہیں رکھ سکتے تھے رکھ سکتے تھے اور ضرور رکھ سکتے تھے لیکن نہ رکھا۔ یا استعمال عام کی کثرت نے سوچنے کا موقع نہ دیا علامہ سیماب اور مولانا نیاز کو تو جانے دیجئے، خود معترض یعنی علامہ فہامہ حضرت مولانا المولوی الحاج الحافظ السید مہدی حسن اپنے رسالہ مفیدہ "کشف الغمہ بسراج الامۃ" کے صفحہ ۱۳ سطر ۱۲ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"دسواں سلسلہ امام بخاری اور امام ترمذی شاگرد یحییٰ بن اکثم کے اور یحییٰ امام محمد صاحبؒ کے فنِ حدیث میں شاگرد ہیں، یہ دس سلسلے **نمونتہً** ہدیۂ ناظرین ہیں۔"

نیز اسی رسالہ مفیدہ کے صفحہ ۹ سطر ۱۸ میں ارقام فرماتے ہیں:-

"تیسرے اگر امام احمد کے قول سے کلیہ مراد ہے تو قطعاً غلط ہے کیونکہ سینکڑوں شاگرد امام صاحب کے فن حدیث کے امام اور شیوخ تسلیم کئے گئے ہیں۔ **نمونتہً** چند ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔"

اوّل الذکر اور ثانی الذکر دونوں عبارتوں میں خط کشیدہ لفظ یعنی "نمونہ" فارسی ہے۔ "عالم دین" "مفتیٔ علام" اور "سیدنا" نے اس کو بقاعدۂ عربی یقیناً، فطرتاً یوماً فیوماً وغیرہ کی طرح منصوب بناکر مثلاً کی جگہ پر استعمال کیا ہے۔ اب تو یقیناً، شباً، روزاً، گلزاراً، باغاً، چمناً وغیرہ کوئی لکھے تو جواز میں کلام نہیں؟ کیونکہ مہدی حسن صاحب جو کچھ فرمائیں گے وہ کالوحی المنزل من اللہ ہوگا ــــ اسکی تحقیق تو بلا ہی کرے کہ یقیناً، یوماً، شاناً وغیرہ عربی الفاظ منصوب کیوں ہوتے ہیں تاکہ "نمونتہً" کے منصوب کرنے اور فارسی کو عربی جامہ پہنانے کی وجہ سمجھ میں آئے

؏ مجھے الزام دیتے تھے قصور آن کا نکل آیا

اے چشم اشکبار ذرا دیکھنے تو دے — ہوتا ہے جو خراب وہ میرا ہی گھر نہ ہو

"عالم دین" صاحب! کہئے؟ کیسی کہی! اسے کہتے ہیں "آسمان کا تھوکا منہ پر" "مفتیٔ عالم" صاحب! اگر آپ کو نمونتہً استعمال کرنے کا حق ہے تو دوسرے بھی سرشتاً کے استعمال کا حق رکھتے ہیں۔

مہدی حسن صاحب! پہلے اپنے اعتراض کے ارتفاع کی فکر کیجئے کیوں کہ اس ترکیب کے استعمال کا تقدم آپ کو حاصل ہے۔ پھر مصنف نظم "موحد اعظم" پر اعتراض کیجئے گا۔

حضرتِ من! یہ بھی یاد رہے کہ ان دونوں جگہوں میں "نمونتہً" کا استعمال کاتب کے عمل بالید کا کرشمہ نہیں بن سکتا۔

ناظرینِ کرام! یہ ہے "مدینہ" کے "عالم دین" کی تحقیق!

خود تو ؎
ای ہنرہا نہادہ برکفِ دست
عیبہا را گرفتہ زیرِ بغل

کا مصداق ہے، اور حضرت مولانا سیماب مدظلہ العالی کے کلام بلاغت نظام پر ایراد وارد کر رہا ہے، سچ ہے جب چیونٹی کے پر نکل آتے ہیں تو اس کی کمبختی آتی ہے اور جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ اپنی جگہ کو چھوڑ کر شہر کا رُخ کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح اس کی بھی شامت آئی ہے کہ شاعر سے الجھا ہے۔ مولانا مدظلہ کی عداوت

میں جو جی میں آیا بک دیا اور اس کا خیال نہ کیا کہ "لکل فرعون موسیٰ" ؎

سنبھل کر پانوں رکھنا میکدہ میں شیخ جی صاحب
یہاں پگڑی اُچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں

مہدی حسن صاحب! یقیناً، یوماً وغیرہ کے منصوب ہونے کی وجہ کی تحقیق کو کس سے کہتے ہیں؟ میاں! اس سے تو مدرسہ کا بچہ بچہ واقف ہوتا ہے آپ کی نظر میں اس کی تحقیق اہم ہونی چاہئے۔ کیونکہ آپ طفل مکتب سے بھی گئے گذرے ہیں اور اپنی کتابوں میں نمونتہً وغیرہ الفاظ لکھ چکے ہیں۔ کاش! آپ سے دو بدو گفتگو کا موقع نصیب ہو اور آپ کے حواری بھی موجود ہوں تو اسوقت سمجھاؤں ؎

دوستی تشنۂ تکمیل رہی جاتی ہے
وہ ابھی ترکِ عداوت کا ارادا نہ کریں (علامہ سیماب)

دوسرے مصرع کے متعلق اپنی کم فہمی کا اس طرح ثبوت پیش کیا گیا ہے "سجدہ نہ کرنے کی نیت کی بنا پر تجھ کو فطرتاً اس سے نفرت ہونی چاہئے آپس میں لازم و ملزوم ہے یا نہیں؟ یقیناً شعر اپنے مفہوم کے ادا کرنے سے قاصر اور ناتمام ہے یہاں تو سجدہ نہ کرنے کے بعد سے عداوت و دشمنی شیطان کو پیدا ہوئی، یہاں ارادہ کیا اور نیت کیسی؟" ع

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

شعر یقیناً اپنے مفہوم کو تمام و کمال ادا کر رہا ہے۔ حکم سجدہ کے متعلق علماء کے دو قول ہیں۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ حقیقتاً سجدہ اللہ تعالیٰ کو تھا اور آدمؑ بطور قبلہ تھے مگر یہ قول ضعیف ہے، اور جمہور علما کا یہ قول ہے کہ فی الحقیقت سجدہ آدمؑ ہی کو تھا اس لئے کہ اگر یہ سجدہ اللہ تعالیٰ کو ہوتا تو ابلیس ہرگز اس سے انکار نہ کرتا اور یہی قول اول سے زیادہ صحیح ہے (مدارک التنزیل)

مطلب یہ ہے کہ ابلیس کا سجدہ سے انکار کرنا اس نیت و ارادہ پر مبنی تھا کہ یہ سجدہ درحقیقت آدمؑ کو ہے کما قال الجمہور، ظاہر ہے کہ ارادہ فعل سے مقدم ہوا کرتا ہے۔ تقدم نیت اور تاخر فعل کے متعلق "احیاء العلوم"، کی یہ عبارت آپ بطورِ خاص ملاحظہ فرمائیں۔

اعلم ان النیۃ والارادۃ والقصد عبارت متواردۃ علی معنی واحد وھو حالۃ وصفۃ للقلب یکتنفھا امران علم وعمل العلم یقدمہ لانہ اصلہ وشرطہ والعمل یتبعہ لانہ ثمرتہ وفرعہ وذلک لان کل عمل اعنی کل حرکۃ وسکون اختیاری فانہ لا یتم الا بثلاثۃ امور علم وارادۃ وقدرۃ لانہ لا یرید الانسان مالا یعلمہ فلا بدان یعلم ولا یعمل مالم یرد فلا بد من ارادۃ الخ

اب تو آپ کی عقل شریف میں آگیا ہوگا کہ مولانا سیماب کا شعر علمائے جمہور کے قول سے پوری پوری مطابقت رکھتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ دونوں مصرعے آپس میں دست و گریباں اور اچھی طرح مربوط ہیں

اس سے کس کو انکار ہے کہ سجدہ نہ کرنے کے بعد سے شیطان کو عداوت و دشمنی پیدا ہوئی لیکن اس سے کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے کہ انکار امر سجدہ بغیر نیت و ارادہ کے ظہور پذیر ہوا؟ ہاں صرف آپ کو اس سے انکار ضرور ہے کیونکہ آپ نے بڑے زوردار الفاظ میں فرمایا ہے کہ قبل واقعہ آدمؑ حیات ابلیس نہایت تاریک اور بھیانک ہے جس سے کسی عقل سلیم کا کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا دشوار ہے اور علمائے اسلام، مفسرین عظام نے اس کو عابد، زاہد اور ولی وغیرہ سب کچھ لکھا ہے لیکن ان علمائے کرام اور مفسرین عظام سے آپ کی تو تحقیق ہی نرالی اور اچھوتی ہے۔

علاوہ ازیں سب مفسرینؒ کا متفقہ قول یہ ہے کہ "اول من قاس ابلیس فاخطأ" تو کیا اس کا یہ قیاس بغیر نیت و ارادہ کے تھا؟ لامحالہ آپ کو یہ جواب دینا پڑے گا کہ اس کا یہ قیاس نیت و ارادہ کے تحت میں تھا اور یہی قیاس اس کی گمراہی کا باعث ہوا۔ جس طرح آپ نے مولانا سیماب کے متعلق یہ خیال کر لیا کہ وہ دنیا ہی کے اعتبار سے اس کی تعریف کر رہے ہیں اور اسی بنا پر آپ بھی گمراہ ہوئے۔ اس قیاس میں آپ کا اور شیطان کا پلہ برابر ہے۔ اسی سلسلہ میں پھر آپ ابو زید سروجی کے روپ میں جلوہ گر ہو گئے ہیں ؎

میں ہوں بیزار اس مذہب سے جو فتنوں کا حامل ہو
سلام اس قومیت کو جس کا نصب العین باطل ہو

اٹھائیسواں شعر ؎

مگر یہ کفر تھا اس کا ترے اسلام سے بہتر
ادائے خاص تھی اس کی شعارِ عام سے بہتر

یہاں بھی ترکیب حصری اور حصر جنسی کی نوعیت کے اعتراض کی بھرمار کردی گئی ہے۔ اس کے متعلق میرا جواب وہی ہے جو پہلے دے چکا ہوں۔ اعتراض حصر و جنس کے بعد ارشاد ہوتا ہے "شیطان کے کفر کو مسلمانوں کے اسلام سے

بہتر کہا گیا ہے۔ شعار عام جو اسلام اور اس کے احکام ہیں شیطان کی ادائے خاص کفر سے بدتر قرار دیئے گئے ہیں، اس کھلے ہوئے کفر کا بھی کچھ ٹھکانا ہے۔"

مہدی حسن صاحب! کج بحثی ہوتی ہے لاجواب ہوتی ہے، آپ اسے کھلا کفر فرما رہے ہیں، حالانکہ یہ شعر مولانا کے ایمان کی زبردست دلیل ہے کیونکہ شعر زیر بحث میں "کفر اس کا" کا ٹکڑا اس دعوے کا شاہد عادل ہے۔

ندائیری صاحب! آپ کا یہ فرمانا کہ "مخاطب علی السبیل البدلیت عام ہے" غلط اور بالکل غلط! بلکہ مولانا پر بہتانِ عظیم ہے۔ اس شعر میں مولانا کے مخاطب وہ ریاکارانہ عبادت و بندگی کرنے والے ہیں جنکی طرف مولانا نے ان اشعار میں اشارہ کیا ہے:۔

جنکے سجدے دُنیائے ریائی میں بہت ارزاں ہیں، اور جن کے خدا خدائی میں لاکھوں ہیں، جو کبھی آستانۂ حکومت پر سجدے کرتے ہیں، اور جنکے کعبۂ مسجود قیادت کے دروازے ہیں، اور جن کا ہر ایک سجدہ معصیت انگیز ہوتا ہے، اور جنکے مسجود درخت و سنگ ہیں، اور جنہوں نے اہل سرمایہ کو معبود بنا رکھا ہے۔ غرض اس قسم کی ذہنیت کے لوگ مخاطب ہیں جو خدا کے علاوہ اور کسی کے سامنے سجدہ کرنے سے نہیں جھجکتے ع

زبس بوئے کمالِ شرک می آید ز توحیدم (نظیری)

پڑھئے! وہ اشعار جو اس شعر کے تحت میں لکھے گئے ہیں:۔

جنھیں آپ نے اپنی خباثت باطنی کا آئینہ دار سمجھ کر چھوڑ دیا ہے یہ بالکل ایسا ہی ہے جس طرح "لا تقربوا الصلوٰۃ" پر تو عمل کیا جائے اور "و انتم سکاریٰ" کو نظر انداز کر دیا جائے۔

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

مذکورہ بالا قسم کے اسلام رکھنے والوں کو غیرت دلانے کے لئے باندازِ شاعرانہ حضرت مولانا نے یہ شعر فرمایا ہے اور آپ کے اعتراض کا ماحصل یہ ہے کہ آپ اس قسم کے سجدہ کرنے والوں کے اسلام کو جو صریح کفر بلکہ شرک ہے۔ درحقیقت اسلام سمجھتے ہیں، اور ایسے ہی اسلام نما غیر مسلمانہ عبادت کرنے والوں کو حضرت سرمدؒ نے دعوت دی ہے:۔

روشیوۂ بندگی ز شیطاں آموز
یک قبلہ گزین و سجدۂ غیر مکن

حقیقت تو یہ ہے کہ آپ جیسے ریاکاروں کے لئے مولانا کا یہ شعر ایک ایسا تازیانہ تھا کہ جس کی تاب آپ نہ لا سکے اور انتہائی غیظ و غضب میں آکر انبیاؑ و رسول و اتقیاء، و شہداء و صلحاء، و اولیاء و صحابہ و تابعین وغیرہم کو ڈھال بنا کر حملہ آور ہو گئے۔ مفتی جی!

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

مولانا سیماب کے مصرع میں "شعار عام" کا ٹکڑا اس کی روشن دلیل ہے کہ ان کے مخاطب وہ لوگ ہیں جن کا ان اشعار میں ذکر کیا گیا ہے اور آپ نے وہ اشعار نظر انداز کر کے انبیاء علیہم السلام اور نفوس قدسیہ خصوصاً حضور اکرم صلعم کی ذات مبارک کو علی السبیل البدلیت داخل کر کے خود اپنی گردن میں پھندا ڈال لیا ہے کہ جتنا بھی تڑپیں گے اتنا ہی وہ آپ کا گلوگیر ہوتا جائیگا دیکھئے! آپ نے "شعار عام" سے اسلام اور اس کے احکام مراد لے کر سخت ٹھوکر کھائی ہے "شعار"[1]، کو شعائر کے معنی میں سمجھنا آپ کے لغوی تحقیق سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے۔

"شعار" جامہ کہ زیر جامہ دیگر پوشند و آں جامہ بالا را دثار گویند۔

عام طور پر یہ لفظ عادت و خصلت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہاں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ آپ نے جو مراد لی ہے وہ لفظ شعائر سے ادا ہوتی ہے جو عبادت و قربانی کے معنی میں ہے اور جس کا واحد شعیرۃ یا شعارۃ ہے۔ یا لفظ شاعر سے جو جمع ہے شعر کی۔ پہلے مصرع میں "ادائے خاص" کا اقتضا یہ ہے کہ دوسرے مصرعے میں "شعار عام" سے عام لوگوں کی ریاکارانہ عبادت مراد لی جائے۔ موجودہ ترکیب اور آپ کی معنی آفرینی میں بعد المشرقین ہے۔ اگر حضرت مولانا مدظلہ العالی شعائر یا شاعر فرماتے تو آپ کا ان سے اسلام اور اس کے احکام مراد لینا صحیح ہوتا۔ اور اس وقت آپ کا یہ ایراد قابل تسلیم تھا ناظرین ذرا خدا لگتی کہیں کہ ایسے شخص کو جو عربی الفاظ کے معنی اور محل استعمال بھی نہ سمجھ سکے اسے مفتی یا "عالم دین" سمجھنا اور اس کی باتوں کا یقین کرنا دانشمندی کی دلیل ہو سکتی ہے؟ اور افتائے کفر کا جو نازک سے نازک تر مسئلہ ہے۔ شریعت مقدسہ کے نزدیک اس کا کچھ اعتبار ہو سکتا ہے؟ (باقی۔ باقی)

جالب سہرامی

---

[1] حضرت مولانا سیماب نے اپنے خط مطبوعہ "شاعر" بابت ۲۲ء میں شعائر اسلامی تحریر فرمایا ہے اور نظم میں "شعار عام" لکھے ہیں استعمال الفاظ کے محل سے دو وقت واقف ہیں۔ **جالب**

اشکِ غم

بیگم نسیم کی جلوہ افشاں تربت پر

۱۹ ۶ ۴۲

آ اے زینتِ رضی منزل — عزت و عصمت رضی منزل
شمع کاشانۂ رضی منزل — مہرِ ضو خانۂ رضی منزل
گوہرِ معدنِ رضی منزل — جوہرِ مخزنِ رضی منزل
نازشِ محفلِ رضی منزل — تابشِ محلِ رضی منزل
ناظم و رہبر رضی منزل — حاکم و افسر رضی منزل
ہائے خوشنودیٔ رضی منزل — وائے بہبودیٔ رضی منزل

لٹ رہا ہے ترا جلو خانہ
ہو رہا ہے تباہ کاشانہ

آہ اے نزہت و بہارِ نسیم — روحِ شاداب لالہ زارِ نسیم
مونس و ہمدم و شریکِ حیات — حال درد و غمگسارِ نسیم
آشنائے نظر مزاج شناس — عارفِ راز و رازدارِ نسیم
مالکِ حسنِ سیرت و صورت — اے بہر شکل اعتبارِ نسیم
اے بہر حال راضی و قانع — اے بہر وقت حق گزارِ نسیم
اے شہیدِ رضائے امرِ خدا — اے ثباتِ دل و قرارِ نسیم

اٹھ کہ روحِ نسیم ہے بیتاب
دل تڑپتا ہے صورتِ سیماب

لغزہ زا ہو تجھے صبا کی قسم — شاعرِ درد آشنا کی قسم
دیکھ "دعلہ" میاں ہے فریادی — اٹھ تجھے اسکی التجا کی قسم
سن ذرا "صابرہ" کی چیخیں سن — عرش ہل جائیگا خدا کی قسم
"ہاجرہ" رو رہی ہے تیرے لئے — آ تجھے شیون و بکا کی قسم
دیکھ "فیروز" تک رہی ہے منہ — مسکرا دے تجھے خدا کی قسم
گونج "محشر" کی گونج اٹھی ہے — واپس آ جذبۂ وفا کی قسم
مرثیہ غم "مظہر و مظفر" ہیں — آل و اولادِ مرتضیٰ کی قسم

بھائی ماتم کناں ہیں آنکھیں کھول
والدہ رو رہی ہیں منہ سے بول

تیری فطرت ہے غمگسارانہ — سن لے بربادیوں کا افسانہ
میں نے لکھی ہے ایک تازہ نظم — کچھ تو کہہ صورتِ خطیبانہ
دیکھ "بانو" کا اشکِ مضطر دیکھ — شمع پر جل رہا ہے پروانہ
اس نے لکھا ہے دست بستہ سلام — پھر بطرزِ نیازمندانہ
دیکھ "خاتونِ مشرق" دہلی — بن کے آیا ہے تیرا ندرانہ
پڑھ کے "عصمت" کا سالنامہ محرم — کھل رہا ہے ادب کا میخانہ
چھپ کے آیا ہے پڑھ خدا را پڑھ — میرا "شاعر" میں تازہ افسانہ

شاق مجھ کو نہیں ترا ہنسنا
مسکرا کر مرا مذاق اڑا

اے تری نظم و نثر کے قربان — منتشر ہو رہا ہے سب سامان
گرد غم کا ہے ہر طرف انبار — خاک مری ہی ہیں زمین الامان
گوشے گوشے میں ہے سکوتِ عظیم — چپہ چپہ ہے "قصر" کا ویران
ذوقِ زینت ترا کہاں ہے آج — ترا زینت کدہ ہے کیوں سنسان
اب "مشق" "کشیدہ کاری" ہے — نہ ہیں "نقش و نگار" کے ارمان
بند کیوں ہو گئی ہے "دستی مشین" — ہے تحرک ہی زیست کی پہچان
کیوں پڑا ہے یونہی یہ "کیرم بورڈ" — دیکھ آتی ہوئی ہیں "آپا جان"
"بیدل" "ماتے" دے بساط بچھا — کرے "شطرنج" ہی کا کچھ سامان
بلبلِ باغِ دہر کیوں ہے خموش — بند کیوں ہو گئی ہے تیری زباں؟

تجھ کو رویا کرینگے بھائی جان
جان کھویا کرینگے بھائی جان

دل بھر بھر کے منہ کو آتے ہیں — جب "وہ" ماتوں کو گنگناتے ہیں
"رات کاٹے سے کٹ نہیں سکتی — دن کے لمحے تو کٹ بھی جاتے ہیں"
"اے وفا آشنا اداس نہ ہو — تو گئی ہے تو ہم بھی آتے ہیں"
"دردِ دل کا علاج کون کرے — ابنِ مریم بھی کپکپاتے ہیں"
"ہائے دل کا کنول ہے پژمردہ — پھول گلشن کے بکھرے جاتے ہیں"
مونسِ غم کوئی نہیں آتا — دیکھنے کو ہزار آتے ہیں

"فصلِ گل میں لٹا ہے مرا چمن" — "دل میں شعلے سے تھرتھراتے ہیں"
لٹ رہی ہے بہارِ عمرِ نسیم — جھونکے بادِ فنا کے آتے ہیں"

"یہ غزل بھی تجھے سنانی ہے
تیرے جوگی کی یہ کہانی ہے"

ہائے بیدرد موت ظالم موت — جابر و قاطعِ مراسم موت
خوف انگیز و ہول آگیں موت — بے وفا بے اصول آئیں موت
موت سفاک موت رہزن موت — موت اے زندگی کی دشمن موت
قابضِ رنجِ شادمانی موت — موت غارت گرِ جوانی موت
آڑ میں زندگی کی آتی ہے — صورتِ برق مسکراتی ہے
چال تیری ہے زلزلہ انگیز — تیرا ہر اک قدم ہے محشر خیز
رقص کرتا ہے تیرا تیغِ زوال — تجھے دیکھا ہے بیچ موجِ جلال
نقشِ ہستی مٹاتی آتی ہے — آندھیاں سی چلاتی آتی ہے
گرم ہاتھوں سے تیرے ہو گئے سرد — بچے بوڑھے جوان عورت مرد
دھن میں غارت گری کی رہتی ہے — رحم کو تو گناہ کہتی ہے

تو نے لوٹا ہے لالہ زارِ نسیم
چھین کر لے گئی بہارِ نسیم

گیت عشرت کے گائینگی حوریں — تجھے جھولا جھلائیں گی حوریں
حلقۂ نور میں تجھے لیکر — سیرِ جنت کرائیں گی حوریں
نخلِ طوبیٰ کی چھاؤں میں دن رات — ہنسکے تجھ کو ہنسائیں گی حوریں
تشنہ کامی تری مٹانے کو — آبِ کوثر پلائیں گی حوریں
تجھ کو خود ہاتھ سے کھلانے کو — میوۂ جنت کے لائیں گی حوریں
جستہ جستہ حسین جھولوں میں — رفعتوں پر چڑھائیں گی حوریں
رفتہ رفتہ تجھے بھی خلد نشیں — اپنے جیسا بنائیں گی حوریں

اے شہیدِ نسیم زندہ باد
پُرسکوں باد و آرمیدہ باد

صبا متھراوی

مشاعرۂ شاعر

مصرعِ طرح :- "ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"

محسنِ ادب حضرت اختر ہنگامی ایڈووکیٹ اوری

اس وقت دیکھ شانِ گلستانِ انقلاب
جب بنتی بنتی کرتی ہوا اعلانِ انقلاب

سجکے نہ کیوں جبینِ پُرافشانِ انقلاب
"ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"

نیچے گرے ہوؤں کو اُٹھانا ہی اسکا کام
قوموں کی گردنوں پہ ہے احسانِ انقلاب

ہوتا ہے کس پہ فضلِ خدا دیکھنا یہ ہے
رہتا ہے کس کے ہاتھ میں میدانِ انقلاب

ہو راستہ میں خون کا چھڑکاؤ جا بجا
مقدم ہو انقلاب کا شایانِ انقلاب

افراد جس کے مختلف الرائے ہوں تمام
وہ انجمن، نہیں کبھی شایانِ انقلاب

آمد جب انقلاب کی ہوتی ہے دہر میں
ہوتا ہے ذرہ ذرہ سے اعلانِ انقلاب

اپنی ہی زندگی کو کبھی رکھ کے سامنے
لکھنی ہے ایک نظم بعنوانِ انقلاب

کس شانِ انقلاب کو اختر سراہیے
ہر انقلاب میں ہے نئی شانِ انقلاب

حضرت قمر نعمانی سہسرامی

ہو پاک وہم سے اگر ایمانِ انقلاب
ہر اک نفس ہو حاملِ سامانِ انقلاب

پہلے بنا لے ذہن کو شایانِ انقلاب
پھر آئے گی سمجھ میں تری شانِ انقلاب

طوفان بنکے گھیر لیا ہے جہان کو
گھٹنے لگا ہے دل میں جب ارمانِ انقلاب

اب کون ہے کرے جو زمانے کو پرسکوں
اب کون ہے جو روک دے طوفانِ انقلاب

ذرے بھی آفتاب کی کرتے ہیں ہمسری
یہ جوشِ انقلاب ہے، یہ شانِ انقلاب

کرنی نہ چاہئے تجھے انجام پر نظر
اُٹھا ہے تیرے دل میں جب ارمانِ انقلاب

شعلوں میں گھر گیا ہے سکون زارِ زندگی
بھڑکا ہوا ہے جوشِ فراوانِ انقلاب

آثارِ انقلاب سے لرزاں ہے کائنات
اللہ رے یہ جوشِ فراوانِ انقلاب

پیغامِ آخری ہے یہ دُنیا کو کیا قمر
کیا ختم اب نہ ہوگا یہ طوفانِ انقلاب؟

جناب سلیم سہروردی گوالیاری

نکلا ہے جب سے مہرِ درخشانِ انقلاب
پیدا ہے ذرہ ذرہ سے اک شانِ انقلاب

تغیرِ روز و شب سے سبق مل رہا ہے یہ
فطرت نے کر دیا ہے خود اعلانِ انقلاب

ینائے حیات پہ کچھ روشنی سی ہے
کروٹ بدل رہا ہے پھر ارمانِ انقلاب

ذرہ ہو آفتاب ہو یا بحرِ بیکراں
یکساں ہیں سب پہ لطفِ فراوانِ انقلاب

غرقِ اجل ہوئے ہیں سفینے حیات کے
جب سے اُٹھا ہے دہر میں طوفانِ انقلاب

غافل کو اپنے حالِ وطن کا پتہ نہیں
دُنیا ہے آج مرکزِ طوفانِ انقلاب

قطرے کو موج موج کو دریا بنا دیا
سب پر بقدرِ ظرف ہے احسانِ انقلاب

اُن رہروانِ شوق کی مایوسیاں نہ پوچھ
جنکی ہر آرزو میں ہے امکانِ انقلاب

اک شانِ انقلاب نمایاں ہے اے سلیم
کتنا نظر فریب ہے عنوانِ انقلاب

حضرت اختر اعظمی

پھر ہو رہا ہے ملک میں سامانِ انقلاب
سرمایہ دار پھر ہیں پریشانِ انقلاب

مزدور کے شکستہ مکانوں کے سامنے
لہرا رہا ہے پرچمِ سلطانِ انقلاب

دُنیا ہے آج مقتلِ انساں بنی ہوئی
لبریزِ خوں ہے وسعتِ دامانِ انقلاب

ہر ذرے پر ہیں خون کی چھینٹیں پڑی ہوئی
ہے دیدنی بہارِ گلستانِ انقلاب

کر دے جو پارہ پارہ نظامِ انانیت
گردش میں ہے وہ خنجرِ بُرّانِ انقلاب

گلچیں سے منحرف ہے ہر اک ذرہ چمن
جاری ہے آج باغ میں فرمانِ انقلاب

ہر گوشۂ چمن سے بغاوت ہے موجزن
ہر شے سے آشکار ہے طوفانِ انقلاب

چھلنی جو کر دے عیش کی رنگیں بساط کو
اختر چمک رہا ہے وہ پیکانِ انقلاب

معاونِ ادب حضرت صابر اکبرآبادی

ہے دو جہان پہ سایۂ شیطانِ انقلاب
اب کیا رکیگی شورشِ طوفانِ انقلاب

کہدو کہ گردشیں ہوں نگہبانِ انقلاب
لیل و نہار لائے ہیں فرمانِ انقلاب

ہر شے کی شان سے ہے جدا شانِ انقلاب
کہتے ہیں زندگی جسے ہے جانِ انقلاب

ممکن ہی اب نہیں کوئی درمانِ انقلاب
ہے دورِ انقلاب میں امکانِ انقلاب

جب سے زمیں پہ بچھنے لگا خوانِ انقلاب
ہونا پڑا ہر ایک کو مہمانِ انقلاب

گلکاریاں لہو کی جو ہوتی ہیں ہر طرف
شاید لکھا تھا خون سے پیمانِ انقلاب

یہ انقلاب وقت کی زد میں نہ آئے کیوں
انسان فی زمانہ ہے انسانِ انقلاب

ماہر جب انقلاب کا معلوم ہے سبب
پھر میرے یار کیوں ہو پریشانِ انقلاب

جناب فضا الہ آبادی

فطرت نے خود ہی کر دیا سامانِ انقلاب
اب کیا رُکے گا رو کے سے طوفانِ انقلاب

روشن ہوئی وہ شمعِ شبستانِ انقلاب
"ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"

اے محوِ انقلاب، جوانانِ انقلاب
تم روحِ انقلاب ہو تم جانِ انقلاب

آئیں نہ لغزشیں کہیں پائے ثبات میں
چھٹنے نہ پائے ہاتھ سے دامانِ انقلاب

ہمت نہ ہار دینا کہ منزل ہے سامنے
بس دو قدم کی بات ہے یارانِ انقلاب

ہے کارواں روانہ سوئے منزلِ عمل
فطرت بنی ہوئی ہے حدی خوانِ انقلاب

دیکھیں بہار اب کی برس کیا کھلائے گل
دستِ جنوں میں پھر ہے گریبانِ انقلاب

دنیائے شاعری میں نہ کیوں حشر ہو بپا
لکھی فضاؔ نے نظم بعنوانِ انقلاب

جناب قدیر محشر فرخ آبادی

کیوں محو ذوقِ آشیاں ہیں ہے سامانِ انقلاب
سارا چمن ہو مورد طوفانِ انقلاب!

دل ہے اسیر گیسوئے جانانِ انقلاب
آنکھیں ہیں محو جلوۂ تابانِ انقلاب!

لے جا رہا ہے شوقِ اسیری کشاں کشاں
کیا بابِ خلد ہے درِ زندانِ انقلاب؟

ہم چاک کر دیں پردۂ شامِ جمود کو
ہے آرزوئے صبحِ فروزانِ انقلاب

دے کر وطن کی خستہ نصیبی کا واسطہ
قدرت سے لے رہا ہوں میں پیمانِ انقلاب

مردِ مجاہدِ وطن اپنا قدم بڑھا
اب سمتِ ہند ہے رُخِ طوفانِ انقلاب

مل جُل کے اہلِ ہند جہادِ وطن کریں
"ہو خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"

محشرؔ غلامیوں میں تغیر ہے ناگزیر
ذرّوں میں دیکھتا ہوں میں سامانِ انقلاب

حضرت مولانا جالبؔ مظاہری سہسرامی

بڑھتے ہی جا رہے ہیں جوانانِ انقلاب
اللہ رے یہ جوشِ فراوانِ انقلاب

چاکِ سحر ہے چاکِ گریبانِ انقلاب
صبحِ مآل ہے شامِ اسیرانِ انقلاب

ایثارِ جسم و جاں کی ضرورت وطن کو ہے
میری متاعِ زیست ہے قربانِ انقلاب

کچھ برہمیٔ نظمِ تمنائے دل نہ پوچھ!
ہر جنبشِ نگاہ ہے سامانِ انقلاب

شاید یہیں ہو مطلعِ خورشیدِ حریت
کچھ روشنی سی ہے تہِ دامانِ انقلاب

معمورۂ حوادثِ عالم ہے دل مرا
ہوں خانہ زادِ گردشِ دورانِ انقلاب

جالبؔ فروغِ طبع ہے مسند نشینِ بزم
میرا کلام ہے مہِ تابانِ انقلاب

جناب طرفہؔ قریشی بھنڈاروی

غیروں کی بزم میں ہے چراغانِ انقلاب
اک ہم ہیں صرف بے سروسامانِ انقلاب

ہر شخص آ رہا ہے رسن در گلو نظر
ہر نوجواں ہے سلسلہ جنبانِ انقلاب

مل کر لہار گائیں گے مرغانِ باغِ ہند
جنت اثر بنے گا گلستانِ انقلاب

آئینگی ہر طرف سے صدا ہائے زندہ باد
جب سر بلند ہونگے جوانانِ انقلاب

ٹوٹے گا اک دن یہ طلسمِ جمودِ ہند
بیدار ہونگے خواب سے مردانِ انقلاب

اپنے وطن کے واسطے دیگا جو اپنی جان
کہلائے گا وہ غازیٔ میدانِ انقلاب

ہر شعر اس کا کیوں نہ ہو طرفہؔ اثر نواز
لکھی ہے ہم نے نظم بعنوانِ انقلاب

جناب فضا کوثری بنگلوری

"ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"
روشن ہے داغِ دل سے شبستانِ انقلاب

دیکھے تو کوئی جوششِ فیضانِ انقلاب
ہیں سر بکف جہاں میں جوانانِ انقلاب

سینچیں گے اہلِ ہند اسے اپنے خون سے
واقفِ خزاں نہ ہوگا گلستانِ انقلاب

ہے بچہ بچہ ہند کا اک پیکرِ عمل
قائم ہے ہر گلی میں دبستانِ انقلاب

آمادہ انتقام پہ ہے ذرہ ذرہ آج
لائے گا رنگ خونِ شہیدانِ انقلاب

مشاطگانِ ہند ہیں محبوس قید میں
سلجھائے کون زلفِ پریشانِ انقلاب

اہلِ نظر بغور پڑھیں اسکو اے فضاؔ
ہر شعر اس غزل کا ہے دیوانِ انقلاب

جناب اسد سیمابی

پیدا وطن میں ہو چکے سامانِ انقلاب
آواز دو کدھر ہیں جوانانِ انقلاب

بہرِ خدا اٹھائیں نہ احسانِ ناخدا
کشتی بھنور میں ڈال دیں مردانِ انقلاب

بلبل نڈھال ہو نزع ہے ساں چمن اداس
اُف کس قدر عجیب ہے طوفانِ انقلاب

آزادیوں کی عید منانے کو آئے گا
اُجڑے ہوئے دیار میں سلطانِ انقلاب

رنگِ شفق سے اُبھریں گے لالے کے داغ پھر
کھیلیں گے خاک و خوں سے شہیدانِ انقلاب

مشرق میں اور غرب، شمال و جنوب میں
"ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"

اُن ہندیوں کے مُردہ ہیں احساس اے اسدؔ
مفقود جنکے دل سے ہے ہیجانِ انقلاب

جناب بیتاب کالپوی

مژدہ حیاتِ نو کا ہے اعلانِ انقلاب
فطرت کا اک پیام ہے فرمانِ انقلاب

کر دو ضیائے حسنِ عمل سے دلا ورو
ہر گوشۂ جہاں میں چراغانِ انقلاب

حسنِ عمل سے آج بھی دورِ حیات میں
گہوارۂ امید ہے زندانِ انقلاب

ہر دل تجلیات کا مرکز ہے آجکل
فطرت جہاں کی خود ہی ہے خواہانِ انقلاب

سمجھا نہ کچھ وہ زیست میں بھی مدعائے زیست
انسان کو اگر نہیں عرفانِ انقلاب

تازہ بہار آئے فضائے جمود میں
جس خطۂ زمیں پہ ہو بارانِ انقلاب

بیتاب دل میں ایک قیامت سی ہے بپا
اُٹھا ہے آج شان سے طوفانِ انقلاب

جناب صادق مرادآبادی از بھنڈ

کہتی ہے خلق جن کو اسیرانِ انقلاب
مہمانِ انقلاب ہیں مہمانِ انقلاب

پھیلا ہوا ہے ساری بساطِ جہاں پر آج
دیکھے تو کوئی وسعتِ دامانِ انقلاب

رہنے کو گھر تو کھانے کو نانِ جویں نہیں
کتنی مصیبتوں میں ہیں یارانِ انقلاب

فرسودہ ہے نظامِ کہن اس جہان کا
شایانِ انقلاب ہے شایانِ انقلاب

زید اپنی راہ پر ہے تو شام راہ پر
یوں انقلاب ہوگا نہ یارانِ انقلاب

مشکل ہے اب کہ ماند ہو ضو اس کے نور کی
"ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"

صادق کچھ اہلِ ہند کی نادانیاں نہ پوچھ
آپس میں جنگ اور پھر ارمانِ انقلاب!

جناب شاعر کاندھلوی

خونِ وطن سے سُرخ ہے دامانِ انقلاب
"ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"

خود ابر بن کر آج ستمدیدگانِ ملک
برسا رہے ہیں ہند میں بارانِ انقلاب

بعدِ خزاں ریاضِ سیاست میں دیکھئے
کیا گل کھلائے خونِ شہیدانِ انقلاب

پروانہ ہائے ملک مبارک نویدِ سوز
روشن ہوئی ہے شمعِ شبستانِ انقلاب

چارہ ہوا کسی سے نہ جب انقلاب کا
خود انقلاب بن گیا درمانِ انقلاب

لکھتے ہیں خوب حضرتِ بیتاب آجکل
صفحاتِ جنگ وجالِ پریشانِ انقلاب

شاعر وہی ہے اصل میں ای شاعرانِ قوم
لکھا ہے خونِ دل سے جو دیوانِ انقلاب

جناب انور شہادوی

لائی ہے رنگ شمعِ شبستانِ انقلاب
"ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"

اے وہ کہ تیری ذات سے ہے شانِ انقلاب
آ کے وہ کہ تیری آن میں ہے آنِ انقلاب

تیرا وجودِ پاک نویدِ حیات ہے
تو روحِ انقلاب ہے تو جانِ انقلاب

وجہِ نشاط تجھ کو مجاذِ جہاد ہے
نوروز تجھ کو صبحِ درخشانِ انقلاب

تیری جبیں پہ جذبۂ آزاد کی شکن
اور دل ترا نہیں ہے ہراسانِ انقلاب

تیری رگوں میں جذب ہے ماضی کا خونِ گرم
ہے ثبت تیرے قلب پہ عنوانِ انقلاب

ہے تیرا انجم بختِ نشاط آفرینِ دہر
ہے تیرے دم سے بزم فروزانِ انقلاب

ہاں طائرانِ گلشنِ ایجاد کی قسم
رکھ لے اُٹھا کے سر پہ گلستانِ انقلاب

جناب شنکر لال وفا اکبرآبادی

روشن ہو کیوں نہ وسعتِ میدانِ انقلاب
"ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"

شعلہ فگن ہے مہرِ درخشانِ انقلاب
بھڑکی ہوئی ہے آتشِ دامانِ انقلاب

اے گل فروش بند کر اب گل فروشیاں
ہر گل کہ ہے آب و رنگِ گلستانِ انقلاب

یوں انقلاب ہو کہ نہ ہو منقلب جہاں
ہے ایسا کوئی درسِ دبستانِ انقلاب؟

ہے آج آزمائشِ ظرفِ نگاہ و دل
اے طالبانِ جلوۂ پنہانِ انقلاب

تقدیر کے دھنی ہیں جو اس بزمِ دہر میں
دیکھیں گے وہ بہارِ گلستانِ انقلاب

ہشیار باش سیلِ حوادث کو لے وفا
ہر سو بپا ہے دہر میں طوفانِ انقلاب

جناب باقی اعظمی

دیکھا ہے اُن کے ہاتھ ہی میدانِ انقلاب
تر خون سے جو کرتے ہیں دامانِ انقلاب

وہ قوم جس کو ہو نہ کچھ احساسِ زندگی
اس کو مٹا کے چھوڑیگا طوفانِ انقلاب

جو ہیں اسیرِ رنج و محن اور شکستہ پا
ہونگے یہی غریب کبھی جانِ انقلاب

سنبھلو کہ آنے پائے نہ جنبش یقین میں
دیکھو کہ ٹوٹ جائے نہ پیمانِ انقلاب

خواہش اگر تمہاری ہے تجدیدِ زندگی
روکو قدم نہ اپنے جوانانِ انقلاب

یا یہ کہ وقت ہی سے تجھے اتنا نہیں ملا
یا یہ کہ کر سکا نہ تو سامانِ انقلاب

باقی مگر رہا نہیں احساس ہی تجھے
تو بھی اُٹھا تو سکتا ہے طوفانِ انقلاب

جناب کھچھو مل ضیا میرٹھی

ہر پھول کے نکھار میں ہے شانِ انقلاب
سرسبز ہو رہا ہے گلستانِ انقلاب

جب سے ہوا ہے باغ میں جولانِ انقلاب
مشتاق ہیں چمن کے اسیرانِ انقلاب

پُر اضطراب خاطرِ صیاد ہے بہت
برپا قفس میں دیکھ کے طوفانِ انقلاب

قائم نظامِ بزم ہے بنیادِ ظلم سے
"ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"

آثارِ شب فلک سے ہیں آمادۂ وداع
پھیلا دیا ہے صبح نے دامانِ انقلاب

تنظیمِ گلستاں میں ہر اک پھول محو ہے
غنچوں میں آ رہی ہے نظر شانِ انقلاب

عالم ضیا تمام تغیر پذیر ہے
کیا رنگ لائے دیکھئے طوفانِ انقلاب

جناب بقا انصاری جونپوری

دل میں ہے موجزن مرے طوفانِ انقلاب
ہونا پڑیگا کیا مجھے قربانِ انقلاب؟

مڑ کر نہ دیکھو بس یونہی بڑھتے چلے چلو
پیچھے قدم ہٹے نہ فدایانِ انقلاب

ہنس ہنس کے دیکھتا ہے زمانے کا رنگ کیا
دیکھی نہیں ہے تونے ابھی شانِ انقلاب

کیا آشنگی قریب مرے نامرادیاں
اب لے لیا ہے ہاتھ میں دامانِ انقلاب

دُنیا کا رنگ ہی یہ بدل دیگا ایک دن
دُنیا میں آج اُٹھا ہے جو طوفانِ انقلاب

جب تک بقا یہ خون سے سینچا نہ جائیگا
ہوگا کبھی نہ سبز گلستانِ انقلاب

جناب اثر ذائقی بنگلوری

آزادیِ وطن کو شہیدانِ انقلاب ۔۔۔ لکھتے ہیں اپنے خوں سے بعنوانِ انقلاب

ہمدوش لالہ زار ہے دامانِ انقلاب ۔۔۔ لایا ہے رنگ خونِ شہیدانِ انقلاب

خود ان کی جستجو میں ہے حریتِ وطن ۔۔۔ آئین کہاں ہیں آرزو مندانِ انقلاب

تخریبِ کائنات ہے یہ جنگِ حاضرہ ۔۔۔ ہندوستان میں بھی ہے امکانِ انقلاب

غافل تو جلد منزلِ مقصود کر تلاش ۔۔۔ گل ہو نہ جائے شمع فروزانِ انقلاب

یکساں ہے ہر تونگر و محتاج اب اثر ۔۔۔ ہر اک کو دیکھتا ہوں پریشانِ انقلاب

جناب منظر کلیمی جام پوری

نکلے ہیں سرخ رنگ نہالانِ انقلاب ۔۔۔ کتنا ہے پُر بہار گلستانِ انقلاب

خود مٹ نہ جائیں دسترسِ انقلاب سے ۔۔۔ خواہانِ انقلاب و فدایانِ انقلاب

زندہ دلوں میں ڈھونڈ تغیر کی عظمتیں ۔۔۔ یہ مردہ دل بتائیں گے کیا شانِ انقلاب

خالِ سیاہ، شوخ نظر، زلفِ عنبریں ۔۔۔ کیا کیا ہیں بہرِ ہوش یہ سامانِ انقلاب

قسمت مری ازل سے ہے یا رب بلا سرشت ۔۔۔ اس کے لئے بھی ہو کوئی سامانِ انقلاب

منظر نظر میں طور کے جلوے اداس ہیں ۔۔۔ پھر آئے اور دکھائے کوئی شانِ انقلاب

جناب پریم دہلوی

ہو جائے کاش صبحِ بہارانِ انقلاب ۔۔۔ اُجڑی ہوئی ہے شامِ گلستانِ انقلاب

خالی گئی نہ آہِ شہیدانِ انقلاب ۔۔۔ ہے اُنکے دم سے آج چراغانِ انقلاب

کیا کیا نہ چارہ سازنے کیں چارہ سازیاں ۔۔۔ پھر بھی نہ ہو سکا کوئی درمانِ انقلاب

ہوتے رہے ہیں اس میں ہمیشہ تغیرات ۔۔۔ روزِ ازل سے ہند ہے ایوانِ انقلاب

بڑھنے دے اور جبر و تشدد کی داستاں ۔۔۔ اس سے بنے گی قسمتِ یارانِ انقلاب

جو تنگ غم سے تھے پریم کا سرمایۂ حیات ۔۔۔ وہ ہو گئے ہیں زینتِ دامانِ انقلاب

جناب وحید بلاسپوری

ویرانیاں ہیں زینتِ محفل بنی ہوئی ۔۔۔ "ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"

بیداریوں کی آج ضرورت وطن کو ہے ۔۔۔ ورنہ کھڑا ہے سامنے طوفانِ انقلاب

ہمت کو تنگ راہ بنانے کی دیر ہے ۔۔۔ رہ جائے کا پلٹ کے یہ طوفانِ انقلاب

خوں ریزیوں کو امن کے سانچے میں ڈھال دو ۔۔۔ دُنیا کہے گی پھر تمہیں سلطانِ انقلاب

ہر سمت ہو سکون و مسرت کی سلطنت ۔۔۔ باقی رہے دلوں میں نہ ارمانِ انقلاب

پڑھ دو ملا میں شعر کے وہ اذانِ نو وحید آب ۔۔۔ ہل جائے جس کے شور سے ایوانِ انقلاب

جناب اثر احمد آبادی

شاہد ہے شانِ جلوۂ ایوانِ انقلاب ۔۔۔ "ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"

سنتا ہوں آج کل یہ فضائے بسیط میں ۔۔۔ گونجا ہوا ہے نعرۂ طوفانِ انقلاب

جھکتی ہے اسکے سامنے دنیا کی سرکشی ۔۔۔ جس نے پناہ لی تہِ دامانِ انقلاب

دُنیائے انقلاب کا حاصل لئے ہوئے ۔۔۔ ڈوبی ہوئی ہے نبضِ رگِ جانِ انقلاب

لب پر ہے کائنات کے اک شورِ الاماں ۔۔۔ محشر بدوش اُٹھا ہے طوفانِ انقلاب

کیوں آ رہا ہے جانبِ ہندوستاں اثر ۔۔۔ کس نے بدل دیا رُخِ طوفانِ انقلاب

جناب ظفر ناگپوری

دل ہے دیارِ شوق کا سلطانِ انقلاب ۔۔۔ دستِ طلب کو کیوں نہ کہوں جانِ انقلاب

ہوتی چلی جمود کی بنیاد کھوکھلی ۔۔۔ بڑھتا چلا ہے شان سے طوفانِ انقلاب

ہو کر رہیگا پھر متغیر نظامِ دہر ۔۔۔ پھر آگیا جہان میں طوفانِ انقلاب

عزمِ بلند و جوشِ تقاضائے آرزو ۔۔۔ ایمانِ انقلاب ہیں ایمانِ انقلاب

ہم جانتے ہیں گردشِ چرخِ کہن کا راز ۔۔۔ دیتی ہے ہم کو دعوتِ اعلانِ انقلاب

رنگِ تغیرات سے وابستہ ہے حیات ۔۔۔ ہم اے ظفر ہیں تابعِ فرمانِ انقلاب

جناب رونق چمن پٹنی

اب ہند میں ہے دورِ بہارانِ انقلاب ۔۔۔ پھولا پھلا ہوا ہے گلستانِ انقلاب

امن و امانِ ملک نہ کیوں جل کے راکھ ہو ۔۔۔ بھڑکی ہوئی ہے آتشِ سوزانِ انقلاب

ہر حریت طلب نظر آتا ہے سرفروش ۔۔۔ جب سے ہوا ہے ملک میں اعلانِ انقلاب

اب کچھ بھی ہو مآل۔ نہیں ہندیوں کو غم ۔۔۔ تھامے ہوئے ہیں شوق سے دامانِ انقلاب

کافور ہونے کو ہیں غلامی کی ظلمتیں ۔۔۔ نکلا ہے تنکے مہرِ درخشانِ انقلاب

کہدے یہ رونق اُن سے جو کرتے ہیں اس سے خوف ۔۔۔ آزادیِ وطن ہی ہے درمانِ انقلاب

جناب انجم احمد آبادی

ہے شش جہت میں شورشِ ہیجانِ انقلاب ۔۔۔ انجم یہ کس بلا کا ہے طوفانِ انقلاب

مدت سے جنکے دل میں تھا ارمانِ انقلاب ۔۔۔ وہ آج ہو رہے ہیں پریشانِ انقلاب

ظاہر فسردگی سے ہیں آثارِ تازگی ۔۔۔ کیا باغباں تجھے نہیں عرفانِ انقلاب

افشا کسی پہ راز یہ ہوتا نہیں مگر ۔۔۔ ہے انقلاب تا حدِ امکانِ انقلاب

مانا چلو میں دورِ خزاں اسکے ہے مگر ۔۔۔ وابستہ ہے بہار سے دامانِ انقلاب

انجم ہر ایک گوشۂ بزمِ جہاں سے آج ۔۔۔ اُٹھی ہوئی ہے شورشِ طوفانِ انقلاب

جنابِ نازش سیمابی پرتاب گڈھی

ہے کوئی روک دے جو یہ طوفانِ انقلاب؟ — سارا جہاں ہے اب تہِ دامانِ انقلاب
جب دیوِ ظلم حد سے بڑھاتا ہے اپنے پاؤں — انسان چھیڑتا ہے رگِ جانِ انقلاب
خدشہ ہے اب نہ شیخ کا نے محتسب کا ڈر — سب کے لئے کھلا ہے خمستانِ انقلاب
ہے کون حریت کا علم جو اُٹھائے گا — ہے کون جو بنے گا غزلخوانِ انقلاب؟
نازش اگر ہمیں بھی ہوں آزادیاں نصیب — تا عمر مانتے رہیں احسانِ انقلاب

جنابِ اختر وارثی سرحدی

ممکن نہیں کہ ہو سکے درمانِ انقلاب — "ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"
وہ اپنا آشیانہ بناتے ہیں دار پر — جو دیکھتے ہیں خوابِ گلستانِ انقلاب
جس نے نہ کی ہو بھول کے بھی خدمتِ وطن — راحت ملے گی کب اسے پایانِ انقلاب
آساں ہو کیوں نہ جادۂ دشوارِ زندگی — اب چاک ہو چکا ہے گریبانِ انقلاب
اختر مرے خیال کی تصدیق ہو گئی — تخریبِ کائنات ہے سامانِ انقلاب

جنابِ اکرم حنیفی دھولیوی

اکرم یہ ذکرِ عشق یہ دورانِ انقلاب — تجھ کو کہے گا کون غزلخوانِ انقلاب
ہو جائے جس سے تکملۂ شانِ انقلاب — ایسا بھی کوئی کام ہو شایانِ انقلاب
پروانہ وار شمعِ وطن پر نثار ہو — "ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"
شیرازۂ حواس ہمارا بکھر گیا — دیکھا وہ ہم نے خوابِ پریشانِ انقلاب
اکرم دعائے خیر کرو ہر نفس کے ساتھ — بڑھتا چلا ہے ہند میں طوفانِ انقلاب

جنابِ غنی کلنوروی

یادش بخیر فطرتِ ارمانِ انقلاب — "ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"
اے دل بہ ہوش باش کہ ہے وقتِ امتحاں — اُٹھا ہے بحرِ عشق میں طوفانِ انقلاب
یک بارگی بلند ہو پھر پرچمِ عمل — اک بار پھر ہو گردشِ دورانِ انقلاب
رہتی ہے اُن کی لرزہ براندام کائنات — جو ہستیاں ہیں صاحبِ عرفانِ انقلاب
ہے سطوتِ جبیں سے نمایاں تری غنی — پوشیدہ رہ بھی سکتا ہے رجحانِ انقلاب

جنابِ اشعر ہاشمی ملیح آبادی

عالم تمام بن گیا میدانِ انقلاب — اُمڈا ہوا جہاں میں ہے طوفانِ انقلاب
دورِ جنوں زیرِ سکون دے رہا ہے پھر — ہونے ہی کو ہے چاک گریبانِ انقلاب
پھر بن گئی نگاہ مری مرکزِ جمال — پھر آ گیا خیال میں وہ جانِ انقلاب
ٹوٹا کے جبین پہ بل وہ تصور میں آ گیا — ہستی ہماری بن گئی میدانِ انقلاب

اشعر گھٹائیں خون کی برسا رہی ہیں مینھ — پھولے پھلیگا خوب خیابانِ انقلاب

جنابِ نسیم فروکہ ضلع سرگودہا

تقدیر الٹ رہے ہیں ہوائی جہاز آج — برسا رہے ہیں آگ یہ مرغانِ انقلاب
ہر بار دیکھتا ہوں انھیں اور رنگ میں — اُنکے شباب میں بھی ہے کیا شانِ انقلاب
تقدیرِ کہنہ خود ہی بدل ڈال اے غلام — کیوں مفت سر پہ لیتا ہے احسانِ انقلاب
پی پی کے خون حضرتِ انساں کا آجکل — سیراب ہو رہا ہے گلستانِ انقلاب
مدت ہوئی ہے شامِ غلامی میں اے نسیم — ہو گی کبھی تو صبحِ بہارانِ انقلاب

جنابِ شاد سلیمانی نقشبندی جالندہری

اللہ رے طرفہ رنگیٔ بستانِ انقلاب — "ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"
آغاز کا پتہ ہے نہ انجام کا پتہ — ہوں زورقِ شکستہ بطوفانِ انقلاب
باقی رہا نہ کہتر و مہتر میں امتیاز — سنگ و گہر ہیں ایک بہ میزانِ انقلاب
پنہاں خزاں میں جس کی جانِ بہار ہے — وہ طرفہ گلستاں ہے گلستانِ انقلاب
اہلِ زمیں کے حالِ زبوں کی نہ پوچھ شاد — گوئے زمیں ہے آج بچوگانِ انقلاب

جنابِ لکشمی نارائن فارغ

نورِ فرحِ انقلاب ہے ترجمانِ انقلاب — تُو نے کیا ہے کام یہ فیضانِ انقلاب
شاداب ہے چمن یہ فقط انقلاب سے — ممنون ہے شاخ شاخ کے جانِ انقلاب
دنیا پہ پھیل جاتی ہیں آ آ کے رحمتیں — اپنا بدل کے نام، بعنوانِ انقلاب
ہر شاخ کو ہیں سینچتے وہ اپنے خون سے — مالی ہیں اس چمن کے شہیدانِ انقلاب
محفوظ آجکل نہ چمن ہے نہ دشت ہے — فارغ حیات گیر ہے طوفانِ انقلاب

جنابِ خنجر خلیق ایوبی

احساسِ حرص، خواہشِ زر، جاہ کی طلب — دراصل ہیں محرکِ طوفانِ انقلاب
اے ہمنشیں بتا یہ قیامت ہے کس لئے؟ — کیوں تیرے خون سے ہے چراغانِ انقلاب
انساں کے خون سے ہے زمیں آج لالہ رنگ — شوخی یہ ہے بہارِ گلستانِ انقلاب
نالے کہیں نہ ہند کی بہنا بیوں کو بھی — یا رب کہیں یہ ختم ہو طوفانِ انقلاب
دیتا ہے فرد فرد کو درسِ بقا و حفظ — کیا چیز ہے خلیق یہ دبستانِ انقلاب

جنابِ عباس انصاری دھولیوی

کھاتی ہیں ہر قدم پہ نگاہیں شکستِ فاش — جیسے حریمِ حسن ہے میدانِ انقلاب
جاسکتا ہوں کے ساتھ ہے خطرہ لگا ہوا — چھوٹے کہیں نہ ہاتھ سے دامانِ انقلاب
آزادیٔ وطن کی تمنا لئے ہوئے — زنداں میں جا رہے ہیں اسیرانِ انقلاب

ہر بزم میں انھیں کے فسانوں کی دھوم ہے ... یوں ہو رہی ہے یادِ شہیدانِ انقلاب
عباس بزمِ شعر میں ہلچل سی مچ گئی ... میں نے غزل پڑھی جو بعنوانِ انقلاب

جناب جنوں الہ آبادی

کرتا ہوں میں وضاحتِ عنوانِ انقلاب ... سمجھیں اجل کو کھیل اسیرانِ انقلاب
روکے اسے بڑھ کر کوئی کس کی ہے مجال ... اٹھا ہے شش جہات میں طوفانِ انقلاب
یہ چاند، یہ شفق، یہ ستارے یہ کہکشاں ... رکھتا ہے چرخِ پیر بھی سامانِ انقلاب
کرتے ہیں وقفِ دار و رسن وہ مجھے فضول ... ہے دل میں موجزن مرے ارمانِ انقلاب
قابو مجھے جنوں پہ نہ تھا ورنہ میں جنوں ... کرتا ازل کے روز ہی اعلانِ انقلاب

جناب سالک حنیفی نند درباری

پنہاں ہیں میری فکر میں سامانِ انقلاب ... ہر شعر ہے لئے ہوئے طوفانِ انقلاب
کچھ پوچھئے نہ آج کا سامانِ انقلاب ... "ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"
اب کے بہارِ نو کے ہیں انداز ہی کچھ اور ... بیٹھے تمام باغ ہے شایانِ انقلاب
جوشِ عمل میں ہے جو اولوالعزمیوں کے ساتھ ... جلنے نہ دینگے ہاتھ سے میدانِ انقلاب
سالک نہ پوچھئے مری روشن خیالیاں ... داغِ جگر ہے شمعِ شبستانِ انقلاب

جناب مرزا شہادوی

اٹھو! اور اٹھکے تھام لو دامانِ انقلاب ... ہے مقتضائے وقت جوانانِ انقلاب
آزادیِ وطن کے لئے! قوم کے لئے ... بازی لگا دو جان کی یارانِ انقلاب
جھونکے ہیں سخت بادِ سموم خلاف کے ... دیکھو کہیں بجھے نہ چراغانِ انقلاب
گر چاہیں تو بدل دیں ابھی نظمِ کائنات ... یارانِ انقلاب جوانانِ انقلاب
زنجیر سے چھڑاؤ غلامی کی دیس کو ... یارانِ انقلاب جوانانِ انقلاب

جناب موج شیدائی دیوبندی

خوش آمدید دورِ بہارانِ انقلاب ... اٹھی خزاں سمیٹتی دامانِ انقلاب
جب سے طبیعتوں میں ہے رجحانِ انقلاب ... برپا قدم قدم پہ ہیں سامانِ انقلاب
لیکر متاعِ درد بدامانِ انقلاب ... پہنچی فلک پہ خاکِ شہیدانِ انقلاب
تھی جنبشِ نگاہ کہ فرمانِ انقلاب ... برپا ہے کل جہان میں طوفانِ انقلاب
جسکا ہر ایک دور ہے دورانِ انقلاب ... یہ زندگی ہے موج کہ طوفانِ انقلاب

جناب شوق شہادوی

سیلِ نود اب کہاں ہے گلستانِ انقلاب ... "ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"
آتش برس رہی ہے فلک سے بجائے ابر ... سرسبز کیا ہو خاکِ گلستانِ انقلاب

ہر شئے گراں ہے محنتِ مزدور کے سوا ... پھر کیوں اٹھے نہ شورشِ طوفانِ انقلاب
خاموش ہو نہ جائیں عزائم کی مشعلیں ... سنتے سناتے چلتے غزلخوانِ انقلاب
سجدہ کریں کریں یہ کریں شوق اہلِ ہند ... ضوبار ہو جو مہرِ درخشانِ انقلاب

جناب نازک بن ارادت احسنی

اٹھا کئے ہیں سیکڑوں طوفانِ انقلاب ... ہوتے رہے ہیں زیست میں سامانِ انقلاب
طفلی گئی شباب گیا عمر ہو گئی ... دیکھا کیا ہوں آنکھ سے طوفانِ انقلاب
قائم رہے نہ مرکزِ کونین کا نظام ... ہے حکمِ انقلاب بہ فرمانِ انقلاب
نازک بساطِ آرزو اسکی پلٹ نہ جائے ... پڑ جائے جس پہ سایۂ دامانِ انقلاب

جناب پی۔ ایس مصرا آزاد بنارسی (جمشید پور)

ممکن نہیں کہ بسر تصور میں سمجھئے ... اتنا وسیع ہے یہ بیابانِ انقلاب
ماتم کدہ بنا دیا یکسر جہان کو ... آیا اس اہتمام سے طوفانِ انقلاب
یکساں اثر پڑیگا امیر و غریب پر ... سب کو ہدف بنائیگا پیکانِ انقلاب
آزاد اب ہے سیرِ خدا امن آشیاں ... اب ہے جنونِ سیرِ گلستانِ انقلاب

جناب غافل قریشی از بیتول

خونِ جہاں ہلکے جو سینچا ہے باغباں ... پامال ہو ترا وہ گلستانِ انقلاب
اے روحِ انقلاب نہ پر تول کر جھپٹ ... میرا وطن نہیں ابھی شایانِ انقلاب
میں خاک چھان چھان کے دیکھوں گا اب ضرور ... کتنی ہے آج وسعتِ میدانِ انقلاب
غافل سے کیا ملاسکے گی نظریں مجال ہے ... منہ پھیر لیگی دیکھتے ہی شانِ انقلاب

جناب رازی بہل ضلع میانوالی

آئی بہار سنکی ہوا۔ بدلیاں اٹھیں ... یہ ہو رہا ہے غیب سے سامانِ انقلاب
اک آتشیں فسانہ امری آتشیں نفس ... مضطر ہے آج روحِ جوانانِ انقلاب
پھر ساقیٔ جواں! مری رگ رگ میں بجلیاں ... یہ بادۂ جدید ہے سامانِ انقلاب
رازی بلند و پست کا یہ دائمی نظام ... ہو باش باش آئے وہ طوفانِ انقلاب

جناب م۔ ع۔ اسعد السدیدی (ایولہ)

ٹھہرا رہے ہیں حوصلہ مندانِ انقلاب ... کچھ کم نہیں ہے حشر سے طوفانِ انقلاب
دیتی ہیں یہ گھٹائیں ستم کی، ہمیں پتہ ... اٹھے گا زور و شور سے طوفانِ انقلاب
کیا لطف آئے زندگیٔ مستعار میں ... اسعد جو گل ہو شمعِ شبستانِ انقلاب

جناب راز یزدانی از بمبئی

ہو کیوں نہ ضو طراز شبستانِ انقلاب ... "ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"

دل بیٹھا جا رہا ہے نظامِ قدیم کا — اس شان سے اٹھے ہیں جوانانِ انقلاب
ہے جوش پر جنونِ جوانانِ حرّیت — ہے پرزے پرزے جیب و گریبانِ انقلاب

جناب سوز ابنالوی

آزادیٔ خیال کی رنگیں ہو داستاں — لکھتا ہوں خونِ قلب سے عنوانِ انقلاب
ملتے سے داغ عہدِ غلامی کے دُھل گئے — سامانِ انبساط ہے سامانِ انقلاب
شاگرد ایک شاعرِ سحر البیان کا ہوں — اے سوز میری طبع ہے طوفانِ انقلاب

جناب کیفی احمد آبادی

نازل ہے جب سے دہر میں طوفانِ انقلاب — یارب ہر اک بشر ہے پریشانِ انقلاب
"ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب" — روشن ہے کائنات میں ایوانِ انقلاب
کیفی کی یہ دعا ہے تری بارگاہ میں — یارب مٹادے دہر سے طوفانِ انقلاب

جناب سہیل شہادوی

مجھ سے مری نگاہ کی وسعت نہ پوچھئے — میں دیکھتا ہوں تا حدِ امکان انقلاب
پھر کاوشِ اشکِ خوں کا کیا جائے ہر جگہ — گلشن نما قفس ہوا سیرانِ انقلاب
اس دن سے مانگتا ہوں وطن کی سہیل خیر — دیکھا ہے جب سے خواب پریشانِ انقلاب

جناب سراج احمد آبادی

ہے صرف میرے دم سے چراغانِ انقلاب — ورنہ کہاں یہ رونق ایوانِ انقلاب
ہمدم فضائے ہند کی پژمردگی نہ پوچھ — منڈلا رہے ہیں سینکڑوں طوفانِ انقلاب
تمہیدِ پھر چمن میں بہاروں کی ہو سراج — بادِ نسیم کرتی ہے اعلانِ انقلاب

جناب ناظم شہادوی

بے وجہ کس نے کر دیا اعلانِ انقلاب — مجھکو نہیں قبول یہ فرمانِ انقلاب
گھبرائیں اسقدر نہ مریضانِ انقلاب — ہوگا خود انقلاب ہی درمانِ انقلاب
افسوس کر رہا ہوں میں ناظم یہ دیکھ کر — "ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"

جناب حبیب ہردہ

لتھڑا ہوا ہے خون میں دامانِ انقلاب — "ہے خونِ انجمن سے چراغانِ انقلاب"
دیکس طرح سے ساتھ خود راہِ شوق میں — نقشِ قدم ہے خود ہی پریشانِ انقلاب
آزادی و غلامی میں جس سے ہے نہ فرق — پیدا کرے حبیب وہ سامانِ انقلاب

جناب شاغل جبلی

مصروف آج مرثیہ خوانی میں ہیں وہی — عالم میں تھے جو نغمہ نوازانِ انقلاب
تقدیر ہند گا رہی گر ہو شعورِ طلب — پھر کیوں ہو لالہ زار یہ میدانِ انقلاب

جناب نیر ممبئی

آمادہ ورود ہے طوفانِ انقلاب — ہر سمت ہو رہا ہے اب اعلانِ انقلاب
آنے کو ایک منظرِ خونیں ہے سامنے — ہے جلد چاک ہونے کو دامانِ انقلاب

جناب قاضی ازادونی

ہر شے ہے آج مظہرِ سامانِ انقلاب — تارے بھی ہیں فلک پہ چراغانِ انقلاب
بدلے ہیں تخت و تاج اسی انقلاب نے — جو ہیں غلام سمجھیں وہ کیا شانِ انقلاب

جناب قابل منشی فاضل ازادونی

اک باغباں ہی کیا ہے ثناخوانِ انقلاب — ہر پھول اب چمن کا ہے خواہانِ انقلاب
ہر ایک پھول محوِ تبسم ہے ان دنوں — لائی ہے رنگ فصلِ بہارانِ انقلاب

جناب متین ساگری

ڈالے گا خوف خطرہ یہ محبت کی راہ میں — آنے دو اپنے دل میں ارمانِ انقلاب

جناب نادان احمد آبادی

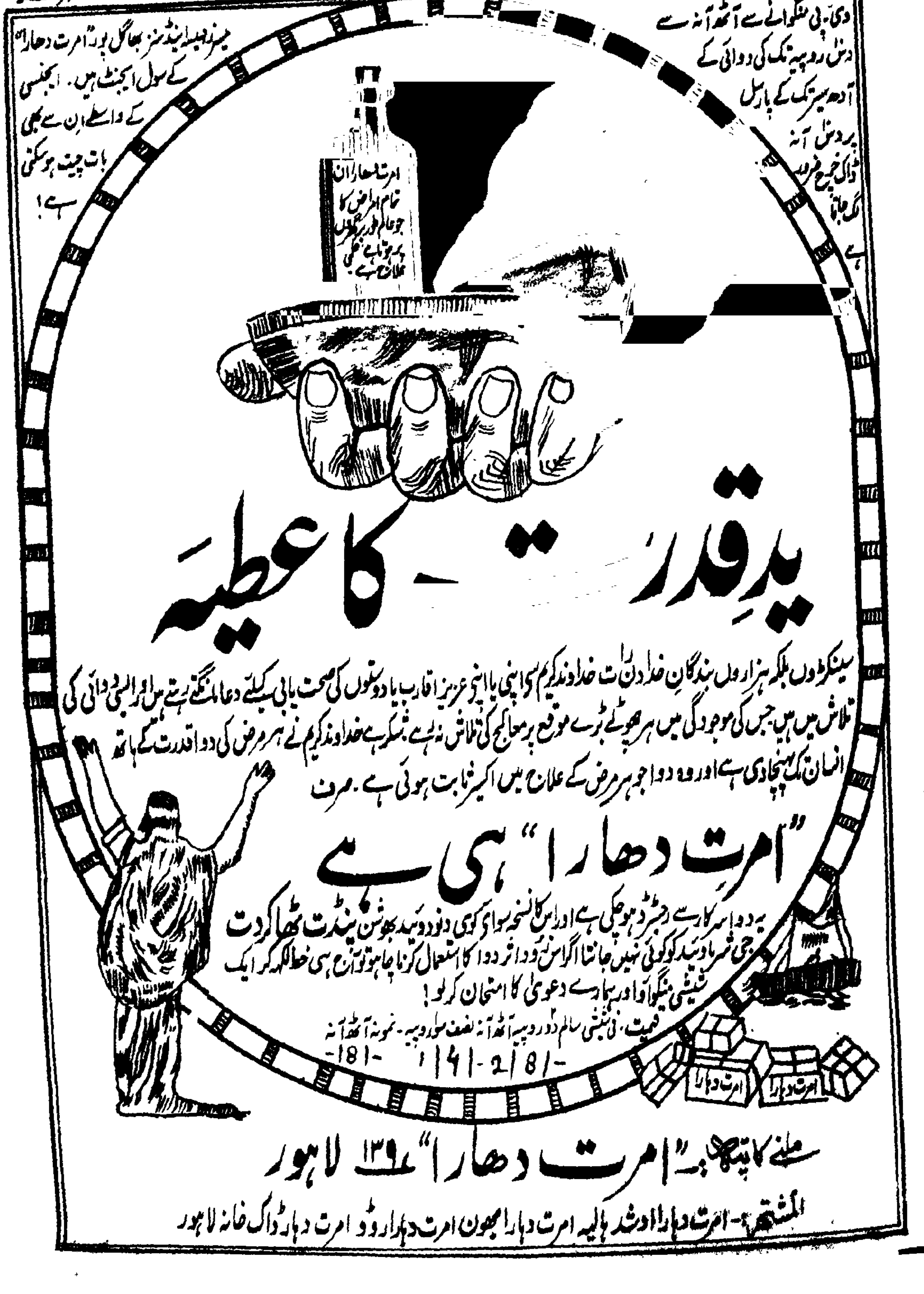
دنیائے پُر فریب سے اکتا گیا ہوں میں — پھر میرے دل میں کیوں نہ ہو ارمانِ انقلاب

جناب قمر فاروقی

سرِ دادگانِ راہِ محبت کے خون سے — سینچا گیا ہے آج خیابانِ انقلاب

جناب سلطان کوٹی

ہر اک نفس ہے آپ ہی جب مبتلائے غم — پھر کون ہو جہان میں پرسانِ انقلاب


دی۔ پی منگوانے سے آٹھ آنہ سے
دس روپیہ تک کی دوائی کے
آدھ سیر تک کے پارسل
پر دس آنہ
ڈاک خرچ فی
لگ جاتا
ہے
میسرز عبدا ینڈ سنز بھاگل پور "امرت دھارا" کے سول ایجنٹ ہیں۔ ایجنسی کے واسطے ان سے بھی بات چیت ہو سکتی ہے!
امرت دھارا ان تمام امراض کا جو عام طور پر پھیلی ہوئی ہیں علاج ہے
یدِ قدرت کا عطیہ
سینکڑوں بلکہ ہزاروں بندگانِ خدا دن رات خداوند کریم سے اپنی یا اپنے عزیز اقارب یا دوستوں کی صحت یابی کیلئے دعا مانگتے رہتے ہیں اور ایسی دوائی کی تلاش میں ہیں۔ جس کی موجودگی میں ہر چھوٹے بڑے موقع پر معالج کی تلاش نہ رہے۔ شکر ہے خداوند کریم نے ہر مرض کی دوا قدرت کے ہاتھ انسان تک پہنچا دی ہے اور وہ دوا جو ہر مرض کے علاج میں اکسیر ثابت ہوئی ہے۔ صرف
"امرت دھارا" ہی ہے
یہ دوا سرکار سے رجسٹرڈ ہو چکی ہے اور اس کا نسخہ سوائے کوی دنود ویدبھوشن پنڈت ٹھاکر دت جی شرما وید کو کوئی نہیں جانتا اگر اس مفید و اثر دوا کا استعمال کرنا چاہو تو آج ہی خط لکھ کر ایک شیشی منگواؤ اور ہمارے دعویٰ کا امتحان کر لو!
قیمت۔ فی شیشی سالم دو روپیہ آٹھ آنہ نصف سوا روپیہ۔ نمونہ آٹھ آنہ
-/8/- 1/4/- 2/8/-
امرت دھارا
امرت دھارا
ملنے کا پتہ :- "امرت دھارا" ۱۳۹ لاہور
المشتہر:- امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون امرت دھارا روڈ امرت دھارا ڈاک خانہ لاہور

سیکڑوں قدردانی خطوط میں سے چند خطوط کا خلاصہ ملاحظہ کیجئے

ایک صاحبِ کمال سنیاسی کا بیش قیمت عطیہ

ضروری اطلاع —— جنگ ختم ہو گئی

یہ مادّی جنگ نہیں بلکہ وہ حقیقی جنگ جس نے میاں بیوی کے تعلقات میں ناخوشگواری پیدا کر دی تھی اور جس کی وجہ سے دُنیا جہنم معلوم ہوتی تھی۔ نامرادی اور مایوسی کی خلیج وسیع ہو گئی تھی صرف دار الشفاء گولیاں اور روغن مالش طلاء نے ہزارہا خاندانوں کو تباہی اور بربادی سے بچالیا ناظرین ہم خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتے ہیں کہ یہ دونوں ادویات نامردی کی آخری منزل میں بھی خدا کے فضل و کرم سے تیر بہدف ثابت ہوتی ہیں دار الشفاء گولیوں کے استعمال سے جریان، احتلام، سرعت انزال، پیشاب سے پہلے یا بعد میں سفید رطوبت کا آنا، چہرہ زرد رہنا۔ دل گھبرانا آنکھوں تلے اندھیرا چھا جانا۔ کام میں جی نہ لگنا۔ عورت کے خیال سے مادہ تولید کا بہہ جانا، غرض وہ تمام شکایتیں جو غلط کاریوں سے پیدا ہو گئی ہوں، ایک ہفتہ ہی میں نیست و نابود ہونی شروع ہو جاتی ہیں اور اکیس دن کے مسلسل استعمال سے انسان فولاد کی طرح مضبوط ہو جاتا ہے۔ تہذیب ہمیں زیادہ وضاحت کی اجازت نہیں دیتی ان گولیوں کے استعمال سے بدن میں صالح خون پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایمان اور دھرم سے ہم کہتے ہیں کہ بالکل حقیقت ہے صرف ایک بار آزما کر دیکھئے۔ **قیمت ۲۱ خوراک صرف تین روپیہ RS. 3/-**

روغن مالش طلاء ہندوستان میں ہزارہا قسم کے طلاء آئے دن اخباروں اور رسالوں میں مشتہر ہوتے رہتے ہیں اور ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں ننانوے فیصدی غلط اثر کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس روغن مالش طلاء سے عضو مخصوص کی تمام خرابیاں نہایت آسانی سے دُور ہو جاتی ہیں۔ کجی، لاغری، رگوں کا اُبھار، خمی۔ خواہش کا پیدا نہ ہونا یا ہونے کے بعد جوش کا ختم ہو جانا۔ سستی غرض ہر شکایت صرف چند بار کے استعمال سے دُور ہونی شروع ہو جاتی ہے اور لطف یہ ہے کہ پھر کسی دوا کے استعمال کی ضرورت نہیں رہتی یقین کیجئے اس روغن سے رگوں اور پٹھوں میں نئی روح اور زندگی پیدا ہو جاتی ہے ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے اور ناکارہ سے ناکارہ انسان تندرست ہو جاتا ہے۔

قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ RS. 3/8/-

شرطیہ علاج اور شرطیہ عہدہ:- ہندو کو دھرم اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے اگر ان ادویات کے استعمال سے فائدہ نہ ہو تو علمی تحریر بھیج کر قیمت واپس منگالیں مگر یہ یاد رہے کہ ہماری دوائی صرف نامردی، سستی، جریان، احتلام، سرعت، کمزوری اور عضو مخصوص کی لاغری کے لئے مخصوص ہیں، خواہ کسی سبب سے ہوں، جلق یا کثرت مباشرت یا عادت بد سے سوزاک یا آتشک سے پیدہ شدہ کمزوری کے لئے بھی بے طاقت کا بیمہ ہے۔

حکیم چونی لال لاہور

یہ دوائی اولاد پیدا کرنے کے قابل بنادیتی ہے۔

اخبار "چونچ" کلکتہ

اخبار چونچ کے پڑھنے والوں نے ہندستان بلکہ ہانگ کانگ تک دار الشفاء گولیوں کی تعریف لکھی ہے۔ دفتر چونچ کے سابق منیجر صاحب نے خود بھی اس دوا کو استعمال کیا اور حسب مرضی فائدہ ہوا اور مجھ سے کہا کہ یہ دوا واقعی دوا ہے اس لئے یہ دوا منگوا کر کھوئی ہوئی صحت حاصل کیجئے۔

عنایت ہلوی ایڈیٹر "چونچ" کلکتہ

مسٹر ایم۔ ڈی انور خاں بی۔ اے

جتوڑ سے تحریر فرماتے ہیں کہ مجھ کو جریان کا مرض لاحق تھا اس مرض سے زرد رنگ ہو گیا تھا۔ آپ کی دوا نے مرض کو جڑ سے غائب کر دیا۔

میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں مہربانی فرما کر ایک شیشی مقوی گولیاں اور بھیج کر مشکور فرمائیں۔

مسٹر ہری رام

از سرکاری ہسپتال گوالیار

یہ دوائی نامردی کے مریض کو استعمال کرائی گئی اور بے حد مفید پائی گئی۔

منیجر صاحب اخبار مدینہ بجنور

بجنور کے ایک ڈاکٹر صاحب نے ہماری معرفت یہ دوا آپ سے منگائی تھی وہ اطلاع دیتے ہیں کہ چند مریضوں کو استعمال کرائی اور بے حد مفید پائی۔

ڈاکٹر ڈی این ساماراؤ

مدراس سے تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کی مقوی گولیاں اپنے ایک مریض کو استعمال کرائیں، مریض کمزوری وغیرہ کی شکایت میں مبتلا تھا۔ استعمال کرانے پر حسب خواہش تندرست ہو گیا واقعی یہ دوا بہت فائدہ مند ہے۔

حکیم اینڈ وید پنڈت ارجن داس شرما

بوٹہ شریف سے تحریر فرماتے ہیں یہ دوا ان مریضوں کے لئے جو بچپن کی غلط کاریوں کے باعث ناکارہ ہو چکے ہیں ازحد فائدہ مند ہے میرے خیال میں اس کے برابر دُنیا بھر میں کوئی دوائی نہیں جس مریض کے لئے یہ دوائی منگائی گئی وہ بالکل تندرست ہو گیا ہے براہِ کرم دو کورس مزید روانہ فرمائیں۔

ڈاکٹر شاہ خیرات امام

حسین آباد سے تحریر فرماتے ہیں ... گم شدہ ... کو دوبارہ بحال کر دیتی ہے ... فرمود

... دار الشفاء گولیاں ... پنجاب

سالِ اجرا موسم بہار ۱۹۳۰ء ——— عرصۂ اشاعت ۱۲ سال

قصر الادب کا خالص علمی۔ ادبی اور فنی ماہنامہ

شاعر آگرہ

زیر سرپرستی

اعلیحضرت رسوا مظلومی والئی پاجود (کاٹھیاواڑ)

منظور شدہ

محکمہ ہائے تعلیم صوبہ ممالک متوسط و برار۔ ریاست میسور۔ ریاست کشمیر

چندہ سالانہ

عوام سے	۴ر	معاونین سے	۲۴ر
خواص سے	۶ر	مربیوں سے	۵۰ر
ہمدردوں سے	۱۲ر	محسنین سے	۶۰ر
ایلیوں سے	۱۵ر	سرپرستوں سے	۱۲۵ر

ششماہی ع۲ ——— فی پرچہ ۶ر

اشاعت گاہ۔ مکتبۂ قصر الادب۔ آگرہ

شاعر

تصویر: — خاں صاحب ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری

جلد ۱۳ | دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۱۲

محسنین، مربی، معاونین، انیسان و ہمدردان شاعر

محسنین ادب و شعر

(۱) محسن ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ؎۶۰ سالانہ
(۲) محسن ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیر خورجوی ؎۶۰ سالانہ
(۳) محسنۂ ادب ہرہائنس علیہ حضرت کتیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ؎۶۰ سالانہ
(۴) محسنۂ ادب شہزادی تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ؎۶۰ سالانہ
(۵) محسن ادب جناب محترم وزیر زادہ شجاعت خانصاحب قہر جوناگڈھی ؎۶۰ سالانہ

مربیان ادب و شعر

(۶) مربی ادب جناب محترم میاں نعمت اللہ خانصاحب خلف میاں سر کرنل حشمت اللہ خاں مرحوم کے۔ ٹی ہوم منسٹر ریاست گوالیار ؎۵۰ سالانہ

معاونین ادب

(۷) معاون ادب مسٹر ایل۔ پی فلپس صابر بی۔ اے اکبر آبادی للعہ سالانہ
(۸) معاونۂ ادب محترمہ نکہ تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی للعہ سالانہ
(۹) معاون ادب جناب مولوی محبوب حسن صاحب آسی ٹنڈو طن رڑکی بمبئی للعہ سالانہ

انیسان ادب

(۱۰) انیس ادب جناب سید تفضل کریم صاحب جمشید پور ؎۱۰ سالانہ

ہمدردان ادب

(۱۱) ہمدرد ادب جناب مولوی عبد الغفور صاحب سلیمان جالندہری ؎۱۲ سالانہ
(۱۲) ہمدرد ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری مرحوم ؎۱۲ سالانہ
(۱۳) ہمدرد ادب جناب نوابزادہ منکور حسین خانصاحب قیس آف ہنڈو ؎۱۲ سالانہ
(۱۴) ہمدرد ادب جناب ابو عبد العظیم خانصاحب رونق دکنی جمشید پور ؎۱۲ سالانہ
(۱۵) ہمدرد ادب جناب صاحبزادہ سید مظفر حسین صاحب کرتریس و زمیندار (وان رادھارام) ؎۱۲ سالانہ
(۱۶) ہمدرد ادب جناب تلاش عمر میاں حسن میاں صاحب نظامی کٹول ؎۱۲ سالانہ
(۱۷) ہمدرد ادب جناب اسمٰعیل کھوکھر صاحب راز جوناگڈھی ؎۱۲ سالانہ
(۱۸) ہمدرد ادب جناب خانصاحب عبد الحمید خاں آف مانا ودر ؎۱۲ سالانہ

خاصان ادب

(۱۹) جناب صاحبزادہ سلطان حامد خانصاحب ثروت گلشن آبادی ؎۶ سالانہ
(۲۰) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمان خانصاحب شفق ٹونکی ؎۶ سالانہ
(۲۱) جناب عبد الحفیظ صاحب ثمر صدیقی پھلواری بی۔ اے ؎۶ سالانہ
(۲۲) جناب لالہ گنگا رام صاحب آذر سرہندی ؎۶ سالانہ
(۲۳) جناب سید مظفر حسین صاحب عرشی دہلی ؎۶ سالانہ
(۲۴) لائبریرین صاحب پبلک لائبریری میسور ؎۶ سالانہ
(۲۵) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی جمشید پور ؎۶ سالانہ
(۲۶) جناب محمد عبید اللہ خاں صاحب بزم امروہوی ؎۶ سالانہ
(۲۷) جناب ناصر حسن خانصاحب اثر بمبئی ؎۶ سالانہ
(۲۸) جناب نذیر احمد صاحب نذیر سشیر کوٹی ؎۶ سالانہ
(۲۹) جناب صبغۃ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی ؎۶ سالانہ
(۳۰) جناب پریم چند صاحب پریم دہلوی ؎۶ سالانہ
(۳۱) جناب طالب ہمدانی لدھیانوی ؎۶ سالانہ
(۳۲) جناب سبحان خانصاحب غافل بیتول ؎۶ سالانہ
(۳۳) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی کوٹا ہہ ؎۶ سالانہ
(۳۴) جناب حبیب حسن خانصاحب حبیب شاہجہانپوری (کوئٹہ) ؎۶ سالانہ
(۳۵) جناب ابو فقیر محمد خانصاحب عارف سیالکوٹی (کوئٹہ) ؎۶ سالانہ
(۳۶) جناب شیو پرشاد صاحب برگ باندوی ؎۶ سالانہ
(۳۷) جناب حکیم مولوی عبد الرحمٰن صاحب شاعر کاندھلوی ؎۶ سالانہ
(۳۸) جناب علامہ پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی ؎۶ سالانہ
(۳۹) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعر نہٹوری ؎۶ سالانہ
(۴۰) جناب کنور فاروق علی خاں صاحب عارف رئیس ہنڈو ؎۶ سالانہ
(۴۱) جناب صوبہ دار اختر علی صاحب اختر گوالیاری ؎۶ سالانہ
(۴۲) جناب ڈاکٹر منشا پرشاد صاحب استھانہ زیب بریلوی ؎۶ سالانہ
(۴۳) جناب مقبول احمد صاحب نجم اعظم گڈھی ؎۶ سالانہ
(۴۴) جناب مولوی مظہر الدین صاحب مظہر نا ملاسی گورداسپوری ؎۶ سالانہ
(۴۵) جناب حبیب الرحمان صاحب حبیب آروی جمشید پور ؎۶ سالانہ
(۴۶) جناب مولوی محمد احسان حسن خانصاحب احسان موضع جولاہی (بہار) ؎۶ سالانہ
(۴۷) جناب مولوی نصیر الدین صاحب حیدر اسارہ (میرٹھ) ؎۶ سالانہ
(۴۸) جناب عطاء الرحمٰن صاحب عطا جالندہری دہلی ؎۶ سالانہ
(۴۹) جناب عبد الرؤف صاحب ثاقب بڑدانی اسسٹنٹ ؎۶ سالانہ
(۵۰) جناب الحاج بشیر احمد صاحب فاروقی دکن ادارہ "الاسلام" کوئٹہ ؎۶ سالانہ
(۵۱) جناب بابو من موہن لال صاحب ساگری چھندواڑہ (سی۔ پی) ؎۶ سالانہ
(۵۲) جناب میاں محمد مخدوم صاحب رئیس چک بیانہ (پنجاب) ؎۶ سالانہ
(۵۳) جناب محمد حسین صاحب خادم شلوی۔ دہلی ؎۶ سالانہ
(۵۴) جناب چودھری حلیم یار صاحب سنڈیلہ ؎۶ سالانہ
(۵۵) جناب سید شاہ عنایت علی صاحب تاباں القادری۔ مدنا پور (بنگال) ؎۶ سالانہ

شعرِ انقلاب —— صُورِ تخریب

اُٹھو زمیں کو اُلٹ دو، اُٹھو زماں کو اُلٹ دو
جہاں رہا نہیں اب کام کا، جہاں کو اُلٹ دو

ہے اتفاق کہ تم چونک اُٹھے ہو نیند سے اپنی
جو وجہ خواب ہے اُس سازِ نغمہ خواں کو اُلٹ دو

جو راستے ہی ہوں اُلٹے، تو کیا ہو رہبرِ منزل
ہر ایک جادۂ دشوارِ کارواں کو اُلٹ دو

نہیں نوازشِ سجدہ، تو سرکشی ہی بجا ہے
سکونِ جبیں کو نہیں ہے تو آستاں کو اُلٹ دو

یہ دیکھنا ہے کہاں اصلِ نقصِ نشو و نما ہے
بڑھا کے دستِ جنوں صحنِ گلستاں کو اُلٹ دو

انھیں گھروں سے ہے انسانیت کی خانہ خرابی
حرم کی شمع بجھا دو، صنم ستاں کو اُلٹ دو

براہِ راست کرو احتجاج اپنے خدا سے
جو آسمان ہو حائل تو آسماں کو اُلٹ دو

تم اپنے خون سے گلکاریاں کرو گے کہاں تک؟
نگار خانۂ صیاد و باغباں کو اُلٹ دو

جگہ تو پاؤں ٹکانے کی تم کو یوں بھی ملے گی
ہے آشیاں ہی پہ جھگڑا، تو آشیاں کو اُلٹ دو

کہاں تک ان میں یونہی کشتیاں اُلٹتی رہیں گی
سمندروں میں ہر اک موجِ رواں کو اُلٹ دو

کرے نہ بادہ فروش اہتمامِ نسل فروشی
صراحی توڑ دو۔ مے پھینک دو، دکاں کو اُلٹ دو

جلالِ فطرتِ کبریٰ ہے دست و پا میں تمہارے
تمہیں یقین ہو اس کا تو ہفتخواں کو اُلٹ دو

تمہارا جذبۂ پرواز کائنات کشا ہے
جو چاہو تم تو ابھی تختِ کہکشاں کو اُلٹ دو

پڑی ہوئی ہیں جو لاشیں نہ ہوں گی دفن وہ کب تک
مکین مُردہ ہوں جس کے اب اُس مکاں کو اُلٹ دو

سُنی بھی تم نے یہ سیماب کی گذارشِ تازہ
مطالبہ ہے کہ آئینِ باستاں کو اُلٹ دو

(۲۰ نومبر ۱۹۴۲ء) — سیماب اکبرآبادی

جرعات

وداعِ سال

۱۹۴۲ء کی جھلاتی ہوئی دھوپ سمٹنے والی ہے۔ یہ سال جنگ کے گذشتہ سالوں سے زیادہ تباہ کن اور ہنگامہ آفریں ثابت ہوا۔ اس سال اقتصادی اور معاشی مشکلات خصوصیت کے ساتھ زندگی کی گاڑی کو کھینچنے میں سدِ راہ رہیں۔ اضطراب و انتشار کی موجیں برابر بڑھ رہی ہیں اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب فضائے عالم میں امن و سکون کی ہوائیں چلیں گی۔

زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ہمارا ادب بھی جگرکاری کا ثبوت دے رہا ہے۔ علمی و ادبی اجتماعات ہوں یا کتب و رسائل اور اخبارات، سب اپنی زندگی کا بقدرِ امکان ثبوت دے رہے ہیں۔ ادبی اور صحافتی اداروں کو نقصانِ عظیم ہو رہا ہے۔ لیکن اس خدمت کو اپنے لئے ناگزیر جانتے ہوئے اپنا سب کچھ قربان کر رہے ہیں اور شاید آخر وقت تک کرتے رہیں۔

"شاعر" کو ۱۹۴۲ء میں کتنا زبردست مالی نقصان ہوا یہ کہانی نہ سننے کی ہے اور نہ سنانے کی۔ بلکہ شکر و امتنان کا موقع ہے کہ وہ اب تک زندہ ہے اور مستقبل کے عظیم ترین حادثات سے ٹکرا کر زندگی کا ثبوت دینے کے لئے کوشاں ہے۔ اس کی جبیں پر شکن ضرور ہے لیکن غیر مرئی۔ وہ طوفانِ ابتلا میں ضرور گھرا ہوا ہے لیکن ناخدا کو چھوڑ کر خدا پر اس کی نظر ہے۔ "شاعر" خالص علمی و ادبی ماہنامہ ہے۔ نہ اس نے کبھی فحش اشتہارات کی پروا کی اور نہ عام پسند ادب پیش کر کے عوام سے داد چاہی۔ اس کا جادہ دوسروں سے بالکل جدا ہے۔ اس بنا پر جو مشکلات ایک خالص علمی و ادبی رسالے کو ہو سکتی ہیں وہی "شاعر" کو بھی ہیں۔ اعلیٰ مذاق رکھنے والے "شاعر" کے ہزارہا ناظرین کا شکریہ بھی ہم پر فرض ہے کہ ان کا ذوقِ نظر ہی "شاعر" کی حیات کا باعث ہے۔ ختم ہونے والے سال میں "شاعر" نے کس درجہ معیاری ادب پیش کیا۔ یہ سب جانتے ہیں۔ تعریف و توصیف سے قطعِ نظر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ علمی و ادبی حلقے نہ صرف "شاعر" کے معیار ہی سے مطمئن ہیں بلکہ بہت زیادہ متاثر بھی۔ جنوری ۱۹۴۳ء کے "شاعر" میں ۱۹۴۲ء کے شائع شدہ مضامین پر ایک تبصرہ شائع کیا جائیگا جو "شاعر" کی خدمات کو زیادہ واضح کر سکے گا۔

جنوری ۱۹۴۳ء سے معیارِ مضامین کو اور بلند کیا جا رہا ہے، چنانچہ آئندہ ماہ شائع ہونے والے مضامین کی اس ناتمام فہرست سے اندازہ کیجئے:—

خطوطِ شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں —— عبد اللطیف اعظمی
کیا اقبال کا پیام کوئی نیا پیام ہے؟ —— بہار کوٹی
ہمارا ادب —— وجدی الحسینی (فاضلِ دیوبند)
اقبال اور خودی کی معنویت —— صبا رشیدی ایم۔ اے۔ بی۔ ایل
اقبال کی خودی —— مخفی القادری علی (جامعہ قادریہ کراچی)
پنڈت چندر بھان برہمن —— مولانا انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی
سرائے جمیل —— (افسانہ) —— رُشدی بھوپالی
ماہی گیر —— (افسانہ) —— اقیاز نسیمی
ناک —— (تمثیلچہ) —— ڈاکٹر ظہیر الدین
شخصیات (وحید العصر حضرت بیخود دہلوی) —— اعجاز صدیقی

ان مضامین کے علاوہ حضرت آرزو لکھنوی۔ اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری۔ حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی۔ حضرت سریر کابری گیاوی۔ مینائی وغیرہ کا تازہ ترین غیر طرحی کلام، ترقی یافتہ شعرا کی نظمیں اور غزلیں بھی رشحہ نواز ہوں گی۔

اس ماہ مضامین کی طوالت کی وجہ سے "شاعر" میں مسلسل شائع ہونے والے مضمون **موحدِ اعظم اور مفتیِ اعظم** کی اشاعت نہ ہو سکی۔ اس سلسلے کی بالکل آخری کڑی جنوری کے "شاعر" میں پیش کی جائیگی۔ ادارہ کو افسوس ہے کہ دو ماہ سے "اصلاحِ سخن" کے لئے بھی گنجائش نہ نکل سکی۔ جنوری ۱۹۴۳ء سے اس کا بھی التزام کیا جائیگا۔

سالنامہ "شاعر"

ناظرین کو احساس تو ہوا ہوگا کہ اکتوبر میں سالنامہ کا اعلان کر کے نومبر کے "شاعر" میں اس کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔ بات یہ ہے کہ ادارۂ "شاعر" جو کہتا ہے وہی کرتا ہے۔ انتظام کی ناتمامی کے دوران میں کسی قسم کا دعویٰ کرنا مناسب نہ تھا۔ الحمد للہ سالنامہ کے ابتدائی مراحل طے ہو چکے ہیں۔ تصاویر، مضامین، ٹائٹل وغیرہ پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ سب سے بڑا اور اہم سوال کاغذ کا ہے اور اسی کے حل کے لئے مجھے بمبئی جانا پڑ رہا ہے۔ سو ڈیڑھ سو صفحہ کا سالنامہ بسرعت شائع کیا جا سکتا ہے لیکن کیا فائدہ؟ ادارہ چاہتا ہے کہ وہ ادب و شعر کا ایک ایسا رنگین، معیاری اور ضخیم صحیفہ پیش کرے جس کی یاد سالہا سال تک ہمارے دلوں کو گرماتی رہے۔ فروری ۱۹۴۳ء میں "شاعر" کی اشاعت کو پورے تیرہ سال ہو جائیں گے۔ لہٰذا اس مناسبت سے **۵ مارچ ۱۹۴۳ء** کو یہ گلدستۂ ادب بازارِ ادب میں جنت نظر ہوگا۔ سالنامہ کی تیاری کے لئے یہ تین ماہ بھی ناکافی ہیں۔ بہرحال اس کا فیصلہ سالنامہ کو دیکھ کر ہی کیا جا سکے گا کہ وہ معجزہ نہیں تو کم از کم قصر الادب کا کارنامہ ضرور ہوگا۔ سالنامہ کی فہرستِ مضامین اور صوری و معنوی محاسن پر جنوری ۱۹۴۳ء کے "شاعر" میں روشنی ڈالی جا سکے گی۔

ناظرینِ "شاعر" توجہ فرمائیں

بغیر کسی تمہید اور "شاعر" کی خدمات گنوائے ہوئے ادارۂ "شاعر" تمام ناظرین کو زبان و ادب کا واسطہ دیتے ہوئے نہ صرف **تجدیدِ خریداری** کی درخواست کرتا ہے بلکہ اس کا بھی متمنی ہے کہ اپنے حلقۂ اثر سے کچھ نئے **خریدار فراہم** کر کے "شاعر" کی اساس کو مضبوط سے مضبوط بنا دیں۔

"شاعر" کی مدد اردو زبان و ادب کی مدد ہے۔ امید کہ میں جنوری کے "شاعر" میں جدید خریدار پیدا کرنے والے

شخصیات:- خان صاحب ابوالاثر حضرتِ حفیظ جالندھری

صوبوں کی تقسیم کے اعتبار سے پنجاب کی دو خصوصیتیں بہت ہی نمایاں ہیں یعنی یہ کہ اُردو ادب و شعر کا چرچا ہر صوبہ کے بعد شروع ہوا اور اُس نے سب سے جلد ترقی کی راہ اختیار کر لی اس ترقی میں بھی ایک امتیازی شان ہے وہ یہ کہ جتنے اخبارات و رسائل پنجاب سے نکل رہے ہیں جتنی کتابیں وہاں سے شائع ہو رہی ہیں اور جتنے ادیب و شاعر وہ پیدا کر رہا ہے اُن اعداد و شمار کا کوئی صوبہ مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہی نہیں بلکہ شعری، ادبی اور صحافتی زندگی کا جتنا گہرا نقش پنجاب میں پایا جاتا ہے، اُس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ یو۔پی میں جس ترقی نے ایک صدی لی، وہ ترقی پنجاب میں صرف ۲۵ سال میں ہو گئی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یو۔پی نے ادب و شعر کے آفتاب و ماہتاب زیادہ اور پنجاب نے کم بلکہ نہ ہونے کے برابر پیدا کئے یو۔پی سے جو اُٹھا وہ اُستاد بن کر چمکا اور پنجاب حدودِ شاگردی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو پنجاب کی مادری زبان نہیں اس لئے وہاں ائمۂ فن محتاط، مناظر اور ثقات کم پیدا ہوئے۔ لیکن میرے خیال میں یہ عذر، عذرِ لنگ سے زیادہ نہیں۔ جب شاعر میں صرف موزونیتِ فطری اور ادیب میں ادیبانہ صلاحیت قدرتی ہوتی ہے باقی ہر چیز اکتسابی تو پھر پنجاب کا اس خصوص میں پیچھے رہ جانا کیا معنی؟ اس کا سبب جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ پنجاب کی ادب و شعری ذہنیت پر ہمیشہ تجارت غالب رہی ہے اور یو۔پی میں ذوق و شوق، اس کے باوجود پنجاب کی اُردو نوازی اور خدمات سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اُس نے تمام ہندوستان میں صحافت و اشاعت کا ایسا مذاق پیدا کر دیا ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ خصوصیت کے ساتھ اُردو افسانہ نگاری اور نظم کا رجحان پنجاب کا سرمایۂ امتیاز ہے۔ میں یہ کہتے ہوئے بھی نہیں ڈرتا کہ اگر پنجاب کوئی ایک ادیب و شاعر پیدا نہ کرتا تو بھی اُس کی سرزمین سے چمکنے والا آفتاب اقبالؔ، اُس کی ابدی شہرت و عظمت کے لئے کافی تھا۔

پنجاب میں نہ فطری مناظر کی کمی ہے اور نہ رومانی فضاؤں کی۔ اُس کے گاتے ہوئے دریا۔ گنگناتی ہوئی ندیاں۔ سرسبز و شاداب باغ۔ لہلہاتے ہوئے کھیت۔ زندگی افروز اور مست کن ہوائیں۔ کہیں ہیر گدازِ عشق کا دعویدار تو کہیں رانجھا محبت کی نغمہ طراز۔ کہیں سوہنی کا جذبۂ اُلفت حشر ساماں تو کہیں مہیوال کا پریم راگ فضاؤں میں محسوس نہ جنت کشمیر دُور نہ زعفران زاروں کی کمی۔ اندریں حالات اگر وہاں حفیظ جیسا مترنم شاعر پیدا ہو تو کیا تعجب! ترنم نے حفیظ کو پیدا کیا یا حفیظ نے ترنم کو ——— اس تنازعہ کو آگے چل کر چھیڑونگا۔ حفیظ نو مسلم ہیں اور سورج بنسی چوہان راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے۔ اُن کے آبا و اجداد کے نام کیا تھے۔ اس کا علم مجھے کسی طرح نہ ہو سکا۔ اِن کے خاندان کو اسلام قبول کئے تقریباً دو سو سال ہو چکے ہیں۔ میرے خیال میں حفیظ کے حالاتِ زندگی احسان دانش سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ احسان نے اُن کے اظہار میں ذرا بیباکی سے کام لیا ہے اور حفیظ نے اشارات و کنایات سے۔ ان کے خود نوشت حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تعلیم چند ابتدائی درجوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ تعلیم کی نا تمامی میں خواہ حالات و واقعات کی نا مساعدت کو دخل ہو یا ان کی مجبوری کو لیکن یہ طے ہے کہ وہ نہایت معمولی پڑھے لکھے ہیں۔ ہاں اس کمی کو انھوں نے مطالعہ سے ضرور پورا کیا ہے۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں پانچ بھائی نذرِ اجل ہوئے۔ اسی دوران میں شادی ہو گئی۔ بوڑھے ماں باپ۔ سوتیلا بھائی۔ بیوہ بہنیں، دو بھاوجیں، یتیم بچے بچیاں غرض حفیظ پر ذمہ داریوں کا ایک ناقابلِ برداشت بوجھ تھا۔ پھر کنبہ اور آمدنی کا ذریعہ کوئی نہیں۔ حفیظ نے افرادِ خاندان کا پیٹ پالنے کے لئے ریلوے لائن پر مٹی عطر فروشی۔ کلاہ سازی۔ خیاطی۔ فوج کی ٹھیکیداری۔ خطوط نویسی۔ ریلوے اسٹیشن پر مزدوری۔ آٹے کی مشین پر کام۔ سنگر سوئنگ مشین کی منیجری۔ قیمتاً غزلیں لکھنا۔ غرض سب کچھ کیا، لیکن کسی سے خاندان کی کفالت نہ ہوئی۔ ۱۹۲۱ء میں سنگر مشین کی ملازمت ترک کر کے وطن آ گئے اور رسالہ "اعجاز" جاری کیا مگر وہ پانچ ماہ بعد سخت مالی نقصان دیکر بند ہو گیا۔ مایوسی اور پریشانی سے حفیظ کی حالت دیوانوں کی سی ہو گئی تھی۔ اپنے والد کو اطلاع دیئے بغیر ایک بڑا مکان بھی فروخت کر دیا جس سے وہ بہت ناراض ہوئے اور گھر سے نکال دیا۔ اسی پریشانی میں کشمیر کا پیدل سفر کیا۔ پھر واپس لاہور آ گئے۔ یہاں رسالہ "شباب اُردو" میں ملازمت مل گئی۔ اس کے بعد "نونہال" اور رسالہ "ہزار داستان" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ "پھول" اور "تہذیبِ نسواں" میں بھی کام کیا۔ پھر ریاست خیرپور سندھ نے بحیثیت درباری شاعر بُلا لیا۔ لیکن حفیظ کے مزاج نے اس پابندی اور جی حضوری کو پسند نہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حفیظ کا ہر قدم منزلِ ترقی

کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ زندگی کے تلخ تجربات نے آدمیت کے جوہر کو نمایاں کر دیا تھا اور یہ عرفانِ ذات کی پہلی منزل تھی۔ چونکہ حفیظ میں صلاحیت موجود تھی اور فطرت ہمنوائی کر رہی تھی اس لئے حفیظ کی پرواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔

حفیظ کو ۱۱ سال کی عمر سے شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ ابتداً الٹا سیدھا کہتے رہے تکمیلِ ذوق کے لئے شعرا کے دواوین کا مطالعہ کیا۔ موزوں طبع بلا کے تھے۔ پھر موسیقی سے خاص لگاؤ تھا۔ ادھر جالندھر میں حضرت مولانا گرامی کا طوطی بول رہا تھا۔ ہر چند وہ دربارِ دکن سے متعلق تھے لیکن جالندھر کے مشاعروں میں مولانا مرحوم کی فارسی غزلیں اکثر آیا کرتی تھیں۔ جب وہ وطن تشریف لاتے تو ایک بڑا مشاعرہ بھی ہوتا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پنجاب میں اُردو شاعری کا چرچا نیا نیا تھا۔ حفیظ بھی اُردو ہی میں شعر کہتے تھے۔ مشاعروں کی واہ واہ اور سبحان اللہ نے ایسا سحر کیا کہ مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ چند ابتدائی غزلیں جناب مولوی سرفراز خاں صاحب سرفراز کو دکھائیں، پھر کسی کے مشورہ سے مولانا گرامی مرحوم کو اپنا کلام بھیجا۔ مولانا نے مرحوم نے لکھا کہ "گرامی فارسی کا شاعر ہے۔ اُردو سے بہت دُور۔ حفیظ جوہرِ قابل معلوم ہوتا ہے۔ حفیظ کو چاہیئے کہ اپنا کلام بار بار خود ہی ناقدانہ نظر سے دیکھا کرے۔" حفیظ نے اس پر عمل کیا اور کافی شعور پیدا کر لیا۔ جب حضرتِ گرامی وظیفہ لیکر مستقلاً جالندھر تشریف لے آئے تو حفیظ نے اُن کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہ کیا۔

حفیظ کی حقیقی ادبی و شعری زندگی کا آغاز ۱۹۲۲ء سے شروع ہوتا ہے۔ گیتوں نے حفیظ کو نئے روپ میں پیش کیا اور مشاعروں کی شرکت کے ساتھ ساتھ رسائل و اخبارات میں کلام کی اشاعت نے شہرت کا نیا دروازہ کھول دیا۔ ان کے پڑھنے کا ڈھنگ اور آواز دونوں میں لوچ اور لچک تھی۔ ترنم کے ساتھ پڑھنے کا شوق بھی ہندوستان میں نیا نیا پیدا ہوا تھا۔ حفیظ تو پہلے ہی سراپا ترنم تھے، شعری فضاؤں میں اُن کے نغمے گونجنے لگے، پھر کیا تھا کوئی مجلس کوئی مشاعرہ اور کوئی انجمن ایسی نہ تھی جس میں حفیظ نہ بلائے جاتیں۔ آہستہ آہستہ اُن کی شہرت ہر طرف ہو گئی۔ جدید طرز و اسلوب کی نظمیں اور گیت حفیظ نے بطورِ خاص لکھے، گیتوں کو چھوڑ کر نظم میں ہر چند اُن کے ذہنی اختراع کو دخل نہ تھا۔ اس لئے کہ ساغر وغیرہ بھی اسی قسم کی نظمیں لکھ رہے تھے، لیکن حفیظ نے قدم ذرا تیزی سے بڑھایا۔ گیتوں میں انفرادیت اور جدید اسلوب کی نظموں میں بہت جلد قبولِ عام کی سند حاصل کر لی۔ نظم کے رجحان کا ارتقا "شاہنامۂ اسلام" کہا جا سکتا ہے اور شاید یہ اُن کی بقا کا ضامن بھی ہو لیکن شاہنامہ کے سلسلے میں بحث و نظر کی بڑی گنجائش ہے۔ شاعری اور معیار کے اعتبار سے وہ کوئی خاص چیز نہیں ہے۔

شاہنامہ کے علاوہ ان کی معتدبہ نظمیں بڑی سُریلی، رواں۔ دلکش اور غنائی ہیں۔ اور موضوع کے اعتبار سے بھی نئی کہی جا سکتی ہیں۔ حفیظ کی شہرت و قبولیت میں جہاں اُن کے ذاتی جوہر کو دخل ہے وہیں پنجاب کے روایتی پروپیگنڈے کا بھی ہاتھ ہے۔ چنانچہ سر شیخ عبدالقادر اُنھیں انگلستان لے گئے۔ حکومت پنجاب نے "خاں صاحب" کے خطاب سے نوازا اور اب گورنمنٹ نے جنگ کے سلسلے میں "SONG ORGANISER" (منتظم موسیقی) کے اعلیٰ عہدہ پر مامور کر دیا ہے۔ اقبال بھی خطاب یافتہ تھے اور مشرقی و مغربی ممالک کا سفر کیا تھا۔ یہاں اور وہاں اقبال نے کیا اثرات چھوڑے یہ سب جانتے ہیں، یہی چیز ہمیں اقبال اور حفیظ کے فرق کو محسوس کراتی ہے۔ حفیظ کو شاعری راس آنے کی طرح راس آئی ہے۔ عوام و خواص میں وہ عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ رؤسا انھیں بلاتے، سنتے اور نوازتے ہیں، کئی ریاستوں سے وظیفہ ملتا ہے۔ ہر صاحب مشاعرہ ان کی شرکت کا متمنی رہتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنے ترنم سے محفل پر چھا جاتے ہیں۔ رہ رہ کر انکے اشاراتی جملے، چہرہ اور ہاتھوں کا اُتار چڑھاؤ، غرض الفاظِ شعر کی مکمل تصویر کھینچ دیتے ہیں مختصر یہ کہ شاعری نے اُن کی زندگی کو کامیاب ترین زندگی بنا دیا ہے۔

حفیظ نہ صرف ناظم ہی ہیں بلکہ غزل گو بھی ہیں اور خصوصیت کے ساتھ نظم و غزل میں اُن کا مخصوص رنگ مشترک ہے وہ ایک انچ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے خواہ نظم کہیں یا غزل، اُن کا رنگ کیا ہے؟ سادگی۔ موسیقی اور ہلکے پھلکے الفاظ میں عام پسند اور سادہ خیالات و جذبات کا اظہار۔ لیکن اسلوب و انداز سے شعر سامعہ نواز ہو جاتا ہے اور سننے والا محظوظ ہوتا ہے۔ حفیظ کے یہاں داخلیت بہت کم ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حقیقی جذبات و واردات شعر کے محرک نہیں ہوتے بلکہ موسیقی چند الفاظ کو موزوں اور سلیقے کے ساتھ کاغذ پر ڈھال دیتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اُن کے یہاں جذبات ہوتے ہی نہیں۔ ہوتے ہیں مگر کم اور پھیکے ہوئے، بجز صناعت اور غنائی التزام کے اُن کے کلام میں وقار اور عظمت کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ ہاں اشعار میں دلکشی اور جاذبیت ضرور ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سننے والے کو غور و فکر کی بھی زحمت نہیں ہوتی تغزل محض حفیظ کا معیار شاعری ہے۔ مگر خیالات میں ندرت نہیں ہوتی۔ ندرتِ اسلوب ضرور پائی جاتی ہے، یہ اشعار دیکھیئے کتنے ہلکے تغزل اور لطافت کے حامل ہیں مگر ایسے اشعار کم ملتے ہیں ؎

سُن لے کوئی اک حرف تو افسانہ بنا دے	کرتا ہے تصور ترا اس رنگ کی باتیں
اور ہوش بھی وہ ہوش کہ دیوانہ بنا دے	دیوانگیٔ عشق کے بعد آہی گیا ہوش

یوں بیٹھنے جیتی اُلفت کی بازی — اک بار کھیلا، تو بار ہارا

بے تعلق زندگی اچھی نہیں — زندگی کیا، موت بھی اچھی نہیں

یہ ہوا، یہ ابر، یہ سبزہ حفیظ — آج پینے میں کمی اچھی نہیں

فغاں کے واسطے ذوقِ سلیم ہے درکار — یہ جس کے پاس نہ ہو صبر اختیار کرے

محبت کی دُنیا میں سب کچھ حسیں ہے — محبت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

یہ اعترافِ عجز بھی معیوب ہے تو خیر — چُپ ہو رہینگے کچھ نہ کہینگے زباں سے ہم

مری ڈوب جانے کا باعث نہ پوچھو — کنارے سے ٹکرا گیا تھا سفینا

مری مجبوریاں کیا پوچھتے ہو — کہ جینے کے لئے مجبور ہوں میں

یہ دامن ہے یہ ہے گریباں، آؤ کوئی کام کریں
موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا

نظموں کے انتخاب کے لئے گنجائش نہیں ورنہ اُن کی کوئی نظم بھی پیش کرتا۔ "شاہنامۂ اسلام" کے علاوہ اُن کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں "نغمہ زار" اور "سوز و ساز" بہت مشہور ہیں۔ حفیظ موسیقی کی دھن میں اتنے کھو جاتے ہیں کہ انھیں بعض سامنے کی غلطیوں کا احساس نہیں رہتا۔ حشو و زوائد کی کثرت۔ غلط تراکیب اور الفاظ کے علاوہ اُن کا مفہوم بھی مکمل نہیں ہوتا۔ اُن کے تجربات میں بھی نقص معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ غور و فکر کے عادی نہیں۔ اُن کی شاعری کا محور شراب و شاہد ہے اور اسی کو اُلٹ پلٹ کر پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اس دَور کے صاحبِ طرز اور شہرت یافتہ شاعر ہیں۔ اُن کی انفرادیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے گیتوں، بچّوں کی نظموں اور جدید طرز کی نظموں سے بہت دن تک زندہ رہیں گے۔ دَورِ جدید میں اُنکی تقلید ہو رہی ہے اور ہوگی لیکن ترقی یافتہ تغزل میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ غزل گو کی حیثیت سے نہیں بلکہ نظم نگار کی حیثیت سے وہ مستقبل میں پکارے جائینگے۔

اعجاز صدیقی

صحیفۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

ہے سختیٔ صبر و ضبط مزدوروں پر
اور بارشِ اختیار مغروروں پر
فطرت کی ستم ظریفیاں دیکھ ذرا
یہ جبر بھی کرتی ہے تو مجبوروں پر

ظالم انساں، اگرچہ مظلوم نہیں
پھر بھی کیونکر کہوں کہ محکوم نہیں
امروز پہ سب حکم لگا سکتے ہیں
حالِ فردا کسی کو معلوم نہیں

قابو میں تھا سبزہ زار وہ بھی نہ رہا
باقی تھا جو اک مدار وہ بھی نہ رہا
قبضے میں ہے قوت کے ہر اک پیداوار
تھا خاک پر اختیار، وہ بھی نہ رہا

عالم پہ بصورتِ وبا طاری ہے
بارش رہے یا برف گری، جاری ہے
یہ جنگ ہے یا "فصلِ جہنم"، کوئی
سردی میں بھی اسکی گرم بازاری ہے

کیا جورِ فلک قابلِ فریاد نہیں
ہے کون جو اس دور میں برباد نہیں
لیتی نہیں انتقام لیکن فطرت
شاید ابھی انتہائے بیداد نہیں

ہر ملک کو ویران کئے دیتے ہیں
یوں حشر کا سامان کئے دیتے ہیں
نزدیک ہے کیا نمودِ محشر کہ یہ لوگ
بستی کو بھی میدان کئے دیتے ہیں؟

تسلیم کہ صاحبِ نظر ہیں ہم لوگ
سچ یہ ہے کہ محرومِ بصر ہیں ہم لوگ
کس سے کہیں ہو رہا ہے کیا، کیا ہوگا
خود حال سے اپنے بے خبر ہیں ہم لوگ

پوری قوت سے خود نمائی کر لی
پردے میں خودی کے کبریائی کر لی
بیٹھا رہا خاموش خدا کچھ دن تک
"سائنس" نے دنیا میں خدائی کر لی

کون آج فسادِ جنگ سے تنگ نہیں
دنیا میں کہیں بھی امن کا رنگ نہیں
اُف رے اثرِ جنگ کی عالمگیری
وہ ملک بھی ویراں ہیں جہاں جنگ نہیں

کہتے ہیں کہ اب سالِ رواں جاتا ہے
یہ بھی معلوم ہے کہاں جاتا ہے؟
شورش گہِ کائنات سے گھبرا کر
تقویم میں لینے کو اماں جاتا ہے

سیماب

تحقیق و تصحیح :-

رُوحِ رواں یا رُوح و رواں؟

رسالہ "شاعر" (آگرہ) ستمبر ۱۹۴۲ء میں حضرت مولانا ماہر القادری کا ایک مقالہ "تحقیق و تصحیح" کے زیرِ عنوان شائع ہوا ہے۔ جس میں "روحِ رواں" اور "روح رواں" کی صحت و عدم صحت پر بحث کی گئی ہے۔ مولانا نے کسی رسالہ کا ذکر (نام نہیں لکھا ہے) کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "معترضین یہ کہتے ہیں کہ "روح" کے ساتھ "رواں" کا استعمال زاید اور فضول ہے کیونکہ روح تو رواں ہی ہوتی ہے۔ روانی اور جاری و ساری ہونا اس کی خاصیت میں داخل ہے۔ غیر رواں روح ہوتی ہی نہیں۔ اصل لفظ "روح و رواں" ہے رواں کے معنی "جان" کے ہیں اور مترادف الفاظ عشق و محبت، خواہش و تمنا....... عام طور پر مستعمل ہوتے ہیں

مولانا ماہر القادری اس کا جواب دیتے ہیں: "ہم اُردو میں "روحِ رواں" کیطرح بہت سے الفاظ بولتے اور لکھتے ہیں۔ مثلاً "برقِ تپاں" نظم و نثر دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ معترضین نے "روحِ رواں" پر جو اعتراض وارد کیا تھا اُس کے لحاظ سے برق تپاں بھی غلط ہے۔ کیونکہ تڑپنا (تپیدن) برق کی فطرت ہے۔ برق ساکت ہو ہی نہیں سکتی۔ برق غیر تپاں کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔"

مولانا نے دوسری مثال گلِ خنداں کی پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں "کلی جب کھل جاتی ہے تو اسے پھول کہا جاتا ہے۔ پھول کی فطرت ہی کھلنا اور رہنا ہے۔ لیکن اس کے باوجود گلِ خنداں لکھا اور بولا جاتا ہے۔"

میرے خیال میں معترضین نے سمجھ کر اعتراض نہیں کیا، اور نہ مولانا ماہر نے اس پر غور فرمایا۔ پہلے تو معترضین نے "رواں" کو "روح" کی صفت کہا اور آگے چلکر مترادف کہدیا۔ مولانا ماہر کا جواب تو پہلی صورت کے لئے کافی ہو جاتا ہے کہ جس طرح "برقِ تپاں" "گلِ خنداں" صحیح ہیں اسی طرح سے روحِ رواں بھی صحیح ہے۔ جیسے برق کی صفت و فطرت میں تڑپنا اور "گل" کی فطرت میں "خنداں" ہونا ہے۔ اسی طرح "روح" کی فطرت میں روانی داخل ہے۔ لیکن مترادف مانتے ہوئے کبھی اور کسی طرح "روح و رواں" کی ترکیب جائز نہیں ہو سکتی۔ اسکی صورت ایسی ہی ہوگی کہ بجائے عشق و محبت، خواہش و تمنا، عشقِ محبت، خواہشِ تمنا، لکھا اور کہا جائے معترضین کا جاری و ساری کہنا پھر مترادف بھی کہنا ہی دلیل ہے کچھ کر اعتراض نہ کرنے کی اور لفظ مترادف پر مولانا ماہر کا کچھ نہ کہنا، پھر جواب میں برق تپاں۔ گلِ خنداں، کی ترکیبیں پیش کر دینا ثبوت ہے۔ اعتراض پر غور نہ کرنے کا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ "روحِ رواں" غلط بھی ہے اور صحیح بھی۔ غلط اس لئے کہ "رواں"، بمعنی "جان" سمجھتے ہوئے لکھنا اور کہنا "عشقِ محبت" جیسی مضحکہ خیز ترکیب ہو جاتی ہے اور صحیح یوں ہے کہ "رواں" کو "روح" کی صفت سمجھا جائے۔ یعنی جاری و ساری۔

مولانا ماہر نے اپنے اسی مضمون کی ابتدا میں فرمایا ہے کہ "میں اس چیز کا قائل نہیں ہوں کہ ہر جدت اور ہر نئی بات دلچسپ، مفید اور ماننے کے قابل ہوتی ہے۔"

مولانا نے جو کچھ فرمایا بالکل بجا و درست فرمایا۔ لیکن یہاں معترضین نے تو کوئی نئی بات نہیں کہی ہے اور اسکا اعتراف آپ خود یوں فرماتے ہیں:-

"مجھے اسکا اعتراف ہے کہ بعض فارسی شاعروں اور ادیبوں نے "روح و رواں" (واوِ عطف کے ساتھ) ہی لکھا ہے۔ مرزا غالب کی تحریروں میں بھی "روح و رواں" ملتا ہے۔"

تو اب یہ فرمائیے کہ معترضین نئی بات کہہ رہے ہیں؟ یا آپ؟ "روح رواں" آپ کو کہیں اساتذہ کے کلام میں نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ آپ نظم میں جہاں کہیں "روحِ رواں" موضوع کر سکتے ہیں، وہاں "روح و رواں" بھی نظم کر سکتے ہیں ذرا اور کسی قسم کی قباحت بھی نہیں ہے تو پھر اتنی سی بات کو موضوعِ بحث بنا دینے سے کیا مقصد ہے۔ کیا یہ صرف اس لئے ہے کہ آپ کو کسی نے ٹوک دیا تھا۔ یا اس پر مناظرہ ہوا تھا؟ آخر تک میں یہ نہ سمجھ سکا کہ "روحِ رواں" لکھنے اور بولنے سے اُردو میں کیا اضافہ ہو جائے گا اور "روح و رواں" لکھنے اور کہنے سے کیا نقصان؟ ہاں اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ "روح و رواں" لکھنے میں اساتذہ کی تقلید ہوتی ہے اور "روحِ رواں" بولنے میں جدت ہے اور بس ——

قمر نعمانی

"روح رواں"

رسالہ "شاعر" (ستمبر ۴۲ء صفحہ ۱۲) میں حضرت ماہر القادری نے "روحِ رواں" کے جواز کے لئے رائے دی ہے۔ اُن سے اختلاف تو مقصود نہیں ہے لیکن محض افادے کے لئے ایک دوسرے بزرگ یعنی استاذی حضرت احسن مارہروی کی رائے نقل کرتا ہوں۔

انٹرمیڈیٹ کالج میگزین (علی گڈھ۔ اکتوبر ۳۰ء صفحہ ۶)

میں حضرت احسن کا ایک قطعۂ تاریخ شائع ہوا تھا:—

"آہ ماتمِ نواب سید حامد علی خاں آلیٔ رامپور"

۱۹ ع ۳۰

سُن چکے حکمِ قضا جب حکمرانِ رامپور | چھوڑ کر قالب کیا روحِ رواں نے عزمِ عدن
مصرعِ تاریخ میں ملہم نے احسن سے کہا | پا گئے نواب سر حامد علیخاں بزمِ عدن

۱۳ ھ ۴۹

اسی کے ساتھ ایک حاشیہ ہے:—

"آج کل "عمرِ رواں" اور "آبِ رواں" کی طرح "روحِ رواں" کی ترکیب بھی بکثرت عام تحریروں میں دیکھی جاتی ہے۔ میری تحقیقات میں "روح" نہ "عمر" کی مترادف ہے، نہ وہ ہر وقت "بلی" یا "عمر" کی طرح "رواں" رہتی ہے۔ بلکہ اُس کی "روانی" کا اطلاق صرف مرنے پر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں یہاں بہ ترکیب توصیفی "روحِ رواں" کہا گیا ہے۔ ورنہ عموماً "**روح و رواں**" عطف (و) تفسیری کے ساتھ لکھنا چاہئے جیسے رنج و غم، عیش و نشاط وغیرہ۔"

حضرت احسن کی اس رائے کے نقل کرنے سے کسی کی تنقیص و تعریض مقصود نہیں بلکہ زبان کی وسعت کا خیال کرتے ہوئے حضرت ماہر کی رائے بھی کسی حد تک مفید ہے فیصلہ ناظرین کے اختیار میں ہے۔"

غلام مصطفٰے خاں ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

امراؤتی (برار)

(بقیہ صفحہ ۶۴)

زندگی کو بنانے والے حسن | زندگی بے عمل نہیں بنتی
پہلے کچھ اُن سے بن بھی جاتی تھی | اب کسی بات پر نہیں بنتی

جناب محسن ساگری

سجدہ گاہِ جبیں کہیں نہیں بنتی | اُسکے در سے گر نہیں بنتی
آرزو تھی کہ قبر اپنی بھی | کوچۂ یار میں کہیں نہیں بنتی
سچ کہا ہے کسی نے یہ اے محسن | "بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"

جناب قیس بدنموی

طاقتِ ضبط بھی نہیں باقی | آہ کرتے بھی اب نہیں بنتی
جو زباں سے کہو سمجھ کے کہو | "بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"
زندگی بیخودی میں ہے زاہد | یہ خودی سے کبھی نہیں بنتی

جناب عصمت قریشی بلاسپوری

اُن سے کیا حالِ شامِ غم کہئے | ہم سے اک بات بھی نہیں بنتی
یوں تو بنتا ہے دوست دشمن بھی | ایک تم سے مگر نہیں بنتی
وہ تبسم سے کام اگر لیتے | ہر کلی جامِ انگبیں بنتی

جناب قاضی ادونوی

کیا بنے گی بگڑ کے پھر قسمت | "بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"
ڈال دیتے جو اپنا دامن تم | میری تربت بھی کچھ حسیں بنتی
کیا سنیں گے وہ میرا قصۂ غم | میری اُن کی کبھی نہیں بنتی

جناب قابل (منشی فاضل) ادونوی

مجھ سے گر ایک بھی خطا ہوتی | ساری مخلوق نکتہ چیں بنتی
جل ہی جاتے فلک کے سب پردے | آہ گر میری آتشیں بنتی
جب مقدر خلاف ہوتا ہے | "بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"

جناب نسیم سیتاپوری

رنج و راحت میں اتفاق نہیں | ضبط اور آہ میں نہیں بنتی
مان جائینگے اے نسیم اک دن | لاکھ اُن سے ابھی نہیں بنتی

جناب خورشید ٹھکوری

چاہتے ہیں بگاڑنا وہ جسے | اُسکی قسمت کہیں نہیں بنتی
ساری دنیا میں کیا کہیں خورشید | دردِ دل کی دوا نہیں بنتی

موت کا تبصرہ

(کارگاہِ حیات پر)

زندگی کیا ہے، بتا دوں اے غلام زندگی
بے نوائی بے سکونی کس مپرسی بے کسی

دردِ ٹیسیں دھڑکنیں، چیخیں، خلش، آہ و فغاں
نا اُمیدی، نامرادی رنج و غم ناکامیاں

دشمنی، غیبت، گلے، شکوے، شکایت، غفلتیں
مکر، دھوکے، جعل، سازش، افترا، اور تہمتیں

خود ستائی، خود نمائی، خود پرستی، خودروی
فخر و نازش، کبر و نخوت، ادعا و خود سری

ذوقِ فاسد، حرص کاسد، او رباطل آرزو
خواب کے عالم میں کوشش، ظلمتوں میں جستجو

لمحہ لمحہ درد و حسرت لحظہ لحظہ پیچ و تاب
ایک پیہم بے سکونی اک مسلسل اضطراب

حسرت اور ناکامیوں کا شعلہ پرور امتزاج
جاودان ہر اک ضرورت متقل ہر احتیاج

بدبوؤں کا تیز جھونکا گندگی کا ارتعاش
آرزوئے خون شدہ کی اک تعفن ریز لاش

سوز میں سلگی ہوئی غمگیں اُمیدوں کا دھواں
حسرتوں کی آگ میں جلتا ہوا اک آشیاں

حسرتوں کی چھاتیوں میں قصارِ دردِ کا ایاغ
وقت کے ہاتھوں میں جنباں ٹمٹماتا سا چراغ

صبح کے عالم میں تاباں پھیکی پھیکی چاندنی
دُور ساحل سے گریزاں سوکھنے والی ندی

باڑ میں کانٹوں کی مرجھایا ہوا سا اک گلاب
آڑ میں شامِ شفق کی سرخمیدہ آفتاب

حملہ زن ہیں ہر قدم پر حادثاتِ زندگی
زندگی ہی لوٹتی ہے کائناتِ زندگی

ہر نفس کو دیکھکر دُنیا میں مجبورِ حیات
مسکرا کر میں بڑھا دیتی ہوں آزادی کا ہات

بزمِ عالم کا ہر اک جھگڑا اُٹھا جاتی ہوں میں
لیکے پیغامِ سکوں چپ چاپ آ جاتی ہوں میں

میں سراپا عافیت ہوں جوشِ رحمت کی قسم
میرا مظلوموں پر احساں میرا ظالم پر کرم

روک کر ظلموں سے ظالم کو دلاتی ہوں نجات
دے کے دامن میں رکھتی ہوں مظلوموں کی بات

فاقہ مستوں کا سکوں ہوں دردمندوں کا علاج
بے کسوں کی ہم نوا ہوں بے بسوں کی ہم مزاج

زندگی کے حشر زا ماحول میں جنت فروش
عالمِ اسباب میں عریانیوں کی پردہ پوش

ساغرِ گلزارِ فطرت رہبرِ بزمِ جمال
اک نویدِ کیف پرور اک پیامِ خوش مآل

اک نشاطِ جاودانی اک سرورِ سرمدی
زندگی کی خشکیوں میں سبھری سی اک ندی

بزمِ عالم کے اندھیروں میں ضیا پرور چراغ
ہر ادا میں ضوفشانی ہر نظر میں شمع چراغ

رات کی غمناک و غم انگیز آہوں کی حریف
ہلکی ہلکی سی نسیمِ صبح کی موجِ لطیف

لوریوں سے میری سو جاتی ہے ساری کائنات
شورشِ پیہم سے میں دُنیا کو دیتی ہوں نجات

باغبانِ گلشنِ ہستی کی ہوں میں رازداں
ہاں مرے ہی ہاتھ میں رہتا ہے نظمِ گلستاں

کاٹ دیتی ہوں وہ شاخیں توڑ لیتی ہوں وہ پھول
باغباں جنکو گلستاں میں سمجھتا ہے فضول

یا وہ گُل چنتی ہوں نذرِ باغباں جو ہو سکیں
تحفۂ رنگینِ اہلِ گلستاں جو ہو سکیں

پامسلتی ہوں وہ کلیاں ہیں جو مرجھائی ہوئی
ہوں بہر صورت ریاضِ دہر پر چھائی ہوئی

زندگی پر ہیں یہ سب میری کرم فرمائیاں
میں نہ ہوں تو بزمِ عالم میں نہ ہوں سرگرمیاں

صبا متھراوی

قادری صاحب کی سخن فہمی

زیرِ نظر مضمون تقریباً ایک سال سے طباعت کے لئے آیا ہوا ہے مگر میں آج تک اس کی اشاعت کو بربنائے مصلحت ٹالتا ہی رہا۔ کچھ تو اس لئے کہ بازارِ ادب میں غلط نویسوں، کوتاہ نظر ناقدوں اور تنقیص نگاروں کی کوئی وقعت نہیں۔ ہر بلند ظرف و نظر رکھنے والا ایک تبسم ایسی چیزوں پر نظر انداز کر دیتا ہے اور کچھ اس لئے کہ مضمون کا تعلق معاصر "عالمگیر" لاہور سے تھا۔ اگر جواب بھی اُسی میں شائع ہوتا تو زیادہ مناسب تھا لیکن معاصر موصوف نے بھی بات کو بڑھا ہوا دیکھکر اُس کی اشاعت سے گریز کیا۔ حالانکہ اصولی طور پر وہ اس مضمون کی اشاعت کا ذمہ دار تھا۔ ایک یہی نہیں بلکہ قادری صاحب کے مضمون کے جواب میں مولوی عبید اللہ قدسی لکچرار سناتن دہرم انٹر کالج بیاور کا مضمون بھی پہونچا تھا۔ مدیر "عالمگیر" نے دونوں میں سے کسی ایک کو بھی شائع نہ کیا۔ یہ واقعہ ہے کہ قدسی صاحب اور قمر صاحب نے "شاعر" میں اپنے مضامین کی اشاعت کے لئے مجھ پر بہت زور ڈالا۔ حضرت صبا رشیدی ایم۔اے۔ بی۔ ایل حضرت مولانا آلم مظفر نگری۔ حضرت صبا متھرادی۔ مولوی محبوب حسن آسی اور جناب باقی اعظمی وغیرہ ادبا نے بھی لکھا کہ ہم قادری صاحب کے مضمون کا جواب لکھ رہے ہیں۔ لیکن میں سب سے معذرت چاہی کہ میں "شاعر" میں جوابی مضمون شائع نہ کر سکونگا۔

یہ مضمون اُس وقت کیوں شائع نہ کیا گیا اور اب کیوں شائع کر رہا ہوں۔ اس کی وجوہ ایک دو نہیں بلکہ متعدد ہیں۔ ان سب میں جناب حکیم مولوی بدیع الزماں صاحب قمر نعمانی سہرامی (فاضل علوم مشرقیہ) کا شدید اصرار جو خفگی کی حد تک پہونچ چکا ہے اور جناب مولوی حامد حسن قادری کی بدایونی کی ناز یبا حرکات زیادہ اہم ہیں۔

اپنے وطن کی جہالت۔ پست مذاقی اور تہذیب و اخلاق سے بیگانگی کا آج پہلی بار اظہار کرتے ہوئے میں انتہائی ندامت و افسوس محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن کیا کروں کہ ——— "بنتی نہیں ہے راز کو افشا کئے بغیر" ——— اگرہ میں چند جنت ساز و جنت فروش بھی شاعر ہیں جنھیں اہلِ علم میں کوئی وقعت حاصل نہیں۔ مقامی شاعروں میں جماعت بندی کے طفیل بے کیف۔ پھیکے۔ غلط اور عریاں اشعار پر داہ داہ کرا لیتے ہیں۔ کچھ جاہل قسم کے تلامذہ ساتھ ہیں۔ اور خود نام نہاد استاد ——— اگرہ کے یہ اہل شعرا خیر سے "جماعتِ ادبیہ سیابیہ" کو اپنا حریف سمجھتے ہیں حالانکہ ان لوگوں کو کبھی منہ نہ لگایا گیا۔ بہرحال اسی جذبہ کے ماتحت اس طبقہ نے جس کے امام ہمارے مولوی حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج اگرہ ہیں۔ ایک ۲ صفحہ کی "رسالچی" میں حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کی زیرِ نظر غزل پر سیف اکبرآبادی کے فرضی نام سے اصلاح شائع کی؟ مجھ سے بھی لوگوں نے کہا میں ہنس کر خاموش ہوگیا۔ اس کے دو ایک ماہ بعد سینٹ جانس کالج اگرہ کے میگزین میں مولوی حامد حسن صاحب قادری کی طرف سے اسی اصلاح شدہ غزل کی توجیہ شائع ہوئی ———

میں پھر بھی خاموش رہا اور قادری صاحب کی طرف سے جو حسن ظن تھا وہ اپنی جگہ قائم رہا۔ لیکن ہمارے قادری صاحب کے جذبۂ مخالفت و معاندت کی تسکین پھر بھی نہ ہوئی۔ جب وہ بھی کہ سیف کے کندھے پر رکھکر جو بندوق چلائی گئی تھی۔ اُس کی آواز کسی کے کان تک نہیں پہونچی تو اُنھوں نے چند دیگر اساتذہ کی اصلاح شدہ غزلوں کے ساتھ سیف اجمیری[1] کی اصلاح شدہ غزل مع اپنی توجیہ مطبوعہ "سینٹ جانس کالج میگزین اگرہ" رسالہ "عالمگیر" لاہور میں دوبارہ شائع کرادی۔ دوسرے اساتذہ کی اصلاحیں ضمنی تھیں۔ قادری صاحب کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو۔ مولانا سیماب کی شہرت کو نقصان پہونچائیں اور دُنیا کو دکھائیں کہ سیماب کو ابھی اصلاح کی ضرورت ہے لاحول ولاقوۃ۔ واذا مرّوا باللغو مرّوا کراما۔ جہلا تو خدا کے کلام پر بھی اعتراض کر چکے ہیں۔ پھر مولانا سیماب تو انسان ہیں۔ اور اب تو وہ تہیہ کر چکے ہیں کہ در پردہ یا بے پردہ مولانا پر زیادہ سے زیادہ اعتراضات کرینگے۔ اِن تمام لغو حرکات کا علم ہونے کے باوجود مولانا سیماب مدظلہٗ کا ظرف دیکھئے کہ اُنھوں نے قادری صاحب کے خلاف کبھی کوئی مضمون نہ لکھا۔ ورنہ قادری صاحب فرشتہ نہ تھے۔ ان کی ہزاروں لغزشیں گرفتِ اعتراض میں آسکتی تھیں۔

قادری صاحب خدا کے فضل و کرم سے پختہ عمر انسان اور اُردو کے تھوڑے سے بہت ماہر بھی ہیں۔ انھیں یہ غیر سنجیدہ باتیں ہرگز زیب نہیں دیتیں اور اگر میں اپنے ماضی کو آواز دیکر

---

[1] سارے ہندوستان میں اس نام کا کوئی شاعر نہیں ہے۔

اُن کے ادب و احترام کا خیال کروں تو یہ کہونگا کہ یہ سب کچھ اُن کی شان کے خلاف ہے۔ حال میں رسالہ "نگار" لکھنؤ میں اُنھوں نے مولانا سیماب کی نظم **"موحدِ اعظم"** کے سلسلے میں **"الحق"**[1] کے نام سے ایک مضمون لکھا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ فرضی نام کیوں اختیار کیا گیا؟ بے پردہ ہو کر لکھنے کی ہمت کیوں نہ ہوئی؟ لطف یہ ہے کہ حضرت مولانا مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی سے اس نظم کی تعریف بھی کر چکے ہیں۔ قادری صاحب کے ظاہر و باطن کا یہ تضاد بھی دیدنی ہے۔ اب اِن کی ایک اور نئی کتاب جس کا نام غالباً **"نقد و نظر"** ہے بازارِ ادب میں آنے والی ہے اس تصنیف کی غایت بھی یہی ہے کہ دوسرے ادبا اور شعرا کی آڑ لیکر مولانا سیماب پر اعتراض کئے جائیں ——— انھیں تیار رہنا چاہئے کہ اُن کی **"تنقید کے نئے زاویئے"**[2] اُن کی ادبی موت کا سبب ہونگے۔ قادری صاحب تمام عمر مولانا سیماب کے خلاف لکھتے اور لکھواتے رہیں لیکن میں اُنھیں یقین دلاتا ہوں کہ اُن کی اس معاندانہ کد و کاوش کا مآل کچھ نہ ہوگا جب ایسے متعدد مخالفین کی مخالفت بے اثر ثابت ہو چکی ہے تو قادری صاحب کی ژولیدہ تحریریں کیا اثر رکھ سکتی ہیں۔ مجھے افسوس اس کا ہے کہ وہ عوام کالانعام میں قبولِ عام حاصل کرنے یا چند جاہل ہجو کروں اور طلبا کو خوش کرنے کے خبط میں اپنے وقار کو نقصان پہونچا رہے ہیں۔ مستقبل میں مولانا سیماب کے خلاف وہ جو کچھ لکھیں گے اُسے اُن کے زیرِ اثر اخبارات و رسائل شائع تو کر دینگے یا بحیثیت پروفیسر کے پبلشرز سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ کتابی صورت میں اپنے مضامین شائع کرا دینگے لیکن اُس ذاتِ گرامی کی شہرت۔ قبولیت۔ خدمات۔ وقار اور شخصیت پر کوئی اثر نہ پڑیگا جس نے اپنی ساری زندگی ادب و شعر کے لئے تج کر اُسے اوجِ ثریا بخشا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حاسدین کے اوچھے وار اہلِ کمال پر کبھی کارگر نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ اُن کی زندگی و پائندگی کا سبب ہوتے ہیں۔

میں چاہوں تو قادری صاحب کو ایک لفظ لکھنا دشوار ہو جائے۔ ہندوستان کے کونے کونے سے ان کی لوزح اور بحر تصانیف و مضامین پر تنقیدیں شائع ہونے لگیں لیکن میرا اخلاق اسے گوارا نہیں کرتا۔ میں تو اُن سے بہ ادب یہی گذارش کروں گا کہ وہ اپنے مقام کو پہچانیں، اپنی بشریت پر غور کریں اور اپنے مبلغِ علم کو ٹٹولیں۔ تخلیقی ادب دیدہ دری پیدا کر سکتے ہیں۔ کتابوں کو سامنے رکھ کر نقل کرنے والے سطحی چیز کے علاوہ اور کچھ پیش نہیں کر سکتے۔ سیماب اور قادری میں زمین و آسمان کا جو فرق ہے اُسے سب جانتے ہیں۔

میرے اس نوٹ میں اگر کوئی بات خلافِ آئینِ اخلاق ہو اور اُس کا اثر قادری صاحب کی ذات پر زیادہ گہرا پڑتا ہو تو میں اُس کے لئے معذرت خواہ ہوں ——— میں کیا کروں کہ خاموشی مصلحتِ وقت کے خلاف ہوتی جا رہی تھی ———

اعجاز صدیقی

رسالہ "عالمگیر" خاص نمبر ۱۹۴۱ء میں "اصلاحِ اساتذہ پر ایک نظر" کے عنوان سے الحاج مولوی حامد حسن قادری بچھرایونی کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ اپنی دانست میں قادری صاحب نے بڑی دقتِ نظر سے کام لیکر اصلاحِ اساتذہ کی توجیہیں کی ہیں اور اپنی سخن فہمی کے وہ وہ ثبوت فراہم کئے ہیں جسے دیکھ کر سطحی نگاہ رکھنے والے تو بیشک جھوم جائیں گے لیکن اہلِ نظر ایک تبسمِ خفی کے ساتھ ٹال دینگے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو لوگ صرف نام یا ڈگریاں دیکھ کر مرعوب ہو جاتے ہیں اور کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اُن کی نگاہوں کے پردے اُٹھائے جائیں۔ قادری صاحب کی نظر پر نظر ڈالنے کی ضرورت اسی لئے ہوئی ہے

امیر مینائی کی اصلاح

نواب کلب علیخاں کی غزل پر حضرت امیر مینائی کی اصلاح اور حامد صاحب کی توجیہ ملاحظہ ہو۔

شعرِ نواب

کچھ کم تو نہ تھا قتل کو وہ حسن پر افسوس — کیوں تجھ کو دیا چرخ نے بیساختہ پن بھی

اصلاحِ امیر

کچھ کم تو نہ تھا قتل کو وہ حسن پر افسوس — کیوں اس کو دیا چرخ نے بیساختہ پن بھی

توجیہہ قادری صاحب:- دوسرے مصرع میں (تجھ) کی جگہ (اُس) کر دیا ہے لیکن اس ذرا سی ترمیم سے بڑی خامی رفع کر دی۔ جب دوسرے مصرع میں خطاب ہے تو پہلے مصرع میں (وہ) بے محل تھا۔ اس لئے دوسرے مصرع میں بھی ضمیر غائب رکھدی اور شعر کو بامعنی بنا دیا۔ اب اس بات پر غور کیجئے کہ اس شعر میں اصلاح کی ایک اور صورت بھی تھی یعنی دوسرا مصرع بجنسہ رہتا اور پہلے مصرع میں (وہ) کو (یہ) کر دیا جاتا۔ اور شعر یوں ہو جاتا۔

---

[1] "نگار" میں "الحق" کے جواب میں میرا جو مضمون شائع ہوا ہے۔ اُس کی تمہید میں میں نے ایسے چند اشارے کئے تھے جن سے **"الحق"** کی شخصیت واضح ہو جائے لیکن افسوس کہ مولانا نیاز نے تمہید کو حذف کر کے میرا مضمون شائع کیا ہے۔ [2] یہ اُن کی تازہ تصنیف کا ایک باب ہے ——— **اعجاز**

کچھ کم تو نہ تھا قتل کو یہ حسن پرافسوس — کیوں تجھ کو دیا چرخ نے بیساختہ پن بھی

ممکن ہے حضرت امیر مینائی نے پہلی نظر میں مصرع ثانی کی ترمیم کردی ہو یا دونوں صورتوں کو دیکھکر ایک کو ترجیح دی ہو۔ بہرحال کوئی خاص وجہ ترجیح نہیں دونوں صورتیں یکساں ہیں۔

اس شعر میں ایک اور بات قابلِ غور ہے۔ خیام میں یہ شعر اسی طرح چھپا ہے۔ اس لئے میں نے اس کو بجنسہٖ رکھ کر بحث کی ہے۔ لیکن میرے نزدیک پہلے مصرع میں (پر) بے موقع ہے۔ ممکن ہے اس کی جگہ (پھر) ہو اور سہو کاتب سے یہ صورت شائع ہوگئی ہوگی یعنی شعر اس طرح زیادہ موزوں تھا۔

کچھ کم تو نہ تھا قتل کو وہ حسن پھر افسوس — کیوں اس کو دیا چرخ نے بیساختہ پن بھی

(پر) کا موقع بھی نہیں ہے اور یہ لفظ (لیکن) کے معنی میں امیر صاحب کے بعد سے کلام میں متروک بھی ہے۔

میری گذارش:— قادری صاحب آپ نے پہلی ہی توجیہہ میں عجیب عجیب کرشمے دکھائے ہیں۔ آپ توجیہہ تو فرما رہے امیر مینائی کی اصلاح کی لیکن لکھتے یہ ہیں کہ (پر) (لیکن) کے معنی میں امیر صاحب کے بعد سے کلام میں متروک ہے۔ یہاں بعد کا سوال کس طرح پیدا ہوتا ہے؟

(پر) صرف امیر ہی صاحب کے یہاں نہیں بلکہ مرزا داغ کے یہاں بھی (لیکن) کے معنی میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:—

رات دن رونا، تڑپنا، تلملانا، بیٹھنا (امیر) ہیں تو ہم ناکام پر رہتا ہی کاموں کا ہجوم
دل چرایا ہے مرا پر وہ خجل کتنا ہے (") فق ہوا جاتا ہے منہ چور کا دل کتنا ہے
تکلیف ہے پر شکر گدا کو ہے مناسب (") شاہوں کی طرح کچھ غمِ عالم تو نہیں ہے
میں توراز دل چھپاؤں پر چھپا ہنے بھی دے (") جان کی دشمن یہ ظالم آنکھ للچاتی ہوئی
خدا دے تو دے اپنا غم ہر کسی کو (داغ) کرے پر نہ مائل کسی پر کسی کو
ہرچند ترے ظلم کی کچھ حد نہیں ظالم (") پر ہم نے کسی شخص کو نالاں نہیں دیکھا
غربت کے رنج فاقہ کشی کے ملال کھینچ (") اے داغ پر زمانے سے دستِ سوال کھینچ

اس کے علاوہ امیر مینائی نے (پر) (لیکن) کے معنی میں ایسی جگہ بھی لکھا ہے جہاں (لیکن) لکھ سکتے تھے مثلاً ؎

شاعروں میں تھی سخن سازی بہت پرلے امیر — رہ گئے منہ کھول کر جب وہ دہن یاد آ گیا

دیکھئے حضرت امیر یہاں "پرلے" کی جگہ "لیکن" لکھتے تو مصرع بھی صاف ہوجاتا اور بقول آپ کے حرف متروک کے استعمال کا الزام بھی نہ آتا۔ اب ہمارا یہ نتیجہ نکالنا کہ (پر) (لیکن) کے معنی میں متروک نہیں تھا بجا ہے آپ نے بجائے (پر) کے (پھر) کی بحث چھیڑ کر صرف داد چاہی ہے اور کچھ نہیں۔ زمانہ موجودہ[1] کے اساتذہ میں حضرت جلیل جانشین حضرت امیر کو لے لیجئے ان کا تو یہ قول ہے۔

اپنا دیوان حسینوں کا مرقع ہے جلیل — نکتہ چیں تھک گئے کچھ عیب نکالے نہ گئے

وہ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:—

میں تو منہ کھولوں نہ اظہارِ محبت کے لئے — پر ہے مشکل بند ہو جائے لبِ فریاد بھی

قادری صاحب اگر آپ غور و فکر سے توجیہہ فرماتے تو خواہ مخواہ اتنی بات نہ بڑھتی۔ افسوس تو یہ ہے کہ آپ نے باوجود اتنی دیدہ ریزیوں کے لفظ "افسوس پر غور نہ فرمایا۔ آپ کی تمام تر توجہ صرف (پر) ہی تک محدود رہی۔ کاتب نے غلطی تو یقیناً کی ہے مگر وہ نہیں جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے۔ ہاں "افسوس" غور طلب ہے۔ درصل یہاں "افسوس" کا کوئی محل ہی نہیں۔ اس سے تو شعر مہمل ہوگیا۔ اگر شعر کا مفہوم یہ ہوتا کہ حسن تو اتنا قاتل نہیں تھا لیکن افسوس کہ چرخ نے اسے بیساختہ پن دے کر قاتل بنا دیا تو دوسری بات تھی، حقیقت یہ ہے کہ کاتب نے حرف (س) غلط لکھ دیا ہے۔ وہاں نون غنہ ہے اب بجائے "پر افسوس" کے "پُرافسوں" پڑھئے تو "پر افسوس" کی لغویت سمجھ میں آجائے گی۔

کچھ کم تو نہ تھا قتل کو وہ حسنِ پُرافسوں — کیوں اس کو دیا چرخ نے بیساختہ پن بھی

شعر نواب ؎

ہر وقت عبث گرمیاں کرتے ہو عدو سے — کافی ہے جلانے کو مرے دل کی جلن بھی

اصلاح امیر ؎

بھڑکاؤ نہ دوزخ نہ کرو غیر سے گرمی — کافی ہے جلانے کو مرے دل کی جلن بھی

توجیہہ قادری صاحب:— یہاں حضرت امیر نے (گرمیاں کرنے) کو (گرمی کرنے) سے بدلا ہے۔ اس کا یہ سبب نہیں کہ "گرمیاں کرنا" غلط ہے دونوں محاورے درست ہیں۔ لیکن اس غزل کے وزن و بحر میں (گرمیاں) کا لفظ صاف اور پورے تلفظ کے ساتھ نظم نہیں ہوسکتا۔ نون غنہ تو گرا ہی کرتا ہے یہاں (الف) بھی گرتا ہے اور اس سے بندش سست ہوجاتی ہے۔ اگرچہ (گرمیاں) میں (الف و نون) اردو جمع کی علامت ہے اور اردو کے الفاظ میں حروف علت کا گرنا یا دبنا فصاحت کے خلاف نہیں مانا گیا، لیکن اسی وقت جب حروف علت لفظ کے بالکل آخر میں ہوں اور ان میں بھی الف

---

[1] "پر" لیکن کے معنی میں دیکھنا ہو تو علامہ اقبال کا کلام ملاحظہ فرمائیے۔ "ق"

نہیں بلکہ (ی) اور (واو) کے لئے یہ جواز ہے۔ نون غنہ سے پہلے کسی حرف علت کا گرنا فصیح نہیں ہے۔ امیر صاحب نے نواب صاحب کی بندش کو درست کیا ہے معلوم ہوتا ہے نواب صاحب کے ذہن میں اس محاورے (گرمیاں کرنا) کی دوسری صورت (گرمی کرنا) نہ تھی ورنہ بندش کا عیب ان کو بھی محسوس ہوا ہوگا وہ خود ہی دوسرا محاورہ لکھ کر درست کر دیتے، اور اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان محاوروں میں سے دہلی میں صرف (گرمیاں کرنا) بولتے ہیں (گرمی کرنا) اہلِ دہلی کی زبان نہیں ہے اور داغ میں دہلی کی زبان کا اتباع زیادہ تھا۔ اسی کی نواب صاحب کو عادت تھی۔ لکھنؤ میں تپاک اور گرمجوشی کے لئے گرمیاں کرنا اور (گرمی کرنا) دونوں مستعمل ہیں۔

اس شعر میں دوسری اصلاح یہ ہے کہ حضرت امیر نے اسلوب ادا بدل دیا۔ اور (پھر کاؤنہ دوزخ) کا اضافہ کر دیا، ممکن تھا کہ صرف محاورے کی بندش کو درست کر دیا جاتا۔ اور اندازِ بیان نواب صاحب ہی کا قائم رہتا یعنی شعر یوں بنایا جاتا ؎

ہر وقت عبث کرتے ہو تم غیر سے گرمی — کافی ہے جلانے کو مرے دل کی جلن بھی

لیکن رعایتِ الفاظ **لکھنوی** طرزِ بیان کا خاصہ اور امیر صاحب کا کمالِ فن ہے۔ اس لئے عادۃً اُن کا ذہن اس طرف منتقل ہوا اور مصرع کو اس طرح بنا دیا۔

"پھر کاؤنہ دوزخ نہ کرو غیر سے گرمی" کوئی **دہلوی استاد** اصلاح دیتا تو نواب صاحب کے اسلوب بیان کو قائم رکھتا اور اس محاورے سے قطع نظر مصرع کو اس طرح بناتا جیسا میں نے اوپر لکھا ہے یعنی

"ہر وقت عبث کرتے ہو تم غیر سے گرمی"

یہاں **لکھنؤ اسکول** اور **دہلی اسکول** کا فرق نظر آتا ہے۔ لکھنؤ میں رعایت الفاظ کو مقدم سمجھا جاتا ہے۔ جس کے سبب سے کبھی کبھی شاعر کے جذبے اور شعر کی تاثیر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ **دہلی** میں ایہام اور مراعاۃ النظیر کو صرف شعر سازی کی خاطر نہیں لاتے بلکہ اس حد تک استعمال کرتے ہیں کہ جذب و اثر میں فرق نہ آئے۔ نواب صاحب کے مضمون میں **ایک التجا اور سوز و گداز تھا** جو "پھر کاؤنہ دوزخ" کے مبالغہ اور طعن سے جاتا رہا۔

میری گذارش:۔ قادری صاحب! ایک معمولی بات کو طول دے کر آپ خود بھٹک گئے۔ ایک جگہ تو یہ فرمایا کہ "رعایت الفاظ لکھنوی طرزِ بیان کا خاصہ اور امیر کا کمالِ فن ہے" پھر آگے چل کر لکھا کہ "نواب صاحب کے مضمون میں ایک التجا اور سوز و گداز تھا جو "پھر کاؤنہ دوزخ" کے مبالغہ اور طعن سے جاتا رہا" حالانکہ امیر صاحب کی اصلاح "پھر کاؤنہ دوزخ" میں جو درد ہے وہ نواب صاحب کے بیان میں کہاں؟ یہ کون نہیں جانتا کہ "دوزخ" کا نام جب آتا ہے تو انسان پناہ مانگنے لگتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "پھر کاؤنہ دوزخ" میں کیسی التجا اور سوز و گداز ہے۔

پروفیسر صاحب آپ اسے "مبالغہ" فرماتے ہیں حالانکہ جس موقع پر امیر صاحب نے اس کا استعمال کیا ہے وہاں تو دوزخ کی آگ بھی ہیچ سمجھی جاتی ہے مگر اسے ایک مجروح یا حساس دل کے علاوہ دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ قادری صاحب آپ "گرمیاں کرنا" اور "گرمی کرنا" کو ہم مفہوم سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے "گرمیاں کرنا" صرف محبت جتانے اور اختلاط ظاہر کرنے کے معنی میں آتا ہے اور "گرمی کرنا" کنایہ ہے۔ شرارت کرنا، شوخی کرنا، غصہ کرنا، اور حرارت بڑھانا سے ملاحظہ فرمائیے ؎

مجھے اب گھر کو جانے دیجئے آپ — گرمیاں اور سے یہ کیجئے آپ

ہنستے ہیں غیروں سے وہ میری جلانے کیلئے — یار دو اُس برقِ تبسم کی شرارت دیکھنا

(شہیر مچھلی شہری)

منیر شکوہ آبادی ؎

گرمیاں غیروں سے ہیں منیر جلانے کیلئے — یار کے برقِ تبسم کی شرارت دیکھنا

ان دونوں اشعار میں "گرمیاں کرنا" صرف "محبت اور اختلاط کے معنی میں نظم ہوا ہے اور "گرمی کرنا" کی مثال ملاحظہ ہو ؎

مجھ سے گرمی بھی وہ کرتا ہی تو دہری گرمی — خود جلانا مجھے خود آگ بگولا ہونا

(رشک)

اس سے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ (گرمی کرنا) دونوں معانی میں مستعمل ہے اور (گرمیاں کرنا) صرف ایک معنی کے لئے ہے جو آپ کا ارشاد ہے نادانیت کی دلیل ہے

ان تمام توجیہات کے بعد بھی ایک اور بات آپ نے فقر چھوڑ ہی نہیں دی بلکہ وہاں تک آپ کی نظر ہی نہیں پہونچی۔ نواب صاحب کے پہلے مصرع میں۔ لفظ "عبث" بھی خرابی پیدا کر رہا تھا "عبث" کے ساتھ ردیف "بھی" کمزور ہو گئی تھی اور "ہی" کا پہلو نکل رہا تھا۔ دوسری خرابی یہ تھی کہ اس بیان میں محبوب کو مذموم پیرائے سے روکا اور ٹوکا جا رہا تھا "یہ کیا فعل عبث ہے کہ ہر وقت غیر سے گرمی کرتے رہتے ہو۔ جب میرے جلانے کے لئے میرے دل کی جلن ہی کافی ہے" اور حضرتِ امیر مینائی کی اصلاح میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو آپ نے نواب صاحب کے اسلوب ادا میں بتائیں۔ یعنی "دوزخ نہ بھڑکاؤ" اس زحمت کی کیا ضرورت ہے میرے جلانے کے لئے تو میرے دل کی گرمی بھی کافی ہے" اس سے ایک خوبی تو یہ پیدا ہوئی کہ محبوب کو غیر سے محبت جتانے میں ایک اچھے اسلوب سے

ندہ کا گیا اور محبوب کا احترام بھی باقی رہا اسے فعل عبث کا مرتکب نہیں بتایا گیا لہٰذا "عذر گاہ نہ دوزخ" میں جو لطف ہے اسے زاہد خشک نہ سمجھے تو نہ سمجھے لیکن اہلِ درد محبت اس تکلیف کا احساس دوزخ کی آگ سے بھی زیادہ کرتے ہیں۔

شعر نواب ؎

غصے کا اثر صرف نہیں چہرے سے ظاہر — منہ پر کبھی دیتے تھے وہ ابرو کی شکن بھی

اصلاح امیر ؎

غصے کا اثر صرف نہیں چہرے سے ظاہر — منہ بہ کہے دیتی ہے وہ ابرو کی شکن بھی

توجیہہ قادری :- نواب صاحب کا دوسرا مصرع ناقص تھا "شکن دینا" ان معنوں میں روزمرہ کے خلاف ہے پھر ابرو کی شکن کے لئے منہ کے لفظ کی ضرورت نہ تھی جبکہ پہلے مصرع میں چہرے سے غصے کے ظاہر ہونے سے انکار ہے۔ اس لئے دوسرے مصرع میں (منہ) کا ذکر غلط تھا حضرت امیر مینائی کو اپنی اصلاح نواب صاحب کے الفاظ ہی سے ذہن میں آئی ہوگی لیکن اس طرف ذہن کا منتقل ہونا اور یہ مضمون پیدا کر دینا صرف **اہلِ لکھنؤ اور امیر صاحب کے حُسنِ تخیل کا کمال ہے دہلی والوں کو** یہ بات کبھی نہ سوجھتی۔

میری گذارش :- اس شعر کی توجیہہ میں آپ ایک بات بھول گئے یا وہاں تک آپ کی نظر نہ پہونچی، ورنہ ذکر ضرور کرتے وہ یہ کہ پہلے مصرع میں "نہیں" دوسرے مصرع کی خرابی سے غلط ہوا جا رہا تھا دوسرے مصرع میں منہ پر کبھی دیتے تھے وہ ابرو کی شکن بھی" کا تقاضا تو یہ تھا کہ پہلے مصرع میں "نہیں" کی بجائے "نہ تھا" ہوتا، لیکن حضرت امیر نے صرف ایک مصرع کی اصلاح سے یہ خرابی دور کر دی باقی رہا آپ کا یہ فرمانا کہ "یہ مضمون پیدا کر دینا اہلِ لکھنؤ اور حضرت امیر کے حسن تخیل کا کمال ہے دہلی والوں کو یہ بات کبھی نہ سوجھتی" تو یہ ایک ایسا غلط دعویٰ ہے جس کی دلیل آپ قیامت تک نہیں لا سکتے۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اہلِ دہلی اسے پسند نہ کریں اور معیوب سمجھیں، جیسا کہ آگے چلکر خود آپ نے داغ صاحب کی اس قسم کی اصلاح پر اظہار تعجب کیا ہے۔

شعر نواب ؎

تم نے جو پوچھا کہ دل میں ہے تیرے کیا ارماں — نہ رہا بس کوئی اب حسرت و ارماں مجھ کو

اصلاح امیر ؎

تم نے ارماں مرے دل کے جو پوچھے مجھ سے — کیا بتاؤں نہ رہا اب کوئی ارماں مجھ کو

توجیہہ قادری صاحب :- نواب صاحب کے پہلے مصرع میں (جو) کے واؤ کا اعلان اور (پوچھا) کے الف کا گرنا، دونوں فصاحت کے خلاف ہیں۔ دوسرے مصرع میں (حسرت و ارماں) دو چیزوں کا ذکر غیر ضروری بلکہ ناموزوں تھا جب پہلے صرف "ارماں" کہا ہے اور دو چیزوں کے لئے فعل واحد (نہ رہا) بھی غلط تھا۔ امیر صاحب کی اصلاح سے سب خامیاں اور خرابیاں رفع ہوگئیں۔ لیکن (کیا بتاؤں) کی مضمون کے لئے ضرورت نہ تھی اور اس واقعہ اور جذبہ کے موقع پر یوں کہا بھی نہیں کرتے۔ بیساختگی نواب صاحب ہی کے طرزِ ادا میں تھی۔ اس محل پر بے اختیار منہ سے یہی نکلتا ہے کہ

"بس اب کوئی ارماں نہیں"

میری گذارش :- قادری صاحب آپ یہاں "کیا بتاؤں" کو بے محل فرما رہے ہیں۔ حالانکہ اس "کیا بتاؤں" میں جو بے ساختگی، یاس اور درد پایا جاتا ہے وہ "نہ رہا بس" جیسے خشک ٹکڑے میں کہاں ایسے مواقع پر ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ بالکل اسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضرت امیر نے بنایا ہے "حسرت و ارماں" کے لئے فعل واحد (نہ رہا) بھی غلط بتایا جا رہا ہے مگر پروفیسر صاحب آپ نے پہلے مصرع میں لفظ "ارماں" پر غور نہیں فرمایا کہ واحد لکھکر (پوچھے) جمع کیوں بنا دیا گیا اور یہ کیونکر جمع ہو گیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ آپ اتنے پرانے ادیب (اور کچھ شاعر بھی) ہو کر اتنی بے خبری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ کیا ارشاد ہے پروفیسر صاحب غالب کے اس شعر اور اسی قسم کے اساتذہ کے ہزار ہا اشعار کے متعلق؟ ؎

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

بقول آپ کے غالب کا تین چیزوں کا ذکر کرنا پھر (ہے) واحد لکھنا تو سراسر غلط ہوگا!! ایک معمولی استعداد کا آدمی بھی جانتا ہے کہ جب چند چیزوں کا ذکر کرتے ہیں تو واؤ عطف لاکر کبھی فعل جمع اور کبھی واحد لکھا جاتا ہے۔ اور (جو) میں واؤ کے اعلان کو بھی غلط بتایا جا رہا ہے۔ کم از کم میرے لئے تو یہ بالکل نئی بات ہے یہ نکتہ ابھی تک میری نظر سے نہ گذرا تھا اور نہ اب تک کسی سے سنا۔ حضرت امیر فرماتے ہیں ؎

طلسم ناز تیرا سایۂ دیوار رکھتا ہے — بدلتا ہے پری کا بھیس جو دیوانہ آتا ہے

میں کیا کہوں کہ جو مجھے شوقِ وصال ہے
تم دیکھ لو فقیر کی صورت سوال ہے (داغ)

میری رائے میں تو نواب صاحب کا مصرع کھٹکتا تھا امیر صاحب کی اصلاح سے

ثقالت یا ناہمواری دُور ہوگئی اور شعر صاف ہوگیا۔

داغ دہلوی کی اصلاح

پروفیسر سید منظور علی صاحب ارشاد بی۔ اے نے حضرت داغ دہلوی مرحوم کی اصلاح کی توجیہ کی ہے اور توجیہ پر توجیہ پروفیسر قادری نے فرمائی ہے۔

شعر ارشاد ؎

اے دوستو دل لیکے وہ چٹکی میں ہمارا پھر اس طرح ملتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اصلاح داغ ؎

کیا ظلم ہے چٹکی میں وہ لیتے ہی مرا دل اس طرح سے ملتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

توجیہ ارشاد:۔ پہلے مصرع کی اصلاح نے مخاطبہ کو وسیع اور مقید اور دنیائے تخیل و تحیر کو آباد کر دیا "لیکے" کے بعد "پھر" کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ لہٰذا اس کے اخراج اور "سے" کے اضافے نے شعر کو رواں اور پُر تاثیر بنا دیا۔

توجیہ حامد:۔ اس شعر میں بس یہ بات تو درست ہے کہ "لیکے" کے بعد پھر کی ضرورت نہ تھی، باقی، ان کا یہ ارشاد کہ اصلاح نے مخاطبہ کو وسیع اور دنیائے تخیل و تحیر کو آباد کر دیا یا "سے" کے اضافے نے شعر کو رواں اور پُر تاثیر بنا دیا۔ محض زیب داستاں کے لئے ہے۔ ان میں سے کسی توجیہ کی کوئی حقیقت نہیں۔ نہ کچھ توسیع و افادہ ہوا ہے نہ کوئی آبادی بڑھی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ارشاد صاحب اصلاح کے اصلی وجوہ کو نہیں سمجھے۔ یہی کہا جائیگا کہ انھوں نے کسی مصلحت سے بیان کرنا نہ چاہا۔

بات یہ ہے کہ پہلے مصرع میں "اے دوستو" کا خطاب عامیانہ اور متروک ہے اور اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ (دوستو) کا (واؤ) گر رہا ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرع میں (طرح) کی (ح) ساقط ہوتی ہے ان دونوں وجوہ سے دونوں مصرعے نہایت سست ہو گئے تھے۔ اصل میں یہ عیب رفع کیا گیا ہے (اس طرح) کے بعد (سے) کے اضافے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ ہو یا نہ ہو۔ بالکل یکساں ہے اصل چیز لفظ (طرح) کا صحیح تلفظ ہے وہ استاد نے بنا دیا:۔

میری گذارش:۔ قادری صاحب آپ متروک اور عامیانہ ہونے کا حکم بہت جلد لگا دیتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ حکم آپ کا اپنا حکم ہوتا ہے یا کسی استاد کا "دوستو" سے زیادہ عامیانہ تو "یارو" یا "یار" ہے لیکن آپ کو یہ داغ کے کلام میں جگہ جگہ ملیگا۔ اس کے علاوہ جو توجیہیں بیان کی گئی ہیں ان سے مجھے اتفاق ہے (طرح) میں (ر) ساکن اور مفتوح دونوں طرح لکھتے ہیں لیکن یہاں (ح) ساقط از بحر تھی جو کسی طرح جائز نہیں اور حامد صاحب کا یہ فرمانا کہ (طرح) کے بعد (سے) کا ہونا نہ ہونا یکساں ہے" درست نہیں، یہ خلاف فصاحت ہے (طرح) کے بعد (سے) کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ اگرچہ اساتذہ احتیاط نہیں کرتے۔ بجائے (طرح سے) کے مصرع یوں بنا دیا جاتا تو تمام خامیاں دُور ہو جاتیں۔

"اس طور سے ملتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا"

شعر ارشاد ؎

رنج نے ساتھ مسرت میں بھی چھوڑا نہ کبھی وصل کی شب میں مجھے ہجر کا غم یاد آیا

اصلاح داغ ؎

رنج نے ساتھ خوشی میں بھی چھوڑا افسوس کہ شبِ وصل مجھے ہجر کا غم یاد آیا

توجیہ ارشاد: "وصل کی شب" میں اس قدر تناسب و توافق نہ تھا جس قدر کہ "شب وصل" میں ہے۔ بقول علامہ شبلی مرحوم: "کلام کی فصاحت میں لفظ کا صحیح ہونا ہی کافی نہیں۔ بلکہ یہ ضروری ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے ہیں۔ انکی ساخت، ہیئت، نشست، سبکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو، ورنہ فصاحت کا خون ہوگا"

توجیہ قادری صاحب:۔ معلوم ہوتا ہے ارشاد صاحب کو خاص شوق و ملکہ ہے کہ بات کو چکر دیکر غلط مبحث پیدا کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی اصلاح کا اصلی سبب بیان نہ کیا (وصل کی شب) اور (شب وصل) کا تناسب و توافق کیا چیز ہے اور علامہ شبلی کا قول یہاں کیونکر صادق آتا ہے۔ اس کو ارشاد صاحب نے ارشاد نہیں فرمایا اور جو کچھ لکھا اس سے دھوکا ہوتا ہے کہ شب وصل اور وصل کی شب میں فارسی و اردو ترکیب اور اضافت سے کوئی فرق پیدا ہو رہا ہے۔ دوسرے اگر یہی بات تھی تو صرف دوسرے مصرع کی اصلاح کی جاتی، پہلے مصرع کی ترمیم کا کوئی سبب بیان نہیں فرمایا۔

اصل توجیہ یہ ہے کہ رنج کا مقابلہ مسرت سے نہیں بلکہ خوشی سے ہے۔ دوسرے مصرع کی اصلاح کا سبب ہے کہ اوّل تو (وصل کی شب) کے بعد (میں) کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی دوسرے (میں مجھے) تنافر حروف پیدا کر رہا ہے۔

میری گذارش:۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے ارشاد صاحب کی توجیہ کی تردید کی قسم کھائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ علامہ شبلی کا قول یہاں صادق نہیں آتا حالانکہ لفظ بلفظ صادق آرہا ہے یہ تو سب جانتے ہیں کہ (وصل کی شب) اور (شبِ وصل) میں کوئی

فرق معنًا نہیں ہے لیکن شب وصل بنا دینے سے وہ ثقالت جاتی رہی یا نہیں جو (وصل کی شب میں مجھے) میں تھی ؟ اور یہی شبلی صاحب کا قول ہے کہ نشست الفاظ اور سبکی و گرانی کا لحاظ رکھا جائے بالکل وہی صورت ہے ایک عجیب بات آپ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ رنج کا مقابلہ مسرت سے نہیں ہے معلوم نہیں یہ رنج، کے ساتھ خوشی، کی کب عقد خوانی ہوئی ہے یا خود آپ نے یہ کلیہ بنالیا ہے۔ یا داغ صاحب کی اصلاح سے یہ نتیجہ نکالا ہے اگر یہ خود ساختہ قاعدہ ہے تو آپ کو چاہئے کہ رنج، غم، الم، حزن، ملال وغیرہ کا بھی مسرت، شادمانی، انشاط، بہجت وغیرہ سے دامن باندھ دیں کہ فلاں لفظ کے مقابلہ میں فلاں لکھا جائے اور فلاں کے ساتھ فلاں۔

افسوس کہ دور از کار توجہات کی وجہ سے آپ دوسری طرف توجہ نہ کرسکے اگر آپ مرزا داغ کی اصلاح پر غور کرتے تو کہ "شب وصل مجھے ہجر کا غم یاد آیا" میں (کہ) کو بے معنی اور بے ضرورت سمجھنے میں کامیاب ہوجاتے اور اُس کے بعد اپنی اصلاح یوں پیش فرماتے :-

وصل کی رات مجھے ہجر کا غم یاد آیا

مگر "یاد آیا" بھی کچھ بیکار ہی سا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے پہلے مصرع کی ساخت الفاظ تو یہ چاہتے ہیں کہ بجائے "یاد آیا" کہ "یاد رہا" ہوتا یعنی مصرع یوں ہوجاتا۔

وصل کی رات مجھے ہجر کا غم یاد رہا

اور "وصل کی رات" کے بعد "میں" کی ضرورت تو نہیں ہوتی لیکن کیا کیا جائے کہ اساتذہ بھی بسا اوقات مجبور ہوجاتے ہیں اور ایسے الفاظ لکھنے ہی پڑتے ہیں مثلاً :-

غیر کا قصہ شب وصل میں کیوں لے بیٹھے　　باتوں باتوں میں یونہی وقت گزر جائیگا
کھالیا ہم نے شب وصل میں سب خونِ جگر　　روزِ فرقت ہمیں اب صاف گزر جائیگا
(داغ)

اور حضرت امیر مینائی تو اتنا عجز کا ثبوت دیتے ہیں کہ تنافر حروف بھی دور نہیں فرماتے۔ مثلاً سے

کیا وصل کی شب میں مشکلیں ہیں
فرصت ہے کم آرزو بہت ہے　(امیر)

مختصر یہ کہ اصلاح سے شعر میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی، صرف اتنا کہ شعر پہلے سے ذرا صاف ہوگیا۔

شعر ارشاد سے
بننے سنورنے سے انھیں فرصت نہیں ملی　　ہم لے چلے جنازہ شہیدِ نگاہ کا

اصلاح داغ سے
سُرمہ لگانے سے انھیں فرصت نہیں ملی　　ہم لے چلے جنازہ شہیدِ نگاہ کا

توجیہہ ارشاد :- محض ایک لفظ کی درستی سے قافیہ کس قدر مضبوط اور موزوں بنادیا۔ سبحان اللہ،

توجیہہ قادری صاحب :- حضرت داغ کی اصلاح کے متعلق ارشاد صاحب کی تو یہ رائے ہے اور میری رائے یہ ہے کہ اس اصلاح کی حضرت داغ سے توقع نہ تھی۔ یہ بات نہیں کہ غلط ہے، بلکہ یہ رعایت لفظی اس عامیانہ حد تک ہے جو اہلِ لکھنؤ ہی سے مخصوص ہے مرزا داغ نے اپنے تمام کلام میں اس طرح سے[1] سرمہ لگانے کا ذکر نہ کیا ہوگا۔ سُرمہ۔ مسّی۔ پان کا ذکر اہلِ دہلی کے ہاں[2] شاذ و نادر ہی ہوگا وہ بھی صرف مناسبت الفاظ پیدا کرنے کی خاطر ایک جگہ بھی نہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ارشاد صاحب کا مصرع شستہ و فصیح نہیں ہے اس لئے بدلنے کی ضرورت یقینی تھی لیکن صرف "آرائش جمال" کا ذکر اور بننے سنورنے کے ہم معنی لفظ کا ہونا کافی تھا۔

میری گذارش :- قادری صاحب آپ نے صرف دو لفظ یاد کرلئے ہیں "عامیانہ" اور "متروک" اور یہی ہر جگہ چسپاں کردیتے ہیں۔ رعایت الفاظ کی مثالیں اساتذۂ دہلی کے کلام میں موجود ہیں۔ خاص کر مومن خاں نے تو اپنے مقطع میں اس کا بہت زیادہ خیال رکھا ہے۔ اِن کے علاوہ نسیم۔ غالب۔ داغ وغیرہ کے کلام بھی اس سے خالی نہیں، ہاں اس کا بطور خاص اہتمام نہ کیا جائے وہ دوسری بات ہے لیکن احتراز نہیں کرتے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں سے

کونسا یہ خاکسار آتا ہے دیکھ او شہسوار (نسیم)　اک بگولا سا قریب گرد توسن آگیا
آپ کی آنکھوں میں کسطرح نہ ٹیسو پھولے (داغ)　زردی چہرہ بیمار اثر کرتی ہے
جو تھیں آنکھیں تو پلکیں بھی کوئی دم کی ہیں (〃)　رہی ہیں بس یہی آنکھوں کی سوئیاں باقی
کیا کیا بڑھی ہے ناز سے شام شب فراق (ظہیر)　لے لیکے لمبیاں تری زلفِ سیاہ کی
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا (غالب)　یہ زمرد بھی حریفِ دم افعی نہ ہوا

یہ چند مثالیں ہیں جن سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اساتذہ دہلی رعایت لفظی کو

---

[1] (طرح) کے بعد (سے) نثر میں لکھنا شریعتِ ادب میں گناہِ کبیرہ ہے۔

[2] بجائے (یہاں) کے (ہاں) متروک و مردود ہے۔ معلوم نہیں قادری صاحب زمانۂ ماضی میں کیوں لوٹ گئے جبکہ آپکی زبان پر "عامیانہ" اور "متروک" چڑھا ہوا ہے۔ ——— قمر

گا دہیں سمجھتے۔ داغ صاحب نے ارشاد صاحب کے پہلے مصرع سے "بنے سنورنے" کی ثقالت دور کی ہے اور رعایت لفظی کو اس گنجلک انداز پر ترجیح دی ہے اگر آپ کو اس کی توقع نہ ہو تو اپنی ذوق کی اصلاح فرمائیں۔ داغ صاحب کو موردِ الزام کیوں سمجھتے ہیں؟

شعر ارشاد

اندھیر دیکھئے یہ نسیم بہار کا	گل کر دیا چراغ ہماری مزار کا

اصلاح داغ

اچھا سلوک ہے یہ نسیم بہار کا	گل کر دیا چراغ ہمارے مزار کا

توجیہہ ارشاد:— اوّل تو استاذی مرحوم نے "گل کر دیا" کو دو معنی پہنانے کا خیال قائم کیا۔ پھر اپنی فطری ودیعت سے "سلوک" کا لفظ تلاش کیا جو ایسا لفظ ہے کہ اس سے دو کام لئے یعنی نسیم بہار کے ظلم کو کتنی خوبی کے ساتھ کرم سے بدل دیا اور طرح زمینِ شعر کو آسمان پر پہونچا دیا۔

توجیہہ قادری صاحب:— جناب ارشاد صاحب نے یہ توجیہہ بھی عجیب فرمائی ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ یعنی داغ مرحوم نے نہ "گل کر دیا" کو ۲ دو معنی پہنائے ہیں نہ "سلوک" کے لفظ سے ۲ دو کام لئے ہیں۔ نہ نسیم بہار کے ظلم کو کرم سے بدلا ہے۔ ارشاد صاحب نے "اندھیر" کی جگہ "سلوک" دیکھکر وہ باتیں سمجھی ہیں۔ حالانکہ (گل کر دیا) کا دوسرا مفہوم (پھول بنا دیا) یہاں بالکل بے معنی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ "سلوک" کا لفظ اچھے بُرے دونوں برتاؤ کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن (اچھا سلوک) ایسے موقع پر جیسا یہاں ہے ہمیشہ بُری معاملے کے لئے آتا ہے۔ "آپ نے یہ اچھا سلوک کیا"۔ "یہ اُن کا اچھا سلوک ہے" یہ فقرے ہمیشہ طعنہ کے طور پر بدسلوکی کے لئے بولتے ہیں۔

ارشاد صاحب کے شعر میں جہاں استاد مرزا داغ مرحوم نے جس وجہ سے "اندھیر" کا لفظ بدلا ہے۔ اُس کی لائق شاگرد نے قدر نہ کی اور داد نہ دی۔ اصل میں "اندھیر" کا لفظ چراغ اور گل کرنے کی مناسبت سے بہت پامال عامیانہ اور لکھنوی تخیل کا لفظ تھا اس کے مقابلے میں "اچھا سلوک" بھی وہی مفہوم رکھتا ہے۔ لیکن اس میں لطیف طنز اور ہجو ملیح بھی ہے۔

یہاں حضرت داغ مرحوم کی فکر و پسند کا بھی دلچسپ تلوّن نظر آتا ہے کہ ایک جگہ سُرمہ لگانے کا عامیانہ مضمون خود تلاش کر کے رکھدیا اور دوسری جگہ ویسا ہی عامیانہ لفظ "اندھیر" نکال دیا۔

میری گذارش:— میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قادری صاحب آپ نے ایک سبق یاد کر لیا ہے "عامیانہ اور متروک" اور ہر جگہ اُسے چسپاں کر دیتے ہیں۔ جہاں امیر صاحب اس قسم کی اصلاح فرماتے ہیں تو آپ امیر صاحب کا کمال بتاتے ہیں کہ "کسی دہلوی استاد کو یہ بات کبھی نہ سوجھتی" اور جہاں داغ صاحب اس قسم کی اصلاح فرما دیتے ہیں تو اُن کی تلوّن طبعی پر محمول کیا جاتا ہے اگر "اندھیر" عامیانہ لفظ ہے تو حامد صاحب کو چاہئے کہ "امیر اللغات" سے یہ لفظ چھیل ڈالیں جس کے معنی اور محاورات امیر صاحب نے یہ سب لکھے ہیں انھیں بھی متروک و مردود فرمائیں۔

اندھیر۔ ہ مذکر۔ قہر، ستم، آفت، غضب

مسجد میں گئے وہ بال کھولے (امیر) اندھیر کیا خدا کے گھر میں

آج اندھیر ہے گر وصل نہ ہو (صبا) رات آئی ہے کہاں جائیگا

بے انصافی۔ بدنظمی۔ کسمپرسی وغیرہ کی جگہ

زلفوں نے دل کو چھین لیا رُخ کی دید میں
لوٹا ہے دن دہاڑے یہ اندھیر دیکھئے (وزیر)

واہ رے اندھیر بہر روشنیٔ شہر مصر	دیدۂ یعقوب سے نورِ نظر جاتا رہا

فقرے۔ اپنی اپنی طرف سب لوٹے کھاتے ہیں ایک اندھیر ہے

واہ رے اندھیر جس کا مال جائے وہی بندھا بندھا پھرے۔

سیاہ تاریک رنج و غم کی جگہ

دھیان زلفوں کا بندھا ہو گئی دنیا تاریک	اے سحر کیا میں کہوں آپ سے شب کی تشویش

عالم مری آنکھوں میں جو اندھیر ہے جو آرت	جانے کا ارادہ ہے یہ کس رشکِ قمر کا

(امیر اللغات صفحہ ۲۵۸)

اتنی مثالوں کے بعد آپ کا فیصلہ کہ "اندھیر" عامیانہ لفظ ہے کتنا قابل قدر ہے اور آپ نے اسے عامیانہ کہہ کر اردو پر کیسا احسانِ عظیم کیا ہے!!

دراصل داغ صاحب نے بجائے "اندھیر" کے "سلوک" اسی لئے بنایا ہے کہ اس موقع پر "سلوک" بنانے سے شعر پہلی صورت سے بہت اچھا ہو گیا کیونکہ "اندھیر" کے ساتھ "دیکھئے" بھی بدنما معلوم ہو رہا تھا اور "اچھا سلوک" نے شعر کو بلند اور صاف بنا دیا۔ باقی رہا آپ کا ارشاد۔ کہ "لائق شاگرد نے اس اصلاح کی قدر نہ کی"۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ لائق شاگرد نے اس سے زیادہ قدر کی جتنی کرنی چاہئے تھی کیونکہ جوشِ عقیدت میں وہ معانی بھی پہنا دئے جو یہاں کسی طرح پیدا نہیں ہوتے۔

شعر ارشاد

جادو ہوا ہے دل پہ کسی چشم یار کا	شکوہ عبث ہے گردشِ لیل و نہار کا

اصلاح داغ ؎

ایما رسے ہوا ہے مگر چشمِ یار کا — شکوہ عبث ہے گردشِ لیل و نہار کا

توجیہہ ارشاد:۔ چشمِ یار کو دل کی جانب سے لیل و نہار کی گردش کی طرف کس نزاکت اور تکلف سے پھیر دیا اور ایمار کی تلاش جس انتہائی بلند پروازی سے کی گئی ہے وہ کسی اور استاد کی قوتِ متخیلہ سے کہیں بلند تر ہے۔

توجیہہ قادری صاحب:۔ یہاں بھی ارشاد صاحب نے اصلی سببِ اصلاح بیان نہیں کیا اور باتیں بڑے تکلف اور بلند پروازی کے ساتھ لکھدیں۔ اصلاح کی اصلی وجہ یہ تھی کہ ارشاد صاحب کے پہلے مصرع میں (کسی) کا لفظ زبان اور گرامر کے لحاظ سے بالکل غلط تھا (کسی چشمِ یار) کے یہ معنی ہیں کہ داہنی آنکھ یا بائیں آنکھ۔ ارشاد صاحب کی مراد (کسی یار کی آنکھ) ہے لیکن اس مفہوم کے لئے وہ الفاظ درست نہیں ہیں۔ استاد داغ کو یہ عیب دور کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اصل شعر کے مضمون سے بہتر مضمون اُن کے ذہن میں آگیا۔ ارشاد صاحب کا مضمون یہ تھا کہ دل کی موجودہ حالت گردشِ لیل و نہار کے سبب سے نہیں بلکہ چشمِ یار کے جادو سے ہے گردشِ لیل و نہار کا کوئی قصور نہیں۔ اس لئے اس کا شکوہ عبث ہے۔ استاد نے بلا شبہ اس سے لطیف تر مضمون پیدا کر دیا کہ ہماری اس حالت کا سبب بظاہر تو گردشِ لیل و نہار ہی ہے لیکن اس میں گردشِ لیل و نہار کا اپنا اختیار شامل نہیں ہے۔ بلکہ اس کو چشمِ یار کی طرف سے ایما ہوا ہے۔ اور ہماری گردشِ تقدیر چشمِ یار کی رضا و پسند سے ہے۔

میری گذارش :۔ ارشاد صاحب نے جس طرح اصلی سبب چھوڑ کر دوسری باتیں بلند پروازی کے ساتھ بیان کردی تھیں، اسی طرح آپ نے بھی بلند پروازی دکھائی صرف فرق اتنا ہے کہ آپ نے ایک سببِ اصلاح بیان فرمایا یعنی (کسی چشمِ یار) مگر یہ نہیں بیان فرمایا کہ "جادو ہوا" کیوں بدلا گیا شاید آپ کو معلوم نہیں کہ (جادو ہونا) کوئی محاورہ نہیں ہے ورنہ وہ کبھی نظر انداز نہ فرماتے جب ایک معمولی بات کو بھی زیادہ سے زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان فرماتے ہیں۔ اگر "جادو ہونا" محاورہ ہوتا تو داغ صاحب اسے بجائے بدلنے کے یوں بناتے ؎

جادو ہوا ہے اس پہ مگر چشمِ یار کا — شکوہ عبث ہے گردشِ لیل و نہار کا

مگر قادری صاحب یہ بات آپ کی سمجھ میں کہاں آسکتی تھی حالانکہ بہت معمولی ہے۔

شعر ارشاد ؎

اُن کی حیا ہے میرے لئے اور بھی ستم — عالم نہ پوچھئے نگہِ شرمسار کا

اصلاح داغ ؎

تھی وہ ادائے عذرِ ستم اور بھی ستم — عالم نہ پوچھئے نگہِ شرمسار کا

توجیہہ ارشاد:۔ محبوب کی جس شرمیلی ادا کو سامنے رکھکر شعر کہا گیا تھا وہ بولتی ہوئی تصویر استاد نے "ادائے عذرِ ستم" سے کھینچی اور شعر کے اصلی معنی کو پیدا کر دیا

توجیہہ قادری صاحب:۔ ارشاد صاحب کی یہ توجیہہ بھی پُر لطف ہے یعنی استاد کی نازک خیالی کو بھی اپنی ہی فکر و تخیل سے منسوب کر لیا۔ ارشاد صاحب تو صرف اتنا کہتے ہیں کہ "نگہِ شرمسار کا عالم نہ پوچھئے" یہ حیا اور بھی ستم کرتی ہے۔ اس میں "ادائے عذرِ ستم" کا مضمون کدھر سے نکلتا ہے "نگہِ شرمسار کے بہت سے سبب ہو سکتے ہیں۔

میری گذارش :۔ یہاں بھی حامد صاحب نے ارشاد صاحب پر طنز فرمادیا لیکن خود کوئی توجیہہ نہیں فرمائی صرف "استاد کی بلند پروازی" کی طرف اشارہ کر دیا۔ "حیا" سے "عذرِ ستم" کا مضمون کیوں نہیں پیدا ہوتا جہاں "حیا" کے اور بہت سے سبب ہو سکتے ہیں وہاں "عذرِ ستم" بھی سبب بن سکتا ہے جس نے شعر کہا ہے اس کا بیان ہے کہ "محبوب کی جس شرمیلی ادا کو سامنے رکھکر شعر کہا گیا تھا۔ استاد نے اس کی "تصویر عذرِ ستم سے کھینچ دی۔ اس لئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارشاد صاحب اپنا مافی الضمیر ادا کرنے سے معذور تھے کہنا ہی چاہتے تھے لیکن کہہ نہ سکے۔ استاد کی نظر وہاں پہنچی اور بیک جنبشِ قلم وہ بات پیدا کر دی۔

مولانا سیماب اکبرآبادی کی غزل پر اصلاح

شعر سیماب ؎

گراں سمجھ کے جسے سب نے یہ کہا کہ نہیں — وہ بار دوش پہ میں نے اٹھا لیا کہ نہیں؟

اصلاح سیف ؎

وہ بار جس پہ اک عالم پکار اٹھا کہ نہیں — اُٹھاتے وقت مجھے سر کا ہوش تھا کہ نہیں

توجیہہ قادری صاحب:۔ سیماب صاحب کا مطلع بالکل درست تھا، لیکن مضمون معمولی تھا، کوئی لطف و جدت نہ تھی۔ سیف صاحب کی اصلاح نے مضمون کو بہت بلند کر دیا اب اس مطلع کا جواب نہیں "سر کا ہوش تھا کہ نہیں" کیا خوب کہا ہے لیکن پہلے مصرع میں ایک عیب پیدا ہو گیا جو بغیر احاطۂ فن کے نظر نہیں آیا کرتا یعنی (عالم) کا عین گر رہا ہے اس کو اس طرح کہہ سکتے تھے ؎

وہ بار جس پہ زمانہ پکار اٹھا کہ نہیں — اُٹھاتے وقت مجھے سر کا ہوش تھا کہ نہیں

میری گذارش :۔ قادری صاحب کو یہ اعتراف ہے کہ مطلع میں ایک غلطی

ہوگئی ہے جو بغیر احاطۂ فن نہیں معلوم ہوا کرتی پھر ایسے بیگانۂ علم و فن کی اصلاح کی توجیہ کرنی بھی خارج از عقل ہے۔ قادری صاحب بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں، توجیہ کرتے وقت آپ کو اپنے "سر کا ہوش تھا کہ نہیں"؟ کیا میں یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ آپ علم قوافی سے بے بہرہ ہیں۔ جب مطلع میں آپ نے "اٹھا" اور "تھا" بنادیا تو باقی اشعار کے قوافی کی کیا صورت ہونی چاہئے تھی۔ قادری صاحب یہ کیا طفلانہ حرکت ہے؟ لطف یہ کہ آپ نے اپنی اصلاح بھی پیش فرمادی۔ اگر آپ اب بھی نہیں سمجھے تو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس صورت میں (ہ) کی قید ہوگی۔ ہر قافیہ میں اور یہ التزام ہر شعر میں رہنا چاہئے۔ آپ بھی اگرہ میں ہیں کاش سیماب صاحب کے کسی شاگرد ہی سے دریافت فرما لیتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ رہی سیف کی اصلاح تو اس سے جہالت کا اظہار صاف طور پر ہو رہا ہے۔ آپ ہی جیسے لوگ ایسی اصلاح کو سراہ سکتے ہیں۔ اصل مطلع اور اصلاحی مطلع کی حقیقت کسی اہل نظر سے پوچھئے۔

موافق ہوجائیگا۔ مولانا کے اور دو شعر اسی قبیل کے ملاحظہ ہوں:-

فطرتِ طلب معلوم ہاں گر یہ دیکھ لے　　جس نے چھوڑ دی دنیا اُسکے ساتھ دنیا تھی

جادۂ توکل بھی اک عجیب جادہ تھا　　میں جدہر بھی جاتا تھا ٹھوکروں میں دنیا تھی

استاذی جناب سیف کی اصلاح کی حقیقت اور قادری صاحب کی توجیہات پر غور کیجئے، نا اہلیت کی داد دیجئے۔ سیف کو تو دُور کی سوجھی ہی تھی لیکن ہمارے پروفیسر صاحب کو اُن سے بھی دُور کی سوجھی۔ اگر بخت و تقدیر آپ کے موافق ہی ہوں تو یہ کونسا کمال ہوگا اور آپ کی کونسی علو ہمتی کا ثبوت سمجھا جائیگا۔

قادری صاحب کو مدعی میں تشدید ثقیل معلوم ہوتی ہے اس لئے کیوں نہ وہ تمام اساتذہ کے کلام پر نظر ثانی فرماکر اس قسم کی اضافتوں کو نکالدیں۔ خصوصاً کلام غالب کی۔ قادری صاحب نے یہ باریکی بیان فرماکر اپنی جس سادہ لوحی کا ثبوت دیا ہے وہ داد کا مستغنی ہے۔

شعر سیماب ؎

نہ مدعیٔ زمانہ ہو میں نہ کہتا تھا　　زمانہ اب ہے ترے حسبِ مدعا کہ نہیں

اصلاح سیف ؎

اُٹھا ہے تُو جو زمانے کا مدعی بن کر　　زمانہ بھی ہے ترے حسبِ مدعا کہ نہیں

توجیہ قادری صاحب:- سیماب صاحب کا شعر اپنے مفہوم میں پورا ہے۔ اس مضمون کو پیشِ نظر رکھکر کسی ترمیم کی ضرورت نہ تھی لیکن سیف نے اسی مضمون میں جو بات نکالی وہ بھی خوب ہے اور جس اسلوب سے کہی ہے۔ اس میں بڑی ندرت ہے۔ حقیقت میں خوب سوجھی۔ سیف صاحب کے شعر میں پہلے "زمانے" سے مراد "عالم" اور دوسرے "زمانہ" سے بخت و تقدیر۔ کہتے ہیں کہ تو جو زمانہ کا مدعی بنکر اُٹھا ہے تو تیرا زمانہ بھی حسب مدعا ہے۔ تیری تقدیر بھی موافق ہے یا نہیں۔ بخت کی سازگاری کے بغیر تو زمانے کا کیا کرسکتا ہے۔

سیماب صاحب کے پہلے مصرع میں (مدعیٔ زمانہ) سے ثقل پیدا ہوگیا۔ ایک تشدید مدعی میں پہلے سے تھی۔ دوسری اضافت سے پیدا ہوگئی۔ اگر اس کے بغیر چارۂ کار نہ ہو تو بیشک جائز ہے لیکن یہاں ناگزیر نہ تھا، یوں کہہ سکتے تھے:-

"نہ مدعی ہو زمانہ کا میں نہ کہتا تھا"

میری گذارش:- مجھے یقین ہے کہ حامد صاحب شعر ہی نہیں سمجھے ورنہ ایسی نافہمی کا اظہار نہ کرتے۔ مولانا سیماب کا مفہوم ہی دوسرا ہے وہ فرماتے ہیں کہ "زمانے کے حصول کی کوشش نہ کر میں تجھ سے نہیں کہتا تھا کہ اس صورت میں زمانہ تیرے

شعر سیماب ؎

فضا خموش، اعزہ نڈھال، تم محتاط　　کوئی ہمارا جنازہ اُٹھائیگا کہ نہیں؟

اصلاح سیف ؎

اُنھیں حجاب، عدو شادماں عزیز نڈھال　　مرا جنازہ بھی کوئی اُٹھائیگا کہ نہیں؟

توجیہ قادری صاحب:- یہاں سیماب صاحب کے شعر میں بیشک اصلاح کی ضرورت تھی۔ فضا کے سکوت و تکلّم یا سکون و حرکت کو جنازہ اُٹھانے نہ اُٹھانے سے کوئی تعلق نہیں۔ خدا جانے سیماب صاحب کو یہ کیا سوجھی۔ سیف صاحب نے تینوں متعلق باتیں جمع کردیں۔ اس کے علاوہ سیماب صاحب کے شعر میں "تم محتاط" کی احتیاط و اہتمام کی کیا ضرورت تھی۔ "حجاب" نہایت موزوں حسب موقع اور صحیح جذبہ کا لفظ ہے (ہمارا جنازہ) کے مقابلہ میں (مرا جنازہ) میں جو اثر ہے اور (بھی) میں جو درد ہے۔ وہ بھی اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہیں۔

میری گذارش:- پہلے میں حامد صاحب کو "فضا" کے معانی بتادوں اس کے بعد شعر کا مطلب سمجھاؤنگا۔

فضا:- زمین فراخ و فراخیٔ زمین وکشادگیٔ صحن خانہ و میدان۔ از منتخب و بحر الجواہر و منزل، وکشف و صراح۔　(غیاث اللغات)

آپ کا یہ فرمانا کہ "فضا کو جنازہ اُٹھانے نہ اُٹھانے سے کیا تعلق"؟ ہنسی آتی ہے کہ اس پر آپ کی نظر کیوں گئی۔ اور یہ بات کس طرح لکھدی۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے

کہ آپ نے شعر ہی نہیں سمجھا۔ مولانا سیماب فرماتے ہیں۔ اعزہ تو روتے روتے نڈھال ہوچکے ہیں اور وہ محتاط ہیں، اُن کی احتیاط یا تو اس لئے ہے کہ وہ میت سے خوف کھاتے ہیں یا رسوائی سے ڈرتے ہیں کہ کہیں مجھ سے کسی ایسی بات کا اظہار نہ ہو جائے جس سے لوگ یہ سمجھ جائیں کہ مرحوم سے کوئی خاص لگاؤ تھا، یا زندگی میں نہ پوچھا اب مرنے کے بعد اس کی تلافی کررہے ہیں غرض کوئی وجہ احتیاط ضرور ہے۔ اس کے بعد فضا (صحن خانہ) میں بالکل سکون ہے یعنی مرنے والے سے جن سے قربت تھی وہ نڈھال ہوچکے ہیں اب جنازہ اُٹھانے کا کون سامان کرے۔ اس وجہ سے فضا میں سکوت ہے۔ کوئی سامان نہیں ہورہا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا سیماب نے "اعزہ" لکھا ہے اور اصلاح میں "عزیز" واحد لکھا گیا ہے جو قادری صاحب کے قاعدہ کے اعتبار سے غلط ہے۔ جیسا آپ نے امیر صاحب کی اصلاح میں فرمایا ہے کہ "حسرت وارماں" کے ساتھ "نہ رہا" لکھنا غلط ہے۔ پھر یہاں "عزیز" لکھنا کیونکر درست ہوگیا۔ اور آپ کا یہ فرمانا کہ "سیف صاحب نے تینوں متعلق باتیں جمع کردیں"! وہ باتیں آپ کو مبارک ہوں۔ مولانا سیماب تو کیا اُن کا کوئی ادنیٰ شاگرد بھی "عدو شادماں" جیسی ترکیب لکھنا ننگ سمجھتا ہے اور "بھی" میں آپ کو درد معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ "بھی" نے شعر ہی غلط کردیا۔ لیکن یہ بات آپ جیسے نام نہاد ادیبوں کو نہیں سوجھ سکتی۔ دیکھئے "بھی" سے یہاں یہ مفہوم پیدا ہورہا ہے کہ بہت سے جنازے پڑے ہوئے ہیں اور لوگ یکے بعد دیگرے اُٹھا رہے ہیں۔ لیکن ایک جنازہ ہے کہ اسے کوئی ہاتھ نہیں لگاتا اُدھر کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ یہ ہے "بھی" کی معنویت جس میں آپ نے بتایا کہ "درد" ہے۔ مجھے بھی اعتراف ہے کہ اس میں درد ہے لیکن آپ نے جو سمجھا ہے وہ نہیں، بلکہ یہ کہ اہلِ ذوق سر دُھن لیں سیف صاحب نے سلیفیت سے کام تو لیا ہی تھا لیکن آپ کی تائید "سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا" کے مرادف ہوگئی۔

جس شعر پر سیف جیسے جاہل اور گمنام شاعر نے اصلاح دی ہے اور جسے قادری صاحب نے بغضِ معاویہ کے طور پر ہفت افلاک پر پہونچایا ہے وہ شعر اُردو شاعری کا شاہکار ہے مولانا سیماب نے جس لطیف مگر دردناک پیرایہ میں شعر کہا ہے اُسے صاحبانِ ذوق سے پوچھئے کور ذوق کیا جانیں۔ "فضا خموش" اور "محتاط" ہی تو شعر کی جان ہیں "اُٹھائے گا کہ نہیں" میں خود زور اور درد موجود ہے۔ "بھی" کی لغویت سیف اور قادری صاحب ہی کو مبارک رہے۔

شعر سیماب ؎

جب آنکھ ملتی ہے ان سے تو غور کرتا ہوں — نظر کے ساتھ ہے دل کا معاملہ کہ نہیں

اصلاح سیف ؎

نگاہ ملتے ہی ہوتی ہے جستجو مجھ کو — نظر کے ساتھ ہے دل کا معاملہ کہ نہیں

توجیہ قادری صاحب:۔ سیف کی اصلاح نے شعر کو نہایت خوبصورت اور دلکش بنادیا۔ ساری غزل میں صحیح تغزل کا شعر اس سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ اس مضمون کا سیماب صاحب ہی کے سر سہرا ہے لیکن انھوں نے غور نہیں فرمایا ورنہ (غور کرتا ہوں) نہ لکھتے "جستجو ہونا" اصلی اور صحیح جذبہ ہے "غور کرنا" علم و فلسفہ کا نتیجہ ہے "جستجو" عشق و اضطراب کا (آنکھ ملنا) دونوں صحیح محاورے ہیں۔ لیکن "نگاہ ملنا" چونکہ واقعہ ہوتا ہے۔ اس لئے زیادہ لطیف و نازک ہے۔ یہی وجہ سے اساتذہ نے "آنکھ ملنا" کم لکھا ہے اور "نگاہ ملنا" بہت زیادہ استادوں کے کلام پر نظر ڈالنے سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

میری گذارش:۔ قادری صاحب آپ نے اس اصلاح کی جتنی توجیہیں کی ہیں وہ بھی آپ کی ناسخن فہمی اور فقدانِ علمیت کی غمازی کررہی ہیں "جستجو" عشق و اضطراب کا نتیجہ تو ہے لیکن دل کا معاملہ معلوم کرنے کے لئے جستجو کی ضرورت ہے یا غور کی؟ اسے اس طرح سمجھئے کہ کوئی طالب علم آپ کے پاس آئے اور کہے کہ پروفیسر صاحب اس شعر کا مطلب کیا ہے؟

> ہر چہ بر ما می رود گر بر شتر رفتے زغم
> می زدندے کافراں در جنت الماویٰ قدم

اور آپ کی سمجھ میں نہ آرہا ہو وہ جواب کے لئے جلدی کرے۔ تو کیا آپ اس وقت اس سے یہ فرمائیں گے کہ ذرا ٹھہرو "جستجو" کرلوں پھر بتاتا ہوں۔ یا یہ فرمائینگے کہ ذرا غور کرلوں آپ نے (نگاہ ملنا) اور (آنکھ ملنا) کی جو بحث کی وہ بھی داد سے مستغنی ہے اگر آپ کو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ہوتی تو سمجھ میں آتا کہ علامہ سیماب کے پہلے مصرع میں (آنکھ ملنا) اور دوسرے میں (نظر) موجود ہے اور سیف کی اصلاح کے پہلے مصرع میں "نگاہ" اور دوسرے میں "نظر" ہے اس خامی کا سمجھنا اور سمجھانا بیکار ہے بہت موٹی بات ہے لیکن آپ کے لئے دشوار ہے آپ کو اگر ادب میں واقعی کوئی دخل ہوتا (اگرچہ اس مضمون سے بالکل نہیں معلوم ہوتا) تو سیماب کو پہچاننے اور اُن کے کلام کی اصلاح کی توجیہ میں اتنی تنگ نظری کا ثبوت نہ دیتے۔ آپ کو علامہ سیماب کی عظمت پر رشک ہوتا ہے تو اپنے ضمیر کی اصلاح کی کوشش کیجئے۔ آپ کی اس خاکبازی سے اُن کے آفتابِ شاعری کی ضیا میں کوئی کمی نہیں ہوسکتی میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آپ کی علمیت اور واقفیت اتنی ہی ہے تو سیماب صاحب کے کسی شاگرد سے استفادہ کیجئے۔ کچھ دنوں کے بعد آپ اپنے اندر نمایاں فرق محسوس کرینگے۔ میری تشریح سے تو آپ نے سمجھ لیا ہوگا (اگر واقعی اتنی

صلاحیت ہے) کہ علامہ سیماب کے رکھے ہوئے الفاظ میں متناوزن ہے انھیں جنبش دیدلیا، آپ اور سیف کا تو کیا ذکر! کسی اچھے سے اچھے شاعر کا بھی بوتہ نہیں ہے۔

شعر سیماب ؎
معاملہ نفسِ واپسیں تک آپہنچا　　ابھی ہوئی ہے محبت کی ابتدا کہ نہیں؟

اصلاح سیف ؎
معاملہ نفسِ واپسیں پہ اٹکا ہے　　ابھی ہوئی ہے محبت کی ابتدا کہ نہیں؟

اس شعر کی توجیہ میں نادانستہ یا قصداً ایمانداری سے کام لیا گیا ہے یہ کیوں اسے آخرِ مضمون میں عرض کرونگا۔

شعر سیماب ؎
فغانِ نیم شب و آہِ صبح گاہی میں　　تجھے۔ پکار رہا ہوں۔ تجھے سُنا کہ نہیں؟

اصلاح سیف ؎
فغانِ نیم شبی ہو کہ نالۂ شبگیر　　تجھے پکار رہا ہے کوئی سُنا کہ نہیں؟

توجیہ قادری صاحب :- یہ اصلاح غور طلب ہے اس سے پہلے کے اشعار میں سیف صاحب نے مضمون میں کچھ نہ کچھ ترقی و اضافہ کیا ہے۔ یہاں دونوں شعروں کا مضمون بالکل یکساں ہے۔ پھر ترمیم کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے فیصلہ کے لئے ذوقِ سلیم شاہد ہے کہ پہلا مصرع سیماب صاحب کے مقابلہ میں سیف صاحب کا نہایت ڈھلا، سبک و لطیف ہے، سیماب کا مصرع پورا جملہ نہیں بلکہ جملہ کا جزو ہے اور سیف صاحب کا مصرع پورا جملہ ہے۔ اس طرز ادا نے پڑھنے اور سننے دونوں میں حسن و لطافت پیدا کردی۔ سیماب صاحب کے دوسرے مصرع پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا (تجھے) کی تکرار کبھی تہدید کے طور پر ہوتی ہے اس کا یہ محل نہیں، کبھی یہ تکرار غایت شوق کے سبب ہوتی ہے۔ وہی مقصود ہے لیکن سیف صاحب کے مصرع میں (کوئی) سے ایک خاص لطف پیدا ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ کنایہ صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ ضمیر شخصی یا ضمیر متعین کی جگہ غیر متعین لانے سے بڑا لطف پیدا ہو جاتا ہے، خواہ شاعر اپنے لئے استعمال کرے جیسے مرزا داغ فرماتے ہیں۔

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی　　بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

یا محبوب کے لئے جیسے کسی کا شعر ہے ؎

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے　　کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

پہلے شعر میں (کوئی) کی جگہ (عاشق) اور دوسرے شعر میں (وہ بت) یا اُن کے ہم معنی کوئی اور اسم یا ضمیر رکھ کر پڑھنے سے وہ تاثیر باقی نہیں رہتی۔

باقی اشعار کی اصلاح و توجیہ حذف کرتے ہوئے میں یہ عرض کرونگا کہ قادری صاحب کی یہ توجیہ بھی اُن کی نکتہ رسی اور قابلیت کی اچھی خاصی دلیل ہے۔ رسائل میں آپ کا نام نامی جس طرح لکھا جاتا ہے اُسے دیکھکر وہ غریب جو فن شعر و ادب سے ناواقف ہیں کیا کچھ نہ سمجھتے ہونگے۔ مگر ہمارے ان پرانے ادیب کا یہ حال ہے کہ ع

"چہل سال عمرِ عزیزت گذشت"

سیف کی اصلاح میں "فغانِ نیم شبی" و "نالۂ شبگیر" کی معنویت کو سمجھنا قادری صاحب کے بس کی بات نہ تھی، ورنہ یہ فرماتے کہ جب "نالۂ شبگیر" ہے تو "فغانِ نیم شبی" کی کیا ضرورت ہے۔ اب علامہ سیماب کی بلندیِ فکر ملاحظہ ہو کہ "فغانِ نیم شب" کے بعد "آہِ صبح گاہی" فرمایا اس سے یہ بات صاف نمایاں ہو جاتی ہے کہ رات کی "فغاں" صبح ہونے تک "آہ" میں تبدیل ہو گئی یعنی عاشق رات بھر پکارتا رہا اور پکارتے پکارتے صبح تک نڈھال ہو گیا تو بجائے "فغاں" کے "آہ" نکلنے لگی ــــــ (تجھے) کی تکرار کے متعلق پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ "یہاں غایتِ شوق کے سبب ہے" حالانکہ "تاکیدِ تخاطب" کے لئے ہے اور (کوئی) کو ترجیح یہ فرما کر دی جا رہی ہے کہ "کنایہ صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے" معلوم ہوتا ہے کسی سے آپ نے سُنا تھا یا کہیں یہ جملہ دیکھا ہوگا الکنایۃ ابلغ من التصریح لیکن اصل جملہ بھول گئے اور ترجمہ یاد رہا اُسے ٹھونس دیا۔ چاہے "پھوٹے آنکھ" یہاں تو اپنی نکتہ رسی کا ثبوت دینا ہے۔ (تجھے) کی تکرار شعر کی جان ہے مگر حامد صاحب یا سیف جیسے کور ذوق حضرات کے لئے نہیں۔

اوپر حضرت اثر کی اصلاح کی توجیہ میں آپ کوئی فرق محسوس نہ فرما سکے۔

کچھ کم تو نہ تھا قتل کو وہ حسن پر افسوس　　کیوں تجھ کو دیا چرخ نے بیساختہ پن بھی

اثر صاحب نے دوسرے مصرع میں بجائے (تجھ) کے (اس) بنا دیا تو پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ "اس بات پر غور کیجئے کہ اس شعر میں اصلاح کی ایک اور صورت بھی تھی یعنی دوسرا مصرع بجنسہ رہتا اور پہلے مصرع میں (وہ) کو (یہ) کر دیا جاتا۔

کچھ کم تو نہ تھا قتل کو یہ حسن پر افسوس　　کیوں تجھ کو دیا چرخ نے بیساختہ پن بھی

ممکن ہے حضرت اثر نے پہلی نظر میں مصرع ثانی کی ترمیم کر دی ہو یا دونوں صورتوں کو دیکھکر ایک کو ترجیح دی ہو۔ بہرحال کوئی خاص وجہ ترجیح نہیں ہے دونوں صورتیں یکساں ہیں۔"

لیکن یہاں مولانا سیماب کے شعر پر اصلاح فرمائی گئی تھی اس لئے کوئی خوبی ضرور بتانی تھی مگر موقع اور محل سمجھنا "کارے دارد" حضرت اثر نے ضمیر غائب بہت مناسب

دیکھی ہے، اس موقع پر تخاطب سے شعر کی مٹی پلید ہوجاتی ہے محبوب سے یہ کہنا کہ "کیوں تجھ کو دیا چرخ نے بیساختہ پن بھی" ایک بھونڈی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مولانا سیماب کے شعر میں جہاں مخاطبت ہے وہاں ضمیر بافعل غائب لانا شعر کی لطافت کا خون کرنا ہے۔

سیف کی اصلاح کے پہلے مصرع کو حامد صاحب پورا جملہ فرما رہے ہیں لیکن "دائے برحال ما" کہیں دُم بریدہ معلوم ہو رہا ہے۔ آپ بھی غور فرمائیے ؎

فغانِ نیم شبی ہو کہ نالۂ شبگیر　　تجھے پکار رہا ہے کوئی سُنا کہ نہیں

اگر "فغانِ نیم شب" کو "نالۂ شبگیر" سے علیحدہ مان لیا جائے تو بھی پہلے مصرع میں کمی رہتی ہے یعنی (مَیں) کا ہونا ضروری ہے ورنہ یہ مفہوم ہوتا ہے کہ فغانِ نیم شب اور نالۂ شبگیر پکار رہے ہیں معلوم نہیں یہ پورا جملہ کیونکر ہوا؟ قادری صاحب پھر ملاحظہ فرمائیے کہ سیماب صاحب کا مصرع مکمل ہے یا نہیں،

فغانِ نیم شب و آہِ صبح گاہی میں　　تجھے پکار رہا ہوں — تجھے سُنا کہ نہیں؟

یہ فرق ہے سیماب اور معاندینِ سیماب میں "فتدبّر" ——

قادری صاحب نے اس مضمون کی تمہید میں فرمایا ہے کہ "میری نظر تنقید کے تعمیری پہلو پر ہے۔ تخریبُ تنقیص کی نیت نہیں۔ اگر انسان خطا اور نسیاں سے مرکب ہے، تو میں اوروں سے زیادہ خطاکار و نسیاں شعار ہوں اس لئے میری غلطی ہو تو دُعا کرتا ہوں کہ رَحِمَ اللہُ مَن ہدانی اِلیٰ عُیُوبی"

آیئے ذرا غور کریں کہ اَلحاج مولانا پروفیسر حامد حسن قادری بچھرایونی کے اِن ارشادات میں کہاں تک صداقت ہے۔ میں ان ہی کی عبارت کے چند ٹکڑے جوڑے دیتا ہوں جو اُن کے لئے خود ایک آئینہ بن جائیگا جس میں اُن کے صحیح خدوخال نمایاں ہوجائینگے پھر آپ کو حیرت کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہوگا کہ وہ اُردو داں حضرات جو زبانُ فن کے مربّی و محسن سمجھے جاتے ہیں اور جن کے ذمہ کالجوں کے طلبا کی تہذیبُ تعلیم ہے۔ وہ اتنے تنگ نظر اور متعصب کیوں ہیں۔ اگر اس "کیوں" کا مطلب سمجھ میں نہ آئے تو اتنا سمجھ لیجئے ؎

نیش عقرب نہ ازپئے کیں است
مقتضائے طبیعتش ایں است

بہرحال میں اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے پروفیسر صاحب ہی کی عبارت پیش کرکے اس کا فیصلہ سنجیدہ اور غیر متعصب حضرات پر چھوڑتا ہوں۔

"سیماب اکبر آبادی کی غزل پر اصلاح"

یہ چوتھی قسم کی اصلاح پیش کرتا ہوں جو مذکورہ صورتوں سے الگ اور اپنی نوعیت میں بالکل نئی اور میرے علم میں اپنی وضع کی پہلی اصلاح ہے۔ یعنی ایک مشہور شاعر جو خود استاد ہے اور سیکڑوں شاگرد رکھتا ہے اس کی غزل پر بغیر اسکی فرمائش کے کوئی دوسرا استاد بطور خود اصلاح دیتا ہے اور شائع کرتا ہے۔ یہ صورت نادر الوجود ہے۔ لیکن شاعری کے طالب علموں کے لئے بصیرت آموز اور سخن سنجوں کے لئے لطف انگیز ہے۔ اس لئے کہ ایک کہنہ مشق شاعر کا غلطی کرنا مشکل ہے۔ پھر اُس کے صحیح و درست شعر میں کوئی کیا اصلاح دیگا۔ لامحالہ اس مضمون کو بہتر بنانے کی کوشش کریگا۔ اس لئے کہ صحیح کہنا اور بات ہے اور درجہ و معیار کا تفاوت الگ چیز ہے۔ "وفوق کُلِّ ذی عِلمٍ علیم"

ان زردہ عبارتیں پڑھئے پھر اس سے جو نتیجہ نکلے اُس روشنی میں قادری صاحب کی تنقید کے تعمیری پہلو پر غور کیجئے۔

ہمارے پروفیسر صاحب جناب سیف کو استاد مانتے ہیں وہ بھی اُس علم و فضل کا کہ علامہ سیماب کی غزل پر اصلاح کرے پھر اصلاح ایسی کہ معیار بلند کردے۔ میں قادری صاحب سے پوچھتا ہوں کہ یہ سیف اجمیری کون بزرگ ہیں جو چھپے ہیں تو اس طرح کہ دُنیائے ادب ان کی ہستی سے بالکل بے خبر رہی اور نمایاں ہوئے تو اس تزک و طمطراق سے کہ علامہ سیماب کی غزل پر اصلاح فرمادی۔ غالباً اور کوئی شاعر ان کے زرّین مشورے کے لائق ہی نہ تھا اس لئے سب محروم رہے۔ اس کے علاوہ بھی تو سیف صاحب نے اصلاح فرمائی ہے اور اتنی کہ علامہ سیماب کی اس غزل کا ایک شعر بھی نہیں چھوڑا۔ لیکن قادری صاحب نے تمام اشعار چھوڑ کر چند اشعار کی توجیہیں کیں جن میں اُن کو یہ معلوم ہوا کہ واقعی سیف نے ترقی دیدی ہے۔ صرف ایک شعر ایسا لیا ہے جس میں دوسروں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ قادری صاحب نے یک طرفہ فیصلہ کیا ہے لیکن ان اشعار میں اگر کچھ بات پیدا کی گئی ہے تو پروفیسر صاحب کی عقل اور سمجھ میں ورنہ اہلِ نظر کے سامنے اُس کی اتنی ہی قیمت ہے جو میں سطور بالا میں عرض کرچکا ہوں۔

اس کے بعد میں معاندینِ سیماب سے کہتا ہوں کہ تمہاری طفلانہ خاکبازی کسی تنگ نظر حاسد اور کوتاہ اندیش کے لئے باعثِ مسرت ہو تو ہو لیکن اہلِ علم اور جوہر شناس نگاہوں میں کوئی وقعت و اہمیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ سیماب نے اتنے ادیب شاعر پیدا کردئے ہیں اور وہ اس علم و فضل کے مالک ہیں کہ اس قسم کے نام نہاد ادبا اور شعرا کو برسوں رموز و نکات فن بتائیں گے۔ سیماب کو پہچاننے کے لئے علم کی ضرورت ہے وہ ایک روشن آفتاب ہے جسکی تابانی و ضیاباری کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ اور معاندینِ سیماب کا یہ حال ہے جو گذارش ہے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

قمر نعمانی سہسرامی

لہ جب اپنی کم مائگی کا احساس بھی ہے تو پھر اس زحمت کی کیا ضرورت تھی۔ "ق"

رفتارِ تغزل

حُسن تو چھایا ہوا کونین کی محفل پہ تھا — یہ نہ لیکن کھُل سکا خود عشق کس منزل پہ تھا

اسقدر ایقان مجھکو رہبری دل پہ تھا — پاؤں اک رستے میں تھا اور دوسرا منزل پہ تھا

پار کشتی لگ گئی تو بارِ شورش دل پہ تھا — میں ہی کیا ساحل پہ تھا طوفان بھی ساحل پہ تھا

کل تصوّر میں مرا سر خنجرِ قاتل پہ تھا — بوجھ ہلکا ہوگیا آخر جو میرے دل پہ تھا

شمع کے دل پر سحر تک سوز برساتا رہا — وہ فسانہ جو پرِ پروانۂ محفل پہ تھا

ڈوبنے پر اس حقیقت سے ہوا آگاہ میں — جو تہِ دریا میں جا پہنچا وہی ساحل پہ تھا

یاد ہوگا وہ بھی تھا اک وقت میرِ کارواں — جب گماں منزل کا مجھ کو جادۂ منزل پہ تھا

عمر گزری ہے اُمید و بیم کے گرداب میں — میں کبھی طوفاں کی موجوں میں کبھی ساحل پہ تھا

دیکھتا تھا جب تمھیں کو دیکھتا تھا ہر طرف — اعتبار اتنا مجھے ہر جلوۂ باطل پہ تھا

عمر بھر کرتا رہا روشن شبِ تاریکِ غم — صرف وہ اک داغِ ناکامی جو میرے دل پہ تھا

حاصلِ دردِ شکستہ پائی اچھا تو ملا — ساری دُنیا راہ میں تھی اور میں منزل پہ تھا

اب ہوا محسوس رنجِ حسرتِ آسودگی — دوسرا طوفان تھا وہ شور جو ساحل پہ تھا

قیس کو پھر بھی نہ تھا معلوم لیلیٰ کا مقام — اک نظر محمل پہ تھی اک ہاتھ اپنے دل پہ تھا

دیکھ اے منعم یہی تھا مجھ میں تجھ میں امتیاز — تیرا قبضہ تھا جہاں پر میرا قبضہ دل پہ تھا

اُن کے کوچے میں الم کو آج دیکھا اس طرح
آنکھ سوئے آسماں تھی دستِ حسرت دل پہ تھا

الم مظفر نگری

انتقام

ہم دونوں شریک سفر تھے۔ میرے پاس ایک عمدہ گھوڑا تھا ـــــ میں اسے عمدہ اس لئے کہتا ہوں کہ میں اس کے اوپر سے کئی مرتبہ گر کر سجدہ ریزی کر چکا تھا ـــــ اور میں اکثر عمدہ گھوڑے پر ہی سے گرا کرتا ہوں۔ وہ بہت شاندار، پُرشکوہ اور تیز رفتار تھا، چلتے وقت اپنا سر ہمیشہ اونچا رکھتا ـــــ میرا ہمراہی اپنی سفید گھوڑی پر خاموش چلا جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے چار، پانچ باربردار گھوڑے بھی چل رہے تھے ـــــ مگر سب خالی ـــــ

اس کا جسم گٹھیلا تھا، قد لانبا اور سینہ کشادہ ـــــ اُس کا چہرہ کچھ پژمردہ اور زرد سا تھا مگر مرعوب کن ـــــ اس کی شاہانہ پوشاک اُس کے جسم پر نہایت موزوں معلوم ہوتی تھی۔ اس کی صدری پر بہت سے چمکدار بٹن لگے ہوئے تھے اُس نے اپنے سر پر ریشمی رومال باندھ رکھا تھا۔ رومال کے سرے اُس کے دوش پر لٹک رہے تھے۔ اُسکی متاثر کن، بارعب اور دلکش طرز و ادا کو میں بہت دیر تک بیک نظر دیکھتا رہا۔ میں گفتگو کرنے میں اس لئے تامل کر رہا تھا کہ ایسا کرنے سے میرا وہ کیف و سرور ختم ہو جائیگا جس کا باعث ”عدول“، سکوت و خاموشی ہے۔

اس کا نام تھا ـــــ ”دیوکو مرادوچ“

میں نے اس کے متعلق بہت سے تحیر زا اور تعجب انگیز افسانے سُن رکھے تھے۔ وہ بہت بہادر و جری سمجھا جاتا تھا ـــــ وہ ایک ہوشیار و چالباز اور مشہور و معروف رہزن تھا۔ سب لوگ اس کی جرأت و بسالت کے معترف و مداح تھے۔ اس نے ہرزگوونیا کے بہت سے حصوں کو مرعوب کر رکھا تھا ـــــ وہ مجھ پر بڑی مہربانی و محبت کا اظہار کر رہا تھا۔

طویل سکوت جب کیف و نشاط کی حد سے گذر کر بے کیف ہونا شروع ہو گیا تو میں نے اُس کی توجہ کو گفتگو کی طرف منتقل کرنے کے خیال سے دریافت کیا:-

”آپ اپنے ہمراہ اتنے باربردار گھوڑے کیوں لے گئے تھے۔ جبکہ ان پر کچھ بھی سامان نہیں ہے؟!“

”میں سامان لاد کر شہر لے گیا تھا۔ اب وہاں سے واپس آ رہا ہوں!“

”آپ وہاں کیا کیا سامان لے گئے تھے؟“

”روٹیاں، آلو، گوبھی وغیرہ بہت سی چیزیں تھیں!“

”یہ سب سامان کس کے لئے لے گئے تھے؟“

”علی مویاگیچ مرحوم کے بال بچوں کے لئے!“

میں رُک گیا اور اُسکی طرف متعجبانہ دیکھنے لگا۔ علی مویاگیچ ترکوں میں بڑا بہادر اور دہشت آفریں شخص مانا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ مرادوچ لوگوں کا سخت ترین دشمن مشہور تھا۔

”کیا آپ نے اُس کا کوئی کھیت لے رکھا ہے؟“

”نہیں تو! میں اس کا قرضدار ہوں، مجھے اُس کا بہت بڑا قرض ادا کرنا ہے!“

یہ کہکر وہ خاموش ہو گیا اور سر جھکا کر اُس نے گھوڑی کے ایک چابک رسید کیا ـــــ گھوڑی کافی تیز چل رہی تھی۔ وہ بدکی اور کسی قدر رُک گئی۔ اس نے دوبارہ چابک جمایا، وہ تیزی سے دوڑنے لگی۔

اس کی یہ عجیب کیفیت دیکھکر میں خاموش ہو گیا۔ کسی مزید استفسار کی جرأت نہیں کی۔ اپنے گھوڑے کا لگام ڈھیلا کر کے میں آہستہ آہستہ گانے لگا۔ مجھے اس وقت یاد نہیں کہ میں کیا گا رہا تھا۔

اُس نے گانے کو بہت پسند کیا۔ وہ اپنی گھوڑی میرے قریب لے آیا اور کان لگا کر سننے لگا۔

”ذرا زور سے گاؤ!“

میں نے آواز بلند کر دی اس نے اپنے سر پر بندھا ہوا رومال کھول ڈالا۔ رومال گردن پر لٹکنے لگا۔ وہ گانا سُنتے سُنتے کبھی کبھی اپنا سر بھی معنی خیز انداز میں ہلانے لگتا تھا۔

میں نے گانا بند کر دیا

”اور گاؤ!“

”مجھے اس سے آگے یاد نہیں“

میرے ان الفاظ نے اس کی پیشانی شکن آلود کر دی، اور وہ گھوڑی کا لگام کھینچتے ہوئے تیزی سے اُس راستہ کی طرف مڑ گیا جو جنگل میں داخل ہوتا تھا۔

”میں جنگل جا رہا ہوں ـــــ آؤ کچھ دیر آرام کریں!“

میں اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا جنگل میں داخل ہوکر ہم لوگ گھوڑوں سے اُتر گئے اور اُن کو چرنے کے لئے چھوڑ کر ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ تمباکو نکال کر ہم دونوں نے اپنے اپنے حقے بھر لئے۔

ہم خاموش بیٹھے رہے۔ گھوڑوں کے چرنے اور کہیں دُور سے لکڑی کاٹنے کی آواز آرہی تھی۔

"آپ علی کے قرضدار کب سے ہیں؟" ——— میں نے خاموشی کی طوالت و بے کیفی سے اکتا کر گفتگو شروع کرنے کے لئے دریافت کیا۔

ڈیوکو کا چہرہ ناقابل فہم تاثرات کا مظہر بنا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ کو اثر آفریں انداز میں جنبش دیتے ہوئے جواب دیا:۔

"بہت عرصہ سے۔"

"کیا آپ نے قرض ادا کر دیا؟"

"کہاں بھائی! پورا قرض ادا کرنے میں تو بہت عرصہ لگے گا۔"

دو تین مرتبہ منہ سے دُھواں نکالنے کے بعد اُس نے لمحہ بھر کے لئے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا:۔

"بہت طویل داستان ہے اگرچہ میرے لئے یہ مسرت افزا نہیں۔ لیکن خیر، میں تمہیں سناتا ہوں:۔

"ترکوں کی ناانصافی نے مجھے ڈاکہ زنی پر مجبور کر دیا۔ میں ترکی رعایا کے صاحب اختیار لوگوں کے نامناسب سلوک سے پریشان ہوگیا۔ سب کے سامنے سر جھکاتے جھکاتے تھک گیا مگر پھر بھی سب لوگ مجھے متنفر آگیں نظروں سے دیکھتے اور کوئی بھی عزت نہ کرتا تھا۔ مایوس ہوکر میں نے ایک بندوق سنبھالی۔ چھ ساتھی جمع کئے اور جنگل کی راہ لی یہاں ہم لوگ ترکوں کی فکر میں رہا کرتے۔ جب وہ اِدھر سے گذرتے۔ اچانک اُن پر حملہ آور ہو جاتے۔ ہمارا کوئی دن بھی ایسا نہ گذرتا جس روز کسی سے تقابل کی نوبت نہ آئے۔ لوٹ مار میں ہمیں روزانہ کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا تھا ——— ہم نے جرأت کر کے علی موریا بیگ سے مقابلہ کرنے کا عزم کر لیا۔ ایک دن اس کے مکان پر چھاپا مارا اور تین آدمیوں کو ختم کر ڈالا۔ علی، جان بچا کر بھاگ گیا۔ ہم بہت عرصہ تک اس کی جستجو میں لگے رہے لیکن اُس کا پتہ لگانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہم نے مکان کو خوب لوٹا اور وہاں سے زر و دولت کے انبار لیکر جنگل واپس آگئے۔

لیکن ہمیں اس ڈاکہ زنی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ علی نے ہم سے کہیں زیادہ طاقت مجتمع کی اور ہمارے تجسس میں پہاڑ اور پہاڑیوں پر گھومنے لگا۔ اس کے خوف سے ہم نے راہ فرار اختیار کی۔ مگر اس نے ہمارا تعاقب کیا۔ ہم گھنے جنگل میں ایک جگہ پوشیدہ ہوگئے۔ ہمارے چھپنے کا مقام اتنا محفوظ و مامون تھا کہ وہاں تک کسی کی رسائی تقریباً ناممکن تھی۔ علی اور اُس کے معاونین نے ہمارا محاصرہ کیا۔ چاروں طرف سے راستہ بند ہو جانے کے باعث ہم بڑی مصیبت میں گرفتار ہوگئے۔ ہمارے پاس خورد و نوش کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم میں سے کوئی باہر جا کر کھانے پینے کا سامان لانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ گرسنگی و تشنگی حدِ اعتدال سے متجاوز ہوکر ہمیں سخت اذیت دینے لگی اور دل خراش طریق پر پیغام موت دینے لگی۔ میرے ساتھیوں کے چہرے یاس و ناامیدی کے مظہر بن گئے لیکن نہ تو کسی کی زبان پر حرفِ شکایت آیا اور نہ اپنی تقدیر پر اظہارِ افسوس کیا۔

تنگ آمد بجنگ آمد۔ بالآخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ ہم لوگ اس دہشت آفریں اور درد انگیز ماحول میں زیادہ عرصہ مبتلا نہیں رہ سکتے۔ میں نے اپنے ہمراہیوں سے کہا:۔

"دیکھو بھائیو! اگر ہم اسی حالت میں پڑے رہے تو بھوک اور پیاس کی شدت سے زیادہ عرصہ تک ہمارا رشتۂ حیات قائم نہیں رہ سکتا۔ چند روز میں ہمیں ضرور داعئ اجل کو لبیک کہنا پڑے گا۔ جب موت یقینی ہے تو ہمیں بہادری و پامردی کے ساتھ قسمت آزمائی کرنا ضروری و لازمی معلوم ہوتا ہے۔ جنگ کے شعلوں سے پیکار آزما ہوکر بہادروں کی طرح جان دینا کہیں زیادہ سہل اور بہترین ہے۔ جب موت ہمارے سامنے تبسم ریز ہے تو ہم کیوں نہ لڑ کر مر جائیں۔ خونِ ترک کی تشنگی لے کر جنت رسید ہونا کچھ مناسب نہیں ہوتا ہے۔"

اُن کے بھی ذہن و دماغ میں یہ بات سما گئی کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں درست کہہ رہا ہوں ——— اس مصیبت سے نجات پانے کا کوئی دوسرا راستہ نظر بھی نہ آتا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے میری تجویز کو منظور کر لیا۔

میں سب سے پہلے تلوار لیکر میدان میں آیا۔ میرے پیچھے دیگر ساتھی بھی آگئے ——— ترکوں نے ہم لوگوں پر گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ میرے دو ہمراہی زخمی ہوکر گر پڑے۔ میں نے خیال کیا کہ اب مرنے کے سوائے کوئی چارہ نہیں ہے میں اپنی پوری قوت و جرأت کے ساتھ جنگ میں مشغول ہوگیا۔ میرے ساتھیوں نے بھی میری تقلید کی۔ میری آنکھوں میں خون اُتر رہا تھا۔ مجھے چاروں طرف کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں اپنی تلوار ہلاتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا۔ اچانک مجھے پیچھے سے شدید ترین زخمی کر دیا گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو خود کو موریا بیگ کے مکان میں پایا۔ میں ایک چٹائی پر لیٹا ہوا تھا۔

بہت سے ترک جن میں علی مویا گیم بھی تھا میرے نزدیک کھڑے ہوئے سر ملا رہے تھے۔ میں نے جس وقت آنکھیں کھولیں۔ علی نے جھک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دریافت کیا

"کیسی طبیعت ہے؟"

مَیں نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن ایسا محسوس ہوا کہ مجھے کسی نے دوبارہ زخمی کر دیا ہے۔ میں پھر بیہوش ہو گیا۔

پورے ایک ماہ تک میں بستر علالت پر دراز رہا۔ علی میرے پہلو سے لمحہ بھر کے لئے بھی جُدا نہ ہوا۔ وہ میری اتنی خدمت کرتا تھا کہ اگر میرے والدین حیات ہوتے تو ممکن ہے وہ بھی اتنی خدمت نہ کر سکتے۔ اپنے ہاتھ سے میرے زخموں کو دھوتا۔ پٹیاں بدلتا۔ پیاس لگنے پر پانی پلاتا اور بچوں کی طرح مجھے کھانا کھلاتا۔ جب کبھی مجھے بھوک نہ ہوتی تو وہ کھانے کے لئے بہت اصرار کرتا۔ بعض اوقات اپنے زانو پر میرا سر رکھ زبردستی منہ میں انڈے اور گوشت ڈال کر مجھے کھلاتا تھا۔

آخرکار میں صحت یاب ہو گیا۔ جب مجھ میں کچھ تھوڑی سی طاقت آئی تو میں کھڑا ہو کر دیوار کے سہارے کرہ میں چلنے لگا۔ کبھی کبھی علی میرا ہاتھ پکڑ کر صحن میں لے آتا۔ جہاں میں شہتوت کے زیر سایہ بیٹھ کر آرام کرتا۔

میری طاقت روز بروز افزوں سے افزوں ہونے لگی۔ علی جس وقت میری طرف مسکرا کر دیکھتا تو اُس کے چہرہ پر مسرت آگیں جذبات رقصاں نظر آنے لگتے۔

اس نے ایک روز پوچھا:- "کیا تم اب کود سکتے ہو؟"

میں نے جواب دیا:- "نہیں! ابھی میں کود نہیں سکتا۔ میں ابھی بہت کمزور ہوں"

وہ اپنی مونچھ موڑتا ہوا ہنس پڑا۔

"تم میں بہت جلد طاقت آجائے گی اور جلد ہی کودنے کے لائق ہو جاؤ گے"

کچھ عرصہ کے بعد اُس نے مجھ سے پھر وہی استفسار کیا۔ میں نے جواب دیا:-

"میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں"

وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ میں دوڑا، اور تھوڑی دُور دوڑ کر کود بھی گیا۔ میں اتنا بلند کودا کہ علی نے فرطِ مسرت سے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا:- "اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تم بالکل تندرست ہو"

مجھے صحن میں چھوڑ کر وہ مکان کے اندر گیا۔ میں حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ لمحہ بھر کے بعد وہ دونوں ہاتھوں میں دو بھری ہوئی بندوقیں لیکر واپس لوٹا۔ اس کے چہرہ کی مسرت آگیں کیفیات متغیر ہو چکی تھیں۔ وہ اس وقت دہشت آفریں اور درندہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں گرسنہ بلی کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ میرے سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا:-

"اب تم صحت یاب ہو چکے ہو۔ اب تمہیں چلنے پھرنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اب تم میں پھر سے طاقت و قوت عود کر آئی ہے جو زخمی ہونے سے پیشتر تھی۔ اب تم اس قابل ہو گئے ہو کہ میرا قرض ادا کر سکو ——— تمہیں میرا بہت سا قرض ادا کرنا ہے۔ تمہیں تین سروں کی قیمت دینی ہے۔ کیونکہ تم نے میرے تین بھائیوں کو قتل کیا ہے"

اس طرح کہتے کہتے کسی خواہش و تمنا کے زیر اثر دہشت انگیز اور بھیانک انداز سے اس کی آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس کا نیچے کا جبڑا کانپنے لگا:-

"جس وقت تم میرے سامنے زخم خوردہ پڑے ہوئے تھے ——— اگر مَیں چاہتا تو تمہیں اسی وقت ختم کر سکتا تھا لیکن میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں تمہیں تندرست کر کے مارنا چاہتا تھا۔ علی مویا گیم نے زخم خوردہ اور قابل رحم دشمن کو کبھی نہیں مارا۔ وہ اپنے اصول کے خلاف ایک قدم بھی اُٹھانا نہیں چاہتا"

مجھے ایک بندوق دیتے ہوئے اُس نے کہا:-

"یہ بندوق لو، یہ میری بندوق کی طرح مضبوط اور بھری ہوئی ہے۔ چلو ہم تم دونوں جنگل چلیں وہاں پہنچکر پیکار آزمائی کریں گے"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یاس و اندوہ کے عالم میں آگے آگے چلنے لگا۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ میرے لئے اس وقت کیا طرزِ عمل مناسب ہے۔

ہم لوگ جنگل پہنچ گئے۔

میری غیر اختیارانہ کیفیت فوراً دُور ہو گئی۔ میں ہاتھ سے بندوق پھینک کر الگ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:-

"کیا میں اپنے ایک محسن پر گولی چلاؤں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اتنا کمینہ ہوں کہ تم پر گولی چلا دوں گا؟ کیا مجھے اپنی ذلت و رسوائی کا خوف نہیں؟"

اُس نے نفرت و حقارت سے میری طرف دیکھکر مسکراتے ہوئے کہا:-

"تمہیں بندوق اُٹھانی ہوگی۔ میں تمہیں مجبور کرونگا کہ تم اپنی بندوق سنبھالو ——— اور میرے مقابلے پر آؤ۔ میں اس جنگ کو ملتوی نہیں کر سکتا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ غیر مسلح آدمی پر میں کبھی بھی وار نہیں کرونگا۔ بندوق اُٹھاؤ تمہارے ساتھ دل لگی یا مذاق نہیں کر رہا ہوں"

میں بدستور اپنی جگہ ساکت و صامت کھڑا رہا۔

اُس نے زور سے چلا کر کہا:-

"میں کہتا ہوں کہ بندوق اُٹھاؤ۔ نہیں تو میں تمہیں بزدل لومڑی

کہہ کر پکاروں گا۔"

میں نے جھک کر بندوق اٹھالی۔

"اس طرف مڑو!"

میں نے اس طرف منہ کر لیا جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔

"میری طرف نشانہ جماؤ!"

اس نے اپنی بندوق سے میری طرف شست جمائی اور میں نے اپنی بندوق سے اس کی طرف۔

اس نے گولی چھوڑ دی۔ گولی کی آواز سے جنگل گونج اٹھا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے کب گھوڑا دبایا، لیکن میں نے جیسے ہی اس کی طرف دیکھا وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ میرے منھ سے ایک اضطراب آگیں چیخ نکل گئی میں اس کی طرف دوڑا۔ لیکن اس وقت اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

اس وقت سے میں ہر سال بہت سے آلو۔ گوبھی اور روٹی اس کے بال بچوں کو پہنچایا کرتا ہوں۔ میں اس وقت ان ہی کی پرورش کے لئے گیا تھا۔

ڈیو کو نے خاموش ہو کر سر جھکا لیا۔ انتہائی سعیِ ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں اشک ریز ہو ہی گئیں۔

(سر بین مصنف :—
سوئیٹو زار کورو وتج)

(مترجمہ) امتیاز نسیمی

یقین و عمل

سب رہے گمراہیوں میں عمر بھر تیرے بغیر
وہم و شک کے بن گئے دیوار و در تیرے بغیر

تو نہ ہو۔ تو ایک ویرانہ ہے گھر تیرے بغیر
اس جہاں میں شام ہے سب کو سحر تیرے بغیر

دیتی رہتی ہے ہمیشہ۔ درسِ گمراہی خرد
اس لئے فکر و عمل ہے نیشتر تیرے بغیر

دل جری بھی ہے نڈر بھی روزِ اوّل سے مگر
اس کے نالے ہوگئے ہیں بے اثر تیرے بغیر

اے یقیں قربان تیرے۔ تو تصور کی ہے روح
ہو نہیں سکتا ہے کوئی جلوہ گر تیرے بغیر

جلوہ گر ہو اور کر دے پردۂ اسرار چاک
جلد آ۔ تاریک ہیں قلب و جگر تیرے بغیر

(۲)

انجمن سونی ہے اے حسنِ عمل تیرے بغیر
رہ نہیں سکتا کوئی روشن کنول تیرے بغیر

وہ تمدن جس کا سرمایہ بہارِ مستعار
اس قہم کا ہے ہمیں دشوار حل تیرے بغیر

اس تمدن سے خدارا دے کسی صورت نجات
کب سے ہے بگڑا ہوا سازِ عمل تیرے بغیر

ہیں گمان و شک کے بادل سر پہ منڈلائے ہوئے
زہر ہے فکرِ عمل۔ ایک پل پل تیرے بغیر

تاج چھینا تھا مدائن سے کسی کے فقر نے
وہ تو عنقا ہے خصوصاً آجکل تیرے بغیر

نوجواں کہتے ہیں ملجائے ہمیں تاج شکوہ
مل نہیں سکتا انھیں کوشش کا پھل تیرے بغیر

اس تصور میں کہ مل جائے ہمیں مطلوب چیز
ممکن اس کا بھی نہیں ردِّ عمل تیرے بغیر

دونوں عالم میں یقیناً ہو نہیں سکتا کبھی
کچھ تغیر اور کچھ ردّ و بدل تیرے بغیر

جو کہا یہ سب حقیقت ہے مگر ممکن نہیں
عزم ان کا اور ہو کوہ و جبل تیرے بغیر

ورد کاکوی

وطن دوست سپاہی کا ترانہ

جوانِ سر بکف ہوں، مردِ میداں ہوں، دلاور ہوں
فدائے قوم ہوں ایثار و قربانی کا پیکر ہوں
اگرچہ قیدِ زنداں میں نہ ہونے کے برابر ہوں
مگر جب تک ہے آزادی کی دل میں جستجو باقی
کوئی میرے وطن پر حملہ آور ہو نہیں سکتا

چمن کا رازداں ہوں میں چمن ہے رازداں میرا
یہ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ہے ہندوستاں میرا
اُمنگیں بھی جواں ہیں اور دل بھی ہے جواں میرا
مرے بازو میں قوت ہے رگوں میں ہے لہو باقی
کوئی میرے وطن پر حملہ آور ہو نہیں سکتا

فنونِ حرب سے تا حدِ ممکن آشنا ہوں میں
ہزاروں مرتبہ دادِ شجاعت دے چکا ہوں میں
وطن کے نام پر خنجر اُٹھانا جانتا ہوں میں
مرے سینے میں جب تک ہے مذاقِ "جاہدو" باقی
کوئی میرے وطن پر حملہ آور ہو نہیں سکتا

علی کرم کے نام لیوا رہنما میرے وطن کے ہیں
فدائی کرشن کے تیغ آزما میرے وطن کے ہیں
جوانانِ جری مردِ وفا میرے وطن کے ہیں
مری ملت کے لوگوں میں ہے پاسِ آبرو باقی
کوئی میرے وطن پر حملہ آور ہو نہیں سکتا

ابد سرہندی

ادَب

اس دُنیا میں جہاں اور صدہا فتنے صبح سے شام تک بیدار ہوتے رہتے ہیں ان ہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فلاں ادب قدیم ہے اور فلاں جدید وہ ادب پرانا ہے اور یہ نیا یہ موضوع اپنی جگہ چاہے کتنا ہی دلچسپ ہو لیکن اسکے گمراہ کن اور لغو ہونے سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

قبل ازیں کہ ہم نفس موضوع پر روشنی ڈالیں بہتر ہوگا کہ "قدیم اور جدید" ان دونوں الفاظ کو سمجھنے کی کوشش کریں کیونکہ اس گتھی کے سلجھ جانے سے ہمارا راستہ بہت کچھ آسان ہو جائے گا۔

"قدیم اور جدید" جب ہم یہ دو الفاظ کہتے یا سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں دو چیزوں کا تصور ہوتا ہے ایک تو وہ جو کل تھی آج نہیں ہے اور دوسری وہ جو کل نہیں تھی آج ہے۔ یعنی اوّل الذکر قدیم اور ثانی الذکر جدید اور چونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ:-

"کس نگوید کہ دوغِ من ترش است

لہٰذا انسان جس میں انفرادیت اور انانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ اپنے پیشرووں کے کارناموں کو قدیم کہکر نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے اور اپنے کارناموں کو جدید کہکر فروغ دیتا رہا ہے۔ چونکہ جو کچھ وہ کرتا ہے وہ وہی ہوتا ہے جسے وہ قدیم کہتا ہے۔ صرف ظاہری صورت بدلی ہوئی ہوتی ہے اور اس صورت میں قدیم کی موجودگی جدید کو فروغ نہیں پانے دیتی لہٰذا مجبوراً جدید کا علمبردار قدیم کے خلاف آواز بغاوت بلند کرتا ہے اور اسے قدیم کہکر اپنے جذبۂ نفرت کو تسکین پہنچاتا ہے۔

زمانے کی یہ تحدید اور تقسیم اسی انسانی تنگ نظری اور مفروضہ غلط اعتبارات کا نتیجہ ہے اور ہم فنِ تاریخ میں اسکے افادی پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور واقعات کے تعین کے لئے یہ ضروری بھی ہے کہ دن اور دنوں سے مہینہ اور مہینوں سے سال اور سالوں سے صدیاں اور صدیوں کے آگے قدیم کا تعین کریں لیکن یہ پابندیاں انسانی خیالات کے لئے نہیں ہیں اور ایسا کرنا دونوں پر ظلم کرنا ہے اور شاید اس سے زیادہ غلط استعمال کی نظیر کہیں نہ مل سکے۔

ہماری اس مادّی کائنات کی وہ تمام چیزیں جو آفریدۂ قدرت ہیں۔ ہمارے موضوع سے یکقلم خارج ہیں۔ لیکن انسان کی بنائی ہوئی اشیاء نتیجہ ہیں اس کے غور و فکر کا۔ اور انسان جو کچھ کل سوچ سکتا تھا اور سوچتا تھا وہی آج بھی سوچ سکتا ہے اور سوچتا ہے اور اس تعقل و تفکر کے وہی نتائج جو آج ظاہر ہوتے ہیں کل بھی ہوتے تھے اور تعقل و تفکر کے نتائج نہیں بدلے صرف مظاہر بدل گئے۔ اور ظاہری شکل ضرورتِ وقت کی تابع ہے لہٰذا اس کا بدلنا اور بدلتے رہنا ضروری ہے۔

جب ہم خالی الذہن ہو کر متذکرہ بالا روشنی میں دوسری اشیاء پر بھی نظر ڈالیں گے تو یہی حقیقت تمام میں جاری و ساری نظر آئیگی۔ جس طرح آپ آج کسی خیال یا واقعہ سے مسرور ہو سکتے ہیں اسی طرح ایک غیر متمدن اور وحشی بھی جسے آج ہو یا زمانۂ جاہلیت میں مسرور ہونے کا مستحق ہے اور اگر آج آپ اپنے تعقل و تفکر کے بل پر ہوائی جہاز میں اُڑتے ہیں تو کل کا انسان بھی اُڑن کھٹولے میں اُڑتا تھا۔ اب اگر آپ ظاہری اختلاف و تباین کی بنا پر کوئی حکم لگا دیں گے تو ایک شدید غلطی کے مرتکب ہونگے۔

ہمارے تعقل و تفکر کے دیگر نتائج اور مظاہر کے علاوہ اور ان سب میں افضل ادب بھی ہے اور ادب کو جغرافیائی حدود یا تقسیم ازمنہ کے لحاظ سے محدود یا منقسم کرنا نوعِ انسان پر ناقابلِ تلافی ظلم کرنا ہے ادب چاہے وہ چینی ہو یا ہندوستانی ادب ہے اور عرب کے باشندوں کے لئے بھی ویسا ہی کارآمد اور مسرت بخش ہے جیسا چینی یا ہندوستانی کے لئے۔ اور ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم اسے کسی زمانہ یا کسی قوم یا کسی خطۂ زمین کے ساتھ مختص کریں۔ اس اختصاص سے زیادہ دشمنی ان نفوسِ ملکوتیہ کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتی جنھوں نے اپنی زندگی کے بیش قیمت اور گراں بہا لمحات اس کوششِ بلیغ میں صرف کئے ہیں۔

آپ تھوڑی دیر کے لئے اس وقت کا تصور کیجئے جب سرزمینِ یونان میں افلاطون اپنی "ریاست" لکھ رہا ہے۔ یا الف لیلہ کا مصنف اپنے وطن مالوف میں اپنے تخیلات کو الفاظ کا جامہ پہنا رہا ہے یا خاکِ پاک شیراز کی آغوش میں سعدی گلستان کی تشکیل میں مصروف ہے یا ہندوستان جنت نشان میں کالیداس شکنتلا لکھ رہا ہے اور پھر اپنے زمانے سے انکے زمانوں میں جو بُعد ہے اُس پر نظر ڈالئے اور ان مصنفین کے مذاہب کے اختلاف پر نظر ڈالئے اور یہ بتایئے کہ کیا یہ تصانیف اپنے چشمۂ فیض سے بنی نوع انسان کو اپنے زمانۂ تخلیق سے آج تک بلا امتیاز مذہب و ملت سیراب نہیں کرتی رہیں۔ اور کیا

یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ان کا افادی پہلو پہلے کی بہ نسبت کچھ کمزور اور تاریک ہو گیا ہے اور ہم انھیں پڑھکر قطعی لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

میکدۂ شیراز کے رندِ سرمست حافظ کی بارگاہ میں ایک عرصہ کے بعد المانی فلسفی شاعر گوئٹے ہدیۂ نیاز پیش کرتا ہے شکنتلا کی تصنیف کو صدیاں گذر گئیں لیکن آج بھی دنیا کا ہر نقاد اور مبصر اسکی داد دینے پر مجبور ہے۔ ہومر، بائرن، شکسپیر، فردوسی، عرفی، انوری، سعدی، کالیداس، والمیک، ودیاپتی کے کارنامے آج بھی ویسے ہی تازہ ہیں۔ جیسے کل تھے۔ وہ آج بھی اسی طرح خراجِ تحسین وصول کر رہے ہیں وہ آج بھی اسی طرح زندہ ہیں۔

ادب کی صحیح تعریف ہی یہ ہے کہ وہ قدیم اور جدید کی تقسیم سے بالا اور جغرافیائی حدود کی تحدید سے بلند ہو۔ وہ ادب ہی نہیں جو آج مردہ اور بیکار ہے لیکن کل زندہ بھی تھا اور کارآمد بھی۔

ادب ہر دور میں زندگی کا آئینہ دار اور صحیح و حقیقی مظہر رہا ہے۔ اور "ادب برائے ادب" یا "ادب برائے زندگی" دونوں تعریفیں خطِ اعتدال سے ہٹی ہوئی ہیں اور انتہائی مضحکہ انگیز بھی لیکن ان سے زیادہ مضحکہ انگیز ان تعریفوں کے علمبرداروں کی وہ حرکتیں ہیں جو وہ اپنی پسندیدہ تعریف کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش میں کرتے ہیں۔

ادب ہر دور میں آرٹ مسرت بھی رہا ہے اور زندگی کے حقائق کا مظہر بھی، اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ ادب کا صحیح مقصد صرف حصولِ مسرت ہے یا صرف زندگی کے حقائق کی آئینہ داری تو وہ ایک بدیہی غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔ ہم کسی ایک عنصر کو اس سے ہرگز علیحدہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ادب ان دونوں سے عبارت ہے اور کسی بھی ایک عنصر کو علیحدہ کرنا ادب کی تخریب میں ہاتھ بٹانا ہے اور اس تخریبی اقدام پر تعمیر کا پردہ ڈالنا اپنے ضمیر کو اور دیگر انسانوں کو ایک خطرناک فریب میں مبتلا کرنا ہے۔

جب ہم ادب کے لئے "قدیم" یا "جدید" یا "برائے ادب یا برائے زندگی" ہونے کا حکم صادر کرتے ہیں تو فی الحقیقت ادب کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہوتے ہیں۔

ادب حقائق و معارفِ زندگی سے بھی آگاہ کرتا ہے اور مسرت بھی بخشتا ہے۔ نہ وہ قدیم ہے نہ جدید وہ ان تمام قیود سے بلند ہے اور ہم گوئٹے کے ان الفاظ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ

"ارض و سما میں جو کچھ ہے وہ سب اس ایک نام میں جمع کر دیا گیا ہے"

اثر جلیلی چشتی اجمیری

زندگی کے ساتھ

غم ہے، نبھا رہا ہوں مگر زندگی کے ساتھ — اب تو سکوں ملیگا مجھے موت ہی کے ساتھ

یہ بھی مشاہدہ ہے مرا زندگی کے ساتھ — آنکھوں سے اشک نکلے ہیں اکثر ہنسی کے ساتھ

اے دل نہ مسکرا تو جہانِ نشاط میں — یہ سوچ لے کہ غم بھی لگا ہے خوشی کے ساتھ

اُس نے پلائی یوں نگہِ بادہ گوں سے آج — توبہ کا عزم ٹوٹ گیا بیخودی کے ساتھ

میرا کوئی نہیں، ہیں سبھی اُنکے حشر میں — اک اک کو دیکھتا ہوں میں کس بیکسی کے ساتھ

دورِ خزاں کے ساتھ ہے فصلِ بہار بھی — غم آئے تو گذار ہنسی اور خوشی کے ساتھ

اس نامرادِ زیست کی مجبوریاں نہ پوچھ — جو بھی رہا ہوا اور بڑی بے دلی کے ساتھ

ظلمت کدے میں غم کے فروزاں ہوئی ہلال

پھر کاروانِ عشق بڑھے روشنی کے ساتھ

ہلال پریمی۔ از کوشی

ہم اور تم

ایمانِ عشق ہے کہ جئے جا رہے ہیں ہم — دھوکے جو دے رہے ہو ہمیں کھا رہے ہیں ہم
یہ حسنِ ظن ہے اپنا کہ ہے پاسِ حسنِ دوست — ناکردہ معصیت پہ بھی شرما رہے ہیں ہم
احساس تک شباب کے جینے کا ہوش تھا — اب زندگی فریب سے بہلا رہے ہیں ہم
ابتک ترانہ ریز ربابِ خیال ہے — اک شے ہے بے محل جسے دہرا رہے ہیں ہم
جینا وبالِ جان ہی تو جان ہے بلائے زیست — آخر یہ کس خطا کی سزا پا رہے ہیں ہم
یہ اور بات ہے کہ زمانہ بدل گیا — تم اپنی اور تمہاری تمنا رہے ہیں ہم
یہ اور بات ہے کہ نہ آئے قرار اسے — کیا کیا دلِ حزیں کو نہ سمجھا رہے ہیں ہم
یہ اور بات ہے کہ پشیماں نہیں ہو تم — اپنے کئے پر آپ ہی پچھتا رہے ہیں ہم

تھا غیرتِ ارم کبھی ایوانِ آرزو
ویراں پڑا ہے آج وہ بستانِ آرزو

کیوں بار بار یاد ہمیں آ رہی ہو تم — بھولے ہوئے فسانوں کو دہرا رہی ہو تم
آنکھوں سے ہو کے دل میں تو پہلے سما گئیں — دل سے ابھر کے آنکھوں پر اب چھا رہی ہو تم
آلودۂ عتاب تصور ہے کس لئے — دھوکا کہیں خدا نہ کرے کھا رہی ہو تم
دنیا تخیلات کی کر کے مری تباہ — آخر دل و دماغ پہ کیوں چھا رہی ہو تم
کیوں خود بخود ہے زمزمہ پیرا ربابِ دل — کیا اب بھی سازِ حسن پہ کچھ گا رہی ہو تم
اُن کیف بار راتوں کا اللہ ذکر کیا — کیوں ساغرِ شکیب کو چھلکا رہی ہو تم
جانے کو ہیں قرار و سکوں سب تمہارے ساتھ — برباد کر کے ہم کو کہاں جا رہی ہو تم
کیا جان و تن میں آگ لگانے کا عزم ہے — داغوں کو دل کے کس لئے چمکا رہی ہو تم
معلوم ہے کہ وصل اک امرِ محال ہے — کیوں اک شکستہ حال کو تڑپا رہی ہو تم

شوقِ اُمید اور نہ غم و بیم چاہیئے
اب مدعائے زیست میں ترمیم چاہیئے

رونق دکنی جمشید پور

سرمایۂ الفت

محترمی ایڈیٹر صاحب

یہ اینہاکہ میری عمر کافی ہے مگر میں ہنوز غیر شادی شدہ ہوں۔ ایسا کیوں ہے اسکا جواب یہ چند خطوط دینگے۔ اِن کے علاوہ بھی میرے پاس بہت سے خطوط ہیں مگر میں انھیں منظرِ عام پر لانا مناسب نہیں سمجھتا۔ اِن خطوط کی اشاعت تو درکنار میں کسی کو دکھانے کا بھی روادار نہ تھا، لیکن جناب بشیر احمد کے اصرار سے مجبور ہوکر اور "مذہب و ملت" کے سرپرستوں ــــ دُنیا اور سوسائٹی کے آقاؤں عزت و آبرو کے ٹھیکیداروں کو یہ بتلانے کے لئے کہ ان کا دامن اس قسم کے کتنے خونی واقعات سے داغدار ہے، انھیں شائع کرانے کی اجازت دے رہا ہوں۔

میں مطمئن ہوں کہ "آشا" میری ہے اور میری ہوکر رہے گی۔ آج نہیں کل۔ یہاں نہیں وہاں۔ حقیقی محبت کسی کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتی ــــ "آشا" کے جسم کا کوئی بھی مالک ہوسکتا تھا اور ہوگیا ــــ مگر کسی کی روح پر مفتوح ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ غیر ممکن ہے۔ محبت ایک جذبہ ہے اور وہ بھی بے اختیاری۔ اسی لئے "آشا" بھی مجبور ہے۔ عورت اپنی زندگی میں ایک بار اور صرف ایک بار محبت کرتی ہے۔

یہ خطوط میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ جب میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی آشا سے ملوں، اُس کو دیکھوں تو اِن خطوط کو نکال لیتا ہوں اور پھر ان کے مطالعے میں ایسا محو ہوجاتا ہوں کہ دُنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔

برباد تمنا ــــ **کنول**

---

(۱)

از .... ــــــــ کنول

ولایت کا سفر مبارک .... وہاں کی برف پوش چٹانوں کو میرا سلام ــــ جب وہاں کے پُرلطف مناظر سے لطف اندوز ہوچکو تو یہاں کی ان روشوں کو بھی یاد کرلیا کرنا جہاں بارہا میں نے تمہاری گردن میں ہاتھ ڈالے تھے ــــ اور تمہارے مسکراتے ہوئے لبوں نے نہ صرف شکریہ ادا کیا تھا بلکہ محبت کے پودوں کو سرسبز و شاداب رکھنے کی دُعائیں مانگی تھیں۔

میرے لئے ولایت سے کیا لاؤگے ؟

شاید ــــ ! سرخ و سپید گڑیا .... مگر نہیں .... نہیں ..... مجھے یہ نہیں چاہئے .... اور .... نہ وہاں کی کوئی اور چیز ہی چاہتی ہوں ــــ صرف ایک تمنا ہے اور وہ یہ کہ جب تم وہاں سے واپس ہوتو ... تمہارے دل و دماغ میں سوائے میرے اور کوئی سمایا ہوا نہ ہو ــــ تمہاری آرزوئیں ؟ تمہاری تمنائیں ؟؟ مجھ سے ملنے کے لئے بیتاب ہوں ــــ !!!

مگر میں یہ کیا لکھ رہی ہوں ــــ مجھے یہ نہ لکھنا چاہئے ــــ تمہاری طرف سے مجھے ہرگز یہ اندیشے پیدا نہ ہونے چاہئیں ــــ کیوں ــــ کیونکہ تمہارا وہ اُداس اور حسرت و یاس میں ڈوبا ہوا خوشنما چہرہ اشک آلود آنکھیں مجھے اب تک یاد ہیں ــــ اور میرا یقین ہے کہ ایسا شخص بے وفا نہیں ہوسکتا۔

ــــ "آشا"

(۲)

از .... ــــــــ کنول

تمہارے جانے کے بعد دل پر کیا گذر رہی ہے ــــ کس طرح بیان کروں ــــ تمہاری دُنیا کو اُردو لٹریچر پر ناز ہے ــــ مگر غلط اور جھوٹ ــــ اس میں اتنی بھی وسعت نہیں کہ وہ میرے دل کی دھڑکنوں کو ــــ الفاظ میں مقیّد کرسکے۔

در و دیوار ــــ پھول، باغ غرض سب کچھ ــــ وہی ہیں ــــ مگر نہ جانے کیوں نہ تو پھول مسکراتے ہیں ــــ نہ نسیم اٹکھیلیاں کرتی ہے ــــ نہ معلوم تم اپنے ہمراہ کیا کیا لے گئے ــــ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ میری "آشا" کس سے دل بہلائے گی۔

مجسّم بہار بن کر مجھ سے ملے تھے اور سراپا خزاں بنکر چلے گئے۔

ــــ آشا

(۳)

از ...... ——— کنول

——— کیا کہا ——— "بھول نہ جانا" میرے دل و دماغ میں ——— روح میں اور جان و تن میں ایک ہیجان برپا کر دیا ——— میرے جسم کو ہزاروں نشتروں سے چھلنی بنا دیا۔

دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی۔ خامہ خوں چکاں اپنا

میں ——— اور تم کو بھول جاؤں ——— ناممکن ——— بھول سکتی ہوں مگر صرف اپنے آپ کو ——— تم کو نہیں،

کنول! ——— ایسی باتوں سے دل پاش پاش ہو جاتا ہے ——— اچھے کنول ایسا نہ لکھا کرو

——— آشا

(۴)

از .... ——— کنول

تمہیں یہ معلوم کر کے ایک گونہ مسرت ہوگی کہ میں پاس ہو گئی ——— گر مجھے اسکا سخت افسوس ہے ——— مجھے خوشی ہوتی اور بہت بڑی خوشی ——— کاش میں فیل ہو جاتی ——— اس صورت میں میری تعلیم نا مکمل سمجھی جاتی اور کم از کم ایک سال کے لئے بات بڑھ جاتی ——— پتا جی اب پڑھانا نہیں چاہتے ——— یہ سال تو کتابوں کی رفاقت میں گذر گیا ——— لیکن ——— اب کیا ہوگا ——— ماتا جی بھی نہیں سنتیں ——— کہتی ہیں جو پتا جی کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے ——— اب تمہیں بتاؤ کہ کیا کروں ——— تمہیں لکھو شاید پتا جی تمہارا کہا مان جائیں ——— مگر نہیں ——— وہ نہیں مانیں گے۔ میں سب تدبیریں کر چکی ——— آخر تھک کر بیٹھ رہی ——— اب یہ پہاڑ سے دن کیسے گذریں گے۔

——— آشا

(۵)

از .... ——— کنول

"میں دن کیسے گذارتی ہوں" ——— تم بھی معلوم کرنا چاہتے ہو نا۔

سنو ——— !

خیال کرتے ہی ——— میرا کنول میرے سامنے مسکرانے لگتا ہے ——— خوب خوب باتیں ہوتی ہیں مگر وہ تمہاری طرح ضدی نہیں۔ میں جو کچھ کہتی ہوں۔ مان لیتا ہے ——— کبھی انکار بھی کر دیتا ہے ——— مگر جب میرے آنسو دیکھتا ہے تو فوراً اپنی ضد سے باز آجاتا ہے اور کہتا ہے ——— "میری آشا ——— میری تمنا ——— میری آرزو ——— تم جو کچھ کہتی ہو وہ ٹھیک ہے"

ایک دن

شام کا وقت تھا ——— ہلکی ہلکی روشنی سارے شہر میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور میں کسی کے خیال میں چھت پر کھڑی ہوئی بظاہر غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہی تھی کہ یکایک۔ بالکل اسی جگہ سے جہاں آفتاب غروب ہو رہا تھا کنول آتا ہوا دکھائی دیا ——— آتے آتے جب بالکل میرے قریب آگیا تو میں نے کہا ——— کنول ——— ! مرد کی محبت کا کوئی اعتبار نہیں ——— مرد اس معاملہ میں بہت کمزور اور عجلت پسند واقع ہوا ہے .... اس کے دعوے کبھی پورے نہیں ہوتے ——— وہ بہ یک وقت کئی عورتوں سے محبت کر سکتا ہے حتیٰ کہ بہ یک وقت بہت سی تمنائیں بھی دل میں پرورش کر لیتا ہے۔

تو جانتے ہو ——— کنول! ——— اُس نے کیا جواب دیا ———

اچھا یہ پھر بتاؤں گی ——— مختصراً یہ کہ وہ ایسا نہیں ہے۔ ——— باقی پھر۔

——— آشا

(۶)

از... ....

لو کنول! ——— آسمان کے ترکش میں صرف ایک ——— اور صرف ایک تیر باقی رہ گیا تھا ——— وہ بھی اُس نے ہم پر صرف کر دیا۔

کوئی صاحب ہیں جو حال ہی میں ولایت سے لوٹ کر آئے ہیں۔ اُن سے پتا جی نے میری شادی طے کی ہے۔

میری تو سب تدبیریں اور حیلے حوالے بیکار ثابت ہوئے۔ تم بھی لکھ دیکھو شاید تمہاری تدبیر کارگر ہو جائے۔

جب میں اپنے بچپن کی سنہری حدود سے نکل کر جوانی کے خلدزار میں پہونچی ——— تو میرے دل میں ہزاروں قیامتیں برپا تھیں ——— ایک طوفان ——— بہت بڑا طوفان سا اُٹھتا معلوم ہوا اُس وقت میں نہیں جانتی تھی کہ مجھے کیا چاہیئے ——— اور میرا خیال ہے کہ دنیا کی کوئی بھی دوشیزہ اس عالم میں پہنچ کر نہیں بتا سکتی کہ وہ کیا چاہتی ہے ——— مگر جب میں نے تم کو دیکھا ——— تو میرے دل کا آتش فشاں پھٹتا سا معلوم ہوا ——— دل سے طرح طرح کی آوازیں آ؟

شروع ہوئیں ـــــ معلوم ہوتا تھا کہ ایک شورِ قیامت برپا ہوگیا ہے۔ اس عالم میں تم نے مجھے گدگدایا ـــــ نگاہوں ـــــ دل سے ـــــ اور اپنی مسکراہٹ سے ـــــ پھر کیا تھا میری رگوں میں بجائے خون کے آتشیں سیال بھر گیا ـــــ اور میں اپنی ہستی کو بھول کر ایک عالم خود فراموشی میں پہنچ گئی ـــــ مگر اب جبکہ میری محبت کا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے ـــــ جب اس کو ضرورت محسوس ہورہی ہے کہ تم سہارا دو تو سوسائٹی اسے توڑ دینا چاہتی ہے۔

میرے سامنے اس وقت فرض اور محبت کی جنگ ہے۔ نہیں کہہ سکتی کہ کس کی فتح ہوگی۔

ـــــ آشنا

(۷)

از .... ـــــ کنول

آہ! ـــــ کنول!! ـــــ تم نے یہ کیا لکھ دیا کہ "آشا میری ہے اور میں آشا کا ہوں"

پتاجی نے زمین و آسمان ایک کر دئے ـــــ تم پر سینکڑوں الزام لگائے ـــــ ہزاروں بہتان باندھے ـــــ کہتے ہیں کہ اگر وہ ولایت چلا گیا تو کیا ہوا ـــــ اسکی ذات تو وہی ہے ـــــ وہ ہماری برابری کا نہیں۔

کنول تم مرد ہو ـــــ سب کچھ کر سکتے ہو ـــــ تم اپنی محبت کو فلسفہ ـــــ ادبیات، شاعری، مصوری، اور دوسری دلچسپیوں میں بہلا سکتے ہو ـــــ مگر میں عورت ہوں ـــــ عورت ایسا نہیں کر سکتی ـــــ وہ جب محبت کرتی ہے تو محبت ہی کی ہو کر رہ جاتی ہے ـــــ اور پھر میں لڑکی ہوں ـــــ اور وہ بھی ہندوستان کی بے زبان لڑکی ـــــ ہندوستان کی لڑکیاں کس قدر فرض شناس ہوتی ہیں ـــــ؟

کنول! ـــــ محبت دکھانے کی نہیں ہوتی ـــــ ہماری روح ایک دوسرے سے وابستہ ہوچکی ہے اور وہ اسی طرح ہمیشہ رہے گی ـــــ سماج جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر لینے دو ـــــ میری پتا کے کہنے پر دنیوی معاملات کو انھیں کے سپرد کر دو ـــــ ہم تم وہاں ملیں گے جہاں نہ ذات و مذہب کا سوال ہوگا نہ دولت و ثروت کا اور نہ ذلت و رسوائی کا۔ وہاں ہماری روحیں ایک دوسرے سے ایسی وابستہ ہونگی کہ پھر انھیں موت کا ظالم و جابر ہاتھ بھی جدا نہ کر سکے گا۔

بہت کچھ غور و خوض کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچی ہوں وہ یہ ہے کہ میرا جسم میرے پتی کی سیوا کریگا ـــــ اور ـــــ میرا دل ـــــ تمہاری یاد اور تمہارے خیال میں ڈوبا رہے گا۔

میں عنقریب دوسرے کا کھلونا بننے والی ہوں ـــــ تم مرد ہو ـــــ اور پختہ خیال مرد ـــــ اس حادثہ جانکاہ کا مردانگی سے مقابلہ کرنا ـــــ محبت غیر فانی ہے ـــــ میں ہر حال میں تمہاری رہونگی ـــــ محبت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اسے جکڑ کر رکھا جائے ـــــ محبت آزاد ہے ـــــ پابندِ وصال نہیں۔

کاش ہم تم ملکر اپنی زندگی گذار سکتے

ـــــ آشنا

(۸)

از .... ـــــ کنول

کنول ـــــ! وہ خوبصورت جام جس میں میں نے محبت کے پاک لبوں کی مٹھاس جمع کی تھی ـــــ جس میں محبت کے رس بھرے انگوروں سے شراب ٹپکائی تھی ـــــ جسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا تھا ـــــ وہ جام چکنا چور ہوگیا ـــــ مذہب اور سوسائٹی نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ میری متاعِ حیات میرے سامنے روندھ دی گئی ـــــ اور میں اُف بھی نہ کرسکی۔

یہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ میں مجبور کی گئی ہوں کہ اس غیر رومانی اور خنک فضا میں سانس لوں ـــــ لیکن یہ جھلملاتے تارے اور ہنستا ہوا چاند گواہ ہیں کہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی تم کو نہیں بھولی۔

زمانے کے تسلسل کی طرح میرے تمام خیالات کے جولانگاہ تم اور صرف تم ہو ـــــ آہ! ـــــ یہ ارمان بھرا دل ـــــ اور چاندنی راتیں ـــــ سب تمہارے بغیر ہیچ ہیں۔

ـــــ آشنا

بشیر احمد قریشی گوالیاری

خمخانۂ پندار

حقیقت زیست کی لفظوں میں کب سمجھائی جاتی ہے
اُلجھ جاتی ہے اتنی جسقدر سلجھائی جاتی ہے

مری رودادِ غم شاید کہیں دہرائی جاتی ہے
ستارے مرتعش ہیں چاندنی تھرّائی جاتی ہے

خدا جانے وفورِ شوق میں کیا کہہ گیا ان سے
پشیمانی سی کچھ اُن کی نظر میں پائی جاتی ہے

ترنم ریز ہے یہ کون میرے بربطِ دل پر
فضائے زندگی پر بیخودی سی چھائی جاتی ہے

زمانے میں ابھی کچھ دورِ رنگیں آنے والے ہیں
بشارت ان کی میری حال ہی سے پائی جاتی ہے

شمیم گل، بہارِ خلد، اور سرمستیٔ عالم
تمہاری یاد میں شامِ تمنا پائی جاتی ہے

کلی جیسے چٹک جاتی ہے سورج کی شعاعوں سے
اُنھیں یوں دیکھکر دل کی کلی کھل جاتی ہے

چمکتا ہے یہ اُن کا جلوۂ رنگیں نگاہوں میں
کہ اک برقِ مجسم سامنے لہرائی جاتی ہے

کہاں ہے وہ مئے رنگیں تری شیشوں میں اے ساقی
مرے خمخانۂ پندار میں جو پائی جاتی ہے

محبت میں طبیعت پر کوئی قابو نہیں چلتا
اُلجھنے پر بڑی مشکل سے یہ سلجھائی جاتی ہے

مرے زخمِ جگر کی ٹیس میں کب انقلاب آیا
جہاں پر پائی جاتی تھی، وہیں پر پائی جاتی ہے

ہوا کرتی ہے قدرِ آدمی حسنِ تکلم سے
یہ وہ نایاب شے ہے جو بہت کم پائی جاتی ہے

کبھی ایسی بھی ساعت قہرؔ آتی ہے محبت میں
کہ اظہارِ تمنا میں بھی مشکل پائی جاتی ہے

قہر عثمانی (وزیرزادہ) جوناگڈھ

سجدۂ مستی

حجابِ حُسن نہیں وہ ہجومِ ناز نہیں!!
میں اُس جگہ ہوں جہاں کوئی راز راز نہیں

اُٹھا دے پردۂ دیر و حرم نگاہوں سے
نیازِ عشق اسیرِ حدودِ ناز نہیں

جبینِ اشک پہ تصویر کھنچ گئی تیری
خدا کی مار کہ غم پردہ دارِ راز نہیں

اُلجھ کے رہ گئیں تارِ نقاب میں نظریں
مذاقِ دید حریفِ نگاہِ ناز نہیں

بس ایک سجدۂ مستی ہے حاصلِ کونین
جبینِ شوق نہیں یادِ نیاز نہیں

گذر گئی ہیں ہزاروں قیامتیں سر پر
حیاتِ خضر شبِ ہجر سے دراز نہیں

ہمیشہ رہتا ہے وہ میکدے میں سربسجود
یہ کس نے کہدیا خیّام پاکباز نہیں

خیام ہندی

احمد خاں صوفی اکبرآبادی

احمد خاں نام ۔ صوفی تخلص ۔ آگرہ کے رہنے والے ۔ ولادت ۹ جولائی ۱۸۳۳ء
وفات ۱۸۹۱ء ۔

والد کا نام محمد زماں خاں تھا ۔ آبا و اجداد سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں بلند مراتب پر سرفراز تھے ۔ تین سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ میر حسین علی انکے ماموں نے پرورش کی اور انکی تعلیم و تربیت کا خاص طور پر خیال رکھا ۔ طالب علمی کے زمانہ ہی میں شادی ہو گئی ۔ لیکن تحصیل علم کا روز افزوں انہماک جاری رہا ۔ اور نہایت کوشش و محنت سے پڑھتے رہے ۔

صوفی کا ابتدائی زمانہ بڑی تنگدستی اور عسرت میں بسر ہوا ۔ شروع شروع منشی سادھو سنگھ کے مطبع میں کتابت کرتے تھے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مداح المصطفےٰ مولانا غلام امام شہید کا آگرہ میں طوطی بول رہا تھا ۔ صوفی نے ان سے اصلاح لینا شروع کی شعر و سخن کا صحیح مذاق اور خصوصاً صوفیانہ رنگ دیکھکر مولانا صوفی پر بڑی نظر عنایت رکھتے تھے اور اسی وجہ سے ان کے شاگردوں میں صوفی کو سب پر فوقیت حاصل تھی ۔ مولانا جب ریاست گوالیار میلاد شریف پڑھنے تشریف لے گئے تو صوفی بھی انکے ہمراہ تھے ۔ یہاں مصاحب خاں وزیر اعظم ریاست گوالیار نے صوفی کو اپنا مصاحب خاص بنایا اور ڈھائی سو ۲۵۰ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا ۔ تقریباً سات آٹھ سال تک وہاں رہے غدر کے دو ۲ سال بعد صوفی اپنے وطن تشریف لے آئے ۔

۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامے نے اسقدر خستہ حال کر دیا کہ صوفی نے تحصیل فیروز آباد میں محض پندرہ روپیہ ماہوار پر سیاہہ نویسی اختیار کی ۔ اسکے بعد نارمل اسکول آگرہ میں تیس ۳۰ روپیہ ماہوار پر معلمی کی ۔ لیکن ۱۸۶۹ء تک حالت نہ سدھر سکی ۔ بالآخر ۱۸۶۹ء میں جب مطبع "مفید عام" اور "اخبار مفید عام" جاری کیا ۔ تو کسی قدر سکون اور اطمینان نصیب ہوا ۔ مطبع کو اس قدر غیر معمولی شہرت اور اخبار کو مقبولیت حاصل ہوئی کہ تھوڑے سے ہی عرصہ میں دونوں ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے خراج تحسین لینے لگے ۔ سرسید ۔ نواب محسن الملک مہدی علیخاں ۔ ڈپٹی نذیر احمد ۔ مولانا حالی ۔ مولانا شبلی نعمانی ۔ حضرت امیر مینائی ۔ اکبر الہ آبادی اور سید علی بلگرامی جیسی متعدد ہستیوں کو روشناس کرانے کا فخر مطبع مفید عام کو ملا ۔ غرض انیسویں صدی کے آخر میں اردو ادب کی اکثر و بہترین کتابوں کی اشاعت کا شرف صوفی کو حاصل ہوا علیہ حضرت شاہجہاں بیگم والیٔ بھوپال اور نواب صدیق حسن خاں مرحوم و مغفور کی قریب قریب تمام تصانیف اسی مطبع سے شائع ہوئیں ۔ اس کے علاوہ صحت و پاکیزگی اور خوش معاملگی کی وجہ سے ریاستہائے بھوپال ۔ رامپور ۔ ٹونک اور حیدر آباد کا کام مطبع مفید عام کے علاوہ اور کہیں نہیں چھپتا تھا ۔

مطبع کی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود شعر و شاعری کا فطری شوق ہمیشہ بے چین رکھتا تھا ۔ آگرہ کی تمام ادبی مجالس میں شریک ہونے اور شعر و شاعری سے ذوق تمام رکھنے والے اصحاب کو اپنے گھر بلاتے ۔ ۱۸۸۲ء میں رسالہ گلدستہ سخن نکالا اس رسالہ کو اسقدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ بھوپال ۔ حیدر آباد اور رامپور کے شاعر اس میں چھپنے لگے ۔ صوفی سے تقریباً گیارہ تصانیف یادگار ہیں ۔ مثنوی فنون بابل (اردو) مینا بازار (اردو) مثنوی فریاد دل ۔ ذکر الشہادتین ۔ مولود شریف جدید تاریخ بادشاہان سلف ۔ حکمائے فلاسفہ کی قدیم تاریخ ۔ مثنوی بلقیس و سلیمان (فارسی) مثنوی حسن و عشق (فارسی) رسالہ در علم عروض اور بیاض قلمی ۔

دو تمنائیں اپنے ساتھ قبر میں لیکر گئے ۔ ایک حج بیت اللہ اور دوسری پنج گنج نظامی کے تتبع میں پانچ مثنویاں نظم کرنا ۔ لیکن ناگہاں موت کی چیرہ دستی نے چار مثنویاں تمام کرنے کے بعد پانچویں مثنوی لکھنے کی مہلت نہ دی ۔

پرانے زمانے کے دستور کے مطابق صوفی کو ورزش کا تادم آخر شوق رہا خوش خوراک تھے ۔ قد میانہ ۔ قویٰ بہت مضبوط ۔ ایک برکا پائجامہ اور انگرکھا پہنتے تھے ۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے ۔ ہاتھ میں چھڑی اور کندھے پر رومال ۔ صفائی ستھرائی کا بہت خیال رکھتے تھے ۔

۱۸۹۱ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا ۔ اور آگرہ کے مشہور قبرستان کربلا میں مدفون ہوئے ۔ ۵۸ برس کی عمر پائی ۔

صوفی عادتاً نہایت خوش خلق متواضع اور حلیم الطبع تھے ۔ خاکساری اور انکساری بدرجہ اتم پائی جاتی تھی ۔ صوم و صلوٰۃ اور دیگر فرائض دین پر سختی سے پابند ۔ صوفی منش اور غریب پرور ۔ ظاہر داری اور فخر و مباہات کو کبھی جائز نہیں رکھتے تھے مزاج میں

سنجیدگی اور متانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ ہنس مکھ اور خوش مزاج تھے صبر و تحمل اور قناعت و توکل انکی بڑی خصوصیات تھیں۔ غرض صوفی حقیقی معنی میں صوفی تھے۔

علامہ اقبال کی طرح فارسی زبان کی شیرینی سے اسقدر لذت چشیدہ تھے کہ اُردو میں بہت کم کہتے تھے۔ مثنوی حسن و عشق۔ مثنوی بلقیس و سلیمان اور فارسی غزلیات سے پتہ چلتا ہے کہ صوفی کو فارسی زبان پر کسقدر عبور تھا۔ صوفی نے تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن مثنوی کی طرف طبیعت زیادہ مائل تھی۔ واردات عشق۔ شمع و پروانہ۔ مَے و مینا گل و بلبل کے مضامین سے کلام لبریز ہے۔ لیکن صوفیانہ رنگ سب پر غالب نظر آتا ہے۔ خدا اور رسولؐ کی محبت نے اسقدر وارفتہ بنا دیا تھا کہ "اس سراب رنگ و بو" پر نظر اُٹھا کر دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اور اس دُنیا کو ــــــ اسکی ناپائداری۔ اسکی جاہ و ثروت اسکے عیش و آرام۔ اسکے نام و نمود غرض ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے فصاحت و شیرینی انکے کلام کی ممتاز خصوصیات ہیں۔ لیکن طرز ادا میں جدت اور انوکھے پن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ معاملہ بندی اور مضمون آفرینی میں سعدی اور حافظ کا سا لطف محسوس ہوتا ہے۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو

مُردم از درد فراق و خبرے نیست ترا من شدم خاک و بہ خاکم گذرے نیست ترا
شبنم آسا بوے چرخ زیستی برخیز ہمتے ہست اگر بال و پرے نیست ترا

اذاں در گلشنِ ہستی بچشم من نمی آئی کہ ہستی ہمچو بو پنہاں درون غنچہ دلہا
رسید کارواں بر منزل و گوید قضا با من کہ اینجا اشتقامت نیست بربندید محملہا
بدردِ عشق تو عشاق میدارند تمکینے صدائے بر نخیزد از شکستِ شیشۂ دلہا

شاید کہ دگر شانہ زدی زلف دوتارا سودا زدہ در کوئے تو دیدیم صبارا
دل ہست و لیکن بہ دلآرام نہ بستیم از دیدہ چہ حاصل کہ ندیدیم خدارا

اناں دمید ز خاکِ مزارِ من نرگس کہ عشق خوش نگہاں بود در سرشت مرا
درونِ میکدہ از یادِ حق نیم غافل جمال کعبہ عیاں است در کنشت مرا

میکشی تصویر و می بینی بسوئے او کہ او رشک بر چشم تو اے بہزاد می آید مرا
حسرت گلزار و یاد ہمصفیراں در دلم اندرونِ دام اے صیاد می آید مرا
جانِ شیریں ہر دو در مہر و محبت باختند گریہ بر صوفی و بر فرہاد می آید مرا

مستم چنانکہ پیش تو بر رنگ می زنم در دورِ چشم مست تو جامِ شراب را
ہر کس کہ در جہاں بہ پیداست از عدم افسانہ شنید و پسندید خواب را

بُردم بزیرِ خاک دلِ داغدار را روشن ازیں چراغ بدارم مزار را
گمنامیم بہ بیں کہ پسِ مرگ در جہاں کس بر زمیں ندید نشانِ مزار را

یار آمد چو در کنارِ ما باز آمد بما بہارِ ما
شعلۂ آہ ما پسِ مردن شمع گردید بر مزارِ ما
بعد مُردن نہ بُرد بادِ صبا تا سر کوئے او غبارِ ما
صوفیا در قفس بیادِ چمن گریہ و نالہ ہست کارِ ما

یارب ز رشتِ خاک چہ آید بجز گناہ بر بخشش تو جرأت خطا میکنیم ما
عمرے بسر رسید کہ چوں صوفیِ حزیں با بیوفائے خویش وفا میکنیم ما

غافل مشو کہ عمر دو روزہ غنیمت است دنیا طلب مباش خدارا خدا طلب
تنہا گذاشتند مرا جملہ ہمرہاں صوفی سراغِ قافلہ از نقش پا طلب
صحبتِ پیر طریقت رہبر راہ خدا است بوئے گل باشد بہ بستاں رہنمائے عندلیب
رہینِ منت ہم مشرباں ہستم پسِ مردن کہ آمد بلبل و پروانہ بر خاکِ مزار شب

دوشش از بزم چواں فتنۂ دوراں برخاست
شور محشر بقدش دست و گریباں برخاست

نیست ایں گنبدِ گردوں کہ بسر می بینی
دود آہیست کہ از سینۂ سوزاں برخاست

ہر کہ آمد بجہاں بہر تماشا صوفی
شاد بنشست دریں خانہ و گریاں برخاست

حباب ما وجود حباب ہر دو یکیست تمام عالم و نقش بر آب ہر دو یکیست
حذر ز گریۂ عشاق خویشتن داری کہ چشم عاشق و چشم سحاب ہر دو یکیست

دل را بعشق نرگس مستانہ سوختیم قندیلِ عرش بردِ میخانہ سوختیم
خوش گفت شمع نکتہ روشن بہ انجمن خود را تمام از پئے پروانہ سوختیم

عاشق بدرد ہجر تو کارے نمی کند ایں عمر مستعار بافسانہ می برد
صوفی بہ ہجر یار مکن گریہ متصل سیلاب چوں بلند شود خانہ می برد

یار را ناز و ادائے است کہ من میدانم بر من خستہ جفائے است کہ من میدانم
عمر در جرم و خطا رفت و لیکن ہر دم از خدا لطف و عطائے است کہ من میدانم
عشق گل چند کنی بلبل ناداں گل را اندریں باغ بقائے است کہ من میدانم
زخمہ بر تار مزن مطرب و کم کن آواز اندریں تار نوائے است کہ من میدانم

مسعود علی اشرف

آزادی کی راہ

نوجوانانِ وطن ہیں کس قدر گم کردہ راہ
منزلِ مقصد سے کوسوں دُور، آوارہ تباہ

اپنی طاقت کر رہے ہیں سعیِ لاحاصل میں صرف
زور ہوتا ہے حصولِ دوریِ منزل میں صرف

دوڑ کر ہر راہِ ناہموار پر گرتے ہیں یہ
عقل بیچاری کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں یہ

ہیں رواں سمتِ زوال اسپِ جہالت پر سوار
جیسے جائیں غرب کی جانب بہائم بے مہار

ہر قدم منزل بہ منزل باغیانہ ہے روش
راہِ آزادی میں کتنی مجرمانہ ہے روش؟

گو اُڑے جاتے ہیں لیکن انکی آنکھیں بند ہیں
بے خبر انجام سے، آغاز سے خورسند ہیں

آہ یہ کیسا جنوں انگیز ہے ان کا شغف
بے تحاشا دوڑنا قعرِ مذلت کی طرف!

ان کو اقدامِ غلط پر ٹوک دینا چاہیئے
مطلقاً اس کج روی کو روک دینا چاہیئے

ان کو دی جائے رہِ منزل سے آوازِ بلند
پھر بتائی جائے اک ترکیبِ پروازِ بلند

اے جوانانِ وطن! اے نوجوانانِ وطن!
دست و بازوئے وطن! شانِ وطن. جانِ وطن!

گامزن ہو جس پہ تم مطلق ہی بربادی کی راہ
آؤ دیکھو میں بتاؤں تم کو آزادی کی راہ

لازمی ہے راہ سے منزل بہ منزل آگہی
فائزِ منزل ہوا ہے کوئی ناواقف کبھی؟

پہلی منزل اتحادِ باہمی ہے بزم میں
دوسری منزل حکومت سے تعاون رزم میں

تیسری منزل ہے ان سب سے گذر جانے کے بعد
دشمنانِ ہند پر فتح و ظفر پانے کے بعد

یعنی آزادی طلب کیجائے ہر اک ڈھنگ سے
عاجزی سے آشتی سے یا بالآخر جنگ سے

کوششِ منزل رسی بیکار ہے انکے بغیر
کامیابی حشر تک دشوار ہے ان کے بغیر

دعوتِ حق پر عمل پیرا اگر ہو جاؤ گے
منزلِ مقصود پر اپنے کو اک دن پاؤ گے

ہمکنارِ حریت ہو جائے گی خاکِ وطن
ناز تم پر حشر تک فرمائے گی خاکِ وطن

برقؔ صدیقی فتحپوری

آتشدان

"۳۲ پلیز"

"کون چھوٹے بابو؟ —— وہ تو سرکار اس وقت موجود نہیں ہیں"

"اچھا جب آئیں تو کہہ دینا کہ شمیم بابو کو بہت ضروری کام ہے فوراً مل جائیں یا ٹیلیفون پر بات کر لیں"

....

"ہیلو —— کون فہیم، معاف کرنا دوست میں پتا جی کے ایک کام سے گاؤں چلا گیا تھا۔ خیر تو ہے، اتنی رات گئے کیوں یاد کیا۔ کیا کہیں مشاعرہ ہے؟"

"مشاعرہ وشاعرہ تو کچھ نہیں تم نے کل ایک وعدہ کیا تھا —— یاد ہے کہ نہیں —— میں تمہارا انتظار کرتا رہا۔ جب تم نہ آئے تو یاد دہانی کے لئے ......"

"—— ہاں ہاں فہیم میں نے وعدہ کیا تھا، اُف بھول گیا۔ اچھا میں ابھی آتا ہوں۔ تیار رہنا"

"سرو قد۔ چھریرہ بدن، گر گٹھے ہوئے اعضا، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، لانبی پلکیں، متبسم ہونٹ۔ صبیح اور روشن چہرہ۔ مرمریں باہیں۔ سینے کا قیامت آفریں اُبھار، بمشکل ۱۴ سال کی عمر —— کیونکر یقین آئے اور کس طرح باور کیا جائے۔ راجو تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ بازارِ ہوس میں حسنِ کمل کو اتنی ارزاں قیمت پر فروخت ہوتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ارزانی وقتی اور شمع کے گرد پروانوں کو جمع کرنے کے لئے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ہیرا کوڑیوں کے مول تشنگیٔ حیات بجھانے کے لئے فروخت کیا جا رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایمائے حسن کے بغیر جبراً یہ سب کچھ ہو رہا ہو۔ مگر حسن اور معصوم —— جوانی اور بھرپور۔ شباب اور الھڑ۔ پھول اور نورس۔ چاند اور چودھویں کا۔ ہیرا اور ترشا ہوا۔ باغ اور پھولوں سے لدا ہوا۔ کلی اور نوشگفتہ؟! —— قیامت قیامت میں کیونکر تاب لا سکونگا۔ کیا اس برقِ حسن کی شعاعوں سے متاعِ ہوش باقی رہ سکیگی....؟"

"اتنی محویت —— حد کر دی تم نے شمیم۔ میں نے ہورن بجایا تو تم نے نہیں سُنا تالی بجائی تو تم نہ چونکے۔ کمرہ میں زور زور سے قدم رکھے تو تمہارا سلسلۂ محویت نہ ٹوٹا" راجو نے شمیم کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا بتاؤں دوست تم نے ذکر ہی کچھ اس انداز سے کیا تھا کہ روح بیتاب ہے، دل و دماغ صرف تصور ہی سے تسکین ہو رہے ہیں۔ جانتا ہوں کہ حسن مشاطۂ غازہ میں لپٹا ہوا کھلونا ہوتا ہے —— مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ متاعِ ہوسمندی ایک زیور ہے فتح شدہ اس کے باوجود نہ جانے کونسی کشش اُدھر جانے اور نظر کو خراب جمال کرنے پر مجبور کر رہی ہے"

"تو چلو نا —— مگر اس معاملہ میں تو تم نرے زاہد خشک واقع ہوئے ہو۔ مجھے تو تعجب ہے کہ تمہاری شاعری صحیح تغزل کی آئینہ دار کیونکر ہے" راجو نے ہنستے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"یہ تم نہیں سمجھ سکتے راجو —— میں اُن شاعروں میں سے نہیں ہوں جو شراب پی کر شراب کی تعریف کرتے ہیں۔ جو پھول کو سونگھ کر اس کی بُو باس کا ذکر کرتے ہیں۔ جو حسن کو زینتِ آغوش بنا کر اس کا چرچا کرتے ہیں، اور جنھیں پیاسا رہنے کے بعد تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ میری شاعری کی اساس غور و فکر اور تخیل پر ہے میں ہر چیز کو نظر سے چھوتا ہوں۔ مجھے اس کا عرفان ہے کہ پھول کو سونگھنے سے اس کی عصمت باقی نہیں رہ سکتی۔

"ہاں جوبلی ہوٹل"

"بہت بہتر"

"یہی ہے وہ ہوٹل" میں نے کار سے اترتے ہوئے پوچھا

"ہاں یہی ہے" راجو نے رئیسانہ استغنا کے ساتھ جواب دیا

ہم دونوں بالائی حصے پر پہونچ گئے۔ ہرچند یہ ہوٹل تھا مگر ہوٹل کے سارے آثار مفقود —— دو ایک ٹوٹی پھوٹی میزیں۔ چند گرد آلود گلاس۔ جالوں سے اٹی ہوئی چھت —— اس کے باوجود مکانیت فرضی تھی —— بڑا ہال، ادھر اُدھر دو کوٹھریاں، درمیان میں ایک دروازہ اس پر کثیف اور بوسیدہ پردہ۔ نہ آدم نہ آدم زاد ہاں برابر والی کوٹھری میں ایک دو لڑکوں کے کھسر پھسر کرنے کی آواز ضرور محسوس ہوتی تھی۔ لیکن ہماری چاپ سن کر وہ خاموش ہو گئے۔ میں حیران تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے کہیں وہ غارتگرِ ہوش نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں سمجھا شاید راجو نے مذاق کیا ہے کہ اتنے میں ایک لڑکا کسی طرف سے وارد ہوا۔

"فرمایئے" اُس نے بڑے اطمینان سے کہا

"اندر کوئی ہے ؟" راجو نے تحکمانہ مگر رندانہ انداز میں پوچھا۔

"ابھی بتاتا ہوں" ـــــــ لڑکا بوسیدہ پردے سے گزر کر غائب ہوگیا اور دو تین منٹ بعد پردے سے سر نکال کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔

میں راجو کے اتباع پر مجبور ہوگیا۔ وہ آگے اور میں پیچھے۔ دل دھڑک رہا تھا اور روح آلِ ذوق سے لرز رہی تھی۔ پردے کے اندر بھی کافی وسیع و عریض پختہ عمارت تھی۔ یہ تو یاد نہیں کہ کتنے کمرے تھے۔ ہاں ایک کمرہ سامنے کے رُخ پر تھا اور دوسرا اُس سے ملحق ملحقہ کمرہ سے ہارمونیم کی آواز آرہی تھی ـــــ گرہمیں سامنے والے کمرہ میں لے جایا گیا۔

ـــــــ راجو بیباکانہ داخل ہوا اور میں اندیشوں، خطرات اور شوق کی کشمکش کیساتھ۔

"آداب عرض ہے منیجر صاحب" راجو نے ایک ادھیڑ عمر کے دُبلے پتلے انسان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اتنی تیزی سے کہ میں کمرہ کا جائزہ بھی نہ لے سکا اور راجو کی دوسری آواز ـــــ "اچھی تو ہو مس نرگس" ـــــ نے کرسی کے نصف حصہ پر بیٹھی ہوئی ایک نوخیز دوشیزہ پر نظر جما دیں، پہلی نظر اٹھ کر واپس آچکی تھی جو ناقدانہ نہ سہی مگر بیتابانہ ضرور تھی لیکن اس جوابکے بعد "اچھی ہوں" اور وہ بھی بجھے ہوئے دل اور دبے ہوئے الفاظ میں ـــــ میں دوبارہ نگاہیں ڈالنے پر مجبور ہوگیا راجو کرسی کے قریب پہونچ چکا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ کرسی کے اوپری ڈنڈے پر تھا جس سے اُس مجسمۂ حُسن و جوانی کے سیاہ، دراز اور ریشم سے زیادہ چمکدار بال مَس ہو رہے تھے۔

"سگریٹ پیوگی" راجو نے عیاشانہ انداز میں پوچھا

"اگر آپ پلائیں گے" ـــــ یہ کہہ کر حُسن کی نگاہیں پھر جھک گئیں۔

راجو اب منیجر سے مخاطب ہو رہا تھا ـــــ کبھی انگریزی اور کبھی اُردو میں

(FIFTEENRUPEES TOO MUCH)

(پندرہ روپیہ بہت زیادہ ہیں) کا مبہم جملہ کبھی کبھی فضا میں سُنائی دیتا تھا ـــــ میری نظریں کرسی پر ساکت و سامت بیٹھی ہوئی لعبتِ رنگیں پر جم کر رہ گئیں تھیں اور نگاہیں ایک عرفانی کی طرح احساس کی معراج تک پہونچی ہوئی تھیں ـــــ میں نے کیا دیکھا ـــــ شاید الفاظ اس کے متحمل نہ ہوسکیں ـــــ خزاں آلود بہار ـــــ روندی ہوئی جوانی ـــــ کچلا ہوا شباب، قبل از وقت توڑی ہوئی پژمردہ کلی۔ کثافت و غلاظت میں اٹا ہوا موتی۔ جال میں پھنسی ہوئی ہرنی۔ خجالت اور ندامت کے بوجھ سے دبی ہوئی حور ـــــ اور سماج کی ہوس رانیوں کے دور اہے پر اپنی عصمت و عفت کو نیلام کرکے تلخابۂ حیات پینے والی دوشیزہ ـــــ اُس کی نظریں بے اختیارانہ طور پر کبھی کبھی اُٹھ جاتی تھیں وہ محسوس کر رہی تھی کہ اُس پر تنقیدی نگاہیں ڈالی جا رہی ہیں۔ اُس کے جسم کو بیچا جا رہا ہے۔ وہ کرب و بیچینی کو چھپانے کی انتہائی کوشش کر رہی تھی۔ مگر یہ کوشش ناتجربہ کاری، ہجوم افکار اور اُس تعلیم سے جو آنے والے لوگوں کے سلسلے میں دی گئی تھی۔ مل جُل کر اور زیادہ اُبھر گئی تھی ـــــ وہ خاموش تھی مگر اس کی نگاہیں گویا۔ وہ لب بستہ تھی مگر اُس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دلی جذبات کا غماز ـــــ،

زندگی کا وہ پہلا تلخ تجربہ، سماج کی غفلتوں کا زندہ جاوید شاہکار۔ مذہب اور سیاست کے ٹھیکیداروں کے دامن کا بدنما داغ۔ مظلومیت کا مرقع۔ عورت کی خلقت کو گناہ جانتے ہوئے اور مردوں کی ہوس رانیوں کا بھیانک منظر میرے احساس پر رہ رہ کر تیر چلا رہا تھا۔ اُس آہوئے دام رسیدہ کی سرسری ملاقات کو دو دن ہوچکے تھے اور ملاقات بھی کیسی بجز نگاہوں کے سوال و جواب کے نہ میں نے کچھ پوچھا اور نہ وہ گویا ہوئی ـــــ مگر دل میں ایک خلش تھی۔ دماغ میں ایک ہیجان تھا اور جذبات میں ایک طوفان۔ میں اس سے دوبارہ ملنے کا خواہش مند تھا اُس کے اتصال سے لطف اندوز ہونے کے لئے نہیں بلکہ اُس تجربہ، اس عمل اور اس نظریہ کی تکمیل کے لئے جو ایک طالب العلم مدرسۂ حیات میں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ اپنے شاعرانہ احساس کی تسکین فرو... کرنا چاہتا تھا ـــــ،

"یہ بیس روپیہ ہیں منیجر صاحب۔ آپ پندرہ مانگ رہے تھے نا۔ مگر دیکھئے کوئی دوسرا نہ آنے پائے۔ ہوٹل کا دروازہ بند کرا دیجئے۔ میں آج رات آپ ہی کے یہاں گذارنا چاہتا ہوں"

"بہت بہتر" اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ نرگس بائی نے تو جب سے آپ کو دیکھا ہے ہر وقت آپ ہی کے خیال میں محو رہتی ہے۔ نہ جانے آپ نے کیا جادو کر دیا ہے" منیجر نے کہا مجھے ہنسی بھی آرہی تھی اور غصہ بھی ـــــ آہ چند روپہلی ٹھیکریوں پر معصوم دوشیزاؤں کو بھینٹ چڑھانے والا یہ ناپاک گروہ کتنا بے رحم اور سنگی ہوتا ہے۔ میں نے وقت کی کمی اور اضطراب شوق کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"میں کمرہ میں جا سکتا ہوں"

"کیوں نہیں ـــــ بڑے شوق سے۔ آیئے، تشریف لایئے"! منیجر نے کہا اور پھر دوسری طرف مڑتے ہوئے خیال کی رو میں بہی ہوئی دوشیزہ سے مخاطب ہوا جو میری موجودگی سے کچھ سراسیمہ سی ہوگئی تھی اور چھپانے کے باوجود سینے کا اُتار چڑھاؤ

صاف محسوس ہو رہا تھا؟ نرگس بائی ــــــ آپ اُس دن راجو بابو کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ ہماری قسمت کہ آج پھر کرم فرمایا ہے۔ بڑے فیاض اور نیک دل انسان ہیں ــــ تم بھی بے چین تھیں، لو تمہاری آرزو پوری ہو گئی ــــ" منیجر نے کمرہ سے جاتے ہوئے کہا۔

چند ہی سیکنڈ کے بعد باہر کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور عمارت میں موت کی سی خاموشی چھا گئی ــــ میں اپنی جگہ بدستور کھڑا تھا۔ میرے قدم جم کر رہ گئے تھے۔ میری گویائی سلب ہو گئی تھی اور وہ ــــ چاہتی تھی کہ کچھ کہے، ارادہ کر رہی تھی کہ مجھ سے مخاطب ہو ــــ میں نے سگریٹ سلگایا، کمرہ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ایک پلنگ، دو تین کرسیاں۔ ایک سنگار میز۔ ایک بڑا آئینہ اور چند تصویریں میری پشت پر جو تصویر تھی اُس پر "ملاح شبِ تاریک میں" لکھا ہوا تھا۔ میں "ملاح" اور شبِ تاریک کا نفسیاتی تجزیہ کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کمرہ میں بھی ایک مریض عورت ہے، مگر ظلمت میں لپٹی ہوئی، کہ اتنے میں اُس نے بڑی لطیف مگر مضمحل آواز میں کہا "تشریف رکھئے"۔

جیسے کسی نے خواب سے چونکا دیا ہو۔ میں آگے بڑھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ دل گوناگوں جذبات سے بھرا ہوا تھا، غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا

"آپ گانا نہیں گاتیں"

"جی ہاں گاتی ہوں مگر کم، میرے گانے کو لوگ پسند نہیں کرتے" اُس نے اپنی مدبھری آنکھوں کو گردش دیتے ہوئے کہا۔

"آپ یہاں کب سے مقیم ہیں"

"دو ہفتہ سے" اُس نے موضوعِ گفتگو کو بدلتے ہوئے ایک عارضی بناوٹ اور پھیکی مسکراہٹ سے کام لیتے ہوئے میری گھڑی کی طرف اشارہ کیا اور کہا "گھڑی تو بہت خوبصورت ہے۔ کیا وقت ہوا ہے" ــــ اُس کے سر سے ساری کا آنچل سرک چکا تھا اور اب وہ کیا نظر آ رہی تھی۔ یہ وہ بتا سکتا ہے جسے اپنے سراپا کا ہوش ہو۔ مجھ پر وارفتگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ میں نے "۱۱ بجے ہیں" کہتے ہوئے اپنی کرسی اُس کے پلنگ کے قریب کر لی۔ اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ بیک لمحہ اُس کے قریب پلنگ پر جا بیٹھا۔ میری اخلاقی قوتیں اور شاعرانہ لطافتیں مضمحل ہونے والی تھیں۔ شیطان مجھ پر قہقہہ زن تھا۔ میں اُس کا خوبصورت اور مرمر سے زیادہ سفید ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا ہی چاہتا تھا کہ اُس کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہو گیا میں اُس کے دل کی دھڑکن محسوس کر رہا تھا۔ اُس کی نگاہوں سے رحم طلبی کی ایسی شعاعیں نکل رہی تھیں کہ میں اُن کو تاب نہ لا سکا۔ میں سنبھلا، خود کو ندامت کی نظر سے دیکھا اور بات بنانے کے لئے سگریٹ آگے بڑھا دیا مگر میرے دل میں ایک چبھن سی محسوس ہو رہی تھی جس سے روح تحلیل ہوئی جا رہی تھی۔ میں اپنی توجہ کم نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس گتھی کا حل بھی ڈھونڈھ رہا تھا جو اُس کے اور میرے مابین پیدا ہو گئی تھی۔ معاً میری نظر اُس کے شفاف اور سیمگوں سینے پر لٹکی ہوئی لاکٹ پر پڑی جو اتفاقاً باہر آ گئی تھی اور جس پر انگریزی میں "FEROZE CHABLA" "فیروز چاؤلا" لکھا ہوا تھا۔

میں چونکا، دل و دماغ میں بمبئی کے مشہور پارسیوں کے چاؤلا خاندان کی یاد تازہ ہو گئی ــــ میں لاکٹ پر کھدے ہوئے نام کو قریب سے پڑھنا چاہتا تھا اور اس ذیل میں چند سوالات کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اُس نے گلے سے لاکٹ کو تیزی سے کھینچا اور آتشدان میں دہکتی ہوئی انگیٹھی میں ڈال دیا ــــ جیسے کسی نے مجھ سے زندگی کی روشنی چھین لی ہو۔ جیسے ہاتھ میں آئی ہوئی دولت نکل گئی ہو اور جیسے کسی نے روح کو چھید دیا ہو ــــ میں تیزی کے ساتھ اُٹھا اور بغیر کسی خیال کے دہکتی ہوئی انگیٹھی میں ہاتھ ڈال کر لاکٹ کو گلنے سے پہلے باہر نکال لیا، اُس کا چہرہ انتہائی بھیانک اور خوف زدہ ہو چکا تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا اور قبل اس کے کہ میں کوئی استفسار کروں وہ بے ہوش ہو چکی تھی ــــ چونکہ میری انگلیوں میں آبلے پڑ گئے تھے اور کئی جگہ چربی بھی نمودار ہو گئی تھی۔ اس لئے میں شدید تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ لیکن کامیابی اور کامرانی کے احساس نے تکلیف کو وقتی طور پر راحت سے بدل دیا۔ میں نے سنگار میز پر رکھی ہوئی کریم کو رومال پر انڈیل لیا اور رومال جلے ہوئے ہاتھ پر لپیٹ لیا۔ اب سوزش میں کمی ہو چکی تھی اور بیگانۂ ہوش حسن بھی عالمِ ہوش میں کسمسا رہا تھا، مگر آنسوؤں سے بھیگے ہوئے رخسار، بکھرے ہوئے بال اور پژمردہ چہرہ ــــ میں نے ــــ انتہائی ہمدردانہ لہجہ میں کہا:-

"خوفزدہ نہ ہو نرگس، میں اِن ناپاک اور ذلیل کتوں سے انتقام لونگا اور تمہیں اِنکے پھندے سے چھڑا کر عزت و عافیت کیساتھ تمہارے گھر پہنچا دونگا" گھر کا نام سنکر وہ رونے لگی۔ اُس کی زبان سے نکلا" میں اس قابل نہیں ہوں میرے محسن میری زندگی کو ختم کر دو، میں بیسوا ہوں، میں عصمت فروش ہوں دُنیا اس کو کبھی یقین نہیں کر سکتی کہ میں نے ہر آنے والے کو اپنے آنسوؤں کا نذرانہ دیکر، ہاتھ جوڑ کر، پاؤں پڑ کر اپنی عصمت کو بچایا ہے۔

ایک ہفتہ کی مسلسل تگ و دو کے بعد تین آدمی گرفتار ہوئے۔ اِن ہی نے نرگس کا اغوا کیا تھا نرگس کے اعزا بھی آ چکے تھے۔ نرگس کون تھی بمبئی کے ایک مشہور پارسی خاندان کی یتیم لڑکی جس کا اصلی نام "وِن مالا" تھا

اس واقعہ کو دو ماہ ہو چکے ہیں۔ لیکن میرے دل و دماغ اب تک یکسو نہیں ہوئے۔ نرگس کی ساحرانہ آنکھیں۔ اُس کا معصوم چہرہ۔ عنابی نیم شگفتہ لب اور اُس کے سیاہ دراز بال *۔

* میرے شاعرانہ نہیں بلکہ بلند انسانی جذبات کو اب بھی کبھی کبھی برانگیختہ کر دیتے ہیں اور میں بے اختیارانہ کہہ اٹھتا ہوں :- "نرگس تم کتنی خوبصورت تھیں" ۴۴

گلبانگِ بہار

اس شان سے صورت تری فردوسِ نظر ہے　　ہر ذرہ میں رنگینیٔ صد شام و سحر ہے
یہ تیری نگاہوں کے تبسم کا اثر ہے　　فردوس در آغوش ہر اک تارِ نظر ہے
بجلی کو وہاں بار، نہ موسیٰ کا گزر ہے　　اے جلوۂ جانانہ جہاں میری نظر ہے
ہر سانس سے الجھی ہوئی ہے تیری تمنا　　ہر گام پہ جلوہ ترا آشوبِ نظر ہے

دل تھام کے کہنا یہ کسی کا شبِ فرقت
کمبخت کی آہوں میں قیامت کا اثر ہے

بہار کوٹی

بیانِ شوق

بیانِ شوق و زبانِ فغاں نہیں معلوم　　انھیں ابھی مرا دردِ نہاں نہیں معلوم
قدم قدم پہ ہے قربانِ عظمتِ کونین　　چلا ہے لیکے مجھے دل کہاں نہیں معلوم
میں نو اسیرِ قفس ہوں معاف کر صیاد　　میں کیا کروں مجھے طرزِ فغاں نہیں معلوم
ابھی قبول نہ کر میرے سجدہ ہائے خودی　　ابھی جبیں کو ترا آستاں نہیں معلوم
نگاہِ عشق میں ہم رنگ ہیں حیات و ممات　　نگاہِ عشق کو سود و زیاں نہیں معلوم
حضورِ دوست میں اللہ بیخودی میری　　چمن میں ہوں خبرِ گلستاں نہیں معلوم
زہے وہ دل جو نظر کردۂ تغافل ہے　　خوشا وہ راز جسے رازداں نہیں معلوم
بہار ہو کہ خزاں ہو چمن پرست ہوں میں　　مرے جنوں کو بہار و خزاں نہیں معلوم

کلی کلی ہے تبسم نواز اے اختر
یہ کون سامنے ہے گلفشاں نہیں معلوم

"خطیبۂ ہند" سیدہ اختر حیدرآبادی

عزیز لکھنوی کی قصیدہ گوئی

امیر و داغ کے بعد اردو شاعری کا ایک ایسا دور شروع ہوا جو اپنے گوناگوں انقلابات اور جدید رجحانات کے اعتبار سے اس زبان کی تاریخ میں نمایاں طور پر نظر آتا رہے گا۔ ایک طرف تو شعراء کے درباری تعلقات کا قریب قریب خاتمہ ہوا اور دوسری طرف یوروپ کے علوم و فنون شعر و ادب نے سامنے آ کر ہمارے شعراء کی نگاہوں سے قدامت کے پردے اٹھانا شروع کئے صاحبانِ ذوق و نظر نے دیکھا کہ ہماری شاعری کے اعضا خستہ و فرسودہ ہوتے جاتے ہیں، پھر "وفاداری بشرط استواری" کہاں تک؟ ادب کو زندگی کے تمام شعبوں کا ترجمان ہونا چاہئے۔ پرانی راہیں کثرتِ نقشِ قدم سے پامال ہو چکی ہیں۔ نئے راستے دعوت گام فرسائی دے رہے ہیں۔ قدم قدم پر اپنی تنگ دامانی کا احساس ہوا اور ایسی شدت سے ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہماری شاعری ایک نئے قالب میں نظر آنے لگی۔

ان جدید میلانات سے یوں تو ہر صنف شاعری متاثر ہوئی لیکن ذوق قصیدہ گوئی جس میں پہلے ہی سے آثارِ زوال پیدا ہو چلے تھے۔ قریب قریب معدوم ہی ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ قصیدوں کا عنصر آزمانا طول۔ کثرت آورد۔ زور مبالغہ۔ جدید شاعری کے رجحانات اختصار۔ صفائی و سادگی کا حریف نہیں ہو سکتا تھا حقیقت یہ ہے کہ قصیدہ کا تو شاید لوگ نام بھی بھول جاتے۔ لیکن ایک سلسلہ ایسا پیدا ہو گیا جس نے پھر کچھ عرصے کے لئے اس میں روح پھونکدی۔

لکھنؤ اور اسکے نواح میں حضرت رسالتمآبؐ اور آئمہ اہلبیتؑ کے جشن ولادت کی تقریب میں محافلِ میلاد منعقد ہونے لگیں جن میں ذکر ولادت و فضائل کے بعد قصیدہ خوانی ہوتی تھی یہ رسم اب بھی جاری ہے اور چونکہ وقت کا زیادہ حصہ قصیدہ خوانی ہی میں صرف ہوتا ہے۔ اس لئے اس قسم کی محفلوں کو عموماً محافل مقاصدہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان جلسوں میں قریب قریب تمام عقیدتمند شعراء حصہ لیتے ہیں اور باوجود اسکے کہ ان میں سے بعض کی طبیعتیں قصیدے کے لئے بالکل موزوں نہیں ہوتیں پھر بھی جوشِ عقیدت اور مقامی رسم سے مجبور ہو کر اس میدان میں طبع آزمائی کی جاتی ہے ہمارے خیال میں حضرت عزیز بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ ان کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ درحقیقت تغزل کے دلدادہ تھے۔ قصیدہ گوئی کا ذوق انکی طبیعت میں نہ تھا۔ مقامی حالات سے متاثر ہو کر اس صنف کو اختیار کیا۔ مشق شعر بڑھی ہوئی تھی۔ جذبات عقیدت نے کچھ سہارا دیا۔ رفتہ رفتہ قصائد کی تعداد بڑھتی گئی "صحیفۂ ولا" (مجموعہ قصائد عزیز) شائع ہو گیا اور وہ دورِ جدید کے قصیدہ گو شعراء کی مختصر فہرست میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک بن گئے۔ فارسی زبان کا مشہور شاعر عرفی بھی غزل گوئی کے لئے پیدا ہوا تھا۔ کہتا ہے ؎

قصیدہ کار ہوس پیشگاں بود عرفی
تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل است

لیکن اس زمرۂ "ہوس پیشگاں" میں اُسے خود بھی شامل ہونا پڑا۔ رسم زمانہ اور درباری تعلقات سے مجبور ہو کر قصیدہ کہے اور ایسے بلند کہے کہ ہندوستان میں آج اسکی شہرت کا دارومدار اسکے قصیدوں پر ہے۔ عزیز بھی اس اعتبار سے اگرچہ اردو زبان کے عرفی معلوم ہوتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ انکی شہرت کا انحصار غزل گوئی پر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عرفی نے مذہبی قصائد کے ساتھ ساتھ سلاطین و امراء کی تعریف میں بھی قصیدے کہے ہیں۔ عزیز کا دامن اس لوث سے پاک ہے۔

ابھی لکھا جا چکا ہے کہ عزیز غزل گو شاعر تھے اور انکی غزلوں میں ایک خاص قسم کا اظہار حزن و یاس پایا جاتا ہے۔ سکرات موت کا عالم۔ ہچکیں۔ آنکھیں پھرنا۔ سانس اکھڑنا دم نکلنا۔ گور غریباں کی بیکسی۔ شام ہجر کی تنہائی۔ اور اسی سے ملتی جلتی حالتیں جابجا نظر آتی ہیں۔ غرض انکی شاعری ایک دل شکستہ کا نغمۂ یاس ہے۔ خود کہتے ہیں

جہاں تک میری حدِ شاعری ہے ۔۔۔ بساطِ آرزو شکستہ خاطری ہے

جس کے مزاج میں اسقدر یاس و قنوطیت ہو اس کے لئے قصیدہ کہنا آسان نہیں۔ میر کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہی حال ان کا بھی تھا۔ قادر الکلام ہونے کے باوجود قصیدہ گوئی میں کامیاب نہ ہو سکے۔ عزیز بھی مجبور تھے۔ دیکھا کہ بغیر غزل کا سہارا لئے ہوئے قصیدہ کہنا ذرا دشوار ہے تشبیب میں اس کے لئے بہت گنجائش تھی۔ چنانچہ اس تدبیر کو اختیار کیا۔ مجموعۂ قصائد ہمارے پیشِ نظر ہے۔ زیادہ تعداد میں قصیدے ایسے ہیں۔ جنکی تشبیبوں میں غزل کا رنگ غالب ہے۔ چند شعر پڑھئے۔ عمدہ غزلوں کے منتخب اشعار معلوم ہوتے ہیں ؎

شرحِ جنون سلسلہ جنباں کئے ہوئے ۔۔۔ بیٹھا ہوں چاک چاک گریباں کئے ہوئے
رقیب صبر ہیں اندیشہ ہائے مایوسی ۔۔۔ اُمید وصل پہ جینا بھی اب ہوا مشکل
بے حقیقت جانئے ہم تو سامانِ وجود ۔۔۔ پھر فراہم ہوکے یہ تنکے قیامت ہوگئیں
ہیں سر رخ سب اندر سے پھر بھی نہیں کھلتی ہیں ۔۔۔ دُکھتی ہوئی آنکھیں ہیں کلیاں ہیں بستر کی
علاجِ داغ کرتا ہے بسی کا دشِ ناخن ۔۔۔ مقدر سے ملا ہے چارہ گر بھی مجھکو سودائی

اظہارِ واردات و جذبات کے ساتھ ساتھ معشوق کے خارجی اوصاف بھی نظر انداز نہیں کئے گئے ہیں۔ یہ شاید غالبِ لکھنؤ کی تاثیر ہے اور کیا کہا جائے۔ سنئے:۔

دلِ شب آگیا ہے دیکھ کر اندازِ دلداری — نہ سمجھو خالِ مشکیں اے حسینو اپنے عارض پر
دہن بستہ ہے لبِ خُرمازِ نخداں مثلِ شفتالو — بنفشہ زار ہے روئے مخطط اس ستمگر کا

بعض تشبیبوں میں بہاریہ مضامین بھی نظم کئے گئے ہیں اور جا بجا ذکرِ ساقی و ساغر سے مَے فطرت کو دو آتشہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن نشہ ساحروں ہونے کے باوجود کسی منظر کی تصویر اس طرح آنکھوں کے سامنے نہیں آتی جس کو عمدہ محاکات کا نمونہ سمجھا جائے پروازِ تخیل اور مضمون آفرینی سے جوہرِ سادگی رخصت ہو جاتا ہے۔ اور مناظر مصنوعی معلوم ہونے لگے ہیں شعرائے متقدمین نے بھی قصیدہ گوئی میں اس چیز کا خیال نہ رکھا۔ زورِ مبالغہ اور شکوہِ الفاظ کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ لہٰذا سیدھی سادھی بات کو بھی بکوشش پیچیدہ کر دیتے تھے۔ عزیز نے بھی اس معاملہ میں زیادہ تر انھیں کی تقلید کی ہے تاہم ضرور ہے کہ کہیں کہیں نرم الفاظ مترنم ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ محاکات اگرچہ مکمل نہیں لیکن "فردوسِ گوش" کی سحر آفرینیاں "جنت نگاہ" کی کوتاہیوں کی تلافی کر دیتی ہیں چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

مگر جس شئے پہ ڈالی پھول بنکر وہ ابھر آئی — نموکے یہ مناظر دیدنی ہیں دیکھنے والو
ادھر آغوش میں گلشن کے لی بیلوں نے انگڑائی — نگارِ سبز نے ہمدِ زمیں پر کروٹیں بدلیں
غبارِ دشت نے اٹھکر خزاں کی لاش کفنائی — جوانانِ چمن زندہ ہوئے اعجازِ موسم سے

کمندیں پھینکتے ہیں گنبدِ گردونِ گرداں پر — سماتی ہے یہ رفعت کی ہوا سر میں کہ فوارے

بعض قصیدوں میں طولانی تشبیبیں ہیں جن میں مختلف پیچیدہ مسائل پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ عزیز کے کلام کا جوہر وہ لطافت اور نرمی ہے جو غزل کی جان ہے لہٰذا وہ زور مبالغہ جو قصیدوں کے لئے ضروری ہے پیدا نہ ہو سکا۔ گویا ایک کمی رہی جاتی تھی اس کمی کو علمی اصطلاحوں اور تلمیحوں سے پورا کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس قسم کے اشعار سے استاد ذوق کی تقلید کا پتہ چلتا ہے۔ بعض جگہ تخلیق و ارتقائے عالم وغیرہ جیسے خشک مسائل میں سوال اور جواب سے دلچسپی پیدا کی گئی ہے۔ ایک موقع پر دو مختلف الخیال لوگوں کی گفتگو کا مرقع اس طرح کھینچا ہے کہ خوش طبعی اور ظرافت کی ہلکی ہلکی جھلکیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

یہ کہتا ہے غلط تفسیر حرفِ کن ہے سرتاسر — وہ کہتا ہے کہ یہ عالم قدیم الاصل ثابت ہے
کہا اس نے چھپائیگا نہ اپنی اصلیت کیونکر — کہا اسنے کہ ہم قائل نہیں ہیں مسخ ہونے کے
یہ کہتا ہے نہیں جب حِس تو اسپیشیز ہو کیونکر — وہ کہتا ہے کہ ہر ذرّہ میں ہم نے روح ثابت کی
کہا اسنے کہ تو دیکھو اپنی صورت آئینہ لے کر — کہا اس نے وجودِ ابلیس کا کب ہے دکھا دو تو

چند قصیدے ایسے بھی ہیں جنکی تشبیبوں میں بے ثباتی "ہستی بے حقیقت" اور حکمت و عظمت و نصیحت کے مضامین موثر طریقہ سے نظم کئے گئے ہیں جیسا پہلے کہا جا چکا ہے۔ انکے مزاج میں قنوطیت کی فراوانی ہے۔ ناپائداریٔ حیات اور مصائبِ زندگی سے بہت متاثر ہوئے ہیں اور نقوشِ تاثر صرف غزلوں ہی میں نہیں بلکہ قصائد میں بھی جلوہ گر ہوتے رہے ہیں۔ ان کے اس قسم کے اشعار پڑھکر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دل بیٹھا جا رہا ہے۔ یہ احساس ناخوش گوار سہی لیکن تلخیٔ حیات ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں شاعر کا کمال یہ ہے کہ زورِ بیاں سے رُلا دیتا ہے اور لطافتِ خیال سے آنسو پونچھا جاتا ہے۔

کیا قد دوتا نے تیری ہستی کو شکلِ لا — فنا کا وقت آیا جنبشِ سر خود موید ہے
جسے پیری میں اپنے جسم پر تو جھریاں سمجھا — یہ خطِ نسخ فردِ زندگی پر تیرے کھینچے تھے
سحر ہوتے ہی پیشانی پہ چمکے صبح کا تارا — فروغ ایسے نشانِ سجدہ کو پیری میں اے غافل

حصۂ مدح میں چند امور خاص طور پر درخورِ توجہ ہیں۔ عزیز کے ممدوحین ایسے لوگ ہیں جنکو وہ بعد از خدا تمام زمانہ سے بزرگ تر اور افضل مانتے ہیں اور جنکی ولا و مودت کو وہ اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ انکا عقیدہ یہ ہے کہ مرتبۂ الوہیت کے سوا ہر وصف اُن کے ممدوحین میں موجود ہے۔ اس لئے ایسے اشعار بھی جو بظاہر رسمی ستائش کے آئینہ دار معلوم ہوتے ہیں اُن کے عقیدہ کے مطابق صداقت آمیز کہے جا سکتے ہیں۔ تاہم انھوں نے یہ ہوشیاری کی ہے کہ ایسے اوصاف کا ذکر بھی بکثرت کیا ہے جو تاریخی حیثیت سے ثابت ہیں۔ ایک نعتیہ قصیدے میں کہتے ہیں:۔

واللہ کہ میں وحی سمجھتا ہوں تری بات[۱] — کس منہ سے کہوں کیفیتِ لذتِ تقریر

---

[۲]
نہیں بے رخ سے دل بخداں والوں کے ہلا دینگے — عبا میں لیکے اپنی پاک اولادوں کو یہ اکدن

ایسی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جاتیں لیکن بخوفِ طوالت ترک کی جاتی ہیں۔

اکثر مدحِ حاضر میں ایسا انداز بیان اختیار کر لیا ہے جس سے اشعار میں تغزل کی چاشنی پیدا ہو گئی ہے:۔

آنکھ بھر کر تجھے دیکھیں گے قیامت والے — حشر میں تیری ضرورت ہے مگر ہے یہ خیال
در پہ بیٹھے ہیں ابھی اور جراحت والے — الغیاث دلِ گردوں سے فقط کیا ہوگا

---

[۱] اس شعر میں قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے ما ینطق عن الھوا الخ۔ ..

[۲] اس واقعہ کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے۔

کہیں کہیں مدح میں مکالمہ کی روش اختیار کی ہے۔ جس سے کلام میں ایک خاص کشش پیدا ہوگئی ہے ؎

میں نے کہا زندہ ہیں شہیدانِ محبت — فرمایا تجھے قتل کرونگا پئے اثبات
میں نے یہ کہا عشق کی خلقت ہوئی پہلے — فرمایا غلط سب سے مقدم ہے مری ذات

قصیدوں میں مبالغوں کا زور بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ متقدمین نے اس میں بہت کاوشیں کی ہیں اور اکثر حدودِ اعتدال سے اتنا آگے نکل گئے ہیں کہ مبالغے نامقبول ہوکر رہ گئے ہیں۔ عزیز نے بھی اس روش کو ضرورتاً اختیار کیا ہے۔ لیکن بڑی احتیاط ملحوظ رکھی ہے اور مبالغوں کی درشتی میں لطافتِ خیال رنگینیٔ ادا اور ندرتِ بیان سے ایک خوش آیند نرمی پیدا کردی ہے۔ ذیل کے چند اشعار اس بیان کی تائید کرینگے ؎

پڑھی ہے اس قدر اوراقِ گل میں مدح حضرت کی
کہ ابتک خشک ہے نوکِ زبانِ خارِ صحرائی

نہ ہوتا انفکاکِ سایہ گر جسمِ منور سے
کہاں یہ چادرِ مہتاب میں ہوتی ضیا باری

اگر لے سبزۂ تزویر کوئی عہد میں ان کے
جکڑ لے ہتکڑی بنکر وہ فوراً حکمِ مولا سے

زمیں کو آپ کی تعظیم کی اس درجہ عادت تھی
بگولے سرو قد اٹھتے ہیں ابتک خاکِ صحرا سے

قمر دو شق ہوا تھا جنبشِ انگشتِ حضرت سے
اسی کے ڈر سے ہے کاہیدگی کی اسکو بیماری

حواسِ عنصرِ خاک و ہوا ابتک پریشاں ہیں
دکھائی تھی فرس نے انکے اکدن تیز رفتاری

اگر بادِ مخالف اسکے زوّاروں کو ایذا دے
طمانچے مارنے موجیں اٹھیں خارِ طوفاں پر

بعض مقامات پر اپنے جذبات کو ایسے لطیف انداز میں بیان کیا ہے کہ طبیعت وجد کرنے لگتی ہے۔

ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

عزیز اب زندگی دشوار ہے کیوں کہدیا مجھ سے
زمینِ کربلا پر تیری تربت ہونیوالی ہے

شکوہ الفاظ سے بھی انھوں نے اپنے قصیدوں میں زور پیدا کیا ہے۔ "شمہ ایوان نزل" "قاطع اعناق کافران مضل" "مستم نعمائے منعم عادل" "ذو العطایا" "لیل مقمر" "نقوش معوبالارحام" "مدات نسیم الفاس" "کف الخضیب" وغیرہ جیسی ترکیبیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

حضرت عزیز کی قصیدہ گوئی کے یہ صرف چند رُخ ہیں جو اس مضمون میں پیش کئے جارہے ہیں ورنہ ابھی بہت سے دوسرے محاسن قابلِ بحث ہیں بعض کوتاہیاں بھی ہیں۔ جو معرضِ بیان میں آنا چاہئیں۔ لیکن فی الحال اس مضمون کو یہ کہکر ختم کیا جاتا ہے کہ عزیز نے کچھ ایسی جدتیں پیدا کی ہیں جو باعتبارِ فن قصیدے میں ناموزوں معلوم ہونے کے باوجود اپنے مقام پر نہایت پسندیدہ ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ اگر قصیدہ گوئی کا ذوق پھر کسی وقت ابھرا تو عزیز کی یہ جدتیں قصیدہ گو شعرا کے لئے قابلِ تقلید بنجائیں گی۔

سید صفی حیدر دانش

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح برائے ماہ فروری سنہ ۱۹۴۲ء

"خوابیدگانِ غم کو نوید سحر ہے آج"

سحر۔ اثر وغیرہ قوافی۔ ہے آج ردیف

نوٹ:۔ ۸ جنوری کے بعد جو غزلیں وصول ہونگی وہ شریکِ اشاعت نہ ہوسکینگی ——— منیجر

حرفِ آخر

لفظِ "شروعات" ۲۳ مستند اساتذہ، محققین، فضلا اور ادبا کی نظر میں جہلا کا مختار ہے

شاید کسی کو یہ احساس ہو کہ میں اپنے یا "آگرہ اسکول" کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتا تو حقیقت یہ ہے کہ میں خود بہت سی باتیں نظر انداز کرتا رہتا ہوں۔ اسے کیا کیجئے کہ بعض مفسدین خود بخود اُلجھ پڑتے ہیں۔ چونکہ مباحث کا پس منظر علمی و ادبی ہوتا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی جواب دینا ہی پڑتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس میں مخالفین کو شکست نہ ہوئی ہو۔ مستقبل کا مورخ جب اس تمام ادبی نوک جھونک کا تجزیہ کریگا تو اس میں اُسے نناوے فیصدی رشک و حسد کا عنصر نظر آئے گا۔ ہر دور میں ایسے لوگ ہوتے رہے ہیں کہ جب انھیں اپنی بیتیم العلمی کے سبب چمکنے کا موقع نہیں ملتا تو وہ مشاہیر کے منہ آنے لگتے ہیں۔ غرض تو شہرت سے ہے کسی طرح بھی ہو، لیکن میرے خیال میں کسبِ شہرت کا یہ طریقہ گمنامی کی موت سے کہیں زیادہ گھناؤنا اور قابلِ نفرت ہے۔ یہ حُسنِ اتفاق ہے کہ آجتک "شاعر" میں کوئی بحث ایسی نہ چھڑی جس کا تعلق علم و فن سے نہ ہو اور جس سے ادبی دُنیا نے استفادہ نہ کیا ہو۔ ذاتیات سے بحث کرنا صرف مخالفین کی طبع فاسد کا نتیجہ ہوتا ہے! اور یہ پہلو نہ صرف میرے بلکہ غیروں کے لئے بھی تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ ورنہ میں تو چاہتا ہوں کہ علمی و فنی مباحث کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔ مجھ سے یا میرے ادارۂ خیال کے افراد سے غلطی کا امکان ہے اس لئے کہ غلطی اقتضائے بشریت ہے لیکن سارے ہندوستان کے ادبا اور شعرا کو چھوڑ کر مخالفت کا رُخ ایک ہی طرف ہونا صاف بتاتا ہے کہ معترضین کی ذاتی ناکامی اور محرومی اُنھیں اس پر مجبور کرتی ہے۔ بہرحال مخالفت کی نہ کبھی پروا کی گئی اور نہ کی جائے گی۔ ادب و شعر کے جذبۂ خدمت کے سامنے یہ چیزیں ہیچ اور پوچ ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ جنھیں جنونِ تعمیر ہوتا ہے۔ اُن کی تخریب کا سامان دنیا والے ضرور کرتے ہیں۔ مگر تعمیر ہوکر رہتی ہے۔

"**شروعات**" کی بحث سے تقریباً تمام ادبی حلقے دلچسپی لے رہے ہیں۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں اکتوبر کے "شاعر" میں جناب جوش مدیر معاون رسالہ "رہنمائے تعلیم" لاہور اور جناب آبر کی اس دریدہ دہنی کا جواب دونگا۔ جس کا اظہار ان حضرات نے اکتوبر کے "رہنمائے تعلیم" میں کیا ہے۔ مگر بعض اہم مضامین کی اشاعت مانع رہی اور میں اس سلسلے کی دوسری کڑی پیش نہ کرسکا۔ یہ تو میں آغازِ بحث ہی میں سمجھ چکا تھا کہ آبر اور جوش ملسیانی کا مقصد زبان و ادب کو فائدہ پہونچانا نہیں بلکہ اظہارِ تشخص و تمسخر ہے ــــــ بھلا علم و فن سے ان لوگوں کو کیا سروکار۔ نہ شاعر نہ ادیب۔ جوش صاحب ملسیانی "رہنمائے تعلیم" کے نیجر صاحب کو دُعا دیں کہ انھوں نے اپنے رسالہ میں شائع کرکے علمۂ طلبہ سے متعارف کرادیا اور آبر صاحب کو حضرت علامہ آحسن مارہروی مرحوم و مغفور نے ــــــ اپنے مضامین میں ان حضرات نے جس کج بحثی اور ہرزہ سرائی سے کام لیا۔ اُس نے عوام و خواص کو اتنا متاثر اور مغموم کیا کہ سیکڑوں خطوط میں مقدمہ چلانے کا مشورہ دیا گیا، مگر میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں کہ کسی کو ذات کا نقصان نہیں پہونچانا چاہتا ــــــ صرف یہ دکھانے کے لئے کہ آبر صاحب اور اُن کے دوست جناب لبھو رام جوش ملسیانی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ میں نے ملک کے مستند ادبا، شعرا اور اساتذہ سے چند آرا حاصل کرکے ایک ہلکے محاکمہ کے ساتھ ستمبر ۱۹۴۲ء کے "شاعر" میں شائع کردی تھیں، جس سے تمام ادبی حلقوں میں ایک آگ سی لگ گئی اور مخالفین بغلیں جھانکنے لگے۔ ایراد و بحث کی اساس از روئے علم و فن ہوتی تو یہ لوگ ٹھہر بھی سکتے تھے۔ اب موت کی خاموشی طاری ہوگئی ہے اور میں انھیں قابلِ رحم سمجھتے ہوئے نظر انداز کر رہا ہوں۔

میرا مضمون دیکھنے کے بعد "شروعات" کے سلسلے میں کتنے خطوط آئے اور ادبا و شعرا نے کیا کیا لکھا۔ یہاں اس تفصیل کی گنجائش نہیں۔ ان خطوط میں سید ضیا علی صاحب مارہروی کا طویل خط[1] بہت اہم اور دلچسپ ہے میں اسے پڑھکر ہنسا بھی ہوں اور آبر صاحب کی ذہنیت پر ماتم کرنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ سید صاحب کا خط اس بحث کو نقطۂ آخر تک پہونچانے کے لئے کافی ہے۔ سید صاحب نے اپنے خط میں مجھ سے بھی چند سوالات کئے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ

---

[1] سید صاحب نے اپنے خط میں آبر صاحب کے جن خطوط کا حوالہ دیا ہے وہ اور اسی قسم کے تقریباً پچاس خطوط کی اصل بھی اُنھوں نے مجھے بھیجدی ہے ــــــ اعجاز صدیقی

انھیں کیا جواب دوں۔ بس وہ یہ سمجھ لیں کہ ابر صاحب کو للّہی بغض ہے اُن کی ناکامیابی نے انھیں مجذوب بنادیا ہے۔ ایسی حالت میں وہ اگر مشاہیر ادب اور اہلِ کمال سے انھیں تو اس میں اُن کا کیا قصور۔ وہ فطرت ہی ایسی لیکر آئے ہیں۔ مجھے ابر صاحب کے ساتھ بڑی ہمدردی ہے کہ بیدبنیاد علی صاحب کے خط کی اشاعت کے بعد وہ اپنے خاص دوستوں کی نظروں سے بھی گر جائینگے اور آئندہ شاید مدیران اخبارات ورسائل بھی اُن پر اعتماد نہ کریں مگر

"خود کردہ را علاجے نیست"

حضرتِ قمر جلال آبادی مدیر ہفتہ وار اخبار "سٹار" لاہور نے اپنے اخبار اور حضرت فضا جالندھری (منشی فاضل و ادیب فاضل) نے رسالۂ **فصاحت** حیدرآباد (دکن) اور رسالہ **عالمگیر** لاہور میں "شروعات" کے متعلق مضامین لکھے ہیں۔ حضرتِ فضا نے بھی ۱۱ مشاہیر ادبا اور فضلا سے استصواب رائے کیا۔ میں ستمبر ۱۹۴۲ء کے شاعر میں حضرت آرزو لکھنوی۔ صفی لکھنوی۔ ثاقب لکھنوی۔ دل شاہجہانپوری۔ حسرت موہانی۔ بیخود دہلوی سیماب اکبرآبادی۔ وحشت کلکتوی۔ جلیل مانکپوری۔ شفق عمادپوری۔ سریر کابری گیاوی اور نوح ناروی کی آرا پیش کر ہی چکا ہوں۔ ناظرین دیکھیں کہ فضا صاحب کی حاصل کردہ آرا بھی کتنی وقیع اور معلومات آفریں ہیں۔ جب ۲۳ مستند ادبا۔ شعرا اور محققین یہ لکھ رہے ہیں کہ "شروعات" "غلط العوام" اور جہلا کی زبان کا لفظ ہے تو بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ابر صاحب جناب جوشؔ ملسیانی کو آواز دیں اور جوشؔ صاحب جناب ابر کو!!

"ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"

اعجاز صدیقی

حضرتِ فضا جالندھری کی حاصل کردہ آرا

(مطبوعہ رسالۂ فصاحت حیدرآباد (دکن) و عالمگیر لاہور نومبر ۱۹۴۲ء)

(۱) ڈاکٹر غلام جیلانی خاں برقؔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی گورنمنٹ کالج کیمبلپور

لفظ "شروعات" ایک بدعت ہے اگر اسے شرع کی جمع سمجھکر استعمال کیا جا رہا ہے تو غلط اور اگر شروع کی جمع ہے تو غلط تر۔

(۲) پروفیسر سلیم فارانی ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل گورنمنٹ کالج ہوشیارپور

شروعات کا استعمال میرے نزدیک غیر فصیح ہے۔ قدما کے کلام میں میری نظر سے یہ لفظ نہیں گذرا۔ متاخرین کا کیا کہنا۔ ان کے نزدیک تو وہی لفظ فصیح ہے جو غلط العام ہو۔ متاخرین سے میری مراد عہدِ حاضر کے وہ شاعر ہیں جن کا دائرۂ علم بہت محدود ہے کسی کا شعر یا سطر اس کے جواز کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اساتذہ اسکی تائید نہ کریں، بہرحال اس کی ثقالت سے انکار نہیں ہو سکتا۔

(۳) ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی لیکچرار ڈھاکہ یونیورسٹی

غلط العام اور غلط العوام دو مختلف چیزیں ہیں۔ غلط العام وہ ہے جسے خواص و عام سب استعمال کرتے ہوں جیسے "مشکور" بمعنی متشکر و ممنون مولانا شبلی اور بعض دوسرے فضلا نے بھی مشکور بمعنی متشکر لکھا ہے۔ اس لئے اب مشکور اردو میں غلط العام کے تحت میں آ سکتا ہے لیکن شروعات غلط العوام ہے۔ غلط العام نہیں۔ خواص کے یہاں میری نظر سے نہیں گزرا میرے نزدیک یہ لفظ صحیح نہیں۔

(۴) علامہ سید سلیمان صاحب ندوی اعظم گڈھ

غلط العام فصیح کا مقصد یہ ہے کہ لفظ قواعد کے لحاظ سے غلط ہو لیکن کثرتِ استعمال کی وجہ سے مستند ادیبوں اور شاعروں نے بھی اس کو قبول کر لیا ہو۔ تنہا قبولِ عام سے کوئی غلط لفظ زمرۂ فصاحت میں نہیں آتا۔ شروعات عامی لفظ ہے۔ کسی سنجیدہ صاحب قلم اور اہلِ علم کی تحریر میں نہیں ملا۔ ممکن ہے کہ کبھی کسی نے اس کا استعمال کیا ہو لیکن اب متروک ہے۔

(۵) حضرت نشتر جالندھری اڈیٹر اخبار انجمن حمایت اسلام لاہور

(۱) غلط العام فصیح کے ذیل میں آنے والے الفاظ کے لئے ضروری ہے کہ انھیں اساتذہ نے نظم و نثر میں استعمال کیا ہو۔ (۲) میری رائے میں شروعات پر غلط العام کا اطلاق نہیں ہو سکتا (۳) میں نے یہ لفظ کسی مستند شاعر کے کلام میں نہیں دیکھا اور نہ خود کبھی نظم و نثر میں استعمال کیا ہے۔ کیونکہ میرے نزدیک یہ غلط العوام معیوب کے ذیل میں آنے کے باعث قابلِ استعمال نہیں (۴) میرے خیال میں وہ جماعت حق پر ہے جو اس لفظ کو عوام کی زبان قرار دیتی ہے۔

(۶) مولانا عبدالمجید سالک مدیر روزنامہ "انقلاب" لاہور

غلط العام فصیح کا قول میرے نزدیک پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ اس لئے بہت کم ایسے الفاظ ہیں جن پر اس کا اطلاق ہو سکے عام اصول یہی ہے کہ جو لفظ مستند فصحا اپنے کلام (سنجیدہ کلام) میں استعمال کرلیں اُسے علی العموم فصیح سمجھا جائے۔ گو میں اُسے بھی کلیہ قرار نہیں دیتا۔ لفظ شروعات کسی مستند شاعر یا نثر نگاروں کے ہاں میری نظر سے نہیں گزرا البتہ بعض اہلِ زبان بولتے ہیں۔ لیکن مجھے اس قسم کے الفاظ کبھی پسند نہیں آئے

اہلِ زبان بہت سے ایسے الفاظ بولتے ہیں۔ جنکو ہم قبول نہیں کرتے۔ کیونکہ ہماری زباں دانی اکتسابی ہے۔ جس میں علمی احتیاط مقدم رہتی ہے۔ میں نے عمر بھر یہ لفظ نہیں لکھا۔ ... جو شخص اسے استعمال کرے وہ سند کے طور پر اہلِ زبان کے قول پیش کر سکتا ہے۔ لیکن جسکے وجدان ہی کو یہ لفظ پسند نہیں آتا۔ اس کے لئے یہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میں اہلِ زبان کی تقلید کا منکر نہیں ہوں۔ لیکن اندھی تقلید کا کسی حال میں قائل نہیں "مشکور" "متشکر" کے معنوں میں تمام ثقات اہلِ زبان استعمال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ مولانا شبلی بھی لکھ جاتے ہیں۔ لیکن میں نے عمر بھر نہیں لکھا۔ یہی میری رائے شروعات کے متعلق سمجھنی چاہیئے۔

(۷) میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے آکسن ایڈیٹر رسالہ "ہمایوں" لاہور

مکرمی تسلیم۔ آپ کے جوابات حسب ذیل ہیں

۱۔ الفاظ غلط العام فصیح کے لئے عموماً اچھا ہے کہ مستند اساتذہ نے انھیں استعمال کیا ہو لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں اور نہ یہ قطعاً ضروری ہے۔ اپنا اپنا رجحان ہے۔

۲۔ لفظ شروعات کو میں جائز نہیں سمجھتا اور نہ مجھے یہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

(۸) حضرت مولانا نیاز فتحپوری ایڈیٹر رسالہ "نگار" لکھنو

خط ۱؎۔ مکرمی تاخیرِ جواب پر معذرت خواہ ہوں۔ شروعات بالکل غلط ہے۔

خط ۲؎۔ شروعات کے متعلق میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔ یہ جاہلوں کی زبان ہے اور کوئی پڑھا لکھا آدمی نہ بولتا ہے۔ نہ لکھتا ہے۔ غلط العام فصیح سے اسے کیا واسطہ۔

(۹) حضرت مولانا ناطق گلاوٹھی تلمیذ حضرت داغ دہلوی

لفظ شروعات کو جس طرح محض ابتدا کے معنی میں جہلا اور عوام استعمال کرتے ہیں یہ بھی غلط العام نہیں ہوا۔ غلط العام کے معنی یہ ہیں کہ اسی طرح فصحا اور اہلِ علم بھی بولتے ہوں۔ اور میں نے کبھی اہلِ علم کو اس معنی میں یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے نہیں سنا ہے

سندِ اہلِ فصاحت نہیں اندازِ عوام آپ سمجھے نہیں ناطق غلط العام ابھی

اس لئے شروعات کو بمعنی واحد لکھنا اور بولنا نہ صرف یہ کہ غیر فصیح بلکہ غلط ہوگا البتہ اگر کسی بات کام یا مرض کے مختلف اسباب علامات ہوں تو وہاں اس لفظ کا استعمال بصیغۂ جمع ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اہلِ خانہ کا چڑچڑا پن وقت پر کھانا نہ پکانا اور بات بے بات بچوں کو مارنا جھگڑے کی شروعات ہیں یا سستی منہ کا بے مزہ ہونا اور پاؤں کو ٹھنڈا ہو جانا بخار کی شروعات ہیں۔ مگر ایسا استعمال بھی اہلِ علم میں کم ہے۔ وہ بیشتر ایسے موقع پر علامات بولتے ہیں۔ میں نے ایسا استعمال بھی بمعنی واحد نہ خود کبھی کیا نہ کسی مستند استاد ماضی و حال کے کلام میں دیکھا اور یاد نہیں آتا کہ کسی عالی شاعر کے کلام میں بھی میں نے اس لفظ کا استعمال دیکھا ہو۔ البتہ افسانچی حضرات ایسا ضرور لکھ جاتے ہیں۔ جنکی مجبوبہ آج کل یہی ہو رہی ہے۔ میرے ناگپور میں بھی کتنی ایسے جہلا تراش خراش کے افسانہ نگاری کرتے ہیں جنھیں دو حرف سیدھے بولنے کا بھی سلیقہ نہیں اور مدیران اخبار و رسالہ جات میں بھی ایسی بدلیاقتی کی کمی نہیں۔ جو سب اغلاط و خرافات کی اشاعت کی ذمہ دار ہو جاتی ہے۔ والسلام

(۱۰) حضرت جوش ملیح آبادی

"شروعات" غلط العام نہیں بلکہ غلط العوام کی تعریف میں آتا ہے۔ عربی قواعد کی رو سے محض غلط ہے اور فارسی میں کسی ایرانی کیا معنی کسی باخبر فارسی داں کے کلام میں بھی میری نظر سے نہیں گذرا، اور نہ میں نے کہیں استعمال کیا ہے۔

(۱۱) حضرت مولانا عبد الباری آسی لکھنوی

"شروعات" غلط العام میں نہیں ہے بلکہ غلط العوام میں ہے اور غلط العوام پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ میں نے اساتذۂ قدیم کے کلام میں یہ لفظ نہیں دیکھا اور خود بھی استعمال نہیں کیا۔ جو جماعت اس کو ٹکسالی بتاتی ہے اس سے پوچھنا چاہیئے کہ جب "شروع" موجود ہے تو "شروعات" کے کیا معنی؟ کیا یہ مصدر ہے؟ یا مصدر کی جمع، کیا ہے؟ اگر صحیح ہے تو کسی لغت سے اس کا ثبوت نہ ملنا کیا معنی۔ بہرحال میں اس کو غلط جانتا ہوں۔ ممکن ہے کسی نے لکھا ہو۔ مگر مشکل یہ ہے کہ غلط کی مثال اور غلط کی سند بھی غلط ہی ٹھہرے گی۔

اخبار "اسٹار" لاہور ۲۶ ستمبر ۱۹۴۲ء

ماہنامہ "شاعر" آگرہ میں اکثر تحقیق طلب مسائل پر بحث ہوتی رہتی ہے۔ اس سلسلہ میں لفظ "شروعات" بھی زیرِ بحث تھا کیونکہ عام گفتگو میں یہ لفظ اکثر استعمال ہوتا ہے۔ موقر ماہنامہ "رہنمائے تعلیم" لاہور اور ماہنامہ "شاعر" میں اس موضوع پر ایک بحث بھی چھڑ گئی تھی "شاعر" کے تازہ شمارہ میں ہم اس بحث کے نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس بحث میں جناب ابر احسنی گنوری اور حضرت اعجاز صدیقی حریف تھے۔ ابر صاحب "شروعات" کا استعمال صحیح مانتے ہیں اور اعجاز صاحب غلط۔ ذیل کے حضرات نے ابر صاحب کے نظریہ کی تائید کی۔ سائل دہلوی۔ دلیر مارہروی۔ جوش ملسیانی۔ طپش مارہروی اور اختر نگینوی۔ اس کے مقابلے میں ذیل کے حضرات اعجاز صاحب کا نظریہ صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ آرزو لکھنوی صفی لکھنوی۔ ثاقب لکھنوی۔ دل شاہجہانپوری۔ حسرت موہانی۔ بیخود دہلوی۔ سیماب اکبر آبادی۔ وحشت کلکتوی۔ جلیل مانکپوری۔ شفق عمادپوری۔ سرور کاکوری۔ تاجور نجیب آبادی ——— !

حضرت نوح ناروی نے پہلے "شروعات" کو غلط کہا۔ مگر بعد میں رائے بدل لی۔

اُن کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص بقول حضرت سائل دہلوی اس لفظ کو لکھے تو کوئی برائی نہیں؟

ظاہر ہے کہ اعجاز صاحب کا پلڑا بھاری ہے، اس کا یہ مقصد نہیں کہ جن بلند پایہ شعرا اور ادبا نے آثر کے نظریہ کو صحیح تسلیم کیا ہے۔ اُن کی اصابت رائے میں مجھے شک ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اعجاز کے ہم نوا حضرات نہ صرف اکثریت میں ہیں بلکہ نقادانہ نقطۂ نظر کی زیادہ شہرت اور مقبولیت کے حامل ہیں چنانچہ یہ نظریہ قابلِ تسلیم ہے کہ لفظ "ثمروعات" کو زبان اُردو میں جگہ دینا بدعت ہے۔ جدت نہیں ——

قمر جلال آبادی مدیر "استار" لاہور

جناب سید بنیاد علی صاحب مارہروی کا مکتوب

مارہرہ، ۷ اکتوبر ۱۹۴۲ء

مکرمی جناب اعجاز صاحب، سلام مسنون

آپ مجھ سے واقف نہیں ہیں، میں آپ سے غائبانہ متعارف ہوں، اس واقفیت کا ذریعہ جہاں رسالۂ "شاعر" ہے وہیں آپ کی ادبی خدمات بھی ہیں لیکن ان سب پر بالاتر مولانا سیماب مدظلہٗ کا تعلق ہے۔ مولانا کی عقیدت عرصے سے دل میں ہے، اُن کی شاعرانہ عظمت اور اُن کے فنی و ادبی کمالات بہت سی خاموش محفلوں میں موضوعِ گفتگو رہا کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر نذرانۂ عقیدت حاصل کرتے ہیں۔ میں ایک عرصے سے بعض رسائل میں "ثمروعات" پر بحث دیکھ رہا ہوں۔ اس کے محرک آثر صاحب گنوری ہیں۔ کسی مسئلہ پر تبادلۂ خیالات یا مباحثہ بذاتہ کوئی بری بات نہیں۔ سلیم الطبع اور اچھی صحبت کے لوگ ہمیشہ بحث کو بحث کی حد تک رکھا کرتے ہیں، اپنی معلومات اور اپنے دلائل سے بحث کو مفید بنانے اور حتی الامکان بدمزگی اور تُو تُو میں میں سے گریز کرتے ہیں، آثر صاحب گنوری کے وہ مضامین جو "زمانے تعلیم" کے صفحات پر رونما ہو چکے ہیں، متانت اور سنجیدگی سے گرے ہوئے ہیں جو بحث معقولیت کی حدیں چاک کر کے طعنہ زنیوں اور گالی گلوچ پر ٹھوکر کھائے اُس میں یقیناً کوئی قدیم پرخاش یا دیرینہ خلش کارفرما ہوتی ہے۔ گنوری صاحب کے مضامین میرے اس قیاس کی کھلی ہوئی دلیل ہیں۔ بحث ثمروعات کی ہے اور چوٹیں ہو رہی ہیں ذاتیات پر، کتنے افسوس کی بات ہے، آثر صاحب بحث تو کر رہے ہیں علم اللغات پر اور طرزِ کلام اور اندازِ تخاطب اختیار کیا ہے ایسا کہ جیسے کوئی تانگے والا کسی شریف اور بھلے مانس سے طلبِ کرایہ پر حجت کر رہا ہو اور دلیلیں پیش کر رہا ہو۔ میں آثر صاحب سے بہت کچھ واقف ہوں۔[۵] اس باب میں وہ بیچارے مجبور ہیں، آنکھ کھولی۔ دیہات میں، معمولی تعلیم کے بعد پرائمری اسکول میں مدرس ہوگئے۔ پرائمری اسکول کا ماحول انسان کو ہٹ دھرم، ضدی اور خود غرض بنانے کیلئے بہت کافی ہوتا ہے۔ حضرت مولانا احسن مارہروی مرحوم کے شاگرد ہوتے تمام عمر اس اُدھیڑ بن میں گذری کہ مولانا مرحوم کی شہرت و وقعت کا کچھ حصہ جناب کو بھی مل جائے استاذ کا مرنجاں مرنج طرزِ زندگی اختیار کرنے کے بجائے ہمیشہ بعض حالات میں استاد کے احکامات و فرمودات سے روگردانی و سرکشی اپنا وطیرہ رکھا۔ عطائیانہ طبیعت پائی ہے۔ خوانچہ والوں کی دھن میں اچھا گا لیتے ہیں، رنگین مزاج افراد نے اشعار کے حسن و قبح سے قطع نظر تال و سُر کی ہمیشہ داد دی، آثر صاحب اس داد کو ہمیشہ اپنے کلام کی داد متصور کرتے رہے۔ ایسے حالات میں ان سے یہ اُمید رکھنا کہ وہ اپنے استاد کی وفات کے بعد خدائی کے دعوے سے باز رہیں گے۔ غیر ممکن و محال ہے۔ استاد کی آنکھیں بند ہوتے ہی پر جھاڑ کر میدانِ جنگ میں آدھمکے اور ایک ایسے شخص سے منہ لگ گئے کہ جس کے منہ آنے میں بھی نفع ہی نفع ہے، انتہائی مطعون اور رسوا ہونے کے بعد شہرت اور ناموری تو کہیں گئی ہی نہیں۔

اعجاز صاحب! مجھے آثر صاحب کے بعض ان جملوں نے جو بالواسطہ مولانا مدظلہٗ کی شان میں مستعمل ہوئے ہیں۔ بہت دُکھ دیا ہے۔ آپ کتنے متحمل مزاج ہیں۔ گو میری آپ کی دید شنید نہیں، مولانا مدظلہٗ کی وہ عقیدت جو فطرتاً میرے دل میں موجود ہے مجھے خاموش نہ رکھ سکی اور میں ایک عجیب پیچ و تاب میں گرفتار ہوں اور آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ تحمل کیوں اور یہ قوتِ برداشت کس لئے؟ سچ ہے، گنوار کی گالی ہنس کر ٹالی۔ ممکن ہے کہ یہ بحث بہت جلد ختم ہو جائے، جہاں تک تعلق ثمروعات کی بحث کا ہے وہ ختم ہی سمجھئے لیکن اس ضمن میں آثر صاحب نے جن بدکلامیوں اور افترا پردازیوں سے کام لیا ہے۔ اُن کا کوئی نتیجہ ضرور نکلنا چاہئے۔ میری نگاہ سے آثر صاحب کے کچھ خطوط ایسے گذرے ہیں جو انہوں نے اپنے استاد مولانا احسن مارہروی مرحوم کو وقتاً فوقتاً لکھے تھے۔ اُن کے دیکھنے کے بعد میرے غم و غصہ کی کوئی حد نہیں رہی، معلوم ہوتا ہے گنوری کو آپ سے اور مولانا مدظلہٗ سے بہت پرانی پرخاش ہے۔ لیکن اب تک وہ بے حجاب نہیں ہوئے تھے اور غالباً یہ وجہ تھی استاد کی تادیب و تنبیہہ کی، میں آثر صاحب کے ان خطوط کے اقتباسات ذیل میں پیش کرتا ہوں اور جناب سے یہ دریافت کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ آخر زمانہ ماسبق میں آپ کے اور آثر صاحب کے درمیان وہ کونسی غلط فہمیاں رو چکی ہیں۔ جن کی بنا پر وہ اپنے استاد کو آپ کے اور مولانا مدظلہٗ کے باب میں اس قسم کی غلیظ اور رجالانہ تحریریں بھیجنے پر مجبور رہے۔ آثر صاحب نے اپنے ان خطوط میں جس بہ تہذیبانہ اندازِ تحریر کو جائز رکھا ہے اُس کو یہاں پیش کرتے ہوئے میں ایک حجاب سا محسوس کر رہا ہوں لیکن

[۵] حالانکہ وہ اس سے انکار ہی کریں گے۔

بہرحال چونکہ مجھے یہ سب امور آپ کے گوش گذار کر کے حقیقتِ حال سے آگاہ ہونا ہے۔ اِس لئے لکھتا ہوں۔

غالباً ستمبر ۱۹۳۲ء میں متھرا میں ایک مشاعرہ ہوا تھا، مولانا سیماب صاحب بحیثیتِ صدر اس مشاعرے میں مدعو کئے گئے تھے۔ بانیٔ مشاعرہ نے حضرت احسن مارہروی مرحوم کو بھی مدعو کیا، حضرتِ مرحوم اپنے ایک خواجہ تاش اور محب کی شرکت کی اطلاع سے اس مشاعرے کی شرکت پر آمادہ ہوگئے، آبر صاحب کو بھی غالباً انھوں نے لکھا کہ وہ بھی مشاعرے میں شریک ہوں، مغرور اور خود پرست شاگرد نے اپنے اُستاد کو جو جواب دیا، ملاحظہ ہو:—

"غالباً حضور دہلی سے تشریف لے آئے ہوں اور متھرا تشریف لے جانے پر مجبور کئے جا چکے ہوں، حضور کو علم ہے کہ علامہ صاحب مذکور سے میرا دل نفرت کرتا ہے، میں اُن کی انانیت میں بہت کمی پاتا ہوں۔ اُن کو منافقِ اعظم جانتا ہوں، پس مرا دل نہیں چاہتا کہ اُنکی صدارت میں مشاعرہ پڑھوں اور جب میں اپنے لئے یہ چیز ناپسند کرتا ہوں تو حضور والا کے لئے کیسے گنا اس قسم کا جذبہ رکھتا ہوں، ہرچند یہ چیز اُن اُستاد العلام کے لئے قابلِ فخر سہی کہ اُن کی صدارت میں حضور غزل پڑھیں مگر حضور کے لئے وہی چیز قابلِ توہین ہو جاتی ہے، میری بدتمیزی کو معاف کر دیا جائے۔ دل کی بات نوکِ قلم پر آگئی۔ اسی کے ساتھ یہ گزارش ہے کہ خادم حکم حضور کا تابع ہے اگر ان کے صاحبزادے یا اُن کے ادنیٰ شاگرد کی صدارت میں بھی مجھے مشاعرہ پڑھنے کا حکم دیا جائے گا تو محض حکم کی عظمت برقرار رکھنے کو یہ خادم فخریہ تیار ملے گا۔ ویسے بھی کوئی عذر نہیں لیکن جہاں تک ہو گریز کرنا چاہئے وہ کم ظرف فخریہ ان چیزوں کو اشاعت میں لے آتا ہے۔"

یہ خط ۹ اگست کو گنور سے لکھا گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ دُنیا کا کوئی آبرو باختہ سے آبرو باختہ انسان بھی ایسے رکیک خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا، حضرت احسن مارہروی مرحوم نے اس کا جو جواب دیا وہ بھی ہمارے علم و یقین میں ہے، گنوری نے کبھی اپنے استاد کے احکامات اور ارشادات کو اپنی خود رائی کے آگے دل سے قبول نہیں کیا، موقع اور وقت پر ظاہرہ خاموشی اختیار کرلی اور سرِ تسلیم خم کر دیا لیکن عداوت اور حسد کی آگ کو ہمیشہ دل کی خاکستر میں پوشیدہ رکھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہمیشہ کوئی نہ کوئی نیا فتنہ کھڑا کر دینا چاہا۔ استاد مرحوم ہمیشہ ایسے مواقع پر تادیب و تنبیہ فرمایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ مولانا سیماب مدظلہٗ کی مخالفت میں ایک استفسار تیار کیا اور اس استفسار کو منظرِ عام پر لانے سے پہلے اپنے استاد کے پاس بہ غرضِ مشورہ بھیجا، آبر صاحب کا وہ استفسار اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا بجنسہٖ میری نظر سے گذرا ہے۔ اِس کی نقل آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:—

استفسار

"ملکِ سخن کے ہر گوشے میں شہرت کافی پروپیگنڈے کے ساتھ کی جاچکی ہے کہ علامہ جناب سیماب اکبرآبادی نواب مرزا داغ مرحوم کے شاگرد ہیں سیماب صاحب خود "میں شعر کیوں کر کہتا ہوں" ایک مضمون "نیرنگِ خیال" کے کسی عید نمبر میں لکھ چکے ہیں جس میں ۱۸۹۵ء یا ۱۸۹۶ء میں داغ مرحوم کی شاگردی کا اقبال کیا ہے لیکن گلدستہ "مرقع قیصری" کانپور بابت ماہ جون ۱۹۰۴ء جلد ۲ نمبر ۶ کے صفحہ ۱۶ پر حسبِ ذیل ہیڈنگ کے ساتھ اُن کا ایک قطعہ تاریخ درج ہے:—

"قطعۂ تاریخ از نتیجۂ فکر جناب عاشق حسین صاحب سیماب اکبرآبادی شاگرد جناب ازل عظیم آبادی"

قطعہ کا پہلا شعر ہے ؎

شائع شد آں مرقعِ تخئیل شاعراں
ہر کس شدہ ز نقدِ دل خویش مشتری

قطعہ کے ہیڈنگ سے پتہ چلتا ہے کہ سیماب صاحب فصیح الملک حضرت داغ کے شاگرد نہیں ہیں بلکہ ازل صاحب عظیم آبادی کے ہیں، لہٰذا واقف حالات حضرات یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں کہ سیماب صاحب درحقیقت کس کے شاگرد ہیں؟

ابر احسنی گنوری بقلم خود

یہ استفسار جب مولانا حضرت احسن مارہروی کے پاس پہونچا تو انھوں نے گنوری کو بہت سختی کے ساتھ ڈانٹا اور بتایا کہ اُن کی موجودگی میں حضرت داغ مرحوم کے پاس مولانا کی غزلیں بغرضِ اصلاح حیدرآباد پہونچا کرتی تھیں ——

رسالہ "معیار الانشاد" جو حضرت سائل دہلوی کی ادارت میں بہ زمانۂ حیات فصیح الملک مرحوم حیدرآباد سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں بھی مولانا سیماب کے نام کے ساتھ "تلمیذ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی" موجود ہے۔

اور "فصیح الملک" جو ان کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اُس میں بھی نسبتِ تلمذ فصیح الملک ہی سے ہے۔[1]

[1] سالنامۂ شاعر ۱۹۳۲ء میں نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی نے خود بھی ایک مضمون لکھا ہے جس میں نہ صرف شاگردانِ فصیح الملک میں حضرت مولانا سیماب مدظلہٗ کو تسلیم کیا ہے

نیز آئندہ اس قسم کی مخالفت کے مظاہرے سے روکا۔ اسی زمانے میں ابر صاحب نے چند دوسرے اساتذہ سے مقابلے کی لی۔ حضرت احسن مرحوم نے اُن کی اس ذہنیت سے تنگ آکر خفگی کا اظہار کیا اور عرصے تک ناراض رہے۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے گنوری صاحب کے ایک خط کا جملہ ملاحظہ ہو، جو اُنھوں نے اپنے استاد کو لکھا تھا:۔

"آں حضرت کی بارگاہ میں اب میرے لئے کوئی نشست نہیں میرا شمار بدترین اور کمترین شاگردوں میں ہے اور آپ کو مجھے اپنا شاگرد کہتے ہوئے بھی عار آتا ہے"

سنہ ۳۹ء میں ہارڈنگ لائبریری میں مشاعرہ ہوا ساغر صاحب نظامی نے ایک گستاخانہ نظم مولانا احسن مارہروی کی ایک رباعی کے جواب میں پڑھی، اس سے ملک کا باعلم طبقہ بہت متاثر ہوا اور ساغر صاحب کی بہت لے دے ہوئی۔ قصور ساغر صاحب کا تھا کہ وہ ایک استاد کے مقابلے پر آئے، بُری طینت والوں کو تو ایسے مواقع کی جستجو رہتی ہے، مورخہ ۲۵ اپریل کو ابر صاحب گنوری مولانا احسن مرحوم کو خط لکھتے ہیں، ملاحظہ ہو:۔

"آج محترمی حضرت جوش ملسیانی کا خط آیا ہے، دیگر کوائف و حالات کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ میں مارچ میں دہلی کے مشاعرے میں گیا تھا جس میں آنحضرت اور قبلہ حضرت نوح بھی شریک تھے منجملہ ان کے ساغر بھی زینتِ محفل تھے، ساغر نے ایک گستاخانہ نظم پڑھی جس کا روئے سخن آنحضرت کی جانب تھا، اس خبر نے میرے جسم میں آگ لگا دی اور غم و غصہ نے میرے دماغ کو معطل کر دیا ہے۔ اس لئے حضرت سے نہایت ادب کے ساتھ اور التجا سے عرض گزار ہوں کہ اس کی تفصیل، نظم کا مضمون مجھے جلد سے جلد لکھ کر بھیج دیجئے اور عنداللہ و عندالرسول حسبِ عادت پردہ ڈالنے کی سعی نہ فرمایئے، شاید ساغر بھول گئے کہ اُن کی ایک مرتبہ کی دریدہ دہنی کا انتقام مسلسل ۸۔۱۰ برس میں نے ان سے اور اُنکے رفیقِ حیات استاد سے لیا ہے، اور بفضلہ ابھی زندہ ہوں گو گردشِ زمانہ نے مضمحل اور بد دل کر دیا ہے۔"

اس خط کی عبارت سے گنوری صاحب کی اس کثیف ذہنیت پر روشنی پڑتی ہے کہ بات ساغر صاحب کی تھی اور چوٹ کی اُنھوں نے مولانا سیماب صاحب پر۔ حالانکہ وہ خوب واقف تھے کہ ساغر صاحب جس قسم کی گستاخی کے مرتکب حضرت احسن مرحوم کی شان میں ہوئے تھے اس سے کہیں زیادہ گستاخیاں اور زیادتیں خود انھوں نے اپنے استاد حضرت سیماب کی شان میں جائز رکھیں۔ لیکن گنوری صاحب کو چونکہ واسطہ و بلا واسطہ اپنی کثافتِ طبع کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے لہذا وہ موقع و بے موقع کبھی اس سے نہیں چوکتے۔ واقعات سے بڑی حد تک واقف ہونے کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ گنوری صاحب کو نہ صرف سیماب صاحب بلکہ ملک کے اکثر اساتذہ سے برخاش رکھنے کی کچھ عادت سی ہے۔ ایک واقعہ اور گوش گزار کر لیجئے، سنہ ۱۹۲۴ء میں حضرت مولانا قمر بدایونی کے مقابلے پر آگئے۔ بریلی سے ایک اخبار العرش نکلتا تھا، اس میں ایک مضمون لکھا، جس کا مفہوم یہ تھا کہ میں ایک عرصہ سے بدایوں میں مقیم ہوں، میں نے یہاں کے شعرا کے ناپ بڑی محنت سے تیار کئے ہیں۔ پورے شاعر کا ناپ ۱۶ گرہ قرار دے کر بدایوں کے اکثر شعرا کو ابر صاحب نے گنور کی انچیل سے ناپا تھا، قمر صاحب مرحوم پر خوب خوب چوٹیں کیں تھیں، مولانا قمر مرحوم کے عقیدت مند بگڑ گئے۔ حضرت گنوری اور اُن کے لواحقین پر دفعات ۵۰۰ ۵۰۱ کے دعوے ہوئے، سب ناپ تول بھول گئے۔ خوشامد پر اتر آئے، ابر صاحب کا خود منہ تو کیا تھا کہ مولانا قمر مرحوم کے پاس جاتے اپنے احباب کے ذریعہ خواستگار معافی ہوئے۔ جب کسی طور کام نہ بنا تو بالآخر مولانا احسن مارہروی کے مولانا قمر مرحوم کو لکھ کر جناب ابر کی عدالت کی گرفت سے گلوخلاصی کرائی۔ اس سلسلے میں خود ابر گنوری نے حضرت احسن مرحوم کو متعدد خط لکھے۔ لیکن اِن کے ایک قلبی دوست راز احسنی کا خط اس مسئلہ پر پوری پوری روشنی ڈالتا ہے۔ راز صاحب احسنی، گنوری صاحب کے بہت ہی مخلص اور گہرے دوست ہیں، آدمی صائب الرائے اور سمجھ دار ہیں، انھوں نے تعلقات سے قطع نظر گنوری صاحب کے متعلق جو اظہارِ خیال اپنے اس خط میں کیا ہے وہ اُن کی حقائق بندی پر دال ہے۔ اِن کے خط کا تھوڑا سا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"———ابر صاحب سے بدایوں کی مخالفت ابر صاحب کی حماقت پر مبنی ہے اور اس تمام بکھیڑے کا صرف ایک سبب ہے یعنی یہ کہ ابر صاحب کی خود نمائی۔ ان میں یہ مرض ہمیشہ رہا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح مشہور ہو جائیں .... مجھے یقین کامل ہے کہ یہ صورت صرف حضور کے ارشادات کی تعمیل نہ کرنے سے پیدا ہوئی ابر صاحب اور میں ایک ہی رشتۂ غلامی میں منسلک ہیں لیکن ایمان کی بات اور وہ بھی حضور سے کہنے میں مجھے ذرا تامل نہیں کہ ان میں خود بینی اور خود نمائی کا مرض ہے۔ ابر صاحب کی موجودہ حالت نہایت درجہ قابلِ عبرت ہے، دن دن بھر کھانا نہیں کھاتے، ہمہ اوقات پریشان و متفکر رہتے ہیں، ایک یکہ و تنہا شخص اور پھر مفلسی کا عالم اس پر ایسے مصائب آپڑیں کہ اُس غریب کی عزت اور روزی کے جانے کا سوال ہو

---

۵ ۵۰ ازالۂ حیثیت عرفی

در حقیقت آبرؔ صاحب آجکل تصویرِ یاس بنے ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے
کہ صاحبِ اثر ہستیاں اُن کی امداد کریں۔ میں کل قمرؔ صاحب کے پاس گیا تھا
دُو ڈھائی گھنٹے بیٹھا۔ اُن کی خوشامد کی، ہر طرح کہا کہ وہ انھیں معاف
کردیں لیکن وہ کسی طرح رضامند نہیں ہوئے البتہ مجھے یہ اندازہ ضرور
ہوا کہ اگر کوئی بااثر ہستی جیسے کہ حضور ہیں اُن سے سفارش کرے تو
وہ ضرور معاف کردیں گے اور معاملہ طے ہوجائے گا۔ اب حضور جیسا مناسب
سمجھیں کریں وہ قابلِ امداد و معافی ہیں، ایک فریب خوردہ ہستی ہیں۔
اس لئے ضرورت ہے کہ اُن کی پرورش فرمائی جائے اور ایسی جگہ کے
رہنے والے ہیں جس کو دیہات سے تعبیر کرنا بالکل صحیح ہے، وہ شہری
لوگوں اور پڑھے لکھے انسانوں کی طرح سمجھدار نہیں ہیں۔.......
وغیرہ وغیرہ۔

راز صاحب احسنی کے خط کے اس اقتباس سے کئی نتیجے نکالے جاسکتے ہیں، اوّل یہ کہ آبرؔ صاحب کو اپنی شہرت و ناموری کے خبط میں بڑی سے بڑی طاقت سے بھڑ جانے میں باک نہیں، اس ضمن میں ان کی حماقت، خود غائی، خود بینی، اور استاد کے ارشادات کی عدم پیروی کا اظہار و اقرار خود ان کا ایک ایسا دوست کر رہا ہے جو ان سے جُدا کوئی دوسری چیز نہیں ہے پہلے تو مولانا قمرؔ بدایونی جیسے بااثر اور مستند شاعر سے مقابلے کی لی۔ جب اُدھر سے مناسب و ضروری تدارک ہوا تو پھر گنوری صاحب کی پیچ پیر زنی، بے کسی اور پریشانیوں کی کوئی حد نہ رہی اور اس سلسلے میں جو مالی و روحانی زحمتیں حضرت نے برداشت کیں اس کی تصویر راز صاحب احسنی نے اپنے خط میں بدرجہ اتم کھینچ دی ہے۔ ان پریشانیوں کے ازالے کے لئے اُن کے دوست راز صاحب کا مولانا قمرؔ مرحوم کے پاس جانا اور معافی کا خواستگار ہونا، اپنی جگہ پر قابلِ غور ہے۔ بظاہر یہ فعل اُن کے دوست کا رہا لیکن اس فعل میں خود اُن کی کتنی خواہش شریک ہوں گی اُس کا اندازہ بھی ہر ذی فہم بہ آسانی لگا سکتا ہے۔ اس حقیقت کے دوش بدوش حضرتِ گنوری کی یہ دیدہ دلیری ملاحظہ ہو کہ جب اُن کے استاد مولانا احسن مرحوم نے دریافت حال کیا تو صاف انکار کردیا اور لکھ دیا کہ نہ میں خود مولانا قمرؔ مرحوم کے پاس معافی مانگنے گیا اور نہ کسی کو اُن کے پاس بھیجا۔ ۲۰ جون ۱۹۳۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:-

" یہ خبریں غلط ہیں کہ میں نے قمرؔ صاحب کی بے انتہا خوشامد کی، میں رو دیا
اور اُنھوں نے انکار کر دیا۔ قمرؔ صاحب نے مجھے پان پیش کیا میں نے کہا میرا
منہ پان کے قابل نہیں۔ جوتیوں کے قابل ہے۔ میں نے قمرؔ صاحب کی
شان میں ایک قصیدہ پڑھا، میں نے برائے اصلاح ان کو غزل
پیش کی اور اُن کا شاگرد ہوا، یہ کہہ کر میں اب تک بہت مغالطہ میں
تھا مجھے علم نہ تھا کہ میرے ضلع میں بھی ایک ایسا استادِ کامل پڑا ہوا
ہے....... وغیرہ وغیرہ"

در آں حالیکہ حقیقت یہ تھی کہ آبرؔ صاحب کے احباب نے مولانا قمرؔ مرحوم کا گھر گھیر رکھا تھا اور خوشامد کا کوئی پہلو اُٹھا نہ رکھا، جب کسی طرح کاربراری نہ ہوئی تو پھر اپنے استاد کا سہارا لیا، استاد پہلے ہی سے گنوری صاحب کے بیہودگیوں سے نالاں تھے۔ بالآخر آبرؔ صاحب کی انتہائی پریشانیوں اور دشواریوں کو محسوس کرکے معاملے کو حضرت احسن مرحوم نے طے کرادیا۔

آبرؔ صاحب گنوری نے شررعات کے استعمال کی تائید میں جن بدایونی بزرگوں کی آرا حاصل کی ہیں اور نہایت فخر و مباہات سے اُن کو پیش کیا ہے اور جن کے شاعرانہ کمالات اور علمی تبحر کے وہ آج معترف ہو رہے ہیں۔ اُن کے بارے میں آج سے کچھ روز قبل ہی اُن کے خیالات نہایت عبرتناک تھے۔ اُن کے چند جملے ملاحظہ ہوں:-

" بدایوں کی مخلوق الاماں والحفیظ عجیب و غریب فطرت کی تنہا مالک
ہے۔ پانی میں آگ لگا دینا اُس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ چنانچہ اسی
عیاری کے ماتحت حضور کو فریب دیا گیا ہے۔ حضور کو گاہے گاہے
چند ساعت یا ایک دُو دن کو ان سے واسطہ پڑتا ہے مجھے تو احباب
بدایوں کی منافقت کا مسلسل ۵ سال تجربہ ہے، میں نے ان کو ابن الوقت
بے اصول، طوطا چشم، بے محبت، دشمن دوست پایا"

ایک دوسرے خط میں تحریر ہے کہ:-

" حاسدانِ بدایوں کی ذلیل حرکات اور کمینہ حملوں سے تنگ آکر
دس روپیہ کی کمی پر گنور آگیا اور یہ کمی جس قدر محسوس ہو رہی ہے
اُس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں.........."

یہ تحریریں ناموں کے حوالے کے ساتھ گنوری صاحب نے لکھی ہیں، لیکن میں نے بات کو کوتاہ کرنے کی خاطر، ناموں کو حذف کردیا ہے۔ بدایونی حضرات کے حق میں گالی گلوچ گنوری صاحب مدت سے کر رہے ہیں، غالباً اس ابن الوقتی کا سبق اُن کو بدایوں سے ہی ملا ہے کہ جن بزرگوں کو وہ آج سے کچھ روز قبل حاسد اور دنیا کی بدترین مخلوق کہتے تھے ہیں آج محض اس بنا پر کہ بعض سادہ لوح اور نیک خو حضرات نے اُن کی پاس خاطر سے "شررعات" کی تائید میں ان کو تحریریں دیدی ہیں تو وہ ان کی قابلیت و اہلیت کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ تحقیق و جستجو نے یہی ثابت کیا کہ گنوری صاحب نے ان سب حضرات سے

نہایت پُرفریب طریقے سے آراء حاصل کی ہیں۔ میں حضرت دلیر مارہروی سے ملا۔ انھوں نے فرمایا کہ مجھ سے آبر گنوری نے جس انداز سے ثمر دعات کے باب میں رائے مانگی تھی اُس کا اقتضا ہی یہ تھا کہ میں اُنکی خوشی کر دوں ورنہ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے وہ محفوظ ہے اور میں کسی صورت "ثمر دعات" کی تائید میں نہیں ہوں، دلیر صاحب نے اپنے اس خیال کی عام اشاعت کی بھی مجھے اجازت دی ہے، مارہرے کے ایک دوسرے موقر و معمر شاعر حضرت طپش مارہروی سے ملا، یہ حضرت "باقیات الصالحات" کے مصداق ہیں۔ حضرت احسن مرحوم کے بعد ضلع ایٹہ میں فنی و شعری واقفیت کے اعتبار سے آپ پر ہی نگاہ پڑتی ہے، ان سے بھی آبر صاحب نے نہایت پُرفریب طریقے سے ایک مبہم سی رائے حاصل کر لی تھی۔ حالانکہ ہمیں معلوم ہوا کہ اگر وہ حضرت طپش کا پورا خط شائع کرتے تو یہ مبہم سی تائید بھی مضمحل ہو جاتی۔ بہر حال طپش صاحب نے اپنی دستخطی تحریر مجھے جو دی وہ ذیل میں درج ہے :۔

"ثمر دعات" غلط العوام ہے۔ البتہ غلط العام میں وہ طاقت ہے کہ اصل کی کوئی حقیقت نہیں رہتی ہے۔ مرزا غالب، اب، جب، کب کے قافیوں میں لفظ صاحب استعمال کر گئے ہیں ؎

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آنے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

لیکن میرے نزدیک "ثمر دعات" فصیح نہیں ہے۔ جاہل طبقہ کے لوگ استعمال کرتے ہیں۔

خاکسار

محمد یوسف حسن طپش۔ ۵ ر اکتوبر ۱۹۴۲ء

میں نے حضرت طپش کی پوری تحریر پیش کر دی ہے۔ اب آبر صاحب فرمائیں کہ ان کے ایک مبہم جملے کے مقابلے میں جس کو اُنھوں نے طپش صاحب سے منسوب کیا ہے۔ اس رائے کی کیا وقعت ہے؟ میرے پاس وقت نہیں ورنہ میں خود گنوری صاحب کے استاد حضرت احسن مارہروی مرحوم کے منظوم و منثور کلام سے یہ بات واضح کرتا کہ ان کا شاگرد آج جس مہمل لفظ کے استعمال پر مصر ہے وہ اسکے منکر تھے۔ مولانا مرحوم کی ایک غزل مجھے ملی ہے جس کے قوافی میں "ثمر دعات" مستعمل ہو سکتا تھا۔ چند شعر اس غزل کے ملاحظہ ہوں ؎

کیوں چپ ہیں وہ بے بات سمجھ میں نہیں آتا ‏ ‏ یہ رنگِ ملاقات سمجھ میں نہیں آتا
کیا دادِ سخن ہم تمہیں دیں حضرتِ ناصح ‏ ‏ ہے تم کی یہ اک بات سمجھ میں نہیں آتا
شیخ اور بھلائی سے کرے تذکرہ تیرا ‏ ‏ اے پیرِ خرابات سمجھ میں نہیں آتا
دل ایک ہے اور اس کے طلبگار ہزاروں ‏ ‏ دیں کس کو یہ سوغات سمجھ میں نہیں آتا
کیونکر کہوں احسن کہ عدو دوست ہے میرا ‏ ‏ ہو نیک وہ بد ذات سمجھ میں نہیں آتا

ان قوافی میں مولانا احسن مرحوم کے اور اشعار بھی ہیں، ثمر دعات بھی آ سکتا تھا، لیکن اُنھوں نے غالباً اس لفظ کو محض اس لئے استعمال نہیں کیا کہ ان کے شاگرد جناب آبر کا حصہ تھا۔ حضرت احسن مرحوم نے صحتِ لفظی کو ہمیشہ غلط العام پر ترجیح دی، اُنکے متعدد مضامین بھی اسکی تائید میں موجود ہیں، خود آبر گنوری نے ان کے ایک مقالے کو دیکھ کر استفسار حال کیا تھا۔ آبر صاحب کی اس تحریر سے "ثمر دعات" کے عدم استعمال کی تائید ممکن ہے، مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۳۵ء کو وادہ بداؤں سے مولانا احسن مرحوم کو لکھا جاتا ہے کہ :۔

"آنحضرت نے تصحیح اللغات پر ایک مقدمہ لکھا تھا، جو بھائی ضیاء احمد صاحب کے والد مرحوم قبلہ مولوی شفیع احمد صاحب عالی کا مرتبہ تھا، اس میں فرمایا تھا کہ صحتِ لفظی کی پابندی چاہئے اور یہ ارفع و اولیٰ ہے، اب حضور یہ فرمائیں کہ غلط العام اور صحیح میں کس کو ترجیح دی جائے اور کس پر کاربند ہونا چاہئے۔ اگر غلط العام کو قابلِ استعمال مان لیا جائے تو ایسے کئی ہزار لغت بیکار ہو جاتے ہیں، بہر حال اس کے متعلق مفصل ہدایات سے سرفراز فرمایا جائے۔"

مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۳۵ء کے ایک خط میں گنوری صاحب پھر اسی کا ذکر کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

"حضور نے تصحیح اللغات کا جو مقدمہ لکھا ہے اس میں صحتِ لفظی کو غلط العام پر ترجیح دی ہے۔ اگر حضور کو فرصت ہو تو اس مقدمہ کو ملاحظہ فرما کر قطعی حکم صادر فرمائیے کہ مجھے کس راستے پر چلنا چاہئے، میں آج تک صرف آنحضرت کا مقدمہ دیکھ کر صحتِ لفظی کو مقدم سمجھ رہا ہوں، اب جو ارشاد ہو، منتظر ہوں۔"

گنوری صاحب کے اس خط کا جواب مولانا مرحوم نے ضرور کچھ نہ کچھ دیا ہوگا، لیجئے ساری بحث ختم ہوتی ہے۔ گنوری صاحب نہایت ایمانداری کے ساتھ اپنے استاد کا وہ خط شائع کرا دیں اور دیکھیں کہ اُنکے استاد اُنکی تائید میں ہیں یا اپنے خواجہ تاش بھائی کے صاحبزادے کے ساتھ؟ بڑی حیرت کی بات ہے کہ جو شخص کل تک صحتِ لفظی کو مقدم سمجھتا تھا آج غلط العام کو مقدم سمجھ رہا ہے، "ابن الوقتی اور جہالت کی اس سے آگے دوسری مثال ناممکن"۔

اعجاز صاحب! یقین کیجئے کہ حضرت گنوری جو کچھ کر رہے ہیں اور ملک کے ایک مشہور و مستند دائرہ کا ادبی جو منہ آ رہے ہیں، وہ محض اپنی پرانی پرخاش اور کم ظرفی کی بنا پر ہے۔ وہ اس کے کاربند ہیں کہ "بدنام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا" خط بہت لمبا ہوتا جا رہا ہے، میرے ایک دوست نے گنوری صاحب سے متعلق بہت زبردست مسالا اکٹھا کیا ہے، ایک روز ثمر دعات کی بحث کا ذکر تھا تو اُنھوں نے اس ریکارڈ سے یہ چند تحریریں مجھے دکھائیں، جی تو یہی چاہتا ہے کہ جو کچھ پاس ہے سب ایک ساتھ ہی پیش کر دوں اور بتاؤں کہ گنوری صاحب کی موجودہ لاف گزافی

اور خدائی کے دعوے اِن کی تحریروں کے آگے کتنے مضمحل اور بے روح ہیں، افسوس میرے دوست نے ان تمام تحریروں کے دینے سے صرف اس بنا پر انکار کر دیا کہ اوّل تو وہ گنوری صاحب کی ذاتیات سے متعلق ہیں نیز اُن کو منظرِ عام پر لانے کا ابھی وقت نہیں آیا ہے، بہر حال ان سے جو تحریریں بھی بہ لطائف الحیل ہاتھ لگیں بغیر کسی نقل کے بجنسہٖ جناب کی خدمت میں ارسال کرتا ہوں اور دریافت کرتا ہوں کہ گنوری صاحب کی یہ تحریریں کیا واقعی اس قابل ہیں کہ ان سے اغماض نہ کیا جائے۔ مولانا سیماب مدظلہٗ ہندوستان گیر شہرت و وقعت کے حامل ہیں اُن کی توہین گویا فن و ادب کی توہین ہے، آپ پسند نہ کریں تو کم از کم مولانا کے عقیدتمندوں کو ہی اجازت دیجئے کہ وہ گنوری کی بدکلامی کا جواب نوکِ قلم کے علاوہ قانونی گرفت سے دینے کا جلد تر بندوبست کریں، ایک جاہل، غیر معروف، ہٹ دھرم اور غیر متطبع کی تحریر کا جواب قلم سے دینا ایک صاحبِ قلم کے لئے کسی طرح موزوں اور مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ضرورت ہے کہ قمر مرحوم کی طرح عدالت کے کمرے میں کھڑا کر کے "شروعات" کی بحث کرائی جائے۔ اگر آپ نے موقع دیا تو گنوری صاحب کی خاطر سے ہم بھی بطور گواہ عدالت میں جا کر بطور سند یہ شعر پڑھ دینگے ؎

سنبھل اب "شروعات" کرتا ہوں میں | کہ دائر مقدمات کرتا ہوں میں

گنوری صاحب کو اپنی ناموری اور شہرت کا خیال ہمیشہ ستاتا رہتا ہے اور یقیناً اسی خواہش فراواں سے ماؤف ہو کہ وہ آپ اور آپکے ساتھ مولانا سیماب مدظلہٗ پر حرف گیری کا ارتکاب بیٹھے مولانا احسن مرحوم کی وابستگی بھی اس جنونِ بے درماں کے ماتحت تھی، جسکی تائید میں صدہا تحریریں میری نظر سے گذر چکی ہیں، اُن کے مخلص دوست جناب راز احسنی کی تحریر بھی اس پر مہر توثیق ہے، مزید تائید و تصدیق کے لئے خود آبر صاحب کا ایک خط ملاحظہ ہو، اپنے استاد کو کس دلسوزی کے ساتھ اپنی شہرت و ناموری کے اقدام کے لئے لکھتے ہیں:۔

"اس گمنامی والے فقرے سے میرا مطلب دیوان کی اصلاح نہیں تھا بلکہ غرض یہ تھی کہ دُنیائے رسائل میں ہنوز میں گم نام ہوں مجھ سے بہت بعد کے قلفلے اُٹھے اور منزل پر پہونچ گئے۔ ساغر کی حالت اور استعداد حضور سے پنہاں نہیں، ایسے ہی میری نظر اور معلومات میں ایک درجن ہیں جن کی ہر بکواس کو بڑے بڑے رسالے سنہری نوٹوں کے ساتھ شائع کرتے ہیں، ایسا کیوں ہوا، اُن کے استادوں نے اس میں کوشش کی، میں اپنی جگہ پر ہوں، اور میں نے کبھی حضور سے اس امر کا تذکرہ نہیں کیا، میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ حضور کو خود اس کا خیال ہونا فطری امر ہے۔ اگرچہ یہ فرمایا جا سکتا ہے کہ تو خود اس قابل بن، میں یہ عرض کروں گا کہ کسی چیز میں جوہرِ قابلیت ہونے کے علاوہ بھی اس کو متعارف بنانے کے لئے کسی بڑی ہستی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے حضور سے زیادہ کوئی بڑی ہستی نظر نہیں آتی، اگر کوئی شخص کسی نوعیت سے میرے کلام منثور و منظوم کی کثیر الاشاعت رسالے سے سفارش کرنی چاہے تو مجھ جیسے خود دماغ کو اس میں اپنی توہین محسوس ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہئے۔ میرے گھر میں کس چیز کی کمی ہے جو میں کسی دوسرے کا احسان لوں، دیکھتا ہوں کہ معمولی معمولی لوگوں کے پاس درجنوں رسالے چلے آتے ہیں اُنکے کلام اوندھے سیدھے شائع ہوتے ہیں اور میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ حالانکہ حضور اگر ذرا توجہ فرمائیں تو کل کو ہی مجھے کوتاہیٔ داماں کی شکایت ہو جائے حضور کے ایک اشارے پر ہر ایڈیٹر مجھے نہ معلوم کیا سمجھنے لگے گا اور ان ایڈیٹروں کا مذہب ہے صرف شخصیت پرستی، میں اگرچہ کوئی شخصیت یا قابلیت نہیں رکھتا مگر پھر بھی میری شخصیت وہ ہے کہ جس پر مجھے ناز ہے یعنی میں حضرت احسن مدظلہ العالی کا شاگرد ہوں یہی مطلب تھا شانِ بے نیازی کو حرکت میں لانے سے، کہ اب یہ احساس ستاتا ہے، اب حضور اس طرف توجہ فرماویں تاکہ دنیائے ادب کو یہ معلوم ہو جائے کہ جہاں ساغر صاحب سیماب صاحب کے ہونہار، قابل، شیرازی[ل]، غلط گو وغیرہ وغیرہ شاگرد ہیں وہاں حضور کا غلام بھی شہرت میں پیچھے نہیں"۔

یہ تحریر پڑھنے کے بعد کون ہے جو اس سے انکار کر سکتا ہے کہ گنوری صاحب کو شہرت و ناموری کی ہوس و طلب نے دیوانہ بنا رکھا ہے، لیکن افسوس اس کے حصول کی خاطر انھوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس میں قدم قدم پر کانٹے ہیں اور قعرِ مہیب، مجھے اندیشہ ہے کہ اگر وہ شہرت و ناموری کے اشتیاق میں یہی راستہ اختیار کئے رہے تو ایک نہ ایک دن کسی تاریک غار میں اوندھے منھ جا پڑیں گے، اور انھیں کے استاد کا یہ شعر ان کے وردِ زبان ہوگا ؎

راہِ مقصد تک پہونچکر پا شکستہ ہوگیا | اب لئے بیٹھی رہے آرام سے منزل مجھے

اعجاز صاحب! آپ کا بہت وقت خراب کیا، تضیع اوقات کی معافی چاہتا ہوں گنوری صاحب کی بدکلامیاں دیکھ کر دل نہ مانا اور ایک غیر متعارف شخص آپکے معروف اوقات خراب کرنے آگیا، مجھے مولانا سیماب مدظلہٗ سے جو عقیدت ہے۔ اسکی وجہ سے دل گوارا نہیں کرتا کہ کوئی اُن کے منہ آئے۔

سید بنیاد علی مارہروی

[ل] بیشک آپ کو ان صفات سے مبرا اور پیچھے کون کہہ سکتا ہے جن صفات کا حامل آپ نے ساغر صاحب کو قرار دیا ہے۔

مشاعرۂ شاعر —— مصرعِ طرح :- بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی

محسنِ ادب حضرت نشتر ہنگامی

جسکی دنیا سے دیں نہیں بنتی — اُس کی دنیا کہیں نہیں بنتی
ہمنشینوں سے اب نہیں بنتی — کاش یادِ اُس کی ہمنشیں بنتی
اور سب کچھ بگڑ کے بنتا ہے — "بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"
اشکِ غم جبتک امینِ حدیث ہوں — آستیں آستیں نہیں بنتی
جب بگڑنے پہ آگئی قسمت — پھر بنایا کرو نہیں بنتی
ہوگئی یہ زمیں فلک خوردہ — اب تو کوئی نئی زمیں بنتی
آنکھ پر تھے پڑے ہوئے پردے — کیا یہ نشتر جمال بیں بنتی

معاونِ ادب حضرت صابر بی - اے

بزمِ عاشق گر یہیں بنتی — قابلِ رشک یہ زمیں بنتی
نذرِ گردش ہوئی ہیں لیل و نہار — جب سے انکی مری نہیں بنتی
جب جنوں ہی نصیبِ انساں تھا — جیب بنتی نہ آستیں بنتی
میری قسمت سے کھیل رسے تو یہ — بات بنتی ہے اور نہیں بنتی
اللہ اللہ بگاڑ قسمت کا — میں بناتا ہوں نہیں بنتی
آسماں اُن کا آستاں ہوتا — اور دُنیا مری جبیں بنتی
آپ سے کیا چھپائیں اے صابر — رازِ دل بے کہے نہیں بنتی

ہمدردِ ادب حضرت رونق دکنی (جمشید پور)

آہ گر دردِ آفریں بنتی — دل سے اُٹھتی ہی دلنشیں بنتی
یہ نمائش ہے مٹنے والوں کی — ان کی تربت کہیں نہیں بنتی
جذبۂ عشق جب جواں ہی نہیں — کیا تمنائے دل حسیں بنتی
اشکِ خوں کی ہر ایک بوند ای کاش! — حُسن داماں دا آستیں بنتی
دردِ انسانیت اگر ہوتا — زندگی اپنی بہتریں بنتی
تھی نشاط آفریں امیدِ وفا — رازِ دل کی اگر امیں بنتی
عیب ہی عیب ہم میں ہیں رونق — ہر نظر کیوں نہ نکتہ چیں بنتی

حضرتِ اختر وارثی سرحدی

یہ زمیں خلد آفریں بنتی — دہر کا نقشِ بہتریں بنتی
گر نہ ہوتی یہاں بدی کی کاشت — زندگانی بہت حسیں بنتی
پاس ہوتی جو دولتِ ایماں — موت کیوں مارِ آستیں بنتی
ہوں نہ اخلاق بہتریں جبتک — زندگی، زندگی نہیں بنتی
جسکے دل میں خدا کا خوف نہیں — اُسکی بگڑی کبھی نہیں بنتی
کاش امتِ رسولِ اکرمؐ کی — پیروِ دورِ اولیں بنتی
تم نہ کرتے اگر تپ واسے — دل پہ کیوں اخترِ حزیں بنتی

جناب سلیم سہروردی گوالیاری

بزمِ دل کس قدر حسیں بنتی — یادگر تیری دلنشیں بنتی
دل میں طوفانِ درد اٹھا ہے — کوئی تدبیر اب نہیں بنتی
آستانے کی خاک میرے لئے کاش — اک وفا آشنا جبیں بنتی
زندگی ہے تضاد کی حامل — سوز اور ساز میں نہیں بنتی
میں نکالا ہوا ہوں جنت سے — کیوں جہنم نہ یہ زمیں بنتی
رنگ لاتا جو سوزِ پروانہ — شمع اک اشکِ آتشیں بنتی
ہوتی طبعِ سلیم کیا موزوں — ہجر میں بات تک نہیں بنتی

جناب کیفی جام پوری

ہر قدم پر نئی جبیں بنتی — بات سجدوں کی پھر کہیں بنتی
عشق وہ عشق ہی نہیں جس میں — "بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"
لے اُڑتے فردوس اسے ورنہ — خاکِ دل سے نئی زمیں بنتی
پاک ہوتی جو کینہ سازوں سے — رشکِ فردوس یہ زمیں بنتی
تیری خوئے وفا پرستی کی — دردمندوں سے کیوں نہیں بنتی
نامکمل ابھی بہاریں ہیں — تیری تصویر کیا کہیں بنتی
زخمِ دل کے نہ کھل سکے کیفی — کیا بہار آکے خوشہ چیں بنتی

جناب سہا قریشی (از کھنڈ)

بات بگڑی بھی ہے کہیں بنتی — کہہ سہ مارتے نہیں بنتی
وہ کلیسا ہو دیر ہو کہ حرم — بگڑی قسمت کہیں نہیں بنتی
اس قضیئے کو آکے سُلجھاؤ — آس اور یاس میں نہیں بنتی

اور ہر شے تو بن بھی جاتی ہے　　"بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"
تھی زمینِ چمن اسی قابل　　حُسنِ معصوم کی امیں بنتی
متبسم جو آپ آجاتے　　شامِ غربت مری حسیں بنتی
ہوتی خاموش وہ اگر نہ سہا　　اُنکی تصویر جانشیں بنتی

جناب شاد اٹاوی

صورتِ حسن ہر کہیں بنتی　　جو نظر عشق کی حسیں بنتی
المدد صبر آزمائے نیاز　　ہوش و وحشت یہاں نہیں بنتی
اشک شوئی کا لطف تو جب تھا　　اُن کے دامن سے آستیں بنتی
خاطرِ عشق خود غرض تو نہیں؟　　دُوریِ حُسن سے نہیں بنتی
بے حسی و جمود لاحاصل　　بے عمل زندگی نہیں بنتی
سانس اُلجھتی ہے دم ہے آنکھوں میں　　اب تو آجا۔ کہ اب نہیں بنتی
شاد اللہ سے محبت کر　　اب بتوں سے اگر نہیں بنتی

جناب منظر کلیمی جام پوری

رنج واندوہ بھی ہیں روح گداز　　عیش و عشرت سے بھی نہیں بنتی
میں وہ ناکامِ عشق ہوں جسکی　　"بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"
تیرے جانے ہی ہوگئی برہم　　جسم سے جان کی نہیں بنتی
عشق سے بہرہ ور نہ ہو جبتک　　زندگی زندگی نہیں بنتی
سوز ہوتا اگر نہ سینے میں　　کس طرح آہ آتشیں بنتی
کوئے جاناں پہ جنتیں قرباں　　کاش تربت مری یہیں بنتی
رہتی کیوں شاد فطرتِ منظر　　درد و غم کی نہ گر امیں بنتی

جناب حبیب آروی

یاد اُن کی جو ہمنشیں بنتی　　دل کی ہر آرزو حسیں بنتی
دل میں ذرّوں کا سوزِ غم ہوتا　　پھول کی روح آتشیں بنتی
چشمِ موسیٰ پہ اعتراض نہیں　　خوب ہوتا جو دُوربیں بنتی
تنگ ہے اب مجھے تصور بھی　　ایک تصویرِ غم نہیں بنتی
چاہیے تھا کہ ماورائے عرش　　میرے قابل کوئی زمیں بنتی
اُن کا نقشِ قدم جو مِلجاتا　　ایک جنت مری وہیں بنتی
کاش منزل کی آرزو میں حبیب　　میری دُنیا نئے آدلیں بنتی

جناب شاعر کاندہلوی

کس طرح تجھ سے نکتہ چیں بنتی　　"بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"

نظم سیماب سے سبق لینا　　عقل "ہمدمی" جو نکتہ بیں بنتی
کاش شمعِ حقیقت و عرفاں　　رہبرِ و رہنمائے دیں بنتی
ایسی بگڑی ہے صورتِ تقدیر　　ہم بناتے ہیں اور نہیں بنتی
نعش جاتی نہ کوئے جاناں سے　　میری تربت یہیں کہیں بنتی
پاؤں دیتے اگر جواب مرے　　جادہ پیما مری جبیں بنتی
اُن سے جس کی بگڑ گئی شاعر　　تم نے دیکھی ہے پھر کہیں بنتی

جناب شرقی ٹمکوری بی۔ اے

کیا مری آہ دلنشیں بنتی　　"بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"
اپنی ہی ذات پر میں رشک کردں　　زندگی ایسی کیوں نہیں بنتی
اک مجھی سے انھیں عداوت ہے　　یار قیبوں سے بھی نہیں بنتی
شرفِ بندگی ہی مل جاتا　　قابلِ سجدہ گر جبیں بنتی
یاس اُمید سے بدل جائے　　بات ایسی کوئی نہیں بنتی
سردمہری کو ان کی کیا کہئے　　زندگی زندگی نہیں بنتی
خاکِ شرق سرشت ہی شرقی　　میری جنت یہیں کہیں بنتی

جناب حزیں قریشی احمد آبادی

آہِ دل کیوں فلک نشیں بنتی　　غمگسارِ دلِ حزیں بنتی
"کاش کے" یوں جبیں جبیں بنتی　　حاملِ ذوقِ صد یقیں بنتی
خون روتا تو ہر لہو کی بوند　　زینتِ جیب و آستیں بنتی
دردِ پنہاں کی اک خلش ابتک　　وجہِ تسکینِ دل نہیں بنتی
حاصلِ کوششِ دوام نہ پوچھ　　"بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"
کچھ نہ بنتی تو عشق کی فطرت　　آئینہ دارِ کفر و دیں بنتی
جتنی تصویرِ حسن ہے دلکش　　اُتنی ہی کاش دلنشیں بنتی

جناب شوق تہادوی

نئی دُنیا نئی زمیں بنتی　　لاکھ چاہا مگر نہیں بنتی
ہر ادا تیری دلنشیں بنتی　　ہر نظر کیف آفریں بنتی
کیا زمانے کی کج ادائی ہے　　"بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"
دَور ہے انقلاب کا ورنہ　　میری کوشش تو القیں بنتی
اُنکی نظروں کا فیض کیا کہئے　　قسمتِ دل مگر نہیں بنتی
ذکر پر میرے ہنس کے کہتے ہیں　　اُن سے اپنی کبھی نہیں بنتی
شوق قسمت کو رو دیے کبتک　　کیا بگڑتا ہے گر نہیں بنتی

ابوالمختار جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی

تیری صورت جو دلنشیں بنتی   دل کی ہر چوٹ نازنیں بنتی

دل کی وحشت کچھ اور بڑھ جاتی!   دامنِ گل سے آستیں بنتی

تم جو ہوتے نیاز کے خواہاں!   فطرتِ عشق نازنیں بنتی

کچھ تو اُن سے پیامبر کہتا   تجھ سے اک بات بھی نہیں بنتی؟

اپنے گیسو سنوارنے والے   میری تقدیر کیوں نہیں بنتی؟

اُن کی مرضی ہے جو کریں طرفہ!   اُن سے کہتے ہوئے نہیں بنتی

جناب اخلاص زبیری، ایم - اے (بھنڈ)

پیر ہیں یاس کی معاذ اللہ   دل میں اب آرزو نہیں بنتی

دیکھ کر آئینہ اُداسی کیوں   شکل کیا اور بھی حسیں بنتی؟

ہر دمہ کی الگ الگ ہے راہ   دو بتوں میں کبھی نہیں بنتی

ہوش ہی کس کو تھا حضورِ حسن   بات کیا ہم سے ہمنشیں بنتی

کاش جلتے چراغ آزادی   اس غلامی میں اب نہیں بنتی

شعر گوئی کجا، کجا اخلاص   بے کہے بھی مگر نہیں بنتی

جناب آذر ناگپوری

میری دنیا کوئی حسیں بنتی   جس میں ہر چیز نازنیں بنتی

صحنِ گلشن میں تم نہیں ورنہ   یہ فضا اور دل نشیں بنتی

اپنے مرکز سے گر نہ ہٹتی نظر   رازدارِ دلِ حزیں بنتی

تیرے کوچہ میں یا ترے در پر   قبر میری نہیں کہیں بنتی

ختم ذوقِ نیاز ہو جاتا   قابلِ سنگِ در جبیں بنتی

یادگارِ آذرِ جنوں کی   تیرے کوچہ کی سرزمیں بنتی

جناب شاد سلیمانی نقشبندی جالندھری

کل تو اپنی تھی ہر کہیں بنتی   اے وطن اب یہیں نہیں بنتی

تجھ سے بنتی جو نفسِ امارہ   ساری دنیا سے بالیقیں بنتی

ہند کی سرزمیں ہے ڈائن   حریت کی یہاں نہیں بنتی

کیوں نہ اہلِ وطن پریشاں ہوں   اُنکی آپس ہی میں نہیں بنتی

دوست روٹھا ہوا نہیں منتا   "بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"

عشق سازِ حیاتِ عالم ہے   شاد اس بن کہیں نہیں بنتی

جناب بزم امروہوی

بات بگڑی اگر کہیں بنتی   میری تقدیر کیوں نہیں بنتی

اے مقدر تو کیوں بگڑتا ہے   کیوں کسی سے تری نہیں بنتی

کام بگڑا ہوا تو بنتا ہے   "بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"

مجھکو مل جائے وہ بغیر تلاش   ایسی صورت کوئی نہیں بنتی

پہلے اُن سے بہت محبت تھی   بزم اب اُن سے کیوں نہیں بنتی

جناب فضا کوثری

کس طرح اُن سے ہمنشیں بنتی   جن سے اک آن بھی نہیں بنتی

کس نے ایسا بگاڑ ڈال دیا   میری تقدیر کیوں نہیں بنتی

اُن کے دل میں تھی جو میری جگہ   یاد ہی میری دلنشیں بنتی

اس سے بہلاتے اپنے دل کو ہم   تیری تصویر ہی نہیں بنتی

اے فضا رفعتِ تخیل سے   آسماں کاش یہ زمیں بنتی

جناب بسمل بھنڈاروی بی۔اے

یاد اُس کی اگر مکیں بنتی   دل کی دنیا بڑی حسیں بنتی

رازِ تدبیر مجھ پہ گر کھلتا   میری تقدیر بالیقیں بنتی

خود وہ آتے کہ موت ہی آتی   کچھ تو صورت دلِ حزیں بنتی

آشنائے خودی اگر ہوتی   ہر نظر حسن آفریں بنتی

جب وہ ہوتے ہیں جلوہ گر بسمل   نذرِ جاں کے سوا نہیں بنتی

جناب نکہت بی۔اے فاضل (ناگپور)

ہاں ہی کہدو تو کیا بگڑتا ہے   نہیں کہتے اگر نہیں بنتی

جب بگڑتے ہیں حسن کے تیور   جانِ عاشق پہ کیا نہیں بنتی

موسمِ گل کی آمد آمد ہے   دست و دامن میں اب نہیں بنتی

موت جب تک نہ آئی الفت میں   زندگی زندگی نہیں بنتی

اُن سے مل کر کروگے کیا نکہت   بات کرتے بھی جب نہیں بنتی

جناب لکشمی نارائن - فارغ - ادے پور

اور کس کی ہے ہمنشیں بنتی   اُن سے اپنی اگر نہیں بنتی

چھپتی پھرتی نہ آسمانوں میں   برق اگر چشمِ شرمگیں بنتی

بس میں ہوتا یہ میرا دل یارب   صورت اُنکی نہ دلنشیں بنتی

نار اور نور میں اگر یک رنگ   حسن و الفت میں کیوں نہیں بنتی

خونِ دل کو ہوا جہاں فارغ   جسم کی قبر بھی وہیں بنتی

جناب خلیل ازسگولی

پیر کبھو مرگ تمنا [illegible] بنتی   اُنکی رحمت جو ہمنشیں بنتی

شامِ ہستی مری معاذ اللہ صبحِ رنگیں کبھی نہیں بنتی
خود نگر عشق گر نہ ہو جاتا فطرتِ حسن سحر گیں بنتی
ایک دل اور ہزار ویرانی! کاش منزل تری یہیں بنتی
ہو ہی جاتا خودی کا راز افشا نظر اپنی جو نکتہ بیں بنتی

جناب سوز ابنالوی

بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی ہم نے دیکھی نہیں کہیں بنتی
کاش اس بیکسی میں یاد آتی دلِ برباد کی مکیں بنتی
طائرِ دل کی قبر بھی پس مرگ آشیانے ہی کے قریں بنتی
عشق جب لاعلاج ہو جائے چارہ گر سے بھی پھر نہیں بنتی
میری مٹی سے سوز بعد وفات کاش مے خانہ کی زمیں بنتی

جناب شعر ہاشمی ملیح آبادی

انقلاباتِ عشق کیا کہنا آج بنتی ہے کل نہیں بنتی
رہ نوردی کا شوق تھا دل کو ورنہ منزل تو ہر کہیں بنتی
ہر قدم پر بلائیں آتی ہیں جب مقدر سے کچھ نہیں بنتی
اپنے وعدہ پہ تم جو آ جاتے تو مری جان پر نہیں بنتی
عشق میں اُن کے مر مٹے اشعر داستاں اپنی کیوں نہیں بنتی

جناب انور شہادوی

کوششوں پر بھی وائے ناکامی "بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"
تھی زمیں کوئے دوست کی فانی میری تربت یہیں کہیں بنتی
خاک اڑاتا جو دشتِ وحشت میں اک زمیں پر نئی زمیں بنتی
سر ترے آستاں پہ جھک جاتا کاش میری جبیں جبیں بنتی
طبع اندوہ گیں مری انور کیوں نشاط آفریں نہیں بنتی

جناب بیتاب کالپوی

سامنے اُن کے کچھ نہیں بنتی بات کیا وقتِ واپسیں بنتی
ہوتا خوددار اگر وطن اپنا آسماں پھر تو یہ زمیں بنتی
چشم و دل گر نہ دریا ہوتے اپنی ہر بات بالیقیں بنتی
آرزو ہی رہی مجھے بیتاب اُن سے بنتی کبھی کہیں بنتی

جناب محسن ساگری

جو بنا کر بگاڑ لیتا ہے بات اسکی کہیں نہیں بنتی
جسکی عادت بگاڑ دی جائے پھر بنانے سے بھی نہیں بنتی

دو دلوں کی کسی زمانے میں تو نے دیکھی بھی ہے کہیں بنتی
غیر کا کیوں کرے محسن شکوہ آج اپنوں سے بھی نہیں بنتی

جناب خنجر خلیق جمیلی ایولوی

بنتی باتیں مری بگڑتی ہیں بات بگڑی مگر نہیں بنتی
جھوٹے فنون سے گر نہ لیتے کام ایسی درگت نہ اہلِ دیں بنتی
قابلِ فخر ہوتی دل کی متاع اُنکی دنیا اگر حسیں بنتی
میں بناتا تو ہوں ہزار خلیق میری دنیا مگر نہیں بنتی

جناب غافل از بتول

وہ ہیں مصروف خوابِ ناز جہاں میری تربت وہیں کہیں بنتی
آدمی جس طرح بنا ہے یہاں کاش تقدیر بھی یہیں بنتی
دل کی دنیا بنی مگر افسوس "بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"
ہائے مٹی نہ گر ابھی غافل اور دنیا تری حسیں بنتی

جناب طالب بیڑکری جاگیردار سنڈیرا

واہ ری میری شوخیِ قسمت بات بنتی ہوئی نہیں بنتی
پھوٹی قسمت جو بنش کی ہم نے بولے جھنجلا کے جا نہیں بنتی
آج طالب ہی لب پہ مہرِ سکوت کیا کہوں بات تک نہیں بنتی

جناب طالب بھاٹاپاروی

ہم سے تقدیر کچھ خفا سی ہے "بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"
کیا کٹھن راستہ ہے جادۂ عشق عقل بھی راہبر نہیں بنتی
پہلا سا طالب انہماک کہاں نظم کیونکر یہ تابگیں بنتی

جناب غنی کلم نوری ضلع پربھنی

کاش بادِ بہار گلشن میں کارسازِ دلِ حزیں بنتی
خاک اُڑاتے جو میکدہ میں رند سُرمۂ چشم اہلِ دیں بنتی
اے غنی کاش میری موجِ وہم رہبرِ منزلِ یقیں بنتی

جناب عالی از پورپور

اُنکی صورت جو خشمگیں بنتی اور میرے لیے حسیں بنتی
کاش مڑ کر مری طرف وہ نظر تیرِ دلدوز و دل نشیں بنتی
کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی "بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی"

جناب مرزا شہادوی

اب کسی سے نہیں ہے رسم و راہ اب کسی سے مری نہیں بنتی

(اعجاز حسین پرنٹر و پبلشر نے آگرہ اخبار ... پریس میں چھپوا کر دفتر شاعر ... آگرہ سے شائع کیا)